سنائپر
ریاض عاقب کوہلر

ناول

ریاض عاقب کوہلر

سنائپر

اس دوشاخے پر بیٹھے مجھے بارہ گھنٹے ہونے کو تھے۔میں بس اپنے ہاتھ پاؤں کو محدود حرکت دے کر اپنے اعضاء کو سُن ہونے سے بچا سکتا تھا۔اس سے زیادہ حرکت کرنے کی عیاشی میری قسمت میں نہیں تھی۔لیکن یہ سب میرے لیے اتنا زیادہ بھی مشکل نہیں تھا کہ مجھے اپنے فرض سے باز رکھ سکتا۔دوران ٹریننگ میں چھتیس چھتیس گھنٹے اس سے بھی محدود جگہ پر بیٹھ کر گزار چکا تھا۔بلکہ ایک مرتبہ تو مجھے اڑتالیس گھنٹے گزارنے پڑ گئے تھے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ٹریننگ اور حقیقت میں زمین، آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ٹریننگ ہوتی ہی غلطیاں سدھارنے کے لیے ہے جب کہ حقیقت میں غلطی کرنے کا مطلب اپنی جان گنوانا ہوتا ہے۔خاص کر ایک سنائپر کے لیے غلطی کا تصور ہی محال ہے۔ہمارے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ ”سنائپر کے پاس فائر کرنے کے لیے صرف ایک گولی ہوتی ہے۔اگر وہ گولی ہدف کو نہ چھو سکے تو دردناک موت سنائپر کا مقدر بن جایا کرتی ہے۔“

میرے پسندیدہ استاد، راؤ تصور کا قول اس بارے اور بھی متشدد تھا۔ان کے مطابق سنائپر کے پاس فائر کرنے کے لیے دو گولیاں ہوتی ہیں، پہلی گولی ہدف کے لیے اور اگر وہ خطا ہو جائے تو دوسری گولی اپنے لیے، کیونکہ دشمن کے ہاتھ آنے کا مطلب زندہ درگور ہونا ہوتا ہے۔

البتہ گولی کے نشانے پر لگنے کی صورت میں ایسی افراتفری اور انتشار پھیلتا ہے کہ سنائپر کی طرف لوگوں کا دھیان ہٹ جاتا ہے۔یوں بھی سنائپر کا ہدف اہم شخصیات ہی کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔لیکن عملی زندگی میں آنے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بہ جانب ہوں کہ اس کے برعکس ہونا بھی ممکن ہے۔کیونکہ ایک بار ہمارا ایک ساتھی ناکام فائر کرنے کے بعد بھی اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اور اس کی وجہ اس کا آہنی ارادہ، بہترین کیموفلاج اور نشانہ بازی میں اعلیٰ درجے کی مہارت تھی۔گو اصل ہدف خوش قسمتی سے بچ گیا تھا، مگر اس کے آٹھ نو محافظ ہمارے سنائپر نے چن چن کر مار ڈالے تھے۔مجبوراً دشمن کو سنائپر پکڑنے سے زیادہ اپنی جان بچانے کی فکر ہوئی اور وہ مزید کمک کی تلاش میں میدان چھوڑ کر بھاگ گئے انکی واپسی تک ہمارا ساتھی وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

درحقیقت ایک سنائپر کو نشانہ بازی میں مہارت کے ساتھ ذہنی طور پر بھی چاق چوبند اور ہوشیار ہونا چاہیے ،تاکہ حالات کے مطابق بہتر فیصلہ کر سکے۔اس کے ساتھ اسے چھپنے کی جگہ کا چناؤ کرتے وقت وہاں سے فرار ہونے کے رستوں کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے، کہ کسی بھی ناگہانی صورت حال میں وہاں سے بھاگ کر اپنی جان بچا سکے۔

اس وقت میرے ہاتھ میں آسٹریا کی بنی ایس ایس جی رائفل تھی۔جسے سٹائیر سنائپر رائفل کہتے ہیں۔گو آج اس سے کئی گنا زیادہ بہترین اور معیاری رائفلیں دستیاب ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی افادیت اچھی رائفلوں کی موجودی میں کم ہو جائے۔اس سے آٹھ سو گز تک کسی آدمی کو آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔اس کی میگزین میں پانچ گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے لیکن ہر بار فائر کرنے کے بعد رائفل دوبارہ کاک کرنا پڑتی ہے۔اس وقت میں نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہاں سے ہدف کا فاصلہ سات سو گز بنتا تھا۔

سبز درخت کی مناسبت سے میں نے اپنے لباس کے اوپر سبز رنگ کا گِلی سوٹ پہنا ہوا تھا۔گِلی سوٹ ،سنائپر کا وہ مخصوص لباس ہوتا ہے جو اسے علاقے کی مناسبت سے چھپنے میں مدد دیتا ہے۔صحرائی علاقے میں ریتلے رنگ کا گِلی سوٹ جو خشک جھاڑیوں سے میل کھائے، بنجر اور خشک علاقے میں مٹیالے رنگ کا گِلی سوٹ مکمل برفیلے علاقے میں سفید رنگ کا گِلی سوٹ اور سرسبز علاقے میں گہرے سبز رنگ کا گِلی سوٹ سنائپر کو چھپنے میں مدد دیتا ہے۔یوں بھی سنائپنگ میں چھپنے کی اہمیت اتنی ہی اہم ہے جتنی ہدف کو نشانہ بنانے کی، کیونکہ خود کو

چھپا کر ہی ایک سنائپر ہدف تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہی سنائپر نے منصوبہ بندی کی ہوتی ہے کہ وہ کس قسم کا گلی سوٹ ساتھ لے کر جائے گا۔ بعض اوقات اسے منصوبے کے مطابق چھپنے کی جگہ نظر نہیں آتی، ایسی حالت میں وہ وقتی طور پر گھاس پھوس درختوں کے پتوں یا اپنے جسم کو کیچڑ میں لت پت کر کے علاقے کی مناسبت سے اپنا کیموفلاج کر لیتا ہے۔

میں نے پشت پر بندھی پانی کی بوتل کے پلاسٹک پائپ کو منہ میں لے کر تھوڑا سا پانی پیا۔ موسم کافی خوش گوار تھا۔ ورنہ تو گرمی سنائپر کے لیے کا اذیت کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح پانی ختم ہونے کی صورت میں پیاس کی زیادتی بھی ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ٹیلی سکوپ سائیٹ میں جھانک کر میں دائیں بائیں کے علاقے کو دیکھنے لگا۔ اطراف میں چھدرے چھدرے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ میرے ہدف نے دائیں جانب سے نمودار ہونا تھا، مگر میں اس سمت کی دور تک نگرانی نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے اپنی مچان بنانے کے لیے موڑ کے قریب جگہ کو پسند کیا تھا۔ وہاں سے موڑ تک کا فاصلہ قریباً دو کلو میٹر بنتا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے ایک لحظے کے لیے دوشاخے کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ ہلکی سی غنودگی کا احساس ہوا اور میں سر جھٹک کر نیند کو بھگانے لگا۔ ذرا سی نیند بھی مجھے تکمیلِ مقصد سے غافل کر سکتی تھی۔ ٹریننگ کی ابتدا ہی میں ہمیں جوڑیوں کی صورت میں ہر کام کرنا سکھایا گیا تھا، کیونکہ سنائپرز کا جوڑیوں کی صورت کام کرنا نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔ اس مشن میں میرا ساتھی حوالدار صادق تھا، مگر بد قسمتی سے سرحد پار کرتے ہوئے اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور مجھے مجبوراً اسے یہاں سے چند میل پیچھے سرحد کی جانب ایک محفوظ مقام پر چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ وہ مجھ سے سینئر تھا، بلکہ میرا استاد بھی تھا۔ اور اس مشن کی تکمیل کی اصل ذمہ داری اسی کے کندھوں پر تھی۔ پاؤں میں موچ آنے کے بعد وہ واپسی کے حق میں تھا مگر میں اکیلا جانے پر بہ ضد ہوا کہ میرا پہلا مشن تھا اور پہلی بار ہی منہ اٹھا کے واپس ہو جانے میں مجھے سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

امید تھی میری واپسی تک اس نے چلنے کے قابل ہو جانا تھا۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے چھ کا ہندسہ عبور کر رہی تھیں۔ میں صبح پانچ بجے سے پہلے درخت پر سوار ہوا تھا۔ اس

وقت سورج غروب ہونے کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔یقیناً میرے ہدف کی آمد اگلی صبح تک کے لیے ملتوی ہوگئی تھی ، کہ اس علاقے میں رات کی حرکت نہ ہونے کے برابر تھی۔میں نے آخری بار دائیں بائیں دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لینے لگا۔مزید چند منٹ میں نے اپنے مختلف اعضاء کو حرکت دے کر سستی کو بھگایا اور پھر سمال پیک سے بھنے ہوئے چنے نکال کر کھانے لگا۔چنے کھا کر میں نے پانی پینے کے لیے واٹر پائپ کو منہ لگایا تو دو گھونٹ سے زیادہ پانی نہ مل سکا۔میں آتے وقت ایک چشمہ تاڑ آیا تھا، مگر وہاں تک جانے کے لیے مجھے اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا تھا۔دشمن کا علاقہ تھا میری نقل و حرکت کسی کی نگاہ میں آنے کا مطلب، مشن سے ہاتھ دھو بیٹھنا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی میں درخت سے نیچے اتر آیا۔سمال پیک سے امریکن نائیٹ ویژن سائیٹ نکال کر اس کے ساتھ لگے تسموں کی مدد سے سائیٹ آنکھوں پر باندھ لی۔سائیٹ آن کرتے ہی اس کا اندرونی پیٹرن روشن ہوا اور مجھے ہر طرف ہلکا سبز دکھائی دینے لگا۔اندھیری رات میں وہ سائیٹ مجھے بارہ، تیرہ تاریخ کے چاند کے بہ قدر ارد گرد کا علاقہ روشن دکھا رہی تھی۔رائفل کندھے سے لٹکا کر میں نے پسٹل ہاتھ میں پکڑ لیا کیونکہ سنائپر رائفل سے تیزی سے فائر کرنا ممکن نہیں ہوتا، ہر سناپر اپنے ساتھ سنائپر رائفل کے علاوہ کوئی اچھی ساخت کا پسٹل ضرور رکھتا ہے تاکہ بہ وقت ضرورت اسے کام میں لا سکے۔پسٹل کی نال پر سائیلنسر فٹ تھا۔تیس راؤنڈ کی لمبی میگزین لگا کر گلاک نائنٹین کسی بھی طرح کلاشن کوف سے کم مفید نہیں تھا۔ایک سنائپر کو سنائپر رائفل کے ساتھ پستول کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اور بلاشبہ میں پستول کے استعمال میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔

چشمے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے میں نے فطری تقاضا پورا کیا۔اور پھر چشمے کی طرف بڑھ گیا۔وہ پہاڑی علاقہ تھا۔جولائی کے مہینے میں بھی موسم اچھا خاصا سرد تھا۔دن کی روشنی میں دور نظر آنے والی اونچی چوٹیوں پر برف کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی۔گو دن کو سورج کی تمازت ماحول کو کافی حد تک گرما دیتی تھی مگر یہ حدت بھی خوشگوار اثر لیے ہوئے ہوتی تھی۔چشمہ مچان سے قریباً ڈیڑھ کلومیٹر دور تھا۔اس قریباً ڈیڑھ کلومیٹر میں پچیس تیس گز کی کمی بیشی ہو سکتی تھی اس سے زیادہ نہیں، کیونکہ ایک سنائپر کے لیے فاصلوں کا اندازہ لگانا بیکار کا مشغلہ نہیں ٹریننگ کا حصہ ہوتا ہے، جو بعد کو عملی زندگی میں کام آتا ہے۔

اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے میں نارمل رفتار سے چشمے کی طرف بڑھتا گیا۔جنگلی جانوروں سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔گو اس علاقے میں کبھی کبھار ریچھ اور شیر نظر آ جاتے ہیں مگر ایسا واقعہ خال ہی پیش آتا ہے۔البتہ وہاں لومڑ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔دشمن کے گشتی دستے بھی چونکہ پہلے سے موجود رستوں پر گشت کرتے رہتے تھے اس لیے ان کی طرف سے بھی میں بے فکر تھا۔لیکن کسی بھی قسم کی انہونی،اچانک سر پر پڑنے والی افتاد کا گمان،اس کے ساتھ رات کا اندھیرا،انجان علاقہ،دشمن کی سرزمین اور تکمیل مقصد سے پہلے کسی حادثے کا خطرہ اور اس جیسے کئی ایک احساسات بہ ہر حال میرے دل میں ضرور جاگزیں تھے۔

ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔یہ ہوا سردی بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔کیونکہ یہ برفیلی چوٹیوں سے گھوم پھر کر یہاں تک پہنچتی ہے۔چشمے کے قریب پہنچ کر میں بیٹھ گیا اور ہاتھوں کا اوک بنا کر پانی پینے لگا۔نہایت ٹھنڈا اور شیریں پانی تھا۔خوب سیر ہونے کے بعد میں نے سمال پیک سے پلاسٹک کی بوتل نکالی اور بھرنے لگا۔بوتل بھر کر میں نے سمال پیک میں رکھی اور واپس چل پڑا۔لیکن واپس چلنے سے پہلے میں نے قطبی ستارے کو دیکھ کر سمت کا تعین ضروری سمجھا تھا۔گو میرے پاس کمپاس بھی موجود تھا لیکن آسمان صاف ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت مجھے محسوس نہیں ہوئی تھی۔

ایک سنائپر کے ضروری سامان میں کمپاس،دوربین،نائیٹ ویژن سائیٹ،نقشہ،چاقو،رسی،ونڈ میٹر،ٹارچ ،لائیٹر یا ماچس اور وائر کٹر وغیرہ کی موجودی نہایت ضروری ہے۔

☆......☆......☆

واپس جاتے ہوئے میرے ذہن میں اپنے سینئر کی ہدایات اجاگر ہوئیں۔جو اس نے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے ہمیں دی تھیں۔

’’اٹھائیس یا انتیس جولائی کو اس علاقے میں بریگیڈئر پرکاش کی آمد متوقع ہے۔‘‘اس نے دیوار پر ٹنگے بڑے سے نقشے پر سبز رنگ کے لیزر پوائنٹر کی روشنی سے ایک مخصوص جگہ کی نشان دہی کی۔

’’اور یہ وہی بدبخت ہے جس کے حکم سے اس سرحدی پٹی پر آئے روز گولہ باری جاری رہتی ہے۔‘‘اس نے مخصوص رستے کی نشان دہی کے ساتھ نقشے کے ساتھ لٹکی ایک بڑی سی تصویر پر لیزر پوائنٹر کی روشنی ڈالی،وہ تصویر

بریگیڈیر پرکاش کی تھی۔ ہمارے سینئر کی گفتگو جاری رہی۔

"سرحد کے سکون کو تہ و بالا کر دیا ہے خبیث نے۔ گو اس بے مقصد گولہ باری سے سرحدی علاقے کے مظلوم شہری ہی بے سکون رہتے ہیں بلکہ، کئی ایک کے زخمی اور جاں بہ حق ہونے کی خبریں بھی تواتر سے ملتی رہتی ہیں۔ اس لیے ایسے شر پسند جو امن معاہدے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی کارروائیاں جاری رکھیں، زندہ رہنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ یہ ایسا خبیث شخص ہے کہ اس کی اپنی سپاہ اس سے سخت نالاں ہیں۔ اسے یہاں تعینات ہوئے چار ماہ ہونے کو ہیں اور ان چار ماہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب اس کے حکم سے دشمن کی توپیں خاموش ہوئی ہوں۔ اب ہمیں باوثوق ذرائع سے خبر ملی ہے کہ یہ اگلے مورچوں کے معاینے کے لیے ان دو تاریخوں میں آنے والا ہے، یقیناً اس بدبخت نے کوئی نئی شرارت سوچنی ہوگی۔ ہم اس کی شرارتوں سے خوف زدہ نہیں، لیکن شرارت کرنے والے کا سدّ باب اگر ممکن ہو تو سستی نہیں کرنی چاہیے۔ اور صادق!...... آپ سینئر ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار سرحد پار جا کر کامیابی سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ جبکہ راجا ذیشان حیدر پہلی مرتبہ کسی مشن پر جا رہا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھانا تاکہ آیندہ یہ بھی آپ کی طرح ایک اچھے سنائپر کے طور پر سامنے آ سکے ...... یوں بھی یہ آپ کا ہونہار شاگرد ہے۔ اور ذیشان!...... آپ خوش قسمت ہیں کہ پہلا مشن اپنے استاد کی زیرِ نگرانی پورا کرو گے۔"

اب وہ سینئر، تجربہ کار سنائپر اور میرا استاد جس کے سر پر تکمیلِ مشن کا بوجھ تھا یہاں سے قریباً پانچ کلومیٹر دور بے بسی کی حالت میں پڑا تھا۔ اور مشن کی ساری ذمہ داری ایک نوآموز سنائپر یعنی مجھ پر آن پڑی تھی۔ گو زخمی ہونے کے بعد استاد صادق نے مشن کو ادھورا چھوڑ کر واپس جانے کا مشورہ دیا تھا، مگر میرے اصرار پر اسے ضروری ہدایات اور نیک خواہشات کے ساتھ مجھے رخصت کرنا پڑا تھا۔ وہ دو گھنٹے تک مجھے سمجھاتا رہا تھا اور حقیقی بات ہے مجھے اپنی ساری ٹریننگ سے استاد صادق کی آخری ہدایات زیادہ موثر لگی تھیں۔ کیونکہ یہ ہدایات عملی زندگی کی عین ابتدا تھیں۔

درخت کے قریب پہنچ کر میں آگے نکلتا چلا گیا، جس جگہ ہدف کو نشانہ بنانا تھا وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں قدرتی طور پر ایک دو پتھر ابھرے ہوئے تھے اس طرح کہ اس رستے سے گزرنے والی گاڑیوں کے لیے ایک

قدرتی سپیڈ بریکر سا بن گیا تھا۔اس جگہ سے پچاس ساٹھ گز مخالف سمت میں ایک جگہ میں نے IED (Empervis Explosive Divice) دو پتھروں کے درمیان، زمین میں اس طرح دبائی ہوئی تھی کہ درخت پر بیٹھ کر اسے نشانہ بنا سکوں۔اور اس کا مقصد ہدف کو نشانہ بنانے کے بعد بریگیڈیر پرکاش کے محافظوں کو وقتی طور پر خوف زدہ کرنا اور ان کی توجہ کو کسی اور جانب پھیرنا تھا۔اور حقیقت میں ہدف کو نشانہ بنانے کے بعد اس IED کو ہٹ کرنا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔اور ایک سنائپر کی اصل پہچان یہی ہوتی ہے کہ اسے ہمیشہ اپنے نشانے پر اعتماد ہوتا ہے۔

آج اٹھائیس جولائی کا دن گزر گیا تھا اور کل بریگیڈیر پرکاش کی آمد یقینی تھی۔میں نے دیکھ بھال اور خوب سوچ سمجھ کر دشمن کی آمد کی سمت سے بائیں جانب ایک درخت پر عارضی مچان بنائی تھی۔بائیں سمت جگہ چننے میں ایک تو یہ فائدہ تھا کہ بریگیڈئر پرکاش نے ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہونا تھا اس لیے لامحالہ اس نے بائیں سائیڈ پر ہونا تھا۔دوسرا مجھے فرار کے لیے بھی یہی سمت مطلوب تھی۔اس جانب درخت بھی کچھ زیادہ تھے۔

IED کے ٹھیک لگا ہونے کا اطمینان کر کے میں واپس درخت کے پاس آیا اور مچان میں لیٹ کر سو گیا۔خود کو رسے سے باندھنا مجھے نہیں بھولا تھا، ورنہ دوسری صورت میں نیچے گر کر میں زخمی یا ہلاک ہوسکتا تھا۔

سارے دن کی تھکن اور بے آرامی کے باوجود میں رات کو اچھی طرح نہیں سو سکا تھا بار بار آنکھ کھل جاتی ،ایک بار تو سیٹی کی آواز سن کر میں بے ساختہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔اور دوبارہ سیٹی بجنے پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی کیونکہ غنودگی بھاگتے ہی میں نے آواز کو پہچان لیا تھا۔یہ اس علاقے میں موجود ایک بڑے سائز کے چوہے کی آواز تھی جو جسامت میں بلی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔اس کا مقامی نام ترشون ہے۔اپنے بل کے دہانے پر کھڑا ہو کر جب یہ زوردار آواز نکالتا ہے تو بالکل یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سیٹی بجائی جا رہی ہو۔

صبح تڑکے اٹھ کر میں ضروریاتِ فطرت سے ہم کلام ہوا اور پھر درخت پر چڑھ کر اونگھنے لگا، دشمن کی آمد بعد از دوپہر متوقع تھی کیونکہ اس رینک کے آفیسر کا صبح تڑکے جاگنا ایک مذاق ہی معلوم ہوتا ہے۔جاگنے کے بعد بہ ذریعہ ہیلی کاپٹر بریگیڈ ہیڈ کواٹر میں پہنچنا اور پھر وہاں سے اگلے مورچوں کے معاینے کے لیے بائی روڈ آنے میں اتنی دیر تو بہر حال ہو ہی جانی تھی۔مگر اس کے باوجود بالکل ہی بے پروا ہو جانا مناسب نہیں تھا۔دھوپ کے تیز

ہوتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گیا وقفے وقفے سے میں دوربین کے ذریعے اردگرد کے علاقے کا جائزہ بھی لے لیتا تھا۔ جونہی سورج نے نصف سفر طے کیا، مطلوبہ سمت سے ایک جیپ نمودار ہوئی میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی، جیپ کا نظارہ بالکل قریب ہو گیا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں جوانوں کی شکل بریگیڈیر پرکاش سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ تھوڑا مزید نزدیک آنے پر ان کے رینک بھی نظر آنے لگے۔ ڈرائیور کے ساتھ درمیانی رینک کا ایک آدمی بیٹھا تھا جبکہ عقبی جانب تین آدمی کلاشن کوفوں سے لیس کھڑے ہوئے تھے۔ جیپ سست رفتاری سے چل رہی تھی، یقیناً یہ بریگیڈیر پرکاش کے آنے سے پہلے رستے کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ اسی سست رفتاری سے اس کچے رستے پر سے گزرتے چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں۔ اپنے کیموفلاج کا بغور جائزہ لے کر میں بریگیڈیر پرکاش کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ گھٹنوں پر رکھی رائفل میں نے ہاتھوں میں تھام لی تھی۔ ٹیلی سکوپ سائیٹ کے سامنے اور عقبی طرف کے گلاس کور اتار کر میں نے موڑ کی سمت شست باندھ لی۔ سائیٹ کے اندر تین گہری سیاہ لکیریں نظر آ رہی تھیں، دو لکیریں دائیں بائیں سے درمیان کی طرف آ رہی تھیں اور ایک قدرے موٹی لکیر تھی جو نیچے سے اوپر کی جانب اٹھ کر جا رہی تھی۔ موخّر الذکر لکیر نیچے سے موٹی تھی اور اس کا اوپری سرا بالکل باریک تھا۔ تینوں لکیریں درمیان سے ذرا پہلے ختم ہو جاتی تھیں۔ اگر نیچے والی لکیر کو اوپر کی طرف مکمل اٹھا دیا جاتا تو سائیٹ کے اندر بڑا سا جمع کا نشان بن جاتا۔ اسی عمودی لکیر کا اوپری سرا میرا شستی نقطہ تھا۔

☆......☆......☆

دشمن کی گشتی جیپ کو گزرے گھنٹا گزرا ہوگا کہ ایک دم موڑ سے تین گاڑیاں نمودار ہوئیں، دو کھلی چھت کی جیپیں اور درمیان میں چھت والی ٹویوٹا جیپ تھی۔ درمیانی رفتار سے چلتے ہوئے تینوں گاڑیوں نے کلومیٹر بھر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک مجھے ٹویوٹا جیپ کے شیشوں کا کالا رنگ نظر آیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہدف کو میں نے سائیڈ سے نشانہ بنانا تھا اور کالے شیشوں کی وجہ سے ہدف کا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ اس ایک حل تو یہی تھا کہ میں سامنے سے جیپ کو نشانہ بناتا، مگر ایسی صورت میں ہدف کا فاصلہ مجھ سے بڑھ جاتا جس کے باعث درست نشانہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اس رائفل سے آٹھ سو میٹر تک ہی درست نشانہ لگایا جا سکتا تھا۔ اگر آٹھ سو میٹر سے فاصلہ بڑھ

جاتا پھر نشانے کی درستی یقینی نہیں تھی۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس منحوس کی جیپ کالے شیشوں والی ہوگی۔ یوں بھی آرمی میں جیپوں کے کالے شیشے اس سے پہلے میری نظر میں نہیں گزرے تھے۔ ایک دم مجھے اپنا مشن ناکام ہوتا دکھائی دیا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے دو تین منٹ سے زیادہ وقت نہیں تھا۔ بریگیڈیر پرکاش نے واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنا تھا جو یہاں سے پندرہ بیس کلومیٹر دور تھا۔ بریگیڈیر پرکاش سے پہلے وہاں تک پہنچنا میرے لیے ناممکن تھا۔ اگر میں بہت زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا اور کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ بھی جاتا تب بھی خود کو چھپا کر دشمن کے خلاف کوئی پروگرام سوچ کر اس پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا تھا۔

استاد صادق نے آخری نصیحت میں کہا تھا کہ ”ایک تربیت یافتہ سپاہی کا مشن میں ناکام ہونے کے بعد زندہ واپس لوٹنا بھی آدھی کامیابی ہوتی ہے۔“ مگر میں اپنے پہلے مشن میں آدھی کامیابی پر اکتفا نہیں کرسکتا تھا۔ گاڑیوں کا فاصلہ ہر گزرتے سیکنڈ کم ہوتا جا رہا تھا۔ رائفل کی بیرل پر سائیلنسر فٹ تھا اور فائر ہوتے وقت صرف ہلکی سی ”ٹھک“ کی آواز اٹھنی تھی جو فائر کی جگہ سے زیادہ سے زیادہ چند گز دور ہی سنی جاسکتی تھی۔

اور پھر فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا۔ اگلی جیپ میرے سامنے سے گزری۔ بریگیڈیر کا ٹویوٹا اس سے بیس پچیس گز پیچھے تھا میں سیکنڈ بھر میں ایک نتیجے پر پہنچا اور شست لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ ”ٹھک“ کی آواز کے ساتھ بلٹ نے مزل کو چھوڑا اور اسی لمحے سب سے آگے والی جیب کا پچھلا ٹائر زوردار دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ ہلکے سے لہرا کر رک گئی۔ جیپ میں کھڑے باوردی ہتھیار بردار جوان چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور چاروں طرف سرسری نظر دوڑا کر ٹائر کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ تینوں گاڑیاں رک گئی تھیں۔ سب سے آخری جیب میں موجود ہتھیار بردار جوانوں نے بھی جیپ سے اتر کر اطراف میں پوزیشن اختیار کرلی تھی۔

اس دوران میں نے کاکنگ ہینڈل کو کھینچ کر رائفل اس احتیاط سے دوبارہ کاک کرلی تھی کہ خالی کیس نیچے زمین پر نہ گرنے پائے۔ پتھریلی زمین پر تانبے کا کیس اچھی خاصی آواز پیدا کر کے دشمن کو متوجہ ہونے کا باعث بن سکتا تھا۔

اگلی جیپ کے ڈرائیور نے جیپ کی عقبی طرف بندھا فالتو ٹائر کھولنا شروع کردیا تھا۔

اسی وقت میری دعائیں رنگ لائیں اور میری ترکیب کو کامیابی کی جھلک نظر آئی۔ بریگیڈیر پرکاش نے اپنی

جانب کا شیشہ نیچے کر کے سر باہر نکالا، شاید وہ اگلی جیپ والوں کو کوئی ہدایت دینے والا تھا یا خالی ایک نظر ہی باہر دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے ارادے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ شیشے کے نیچے ہوتے ہی میری انگلی نے ایک جھٹکے سے ٹریگر کی آزادانہ حرکت کو پورا کرتے ہوئے مکمل ٹریگر دبا دیا۔ سر میں لگنے والی گولی چیخنے کا موقع نہیں دیا کرتی۔ طاقتور بلٹ نے اس کا آدھا سر اڑا دیا تھا۔

ڈرائیور بلند آواز میں چیخا اور جیپ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ باقی سب بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

میں نے ان سے نظر ہٹا کر ایک بار پھر رائفل کاک کی اور IED کی جگہ پر شست باندھ کر تیسری گولی فائر کر دی۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اسی وقت تمام ہتھیار برداروں نے اچانک فائر کھول دیا تھا۔ کلاشن کوفوں کے فائر کی تڑتڑاہٹ سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ چونکہ کسی کو ابھی تک میرے چھپنے کی جگہ کے بارے معلوم نہیں ہوا تھا اس لیے وہ چاروں طرف گولیاں برسا رہے تھے۔

جیپ کی عقبی نشست کھول کر دو آفیسر باہر آئے اور تمام کو اندھا دھند فائر کرنے سے منع کرنے لگے۔ یقیناً بریگیڈیر پرکاش کے بعد وہی دونوں سینئر تھے۔

ہمارے استاد صوبیدار راؤ تصور کہا کرتے تھے کہ کسی بھی فوجی دستے کو اگر سراسیمہ اور حواس باختہ کرنا ہو تو ان کے کمانڈر کو ختم کر دو۔ کمانڈر کی غیر موجودی میں وہ دستہ بھیڑوں کا ریوڑ بن جائے گا۔"

اپنے استاد کا سنہری قول اس وقت میرے دماغ میں گونجا اور میں نے ٹویوٹا جیپ سے برآمد ہونے والے دونوں آفیسرز میں سے ایک کا نشانہ لے کر فائر داغ دیا۔ وہ اچھل کر نیچے گرا۔ دوسرا ایک لمحے کے لیے شاک کی کیفیت میں آ گیا تھا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میری رائفل نے میگزین میں موجود آخری گولی اُگلی اور دوسرا بھی اس کے قریب گر کر بن پانی کی مچھلی کی طرح پھڑکنے لگا۔

میں نے سرعت سے میگزین بدلی کی اس وقت وہاں آٹھ بندے زندہ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی کلاشن کوف کا رخ انھی درختوں کی طرف تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے دفاعی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے اسی سے جان چھڑانے کا سوچا اور اگلے لمحے وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اصولاً مجھے بریگیڈیر پرکاش کے مرتے ہی وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے تھا، مگر دشمن کی کم تعداد اور اپنی گولیوں کو مسلسل نشانے

پر لگتا دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ بقول استاد محترم سنائپر کی مثال اندھیرے کے تیر جیسی ہوتی ہے، کہ جانے کس وقت کہاں سے نکل کر گردن سے پار ہو جائے۔ نظر نہ آنے والے دشمن کا خوف، دکھائی دینے والے دشمن سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

اگلی ٹھک نے ایک اور کی زندگی چھین لی تھی۔

کوئی چیخا...... ''بھاگو، ہم دشمن کے گھیرے میں ہیں۔ ایک آدمی نے آخری جیپ سٹارٹ کر کے ریورس گیئر لگایا، مگر چند گز سے زیادہ پیچھے ہٹنا اسے نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اسے اسٹیرنگ پر لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باقی آدمی گاڑیوں کا خیال دل سے نکال کر سرپٹ دوڑ پڑے۔ میری رائفل کی رینج سے نکلنے سے پہلے دو مزید روحیں اپنے فانی جسم سے روٹھ کر محو پرواز ہو چکی تھیں۔

وہ سرپٹ موڑ کی طرف بھاگتے جا رہے تھے۔ مسلسل اپنے ساتھیوں کو لاشوں میں تبدیل ہوتا دیکھ کر ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ جبکہ میرا حوصلہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ ان کے ''آؤٹ آف رینج'' ہوتے ہی میں سرعت سے نیچے اترا اور درختوں کی آڑ لے کر واپس چل پڑا۔ عام لباس کے اوپر پہنا، گلی سوٹ گو چلنے میں رکاوٹ پیدا کر رہا تھا مگر چھپاؤ کے لیے بہت ضروری تھا۔ [گلی سکاٹ لینڈ میں استعمال ہونے والی ایک اصطلاح ہے جو ایک زمانے میں اُن خاص داروغوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ جو اپنے بادشاہ کی زمینوں میں ناجائز طور پر شکار کھیلنے والوں سے حفاظت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ گلی گھاس میں مکمل طور پر چھپ کر بلا حرکت پڑے رہتے اور ہرن کا انتظار کرتے۔ مناسب وقت آنے پر کود پڑتے اور اُسے ہاتھوں سے دبوچ لیتے پھر بادشاہ کے حضور پیش ہو کر ہرن کا تحفہ دیتے اور انعام و کرام سے نوازے جاتے۔ چھپاؤ تلبیس کے اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کل کے دور میں سنائپر اپنے آپ کو دشمن سے بچانے کے لیے اپنے اردگرد کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لیتے ہیں۔ آج کے جدید دور میں، گلی سوٹ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مختلف ممالک اعلا درجے کے، گلی سوٹ تیار کر رہے ہیں جو ہر علاقے میں استعمال ہو سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے سنائپر یہی، گلی سوٹ استعمال کر رہے ہیں] میں، گلی سوٹ اتارے بغیر چلتا گیا۔ وہاں سے میں جتنا جلد غائب ہو جاتا اتنا بہتر تھا۔ جلد ہی دشمن نے اس علاقے کو گھیرے میں لے لینا تھا، پکڑے جانے کی صورت میں انھوں نے میرے

ساتھ جو کرنا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے کسی عقل بینا کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے چشمے والا راستہ ہی اختیار کیا تھا۔ چشمے کے قریب رک کر میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور واٹر بوتل بھر کر آگے بڑھ گیا۔ چشمے سے فرلانگ بھر آگے جا کر اترائی شروع ہو جاتی تھی۔ اترائی شروع ہوتے ہی میری رفتار خود بہ خود بڑھ گئی۔ چونکہ میں باقاعدہ کسی رستے پر نہیں جا رہا تھا اس لیے سمت کی درستی کے لیے میں گاہے گاہے کمپاس پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔

اونچے، نیچے اور ٹیڑھے میڑھے رستوں سے گزر کر میں نے تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور ایک خشک نالے کے قریب پہنچ گیا۔ نالے کے درمیان بارشی پانی کے گزرنے کی وجہ سے ریت ابھر آئی تھی اور ساتھ میں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ جھاڑیاں وغیرہ نالے کے کنارے پر موجود تھیں درمیانی علاقہ صاف تھا۔ نالے کی چوڑائی پچاس ساٹھ گز کے بہ قدر تھی۔ اور بدقسمتی سے وہاں سے سات آٹھ سو گز کے فاصلے پر موجود ٹیکری پر انڈین آرمی کے ایک سیکٹر کا بیس موجود تھا جہاں سے نالے کا یہ درمیانی حصہ آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا ۔جھاڑیوں کے اندر لیٹ کر میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔

بیس پر غیر معمولی چہل پہل دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا، کہ ان تک بریگیڈیر پرکاش کے ہلاک ہونے کی خبر پہنچ چکی ہے۔ دس آدمیوں کا ایک دستہ مجھے بیس سے نیچے اتر کر نالے کی سمت آتا دکھائی دیا وہ یقیناً جائے وقوعہ کی جانب روانہ تھے۔ تمام کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھے۔ وہ نالے میں اتر کر میری جانب بڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے ایک اور دستہ تھا جو نالے میں آنے کے بجائے سیدھے رستے پر چلتے ہوئے وقوعہ کی جانب بڑھتا گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں تیز رفتاری سے چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گیا تھا ورنہ یقیناً ان سے رستے میں مڈبھیڑ ہوتی اور ایسی صورت میں میرا مارا یا پکڑا جانا یقینی تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہیں چھپا رہوں ۔دوربین سمال پیک میں ڈال کر میں جلدی سے جھاڑی کے مزید اندر کھسک گیا۔ جھاڑی کے تنے کے قریب پہنچ کر میں بالکل ساکت لیٹ گیا۔ یوں کہ اپنے سانس کی آواز خود مجھے بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا جلد ہی ان کی باتوں کی آواز مجھے سنائی دینے لگی۔ وہ پنجابی اور ہندی دونوں زبانوں میں بات کر رہے تھے۔ پنجابی بولنے والے شاید سکھ تھے۔ ان کے قریب آنے تک جھاڑی کے تنے اور شاخوں پر

پھرتے ہوئے چیونٹوں نے میرے بدن پر مٹر گشت شروع کر دی تھی۔ایسی حالت میں عام بندہ چیونٹوں کو بدن سے دور جھٹکنے سے باز نہیں رہ سکتا، کیونکہ یہ بہت بے دردی سے کاٹتے ہیں۔میرے کان کی عقبی جانب اور ناک کی جڑ میں بھی دو نے بڑے مزے سے دانت گاڑ رکھے تھے، مگر میں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ایسی حالت میں تو سنائپر ایک بچھو کو بھی خود سے دور نہیں جھٹکتا۔

☆......☆......☆

"کم از کم آٹھ دس بندے ہوں گے۔" میری سماعتوں سے گزرنے والوں کا پہلا، مکمل اور واضح فقرہ یہی ٹکرایا تھا۔

"زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔" ایک دوسری آواز نے اس کی تردید کی تھی۔وہ جوڑیوں کی صورت میں روانہ تھے۔اپنے ہتھیار انھوں نے تیاری حالت میں پکڑے ہوئے تھے۔ایک آدمی نالے کی دائیں اور دوسرا بائیں سمت کی نگرانی کر رہا تھا۔

"یار! اچھا ہوا، بریگیڈیر پرکاش سے تو جان چھوٹی، خجل خوار کر رکھا تھا بے غیرت نے۔" یہ دوسری جوڑی کے آدمی آواز تھی۔

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔"اس کی تو خیر ہے بلکہ، میجر سورن کی موت بھی قابل برداشت ہے مگر، کرنل جگجیت سنگھ بہت اچھا انسان تھا۔"

"گھات لگانے والے تو بس بریگیڈئر پرکاش ہی کے لیے آئے ہوں گے مگر.........." اس کی آواز معدوم ہوتی گئی اور تیسری جوڑی کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔

"اگر ان کی تعداد واقعی آٹھ دس ہے تو ہم دس بندے انھیں کیسے روکیں گے؟"

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔"دوسری پارٹی سیدھے رستے پر جا رہی ہے اور باقی سیکٹرز سے بھی پارٹیاں روانہ ہیں، سارے علاقے کا گھیراؤ کر کے تلاشی لی جائے گی۔کمانڈوز پلاٹون بھی بلائی جا رہی ہے۔"

چوتھی جوڑی کا ایک آدمی انھی جھاڑیوں میں جہاں میں چھپا ہوا تھا۔رکتا ہوا بولا۔"میرا خیال ہے یہ جگہ مناسب ہے۔"

اس کے ساتھ نے جواب دیا۔ ”اچھا جلدی کرو، میں آگے جا رہا ہوں۔تم فارغ ہو کر آ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر وہ جھاڑی کی آڑ میں آ کر اپنی پینٹ کھولنے لگا۔

آخری جوڑی کے ایک آدمی نے مسکرا کر کہا۔ ”سریش!......تیری پینٹ ابھی سے ڈھیلی ہو گئی ہے۔“ اس کے دوسرے ساتھی کا قہقہہ اس کے ساتھ شامل تھا۔

سریش جواباً بولا۔ ”یار! صبح سے پیٹ خراب ہے۔اب آپ لوگ مذاق ہی اڑاؤ گے۔“

وہ آگے گزرتے چلے گئے، جبکہ سریش پینٹ کھول کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔اس کا رخ میری جانب تھا، مگر اس کی نگاہیں اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ تھیں۔میں اس وقت جھاڑی کا حصہ بنا ہوا تھا۔میرے بدن کا کوئی جزو بھی، گلی سوٹ سے باہر نہیں تھا۔سر پر رکھی ہوئی ٹوپی نے پورے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔مخصوص سیاہ رنگ کی کریم میں نے پورے چہرے پر تھوپی ہوئی تھی۔سنائپر رائفل پر بھی میں نے سبز رنگ کے کپڑے کی کترنیں اس انداز سے باندھی ہوئی تھیں کہ سوائے رائفل کے دہانے کے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک فضا میں وائرلیس سیٹ کی آواز گونجی، یقیناً سریش کا واکی ٹاکی بول رہا تھا۔

”نمبر فائیو!......سینڈ یور لوکیشن اوور۔“

”سفید نالا، جنگل موڑ۔اوور۔“ دوسری آواز نے اپنی جگہ بتائی۔

یقیناً اس نالے کا کوڈ نام، سفید نالا تھا۔میری موجودہ پوزیشن سے وہ نالا جنوب کی جانب مڑ رہا تھا۔نالے کی مغربی طرف ان کا سیکٹر بیس تھا۔بیس کے نیچے بھی چھدرے چھدرے درخت موجود تھے، مگر مشرقی طرف کافی گھنے درخت پھیلے تھے جو نالے کے ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔جنوب کی طرف مڑنے کے بعد نالے کی چوڑائی دگنے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔اور درخت بہ تدریج جوانب کی ٹیکریوں تک پھیل گئے تھے۔ان میں چیڑ و دیار کے بلند بالا درختوں کے ساتھ ساتھ جھاڑی نما درخت بھی موجود تھے۔تنگ کے سدا بہار درخت بھی بہ کثرت بکھرے ہوئے تھے۔اور انھی درختوں کے جنگل میں، میں اپنے استاد صادق کو چھوڑ گیا تھا۔سنائپرز کے نقطہ نظر سے اب یہ علاقہ محفوظ نہیں رہا تھا، مگر اپنے ساتھی کو ساتھ لینا نہایت ضروری تھا۔اگر حوالدار صادق وہاں چھپا نہ ہوتا تو یقیناً میں نے نالے نالے میں آگے بڑھ جانا تھا اور دشمن کے اس علاقے کو گھیرنے سے پہلے میں

کہیں دور نکل گیا ہوتا۔

''اپنے ساتھیوں کو چوکنا ہونے کی ہدایت دے دو۔اور تمام کو بتا دو کہ یہاں صرف ایک بندے کی موجودی کے آثار ملے ہیں۔وہ بہت اچھا نشانے باز اور منجھا ہوا سنائپر ہے۔اس ایک ہی نے ہمارے آٹھ آدمیوں کو شہید کر دیا ہے،اس لیے احتیاط سے کام لیں۔اوور''(مسلمانوں کی دیکھا دیکھی دوسرے مذاہب کے لوگ بھی اپنے جنگ میں ہلاک ہونے والے سپاہیوں کو شہید کہنے لگے ہیں)

''راجر......''نمبر فائیو نے گویا بات سمجھ جانے کا اقرار کیا۔

''کسی بھی چھوٹی سی چھوٹی بات کی فوراً اطلاع دینا۔کیپ لسننگ آؤٹ۔''احکام دینے والے نے اسے آؤٹ کہتے ہی دوسری پارٹی کو پکارنا شروع کر دیا۔''نمبر سکس!......سینڈ،یوور لوکیشن اوور۔''

جواب ملا۔''نالا روڈ جنکشن اوور۔''

''کاپیڈ میسج،سیم ٹو یو۔''پوری بات دہرانے کی ضرورت اس نے اس لیے بھی محسوس نہیں کی تھی کہ،نمبر فائیو سے ہونے والی گفتگو نمبر سکس بھی سن رہا تھا۔

''راجر۔''نمبر سکس کی طرح سے سمجھ جانے کی اطلاع ملنے پر وہ اسے بھی لسننگ پر رکھ کر تیسری پارٹی سے بات کرنے لگا۔اس مرتبہ اس نے نمبر سیون پکارا تھا،مگر نمبر سیون کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی یقیناً وہ ہم سے دور تھا۔کنٹرول کی مختلف پارٹیوں کو پکارنے کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔

گفتگو جاری رہی وہ واکی ٹاکی سیٹ کی طرف متوجہ رہا اور پھر مٹھی میں ریت بھر کر اپنی صفائی کرنے لگا۔پینٹ باندھتے وقت اس کی نظر غیر ارادی طور پر اسی جھاڑی کی طرف اٹھی رہی جہاں میں چھپا بیٹھا تھا۔اور اس کی بدبختی کہ میں نے اسے چونکتے دیکھا۔مسلسل اس جانب گھورنے پر اسے میری ہیئت نے چونکا دیا تھا۔یوں بھی میں افراتفری میں چھپا تھا اس لیے جھاڑیاں وغیرہ اپنے اوپر نہیں ڈال سکا تھا۔بیلٹ باندھے بغیر وہ زمین پر پڑے اپنے ہتھیار کی طرف متوجہ ہوا۔اس کے ہتھیار سنبھالنے تک میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

''ٹھک''کی آواز کے ساتھ اس کے سر میں روشن دان کھل گیا تھا۔وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔میں جلدی سے جھاڑی سے باہر نکلا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھاڑی میں پھینک دیا۔اس کا واکی ٹاکی سیٹ مجھے کارآمد لگا

۔واکی ٹاکی سیٹ مع اضافی بیٹری اٹھا کر میں نے پاس رکھ لیا اور پھر جھاڑیوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے میں نے اس کے جانے والے ساتھیوں کی طرف نگاہ دوڑائی، وہ فرلانگ بھر آگے نکل گئے تھے۔ دور بین نکال کر میں نے بیس کی طرف نگاہ دوڑائی ایک آدمی مجھے ٹہلتا ہوا نظر آیا۔اس جگہ سے نالا عبور کرنے میں دیکھے جانے کا سخت خطرہ تھا۔میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر بیس کی طرف روانہ ہو گیا۔واکی ٹاکی سیٹ کی آواز کم کر کے سیٹ میں نے آن رہنے دیا تھا۔

جلد ہی سیٹ سے سریش کو پکارا جانے لگا۔

''نمبر فائیو، فار نِک نیم سریش اوور!......نمبر فائیو، فار نِک نیم سریش اوور!..........'' وہ بار بار سریش کو پکار رہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے وقفہ کیا، سیٹ سے ایک دوسری آواز بلند ہوئی۔ (ویسے زیادہ تر قارئین تو جانتے ہوں گے، مگر جن کا کبھی وائرلیس سیٹ سے واسطہ نہیں پڑا ان کی اطلاع کے لیے بتلاتا جاؤں کہ وائرلیس سیٹ پر جب ایک طرف سے بات ہو رہی ہو تو سننے والا بات نہیں کر سکتا، یہاں تک کہ بولنے والے کو اوور کہہ کر اگلے کو موقع دینا ہوتا ہے۔اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ کنٹرول اس کو کہتے ہیں جو کسی جگہ موجود تمام پارٹیوں کو کنٹرول کر رہا ہو اور وائرلیس پر پیغام بھیج رہا ہو)

''کنٹرول فار نمبر فائیو اوور!''

''یس نمبر فائیو فار کنٹرول اوور۔'' وہ کنٹرول کو جواب دینے لگا۔

''نمبر فائیو، نک نیم سریش کہاں گیا ہے اور جواب کیوں نہیں دے رہا؟''

''وہ رفع حاجت کے لیے رکا تھا پندرہ بیس منٹ ہونے کو ہیں، پتا نہیں کیوں جواب نہیں دے رہا، میں نے اس کی تلاش میں آدمی بھیج دیا ہے اوور۔''

''اکیلا آدمی نہیں بھیجنا، تمام کو واپس لے کے جاؤ ہری اپ اینڈ جلدی سے اوکے رپورٹ بھیجو اوور!'' کنٹرول سے بولنے والے کا لہجہ کافی سخت اور تنبیہی تھا۔

''راجر!'' نمبر فائیو جلدی سے بولا۔ مگر کنٹرول کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

ان کی گفتگو سن کر میرے قدموں میں خود بہ خود تیزی آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں بیس کے نیچے سے ہو کر نالا

عبور کر رہا تھا، اس جگہ میں بیس سے بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور نالے میں موجود دشمن کی نظر سے بھی اوجھل تھا۔

نالا عبور کر کے میں جونہی جھاڑیوں میں گھسا، واکی ٹاکی ایک مرتبہ پھر بول پڑا۔

''نمبر فائیو فار کنٹرول اوور!'' اس کی آواز سخت گھبرائی ہوئی اور متوحش تھی۔

''یس اوور۔'' کنٹرول کی بھاری آواز ابھری۔

''سر لیش قتل ہو گیا ہے اوور۔'' نمبر فائیو گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا تھا۔

''ہری اپ، پوزیشن لے لو، وہ یہیں کہیں چھپا ہے، میں باقی پارٹیاں بھیج رہا ہوں۔ جوانوں کو کہو، آڑ میں رہیں اوور۔''

''راجر۔'' نمبر فائیو نے کہا۔

''کنٹرول فار لالی سیکٹر بیس اوور!'' کنٹرول یقیناً اسی بیس کو رابطہ کر رہا تھا جہاں سے میں گزر کر آیا تھا۔

''بیس فار کنٹرول سینڈ یور میسج اوور!''

''کیا اپنے آدمی تمھاری نظر میں ہیں اوور''

''یس، مجھے نظر آ رہے ہیں اوور۔''

''کیا ان کے علاوہ کوئی حرکت نظر آ رہی ہے اوور؟''

''نو، اب تک تو نظر نہیں آئی جیسے ہی نظر آئی میں آپ کو بتا دوں گا۔ اوور''

''اوور اینڈ آل۔''

کہہ کر کنٹرول تمام پارٹیوں کو سفید نالے کی طرف اکٹھا ہونے کی ہدایات جاری کرنے لگا۔

میں نے ان کی گفتگو کے اختتام پر واکی ٹاکی کو بند کر دیا کیونکہ مسلسل چلنے پر بیٹری نے ختم ہو جانا تھا گو ایک اضافی بیٹری میرے پاس موجود تھی مگر پھر بھی عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں واکی ٹاکی کے استعمال میں کفایت شعاری سے کام لیتا۔ ان کی گفتگو نے میرے قدموں میں بجلی بھر دی تھی میں جتنا جلدی وہاں سے غائب ہو جاتا، بہتر تھا۔ اگر ایک بار وہ جنگل کو گھیرے میں لے لیتے تو یقیناً میں نے چوہے دان میں پھنس کر رہ جانا تھا۔ بلکہ میرے ساتھ استاد صادق نے بھی مارا جانا تھا۔ کلو میٹر بھر سفر طے کرنے کے بعد میں تھوڑا سا رکا، سمال پیک سے

نقشہ نکال کر میں نے اپنی سمت درست کی اور پھر چل پڑا۔

جلد ہی مجھے امدادی نشان نظر آ گیا۔ یہ چیڑ کا ایک بلند درخت تھا جس کے تنے پر میں نے جاتے وقت مخصوص نشان لگایا تھا۔ وہ درخت نظر آتے ہی میرے لیے رستے کی شناخت آسان ہوگئی تھی۔ اس درخت سے دوسو قدم جنوب کی جانب ایک چھتری نما درخت جو ذرا سا مشرق کی جانب جھکا ہوا تھا، نشانِ راہ تھا۔ چھتری نما درخت کے بعد چیڑ کا ایک ٹوٹا ہوا درخت اسی سیدھ میں موجود تھا۔ آسمانی بجلی گرنے کی وجہ وہ درخت نصف تنے سے کٹ گیا تھا۔ ایک نشان مل جانے کے بعد باقی نشان ملتے چلے گئے۔ ٹوٹے ہوئے تنے والے درخت سے آگے مجھے پندرہ بیس منٹ لگے اور اس کے بعد میں ٹھیک اس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں میں نے استاد صادق کو چھوڑا تھا۔

☆......☆......☆

”استاد صادق!“ میں نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر اسے آواز دی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا ورنہ اصولاً تو مجھے وہاں بے دھڑک آنے سے گریز کرنا چاہیے تھا کیونکہ اگر استاد صادق خدانخواستہ کسی وجہ سے پکڑا گیا ہوتا تو یقیناً دشمن وہاں میری گھات میں بیٹھا ہوتا۔

”میں یہاں ہوں۔“ مجھے استاد صادق کی آواز تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ میں نے آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے اس طرف نگاہ دوڑائی۔

وہاں تین درخت آپس میں اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ ایک پھیلے ہوئے گھنے درخت کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ اگر وہ مجھے آواز نہ دیتا تو میں اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہتا۔

”چلیں سر!......ہمیں فی الفور یہاں سے دور جانا ہوگا۔“ ان درختوں کے نیچے جا کر میں نے نظریں اٹھائیں مگر اس بار بھی مجھے گھنی شاخوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر شاخوں میں حرکت ہوئی اور استاد صادق کا چہرہ نظر آیا۔

”مشن کا کیا ہوا؟“ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”سر! الحمداللہ کامیاب لوٹا ہوں، مگر اب تفصیلات بتانے کا وقت نہیں ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“

”ذیشان! مجھے لگتا ہے میرے پاؤں کی ہڈی کریک ہوگئی ہے، پاؤں سوج گیا ہے۔اس پاؤں کے ساتھ چلنا ایک خواب ہی ہوگا۔“اس کی آواز میں گہرے تاسّف کی جھلک تھی۔

”مگر سر!......تھوڑی دیر بعد یہ جنگل دشمن کے گھیرے میں ہوگا۔“

اس نے کہا۔”میری مانو تو نکل جاؤ،کم ازکم ایک کا زندہ لوٹنا دونوں کی شہادت سے بہت بہتر ہوگا۔“

”اگر میرا سہارا لے کر چلنے کی کوشش کرو تو شاید ہم آہستہ آہستہ............“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔”یقیناً وقت ضائع کر رہے ہو۔اب تک آپ کافی دور نکل گئے ہوتے۔“

”صحیح کہا۔“میں اطمینان سے بولا۔”ویسے مجھے امید ہے کہ ان درختوں پر دو آدمیوں کے چھپنے کی گنجائش ہے۔“

”بے وقوف مت بنو ذیشان!“اس نے مجھے ڈانٹا۔

”اگر یہ بے وقوفی ہے تو میں بے وقوف بھلا۔“میں رائفل کندھے سے لٹکا کر درمیان والے درخت پر چڑھنے لگا۔

”جانتے بھی ہو،ایک سنائپر تیار کرنے میں کتنی محنت اور پیسا خرچ ہوتا ہے اور اتنی محنت کے اور خرچ کے بعد بھی کسی شخص کا اچھا سنائپر بننا یقینی نہیں ہوتا۔“

میں نے اطمینان سے جواب دیا۔”یہ بات مجھے یہاں بھیجنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔“

وہ زچ ہو کر بولا۔”وہ مشن تھا۔“

”اور یہ عبادت ہے۔“میں ایک مضبوط شاخ منتخب کر کے چھپنے کے لیے مچان بنانے لگا۔

”ذیشان! آپ اچھا نہیں کر رہے۔“

”استاد جی!......ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“

”آپ اپنی توانائی کیوں ضائع کر رہے ہیں؟“

”ہونہہ!......“وہ گہرا سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

”اچھا تفصیل نہیں سنو گے۔“

”سنادو یار!“ وہ بے بسی سے بولا۔

اور میں اسے تفصیل سے اپنی کارروائی کے بارے بتانے لگا۔اس دوران میرے ہاتھ کام سے غافل نہیں ہوئے تھے۔میری بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ تعریفی کلمے ادا ہوئے۔

”شاباش،آپ نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔اس سے زیادہ کی توقع ایک منجھے ہوئے سنائپر سے بھی نہیں کی جاسکتی۔“

”لیکن اب کیا کریں گے؟“میں مستفسر ہوا۔

”میں اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔“

”اسے رائے کا اظہار نہیں لٹھ مارنا کہتے ہیں۔“

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔”تو سمجھ لو اب ہم لٹھ مارنے ”جوگے“ ہی رہ گئے ہیں۔“

”اچھا یہ دیکھو۔“میں نے واکی ٹاکی نکال کر اسے دکھایا۔

”یہ آخری مقتول سے چھینا ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔”جی۔“

”ویسے اسے مار کر آپ نے دشمن کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے۔“اس نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

”استاد جی!......میں مجبور تھا،ورنہ اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے کہ ایسا کر کے میں نے دشمن کی تلاش کو ایک متعین رخ مہیا کر دیا ہے۔“

”اب ان کی ساری توانائیاں اس جنگل کو گھیرنے میں صرف ہوں گی۔“

”ہاں،میں نے ان کی گفتگو وائرلیس پر سنی ہے۔وہ جنگل کو گھیرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔“

”اچھا اب اسے آن کرو،تاکہ چل سکے کہ ہم کب تک ان کے ہتھے چڑھنے والے ہیں۔“

”یہ بدشگونی کی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔“کہتے ہوئے میں نے واکی ٹاکی آن کر دیا،مگر دشمن کے کسی آدمی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

چند لمحے تک خالی ”شائیں شائیں“ سننے کے بعد استاد صادق بولا۔

”غالباً انھیں واکی ٹاکی کے غائب ہونے کا پتا چل گیا ہے اور انھوں نے فریکونسی تبدیل کر دی ہے۔“ مگر اسی وقت واکی ٹاکی سے ابھرتی کنٹرول کی آواز نے استاد کامران کے اندیشے کو جھٹلا دیا تھا۔

وہ کال سائن نمبر فائیو اور نمبر سکس سے ان کی لوکیشن کے بارے پوچھ رہا تھا۔ پتا چلا کہ وہ دونوں گروپ جنگل کی مغربی طرف سفید نالے میں پوزیشن لے چکے تھے۔

جنوبی سمت قریباً آٹھ دس کلومیٹر دور ایک اور گروپ پہنچ گیا تھا جو اگلے مورچوں سے ایک ایک دو دو آدمی اکٹھے کر کے جمع کیا گیا تھا۔ اس گروپ کے ساتھ کنٹرول کا رابطہ کسی بڑے وائرلیس سیٹ پر تھا، کیونکہ وہ لوگ واکی ٹاکی کی رینج سے دور تھے۔ ان کی بابت شمالی اور مغربی اطراف میں موجود پارٹیوں کو کنٹرول نے آگاہ کیا تھا ۔کنٹرول بار بار انھیں احتیاط سے حرکت کرنے کی تلقین کر رہا تھا کیونکہ وہ ایک سنائپر کے خلاف گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ ایک ایسا سنائپر جو ان کے نو بندوں کو ہلاک کر چکا تھا۔

”بس اب بند کر دو۔“ استاد صادق نے مجھے واکی ٹاکی بند کرنے کا اشارہ کیا۔ ”تھوڑی دیر بعد صورت حال معلوم کریں گے، مسلسل آن حالت میں رہنے پر بیٹری جلد ختم ہو جائے گی۔“

”اس کی ایک اضافی بیٹری بھی ساتھ لایا ہوں۔“ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا، مگر واکی ٹاکی آف کرنا میں نہیں بھولا تھا۔

”ہونہہ!“ کہہ کر اس نے کسی بھی قسم کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا تھا۔

سورج کافی دیر ہوئی پہاڑوں میں غائب ہو چکا تھا۔ اب اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔

”شاید وہ رات کو جنگل میں گھسنے کی کوشش نہ کریں۔“ میں نے اندازہ لگایا۔

”حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ان کا گھیرا مکمل ہو چکا ہے تو وہ صبح تک کارروائی کو موخّر کر سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ پوری رات انتظار کرنے میں ان کا نقصان ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

”ظاہر ہے ہمارا جنگل میں چھپا ہونا ایک اندازہ ہی تو ہے اور اندازوں کا غلط ہونا حیران کن نہیں ہوتا۔“

''آپ کے پاس پانی موجود ہے یا ختم ہو گیا ہے؟''میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''تھوڑا سا ہو گا، چاہیے کیا۔''

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''میری واٹر بوتل بھری ہوئی ہے۔''

''پانی کے استعمال میں احتیاط برتنی پڑے گی، نا معلوم کب تک چھپنا پڑے۔''

''چشمے کی جگہ مجھے معلوم ہے، مگر فاصلہ زیادہ ہے۔''میں نے انکشاف کیا۔

''چشمے تو یہاں بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ البتہ انھیں ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔''

''اگر نقشے میں موجود ہوئے پھر تو ان کی تلاش آسان ہو گی۔''

''یہ عارضی اور چھوٹے چشمے ہیں، یہ نقشے پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔''

''کچھ کھانے کا موڈ ہے۔''

''ہونہہ!......''اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''کچھ، تو یوں کہہ رہے ہو جیسے دسیوں کھانے یہاں موجود ہیں۔''

میں کھسیا کر بولا۔''سر!......کچھ نہ کچھ تو موجود ہے نا۔''

''اچھا فی الحال گفتگو سے پرہیز کرو۔ نائیٹ ویژن سائیٹ سے چاروں جانب کے علاقے کو یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لو۔ کیا پتا دشمن پیش قدمی کر رہا ہو۔''

''نائیٹ ویژن سائیٹ کی کیا ضرورت ہے، میرے پاس وائرلیس سیٹ جو موجود ہے۔''میں نے واکی ٹاکی آن کر لیا۔

چند لمحوں کی شاں شاں کے بعد ایک آواز ابھری۔

''کنٹرول فار آل اسٹیشن!......اوکے رپورٹ دیں گے، نمبر فائیو......''

نمبر فائیو نے الفابٹ کی زبان میں جواب دیا۔''آسکر کلو (اوکے)!''

''نمبر سکس......''کنٹرول نے اگلا کال سائن پکارا۔

''نمبر سکس، آسکر کلو۔''نمبر سکس نے جواب دیا۔

وہ فرداً فرداً تمام پارٹیوں کو پکارتا گیا اور متعلقہ پارٹی لیڈر جواب دیتا گیا۔سب اچھا کی رپورٹ لے کر اس تمام نے پارٹیوں کو اگلے حکم کے انتظار کا مژدہ سنایا۔یقیناً اس نے پارٹیوں کو آگے بڑھنے یا اپنی جگہ پر رات گزرنے کا انتظار کرنے کی بابت حکم سنانا تھا۔میں بھی واکی ٹاکی بند کیے بغیر محوِ انتظار رہا۔دس پندرہ منٹ کے بعد ایک مرتبہ پھر تمام پارٹیوں کو اپنی جگہ پر ٹھہرے رہ کر صبح سویرے تک پیش قدمی کی کارروائی موخّر کرنے کا حکم سنا دیا گیا۔

میں نے واکی ٹاکی بند کرتے ہوئے کہا۔''مطلب وہ ڈر گئے ہیں۔''

''نہیں یار!......ایک سنائپر کو رات کے وقت اس جنگل میں ڈھونڈنا، یقیناً بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔انھوں نے جنگل کو تقریباً گھیرے میں لے لیا ہے، کل دن کی روشنی میں اطمینان سے اپنا شکار ڈھونڈ لیں گے۔''

''اگر آپ ٹھیک ہوتے تو کیا ہم یہیں بیٹھے ان کا انتظار کرتے رہتے۔''

''تو کہاں جاتے؟''

''اس جنگل سے نکل بھاگتے، وہ جتنی بھی کوشش کر لیں چپے چپے پر اپنے آدمی تعینات نہیں کر سکتے۔ان کے گھیرے میں کئی شگاف ہوں گے۔''

''ذیشان!......آتے وقت دشمن کی بے خبری میں ان رستوں سے گزرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ہم نے نقشے کو بھی بس سرسری انداز میں دیکھا تھا۔آج دن کو میں بڑی باریکی سے علاقے کا نقشہ کھنگال چکا ہوں۔اس جنگل کے مشرقی طرف جو پہاڑی سلسلہ ہے، جنگل کی جانب سے سارا سلسلہ سیدھی کھڑی چٹانوں پر مشتمل ہے جنھیں نقشے کی زبان میں اسکارپمنٹ کہتے ہیں۔اور ایسی چڑھائیاں کوئی کوہ پیما ہی سر کر سکتا ہے۔مغربی جانب ان کے کسی سیکٹر کا بیس ہے، غالباً آپ جسے لالی سیکٹر بتلا رہے تھے، اور اسی پہاڑی سلسلے پر ان کی دو اور پوسٹیں بھی موجود ہیں، سادہ الفاظ میں کہوں تو اس جانب سے اس وقت بھاگ نکلنا جب کہ پوستوں کے سنتری چوکنا ہوں نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔شمال کی جانب تنگ درے کی روڈ اور سفید نالا ہے، یہ دونوں رستے کھلی کتاب کی مانند ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ راستہ دشمن کے علاقے کی طرف جاتا ہے۔کوئی بے وقوف ہی اس سمت نکلنے کی کوشش

کرے گا۔اب رہ گئی جنوب کی سمت، تو اس جانب چپے چپے کی نگرانی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔‘‘

’’سر!......آپ مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔‘‘

’’نہیں، بس صورت حال کا صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔‘‘

’’اچھا چھوڑیں سر!...... پیٹ پوجا کرتے ہیں۔‘‘میں نے سمال پیک سے بھنے ہوئے چنے کے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کر دیے۔یہ غذائیت سے بھرپور بسکٹ تھے۔چند بسکٹ ہی آدمی کو چوبیس گھنٹے کی توانائی مہیا کر دیتے تھے۔یہی بسکٹ استاد صادق کے پاس بھی موجود تھے۔میری ترغیب پر اس نے بھی بسکٹ چبانے شروع کر دیے۔

اس نے بسکٹ کھا کر کہا۔’’پانی مجھے بھی پلانا۔‘‘

’’یہ لیں پہلے آپ پی لیں۔‘‘میں نے اپنی جگہ سے سرک کر واٹر پائپ اس کی جانب بڑھا دیا۔

’’بہت میٹھا پانی ہے اس چشمے کا۔‘‘سیر ہو کر پانی پینے کے بعد اس نے واٹر پائپ میری جانب بڑھا دیا۔

’’واقعی سر!......بہت عمدہ پانی ہے۔‘‘

’’اچھا اب آرام کر لو، کیونکہ صبح ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، مگر پہلے آپ کا پاؤں دیکھ لوں۔‘‘میں استاد صادق کی طرف بڑھ گیا۔واقعی اس کا پاؤں کافی سوجا ہوا تھا۔سوجن پنڈلی تک پھیل گئی تھی۔اس کا علاج کسی ہسپتال ہی میں ممکن تھا۔

میں نے اپنی جگہ واپس آ کر آنکھیں بند کر لیں۔میرے اعصاب جتنے بھی مضبوط ہوتے میرا پہلا مشن تھا ۔اور ایسے حالات سے پہلی بار میرا واسطہ پڑ رہا تھا۔گزشتہ رات کی طرح، مجھے اس رات بھی بس واجبی سی نیند آئی ۔بار بار آنکھ کھل جاتی۔چند بار میں نے واکی ٹاکی آن کر کے دشمن کو بھی سننے کی کوشش کی۔بس ایک مرتبہ انھیں سب اچھا دیتے ہوئے سنا اس کے علاوہ خاموشی چھائی رہی۔

☆......☆......☆

صبح صادق کے وقت مجھے استاد صادق کی آواز سنائی دی۔

’’ذیشان!......سو رہے ہو۔‘‘

”کوشش تو رات بھر رہی ہے، مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔“

”اچھا اپنی ضروریات سے فارغ ہو جاؤ، کیونکہ دن بھر موقع نہیں ملے گا۔“

”ٹھیک ہے سر!......مگر آپ......“

”یقیناً میرے لیے نیچے اترنا ممکن نہیں ہوگا۔“

”تو......؟“

”تو یہ کہ میرے پاس اس مقصد کے لیے شاپر موجود ہے۔بس آپ کو تھوڑی زحمت کرنا پڑے گی۔“

”بڑی خوشی سے۔“ کہہ کر میں نیچے اتر گیا۔نیچے اترنے سے پہلے میں نے اپنا سمال پیک اور رائفل وہیں مچان پر چھوڑ دی تھی۔تھوڑی دور جا کر میں نے فطری تقاضا پورا کیا اور فضلہ جات کو بڑی احتیاط سے زمین میں دبا دیا کیونکہ اس سے دشمن کو ہماری موجودی کا یقین ہو جاتا اور یہ یقین ان کی کوششوں کو تقویت دینے کے ساتھ انھیں مزید چوکنا اور محتاط کر دیتا۔واپس جا کر میں نے استاد صادق کے شاپر میں بند فضلہ جات کو بھی ٹھکانے لگایا اور پھر درخت پر چڑھ کر خود کو مچان میں چھپانے لگا۔

”چھپنے سے پہلے مجھے تھوڑا پانی دے دینا۔بعد میں یقیناً ہمیں حرکت کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”جی سر!......“ کہہ کر میں نے سمال پیک سے واٹر بوتل نکالی اور استاد صادق سے واٹر بوتل لے کر آدھا پانی اس میں منتقل کر دیا۔

خود کو کیموفلاج کر کے میں نے واکی ٹاکی آن کر لیا۔پارٹیوں کو پیش قدمی کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔”آگے بڑھیں......لیکن احتیاط سے، فائر کرنے سے پہلے یہ بات مدنظر رہے کہ چاروں طرف آپ کے اپنے ساتھی موجود ہیں۔کوشش یہی کرنا کہ دشمن زندہ ہاتھ لگے۔“

میں ان کی باتیں سننے لگا۔مگر استاد صادق نے زیادہ دیر مجھے واکی ٹاکی آن نہ رکھنے دیا۔

”ذیشان!......بس وائرلیس سیٹ آف کر دو، اس کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے۔“

”جی سر!“ کہہ کر میں نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد دشمن کے چند سپاہی ہمارے قریب سے گزرتے چلے گئے۔وہ آہستہ قدموں سے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں سے گزر رہے تھے۔گاہے گاہے

وہ درختوں کے اوپر بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ مجھے ان کے انداز میں خوف کی جھلک نظر آئی، بلاشبہ وہ اندھی گولی کا شکار ہونے سے خوف زدہ تھے۔ شام تک وہ وہیں گھومتے رہے۔ مختلف اطراف سے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دیتی رہی۔ رات کو بھی پارٹیوں نے جنگل میں ڈیرا ڈالا، مگر ہماری مچان کے قریب کوئی پارٹی نہیں ٹھہری تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں نے پہلے تو شبِ دید عینک لگا کر چاروں جانب کسی دشمن کے نہ ہونے کا یقین کیا۔ اور پھر واکی ٹاکی کی آواز کم کر کے آن کر لیا۔

ان کی باتوں سے پتا چلا کہ ہر پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک گروپ کا کام جنگل میں گھس کر تلاشی لینا اور دوسرے گروپ کا کام جنگل کا گھیراؤ کرنا تھا۔ اس لیے گھیرا ڈالنے والی پارٹیاں کل سے اپنی اپنی جگہ موجود تھیں اور تلاشی کے لیے مختلف پارٹیاں تین اطراف سے جنگل میں داخل ہو چکی تھیں، بلکہ اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی جنگل ہی میں تھیں۔ البتہ اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے پارٹیوں کو اپنی اپنی جگہ پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

''میرے پاس پانی ختم ہو گیا ہے۔'' میں نے گفتگو کی ابتدا ہی مایوسی بھری خبر سے کی۔

استاد صادق نے مسکرا کر کہا۔ ''یہی خبر میرے پاس بھی ہے۔''

''مطلب، اپنی آزمائش شروع ہو گئی ہے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''سنائپر کی ساری زندگی ہی آزمائشوں میں گھری ہوتی ہے۔''

''ویسے پانی کے بغیر انسان کتنے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار تو انسان کی جسمانی حالت، ارادے، اللہ پاک کی ذات پر اعتماد اور واپس لوٹنے کی امید پر ہوتا ہے۔ ویسے سنا یہی ہے کہ پانی کے بغیر لوگ مہینا بھر بھی زندہ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر مسکراتا ہوا بولا۔ ''بہر حال یہاں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ درختوں کے سبز پتے پانی اور خوراک دونوں کی کمی کو پورا کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں۔''

میں دبی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے سر!......آپ پہلے بھی مختلف مشن پر سرحد پار آ چکے ہیں، کیا کبھی ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا؟''

وہ گہری سوچ میں ڈوبتا ہوا بولا۔ ''میں پہلے مشن میں کامیابی کے قریب پہنچ گیا تھا، مگر مجھے اپنے استاد نے دھوکا دے دیا۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''استاد نے دھوکا دے دیا؟''

''ہاں ذیشان!......استاد ہاشم میرے ساتھ سینئر تھا۔ ہم دونوں ایک ہی جھاڑی میں چھپے ہدف کی آمد کے منتظر تھے۔ ہدف کے نظر آتے ہی استاد کے حکم پر میں نے گولی چلائی جو ہدف کے ماتھے پر لگی تھی۔ دشمن کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ اور ہماری بدقسمتی کہ دشمن کو ہماری جگہ کے بارے اندازہ ہوگیا تھا۔ استاد ہاشم نے مجھے وہاں سے فرار ہونے کا کہا اور میری سنائپر رائفل مجھ سے یہ کہہ کر لے لی، کہ اس کی رائفل فائر کے قابل نہیں رہی تھی۔ اپنی رائفل اس نے مجھے پکڑا دی تھی۔

''استاد جی!......آپ بھی چلیں نا۔'' میرے لہجے میں ناتجربہ کاری بول رہی تھی۔ ورنہ وہاں سے دونوں آدمیوں کا ایک ساتھ بھاگنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ پر یہ بات استاد ہاشم کو اچھی طرح معلوم تھی اس نے کہا۔

''آپ سیدھے وہاں پہنچیں جہاں ہم نے گزشتہ شب گزاری تھی۔ وہاں سے پہلے رکنے کی کوشش نہ کرنا اور میری فکر بھی نہ کرنا میں مرنے والا نہیں۔ مجھے ایک دوسرا راستہ معلوم ہے۔''

مجھے متذبذب دیکھ کر اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''وعدہ کرتا ہوں زندہ رہوں گا۔ اور یہ بھی اپنے پاس رکھو میں آکر لے لوں گا۔ کم از کم یہ وزن تو آپ ساتھ لے جائیں، تاکہ مجھے بھاگنے میں آسانی رہے۔'' اس نے اپنا پستول مع فالتو میگزین کے اور اپنی واٹر بوتل بھی میرے حوالے کر دی۔

''استاد جی!......'' میں نے تکرار کرنا چاہی مگر اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے اپنی جیب سے ایک لپٹا ہوا کاغذ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھے تھوڑی دیر ہو جائے تو اس رستے پر چل پڑنا یہ بالکل آسان اور محفوظ راستہ ہے۔ اب بھاگو ورنہ میں صحیح طور پر دشمن کو نہیں روک پاؤں گا۔'' اس کی تنبیہ سے پہلے دشمن کی جانب سے فائر کے دو تین برسٹ آئے اور میں پیچھے کو کھسک گیا۔ اسی وقت ہلکی سی ''ٹھک'' میری سماعتوں سے ٹکرائی اور مجھے پتا چل گیا کہ دشمن اپنے ایک آدمی سے محروم ہو گیا ہے۔

گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ اتنا طویل نہیں تھا، مگران جھاڑیوں کی آڑ لے کر فرار ہوا جا سکتا تھا۔ جھاڑیوں کے اختتام پر ڈھلان تھی وہاں پہنچ کر بندہ یوں بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ سب اس وقت ممکن تھا جب دشمن کو ہماری جگہ کے بارے میں پتا نہ ہوتا۔ اب تو دشمن اس جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اور یقیناً ہمارا تعاقب کر کے وہ آسانی سے ہمیں رستے ہی میں دھر لیتے۔ البتہ اگر ایک آدمی ان کے ساتھ فائر کا تبادلہ کرتا رہتا تو دوسرا آسانی کے ساتھ فرار ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر استاد ہاشم نے مجھے بھگا دیا تھا۔

رستے میں یہ سوچ میرے دماغ میں سرگرداں رہی کہ استاد ہاشم وہاں سے کیسے بھاگے گا، کیونکہ وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا تھا اور اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اسے ایک دوسرا راستہ معلوم ہے۔ اور مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔

جھاڑیوں کا علاقہ میں نے جھک کر دوڑتے ہوئے طے کیا تھا مگر ڈھلان سے اترتے ہی میں سیدھا کھڑا ہو کر بھاگ پڑا۔ اس نشیب میں میں اندھا دھند ہونے والے فائر سے محفوظ تھا۔ گزشتہ رات کی پناہ گاہ تک میں بغیر رکے بھاگتا چلا گیا۔ وہ جگہ کارروائی کے علاقے سے قریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ تمام رستے میرے کانوں میں مسلسل فائرنگ کی آواز گونجتی رہی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ استاد ہاشم مقابلے پر ڈٹا ہوا ہے، مگر جب میں اپنی پناہ گاہ سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر پہنچا تو ایک دم فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ میں جھاڑیوں میں چھپی چھوٹی سے کھوہ میں گھس کر استاد ہاشم کا انتظار کرنے لگا۔ نا معلوم کیوں میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میری پریشان سوچوں میں مختلف خیالات سرگرداں تھے۔ ”استاد ہاشم وہاں سے کیسے فرار ہوگا، دشمن کو کیسے چکما دے گا، کہیں دشمن اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس ٹھکانے تک تو نہیں پہنچ جائے گا؟ اور کیا مجھے وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا چاہیے یا چھپنے کے لیے جگہ تبدیل کر لینی چاہیے۔“

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو استاد ہاشم کو فرار کا جو راستہ معلوم ہے وہ کسی اور سمت کو جاتا ہو۔ اور اسی لیے تو استاد نے مجھے رستے کا نقشہ دیا تھا۔ میں نے جیب سے استاد کا دیا ہوا کاغذ نکال کر کھولا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کاغذ میں سنائپر رائفل کی فائرنگ پن لپٹی ہوئی تھی۔ استاد ہاشم نے سچ کہا تھا کہ اس کی رائفل فائر کے قابل نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ وہ خرابی اس کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کی ہوئی تھی

۔رائفل کی فائرنگ پن کاغذ میں بند کر کے اس نے مجھے واضح اشارہ دیا تھا کہ مجھے اس کی غلط بیانی کے بارے معلوم ہو جائے اور میں یقین کرلوں کہ وہ اپنے ملک پر قربان ہو گیا ہے۔لیکن اس طرح کہ اپنے زیرِ کمان کی جان کو بچا گیا تھا۔اس وقت مجھ پر خود بہ خود اس کی آخری گفتگو کی گتھیاں کھلتی چلی گئیں۔

اس نے اپنی رائفل یہ کہہ میرے حوالے کی تھی کہ رائفل خراب ہے لیکن اس کے ساتھ اس خرابی کا علاج بھی میرے حوالے کر دیا تھا۔اور یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ ہر سنائپر ریٹائر ہوتے وقت اپنی رائفل اپنے جانشین کے حوالے کرتا ہے۔اس نے بھی یہی کیا مگر مجھے شک بھی نہیں ہونے دیا۔پھر اس نے کہا تھا کہ ”مجھے دوسرا راستہ معلوم ہے۔“ اور وہ دوسرا راستہ ایک ایسی سمت کو جاتا تھا جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں۔اور پھر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرے گا نہیں۔اور یقیناً شہید مرا نہیں کرتے۔ہاں ذیشان وہ آج بھی زندہ ہے۔مجھے اپنے اردگرد محسوس ہوتا ہے۔اس کی شہادت کے بعد دشمن کو خود بہ خود یقین آ گیا تھا کہ وہ بدلا لے چکے ہیں،مگر یہاں بھی استاد چال چل گیا تھا۔اس نے میرے ہاتھ سے دشمن کا خاتمہ کرایا تھا اور میں محفوظ تھا۔یہاں بھی دشمن کو شکست ہوئی تھی۔مجھے شدت سے رونا آیا اور میں اس دھوکے باز کو یاد کر کے رو پڑا۔وہ مجھ سے اچھا نشانے باز تھا۔اس کا تجربہ بہت زیادہ تھا۔جانے کیوں اس نے ایک بہترین نشانے باز کو ایک نئے اور نا تجربہ کار سنائپر کے لیے قربان کر دیا تھا۔یقیناً میں اسے اکیلا چھوڑ کر کبھی نہ جاتا اگر وہ مجھے دھوکے میں نہ رکھتا۔اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا مگر مجھے دھوکا ضرور دیا تھا۔آج تک اس دھوکے باز کو نہیں بھلا سکا ہوں یار!“ استاد صادق کی آواز میں شامل دکھ میری آنکھیں بھی بھگو گیا تھا۔میں بس خاموش بیٹھا اس کے محترم استاد کے متعلق سوچتا رہا۔

کچھ باتیں ایسی تھیں کہ استاد صادق نے مجھے نہیں بتائی تھیں مگر مجھے خود بہ خود ان کا اندازہ ہو گیا تھا۔استاد ہاشم نے اپنی واٹر بوتل اور پستول یہ کہہ کر استاد صادق کے حوالے کیے تھے۔کہ یہ وزنی ہیں۔مگر اصل وجہ اور تھی ۔وہ اپنے حصے کا پانی اپنے شاگرد کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔اسی طرح پستول اور اس کے اضافی راؤنڈ بھی رستے میں استاد صادق کے کام آ سکتے تھے۔رات کو سوتے ہوئے بھی میری سوچ میں استاد ہاشم اپنے ان دیکھے خدوخال کے ساتھ سرگرداں رہا۔

☆......☆......☆

صبح صادق کو اٹھ کر ہم نے اپنی فطری ضروریات کو پورا کیا۔ آج میں ان درختوں سے زیادہ دور نہیں گیا تھا ۔ ملگجا اجالا ہونے سے پہلے ہم کیموفلاج ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ پوری رات ہم نے پانی پیے بغیر گزاری تھی صبح دم اچھی خاصی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پہلی روشنی کے ساتھ دشمن کی چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ میں نے دوپہر کے وقت خوب احتیاط سے اطراف کا جائزہ لے کر واکی ٹاکی سیٹ آن کیا مگر اس کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔ میں نے اضافی بیٹری لگا کر واکی ٹاکی آن کیا اور دشمن کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ واکی ٹاکی کی آواز کو مدہم کر کے میں نے کان سے لگا لیا تھا۔

چند لمحوں بعد ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ زیادہ تر پارٹیاں کھڑی چٹانوں کے سلسلے کے نیچے موجود گھنی جھاڑیوں میں مجھے تلاش کر رہے تھے۔ (میں نے مجھے اس لیے استعمال کیا کہ ان کی نظر میں یہ کارروائی کرنے والا میں اکیلا تھا۔ اور اگر بہ نظر انصاف دیکھا جاتا تو ان کا مجرم میں ہی تھا)

تھوڑی دیر ان کی باتیں سننے کے بعد میں نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔

استاد صادق نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میری تلاش جاری ہے۔“

استاد صادق نے اپنی رائے دی۔ ”شاید ہفتہ بھر جاری رہے۔“

میں ہنسا۔ ”مطلب، ہفتہ بھر سبز پتوں پر گزارا کرنا پڑے گا۔“

”اگر کوشش کرو تو پانی لا سکتے ہو۔“

”کیسے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”چشمے کی جگہ آپ کو معلوم ہے، اور ایک سنائپر کس طرح چھپ کر حرکت کرتا ہے یہ جاننے کی ضرورت شاید آپ کو نہ ہو۔“

”مگر آپ کو اکیلا چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا ہوں؟“

”اگر آپ زخمی ہوتے تو یقیناً میں چلا جاتا مگر اب یہ خطرہ آپ ہی کو مول لینا پڑے گا۔“

میں خفّت بھرے لہجے میں بولا۔ ”سر! آپ بات کو کوئی اور رخ دے رہے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”نہیں ذیشان!...... پانی لانے میں واقعی بہت زیادہ خطرہ ہے مگر اس کے بغیر چارہ بھی تو کوئی نہیں۔“

”مجھے کس وقت نکلنا چاہیے؟“میں استاد صادق کے دل میں کوئی غلط فہمی پلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”دشمن رات کے وقت زیادہ چوکنا ہوتا ہے۔اور گھیرا ڈالنے والی پارٹیوں کے پاس لازماً تھرمل نائیٹ سائیٹ ہوگی اور یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں حرارت خارج کرنے والی اشیاء بہت جلد نظر آجاتی ہیں اور ہر جاندار شیے حرارت خارج کرتی ہے۔“(قارئین کی معلومات کے لیے لکھتا چلوں کہ نائیٹ ویژن سائیٹ کی اب تک تین اقسام آچکی ہیں۔پہلی قسم انفرا ریڈ کے اصول پر کام کرتی تھی۔اس کا دکھاؤ بہت محدود تھا۔آج کل اس کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔دوسری قسم اس سے بہتر ہے اور روشنی کے اصول پر کام کرتی ہے۔یعنی چاند ستاروں کی روشنی کو بڑھا کر دکھاتی ہے۔اور تیسری جو سب سے بہتر ہے”تھرمل امیجنگ“ وہ حرارت کے اصول پر کام کرتی ہے۔)

”یعنی مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔“میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر سے کپڑا ہٹا کر وقت دیکھا۔دن کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔

”بالکل!......گھیرا ڈالنے والی پارٹیاں دن کو اتنی چوکنی نہیں ہوں گی۔اور مجھے امید ہے شمال کی جانب سے آپ باآسانی سے نکل سکتے ہیں۔ان کا زیادہ دھیان مشرقی اور جنوبی سمت میں ہوگا۔“

”لیکن تلاشی لینے والی پارٹیاں تو چوکنا ہوں گی نا؟“میں نے ایک اہم نقطے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

”تو پھر؟“ وہ مستفسر ہوا۔

”پھر ایسا ہے کہ صبح صادق کے وقت نکلنا بہتر رہے گا،اس وقت پہرے دار عموماً سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔“

”گڈ۔“اس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

”یعنی آپ مجھ سے متفق ہیں۔“

”سوفی صد۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔’’تو ابھی جانے کے حق میں کیوں دلائل دے رہے تھے۔‘‘

’’بس آپ کو جانچنا تھا۔‘‘

’’شکر ہے کہ میں آپ کے معیار پر پورا اترا۔‘‘

’’استاد کا کام ہر پل شاگرد کو جانچتے رہنا ہوتا ہے۔‘‘

میں ہنسا۔’’ویسے دورانِ ٹریننگ بھی آپ نے ہمیں کافی خوار کیا تھا۔‘‘

’’ہماری وہی سختی آج آپ کو ان حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ دیے ہوئے ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’صحیح کہا سر!‘‘ مگر استاد صادق نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔منصوبہ طے ہو گیا تھا ۔بس عمل کرنا باقی تھا۔

پیاس کی وجہ سے کچھ کھانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔شام کے وقت میں نے ایک بار پھر دشمن کی باتیں سنیں ،انھیں اکٹھا ہونے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

میں رات کو کوشش کے باوجود بہت تھوڑی نیند لے سکا تھا۔پیاس کی زیادتی اور پھر آنے والے جاں گسل لمحات کے خیال نے مجھے بے چین رکھا تھا۔سوا تین بجے کے قریب مجھے استاد صادق نے آواز دی۔

’’ذیشان۔‘‘

’’میں تیار ہوں سر!‘‘ میں چابک دستی سے بولا۔اور درخت سے نیچے اتر گیا۔اس سے پہلے میں اطراف کا جائزہ لینا نہیں بھولا تھا۔گو ہم نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا، کیونکہ پانی کی غیر موجودی میں خشک بسکٹ کھانا پیاس کو بڑھانے کا موجب ہی بنتا۔اور درختوں کے پتے اس لیے نہیں چبائے تھے کہ ابھی تک ہماری پیاس برداشت سے باہر نہیں ہوئی تھی۔پھر بھی تھوڑی بہت حاجت محسوس ہو رہی تھی۔‘‘

فریش ہونے کے بعد میں جانے کے لیے تیار تھا۔استاد صادق نے میری جانب میرا سمال پیک بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’میں نے اپنی واٹر بوتل بھی تمھارے پیک میں ڈال دی ہے تاکہ زیادہ پانی لا سکو۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے گھیرے سے نکل جانا، ورنہ پھنسنے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔'' استاد صادق نے مجھے آخری نصیحت کی۔

اور میں نے ''فی امان اللہ سر!'' کہہ کر اپنی رائفل کندھے سے لٹکا لی۔ گلاک نائنٹین پسٹل میں نے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ کیونکہ سنائپر رائفل کو اسالٹ رائفل کے طور پر استعمال کرنا بے وقوفی ہے۔ حرکت کرتے ہوئے اچھی ساخت کا پستول سنائپر رائفل سے کئی گنا زیادہ کارکردگی دکھا سکتا ہے۔

آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر میں نے قطبی ستارے کو ڈھونڈا اور پھر بازو لمبا کر کے قطبی ستارے سے ڈگری لینے لگا۔ میں نے قطبی ستارے سے بارہ ڈگری دائیں سفر کرنا تھا۔ ایک سنائپر کے لیے کمپاس کے ساتھ ستاروں کے استعمال سے واقفیت بھی نہایت ضروری ہے۔ (کچھ قارئین کے لیے کمپاس کا استعمال اور ڈگریوں وغیرہ کا کھٹ راگ یقیناً ایک نئی چیز ہوگا۔ اگر ڈگریوں کی بابت بتانے کے لیے عام فہم انداز میں بات کی جائے تو ایک دائرے کو تین سو ساٹھ ڈگریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر ایک آدمی قطبی ستارے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے تو اس کا رخ صفر یا تین سو ساٹھ ڈگری کی طرف ہوگا۔ مشرق نوّے ڈگری، جنوب ایک سو اسی ڈگری اور مغرب کی سمت دو سو ستّر ڈگری پر واقع ہے۔ ہر سمت کے درمیان نوے ڈگری کا فرق ہے۔ کمپاس پر یہ تمام ڈگریاں درج ہوتی ہیں اور کسی بھی ڈگری پر سفر کرنے کے لیے بس کمپاس کی سوئی کو مطلوبہ ڈگری کی طرف کر کے چل پڑنا ہوتا ہے۔ جبکہ ستاروں کی مدد سے سفر کرنے کے لیے ستاروں کے طلوع و غروب ہونے کا علم اور آسمان پر مطلوبہ ستارے کی جگہ کا پتا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تمام ستاروں میں فقط قطبی ستارا ایسا ہے جو اپنی جگہ نہیں بدلتا اور ہر وقت قطب شمالی کے اوپر چمکتا رہتا ہے۔ باقی ستارے مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتے ہیں البتہ ہر ستارے کا راستہ الگ الگ ہوتا ہے، کوئی جنوب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو کوئی شمال مشرق سے اور کوئی عین مشرق کی سمت سے)

میں نے چونکہ شمال کی جانب سفر کرنا تھا اس لیے مجھے اتنی تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ بس قطبی ستارے کو دیکھا ہاتھ کی مدد سے بارہ ڈگری کے فاصلے کا اندازہ کیا اور چل پڑا۔ قطبی ستارے کے علاوہ کسی دوسرے ستارے کو سمت برقرار رکھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں چنا جا سکتا کیونکہ ستاروں کا اپنا سفر جاری رہتا ہے اس لیے ہر آدھے

گھنٹے بعد پہلے والے ستارے کو چھوڑ کر دوسرا چننا پڑتا ہے۔

میں گاہے گاہے شبِ دید عینک میں بھی جھانک کر دائیں بائیں کے علاقے کو دیکھ لیتا تھا۔ چلتے وقت حتی الوسع میری کوشش یہی تھی کہ میرے پاؤں کی آواز پیدا نہ ہو۔ گو اس طرح میری رفتار کافی سست ہوگئی تھی، مگر کبھی نہ پہنچنے سے، دیر سے پہنچنا بہت بہتر تھا۔

رستے میں مجھے دشمن کی کوئی پارٹی نظر نہ آئی۔ یقیناً زیادہ تر پارٹیاں مشرقی سمت میں کھڑی چٹانوں کے سلسلے کے نزدیک، گھنے جنگل میں موجود تھیں۔ درختوں کا سلسلہ ختم ہونے کے قریب ہوا تو میری رفتار مزید سست ہوگئی اور میں قریباً رینگ رینگ کر آگے بڑھنے لگا۔ اندھیرے کو ختم کرنے کے لیے روشنی اپنے رخ سے آہستہ آہستہ نقاب سرکا رہی تھی۔ جھاڑیوں کی آخری لائن کے قریب میں لیٹ گیا۔ میرے سامنے وہی خشک نالا تھا جسے دشمن سفید نالے کے نام سے پکارتا تھا۔ اسی نالے کی دوسری جانب میں نے دشمن کے سریش نامی آدمی کو ہلاک کیا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں مجھے دور سے دو ہیولے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ دونوں سنتری ہیں۔ میں وہیں دبک کر لیٹا رہا یہاں تک کہ وہ میرے قریب سے گزرتے چلے گئے۔ دونوں دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ موضوعِ سخن گھریلو مسائل اور تنخواہ کی کمی تھی۔ ان کے چند قدم آگے جاتے ہی میں کرالنگ کرتا ہوا خشک نالے سے گزرنے لگا۔ گو یہ رسک تھا، مجھے مکمل طور پر ان کی روٹین سے واقف ہوئے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، مگر وقت کی کمی نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ یوں بھی ان دونوں سنتریوں کا بے پرواہانہ انداز اس بات کا مظہر تھا کہ انھیں میرے اس سمت آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ان کے پیچھے مڑنے سے پہلے میں نے نالا عبور کر لیا تھا۔ ایک جھاڑی کی آڑ لے کر میں نے نالے میں نگاہ دوڑائی۔ پہلے نظر آنے والے پہرے دار تو ابھی تک نہیں پلٹے تھے البتہ وہ جس سمت سے آئے تھے اس طرف سے دو اور پہرے دار ٹہلتے ہوئے آگے آ رہے تھے۔ میں نے اس جھاڑی کی آڑ میں پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ اچانک میری سماعتوں سے کسی کے قدموں کی آواز ٹکرائی۔ وہیں دبک کر میں نے آواز کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ میرے چھپنے کی جگہ سے دو جھاڑیاں پہلے بیٹھ گیا۔ یقیناً وہاں ٹوائلٹ کی سہولت موجود نہیں تھی اس لیے صبح دم جس کا جدھر منہ ہوتا وہ چل پڑتا تھا۔

اس کے فارغ ہونے تک میں وہیں دبکا رہا۔ اس کے واپس پلٹتے ہی میں رینگتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ روشنی کی

جارحیت بڑھتی جارہی تھی۔میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا وہاں سے دور ہوتا گیا۔طلوعِ آفتاب تک میں اس نالے سے چار پانچ سو میٹر دور آ گیا تھا۔گو اس علاقے میں خطرہ کم تھا مگر میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ایک مرحلہ تو، بہ خیر و عافیت گزر گیا تھا۔اب پانی بھر کر واپسی کا مرحلہ باقی تھا۔واپسی کے لیے مجھے لازماً رات کا انتظار کرنا پڑتا۔مجھے استاد صادق کا خیال آیا میں نے سوچا۔

''استاد صادق کو آج کا دن بھی پیاسا گزارنا پڑے گا۔''

اب میں جھکے جھکے انداز میں چل رہا تھا۔نالے سے چشمے کا فاصلہ قریباً تین کلومیٹر تھا۔میں آدھے کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور اب گویا اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ باقی تھا۔لیکن یہ تمام راستہ مسلسل چڑھائی پر مشتمل تھا۔اس لیے قدرتی طور پر میری رفتار سست رہی۔میں مزید سو میٹر آگے گیا ہوں گا کہ اچانک میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔میں چونک کر پلٹا اور ایک ابھری ہوئی چٹان کی آڑ میں پیچھے کی جانب نظریں دوڑانے لگا۔

''شاید میں دیکھ لیا گیا ہوں۔''میرے ذہن میں سب سے پہلے یہی سوچ ابھری مگر پھر میں نے نفی میں سر ہلا کر اس سوچ کو دور جھٹکا۔اگر میں نظر آ گیا ہوتا تو گولیوں کا رخ میری جانب ہونا چاہیے تھا۔میں نے دوربین آنکھوں سے لگا کر منظر کو مزید قریب کیا۔اور یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہونے لگا کہ گھیرے میں موجود تمام آدمی اپنے اپنے ہتھیار سونتے جنگل کے اندر کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔اچانک مجھے واکی ٹاکی کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے آن کر لیا۔کوئی شخص چیخ چیخ کر اپنے ہلاک ہونے والے دو آدمیوں کی رپورٹ دے رہا تھا۔جنھیں کسی سنائپر کی گولی نے لقمۂ اجل بنایا تھا۔

انھیں محتاط رہنے کا مشورہ دے کر کنٹرول تمام پارٹیوں کو اسی سمت اکٹھا ہونے کا حکم دے رہا تھا۔

''استاد صادق! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''میں نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں تھامی اور ٹیلی سکوپ سائیٹ کے کور اتار کر شست لینے لگا۔دشمن کی نالے کے اطراف میں موجود سپاہ میری رینج میں تھی۔ایک بندے کے سر کا نشانہ لے کر میں نے بغیر کسی جھجک کے ٹریگر پریس کر دیا۔

''ٹرنچ'' کی آواز نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔میں نے جلدی سے رائفل کاک کی لیکن میگزین خالی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری رائفل نہیں ہے۔

میں نے جلدی سے سمال پیک پیٹھ سے اتارا اور اس میں موجود فالتو راؤنڈ نکالنے کے اپنا ہاتھ داخل کیا۔مگر میرا ہاتھ نامراد باہر آیا۔استاد صادق نے سٹائیر سنائپر رائفل کی تمام گولیاں نکال لی تھیں۔اور ان کی جگہ اپنا پسٹل اس نے میرے جھولے میں رکھ چھوڑا تھا۔اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے پانی لینے بھیجا تھا۔ورنہ کوئی سنائپر پانی کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لیا نہیں کرتا۔وہاں سبزے کی بہتات تھی ہم آسانی سے وہ سبزہ کھا کر پانی اور کھانے کی ضرورت سے بے فکر ہو سکتے تھے۔لیکن وہ جانتا تھا کہ ہم زیادہ دیر اس درخت پر چھپے نہیں رہ سکتے تھے ۔اور پھر اپنے زخمی پاوں کے ساتھ اس کا سفر کرنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن تھا۔یہی سوچ کر اس نے مجھے تحفظ دینے کا سوچا اور اس پر عمل کر گزرا۔

اچانک فائرنگ کی آواز میں شدت آ گئی دشمن کو ہدف مل گیا تھا۔درخت کی ٹہنیاں صرف نظری آڑ مہیا کر سکتی ہیں۔گولی روکنے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔وائرلیس سیٹ پر کوئی چیختے ہوئے اپنی کامیابی کی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔اور میرے دماغ میں استاد صادق کی گفتگو گونج رہی تھی۔

"یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر سنائپر ریٹائر ہوتے وقت اپنی رائفل اپنے جانشین کے حوالے کیا کرتا ہے۔"

اس نے صبح میرے درخت سے اترتے ہی میری رائفل کی جگہ اپنی رائفل رکھ دی تھی اور میرے سمال پیک سے سٹائیر سنائپر کے تمام راونڈ بھی نکال لیے تھے تاکہ میں جوش میں آ کر دشمن پر فائر کرنا نہ شروع کر دوں۔البتہ اپنے استاد ہاشم کی طرح اپنا پستول، اپنے جانشین کے حوالے کرنا اسے نہیں بھولا تھا۔

"دھوکے باز استاد کا دھوکے باز شاگرد۔"میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور میری آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

☆......☆......☆

میں کافی دیر وہیں لیٹا دشمن کی چہل پہل دیکھتا رہا۔استاد صادق کی شہادت کے بعد وہ کچھ بے فکر سے ہو گئے تھے۔ان کی باتیں سن کر پتا چلا تھا کہ استاد صادق کو شہید کرنے والے ان کی کمانڈو پلاٹون کے جوان تھے لیکن اس سے پہلے ان کے پانچ آدمیوں کو استاد صادق نشانہ بنانے میں کامیاب رہا تھا۔جس میں سے چار آدمی ہلاک ہو چکے تھے جبکہ گولی پانچویں آدمی کے سر سے رگڑ کھاتی ہوئی نکل گئی تھی۔مزید کچھ دیر وہیں پڑا رہنے کے

بعد میں دوبارہ چل پڑا۔اگراستاد صادق نے میرے پاس سنائپر رائفل کی گولیاں رہنے دی ہوتیں تو شاید میں کئی کونشانہ بنا چکا ہوتا،مگراب پسٹل سے تو سنائپنگ نہیں کی جا سکتی تھی۔گو اُس طرح میرے زندہ بچ جانے کے امکانات صفر فیصد بھی نہ رہتے،مگر جذباتی کیفیت میں مبتلا ہونے کے بعد فائدے نقصان کا ہوش کس کو رہتا ہے

چشمے تک میں بغیر کسی سے مڈبھیڑ ہوئے پہنچ گیا تھا۔خوب سیر ہو کر پانی پینے کے بعد میں نے دونوں واٹر بوتلیں بھر کر سمال پیک میں رکھ لیں اور پھر وہاں سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر موجود جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔میرا ارادہ وہیں رات گزارنے کا تھا۔کیونکہ آج کے دن ہماری تلاش میں سرگرداں ٹروپس نے واپس اپنی اپنی جگہ پر پہنچنا تھا۔ان کی نقل وحرکت کے دوران میرا ایک جگہ رکے رہنا بہتر تھا،کیونکہ کسی بھی پارٹی سے اتفاقی مڈبھیڑ ایک نیا محاذ کھول دیتی۔

جھاڑیاں کافی گھنی تھیں وہاں سے چشمے کی جگہ صاف نظر آ رہی تھی۔دن ڈھلنے کو تھا جب چشمے پر چند آدمی پانی بھرتے دکھائی دیے۔وہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ایک سخت ابتلا کے بعد انھیں ذہنی سکون حاصل ہوا تھا۔اورانھوں نے ایک خطرناک دشمن سے خلاصی پائی تھی۔ایسا سفاک دشمن جس نے ان کے درجن بھر ساتھی ہلاک کر دیے تھے۔میں بس خالی نظروں سے انھیں چہلیں کرتے دیکھتا رہا۔چشمے کے پانی سے ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اپنے رستے ہو لیے تھے۔سیر ہو کر پانی پینے کے بعد میری بھوک بھی ابھر آئی تھی۔میں پیک سے بسکٹ نکال کر کھانے لگا۔استاد صادق نے اپنی خوراک بھی میرے پیک میں ڈال دی تھی۔اپنے مقدر کا رزق میرے حوالے کرتے ہوئے اسے ذرا بھر بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔اس نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اپنی آخری گفتگو میں اس نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا کہ مجھے اس کے ارادے کی بابت معلوم ہوتا۔یقیناً یہ فیصلہ اس نے بہت پہلے کر لیا تھا۔اس وقت جب میں نے اس کی بات ماننے کے بجائے اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔اپنے استاد ہاشم کی کہانی سنانے کا مقصد مجھے،اپنی موت کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا تھا۔دورانِ ٹریننگ اس نے اپنے کئی تجربات ہمارے گوش گزار کیے تھے مگر اپنی زندگی کا سب سے اہم واقعہ اس نے ایسے حالات میں سنایا تھا جب وہ خود اپنے استاد کی راہ پر چلنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

وہ رات میں نے انھی جھاڑیوں میں استاد صادق کی یادوں سے لڑتے گزاری۔صبح صادق کے قریب میں

اپنی کمین گاہ سے نکلا اور چشمے کی طرف بڑھ گیا۔کیا پتا رستے میں پانی ملنا بھی تھا یا نہیں۔میں نے واٹر بوتل میں رات کے وقت ہونے والی کمی پوری کی اور اپنے رستے ہولیا۔چلتے وقت میں نے واکی ٹاکی سیٹ بھی آن کر لیا،مگر پہلے والی فریکونسی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔فریکونسی بدل کر بھی میں نے سن گن لینے کی کوشش کی مگر کوئی ایسی بات سننے میں ناکام رہا جو مجھے احتیاط پر مجبور کرسکتی۔ایک دو جگہ پر روزمرہ کی عام گفتگو سنائی دی۔دو تین پوسٹوں سے لالی سیکٹر بیس کو صبح کے ''سب اچھا'' کی رپورٹ دی جارہی تھی۔واپسی کے لیے میں نے پہلے والا راستہ استعمال نہیں کرنا تھا۔لالی سیکٹر کی بیس کے نیچے پہنچ کر میں جنوب کی سمت میں سیدھا نکلتا چلا گیا،نالا عبور کر کے جنگل میں گھسنے کی کوشش میں نے نہیں کی تھی۔سورج کے طلوع ہونے تک میں لالی سیکٹر بیس سے قریباً دو کلومیٹر آگے نکل گیا تھا۔روشنی ہونے کے ساتھ میری رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔میں پوری طرح کیموفلاج تھا۔گلی سوٹ نے مجھے جھاڑیوں کا حصہ بنایا ہوا تھا۔آگے جا کر نالا تنگ ہوگیا میرے دہنی جانب پہاڑی سلسلہ تھا۔جب کہ بائیں طرف جنگل تھا اور درختوں کے اختتام پر سیدھی کھڑی چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔دہنی جانب درختوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔میں نالا عبور کر کے جنگل میں گھس گیا۔آگے جا کر نالا غربی جانب مڑ رہا تھا۔اس نالے میں بس اکا دکا درخت تھے۔اور وہی میری واپسی کا راستہ بھی تھا۔دوربین نکال کر میں نے دوروزنزدیک کا بہ غور جائزہ لیا۔مگر کسی قسم کی حرکت نظر نہ آئی۔نقشہ کھول کر میں نے ایک بار پھر دشمن کے مورچوں کی جگہ کو بغور دیکھا۔اسی نالے میں آگے جا کر دشمن کی ایک پوسٹ تھی جس کا نام سدرتی پوسٹ تھا۔وہاں پر ان کے پندرہ سے بیس آدمی موجود رہتے تھے۔مذکورہ پوسٹ سے دائیں اور بائیں جانب تین چار کلومیٹر کے وقفے پر دو اور پوسٹیں تھیں وہاں بھی ان کی نفری دس کا ہندسہ عبور کر جاتی تھی۔مجھے سدرتی پوسٹ سے دائیں جانب کا راستہ اختیار کرنا تھا۔اور گجر پوسٹ کے قریب سے پھر غربی سمت مڑ کر دشمن کی آخری پوسٹ لیفٹ ترکیاں کی ذمہ داری کے علاقے سے گزر کر میرے سامنے پاکستان کی پہلی پوسٹ رنگ کنٹور آجانا تھی۔ہم نے آتے وقت دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔اس وقت ہمیں بارڈر پار کرانے کے لیے ایک رہبر بھی آیا تھا جو ہمارے بارڈر پار کرتے ہی واپس چلا گیا تھا۔اب واپسی کے سفر میں میں اکیلا تھا اور اپنا راستہ مجھے خود ڈھونڈنا تھا۔

نقشہ واپس سمال پیک میں رکھ کر میں اللہ پاک کا بابرکت نام لے کر غربی نالے میں گھس گیا۔گو وہاں

چھدرے چھدرے درخت تھے مگر رستے میں بڑے بڑے پتھر بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جو چھپنے میں مدد دے سکتے تھے۔ میں رکے بغیر چلتا رہا۔ البتہ سدرتی پوسٹ کے علاقے کو میں رات کے اندھیرے ہی میں عبور کر سکتا تھا۔ پوسٹ سے کلو میٹر بھر پہلے ایک مناسب مقام پر رک کر میں رات کا انتظار کرنے لگا۔ آنے والی رات کو چونکہ مجھے بقیہ تمام راستہ طے کرنا تھا اس لیے کھا پی کر میں آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ میرے دیکھے جانے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

سر شام ہی میں اپنی کمین گاہ سے باہر نکلا۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب پوسٹ پر موجود سنتری اتنے چوکنا نہیں ہوتے، کیونکہ ایک تو یہ وقت شام کے کھانے کا ہوتا ہے اور دوسرا ڈیوٹی وغیرہ کی تبدیلی اور رات کے انتظامی امور میں بھی لوگ مصروف ہوتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر مجھے بیس کلو میٹر کے قریب فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس لیے سر شام ہی سفر شروع کرتا تو پہاڑی علاقے کا یہ فاصلہ طے ہو سکتا تھا۔

میں بڑے پتھروں اور رستے میں آنے والے اکا دکا درختوں کی آڑ لے کر چلتا رہا۔

سدرتی پوسٹ کے علاقے کو عبور کرتے ہی میری رفتار تھوڑی تیز ہو گئی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد میں گجر پوسٹ کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے نالا سیدھا آگے نکلتا چلا گیا جبکہ میں غربی سمت کو مڑ گیا۔ آگے چڑھائی تھی میری رفتار کافی سست ہو گئی۔ آکسیجن کی کمی کے باعث اس علاقے میں تیز رفتاری سے حرکت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ خاص کر اس وقت جب بندہ چڑھائی چڑھ رہا ہو۔

رات دو بجے کے قریب میں دشمن کی آخری پوسٹ لیفٹ ترکیاں کی حدود میں پہنچ گیا تھا۔ وہ علاقہ خطرناک تھا کیونکہ ایسی پوسٹ پر جو دشمن کے بالکل سامنے ہو اس پر ڈیوٹی والے سپاہی بہت چوکس ہوتے ہیں۔ اور ہندو تو اس معاملے میں یوں بھی بہت ڈرپوک ہیں اور ڈر کی وجہ سے ان کا ڈیوٹی پر موجود جوان سست نہیں ہو پاتا، جبکہ پاک آرمی کے جوان دلیری کی وجہ سے عموماً بے پروا ہوتے ہیں۔

میں ڈھلان عبور کر کے نسبتاً اونچائی پر پہنچا۔ نقشے کے مطابق لیفٹ ترکیاں پوسٹ وہاں سے دو سو گز آگے تھی۔ سمال پیک سے نائیٹ ویژن سائیٹ نکال کر میں نے آنکھوں سے لگائی مگر اتنے فاصلے سے میں صرف پوسٹ کے خدو خال ہی دیکھ سکا کوئی اور نقل و حرکت مجھے دکھائی نہ دی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ اس مرتبہ میں بہ قدر سو

گز پوسٹ سے پہلے رکا اور ایک پتھر کی آڑ لے کر پوسٹ کا جائزہ لینے لگا۔ پاکستان کی طرف سے وہ پوسٹ ڈھلان کی آڑ میں بنائی گئی تھی۔ اور رہائشی علاقے کو پاکستان کی طرف سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا البتہ سنتریوں کی دیدبانی کے لیے جو دو مورچے بنائے گئے تھے وہ بہ خوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ نائیٹ سائیٹ سے میں نے ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لیا۔ پوسٹ کے علاقے کو عبور کرنے کے بعد ایک نالا شروع ہو رہا تھا مگر اس نالے میں سفر کرنا اس لیے بھی مخدوش تھا کہ ایسے رستوں پر دشمن نے بارودی سرنگیں لگائی ہوتی ہیں۔ گو ضروری نہیں ہوتا کہ ہر آدمی کا قدم بارودی سرنگ پر پڑے۔ لیکن ایسی جگہوں پر خطرہ مول لینا بھی بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی معذوری کون گوارا کر سکتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو بارودی سرنگ انسان کی جان بھی لے لیتی ہے۔ ایک بار میری آنکھوں کے سامنے ہمارا ایک ساتھی شہید ہوا تھا۔ وہ بے چارہ غلطی سے اپنی فوج کے لگائے ہوئے بارودی قطعے میں گھس گیا تھا۔ اور اس کی بدقسمتی کہ جیسے ہی اس کے پاؤں کے نیچے بارودی سرنگ پھٹی وہ اچھل کر پیچھے گرا اور اگلی بارودی سرنگ عین اس جگہ پھٹی جہاں اس کا سر زور سے زمین سے ٹکرایا تھا۔ بعد میں ہم نے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو وہاں سے نکالا تھا۔

ساری صورت حال کا جائزہ لے کر جو لائحہ عمل مجھے سوجھا وہ یہی تھا کہ میں اس پوسٹ کو بائی پاس نہیں کر سکتا تھا۔ پوسٹ کے دائیں بائیں جو چڑھائیاں تھیں انھیں کوہ پیمائی کے سامان کے بغیر عبور کرنا ناممکن تھا۔ کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لیے مجھے دوبارہ پیچھے جانا پڑتا اور دشمن کے علاقے میں یوں آزادانہ حرکت مجھے پھنسا سکتی تھی۔ آخر ایک فیصلے پر پہنچ کر میں خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا۔

منصوبہ بناتے ہی میں ایک بار پھر دشمن کے مورچوں کو تاڑنے لگا۔ اڑھائی بجنے میں چند منٹ ہی رہتے تھے مجھے امید تھی کہ سنتریوں کی بدلی آنے والی ہوگی۔ (اڑھائی میری گھڑی بجا رہی تھی۔ انڈیا کا ٹائم چونکہ ہم سے نصف گھنٹا آگے ہے اس لیے ان کی گھڑیوں میں لازماً تین بجنے والے تھے) کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ ڈیوٹی پر موجود سپاہیوں کی ہر دو گھنٹے بعد بدلی ہوتی ہے۔ اور چونکہ ایسی حساس پوسٹوں پر بیک وقت دو سنتری جاگ رہے ہوتے ہیں اس لیے ڈیوٹی کے اوقات کار اس طرح بانٹے جاتے ہیں کہ ایک کی ڈیوٹی اگر پانچ سے سات بجے تک ہو تو دوسرے کی چھ سے آٹھ بجے مقرر کی جاتی ہے تاکہ دونوں سنتری اکٹھے نہ جاگیں اور دونوں نیند کی

زیادتی کی وجہ سے سست ہوں۔ جبکہ ایک گھنٹے کے فرق کے ساتھ اٹھنے کی وجہ سے جب نیا سنتری جاگتا ہے تو دوسرے مورچے والا ایک گھنٹا ڈیوٹی دے کر چوکنا ہو گیا ہوتا ہے۔

جلد ہی مجھے اپنا اندازہ درست ہوتا دکھائی دیا اور رہائشی جگہ سے ایک آدمی سست قدموں سے دائیں والے مورچے کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ یقیناً اسے رہائشی علاقے میں موجود سنتری نے جگایا تھا۔ دوسرے سنتری کی واپسی تک ایک اور سنتری کمرے سے برآمد ہوا اور وہیں ٹہلنے لگا۔ گویا بیک وقت تین آدمی جاگ رہے تھے۔ جب واپس آنے والا سنتری رہائشی کمرے میں غائب ہوا تو میں آگے کھسکنے لگا۔ میرے دل میں صرف کتوں کا خوف سمایا ہوا تھا کیونکہ اگر پوسٹ پر کتے موجود ہوتے تو دشمن نے چوکنا ہو جانا تھا۔ گو جس وقت سے میں آیا تھا کتوں کے بھونکنے کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی اس کے باوجود میرے دل میں خدشہ موجود تھا۔

میں آہستگی سے آگے بڑھتا رہا۔ نائیٹ ویژن سائیٹ میری آنکھوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ سنتری سست روی سے ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سر گھما کر اطراف کا جائزہ لے لیتا تھا۔ ایک دو بار اس نے ٹارچ جلا کر بھی اپنے چوکنے پن کو ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ٹارچ کی روشنی اس نے نالے والی سمت میں پھینکی تھی اس کے باوجود میں زمین سے چمٹ کر لیٹ گیا تھا۔ لیکن وہ عقبی سنتری تھا اور زیادہ ذمہ داری سامنے والے سنتریوں کی ہوتی ہے اس لیے اس میں وہ چوکنا پن مفقود تھا جو کہ سامنے والے سنتریوں کا خاصا ہوتا ہے۔ میں کرالنگ کرنے کے بجائے بیٹھے بیٹھے اس کی جانب بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ پتھریلا علاقہ تھا اس لیے کرالنگ کرنے کی صورت میں ایک تو نیچے بکھرے پتھر گھٹنوں اور ٹانگوں میں بری طرح چبھنے تھے دوسرا پتھروں پر رینگنے کی وجہ سے شور بھی پیدا ہو سکتا تھا جو سنتری کو چوکنا کر دیتا۔

اب سنتری سے میرا فاصلہ دس گز کے بہ قدر رہ گیا تھا۔ میں نے پسٹل پہلے سے تیار کر کے بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ پسٹل ہاتھ میں لے کر میں نے سنتری کے مڑنے کا انتظار کرنے لگا۔

جیسے ہی وہ مڑا میں کھڑا ہو کر دبے قدم اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اور جب میں بالکل اس کے قریب پہنچ گیا تب اسے آنے والی مصیبت کا احساس ہوا۔ اس نے پیچھے مڑنے کی کوشش کی مگر میں نے ایک دم اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس نے تڑپ کر مجھے خود سے جھٹکنا چاہا مگر اس وقت تک میں پسٹل اس کی

کنپٹی سے لگا کر ٹریگر دبا چکا تھا۔ہلکی سے ٹھک ہوئی اور اس کی کھوپڑی میں روشن دان کھل گیا تھا۔اس کا پھڑکتا بدن ساکت ہونے لگا میں نے اسے آہستہ سے زمین پر لٹا دیا۔

پہلا مرحلہ بہ خوبی مکمل ہو گیا تھا۔میں نے وقت دیکھا تین بج کر بیس منٹ تھے۔گویا اگلے سنتری نے دس منٹ بعد ڈیوٹی پر اٹھنا تھا۔

میں نے جلدی سے گلی سوٹ اتار کر سائیڈ پر پھینکا اور سنتری کے بدن سے چادر اتار کر لپیٹ لی۔اس کے پاس پڑی ٹارچ بھی میں نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ساڑھے تین ہوتے ہی میں دھڑکتے دل کے ساتھ بائیں والے مورچے کی طرف بڑھ گیا۔نائیٹ ویژن سائیٹ میں نے دوبارہ سمال پیک میں ڈال لی تھی۔چادر میں نے اس طرح لپیٹی تھی کہ میرا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

''تو آ گیا ہے دلجیت!'' جونھی میں مورچے کے دروازے پر پہنچا، اندر موجود سنتری بے صبری سے مستفسر ہوا۔دو گھنٹے اس سردی میں جاگ کر یقیناً وہ گرم رضائی میں جانے کے لیے بے چین تھا۔

میں نے ٹارچ جلا کر اس کے چہرے پر روشنی پھینکی۔

اس نے چہرہ سائیڈ پر کرتے ہوئے کہا۔''یار! اسے تو آف کرو۔''

اور یہ آخری الفاظ تھے جو اس کے ہونٹوں سے ادا ہوئے تھے۔گلاک پسٹل کی مزل سے نکلنے والے چند گرام سیسے نے اس کی کھوپڑی میں کھڑکی بنا دی تھی۔وہ لہرا کر نیچے گرا۔مورچا اتنا بڑا نہیں تھا نیچے گرتے ہوئے دیوار کے ساتھ کھڑی دو رائفلیں بھی نیچے گر گئی تھیں۔ان رائفلوں کے گرنے سے اچھا خاصا شور ہوا تھا۔

''تھوڑا زور سے پھینکو شاید توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ۔'' ساتھ والے مورچے سے مزاحیہ انداز میں پکارا گیا۔دونوں مورچوں کے درمیان بیس گز کے قریب فاصلہ تھا۔اس کے باوجود اسے رائفلز کے نیچے گرنے کا شور سنائی دے گیا تھا۔

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر باہر نکلا اور سرعت سے دوسرے مورچے کی طرف بڑھا۔

اس نے با آواز بلند پوچھا۔''خیریت تو ہے نا؟'' یقیناً اسے میرے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس مرتبہ بھی میں خاموش رہا تھا۔

”اوئے! جواب تو دونا؟“اس نے جھنجلاتے ہوئے باہر جھانکا اس وقت تک میں بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

”میرے پاس تو بس ایک ہی جواب ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے ٹارچ روشن کر کے اس کی کھوپڑی میں گولی جھونک دی۔

اس نے تھوڑا جھک کر باہر جھانکا تھا۔گولی لگتے ہی منہ کے بل گر گیا۔اس طرح کہ اس کا بالائی دھڑ مورچے سے باہر اور ٹانگیں مورچے کے دروازے میں تھیں۔

میں اس کے جسم پر پاؤں رکھ کر اندر داخل ہوا۔ٹارچ روشن کر کے میں نے جائزہ لیا۔دو جی تھری رائفلیں ایک کلاشن کوف اور ماؤنٹ پر لگی وکرس گن نظر آ رہی تھی۔مورچے کے سامنے والے ہول میں مجھے تھرمل امیجنگ نائیٹ ویژن سائیٹ دکھائی دی۔اسے آن کر کے میں باہر نکل آیا۔وہاں سے ہماری اپنی پوسٹ تقریباً چار سو میٹر کے فاصلے پر تھی۔لیکن یہ ہوائی فاصلہ تھا۔ورنہ لیفٹ ترکیاں سے ہماری پوسٹ رنگ کنٹور پر جانے کے لیے ایک ڈھلان عبور کرنا پڑتی جس کے باعث یہ فاصلہ ہزار میٹر کے قریب بن جاتا۔رنگ کنٹور پر مجھے پاک فوج کا دلیر جوان ٹہلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔تھرمل امیجنگ سائیٹ میں یہ خصوصیت ہے کہ یہ دوربین کی طرح کافی دور تک دکھاؤ مہیا کرتی ہے۔اس کا اندرونی نظارا بلیک اینڈ وائیٹ ہوتا ہے جس میں ہر جاندار کالے یا سفید رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔

وہاں مزید رکے رہنا وقت کا ضیاع تھا۔تھرمل امیجنگ سائیٹ گلے میں لٹکا کر میں لیفٹ ترکیاں کی سامنے والی ڈھلان اترنے لگا۔اترائی کافی سخت تھی۔چونکہ راستہ بنا ہوا نہیں تھا اس لیے اندھیرے میں گرنے کا بھی اندیشہ تھا۔میں نے بے دھڑک ٹارچ جلا دی۔مجھے معلوم تھا کہ پاک فوج کے جوان نے فوراً اس طرف متوجہ ہو جانا ہے۔اور وہی ہوا۔ٹارچ جلائے مجھے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ رنگ کنٹور کی جانب سے ٹارچ کا اشارہ آنے لگا۔گویا وہ آنے والے کو متنبہ کر رہا تھا۔

جواباً میں نے بھی ٹارچ کا رخ اس کی جانب کر کے دو تین دفعہ اشارہ دیا تا کہ اسے پتا چل جائے کہ میں بے خبری میں نہیں آ رہا۔نیچے اترتے ہی سو میٹر کے قریب ہموار میدان سا تھا جہاں بارودی سرنگی قطعے بچھا کر کانٹا دار تار سے اس کی حد بندی ظاہر کی گئی تھی۔(جینوا کنونشن کے مطابق کسی بھی ملک کی سپاہ جب سرنگی قطعہ لگاتی ہے

تو اسے قانوناً اس قطعے کو کانٹا دار تار سے ظاہر کرنا پڑتا ہے۔لیکن ہندو بنیا پنچ ذہنت کا مالک ہے۔اسے ایسے اصول وضابطے کی کیا پروا، بھارتی آرمی پہاڑی علاقے میں حد بندی کے علاوہ بھی بہت سی جگہوں پر بارودی سرنگیں بچھا کر رکھتی ہے،جس کی زد میں عموماً سول لوگ یا جانور وغیرہ آجاتے ہیں)

وہ بارودی قطعہ عبور کرنے کے لیے مجھے چند سو گز کا چکر کاٹنا پڑا۔بارودی قطعے کی بائیں طرف کی حد بندی کے ساتھ قدرتی طور پر بڑے بڑے پتھر پڑے تھے کہ جہاں بارودی سرنگ لگانا ممکن ہی نہیں تھا۔میں انھی پتھروں پر چل کر آگے بڑھتا گیا۔بارودی قطعے کے سامنے گچھا دار تار جسے ''کنسرٹینا وائر'' کہتے ہیں۔لگی ہوئی تھی۔سمال پیک سے وائر کٹر نکال کر میں نے تار کو کاٹ کر راستہ بنایا اور آگے بڑھ گیا۔ٹارچ بجھانے کی کوشش میں نے نہیں کی تھی۔رنگ کنٹور پر اس وقت دو ٹارچوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔یقیناً سنتری نے گارڈ کمانڈر کو بھی اطلاع کر دی تھی۔اپنی طرف کی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے بعد میں رنگ کنٹور سے پچاس میٹر کے فاصلے پر تھا جب مجھے زور دار انداز میں ''رک'' پکارا گیا۔

میں سنتری کے حکم کے بہ موجب رک گیا۔

''ہاتھ اوپر''اس نے اگلا حکم دیا اور مجھے تعمیل کرتے بنی۔

''تالی بجاؤ۔''اس نے یقیناً میرے ہاتھوں کے خالی ہونے کا یقین کرنا تھا۔

''بادل......''میرے تالی بجاتے ہی اس نے کہا۔اور یہ اس دن کا پاس ورڈ تھا۔

میں خاموش رہا کیونکہ مجھے پاس ورڈ معلوم نہیں تھا۔

''تھری......''اس مرتبہ اس نے فگر پوچھا تھا۔اگر مجھے اس رات کا فگر پتا ہوتا تو میں مطلوبہ فگر دہرا دیتا،مگر میں اس سے بھی انجان تھا۔(سرحدی علاقے میں اپنی سپاہ کی پہچان کے لیے رات نام مقرر کیا جاتا ہے جو دو اسماء پر مشتمل ہوتا ہے۔مثلاً، بادل اور لوٹا۔پہرے پر موجود سنتری آنے والے کے سامنے رات نام کا پہلا اسم بولتا ہے اور آنے والے کو اس کے جواب میں دوسرا نام بتانا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ ہر رات کے لیے ایک فگر بھی مقرر کیا جاتا ہے۔مثلاً اگر سات فگر مقرر کیا ہے تو سنتری سات سے کم کوئی بھی عدد بول کر آنے والے کو عدد مکمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔اب اگر سنتری تین کہتا ہے تو آنے والا چار کہہ کر عدد کو مکمل کرنا پڑتا ہے)

"کون؟" اس دفعہ اس نے براہ راست میرا تعارف مانگا تھا۔

"ذیشان۔" میں اطمینان سے بولا۔

"پہچانا نہیں۔"

"قریب تو آنے دو یار! تعارف بھی کرا دیتا ہوں۔" میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔

"اسی حالت میں آگے بڑھو۔" اسے میرا اطمینان دیکھ کر کہنا پڑ گیا تھا۔

اور میں ہاتھ سر سے بلند کیے آگے بڑھ گیا۔ خود سے دو میٹر دور اس نے مجھے دوبارہ روکا اور اس کے ساتھ کھڑا دوسرا آدمی خود بہ خود آگے بڑھ کر ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لینے لگا۔ میرے کندھے پر لٹکی سنائپر رائفل اتار کر اس نے سائیڈ پر رکھی، میرا اسمال پیک، تھرمل امیجنگسائیٹ اور میری جیبوں میں موجود تمام سامان اپنے قبضے میں کر لیا۔

"ہاتھ نیچے کر سکتا ہوں۔" تلاشی لینے والے کے دور ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

"کرلو۔" مجھے نشانے پر رکھنے والا نرم لہجے میں بولا۔

"شکریہ۔" کہہ کر میں نے ہاتھ نیچے کر لیے۔

"آؤ اندر بیٹھ کر بات کرے ہیں......" یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھے کہ لفٹ تر کیاں پوسٹ کی طرف سے ٹارچوں کی روشنی پھینکے جانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔

میں نے کہا۔ "سنتری کو آڑ میں کر لو۔" مگر میرا یہ کہنا بے فائدہ تھا کیونکہ فاریکی آواز سنتے ہی سنتری مورچے میں ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے کلاشن کوف کی زد پر لینے والا گارڈ کمانڈر تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پوسٹ کمانڈ کا کمرہ تھا کیونکہ اندر داخل ہوتے ہی گارڈ کمانڈر نے سیلوٹ کیا تھا۔ اندر پیٹرومیکس لیمپ روشن تھا۔

پوسٹ کمانڈر نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لے کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"استاد اکرم! چائے پانی کا بندوبست کرو۔" وہ مجھے ساتھ لانے والے کو مخاطب ہو۔ اور وہ "جی سر!" کہہ کر باہر نکل گیا۔

''جی؟''اس نے مختصراً کہتے ہوئے مجھ سے تعارف چاہا۔

اور میں اسے تفصیل سے اپنے بارے بتانے لگا۔میری بات ختم ہونے تک چائے اور حلوہ آ گیا تھا۔میں بے تکلف حلوے کو جڑ گیا جبکہ پوسٹ کمانڈر لائن ٹیلی فون پر اپنے بٹالین ہیڈکوارٹر میں میرے بارے تفصیل بتانے لگا۔گھنٹے ڈیڑھ کے اندر میری شناخت کی تصدیق ہو گئی تھی۔پوسٹ کمانڈر نے مجھے تپاک سے گلے سے لگا کر میری پیٹھ تھپکی اور پھر اپنے ہی کمرے میں میرا بستر لگوا کر مجھے آرام کرنے کا کہہ کر خود باہر نکل گیا۔لیفٹ ترکیاں کی طرف سے وقفے وقفے سے فائر کی آوازیں آ رہی تھیں یقیناً انھیں اپنے تین آدمیوں کی ہلاکت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔میں بے فکر ہو کر بستر میں گھس گیا کہ اب میں اپنوں میں تھا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد میں اپنے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گیا تھا۔وہاں جا کر ایک مرتبہ پھر استاد صادق کا غم تازہ ہو گیا۔مشن پوا ر کرنے کی خوشی سے استاد صادق کے بچھڑنے کا نقصان زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔مگر میرے سینئرز مطمئن تھے ۔کیونکہ شہادت کی موت ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

ایک دن ہیڈکوارٹر میں گزار کر میں نے چھٹی لی اور گھر کو سدھارا۔میرا تعلق تلہ گنگ کے ایک مضافاتی گاؤں سے ہے۔فوج میں بھرتی ہونے کے ساتھ میں نے شادی کر لی تھی لیکن ہنوز اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ماہین میری دور پار کی رشتہ دار تھی۔یہ الگ بات کہ شادی سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں تھا لیکن شادی کے بعد ہمارے درمیان ایسی محبت پیدا ہو گئی تھی گویا ہم دونوں پیدا ہی ایک دوسرے کے لیے ہوئے ہوں۔امی جان،میرے بچپن ہی میں وفات پا گئیں تھیں۔ان کے انتقال کے بعد ابو جان نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔گاؤں میں تھوڑی بہت زمین تھی بس وہی کاشت کر کے وہ میرا اور اپنا پیٹ پالتے رہے۔ایف ایس سی کرنے کے بعد ابو جان کا ارادہ تھا کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں مگر میں نے والد صاحب پر مزید بوجھ بننا گوارا نہ کیا اور پاک آرمی میں بھرتی ہو گیا۔دورانِ ٹریننگ ہی میری نشانہ بازی کی صلاحیت کھل کر سامنے آ گئی تھی ۔یونٹ میں جانے کے بعد نشانہ بازی کے مقابلوں میری اس صلاحیت میں مزید نکھار آیا اور پھر اسی صلاحیت کو دیکھ کر مجھے سنائپر کورس کے لیے کوئٹہ جانا پڑا۔وہ کورس میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اس کورس

میں اچھی پوزیشن لینے کی وجہ سے مزید ٹریننگ کے لیے مجھے سپیشل سروس گروپ یعنی کمانڈوز کے پاس بھیج دیا گیا ۔وہاں بھی میرے نشانہ بازی کی صلاحیت نے دوسروں کو متاثر کیے رکھا۔اور پھر اس کورس میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل کرنے بعد مجھے خصوصی سنائپر ٹیم کی زیرِ نگرانی تربیت دی جانے لگی۔اس مرتبہ ہمارے استاد وہ تھے جنھوں نے ٹریننگ سے زیادہ عملی میدان میں وقت گزارا تھا۔وہ اسباق پڑھانے سے زیادہ، ہمیں واقعات سناتے ۔ایسے واقعات جو، ان کے ساتھ بیت چکے تھے۔اور ہر واقعہ کوئی نہ کوئی سبق لیے ہوئے ہوتا تھا۔اس کورس میں بھی میری کارکردگی پچھلے کورسوں کی طرح شاندار رہی اور مجھے اپنے اساتذہ کے ساتھ ہی پیشہ ور سنائپر بننے کا موقع مل گیا۔اور پھر ایک دن مجھے اپنے پہلے مشن کے لے سرحد پار جانا پڑ گیا جس کی کہانی میں گزشتہ صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔

میں ظہر وقت گھر پہنچا تھا۔مجھے دیکھتے ہی ماہین کھل اٹھی اور اس کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ جھلملانے لگے۔ابو جان نے بھی مجھے چھاتی سے لگا کر خوب بھینچا تھا۔ابو جان کے کمرے سے باہر جانے کے بعد میں ماہین کو مخاطب ہوا۔

’’بڑی خوش نظر آ رہی ہو؟‘‘

وہ ہنسی۔’’غمگین تو آپ بھی نہیں لگ رہے۔‘‘

’’میں تو اس لیے خوش ہوں کہ چھٹی ملی ہے، چند دن آرام کروں گا اور تم؟‘‘

وہ ناز سے بولی۔’’جھوٹا۔‘‘

’’جھوٹی ہو گی تم خود۔‘‘اسے اپنے قریب کرتے ہوئے میں نے والہانہ لہجے میں کہا۔واقعی سچ کہتے ہیں کہ کائنات کی رونق اور رنگینی عورت کے دم قدم سے ہے۔

اگلے دن ناشتا کر کے میں گھر سے نکلا۔میرے دوستوں کی تعداد محدود سی تھی۔ان میں سے بھی ایک دو ہی خط چھٹی ڈال دیا کرتے تھے ورنہ تو، چھٹی آتے ہی ملاقات ہو پاتی۔اس وقت موبائل فون اتنا عام نہیں ہوا تھا ۔خال خال لوگ ہی موبائل رکھنا پسند کرتے تھے۔گو موبائل فون میری پہنچ سے باہر نہیں تھا۔لیکن ابھی تک مجھے یہ فضول خرچی ہی لگ رہا تھا۔

اپنا سب سے قریبی دوست اویس، مجھے اس کے گھر کے باہر ہی مل گیا تھا۔

”ارے شانی!......کیا بات ہے یار، میرا خیال ہے خط ملتے ہی تم بھاگے چلے آئے۔“

”خط؟“ میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

”میرا خط نہیں ملا۔“

”خط تم نے پوسٹ کب کیا تھا؟......اور خیر تو ہے نا؟“

”پرسوں۔“

”واہ! پرسوں تم نے خط بھیجا اور کل مجھے مل گیا، کیا ذہانت ہے۔“

وہ سر کھجاتے ہوئے خفت سے بولا۔”میں نے سوچا شاید تم میری وجہ سے چھٹی آئے ہو۔“

”ضرور آتا، مگر اب تو میں روٹین کی چھٹی آیا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم چھٹی آ گئے ہو۔“

”اب وجہ بھی پھوٹو؟“

وہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا۔”ہفتے کو میری شادی ہے۔“

”شادی......کیوں وہ صوابی والی کا کیا بنا؟“

وہ خوشی سے چہکا۔”اسی سے تو ہے نا۔“

میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔”بھلا وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ ابو جان مان گئے اور رشتہ لے کر صوابی پہنچے۔ارم کے والد تو پہلے سے راضی تھے اور اب تمھاری کی دعا سے ہفتے کے دن تمھارا بھائی اپنی ارم کو لانے والا ہے۔“

”مبارک ہو یار!“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

”خیر مبارک، خیر مبارک۔“ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ وہ اپنی محبت پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔محترما ارم نصیب خان سے اس کی ملاقات راولپنڈی میں ہوئی تھی۔اویس کا والد تلہ گنگ سے تازہ سبزی راولپنڈی سبزی منڈی لے جایا کرتا تھا۔اس کام میں اویس اس کا ہاتھ بٹاتا۔کبھی

کبھار سبزی منڈی سے واپسی پر وہ والد سے اجازت لے کر راولپنڈی شہر میں گھومنے نکل جاتا۔ایک بار راولپنڈی راجا بازار میں بہنوں کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے اس کی نظر ارم پر پڑ گئی جو اپنی والدہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی ہوئی تھی۔ارم کا والد نصیب خان پاک آرمی میں حوالدار تھا اور اس نے اپنی فیملی راولپنڈی ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ارم کو دیکھتے ہی اویس پہلی نظر میں اس پر فدا ہو گیا۔اور پھر اپنی شاپنگ بھول کر ماں بیٹی کے تعاقب میں ہولیا۔عورت ذات اس معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے۔ارم خوب صورت تھی بازار میں گھورنے والوں کی کمی بھی نہیں تھی کہ یہ مرد کی اوباش فطرت کا خاصہ ہے۔مگر کسی کا یوں مسلسل گھورنا اور پیچھا کرنا اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔پہلے پہل تو وہ گھبرائی،مگر اویس کی آنکھوں میں جو جذبہ ہویدا تھا اسے پہچانتے ہی وہ شانت ہو گئی۔اویس بھی اچھا خاصا خوش شکل ہے۔جلد ہی ارم بھی اس میں دل چسپی لینے لگی اور جب اس کی ماں خریداری کی طرف متوجہ ہوتی تو وہ اپنی دل کش مسکراہٹ اویس پر نچھاور کرنے لگتی۔حوصلہ پا کر اویس نے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا جب وہ ماں بیٹی واپس ہوئیں تو وہ بھی ان کے پیچھے ہولیا۔جس سوزکی میں وہ بیٹھیں وہ اس کے پیچھے لٹک گیا۔آخری سٹاپ کا کرایہ دے کر وہ اس جگہ اتر گیا جہاں وہ ماں بیٹی اتریں۔اور جب وہ ایک کوارٹر میں داخل ہوئیں تو ایک عجیب پاگل پن کے ساتھ اس نے دروازے پر دستک دے دی۔ نصیب خان باہر نکلا تو اویس نے چند منٹ بات کرنے کی اجازت مانگی اور پھر اپنا مکمل تعارف کرا کر بتا دیا کہ اس نے آج اس کی بیٹی کو بازار میں دیکھا اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے اور اب اگر نصیب خان اجازت دے تو وہ اپنے والد کو اس کے پاس بھیج دے۔نصیب خان اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا تھا۔کسی پٹھان کے سامنے اس بات کا اعتراف کہ وہ اس کی بیٹی اور بیوی کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے گھر تک پہنچا ہے بڑے حوصلے،جرأت اور دلیری کی بات تھی۔مگر عشق عجیب چیز ہے اس کے اس کے دامن میں بزدلی جگہ نہیں پا سکتی۔نصیب خان چند لمحے تو کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا اور پھر فقط اتنا کہہ سکا۔”جوان پتا بھی ہے کیا کہہ رہے ہو؟“

”جی سر!“اویس نے سعادت مندی سے کہا۔”میں آپ کی بیٹی کو اپنی عزت بنانے کے لیے آیا ہوں۔آپ منع کر دیں گے تو واپس لوٹ جاؤں گا اور اس کے بعد اگر مجھے کبھی یہاں دیکھ لیا تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔“

”دیکھو جوان!......آپ بہت بڑی جرأت کا اظہار کر چکے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ کیا کہوں اور پھر میں روایتی باپ بھی نہیں ہوں کہ بیٹی کی مرضی جانے بغیر اس کی شادی کر دوں۔“

”آپ پوچھ لیں بیٹی سے۔ یقیناً وہ میرے تعاقب سے بے خبر نہیں رہی ہوگی۔“

اور نصیب خان نے بھی اسے ششدر کر دیا اس نے بھی اسی وقت بیٹی کو بیٹھک میں بلا لیا۔ اور پشتو کے بجائے اردو میں اس سے پوچھا کہ آیا وہ اویس کو جانتی ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”اس نے آج تمھیں بازار میں دیکھا ہے اور اب اپنے والد صاحب کو یہاں لانا چاہتا ہے۔ کیا میں اسے والد کو بلانے کی اجازت دے دوں؟“

اس مرتبہ ارم کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا۔ منہ سے کچھ کہے بنا اس نے سر کو جھکا لیا۔

”ٹھیک ہے بیٹی!......جاؤ۔“ بیٹی کو واپس بھیج کر وہ اویس کو مخاطب ہوا۔

”جوان! آپ کا یہ فعل عجیب لگتا ہے، مگر مجھے اچھا لگا۔ آپ نے آج کل کا بے ہودہ طریقہ کار اپنانے کے بجائے سادہ اور سچا طریقہ اپنایا۔ اور یہ اس بات کا مظہر ہے کہ آپ کے من میں کوئی کھوٹ یا میل نہیں ہے۔ آپ میری بیٹی کو بھی ورغلانے کی کوشش کر سکتے تھے، مگر آپ نے ایسا نہ کیا۔ جاؤ اب اپنے والد کو راضی کرنے کی کوشش کرو میری طرف سے ہاں ہے۔“ اویس خوشی سے پھولا نہ سماتے ہوئے واپس آ گیا۔ گھر آ کر اس نے والد سے بات کی مگر وہ اس کی شادی کہیں اور کرنے کا سوچے ہوئے تھا۔ اس نے کھلا انکار کر دیا۔ دو تین دن بعد اویس نے راولپنڈی جا کر نصیب خان کو ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ وہ ارم کے علاوہ کہیں شادی نہیں کرے گا اگر نصیب خان اس پر تھوڑی اور مہربانی کرے اور اسے چند ماہ کی مہلت دے دے تاکہ وہ اپنے والدین کو راضی کر سکے۔ نصیب خان نے اس مرتبہ بھی بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سال بھر کی مہلت دے دی اور اس کے ساتھ اپنے آبائی گھر کا پتا بھی اس کے حوالے کر دیا کہ اس کی سروس کے فقط چھ ماہ بقایا تھے۔ اویس اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا واپس آ گیا۔ اور اس کے بعد وہ مسلسل اس کوشش میں مصروف رہا کہ اپنے والد کو راضی کر سکے۔ وہ سعادت مند بیٹا تھا باپ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ والد کب تک جوان بیٹے کی خواہش کو ٹالتا، آخر گیارہ ماہ اویس کی مسلسل منت سماجت نے اسے راضی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران اویس نے نصیب

خان سے رابطہ منقطع نہیں کیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے مہینے پندرہ دن کے بعد نصیب خان سے ملاقات کے لیے اس کے گاؤں جاتا رہا۔ نصیب خان کا تعلق صوابی کے مشہور گاؤں شیوہ سے تھا۔ اور جب وہ ریٹائرڈ ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا تو وہاں بھی اس کا آنا جانا لگا رہا۔ اور اب وہ مجھے کامیابی کی نوید سنا رہا تھا۔ مجھے بھی یہ سن کر بہت اچھا لگا تھا کہ اس کی راہ کی ساری رُکاوٹیں دور ہو چکی ہیں۔

☆......☆......☆

ہفتے کی صبح سویرے سویرے ہی ہمارا قافلہ شیوہ گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ پانچ بڑی بسوں کے علاوہ دو ویگنیں اور چار کاریں بھی تھیں۔ تین بسوں میں عورتیں سوار تھیں۔ نوجوان لڑکے بسوں کی چھتوں پر بیٹھے بیٹھے ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی سریلی آواز پر تھرک رہے تھے۔ لڑکیوں کی بسوں میں بھی ڈھولک کی آواز کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کی تالیوں کی آواز ایک تسلسل سے سنائی دے رہی تھی۔ کچھ سریلی اور کچھ بے سری آوازیں بھی گیتوں کی شکل میں بلند ہو رہی تھیں۔ اویس کے تمام دوست ایک ہی ویگن میں بیٹھے تھے۔ صوابی شہر سے گزرتے ہوئے ہم ساڑھے آٹھ بجے کے قریب شیوہ پہنچ گئے تھے۔ شیوہ صوابی سے قریباً بیس بائیس کلومیٹر دور ہے اور کافی بڑا گاؤں ہے۔ بلکہ اسے شہر کہنا ہی مناسب ہوگا۔ پٹھانوں نے روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برات کے لیے بہت اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے مہمانوں کی تواضع موسم کی مناسبت سے ٹھنڈے مشروبات سے کی گئی اور اس کے بعد نکاح پڑھایا گیا۔ نکاح کے اختتام پر کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ پر تکلف کھانے کے بعد رخصتی ہونا تھی مگر اس سے پہلے دولھن والوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھ دی کہ رخصتی اس وقت ہوگی جب دولھا یا اس کے دوستوں میں سے کوئی فائر کے ذریعے مطلوبہ ہدف کو نشانہ بنائے گا۔ اویس کے دوستوں نے بڑی خوشی سے یہ شرط قبول کی اور میدن میں اتر آئے۔ گاؤں کے نزدیک ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی موجود تھی۔ دولھن والے برات کو لے کر پہنچ گئے، گو نصیب خان جوان لڑکوں کو منع کرتا رہا کہ یہ طریقہ پٹھانوں میں رائج ہے پنجاب میں اس کا کوئی تصور نہیں۔ مگر جوان اس کی کہاں سننے والے تھے۔ سب سے زیادہ پر جوش اس کا سگا بھتیجا تھا جو اویس ہی کا ہم عمر تھا۔ لگتا تھا ارم کی شادی سے اسے کوئی خاص تکلیف پہنچی تھی اور اب اس کا کچھ نہ کچھ تدارک وہ برات کی بے عزتی کر کے چکانا چاہتا تھا۔

پہاڑی کی بنیاد میں آس پاس کی زمین سے تھوڑی ابھری ہوئی جگہ پر ایک مربع فٹ کا ایک شیشہ لگایا گیا تھا اور قریباً تین سو میٹر دور سے اسے نشانہ بنانا تھا۔

”اس شیشے کو ہٹ کرنے کے لیے آپ لوگوں کے پاس دس گولیاں ہیں۔“ رحمت خان نے فخریہ انداز میں ایک کلاشن کوف دولھا کی طرف بڑھائی۔ ”آپ خود فائر کرنا چاہیں یا آپ کا کوئی دوست اپنی مہارت کا ثبوت دینا چاہے یہ آپ پر منحصر ہے۔لیکن اگر دس گولیوں میں نشانہ نہ بنا سکے تو پھر دولھن لینے کے لیے آپ کو کل آنا پڑے گا اور یہ ہماری روایت ہے۔“

”نہیں یہ روایت ہمارے پنجابی بھائیوں پر لاگو نہیں ہوتی۔“ نصیب خان نے جلدی سے اپنے بھتیجے کی تردید کی۔

”چچا جان! روایت تو روایت ہوتی ہے۔اور لڑکے والوں کے لیے لڑکی کے خاندان کی روایات کا پاس کرنا ضروری ہوتا ہے۔“

اویس کا والد جلدی سے بولا۔ ”ہاں مگر کوئی ایسی روایت ہو جس پر عمل بھی کیا جا سکے، ہمارے جوان ہتھیاروں سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔

”حالانکہ ہتھیار مرد کا زیور ہیں۔یقین مانو اگر میں اپنے گاؤں کی کوئی لڑکی بلالوں تو دس گولیوں میں تو وہ بھی اس شیشے کو نشانہ بنا لے گی۔“

”رحمت خان!......غلط بات، مہمانوں سے ایسے بات نہیں کرتے۔“ نصیب خان نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹا۔

”چچا جان!......مردوں سے مردانگی کی توقع ہی کی جا سکتی ہے۔“ رحمت خان نے نصیب خان کی بات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا تھا۔

اویس نے بے بسی سے دائیں بائیں دیکھا۔میں جانتا تھا کہ وہ فائر کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔ہمارے باقی دوست بھی اس معاملے میں کورے تھے۔لیکن رحمت خان کی بات ایسی نہیں تھی کہ ہمیں غصہ نہ آتا۔اویس نے سر جھٹکتے ہوئے کلاشن کوف پکڑی نشانہ لگانے کی جگہ کی طرف بڑھا۔

”ایک منٹ اویس!“ میں اسے رکنے کا اشارہ کر کے رحمت خان کی طرف متوجہ ہوا۔

”رحمت خان!......کیا اچھی نشانہ بازی کا مظاہرہ ہی مردانگی کی علامت ہے؟“

اس نے استہزائی انداز میں کہا۔”ہمارے ہاں تو ہے۔“

میں نے پوچھا۔”مطلب جو آپ سے اچھا نشانہ باز ہوگا وہ آپ سے بہتر مرد ہوگا؟“

”بے شک......مگر آپ لوگوں میں یقیناً کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے اچھا تو کیا صرف مرد ہونے کا ثبوت ہی دے دے۔“

اس کی بات پر ہمیں تو کیا نصیب خان کو بھی غصہ آ گیا تھا۔”رحمت خان تم حد سے بڑھ رہے ہو۔چلو کوئی نشانہ بازی نہیں ہوگی۔بیٹی کا باپ میں ہوں اور میں اپنی بیٹی کے لیے کوئی ایسی شرط ضروری نہیں سمجھتا۔“

”چچا جان! آپ کی بیٹی ہماری بھی کچھ لگتی ہے۔اور اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے کہ ہم اپنی روایات دور جھٹکنے پر مجبور ہو جائیں۔“

”بدتمیز!“نصیب خان غصے میں اس کی طرف بڑھا مگر میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔”ایک منٹ چچا جان!......آپ غصے نہ ہوں میں مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اویس کے ہاتھ سے کلاشن کوف لے کر کہا۔”رحمت خان!......اب جبکہ آپ نے ہمیں مردانگی کا ثبوت دینے پر مجبور کر ہی دیا ہے تو ذرا اس شیشے کے دائیں بائیں تھوڑے فاصلے پر دو شیشے اور بھی گاڑ دیں۔“

اس نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا”تو آپ دس گولیوں سے تین شیشوں کو نشانہ بنائیں گے؟“

میں مصر ہوا۔”آپ شیشے تو لگوائیں۔“

”اس نے اپنے ایک دوست کو دو شیشے دے کر ہدف کی طرف دوڑا دیا۔

برات میں موجود لوگوں میں جوش کی لہر دوڑ گئی تھی کیونکہ اب بات عام رواج سے ہٹ کر چیلنج کی طرف پھر گئی تھی۔اویس کی آنکھوں میں اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔اور کیوں نہ ہوتا کہ اس کی دلھن کا معاملہ تھا۔وہ لڑکی جو جانے کب سے اس کے خوابوں میں بسی ہوئی تھی، ایک فرسودہ روایت کی وجہ سے اس کے ملنے میں چوبیس گھنٹے کی تاخیر ہونے والی تھی۔گو وہ میرے بارے میں جانتا تھا کہ فوجی ہونے کے ناتے میں رائفل کے

استعمال سے اچھی طرح واقف ہوں گا، مگر پھر بھی اتنی دور سے چھوٹے سے شیشے کو نشانہ بنانا اسے نہایت مشکل نظر آرہا تھا۔

اس لڑکے کے واپس آتے ہی میں نے کلاشن کوف کی میگزین اتار کر میگزین میں بھری تمام گولیاں باہر نکالیں اور پھر رحمت خان کی طرف پانچ گولیاں پھینک کر میں نے باقی کی پانچ گولیاں میگزین میں بھر لیں۔

''تو آپ پانچ گولیوں سے تین شیشوں کو نشانہ بنائیں گے؟'' رحمت خان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دو گولیاں صرف کلاشن کوف کو جانچنے کے لیے ہیں۔ اس لیے پہلی دو گولیاں میں کسی پتھر پر فائر کروں گا۔ جب مرد ہونے کی نشانی ہی درست نشانہ لگانا ہے تو پھر کسی گولی کو خطا نہیں جانا چاہیے۔''

''دوست!...... بڑھکیں مارنا بہت آسان ہے۔'' اس مرتبہ رحمت خان کے لہجے میں پہلے والا استہزا غائب تھا۔ ''لیکن یہاں سے تین گولیوں پر تین شیشے توڑنا ناممکن ہے......''

''یہ میرا درد سر ہے۔'' کہہ کر میں زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

''اچھا اگر آپ نے تین گولیوں میں ایک بھی درست نشانہ لگا دیا تو......''

''اگر تینوں ہٹ نہ ہوئیں تو ہم خالی ہاتھ جائیں گے۔'' میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

''ذیشان!'' اویس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں مجھے پکارا۔

میں پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''فکر مت کرو۔ اویس! آج میں اپنی بہن کو لے کر ہی جاؤں گا۔'' میری بات نے نصیب خان اور ارد گرد موجود اس کے کافی رشتہ داروں کے چہروں پر فخریہ مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

اگر میری اپنی رائفل ہوتی تو یہ ہدف نہایت آسان تھا مگر کسی دوسرے کی رائفل سے ہدف کو نشانہ بنانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ تین سو گز کا فاصلہ ایک سنائپر کے لیے نہ ہونے کے برابر ہے لیکن رائفل نشانہ بازی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہاں قارئین کی معلومات کے لیے یہ بتاتا چلوں کہ اچھی نشانہ بازی ایک مکمل سائنس ہے۔ اس میں جہاں ایک فائرر کو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے وہیں ہتھیار کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ آرمی میں کسی بھی فائرنگ مقابلے یا عام روٹین کی فائرنگ سے پہلے جوان اپنے ہتھیار کو صفر کرتے

ہیں۔صفر کرنے سے مراد ہتھیار کو ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے تاکہ گولیاں صحیح نشانے پر لگ سکیں۔اس معاملے میں سنائپر تو بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ایک سنائپر کبھی بھی اپنی رائفل دوسرے کو استعمال کے لیے نہیں دیتا۔یقیناً ایک اچھے نشانہ باز کے لیے میری پوزیشن کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔

خیر مجھے اپنے تجربے پر بھروسا تھا۔میں نے سو گز دور پڑے ایک چھوٹے سے پتھر پر نشانہ باندھا اور سانس روکتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔گولی پتھر کے دائیں کونے پر لگی تھی اس وجہ سے پتھر ایک گز بائیں جا پڑا تھا۔گویا کلاشن کوف دائیں مار کر رہی تھی۔میں نے دوبارہ اسی پتھر کے بائیں کونے پر نشانہ باندھا۔اس مرتبہ گولی پتھر کے درمیان میں لگی اور پتھر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

میں نے پیچھے مڑ کر رحمت خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''پہلے دائیں طرف والا شیشہ،پھر درمیانی اور آخر میں بایاں۔''

اور سامنے مڑ کر نشانہ سادھنے لگا۔سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس وقت ہوا بالکل ساکن تھی ورنہ ہوا فائر پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہے۔سونے پر سہاگہ کہ سورج بھی میری پیٹھ پیچھے چمک رہا تھا جو نشانہ بازی کو مزید تقویت دیتا ہے۔

کلاشن کوف کی رئیر سائیٹ پر بارہ سو تک رینج لگائی جا سکتی ہے۔مگر ایک انسانی آنکھ ٹیلی سکوپ یا کسی دوسرے خارجی ذریعے کے بغیر تین سو سے چار سو میٹر تک صحیح نشانہ لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ہتھیار بھی عموماً اس نہج پر تیار کیے جاتے ہیں۔تین سو میٹر کے بعد شستی نقطہ اور گولی کے ملاپ میں فاصلہ بڑھنے لگتا ہے۔یوں تو گولی بہت زیادہ فاصلے تک جا سکتی ہے۔مگر نشانے کی درستی نشانے باز کے منتخب کیے گئے فاصلے تک ہوتی ہے۔مثلاً اگر آرمی میں زیادہ استعمال ہونے والی رائفل جی تھری کو دیکھیں تو اس کی کارگر رینج تین سو میٹر ہے۔اگر اسی جی تھری کے ساتھ ٹیلی سکوپ سائیٹ لگا دیں تو اس کی کارگر رینج چھ سو میٹر ہو جاتی ہے۔جبکہ جی تھری کی گولی ساڑھے تین کلو میٹر تک ایک انسان کی جان لے سکتی ہے۔لیکن ساڑھے تین کلو میٹر تک گولی کو منتخب ہدف تک پہنچانا ناممکن ہے۔بلکہ کارگر رینج کے بعد ہدف کا تعین گولی خود کرتی ہے۔گو بہت پرانے فائر کارگر رینج کے بعد سو دو سو میٹر تک اپنے تجربے سے کچھ نہ کچھ اندازہ لگا کر ضرور کامیاب فائر کر لیتے ہیں۔مگر یہ ان کا ذاتی تجربہ

ہوتا ہے۔عام لکھائی پڑھائی میں یہ بات نہیں آتی۔

کلاشن کوف کی کارگر رینج بھی تین سو میٹر ہے۔پتھر کو نشانہ بنانے کے لیے میں نے سو میٹر کی رینج لگائی تھی۔شیشہ چونکہ تین سو گز دور تھا اس لیے میں نے تین سو کی رینج لگا کر رئیر سائیٹ کی وی سے فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کو دیکھتے ہوئے شیشے کے بائیں کنارے کا نشانہ باندھا۔میں زمین کے اوپر بیٹھا تھا اور میری کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ہتھیار کو ہدف کے متوازی تھامتے ہوئے میں نے سانس روکا اور ٹریگر کو آرام سے پریس کر دیا۔دھماکے کی آواز کے ساتھ دائیں شیشے کی کرچیاں ہوا میں بکھر گئی تھیں۔وہاں موجود افراد کے لبوں سے تحسین آمیز آوازیں بلند ہوئیں۔اپنی پوزیشن بدلے بغیر میں نے کلاشن کوف کی مزل کو تھوڑا بائیں گھمایا اور ٹریگر دبا دیا درمیانی شیشے کی کرچیاں پہلے والے شیشے کے ساتھ مکس ہو گئیں۔اور پھر تیسرے فائر کے ساتھ میں نے تیسرا شیشہ بھی توڑ دیا تھا۔لوگوں نے تحسین آمیز نعرہ بلند کیا۔سب سے پہلے اویس میرے قریب آ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

”شکریہ شانی!“اس نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔اس کے بعد نصیب خان اور پھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔اچھا نشانہ باز پٹھانوں کے لیے ہیرو کی مانند ہوتا ہے۔کیونکہ ہتھیار سے پٹھان کی محبت اس کے خون میں شامل ہے۔رحمت خان نے بھی پھیکے دل سے میری تعریف کی تھی۔وہ مجھ سے مرعوب تو ہو گیا تھا مگر اس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت کا پیغام بھی صاف پڑھا جا سکتا تھا۔خیر مجھے اس سے کچھ لینا دینا تو تھا نہیں، کہ میں اس کی نفرت یا محبت کو خاطر میں لاتا۔گو اسے کہنے کے لیے میرے پاس کافی ذخیرہ الفاظ موجود تھا مگر اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے میری نشانہ بازی کا عملی مظاہرہ ہی کافی رہا تھا۔اس کے بعد وہ ہماری روانگی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

ایک صاحب نے نزدیک آ کر میری پیٹھ تھپتھاتے ہوئے کہا۔

”بھائی صاحب!......آج تو آپ نے یوسف خان کی طرح لڑکی والوں کی منہ مانگی شرط پوری کی ہے۔“

مجھے یوسف خان کی کہانی کا تو علم نہیں تھا، مگر میں نے ہنس کر اس کا شکریہ ضرور ادا کر دیا تھا۔

دولھن کو اس کی رشتہ دار عورتیں پکڑ کر باہر لائیں اور کار میں بٹھانے لگیں۔دوسری عورتیں اور مرد بھی بسوں

وغیرہ میں بیٹھنے لگ گئے تھے۔میں اپنی ویگن کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔میں نے مڑ کر دیکھا۔ایک عمر رسیدہ بزرگ کھڑے تھے۔

''اسلام علیکم بابا جی!''میں نے جلدی سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری نشانہ بازی پر مجھے سراہنے والا کوئی ہوگا۔کیونکہ کافی انجان آدمیوں نے بڑی محبت اور چاہت سے میری پیٹھ تھکنے کے ساتھ مجھ سے بڑی چاہت سے معانقہ بھی کیا تھا۔مگر جب اس بوڑھے نے لبوں کو جنبش دی تو میں ششدر رہ گیا تھا۔

''بیٹا!......بہت مایوس کیا آپ نے۔''اس نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''وہ کیسے بزرگو!......؟''میرے لہجے میں حیرانی کے ساتھ طنز کی بھی آمیزش تھی۔

وہ مدبرانہ لہجے میں گویا ہوا۔''بیٹا!جسے آپ اپنے تئیں کارنامہ سمجھ رہے ہو میرے نزدیک ایک نوآموز کی درمیانہ درجے کی کارروائی ہے۔عام لوگوں کا سراہنا اپنی جگہ مگر آپ ایمان داری سے بتائیں جب پتھر پر پہلی گولی چلانے کے ساتھ آپ کو یہ پتا چل گیا تھا کہ گولی کس طرف کو جا رہی ہے تو دوسری گولی چلانے کا فائدہ ؟......یہ سراسر اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ آپ میں خوداعتمادی کی کمی ہے۔ہوا بھی ساکن تھی،روشنی آپ کے موافق،پھر دوسری گولی کیوں ضائع کی۔سنائپر کے لیے ایک گولی کی کتنی اہمیت ہوتی ہے کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے۔پھر آپ نے پہلے شیشے کے درمیان میں گولی ہٹ کی دوسرے شیشے پر یہ گولی دائیں کنارے پر لگی اور تیسرے شیشے پر یہ گولی بائیں کنارے پر لگی۔میں خود قریب جا کر دیکھ کر آیا ہوں۔یہ کون سی سنائپنگ ہے ؟......سراسر اناڑی پن ہے۔اور پہلی گولی کے بعد ہر دفعہ نیا نشانہ لیتے ہوئے آپ نے دس سے پندرہ سیکنڈز ضائع کیے۔اگلا نشانہ ایک سے دو سیکنڈ کے اندر لے لینا چاہیے تھا۔جبکہ سنائپر رائفل کے برعکس آپ کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھی جو کہ آٹومیٹک ہتھیار ہے۔''

اس بوڑھے کی باتوں نے مجھے ایک دم احساس دلا دیا کہ میں کسی اہل فن کے سامنے کھڑا ہوں۔اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔یقیناً ایک ہی رائفل سے فائر کرنے والے اچھے فائرر کی گولیاں ایک ہی جگہ پر لگنی چاہیں تھیں۔اور نشانے کو یقینی بنانے کے لیے میں نے واقعی عام حالت کے برعکس زیادہ وقت لگایا تھا۔

میں نے خفیف لہجے جواب دیا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!......وہ کیا کہتے ہیں اندھوں میں کانا راجا، تو بس وہی مثال مجھ پر فٹ بیٹھتی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کوئی استاد یہاں موجود ہے۔ اگر پتا ہوتا تو ضرور احتیاط کرتا۔ گو اس کے بعد بھی آپ میری غلطیاں ڈھونڈ لیتے مگر یہ یقینی بات ہے کہ ایسی صورت میں غلطیوں کی تعداد میں تھوڑی کمی ضرور ہوتی۔''

''بیٹا!...... ہمیشہ یاد رکھو ایک سنائپر کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب بھی ٹریگر پریس کرے یہ سوچ کر کرے کہ اس کے پاس آخری گولی ہے جو نشانے پر لگنے کی صورت ہی میں اس کا مشن پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔''

''ویسے سر!......آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں سنائپر ہوں؟'' میں متجسس ہوا۔

وہ ہنسا۔ ''جس نے عمر کا بہترین حصہ اس شغل میں بتایا ہو؟ یہ سوال اس کا مذاق اڑانے ہی کے مترادف ہے۔''

''آپ کا نام جان سکتا ہوں سر؟''

''آج کل مجھے عمر دراز خان کہتے ہیں۔ ویسے کبھی عزرائیل ثانی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔''

''کیا؟'' میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام کر چوم لیے۔ وہ میرے استادوں کے استادوں کا بھی استاد تھا۔ اس وقت پاک آرمی میں سنائپنگ کے لیے جی تھری پر ٹیلی سکوپ سائیٹ لگا کر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ جی تھری رائفل سے چھ سو میٹر تک بھی ایک آدمی کے عین دونوں آنکھوں کے درمیان گولی مارنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ (آج کی جدید سنائپر رائفل سے ایک نو آموز بھی چھ سو میٹر پر ہدف کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا ہے۔ مگر جی تھری رائفل سے چھ سو کے فاصلے پر کسی آدمی کو نشانہ بنانا بہت بڑا کمال تھا کجا یہ کہ اس کے سر میں گولی ماری جائے) دو سو اور تین سو میٹر کے فاصلے سے وہ ٹارگٹ پر کوئی بھی نام لکھ لیتا تھا۔ اس کی کہانیاں آج تک سنائپرز میں زبان زد عام تھیں۔ وہ کبھی اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ کر نہیں لوٹا تھا۔ استاد ہمیں بتاتے تھے کہ وہ اڑتی ہوئی مکھی کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ ہمارے لیے ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد وہ بہ ظاہر گم نام ہو گیا تھا مگر اس کے شاگرد اور پھر شاگردوں کے شاگرد آج تک اس کے کارناموں اور اس کے نام کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

''آپ مجھے جانتے ہیں؟'' اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری جس میں غرور کے بجائے انکساری

چھپی تھی۔

میں نے فرطِ عقیدت سے کہا۔ ’’آپ میرے ہیرو ہیں سر!...... بلکہ میرے کیا ہم سب کے ہیرو ہیں۔‘‘

’’آپ لوگوں کی محبت ہے بیٹا!‘‘

اسی وقت اویس نے مجھے آواز دی۔ ’’ذیشان!...... ہم بس تمھارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

’’اچھا سر!...... اجازت دیں۔‘‘ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر چوما۔ ’’میں ان شاء اللہ جلد ہی آپ کو ملنے دوبارہ آؤں گا۔‘‘

’’ضرور بیٹا!‘‘ اس نے مجھے کھینچ کر چھاتی سے لگایا اور میرے ماتھے پر بوسا دیتے ہوئے بولا۔ ’’لگتا ہے تم میرا ریکارڈ توڑ دو گے۔‘‘ اس نے اپنائیت سے مجھے آپ کے بجائے تم کہا تھا۔ جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

’’مشکل ہے سر!‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’ہاں البتہ کوشش ضرور کروں گا۔‘‘

’’گڈ، اور جب ملنے آنا تو وہ میرا مکان ہے۔‘‘ اس نے تھوڑی دور موجود ایک سفید رنگ کے پختہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔

میں ’’شکریہ۔‘‘ کہہ کر منتظر کھڑی ویگن کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن اویس کی دعوتِ ولیمہ تھی۔ جہاں میں مرکزِ نگاہ بنا رہا۔ مرد تو کیا گاؤں کی عورتوں کو بھی میرے کارنامے کی بابت پتا چل گیا تھا۔ اویس تو میرے صدقے قربان جا رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے اپنی نئی نویلی دولھن کا شکریہ بھی مجھ تک پہنچا دیا تھا۔

’’بس یار اللہ پاک نے عزت رکھ لی۔‘‘ میں نے انکساری سے اس کی بات کا جواب دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’بالکل اللہ پاک ہی سب کی عزت رکھنے والا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بندہ اس طرح کی استادی نہیں دکھا سکتا۔‘‘

اس وقت بشیر بابا نے آکر مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ ’’واہ میرے شیر!...... دل خوش کر دیا ہے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو کل شاید پٹھان بھائیوں کے سامنے ہماری سبکی ہو جاتی۔‘‘

"عزت ذلت اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے چچا۔"

"ہاں بیٹا! صحیح کہا۔سبب بھی تو وہی پاک پروردگار پیدا فرماتا ہے۔"

میں اثبات میں سر ہلا کر اویس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔صبح دس بجے ہی کھانا کھلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔میں چونکہ دولھا کا قریبی دوست تھا اس لیے میں بھی انتظامیہ میں تھا۔اور پھر دن بارہ بجے کے قریب ابو جان نے وہیں آ کر مجھے ایک مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

"کون ہے ابو جان؟"

"تمھارا فوج کا کوئی ساتھی ہے بیٹا!"

"اسے یہیں ساتھ لے آنا تھا۔"

ابو جان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"وہ ہمارا مہمان ہے بیٹا......تمھارے دوست اویس کا نہیں۔"

"اچھا آپ چلیں، میں اویس کو بتا کے آتا ہوں۔"

ابو جان سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے اور میں اویس کی طرف بڑھ گیا، کہ اس سے اجازت لینا ضروری تھا

"یار مہمان کو بھی یہیں لے آتے۔"اویس نے بلا تکلف آفر کی۔

"میرا بھی یہی ارادہ تھا مگر ابو جان کہتے ہیں گھر کی رحمت پر پہلا حق اسی گھرانے کا ہوتا ہے جہاں رب پاک نے وہ رحمت بھیجی ہوتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا اور میں گھر کی جانب چل دیا۔

بیٹھک میں ابو جان کے ہمراہ شہزاد بیٹھا تھا۔اس کا تعلق بھی تلہ گنگ ہی سے تھا۔

"ارے شہزادے!......تم؟"میں بازو پھیلا کر اس کی جانب بڑھا۔وہ بھی مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا ۔پرتپاک معانقے کے بعد میں اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"اچھا آپ لوگ گپ شپ کرو میں کھانے کا دیکھ لوں۔"ابو جان گھر کے اندر کی جانب بڑھ گئے۔ٹیبل پر دھرے چائے کے برتن وہ ساتھ لے جانا نہیں بھولے تھے۔

"سناؤ بھئی! کیسے راستہ بھول پڑے؟"

وہ ہنسا۔ ”کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

”یا اللہ خیر۔“ میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔

”اتنا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تمھاری بقیہ چھٹی منسوخ ہوگئی ہے۔“

”دھت تیرے کی۔“ میں نے منہ بنایا۔

”گھبرا گئے؟“

”نہیں بہت خوش ہوں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

”وجہ نہیں پوچھو گے؟“

”نہیں...... پہلے چھٹی کی منسوخی کی خبر ہضم کر لوں۔“

”اب اتنا بھی خراب نہیں ہے تمھارا ہاضمہ۔“

”اچھا پھوٹو...... تمھارے پیٹ میں درد ہو رہا ہوگا۔“

”ہا...... ہا...... ہا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”یقین مانو کسی فوجی کے لیے سب سے بری خبر چھٹی سے بلاوے کی ہوتی ہے۔“

”صحیح کہا یار!“ میں نے تکیے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

”کسی کورس کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے کا سنا ہے میں نے۔“ اس نے محتاط الفاظ میں مجھے اصل بات بتانا چاہی۔

”ملک سے باہر، کیا میں نے جانا ہے؟“ میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”دو نشانہ باز جائیں گے اور ان کا انتخاب کارکردگی کی بنیاد پر ہوگا۔“

”تو دو بندوں کے جانے کا میری چھٹی سے کیا تعلق......؟“

”کل سے تمام لوگوں کی دو ہفتوں کی پری ٹریننگ شروع ہو رہی ہے۔ ٹریننگ کے اختتام پر اچھی کارکردگی والے دو سنائپرز امریکہ جائیں گے۔ وہاں پر دوسرے ممالک سے بھی کچھ سنائپرز آ رہے ہیں۔ اس اکٹھ میں پہلا ہفتہ تو رینج ماسٹر کی سائیٹ کے بارے جان کاری مہیا کرنے کے متعلق ہوگا اس کے بعد آٹھ ہفتوں کا سنائپر کورس

ہے جس میں کارکردگی کی بنیاد پر سرٹیفکیٹ بھی جاری کیے جائیں گے اور یقیناً ہر ملک چنے ہوئے افراد ہی بھیجے گا۔اور یہی کوشش ہمارے کمانڈر کی بھی ہے۔''

''مگر یار!......رینج ماسٹر تو برطانیہ کا ہتھیار ہے؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔(ان دنوں رینج ماسٹر نئی نئی پاکستان آرمی میں وارد ہوئی تھی۔یہ ایک لانگ رینج اور بڑے کیلیبر والی سنائپر رائفل ہے۔اور اپنی ٹیلی سکوپ سائیٹ کی مدد سے کوئی بھی اچھا نشانے باز اس سے ڈیڑھ سے دو کلومیٹر تک کسی انسان کو نشانہ بنا سکتا ہے۔اپنے بڑے کیلیبر کی وجہ سے اسے افراد کے علاوہ میٹریل کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔)

''ہاں،مگر لیوپولڈ سائیٹ ایک امریکن کمپنی کی ایجاد ہے۔''اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

''جانا کب ہے؟''

''بتایا تو ہے۔دو ہفتوں کی ٹریننگ کے بعد جن افراد کا انتخاب ہوگا وہی جائیں گے۔شاید ہفتہ ایک مزید کاغذی کارروائی وغیرہ میں لگ جائے۔''

''مطلب دو ہفتوں بعد مجھے بقیہ چھٹی مل جائے گی؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''کیوں؟تم نہیں جانا چاہتے؟''

''میرے چاہنے سے کیا ہوگا یار!،کئی پرانے سنائپر موجود ہیں وہ ہمیں آگے تھوڑا بڑھنے دیں گے۔''

وہ خلوص سے بولا۔''کوشش کرو۔تم جا سکتے ہو۔''

''خوش فہمی ہے تمھاری۔''

''نہیں......خوش فہمی ہمیشہ اپنے بارے ہوا کرتی ہے۔''اس نے کہا۔اسی وقت ابوجان کھانے کے برتنوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''ابوجان!مجھے آواز دے لی ہوتی۔''میں نے جلدی سے برتن ان کے ہاتھ سے پکڑ لیے۔

''کوئی بات نہیں بیٹا!......''ابوجان نے مسکرا کر کہا۔''یہ کون سا بھاری بوجھ ہے۔چند روٹیاں اور ڈونگا بھر سالن ہی تو ہے۔''

''بات وزن کی نہیں احساس کی ہے ابوجان!''

مجھے نادم دیکھ کر ابو جان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔’’مہمان کے لیے لایا ہوں بیٹا!‘‘

’’آپ بھی آئیں نا۔‘‘ انھیں واپس جاتے دیکھ کر میں نے کہا۔

’’میں کھا چکا ہوں۔‘‘

’’میں بھی آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔‘‘ کھانے کے برتن شہزاد کے سامنے دھرتے ہوئے میں صاف گوئی سے بولا۔

’’کیوں ڈائیٹنگ کر رہے ہو یا بھابی کی اجازت نہیں ہے۔‘‘

’’میں ولیمے سے آ رہا ہوں۔ کیا کوئی گنجایش سے ہو سکتی ہے؟‘‘

’’یقیناً نہیں۔‘‘ کہہ کر وہ کھانے کو جڑ گیا۔ مگر اس دوران اس کی زبان نہیں رکی تھی۔

’’یار شانی!...... تمھارا نشانہ بہت اچھا ہے اور سنائپنگ میں نشانے کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔‘‘

’’اچھا ایک اور بات بتاؤں......‘‘ مجھے استاد عمر دراز سے ملاقات یاد آئی۔’’کل اپنے دوست کی اویس کی شادی کے سلسلے میں ہم صوابی گئے تھے وہاں اتفاق سے استاد عمر دراز سے ملاقات ہو گئی۔‘‘

’’عمر دراز......؟‘‘

میں ہنسا۔’’تم اسے عزرائیل ثانی کے نام سے جانتے ہو گئے۔‘‘

’’کیا......یعنی وہ ایک حقیقی کردار ہے؟‘‘ اس نے چبائے بغیر نوالہ نگلتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

اس کی حیرانی بجا تھی استاد عمر دراز کے اتنے زیادہ قصے ہم نے سنے تھے کہ ہمیں وہ افسانوی کردار لگتا تھا۔

’’بالکل۔‘‘

’’مگر تم نے اسے کیسے پہچانا، مطلب تمھارا تعارف کیسے ہوا؟‘‘

جواباً میں نے ملاقات کی ساری تفصیل دہرا دی۔

اس نے بے ساختہ مجھے داد دیتے ہوئے کہا۔’’واہ......اس کا مطلب ہے جناب کی نشانہ بازی کی شہرت پنجاب سے خیبر پختون خواہ تک پھیل چکی ہے۔‘‘

’’شہرت کہاں یار!......استاد عمر دراز نے میرے شیخی کے غبارے سے ایسے ہوا نکالی کہ اب تو شرمندگی ہو

رہی ہے۔“

”بے وقوف ہوتم......اس جیسے اہل فن کا تمھاری نشانہ بازی پر بات کرنا ہی تمھارے لیے باعثِ فخر ہے۔“

”صحیح کہا۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ویسے وہ دکھنے میں کیسا ہے؟“

”درمیانی قدوقامت کا ہے۔قریباً میرے جتنا ہی قد ہوگا۔“

”کبھی موقع ملا تو ملاقات کو چلیں گے۔“

”ان شاءاللہ،ضرور۔“میں نے کہا۔

”واپسی کا کیا ارادہ ہے؟“

”اپنی کہو۔“

”جمعہ کو آیا تھا اور آج ہی واپسی ہے۔“

”ٹھیک ہے بس اڈے پر میرا انتظار کرنا۔اکٹھے چلیں گے۔“

اور اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

دوڑنا بھاگنا آرمی کے ہر کورس،کھیل اور کیڈر کا جزو لاینفک ہے۔ہم بھی صبح کی سخت ترین پی ٹی کے بعد فائرنگ رینج پر پہنچے تو انسٹرکٹر شدت سے منتظر نظر آئے۔چونکہ پی ٹی اور فائرنگ کے انسٹرکٹر علیحدہ علیحدہ تھے اس لیے فائرنگ انسٹرکٹر وہاں پہلے سے وہاں موجود تھے۔صوبیدار راؤ تصور صاحب ہمیں پڑھانے لگے۔

”سنائپنگ آپ لوگوں کے لیے کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن الفاظ کے تکرار اور دہرائی سے ہمیشہ انسان کو زیادہ سے زیادہ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ کوئی بات دوسری یا تیسری دفعہ سمجھانے پر انسان کے دماغ میں بیٹھتی ہے۔ہم آج بھی زیادہ تر پرانی باتوں کو دہرائیں گے۔ اس کا یہ مطلب لینا بھی بالکل غلط ہے کہ کچھ نیا نہیں پڑھیں گے۔گویا ہم دہرائی کے ساتھ پڑھائی بھی کریں گے۔آپ جانتے ہوں گے کہ ایک اچھے سنائپر کے لیے چند باتوں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔جیسا کہ وہ اچھا نشانے باز ہو،چھپاؤ اور

تلبیس کا ماہر ہو، جنگی چالوں سے اچھی طرح واقف ہو، اسے نقشہ بینی پر عبور ہو، بہت زیادہ قوت برداشت کا مالک ہو اور جلدی سے فیصلہ کر کے اس پر عمل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ گو اس کے علاوہ بھی کئی خصوصیات ایک اچھے سنائپر سے توقع کی جا سکتی ہیں مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ جہاں تک تعلق ہے نشانہ بازی کا یہ ایک قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور زیادہ سکھلائی اس صلاحیت کو مزید پالش کرتی ہے۔ اگر ایک آدمی قدرتی طور پر اچھا فائر نہیں ہے تو زیادہ پریکٹس سے اس کا فائر بہتر تو ہو سکتا ہے بہترین نہیں ہو سکتا۔ مطلب وہ اچھا سپاہی بن سکتا ہے، اچھا سنائپر نہیں بن سکتا۔ نشانہ بازی کے علاوہ جلدی اور بروقت فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی ایک آدمی کو قدرتی طور پر میسر ہوتی ہے۔ البتہ باقی کی صلاحیتیں مشق کی متقاضی ہوتی ہیں۔ جیسے چھپنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ چیزیں نظر کیوں آتی ہیں، کوئی بتا سکتا ہے چیزیں نظر کیوں آتی ہیں؟'' راؤ صاحب ہمیشہ تبادلہ خیال کے انداز میں لیکچر دیتے۔

''جی سر!'' شہزاد جلدی سے بولا۔ ''شکل و صورت سے، سائے سے، حرکت سے، فوجی ساز و سامان سے، سطح سے، پس منظر سے، ۔ درمیانی فاصلے سے۔''

''گڈ، اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا کہ ہم کس وجہ سے نظر آ سکتے ہیں تو چھپنے کے لیے ہمیں ان باتوں سے پرہیز کرنا ہوگا۔ دیکھیں بھیڑوں کے ریوڑ کے درمیان چلتا ہوا گڈریا ہمیں فوراً نظر آ سکتا ہے لیکن وہی گڈریا اگر اپنے ہاتھ زمین پر ٹیک کر گھٹنوں کے بل چلنا شروع کر دے تو یقیناً اس کا نظر آنا ممکن نہیں رہے گا۔ کیا خیال ہے؟''

''جی سر!'' ہم یک زبان بولے تھے۔

''اسی طرح سرسبز جھاڑیوں کے بیچ سفید، سرخ، زرد رنگ وغیرہ قسم کا لباس پہن کر چھپنے کی کوشش کرنا، ناکامی کو گلے لگانے والی بات ہے۔ البتہ سبز رنگ کا لباس آپ کو سبزے کا حصہ بنا دے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ برفیلے علاقے میں ہیں تو وہی سبز رنگ آپ کو پھنسا دے گا۔ وہاں آپ کو سفید رنگ کا لباس چھپنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ ساکن اشیاء کے درمیان آپ کی ذرا سی حرکت بڑی آسانی سے مشاہدے کی زد میں آ جائے گی اور سکائی لائن پر حرکت تو ایک سنائپر کے لیے تباہ کن ہے.........'' ان کی باتیں جاری رہیں۔ راؤ صاحب کا کسی بھی موضوع پر لیکچر سن کر میرے دل میں یہی خیال جنم لیتا کہ میں اس موضوع

کے بارے بہت کم جانتا ہوں ۔ ہمیشہ ان کے لیکچر میں نئے نئے نکات اور عمدہ معلومات کی بھر مار ہوتی ۔ دو پیریڈ پڑھائی کے بعد ہم فائر کرنے لگے اور بقیہ دن اسی کام میں گزرا۔

☆......☆......☆

دو ہفتوں کے بعد ہمارا ٹیسٹ ہونا تھا جس میں سب سے زیادہ نمبر نشانہ بازی کے تھے ۔ پہلے ہفتے کے اختتام پر میں نے ویک اینڈ لیا، لیکن گھر جانے کے بجائے میں نے صوابی کا رخ کیا تھا۔ ہمارے استاد ہمیں بہت اچھا پڑھا رہے تھے مگر اس کے باوجود میری خواہش تھی کہ میں مقابلے کے ٹیسٹ سے پہلے استاد عمر دراز سے کوئی رہنمائی لے لوں ۔ یقیناً اس کے پاس عملی تجربہ موجود تھا۔ صوابی سے بیس بائیس کلومیٹر آگے اس کا گاؤں تھا۔ شیوا نام کا گاؤں کافی بڑا تھا۔ اس کا مکان ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی ۔ دروازے پر اطلاعی گھنٹی کی غیر موجودی میں مجھے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

دروازہ استاد عمر دراز ہی نے کھولا۔ ''ارے ذیشان بیٹا۔'' مجھے دیکھتے ہوئے اس نے حیرانی سے کہا اور اس کے ساتھ ہی معانقے کے لیے بازو وا کر دیے۔

''جی سر!'' میں نے احترام سے جواب دیا۔

''اندر آجاؤ'' اس نے ایک طرف ہو کر مجھے اندر جانے کا راستہ دیا۔

''ویسے سر! شاید میں نے اپنا نام آپ کو نہیں بتایا تھا۔'' میں نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ سوال اس بات کا ثبوت ہے کہ تم اپنی ٹریننگ کو عام زندگی میں بروئے کار نہیں لا رہے۔''

''بھلا وہ کیسے؟'' استاد عمر دراز کے اشارے پر میں صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''بھول گئے، اس دن جب تم لوگ واپس جا رہے تھے تو تمھارے دوست نے نام لے کر تمھیں پکارا تھا۔ اور ایک سنائپر کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہونی چاہیے کہ اسے ہفتے ڈیڑھ میں اسے کسی کا نام بھول جائے۔

اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ واقعی میں اس کی یادداشت اور مشاہدہ غضب کا تھا۔ کسی دوسرے کے پکارنے پر کسی کا نام یوں یاد رکھ لینا بہ ظاہر نظر عام سی بات ہے مگر روزمرہ کی زندگی کو دیکھیں تو اس بات

کا اندازہ ہوگا، کہ کیا ہم سرسری ملاقات میں کسی کا نام اس طرح یاد رکھ سکتے ہیں، یقیناً سیکڑوں میں کوئی ایک ادھ بندہ ہی یاد رکھ پاتا ہوگا۔

''سر! آپ قدرتی سنائپر ہیں۔''میں تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''واہ! ایک نام یاد رکھنے سے میں سنائپر بن گیا۔''

''سر!......نام تو میں ایک وقت میں درجنوں یاد کرلوں گا، الحمداللہ میری یاداشت بھی بہت اچھی ہے، مگر آپ انداز تھوڑا انرالا لگا۔''

وہ ہنسا۔''خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ چائے، قہوہ یا ٹھنڈا چلے گا؟''

''موسم کی مناسبت سے تو ٹھنڈا ہی بہتر رہے گا۔''میں نے بغیر کسی تکلف کے جواب دیا۔

اس نے وہیں سے زوردار ہانک لگائی۔''وشمہ!''اور اس کے بعد پشتو میں جو کچھ کہا اس میں صرف شربت کا لفظ میرے پلّے پڑا تھا۔

اور پھر اس سے پہلے کہ میں وشمہ کے بارے کوئی اندازہ لگاتا وہ اپنا تعارف کرانے لگا۔ اس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ دو بیٹیاں تھیں جو کہ کب کی اپنے گھروں کی ہوگئیں تھیں بلکہ اب تو خود بچوں والی تھیں۔ ان دنوں وہ اپنی گھر والی کے ساتھ اکیلا ہی رہ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے سیدھا گھر کے اندر لے آیا تھا ورنہ پٹھانوں میں کسی کو گھر کے اندر لے جانے کا رواج ذرا کم ہی ہے۔ مہمانوں کی خاطر ہر گھر سے ملحق بیٹھک موجود ہوتی ہے۔

شربت بنا کر اس کی بیوی وہیں لے آئی تھی۔ جگ گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پشتو میں کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ استاد عمر دراز نے کیا۔ وہ مجھ سے حال چال پوچھ رہی تھی۔

''ٹھیک ٹھاک ہوں خالہ!......بس آپ کی دعا چاہیے۔''میں نے اردو میں کہا۔

میری کا ترجمہ بھی استاد عمر دراز نے پشتو میں کیا اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس چلی گئی۔

استاد عمر دراز نے مسکراتے ہوئے مجھے مشورہ دیا۔''ویسے تمھیں پشتو سیکھ لینا چاہیے۔''یہ کہہ کر وہ گلاس بھرنے لگا۔

''صحیح فرمایا۔''شربت کا گلاس اس کے ہاتھ سے تھامتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔''فی الحال تو آپ

مجھے نشانہ بازی کے بارے کچھ سکھائیں۔''
''اتنے اچھے نشانہ باز تو ہو تم۔''
''شاید ایسا ہی ہے، مگر میں آپ جیسا بننا چاہتا ہوں۔''
''تو کس نے کہا کہ تم مجھ سے کم ہو۔''
''سر! گو آپ کسرِ نفسی سے یہ کہہ رہے ہیں۔اس کے باوجود میں پھولے نہیں سما رہا۔''
''اب ایسا بھی نہیں ہے۔''
سر! اب چھوڑیں بھی یہ نہ ہو میں پھول کر پھٹ ہی جاؤں۔اور میری یاداشت اتنی بھی کمزور نہیں ہے۔مجھے آپ کی ساری گفتگو حرف بہ حرف یاد ہے کہ میرے فائر میں آپ کو کون کون سی خامیاں دکھائی دی تھیں اب میں وہ اور اس جیسی مزید خامیاں دور کرانے آیا ہوں۔''
''اس کے لیے آپ کے اساتذہ موجود ہیں نا۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔''یا ان سے مطمئن نہیں ہو؟''
''نہیں بہت اچھے استاد ہیں، خاص کر راؤ تصور صاحب تو بہترین انسٹرکٹر ہیں۔''میں خلوص دل سے بولا۔''لیکن آپ تو ان کے بھی استاد ہیں، بلکہ ان کے استادوں کے استاد۔''
''ہاں مگر اب تو کئی جدید رائفلز متعارف ہو گئی ہیں اور ہم ٹھہرے ماضی کے سنائپر۔''
''سر! نشانہ بازی کی اصل تکنیکس تو وہی ہیں نا۔''
وہ مسکرایا۔''ویسے تمھارے بارے میرا اندازہ ٹھیک تھا، کہ کافی ضدی ہو۔''
''پرسوں شام کو میری واپسی ہے۔''میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔
''ہتھیار تو یقیناً ساتھ نہیں لایا ہوگا؟''اس نے پوچھا۔
میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''سر! آپ تو آرمی کے قوانین کے بارے اچھی طرح جانتے ہیں۔''
''یونھی پوچھ لیا تھا۔ویسے میرے پاس ڈریگنو موجود ہے۔''
''اوہ ویری گڈ۔''میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔(ڈریگنو سنائپر رائفل روس کی ایجاد کردہ ایک سیمی

آٹومیٹک سنائپر رائفل ہے حالانکہ عمومی طور پر سنائپر رائفلز بولٹ ایکشن ہوتی ہیں مطلب ہر دفعہ فائر کے بعد رائفل کو کاک کرنا پڑتا ہے۔اس کی رینج ہزار میٹر ہے اور میگزین میں دس گولیوں کی گنجائش ہے۔اس کا بُلٹ سٹائر سنائپر جتنا ہی ہوتا ہے مطلب 7.62 ایم ایم۔)

''بس میاں! شوق تھا پچھلے سال کچھ رقم ہاتھ لگی اور میں نے اپنا شوق پورا کرلیا۔ٹھہرو تمھیں دکھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔اور چند لمحوں بعد ڈریگنوو رائفل کو ہاتھ میں پکڑے کمرے سے برآمد ہوا۔رائفل کی بھوری باڈی چمک رہی تھی۔واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ استاد عمر دراز اس کی صفائی کا خصوصی اہتمام کرتا ہے۔

''یہ دیکھو۔''اس نے رائفل اس انداز میں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر میرے حوالے کی گویا وہ کوئی مقدس صحیفہ ہو۔

میں نے اس کے ہاتھ سے رائفل تھامتے ہوئے اپنی ٹریننگ کے مطابق سب سے پہلے رائفل کی میگزین اتاری اور پھر دو دفعہ کاک کر کے اس کے خالی ہونے کا یقین کرنے کے لیے اس کی بیرل اوپر کی طرف کر کے میں نے ٹریگر پریس کیا اور پوچھا۔

''کافی مہنگی آئی ہوگی؟''

''نہیں، میرے شوق سے تھوڑی کم قیمت ہی تھی۔''

''ہاں سر! شوق سے تو ہر قیمت کم ہی ہوتی ہے۔اور اس کی ٹیلی سکوپ سائیٹ؟''میں بے ساختہ ہنس کر پوچھا۔

''خریدی تھی۔اس کے بغیر یہ رائفل کس کام کی۔''

''صحیح کہا سر!''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی وقت شام کی آذان ہونے لگی تھی وضو کر کے ہم مسجد میں چلے گئے۔وہاں کافی آدمیوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔اویس کی شادی کے دن میں نے نشانہ بازی کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ انھیں بھولا نہیں تھا۔وہ تمام مجھے بہت محبت اور عقیدت سے ملے تھے۔نماز کے بعد کافی آدمی بہ ضد تھے کہ میں ان کے گھر کھانا کھانے چلوں، مگر استاد

عمر دراز خود ایک روایتی پٹھان تھا۔ گھر آئی رحمت کو وہ کسی کے گھر کیسے جانے دے سکتا تھا، کھانا کھا کر ہم عشاء کی نماز تک گپ شپ کرتے رہے۔ نماز پڑھ کر استاد عمر دراز بیٹھک ہی میں رائفل اٹھا لایا اور مجھے نشانہ بازی کے متعلق خاص خاص باتیں بتانے لگا۔

''پتا ہے، فائر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز کون سی ہے؟''

''ہوا......'' میں بغیر کسی جھجک کے بولا۔

''گڈ۔'' اس نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔ ''فائر پر اثر انداز ہونے والے امور میں ہوا سب سے اہم ہے۔ اور یقیناً تم جانتے ہو گے، کہ جوں جوں فاصلہ بڑھتا جائے گا فائر ہونے والی گولی پر ہوا کا اثر بڑھتا جائے گا۔ ایک سنائپر نے لمبے فاصلے سے ہدف کو نشانہ بنانا ہوتا ہے اس لیے اسے ہوا کی اقسام، فائر شدہ گولی پر ہوا کا اثر اور اس کے تدارک کے بارے معلوم ہونا چاہیے۔ بنیادی طور پر ہوا کی چار اقسام ہوتی ہیں۔ ہلکی ہوا، درمیانہ ہوا، تازہ ہوا اور تیز ہوا..........'' استاد عمر دراز ہوا کے فائر پر اثر انداز ہونے پر تفصیل سے روشنی ڈالنے لگا۔ گو ان میں اکثر باتوں کا مجھے پہلے سے پتا تھا، مگر کافی نئی باتیں بھی سننے کو ملیں۔ ہوا کے تذکرے کے بعد وہ دھوپ، دھند، ٹھنڈ، بارش، نمی، درجہ حرارت اور گیلے ایمونیشن وغیرہ کے بارے بھی تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں جانتا ہوں، تقریباً یہ تمام باتیں تمھیں پہلے سے معلوم ہوں گی، مگر میں چاہ رہا تھا کہ دہرائی ہو جائے تا کہ کل عملی تو پر بروے کار لاتے وقت یہ باتیں ہمارے ذہن میں ہوں۔''

''نہیں سر! تمام تو نہیں، البتہ اکثر باتیں میرے علم میں تھیں۔''

''اچھا اب سو جاؤ رات کافی ہو گئی ہے۔ صبح ان شاء اللہ عملی طور پر مشق کریں گے۔''

''سر! ایک بات پوچھنا تھی؟'' اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر میں نے اپنے دل کی خلش دور کرنا چاہی۔

''ہاں ہاں پوچھو؟''

''یہ یوسف خان کون تھا؟''

''کون یوسف خان؟'' استاد عمر دراز نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ جس دن ہم شادی کے سلسلے میں یہاں آئے تھے اس دن ایک بھائی نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا

تھا، کہ میں نے یوسف خان کی طرح دلھن والوں کی شرط پوری کی ہے۔‘‘

استا عمر دراز مسکرایا۔’’خیر، یہ تو اس نے مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔‘‘

’’یہ تو ہے سر!......وقتی جوش میں آ کر کافی حضرات مبالغہ آرائی میں ملوث ہو جاتے ہیں۔‘‘

’’ویسے تم نے یوسف شیر بانو کا قصہ نہیں سنا۔‘‘

’’نہیں سر۔‘‘میں نے نفی میں سر ہلایا۔

استاد عمر دراز چند لمحے سوچ کر کہنے لگا۔’’یہ بہت دل چسپ داستان ہے ذیشان!......یوسف خان اور شیر بانو اسی علاقے کے حقیقی کردار ہیں۔ یہ جو شیوہ گاؤں سے ملحق پہاڑی آپ کو نظر آ رہی ہے اسے کرماڑ پہاڑی کہتے ہیں۔اس کی چوٹی پر دونوں کا مزار بنا ہوا ہے۔یوسف خان ترلاندی گاؤں کا تھا اور شیر بانو شیرا غنڈ گاؤں کی تھی۔یوسف خان والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور شکار کا شوقین تھا اس کی ایک بہن بھی تھی۔جو اس سے چھوٹی تھی۔وہ ہرن کے شکار کے لیے کرماڑ پہاڑی پر جایا کرتا تھا۔وہ نہایت حسین و جمیل اور پرکشش جوان تھا۔ایک دن شکار پر جاتے ہوئے اس کی مڈھ بھیڑ شیر بانو سے ہوگئی جو بہ ذات خود حسن کا مجسمہ تھی۔اسے دیکھتے ہی شیر بانو دل ہار بیٹھی۔اب وہ روزانہ یوسف خان کا انتظار کرتی کہ اسے دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکے۔اور پھر زیادہ دن اس سے صبر نہ ہو سکا اور ایک دن اس نے یوسف خان کو روک کر اپنے دل کا حال کہہ سنایا۔اس کی شکل وصورت ایسی نہ تھی کہ یوسف خان انکار کرنے کے قابل ہوتا۔وہ بھی دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔یوسف خان کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں تھا۔اسی طرح شیر بانو کا تعلق بھی سفید پوش طبقے ہی سے تھا۔بہ ظاہر نظر ان کی محبت کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔پس یوسف خان، شیر بانو کا رشتہ لے کر اپنے سرپرستوں کے ہمراہ ان کے گھر پہنچ گیا۔لیکن یہ تو اصولِ دنیا ہے، کہ دنیا والے محبت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔شیر بانو کے حسن کی وجہ سے اس کے بھی کئی طلب گار تھے۔شیر بانو کے والدین نے یوسف خان کو ٹالنے کے لیے ایک بہت بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا۔اتنی رقم کہ اس کی ادائی یوسف خان کی بساط سے کیا اس کے پورے خاندان کی بساط سے باہر تھی۔مگر وہ عاشق صادق ذرا نہ گھبرایا اور شیر بانو کے والدین سے مہلت طلب کر کے رقم کے حصول کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر اکبر بادشاہ کی فوج میں ملازم ہو گیا۔وہ ایک اچھا سپاہی تھا۔جلد ہی اس نے اکبر کی فوج

میں اپنے قدم جما لیے۔ اور پھر اس کی خوش قسمتی کہ کسی باغی ریاست کے نواب کی سرکوبی کے لیے اکبر نے ایک لشکر بھیجا اور یوسف کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اس مختصر لشکر کی سپہ سالاری اسے سونپ دی گئی۔ اس جنگ میں یوسف خان کو فتح ہوئی۔ اکبر بادشاہ اس کی کارکردگی کے متعلق سن کر بہت متاثر ہوا اور اس نے خوش ہو کر اسے شرفِ ملاقات بخشا۔ دورانِ ملاقات اس نے یوسف خان سے، اپنی فوج میں اس کی شمولیت کی وجہ دریافت کی ۔ جواباً یوسف خان نے ساری کہانی کہہ سنائی۔ بادشاہ نے اسی وقت اتنی رقم یوسف خان کے حوالے کرنے کا حکم دیا جس سے وہ شیر بانو کے والد کا مطالبہ پورا کر سکے۔ اور پھر رقم کی حفاظت اور یوسف خان کو بہ حفاظت اس کے علاقے تک پہچانے کے لیے سپاہیوں کا ایک دستہ بھی اس کے ہمراہ روانہ کیا۔ یوسف خان قریباً دس برس بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ جس وقت وہ اپنے علاقے میں پہنچا اسے اطلاع ملی کہ شیر بانو کی شادی کسی اور سے طے پا گئی ہے۔ یوسف خان کو یہ اطلاع صوابی کے مشہور گاؤں دوبیان میں ملی۔ یوسف خان وہاں پڑاؤ ڈالنے کی تیاریوں میں تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ بغیر کسی تاخیر کے شیر بانو کے گاؤں شیر اغنڈا کی جانب روانہ ہوا ۔ وہاں پہنچ کر اس نے ساری رقم شیر بانو کے والدین کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ مگر اب اس میں ایک دوسرا خاندان بھی ملوث ہو گیا تھا۔ جس خاندان کے لڑکے سے شیر بانو کی نسبت طے ہوئی تھی وہ ہتھیار سونت کر باہر نکل آئے اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ یوسف خان بھی کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ اپنی جس محبوبہ کے لیے اس نے در در کی خاک چھانی تھی وہ اسے کسی دوسرے کے حوالے کرنے پر کیسے تیار ہو سکتا تھا۔ دونوں طرف کے جنگجو آمنے سامنے ہو گئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں دونوں طرف کے کافی لوگ مر گئے۔ اس لڑائی میں فتح یوسف خان کی ہوئی۔ اور بالآخر وہ شیر بانو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنی دلھن کو لے کر وہ گھر پہنچا۔ وہ منتیں مرادیں پوری ہونے کی رات تھی۔ جب وہ اپنی دلھن کا گھونگٹ اٹھانے کے لیے نزدیک ہوا تو شوخ و شنگ محبوبہ نے ایک عجیب شرط رکھ دی۔ کہنے لگی یوسف خان جب تمھیں پہلی بار دیکھا تھا تو تم ہرن کے شکار کے لیے جا رہے تھے اور اب میں منہ دکھائی میں بھی ہرن کے گوشت کی طلب گار ہوں ایسا ہرن جو تم نے اپنے ہاتھ سے شکار کیا ہو؟...... یوسف خان نے محبوبہ کی شرط پر سرِ تسلیم خم کیا اور رات کے اسی پہر تیر کمان اٹھا کر کرماڑ پہاڑی کی جانب روانہ ہوا۔ وہ محبوبہ سے وصل میں مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دو پالتو کتے بھی اس کے

ہمراہ تھے۔اور پھراس کی بدقسمتی کہ پہاڑی کی بلندی پراس کا پاؤں پھسلا اور محبوبہ کی شرط پوری کرنے کی حسرت دل میں لیے وہ قریباً سو میٹر گہرائی میں جاگرا۔وفادار جانور مالک کو گرتے دیکھ کر بھونکتے ہوئے واپس گھر کی جانب بھاگے۔گھر والوں نے دونوں کتوں کو دردناک انداز میں بھونکتے دیکھ کر جان لیا کہ یوسف خان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔کتوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے جب وہ اس جگہ پہنچے تو یوسف خان اپنی آخری سانس لے رہا تھا۔غم سے نڈھال محبوبہ نے بے تابانہ محبوب شوہر کا سر اپنی گود میں رکھا اور یوسف خان اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا خالق حقیقی سے جاملا۔یوسف خان کو اسی پہاڑی کی چوٹی پر دفن کیا گیا۔اس کے بعد شیر بانو بھی زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی اور جلد ہی اس کی روح اپنے محبوب سے جاملی۔اور اسے بھی اس کے محبوب کے پہلو میں دفن کردیا گیا۔ان کی قبریں آج بھی اس پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہیں۔اور محبت کرنے والے وہاں اپنی محبت کے حصول کے لیے دور دراز سے منتیں مانگنے کے لیے آتے ہیں،تاکہ ان کی محبت کامیابی سے ہم کنار ہو۔اب یہاں منت پوری ہوتی ہے یا نہیں یہ تو خیر اللہ کو پتا ہے۔مگر جہلا نے عقیدہ یہی بنایا ہوا ہے ۔پشتو کے مشہور شاعر جوشی علی حیدر نے یوسف خان اور شیر بانو کے متعلق کافی دردناک اشعار کہے ہیں جنھیں پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ۔''استاد عمر دراز وہ دردناک کہانی ختم کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔''اب بتاؤ ذیشان !......کیا تم نے یوسف خان کی طرح دلھن والوں کی شرط پوری کی ہے؟''

''نہیں سر!''میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔''میں تو فی الحال یوسف خان کے کلی وال (گاؤں والے) سے فائرنگ کے ڈھنگ سیکھنے آیا ہوا ہوں۔''

استاد عمر دراز بے ساختہ ہنس دیا۔''اچھا ٹھیک ہے،تم آرام کرو۔ان شاءاللہ صبح ملاقات ہوگئی۔

''ان شاءاللہ !''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم نے صبح کی نماز کے بعد ناشتا کیا اور پھر کرماڑ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔آج مجھے وہاں محبت کی انوکھی داستان کے دونوں کرداروں کی خوشبو بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی ۔استاد عمر دراز اپنے ایک دوست کو بھی مددگار کے طور پر ساتھ لے آیا تھا۔گھی کے کنستر سے بنایا گیا ہدف جس کی ہیئت بالکل درمیانی

جسامت کے آدمی جتنی تھی۔اس پر سفید کاغذ چسپاں کیا گیا تھا۔ہدف ہم نے پہاڑی کی جڑ میں گاڑا اور اس کے ساتھ ایک گہرے گڑھے میں اپنے ساتھ لانے والے آدمی کو بھی بٹھا دیا۔اس کا کام ہمیں گولی لگنے کی جگہ اشارے سے بتانا تھا اور پھر گولی سے بننے والے سوراخ پر گوند سے ایک چھوٹا سا کاغذ چپکانا تھا۔کیونکہ ہم ہر گولی کے بعد ہدف کو قریب سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ہم پانسو میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر فائر کرنے لگے۔اس دوران استاد عمر دراز اپنی رات کی گفتگو کو عملی طور پر بروئے کار لانے کے بارے بتاتا رہا۔پانسو میٹر سے کامیاب فائر کے بعد ہم چھ سو میٹر پر چلے گئے۔اسی طرح فاصلہ بڑھاتے بڑھاتے آخر میں ہم نو سو میٹر سے فائر کر رہے تھے۔پہلی دونوں گولیوں میں میں ٹارگٹ ہٹ نہیں کر سکا تھا۔استاد عمر دراز نے کہا۔

”دیکھو بیٹے!ڈریگنو ورائفل سے ہزار میٹر کے فاصلے تک ہدف کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور تم نو سو میٹر کے فاصلے پر ناکام ہو رہے ہو؟وجہ معلوم ہے؟“

میرے نفی میں سر ہلانے پر اس کی بات جاری رہی۔”اس کی دو تین وجوہات ہیں۔نمبر ایک،کہ تمھارا ایمونیشن کافی دیر سے دھوپ میں پڑا ہے۔میں نے جان بوجھ کر یہ بات نظر انداز کیے رکھی کہ شاید تم غور کر لو مگر تم نے توجہ نہ دی۔اور جانتے ہو جب ایمونیشن گرم ہو تو اس کی وجہ سے چیمبر میں پریشر بڑھتا ہے اور گولی نشانے پر نہیں لگتی۔دوسری بات یہ ہے کہ تم پہلی دفعہ ڈریگنو ورائفل سے فائر کر رہے ہو۔اور یہ عام سنائپر رائفل کے برعکس سیمی آٹو میٹک ہے۔اس وجہ سے عام سنائپر رائفل کے برعکس اس سے فائر کرتے وقت جھٹکا زیادہ لگتا ہے۔اور لاشعوری طور پر اس جھٹکے کو سہارنے کے لیے رائفل پر تمھاری گرفت سخت ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ تم اس جھٹکے کو سہارنے کے لیے کندھے کو بھی تھوڑا سا آگے کر رہے ہو۔تیسری بات یہ کہ دھوپ بہت تیز ہو گئی ہے یہ وقت آئیڈیل فائر کے لیے غیر موزوں ہے۔“

”سر!ضروری تو نہیں کہ عملی زندگی میں ہدف موزوں وقت میں آئے؟“

”دیکھو پہلے تم ان غلطیوں کو درست کرو جو آسانی سے درست کی جا سکیں۔مطلب ایمونیشن کو دھوپ سے بچاؤ،رائفل کے فائر سے ہونے والے جھٹکے کو سہارنے کے لیے وہ غلطی نہ کرو جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔“

”یہ تو میں کر لوں گا سر!......مگر دھوپ سے کیسے بچوں؟“

”دھوپ سے بچاؤ ممکن نہیں۔ پر ہدف کو تو بڑا کیا جا سکتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں؟“ میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

”اچھا یہ بتاؤ؟ ایک انسان کے سر کا حجم کتنا ہوتا ہے؟“

”قریباً آٹھ سے دس انچ اونچا اور چھ انچ چوڑا۔“

”گڈ۔“ کہہ کر اس نے ایک اور سوال جڑ دیا۔ ”اور سر کو نکال کر اوپری دھڑ کتنا لمبا چوڑا ہوتا ہے؟“

”قریباً دو فٹ لمبا اور اٹھارہ سے بیس انچ چوڑا...... بازو شامل نہیں ہیں۔“

”تو بس، سر کے بجائے چھاتی میں گولی مارو۔ سنائپر رائفل کی گولی اگر کسی کی چھاتی میں لگ جائے تب بھی اس کا بچنا مشکل ہوتا ہے اور حفظ ما تقدم کے طور پر دوسری گولی بھی ماری جا سکتی ہے۔“

استاد عمر دراز کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس لیے تیسری اور چوتھی گولی میں نے کامیابی سے ہدف کی چھاتی میں ماردی۔

استاد عمر دراز نے میری پیٹھ ٹھونکی۔

”دیکھا، بس اتنی سی بات تھی۔ بہت جلدی تمھاری سمجھ میں آ گئی۔“

”جی سر!“ میں سعادت مندی سے بولا۔ حالانکہ میں کہہ سکتا تھا ”کہ اتنی جلدی کہاں آئی، میں کئی سال سے سنائپر کی ٹریننگ حاصل کر رہا ہوں۔“ مگر ایسا کہنا استاد کی بے ادبی ہوتا۔

”اچھا کھانا کھانے چلتے ہیں۔“ اس نے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا ہم نے گھر جا کر کھایا۔ اس کے بعد ہم نے ظہر کی نماز پڑھی اور دوبارہ اسی جگہ پہنچ کر فائر کی مشق کرنے لگے۔ شام کی آذان کے ساتھ ہم نے مشق ختم کی اور گھر لوٹ آئے۔ رات گئے تک استاد عمر دراز مجھے اپنے واقعات ایسے انداز میں سناتا رہا جن میں فائر کی باریکیوں اور موقع محل کی مناسبت سے ایک سنائپر کی ترجیحات واضح ہوتیں؟ اگلے دن بھی ہم دوپہر تک مشق کرتے رہے اس کے بعد میں استاد عمر دراز سے اجازت لے کر واپسی کے لیے روانہ ہوا۔ صوابی کی حدود تک ان دیکھے یوسف خان پر چھائیاں میری سوچ میں سرگرداں رہیں ۔اپنی یونٹ میں پہنچ کر میں اس کہانی کو ذہن سے جھٹک کر اپنے کورس کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ یوں بھی

اس ظالم دنیا میں جانے کتنے یوسف خان اور کتنی شیر بانو سماج کے اندھے قانون کی بلی چڑھ گئے ہیں۔اور اگر کوئی سخت جان ہر آزمائش عبور کر کے اپنی محبت کے قریب پہنچ بھی گیا تو مقدر نے اسے اوندھے منہ گرا دیا۔

سوموار کو میں نے پہلی مشق ہی میں تیرہ سو میٹر کے فاصلے سے ساری گولیاں ہدف پر ہٹ کر دیں۔ہم ہیوی سنائپر رائفل سے فائر کر رہے تھے۔اور اسی رائفل کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے بارے پڑھنے کے لیے ہم میں سے دو سنائپرز نے امریکہ بھی جانا تھا۔اس کی کارگر رینج دو ہزار میٹر ہے۔صوبیدار تصور صاحب نے مجھے خصوصی شاباش دی تھی۔باقی کا دن بھی میرا فائر سب سے نمایاں رہا۔استاد عمر دراز کی معیت میں گزرے دو دن میرے لیے بہت مفید رہے تھے۔

ہفتے کے اختتام پر ہمارا امتحان ہوا جس میں میں نے پہلی اور سردار خان نے دوسری پوزیشن حاصل کی تھی ۔وہ مجھ سے پانچ سال پہلے بھرتی ہوا تھا۔تین مرتبہ مشن پر سرحد پار بھی جا چکا تھا۔بڑا ہنس مکھ اور پر مزاح بندہ تھا۔لیکن ہنس مکھ اور پر مزاح وہ صرف اپنے دوستوں کے لیے تھا۔دشمن کے لیے وہ خالص پٹھان تھا۔گھٹا ہوا جسم ،میانہ قد،سرخ و سفید رنگت،خوب صورت نین نقش رکھنے والا یہ پٹھان بہت محنتی اور اچھا نشانہ باز تھا۔اس کا تعلق مردان سے تھا۔میں ہدف پر صرف ایک گولی اس سے زیادہ مار سکا تھا۔اس نے خوش دلی سے مجھے پہلی پوزیشن کی مبارک باد دی تھی۔

ایک ماہ کے اندر ہم نے امریکہ کے لیے اڑان بھرنا تھی ۔یہ ایک مہینا تیاریوں میں گزرا۔دو ہفتے ہمیں انگریزی زبان کی کلاس بھی اٹینڈ کرنا پڑی،تاکہ وہاں جا کر بول چال میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔اس دوران پاسپورٹ بھی بنے ، ویزہ وغیرہ لگا اور پھر ہم جانے کے لیے تیار تھے۔روانگی سے تین چار دن پہلے ہمیں گھر جانے کی اجازت ملی۔دو تین گھر گزار کر ہم واپس پہنچ گئے۔اور پھر ایک دن ہم جہاز میں بیٹھے اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ تھے۔ہماری منزل امریکہ کا ساحلی شہر نیو جرسی تھا۔

☆......☆......☆

وہاں پینتیس ممالک سے سنائپرز آئے ہوئے تھے۔مختلف ممالک سے آنے والے سنائپرز کی تعداد مختلف تھی ۔کسی ملک سے صرف ایک سنائپر آیا تھا تو کسی ملک سے چار سنائپرز بھی تھے۔انڈیا سے بھی دو سنائپر آئے تھے۔

دونوں ہندو تھے۔ایک کا نام شری کانت اور دوسرے کا راج پال تھا۔دونوں نے بڑی کینہ توز نظروں سے ہمیں گھورا تھا۔ابتدائی دوتین دن انتظامی وانصرامی کارروائیوں کی نظر ہو گئے اور پھر نئے ہفتے کی شروعات کے ساتھ با قاعدہ کلاس کی ابتدا ہوئی۔تمام طلبہ سوّل سوٹ پہن کر آئے تھے۔کیونکہ لباس کے بارے کوئی ہدایت جاری نہیں کی گئی تھی۔طلبہ کی تعداد 76 تھی جن میں سات لڑکیاں بھی شامل تھیں۔امریکہ کے چار طلبہ تھے جن میں سے دو لڑکیاں کیپٹن جینیفر ہنڈسلے اور لیفٹیننٹ کیٹ واٹسن تھیں۔جبکہ مردوں میں سارجنٹ ریگن واچ اور سارجنٹ نارمن تھے۔اسرائیل سے بھی دو لڑکیاں اور دو مرد آئے تھے۔ایک لڑکی کا تعلق جاپان سے تھا۔فرانس ،برطانیہ،چین یا روس جیسے ممالک سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

سری لنکا،نیپال،بنگلہ دیش،ایران اور انڈونیشیا سے بھی دو دو سنائپرز آئے ہوئے تھے۔یہاں تک کہ دو سنائپرز افغانستان سے بھی آئے تھے۔لیکن شکل وصورت سے وہ بالکل افغانی نہیں لگ رہے تھے۔دونوں کلین شیو تھے۔تمام سنائپرز میں داڑھی والا ایک میں ہی تھا۔گو میری داڑھی بھی بس کہنے کی حد تک ہی داڑھی تھی مگر پھر بھی میرے چہرے پر چند بال موجود تھے۔زیادہ تر مرد کلین شیو ہی تھے۔میرا ساتھی سردار خان بھی شیو کرتا تھا ۔البتہ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں ضرور موجود تھیں۔

پہلا پیریڈ تعارف ہی میں گزر گیا تھا۔گو صرف سرسری سا نام لینے سے ہر کسی کو نام یاد نہیں رہ جایا کرتے ۔البتہ اس معاملے میں میری یادداشت کافی بہتر تھی۔خاص کر استاد عمر دراز سے ملنے کے بعد تو میں اردگرد کی چیزوں کو اور زیادہ غور سے دیکھنے لگا تھا۔اب تو میں عام سے عام بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔میں نے تعارف کے درمیان قریباً پوری کلاس کے نام اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے تھے۔ جیسے ہی کوئی کھڑے ہو کر اپنا اور اپنے ملک کا نام بتاتا،میں اپنی یادداشت میں اس کا نام بٹھا کر زبانی طور پر بھی اس کا نام دہرانا شروع کر دیتا ۔اور اس وقت تک زیر لب اس کا نام دہراتا رہتا،جب تک کہ دوسرا آدمی کھڑا ہو کر اپنا تعارف نہ شروع کر دیتا۔

دوسرے پیریڈ میں باقاعدہ پڑھائی کا آغاز ہوا۔انسٹرکٹر لیوپولڈ سائیٹ کے بارے پڑھانے لگا۔گو سنائپر پری کیڈر کے بعد ہم نے دو ہفتے تک انگلش زبان کی کلاس اٹینڈ کی تھی مگر پھر بھی گورے انسٹرکٹر کی روانی میں بولی گئی انگلش سمجھنے میں مجھے تھوڑی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔خیر میں تو پھر بھی گزارا کر رہا تھا،کہ میری تعلیم بی اے

تھی اور مجھے انگریزی سے اچھی خاصی شد بد تھی۔اصل دشواری تو سردار خان کو تھی جس کی تعلیم میٹرک تھی اور میٹرک بھی ایسی کہ جیسے وطن عزیز میں لاکھوں، کروڑوں جوان میٹرک کی سند لیے گھوم رہے ہیں، کہ نام ہی کی سند ہی ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہے۔انسٹرکٹر کی باتیں اس کے سر سے کافی اونچی گزریں تھیں۔ پیریڈ کے اختتام پر میں نے اپنے ساتھی کا مسئلہ انسٹرکٹر کے گوش گزار کر دیا۔

ایک لمحہ سوچ کر اس نے کندھے اچکائے اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگا......

It,s very deficult to arrange any translator today."

"**However I will try my best tomorrow.**

(آج تو کسی ترجمان کا بندوبست کرنا مشکل ہے البتہ کل میں پوری کوشش کروں گا)

ہندو سنائپر شری کانت طنزیہ لہجے میں بولا۔"پڑھ لکھ کر آنا تھا نا؟" یہ بات اس نے ہندی میں کہی تھی۔(اور یہ بات تو قارئین جانتے ہوں گے کہ ہندی اور اردو بولنے کی حد تک قریباً ایک جیسی ہیں۔البتہ ہر ایک کا رسم الخط مختلف ہے)

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔"میرا خیال ہے ہم پی ایچ ڈی کرنے نہیں آئے؟"

گورے انسٹرکٹر کی سمجھ میں ہماری بات چیت تو نہیں آئی تھی، لیکن لہجے کا اتار چڑھاؤ اسے محسوس ہو گیا تھا۔اس نے جلدی سے سبق شروع کر دیا......

"اوکے گائیز!......وی آر لرننگ اباؤٹ ڈیفلیکشن......"

ہمیں مجبوراً چپ ہونا پڑا تھا۔ورنہ سردار خان کے تیور بدلنے شروع ہو گئے تھے۔اور یہ تو صرف مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش اخلاق سا پٹھان اندر سے خالص اور کھرا پٹھان تھا۔ ہندو سے وہ اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنا کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔

پیریڈ کے اختتام پر ہم کلاس روم سے باہر نکل آئے تھے۔ کچھ لوگوں نے سگریٹ سلگا لیے تھے اور چند ایک واش روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

میں اور سردار باقی لوگوں سے تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اسے انسٹرکٹر کی بتائی ہوئی خاص خاص

باتوں سے آگاہ کرنے لگا۔اسی وقت سنہری بالوں والی خوب صورت جینیفر ہمارے قریب آئی......

''ہائے......آئی ایم جینیفر!......''اس نے بے تکلفی سے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔اگر وہ اپنا نام نہ بتاتی تب بھی مجھے اس کا نام یاد تھا۔بلکہ مجھے یقین تھا کہ پوری کلاس کو اس کا نام ازبر ہو گیا ہوگا؟اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں تھی کہ وہ ایک پرکشش اور خوب صورت لڑکی تھی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔''تعارف تو ہو چکا ہے،کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے۔''

''اوہ!......میرا خیال ہے تمھیں صرف میرا ہی نام یاد رہ گیا ہوگا؟''وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔وہ ایک امریکن لڑکی تھی پاکستانی لڑکی نہیں کہ اپنی خوب صورتی نہ جتاتی۔

میں اطمینان سے بولا۔''تم باقی کلاس کے بارے ایسا کہہ سکتی ہیں؟''

وہ دلچسپی سے بولی۔''اور تم؟''

''مجھ سے کسی کا نام بھی پوچھ سکتی ہو؟''

اس نے شوخی سے کہا۔''اچھا......یہ ساتھ والے صاحب کو نام لے کر بلائیں؟''اس کا اشارہ سری لنکا سے تعلق رکھنے والے کالے رنگ کے سورن منگ سے تھا۔

''مسٹر سورن!......تمھارا ایک منٹ ضائع کر سکتا ہوں؟''میں نے سورن کو نام لے کر بلایا۔

''یس پلیز!......''وہ خوب صورت مسکراہٹ بکھیرتا ہمارے قریب آ گیا۔

''تمھارا نام سورن منگ ہی ہے نا؟''میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''جی جی!......بالکل......''اس نے میرے ساتھ کھڑے سردار خان اور جینیفر کو بھی ہاتھ ملاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔''مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا نام اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے کہ اتنے پرکشش لوگوں کو یاد رہ جائے۔''اس کا اشارہ واضح طور پر جینیفر کی طرف تھا۔

''یہ واش روم سے کون باہر آ رہا ہے؟''سورن منگ کی بات پر جینیفر نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر مجھے واش روم کے دروازے کی طرف متوجہ کیا۔جہاں سے امریکن سارجنٹ باہر آ رہا تھا۔

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''اس کا نام تو مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔بھلا ریگن واچ بھی کوئی نام ہے؟''

”اور وہ جو سگریٹ پی رہا ہے؟“جینیفر میرا امتحان لینے پر تل گئی تھی۔

”وہ بے چارہ اسرائیلی ......اگر اس کے والدین مجھ سے پوچھتے تو میں کبھی انھیں کلارک نام رکھنے کا مشورہ نہ دیتا۔“

”تو اس اسرائیلی دوشیزہ کا کیا نام رکھتے ؟“جینیفر نے کالے بالوں والی اسرائیلن دوشیزہ کی جانب اشارہ کیا جسے دونوں ہندوؤں نے گھیرا ہوا تھا۔یوں بھی یہود و ہنود کی آپس میں گاڑھی چھنتی ہے۔اور اس دوستی کو تقویت دونوں کی مسلم دشمنی دیتی ہے۔

میں ہنسا۔”بہ ہر حال سکارلیٹ نہ رکھتا۔“

”تو کیا رکھتے؟“

”کیٹ ٹھیک تھا بے شک اس کے باپ کا نام واٹسن نہ ہوتا۔“میں نے جینیفر کی امریکن ساتھی کیٹ واٹسن کا نام دہرایا۔

”میں تم سے متاثر ہو رہی ہوں۔“جینیفر کی مسکراہٹ میں حیرانی تھی۔

”اور میں اینڈریا برٹن سے۔“میں نے دوسری اسرائیلی دوشیزہ کی طرف اشارہ کیا۔جس کا مختصر لباس دعوت نظارہ دے رہا تھا۔”کیا خوب صورت لباس زیبِ تن کیا ہے؟“

”اگر تمھیں وہ اس لباس میں اچھی لگ رہی ہے تو میرے پاس اس سے بھی اچھا لباس موجود ہے۔“جینیفر معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے گھبرا کر کہا۔”نہیں تم جینز ہی میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔اور میں تو اینڈریا پر طنز کر رہا تھا۔“

”جہاں تک میں سمجھا ہوں امریکن بیوٹی ہمارے پاکستانی بھائی کا امتحان لے رہی ہے؟“سورن منگ نے ہماری گفتگو سے کامیاب اندازہ لگایا۔

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

سورن منگ نے منہ بنا کر کہا۔”مجھے تو بس ان دو انڈین کے نام یاد رہ گئے ہیں اور وہ بھی اس لیے کہ ہمارا تعارف پہلے سے ہو چکا تھا۔“

''تم شاید شری کانت اور راج پال کی بات کر رہے ہو؟''

''یہ لیس جی مس امریکا!...... بھائی کو ان کے نام بھی یاد ہیں۔''

''میرا نام جینیفر ہے۔'' جینیفر کو شاید محسوس ہوا تھا، کہ سورن منگ کو اس کا نام نہیں آتا۔

''شکریہ...... مس جینیفر!...... اب کم از کم تمھارا نام مجھے نہیں بھولے گا۔ تم بے شک ہماری واپسی کے بعد فون کر کے بھی میرا امتحان لے سکتی ہو؟ بلکہ روزانہ امتحان لیتی رہا کرنا اس بہانے ہم بھی یہ خوب صورت اور رسیلی آواز سن لیا کریں گے؟'' اس کی بات پر جینیفر نے ایک خوب صورت سا قہقہہ اچھالا۔ اور اس سے پہلے کہ ہم میں سے مزید کوئی بات کرتا انسٹرکٹر کی طرف سے بلاوا آ گیا اگلا پیریڈ شروع ہو گیا تھا۔

کلاس روم کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جینیفر پوچھنے لگی۔

''اب اپنا تعارف بھی کرا دیں؟''

''میرا نام ذیشان ہے اور میرے ساتھی کا نام سردار خان ہے۔'' میں نے سردار خان کی طرف اشارہ کیا جو اس ساری گفتگو میں خاموش رہا تھا۔

''ذی ژان......؟'' اس نے عجیب سے تلفظ سے میرا نام لیا۔

''بس ایسا ہی کچھ کہہ لیا کرو؟'' مجھ میں اپنے نام کی مزید مٹی پلید کرانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ تلفظ ٹھیک کرتے کرتے اگلی مرتبہ جانے کیا کہہ دیتی۔

''اگر میں صرف ذی کہہ لیا کروں تو؟'' اس نے شوخ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''بدلے میں تم بھی مجھے جینی کہہ لینا۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''نہیں میں صرف جی کہوں گا۔''

''جی......؟'' وہ آنکھیں میچتے ہوئے دلربانہ انداز میں مسکرائی اور کہا۔ ''ڈن۔''

''یہ بھی بتا دوں؟...... ''جی'' ہمارے ہاں خود سے زیادہ مرتبہ والے شخص کو اثباتی جواب دینے کے لیے کہا جاتا ہے۔''

''ہا...... ہا...... ہا'' وہ بے ساختہ ہنسی۔ ''ویسے میں تم سے سینئر تو ہوں نا؟...... آخر کو کیپٹن ہوں؟''

اور میں بھی جوابی مسکراہٹ اچھال کر انسٹرکٹر کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔جینیفر میرے اور سردار کے درمیان ہی بیٹھ گئی تھی۔

تین پیریڈز کے بعد آدھا گھنٹا ٹی بریک کرنے کے لیے ملا۔میس نزدیک ہی تھا۔میرے اور سردار کے علاوہ بس چند آدمیوں نے چائے یا کافی کے مگ کو ہاتھ لگایا تھا۔اکثریت نے ام الخبائث کا جام تھامنے میں دلچسپی لی تھی۔جینیفر نے بھی ہمیں کمپنی دینے کے لیے کافی پینا پسند کیا تھا۔

دوران گفتگو وہ پوچھنے لگی۔

''مسٹر ذی!......پہلے پیریڈ میں تم اس انڈین سے کیوں تلخ ہو رہے تھے؟''جینی کا اشارہ شری کانت کی طرف تھا۔

''وہ ہماری تعلیم پر پھبتی کس رہا تھا؟''

''انگریزی نہ جاننے سے تعلیم کا کیا تعلق؟''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔''یہ بات کم از کم تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتی؟''

''میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔مجھے تو بس یادداشت بہتر کرنے کے طریقے بتاؤ؟''

''ایک شرط پر؟''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔''شرط سنے بغیر کم از کم کسی خوب صورت لڑکی کو ہاں نہیں کرنا چاہیے؟''

''کوئی اتنی بڑی یا بری شرط نہیں ہے؟''میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''بس تم اپنی خوب صورتی کے راز کھول دو۔یادداشت بہتر کرنے کے طریقے میں بتا دیتا ہوں؟''

جواباً اس کا مترنم قہقہہ گونجا۔اسی وقت سامنے بیٹھا راج پال اپنے ساتھی شری کانت کو کہنے لگا۔''ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں مسلے نے لڑکی دیکھی وہیں رال ٹپکانی شروع کر دی۔''یہ بات اس نے ہندی میں کہی تھی۔

میں نے اس کی بات کا برا مانے بغیر جواب دیا۔''صحیح کہا مہاراج!......اور اسی وجہ ہی سے تو تم لوگ ہمیں بہت آسانی سے پھانس لیتے ہو؟''

''تم حد سے بڑھ رہے ہو؟'' راج پال کا غصہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی تھی۔

''نہیں!......'' میں اطمینان سے بولا۔ ''تم اپنی حد عبور کر رہے تھے اس لیے تمھیں تمھاری جگہ واپس دھکیلنا ضروری تھا۔''

''میرا خیال ہے تم لوگوں کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے؟'' جینی نے ایک دم صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس دوران سردار خان نے اپنا کوٹ اتار کر اپنی کرسی کے پیچھے لٹکایا اور اپنی آستین اڑسنے لگا۔ گو اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس کا انداز ایسا تھا کہ دیکھنے والے خود بہ خود سمجھ گئے تھے۔

''مسٹر کھان پلیز!......'' جینی نے اسے بازو سے پکڑ کر کرسی پر بٹھانا چاہا۔

وہ اردو ہی میں جینی سے مخاطب ہوا۔ ''اس خنزیر کے بچہ کو زبانی بات سمجھ میں نہیں آتا بی بی!''

''سردار!......تم بیٹھو؟ میں نے انھیں ان کی زبان میں سمجھا دیا ہے۔'' میں نے سردار کو بازو سے تھام کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔

شری کانت اور راج پال ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے تھوڑی دور پڑی ہوئی کرسیوں کی جانب بڑھ گئے تھے۔

''ذی!......تم لوگ ایک دوسرے کے اتنا خلاف کیوں ہو؟''

''تم لوگ، رشین اور چائنیز کے خلاف کیوں ہو؟''

''او کے چھوڑو؟......تم شاید نہیں بتانا چاہتے۔''

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بتا تو دیا ہے۔''

''او کے۔'' روکھے لہجے میں کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ یقیناً اسے روس اور چائنہ کا ذکر پسند نہیں آیا تھا۔

میں بھی اسے منانے کے بجائے سردار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یار سردار!......خود پر قابو پایا کرو؟......ہم میدانِ جنگ یا بارڈر پر نہیں ہیں کہ تم فوراً لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو؟''

’’ان خنزیروں کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔‘‘ سردار کا غصہ ابھی تک نہیں اترا تھا۔

’’تمھاری بات درست ہے مگر جگہ بھی تو دیکھی جاتی ہے؟ اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈسپلن کی خلاف ورزی پر ہمیں واپس بھی بھیجا جا سکتا ہے؟......کتنا دکھ ہوگا ہمارے سینئرز کو؟......معلوم بھی ہے ہمیں یہاں بھیجنے کے لیے کتنی رقم خرچ ہوئی ہے؟‘‘

’’معذرت خواہ ہوں ذیشان بھائی!......آئندہ خیال رکھوں گا؟‘‘ اس نے نادم ہو کر کہا۔

’’ٹریننگ کے میدان میں انھیں نیچا دکھا کر ہم اپنا غصہ نکال سکتے ہیں؟‘‘

’’ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔‘‘ سردار خان نے پرعزم ہو کر کہا۔

’’اچھا چلیں بریک ختم ہونے والی ہے۔‘‘ لوگوں کو کلاس روم کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ سردار نے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میری تقلید کی تھی۔ ٹی بریک کے بعد انسٹرکٹر نے صرف ایک پیریڈ پڑھا کر ہمیں یہ کہہ کر چھٹی دے دی، کہ اگلے دن ہر سنائپر اپنے ملک کی آرمی یونیفارم میں ہوگا۔

☆......☆......☆

شام کو کوئی کلاس وغیرہ نہیں تھی ہم دونوں ٹریک سوٹ ڈال کر پی ٹی گراؤنڈ میں چلے گئے۔ بڑا خوب صورت ٹریک بنا ہوا تھا۔ چار سو میٹر کے ٹریک پر بیس چکر لگانے کے بعد ہم دونوں جم میں گھس گئے تھے۔ ایک اچھے سنائپر کے لیے جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے صحت مند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس میں بلا کی قوت برداشت بھی چاہیے ہوتی ہے۔ سردار خان کی طرح جوشیلے سنائپر زیادہ دیر اپنی ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتے۔ کیونکہ دورانِ مشن ایسے بہت سے مواقع آتے ہیں جہاں ذلت آمیز برداشت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ساتھی کو آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھ کر دم سادھ کر لیٹنا پڑتا ہے۔ اس کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی سکت ہونے کے باوجود اسے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اور پھر بھوک پیاس کا تو سنائپر کے ساتھ جنم جنم کا ساتھ ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ سنائپر کی ٹریننگ کی شروعات کے ساتھ استاد اپنے شاگردوں کے ذہن میں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں مگر وقت پڑنے پر بہت کم سنائپرز ان باتوں پر پورا اترتے ہیں۔

ہم جم سے باہر نکلے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ کمرے میں جا کر ہم نے نیم گرم پانی سے غسل کیا اور

کپڑے بدل کر شام کی نماز وہیں کمرے میں پڑھ لی۔

رات کو ڈائیننگ ٹیبل پر ایک بار پھر تمام سے ملاقات ہوئی۔ جینیفر مجھے شری کانت کے ساتھ گھومتی نظر آئی مگر میرے لیے یہ بات کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ یوں بھی میں یوسف ثانی نہیں تھا کہ وہ میرے اطراف میں گھومتی رہتی۔ اتنی گپ شپ بھی اس نے جانے کس لیے کر لی تھی۔ سب سے بڑھ کر میں خود بھی اس کے ساتھ تعلق رکھنے کے حق میں نہیں تھا کہ کسی لڑکی کی قربت میں مجھ سے کوئی غلط کام بھی ہو سکتا تھا اور پھر لڑکی بھی جینیفر جیسی، جو لاکھوں میں ایک ہو؟۔ سب سے بڑھ کر اس وقت میں پاک آرمی کی نمایندگی کر رہا تھا۔ گو اس علاقے میں عورت کی قربت کو غلط نہیں سمجھا جاتا، مگر میرا دین اور معاشرہ تو اس تعلق کو برا گردانتا ہے اور میرے لیے یہی کافی تھا۔

ڈائیننگ ٹیبل پر حرام اور حلال ہر قسم کی خوراک دستیاب تھی۔ حلال کھانے والوں کے لیے برتن تک علیحدہ دستیاب تھے۔ حلال کھانے میں سبزی، چاول اور چکن کی ڈشیں بنی تھیں جبکہ دوسروں کے لیے جو کچھ پکا تھا نہ تو ہم ان ڈشوں سے واقف تھے اور نہ واقفیت کا کوئی شوق ہی تھا۔ اس لیے ہم اپنے کھانے کی جانب متوجہ رہے۔

ہم وہاں پر دس مسلمان تھے۔ پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور افغانستان سے تعلق رکھنے والے ہم سارے مسلم کھانے کی ٹیبل پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ مسلم چاہے کسی بھی قوم، علاقے یا ملک سے تعلق رکھتے ہوں۔ خدا، رسول و قران کی ایک ان دیکھی ڈور انھیں آپس میں باندھے رکھتی ہے۔ کھانے کے دوران ایک بار پھر تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے زیادہ مسئلہ سردار خان کے لیے تھا کہ اسے اردو اور پشتو کے علاوہ کوئی زبان بولنا نہیں آتی تھی۔ اس کے لیے مجھے ہی مترجم کے فرائض سرانجام دینا پڑتے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں اپنے کمرے کی جانب چل دیے کہ دوسری خرافات کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ جینیفر بھی مجھے اکیلی ہی ایک سپورٹس کار کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ شاید وہ باہر کسی سے ملنے جا رہی تھی۔ یوں بھی اس عمر تک امریکن لڑکیاں درجنوں بوائے فرینڈ بھگتا چکی ہوتی ہیں۔

ہمارے کمرے کے اندر بھی ایک LED موجود تھی مگر ہم دونوں کی دلچسپی سنائپنگ کے متعلق کتابوں اور سنائپرز فلموں کے ساتھ تھی۔ ایک شیلف میں سنائپنگ کے متعلق مختلف کتابیں موجود تھیں کچھ سنائپرز رائفلز

کے متعلق تھیں اور کچھ مختلف سنائپرز کے تجربات کے بارے تھیں ۔ کمرے میں ایک کمپیوٹر اور درجنوں سی ڈیز بھی موجود تھیں ۔ ہم سنائپر کی زندگی کے متعلق ایک معلوماتی فلم لگا کر دیکھنے لگے ۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ایک امریکن سپاہی پاکستانی سپاہی سے بہتر ہے ۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ان کی تربیت بہت بہتر اور جدید سہولیات کو بروے کار لا کر کی جاتی ہے ۔ جیسے ہم سنائپر کورس کے لیے آئے تھے تو ٹریننگ میدان کے علاوہ، ہم تمام کے رہائشی کمروں میں بھی انھوں نے ایسی سہولیات مہیا کر دی تھیں کہ ہم اپنے کمرے میں آرام کرتے وقت بھی سنائپنگ کے متعلق کافی کچھ سیکھ سکتے تھے ۔

کوئی بھی انسان کبھی اپنے فن میں کامل نہیں ہوتا اور کوئی بھی عقل مند زندگی کے کسی مرحلے پر یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ ابھی اسے سب کچھ معلوم ہے ۔ بہ قولِ سقراط ”سب سے زیادہ جاننے والا وہ ہے، جو یہ جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ۔“

فلم دیکھنے کے دوران میں نے سردار حسین کو کہا ۔ ”آج کے بعد ہم پشتو میں گفتگو کریں گے ۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا ۔

”مطلب یہ خان صاحب! کہ مجھے پشتو سیکھنے کا شوق ہے اور اب ایک خان کی صحبت بھی میسر آ گئی ہے تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے؟ اور اس بارے مجھے استاد عمر دراز نے بھی تاکید کی تھی؟“

”استاد عمر دراز؟“

”ہاں استاد عمر دراز............“ میں نے اسے استاد عمر دراز سے ہونے والی ملاقات کا حال بتا دیا ۔

”بڑے خوش قسمت ہو یارا!...... میں بھی کہوں ایک دم تمھارا فائر مجھ سے بہتر کیسے ہو گیا؟“

”یہ تو ہے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ۔

”ویسے پشتو سیکھنا کسی فارغ وقت کے لیے مؤخر کر دیتے تو ٹھیک تھا ۔ کہیں سنائپر ٹریننگ ہی سے نہ ہاتھ دھو بیٹھو؟“

”فکر مہ کوہ مڑہ ۔“ (فکر نہ کرو) میں مزاحیہ لہجے میں بولا ۔ اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا ۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم پاک آرمی کی یونیفارم پہن کر گئے تھے۔ تمام اپنے اپنے ملک کی یونیفارم میں تھے۔ پیریڈ شروع ہوا تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص سردار خان اور میرے درمیان آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ترجمان تھا۔ انسٹرکٹر کی کہی ہوئی باتیں وہ سردار کے سامنے دہراتا گیا۔ بریک ٹائم میں میں سردار کے ساتھ کھڑا ٹوٹی پھوٹی پشتو بولتے ہوئے اسے ہنسا رہا تھا، کہ مجھے اپنی پیٹھ پیچھے جینیفر کی شوخ آواز سنائی دی وہ سورن منگ سے مخاطب تھی۔

”ویسے نام یاد رکھنا وقت کا ضیاع ہی ہے سورن صاحب!...... اب دیکھو نا تمام کی چھاتیوں پر نیم پلیٹ لگی ہے۔ نام پڑھ لو یونھی دماغ کھپانے کا فائدہ؟“

مجھے معلوم تھا کہ وہ یہ سب کچھ مجھے سنانے کے لیے کہہ رہی ہے، مگر میں اس کی بات پر توجہ دیے بغیر سردار سے محو گفتگو رہا۔

اس دن بھی ہمیں چار پیریڈز پڑھائی کرنا پڑی۔ سہ پہر کو ہم ٹریک پر دوڑ رہے تھے کہ اسرائیل سے تعلق رکھنے والے کلارک اور ڈونلڈ پاسکو تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ڈونلڈ پاسکو نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔ یہ یہودی مجھے کافی دفعہ شری کانت پارٹی کے ساتھ بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔

”ان کی ایسی کی تیسی؟“ سردار خان نے اپنی رفتار تیز کرنا چاہی، مگر میں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”انھوں نے اس رفتار سے ٹریک کے ایک یا دو چکر لگانے ہیں بھولے بادشاہ!...... اور ہم نے پانچ کلومیٹر کا فاصلہ پورا کرنا ہے۔“

”میں پانچ کلومیٹر کا فاصلہ بھی پورا کروں گا اور انھیں آگے بھی نہیں نکلنے دوں گا؟“ سردار خان کی پٹھانی حس بیدار ہو گئی تھی۔

”یار!...... دماغ کو تھوڑا سا ٹھنڈا رکھو؟ سنائپر کو غصہ نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے اسے سمجھا بجھا کر ان کا پیچھا کرنے سے روک دیا۔ اور اگلے چکر ہی میں وہ دونوں ٹریک سے اتر کر جم کی طرف جا رہے تھے۔

”دیکھ لیا...... بس یہی ان کی پریکٹس تھی۔“

”وہ ہمیں چڑا رہے تھے ذیشان!“ سردار کا غصہ اب تک نہیں اترا تھا۔

''تو چڑاتے رہیں؟ ہمیں ضرورت ہی کیا ہے چڑنے کی؟...... یہ کوئی مقابلہ تو نہیں تھا نا؟''

''تمھارا تو ہر بات میں علیحدہ فلسفہ ہوتا ہے؟...... کل اس خوب صورت لڑکی کو بھی خفا کر دیا تھا۔ اب وہ ہندوؤں کے ساتھ گھوم رہی تھی۔''

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''تمھیں اس کے خفا ہونے کا غم ہے یا اس کے ہندوؤں کے ساتھ گھومنے پر؟''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس کے ہندوؤں کے ساتھ گھومنے پر۔''

''مطلب میں اسے کہہ دوں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ نہ گھوما کرے؟...... کیونکہ میرے خان بھائی کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگر وہ خود کو اکیلا سمجھتی ہے تو سردار خان اس کا اکیلا پن دور کر سکتا ہے؟''

وہ جھٹ بولا۔ ''یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟...... چنارے بیگم میری جان کو آ جائے گی؟''

''میری باجی کو کیا پتا کہ اس کا شوہر امریکہ میں کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''وہ مجھے سونگھ کر بتا دیتی ہے کہ میرے دل میں کیا؟''

''یعنی آپ کے خیالات اتنے بدبودار ہیں کہ ان کی بو ہماری بہن فوراً سونگھ لیتی ہے۔

''یار!...... مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرو؟ میں نے یونھی کہہ دیا تھا۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔''

جواباً میں ہنس کر خاموش ہو گیا تھا کہ زیادہ باتیں کرنے کی وجہ سے ہمارا سانس پھولنے لگا تھا۔

اسی وقت ہم نے جینیفر کو آتے دیکھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کی امریکن ساتھی کیٹ واٹسن بھی اس کے ہمراہ تھی۔ دونوں نے چست پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ بالائی لباس بھی فقط بلاؤز پر مشتمل تھا۔ مگر یہ پاکستان تو تھا نہیں کہ ہمیں حیرانی ہوتی۔ وہاں کی عورتوں کے نزدیک تو وہ ایک مکمل لباس تھا۔

''بے حیا عورتیں۔'' سردار خان نے ناک بھوں چڑھائی۔

''دیکھ لو...... تم مجھے ان سے دوستی کا مشورہ دے رہے تھے۔'' میں نے سردار کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''وہ کیا کہتے ہیں جنگ اور محبت میں ہر کام جائز ہوتا ہے۔''

''اس سے محبت کون کرتا ہے؟''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''محبت نہ سہی؟ ہندو کے بچے سے جنگ تو ہے نا؟''

”سردار!......جانتے ہو؟ تمھاری باتوں سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟“

”کیا......؟“

”یہی کہ تم خالص اور کھرے پٹھان ہو۔“

وہ خفت سے بولا۔”ذیشان بھائی!......طنز کر رہے ہو؟“

”تو اور کیا کروں؟......تم نے اس کے علاوہ مجھے کسی قابل چھوڑا ہی نہیں ہے؟“

”وہ دیکھو کافر کے بچے بھی پہنچ گئے؟“ سردار خان نے دور سے آتے ہوئے شری کانت اور راج پال کو دیکھ کر نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”بھاڑ میں جائیں یار!“ سردار کو کہہ کر میں امریکن تتلیوں کی پشت کو گھورنے لگا جو۔”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔“ سے بھی ایک قدم آگے کا لباس زیب تن کیے ہم سے تیس پینتیس میٹر آگے دوڑ رہی تھیں ۔ان کے پاجامے، جسم کا اصل رنگ چھپانے کے علاوہ کسی عضو کو چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ آج کل تو خیر سے پاکستان میں بھی اس طرح کے سکن ٹائیٹ پاجامے کا عام رواج ہے۔ بلکہ ہمارے لبرلز ہم وطنوں کا پسندیدہ لباس یہی ہے۔ وہ دونوں لڑکیاں ہماری طرح جاگنگ ہی کر رہی تھیں اس لیے ہمارے بیچ فاصلہ برقرار رہا تھا۔ شری کانت اور راج پال ٹریک کے کنارے کھڑے ہو کر ان کے قریب آنے کے منتظر رہے۔ جیسے ہی وہ دونوں ان کے قریب پہنچیں وہ ان کے ساتھ قدم ملا کر دوڑنے لگے۔ ہمارا بیسواں چکر مکمل ہو گیا تھا اس لیے ہم جم کی طرف بڑھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ چاروں بھی شوخ جملوں کا تبادلہ کرتے ہوئے جم میں داخل ہوئے۔

شری کانت نے ہمیں دیکھ کر معنی خیز لہجے میں پوچھا۔”کیا حال ہے ساتھیو!“ وہ گویا ہمیں یہ جتا رہا تھا کہ اس نے جینیفر کو ہم سے چھین لیا ہے۔

سردار کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے مسکرا کر کہا۔”آج، کل سے کچھ بہتر ہے کہ یہ بلا سر سے ٹلی؟۔“

شری کانت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”اتنی خوب صورت لڑکی کو بلا کہنے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ انگور کھٹے ہیں؟“

میں سادگی سے بولا۔ ''اب مجھے اس کے ذائقے کا کیا پتا؟......میں نے چکھا تھوڑی ہے اسے؟......یوں بھی ہم مسلمانوں کا مزاج اس بارے مختلف ہوتا ہے۔ہم کسی کے بچے یا پھینکے ہوئے مال کو منہ نہیں لگاتے؟''

''ہا......ہا......ہا''شری کانت نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔''اسے کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے؟''

''ہا......ہا......ہا''میں نے بھی قہقہہ لگا کر اس کا ساتھ دیا تھا۔

اسی وقت جینیفر نے راج پال سے ہم دونوں کی گفتگو کا مطلب پوچھا۔جواباً راج پال نے بغیر لگی لپٹے رکھے سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔اس کی بات سنتے ہی جینیفر لال بھبکا ہو کر میرے پاس آئی۔

''یو......''وہ گالی بکنے لگی تھی مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر رک گئی اور لمحہ بھر مجھے گھورنے کے بعد بگڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔''تمھاری گفتگو کا مطلب کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے؟......میں نے تمھیں کوئی بات نہیں کی کیپٹن!''میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''مسٹر کانٹ،کوتو کی ہے نا؟''اس نے شری کانت کے نام کا حلیہ بگاڑا۔

''نہیں......شری کانت نے ہمارا حال پوچھا اور میں نے بتا دیا کہ کل سے بہتر ہے۔باقی وہ خود تمھاری ذات کو گفتگو میں گھسیٹ رہا تھا تو میرا جواب دینا تو بنتا تھا نا؟''

''مسٹر ذی!......اپنی حد میں رہو؟''

''کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے!......میرا نام راجا ذیشان حیدر ہے۔اگر نام لینا نہیں آتا تو پلیز مجھے مخاطب نہ ہوا کرو؟''

ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ ایکسر سائز مشین کی طرف بڑھ گئی۔

''Any problem friend?''سارجنٹ ریگن واچ ہم سے تھوڑا دور ایکسر سائز کر رہا تھا۔ہمارے درمیان تلخ کلامی سن کر اس نے میرے نزدیک آکر پوچھا۔

''نہیں شکریہ دوست!......کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔''

''اوکے۔''کہہ کر وہ کندھے اچکاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔

رنگین واچ کے واپس مڑتے ہی سردار نے پوچھا۔ ”یہ کیوں غصے میں لال پیلی ہورہی تھی؟“

میں نے شرارت سے کہا۔ ”کہہ رہی تھی؟ تمھارا ساتھی سردار خان اسے کیوں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے؟“

”اب اتنا بھی پٹھان نہیں ہوں یار!“

”کیوں پٹھان ہونا کوئی بری بات ہے کیا؟“

”تم لوگ پٹھانوں کو بے وقوف سمجھتے ہو نا؟“

”بالکل غلط...... یہ کس نے کہا کہ پٹھان بے وقوف ہوتے ہیں۔ پٹھان تو غیرت، جرأت اور بہادری کا دوسرا نام ہیں۔ البتہ انھیں سادہ کہا جاسکتا ہے کہ دل میں کوئی بات چھپا نہیں سکتے اور جذبات میں ذرا جلدی آ جاتے ہیں؟“

”اصل بات بتاؤ، مجھے ٹرخانے کی کوشش نہ کرو؟“

”کمرے میں بتاؤں گا یہاں دشمن سن رہے ہیں۔“ کہہ کر میں پش اپ نکالنے لگا۔

راج پال اور شری کانت ٹریک سوٹ کا اپّر اتار کر بھونڈے انداز میں اپنے مسلز کی نمایش میں لگے تھے۔ بالکل آج کل کی انڈین فلموں کے ہیروز کی طرح جو سین کی ڈیمانڈ نہ ہونے کے باوجود اپنے مسلز کی نمایش پر بہ ضد نظر آتے ہیں۔ ہاں یہ علیحدہ بات کہ فلموں میں تو کیمرہ ٹرک یا ڈمی کے استعمال سے یہ مقصد پورا ہوجاتا ہے یہاں ان دونوں کے پاس کوئی ایسے جسم موجود نہیں تھے کہ وہ کسی کو امریکن لڑکی کو متاثر کرسکتے۔ خیر یہ میری ذاتی رائے ہے۔ ضروری نہیں کہ لڑکیاں صرف مسلز دیکھ کر ہی متاثر ہوتی ہوں۔ ان کی کوئی دوسری خوبی بھی ان گوریوں کو پسند آسکتی تھی۔

مشق کے اختتام پر ہم دونوں جم سے باہر نکل آئے تھے۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں نے سردار خان کو جینیفر کے غصے کی بابت بتادیا۔

”ایک بات کہوں ذیشان بھائی!...... مجھے لگتا ہے یہ گوری تمھاری ذات میں دلچسپی لے رہی ہے؟“

”بھلا وہ کیسے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”یار!...... سامنے کی بات ہے؟ وہ کل سے ان لوگوں کے ساتھ گھوم رہی ہے جن سے تمھیں نفرت ہے۔ اور

پھر چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ تم سے الجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ایسا خواہ مخواہ تو نہیں کیا جاتا۔مجھے یاد ہے کہ چنارے بیگم ہر وقت میرے پیچھے پڑی ہوتی تھی۔مجھ سے لڑنا جھگڑنا اس کا آئے روز کا معمول تھا۔اب دیکھو وہ میری بیوی ہے؟''

''خان صاحب!......صاف کہونا؟ تم مجھے میری بیوی کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے ہو؟''

''ہا......ہا......ہا......وہ چنارے بیگم تو نہیں ہے کہ ایسا سخت قدم اٹھائے گی؟''

''بھول ہے تمھاری؟ یہ جنس جسے بیوی کہا جاتا ہے؟ شوہر نام کی مخلوق کے لیے برابر خطرناک ہوتی ہیں۔''

''ویسے ذیشان بھائی!......مجھے تو چنارے کا غصہ،اس کا لڑنا جھگڑنا،اس کی ضد یہ بہت یاد آتا ہے۔یقین کرو جو پیار محبت اس کے غصے میں ہوتا ہے اس کے لیے پردیس میں ترا ستا رہتا ہوں۔''

''صحیح کہا۔''میں ٹھنڈا سانس لے کر ماہین کی یادوں میں کھو گیا تھا۔وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔یقیناً ساری محبت کرنے والی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ان کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان سے دور ہوتے ہیں کہ چند منٹ دیر سے گھر لوٹنے پر وہ کس کس طرح کی جرح کرتی ہیں۔اور خفا ہو کر یا روٹھ کر بھی وہ اپنے خاوند کا اتنا ہی خیال رکھتی ہیں جتنا خوشی کی حالت میں رکھتی ہیں۔بغیر کچھ کہے کھانے کے برتن سامنے لا دھرنا۔بے توجہی ظاہر کرتے ہوئے بھی مکمل دھیان رکھنا کہ پلیٹ میں سالن ختم تو نہیں ہو گیا یا پانی کا گلاس تو خالی نہیں ہو گیا۔بستر پر لیٹتے ہوئے ایسی حرکات کرنا کہ شوہر کو معلوم ہوتا رہے کہ بیگم صاحبہ جاگ رہی ہے سوئی نہیں اور شوہر صاحب کے پاس منانے کی گنجایش موجود ہے۔بہ ظاہر لاتعلقی کا انداز لیے شوہر کی ہر سہولت کا پوری توجہ سے جائزہ لینا؟ ایسا کوئی مشرقی بیوی ہی کر سکتی ہے۔مغرب کے حصے میں یہ محبتیں کہاں؟......وہاں تو بس ساری محبتوں کا محور ہی مرد و عورت کی جسمانی کشش یا دولت کا حصول ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

اگلے دن بریک کے دوران میں اور سردار ایک طرف کھڑے ہو کر لیوپولڈ سائیٹ کے متعلق تبادلہ خیال کر رہے تھے۔جینیفر ہمارے قریب کھڑے جمیل خان اور سکندر علی خان کے ساتھ آ کر گپیں ہانکنے لگی۔ان دونوں کا تعلق افغانستان سے تھا۔دونوں کلین شیو پٹھان تھے۔انگریزی زبان پر انھیں اچھا خاصا عبور تھا۔جینیفر ان سے

افغانستان کی صورت حال پر تبادلہ خیال کرنے لگی۔ میں سردار کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے تھوڑا دور ہٹ گیا۔ سردار کو وہاں سے دور ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہوئی تھی کیونکہ جینفر کی طرف اس کی پشت تھی۔ البتہ جس جگہ پر جا کر ہم رکے تھے وہاں جاپانی لی زونا اپنے ساتھی کے ساتھ ایسی زبان میں محو گفتگو تھی جس کا ایک لفظ بھی ہمارے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

''یہ دونوں اتنی خوب صورت گفتگو تو نہیں کر رہے کہ تم مجھے اتنی تیزی سے یہاں تک کھینچ لائے ہو؟'' سردار طنزیہ انداز میں مستفسر ہوا۔

''خان بھائی!...... لی زونا کی معصومیت تو دیکھو نا؟'' میں نے بچوں کے سے نقش رکھنے والی جاپانی لڑکی کی جانب اسے متوجہ کیا۔

لی زونا اپنا نام میرے منہ سے سن کر چونکی اور مجھے اپنے جانب گھورتا پا کر مسکرا کر ادب دینے کے انداز میں جھک گئی۔

میں نے بھی اسی کے انداز میں جھک کر اسے آداب کہا۔ اس کا ساتھی اور سردار میرے انداز پر ہنس پڑے تھے۔ لی زونا کے معصوم چہرے پر بھی تبسم کھلنے لگا۔

''ہائے لی زونا!...... میں ذیشان اور یہ میرا ساتھی سردار خان ہے۔'' میں نے اس کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

وہ پر تپاک مصافحہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''تھینک یو ذیشان!...... اینڈ تھینک یو سردار۔'' اس کا ساتھی بھی ہمیں خوش دلی سے ملا تھا۔ ان سے مصافحہ کر کے ہم ان کے ساتھ ہی رک کر گپ شپ کرنے لگے۔ میں نے کن انکھیوں سے جینیفر کی جانب دیکھا وہ ہماری جانب ہی متوجہ تھی۔ اس کا رویہ مجھے الجھن میں ڈالنے لگا تھا۔ ہر انسان اپنی خوب صورتی کے بارے خوش فہمی شکار ہوتا ہے۔ میں بھی اچھا خاصا خوب صورت اور پر کشش تھا مگر وہاں پر ایسے مرد موجود تھے جو مجھ سے خوب صورت اور قد آور تھے۔ میں تو شاید ان کے عشر عشیر بھی نہیں تھا۔ درمیانی قد و قامت، رنگت بھی ہلکی سانولی جسے زیادہ سے زیادہ گندمی کہا جا سکتا تھا۔ افغانستان سے آنے والے دونوں حضرات تو چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد کے تھے۔ سرخ و سفید رنگت اور صحت مند جسم۔ بلاشبہ مغربی

تہذیب کی میں پلی بڑھی ان عورتوں کے لیے وہ آئیڈیل ساتھی تھے ۔ان دو کے علاوہ بھی وہاں کافی خوب صورت مرد موجود تھے۔ان تمام کی موجودی کے باوجود جینیفر کا یوں مجھ میں دلچسپی لینا مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا...... میں کسی مخصوص عہدے پر براجماں کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں کہ ایک لڑکی کے اپنی جانب مائل ہونے کو کسی سازش کا نام دے دوں۔اسی طرح کوئی الھڑ دوشیزہ بھی نہیں، کہ اپنی عزت و عصمت کا خوف لاحق ہو؟ گو مرد کی بھی عزت ہوتی ہے مگر فی زمانہ اس کا خیال بھی عورتوں ہی کو کرنا پڑتا ہے۔خود مرد کو ایسی کوئی تگ و دو نہیں کرنا پڑتی کہ اس کی عزت محفوظ رہے۔اپنے تئیں میں یہی کر سکتا تھا کہ اسے نظر انداز کرتا رہوں اور یہی میں کر رہا تھا۔

''شاید یہ دلچسپی کے بجائے نفرت ہو؟'' میرے دماغ میں ایک قابلِ قبول سوچ لہرائی۔اسی وقت بریک ختم ہونے کی گھنٹی ہوئی اور میں سر جھٹک کر کلاس روم کی طرف بڑھ گیا۔

تین دن لیوپولڈ ٹیلی کوپ سائیٹ کے بارے پڑھانے کے بعد چوتھے دن ہمیں عملی طور پر فائرنگ رینج پر لے جایا گیا۔جدید سہولیات سے مزین وہ ایک بہترین فائرنگ رینج تھی۔یہاں پاکستان میں آؤٹ ڈور فائرنگ رینج میں مختلف فاصلوں پر فائر کرنے کے لیے فائرر کو ہدف سے دور جانا پڑتا ہے اور ہدف ایک جگہ پیوست ہوتے ہیں۔وہاں اس کے برعکس حرکتی ہدف لگے ہوئے تھے۔فائرر کو اپنی جگہ سے ہلنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔بٹن دبا کر ہدف کو پچیس میٹر سے لے کر تین ہزار میٹر کے فاصلے تک باآسانی قریب یا دور کیا جا سکتا تھا۔کلاس کے طلبہ کی تعداد کے برابر رینج ماسٹر سنائپر رائفلز دستیاب تھیں۔تمام سنائپرز کو علیحدہ علیحدہ رائفل ملی۔ہر ایک نے اپنی رائفل کو خود ہی فائر کے لیے درست کرنا تھا۔رہنمائی کے لیے انسٹرکٹرز موجود تھے۔رینج پر دس ہدف نصب کیے گئے تھے۔اور ہر ہدف طاقتور کیمرے کی زد میں تھا۔ایک فائرر اپنے ہر فائر کے بعد قریب لگی سکرین پر فائر شدہ گولی کو باآسانی دیکھ سکتا تھا۔اگلے دو دن ہم نے مختلف فاصلوں سے ہدف پر فائر کرنے میں گزارے۔فائرنگ کی کارروائی دوپہر تک ہوتی اس کے بعد ہم واپس آجاتے۔

دوسرے دن فائر کے اختتام پر انسٹرکٹرز نے ہمیں اگلے دن فائنل فائر کے متعلق بتا دیا۔لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کا اختتامی فائر تھا۔اس کے بعد سنائپر کورس کی شروعات ہونا تھی۔

ہم دونوں اپنی اپنی رائفل کمرے ہی میں اٹھا لاتے تھے۔وہاں رائفل کمرے میں لانے کی اجازت تھی ۔البتہ کسی بھی سنائپر کو ایمونیشن کمرے میں لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

سردار خان مجھے مخاطب ہوا۔"ذیشان بھائی!......کل ہندوؤں کو آگے نہ بڑھنے دینا؟"

"سینئر تم ہو سردار بھائی!......اور یہ تمھاری ذمہ داری ہے میری نہیں؟"

"لانس نائیک اور سپاہی میں فرق ہی کتنا ہوتا ہے؟"

میں ہنسا۔"یہ تو تمھاری سوچ ہے؟پاک آرمی میں تو ایک دن پہلے آنے والا سینئر گردانا جاتا ہے اور تم دو مختلف رینکوں کو مماثل کرنے کے چکر میں ہو؟"

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔"مگر یہ پاکستان تو نہیں ہے نا؟"

میں کب پیچھے رہنے والا تھا۔فوراً جواب دیا۔"ہم تو پاکستانی ہیں نا بھائی؟"

"تم شاید بھول رہے ہو؟وہاں پہلے نمبر پر کون آیا تھا؟"

"پہلے نمبر پر آنے سے عہدے میں فرق نہیں پڑتا میرے بھائی؟"

"اچھا مذاق چھوڑو نا یار!......میں اپنی پوری کوشش کروں گا،مگر یہ بھی دیکھو کہ تمھارا فائر مجھ سے کہیں بہتر ہے؟"

"ٹھیک ہے۔فی الحال تو رائفل کو صاف کر لیں۔"میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کلینگ راڈ میں چندی ڈالنے لگا۔

"چلو۔"وہ بھی اپنی رائفل کی طرف متوجہ ہو گیا۔(رائفل کی بیرل فائر کے بعد اندر سے بہت زیادہ گندی ہو جاتی ہے۔فائر سے پیدا ہونے والی آلودگی رائفل کی بیرل کے اندر جم جاتی ہے۔اگر اس آلودگی کو صاف نہ کیا جائے تو بہت جلد بیرل اندر سے خراب ہو جاتی ہے۔نتیجے کے طور پر رائفل فائر کے قابل نہیں رہتی۔ایک اچھا سنائپر اپنی رائفل کی صفائی کا اہتمام اپنے چہرے سے بھی زیادہ کرتا ہے)

☆......☆......☆

اگلے دن فائرنگ رینج پر پہنچتے ہی ہمارے سینئر انسٹرکٹر میجر جیمس میتھونی ہمیں اختتامی فائر کے متعلق ضروری

ہدایات دینے لگا......

”آج لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ سے فائر کرنے کا اختتامی مرحلہ ہے۔کسی بھی سکھلائی کی کلاس میں اگر مقابلے کی فضا پیدا نہ کی جائے تو سکھلائی کے اندر طلبہ کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج اختتامی فائر کے باقاعدہ نمبر دیے جائیں گے۔ ہر سنائپر کو پانچ گولیاں دی جائیں گی۔جنھیں وہ اپنی مرضی سے کسی بھی فاصلے پر سے فائر کر سکتا ہے۔فاصلے کی اکائی تین سو میٹر ہے۔اور یہاں سے ایک گولی کے ہدف کو لگنے کے نمبر عشاریہ پچیس ہوں گے۔پانسو میٹر سے ایک گولی کے نمبر عشاریہ پچاس، سات سو میٹر سے ایک گولی کا ایک نمبر، ہزار میٹر سے ایک گولی کے دو نمبر، پندرہ سو میٹر سے ایک گولی کے تین نمبر اور اٹھارہ سو کے فاصلے سے ایک گولی کے چھ نمبر ہوں گے۔کوئی بھی فائرر اپنی تمام گولیاں تین سو میٹر کے فاصلے سے بھی فائر کر سکتا ہے اور اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے سے بھی بلکہ انیس سو یا دو ہزار میٹر سے فائر کرنے کی بھی ممانعت نہیں ہے۔انیس سو میٹر پر ایک گولی کے نو نمبر ہوں گے۔یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ لیوپولڈ سائیٹ کی رینج دو ہزار میٹر تک ہے مگر میں خود سترہ سو کے بعد ہدف کو نشانہ بنانے میں ناکام رہا ہوں۔ہمارے ایک انسٹرکٹر ہوا کرتے تھے پیٹر سمتھ۔وہ اٹھارہ میٹر کے فاصلے سے ہدف کو نشانہ بنا لیتے تھے۔لیکن تم لوگوں کی بدقسمتی کہ میں ان سے تمھاری ملاقات نہیں کرا سکتا، کیونکہ قریباً دو ماہ پہلے وہ وفات پا چکے ہیں۔خیر یہ ایک ضمنی بات تھی میں تم لوگوں کے حوصلے کو مہمیز نہیں کرنا چاہتا۔اور یاد رکھنا کہ یہ فائر جوڑیوں کی صورت میں ہو رہا ہے اس لیے دو آدمیوں کے نمبر ملا کر نتائج کا اعلان کیا جائے گا۔اب تمام سنائپرز اپنے فائرنگ اڈوں پر تشریف لے جا سکتے ہیں۔“

میجر جیمس میتھونی کی بات ختم ہوتے ہی ہم فائرنگ اڈوں کی جانب بڑھ گئے۔میں سردار خان کو فائرنگ کی ہدایات کے متعلق بتانے لگا۔میری بات ابھی تک درمیان میں تھی کہ مجھے میجر جیمس میتھونی نے پکارا۔

”مسٹر ذیشن!“ وہ میرے نام میں الف کو حذف کر دیتے تھے۔

”جی سر!......“میں نے رک جواب دیا۔

”میرے پاس آسکتے ہو؟“

”یس سر!......“ کہہ کر میں نے سردار کو کہا۔”تم جاؤ میں انسٹرکٹر کی بات سن کر آتا ہوں۔اور سردار سر ہلا کر

فائرنگ اڈے کی سمت چل پڑا۔جبکہ میں میجر جیمس میتھونی کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے نزدیک ،جینفر ہنڈ سلے ،یہودی ڈونلڈ پاسکو،جاپانی مان ین لی ،شری کانت اور جمیل خان افغانی کھڑے تھے۔

"جی سر!......"میں نے قریب جا کر اسے سیلوٹ کیا۔

سر کے اشارے سے میرے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے وہ گویا ہوا......

"تمام کو بلانے کا مقصد یہ ہے کہ پریکٹس فائر کی کمپیوٹر رپورٹ کے مطابق چھیوں کا فائرنگ رزلٹ سب سے اچھا ہے۔آج فائنل ٹیسٹ ہے اور میری خواہش ہے کہ پہلی پوزیشن پر تم ہی میں سے کوئی کھڑا نظر آئے۔لیکن یہ یاد رکھنا کہ کسی اکیلے کی کارکردگی اسے پہلا نمبر نہیں دلا سکتی۔سنائپنگ میں اپنے ساتھی کو بھی ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔کیپٹن ہنڈ سلے !......تمھارے پاس تو ساتھی کے چناؤ کی تین آپشن موجود ہیں۔اسی طرح مسٹر ڈونلڈ کے پاس بھی تین آپشن موجود ہیں کہ یہ اپنے کسی بھی ہم وطن کا انتخاب کرسکتا ہیں۔لیکن باقی چاروں کے پاس ایسی کوئی آپشن موجود نہیں ہے۔اس لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔پہلی تین پوزیشنوں کا حصول تمھارے اور تمھارے ملک کے لیے ضرور قابل فخر بات ہوگی۔کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"جی سر!......"ہم نے بیک زبان کہا۔اسی وقت فائرنگ کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔

"او کے!......بیسٹ آف لک۔"میجر جیمس نے ہمیں واپس جانے کا اشارہ کیا۔اور ہم اپنے اپنے فائرنگ اڈوں کی جانب بڑھ گئے۔وہاں چونکہ فائرنگ کے دس اڈے بنائے گئے تھے اس لیے ہر اڈے پر سات ،آٹھ سنائپر فائر کرتے تھے۔ہمارے اڈے پر انڈین اور نیپالی سنائپر بھی ہمارے ساتھ موجود تھے۔

میں اس لحاظ سے باقیوں سے خوش قسمت تھا کہ میرا ساتھی بھی ایک اچھا فائرر تھا۔یہ سوچ میں میرے دماغ میں سرگرداں تھی کہ رزلٹ اناؤنسمنٹ کرنے والی کی دلکش آواز میرے کانوں میں پڑی۔اعلان کیا تھا کہ اس نے میرے سر پر بم پھوڑ ڈالا تھا۔

"پاکستان سے تعلق رکھنے والے سردار خان نے تین سو میٹر کے فاصلے سے پانچ گولیاں کامیابی سے ہدف

پر ہٹ کر دی ہیں۔'' وہ دوسرے کچھ نام بھی لے رہی تھی۔مگر میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔میرے ساتھ چلنے والے شری کانت نے قہقہہ لگایا۔

''لو جی ساتھی!......تمھارے بڈی نے کامیابی سے پانچ گولیاں ہدف پر ماردی ہیں اور ایک نشانہ بھی خطا نہیں ہوا۔''

غم و غصے کو ضبط کرتا میں فائرنگ اڈے پر پہنچا۔''سردار خان!......یہ کیا کر دیا؟''

میرا لہجہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ وہ پریشان نہ ہوتا۔

''کیا ہوا ذیشان بھائی......؟ دیکھو تو میں نے تمام گولیاں ہٹ کر دی ہیں؟''

میں نے جھلا کر کہا۔''تمھیں کس نے کہا تھا کہ فائرنگ شروع کرو؟''

''مم......مجھے اس نے کہا تھا۔'' اس نے راج پال کی جانب اشارہ کیا۔

راج پال معصومانہ لہجے میں کہنے لگا۔''میں نے تو فقط اتنا بتایا تھا کہ ہر سنائپر کو اجازت ہے وہ جس فاصلے سے چاہے فائر کرے؟ اور کیا یہ غلط ہے؟''

''ذیشان بھائی!......آخر ماجرہ کیا ہے؟......مجھے بھی تو بتاؤ۔کیا غلط کر دیا ہے میں نے؟ اور تمھیں معلوم تو ہے مجھے انگریزی زبان نہیں آتی؟''

شری کانت طنزیہ لہجے میں بولا۔''اسی لیے مشورہ دیا تھا کہ پڑھ لکھ کر آنا تھا؟''

''مسٹر شری کانت!......پلیز اپنے کام سے کام رکھیں۔اور یہ سارا قصور تمھارے ساتھی کا ہے؟ اسے کیا ضرورت تھی آدھی بات بتانے کی؟''

راج پال نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔''میں کسی کا نوکر نہیں کہ ترجمہ کرتا پھروں؟''

ساتھ ہی شری کانت نے لقمہ دیا۔''ہمیں دوش دینے کے بجائے اپنی ساتھی کو جھڑکو؟''

راج پال کی حرکت گھٹیا ہونے کے باوجود میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔سردار خان بھی برابر کا قصوروار تھا اسے میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

''میرے ساتھ آؤ سردار!'' میں واپس میجر جیمس کی جانب مڑ گیا۔سردار بھی سر ہلاتا ہوا میرے ساتھ ہولیا۔

''ذیشان بھائی!...... بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟'' سردار نے پریشانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یار سردار!...... تمھیں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا؟...... ہندو کو دشمن سمجھنے کے باوجود تم نے اس کا اعتبار کر لیا؟''

''اس نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ ایک منٹ میں پانچ گولیاں فائر نہیں کی جاسکتیں؟...... بس مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے سوچا جب ہر آدمی کی مرضی ہے کہ وہ جس فاصلے سے چاہے فائر کرے تو کیوں نا؟ تین سو سے فائر کر کے اس ہندو کا منہ تو بند کر دوں۔ یقین کرو تمھارے آنے سے پہلے اس نے میری پیٹھ تھپتھا کر مجھے شاباش دی تھی۔''

''ہاں شاباش تو اس نے دینا تھی کہ ہمیں پوزیشن سے جو آوٹ کر دیا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے جناب!...... کہ تین سو کے فاصلے سے ایک گولی لگنے کے عشاریہ پچیس نمبر ہیں اور تمھاری پانچ گولیوں کے ٹوٹل سوا ایک نمبر ملے ہیں۔ اب بس میرے والی پانچ گولیاں رہتی ہیں اور ان پانچ گولیوں سے ہم کیسے کسی پوزیشن پر آسکتے ہیں؟''

میری بات سن کر سردار ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ اسے غلطی کا احساس تو ہو گیا تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میجر جیمس نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بڑی سکرین پر مختلف سنائپرز کے فائر کا جائزہ لے رہا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''مسٹر ذیشان!...... تمھارے ساتھی نے کیا بے وقوفی کا مظاہرہ کیا ہے؟''

''سر! اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔ یہ اصل میں انگلش زبان سے نابلد ہے۔ راج پال نے اسے مس گائیڈ کیا اور اس نے تمام گولیاں تین سو کے فاصلے سے فائر کر دیں۔''

''تو اس ضمن میں، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''سر!...... اگر میرے ساتھی کو دوبارہ موقع دیا جائے............؟''

''نہیں ذیشان! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟......اس طرح تو وہ تمام جو ایک دفعہ فائر کر چکے ہیں؟ دوبارہ فائر کرنے پر اصرار کریں گے۔ معذرت خواہ ہوں۔ بس اسے اپنی قسمت سمجھ کر قبول کر لو۔''

''اوکے سر!......''میجر جیمس کا حتمی لہجہ سن کر میں نے مزید منت زاری سے پرہیز کرتے ہوئے واپس جانا ضروری سمجھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں ذیشان بھائی!......''سردار خان نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔''میری وجہ سے یہ گڑبڑ ہوئی۔''

''اچھا چھوڑو یار!......''میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''شاید پوزیشن ہماری قسمت ہی میں نہیں تھی؟''

واپس فائرنگ اڈے پر جا کر میں شری کانت پارٹی کو فائر کرتے دیکھنے لگا۔خود میرا جی بالکل فائر سے اچاٹ ہو گیا تھا۔شری کانت نے پندرہ سو میٹر سے چار گولیاں ہٹ کیں اور اس کی ایک گولی خطا گئی تھی۔فائر اڈے سے پیچھے ہٹ کر اس نے مجھے فائر کرنے کی دعوت دی۔

''شکریہ......آپ جاری رکھیں۔''میرا موڈ سخت آف تھا۔شری کانت نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ نیپالی سنائپرز کو دعوت دے دی۔دونوں نیپالی سنائپر فائر کرنے لگے۔اس کے بعد راج پال نے اپنی پانچوں گولیاں ہزار میٹر کے فاصلے سے فائر کر کے دس نمبر حاصل کر لیے۔جینیفر نے پانچ گولیاں پندرہ سو میٹر کے فاصلے سے کامیابی سے ہٹ کر کے پندرہ نمبر حاصل کر لیے تھے۔جینیفر کے ساتھی نے بھی دس نمبر حاصل کیے تھے۔پہلی پوزیشن پر پچیس نمبر کے ساتھ جینیفر پارٹی براجمان تھی۔چوبیس نمبر حاصل کر کے اسرائیل کا ڈونلڈ پاسکو اور اس کی ساتھی سنائپر اینڈریا برٹن دوسری پوزیشن پر تھے۔جبکہ بائیس نمبر کے ساتھ تیسری پوزیشن پر جاپانی اور انڈین سنائپرز کی ٹیمیں آئی تھیں۔سب سے کم نمبر ہماری ٹیم کے تھے۔سوا ایک نمبر کے ساتھ ہم سب سے آخری پوزیشن پر تھے۔تاہم ابھی تک میرے پاس پانچ گولیاں موجود تھیں۔میرا نام اناؤنس کر کے مجھے مطلع کیا گیا کہ فائر سے رہ جانے والا میں اکیلا سنائپر باقی ہوں۔

اسی وقت جینیفر بھی وہاں پہنچ گئی۔شاید مجھ پر طنز کرنے آئی تھی۔''تیسری پوزیشن کی مبارک ہو مسٹر کانٹ!''وہ با آواز بلند شری کانت کو مبارک باد دیتے ہوئے بولی۔

"شکریہ کیپٹن!......اصل مبارک باد کی مستحق تو تم ہو؟"

"صحیح کہا......" وہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔"ویسے ہم نے اور تمھارے پڑوسیوں نے بریکٹ بنا دی ہے۔ایک سائیڈ پر ہم اور دوسری جانب تمھارے ہمسائے؟"

"بھلا وہ کیسے؟" شری کانت مجھے جلانے کا کوئی موقع کیسے ہاتھ سے جانے دے سکتا تھا۔

وہ اطمینان سے بولی"اول ہم اور سب سے پیچھے پاکستان، درمیان میں باقی سب۔"

جواباً شری کانت قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔"ایسی بھی کوئی بات نہیں کیپٹن!......مسٹر ذیشان کی پانچ گولیاں بقایا ہیں۔یقیناً وہ پانسو سے فائر کر کے اڑھائی نمبر لے لے گا سوا ایک نمبر ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔بس پونے چار نمبر لے کر ہمارے ساتھی سیکنڈ لاسٹ ہو جائیں گے؟......اور یہ تمھیں معلوم ہوگا کہ انڈونشین سنائپرز کے ساڑھے تین نمبر ہیں۔"

"ہا......ہا......ہا" دونوں نے با آواز بلند استہزائی قہقہہ لگایا۔

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔سرداران کی گفتگو تو نہیں سمجھ پا رہا تھا مگر یہ اندازہ اسے ضرور تھا کہ وہ ہمارے متعلق ہی کچھ کہہ رہے ہیں۔مگر اس وقت وہ اتنا پشیمان تھا کہ غصہ بھی ظاہر نہیں کر پا رہا تھا۔اسی وقت میں نے میجر جیمس کو اپنی جانب آتے دیکھا۔

"آر یو فائن مسٹر ذیشن؟" قریب آتے ہی وہ فکر مندی سے مستفسر ہوا۔

"یس سر!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم فائر نہیں کر رہے ہو؟......کوئی مسئلہ؟"

"نہیں سر!......بس فائر کرنے ہی لگا تھا۔" اپنی رائفل اٹھا کر میں فائرنگ اڈے کی جانب بڑھا۔

"سنو؟" میجر جیمس نے مجھے متوجہ کیا۔"تم پانچ گولیاں پندرہ سو میٹر کے فاصلے سے ہٹ کر کے چوتھی پوزیشن لے سکتے ہیں۔اس وقت افغانی سنائپرز سولہ پوائنٹ کے ساتھ چوتھی پوزیشن پر ہیں۔"

"پندرہ سو میٹر سے پانچ گولیاں؟" شری کانت نے قہقہہ لگایا۔جینیفر اور گوپال نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

میں ان کے قہقہے پر تبصرہ کیے بغیر فائرنگ پوزیشن بنانے لگا۔فائرنگ کے لیے سب سے بہترین اور آرام دہ

پوزیشن لیٹی پزیشن ہوتی ہے۔اس حالت میں ایک فائرر کے تمام اعضاء پرسکون حالت میں ہوتے ہیں۔اور پھر رینج ماسٹر کے ساتھ فائر کرنے میں سب سے بڑی سہولت یہ ہے کہ رائفل کے ساتھ لگی دوپائی کی وجہ سے بیرل کو تھامنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔فائرر کو صرف بٹ کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ہدف کو حرکت دینے والے بٹن کو دبا کر میں نے ہدف کو پندرہ سو میٹر کے فاصلے پر ایڈجسٹ کیا۔لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ پر بھی پندرہ سو میٹر کا فاصلہ ایلی ویشن ناب پر سیٹ کر کے میں نے ہدف کے درمیان میں شست لی اور سانس روک کر ٹریگر دبا دیا۔

ساتھ لگی سکرین پر نظر ڈالنے سے پہلے میری سماعتوں تک شری کانت پارٹی کا قہقہہ پہنچ گیا تھا۔گولی ہدف کے دائیں طرف نکل گئی تھی۔

میں نے سٹپٹا کر سائیٹ پر لگی ڈیفلکشن ناب کو دیکھا۔(ڈیفلیکشن ناب سے رائفل کی دائیں بائیں کی غلطی درست کی جاتی ہے)میں نے ڈیفلیکشن زیرو لگائی ہوئی تھی کیونکہ رائفل میں دائیں بائیں کی کوئی غلطی موجود نہیں تھی۔اور چونکہ میں دو دن سے اسی ڈیفلکشن پر فائر کر رہا تھا اس لیے میں نے ڈیفلکشن ناب کو چھونے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔لیکن غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے کمینے اور کم ظرف دشمن کو نظر انداز کر دیا تھا۔کسی بد باطن نے ڈیفلکشن ناب کو اپنی پوزیشن سے ہلا دیا تھا۔اور ایسا شری کانت یا راج پال کے علاوہ کون کر سکتا تھا۔میں انسٹرکٹر سے شکایت کرنے کی حالت میں بھی نہیں تھا کہ ڈیفلیکشن ناب کا جائزہ نہ لینا میری اپنی غلطی تھی۔چند گہرے سانس لے کر میں نے اپنا بلڈ پریشر نارمل کیا۔ڈیفلکشن ناب کو گھما کر صفر پر لگایا اور دوبارہ فائر کے لیے تیار ہو گیا۔اگلی گولی میں نے بڑی آسانی سے ہدف کے بیچوں بیچ ہٹ کر دی تھی۔یوں دو گولیاں فائر کر کے میں نے تین پوائنٹ حاصل کر لیے تھے۔اگر میں باقی رہ جانے والی تین گولیاں اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے سے فائر کرتا تو تینوں گولیوں کے ہٹ ہونے کی صورت میں مجھے اٹھارہ پوائنٹ ملتے۔تین پوائنٹ دوسری گولی کے اور سوا پوائنٹ سردار خان والے ملا کر ہم سوا بائیس نمبر لے کر تیسری پوزیشن پر آ سکتے تھے۔اور اگر میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو شری کانت پارٹی کے استہزائی قہقہوں کا بدلہ لے سکتا تھا۔یہ سوچتے ہی میرا ہاتھ ہدف کو حرکت دینے والے بٹن پر پڑا۔اور جب تک ہدف اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے تک نہ پہنچا میں نے بٹن دبائے رکھا۔

''اچھی کوشش، میں تمھارے حوصلے کی داد دیتا ہوں؟'' مجھے پشت کی جانب سے میجر جیمس کی آواز سنائی دی

''سٹھیا گیا ہے؟'' شری کانت نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔

''نہیں بھئی!...... پیٹر سمتھ بننے کی کوشش میں ہے؟'' اس دفعہ جینیفر کی آواز نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا تھا۔

مگر میں تمام سے بے نیاز نشانہ سادھنے لگا۔ اٹھارہ سو میٹر کا طویل فاصلہ نا قابلِ شکست کھائی کی صورت میں میری تمنا کی راہ میں حایل تھا۔ لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کے دیکھنے کی طاقت انسانی آنکھ سے پچیس گنا زیادہ ہے۔ خالی آنکھ سے نظر نہ آنے والا ہدف سائیٹ کے اندر بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔ دو تین گہرے سانس لے کر میں نے خود کو نارمل کیا اور پھر مکمل سانس روک کر ٹریگر دبا دیا۔

''شاباش۔'' میرے کانوں میں میجر جیمس کی داد دینے والی آواز گونجی۔ ''جوان!...... تم نے کر دیکھایا۔''

فائر کرنے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آنکھیں کھول کر میں نے سکرین کی جانب دیکھے بغیر دوبارہ پہلے والی جگہ پر شست سادھی اور سانس روک کر اگلا راؤنڈ بھی فائر کر دیا۔

''زبردست!......'' میجر جیمس کے نعرے نے میری سماعتوں میں رس گھولا۔ میں نے سکرین کی جانب دیکھا دونوں گولیاں درمیانی نقطہ سے چند انچ اوپر لگی تھیں۔ تیسری گولی فائر کر کے میں شری کانت پارٹی کو ہرا سکتا تھا۔ مگر پھر بھی میں تیسری پوزیشن لے پاتا۔ ایک سوچ میرے دماغ میں سرسرائی اور میں کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' میجر جیمس نے آگے بڑھ کر مجھے کندھوں سے تھاما۔ ''تم کر سکتے ہو؟...... بس آرام سے۔ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑو۔''

''شکریہ سر!'' کہہ کر میں نے ایک گہرا سانس لیا۔

''تم کچھ اور سوچ رہے ہو؟'' میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میجر جیمس نے اضطراری انداز میں کہا۔ شاید اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔

''نہیں......نہیں تم تیسری پوزیشن کھو دو گے؟'' اس کی گرفت میرے بازوؤں پر بہت سخت ہو گئی تھی۔

''شاید ایسا نہ ہو؟'' میرے منہ سے نحیف آواز برآمد ہوئی۔

میجر جیمس نے میرے بازو چھوڑ کر دونوں ہاتھ آپس میں رگڑے۔''اوکے......اوکے، میں کچھ نہیں کہتا؟ مگر ایسا ہو گیا تو؟......بہت انوکھا ہو گا؟''اس نے سارا بوجھ میری جانب منتقل کر دیا۔وہ واقعی ایک ذہین انسٹرکٹر تھا کہ اپنے شاگرد کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کا ارادہ جان گیا تھا۔

''سردار اپنی ذمہ داری سنبھالو۔''شری کانت اور راج پال کے پژمردہ چہروں پر ایک نگاہ ڈال کر میں دوبارہ فائر کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

سردار جو اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے سے دو گولیوں کو ہٹ ہوتے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔''جی ذیشان بھائی!......''کہہ کر میرے قریب آ گیا۔اس نے میری کمر کے قریب بیٹھ کر اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا، گویا اس وقت اس کی دعائیں، اس کا حوصلہ، اس کی قوت سب کچھ مجھے مل گیا تھا۔میں اکیلا نہیں تھا ہم دو تھے۔اور یہ سنائپرز کا خاص انداز ہوتا ہے۔کسی بھی مشکل فائر کے وقت اسے اپنے ساتھی کا جذباتی سہارا چاہیے ہوتا ہے۔اور پھر سردار کا ہاتھ مجھے اپنے مشفق استاد عمر دراز کا ہاتھ لگا۔اس کے ساتھ میری سماعتوں میں استاد عمر دراز کی سرگوشی گونجی......

''ذیشان بیٹا!......ناممکن صرف وہ کام ہے جس کے بارے سوچا نہ جا سکے۔پیٹر سمتھ نے اٹھارہ سو میٹر سے کامیاب فائر کیا تھا اور تم نے بھی یہ کر دکھایا، لیکن یاد رکھو رینج ماسٹر کی کارگر رینج دو ہزار میٹر ہے۔اور ایک سنائپر کو رسک لیتے رہنا چاہیے۔ورنہ اس کے پاس صرف ہار کا آپشن بچے گا۔اور ہارنا تو دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جاؤ؟......ہار جاؤ گے۔''

میرا ہاتھ ہدف کو حرکت دینے والے بٹن کی طرف بڑھا۔بٹن دباتے ہی ہدف آگے کو سرکنے لگا یہاں تک کہ سکرین پر انیس سو میٹر کا ہندسہ چمکنے لگا تھا۔اگر میں انیس سو سے گولی ہٹ کر لیتا تو مجھے نو نمبر ملتے اور سوا پچیس نمبروں کے ساتھ ہم پہلی پوزیشن حاصل کر لیتے۔

اپنی جسمانی ہیئت درست کر کے میں نے رائفل کے بٹ کو اپنے دائیں کندھے میں پھنسایا، بایاں ہاتھ بٹ پر رکھ کر میں نے رائفل کو مضبوطی سے جکڑا، اپنی بائیں آنکھ بند کر کے میں نے دایاں گال مخصوص جگہ پر ٹیکا۔آنکھ کو ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے سے برابر فاصلے ایڈجسٹ کیا۔اور میری دائیں آنکھ کی دید ٹیلی سکوپ

سائیٹ کے عدسوں سے گزرتی ہوئی انیس سومیٹر دور موجود ہدف پر جارکی۔میں نے شست درمیانی نقطے سے ذرا نیچے لی تھی کیونکہ اٹھارہ سومیٹر کے فاصلے سے فائر ہونے والی گولی درمیانی نقطہ سے چندانچ اوپر لگی تھی۔دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی نے ٹریگر کے گرد اپنا گھیرا تنگ کیا۔اور پھر سانس روکتے ہوئے میں نے ٹریگر پریس کردیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دیا۔بالکل خاموشی چھاگئی تھی۔اور پھر اس خاموشی کو میجر جیمس کی پاٹ دار آواز نے توڑا۔

''ناقابل یقین!......''اور اس کے ساتھ میرے کانوں میں تالیوں کی آواز گونجی۔تمام سنائپرز آہستہ آہستہ اسی فائرنگ اڈے کے قریب جمع ہوگئے تھے۔

''مبارک ہو ذیشان بھائی!......''سردار خان کی خوشی سے چہکتی ہوئی آواز نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔اور میں گہرا سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔سردار خان پر جوش انداز میں مجھ سے لپٹ گیا تھا۔میں نے سکرین کی جانب نگاہ دوڑائی۔یہ گولی پہلے والی دونوں گولیوں کے درمیان لگی تھی۔

سردار خان سے گلے مل کر میں جیسے ہی آگے بڑھا،میجر جیمس نے مجھے بانہوں میں بھر کر میرا ماتھا چوم لیا۔اور اس کے بعد فرداً فرداً تمام ملنے لگے۔شری کانت اور راج پال وہاں سے کھسک لیے تھے کہ کوشش کے باوجود مجھے نظر نہ آئے۔جینیفر البتہ ایک جانب کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔اس نے گہری نظروں سے میری جانب دیکھا ضرور تھا مگر مبارک باد دینے آگے نہیں بڑھی تھی۔میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پھر اپنی رائفل کی جانب بڑھ گیا۔کیونکہ میجر جیمس نے واپسی کا اعلان کردیا تھا۔

اپنی رائفل کو بیگ میں رکھتا ہوا سردار خان دوبارہ مجھ سے لپٹ گیا۔

''شکریہ ذیشان بھائی!......تم نے مجھے بہت بڑی شرمندگی اور پشیمانی سے بچالیا۔''

''نہیں سردار!......شکریہ تمھارا کہ مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ورنہ دوسری صورت میں، میں کبھی بھی اتنا بڑا رسک نہ لے پاتا۔''

''ان بنیوں کی شکلیں تو اس وقت دیکھنے والی تھیں جب تم اٹھارہ سومیٹر سے دوسری گولی بھی ہٹ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔''

"ویسے نظر نہیں آئے؟"

"نظر تو اب وہ کافی دن تک نہیں آئیں گے؟" سردار خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔اور ہم پارکنگ میں کھڑی لگژری بس کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

اتوار کا دن ہم دن چڑھے تک سوتے رہے۔اٹھے تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر ہم ڈائینگ روم کی جانب بڑھ گئے۔وہاں ہمیں بس چند آدمی ہی نظر آئے۔جاپانی لی زونا اور ساتھی کے ہمراہ موجود تھی۔مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگی۔

"لو جی!......تمھاری کارکردگی دیکھ کر لڑکیاں کافی متاثر ہوئی ہیں۔"

"یہ تو ہر کسی کو ہنس کر ملتی ہے۔بہت سادہ سی ہے؟" اسے کہہ کر میں نے لی زونا اور اس کے ساتھی کو 'ہیلو۔' کہا۔

"مجھ سے تو کبھی ہنس کر نہیں ملی؟ نہ کبھی بات ہی کی ہے؟" سردار خان نے منہ بنایا۔

"اردو یا پشتو بولنا اسے نہیں آتا،جاپانی اور انگلش سے تم ناواقف ہو تو اسے اپنی ہنسی ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟"

"کیسے ہو مسٹر ذیشان!" ہمارے کرسیاں سنبھالتے ہی لی زونا نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔ہوں سسٹر!" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"ویسے اگر میں جاپانی سیکھ لوں تو؟" سردار خان نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا فائدہ؟......جب تک تم جاپانی زبان سیکھو گے لی زونا بوڑھی ہو چکی ہوگی۔"

"تم میرے بارے کیا کہہ رہے ہو اپنے ساتھی کو؟" میرے ہونٹوں سے اپنا نام سن کر لی زونا نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے بغیر لگی لپٹی رکھے کہا۔"میرا ساتھی جاپانی زبان سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا......تو میں نے مشورہ دیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ جب تک تم جاپانی زبان سیکھو گے لی زونا بوڑھی ہو چکی ہوگی؟"

”ہا......ہا“ لی زونا اور مان ین لی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”محترم!...... یقیناً تم نے اصل بات پھوٹ دی ہوگی؟ اسی لیے یہ دونوں اتنا زور سے ہنسے ہیں؟“ سردار نے کہا۔ ”ویسے سودا گھاٹے کا نہیں ہوا، ہنستے ہوئے یہ اور بھی خوب صورت لگتی ہے۔“

”اسے بتا دوں؟“

”کہہ دو، میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ بات بگڑنے لگی تو میں مکر جاؤں گا۔ انھیں کون سا اردو زبان سمجھ میں آتی ہے؟“

”ویسے تمھارا ساتھی چاہے تو میں اسے بوڑھا ہونے سے پہلے جاپانی زبان سکھا سکتی ہوں۔“ لی زونا نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی بات کا ترجمہ سردار کے سامنے دہرایا۔

”مکمل زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں؟ بس اتنا ہی سکھا دے کہ کسی کو آئی لو یو کیسے کہتے ہیں؟“

اور میرے منہ سے سردار کا جواب سن کر مان ین لی تو زور زور سے ہنسنے لگا البتہ لی زونا شرما کر کہنے لگی۔

”شکل سے تو بہت بھولا لگتا ہے؟ واقعی میں یہ سب کچھ اسی نے کہا ہے؟ یا تم اپنی طرف سے کہے جا رہے ہو؟“

”تمھیں کیسے یقین آئے گا؟“

”اچھا چھوڑیں؟“ وہ اپنے سامنے دھری پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”کیا کہہ رہی ہے؟“ سردار خان نے بے تابی سے پوچھا۔

”خان صاحب!...... میرا خیال ہے چنارے بیگم کے ہاتھوں حرام موت مرنے سے بہتر ہے تم کسی مشن میں جامِ شہادت نوش کرو؟“

”اس میں چنارے بیگم کہاں سے آن ٹپکی؟...... اور اسے بھلا یہ کون بتائے گا؟“

”تو کیا لی زونا کے ہاتھوں گولی کھانی ہے؟ کافی اچھا نشانہ ہے۔ کل دس پوائنٹ حاصل کیے ہیں محترمہ نے؟“

''اب تم نے پھر اس کا نام لے لیا اور وہ ہماری جانب دیکھ رہی ہے؟ کیا سوچ رہی ہوگی ہمارے بارے ؟''لی زونا کو اپنی جانب گھورتا پا کر سردار خان پریشانی سے بولا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔''ہمارے نہیں؟......تمھارے بارے خان صاحب!''

لی زونا نے ٹشو اٹھا کر ہاتھ صاف کیے اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے بولی۔''ویسے میں کافی بہت اچھی بناتی ہوں ذیشان صاحب!''مان ین لی بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا تھا۔

''ضرور۔''میں نے خوش دلی سے کہا۔''ڈنر کے بعد ہم تمھارا ٹیسٹ لینے آئیں گے؟''

''سر آنکھوں پر۔''وہ ایک گہری نگاہ سردار خان پر ڈال کر مان ین لی کے ساتھ چل پڑی۔

''ضرور میرے بارے کچھ برا کہا ہوگا؟ جبھی تم بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہے تھے؟''ان کے ڈائیننگ ہال سے نکلتے ہی سردار شکوہ کناں ہوا۔

''نہیں یار!......وہ کافی پینے کی دعوت دے رہی تھی؟''

''تو ٹھیک ہے نا؟......انکار کیوں کر دیا؟''سردار خان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔

''انکار کہاں کیا ہے؟......رات کے کھانے کے بعد جائیں گے؟''

''چلو پھر ٹھیک ہے۔''سردار خان دوبارہ کھانے کو جڑ گیا۔

☆......☆......☆

سنائپرز لڑکیاں علیحدہ بلاک میں تھیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جینیفر لی زونا کی روم میٹ ہے تو میں کبھی بھی وہاں نہ جاتا۔ جس وقت ہم دونوں لی زونا کے کمرے میں پہنچے وہ اکیلی بیٹھی ٹی وی پر کوئی جاپانی فلم دیکھ رہی۔

''آئیں ذیشان صاحب!''اس نے فرداً فرداً ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔''بیٹھیں۔''اس نے بیڈ کی جانب اشارہ کیا۔

ہم دونوں اس کے بیڈ سے متصل پڑے بیڈ پر بیٹھ گئے۔''مان ین لی نظر نہیں آ رہا؟''میں نے بیٹھتے ساتھ پوچھا۔

''ابھی اپنے کمرے کی طرف گیا ہے؟ اسے نیند آئی ہوئی تھی۔''

”اگر تم نے بھی سونا ہو تو......؟“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے سرعت سے بولی۔”نہیں نہیں......میں اتنا جلدی نہیں سوتی۔“

سردار نے میرے کان میں سرگوشی کی۔”مجھے اس کی صورت دکھانے ساتھ لائے ہو؟“

میں نے مسکراتے ہو کہا۔”کیا یہ کم ہے؟“

مجھے ہنستے دیکھ کر لی زونا بھی اپنے ہونٹوں پر تبسم بکھیرتے ہوئے پوچھنے لگی۔”کیا بات ہو رہی ہے؟“

”کہہ رہا ہے مجھے اپنا مترجم بنا کر لایا ہے اور میں نے خود تم سے گپ شپ ہانکنی شروع کر دی ہے؟“

”اچھا بڑا تیز ہے یہ؟“وہ معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے کھڑی ہوئی۔”میں کافی بنا لوں؟“وہ کونے میں بنے کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی جہاں الیکٹرک کیتلی رکھی ہوئی تھی۔

”کیا کہہ دیا اسے؟“

”وہی جو تم نے کہا تھا۔“

”ساتھ اس کا جواب بھی بتا دیا کرو؟“

”کافی بنا رہی ہے۔“

”کافی تو ہم اپنے کمرے میں بھی بنا کر پی سکتے تھے؟“سردار نے منہ بنایا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر جینیفر اندر داخل ہوئی۔ہم دونوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی

”جینی آؤ......“اسے دیکھتے ہی لی زونا خوش دلی سے بولی۔”مہمانوں کے لیے کافی بنا رہی ہوں تم لینا پسند کرو گی؟“

جینیفر نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سخت لہجے میں کہا۔”یقیناً مہذب لوگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی کے بیڈ پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھنے کی زحمت کریں۔“

”جینی!......سوری تمھیں برا لگا۔اصل میں انھیں میں نے یہاں بیٹھنے کو کہا تھا۔“اس کا تلخ لہجہ سن کر لی زونا گھبرا گئی تھی۔

میں سردار کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔”ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ تمھارا بیڈ ہے ورنہ کبھی ایسی جسارت نہ کرتے

؟‘‘

’’عذرِ گناہ بدتر از گناہ؟‘‘جینیفر نے انگریزی میں جو کچھ کہا اس کا بامحاورہ ترجمہ یہی بنتا تھا۔

’’اوکے لی زونا!......پھر کبھی سہی؟‘‘لی زونا کو کہہ کر میں نے سردار کو چلنے کا اشارہ کیا۔

’’پلیز ذیشان!......بیٹھیں نا؟......میرے بیڈ پر بیٹھ جائیں یا یہ کرسیاں لے لیں؟‘‘لی زونا نے ایک کونے میں پڑی ہوئی دو کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔وہ جینیفر کے رویے اور ہمارے ردعمل پر پریشان ہوگئی تھی۔

’’نہیں شکریہ۔تمھاری طرف سے کافی ہوگئی۔‘‘یہ کہہ کر میں سردار کے ساتھ باہر جانے لگا۔میری طرف سے سخت جواب نہ ملنے پر جینیفر نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی۔بس خاموش کھڑی کڑے تیوروں سے مجھے گھورتی رہی۔

’’اب کیا ہوا؟......‘‘باہر نکلتے ہی سردار خان نے معصومیت سے پوچھا۔’’میں تو بس بے زبان جانوروں کی طرح بغیر کچھ جانے تمھارے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہوں؟‘‘

’’یار!......کیپٹن صاحبہ کو ہماری وہاں موجودی پر اعتراض تھا۔‘‘

’’تو وہ اس اکیلی کا کمرہ تو نہیں ہے؟‘‘

’’بے شک نہ ہو؟......مگر ہم وہاں خواہ مخواہ لڑائی جھگڑا تو نہیں کر سکتے تھے؟یوں بھی اسے اپنی ہار کا غم ہے؟وہ کوئی ایسی بکواس بھی کر سکتی تھی کہ جسے میں برداشت نہ کر پاتا اور بات بہت بڑھ جاتی۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘سردار نے میرے ساتھ متفق ہونے میں تاخیر نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

سوموار کے دن سنائپر کورس کی شروعات میجر جیمس میتھونی کے لیکچر سے ہوئی۔

’’تمام کو ایک بار پھر خوش آمدید۔لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کی سکھلائی کی ایک سنائپر کے لیے کارآمد سہی،مگر اس کے باوجود اس کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی اس کے بارے مکمل جانکاری حاصل کرنے کے بعد اچھا سنائپر بننے کا دعوا کر سکے۔ہر اچھا سنائپر اچھا نشانہ باز ضرور ہوتا ہے،مگر ہر اچھا نشانہ باز اچھا سنائپر نہیں ہو سکتا۔سنائپنگ کے لیے نشانہ بازی کے علاوہ بھی بہت خوبیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اچھا مشاہدہ،قوت

برداشت ،بہترین یاداشت ،بروقت فیصلہ کرنے کی صلاحیت ، بھوک، پیاس ،سردی، گرمی برداشت کرنے طاقت اوراس کے علاوہ بھی کافی کچھ۔ابھی اگر میں مشاہدے اور یاداشت کی بات کروں تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تمام لوگوں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہوگا جو سامنے آ کر کلاس کے ہر فرد کواس کے نام سے پکار سکے ۔حالانکہ تم لوگ ایک ہفتے سے ساتھ ہو؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘میجر جیمس نے سوالیہ انداز میں اپنی طائرانہ نگاہ چاروں طرف گھمائی پہلی قطار میں بیٹھی جینیفر نے پیچھے مڑکر میری جانب گہری نظروں سے دیکھا۔میں خاموش بیٹھا رہا۔گو میں میجر جیمس کا دعوا غلط ثابت کرسکتا تھا،مگر وہ میرا استاد تھا۔اور مجھے میرے استادوں ہی نے اپنے استاد کا چیلنج قبول نہ کرنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔میجر جیمس کی بات جاری رہی......

’’یہ میں نے صرف ایک مثال دی ہے۔کافی حضرات کوشاید میری باتیں ہضم نہیں ہو رہی ہوں گی؟اوراچھی یاداشت،قوتِ برداشت وغیرہ انھیں فضول کی باتیں لگ رہی ہوں گی؟لیکن ذرا تصور کروشدید گرمی میں، بھاری گِلی سوٹ پہن کر، کسی تیار فصل میں، براہ راست دھوپ کی زد میں لیٹے ہوئے سنا ئپر کا،جسے ہدف کے انتظار میں کئی گھنٹے بے حس وحرکت وہیں لیٹنا ہو؟......اسے کتنی قوت برداشت کی ضرورت پڑے گی؟......یا وہ سنا ئپر جو کسی انجان علاقے سے گزرتے ہوئے رستے کی نشانیوں کوذہن میں بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہوتا کہ وہ واپس پلٹتے وقت راستہ نہ بھول جائے۔ایسے وقت میں کیسی یاداشت درکار ہوگی؟..........‘‘میجر جیمس مثالوں کے ذریعے اپنی بات کی وضاحت کرتا گیا۔

پہلا مکمل پیریڈ اس نے لیکچر میں گزار دیا تھا۔بریک میں سورن منگ میرے قریب آ کر مستفسر ہوا ......’’ارے پاکستانی بھائی!......تم میجر جیمس کا دعوا غلط کرسکتے تھے؟‘‘

’’فائدہ؟‘‘میں نے مسکرا کر پوچھا۔

’’اس کے دل میں تمھاری دھاک بیٹھ جاتی؟‘‘

’’شاید......‘‘میں نے اثبات میں سر ہلایا۔’’مگرعزت ختم ہوجاتی۔‘‘

’’بھلاوہ کیسے؟‘‘

’’سورن بھائی!......استاد کا چیلنج قبول کرنے کے لیے نہیں ہوتا؟سمجھانے کے لیے ہوتا ہے۔ایک میرے

سامنے آنے سے میجر جیمس کی بات میں وہ اثر نہ رہتا جواب طلبہ پر پڑا ہوگا۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘ سورن منگ اثبات میں سر ہلا کر میری پیٹھ تھپتھائی اور اپنے ساتھی کی جانب بڑھ گیا۔ سردار اس وقت جمیل خان اور سکندر علی خان کے ساتھ پشتو میں مصروفِ گفتگو تھا۔

اسی وقت لی زونا نے میرے قریب آکر ’’ہیلو‘‘ کہہ کر مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

’’کیسی ہو؟ لی زونا!‘‘ میں نے اس کا ملائم ہاتھ تھام کر پوچھا۔

’’میں رات والے واقعے پر معذرت خواہ کرنے آئی ہوں۔ نہ جانے جینیفر کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ ایسی بد اخلاق ہے تو نہیں؟‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ اور معذرت کیوں کر رہی ہو؟‘‘

’’تم میرے مہمان تھے نا؟‘‘

اسی وقت سردار خان افغانیوں سے گفتگو چھوڑ کر ہمارے قریب آگیا۔

’’ارے تم تو پشتو تازہ کر رہے تھے نا؟‘‘ اسے دیکھ کر میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

’’اوہ ہاں......مگر اچانک ایک ضروری بات یاد آگئی تھی۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’یہی کہ مجھے انگریزی سیکھ لینا چاہیے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ لی زونا کو مخاطب ہوا۔ ’’ہیلو!......مائی نیم از سردار خان اینڈ آئی بیلانگ ٹو پاکستان۔‘‘ اس کی پٹھانی لہجے میں بولی گئی انگلش سن کر لی زونا کا دلکش قہقہہ فضا میں گونجا۔

’’اینڈ آئی ایم لی زونا فرام جاپان۔‘‘ وہ سردار کے انداز ہی میں بولی تھی۔

’’یس یس آئی نو......‘‘ سردار نے جلدی سے سر ہلایا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ’’آگے کیا کہوں؟‘‘

’’کچھ بھی کہہ دو، اس نے کون سا برا ماننا ہے؟‘‘

’’سردار!......مجھ سے بات کرو نا؟‘‘ لی زونا نے ٹھہر ٹھہر کر چھوٹا سا فقرہ ادا کیا۔

’’مائی انگلش از فنش جی!......آئی سپیک لٹل لٹل انگلش۔‘‘ اس مرتبہ لی زونا کے ساتھ میں بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر پایا تھا۔ اور ہمارے قہقہے سن کر ارد گرد کھڑے کافی لوگ ہماری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”ویری انٹرسٹنگ……“لی زونا نے ہنستے ہوئے سردار کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

”تھینک یو، تھینک یو۔“ کہہ کر وہ مجھے مخاطب ہوا۔”ٹھیک کہا ہے نا؟“

”بالکل درست۔“ میں نے انگوٹھا اٹھا کر اسے شاباش دی۔

اسی وقت بریک ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور ہم کلاس روم کی طرف بڑھ گئے۔

ٹی بریک کے وقت بھی لی زونا، سردار خان کو ڈھونڈتے ہمارے قریب آ گئی تھی۔ سردار مجھ سے چھوٹے چھوٹے انگلش کے فقرے پوچھ کر اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ خود جاپانیوں کی انگلش بھی اتنی فصیح نہیں ہوتی، مگر لی زونا کو انگلش پر کافی عبور تھا۔ وہ سردار خان کی ذات میں بھی کافی دلچسپی لے رہی تھی۔

ٹی بریک کرتے ہوئے اس نے سردار خان کو سکاچ پینے کی دعوت دی تھی۔ مگر سردار نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”نو……نو……لی زونا!……ڈرٹی تھنگ۔“

وہ ہنسی۔”بٹ وائے؟“

سردار میری جانب مڑا۔”اب کیا کہوں؟“

میں نے انگریزی میں کہا۔”کہہ دو ہمارے مذہب میں شراب پینا حرام۔“

چونکہ لی زونا بھی میری بات سن رہی تھی اس لیے سردار کے دوبارہ دہرانے سے پہلے وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

”لیکن ذیشان!……کھانے پینے کی چیز کا مذہب سے کیا تعلق؟“

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے صرف عبادت کرنا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ ہر کام میں مذہب سے پوچھ کر قدم اٹھانا ہوتا ہے۔“

اس نے دلچسپی سے پوچھا۔”تو کیا تم ہر کام میں مذہب کی مکمل پیروی کرتے ہو؟“

”ہم دونوں کی حد تک تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔ البتہ ہمارے ملک میں ایسے لاکھوں مسلمان موجود ہیں جو ہر کام میں مذہب کی شمولیت کو لازم خیال کرتے ہیں۔“

”جب ہر بات پر عمل نہیں کرتے تو شراب پینے میں کیا مضائقہ ہے؟“

”کیونکہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے خصوصی طور پر منع کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔“

”یار!......اسے کن باتوں میں لگالیا ہے؟“ سردار شکوہ کناں ہوا۔”مجھے انگلش سیکھنے دو؟“

”انگلش بولنا مجھے بھی آتا ہے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے مگر لی زونا کی باتیں میری سمجھ میں زیادہ آتی ہیں۔“

لی زونا پوچھنے لگی۔”کس بحث میں پڑ گئے ہو؟“

”موصوف نے تم سے انگلش سیکھنا ہے؟ اس لیے براہ مہربانی جناب سے مخاطب ہوں۔“ لی زونا کو کہہ کر میں نے کرسی سے ٹیک لگالی۔ جبکہ وہ ہنستے ہوئے سردار خان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اور بریک کے خاتمے تک مجھے سردار خان کی فصیح و بلیغ انگلش سے بہرہ مند ہونا پڑا۔

☆......☆......☆

پہلا ہفتہ ہم کلاس روم تک محدود رہے۔ انسٹرکٹرز لیکچر کے ساتھ مختلف وڈیوز وغیرہ دکھا کر ہمیں سنائپنگ سے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی دیتے رہے۔ اس کے باوجود کہ ہم دونوں عملی طور پر بھی سنائپنگ کر چکے تھے ،وہاں بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا تھا۔ ہمیں جدید سنائپر رائفلوں کو دیکھنے، سمجھنے اور استعمال کرنے کا موقع ملا۔ مختلف ممالک کے ،گلی سوٹوں کو دیکھنے اور پہننے کا موقع ملا۔ سرکشوں اور باغیوں کے خلاف کاروائیوں میں ہمیں ایسا ایمونیشن مہیا کیا گیا جسے پینٹ ایمونیشن کہتے تھے۔ نرم پلاسٹک کے بُلٹ میں سرخ رنگ کا پینٹ بھر کر تانبے کے کیس میں فٹ کیا گیا تھا۔ یوں کہ فائر ہونے کے بعد گولی جس جگہ پر بھی لگتی سرخ رنگ کا ان مٹ نشان چھوڑ جاتی۔ اس ایمونشن کو فائر کرنے کے لیے نقل بہ مطابق اصل سنائپر رائفلیں بھی موجود تھیں۔ مختلف حرکتی ہدفوں پر ہم اصل گولیاں فائر کرتے۔ مگر مقابلے وقت یا کسی عمارتی علاقے میں دہشت گردوں کے خلاف ہونے والی کارروائی میں پینٹ ایمونیشن استعمال کرایا جاتا۔

ایک دن صبح ناشتے کے بعد ایک ایک راونڈ دے کر ہمیں اپنی پٹ (سنائپر کے زمین پر چھپنے کی جگہ) میں چھپ جانے کا حکم ملا۔ ہم جوڑیوں کی شکل میں تھے۔ کام یہ تھا کہ ہمیں سارا دن اس پٹ میں گزار کر ہدف کا انتظار کرنا تھا۔ ہدف کسی بھی وقت نمودار ہوسکتا تھا۔ ہر جوڑی کو ان کے مطلوبہ ہدف کی نشان دہی اسی وقت کی جاتی۔ ہدف نمودار ہونے کے ایک منٹ کے اندر ہدف کو نشانہ بنانا تھا۔ کھانے پینے کے نام پر ہوا میں موجود

آکسیجن اور صبر کے گھونٹ ہی تھے۔ ہماری حرکات پر نظر رکھنے کے لیے ہر پٹ پر ایک کیمرہ بھی نصب تھا جو ذرا سی بے قاعدہ حرکت کو اجاگر کر کے سنائپر کے کارکردگی نمبرز میں نمایاں کمی کرا سکتا تھا۔

علاقہ سرسبز تھا اس لیے ہم نے پٹ بناتے وقت سبزے کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا تھا۔

''ویسے، کسی نے اپنی مرضی کی جوڑی بنانے اجازت نہیں دی ورنہ ضرور میں اتنا افسردہ نہ ہوتا؟'' سردار نے پٹ میں جگہ سنبھالتے ہی موشگافی کی۔

''کچھ لوگوں کی نیت کے بارے انسٹرکٹرز کو اچھی طرح اندازہ ہے؟ وہ ایسا غلط فیصلہ کبھی بھی نہیں کر سکتے؟''

سردار ترکی بہ ترکی بولا۔ ''میں نے تمھاری اور جینیفر کی بات نہیں کی تھی کہ تم نیت کو بیچ میں لے آئے؟''

''یہ بھی خوب کہی؟...... جبکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جینیفر اور میں ایک دوسرے کو کتنا ناپسند کرتے ہیں؟''

''خوش فہمی ہے جناب کی؟...... کیپٹن صاحبہ!...... ہر وقت تمھاری ٹوہ میں لگی رہتی ہے؟'

''ہاں، اسے خداواسطے کا بیر جو ہوا؟''

''نہیں، وہ چاہتی ہے تم اس کے آگے پیچھے پھرو؟''

''راج پال اور شری کانت کم ہیں کیا؟''

''وہ دونوں تو ہیں ہی بونگے، کئی بار لی زونا کے اردگرد بھی منڈلا چکے ہیں؟''

''تمھارا مطلب ہے لی زونا کے گرد منڈلانے والے بونگے ہوتے ہیں؟''

''بس میرے پیچھے پڑے رہو؟'' الفاظ سردار کے ہونٹوں پر تھے کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یقیناً کسی کے سامنے اس کا ٹارگٹ نمودار ہو گیا تھا۔

''لیں جی؟ کسی بھائی کا انتظار تو اختتام پذیر ہوا؟''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ ہم نے جوڑیوں میں کارروائی کرنا ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے۔'' سردار نے اثبات میں جواب دیا۔

اچانک میرے سامنے پڑے میسج رسیور پر ہلکی سی ٹون کے ساتھ ایک میسج نمودار ہوا۔

''سردار خان کے لیے، نوے ڈگری، فاصلہ پانسو میٹر، سرخ رنگ کا غبارہ، وقت ایک منٹ۔''

میں نے پٹ بناتے وقت شمال کی سمت کے تعین کے لیے ایک پتھر رکھ لیا تھا۔اور شمال کی سمت اتفاق سے ہماری ناک کی سیدھ میں بن رہی تھی۔

میں نے فوراً سردار کو مطلع کیا۔”سردار پورا دائیں طرف، پانسو میٹر کے فاصلے پر نظر آنے والا سرخ غبارہ تمھارا ہدف ہے۔تمھارا وقت شروع ہے۔“

”اوکے باس!“بغیر کسی پریشانی کے سردار نے ٹیلی سکوپ سائیٹ پر پانسو میٹر کی رینج لگائی اور دائیں سمت مڑ کر دور نظر آنے والے غبارے پر شست باندھ لی۔ہر سنائپر کے پاس فائر کرنے کے لیے ایک منٹ کا وقت تھا۔میری نگاہ گھڑی پر تھی سردار کو پینتیس سیکنڈ ہو گئے تھے۔

”اطمینان سے سردار تمھارا پاس پچیس سیکنڈ ہیں۔“اسے کہتے ہوئے میری نگاہ گھڑی کی سیکنڈز والی سوئیوں پر تھی۔

”پندرہ سیکنڈ بقایا......پچاس ....“اور اس کے ساتھ ہی سردار نے ٹریگر دبا دیا تھا۔گولی چلنے کے دھماکے ساتھ میں نے غبارہ پھٹتے دیکھا۔

”شاباش سردار!......“میں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا۔”لیکن وقت زیادہ لگا ہے۔

سردار نے منہ بنایا۔”تم خود کہہ رہے تھے کافی وقت ہے اور اب کہہ رہے ہو کہ وقت زیادہ لگا ہے؟“

”وہ تو میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں گولی مس ہی نہ کر دو؟ ورنہ ہر پانچ سیکنڈ کا ایک بونس نمبر ہے۔“

”تو کیا جس نے پہلے پانچ سیکنڈ میں نشانہ بنالیا اسے گیارہ بونس نمبر ملیں گے؟“

”بالکل!“میں نے اثبات میں سرہلایا۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”بتایا تھا حضور!......مگر اس وقت تم لی زونا سے محوِ گفتگو تھے تو اس غریب کی بات پر کہاں کان دھرتے۔“

”یار! سچ کہوں تو لی زونا بالکل چنارے بیگم کی ڈپلی کیٹ لگتی ہے؟“

”جی جی بالکل ......تمام لڑکیاں ایک دوسرے کی ڈپلی کیٹ ہی ہوتی ہیں بس نین نقش کا فرق ہوتا ہے ۔ورنہ تو وہی دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک، ایک ٹھوڑی اور باقی کا پورا جسم؟“

”تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”یہ بھی جناب کی غلط فہمی ہے۔ ورنہ تو میں تمھارا ٹھیک ٹھاک مذاق اڑا چکا ہوں۔“

اسی طرح کی گپ شپ میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ سہ پہر کے قریب میسج رسیور پر میرے نام کا پیغام ایک ہلکی سی ٹون کے ساتھ اجاگر ہوا۔

”راجا ذیشان حیدر کے لیے، دو سو ستر ڈگری، فاصلہ چار سو میٹر، سبز رنگ کا غبارہ، وقت ایک منٹ۔“

پیغام پڑھتے ہی میں فوراً بائیں ہاتھ لیٹا۔ ایلی ویشن ناب جو کہ سردار کے فائر کے بعد میں نے پانسو میٹر پر لگا دی تھی۔ اسے چار سو میٹر پر سیٹ کرتے ہی سائیٹ کے ساتھ آنکھ لگائی اور بغیر کسی وقفے کے سانس روکتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ رائفل کے دھماکے کے ساتھ غبارہ پھٹنے کا دھما کا شامل تھا۔

”تیرہ سیکنڈز۔“ سردار نے بغیر توقف کے اعلان کیا۔

”میرا خیال ہے بہترین ہو گیا؟“ ایک گہرا سانس لے کر میں ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

سردار نے پوچھا۔ ”اب کیا کریں گے؟“

”انتظار۔“ میں نے کہا۔ ”جب تک واپسی کا حکم نہیں ملتا ہم پٹ نہیں چھوڑ سکتے؟“

اگلے آدھ گھنٹے میں ہمیں واپسی کا حکم مل چکا تھا۔ ہم سارے بسوں کی پارکنگ میں جمع ہونے لگے۔ وہاں سے ہماری رہائش تک کا ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ تمام کی گنتی پوری ہوتے ہی ہمیں بسوں میں سواری کا حکم ملا۔ میں بس میں گھس کے شیشے والی طرف بیٹھ گیا۔ سردار ابھی تک سوار نہیں ہونے پایا تھا۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ اسی وقت کوئی میرے ساتھ آ کر بیٹھا۔ میں نے سمجھا سردار ہے۔ باہر جھانکتے ہوئے مجھے دو غبارے نظر آئے۔

”سردار!...... وہ دیکھو دو غبارے نظر آ رہے؟ یقیناً یہ کچھ لوگوں کے ناکام فائر کا اعلان کر رہے ہیں۔“

جواباً دلکش انداز میں گلا کھنکارا گیا۔ میں نے چونک کر پلٹا۔ اور ششدر رہ گیا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر کیپٹن جینیفر بیٹھی تھی۔

اسے دیکھتے ہی میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

”پلیز تھوڑا راستہ دیں؟“ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔

مجھے راستہ دیے بغیر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ’’ذی!...... تمھیں نہیں لگتا کہ ہمیں اب صلح کر لینا چاہیے؟‘‘

’’میرا تم سے کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے کیپٹن صاحب؟‘‘ بے رخی سے کہتے ہوئے میں نے اپنے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کو ٹہوکا دیا تا کہ میرا راستہ چھوڑ دے۔

’’اگر جھگڑا نہیں ہے تو پھر بیٹھیں۔‘‘ اس نے بے تکلفی سے میرے بازو کو پکڑ کر کھینچا۔

مگر میں ایک جھٹکے سے بازو چھڑا کر اسکی ٹانگوں کے اوپر سے گزر کر باہر آ گیا۔ سردار مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً وہ کسی دوسری بس میں سوار ہو گیا تھا۔ اور اس میں تو شک کی کوئی گنجایش ہی نہیں تھی کہ وہ لی زونا کے ساتھ تھا۔

میری اس حرکت کا کوئی بھی نوٹس نہیں لے پایا تھا کہ ابھی تک تمام لوگ سیٹوں پر بیٹھ نہیں پائے تھے۔

بس میں نظر دوڑانے پر مجھے صرف ایک سیٹ خالی نظر آئی۔ مختصر سا سکرٹ پہننے والی یہودن اینڈریا برٹن، گلی سوٹ میں کافی عجیب لگ رہی تھی۔

’’آفیسر! کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟‘‘ وہ لیفٹیننٹ تھی۔ اس سے پوچھے بغیر وہاں بیٹھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔

’’مجھے خوشی ہوگی مسٹر ذیشان!‘‘ اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔

’’شکریہ۔‘‘ کہہ کر میں بیٹھ گیا۔

’’آج میں نے سات بونس نمبر لیے ہیں؟‘‘ اس نے خوشگوار لہجے میں مجھے اطلاع پہنچائی۔

’’ویلڈن!......‘‘ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ’’اور تمھارے بڈی نے؟‘‘

’’تین۔‘‘

’’بہت خوب۔‘‘

’’اور تم؟‘‘

میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’غبارہ پھاڑ لیا تھا۔‘‘

”شاید تم بتانا نہیں چاہتے۔“

”کیا؟“

”یہی کہ تم نے کتنے سیکنڈز میں گولی فائر کر لی تھی؟“

”میرا ساتھی تو تیرہ سیکنڈ بتا رہا تھا؟“

وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔”میں جانتی تھی، میرے خوشی زیادہ دیر باقی رہنے والی نہیں ہے؟“

”میں تو تمھاری خوشی کو کل تک برقرار رکھنا چاہ رہا تھا؟ تم نے خود ہی اگلوا لیا؟“

اس نے معصومیت سے پوچھا۔”ویسے ہم آپس میں بڈی نہیں بن سکتے؟“

”شاید تم مسٹر پاسکو کے ہاتھوں میرا قتل کرانا چاہتی ہو؟“ میں نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی۔”پورا باڈی بلڈر ہے۔ معلوم نہیں کیا کھاتا ہے؟“

”ہا......ہا......ہا“ اس کا سریلا قہقہہ گونجا۔ جینیفر پیچھے مڑ کر قہر آلود نظروں سے ہمیں گھورنے لگی تھی۔

”یہ کیپٹن صاحبہ کو کیا ہوا؟“ اینڈریا حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”کیا پتا؟ تمھارا قہقہہ ان کی طبع نازک پر گراں گزرا ہو؟“

”ہونہہ!......کیپٹن ہوگی امریکن آرمی کی؟“ اینڈریا نے منہ بنا کر کہا۔”ویسے پتا ہے کورس سے واپسی پر میں نے بھی کیپٹن کا رینک لگا لینا ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔”پیشگی مبارک ہو؟“

”شکریہ۔ اور اس خوشی میں تمھیں ڈنر کرا سکتی ہوں؟“

”نہیں آفیسر!......شکریہ۔ یوں بھی جب سے ہم آئے ہیں باہر نہیں نکلے؟“

”پھر تو ڈنر اور ضروری ہو جاتا ہے؟“ وہ اصرار کرنے لگی۔

”پھر کسی دن سہی؟“ میں نے جان چھڑائی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ڈنر کی شروعات کے ساتھ باہر جانے کا آغاز ہو جانا تھا جسے روکنا مشکل ہو جاتا۔ اور ہمارے پاس اتنے اخراجات نہیں تھے کہ گوریوں پر لٹا سکتے۔ آرمی کے خرچے پر امریکہ میں کورس کے لیے جانا ایک علیحدہ بات تھی۔ ورنہ اپنی محدود تنخواہ میں تو ہم بس عزت کی روٹی

کھا سکتے تھے۔

''جیسے تمھاری مرضی ۔''اس نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔

رہائش پر پہنچ کر ہم نیچے اترے ۔اینڈریا نے پر جوش مصافحے کے ساتھ مجھے الوداع کہا اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

پارکنگ سے ہمارا کمرہ نزدیک ہی تھا۔کمرے میں گھستے ہی میں بیڈ پر بیٹھ کر اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا ۔اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ؟''میں نے حیرانی سے کہا۔کیونکہ سردار کبھی بھی دروازہ کھٹکھٹانے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔

دروازہ کھول کر جینیفر اندر داخل ہوئی۔اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔''ذی !......تم نے اچھا کیا جو مس اینڈریا کے ساتھ ڈنر کی حامی نہیں بھری۔میں تمھیں کبھی بھی اس کے ہمراہ جانے کی اجازت نہ دیتی۔''

گہرا سانس لے کر میں نے اپنے غصے کو نارمل کیا۔اور اس کی بات کا جواب دیے بغیر بایاں جوتا اتار کر دائیں جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔

اسی وقت سردار کمرے میں داخل ہوا۔

''ذیشان بھائی آج..........''وہ مجھے کچھ بتانے لگا تھا مگر جینیفر کو دیکھتے ہی بات بدلتے ہوئے بولا۔

''ہیلو کیپٹن!......ہاؤ آر یو؟''

وہ مسکرائی۔''فائن مسٹر سیردر!......''اس نے مصافحے کے لیے سردار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے سردار نے کہا۔''نائیس تو میٹ یو؟''وہ مکمل انگریزی جھاڑنے کے چکر میں تھا۔

''ہاؤ سوئیٹ ،تم نے تو انگلش میں بھی مہارت حاصل کر لی۔''جینیفر نے کھلے دل سے اس کی انگریزی کو سراہا۔

''شکریہ کیپٹن!......یہ بس لی زونا کی مہربانی ہے۔''سردار نے سارا کریڈٹ لی زونا کے کھاتے میں ڈال دیا۔

''ویسے آج ڈنر کے بارے کیا خیال ہے، باہر چلیں؟''اس نے ایک دم سردار کو مشورہ دیا۔''لی زونا کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہے......ڈنر اور لی زونا؟''سردار مجھ سے پوچھنے لگا۔جینیفر کی تیزی سے بولی گئی انگلش اس کے سر پر سے گزر گئی تھی۔

''یہ تمھیں ڈنر کی دعوت دے رہی ہے۔اور بتا رہی ہے کہ لی زونا بھی اس کے ہمراہ ہوگی۔''

''یس......یس۔''وہ جلدی سے بولا۔''وائے ناٹ؟......آئی ایم ریڈی۔''

''لیکن ذی بھی ساتھ ہوگا۔''اس مرتبہ اس نے بولنے کی رفتار کم کرتے ہوئے میری جانب ہاتھ سے اشارہ بھی کیا تھا۔

''تو کیا؟......یہ نہیں جانا چاہتا۔''

''ہاں میں نہیں جانا چاہتا۔''

''کیوں؟''سردار نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیونکہ میں نے اینڈریا کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے۔''سردار کو اردو میں بتا کر میں نے وہی فقرہ انگلش میں بھی دہرا دیا تھا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کرنے والے۔''جینیفر نے غم وغصے کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔''میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

سردار نے گھبرا کر کہا۔''ارے تم تو لڑنے لگے۔''

''تم میرے ساتھ جاؤ گے۔''جینیفر بھی میرے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''کیوں میں تمھارا زرخرید ہوں۔''

وہ بے باکی سے بولی۔''نہیں......بلکہ اس لیے کہ میں تمھیں پسند کرتی ہوں۔''

''مگر تمھاری مجھے پسندیدگی کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔''

''جھوٹ کہتے ہو......جھوٹے۔''

”کیپٹن صاحبہ!......تم زیادتی کر رہی ہو۔“

”ذیشان بھائی!......تم گلی سوٹ اتارو......اور میڈم تم بھی جا کر گلی سوٹ بدلی کرو پھر بات کرتے ہیں۔“ سردار نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس تک اپنی بات پہنچائی۔

”اوکے، میں کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں۔“ جینیفر اثبات میں سرہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”تم کس خوشی میں اتنا چہک رہے ہو۔“ میں سردار پر برس پڑا۔

”جینی بھابی ہمارے کمرے میں آئی تھیں، اب خوشی کا اظہار بھی نہ کروں۔“

”بکواس نہ کرو یار!“ اسے جھڑک کر میں واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

ڈنر پر جینیفر نہایت خوب صورت لباس میں نظر آئی۔ میں اسے نظر انداز کیے سردار سے محو گفتگو رہا۔ مگر جب ہم واپس آرہے تھے تو اس نے سردار خان کو اشارے سے اپنے پاس بلا کر جانے کیا کہا۔ جواباً سردار خان نے اثبات میں سرہلا کر میرے پاس واپس آیا اور کہنے لگا۔

”ذیشان بھائی!......تم کمرے میں جاؤ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

”خیریت تو ہے......مجھے بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”آکر بتاتا ہوں۔“ سردار کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔ میں کندھے اچکاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ خواہ مخواہ کا اصرار مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔

کمرے میں آئے مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ کھٹکھٹا کر جینیفر اندر داخل ہوئی۔ ایک دم میرے ذہن میں ساری کہانی آگئی۔ یقیناً جینیفر نے سردار کو یہاں آنے سے منع کیا تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں تھا کہ اس نے سردار کو لی زونا کے پاس بھیجا ہوگا۔

”ہیلو ذی!......“ وہ بے تکلفی سے میرے بیڈ پر آکر ٹک گئی تھی۔

”مجھ سے کیا چاہتی ہو مس جینیفر!“ میں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں، بس تم مجھے اچھے لگتے ہو اور میرے خیال میں یہ وجہ کافی ہے۔“

”تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔“

”ہا......ہا......ہا“اس کے نقرئی قہقہے سے کمرے کی فضا گونج اٹھی۔”تو میں نے کب کہا ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں......محبت کے بعد شادی کرنا مشرقی روایات کا خاصا ہوگا، ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“

”تو تمھارے ہاں کیا ہوتا ہے؟“

”ہمارے ہاں تو محبت ہونے کے بعد بس محبت کی جاتی ہے۔“معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے وہ میرے قریب ہوگئی۔

میں جلدی سے بیڈ سے اترتا ہوا بولا۔”پلیز......کیپٹن!“

”ذی!......کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“میرے دور ہٹنے پر وہ دل گرفتہ سی ہوگئی تھی۔

میں صاف گوئی سے بولا۔”اس لیے تو دور بھاگا ہوں کہ بہت خوب صورت ہو۔“

”سچ......“وہ خوش ہوگئی تھی۔”اگر ایسا ہے تو یوں دور ہٹنے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”میں سمجھا بھی نہیں سکتا۔“

”ذی!......“وہ بیڈ سے اٹھ کر میرے جانب بڑھی۔

”پلیز جینی!......تم بہت اچھی لڑکی ہو لیکن میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“میں نے فی الفور سارے جھگڑے مٹا دئے تھے کہ وہ مجھے راضی کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے پر کمر بستہ نظر آرہی تھی۔

”چلو تم نے مجھے جینی تو کہہ دیا نا۔“وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔”اور وعدہ کرو کل میرے ساتھ ڈنر پر باہر چلو گے۔“

”مشکل ہے۔“میں نے سردار کے بستر پر جگہ سنبھالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”آخر کیوں؟“

”جینی!......تم جانتی ہو میرا تعلق بہت غریب ملک سے ہے۔......یہاں میری آمد کا مقصد بس لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کے بارے سیکھنا اور سنائپر کورس کرنا ہے۔میں ان عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوبارہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔”تم سے اچھا نشانے

باز بھلا کون ہوسکتا ہے......آج بھی تم نے نو بونس پوائنٹ لیے ہیں......اور ڈنر پر جانے سے تمھارے کورس پر کیا فرق پڑے گا۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے، لیکن صرف ایک بار۔‘‘ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑانا چاہا۔ وہ نہایت حسین لڑکی تھی اور اس کی قربت کسی کو بھی پھسل جانے پر مجبور کرسکتی تھی۔

’’اب کیا ہاتھ پکڑنے پر بھی تمھیں اعتراض ہے۔‘‘ غصے سے کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت سخت کردی۔

’’جینی! پلیز۔‘‘ میں زبردستی ہاتھ چھڑا کر اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ ’’اگر یونھی ضد کروگی تو میں تمھارے ساتھ دوستی نہیں کرپاؤں گا۔‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ غیر متوقع طور پر وہ مان گئی تھی۔

اسی وقت سردار کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

’’ہیلو کیپٹن!‘‘ کہہ کر وہ میرے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔

’’ہائے سردار!‘‘ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اور مجھے مخاطب ہوکر بولی۔ ’’ٹھیک ہے ذی!......میں چلتی ہوں ۔کل ملاقات ہوگی۔‘‘

اور میں مسکراتے ہوئے اسے الوداع کہنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک دم مڑی اور مجھ سے لپٹ کر میرے گال پر بوسا دیتے ہوئے بولی ۔’’سوری ذی!......یہ ہماری ثقافت ہے۔‘‘ میں سوائے خفت سے سر جھکانے کے اور کچھ نہ کہہ سکا۔

دروازہ بند کرکے میں سردار کا حال پوچھنے لگا۔ ’’کیا ہوا خان صاحب!......تمھاری صورت پر کیوں بارہ بج رہے ہیں؟‘‘

’’کچھ نہیں یار!......بس گھر یاد آرہا ہے۔‘‘

’’گھر تو خیر مجھے بھی یاد آرہا ہے۔‘‘

’’کچھ دیر کھلی فضا میں نہ پھرلیں۔‘‘ اس نے مشورہ دیا۔

”میرا تو خیال ہے سونا چاہیے۔“

وہ مصر ہوا۔”بس جاگنگ ٹریک کا ایک چکر لگا کر واپس آ جائیں گے۔“

”اچھا چلو۔“اس کا اصرار دیکھتے ہوئے میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

ٹریک کے قریب پہنچتے ہوئے وہ پراسرار لہجے میں کہنے لگا۔”میں تمھیں ایک خاص بات بتانے کے لیے کمرے سے باہر لایا ہوں۔“

”خاص بات۔“

”ہاں ...... لی زونا کہہ رہی تھی تمھیں بتادوں کہ جینیفر سے تھوڑا دور رہے۔“

میں نے منہ بنایا۔”تو یہ کمرے میں بھی کہا جاسکتا تھا۔“

”نہیں۔“اس نے نفی میں سر ہلایا۔”وہ کہہ رہی تھی یہ بات تمھیں کمرے سے باہر لے جا کر بتاؤں۔اور وہ خود بھی مجھے یہ بتانے کے لیے تازہ ہوا میں ٹہلنے کے بہانے کمرے سے باہر لے گئی تھی۔“

”جینیفر سے محتاط رہنے کا بھلا کیا مقصد ہوا؟“

”بس اس نے آسان لفظوں میں یہی بتایا تھا۔اور مزید یہ کہا کہ موقع ملنے پر وہ تمھیں ساری بات سمجھا دے گی۔“

”لی زونا جاسوس تو نہیں ہے؟“میں نے مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔

”صحیح پہچانا۔“سردار نے داد دینے والے انداز میں کہا۔”اس کا تعلق جاپان انٹیلی جنس سے ہے۔“

”ویسے مجھے خود جینیفر کے رویے پر حیرانی تھی۔مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ وہ یوں فریفتہ ہو جاتی۔“

”شاید تمھاری کسی صلاحیت کی وجہ سے وہ تمھاری جانب مائل ہوئی ہو۔“سردار نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں ...... اس کی دلچسپی مجھے پہلے روز دکھائی دے گئی تھی۔گو یورپین ممالک میں یہ ایک عام سی بات ہے مگر کافی پرکشش اور خوب صورت قد کاٹھ کے جوانوں کو چھوڑ کر اسے میری ذات سے جو عشق ہو گیا تھا وہ ضرور اچنبھے میں ڈالنا والا تھا اور اب لی زونا کی بات نے میرے شبے کی تائید کر دی ہے کہ جینیفر مجھ سے کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔“

سردار نے کہا۔''اچھا چلو واپس چلتے ہیں...... بعد میں لی زونا سے مل کر مزید تفصیل پوچھ لینا۔''

''چلو۔''میں اس سے متفق ہوتا ہوا بولا۔اور ہم اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

اگلے دن سرِشام ہی جینیفر ایک خوب صورت لباس پہنے میرے پاس پہنچ گئی۔میں نے سردار اور لی زونا کو ساتھ لے جانے پر اصرار کیا مگر وہ فقط مجھے لے جانے پر بہ ضد ہوئی۔مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔اس کے پاس اپنی کار موجود تھی۔ٹریننگ کیمپ سے نکل کر بجائے شہر کی طرف جانے کے وہ باہر کی جانب مڑ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے اطمینان سے جواب دیا''پہلے لانگ ڈرائیو،اس کے بعد ڈنر کریں گے۔''

''دیر ہو جائے گی۔''میں نے فکر ظاہر کی۔

''کوئی نہیں ہوتی دیر۔''ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''جیسے تمھاری مرضی۔''میں نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اسی وقت اس کے موبائل فون پر کال آنے لگی۔وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر کال ریسیو کرنے لگی۔''جی! میں مہمان کے ساتھ ڈنر پر جا رہی ہوں۔''مختصر جواب دے کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔اس وقت پاکستان میں بھی موبائل فون خواص کے دائرے سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں نظر آنے لگ گئے تھے۔گو میں خود اس نعمت سے محروم تھا مگر موبائل میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا۔

قریباً دس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک ذیلی سڑک پر کار موڑ دی۔کار کے تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی میری نظر چھوٹی دیواروں والی فارم نما عمارت پر پڑی۔گویا وہ ذیلی سڑک کے بجائے اس عمارت تک پہنچنے کا راستہ تھا۔

''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہا...... ہا...... ہا۔''اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔''اسے کہتے ہیں سرپرائز...... یہ فارم ہاؤس میرے ابو

کے دوست کا ہے۔آج ہم یہیں ڈنر کریں گے۔اور فکر نہ کرو میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میرا مہمان ایک مسلم ہے ۔اس نے گوشت وغیرہ کسی مسلم ہی سے لایا ہوگا۔‘‘

’’مگر ہم تو کسی ہوٹل میں جانے والے تھے نا۔‘‘میں نے ناراضی سے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘اس نے فارم ہاوس کے داخلی دروازے پر کار روک کر ہیڈ لائیٹ بجھائی۔اسی لمحے خود کار دروازہ کھل گیا۔کار آگے بڑھاتے ہوئے وہ تسلی بخش انداز میں بولی۔’’میں نے فقط باہر جانے کی بات کی تھی۔اگر تم نے خود سے ہوٹل سمجھ لیا تو میرا کیا قصور۔‘‘یہ کہتے ہوئے اس نے کھلے صحن میں کار روک دی۔

’’اور ابھی آتے وقت بھی کچھ ایسا کہا تھا کہ لانگ ڈرائیو کے بعد ڈنر کریں گے۔‘‘

وہ ہنسی۔’’تو کیا یہ غلط ہے۔‘‘یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اتر گئی۔میں بھی دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

اسی وقت اندرونی عمارت سے ادھیڑ عمر کا ایک مرد اور ایک عورت برآمد ہوئی۔عمارت میں ہر طرف لگے بڑے بڑے انرجی سیورز کی وجہ سے دن کا سا سماں تھا۔

انھوں نے قریب آتے ہی جینفر کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور مجھ سے پرتپاک مصافحہ کیا۔

جینیفر نے تعارف کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے مرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔’’یہ ہیں جناب !......انکل انتھونی گرانٹ اور یہ ہیں آنٹی پیٹریشیا۔‘‘اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔’’اور یہ ہیں مسٹر ذیشان، جسے میں ذی کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔‘‘

’’تم سے مل کر خوشی ہوئی۔‘‘انتھونی نے رسمی انداز میں کہا۔

’’اندر چلتے ہیں؟‘‘ پیٹریشیا نے مشورہ دیا۔’’بقیہ گفتگو وہاں کریں گے۔‘‘

عمارت اندر سے بہت سجی ہوئی اور خوب صورت تھی۔ڈرائینگ روم کے اندر بچھے ہوئے قیمتی صوفوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی فارم ہاؤس وغیرہ نہیں تھا۔

ہمارے نشست سنبھالتے ہی ایک باوردی ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ٹرالی درجن بھر گلاس مختلف قسم کے رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔

’’لڑکے!......گھبرانا نہیں؟ یہ مختلف قسم کے جوس ہیں۔‘‘انتھونی نے مسکراتے ہوئے مجھے تسلی دی۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک گلاس اٹھالیا۔

''رستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' پیٹریشیا مستفسر ہوئی۔

جینیفر نے جواب دیا۔''ہم کون سا پیدل آئے ہیں آنٹی!''

''تو کیسی جارہی ہے ٹریننگ؟'' انتھونی مجھے مخاطب ہوا تھا۔

میں نے مختصراً کہا۔''بہت اچھی۔''

پیٹریشیا نے پوچھا۔''اس سے پہلے کبھی امریکہ آنا ہوا؟''

''نہیں آنٹی!...... یہ پہلا موقع ہے۔''

''تو پھر، پسند آیا ہمارا ملک؟'' اس کے لہجے میں دنیا کی طاقتور مملکت کا شہری ہونے کا غرور کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

میں نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔'' کیا تبصرہ کروں، آج پہلی بار ٹریننگ کیمپ سے نکلا ہوں اور وہ بھی رات کے وقت۔''

انتھونی نے کہا۔''اتوار کو تو چھٹی ہوتی ہے، گھوم پھر لیا کرو۔''

''اسے ٹریننگ میں پہلی پوزیشن کے حصول کا بخار چڑھا ہے...... چھٹی کے دن بھی ٹریننگ میں جتا رہتا ہے۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھی جینی نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ویسے یہ تو زیادتی ہے اپنے ساتھ، کہ امریکہ میں آکر اس طرح ٹریننگ کیمپ میں محدود ہو کر بیٹھا رہا جائے۔'' انتھونی نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''میرا خیال ہے پہلے ڈنر کرتے ہیں، باقی گپیں بعد میں ہانکیں گے۔'' جینیفر نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پیٹریشیا اور انتھونی مسکرا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔

وسیع ڈائننگ ٹیبل مختلف لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

''لڑکے!...... چکن اور بیف ایک مسلم کی دکان سے خریدا ہے، بلکہ یہ ساری ڈشیں پکانے والا بھی ایک انڈین مسلمان ہے۔ میں نے جینی کی ہدایات پر پورا عمل کیا ہے، تم بے فکر ہو کر ہر ڈش پر ہاتھ صاف کر سکتے ہو۔''

''شکریہ انکل!'' جینی نے انتھونی کا شکریہ ادا کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ ڈرائینگ روم میں آ گئے تھے۔انتھونی اور پیٹریشیا مجھ سے پاکستان کے بارے مختلف سوال کرنے لگے۔طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد دہشت گردی کی اٹھنے والی لہر زیادہ تر ان کے سوالات کا موضوع رہی۔

''اچھا تم لوگوں کے لیے اوپر والا کمرہ ٹھیک کر دیا تھا۔ہم آرام کرنے جا رہے ہیں تم بھی انجوائے کرو۔'' انتھونی پیٹریشیا کو ساتھ لیے کھڑا ہو گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا۔''نہیں، ہم واپس جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، واپس چلے جانا۔'' انتھونی نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئے

''چلیں؟'' میں نے جینیفر سے پوچھا۔

''گھڑی دو باتیں بھی کر لو، ہم خالی ڈنر کرنے تو نہیں آئے تھے۔''

''باتیں وہاں جا کر بھی ہو سکتی ہیں۔''

''کچھ باتوں کے لیے خلوت کی ضرورت پڑتی ہے نا۔'' معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ میرے بالکل قریب ہو گئی۔

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے وہاں بغیر کسی مقصد کے لے کے نہیں آئی تھی۔اور پھر اتنی خوب صورت اور دلکش لڑکی جب کسی کو گناہ پر مائل کرنا چاہے تو بچنے کے لیے جنید بغدادیؒ کا زہد اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا تقویٰ چاہیے ہوتا ہے۔میں یقیناً اس کے حسن کی لپیٹ میں آ جاتا اور فخر کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہ بچتا، مگر لی زونا کی چھوٹی سی نصیحت مجھے چیخ چیخ کسی خطرے سے روشناس کرا رہی تھی۔اگر گزشتہ رات سردار مجھ تک لی زونا کی بات نہ پہنچاتا تو یقیناً میں بہک گیا ہوتا۔مگر اب میرے جذبات پر عقل غالب تھی۔اور یہ تو اصول دنیا ہے کہ جب انسان خود کو کسی ان دیکھے خطرے میں گھرا پائے تو اس کے جذبات کی آگ عقل پر غالب نہیں آ سکتی۔مجھے اس وقت واضح طور پر لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ آنکھ ہماری نگرانی کر رہی ہے۔

میں خود کو اس کی گرفت سے آزاد کراتا ہوا کھڑا ہوا ہو گیا۔

”میرا خیال ہے اس بارے میں نے تمھیں پہلے سے بتا دیا تھا۔“

وہ جلدی سے میرا ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی۔”ذی!......لڑکی میں ہوں اور گھبرا تم رہے ہو۔“

”ہاں......کیونکہ میرا مذہب، میری تہذیب، میرا معاشرہ اور پاک آرمی کا قانون مجھے اس کام کی اجازت نہیں دیتا۔“

”ہا......ہا......ہا“ وہ کھڑے ہو کر بے باکی سے مجھ سے لپٹ گئی۔”یہ لطیفے کسی اور دن کے لیے سنبھال رکھو جانی!“

”جینیفر!......میرا خیال ہے، تمھاری گاڑی کے بغیر مجھے کیمپ تک پہنچنے کے لیے گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں بڑی سختی سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا تھا، کیونکہ اگر وہ مزید کچھ دیر مجھ سے لپٹی رہتی تو شاید میری مدافعت دم توڑ دیتی۔

جینیفر کے چہرے پر خجالت اور غصے کے آثار دیکھ کر میں بغیر معذرت کے باہر کی جانب چل پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں داخلی دروازے تک پہنچتا میری سماعتوں سے انتھونی کی آواز ٹکرائی۔

”مسٹر ذیشان!......ایک منٹ۔“

میں نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ پیٹریشیا اور وہ دونوں اکٹھے کھڑے تھے۔

انتھونی نے کہا۔”ہماری بات سن کر چلے جانا۔“

اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے میں خاموشی سے پلٹ کر ان سامنے پہنچ گیا۔

”جی فرمائیں؟“

”بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے مجھے نشست سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے جب وہ بریف کیس ٹیبل پر رکھا تبھی میری نظر اس بیگ پر پڑی۔

”بیٹھ جاؤ کیپٹن!“ اس مرتبہ انتھونی کے لہجے میں پہلے والی شفقت اور پیار محبت کی جگہ حکم کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

جینیفر بھی سر جھکائے خاموشی سے بیٹھ گئی۔

انتھونی نے بریف کیس کھول کر میری طرف گھمایا۔سوسو ڈالر کے نئے کڑکڑاتے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ پچاس ہزار ڈالر میں......تمھارے ملک کی کرنسی میں یہ کتنے ہوتے ہیں، یہ حساب خود کر لینا۔''انتھونی نے اطمینان سے وہ بریف کیس میری جانب کھسکا دیا۔

''کس خوشی میں؟''بریف کیس کو ہاتھ لگائے بغیر میں مستفسر ہوا۔

''ایک چھوٹے سے کام کا یہ پیشگی معاوضا ہے۔بقیہ کا آدھا معاوضا کام ہونے کے بعد۔''

''یقیناً مجھے کسی غیر قانونی کام میں دلچسپی نہیں ہوگی۔''

''قانون کون بناتا ہے،حکومت۔''اس نے تصدیق چاہتے ہوئے پوچھا۔''کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں۔''میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''تمھاری تسلی کے لیے عرض ہے کہ یہ امریکن حکومت ہی کا کام ہے۔اور میرا تعلق امریکن سی آئی اے سے ہے۔تسلی کے لیے میرا کارڈ دیکھ سکتے ہو۔اس نے جیب سے اپنا سروس کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے کارڈ کو ہاتھ لگائے بغیر اس کے مندرجات پر نگاہ دوڑائی۔کرنل سکاٹ ڈیوڈ لکھا ہوا نظر آیا۔

''میرا اصل نام سکاٹ ڈیوڈ ہے،اور یہ کرنل جولی روزویلٹ ہیں۔''

''شاید تم صحیح کہہ رہے ہو،مگر میں پاکستان آرمی کے زیرِ کمان ہوں۔اس رقم کے بجائے مجھے میرے سینئرز سے حکم دلوادیں۔اتنی رقم خرچ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔''

''کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں خفیہ رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''چھپا کر کرنے والا کام غلط ہی ہوتا ہے سر!''میں نے حتی الوسع کوشش کی تھی کہ میرے لہجے سے تلخی یا طنز نہ جھلکے۔

وہ ہنسا۔''غلط فہمی ہے تمھاری مسٹر ذیشان!......میاں، بیوی کا جسمانی تعلق رکھنا کسی قوم اور مذہب کے نزدیک غلط یا ناجائز نہیں ہے لیکن ہم یہ کام چھپ کر سر انجام دیتے ہیں۔قضائے حاجت کے لیے بھی ہم لوگوں

کی نظروں سے چھپ کر جگہ ڈھونڈتے ہیں۔ بچے کو دودھ پلاتے ہوئے ماں بچے اور اپنے جسم کو چادر سے ڈھانپ لیتی ہے۔ آپریشن کرنے کے لیے ڈاکٹر کسی غیر متعلق شخص کو آپریشن کی کارروائی دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے ......وغیرہ وغیرہ......میں اس موضوع پر اور بھی درجنوں مثالیں پیش کرسکتا ہوں، کہ ہر چھپا کر کیا جانے والا کام جرم نہیں ہوتا۔"

"سر!...... یہ تمام کام چھپ کر سرانجام دینے کے باوجود سب کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔ کیا لوگ نہیں جانتے کہ میاں بیوی بند کمرے میں کیا کررہے ہیں، یاماں کے بچے کو چادر سے ڈھانپنے کا مطلب کیا ہے ؟......یقیناً سب ان کاموں کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔ میں تمھاری مثال سے بالکل متفق نہیں ہوں۔"

"ذیشان!......ہر حکومت کی ترجیحات میں رازداری پہلے نمبر پر آتی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، اس کے لیے حکومت کو ایسا آدمی بھی ڈھونڈنا چاہیے جو رازداری برت سکے۔"

"اچھا تم کام کے متعلق تو سن لو، کرنے نہ کرنے کا فیصلہ بعد میں کرنا۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھی جولی روز ویلٹ نے زبان کھولی۔

"میڈم!......اگر کوئی ایسا خفیہ کام ہے جس کے بارے جان لینے کے بعد، وہ کام نہ کرنے کے فیصلے پر مجھے جانی نقصان پہنچ سکتا ہو تو براہ مہربانی مجھے نہ بتائیں، یوں بھی، اطمینان رکھیں کہ میں یہ کام نہیں کرنے والا۔"

"تو یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟" کرنل سکاٹ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"جی سر!......میں اپنی حکومت کی مرضی جانے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتا۔"

"اوکے......تمھاری صاف گوئی پسند آئی۔" کرنل سکاٹ نے بیٹھے بیٹھے میری جانے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اس سے ہاتھ ملا کر میں کھڑا ہوگیا۔ کرنل جولی روز ویلٹ خاموش بیٹھی مجھے کڑے تیوروں سے گھورتی رہی۔ میں نے بھی اس کی جانب ہاتھ بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"کیپٹن!......تم لوگ جاسکتے ہو۔" کرنل سکاٹ، خاموش بیٹھی جینیفر سے مخاطب ہوا۔

اور وہ "یس سر!" کہہ کر کھڑی ہوگئی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے وہاں سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئے

۔جینیفر نے خاموشی سے کار موڑی، خودکار دروازہ خود بہ خود کھل گیا تھا۔مین روڈ پر چڑھتے ہی وہ نارمل رفتار سے ڈرائیونگ کرنے لگی۔

''خفا ہو۔'' مجھے خاموش پا کر اس نے گفتگو کی ابتداء کی۔

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا

''ہاں......کیونکہ میں نے تمھیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔''

''تو یہ کیا تھا؟......اتنی رقم کی آفر کسی خطرناک کام کے لیے ہی کی جاتی ہے۔''

''مجھے حکم ملا تھا۔'' اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''دھوکا دینے کے لیے محبت اور دوستی کا سہارا نہ لیا ہوتا۔'' یہ بات میں بہ مشکل پوری کر پایا تھا کہ جینیفر نے ایک دم بریک لگا کر میری جانب مڑی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ذی!'' اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر وارفتگی سے کہا۔ ''تمھیں پہلی بار کلاس روم میں دیکھا اور تم مجھے اچھے لگے۔یاد ہے میں پہلے دن ہی تمھاری جانب متوجہ ہو گئی تھی، گو اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے تھوڑے خفا رہے۔اس دوران میں نے جو الٹی سیدھی حرکتیں کیں، ساری کی ساری تمھاری توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے کی تھیں۔اور جہاں تک اس کام کا تعلق ہے جو تم سے کرنل سکاٹ لینا چاہ رہے ہیں ،تو یقین مانو اس بارے مجھے پرسوں حکم ملا ہے۔''

''مجھے اب اس موضوع پر بات نہیں کرنی، یوں بھی کافی دیر ہو گئی ہے اب چلنا چاہیے۔''

''تم مجھ سے خفا نہیں ہو سکتے۔'' اس کی آنکھوں میں مجھے ہلکی سی نمی کی جھلک نظر آئی۔اگر یہ اداکاری تھی تو کمال کی اداکاری تھی۔

خواہ مخواہ بات بڑھانا مجھے مناسب نہ لگا۔میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے خفا نہیں ہوں جینی !......اب آگے بڑھو۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

''شکریہ ذی!'' اس نے بے تکلفی سے آگے ہو کر میرے گال پر بوسا دیا اور پھر سیدھے ہو کر کار آگے بڑھا دی۔ اس کے بعد کیمپ کے آنے تک ہم نے اس موضوع کو نہیں چھیڑا اور ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔

کیمپ میں پہنچتے ہی اس نے مجھے کار سے اترنے سے پہلے کہا۔ ''ذی!...... یقیناً تم آج کے واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔''

''بے شک۔'' کہہ کر میں کار سے باہر نکل آیا۔ مجھے کمرے کے دروازے تک پہنچا کر اس نے الوداع کہا۔ مگر جاتے جاتے وہ اپنی ثقافت پر عمل کرنا نہیں بھولی تھی۔

سردار کمپیوٹر پر سنائپر سے متعلق ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ چہکا۔

''شکر ہے تمھیں اپنی جینی سے فرصت ملی، میں تو سوچ رہا تھا شاید صبح ہی واپسی ہو گی۔''

''فضول کی نہ ہانکا کرو یار!'' میں جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

''ویسے ذیشان بھائی!...... اسی کو ڈیٹ پر جانا کہتے ہیں نا۔'' یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

اور میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ واش روم میں گھس گیا۔

☆......☆......☆

اگلا ہفتہ بغیر کسی خاص واقعے کے گزر گیا۔ اس دوران ایک دفعہ لی زونا سے تفصیل سے بات ہوئی اسے فارم ہاؤس والی بات بتائے بغیر میں نے اس کے ان خدشات کے بارے استفسار کیا جو اس نے سردار کی زبانی مجھ تک پہنچائے تھے۔ جواباً اس نے بتایا کہ اس نے جینیفر کی کسی سے ہونے والی مبہم سی گفتگو سنی تھی۔ اور اس وقت جینیفر مجھے راضی کرنے کی حامی بھر رہی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ لی زونا واش روم میں ہے۔ اور کمرے کے اندر اس نے یہ بات بتانے سے اس لیے منع کیا تھا، کہ ہمارے کمروں میں خفیہ کیمروں کی موجودی کے شک کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جینیفر بھی مجھے باقاعدگی سے مل رہی تھی۔ اس کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شری کانت پارٹی کو اس کا مجھ سے یوں گھلنا ملنا سخت ناگوار گزرتا تھا، مگر ان بے چاروں کے بس میں کوئی بات نہیں تھی۔

اور پھر ہمارا کورس اختتام پذیر ہونے میں تین دن رہ گئے۔ آخری تین دن ہمیں ایک مخصوص علاقے میں

سنائپر مخالف کارروائی کرنا تھی۔اس کے لیے ہر آدمی کے حوالے پینٹ ایمونیشن کیا گیا۔اور ایسی سنائپر رائفلیں ہمارے حوالے کی گئیں جو اصل سنائپرز رائفلوں کی ہو بہ ہو نقل تھیں۔بس اصل اور نقل میں اتنا فرق تھا کہ نقل سے صرف پینٹ ایمونشن فائر ہوسکتا تھا۔

پینٹ رائفلز سے بھی چھ سات سو میٹر کے فاصلے تک ہدف کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔تین دنوں کا راشن پانی ہمارے پاس ہونا تھا۔تمام سنائپرز کو جوڑی جوڑی کی شکل میں جنگل میں جانا تھا۔ہر سنائپر کو ایسی گھڑی پہننے کو دی گئی تھی جس میں کیمرہ نصب تھا۔اس طرح سارے سنائپرز کو سکرین پر دیکھا جا سکتا تھا۔جو جو سنائپر دوسرے سنائپر کی گولی کا شکار ہوتا جاتا وہ اس کارروائی سے نکلتا جاتا۔اس طرح صرف ایک جوڑی نے باقی بچنا تھا اور بچ جانے والے کو جیتا ہوا تصور کیا جاتا۔اگر تین دن کے بعد بھی ایک سے زیادہ جوڑیوں نے بچ جاتیں تو اس صورت میں وہ جوڑی یا اکیلا بچ جانے والا سنائپر جیت کا حق دار ٹھہرتا جس نے زیادہ سنائپرز کو نشانہ بنایا ہوتا۔یہ ساری تفصیل ہمیں اس مشق کے آغاز سے ایک دن پہلے میجر جیمس نے بتا دی تھی۔

اسی رات جینیفر ڈنر کے بعد میرے پاس پہنچ گئی۔اس وقت سردار لی زونا کے پاس تھا۔

''پتا ہے میں تمھارے لیے کیا تحفہ لائی ہوں؟''اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''جادو مجھے آتا نہیں، الہام مجھے ہوتا نہیں اور علم الغیب جاننے والی ذات صرف اللہ پاک کی ہے۔''

''ذی! تم بھی نا۔''اس نے ہنستے ہوئے قطع کلامی کی۔''اچھا یہ دیکھو۔''اس نے خوب صورت پیکنگ میں ایک چھوٹا سا ڈبا میری جانب بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟''میں نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر حیرنی سے دیکھا۔

''کھول کر دیکھو۔''وہ میرے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گئی۔چونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں وہاں سے اٹھ کر کہیں بھی بیٹھتا اس نے میرے ساتھ لگ کر ہی بیٹھنا تھا۔اس لیے اسے نظر انداز کر کے میں پیکنگ کھولنے لگا۔ڈبے میں کالے رنگ کا ایک چھوٹا سا موبائل فون بند تھا۔

''یہ تو موبائل فون ہے۔''

''اچھا ہے نا؟''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں مگر میرے کس کام کا۔''

''پتا ہے، یہ تحفہ وغیرہ نہیں ہے۔'' خلاف توقع وہ میرے قریب سے اٹھ کر سردار کے بیڈ پر بڑے انداز سے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ یقیناً وہ کوئی خاص بات کرنے کے موڈ میں تھی۔ اور چاہتی تھی کہ میں پرسکون انداز میں اس کی بات سنوں اسی لیے وہ مجھ سے تھوڑا دور ہٹی تھی۔

میں نے متبسم ہو کر پوچھا۔ ''تو پھر کیا ہے؟''

''کل کی مشق کے بارے علم ہے نا۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو بات یہ ہے کہ میں تمھارے ہاتھوں مشق سے آؤٹ نہیں ہونا چاہتی۔ تم سب سے خطرناک نشانے باز ہو۔ اور میں چاہتی ہوں کم از کم میں تمھاری گولی کا نشانہ نہ بنوں۔''

''تو اس میں موبائل فون کا کیا کردار، کیا یہ بہ طور رشوت کے ہے؟''

''تمھیں پتا ہے نا، سب کے پاس نقشہ اور جی پی ایس موجود ہوگا۔''

''ہاں تو؟''

''بس مجھے اپنی جگہ سے آگاہ رکھنا، اسی طرح میں تمھیں اپنی جگہ سے باخبر رکھوں گی۔ پس ہم دونوں ایک دوسرے سے دور رہیں گے۔''

''تم جانتی ہو ہر آدمی کیمرے کی آنکھ کی زد میں ہوگا، پھر میں کیسے بتا پاؤں گا؟''

''کال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، موبائل فون پر میسج بھی بھیجا جا سکتا ہے۔'' وہ موبائل فون آن کر کے مجھے میسج بھیجنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

''کیمرہ گھڑی میں لگا ہے۔ جب بھی میسج کرنا چاہو موبائل فون کو اسی گھڑی والے ہاتھ کے نیچے کر کے میسج بھیج دینا۔ نہ کسی کو موبائل فون دکھائی دے گا اور نہ کسی کے کانوں میں تمھاری آواز پڑے گی۔''

مجھے بہ ظاہر جینیفر کی بات میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی تجویز بھی ہر سقم اور کجی سے پاک تھی۔ اس کے محبت بھرے رویے کے جواب میں میں اتنا تو اس کے لیے کر ہی سکتا تھا۔

”تم کسی اور کے ہاتھوں بھی تو نشانہ بن سکتی ہو؟“

”ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔“اس نے منطقی انداز میں کہا۔”لیکن انسان ڈرتا تو اسی سے ہے جو اسے نقصان پہنچا سکے اور اس لحاظ تمام سنائپرز کے لیے سب سے بڑا خطرہ تم ہو۔تمام اسی کوشش میں رہیں گے کہ تم سے دور دور رہیں۔“

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”آج تمھارے ہاتھ میں کچھ زیادہ لمبا بانس نہیں ہے۔“

وہ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے تھی۔سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔”میں تمھیں یقین دلا سکتی ہوں۔“

”مجھے یقین آ گیا ہے۔“میں نے فوراً دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے شکست کا اعلان کیا۔اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

تھوڑی دیر مزید مجھے بریف کرنے کے بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی۔جاتے جاتے وہ مجھے موبائل فون چارج کر لینے کی تاکید کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆......☆......☆

جانے سے پہلے ہم تمام تیار کھڑے تھے۔

”تمام لوگ جس جس جگہ پر کھڑے ہیں، اپنا پیک اور ہتھیار وہیں چھوڑ کر میرے پاس آ جائیں۔“ہمارے انسٹرکٹر کیپٹن ٹونی گریفن نے میگا فون کے ذریعے اپنی بات ہمارے کانوں تک پہنچائی کیونکہ ہم تمام کافی دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔

اپنا سامان اپنی جگہ پر چھوڑ کر ہم اس کے قریب اکٹھے ہو گئے۔

”سارے اس ہال میں چلے جائیں۔“اس نے ایک بڑے ہال کی جانب اشارہ کیا۔

ہم نے حکم کی تعمیل کی۔وہ سینما کے جیسا ہال تھا۔تمام فرش میں گڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کیپٹن ٹونی گریفن نے سامنے آ کر کہا۔”ہم تمھیں جنگل میں داخل کرنے سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس جنگل کی اندرونی تفصیلات بہ ذریعہ فلم دکھا دیں۔گو نقشے اور جی پی ایس وغیرہ تمھارے پاس موجود ہیں؟ کسی بھی علاقے میں کارروائی کرنے سے پہلے سنائپر اس علاقے کی قراولی (ریکی) کرتا ہے۔اور ہم تمھیں قراولی کا

موقع فراہم نہیں کر سکے اس لیے جنگل کے متعلق یہ تفصیلی فلم دکھا کر قراولی نہ کرنے سے ہونے والی کمی کو پورا کر رہے ہیں۔‘‘

گھنٹے بھر کی فلم میں اس جنگل کے متعلق تمام تفصیلات موجود تھیں۔فلم دکھانے کے بعد کیپٹن ٹونی گریفن نے ہمیں کچھ اہم باتوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہمارے پاس فقط ایک گھنٹے کا وقت ہو گا اس کے بعد تمام جوڑیوں کو اجازت ہوگی کہ وہ ایک دوسرے پر اپنا نشانہ آزما سکیں۔اپنی آنکھوں کی حفاظت کے لیے ہمیں شفاف آئینوں والے خصوصی چشمے دیے گئے تھے تاکہ پینٹ ایمونیشن براہ راست آنکھ پر لگ کر کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

اپنے سامان کی طرف واپس جاتے ہوئے ایک چھوٹی سی بدمزگی یہ پیدا ہوگئی کہ سردار لی زونا سے کوئی بات کہنے کے لیے اس کے قریب لمحہ بھر کے لیے رکا اور وہاں سے گزرنے والے شری کانت نے طنزیہ انداز میں کہہ دیا کہ وہ سب سے پہلے سردار کی اس ننھی بلبل کو نشانہ بنائیں گے۔

جواباً سردار نے بھی اسے ٹھیک ٹھاک جواب دیا۔بات شاید بڑھ جاتی مگر جینیفر نے آ کر معاملہ سنبھال لیا اور دونوں اپنے سامان کی طرف بڑھ گئے۔

’’اگر جینیفر نہ آجاتی تو اس بنیے کو تو میں نے جنگل میں گھسنے سے پہلے فارغ کر دینا تھا؟‘‘ سردار نے اپنا پیک اٹھاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

’’ہاں، ٹھنڈے دماغ سے کسی بات پر غور کرنا خانوں کے مسلک میں کہاں؟‘‘

’’مجھے ہی ٹوکتے رہنا......؟ ان بنیوں کو سبق سکھانے کی نہ سوچنا؟‘‘

’’انھیں سبق سکھا تو دیا تھا؟......بھول گئے لیوپولڈ ٹیلی سکوپ کے سائیٹ کے فائر میں کتنے شرمسار اور بے عزت ہوئے تھے؟‘‘

’’اس بات کو کئی ہفتے گزر گئے ہیں؟‘‘ سردار نے منہ بنایا۔

’’ہفتے نہیں کئی سال گزر جائیں، مگر وہ یہ ذلت فراموش نہیں کر سکتے؟‘‘

’’اچھا ٹھیک ہے بقراط صاحب!......اب چلو؟......یہ نہ ہو اگلے ہماری شروعات کا یہیں اختتام کر دیں؟‘‘

”بہت باتیں کرنا آ گیا ہے......؟ یقیناً یہ لی زونا کی صحبت کا اثر ہوگا؟“

”ہاں لی زونا کے ذکر سے یاد آیا؟......وہ کہہ رہی تھی ذیشان بھائی کو کہہ دینا کہ کم ازکم پہلے دن اگر وہ ہمارے نشانے کی زد میں آجائیں تو انھیں کچھ نہ کہیں؟“

”ہونہہ!......ہم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟......ہم خود لوگوں سے چھپتے پھر رہے ہوں گے؟“

”یار!......میں کچھ نہیں جانتا؟ اگر لی زونا آج نظر آ گئی تو میں تمھیں گولی نہیں چلانے دوں گا؟“ سردار حتمی لہجے میں بولا۔

”اچھا اب فالتو کی باتوں کو چھوڑو؟......پہلے مرحلے میں چھپنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ باتیں بالکل ختم، اردگرد کا اچھی طرح جائزہ لو؟ یہ دیکھو دشمن کہاں کہاں چھپ سکتا ہے؟“

”اوکے باس!“ سردار نے مزاحیہ انداز میں کہا اور ہم چاروں اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے چلنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی مجھے ایک مناسب جگہ دکھائی دے گئی تھی، مگر میں سردار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اس جگہ سے سو میٹر دور جا کر میں سردار کے ساتھ ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ خوب اچھی طرح اطراف کا جائزہ لے کر میں نے سردار کو بتایا کہ ہمیں پیچھے مڑنا ہے۔

”پہلے وہیں رک جاتے؟“ اس نے سرگوشی کی۔

”ہوسکتا ہے کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہو؟......یہاں سے کرال کر کے جائیں گے؟......“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ سردار نے میری تائید کی۔ اور ہم دونوں اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے بیچ گھنّی شاخوں والا وہ درخت ایک سنائپر کے لیے بہت مناسب مچان بن سکتا تھا۔ گو ایسی آئیڈیل جگہ دوسروں کی نگاہ میں بھی بہت جلدی آجاتی ہے مگر وہاں درخت اتنی کثرت سے تھے کہ اس درخت کا نمایاں ہونا آسان نہیں تھا۔

”میں نگرانی کر رہا ہوں تم مچان بناؤ؟“ ایک مضبوط شاخ پر بیٹھ کر میں نے سردار کو کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا پیک اتار کر سائیڈ پر رکھا۔ رائفل دوسری شاخ سے لٹکائی اور مچان بنانے لگا۔ جبکہ میں چوکنا ہو کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

مچان کی تکمیل کے ساتھ ہم دونوں اس میں لیٹ گئے۔

سردار نے پوچھا۔''اب کیا تین دن یہیں گزاریں گے؟''

میں نے جواب دیا۔''نہیں، بس آج کا دن......اس دوران اگر کوئی اس رستے سے گزر گیا تو انجام کو پہنچے گا دوسری صورت میں کل جنگل میں گھوم کر شکار ڈھونڈیں گے؟''

اسی وقت موبائل پر میسج رسیو ہوا۔ میں سردار کو موبائل کے بارے تفصیل سے بتا چکا تھا اس لیے اس نے ٹون کی آواز سن کر کوئی سوال پوچھنے سے گریز کیا تھا۔ میں نے کیمرے کی آنکھ سے بچ کر میسج پڑھا۔ جینیفر نے اپنی جگہ کا چھ ہندسی حوالہ بھیجا تھا۔ (چھے ہندسہ حوالہ معلوم ہونے کے بعد ہم کسی بھی آدمی کی جگہ کے بارے جان سکتے ہیں۔ کہ وہ نقشے کے مطابق کس جگہ پر بیٹھا ہوا ہے۔ آرمی سے متعلق قارئین اس بارے مکمل آگاہ ہوں گے۔ دوسروں کو سمجھانے کے لیے یہ مجمل بات ہی کافی ہے۔ ورنہ تفصیل بتانے کی صورت میں تو شاید اصل کہانی درمیان ہی میں رہ جائے اور ہم نقشہ بینی سیکھنے میں لگ جائیں۔)

میں نے جی پی ایس پر اپنی جگہ کا چھ ہندسی حوالہ دیکھ کر اسے بھیجا اور پھر نقشہ نکال کر جینیفر کی جگہ دیکھنے لگا۔ وہ ہم سے قریباً سات سو میٹر دائیں طرف موجود تھی۔

اچانک سردار نے سرگوشی بھرے لہجے میں کہا۔''ذیشان!......ایک پارٹی اسی طرف آ رہی ہے؟''

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں نگاہ دوڑائی۔ درختوں کی آڑ لے کر دو آدمی ہماری جانب ہی بڑھتے آ رہے تھے۔

''کیا خیال ہے؟''

''بسم اللہ پڑھیں۔'' سردار نے مجھے دعوت دی۔

''فاصلہ معلوم کرو؟'' میں ٹیلی سکوپ سائیٹ کے حفاظتی کور تار کر شست باندھنے لگا۔

لیزر رینج فائینڈر سے فاصلہ معلوم کر کے سردار نے جواب دیا۔''چار سو میٹر۔''

''ایلی ویشن ناب گھما کر میں نے چار سو کی رینج لگائی اور ان دونوں کے تھوڑا آگے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ آگے تھوڑی سی جگہ ایسی تھی کہ انھیں جھاڑیوں یا درختوں کی آڑ میسر نہیں آ سکتی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جونھی خالی جگہ پر آئے میں نے پیچھے والے کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔

''ہٹ۔'' آنکھو ں سے دوربین لگائے سردار نے فوراً اعلان کیا۔

یقیناً پیچھے والے کے منہ سے خود کو کوسنے کا کوئی فقرہ ادا ہوا ہوگا؟ کہ آگے والا رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔اور جب تک آگے والے کی سمجھ میں کچھ آتا میں نے رائفل دوبارہ کاک کر کے فائر کر چکا تھا۔دونوں کی چھاتیوں پر سرخ نشان ثبت ہو گیا تھا۔احکامات کے مطابق انھوں نے اپنے پیک سے سفید رنگ کی قمیصیں نکال کر پہن لیں۔اب انھیں کوئی نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔

''اگلی دفعہ میری باری ہے؟'' سردار نے کہا۔اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس وقت میری سماعت میں ہلکے ہلکے دھماکوں کی آواز آئی۔یقیناً کوئی اور جوڑی مقابلے سے باہر ہو گئی تھی۔

سہ پہر کے قریب،ہمیں بائیں جانب سے ایک جوڑی گزرتی دکھائی دی۔میں نے سردار کو متوجہ کیا۔اس نے جلدی سے لیٹ کر شست باندھی اور میں ان کا فاصلہ ناپنے لگا مگر اس کے فائر کرنے سے پہلے فائر کی آواز ہمارے کانوں میں پہنچی۔وہ دونوں کسی اور کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔

''دھت!......'' سردار نے منہ بنایا۔

''تمھاری قسمت محترم!......؟'' میں نے کہا۔

اس کے بعد شام کے قریب ایک اور جوڑی دکھائی دی۔دونوں سنائپر کہیں مچان بنانے کے فکر میں تھے۔اس بار بھی سردار نے انھیں نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر سردار سے پہلے ہی وہ کسی دوسرے کا نشانہ بن گئے تھے۔

سردار زچ ہو کر بولا۔''کیا مصیبت ہے یار!''

''اب تمھاری باری ختم۔'' میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے؟ تم اپنا شوق پورا کرلو؟'' سردار نے اپنی رائفل ایک طرف پھینک دی تھی۔مگر اس کے بعد کوئی نہ آیا اور اندھیرا چھا گیا۔

میں نے کہا۔''ایک آدمی کو جاگنا پڑے گا؟''

''ٹھیک ہے تم سو جاؤ۔'' سردار اطمینان سے بولا۔اور میں رائفل کو چھاتی سے لگا کر لیٹ گیا۔

ایک بجے کے قریب سردار نے مجھے ہلایا۔

"ٹھیک ہے خان صاحب!......سو جاؤ۔" میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں سردار کی بھاری سانسوں کی آواز سن رہا تھا۔

گھنٹا ڈیڑھ بعد میں فطری تقاضا پورا کرنے کے لیے نیچے اترا۔ مچان سے تھوڑی دور ہوتے ہی مجھے پانچ چھ گز دور ہلکی ہلکی روشنی کی جھلک نظر آئی۔ کوئی آگ جلا کر کچھ پکانے کی تگ و دو میں تھا۔ میں نیچے اترنے کے مقصد کو موخّر کرتے ہوئے جلدی جلدی درخت پر چڑھا، اپنے پیک سے نائیٹ ویژن گاگل نکال کر آنکھوں پر لگائی اور رائفل اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ سردار کو اٹھانے کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ اندھیرے کے باوجود میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس جانب روانہ ہو گیا۔ آخری سو میٹر کا فاصلہ میں نے کرالنگ کرتے ہوئے طے کیا تھا۔ بیس پچیس گز دور رک کر میں ان کی باتوں کی طرف دھیان دیا۔ وہ شاید قہوہ یا چائے وغیرہ بنا چکے تھے۔ پشتو سے ملتے جلتے فارسی لب لہجے سے میں نے فوراً پہچان لیا کہ وہ ایرانی سنائپر تھے۔ دونوں کا رخ دوسری جانب تھا۔ اتنے فاصلے سے مجھے شست لینے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ نائیٹ ویژن سائیٹ اتارے بغیر میں نے پہلی گولی فائر کی۔ دھماکے کی آواز سن کر وہ اچھل پڑے تھے۔ مگر ان کی کسی حفاظتی تدبیر سے پہلے میں نے دوسری گولی بھی فائر کر دی تھی۔

"گڈ یار!......اب ہو کون سامنے ہی آ جاؤ۔" گولی کی چوٹ کھاتے ہی ان میں سے ایک مزاحیہ انداز میں بولا۔ مگر میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر پیچھے مڑا اور تیز قدموں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں ان کے ساتھ بات چیت کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ گولی چلنے کے بعد اگر وہاں قریب کوئی دوسری پارٹی موجود ہوتی تو وہ مجھے نشانہ بنا سکتی تھی۔ وہ مجھے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا اس لیے مجھے سمجھنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے نہ بتاؤ؟" اسی آدمی نے دوبارہ آواز دی۔ "ویسے شکریہ۔ اب ہم جا کر آرام کر سکیں گے؟"

واپسی پر سردار مجھے سوتا ہوا ملا۔ اور اس کی وجہ یقیناً یہ تھی کہ ایک تو اسے معلوم تھا کہ اس کا ساتھی جاگ رہا ہے اور دوسرا یہ کوئی اصلی جنگ نہیں تھی۔ ورنہ ایک سنائپر اتنی بے فکری سے نہیں سو سکتا۔

صبح کے قریب میں ایک بار پھر نیچے اترا، اور نقشہ کھول کر ٹارچ کی روشنی میں جنگل میں موجود پانی کا مقام تلاش کرنے لگا۔ ٹارچ کی روشنی کو چھپانے کے لیے میں نے ایک چادر اوڑھ لی تھی۔ جھیل اس جگہ سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ڈگری، فاصلہ وغیرہ نوٹ کرنے کے بعد میں نے نقشہ لپیٹ کر پیک میں ڈالا۔ اور مچان پر چڑھ کر سردار کو جگانے لگا۔

''خان صاحب!......اٹھ جاؤ۔''

''اٹھ گیا یار!......سردی سونے ہی کدھر دے رہی ہے؟'' سردار جمائی لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔ واقعی سردی کافی زیادہ تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم نے گلی سوٹوں کے نیچے گرم لباس پہنے ہوئے تھے پھر بھی سردی کی شدت میں کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''حرکت کرنے کے لیے سب سے بہترین وقت یہی ہے؟''

''بس مجھے دس منٹ درکار ہیں تیاری کے لیے؟'' سردار نے کہا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم محتاط انداز میں جھیل کی جانب روانہ تھے۔ ایسی حالت میں بات چیت کرنا بالکل مناسب نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ہم دونوں کی زبان پر بھی تالے لگے تھے۔

ہم بہ دقت تمام تین کلومیٹر چلے تھے کہ اچانک میرے کانوں میں ہلکی ہلکی باتوں کی آواز پڑی۔ اپنے قدم روکتے ہوئے میں نے تصدیق کرنا چاہی۔ سردار نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا مگر پھر باتوں کی آواز اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

ہم دونوں ایک دم لیٹ گئے۔

''یہیں رکو۔'' اسے کہہ کر میں رینگتا ہوا ایک درخت کے تنے کی آڑ لے کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ابھی تک سورج طلوع نہیں ہوا تھا مگر روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ دونوں ہم سے پچاس میٹر دور ہوں گے۔ دونوں اپنا سامان پیک کر رہے تھے۔ یقیناً انھوں نے رات وہیں گزاری تھی۔ میں بغیر وقت ضائع کیے دو گولیاں فائر کر دیں۔ دونوں بڑی آسانی سے نشانہ بن گئے تھے۔ میں جھک کر بھاگتا ہوا سردار کے نزدیک پہنچا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔

جھیل کے کنارے ایک مناسب درخت پر میں نے مچان بنائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ ڈیوٹی کا نمبر سردار کا تھا۔ ہم بہ مشکل اوپر پہنچے ہی تھے کہ جینیفر کا پیغام آ گیا۔ وہ میری جگہ کے بارے پوچھ رہی تھی۔

میں نے جی پی ایس پر دیکھ کر اپنی جگہ کا چھ ہندسہ حوالہ دے دیا۔

جھٹ اس کا اگلا پیغام ملا۔ ''ہم بھی اسی جانب آ رہے ہیں؟...... پہنچ کر اپنی جگہ کے بارے بتاتی ہوں۔''

''اوکے۔'' لکھ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں بھی سردار نگرانی کر رہا تھا۔ اور پھر مجھے اونگھ آ رہی تھی کہ موبائل فون پر پیغام کی ہلکی سی گھنٹی بجی۔ ''شاید وہ اپنی جگہ کے بارے بتا رہی ہے؟'' ایک بار تو میں میرے جی میں پیغام کو نظر انداز کرنے کا خیال آیا۔ کیونکہ میں اٹھ کر بھی وہ پیغام پڑھ سکتا تھا، مگر پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں پیغام کھول کر پڑھ لیا۔

پیغام پڑھتے ہی میری غنودگی غائب ہو گئی تھی۔ جینیفر نے لکھا تھا کہ اس نے شری کانت اور راج پال کو ہمارے طرف جاتے دیکھا ہے۔''

میں فوراً لکھا۔ ''تو نشانہ کیوں نہیں بنایا؟''

اس کا شوخی بھرا پیغام موصول ہوا۔ ''میں ایسی حالت میں نہیں تھی کہ انھیں نشانہ بنا سکتی...... میرا مطلب ہے جب تک میں پتلون پہنتی وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے تھے۔ یوں بھی میں اپنا ہتھیار اپنے ساتھی کے پاس چھوڑ آئی تھی اور وہ مجھ سے پچاس ساٹھ میٹر دور تھا۔''

''کس جانب سے آ رہے ہیں؟''

اس نے مختصراً لکھا۔ ''شمال۔''

''ٹھیک ہے، شکریہ۔'' لکھ کر میں سردار کو مخاطب ہوا۔

''خان صاحب!...... ذرا ہوشیار رہنا؟''

''کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''شاید ہمارے پڑوسی اسی جانب آ رہے ہیں؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھنے لگا جبکہ میں دائیں جانب متوجہ رہا۔ کہ وہی سمت شمال بھی تھی۔

وہ مجھے جلد ہی دکھائی دے گئے تھے۔ اگر جینیفر اطلاع نہ دیتی تو شاید وہ چھپ کر ہماری پوزیشن تک پہنچ جاتے۔ مگر سوال یہ تھا کہ انھیں ہماری جگہ کے بارے معلوم تھا یا وہ یونہی احتیاط سے حرکت کر رہے تھے۔ موخّر الذکر سوچ مجھے صحیح لگی کیونکہ ہمارے چھپنے کی جگہ کے بارے صرف جینیفر جانتی تھی۔ اور جینیفر سے یہ بعید تھا کہ وہ ایسا کچھ کرتی۔ بلکہ اس نے تو مجھے ان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

''سردار!......وہ دیکھو؟''میں نے سردار کو ان کی جانب متوجہ کیا۔ وہ دونوں قریباً تین سو میٹر دور تھے۔

''اب میری باری۔''سردار نے شست باندھتے ہوئے کہا۔ جبکہ میں ان کا درست فاصلہ اور ہلکی ہلکی چلنے والی ہوا کی رفتاناپ کر سردار کو مدد دینے لگا۔ سنائپرز کا جوڑیوں کی شکل میں حرکت کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک آدمی فائر کرتا ہے جبکہ دوسرا ہوا کی رفتار، درست فاصلہ وغیرہ ناپتا ہے۔

''چار سو بیس میٹر۔''میں نے اسے فاصلے سے آگاہ کر کے ونڈ میٹر دیکھنے لگا۔''دو کلو میٹر فی گھنٹا۔''میں نے اسے ہوا کی رفتار بھی بتا دی۔

''ٹھیک ہے۔''کہہ کر وہ شست باندھنے لگا۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ جھک کر حرکت کرنے والا الٹ کر پیچھے جا گرا تھا۔

فائر کی آواز اور ہدف کے گرنے کے انداز کو دیکھتے ہی میرا دل کسی انجانے خطرے کے زیر اثر دھڑکنے لگا۔

''رائفل ادھر دو؟''وہ دوبارہ شست باندھ رہا تھا کہ میں نے اس سے رائفل جھپٹ لی۔

''کیا ہوا؟''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

اسے جواب دیئے بغیر نے میگزین کیچ دبا کر میگزین کو رائفل سے علیحدہ کیا اور میرے بدترین اندیشے درست ثابت ہوئے۔

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔''سردار!......یہ ایمونیشن تو اصلی ہے؟''

''کک کیا......؟''سردار کا رنگ اڑ گیا تھا۔''م......مم......مگر میں نے تو......پینٹ ایمونیشن ڈالا تھا؟''

''یہ رائفل بھی اصلی ہے؟......تم کل سے لیے پھر رہے ہو؟......کیا اتنا اندازہ نہیں ہو سکا تمھیں؟''ناگواری سے رائفل نیچے رکھتے ہوئے میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ اس کا ساتھی گھٹنوں کے بل اس کے ساتھ بیٹھا

ہوا شاید اس کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی وقت ہمارے پاس موجود واکی ٹاکی پر ایک پیغام دہرایا گیا۔

''مشق اختتام پذیر ہوئی؟......کوئی سنائپر اب گولی نہیں چلائے گا۔میں دہرا رہا ہوں کوئی سنائپر اب گولی نہیں چلائے گا۔ایک سنائپر شدید زخمی ہو گیا ہے۔تمام واپس کیمپ میں آ جائیں......'' یہ پیغام بار بار دہرایا جانے لگا۔

اچانک موبائل پر جینیفر کی کال آنے لگی۔تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر میں نے کال رسیو کر لی۔

''ذی!......کیا ہوا؟'' اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''پپ......پتا نہیں؟'' میں گڑبڑا گیا تھا۔

''ذی!......شاید تمھاری گولی سے انڈین سنائپر زخمی ہو گیا ہے؟......یوں کرو واپس کیمپ لوٹ جاؤ۔زخمی سنائپر کے قریب نہ جانا۔تمھیں دیکھ کر وہ جھگڑا نہ شروع کر دیں۔اور کسی کو بھی اصل بات کی ہوا نہ لگنے دینا۔میں واپس آ کر تم سے بات کرتی ہوں؟''

''ٹھیک ہے۔'' رابطہ منقطع کر کے میں ہکا بکا بیٹھے سردار کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔نیچے اترتے ہی میں نے رائفل سے زندہ گولیاں نکال کر نیچے پھینکیں اور میگزین میں پینٹ ایمونیشن بھر دیا۔سردار کے حوالے اس کی رائفل کر کے ہم کیمپ کی جانب بڑھ گئے۔

''خود پر قابو پاؤ؟'' سردار کے چہرے پر ثبت پریشانی کے اثرات دیکھ کر میں نے اسے تسلی دی۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے ذیشان بھائی کہ میں نے میگزین میں پینٹ ایمونیشن لوڈ کیا تھا۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے پاس ڈمی رائفل تھی۔نہ جانے کب رائفل اور ایمونیشن بدلی ہوا؟''

''اچھا فی الحال خاموش رہو۔اور اس بارے کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔''

اسے چپ کرا کے میں اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔مجھے سردار کی بے گناہی پر کوئی شبہ نہیں تھا۔مگر صرف میرے کہنے سے تو کوئی اسے بے گناہ نہ مانتا۔سب سے بڑھ کر ایک انڈین سنائپر اس کی گولی سے گھایل ہوا تھا۔ہمیں چلتے ہوئے دس پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک ہیلی کاپٹر گڑگڑاتا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا

۔یقیناً وہ زخمی کو اٹھانے جا رہا تھا۔پھر ایک چکر فضا میں کاٹ کر ہیلی نیچے بیٹھنے لگا۔ہمارے کیمپ تک پہنچنے سے پہلے ہیلی واپس روانہ ہو گیا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ میں ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے مشق کی شروعات ہوئی تھی۔مشق سے باہر ہونے والے سنائپرز واپس کیمپ پہنچ چکے تھے۔ہم فلم ہال میں بیٹھ کر باقی سنائپرز کا انتظار کرنے لگے۔ہم سے پہلے بھی چند سنائپرز موجود تھے۔وہ بھی مشق کے ایک دم ختم ہونے پر حیرانی کا اظہار کر رہے تھے۔زخمی ہونے والے سنائپر کے متعلق بھی وہ قیافہ شناسی کر رہے تھے۔لی زونا بھی وہاں موجود تھی۔

میں نے آہستہ سے سردار کو کہا۔"لی زونا کو کچھ نہ بتانا؟"

لی زونا ہمیں دیکھتے ہی جلدی سے ہماری طرف بڑھی۔

"شکر ہے تم لوگ ٹھیک ہو۔"ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔"ویسے پتا چلا کون زخمی ہوا ہے؟"

"فکر نہ کرو،تھوڑی دیر تک پتا چل جائے گا؟"میں نے جھوٹ بولنے کے بجائے بات کو گول مول کرنا مناسب سمجھا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں تمام پہنچ گئے تھے۔

انڈین سنائپرز کے ہمراہ مجموعی طور پر بارہ جوڑیاں بقایا تھیں۔ان کے علاوہ سارے سنائپرز مشق سے باہر ہو کر واپس کیمپ پہنچ گئے تھے۔

جینیفر نے آکر تمام کو بتایا کہ انڈین سنائپر شری کانت شدید زخمی ہو کر ہاسپٹل پہنچ گیا ہے۔شری کانت کے زخمی ہونے کی وجہ سے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

تمام کے اکٹھا ہوتے ہی ہم لگژری بس میں بیٹھے اور واپس روانہ ہوئے۔

سردار کے چہرے پر ہویدا پریشانی بھرے تاثرات کسی کو بھی حقیقت سے روشناس کرا سکتے تھے۔میں دبے لفظوں میں اسے اپنی حالت پر قابو رکھنے کا مشورہ دینے لگا۔

کیمپ میں پہنچ کر ہم نے گلی سوٹ سے چھٹکارا حاصل کیا۔اور نہا کر سول کپڑے پہن لیے۔

”چائے کے بارے کیا خیال ہے؟“ سردار کے غسل خانے سے نکلتے ہی میں نے پوچھا۔

”میں بنا دیتا ہوں۔“ وہ الیکٹرک کیتلی کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ”ویسے تمھارا کیا خیال ہے، کہ یہ رائفل کون تبدیل کر سکتا ہے؟“

”کیا یہاں یہ گفتگو کرنا مناسب ہوگا۔“

”ہاں ......“ میں اطمینان سے بولا۔ ”کیونکہ، انتظامیہ اس بات سے بے خبر نہیں ہے کہ شری کانت کس کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔“

”میرے خیال میں یہ اسی کا کام ہے جو خود گولی کا نشانہ بنا ہے۔“ سردار نے کمرے میں پڑے چھوٹے فرج سے ملک پیک کا ڈبہ نکال کر الیکٹرک میں دودھ ڈالنے لگا۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو وہ کبھی بھی ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کرتے۔“

”وہ ہمارا پیچھا کب کر رہے تھے۔“ ملک پیک کا خالی ڈبی کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں اچھال کر وہ کیتلی میں چائے کی پتی ڈالنے لگا۔

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ ”کہہ تو صحیح رہے ہو، انھیں کیا خبر کہ ہم کہاں چھپے ہیں۔“

سردار کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”جی آجائیں۔“ میں نے آواز دی اور دروازہ کھول کر ایک انجان آدمی اندر داخل ہوا۔

”ذیشان!......کون ہے؟“ وہ مستفسر ہوا۔

”جی!“ میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”تمھیں کرنل یاد کر رہے ہیں۔“

”مجھے، کہاں ہیں وہ؟“ میں حیرانی سے کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

اس نے جواب دیا۔ ”آئیں میں تمھیں لے چلتا ہوں۔“

سردار نے مجھے جانے پر آمادہ دیکھ کر کہا۔ ”چائے تو پی لیتے۔“

”واپسی پر پی لوں گا۔“ کہہ کر میں نو وارد کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد میں کرنل کے سامنے تھا۔ اسے

دیکھ کر حیرانی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔کرنل سکاٹ ڈیوڈ کا چہرہ میرے لیے نیا نہیں تھا ۔میں نے اٹن شن ہو کر اسے تعظیم دی اور اس کے اشارے پر اس کے سامنے رکھی نشست سنبھالی۔

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔میں نے بھی اس سے نظریں نہیں چرائی تھیں۔

''تو کیا خیال ہے۔''اس نے بغیر کسی تمہید کے گفتگو شروع کر دی۔

''میں نے بتا دیا تھا۔''

''جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہے؟......تم دونوں کے ہاتھوں ایک انڈین فوجی قتل ہوا ہے اور ایسا غلطی سے نہیں ہوا۔''

میں نے بے ساختہ پوچھا۔''کیا وہ مر گیا ہے؟''

''نہیں......فی الحال تو زندہ ہے،مگر مرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

''یہ سراسر الزام ہے،ہمیں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''ہاں۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''مگر اس بات کا تو صرف تمھیں یا مجھے پتا ہے نا،ورنہ بہ ظاہر تو یہ قتل عمد ہے اور کیپٹن جینیفر بھی تم لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔اب یہ نہ پوچھنے بیٹھ جانا کہ کیپٹن جینیفر کا مجھے کیسے پتا۔''

میں نے تلخی سے کہا۔''ظاہر بات ہے،وہ بھی اس سازش کا حصہ ہے۔''

''نہیں۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔''اس کے علم میں اصل بات نہیں ہے۔ہم نے تو بس اسے کورس میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔اور وہ بے خبری میں استعمال ہو گئی۔اس کے بھیجے ہوئے آخری پیغام محفوظ ہیں جس میں اس نے تمھیں انڈین سنا ئپرز کے آنے کی اطلاع دی۔اور تمھارے ساتھی نے اصل سنا ئپر رائفل کا استعمال کیا۔ورنہ اس سے پہلے بھی تم نے کافی سنا ئپرز کو نشانہ بنایا تھا۔تو پھر ان میں سے کسی پر اصل سنا ئپر رائفل کی گولی کیوں نہیں چلائی گئی؟''

''پہلے بھی سردار نے............''

''صفائی دینے کی ضرورت نہیں،اس بات کا یقین کیسے دلاؤ گے،کیا عدالت میں یہ بات ثابت کر سکو گے۔جبکہ کیمرے سے بننے والی فلمیں ہمارے پاس ہیں۔''

میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ درحقیقت ہمیں بڑی چابک دستی اور ہوشیاری سے پھانسا گیا تھا۔ ساری کارروائی بالکل بے داغ تھی۔

مجھے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔ ”گولی چلانے والا الیکٹرک چیئر پر بیٹھے گا۔ اس کا ساتھ دینے والا کم از کم دس سال قید بامشقت پائے گا اور قاتلوں کو معلومات دینے والی کیپٹن کا کورٹ مارشل ہوگا، یہ میں نے کم سے کم سزا تجویز کی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔“ کرنل سکاٹ مسکرایا۔ ”یقین مانو اگر یہ کام تمھارے علاوہ کوئی اور کر سکتا تو ہم کبھی بھی تمھیں تکلیف نہ دیتے۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”پھر تو، مجھے فخر کرنا چاہیے کہ میں بھی کچھ ایسا کر سکتا ہوں جو کوئی بھی امریکی نہیں کر سکتا۔“

”یہ حقیقت ہے۔ انیس سو میٹر کے فاصلے سے آج تک کسی نے بھی ہدف کو نشانہ نہیں بنایا۔“

میں نے منہ بنایا۔ ”اس میں نشانہ بازی کہاں سے آگئی۔“

”کیونکہ تمھیں اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے سے ایک آدمی کو نشانہ بنانا ہے۔“

”اگر کسی کو قتل کرنا ہی مسئلے کا حل ہے تو مجھے بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہر سزا قبول ہے۔“ میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

”چاہے کسی مسلم دشمن شخص کو بھی مارنے کا موقع ملے۔“

”کسی مسلم دشمن شخص کو امریکا کیوں قتل کرائے گا؟“

”یہ ایک الگ بحث ہے، البتہ تم ہر طرح سے اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔“ اس نے اپنے سامنے رکھی ایک ضخیم فائل اٹھا کر میری جانب بڑھائی۔ ”اس میں مطلوبہ شخص کے بارے مکمل معلومات درج ہیں۔ کچھ اخباری تراشے بھی ہیں۔ تمھارے پاس دو دن ہیں فائل تفصیل سے پڑھ لو، پرسوں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا۔“ یہ گویا بات ختم ہونے کا اعلان تھا۔

''ایک چھوٹی سی خلش ہے۔''

''پوچھو۔''اس نے استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''سردار!...... پہلے بھی تو اس رائفل سے فائر کرسکتا تھا۔''

وہ ہنسا۔''دو تین مرتبہ اس نے کوشش کی تو تھی، پھر کیا کیوں نہیں۔''

''مطلب......؟''

''جی بالکل، تم صحیح سمجھے۔''اس نے میری بات کاٹی۔''تمھارا ساتھی جب بھی فائر کرنے کی کوشش کرتا ہم اس کے فائر سے پہلے مطلوبہ سنائپر کو نشانہ بنوا دیتے۔''

''اور اگر انڈین سنائپرز کو میں نشانہ بناتا پھر؟''

''بہ ظاہر تو ایسا ممکن نہیں تھا، کیونکہ تمھارا پٹھان دوست مشق شروع ہونے سے پہلے ان سے جھگڑ چکا تھا، بلکہ انھیں دھمکی بھی دے چکا تھا۔بس ضرورت اس بات کی تھی کہ تم لوگوں تک یہ خبر بروقت پہنچ جائے کہ تمھاری جانب آنے والے انڈین سنائپرز ہیں اور یہ کام کیپٹن جینیفر نے بہ حسن خوبی کرلیا۔اور یہی وجہ تھی کہ تمھارے موبائلز کو ہم نے نظرانداز کیے رکھا۔''

''اور اب اگر میں اس کام کے لیے راضی ہو جاتا ہوں تو پھر یہ کیس کس طرح حل ہوگا۔''

''کوئی مسئلہ ہی نہیں......شری کانت کی جان بچ گئی ہے؟......گولی چلانے کی ذمہ داری سارجنٹ ریگن واچ قبول کرلے گا۔''

''اوکے۔''میں جانے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔

''غالباً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی یہ بات تمھارے تک رہنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ تم اپنے ساتھی سردار سے مشورہ کرسکتے ہو۔''یہ کہہ کر اس نے سر کے اشارے سے مجھے جانے کا اشارہ کیا اور میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

اس کا نام برین ویلز تھا۔ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ وہ سول حلقوں میں بھی کافی اثر رسوخ

رکھتا تھا۔اس کی مسلم دشمنی واقعی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔مسلمانوں کے خلاف چلنے والی ہر تحریک میں وہ پیش پیش ہوتا۔فائل میں لگے اخباری تراشوں میں اس کے بیانات پڑھ کراس کی مسلم دشمنی مجھ پر روزِ روشن کی طرح واضح ہوچکی تھی۔اب امریکن حکومت یا کرنل سکاٹ ڈیوڈا سے کیوں مروانا چاہتے تھے، یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔کافی غور وفکر کے بعد میں نے سردار کو بھی ساری بات تفصیل سے بتلا دی۔اس وقت ہم باہر لان میں بیٹھے تھے۔

''توکل اس لیے تمھیں بلایا گیا تھا۔''اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

''بالکل۔''

''اس میں بھی ان کی کوئی چال نہ ہو،آج کل یوں بھی نام نہاد مسلمانوں کو رقم دے کر دہشت گردانہ کارروائیوں ملوث کیا جاتا ہےاور پھراسی کوآڑ بنا کراسلام کو بدنام کیا جاتا ہے۔''

''اس بارے میں نے کافی سوچا ہے،لیکن موجودہ صورت حال میں ہم سے یہ کام لے کر ہمیں پھنسایا نہیں جا سکتا،کیونکہ نہ تو ہمارا امریکہ میں کسی ایسی مسلمان تنظیم سے رابطہ ثابت کیا جاسکتا ہےاور نہ ایک ٹریننگ کرنے والے سپاہی کے پاس ہیوی سنائپر جیسے ہتھیار کی موجودی کا کوئی جواز بنتا ہے۔ایسا ہونے میں سراسران کی اپنی نااہلی ثابت ہوگی اور پھر میں یوں بھی اس کام کے لیے تمھارے علاوہ کسی دوسرے کو مددگار کے طور پر ساتھ لے جانے کی کوشش کروں گا۔''

''اصل بات یہ ہے کہ وہ خود کیوں نہیں یہ کام کرتے؟''

''اس بارے کرنل سکاٹ کا کہنا تھا کہ وہ اٹھارہ سو میٹر دور سے ہدف کونشانہ بنوانا چاہتے ہیں اور میرے علاوہ کوئی بھی اس فاصلے سے فائر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔''(قارئین کی معلومات کے لیے لکھتا چلوں کہ اب **Anzio 20mm Gaint Sniper Rifle** بھی ایجاد ہوگئی ہے جس کی کارگر رینج **3500** میٹر ہے۔البتہ کچھ ہتھیار شناس اسے صرف اینٹی میٹریل رائفل کہتے ہیں)

''بہ ظاہر تو اس کی بات بالکل ٹھیک ہے۔''سردار نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے پوچھا۔''تو پھر کیا کروں،آمادگی ظاہر کردوں؟''

''اگرلی زونا سے مشورہ کرلیں، وہ یوں بھی انٹیلی جنس سے متعلق ہے اس معاملے میں بہتر رائے دے سکے گی۔'' سردار کا مشورہ کافی بہتر تھا۔

''کیا لی زونا کو رازدار بنانا ٹھیک ہوگا، کہیں وہ راز فاش نہ کردے۔''

''جہاں تک میرا اندازہ ہے لی زونا قابل اعتماد لڑکی ہے، وہ یقیناً ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔ بلکہ یاد کرو تو تمھیں جینیفر سے محتاط رہنے کا مشورہ اسی نے دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے رات کو ڈنر کے بعد تم اس کے کمرے میں چلے جانا وہاں کافی وغیرہ پی کر تھوڑی دیر گپ شپ کرنا اور پھر ہوا خوری کے بہانے اسے یہاں لے آنا، لیکن یاد رہے کسی بھی قسم کے نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔''

''نقصان۔'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں نقصان، کیونکہ یقیناً ہمارے کرم فرماؤں کو لی زونا کا اس راز سے واقف ہونا پسند نہیں آئے گا۔''

''رہنے دو پھر۔'' سردار دوٹوک لہجے میں بولا۔

''بڑی فکر ہے خان صاحب!''

''نہیں یار!...... کسی بے گناہ کو خواہ مخواہ اپنے مسائل کا شریک بنانا کہاں کی عقل مندی ہے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''درست کہا...... یوں بھی کرنل سکاٹ نے مجھے کسی بھی آدمی کو یہ بات بتانے سے منع کر دیا تھا۔'' میں فوراً اس کے ساتھ متفق ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا کھا کر سردار لی زونا کے ساتھ کافی پینے چلا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے بھی دعوت دی مگر میں نے اس کے ساتھ جانا مناسب نہ سمجھا۔ میری وجہ سے لی زونا پر شک کیا جا سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر برین ویلز کی فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔ مجھے پڑھتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹا کر جینیفر اندر داخل ہوئی۔ مشق سے واپسی کے بعد وہ پہلی بار میرے پاس آئی تھی۔

''کیا حال ہے ذی!'' وہ بے تکلفی سے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

''بہتر ہے۔'' مختصراً کہہ کر میں مطالعے کی طرف متوجہ رہا۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' میرے موڈ کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ سے فائل لینے کی کوشش کی۔

میں فائل بند کر کے تکیے نیچے رکھتا ہوا بولا۔ ''کسی کے ذاتی کاغذات کو دیکھنے کی کوشش کرنا میرا خیال ہے مہذبانہ فعل نہیں ہے۔''

''تمھارا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے؟''

''تم نہیں جانتیں۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے تلخی سے کہا۔ ''جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

''ذی!...... بہ خدا مجھے علم نہیں ہے تم کیوں خفا ہو۔''

''اچھا...... یہ بتا دو کہ شری کانت کو موبائل فون کس نے لے کر دیا تھا؟'' میں نے ہوا میں تیر چھوڑا، کیونکہ جس طرح جینیفر کو مجھے انڈین سنائپرز کی آمد سے مطلع کرنے کے لیے کسی رابطے کی ضرورت تھی، بعینہ اسے شری کانت پارٹی کو میری جگہ کے بارے بتانے کے لیے بھی ان سے رابطے کی ضرورت ہوتی۔ اس کے علاوہ تو کوئی ایسی صورت نہیں تھی جس سے انڈین سنائپرز کو میری جانب بھیجا جا سکتا۔

''کک...... کون سا موبائل؟'' اس کی آواز میں شامل لرزش مجھے یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔

''اب کہہ دو یہ بھی جھوٹ ہے کہ شری کانت کے حوالے بھی تم نے موبائل کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن اسے بھی تو میں نے اسی لیے لے کر دیا تھا تا کہ میں اس کی گولی کا نشانہ بننے سے بچ جاؤں، اصل میں میں چاہتی تھی کہ تم لوگ آپس میں لڑتے رہو گے اور میں......''

''بس کرو جینی۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''جھوٹ بولنے کے لیے لہجے میں اعتماد کا ہونا

ضروری ہوتا ہے۔‘‘

’’میں مجبور تھی۔‘‘

’’مجھے بس یہ افسوس ہے کہ تم نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے دوستی اور محبت کو ہتھیار بنایا۔‘‘

’’ذی!......میں تم سے سچ مچ محبت............‘‘

’’براہ مہربانی میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔تم تشریف لے جا سکتی ہو۔‘‘میں نے ایک بار پھر اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

’’اس میں تمھارا کوئی نقصان نہیں تھا سمجھے تم۔‘‘وہ بھی ایک دم غصے میں آ گئی تھی۔’’گولی کا نشانہ انڈین سنائپرز نے بننا تھا تم نے نہیں۔اور جس کام کے لیے تمھیں مجبور کیا جا رہا ہے اس میں بھی تمھارا کوئی نقصان نہیں بلکہ ایک طرح سے فائدہ ہے کہ تمھیں ایک مسلمان دشمن شخص کو ختم کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔‘‘

’’کیا مجھے اعتماد میں نہیں لیا جا سکتا تھا۔‘‘

’’کوشش تو کی تھی،تم مانے ہی نہیں۔‘‘

’’فارم والے قصے کو چھوڑو،میرا اشارہ مشق والے واقعے کی طرف ہے۔‘‘

اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔’’میں نہیں بتا سکتی تھی،اگر بتا دیتی تو میرا بہت زیادہ نقصان ہو جاتا۔‘‘

’’تو پھر محبت کا دعوا کس لیے؟‘‘

’’ٹھیک ہے نہیں کرتی دعوا،میں تمھاری دشمن ہوں،مجھے تم سے نفرت ہے،مجھے تم ایک آنکھ نہیں بھاتے،اب خوش۔‘‘وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔اس کی آنکھوں کے کٹورے پانی سے لبریز ہو گئے تھے ۔مگر اس سے پہلے کہ آنسو باہر آتے وہ رخ موڑ کر چل دی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔دروازے کے سامنے وہ ایک لمحے کے لیے رکی،اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو ملا اور باہر نکل گئی۔

میں آنکھیں بند کر کے موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔میں انکار کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔اس سے جہاں ہم دونوں سزا کے حق دار ٹھہرتے وہیں ملک کی بھی بدنامی تھی۔ہم دونوں بری طرح پھنس گئے تھے

۔کرنل سکاٹ کے لیے شری کانت کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔اور اس کی موت کا الزام لامحالہ ہم دونوں کے سر ہوتا، کہ ہمارے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت موجود تھے۔برین ویلز کو وہ جس وجہ سے بھی مروار ہے تھے یہ میرا دردِ سر نہیں تھا، مگر برین ویلز کی مسلم دشمنی میں شبے کی گنجایش نہیں تھی، کیونکہ کرنل سکاٹ نے میرے حوالے جو فائل کی تھی اس میں زیادہ تر حوالے مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے برین ویلز کے بیانات پر مشتمل تھے۔اور ایک مسلم دشمن یہودی کو اپنی جان بچانے کے لیے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں کرنل سکاٹ کے سامنے بیٹھا اسے اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

''گڈ!......مجھے تم سے اسی فیصلے کی توقع تھی۔''میرا اثبات سنتے ہی کرنل سکاٹ خوش دلی سے مسکرایا۔

''مجبوری ہے۔''میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

''اچھا میں فالتو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اصل مدعا پر آتا ہوں۔تمھارے پاس قریباً ایک ہفتے کا وقت ہے اس دوران تم روزانہ فائرنگ رینج پر جا کر مشق کر لیا کرو۔اس ضمن میں ایک نئی ہیوی سنائپر تمھارے حوالے کر دی جائے گی۔''

میں نے کہا۔''وہ پہلے والی ٹھیک ہے نا۔''

''نہیں......ہم وہ استعمال نہیں کر سکتے۔فائر کے بعد رائفل وہیں پر چھوڑنا پڑے گی اور اس رائفل پر آرمی کا نمبر کھدا ہوا ہے، تفتیش کا رخ فوراً ہماری جانب مڑ جائے گا اور ہمیں جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔اس لیے ہم تمھیں بالکل نئی رائفل دیں گے۔یقیناً ایک ہفتے میں نئی رائفل کو اپنے موافق کرنا تمھارے لیے مشکل نہیں ہو گا۔''

''ویسے میری فائرنگ مشق پر دوسرے ممالک کے سنائپرز کو کوئی حیرانی یا شک وغیرہ نہیں ہو گا۔''

تم یہاں سے جینیفر کے ساتھ سیر سپاٹے کے بہانے نکلو گے۔کسی کو کیا معلوم کہ تم کہاں جا رہے ہو۔''

''ویسے مجھے حیرانی اس بات پر ہے کہ ایک آدمی کو مروانے کے لیے تم اتنے پاپڑ بیل رہے ہو، حالانکہ تم لوگ

پورے کے پورے شہر صفحہ ہستی سے مٹا کر بھی انسانیت کے خادم ہی رہتے ہو۔''

''اور تم لوگ بس کڑھتے رہنا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔''بہ ہر حال تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ برین ویلز کوئی عام آدمی نہیں، ایک امریکن شہری ہونے کے ساتھ بہت اثر رسوخ اور پہنچ والا شخص ہے۔ وہ جس گاڑی میں سفر کرتا ہے وہ کئی کلوگرام بارود کا دھما کا برداشت کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس کے گرد ہر وقت درجن بھر اعلا تربیت یافتہ کمانڈوز کا گھیرا ہوتا ہے۔ بلٹ پروف جیکٹ وہ صرف سوتے وقت اتارتا ہے۔ پانی کا ایک گلاس بھی بغیر طبی معائنے کے اسے پیش نہیں ہوتا۔ ایک اسی منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اس کی رہائش ہے۔ جس کی ساری کھڑکیوں میں بلٹ پروف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کی نچلی منازل میں حساس سرکاری دفاتر ہیں اس لیے وہاں کسی غیر متعلقہ شخص کا گزر ممکن ہی نہیں۔ اور بالفرض کوئی اندر گھسنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو برین ویلز کی رہائش گاہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ وہاں صرف اس کے محافظوں ہی کا داخلہ ممکن ہے۔ کوئی اس کے محافظوں کا روپ دھار کے بھی اندر نہیں جا سکتا کہ داخلے کے وقت کمپیوٹر، انگلیوں کے نشان، آنکھ کی پتلی کا معائنہ اور آواز کو پہچان کر ہی داخلے کی اجازت دیتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر گویا ہوا۔''یقیناً یہ سرسری معلومات ہی تمھیں یہ بتانے کے لیے کافی ہوگی کہ برین ویلز کو ختم کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے ختم کرنے کے ساتھ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ہم پر شک کر سکے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم ہماری مدد کرو گے۔''

میں نے پوچھا۔''اور میں اسے کہاں سے نشانہ بناؤں گا؟''

''وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا؟ فی الحال تم اپنی مشق پر توجہ دو۔''

''اس دوران تمام ممالک کے سنائپرز یہیں رہیں گے۔''

''ہاں، کیونکہ اکیلے تمھیں روکنے میں انھیں پتا چل جائے گا کہ شری کانت کے زخمی ہونے میں تمھارا ہاتھ ہے، جبکہ تحقیقات کے بہانے سب کو روکنے پر کسی کو شک نہیں ہوگا۔''

''آخری بات، کیا میرے ساتھ جینیفر کا ہونا لازمی ہے۔''

''ایک تو اسے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ زیادہ آدمیوں تک یہ بات پہنچے۔ دوسرا اس کی

اپنی یہ خواہش ہے۔اس کے ساتھ وہ امریکن شہری ہے، جہاں پر کارروائی ہونا ہے اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہےاور سب سے بڑھ کر وہ خود بھی بہت اچھی سنا ئپر ہے۔''

''مجھے اجازت دیں۔''میں کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے......لیکن یاد رکھنا اس کام کو ہلکا نہ سمجھنا، تمھاری نا کامی کا مطلب یہ ہے کہ وہ مزید چوکنا ہو جائے گا اور یہ مشکل کام ناممکن میں تبدیل ہو جائے گا۔''

''جب حامی بھر لی ہے تو دھوکا نہیں دوں گا، البتہ سو فیصد کامیابی کا دعوا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔''

اس نے متفق ہونے کے انداز میں سر ہلایا اور میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

میں بہ مشکل اپنے کمرے میں داخل ہو پایا تھا کہ جینیفر آدھمکی۔اس کے چہرے پر کل والی گفتگو کے آثار اب تک معدوم نہیں ہوئے تھے۔

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔''سر سکاٹ کہہ رہے ہیں، ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

''میں تیار ہوں۔''میرے لہجے میں بھی اجنبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''چلو پھر۔''اس نے کہا۔اور ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔سردار غائب تھا۔اور میرے اندازے کے مطابق اسے لی زونا کے پاس ہونا چاہیے تھا۔اسے میں نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ لی زونا کو یہ بات بالکل نہ بتائے۔یوں بھی وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا کہ اپنے فائدے نقصان کی بابت نہ جان سکتا۔

میں جینیفر کی معیت میں چلتا ہوا اس کی کار تک پہنچا۔اس کے پاس سرخ رنگ کی خوب صورت بی ایم ڈبلیو تھی۔فائرنگ رینج تک ہم بغیر کوئی گفتگو کیے پہنچے تھے۔شناخت کے مراحل سے گزر کر ہم فائرنگ اڈے پر پہنچ گئے۔مجھے وہیں رکنے کا کہہ کر وہ وہاں پر بنی ایک دو منزلہ عمارت کی طرف بڑھ گئی۔تھوڑی دیر بعد ایک وہ ایک نوجوان کے ہمراہ واپس لوٹی جس نے ہیوی سنا ئپر، رینج ماسٹر کا بکس اٹھایا ہوا تھا۔خود جینیفر کے پاس ہیوی سنا ئپر کا چھوٹا ایمونیشن بکس تھا جس میں اس رائفل کی سو گولیاں پیک ہوتی ہیں۔بکس وہیں رکھ کر وہ واپس لوٹ گیا۔میں نے بکس کھول کر رائفل باہر نکالی ٹیلی سکوپ سائیٹ اس پر فٹ کی۔اس دوران جینیفر نے ایمونیشن نکال کر میگزین میں بھرنا شروع کر دیا تھا۔تیار ہو کر میں نے ہدف کو دو سو میٹر کے فاصلے پر سیٹ کیا اور رائفل کی زیرونگ

دیکھنے لگا۔ پانچ گولیاں فائر کرنے کے بعد میں نے لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ مناسب تبدیلی کی۔ اور پھر ہدف کو پانسو میٹر دور کر کے فائر کرنے لگا۔ اگلی مرتبہ میں نے ہزار میٹر سے فاصلے سے فائر کیا۔ اور پھر ہزار سے ایک دم میں نے ہدف کو اٹھارہ سو میٹر کے فاصلے پر دھکیل دیا۔ ہوا بالکل موافق تھی۔ جینیفر خاموشی سے خالی میگزینیں بھرتی رہی اور میں میگزینیں ہدف پر خالی کرتا رہا۔ بکس میں موجود تمام گولیاں ختم کرنے کے بعد ہم واپس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

کار میں بیٹھتے وقت وہ سرسری لہجے میں بولی۔ ''تم واقعی بہت اچھے نشانہ باز ہو۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں اور یہ صلاحیت مجھے اس مقام پر لے آئی ہے۔''

میرا جواب ایسا نہیں تھا کہ وہ مزید کچھ بول پاتی۔

☆......☆......☆

اگلے پانچ دن میں اور جینیفر مسلسل فائرنگ رینج پر جاتے رہے۔ میں روزانہ پچاس گولیاں اٹھارہ سو اور پچاس گولیاں انیس سو میٹر کے فاصلے سے ہدف پر فائر کرتا۔ اس دوران کبھی تیز ہوا چل رہی ہوتی، کبھی درمیانی۔ کبھی تیز دھوپ، کبھی معتدل اور کبھی سہ پہر کے بعد کا وقت۔ ہر قسم کے حالات میں فائر کرنے سے اس فاصلے پر میرا نشانہ مزید پختہ ہو گیا تھا۔ اتوار کے دن مجھے ایک مرتبہ پھر کرنل سکاٹ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ جینیفر بھی میرے ہمراہ تھی۔ وہ بھی اکیلا نہیں تھا۔ فارم ہاؤس والی کرنل جولی روز ویلٹ اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

رسمی کلمات کی ادائی کے بعد وہ براہ راست مقصد پر آ گیا۔ ''آج شام کو تم لوگوں نے نیویارک جانا ہے۔ سنائپر رائفل پہلے ہی سے بھجوا دی گئی ہے۔ تم لوگوں نے جس جس ہوٹل میں ٹھہرنا ہے اس کے بارے جینیفر کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہاں تم لوگوں کے چہرے بدل دیے جائیں گے اور نئی شناخت کے کاغذات تمھیں مل جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ کرنل جولی روز ویلٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ خاموش بیٹھی جولی روز ویلٹ نے ٹیبل سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر دیوار پر لگی بڑے سائز کی ایل ای ڈی آن کی اور اپنے سامنے موجود لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایل ای ڈی کی سکرین روشن ہوئی اور پس منظر میں ایک خوب صورت عمارت نظر آنے لگی۔ جولی کے لب وا ہوئے۔

’’سوموار کو دن دس بجے ہدف نے یہاں ایک میٹنگ میں شمولیت کرنا ہے جس کا دورانیہ ایک گھنٹا ہوگا۔اس کے بعد وہ اسی عمارت کے لان میں ایک پریس کانفرس سے خطاب کرے گا۔اس نے دس منٹ کی مختصر سی تقریر کرنی ہے اور اس کے بعد صحافیوں کی طرف سے سوالات و جوابات کا ایک مختصر سا سلسلہ ہوگا اس کا دورانیہ بھی دس سے پندرہ منٹ پر مشتمل ہوگا۔صحافیوں سے گفتگو ختم کر کے وہ اس جگہ آئے گا۔‘‘جولی نے کرسر سے،ترتیب سے لگی کرسیوں کی نشان دہی کی۔’’اس کرسی پر میں نے اس سے تین کاغذ سائن کرانے ہیں۔اور اس میں بہ مشکل پچاس سیکنڈ سے ایک منٹ تک کا وقت لگے گا۔اسی دوران اسے نشانہ بنایا جا سکے گا۔اس عمارت کے گرد تیرہ سو سے چودہ سو میٹر کے دائرے میں جتنی بھی بلند عمارتیں ہیں کہ جن کی چھت سے اس جگہ کو دیکھا جا سکے،ان پر پولیس،سی آئی اے اور ایف بی آئی کے اہلکار تعینات ہوں گے۔البتہ اس سے زیادہ فاصلے والی عمارتوں کو ہم نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔اور اس میں ایک اس ہوٹل کی عمارت ہے۔‘‘جولی نے ایک بلند ہوٹل کی تصویر پر کرسر روکا۔’’یہ فور سیزن ہوٹل ہے اس کی بلندی قریباً دو سو میٹر ہے۔اور یہ باون منزلہ عمارت ہے۔اس کی چھت سے اس کرسی تک کا ہوائی فاصلہ اٹھارہ سو پچاسی میٹر بنتا ہے۔پچاسویں منزل پر تم دونوں کے لیے کمرہ بک ہو چکا ہے۔وہاں سنائپر رائفل بھی پہنچا دی گئی ہے۔کمرے سے رائفل چھت پر لے جانا اور کامیاب فائر کے بعد خود کو سرکاری اہلکاروں سے محفوظ رکھنا تمھاری اپنی ذمہ داری ہوگی۔‘‘

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔’’مطلب اگر ہم ان کے ہاتھ چڑھ گئے تو تم ہم سے لاتعلقی ظاہر کرو گے؟‘‘

’’نہیں،میں نے ایک امکانی بات کی ہے،ویسے ایسا موقع نہیں آئے گا۔اس ہوٹل میں قریباً پونے چار سو کمرے ہیں اور تمام کمروں کی چھان بین کر کے کسی اہلکار کا تم تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوگا،مگر احتیاط تو لازم ہے نا۔‘‘

’’تم جانتی ہو کہ میرے لیے یہ بالکل انجان علاقہ ہے۔‘‘

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔’’کیپٹن کی موجودی میں تمھارا یہ گلہ بے جا ہے۔‘‘

’’کاغذ دستخط کراتے وقت تمھارا اس سے فاصلہ کتنا ہوگا؟‘‘

’’وہ اس کرسی پر بیٹھا ہوگا اور میں اس کے بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھی ہوں گی۔‘‘اس نے دو اکٹھی پڑی

کرسیوں کی نشان دہی کی۔

میں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔''مناسب ہوگا کہ تم بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو کر اس سے دستخط لینا اور بلٹ پروف جیکٹ ضرور پہننا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ٹانگ میں لگنے والی گولی سے موت واقع نہیں ہوتی۔''

''مگر مجھے تو بتایا گیا ہے کہ تم بے مثال نشانہ باز ہو۔''

''میڈم انیس سو میٹر کے فاصلے سے ایک آدمی کے سر کو نشانہ بنانا ہے اور موسم کا کوئی پتا نہیں کہ کیسا ہو، سب سے بڑا خطرہ ہوا کا ہوتا ہے۔گولی کو آسانی سے دائیں بائیں لے جاسکتی ہے۔''

''جب وہ روسٹرم سے چل کر اس کرسی تک آئے گا تو کیا اس وقت اسے نشانہ بنانا ممکن نہیں ہے؟''

''حرکتی ہدف کو اتنے فاصلے سے نشانہ بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی کہ کھڑے ہو کر اس سے دستخط لوں، لیکن اگر اس نے مجھے بیٹھنے کا کہا تو یقیناً میں انکار نہیں کرسکوں گی۔''

''یہ کاغذ تمھارے بجائے کوئی اور دستخط کرانے نہیں آسکتا؟''

''نہیں......اور اگر آسکتا تب بھی میں خود ہی آتی کہ دوسری صورت میں میں شک کی زد میں آسکتی ہوں۔''

''تیز ہوا چلنے کی صورت میں کیا میں گولی نہ چلانے کا فیصلہ کرسکتا ہوں؟''

جولی روزویلٹ نے سوالیہ نظروں سے کرنل سکاٹ کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔'' کرنل سکاٹ نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ موقع بہت عرصے بعد ہاتھ آیا ہے۔اور ہم تم لوگوں کو مزید یہاں روک بھی تو نہیں سکتے نا۔''

''ٹھیک ہے، لیکن کوشش کرنا میڈم!......ہوا اگر ہدف سے تمھاری طرف چل رہی ہو تو پھر بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہونے کو ترجیح دینا۔''

''کوئی اور سوال؟'' کرنل جولی روزویلٹ نے میری بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”شکریہ مادام!“ میں نے کہا، جبکہ جینیفر نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔تمھارے پاس ایک گھنٹے کا وقت ہے۔یہ ساری تفصیلات ایک بار پھر اس پریزنٹیشن میں دیکھ لو۔دو گھنٹے بعد تمھیں یہاں سے روانہ ہونا ہوگا۔“ یہ کہہ کر کرنل سکاٹ کھڑا ہو گیا۔کرنل جولی روز ویلٹ نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ہم دونوں نے بھی اٹھ کر انھیں تعظیم دی۔وہ لیپ ٹاپ کو آن چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ان کے جانے کے بعد جینیفر مجھے اس جگہ اور ارد گرد کی عمارتوں سے واقفیت دلانے لگی۔اس کی باتیں سن کر مجھے کرنل سکاٹ کی بات بالکل صحیح لگنے لگی تھی کہ اس مشن میں جینیفر سے اچھا ساتھی مجھے نہیں مل سکتا تھا۔تمام پہلوؤں کا ایک بار پھر جائزہ لینے کے بعد ہم دونوں جانے کے لیے تیار تھے۔

میں نے کہا۔”میرا خیال ہے میں ایک بار اپنے ساتھی سے مل لوں۔“

”ٹھیک ہے، تم ہو آؤ۔“ جینیفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔سردار ٹی وی دیکھ رہا تھا۔مجھے دیکھتے ہی شکوہ کناں ہوا۔

”آج کل نظر ہی نہیں آتے ذیشان بھائی!“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔”تمھاری نظر لی زونا پر سے ہٹے ہو تو ہم نظر آئیں نا، خان صاحب!“

”کہہ سکتے ہو بھائی!“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”اچھا میں تمھیں الوداع کہنے آیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”میں اور جینیفر بس کچھ دیر میں نیویارک روانہ ہو جائیں گے۔“

”مجھے بھی ساتھ لے چلتے۔“

”ہم کوئی سیر سپاٹے کے لیے نہیں جا رہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ پر خلوص لہجے میں بولا۔

”بس یار!......دعا کرنا۔“ میں نے اس سے الوداعی معانقہ کیا اور واپس مڑ گیا۔

☆......☆......☆

جینیفر کی خوبصورت بی ایم ڈبلیو کار میں بیٹھ کر ہم نیو جرسی سے نیو یارک روانہ ہو گئے۔ پونے دو گھنٹوں میں ہم نیو یارک پہنچ گئے تھے۔ نومیڈ ہوٹل میں ہمارے لیے ایک کمرہ اصل ناموں سے بک تھا۔ وہاں ہمارا حلیہ بدلنے کے لیے میک اپ کا ایک ماہر موجود تھا۔ ہم نے اپنا حلیہ بدلی کیا اور وہاں سے باہر آ گئے۔

جینیفر ایک نیگرو لڑکی کے روپ میں تھی۔ اس کے چہرے، گردن اور ہاتھوں پر مخصوص کالے رنگ کی باریک جھلی ایسے چپکا دی گئی تھی کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی سرخ و سفید جینیفر ہے۔ اس نے جینز کے ساتھ مکمل بازوؤں والی قمیص پہنی تھی یوں باقی جسم لباس میں چھپ گیا تھا۔ اس نے سر پر گھنگریالے بالوں والی وگ پہن لی تھی۔ میں خود اس وقت ایک گورے کے بہروپ میں مستور تھا۔ چونکہ انگلش پر دسترس رکھنے کے باوجود میرا لہجہ امریکنوں سے یکسر مختلف تھا اس لیے جینیفر نے مجھے زیادہ بات چیت سے منع کر دیا تھا۔ البتہ روزمرہ کے چند فقرے میں نے امریکنوں کے انداز میں کہنا رٹ لیے تھے۔

نومڈ ہوٹل سے فور سیزن ہوٹل تک اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر فور سیزن ہوٹل کی جانب روانہ ہو گئے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ رش کافی زیادہ تھا۔ یوں بھی نیو یارک دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں ہم فور سیزن ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کے سامنے تھے۔ نیچے اتر کر جینیفر نے کرایہ ادا کیا اور ہم اندر کی طرف بڑھ گئے۔ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کو جینیفر خود مخاطب ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم لفٹ کے ذریعے بلند ہو رہے تھے۔

کمرہ نہایت شاندار، صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ دروازہ اندر سے لاک کر کے ہم نے بیڈ کے نیچے سے پیک شدہ ہیوی سنائپر نکالی۔ اس کے ساتھ ایک بیگ میں سنائپنگ سے متعلقہ سامان یعنی دوربین، لیزر رینج فائنڈر، ونڈ میٹر وغیرہ بھی موجود تھے۔

سامان واپس رکھ کر ہم سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر پہنچے اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ نیچے جھانکنے پر روشنیوں کا سیلاب نظر آ رہا تھا۔ لیکن کتنی زیادہ بھی روشنی کیوں نہ ہوتی؟ ہدف کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اگلے دن کے لیے ہم نے اپنے بیٹھنے کی جگہ کا چناؤ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر چھت پر گزار کر ہم نیچے اتر آئے۔

کھانا ہم نے روم سروس کے ذریعے کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔ چونکہ ہوٹل میں مسلمانوں کے لیے حلال

کھانا دستیاب تھا اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر ہم نے تھوڑی دیر کل کی کارروائی پر بات چیت کی اور پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ مجھے اس کی عادت کا پتا تھا اس لیے میں نے اس کے ساتھ بستر پر لیٹنے سے گریز کیا تھا۔ مجھے صوفے پر لیٹتا دیکھ کر وہ بس مجھے گھور کر رہ گئی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر ہم سیڑھیوں کے ذریعے چھت پر پہنچے اور وہاں ہیوی سنائپر اور دوسرا سامان چھپا کر رکھ دیا۔ پھر نیچے آ کر ناشتا کرنے لگے۔

کافی کا سپ لیتے ہوئے وہ سرسری لہجے میں بولی۔ ''مشن کی تکمیل کے بعد ہم نے فوراً یہ ہوٹل چھوڑنا ہے نا؟''

''جی!...... طے تو یہی ہوا تھا؟''

''اگر اس وقت میں حکمت عملی میں کوئی تبدیلی کر دیتی ہوں تو تم بحث میں نہ الجھنا، بس میں جو کہوں خاموشی سے اس پر عمل کرنا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کو چھوڑو، تمھیں یہاں سے بہ خیریت واپس لے جانا میری ذمہ داری ہے اور براہ مہربانی چوں چراں کیے بغیر میری ہدایات پر عمل کرتے رہنا۔''

''جو کچھ کرنا ہے، ہم اس پر کافی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں، پھر تمھاری اس بات سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''یہی کہ میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔'' میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ ایک عزم سے بولی۔

اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں سوائے سچائی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا یا شاید وہ اتنی اچھی اداکاری کر رہی تھی کہ مجھے اس کا اصل چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

نو بجے کے قریب ہم اوپر پہنچے، ہوٹل سیکورٹی کی وردی میں ایک آدمی جینیفر نے چھت کے دروازے پر متعین کر دیا تھا تاکہ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے۔ ہمارا کام پورا ہوتے ہی اس نے وہاں سے رفو چکر ہو جانا تھا۔ اس کی موجودی میں ہم دونوں بے فکر ہو کر اپنا کام کر سکتے تھے۔ دن کی روشنی ہمیں مطلوبہ عمارت آسانی سے نظر آ رہی تھی۔ دوربین کی مدد سے میں نے اس عمارت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ تقریب کے لیے وہاں کرسیاں اور

روسٹرم وغیرہ رکھ دیا گیا تھا۔ چھاتی تک تو ہدف نے روسٹرم کے پیچھے چھپ جانا تھا اس سے اوپر بلٹ پروف شیشہ لگا تھا۔

جینیفر کو موبائل فون پر کارروائی میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کا پیغام موصول ہوا کہ برین ویلز نے اپنی تقریر کے بعد کاغذ دستخط کرنے تھے اور اس کے بعد صحافیوں کے سوالات کا جواب دینا تھا۔ میں نے اس عمارت کے گرد موجود اونچی عمارتوں پر سرکاری اہلکار گھومتے دیکھے۔ عمارت کو بھی پولیس کی تیز رفتار کاروں نے گھیرا ہوا تھا۔ جولی روزویلٹ نے جتنی کرسیاں پریزنٹیشن میں دکھائی تھیں اتنی ہی کرسیاں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

جینیفر رائفل کو بکس سے نکال کر سیٹ کرنے لگی۔ میں بھی نیچے بیٹھ کر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ رائفل کو جوڑ کر میں نے مطلوبہ کرسی پر فکس کر دیا۔ جینیفر نے لیزر رینج فائینڈر سے کرسی کا فاصلہ ناپا۔ اٹھارہ سونوے میٹر فاصلہ بنا تھا۔ ایلیویشن ناپ پر مطلوبہ رینج لگا کر میں رائفل کے پیچھے لیٹ گیا۔

جینیفر نے ونڈ میٹر، بلاسٹک کیلکو لیٹر اور فائرنگ ٹیبل بیگ سے باہر نکال لیے تھے۔ یہ فائرنگ ٹیبل ہم نے مشق کے ذریعے ترتیب دیا تھا۔ ویسے تو فائرنگ ٹیبل ہر رائفل کے ساتھ بھی دستیاب ہوتا ہے مگر مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے ایمونشن میں فرق ہوتا ہے۔ درجہ حرارت اور ہوا میں موجود نمی وغیرہ بھی ہر علاقے میں یکساں نہیں ہوتی۔ جبکہ ان چیزوں کا فائر پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو سنائپر رائفل سے نشانہ بازی کسی سائنس سے کم نہیں ہوتی۔ البتہ عام نشانے بازی میں ان سب باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

میں نے پوچھا۔ ”میگزین میں گولیاں بھر دی ہیں؟“

”بھر دیتی ہوں۔“ اس نے میگزین اتار کر بیگ سے دو گولیاں نکالیں اور میگزین میں ڈال کر میگزین دوبارہ رائفل سے جوڑ دی۔ دونوں گولیوں پر کسی بھی قسم کی لکھائی اور نشان وغیرہ لگا ہوا نہیں تھا۔

”دو ہی گولیاں ملی ہیں۔“ کہہ کر وہ ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار ماپنے لگی۔ رفتار ماپ کر اس نے فائرنگ ٹیبل کی مدد سے مطلوبہ ڈیفلیکشن مجھے بتا دی۔

ابھی تک ٹھہرو، ہوا کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ رک جائے یا تیز ہو جائے۔ جس وقت ہدف روسٹرم چھوڑ کر کرسی کی جانب حرکت کرے گا اس وقت تم نے ہوا کی رفتار معلوم کر کے مطلوبہ ڈیفلیکشن بتانا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر اس نے دوربین اٹھائی اور میرے ساتھ ہی الٹی لیٹ کر اطراف کا جائزہ لینے لگی ۔میں یہ کام ٹیلی سکوپ سائیٹ کی مدد سے کر رہا تھا۔

”ویسے ایمونیشن معیاری تو ہے نا؟“ ایک اندیشہ میرے ذہن میں کلبلایا اور میں نے جینیفر کے گوش گزار کر دیا۔

”یہ بالکل وہی ایمونیشن ہے جس سے کہ تم مشق کرتے رہے ہو، بس کیس اور بلٹ پر کوئی نشان وغیرہ نہیں ہے۔“ اس کے جواب پر میں نے اطمینان سے سرہلا دیا تھا۔قارئین کی معلومات کے لیے لکھتا چلوں کہ ہر سنائپر رائفل کا ایمونیشن مختلف کمپنیاں بناتی ہیں اور ہر کمپنی ایک مخصوص گرین بارود کیس میں بھرتی ہے۔(گرین، گولی میں بارود کی مقدار ناپنے کا پیمانہ ہے)

انتظار کے لمحات طویل ہونے کے باوجود بیت جایا کرتے ہیں۔ آخر وہ وقت آہی گیا۔ برین ویلز اندرونی عمارت سے محافظوں کے نرغے میں برآمد ہوا۔اور سیدھا روسٹرم کے پیچھے آکر رک گیا۔دو محافظ اس کے دائیں بائیں اور تین پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔جینیفر مسلسل رنگ بدلتی ہوا کو ونڈ میٹر سے ماپ رہی تھی۔اور پھر جیسے ہی برین ویلز روسٹرم کو چھوڑ کر کرسی پر بیٹھی کرنل جولی روز ویلٹ کی جانب بڑھا، جینیفر نے فوراً مطلوبہ ڈیفلیکشن معلوم کر کے سائیٹ پر لگانے لگی۔میں نے اعصاب کو پرسکون کر کے کرسی کا نشانہ سادھ لیا تھا۔برین ویلز جونھی قریب پہنچا کرنل جولی روز ویلٹ کھڑی ہوگئی۔اور پھر شاید اس نے نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا کہ وہ اس کے سامنے فائل دھرتی ہوئی بیٹھ گئی تھی۔ ہوا نارمل ہی تھی لیکن پھر بھی کرنل جولی روز ویلٹ کے دل میں خوف کی موجودی یقینی تھی۔اسے معلوم تھا کہ جو شخص اس کے اتنے قریب بیٹھا ہے اس نے گولی کا نشانہ بننا ہے اور نشانہ باز کی ہلکی سے غلطی سے وہ گولی برین ویلز کے بجائے اس کے سر میں پیوست ہو سکتی تھی۔

گہرا سانس لے کر میں نے نشانہ سادھ لیا۔جینیفر نے بھی آنکھوں سے دوربین لگاتے ہوئے مجھے دھیمے لفظوں میں تسلی دینا شروع کر دی تھی۔

”ذی!......تم یہ کر سکتے ہو، تمھارے لیے یہ بالکل مشکل نہیں ہے، اطمینان سے ٹریگر دبانا کہ ہمارے پاس بس ایک ہی گولی فائر کرنے کا موقع ہے۔ہلکی ہوا دائیں سے بائیں چل رہی تھی۔جینیفر کے ڈیفلیکشن لگانے

کے بعد ہوا کی رفتار میں تھوڑا اضافہ ہوا تھا لیکن اب حساب کتاب کا وقت گزر چکا تھا۔کرنل جولی روز ویلٹ بھی برین ویلز کے دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ہوا کی رفتار میں اضافہ جینیفر نے بھی محسوس کر لیا تھا۔اور یہ بات مجھے بتانے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

''ڈی!......ہوا میں تھوڑی تیز آ گئی ہے۔''

مگر میں نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی شست تھوڑی سی دائیں طرف کر دی۔یہ اندازہ ہر سنائپر کے ذاتی تجربے کی مرہون منت ہوتا۔اس بارے نہ تو کوئی استاد سکھا سکتا ہے اور نہ کسی کتاب میں یہ اندازہ درج ہوتا ہے۔اور یہی انداز ایک عام نشانے باز اور اچھے نشانے باز میں تمیز کی وجہ بنتا ہے۔

ہدف کے سر جھکا کر دستخط کرنے تک میں منتظر رہا۔جونہی اس نے فائل بند کر کے کرنل جولی روز ویلٹ کی سمت بڑھائی۔اس وقت سیکنڈ بھر کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔میں نے سانس روکتے ہوئے ایک دم ٹریگر کھینچ لیا ۔ہلکے سے دھماکے کے ساتھ گولی مزل سے نکلی۔میرے کندھے کو جانے پہچانے جھٹکے کا دباؤ محسوس ہوا اور اس کے ساتھ جینیفر بچوں کی طرح قلقاری مارتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

''آئی لو یو ڈی!''وہ وارفتگی سے بولی۔''تم نے کر دکھایا۔''

ٹیلی سکوپ سائیٹ میں مجھے وہاں بھگدڑ مچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''اٹھو۔''میرے چہرے کو اپنے ہونٹوں کا نشانہ بنا کر وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

میں فوراً کھڑا ہو گیا۔رائفل اور دوسرا سامان اٹھا کر ہم فوراً نیچے کی طرف بھاگے۔چھت کے قریب پہلا کمرہ خالی تھا۔اسے ماسٹر کی سے کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔رائفل اور دوسرے سامان کو بیڈ کے نیچے دھکیل کر ہم سرعت سے باہر نکلے۔سیکورٹی گارڈ کی وردی میں ملبوس ہمارا ساتھی فائر ہوتے ہی غائب ہو گیا تھا۔

لفٹ کا انتظار کرنے کے بجائے ہم سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔منصوبے کے مطابق ہمیں تین چار منزل نیچے اتر کر لفٹ پکڑنا تھی۔اڑتالیسویں منزل پر ہمیں لفٹ خالی ملی۔پہلی منزل کے بجائے جینفر نے پانچویں منزل کا بٹن دبا دیا۔

میں نے پوچھا۔''ہم نے تو نیچے اترنا تھا۔''

”ذی!......بالکل خاموش رہو۔“جینیفر نے آہستہ سے مجھے جھڑکا۔

تیز رفتار لفٹ نے ہمیں جلد ہی پانچویں منزل پر پہنچا دیا تھا۔مجھے ساتھ لے کر وہ ایک مخصوص کمرے میں گھس گئی۔

اندر گھستے ہی اس نے فوراً وگ اتاری،چہرے پر چڑھا ماسک اتارا اور اصل شکل میں آ گئی۔ہاتھ پر چڑھے باریک کالے دستانے اتار کر اس نے میری پرواہ کیے بغیر اپنی جینز کی پتلون بھی اتار دی تھی۔نیچے اس نے باریک انڈر ویئر پہنا ہوا تھا۔میں نے فوراً اپنا رخ دوسری جانب موڑ لیا تھا۔

چند لمحے بعد اس کی آواز آئی۔”اب تم میری جانب دیکھ سکتے ہو۔“

وہ کالی رنگ کی چست پتلون اور سفید رنگ کی شرٹ پہن چکی تھی۔اس کے اوپر ایک کالے ہی رنگ کا کوٹ پہن کر وہ میری طرف متوجہ ہو گئی۔

اس نے میرا ماسک اتارا۔اور وہاں پر موجود بیگ سے ایک دوسرا ماسک نکال کر مجھے پہنانے لگی۔میرے سکن کلر کے دستانے اتار کر اس نے مجھے دوسرے دستانے پہنا دیے۔اور ایک دوسرا لباس نکال کر اس نے مجھے لباس بدلنے کا کہا۔اسی وقت دراز ے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

مجھے سائیڈ پر ہونے کا اشارہ کر کے اس نے آگے بڑھ کر دروازے میں لگے مخصوص سوراخ سے باہر جھانکا اور پھر مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیا۔

اندر داخل ہونے والی شخصیت دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔کیونکہ وہ بھی جینیفر ہی تھی۔بالکل اسی حلیے میں جس میں اصل جینیفر کھڑی تھی۔

”ذی!......اس کی باتوں پر عمل کرنا۔“میرے قریب ہو کر اس نے ایک بار پھر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور سرعت سے باہر نکل گئی۔

”شاید تم لباس بدلی کر رہے تھے؟“اس کا لہجہ جینیفر سے بہت مماثل تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔یوں بھی میں کافی الجھ گیا تھا کہ وہ سارا ڈراما میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''تم یہیں تبدیل کرلو۔میں ڈریسنگ روم میں چلی جاتی ہوں۔'' بیڈ پر رکھا بیگ اٹھا کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔میں نے بھی جلدی جلدی لباس تبدیل کرلیا۔

جب وہ ڈریسنگ روم سے نکلی تو اس کی شکل بالکل بدلی ہوئی تھی۔جینیفر کے بال سنہری تھے۔جبکہ اس لڑکی کے بال کالے اور بالکل لڑکوں کے انداز میں ترشے ہوئے تھے۔

میرا لباس اور باقی کا سامان اس نے کالے رنگ کے بیگ میں منتقل کیا اور بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے بولی۔

''یہیں رہنا،کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔''

''تم کہاں جارہی ہو؟''

''میں یہ سامان ٹھکانے لگادوں۔''

میں نے پوچھا۔''واپس آؤ گی؟''

''نہیں......''اس نے نفی میں سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔کبھی سوچتا کہ مجھے جینیفر پر اعتبار کرنا چاہیے کہ وہ مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔اور کبھی یہ خیال آتا کہ میں کسی بڑی سازش کا شکار بن گیا ہوں۔

کافی دیر تک میں شش و پنج میں مبتلا رہا اور آخر میں خود کو جینیفر کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

جینیفر کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔میں نے مخصوص سوراخ سے جھانک کر دیکھا۔کالے رنگ کے سوٹ میں ملبوس دو آدمی نظر آئے۔میں نے دروازہ کھول دیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔اور جینیفر نے بھی اس بارے کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔اور آتے ساتھ مجھ سے نام پوچھا۔

''سٹیفن۔''میرے ذہن میں جو پہلا نام آیا میں نے اگل دیا۔

اس کا اگلا سوال شناختی کارڈ کے متعلق تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔مجھے خاموش پا کر ایک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال کر مجھے حکم دیا۔

''ہاتھ اوپر۔'' ہاتھ اوپر کرتے ہوئے میرے دماغ میں سوچ ابھری کہ بس ابھی پھنس گیا ہوں۔

اسی وقت جینیفر دو آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوئی جنھوں نے تین آدمیوں کو ہتھکڑی لگا کر پکڑا ہوا تھا۔

''کیپٹن!......اس کے پاس شناختی کارڈ موجود نہیں ہے۔''

''گرفتار کرلو۔'' جینیفر کی آنکھوں میں مجھے شناسائی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔

میرا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ میں ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہو چکا تھا۔

''مم......مگر میں............'' میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا۔

''ہیڈ کواٹر جا کر بات کرنا۔'' میری بات سنے بغیر اس نے سختی سے میرے بازو پشت کی جانب موڑتے ہوئے ہتھکڑی لگا دی۔ جینیفر پیچھے مڑ کر باہر نکل گئی تھی۔ ہم چاروں کو دھکیلتے ہوئے وہ باہر لائے اور کالے شیشوں والی ایک ویگن میں بٹھا کر انھوں نے ہمارے سروں پر کالے رنگ کے نقاب چڑھائے اور اس کا دروازہ باہر سے تالا کر دیا۔

میں جینیفر پر اعتبار کر کے بری طرح پھنس گیا تھا۔ ویگن سٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں جاتے ہی جب میک آپ اترتا اور میرا اصل چہرہ سامنے آتا تو مجھے الیکٹرک چیئر پر بیٹھنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اور اس کے ساتھ جو پاکستان اور مسلمانوں کی بدنامی ہونی تھی وہ ایک علاحدہ پریشانی تھی۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ساری بات بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے بتا دوں گا۔

''اگر میں نے فوراً ہوٹل سے نکلنے کی کوشش کی ہوتی تو یقیناً بچ جاتا۔'' ایک حسرت بھری سوچ میرے ذہن میں ابھری۔ اور میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا میں کئی بار جینیفر کے ہاتھوں دھوکا کھانے کے باوجود ایک مرتبہ پھر اس پر اعتبار کر بیٹھا تھا۔ کہتے ہیں مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا لیکن میں نے تیسری مرتبہ اس سے دھوکا کھایا تھا۔ اور اس کے بعد مزید یوں بھی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اب میرے بچنے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں رہا تھا۔ میں حقیقت بتا کر بھی اپنی جان نہیں بچا سکتا تھا۔ بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ کرنل سکاٹ پارٹی مجھے حقیقت بتانے کے قابل ہی نہ چھوڑتے اور اس سے پہلے ہی میرا اگلے جہاں کا ٹکٹ کٹا دیتے۔

ویگن ایک جھٹکے سے رکی اور میں اذیت بھری سوچوں سے حال کی جانب پلٹا۔

''سٹیفن!......باہر آؤ۔''میں گرفتار ہوتے وقت جو نقلی نام بتایا تھا اسی سے مجھے پکارا گیا۔

میں جھجکتے جھجکتے اٹھا۔دروازے کے قریب کھڑے کسی آدمی نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اترنے میں مدد دی اور میرے نیچے اترتے ہی اس نے میرے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول دی۔لیکن اس نے میرے چہرے سے کالے رنگ کا کپڑا نہیں ہٹایا تھا۔ازخود میں نے بھی کپڑا اتارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔میرے کانوں میں ویگن کے آگے بڑھنے کی آواز آئی۔اسی وقت کسی نے میرے سر سے نقاب کھینچا۔میری آنکھوں کے سامنے جو پہلا منظر ابھرا وہ سنہری بالوں والی خوب صورت اور دلکش جینیفر کا تھا وہ مسکرا رہی تھی۔ہاتھ میں پکڑا نقاب اس نے دور پھینک دیا تھا۔

کالی ویگن دور جارہی تھی۔ہم اس وقت ایک ویران سے کوچے میں موجود تھے۔

''ی......یہ......کیا ہے؟''میں ہکلایا۔

وہ شوخی سے بولی۔''کہا تھا نا،اپنی جینی پر اعتبار کرو۔''یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے سے ماسک نوچ کر پرے پھینکا اور وارفتگی سے لپٹ گئی۔

''جینی!......کیا مذاق ہے،کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''یہ بھلا کیا بات ہوئی کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔جناب یہ پاکستان نہیں نیویارک ہے۔''

''پھر بھی۔''میں نے نرمی سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے پوچھا۔''بتاؤ نا،کیا معاملہ ہے؟''

''چلو ہوٹل چل کر بتاؤں گی۔''وہ میری حرکت کا برا مناتے بغیر بولی۔میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی معیت میں چل پڑا۔تھوڑی دیر بعد ہم مصروف شاہراہ پر نکل آئے تھے۔چونکہ وہاں سے نومیڈ ہوٹل نزدیک ہی تھا اس لیے ہم نے ٹیکسی میں بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

کمرے میں جا کر وہ پرتکلف کھانے کا آرڈر دے کر وہ واش روم کا رخ کرتے ہوئے وہ شوخ لہجے میں بولی

''ذی!......نہانا ہے تو آجاؤ۔''

''شکریہ میں بعد میں نہالوں گا۔''میں نے منہ بنا کر کہا۔اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

اس کے انداز سے مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔شاید یہ برین ویلز کو کامیابی سے ٹھکانے لگانے کی

خوشی تھی۔

اس کے واش روم سے باہر نکلتے ہی میں اندر جانے لگا۔

وہ میرے قریب رک کر بولی۔

''اندر نیا سوٹ لٹکا ہوا ہے۔ نہا کر پہن لینا۔'' اور میں سر ہلا کر اندر گھس گیا۔ میرے نہا کر باہر آنے تک کھانا آچکا تھا۔ میری وجہ سے اسے بھی حلال کھانا پڑ رہا تھا۔

''اب پوچھو تمھارے ذہن میں کون سے سوالات آرہے ہیں؟'' وہ چھری کانٹا سنبھالتے ہوئے مستفسر ہوئی

''ہم نے منصوبے کے مطابق کیوں کارروائی نہیں کی۔''

''کیونکہ میں تمھیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''مطلب یہ ہے میری جان!...... کہ جب تم نیچے پہنچ کر ہوٹل سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے، اس وقت تک درجنوں سرکاری اہلکاروں نے وہاں پر پہنچ کر ہوٹل سے کسی کے بھی باہر جانے کو ناممکن بنا دیا تھا۔ اور جو لوگ بھی باہر جانے کی کوشش میں تھے وہ تمام اس وقت تفتیش کا سامنا کر رہے ہیں۔''

میں نے تلخی سے پوچھا۔ ''کیا منصوبہ بناتے وقت یہ پہلو تم لوگوں کی نظر سے اوجھل تھا۔''

''نہیں۔ کرنل سکاٹ اور کرنل جولی روز ویلٹ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے حکم دے دیا تھا کہ اگر تم کامیابی سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تو تمھیں قتل کر دیا جائے، میں نے بہ ظاہر تو حامی بھر لی لیکن اس کے ساتھ تمھیں بچانے کا تہیہ بھی کر لیا تھا۔ میں نے خود سی آئی اے کے اہلکار کی صورت میں ہوٹل کی تلاشی لینا تھی اور اسی صورت میں میں خود کو شک کے نرغے میں آنے سے بچا سکتی تھی۔ یہ بات کرنل سکاٹ وغیرہ نے پہلے سے طے کر دی تھی کہ لزا کو میرا ہم شکل بنا کر ہوٹل میں داخل کیا جائے گا اور ہوٹل میں داخل ہو کر وہ اپنے اصل روپ میں آجاتی اور میں اس کی جگہ لے لیتی۔ ہم دونوں نے چونکہ لفٹ سے نکلتے ہی علیحدہ علیحدہ ہو جانا تھا اس لیے آگے تمھاری اپنی صواب دید تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ تمھارا بچ نکلنا مشکل ہو جائے گا اس لیے میں نے منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی۔ اور دیکھ لو تمھیں مکھن سے بال کی طرح نکال کر

لے آئی۔“

”مطلب کرنل سکاٹ اور جولی نے مجھے دھوکے میں رکھا۔“

وہ صاف گوئی سے بولی۔”سب سے پہلے ہر آدمی کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔“

”تم کل رات یا آج صبح کو بھی یہ سب کچھ بتا سکتی تھیں۔“

”اگر فائر سے پہلے بتاتی تو شاید تم صحیح طریقے سے فائر نہ کر پاتے اور اس کے بعد وقت ہی نہیں تھا بتانے کا......البتہ اس کے متعلق صبح ناشتے پر میں نے اشارہ کر دیا تھا۔“

”تم نے میرے لیے اتنی تگ و دو کیوں کی؟“

میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ افسردہ لہجے میں بولی۔”کیا تم نہیں جانتے۔“

”ویسے سچ کہوں تو میں تم پر اعتبار کر کے بہت پچھتا رہا تھا۔“

”جانتی ہوں......تم نے کبھی مجھے اعتبار کے قابل سمجھا ہی نہیں۔“

”میری جگہ پر تم خود کو رکھ کر سوچو۔“

”میں کئی بار صفائی دے چکی ہوں کہ میرا تمھاری جانب مائل ہونا کسی مقصد کے مرہون منت نہیں تھا۔ بلکہ تمھاری نشانہ بازی کی صلاحیت سامنے آنے کے بعد بھی کسی کے دماغ میں یہ منصوبہ نہیں آیا تھا۔البتہ جس وقت برین ویلز کا یہ صحافیوں کے ساتھ سوال و جواب کا پروگرام کرنل جولی روز ویلٹ کے علم میں آیا اس وقت کسی ایسے سنائپر کی ضرورت محسوس ہوئی۔اور اس نے کرنل سکاٹ تک یہ بات پہنچائی۔کرنل سکاٹ چونکہ مجھے بہ طور ایک اچھے سنائپر کے پہچانتا ہے اس لیے اس نے مجھ سے مشورہ لیا۔مگر میں نے پندرہ سو میٹر سے زیادہ فاصلے پر نشانہ لگانے سے معذوری ظاہر کی۔تب اس نے میجر جیمس میتھونی سے بات کی۔اور میجر جیمس میتھونی کے واسطے سے تمھارا نام اس کے کانوں تک پہنچا۔کرنل سکاٹ نے تمھیں راضی کرنے کی ذمہ داری فوراً مجھے سونپ دی۔اور میری پسندیدگی فرض کی لپیٹ میں آگئی۔میں تمھیں اصل بات بتانے کی حالت میں نہیں تھی۔اسی طرح میرے سینئرز بھی ابھی تک میرے ان جذبات سے واقف نہیں ہیں جو میرے دل میں تمھارے لیے پنہاں ہیں۔البتہ میری آج کی کارروائی کے بعد انھیں اصل بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔شاید تھوڑی بہت باز پرس

بھی ہو۔مگر مشن خوش اسلوبی سے پورا ہونے کی خوشی میں بات زبانی کلامی سرزنش سے آگے نہیں بڑھے گی۔‘‘

’’پندرہ سو میٹر سے برین ویلز کو نشانہ بنانے میں کیا قباحت تھی؟‘‘

’’پندرہ سو میٹر کے دائرے میں آنے والی عمارتوں پر اگر سرکاری اہلکار تعینات نہ کیے جاتے تو سیکورٹی آفیسر شک کی زد میں آ جاتا۔اب یہ ہوٹل تو قریباً دو کلو میٹر دور تھا۔یہاں سرکاری عملہ تعینات نہ کرنے کا مضبوط جواز تو موجود ہے نا۔‘‘

کھانا کھانے کے بعد ہم نے چائے بھی وہیں منگوا کر پینے لگے۔اس دوران جینیفر نے ٹی وی آن کر دیا۔برین ویلز کے قتل کی خبر اب تک بریکنگ نیوز کے طور پر چل رہی تھی۔اور اس کے قتل کے پیچھے اصل محرک ڈھونڈنے کے لیے مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔مستقبل قریب میں ہونے والے صدارتی انتخابات کو بھی اس قتل کے ساتھ جوڑا جا رہا تھا۔تحقیقات کرنے والوں کی رسائی اس وقت تک ہیوی سنائپر تک نہیں ہو پائی تھی البتہ ہمارے فائر کرنے کی جگہ تلاشنے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔برین ویلز کے آدھے اڑے ہوئے چہرے کی تصویر بھی سکرین کے ایک کونے میں نظر آ رہی تھی۔وہ چونکہ دستخط کرتے وقت کئی کیمروں کی زد میں تھا اس لیے اسے گولی لگنے کی فلم بہت صاف بنی تھی۔اس کا کرنل جولی روزویلٹ کی طرف فائل کا بڑھانا اور پھر مسکراتے ہوئے کچھ کہنا اور اسی لمحے اس کے چہرے کے ٹکڑوں کا ہوا میں اڑنا اور اس کا اچھل کر پیچھے گر کر تڑپنے لگ جانا۔یہ دو تین سیکنڈز کے اندر برپا ہوا تھا۔

’’ویسے کیا تمھیں بھی اصل وجہ معلوم نہیں ہے؟‘‘میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

’’برین ویلز کا واضح جھکاؤ ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف تھا اور شاید اس کی زندگی مسٹر جارج ڈبلیو بش کے دوبارہ صدر بننے میں رکاوٹ بنتی۔‘‘اس نے گول مول انداز میں اصل بات اگل دی۔بیس جنوری دو ہزار پانچ کو جارج ڈبلیو بش کی مدت صدارت پوری ہو رہی تھی۔میں نے اسے مزید کریدنے سے احتراز برتا کہ اس طرح کی زیادہ معلومات کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔

چائے کا کپ خالی کر کے اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔’’اگر چاہو تو ہم رات یہیں گزار سکتے ہیں۔‘‘

میں نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔’’شکریہ جی!......‘‘

''ویسے باقی سنائپرز بھی آج کیمپ میں تو نہیں ہوں گے۔''

''کیا مطلب؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ کل ہمارے کیمپ سے نکلتے باقی تمام کو بھی ایک دو دن باہر گزارنے کی اجازت مل گئی تھی۔اس ضمن میں تمام کو ایک ایک ہزار ڈالر بہ طور جیب خرچ کے بھی دیا جانا تھا تاکہ وہ نیو یارک یا کسی دوسرے قریبی شہر کی سیر کرسکیں۔''

''اور یہ مہربانی کس لیے؟''

''تاکہ کرنل سکاٹ کے پاس تمھارے کیمپ سے باہر جانے کا مضبوط جواز موجود ہو، تمھارے پکڑے جانے کی صورت میں وہ کہہ سکتا تھا کہ کیمپ سے صرف تم نہیں تمام سنائپرز باہر ہیں۔''

''ویسے بہت مکار قوم ہے تمھاری، بہت دور تک سوچتے ہو۔''میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔''اب تمھیں اصل بات بتادی تو تم طنز کرنے لگے۔اور پلیز کرنل سکاٹ یا میڈم جولی کے سامنے ایسا کچھ نہ کہہ دینا، وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ ان کی حقیقت تم پر ظاہر ہو۔''

''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔''

''اب تو ایسی کوئی بات نہیں کہ تمھیں مجھ سے بھاگنے کی ضرورت پڑے۔''

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''پہلے ایسی کون سی بات تھی؟''

''نن......نہیں......میرا مطلب ہے اب تو تم آزاد ہو نا،تم نے اپنا مشن پورا کرلیا ہے۔''وہ گڑبڑا گئی تھی۔

''کیپٹن جینیفر !......میں جانتا ہوں کہ تم نے پہلے پہل جو مجھے اس قسم کی آفر کی تھی اس کے پسِ پردہ مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ کارفرما تھا۔اور اسی وجہ سے تم مجھے اس فارم ہاؤس پر لے گئی تھیں......کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو اور ہمیں چلنا چاہیے۔''وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔میں بھی ہونٹوں پر تبسم سجائے اس کے پیچھے ہولیا۔اس کی خاموشی ظاہر کررہی تھی کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔

☆......☆......☆

واپسی کے سفر میں جینیفر بہت خوش تھی۔اسے اس کارنامے پر ترقی ملنے کی بھی امید تھی۔

''ویسے شادی وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں سوچا؟''میں نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''فی الحال تو بالکل نہیں۔''وہ صاف گوئی سے بولی۔''ابھی تو زندگی انجوائے کرنے کے دن ہیں۔ابھی سے یہ بیڑیاں پہن لوں۔''

''تمھارے لیے زندگی انجوائے کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ بندہ جنسی بے راہروی کا شکار ہو جائے۔حالانکہ شادی بھی اسی انجوامنٹ کا نام ہے۔بس فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صرف ایک مرد میسر ہوتا ہے اور اور وہ شغل باعث گناہ بھی نہیں ہوتا۔''

''ذی!......کیا میں تمھیں اتنی گھٹیا اور بے راہرو لگتی ہوں۔''وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔''تمھیں آفر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں سہل الحصول ہوں۔اگر ایسا ہوتا تو سنائپر کورس پر آنے والے کم از کم خوب صورت مردوں کے ساتھ میں تعلق رکھ چکی ہوتی،مگر میں تمھیں چیلنج کرتی ہوں کہ کوئی ایک مرد ایسا لے آؤ جو یہ دعوا کر سکے کہ اس نے جینیفر کو حاصل کر لیا ہے۔''

''پھر انجوائے منٹ اور شادی نہ کرنے سے کیا مراد؟''

''شادی کے بعد عورت واقعی بندھ جاتی ہے،آزادی کی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔''

''ایسا صرف ہمارے ہاں ہوتا ہے۔''

''ذی!......ایک سچ بول دوں؟''اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''سچ ہی تو سننا چاہتا ہوں۔''

''میں شروع دن سے جانتی تھی کہ تم میرے ساتھ جسمانی تعلق نہیں رکھو گے،اس لیے جتنی بار بھی میں نے تمھیں دعوت دی ہے وہ صرف ڈرامے اور دکھاوے کے طور پر تھی۔''

''اور اس دن جو فارم ہاوس پر لے جا کر پوری کوشش کی تھی وہ کیا تھا؟''میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''اگر تم راضی ہو جاتے تو تمھیں کمرے میں لے جاتی اندھیرا کر کے واش روم میں جاتی اور وہاں ایک اور لڑکی تیار بیٹھی تھی تمھیں سنبھالنے کے لیے۔''

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”ہونہہ!......صحیح کہا۔“

اس نے پوچھا۔ ”خفا ہو گئے ہو؟“

”نہیں......بس عورت ذات کی مکاری کے بارے سوچ رہا ہوں۔“

”عورت کو مکاری پر مجبور کرنے والی ذات بھی تو مرد کی ہے نا۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ایک غلط کام پر کسی مرد کو راضی کرنے کے لیے دوسرا مرد، عورت کو استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی صنف کی فطرت جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی معصوم عورت کو پامال کرنے کے لیے ایک مرد کتنا گر سکتا ہے، اگر مرد کی فطرت میں عورت کے حصول کی اتنی تمنا نہ ہوتی تو کسی کو عورت کے استعمال کی ضرورت ہی نہ پڑتی، اور نہ عورت کو اپنی ذات پر جبر کر کے کسی ناپسندیدہ شخص کو اپنی چاہت کا یقین دلانا پڑتا۔“

”سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

”ساری عورتیں بھی ایک سی نہیں ہوتیں اور معاف کرنا ایک دو مردوں کا عمل پوری برادری کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ یہ جاسوسی کی دنیا کا قانون ہے کہ مرد کو بلیک میل کرنے کے لیے سب سے آسان، اہم اور تیر بہ ہدف طریقہ عورت کا استعمال ہے۔ اور ایسا مرد کی ہوس پرست طبیعت کی وجہ سے ہے، مرد چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا اس کی فطرت ایک سی ہوتی ہے۔“

”ہر آدمی اپنی ذات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔“ اس کی سچی اور کھری باتوں کا اس کے علاوہ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔

”مان لیا، مگر تم نے عورت ذات کو مکار کہا تو جواباً تمھیں آئینہ دکھانا پڑا۔ ورنہ تم سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔“

”چلو اس بہانے مجھے اپنی حیثیت کا تو پتا چل گیا کہ تم میری جانب کیوں مائل ہوئی تھیں۔“

اس بار اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد دوبارہ زبان کھولی۔

”اور جہاں تک گلے کا تعلق ہے تو وہ مجھے تم سے ہونا چاہیے، اگر حقیقت کھنگالی جائے تو پہلے دن تم جانے کیوں میرے پاس آئی تھیں، یقیناً اس وجہ سے کہ ہمارا ملک تمھارے ہاں کچھ زیادہ ہی بدنام ہے۔ اور پھر مجھ سے ملتے وقت تم میری یادداشت سے متاثر ہوئیں اور میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہ دوستی شاید برقرار رہتی

اگر میں روس اور چائنہ کا ذکر کر کے تمھارے پیارے اور عظیم ملک امریکہ کی شان میں گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا۔اس کے بعد تمھارے دل میں دبی نفرت ابھر کر سامنے آئی اور اس نفرت کے اظہار کے لیے تم انڈین سنائپرز کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگیں، مجھے تحقیر اور حقارت کا نشانہ بنانے لگیں اور پھر بدقسمتی سے میری نشانہ بازی کی صلاحیت سامنے آئی اور تمھیں حکم ملا کہ اس مرغے کو پھانسنا ہے پس تمھیں مجھ سے محبت کا ڈراما کھیلنا پڑا۔سب سے پہلے تم نے مجھے اپنے جسم کی رشوت پیش کی، ناکام ہونے پر دولت کی آفر کی اور جب اس طرح بھی دال نہ گلی تو میرے اعتبار پر ڈاکا ڈالا۔دوستی اور محبت کی آڑ میں میری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔اب کہو گلہ میرا بنتا ہے یا تمھارا؟تم مجھے جسمانی تعلقات کی آفر کرتیں، دولت کی رشوت دیتیں یا کچھ بھی کرتیں مگر محبت اور دوستی کا ڈراما تمھیں نہیں کھیلنا چاہیے تھا۔اور سچ کہوں تو آج جو تم مجھے ہوٹل سے بچا کر لے آئی ہو تو ایسا کرنل سکاٹ اور کرنل جولی روز ویلٹ وغیرہ کی منشا کے مطابق ہوا ہے۔اسی وجہ سے تم کہہ رہی تھیں کہ میں کرنل سکاٹ وغیرہ سے اس بات کا ذکر نہ کروں کہ انھوں نے میرے لیے کوئی اور آرڈر دیا تھا۔''

کچھ پینا پسند کرو گے؟''پٹرول پمپ کے ساتھ بنی ایک ٹک شاپ کو دیکھ کر اس نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔میری بات کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''ہاں ایک ٹھنڈی بوتل یقیناً مجھے غصے پر قابو پانے میں مدد دے گی۔''اور وہ سر ہلاتی ہوئی دکان میں گھس گئی

☆......☆......☆

سردار مجھے اپنے کمرے ہی میں ملا تھا۔

''ذیشان بھائی!''وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔بستر سے اٹھ کر وہ میرے گلے لگ گیا۔

''تمھاری کامیابی کی خبر میں نے ٹی وی پر دیکھ لی تھی۔''

''تم کہیں نہیں گئے؟''

''دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔تم میرے لیے خطرے کا سامنا کر رہے تھے۔میں کیسے سیر سپاٹے کرتا۔''

''گویا لی زونا بے چاری کو اکیلا چھوڑ دیا۔''

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔''وہ بھی یہیں ہے۔''

”تو یوں کہونا، کہ یہیں پر رنگ رلیاں منارہے تھے۔“

”نہیں جناب !......وہ تمھاری جینیفر کی طرح آوارہ مزاج نہیں ہے۔وہ اور میں گپیں ہانکتے ہیں ایک دوسرے کو اپنی گزری زندگی کی کہانیاں سناتے ہیں اور بس۔“

”یونھی جینیفر غریب پر الزام تو نہ لگاؤ نا یار!“

”اچھا چھوڑو اس موضوع کو تم مجھے تفصیلات بتاؤ نا؟“

”لیکن اس کے لیے تمھیں اچھی سی چائے پلانا پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے۔“وہ بستر کو چھوڑ کر الیکٹرک کیتلی کی طرف بڑھ گیا۔اور میں اسے تفصیل سے ساری کہانی سنانے لگا۔

چائے پینے تک میں ساری تفصیل اس کے گوش گزار کر چکا تھا۔اس کے بعد ہم سو گئے۔

اگلی صبح آٹھ بجے کے قریب ہی کرنل سکاٹ کا بلاوا آ گیا تھا۔وہاں کرنل جولی روز ویلٹ بھی اس کے ہمرا موجود تھی۔

”ویلڈن بوائے !“میرے اندر داخل ہوتے ہی کرنل جولی روز ویلٹ مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے سے لگاتے ہوئے میرے دونوں گال چوم لیے تھے۔کرنل سکاٹ نے بھی مجھے چھاتی سے لگا کر میری پیٹھ تھپکی۔

”بیٹھو۔“وارفتگی سے خوش آمدید کہہ کر کرنل سکاٹ نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ سر۔“میں نے کرسی سنبھال لی۔

”بہت عمدہ اور بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے تم دونوں نے۔خاص کر تمھارے کام کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہوگی۔“

”شری کانت کیسا ہے سر؟“میں نے گویا بین السطور اس کا وعدہ یاد دلایا۔

”وہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔اور اسے یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ ریگن واچ کی غلطی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے۔آج سرکاری طور پر بھی انڈین آرمی کو معذرت کا لیٹر بھیج دیا گیا ہے۔شری کانت کو بھی اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ

ساری زندگی ریگن واچ کو دعائیں دیتا رہے گا۔"

"مجھے بھی یہی امید تھی۔"میں نے متشکرانہ انداز میں کہا۔

کرنل سکاٹ نے کہا۔"کل تمھارے کورس کی اختتامی تقریب بھی ہے۔اول پوزیشن حاصل کرنے پر بھی پیشگی مبارک ہو۔"

میں نے پوچھا۔"یہ پوزیشن مجھے حالیہ کارکردگی پر دی جارہی ہے یا حقیقت میں میری یہی پوزیشن بن رہی ہے؟"

"تم نے مجموعی طور پر اٹھانوے فیصد نمبر حاصل کیے ہیں اور سیکنڈ والے کے اسی فیصد نمبر ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے۔"میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"کچھ اور درکار ہو تو کہو؟"کرنل جولی روزویلٹ نے خوش دلی سے آفر کی۔

"شکریہ میڈم!"

"میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر تمھارے نشانے پر اعتماد کیا اور شکریہ کہ تم میرے اعتماد پر پورے اترے۔جینیفر نے تمھارے نشانے کی جتنی بھی تعریف کی تھی کچھ کم ہی تھی۔اب مجھے تمھارے کسی بھی کام آکر خوشی ہو گی۔"

"اگر کوئی ایسی ضرورت پڑی تو میں یقیناً اظہار کرنے میں تامّل نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔اس کے بعد شاید تم سے ملاقات نہ ہو۔"ان دونوں نے اٹھ کر مجھے الوداع کیا اور میں واپس کمرے میں آگیا۔جینیفر دوپہر کے کھانے اور پر رات کے کھانے پر بھی دکھائی نہیں دی تھی۔میں نے بھی کسی سے معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔اگلے دن تقسیم انعامات کی تقریب میں البتہ وہ نظر آگئی تھی۔بجھی بجھی اور مجھ سے دور دور۔سردار نے اس کی وجہ بھی دریافت کی مگر میرے پاس اسے مطمئن کرنے کے لیے کوئی مناسب جواب موجود نہیں تھا۔

میجر جیمس نے کورس میں تمام سنائپرز کی کارکردگی پر اجمالاً روشنی ڈالی۔اور پھر تیسری پوزیشن والے سنائپر کا نام لیا۔وہ اسرائیلی دوشیزہ اینڈریا برٹن تھی۔اسے سٹیج پر بلا کر میجر جیمس نے ایک شیلڈ اور دس ہزار ڈالر کا چیک تھما

دیا۔دوسری پوزیشن کے لیے جینیفر ہنڈ سلے کا نام پکارا گیا۔اسے بھی ایک شیلڈ اور بیس ہزار ڈالر کا چیک تھمایا دیا گیا۔اول پوزیشن کے بارے مجھے پہلے سے پتا چل گیا تھا۔مگر میں نے سردار اور لی زونا وغیرہ کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔اس لیے جونھی جیمس میتھونی نے اول پوزیشن لینے کے ضمن میں میرا نام لیا سردار اور لی زونا خوشی سے اچھل پڑے تھے۔میجر جیمس نے مجھے گلے سے لگا کر چند شاندار جملے میری تعریف میں کہے اور پھر حسنِ کارکردگی کا ایک سرٹیفکیٹ ، پچاس ہزار ڈالر کا چیک اور اول پوزیشن کی ٹرافی میرے حوالے کر دی۔سوائے راج پال کے تمام نے میرے لیے دل کھول کر تالیاں بجائی تھیں۔پچاس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔اتنی ہی رقم کرنل سکاٹ نے مجھے برین ویلز کے قتل کے سلسلے میں آفر کی تھی۔مجھے لگ رہا تھا کہ اتنی خطیر رقم مجھے برین ویلز کو ٹھکانے لگانے کے صلے ہی میں ملی تھی۔

اختتامی کلمات کہہ کر میجر جیمس نے ہماری اگلے دن کی فلائیٹس کا اعلان کیا اور تقریب اختتام پذیر ہوئی۔انعامی تقریب سے واپسی پر میں نے چیک میجر جیمس کے حوالے کر کے نقد رقم منگوالی تھی۔

رات کو پر تکلف ڈنر اور اس کے بعد موسیقی کی محفل کا انعقاد ہوا۔پینے پلانے کا بھی خوب اہتمام کیا گیا تھا۔انگلش کی بے ہنگم موسیقی اور بے ہودہ شاعری سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔گو میری اس بات سے اختلاف کرنے والے کثیر لوگ ہوں گے۔مگر یہ وہ لوگ ہیں جو انگلش کی اچھی شاعری کے دلدادہ ہیں۔آج کل کے پاپ میوزک کی وکالت یقیناً وہ بھی نہیں کریں گے اور بے ہودہ شاعری سے میری مراد بھی پاپ میوزک کی لچر شاعری ہی سے ہے۔

مجھے کمرے میں آئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ سردار لی زونا کے ہمراہ وہاں آن پہنچا۔

”ذیشان بھائی!......آج تو ہم دونوں رات بھر گپ شپ کریں گے۔“

”تو لی زونا کے کمرے میں بیٹھ جاتے ،جینیفر تو یوں بھی موسیقی سے بہرہ مند ہو رہی ہو گی۔“

”وہ تو ڈنر کے بعد ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔“لی زونا نے متبسم ہو کر کہا۔

”چلو ٹھیک ہے،مگر اس شرط پر کہ لی زونا بہن اپنے ہاتھوں سے بہترین سے کافی بنا کر پلائے۔“

”ابھی لیں بھائی!“وہ اٹھ کر الیکٹرک کیتلی کی طرف بڑھ گئی۔

لی زونا کافی واقعی بہت اچھی بناتی تھی۔ کافی پی کر میں نے ان کے ساتھ تھوڑی گپ شپ کی اور پھر باہر نکل آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کافی پسند کرنے لگے تھے۔ سردار کی شادی کے متعلق جاننے کے بعد بھی لی زونا کی پسندیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آخری رات انھیں تنہائی کی چند گھڑیاں اکٹھے بتانے دوں پھر تو جانے وہ کبھی مل بھی پاتے یا نہیں۔

باہر میوزک کا اونچا شور سنائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر لان میں ٹہلنے کے بعد میرے قدم غیر ارادی طور پر جینیفر کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ نیویارک سے واپسی کے بعد اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا چلو اس کو تھوڑا مطعون ہی کر دوں کہ محبت کی دعوے دار مجھے الوداع کہنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔

دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ نیچے قالین پر بیٹھی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی ٹانگیں قالین پر پھیلائی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی سی بوتل اس کے سامنے دھری تھی جبکہ ادھ بھرا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

مجھے دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کوئی تاثر اجاگر نہیں ہوا تھا۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

”آج تو عیاشی ہو رہی ہے۔“ میں نے مزاحیہ لہجے گفتگو کی ابتدا کی۔

اس نے ایک ہلکا سا گھونٹ بھر کر پوچھا۔ ”کیسے آنا ہوا؟“

”کل واپسی ہے سوچا الوداعی ملاقات کر لوں۔“

”ہو گئی ملاقات۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ اس کے لہجے میں بھرپور اجنبیت در آئی تھی۔

”جینی!...... کیا ہو گیا ہے تمھیں؟...... کہاں تو اتنی چاہت کے دعوے اور کہاں اتنی بے زاری کہ دو گھڑی کی گفتگو بھی گوارا نہیں۔“

”ہاں نہیں ہے گوارا تو۔ اور تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا نام کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے ہے۔ جینی نہیں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”اتنا لمبا نام تو خیر میں نہیں لے سکتا۔“

”کیوں نہیں لے سکتے ہاں، تم چیز کیا ہو، ایک تھرڈ کلاس پاکی فوجی، ایک سپاہی۔تم میرا پورا نام کیوں نہیں لے سکتے؟ سنائپر کورس میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم تمیز ہی کھو دو سینئر جونیئر کی۔“اس کے لہجے سے صاف محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس وقت نشے میں تھی۔اس کی بدتمیزانہ گفتگو مجھے عجیب لگ رہی تھی۔

”جینی!......کیا ہوگیا ہے؟“میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

”میں کہہ رہی ہوں پورا نام لو میرا۔تمھاری سمجھ میں نہیں آرہا۔“اس نے الٹے ہاتھ سے میرا گریبان تھام کر بدتمیزی سے پوچھا۔

”اچھا یہ گلاس مجھے دو۔“میں نے اس کے ہاتھ سے ادھ بھرا گلاس لینا چاہا۔

”بکواس کرنے کی ضرورت نہیں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“وہ غصے سے دھاڑی۔”نفرت ہے مجھے تم سے تمھاری صورت اور تمھاری عادات سے۔میں کہہ رہی ہوں دفع ہو جاؤ۔“

”ادھر میری طرف دیکھو جی!“میں نے اس کا نام مزید مختصر کرتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

”چھوڑو مجھے۔“اس نے ایک جھٹکے سے اپنے کندھے میری گرفت سے آزاد کرائے۔

میں نے زبردستی اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر کمرے کے کونے کی طرف اچھال دیا۔

”تمھاری یہ جرأت۔“اس نے میرا گریبان تھامنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔مگر میں نے اس کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی رہی اور پھر ایک دم میرا گریبان چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اس کے ساتھ ہی اس کی سسکیوں سے کمرے کی فضا گونج اٹھی تھی۔میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تسلی دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھ سے علیحدہ ہو کر وہ اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

”ملنے کیوں نہیں آئیں؟“میں اس کا ہاتھ تھام کر مسکرایا۔

”ہونہہ!......ایک دھوکے باز، آوارہ اور فراڈی لڑکی سے یہ پوچھنا ہی فضول ہے۔“

”میں بے شک تمھیں دھوکے باز کہتا رہا ہوں مگر دل سے کبھی ایسا نہیں سمجھا۔اور معاف کرنا جس کو دھوکے

باز سمجھا جاتا ہے اس کی کسی بات پر یقین نہیں کیا جاتا۔کیا میں نے کبھی تمھاری کسی بات سے انحراف کیا ہے ،سوائے ایک بات کے۔اور وہ بھی بہ قول تمھارے تم نے دل سے کبھی نہیں کہا۔‘‘

’’جھوٹ بول رہے ہو۔‘‘ وہ سسکی۔

’’جھوٹ کیوں، اگر ایسا ہوتا تو میں تمھیں ملنے ہی کیوں آتا۔‘‘

’’کل اور پرسوں کیوں نہیں آئے؟‘‘ وہ شکوہ کناں ہوئی۔

’’میں شرمندہ تھا، کیونکہ رستے میں تمھاری کافی بے عزتی کر چکا تھا۔‘‘میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے صریحاً جھوٹ بولا۔

’’ذی!......پلیز تم نہ جاؤ۔‘‘ میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے وہ گڑگڑائی۔

میں ہنسا۔’’ویسے اتنی شراب نوشی اچھی نہیں ہوتی، بندہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا ہے۔‘‘

’’میں نشے میں نہیں ہوں، میں سچ کہہ رہی ہوں ذی!......تم نہ جاؤ میں تمھیں گرین کارڈ لے دوں گی۔کرنل سکاٹ تمھیں بہت اچھے معاوضے پر اپنے پاس رکھ لیں گے، میں وعدہ کرتی ہوں میرے جسم و جان کے بس تم ہی مالک ہو گے اور میں تمھیں یہ بھی یقین دلا سکتی ہوں کہ آج تک میں کسی مرد کے ساتھ ڈیٹ پر نہیں گئی۔‘‘

’’جی!......اگر یہ ممکن ہوتا تو میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ ہچکچاتا، مگر سچ تو یہ ہے کہ میں مجبور ہوں، میرے پاؤں میں نہ صرف پاک آرمی کی زنجیریں ہیں بلکہ میں ایک بیوی کا شوہر اور ایک باپ کا اکلوتا سہارا بھی ہوں۔‘‘

’’تم انھیں یہاں سے کافی ساری رقم بھجوا سکتے ہو اور پاک آرمی کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں کہ تمھیں یہاں سے گرفتار کر کے لے جائیں۔‘‘

’’صحیح کہا......مگر یہاں میری حیثیت کیا ہو گی؟......ایک اجرتی قاتل کی، کرنل سکاٹ مجھ سے سوائے اپنے دشمنوں کو قتل کرانے کے اور کیا کام لے گا۔‘‘

’’تم کچھ بھی نہ کرنا۔میں ہوں نا، کمانے کے لیے۔تم بس مجھے سنبھال سمیٹ کر رکھنا اور مجھے ڈھیر سارا پیار دینا۔‘‘

’’ہاں جی!......تم ہو بھی اس قابل کہ تمھیں ڈھیر سارا پیار دیا جائے، مگر افسوس کہ تم میری مجبوریوں کو سمجھ نہیں

پا رہی ہو۔ تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ میں پاکستان آرمی کے خوف سے یہاں نہیں رک رہا تو یقین مانو ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے پاکستان آرمی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ مجھے تو میرا ضمیر ملامت کرے گا کہ جس ملک نے مجھے اس مقام تک آنے میں مدد دی میں کسی قابل ہوتے ہی اس سے غداری کر بیٹھا۔ پھر میرے والد کو فقط پیسوں کی نہیں میری دیکھ بھال اور محبت کی ضرورت ہے۔ معافی چاہتا ہوں جی!...... مگر میں تمھاری یہ آفر کو قبول نہیں کر سکتا۔''

''ہاں، میری آفر قبول کرو گے بھی کیسے، تم مجھ سے محبت تھوڑی کرتے ہو۔''

''بیوقوفوں کی سی باتیں نہ کرو جینی!'' میں نے اسے محبت سے جھڑکا۔

''ذی!...... میں مر جاؤں گی۔''

''کچھ نہیں ہوگا تمھیں اور اب پلیز کوئی اور بات کرو۔''

''تم تو ہو ہی سنگ دل۔'' وہ میرے قریب سے اٹھ کر الیکٹرک کیتلی کی جانب بڑھ گئی۔ ''کافی یا چائے؟''

''جو مل جائے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''پھر کافی ٹھیک رہے گی۔'' کہہ کر اس نے کیتلی کا پلگ سوئچ میں لگا دیا۔

کافی پینے کے بعد بھی وہ محبت کے اظہار کے ساتھ مجھے وہاں روکنے کی کوشش میں مصروف رہی۔ میں رات گئے تک اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت اور پرکشش تھی، لیکن وہ اس سے دگنی بھی حسین ہوتی تو بھی میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ پاکستان آرمی سے غداری کرنا اور پھر اپنی بیوی اور باپ کو لاوارث چھوڑنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جس وقت میں اپنے کمرے میں پہنچا تو سردار اور لی زونا کو مصروف گفتگو پایا۔

''میرا خیال ہے گھنٹا ڈیڑھ آرام کر لیا جائے۔'' میں نے مشورے کے انداز میں کہا۔

''صحیح کہا بھائی!'' لی زونا خوش دلی سے بولی۔ اور پھر ہم دونوں سے مصافحہ کر کے وہ باہر نکل گئی۔

جینیفر صبح ناشتے کی میز پر ہی مجھے الوداع کہہ کر چلی گئی تھی۔ بہ قول اس کے کہ وہ مجھے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

لی زونا اور اس کے ساتھی کی فلائیٹ ہم سے بعد تھی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھی گپ شپ کرتی رہی۔ ہم اپنا

سامان پیک کر کے باہر لان میں بیٹھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔باتوں باتوں میں جینیفر کا ذکر ہوا اور وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''بھائی ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہو گے۔''

''بالکل بھی نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل جینیفر تمھیں کس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''تمھیں کیسے پتا؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''کل رات کو جب میں اپنے کمرے میں لوٹی تو وہ کسی کو فون پر کہہ رہی تھی کہ، وہ نہیں مان رہا میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے۔میں جان گئی کہ موضوعِ گفتگو تمھاری ذات ہے۔''

ایک تلخی سی میرے اندر گھل گئی تھی۔وہ گزشتہ رات بھی میرے ساتھ محبت کا ڈراما کرتی رہی تھی۔یقیناً اس کے پس پردہ کرنل سکاٹ کی ہدایت ہو گی۔اسے کرائے کا ایک ایسا قاتل چاہیے تھا کہ جس کا نشانہ بے خطا ہو اور جس کے پکڑے جانے کی صورت میں اسے کسی الزام کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔

میں آہستہ سے بولا۔''وہ مجھے روکنے کی کوشش میں تھی۔''

''ہونہہ!......تو میرا شک درست تھا۔''اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

''تم نے مجھے تو یہ بات نہیں بتائی۔''خاموش بیٹھا سردار مجھے مخاطب ہوا۔میں نے اس کی بات پر کان دھرے بغیر لی زونا کو کہا۔''کون سا شک؟''

''یہی کہ اس دن نیویارک میں جو اہم شخص دو کلومیٹر دور سے نشانہ بنایا گیا اس کے پسِ پردہ تمھارا ہاتھ ہے۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔''میں نے اعتراف کرنے میں حرج نہیں سمجھا تھا۔

''ویسے تم سے اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔''وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''ایسا تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ اصل بات سے ناواقف ہو۔''

''ایسی بھی کیا مجبوری آن پڑی تھی؟''

جواباً میں نے مختصر الفاظ میں ساری کہانی سنا دی۔

''اور تم لوگوں نے مجھے اس بات سے بے خبر رکھا۔اس کی شاکی نظروں کا محور سردار کی ذات تھی۔سردار اس سے نظریں چرا کر نیچے دیکھنے لگا۔

''اسے میں نے منع کیا تھا۔''

''کیا مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔''وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

''نہیں......بلکہ تم پر کوئی آنچ آتی نہیں دیکھ سکتے تھے۔''

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے خفگی کو دور جھٹکا۔''بہرحال میں اس سلسلے میں تمھاری اچھی رہنمائی کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا۔''ہاں مگر انھوں نے کوئی دوسری صورت چھوڑی ہی نہیں تھی۔''

''اے!......تم نے کیوں منہ لٹکا لیا ہے۔''وہ سردار کی پیٹھ میں مکا مار کر ہنسی۔''میں بھلا تم سے خفا ہو سکتی ہوں اور وہ بھی الوداع ہوتے وقت۔''

''میں معذرت خواہ ہوں۔''سردار پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔اسی وقت مان ین لی بھی لی زونا کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آن پہنچا۔

''ہیلو دوستو!''کہہ کر وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ہمیں مجبوراً موضوع گفتگو بدلنا پڑا۔اور پھر ہمارے جانے کا وقت آن پہنچا۔لی زونا ہماری موجودی کی پروا کیے بغیر سردار سے لپٹ کر رو پڑی تھی۔خود سردار بھی آبدیدہ ہو گیا تھا۔

''بھول تو نہیں جاؤ گے؟''اس نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔''کہہ کر سردار نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہمیں لے جانے والی کار کی جانب بڑھ گیا۔اب چنارے بیگم کی محبت میں دھڑکتے دل میں کسی اور کا نام بھی شامل ہو گیا تھا۔

میں نے لی زونا اور مان ین لی سے مصافحہ کیا اور سردار کے پیچھے چل پڑا۔کار میں بیٹھ کر اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔موت سے نظریں ملانے والا سچا اور کھرا پٹھان اس وقت لی زونا کو دیکھنے کا حوصلہ اپنے اندر مفقود پاتا تھا۔

کار چل پڑی۔ لی زونا ہاتھ لہراتی رہی میں نے بھی کار سے ہاتھ نکال کر انھیں خدا حافظ کہا، مگر سردار آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

☆......☆......☆

ہم پاکستان میں سہ پہر ڈھلے اترے تھے۔

''اب کیا کریں؟'' سردار نے پوچھا۔''یونٹ رپورٹ کریں یا گھر کا چکر لگا لیں۔''

میں نے جواباً کہا۔''میرا تو خیال ہے ہمارے کے گھر اتنی دور نہیں ہیں؟ تم نے مردان جانا ہے اور میں نے تلہ گنگ۔ تو کیوں نا آج کی رات گھر گزار لیں، صبح گیارہ بارہ بجے تک راولپنڈی پہنچ جانا یونٹ چلے جائیں گے۔ اور یوں بھی ہمارے اگلے چند دن انٹرویو وغیرہ ہی میں گزریں گے۔ شاید ہفتہ ایک مزید چھٹی ملنے میں بھی لگ جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سردار بہ خوشی تیار ہو گیا۔ ہم نے اگلے دن بارہ بجے پیرودھائی بس اڈے میں ملنے کا پروگرام طے کر کے اپنی اپنی راہ چل پڑے۔

میرے پاس کافی بڑی رقم موجود تھی۔ میں ایرپورٹ سے ٹیکسی کرا کے صدر بازار پہنچا اور ماہین اور ابو جان کے لیے تحائف خریدنے لگا۔ شام کی آذان مجھے وہیں ہو گئی تھی۔ دوبارہ ٹیکسی کرا کے میں پیرودھائی موڑ پہنچا اور تلہ گنگ جانے والی ویگن میں بیٹھ گیا۔ رات کے نو بج رہے تھے جب میں تلہ گنگ اڈے پر اترا۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے ویرانی کا عالم نظر آیا۔ وہاں سے میرے گاؤں کا فاصلہ پانچ چھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ میں عموماً پیدل ہی گھر چلا جاتا تھا۔ اس دن میں نے ایک ٹیکسی والے سے بات کی کرائے سے چار پانچ گنا زیادہ پیسے لے کر وہ میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ مجھے گھر کے سامنے اتار کر اس نے کرایہ وصول کیا اور واپس مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر پھر ابو جان کو بے آرام کرنا مجھے مناسب نہ لگا کہ دروازہ کھولنے انھی نے آنا تھا۔ بیگ کندھے سے اتار کر میں نے نیچے زمین پر رکھا اور اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری جانب آہستگی سے اتر کر میں نے دروازہ کھول کر اپنے دونوں بیگ اٹھائے اور دروزاہ کنڈی کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ صحن میں اندھیرا تھا البتہ برآمدے کے اندر جلنے والے انرجی سیور کی روشنی نے

صحن میں بھی اچھا خاصا اجالا کر رکھا تھا۔ اپنے کمرے سامنے پہنچ کر میں رکا۔ دروازے کی درز سے جھلکنے والی روشنی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کیونکہ ماہین لائیٹ بجھا کر سونے کی عادی تھی۔ میں دروازے پر دستک دینے ہی لگا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ماہین کی ہنسی گونجی۔ اور پھر جواباً ایک مردانہ آواز نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا میں بالکل سن ہو گیا۔ اس وقت ماہین کے کمرے میں کسی غیر مرد کی موجودی۔ میرا دل ناخوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

قریب ہو کر میں نے دروازے سے کان لگائے۔ مرد کہہ رہا تھا۔

''اتنی جلدی تو میں جانے والا نہیں۔''

''جانو!......تم تو سیر ہی نہیں ہوتے۔'' ماہین کی جذبات میں ڈوبی آواز سن کر تو مجھے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

''میری پیاری ماہی کی صورت ہی ایسی ہے کہ ساری زندگی دیکھنے سے بھی دل نہ بھرے۔''

''تو پھر کوئی کام دھندا کرو نا، تاکہ میں اس مصیبت سے طلاق لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھاری ہو جاؤں۔''

''کام دھندہ بھی کر لوں گا تھوڑا صبر تو کرو۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے جانے کیا حرکت کی تھی کہ ماہین کی تیز سسکی ابھری۔

اور پھر کسی کو تھپڑ مارنے جیسی آواز ابھری اس کے ساتھ ماہین کی آواز آئی۔

''کتنی بار منع کیا ہے کہ شرارت نہ کیا کرو۔''

وہ کمینگی سے ہنسا۔ ''تم بھی مجھے کام دھندے کا نہ کہا کرو۔'' اس کی آواز مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

''تو کیا مجھے پانے کے لیے تم اتنا نہیں کر سکتے؟'' ماہین نے ناراضی بھری آواز میں پوچھا۔

''واہ جی واہ...... تمھیں پانے کے لیے اب مزدوری شروع کر دوں۔'' اس نے قہقہہ لگایا اور میں نے پہچان لیا۔ وہ اس کا چچازاد طاہر تھا۔ جانے کتنے عرصے سے یہ کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اور جہاں تک میرا اندازہ تھا وہ ابو جان کو نیند کی گولیاں کھلا دیتے تھے۔

”تو کوئی نوکری شروع کردو۔“ ماہین نے مشورہ دیا۔

”نوکری وغیرہ تو مجھ نہیں ہونے والی البتہ کوئی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ہے۔تم کچھ رقم کا بندوبست کر دونا۔“

”میں کہاں سے رقم کا بندوبست کروں، مجھے ذیشان اتنے پیسے تھوڑی دیتا ہے کہ اس سے کوئی کاروبار ہو سکے۔“

”اتنے زیورات جو پڑے ہیں تمھارے پاس،ان کا کیا کروگی؟“

”ذیشان پوچھے گا نہیں کہ زیورات کہاں گئے۔“

”کر لینا کوئی بہانہ۔“ طاہر نے کہا اور اس کے ساتھ محبت کے اظہار کی حیوانی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔

”اچھا اب جاؤ نا، میں اس بارے کچھ سوچتی ہوں۔“ وہ نیم رضامندی سے بولی۔

”بس تھوڑی دیر اور......“ طاہر کی جذبات سے بوجھل آواز کوئی اور تقاضا کر رہی تھی۔

”جانو!......تم بھی نا۔“ ماہین کی آواز میں بھی سپردگی کا عندیہ تھا۔

اس سے زیادہ بکواس سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔میں نے دروازے کو دھکا دیا۔دروازہ کھلا ہوا تھا۔یوں بھی انھیں کسی کا ڈر خوف نہیں تھا کہ وہ دروازہ کنڈی کرتے۔گھر میں موجود اکیلا بوڑھا کسی نامعلوم نشے کے زیر اثر تھا۔میں دندناتا ہوا اندر داخل ہوا۔مجھے دیکھ کر دونوں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ماہین تو گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی زندہ مثال لگ رہی تھی۔

طاہر ایک جھٹکے سے اٹھا اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔اسے دیکھ کر ماہین کو بھی اپنی بے لباسی کا خیال آ گیا تھا۔وہ بھی اٹھ کر کپڑے ڈالنے لگی۔

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔”تمھیں کیا ضرورت ہے کپڑے ڈالنے کی،ایک تمھارا شوہر ہے اور دوسرا......اس سے ویسے کچھ چھپا نہیں ہے۔“

”ہم بات چیت سے یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“ کپڑے پہنتے ہی طاہر نے گفتگو کی ابتدا کی۔

”کون سا مسئلہ۔“ میں نے حیرانی ظاہر کی۔

”یہی مسئلہ، آپ بس درگزر کریں۔“

میں نے ان دونوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔”ویسے اس حالت میں اگر ایک شوہر اپنی بیوی کو پکڑ لے تو کیا وہ بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔“

”نخ......خدا کے لیے معاف کر دو۔“ ماہین تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

”ہم آیندہ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔“ طاہر کی ٹانگیں بھی لرزنے لگی تھیں۔

”تمھیں مار کر ہاتھ ہی گندے ہوں گے۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔”اور ماروں بھی کس کے لیے، جب میری عزت ہی کو اپنی عزت کا پاس رکھنا نہیں آیا۔“

ماہین نے شرمندگی سے سر کو جھکا لیا تھا۔

”ویسے تمھیں کس چیز کی کمی دی تھی میں نے۔اور اگر تمھیں میں پسند نہیں تھا تو تم مجھے بتا دیتیں زبردستی تھوڑی کرنا تھی میں نے۔“

”میں بہک گئی تھی۔“ اس نے سسکی بھر کر کہا۔

”یہ بھی خوب کہا۔میں امریکہ میں خود کو تمھاری امانت سمجھ کر غیر عورتوں سے دور رکھتا رہا اور تم یہاں بہک گئیں۔خیر اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔“

”پلیز ذیشان!......مجھے ایک موقع دے دو۔“ اس نے بھاگ کر میرے قدموں سے لپٹنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے دھکا دے کر اسے پیچھے گراتے ہوئے کہا۔”میرا عورت ذات سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور پاگل تم اپنا رونا رو رہی ہو۔بہ ہر حال جاؤ تم آزاد ہو۔میں تمھیں طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں۔اور اگلے پانچ منٹ میں تم دونوں یہاں سے غائب نہ ہوئے تو شاید تمھیں قتل نہ کرنے کے فیصلے میں مجھے ترمیم کرنا پڑے۔“

”چلو ماہین!......“ طاہر نے گھبراتے ہوئے کہا۔وہ لرزتی کانپتی کھڑی ہوگئی۔طاہر نے بستر سے اس کی گرم چادر اٹھا کر اسے پکڑائی اور وہ دونوں گھر سے باہر نکل گئے۔گلی کا دروازہ بند کر کے میں اپنے کمرے میں آیا

۔ماہین کی چارپائی سے مجھے گھن آرہی تھی۔بڑی جستی پیٹی سے میں نے اپنا کمبل نکالا اور بستر پر لیٹ گیا۔آن کی آن میں میری دنیا تباہ وبرباد ہوگئی تھی۔میں جینیفر کی چال بازیوں اور مکاریوں پر شاکی آرہا تھا ماہین تو اس سے بھی سوقدم آگے نکلی تھی۔آج تک وہ مجھ سے جھوٹی محبت جتاتی رہی تھی۔اس کے گزشتہ رویے کو یاد کرکے میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔اس کے ناز نخرے،اس کی ادائیں،اس کا لاڈ بھرا انداز،میری آمد پر اس کی آنکھوں میں جھلملاتے قوس قزح کے رنگ ،وہ روٹھنا ،وہ منانا......کیا وہ سب جھوٹ تھا ؟......سب دھوکا فریب تھا ؟......میرے دل میں عورت ذات کی نفرت بھرنے لگی۔مجھے اپنا سکول کا استاد حمید اللہ یاد آ گیا۔وہ ہمیشہ عورت ذات کی برائیوں پر مائل رہتا تھا۔"یہ مکار،چال باز اور فریبی ہوتی ہیں......خبردار کبھی عورت پر اعتبار کرنے کی کوشش نہ کرنا؟"عورت کے بارے بات چیت کرتے ہوئے اس کی گفتگو کا اختتامی فقرہ یہی ہوا کرتا تھا ۔حالانکہ اس وقت ہم میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ استاد کی باتوں کو پرکھ سکتے۔اور پھر سکول کے بعد کبھی کسی نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ماہین سے شادی کے بعد تو استاد حمید اللہ کی باتیں یوں بھی بھول گئی تھیں۔آج بہت عرصے بعد جب ٹھوکر لگی تو اپنا استاد بھی یاد آ گیا۔وہ چند سال پہلے فوت ہوگیا تھا ورنہ میں اپنی درد بھری داستان سنا کر اس کے تجربات کو ضرور خراج تحسین پیش کرتا۔

اچانک مجھے لگا کہ میں نے ان دونوں کو زندہ چھوڑ کر بے غیرتی کا ثبوت دیا تھا۔مگر پھر میں خود کو سمجھانے لگا کہ انھیں قتل کر کے بھی مجھے کیا حاصل ہو جاتا؟......اور دیکھا جاتا تو وہ ایک طرح سے میرے لیے قتل ہی ہو چکی تھی۔

صبح کی آذان تک میں یونھی اذیت ناک سوچوں میں گھرا رہا۔اور پھر آذان کی آواز سنتے ہی غسل خانے میں گھس گیا۔وضو کر کے میں ابوجان کے کمرے کی طرف بڑھا۔لائیٹ جلانے پر وہ مجھے بے سدھ لیٹے نظر آئے ۔حالانکہ وہ ہلکی سی آواز سن کر جاگ جایا کرتے تھے۔

میں نے ان کے پاؤں کو ہاتھ لگایا اور پھر ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔تھوڑی دیر کے بعد ان کی آنکھوں میں جنبش ہوئی اور انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔

"ارے ذیشان بیٹا!"وہ سر جھٹک کر غنودگی بھگاتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔"تم کب پہنچے؟"

”بس تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے ابو جان!......آپ اٹھیں جماعت نکل جائے گی؟“

”ہاں بس اب تو اٹھ گیا۔ آج کم بخت نیند نے کچھ زیادہ ہی اثر دکھایا ہے۔“

انھیں جگا کر میں مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی پر ہم اکٹھے ہی آئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے ماہین کو آواز دی۔

”ماہین بیٹا!......چائے تو لے آؤ؟“

”آپ بیٹھیں ابو جان! میں بنا لاتا ہوں؟“

”ماہین بیٹی کو بنانے دو یار!......تم ذرا امریکہ کا حال احوال سناؤ؟“

”وہ چلی گئی ہے ابو جان!......“میں آہستہ سے بولا۔

”چلی گئی ہے؟“ابو جان ششدر رہ گئے تھے۔”مگر کہاں؟......کیوں؟“

”میں چائے بنا کر لاتا ہوں پھر بات کرتے ہیں؟“

”چھوڑو چائے کو۔“ابو جان پریشانی سے بولے۔”ماہین کیوں چلی گئی ہے؟“

”وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی ابو جان!“

”یہ بھلا کیا بات ہوئی؟“میری مہمل بات بھلا کب انھیں مطمئن کر سکتی تھی۔

”ابو جان!......آپ اتنی گہری نیند سونے کے عادی تو نہیں تھے پھر آج آپ کو کیا ہوا تھا؟“

”اس میں میری نیند کہاں سے آ آ آ......“ابو جان نے فقرہ مکمل کرنے کے بجائے میری طرف دیکھا۔اور پھر سوچتے ہوئے بولے۔”ایسا ہفتے میں ایک ادھ بار ہو جاتا ہے؟......مگر وہ ایسی تو نہیں تھی۔“ابو جان بغیر میرے بتائے بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

”میں بھی کسی کے کہنے پر انھیں ایسا نہ سمجھتا مگر آنکھوں دیکھا جھٹلانا ممکن نہیں۔“

یہ کہہ کر میں باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔جب چائے بنا کر لوٹا تو ابو جان کسی گہری سوچ میں تھے۔شاید انھیں یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

”چائے لیں ابو جان!“میں نے پیالی ان کی جانب بڑھائی جو انھوں نے خاموشی سے تھام لی۔ہم نے

خاموشی سے چائے پی گویا ہمارے پاس کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔اس وقت میں برتن باورچی خانے میں رکھنے جا رہا تھا جب دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"چچا حشمت علی اپنے دنوں بیٹوں اصغر اور اشغر کے ہم راہ دروازے پر کھڑا کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔وہ ابوجان کے ماموں کا سالا تھا۔میرا سابقہ سسر اور ماہین کا باپ۔میں اسے ہمیشہ چچا جان کہہ کر بلاتا تھا۔

"آئیں چچا جان!" میں دروازے سے ایک طرف ہوا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ذیشان!" وہ اندر داخل ہوتا ہوا غصیلے لہجے میں بولا۔"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ تم نے آدھی رات کو میری بیٹی کو طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کیا؟"

اس کی بلند آواز سن کر ابوجان بھی کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔انھیں دیکھ کر حشمت ان کی طرف قدم بڑھاتا ہوا بولا۔"اور بھائی حیدر علی!...... مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی؟"

جواباً ابوجان خاموش رہے تھے۔

"اب بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ بیوی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے شوہر کو کھانا گرم کر کے نہ دے اور شوہر آدھی رات کو اسے طلاق دے کر گھر سے باہر نکال دے؟"

"غصہ انسان سے بہت کچھ کروا دیتا ہے بھائی صاحب!......بہرحال کمان سے نکلا تیر اور بیوی کو دیے طلاق کے تین الفاظ واپس نہیں آسکتے؟" مجھے کچھ نہ کہتا دیکھ کر ابوجان نے بھی اصل بات سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"ویسے شرم و حیا اور غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے ذیشان میاں!......" چچا حشمت علی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔"میرا دل تو کر رہا ہے کہ تمھیں، تمھاری مردانگی کا مزا چکھاؤں مگر بے غیرت آدمی کی پٹائی سے بھی کچھ حاصل ہونے کی توقع نہیں ہے؟"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔میں چاہتا تو اصل بات بتا کر اسے شرمندہ کر سکتا تھا مگر ایک باپ کے لیے بیٹی کی طلاق کا صدمہ ہی کافی تھا۔اگر وہ اس کی بے راہروی کا سنتا تو شاید کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔

”حشمت بھائی!......غصہ تھوکیں اور آئیں بیٹھیں؟“ابو جان نرم طبیعت کے مالک تھے۔جھگڑے فساد سے ان کی جان جاتی تھی۔

”بیٹھنا اور اس گھر میں؟“حشمت علی طنزیہ لہجے میں بولا۔”میں یہاں تھوکنا گوارا نہ کروں؟اور اس وقت میں تم لوگوں سے بات چیت کرنے نہیں آیا؟اپنی بیٹی کا سامان سمیٹنے آیا ہوں۔“یہ کہہ کر وہ خاموش کھڑے بیٹوں کو مخاطب ہوا۔

”چلو بھئی!......سامان سمیٹو بہن کا۔“وہ دونوں نتھنے پھلائے میرے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔خود حشمت چچا بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔انھوں نے ہم سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی کہ آیا کوئی ہمارا سامان بھی کمرے میں موجود ہے یا نہیں؟

اصغر اور اشغر سامان کمرے سے نکال کر صحن میں رکھنے لگے۔اچانک حشمت علی کمرے سے باہر نکلا اس نے ہاتھ میں بٹوہ پکڑا ہوا تھا۔میں نے اس کے چہرے کی طرف نگاہ دوڑائی وہاں غصے اور غضب ناکی کی جگہ ندامت اور شرمندگی بھرے اثرات تھے۔

قریب آکر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور پھر سسکیاں بھرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹا!......میں غلطی پر تھا۔“میں اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا تھا۔جانے اس کے ہاتھ کیا لگا تھا کہ ایک دم اس کی حالت تبدیل ہو گئی تھی۔

”چچا جان!خیر تو ہے؟“میں نے آہستہ سے پوچھا۔”کیا ہوا؟“

”تمھیں دونوں کو مار دینا چاہیے تھا بیٹا!“تھوڑی دیر پہلے والا حشمت کہیں غائب ہو گیا تھا۔

”تو کیا ہوتا چچا!......اب بھی وہ میرے لیے تو مر ہی گئی ہے نا؟“

”اس طاہر کی گردن تو میں اتاروں گا؟“چچا نے بٹوہ کھول کر میرے سامنے کیا۔وہ طاہر کا بٹوہ تھا۔جو وہ غلطی سے ماہین کے بستر پر چھوڑ گیا تھا۔اس میں اس نے ماہین کی تصویر بھی رکھی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ اس کی اپنی تصویر اور شناختی کارڈ وغیرہ بھی تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں چچا!......دو بول پڑھوا کر اس کے ساتھ رخصت کر دو؟اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ

مخلص ہیں تو انھیں اکٹھے زندگی گزارنے کا حق ہے؟ گو ان کا طریقہ غلط تھا مگر مطالبہ تو غلط نہیں ہے نا؟''

''اگر مجھے اس بے غیرت کا بٹوہ نہ ملتا تو کیا تم یونھی ہمیشہ میرے اور میرے بیٹوں کے ہاتھوں مطعون ہوتے رہتے؟''

''ہم نے کون سا ایک گھر میں رہنا ہے چچا!'' میں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''یوں بھی اگر وہ اپنے گناہ پر پردہ ڈالنا چاہتی تھی تو مجھے اس کی پردہ دری کرنے سے کیا حاصل ہوتا۔''

''میں آپ سے بھی شرمندہ ہوں حیدر بھائی!'' حشمت چچا ابوجان کو مخاطب ہوا۔

''اچھا چھوڑو جو ہونا تھا وہ ہو چکا؟'' ابو نے اسے تسلی دی۔

''بیٹا یہ سامان واپس رکھ دو؟'' حشمت اپنے بیٹوں کو مخاطب ہوا۔

''نہیں نہیں چچا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور معاف کرنا یہ سامان آپ کا نہیں آپ کی بیٹی کی ملکیت ہے۔''

پہلے تو اس نے سخت سے انکار کر دیا مگر پھر ابوجان اور میرے سمجھانے پر وہ سامان لے جانے پر راضی ہو گیا۔ انھوں نے اپنی ٹریکٹر ٹرالی ساتھ لائی تھی۔ اصغر اور اشغر کو بھی اصل بات کی بھنک پڑ گئی تھی۔ وہ دونوں مجھ سے نظر نہیں ملا پا رہے تھے۔ میں نے ماہین کا سارا زیور جو وہ اپنے گھر سے لائی تھی یا اسے ہم نے دیا تھا، ان کے حوالے کر دیا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو میں نے ایک دن پہلے خریدے ہوئے تحائف بھی یہ کہہ کر ان کے حوالے کر دیے کہ ''میرے یہ کس کام کے؟ چلو جس کے لیے خریدے ہیں وہی استعمال کر لے؟''

غضب ناک اور تپش کی حالت میں آنے والے میرا سسر اور سالے ندامت اور خفت بھرے آنسو بہاتے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں بھی ابوجان سے اجازت لے کر راولپنڈی روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

سردار مجھ سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے گھر کی خیر خیریت پوچھی۔ جواباً میں نے۔ ''الحمدللہ'' کہہ کر اصل بات بتانے سے گریز کیا۔ یوں بھی ایک مسلم کے لیے اللہ پاک شکر تو ہر وقت بنتا ہے۔ مگر ایک انسان کی

فطرت عجیب قسم کی ہے۔لاکھوں کروڑوں نعمتیں وصول کر کے ایک تکلیف پر رب کریم کی ناشکری پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

یونٹ میں ہمیں پر جوش طریقے سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔خاص کر میری بہت پذیرائی ہوئی تھی۔دو تین دن کے بعد ہمیں دس دس دن کی چھٹی مل گئی۔میرا گھر جانے کو دل ہی نہیں کر رہا تھا۔میں گھر جانے کے بجائے صوابی چلا گیا۔استاد عمر دراز مجھے بہت محبت سے ملا تھا۔میں ان کے ساتھ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر امریکہ میں گزرے شب وروز دہرانے لگا۔ساری تفصیل سننے کے بعد اس نے میری تعریف کرنے کے بجائے پوچھا۔

''ذیشان بیٹا!......تم پریشان اور افسردہ کیوں ہو؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں سر!''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ہنسا۔''تمھارا مطلب ہے میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟''

''چھوڑیں سر؟''دکھ کے بادل برسنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔''ضروری نہیں کہ آنسو روکنے والا غم چھپانے میں بھی کامیاب ہو جائے؟''

''سر!......مجھے گزرے غموں کو یاد کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا؟''

''غم بانٹنے سے ہلکا ہو جاتا ہے بیٹے!''

میں نے صاف گوئی سے کہا۔''کچھ غموں کے تذکرے پر غیرت آمادہ نہیں ہوتی؟''

''عورت کا غم ہمیشہ مرد کو توڑ کر رکھ دیتا ہے؟''وہ جہاں دیدہ شخص بغیر میرے بتائے حقیقت کے قریب پہنچ گیا تھا۔''لیکن یاد رکھنا بیٹے کمزوری نہیں دکھانا۔تم سے زیادہ نقصان اس کا ہوا ہے؟......اس نے ایک مخلص ساتھی گنوا دیا جبکہ تمھاری جان ایک دغاباز اور مطلبی سے چھوٹ گئی ہے؟''

استاد عمر دراز کی بات سن کر میرے دل پر چھائے غم کے بادل ایک دم ہٹ گئے تھے۔

''صحیح فرمایا سر!''میرے ہونٹوں پر تبسم ظاہر ہوا۔''اس طرح تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا؟''

''اچھا اب اصل بات بتاؤ؟......کون تھی؟''

”میری بیوی نے طلاق لے لی ہے سر؟“

”اچھا کیا اس نے خود طلاق لے لی ورنہ ایسی عورتوں کو طلاق دینا پڑ جاتی ہے؟“

”یہی تو غم ہے؟“ میں ایک بار پھر اداس ہو گیا تھا۔

”اوہ ...... چلو یہ بھی بہتر ہوا کہ جوانی ہی میں تمھیں اس کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ ورنہ اولاد ہو جانے کی صورت میں تمھیں فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آتی؟“

”اچھا چھوڑیں سر! ......اس موضوع کو آپ نے میری کارکردگی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا؟“

”وہ تو میں نے پہلے دن سے بتا دیا تھا کہ تم میرا ریکارڈ توڑ دو گے اور وہی ہوا؟ میں بس چھ سات سو میٹر تک ہدف کو نشانہ بناتا رہا اور تم انیس سو میٹر تک پہنچ گئے؟“

”یہ تو خیر آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ انیس سو میٹر سے میں نے اس ہتھیار سے ہدف کو نشانہ بنایا ہے جس کی کارگر رینج دو ہزار میٹر ہے جبکہ آپ نے سات سو میٹر پر جی تھری سے ہدف کو نشانہ بناتے تھے۔ جس کی کارگر رینج ٹیلی سکوپ سائیٹ لگا کر بھی چھ سو میٹر بنتی ہے۔“

”یہ بھی تو دیکھو نا کہ میری شہرت پاکستان تک محدود رہی اور تم جانے کتنے ممالک کے سنائپرز کو پچھاڑ آئے ہو؟“ استاد عمر دراز سنائپنگ کے فن کی طرح باتوں میں بھی ماہر تھا۔

میں ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ کردار کی طرح گفتار کے بھی غازی ہیں۔“

انھوں نے شفقت سے کہا۔ ”بس، ہر فرمان بردار شاگرد کی طرح تم اپنے استاد ہارتے نہیں دیکھ سکتے۔“

”شام کی آذان ہو رہی ہے، میرا خیال ہے وضو مسجد میں کرنا بہتر رہے گا؟“ میں نے اس بحث سے جان چھڑاتے ہوئے مشورہ دیا۔

”یہ مناسب ہے۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

☆......☆......☆

اگلا دن ہم نے استاد عمر دراز کے گھر گپ شپ میں گزارا۔ ان کے چند دوست بھی آ گئے تھے خوب محفل جمی رہی۔ اب اتنی پشتو تو مجھے بھی آ گئی تھی کہ ان کی بات چیت سمجھ لیتا، البتہ میں خود مکمل طور پر بول نہیں پاتا تھا۔ اس

دن سہ پہر کو میں نے استاد عمر دراز سے اجازت چاہی

''بیٹا!...... آتے جاتے رہا کرو۔'' وہ مجھے گلے ملتے ہوئے شفقت سے بولے۔

''جی سر!...... یہ کوئی بتانے کی بات تو نہیں ہے نا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

انھوں نے شرارتی لہجے میں کہا،'' اور اگر شادی کا ارادہ ہو تو ضرور بتانا، ایسی دلھن ڈھونڈ کر دوں گا کہ تمھاری سوچ سے بھی ماورا ہو گی۔''

''سر!...... اگر حقیقت کہوں تو مجھے عورت ذات سے نفرت ہو گئی ہے، اتنی نفرت جس کی بابت آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں امریکہ میں بھی ایک اپنی جھوٹی محبت کے دعوے لے کر میرے پیچھے پڑ گئی تھی بعد میں پتا چلا کہ اس کے یہ دعوے فقط مجھے امریکہ کا غلام بنانے کی نیت سے تھے۔ اب تو عورت کے بارے میرے تجربات ومشاہدات کا نچوڑ یہی ہے جو کہ ہمارے اسکول کے استاد مرحوم حمید اللہ جان صاحب کا تھا کہ بے شک سانپ ،بچھو پر اعتبار کر لینا عورت پر نہیں۔''

''اسے شدت پسندی اور تشدد کہتے ہیں بیٹا۔'' استاد عمر دراز نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ صحیح فرما رہے ہیں سر! مگر کبھی کبھی یقین کی سب سے اونچی سیڑھی سے اتنے زور کا دھکا لگتا ہے کہ انسان کے سارے نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ چاہ کر بھی کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔''

''تم جز کو کل پر منطبق کر رہے ہو؟'' ان کی کوشش جاری رہی۔

''میرا کُل تو وہی تھی سر!'' میں اداس ہو گیا۔

''میں امید کرتا ہوں کوئی تو ایسی ہو گی جو تمھارے دل سے عورت ذات کے بارے یہ بدگمانی دور کر دے گی۔''

''سر!...... اپنا خیال رکھیے گا، آپ کی دعاؤں کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔'' ان کی بات کا جواب نہ دے کر میں نے اپنا مطمح نظر ان تک پہنچا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا!...... اللہ پاک تمھیں سکھی رکھے۔ وہی ذات بابرکات ہی تمھارے ذہن سے یہ غلط سوچ نکال سکتی ہے۔''

”اللہ حافظ سر!“ میں نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھوں کو بوسا دیا اور وہاں سے نکل آیا ۔شام کی آذان ہو رہی تھی جب میں گھر میں داخل ہوا۔ وہاں پھوپھو جان کو دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی تھی ۔وہ بیوہ تھیں، ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ تمام شادی شدہ تھے۔ پہلے وہ باری باری تینوں بیٹوں کے ہاں قیام کرتی تھیں مگر اب شاید ابو جان انھیں مستقل اپنے پاس لے آیا تھا۔ بعد میں ابو جان سے گفتگو ہونے پر پتا چلا کہ میرا اندازہ درست تھا۔کلثوم بوا مستقل ہی وہاں منتقل ہوگئی تھیں۔ابو جان مجھے دیکھ کر خوش ہوگئے تھے ۔پھوپھو نے بھی مجھے گلے سے لگا کر پیار کیا۔یقیناً انھیں ماہین کے ساتھ میری علاحدگی کی خبر مل چکی تھی لیکن انھوں نے اس متعلق کوئی سوال کرنے سے گریز کیا تھا۔چھٹی کے بقیہ دن میں نے گھر میں گزارے۔ زیادہ تر میں گھر ہی میں رہتا تھا۔بس دو تین بار اپنے دوست اویس ہی سے ملاقات کرنے گیا یا وہ خود میرے گھر آ گیا تھا ۔ماہین کے مسئلے پر اس نے مجھے کریدنے کی کوشش کی مگر اسے بھی میں نے اصل بات کی ہوا نہیں لگنے دی تھی ۔البتہ دبے لفظوں میں اس نے مجھے یہ باور ضرور کرا دیا تھا کہ لوگوں کو اصل بات کا پتا چل چکا تھا، ایسی باتیں چھپا نہیں کرتیں۔

ابو جان اور پھوپھو نے دوسری شادی کے بارے میرا عندیہ جاننے کی کوشش کی مگر میں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ دنیاوی دلچسپیوں سے جی ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ماہین کے اس طرزِ عمل کے باوجود بستر پر لیٹتے ہوئے عموماً اس کی یاد دماغ میں در آتی۔ وہ مجھے بہت زیادہ پیاری تھی۔ میں نے اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی، کبھی اس کی کسی خواہش کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔خود اس کے رویے سے بھی مجھے کبھی یہ اندازہ نہ ہو پایا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے اور میری امانت میں خیانت کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یا اسے میں ناپسند ہوں اور کوئی اور پسند ہے ۔میرے چھٹی آنے پر اس کا خوش ہو جانا، میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا، روٹھنا منانا، گلے شکوے کرنا، ابو جان کی خدمت بیٹیوں کی طرح کرنا اور بھی اس کی کئی ایسی عادات تھیں جو مجھے بہت پسند تھیں۔ اگر میں نے خود اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑا ہوتا تو شاید ابو جان کے بتانے پر بھی یقیناً نہ کرتا۔ امریکہ میں کیپٹن جینیفر کی وجہ سے عورت ذات کے بارے میرے دل میں جو بدگمانی پیدا ہوئی تھی ماہین کی حرکت نے اس پر تصدیقی مہر ثبت کر دی تھی ۔اب میں چاہ کر بھی عورت ذات پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ جینیفر نے ہمیشہ مجھے اپنے رویے سے یہی باور کرایا تھا

کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری ملاقات میں اس نے جو اداکاری کی تھی، جس طرح مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا چاہا تھا ایسی مکاری اور عیاری کسی عورت ہی کا خاصا ہو سکتی ہے۔ گو مرد ذات بھی دھوکا دہی میں کچھ کم نہیں مگر میرے نزدیک اس میدان میں مرد، عورت کے عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

وہ چھٹی جو کبھی یوں گزرتی تھی کہ جاتے وقت تشنگی کا احساس شدت سے دل میں رہتا تھا، اب بڑی مشکل سے گزری۔ وہی گھر جس میں کوئی لمحہ ماہین کے بغیر نہیں گزرتا تھا اب اس کا وجود ناپید تھا۔ چھٹی ختم ہونے پر میں بڑی مشکل سے رخصت ہوا کرتا تھا مگر اس دن میں صبح ناشتے کے بعد ہی جانے کے لیے تیار تھا۔ بوا اور ابو جان سے دعائیں لے کر میں گھر سے نکل آیا۔

☆......☆......☆

سردار رات گئے ہی واپس لوٹا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے ہی میں سو گیا تھا۔ صبح ہی اس سے ملاقات ہو پائی تھی۔ چنارے بیگم کی رفاقت نے اس سے دل سے لی زونا کے بچھڑنے کے غم کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔

ہم دو تین دن ہی آرام سے گزار پائے تھے کہ یونٹ کو ایک نئی سرگرمی کا لیٹر ملا۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں تعینات ڈویژنز نے اپنی زیر کمان یونٹوں میں سنائپرز کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ہمارے کمانڈنگ آفیسر سے انسٹرکٹرز طلب کیے تھے، اس کے علاوہ حساس علاقوں میں تعینات کرنے کے لیے کچھ تجربہ کار سنائپرز بھی مانگے تھے کیونکہ دہشت گردوں کے بہت سے سنائپرز پاک آرمی کا کافی نقصان کر چکے تھے۔ مجھے امید تھی بھیجے جانے والے سنائپرز میں میرا نام ضرور شامل ہوگا۔ مگر دو دن بعد انسٹرکٹرز کے طور پر راؤ تصور صاحب اور حوالدار فیاض کا چناؤ ہوا تھا جب کہ سنائپنگ کے لیے سردار خان، اسد خٹک، بشیر حیدر، عصمت اللہ جان اور سہیل مروت کا انتخاب کیا گیا تھا۔

ان کے جانے کے دوسرے دن مجھے پتا چلا کہ اس پارٹی میں میرا قرعہ فال کیوں نہیں نکلا تھا۔ مجھے دوبارہ انڈین سرحد پار جا کر ایک اور ہدف کو نشانہ بنانا تھا۔ اس بار میرے ساتھ حوالدار نصیر الدین جا رہا تھا۔ وہ یوں بھی مجھ سے سینئر تھا۔ مشن کی تفصیلات ہمیں یونٹ سیکنڈ ان کمانڈ کی زبانی سننے کو ملیں تھیں۔ ٹو آئی سی صاحب نے کانفرنس روم میں ہمیں بریفنگ دی۔ پچپن انچ کی بڑی ایل ای ڈی پر ہمیں ہدف کی تصاویر، اس کے علاقہ اور

اسے قتل کرنے کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ سرحد عبور کرنے کے مقام کا بھی سرسری ذکر انھوں نے کر دیا تھا، ویسے اس علاقے میں سرحد پار کرنا عمومی طور پر ہماری اپنی صوابدید پر ہوتا ہے۔ ٹو آئی سی کی بریفنگ کے بعد اگلا پورا ہفتہ ہم ہندی زبان کے وہ مشہور الفاظ سیکھنے میں مصروف رہے جو اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ یوں بھی اردو اور ہندی کے رسم الخط مختلف ہونے کے باوجود بولنے میں دونوں زبانیں قریباً مماثل ہیں۔ بلکہ پاکستان میں انڈین فلموں، ڈراموں اور کارٹونز وغیرہ کے بڑھتے ہوئے رجحان نے ان خالص ہندی الفاظ کو بھی نامانوس نہیں رہنے دیا۔ البتہ عام بول چال میں ہم وہ الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

اس کا نام رنجیت چوپڑہ تھا۔ اس کی شخصیت اتنی اہم نہیں تھی کہ اسے قتل کرنے کے لیے خصوصی طور پر پاکستان سے سنائپرز بھیجے جاتے، بس انا کا مسئلہ آڑے آ گیا تھا۔ وہ شخص پاکستان میں دومرتبہ دہشت گردی کی واردات کرنے کے بعد بھی صاف بچ کر نکل گیا تھا۔ اس کے خلاف سارے ثبوت ملنے کے بعد پڑوسی ملک سے اس کی گرفتاری کا مطالبہ کیا گیا مگر ایسی بات اگر بنیا مان جائے تو اسے بنیا کون کہے؟ اور مزے کی بات یہ کہ وہ کسی سرکاری ایجنسی یا انڈین آرمی کا فرد نہیں بلکہ کرائے کا ٹٹو تھا۔ انڈین حکومت کی ہٹ دھرمی کو دیکھ کر ہائی کمان کی طرف سے یہی حکم آیا تھا کہ اس شخص کو زندہ رہ کر پاکستان میں کرنے والی دہشت گردی کی کارروائی پر ملنے والے انعام سے مستفید نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ یوں بھی دومرتبہ معصوم لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والے، بلکہ ہندو محاورے کے مطابق معصوم لوگوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے کو یہ دہری دہشت گردی اندرونِ خانہ بہت زیادہ کامیاب کر گئی تھی۔ اور اب تو وہ باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے پر پرتول رہا تھا۔ پاکستانی حکومت کی طرف سے رنجیت چوپڑہ کے مطالبے کا ایک نقصان یہ ہوا تھا کہ اس شخص کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا گیا تھا۔ انڈیا میں پاکستانی جاسوسوں کی موجودی یقینی ہونے کے باوجود یہ کام ان سے نہیں لیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ ایک تو پاکستانی جاسوس ایسی دہشت گردانہ کارروائیوں سے عمومی طور پر دور رہتے ہیں جن سے سوّل عوام یا معصوم لوگ متاثر ہوں۔ ان کا غیر مسلم ہونا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ انھیں جینے کا حق نہیں۔ اسلام اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا کہ کسی بھی مذہب یا مسلک کے بے گناہ افراد کو قتل کر دیا جائے۔ دوسرا وہ جاسوس لڑائی بھڑائی کے چکر میں ذرا کم کم ہی پڑتے ہیں۔ یوں بھی ان میں زیادہ تعداد ان افراد کی ہوتی ہے جو لڑائی بھڑائی کے فن سے نا آشنا ہوتے

ہیں۔انھی وجوہات کو دیکھ کر یہ ہدف ایک سنائپر کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لیے ہم دونوں کا انتخاب ہوا تھا۔

وہ یونٹ میں ہماری آخری رات تھی صبح سویرے ہم نے کشمیر روانہ ہونا تھا کہ سرحد پار کرنے کے لیے پہاڑی علاقہ ہی مناسب تھا۔رات کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا جب ڈیوٹی پر متعین سپاہی نے مجھے جگا کر بتایا کہ کمانڈنگ آفیسر مجھے اپنے آفس میں یاد کر رہے ہیں۔میں نے جلدی سے غسل خانے میں گھس کر منہ پر چند چھینٹے پانی کے مارے اور منہ پر تولیہ رگڑ کر کمانڈنگ آفیسر عرفان ملک کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔استاد نصیر الدین بھی مجھے اپنے کمرے سے نکلتا دکھائی دیا۔یقیناً اسے بھی طلب کیا گیا تھا۔مجھے دیکھ کر وہ سر ہلاتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑا کمانڈنگ آفیسر کے اردلی نے ہمیں دیکھتے ہی کہا کہ کمانڈنگ آفیسر بے تابی سے ہمارے منتظر ہیں۔اور ہم سر ہلاتے ہوئے دفتر میں داخل ہو گئے۔

''آ گئے آپ لوگ۔''ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے سامنے پڑے لیپ ٹاپ کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔''بیٹھیں۔''

اور ہم دونوں آفس ٹیبل کے سامنے پڑی فوم والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''تو جانے کے لیے تیار ہو؟''عرفان صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی سر!''ہم بیک زبان بولے تھے۔

''اچھا آپ لوگوں کو اس وقت بلانے کا مقصد یہ ہے کہ جانے کی ترتیب میں تھوڑی تبدیلی کرنا ناگزیر ہو گئی ہے۔اب دو کے بجائے صرف ایک سنائپر نے جانا ہے تو آپ دونوں میں سے کون زیادہ تیار ہے۔''کمانڈنگ آفیسر نے انتخاب کی ذمہ داری ہمارے سر پھینکی۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر میں نے گلا کھنکھارتے ہوئے دبے لفظوں میں کہا۔

''سر!......استاد نصیر الدین گو مجھ سے سینئر ہیں اور ہر لحاظ سے بہتر بھی ہیں،مگر اس مشن پر سرحد پار جا کر ہمیں ڈریگنو سنائپر رائفل ہمارے حوالے کی جانی تھی اور اس رائفل کو میں استعمال کر چکا ہوں اور بدقسمتی سے استاد نصیر الدین کو اس سے پہلے ڈریگنو رائفل استعمال کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔''

''یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے سر!'' استاد نصیر الدین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میری بات کی تردید کی ۔''ذیشان بلاشبہ ایک اچھا نشانے باز ہے۔مگر ہندی زبان پر مجھے اس سے زیادہ عبور ہے اور اس سے پہلے ایک مشن پر میں انڈین سرحد عبور کر کے قریباً ایک ماہ وہاں رہ بھی چکا ہوں۔''

کمانڈنگ آفیسر ملک عرفان کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''آپ دونوں کا جذبہ قابلِ تعریف ہے اور مجھے فخر ہے کہ مجھے آپ جیسے ماتحت ملے ہیں کہ ماہرِ فن ہونے کے ساتھ جن میں وطن کی خدمت اور محبت کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔بہ ہر حال میں جانتا ہوں کہ اس مشن کے لیے آپ دونوں ایک بہترین انتخاب ہیں پھر بھی میں یہ ذمہ داری ذیشان کے کندھوں پر ڈالتا ہوں ......اور حوالدار نصیر الدین!......آپ صبح میجر وسیم سے مل کر نئے مشن کی تفصیلات معلوم کرلیں آپ کے پاس تیاری کے لیے فقط دو دن ہیں۔''

''جی سر!'' حوالدار نصیر الدین کا چہرہ جو کمانڈنگ آفیسر کی پہلی گفتگو پر بجھ سا گیا تھا ایک دم کھل اٹھا۔

''فی امان اللہ!......'' عرفان صاحب نے کھڑے ہو کر ہم دونوں سے معانقہ کیا اور پھر دفتر کے دروازے تک ہمیں رخصت کرنے بھی آئے۔

ان کے دفتر سے نکل کر ہم دونوں استاد نصیر کے کمرے میں آ گئے،وہاں وہ مجھے علاقے کے بارے ضروری ہدایات دینے لگا۔گو اس سے پہلے علاقے کے بارے ضروری باتیں ہمیں ٹو آئی سی میجر وسیم تفصیل سے بتا چکے تھے۔لیکن استاد نصیر چونکہ علاقے سے زیادہ واقفیت رکھتا تھا اس لیے وہ اہم باتوں پر دوبارہ روشنی ڈالنے لگا۔رات کا بقیہ حصہ میں نے استاد نصیر الدین سے اس سے علاقے کے بارے ضروری معلومات حاصل کرتے گزارا۔صبح کی آذان کے ساتھ ہم نے مسجد میں جا کر نماز ادا کی اور پھر ناشتا کر کے میں جانے کے لیے تیار تھا ۔آخری دم تک استاد نصیر الدین کی نصیحتیں جاری رہیں۔سردار خان اور میرے محترم استاد راؤ تصور تو یوں بھی وزیرستان جا چکے تھے۔

بس میں بیٹھ کر میں نے ابوجان اور پھوپھو سے چند منٹ بات کی لیکن انھیں اصل بات نہیں بتائی تھی۔اس کے بعد استاد عمر دراز بات کی۔انھیں البتہ میں نے تمام بات بتادی تھی۔دو تین مفید مشوروں کے ساتھ انھوں نے ڈھیروں دعائیں دیں۔رابطہ منقطع کر کے میں نے بس کی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔دوست

احباب کی صورتیں کسی فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھومنے لگیں ۔ان میں ماہین کی شکل بھی شامل تھی جانے کیوں وہ بے وفا وقت بے وقت یاد آنے لگتی ۔ بہت مختصر وقت کے لیے وہ میری زندگی میں آئی تھی اور اس سے میں نے بہت زیادہ محبت کی تھی مگر اب وہ محبت نفرت میں ڈھل گئی تھی ۔ بلکہ وہ کیا مجھے تو عورت ذات ہی سے سخت قسم کی نفرت ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود اکثر اوقات تنہائی میں اس کے ساتھ گزارا وقت بے طرح یاد آنے لگتا ۔بھروسے کا ٹوٹنا بعض اوقات انسان ہی کو توڑ دیتا ہے ۔اس کی بے وفائی اور بدکرداری نے مجھے بھی توڑ دیا تھا ۔اب تو بس دل میں وطن کی خدمت کے علاوہ کوئی تمنا، کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی ۔ پہلے میں سوچا کرتا کہ جانے کب میری نوکری کی مدت پوری ہوگی اور میں ماہین کے ساتھ اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزاروں گا ۔اور اب نوکری کی میعاد پوری ہونے کے خوف سے دل مسوس کر کے رہ جاتا کہ اس کے بعد میری زندگی کا کیا مصرف ہوگا ۔ ہر انسان کی زندگی کے ساتھ مختلف رشتے جڑے ہوتے ہیں اور ان میں سب سے پائیدار رشتہ اولاد کا ہوتا ہے لیکن اولاد بھی بیوی کے واسطے ہی سے انسان کی زندگی شامل ہوتی ہے گویا اصل رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے ۔قرآن مجید فرقان حمید میں بھی رب کریم نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گویا مرد کے لیے اپنی عورت اور عورت کے لیے اپنے مرد سے بڑھ کر کوئی قریب نہیں ہوتا ۔ نبی پاک ﷺ کو اپنی چاروں بیٹیوں سے بہت زیادہ محبت تھی ۔ خصوصاً سیدہ فاطمہؓ پر تو آپ خصوصی شفقت فرمایا کرتے اس کے باوجود اس جہان فانی سے رخصت ہوتے وقت آپ ﷺ کا مبارک سر مومنوں کی ماں امی جان سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی مقدس گود میں تھا ۔ بیوی کا رشتہ اتنا خوب صورت، اتنا مفید اور اتنا پیارا ہے کہ اس کے مقابل کوئی رشتہ پیش نہیں کیا جا سکتا، لیکن میرا اس مقدس رشتے پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا ۔ میں چاہ کر بھی عورت پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا ۔آج کل تو میں جہاں کوئی لڑکی دیکھتا میری آنکھوں میں خون اتر آتا ۔اور عجیب بات یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نفرت بڑھتی جا رہی تھی ۔ ہزاروں دلائل اور ہزاروں تاویلات کے باوجود میں عورت کی طرف مائل نہیں پا رہا تھا ۔ میں ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان ہوں اور اپنے جذبات و غصے پر قابو پانے میں بھی زیادہ تر کامیاب ہی رہتا ہوں ۔ ماہین کو غیر مرد کی آغوش میں دیکھ کر اگر میں اسے قتل بھی کر دیتا تب بھی یقیناً میں حق بہ جانب ہوتا کہ عموماً اس قسم کے معاملے میں مرد حضرات یونہی کیا کرتے ہیں ۔ بلکہ کچھ عیار مرد تو اپنی بے گناہ بیویوں سے جان چھڑانے کے لیے

بھی ان کی جھوٹی بے راہ روی کا ڈراما ترتیب دے کر انھیں جان سے مار دیتے ہیں۔لیکن میں ایسا نہیں کر سکا تھا اور اب اپنے صبر و حلم پر پچھتا رہا تھا۔میں خود کو تنہائی میں کوسنے لگتا کہ میں نے سراسر بزدلی اور بے وقوفی کا ثبوت دیا تھا۔مجھے ان دونوں کو اتنے آرام سے نہیں جانے دینا چاہیے تھا۔کم از کم ان دونوں کی اچھی طرح پٹائی تو کر ہی سکتا تھا۔میں کافی دیر انھی سوچوں میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ بس ایک طویل فاصلہ طے کر کے باغ پہنچ گئی۔باغ سے چھتر دو کا فاصلہ سات آٹھ کلو میٹر تھا اور مجھے وہیں پاک آرمی کی ایک یونٹ میں رات گزارنا تھی۔باغ سے چھتر دو کے لیے ویگنیں اور ڈاٹسن وغیرہ دن کے وقت دستیاب ہوتی ہیں۔ایک ویگن میں بیٹھ کر میں چھتر دو پہنچا۔ویگن سے اترتے ساتھ مجھے روڈ کے کنارے ایک گیٹ پر پاک آرمی کا جوان ڈیوٹی پر کھڑا نظر آیا۔اس سے مطلوبہ یونٹ کے بارے معلومات لے کر میں اس سمت کو بڑھ گیا۔مطلوبہ یونٹ کے گیٹ پر اپنا تعارف کرانے پر اس نے میرا سروس کارڈ دیکھ کر میری پہچان کو یقینی بنایا اور پھر مجھے گیٹ پر بنے استقبالیہ کے کمرے میں بٹھا کر اپنے سینئر سے بات کرنے لگا۔تھوڑی دیر بعد رجمنٹ پولیس کا حوالدار وہاں پہنچ گیا۔اسے بھی میں نے اپنی آمد کا مقصد بتائے بغیر کسی ذمہ دار آفیسر سے ملوانے کی درخواست کی۔وہاں ان کی یونٹ کا ریئر تھا۔باقی کی یونٹ آگے پوسٹوں پر لگی ہوئی تھی۔البتہ آفیسر میس میں ایک کیپٹن صاحب موجود تھا جو غالباً چھٹی سے واپس آیا تھا۔رجمنٹ پولیس کے حوالدار نصر اللہ نے انٹر کام پر آفیسر سے بات کر کے مجھے وہیں لے گیا۔

کیپٹن کاشف اس یونٹ کا کواٹر ماسٹر صاحب تھا۔پرتپاک انداز میں مصافحہ کر کے اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

میرے نشست سنبھالتے ہی وہ حوالدار کی طرف متوجہ ہوا۔”نصر اللہ!......آپ جائیں اور چائے وغیرہ کا میس ویٹر کو بتا دو۔“

”جی سر!“ کہہ کر نصر اللہ سیلوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

”جی راجا ذیشان حیدر!......بتائیں کیا مسئلہ ہے۔“

اس مرتبہ میں نے جیب سے خفیہ چٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔چٹھی پڑھ کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔چند لمحے سوچنے کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”ویسے کیا آپ سرحد پار جانے کے مقصد پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔“

میرے ہونٹوں پر مدھم سے مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میں نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ہونہہ!......'' کہہ کر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور فون اٹھا کر بٹالین میں رابطہ کرنے لگا۔ چند سیکنڈز بعد وہ اپنے کمانڈنگ آفیسر سے محو گفتگو تھا۔ اس نے میرا نام وغیرہ ہی بتایا تھا کہ اسے آگے سے ہدایات ملنے لگیں یقیناً انھیں بذریعہ فون یا چٹھی پہلے سے میری آمد کے بارے مطلع کر دیا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے کمانڈنگ آفیسر کی باتیں سنتا رہا۔ درمیان میں وہ ''جی سر۔'' اور ''ٹھیک ہے سر۔'' کہہ کر تائید بھرے انداز میں اپنا سر ہلاتا رہا۔ جونھی دوسری جانب سے بات مکمل ہوئی اس نے رسیور رکھ دیا۔ اسی وقت میس ویٹر چائے کے برتن لیے اندر داخل ہوا ۔ چائے پینے کے دوران ہی اس نے حوالدار نصر اللہ کو بلا کر مجھے مہمان خانے میں سلانے کا حکم دیا اور مجھے بتایا کہ میں نے اگلی صبح اس کے ہمراہ بٹالین ہیڈ کوارٹر جانا تھا۔ چائے پی کر میں کیپٹن کاشف سے مصافحہ کر کے آفیسر میس سے نکل آیا۔ وہ رات میں نے مہمان خانے میں گزاری۔ اگلی صبح میں نے کیپٹن کاشف کے ساتھ ان کے بٹالین ہیڈ کوارٹر جانا تھا جو وہاں سے کم از کم بائیس، تئیس کلو میٹر آگے تھا۔

☆......☆......☆

چاند کی انیس، بیس تاریخ تھی۔ چاند نکلتے ہی میں آگے جانے کے لیے تیار تھا۔ میں دو دن پہلے وہاں پہنچا تھا۔ بہادر کیمپ میں کمانڈنگ آفیسر سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی تھی۔ ایک رات بہادر کیمپ میں گزاری اگلا سارا دن اس بٹالین کا انٹیلی جنس آفیسر مجھے وہاں بارڈر پر تعینات اپنی اور دشمن کی پوسٹوں کی جگہ کے بارے تفصیل سے بتاتا رہا تھا۔ نقشے پر بھی اس نے مجھے باریکی سے سمجھا دیا تھا۔ اس سے اگلے دن وہ مجھے لے کر کیدیٰ گلی پہنچا جہاں سے میں نے سرحد عبور کرنا تھی۔ کیدیٰ گلی کا علاقہ بھی اسی بٹالین کی حدود میں آتا تھا۔ بہادر کیمپ سے قریباً چھ سات کلو میٹر دور تھا۔

رات کا کھانا کھا کر میں نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی اور پھر سرحد پار کرنے کے لیے ضروری کارروائیاں کرنے لگا۔

اپنے ساتھ میں صرف ایک پستول لے کے جا رہا تھا۔ گلاک نائینٹین ایک اعلا قسم کا پستول ہے۔ وزن میں ہلکا جسامت میں مختصر اور کارکردگی میں بہت عمدہ۔ دنیا بھر میں پائے جانے والے پستولوں میں ایک نمایاں مقام

رکھتا ہے۔ڈریگنو ورائفل مجھے وہیں سے ملنا تھی۔

اس بٹالین کا انٹیلی جنس آفیسر میرے ساتھ بارودی سنگی قطعے تک چل کر آیا تھا۔اس کے ساتھ اس پوسٹ کا کمانڈر میجر مزمل بھی تھا۔اس جگہ سے گزرنے کے رستے کی نشان دہی کر کے انھوں نے الوداعی معانقہ کیا۔

”ذیشان!......اللہ پاک تمھیں کامیاب کرے اور خیریت سے لوٹو۔“ دعائیہ انداز میں میرا کندھا تھپتھپا کر انھوں نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔اور خود وہیں کھڑے ہو کر میری حرکت کی نگرانی کرنے لگے۔

بارودی سرنگی قطعے کو عبور کرتے ہی میں نے پیچھے دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔وہ ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔مجھ پر نظر رکھنے کے لیے انھوں نے اپنی آنکھوں سے شب دید عینک لگائی ہوئی تھی۔میرے ہاتھ کے جواب میں انھوں نے بھی جواباً ہاتھ لہرا دیے۔میں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔فروری کا مہینا اختتام پذیر ہونے کو تھا لیکن اس علاقے میں سردی عروج پر تھی۔برف نے سارے پہاڑوں کو سفیدی کی چادر اوڑھا دی تھی۔میں مکمل تیاری کے ساتھ آگے روانہ ہوا تھا مگر میرے پاس موجود سامان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جو پاک آرمی میں استعمال کی جاتی ہو۔بوٹ، دستانے، جرابیں، گرم ٹوپی سے لے کر میرے پہننے والے کپڑوں تک۔تمام کی تمام وہ اشیاء تھیں جو خصوصاً اس علاقے کے مقامی لوگ استعمال کرتے تھے۔انڈین کرنسی کے چند ہزار روپے بھی میرے پاس موجود تھے۔ضرورت پڑنے پر میں مزید رقم وہاں پر موجود ایک مخصوص شخص سے لے سکتا تھا۔کرن مہتا کے نام سے میرے پاس شناختی کاغذات بھی موجود تھے جو کہ انبالے کے ایک مضافاتی گاؤں کا رہائشی تھا۔

پیدل چلتے ہوئے سردی کا احساس نہیں ہوتا۔مجھے بھی مسلسل چلتے ہوئے پسینہ آ گیا تھا۔رات کے وقت اترائی کا سفر پر مشقت تو نہیں لیکن مشکل بہت ہوتا ہے ذرا سی بے احتیاطی سے انسان نیچے لڑھک سکتا ہے اور نیچے لڑھکنے کا مطلب موت ہی ہے کیونکہ اتنی بلندی سے گر کر بچ جانے والا جن بھوت تو ہو سکتا ہے انسان نہیں۔ٹارچ جلانے کا خطرہ میں مول نہیں لے سکتا تھا۔لے دے کے بیسویں کے چاند کی مدھم روشنی میری معاون اور مددگار تھی۔مجھے اس پہاڑ سے نیچے آتے گھنٹا، پون گھنٹا لگ گیا، کیونکہ میں سیدھا نیچے اترنے کے بجائے ترچھا چلتا گیا تھا۔سیدھا اترنے میں پھسلنے کا خطرہ زیادہ تھا۔جنوری فروری میں برف جم کر بہت سخت ہو چکی ہوتی ہے۔اور برفانی تودوں کے گرنے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔اس کے برعکس اکتوبر نومبر میں

چونکہ برف تازہ تازہ پڑی ہوتی ہے اس لیے برفانی تودے زیادہ گرتے ہیں۔

نالے میں اترتے ہی میں خطرناک علاقے میں پہنچ گیا تھا۔سامنے والی پہاڑی پر انڈیا کا بٹالین ہیڈ کواٹر موجود تھا۔گو وہ کافی اونچائی پر تھا لیکن اس کے سامنے نیچے کی طرف اس کی فارورڈ آبزرونگ پوسٹ بھی موجود تھی جو نالے سے قریباً پچاس ساٹھ گز ہی بلند ہو گی۔ایسی پوسٹوں پر ڈیوٹی پر موجود سنتری حد سے زیادہ چوکنا ہوتے ہیں۔خاص کر ہندو تو اس معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں ڈر کی وجہ سے پوری پوری رات جاگ کر گزار دیتے ہیں۔اور پھر شب دید عینکوں کی موجودی میں کسی بھی شخص کو دیکھ لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔اس ضمن میں تھرمل امیجنگ سائیٹ بہت کار آمد ہے جو حرارت کے اصول پر کام کرتی ہے۔یہ نہ صرف اندھیرے میں دیکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ دوربین کی طرح اس سے لمبے فاصلے تک بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر خطرہ مجھے پوسٹ پر موجود کتوں سے تھا۔ان علاقوں میں ہر پوسٹ پر کتے موجود ہوتے ہیں، خال ہی کوئی پوسٹ کتوں سے تہی دامن ہوتی ہے۔اور یہ کتے رکھوالی کا بہت عمدہ، اعلا، سستا اور کار آمد ذریعہ ہیں۔ساری رات نہیں سوتے اور پوسٹ کی حدود میں کسی بھی جنگلی جانور کی آمد پر یا کسی غیر متعلق آدمی کی آمد پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔اور کتوں کے بھونکنے پر سنتری فی الفور شب دید عینک کی مدد سے علاقے کا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔یہ کتے بعض اوقات کافی دور کی حرکت بھی دیکھ لیتے ہیں اور بھونکتے ہوئے اسی سمت دوڑ پڑتے ہیں۔انسان کتنا ہی چاق و چوبند اور ہوشیار کیوں نہ ہو، مسلسل ایک ہی کام کر کے سست پڑ ہی جاتا ہے اور کتوں کا تسلسل سے بھونکنا اسے ہوشیار کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

انھی کتوں کے خوف سے میں فارورڈ آبزرونگ پوسٹ سے مخالف جانب بالکل نالے کی جڑ میں، جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا گزرنے لگا۔دن کو اپنی پوسٹ سے میں اس علاقے کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔اس فارورڈ پوسٹ سے کلومیٹر بھر آگے مجھے چند گھر بھی نظر آئے تھے۔وہ سول لوگ تھے اور اس علاقے میں زیادہ تر مسلمان ہی آباد تھے لیکن ان میں جاسوسوں کی موجودی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، بلکہ کئی بار پاک آرمی مقامی لوگوں کی صورت دھارے انڈین جاسوسوں کو گرفتار کر بھی چکی تھی۔ان میں کچھ تو انڈین آرمی کے تربیت یافتہ جاسوس تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو روپے پیسے کی لالچ میں آکر اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے تھے۔انھی میں جاسوسوں کی ایک قسم

وہ بھی ہے جو دونوں جانب کی آرمی سے ملے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ پاک آرمی کی کارروائیوں اور حرکت کی خبریں انڈین آرمی تک پہنچا دیتے ہیں اور انڈین آرمی کی باتیں پاک آرمی تک لے آتے ہیں۔کچھ مقامی اور بے بس لوگوں کو بھی انڈین آرمی بلیک میل کر کے اپنا جاسوس بنا لیتی ہے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں جان، مال اور عزت و آبرو کے نقصان کی دھمکی دی جاتی ہے۔مختصراً یہ کہ وہاں کسی مقامی آدمی پر اعتبار کرنا نہایت مشکل ہے۔سرحد عبور کرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ جوں کا توں ہی باقی رہتا ہے۔کسی بھی شخص پر اعتبار کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بارے سرحد عبور کرنے والے کسی بھی جاسوس اور میری طرح کسی ہدف کی تلاش میں آئے ہوئے شخص کو پہلے ہی سے مطلع کر دیا جائے، کہ فلاں شخص سے رابطہ کر کے مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ورنہ اس کے علاوہ کسی پر بھی اعتبار کرنے کی صورت میں پکڑے جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

مجھے بھی چند مخصوص نام اور ان سے ملنے کے لیے شناختی الفاظ وغیرہ بتا دیے گئے تھے۔جس آدمی سے میں نے ڈریگنو ورائفل لینا تھی وہ ہندو کا نام اور شناخت دھارے ایک مسلم تھا۔اس کا نام آدیت ورما تھا۔اس نے شادی بھی ایک ہندو لڑکی سے کی ہوئی تھی۔نا معلوم وہ کب سے وہاں موجود تھا۔پاکستان سے جانے والے خاص الخاص افراد ہی کو اس کے بارے بتایا جاتا۔میرے مقصد کو مدنظر رکھ کر مجھے بھی اسی سے ملنے کا حکم دیا گیا تھا۔

میں نالے میں آگے بڑھتا رہا۔نالے میں برف موجود نہیں تھی البتہ درمیان میں صاف و شفاف پانی ضرور بہہ رہا تھا۔پانی کی سطح تو چند انچ سے زیادہ بلند نہیں تھی البتہ چوڑائی میں نالہ سات آٹھ گز سے زیادہ وسیع تھا۔اور اس میں بکھرے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھ کر بغیر جوتے بھگوئے نالے کو عبور کرنا نہایت آسان تھا۔نالے میں موجود گھر نسبتاً بلند جگہ پر واقع تھے۔تمام گھر نالے میں قدرے دائیں جانب واقع تھے جبکہ انڈین پوسٹیں بائیں جانب واقع تھیں۔میں ان گھروں سے دو سو گز پہلے ہی وہ نالہ احتیاط سے عبور کرنے لگا۔کیونکہ نالے کے دائیں کنارے حرکت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ایسا کرنے کی صورت مجھے ان گھروں کے درمیان سے گزرنا پڑتا۔اور اس آبادی میں کتوں کی موجودی یقینی تھی۔ایک اجنبی پر وہ جس غضب ناک انداز میں بھونکتے اس کا اندازہ لگانے کے لیے عقل بینا کی ضرورت نہیں ہے۔

نالے کا پانی پتھروں سے ٹکراتے اور ہلکے پھلکے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے دھیمی دھیمی سرگوشیاں کر رہا تھا

۔ایسی سرگوشیاں گرمیوں کے موسم میں تو بہت بھلی لگتی ہیں لیکن سردیوں میں یہ خوب صورت شور کپکپی طاری کر دیتا ہے۔پتھر پانی میں مسلسل پڑے پڑے چکنے ہو گئے تھے۔ان پر پاؤں جما کر نالہ عبور کرنا تھوڑا دشوار گزار لگا کیونکہ پھسلنے کی صورت میں کپڑے گیلے ہونے کا اندیشہ تھا۔اور اس علاقے میں موسم بھی کسی کمینے دشمن سے کم نہیں ہے ۔سردی کسی کی جان لیتے وقت مذہب، ارادہ اور مقصد نہیں پوچھتی بس جو اس کی لپیٹ میں آ جائے اس کا کام نبٹا دیتی ہے۔

نالہ خیریت سے پار کر کے میں نالے کے بائیں کنارے چلنے لگا۔مجھے سب سے بڑی سہولت وہاں بکھری ہوئی جھاڑیاں دے رہی تھیں۔ان کی آڑ لے کر چلتے ہوئے میں دشمن کی نظروں سے اوجھل تھا۔آگے جا کر وہ نالہ بائیں جانب مڑ رہا تھا۔اسی جانب تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر اوڑی شہر تھا۔میری منزل انبالہ کا شہر تھا ۔کشمیر کی سرحد کے ساتھ جالندھر واقع تھا اور اس کے بعد انبالہ آتا تھا۔وہاں تک مجھے اپنی کوشش سے پہنچنا تھا۔ جالندھر اور انبالہ کے بارے اچھی خاصی معلومات یونٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ اور پھر استاد نصیر الدین کی وساطت سے مجھے مل چکی تھیں لیکن زبانی کلامی سننے اور عملی طور پر وہاں پہنچنے میں بڑا فرق ہے۔

نالہ مڑ کر دو تین سو گز آگے مگر بلندی پر انڈیا کی ایک اور پوسٹ تھی جو اسی موڑ کی حفاظت پر مامور تھی۔میں اس پوسٹ کے نیچے سے ہو کر گزرا۔وہاں بنی ہوئی پگڈنڈی اس بات کا مظہر تھی کہ وہ راستہ مسلسل استعمال میں رہتا تھا۔ایسے رستے پر چلنا اس لحاظ سے مفید رہتا ہے کہ بارودی سرنگ وغیرہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔میں بھی اسی رستے پر ہو لیا۔وہاں کافی جھاڑیاں پھیلی تھیں ۔اس پوسٹ کی حدود سے میں تھوڑا ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی آواز پڑی۔میں نے فوراً قریبی جھاڑی کی آڑ لی اور اس کے ساتھ ہی نیفے میں اڑسا ہوا پسٹل میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔جھاڑیوں کی وجہ سے دکھاؤ محدود ہو گیا تھا۔اگر میرے کانوں میں باتوں کی آواز نہ پڑتی تو یقیناً میرا ان بولنے والوں سے آمنا سامنا ہو گیا ہوتا۔منٹ بھر بعد ہی آواز واضح ہو گئی تھی۔

’’موہن!......تھوڑا آہستہ چلو یار!......تاکہ پوسٹ تک پہنچتے ہوئے ہماری ڈیوٹی کا وقت پورا ہو جائے۔‘‘

’’دو تین منٹ آرام کر لیتے ہیں۔‘‘ایک دوسری آواز سنائی دی۔

’’سجیت کو تو ہر وقت آرام کی پڑی ہوتی ہے۔‘‘ یہ آواز پہلی دونوں آوازوں سے مختلف تھی۔

’’ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ آہستہ چلنے سے بہتر ہے چند منٹ بیٹھ کر آرام کر لیا جائے۔‘‘ وہ یقیناً سجیت تھا ،جو اپنے کہے کا دفاع کر رہا تھا۔ یہ بات کرتے ہوئے وہ میرے سامنے پہنچ گئے تھے۔ میں ان کی تعداد گننے لگا ۔پانچ افراد تھے۔ پانچوں نے اپنے کندھوں سے ہتھیار لٹکائے ہوئے تھے۔ ایک نے اپنی پیٹھ پر بڑا وائرلیس سیٹ بھی باندھا ہوا تھا۔ یقیناً یہ ان پٹرولنگ پارٹی تھی۔ کشمیر کی سرحد کو دونوں ممالک پوسٹوں بنا کر محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ بڑے بڑے نالے اور پہاڑی علاقے کو زمینی سرحد کی طرح مورچے وغیرہ بنا کر اور کانٹا تار لگا کر اپنے قبضے میں کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ پھر سردیوں میں تو یوں بھی برف اتنی شدید ہوتی ہے کہ کئی کئی فٹ تک علاقے کو ڈھک دیتی ہے اور کانٹا دار تار وغیرہ برف کے اندر دب کر اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔

وہ گپ شپ کرتے میرے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ لیکن وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے کہ اچانک ایک جھاڑی سے لومڑ نکل کر بھاگا۔ جھاڑیوں کی حرکت دیکھ کر ایک آدمی چیخا۔

’’یہاں کوئی ہے۔‘‘

’’کوئی جانور ہوگا گنیش!‘‘ کسی نے بے پروا انداز میں اسے تسلی دی۔

’’ایک منٹ دیکھ تو لوں۔‘‘ گنیش پیچھے مڑا۔ اس کا رخ اس جھاڑی کی طرف تھا کہ جس کی میں نے آڑ لی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے وہ بدبخت لومڑ بھی اسی جانب کو دوڑا تھا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹنا چاہا مگر دیر ہو گئی تھی۔ مجھے پہلے ہی دو تین جھاڑیاں چھوڑ کر چھپنا چاہیے تھا لیکن جلدی میں میں جس جگہ چھپا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ میرے خیال میں تو وہ یوں بھی آگے بڑھ رہے تھے اس لیے مزید رستے سے ہٹنے ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس میں میرا قصور بھی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کوئی لومڑ آخری وقت پر ایسی حرکت کر گزرے گا۔ میں ابھی وہاں سے غائب ہونے کا کوئی طریقہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم گنیش جھاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوا چاند کی مدہم روشنی سے بڑھ کر گنیش کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طاقتور ٹارچ نے میرا بھانڈا پھوڑا تھا۔

’’کون ہو تم؟‘‘ اس کے منہ سے خوف اور غصے کی ملی جلی آواز برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے

کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتارنے کی کوشش کی۔
اسے اس کوشش میں کامیاب ہونے دینا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔میں نے بغیر دیر کیے ٹریگر دبا دیا۔میرے پاس سائیلنسر موجود تھا مگر اتنا وقت نہیں تھا کہ میں سائیلنسر پستول کی نال پر فٹ کر پاتا۔ماحول دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔دو تین گز کے فاصلے سے چلائی ہوئی گولی کے خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔گو روشن ٹارچ کی وجہ سے مجھے اس کا چہرہ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کا ہیولہ واضح تھا اور گولی چلانے کے لیے اتنا دکھاؤ کافی ہوتا ہے۔سر میں لگنے والی گولیوں نے اسے چیخنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔میں نے مسلسل دو مرتبہ ٹریگر دبایا تھا۔اس کے گرتے ہی میں نے قدم بڑھا کر اس کی کلاشن کوف اٹھالی۔اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کا رخ قدرتی طور پر اس کی طرف ہو گیا تھا۔اس نے بنڈوریل پہنا ہوا تھا جس کے سامنے مجھے دو ہینڈ گرنیڈ لٹکتے نظر آئے۔میں نے لگے ہاتھوں وہ گرنیڈ بھی اس کے بنڈوریل سے نکال کر اپنی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔یہ کرتے ہی میں جھکے جھکے پیچھے بھاگا۔
”گنیش!......گولیاں تم نے چلائی ہیں؟“ سراسیمہ لہجے میں پوچھا گیا۔گنیش غریب جواب دینے کی حالت میں ہوتا تو بتاتا۔
”گنیش!......تم جواب کیوں نہیں دے رہے؟“ اس مرتبہ ایک اور خوفزدہ آواز ابھری۔
میں اس دوران جھکے جھکے وہاں سے دور ہٹنے لگا۔
”گنیش کو گولی لگ چکی ہے۔“ کسی نے چیختے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کلاشن کوف کا فائر کھول دیا تھا۔فضا مسلسل فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔میں بغیر کسی تاخیر کے زمین پر لیٹ گیا اور اسی حالت میں ان سے دور ہٹنے لگا۔اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میری طرف سے فائر کا جواب نہ دیا گیا تو وہ میرا تعاقب کر سکتے تھے۔میں نے رک کر کلاشن کوف کا کاکنگ ہینڈل کھینچ کر چھوڑا۔انجکشن سلاٹ کے رستے گولی اڑ کر دور جا گری تھی۔یقیناً رائفل پہلے سے لوڈ تھی اور میرے کاکنگ ہینڈل کھینچنے کی وجہ سے پہلے سے لوڈ شدہ گولی باہر نکل گئی تھی لیکن وہ وقت ایسی باتوں پر غور کرنے کا نہیں تھا۔میں نے سیفٹی لیور کو سنگل راؤنڈ فائر کرنے کی حالت پر لگایا اور دو تین فائر داغ دیے۔اس کے ساتھ ہی میں زوردار آواز میں بولا۔

”عبداللہ!......فائرمت کروانھیں زندہ پکڑنا ہے۔اسامہ!......تم وقاص کے ساتھ دائیں طرف سے جاؤ۔حمزہ تمھارے ساتھ ہوگا اور ہارون تم ابوہریرہ اور خالد کے ساتھ بائیں طرف سے آگے بڑھو۔“اتنا کہہ کر میں نے بھاری آواز بنا کر کہا۔”جی کمانڈر!“

اور خود پیچھے مڑ کر جھکے جھکے انداز میں بھاگنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کسی کا گھبرائی ہوئی آواز میں ”بھاگو۔“ کہنا پڑ چکا تھا۔بھاگتے ہوئے انھوں نے چند گولیاں فائر کی تھیں مگر وہ ان کی اضطراری حرکت تھی،تمام گولیاں بغیر نشانہ سادھے اور کسی ہدف کو تاکے بغیر چلائی گئی تھیں۔ہندوا تنا بہادر نہیں ہے کہ رک کر مجاہدین کا مقابلہ کرسکتا۔میں نے بھی جلدی میں ہونے کے باوجود ایسے نام لیے تھے جن سے عموماً مجاہدین ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں۔اور یہ سب سنتے ہی انھوں نے تحقیق کرنے یا کچھ سوچنے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔لیکن ان چار بندوں کے بھاگنے سے خطرہ نہیں ٹلا تھا۔میں انڈیا کی حدود میں داخل ہوگیا تھا۔اور مجھے یقین تھا کہ انھوں نے بڑے پیمانے پر فرضی مجاہدین کی تلاش کا کام شروع کر دینا ہے۔

خیر وہ بعد کی بات ہے۔میں نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی۔فی الحال وہاں سے غائب ہونا ضروری تھا۔میں تمام احتیاط بلائے طاق رکھ کر سرپٹ دوڑنے لگا۔اس علاقے میں موجود نالے بتدریج گہرائی میں اترتے جاتے ہیں۔ہلکی ہلکی ڈھلان میں مجھے بھاگنے میں اگر کوئی دقت تھی تو بکھرے ہوئے پتھروں کی وجہ سے تھی۔بھاگتے ہوئے ہندوؤں کے اکادکا کی فائر کی آواز ابھی تک آرہی تھی۔اچانک پورا علاقہ روشنی میں نہا گیا تھا۔میں فوراً زمین پر لیٹ کر ساکن ہوگیا۔نالے پر تعینات پوسٹ سے کسی نے مارٹر گن سے روشنی کا گولہ فائر کیا تھا۔مارٹر کا روشنی کا گولہ کافی بلندی پر جا کر پھٹتا ہے۔روشنی کے گولے کے ساتھ چھوٹا سا چھتری نما کپڑا لگا ہوتا ہے اس لیے نیچے گرتے وقت گولہ دھیمی رفتار میں نیچے آتا ہے اور اس دوران اس کی روشنی سے کافی دور تک کے علاقے کی دیکھ بھال کی جاسکتی ہے۔گولے کی روشنی ختم ہوتے ہی میں ایک بار پھر بھاگ پڑا اس دوران ایک اور گولہ فائر ہوا اس وقت تک میں جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہوگیا تھا۔اس مرتبہ میں نے رکنے کی کوشش نہیں کی اور آگے بڑھتا گیا۔وہ نالہ آگے جا کر تین شاخوں میں بٹ گیا تھا۔میں نے بغیر کسی منطقی سوچ کے ایک نالے کا چناؤ

کیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ روشنی کے گولے مسلسل فائر ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان جھاڑیوں کے جھنڈ پر تواتر سے گولیاں برسائی جانے لگیں۔ وکرس گن سے فائر کیا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اور پھر وہاں دو انچ مارٹر کے گولے بھی فائر کیے جانے لگے۔ جن جھاڑیوں سے میں گزر رہا تھا وہ البتہ دو انچ مارٹر گن کی زد سے باہر تھیں۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق انڈین آرمی کے پاس موجود دو انچ قطر کی مارٹر کا زیادہ سے زیادہ رینج بہ مشکل ساڑھے سو میٹر تھا۔ اس کے ساتھ ان کے پاس ساٹھ ایم ایم مارٹرز بھی موجود ہیں جن کا رینج بارہ سو پچاس میٹر ہے۔ ان دونوں مارٹرز کے مار کے علاقے سے تو میں نکل آیا تھا لیکن اکیاسی ایم ایم مارٹر کہ جس کا رینج پانچ کلو میٹر تھا اس کی رینج میں میں اب بھی آ رہا تھا۔ لیکن اتنی عقل تو بہ ہر حال ان میں بھی موجود تھی کہ کہ اکیاسی ایم ایم مارٹر کے گولے وہ اپنے علاقے میں فائر نہیں کر سکتے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے خود ان کی کوئی اپنی پوسٹ بھی فائر کی زد میں آسکتی تھی۔ (قارئین کی معلومات کے لیے بتا تا چلوں کہ یہاں میں نے انڈین مارٹروں کی رینج وغیرہ لکھی ہے۔ پاکستان آرمی کے پاس موجود انھی ناموں کی مارٹروں کی رینج بالکل مختلف ہے)

میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چھوٹی مارٹروں سے اپنی پوسٹ کے قریب موجود جھاڑیوں ہی میں مارٹر اور وکرس کا فائر کرتے رہے۔ دور و نزدیک کے علاقے میں بھی روشنی کے گولے فائر ہونا شروع ہو گئے تھے ۔ یقیناً وائرلیس سیٹ سے وہ اپنی دوسری پوسٹوں تک یہ خبر پہنچا چکے تھے۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اپنی ایک پوسٹ سے فائر ہوتا دیکھ کر دوسروں نے حفظ ما تقدم کے طور پر روشنی کے گولے فائر کرنا شروع کر دیے ہوں۔

بہ ہر حال کچھ بھی تھا یہ بات یقینی تھی کہ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی شک سے مبرا تھی کہ میں اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔

میں جھاڑیوں کے جنگل سے باہر آ چکا تھا۔ اب دوڑنے کے بجائے میں نے تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پھیپھڑے منہ کے رستے باہر آ گریں گے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے میری یہ حالت ہو رہی تھی۔ میں نے لمحہ بھر ٹھہر کر اپنا سانس قابو میں کیا اور پھر چل پڑا۔ وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ جلد ہی انھوں نے علاقے کی تلاشی

کے لیے اپنی پارٹیاں نکال دینا تھیں۔اس وقت تک میں اس علاقے سے جتنا دور نکل جاتا اتنا بہتر تھا۔

اچانک مجھ سے چند سو گز آگے روشنی کا گولا فائر ہوا۔بغیر کسی شبے وہ اکیاسی ایم ایم مارٹر کا گولہ تھا کیونکہ یہ اس سے پہلے فائر ہونے والے گولوں سے حجم میں بڑا تھا اور اس کی روشنی بھی زیادہ تھی۔

میں فوراً نیچے لیٹ کر ساکن ہو گیا۔اس کی روشنی میں دور دور تک کسی بھی چیز کی حرکت کو دیکھا جا سکتا ہے۔نیچے لیٹ کر میں بھی اس گولے کی روشنی سے مستفید ہونے لگا۔حدنگاہ تک نظر آنے والے علاقے کا میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔دوسرے گولے کے فائر ہونے سے پہلے میں اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔آگے وہ نالہ مزید دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔جس سمت پوسٹ موجود تھی میں نے اسی سمت سفر جاری رکھا۔دوسرے نالے میں لازماً آگے جا کر دوسری پوسٹ موجود ہونا تھی۔اور نا معلوم وہاں سے اس کا فاصلہ کتنا تھا۔جبکہ اس پوسٹ کے علاقے کو عبور کرنے کے بعد آگے چند کلومیٹر تک میں دوسری پوسٹ کے درد سر سے بچ سکتا تھا۔پوسٹ چونکہ دو تین سو گز دور ڈھلان پر واقع تھی اس لیے میں پتھروں کی آڑ لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔پوسٹ اور میرے درمیان کسی بڑی چٹان آنے کی صورت میں میں وہ فاصلہ بھاگ کر طے کرتا۔اور اس کے برعکس ہونے کی صورت میں زمین پر لیٹ کر رینگنے لگتا۔اچانک کلاشن کوف گرجی، گولیوں کی بوچھاڑ اسی سمت آئی تھی جہاں میں موجود تھا۔بلا شک وشبہ شب دید آلات میں میری حرکت نظر آ گئی تھی۔اب اس سمت سفر جاری رکھنا بے وقوفی تھی۔میں فوراً پچیس تیس گز دور نالہ موڑ کی طرف بڑھا۔لیکن زمین سے اٹھنے کی غلطی میں نے نہیں کی تھی۔چند قدم دور پتھر کی ایک بہت بڑی چٹان موجود تھی اس کی آڑ لے کر میں اس نالے میں گھس سکتا تھا جس میں داخل ہونا میں نے پہلے نامناسب سمجھا۔چٹان کی آڑ میسر آتے ہی میں سرپٹ بھاگا۔اس وقت روشنی کا گولہ فائر ہوا۔لیکن روشنی پھیلتے تک میں دوسرے نالے میں مڑ کر اوجھل ہو گیا تھا۔اب میں نے پھر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔موڑ کے سرے کی طرف مجھے مسلسل فائر کی گونج سنائی دیتی رہی۔میں چوکنے انداز میں آگے بڑھتا رہا۔اس جگہ نظر آنے کا مطلب یہ تھا کہ میرا پچھلا سفر بے کار گزرا تھا۔دشمن میرے سفر کی سمت کو جان چکا تھا۔اس کے ساتھ میں کتنا سفر کر چکا تھا یہ بھی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ہو سکتا ہے انھیں میرے اکیلا ہونے کے بارے بھی معلوم ہو گیا ہو کیونکہ جس آخری پوسٹ کے قریب میری حرکت دیکھی گئی تھی لازماً انھیں صرف ایک آدمی ہی نظر آیا ہوگا۔گو یہ حتمی بات نہیں

تھی۔وہ یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ وہ فرضی مجاہدین مختلف سمتوں میں فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

قدموں کی رفتار سے زیادہ میری سوچیں مختلف قسم کے مفروضوں میں الجھی ہوئی تھیں۔پاؤں جلد از جلد اس جگہ سے دور ہونے میں میری مدد کر رہے تھے اور دماغ کوئی بہتر حل سوچنے میں مسلسل سرگرداں تھا۔موڑ سے تھوڑا دور آنے پر گھنی جھاڑیاں اور درخت شروع ہو گئے تھے۔درختوں کی وجہ سے چاند کی روشنی بھی کارآمد نہیں رہی تھی لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں ٹارچ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ٹارچ کی روشنی بہت دور سے نظر آ جاتی ہے اور ایسی حالت میں کہ دشمن میری موجودی سے باخبر تھا ٹارچ روشن کرنا۔''آبیل مجھے مار۔'' کی کہاوت کا عملی ثبوت دینا تھا۔

میں ٹھوکریں کھاتا جھاڑیوں سے الجھتا آگے بڑھتا رہا۔رکنے کا خطرہ میں کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا ۔مجھے علم تھا کہ صبح پہلی روشنی کے ساتھ ہی یہ سارا علاقہ انڈین آرمی نے گھیر لینا تھا۔ایسا کرنا ان کے لیے اس لیے بھی آسان تھا کہ وہاں چاروں اطراف ان کی پوسٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔اپنی پوسٹوں کی آدھی نفری ہی نیچے نالوں میں تعینات کرنے سے وہ آنے جانے کے زیادہ تر رستے بند کر سکتے تھے۔ایسا ہونے کی صورت میں میں لمبے عرصے کے لیے محبوس ہو جاتا۔میرے پاس اتنا راشن موجود نہیں تھا کہ میں زیادہ وقت کسی پوشیدہ مقام پر گزار سکتا ۔یوں بھی سردی کی وجہ سے رضائی کے بغیر رات گزارنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔اور ایسا بھی میں اپنے پاس موجود گرم کپڑوں کی بنا پر کہہ رہا ہوں ورنہ اس سردی میں رات گزارنا عزرائیلؑ سے معانقہ کرنے کے مترادف تھا۔

انھی سوچوں میں الجھا میں لمبے قدم اٹھاتا آگے روانہ تھا۔اس نالے میں نہ تو کوئی موڑ آیا تھا اور نہ کہیں نالے کی ذیلی شاخ نظر آئی تھی۔دونوں اطراف کی چڑھائیاں بھی کافی دشوار گزار تھیں۔اور رات کی وجہ سے تو وہ چڑھائیاں اور بھی سخت اور دشوار گزار نظر آ رہی تھیں۔

اچانک مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ہوا کے دوش پر وائرلیس سیٹ کے سپیکر سے نکلتی آواز میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ایک دم نیچے بیٹھ کر میں نے اپنے کان آواز کی سمت لگا دیے۔

آواز اتنی واضح نہیں تھی میں ان کی بات سمجھ پاتا۔

میں بیٹھے بیٹھے ہی اس سمت کو بڑھنے لگا۔جلد ہی واضح آواز میرے کانوں میں آنے لگی تھی۔یقیناً وائرلیس سیٹ والے نے آواز کو دھیما رکھا ہوا تھا لیکن رات کے سناٹے میں پھر بھی کافی دور تک آواز جا رہی تھی۔

''نہیں۔اور بندوں کی ضرورت نہیں ہے۔اتنے ہی کافی ہیں،اوور۔'' میری سماعتوں میں پہلا مکمل فقرہ پڑا تھا۔

''ٹھیک ہے سر!......ہم تیار بیٹھے ہیں،اوور۔'' وہاں موجود آدمی نے نسبتاً دھیمے لہجے میں جوب دیا تھا۔(وائرلیس سیٹ کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ اس پر بات چیت کرتے وقت اونچی آواز سے بات کرنا پڑتی ہے۔اس طرح دوسری طرف سے آنے والی آواز بھی اچھی خاصی بلند ہوتی ہے۔اور آواز کے کم ترین درجے میں بھی،موبائل فون کے سپیکر آن ہونے جتنی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔لیکن اس وقت وائرلیس سیٹ کی وہ خامی میرے لیے رحمت کا باعث بنی تھی۔شہری علاقوں میں آپریشن وغیرہ کرنے کے لیے اب وائرلیس کے ساتھ ایئر فون کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس وجہ سے دوسری طرف سے آنے والی آواز کو فقط استعمال کرنے والا ہی سن سکتا ہے)

''اور ضروری نہیں کہ ایک بندہ ہو۔ایک بندہ تو ہمیں نظر آیا ہے۔ہوسکتا ہے زیادہ افراد ہوں۔ہم پیچھے سے آرہے ہیں۔تم نے آگے گزرنے نہیں دینا۔اور جنگل سے باہر گھات لگانی ہے۔دوسری صورت میں وہ درختوں کی آڑ وغیرہ لے کر نکل بھی سکتے ہیں،اوور۔'' دوسری جانب دی جانے والی تمام ہدایات مجھے بغیر کسی دشواری کے سنائی دے گئی تھیں۔

''ہم جنگل کے سرے ہی پر موجود ہیں سر!......اوور۔''

''ٹھیک ہے وہیں انتظار کرو آگے نہیں آنا۔اور اپنے آدمیوں کو آڑ میں رکھنا ہے یہ نہ ہو ہماری طرف سے چلائی گئی گولیوں کا نشانہ اپنے آدمی بن جائیں اوور۔''

''ہم مختلف پتھروں اور چٹانوں کی آڑ میں ہیں سر!اوور۔''

''کیپ لسننگ،اوور اینڈ آل۔'' دوسری جانب کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔

میں چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔''آگے دریا،پیچھے کھائی۔''والی مثال اس وقت سو فیصد مجھ پر منطبق ہو

رہی تھی۔میرے تعاقب میں آنے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ ہی ہونا تھی۔اسی طرح سامنے بھی اتنے آدمی تو لازمی طور پر موجود ہونا تھے۔ایسی صورت میں میرا بچ جانا ایک کرامت ہی ہوتی۔

لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔میں نے فیصلہ کرنے میں چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔حتمی فیصلے پر پہنچتے ہی میرے قدم چڑھائی کی طرف اٹھنے لگے۔چڑھائی کا سفر یوں بھی بہت مشکل ہوتا ہے اور وہ چڑھائی تو بہت دشوار گزار تھی۔وہ پہاڑی عبور کر کے اگر میں دوسری جانب اتر جاتا تو کسی محفوظ مقام تک پہنچ سکتا تھا۔درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ نے زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔درختوں کی آڑ سے نکلتے ہی چڑھائی مزید سخت ہوگئی تھی۔پہلے تو میں اوپر چڑھنے کے لیے جھاڑیوں وغیرہ کی مدد لے رہا تھا،لیکن اب ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی جس کا سہارا لے کر میں اوپر چڑھتا۔کلاشن کوف کی سلنگ میں نے سر سے گزار کر کلاشن کوف پیٹھ پیچھے لٹکا لی تھی۔پہاڑی علاقہ عبور کرنے تک میں اس کلاشن کوف کو پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔ہاتھوں کی مدد سے پتھر کے باہر کو نکلے ہوئے نوکیلے سرے پکڑ کر میں نے آہستہ آہستہ اوپر کھسکنا شروع کر دیا۔اگر میرا ہاتھ پھسل جاتا تو میرا بچنا محال تھا۔میں درختوں کی آڑ سے نکل کر چند گز ہی اوپر چڑھا ہوں گا کہ میری سماعتوں میں کلاشن کوف کے برسٹ کی آواز گونجی۔

”چل بھئی شانی!......تمھارا وقت تو پورا ہوا۔“میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

اسی وقت دو تین اور برسٹ چلائے گئے۔لیکن کوئی بھی گولی مجھے نہیں چھو سکی تھی۔میں نے نیچے کی طرف نظر دوڑائی۔اسی وقت ایک اور کلاشن کوف گرجی۔آواز کی سمت کا اندازہ کرتے ہی میرا رکا ہوا سانس اطمینان بھرے انداز میں خارج ہوا۔میری تلاش میں سرگرداں دشمن گھنی جھاڑیوں اور شک والی جگہ پر اپنا ایمونیشن پھونک رہا تھا

میں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کر دیا۔دشوار گزار چٹان پر چڑھ کر آگے پچاس ساٹھ قدموں کا سفر پہلی چٹان کی نسبت آسان تھا۔وہاں برف بھی بکھری پڑی تھی۔میں آگے کو جھک کر بلندی سر کرنے لگا۔فائر کی آواز آنا بند ہوگئی تھی۔میرے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔کیونکہ کہ مجھے جنگل میں نہ پا کر ان کا خیال دائیں یا بائیں موجد بلندی کی طرف جا سکتا تھا۔گو چڑھائی بہت دشوار گزار تھی۔لیکن جہاں تک درختوں کی حدود موجود تھی وہاں تک مجھے ڈھونڈنے کے لیے وہ آسکتے تھے۔

جلد ہی میرے اندیشوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔اس مرتبہ پہاڑی کے قریباً درمیان میں کلاشن کوف کا برسٹ چلایا گیا تھا۔اس وقت تک میں نے آسان راستہ طے کر لیا تھا۔آگے پھر کھڑی چٹان تھی۔اس چٹان کی جڑ میں میں آگے بڑھنے لگا تاکہ کہیں بھی ایسی جگہ نظر آئے جہاں سے اوپر جانا ممکن ہو سکے تو کوشش کروں۔مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔گو وہ جگہ بھی ایسی تھی کہ عام حالات میں اس پر پاؤں دھرنے کی جرّات میں خود بھی نہ کرتا۔لیکن اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی اور جب معاملہ آر پار والا ہو تو بڑے بڑے خطرے مول لے لیے جاتے ہیں۔

جیب سے مضبوط اور تیز دھار خنجر نکال کر میں نے منہ میں پکڑ لیا تھا۔کیونکہ بعض جگہوں پر ہاتھ پکڑنے کے لیے کوئی نوکیلی جگہ یا دراڑ نہ ملتی تو میں اس خنجر کو کسی تنگ درز میں گھسا کر ہلکا سا آسرا حاصل کرتا۔سات آٹھ گز کی اس چٹان کو سر کرتے مجھے دانتوں پسینا آ گیا تھا۔اپنی پکڑ مضبوط رکھنے کے لیے میں نے دستانے اتار کر جیب میں ڈال لیے تھے۔اور اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ میرے جسم کا حصہ نہ ہوں۔سرد چٹان کے مسلسل لمس نے میرے ہاتھوں میں اینٹھن شروع کر دی تھی۔چٹان پر چڑھتے ہی میں نے ہاتھوں کو آپس میں زور زور سے رگڑنے لگا۔منٹ بھر یہ وظیفہ جاری رکھنے کے بعد میں نے جیب میں رکھے گرم دستانے نکال کر پہن لیے۔اس کے بعد پہاڑی کی چوٹی تک کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی کہ مجھے دستانے اتارنے کی ضرورت پڑتی ۔تیس پینتیس قدموں کا سفر طے کر کے میں اوپر پہنچا۔تلاش کرنے والی پارٹیاں پہاڑ کی اس بلندی تک پہنچ گئی تھیں جہاں درختوں کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔اس کا اندازہ مجھے ان کے کسی جھاڑی پر فائر کرنے سے ہوا۔وہاں پر میں ان پارٹیوں کی کارروائی سے بالکل محفوظ تھا۔کیونکہ جس چٹان کو سر کر کے میں اوپر چڑھا تھا۔اسے عام حالات میں سر کرنے کے لیے کوہ پیمائی کے سامان کا ہونا ضروری تھا۔میں نے بھی بس جان کا خطرہ مول لیتے ہوئے اسے عبور کرنے کی کوشش کی تھی۔کہ اس کو عبور نہ کرنے کی صورت میں بھی میرے لیے موت ہی تھی۔اور کوشش کر کے مرنا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کہیں بہتر ہے۔اس طرح کم از کم دل میں کوئی حسرت تو باقی نہیں ہوتی۔سکائی لائن سے نیچے ہو کر میں پہاڑ کی بلندی ہی پر آگے بڑھ گیا۔(کچھ قارئین کی سمجھ میں شاید سکائی لائن کی بات نہ پڑی ہو۔ان کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ کسی ایسی جگہ پر حرکت کرنا جہاں آدمی کے

پس منظر میں کوئی چیز موجود نہ ہوایسی صورت میں اس آدمی کی حرکت دور سے بھی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے)

میری حرکت کنسر ٹینا وائر (لچھے دار کانٹا دار تار) کو دیکھ کر رکی ۔تار کی موجود یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہاں سے سودوسوگز کے فاصلے پر انڈیا کی کوئی پوسٹ موجود تھی ۔حالات جس قسم کے بن چکے تھے ان میں پوسٹ کے لوگوں کو غافل سمجھنا ایک حماقت ہی تھی ۔کنسر ٹینا وائر آدھے سے زیادہ برف میں چھپی ہوئی تھی ۔اور اسے عبور کرنا چنداں دشوار نہیں تھا۔لیکن میں پوسٹ کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔میں دائیں جانب سے اس پہاڑی پر چڑھا تھا۔کنسر ٹینا وائر کے ساتھ ساتھ ہی میں بائیں جانب نیچے اترنے لگا۔بارودی سرنگی قطعے کو عموماً بار برڈ وائر (سیدھی کانٹا دار) لگا کر ظاہر کیا جاتا ہے۔گو ہندو جس گھٹیا ذہنیت کا مالک ہے اس سے یہ بعید ہے کہ وہ جینوا معاہدے کے مطابق بارودی سرنگی قطعے کی نشان دہی بار برڈ وائر سے کرے ۔لیکن یہ ان کی فارورڈ پوسٹ نہیں تھی ۔یہاں دشمن کے لیے نہیں تو اپنے آدمیوں کی نشان دہی کے لیے اسے بارودی سرنگی قطعے کی نشان دہی کرنا ضروری تھا۔اس کے علاوہ کئی کئی فٹ پڑی برف بھی عارضی طور پر بارودی سرنگوں کو ناکارہ کر دیتی ہے ۔کیونکہ برف کی موٹی تہہ کی وجہ سے بارودی سرنگ پر مطلوبہ دباؤ نہیں پڑتا اور دباؤ نہ پڑنے کی صورت میں بارودی سرنگ نہیں پھٹتی ۔

میں تار سے باہر رہ کر نیچے اترنے لگا۔دوسری جانب بھی اترائی کافی دشوار تھی لیکن اتنی نہیں کہ میری حرکت رک سکتی ۔تھوڑا سا نیچے ہوتے ہی اکادکا درخت اور جھاڑیاں شروع ہو گئی تھیں ۔میں نے مکمل نالے میں اترے بغیر پہاڑی کے درمیان میں رہتے ہوئے آگے کا سفر شروع کر دیا۔گھڑی پر نگاہ دوڑانے پر مجھے صبح کے تین بجتے نظر آئے ۔میں نے دس بجے اپنا سفر شروع کیا تھا۔گویا مجھے مسلسل حرکت کرتے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے ۔روشنی پھیلنے میں دو اڑھائی گھنٹے رہ گئے تھے اور اس مختصر وقت میں مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا ضروری تھا۔اچانک میرے کانوں میں شدید فائرنگ کی آواز آئی ۔تین چار کلاشن کوفیں اکٹھی ہی گرج رہی تھیں ۔شاید کسی جنگلی جانور کی کم بختی آئی تھی ۔فائر کا دورانیہ کچھ زیادہ نہیں رہا تھا۔جلد ہی فائر رک گیا تھا۔گویا میرا اندازہ صحیح تھا کہ کسی گیدڑ یا لومڑ وغیرہ کی حرکت کے باعث جھاڑیاں ہلی تھیں اور بہادر بنیے نے فائر کھولنے میں دیر نہیں لگائی تھی ۔

میں نے حفظ ما تقدم کے طور پر پسٹل کی نال پر سائیلنسر بھی چڑھا دیا تھا۔تھوڑا آگے بڑھتے ہی مجھے بائیں

طرف کافی دور روشنی کے دو تین گولے بلند ہوتے دکھائی دیے۔لیکن وہ وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔

تھوڑی سی دبی ہوئی جگہ آئی۔گویا کہ کوئی چھوٹا سا نالہ ہو۔مجھے اچھی خاصی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس دبی جگہ میں چشمے کی موجودی یقینی تھی۔اور بدقسمتی یہ تھی کہ برف نے چشمے کو اپنے نیچے دبایا ہوا تھا۔نالے میں اتر کر مجھے پانی ضرور مل جاتا،لیکن صرف پانی کے حصول کے لیے نالے میں اترنا مجھے کب گوارا ہو سکتا تھا۔ایک اچھے سنائپر میں اس سے کئی گنا زیادہ پیاس بھی برداشت کرنے کا حوصلہ موجود ہوتا ہے۔میں ایک اچھا سنائپر ہوں یا نہیں اس بارے تو میں کچھ نہیں کہتا البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھ میں بھوک پیاس کو برداشت کرنے کا مادہ وافر مقدار میں موجود ہے۔

میں اسی سیدھائی میں چلتا رہا۔روشنی ہونے کے خوف نے مجھے رفتار بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری بدقسمتی کہ درختوں کی حد اچانک ختم ہوئی۔اس کے بعد درختوں کے کٹے ہوئے تنوں نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔وہاں سے درخت اور جھاڑیاں کاٹنے کا مقصد یہی تھا کہ قریب کوئی پوسٹ موجود تھی۔اس علاقے میں درختوں کی کٹائی تین مقصد سے کی جاتی ہے۔مورچوں اور رہائشی بنکرز کی تعمیر کے لیے۔جلانے کے لیے اور فیلڈ آف صاف کرنے کے لیے۔اور وہاں مجھے موخّر الذکر بات صحیح لگی کیونکہ درخت بہت زیادہ تعداد کاٹے گئے تھے اور زیادہ تر درختوں کے خشک تنے وہیں موجود تھے۔

درختوں کی آڑ سے باہر آنے کے بجائے میں نیچے نالے میں اترنے لگا۔تھوڑا سا اترتے ہی مجھے اپنے سفر کرنے کی سمت ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔وہاں ایک اور پوسٹ موجود تھی۔میں درختوں کی آڑ لے کر نیچے اترتا رہا۔نیچے اترتے ہوئے میری کوشش تھی کہ جھاڑیوں اور پتھروں وغیرہ کا شور نہ ہو۔زیادہ تر پتھر تو برف میں دب گئے تھے لیکن جس جس جگہ برف ہٹ گئی تھی وہاں بہ ہر حال یہ خطرہ موجود تھا۔اور کھڑی ڈھلان میں یوں بھی برف جلد ختم ہو جاتی ہے۔میں پندرہ بیس منٹ میں نیچے پہنچ گیا تھا۔یہ نالا دوسرے نالوں کی نسبت تنگ تھا۔پانی کے ہلکے شور نے مجھے پیاس کا احساس دلایا اور میں دستانے اتار کر اوک سے پانی پینے لگا۔پانی کافی ٹھنڈا تھا۔اس علاقے میں ایسے کافی چشمے مل جاتے ہیں جن کا پانی بہت گرم ہوتا ہے۔لیکن وہ نالے کا پانی تھا اس میں مختلف چشموں کے پانی کے ساتھ پگھلی ہوئی برف کا پانی بھی شامل تھا۔

پانی پی کر میں نے جھولے سے پلاسٹک کی واٹر بوتل نکال کر بھری اور نالے کی جڑ میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔پانچ چھ سو گز کا علاقہ میرے لیے بہت خطرناک تھا۔کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے اس پوسٹ کا علاقہ عبور کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔روشنی ہوتے ہی دوسری طرف کے نالے میں موجود،میری تلاش میں سرگرداں افراد کو میرے فرار کی سمت معلوم ہو سکتی تھی۔پچاس ساٹھ گز کا علاقہ ایسا تھا جہاں میں پیدل چل کر آیا تھا۔گو وہاں برف قدرے سخت تھی اور میرے پاؤں اس میں دھنسے نہیں تھے۔لیکن قریب سے دیکھنے پر ایسے نشان ضرور نظر آ جاتے جس سے انھیں معلوم ہو جاتا کہ میں اس رستے سے بھاگا ہوں۔

وہ پوسٹ نالے سے پچاس ساٹھ گز ہی اوپر بنائی گئی تھی۔چاند پہاڑ کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔رات کے اندھیرے کے ساتھ درختوں کے گھنے پتے اور نالے کے تنگ ہونے کی وجہ سے دائیں بائیں موجود پہاڑ کی ڈھلانیں اندھیرے میں اضافہ کر رہی تھیں۔میں کافی دیر سے اندھیرے میں چل رہا تھا لیکن اس کے باوجود بہ مشکل دو تین گز کے فاصلے پر موجود بڑی چٹان یا درختوں کے تنوں کا ہیولہ وغیرہ ہی دیکھ پا رہا تھا۔سنتری بھی مجھے ٹارچ جلا کر یا شبِ دید عینک ہی کی مدد سے دیکھ سکتا تھا دوسری صورت میں مجھے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

اسی طرح احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے مجھے پوسٹ کی ہلکی سی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔بیس قدم مزید لے کر میں نے پوسٹ کے متوازی آ جانا تھا۔اور پھر اس سے آگے میں تیزی سے سفر کر سکتا تھا۔میں مزید نالے کی جڑ میں ہو کر آگے بڑھا۔اچانک میرا پاؤں کسی چیز میں الجھا۔میں کسی جھاڑی کی ٹہنی سمجھتے ہوئے پاؤں کو جھٹکا دیا۔میرا پاؤں آزاد ہوا اور اگلے ہی لمحے پورا ماحول روشنی سے نہا گیا تھا ۔میں بغیر کسی تاخیر کے نالے کی جڑ میں لیٹ گیا۔میں دشمن کے جال میں پھنس چکا تھا۔نالے کی تنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے وہاں ٹرپ فلیئر لگا دی تھی۔یہ ایک باریک سی تار ہوتی ہے جو کسی بھی رستے پر یوں لگائی جاتی ہے کہ آتے ہوئے دشمن کا پاؤں الجھنے پر تار کٹ جائے۔تار کٹتے ہی ٹرپ فلیئر ایک لمحے میں جل جاتا ہے اور سارا ماحول روشنی سے نہا جاتا ہے۔ٹرپ فلیئر استعمال کرنے والوں نے ایسی جگہ پر پہلے سے اپنے خود کار ہتھیار فکس کیے ہوتے ہیں۔ٹرپ فلیئر کے جلتے ہی ہتھیاروں کے قریب موجود سنتری فائر کھول دیتا ہے۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ٹرپ فلیئر کے جلتے ہی ورکرس گن کا فائر مسلسل وہاں آنے لگا اس کے ساتھ ہی

انھوں نے نعرے لگاتے ہوئے کلاشن کوفوں کے دہانے بھی کھول دیے تھے۔مجھ پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی ۔میں اسی طرح جڑ ہی میں لیٹا رہ گیا تھا۔اگر میں اپنا سر ذرا سا بھی اوپر اٹھاتا ۔گولی مجھے لگ جاتی ۔ایک بنیادی غلطی ان سے یہ ہوئی تھی کہ انھوں نے نالے کے دوسرے کنارے پر اپنے آدمی نہیں بٹھائے تھے۔اگر وہ ایسا کر لیتے تو یقیناً آج میں یہ کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ بچا ہوتا۔

ٹرپ فلیئر کی روشنی لمحاتی ہوتی ہے۔روشنی ختم ہوتے ہی دوبارہ اندھیرا چھا گیا تھا۔اوراس مرتبہ اندھیرا کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا کہ روشنی ہونے کے بعد اندھیرا زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

''مر گیا ہے کہ زندہ ہے؟''اندھیرا ہوتے ہی کسی کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔

''ایلمونیٹنگ راؤنڈ فائر کرو۔''(روشنی کا گولہ) کسی دوسرے نے مشورہ دیا تھا۔

ان باتوں کے دوران ایک لمحے کے لیے فائر رکا اور میں نے وہ جگہ چھوڑنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگایا تھا ۔میں چند قدم ہی لے سکا تھا کہ اچانک ۔''ٹھک۔'' کی آواز آئی۔میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔انھوں نے مارٹر کا روشنی والا گولہ فائر کیا تھا۔مارٹر کا گولہ ایک دم نہیں پھٹتا۔اسے مکمل بلندی تک جاتے ہوئے دو تین سیکنڈ لگتے ہیں۔اس لیے''ٹھک۔'' کی آواز سننے کے بعد بھی میں نے چار پانچ قدم مزید بھی لے لیے تھے ۔روشنی کے پھیلنے سے پہلے میں پوسٹ کے بالکل متوازی پہنچ گیا تھا۔اس مرتبہ مجھے جو جگہ ملی تھی وہاں میں بیٹھ کر جوابی فائر بھی کر سکتا تھا۔نالے کی بالکل جڑ میں سمٹ کر میں نے کلاشن کوف گلے سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی ۔کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی صرف سیفٹی لگی ہوئی تھی ۔سیفٹی لیور سنگل راؤند کی پوزیشن پر کر کے میں نے سر ابھار کر پوسٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

''کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔شاید وہ بھاگ گیا ہے۔''ایک آدمی نے مورچے سے آگے بڑھ کر مجھے اس جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جہاں میں اس سے پہلے پڑا تھا۔اس وقت وہ میرے لیے ایک آسان ہدف کی صورت سامنے کھڑا تھا۔اور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر اس کا بچ کر واپس لوٹ جانا میرے لیے گالی سے کم نہیں تھا۔

پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک سنائپر کو نشانہ سادھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔کلاشن کوف کو سیدھا کرتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا تھا۔

دھماکے کی آواز کے ساتھ اس کی چیخ بھی شامل تھی۔گولی اسے چھاتی میں لگی تھی۔درد بھری آواز نکالتے ہوئے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔

''مورچے میں ہو جاؤ......مورچے میں ہو جاؤ۔'' کسی نے چیخ کر کہا۔اس کے ساتھ ہی وکرس گن گرجی مگر نشانہ میں نہیں تھا۔جس کسی نے بھی فائر کیا تھا وہ عجلت میں گن کو میری سمت موڑ بھی نہیں سکا تھا۔اس کے ساتھ ہی روشنی کا گولہ زمین پر گر چکا تھا۔

میں نے جیب سے ہینڈ گرنیڈ نکال کر اوپر کی طرف اچھالا۔مجھے معلوم تھا کہ اس گرنیڈ کے پھٹنے سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے والا لیکن اس کے ڈر سے وہ میرا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔

زوردار دھماکے کے ساتھ کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔''اس کے پاس ہنڈ گرنیڈ ہیں نیچے ہو جاؤ۔''

میں نے ان کی سمت مزید دو تین سنگل راونڈ فائر کیے اور جھکے جھکے انداز میں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔

''سیکٹر نمبر ٹو کو کال کر کے مدد مانگو۔'' کسی نے چیختے ہوئے حکم دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مسلسل گولیاں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔وہ مورچے میں چھپ کر مسلسل نالے میں فائر کر رہے تھے۔میرے پاس نہ تو اتنا ایمونیشن اور نہ اتنا وقت ہی کہ وہاں رک کر ان کا مقابلہ کرتا۔وہ اکیلی پوسٹ نہیں تھی۔انھیں وہ جگہ گھیرنے میں تھوڑی دیر ہی لگنا تھی۔اور میں خودکش حملہ آور بھی نہیں تھا کہ مجھے ان کی کمک کی پروا نہ ہوتی۔

پوسٹ سے تھوڑا دور آتے ہی میں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔لیکن اس بھاگنے والے فیصلے پر میں زیادہ دیر عمل درآمد نہیں کر سکا تھا۔درمیانی جسامت کے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر میں گھٹنوں کے بل گرا۔گھٹنوں کو اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔ایک دو منٹ گھٹنوں کو زور زور سے ملنے کے بعد میں کھڑا ہوا اور لمبے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔فائرنگ کی تیز آواز اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

ایک اور روشنی کا گولہ فضا میں بلند ہوا۔اس کی روشنی میں مجھے اس نالے کی ایک شاخ داہنی جانب مڑتی نظر آئی جبکہ دوسری شاخ سیدھا آگے جا رہی تھی۔میں نے مڑنے کے بجائے سیدھا آگے نکلنے کو ترجیح دی تھی۔سیدھا جانے والا نالہ آگے جا کر چوڑا ہونا شروع ہو گیا تھا۔اس کے ساتھ وہاں کافی جھاڑیاں بھی بکھری تھیں

۔مجھے روشنی کے چند اور گولے فضا میں بلند ہوتے نظر آئے۔لیکن نالے میں موجود جھاڑیوں کی وجہ سے میں نے رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔نالہ آہستہ آہستہ ہموار ہونا شروع ہو گیا تھا۔اور پہلے جو مسلسل اترائی شروع تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔ہموار جگہ پر میں نے اپنی رفتار تھوڑی اور بڑھا لی تھی۔میں آخری مڈبھیڑ ہونے والی پوسٹ سے کلومیٹر ڈیڑھ کلومیٹر دور آیا ہوں گا کہ اچانک مجھے سامنے سے ٹارچوں کی روشنی نظر آئی۔وہ سو ڈیڑھ سو گز دور ہوں گے۔ان کے آنے کے انداز سے محسوس یہی ہو رہا تھا کہ انھیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔موخّر الذکر پوسٹ کی جانب سے بھی اب تک اکا دکا فائر کی آواز آ رہی تھی۔ان کے قریب پہنچنے سے پہلے میں نالے ایک کنارے ہو گیا تھا۔جھاڑی میں چھپنے کے بجائے میں نے ایک بڑے پتھر کی آڑ لینا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔کیونکہ کسی بھی شک کی بنا پر ان کے فائر کھولنے کی صورت میں جھاڑی مجھے فائر سے حفاظت مہیا نہیں کر سکتی تھی۔اس کے برعکس پتھر مجھے نظری آڑ کے ساتھ فائری آڑ بھی مہیا کر رہا تھا۔

وہ دس بارہ آدمی تھے۔ایک دوسرے کو جلدی چلنے کی تلقین کرتے ہوئے وہ اطراف کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے آگے نکلتے چلے گئے۔وہ اس پوسٹ کی مدد کو جا رہے تھے۔یقیناً ان کے تیئں مجاہدین نے ان کی پوسٹ پر حملہ کیا تھا۔شروع میں میری جن آدمیوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی تھی۔اور انھیں میں نے جس غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا ،اب تک وہ غلط بیانی مجھے فائدہ دے رہی تھی۔

اس پارٹی کے بیس پچیس قدم دور جاتے ہی میں پتھر کی آڑ سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔اتنا اندازہ تو بہرحال مجھے تھا کہ ان کی پوسٹ قریب ہی تھی۔لیکن اس نالے میں ان کے گزر جانے کی وجہ سے اب اس نالے پر کسی شک کم ہی گزرتا۔

مزید ادھ کلومیٹر آگے جانے پر مجھے نالے کے بائیں طرف اونچائی پر روشنی کی جھلک نظر آنے لگی۔میں رکنے کے بجائے اسی طرح آگے بڑھتا گیا۔پوسٹ نالے سے کافی بلند تھی۔میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر آگے نکلتا چلا گیا۔پوسٹ سے پچاس ساٹھ گز آگے آتے ہی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔میں نے دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا۔روشنی میں اضافے کے ساتھ میری رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔میری نظریں گاہے گاہے اردگرد کی پہاڑیوں کا جائزہ لے کر رستے پر مرکوز ہو جاتیں۔نالے میں بکھرے ہوئے پتھر سے ٹکرا کر گرنے کا

تجربہ اگر میرے ذہن سے محو ہوا بھی تھا تو گھٹنوں کو اچھی طرح یاد تھا۔ ملگجا اجالا پھیلتے ہی میری نظر نالے کے ایک کنارے بنے ہوئے کچے رستے پر پڑی۔ رستے کے دائیں بائیں بھی گھنی جھاڑیاں موجود تھیں اس لیے مجھے اس رستے پر سفر کرنے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔

روشنی بڑھتی جا رہی تھی اور میری نظریں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ ہلکا سا نشیب آیا نالہ شمال مشرق کی جانب مڑا اور مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ آگے اچھی خاصی آبادی نظر آ رہی تھی۔ وہاں مجھے پناہ مل سکتی تھی لیکن ایسی جگہوں پر کسی اجنبی کا چھپنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں سیاح وغیرہ تو آنے سے رہے۔ لے دے کے مقامی لوگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اگر انڈین آرمی وہاں گھر گھر تلاشی لینے پر تل جاتی تو یقیناً میرے ساتھ میرے میزبان کی بھی شامت آ جاتی۔ بلکہ ممکن تھا کافی بے گناہ ان کے ظلم کی لپیٹ میں آ جاتے۔ جنوب کی سمت موجود پہاڑی پر مجھے کافی گھنا جنگل نظر آ رہا تھا۔ آبادی سے تین چار سو گز جنوب مغرب کی طرف وہ جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے اسی جنگل کا رخ کیا۔ کچی سڑک سے اتر کر میں اس ٹریک کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی تک اس چھوٹے سے گاؤں میں زندگی سوئی ہوئی تھی۔ بس اکا دکا گھروں سے اٹھتا دھواں اس بات کا مظہر تھا کہ وہ گھر غیر آباد نہیں تھے۔ چوڑا نالہ عبور کر کے میں دوسری طرف موجود جنگل میں داخل ہوا اور بلندی کا سفر طے کرنے لگا۔ میری نظریں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھیں۔ میں نے وہاں پورا دن گزارنا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسی جگہ ہوتی جو آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہوتی۔ یہ اور بات کہ سنائپر اپنی کمین گاہ چنتے وقت چھپاؤ کو آرام پر ترجیح دیتا ہے۔ جلد ہی مجھے ایسی جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آ گیا تھا ۔اپنے جھولے سے تیز دھار خنجر نکال کر میں نے وہاں موجود جھاڑیوں سے اپنے مطلب کی ٹہنیاں کاٹنا شروع کر دیں۔ گھنٹا بھر بعد ہی میرے پاس ٹہنیوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ میں ان ٹہنیوں سے اپنے لیے مچان بنانے لگا۔ گو عمومی طور پر سنائپر بلند درختوں پر مچان ناتے ہیں تا کہ دور دور تک کے علاقے پر نظر رکھی جا سکے اور فائر کرتے وقت کوئی رکاوٹ بھی نظر نہ آئے۔ لیکن وہاں میرا مقصد کسی ہدف کو نشانہ بنانا نہیں تھا کہ میں اونچا درخت چنتا ۔اس کے علاوہ یہ بھی مسئلہ تھا کہ وہاں درخت بہت اونچے ہوتے ہیں۔ چیڑ دیار کے درختوں پر تو مچان بنائی ہی نہیں جا سکتی اور جن درختوں پر مچان بنائی جا سکتی ہے وہ بھی ایسی کہ اس میں بہ مشکل بیٹھا جا سکتا ہے۔ اور میرا

ارادہ بیٹھنے کا نہیں لیٹنے کا تھا۔

مزید گھنٹا بھر کی محنت سے میں مچان بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔دھوپ اچھی طرح نکل آئی تھی۔اور مچان کے اوپر براہ راست دھوپ پڑ رہی تھی۔اپنا جھولا سر کے نیچے رکھ کر میں لیٹ گیا۔ساری رات دوڑنے بھاگنے میں گزر گئی تھی۔جس جگہ دشمن سے آخری مڈبھیڑ ہوئی تھی وہ جگہ بھی میں کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔اس سارے علاقے کی تلاشی لینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔زیادہ سے زیادہ وہ میری تلاش میں چند پارٹیاں نکال سکتے تھے۔ان پہاڑی بلندیوں کو سر کر کے اور تمام جنگلوں کو چھان کے کسی ایک یا چند آدمیوں کو ڈھونڈ نکالنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔البتہ اگر انھیں میرے چھپنے کی جگہ کے بارے معلوم ہو جاتا تو پھر میرا نکلنا محال تھا۔کیونکہ وہ اس جنگل کو گھیرے میں لے کر باریک بینی سے تلاشی کرتے اور میرا پکڑا جانا یقینی ہو جاتا۔

دھوپ کی نرم حدت نے جلد ہی مجھے نیند کی آغوش میں دھکیل دیا تھا۔میری آنکھ بکری کے منمنانے سے کھلی۔ایک سنائپر کی تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے کہ نیند سے اٹھتے ہی اس کے حواس کام کرنے لگیں۔اس لیے جاگتے ہوئے اسے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ کہاں اور کس ماحول میں پڑا ہے۔آنکھ کھلتے ہی مجھے بھی دماغ پر زور نہیں دینا پڑا تھا۔اس طرح جنگلوں اور مچانوں پر میں کئی راتیں گزار چکا تھا۔یہ ماحول اور حالات میرے لیے نئے نہیں تھے کہ مجھے گھبراہٹ ہوتی۔میں نے کروٹ بدلتے ہوئے اس سمت نگاہ دوڑائی جہاں سے آواز آئی تھی۔مجھے کافی بھیڑیں اور بکریاں دائیں بائیں جھاڑیوں پر منہ مارتی نظر آئیں۔جنگل آبادی کے قریب تھا اور وہاں کسی چرواہے کا آنا عجیب بات نہیں تھی۔البتہ یہ فکر مجھے ضرور دامن گیر ہوئی کہ کہیں اس کی میرے مچان پر نظر نہ پڑ جائے۔ایسی صورت میں میرے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ایک بے گناہ کو قتل کرنے پر میرا ضمیر کسی طور بھی آمادہ نہ ہوتا۔اور اسے زندہ چھوڑنے میں یہ قباحت تھی کہ وہ انڈین آرمی کی رہنمائی کر کے میری موت کا سامان پیدا کر سکتا تھا۔میں لیٹے لیٹے بھیڑ بکریوں کا جائزہ لیتا رہا۔دو تین بکریاں ان جھاڑیوں کے پاس بھی پہنچ چکی تھیں جہاں میں چھپا ہوا تھا۔اچانک ایک جھاڑی کی اوٹ سے گہرے سبز اور سرخ رنگ کا لباس جھلکا۔میں چونک پڑا تھا۔اگلے ہی لمحے وہ میرے سامنے تھی۔وہ ایک چرواہن تھی۔بکری کے ایک چھوٹے سے میمنے کو ہنکاتی وہ میرے مچان کی طرف ہی آ رہی تھی۔ڈوپٹے کو اس نے بڑے عجیب بلکہ خوب صورت انداز میں سر سے لپیٹا ہوا تھا۔یوں

کہ اس کے تمام بال اس میں چھپ گئے تھے۔ وہ ایک دلکش اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ کشمیر کا حسن یوں بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔ لیکن مجھ پر اس کے حسن نے ذرا سا بھی اثر نہیں ڈالا تھا۔ ماہین کی بے وفائی کے بعد، عورت ذات سے مجھے اتنی ہی نفرت تھی جتنا کسی بھی ناپسندیدہ چیز سے کی جا سکتی ہے۔ وہ نہ صرف میری امانت میں خیانت کی مرتکب ہوئی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس نے میرا مان، غرور اور بھروسا بھی توڑ دیا۔ اگر اسے طاہر سے محبت تھی تو وہ مجھ سے طلاق لے کے اس سے شادی کر سکتی تھی۔ یوں میری اور اپنی عزت کا جنازہ نکالنا اسے کسی طور زیب نہیں دیتا تھا۔ اس چرواہن کو دیکھ کر جانے کیوں میری سوچیں ماہین کی طرف پلٹ گئی تھیں۔ سر جھٹک کر میں نے ان ناپسندیدہ سوچوں کو دور کیا اور اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔

وہ ہلکی آواز میں کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ شکل کی طرح اس کی آواز بھی سریلی تھی۔ گیت کے بول تو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے البتہ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور مٹھاس متاثر کن تھے۔ وہ میرے مچان سے آگے گزرتی چلی گئی۔ مچان کی طرف اس نے کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ ان جھاڑیوں سے پندرہ بیس گز آگے ایک صاف پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گئی۔ اس چھوٹے میمنے کو پکڑ کر اس نے گود میں لٹایا اور اس کے چہرے اور جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے سامنے دیکھنے پر مجھے اس کے چہرے کی ایک طرف نظر آتی۔ جانے وہ اس میمنے سے کیا باتیں کیے جا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ تھوڑا سا آگے کو کھسک کر زمین پر لیٹ گئی میمنے کو اٹھا کر اپنی چھاتی پر لٹاتے ہوئے اس نے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میمنا یقیناً پہلے سے ان حرکتوں کا عادی تھا کہ بڑے مزے سے اپنا سر اس کی گردن پر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ میں نے اسی طرح لیٹے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک کشمیری دوشیزہ کی تنہائی میں کی جانے والی ادائیں دیکھنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ مجھے بس فکر تھی تو یہ کہ وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ اسی وجہ سے میں نے کروٹ بدلنے سے بھی احتراز برتا تھا۔ ممکن تھا کہ میرے کروٹ بدلنے سے جھاڑی کی شاخوں میں پیدا ہونے والی حرکت اسے اس جھاڑی کی طرف دیکھنے پر مائل کر دیتی۔

لیکن میری احتیاط کسی کام نہیں آ سکی تھی۔ اس کی بکری کسی چیز سے ڈر کر بھاگی۔ بکری کا رخ میرے مچان ہی کی طرف تھا۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر اس سمت کو دیکھنے لگی جہاں سے بکری بھاگ کر آئی تھی۔ یقیناً بکری نے لومڑی یا گیدڑ وغیرہ دیکھا تھا۔ میں بھی اسی جانب دیکھنے لگا۔ اور اسی لمحے میری غلط فہمی ہوا ہو گئی

۔انڈین آرمی کے دو جوانوں کو دیکھتے ہی میں نے سائیڈ پر پڑی کلاشن کوف ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

''ارے پردیپ سنگھ!......دیکھو تو، بھوت کو ڈھونڈتے ہوئے ایک اپسرا مل گئی ہے۔''

''بات تو صحیح کہہ رہے ہو۔'' پردیپ سنگھ نے مسکرا کر اس کی تائید کی تھی۔

ان دونوں کا رخ اسی لڑکی کی جانب ہو گیا۔ اطراف سے وہ یکسر بے پروا ہو گئے تھے۔

''شہزادی!......کیا نام ہے تمھارا؟'' پہلے والے نے قریب جا کر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''رر......رے......ریشم!......'' لڑکی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''آہ......کتنا پیارا نام ہے۔'' اس نے خباثت بھرے لہجے میں کہا۔

''سلیم بھائی!......چلتے ہیں۔ باقی پارٹیاں آگے نکل جائیں گی۔'' پردیپ سنگھ نے ان جھاڑیوں کی طرف سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا جہاں میں چھپا تھا۔

اور اس کے منہ سے سلیم سنتے ہی میرے سر پر گویا بم پھٹ پڑا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور اس کے باوجود یوں گھٹیا انداز میں ایک معصوم لڑکی کو ندیدے پن سے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے گندے وجود پر پوری میگزین خالی کر دوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے ارادے پر قابو پایا تھا۔ یقیناً انڈین آرمی میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے وہ بھی ان کی صحبت میں پوری طرح رنگ چکا تھا۔

سلیم نے بازاری انداز میں کہا۔ ''ویسے دل تو نہیں کر رہا کہ اس موقع کو ضائع کیا جائے۔''

''پھر کبھی سہی یار!......اور اب تو صوبیدار صاحب بھی ساتھ ہے۔ اسے اگر معلوم ہو گیا تو تمھاری کھال کھینچ لے گا۔ تمھارا ہم مذہب ہی ہے۔''

''ہونہہ!......بہت دیکھے ہیں ایسے ہم مذہب۔'' سلیم نے طنزیہ ہنکارا ابھرا۔ ''اور پھر کیپٹن پرسادر انجن بھی تو ساتھ ہے۔ جانتے ہو کتنا شوقین ہے وہ ان کشمیری لڑکیوں کا۔''

''اچھا اب چلو بھی باقی پارٹیاں آگے نکل گئی ہوں گی۔ نظر بھی آ رہا ہے کہ کتنا زیادہ جنگل باقی ہے۔ اب تک تو ہم ایک حصے ہی کی تلاشی لے پائے ہیں۔ اس سے دوگنا حصہ باقی ہے اور اس کے بعد سیکٹر دو کے علاقے کی

بھی تلاشی لینا ہے۔“

”افف یار!......تم بھی نا بس......“ سلیم نے افسوس بھرے انداز میں گندی سوچوں بھرا سر ہلایا۔

”ویسے تم نے یہاں کسی کمینے گھس بیٹھے کو تو نہیں دیکھا؟“ سلیم نے اپنا ہاتھ ریشم کے گال کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ ریشم کے رخسار کو چھوتا وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔اس کے ساتھ ہی اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔”کسی کو نہیں دیکھا۔“

”ہائے اوے!......نخرہ تو دیکھو۔“ سلیم نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ریشم کے منہ سے ایک سریلی چیخ بلند ہوئی تھی۔وہ جھٹکا دے کر اس خبیث سے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی مگر سلیم کی گرفت کافی سخت تھی۔

”کیا ہوا......کون ہے؟“ ڈیڑھ دو سو گز دور سے کسی کی چیختی ہوئی آواز آئی تھی۔

”کوئی نہیں یار!......بس ایک بلبل ہمیں دیکھ کر گھبرا گئی ہے۔“ سلیم نے خباثت سے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”یہ بلبلوں کے چکر کو چھوڑو اور آگے بڑھو۔“ اس مرتبہ اسی آواز نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔اور سلیم، ریشم کا ہاتھ چھوڑ کر چل پڑا۔ریشم کا ہاتھ پکڑتے پکڑتے وہ اس رخ سے ہٹ گیا تھا جس پر وہ پہلے چل کر آرہے تھے۔میرا مچان اب ان سے پانچ چھ گز دائیں پڑا رہا تھا۔آگے بڑھتے ہوئے بھی ان کی نظریں ریشم کی جانب سرگرداں رہیں جو گھبرائے ہوئے انداز میں انھیں گھور رہی تھی۔اس کی وجہ سے وہ دائیں بائیں کی جھاڑیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکے تھے۔

”پریشان نہیں ہونا، میں بعد میں آؤں گا میری جان!“ پندرہ بیس قدم آگے جا کر سلیم نے بے ہودہ انداز میں کہا۔

پردیپ سنگھ اس کے انداز پر ہنس پڑا تھا۔”یار!......اب اس غریب کو بخش بھی دو۔“

جواباً سلیم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔اور وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں غائب ہو گئے۔آہستہ آہستہ ان کی آواز معدوم ہونے لگی۔

بے اختیار میرے منہ سے گہرا سانس خارج ہوا اور میں نے کلاشن کوف مچان پر رکھ دی۔اس کے ساتھ ہی میں نے ریشم کی جانب دیکھا۔وہ چونکتے ہوئے میرے مچان کی جانب ہی دیکھنے لگی تھی۔شاید میرے منہ سے کچھ زیادہ ہی گہرا سانس خارج ہو گیا تھا۔مجھے اپنی بے احتیاطی پر سخت غصہ آیا،لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔وہ کھوجتی نگاہوں سے قریب آئی۔اس نے اضطراری انداز میں اپنے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا بھی پکڑا ہوا تھا۔میں نے خود کو اچھی طرح چھپایا ہوا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں نے سلیمانی ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی اور بالکل نظر بھی نہیں آرہا تھا۔

اس کے قریب آتے ہی میں اسے مزید سسپنس میں مبتلا کیے بغیر اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا۔مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، چیخ روکنے کے لیے اس نے بے ساختہ اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

مچان سے نکل کر میں اس کے سامنے آگیا۔"یقیناً،انھیں آواز دے کر واپس بلانے میں آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

"نن......نہیں میں انھیں نہیں بلاؤں گی۔"اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں دائیں بائیں سر ہلایا۔

"ویسے میری طرف سے کوئی قدغن نہیں ہے۔آپ انھیں بڑے شوق سے بلا سکتی ہیں۔تاکہ مجھے گرفتار کرنے کے ساتھ وہ آپ کو بھی انعام کے طور پر ساتھ لے جائیں گے۔یہ بھی ہوسکتا ہے ساتھ نہ لے جائیں اور یہیں مک مکا کرلیں۔"

(یہاں قارئین کی معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ وہ لڑکی اور اس سے پہلے پردیپ سنگھ اور سلیم وغیرہ اردو میں بات نہیں کررہے تھے۔لڑکی بس ٹوٹی پھوٹی اردو ہی بول سکتی تھی۔لیکن جس انداز میں بول رہی تھی۔یقیناً وہ الفاظ جاننے سے قارئین کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔اسی طرح پردیپ اور سلیم کے بولے ہوئے الفاظ میں بھی ہندی اور پنجابی کے بہت سارے الفاظ شامل تھے جنھیں میں نے آسان اردو میں لکھ دیا ہے)

ریشم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔"اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا تب بھی میں ان خنزیروں کو کچھ نہ بتاتی۔میں انڈین فوج سے سخت نفرت کرتی ہوں۔"

"اچھا آپ کس وقت واپس لوٹتی ہیں؟"اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں خود بھی ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا

”سہ پہر کو لوٹتی ہوں۔“ مجھ سے دو تین قدم دور ہٹ کر وہ بھی نیچے بیٹھ گئی تھی۔

مرد کی سوچ کے بارے عورت کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ میرے چہرے اور آنکھوں سے ہویدا اثرات اسے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھے کہ میں اس کے بارے کچھ غلط نہیں سوچ رہا تھا۔

اس کے جواب نے مجھے اطمینان بھرا سانس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں بھی میں اسے سہ پہر سے پہلے واپس لوٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس پر شک کرنا میری مجبوری تھی۔ وہ گاؤں میں جا کر کسی کو بھی میرے بارے اطلاع دے سکتی تھی اور ضروری نہیں تھا کہ جسے وہ یہ خبر سناتی وہ بھی انڈین آرمی سے اتنی ہی نفرت کرنے والا ہوتا۔ یا نفرت کرنے کے باوجود انعام حاصل کرنے کا لالچ بھی اسے یہ اطلاع انڈین آرمی تک پہنچانے پر مجبور کر سکتی تھی۔ البتہ سہ پہر کو اس کے چلے جانے کے بعد میں نے بھی وہ جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ جانا تھا۔ اس کے بعد وہ بے شک جس کسی کو اطلاع دیتی رہتی میری صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

”آپ روزانہ اس طرف ریوڑ لے کے آتی ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ ہمارے گاؤں کی کئی اور لڑکیاں اور لڑکے بھی اس جنگل میں اپنے ریوڑ لے کے گھوم رہے ہیں۔“

”آپ کا کوئی بھائی نہیں ہے۔“ میں نے سلسلہ گفتگو دراز کیا۔

وہ جواباً بولی۔ ”دو بڑے بھائی ہیں۔ لیکن دونوں سردیوں میں مزدوری کے لیے شہر چلے جاتے ہیں اور سردیوں کے اختتام پر لوٹ آتے ہیں۔ گاؤں کے دوسرے بہت سے مرد بھی یہی کرتے ہیں۔“

”ہونہہ!......“ ہنکارا بھرتے ہوئے میں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ جانے کیسے اسے میزبان بننے کا خیال آ گیا تھا۔ وہ کندھے سے لٹکایا کپڑے کا تھیلا کھولنے لگی۔

ساری رات کی بھاگ دوڑ اور پھر چند گھنٹے کی نیند کے بعد مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اور میرے پاس اس وقت بھوک مٹانے کے لیے چنوں کے بنے ہوئے مخصوص بسکٹ موجود تھے۔ لیکن وہ بسکٹ بس مجبوری کی حالت ہی میں کھائے جا سکتے ہیں۔ بھوک مٹانے کے ساتھ وہ غذائیت سے بھی بھرپور ہوتے ہیں

۔لیکن گندم کی روٹی اور سالن میں جو لذت ہے اس کا مقابلہ وہ روکھے پھیکے بسکٹ کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے واجبی سا انکار کیا۔ ”یہ تو تمھارا کھانا ہے، اگر میں نے کھا لیا تو تم کیا کھاؤ گی؟“

”مجھے کوئی خاص بھوک نہیں ہے۔ اور پھر میں رات کو بھی تو کھا سکتی ہوں۔ آپ تو شاید کب کے بھوکے ہوں“ اس نے کپڑے میں بندھی ہوئی دو روٹیاں جن پر ساگ رکھا ہوا تھا میرے سامنے رکھ دیں۔

”شکریہ...... ویسے میرے پاس بسکٹ موجود ہیں۔“ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ روٹیوں کی طرف بڑھا دیا ۔روٹیاں اور سالن ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن اس کی لذت اور مزہ برقرار تھا۔

اسے آرام سے بیٹھا دیکھ کر میں نے کہا۔ ”آپ بھی کھائیں نا؟“

”نہیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ اپنا تھیلا اور ڈنڈا وہیں چھوڑتے ہوئے وہ جھاڑیوں پر منہ مارتی ہوئی ایک بکری کو پچکارنے لگی۔ بکری اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسے کان سے پکڑ کر وہ وہیں کھینچ لائی ۔اپنے تھیلے سے جست کا ایک کٹورا نکال کر اس نے اپنے دونوں گھٹنوں کے درمیان میں رکھا۔ اور دونوں ہاتھوں سے بکری کو دوہنے لگی۔ اس حالت میں وہ اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ میں بے اختیار نظر چرانے پر مجبور ہو گیا۔

کٹورا آدھے سے زیادہ دودھ کا بھر کر اس نے نیچے رکھا اور بکری کو آزاد کر کے خشک لکڑیاں جمع کرنے لگی ۔جب تک میں کھانا کھاتا وہ لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ لگا چکی تھی۔ آگ کے دو طرف پتھر رکھ کر اس نے کٹورا اوپر رکھا اور اپنے تھیلے سے پتی اور چینی نکال کر اس میں ڈالنے لگی۔ یقیناً یہ اس کا روزانہ کا کام تھا تبھی اتنے اطمینان اور ترتیب بھرے انداز میں سرانجام دے رہی تھی۔

چائے تیار ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ چائے بنا کر اس نے سٹیل کا ایک بڑا سا مگ نکال کر چائے کا بھرا اور میری جانب بڑھا دیا۔ چائے کی عام تین پیالیاں بہت آسانی سے اس مگ میں سما سکتی تھیں۔ لیکن وہ خالص دودھ کی چائے تھی۔ بغیر پس و پیش کے میں مگ تھام کر چائے پینے لگا۔ چائے بہت ہی عمدہ بنی تھی اور اس وقت مجھے چائے کی طلب بھی بہت شدت سے ہو رہی تھی۔ میں سارا مگ خالی کر گیا۔ اس دوران وہ دلچسپی سے میرے چہرے کو گھورتی رہی۔

مگ خالی ہوتے ہی اس نے کٹورے سے مزید چائے اس میں انڈیلی او مگ دوبارہ میری جانب بڑھا دیا۔

”شکریہ۔“میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”تھوڑی سی تو لیں نا۔“ وہ مصر ہوئی۔

”نہیں آپ پئیں، میں تھوڑی دیر بعد پی لوں گا۔“

اور اثبات میں سر ہلا کر وہ چائے پینے لگی۔ چائے پی کر اس نے ڈنڈا اٹھایا اور بکھری بکریوں، بھیڑوں کو اکٹھا کرنے لگی۔ اس دوران میری نظریں اس پر گڑی رہیں۔ ایک دو بکریوں کو قریب لانے کے لیے اسے میری نگاہ سے اوجھل بھی ہونا پڑا لیکن جلد ہی وہ دوبارہ نظر آنے لگی تھی۔ اپنا میمنا پکڑ کر وہ پھر میرے قریب آ بیٹھی۔

”آپ واپس جا رہے ہیں یا آ رہے ہیں۔“ میمنے کے منہ کو سہلاتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

”یقیناً یہ جاننا آپ کو ذرا سا بھی فائدہ نہیں دے گا۔“ میں نے بغیر لگی لپٹی رکھے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

”شاید آپ کو میرا سوال برا لگا ہے۔“ میرا لہجہ ایسا نہیں تھا کہ اسے میرے موڈ کا پتا نہ چلتا۔

”کیوں نہیں لگنا چاہیے؟“ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ اس نے منہ بنایا۔

”کیوں؟“ اس مرتبہ میرے لہجے میں غصے بھری حیرانی شامل تھی۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ”کیونکہ میں جانتی ہوں آپ نے گزشتہ رات ہی سرحد عبور کی ہے۔“

میں استہزائی انداز میں ہنسا۔ ”ضروری نہیں کہ آدمی کا ہر تکا نشانے پر لگے۔“

”اندازے نہیں لگا رہی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔“ اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر مجھے نظر چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“ میں نے اپنا اشتیاق چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”یقیناً یہ جاننا آپ کو ذرا سا بھی فائدہ نہیں دے گا۔“ اس نے میرا کہا ہوا فقرہ لوٹایا۔

میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس کے ہونٹوں سے نقرئی قہقہہ برآمد ہوا۔

”خفا ہو گئے۔“ اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ اور میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کہنے لگی۔ ”اچھا میں بتا دیتی ہوں۔ آج صبح چند انڈین فوجی ہمارے گاؤں کے بڑے کے پاس آئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ آج

صبح یا رات کے کسی وقت اگر کوئی باہر کا آدمی ہمارے گاؤں میں آیا ہو یا کسی اجنبی کو ہمارے گاؤں کے کسی آدمی نے یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہو تو بتا دیں۔ پس گاؤں کے بڑے نے ان کے سامنے تمام لوگوں کو بلا کر یہ بات پوچھی مگر کسی کی طرف سے اثباتی جواب نہ ملا۔ پھر گاؤں کے بڑے نے ان فوجیوں سے پوچھا کہ مطلوبہ آدمی کا رخ کس جانب ہے۔ تب انھوں نے بتایا کہ آدمیوں کی تعداد تو یقینی نہیں کہ ایک آدمی بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے گزشتہ رات ہی سرحد پار کی ہے۔ اور ان میں سے ایک آخری مرتبہ ہمارے گاؤں ہی سے چند کلومیٹر دور دیکھا گیا ہے۔ اس کا رخ ہمارے گاؤں کی طرف ہی تھا۔ اس کے ساتھ وہ آپ کے خطرناک ہونے کے متعلق بھی کافی کچھ کہہ رہے تھے۔''

''اور آپ کے خیال میں وہ میں ہوں؟'' اس کی تفصیلی گفتگو سن کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔

وہ زور سے ہنسی۔ ''نہیں وہ میں ہوں۔''

اس کے انداز پر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔

''ویسے آپ تیسرے آدمی ہیں۔''

''کیا......تیسرا......؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا مطلب آپ سے پہلے بھی میں دو مجاہدوں سے اسی جنگل میں مل چکی ہوں۔''

''کب؟''

''پانچ چھ ماہ ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ان کی تلاش میں انڈین فوجی نہیں آئے تھے۔''

''ہونہہ۔'' ہنکارا بھرتے ہوئے میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ ساڑھے تین ہو رہے تھے۔ ''کیا آپ میرے لیے چائے گرم کر سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ خوش دلی سے کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کا رخ اسی جانب تھا جدھر دوپہر کو ہندو فوجی گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے وہ سرعت سے نیچے بیٹھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ گھبرائی ہوئے لہجے میں بولی۔

''وہ خبیث واپس آ رہے ہیں۔''

یہ سن کر ایک لمحے کے لیے تو میں سن سا ہو گیا تھا۔لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دماغ حفاظتی تدبیر سوچنے لگا ۔اتنا وقت نہیں تھا کہ میں مچان میں گھس سکتا یا وہاں سے اٹھ کر دور جا سکتا۔میں فوراً زمین پر الٹا لیٹ کر عقبی جھاڑی میں گھسنے لگا۔ایک عقل مندی ریشم نے یہ کی کہ وہ اپنا جھولا اور چائے کے برتن اٹھا کر اس پتھر کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ پہلے لیٹی تھی۔

”دیکھا، میں نے کہا تھا نا یہ سہ پہر کے بعد ہی واپس لوٹے گی۔“سلیم کے خباثت بھرے لہجے نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا۔

”مان گئے یار!“اس کے ساتھ دوسرا پردیپ سنگھ ہی تھا۔

”ماننا تو پڑے گا سردار جی!......اور دیکھا کیسی لاجواب ترکیب لڑائی ہے۔وہ سالا صوبیدار تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔اس پھول کا رس چوسنے کے لیے مجھے خود کو ڈھلان سے بھی نیچے لڑھکانا پڑا۔“

”ہاہاہا......بڑا احرامی ہے رے تو۔“پردیپ سنگھ نے تحسین آمیز لہجے میں گالی بکی۔

”اب تو پہلا نمبر میرا بنتا ہے نا۔“سلیم نے داد چاہنے والے انداز میں پوچھا۔

”ٹھیک ہے یار!......جیسا تمھیں پسند ہو۔“پردیپ سنگھ نے فوراً اتفاق کیا تھا۔ان کی بکواس سنتے ہی مجھے حقیقت تک پہنچتے دیر نہیں لگی تھی۔سلیم وہاں سے چلا تو گیا تھا مگر ریشم کو وہ خبیث اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پایا تھا ۔اور رستے میں اس نے خود کو جان بوجھ کر ڈھلان سے لڑھکا لیا تاکہ سینئر کی نظر میں زخمی بن سکے۔صرف اس کے زخمی ہونے کی وجہ سے باقی تمام تلاشی کا کام تو نہیں روک سکتے تھے۔یقیناً سینئر اسے واپس اپنی پوسٹ پر جانے کا کہہ کر باقیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا ہوگا اور پردیپ سنگھ کو اس کی مدد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہوگا۔باقیوں کے آگے بڑھتے ہی وہ دونوں ریشم کی تلاش میں نکل پڑے۔اب یہ ریشم کی بدقسمتی کہ وہ میری وجہ سے اب تک اس جگہ سے ہل نہیں پائی تھی۔بلکہ وہ وہاں سے کہیں اور چلی جاتی تب بھی انھوں نے اسے تلاش کر لینا تھا۔کہ ان کے ذہن پر اس وقت شیطان سوار تھا۔

ان کی بکواس ریشم نے بھی سن لی تھی۔وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اپنی چیزیں جھولے میں ڈال رہی تھی ۔کٹورے سے بقیہ چائے گرا کر اس نے کٹورہ مگ اور کھانے والا کپڑا جھولے میں ڈالا اور جھولے کو بغل سے لٹکا

کر اس نے اپنی لاٹھی ہاتھ میں پکڑ لی۔
”کہاں کے ارادے ہیں میری بلبل۔“ اس کے قریب پہنچتے ہوئے سلیم نے گھٹیا انداز میں پوچھا۔
”مم......میں نے گھر جانا ہے۔“ ریشم کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ان دونوں کے ارادے سے بے خبر نہیں تھی۔
”چلی جانا میری جان !......ہم نے تمھیں کون سا پوری رات مصروف رکھنا ہے۔“ سلیم کے وضاحت بھرے غلیظ الفاظ سن کر ریشم کانپنے لگی تھی۔
”خ......خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔“ وہ منمنائی۔
”خدا کے واسطے ایسا نہ کہو۔“ سلیم نے اسی کے انداز میں جواب دیا تھا۔ پردیپ سنگھ یوں قہقہہ لگا کر ہنسا جیسے سلیم نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔
آپ کو اللہ کا واسطہ، سوہنڑیں رسول کا واسطہ۔“ ریشم نے آنسو بہاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے تھے۔
مگر ان پر شیطانیت سوار تھی۔ پردیپ سنگھ تو چلو سکھ تھا لیکن سلیم کے اوپر بھی ان مقدس ناموں کے واسطوں نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ سلیم خباثت سے ہنسا۔
”ارے شہزادی !......گھبراتی کیوں ہے؟......ہم تمھیں جان سے تھوڑی مار رہے ہیں۔ بس ذرا سا شغل کریں گے اور چلی جانا۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنی کلاشن کوف ایک طرف پھینکی اور جھپٹ کر ریشم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔
”چھوڑو مجھے۔“ ریشم مچلتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ایک کشمیری چرواہن تھی۔ بلاشک وشبہ اس کے اندر اچھی خاصی قوت موجود تھی۔ ایک سلیم کے قابو میں وہ اتنی آسانی سے نہیں آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے خود کو سلیم کی گرفت سے چھڑا لیا لیکن پھر سلیم بری طرح اس سے چمٹ گیا۔ اسی دوران پردیپ سنگھ بھی اپنا ہتھیار پھینک کر تڑپتی مچلتی ریشم کو قابو کرنے میں سلیم کی مدد کرنے لگا۔ میں اس وقت تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔ گو میں اتنا بے ضمیر اور بزدل نہیں تھا کہ ایک معصوم لڑکی کو اپنی نظروں کے سامنے لٹتا دیکھا رہتا۔ میں بس مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ اور جس وقت پردیپ سنگھ نے بھی اپنا ہتھیار نیچے پھینکا

میں جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں سائیلنسر لگا گلاک تھام لیا تھا۔ اسی وقت ریشم کے منہ سے منت اور درد بھرے انداز میں نکلا۔

''خدا کے لیے میری مدد کرو۔'' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اس وقت مجھے ہی پکارا تھا۔ میں سرعت سے ان کے قریب پہنچا۔ میرے دوڑتے قدموں کی آواز سن کر پردیپ سنگھ نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ مگر اس کا یہ دیکھنا کسی کام نہیں آ سکا تھا۔ ٹریگر دبانے سے ہلکی سی ''ٹرچ'' کی آواز نکلی اور پردیپ سنگھ کی کھوپڑی میں روشندان کھل گیا تھا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور منہ کالا کرنے کی حسرت دل میں لیے تڑپنے لگا۔ سلیم کو بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پردیپ سنگھ کا خون میں نہایا تڑپتا جسم اور میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاک جو سائیلنسر لگانے مزید بھیانک ہو گیا تھا دیکھتے ہی وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''کک......کون ہو تم؟''

''کتوں اور خنزیروں کا شکاری۔'' غضب ناک انداز میں کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر پستول کی نال رسید کی۔

''اُف......'' کہتے ہوئے اس نے اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''اوہ......معذرت خواہ ہوں۔ شاید زور کی لگی ہے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مم......میں بھی مسلمان ہوں۔ مم......میں خدا قسم مسلمان ہوں۔''

''سچ میں؟'' میں نے استہزائی لہجے میں پوچھا۔

''اللہ پاک کی قسم میں مسلمان ہوں۔'' جوش سے کہتے ہوئے وہ پہلا کلمہ دہرانے لگا۔

''اچھا، تو یہ کون سی عبادت کر رہے تھے؟'' میں نے آنکھوں سے قہر برساتی ریشم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اتنے غصے میں تھی کہ اپنے پھٹے ہوئے گریبان پر بھی توجہ نہیں دے سکی تھی۔

''غغ غلطی ہو گئی۔ مم...... مجھے اس نے ورغلایا تھا۔'' اس نے پردیپ سنگھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں نے ٹریگر دبایا۔ گولی اس کے بائیں گھٹنے میں لگی تھی۔ ''ہائے۔'' کہتے ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔

اس کی ''ہائے۔'' پر توجہ دیے بغیر میں دوبارہ ٹریگر دبایا اس کے دوسرے گھٹنے میں بھی سوراخ ہو گیا۔

''خدا کے واسطے مجھے معاف کردو۔'' وہ زور سے چیخا تھا۔اس کا بدن مسلسل لرز رہا تھا۔

''معلوم ہے اس سکھ کو میں نے کیوں اتنی آسان موت کے حوالے کیا ہے۔'' اس کے چہرے کو ٹھوکر کا نشانہ بناتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''اللہ کے واسطے چھوڑ دو، معاف کردو۔'' وہ گڑگڑایا۔

مگر میں اس کی معافی پر توجہ دیے بغیر بولا۔'' کیونکہ یہ غیر مسلم تھا۔اور تم......تم کس منہ سے یہ مقدس نام اپنے گندے ہونٹوں سے ادا کر رہے ہو۔'' میں نے اپنے جوتے کی ایڑی پوری قوت سے اس کے منہ پر ماری ۔اس کے سامنے والے سارے دانت ٹوٹ کر اس کے منہ میں گر گئے تھے۔اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے خون ابل پڑا۔وہ زور زور سے کراہنے لگا تھا۔

''کیا تم اس کے گندے وجود سے دھرتی کو پاک کرنا چاہو گی۔'' میں نے ریشم سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''تو یہ لو۔'' میں نے پسٹل اس کی طرف بڑھایا۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے زمین پر پڑا نو دس کلو وزنی پتھر اٹھایا اور سلیم کی طرف بڑھی۔

سلیم نے اسے پتھر لے کر اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو زور زور سے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ باندھنے لگا۔اس کے زخمی منہ سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی۔اس پر توجہ دیے بغیر ریشم نے اپنے دونوں ہاتھوں سر سے بلند کیے اور پوری قوت سے پتھر سلیم کے سر پر دے مارا۔اسے چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔دو تین دفعہ ہاتھ پاؤں جھٹک کر وہ دنیاوی غموں سے آزاد ہو گیا تھا۔

ریشم نے قریب آ کر میرے دونوں ہاتھ تھام کر رندھے ہو لہجے میں کہا۔''اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے، خوش رکھے اور ہر غم سے آزاد کرے۔''

''آمین۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کے پھٹے ہوئے گریبان سے نظریں چرائیں جو کچھ مخفی رازوں کو آشکارا کرنے پر تلا تھا۔اور گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''ویسے اس وقت آپ کے دوپٹے کی ضرورت بال چھپانے سے زیادہ کسی اور جگہ پر ہے۔''

''جج......جی؟''اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔اس کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اگر سوئی دھاگا موجود نہ ہو تو پھٹی ہوئی قمیص پر دوپٹا لپیٹا جا سکتا ہے۔''

اس نے اپنے گریبان کی طرف دیکھا۔ایک دم اس کے چہرے پر شرم کی لالی قوس قزح کے رنگوں کی طرح پھیل گئی تھی۔

''وہ......میں......'' کہہ کر اس نے رخ دوسری جانب موڑا اور اپنے پھٹے ہوئے گریبان کے ساتھ کوئی ضروری کارروائی کرنے لگی۔جبکہ میں ان لاشوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ان لاشوں کا چھپانا نہایت ضروری تھا۔ورنہ اس گاؤں کے لوگ کسی مصیبت میں بھی پڑ سکتے تھے۔کیونکہ سلیم کی لاش دیکھ کر کسی کو بھی یہ اندازہ لگاتے دیر نہ لگتی کہ اسے دردناک طریقے سے ہلاک کیا گیا ہے۔اور ایسا کسی وجہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔جاسوس یا دہشت گرد گولی مارنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔یوں تشدد کا نشانہ نہیں بناتے۔گو وہ یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ اس سے پوچھ گچھ کے لیے اس پر یوں تشدد کیا گیا ہے۔لیکن پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ ریشم کی ذات ملوث ہو رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے واپس پلٹنے کی وجہ ریشم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''ریشم کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا۔اس نے اپنی قمیص بکسوئے لگا کر مرمت کر لی تھی۔

''ان لاشوں کو چھپانے کے بارے سوچ رہا ہوں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''تمھارا کیا خیال ہے اپنے دو بندوں کی گمشدگی انڈین فوج کو آسانی سے ہضم ہو جائے گی۔''

''اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ کوئی نہ کوئی انھیں ضرور اطلاع کر دے گا۔''

''تو جب انھیں پتا چلے گا اور وہ لاشیں اٹھانے آئیں گے تو سوچیں گے نہیں کہ یہ یہاں کیوں آئے تھے۔کم از کم اتنا اندازہ تو انھیں ہو جائے گا کہ یہ کسی لڑکی کے پیچھے یہاں تک پہنچے ہیں اور اس طرح شک کی زد میں تمھاری ذات بھی آ سکتی ہے۔کیا ان درندوں کی تفتیش کا سامنا کر لو گی؟''اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے

میں نے پوچھا۔
اس نے خوف سے جھرجھری بھرتے ہوئے پوچھا۔ ”انھیں کیسے چھپائیں؟“
میں دھیرے سے ہنسا۔ ”میرا خیال ہے تمھاری سمجھ میں میری بات آ گئی ہے۔“
”میری بے بسی ہی کا مذاق اڑاتے رہو گے یا لاشیں چھپانے کی کوئی ترکیب بھی سوچو گے۔“ وہ دکھ بھرے انداز میں بولی۔
”آپ تو خفا ہی ہو گئیں۔“
”تو اور کیا کروں۔ خفا ہونے کا حق بھی چھیننا چاہتے ہو۔“ اس کے لہجے میں انتہا کی بے بسی کے ساتھ طنز کا عنصر بھی شامل تھا۔
”میرا خیال ہے، اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ مجھے اس کا طنزیہ انداز اچھا نہیں لگا تھا۔
”کیوں قصور نہیں ہے۔ کیا آپ ایک آزاد مسلمان ملک کے شہری نہیں ہیں۔ کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟“ اس کا غصے بھرا انداز مجھے حیران کر گیا تھا۔
”ریشم!......آپ کی باتیں میرے سر سے کافی بلند گزر رہی ہیں۔“
آپ کو سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یوں بھی وہ مسلمان تو کب کے مر چکے جو ایک جسم کی مانند ہوا کرتے تھے کہ ایک عضو کی تکلیف پر سارا جسم بے چینی اور بے قراری محسوس کرتا ہے۔ اب کہاں سے لاؤں وہ حجاج بن یوسف جس نے ایک مسلم لڑکی کی پکار پر پورے سندھ کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ ہماری آنکھیں تو طارق بن زیادہ اور محمد بن قاسم کی راہ تکتے تکتے پتھرا چکی ہیں مگر لگتا ہے ہمارے مجاہدین کو عیش و نشاط کی محافل ہی سے فرصت نہیں مل رہی ۔ جانے کب وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی ماوؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی خبر لیں گے۔“ ایک لمحہ کے لیے رک کر وہ استہزائی انداز میں ہنسی اور پھر اس کی بات جاری رہی۔ ”یقیناً وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔ یوں بھی جب جہاد ہی دہشت گردی کے زمرے آ گیا تو جہاد کرے گا کون؟“
اس کی حقیقت پر مبنی گفتگو کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن میں نے چپ رہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔
”آپ کے مسلمان بھائی نہیں سوئے، یقیناً جس سے جتنا ہو سکتا ہے وہ کر رہا ہے اور اس کی زندہ مثال میری

صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ باقی ہمارے حکمران کیا کر رہے ہیں ان کا جواب عوام سے مانگنا یقیناً زیادتی ہے۔''

''حکمرانوں کا چناؤ عوام ہی کرتی ہے۔'' وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

''غالباً اس لاینحل بحث کی وجہ سے ہم اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔'' میں نے ان پر اذیت باتوں سے جان چھڑانا چاہی۔

''ہونہہ!......صحیح کہا۔''

''تو چلو کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔'' میں آگے بڑھ کر ان کی تلاشی لینے لگا۔ ان کی جیبوں میں سگریٹ اور لائیٹر کے علاوہ کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔ لائیٹر اپنی جیب میں ڈال کر میں نے ان کے بنڈوریل سے کلاشن کوف کے فالتو میگزین بھی نکال کر کلاشن کوفوں کے ساتھ رکھ دیے۔

وہ گھوم پھر کر کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔

''ذرا یہاں آئیں۔'' نسبتاً ڈھلان کی طرف سے مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑی تھی۔ میرے قریب پہنچے پر پوچھنے لگی۔ ''آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''میں نے اپنا نام بتایا ہی نہیں تھا۔ البتہ آپ مجھے اجنبی کہہ سکتی ہیں۔'' روکھے لہجے میں کہتے ہوئے میں اس گڑھے کا جائزہ لینے لگا۔ گڑھا کافی گہرا تھا، دونوں لاشیں آسانی سے اس میں سما سکتی تھیں۔

میرا روکھا لہجہ سن کر اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا۔ میں لاشوں کی طرف بڑھ گیا۔

''بات سنو۔'' میں نے پردیپ کی لاش کے پاس رک کر اسے آواز دی۔

''جی۔'' وہ میرے قریب آنے لگی۔

''اگر میں نے اکیلے یہ لاش اٹھائی تو میرے کپڑے ان کے گندے خون سے لتھڑ جائیں گے۔''

نزدیک پہنچ کر اس نے پردیپ سنگھ کے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا۔ ''چلو......مل کر اٹھا لیتے ہیں۔''

میں نے پردیپ سنگھ کی ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ اسے گڑھے میں دھکیل کر ہم نے سلیم کے ساتھ بھی وہی کیا۔ اور اس کے بعد وہاں بکھرے پتھروں اور کنکروں سے گڑھے کو پاٹنے لگے۔ اس کام میں ہمیں گھنٹا بھر لگ گیا تھا۔

ان کی لاشوں کی طرف سے بے فکری ہوتے ہی میں ریشم کو مخاطب ہوا۔”ان کی دونوں کلاشن کوفین کسی ایسی جگہ چھپادو جہاں آسانی سے نہ ڈھونڈی جاسکیں۔اور خبردار انھیں گھر لے جانے کی کوشش نہ کرنا۔ان پر نمبر لکھے ہوتے ہیں۔انڈین فوجی انھیں دیکھتے ہی فوراً پہچان جائیں گے۔“

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔”انھیں بھی گڑھے میں دبا دینا چاہیے تھا۔“

”شاید کبھی کام آجائیں۔میرا مطلب ہے کبھی کسی مجاہد سے سامنا ہو تو آپ یہ ان کے حوالے کرسکتی ہیں۔“

”آپ ہی لیتے جائیں نا،کیا آپ مجاہد نہیں ہیں۔“

”نہیں میں مجاہد نہیں ہوں۔بس کسی ذاتی کام سے سرحد عبور کی تھی غلطی سے ان کی نظر میں آگیا اور اس کے بعد سے مسلسل بھاگتا پھر رہا ہوں۔“

”شاید جھوٹ بولنے کا کوئی ڈپلوما ہی کیا ہوا ہے۔“مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ نیچے پڑی کلاشن کوفیں اٹھانے لگی۔”اور شاید آپ کو بھول گیا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کوئی اور بڑھک مار چکے ہیں۔“

”یہ دو میگزینیں بھی ساتھ رکھ دو۔“اس کے طنز پر تبصرہ کیے بغیر میں نے فالتو میگزینوں میں سے دو اس کی جانب بڑھادیں۔گو مجھے ان کی ضرورت تھی۔لیکن زیادہ وزن ساتھ پھرانے سے احتراز برتتے ہوئے میں نے وہ میگزینیں وہیں چھوڑنا مناسب سمجھا تھا۔

”دونوں کلاشن کوفیں اٹھا کر اس نے میرے ہاتھ سے میگزینیں لیں اور ایک بڑی چٹان کی طرف بڑھ گئی۔ چٹان کی جڑ میں گنیں رکھ کر وہ انھیں پتھروں سے ڈھانپنے لگی۔

”ابھی عارضی طور پر تو یونھی رکھ دو،لیکن کل کوشش کرنا کہ انھیں پلاسٹک وغیرہ میں لپیٹ لینا کیونکہ اس طرح تو یہ زنگ پکڑ کرنا کارہ ہوجائیں گی۔“

”مشورہ دینے کا شکریہ۔“گنیں چھپا کر وہ واپس پلٹ آئی۔میں وہاں بکھرے ہوئے خون کو چھپانے کے لیے کنکر اور مٹی وغیرہ ڈالنے لگا۔گو اتنے بڑے علاقے میں زمین پر پڑے چند دھبوں کو ڈھونڈنا ناممکن تھا لیکن کوئی مقامی آدمی وہ دھبے دیکھ کر کسی کو اطلاع دے سکتا تھا۔اور ایسی بات پھیلتے دیر نہیں لگتی۔مجھے بس ریشم کی فکر تھی۔وہ معصوم لڑکی اگر ان بزدلوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو یقیناً اس کی بے گناہی ثابت ہونے تک وہ کئی جاں گسل مراحل

سے گزر چکی ہوتی۔ وہ ننگ انسانیت چانکیہ کے چیلے کمزور کے لیے کتنے خوں خوار اور ظالم ہیں اس کا اندازہ لگانے کے لیے تقسیم ہند کے واقعات پڑھنا ہی کافی ہے۔

میں نے گھڑی پر نظر دوڑا کر کہا۔" اب آپ کو واپس لوٹنا چاہیے۔"

" چائے بنانے میں اتنی دیر نہیں لگے گی۔" اپنی دودھ والی بکری کی تلاش میں اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

" نہیں تمھیں دیر ہو جائے گی۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ مگر میری بات کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے وہ مطلوبہ بکری کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دودھ دوہتے دیکھنا ایک خوش کن نظارہ تھا لیکن میں نے اپنا رخ موڑ لیا تھا ۔اب میں اپنے دل میں کسی لڑکی کو جگہ نہیں دے سکتا تھا۔

اسے مصروف چھوڑ کر میں لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا۔ خشک لکڑیوں کی وہاں کمی نہیں تھی۔ اس کے دودھ دوہنے تک میں آگ بھڑکا چکا تھا۔ کٹورا آگ پر رکھ کر وہ پتی چینی شامل کرنے لگی۔ چائے تیار ہوتے دیر نہیں لگی تھی۔

مگ بھر کر اس نے میری جانب بڑھا دیا۔ میں گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

" اگر چاہو تو میں رات کا کھانا لا سکتی ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے آفر کی۔

" ضرورت نہیں ہے۔" اس پر بھروسا کرنے کے باوجود میں یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس نے پھیکے لہجے میں کہا۔" شاید مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔"

" جب معلوم ہے تو میرے منہ سننا ضروری ہے کیا؟"

" وجہ۔" اس نے اذیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔" کسی بھی انجان پر بھروسا کرنا، نا قابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔"

" کیا اب بھی میں انجان ہوں۔" اس کا لہجہ دکھی ہو گیا تھا۔

" کیا کہوں۔" مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں سوجھا تھا۔

" کہنے کو بچا ہی کیا ہے۔" اس نے کٹورے ہی کو منہ لگا کر چائے پینا شروع کر دیا۔ سورج پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ لیکن پہاڑ کی چوٹیوں پر اب تک سنہری دھوپ نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سردی کی شدت میں

اضافہ کرنے لگی۔ہم دونوں آگ کے قریب سمٹ آئے تھے۔
چائے پی کر اس نے مگ اور کٹورا اپنے کپڑے کے تھیلے میں ڈالا اور ڈنڈا لے کر اپنے ریوڑ کو اکٹھا کرنے لگی۔یوں بھی پالتو جانوروں کو بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے۔بھیڑ بکریاں اپنے مطلوبہ رستے پر ہولیں۔
ریوڑ کو اپنے رستے پر لگا کر وہ میرے قریب آئی۔''خدا حافظ۔''میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ اداسی بھرے لہجے میں بولی۔
میں نے بھی ہونٹوں پر رسمی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔''فی امان اللہ۔''
ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ مڑی اور اپنی بھیڑ بکریوں کے پیچھے چل پڑی۔چھوٹا میمنا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔
میں آگ پر لکڑیاں ڈالنے لگا۔چند قدم لے کر وہ پیچھے مڑی۔
''جھوٹے اجنبی!......کیا اسی رستے سے واپس آؤ گے؟''
''معلوم نہیں۔''میں نے بے رخی سے جواب دیا۔
''میں انتظار کروں گی۔ہو سکے تو میرے انتظار کا اختتام کرتے جانا۔''اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔میں سر جھکائے آگ تاپتا رہا۔اپنے چہرے پر مجھے اس کی نگاہوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔
وہ چند لمحے میرے بولنے کی منتظر رہی اور پھر اس کے ہونٹوں سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔''اپنا خیال رکھنا میرے اجنبی!''یہ کہہ کر وہ مڑ گئی۔
میرے ہونٹوں سے بے ساختہ پھسلا۔''میرا نام راجا ذیشان حیدر ہے۔''
''شکریہ۔''وہ ایک دفعہ پھر مڑی۔''امید کرتی ہوں یہ سچ ہوگا۔''یہ کہتے ہی وہ جھاڑیوں کے پیچھے روپوش ہو گئی تھی۔میرے دل کے کسی نہاں کونے میں ہلکی سی کسک نے سر ابھارہ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ماہین کی یاد تازہ ہوئی اور میرے اندر تلخی پھیلتی چلی گئی۔
میں نے اضطراری انداز میں بچی ہوئی تمام لکڑیاں آگ میں ڈالیں اور اپنی کلاشن اٹھانے کے لیے مچان کی

طرف بڑھ گیا۔ اپنی کلاشن کوف اور تھیلا اٹھا کر میں دوبارہ آگ کے قریب آبیٹھا۔ مجھے یقین تھا کہ ریشم کے گھر پہنچنے تک شام کا اندھیرا چھا جانا تھا۔ اتنی جلدی وہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔ یوں بھی انڈیا کی کوئی پوسٹ ان کے گاؤں کے اتنے زیادہ قریب نہیں تھی جہاں جا کر وہ میرے بارے اطلاع دیتی اور آناً فاناً وہ میرے خلاف کارروائی کرنے پہنچ جاتے۔ سب سے بڑھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس پر اعتبار کروں۔ کلاشن کوف گود میں رکھ کر میں آگ تاپتا رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی وہاں سے نکل پڑوں گا۔ آگ کو بجھتے دیکھ کر میں نے تھوڑی سی اور خشک لکڑیاں اکٹھی کیں اور دوبارہ آگ کے پاس آن بیٹھا۔ ریشم کو گئے ہوئے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اچانک مجھے لگا کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ میں نے فوراً کلاشن کوف ہاتھوں میں تھامی اور پاس پڑی ہوئے ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے ہو گیا۔ میری نظریں آواز کی طرف نگران ہو گئیں۔ ریشم بھی انھی جھاڑیوں کے عقب میں غائب ہوئی تھی۔ اور پھر ملگجے اندھیرے میں وہاں سے ریشم کو برآمد ہوتے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں جلدی میں جلتی ہوئی آگ کا کوئی بندوبست نہیں کر سکا تھا۔ اس کا رخ آگ ہی کی جانب تھا۔ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس نے دھیمے لہجے میں پکارا۔ ”اجنبی...... اجنبی۔“ یقیناً وہ بھاگتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔

میں خاموش پڑا رہا۔ آگ کے قریب آ کر اس نے آگے پیچھے دیکھا اور پھر مچان کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی اٹھائی ہوئی تھی۔ مچان پر ایک سرسری نظر دوڑا کر وہ دوبارہ آگ کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”میں جانتی ہوں آپ کہیں قریب ہی ہیں۔ جب یقین آ جائے کہ میں اکیلی ہوں تب سامنے آ جانا۔ میں بس آپ کے لیے کھانا لے کے آئی ہوں۔“

میں نے اس مرتبہ بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پرعزم لہجے میں بولی۔

”جب تک آپ سامنے نہیں آئیں گے میں یہاں سے ٹلنے والی نہیں۔“

”یقیناً بہت سے لوگ تمھیں بتا چکے ہوں گے کہ تم نرا سر درد ہو۔“ میں جھلا کر پتھر کے عقب سے نکل آیا۔

”نہیں آج ہی پتا چلا ہے۔“ شوخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ میرے جانب مڑی۔ ”ویسے مجھے پہلے سے

اندازہ ہو چکا تھا کہ آپ اسی پتھر کے عقب میں چھپے ہوں گے۔ بس گولی کے ڈر سے قریب جانے کی ہمت نہ کر سکی۔"

"تو ایسا کام نہ کرو نا جس میں تمھیں ڈرنا پڑے۔" کلاشن کوف گود میں رکھ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"اگر میرے نہیں کرنے سے تم نے نہیں پوچھنا، تو نہیں۔"

وہ ہنسی۔ "نہیں اجازت تو میں رسماً مانگی تھی۔ اور پوچھنا یہ تھا کہ میں نے آپ سے تم کے تخاطب پر ترقی پائی ہے یا تنزلی۔"

"کیا......؟" میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔

"آپ مجھے مسلسل تم کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں نا، تو تم یا تو بہت قریبی کو کہا جاتا ہے یا کسی ناپسندیدہ اجنبی کو۔"

اس کے توجہ دلانے پر مجھے احساس ہوا کہ اس کی دوبارہ آمد پر میں اسے مسلسل تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں دھیان نہیں رہا۔"

اس نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔ "اتنی بے دھانیاں اچھی نہیں ہوتیں جناب!۔"

"ویسے آپ کو اس وقت گھر سے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

"آپ کا، مجھے ناپسندیدہ اجنبی سمجھ کر بھی تم کہہ کر مخاطب کرنا۔ اس آپ سے کئی گنا زیادہ عزیز ہے۔"

"میں نے کچھ اور کہا ہے۔" اس کے چاہت جتلانے پر مجھے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

"تو میں اکیلی کب ہوں، آپ میرے ساتھ موجود ہیں نا۔ اور آپ کی موجودی میں مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا۔"

"اچھا ایسا ہے کہ اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور فی الحال مجھے بالکل بھوک نہیں ہے کیونکہ، تھوڑی دیر ہی پہلے میں نے لیٹر بھر چائے اپنے معدے میں انڈیلی ہے۔ اس لیے تم اپنا کھانا واپس لے جا سکتی ہو۔"

"واہ بہت خوب، میں اپنی پیاری بکریوں کو اکیلا چھوڑ کر یہاں سے بھاگتے ہوئے گھر پہنچی اور وہاں سے

واپس بھی اسی حالت میں آئی صرف آپ کے کھانے کے لیے۔اور آپ فرما رہے ہیں کہ آپ کو بھوک نہیں ہے اس لیے میں اپنا کھانا واپس لے جاؤں ۔کیا میں نے کھانے کا کوئی معاوضا مانگا ہے کہ آپ کو ایسا کہنے کی ضرورت پڑ گئی؟''

''ایسا میں نے کب کہا؟......'' میں نے فوراً پٹڑی تبدیل کی کہ میں واقعی بہت غلط بات کہہ چکا تھا۔''میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تم گھر جاسکتی ہو میں یہ کھانا بعد میں کھالوں گا۔''

''پتا ہے اس کپڑے پر میں نے اپنے ہاتھوں سے بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔اپنا نام بھی لکھا ہے کھانا کھا کر اسے پھینک نہ دینا۔شاید اسے دیکھ کر ہی کبھی میری یاد آجایا کرے۔''اس نے کھانے کی پوٹلی میری جانب بڑھاتے ہوئے بہ ظاہر مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

''یقیناً اس سے پہلے ملنے والے مجاہدوں کو کھانا دیتے ہوئے بھی آپ نے کچھ ایسا ہی کہا ہوگا۔''میرا لہجہ اتنا طنزیہ نہیں تھا جتنا الفاظ زہریلے تھے۔اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لیے میں اس کے چہرے ہی کو دیکھ رہا تھا۔آگ کی لپٹیں اس کے چہرے کو مزید دلکش بنا رہی تھیں۔

وہ جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔''ہاں میں نے ان دونوں کے لیے بھی گھر سے کھانا لایا تھا۔کیونکہ ان انھوں نے خود مجھ سے کھانا مانگا تھا۔وہ آپ کی طرح شکی مزاج نہیں تھے۔اور پھر رخصت ہوتے وقت ایک نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔بیٹی،اللہ پاک تمھیں حفظ وامان میں رکھے اور دوسرے کو میں نے کہا تھا، بھائی تمھاری بہن ہمیشہ تمھارے لیے دعا گو رہے گی۔''اس نے میری طرف رخ موڑا۔''آپ اجنبی تھے اور اجنبی ہی رہیں گے۔''یہ کہتے ہی وہ اٹھ کر تھکے تھکے انداز میں چل پڑی۔چند قدم لینے کے بعد وہ رکی اور پیچھے مڑے بغیر بولی۔

''اندھیرا اچھل رہا ہے، یہ آگ دور سے نظر آسکتی ہے۔اور کوئی بھی اس طرف متوجہ ہو گیا تو آپ نے میری ذات کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ہے۔شاید میں آپ کی نفرت برداشت نہ کر پاؤں۔خدارا آگ کو بجھا دو۔اور یاد رکھنا میرا نام رومانہ ہے۔''آخری الفاظ کہتے ہوئے مجھے اس کی سسکی سنائی دی اور وہ ایک دم بھاگ پڑی تھی۔

آگ کے بارے اس نے صحیح کہا تھا۔میں دیر کیے بغیر دائیں بائیں پڑے پتھر آگ پر پھینکنے لگا۔پتا نہیں

پہلے اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے غلط بیانی کیوں کی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ریشم نام تو اس نے پردیپ سنگھ وغیرہ کو بتایا تھا اور میں بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا۔ بہ ہر حال وہ رومانہ تھی یا ریحانہ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اور نہ مجھے اس کا نام یاد رکھنے کی ضرورت تھی ۔اب کسی لڑکی کا میری زندگی میں آنا مشکل تھا۔ میرے لطیف جذبات مرچکے تھے، میرا دل مردہ ہو گیا تھا۔ کسی عورت کا محبت اور خلوص بھرا برتاؤ مجھے ہضم ہونے والا نہیں تھا۔ رومانہ کی ساری باتوں کا مجھ پر ذرا بھر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی میں نے کسی خاص مقصد کے لیے سرحد عبور کی تھی جس میں رومانہ جیسی لڑکی سے تعلق کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ بہ قول شاعر

کسی نے دھول کیا آنکھوں میں جھونکی
میں اب پہلے سے بہتر دیکھتا ہوں

آگ بجھا کر میں نے اپنا سامان سنبھالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے وہی راستہ استعمال کیا تھا جس پر رومانہ یا ریشم چل کر گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں نیچے پہنچ گیا تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان ختم ہونے کے بعد نسبتاً ہموار جگہ تھی۔ پہاڑ کی جڑ سے فرلانگ بھر دور آبادی شروع ہو رہی تھی ۔ میں نے آبادی سے دور دور ہی آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ کسی کسی گھر سے روشنی کی ہلکی ہلکی جھلک نظر آ رہی تھی ۔اندھیرا چھا گیا تھا ورنہ یقیناً گھروں کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں ضرور نظر آتا۔ چاند نکلنے میں ابھی تک کافی وقت پڑا تھا۔ اس علاقے میں یوں بھی پہاڑوں کی وجہ سے چاند طلوع ہونے کے کافی دیر بعد نظر آتا ہے۔

گو کچی سڑک پر سفر کرنا مجھے کافی مسائل سے بچا سکتا تھا لیکن اس میں بڑی قباحت یہ تھی کہ کچی سڑک نے پوسٹوں کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا اور میں کسی کی نظر میں آنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ انڈین فوج مجھے پچھلے علاقے میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ وہیں مشغول رہیں۔

گزشتہ رات کے ہنگاموں کی وجہ سے میں رستے سے ہٹ گیا تھا۔ اور اب میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں تھا جسے بروئے کار لا کر میں متعین سمت سفر کر سکتا۔ اپنے ساتھ نقشہ اور کمپاس وغیرہ میں نے نہیں لایا تھا ۔کیونکہ میری منزل انبالہ شہر تھا اور وہ کسی ایسی خفیہ جگہ پر موجود نہیں تھا کہ مجھے نقشے کی ضرورت پڑتی ۔ پہاڑی علاقے سے نکلنے کے بعد انبالہ تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ مجھے چلتے ہوئے دو گھنٹے ہو رہے تھے۔ میں

آبادی سے کافی آگے نکل آیا تھا۔ وہ وسیع نالہ آہستہ آہستہ تنگ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بائیں طرف بلندی پر مجھے دور ہلکی سی روشنی چمکتی نظر آئی۔ وہ کوئی پوسٹ بھی ہو سکتی تھی اور کسی کا گھر بھی۔ کیونکہ اگلے دفاعی مورچوں کو میں کافی پیچھے چھوڑ آیا تھا اس لیے مشکل تھا کہ یہاں انھیں کسی پوسٹ بنانے کی ضرورت پڑتی۔ بہرحال یہ میرا اندازہ تھا۔ بعض اوقات آرمی اپنی عقبی رہائش اور اگلے مورچوں کے مابین زیادہ فاصلے کی وجہ سے درمیان میں ٹرانزٹ کیمپ وغیرہ بنا دیتی ہے۔ تاکہ آگے یا پیچھے جانے والے دستے چند گھنٹے یا ایک دو دن وہاں آرام کر سکیں۔ بعض اوقات تو درمیاں میں دو تین ٹرانزٹ کیمپ بھی بنا دیے جاتے ہیں۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب سپاہ کو پیدل سفر کرنا پڑے۔

میں نالے کی دائیں طرف چھوڑ کر بائیں جانب ہو گیا۔ اس کے لیے مجھے پانی سے گزرنا پڑا تھا۔ مگر پانی بالکل ہی تھوڑا تھوڑا بہہ رہا تھا اس لیے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ بائیں طرف ابھی تک کچا راستہ موجود تھا۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی وہ کچا راستہ بلند ہونے لگا۔ اور مجھے وہ راستہ چھوڑنا پڑا کیونکہ اب اس رستے کا رخ اسی روشنی کی طرف ہو گیا تھا۔ گویا وہ روشنی کسی درمیانی کیمپ ہی کی تھی۔ ایسے کیمپوں میں عموماً سنتری وغیرہ اتنے چوکنا نہیں ہوتے۔ میں نیچے سے ہو کر وہاں سے گزر گیا۔ اس کیمپ سے پانچ چھ سو گز آگے آنے کے بعد ایک بار پھر مجھے کچی سڑک مل گئی تھی۔ میں اسی پر چلنے لگا۔ چاند نکل آیا تھا۔ اس نالے میں دائیں بائیں سے اور چھوٹے چھوٹے نالوں کا پانی بھی شامل ہو رہا تھا۔ اب پانی کے شور کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ نالے کی تہہ میں اچھا خاصا پانی بہہ رہا ہے۔ آگے جا کر وہ نالہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مجھے مجبوراً سیدھی سمت میں ہی سفر جاری رکھنا پڑا۔ کیونکہ وہاں پانی دو حصوں میں تقسیم ہونے کے باوجود اتنا زیادہ تھا کہ گیلے ہوئے بغیر نالہ عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ جانے کتنے نالوں کا پانی اس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کچی سڑک سے بھی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ سڑک آگے جا کر کسی نہ کسی آبادی میں جا نکلے گی۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے جب میں نے ستانے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں دائیں بائیں نظریں گھمانی شروع کر دیں۔ اچھی خاصی بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جلد ہی ایسی جگہ مجھے مل گئی جہاں میں آگ جلا سکتا تھا۔ ایک نالے کی وجہ سے سڑک پہاڑی کے اندر کی جانب مڑی تھی اور پھر نصف دائرہ بنا کر دوبارہ سیدھی ہو گئی تھی۔ وہ نصف دائرے کی جگہ ایسی تھی جہاں آگ جلانے کی

صورت میں آگ دور سے نظر نہیں آسکتی تھی۔ٹارچ کے شیشے پر ہلکا کپڑا لپیٹ کر میں نے روشنی کو دھیما کیا اور دائیں بائیں سے خشک جھاڑیاں ڈھونڈنے لگا۔آگ نے رستے سے تھوڑا ہٹ کر جلائی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ دن کے وقت وہاں سے گزرنے والے کسی فوجی کو بجھی ہوئی راکھ دیکھ کر ذرا سا بھی شک گزرے۔وہاں سے بہنے والا پانی کسی چشمے کا تھا کیونکہ پانی بالکل بھی ٹھنڈا نہیں تھا۔خوب سیر ہو کر پانی پی کر میں نے رومانہ کا دیا ہوا کھانا نکالا۔کپڑا کھولتے ہی دیسی گھی کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔تین روٹیاں تھیں اور تینوں پر دیسی گھی اچھی طرح چپیڑا گیا تھا۔سالن آلو گوشت کا تھا۔لیکن یقیناً میرے لیے وہ بس روٹیوں پر گھی چپیڑنے کا اہتمام ہی کر سکی تھی۔آلو گوشت ان کے روزمرہ کے مطابق بنا ہوا تھا۔

روٹیوں کو آگ پر سینک کر میں کھانے کو جڑ گیا۔اگر وہ لذیز نہیں بھی تب بھی اس وقت مجھے اتنا لطف دے رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔میں تینوں روٹیاں چٹ کر گیا تھا۔کھانے کے بعد مجھے دن کو پی ہوئی چائے کی بہت یاد آئی۔اتنی اچھی چائے پینے کا اتفاق خال ہی ہوتا ہے۔

چشمے کے پانی سے ہاتھ دھو کر میں نے وہی روٹیوں والا کپڑا اٹھا کر ہاتھ خشک کرنے ہی لگا تھا کہ کچھ سوچ کر میں نے وہ کپڑا واپس رکھ دیا۔اور اپنے ہاتھ آگ پر پکڑ لیے۔شاید کھانا باندھنے کے احترام کی وجہ سے میں وہ کپڑا استعمال نہیں کر سکا تھا۔

ہاتھ آگ پر سکھا کر میں بے خیالی میں اس کپڑے پر کشیدہ کیے بیل بوٹوں کو گھورنے لگا۔بہت ہی نفاست سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔زیادہ تر سرخ گلابی اور گہرے سبز رنگ کا استعمال کیا گیا تھا اور پھر میری نظریں سرخ پھولوں اور سبز رنگ کی بیل سے پھسلتی ہوئی اس کونے میں جا رکیں جہاں بہت خوب صورت لکھائی میں رومانہ لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''یاد رکھنا میرا نام رومانہ ہے۔'' میرے کانوں میں اس کی گلوگیر آواز گونجی اور میں نے جلدی سے وہ کپڑا لپیٹ کر جھاڑی کی طرف اچھال دیا۔

''میری بلا سے۔'' سر جھٹک کر میں آگ کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے شعلے مدہم پڑتے جا رہے تھے۔پاس پڑی خشک لکڑیاں اس پر ڈال کر میں نے آگ کو تازہ کیا۔کھانا کھانے کے بعد سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے

لگتی ہے۔ یوں بھی وہاں اچھی خاصی سردی تھی۔ چلتے ہوئے البتہ اتنی سردی محسوس نہیں ہوتی۔

میں اپنی جمع کی ہوئی لکڑیوں کے جلنے تک وہیں بیٹھا رہا۔ جونہی لکڑیاں ختم ہوئیں۔ اپنا تھیلا پیٹھ پر لٹکا کر میں چل پڑا۔ چار پانچ قدم لینے کے بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر کسی کو کھانے والا وہ کپڑا وہاں پڑا ہوا مل گیا تو کیا رومانہ کے نام سے وہ اس تک پہنچ تو نہیں جائے گا۔ گو یہ بات امکان سے کافی بعید تھی لیکن اس کے باوجود میں نے پیچھے جا کر وہ کپڑا اٹھا لیا کہ اسے دہکتے ہوئے انگاروں میں ڈال کر خاکستر کر دوں۔ لیکن پھر میں وہ کپڑا انگاروں پر نہ پھینک سکا۔

”پتا ہے اس کپڑے پر میں نے اپنے ہاتھوں سے بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔ اپنا نام بھی لکھا ہے کھانا کھا کر اسے پھینک نہ دینا۔ شاید اسے دیکھ کر ہی کبھی میری یاد آجایا کرے۔“ میرے دماغ میں جیسے کسی نے سرگوشی کی اور میں نے وہ کپڑا تھیلے میں ڈال لیا۔ شاید میں وہ کپڑا وہاں پھینکنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

نیچے اتر کر میں دوبارہ سڑک ناپنے لگا۔ آگے جا کر وہ سڑک دائیں طرف مڑ گئی۔ نالہ عبور کرنے کے لیے لوہے کا مضبوط پل بنا ہوا تھا۔ نالے میں پانی کی مقدار اتنی ہو گئی تھی کہ اب اسے پل کے بغیر عبور کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔ یوں بھی مسلسل اترائی کی وجہ سے پانی کی رفتا بہت تیز تھی۔ پل عبور کرنے کے بعد سڑک پختہ ہو گئی تھی۔ میں صبح کی روشنی ظاہر ہونے تک یونہی بے فکر چلتا رہا۔ ملگجا اجالا ہوتے ہی میری نظریں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی تھیں۔ سامنے نظر دوڑانے پر مجھے سڑک دائیں طرف مڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ اور اسی جگہ دائیں طرف سے ایک بہت بڑا نالہ اس نالے میں آکر مل رہا تھا۔ جونہی میں موڑ مڑا مجھے سامنے ایک کافی کھلی وادی دکھائی دی۔ پرشور نالہ جو اچھی خاصی نہر کی شکل اختیار کر گیا تھا بائیں طرف پہاڑی کی جڑ میں بہہ رہا تھا، جبکہ دائیں طرف بہت بڑی آبادی نظر آرہی تھی۔ کچھ گھر نالے کے پار بائیں طرف کی پہاڑی پر بھی موجود تھے اور ان کے شہر میں داخل ہونے کے لیے نالے کے اوپر لکڑی کا ایک جھولتا پل موجود تھا۔ پہاڑی علاقے میں اتنی بڑی آبادی کا علاقہ شہر ہی کہلاتا ہے۔ کچھ گھروں کی کھڑکیوں سے جھانکتی روشنی اس بات کا مظہر تھی کہ وہاں بجلی موجود تھی۔ یقیناً وہ اس نالے کے پانی کو بجلی بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں بجلی بنانے کا یہ سب سے اچھا اور سستا طریقہ ہے۔ اس آبادی کو دیکھ کر میں نے کلاشن کوف سے جان چھڑانے

کا طریقہ سوچنا شروع کر دیا۔لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی جہاں اسے محفوظ طریقے سے چھپا سکتا ۔یہاں تک کہ آبادی قریب آ گئی تھی ۔میں نے سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور کلاشن کوف مع فالتو میگزینوں کے نالے میں اچھال دیں۔میری واپسی جانے کب اور کس رستے سے ہونا تھی ۔اور اس کو چھپانے کے لیے نالے کے تیز رفتار پانی سے اور کوئی جگہ بہتر نہیں تھی ۔اب میرے پاس صرف گلاک پسٹل ہی رہ گیا تھا۔پسٹل کو میں نے مع سائیلنسر پیٹھ کی طرف سے شلوار میں اڑس لیا تھا۔تیز دھار خنجر بھی چمڑے کے کیس میں بند کر کے میں نے جرابوں میں اڑس لیا۔مضبوط پلاسٹک کے بوٹ کچھ عجیب سے لگ رہے تھے کیونکہ وہاں برف موجود نہیں تھی ۔اس کا بندوبست میں نے پہلے سے سوچا ہوا تھا۔میری پیٹھ پر بندھے تھیلے میں سپورٹس شوز موجود تھے۔تھیلے سے سفید رنگ کے سپورٹس شوز نکال کر میں نے پاؤں میں ڈالے اور دوسرے بوٹ ہاتھ میں لٹکا لیے۔آبادی میں داخل ہوتے ہی نسبتاً ایک غریب گھر دیکھ کر میں نے وہ بوٹ اس کے دروازے پر پھینک دیے کہ چلو کسی غریب کے کام ہی آ جائیں گے۔

زندگی بیدار ہو گئی تھی۔چھوٹے سے بازار میں دو تین ہوٹلوں پر مجھے پراٹھے بنتے نظر آئے۔مجھے کھانے کی کوئی خاص حاجت تو محسوس نہیں ہو رہی تھی البتہ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ایک مناسب ہوٹل دیکھ کر میں اس میں گھس گیا۔چائے کے ساتھ انڈہ فرائی اور پراٹھے کا کہہ کر میں لکڑی کے بینچ پر ٹک گیا۔وہاں تین چار بندے پہلے سے بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔کسی نے بھی مجھ پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔میں ذرا مطمئن ہو گیا تھا۔ہوٹل میں ایک ہی آدمی کام کرتا نظر آ رہا تھا۔وہی اس کا مالک ،وہی باورچی اور وہی بیرا تھا۔اس نے میرے سامنے ناشتا رکھا۔چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی مجھے رومانہ کی بنائی ہوئی چائے یاد آ گئی۔میں نے بے زاری سے سر جھٹکا اور انڈے پراٹھے کے ساتھ انصاف کرنے لگا۔

ناشتا کر کے میں بل کی ادائی کرتا ہوا ہوٹل سے باہر آ گیا۔سورج مشرق سے سر ابھار رہا تھا۔ایک دکان کے سامنے انگریزی میں لکھا ہوا مین بازار اوڑی پڑھ کر مجھے شہر کا نام معلوم ہوا۔میں نے اندازے ہی سے درست جگہ پہنچ گیا تھا۔اوڑی کے بعد قریب ترین شہر غالباً دمبہ تھا۔میرا ارادہ اوڑی شہر کے مضافات میں کسی کا زبردستی مہمان بننے کا تھا۔رات بھر کے مسلسل سفر کے بعد میرے بدن کو آرام کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔شاید

شب بسری کے لیے بھی وہاں کوئی ہوٹل وغیرہ موجود ہوتا لیکن ہوٹل میں کمرہ لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ جس جگہ وہ شہر موجود تھا وہاں لازماً انڈین ایجنسیوں کے ایک دو بندوں نے ضرور موجود ہونا تھا۔ اور ان کی تفتیش کا سامنا کرنے سے اچھا تھا کہ میں کسی ویرانے میں دن گزار لیتا۔

لیکن کچھ آگے جاتے ہی ایک سٹارٹ ویگن کو دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ تبدیل کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ ویگن آدھی سے زیادہ سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں بھی اندر گھس کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد ویگن چل پڑی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی اگلی منزل کیا ہونی ہے۔

اوڑی سے نکلتے ہی کنڈیکٹر کرایہ وصولنے کے لیے سواریوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک سواری کے منہ سے دمبہ کا نام سن کر میں نے سکون بھرا سانس لیا تھا۔ اس نے کنڈیکٹر کی طرف سو روپے کا نوٹ بڑھایا تھا۔ کنڈیکٹر نے نوّے روپے کاٹ کر دس روپے اس کی جانب بڑھا دیے۔ جب کنڈیکٹر نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے پہلے سے گنے ہوئے نوّے روپے اس کی جانب بڑھا دیے۔

سڑک پختہ تھی لیکن کئی جگہوں پر مرمت ہونے والی تھی۔ نالوں وغیرہ میں تو سڑک قریباً ختم ہو چکی تھی۔ میں زیادہ دیر باہر کے نظارے نہ کر سکا اور سامنے والی سیٹ پر سر ٹیک کر خواب کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کیسے سپنے میں مجھے رومانہ دکھائی دینے لگی۔

"میں جاگ رہی ہوں نا آپ سو جائیں۔" میرا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس نے شیریں لہجے میں پکارا۔ ہم اسی جگہ موجود تھے جہاں ہم نے کل کا پورا دن گزارا تھا۔

میں نے فکرمندی سے کہا۔ "کوئی آ نہ جائے۔"

"تو میں فوراً آپ کو جگا دوں گی۔" میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے سر بکھیرے۔

"میرا دل چائے پینے کو کر رہا ہے۔" میں نے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔

"اچھا میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" اس نے میرا سر زانو سے اٹھا کر نیچے تھیلے پر رکھنا چاہا اور اچانک اس کے ہاتھ سے میرا سر چھوٹ گیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میرا سر تھیلے پر لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔

کسی گڑھے کو عبور کرتے ہوئے ویگن کو سخت جھٹکا لگا تھا۔ دائیں بائیں نظر دوڑانے پر مجھے زیادہ تر سواریاں

اونگھتی ہوئی نظر آئیں۔ٹیپ ریکارڈ وغیرہ کی سہولت شاید ڈرائیور کے پاس موجود نہیں تھی تبھی گانے بجانے کے بے ہنگم شور کے بجائے ویگن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے میں خواب کے دلکش مناظر کو تصور میں لانے لگا۔مگر کہاں بے ڈھنگی اور سخت سیٹ کا ناپسندیدہ لمس اور کہاں رومانہ کے ریشمی اور ملائم زانو کا تازگی بھرا احساس۔

''یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔''اچانک میں نے خود کو کوسا۔کل سے میری سوچیں بے اختیار ہو کر رومانہ کو یاد کرنے لگتیں۔یہاں تک کہ تھوڑی سی آنکھ لگتے ہی وہ میرے خیالوں میں در آئی تھی۔ماہین کا دیا ہوا گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں تھا اور دل کم بخت کسی اور خوش جمال کے ہاتھوں برباد ہونے پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔میں دل ہی دل میں خود کو سمجھانے لگا۔عورت ذات کی حقیقت جب مجھ پر کھل گئی تھی پھر جان بوجھ کر نئی چوٹ کھانا کہاں کی عقل مندی تھی۔

کافی دیر دل ناداں کو نصیحتوں کا پرچار کرنے کے بعد مری آنکھ لگی اور رومانہ کود کر میری نظروں کے سامنے آ دھمکی۔سارے نصیحتیں اور سارے خیر خواہی کے مشورے دل نے بغیر کسی دلیل کے رد کر دیے تھے۔وہ خوب صورت لباس پہنے سر پر تاج سجائے ہوئے،ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے بکری کے میمنے سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔کبھی کبھی وہ ترچھی نگاہ مجھ پر بھی ڈال لیتی۔اور ایسا کرتے ہی اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوتی

''اب اس میمنے کی جان چھوڑو اور میرے قریب آؤ۔''میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔میں اس وقت اپنی مچان ہی میں لیٹا تھا۔

''نہ جی نہ۔''اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے خوب صورت دانتوں کی نمائش کی۔''مجھے جھوٹے اجنبی پر بالکل بھی بھروسا نہیں کرنا۔''

''یہ بات ہے۔''میں نے بہ ظاہر خفگی ظاہر کی۔

''ارے مذاق کر رہی تھی۔آپ تو خفا ہو گئے۔اپنے پیارے اجنبی کو بھلا میں خفا کر سکتی ہوں۔''میمنے کو گود سے اتار کر وہ سبک قدموں سے میرے مچان کی طرف آنے لگی اسی وقت جھاڑیوں اوٹ سے ماہین نکلی۔اس نے ہاتھ میں بہت بڑا اچھرا پکڑا ہوا تھا۔

”خبردار اگر میرے شانی کے قریب گئیں۔“اس نے دور ہی سے رومانہ کو للکارا۔
”یہ میرا اجنبی ہے۔“رومانہ اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔ماہین کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چھرے کی پروا اس نے بالکل بھی نہیں کی تھی۔
”میرا خیال ہے تمھاری سمجھ میں ایسے نہیں آئے گا۔“ماہین نے بلاخوف وخطر رومانہ کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔
”نہیں۔“اسے روکنے کے لیے میں نے مچان سے نیچے چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔اس کے بعد دمبہ تک میری آنکھ نہیں لگی تھی۔میں بلاارادہ اسی اوٹ پٹانگ خواب کو سوچتا رہا۔رومانہ کا یوں بار بار اپنے خواب میں آنا مجھے جو باور کرا رہا تھا میرا دماغ وہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔چند گھنٹے ایک انجان لڑکی کے ساتھ گزار کر بے وقوف دل جانے کیا امیدیں باندھ بیٹھا تھا۔جب رومانہ کی یادوں نے کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکالنے شروع کیے تو تنگ آ کر میں نے اپنی سوچوں دھارا موجودہ مشن کی طرف موڑ دیا۔
انبالہ جا کر مجھے پاکستانی جاسوس آدیت ورما سے ہدف کے بارے مکمل تفصیل پتا چلنا تھی۔اور اس کے ساتھ اس نے ڈریگنو ورائفل بھی میرے حوالے کرنا تھی۔رقم اور ضرورت کی کسی اور چیز کا بندوبست بھی آدیت ورما ہی کے ذمہ تھا۔اس کا اسلامی نام مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔البتہ آدیت ورما کیسے نہ مل سکنے کی صورت مجھے دو اور نام بھی بتائے گے تھے،لیکن ان سے اشد ضرورت کے علاوہ رابطہ کرنے کی ممانعت تھی۔یوں بھی ان میں سے ایک دہلی اور دوسرا آگرے میں تھا۔اس کے بعد دمبہ آنے تک میں اپنے ہدف کو ٹھکانا لگانے کے منصوبے سوچتا رہا۔
سنائپرز کو شروع شروع میں صرف میدان جنگ اور سرحدوں ہی پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب تو سنائپرز ہر قسم کی روایتی اور غیر روایتی جنگ میں استعمال ہو رہے تھے۔بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں تو کئی قسم کے اجرتی قاتل سنائپنگ کر کے ہی مطلوبہ افراد کو ٹھکانے لگا رہے ہیں۔خود میں بھی امریکہ میں جا کر ایک ایسی ہی کارروائی کا حصہ بن چکا تھا۔
دمبہ کا محل وقوع بھی اڑوی شہر سے مختلف نہیں تھا۔وہی پہاڑ،وہی پرشور نالہ جس میں پانی کی مقدار پہلے

سے کافی زیادہ ہوگئی تھی اور ویسے ہی گھر جو پہاڑی علاقے کا خاصا ہیں۔ہم دو پہر ڈھلے ہی وہاں پہنچ پائے تھے۔پوری رات کے پیدل اور پھر ویگن کے غیر آرام دہ سفر نے مجھے اچھا خاصا تھکا دیا تھا۔گو ایک سنائپر کے لیے تھکن، بے آرامی، مسلسل جاگنا اور بھوکا پیاسا رہنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے کہ سنائپر میں عام آدمی کے برعکس برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔یہ برداشت کچھ تو قدرتی طور پر انسان میں موجود ہوتی ہے اور کچھ اسے تربیت جلا بخشتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر آرام کرلوں۔ویگن سے اتر کر میں سمت کا تعین کیے بغیر چل پڑا۔صبح ناشتا کرنے کی وجہ سے مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔دمبہ کا بازار اوڑی شہر سے کچھ بڑا تھا۔لیکن وہاں ہوٹلز میں مجھے رہائش وغیرہ کا انتظام نظر نہ آیا۔مجبوراً مجھے ایک کھوکے والے سے معلومات لینا پڑی۔اس کے جواب کا لبِ لباب یہی تھا کہ وہاں ایسے کئی گیسٹ ہاؤس موجود تھے جہاں کرائے پر کمرے بھی دستیاب تھے اور بستر بھی۔بستروں کی بابت پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک بڑے کمرے میں کئی بستر لگے ہوتے تھے گیسٹ ہاؤس کا مالک چوبیس گھنٹوں کے لیے ایک بستر کے چالیس روپے وصول کرتا تھا۔گرمیوں میں وہاں سیاحوں کا کافی رش رہتا تھا ابھی سردیوں کی وجہ سے کوئی سیاح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

یہ مفید معلومات لے کر میں اسی کھوکے والے سے ایک گیسٹ روم کا پوچھ کر اس جانب روانہ ہو گیا۔وہ آبادی قریباً مسلمانوں ہی کی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہندو، سکھ اور دوسرے مذاہب کے افراد بھی خال خال موجود تھے۔اس کا اندازہ مجھے دکانوں کے نام پڑھ کر ہی ہو گیا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ایک ہندو کے مسافر خانے میں کمرہ لیا۔کیونکہ ایجنسیوں کے بندوں کی نظریں زیادہ تر مسلمان کے ہوٹلز اور مسافر خانوں پر گڑی رہتی ہیں اور پھر میں ایک ہندو کی شناخت ہی سے سفر کر رہا تھا۔البتہ کمرہ لینے سے پہلے میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھانا کھا لیا تھا جو کہ کسی مسلمان کی ملکیت تھا۔کیونکہ ہندو کے ہاتھ کے پکے ہوئے پر مجھے یقین نہیں تھا۔جس مذہب میں گائے کا پیشاب پینا عبادت سمجھی جائے، جو اپنے تئیں ہر پلید چیز کو گاؤ ماتا کے پیشاب کے چھینٹوں سے پوتر (پاک) کر دیں ایسے لوگوں کا پکا ہوا کھانا نری بے وقوفی ہی تو تھی۔

چھوٹے سے کمرے میں ایک چارپائی پڑی تھی۔اس پر بچھا ہوا بستر بھی اس قابل ضرور تھا کہ اس میں گھس

کر چند گھنٹے آرام کر لیے جائیں۔ کمرے سے ملحق چھوٹے سے غسل خانے اور بیت الخلا کی سہولت بھی موجود تھی۔ دروازہ اندر سے کنڈی کر کے میں لمبی تان کر سو گیا۔ میری آنکھ شام کو کھلی تھی۔ غسل کی حاجت محسوس ہو رہی تھی اور گرم پانی بھی وہاں موجود تھا۔ غسل کر کے میں نے باہر جا کر پیٹ پوجا کی اور واپس آ کر پھر سو گیا۔ اگلی صبح میں بس میں بیٹھا جالندھر کی طرف رواں دواں تھا۔ جالندھر میں میں نے بس اڈے ہی پر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر وہیں بس اڈے پر گھومتا رہا۔ ضرورت کی ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں بھی میں نے خرید لی تھیں۔ اس کے بعد میں انبالہ جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔ انبالہ جاتے ہوئے رستے کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ یا آگے والے سیٹ پر سر ٹیک کر سو گیا۔ اس سونے جاگنے کی کیفیت میں میری سوچوں کا مرکز نہ چاہتے ہوئے بھی رومانہ بنی رہی۔ البتہ جاگتے ہوئے میں اس کی سوچوں کو دماغ سے جھٹک کر مشن کے متعلق سوچنے لگتا۔

انبالہ پہنچ کر میں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرہ لے کر سو گیا۔ دوپہر ایک بجے کے قریب اٹھ کر میں تازہ دم ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ اپنا پستول میں نے وہیں کمرے ہی میں چھپا دیا تھا۔ شہر میں پستول اپنے ساتھ پھرانا مناسب نہیں تھا۔ آدیت ورما کا پتا میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ وہ کپڑے کے کاروبار سے منسلک تھا۔ مین بازار میں اس کی کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی جہاں صبح آٹھ بجے سے لے کر شام کی آذان تک وہ بیٹھا رہتا۔ اس دکان کے عقب میں اس نے کپڑے کے بڑے بڑے گودام بھی بنائے ہوئے تھے۔ انبالہ جالندھر اور ان شہروں کے مضافاتی قصبوں، دیہاتوں کے زیادہ تر کپڑے کے تاجر اسی سے کپڑا خریدتے تھے۔ اس کی دکان ڈھونڈتے ہوئے مجھے ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

دکان پر کافی رش تھا۔ تین چار لڑکے مسلسل گاہکوں کو نبٹا رہے تھے۔ میں نے آدیت ورما کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ اس کا حلیہ مجھے بڑی تفصیل سے بتا دیا گیا تھا۔ لیکن وہاں مجھے اپنے مطلوبہ حلیے کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ اس وسیع دکان کے ایک کونے میں شیشے کا چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ جس کے شیشوں سے باہر سے اندر کا منظر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے اندر بیٹھنے والی شخصیت آدیت ورما ہی کی تھی۔ اور پھر دکان کے ایک ملازم سے اس بات کی تصدیق کرتے ہی میں شیشے کے اس کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ شیشے کے اس چھوٹے

سے کیبن میں وہ ایک خوب صورت سی میز کے عقب میں گھومنے والی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔اس کی عمر مجھے پچاس سال کے قریب بتائی گئی تھی۔لیکن دیکھنے میں وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔وہ کلین شیو تھا۔اس کے سامنے دھری میز پر مختلف فائلوں کے ساتھ لیپ ٹاپ بھی نظر آرہا تھا۔میز کے سامنے تھری سیٹر صوفہ رکھا ہوا تھا۔جس پر اس دو اچھے تن وتوش کے حضرات براجمان تھے کہ ان کی موجودی میں تیسرے آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔دائیں طرف دو فوم کی کرسیاں بھی رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔میرے اندر داخل ہوتے ہی،آدیت ورمانے فوم کی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔یقیناً اجنبی افراد کی آمد اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔روزانہ کپڑے کے درجنوں بیوپاریوں کی آمدورفت وہاں ہوتی ہوگی۔

''لالا جی!......دو مہینے تو آپ کو بڑھانا ہوں گے۔''میرے نشست سنبھالتے ہی صوفے میں دھنسے ہوئے ایک فرد نے سلسلہ کلام جوڑا۔

''مکرم بھائی!......چھ ماہ کم تو نہیں ہوتے۔''آدیت ورمانے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجالی تھی۔اس کے لہجے سے ہویدا متانت اس کے اچھے کاروباری ہونے کی دلیل تھی۔

''اچھا نہ آپ کا نہ ہمارا۔سات ماہ کے اندر ہم مکمل ادائی کے ذمہ دار ہوں گے۔''اس مرتبہ مکرم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی نے زبان کھولی۔

''ہونہہ!......''گہرا سانس لیتے ہوئے آدیت ورمانے کہا۔''چلو،جیسے آپ کی اِچھا۔''(مرضی)اور ان دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

مکرم نے کہا۔''تو پھر لڑکوں کو لوڈنگ کا بتادیں۔''

آدیت ورمانے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے سامنے ٹیبل پر پڑی گھنٹی کا بٹن دبایا۔چند سیکنڈز کے اندر ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔

''مہیت!......مکرم صاحب کا یہ کپڑا لوڈ کروادو۔''آدیت ورمانے میز پر پڑی ایک فہرست اٹھا کر مہیت نامی نوجوان کی طرف بڑھادی۔

مہیت نے۔''جی لالا جی!......''کہہ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

"جی بھائی!......" مہیت کے باہر نکلتے ہی آدیت ورما میری جانب متوجہ ہوا۔

"لالا جی!......سنا ہے لٹھے کا بھاؤ کافی نیچے آگیا ہے۔کیا یہ سچ ہے؟" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مخصوص کوڈ دہرایا۔

یہ الفاظ سنتے ہی مجھے اس کی آنکھوں میں بے چینی کی لہر اٹھتی نظر آئی لیکن اس نے اپنے چہرے پر کوئی ایسا اثر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔میں دل ہی دل میں اس کے مضبوط اعصاب کا قائل ہو گیا تھا۔

"ایسی افواہیں عموماً سننے میں آتی رہتی ہیں۔" اس نے متبسم ہو کر نرم لہجے میں جوابی کوڈ دہرایا۔

مکرم اور اس کا ساتھی بھی آدیت ورما کی بات پر مسکرا پڑے تھے۔

"میں بس تصدیق کرنے ہی آیا تھا۔" میں نے نادم انداز میں اگلا کوڈ بھی دہرا دیا تھا تا کہ شک کی گنجائش بھی ختم ہو جائے۔

"ہاں ہم بھی لوگوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کو تو بیٹھے ہیں۔" آدیت ورما نے قہقہہ لگا کر کوڈ کا آخری حصہ دہرا دیا۔

"شکریہ لالا جی!......" میں نے انکسارانہ لہجے میں جواب دیا۔میں نے اپنی پہچان کرا دی تھی اس کے بعد میں آدیت ورما کی صوابدید پر تھا کہ کس طرح وہ مجھے ہدف سے متعلق معلومات پہنچاتا ہے اور کس طرح مجھے مطلوب سامان میرے حوالے کرتا ہے۔

"ویسے آپ کو کتنا لٹھا چاہیے تھا؟" آدیت ورما نے مکرم وغیرہ کی وجہ سے سلسلہ کلام جاری رکھا کیونکہ اس کے علاوہ تو میرے وہاں بیٹھنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔

"چھوٹا سا دکان دار ہوں لالا جی!......اب کیا کہوں۔"

"اچھا اس بارے بات کر لیتے ہیں، پہلے میرا خیال ہے چائے پی لیں۔" اس نے مرتبہ پھر سامنے پڑی گھنٹی بجادی۔

"آپ لوگ یقیناً چائے لینا پسند کریں گے۔" آدیت نے ان دونوں سے دریافت کیا۔

"شکریہ لالا جی!......مکرم نے بہ مشکل صوفے سے اٹھتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔اس کا ساتھی بھی اس

کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ ’’ہم اب اجازت چاہیں گے۔‘‘

آدیت نے بھی کھڑے ہو کر ان سے الوداعی مصافحہ کیا۔ اور گھنٹی کی آواز پر اندر آنے والے لڑکے کو دو چائے کا بتا کر وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔

’’آپ کا نام نہیں پوچھ سکا ہوں؟‘‘

’’کرن مہتا۔‘‘

’’کہاں ٹھہرے ہو؟‘‘ اس نے میرا اصل نام جاننے کی خواہش نہیں کی تھی۔

’’ہنومان جی ہوٹل کمرہ نمبر ستائیس۔‘‘

اس نے کاغذ پر ایک پتا لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ’’فی الحال یہاں پہنچو۔ یہ ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے دراز سے ایک چابی بھی نکال کر مجھے دے دی۔ ’’جب تک مزید معلومات نہیں ملتیں آپ نے کہیں بھی نہیں جانا۔ کھانا آپ قریبی ہوٹل سے کھا لیا کرنا۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر!‘‘ میں نے اس کی عمر اور انڈیا میں گزارے ہوئے عرصے کو دیکھتے ہوئے مودّبانہ لہجے میں کہا اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی تنبیہہ کے انداز میں اٹھا کر نفی میں سر ہلایا۔ ’’فقط لالا جی۔‘‘

’’جی لالا جی!‘‘ میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

’’اب جاؤ۔ چائے پینا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔‘‘ اس نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں ہندوؤں کے انداز میں نمستکار کہتے ہوئے وہاں سے باہر نکل آیا۔ میرے دل میں اس کی ذات کے بارے ہلکی سی کرید تو ضرور موجود تھی لیکن اپنے اندر میں اتنی جرّات مفقود پاتا تھا کہ اس سے کچھ دریافت کر سکوں۔ وہ ایک خاموش مجاہد تھا جانے کتنے سال اس نے مادر وطن کے لیے قربان کر دیے تھے۔ اپنی جوانی کے بہترین دن یوں گزار دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنے علاقے، گھر، والدین، بہن بھائیوں اور بیوی وغیرہ کے لیے اس کی حیثیت ایک مردے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ سب بڑھ کر وہ اطمینان اور سکون سے اپنے ربّ کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا تھا۔ اور گھر میں ایک ہندو بیوی کے ہوتے ہوئے شاید اسے چھپ کر بھی نماز پڑھنے کا وقت نہ ملتا ہو۔ اس جیسے کئی اور خاموش مجاہد بھی انڈیا میں موجود ہیں۔ جن کا مقصد زندگی ہی پاک وطن کے خلاف سازشوں کو بے نقاب کرنا

اور اپنے ازلی دشمن کے خلاف ایسی کارروائیاں جاری رکھنا ہوتا ہے جس سے دشمن کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔عوام کو شاید پتا نہ ہو کہ ایسے خاموش مجاہدوں کی وجہ سے جانے کتنی بار پاکستان جنگ کا ایندھن بننے سے بچا ہے۔اور کتنی بار ایسی سازشیں تکمیل سے پہلے ہی طشت ازبام ہو گئیں کہ جن پر عمل درآمد کی صورت میں پاکستان مزید کئی ٹکڑوں میں بٹ چکا سکتا تھا۔بنگلہ دیش کے بارے بھی ان مجاہدوں نے بہت پہلے ساری سازش کا پتا چلا لیا تھا لیکن ہماری عیاش اور خود غرض قیادت نے اس بارے غور وغوص کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ بلکہ ہمارے کچھ سیاست دان تو خود ایسا ہونے دینا چاہتے تھے۔ان کے نزدیک بنگلہ دیش کا علیحدہ ہو جانا ہی مفید تھا۔بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے اور اس کا میری کہانی سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔یوں بھی پاک آرمی کی اعلا قیادت کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تو میرے جیسے عام سپاہی کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔

ہوٹل سے اپنا سامان سمیٹ کر میں حساب کتاب چکتا کر کے باہر نکل آیا۔مجھے انتظار نہیں کرنا پڑا اور ہوٹل سے باہر نکلتے ہی مجھے ایک خالی رکشا مل گیا تھا۔مطلوبہ پتا چونکہ آدیت ورما نے انگلش میں لکھا تھا اس لیے میں نے خود پڑھ کر رکشا ڈرائیور کو بتا دیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں مطلوبہ کوارٹر کے سامنے تھا۔رکشے والے کو فارغ کر کے میں تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔دو کمرے،ان کے سامنے چھوٹا سا برآمدہ،باورچی خانہ،بیت الخلا اور غسل خانے پر مشتمل وہ ایک ساتھ ستھرا کوارٹر تھا۔چھوٹا سا صحن جس میں بس دو چارپائیاں پہلو بہ پہلو آسکتی تھیں۔ برآمدے میں کھڑی انڈین ساخت کی نئی بائیک دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔

بیرونی دروازہ کنڈی کر کے میں اندر گھس گیا۔بائیک کا ہیلمٹ اور چابی مجھے کمرے کے اندر میز پر پڑا نظر آ گیا تھا۔دونوں کمروں پر سرسری نظر ڈال کر میں نے ایک چارپائی کو اپنے سونے کے لیے پسند کیا اور بستر جھاڑ کر لیٹ گیا۔نا معلوم کس وقت آدیت ورما مجھے اگلی پلاننگ سے آگاہ کرتا تھا۔اس وقت تک راوی چین ہی لکھتا نظر آتا تھا۔

مجھے ہفتہ یونھی بےکار رہنا پڑا۔اس دوران میں ایک قریبی ہوٹل پر جا کر دو وقت کھانا کھاتا اور بس اس کے بعد اسی کوارٹر میں رہتا۔کیونکہ آدیت ورما نے مجھے فضول گھومنے سے منع کیا تھا۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔گیارہ بجے کے قریب کسی نے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی۔میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔یوں بھی دشمن ملک رہنے والے کو ہر وقت پکڑے جانے ہی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔پسٹل نیفے میں اڑس کر میں نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔"کون؟"

"میں ڈاکیہ ہوں جی۔"

"ڈاکیہ؟" میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔"میرے دروازے پر ڈاکیے کا کیا کام؟"

حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا گیا۔"یہ کرن مہتا صاحب کا گھر نہیں ہے؟"

"میں ہی کرن مہتا ہوں۔" میں نے بادل نخواستہ دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا۔اور باہر کھڑے اکیلے آدمی کو دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان محسوس ہوا تھا۔

"آپ کے نام رجسٹری آئی ہے مہاراج!" اس نے ایک خاکی لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے مودّبانہ لہجے میں کہا۔لفافے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔اور اس نے خفیف انداز میں مسکراتے ہوئے دائیں آنکھ میچ لی۔گویا وہ اپنا ہی آدمی تھا۔

"دھنے واد۔" (شکریہ) کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا مزید کوئی بات کیے بغیر رخصت ہو گیا۔

درواہ کنڈی کر کے میں اپنے کمرے میں پہنچا اور لفافہ چاک کر کے اندر سے لکھا ہوا کاغذ برآمد کر لیا۔

خط ہفتہ وار شائع ہونے والے کسی اردو رسالے کے مدیر کی جانب سے لکھا گیا تھا۔مضمون کچھ اس طرح تھا

"آپ کا بھیجا گیا افسانہ قابل اشاعت تو ہے لیکن اس میں رسالے کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ کانٹ چھانٹ کی گئی ہے۔خاص کر وہ سین تو بالکل ختم کرنا پڑا جس میں مرکزی کردار کو اپنے بیڈ کے نیچے کھدائی کرنے پر خزانہ ہاتھ لگتا ہے۔محترم اب خزانوں کا دور نہیں ہے امید ہے آپ کو برا نہیں لگا ہوگا۔بہ ہر حال آپ کوشش جاری رکھیں امید ہے جلد ہی کچھ بہتر کر پائیں گے۔باقی جس ہفتے آپ کا افسانہ شائع ہوگا آپ کو بہ ذریعہ چھٹی اطلاع کر دی جائے گی۔اور یاد رکھنا لکھائی کی مشق کے لیے کھلی فضا خاص کر پہاڑی علاقہ بہتر رہتا ہے۔" آخر میں انگریزی محاورہ درج تھا۔Practice makes a man perfect

ایک دفعہ تو وہ تحریر پڑھ کر میں چکرا گیا تھا کہ اس بے معنی تحریر کا مقصد کیا ہے۔ دوبارہ پڑھنے پر بیڈ کے نیچے کھدائی والے فقرے نے مجھے تحریک کی دعوت دی۔ اس کوارٹر میں ایک ہی بیڈ پڑا تھا۔ دوسرے کمرے میں دو چار پائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور اتفاق سے میں بیڈ ہی پر سو رہا تھا۔ میں نے بیڈ ہٹا کر اس کے نیچے بچھی ہوئی پلاسٹک کی چٹائی بھی ہٹا دی۔ کمرے کا فرش پختہ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ لیکن بیڈ کے نیچے ڈیڑھ فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی جگہ کی اینٹیں واضح طور پر ایسی دکھائی دے رہی تھیں کہ کسی نے اکھیڑ کر دوبارہ لگائی ہوں۔ میں جلدی جلدی وہ اینٹیں ہٹانے لگا۔ دو تین اینٹیں ہٹاتے ہی مجھے اس کے نیچے مضبوط پلاسٹک کا بکس نظر آنے لگا تھا۔ جلد ہی میں نے اکھڑی ہوئی تمام اینٹیں اٹھا کر ایک جانب رکھ دی تھیں۔ نیچے موجود پلاسٹک بکس نکال کر میں نے بے تابی سے کھولا۔ اس میں ایک سنائپر رائفل اور سنائپرز کے کام آنے والا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہاں روس کی ایجاد کردہ ڈریگنو رائفل کے بجائے اسرائیلی ساخت کی گلیل سنائپر رائفل پڑی تھی۔ خوش قسمتی سے گلیل کو بھی میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت استعمال کر چکا تھا۔ کارگر رینج دونوں رائفلوں کا ہزار میٹر ہے۔ ڈریگنو وسنائپر رائفل کی میگزین میں دس گولیاں پڑتی ہیں جبکہ غلیل کی میگزین میں بیس گولیوں کی گنجائش ہے البتہ گلیل، ڈریگنو و کے مقابلے میں وزن میں تھوڑی زیادہ ہے، لیکن کارکرگی میں اس سے بہتر ہے۔ وزن میں زیادہ کا مطلب کوئی یہ نہ لے کہ گلیل کوئی بہت ہی وزنی رائفل ہے۔ گلیل کا مجموعی وزن ساڑھے چھ کلوگرام ہے۔ یقیناً یہ کوئی اتنا وزن نہیں ہے کہ کسی سنائپر کو ساتھ پھرانے میں کوئی تکلیف محسوس ہو۔ امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران مجھے گلیل سے دو تین مرتبہ فائر کرنے کا موقع ملا تھا۔ البتہ ڈریگنو و رائفل سے میں فائر کی کافی مشق کر چکا تھا اور پاکستان سے آتے وقت مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ انڈیا میں مجھے ڈریگنو و رائفل ملے گی۔ اس کے باوجود ڈریگنو و کے بجائے گلیل کو پا کر مجھے خوشی محسوس ہوئی تھی۔

یقیناً تحریر میں موجود آخری فقرہ Practice makes a man perfect کا مطلب یہی تھا کہ مجھے مشق کی دعوت دی گئی تھی اور مشق کے لیے پہاڑی علاقہ تجویز کیا گیا تھا۔ رائفل کے ملتے ہی ساری تحریر ایک دم واضح ہو گئی تھی۔ سادہ الفاظ میں مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ میں اگلے حکم تک گلیل رائفل کے ساتھ مشق کروں۔ اسی بکس میں گلیل کا ایمونیشن بھی پڑا تھا۔ دو سو گولیاں کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک سو ننانوے گولیاں مشق کے

لیے استعمال کرسکتا تھا۔ ہدف کے لیے مجھے یوں بھی ایک ہی گولی درکار تھی۔ رائفل کے پرزوں کے ساتھ موجود اعلا کوالٹی کا سائیلنسر یقیناً مجھے چھپ کر مشق کرنے میں مدد دینے کے لیے تھا۔ بلکہ سائیلنسر کے علاوہ تو مشق کرنا ناممکن ہو جاتا۔

میں نے ایک بار رائفل کے پرزوں کو مکمل جوڑ کر اطمینان کرلیا تھا کہ رائفل صحیح کام کر رہی ہے اس کے بعد دوبارہ پرزوں کو کھول کر ایک سفری بیگ میں ڈال لیا۔

سب سے پہلے میں نے قریبی ہوٹل پر جا کر دن کا کھانا کھایا اور پھر کوارٹر پر واپس آ کر سفری بیگ کندھوں میں ڈال کر بائیک کو کوارٹر سے باہر لے آیا۔ چیک کرنے پر بائیک کی ٹینکی پٹرول سے بھری نظر آئی۔ بائیک کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ میری آمد سے ایک دو دن ہی پہلے خریدی گئی ہے۔

درمیانی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے میں شہر کے مضافات میں موجود پہاڑی سلسلے کی جانب روانہ ہو گیا۔ گھنٹے بھر بعد ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں میں بغیر کسی کی مداخلت کے مشق کرسکتا۔ سائیلنسر کی موجودی نے یوں بھی فائر سے پیدا ہونے والی آواز سے بے فکر کر دیا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے کے اندر میں نے فائر کرتے ہوئے گلیل کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کو اچھی طرح جانچ کر اپنے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اس دوران میں نے پچاس راؤنڈ فائر کیے تھے۔ آخری دس راؤنڈ میں نے ہزار میٹر کے فاصلے پر فائر کیے تھے۔ نشانے کی درستی سے مطمئن ہو کر میں نے رائفل کو کھول کر سفری بیگ میں ڈالا اور واپسی کی راہ لی۔ اپنے کوارٹر میں پہنچ کر میں نے رائفل کی بیرل اور فائر سے گندے ہونے والے پرزوں کو اچھی طرح صاف کیا گرم ابلتا پانی بھی بیرل میں ڈالا تاکہ صفائی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ یوں بھی جس ہتھیار کو فائر کے بعد صاف نہ کیا جائے وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور ایک سنائپر تو اپنے ہتھیار کی صفائی کے بارے بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔

گلیل کو صاف کر کے میں نے ہلکا سا تیل کر واپس بیگ میں ڈال دیا۔ اب مجھے مزید مشق کی ضرورت نہیں تھی۔ اگلے چار دن تک پھر آدیت ورما کی جانب سے پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ پانچویں دن میں اپنے مخصوص وقت پر دوپہر کے کھانے کے لیے کمرے سے نکلا۔ بیرونی دروازے کی کنڈی کھولنے سے پہلے میری نظر سفید رنگ کے لفافے پر پڑی جو یقیناً کسی نے دروازے کے نیچے سے اندر دھکیلا تھا۔

لفافہ اٹھا کر میں واپس پلٹ آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بے صبری سے لفافہ کھولا۔ وہاں فقط چند الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

''ہوٹل اور کمرہ نمبر کے بارے آپ جانتے ہیں۔'' اتنا لکھ کر آنے والے کل کی تاریخ اور دن کے تین بجے کا وقت درج تھا۔

اور وہاں پر میں صرف ایک ہوٹل سے واقف تھا جہاں میں نے اس شہر میں وارد ہونے کے ساتھ پہلی رات گزاری تھی۔ گویا مجھے ہنومان جی ہوٹل کمرہ نمبر ستائیس کا بتایا گیا تھا۔ یقیناً آدیت ورما کا کوڈ ورڈز میں مجھ تک پیغام پہنچانے کا مقصد یہی تھا کہ اگر اس کی لکھی ہوئی چٹھی کسی اور کے ہاتھ لگ بھی جاتی تو وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ بہر حال یہ جاسوسوں کا اپنا طریقہ کار تھا۔ اور میں نے گو جاسوس بننے کی کوئی تربیت تو حاصل نہیں کی تھی اس کے باوجود اس بارے کافی کچھ جانتا تھا کہ کمانڈوز کی زیر نگرانی میں بھی چند کورس کر چکا تھا۔ اسی طرح امریکہ میں بھی ہمیں دشمن سنائپرز کے طریقہ کار اور ان کی چالوں وغیرہ کے بارے کافی تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ ایک سنائپر دشمن ملک میں جا کر خود کو کس طرح سے دشمن کی گرفت میں آنے سے بچا سکتا ہے یہ اسباق کسی بھی طرح جاسوسی پڑھائی سے کم نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں مرتبہ آدیت ورما کے خط پڑھتے ہوئے مجھے مطلب سمجھنے میں زیادہ دقّت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اگلے دن میں مطلوبہ وقت سے گھنٹا بھر پہلے ہنومان جی ہوٹل میں پہنچ گیا تھا۔ تین بجے تک کا وقت میں نے چائے پیتے اور ہال کی دیوار پر ٹنگی بڑی ایل سی ڈی پر چلتی فلم دیکھتے گزارا۔ تین بجنے سے پانچ منٹ رہتے تھے جب میں سیڑھیوں کے ذریعے ہوٹل کی دوسری منزل پر پہنچا۔ کمرہ نمبر ستائیس میں ایک رات گزار چکا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ رقعے میں اسی کمرے کی بابت بتایا گیا تھا۔ اس کے باوجود دروازے پر دستک دیتے وقت میرے دل میں ہلکا سا دھڑکا موجود تھا۔

''دروازہ کھلا ہے، آجاؤ۔'' دستک کے جواب میں مجھے فوراً جواب موصول ہوا تھا۔

اندر گھستے ہی میری نظر صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک قبول صورت جوان پر پڑی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس، چھتیس سال کے قریب لگایا تھا۔ اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر دیسی شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس رکھے

ہوئے تھے۔ ایک گلاس آدھا بھرا ہوا جبکہ دوسرا بالکل خالی تھا۔

’’خوش آمدید۔‘‘اس نے بیٹھے بیٹھے میری جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اسے ہاتھ ملا کر میں نے بھی اس کے سامنے کرسی سنبھال لی تھی۔

وہ دوسرے گلاس میں بھی شراب انڈیلنے لگا۔

’’میں یہ نہیں پیتا۔‘‘

’’میں بھی نہیں پیتا۔‘‘ ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس نے آدھے سے زیادہ گلاس بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ’’میرا نام دھیراج ودھاوا ہے۔‘‘

’’کرن مہتا۔‘‘ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اپنا تعارف بھی کرا دیا۔ یقیناً اس بات سے ہم دونوں واقف تھے کہ ہم دونوں کے بتائے گئے نام فرضی تھے۔

’’پرسوں سہ پہر کے چار بجے عوامی پارک میں رنجیت چوپڑہ کا جلسہ ہے۔ انتخابات میں پانچ چھ ماہ پڑے ہیں لیکن اس نے اپنی انتخابی مہم شروع کر دی ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے کافی سپورٹ کیا جا رہا ہے۔ اس کی حفاظت کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ بلٹ پروف گاڑی اسے ملی ہوئی ہے، چار پانچ محافظ ہر وقت اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس کا مکان بھی پولیس کے ساتھ خفیہ ایجنسی کے بندوں کے نرغے میں رہتا ہے۔ اور ایسا پاکستانی سرکار کی طرف سے اس کے مطالبے کے بعد کیا گیا ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو اس پر ہونے والے ایک ناکام حملے کے بعد اس کی حفاظت کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ بات شاید تمھارے لیے حیرانی کا باعث بنے کہ اس پر حملہ نہ تو کسی پاکستانی جاسوس نے کیا اور نہ یہ کام پاکستان سے آئے ہوئے کسی سنائپر یا کمانڈو وغیرہ کا ہے۔‘‘

میں اس پر حملہ ہونے کی بات سے لاعلم تھا۔ لیکن اس کے ساتھ جو بات دھیراج کر رہا تھا وہ اور بھی حیران کرنے والی تھی۔

’’پھر حملہ آور کون تھا؟‘‘ میں سوال پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

’’یہ کام اس نے خود کروایا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی حفاظت کو مزید بہتر بنا دیا گیا ہے۔‘‘

’’ہونہہ!‘‘ میں گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔

''بہ ہر حال اب انتخاب میں کامیابی کے بعد تو اس کی پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں ہوگا۔یوں بھی ان انتخاب میں اس کی کامیابی ننانوے فیصد یقینی ہے۔اس کے ساتھ یہ بات بھی آپ کے ذہن میں رہے کہ اگر پرسوں کا حملہ ناکام ہوگیا تو اس کے بعد اس کی حفاظت کو مزید بھی بہتر بنادیا جائے گا۔بلکہ وہ خود بھی محتاط ہو کر قلعہ بند ہوجائے گا۔''

''منصوبہ کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''منصوبہ بنانا آپ کا کام ہے۔تفصیلات پوچھ سکتے ہیں کوئی چیز چاہیے ہو تو بتا سکتے ہیں۔''

''عوامی پارک کا نقشہ چاہیے۔''

''یہ لو۔''اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

''پارک کے اطراف میں کوئی ایسی عمارت جہاں سے سٹیج نظر آسکے۔''

''نقشے میں پارک اور اس کے دائیں بائیں کے سارے علاقے کی تفصیلات نمبر ون نے خود باریک بینی سے درج کردی ہیں۔''

''نمبر ون؟''میرے منہ سے نادانستگی میں نکلا۔

''یہ جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں ہے۔''اس نے منہ بنا کر کہا۔

''معذرت خواہ ہوں۔''میں نے جلدی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔''وہ خوش دلی سے ہنسا۔''ویسے آپ اسے جانتے ہیں۔''

اس کے کہنے کے مطابق تو آدیت ور ماہی نمبر ون تھا کیونکہ میں اس کے علاوہ وہاں کسی سے واقف نہیں تھا۔

''روسٹرم پر کوئی بلٹ پروف شیشہ وغیرہ تو نہیں لگا ہوتا۔''

''نہیں۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے اس کا دیا ہوا نقشہ کھول کر میز پر رکھا اور جائزہ لینے لگا۔وہ نقشہ بڑی عرق ریزی اور مہارت سے بنایا گیا تھا۔میں دل ہی دل میں نقشہ بنانے والے کی قابلیت کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ہر وہ سوال جو اس نقشے کو دیکھ کر کسی کے دل میں پیدا ہوسکتا تھا اس کے بارے پہلے ہی سے حاشیے پر تفصیل درج کردی گئی تھی۔سٹیج بنانے

کے لیے تین جگہوں کی نشان دہی کی گئی تھی کہ جہاں جہاں سٹیج بننے کا امکان تھا۔تینوں جگہوں کا درمیانی فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں تھا۔یقیناً آدیت ورما کو سنائپرز کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقفیت تھی۔میرے نقشہ پڑھنے کے دوران دھیراج دونوں گلاسوں کی شراب غسل خانے میں گرا کر آ گیا تھا۔گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

نقشے کو بہ غور دیکھنے کے بعد میں نے دو تین چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھیں۔جس کا دھیراج نے تسلی بخش جواب دیا تھا۔

''رائفل کا کیا کرنا ہے؟''میں نے ایک اہم سوال پوچھا کیونکہ اگر اس رائفل کی وجہ سے کسی اپنے کے پھنسنے کا ذرا بھر بھی امکان ہوتا تو مجھے اس رائفل کو بھی سنبھالنا پڑتا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔''یہ ایک قیمتی رائفل ہے اور اس کی خریداری پاک وطن کے خزانے کے پیسوں سے ہوئی ہے۔لیکن یہ آپ کی جان سے قیمتی نہیں ہے۔''

اس کے کہنے کا صاف مطلب یہی تھا کہ اگر میں خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اس رائفل کو بچا سکتا تھا تو ٹھیک، ورنہ رائفل سے زیادہ اہمیت میری اپنی تھی۔وہ میری اہمیت واضح نہ کرتا تب بھی میں اپنی اہمیت سے واقف تھا۔میری تربیت پر پاک آرمی بہت زیادہ خرچ کر چکی تھی اور مجھے کوئی نقصان پہنچنے کی صورت میں خسارہ پاک آرمی ہی کو ہونا تھا۔

''شکریہ۔''کہہ کر میں نے اعلان کی کہ میرے پاس مزید سوالات موجود نہیں تھے۔

''آپ کا بھی شکریہ۔''اس مرتبہ اس نے کھڑے ہو کر مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا کچھ پوچھنا ہو تو پرسوں دوپہر تک میں یہیں ملوں گا۔''اور میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا۔

اگلے دن صبح سویرے ہی میں بائیک پر مطلوبہ پارک کی طرف بڑھ گیا۔لیزر رینج فائینڈر (فاصلہ ناپنے کا آلہ) میں نے ایک لفافے میں ڈال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔پارک میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی لوگوں کی آمدورفت سے حوصلہ پا کر میں بھی اندر گھس گیا۔پارک کی چاردیواری کی جگہ لوہے کا مضبوط جنگلہ لگا ہوا تھا جس کی بلندی پانچ فٹ کے قریب تھی۔اور پھر جنگلے ساتھ لگے ہوئے درخت نظری دیکھ بھال کے لیے بہت بڑی

رکاوٹ تھے۔سٹیج بنانے کی جگہ پارک کے شرقی جانب تھی۔اس طرف جنگلے سے باہر کچھ دکانوں کی عقبی دیوار پڑتی تھی۔اور دکانوں کی چھت پر لامحالہ سیکیورٹی نے موجود ہونا تھا۔پارک کے مغربی جانب سڑک گزر رہی تھی اور سڑک عبور کر کے تین منزلہ شاپنگ پلازہ بنا ہوا تھا۔

شمال اور جنوب کی جانب بھی سڑک گزر رہی تھی لیکن سڑک کے پار جو عمارتیں تھیں وہاں سے سٹیج کی جگہ کو دیکھنا ناممکن تھا۔اب میرے پاس لے دے کے شاپنگ پلازہ کی چھت رہ گئی تھی۔اس کے علاوہ میں پارک ہی کے کسی درخت پر مچان بنا سکتا تھا۔لیکن ایک تو وہاں مچان بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا اور دوسرا میں چھپ کر بیٹھ بھی جاتا اور کامیابی سے اپنا کام بھی کر لیتا تب میرا بچنا جھوٹ تھا۔گویا پارک کے کسی درخت پر مچان بنانے سے بہتر تھا کہ میں خودکش دھماکا کر لیتا۔کم ازکم اس طرح رنجیت چوپڑہ کی موت تو یقینی ہو جاتی۔شاپنگ پلازہ کی دائیں طرف سے ایک چوڑی سڑک گزر رہی تھی جبکہ بائیں جانب ایک زیر تعمیر عمارت تھی جس کی پہلی منزل بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔لے دے کے وہاں فائر کے لیے مناسب جگہ شاپنگ پلازہ کی چھت تھی۔اور میرے خیال کے مطابق وہاں سنتری ضرور تعینات کرنے تھے۔پہلے تو میں نے شاپنگ پلازہ کے تین اطراف میں گھوم کر اچھی طرح جائزہ لیا۔پلازہ کی عقبی جانب ایک مارکیٹ تھی۔دائیں جانب گزرنے والی سڑک کے کنارے ایک بڑا کچرہ دان بنا ہوا تھا جس کی عقبی دیوار پلازے ہی کی دیوار تھی۔باہر سے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں اندر گھس گیا۔داخلی دروازے پر واک تھرو گیٹ بنا ہوا تھا جس سے گزر کر لوگ اندر جا رہے تھے۔لیکن مجھے اس گیٹ کو اس لیے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا کہ کافی لوگوں کے گزرنے پر وہ مخصوص سائرن بجا کر اعلان کر رہا تھا کہ متعلقہ افراد کے پاس لوہے یا دھات کی کوئی چیز موجود ہے لیکن اس کے قریب کرسیاں رکھے دو محافظ اس آواز پر کوئی دھیان نہیں دے رہے تھے۔کیونکہ واک تھرو گیٹ کی سیٹی تو موبائل فون اور موٹر سائیکل کار کی چابی وغیرہ سے بھی بج اٹھتی ہے۔البتہ کسی کے ہاتھ میں بیگ وغیرہ کی موجودی میں محافظ سرسری انداز میں چیک کر لیتے تھے۔میں نے رینج فائینڈر کو اپنے کوٹ کے اندر سے بغل میں داب لیا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بے دھڑک واک تھرو سے گزر گیا۔موٹے کوٹ کر اندر کسی کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں نے اپنی بغل میں کوئی چیز پکڑی ہوئی ہے۔

اوپر جانے کے چوڑی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔جس پر لوگوں کی آمدورفت اچھی خاصی تھی۔آخری منزل پر پہنچ کر میں چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی تلاش میں نظریں گھمانے لگا۔اور وہ کوئی ایسی چھپی ہوئی نہیں تھیں کہ میں تلاش نہ کرسکتا۔چھت کی سیڑھیاں ایک کونے میں بنی ہوئی تھیں۔ان کی بائیں جانب لکڑی کے بڑے بڑے ریک رکھے ہوئے تھے جو مختلف قسم کے سامان سے بھرے ہوئے تھے۔جبکہ دائیں جانب دیوار تھی ۔سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی بندہ دوسرے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔سیلز مین کو نگاہ میں رکھ کر میں سیڑھیوں کی جانب غیر محسوس انداز میں کھسکا اور جونھی وہ ایک گاہک کی فرمائش پوری کرنے کے لیے پیچھے کی طرف مڑا میں نے جھپاک سے سیڑھیوں پر قدم رکھ لیے۔سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا ایک دروازہ تھا۔جس کی کنڈی کے ساتھ حسب توقع ایک تالا جھول رہا تھا۔لیکن اس کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا اور اس کا بندوبست بھی میں کر کے آیا تھا۔جیب سے دومڑی ہوئی تاریں نکال کر میں تالا کھولنے لگا۔یوں بھی انھوں نے ایک واجبی سا تالا لٹکا رکھا تھا۔تالا کھول کر میں نے آہستہ سے کنڈی کھولی اور چھت پر نکل آیا۔چھت کے دائیں کونے پر پانی کی ایک بڑی ٹینکی بنی ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ہی تھوڑا بہت کاٹھ کباڑ بھی بکھرا پڑا تھا۔وہاں سے قریباً سارا پارک نظر آرہا تھا۔خصوصاً وہ جگہ جہاں سٹیج بننا تھا۔لیکن مصیبت یہ تھی کہ کل یہاں پر دو تین بندوں کی موجودی لازمی تھی۔یوں بھی ایسی جگہ کو کوئی احمق ہی نظر انداز کر سکتا تھا۔ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ شاید کل سیکورٹی کے پیش نظر یہ شاپنگ پلازہ ہی بند کر دیا جائے۔

میں چھت کے کنارے سے سٹیج کے عقب میں موجود دیوار کا فاصلہ ناپا۔وہاں تک نوسو پندرہ میٹر فاصلہ بن رہا تھا۔گویا اس لحاظ سے بھی وہ ایک مناسب جگہ تھی۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک قابل عمل منصوبہ میرے ذہن میں آیا۔گو خطرہ تو اس میں بھی موجود تھا۔ایک سنائپر کی زندگی یوں بھی ہر دم خطرات میں گھری ہوتی ہے اس لیے کسی بھی خطرے کا سامنا کرنا سنائپر کے مشن کا لازمہ ہوتا ہے۔

واپس پلازہ میں جا کر میں نے پلاسٹک کی پچاس فٹ لمبی، پتلی لیکن مضبوط رسی خریدی اور ساتھ ایک مضبوط دھاگے کا گولہ بھی خرید لیا۔دونوں چیزیں شاپنگ بیگ میں ڈال کر میں نے ہاتھ میں لٹکائیں اور سیلز مین کی

نظروں سے بچ کر دوبارہ چھت پر پہنچ گیا۔

رسی کا ایک سرا پانی کے ٹینک کے ساتھ لگی لوہے کی سیڑھی سے باندھ کر میں نے دوسرا سرا دھاگے سے باندھا اور دھاگے کے ساتھ ایک چھوٹا سا پتھر باندھ کر میں نے نیچے کچرادان میں پھینک دیا۔ رسی میں نے اس لیے نہیں لٹکائی تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنی جانب متوجہ کر سکتی تھی جبکہ اتنے باریک دھاگے کا کسی کو نظر آنا آسان نہیں تھا۔

یہ کام کر کے میں چھت سے نیچے اتر آیا۔ دوسری منزل پر مجھے عورتوں کے خوب صورت سلے سلائے سوٹ نظر آئے۔ اس وقت جانے کیوں میری آنکھوں میں رومانہ کا خوب صورت سراپا لہرا گیا۔ بے اختیار میں نے اپنی پسند کے دو سوٹ، ایک گرم اور قیمتی زنانہ سوئیٹر اور سرخ و سبز رنگ کی کانچ کی چوڑیاں بھی خرید لیں۔ گہرے سرخ رنگ کی سوئیٹر جس پر سبز رنگ کے پھول بنے تھے۔ رومانہ نے لباس بھی اسی رنگ کا پہنا تھا۔ یقیناً یہ دونوں رنگ اس کی سج دھج میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ سر جھٹک کر میں نے ان فضول خیالات سے دامن چھڑانے کی کوشش کی، لیکن یہ ایک بھونڈی کوشش ہی تھی۔ کسی کے نام پر خریداری کرنا اور اسے اپنی سوچوں سے دور بھی جھٹکنا ایک نرالا کام ہی تو تھا۔

پلازے کا داخلی اور خارجی دروازہ ساتھ ساتھ ہی تھا۔ خارجی دروازے پر خریداری کی رسید دکھا کر میں باہر آ گیا۔ پارکنگ میں جا کر میں نے اپنی بائیک نکالی، میرا رخ ہنومان جی ہوٹل کی طرف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ دھیراج وردھا مجھے اپنے کمرے ہی میں ملا تھا۔

''جی جناب!......'' میری دستک کے جواب میں دروازہ کھول کر اس نے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اپنی تصویر والا پولیس کی اسپیشل برانچ کے انسپکٹر کا کارڈ شام تک چاہیے۔ ضروری نہیں کہ بالکل اصل ہو۔ بناوٹی بھی چل جائے گا۔''

''کوئی پرمسئلہ نہیں۔ آپ ذرا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر لیں۔'' دھیراج نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

میں بالوں کو ہاتھ سے کنگھی کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تصویر نکال کر اس نے پوچھا۔

''کچھ اور؟''

''دوعدد دوا کی ٹا کی سیٹ بھی چاہیں۔''

''ٹھیک ہے۔مزید کچھ۔''

''نہیں...... یہ چیزیں لینے کے لیے میں کتنے بجے آسکتا ہوں؟''

''دو گھنٹے بعد آجانا۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر میں وہاں سے نکل آیا۔اپنے کوارٹر پر جا کر میں نے کپڑوں کے سوٹ اور سوئیٹر کو الماری میں رکھا اور اپنے منصوبے پر از سر نو غور کرنے لگا۔اس منصوبے کو سوچتے سوچتے نہ جانے پھر کیسے رومانہ میرے خیالوں میں آدھمکی۔اور میں اس سادہ اور بھولی بھالی کشمیرن کے خیالوں میں کھو گیا۔ ماہین کی بے وفائی کے بعد مجھے کسی ایسے ہی سہارے کی ضرورت تھی۔اور میں جو پھوپی جان اور ابو جان کو سختی سے شادی کے بارے انکار کر آیا تھا اب پھر سے خود کو نئے رشتے پر آمادہ پا رہا تھا۔خود رومانہ کے ساتھ بھی میرا رویہ کچھ زیادہ ہی خشک اور روکھا روکھا رہا تھا۔لیکن جونھی اس کا ظاہری بدن میری آنکھوں سے اوجھل ہوا تھا ایک دم ہی اس کی شخصیت کا ساحرانہ پن مجھے اپنی گرفت میں لینے لگا تھا۔

''جھوٹے اجنبی!......'' اس کی شوخ آواز میرے کانوں میں پڑی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''پتا ہے اس کپڑے پر میں نے اپنے ہاتھوں سے بیل بوٹے کاڑھے ہیں۔اپنا نام بھی لکھا ہے کھانا کھا کر اسے پھینک نہ دینا۔شاید اسے دیکھ کر ہی کبھی میری یاد آجایا کرے۔'' میں اپنے سفری تھیلے سے کھانے والا کپڑا نکال کر دیکھنے لگا۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ضروری تو نہیں تھا کہ میری واپسی اسی رستے سے ہو۔شاید آدیت ورما نے میرے لیے کوئی دوسرا راستہ چنا ہو۔اور ان حالات میں کسی سینئر کے احکامات پر عمل نہ کرنا خود کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف تھا۔

''کیا رومانہ کی وجہ سے میں دوبارہ سرحد عبور کرنے کی جرّات کر سکوں گا؟'' اپنی اس سوچ کا جواب نفی میں تھا۔کیونکہ سرحد عبور کرنے کے لیے مجھے پاک آرمی کی اجازت درکار تھی۔اور میرا کوئی بھی سینئر اس بات کی ہرگز

اجازت نہ دیتا کہ میں ایک لڑکی کی خاطر انڈیا کی سرحد عبور کرتا۔ وہ میرے لیے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہوتی میرے سینئرز کے لیے ایک عام لڑکی ہی تھی۔

''مگر وہ میرے لیے کب اتنی ضروری ہوئی ہے۔'' میں نے اپنی پاگل ہوتی سوچوں سے پوچھا۔ اور جواب ڈھونڈنے کے لیے میرے دماغ نے ان لمحات کو میری نظروں کے سامنے لا پھینکا جو اس کی معیت میں گزرے تھے۔

''کیا اس کے کندن بدن کی جھلک نے مجھے اس کی ذات میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا ہے؟'' میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب وہ اپنا پھٹا گریبان لیے میرے سامنے بے پرواہی سے کھڑی تھی۔ لیکن میرے دل نے اس سوال کو درخور اعتناء نہ جانا۔ یقیناً یہ وجہ نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر نہ تو اس وقت میرے دماغ میں اس وقت کوئی غلط خیال آیا تھا اور نہ ابھی آ رہا تھا۔

''پھر؟'' میری خود احتسابی جاری رہی۔

''اپنا خیال رکھنا میرے اجنبی!............ آپ کا، مجھے ناپسندیدہ اجنبی سمجھ کر بھی تم کہہ کر مخاطب کرنا، اس آپ سے کئی گنا زیادہ عزیز ہے...... شاید میں آپ کی نفرت برداشت نہ کر پاؤں............ اور یاد رکھنا میرا نام رومانہ ہے...... رومانہ ہے......'' میں بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

''ہاں یاد ہے کہ تم رومانہ ہو۔'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

ان خوشگوار یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں اپنے منصوبے پر نظر ثانی کرنے لگا۔ گھڑی پر نگاہ دوڑانے پر مجھے دو گھنٹے پورے ہوتے نظر آئے۔ میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ہنومان ہوٹل کے کمرہ نمبر ستائیس میں داخل ہو رہا تھا۔ دھیراج نے میری مطلوبہ چیزیں میری طرف بڑھا دیں۔ دو واکی ٹاکی سیٹ اور میرا تعلق پولیس کی اسپیشل برانچ سے ظاہر کرنے والا کارڈ۔ اس پر میری تصویر بھی چسپاں تھی۔ کارڈ بنانے والے نے میرے کپڑوں والی تصویر کو وردی پہنا دی تھی جس کے کندھوں پر انسپکٹر رینک کے سٹار چمک رہے تھے۔ آج کل یوں بھی کمپیوٹر نے اس کام کو نہایت آسان کر دیا ہے۔

''اب ایسا ہے کہ کل جونھی رنجیت چوپڑہ کی تقریر شروع ہوتی ہے آپ واکی ٹاکی کو آن کر کے عوامی پارک

کے سامنے موجود پلازہ کے پاس پہنچ جانا۔اور.........‘‘میں اسے تفصیل سمجھانے لگا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘میرے بات ختم ہوتے ہی اس نے پر جوش انداز میں سر ہلا دیا تھا۔وہاں سے میں نے مارکیٹ جاکر پچاس ساٹھ فٹ مضبوط نائیلون کی رسی خریدی اور واپس کوارٹر پر پہنچ گیا۔شام تک کا وقت میں نے کوارٹر میں گزارا۔شام کی آذان سن کر میں نے نماز پڑھی اور اللہ پاک سے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے دعا کی۔اس کے بعد گلیل سنائپر رائفل اور دوسرے ضروری سامان کو سفری بیگ میں ڈال کر میں دوبارہ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔شاپنگ پلازہ رات کے نو بجے بند ہوتا تھا۔سب سے پہلے میں نے پلازے کے دائیں کونے میں موجود کچرہ دان کے قریب جاکر موٹر سائیکل روکی اس جگہ پر تقریباً اندھیرا چھایا ہوا تھا۔مطلوبہ دھاگا ڈھونڈنے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔دھاگے سے پکڑ کر میں نے پلاسٹک کی رسی نیچے کھینچ لی۔رسی کا سرا مضبوطی سے سفری بیگ کے ساتھ باندھ کر میں نے بیگ کو کچرے دان میں رکھا اور اوپر بھی تھوڑا بہت کچرہ ڈال دیا۔رات کے وقت یوں بھی کسی کی نظر اس طرف نہیں پڑنا تھی۔

اس سے فارغ ہوکر میں نے اپنی موٹر سائیکل شاپنگ پلازہ کے سامنے بنی پارکنگ میں کھڑی کی اور اندر گھس گیا۔صبح کے مقابلے میں رات کے اس وقت وہاں رش زیادہ تھا۔مجھے چھت پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔پہلی فرصت میں میں نے پلاسٹک کی رسی کی مدد سے اپنا بیگ اوپر کھینچا اور پلاسٹک کی رسی اور بیگ کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں چھپا کر شاپنگ پلازہ سے باہر نکل آیا۔واکی ٹاکی میں نے اپنے پاس ہی رہنے دیا تھا۔میرا اس دن کا کام ختم ہوگیا تھا۔اگر اگلے دن شاپنگ پلازہ نے بند بھی ہونا تھا تو یقیناً دوپہر کے بعد ہی ہوتا۔ویسے امید یہی تھی کہ شاپنگ پلازہ بند نہ ہوتا کیونکہ رنجیت چوپڑہ کوئی صدر یا وزیراعظم نہیں تھا کہ اس کی سیکورٹی اتنی زیادہ سخت رکھی جاتی۔پلازے کی چھت پر دوتین سنتری چھوڑ کر انھوں نے پارک گھیرنے پر زیادہ توجہ دینا تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں آٹھ بجے اپنے کوارٹر سے نکل آیا تھا۔صبح ہی سے سٹیج بننا شروع ہوگیا تھا۔اس کے ساتھ پارک کے داخلی دروازے پر بھی پولیس کے دو سپاہی تعینات کر دیے گئے تھے۔گو وہ سپاہی آنے جانے والوں سے کوئی خاص تعرض نہیں کر رہے تھے اس کے باوجود میں نے پارک میں گھسنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔دوپہر کا کھانا

شاپنگ پلازہ کے عقبی سمت میں موجود ہوٹل میں کھا کر میں نے اسی ہوٹل کی پارکنگ میں اپنی موٹر سائیکل کھڑی کر کے تین بجے کے قریب شاپنگ پلازہ میں گھس گیا۔ایک سیلز مین سے چمڑے کے مضبوط دستانے خریدتے ہوئے میں نے سرسری انداز میں پلازے کے بند ہونے کے بارے پوچھ لیا تھا۔

''نہیں سر!......ہمیں تو ایسے کوئی احکام موصول نہیں ہوئے۔''اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ساڑھے تین بجے مجھے پولیس کے دو سپاہی سیڑھیوں سے چھت پر چڑھتے دکھائی دیے۔گویا میرا اندازہ درست تھا۔چار بجے کے قریب لاؤڈ سپیکر کی آواز وہاں آنے لگی تھی لیکن وہ رنجیت چوپڑہ نہیں تھا۔کوئی دوسرا آدمی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔سوا چار بجے وہ خود سٹیج پر پہنچا۔اس کی آواز میں نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہی کمینہ ہے۔بہت اچھا ساؤنڈ سسٹم لگایا گیا تھا کہ اس کی آواز شاپنگ پلازہ کے اندر بھی نہایت واضح سنائی دے رہی تھی۔اس کی تقریر شروع ہوتے ہی میں نے چھت کا رخ کیا۔اس مرتبہ اوپر جاتے ہوئے میں نے سیلز مین کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''جی سر!''مجھے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھاتے دیکھ کر سیلز مین نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''انسپکٹر ارجن سنگھ راٹھور۔''میں نے جیب سے سروس کارڈ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور اس کا جواب سنے بغیر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

پولیس کے دونوں سپاہی اکٹھے کھڑے زور و شور سے کسی دوشیزہ کے لباس پر تبصرہ کر رہے تھے۔میرے قدموں کی چاپ پر دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''یہاں پر تم دو آدمی ہو بس؟''ان کے سوال کرنے سے پہلے میں نے سوال جڑ دیا۔

''جی ہاں!......لیکن آپ کون؟''ان میں سے ایک نے محتاط انداز میں میرا تعارف مانگا۔

''اس کے سوال کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے میں نے واکی ٹاکی نکال کر پکارنے لگا۔

''انسپکٹر ارجن فار ایس پی سریش اوور!''

''سریش فار انسپکٹر ارجن سینڈ یور میسیج اوور!''مجھے دھیراج کی واضح آواز سنائی دی۔یہ دو چھوٹے فقرے ہی ان دونوں کو چوکنا کرنے کے لیے کافی تھے۔

”سر!......اسپیشل برانچ کے آدمی اب تک نہیں پہنچے اور میں یہاں اکیلا ہوں اوور۔“

”سوری انسپکٹر ارجن!......میں نے تین آدمی بھجوا دیے ہیں شاید پندرہ بیس منٹ تک تمھارے پاس پہنچ جائیں اوور۔“

”ٹھیک ہے سر!......لیکن اب پلازے کے داخلی دروازے پر کس کو کھڑا کروں اوور؟“میں نے پریشانی بھرے انداز میں جواب دیا۔

”کیا وہاں پولیس کا کوئی سپاہی موجود نہیں ہے اوور؟“دھیراج میرے بتائے ہوئے الفاظ بہت خوب صورتی سے بول رہا تھا۔

”یہاں چھت پر دو سپاہی ڈیوٹی پر موجود ہیں۔اور نیچے پارک کے گیٹ پر بھی تین کے قریب سپاہی موجود ہیں۔باقیوں نے سٹیج کو گھیرا ہوا ہے اوور۔“

”ایسا کرو دس پندرہ منٹوں کے لیے ان چھت والے سپاہیوں کو گیٹ پر کھڑا کر دو۔انھیں سمجھا دو کہ کسی کو بھی پلازے کے اندر داخل نہ ہونے دیں۔اس دوران تم خود چھت پر ہی موجود رہنا اوور۔“

”ٹھیک ہے سر اوور اینڈ آل۔“

دھیراج سے بات ختم کر کے میں ان دونوں سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔گو دونوں نے ہماری بات چیت سن لی تھی اس کے باوجود میں نے دوبارہ سے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔

”ہیلو، میں انسپکٹر ارجن سنگھ راٹھور فرام سپیشل برانچ!“میں نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”سر سپاہی سنیل داس!“میرا نام پوچھنے والے نے جلدی سے میرا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر اپنا نام بتایا۔

”اور میں ارلیش گپتا سر!“دوسرے نے بھی مودّب انداز میں مجھے ہاتھ ملایا۔

”اچھا آپ لوگوں کے ذرا سے تعاون کی ضرورت تھی، گو یہ آپ لوگوں کی ڈیوٹی نہیں بنتی لیکن سرکار کا ملازم ہونے کے ناتے ہمارا کام تو ایک ہی ہے نا۔“

”ٹھیک ہے سر!......ہم نے آپ کی تمام باتیں سن لی ہیں۔آپ حکم کریں کرنا کیا ہے؟“ارلیش گپتا نے

جلدی سے سر ہلایا۔

''نیچے داخلی دروازے پر اتنی دیر رکنا ہے کہ جب تک سپیشل برانچ کے بندے آپ کے پاس نہیں پہنچ جاتے ۔وہ ہیڈ کوارٹر سے نکل چکے ہیں،بس دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے۔آپ کا کام بس اتنا ہے کہ کسی بھی آدمی کو پلازے کے اندر نہیں آنے دینا۔البتہ باہر نکلنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے سر!'' دونوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھے سیلوٹ کیا۔

''ویسے آپ اپنے کسی سینئر سے اجازت لینا چاہتے ہیں بے شک پوچھ لیں۔''میں انھیں کسی بھی قسم کے شک کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''نہیں سر!......ایسی کوئی بات نہیں۔اگر کسی سینئر نے باز پرس کر بھی لی تو آپ یہیں موجود ہیں نا۔''

''گڈ۔اور یاد رکھنا کسی کو بھی اندر نہ آنے دینا۔''

''آپ بے فکر رہیں سر!'' وہ دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے رخصت ہوتے ہی میں نے کسی بھی مداخلت سے بچنے کے لیے فی الفور چھت کے دروازے کی کنڈی باہر سے لگائی اور اپنے بیگ کی طرف بڑھ گیا۔سب سے پہلے میں نے بیگ سے نائیلون کی مضبوط رسی نکالی اور پانی کی ٹینکی کے ساتھ گڑی سیڑھی سے اس کا ایک سرا باندھ کر دوسرا سرا پلازے کی عقبی جانب لٹکا دیا ۔عقبی جانب دکانوں کی چھت پلازے کی دیوار سے متّصل تھی۔رسی چھت سے سات آٹھ فٹ اوپر ہی ختم ہوگئی تھی لیکن میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

اپنے فرار کا راستہ منتخب کرتے ہی میں نے جلدی جلدی گلیل رائفل کے پرزے جوڑے اس کی مزل پر سائیلنسر چڑھایا اور ایک مناسب جگہ پر رائفل کی دو پائی منڈیر پر لگا دی۔چھت کی منڈیر تین چار فٹ اٹھی ہوئی تھی اس لیے میں لیٹ کر فائر نہیں کر سکتا تھا۔سٹیج کا فاصلہ ناپ کر میں نے ایلیویشن ڈرم کو مطلوبہ رینج کے مطابق گھمایا اور ٹیلی سکوپ سائیٹ سے رنجیت چوپڑہ کے سر کا نشانہ لینے لگا۔ہوا کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی اور سورج میری پشت پر تھا یہ میرے لیے ایک بہترین صورت حال تھی۔

''میں بھارت ماتا کا ادنا سا سیوک ہوں،ساری جنتا کا سیوک ہوں ....''اس کی بکواس جاری تھی

۔اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے بکواس کرنے کی زیادہ مہلت دیتا۔

سانس روک کر میں نے ٹریگر دبا دیا۔ایک ہلکی سی۔''ٹھک۔'' ہوئی اور وہ پیچھے کو گر گیا۔ایک لمحہ کے لیے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہین آیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔اس کے بعد کہرام مچ گیا تھا۔ایک دم شور کی آواز اٹھی۔میرے پاس وہ تماشا دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔میں نے فوراً نیچے بیٹھ کر رائفل کو کھولنے لگا۔اس کام میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔رائفل کو بیگ میں رکھ کر میں بھاگتا ہوا پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچا اور وہ بیگ نیچے کچرہ دان میں پھینک دیا۔کچرہ دان کے ساتھ کھڑی چھوٹی سی وین میں دھیراج موجود تھا۔میں خود جلدی سے پلازے کی عقبی جانب بڑھ گیا۔چمڑے کے دستانے میں نے دوڑتے ہوئے ہاتھ میں دال لیے تھے۔رسی کو پکڑ کر میں نے ہاتھ ہلکے سے ڈھیلے رکھے اور تین چار سیکنڈ میں میں پلازے کی عقبی جانب موجود دکان کی چھت پر تھا۔دو تین چھتوں سے گزر کر میں ایک گلی میں اترا اور تیز قدموں سے ہوٹل کی جانب چل پڑا۔گلی میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔مجھے چھت سے اترتے دیکھ کر ایک دو تین آدمیوں نے مجھے حیرانی بھری نظروں سے گھورا لیکن میں ان کی نظروں کی پروا کیے بغیر چلتا رہا۔ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہوتے وقت مجھے پولیس کی دو تین جیپیں ہوٹل کے سامنے سے گزر کر پارک کی طرف جاتی دکھائی دیں۔اسی وقت ایک ایمبولینس بھی سائرن بجاتی ہوئی وہاں سے گزری۔میں نے موٹر سائیکل کا ہنڈل لاک کھول کر ہیلمٹ سر پر رکھا۔اور اطمینان بھرے انداز میں موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے وہاں سے باہر نکل آیا۔کوارٹر پر پہنچتے ہی میں نے ٹی وی آن کر لی تھی۔رنجیت چوپڑہ کی ہلاکت کی بریکنگ نیوز بڑے زور شور سے چل رہی تھی۔گولی اسے ماتھے میں لگی تھی۔یوں بھی اس وقت کئی کیمرے اس کے چہرے کو فوکس کیے ہوئے تھے۔گولی لگ کر پیچھے گرنے کا منظر نہایت صفائی سے فلم بند ہوا تھا۔نیچے گرتے ہی اس کا ہاتھ پاؤں جھٹکتے ہوئے تڑپنا مجھے کافی سکون دے گیا تھا۔اس کمینے کی وجہ سے جانے کتنے مظلوم اور بے قصور یونھی تڑپے تھے۔یہ منظر مختلف چینلز پر بار بار دکھایا جا رہا تھا۔البتہ اس کی لاش کی فوٹو نہیں دکھائی جا رہی تھی۔

ایک اینکر بڑے سخت الفاظ میں اس کارروائی کو کسی پاکستانی دہشت گرد سے منسوب کر رہا تھا اور یہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔اس کی بات کا لبِّ لباب یہی تھا کہ پاکستانی حکومت نے رنجیت چوپڑہ پر خوامخواہ بم دھماکے میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اب اس خود ساختہ الزام کو سچا ثابت کرنے کے لیے دہشت گردی کی یہ کارروائی عمل

میں لائی گئی۔

رات آٹھ بجے کی خبروں میں پولیس کی بے مثال کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی، انھیں وہ رسی وغیرہ مل گئی تھی ۔غلیل کا فائرشدہ کیس بھی انھیں مل گیا تھا۔ یقیناً وہاں ڈیوٹی پر موجود دونوں سپاہی زیرعتاب آ گئے ہوں گے۔

اگلے دن کی خبروں میں دونوں سپاہیوں کی کہانی تک بھی کسی تیز طرار رپورٹر نے رسائی کرلی تھی۔ سپیشل برانچ کے انسپکٹر ارجن سنگھ راٹھور کی تلاش بڑی تندہی سے جاری تھی۔ میرا حلیہ بھی تفصیل سے بتایا جا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، درمیانہ قد کالے گھنے بال عمر بائیس سے پچیس سال کے درمیان، سڈول جسم، گندمی رنگت، اٹھی ہوئی ستواں ناک باریک مونچھیں۔ چوڑی پیشانی وغیرہ وغیرہ۔ میرے پہنے ہوئے لباس کو بھی انھوں نے تفصیل سے بیان کیا تھا۔ اپنے حلیے کا سن کر مجھے کافی دلچسپ لگا تھا۔ شام تک ہاتھ سے بنی ہوئی میری ایک تصویر بھی جاری کردی گئی تھی۔ اور وہ تصویر قریباً نوے فیصد مجھ سے مماثلت رکھتی تھی۔ میں نے دیر کیے بغیر سب سے پہلے تو اپنی داڑھی مونچھیں صاف کیں۔ اپنا لباس اتار کر ایک شاپر میں ڈالا اور شام کو کھانے کے لیے جاتے وقت ان کپڑوں پر پٹرول چھڑک وہ ساتھ لے گیا۔ رستے میں ایک کچرہ دان موجود تھا۔ گلی کے خالی ہونے کا یقین کر کے میں نے شاپر کو کچرہ دان میں پھینک کر تیلی دکھا دی۔ پٹرول نے آگ پکڑنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں تیزی سے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔

واپسی پر کوارٹر کا دروازہ کھولتے ہی مجھے ایک سفید لفافے میں بند ایک خط زمین پر پڑا دکھائی دیا۔ دروازہ کنڈی کے کر کے میں نے اسے اٹھالیا۔

”شاباش آپ تو بہت اچھے قلم کار ہیں۔ اتنی مہارت سے کم لکھاری ہی قلم چلاتے ہوں گے۔ بہرحال فی الحال آرام کریں۔ افسانے کی اشاعت کے بارے آپ کو جلد ہی مطلع کر دیا جائے گا۔“

اس خط کے بعد دس دن تک مجھے وہیں آرام کرنا پڑا۔ رنجیت چوپڑہ کی ہلاکت چند دن سے زیادہ خبروں میں نہیں ٹک پائی تھی۔ آج کی عوام ہر آن نئی خبروں کی متلاشی رہتی ہے۔ جلد ہی کئی قسم کی بریکنگ نیوز نے اس خبر کو نیچے دبا دیا تھا۔ ہفتہ بھر خبریں پڑھنے والے ایک دو لائن رنجیت کے قاتل کے بارے پڑھ دیتے بعد میں وہ بھی ختم ہوگیا۔ البتہ اس بارے دو تین خصوصی پروگرام ضرور چلائے گئے جس میں بیٹھے تبصرہ نگاروں نے پاکستان کے

بارے خوب ہرزہ سرائی کی۔

گیارہویں دن میں دھیراج ودھاوا کے سامنے ہنومان جی ہوٹل کے اسی کمرے میں موجود تھا۔سرسری لہجے میں میرے کام کی تعریف کرتے ہوئے اس نے مجھے تھوڑی سی رقم پکڑائی اور واپس جانے کا مژدہ سنایا۔واپس جانے کے لیے رستے کا انتخاب میری صواب دید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔اور یہ اجازت ملتے ہی میری آنکھوں کے سامنے رومانہ کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔

’’چھوٹے اجنبی!......کیا اسی رستے سے واپس آؤ گے۔‘‘اس کا معصومیت بھرا شوخ فقرہ میرے کانوں میں گونجا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

’’کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا سکتے ہو۔‘‘دھیراج مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

’’شکریہ۔‘‘اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں جانے کے ارادے سے کھڑا ہو گیا۔

’’ویسے اگر آپ مزید یہاں رہنا چاہتے ہیں تو ممانعت کوئی نہیں ہے۔‘‘میری معیت میں اس نے بھی نشست چھوڑ دی تھی۔

’’قید میں کون رہنا چاہتا ہے مہاراج!‘‘میں مزاحیہ انداز اپناتے ہوئے آہستہ سے ہنسا۔وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

واپسی کا راستہ مجھے ازبر تھا۔کوارٹر کو تالا لگا کر میں نے چابی دھیراج کی بتائی ہوئی مخصوص جگہ پر رکھی اور بس اڈے کی جانب روانہ ہو گیا۔جالندھر جانے والی بس مجھے بڑی آسانی سے مل گئی تھی۔شام تک میں جالندھر پہنچ گیا تھا۔رات کو ایک ہوٹل میں کمرہ لے کر میں نے آرام کیا اور اگلے دن صبح دمبہ جانے والی ویگن میں بیٹھ گیا۔رات کو آٹھ نو بجے تک میں اوڑی شہر پہنچ گیا تھا۔انبالہ میں مجھے تقریباً بیس دن لگ گئے تھے۔فروری کا مہینا اختتام پذیر ہو گیا تھا۔میں نے سپورٹس شوز ہی میں آگے جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب برف تقریباً ختم ہو چکی تھی۔بس بلند و بالا چوٹیوں پر یا ایسے کونوں کھدروں میں جہاں سورج کی روشنی نہیں پڑتی تھوڑی بہت برف نظر آجاتی تھی۔زیادہ تر رستے صاف تھے۔اور پھر مجھے مسلسل چڑھائی بھی تو چڑھنا تھی۔نیچے اترتے وقت تو آدمی آسانی سے اتر سکتا ہے چڑھائی چڑھنے کے لیے کافی زور لگتا ہے۔اپنا سفری تھیلا پشت پر لٹکا کر میں چل پڑا۔آتے وقت

مجھے اس رستے پر سفر کرنا محسوس ہی نہیں ہوا تھا لیکن واپسی کے لیے مسلسل چڑھائی چڑھنا بہت مشکل تھا۔ رومانہ کے گاؤں سے اوڑی شہر تک مجھے پوری رات لگ گئی تھی۔ لیکن اب یقیناً میں ایک رات میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے قدموں کی رفتار ہلکی رکھی تھی۔ گو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر رومانہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ اس کے لیے خریدی ہوئی سوئیٹر اور کپڑوں کے دو سوٹ میرے سفری جھولے میں موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے جھوٹے اجنبی کے یہ تحائف اسے پسند ضرور آنے تھے۔ صبح ہونے کے قریب میں بہ مشکل اس جگہ تک پہنچا تھا جہاں میں نے آتے وقت کھانا کھایا تھا۔ وہ جگہ دن گزارنے کے لیے بہترین تھی۔ کھانے کے لیے میرے پاس بسکٹ اور خشک میوہ موجود تھا۔ پیٹ بھر کر میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے جسم پر میں نے گرم چادر لپیٹ لی تھی ۔لیکن سردی کی وجہ سے مجھے نیند نہ آسکی مجبوراً میں گھٹنوں میں سر دے کر اونگنے لگا۔ آگ میں نے جان بوجھ کر نہیں جلائی تھی کہ ہلکا سا خطرہ مول لینا بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ اگر وہاں میری موجودی کی ذرا سی بھنک بھی انڈین آرمی کو پڑ جاتی تو میرے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ گو مجھے خطروں کی اتنی پروا نہیں تھی لیکن ایسی صورت میں شاید میرا رومانہ سے ملنا بھی کھٹائی میں پڑ جاتا جو مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ دھوپ چڑھنے پر مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ ہلکی سی آواز سے کھلی۔ وہ ایک لومڑ تھا میرے بدن میں حرکت ہوتے دیکھ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا ۔سورج کا سفر جاری تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی میں وہاں سے چل پڑا۔ اس مرتبہ میرے سفر کا اختتام اسی جگہ پر ہوا جہاں میری رومانہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان جھاڑیوں میں اب تک وہ مچان بنی ہوئی تھی۔ میں نے بے دھڑک ٹارچ روشن کر کے مچان کا جائزہ لیا کیونکہ اتنے گھنے جنگل میں اول تو ٹارچ کی روشنی کے دور سے دیکھے جانے کا خطرہ کم تھا۔ اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تب بھی گاؤں قریب تھا اور گاؤں کے لوگوں کا وہاں آنا جانا لازماً رہتا ہوگا۔ یوں بھی صبح صادق طلوع ہو چکی تھی۔ میں چادر اوڑھ کر مچان میں بیٹھ گیا۔ سورج نکلنے تک میں سردی کی وجہ سے نہیں لیٹ سکا تھا اور سورج نکلنے کے بعد کسی کو دیکھنے کی چاہت میں آنکھیں بند نہیں کر پایا تھا۔ وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ انتظار ہمیشہ انسان کو کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں بھی بے چین ہونے ساتھ سخت بوریت محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ بس جلدی سے رومانہ آ جائے اور پھر وہ آ گئی۔ میرے کانوں میں ہلکی سی

گھنگھناہٹ پڑی۔رومانہ نے چند بکریوں کے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ان کے بجنے کی آواز سنتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔پہلی بکری جس پر میری نظر پڑی وہ وہی تھی جس کا دودھ نکال کر رومانہ نے میرے لیے چائے بنائی تھی۔میں پراشتیاق نگاہوں سے اس جانب دیکھتا رہا۔وہ جھاڑیوں کی اوٹ سے طلوع ہوئی۔وہی لباس،وہی حلیہ،اس کے دائیں بائیں گھومتا سفید میمنا پہلے سے تھوڑا بڑا ہوگیا تھا۔اس کا رخ اسی مچان کی طرف تھا۔مجھے خاصی حیرانی ہوئی کہ وہ دائیں بائیں توجہ دیے بغیر یوں مچان کی طرف کیوں بڑھتی چلی آرہی ہے۔اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں بھی مچان سے باہر نکل آیا۔

رنجیت چوپڑہ کو قتل کرنے کے اگلے دن میں نے کلین شیو کروالی تھی۔لیکن اس بات کو بھی قریباً دو ہفتے ہونے والے تھے۔میری داڑھی اب قریباً اتنی ہی ہوگئی تھی جتنی کہ پہلے تھی۔

جھاڑیوں کے ملنے پر وہ ٹھٹک کر رکی اس کی آنکھوں میں پراشتیاق حیرانی تھی۔جونھی میں مچان سے نکل کر سیدھا کھڑا ہوا اس نے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا پھینکا اور اتنی تیزی سے میرے جانب بڑھی کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا،اگلے لمحے وہ مجھ سے لپٹ چکی تھی۔

”میرے اجنبی!“اس کی کومل آواز نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔”اتنی دیر کردی۔“اس نے میری چھاتی پر سر رکھ دیا۔

میں کوشش کے باوجود اپنی بانہوں کو اس کے گرد گھیرا ڈالنے سے روک نہیں سکا تھا۔جانے کتنی دیر ہمیں اس حالت میں گزر گئی۔میرا دل ہی سیر نہیں ہورہا تھا۔یقیناً یہی حالت اس کی تھی کہ وہ بھی علیحدہ ہونے کو تیار نہیں تھی۔پہلے فقرے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا میری زبان بھی گنگ تھی۔

کافی دیر کے بعد اس کی سریلی آواز نے ایک بار پھر میرے کانوں میں جلترنگ بجائے۔”مجھے یقین تھا کہ آپ اسی رستے سے لوٹیں گے۔“

”یقین کی وجہ؟“میں نے دایاں ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔

اس نے پلکوں کی چلمن اٹھا کر اپنی ساحرانہ آنکھوں سے مجھے مسحور کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہو جواب دیا۔”کیونکہ میں روزانہ خواب میں تمھیں لوٹتے دیکھا کرتی تھی۔“

میں ہنسا۔ ''اچھا خواب بھی دیکھتی ہو۔''

''ہاں ...... بہت زیادہ ...... لیکن صرف اپنے اجنبی کے۔'' اس نے دوبارہ اپنا سر میری چھاتی پر دھر دیا شاید اس کا علیحدہ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''کیوں تمھارے اجنبی میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''پتا نہیں۔'' وہ بھول پن سے بولی۔

''اچھا پتا ہے میں تمھارے لیے تحفہ لے کر آیا ہوں۔''

''صحیح کہا۔ آپ میرے لیے قدرت کا ایک عظم تحفہ ہی تو ہیں۔''

''میں تمھارے لیے چوڑیاں لے کے آیا ہوں۔'' میں نے اس کے کان سے منہ لگا کر کہا۔ یہ بات میں اپنا منہ اس کے کان سے لگائے بغیر بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن پھر میرے ہونٹوں کو وہ حلاوت تو نصیب نہ ہوتی جو اس طرح کہنے میں ہوئی تھی۔

''سچ میں۔'' اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں پوچھا۔

''کیوں تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو؟''

میری بات پر پورا جنگل گنگنا اٹھا تھا۔ یا شاید صرف وہ ہنسی تھی اور مجھے یونھی محسوس ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے سمجھ میں آ گیا، کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کی معنی خیز ہنسی کے جواب میں میں جلدی سے بولا۔

''ویسے چوڑیاں دکھا کر آپ مجھے غلط بھی تو ثابت کر سکتے ہیں۔'' وہ شوخی بھرے لہجے میں بولی۔

''تم چھوڑو گی تو ایسا کر پاؤں گا نا۔''

''اتنا ہی تنگ ہو رہے ہو تو یہ لو۔'' مجھے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ منہ بنا کر پیچھے ہٹی۔

مجھے لگا کہ میں نے خود اپنے پاؤں پر کلھاڑی مار دی ہے۔ لیکن پھر میں نے خود میں اتنی ہمت مفقود پائی کہ اسے دوبارہ تھام لوں۔ مچان میں پڑا سفری تھیلا اٹھا کر میں نے رومانہ کے لیے لائے ہوئے تحائف باہر نکال لیے۔

کپڑوں کے دو جوڑے، سوئیٹر اور چوڑیاں۔ تمام چیزیں دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''اب بتاؤ جھوٹا ہوں یا سچا۔''

''جھوٹا......'' اس نے شوخ مسکراہٹ میرے جانب اچھالی۔ ''کہا تھا کہ چوڑیاں لایا ہوں اور اس کے ساتھ کپڑے اور سوئیٹر بھی تو ہیں نا۔''

''پسند آئے۔''

میری بات کا جواب دیے بغیر وہ ایک قمیص کو اپنے سامنے لٹکا کر پوچھنے لگی۔ ''کیسے لگ رہی ہوں۔''

میں بے اختیار بولا۔ ''تمھیں خوب صورت لگنے کے لیے کسی سجاوٹ کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے یہ دونوں رنگ بہت پسند ہیں؟'' ایک قمیص لپیٹ کر پتھر رکھتے ہوئے اس نے دوسری قمیص اپنے سامنے پھیلا لی۔

''پتا نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا مجھے چوڑیاں پہناؤ نا۔'' اس نے اپنی ریشمی کلائیاں میرے سامنے پکڑیں۔ اور میں اسے ساتھ لیے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ملائم اور لچک دار ہاتھوں میں تمام چوڑیاں آسانی سے پھسل کر داخل ہو گئی تھیں۔

چوڑیاں پہن کر اس نے اپنی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹیکیں اور کلائیاں نیچے لٹکا کر مسرت بھری نظروں سے چوڑیوں کو دیکھنے لگی۔ گاہے گاہے وہ اپنے شوخ نظر مجھ پر بھی ڈال لیتی۔ ہنسی اس کے ہونٹوں سے چپکی ہوئی تھی۔

''ایک بات کہوں۔'' اسے کچھ بولتے نہ دیکھ کر میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''کب سے آپ کے کچھ کہنے کی منتظر ہوں۔'' چاہت بھرے لہجے میں کہہ کر وہ سوئیٹر پہننے لگی۔

''مجھے تمھارا نام بھی یاد ہے اور میں نے تمھارا کھانا باندھنے والا کپڑا ابھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

''ہا...... ہا...... ہا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ میں مبہوت ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ شرما کر نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پتا ہے میں روزانہ جنگل میں آتے ہی سب سے پہلے مچان میں جھانکتی تھی کہ کہیں آپ لوٹ ہی نہ آئے ہوں۔''

مجھے اس کی بات پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا کیونکہ آج بھی وہ سیدھا مچان ہی کی طرف آئی تھی۔

''روما!......میں تم سے شادی کرنے کے لیے لوٹا ہوں۔'' میں زیادہ دیر اس خواہش کو اپنے دل میں نہیں دبا سکا تھا۔

وہ کھسک کر قریب ہوئی اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اس نے خوب صورت طریقے سے اپنی رضامندی مجھ تک پہنچادی تھی اور یقیناً یہ طریقہ الفاظ سے کے استعمال سے زیادہ مجھے اچھا لگا تھا۔

''روما!...... پتا ہے میں ایک فوجی ہوں۔ انڈیا میں ایک ایسے دہشت گرد کو ٹھکانے لگانے گیا تھا جو پاکستان میں دو دفعہ بم دھماکے کروا کر درجنوں بے قصور اور معصوم لوگوں کی موت کی وجہ بنا تھا۔ اور یاد رکھنا میری آنے والی زندگی میں بھی ایسے کئی مشن آئیں گے۔ کیا تمھیں ایسا آدمی قبول ہے جس کی جان ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے سے جانتی ہوں کہ آپ کیا ہیں؟''

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں اس کا ملائم ہاتھ تھاما۔ یوں لگ رہا تھا میں نے گلاب کی بہت ساری پتیاں ہاتھ میں پکڑ لی ہوں۔ ''اس کا مطلب ہے مجھے آج ہی تمھارے ابو جان سے بات کرنا پڑے گی۔''

''نن...... نہیں...... نہیں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''میں سہ پہر کو بکریاں گھر چھوڑ کر تمھارے لیے کھانا لے کر آؤں گی۔ اور یہاں سے اکٹھے نکل چلیں گے؟''

مجھے اس کی گھبراہٹ پر اچنبھا ہوا تھا۔ ''کیسی بات کر رہی ہو روما!...... تمھارے والد کی اجازت کے بغیر ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' میں نے اس کی گھنی سیاہ زلفوں کو دوپٹے کی قید سے آزاد کیا اور اپنی انگلیاں ان میں پھیرنے لگا۔ وہ گویا ریشم کے تار ہی تو تھے۔ نرم، چمکیلے، خوشبودار۔

''اگر اس نے انکار کر دیا؟''

''انکار کیوں کرے گا...... میں اس کی منت کر کے اسے منالوں گا۔ اس کے پاؤں پڑ جاؤں گا اس کا ہر مطالبہ پورا کروں گا اور مجھے یقین ہے ایک سچا کشمیری پاک آرمی کے جوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''کیوں نہیں کر سکتا۔ آپ کچھ بھی تو نہیں جانتے میرے بھولے بھالے اجنبی!'' اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں کو اضطراری انداز میں مروڑنے لگی۔

”اچھا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر وہ کسی بھی صورت نہ مانے تو میں تمھیں یونھی لے جاؤں گا۔لیکن ایک بار ان سے بات کرنا ضروری ہے۔“

”آپ کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آ رہی ، وہ نہیں مانیں گے......نہیں مانیں گے......نہیں مانیں گے۔“روما کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی۔”اپنا اور میرا وقت برباد نہ کرو۔بس طے ہو گیا کہ ہم شام کو جائیں گے اور پتا ہے جس دن آپ یہاں سے گزرے تھے اسی رات میں نے اپنی ضروری چیزیں باندھ کر رکھ دی تھیں۔مجھے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی پسندیدگی مجھے پہلی نگاہ ہی میں نظر آ گئی تھی اور میں اچھی طرح جانتی تھی آپ ضرور لوٹیں گے بس مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کب لوٹیں گے؟“

”ایک امکان کو آپ کیوں یقین سمجھے بیٹھی ہیں۔“میں بہ ضد ہوا۔

”میں آپ کو اچھی لگتی ہوں نا؟“اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”پگلی!......میرا جواب تمھیں معلوم ہے۔“میں نے اس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔

”کیا میرے بغیر رہ لو گے؟“اس نے حسرت بھری نگاہوں سے مجھے گھورا۔

”یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔یوں بھی میں ایسا موقع نہیں آنے دوں گا۔اور کہہ تو دیا کہ وعدہ کرتا ہوں اگر تمھارے والد محترم نہ مانے تو پھر موقع ملتے ہی میں تمھیں لے اڑوں گا۔“

”اگر ہاں کرنا ابو جان کے بس میں نہ ہو تو پھر بھی اس سے ملنے پر اصرار کرو گے۔“عجیب حسرت زدہ درد بھری آواز میں وہ پوچھ رہی تھی۔

”روما!......تم کیوں اپنی گفتگو سے مجھے اذیت پہنچا رہی ہو اور تمھارے ابو جان کے بس میں بھلا کیوں نہیں ہوگا۔“میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر مہرِ محبت ثبت کی۔

”اگر میں کسی اور کی ملکیت ہوئی پھر؟“اس کی آواز جیسے گہری کھائی سے ابھری تھی۔

”کسی اور کی ملکیت؟......یقیناً میں تمھاری بات سمجھنے میں ناکام رہا ہوں۔“

”میں شادی شدہ ہوں، گزرے ستمبر میں میری شادی میرے چچا زاد اسفندیار سے ہو گئی ہے۔شادی کے ہفتے بھر بعد وہ میرے دونوں بھائیوں کے ساتھ کمانے کے لیے چلا گیا اور اب وہ اگلے ماہ واپس لوٹ آئے گا

۔‘‘اس نے سسکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔میرے کانوں میں جیسے کسی پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا تھا۔میرے ہاتھ بے جان انداز میں اس کے ریشمی گالوں سے نیچے پھسلے، میری بولتی بند ہو گئی تھی۔

’’مجھے معاف کر دو اجنبی!‘‘ وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔’’میں مجبور تھی۔‘‘

وہ کسی اور کی امانت تھی، کسی اور کی ماہین۔اگر اسے وہ رشتہ پسند نہیں تھا تو اسے پہلے انکار کر دینا چاہیے تھا۔اور اب وہ مجھے انجانے میں ایک ایسے گناہ کی جانب گھسیٹنے والی تھی جس کا کوئی کفارہ بھی نہیں تھا۔اگر میں اسے یونھی ساتھ لے گیا ہوتا تو نکاح کرنے کے باوجود ہماری شادی نہیں ہو سکتی تھی۔وہ کسی اور کی منکوحہ تھی۔اس سے طلاق لیے بغیر بھلا وہ میرے آنگن میں کیسے روشنی پھیلا سکتی تھی۔

میں جھرجھری لے کر ایک دم ہوش میں آیا اور اسے خود سے دور جھٹک دیا۔’’تم عورتیں ہوتی ہی قابلِ نفرت ہو، تمھاری جنس ہے ہی مکاری اور دھوکے کی علامت۔کیا تم مجھے پہلے یہ بات نہیں بتا سکتی تھیں۔اور اگر تمھیں اپنا چچازاد پسند نہیں تھا تو اس سے شادی کے لیے کیوں حامی بھری، کیوں نکاح کے وقت قبول کہا، کیوں ڈولی میں بیٹھ کر اس کے گھر گئیں، کیوں......کیوں......کیوں؟‘‘ میرے ہونٹوں سے وحشت زدہ آواز برآمد ہوئی۔

وہ جیسے کراہی۔’’کیونکہ اس وقت تک مجھے آپ نہیں ملے تھے۔‘‘

’’اور جب مجھ سے بھی خوب صورت مل جائے گا پھر؟‘‘ میں نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے اسے مطعون کیا۔

’’اللہ پاک کی قسم وہ شکل وصورت کے لحاظ سے آپ سے خوب صورت ہے۔‘‘

’’تم نے بہت برا کیا رومانہ!......بہت زیادہ۔میں پہلے ہی عورت ذات کا ڈسا ہوا ہوں، تم نے بھی میرے گھاؤ پر تیزاب انڈیل دیا۔مجھے نفرت ہے تم سے اور......اور ہر عورت سے۔‘‘ یہ کہتے ہی میں وہاں سے چل پڑا۔اپنا تھیلا اٹھانا بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا۔

’’اجنبی!......اجنبی......میں مر جاؤں گی۔‘‘ وہ روتے ہوئے میرے پیچھے سے آ کر لپٹ گئی تھی۔’’یوں خفا ہو کر نہ جاؤ......لوٹ آنے کا وعدہ کر کے جاؤ۔میں اس سے طلاق لے لوں گی۔‘‘

میں نے پیچھے مڑ کر اس کی گرفت سے خود کو چھڑایا اور اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ گھوما۔’’چٹاخ۔‘‘ کی آواز

کے ساتھ اس کے پھول سے گال پر میرا تھپڑ پڑا، وہ نیچے گر گئی تھی۔ مجھے یوں لگا وہ تھپڑ میرے دل پر پڑا ہوا۔ میں اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرا رخ کس جانب ہے۔ میرے دماغ میں تو بس رومانہ کی باتیں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔

⚝......⚝......⚝

http://sohnidigest.com سوہنی ڈائجسٹ

''میں شادی شدہ ہوں، گزرے ستمبر میں میری شادی میرے چچازاد سے ہوگئی ہے۔ میں شادی شدہ ہوں ......میں شادی شدہ ہوں ......میں شادی شدہ ہوں۔'' میں بھاگتا رہا۔ ناہموار زمین پر، جھاڑیوں اور درختوں سے بھری ہوئی ڈھلوان پر، جا بہ جا بکھرے ہوئے پتھروں اور کنکروں پر۔ پتا نہیں مجھے بھاگتے ہوئے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ شاید پوری صدی بیت گئی تھی یا شاید میں نے اسی وقت دوڑنا شروع کیا تھا۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی میں اوندھے منہ گرا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ وہ ڈھلان کافی نیچے جا رہی تھی، لیکن مجھے ایک بڑی چٹان نے مزید نیچے جانے سے روکا اور میں وہیں اوندھے منہ لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ دوبارہ اٹھنے کی ہمت مجھ میں مفقود تھی۔ میں لیٹا رہا، سوچتا رہا، سوچتا رہا...... سوچتا رہا، یہاں تک کہ میرا سر درد سے پھٹنے لگا۔ کتنی آسانی سے اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ یا شاید میں تھا ہی احمق۔ اگر احمق نہ ہوتا تو اتنی بڑی ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے سنبھل جانا چاہیے تھا۔ امریکہ میں مجھے کیپٹن جینفر الو بناتی رہی تھی۔ پاکستان میں ماہین اور اب کشمیر میں میں رومانہ کے ہاتھوں گدھا بن چکا تھا۔ کافی دیر میں اسی حالت میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ میری مثبت سوچوں نے مجھے ان حالات کی طرف متوجہ کیا جو مجھے درپیش تھے۔ میں ابھی تک پاکستان کی سرحد عبور نہیں کر پایا تھا۔ زادِ راہ کا تھیلا میں مچان میں بھول آیا تھا۔ مچان کی طرف لوٹ کر جانے میں مجھے اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ جس جگہ میں موجود تھا وہاں بہت اچھی دھوپ لگ رہی تھی۔ میں پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا سب کچھ اس تھیلے میں رہ گیا تھا۔ پستول، ٹارچ، خوراک، چادر ہر چیز وہیں تھیلے میں تھی۔ پتا نہیں بے دھیانی میں میں کتنا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اگر میں سہ پہر کے بعد وہیں لوٹ جاتا تو شاید اپنا تھیلا واپس حاصل کر لیتا۔ ''لیکن اگر روما شام تک وہیں بیٹھی رہی پھر؟''

میری سوچوں میں جو سوال ابھرا اس کا آسان جواب یہی تھا کہ اب میں واپس نہیں لوٹوں گا۔

گھنٹا ڈیڑھ مزید وہیں گزارنے کے بعد میں چڑھائی چڑھنے لگا۔ ایک دو بکریوں کو دیکھ کر میں نے اپنے جانے کی سمت میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا ضروری سمجھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا کسی اور سے ٹکراؤ ہو۔ مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک جوان عورت تھی اس کے ساتھ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا بھی

تھا۔وہ دونوں ایک دم جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر میرے سامنے آگئے تھے۔مجھے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک کر رکے مگر میں انھیں مخاطب کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔جھاڑیوں کی آڑ میسر آنے تک میں اپنی پشت پر کسی کی نظروں کو محسوس کرتا رہا۔مطلوبہ بلندی پر پہنچ کر میں نے اس سڑک کی تلاش میں نظریں دوڑائیں جس پر چل کر میں وہاں تک پہنچا تھا۔اسی سڑک سے میں اپنی سمت درست رکھ سکتا تھا۔مجھے وہ سڑک تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔میں اسی جانب چل پڑا۔اب مجھے اترائی کا مرحلہ درپیش تھا۔میں احتیاط سے چلتے ہوئے جنگل سے باہر نکلا سامنے وسیع نالا تھا اس کو عبور کر کے میں مطلوبہ سڑک تک پہنچ جاتا۔اس سڑک کے متوازی میں نے اسی نالے میں چلنا شروع کر دیا۔مجھ سے رات ہونے کا انتظار بھی نہیں ہوسکا تھا۔اندھیرا چھاتے ہی میں روڈ پر چڑھ گیا۔چاند کی بارہ تاریخ تھی۔اس لیے مجھے روشنی کی کوئی فکر نہیں تھی۔انڈین پوسٹوں سے چھپتا چھپاتا ۔چڑھائیاں چڑھتا میں طلوع آفتاب سے ذرا پہلے اس جگہ پر پہنچ گیا تھا جہاں آتے وقت میرا انڈین پٹرول سے واسطہ پڑا تھا۔اس جگہ سے آگے سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔مجھے مسلسل جاگتے ہوئے اڑتالیس گھنٹے ہونے کو تھے تھکن بھی کافی ہو رہی تھی۔لیکن جس جگہ میں نے دن بھر چھپ کر رہنا تھا وہ علاقہ انڈین فوجیوں کی گزرگاہ تھا۔ نسبتاً پہاڑ کی جڑ کی طرف ہو کر میں جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ میں گھس کر بیٹھ گیا۔کچھ نہ کھائے ہوئے بھی چھتیس گھنٹے ہونے والے تھے۔میں نے تو رومانہ کے پاس موجود کھانا کھانے کے لالچ میں گزشتہ صبح وہاں پہنچتے ہوئے بسکٹ وغیرہ کھانے سے احتراز برتا تھا۔بہر حال بھوکا ہونے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ نیند مجھ سے دور رہی۔گو اس میں بھوک کے ساتھ ساتھ سردی کا بھی گہرا عمل دخل تھا۔وہ میری زندگی کا ایک اذیت بھرا دن تھا۔تھکن، نیند کی کمی، بے پناہ بھوک اور سب سے بڑھ کر دماغی بے سکونی جس کی وجہ رومانہ کی یاد تھی۔

وقت چاہے اچھا ہو یا برا گزر جاتا ہے۔وہ دن بھی گزر گیا۔رات نے ڈیرے ڈالے اندھیرا گہرا ہوا اور میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔میری واپسی اسی رستے پر ہوئی تھی جس پر میں چل کر آیا تھا۔چند گھرانوں کی آبادی عبور کر کے میں نے نالہ پار کیا۔اس میں اب پہلے کی نسبت پانی کی مقدار تھوڑی زیادہ تھی۔لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی کہ مجھے پاؤں گیلے کرنے پڑتے۔جلد ہی میں اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں بارودی سرنگی قطعہ موجود تھا ۔اس قطعے کو پار کرنے کا راستہ مجھے معلوم تھا لیکن اس سے پہلے میں نے پاکستانی سنتری کو آواز دینا ضروری سمجھا

۔کیونکہ اس قطعے میں قدم دھرتے وقت میں نے اس کی نظروں میں آ جانا تھا۔اور یوں ایک آدمی کو یوں خاموشی سے پوسٹ کی جانب آتا دیکھ کر وہ فائر بھی کھول سکتا تھا۔

’’اسلام علیکم بھیا!‘‘میں نے زوردار آواز میں پکارا۔

’’ایک تیز ٹارچ چمکی اور اس کے ساتھ ہی آواز آئی۔’’کون؟‘‘

’’قریب آ کر تعارف کرا دیتا ہوں۔‘‘میں نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے کہا۔

اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔’’حرکت نہ کرنا،تم بارودی سرنگی قطعے کے کنارے کھڑے ہو۔‘‘

’’راستہ مجھے معلوم ہے بھائی!......بس آپ اپنی گولی ضائع نہ کرنا۔‘‘میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔اس نے ٹارچ بجھا دی۔چاند کی روشنی ہی اتنی تیز تھی کہ ٹارچ جلانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

ارودی سرنگی قطعہ پار کر کے میں اس کی جانب بڑھ گیا۔میں اس سے دس گز دور ہوں گا کہ اس نے مجھے رکنے کو کہا۔اس کے ساتھ ہی اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔

’’ارے آپ۔‘‘اس کے منہ تحیّر آمیز آواز برآمد ہوئی۔’’آجائیں۔‘‘ٹارچ بجھا کر وہ خود بھی میری جانب بڑھا۔

’’کریم!......کون ہے یہ؟‘‘مورچے کی طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔یقیناً وہاں ایک اور آدمی موجود تھا۔

’’استاد جی!......یہ وہی ہے جسے ہم شہید سمجھے ہوئے تھے۔‘‘کریم قریب آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

اس کا استاد بھی مورچے سے باہر آ گیا۔’’کیا حال ہے بھائی جان!......‘‘کریم کے بعد اس نے بھی مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے پوچھا۔

’’اللہ پاک کا کرم ہے جی!‘‘میں اطمینان بھرے انداز میں مسکرایا۔

اس نے اسی وقت فیلڈ ٹیلی فون پر پوسٹ کے سینئر کو میرے پہنچنے کی خبر سنائی۔اگلے پانچ منٹ میں وہ سینئر وہیں تھا۔وہ میجر مزمل تھا۔جس دن میں گیا تھا اس دن بھی وہ اسی پوسٹ پر موجود تھا۔استاد نے ایڑیاں جوڑ کر اسے سیلوٹ کیا۔میں نے بھی اپنی ایڑیاں جوڑ لی تھیں۔

''ذیشان!......صحیح نام لیا نا؟''میجر صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے چھاتی سے لگایا۔اس کے چہرے سے ہویدا خوشی کے اثرات مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھے کہ پاک آرمی ایک خاندان کی مانند ہے اور کسی ایک کی کامیابی کو تمام اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔اس میں آفیسرز اور نچلے رینک کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

''جی سر!......میرا نام ذیشان ہی ہے۔''

''یار!......ہم تو اس دن ڈر ہی گئے تھے۔''میرے کندھے پر بے تکلفانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر وہ مجھے پوسٹ کی سمت لے جانے لگا۔''ویسے ہوا کیا تھا؟''

''لمبی کہانی ہے سر!......اور مجھے مسلسل جاگتے ہوئے ساٹھ گھنٹے ہونے والے ہیں۔''

''ہونہہ!......میرا خیال ہے سونے سے پہلے آپ کھانا کھانا ضرور پسند کریں گے؟''

''جی سر!''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے ایک حوالدار کو بلا کر میرے لیے تازہ کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور ساتھ میرے سونے کے لیے جگہ تیار کھرنے کا بھی بتا دیا۔حوالدار مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔برفانی علاقوں میں ٹن پیک سالن ملتا ہے۔کک نے اٹھ کر فوری طور پر میرے لیے چکن کا سالن گرم کیا اور اور جلدی جلدی روٹیاں بنا کر میرے سامنے دھر دیں۔تھوڑی دیر بعد خوب سیر ہو کر کھانا کھانے کے بعد میں سنو کے سلپنگ بیگ میں گم ہو گیا تھا۔خوابوں کی دنیا میں روما میرا انتظار کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

یونٹ واپسی پر کمانڈنگ آفیسر نے مجھے خصوصی شاباش دی۔میرے مشن کے کامیاب ہونے کی خبر وہ ٹی وی پر دیکھ چکا تھا۔

''ویسے نو سو میٹر کے فاصلے سے ماتھے میں گولی مارنا۔اچھی کارکردگی ہے۔''کمانڈنگ آفیسر کے چہرے پر مجھے خوشی چھلکتی دکھائی دی۔

''شکریہ سر!''

وہ ہنسا۔''اب تم یقیناً مہینا چھٹی مانگو گے۔''

”نہیں سر!“میں نے نفی میں سر ہلایا۔”دس دن کافی ہیں۔“

”ہا......ہا......ہا۔“اس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔”تمھارا کمپنی آفیسر مہینا چھٹی کی اجازت لے چکا ہے برخوردار!“

”پھر تو مجبوری ہے سر!“میں نے دس دن پر اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔یوں بھی فوجی آدمی کے لیے چھٹی کا حصول سب سے بڑی خوش خبری ہوتی ہے۔اور سینئر کی جانب سے آفر کی ہوئی چھٹی کو ٹھوکر مارنے کا مطلب خود کو خوامخواہ فضول سوالات کے حوالے کرنا تھا۔اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ذات زیر بحث لائی جائے۔البتہ کلرک کے پاس میں باضابطہ طور پر طلاق نامہ جمع کروا چکا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی حادثے کا شکار ہونے کے بعد میرے لواحقین کو ملنے والی ساری رقم ماہین کے پاس چلی جاتی۔(ہر فوجی کی قانونی وارث اس کی بیوی ہوتی ہے)

”کوشش کرو اسی مہینے میں نئی دلھن ڈھونڈ لو۔“اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔یقیناً میرا طلاق نامہ اس کے سامنے بھی پیش ہوا تھا۔اور اسے معلوم تھا کہ میں بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔لیکن اس بارے اس نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”پہلے والی سے مشکل سے جان چھڑائی ہے سر!“میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”صحیح کہا۔“اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔اور میں سیلوٹ کر کے وہاں سے باہر نکل آیا۔

دو دن گھر گزار کر میں تیسرے دن ابو جان سے اجازت لے کر استاد عمر دراز کو ملنے چل پڑا۔مجھے دیکھ کر استاد عمر دراز خوش ہو گئے تھے۔میں نے انھیں آخری مشن کی تفصیلات وغیرہ بتلائیں۔وہ مجھ سے ہدف کا فاصلہ ،ہوا کی رفتار سورج کی سمت اور اس طرح کی دوسری تفصیلات بڑی باریک بینی سے معلوم کرنے لگے۔یقیناً انھیں سنائپنگ کا جنون تھا اور اس طرح کی کارروائی سے وہ بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔

”ذیشان بیٹا!......بلاشبہ تمھارا نشانہ اب مجھ سے بہتر ہو گیا ہے۔“میری بات کے اختتام پر انھوں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”یہ خوش فہمی تو کبھی کبھی مجھے بھی ہو جاتی ہے۔“

”یہ حقیقت ہے بیٹا!“ اس نے آگے بڑھ کر میری پیٹھ تھپکی۔

”ساٹھ ستر سال کے بوڑھے سے مقابلہ کرنا بھی تو زیادتی ہے ناسر!“

”میں اپنی جوانی کی بات کر رہا ہوں میاں!“

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”یہ مبالغہ آرائی کچھ کم نہیں ہو سکتی۔“

”اس میں مبالغہ آرائی کہاں سے آ گئی۔“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ویسے میں چکن کے بجائے مونگ کی دال کھانا پسند کروں گا۔“ میں نے موضوع تبدیل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

اور میری بات پر استاد عمر دراز شفقت بھرے انداز میں مسکرا پڑے تھے۔

اگلے دو تین دن میں نے انھی کے ساتھ پشتو سیکھتے گزارے۔ اس کے علاوہ ہم نشانہ بازی اور مختلف سنائپر رائفلز کے بارے بھی گفتگو کرتے رہتے۔ جدید رائفلز کے بارے میرا علم کافی وسیع تھا۔ استاد عمر دراز ان رائفلز کے بارے جاننے میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔

وہاں سے واپسی پر پھر وہی خواب گاہ اور تلخ یادیں۔ اب تو ماہین مجھے بھول ہی چکی تھی۔ اس کی جگہ لینے کے لیے روما جو موجود تھی۔ وہ بھولی بھالی کشمیری چرواہن مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ لیکن اس نے میرے ساتھ بہت غلط سلوک کیا تھا۔ اگر اس نے پہلی ملاقات میں اپنے شادی شدہ ہونے کی بات بتا دی ہوتی تو میں کبھی بھی اسے دل میں جگہ نہ دیتا۔ لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اور وہ راز کھولا بھی تو اس وقت جب میں اس سے شادی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس کے آخری الفاظ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتے رہتے۔

”اجنبی!...... میں مر جاؤں گی۔ یوں خفا ہو کر نہ جاؤ...... لوٹ آنے کا وعدہ کر کے جاؤ۔ میں اس سے طلاق لے لوں گی۔“

”ہونہہ!...... طلاق لے لوں گی۔“ میں نے طنزیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔ ”طلاق لینا تھی تو شادی کیوں کی تھی۔“

وہ سسکی۔ ''کیونکہ پہلے مجھے تم نہیں ملے تھے۔''

''اگر اتنا یوسف ثانی ہوتا تو ماہین میرے ساتھ یوں نہ کرتی۔'' میں نے تلخ ہوتے ہوئے سوچا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں ابوجان چارپائی ڈالے پھوپھوجان سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ چولھے کے ساتھ لکڑی کی چوکی پر بیٹھی غالباً چائے بنا رہی تھیں۔ میں بھی دوسری چارپائی پر بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگا۔

''کوئی نئی تازی سناؤ خوردار!'' میرے بیٹھتے ہی ابوجان میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''میرے پاس تو وہی گھسی پٹی فوجی باتیں ہی ہوں گی ابوجان!......''

''ہونہہ!......ویسے ملک شاہ جہان کی بیٹی نے بارہ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ تو کیا خیال ہے؟'' ابوجان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''خیال تو ٹھیک ہے لیکن شاید وہ انکار کر دے۔'' میں نے ان کی طرف جوابی مسکراہٹ اچھالی۔

''انکار کیوں کرے گا۔'' ابوجان ایک دم اٹھ بیٹھے۔

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''ساٹھ پینسٹھ سال کے بوڑھے کے لیے وہ کیسے اپنی بیس بائیس سال کی بیٹی کا رشتہ دے گا۔''

''دھت تیرے کی۔'' ابوجان ہنسے۔ پھوپھو نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔ ''میں تمھارے بارے بات کر رہا تھا۔''

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''اور میں آپ کے بارے۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔'' ابوجان نے دوبارہ تکیے سے ٹیک لگا لی۔

''اچھا میں ذرا اویس سے ہو آؤں۔'' میں گھر سے باہر آ گیا۔ اویس مجھے اپنے گھر ہی میں ملا تھا۔ ارم سے شادی کے بعد اس کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔ اپنا فارغ وقت وہ گھر ہی میں گزارا کرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتا رہتا کہ ان کی محبت کو کسی کی نظر نہ لگے۔

ان کی بیٹھک میں بیٹھ کر ہم کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ اس دوران اس کی بیوی وہیں چائے بنا کر لے آئی تھی۔ وہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔

''اسلام علیکم ذیشان بھائی!''

”وعلیکم اسلام!......میری چھوٹی بہن کسی ہے؟“میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

”اللہ پاک کا فضل ہے۔“چائے کے کپ ہمارے سامنے رکھ کر وہ باہر نکل گئی۔

”سنا ہے طاہر اس سے شادی کر رہا ہے۔“ارم کے بیٹھک سے نکلتے ہی اویس نے گویا مجھ سے تصدیق چاہی۔

”کس سے۔“

”ماہین سے۔“اویس کا انداز انکشاف کرنے والا تھا۔

”اگر ایسا ہے تو بہت اچھا ہے۔“میں بے پرواہی سے بولا۔

”شانی تمھیں وہ بہت پسند تھی نا؟“اویس نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

”شکر ہے تم نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔“

”کیا مطلب؟“اویس نے حیرانی سے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ وہ مجھے پسند تھی۔ ہے نہیں اور اللہ پاک کا شکر کہ میرے سامنے اس کی اصلیت کھل گئی۔ ورنہ بچہ، بچی ہونے کے بعد یہ راز کھلتا تو خود سوچو میں نے کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جانا تھا۔“

”صحیح کہتے ہوئے۔“وہ اپنا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا۔

ہفتے بھر بعد ہی اویس کی بات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ ماہین کے باپ حشمت چاچا نے ہمارے گھر آ کر مجھ سے اجازت مانگی تھی۔

”بیٹا!......اگر تمھیں برا نہ لگے تو طاہر کے گھر والے ماہین کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔“

”حشمت چچا!......میرا آپ کی بیٹی سے کیا واسطہ؟ اور پھر جو کچھ ان دونوں کے درمیان تعلق رہ چکا ہے اس کے بعد ان کی شادی کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔“

”بیٹا!......میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“چچا حشمت کے لہجے میں ندامت تھی۔

”چچا جان!......آپ کا شرمندہ ہونا تب بنتا تھا جب وہ شادی سے پہلے ایسی کوئی حرکت کرتی۔ شادی کے بعد مرد و عورت اپنے عمل کے خود جواب دہ ہوتے ہیں۔ آپ میرے بڑے ہیں اور خدارا یوں ندامت ظاہر کر کے

مجھے شرمندہ نہ کیا کریں۔"

"جیتے رہو بیٹا!" چچا حشمت میرے سر پر ہاتھ پھیر کر واپس لوٹ گئے۔

مہینا گزار کر میں نے یونٹ کی راہ لی۔راؤ تصور صاحب اور حوالدار فیاض واپس آ گئے تھے۔وہ دونوں وزیرستان میں بہ طور انسٹرکٹرز گئے تھے۔البتہ سردار خان، اسد خٹک وغیرہ جو سنائپنگ کے لیے گئے تھے ان کی واپسی کا کوئی پتا نہیں تھا۔

مجھے چھٹی سے واپس آئے ہفتہ ہونے کو تھا کہ ایک دن شام کے وقت مجھے حکم ملا کہ صبح میں نے پشتو زبان سیکھنے کی کلاس میں شامل ہونا ہے۔مجھے حیرانی تو کافی ہوئی مگر فوج کی زندگی میں اس سے بھی کئی گنا عجیب احکام ملتے رہتے ہیں۔اگلے دن کلاس شروع ہونا تھی۔اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ پڑھانے والے دو تھے اور پڑھنے والا میں اکیلا۔مجھے پڑھانے کے لیے اپنی یونٹ ہی کے دو پٹھانوں کا انتخاب ہوا تھا۔کلاس کیا تھی بس پشتو زبان کا سیکھنا تھا جو پہلے بھی تھوڑی بہت جانتا تھا۔سارا دن ہم پشتو میں گپیں کرتے رہے۔اس دوران مجھے جس لفظ کی سمجھ نہ آتی میں ان دونوں سے پوچھ لیتا۔یوں بھی مجھے پشتو کی گرائمر نہیں سیکھنا تھی۔

اسی دن رات کو آٹھ بجے مجھے یونٹ سیکنڈ ان کمانڈ میجر وسیم کے دفتر حاضر ہونے کا حکم ملا۔اس کے اردلی کو کہہ کر میں نے اندر جانے کی اجازت مانگی وہ میرا ہی منتظر تھا۔

"آؤ ذیشان!......بیٹھو۔"اس نے سامنے پڑی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔میں مودّبانہ انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج پشتو زبان سیکھنے کی کلاس اٹینڈ کی تھی۔"اپنی گھومنے والی کرسی سے ٹیک لگا کر اس نے تمہید باندھی۔

"جی سر!......"

"تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ تمھارے کچھ ساتھ وزیرستان میں پاک آرمی کی مختلف کانوائیوں کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

"جی سر!"میں نے لگا بندھا جواب دہرایا۔

"تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وہ اپنے کام کو کچھ خاص بہتر طریقے سے انجام نہیں دے پا رہے۔اور

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ گاڑی پر بیٹھ کر پہلے سے چھپے ہوئے دشمن کے سنائپرز کا مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور یہ بات ہائی کمانڈ کی نظر سے بھی اوجھل نہیں ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ وزیرستان میں اپنی فوج قلعہ بند ہے۔ حرکت کرتے وقت یا کسی علاقے کی تلاشی لینے کے علاوہ کسی کو کیمپ سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جبکہ دہشت گرد اطمینان سے دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے سنائپرز کو بھی کیمپ سے باہر جانا ہوگا۔ طالبان کے کئی دھڑے ہیں۔ لیکن انھیں ہم بنیادی طور پر دو بڑے گروپوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ پہلا گروپ اصل طالبان یا مجاہد ہیں۔ اور وہ امریکہ کے خلاف افغانستان میں برسرِ پیکار ہیں۔ دوسرا گروپ جو کئی گروپوں کا مجموعہ ہے اس میں مقامی لوگ ہیں جو ایجنسیوں سے پیسے لے کر پاک آرمی پر حملے کرتے ہیں، باہر کی کئی ایجنسیاں جیسے، را، موساد، فری میسن اور کے جی بی وغیرہ کے تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں، کچھ اپنے پنجاب کے علاقے سے خریدے گئے دہشت گرد ہیں۔ یہ سب ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کام تقریباً ایک سے ہیں۔ پاک آرمی پر چھپ کر حملے کرنا، سنائپنگ کرنا، آرمی کے قافلوں کے رستے پر آئی ای ڈیز وغیرہ لگانا اور ملک بھر میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا اور پھر اس کی بات جاری رہی۔

''سردار خان، اسد خٹک، بشیر حیدر، عصمت اللہ جان اور سہیل مروت کو جلد ہی کیمپ سے باہر رہنے کے احکام مل جائیں گے۔ یوں بھی وہ پانچوں پختون ہیں اس لیے انھیں پشتو کلاس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ان سے سروس کارڈ وغیرہ بھی جمع ہو جائیں گے اور وہ مکمل طور پر سول کی طرح کام کریں گے۔ طریقہ وہی ہوگا جو سنائپرز کا خاصہ ہوتا ہے وہ جوڑیوں یعنی بڈی سسٹم میں کام کریں گے۔ میر علی، بکا خیل، میرن شاہ، دتہ خیل، غرلامئے، اور اس سے ملحقہ علاقے ان کے دائرہ کار میں آئیں گے۔ تمھیں ایک مہینے بعد وانہ، شکئی، شوال وادی اور انگور اڈے کی طرف جانا پڑے گا۔ وہاں پر فوجی قافلوں پر بہت زیادہ حملے ہو رہے ہیں۔ اور اس طرف آپریشن کی تقریباً شروعات ہے۔ اب تم یہ بھی سوچو گے کہ تمھیں پشتو سکھانے کی کیا ضرورت آن پڑی جبکہ وہاں دوسری زبانوں کے جاننے والے بھی موجود ہیں۔'' اس نے جو نکتہ اٹھایا تھا وہی بات میرے دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ وہ خود ہی اس سوال کا جواب دینے والا تھا اس لیے میں خاموشی سے اس کی سنتا رہا۔ ''اصل میں

کمانڈنگ آفیسر نہیں چاہتا کہ تم پشتو نہ جاننے کی وجہ سے مار کھا جاؤ۔اور کوئی آدمی تمھارے سامنے ہی تمھارے خلاف منصوبہ بندی کرتا رہے اور تمھیں معلوم ہی نہ ہو۔تم پر وہ بہت زیادہ انحصار کر رہے ہیں۔ تمھیں وہاں کافی عرصہ گزارنا پڑے گا کچھ اور ضروری باتیں بھی ہیں جو تمھیں بعد میں بتائی جائیں گی فی الحال ان پانچوں میں سے تم اپنی پسند کا ایک ساتھی چن لو اسے کل ہی واپس بلا لیا جائے گا۔ بلکہ میرا خیال ہے سردار ہی کو بلوا لوں۔'' آخری فقرہ انھوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

''جی سر!''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کوئی سوال؟''اس نے گویا اپنی بات ختم کرنے کا اعلان کیا۔

''سوال جواب کے لیے مہینا پڑا ہے سر!''

''انتیس دن۔''اس نے میری تصحیح کرتے ہوئے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

اور میں۔''اسلام علیکم سر!'' کہتے ہوئے باہر آ گیا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد سردار واپس آ گیا تھا۔اسے ابھی تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اسے کیوں واپس بلایا گیا تھا۔

''یار!......اسد خٹک اور سہیل مروت پارٹی مجھ سے اچھے سنائپر تو نہیں ہیں۔''رسمی کلمات کے اختتام پر اس نے شکوہ داغا۔

میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔''یہی بات میں نے بھی میجر وسیم کو کہی تھی مگر اس کی نظر میں تو تم نکمے ترین سنائپر ہو۔''

''یہ تو خیر جھوٹ ہے۔لیکن مجھے واپس نہیں بلانا چاہیے تھا۔''

''اچھا یار!......اب تو واپس آ گئے ہو چھوڑو اس قصے کو۔''

''سنا ہے تم دوبارہ سرحد پار گئے تھے۔''

''ہاں گیا تو تھا۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو کیا رہا؟''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے منہ بنایا''اگر تمھارے سامنے زندہ موجود ہوں تو یقیناً کامیاب ہی لوٹا ہوں۔''

''مکالمہ بازی نہیں چلے گی محترم!...... پوری کہانی پھوٹو۔''

اور میں نے ہنستے ہوئے اجمالاً ساری کہانی سنا دی۔سردار کے ساتھ میرے تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ میں نے روما کا بھی سرسری ساذکر کر دیا تھا۔

''باقی سب تو ٹھیک ہے یہ کشمیری چرواہن والی بات ذرا پھر سے دہراؤ اور اس میں جو جو باتیں حذف کی ہیں اب کی بار وہ بھی شامل کرنا۔''

میں چڑ کر بولا۔''بکواس نہ کرو یار!''

''اچھا اس کا نام تھا رومانہ......ویسے دکھنے میں کیسی تھی؟ کیا کیپٹن جینیفر سے خوب صورت تھی۔''

میں طنزیہ انداز میں بولا۔''ہاں بس لی زونا جیسی شکل تھی۔''

''یہ ظلم نہ کرو جانی!''وہ افسردہ ہو گیا تھا۔''خدا کی قسم سو سے زیادہ مرتبہ خواب میں آچکی ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔''کہتی کیا ہے؟''

''جاپانی زبان مجھے خاک سمجھ میں آتی ہے۔''اس نے منہ بنا کر کہا اور مجھے ہنسی چھوٹ گئی۔

''اچھا چھوڑو ان فضول باتوں کو کام کی بات سنو، تمھیں میرے ساتھ کام کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔ایک ماہ بعد ہم دونوں نے وانہ کا رخ کرنا ہے اور..........''میں نے ٹو آئی سی کی ساری باتیں اس کے سامنے دہرا دی تھیں۔

''سچ کہہ رہے ہو۔''اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''سو فیصد سچ۔''

''مطلب اب مزہ آئے گا۔''وہ کھل اٹھا تھا۔

☆......☆......☆

سردار کی آمد کے دوسرے دن میں کلاس کے بعد ٹو آئی سی میجر وسیم کے دفتر میں کھڑا تھا۔

''جی ذیشان!......''میرے سیلوٹ کے جواب میں وہ خفیف سا سر ہلاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”سر!......میں پشتو سیکھنے کے لیے پٹھانوں کے کسی علاقے میں جا کر پندرہ بیس دن گزارنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنسا۔”ابھی تو مہینا چھٹی کاٹ کر آئے ہو یار!“

”سر!......میں نے پٹھانوں کے علاقے کی بات کی ہے۔“

”گویا سردار خان کو چھٹی کٹوانے کا ارادہ ہے۔“

میں صاف گوئی سے بولا۔”چھٹی تو اس کی یوں بھی بنتی ہے۔وہ آپریشن کے علاقے سے براہ راست یونٹ واپس پہنچا ہے۔“

”ہونہہ!......اس کی چھٹی کی بات تو اس کے سینئر کو کرنا چاہیے۔“

”میں اس کی چھٹی نہیں اپنی کلاس کی بات کرنے آیا ہوں سر!“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔”لیکن واپسی پر میں خود تمھارا امتحان لوں گا۔“

”ٹھیک ہے سر!“میں نے اثبات میں سر ہلا کر الوداعی سیلوٹ کیا اور اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

اسی دن سہ پہر ڈھلے میں اور سردار گاڑی میں بیٹھے اس کے گاؤں کی طرف روانہ تھے۔اس کا تعلق مردان سے ہے۔ایک رات اس کے پاس گزار کر اگلے دن میں صوابی چلا گیا۔گو سردار نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے سختی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے وہ اپنے بچوں کو صحیح وقت نہ دے پاتا۔وہاں سے میں سیدھا استاد عمر دراز کے پاس پہنچا۔باقی کے چودہ دن میں نے استاد عمر دراز کے پاس ہی گزارے وہاں قیام کے دوران میں مسلسل پشتو میں بات کرتا رہا۔الحمد اللہ میری یاداشت کافی تیز ہے اور پھر استاد عمر دراز کے سکھانے کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ میں ٹھیک ٹھاک پشتو بولنے لگا۔سردار کی آمد کے اگلے دن ہم دونوں صبح سویرے استاد عمر دراز سے اجازت لے کر روانہ ہوئے۔دوپہر کا کھانا ہم نے میرے گھر میں کھایا اور سہ پہر ڈھلے وہاں سے یونٹ روانہ ہو گئے۔یونٹ پہنچنے کے تیسرے دن میجر وسیم نے ہمیں رات کے وقت کانفرنس روم میں بلایا اور بڑی تفصیل سے اس علاقے کے بارے بتانے لگا۔

”جو کچھ میں بتا رہا ہوں اسے غور سے سننا اور اچھی طرح دماغ میں بٹھا لینا۔تم دونوں جس علاقے میں جا رہے ہو مجھے نہیں معلوم کے اس بارے تم کتنا کچھ جانتے ہو۔لیکن سینئر ہونے کے ناتے تمھیں اس علاقے کے

بارے بنیادی معلومات فراہم کرنا میرا کام بنتا ہے۔ فاٹا کی دو حدود ہیں، ایک انتظامی حد جو کہ پرسکون تحصیلوں کو قبائلی علاقے سے علیحدہ کرتی ہے اور دوسری پاک افغان سرحد جو کہ پاکستان کو افغانستان سے علیحدہ کرتی ہے۔ دونوں سرحدوں کا درمیانی علاقہ سات ایجنسیوں، باجوڑ، مہمند، خیبر، کرم، اورکزئی، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان ایجنسیپر مشتمل ہے۔ ان سے متصل کچھ مخصوص علاقے جو کہ پشاور کے ساتھ ملحق ہیں۔ کوہاٹ، بنوں، لکی مروت، ٹانک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان ہیں۔ یہ عموماً فرنٹیئر ریجن (FR) یعنی سرحدی علاقہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ سات ایجنسیاں اور FR کو فاٹا کہا جاتا ہے۔ FATA صوبہ سرحد کی تقریباً 20 فیصد آبادی اور 37 فیصد رقبے پر مشتمل ہے۔ ان میں سرحدی علاقوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکمل پہاڑی علاقہ ہے۔ قبائلی علاقے اور افغانستان کے درمیان بے شمار درے ہیں۔ آپ لوگوں نے چونکہ وزیرستان میں کام کرنا ہے اس لیے میں باقی تفصیل چھوڑ کر صرف وزیرستان کے بارے بات کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وزیرستان دو ہیں ایک شمالی اور دوسرا جنوبی۔ شمالی وزیرستان ایجنسی کی آبادی قریباً اڑھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہو گی اس میں وزیر اور داوڑ رہتے ہیں۔ ایجنسی ہیڈ کوارٹر میران شاہ میں ہے۔ ٹوچی دریا ایجنسی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کچھ اہم جگہیں اور مواصلاتی مراکز میں میرانشاہ دتہ خیل لاؤدہ سنڈی غلام خان اور رزمک ہیں۔ جنوبی وزیرستان کی آبادی قریباً پانچ لاکھ ہوگی۔ ایجنسی ہیڈ کواٹر وانہ میں ہے ایجنسی کا دوسرا ہیڈ کوارٹر ضلع ٹانک میں ہے۔ وہاں زیادہ تر محسود قبائل رہتے ہیں۔ آبادی کا تین چوتھائی حصہ محسود قبائل ہیں۔ اور باقی وزیر قبائل ہیں جنوبی وزیرستان میں محسود اور وزیر قوم کے درمیان کچھ مسئلے چل رہے ہیں۔ اور یاد رہے کہ وزیرستان میں دو بڑی قومیں وزیر اور محسود کی ہیں اور باقی چھوٹی قومیں انھی دو قوموں کی مختلف شاخیں ہیں۔ موجودہ نظام کے مطابق سرکاری املاک، سڑکیں اور کچھ بندوبستی علاقہ چھوڑ کر باقی کا تمام علاقہ قبائلی معاشرے کے لوگ اپنے رسوم ورواج کے مطابق اس کا انتظام وانصرام سنبھالتے ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ علاقے کا بیک وقت سفیر بھی ہوتا ہے اور حاکم بھی ہوتا ہے یہ مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے پولیس کا سربراہ بھی ہوتا ہے صحت اور تعلیم کا امیدوار بھی ہوتا ہے اور چیف انجینئر بھی ہوتا ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو تمام قبیلوں کا اعتماد لے کر چلنا ہوتا ہے اور اپنی وفاداری اور سچائی کا یقین دلانا ہوتا ہے۔ انتظامی لحاظ سے پولیٹیکل ایجنٹ کے ماتحت اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ تحصیل دار اور

نائب تحصیلدار ہوتے ہیں۔ پولیس کی خدمات خاصہ داروں سے لی جاتی ہیں جو کہ علاقے کے مَلک فراہم کرتے ہیں۔ وزیرستان میں جرگہ سسٹم رائج ہے۔ جرگے سے مراد کچھ قبائلی سرداروں کا کسی مسئلے پر غور کرنے کیلئے اکٹھا ہونا ہے۔ اس مسائل میں چاہے کسی کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہو یا کسی کے ساتھ امن صلح کرنا ہو یہ قبائلی علاقوں کی قدیم روایات میں سے ایک اہم جز ہے جس میں اہم فیصلے کیے جاتے ہیں۔ معاملات چاہے ذاتی نوعیت کے ہوں یا معاشرتی ہوں تمام کے تمام اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ جرگے کو عدلیہ، مقننہ اور انتظامی خود مختاری حاصل ہے اور انھیں اختیار ہے چاہے کسی کو سزا دیں یا جزا دیں۔ الغرض جرگہ ایک اہم ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں اس پر ہر علاقے میں اٹھنے والے تمام طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ہے۔ جرگہ ہی حکومت کے ساتھ معاملات کو حل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ملکی سسٹم بھی رائج ہے کہ ہر قبیلے کا ایک روایتی سردار ہوتا ہے جو اپنے قبیلے کی نمائندگی کرتا ہے ان کے مسائل کو حل کرتا ہے اسے حکومت اور قبائلی معاشرے میں انتہائی عزت حاصل ہے ان سرداروں کو مَلک کہا جاتا ہے ان سب کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے جن کو ملکی وظیفہ کہا جاتا ہے۔ اور یہ موروثی نظام کے تحت اگلے وارث کو منتقل ہوتا جاتا ہے ہے ملک کا حکومت اور قبیلے کے درمیان خلیج کو دور کرنے میں اہم کردار ہے۔ پھر ایک سسٹم نکات کا ہے۔ نکات لفظ نکہ سے نکلا ہے۔ جس کے لغوی معنی دادا کے ہیں۔ نکات سسٹم قبائلی روایات کا اہم ترین جزو ہے اس سے مراد نفع ونقصان کی بنیاد پر قبائل اور خاندانوں کے مابین آمدن کی تقسیم کا نظام ہے۔ یہ نظام بھی موروثی ہے اس نظام کے تحت حکومتی مراعات کی تقسیم، جرمان کا اکٹھا کرنا اور کسی بھی تصفیے کے حل کرنے کیلئے چندہ اکٹھا کرنا ہے۔ تمام تعمیراتی منصوبوں کی اس نظام کے تحت تقسیم کی جاتی ہے۔ وزیرستان کا مکمل علاقہ مختلف قبائل کی ملکیت ہے اس لیے کوئی بھی قبیلہ یا قوم اپنے علاقے میں ہونے والے کسی بھی جرم یا بدسلوکی کی ذمہ دار ہے چاہے یہ عمل اس علاقے کے مقامی شخص نے کیا ہو یا کسی خارجی شخص نے کیا ہو اصطلاحاً وہ انھی کی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح کسی بھی بااثر شخص کو حکومت کے ساتھ مخلص ہونے پر یا پھر کوئی خدمات سرانجام دینے پر لنگی یا پگڑ کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ انہیں لنگی بردار کہتے ہیں۔ لنگی بردار کا بھی کچھ وظیفہ مقرر کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ ملکی نظام کی طرح موروثی نہیں ہوتا بلکہ اس شخص کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خاصہ داری نظام کو قبائلی

معاشرے میں ایک ادارے کی حیثیت حاصل ہے جو کہ ملکی نظام کے ماتحت کام کرتا ہے۔ خاصہ داری نظام کی ذمہ داری ہے کہ علاقے میں نظم و نسق برقرار رکھا جائے اور گزرگاہوں کی رکھوالی کو ہر طرح ممکن بنایا جائے اسی لئے اسے مجموعی قبائلی ذمہ داری برائے تحفظ کا نام دیا جاتا ہے۔ قبائلی معاشرے میں لشکر کو طاقت کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے۔ لشکر کی تعداد چند درجن سے لے کر ہزاروں تک ہو سکتی ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ بسا اوقات ملک کے لشکر کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔" وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکا پھر اس کی بات جاری رہی۔

"یاد رہے، قبائلی معاشرہ ایک تنگ نظر معاشرہ ہے تاہم مذہبی اقدار کا پاس بری سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ قبائلی معاشرے نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے کچھ ساختہ اسلوب مرتب کیے ہیں۔ انصاف کا نظام جرگہ اور بدل کے ذریعے نافذ کیا جاتا ہے جو کہ صدیوں پرانی رسوم و روایات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جرگے کی وجہ سے پولیٹیکل انتظامیہ کا کردار علاقے میں انتہائی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قبائلی علاقے کے لوگ جنگ جو اور انتہائی مہمان نواز ہیں تاہم اگر کوئی ان کی روایت کی پاس داری نہ کرے تو یہ جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ انتہائی سخت گیر نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور موروثی، خونی لڑائیوں کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی نوعمری ہی سے ذاتی بچاؤ اور نشانہ بازی کے رموز میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ ان لوگوں میں پہل پن کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اور وہ دشمن کی کمزوری سے بہ خوبی فائدہ اٹھانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ قبائلی علاقوں کے لوگ گوریلا کاروائیوں میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ افواج پاکستان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور خود ان کے بارے میں مصدقہ اطلاعات حاصل کرنا انتہائی مشکل ہے۔ کیونکہ وہ انتہائی چالاک لوگ ہیں۔ اسی لئے وہ نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں۔ قبائلی علاقے کے لوگوں کے بہت سے روپ ہوتے ہیں اس لئے ان کی شناخت نہایت ضروری ہے۔ روایتی طور پر وہ لوگ چھوٹی چھوٹی جنگی کارروائیوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ جن میں خاص طور پر چھاپہ، گھات شامل ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اچھے نشانہ باز ہوتے ہیں اس لیے کلاشن کوف ہی کو سنائپر رائفل کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں گھل مل کر رہنے کے لیے ضروری ہے کہ تمھیں ان لوگوں کی اچھی بری عادات کے بارے مکمل علم ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ وہاں آپ لوگوں کا پالا صرف قبائلیوں سے نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہاں پر ہر علاقے کے آدمی تمھیں نظر آئیں گے۔ مجاہدین کے روپ میں

دہشت گرد اور ایجنسیوں کے آدمی ملیں گے تو ملکوں اور سرداروں کے روپ میں غنڈے۔ باہر ممالک جیسے سعودی عرب وغیرہ کے بھی مجاہد امریکہ سے برسر پیکار ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ مجاہد اور دہشت گرد کی پہچان ہے جسے انڈیا، اسرائیل اور امریکہ وغیرہ کی ایجنسیوں اور بھی مشکل بنا دیا ہے۔ اس وجہ سے آرمی کو وہاں کام کرنے میں کافی مشکل پیش آرہی ہے۔ اس بارے آرمی کا لائحہ عمل تو بہت وسیع ہے جس کے بارے بات کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ البتہ اس لائحہ عمل کا ایک جز وہاں اپنے آدمیوں کو سول لوگوں کے روپ میں بھیجنا بھی ہے۔ اس ضمن میں آرمی نے کچھ تو سول لوگوں ہی کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے ایسے لوگ جو کہ اسلام اور وطن سے محبت رکھتے ہیں ۔ باقی تم جیسے خصوصی ایجنٹ وہاں بھیجے جا رہے ہیں۔ اور تم لوگوں کا کام بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں جو بڑے بڑے گروپ سرگرم عمل ہیں ان میں حقانی گروپ، حافظ گل بہادر گروپ.................." وہ تفصیل سے گروپوں کے بارے بتانے لگا۔ وہ بریفنگ کئی گھنٹوں پر مشتمل تھی۔ رات کے دو بجے جا کر ہمیں رخصت ملی اور اس کے بعد یونٹ سے رخصت ہونے تک روزانہ بلاوا آجاتا اور ہمیں بوریت بھری مفید معلومات سے بہرہ مند ہونا پڑتا۔

ہم دونوں کو جو بنیادی کام ملا وہ دشمن کے سنائپرز کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں موجود ایسے مقامی اور بااثر افراد کا خاتمہ تھا جو درپردہ غیر ملکی ایجنسیوں کے پٹھو تھے۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ ہدایات بھی مل گئی تھیں کہ وہاں ون الفا نامی ایک سینئر ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہونا تھا۔ ہمیں بغیر اشد ضرورت کے کسی سرکاری فرد سے رابطہ نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ کیونکہ ہمارا بھانڈا پھوٹ جانے کی صورت میں ہم دردناک موت کا شکار بھی ہو سکتے تھے۔ البتہ بہ حالت مجبوری آرمی سے رابطہ کرنے کی صورت میں ایک مخصوص پاس ورڈ بتا دیا گیا تھا، جو اس علاقے میں کام کرنے والی یونٹوں کے کمانڈنگ آفیسرز ہی جانتے تھے۔ اس کے ساتھ ہمیں نہ تو اپنا سروس کارڈ ساتھ لے جانے کی اجازت تھی اور نہ کوئی ہتھیار ہی ساتھ لے جا سکتے تھے۔ کیونکہ آرمی کے ہتھیاروں پر مخصوص نمبر کندہ ہوتے ہیں۔ ہتھیار خریدنے اور دوسری ضروریات کے لیے ہمارے اکاؤنٹس میں اچھی خاصی رقم ٹرانسفر کر دی گئی تھی۔ ہمیں رخصت کرتے وقت میجر وسیم کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"یوں سمجھو کہ تم دونوں پاکستان میں نہیں بلکہ کسی دشمن ملک میں جا رہے ہو۔ کچھ مخصوص بندوں کے بارے

میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔لیکن یہ یاد رکھنا وہ سول ہیں وہ تمھیں دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔بہت زیادہ محتاط رہنا ۔باقی تمھارے اکاؤنٹس میں منتقل کی گئی رقم کا مصرف صرف اور صرف تم دونوں کا مشن ہے۔یہاں تک کہ وہاں سے چھٹی آتے وقت کرایہ بھی تم اپنے ذاتی پیسوں سے ادا کرو گے۔باقی وہاں ون الفا تمھاری بہترین رہنمائی کے لیے موجود ہوگا۔امید ہے میری بات تم دونوں کی سمجھ میں آ گئی ہوگی۔''

''جی سر!'' بیک زبان کہتے ہوئے ہم نے اثبات میں سر ہلا دیے۔

''کوئی سوال؟''

''نو سر!''

''اللہ کے حوالے۔''اس نے کھڑے ہوتے ہوئے الوداعی معانقے کے لیے بازو پھیلا دیے۔

☆......☆......☆

یونٹ سے رخصت ہوتے وقت ہمیں پانچ پانچ دن کی چھٹی ملی تھی اس کے بعد ہم نے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔جب سے مجھے وزیرستان جانے کی بابت پتا چلا تھا میں نے بال کٹوانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وزیر اور محسود قوم کے مردوں کے بال بھی عورتوں کی طرح بڑے بڑے ہی ہوتے ہیں۔ویسے تو ایک مخصوص حد تک بڑے بال نبی پاک ﷺ کی مبارک سنت بھی ہے۔لیکن وزیر اور محسود یہ بال شاید ہی سنت سمجھ کر بڑھاتے ہوں۔وہ تو بس اپنی ثقافت جان کر ایسا کرتے ہیں۔واپسی کے دن ہم نے ڈیرہ اسماعیل خان میں اکٹھا ہونا طے کیا تھا۔میں صبح ناشتے کے بعد پھوپھو جان اور ابو جان سے الوداع ہو کر گھر سے نکل آیا،دن کے ایک بجے تک میں ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا تھا۔سردار کے آنے تک میں ویگن اڈے میں موجود ایک سستے ہوٹل کے سامنے دھری چارپائی پر بیٹھا رہا ۔وہ اڑھائی بجے کے قریب وہاں پہنچا تھا۔ویپن خریدنے کے لیے ہم نے اپنے اکاؤنٹس سے دو دو لاکھ کے قریب رقم پہلے سے نکلوائی ہوئی تھی۔وانہ جانے کے لیے اس اڈے سے کوئی گاڑی نہیں مل رہی تھی۔پوچھنے پر ہماری ایک اور بس اڈے کی طرف رہنمائی کر دی گئی۔رکشے میں بیٹھ کر ہم مطلوبہ بس اڈے میں پہنچ گئے۔رستے میں البتہ ہم نے کچھ ضروری خریداری بھی کر لی تھی۔جس میں دو سلیپنگ بیگ اور گرم چادریں اور اور گرم کوٹ وغیرہ شامل تھے۔وانہ جانے کے لیے ہمیں ویگن مل گئی تھی۔ہم رات کو کہیں آٹھ نو بجے ہی وانہ پہنچ پائے تھے۔

ایک مناسب سے ہوٹل میں کمرہ لے کر ہم نے شب باشی کا بندوبست کیا۔

''سردار صاحب!......اب سناؤ کیا ارادے ہیں؟'' چارپائی سنبھالتے ہی میں نے سردار کو پشتو میں مخاطب ہوا۔اب میں اچھی خاصی روانی سے پشتو بول لیتا تھا۔

''فی الحال تو آرام کرنا ہے بہت تھک گیا ہوں، صبح ہی اسلحہ وغیرہ کی خریداری ہو سکے گی۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کرلیں تھیں۔

''اچھا مشورہ ہے۔'' میں نے اس کی تائید کرنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔

صبح نو دس بجے ہم وانہ میں موجود مخصوص آدمی کے حجرے میں موجود تھے۔اسے اپنی پہچان کراتے ہوئے ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''قہوے سے ہماری تواضع کرنے بعد وہ سید ھا مدعا پر آ گیا۔''جی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''ہمیں اسلحہ درکار ہے۔'' سردار نے جواب دیا۔

''کون کون سا؟''

''ایک کلاشن کوف، ایک تیس بور پستول، ایک ڈریگنو ورائفل اور آئی کام سیٹ۔'' اس مرتبہ بھی اسے جواب دینے والا سردار ہی تھا۔چونکہ ہم نے پہلے سے طے کرلیا تھا کہ کون کون سا ہتھیار اور سامان خریدنا ہے اس لیے اس نے بغیر لمحہ ضائع کیے بتادیا تھا۔

''ہونہہ!......مل جائے گا۔اور کچھ؟''

''نہیں بس یہی کافی ہے۔'' سردار کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''چلو پھر یہ تو ابھی خرید لیتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم ایک دوسرے آدمی کے گھر میں موجود تھے۔بیٹھک کے ساتھ اس نے ایک کمرہ ایسا بنایا ہوا تھا جدھر کافی مقدار میں اسلحہ موجود تھا۔ہمارے میزبان قرار خان سے اس کی اچھی واقفیت تھی اس لیے بغیر کسی پوچھ گچھ کے وہ ہمیں سیدھا اپنے اسلحہ خانے میں لے گیا۔روسی ساخت کی کلاشن کوف جس کی بیرل قلم نما ترشی ہوتی ہے سردار نے اپنے لیے پسند کی تھی۔میں نے ڈریگنو ورائفل اور درے کا بنا ہوا تیس بور پستول خرید لیا۔اس

کا سائیلنسر بھی میں نے مانگا مگران کے پاس سائیلنسر موجود نہیں تھا۔ڈریگنو ورائفل کے میں نے سوراؤنڈ بھی خرید لیے تھے۔آئی کام سیٹ خریدنے کے لیے ہمیں بازار کارخ کرنا پڑا۔ایک سیٹ،ایک فالتو بیٹری اورایک چارجرخرید کرہم قرار خان کا شکریہ ادا کرکے اسی ہوٹل میں آگئے جہاں ہم نے رات گزاری تھی۔ایک اور رات وہیں گزار کرہم اگلے دن وانہ سے آگے بڑھ گئے۔ہماری منزل شکئی کا شہر تھا جووانہ سے قریباً تیس پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

آرمی قافلے کی حرکت کے بارے ہمیں ایک مخصوص شخص سے پتا چلنا تھا۔روزانہ رات کے نو بجے کے بعد صبح طلوع آفتاب سے پہلے تم ہم چینل نو پراس سے رابطہ قائم کرسکتے تھے۔

شکئی ایک چھوٹا سا شہر ہے۔وہاں ٹھہرنے کے بجائے ہم نے مضافات میں نکل جانا مناسب سمجھا۔وزیرستان میں ہرطرف چھوٹی چھوٹی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔پہاڑوں کی وادیوں میں اونچی ڈھلانوں پر نالوں کے کناروں پراور جنگلات میں۔کہیں تو فقط تین چار گھروں کی آبادی ہے تو کہیں پچاس،ساٹھ اور سوا اور دو سو گھرانوں کی آبادی ہے۔دہشت گردوں کے اڈے زیادہ تر پہاڑیوں کی بلندیوں پر بنے ہوئے تھے۔پہاڑیوں میں موجود بڑے بڑے غار انھیں چھپنے میں مدد دیتے تھے۔جہاد کا جذبہ رکھنے والے اصل مجاہدوں کے ٹھکانے بھی ایسی ہی جگہوں پر بنے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ آبادیوں میں بھی گھر لے کر وہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ہرآبادی کا ایک بڑا ہوتا ہے،جسے ملک یا مشر کہتے ہیں۔

ہم دونوں پیدل ہی ایک جانب روانہ تھے۔دوپہر کا کھانا ہم نے خرید کر پاس رکھا ہوا تھا۔ایک مناسب جگہ بیٹھ کر ہم نے پیٹ پوجا کی اور پھر چل پڑے۔دو تین ڈبل کیبن جیپیں ہمارے پاس سے گزریں مگر ہم لفٹ مانگے بغیر چلتے رہے۔سہ پہر ڈھلے ہم ایک چھوٹی آبادی کے قریب سے گزرے کچی سڑک سے وہ آبادی کوئی سو دوگز بلند ہموار جگہ پر بنی ہوئی تھی۔سڑک کنارے ایک شخص گدھے پر لکڑیاں لادے جارہا تھا۔اس کا رخ آبادی ہی کی جانب تھا۔وہ سڑک کے دائیں جانب موجود جنگل سے برآمد ہوکر ہمارے آگے آگے چلنے لگا تھا۔

سردار قدم بڑھا کراس کے قریب ہوتے ہوئے مخاطب ہوا۔”بھائی صاحب!......رات گزارنے کی کوئی جگہ مل جائے گی۔“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔”چلو میرے ساتھ۔“

ہم۔”جزاک اللہ۔“ کہہ کر اس کی معیت میں چل پڑے۔

وہ پوچھنے لگا۔”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”شوال وادی۔“اس بار بھی جواب سردار ہی نے دیا تھا۔

”ویسے یہاں سے شوال وادی تک کتنا فاصلہ ہوگا؟“اس کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے میں اس سے پوچھنے لگا۔

لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔”فاصلے کے بارے تو وضاحت نہیں کر سکتا البتہ پیدل جاتے ہوئے ایک دن لگ جائے گا۔“

”کبھی گئے ہو وہاں؟“میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”جی، دو تین بار اتفاق ہوا ہے جانے کا۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور اس گاؤں کا کیا نام ہے؟“

”شہزادہ خان کلے، ویسے اصل شہزادہ خان کلے پیچھے والا گاؤں ہے جس سے گزر کر آپ یہاں تک پہنچے ہیں۔“اسی سوال و جواب میں ہم اس کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے۔وہاں چند گھر ہی تھے۔گھروں کے تقریباً درمیان میں ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔اس وقت بھی دو تین قریب البلوغ بچیاں وہاں بیٹھی پانی بھر رہی تھیں۔ہم ان کے قریب سے گزرے تھے۔وہ ہمیں حیرانی اور دلچسپی بھری نظروں سے گھور کر رہ گئی تھیں۔

وہاں عموماً لوگ قلعہ نما گھر بناتے ہیں۔جن کی چار دیواری دس گیارہ فٹ کے قریب ہوتی ہے۔دیوار کے دو مخالف کونوں میں مورچوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔اس چار دیواری کے بیچوں بیچ وہ رہائشی کمرے بناتے ہیں جن کی بلندی بس اتنی ہوتی ہے کہ آدمی آسانی سے کھڑا ہو سکے۔چار دیواری مٹی کی بنی ہوتی ہے لیکن بہت مضبوط ہوتی ہے۔دیوار کی چوڑائی قریباً ڈیڑھ سے دو فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔اتنی سیدھی اور ہموار گویا اینٹوں سے چنائی کی گئی ہو۔دیوار کو لپائی کرنے کی زحمت وہ نہیں کرتے اور دیوار کے اوپر سرکنڈے، جھاڑیاں یا اس طرح کی کوئی اور چیز رکھ کر اوپر مٹی ڈال دیتے ہیں اس طرح دیواروں کے اوپر پڑنے والا بارش کا پانی دیوار پر نہیں بہہ

پاتا۔اندرونی کمرے، کچے یا پکے بلاکوں کے بنے ہوتے ہیں۔چھتوں میں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر استعمال کرتے ہیں۔لکڑی کی اس علاقے میں کوئی کمی نہیں ہے۔

ہمارے میزبان کا نام کریم خان تھا۔اس کا گھر بھی رواج کے مطابق بنا ہوا تھا۔ہمارے لیے بیٹھک کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلا گیا۔گھر کا سربراہ کریم کا والد تھا۔کریم کے علاوہ اس کے دو بیٹے اور بھی تھے۔رات کا کھانا ہم نے تینوں بھائیوں اور باپ کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہی ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے میں تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے لیٹ گیا۔وہ بھی گپ شپ پر مصر ہوئے بغیر خوش دلی سے اٹھ کر اندر چلے گئے۔

نو بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے جب میں نے آئی کام آن کر لیا۔آواز میں نے بالکل دھیمی ہی رکھی تھی۔چونکہ یہ پہلے سے طے تھا کہ میرے پکارنے ہی پر جواب دیا جائے گا۔اس لیے میں نے خود ہی اپنا پاس ورڈ پکارنا شروع کر دیا۔

''ایس ایس فارون الفا اوور۔'' چند مرتبہ یہ دہرانے کے بعد ہی سپیکر سے ایک بھاری آواز برآمد ہوئی۔

''ون الفا فار ایس ایس......سینڈ یور میسج اوور۔''

''پہنچنے کی اطلاع دینا تھی اوور۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے کہا۔''یس، خدا حافظ۔'' میں نے فوراً سات چینل اوپر کر کے نئی فریکونسی لگا دی۔ایسا ون الفا نے احتیاطاً کروایا تھا کیونکہ کوئی بھی اگر ہماری بات سن رہا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ ہم نے رابطہ منقطع کر دیا ہے۔لیکن اس نے یس کہہ کر جو خدا حافظ کہا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ'' خدا حافظ'' میں جتنے حروف تھے اتنے چینل اوپر چلوں۔اگر وہ نو کہہ کر کوئی لفظ بولتا تو اس لفظ میں موجود حروف کی تعداد کے مطابق میں نیچے چینل لگاتا۔

مطلوبہ چینل لگاتے ہی وہی بھاری آواز سنائی دی۔

''جگہ اوور؟''

''شہزادہ خان کلے اوور۔''

''پرسوں شکئی سے آگے فوجی قافلہ چلے گا۔تین جگہیں ایسی ہیں جہاں گھات لگنے کا زیادہ خطرہ ہے۔پہلی دو

جگہوں پر آرمی کی پکٹنگ لگی ہوگی، تیسرا مقام جو سب سے خطرناک ہے اسے تم لوگوں نے سنبھالنا ہے۔ گزشتہ قافلے میں اس جگہ ہمارے چار جوان، سنائپرز کا شکار ہو چکے ہیں اوور۔''

''وہاں پکٹنگ نہیں لگ سکتی اوور!''

''نہیں وہ جگہ کافی دور ہے۔ اور ہمارے پاس اتنی نفری نہیں ہے کہ تمام علاقے میں پکٹنگ کر سکیں۔ ایک دو اور وجوہات بھی ہیں جو ملنے پر بتا پاؤں گا۔ اوور!''

میں نے پوچھا۔''جگہ کی نشان دہی کر دو اوور۔''

''شہزاد خان کلے سے آپ جنتوئی جائیں وہاں سے آگے لگرائے آئے گا۔ یہ گاؤں جس پہاڑی کے دامن میں بنا ہے اس کی بلند ترین چوٹی لگی نرائے کے ساتھ ہی زیڑہ کیل کی چوٹی آتی ہے۔ یہ بالکل شمالی اور جنوبی وزیرستان کی حد بن رہی ہے۔ اسی جگہ کو آپ نے سنبھالنا ہے اوور!''

میں نے پوچھا۔''قافلہ گزرنے کا وقت اوور!''

''بارہ سو سے چودہ سو کے درمیان اوور۔'' (یاد رہے آرمی میں دن کے بارہ بجے کے بعد تیرا بجتے ہیں۔ اور وقت کی فارمیٹ چوبیس گھنٹے والی استعمال ہوتی ہے، تاکہ مطلوبہ وقت میں کسی شک کی گنجائش ہی نہ رہے)

میرے ''راجر!'' (سمجھ گیا) کے جواب میں اس نے۔''اوور اینڈ آل!'' کہا اور میں نے آئی کام بند کر دیا۔

سردار نے ساری گفتگو سن لی تھی۔ میری بات ختم ہوتے ہی اس نے کہا۔

''مطلب کل جنتوئی کا راستہ ناپیں گے۔''

''بالکل۔'' کہہ کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح ناشتا کر کے ہم نے اپنے میزبانوں سے جنتوئی کا راستہ معلوم کیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے اجازت لے کر چل پڑے۔ وہاں سے جنتوئی تک سڑک موجود تھی۔ دو تین گھنٹوں میں پیدل چلتے ہوئے ہم جنتوئی پہنچ گئے تھے۔ ہم نے اپنا حلیہ اور لباس اسی علاقے کے لوگوں جیسا بنایا ہوا تھا اس لیے کسی نے ہم پر خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس علاقے کے لحاظ سے جنتوئی ایک بڑی آبادی کا گاؤں تھا۔ ایک مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے تبلیغی جماعت ڈیرہ ڈالے نظر آئی۔ سردار خان کو آنکھ سے اشارہ کر کے میں مسجد ہی میں گھس گیا۔ سردار نے میری تقلید کی تھی۔ ہمارے پاس موجود سفری تھیلوں

سے انھیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ہم مسافر ہیں۔ان سے ہاتھ ملا کر ہم نے اپنا سامان ایک دیوار کے ساتھ رکھا اور وضو کرنے لگے۔ ہمارے وضو کرنے تک ان کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔دستر خواں بچھا کر انھوں نے ہمیں خلوص سے کھانا کھانے کی دعوت دی۔ ہمارا تو مطمع نظر ہی اس وقت کھانا کھانا تھا اس لیے ہم بلا تکلف ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔کھانے کے بعد بھی ہم ان کے ساتھ بیٹھے رہے۔ان کا امیر ایک باریش شخص تھا۔اپنا تعارف وغیرہ کرانے کے بعد اس نے غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رخ دعوت الی اللہ کی طرف موڑ دیا ۔ظہر کی آذان تک ہم اس کی پر مغز اور روح پرور گفتگو سے مستفید ہوتے رہے۔نماز پڑھ کر بھی ہم وہیں بیٹھے رہے۔اپنی دعوت کے روزمرہ سے فارغ ہو کر انھوں نے ہمیں چائے بھی پلائی۔اس کے بعد ہم ان سے رخصت ہو لیے۔ہمارا ارادہ لگی نرائے تک جانے کا تھا۔تا کہ اگلے دن ہم صبح سویرے ہی اپنی جگہ پر بیٹھ سکیں۔ عصر سے پہلے ہی ہم لگرائے پہنچ گئے تھے۔لیکن وہاں رکنے کے بجائے ہم آگے بڑھتے گئے۔لگرائے گاؤں سے آگے مسلسل چڑھائی تھی۔جب ہم لگی نرائے پہنچے تو شام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔مکمل اندھیرا چھانے سے پہلے ہم نے رات گزارنے کے لیے جگہ تلاش کر لی۔درختوں کے جھنڈ میں موجود ایک بڑی چٹان کے نیچے ہم نے اپنا سامان رکھا اور اطراف میں گھوم کر چند منٹوں میں کافی ساری خشک لکڑیاں اکٹھی کر لیں۔وہاں اچھی خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔اپنی گرم چادریں دائیں بائیں باندھ کر ہم نے ہوا کی آمد کا راستہ روکنے کی واجبی سے کوشش کی اور پھر آگ جلا دی۔ایسے موقع کے لیے ہم پہلے سے انتظام کر کے چلے تھے۔سردار سٹیل کا کٹورا نکال کر چائے بنانے لگا۔چنوں وغیرہ سے بنے غذائیت سے بھرپور مخصوص بسکٹ ہمارے پاس موجود تھے۔دو تین بسکٹ ہی آدمی کو بارہ تیرہ گھنٹے کے لیے خوراک سے بے نیاز کر دیتے تھے۔چائے وغیرہ پی کر سردار نے میرا سلیپنگ بیگ نیچے بچھایا اور اپنے سلپنگ بیگ میں گھس کر سو گیا۔جبکہ میں رات ایک بجے جاگتا رہا۔اس دوران میں نے آگ کو نہیں بجھنے دیا تھا۔ایک بجے سردار نے میری جگہ سنبھالی اور میں سو گیا۔میری آنکھ سردار کے جگانے پر کھلی۔وہ چائے تیار کر چکا تھا۔ناشتے سے فارغ ہو کر ہم بغیر وقت ضائع کیے زیرہ کیل کی جانب بڑھ گئے ۔ہتھیار کے علاوہ ہم نے باقی سامان وہیں چھوڑ دیا تھا۔وہ چوٹی قریباً تین چار سو میٹر آگے تھی۔اس کی بلندی بھی لگی نرائے سے کچھ زیادہ تھی۔ پندرہ بیس منٹ میں ہم وہاں تھے۔مزید گھنٹا بھر لگا کر ہم نے اپنے لیے ایک

فائرنگ پوزیشن بنالی۔ایسی جگہ جہاں سے ہمیں آسانی سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔کچا راستہ کافی نیچے سے گزر رہا تھا۔یہ جگہ ایسی تھی کہ وہاں سے سڑک تک اترنے کے لیے کافی دور جا کر راستہ مل سکتا تھا۔وہ درہ نما راستہ بن رہا تھا۔ہمیں اپنی جگہ پر چھپے گھنٹا بھر ہی ہوا ہوگا کہ مجھے بائیں جانب حرکت نظر آئی۔دوربین تو ہمارے پاس موجود نہیں تھی میں نے ڈریگنو ورائفل کی ٹیلی سکوپ میں دیکھا۔دو تین آدمی اوپر آرہے تھے۔انھوں نے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامی ہوئی تھیں۔ان کے اطمینان کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اس پہاڑی پر آرمی کی کوئی پکٹ لگی ہوئی نہیں ہے۔اور ایسا لازمی طور اس وجہ سے تھا کہ وہ آرمی کی حرکت سے باخبر رہتے تھے ۔مزید کچھ دیر کی جستجو کے بعد مجھے ان کی صحیح تعداد معلوم ہوگئی تھی۔

”سردار خان!...... پانچ آدمی ہیں اور تمام کے پاس کلاشن کوفیں ہیں۔“

سردار مسکرایا۔”گویا، تمھاری پانچ گولیاں ضائع ہوگئیں۔“

وہ ایک اچھا نشانے باز تھا۔پٹھان قوم یوں بھی ہتھیار کے استعمال کی ماہر ہوتی ہے۔وہ پٹھان ہونے کے ساتھ ایک سنائپر بھی تھا۔لیکن جب سے ہم امریکہ سے لوٹے تھے اس کے بعد اسے میرے نشانے پر بہت زیادہ اعتماد ہو گیا تھا۔اب بھی اصولاً ڈریگنو ورائفل اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھی کہ وہ مجھ سے سینئر تھا۔لیکن اس کے عکس اس نے خود کلاشن کوف پکڑی ہوئی تھی اور میرے حوالے سنائپر رائفل کی ہوئی تھی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا۔”ہونے دو ضائع، ہمارے کون سے اپنے پیسے خرچ ہوئے ہیں۔“

”اب مجھے بھی نظر آ گئے ہیں۔“ سردار نے درختوں کے عقب سے برآمد ہونے والے آدمیوں کو دیکھ کر کہا۔

وہ تمام اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگے۔ہم نے جان بوجھ کر ایسی جگہ پر فائرنگ پوزیشن بنائی تھی جہاں سے نیچے سڑک پر فائر کرنا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔اسی وجہ سے انھوں نے اس ٹیکری کو نظر انداز کر دیا تھا۔چند منٹوں کے اندر انھوں نے اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کر لی تھی۔دو آدمی ہمارے چھپنے کی جگہ سے فقط پچاس گز دور ہی بیٹھے تھے۔ان سے ساٹھ ستر گز ہٹ کر دو آدمی ایک بڑے پتھر کے پیچھے لیٹ گئے تھے ۔ان کا پانچواں آدمی ہم سے دو سو گز کے فاصلے پر ایک بڑے درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھا تھا۔اس کے ہاتھ میں مجھے وائرلیس سیٹ بھی نظر آ رہا تھا۔

میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی ساڑھے گیارہ ہونے کو تھے۔چند کلومیٹر کے فاصلے پر مجھے گرد و غبار اٹھتا نظر آیا ۔یہ وہی سمت تھی جس جانب سے آرمی قافلے نے آنا تھا۔

میرے کانوں میں دہشت گردوں کے قہقہے کی آواز آئی۔نہ معلوم کس بات پر وہ ہنس رہے تھے۔ان کے حملے کا طریقہ کار مجھے معلوم تھا۔کلاشن کوف کے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کر کے یہ بیرل کا رخ آرمی کے جوانوں کی طرف کر کے ٹریگر دبا کر رکھتے ہیں۔اور جب تک میگزین خالی نہیں ہو جاتی ٹریگر دبائے رکھتے ہیں۔اس طرح اندھادھند فائرنگ کی زد میں پاک آرمی کا کوئی نہ کوئی جوان لازمی آجاتا ہے اور یہی ان کی کامیابی ہوتی ہے۔

''میرا خیال ہے پہلے انھی دونوں کا سر اڑانا۔'' سردار نے سرگوشی کرتے ہوئے نزدیک موجود دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں پہلے دور والے۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سرگوشی کی۔''دور والوں کو اگر ہماری بھنک مل گئی تو وہ چھپ سکتے ہیں۔یہ دونوں تو گھڑے کی مچھلی ہیں۔''

''ہونہہ!...... یہ صحیح ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں آرمی کا قافلہ قریب پہنچ گیا تھا۔قافلے کے قریب پہنچتے ہی میں نے سب سے دور موجود شخص کے سر کا نشانہ سادھ لیا تھا۔

پہلی تین گاڑیوں کے گزرنے کے ساتھ ہی انھوں نے ایک دم فائر کھول دیا تھا۔تمام خود تو پتھر کے پیچھے چھپے تھے۔البتہ ان کی کلاشن کوف کی نال پتھر کی ایک جانب سے آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔اس طرح کہ اگر ان کے خلاف درست فائر بھی کیا جاتا تب بھی وہ سامنے سے آنے والی گولی سے محفوظ رہتے۔لیکن اس وقت ان کی بدقسمتی کہ ان کے عقب میں ہم موجود تھے۔

ماحول گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ایسی صورت حال میں ڈریگنو کی گولی کی آواز کس نے سننا تھی ۔میرے ٹریگر دباتے ہی ان کا پہلا آدمی لڑھک گیا تھا۔وہ جس تنے کی آڑ میں بیٹھا تھا وہیں نیچے ڈھلان کی طرف منہ کے بل گرا تھا۔اگلی دو گولیوں نے سو گز دور پڑے دونوں آدمیوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر دیے تھے

۔سردار نے بھی کلاشن کوف تیاری حالت میں پکڑی تھی مگر یہ صرف حفظِ ماتقدم کے طور پر تھا۔آرمی کے جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کردی تھی۔اس لیے فائرنگ کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

ہمارے نزدیک پڑے دونوں جوان ابھی تک اپنے ساتھیوں کی ہلاکت سے ناواقف تھے۔میں نے ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کے سر میں گولی اتاری۔اس مرتبہ اس کے ساتھی کو پتا چل گیا تھا۔اس نے ہراساں نظروں سے اپنے ساتھی کی خون چکاں لاش دیکھی۔اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف اٹھیں۔انھیں بے حس وحرکت دیکھ کر وہ جھکے جھکے انداز میں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ان بہادروں کی ہمت بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ چھپ کر فائر کرو اور جب دیکھو کہ آگے سے اینٹ کا جواب پتھر سے مل رہا ہے تو پھر بھاگو۔انھوں نے بھی گھات کے لیے جو جگہ چنی تھی اس کے عقب میں بھاگنے کا وسیع راستہ موجود تھا۔عقبی ڈھلان سے اتر کر وہ جہاں مرضی چاہے جا سکتے تھے۔ان گھنے جنگلوں، ہاتھ کی لکیروں کی طرح پھیلے ندی نالوں، غاروں، کھڈوں اور سمندر کی لہروں کی طرح حدنگاہ تک نظر آنے والے پہاڑی سلسلوں میں چندافراد کو ڈھونڈنا جتنا مشکل ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص آسانی سے لگا سکتا ہے۔جس نے ان علاقوں کو دیکھا ہوا ہو۔

میں نے اسے چند قدموں سے زیادہ آگے نہیں جانے دیا تھا۔ڈریگنوو کی گولی اس کے کولہے میں لگی تھی۔وہ منہ کے بل گر پڑا تھا۔

”سردار!......اسے زندہ پکڑنا ہے۔“

”ٹھیک ہے باس۔“اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”یوں بھی اسے جس جگہ گولی لگی ہے اب گھسیٹ کر ہی کہیں جا سکتا ہے۔

اچانک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور ہم سے دو سو گز دور مارٹر گن کا گولہ لگا۔میں نے متوحش انداز میں نیچے جھانکا۔آرمی کے جوانوں نے ایک بڑی چٹان کے عقب میں مارٹر گن لگا لی تھی۔میں نے جلدی جلدی آئی کام آن کیا۔

”ایس ایس فاروَن الفا اوور۔“

”سینڈ یور میسج اوور!“ مجھے پہلی کال کے جواب میں وَن الفا کی آواز سنائی دی۔

”ون الفا!......آپ قافلے کے ساتھ ہیں اوور!“میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”ہاں......ساتھ ہوں تو تمھیں سن رہا ہوں نا، ورنہ اتنی دور تک آواز کہاں جاتی ہے اوور!“

”تو پھر جلدی سے مارٹر کا فائر رکواؤ۔ یہاں اب ہم دو ہی بچ گئے ہیں۔ پانچ بندے تھے سارے جہنم واصل ہو گئے ہیں اوور!“

”گڈ!“ کہہ کر خاموشی چھا گئی تھی۔اسی وقت ایک اور گولہ پہلے گولے سے پچاس گز ہماری طرف لگا تھا۔

”ون الفا فار ایس ایس اوور!“

”یس!“میں نے مختصراً کہا۔

”فائر رکوا دیا ہے اور......ویٹ......“اس نے بات درمیان میں چھوڑ دی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس کے آواز دوبارہ ابھری۔”ایس ایس!......ہمارے دائیں جانب پہاڑی پر کوئی سنائپر موجود ہے اوور!“

”لوگوں کو اس طرف آڑ میں کر لو میں دیکھتا ہوں اوور!“سرعت سے جواب دیتے ہوئے میری نگاہیں سامنے کی پہاڑی پر گھومنے لگیں۔خوش قسمتی سے سورج میری پشت پر چمک رہا تھا۔میری نگاہیں نے ایسی جگہ کو تلاشنے لگیں جہاں ایک ایسا سنائپر جس نے نیچے گہرائی میں موجود ہدف کو نشانہ بنانا ہو اپنا ٹھکانہ بنا سکتا تھا۔

”ایس ایس!......“دو آدمی زخمی ہو گئے ہیں اوور۔“الفا کی آواز میں گہرا غم چھپا تھا۔اسے جواب دینے کے بجائے میری نظریں سامنے پہاڑی پر سرگرداں تھیں۔اور پھر شیشے کی چمک نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا میں نے بغیر تاخیر کے ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے سے اس سمت دیکھا۔سبزے کا ڈھیر مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ وہاں دو سنائپر موجود تھے۔ان کے چھپنے کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ باقاعدہ سنائپر کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔

”سردار!......سامنے والی پہاڑی پر موجود درختوں کے جھنڈ کے ساتھ والی ٹیکری کا فاصلہ میرے خیال میں تو آٹھ سو میٹر ہو گا۔“

”نہیں ہزار میٹر سے کم نہیں ہے۔“اس نے فوراً جواب دیا۔چونکہ ہمارے پاس لیزر رینج فائینڈر (فاصلہ

ناپنے والا آلہ) موجود نہیں تھا اس لیے میں اندازے والا کلیہ استعمال کیا تھا۔

"ٹھیک ہے نوسو رینج لگا دی ہے۔" میں نے فوراً اپنے اور اس کے اندازے کا اوسط نکالتے ہوئے نوسو رینج لگائی۔ اور اس سبزے کے ڈھیر پر شست سادھ لی۔ اچانک مجھے ہلکی سی حرکت دکھائی دی شاید اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ میری انگلی نے فوراً ٹریگر کی آزادانہ حرکت کو پورا کیا۔ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ میں نے اٹھے ہوئے سر کو نیچے گرتے دیکھا۔ ایسا دو صورتوں میں ہو سکتا تھا۔ یا تو اسے گولی لگ تھی یا وہ اگلی گولی سے بچنے کے لیے لیٹا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ پڑے ڈھیر میں حرکت ہوتی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرا پہلا اندازہ درست تھا۔ وہ میری گولی کا شکار ہو چکا تھا۔ میں نے اندازے سے بالکل صحیح رینج لگالی تھی۔ دوسرے بے وقوف نے ایک دم اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ڈریگنو ورائفل عام سنائپر رائفلز کے برعکس سیمی آٹو میٹک ہے۔ اس لیے مجھے رائفل کو بار بار کاک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور زمین سے اٹھ کر اس نے یوں بھی مجھے زیادہ ہدف مہیا کر دیا تھا۔ یقیناً گولی اس کی گردن کے تھوڑا نیچے، دونوں کندھوں بیچ میں لگی تھی۔ وہ منہ کے بل گر گیا تھا۔

"ایس ایس فار الفا اوور!"

"سینڈ یور میسج اوور!" الفا کی آواز میں غصے کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"ہدف کو کامیابی سے نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ آپ اپنا سفر جاری رکھیں اوور!"

"گڈ......اوور اینڈ آل۔" اس کے لہجے میں غصے کی جگہ اطمینان اور خوشی نے لے لی تھی۔

"سردار!......اپنے دوست کو سنبھالو۔"

"لیس باس!" کہہ کر وہ تھوڑی دور اوندھے لیٹے دشمن کی طرف بڑھ گیا۔ میری نظریں چاروں جانب سرگرداں رہیں۔ ممکن تھا کوئی چھپا ہوا شکاری ہماری تاک میں ہوتا۔ مگر سردار کو بہ خیر و خوبی اس زخمی کے پاس پہنچتے دیکھ کر میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔

"اسے یہاں لے آؤ۔" میں نے سردار کو آواز دی اور وہ سر ہلاتے ہوئے نیچے پڑے دشمن کا ہاتھ پکڑ کر اسے میری جانب گھسیٹ کر لانے لگا۔ وہ ننگ انسانیت اسی لائق تھا اس لیے میں بھی سردار کے طریقے سے متفق تھا۔ سردار نے اسے ٹیکری کی جڑ میں پھینکا۔ میں نیچے اتر کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔

میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے سیدھا لٹایا۔اس کے چہرے کے نقوش درد کی شدت سے بگڑ گئے تھے ۔اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں خوف اور نفرت بھرے تاثرات کو محسوس کرنا مشکل نہیں تھا۔

''تو تمھارا نام کیا ہے؟''میں نے اس کی زخمی طرف پاؤں رکھ کر زور سے دبایا۔

''آہ......''اس کے منہ سے بے ساختہ درد بھری آواز نکلی۔

''اوہ......معذرت خواہ ہوں۔شاید درد ہو رہا ہے۔''میں نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''تم کس کے آدمی ہو؟''اس نے بہ مشکل اپنی کراہوں پر قابو پا کر بگڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''میں نے کچھ پوچھا تھا۔''میں نے دوبارہ اس کی مضروب جگہ پر پورے پاؤں کا دباؤ ڈالا۔

''ضض......ضمیر خان......ضمیر خان۔''اس نے درد سے چلاتے ہوئے اپنا نام ادا کیا۔

''ہونہہ!......تو کس کے کتے ہو؟''اس مرتبہ بھی میں نے اس کی زخمی طرف کو اپنے پاؤں کے دباؤ کا نشانہ بنایا تھا۔

''تت......تم اچھا نہیں کر رہے......سردار قبیل خان تم لوگوں کو چھوڑے گا نہیں۔''درد سے تڑپتے ہوئے بھی وہ دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

''یہ پانچوں سردار قبیل خان کے آدمی تھے۔''میں نے اپنی حرکت دہراتے ہوئے اگلا سوال پوچھا۔

''ہاں......ہاں......ہاں اور خدا کے لیے میں ہر بات کا جواب دوں گا یوں نہ کرو......''زخم پر مسلسل پڑنے والے دباؤ سے اس کی ٹانگ رعشے کے مریض کے ہاتھوں کی طرح کانپ رہی تھی۔

''وہ سامنے پہاڑی پر جو دو آمی موجود تھے وہ بھی قبیل خان کے آدمی تھے؟''اس مرتبہ میں نے اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ان پانچوں کے علاوہ مجھے نہیں معلوم کہ سردار کو کوئی اور بندہ یہاں تھا۔''

''سردار خان!......اس کے ہاتھ باندھ کر لاشوں کی تلاشی لو اور تمام ہتھیار اکٹھے کر لو،میں ذرا ان سنائپرز کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

سردار نے منہ بنایا۔''کیا ضروت ہے ان کا جائزہ لینے کی۔''

''وہ دونوں مجھے تربیت یافتہ سنائپر لگ رہے تھے۔اس لیے ان کے بارے جاننا ضروری ہے۔'' نیفے میں تیس بور پستول کی موجودی کا یقین کرتے ہوئے میں اس طرف بڑھ گیا جہاں سے نیچے اتر سکتا۔آرمی کا قافلہ وہاں سے نکل گیا تھا۔سامنے والی پہاڑی کا ہوائی فاصلہ تو آٹھ نو سو میٹر تھا،لیکن درمیان میں ایک نالہ پڑتا تھا اس وجہ سے زمینی فاصلہ زیادہ بن رہا تھا۔پھر اس مقام سے براہ راست نالے میں اترنا بھی مشکل تھا اس کے لیے مجھے تین چار سو میٹر دائیں جانا پڑا۔وہاں سے نالے میں اتر کر میں تیز تیز چلتے ہوئے مطلوبہ پہاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔یوں بھی اس علاقے میں دوڑنا قریباً ناممکن ہی ہے کیونکہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس بہت زیادہ پھول جاتا ہے۔اترائی میں جاتے ہوئے تو پھر بھی کچھ نہ کچھ دوڑا جا سکتا ہے چڑھائی چڑھتے ہوئے تو ایسا سوچنا ہی بے وقوفی ہے۔میں نالے میں آگے بڑھتا گیا۔مناسب ڈھلوان آتے ہی میں اوپر چڑھنے لگا۔درمیان سے کچھ اوپر پہنچتے ہی میں نے پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔مطلوبہ جگہ کے قریب پہنچ کر میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ان دونوں میں سے اگر کوئی زندہ بچ گیا ہوتا تو مجھے نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ ان کا کوئی تیسرا آدمی بھی وہاں موجود ہوتا۔لیکن یہ صرف امکان تھا۔سنائپرز عموماً جوڑیوں میں اپنا کام کرتے ہیں،یا پھر اکیلے۔

ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر میں نے چند سیکنڈز گن لی اور پھر اپنا سر آگے کو نکال کر ان کا جائزہ لیا،مگر ان کے بدن میں حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔پھر بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑے بغیر میں ان کی جانب بڑھا۔سب سے پہلے میں نے اس کا جائزہ لیا جو فرار ہونے کی کوشش میں میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔میں نے اسے سیدھا کیا شکل سے وہ کوئی مقامی ہی نظر آتا تھا۔اس کی حرکت یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کوئی باقاعدہ سنائپر نہیں تھا ورنہ یوں اٹھ کر نہ بھاگتا۔البتہ اس کا چھپنا مجھے اچنبھے میں ڈالے ہوئے تھا۔دوسرا سنائپر گہرے سبز رنگ کے لباس ہی میں تھا۔اس کی رائفل بھی سبز رنگ کی پٹیوں اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔میں نے اس کی لاش کو سیدھا کیا اور میرے منہ سے گہرا سانس خارج ہوا۔وہ کوئی یورپین تھا۔خدوخال سے امریکی ہی لگ رہا تھا۔اب اس کے چھپاؤ اور تلبیس کا عقدہ مجھ پر کھل چکا تھا۔میں نے اس کی رائفل سے ٹہنیاں ہٹائیں اور مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ٹہنیاں ہٹتے ہی بیرٹ ایم 107 میرے سامنے پڑی میرے دل کی دھڑکنوں کو مزید تیز کر رہی تھی۔یہ امریکہ کی ایجاد کردہ اعلا کوالٹی کی سنائپر رائفل تھی۔اس کا رینج ساڑھے

اٹھارہ سومیٹر ہے۔اس کی میگزین میں بھی دس گولیاں پڑتی ہیں۔میں اپنے وہاں آنے کے فیصلے کو دل ہی دل میں سراہنے لگا۔اس رائفل کے لیے تو میں کراچی تک بھی پیدل جا سکتا تھا۔میں نے اس امریکن کی لاش کی تلاشی لی ٹانگ کے ساتھ بندھے گلاک نائینٹین کو دیکھ کر مجھے لگا شاید میں خواب دیکھ رہا۔اپنے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارنے کے بعد بھی جب سائیلنسر لگا گلاک موجود رہا تو مجھے یقین آ گیا کہ آج میری قسمت عروج پر ہے۔گلاک مع ہولسٹر کے کھول کر میں نے اپنی ٹانگ کے ساتھ باندھا۔اس کے سامنے بکھرا سنائپنگ کا ضروری سامان سمیٹ کر اس کی پشت پر بندھے مضبوط جھولے میں ڈالا۔اس میں دوربین، لیزر رینج فائینڈر، ونڈ میٹر، کمپاس ، جی پی ایس، جدید نائیٹ ویژن سائیٹ اور اسی طرح کی ضرورت کی چند اور چیزیں شامل تھیں۔اس کے ہاتھ پر ایک قیمتی گھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔اس کے ساتھ ایک چمڑے کی مضبوط پٹی تھی جس میں بیریٹ ایم 107 کے دس راؤنڈ ترتیب سے لگے تھے۔گولیوں کا ایک ڈبہ اس کے جھولے میں بھی موجود تھا۔مجموعی طور پر اس کے پاس تیس گولیاں موجود تھیں، جن میں سے وہ تین گولیاں ہی فائر کر سکا تھا۔اس کا مزید ایمونیشن منگوانا مشکل نہیں تھا ۔دوسرے آدمی کی تلاشی لینے پر چرس، نسوار، ایک چاقو اور تھوڑی سی نقدی نکلی۔اس کے پاس کلاشن کوف تھی۔اس کی کلاشن کوف کو گلے میں لٹکا کر میں نے بیریٹ ایم 107 کندھے پر رکھی اور نیچے اترنے لگا۔ڈیڑھ گھنٹے بعد میں سردار کے پاس پہنچ گیا تھا۔مجموعی طور پر میں اڑھائی گھنٹے لگا کر آ رہا تھا۔سردار اہم کام نمٹا چکا تھا۔تمام لاشیں اس نے ایک گڑھے میں ڈال دی تھیں۔ان کے پاس موجود آئی کام سیٹ اس نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ایک آئی کام سیٹ مجھے اس سنائپر کے پاس بھی ملا تھا۔بلکہ اس کے ساتھ تو ائیر فون بھی تھا جو اس نے کان میں لگایا ہوا تھا۔وہ بھی میں اتارتے ہوئے ساتھ لے آیا تھا۔

”بڑی دیر لگا دی۔“ مجھے دیکھتے ہی سردار شکوہ کناں ہوا۔

”اللہ کے بندے جو کچھ مجھے وہاں ملا ہے اگر اس کے لیے ایک ہفتہ بھی لگ جاتا تو کم تھا۔

میں نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔” بیریٹ ایم 107، دوربین، کمپاس، ونڈ میٹر، لیزر رینج فائینڈر، گلاک نائینٹین اور بہت کچھ۔“ یہ کہتے ہی میں نے بیریٹ ایم 107 کندھے سے اتار کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''ارے واہ، یہ ان کے پاس کیسے؟'' حیرانی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ بیریٹ ایم 107 کا جائزہ لینے لگا۔

''یہ ایک امریکن سنائپر کے پاس تھی۔'' میں نے انکشاف کیا۔

''ہونہہ!......اتنا قیمتی سامان ایک امریکن کے پاس ہی ہوسکتا ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' بہ ہر حال اب کیا کریں ہمارے پاس کل سات کلاشن کوفیں اور دو سنائپر رائفلز موجود ہیں۔''

''پہلے تو تم یہ اپنے پاس رکھو۔'' میں نے نیفے میں اڑساتیس بور پستول اس کی جانب بڑھایا۔

''شکریہ۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے پستول پکڑ لیا تھا۔

''گلاک تو نہیں دے سکتا۔'' میں نے بغیر لگی لپٹی رکھے کہا۔

''گلاک تم دے نہیں سکتے اور بیریٹ ایم 107 تم سے اچھی میں چلا نہیں سکتا۔ نتیجہ واضح ہے۔''

''ہا......ہا......ہا۔'' اس کے بات کرنے کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''ہنسنے کی ضرورت نہیں اب اس کے بارے کیا کرنا ہے؟'' اس نے زخمی کی جانب اشارہ کیا جس پر غشی طاری تھی۔ یقیناً اس کا کافی سارا خون بہہ چکا تھا۔

''اس سے کافی کچھ پوچھنا تھا۔''

''میں نے اچھی طرح کھنگال لیا ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ اس کا کرنا کیا ہے؟ تاکہ یہاں سے نکلنے کی کریں ۔ان کا پتا کرنے کے لیے کوئی بھی آ سکتا ہے۔''

''صحیح کہا۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔'' ویسے ان کے پاس جو آئی کام تھا اس پر انھیں کیوں نہیں پکارا جا رہا؟''

''آئی کام تو میں نے آف کر دیا ہے۔''

''ہاں، آخر تم نے کسی نہ کسی طرح تو یہ ثابت کرنا ہے نا کہ تم پٹھان ہو۔''

''اگر تم نے دوبارہ پٹھانوں کے خلاف منہ کھولا تو میں کلاشن کوف کی ایک گولی ضائع کر کے اس ثبوت کو مزید بھی پختہ کر سکتا ہوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر یہ بات لی زونا کرتی پھر؟''

''یار!......اس کا نام یوں نہ لیا کرو۔ تمھیں اچھی طرح پتا ہے مشکل سے اس کی یادوں سے جان چھڑاتا ہوں اور تم دوبارہ یاد دلا دیتے ہو۔'' سردار خان سچ مچ اداس ہو گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے ہاتھ سے دہشت گردوں والا آئی کام لے کر آن کر چکا تھا۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔

''چلو نکلتے ہیں۔'' میں نے ہولسٹر سے گلاک نکال کر ایک گولی زخمی ضمیر خان کے سر پر ضائع کی اور سردار کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تمام ہتھیار ہم نے اٹھا لیے تھے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ ہمیں اتنی زیادہ کلاشن کوفیں ملنے والی ہیں تو کم از کم کلاشن کوف پر تو اتنی رقم خرچ نہ کرتے۔

زیڑہ کیل سے اتر کر ہم لگی نرائے اس جگہ پہنچے جہاں ہم نے رات گزاری تھی۔ اپنے سفری جھولے وغیرہ ہم نے وہیں چھوڑے دیئے تھے۔ سب سے پہلے اس پتھر کے ساتھ ایک مناسب جگہ ڈھونڈ کر ہم نے چار کلاشن کوفیں اور ان کے فالتو میگزین چھپا دیے۔ لگی نرائے سے دو سو گز نیچے آ کر ہم نے ایک اور جگہ پر دو کلاشن کوفیں اور ان کے فالتو میگزین چھپا دیے۔ بیریٹ ایم 107 کو ہم نے نہایت محفوظ جگہ پر چھپایا تھا۔ ایسی جگہ جہاں کسی کا گمان بھی نہ پہنچتا کیونکہ میں اس قیمتی اور مفید رائفل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کیرنگ بیگ مضبوط پلاسٹک کا تھا اس لیے میں نے اس پر کوئی کپڑا وغیرہ لپیٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم بیریٹ کو چھپا کر بہ مشکل دو تین قدم چلے ہوں گے کہ آئی کام سے آوازیں آنے لگیں۔

''روشن خان......روشن خان......روشن خان!''

''سن رہا ہوں گل جان!......کہو۔''

''ہم اچھی طرح دیکھ چکے ہیں، یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔'' گل جان خاصا ڈرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی روشن خان کی کرخت آواز سنائی دی۔ ''ٹھیک ہے ضمیر خان کی لاش کو بھی باقی چاروں کے ساتھ اسی گڑھے میں ڈال کر اوپر پتھر وغیرہ ڈال دو۔''

''روشن خان!......میرا خیال ہے ہمیں لاشوں کو ساتھ لانا چاہیے۔'' پہلے والے آدمی نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا تھا۔

روشن خان نے بے پرواہی سے کہا۔ ’’تم تین آدمی، پانچ لاشیں لا سکتے ہو تو لے آؤ۔‘‘

’’ہم کس طرح پانچ لاشیں اٹھا کر چل سکتے ہیں۔‘‘

’’تو پھر وہی کرو جو میں نے کہا ہے اور یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ میں جو بھی کہتا ہوں سردار کے حکم پر کہتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے ہمارے لیے کیا حکم ہے؟‘‘

’’لاشیں دفنا کر بہ راستہ لگرائے جنتوئی پہنچو۔ جنتوئی میں موجود اپنے آدمیوں کو بھی چوکنا کر دو کہ نئے آدمیوں پر نظر رکھیں۔ یقیناً ہمارے آدمی آرمی نے نہیں مارے ورنہ وہ لاشوں کو ساتھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اور جس نے بھی مارے ہیں وہ اسی علاقے میں گھومتا نظر آ جائے گا۔‘‘

’’کہیں مجاہدین نہ مارے ہوں؟‘‘ گل خان نے خوف زدہ آواز میں پوچھا۔

’’نہیں ان کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہے، وہ ہمارے آدمیوں کو نہیں چھیڑتے، نہ ہم انھیں کچھ کہتے ہیں۔‘‘

گل خان نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے ہم لاشیں دفنا کر لگرائے جا رہے ہیں۔‘‘

’’سیدھا لگرائے جانا وہ یقیناً کافی دیر کے وہاں سے نکل گئے ہوں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ گل خان نے بغیر کسی پس و پیش کے کہا۔ اور روشن خان کے۔ ’’خدا حافظ۔‘‘ کہنے پر خاموشی چھا گئی۔

ہمارا رخ اس وقت لگرائے ہی کی جانب تھا۔ ان کی گفتگو سنتے ہی میرے قدم رک گئے تھے۔

’’شاید تم لگرائے نہیں جانا چاہتے۔‘‘ سردار میرا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

’’کیا ان حالات میں وہاں جانا مناسب ہوگا؟‘‘ میں نے جواباً دریافت کیا۔

’’تو پھر؟‘‘ اس نے گیند میرے کورٹ میں رہنے دی تھی۔

’’وہیں چلتے ہیں جہاں گزشتہ شب گزاری تھی۔‘‘

’’خیال رہے اس طرف سے دشمن کے آدمی بھی موجود ہیں۔‘‘

’’نہیں شام کا اندھیرا چھا رہا ہے، یقیناً وہ زیڑہ کیل سے سیدھا لگرائے کا رخ کریں گے، لگی نرائے پر آنے

کا ان کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ یوں بھی انھیں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ سیدھا لگرائے کا رخ کریں۔“

”ٹھیک ہے۔“ سردار نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم واپس لگی نرائے کی بلندی طے کرنے لگے۔ اوپر پہنچنے تک اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔

سردار نے اندھیرے میں ٹھوکر کھاتے ہوئے پوچھا۔ ”ٹارچ جلا لوں؟“

”نہیں۔“ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

”مجھ سے ٹھوکریں نہیں کھائی جاتیں۔“ ضدی لہجے میں کہتے ہوئے سردار نے ٹارچ جلا لی۔

اچانک کلاشن کوف کاک کرنے کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”جھک جاؤ۔“ سردار کے ہاتھ سے ٹارچ جھپٹتے ہوئے میں نیچے لیٹ گیا تھا۔

”کک......کیا ہوا؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ لیکن میرے جواب دینے سے پہلے کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ نے اس کی حیرانی دور کر دی تھی۔

”بائیں جانب چلو۔“ سردار کو کہہ کر میں جھکے جھکے انداز میں اس طرف بڑھ گیا۔

”یہ کون ہو سکتے ہیں؟“ سردار نے میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دبے لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ”یہ یقیناً وہی ہیں جو کہہ رہے تھے کہ رستے میں وقت ضائع کیے بغیر لگرائے پہنچو۔“ یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ اسی جگہ دو تین اور برسٹ آئے۔

”کبیر خان!......ہم پہنچ گئے۔“ ایک چیختی ہوئی آواز ہمیں دائیں اور تھوڑا نیچے کی طرف سے آئی تھی۔

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ سردار نے دشمنوں کی بات پر دھیان دیے بغیر الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

”بالکل ایسا ہی ہے سردار خان!......انھوں نے ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق روشن خان اور گل خان کی ساری گفتگو فرضی تھی۔ دونوں پاس بیٹھے ہوئے یہ بکواس کر رہے تھے۔ تاکہ اگر ہم یہیں چھپے ہوں تو اطمینان سے چھپے رہیں اور یہ بات وہ بڑے اطمینان سے اسی چینل پر کر رہے تھے جو ان کے ہلاک ہونے والے ساتھی نے اپنے وائرلیس سیٹ پر لگایا ہوا تھا۔“ اسی وقت اکٹھی دو گنیں چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔

''اس کا مطلب ہے ان کی تعداد بھی تین سے زیادہ ہوگی۔'' پتھر کی ایک بڑی چٹان کے پیچھے رکتے ہوئے سردار نے پوچھا۔

''بلا شبہ۔'' مختصراً کہتے ہوئے میں نے ڈریگنو کو ہاتھ میں پکڑ کر کاک کر لیا۔ سردار نے کلاشن کوف پہلے سے تیاری حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے سیٹ آن کر کے ائیرفون کی لیڈ اس میں لگا کر کان میں اڑس لی۔ اب سیٹ کی آواز دور تک سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سیٹ آن کیا لیکن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں چینل تبدیل کرنے لگا۔ چینل انیس پر مجھے مطلوبہ گفتگو سنائی دینے لگی۔

''میں نے صرف دو آدمی دیکھے ہیں اور دونوں غالباً مشرقی طرف بھاگے ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم اسی جگہ موجود رہو، تمھارے ساتھ دوسرا کون ہے؟'' پوچھنے والا روشن خان تھا۔

اس نے مختصراً کہا۔ ''بسمل جان۔''

اس مرتبہ اسے جواب دینے کے بجائے وہ کسی دلبر خان کو پکارنے لگا۔

''سن رہا ہوں۔'' دلبر خان نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''شاید ان کا رخ تمھاری طرف ہے..... دو آدمی ہیں، کوشش کرنا زندہ ہاتھ لگ جائیں۔ نہیں تو اڑا دو لیکن بھاگنے نہ پائیں ورنہ سردار قبیل خان ہماری جان کو آجائے گا۔''

''بے فکر رہو۔'' دلبر خان نے اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ناصر خان!..... تمھارے پاس کتنے آدمی ہیں؟'' اس مرتبہ وہ ایک اور آدمی کو مخاطب ہوا تھا۔

''دس آدمی ہیں کمانڈر!'' جواب دینے والا لازماً ناصر ہی تھا۔

''پانچ آدمی نالے کے سامنے بھی بھیج دو، تاکہ وہ نالے میں اتریں تو مکمل گھیرے میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ناصر خان نے جواب دیا۔

''عظمت جان!..... تمھارے ساتھ آٹھ آدمی تھے؟'' وہ باقاعدہ کسی فوجی کمانڈر کی طرح اپنے ماتحتوں سے بات کر رہا تھا۔

''جی کمانڈر!'' عظمت نامی شخص نے جواب دینے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ وہ تمام آئی کام کے استعمال کے

ساتھ پہاڑی علاقے میں جنگ کے طریقہ کار سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

''میرا خیال ہے ان آدمیوں کے ساتھ لگرائے کی طرف آنے والا کوئی آدمی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔''

''جی کمانڈر!''عظمت جان نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا تھا۔

''سردار خان!...... برے پھنسے دوست!''میں نے ساتھ بیٹھے سردار خان کو دبی آواز میں صورت حال سے آگاہ کیا۔''ان پہاڑیوں کو انھوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔''

سردار نے اعتماد بھری سرگوشی سے جواب دیا۔''اگر ان کے پاس سو بندے بھی ہوں تب بھی ان پہاڑیوں کو نہیں گھیر سکتے۔''

''بات تو ٹھیک ہے لیکن فی الحال ہم گھیرے میں ہیں دوست۔''

''لگرائے کی طرف نیچے اترنے کے بارے کیا خیال ہے؟''سردار نے مشورہ دینے والے انداز میں پوچھا

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں اس جانب کوئی عظمت جان آٹھ آدمیوں کے ساتھ ہمارا منتظر ہے۔''

''ویسے تمھارا مشورہ مان کر میں نے بہت بے وقوفی کا ثبوت دیا ہے۔''

میں ہنسا۔''اس کے بجائے اگر تم یہ کہو کہ میرا مشورہ مان کر تم نے پٹھان ہونے کا ثبوت دیا ہے تو کیسا رہے گا۔''

''راجا ذیشان حیدر صاحب!......ایک بات بتا دوں اگر ہم رات کے اندھیرے میں ان کے گھیرے سے نہ نکل سکے تو دن کی روشنی میں ہمارا بھاگنا ناممکن ہو جائے گا۔''

اس کی بات رد کرنے کے قابل نہیں تھی۔''صحیح کہا۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کوئی سگریٹ سلگا رہا ہے۔''سردار نے مجھے ہلکے سے شعلے کی جانب متوجہ کیا۔اس کا فاصلہ ہم سے پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔

''یہ اس کی زندگی کا آخری کش ہوگا۔''دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے ٹیلی سکوپ کے کور اتارے بغیر ہی ڈریگنو وکی مزل کو اس کی جانب سیدھا کیا اتنے نزدیکی فاصلے پر مجھے ٹیلی سکوپ سائیٹ کے استعمال کی ضرورت نہیں تھی۔ٹریگر دباتے ہی دھماکے کی گونج کے ساتھ ایک درد بھری کراہ نے مجھے بتا دیا کہ میں کامیاب رہا

تھا۔اسی وقت کلاشن کوف کا اندھا دھند فائر اس پتھر کی جانب آنے لگا۔

”سردار!...... نیچے لیٹ کر اسی سمت جانا ہے جدھر سے فائر آ رہا ہے۔“میں نے سرگوشی کی۔

”گویا مجھے ایک بار پھر پٹھان ہونے کا ثبوت دینا پڑے گا۔“دبی آواز میں ہنستے ہوئے اس نے کہا۔”میرا مطلب ہے تمھاری بات مان کر۔“

”مذاق کا وقت نہیں ہے خان صاحب!......“انھیں ہماری جگہ کے بارے معلوم ہو گیا ہے۔“

”میں مذاق تو نہیں کر رہا۔“سردار نے جواب دیا۔اسی وقت کسی نے ٹارچ کی روشنی ہماری سمت پھینکی۔وہ شاید ہمارے چھپنے کی جگہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔وہ اس بات میں کامیاب بھی ہو گیا،لیکن زندگی کی بازی ہار گیا۔وہ بے وقوف شاید نہیں جانتا تھا کہ روشنی پر نشانہ سادھنا کتنا آسان کام تھا۔ڈریگنو وکی ایک اور گولی کم ہو گئی تھی۔

”اب اگر کسی الو کے پٹھے نے روشنی کرنے کی کوشش کی تو اسے میں خود گولی مار دوں گا۔“روشن خان کی دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔اسی وقت کلاشن کوف کے دو تین برسٹ ہماری طرف آئے،مگر ہم نے جوابی فائر سے گریز کیا تھا۔ہمارے پاس اتنا فالتو ایمونیشن نہیں تھا کہ ان کے ہر فائر کا جواب دیتے۔

”تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں ہو بہتر یہی ہو گا کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“وہ روشن خان کی آواز تھی اس کی آواز کو میں اچھی طرح پہچان گیا تھا۔اس کی بات کا جواب سردار نے دو گولی فائر کے ساتھ دیا تھا ۔سردار کے فائر کے ساتھ دو تین برسٹ فائر آئے لیکن ہم پتھر کی چٹان کے باعث محفوظ رہے۔

مجھے آئی کام پر روشن خان کی آواز سنائی دی وہ دلبر خان کو پکار رہا تھا۔دلبر خان کے جواب دینے پر وہ کہنے لگا

”دلبر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ ہماری طرف بڑھتے آؤ۔“

جواباً دلبر خان نے”جی کمانڈر!“کہہ کر حکم پر عمل پیرا ہونے کا عندیہ دیا۔

اس کے ساتھ ہی روشن خان کسی برمن خان کو آواز دینے لگا۔

برمن خان کے”حکم جناب!“پر وہ پوچھنے لگا۔

”تمھارے پاس ہینڈ گرنیڈ موجود ہیں۔“

”جی ہاں،تین گرنیڈ موجود ہیں۔“برمن خان کا اقراری جواب سن کر وہ بولا۔

”فوراً میرے پاس آجاؤ، میں اس وقت لگی نرائے کی بلندی پر کھڑا ہوں۔“

”کمانڈر!...... پانچ دس منٹ لگ جائیں گے۔“

”میں منتظر ہوں۔“ کہہ کر روشن خان خاموش ہو گیا تھا۔

”سردار!...... روشن خان کسی آدمی سے ہینڈ گرنیڈ منگوا رہا ہے، یقیناً اس کا ارادہ ہمارے خلاف ہینڈ گرنیڈ استعمال کرنے کا ہے، اس لیے جتنا جلدی ہو یہاں سے نکلنا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے سامنے کے بجائے دائیں طرف نکل چلتے ہیں۔“ سردار نے مشورہ دیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس طرف تنگ نالہ ہے اگر اس میں اتر گئے تو چوہے دان میں پھنس جائیں گے۔ انھوں نے نالے کو پہلے سے گھیرا ہوا ہے۔“

”مکمل نہیں اترتے، ڈھلان پر ہو کر زیڑہ کیل کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر روشن خان پارٹی کی حد بندی سے گزر گئے تو آگے جانا مشکل نہیں ہوگا۔“ سردار اپنی بات پر مصر رہا۔

”ہونہہ!...... لگتا ہے لی زونا کے ساتھ دو ماہ گزار کر تم میں بھی تھوڑی عقل آگئی ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”تو چلیں، اس سے پہلے کہ ہینڈ گرنیڈ کا سامنا کرنا پڑ جائے۔“

”میرے پیچھے رہنا اور تم فائر نہ کرنا میرے پاس سائیلنسر لگا پستول موجود ہے کسی بھی اچانک نمودار ہونے والے ہدف کو میں خود سنبھال لوں گا۔“ اس سے بات کرتے ہوئے میں نے ڈریگنو وارئفل کی سلنگ سر سے گزار کر اپنی چھاتی کے سامنے لائی اس طرح کہ رائفل میرے پشت پر بندھے تھیلے پر مضبوطی سے ٹھہر گئی۔ سائیلنسر لگا گلاک نائینٹین میں نے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ سردار نے کہا اور اس کا جواب سنتے ہی میں جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھ گیا۔

ہم جس چٹان کے پیچھے دبکے تھے اس کے سامنے روشن خان نے مورچہ بنا رکھا تھا، اس کے عقبی جانب دلبر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ دائیں جانب عظمت خان اور بائیں جانب ناصر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن ناصر خان نالے کی پرلی طرف اور سامنے کی سمت میں موجود تھا۔ وہ نالہ زیڑہ کیل سے نکل رہا تھا۔ لازمی طور پر زیڑہ کیل کی بلندی پر بھی ان کے آدمیوں نے موجود ہونا تھا۔ روشن خان جیسے شاطر سے بعید

تھا کہ اس نے وہ سمت نظر انداز کر دی ہو۔لیکن زیڑہ کیل کی پرلی جانب اگر ہم پہنچ جاتے جس طرف امریکن سنائپر میرا نشانہ بنا تھا تو ہمارا نکلنا مشکل نہیں تھا۔

نالے میں دس پندرہ گز نیچے جا کر ہم اسی ڈھلان پر متوازی آگے بڑھنے لگے۔ہوا کافی تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔اور یہ ہوا جہاں سردی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی وہیں ہمارے لیے اس لحاظ سے نہایت مفید تھی کہ ہماری ہلکی پھلکی آہٹ دشمن کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہم تیس پینتیس گز ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک زوردار دھما کا سنائی دیا۔یقیناً انھوں نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا تھا۔

''جانانہ!......میرا خیال ہے ان کمینوں کا کام تو ہو گیا۔'' مجھے ہلکی ہنسی کے ساتھ کسی کی آواز سنائی دی ۔ہمارے استقبال کے لیے اس جانب بھی روشن خان نے اپنے آدمی کھڑے کیے ہوئے تھے۔ہماری خوش قسمتی کہ ہوا زیڑہ کیل کی جانب سے ہمارے رخ چل رہی تھی۔اس لیے وہ آواز آسانی سے سنائی دے گئی تھی۔سردار نے بھی وہ آواز سن لی تھی۔ہم دونوں دب کر نیچے بیٹھ گئے۔اسی وقت ایک اور زوردار دھما کا ہوا انھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک اور گرنیڈ بھی پھینک دیا تھا۔

سردار کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے میں رینگتا ہوا آگے بڑھا۔ان کے باتیں کرنے کی دھیمی آواز میری رہنمائی کر رہی تھی۔جلد ہی ان کے ہیولے مجھے نظر آ گئے تھے۔ان کا رخ ہماری جانب ہی تھا۔

اسی وقت میرے کان میں لگے رسیور میں روشن خان کی آواز ابھری،اور ساتھ ہی وہی آواز مجھے ان آدمیوں کے پاس موجود آئی کام سے بھی آ رہی تھی۔

''تمام پارٹیاں ہوشیار رہیں۔وہ یہاں سے غائب ہیں۔''

''اس کا مطلب پھر بچ گئے ہیں کمینے۔'' مجھے وہی پہلے والی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی میں نے گلاک سیدھا کرتے ہوئے مسلسل دو مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔

''ٹھک ٹھک۔'' کی آواز کے ساتھ دو دردبھری کراہیں بلند ہوئیں۔میں زمین سے اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھا۔سردار نے بھی میری تقلید کی تھی۔ان کے تڑپتے اجسام کو پھلانگتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔دس پندرہ گز

آگے جاتے ہی ہم دوبارہ بلندی چڑھنے لگے۔ڈھلوان سے ہموار سطح پر آتے ہی ہم تیزی سے زیڑہ کیل کی طرف بڑھ گئے۔

”ناصر خان!......تیار ہو جاؤ، میرا خیال ہے وہ نالے میں اتر گئے ہیں۔“

”ہم تیار ہیں کمانڈر!“ ناصر کی اعتماد بھری آواز ابھری۔

ہم زیڑہ کیل کی بلندی پر چڑھنے لگ گئے تھے۔وہ لگی نرائے سے اتنی زیادہ بلند نہیں تھی۔

”گل خان!......تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“ روشن خان کسی نئے بندے کو پکار رہا تھا۔

”ہم دو آدمی ہیں کمانڈر!“ گل خان کی آواز سنائی دی۔

”برمن خان!......تم اپنے ساتھ ایک آدمی کو لے کر گل خان کے پاس پہنچو۔

”ٹھیک ہے کمانڈر!“ برمن نے جواب دیا۔

اب معلوم نہیں برمن خان اس وقت کہاں تھا۔چڑھائی ختم ہونے کے قریب ہی ہم دبے قدموں چلنے لگے اسی وقت سردار کے پاؤں کے نیچے ایک پتھر آ کر لڑھک گیا۔ہم فوراً لیٹ گئے۔ یہ بروقت لیٹنا ہمارے کام آ گیا تھا۔اسی وقت ایک طاقتور ٹارچ کی روشنی اس طرف آئی۔سردار میرے آگے تھا۔اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کلاشن کوف کا فائر کھول دیا۔

”تڑتڑاہٹ کی آواز میں ایک چیخ بھی شامل تھی۔ٹارچ سمیت وہ اوندھے منہ گرا،ٹارچ ابھی تک روشن تھی

”سردار!......ادھر ہو جاؤ۔“ ایک قریبی پتھر کی آڑ لیتے ہوئے میں نے سردار کو سرعت سے پکارا۔

اسی وقت روشن خان بھی اپنے آدمی سے پوچھنے لگ گیا تھا۔”گل خان!......فائر تم نے کیا ہے۔“ گل خان غریب زندہ ہوتا تو جواب دیتا۔

سردار ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر لیٹے لیٹے ہی لڑھکتے ہوئے میرے قریب پہنچا۔اور اسی وقت کسی نے کلاشن کوف کا فائر کھول دیا۔کلاشن کوف مسلسل گرجنے لگی۔اس نے اس وقت تک ٹریگر سے انگلی نہ اٹھائی جب تک ”ٹرچ۔“ کی آواز کے ساتھ کلاشن کوف خالی نہ ہوگئی۔

ہم پتھر کے پیچھے سمٹ کر لیٹے ہوئے تھے۔اگر وہ پتھر نہ ہوتا تو یقیناً ہم مارے گئے تھے۔”ٹرچ۔“ کی آواز

سنتے ہی میں نے کہا۔ ’’سردار!......فائر۔‘‘ اوراس نے لیٹے لیٹے مطلوبہ جانب کلاشن کوف کی نال کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ مسلسل دھماکوں کی وجہ سے ہمیں پتا نہیں چلا تھا کہ وہ فائرنگ کامیاب گئی تھی یا ناکام۔ آئی کام پر روشن خان مسلسل گل خان کو پکار رہا تھا۔ میگزین خالی ہوتے ہی سردار نے نئی میگزین لگاتے ہوئے کلاشن کوف کاک کی۔ لگی نرائے کی جانب سے دو تین برسٹ فائر ہوئے۔ یقیناً وہ اسی جانب ہی بڑھتے چلے آرہے تھے۔

’’سردار!......خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔‘‘ میں اٹھ کر تھوڑا دائیں مڑا اور جھکے جھکے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ سامنے سے فائر نہ آتے دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ سردار کی گولیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔

زیڑہ کیل کی بلندی چڑھتے ہی میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں سے میں دن کو اتر کر امریکن سنائپر والی پہاڑی پر چڑھا تھا۔ سردار میرے پیچھے ہی دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ عقب میں مجھے مسلسل فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

روشن خان نے ناصر خان کو چند بندے اس جانب بھیجنے کا حکم دیا۔ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ زیڑہ کیل پر ان کا کوئی آدمی باقی نہیں بچا تھا۔

میں اور سردار ٹھوکریں کھاتے کسی نہ کسی طرح اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے میں دن کو نیچے اترا تھا۔ وہ راستہ کافی ہموار تھا۔ اس پر چھدرے چھدرے درخت بھی موجود تھے۔ جلد ہی ہم نیچے کچی سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ ہم تیز رفتاری سے زیڑہ کیل سے دور ہٹنے لگے۔ آگے وہ نالہ انگلش کے لفظ وائی کی طرح دو شاخہ ہو گیا تھا۔ ہم نے مشورے سے بائیں جانب اختیار کر لی تھی۔ تیز رفتاری سے حرکت کرنے کے باعث ہمارے سانس پھول گئے تھے۔ زیڑہ کیل کی جانب سے اب بھی فائرنگ کی آواز آرہی تھی لیکن آئی کام خاموش تھا۔

شاید وہ کسی دوسرے چینل پر شروع ہو گئے تھے۔ میں نے چینل تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی روشن خان کی منحوس آواز پھر سے میرے کانوں میں پڑنے لگی۔ وہ انھیں تین پارٹیوں میں بانٹ کر ایک پارٹی کو لگرائے کا رخ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ دوسری پارٹی کو اس نے وہ سمت بتائی کہ جس طرف ہم دونوں روانہ تھے اور تیسری ناصر خان والی پارٹی کو اسی نالے پر تعینات رکھا تھا۔ مجھے یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس نے چینل کیسے تبدیل کرایا تھا۔ کیونکہ میں نے پچھلے چینل پر اس کے منہ سے کوئی کوڈ ورڈ یا کوئی لفظ نہیں سنا تھا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالنے پر ہند سے سوا

نو بجے کا اعلان کرتے نظر آئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید نو بجے کے بعد انھیں پہلے سے چینل تبدیل کرنے کا بتایا ہوا تھا۔ پہلے والا چینل نو بجے تک ہی استعمال ہونا تھا۔ وائرلیس سیٹ کو استعمال کرتے وقت اس طرح کے چٹکلے ہر کوئی آزماتا رہتا ہے۔

میں نے سردار کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''سردار خان!...... اب ہمارا مقابلہ روشن خان کے ایک تہائی لشکر سے ہے۔''

سردار نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ ''جس وقت بھی یہ روشن خان ہاتھ لگا اسے تو میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا دور ٹارچ کی روشنی نظر آئی تھی۔ ہم نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر لی۔ ایک لحاظ سے ہماری رفتار کو ان پر فوقیت حاصل تھی کہ انھوں نے ہمیں تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا جبکہ ہم ارد گرد کا جائزہ لیے بغیر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ مسلسل تیز رفتاری سے سفر کرتے ہمیں تین گھنٹے ہونے کو تھے۔

شیطان کی آنت کی طرح کا وہ لمبا نالہ اب اوپر کو بلند ہونے لگا تھا۔ اچانک پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک طاقتور ٹارچ کی روشنی ہم پر پڑی۔ ہم نے نیچے لیٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسی وقت سامنے سے ایک برسٹ فائر ہوا۔

''یہ وہی گروپ ہے یا ان کے کوئی اور ساتھی ہیں؟'' سردار ہکلایا۔

''جو بھی ہیں اب تو برے پھنس گئے ہیں خان جی!'' میں آہستہ آہستہ پیچھے کو کھسکا۔

ٹارچ ایک بار پھر روشن ہوئی اور اس روشنی میں چند قدم آگے لگی کانٹا دار تار کو دیکھتے ہی میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا۔

''سردار خان!...... یہ آرمی کی کوئی پوسٹ ہے۔'' میں نے خوشی سے بے قابو لہجے میں کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر بار بار جلا کر ٹارچ کا اشارہ کرنے لگا۔

''کون؟'' دبنگ لہجے میں پوچھا گیا۔

''ہم دوست ہیں دشمن نہیں۔'' سردار کو اٹھنے کا کہہ کر میں ہاتھ بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔ پستول میں نے ہولسٹر

میں رکھ لیا تھا۔ سردار بھی کلاشن کوف زمین پر رکھتے ہوئے میرے ساتھ ہاتھ بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔

"آگے آجاؤ۔" اسی آواز نے ہمیں پکارا۔ اور ہم ہاتھ بلند کیے آگے بڑھنے لگے۔ کانٹا دار تار کے درمیان میں ایک جگہ راستہ بنا نظر آرہا تھا۔ ہم اسی سے گزر کر آگے بڑھنے لگے۔

ہم ٹارچ والے سے دس پندرہ گز دور پہنچے ہوں گے کہ اس نے اگلا حکم صادر کیا۔ "رک، اپنے ہتھیار اور سامان یہیں چھوڑ دو۔"

ہم نے بے چوں وچراں ان کے کہنے پر عمل کیا۔

"اب آگے بڑھو۔" ہتھیار اور تھیلے زمین پر رکھتے ہی ہمیں دوبارہ آگے بلایا گیا۔

نزدیک پہنچنے پر ہمیں تین فوجی نظر آئے ایک نے ہاتھ میں ٹارچ تھام رکھی تھی جبکہ دو کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ ایک اپنا ہتھیار سلنگ اپ کر کے آگے بڑھا اور ہماری تلاشی لینے لگا۔

تلاشی کے بعد ان کے سینئر نے ایک سپاہی کو ہمارا سامان لینے بھیجا جو ہم ان کے حکم پر پیچھے چھوڑ آئے تھے ۔تھوڑی دیر بعد ہم پوسٹ کمانڈر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ایک جونیئر آفیسر تھا۔

"جی جناب!......اپنا تعارف کرائیں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ہمارے پراعتماد لہجے میں کی جانے والی بات چیت سے اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ہم دشمن نہیں تھے۔

"میں اپنے آئی کام سیٹ پر آپ کی بات کسی سے کرانا چاہتا ہوں۔"

"بات کراؤ۔" اس نے اجازت دینے والے انداز میں سر ہلایا۔ اس کا جواب سن کر ایک بندے نے آئی کام سیٹ میری جانب بڑھا دیا۔

"پوسٹ کا نام؟" آئی کام سیٹ پکڑتے ہوئے میں نے جونیئر آفیسر سے پوچھا۔

"یہ ایف بلاک ہے۔" اس نے بغیر کسی تردّد کے پوسٹ کا نام بتا دیا۔

سیٹ آن کر کے میں نے چینل نو لگایا اور ون الفا کو پکارنے لگا۔

"سینڈ یور میسج اوور۔" میرے دو تین دفعہ پکارنے پر ون الفا کی بھاری آواز سپیکر سے برآمد ہوئی۔

"ہم اس وقت ایف بلاک پر پہنچ گئے ہیں اوور!" بغیر کسی تمہید کے میں مطلب کی بات پر آ گیا کہ وائرلیس

سیٹ پر تمہیدیں نہیں باندھی جاسکتیں۔

''مگر کیوں؟......اوور۔''اس کا لہجہ حیرانی سے پر تھا۔

''کہانی لمبی ہے اوور۔''میں نے تفصیل بتلانے سے گریز کیا تھا۔

''کام بتاؤ اوور۔''اس نے بھی تفصیل پوچھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔

''پوسٹ کمانڈر کو ہماری شناخت کروادو اوور۔''

''ٹھیک ہے پوسٹ کمانڈر کو ابھی آرڈر مل جائیں گے اور تم نے اگلے حکم تک یہیں رہنا ہے اوور۔''

اور میرے''راجر۔''(سمجھ گیا) کہنے پر اس نے اوور اینڈ آل کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

پانچ منٹ بعد پوسٹ کمانڈ کے بینکر میں پڑے فیلڈ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔اس نے رسیور اٹھا کر کہا ۔''یس!......صوبیدار رمضان بات کر رہا ہوں۔''

اور پھر دوسری جان سے اسے کچھ ہدایات دی جانے لگیں۔ہمیں تو بس اس کی۔''یس سر،یس سر۔''ہی سنائی دیتی رہی۔

بات ختم کرتے ہی اس نے رسیور میری جانب بڑھا دیا۔

''اسلام علیکم سر!......ذیشان حیدر بات کر رہا ہوں۔''میں نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا

''وعلیکم اسلام،ذیشان!......کل کا دن ایف بلاک پر گزارو اور پرسوں تم دونوں ڈی بلاک پر چلے جانا،وہاں ون الفا تمھارا منتظر ہے۔ڈی بلاک کا راستہ تمھیں صوبیدار رمضان سے معلوم ہو جائے گا۔''

اور میرے''ٹھیک ہے سر!''کہنے پر اس نے۔''خدا حافظ۔''کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''یقیناً آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا؟''میرے رسیور رکھتے ہی صوبیدار رمضان مستفسر ہوا۔

''جی سر!''سردار نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک آدمی کو کھانا لانے کا کہہ کر وہ ہم سے گپ شپ کرنے لگا۔ہماری دن بھر کی کارروائی چونکہ اپنی فوج کے لیے کوئی راز کی بات نہیں تھی اس لیے ہم نے اسے مکمل تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ساری تفصیل سردار نہیں سنائی تھی۔اس کی بات ختم ہوتے ہی صوبیدار رمضان نے باقاعدہ ہمیں گلے لگا کر ہماری پیٹھ تھپتھپائی تھی۔اسی وقت

تازہ کھانا تیار ہو کر آ گیا۔ گرم گرم روٹیوں اور بھیڑ کے گوشت سے سیر لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے ملک پاؤڈر کی بنی چائے پی اور بستر میں گھس گئے۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد سخت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وزیرستان نے ہمیں کافی اچھے انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ قسمت اچھی تھی ورنہ سردار قبیل خان کے آدمیوں نے تو ہمیں مارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اگلا پورا دن ہم ایف بلاک پر آرام کرتے رہے۔ سہ پہر کے وقت ہم نے صوبیدار رمضان سے ڈی بلاک کا راستہ معلوم کر لیا تھا جہاں ون الفا ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ایک دور ایک پہاڑی کی جان اشارہ کیا اور ساتھ ہمیں وہاں تک جانے کے رستے کے بارے بھی تفصیل سے بتا دیا۔ اگلی صبح کا انتظار کرنے کے بجائے ہم شام کا کھانا کھا کر ہی ڈی بلاک کا راستہ ناپنے لگے۔ امریکن سنائپر کا کمپاس میرے پاس موجود تھا۔ یوں بھی اس کی گھڑی میں بھی ایک جدید کمپاس فٹ تھا۔ ڈی بلاک کا فاصلہ وہاں سے نو دس کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔ وہ پوسٹ ایف بلاک سے زیادہ اونچائی پر واقع تھی۔

کمپاس کی مدد سے ہم اونچے نیچے رستوں اور خشک و تر نالوں کو عبور کرتے ہوئے رات ارہ بجے کے ڈی بلاک کے قریب پہنچ گئے تھے۔ سنتری کو اپنی پہچان کرانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم ون الفا سے معانقہ کر رہے تھے۔

وہ پینتیس چھتیس سال کا خوش رو جوان تھا۔ اس کا تعلق ایک خفیہ ایجنسی سے تھا۔ اس کا رینک میجر اور نام اورنگ زیب خٹک تھا۔ وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملا۔ گزشتہ دن کی تفصیل سن کر اس نے ہمیں ایک بار پھر شاباش دی اور مطلب کی بات پر آ گیا۔

"قبیل خان کا تعلق وزیر قوم سے ہے اور اس کے پاس پندرہ سولہ سو کا لشکر (لڑاکا لوگ) موجود ہے۔ اس کا اصل علاقہ وادی شوال میں موجود گاؤں علام خیل ہے جہاں تک ابھی آرمی نہیں پہنچی۔ یہ انڈین ایجنسی را کا خاص پرزہ ہے۔ دوسری ایجنسیاں بھی اس سے کام لیتی رہتی ہیں۔ بہ ہر حال زیادہ عرصہ بچ نہیں سکے گا۔ تم دونوں کو ایک خاص کام کے بعد اس کی سرکوبی کے لیے جانا ہوگا۔ وادی شوال میں ہمارے تین آدمی موجود ہیں۔ لیکن وہ کھل کر تمھارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔ وہ بس رابطے کا ایک ذریعہ ہی ہیں۔ ان میں سبیل خان نامی آدمی تمھارے ساتھ رابطے میں رہے گا، اس سے بھی تم ایس ایس کے کوڈ نام سے چینل سات پر رابطہ کر سکتے ہو۔ وہ اپنا

کوڈ نام الفاٹو بتائے گا۔"

سردار نے پوچھا۔"خاص کام کیا ہے سر؟"

"یہاں ایک بلند چوٹی ذخیرہ ٹاپ ہے جہاں دہشت گردوں کے دو سنائپر موجود ہیں۔ان میں سے ایک کا نام ذوالجدین ہے اور دوسرے کو مرشد کے نام سے جانا جاتا ہے۔تمھیں یقیناً حیرانی ہوگی کہ یہ ذوالجدین نامی آدمی پاک آرمی کی کمانڈو بٹالین سے بھگوڑا ہو کر دہشت گردوں کے ساتھ شامل ہوا ہے۔یونٹ میں کسی آفیسر سے اس کا جھگڑا ہوا اور یہ باغی ہو کر دہشت گردوں کے پاس چلا گیا۔اور پھر یہاں روپے پیسے کی وافر دستیابی نے اسے مزید شہہ دی۔یہ دونوں بہت اچھے سنائپر ہیں۔ہمارے شہید ہونے والے جس جوان کے سر میں گولی لگی ہو تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ذوالجدین کی فائر کی ہوئی گولی ہے اور چھاتی میں لگنے والی گولی کو مرشد کی حرکت مانا جاتا ہے۔جنگل ٹاپ پر دہشت گردوں کے مضبوط مورچے بنے ہوئے ہیں۔ہیلی کاپٹر کی شیلنگ بھی وہاں فائدہ مند نہیں ہوئی۔وہاں سب سے خطرناک یہی دو آدمی ہیں اور انھیں کس طرح نشانہ بنانا ہے یہ آپ دونوں کی صواب دید پر ہے۔"

"ویسے ذوالجدین کا نام میں نے سنا ہوا ہے۔"میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"کمانڈوز کے ساتھ ایک کورس کے دوران اس کی غائبانہ تعریف سنی تھی۔"

"صحیح پہنچے۔"میجر اورنگ زیب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اگر ہم دونوں جنگل ٹاپ پر جا کر خود کو دہشت گرد ظاہر کریں تو یقیناً انھیں آسانی سے جہنم واصل کر سکیں گے۔"سردار نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں،پہلی بات تو یہ ہے کہ،یہ لوگ بہت شاطر ہیں،کسی نئے آدمی پر اعتماد نہیں کرتے۔اور ان کے پاس آنے والے دہشت گرد کسی سردار یا ایجنسی کی وساطت سے آتے ہیں۔یوں نہیں کہ کوئی بھی آدمی منہ اٹھا کر ان کے پاس پہنچ جائے۔ہمارے جو آدمی ان میں شامل ہیں وہ بھی ہم نے جانے کتنی مشکلوں سے ان کا حصہ بنائے ہیں۔دوسرا جو آدمی قریب جا کر کسی دہشت گرد کو ہلاک کرے گا خود اس کا بچنا بھی ناممکن ہو جائے گا اور میں تم دونوں جیسے تربیت یافتہ اور بہترین سنائپرز کو اتنے سستے میں قربان نہیں کر سکتا۔"

”شکریہ سر!“میں اس کی پرخلوص بات سن کر بولا۔”ویسے ذخیرہ ٹاپ کے قریب کوئی اونچی چوٹی موجود نہیں ہے؟“

”زیڑہ کیل سے شمال کی جانب ایک بلند چوٹی وچہ نرائے ہے جس کا ذخیرہ پوسٹ سے ہوائی فاصلہ ڈیڑھ کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہی ہے۔لیکن وہ ایسی جگہ ہے جہاں فوج پوسٹ نہیں بنا سکتی کیونکہ ایک تو پانی کا نزدیک ترین چشمہ بھی اس سے اتنی دور ہے کہ روزمرہ ضروریات کا پانی وہاں تک پہنچانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔اسی طرح وہاں گاڑی کا راستہ بھی موجود نہیں ہے اس لیے راشن بھی ذخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔اس کے بیس میں پوسٹ بنانے میں یہ قباحت ہے کہ دہشت گرد عارضی طور پر وچہ نرائے کی چوٹی پر چڑھ کر آرمی کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔اس طرح کی چند اور مجبوریاں بھی ہیں۔البتہ تم لوگ اس چوٹی کو عارضی طور پر اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو اور یقیناً اس کے لیے تمھیں ہیوی سنائپر بھی دستیاب ہو گی کیونکہ اس جگہ سے ذخیرہ ٹاپ ڈریگنو کی رینج سے باہر ہو جاتی ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔”آج مارا جانے والا امریکن سنائپر ہمارے لیے بیرٹ ایم 107 کا تحفہ چھوڑ گیا ہے۔“

”بیرٹ ایم 107 ؟“میجر اورنگ زیب کے لہجے میں حیرانی تھی۔

میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔”جی ہاں،یہ بھی ہیوی سنائپر ہی ہے۔“

”تم لوگوں کے پاس نظر تو نہیں آ رہی؟“

میں جواب دیتے ہوئے بولا۔”ایک جگہ پر چھپا دی ہے۔اور ہو سکے تو اس کا ایمونیشن منگوا دیں کیونکہ اس کے ساتھ صرف ستائیس گولیاں ہمیں ملی ہیں۔“

”اچھا میں اپنے پاس لکھ لیتا ہوں۔“اس نے نوٹ بک نکال کر اس پر بیرٹ ایم 107 کا نام لکھ لیا۔

”اور ہاں گلاک نائنٹین کا ایمونیشن بھی۔“مجھے اچانک پستول یاد آ گیا جس کی چند گولیاں ہی میرے پاس رہ گئی تھیں۔

میجر اورنگ زیب نے فوراً کہا۔”اس کی پچاس گولیاں میرے پاس موجود ہیں۔جاتے ہوئے لیتے جانا۔“

''شکریہ سر!''میں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔
''میرا خیال ہے یہ گھڑی بھی تمھیں امریکن سنائپر ہی سے ہاتھ لگی ہے؟''اس نے میری کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔
''جی سر!......''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''اگر پسند ہے تو میں آپ کو دے دیتا ہوں۔''
''میں ضرور لیتا اگر تمھیں اس کی قیمت معلوم ہوتی اور تب تم یہ پیش کش کرتے۔''اس نے گویا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔''یہ گھڑی پاکستانی کرنسی میں کم از کم ڈیڑھ لاکھ کی ہوگی۔''
''سر!......ابھی چند ماہ پہلے جب ہم امریکہ میں سنائپر کورس کر رہے تھے اس وقت اس کی قیمت تین ہزار امریکن ڈالر کے قریب تھی۔آپ نے تو اس کی قیمت آدھے سے بھی گھٹا دی ہے۔''
میری بات سن کر اس کے چہرے پر خفت بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔''معذرت خواہ ہوں،میں نے محتاط اندازے کے مطابق کہا تھا۔''
''کوئی بات نہیں سر!......یہ لیں۔''میں نے گھڑی کلائی سے اتار کر اس کے جانب بڑھائی۔''میرا خیال ہے اپنے الفاظ کا پاس آپ ضرور رکھیں گے۔''
''کن الفاظ کا؟''اس نے حیرانی سے پوچھا۔
''یہی کہ اگر مجھے اس گھڑی کی قیمت معلوم ہوتی اور میں تب بھی آپ کو تحفہ دینا چاہتا تو آپ ضرور قبول کرتے۔''
وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔''میں نے سوچا شاید تم ناواقفیت کی بنا پر مجھے دے رہے تھے۔''
''نہیں میں اس لیے آپ کو دے رہا تھا کہ آپ کے ہاتھ پر یہ اپنی پہچان کرا سکے گی۔ہم جیسے اگر اتنی قیمتی گھڑی باندھ لیں تو دیکھنے والے اسے نقل ہی سمجھتے ہیں۔''
''شکریہ ذیشان!......''اس مرتبہ وہ گھڑی میرے ہاتھ سے لے کر اپنی کلائی پر باندھنے لگا۔میں نے جیب سے اپنی پرانی گھڑی نکال کر کلائی پر باندھ لی تھی۔
''اچھا ہم ذخیرہ ٹاپ کی بات کر رہے تھے۔''میجر اورنگ زیب نے گفتگو کا رخ دوبارہ ہمارے مشن کی

طرف موڑا۔

''سر!......اتنی دور سے ہمیں پہچان کیسے ہو گی کہ فلاں شخص ذوالجدین یا مرشد ہے؟''میں نے کافی دیر سے ذہن میں کلبلاتے سوال کو الفاظ کی صورت میں ڈھالا۔

''اچھا سوال ہے۔''اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میرے سوال کو پسندیدگی کی سند سے نوازا۔''ذخیرہ ٹاپ سے ہماری پوسٹ ای بلاک اور شاہ جہان شہید پوسٹ پر زیادہ فائر آتا ہے مذکورہ دونوں پوسٹوں پر کوئی آدمی آڑ لیے بغیر حرکت بھی نہیں کرسکتا۔اور ذخیرہ ٹاپ میں ان سنائپرز ہی کی وجہ سے ان دونوں پوسٹوں پر ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک کے لیے فائری خندقیں کھودی گئیں ہیں۔اب ہو گا یہ کہ......''وہ ہمیں اپنا منصوبہ بتانے لگا۔اس کی بات ختم ہوتے ہی ہم دونوں نے بیک زبان کہا۔

''سمجھ گئے سر۔''

''گڈ۔''اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔اور پھر مزید معلومات ہمارے گوش گزار کرنے لگا۔ہم صبح کی نماز پڑھ کر ہی سو پائے تھے۔

''اگلے دن شام کا کھانا کھا کر ہمیں رخصت کرتے وقت میجر اورنگ زیب نے کہا۔''میں اگلے دس دن یہیں ہوں،اس کے بعد شاید میں واپس چلا جاؤں لیکن کسی نہ کسی کی وساطت سے تمھیں میرے احکام اور ہدایات ملتی رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے سر!''کہہ کر ہم نے اس سے الوداعی معانقہ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

ڈی بلاک سے لگی نرائے کا زمینی فاصلہ پندرہ سولہ کلو میٹر سے زیادہ بن رہا تھا۔ہم نے وہاں سے لگی نرائے ہی کا رخ کیا تھا کیونکہ اس کے دامن میں ہم نے بیرٹ ایم 107 چھپائی ہوئی تھی۔اس کے بغیر تو وچہ نرائے سے ذخیرہ ٹاپ پر فائر کرنا ناممکن تھا۔صبح کے تین بج رہے تھے جب ہم وہاں پہنچے۔وہاں رکے بغیر ہم نے بیرٹ ایم 107 لی اور وہیں سے وچہ نرائے کی طرف بڑھ گئے۔ڈریگنو رائفل بھی میں نے وہاں نہیں چھوڑی تھی،کیونکہ بیرٹ ایم 107 سے فائر کرنے کے بعد اس کو میں نے کہیں چھپا دینا تھا۔یہ رائفل ہمیں کسی خاص موقع ہی

پر ضرورت پڑنا تھی ورنہ ڈریگنو وکی رینج میرے لیے کافی تھی۔یوں بھی اس کا وزن ڈریگنو سے کافی زیادہ تھا اور اتنی وزنی رائفل کو ہر وقت ساتھ پھرانا آسان کام نہیں تھا۔جبکہ اس کی ضرورت بھی کبھی کبھی پڑنا ہو۔طلوع آفتاب تک ہم وچہ نرائے کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ایک مناسب غار ڈھونڈ کر ہم نے اپنا سامان وہیں رکھا سردی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ہمیں آگ جلانے کی ضرورت پڑتی۔یوں بھی اپریل کا مہینہ ختم ہونے کو تھا۔بلندی پر البتہ اچھی خاصی سردی پڑ رہی تھی۔خاص کر تیز ہوا سردی کی شدت کو بڑھا دیتی تھی۔نومبر میں دسمبر میں تو برف باری بھی شروع ہو جاتی ہے۔

سردار کو آرام کرنے کا کہہ کر میں بیرٹ ایم 107 کو بیگ سے نکال کر جوڑنے لگا۔رائفل کو مکمل جوڑ کر میں غار کے دہانے پر آ گیا۔غار کے سامنے کافی گھنے درخت تھے۔درختوں ساتھ ایک چھوٹی سی ٹیکری پر لیٹ کر میں نے پانسو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا پتھر چنا اور مطلوبہ رینج لگا کر ایک گولی فائر کر دی۔اعلا کوالٹی کے سائیلنسر کی وجہ سے ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی تھی۔وہ پتھر دو تین ٹکڑوں میں بٹ کر بکھر گیا تھا۔ہر سنائپر اپنی رائفل کی صفر کاری اپنے طریقے سے کرتا ہے(صفر کاری کا مطلب ہے رائفل کو درست نشانہ لگانے کے لیے جانچنا)اور ضروری نہیں کہ ایک سنائپر کی صفر کی ہوئی رائفل سے دوسرا سنائپر بھی درست نشانہ لگا پائے کیونکہ ہر انسان کی ماسٹر آئی مختلف ہوتی ہے۔اس کے باوجود امریکن سنائپر کی صفر کی ہوئی رائفل حیرت انگیز طور پر میرے مزاج کے موافق رہی تھی ۔(بہت سے قارئین کو تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ماسٹر آئی ہوتی کیا ہے۔فائر کرتے وقت ہر شخص کو ایک آنکھ بند کر کے فائر کرنا پڑتا ہے اور درست فائر کے لیے ضروری ہے کہ ہر فائرر اپنی ماسٹر آئی کھول کر فائر کرے۔گو ضرورت تو نہیں لیکن قارئین کی معلومات کے لیے ماسٹر آئی معلوم کرنے کا طریقہ درج کر دیتا ہوں۔اپنا بایاں بازو مکمل کھل کر اپنی شہادت کی انگلی کھڑی کریں۔اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھتے ہوئے اس انگلی سے کسی بھی نشان پر شست لیں۔اب باری باری اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے دیکھیں کہ کس آنکھ کو کھلا رکھتے ہوئے اس نشان پر شست برقرار رہتی ہے۔بس وہی آپ کی ماسٹر آئی ہے)

ایک گولی ہزار میٹر کے فاصلے پر فائر کر کے میں نے رائفل کے صفر ہونے کا یقین کیا۔اور واپس غار میں پلٹ آیا۔بیگ کھول کر سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میں بے اختیار اپنا سر پیٹنے لگا۔اس میں رکھی NSV-80

کلپ آن نائیٹ ویژن سائیٹ میرا منہ چڑا رہی تھی۔دو تین دن پہلے زیڑہ کیل پر اگر یہ سائیٹ ہم استعمال کرتے تو روشن خان پارٹی کے کئی بندوں کو نشانہ بنا سکتے تھے۔حالانکہ امریکن سنائپر سے سامان قبضہ کرتے وقت میں نے اچھی طرح NSV-80 کلپ آن نائیٹ ویژن سائیٹ کو دیکھا تھا،لیکن جب ضرورت پڑی اس وقت یہ سائیٹ ذہن ہی سے نکل گئی تھی۔یہ ایک بہترین سائیٹ ہے اور سنائپر رائفل پر لگا کر اس سے رات کے اندھیرے میں بھی فائر کیا جاسکتا ہے۔بہر حال جو بے وقوفی ہونا تھی وہ تو ہو چکی تھی اس پر ماتم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

غار کے ٹھنڈے فرش پر پاؤں پسار کر میں نے اپنے سفری تھیلے سے چنوں کے بنے ہوئے غذائیت سے بھر پور بسکٹ نکال کر کھانے شروع کر دیے۔بسکٹ کھا کر میں نے غار سے باہر جا کر خشک لکڑیاں اکٹھی کیں اور آگ جلا کر چائے بنانے لگا۔

سردار اپنی مرضی سے دو پہر کو بارہ بجے اٹھ گیا تھا۔اس کے بستر سے نکلتے ہی میں لیٹ گیا۔ تھکاوٹ سے یوں بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔سردار کے آواز دینے پر آنکھ کھلی تو شام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔رات کے وقت وچہ نرائے کی بلندی طے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔یہ کام اگلے دن پر اٹھا کر ہم نے وہ رات بھی اسی غار میں گزاری۔صبح سویرے ہم بالکل تازہ دم تھے۔چائے پی کر ہم نے وچہ نرائے کی چڑھائی پر قدم رکھ دیے۔ذخیرہ ٹاپ سے اس کی بلندی ذرا ہی کم تھی لیکن اس کی چڑھائی نہایت دشوار گزار اور خطرناک تھی۔مسلسل اوپر چڑھتے ہوئے ہمیں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔وچہ نرائے کی چوٹی ایسی تھی کہ وہاں رہائش نہیں بنائی جاسکتی تھی۔اس جگہ ہوا بھی خاصی تیز چل رہی تھی۔ایک پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر ہم سستانے لگے۔

ذخیرہ ٹاپ وہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔دو بینکر سامنے تھے اور باقی کھدائی کر کے پہاڑی کے اندر بنائے گئے تھے۔میں نے دوربین نکال کر جائزہ لیا۔ایک آدمی ان بینکرز کے اوپر ٹہلتا نظر آیا۔

آئی کام پر میں نے ای بلاک سے رابطہ کیا۔

”ہم بٹالین میں پہنچ گئے ہیں اوور۔“میں نے کوڈ ورڈ میں انھیں بتایا کہ ہم اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔

پوسٹ کمانڈر نے جواب دیا۔”شاباش،کل چھٹی نکل جانا۔باقی پوسٹ کی فکر نہ کرو ہم چوکنا ہیں اوور۔“

''ٹھیک ہے واپسی پر دوسرے چینل بات ہوگی اور اینڈ آل۔'' کہہ کر میں نے بات چیت ختم کر دی۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم وچہ نرائے کی بلندی پر تیار بیٹھے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میجر اورنگ زیب خٹک فیلڈ ٹیلی فون پر انھیں سارا منصوبہ سمجھا چکا ہوگا۔

''سردار!...... تیار ہو جاؤ۔'' بیرٹ ایم 107 کی دو پائی کھول کر میں نے مناسب جگہ پر لگائی اور رائفل کاک کر کے اس کے پیچھے لیٹ گیا۔

سردار نے سب سے پہلے تو ایل آر ایف (لیزر رینج فائینڈر) نکال کر فاصلہ ناپا۔

''سترہ سو دس میٹر۔'' کہہ کر اس نے ایل آر ایف آنکھوں سے ہٹایا اور اور ونڈ میٹر نکال کر ہوا کی رفتار ناپنے لگا۔ ''پندرہ کلومیٹر فی گھنٹا۔'' ہوا کی رفتار بتا کر وہ ونڈ چارٹ دیکھنے لگا۔ اس دوران میں ذخیرہ پوسٹ کا زاویہ دیکھنے لگا۔ ذخیرہ پوسٹ ہم سے بلند تھی اور فائر کرتے وقت بلندی، گہرائی اور متوازی ہدف پر فائر کرنے کے الگ الگ طریقے ہیں۔ جیسے اپنی پوزیشن سے نیچے فائر کر رہے ہوں تو کشش ثقل کی وجہ سے گولی آگے جائے گی اور جب اپنی پوزیشن سے اوپر فائر کر رہے ہوں تو گولی پہلے لگے گی۔ فائر کرتے وقت سنائپر کو بلندی اور پستی کا فرق نکالنا پڑتا ہے۔ حقیقت میں سنائپنگ ایک سائنس ہے۔ اور جب تک ایک سنائپر رائفل کو صحیح طریقے سے استعمال نہ کر سکے تو کامیابی کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ میں بہ مشکل مکمل تیار ہو پایا تھا کہ ہدف مجھے نظر آ گیا۔ بیرٹ ایم 107 کی طاقتور ٹیلی سکوپ سائیٹ میں مجھے دو آدمی بھاگ کر بینکر سے نکلتے دکھائی دیے۔ ایک نے دونوں ہاتھوں میں سنائپر رائفل اٹھائی ہوئی تھی۔ بینکر کی چھت پر سنائپر کو دو پائی پر لگا کر وہ اس کے پیچھے لیٹ گیا۔ گویا وہی میرا ہدف تھا۔

میں نے سردار کو آئی کام آن کرنے کی ہدایت کی۔ اسی وقت ذخیرہ پوسٹ پر لیٹے سنائپر نے گولی فائر کی اور پھر مکا ایسے لہرایا جیسے اس نے کامیاب فائر کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دوربین میں ای بلاک کا جائزہ لینے لگا۔

''تھری، ٹو، ون......'' میں نے آہستہ سے دہرایا۔ اور ایک سیکنڈ انتظار کر کے ٹریگر دبا دیا۔

جبکہ سردار نے وہی ہندسے آئی کام پر دہراتے ہوئے ایک کے بعد فائر کہا۔ اس کے ساتھ ہی ای بلاک کی

طرف سے 12.7 ایم ایم کا برسٹ چلایا گیا۔مذکورہ سنائپر سر کے بائیں جانب میری گولی کھا کر پشت کے بل گرا تھا۔ذخیرہ ٹاپ وچہ نرائے سے شمال کی سمت میں واقع تھی جبکہ ای بلاک ذخیرہ ٹاپ سے مغرب کی جانب تھا ۔مذکورہ سنائپر کا رخ ای بالک کی طرف ہونے کی وجہ سے اس کی بائیں جانب میری طرف تھی۔ای بلاک سے 12.7 کا فائرہ کرانے کا یہی مقصد تھا کہ دہشت گردوں کا دھیان وچہ نرائے کی طرف نہ آئے اور وہ اپنے سنائپر کی ہلاکت کی وجہ 12.7 کا فائر ہی سمجھیں۔یہ علیحدہ بات کہ ذرا سا غور کرنے پر وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکتے تھے

سردار خوشی سے چہکا۔''راجا صاحب!......''تمھارے فائر کی تعریف کیے بنا رہا نہیں جاتا۔''

''شکریہ یار!'' کہہ کر میں نے ٹیلی سکوپ کے عدسے سے آنکھ پیچھے ہٹالی۔وہ اپنے ساتھی لاش لے کر نیچے اتر گئے تھے۔

''کنٹرول فار ای بلاک اوور۔''سردار سے آئی کام لے کر میں ای بلاک کو پکارنے لگا۔

''ای بلاک فار کنٹرول!......ہمارا ایک آدمی سنائپر کی گولی سے شہید ہو گیا ہے اوور۔''

''ہمیں تو 12.7 ایم ایم کے فائر کی آواز سنائی دی تھی اوور۔''

''12.7 ایم ایم سے جوابی فائر ہم نے کیا ہے اوور۔''

''ٹھیک ہے محتاط رہو ایک ہی سنتری کو گولی لگی ہے دوسرے کو نہیں اوور۔''میں نے کوڈ ورڈ میں بتا دیا کہ ایک سنائپر کو میں کامیابی سے نشانہ بنا چکا ہوں۔

''ٹھیک ہے سر!......ہم فی الحال شہید ہونے والے کی لاش کو اگلی پوسٹ تک پہنچانے کا بندوبست کرتے ہیں اوور۔''

''کل تک خدا حافظ اوور اینڈ آل۔''میں نے اسے بتا دیا کہ اگلی کارروائی کل ہوگی۔چونکہ آئی کام وغیرہ پر گفتگو بالکل محفوظ نہیں تھی اور ہر وقت کسی اور کے سننے کا خدشہ رہتا ہے اس لیے ہم نے ساری گفتگویوں کی کہ کوئی اگر سن بھی رہا ہو تو وہ یہی سمجھے کہ آرمی کا آدمی دہشت گردوں کی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں تھا۔انھوں نے کپڑوں اور روئی وغیرہ سے انسان کے اوپری جسم کا پتلا بنایا تھا یوں کہ اسے مکمل سنتری کا روپ دیا گیا تھا۔کمر سے نیچے ایک ڈنڈا باندھ کر ایک آدمی اس ڈنڈے کو پکڑ کر فائری خندق میں چھپ کر اس

پتلے کو یوں دائیں بائیں حرکت دینے لگا جیسے کوئی سنتری چھت پر ٹہل رہا۔ یہ ہم نے چارے کے طور پر کیا تھا ۔کیونکہ اس سے پہلے بھی یہی ہوتا تھا کہ جونھی کوئی فوجی سامنے نظر آتا ذخیرہ ٹاپ سے فوراً سنائپر کا فائر آجاتا ۔ہماری چال کامیاب رہی تھی۔ فوجی کو چھت پر ٹہلتے دیکھ کر ذوالجدین یا مرشد دونوں میں سے کوئی ایک فوراً اسے شکار کرنے کو بھاگا یوں مجھے آسانی سے پتا چل گیا کہ وہاں پر سنائپر کون ہے۔ اس کے علاوہ اتنی دور سے تو کسی کی پہچان مشکل تھی۔

ہم اپنا سامان سمیٹ کر بلندی سے تھوڑا نیچے اترے۔ درختوں کے جھنڈ کے درمیان ہم رات گزارنے کی جگہ بنانے لگے۔ گو اترے تو ہم جنوب کی طرف سے تھے لیکن رات گزارنے کی مناسب جگہ ہمیں شمال کی جانبب ملی تھی۔ جگہ بنا کر میں آئی کام سے چھیڑ خانی کرنے لگا مختلف چینل تبدیل کر کے میں دشمن کی بات سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک چینل پر روشن خان کی مدہم آواز سنائی دی لیکن وہ جس آدمی سے بات کر رہا تھا اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ روزمرہ کی چند باتیں کرنے کے بعد اس کی آواز بھی غائب ہوگئی۔ ایک دو چینلز پر کوئی عام آدمی ایک دوسرے سے گفتگو کرتے نظر آئے۔ چونکہ موبائل فون اس علاقے میں کام نہیں کرتا اس لیے عام لوگ بھی آئی کام کو رابطے کے ذریعے کے طور پر کام میں لاتے ہیں۔ گو اس کی رینج اتنی زیادہ نہیں ہوتی ,لیکن چند کلومیٹر کے فاصلے پر بات ہو جانا بھی غنیمت ہی ہوتا ہے، کہ پہاڑی علاقے میں تو چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔میں زیادہ دیر اس شغل کو جاری نہ رکھ سکا یوں بھی خواہ مخواہ آئی کام کی بیٹری کو استعمال کرنا مناسب نہیں تھا۔

رات کو ہم آگ جلائے رکھی تھی۔ اگلے دن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم دوبارہ بلندی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ واپسی کے لیے ہم نے وہی راستہ استعمال کیا جس سے نیچے اترے تھے۔ اپنی جگہ پر ہم پہنچنے ہی والے تھے کہ شوں کی آواز کے ساتھ ایک گولی میرے کافی قریب سے گزرتی ہوئی ہمارے عقب میں موجود چٹان سے ٹکرائی۔ میں نے لیٹنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ گولی کے پتھر سے ٹکرانے کی آواز سردار بھی سن چکا تھا۔ وہ بھی فوراً زمین بوس ہو گیا۔

’’بال بال بچے ہیں راجا صاحب!‘‘ سردار اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

یقیناً زیادہ فاصلے کی وجہ سے نشانہ خطا ہوا ہے۔‘‘

"نہیں۔" سردار نے نفی میں سر ہلایا۔"وہ بے وقوف بے صبری کا مظاہرہ کر گیا ہے۔ اگر وہ ہمارے رکنے کا انتظار کر لیتا تو شاید کامیاب ہو جاتا۔

رینگ کر پتھر کی آڑ لیتے ہوئے میں نے بیرٹ ایم 107 کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے ڈسٹ کور اتارے اور ذخیرہ ٹاپ کا جائزہ لینے لگا۔ یقیناً اپنے ساتھی کے سر کی بائیں جانب لگی ہوئی گولی کی وجہ سے انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان پر کس جانب سے فائر کیا گیا ہے۔ ہم بے خبری میں مار کھا گئے ہوتے لیکن فاصلے کے زیادہ ہونے اور ہمیں حرکت کے دوران نشانہ بنانے کی بے وقوفی کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ کیونکہ حرکتی ہدف کو نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور ہے۔

سورج قریباً ہماری پشت پر چمک رہا تھا۔ ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ جلد ہی مجھے ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے کی چمک دکھائی دے گئی تھی۔ مخالف سنائپر قریباً چھت سے چمٹا ہوا تھا۔ لیکن اس کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کا شیشہ اپنی چمک کی وجہ سے واضح نظر آ رہا تھا۔ اسی وقت ایک اور گولی ہمارے سامنے پڑے پتھر کی جڑ میں لگی۔

میری رائفل کی ٹیلی سکوپ سائیٹ پر ابھی تک گزشتہ کل والی ایلی ویشن اور ڈی فلکشن لگی تھی۔ کل چونکہ کافی ہوا چل رہی تھی اس لیے میں نے ڈی فلیکشن ناب کو ونڈ چارٹ کی ریڈنگ کے مطابق گھما دیا تھا۔ آج ہوا ساکن تھی میں نے فوراً ڈی فلیکشن ناب کو گھما کر صفر ریڈنگ پر لگایا اور دشمن کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے پر شست باندھ لی، کیونکہ ٹیلی سکوپ کے آئی گلاس پر لازماً سنائپر کی آنکھ نے ہونا تھا۔ سانس روکتے ہوئے میں نے ٹریگر دبایا۔ سردار نے آنکھوں سے دوربین لگائی ہوئی تھی۔ گولی کی "ٹھک۔" ہوتے ہی اس نے کہا۔

"لیں جی راجا صاحب!...... مشن مکمل۔ دوسرا سنائپر بھی گیا جان سے، اس غریب کو پتا ہوتا کہ عزرائیل ثانی کا شاگرد عزرائیل ثالث مقابلے میں ہے تو یقیناً ٹکر نہ لیتا۔"

مجھے اس کی بات پر ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں یار!...... ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے سے گولی گزارنا شاید استاد عمر دراز کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔"

"نہیں۔" میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "استاد جی!...... کا فائر مجھ سے کئی گنا بہتر ہے۔"

”چلو ای بلاک کو تو خوش خبری سنا دیں۔“ اس نے آئی کام آن کیا اور مطلوبہ چینل کے لیے بٹن دبایا۔ ابھی تک وہ مطلوبہ چینل تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک چینل پر روشن خان کی منحوس آواز سنائی دینے لگی۔ اس کی صاف اور واضح آواز سنتے ہی میں نے فوراً کہا۔

”سردار!...... ٹھہرو اس کی بات سننے دو، ای بلاک کو بعد میں بھی اطلاع دی جا سکتی ہے۔“ وہ بٹن دبا چکا تھا۔ میری بات پر دوبارہ روشن خان والا چینل لگا دیا۔

”آج کسی کی غلطی معاف نہیں ہوگی۔ اس لیے احتیاط سے کام لینا۔ وہ دونوں دن کی روشنی میں کہیں حرکت نہیں کر سکتے۔“

”ہم تیار ہیں کمانڈر!...... ہم بھی...... ہم بھی...... ہم بھی...... ہم بھی۔“ مختلف آدمی وقفے وقفے سے اپنے تیار ہونے کا اعلان کرتے گئے۔

”سردار!...... تم نے وہی سنا جو مجھے سنائی دیا۔“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سردار کی طرف دیکھا۔

میری بات کا جواب دیے بغیر اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور وچہ نرائے کے دامن میں پھیلے درختوں کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

”اب ہوشیاری سے اوپر کی طرف بڑھو۔ اور خود کو حتی الوسع چھپا کر رکھو۔ ان دونوں میں سے کم از کم ایک ایسا ضرور ہے جس کا نشانہ بے داغ ہے۔ ابھی ابھی مجھے ذخیرہ ٹاپ سے خبر ملی ہے کہ مرشد کو آنکھ میں گولی لگی ہے۔“

”راجا صاحب!...... مرنے سے پہلے کون سی دعا پڑھی جاتی ہے؟“ دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے سردار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”مسلمان تو کلمہ شہادت پڑھتے ہیں۔“

”تو پڑھ لو بھائی!...... رات کے اندھیرے میں تو نکل گئے تھے اب وہ یقیناً نہیں چھوڑیں گے۔“

”اتنی بھی جلدی کیا ہے پہلے انھیں تو یاد کرا لیں کلمہ شہادت۔“ میں اتنی آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ”یہ بتاؤ تمھارے پاس کتنی گولیاں ہیں؟“

”کلاشن کوف کی تین میگزین ہیں بھری ہوئی ہیں اور تیس بور کی بھی شاید تیس گولیاں موجود ہوں گی۔“

’’کافی ہیں۔ڈریگنو وکے بھی قریباً نوے راؤنڈ موجود ہیں،تیئس گولیاں بیرٹ ایم 107 کی ہیں ۔گلاک کی بھی ساٹھ سے زیادہ گولیاں موجود ہیں۔‘‘

’’ان کی تعداد بھی تو دیکھو۔‘‘سردار نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

’’وہ گہرائی میں بھی تو ہیں۔تم یوں کرو کہ ڈریگنو وساتھ لے جاؤ اور عقبی جانب مورچہ لگاؤ۔میں یہی جگہ سنبھالتا ہوں۔آئی کام پر چینل پانچ پر بات ہوگی۔اور یاد رہے ایک گولی ضائع نہ جائے۔‘‘

’’یس باس!‘‘زندہ دل پٹھان مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔وہ ان آدمیوں میں سے تھا جن کے دل مرنے کا بس اتنا ہی خوف ہوتا ہے جتنا کسی کے دل میں کانٹا چبھنے کا۔میں نے ٹیلی سکوپ سائیٹ پر لگی ایلی ویشن میں مناسب تبدیلی کی اور گہرائی میں دیکھنے لگا۔جلد ہی درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر دو آدمی دبے قدموں اوپر کی جانب بڑھتے نظر آئے۔وہ چونکہ سامنے کی طرف بڑھتے آرہے تھے اس لیے مجھے حرکتی ہدف کے لیے لی جانے والی لیڈ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ٹریگر دباتے ہی۔’’ٹھک۔‘‘ کی آواز کے ساتھ دائیں جانب والا آدمی اچھل کر پیچھے گرا تھا۔بیرٹ کی طاقتور گولی نے اسے کسی طاقتور آدمی کے دھکے کی طرح پیچھے اچھال دیا تھا۔اس کا ساتھی ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا تھا۔بغیر گولی کا دھماکا ہوئے اس کا ساتھی گرا تھا۔اور اس کی یہ حیرانی میرے لیے غنیمت ثابت ہوئی تھی۔سرعت سے رائفل کاک کرتے ہوئے میں نے اس کی کھوپڑی پر بھی گولی داغ دی تھی۔اپنے ساتھی کے پیچھے گرنے کی وجہ سے وہ اس کی جانب رخ کر کے کھڑا تھا۔میری جانب اس کی پشت تھی۔کھوپڑی کے عقبی حصے میں لگنے والی گولی سے وہ اوندھے منہ اپنے ساتھی پر گر گیا تھا۔

’’شیر خان اور رضا کو گولی لگ ہے کمانڈر!‘‘میرے سامنے آن پڑے آئی کام سے کسی نے روشن خان کو پکار کر کہا تھا۔

’’بتایا تھا احتیاط سے چلو۔‘‘جواباً روشن خان غصے سے چلایا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ای بلاک کو تو اطلاع کر دیں تاکہ میجر اورنگ زیب خٹک تک ہمارے محاصرے میں پھنسنے کی خبر تو پہنچ جائے۔یا مرنے سے پہلے کم از کم انھیں دوسرے سنائپر کے مرنے کی اطلاع ہی پہنچا دیں

۔میں نے فوراً مطلوبہ چینل لگا کر ای بلاک کو کال کرنا شروع کر دیا۔

”ایس ایس فار ای بلاک اوور!“

فوراً جواب آیا۔”ای بلاک سینڈ یور میسج اوور!“

”الفا کو بتا دو کہ ذخیرہ پر موجود دوسرا اسنائپر بھی جہنم واصل کر دیا ہے،لیکن اس کے ساتھ ہم خود دہشت گردوں کے گھیرے میں آ گئے ہیں۔وچہ نرائے کو پچاس ساٹھ آدمیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے اوور۔“

”اگلے دو منٹ میں پیغام پہنچ جائے گا اوور۔“

”شکریہ۔اوور اینڈ آل۔“کہہ کر میں نے ایک بار چینل پانچ لگا کر سردار کی خبر لی۔کہ اس کی جانب سے مجھے ڈریگنو وکی گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔

”ایک دشمن کم ہو گیا ہے۔“سردار کی اطمینان بھری آواز آئی تھی۔

”ایک نہیں تین خان صاحب!“

”جانتا ہوں۔“اس نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا اور میں نے فوراً روشن خان والا چینل لگا دیا۔اس کے ساتھ ہی میں ٹیلی سکوپ سائیٹ میں سامنے پھیلے درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ایک اور بات بھی ہمارے فائدے میں جاتی تھی کہ وچہ نرائے ٹاپ کے چاروں طرف تقریباً ڈیڑھ سو میٹر کے علاقے میں درخت موجود نہیں تھے۔یوں کم از کم وہ چھپ کر ہم تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

نیچے ایک درخت کے تنے کے ساتھ مجھے سفید لباس کی جھلک نظر آئی میں نے اپنی شست اسی پر مرکوز کر دی ۔وہ اپنا سر باہر نکال کر جھانکتا اور پھر سر چھپا لیتا۔میرے دیکھنے کے بعد بھی اس نے دو دفعہ اسی طرف سر باہر نکال کر دیکھا۔تیسری بار بھی اس نے سر باہر تو نکال لیا تھا لیکن بیرٹ کی ظالم گولی نے اسے سر واپس لے جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔اسی وقت دو تین کلاشن کوفیں مسلسل گرجنے لگیں۔لیکن ابھی تک میں کلاشن کوف کی رینج سے دور تھا۔

روشن خان سیٹ پر اپنے آدمیوں کو فائر نہ کرنے کا حکم دے رہا تھا۔

”روشن خان!......کیا حال ہے۔“میں نے اسے غصہ دلانے کے لیے پکارا۔

”کون؟“فوراً اس کا جواب موصول ہوا تھا۔

”روشن خان!......میں تمھیں لکھ کر دیتا ہوں کہ میں تیری دونوں آنکھوں کے درمیان میں گولی ماروں گا ۔بس کوشش یہ کرنا کہ زنانیوں کی طرح سب سے پیچھے نہ چھپے رہنا۔“

”تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ورنہ اس وقت تمھیں پچاس آدمیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔“

”ان میں مرنے والے چار شامل ہیں یا وہ کم کر کے بتا رہے ہو۔“میں نے اسے سلگانے کی کامیاب کوشش کی۔

”تم............“وہ گالیاں بکنے لگا۔

اس کی لغویات ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔”روشن خان!......تمھارے پاس تھوڑا وقت موجود ہے،بہتر ہوگا کہ اپنی وصیت لکھ لے۔کم از کم اپنی ہونے والی بیوہ ہی کو وصٗت کرتا جا کہ وہ تماھرے بعد کس سے شادی کرے۔“

”تم دیکھنا میں تیرے ساتھ کرتا کیا ہوں تم......“اس نے ایک بار پھر بکواس شروع کر دی تھی۔اور یہی میں چاہتا تھا کہ اسے اتنا غصہ دلا دوں کہ وہ کچھ بہتر سوچنے کے قابل نہ رہے۔

”درختوں کی آڑ لے کر تیزی سے اوپر چڑھو۔دو آدمی کتنوں کو روکیں گے۔“اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

کمانڈر کا حکم ملتے ہی ان کی حرکت میں تیزی آ گئی تھی۔اس کے ساتھ ہی مجھے اور سردار کو بھی گولی چلانے کے زیادہ مواقع ملنے لگے تھے۔میں نے مزید پانچ بار ٹریگر دبایا۔اور میری ایک گولی بھی ضائع نہیں گئی تھی ۔سردار کی جانب سے بھی مجھے چھ سات فائر سنائی دے چکے تھے۔اس جانب پیش قدمی میں کمی آتے دیکھ کر میں نے بیرٹ اٹھائی اور جھکے جھکے انداز میں اس جگہ سے پندرہ بیس گز مغرب کی جانب لیٹ گیا۔وہاں سے مجھے پتھر کے پیچھے چھپا سردار بھی نظر آ رہا تھا۔اچانک ایک ساتھ کئی کلاشن کوفیں گرجنے لگیں شاید وہ تیز فائر کر کے ہمیں مرعوب کرنا چاہ رہے تھے۔

”سردار!......مشرق کی جانب کو بھی سنبھالو۔“ آئی کام کے بغیر بتانا مجھے آسان لگا تھا۔

سردار ”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر جھکے جھکے انداز میں وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ دو منٹ بعد میرے کانوں میں اس کی آواز پڑی۔ وہ وچہ نزائے کی بلند ترین جگہ سے مجھے آواز دے رہا تھا۔

”راجے!...... یہاں آجاؤ۔“

”یار!......وہاں ہم بالکل کھلے میں ہو جائیں گے۔“

”تم آؤ تو سہی۔“ وہ مصر ہوا۔ اور میں رائفل اٹھا کر جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اوپر جاتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ لگتا تھا کسی نے لائیٹ مشین گن کا مورچہ بنانے کے لیے کھدائی کی ہے ۔کیونکہ وہاں انگریزی کے حرف وی کی صورت میں زمین کھدائی ہوئی تھی۔

”بے وقوفوں کے سینگ تو نہیں ہوتے نا۔“ میں نے اس گڑھے میں اترتے ہوئے خود کو کوسا۔

”پھر بھی کہتے ہو پٹھانوں ذہن نہیں ہوتے۔“ سردار نے فخر سے چھاتی چوڑی کی۔

اس جگہ سے ہم چاروں طرف دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ ”میرا خیال ہے ڈریگنو میرے حوالے کرو اور تم کلاشن کوف سے فائر کرو۔“

”کیا بیرٹ کا ایمونیشن ختم ہو چکا ہے؟“ یہ پوچھتے ہوئے اس نے ڈریگنو میری جان بڑھادی تھی۔

”نہیں......لیکن اب وہ نزدیک پہنچ گئے ہیں اور اب آٹو میٹک ہتھیار زیادہ مفید رہے گا۔“ میں نے بیرٹ ایم 107 کو گڑھے کی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

میرا رخ شمال کی جانب تھا اور سردار کا جنوب کی طرف۔ ہم دونوں اپنے سامنے اور دائیں بائیں نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح کہ ہم دونوں کی گردنیں مسلسل گردش میں تھیں۔ روشن پارٹی سے لڑائی شروع ہوئے گھنٹے سے زیادہ وقت بیت گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اڑھائی بج چکے تھے۔ انھیں ہماری پوزیشن بھی نظر آ گئی تھی ۔اب پیش قدمی کرتے ہوئے وہ بہت احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سردار نے ایک گولی فائر کی اور اس کے ساتھ ہی اعلان کیا۔ ”گولی ضائع ہو گئی۔“

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک آدمی نے دوڑ کر اگلے جھنڈ کے قریب آنا چاہا۔ ٹریگر دباتے ہی میں نے کہا

گولی ضائع نہیں ہوئی۔"

سردار نے پوچھا۔"طعنہ دے رہے ہو۔"

میں ہنسا۔"ہتھیار بردار پٹھان کو طعنہ دینا بے وقوفی ہی کہلائے گا۔"

"اچھا یہ لو۔"اس نے مسلسل تین گولیاں فائر کرتے ہوئے کہا۔"تینوں ہی ضائع چلی گئیں۔"

"خان صاحب!......ایک ایک کر کے ضائع کرو۔تین تین گولیاں ضائع کرنے کا وقت ابھی تک دور پڑا ہے۔"یہ کہتے ہوئے میں آئی کام کا چینل تبدیل کرنے لگا کہ کافی دیر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔جلد ہی روشن خان کی منحوس آواز میرے کانوں میں پڑ گئی۔

"جو بھی ہے درختوں کے آخری لائن تک تمام آدمی پہنچتے ہیں مجھے اطلاع دو۔"

"ہم مشرقی جانب سے درختوں کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں۔"ایک بھاری آواز نے اپنی کامیابی کی اطلاع دی۔

"ہم مغرب کی جانب سے بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔"ایک دوسری آواز ابھری۔

روشن خان نے پوچھا۔"برمن خان!......تمھاری آدمی کتنی دور ہیں؟"

برمن خان نے جواب دیا۔"ہم درختوں کی لائن سے سو گز دور ہوں گے۔ہمارے کافی آدمی ضائع ہو چکے ہیں۔"یقیناً وہ شمال کی جانب موجود تھا۔اور اسی جانب کافی آدمی میری گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔گویا وہ خود جنوب کی جانب موجود تھا۔

"تم اس جانب کو سنبھالو۔"میں نے سردار کے حوالے شمال کی سمت کی اور خود جنوبی طرف ہو گیا۔اس جانب پتھر زیادہ تھے اس وجہ سے انھیں درختوں کے ساتھ پتھروں کی آڑ بھی دستیاب تھی۔مشرقی جانب سے ایک دم چھ سات کلاشن کوفیں گرجیں،گولیوں کی بوچھاڑ اس مورچے کے اطراف سے ٹکرانے لگی۔ہم اپنی جگہ پر دبک گئے تھے۔سردار نے اپنی کلاشن کوف کی بیرل اس جانب موڑ کر چار پانچ گولیاں فائر کر دیں۔ہم بالکل بھی فائر نہ کرتے تو وہ دلیر ہو کر ہم پر چڑھ دوڑتے۔ہمیں سب سے زیادہ سہولت بلندی کی وجہ سے تھی۔ہموار زمین پر ہم انھیں اتنی دیر نہیں روک سکتے تھے۔اب بھی ہماری پوری کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے نقصان کی وجہ سے پیچھے ہٹ

جائیں۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ رات کے وقت ان کی یلغار کو روکنا ناممکن ہو جاتا۔وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر آسانی سے نزدیک پہنچ سکتے تھے۔بلکہ تیس پینتیس گز دور سے ہینڈ گرنیڈ پھینک کر بھی وہ آسانی سے ہمیں شہادت کے مرتبے پر فائز کر سکتے تھے۔

فائر کے تھمتے ہی میں نے ایک دم سامنے دیکھا۔دو آدمی دوڑ کر ایک پتھر کی آڑ سے نکل کر دوسرے پتھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ان میں صرف ایک ہی کامیاب ہو پایا تھا۔دوسرے کو ڈریگنو وکی گولی نے اتنی مہلت نہیں دی تھی۔اپنے ساتھ کو پشت کے بل گرتے دیکھ کر وہ فوراً اپنی جگہ پر دبک گیا تھا۔نیچے لیٹتے ہی اس نے اپنے کلاشن کوف کی بیرل کا رخ ہمارے مورچے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔اور جب تک میگزین خالی نہیں ہو گئی اس نے ٹریگر دبائے رکھا تھا۔ایک چیختی ہوئی غصیلی آواز نے اسے فائر کرنے سے منع کیا تھا۔وہ آواز روشن خان کی تھی۔وہ کافی نیچے سے آواز دے رہا تھا۔

میں نے آئی کام کا بٹن دا کر کہا۔”روشن خان!......کیوں عورتوں کی طرح چلا رہے ہو۔“

”میں تمھیں کتے کی موت ماروں گا۔میں......“وہ غصے میں چلاتے ہوئے واہی تباہی بکنے لگا۔

”خان صاحب!......سن لیا۔بس پٹھانوں میں اتنی برداشت ہوتی ہے۔“میں نے سردار کو روشن خان کی بکواس کی طرف متوجہ کیا۔

اس نے فوراً کہا۔”سارے پٹھان ایک جیسے نہیں ہوتے۔یہ کتے کا............“اس آگے اس نے بھی نا قابل اشاعت الفاظ منہ سے نکالنے شروع کر دیے۔میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”خان صاحب!......یقیناً سارے پٹھان ایک جیسے نہیں ہوتے۔“میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔“سردار ناراضی بھرے لہجے میں کہہ کر مسلسل فائر کرنے لگا۔

”کوئی نشانہ بھی سادھا ہوا ہے یا خالی ٹھخ ٹھخ سن کر خوش ہو رہے ہو۔“اسے ساتھ آٹھ گولیاں ضائع کرتے دیکھ کر میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

”دو آدمی درختوں کی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش میں تھے۔ایک کو زخمی کر دیا ہے دوسرا اسی جگہ دبک گیا ہے۔“

درختوں کی حد کے پاس آ کر تمام پارٹیاں رک گئی تھیں۔اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں تین بندے ہر حد سے گزر کر اپنے مالک کے حضور پہنچ گئے۔اس کے بعد وہ وہیں سے اکا دکا فائر کرنے لگے۔کبھی کبھی وہ ایک دم تیز فائر کھول دیتے اور اس سے فائدہ اٹھا کر کوئی نہ کوئی چند قدم آگے آ جاتا۔اسی طرح کے طوفانی فائر میں ایک پتھر اڑتا ہوا سردار کے سر سے ٹکرایا اور اس کا خون بہنے لگا۔میں نے فوراً اپنا مفلر اس کے زخم پر کس کر لپیٹ دیا تھا۔

وقت آگے سرکتا جا رہا تھا۔گھڑی پر نگاہ دوڑانے پر ہندسے پانچ بجنے کا اعلان کرتے نظر آئے۔میں نے کہا ”پانچ بج چکے ہیں اور ساڑھے چھ سورج غروب ہوتا ہے،یقیناً اس کے بعد ہم ان کے ہاتھ میں ہوں گے۔“

سردار عزم سے بولا۔”وہ مجھے زندہ تو نہیں پکڑ سکتے۔“

میں نے افسردگی سے کہا۔”تو کیا،بعد میں بھی تو انھوں نے ہمیں ہلاک ہی کرنا ہے۔“

”ہاں لیکن زندہ ان کے ہاتھ لگنے کا مطلب مرنے سے پہلے دردناک اذیتیں جھیلنا ہے۔“

”صحیح کہا۔“میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”یار راجا!......میں مرنے سے پہلے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”یہی نا کہ تم مرنا نہیں چاہتے؟“

”نہیں......میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے لی زونا چنارے سے زیادہ پیاری لگتی تھی۔“اس نے اپنی زندگی کا گویا اہم راز منکشف کیا۔

میں نے پھیکے لہجے میں کہا۔”اب یہ بات بتانے کا کیا فائدہ،نہ تو میں چنارے بہن کو شکایت لگا کر تمھاری پٹائی کرا سکتا ہوں اور نہ لی زونا کو یہ خوش خبری سنا سکتا ہوں۔“

”میں بہت پچھتا رہا ہوں۔“میرے مزاح پر توجہ دیے بغیر اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔اسی وقت کلاشن کوف مخصوص آواز میں گرجنے لگی تھی۔لیکن اس کی تڑتڑاہٹ بھی سردار کی بات میرے کانوں تک پہنچنے سے نہیں روک سکی تھی۔

میں نے جھڑکنے کے انداز میں پوچھا۔”کیا محبت کر کے پچھتا رہے ہو؟“

”راج!……وہ مسلمان ہونے پر تیار ہوگئی تھی۔اسے میری دوسری بیوی بننے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا اور وہ اصرار کیے بغیر چپ ہوگئی تھی۔اس کے تئیں میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا اور سچ کہوں تو مجھے بھی اس وقت یہی لگتا تھا۔“

”تم بعد میں بھی تو اس سے رابطہ کر سکتے تھے۔“

”میں نے گھر آتے ہی اس کا فون نمبر جلا دیا تھا کیونکہ میں اسے بھلانا چاہتا تھا۔“ یہ کہتے ہی اس نے دو تین برسٹ فائر کیے۔تیسرے برسٹ کے خاتمے پر۔”ٹرنچ“ کی آواز نے میگزین کے خالی ہونے کا اعلان کیا اور وہ دوسری میگزین چڑھانے لگا۔اس نے شاید اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے آدھی کے قریب میگزین یونھی پھونک دی تھی۔

”ہونہہ!……مطلب تم نے اس سے رابطے کا راستہ ہی بند کر دیا۔“

”تقریباً ایسا ہی سمجھو۔“

میں مستفسر ہوا۔”تقریباً کا کیا مطلب؟“

”اس نے جو پتا بتایا تھا وہ مجھے یاد ہے۔امریکہ سے واپسی کے دو ماہ بعد میں اس کے پاس جانے کے لیے سخت بے تاب ہوگیا تھا لیکن افسوس کہ غربت نے اس کی اجازت ہی نہ دی۔“

”یعنی تمھارے پاس جاپان جانے کا کرایہ ہی موجود نہیں تھا۔“

”ہاں۔“ سردار نے اعتراف کرنے میں ذرا بھر بھی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔

”تو مجھ سے مانگ لیتے۔“

”کیا کہتا کہ مجھے اپنی محبوبہ کے پاس جانا ہے جاپان کا کرایہ دے دو۔“ اس نے غمزدہ ہنسی سے کہا۔

”دوست سے مدد مانگتے وقت اپنا مسئلہ نہیں بتایا جاتا۔“ اس حالت میں بھی میں اسے مطعون کیے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

”اب اس وقت تو میرے پچھتاوں میں اضافہ نہ کرو۔“

”سردار!……تم خوش قسمت ہو کہ تمھیں دو عورتوں کی محبت حاصل رہی۔مجھے دیکھو تین عورتوں کی مکاریاں

بھگت چکا ہوں۔"

"یہ تیسری کون سی ہے؟" وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے نیچے دبکا۔

"رومانہ......تمھیں اگر وہ کشمیری چرواہن یاد ہو تو۔" میں نے بھی اپنا سر نیچے کرتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ کہنے سے پہلے اس نے کلاشن کوف کی بیرل دشمن کی جانب کر کے ایک لمبا برسٹ فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی بیرل کو نیم دائرے میں گھما دیا تھا۔ میں نے بھی ڈریگنو وکی نال باہر کر کے چھ سات مرتبہ مسلسل ٹریگر دبا دیا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ تیز فائرنگ کی آڑ میں وہ ہمارے قریب پہنچ جائیں۔ لیکن اس طرح ہم انھیں زیادہ دیر نہیں روک سکتے تھے۔ طلوع آفتاب میں گھنٹا ایک رہ گیا تھا۔ اسی طرح ہمارے پاس ایمونشن بھی زیادہ نہیں تھا ۔خاص کر ایسی حالت میں کلاشن کوف جیسے آٹو میٹک ہتھیار کی ضرورت پڑتی ہے۔

اچانک میرے کانوں میں ایک مخصوص گن کے فائر کی آواز آئی۔

"سردار!......ان کے پاس ایل ایم جی کہاں سے آ گئی۔" میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی۔

سردار نے منہ بنایا۔"اس علاقے میں راکٹ لانچر، 12.7 ایم ایم اور مارٹر تک دستیاب ہیں، تم ایل ایم جی کا رونا رو رہے ہو۔"

اسی وقت کئی کلاشن کوفیں ایک دم گرجنے لگیں۔ مجھے محسوس ہوا گولیوں کا رخ کسی اور جانب ہے۔ ہم دونوں ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔

"راجے!......غلطی ہو گئی مجھے لی زونا والا راز نہیں کھولنا چاہیے تھا۔" سردار کی آواز میں مجھے زندگی کی رونق نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہو گیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھتے ہوئے پیچھے مڑ کر اس کے قریب ہوا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے مجھے شمال کی جانب وچہ نرائے کے دامن میں پانچ چھ ڈبل کیبن ٹویوٹا نظر آئیں۔ چاق و چوبند فوجی دستہ ہماری مدد کو پہنچ گیا تھا۔ وہ کیو آر ایف (Quick Reaction Force) تھی۔

"اب یہ بھاگیں گے سردار!......" میں جلدی سے اپنی جگہ پر ہو گیا۔ وہ کیو آر ایف کے جوانوں سے فائر کا تبادلہ کر رہے تھے۔ گو انھیں بلندی کا فائدہ حاصل تھا لیکن اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی موجود تھا کہ ان کے عقب میں

بھی پاک آرمی کے جوان موجود تھے۔اور کوئی بھی آدمی ایک طرف سے آڑ حاصل کرسکتا دونوں جگہ آڑ کا دستیاب ہونا کافی مشکل ہوتا ہے۔

سردار مسلسل فائر کر رہا تھا۔ چھے سات گولیاں فائر کرتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوا۔

”راجا صاحب!......اگر ڈریگنو مل جاتی تو کیا ہی بات تھی۔“

”یہ لو۔“ ڈریگنو اس کے حوالے کرتے ہوئے میں نے دوبارہ بیرٹ اٹھالی کیونکہ اب وہ دوبارہ پیچھے بھاگ رہے تھےاور بیرٹ کی دس گیارہ گولیاں اب تک موجود تھیں۔ تھیلے سے گولیوں کا پیکٹ نکال کر میں نے بیرٹ کی میگزین بھری اور دوبارہ پوزیشن سنبھال لی۔ ہماری طرف سے فائر نہ ہوتا دیکھ کر دو آدمی بھاگتے ہوئے نیچے کی طرف جا رہے تھے۔ایک کو دنیاوی فکروں سے آزاد کر کے میں نے دوبارہ رائفل کاک کی اس دوران دوسرا ایک پتھر کے پیچھے لیٹ گیا تھا۔

میں نے آئی کام پر چینل نو لگایا کہ ہمارا رابطہ ہمیشہ اسی چینل پر ہوتا تھا۔گو اس کے بعد گفتگو کے لیے ہم چینل تبدیل کرلیا کرتے تھے۔

”ایس ایس فارون الفا اوور!“ مجھے امید تو نہیں تھی کہ اورنگ زیب صاحب وہاں آیا ہوگا لیکن اتنا یقین تھا کہ جو بھی وہاں آیا ہوگا اسے اورنگ زیب صاحب نے لازماً چینل اور میرا کوڈ نام بتا دیا ہوگا۔

”ون الفا فار ایس ایس، سینڈ یور میسج اوور۔“ میجر اورنگ زیب کی اطمینان بھری آواز سن کر مجھے خوشگوار حیرانی ہوئی تھی۔

”شکریہ سر!......فی الحال میں بھگوڑوں سے نبٹ لوں اوور اینڈ آل۔“ میں نے چونکہ اس تک اپنی خیریت پہنچانی تھی اس لیے لمبی بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے میں نے سردار کو کہا۔

”سردار اپنے آئی کام پر چینل نو لگا دو میں ذرا روشن خان اسٹیشن پر کوئی کام کی بات سن لوں۔“

اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”راجر (سمجھ گیا) باس!“

میں نے فوراً چینل تبدیل کر کے آئی کام نیچے رکھا اور رائفل سنبھال لی۔ایک آدمی درخت کی آڑ میں بیٹھے ہوئے شمال کی جانب فائر کر رہا تھا کیونکہ اسی جانب سے کیو آر ایف کے جوان پیش قدمی کر رہے تھے۔فائر

کرتے ہوئے اس کا دایاں کندھا درخت کی آڑ سے باہر تھا۔میں نے فوراً اس کے کندھے پر شست سادھی،اگلے ہی لمحے کلاشن کوف اس کے ہاتھ گری اور وہ اپنے کندھے کو تھامتے ہوئے دہرا ہو گیا تھا۔اس حالت میں اس کا سر آڑ سے باہر آیا اور میں نے دوسری گولی فائر کرتے ہوئے اسے دنیاوی تکالیف سے چھٹکارا دے دیا تھا۔

''اندھوں کی طرح مت بھاگو......آڑ لے کر فائر کا جواب دیتے ہوئے نیچے اترو۔''روشن خان کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی کام سے برآمد ہوئی۔میرے پاس اسے چھیڑنے کا وقت موجود نہیں تھا کیونکہ میں چاہتا تھا اس کے زیادہ سے زیادہ آدمی ہلاک کر سکوں۔میری ہدف کی تلاش میں بھٹکتی نظروں کو پتھر کی آڑ میں لیٹے ایک شخص کا پاؤں نظر آیا۔وہ ظالم دو پتھروں کے درمیان میں لیٹا تھا۔نسبتاً بڑا پتھر گہرائی کے جانب تھا۔میری طرف موجود پتھر کی آڑ میں لیٹنے کی وجہ سے وہ چھپ گیا تھا۔میں نے فوراً اس کے پاؤں پر شست باندھی۔ٹریگر دباتے ہی میں نے اسے تڑپ کر سیدھا ہوتے دیکھا یقیناً اس کا آدھا پاؤں قربان ہو چکا تھا۔تین سو گز کے فاصلے پر بیرٹ ایم 107 کی گولی جتنی تباہی مچاتی ہے اس کا اندازہ ایک تربیت یافتہ سنائپر ہی کر سکتا ہے۔

میرے رائفل کو دوبارہ کاک کرنے سے پہلے وہ اسی پتھر کے پیچھے دبک گیا تھا۔لیکن اب وہ وہاں سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔میں بھی انتظار میں تھا کہ وہ کہیں کھسکے اور میں اسے اس کے مرنے والے ساتھیوں کے پاس پہنچاؤں۔

''ناصر خان!......کمانڈر روشن خان کو پاؤں میں گولی لگ گئی ہے۔''آئی کام سے ابھرنے والی آواز نے مجھے خوشی سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اس کے پاؤں پر پگڑی لپیٹ کر اسے نیچے پہنچاؤ۔''ناصر خان نے فوراً حکم پاس کیا۔یقیناً روشن خان کے بعد وہی کمانڈر تھا۔

''روشن خان!......میں نے کہا تھا نا کہ میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔''میں نے فوراً آئی کام اٹھا کر روشن خان کو پکارا۔

''تم جیسے کتے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''روشن خان کی آواز میں شامل تکلیف اور غصہ مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ وہ کتنی اذیت سے گزر رہا تھا۔

''روشن خان !......تم اپنے بدن کے جس حصے کو حرکت دو گے وہ عضو تمھارے بدن کا حصہ نہیں رہے گا،اگر شک ہے تو اپنا ایک ہاتھ پتھر کی آڑ سے نکال کر دکھاؤ۔'' یہ بات کرتے ہوئے بھی میں نے اپنی نشست اسی پتھر پر برقرار رکھی ہوئی تھی۔اسی وقت ایک آدمی جھکے جھکے انداز میں اس پتھر کے قریب پہنچا یقیناً وہ روشن خان کی مدد کے لیے آیا تھا۔اس کی بدقسمتی کہ میری ساری توجہ ہی اس پتھر پر مرکوز تھی۔وہ بہ مشکل بڑے پتھر کی آڑ سے نکل کر روشن خان تک پہنچ سکا تھا کہ میں نے ٹریگر پریس کر دیا۔اور تین سو گز کے فاصلے پر بیرٹ ایم 107 کی گولی کا ضائع جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ میں فائر ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں۔وہ روشن خان کے اوپر ہی گرا تھا۔

رائفل کاک کر کے میں نے آئی کام اٹھالیا۔''روشن خان !......اب تو یقین آ گیا ہوگا۔''

جواباً اس کی کوئی آواز نہیں آئی تھی۔اسی وقت اس نے لاش کو دور جھٹک دیا۔

''ویسے تم معافی مانگ کر اپنی جان بچا سکتے ہو۔''میں نے اسے غصہ دلایا۔

''تمھارا نام کیا ہے جوان؟''روشن خان کی آواز میں شامل بے بسی نے مجھے سکون پہنچایا تھا۔

''تم مجھے ایس ایس کہہ سکتے ہو۔''میں آئی کام سیٹ پر اسی نام سے گفتگو کرتا تھا اور یقیناً یہ اسے بھی معلوم تھا

''ایس ایس !......میں معذرت خواہ ہوں مجھے معاف کر دو۔''روشن خان کی تھکی ہاری آواز سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔میں نے خود ہی تو معافی کی شرط پیش کی تھی۔مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔اسی وقت میں نے روشن خان کو پتھر کے عقب سے اٹھتے ہوئے دیکھا وہ کلاشن کوف کو ڈنڈے کی طرح زمین پر ٹیکتے ہوئے اٹھا اور ایک بار اس نے میری جانب نگاہیں اٹھائیں چند لمحے اسی طرف دیکھتا رہا اور پھر مڑ کر جانے لگا۔وہ میرے نشانے پر تھا۔کوشش کے باوجود میں ٹریگر نہیں دبا سکا تھا۔وہ دو قدم ہی چلا ہوگا کہ بڑے پتھر کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر سہارا دینے کے لیے اس کے قریب ہوا۔روشن خان کے بچ کر نکل جانے کا غصہ میں نے نئے ظاہر ہونے والے ہدف کی کھوپڑی میں روشن دان کھول کر نکالا تھا۔

''معافی صرف تمھیں دی ہے روشن خان!''میں نے آئی کام کا بٹن دبا کر غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''جانتا ہوں۔''روشن خان کی جھلائی ہوئی آواز برآمد ہوئی اور وہ لنگڑاتا ہوا نیچے جانے لگا دس پندرہ گز نیچے ہی درختوں کا جھنڈ تھا۔کیو آر ایف کے جوان شمال کی جانب سے کافی اوپر آ چکے تھے۔چاروں جانب سے

دہشت گرد غائب ہو چکے تھے اس کے باوجود ہم مورچے میں دبکے رہے۔

سورج زرد ہو کر پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔اس حالت میں دہشت گردوں کا تعاقب کرنے سے بھی کیو آر ایف کے جوانوں کو کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔جلد ہی کیو آر ایف کے جوان ہمارے مورچے کے قریب پہنچ چکے تھے۔سب سے آگے میجر اورنگ زیب خٹک کو دیکھ کر مجھے اس کی دلیری پر یقین آ گیا تھا۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔میں مورچے سے باہر آ کر میجر اورنگ زیب کی طرف بڑھ گیا۔

''کیسے ہو جوان؟'' مجھے چھاتی کے ساتھ بھینچتے ہوئے اس نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہماری حالت آپ کو رستے میں ملنے والی لاشوں سے معلوم ہو چکی ہو گی۔''

''مجھے تم دونوں پر فخر ہے۔'' اس نے میری پیٹھ تھپتھپا کر تحسین آمیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ سردار کی جانب بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

کیو آر ایف کے تین جوان زخمی ہوئے تھے۔دشمن اپنی پچیس لاشیں چھوڑ کر بھاگا تھا۔اس میں انیس آدمی ہمارا شکار بنے تھے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' صبح کے نو بجے پر تکلف ناشتے کے بعد چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میجر اورنگ زیب خٹک نے پوچھا۔ہم اس وقت ڈی بلاک پر موجود تھے

سردار کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔''آپ کو پتا ہو گا سر!''

''میرا مطلب تھا کہ اگر قبیل خان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے چھٹی وغیرہ کاٹنے کا ارادہ ہے تو بتا دو۔یہاں تم دونوں کا تعلق براہ راست مجھ سے ہے۔''

میں نے جواب دیا۔''نہیں سر!...... پہلے ہم قبیل خان پر ہاتھ ڈال لیں۔اگر مشکل ہدف ہوا تو پھر دیکھیں گے۔''

''ہدف تو وہ کافی مشکل ہے۔اور تم دونوں تو آتے ساتھ ہی اس سے ٹکرا گئے ہو۔ویسے اس کے خاص آدمی کو چھوڑ کر تم نے اچھا نہیں کیا۔'' آخری فقرہ میجر اورنگ زیب نے ہنستے ہوئے ادا کیا تھا۔

"آپ نے وہ گفتگو سن لی تھی۔" میں نے خفیف انداز میں سر جھکا لیا تھا۔
"تم آئی کام پر بات کر رہے تھے بھائی، موبائل فون پر نہیں۔"
"سر!......بس غلطی یہ ہوگئی کہ میں جلد بازی میں زبان دے بیٹھا تھا۔" میں نے ندامت کا اظہار ضروری سمجھا۔
"ویسے مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے زبان کا پاس رکھا۔"
سردار نے فوراً لقمہ دیا۔ "ورنہ زبان کا پاس صرف پٹھان رکھتے ہیں۔" اس کی بات پر میجر اورنگ زیب نے قہقہہ لگایا۔
میں نے پوچھا۔ "ہم قبیل خان مشن پر کب روانہ ہوں گے سر!"
وہ فیصلے کا بوجھ ہمارے کندھوں پر منتقل کرتے ہوئے بولا۔ "جب تمھاری مرضی ہو چلے جاؤ۔"
"بیرٹ ایم 107 کے ایمونیشن کے بارے پہلے بتا دیا تھا، اب ڈریگنو کا ایمونیشن بھی چاہیے ہوگا۔"
وہ پوچھنے لگا۔ "ویسے دو سنائپر رائفلیں ساتھ پھرانے کی کیا ضرورت ہے؟"
سر!...... بیرٹ ایم 107 کو ہم ہر وقت ساتھ نہیں پھرا سکتے جب بھی کہیں خصوصی ہدف کو نشانہ بنانا ہوتا ہے تب ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ڈریگنو چونکہ ہلکی پھلکی رائفل ہے اس لیے عام طور پر ہم اسی سے کام چلا لیتے ہیں۔"
میجر اورنگ زیب نے پوچھا۔ "تمھارے پاس ڈریگنو کا کتنا ایمونیشن موجود ہے؟"
"بیس پچیس گولیاں باقی بچی ہوں گی۔"
"تو ایسا ہے تم بیرٹ ایم 107 کو یہیں ڈی بلاک پر چھوڑ جاؤ۔ اگلے قافلے میں بیرٹ کی گولیاں آجائیں گی جب موقع ملے تم وادی شوال سے یہاں آکر اپنی رائفل لے جانا۔ یہاں سے چند گھنٹوں ہی کے فاصلے پر قبیل خان کا علاقہ موجود ہے۔"
"ہونہہ!......صحیح ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تصدیق چاہی۔ "ویسے قبیل خان کے گاؤں کا نام علام خیل بتایا تھا نا آپ نے؟"

”بالکل، لیکن ضروری نہیں کہ وہ تمھیں وہیں ملے۔اس کے کئی ٹھکانے ہیں۔افغانستان میں بھی اس کے ٹھکانے موجود ہیں۔مجاہدین کے ساتھ اس نے معاہدہ کیا ہوا ہے۔وہ آپس میں نہیں لڑتے۔مجاہدین امریکن آرمی اور افغان فوج کے خلاف برسرِ پیکار ہیں جبکہ قبیل خان جیسے بے غیرت پاکستان آرمی کے خلاف مختلف ایجنسیوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔“

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔”تو ٹھیک ہے سر!......ہم کل یہاں سے نکلیں گے۔“

”وادی شوال کے مغربی جانب موجود پہاڑوں کے بعد افغانستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور یاد رہے ان پہاڑوں پر افغانستان کی موبائل فون سروس جیسے AWCC (افغانستان وائرلیس کیمونی کیشن)ADIA اور روشن وغیرہ کام کرتی ہیں۔کیونکہ شوال وادی کے پہاڑوں کو عبور کرتے ہی افغانستان کے شہر غزنی ،خوست،لمن وغیرہ آتے ہیں..........“وہ ہمیں اس علاقے کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔اور ہم ضروری باتیں ذہن نشین کرتے گئے۔

☆......☆......☆

ہم اس وقت تقریباً شمالی اور جنوبی وزیرستان کی سرحد پر موجود تھے۔وادی شوال کا علاقہ شمالی وزیرستان میں آتا ہے۔اگر ڈیرہ اسماعیل خان سے وزیرستان کی حدود میں داخل ہوں تو کوڑ قلعہ کے بعد جو پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ افغانستان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔رستے میں جہاں کہیں آبادیاں ہیں یا تو وہ پہاڑی ڈھلانوں پر بنی ہوئی ہیں یا پہاڑیوں میں گھری ہوئی وادیاں ہیں۔شوال وادی بھی شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی کافی وسیع وادی ہے۔جس میں چھوٹی بڑی کافی آبادیاں موجود ہیں۔جیسے گربز،ڈابر میانی ،دیر زوال،سرے خاورے ،درے نشتر وغیرہ اسی میں ایک بڑی آبادی علام خیل کی بھی تھی جس کا مشر یا سردار قبیل خان تھا۔لیکن وہ وہاں کم ہی ملتا تھا۔وزیرستان کے ہر سردار کے پاس اپنی ذاتی فوج ہوتی ہے جسے لشکر کہتے ہیں۔جس کے پاس جتنا بڑا لشکر ہو وہ اتنا بڑا سردار ہوتا ہے۔اور دشمن ممالک کی جو ایجنسیاں اس علاقے میں مصروف عمل ہیں وہ بھی عمومی طور پر بڑے سرداروں ہی کو اپنا آلہ کار بنانے میں دلچسپی لیتے ہیں۔قبیل خان پر بیک وقت انڈین ،اسرائیلی اور امریکی ایجنسیاں خاصی مہربان تھیں۔اس کی کارروائیوں کا دائرہ کار شمالی اور جنوبی وزیرستان کے علاوہ پاکستان

کے پرامن شہروں تک پھیلا ہوا تھا۔اور یہ تو اصول ہے کہ جتنا بڑا مجرم ہو وہ اتنا زیادہ ہی اپنی حفاظت کا بندوبست کرتا ہے۔شروع میں وہ پاک فوج کے خلاف درپردہ کام کرتا رہا،لیکن چند ماہ سے وہ کھلم کھلا سامنے آ گیا تھا۔ اس کا تعلق وزیر قوم سے تھا۔اس لیے وزیر قوم کے کافی سرداروں نے اس کے ساتھ الحاق کیا ہوا تھا۔مگر اس کے لشکر کا حصہ صرف وزیر قوم کے جوان نہیں تھے۔غربت، جہالت اور معاشرے میں پھیلی ناانصافی کے ڈسے ہوئے کئی جوان اور ادھیڑ عمر کے افراد جو پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اس کے لشکر کا حصہ تھے ۔یوں بھی وزیرستان سے تعلق رکھنے والی بڑی قومیں، جن میں وزیر، محسود اور داوڑ شامل ہیں سارے دہشت گرد نہیں ہیں۔ان اقوام کے بہت سے لوگ تو پاک فوج، ایف سی اور رینجر میں شامل ہو کر ملک وقوم کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔اس کے علاوہ بھی اکثریت ایسوں کی ہے جو امن پسند اور محبّ وطن ہیں اور پاک فوج کے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کو غلط سمجھتے ہیں۔اس لیے یہ سوچ کہ وزیرستان کے تمام لوگ ہی پاک فوج اور پاکستان خلاف ہیں، نہایت غلط اور عدل وانصاف کے منافی سوچ ہے۔دیکھا جائے تو دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ۔آج دجالی میڈیا نے دہشت گردی کو فقط اسلام کے ساتھ نتھی کیا ہوا ہے۔حالانکہ یہ بات شواہد اور دلائل کے بالکل خلاف ہے۔البتہ ایسے شواہد کو نہ تو میڈیا پر پیش کیا جاتا ہے اور نہ ایسے دلائل کو کوئی لبرل اور مغربی سوچ رکھنے والا پسند کرتا ہے۔میں (راوی) بہ ذات خود دہشت گردوں سے کئی بار روبہ رو مقابلہ کر چکا ہوں، ان سے مل چکا ہوں اور ان کے خیالات بڑی باریک بینی سے جان چکا ہوں۔ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کی محبت میں ایسا کر رہا ہو۔بیرون ملک بیٹھے ہوئے تھنک ٹینک اپنے زر خرید لوگوں کو استعمال ہی اس انداز میں کر رہے ہیں کہ خواہ وہ کسی بھی مذہب، مسلک سے تعلق رکھتے ہوں خود کو مسلمان ہی ظاہر کریں گے۔آج کل جہاد اور مجاہد کا تو تصور ہی ختم کر دیا گیا ہے، حالانکہ آج بھی مجاہدین کا ایک بڑا گروہ ایسا موجود ہے جو انڈیا اور افغانستان میں کفر سے برسرِ پیکار ہے۔لیکن دشمن زرخرید لوگوں کے ہاتھوں ملک دشمن اور اسلام دشمن کارروائیاں کروا کر مجاہدین بن کر اس کی ذمہ داری قبول کر لیں گے، جسے ہمارا دجالی میڈیا چیخ چیخ کر کچے ذہنوں اور کم علم لوگوں کے دماغ میں ٹھونستا رہے گا۔ورنہ مساجد میں دھماکے کرانا، امام بارگاہوں کو نشانہ بنانا، درباروں میں دھماکے کرانا یہ کسی بھی مسلک یا فرقے کی رو سے جائز نہیں۔اور حیرانی ہوتی ہے کہ ایسا کرنے والے خود کو مسلمان

کہہ کر اقرار کرتے ہیں اور ہم مان لیتے ہیں۔اگر مسلمانوں ہی نے یہ سب کرنا ہوتا تو کیا سینما گھر، کلب، کنجر خانے اور اس طرح کی دوسری جگہیں کم تھیں بم پھینکنے کے لیے۔گو اسلام ایسی جگہوں پر بھی دھماکے کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔اسلام فیصلے کا اختیار صرف حکومت وقت کو دیتا ہے۔ایک اسلامی مملکت کا سربراہ ہی بے راہ روی اور فحاشی کے اڈوں کو قانون کی رو سے بند کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔انفرادی طور پر افراد کے پاس صرف تبلیغ کا حق ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو وعظ و نصیحت کے ذریعے غلط کام سے منع کرے۔طاقت کا اطلاق صرف خونی رشتوں تک ہی محدود ہوتا ہے۔وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ وہ بچپن یا لڑکپن کی عمر میں ہوں۔اس کے بعد زبردستی کا اختیار تو وہاں بھی چھن جاتا ہے۔یعنی ایک مسلمان باپ اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ بیٹے کے اسلام قبول کرنے پر اسے قتل کر دے۔وہ بس اس سے قطع تعلق کا حق ہی رکھتا ہے۔لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے سادے عوام اسلام ہی کا شعور نہیں رکھتے بیرونی طاقتوں کے ہتھکنڈے کیا سمجھیں گے۔یہاں تو ایک ایسا شخص جس کی شکل ہی مسلمانوں کی طرح نہیں ہوتی ہے، جو نماز پڑھنا ہی نہیں جانتا، دوسرے کلمے کو پڑھتے ہوئے دس غلطیاں کرتا ہے وہ پیر بن کر لوگوں کو بچے بھی عطا کرتا ہے ان کی بگڑی بھی بناتا ہے اور انھیں جنت کے ٹکٹ بھی فراہم کرتا ہے۔اس کے نام پر کٹ مرنے والے سیکڑوں ہزاروں میدان میں کھڑے ہوتے ہیں۔ہم ایسے جاہل ہیں کہ ایک آدمی کا کوئی عمل اسلام کے مطابق نہیں پھر بھی ہمارا رہبر اور قائد ہے۔خیر کہاں تک رویا پیٹا جائے ہدایت دینا تو اللہ پاک ہی کے ہاتھ میں ہے۔

☆......☆......☆

ہم صبح سویرے ہی ڈی بلاک سے رخصت ہو گئے تھے۔بیرٹ ایم 107 ہم نے وہیں پر چھوڑ دی تھی۔سردار کو کلاشن کے لیے ضرورت کے مطابق گولیاں وہیں سے مل گئی تھیں۔پستول کی گولیاں پہلے ہی سے ہمارے پاس ضرورت کے مطابق موجود تھیں۔

ڈی بلاک کے جنوب کی سمت سے ایک نالہ گزر رہا تھا جس کے بہاؤ کا رخ مشرق سے مغرب کی جانب تھا۔سفر کے لیے ہم نے اسی نالے کا راستہ اختیار کیا۔ہمیں کہیں پہنچنے کی جلدی تو تھی نہیں اس لیے ہم درمیانی رفتار سے چلتے رہے۔ڈی بلاک سے نالے کی تہہ تک چڑھائی کافی دشوار گزار تھی اس کے بعد مغرب کی سمت میں غیر

محسوس ڈھلان تھی۔ نالے کی تہہ میں ہلکی مقدار میں پانی بہہ رہا تھا۔ نہایت صاف وشفاف اور ٹھنڈا میٹھا پانی تھا۔ ہم نے اپنے پاس موجود پانی کی بوتلوں میں تازہ پانی بھرلیا کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس جگہ پر جا کر پانی ہمارا ساتھ چھوڑ جائے۔ کلومیٹر ڈیڑھ چلنے کے بعد ایک راستہ دائیں جانب نکلتا ہوا نظر آیا۔ دائیں جانب ہی ایک چھوٹی پہاڑی موجود تھی جس پر دو تین گھر بنے نظر آئے۔ یہ راستہ بھی دائیں جانب موجود پہاڑی کے دائیں ہاتھ آگے بڑھ کر دوبارہ اسی نالے سے آن ملتا تھا جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔ ہم آبادی کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''راجا صاحب!......رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ بھی نظر میں رکھنی ہے کہ آگے کسی آبادی میں رہائشی ہوٹل موجود نہیں ہے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔''خان صاحب!......سورج طلوع ہوئے گھنٹا نہیں گزرا کہ تمھیں رات گزارنے کی فکر پڑ گئی؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے اپنی لانس نائیکی کا رعب جھاڑا۔''لازمی بات ہے سینئر ہونے کے ناتے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ انتظام وانصرام کا خیال رکھوں۔''

''اتنا خیال اگر تم نے لی زونا کا رکھا ہوتا تو آج دو بیویوں کے خاوند ہوتے۔''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے جو تمھیں اپنا راز دار بنالیا۔''

''ویسے خان صاحب!......ایک بات میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، اس بار چھٹی جاتے ہوئے مجھ سے اے ٹی ایم کارڈ لیتے جانا۔ میں تمھیں پانچ ہزار ڈالر دے سکتا ہوں اور پانچ ہزار ڈالر کا مطلب ہے پانچ لاکھ روپے۔ جاتے ہی جاپان جانے کے لیے ویزے کی درخواست دے دینا۔ سیاحتی ویزہ یقیناً چند دنوں میں مل جائے گا۔ پاسپورٹ تمھارا یوں بھی بنا ہوا ہے۔ بعد کے پچھتاوں سے بہتر ہے ابھی کچھ کرلو۔''

اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔''پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا پتا لی زونا مجھے بھول بھی چکی ہو۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو کوئی محبوب مل جائیں گے۔ اور دوسری بات یہ کہ......'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر اپنی بات مکمل کرتا ہوا بولا۔''شاید چند دنوں تک میں باپ بھی بن جاؤں۔''

”باپ بننے کی پیشگی مبارک ہو باقی رہی بات لی زونا کی، اگر اسے تم سے محبت تھی تو پھر تمھارے علاوہ اسے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ابھی اتنا وقت نہیں گزرا کے وہ تم سے مایوس ہو چکی ہو۔محبت کرنے والے اتنی جلدی ہمت نہیں ہارتے۔وہ اپنا فون نمبر اور پتا تمھارے حوالے کر چکی ہے یقیناً سال ڈیڑھ تو تمھاری فون کال یا خط کا انتظار کرے گی۔اور بالفرض وہ کسی اور کو اپنا بھی چکی ہے تب بھی تمھارا کیا بگڑے گا، کم از کم تمھارے پچھتاوں کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔باقی پیسے تو یوں بھی میرے خرچ ہو رہے ہیں۔“

اس نے فوراً میرے آخری فقرے پر اعتراض جڑا۔”ابھی سے پیسوں کے طعنے دینا شروع کر دیے۔“

”طعنے نہیں دے رہا، ترغیب دے رہا ہوں۔میں نہیں چاہتا کل کلاں کو تم مزید پچھتاوں کا شکار ہو جاؤ کہ اب تو رقم کی غیر موجودی کا بہانہ بھی نہیں رہا۔“

”تم نے مجھے کشمیری چرواہن کی مکمل بات نہیں سنائی تھی۔“

”دکھوں کو کریدنے سے کرب ہی حاصل ہوتے ہیں دوست!“

”جان چھڑانے کی کوشش نہ کرو راجا صاحب!......میں نے یہ سوال اس وقت کیا تھا جب موت ہم سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی اور اس وقت اگر تم جواب ہیں دے پائے تو اب تو جواب دینا بنتا ہے نا؟“

اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے رومانہ کی کہانی اس کے سامنے دہرا دی تھی۔

”اس میں رومانہ نے کس جگہ پر تمھیں دھوکا دیا ہے ذرا یہ وضاحت بھی کر دو۔“میری بار مکمل ہوتے ہی اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”کسی کی بیوی ہو کر مجھ سے محبت کا دعوا کرنا کہاں کا انصاف ہے۔کیا یہ اس شریف آدمی سے سراسر دھوکا نہیں ہے جو اس کا شوہر ہے۔“

”بات تمھاری ہو رہی ہے حضرت۔کسی شریف آدمی کو نہ گھسیٹو درمیان میں۔“

”یار!......میرے اس کی جانب مائل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میری نظر میں وہ کنواری تھی۔اگر وہ کسی اور کے ساتھ بندھی ہوئی تھی تو اس کو محبت کا کھیل کھیلنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔کیوں اس نے میرا جذباتی استحصال کیا۔ایک شادی شدہ لڑکی کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے محبت جتلائے؟“

''تو کیا ایک شادی شدہ مرد کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے محبت جتلائے، خاص کر اس موقع پر جب وہ باپ بھی بننے والا ہو؟'' وہ فوراً بات کو اپنی ذات کی جانب موڑ گیا تھا۔

''ہاں......اگر اس نے دوسری لڑکی کو اپنی پہلی شادی کی اطلاع دے دی ہے تو وہ اسے بغیر کسی جھجک کے اپنا سکتا ہے۔ مرد کو دوسری شادی کی اجازت شریعت دیتی ہے، پھر اس میں شبے کی گنجائش کہاں رہی۔''

''ہوسکتا ہے چنارے بیگم اسے قبول نہ کرے؟'' سردار نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''اب تو یوں بھی ہمارے پیار کی نشانی بیٹے یا بیٹی کی صورت اس دنیا میں آنے والی ہے۔''

''اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ تم لی زونا کو بہت زیادہ چاہتے ہو، اتنا کہ موت کو قریب پا کر بھی تمھیں لی زونا کو نہ پانے کا دکھ نہ بھول سکا۔ اور دوسری شادی میں رکاوٹ پہلی بیوی کی وجہ سے پڑتی ہے اولاد کی وجہ سے نہیں۔''

''اچھا تم کب چوتھا دھوکا کھانے کا ارادہ رکھتے ہو۔'' اس نے شرارتی انداز میں مشورہ دیتے ہوئے کہا ۔''بہتر تو یہی ہوگا کہ کیپٹن جینیفر کے پاس امریکا چلے جاؤ۔ اور اجرتی قاتل کے طور پر امریکہ میں اپنی دھاک بٹھا دو۔ یوں بھی انھوں نے تم سے امریکی ہی مروانے ہوں گے تو مارتے جاؤ۔ میرا تو خیال ہے امریکیوں کو مارنے پر تمھیں اجر ہی ملے گا۔''

''یہ فتوے اپنے پاس رکھو حضرت، کسی بھی بے گناہ انسان کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

وہ مسکرایا۔ ''یونھی گپ کر رہا تھا یار!......تم تو محسوس ہی کر گئے۔''

''اچھا اس فضول گفتگو کو چھوڑو اور آگے کا لائحہ عمل طے کرو۔'' میں نے اس بے مقصد بحث سے جان چھڑائی

اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''قبیل خان کو ڈھونڈ کر کیفر کردار تک پہنچانا ہے اور لائحہ عمل کیا ہونا ہے۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''قبیل خان تو گویا تمھارے لیے محو انتظار ہے نا۔''

''میرا خیال ہے تو یہی ہے کہ سیدھا علام خیل کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں اگر وہ نہ بھی ہوا تو اس کے کسی کمانڈر کے سامنے جا کر قبیل خان کے لشکر میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کریں گے، اس طرح اس کے قریب جانے کا موقع مل جائے گا۔''

”محترم جناب سردار صاحب!...... کیا وہ ہماری شناخت نہیں پوچھیں گے؟“

”تو پوچھ لیں۔“ وہ بے پرواہی سے بولا۔ ”ہمارے پاس شناختی کارڈ موجود ہیں دکھادیں گے۔“

”اور جب وہ اپنے کسی آدمی کو ہمارے گھر کا پتا بتا کر ہمارے بارے معلومات لینے کی کوشش کریں گے تو یہ جان کر انھیں ازحد خوشی ہوگی کہ سردار صاحب کا تعلق پاک آرمی سے ہے۔ اور اسی خوشی میں وہ خان صاحب کو عزت واحترام کے ساتھ لکڑی کے تابوت میں لٹا کر مردان بھیج دیں گے جس پر خوب صورت لکھائی میں درج ہوگا

ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔“

وہ فوراً اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوا بولا۔ ”اوہ...... اس طرف تو میرا دماغ ہی نہیں گیا تھا۔“

”دماغ ہوتا تو جاتا نا...... پٹھانوں کے پاس صرف دل ہوتا ہے اور تمھارے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مس لی زونا اپنے ساتھ جاپان لے کے گئی ہوئی ہے۔“

”ویسے لی زونا کا اسلامی نام کیا رکھنا چاہیے؟“ اس کی ذہنی رو پھر لی زونا کی جانب مڑ گئی تھی۔

”ہزاروں لاکھوں نام ہیں کوئی بھی اچھا سا نام رکھ لینا مثلاً، اللہ وسائی، جنت بی بی، فتح بی بی، بیگماں، بخت سوائی، کرماں بھلی وغیرہ وغیرہ۔“

مجھے کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔ ”لی زونا ہی ٹھیک ہے۔“

”تو تمھاری پہلی بیوی کا نام کون سا اتنا اعلا ہے۔ بھلا چنارے بھی کوئی نام ہوتا ہے۔ اور اب بیٹا ہو تو اس کا نام کیکر خان رکھ لینا اور بیٹی ہو تو ٹاہلی بیگم۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”ہم قبیل خان کو ڈھونڈنے کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔“

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ”بالکل۔“

”اگر سبیل خان، میرا مطلب ہے الفاٹو سے رابطہ کر لیں۔“

”نہیں، میجر صاحب نے بتایا تو تھا کہ وہ صرف رابطے کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ اس سے کوئی امید رکھنا بھی نہیں چاہیے۔“

سردار نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر تمھی کچھ پھوٹو۔“

''میرا خیال ہے کہ علام خیل جاتے ہیں وہاں کسی غیر متعلق شخص سے قبیل خان کے متعلق معلومات لینے کی کوشش کریں گے۔اور اس کے سامنے ہم خود کو قبیل خان کے لشکر میں شامل ہونے کا خواہش مند بتائیں گے لیکن قبیل خان کے کسی کمانڈر یا خود اس کو ملنے کی کوشش نہیں کریں گے۔اگر قبیل خان کے کسی آدمی سے ٹاکرا ہو گیا تو خود کو مجاہدین کا آدمی بتائیں گے اور کہہ دیں گے کہ پہلی بار افغان بارڈر عبور کرنے جا رہے ہیں۔''

''ہونہہ!......لگتا ہے میری صحبت کا تم پر اثر پڑتا جا رہا ہے اور اب تم بھی کچھ بہتر سوچنے لگ گئے ہو۔''

''تمھاری سوچ تو............'' الفاظ میرے گلے میں گھٹ گئے تھے۔اس جگہ نالہ شمال کی جانب مڑ رہا تھا۔موڑ کاٹ کر میری نظریں جونھی سیدھی ہوئیں مجھے سامنے ایک پتھر کے ساتھ پانچ آدمی بیٹھے نظر آئے۔تین کے پاس کلاشن کوف موجود تھی البتہ دو آدمی خالی ہاتھ تھے۔ہمیں دیکھ کر انھوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

''اسلام علیکم!'' ان کے قریب پہنچنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے سلام کہنا پڑا۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ و برکاۃ۔'' انھوں نے خلوص بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔قریب سے ان کے چہرے دیکھتے ہوئے مجھے ایک خاص قسم کی چمک نظر آئی تھی۔وہ دہشت گرد نہیں لگتے تھے۔میں نے دہشت گردوں کے چہروں پر ایک عجیب سی وحشت اور ویرانی دیکھی تھی۔اس کے برعکس ان کے چہروں پر بلا کا سکون اور اطمینان پھیلا تھا۔

''بیٹھو بھائی جان قہوہ پیو۔'' ان کے ہاتھوں میں اس وقت قہوے ہی کی پیالیاں تھیں۔انھوں نے قہوے کی دعوت دیتے ہوئے دیر نہیں لگائی تھی۔

''جزاک اللہ، کہہ کر میں نے سردار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''بڑی پیاری رائفل رکھی ہوئی ہے۔'' ہمیں قہوہ پینے کی دعوت دینے والے نے ڈریگنو کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

میں رائفل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔''جی بس شوق تھا ڈریگنو رائفل لینے کا، کچھ رقم جمع ہوئی تو پورا کیے بنا رہا نہ گیا۔''

''خالی شوق ہی ہے یا اس کے استعمال سے بھی واقف ہو۔'' وہ خوب صورت مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے

ہوئے مستفر ہوا۔

''شوق تو شوق ہوتا ہے امیر صاحب!......''میں بھی جواباً بھرپور مسکراہٹ سے اس کی جانب اچھالی۔''اور میرا خیال ہے جب بات شوق کی آ جائے تو سب سوال بے کار چلے جاتے ہیں۔''

''ہونہہ!......بات تو صحیح ہے۔''ٹیلی سکوپ سائیٹ کے حفاظتی کور اتار کر اس نے کہنیوں کو اپنے گھٹنوں پر ٹیکا اور دور پہاڑی کی چوٹی پر شست سادھنے لگا۔

''آپ غالباً قبیل خان کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں۔''ایک جوان نے قہوے کی بھری پیالیاں ہماری جانب بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے گول مول انداز میں کہا۔''بس یہی سمجھ لو۔''

''جھوٹ نہ بولو جوان!''ادھیڑ عمر کے آدمی نے جسے میں نے امیر صاحب کہا تھا۔ڈریگنو ورائفل میری جانب بڑھاتے ہوئے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو کیسے معلوم کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''میں سوال کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔''یہ میرا مشاہدہ ہے۔''

''اگر ہم قبیل خان کے لشکر میں شامل ہونے کے ارادہ سے جا رہے ہوں تو کیا پھر بھی میرے بولے گئے الفاظ کو جھوٹ پر محمول کیا جائے گا؟''

''قہوہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''اس نے میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''کیا آپ بھی قبیل خان کے لشکر سے تعلق رکھتے ہیں؟''خاموش بیٹھے سردار نے پوچھا۔

''نہیں۔''اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اور جوان نے کہا۔''ہم مجاہدین کے خدمت گار ہیں۔''

مجاہدین کے بارے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بالکل بھی جھوٹ نہیں بولتے۔اس کے بتانے سے پہلے ہی میں ان کے بارے یہ اندازہ لگا چکا تھا لیکن اس کے جواب سے تو تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

''آپ کے نام جان سکتا ہوں۔''گفتگو کی ابتدا کرنے والے نے پوچھا۔

”میں ذیشان حیدر ہوں اور یہ سردار خان ہے۔“میں نے اصل نام بتانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی تھی۔

”میرا نام عبدالحق، یہ احمد۔“اس نے ہمیں قہوہ دینے والے کی طرف اشارہ کیا۔”اور یہ قاسم۔“اس نے خود کو مجاہدین کا خادم کہنے والے کی طرف اشارہ کیا۔”یہ سبحان اور عبدالمالک ہیں۔“

”قہوے کے لیے شکریہ عبدالحق بھائی۔“میں نے گویا جانے کی اجازت چاہی۔

”ویسے میرا مشورہ مانو تو قبیل خان کے لشکر میں شامل ہونے کے بجائے واپس چلے جاؤ تو بہتر ہوگا۔“عبدالحق نصیحت کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

”میں کھڑا ہونے کا ارادہ مؤخر کرتے ہوئے بولا۔”عبدالحق بھائی!......اگر ہم سے کوئی رستے میں تعارف پوچھے تو کیا ہم انھیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم مجاہدین کے خادم ہیں۔“

وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگا۔”میں جھوٹ بولنے کی تائید کیسے کرسکتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے حالت جنگ میں دشمن کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔“

”ہمارے کمانڈر کا نام حبیب اللہ یوسف زئی ہے۔کارروائی کا علاقہ جلال آباد ہے۔ذیلی گروپوں میں ایک احتشام الحق محسود، عبداللہ خان جھنگوی اور اسد اللہ بابر گروپ شامل ہیں۔“اس نے اپنا مفصل تعارف کروا کر گویا ہمیں اجازت دے دی تھی کہ ہم ان کا نام استعمال کرسکتے تھے۔

میں نے پوچھا۔”عبدالحق بھائی!......کیا دہشت گردوں سے چھینا ہوا اسلحہ جہاد میں استعمال ہوسکتا ہے؟“

”بلاشبہ استعمال ہوسکتا ہے۔“اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر آپ زیڑہ کیل اور لگی نرائے پہاڑی کے دامن تک جانے کی زحمت کرسکیں تو وہاں چھ کلاشن کوفیں ہم نے چھپائی ہوئی ہیں۔“

”سامنے نالے میں پتھر کی بڑی چٹان کے اوپر پڑا چھوٹا پتھر نظر آرہا ہے۔“اس نے دوسو گز دور ایک پتھر کی جانب اشارہ کیا۔صاف نظر آرہا تھا کسی نے نشانہ بازی کے لیے وہ پتھر وہاں رکھا ہے۔

”یہ پتھر ہمی نے رکھا ہے اور اب قہوہ پینے کے بعد ہم اسے نشانہ بنانے والے تھے۔“اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

’’ٹھیک ہے لیکن آپ گفتگو کو اس رخ کیوں موڑ لائے ہیں میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا۔‘‘میں نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’کیا آپ ایک ہی گولی سے اس پتھر کو نشانہ بنا سکتے ہیں؟ جھوٹ نہ بولنا۔‘‘اس نے گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

سردار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔’’عبدالحق بھائی سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ پتھر موجودہ فاصلے سے تین گنا فاصلے پر بھی پڑا ہو تو ذیشان بھائی اسے پہلی گولی میں نشانہ بنا لے گا۔‘‘

’’چلو ایک گولی ضائع کر ہی دو۔‘‘عبدالمالک نے سردار کی بات کی حقیقت جاننے کی کوشش کی۔

رائفل کاک کر کے میں نے دو سو رینج لگائی اور اس پتھر کا نشانہ سادھتے ہوئے فوراً گولی چلا دی۔ میں نے دو تین سیکنڈ سے زیادہ شست نہیں لی تھی۔ اور نہ مجھے دو سو میٹر کے فاصلے پر اتنا وقت خرچ کرنے کی ضرورت تھی۔ پتھر کی چٹان پر رکھا وہ چھوٹا پتھر جانے اڑ کر کہاں غائب ہو گیا تھا۔

’’تو گویا پرسوں قبیل خان کے آدمیوں سے آپ کی جھڑپ ہوئی تھی۔‘‘عبدالحق نے فوراً پوچھا۔

میں مسکرایا۔’’کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔‘‘

’’اور آپ خود کو ایس ایس کہہ رہے تھے ہے نا؟‘‘

’’کیا کہہ سکتا ہوں میں نے اس کی تائید یا تردید کی کوشش نہیں کی تھی۔’’ویسے آپ کو کیسے معلوم ہوا۔‘‘

’’مخابرہ (وہ آئی کام کو مخابرہ کہتے ہیں) ہمارے پاس بھی موجود ہے۔اور اتفاق سے اس وقت ہم لگرائے میں موجود تھے۔ فائرنگ کی شدید آواز سن کر میں نے ایک قریبی ٹیکری پر چڑھ کر مخابرہ آن کیا وہیں پر ساری گفتگو سنی ہے۔ مجھے روشن خان سے اس بزدلی کی توقع نہیں تھی۔‘‘

سردار نے کہا۔’’موت کو سامنے پا کر بڑے بڑے ہمت ہار جاتے ہیں۔‘‘

’’ویسے تم نے اسے پھنسا کیسے لیا تھا۔‘‘احمد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

جواباً میں نے روشن خان کے پھنسنے کی جگہ کے بارے تھوڑی سی وضاحت کر دی۔

’’چند دن پہلے ان سے تمھاری زیڑہ کیل پر بھی ایک جھڑپ ہوئی ہے۔اس کے بارے مجھے لگرائے کے

ایک دوست سے معلوم ہوا ہے۔‘‘

سردار نے جواب دیا۔’’ہاں...... پرانھوں نے ہمیں رات کے وقت گھیر لیا تھا۔‘‘

’’آپ لوگوں نے وہ ہتھیار کس جگہ پر چھپائے ہیں؟‘‘ عبدالحق اصل موضوع کی طرف پلٹا۔

جواباً سردار نے انھیں دونوں جگہوں کے بارے مفصل طور پر سمجھا دیا۔

’’ویسے اب آپ لوگ یہ کہنے میں حق بہ جانب ہو کہ آپ مجاہدین کے خدمت گار ہو۔‘‘ احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ہم دونوں کے ساتھ باقی سب بھی مسکرا پڑے تھے۔

’’ویسے میں اتنی زیادہ باتوں کے بعد انکشاف کے بعد پشیمانی محسوس کر رہا ہوں۔‘‘ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

عبدالحق نے دھیمی مسکراہٹ سے جواب دیا۔’’جوان!...... سمجھو تمھاری ہم سے کوئی بات چیت ہوئی ہی نہیں ہے۔یہ باتیں یہیں دفن ہوگئی ہیں۔ہم صرف اتنی ہی بات کسی دوسرے کو کریں گے جتنی کا ہمیں خود سے پتا تھا۔‘‘

میں نے فوراً کہا۔’’ہمیں آپ کی زبان پر مکمل اعتبار ہے۔‘‘

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔’’ہاں مسلمان کی ایک ہی زبان ہوتی ہے۔‘‘

’’ویسے عبدالحق بھائی!......اگر برا نہ مانو تو ایک سوال پوچھوں؟‘‘

’’میرے دوست!...... کسی بات کا برا ماننا ایک غیر ارادی فعل ہے اور ایسا فعل جس پر میرا اختیار نہ ہو اس کا وعدہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟ البتہ خفا نہ ہونے کا وعدہ کر سکتا ہوں۔‘‘

میں نے جلدی سے کہا۔’’ہاں بس میرا بھی یہی مطلب تھا کہ آپ خفا نہ ہونا۔‘‘

’’پوچھو۔‘‘ اس نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

’’جب آپ قبیل خان کو برا سمجھتے ہو تو اس کے ساتھ معاہدہ کیوں کیا ہوا ہے؟......مجاہدین کو اس کے خلاف بھی تو جہاد کرنا چاہیے۔‘‘

وہ مسکرایا۔’’ہونہہ!......اچھا سوال ہے۔‘‘

’’تو جواب بھی دیں نا۔‘‘ سردار مصر ہوا۔

”دوستو، سیدھی بات یہ ہے کہ ہماری تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے کہ ہم امریکہ اس کے اتحادیوں اور افغان فوج کے ساتھ ساتھ وزیرستان کے ان دہشت گرد سرداروں سے بھی نبرد آزما ہو سکیں۔ان کے ساتھ لڑائی کرنے کی وجہ سے ہمیں سرحد عبور کرنے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس وجہ سے ان کے ساتھ معاہدہ کرنا ہماری مجبوری ہے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔”تو کیا مجبوری میں دین اور وطن کے دشمنوں سے معاہدہ کر لینا جائز ہے؟“

”نبی پاک ﷺ نے مدینہ جا کر وہاں موجود یہود قبائل سے معاہدہ کیا تھا تاکہ مسلمان یک سو ہو کر مشرکین مکہ کا مقابلہ کر سکیں۔گو اس میں اور بھی کئی حکمتیں تھیں کہ وہ ایک نبی ﷺ کا فیصلہ تھا۔بہر حال آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔“

عبدالحق کی دلیل ایسی نہیں تھی کہ اس کا جواب دیا جا سکتا۔میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

عبدالحق نے مجھے خاموش پا کر کہا۔”علام خیل میں آپ کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کے گھر قیام کر سکتے ہو،انھیں صرف میرا حوالہ دینا کافی ہو گا۔ہم فی الحال زیڑہ کیل جا رہے ہیں،کل ہی لوٹیں گے۔“

اس کی بات پر ہم دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔اس کے باوجود میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔”کہیں ہماری وجہ سے آپ لوگوں پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔“

عبدالحق خلوص سے بولا۔”ہمارا تعلق بھی پاکستان سے ہے بھائی!......باقی اپنے طریقہ کار میں اختلاف سہی مقصد تو اپنا ایک ہی ہے نا۔“

”ہمیں واقعی ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں سر چھپا کر ہم قبیل خان کے خلاف کام کر سکتے۔“سردار نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

”ٹھکانوں کی فکر نہ کرو،البتہ اس کے خلاف ہم آپ کی جسمانی مدد نہیں کر سکیں گے۔معاہدے کی رو سے ہم اس بات کے پابند ہیں کہ اس کے کسی آدمی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔اور آپ دونوں کا ہم سے تعلق فقط مہمان کا ہے۔البتہ انھیں اس بارے معلوم ہو گیا کہ ان کے دشمنوں نے کس جگہ پناہ لے رکھی ہے تو پھر آپ کی مشکلات بڑھ سکتی ہیں۔ہمارے ٹھکانے پر وہ بے شک حملہ نہیں کریں گے لیکن باہر نکلنے پر تو وہ آپ کے

خلاف ہر قسم کی کارروائی کر سکتے ہیں۔‘‘

’’ہمیں اس کے علاوہ کوئی مدد بھی نہیں چاہیے عبدالحق بھائی!‘‘ سردار کے لہجے میں ممنونیت کا عنصر نمایاں تھا۔

’’میرا خیال ہے اب رخصت لی جائے۔‘‘ قاسم نے مشورہ دیا۔اور تمام اپنا اپنا سامان سنبھالتے ہوئے کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے الوداعی معانقہ کرنے لگے۔

سب سے آخر میں عبدالحق سے ملا۔اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔’’مجھے آپ کا نشانہ پسند آیا۔‘‘

’’شکریہ عبدالحق بھائی!‘‘

’’اللہ پاک آپ لوگوں کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔‘‘ دعا دیتے ہوئے وہ رخصت ہو گئے۔

’’آپ لوگوں کو بھی فتح مبین نصیب ہو۔‘‘ جواباً کہہ کر ہم بھی اپنے رستے ہو لیے۔

’’ویسے یہ کوئی غائبانہ سی مدد نہیں مل گئی ہمیں۔‘‘ ان سے تھوڑا دور آتے ہی سردار نے گفتگو کی ابتدا کی۔

’’اللہ پاک ہر قدم پر اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے خان صاحب!......چاہے وہ بندہ تمھاری طرح لفنگا ہو جو کافر لڑکی سے محبت کرتا ہو یا میری طرح مظلوم جسے مسلمان لڑکی بھی میسر نہ ہو۔‘‘

’’یار راجے!......خدا کا خوف کرو اب یہاں لی زونا کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔‘‘ سردار کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

’’یونھی تمھارے کرتوت دیکھ کر میں بولے بنا نہیں رہ پاتا۔‘‘ میں نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے۔

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔’’اپنے کرتوت بھول گئے ہو جب ایک شادی شدہ لڑکی کے لیے انڈیا کی مارکیٹوں میں خریداری کرتے پھر رہے تھے۔‘‘

’’تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اسے غیر شادی سمجھا تھا۔‘‘

وہ کہاں پیچھے رہنے والا تھا فوراً بولا۔’’اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے۔‘‘

’’مسلمان ہوئی تو نہیں نا۔‘‘

’’وہ بھی غیر شادی شدہ تو نہیں تھی نا۔‘‘ اسی طرح کی نوک جھوک میں ہم اس نالے سے نکل کر ایک آبادی میں داخل ہوئے۔نالے کا پانی جنوب کی طرف سے آنے والے نالے کے پانی میں شامل ہو کر شمال کی جانب

بہنے لگا تھا۔نالے کے پار جانے کے لیےہمیں لازماً جوتے اتارنے پڑتے اگر درمیان میں بڑے بڑے پتھر رکھ کر راستہ نہ بنا ہوتا۔

آبادی سے باہر ایک بوڑھے آدمی سے علام خیل کا راستہ معلوم کرنے پر اس نے دو تین سو گز دور ایک سڑک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اس سڑک پر سیدھا چلتے جاؤ۔''

اس کا شکریہ ادا کر کے ہم اس چھوٹی سی آبادی میں داخل ہوئے بغیر سڑک کی جانب بڑھ گئے۔ہمیں سڑک پر روانہ ہوئے آدھا گھنٹا گزرا ہوگا کہ ایک ڈبل کیبن دھول اڑاتی ہمارے قریب سے گزر گئی۔اس کی باڈی میں بھی چند ہتھیار بردار موجود تھے۔نہ جانے وہ مجاہدین تھے یا قبیل خان جیسے کسی دہشت گرد کے لشکری۔اسی وجہ سے ہم نے ان سے لفٹ بھی نہیں مانگی تھی۔اس کے بعد بھی دو گاڑیاں ہمارے قریب سے گزریں مگر ہم گپ شپ کرتے پیدل ہی چلتے رہے۔ڈی بلاک سے ہم مسلسل اترائی میں چلتے ہوئے آئے تھے۔لیکن نالے کے اختتام پر ہم جونھی اس شوال وادی میں داخل ہوئے تھےہمیں اونچائی چڑھنا پڑ گیا تھا۔گو یہ چڑھائی کہیں ہموار زمین کی صورت اور کہیں چھوٹی موٹی ٹیکریوں کی بلندی کی صورت لیے ہوئے تھی۔بیچ میں مغربی پہاڑوں سے آئے ہوئے نالے بھی کہیں کہیں سے گزر رہے تھے۔کچھ بالکل خشک تھے،کچھ میں پانی کی ہلکی مقدار بہہ رہی تھی اور ایک دو نالہ ایسا بھی آیا جس میں پانی کی مقدار نسبتاً زیادہ تھی۔

ہم کہیں سہ پہر ڈھلے ہی علام خیل پہنچ پائے تھے۔وہاں کی آبادی کم از کم تین چار سو گھرانوں پر مشتمل ہو گی۔کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کا گھر ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔اس کا گھر کافی بڑا تھا۔گھر کے ساتھ چھوٹی چار دیواری والا وسیع مدرسہ بنا ہوا تھا۔گھر کے دروازے پر دستک دینے پر ایک اٹھارہ انیس سال کی عمر کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔

اس کی استفہامیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے سردار نے پوچھا۔''کمانڈر عبدالرشید بیٹنی سے ملاقات ہو جائے گی۔''

''آجائیں۔''اس نے ایک طرف ہو کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

''پردہ......''سردار نے عورتوں کی موجودی کے خیال سے کہنے لگا تھا۔مگر اس کی بات شروع ہوتے ہی اس

نوجوان نے جلدی سے کہا۔

''یہاں خواتین نہیں ہوتیں۔''اور ہم سر ہلاتے ہوئے اس کی معیت میں چل پڑے۔وہ گھر بھی مقامی طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔اونچی اونچی اور موٹی مٹی کی بالکل ہموار اور سیدھی دیواریں۔شمال مشرقی اور جنوب مغربی کونے میں بنے ہوئے دو مورچے جن میں اس وقت بھی ایک ایک ہتھیار بردار آدمی موجود تھا۔اور چار دیواری کے اندر نیچی چھت کے بنے ہوئے بے شمار کمرے۔جن میں زیادہ تر پختہ بلاکوں کے بنے ہوئے تھے۔داخلی دروازے سے ساتھ قطار میں بنے ہوئے بیت الخلا اور غسل خانے واضح کررہے تھے کہ وہ بس نام کا گھر تھا۔ورنہ اس کی حیثیت ایک ٹریننگ کیمپ جیسی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم عبدالرشید بیٹنی کے سامنے موجود تھے۔اس کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان نظر آئی۔ کمرے میں پلاسٹک کی بچھی چٹائی پر دس بارہ افراد موجود تھے۔ہمارے سلام کا جواب دے کر اس نے استفہامیہ نظروں سے ہماری جانب دیکھتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہم عبدالحق صاحب کے مہمان ہیں۔''گفتگو کی ابتداء سردار نے کی تھی۔

''انوار!......مہمانوں کے لیے پانی لے آؤ۔''اس نے ہمیں ساتھ لانے والے نوجوان کو کہا اور ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔''کھانا ابھی کھانا پسند کریں گے یا شام کی نماز کے بعد؟''

سورج غروب ہونے کو تھا۔میں نے جواب دیا۔''کھانا نماز کے بعد ہی کھائیں گے۔''

اسی وقت انوار نامی نوجوان پانی کا جگ اور گلاس لیے آپہنچا۔ہمارے پانی پیتے ہی عبدالرشید بیٹنی نے ایک اور نوجوان کو کہا۔

''ابرار!......انھیں مہمان خانے کے چھوٹے کمرے میں لے جاؤ تاکہ یہ تازہ دم ہو کر نماز کی تیاری کر سکیں۔''

انوار ہی کی عمر کے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر ہماری سفری تھیلے اٹھائے اور ہمارے آگے آگے چل پڑا۔اس کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جہاں دو چارپائیاں متوازی رکھی تھیں۔ان کے درمیان سرہانے کی طرف ایک میز پڑی تھی جسے دونوں چارپائیوں پر لیٹنے والے یکساں استعمال کر سکتے تھے

۔میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا ہوا تھا۔چار پائیوں کی پائینتی کی طرف مٹی کا ایک تھڑا جیسا بنا ہوا تھا جس پر کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی رکھی تھی۔مٹی کا وہ تھڑا سامان رکھنے کے لیے تھا۔ہمارے تھیلے اس تھڑے پر رکھ کرابرار نے کہا۔

''چلیں آپ کو غسل خانہ دکھادوں۔''

اپنے ہتھیار بھی اسی تھڑے پر رکھ کر ہم دوبارہ اس کی معیت میں چل پڑے۔

☆......☆......☆

شام کا کھانا تمام لوگوں نے دستر خوان بچھا کر ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھایا تھا۔کھانے کے بعد ہم نے کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کے کمرے میں بیٹھ کر گرما گرم قہوہ پیا اور عشاء کی نماز تک وہیں بیٹھے ان کی گفتگو سنتے رہے۔کمانڈر نے ہمیں کرید نے کی بالکل بھی کوشش نہیں کی تھی۔عشاء کی نماز کے بعد کمانڈر نے ہمیں خود ہی آرام کا مشورہ دے کر پوچھنے کی زحمت سے بچالیا تھا۔ہم سارے دن کے تھکے ہوئے تھے اس لیے آپس میں گپ شپ کیے بغیر ہی سو گئے۔وہاں نماز چھوڑنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا اس لیے منہ اندھیرے ہم بھی اٹھ کر غسل خانوں کی طرف بڑھ گئے تھے۔طلوع آفتاب کے بعد ایک بار پھر دستر خوان بچھا کر ناشتا کیا گیا جس میں رات کی بچی ہوئی دال کا سالن باسی و تازہ روٹیاں شامل تھیں۔ہمارے علاوہ سب قہوے ہی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔البتہ ہماری مرضی معلوم کر کے انھوں نے ہمارے لیے دودھ والی چائے بنا دی تھی۔وہ دن بھی ہم نے وہیں آرام کرتے گزارا۔عبدالحق کی آمد سے پہلے میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔عبدالحق اور اس کے ساتھی کہیں شام کے وقت ہی پہنچ پائے تھے۔ہم اس وقت شام کی نماز کے لیے روانہ ہو رہے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔عبدالحق کے علاوہ ہر آدمی نے دو کلاشن کوفیں اٹھائی ہوئی تھیں۔مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ انھیں ہماری چھپائی ہوئی کلاشن کوفیں مل گئی تھیں۔وہ پانچوں ہمیں بڑی محبت سے ملے تھے۔گفتگو کا وقت نہیں تھا اس لیے ہم مسجد کی طرف بڑھ گئے۔رات کو عبدالحق ہمارے کمرے ہی میں گپ شپ کے لیے آ گیا تھا۔اس کی گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ ہم وہاں جب تک چاہے رہ سکتے تھے اور جو روکھی سوکھی وہ کھا رہے تھے وہ ہمارے لیے بھی حاضر تھی۔اس کے ساتھ وہ ہمیں قبیل خان کے آدمیوں سے محتاط رہنے کی بابت بھی زور دیتا رہا۔ہماری اصلیت

فقط انھی پانچ آدمیوں کو معلوم تھی جو ہمیں رستے میں ملے تھے۔ البتہ عبدالرشید بیٹنی کو ہماری اصلیت سے آگاہ کرنے کی اجازت عبدالحق نے خود مانگی اور بغیر کسی ردوقدح کے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ گزشتہ رات اور پورا دن ہم نے آرام ہی میں گزارا تھا اس لیے عبدالحق کے جانے کے بعد بھی ہم کافی دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ دھیمی آواز میں ہم قبیل خان تک پہنچنے کا منصوبہ بھی تشکیل دیتے رہے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد ہم فقط پستول اپنے ہمراہ رکھتے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔ کلاشن کوف اور ڈریگنو کو ساتھ لیے پھرنے کی ضرورت فی الحال نہیں تھی۔ سب سے پہلے ہم نے قبیل خان کا قلعہ نما گھر دیکھا۔ اور پھر علام خیل کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا۔ دوپہر کو ہم گاؤں کے مضافات میں نکل گئے۔ پہاڑی کے دامن میں لکڑیاں کاٹتے ایک بوڑھے کے ساتھ بیٹھ کر ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ باتوں باتوں میں اس نے ہمیں کافی مفید معلومات پہنچائی تھی۔ قبیل خان کا خاص آدمی روشن خان وہیں موجود تھا۔ اس کے علاج معالجے کے لیے مکین سے ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا تھا۔ فائر لگنے سے اس کے پاؤں کا پورا پنجہ ہی غائب ہو گیا تھا۔ میری نشانہ بازی کے افسانے بھی نہ جانے کیسے اس بوڑھے تک پہنچ گئے تھے۔ معلوم یہی ہوا تھا کہ وہاں سے بچ کر نکل آنے والوں نے میری نشانہ بازی کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا تھا۔ اور یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز سے متاثر ہو جائے وہ ہر ملنے والے کو اس سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں مبالغہ آرائی سے بھی باز نہیں آتا۔ اپنی نشانہ بازی کی صلاحیت کا خود مجھے بھی ادراک تھا لیکن جو کارنامے مجھ سے اس بوڑھے نے منسوب کیے تھے اس طرح ہونے کا میں بس خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔

بوڑھے بابا نے لکڑیاں تو کاٹی ہوئی تھیں البتہ لکڑیوں کو باندھنے اور گدھے پر لادنے میں ہم نے اس کی پوری پوری مدد کی تھی۔ اس کے جاتے ہی سردار نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”لو راجا صاحب!...... تمھاری شہرت تم سے پہلے ہی قبیل خان کیا اس کے پورے گاؤں تک پہنچ گئی ہے۔ ویسے مجھے یہ بتاؤ تمھاری گولی گھوم کر پتھر کے عقب میں چھپے آدمی کو کیسے لگتی ہے اس فن کا مظاہرہ کبھی تم نے میرے سامنے نہیں کیا۔“

میں نے جوابی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔’’سنتے رہو خان صاحب!......یہی دنیا کی ریت ہے۔اب پچاس کے قریب آدمی دو آدمیوں کو پکڑ کر نہ لاسکے تو آخر انھیں کوئی بہانہ تو گھڑنا تھا۔‘‘

’’ویسے ایک بات کا تو میں شاہد ہوں،سوائے روشن خان کے تم نے ہر آدمی کے سر ہی میں گولی ماری ہے ،اورنگ زیب صاحب بھی یہی بتا رہے تھے کہ شمال کی جانب موجود تمام لاشوں کے چہرے سر میں گولی لگنے کی وجہ سے ناقابلِ شناخت ہوئے پڑے تھے۔یوں بھی بیرٹ ایم 107 کی ظالم گولی سر کو تربوز کی طرح ٹکڑوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔‘‘

’’اب تو سر پر نشانہ سادھنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔نہ جانے کیوں مجھے یہ لگتا ہے کہ میری گولی خطا نہیں جائے گی۔‘‘

’’اچھا زیڑگل بابا نے کافی مفید معلومات بتائی ہیں اب آگے کا کیا سوچا ہے۔‘‘

’’میرا تو خیال ہے خائستہ گل پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔‘‘خائستہ گل،قبیل خان کی حویلی کا منتظم تھا اور اس کی غیر موجودی میں حویلی کا کرتا دھرتا وہی تھا۔رشتے میں وہ قبیل خان کا سالا لگتا تھا۔قبیل خان نے دو شادیاں کی تھیں اور خائستہ گل اس کی چھوٹی بیوی کا بڑا بھائی تھا۔یہ ساری معلومات ہمیں لکڑیوں والے زیڑگل خان سے ملی تھیں۔اس کے کہنے کے مطابق خائستہ گل سوموار اور جمعرات کو سامان وغیرہ کی خریداری کے لیے انگور اڈے جاتا ہے اور اس وقت اس کے ہمراہ صرف دو محافظ ہوتے ہیں۔

’’کیا خائستہ گل،قبیل خان کی دہشت گردانہ کارروائیوں کے بارے جانتا ہوگا؟‘‘سردار پوچھنے لگا۔

میں نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔’’اس کی دہشت گردی جب عام لوگوں سے نہیں چھپی تو خائستہ گل کو کیوں نہیں پتا ہوگا۔‘‘

’’نہیں میرا مطلب اس کے خفیہ منصوبوں اور چھپنے کی جگہ وغیرہ سے تھا۔‘‘سردار نے جلدی سے وضاحت کی۔

’’بہ ظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اسے پتا ہوگا،کیونکہ اتنے قریبی آدمی کو تو راز دار ہونا چاہیے۔یوں بھی بابا زیڑگل یہی بتا رہا تھا کہ خائستہ گل،قبیل خان کا بہت چہیتا ہے۔‘‘

”آج بدھ ہے۔“ بے صبرے سردار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”چلو پھر رستے کا جائزہ لے لیتے ہیں، اگر کوئی مناسب جگہ مل گئی تو کل ہی چھاپ لیتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ سردار نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمھیں شاید جاپان جانے کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے۔“

”اس میں شبہ ہی کیا ہے۔“ سردار خان نے صاف گوئی سے اعتراف کر کے مجھے حیران کر دیا تھا۔

”اب کی ہے نامردوں والی بات۔“ میں نے جانے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

دو اڑھائی گھنٹے سڑک ناپنے کے بعد ہمیں ایسی جگہ مل گئی تھی جہاں ہم خائستہ گل کی گاڑی پر گھات لگا سکتے تھے۔ جب ہم اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچے تو شام کی آذان کیا نماز بھی ہو چکی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد ہم کمانڈر عبدالحق کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ زمین پر بچھی پلاسٹک کی چٹائی کے اوپر اس نے اپنا بستر لگایا ہوا تھا۔ بلکہ مہمانوں کے دو کمروں کے علاوہ ہم نے وہاں چارپائی نہیں دیکھی تھی۔ تمام زمین ہی پر بستر لگا کر سوتے تھے

”آجائیں بھائی!“ اجازت مانگنے پر اس نے فوراً ہمیں اندر بلا لیا۔ اس کے ہمرہ ایک اور آدمی بھی موجود تھا جسے ہم نہیں جانتے تھے۔

”اسلام علیکم!......اندر داخل ہوتے ہی ہم سلام کہہ کر نیچے چٹائی پر بیٹھ گئے۔

”ٹھیک ہے طارق!......آپ فی الحال جائیں بعد میں بات کرتے ہیں میں فی الحال مہمانوں سے تھوڑی گپ شپ کرنا چاہتا ہوں۔“

اور طارق نامی آدمی سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ”سنائیں ذیشان صاحب!......آپ کا کام کہاں تک پہنچا؟“

میں نے جواباً کہا۔ ”ابھی تو شروع بھی نہیں کیا۔“

”میرے لائق کوئی ہو تو حکم کرو؟“ اس نے خلوص بھرے لہجے میں پوچھا۔

”آپ سے تھوڑی معلومات لینا تھی۔“ میں نے اپنے مطمح نظر کی طرف قدم بڑھائے۔

اس نے کہا۔ ”بے جھجک ہو کر پوچھیں۔“

”قبیل خان کے سالے، خائستہ گل کو جانتے ہیں آپ؟“
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”ہاں دیکھا ہوا ہے، ایک بار ملاقات بھی ہو چکی ہے۔کافی چلتا پرزہ ہے۔“
”دکھنے میں کیسا ہے؟“میں نے اگلا سوال پوچھا۔
”چھوٹی داڑھی، باریک مونچھیں، لمبے گھنگریالے بال، گندمی رنگت، درمیانی قامت، نیلی آنکھیں، تنگ پیشانی، سڈول جسم، اونچی ناک......“
”کافی ہے۔“میں نے ہنستے ہوئے اسے روکا۔”میں نے رشتہ نہیں کرانا بس اتنا ہو کہ دو تین آدمیوں میں اس کی پہچان کر سکوں۔“
عبدالحق نے پوچھا۔”ویسے اس کے بارے معلومات کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“
میں نے جواب دیا۔”سنا ہے اسے قبیل خان کے بارے مکمل ہوتی ہیں۔“
”کچھ کہہ نہیں سکتا۔اصل میں ہمیں قبیل خان کے بارے جاننے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔وہ کیا کہتے ہیں کہ جس گاؤں نہ جانا ہو اس کا راستہ پوچھنے سے کیا حاصل۔“
”صحیح کہا۔“خاموش بیٹھے سردار نے پرزور انداز میں اس کی تائید کی تھی۔
ہم گھنٹا بھر مزید کمانڈر عبدالحق سے گپ کرنے کے بعد اس سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گئے۔
صبح ناشتے کرتے ہی ہم ہتھیاروں سمیت گھات لگانے کی جگہ کی طرف بڑھ گئے۔ہم عبدالرشید بیٹنی کے گھر سے ہم پہلے تو قبیل خان کی حویلی کا رخ کیا کیونکہ وہیں حویلی کے ساتھ بنے ہوئے ایک کھلے احاطے میں اس کی کالے رنگ کی ڈبل کیبن کھڑی ہوتی تھی۔ہم پہلے بھی اس گاڑی کو دیکھ چکے تھے لیکن آج مزید ایک نظر ڈال کر پہچان یقینی بنانا چاہتے تھے۔خائستہ گل کے بارے ہمیں یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ دس گیارہ بجے کے بعد ہی کہیں انگور اڈے کی طرف روانہ ہوتا تھا۔ہم نے جو جگہ منتخب کی تھی، علام خیل گاؤں سے وہاں تک پیدل تقریباً دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ایک نظر کالی ڈبل کیبن کا جائزہ لے کر ہم گاؤں سے باہر نکل گئے۔جاتے ہوئے ہم نے مغرب کی طرف موجود پہاڑی کا رخ کیا اور پھر پہاڑی کے دامن سے مطلوبہ مقام تک اس طرح گئے کہ کسی کو ہمارے اس جانب جانے کے بارے پتا نہ چلے۔اس مقصد کے لیے ہم سڑک سے ہٹ کر چلتے رہے۔اسی وجہ

سے ہمیں دو گھنٹوں سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔وہاں پہنچتے ہوئے میں گھڑی پر نگاہ دوڑائی دس ہونے کو تھے۔

اگر خائستہ گل دس بجے بھی گھر سے نکلتا تب بھی اسے وہاں تک آدھا گھنٹا تو لگ جانا تھا۔جبکہ ہمیں تیاری کے لیے دس پندرہ منٹ سے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔ہم نے گھات کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہاں ایک خطرناک موڑ موجود تھا۔اس لیے گاڑی کی رفتار بغیر کسی شک کے وہاں بالکل آہستہ ہو جانا تھی۔اپنے لیے میں نے روڈ کی دائیں جانب موجود ایک ٹیکری پسند کی تھی جہاں سے اس موڑ کا فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں بنتا تھا۔سردار بائیں طرف کی ڈھلان پر موجود تھا۔اس کا بھی موڑ سے فاصلہ تقریباً میرے جتنا ہی بنتا تھا۔میرا کام گاڑی کے ٹائر کو نشانہ بنانا تھا۔اس کے بعد وہ تینوں ہمارے نشانے پر ہوتے۔ہم نے روڈ کی دونوں جانب مورچہ سنبھالا ہوا تھا اس لیے ان کے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔رابطے کے لیے ہمارے پاس آئی کام موجود تھا۔باقی خائستہ گل کے بارے یہی معلوم ہوا تھا کہ گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کیا کرتا ہے اور دو محافظ گاڑی کی باڈی میں بیٹھے ہوتے ہیں،اس لیے خائستہ گل کو پہچاننا ہمارے لیے مشکل نہیں تھا۔یوں بھی ہم عبدالحق سے ہم مفصّل طور پر اس کا حلیہ معلوم کر چکے تھے۔

خائستہ گل کی کالی ڈبل کیبن قریباً گیارہ بجے نمودار ہوئی تھی۔لیکن اس کے ہمراہ دو اور گاڑیاں دیکھ کر ہمیں اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا نظر آیا۔تینوں گاڑیاں بڑے آرام سے وہاں سے گزر گئیں۔خائستہ گل کی ڈبل کیبن سب سے آگے تھی اور اس میں زیڑ گل کے کہنے کے مطابق اس کے علاوہ دو ہی آدمی تھے جو ڈبل کیبن کی باڈی میں بیٹھے تھے۔اس کے پیچھے بھی دو ڈبل کیبن ہی تھیں اور دونوں گاڑیوں میں کم از کم دس دس افراد ضرور موجود تھے۔ان گاڑیوں کے گزرتے ہی سردار اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف چل پڑا۔

''میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں۔''میرے قریب بیٹھ کر اس نے بھی میری طرح چٹان نما پتھر سے ٹیک لگا لی تھی۔

''واپس کس لیے۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''تھوڑا انتظار کرو بھیا!......شاید واپسی پر وہ اپنے روزمرہ کے مطابق فقط دو محافظوں کے ساتھ ہی لوٹے۔''

''جب وہ یہاں سے گئے تین گاڑیوں میں ہیں تو اکیلا کیسے لوٹے گا؟''

میں نے کہا۔"ضروری تو نہیں کہ باقی دو گاڑیاں واپس بھی لوٹیں۔ ہو سکتا انھوں نے بھی انگور اڈے جانا ہو اور یہاں سے جاتے ہوئے بس اتفاقی طور پر اکٹھے ہو گئے ہوں۔"

"چلو دیکھ لیتے ہیں۔" تھوڑا آگے کو کھسک کر وہ لمبا لیٹ گیا۔ سڑک کی جانب سے ہم آڑ میں تھے۔ اپنے ساتھ ہم سفری تھیلے نہیں لا سکے تھے ورنہ وقت گزاری کے لیے چائے ضرور بناتے۔ رات کی بھرپور نیند کے بعد اس وقت سونے کی حاجت بھی معلوم نہیں ہو رہی تھی ورنہ دو تین گھنٹے سو ہی جاتے۔ ہم بس سر کے نیچے پتھر رکھ کر لیٹ گئے۔ سردار کے پاس لی زونا کا خوش گوار تذکرہ موجود تھا وہ امریکہ میں لی زونا کی معیت میں بیتے خوب صورت لمحوں کو دہراتا رہا۔ امریکہ میں میں بھی کسی کی نظر کا مرکز رہا تھا مگر اس کی محبت فقط اپنے مقصد کے حصول کی خاطر تھی۔ کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے جو ہزاروں نہیں لاکھوں میں ایک تھی۔ لی زونا کا معصومانہ چہرہ بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتا تھا۔ میں اس کے ساتھ گزارے لمحوں کو یاد کرنے لگا۔ سردار کی باتیں بس میرے کانوں تک ہی رسائی پا رہی تھیں میرے دماغ میں جینیفر کے خیالات گھوم رہے تھے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ جب بھی میں اس کے بارے سوچتا میں کسی منطقی نتیجے تک نہ پہنچ پاتا۔ وہ پہلے ہی دن میری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ اور پھر میری ایک بات پر خفا ہو کر وہ مجھ سے چند دن کھنچی کھنچی رہی تھی لیکن اس دوران بھی اس کا رویہ کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کا سا رہا تھا مجھے جلانے کے لیے ہندو سنائپرز کے ساتھ گھومنا۔ میری توجہ حاصل کرنے کے لیے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنا ۔اور پھر صلح کرنے کے لیے بھی اس نے خود ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ لیکن اس کا دوبارہ میری طرف متوجہ ہونا کسی کی ہدایت کے مرہون منت تھا۔ کیونکہ اس کے بعد وہ مجھے رات کے کھانے پر لے جا کر ایک غیر قانونی کام پر مجبور کرنے لگی۔ اور اس کی آخری رات کی اداکاری تو بہت ہی لاجواب تھی اگر لی زونا نے مجھے اس کی کسی سے کی ہوئی باتیں نہ بتا دی ہوتیں تو یقیناً میں اب بھی اسے مخلص سمجھتا رہتا۔ "کیا وہ مطلب پرست اور خود غرض تھی......؟" یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے دماغ نے ہمیشہ اثبات میں دیا تھا لیکن دل ہمیشہ اس بات کی مخالفت کرتا رہتا۔

"تم میری باتیں نہیں سن رہے؟" سردار نے میری غائب دماغی محسوس کر لی تھی۔

میں نے بیزاری سے کہا۔"یار!...... تمھاری یہ باتیں میں سو مرتبہ پہلے بھی سن چکا ہوں۔"

''کوئی بات نہیں ایک مرتبہ اور سن لو؟'' بے پرواہی سے کہتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔''اس نے کافی کا مگ میری جانب بڑھایا...........''

''مگ لیتے ہوئے میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا اور وہ میری طرف اس لیے میرے مگ تھامنے سے پہلے اس نے مگ چھوڑ دیا۔گرم کافی کے چھینٹے میری پینٹ اور جرابوں کو داغ دار کر گئے،ہم دونوں ہنس پڑے اور پھر ہم نے ایک مگ سے اکٹھی کافی پی،ایک گھونٹ وہ بھرتی اور ایک میں۔''قطع کلامی کرتے ہوئے میں پوری بات دہرا دی۔

وہ بگڑتے ہوئے بولا۔''دوبارہ قطع کلامی کی تو خائستہ گل سے پہلے تمھارا نمبر آئے گا۔تو میں کہہ رہا تھا اس نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا..............''اور میں خاموشی سے اس کی زبانی وہی باتیں سننے لگا جو اس سے پہلے کئی مرتبہ سن چکا تھا۔

دو بجے کے قریب میں نے سردار کو دوبارہ اپنی جگہ لوٹنے کو کہا جب وہ چنارے اور لی زونا کے مزاج اور عادت میں موجود مماثلت کو اجاگر کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔

''ٹھیک ہے،باقی باتیں دوبارہ ملنے پر ہوں گی۔''اس نے اس انداز میں کہا گویا میں اس بکواس کو سننے کے لیے مرا جا رہا تھا۔

میں بھی الٹا لیٹ کر انگور اڈے سے آنے والے رستے کو دوربین میں دیکھنے لگا۔عمدہ اور اعلا دوربین کے باوجود میں زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اونچی نیچی پہاڑیاں دکھاؤ کو محدود کر رہی تھیں۔چار بجنے میں چند ہی منٹ رہتے تھے جب مجھے خائستہ گل کی کالی ڈبل کیبن پہاڑیوں کے درمیان سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔اکیلی ڈل کیبن نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔میں چوکنا ہو گیا۔اگلے دس منٹ میں وہ اس موڑ کے قریب ہو گئی تھی جہاں ہم موت کے فرشتے کے روپ میں ان کے لیے کافی دیر سے لیٹے ہوئے تھے۔گو ہم میں دو تین دن تک بھوکے پیاسے ایک محدود جگہ میں چھپ کر بیٹھے رہنے کی صلاحیت موجود تھی اس کے باوجود انتظار انسان کو کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے۔اور پھر میری شہادت کی انگلی نے ٹریگر دبا کر اس انتظار کا اختتام کیا۔حرکتی ہدف کو نشانہ بنانا بہت مشکل اور دشوار گزار ہے،لیکن جب آدمی کو لیڈ لینے کا طریقہ معلوم ہو اور اس نے اس کی کافی مشق

بھی کررکھی ہوتو پھر یہ دشوار گزارکام روز مرہ جیسا ہی لگتا ہے۔گاڑی کی رفتار موڑ کی وجہ سے یوں بھی بالکل آہستہ ہوگئی تھی اس لیے ڈرائیور کو گاڑی سنبھالنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔البتہ ٹائر کے دھماکے سے پہلے ڈریگنو و کے فائر کی آواز انھیں چونکا ضرور دیا تھا۔باڈی میں بیٹھے دونوں محافظوں نے ہڑبڑاتے ہوئے اپنے ہتھیار سنبھالے مگران کے نیچے اترنے سے پہلے ایک سر سے ڈریگنو وکی گولی پار ہو چکی تھی۔دوسرے نے جلدی جلدی کلاشن کوف کاک کی لیکن فائر کرنے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہی وہ عقبی پائیدان کی طرف قدم بڑھا چکا تھا ۔سر میں لگنے والی گولی نے اسے منہ کے بل گرادیا، چونکہ گرتے وقت اس کا بالائی دھڑ گاڑی کے ٹیل بورڈ سے اوپر گزر گیا تھا اس لیے وہ سر کے بل نیچے گرا۔خائستہ گل کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔چونکہ اس کے اور میرے درمیان ڈبل کیبن حائل تھی اس لیے وہ میری رینج سے دور تھا۔اور اسی وجہ سے میں نے مخالف جانب سردار کو بٹھایا ہوا تھا۔خائستہ گل نے گاڑی کی آڑ لے کر میری جانب اندازے سے فائر کیا۔لیکن پہلے برسٹ کے بعد سردار نے اسے دوسری مرتبہ ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا تھا۔سردار کی فائر کی ہوئی گولی اسے نامعلوم کہاں لگی تھی ۔لیکن اس کے بعد مجھے ٹیلی سکوپ سائیٹ میں خائستہ گل کے اٹھے ہوئے ہاتھ نظر آگئے تھے۔سردار پتھر کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے نیچے آنے لگا۔اس کے گاڑی کے قریب پہنچنے تک میں اپنی جگہ سے نہ ہلا جونھی وہ گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچا میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر قریباً بھاگتے ہوئے اس طرف جانے لگا۔میرے قریب پہنچنے تک سردار اس کی زخمی ٹانگ پر اسی کا مفلر لپیٹ چکا تھا۔ایک نظر ڈال کر ہی میں نے عبدالحق کے بتائے ہوئے حلیے کی تصدیق کرلی تھی۔میں نے فوراً ٹیل بورڈ کے ساتھ گری ہوئی لاش کو اٹھا کر گاڑی کی باڈی میں پھینکا اور باڈی میں پڑا فالتو ٹائر نکال کر خائستہ گل سے پوچھا۔

’’ٹائر تبدیل کرنے کے اوزار کہاں ہیں۔‘‘

درد سے کراہتے ہوئے اس نے عقبی نشست کی طرف اشارہ کردیا۔میں فوراً وہ سامان نکال کر ٹائر تبدیل کرنے لگا۔اس دوران سردار خائستہ گل پر نظر رکھنے کے ساتھ اطراف کا بھی جائزہ لیتا رہا۔

ٹائر تبدیل کرنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔اس دوران خائستہ گل نے ایک دوبار سردار کو کوئی صفائی دینے کی کوشش کی مگر سردار نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اگر اس کے بعد تمھارے منہ سے بات نکلی تو بدلے میں کلاشن کوف کی مزل سے بھی گولی نکلے گی اور وہ لگتی کہاں ہے اس بارے مجھے بھی نہیں معلوم۔'' اس کے بعد ٹائر کے تبدیل ہونے تک میں نے خائستہ گل کی آواز نہیں سنی تھی۔

ٹائر تبدیل کرتے ہی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہمارا رستے کے بیچوں بیچ ٹھہرنا گو بالکل ٹھیک نہیں تھا لیکن وہاں قریب میں کوئی ایسی جگہ موجود نہیں تھی جہاں خائستہ گل سے پوچھ گچھ کر سکتے۔ اس کے علاوہ وہاں ٹریفک بھی اتنی نہیں چلتی تھی کہ ہمیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت پڑتی۔ دن بھر میں چند گاڑیاں ہی نظر پڑ جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود راستہ تو راستہ تھا۔ میرے اسٹیئرنگ پر بیٹھتے ہی سردار بھی خائستہ گل کی کلاشن کوف کو فرنٹ سیٹ پر پھینک کر خود اس کے ساتھ عقبی جانب گھس گیا۔

''میرا یقین کریں بھائی صاحب!...... مشرزرولی خان کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا مال سردار قبیل خان نے نہیں لوٹا۔'' ہمیں روانہ ہوتے دیکھ کر اس نے ایک بار پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ سردار نے نہ تو اسے ٹوکا اور نہ اس کی غلط فہمی ہی دور کرنے کی کوشش کی۔

''تمھیں کیسے پتا کہ یہ قبیل خان کا کام نہیں ہے۔''

''آپ جانتے ہی ہوں گے کہ سردار قبیل خان کا کوئی کام مجھ سے چھپا نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا تفاخر در آیا تھا۔

''تو پھر یہ کس کا کام ہے، مشرزرولی خان کو تو اپنا مال واپس چاہیے۔''

''مجھے تو بادشاہ خان محسود پر شک ہے۔ وہ اسی طرح کے کام کرتا رہتا ہے۔'' خائستہ گل نے ہولے ہولے کراہتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش جاری رکھی۔

اس دوران میں نے موڑ کاٹ کر ڈبل کیبن رستے سے نیچے اتار کر نالے میں کر لی تھی۔ اور پھر اسی طرح نالے اندر ہی گاڑی کو آگے لے جاتے ہوئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نظریں گھمانے لگا۔ میرا رخ اس وقت علام خیل سے مخالف جانب تھا۔ جلد ہی مجھے شرقی جانب سے ایک نالہ اس نالے میں شامل ہوتا نظر آیا۔ میں نالے کی مغربی سمت میں تھا اور اس وقت جنوب مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ گاڑی کو نالے کے چھوٹے پانی

سے گزار کر میں شرقی نالے میں گھس گیا۔ان دونوں کی گفتگو جاری تھی۔

''بے شک بادشاہ خان محسود اس طرح کے کام کرتا رہتا ہے لیکن اس سے مشرزرولی کی بات ہو چکی ہے وہ واضح انکار کر رہا ہے بلکہ ہر قسم کا اعتبار دینے کے لیے تیار ہے۔''

وہ کراہتے ہوئے بولا۔''میں حتمی طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس کا کام ہے البتہ سردار قبیل خان کی طرف سے میں ہر ضمانت دینے کو تیار ہوں۔سردار اتنے چھوٹے کام کے لیے اپنی ساکھ اور عزت کو داؤ پر نہیں لگاتا۔''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''تو تمھاری نظر میں یہ چھوٹا کام ہے؟''سردار نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیں بھائی!...... مجھے تو یہی معلوم ہوا ہے کہ بیس پچیس کلاشن کوفیں،تین چار ہزار کلاشن کوف کی گولیاں اور تھوڑا سا ہائی ایکسپلوزیو بارود تھا۔اب آپ خود انصاف کریں کیا سردار قبیل خان اس کے لیے مشرزرولی خان سے دشمنی کا بیج بو سکتا ہے۔''

سردار نے فوراً پوچھا۔''تمھیں یہ تفصیل کہاں سے معلوم ہوئی؟''

''ہم سوئے تو نہیں ہیں بھائی جان!...... یوں بھی اس طرح کی باتیں کہاں چھپی رہ سکتی ہیں۔''

میں نے گاڑی درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف موڑ دی۔یوں بھی اس علاقے میں نالوں اور درختوں کی پہاڑوں ہی طرح بہتات ہے۔درخت بھی ایسے جو سدا بہار ہیں۔سارا سال سرسبز ہی رہتے ہیں۔

گاڑی روک کر میں باہر نکلا اور پہلی بار زبان کھولتے ہوئے خائستہ گل کو مخاطب ہوا۔''تمھارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں قبیل خان کی ہر چھوٹی بڑی بات کے بارے معلوم ہے۔''

''بالکل۔''اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہونہہ!......''کہہ کر میں نے سردار کو اسے باہر نکالنے کا اشارہ کیا۔وہ دونوں ہاتھ اپنی مضروب ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا۔سردار نے دروازہ کھول کر اسے بازو سے پکڑا اور بے رحمی سے باہر گھسیٹ لیا۔

''آہ......کک......کیا کر رہے ہیں آپ؟''تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا تھا۔نیچے گرتے ہوئے اس کی ٹانگ میں یقیناً غضب کا درد اٹھا ہوگا تبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''اب زرولی کے ذکر کو بھاڑ میں ڈال کر ہم کام کی بات کرلیں۔''میں اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔

''افف......''ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے ٹانگ میں اٹھنے والے شدید دد کو برداشت کرنے کی کوشش کی ۔مگر ہمارے دل میں اس کے لیے رحم کی رمق بھی موجود نہیں تھی۔وہ وطن دشمنوں کا آلہ کار ہونے کے ساتھ معصوم لوگوں کے قتل میں بھی ملوث تھا۔ایسے لوگ کسی رحم اور کسی ہمدردی کے حق دار نہیں ہوتے۔یہی وجہ تھی کہ ایسوں کو مارتے وقت میری ٹریگر کو دبانے والی انگلی کبھی نہیں کانپی تھی۔

''ویسے خان صاحب!......تمھارا کیا خیال ہے اگر میں اس کے زخم پر زور دار مکا رسید کروں تو کیا یہ برداشت کرلے گا؟''میں سردار کی طرف متوجہ ہوا۔

سردار نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔''کیوں نہیں ......جوان آدمی ہے۔اسے مکوں اور لاتوں کی کیا پروا۔''

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''مجھے تو نہیں یقین۔''

''چلو مار کر اپنا شک دور کرلو۔''سردار نے مجھے دعوت دی۔

وہ منت بھرے لہجے میں ہکلایا۔''خ......خدا لیے......م......مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔''

''اگر تکلیف ہورہی ہے اور تم مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو ہائے وائے کو چھوڑو اور میرے چند سوالوں کے جواب دو۔شاید ہماری ایک اور گولی ضائع ہونے سے بچ جائے۔''

''مم......میں قسم کھاتا ہوں کہ مشر زرولی......''

''بھاڑ میں گیا تمھارا زرولی یار!......تمھاری سوئی پھر اسی زرولی پر آن اٹکی ہے۔''

''تت......تو تم مشر زرولی......''وہ ہکلاتے ہوئے پوچھنے لگا تھا اور اس کے ہونٹوں سے مشر زرولی کے الفاظ نکلتے ہی میں نے ایک ہلکا سا مکا اس کے زخم پر جڑ دیا۔

''آہ......ہائے......افف......''وہ تڑپ اٹھا تھا۔

''اب اگر تمھارے منہ سے کسی مشر وشر کا نام نکلا تو تو اگلا مکا اتنا آہستہ نہیں ماروں گا۔''میں نے سخت الفاظ میں اسے تنبیہہ کی۔

اس مرتبہ وہ چہرے پر اذیت بھرے تاثرات سجائے کوئی جواب دیے بغیر خاموش رہا تھا۔

''اب یہ بتاؤ کہ قبیل خان سے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟''میں نے سوالوں کی ابتداء کی۔

''آپ کو سردار سے کیا کام ہے؟''میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی راگنی الاپی۔اس مرتبہ میں نے اس کی مضروب ٹانگ پر پہلے سے بھی تھوڑا زیادہ زور سے مکا جڑ دیا۔

''ہائے مرگیا۔''اس کے منہ سے زوردار چیخ خارج ہوئی تھی۔''نخ......خدا کے واسطے میری ٹانگ میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

''خائستہ گل یہ آخری تنبیہہ تھی،اس کے بعد جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔کیوں،کیا،کیسے کو چھوڑ دو۔بس میرے سوالوں کے جواب دو ورنہ پوچھ گچھ چھوڑ کر مجھے تمھارا دماغ جگہ پر لانا پڑے گا۔سمجھ میں آ گئی میری بات۔''

منہ سے کچھ کہے بنا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو جو پوچھا ہے اس بارے کچھ پھوٹو نا؟''

وہ جلدی سے بولا۔''سردار اس وقت انگور اڈے میں اپنے خاص ٹھکانے پر ہے،شاید دو تین دن مزید بھی وہیں رہے۔''

''ایک اور بات بھی یاد رکھنا خائستہ گل!......''میں نے ٹھوس لہجے میں اسے دھمکی دی۔''ہم تمھیں اس وقت آزاد کریں گے جب تمھاری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔اس لیے اگر غلط بیانی کا ارادہ ہے بھی تو اسے ذہن سے نکال دو۔اگر غلط بیانی کی............''میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا کہ اسے بھی معلوم تھا ایک بے بس آدمی کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ گڑگڑایا۔''مم......میں غلط بیانی نہیں کروں گا۔''

''اسی میں تمھاری بہتری ہے۔''کہہ کر میں نے پوچھا۔''اب اس خاص اڈے کا محل وقوع بھی بتا دو۔''

''انگور اڈے سے جنوب مشرق کی جانب سڑک پر قریباً آٹھ کلومیٹر کے بعد ایک چھوٹی سی آبادی خڑ کلے آتی ہے۔خڑ کلے سے مشرق کی جانب ایک کچی سڑک جا رہی ہے جس کی طوالت پانچ کلومیٹر کے بہ قدر ہو گی۔رستے

میں ایک نالہ اور ایک چھوٹی پہاڑی بھی آتی ہے۔سڑک کے اختتام پر ایک جنگل ہے وہاں سردار کی ایک بڑی حویلی موجود ہے۔عام دنوں میں وہاں دو تین محافظ موجود رہتے ہیں۔لیکن جب سردار وہاں پر موجود ہو تب محافظوں کی تعداد کسی بھی طرح پندرہ بیس افراد سے کم نہیں ہوتی۔“

”تو قبیل خان وہاں کیا خاص کام کرتا ہے؟“میں نے اگلا سوال کیا۔

”وہاں وہ اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ شغل میلے کے لیے اکٹھا ہوتا ہے۔“

”مطلب،شراب،شباب،گانا بجانا......وغیرہ وغیرہ۔“

میری بات پر وہ شرمندگی ظاہر کیے بغیر بولا۔”یہ سرداروں کے شوق ہیں بھائی صاحب!“

”تو وہ وہاں سے کب تک لوٹے گا؟“میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا،کیونکہ ان کا ارادہ وہاں سے سیدھا افغانستان جانے کا تھا۔اب یہ نہیں معلوم کہ وہاں وہ کتنا عرصہ گزاریں گے۔“

”اگر اسے تمھارے غائب ہونے کی بابت معلوم ہو جائے تب بھی وہ نہیں لوٹے گا؟“

”اس نے کون سا خود میری تلاش میں بھٹکنا ہے۔اس کے پاس اتنا بڑا لشکر موجود ہے وہ اپنے آدمیوں کو انگوراڈے سے بھی حکم صادر کرسکتا ہے اور افغانستان سے بھی،اس کے لیے اسے علام خیل آنے کیا ضرورت ہے۔“

”اب ذرا اس خاص اڈے کی بناوٹ وغیرہ پر بھی روشنی ڈال لو۔“

وہ اس وسیع اور پختہ حویلی کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔وہ حویلی چلغوزوں کے جنگل میں واقع تھی۔اور وہ جنگل قبیل خان ہی کی ملکیت تھا۔حویلی کا عقبی حصہ پہاڑی کے ساتھ جڑا تھا۔سامنے مضبوط لکڑی کا ایک بڑا گیٹ تھا جو مشرقی جانب پڑتا تھا۔دیواروں کی اونچائی دس گیارہ فٹ تھی۔حویلی کے سامنے والی دیوار جہاں شمالی اور جنوبی سمت کی دیوار سے مل رہی تھی وہاں دو مورچے اس طرح بنے ہوئے تھے کہ ان کی چاروں دیواروں میں فائرنگ کرنے کے لیے ہول موجود تھے۔اس نے کافی تفصیل سے حویلی کا نقشہ کھینچا تھا۔مجھے لگا وہ ہمیں حویلی کے حفاظتی انتظامات سے مرعوب کرنا چاہ رہا تھا۔

اس سے کچھ مزید معلومات پوچھنے کے بعد میں سردار کی طرف متوجہ ہوا۔

''خان صاحب!......آپ نے کچھ پوچھنا ہے؟''

''ہونہہ......''اثبات میں سر ہلاتے وہ خائستہ گل کو مخاطب ہوا۔''محترم جناب سردار قبیل خان کے چہیتے سالے صاحب!......کیا وہ تمھاری موت کی خبر سن کر بھی یہاں نہیں پہنچے گا؟''

وہ تھوک نگلتا ہوا بولا۔''مگر آپ لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے تمام معلومات آپ کو دے دی تو مجھے گولی نہیں ماریں گے۔''

ہم نے جو وعدہ کیا تھا اس پر ہم قائم ہیں دوست۔''میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔''وہ سب سے پہلے اپنے اغراض و مقاصد مدنظر رکھتا ہے۔میں بھی سالا ہونے کی وجہ سے اس کا منظور نظر نہیں ہوں۔میری اپنی ذات میں بھی ایسی کئی باتیں موجود ہیں جن کی وجہ سے اس نے مجھے یہ مقام دیا ہوا۔یہ علیحدہ بات کہ لوگ اس کی وجہ میں رشتہ داری کو لے آتے ہیں۔''

''ویسے تم نے ہمیں پہچان لیا ہے یا اب تک ہمیں زرولی کا آدمی سمجھ رہے ہو۔''

''مجھے شک ہے کہ تم وہی ہو جس نے روشن خان کو لنگڑا کیا ہے۔وہ تمھارا تذکرہ ایس ایس کے نام سے کر رہا تھا۔''

میں مسکرایا۔''شک کی وجہ؟''

''چلتی گاڑی کے ٹائر کو پہلی گولی سے نشانہ بنانا اور پھر اتنی سرعت سے میرے دونوں محافظوں کے سر میں گولی اتارنا یہ کام ہر آدمی نہیں کر سکتا۔''

میں نے اشتیاق امیز لہجے میں پوچھا۔''تو پھر تم ہمیں کسی مشر زرولی سے کیوں منسوب کر رہے تھے۔''

وہ صاف گوئی سے بولا۔''کیونکہ میں چاہتا تھا تم یہ سمجھو میں نے تمھیں نہیں پہچانا اور حقیقت تو یہ ہے کہ مشر زرولی نام کا کوئی سردار اس علاقے میں موجود ہی نہیں ہے۔''

میں نے فوراً پوچھا۔''تو اب کیوں اعتراف کر رہے ہو؟''

''کیونکہ اب تم میری جان بخشی کا وعدہ کر چکے ہو۔اور روشن خان کہہ رہا تھا کہ ایس ایس اپنے الفاظ سے

نہیں پھرتا۔''

''مگر میں نے تم سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔میں نے کہا تھا کہ تمھیں گولی نہیں ماروں گا اور اس بات پر میں قائم ہوں۔''

''نن......نہیں......تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے قتل نہیں کرو گے۔''میری بات سن کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔''یار!......سیدھی بات یہ ہے کہ تمھیں زندہ چھوڑنے سے ہماری سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''میں ہر قسم کی ضمانت دینے کو تیار ہوں،میں اس حملے کو......''مگر اس کی بات درمیان میں رہ گئی تھی کیونکہ ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے میں نے دوسرا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور دونوں ہاتھوں کو مخالف جانب زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ایک ملک دشمن شخص سے وعدے وعید لینے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔اور نہ ہمیں اس سے کوئی ہمدردی تھی۔

سردار نے کہا۔''بندے کو مارنے کا یہ طریقہ مجھے بھی سکھا دو۔''

میں ہنسا۔''اب زندہ بندہ تو کوئی یہاں موجود نہیں،مجھے تمھاری گردن کے ساتھ یہ کر کے ہی تمھیں سکھانا پڑے گا۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔''نہیں تم مجھے زبانی بتا دو اور میں تمھاری گردن پر پریکٹس کر لیتا ہوں۔''

''تمھیں تو نہیں البتہ اپنی چنارے بہن کو میں یہ طریقہ ضرور سکھاؤں گا۔امید ہے لی زونا کی آمد کے بعد وہ اس طریقے کو کسی نہ کسی پر ضرور استعمال کرنا چاہے گی۔''

وہ مجھے مطعون کرتا ہوا بولا۔''اگر میں بھی کمانڈو والوں کے زیر نگرانی سنائپر کورس کر لیتا تو تمھاری منت کی ضرورت نہ پڑتی۔''

''اچھا اتنا وقت نہیں ہے کہ ہم گپیں ہانکیں یہ سیکھنا سکھلانا بعد میں بھی چلتا رہے گا۔''میں نے باڈی میں پڑی لاشوں کی تلاشی لی ان کی نقدی اور ہتھیار اٹھا کر میں نے لاشوں کو وہیں پڑا رہنے دیا تھا۔اس کے بعد خائستہ گل کی بھی تلاشی لے کر اسے ڈبل کیبن کی باڈی میں پھینک دیا۔گاڑی کی تلاشی لینے پر مجھے ڈیش بورڈ سے بریٹا

پسٹل ہاتھ لگا۔پستول سردار کی جانب بڑھا کر میں نے کہا۔
’’تھوڑی خشک لکڑیاں اکٹھی کرنا پڑیں گی۔‘‘
’’خشک لکڑیوں کی کون سی کمی ہے۔‘‘سردار نے بریٹا پسٹل نیفے میں اڑس کر وہاں بکھری لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا۔میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔چھوٹا سا ڈھیرا اکٹھا کر کے میں نے ڈبل کیبن کے آئل ٹینک کے نیچے رکھا اور لکڑیوں کو آگ لگادی۔
’’چلو۔‘‘سردار کو کہہ کر میں وہاں سے دور ہٹتا چلا گیا۔گاڑی سے ساٹھ ستر گز دور آ کر میں نے ایک گولی گاڑی کے آئل ٹینک پر فائر کر دی۔اگر یہ پٹرول والی گاڑی ہوتی تو مجھے لکڑیاں اکٹھا کرنے کی تگ و دو نہ کرنا پڑتی۔یہ ڈیزل والی گاڑی تھی اور ڈیزل کو آگ پکڑنے کے لیے آگ چاہیے ہوتی ہے۔
ڈیزل ٹینک میں سوراخ ہوا اور ڈیزل سیدھا جلتی ہوئی لکڑیوں پر گرا۔آگ کے شعلوں نے بلند ہو کر ٹینکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہم وہاں سے دور ہٹتے گئے۔ہم چند قدم ہی لے پائے ہوں گے کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔جو آئل ٹینک کے پھٹنے کا تھا۔نالے تک جاتے ہوئے وقفے وقفے سے ٹائر پھٹنے کے دھماکے بھی سنائی دیتے رہے۔ہم نے تیز رفتاری سے چلتے ہوئے نالا عبور کیا اور پھر مغرب ہی کی سمت بڑھتے رہے۔شام کا ملگجا سا اندھیرا اچھیل رہا تھا۔نالے سے اوپر چڑھائی کافی سخت تھی۔لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی۔وہ چڑھائی چڑھ کر ہم سڑک پر پہنچے۔اس کے بعد بھی چڑھائی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں تھی تھوڑا آگے بڑھنے کے بعد ہم دائیں ہاتھ موجود نالے میں اتر گئے وہ نالا مغربی پہاڑوں کی طرف سے آ رہا تھا۔لیکن آگے جا کر یہ شمال کی سمت مڑ کر علام خیل کی طرف جا نکلتا اور وہاں سے اس نالے میں شامل ہو جاتا جس نالے کو ہم عبور کر کے آ رہے تھے لیکن اس وقت ہمارا رخ مغربی پہاڑی کی طرف تھا۔نالے میں چڑھائی نسبتاً آسان تھی۔پہاڑی کی جڑ میں جا کر یہ نالے ایک دم اوپر کو اٹھ جاتے ہیں ورنہ نیچے ان کی چڑھائی قریباً غیر محسوس ہی ہوتی ہے۔ہم اس وقت تک اسی نالے میں چلتے رہے جب تک کہ چڑھائی دشوار گزار نہ ہو گئی۔اس کے بعد ہم دائیں طرف کی ہلکی ڈھلان سر کرنے لگے۔اور پھر پہاڑی کے متوازی ہو کر شمال کی جانب بڑھتے گئے۔سیدھے رستے کے جائے یہ دشوار

گزار راستہ ہم نے اس لیے اختیار کیا تھا تا کہ علام خیل سے کوئی آدمی خائستہ گل وغیرہ کا پتا کرنے آئے تو اسے رستے میں ہم نہ ملیں۔گو گاڑی کے آئل ٹینک اور ٹائروں کے پھٹنے کی آواز با آسانی علام خیل میں سنائی گئی ہوگی لیکن اس طرح کے دھماکے چونکہ یہاں کا روزمرہ ہیں اس لیے کوئی زیادہ توجہ نہیں دیتا۔مختلف قبائل کی لڑائیاں ،پاک آرمی اور دہشت گردوں کے ٹاکرے ،دہشت گردوں کی آپس میں فائرنگ ،مجاہدین کا کفار سے دو دو ہاتھ کرنا اور ذاتی دشمنی کے باعث ایک دوسرے پر ہتھیاروں کا استعمال آئے روز کا معمول ہے۔اس کے باوجود کوئی بعید نہیں تھا کہ ان دھماکوں کو سن کر قبیل خان کے آدمی اپنے بندوں کا پتا کرنے کے لیے اس طرف کا رخ کرتے۔

سردار بریٹا پستول کو پا کر کافی خوش تھا۔ان تینوں کی کلاشن کوفیں بھی ہم ساتھ ہی اٹھا لائے تھے۔کمانڈر سعید پہلے والی کلاشن کوفوں کو پا کر کافی خوش ہوا تھا۔میں چاہتا تھا کم از کم ہم وہاں صبح شام جو کھانا کھا رہے تھے اس کا معاوضہ ہی دہشت گردوں کے ہتھیاروں کے ساتھ ادا ہو جاتا۔

ہم گپ شپ کرتے عشاء کی نماز کے بعد ہی کمانڈر عبدالرشید کے گھر پہنچ پائے تھے۔دونوں کمانڈر عبدالحق کے کمرے میں بیٹھے کسی خاص بات چیت میں مصروف تھے۔کمرے کا دروازہ چونکہ کھلا تھا اس لیے ہم کھٹکھٹانے کی زحمت سے بچ گئے تھے۔

’’آؤ دوستو!......آج تو سارا دن ہی غائب رہے ہو۔‘‘ہمیں دیکھتے ہی عبدالحق خوش دلی سے مسکرایا۔

’’ہاں بھیا!......تھوڑا کام تھا۔‘‘ہم تینوں کلاشن کوفیں چٹائی پر رکھتے ہوئے ان سے مصافحہ کرنے لگے۔

عبدالحق نے کہا۔’’شام کی نماز سے ذرا پہلے دھماکے کی آواز سنائی دی تھی۔‘‘

میں نے جواباً کہا۔’’ہاں ہم نے بھی سنی تھی۔میرا خیال ہے کسی نے خائستہ گل اور اس کے دو محافظوں کو قتل کر کے ان کی گاڑی کو آگ دی ہے،یقیناً آپ نے اس گاڑی کے پٹرول ٹینک کے پھٹنے کا دھماکا سنا ہوگا۔‘‘

عبدالحق نے ہمیں مخلصانہ مشورے سے نوازتے ہوئے کہا۔’’دوست کچھ زیادہ ہی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔احتیاط بہ ہر حال بہت اچھی ہوتی ہے اور جہاں تک میرے ناقص علم اور تجربے کی بات ہے تو قبیل خان نہایت چالاک ،مکار اور خطرناک شخص ہے۔اور یہ غالباً تیسرا چوتھا نقصان ہے جو اسے مسلسل تم لوگوں کی طرف سے پہنچ رہا ہے۔‘‘

میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے مخلصانہ مشوروں کی ضرورت ہمیں ہمیشہ رہے گی عبدالحق بھائی!...... باقی فی الحال تو ہم نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔ ہمارے پاس ان کی یہ کلاشن کوفیں ہیں جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں یقیناً آپ کو ان کلاشن کوفوں کی ہیئت تبدیل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔“

”شکریہ جوان!“ خاموش بیٹھا کمانڈر عبدالرشید خوش دلی سے بولا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہتھیار ہمارے لیے ایک بہترین تحفہ ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تینوں کلاشن کوفوں کا جائزہ لینے لگا۔

”سردار!...... اپنا تیس بور پستول عبدالحق بھائی کو دے دو۔“

سردار نے سر ہلاتے ہوئے تیس بور پستول اور اس کی فالتو گولیاں کمانڈر عبدالحق کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”عبدالحق بھائی!...... یہ ہم نے وانہ سے خریدا تھا۔“

”جزاک اللہ۔“ عبدالحق نے شکر گزاری کے کلمات کے ساتھ پستول تھام لیا۔

میں نے کہا۔ ”عبدالحق بھائی!...... ایک چھوٹی سی درخواست تھی۔“

”حکم کرو بھائی!...... اگر ہمارے بس میں ہوا تو انکار نہیں کریں گے۔“

”شاید ایک دو دنوں تک ہم انگور اڈے کا رخ کریں، کیا وہاں بھی ہمیں مجاہدین کے لیے بنی ہوئی دال روٹی کھانے کو مل سکے گی۔“

عبدالحق تفصیل بتاتا ہوا بولا۔ ”انگور اڈے میں ہمارا بہت بڑا تربیتی سنٹر موجود ہے لیکن میں آپ کو وہاں جانے کے بجائے نصر اللہ خان خوجل خیل کے گھر جانے کا مشورہ دوں گا۔ وہ میرا دوست بلکہ استاد ہے۔ وہ خود بھی تربیتی سنٹر جاتا رہتا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہ دال روٹی اس کی بیٹھک میں رہ کر کھائیں۔ باقی انگور اڈے سے پہلے خم رنگ اور رغزئی نام کی دو آبادیاں آتی ہیں۔ خم رنگ میں مولوی عبداللہ اصغر اور رغزئی میں قاری غلام محمد کے گھر آپ کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ بس وہاں یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ آپ کمانڈر عبدالرشید اور عبدالحق کے مہمان ہیں۔ باقی تصدیق وغیرہ وہ خود کرتے رہیں گے۔“

میں شکر گزاری کے گہرے احساس کے زیر اثر بولا۔ ”یقیناً آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہیں اتار سکتے۔“

''یہ کوئی احسان نہیں ہے میرے دوست!...... پاکستان صرف تمھارا نہیں ہمارا بھی ملک ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو اسلام کا قلعہ ہے اور یہ سب ہم اپنے ملک کی خاطر کررہے ہیں۔ اور کہتے ہیں نہ کہ نیت صاف ہو تو منزل آسان رہتی ہے، اب یہی دیکھ لو کہ بہ ظاہر تو ہم احسان کررہے ہیں مگر ہم سے کئی گنا زیادہ آپ لوگ ہمارے کام آرہے ہو۔ نو عدد کلاشن کوفوں کی کافی زیادہ قیمت بنتی ہے اور ایک کلاشن کوف بیچ کر ہی آپ لوگ پانچ چھ ماہ تک ایسی دال روٹی سے مستفید ہوسکتے ہو۔''

''صرف دال روٹی نہیں ہے عبدالحق بھائی!...... چاردیواری کا تحفظ بھی بہت معنی رکھتا ہے۔''

''اچھا کھانا کھالیا ہے کہ نہیں۔'' اس نے خوب صورتی سے موضوع تبدیل کیا۔

''یہ جو میں صبح سے دال کی تعریف پر تعریف کیے جارہا ہوں اس سے بھی آپ کو اندازہ نہیں ہوا۔ بھائی جان!...... بھوکا آدمی ہی دال کی اتنی تعریف کرسکتا ہے۔'' میری بات پر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ سردار کے ہونٹ بھی مسکرانے کے انداز میں کھل گئے۔ عبدالحق نے فوراً ایک آدمی کو لاکر ہمارے لیے کھانا لانے کا حکم دیا۔

سردار نے پوچھا۔ ''ویسے آپ نے ہمیں تربیتی سنٹر جانے سے کیوں منع کردیا ہے؟''

عبدالحق نے جواب دیا۔ ''کیوں کہ وہاں مجاہدین ہر وقت تربیت میں شروع رہتے ہیں۔ اور آپ لوگوں کا تربیت میں حصہ نہ لینا کافی سوالات کو جنم دے گا۔ ہر کسی کے سامنے شاید آپ وضاحت نہ کرسکیں کہ آپ وہاں کیا کررہے ہیں۔ البتہ یہ صرف میرا اپنا خیال ہے اگر آپ کی خواہش تربیتی سنٹر جانے ہی کی ہے تو وہاں بھی آپ کو رہائش اور کھانا پینا ضرور ملے گا۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سرہلایا۔ ''ہمارے لیے نصراللہ صاحب کی بیٹھک ہی مناسب رہے گی۔

اسی وقت کھانے کے برتنوں کے ساتھ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ کھانا کھا کر ہم خوشبودار قہوے سے لطف اندوز ہوئے اور دونوں کمانڈروں سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

ان تینوں کی لاشیں اسی رات دریافت کرلی گئی تھیں۔ تینوں کا آبائی علاقہ بھی علام خیل ہی تھا۔ ظہر کی نماز

کے بعدان کا جنازہ تھا۔ہم نے بڑے اہتمام سے ان کے جنازے میں شرکت کی لیکن قبیل خان کا دیدار نہ ہوسکا ۔خائستہ گل کے بہ قول وہ ایک خودغرض اور مطلب پرست شخص ہی نکلا تھا۔اپنے سالے کے جنازے میں شرکت نہ کر کے اس نے خائستہ گل کی اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ ورنہ انگور اڈے سے وہاں تک گاڑی میں کتنا کچھ وقت لگنا تھا۔اور پھر اسی روز مجاہدین کی ایک گاڑی انگور اڈے جا رہی تھی۔ہم عبدالحق سے اجازت لے کر اسی گاڑی میں انگور اڈے روانہ ہو گئے۔پہلے ہم نے سوچا تھا شاید قبیل خان اپنے سالے کی موت پر وہاں آجائے۔لیکن اسے کوئی زیادہ ہی خوب صورت مصروفیت ملی ہوئی تھی کہ اس نے علام خیل آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

شام کی آذان کے وقت مجاہدین ہمیں نصراللہ خان خوجل خیل کے گھر کے سامنے اتار کر آگے بڑھ گئے ۔جانے سے پہلے وہ نصراللہ خوجل خیل سے ہمارا تعارف کرانا نہیں بھولے تھے۔وہ سفید ریش مجاہد،عمر کی اس منزل میں تھا جہاں انسان کے قویٰ آرام کے طلب گار ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی آخرت سنوارنے میں لگا ہوا تھا ۔اس نے ہمیں خوش دلی سے خوش آمدید کہا۔اور اپنے گھر سے ملحق ایک خوب صورت سے بیٹھک میں ہمیں لے جا کر بٹھا دیا۔ہماری ضروریات وغیرہ کا پوچھنے کے بعد وہ شام کی نماز کے لیے چلا گیا۔ہم نے بیٹھک ہی میں نماز پڑھ لی تھی۔رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد ہی کھا سکے تھے۔کھانا کافی پر تکلف بنا تھا۔کھانے کے بعد اس نے چند منٹ ہم سے گپ شپ کی اور پھر ہمیں آرام کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔صبح ناشتے کے بعد ہم بیٹھک سے تو نکل آئے لیکن قبیل خان کے مخصوص اڈے کا رخ نہ کر سکے، کیونکہ ہم بازار کھلنے کے منتظر تھے اور ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔اسلحے کی دکانیں کھلتے ہی ہم ڈریگنو ورائفل کے سائیلنسر کا پوچھنے کے لیے ایک دکان میں گھس گئے ۔دکان دار کے نفی میں سر ہلانے پر ہم اگلی دکان کی طرف بڑھ گئے۔اسلحے کی تیسری دکان میں ہمیں مطلوبہ چیز مل گئی۔اس کی خریداری میں خائستہ گل کی جیب سے ملنے والی نقدی کام آئی تھی۔ہمارے پاس جو بڑی رقم موجود تھی وہ ہم ڈی بلاک پر چھوڑ کر آئے تھے کیونکہ اتنی زیادہ رقم کو ساتھ پھرانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔سائیلنسر خرید کر ہم جنوب مشرق کی سمت روانہ ہو گئے۔وزیرستان کے لحاظ سے انگور اڈہ خاصا بڑا شہر ہے اور یہ بالکل پاکستان افغان بارڈر پر واقع ہے۔افغان وہاں سے مغرب کی جانب پڑتا ہے۔یہ پاکستان کا آخری شہر ہے۔

گھنٹا ڈیڑھ پیدل چلنے کے بعد ہم خڑ کلے کے قریب پہنچ گئے تھے۔مشرق کی جانب جانے والی سڑک خڑ کلے میں داخل ہونے سے پہلے ہی نظر آ گئی تھی۔ہم اس سڑک سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلنے لگے تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم قبیل خان کی حویلی کی جانب جا رہے ہیں۔آگے چونکہ چڑھائی تھی اس لیے ہمیں گھنٹے سے زیادہ وقت آگے بھی لگ گیا تھا۔اس طرف درخت کافی گھنے تھے اس لیے ہمیں چھپ کر جانے میں آسانی ہو رہی تھی۔پہاڑی عبور کرتے ہی ہمیں وہ وسیع و عریض پختہ حویلی نظر آ گئی تھی۔اس کے قریب جانے کے بجائے ہم سامنے پھیلے جنگل میں گھس گئے۔درختوں کی بہتات نے حویلی کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ہمارے قدم سامنے والی پہاڑی کی جانب بڑھ رہے تھے جس کی بلندی پر جا کر ہم حویلی کا اچھی طرح جائزہ لے سکتے تھے۔اس پہاڑی کا حویلی سے زمینی فاصلہ تو تین چار کلومیٹر سے زیادہ تھا لیکن ہوائی فاصلہ کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔پہاڑی کی بلندی پر جاتے ہی ہم ایک چٹان کی اوٹ میں لیٹ کر حویلی کا جائزہ لینے لگے۔وہاں سے وہ وسیع و عریض حویلی بالکل واضح نظر آ رہی تھی۔خائستہ گل نے حویلی کے بارے بالکل صحیح تفصیل بتلائی تھی۔ابھی ہم حویلی کا مکمل جائزہ نہیں لے پائے تھے کہ ہمیں حویلی کا داخلی دروازہ کھلتا نظر آیا۔دروازہ کھلتے ہی چار ڈبل کیبن باہر نکلیں اور درختوں میں غائب ہو گئیں۔چند منٹ بعد وہ ہمیں اس پہاڑی رستے پر دکھائی دینے لگیں جس طرف سے ہم چل کر آئے تھے۔بلندی سے نیچے اتر کر چاروں گاڑیاں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔

”خاں صاحب!...... مجھے تو لگتا ہے وہ کمینہ یہاں سے نکل گیا ہے۔“

”میں بھی تمھارے ساتھ متفق ہوں۔“ سردار نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے منہ بنا کر کہا۔”گویا یہاں آنا بے کار گیا؟“

”نہیں......حویلی کا جائزہ تو لے لیا نا...... بلکہ میرا تو مشورہ ہے اندر گھس کر بھی دیکھ لیتے ہیں۔خائستہ گل کے کہنے کے مطابق قبیل خان کے جانے کے بعد یہاں دو تین آدمی رہ جاتے ہیں۔اگر یہ اطلاع درست ہے تو ایک وقت میں ایک آدمی کو ڈیوٹی پر ہونا چاہیے باقی دو آرام کرتے ہوں گے۔اور ایک آدمی کو لاعلم رکھ کر اندر گھسنا تمھارے جیسے چور کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔“

”میں کیسے چور ہوا۔لی زونا کا دل تم نے چرایا ہوا ہے اور چور میں ٹھہرا۔“

”تمھیں کمانڈو والوں نے اتنے طریقے تو سکھائے ہی ہوں گے۔“

”انھوں نے یقیناً بہت کچھ سکھایا ہے لیکن اس سے زیادہ مجھے اپنی یونٹ کے استادوں نے تربیت دی ہے۔“

وہ ہنسا۔”مذاق کر رہا تھا یار!......تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔“

”اللہ کی شان اب پٹھان بھی مذاق کرنے لگ گئے۔“

”اچھا بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اب موریچوں کے ہولوں کا جائزہ لو کیا کوئی حرکت نظر آ رہی ہے۔“

میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔”میں کافی دیر سے ہولوں کا جائزہ لے رہا ہوں لیکن کوئی حرکت نظر نہیں آ رہی۔“

”میرا خیال ہے اپنا سامان اور ہتھیار یہیں چھوڑ کر حویلی کے قریب جا کر دیکھتے ہیں شاید اندر جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ یوں بھی ہمارے پاس پستول موجود ہیں اور میرا خیال ہے گلاک اور بریٹا کی موجودی میں ہمیں کسی رائفل وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”پہلے سامان کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ لیں۔“میں اس سے اتفاق کرتے ہوئے اٹھ گیا۔

ادھ پون گھنٹا کی تلاش کے بعد ہمیں ایک غار مل گیا تھا۔ وہ غار اتنا اونچا ضرور تھا کہ اس میں ہم سر جھکا کر کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہاں پتھروں سے بنا عارضی چولھا اور اس میں پڑی راکھ ہمیں یہ باور کرانے کے لیے کافی تھی کہ اس غار کو پہلے بھی کوئی انسان استعمال کر چکا ہے۔ لیکن وہ راکھ کافی پرانی تھی گویا یہ مہینوں پہلے کسی نے آگ جلائی تھی۔

اپنے سفری تھیلے اور ہتھیار وہاں چھوڑ کر ہم غار سے باہر نکل آئے۔ صرف پستول ہم نے اپنے پاس رہنے دیے تھے۔ البتہ میں نے چھوٹی سی طاقتور دوربین بھی تھیلے سے نکال کر جیب میں ڈال لی تھی۔ ایک ہلکی چادر ہم نے مقامی لوگوں کے انداز میں سر پر پگڑی کے طور پر باندھی اور اس کا ایک طرف سے لٹکتا ہوا پلو ہم نے اپنے چہروں کے گرد اس طرح لپیٹا، کہ پلو نے نقاب کی طرح ہمارا چہرہ چھپا لیا تھا۔ حویلی کے قریب پہنچ کر ہم نے

درختوں کی آڑ میں رہتے ہوئے داخلی دروازے کا جائزہ لیا۔مضبوط لکڑی کا دروازہ جس پر سرخ اور سبز رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔کسی قسم کی حرکت نہ ہوتی دیکھ کر میں نے دونوں مورچوں کا جائزہ لیا مگر وہاں بھی سکون نظر آیا۔

ہم جنوب کی جانب سے ایک چکر کاٹ کر حویلی کی عقبی جانب پہنچے عقبی جانب کی دیوار تو باقی تینوں دیواروں سے کم بلند تھی لیکن اس پر کانٹا دار تار اس انداز میں لگی ہوئی تھی اس کو کاٹے بغیر اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ہم نے پہاڑی ڈھلان پر چڑھ کر دوربین سے سامنے کی دیوار میں موجود مورچوں کا جائزہ لیا لیکن مورچوں میں سنتری موجود نہیں تھا۔دونوں مورچوں کے نیچے پختہ کمرہ بنا ہوا تھا۔اور کمرے کی چھت پر چڑھنے کے لیے لوہے کی ایک مضبوط سیڑھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔مورچوں کا دروازہ مغربی دیوار میں بنا ہوا تھا۔ان دروازں میں کواڑ موجود نہیں تھے۔اگر ان مورچوں میں کوئی ایک آدمی بھی موجود ہوتا تو ہم اس ڈھلان پر بیٹھے ہوئے آسانی سے نظر آ گئے ہوتے۔

میں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔''میرا خیال ہے اندر داخل ہونے کے لیے جنوبی دیوار مناسب رہے گی۔''

''انتظار کس بات کا ہے۔''سردار فوراً جنوبی دیوار کی جانب بڑھ گیا۔

''میں اندر جاؤں گا اور تم اسی دیوار کے مشرقی کونے پر میرے اشارے کا انتظار کرنا۔اگر مجھے تمھاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمھیں اندر بلا لوں گا ورنہ تم باہر نگرانی کرتے رہنا۔''

''میرا خیال ہے سینئر ہونے کے ناتے یہ فیصلہ کرنا میرا حق بنتا ہے کہ اندر کون جائے گا اور باہر نگرانی کا کام کون سر انجام دے گا۔''سردار فوراً معترض ہوتا ہوا بولا۔

میں نے پوچھا۔''پتا ہے پٹھانوں کی سب سے بری عادت کون سی ہوتی ہے؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔''تمھارے بہ قول تو پٹھانوں کی ساری عادات ہی بری ہوتی ہیں۔''

''ہاں،مگر اب میں سب سے بری عادت کا پوچھ رہا ہوں۔''

''میں تو یہ کہتا ہوں اپنے ساتھی کو خطرے کا سامنا کرنے دینے کے بجائے اپنی ذات کو پیش کرنا اچھی عادت ہے۔''

''بالکل درست جواب......اسے کہتے ہیں پٹھانی مزاج۔اب ذرا یہ بتاؤ کیا تمھارا نشانہ مجھ سے بہتر ہے؟''

”نہیں......“اس نے نفی میں سر ہلایا۔
”کیا تمھارے پاس سائیلنسر لگا پستول موجود ہے؟“
”نہیں۔“اس نے اس مرتبہ بھی اپنا سر دائیں بائیں ہلا دیا تھا۔
”کیا تم جسمانی لڑائی بھڑائی میں مجھ سے بہتر ہو؟“
اس نے حسب توقع کہا”نہیں۔“
”کیا تمھیں معلوم ہے کہ اندر جا کر کرنا کیا ہے؟“
وہ سوچتے ہوئے بولا۔”اس بارے تو ہم نے مشورہ ہی کوئی نہیں کیا۔“
میں نے آخری سوال پوچھا۔”اب بتاؤ......اندر کیسے جانا چاہیے؟“
”تمھی ہی مرو۔“منہ بناتے ہوئے اس نے دیوار سے پیٹھ ٹیکی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر دونوں ہاتھ اپنے سامنے پکڑ لیے۔

میں نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں پر ایک پاؤں رکھا اور دوسرا پاؤں اس کے کندھے پر رکھ کر میں نے دیوار کا اوپری کنارہ پکڑا اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔اس چوڑی دیوار پر الٹا لیٹ کر مجھے تمام حویلی کا اندرونی منظر نظر آ رہا تھا۔داخلی گیٹ کے جوانب میں دو چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔کمروں کے ساتھ ہی سامنے کے رخ یعنی مشرقی دیوار کے ساتھ دونوں جانب گاڑیوں کی پارکنگ بنی ہوئی تھی۔پختہ اینٹوں کے ستونوں پر لوہے کی چادروں کی چھت تھی۔اس وقت وقت بھی جنوبی طرف کی پارکنگ میں سفید رنگ کی ایک سنگل کیبن ٹویوٹا کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک بڑا ٹینکر کھڑا تھا جس میں یقیناً حویلی کی ضروریات کا پانی لایا جاتا ہوگا۔سامنے کی دیوار کے دونوں کونوں میں بھی ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کی چھت پر دونوں مورچے بنے ہوئے تھے۔شمالی دیوار میں مورچے والے کمرے کے ساتھ دو غسل خانے اور دو بیت الخلاء بنے نظر آ رہے تھے۔یقیناً یہ ملازموں کے لیے بنائے گئے تھے۔جبکہ جنوبی دیوار میں ایک باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔اس کے ساتھ حویلی کا وسیع صحن تھا۔جس میں کسی بھی قسم کے شغل میلے کے لیے کافی گنجائش موجود تھی۔خائستہ گل کے بہ قول وہ جو ناچ گانے وغیرہ کی محفل سجاتے تھے اس کے لیے یہ صحن بہت مناسب تھا۔اس کے بعد شمال مغربی دیوار میں ایک

انیکسی جیسی بنی نظر آ رہی تھی۔اس حویلی کے اندر ہوتے ہوئے بھی وہ باقی حویلی سے علیحدہ تھی۔اس کی دو تین فٹ اونچی چار دیواری بھی بنائی گئی تھی جو بانس کی لکڑی کو چیر کر اس کے ٹکڑوں سے بنائی گئی تھی۔معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ خصوصی مہمانوں کے لیے تھی۔یا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ صرف سردار قبیل خان کے استعمال کے لیے ہو۔اس انیکسی اور جنوب مغربی طرف بنی ہوئی حویلی کی اصل عمارت کو ایک برآمدہ آپس میں ملحق کرتا تھا۔میں دو تین منٹ دیوار پر لیٹ کر حویلی کا جائزہ لیتا رہا۔ملازموں کے شمالی کمرے کا دروازہ مجھے کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔باورچی خانے سے اٹھتا ہوا دھواں اس بات کا مظہر تھا کہ کوئی کھانا وغیرہ بنا رہا ہے۔داخلی دروازے کے پاس ایک کرسی رکھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیوار کے سہارے ایک کلاشن کوف کھڑی تھی۔میں جس دیوار پر لیٹا تھا اس کے دو فٹ نیچے کمرے کی چھت بنی ہوئی تھی۔میں آہستہ سے کمرے کی چھت پر اتر گیا۔گو اس کمرے میں کسی کی موجودی بعید از قیاس تھی اس کے باوجود احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا مجھے گوارا نہیں تھا۔دیوار کے ساتھ لگ کر چلتا ہوا میں اس جگہ پہنچا جہاں سے نیچے اتر کر ملازموں کے لیے بنے ہوئے باورچی خانے کا فاصلہ مجھ سے پندرہ بیس گز سے زیادہ نہ ہوتا۔نیچے اترتے وقت میں چھت کی منڈیر پکڑ کر نیچے لٹکا اور پنجوں کے بل کود گیا۔نیچے کودتے ہی میں اسی کونے میں دبک گیا اور اس کے ساتھ کمر سے بندھے ہولسٹر میں رکھا گلاک نائینٹن میرے ہاتھ میں آ گیا۔اس کی نال میں سائیلنسر فٹ کر کے میں آہستہ سے اٹھا میرا ارادہ اندرونی عمارت کا جائزہ لینے کا تھا لیکن میری یا اس ملازم کی بدقسمتی جو اس وقت باورچی خانے سے روٹیوں کا چھابہ اور سالن کا ڈونگا اٹھائے باہر نکلا۔اگر وہ سامنے دیکھتا ہوا ملازموں کے بنے ہوئے کمرے کا رخ کرتا تو یقیناً زندہ بچ گیا ہوتا۔لیکن اس وقت اس نے بغیر کسی وجہ کے ٹھیک اس طرف نگاہ دوڑائی جہاں میں موجود تھا۔

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا۔"ٹھک" کی آواز کے ساتھ گلاک کی مزل نے گولی اگلی اور وہ ماتھے میں لگنے والی گولی کی وجہ سے پیچھے کی طرف گرا تھا۔اس کے نیچے گرنے کے شور سے زیادہ اس کے ہاتھ میں تھامے ڈونگے کے گرنے کا شور ہوا تھا۔

"ہلکا ہمایونا!...... بیا دے سہ غل او کو۔" (اوئے ہمایون پھر کیا گند کر دیا ہے) یقیناً ڈونگے کے گرنے کی آواز اس کمرے تک پہنچ گئی تھی۔آنجہانی ہمایون نے واقعی گند کیا تھا کہ اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کی موت کا بھی سبب

بن گیا تھا۔اب اگر میں انھیں زندہ چھوڑ دیتا تو خود میری میری سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔میں تیز رفتاری سے اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے آواز آئی تھی۔مرنے والے کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر انھوں نے کمرے باہر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

دروازے پر رکے بغیر میں اندر داخل ہوا،ایک آدمی کانوں میں ایئر فون لگائے موبائل فون پر گانا بجانا یا اسی قسم کی کوئی اور چیز سن رہا تھا۔جبکہ دوسرا کلاشن کوف کی بیرل میں راڈ مار کر صفائی کر رہا تھا۔پہلی گولی میں نے اسی کی کھوپڑی میں اتاری۔جبکہ موبائل فون کے ساتھ مشغول آدمی کی تو آنکھیں بند تھیں اس لیے اسے گولی لگنے کے بعد بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔یہ موبائل فون بھی عجیب ایجاد ہے کہ جہاں کال کے لیے سگنل موجود نہ ہوں وہاں بھی لوگ اسے استعمال کیے بنا نہیں رہ سکتے۔ایک چھوٹی سی مشین جس میں درجنوں سسٹم موجود ہیں۔وزیرستان میں جہاں موبائل فون کی سروس نہیں ملتی وہاں بھی میں نے زیادہ تر نوجوانوں کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھے ہیں۔

خائستہ گل کے کہنے کے مطابق قبیل خان کی غیر موجودی میں وہاں دو سے تین محافظ موجود ہوتے ہیں۔اور تین آدمیوں کو میں ختم کر چکا تھا۔میں وہاں سے نکل کر اس علیحدہ عمارت کی طرف بڑھ گیا جس کی چاردیواری میں بانس کی لکڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔وہی جگہ مجھے اس حویلی میں سب سے اہم نظر آ رہی تھی۔ایک بار تو میرا ارادہ ہوا کہ سردار کو بھی بلالوں مگر پھر یہ سوچ کر کہ وہ باہر کی نگرانی کر رہا ہے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اپنے تئیں میں تمام محافظوں کا خاتمہ کر چکا تھا اس لیے پستول میں نے بے پرواہی کے انداز میں پکڑا ہوا تھا۔بانسوں کی لکڑیوں کی بنائی ہوئی چاردیواری کے بیچوں بیچ ایک راستہ اندر کی طرف جا رہا تھا جس کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔اس رستے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا اس کے ساتھ ہی لکڑی کا بھورے رنگ کا منقش دروازہ تھا۔

دروازے کے ہنڈل کو ہاتھ سے نیچے کرتے ہوئے میں نے دروازے کو دھکیلا دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔اندر خوب صورت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔اس کے اوپر چاروں اطراف میں صوفہ سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ہر صوفہ سیٹ کے سامنے شیشے کی ٹیبل پڑی تھی۔جبکہ صوفوں کے دونوں پہلوؤں پر شیشے کی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں

۔وہ سٹنگ روم کافی وسیع تھا۔تین اطراف کی دیواروں میں شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن پر دبیز اور خوش رنگ پردے لٹکے ہوئے تھے،جبکہ مغربی دیوار میں ایک گیلری کا راستہ نظر آرہا تھا۔صوفوں کے پیچھے بھی کافی جگہ خالی پڑی تھی۔میں اسی گیلری کی طرف بڑھا۔گیلری کے دونوں جانب دو کمروں کے دروازے تھے۔اس عمارت کے تمام دروازے بھورے رنگ کے تھے جن پر دیدہ زیب نقش نگاری کی گئی تھی۔ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس دروازے کو کھولوں،کہ اچانک شمالی جانب موجود کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔وہاں سے برآمد ہونے والا چہرہ ایک خوب صورت اور دلکش لڑکے کا تھا اس کی عمر سولہ سترہ سال کے قریب ہوگی،اس نے ہاتھ میں کلاشن کوف پکڑی ہوئی تھی،ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر اچھل پڑے تھے۔

میں نے ایک دم اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑی کلاشن کوف کی بیرل ڈنڈے کی طرح میرے ہاتھ پر دے ماری،پستول میرے ہاتھ چھوٹ کر دبیز قالین پر جا گرا۔میں نے پستول سنبھالنے کے بجائے فوراً اس کے کلاشن کوف والے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر رسید کی،کلاشن کوف بھی پستول کے پاس پہنچ گئی تھی۔اس نے ایک دم جھک کر میرے پیٹ میں ٹکر ماری میں کولھوں کے بل نیچے گرا اور مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا،لیکن اس وقت ہلکی سی سستی بھی مجھے موت سے ہم کنار کرسکتی تھی۔میرے گرتے ہی وہ کلاشن کوف اٹھانے کے لیے جھکا اور میں نے لیٹے لیٹے ہی اس کے دائیں پہلو پر زوردار لات رسید کردی۔وہ کلاشن کوف کو پکڑ چکا تھا۔میری لات کھاتے ہی دیوار سے ٹکرایا۔اس کے سنبھلنے تک میں اگلی ٹھوکر میں اس کی کلاشن کوف پر مار چکا تھا۔گن ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھ سے گر گئی۔کلاشن کوف اٹھانے کا خیال ترک کرتے ہوئے اس نے خالی ہاتھ ہی مجھ پر حملہ کردیا۔اپنا بایاں بازو گھماتے ہوئے اس نے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔میں نے اپنا سر ذرا سا پیچھے ہٹایا اس کا زوردار مکا میری چھاتی میں پڑا میں بے ساختہ دو قدم پیچھے ہوگیا تھا۔ایک مکا مار کر وہ رکا نہیں تھا بلکہ مسلسل میرے چہرے کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے ہاتھ چلا رہا تھا۔اس کے مشینی انداز میں چلتے ہوئے ہاتھ مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھے کہ وہ لڑائی کی اچھی خاصی شد بد رکھتا ہے۔

ایک دو قدم پیچھے لیتے ہوئے میں گیلری سے نکل کر ڈرائینگ روم میں آگیا۔وہ بھی مکے مارتا ہوا میرے

ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ ڈرائینگ روم میں آتے میں نے جھکائی دے کر اس کا مکا خطا کیا اور اس کے ساتھ میری زور دار لات اس کے پیٹ میں لگی ۔وہ کولہوں کے بل نیچے گرا، اس کے خوب صورت اور دلکش چہرے پر اذیت بھرے اثرات نمودار ہوئے جن پر قابو پانے میں اسے دیر نہیں لگی تھی ۔ نیچے گرتے ہی وہ فوراً اٹھا اسی وقت میں نے دائروی مکا گھما کر اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ اگر وہ اسی جگہ پر لگ جاتا تو یقیناً اسے بے ہوش ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔لیکن ایک قدم پیچھے لیتے ہوئے اس نے میرے حملے کو ناکام بنایا اور اس کے ساتھ ہی ایک زور دار لات میرے پیٹ میں رسید کر دی ،ٹھیک اسی جگہ جہاں اس نے سر کی ٹکر رسید کی تھی ۔میرے نیچے گرتے ہی اس نے چھلانگ لگا کر اپنی بائیں کہنی سے میری چھاتی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی اگر اس کی کوشش کامیاب ہو جاتی تو آج شاید میں کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ بچا ہوتا۔ سرعت سے کروٹ بدلتے ہوئے میں نے اس کی کہنی کے ضرب سے خود کو بچایا۔ اس کی کہنی دبیز قالین پر لگی تھی ۔جس شدت سے اس نے مجھے کہنی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی اگر نیچے قالین نہ ہوتا تو اس کی کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوتی ۔لیکن قالین کی وجہ سے اسے زیادہ ضرب نہیں آئی تھی ۔اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے دوبارہ کروٹ بدلتے ہوئے اسے چھاپنے کی کوشش کی مگر اس نے فوراً سیدھا ہوتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں اکٹھی کر کے میرے پیٹ میں ٹیکیں اور مجھے دیوار کی طرف اچھال دیا۔ میری پیٹھ زوردار انداز میں دیوار سے ٹکرائی لیکن اپنا سر میں دیوار سے ٹکرانے سے بچا گیا تھا۔ میرے سنبھلنے تک وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، ہم ایک مرتبہ پھر آمنے سامنے تھے۔اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں غیض وغضب ہلکورے لے رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنا خوب صورت لڑکا اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ یقیناً وہ قبیل خان کا کوئی خاص پرزہ تھا۔اس علاقے میں ایک بڑی بیماری خوب صورت اور بے ریش لڑکوں کا شوق رکھنا بھی ہے ۔شاید قبیل خان کو بھی کوئی ایسا ہی مرض لاحق تھا۔

اس نے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا اور ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوا، لیکن اب میں سنبھل چکا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اس کے سرعت سے چلائے گئے مکوں سے خود کو بچاتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی، لیکن تیزی میں اس کے بازو کے بجائے اس کی قمیص کا گریبان میرے ہاتھ میں آ گیا

۔گریبان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے میں نے اسے زور سے گھما کر دیوار پر مارنے کے لیے اپنی جانب کھینچا۔اسے بھی میرے داؤ کے بارے معلوم ہو گیا تھا۔اپنے پاؤں زمین پر جماتے ہوئے اس نے اپنا گریبان میرے ہاتھوں سے چھوڑانے کی تگ ودو کی اور اس کے ساتھ ہی۔''چر۔'' کی آواز کے ساتھ اس کی قمیص سامنے سے پھٹتی چلی گئی۔گریبان پر میری گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ لڑکھڑا گیا تھا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ایک قدم آگے لیتے ہوئے میں نے اس کی ٹھوڑی پر دائروی مکا جڑ دیا۔وہ لہرا کر منہ کے بل قالین پر گر گیا۔

میں گہرے سانس لے کر اپنے غصے اور پھولتی سانسوں کو قابو کرنے لگا۔اس وقت مجھے سختی سے یہ خیال آرہا تھا کہ میں نے صرف ہتھیار پر انحصار کرنا شروع کر دیا تھا، حالانکہ میں جسمانی لڑائی کی باقاعدہ تربیت لے چکا تھا۔بلکہ یہ تربیت تو ہر سنائپر کو دی جاتی ہے یہ اور بات کہ نشانہ بازی کی طرح جسمانی داؤ پیچ میں بھی کوئی زیادہ اچھا ہوتا ہے اور کوئی بس گزارا کرتا ہے۔میں الحمد اللہ اپنے تمام ساتھیوں پر اس لحاظ سے بھی فائق تھا۔میں نے ارادہ کر لیا کہ فارغ اوقات میں سردار کے ساتھ اس کی مشق کیا کروں گا۔

سانس بحال ہوتے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔وہ مجھے قبیل خان کے بارے کافی قیمتی معلومات پہنچا سکتا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی وجہ سے میں قبیل خان کو بلیک میل کر سکتا۔

کمروں کی تلاشی لینے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ اسے باندھ دوں۔اور اس کے باندھنے کے لیے اس کی پھٹی ہوئی قمیص سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔

اس کے پاس اکڑوں بیٹھتے ہوئے میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے لگا کسی نے میرے سر پر بم پھوڑ ڈالا ہو۔اس کے عریاں بالائی جسم پر نظر پڑتے ہی میرا سانس رکنے لگا تھا۔وہ لڑکا نہیں بلکہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔لڑکوں والے کپڑے،لڑکوں ہی طرح چھوٹے بال، حالانکہ اس علاقے میں تو مرد بھی عورتوں کی طرح لمبے بال رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔سب سے بڑھ کر اس کی ناک اور کان میں زیور وغیرہ ڈالنے کے لیے کوئی چھید موجود نہیں تھا۔

میں زیادہ دیر اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور فوراً اسے اوندھے منہ لٹا دیا۔اس کے ہاتھ ہی اس کی قمیص کو تین چار ٹکڑوں میں تبدیل کر کے ان لمبی پٹیوں سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے۔اس طرف سے فارغ ہو

کر میں نے گردن کی ایک مخصوص رگ کو دبا کر اس کی عارضی بے ہوشی کی طوالت کو بڑھا دیا تھا۔

اب تو مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ وہ قبیل خان کی رکھیل تھی۔ اور اسی کے حکم پر مردانہ حلیہ بنایا ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مردانہ حلیے میں گھومنا اس کا اپنا شوق ہو۔ اسی وجہ سے اس نے لڑائی بھڑائی میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ایک گمان مجھے یہ بھی ہوا کہ وہ اس کی دوسری بیوی نہ ہو، لیکن پھر میں نے سختی سے اس گمان کو رد کر دیا۔ کیونکہ ایک تو وہ بہت کم سن تھی، دوسرا بیویوں کو گھر میں رکھا جاتا ہے عیش و آرام کے اڈے پر نہیں، تیسرا اس کے نقوش خائستہ گل سے بالکل نہیں ملتے تھے جس کے بارے سنا تھا کہ وہ قبیل خان کی دوسری بیوی کا بھائی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے بھائی کی موت پر اس کے یہاں رہنے کی کوئی تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے تو علام خیل میں ہونا چاہیے تھا۔

بہر حال اس بارے سوچنے کا بہت وقت ملنا تھا فی الحال میں نے وہاں کی تلاشی لینا تھا۔ اس گیلری کے دائیں بائیں صرف دو کمرے تھے۔ میں اسی کمرے میں گھس گیا جہاں سے وہ باہر نکلی تھی۔

وہ ایک پر تعیش خواب گاہ تھی۔ کمرے کے وسط میں لکڑی کا ڈبل بیڈ پڑا تھا جو بھوری پالش سے چمک رہا تھا۔ اس پر تہہ کیا ہوا گہرے نیلے رنگ کا خوب صورت کورین کمبل رکھا تھا۔ گہرے نیلے رنگ ہی کی بیڈ شیٹ اور تکیوں کے غلاف تھے۔ کھڑکیوں کے پردے بھی اسی رنگ کے تھے۔ البتہ کمرے کی چاروں دیواروں میں ہر دیوار مختلف رنگ کے ڈسٹمبر میں رنگی ہوئی تھی۔ میں جلدی جلدی کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ لیکن وہاں کوئی کام کی چیز مجھے نہ مل سکی۔ بس عیاشی کا مختلف سامان بھرا تھا۔ ایک مکمل الماری تو مختلف قسم کی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز وغیرہ کھنگالنے کے بعد میں دوسرے کمرے میں گھس گیا وہ بھی ایک خواب گاہ ہی تھی۔ وہاں ایک الماری میں مردانہ لباس ٹنگے ہوئے دیکھ کر میں نے ایک قمیص اتار کر اپنے پاس رکھ لی تھی، کیونکہ اس لڑکی کا کردار کیسا ہی کیوں نہیں تھا مجھے میرا اخلاق یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ اس پر قابو پانے کے بعد میں اسے برہنہ حالت میں پھراتا رہتا۔

دوسرے کمرے نکل کر میں نے گیلری کے آخری کونے تک جا کر دیکھا۔ وہاں بھی ایک کھڑکی بنی ہوتی تھی۔ قریب پہنچنے پر مجھے کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دکھائی دیا۔ دبیز پردے کی وجہ سے ٹوٹا ہوا شیشہ دور سے نظر نہیں آ رہا تھا

۔واپس ڈرائینگ روم میں آ کر میں نے اس لڑکی کی ہاتھ کی بندشیں کھولیں اور اسے قمیص پہنا کر دوبارہ اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔وہاں سے نکل کر میں نے دوسری عمارت کا بھی سرسری جائزہ لیا لیکن کام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔دوسرے کمروں کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔پہلے بھی بڑی مشکل سے بچ پایا تھا کہ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی نے مجھے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ممکن تھا کہ کسی اور کمرے اس سے بھی بڑی آفت متھے لگ جاتی۔

عمارت کے باقی کمروں میں بھی بس ضرورت ہی کا سامان رکھا ہوا تھا۔کمروں کا جائزہ لیتے ہی میں نے داخلی دروازے کی ذیلی کھڑکی کھول کر سردار کو اندر بلالیا۔

''سردار!......اس کمرے میں سنگل کیبن کی چابی یا تو دیوار سے لٹکی ہوگی یا کسی لاش کی جیب میں ہوگی۔وہ چابی اور وہاں رکھے ہتھیار اٹھا کر سنگل کیبن میں رکھو میں آتا ہوں۔''مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ کر کے میں اس لڑکی کو اٹھانے چل پڑا۔

میری واپسی تک سردار بھی ٹویوٹا کی چابی اور تین کلاشن کوفیں اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔

''یہ کون ہے؟''اس نے میرے کندھے پر اٹھائی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

اس لڑکی کو ٹویوٹا کی باڈی میں رکھتے ہوئے میں نے جواب دیا۔''یہ بہت خاص پرزہ ہے،یوں سمجھو قبیل خان تک پہنچنے کی چابی ہے۔''

اس پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ سردار کے منہ سے نکلا۔''یارا!......دا خوڈیرا خلی ہلک دے۔''(یار،یہ تو بہت خوب صورت لڑکا ہے)

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''ویلے خو مے دی چہ دا اسپیشل شیے دے۔''(کہا تو ہے کہ یہ خاص چیز ہے)

''اس کا مطلب ہے قبیل خان بھی لونڈوں کا شوقین ہے۔''سردار نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''خان صاحب!......پٹھانوں والی بات نہ کرو،یہ لڑکی ہے۔''

''کیا؟''اس نے حیرانی سے ایک مرتبہ پھر اس لڑکی کا جائزہ لیا۔''لیکن اس نے حلیہ تو بالکل لڑکوں والا بنایا

ہوا ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔"حلیے کو چھوڑو، چہرے کے نقوش پر غور کرو۔"

"تو اب اسے لے کر کہاں جا رہے ہیں؟" میرے ساتھ بیٹھنے کے لیے اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔

اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں نے پوچھا۔"دروازہ کون کھولے گا؟"

"دروازہ واپس بند کرتے ہوئے وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔"جونیئر ہونے کے ناتے دروازہ کھولنا تو تمھیں چاہیے تھا۔لیکن کیا کریں آج کل تو سینئر جونیئر کی تمیز ہی نہیں رہی۔"

میں زیر لب مسکراتے ہوئے گاڑی سلف گھمانے لگا۔گاڑی سٹارٹ کر کے میں نے پیچھے لے جا کر داخلی دروازے کی سیدھ میں کی اس وقت تک وہ دروازہ کھول چکا تھا۔میں نے جونہی گاڑی باہر نکالی وہ دروازہ بند کر کے میرے پاس آن بیٹھا۔

"اب بتاؤ اس مصیبت کو کہاں لے جانا ہے۔"

"جہاں اپنا سامان رکھا ہے وہاں لے جا کر پوچھ گچھ کرتے ہیں اگر مناسب لگا تو اس کے ذریعے قبیل خان کو بلیک میل بھی کیا جا سکتا ہے۔"

سردار نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ویسے اس کی شکل وصورت کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ ہم قبیل خان کو ٹھیک ٹھاک دھچکا پہنچا چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔"یہ تو اس سے بات چیت کرنے پر معلوم ہوگا۔"

درختوں سے بچنے کے لیے مجھے مسلسل اسٹیئرنگ گھمانا پڑ رہا تھا۔راستہ بھی ناہموار تھا کہ گاڑی کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔گاڑی کو غار کے دہانے تک لے جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ غار ڈھلان پر بنی ہوئی تھی۔غار کے دہانے کے متوازی گاڑی روک کر میں نے سردار کو کہا۔

"گاڑی واپس لے جاؤ اور دونوں گاڑیوں کے آئل ٹینک میں سوراخ کر کے تیل نکال کر وہاں موجود تمام سامان اور گاڑیوں کو آگ لگا دو اب جبکہ اس کے محافظوں کی موت کے بعد یہ بات کھل گئی کہ اس عمارت تک ہم پہنچ گئے ہیں تو قبیل خان کا کچھ نقصان کرنا تو بنتا ہے۔"

''یہ کام مجھے واقعی پسند ہے۔'' سردار خوشی سے چہکتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
گاڑی سے اتر کر میں نے لڑکی کو کھینچ کر نیچے اتارا اور لڑکی والی اور باقی تین محافظوں والے ہتھیار بھی گاڑی سے اتار کر نیچے رکھ دیے۔سردار گاڑی کو موڑ کر دوبارہ قبیل خان کی حویلی کی جانب بڑھ گیا جبکہ میں اس لڑکی کو کندھے پر اٹھا کر اوپر چڑھنے لگا۔غار کے دہانے کے سامنے کافی درخت موجود تھے جن کے عقب میں دہانہ بالکل چھپا ہوا تھا۔لڑکی کو غار میں لٹا کر میں دوبارہ نیچے پہنچا اور تمام ہتھیار بھی وہاں اٹھا لایا۔لڑکی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔اسے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا کر میں نے تھیلے سے پانی کی بوتل نکال لی۔آدھی بوتل اپنے معدے میں اتار کر میں نے باقی پانی اس کے منہ پر انڈیل دیا تھا۔اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں ۔ہوش میں آتے ہی وہ ایک طرف لڑھک گئی۔اسے دوبارہ بازو سے پکڑ کر میں نے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا ۔گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے نفرت بھری نگاہیں میرے چہرے پر ڈالیں۔اس وقت میری آنکھوں سے پھوٹنے والی نفرت بھی کچھ کم درجے کی نہیں تھی،نا معلوم کیوں مجھے اس پر حد سے زیادہ غصہ آرہا تھا۔
''تمھارا نام؟''میں نے اس کی شعلہ بار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پہلا سوال کیا،مگر وہ ہونٹ بھینچے اسی انداز میں مجھے گھورتی رہی۔
میرا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے گھوما۔''چٹاخ۔'' کی آواز کے ساتھ اس کا بایاں گال سفید سے سرخ ہو گیا تھا ۔وہ دائیں طرف لڑھک گئی تھی۔اس کے بوائے کٹ بالوں کو بے دردی سے پکڑ کر میں نے دوبارہ سیدھا بٹھایا۔
''تم سے نام پوچھا ہے۔''میں نے زہر خند لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔لیکن وہ اسی طرح شعلہ بار نظروں سے مجھے گھرتی رہی اس کی آنکھوں میں موجود نفرت دو چند ہو گئی تھی۔اس کے چہرے پر مجھے ذرہ بھر بھی خوف کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔
اسے خاموش پا کر میرا دایاں ہاتھ دوبارہ گھوما۔اور پھر میں اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا،تین چار تھپڑ میں نے ایک تسلسل سے اس کے گالوں پر جڑ دیے تھے۔لیکن اس مرتبہ اس نے خود کو لڑھکنے سے بچائے رکھا۔میرے تھپڑوں کا تسلسل رکتے ہی اس نے منہ میں جمع خون ایک جانب تھوکا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی۔
مجھے اس کی دلیری پر حیرانی ہو رہی تھی۔ایسی فاحشہ عورتیں تو حد درجہ کی بزدل اور ڈرپوک ہوتی ہیں ذرا سی

دھمکی پر تھر تھر کانپنے لگ جاتی ہیں مگر اسے میرے اتنی شدت سے مارے گئے تھپڑوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔
میں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔
''شاید تمھیں عزت راس نہیں ہے۔تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ میرے ہر سوال کا بے چوں و چراں جواب دے دو۔''
اس نے آنکھیں کھول کر حقارت بھری نظر مجھ پر ڈالی اور غار کے کھلے دہانے کی جانب دیکھنے لگی۔
مجھ پر جیسے دورہ سا پڑ گیا تھا۔میں نے اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔''چٹاخ چٹاخ۔'' کی آواز سے غار کی اندرونی فضا گونج اٹھی تھی۔یقیناً اس کے چہرے کو کافی پزیرائی ملتی رہی ہو گی لیکن اس وقت وہ اس آدمی کے سامنے تھی جو عورت ذات سے نفرت کا دعوے دار تھا۔ماہین کی بے راہ روی کے بعد اس طرح کی آبرو باختہ عورتیں تو مجھے اور بھی بری لگنے لگی تھیں۔اور اس لڑکی پر مجھے جو غصہ آ رہا تھا وہ خود میرے لیے حیرانی کا باعث تھا۔شاید ایسی معصوم اور پاکیزہ شکل وصورت والی کی بے راہ روی مجھے طیش میں ڈالے ہوئی تھی۔مسلسل تھپڑ کھا کر وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور ایک جانب لڑھک گئی اس کے بالوں سے پکڑ کر میں گھسیٹ کر غار کی دوسری دیوار کی طرف پھینکا اور اس کے جسم کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے دور لڑھک کر بھی نہیں جا سکتی تھی۔
''نام پوچھا ہے میں نے،نام پوچھا ہے،فاحشہ!'' چند ٹھوکریں کھانے کے بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔پانی کی دوسری بوتل نکال کر میں نے پانی کے دو تین چھینٹے اس کے چہرے پر مارے۔اور اس نے کراہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ایک زوردار تھپڑ کر ساتھ اس کا استقبال کرتے ہوئے میں غرایا۔''جواب دو۔میں کہہ رہا ہوں جواب دو۔'' اس کا بدن تکلیف کی شدت سے آہستہ آہستہ کانپنے لگ گیا تھا۔اسے خاموش پا کر میں نے دوبارہ اس کے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے مخالف دیوار پر دے مارا۔
اذیت بھری آہ منہ سے نکالتے ہوئے وہ اوندھے منہ لیٹ گئی تھی۔اس کی پیٹھ پر دو تین لاتیں رسید کر کے میں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر دوبارہ غار کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔
''میرا خیال ہے تمھیں اذیت ناک موت کو گلے لگانے کا شوق ہے۔''

''اگر اتنے ہی مرد ہو تو ایک بار مجھے آزاد کر کے دیکھو۔'' اس کی آواز میں نفرت، حقارت غصہ، غیض وغضب اور جانے کیا کیا شامل تھا۔

''تو میں نے تمھیں سوتے ہوئے تو گرفتار نہیں کیا۔ ہاتھا پائی کرتے ہوئے تم بے ہوش ہوئی تھیں۔'' یہ کہتے ہی میرا بایاں مکا پوری قوت سے اس کے دائیں جبڑے پر لگا۔ وہ بے اختیار خون تھوکنے لگی۔

''نام کیا ہے تمھارا۔'' میں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

وہ حسبِ سابق خاموش رہی تھی۔ میں اس کے پاس سے اٹھ غار کے دہانے کے پاس پڑی کلاشن کوف کے قریب پہنچا۔ اس کی میگزین اتار کر میں نے تین گولیاں نکالیں اور واپس اس کے قریب پہنچ کر میں نے تینوں گولیاں اس کی پشت پر بندھے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان میں رکھ کر اس کی انگلیوں کی پوروں کو آپس میں ملا دیا۔ اپنے ہونٹ سختی سے آپس میں بھینچتے ہوئے اس نے اس درد کو سہنے کی کوشش کی لیکن کب تک بے اختیار اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں۔

''نام پوچھا ہے؟'' مجھے اس کی سخت جانی دیکھ کر جیسے مزید تپ چڑھ رہی تھی۔

''پپ...... پلوخان!'' اس کے منہ سے گویا بے اختیاری میں پھسلا تھا۔

''بالکل تیرے کردار ہی کی طرح ہی گھٹیا ہے تمھارا نام بھی۔'' کلاشن کوف کی گولیاں اس کی انگلیوں سے نکال میں نے نیچے پھینکیں۔

''علاقہ کون سا ہے تمھارا؟''

''علام خیل۔'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اب اپنے متعلق تمام تفصیل بتاؤ۔'' میں اگلا سوال کیا لیکن وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گئی تھی۔

''سنا نہیں۔'' میرے ہاتھ نے ایک مرتبہ پھر اس کے گال کا مزاج پوچھا۔ مگر وہ خاموش رہی تھی۔ میں نے دوبارہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے غار کے فرش پر پٹخا اور منہ ناک کا خیال کیے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں غلیظ فاحشہ عورت ....'' ہذیان بکتے ہوئے میں نے اسے زدوکوب کرنا جاری

رکھا۔عجیب ڈھیٹ لڑکی تھی، گھٹی گھٹی آواز میں کراہ رہی تھی لیکن میرے سوال کا جواب دینا اسے گوارا نہیں تھا۔

''راجا!......کیا ہو گیا ہے تمھیں۔''اسی وقت سردار غار میں داخل ہوا۔اس نے ہاتھ میں کچھ سامان بھی اٹھایا ہوا تھا، مجھے غصے کی شدت سے کف اڑاتے دیکھ کر اس نے ہاتھ میں پکڑا سامان نیچے رکھا اور فوراً مجھے کھینچ کر اس سے دور لے گیا۔

میں گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟......بتاؤ نا تمھیں ہو کیا گیا ہے۔''سردار کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کچھ نہیں ہوا......وہ فاحشہ کچھ بتانے کو تیار نہیں۔''میں غضب ناک لہجے میں چلایا۔

''تو عورتوں سے پوچھ گچھ کا یہ کون سا طریقہ ہے؟''سردار نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''یہ عورت ہے؟......''میں غصے میں چلایا۔''یہ ایک فاحشہ ہے، عورت کے نام پر دھبا ہے، کلنک کا ٹیکا ہے، یہ......یہ......اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کیا جائے۔''

''کسی عورت کی بے راہ روی اس بات کی متقاضی نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔اور یہ تو معصوم لڑکی ہے، جانے کس بات نے اسے اس غلیظ مرد کی جھولی میں لا پھینکا ہے۔''سردار کو پلو خان کے ساتھ میرے ناروا سلوک پر بہت دکھ ہوا تھا۔''یار راجے!......مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، یقیناً تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔کسی دوسری عورت کی بے وفائی کا بدلہ تم نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی سے لینے پر تل گئے۔''

میں نے بپھرتے ہوئے کہا۔''یہ ایک دہشت گرد کی رکھیل ہے۔یہ بے گناہ اور معصوم کیسے ہو گئی۔''

''دہشت گرد وہ ہے یہ نہیں۔اور اس کی عمر دیکھو کیا تمھیں نہیں لگتا کہ اس اڈے پر یہ کسی مجبوری کی وجہ سے پھنسی ہوئی تھی۔ہو سکتا ہے اس کے کسی سرپرست نے قبیل خان سے رقم لے کر اسے اس کے حوالے کیا ہو؟اس ضمن میں اور بھی کئی توجیہات کی جا سکتی ہیں۔اور پوچھ گچھ کا کوئی طریقہ کار ہوتا ہے۔یقین مانو اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس کے ساتھ یہ سلوک کرو گے تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتا۔''

''چلو تم ہی پوچھ لو۔''غصے بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے پانی کی بوتل اٹھائی اور غٹا غٹ آدھی بوتل پی گیا۔

میرے بوتل کو ایک طرف رکھتے ہی سردار نے پانی کی بوتل اٹھائی اور اوندھے منہ پڑی لڑکی کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور دیوار کے سہارے بٹھاتے ہوئے پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ میں اس منظر سے نگاہیں چرا کر پاؤں پسارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''مجھے افسوس ہے بہن!......اور اپنے ساتھی کے ناروا سلوک کی میں معافی چاہتا ہوں۔'' سردار کا نرم اور نادم لہجہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

اسی وقت میں نے لڑکی کی تیز سسکی سنی میں نے نظریں گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی کا سیلاب رواں تھا۔

سردار نے جیب سے چاقو نکال کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں کی بندشیں کاٹ دیں۔ میں اسے کہنے لگا تھا کہ وہ لڑکی کتنی خطرناک لڑاکا ہے لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اسے روتے دیکھ کر مجھے بھی ندامت محسوس ہوئی مگر پھر اس کے کردار کا خیال آتے ہی مجھے لگا کہ میں نے ٹھیک کیا تھا۔

''اچھا روؤ مت، اب کوئی بھی تمھیں کچھ نہیں کہے گا۔ اگر تم کچھ بھی نہیں بتانا چاہتیں تب بھی خیر ہے۔'' اس کے رونے پر سردار کا دل پسیج گیا تھا۔ دشمن کے لیے رحم کی رمق نہ رکھنے والے پٹھان سے ایک لڑکی کے دو تین آنسوؤں ہی برداشت نہیں ہوئے تھے۔

''وہ میری بہن کا قاتل ہے۔ مہینا بھر اپنے پاس قید رکھ کر وہ میری بہن کو زیادتی کا نشانہ بناتا رہا، جب اس کا دل بھر گیا تو اسے اپنے کتوں کے سامنے ڈال دیا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی، وہ معصوم اتنے وحشیوں کی زیادتی برداشت نہ کر سکی اور جان کی بازی ہار گئی، کیا اب بھی تمھارے لعنتی سردار کو قتل کرنا غلط اور ناجائز ہے۔''

''ہمارا سردار!......کون ہمارا سردار؟'' سردار نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تمھارا ایک ہی تو سردار ہے قبیل خان۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر سردار کے ساتھ میں بھی اچھل پڑا تھا۔ مجھے لگا وہ سردار کو الو بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

سردار نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر قبیل خان تو ہمارا دشمن ہے اور میرا ساتھی تم سے قبیل خان ہی کے تو متعلق پوچھ رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری جانب دیکھا۔

میں نے فوراً کہا۔ ’’بکواس کر رہی ہے یہ، ہمیں الو بنانا چاہتی ہے۔‘‘

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ’’بکواس تم کر رہے ہو گھٹیا انسان!......ایک بندھی ہوئی عورت کو زدوکوب کر کے تم خود کو بڑا تیس مار خان سمجھ رہے ہو نا۔‘‘

’’سردار!......اس کے منہ میں لگام دو ورنہ یہ نہ ہو اس مرتبہ اسے میرے ہاتھوں سے پٹنے سے تم بھی نہ بچا پاؤ۔‘‘

’’اسے چھوڑو، مجھ سے بات کرو۔‘‘ سردار نے میری بات درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ’’تمھارے کہنے کا مطلب ہے قبیل خان تمھاری بہن کا قاتل ہے اور تم اسے قتل کرنے کے لیے حویلی میں گئی تھیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

کیا تم اپنی بات کی وضاحت کر سکتی ہو؟‘‘

’’مجھے اس کے بارے اطلاع ملی کہ وہ اپنے عیاشی کے اڈے پر موجود ہے۔ میں فوراً یہاں پہنچی لیکن اس کے گرد حفاظتی انتظام بہت سخت تھے۔ اس کے قریب پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ میں اسی جنگل میں چھپی رہی۔ جب وہ چلا گیا تو میں اس حویلی کے شمال مغربی کونے سے اندر داخل ہوئی اس حویلی کا نقشہ مجھے ایک ہمدرد نے ہاتھ بنا کر دیا تھا۔ میں اس کی خواب گاہ کا جائزہ لینا چاہتی تھی تاکہ اگلی مرتبہ جب وہ وہاں آ رہا ہو تو اس کی آمد سے پہلے وہاں چھپ جاؤں۔ سامنے والے محافظوں سے بچنے کے لیے میں گیلری کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر داخل ہوئی اور وہاں تمھارے سورما ساتھی سے ہاتھا پائی ہو گئی۔ میں اسے قبیل خان کا آدمی سمجھ رہی تھی۔ ہاتھا پائی کے دوران اسے غالباً کچھ زیادہ ہی چوٹیں لگ گئیں جن کا بدلہ یہ مجھے باندھ کر لیتا رہا۔‘‘

اس کی تفصیل ختم ہوتے ہی سردار مشکوک لہجے میں مستفسر ہوا۔ ’’کیا میرے ساتھی نے تم سے قبیل خان کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔‘‘

نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔ ’’اس نے تو بس میرا نام پوچھا ہے اور مجھے تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔

سردار نے ملامتی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنا نام بتانے پر ہی راضی نہیں تھی تو میں قبیل خان کے متعلق کیا پوچھتا۔''

''اچھا جو کچھ ہوا ہے غلط فہمی میں ہوا ہے۔ میرا ساتھی تمھیں قبیل خان کی ساتھی سمجھ کر تشدد کرتا رہا۔ اس نے سمجھ شاید تم بھی اس کی طرح دہشت گرد ہو۔''

''تمھارے ساتھی سے بڑا دہشت گرد کون ہوسکتا ہے۔'' وہ مجھ پر تپی ہوئی تھی اور دیکھا جاتا تو اس کا غصہ بھی بجا تھا۔

میں نے کہا۔ ''خان صاحب!...... یہ تمھیں الو بنا رہی ہے۔ یہ قبیل خان ہی کی ساتھی ہے۔''

وہ تنک کر بولی۔ ''چلو، میں اس کی ساتھی ہوں، تم میرا کیا بگاڑ لوگے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے والی مار بھول گئی ہو کیا؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''اس وقت میرے ہاتھ پاؤں بندھے تھے، اب ہاتھ لگا کر دیکھو۔''

میں غصیلے لہجے میں سردار کو مخاطب ہوا۔ ''خان صاحب!...... اگر تم اسے لگام نہیں دے سکتے تو پھر مجھ سے گلہ نہ کرنا۔''

سردار نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یار راجا!...... کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔''

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر غار سے باہر نکل گیا۔ دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے کے باوجود میں نہ تو پلو خان سے معذرت کہنے کو تیار تھا اور نہ اپنی غلطی ہی کا اعتراف کرنا مجھے گوارا تھا۔ اس کا نام بھی عجیب سا تھا پلو خان۔ پتا نہیں اس نے مجھے اپنا نام صحیح بتایا بھی تھا یا نہیں۔ سر جھٹک کر میں قبیل خان کی حویلی کی جانب دیکھنے لگا۔ لیکن اس جانب سے مجھے دھواں وغیرہ اٹھتا ہوا دکھائی نہیں دیا حالانکہ میں نے سردار کو واضح طور پر کہا تھا کہ حویلی کو آگ لگا دے۔ ایک دفعہ تو میرا دل چاہا کہ اس طرف خود جا کر آگ لگا آؤں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا کیونکہ ہمارے کام کا اصول یہی تھا کہ جب تک میں سردار سے مکمل تفصیل معلوم نہ کر لیتا میرا اس طرف جانا نہیں بنتا تھا۔

سردار نے غار کے دروازے پر نمودار ہو کر کہا۔ ''راجے!...... کھانا کھا لو۔''

''کھانا؟'' میں نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

”قبیل خان کے آدمیوں نے جو اپنے لیے جو کھانا بنایا تھا میں ساتھ لے آیا ہوں کہ ضائع نہ ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے، تم لوگ کھاؤ مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو سمجھے۔“اس نے قریب آ کر مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔”وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔“

”یار!......کہہ دیا نا کہ بھوک نہیں ہے۔“

”اچھا کھانا نہ کھاؤ لیکن ہمارے ساتھ بیٹھ تو جاؤ نا۔“ زبردستی مجھے اندر دھکیل کر وہ خود باہر سے خشک لکڑیاں اٹھانے لگا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے پتھریلی چھت میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کے ہونٹوں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔سفید چہرہ میرے مارے ہوئے تھپڑوں کی وجہ سے گہرا سرخ ہو گیا تھا۔اس کے چہرے پر چھائے غم کے بادل دیکھ کر میرے دل میں مستور ندامت کے اثرات اور گہرے ہو گئے تھے۔

سردار نے پہلے سے بنے ہوئے پتھروں کے چولھے کے درمیان میں لکڑیاں رکھ کر انھیں آگ لگائی اور اپنے تھیلے سے سٹیل کا کٹورا نکال کر شاپر میں موجود سالن انڈیلنے لگا۔دوسرے شاپر میں روٹیاں بند تھیں۔سالن کا کٹورا آگ پر رکھ کر اس نے پانی کی بھری ہوئی بوتل اور سٹیل کا گلاس بھی تھیلے سے نکال لیا۔سالن گرم ہوتے ہی اس نے درمیان میں سالن رکھ کر کہا۔

”پلوشہ!......آؤ کھانا کھالو۔“

میں نے سوچا۔”تو گویا اس کا نام پلوشہ خان ہے۔شاید مردانہ حلیے کی وجہ سے یہ لوگوں کو اپنا نام پلو خان بتاتی ہو، اسی وجہ سے اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر بھی پلو خان ہی پھسلا تھا۔“

منہ سے کچھ کہے بنا وہ قریب ہو گئی۔صبح ناشتے کے بعد سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا، پورا دن یونھی بھاگ دوڑ میں گزر گیا تھا۔اور اس وقت سورج غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کھانا بنانے والے کے نصیب میں نہیں تھا۔اور کھانا بناتے وقت اس نے یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ یہ کھانا وہ

اپنے قاتلوں کے لیے بنا رہا ہے۔ واقعی انسان بہت بے خبر، انجان اور ناواقف ہے۔ سالوں بعد کے منصوبے بنانے والے کو اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا۔

اگر کھانا لذیز نہیں بھی تھا تو اس وقت بھوک کی شدت نے اسے مزیدار بنا دیا تھا۔

پلوشہ جبڑوں پر لگنے والے مکوں کی وجہ سے نوالہ صحیح طور پر چبا نہیں پا رہی تھی۔ اسی وجہ سے دو تین نوالے لے کر وہ پیچھے ہو گئی۔

سردار نے فوراً پوچھا۔ ''ولے سہ چل دے خورے؟'' (کیوں، کیا بات ہے بہن)

اس نے غصے بھری نگاہ مجھ پر ڈال کر کہا۔ ''کچھ نہیں بھائی!''

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم بغیر بتائے سب کچھ اگل دیتیں، تو ابھی پیٹ بھر کر کھانا بھی کھا لیتیں، یہ سب تمھاری ضد بازی ہی کا نتیجہ ہے۔''

''تم فکر نہ کرو...... قبیل خان کے بعد تمھارا ہی نمبر ہے۔ اسے قتل کر کے میں تمھیں اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گی۔''

میں نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے۔ ''ہاں اس خواہش میں پہلے بھی کافی منوں مٹی تلے آرام کر رہے ہیں ان میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔''

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''اتنے تیس مار خان ہوتے تو ایک لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پر تشدد نہ کرتے۔''

''عجیب بات ہے کہ تم خود کو لڑکی سمجھتی ہو۔'' میں نے اس کے حلیے پر پھبتی کسی۔

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم جیسوں کے لیے میں یقیناً لڑکی نہیں ہوں۔''

''تم لوگوں کو لڑنے کے علاوہ بھی کچھ سوجھتا ہے۔ جب دونوں جانتے ہو کہ یہ لڑائی غلط فہمی کا نتیجہ تھی تو اب پرانی بات کو بھول جانا چاہیے۔ یوں بھی معافی تلافی ہونے کے بعد گزری باتوں کی اہمیت ختم ہو جایا کرتی ہے۔''

''سردار بھائی!...... معافی تلافی کب ہوئی؟'' وہ حیرانی بھرے لہجے میں سردار کو مخاطب ہوئی۔ ''معاف تو میں اسے تب کرتی، جب یہ معذرت کرتا، اپنی غلطی اور زیادتی کا اعتراف کرتا۔ اور یقین کرو میں اس کے بعد بھی

اسے معاف کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ہاں اس کے بعد اتنا ہوتا کہ قبیل خان کو قتل کرنے کے بعد جب اس کی باری آتی تو میں اسے دردناک طریقے سے قتل نہ کرتی ،بس سر میں گولی مار کر جلد از جلد اس کی جان نکال دیتی۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔''ویسے تمھیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ تمھاری زبان کچھ زیادہ ہی تیز چلتی ہے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''وقت آنے پر پتا چل جائے گا کہ میری زبان تیز چلتی ہے یا ہاتھ پاؤں۔''

سردار زچ ہوتے ہوئے بولا۔''یار راجے!......تم ہی چپ کر جاؤ۔''

میں کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بولا۔''کس وقت چلیں گے؟''

سردار نے کہا۔''آج رات تو مشکل ہے۔''

''کیوں ،مروانے کا ارادہ ہے کیا۔''

''نہیں ،پلوشہ کو اکیلا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتے۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہم نے اس کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔یہ شکر کرے کہ اسے قتل کیے بغیر جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔''

''شکر تم کرو کہ سردار بھائی کی وجہ سے تمھاری جان عارضی طور پر بچ گئی ہے۔کہ اب قبیل خان کی موت کے بعد ہی تمھارا نمبر آئے گا۔''

سردار پلوشہ کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔''یہ اکیلی کیسے رہ پائے گی۔اور یہ بھی تو سوچو اس کی حالت کے ذمہ دار ہم دونوں ہیں۔''

میں نے غیض بھری حیرانی سے پوچھا۔''تو کیا جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتی ہم اس کی تیمارداری کرتے رہیں گے۔''

''تمھاری گھٹیا تیمارداری کی مجھے بالکل بھی ضرورت نہیں ہے،البتہ سردار نے مجھے بہن کہا ہے اور بہنوں کا خیال بھائیوں کو رکھنا پڑتا ہے۔''اس کی ہر بات اور ہر جملے میں میری ذات سے نفرت کا اظہار بھرا ہوا تھا۔لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب دل کی گہرائی سے نہیں کہہ رہی۔

''سردار خان!......میں نے تمھیں کہا تھا کہ حویلی کی ہر اس چیز کو تیلی دکھا دو جو آگ پکڑ سکتی ہے،لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔اگر یہ کام تم کرتے تو یقیناً اتنی جلدی لوٹ کر واپس نہ آتے۔شاید اس وقت تک میں اس کی یہ لمبی

زبان بھی کاٹ چکا ہوتا۔اور اس کی یہ گیدڑ بھبکیاں سننے سے بچ جاتا۔"

"راجا صاحب!......وہاں ایک تہہ خانہ بھی موجود ہے جس میں دنیا جہاں کی آئی ای ڈیز اور بارود جمع ہے ۔ٹائم بم اور مختلف بارودی پھندے بھی پڑے تھے۔پس میں نے دو ٹائم بم تہہ خانے میں لگا دیے اور دونوں گاڑیوں کے آئل ٹینک کے ساتھ بھی ایک ایک ٹائم بم لگا دیا۔تمام پر میں نے چوبیس گھنٹے کا وقت سیٹ کر دیا ہے ۔تہہ خانے کے دروازے کے ساتھ میں نے سوئچ نمبر 4 پل مارک ون لگا دیا ہے۔کہ اگر کوئی چوبیس گھنٹوں سے پہلے وہاں آجائے تو ان ٹائم بموں کو پھٹنے سے نہ روک سکے۔"

"ویسے ایک پٹھان سے مجھے قطعاً اس عقل مندی کی توقع نہیں تھی۔"میں نے ہنستے ہوئے اردو میں کہا تاکہ پلوشہ کی سمجھ میں میری بات نہ آسکے۔ویسے ممکن تھا کہ وہ ارود جانتی ہو۔لیکن اس علاقے کی عمومی خواتین اردو زبان سے نابلد ہیں۔اور پلوشہ کے بارے بھی میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ اردو زبان نہیں جانتی۔میری بات پر اس نے کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا تھا۔یہ دیکھ کر تو میرا گمان یقین میں بدل گیا تھا۔ورنہ سردار کے تسلی دینے اور معذرت کرنے کے بعد سے تو وہ ہر فقرے میں مجھے مطعون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں میں جانتا ہوں کہ تم کتنے ایک عقل مند ہو۔اس کا ثبوت ایک بے قصور لڑکی کے زخمی جسم کی صورت میری آنکھوں کے سامنے دھرا ہے۔"سردار نے بھی جواب دینے کے لیے اردو زبان ہی کا سہارا لیا تھا۔

"بہتر ہوگا کہ تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔اور میں اس وقت کوئی بد مزگی نہیں چاہتا۔"میں اٹھ کر غار سے باہر آگیا۔سورج پہاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔ملگجے اجالے میں میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن کوئی ایسی حرکت نظر نہ آئی جو مجھے کسی حفاظتی انتظام کی ترغیب دیتی۔یوں بھی حویلی میں آنے والوں کا دھیان اس طرف نہیں آسکتا تھا۔دشمن کس کو نقصان پہنچا کر وہیں بیٹھا نہیں رہتا۔

اندھیرا گہرا ہونے تک میں غار کے باہر ہی پھرتا رہا اس دوران میں نے کافی لکڑیاں اکٹھی کر لی تھیں۔گو موسم خوشگوار تھا،لیکن رات کے دو تین بجے سردی بڑھ جاتی تھی اس وجہ سے میں نے لکڑیاں اکٹھی کرنا ضروری سمجھا تھا۔

میں لکڑیاں اندر لے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سردار غار کے دہانے پر نمودار ہوا۔"راجا صاحب!......اگر

چائے پینا ہے تو آ جاؤ۔"

میں نے اکٹھی کی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر سے آدھی لکڑیاں اٹھا کر کہا۔"ہاں چائے تو ضرور پیوں گا،تم ذرا لکڑیاں غار کے اندر لے جانے میں میری مدد کرو۔"

سردار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باقی لکڑیاں اٹھالیں۔چولھے میں پہلے والی لکڑیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔ان کی روشنی میں مجھے پلوشہ سلیپنگ بیگ میں گم نظر آئی۔

"یہ مصیبت سوگئی ہے۔"میں سٹیل کے کٹورے سے کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔

"ہاں،میں نے اسے دردکش گولیاں کھلا کر سلا دیا ہے۔"

"کہیں اسے میرے والے سلیپنگ بیگ میں تو نہیں سلا دیا۔"

"مجبوری تھی یارا!......تمھارا سلیپنگ بیگ تھوڑا آرام دہ ہے۔میں نے سوچا اس کی حیثیت ہمارے پاس مہمان کی سی ہے اور پھر یہ لڑکی بھی ہے تو..........."

"شکریہ۔"میں تلخ انداز میں قطع کلامی کرتا ہوا غار کی سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔پلوشہ کی گہری سانسیں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ اسے نیند آ گئی تھی۔

"ویسے راجے یار!......تم ایسے چڑچڑے،بداخلاق اور ظالم تو نہیں تھے۔"سردار میرے ساتھ لگ کر بیٹھتا ہوا دکھی لہجے میں پوچھنے لگا۔

"سردار خان!......جانتے ہو میں نے اپنی بیوی کو طلاق کیوں دی تھی۔"پلوشہ کے نیند میں ہونے کے باوجود میں نے اردو زبان ہی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا۔

"نہیں۔"اس نے نفی میں سر ہلایا۔مجھے اردو میں بات کرتے دیکھ کر اس نے بھی پشتو بولنے سے احتراز برتا تھا۔

"یاد ہے جس دن امریکہ سے لوٹے تھے،ہم کتنے خوش تھے۔تمھیں چنارے بیگم کے پاس جانے کی جلدی تھی اور میں ماہین کے پاس جانے کو بے تاب تھا۔اور اپنے دکھ سکھ کے ساتھی سے ملنے کی لگن ایسی تھی کہ ہم نے گھروں کا رخ کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی تھی۔"

''ایسے لمحات بھولتے تو نہیں ہیں نا یار!''

''سردار شہر سے میں نے اسپیشل ٹیکسی کروا کر گاؤں کا رخ کیا۔اور پھر ابو جان کی نیند خراب نہ کرنے کے خیال سے میں دروازے پر دستک دینے کے بجائے دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا اور جب لاتعداد خواہشوں ،امنگوں اور محبت سے لبریز دل کے ساتھ اپنی خواب کے دروازے پر پہنچا تو خواب گاہ کی لائیٹ جل رہی تھی اور میری بیوی اکیلی نہیں تھی۔میری شریک حیات، میری لاڈلی بیوی، مجھ سے محبت کی دعوے دار، ہزاروں وعدے اور قسمیں کھانے والی ایک اور مرد کی آغوش میں پڑی تھی۔سردار تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس وقت مجھ پر کیا بیتی ہوگی ۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟اس مرد کو قتل کروں، بیوی کی گردن اتاروں، دونوں کو زندہ زمین میں دفن کر دوں یا خودکشی کرنا بہتر ہوگا۔لیکن پھر میں نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا اور ان دونوں کو اسی وقت گھر سے نکال کر بیوی کو طلاق دے دی۔جینیفر کے بارے تم جانتے ہو کہ آخری دن تک وہ مجھ سے محبت کا ڈراما رچاتی رہی۔کس لیے؟......فقط اس لیے کہ میں ایک اچھا نشانے باز تھا اور اس کے سینئرز کو میری ضرورت تھی۔یقین مانو اس کے بعد مجھے عورت ذات سے نفرت ہوگئی، گھن آنے لگی اس ذات کی مکاریوں اور چالبازیوں سے۔بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن ابھی پچھلے دنوں رومانہ نے اس نفرت کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ مجھے شادی پر اکساتی رہی۔آخر کسی کی بیوی تو تھی ناوہ۔یہ ساری باتیں میرے ذہن میں ہر وقت گردش کرتی رہتی ہیں۔درحقیقت پلوشہ کے چہرے میں مجھے ان تینوں خواتین کی جھلک نظر آئی، وہ تینوں جو مجھے پسند ہونے کے باوجود میرے لیے قابل نفرت ہیں۔پلوشہ ان تینوں سے خوب صورت ہے اور اتنی خوب صورت لڑکی کا یوں بے راہ رو ہونا، قبیل خان جیسے شخص کی داشتہ ہونا میرے لیے اتنا تکلیف دہ اور افسوس ناک تھا کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔اس نے بھی تو مجھے حقیقت نہیں بتائی چپ چاپ مار کھاتی رہی۔بعد میں میرا ندامت ظاہر کرنا یا معذرت کرنا کس کام آتا۔تم نہیں جانتے اس معصوم لڑکی کو میں نے کس قدر زدوکوب کیا ہے ۔اس کے پھول سے گالوں پر کتنے تھپڑ مارے ہیں، اس کے ریشمی بالوں کو کس بے دردی سے کھینچا ہے۔''میں ایک لحظے کے لیے رکا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے گویا ہوا۔''ان تینوں خواتین کا بدلہ میں نے اسی سے لے لیا ہے۔اس سلوک کی حق دار وہ تینوں تھیں لیکن اس کا نشانہ ایک معصوم بن گئی جو پہلے سے قبیل خان جیسے غلیظ کی ڈسی

ہوئی تھی۔“

سردار نے غمگین لہجے میں کہا۔”مجھے تمھارے دکھ کا ادراک ہے راجے!...... یقیناً ایک مرد کے لیے سب سے افسوس ناک اور دکھ دینے والی بات اس کی بیوی کی بے وفائی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا بھر کی عورتوں کے ساتھ غلط تعلق رکھنے والا مرد بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کسی غیر کی طرف التفات رکھے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج تم نے جو کچھ کیا جذبات سے مغلوب ہو کر کیا ہے۔ لیکن بعد میں اس معصوم لڑکی کی دل جوئی ہی کے لیے سہی، اس سے معذرت تو کر لینا تھی۔“

”نہیں کر سکتا، کسی عورت سے بھی معذرت نہیں کروں گا۔ اب تو اس صنف سے میری نفرت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔ اس کا کام بنتا تھا کہ مجھے حقیقت بتا دیتی۔“ میری ذہنی رو پھر بھٹک گئی تھی۔ ایک لمحے پہلے میں اسے معصوم گردان رہا تھا لیکن جب سردار نے معذرت کی بات کی تو میرے اندر وہی عورت بیزار ذیشان جاگ اٹھا۔

”اچھا چھوڑو اس موضوع کو۔“ وہ اصرار ترک کرتا ہوا بولا۔”یوں بھی اس نے صبح چلے جانا ہے۔ بعد میں یہ جانے اور قبیل خان جانے۔ ہو سکتا ہم سے پہلے وہ اسی کے ہاتھوں نشانہ بن جائے۔“

”تہہ خانے میں بارود کے علاوہ کچھ نہیں تھا؟“ میں نے فوراً اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے موضوع تبدیل کر دیا۔

”تھوڑا بہت ایمونیشن بھی پڑا تھا۔ البتہ مجھے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اور بارود تو اتنا زیادہ تھا کہ اس حویلی کی کوئی اینٹ بھی سلامت نہیں رہے گی۔“

”اپنی منہ بولی بھائی نما بہن کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا تھا، یہ نہ ہو ہم سے علیحدہ ہوتے ہی پھر اس حویلی میں گھس جائے۔“

”تمھیں بتاتے وقت وہ بھی تو یہ تفصیل سن رہی تھی۔ مجھے نہیں امید کہ وہ ایسی غلطی کر سکتی ہے۔“

”ممکن ہے وہ ہمیں دھوکا دے رہی ہو۔ یقین مانو میں نے تو عورت کے ایسے ایسے روپ دیکھے ہیں کہ اب کسی عورت پر اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“

''نہیں اس کی باتوں میں حقیقت ہے، یوں بھی یہ جس شیشے کو توڑ کر قبیل خان کی خواب گاہ میں گھسی ہے وہ میں دیکھ کر آیا ہوں، صاف نظر آرہا تھا کہ کوئی شخص وہ شیشہ توڑ کر اندر داخل ہوا ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھو کہ بہ قول تمھارے جب اس کا اور تمھارا سامنا ہوا اس وقت تم دونوں ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر تھے۔تو ایسی حالت میں اسے اپنے ہاتھوں میں کلاشن کوف لے کر گھومنے کی کیا ضرورت تھی۔دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہے کہ وہ خود تمھاری طرح حویلی والوں کی دشمن تھی۔اور سب بڑھ کر یہ بات کہ تم نے اس سے قبیل خان کی ذات کے متعلق کوئی سوال ہی نہیں کیا۔''

''اچھا زیادہ طرف داری کی ضرورت نہیں مجھے یقین آ گیا کہ وہ تمھاری منہ بولی بہن ہے۔اب جاؤ آرام کرو مجھے یوں بھی نیند نہیں آرہی۔''

''ٹھیک ہے یار!...... جب نیند آنے لگے تو مجھے جگا دینا۔'' وہ اٹھ کر اپنے تھیلے سے سلیپنگ بیگ نکالنے لگا۔

سردار لیٹنے کے چند لمحوں بعد ہی سو گیا تھا۔دن بھر کی بھاگ دوڑ کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔بیٹھے ہوئے جانے کون کون سے خیالات میرے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ماہین کی بے وفائی، جینیفر کا دوغلا پن، رومانہ کی بے وقوفی، ابو جان کی بہو اور بچے کی خواہش، پھوپھو جان، اپنے موجودہ حالات، اپنی جان کی قربانی دے کر مجھے بچانے والا استاد صادق، مجھے سنائپر اور ہتھیاروں کی سمجھ بوجھ عطا کرنے والا راؤ تصور، استاد عمر دراز اپنا یار اویس اور پھر عجیب و غریب کردار کی مالک پلوشہ۔میں انھی خیالات میں کھویا رہا ۔یہاں تک کہ فضاؤں کا سینہ چیرتی ہوئی آذان کی پرنور آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

گرم چادر اپنے بدن کے گرد لپیٹتا ہوا میں غار سے باہر نکل آیا۔پانی کی چاروں خالی بوتلیں بھی میں نے ہاتھ میں پکڑ لی تھیں۔چھے سات سو گز کے فاصلے پر چشمہ موجود تھا۔ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے میں نے بوتلیں بھریں اور غار میں واپس لوٹ آیا۔

آگ کب کی بجھ چکی تھی، سردار کے لیٹنے کے بعد میں نے آغ جلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی ۔اس وقت اچھی خاصی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔چولھے میں لکڑیاں رکھ کر میں نے لائیٹر سے آگ جلائی اور چادر بچھا کر نماز ادا کرنے لگا۔نماز بھی عجیب شان والی عبادت ہے لگتا ہے انسان نے اپنے رب سے ملاقات کر لی ہو

۔ساری دنیا سے اپنے دکھ درد چھپانے والا انسان اپنا ایک ایک غم، کمی، پریشانی اپنے رب کی بارگاہ میں بیان کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔میں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنی ساری پریشانیاں ،سارے دکھ،ساری مصیبتیں اپنے مالک کے حضور رکھ دیں۔

چادر جھاڑ کر میں نے تھیلے پر رکھی اور چائے بنانے لگا۔اسی وقت سردار کی نیند سے بوجھل آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''کیا ٹائم ہوا ہے؟''

''اگر کوشش کرو تو نماز پڑھ سکتے ہو۔''

''مجھے جگایا کیوں نہیں؟''سلیپنگ بیگ کی زنجیر کھول کر وہ باہر نکل آیا۔

''نیند ہی نہیں آرہی تھی۔''

''اچھا میں نماز پڑھ لوں۔''کہتے ہوئے وہ غار سے نکل گیا۔اس کی واپسی تک میں چائے بنا کر پی بھی چکا تھا۔وہ نماز چشمے کے کنارے ہی پڑھ کر لوٹا تھا۔

اپنے لیے گلاس میں چائے ڈال کر اس نے تھیلے سے بسکٹ نکالے اور ناشتا کرنے لگا۔

''اب کیا ارادہ ہے؟''بسکٹ کو دانتوں سے کاٹ کر اس نے اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لیا۔

''چائے پی کر نکلتے ہیں،تاکہ دھماکے ہونے کے بعد ہم اس علاقے سے کافی دور جا چکے ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے سوئی ہوئی پلوشہ کو آواز دی۔''پلوشے!''

''جی بھائی!''سلیپنگ بیگ سے برآمد ہوتے ہوئے اس نے توبہ شکن انگڑائی لی۔میں اس کے بدن سے نظر چرا کر غار سے باہر دیکھنے لگا جہاں سورج طلوع ہو رہا تھا۔

سردار نے پانی کی بوتل اس کی جانب بڑھا کر کہا۔''منہ ہاتھ دھو لو۔''

پانی کی بوتل لے کر وہ لنگڑاتے ہوئے غار سے باہر نکل گئی۔اس لنگڑاہٹ میں بھی ایک خاص قسم کی روانی نظر آرہی تھی۔مردانہ قمیص اس پر کافی کھلی تھی لیکن وہ بے ڈھنگا لباس بھی اس کی خوب صورتی کو نہیں گہنا سکا تھا۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ لباس کسی بھی فیشن ایبل لباس سے سے زیادہ اس پر جچ رہا تھا۔

ہاتھ منہ دھو کر وہ اندر آئی اور میری چادر اٹھا کر چہرہ خشک کرنے لگی۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ویسے اتنا اخلاق انسان میں ہونا چاہیے کہ کسی چیز استعمال کرنے سے پہلے مالک سے اجازت مانگ لے۔“

”ہاں یہ ہے نا ریشم و کمخواب کی چادر کہ یوں پھبتیاں کس رہے ہو۔ اور بالفرض میں نے یہ گندی چادر استعمال کر بھی لی تھی تو تمھیں ہی اخلاق کا مظاہرہ کر لینا چاہیے تھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سردار کو مخاطب ہوئی ۔”سردار بھائی!...... اگر پانی کی اور بوتل موجود ہے تو میں دوبارہ ہاتھ منہ دھونا چاہوں گی۔“

”پلوشے!...... بے وقوفوں کی سی بات نہ کرو اور چائے پیو۔“

”اگر چائے اس نے بنائی ہے تو مجھے نہ بتانا ورنہ میں پی نہیں سکوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ چوکی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چپ رہنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ عجیب بد مزاج، جھگڑالو اور باتونی لڑکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں یہ کہہ بھی دیتا کہ وہ چائے میں نے بنائی ہے تب بھی وہ چائے پینے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتی۔

سردار نے چائے کا گلاس بھر کر اس کی جانب بڑھایا اور ساتھ تین چار بسکٹ بھی اس کے ہاتھ میں پکڑا دیے ۔عام بسکٹوں کے برعکس یہ کافی موٹے اور لمبے بسکٹ تھے۔ تین چار بسکٹ کھا کر آدمی پورا دن مزید کچھ کھائے بغیر آرام سے گزار سکتا تھا۔

چائے میں ڈبو کر بسکٹ کھاتے ہوئے اس کے جبڑوں پر کوئی زور نہیں پڑ رہا تھا وہ آرام سے سارے بسکٹ کھا گئی۔ اس کے چائے پینے تک ہم اپنا سامان سمیٹ کر سفری تھیلوں میں ڈال چکے تھے۔ قبیل خان کے آدمیوں سے چھینی ہوئی فولڈنگ بٹ کی کلاشن کوفیں بھی ہم نے تھیلوں ہی میں ڈال لی تھیں۔

پلوشہ کی کلاشن کوف اس کی جانب بڑھاتے ہوئے سردار نے پوچھا۔ ”تم نے کہاں جانا ہے؟“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ”فی الحال تو تمھاری مہمان ہوں۔“

میں نے بپھر کر کہا۔ ”ایسا سوچنا بھی مت۔“

”میں سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا کرتی۔ جو کرنا ہو کر گزرتی ہوں۔ ویسے بھی میں نے تم سے نہیں پوچھا ،میں اپنے بھائی کو بتا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، جاؤ اپنے بھائی کے ساتھ۔“ میں ڈریگنو ورائفل کندھے پر اٹھا کر چل پڑا۔

سراد نے لجاجت بھرے لہجے میں مجھے آواز دی۔ ”یار راجے!...... بات تو سنو۔“

میں نے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”جی خان صاحب!“

وہ ملتجی ہوا۔ ”انگور اڈے تک تو یہ ہمارے ساتھ جاسکتی ہے نا؟“

اس نے اردو میں بات کی تھی اس لیے میں بھی اردو ہی میں جواب دیا۔ ”ہم انگور اڈے نہیں جا رہے۔“

”تو کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے لہجے میں حیرانی در آئی۔

”رغزئی۔“

سردار نے کہا۔ ”تو یہ وہاں تک چلی جائے گی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”وہاں سے اس کی مرضی جہاں جانا چاہے۔“

”تم کسی مستند ڈاکٹر سے میرا علاج کراؤ گے، مجھے نیا لباس خرید کر دو گے اس کے بعد شاید میں تمھاری جان چھوڑ دوں۔“

اس کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اردو زبان زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت جانتی ہے۔

میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔ لیکن اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہت ہی نڈر ، بے باک اور بے پرواہانہ انداز کی مالک تھی وہ۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بالکل بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سترہ اٹھارہ سال کی دوشیزہ ہے۔ اس کے برعکس وہ پر اعتماد اور حوصلہ مند مرد لگتی۔ یقیناً کم عمری ہی میں اس نے حالات سے مقابلہ کرنا سیکھ لیا تھا۔

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر چل پڑا۔

”ایک مشورہ تھا سردار بھائی!“ غار سے نکلتے ہوئے وہ سردار کو مخاطب ہوئی۔ اس کی آواز بہر حال اتنی اونچی ضرور تھی کہ میرے کانوں تک پہنچ گئی۔

سردار نے کہا۔ ”بولو۔“

''یہاں سے رغزئی کا فاصلہ قریباً بیس، بائیس کلومیٹر ہوگا۔اور تمام راستہ پہاڑی ہے۔شاید شام کی آزان ہمیں رستے ہی میں ہوجائے۔اس کے برعکس انگوراڈے کا فاصلہ پانچ چھ کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوگا اور وہاں سے رغزئی کے لیے ویگن وغیرہ بھی مل جائے گی۔''

اس کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں تھا۔یوں بھی وہاں سے رغزئی جانے کا ارادہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ میری نظر میں انگوراڈے کے مقابل رغزئی نزدیک تھا۔

''انگوراڈہ پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ آتے وقت ہمیں تیرہ چودہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔''پلوشہ کے بجائے میں سردار کو مخاطب ہوا۔پلوشہ سے بات کرتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہورہی تھی۔

وہ جواب دینے کے بجائے پلوشہ کی جانب دیکھنے لگا۔

''تم لوگ خڑ کلے والی سڑک پر چل کر آئے ہوگے۔وہ گاڑی کا راستہ ہے، ورنہ پیدل جانے کے لیے پانچ چھ کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا۔''

''کس طرف جانا ہوگا؟''اس مرتبہ بھی میں سردار ہی کو مخاطب ہوا تھا۔

وہ سردار کے پوچھنے کا انتظار کیے بغیر گھوڑے کی زین نما ایک پہاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ''ہمیں اس پہاڑی کے دائیں کنارے کی سیدھ لینا ہوگی۔''

میں کوئی تبصرہ کیے بغیر مطلوبہ جانب مڑ گیا۔وہاں تک ہمیں پون گھنٹا لگ گیا تھا۔

پہاڑی کے قریب پہنچتے ہی اس نے کہا۔''پہاڑی کی دائیں ڈھلان پر ہوکر آگے بڑھتے جائیے، پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ ڈھلان عبور کر کے ہم ایک نالے میں اتر گئے۔بیس پچیس منٹ اس نالے میں چلنے کے بعد وہ نالہ انگریزی کے حرف ''وائی'' کی طرح دوشاخوں میں بٹ گیا تھا۔

''بائیں جانب۔''نالے کے سنگم پر مجھے رکتے دیکھ کر اس نے باآواز بلند پکارا۔اس وقت سردار میرے ساتھ چل رہا تھا۔وہ ہم سے چند قدم پیچھے چلتے ہوئے شاید کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔

ہم جونھی بائیں جانب مڑے اس نے دوبارہ آواز دی۔''سردار بھائی!''سردار کے ساتھ بے اختیار میں بھی

مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔
اس نے شہادت کی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دو تین منٹ لگیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک پتھر کی چٹان کے پیچھے غائب ہو گئی۔
ہم چند قدم آگے چل کر دو صاف پتھروں پر بیٹھ گئے۔
''راجے!......ایک بات کہوں۔'' سردار نے موضوعِ گفتگو تبدیل کیا۔ اس سے پہلے ہم ڈ بلاک جا کر وہاں سے بیرٹ ایم 107 کو لانے کی بات کر رہے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ میجر اورنگ زیب نے اب تک اس کا ایمونیشن منگوا لیا ہوگا۔
میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میرے نہ کہنے سے تم نے کون سا باز آ جانا ہے۔''
''مجھے لگتا ہے پلوشہ تمھاری ذات میں خاصی دلچسپی لے رہی ہے۔''
''خان صاحب!......پہلی بات، یہ تمھارا ذہنی خلجان ہے۔ اور دوسرا اس کے بعد میں تمھارے منہ سے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہ سنوں۔''
''اس میں مرچیں چبانے کی کیا ضرورت ہے میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اسے اپنا لو۔'' سردار کو میری بات خاصی محسوس ہوئی تھی۔
''عورت ذات میرے لیے کتنی قابلِ نفرت ہے اس کا اندازہ تمھیں اب تک نہیں ہوا۔''
''اچھا ٹھیک ہے یار چھوڑو اس موضوع کو، یوں بھی تم میں پہلے والے ہنس مکھ، اخلاقی اور ٹھنڈے مزاج والے ذیشان کی کوئی بات ہی باقی نہیں رہی۔''
''میں جا رہا ہوں، اپنی باجی صاحب کو ساتھ لیتے آنا۔'' اخلاق سے عاری لہجے میں کہتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔
اس کے بعد انگور اڈے تک میرے قریب نہیں آیا تھا۔ وہ اور پلوشہ بیس پچیس قدم کا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ وہ نالہ بتدریج گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ نالے کے اختتام پر پہاڑی ختم ہو رہی تھی۔ اور کلومیٹر بھر کے فاصلے پر انگور اڈے کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ پلوشہ ہمیں نہایت مختصر رستے سے وہاں تک

لے آئی تھی۔ گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو دس بجتے دکھائی دیے۔

آبادی شروع ہوتے ہی وہ دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے پلوشہ کی چال میں بھی لنگڑاہٹ کم ہو گئی تھی۔

''کمانڈر نصراللہ خان خوجل خیل کی بیٹھک میں جائیں گے؟'' سردار نے میرے قریب آتے ہی پوچھا۔

''جی ہاں، اور محترمہ کو اب خدا حافظ کہہ دو۔''

''اگر میں سفارش کروں کہ صبح تک یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' میں بپھر گیا تھا۔

سردار نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''یار!...... میرا اتنا حق نہیں بنتا کہ کہ منہ بولی بہن کو ایک دو راتیں اپنے ساتھ رکھ لوں۔''

مجھے احساس ہوا کہ پلوشہ کے بارے میں نے کچھ زیادہ ہی سخت رویہ رکھ لیا تھا کہ اس کی دشمنی میں سردار کی دوستی کو بھی پس ڈال رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر تم مصر ہو تو صبح آخری حد ہے اس کے بعد اگر تم نے اصرار کیا تو میں خود چلا جاؤں گا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

وہ ہماری گفتگو سے انجان بنی دائیں بائیں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمانڈر نصراللہ خان خوجل خیل کی بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے اس نے سردار سے چادر لے کر مفلر کی طرح اپنے چہرے کے گرد لپیٹ لی تھی۔ مجھے لگا وہ کسی سے اپنی شکل چھپانا چاہ رہی ہے۔ اس کا انداز مجھے کافی مشکوک لگا تھا لیکن میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا ۔ بیٹھک کو تالا لگا تھا جس ایک چابی ہمارے پاس بھی تھی۔ تالا کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کنڈی کرتے ہی اس نے چہرے کے گرد لپیٹی چادر کھول لی۔

''سردار نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کمانڈر نصراللہ کو تکلیف دینے کے بجائے بازار سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر اسے معلوم ہو گیا تو بہت برا منائے گا۔''

''تو......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

تو یہ کہ اسے بلا لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے بیٹھک سے باہر نکل کر اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا ۔دروازہ کھولنے والا وہ خود تھا۔ پر تپاک معانقے کے بعد اس نے میری خیر خیریت پوچھی۔

''الحمدللہ محترم!......ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔''

''میرا خیال ہے کھانا لے آؤں۔''

''جی ہاں، اگر تیار ہے تو......''

''بالکل تیار ہے۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی موجود ہے۔''

''خوش آمدید، میری خوش قسمتی۔'' اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

بیٹھک میں آ کر میں نے سردار کو کمانڈر نصر اللہ خان کی آمد کا بتایا۔ پلوشہ نے ایک مرتبہ پھر چہرے کے گرد چادر لپیٹ لی۔ میری طرح سردار کو بھی اس کا یہ فعل عجیب لگا تھا۔ وہ پوچھے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

''چہرہ چھپانے کی کیا ضرورت آن پڑی؟''

وہ اطمینان بھرے انداز میں بولی۔''کیونکہ کمانڈر نصر اللہ خان میرا استاد ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ وہ مجھے پہچان لے۔''

''استاد......'' سردار کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''لمبی کہانی ہے۔'' پلوشہ نے جواب دینے سے گریز کیا تھا۔

اسی وقت کمانڈر کھانے کے برتن لیے نمودار ہوا۔ پلوشہ نظر جھکا کر نیچے دیکھنے لگی۔

سردار سے ہاتھ ملا کر کمانڈر نصر اللہ نے اس کی جانب بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی پلوشہ نے اپنی نظریں جھکائے رکھی تھیں۔ لیکن کمانڈر نصر اللہ نے اس بات پر دھیان دیے بغیر کہنے لگا۔

''آپ لوگ کھانا کھائیں، میں قہوہ لے کر آتا ہوں۔''

میں نے کہا۔''آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوں نا۔''

''نہیں، میں کھا چکا ہوں۔ دن کا کھانا میں دس بجے تک کھا لیتا ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

پلوشہ کے جبڑوں میں ابھی تک درد ہو رہا تھا۔وہ بہ مشکل آدھی روٹی چبا کر پیچھے ہو گئی۔سردار کو بھی معلوم تھا کہ اس نے کھانے سے کیوں ہاتھ کھینچے ہیں،خواہ مخواہ کی بدمزگی سے بچنے کے لیے اس نے پلوشہ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ہمارے کھانا کھانے تک کمانڈر نصر اللہ قہوہ لے آیا تھا۔ہمارے لیے پیالیوں میں قہوہ انڈیل کر اس نے برتن سمیٹے اور دوبارہ باہر نکل گیا۔اس کے واپس آنے تک ہم قہوے کی پیالیاں خالی کر چکے تھے۔

اس نے پوچھا۔"کچھ اور چاہیے ہو؟"اس کے انداز سے جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پلوشہ کو پہچان گیا ہے اسی لیے وہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔اب یہ بات مجھے واضح نہیں تھی کہ آیا وہ پلوشہ کو بہ طورِ پلوخان پہچانتا ہے یا وہ اس کی پلوشہ والی اصلیت سے واقف ہے۔اگر وہ مؤخر الذکر اصلیت سے واقف ہوتا تو کبھی بھی اس سے ہاتھ نہ ملاتا۔

"نہیں کچھ چاہیے تو نہیں،البتہ یہ اپنے ساتھ لیتے جائیں۔"میں نے اپنے اور سردار کے تھیلوں سے کلاشن کوفیں نکال کر اس کی جانب بڑھا دیں۔

وہ مستفسر ہوا۔"ان کا کیا کرنا ہے؟"

"یہ مالِ غنیمت ہے۔ہم نے قبیل خان کے آدمیوں سے چھینا ہے۔مزید کمانڈر عبدالحق سے پوچھ لینا۔"

"سمجھ گیا۔"تینوں ہتھیار اور قہوے کے برتن اٹھا کر وہ بیٹھک سے نکل گیا۔

"مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔"چارپائی پر لمبا ہوتے ہوئے میں نے سردار کو کہا۔"اگر تم نے بھی لیٹنا ہے تو دروازہ اندر سے کنڈی کر دینا۔"

سردار نے کہا۔"نہیں ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"کہہ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔چند لمحوں میں میں گہری نیند سو گیا تھا۔

میری آنکھیں دروازہ کھلنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر آنے والے کا جائزہ لیتا میرے کانوں میں سردار کی آواز پڑی،وہ پلوشہ کو کوئی بات کہہ رہا تھا۔اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے میں نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

''آپ کا دوست تو ابھی تک نہیں جاگا۔'' چارپائی کی چرچراہٹ کے ساتھ پلوشہ کی آواز ابھری۔

''ساری رات جاگتا رہا ہے پانچ، چھ گھنٹے تو سوئے گا نا۔''

''ساری رات کیوں جاگتا رہا ہے؟'' پلوشہ کی آواز میں حیرانی تھی۔

''معلوم نہیں۔'' سردار نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''اچھا بھائی!...... میری درخواست پر غور کیا کہ نہیں؟''

''دیکھو پلوشے!...... میں اپنی مجبوری تمھیں بتا چکا ہوں، اگر یہ ممکن ہوتا تو مجھے بھلا کیا مسئلہ تھا۔''

''اس میں ناممکن کی کیا بات ہے، اگر آپ کہیں تو میں آپ کے دوست سے بات کر لیتی ہوں، بلکہ میں قبیل خان کی موت کے بعد اسے قتل کرنے کا ارادہ بھی ملتوی کرنے کر دوں گی۔''

سردار نے اسے جھڑکا۔ ''تمھاری انھی باتوں سے وہ چڑتا ہے۔''

''بھائی...... یقین کرو میری وجہ سے آپ لوگوں کو سہولت ہی ملے گی۔ میں اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہوں، آپ کی بہت اچھی رہنمائی کروں گی۔''

''اچھا تم نے یہ نہیں بتایا کہ کمانڈر نصر اللہ تمھارا استاد کیسے ہو گیا؟'' سردار نے اس کے اصرار سے تنگ آ کر موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

''بھائی کہا تو تھا کہ لمبی کہانی ہے۔'' پلوشہ نے اس موضوع سے پہلوتہی کرنا چاہی۔

''تو مختصر کر کے سنا دو۔'' سردار مصر ہوا۔

''ابو جان، قبیل خان کا لشکری تھا۔ اس وقت قبیل خان اسلحے اور منشیات کی سمگلنگ کرتا تھا۔ ایک دن اس خبیث کی نظر میری بڑی بہن پر پڑی۔ وہ اس وقت سترہ سال کی تھی اور خود سے چار سال چھوٹے بھائی کے ساتھ بکریاں چرا رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی قبیل خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ میری بہن کو پکڑ کر گاڑی میں ڈال لیں۔ دو آدمیوں نے میری معصوم باجی کو پکڑ کر زبردستی گاڑی میں گھسیڑ دیا۔ بھائی اس وقت تھوڑی دور کھڑا تھا۔ باجی کو بچانے کے لیے وہ دیوانہ وار بھاگا۔ اس کے قریب پہنچنے تک گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس نے چلتی گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کی مگر ایک ظالم نے اسے لات مار کر نیچے گرا دیا۔ ہماری بدقسمتی کہ نیچے گرتے ہوئے

بھائی کا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش کر گر پڑا۔ اسے بس سے پہلے ایک موٹر سوار نے دیکھا جو ہمارے گاؤں سے گزر کر انگور اڈے کی طرف جا رہا تھا۔ بھائی کا لہولہان جسم دیکھتے ہی وہ لوگوں کو اطلاع دینے کے لیے واپس پلٹا مگر جب تک لوگ اس کے پاس پہنچتے وہ باقی نہیں رہا تھا۔ ابو جان اس وقت پنجاب گئے ہوئے تھے۔ گھر میں، میں اور امی جان اکیلی تھیں۔ لوگ جب بھائی کی لاش اٹھا کر لائے تو گھر پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بھائی کے موت کے ساتھ ہمیں باجی کے غائب ہونے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اور یہ فکر ابو جان کی واپسی سے پہلے ایک اور قیامت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ بھائی کے موت کے چوتھے دن ہمیں باجی کی لاش بھی مل گئی، اس طرح کہ مرنے سے پہلے وہ کئی افراد کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ ابو جان واپس آئے تو کئی دن تک تو اس صدمے سے باہر نہ آسکے۔ اس کے بعد انھوں نے قاتل کی تلاش کی کوششیں شروع کر دی۔ قبیل خان کے محافظوں میں ابو جان کا ایک دوست شامل تھا۔ اس نے ابو جان کو اصل واقعے کی اطلاع دے دی۔ یوں بھی ابو جان کو پہلے پہلے سے قبیل خان پر شک تھا کیونکہ اس کی درندگی کا شکار ہونے والی باجی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ جوان بیٹے کی موت اور معصوم بیٹی کے ساتھ ہونے والے درندگی بھرے سلوک نے ابو جان کو کچھ سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کلاشن کوف اٹھا کر قبیل خان کے خلاف چڑھ دوڑے۔ مگر وہ خبیث تیار تھا۔ اس کے محافظوں نے ابو جان کو اس تک پہنچنے کے لیے زندہ نہ چھوڑا۔ اور یوں ہمارا بھرا پرا گھر ایک ظالم کی ہوس کا شکار ہو گیا۔ میں اس وقت نو سال کی تھی۔ مجھ سے دو چھوٹے بھائی پیدا ہونے کے ساتھ ہی فوت ہو گئے تھے۔ گویا ابو جان کی واحد وارث میں تھی۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس وقت بھی امی جان امید سے تھیں۔ ہم علام خیل چھوڑ کر اپنے رشتے کے ماموں کے پاس چلے گئے۔ ان کا تعلق تحریک طالبان سے تھا۔ تحریک طالبان سے میری مراد مجاہدین طالبان سے ہے، اس وقت تک نقلی اور دہشت گرد طالبان ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ماموں جان جو امی جان کے چچا زاد بھائی تھے لیکن انھوں نے ہمارا بہت زیادہ خیال رکھا۔ امی جان نے ماموں جان سے درخواست کی کہ مجھے اس قابل بنا دیں تا کہ میں اپنے باپ، بھائی اور باجی کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔ امی جان کی واحد امید میں ہی تھی۔ گو چند ماہ بعد اللہ پاک نے مجھے ایک اور بھائی کے تحفے سے بھی نوازا تھا، مگر وہ ابھی تک آٹھ سال کا بچہ ہے۔ ماموں جان نے صاف انکار کر دیا کہ مجاہدین کے کیمپ میں کسی

لڑکی کو تربیت نہیں دی جاتی ۔تب امی جان نے التجا کی کہ وہ مجھے لڑکے کے روپ میں ساتھ لے جائیں ۔۔ہمارے ساتھ ہونے والا ظلم ایسا نہیں تھا کہ ماموں جان امی جان کی التجا ٹال سکتے ۔وہ مجھے لڑکا بنا کر ساتھ لے گئے ۔ابو جان، باجی اور بھائی کی موت نے مجھے بھی سراپا انتقام بنا دیا تھا۔میں لڑکا بن کر تربیت حاصل کرتی رہی۔وہاں ہمیں دینوی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ لڑنے بھڑنے کی تربیت بھی دی گئی۔کمانڈر نصراللہ صاحب بھی میرے اساتذہ میں سے ہیں۔آپ نے ہمیں مختلف قسم کے ہتھیاروں کی تربیت دیتے تھے۔پچھلے دو، تین سال سے میرے اندر بتدریج ایسی جسمانی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے لگیں کہ میرا مردوں کے درمیان رہنا مشکل ہو گیا تھا۔اپنے جسمانی خطوط چھپانے کے لیے مجھے کھلے لباس کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ہاتھا پائی کی تربیت سے بھی میں احتراز برتنے لگی تھی۔اوراب تین ماہ ہوگئے ہیں کہ میں نے مجاہدین کا کیمپ چھوڑ کر گھر آگئی ہوں۔وہ خبیث اب پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو گیا ہے، جبکہ میں اس کے خلاف اکیلی ہوں۔لڑکے کے روپ میں، میں نے اس کے دو تین قریبی محافظوں سے دوستی گانٹھ لی ہے۔انھی کی وساطت سے مجھے اس خبیث کے بارے تھوڑی بہت معلومات مل جاتی ہیں۔مجاہدین کے پاس سے آنے کے بعد سے میں مسلسل کسی موقع کی تلاش میں ہوں ۔اور یہی وجہ ہے ایک مضبوط سہارا سمجھتے ہوئے میں آپ سے درخواست کر رہی ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ رہنے دو ۔کم از کم قبیل خان کی دشمنی کی مضبوط وجہ ہمارے درمیان مشترک ہے۔''مکمل تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں وہ اپنی پرانی درخواست دہرانا نہیں بھولی تھی۔

سردار نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''ہماری قبیل خان سے دشمنی کی وجہ معلوم ہے؟''

''نہیں۔''اس نے نفی میں کہا۔''یوں بھی میں وجوہات کی تلاش میں وقت برباد نہیں کرتی۔''

سردار نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔''ہمارا تعلق پاک آرمی سے ہے اور قبیل خان ایک دہشت گرد ہے ۔اس کے تعلقات ملک دشمن عناصر سے بھی ہیں۔ہماری اور اس کی دشمنی کی واحد وجہ یہی ہے۔''

''کیا......؟''اس کے لہجے میں حد درجہ کی حیرانی بھری تھی۔''کہیں آپ دونوں وہی تو نہیں ہو جنھوں نے پچھلے دنوں قبیل خان کے دو درجن سے بھی زیادہ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کے ساتھ اس کے سب سے اہم کمانڈر روشن خان کو بھی لنگڑا کر دیا۔''

''تمھیں یہ سب کیسے معلوم؟''

''بتایا تو ہے اس کے چند قریبی آدمیوں سے بھی تھوڑی بہت دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ گو وہ بھی میری شکل و صورت کی وجہ سے نرم رویہ رکھتے ہیں، لیکن پھر بھی میں ان سے کچھ نہ کچھ اگلوا لیتی ہوں اور جہاں تک قبیل خان کی حالیہ ہزیمت کا تعلق ہے تو اس سے تو عام لوگ بھی واقف ہیں۔ خاص کر ایس ایس نے جو روشن خان کو زندگی کی بھیک دی تھی اس کا تو بہت چرچا ہوا ہے۔ یقیناً ایس ایس آپ ہی ہوں گے؟'' اس نے آخری فقرہ اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔ میرا دوست ایس ایس ہے۔'' ایسا کہتے ہوئے سردار کے لہجے میں شامل فخر کا مادہ اس کے مخلص ہونے کی نشان دہی کر رہا تھا، کہ اسے اپنے دوست پر فخر تھا۔

''آپ اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔'' وہ دوبارہ اسی موضوع پر لوٹ آئی تھی۔

''پلوشے!...... میں نے تمھیں بہن کہا ہے، مجھ سے جتنا ہو سکا میں نے کر دیا ہے۔ یقین مانو اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں ذیشان کو خفا نہیں کر سکتا۔ یوں بھی اگر وہ اس بارے کسی سینئر کو مطلع کر دے تو میری نوکری تو جائے گی ہی ساتھ میں حوالات کی بھی ہوا کھانا پڑے گی۔

''پتا نہیں تمھارے دوست کو مجھ سے کیا چڑ ہے، عجیب احمق انسان ہے مجھے بے گناہ پیٹا بھی ہے اور اب موڈ بھی وہی بنا رہا ہے۔''

''اس موضوع کو رہنے دو۔'' سردار کو یقیناً اس کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

''بھائی!...... خفا نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟''

سردار نے بغیر تردد کے کہا۔ ''پوچھو۔''

اس نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ساری لڑکیاں ماہین کی طرح ہوتی ہیں؟''

''کک...... کیا...... تم ماہین کو کیسے جانتی ہو؟'' سردار ہکلا گیا تھا۔ خود میں بھی حیرانی میں ڈوب گیا تھا۔

''کل آپ دونوں مجھے سویا ہوا سمجھ کر جو باتیں کر رہے تھے میں نے ساری سن لی تھیں۔ آئندہ اردو میں بات کرتے وقت یہ یاد رکھنا کہ میں اردو زبان مکمل طور پر جانتی ہوں۔''

''اچھا اب اس متعلق زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا، تم نے صبح چلے جانا ہے اور میں نے ذیشان کے ساتھ اکٹھا رہنا ہے، میں نہیں چاہتا میرا دوست کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔''

''صبح نہیں بھائی!......میں ابھی رخصت ہو رہی ہوں، میں نے سوچا تھا کہ شاید ہم مل کر قبیل خان کو فنا کر دیں گے لیکن آپ لوگوں کو میرا ساتھ ہی قبول نہیں تو زبردستی تو میں نہیں کر سکتی۔'' اس کے لہجے میں مایوسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

سردار نے کہا۔''بہن اگر بات صرف میری ہوتی تو میں تمھیں دوسری بار کہنے کا موقع نہ دیتا۔''

''ٹھیک ہے بھائی!......اپنا خیال رکھنا۔''

''سردار کو کہہ کر وہ مجھے مخاطب ہوئی۔''راجا ذیشان حیدر صاحب!......خوش ہو جاؤ میں جا رہی ہوں۔'' مگر میں اس سوتا بنا رہا۔

سردار نے کہا۔''پلوشے!......اسے جگانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ مصر ہوئی۔''نہیں بھائی!......میں دیکھنا چاہتی ہوں آخر اسے میرے جانے کی کتنی خوشی ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے پاؤں کو پکڑ کر ہلایا۔ مجبوراً مجھے اٹھنے کی اداکاری کرنا پڑی۔ چہرے پر سے چادر اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ وہ کلاشن کوف کندھے سے لٹکائے کھڑی تھی۔ اس کے بدن پر نیا لباس نظر آ رہا تھا۔ غالباً وہ کپڑے اسے سردار نے خرید کر دیے تھے۔

''محترم خوش ہو جائیں، میں وعدے کے مطابق جا رہی ہوں۔ سردار بھائی نے مجھے نئے کپڑے بھی دلا دیے ہیں اور ڈاکٹر سے دوائی بھی لے دی ہے۔''

میں جمائی لیتا ہوا بولا۔''میری خوشی دگنی ہو جاتی اگر سردار مجھے جگا کر یہ خوش خبری سناتا کہ آپ تشریف لے جا چکی ہیں۔''

''مجھے روکو گے نہیں۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔ لیکن یہ شرارت اس کے لہجے تک محدود تھی، اس کی آنکھوں کی گہرائی میں کوئی اور جذبہ پوشیدہ تھا جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔ شاید یہ التجا تھی، امید تھی، بھروسا تھا یا کوئی شدت بھری خواہش تھی۔

''کیا، میرے روکنے سے رک جاؤں گی؟''

''کہہ کر دیکھ لو۔''اس مرتبہ میں نے اس کی آنکھوں میں چھپی التجا نما حکم صاف پڑھ لیا تھا۔

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے نہ جاؤ۔''

اس کے چہرے پر مسرت بھرے آثار نمودار ہوئے۔''لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اس طرح میں تمھیں قتل کرنے کا ارادہ ترک کردوں گی۔'' کلاشن کوف کندھے سے اتار کر وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

سردار نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔''میرے کہنے پر تو ایک رات کے لیے راضی نہیں ہو رہے تھے اور پلوشہ کے کہنے پر مستقل ساتھ رکھ لیا۔''

میں نے احسان جھاڑتے ہوئے فوراً کہا۔''ہاں، کیونکہ تم یہی چاہتے تھے اور میں تمھیں خفا نہیں کرسکتا تھا۔''

سردار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''بڑی جلدی خیال آ گیا میری خفگی کا۔''اور میں نے اسے جواب دیے بغیر دوبارہ اپنے اوپر چادر لے لی۔

پلوشہ، سردار کو اپنی جانب متوجہ کر کے دوبارہ چہکنے لگی۔سردار بھی میرے فیصلے سے خوش ہو گیا تھا۔یقیناً وہ اس مظلوم لڑکی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔اچانک میرے کانوں میں زوردار دھماکے کی آواز آئی، میں بے اختیار اٹھ بیٹھا تھا۔

سردار نے فوراً کہا۔''لیں جی قبیل خان کی بربادی کا آغاز ہو گیا ہے۔''

''ویسے کافی زوردار دھماکا تھا کہ آواز یہاں تک پہنچ گئی۔''

سردار نے کہا۔''بارود ہی اتنا زیادہ تھا دھماکا تو ہونا تھا۔''

''مجھے تو بہت سکون محسوس ہو رہا ہے۔''پلوشہ نے خوشی کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

انھیں باتیں کرتا چھوڑ کر میں ایک بار پھر لیٹ گیا۔اور ان کی باتیں سنتے سنتے ہی مجھے نیند آ گئی تھی۔

شام کی آذان ہو رہی تھی جب سردار نے مجھے جگایا۔''راجے!......اٹھ جاؤ یار، شام کی آذان ہو رہی ہے۔''اور میں انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

رات کا کھانا ہم نے لالٹین کی روشنی میں کھایا اور خوشبودار قہوہ پی کر دوبارہ لیٹ گئے۔سردار اور پلوشہ تو چند

منٹ گپ شپ کر کے سو گئے تھے لیکن مجھے رات گئے تک نیند نہ آ سکی۔ میں موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ پلوشہ زور زبردستی سے ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر مجھے مجبوراً اسے ساتھ رہنے کی اجازت دینا پڑ گئی تھی۔ یوں بھی وہ اسی علاقے کی تھی اور مجھے امید تھی کہ اس کا ساتھ ہمارے لیے فائدہ مند ہی ہونا تھا۔ یونھی پلوشہ کے بارے سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد ہم ڈی بلاک جانے کے لیے تیار تھے۔ ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے کمانڈر نصر اللہ نے کہا

''پلو خان!......کوشش کرنا کہ ان لوگوں کا ساتھ نہ چھوڑنا۔''

''ج......جی ......استاد جی۔'' پلوشہ نے گھبرا کر کہا۔ اس کا چہرے کے گرد چادر لپیٹنا کام نہیں آ سکا تھا۔ کمانڈر نصر اللہ نے اسے آسانی سے پہچان لیا تھا۔

''بیٹے!......میں تم سے مجاہدین کا ساتھ چھوڑنے کی وجہ تو نہیں پوچھنا چاہتا لیکن اتنا یاد رکھنا ذاتی لڑائی سے زیادہ اللہ پاک کے رستے میں لڑنے کی اہمیت ہوتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں استاد جی!......'' اس مرتبہ بھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ لیکن بعض اوقات انسان کسی کے ظلم و زیادتی کا ایسا ڈسا ہوا ہوتا ہے کہ وہ انتقام کے علاوہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔''

''اللہ پاک تمھارے لیے آسانیاں پیدا کرے۔'' پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ بات کرتے وقت پلوشہ کا لہجہ کافی بھاری اور مردانہ سا محسوس ہوا تھا۔ یقیناً وہ اپنی آواز کو بھاری بنا کر بات کر رہی تھی۔ نو دس سال کی عمر سے وہ لڑکا بن کر رہتی آ رہی تھی اتنی مشق تو اس کی ہو گئی تھی کہ کوئی اسے آواز سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ البتہ اس کے نین نقش کسی کے دل میں بھی شک کا بیج بو سکتے تھے۔

سردار نے کمانڈر نصر اللہ کے بیٹھک سے نکلتے ہی کہا۔ ''تمھارا چہرہ چھپانا تو کسی کام نہیں آ سکا۔''

''بھائی!......میں اپنی سی کوشش تو کی تھی لیکن استاد آخر استاد ہی ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے انھوں نے مجھے کل ہی پہچان لیا تھا۔''

''کیا انھیں یہ معلوم نہیں کہ تم لڑکی ہو۔''

''نہیں۔'' پلوشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

سردار مجھے مخاطب ہو کر بولا۔ ”پلوشہ بہن نے مجاہدین کے ساتھ لڑکا بن کر تربیت حاصل کی ہے اور کمانڈر نصر اللہ اس کا استاد ہے۔“

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”مجھے اس عورت کے بارے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

وہ کہاں خاموش رہنے والی تھی۔ فوراً بول اٹھی۔ ”میں عورت نہیں لڑکی ہوں۔ بلکہ تم جیسوں کے لیے تو لڑکا ہوں۔“

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”ہاں لڑکیاں تمھاری طرح بدشکل ہوتی بھی نہیں ہیں۔“

”اچھا...... پرسوں غار میں تو تم کچھ اور فرما رہے تھے کہ میرے چہرے پر تمھیں اپنی تینوں پسندیدہ ترین خواتین کی جھلک نظر آ رہی تھی بلکہ ان سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔“ بغیر لگی لپٹی رکھے وہ اس دن کی بات اگلتے ہوئے سردار کی طرف مڑی۔ ”بھائی!...... اس نے کچھ ایسا ہی کہا تھا نا؟“

سردار قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔“

”چلو۔“ کھسیاتے ہوئے میں نے اپنا سفری تھیلا کندھوں سے لٹکایا اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس بے باک اور چالاک لڑکی کی باتوں کا جواب دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ لحاظ رکھنا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔

”ویسے سچ سچ بتاؤ راجا صاحب!...... اس وقت جھوٹ بول رہے تھے یا ابھی؟“ میرے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے اس نے شوخی بھرے لہجے میں پوچھا۔

مگر میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے چلتا رہا۔

سردار نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ویسے یہاں سے علام خیل کے لیے گاڑی تو مل جاتی ہوگی؟“ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں پلوشہ کی باتوں پر غصہ کھا کر کوئی الٹا سیدھا بول دوں یا اسے ساتھ رکھنے کے فیصلے میں ترمیم کر دوں۔

”جی بھائی!...... نہ صرف علام خیل کے لیے بلکہ وانہ، ڈابر میانی، دیر زوال، سرے خاورے، درے نشتر، واخدالائی، رغزی، شالوم وغیرہ کے لیے آسانی سے گاڑی مل جاتی ہے۔“

انگور اڈے سے ویگن میں بیٹھ کر ہم علام خیل روانہ ہوئے۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے کھڑکی والی طرف بٹھا کر

اس کے ساتھ سردار کو بیٹھنے کا کہوں گا مگر میرے کہنے کے باوجود اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم بیٹھو ۔''

اور میرے کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہی وہ سردار سے پہلے اندر گھس کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ میرے ذہن میں سردار کی کہی ہوئی بات تازہ ہوئی کہ۔ ''مجھے لگتا ہے پلوشہ تمھاری ذات میں خاصی دلچسپی لے رہی ہے۔'' اور میں نے یہ سن کر اسے جھڑک دیا تھا۔ لیکن اب اس کا میرے ساتھ بیٹھنے میں دلچسپی لینے نے مجھے سردار کی کہی ہوئی بات پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گاڑی چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ بالکل چپکی جا رہی تھی ۔لیکن میں نے اس بارے منہ کھولنے کے بجائے باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔ اس علاقے کو زیادہ سے زیادہ پہچانا ضروری تھا۔

علام خیل پہنچنے سے کلومیٹر، ڈیڑھ کلومیٹر پہلے وہ سردار کو دبے لہجے میں مخاطب ہوئی۔ ''یہ وہ جگہ ہے بھائی! ...... جہاں وہ واقع پیش آیا تھا۔''

''ہونہہ! ......'' کر کے سردار نے مزید تبصرہ کرنے سے گریز کیا تھا۔

علام خیل میں اترتے ہی میں نے سردار کو کہا۔ ''ویسے بہتر تو یہی ہو گا کہ یہ یہیں رک کر ہماری واپسی کا انتظار کرے۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' سردار کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے کہا۔ ''مجھے تم پر ذرا بھر بھی اعتماد نہیں ہے۔ اپنی کہی ہوئی بات سے پھرنے کے لیے تم ذرا بھی دیر نہیں لگاتے۔ کیا پتا واپس آتے ہوئے تم مجھ سے چھپ کر نکل جاؤ۔''

میں نے بگڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم نے تمھیں ساتھ رکھنے کا نہ تو معاوضا لیا ہے اور نہ وعدہ کیا ہے پھر اس طرح دھونس جمانے کا مطلب؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''تو یہ معاضا کم ہے کہ ایک خوب صورت لڑکی تم جیسے سڑیل کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

''پلوشے!'' سردار نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا، مگر اس نے بے پرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

''تمھیں مظلوم سمجھنا ہی میری غلطی تھی۔'' کہہ کر میں نے مطلوبہ سمت قدم بڑھا دیے۔

''چلو اپنی کوئی غلطی تو تم نے تسلیم کر لی ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے میرے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

ڈی بلاک سے وہاں آتے ہوئے، ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ ہم مسلسل نشیب میں چلتے آئے تھے۔اب وہاں تک جاتے ہوئے بلندی کا سفر طے کرنا تھا جو بلاشبہ مشکل تھا۔پلوشہ مقامی تھی اور پہاڑی علاقے میں چلنے پھرنے کا اس کا تجربہ ہم سے کہیں زیادہ تھا۔اس کے اٹھتے قدم دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ چڑھائی پر چڑھ رہی ہے۔وہ ہم سے چند قدم آگے تھی اور ہمارے لیے اسے کئی بار اپنے قدموں کی رفتار کم کرنا پڑی۔سردار کا سفری تھیلا اس نے زبردستی اس سے لے کر اپنے کندھوں میں ڈال لیا تھا۔ڈی بلاک کے نیچے سے گزرنے والے نالے میں پہنچ کر ہم نے ہاتھ لہرا کر ڈیوٹی پر موجود سنتری کو اپنی جانب متوجہ کیا اور پھر آخری چڑھائی چڑھنے لگے۔درمیان تک تو پلوشہ ہم سے آگے آگے رہی لیکن اس کے بعد جان بوجھ کر ہمارے عقب میں چلنے لگی۔سنتری کے پوسٹ سے تھوڑا دور ہی ہمیں روک دیا تھا۔تھوڑی دیر بعد ہم شناخت کا مرحلہ طے کر کے پوسٹ کمانڈر کے بینکر میں بیٹھے تھے۔اب تک وہی پچھلا پوسٹ کمانڈر ہی وہاں موجود تھا اس لیے ہم تعارف وغیرہ کی زحمت سے بچ گئے تھے۔رسمی گفتگو کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گیا۔

''آپ کی رائفل کا ایمونیشن پہنچ گیا ہے اور اورنگ زیب صاحب نے کہا ہے کہ آپ جیسے ہی یہاں پہنچتے ہیں ذیشان کو کہنا مجھ سے بات کرلے۔''

میں مستفسر ہوا۔''فون پر؟''

پوسٹ کمانڈر نے کہا۔''جی ہاں، آئی کام کی رینج سے تو وہ باہر ہیں۔''

میرے ''بات کراؤ۔'' کہنے پر اس نے فون کا رسیور اٹھایا اور اور صفر ڈائل کر کے کہنے لگا۔''میجر اورنگ زیب کو لائن پر لے آؤ۔انھیں کہو ذیشان نے بات کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے رسیور رکھ دیا۔چند لمحوں بعد ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور پھر رسیور میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے رسیور لیتے ہی کہا۔''اسلام علیکم سر!......ذیشان بات کررہا ہوں۔''

''وعلیکم اسلام!......کیسے ہو جوان!'' اورنگ زیب صاحب کی آواز میں مجھے پریشانی کی جھلک نظر آئی تھی۔

''ٹھیک ہوں سر!'' میں نے ہشاش بشاش لہجے میں جواب دیا۔

''اور سردار۔''

”وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”تم لوگوں نے الفاٹو سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا۔“

’ضرورت ہی پیش نہیں آئی، بلکہ صاف کہوں تو ہمیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔“

”دیکھو ذیشان!......اگر میں نے تمھیں رابطہ نمبر دیا تھا تو اس کا کوئی مقصد بھی تھا۔تمھیں روزانہ کم از کم ایک بار تو اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔“

اورنگ زیب صاحب کے لہجے میں شامل پریشانی سے میرا دل ہولنے لگا تھا۔میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔”سر!......میں معذرت خواہ ہوں آئندہ خیال رکھیں گے۔“

”سردار کی بیوی وضع حمل میں جانبر نہیں رہ سکی۔آج اسے گزرے ہوئے تیسرا دن ہے۔البتہ نومولود ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”کک......کیا......ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“میری آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

”مجھے پرسوں ہی تمھارے کمانڈنگ آفیسر نے فون پر یہ افسوس ناک خبر سنائی اور میں نے اسی وقت الفاٹو کو یہ پیغام دے دیا کہ تمھیں واپسی کا حکم سنا دے۔بہر حال جو ہونا ہوا سے کسی صورت روکا نہیں جاسکتا۔تم بس یہ خیال رکھنا کہ اسے گھر جانے سے پہلے یہ بات پتا نہیں چلنا چاہیے اور اسے وانہ تک بھی چھوڑ آؤ۔“

”ٹھیک ہے سر!“اس کے علاوہ میرے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

”ذیشان!......مجھے افسوس ہے،لیکن ایک دن سب کو جانا ہے۔“

”جی سر!......“

”اگر تم بھی چھٹی جانا چاہو تو......“

”فی الحال تو نہیں جانا سر!“میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے مزید باتوں کا وقت نہیں،میں اس وقت وانہ میں ہوں باقی باتیں اکٹھے بیٹھ کر کریں گے فی امان اللہ۔“

میں نے رسیور رکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ بکھیرتا ہوا بولا۔”خان صاحب

!......مبارک ہو بیٹا ہوا ہے۔''

''کیا......سچ......'' وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

''ہاں یار!......اور دوسری خوش خبری یہ ہے کہ تمھاری چھٹی بھی ہو گئی ہے۔''

''شکریہ یار!......'' اس نے مسرت بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن تم فون پر تو یوں بات کر رہے تھے جیسے کوئی افسوس ناک واقعہ ہو گیا ہو۔''

''اس سے بڑی افسوس ناک بات کیا ہو گی کہ ایک اور پٹھان دنیا میں آ گیا ہے۔'' میں نے مزاحیہ انداز اپنانے کی کوشش کی، مگر میرے دل کی جو حالت تھی اس کے بارے صرف میرا ربّ ہی جانتا تھا۔ وہ عورت جسے میں نے آج تک دیکھا نہیں تھا لیکن اسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ یقیناً اس کی قسمت میں اپنے محبوب شوہر کی بے وفائی دیکھنا نہیں لکھا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ لی زونا کی آمد سے پہلے ہی اپنے شوہر سے دور چلی گئی تھی۔

سردار نے بے صبری سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں ابھی نکلنا چاہیے۔''

''یہاں سے شگئی تک کافی دیر لگ جائے گی۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''شگئی کیوں؟'' پلوشہ نے فوراً پوچھا۔

میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''تو یہ وانہ ہیلی کاپٹر میں اڑ کر جائے گا کیا۔''

وہ محسوس کیے بغیر بولی۔ ''معلوم ہے کتنی چڑھائیاں طے کر کے وہاں تک جانا پڑے گا۔ اس طرف سے جاتے ہوئے دو دن رستے میں لگ جائیں گے۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' سردار نے پریشانی ظاہر کی۔

''اگر کوشش کریں تو ہم آج ہی انگور اڈے پہنچ کر وانہ کی گاڑی پکڑ سکتے ہیں۔''

اس کا مشورہ نہایت ہی مناسب تھا۔ ''چلو نکلیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

بیرٹ ایم 107 میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔ میرا ارادہ اسے واپسی پر وہاں سے لینے کا تھا۔ پوسٹ کمانڈر سے اجازت لے کر ہم وہاں سے نکل آئے۔ پلوشہ ہمارے آگے آگے تھی۔ وہاں سے علام خیل تک مسلسل اترائی تھی اس لیے ہماری رفتار کافی تیز رہی۔ سردار بہت خوش تھا۔

”یار راجے!......بس لی زونا کا باب بند ہی کرتا ہوں، وہ مجھے بہت پیاری ہے لیکن اب تو چنارے نے مجھے ایک بیٹے کا تحفہ دے دیا ہے ایسے موقع پر میں دوسری شادی کی بات کرتا اچھا تو نہیں لگوں گا نا۔ مجھے معلوم ہے چنارے بہت خوش ہو گی اور بہت بے صبری سے میرا انتظار کر رہی ہو۔“

میں نے رندھی ہوئی آواز میں مشورہ دیا۔”ضروری تو نہیں کہ تم جاتے ہی شادی کی بات چھیڑ دو۔اگر اس چھٹی پر نہیں تو اگلی چھٹی پر کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر بات کر لینا۔“

”نہیں یار!...... چنارے مجھے بہت زیادہ پیار کرتی ہے اور لی زونا بھی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ان دونوں کے درمیان پھنس کر رہ جاؤں گا۔ لی زونا کے آنے سے چنارے ضرور واویلا کرے گی۔ ممکن ہے شادی کے بعد لی زونا کو بھی چنارے کی ذات کھٹکنے لگے وہ تو یوں بھی ایک علیحدہ معاشرے کی عادی ہے۔اور یہ نہ ہو دونوں کو پانے کے لالچ میں دونوں کے پیار سے محروم ہو جاؤں۔“

”اللہ پاک بہت زیادہ حکمت والا ہے دوست!......وہ جو کرتا ہے انسان کی بہتری کے لیے کرتا ہے کافی دفعہ ایسے حادثے انسان کی زندگی میں آجاتے ہیں جنھیں برداشت کرنے کی ہمت انسان اپنے اندر مفقود پاتا ہے ،بس میری یہ بات یاد رکھنا کہ صبر اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔“

”یعنی تم بھی میرے ساتھ متفق ہو کہ مجھے لی زونا کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے؟“اس نے میری گول مول گفتگو سے یہی اندازہ لگایا تھا۔

”اس بارے بعد میں بات کریں گے فی الحال تھوڑا تیز چلنے کی کوشش کرو تمھاری باجی صاحبہ تو بے عزت کرنے کے چکر میں پڑی ہے۔یوں جا رہی ہے جیسے میراتھن میں حصہ لے رہی ہو۔“ مجھے اس موضوع سے وحشت ہو رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بار بار چنارے بہن کا ذکر آئے۔ایک بار تو جی میں آیا کہ سردار کو حقیقت بتا دوں مگر پھر اورنگ زیب صاحب کی نصیحت یاد آگئی۔اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ سردار کو اس کی بیوی کی وفات کے بارے نہ بتایا جائے۔یوں بھی آرمی میں حتی الوسع یہی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی کے بھی قریبی رشتہ دار کی ناگہانی موت کی اطلاع متاثرہ شخص کو نہیں دی جاتی کہ کہیں وہ سفر کے قابل ہی نہ رہے۔ گھر جا کر بھی وہ صدمہ اتنا ہی گہرا ہوتا ہے لیکن وہاں دوسرے رشتہ دار اسے سنبھالنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔

سردار نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''ماننا پڑے گا کہ پلوشہ بہن میں بڑی جان ہے۔''

جواباً میں خاموش رہا۔ پانچ گھنٹے کا راستہ ہم نے دو گھنٹے میں طے کر لیا تھا۔ علام خیل میں پہنچ کر ہم سڑک پر کسی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی کوئی گاڑی نہ ملی۔ پلوشہ ہمیں انتظار کرنے کا کہہ کر گاؤں کے اندر گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک ہنڈا125 لیے نمودار ہوئی۔ اسے موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔

میرے قریب موٹر سائیکل روکتے ہوئے اس نے کہا۔ ''موٹر سائیکل کون چلائے گا؟''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ ذمہ داری مجھے سنبھالنا پڑے گی۔''

''میں تم سے اچھی موٹر سائیکل چلا سکتا ہوں۔'' سردار نے مجھ سے پہلے پلوشہ کے ہاتھ سے ہینڈل تھام لیا۔

میں نے اپنا تھیلا موٹر سائیکل کے کیریئر پر رکھ کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں وہی مصیبت بیٹھ گئی جس سے میں مسلسل جان چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ سردار اسی لیے موٹر سائیکل چلانے کی ذمہ داری سنبھالی تھی تاکہ پلوشہ کو میرے ساتھ بیٹھنا پڑے۔

پلوشہ کے بیٹھتے ہی میں نے سردار کو چلنے کو کہا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

تھوڑا آگے جاتے ہی اس نے پلوشہ سے پوچھا۔ ''یہ موٹر سائیکل کہاں سے اٹھا لائی ہو؟''

''اپنے استاد کمانڈر عبدالحق سے مانگا ہے۔'' وہ پہلے بھی مجھ سے چپک کر بیٹھی تھی سردار کو جواب دینے کے لیے مزید آگے جھکی۔

''کمانڈر نصر اللہ سے منہ چھپا رہی تھیں اور عبدالحق کے پاس خود بھاگ کر پہنچ گئی ہو۔''

''مجبوری تھی اس لیے جانا پڑا۔ باقی چھپ ندامت کی وجہ سے رہی تھی ڈرنے کی وجہ سے نہیں۔ مجاہدین زبردستی تھوڑی کرتے ہیں کسی کے ساتھ۔''

''کیا بات کرنے کے لیے آگے ہونا ضروری ہے۔'' میں نے اسے جھڑکا۔

''ٹھیک ہے اگر تمھیں تکلیف ہو رہی ہے تو پیچھے بیٹھ جاؤ، میں نے تو اپنے بھائی سے بات کرنا ہے اور جب تک آگے کی طرف ہو کر بات نہ کروں اسے سنائی نہیں دے گا۔''

اس کی بات پر میں خون کے گھونٹ بھرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔اور میرے چڑنے کی وجہ سے تھوڑا اور آگے کو کھسک آئی تھی۔اس کے ساتھ متھا مارنا دیوار سے سر ٹکرانے کے مترادف تھا۔مجبوراً میں خاموش ہو گیا۔

انگور اڈے تک آتے آتے ہمیں ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا۔سورج غروب ہونے کو تھا۔

انگور اڈے کی آبادی شروع ہوتے ہی اس نے سردار کو کہا۔"موٹر سائیکل، کمانڈر نصراللہ کے گھر کھڑی کرنا پڑے گی سیدھا وہیں چلو۔"

میں نے کہا۔"ہمیں اڈے میں اتار کر تم لے جانا۔"

وہ جواباً بولی۔"جب پوچھا نہ جائے تو مشورہ نہیں دینا چاہیے۔"

"یہ مشورہ نہیں ہے۔"میں نے حتمی لہجے میں کہا۔"ہم تمھیں اپنے ساتھ وانا تو نہیں لے جا سکتے۔"

"تمھارے ساتھ کون احمق جا رہا ہے۔"

سردار نے موٹر سائیکل کا رخ کمانڈر نصراللہ کے گھر کی طرف موڑ دیا تھا۔

"یار!......اڈے کی طرف چلو۔"میں چیخا مگر سردار سنی ان سنی کرتا ہوا کمانڈر نصراللہ کے گھر کی جانب بڑھتا رہا۔

کمانڈر نصراللہ کا گھر قریب ہی تھا۔وہ ہمیں گھر کے باہر ہی مل گیا،وہ شام کی نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔

سردار نے اس کے قریب موٹر سائیکل روک کر۔"اسلام علیکم!"کہا۔

"وعلیکم اسلام۔"کہہ کر اس نے فرداً فرداً ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔

پلوشہ نے کہا۔"استاد جی یہ موٹر سائیکل کمانڈر عبدالحق سے مانگ کر لائی ہے،اگر آپ ہماری واپسی تک اپنے گھر میں رکھ لیں تو مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!......"اس نے خوش دلی سے کہتے ہوئے موٹر سائیکل تھام لی۔"آپ لوگ کھانا تو شام کی نماز پڑھ کر ہی کھاؤ گے نا؟"

"نہیں،ہم وانا جا رہے ہیں۔"پلوشہ نے ہم سے پہلے جواب دیا۔اور وہ سر ہلاتا ہوا موٹر سائیکل کو ہینڈل

سے پکڑ کر گھر کی جانب بڑھ گیا۔ سوائے پستولوں اور ایک عدد آئی کام کے ہم نے اپنا باقی سامان اور ہتھیار اس کے حوالے کر دیے تھے۔

ویگن اڈے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''سردار تمھارے جانے کے بعد میں اسے ایک سیکنڈ بھی اپنے قریب نہیں پھٹکنے دوں گا۔''

سردار کے کچھ کہنے سے پہلے وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ''میرا دماغ خراب ہے کہ تم جیسے بے اعتبار شخص کے ساتھ اکیلی رہوں۔''

''احسان ہو گا تمھارا۔'' تلخی سے کہتے ہوئے میں قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے ان دونوں سے آگے نکل گیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہمیں ویگن اڈے میں داخل ہوتے ہی ایک تیار ویگن مل گئی۔ سواریاں نماز کی ادائی کے بعد اندر بیٹھ رہی تھیں۔ عقبی نشست خالی پڑی تھی۔ کنڈیکٹر نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے ویگن آگے بڑھا دی۔ کوشش کے باوجود ہم ڈیرہ اسماعیل خان جانے والی گاڑی نہیں پکڑ سکے تھے مجبوراً ہمیں ہوٹل میں رات گزارنا پڑی۔

''تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ چھٹی کتنی ہوئی ہے۔'' بستر پر لیٹتے ہی سردار نے پوچھا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''مہینا۔''

''گویا ایک ماہ میں سلطان خان کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔''

میں نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''سلطان......؟''

''ہاں سلطان خان ولد سردار خان اور معلوم ہے میں نے اور چنارے نے پہلے سے یہ طے کیا تھا کہ بیٹا ہوا تو چنارے نام رکھے گی اور بیٹی ہوئی تو میں۔ اور اس نیک بخت نے بیٹے کے لیے سلطان نام چن رکھا ہے۔''

''ہونہہ!'' میں نے دکھ کی لہر کو سینے میں دباتے ہوئے دھیرے گہرا سانس لیا۔

''قسم سے میرا دل چاہتا ہے اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔''

''بھائی یہ آپ کا پہلا بیٹا ہے نا؟'' پلوشہ نے زبان کھولی۔

''ہاں پلوشے!...... یہ تمھارا پہلا بھتیجا ہے۔''

"میری باجی کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد کہنا۔"

"ضرور۔" سردار نے اثبات میں سر ہلایا۔

"قبیل خان کو ہلاک کرنے کے بعد میں ان شاء اللہ سلطان سے ملنے آؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر شرارتی لہجے میں بولی۔ "نہیں بلکہ قبیل خان کی ہلاکت کے بعد میں نے ایک اور قتل بھی کرنا ہے اس کے بعد آؤں گی۔

سردار نے زوردار قہقہہ لگایا، لیکن میں دکھ کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

"ویسے یار!...... مجھے پشیمانی ہو رہی کہ میں نے چنارے کو موبائل فون کیوں نہیں لے کر دیا۔ اگر اس کے پاس موبائل فون ہوتا تو ابھی پی سی او سے گھر بات کر کے کم از کم اس کی آواز ہی سن لیتا۔"

"اچھا میرا اے ٹی ایم اپنے پاس رکھ لو، شادی تمھیں رقم کی ضرورت پڑے۔" میں نے اپنا اے ٹی ایم اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، بتایا تو ہے کہ لی زونا کا باب بند۔"

"پانچ ہزار ڈالر تمھیں دینے کا وعدہ کیا تھا، چاہے وہ لی زونا کے حصول کے لیے استعمال کرو چاہے...... کسی اور مقصد کے لیے۔" میری آواز بھرا گئی تھی۔

"نہیں راجے!...... اتنی زیادہ رقم............"

"مجھ سے غلطی ہو گئی تھی یار!...... یہ رقم مجھے بہت پہلے تمھارے حوالے کر دینا چاہیے تھی، تم بھی امریکا میں میرے ساتھ تھے۔ پچاس ہزار میں سے پانچ ہزار تو تمھارا حق بنتا ہے۔"

"وہ تمھارا انعام تھا۔" سردار نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم نے لینے ہیں کہ مجھ سے بے عزت ہونا ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اس نے خاموشی سے اے ٹی ایم کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اے ٹی ایم کا پاس ورڈ بتا کر میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح سویرے اٹھ کر ہم بغیر ناشتا کیے ہوٹل سے نکل آئے۔ ویگن اڈے پہنچ کر بھی ناشتے کا موقع نہ مل سکا کہ

ویگن جانے کے لیے تیار تھی۔ سردار نے اپنا پستول میرے حوالے کرتے ہوئے مجھ سے معانقہ کیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”میری چھوٹی سی بہن کا خیال رکھنا۔“

میں اسے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجھ سے علیحدہ ہوتے ہوئے اس نے پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور ویگن میں بیٹھ گیا۔

ویگن چلنے تک ہم وہیں کھڑے رہے۔ ویگن کے اڈے سے نکلتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوئی۔ ”اب مجھے اصل بات بتاؤ۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے حیرانی سے اسے گھورا۔

”سردار بھائی کے گھر میں کیا مسئلہ ہے؟“

”تمھیں کیسے معلوم کہ اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہے۔“ میری حیرانی برقرار تھی۔

”اس سوال کو رہنے دو جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔“

”اپنا لہجہ درست کرو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔“ سختی سے کہتے ہوئے میں اسی ہوٹل کی طرف بڑھ گیا جہاں رات گزاری تھی۔

ویگن اڈے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ مجھ سے دو تین قدم پیچھے اطمینان سے چلی آ رہی تھی۔

”تمھاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔“ میں اسے جھڑکنے کے انداز میں بولا۔

وہ شوخی سے ہنسی۔ ”کیوں بلاوجہ توانائی ضائع کر رہے ہو۔“

میں اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے گھورنے لگا۔ اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے وہ بھی للکارنے کے انداز میں مجھے گھورتی رہی۔

”اگر میں یونھی تمھارے پیچھے پیچھے چلتی رہی تو تم میرا کیا بگاڑ لو گے۔“ مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر اس نے دوبارہ زبان کھولی۔

تمھیں شاید اپنی عزت پیاری نہیں ہے۔“ مجھے اس پر حقیقت میں غصہ آنے لگا تھا۔ پیر تسمہ پا کی طرح ہی وہ

مجھ سے چمٹ گئی تھی۔
اس کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”مجھے نہ سہی تمھیں تو میری عزت پیاری ہے نا، بس اتنا ہی کافی ہے۔“
میں نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو جب سردار آئے گا تو تم بھی واپس آ جانا۔“
مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بے پرواہی سے بولی۔ ”چھوڑو مذاق کو اور چلو، ناشتا بھی کرنا ہے۔“
”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے منع کروں، نہ تو وہ میرے غصے کی پرواہ کر رہی تھی اور نہ نرم لہجہ اس پر اثر کر رہا تھا۔
سر جھٹک کر ایک بار پھر چل پڑا۔ وہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”بندے کو اتنا خرسوس بھی نہیں ہونا چاہیے۔“
”تمھیں کسی نے بھی بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی۔“
وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم سکھا دو۔“
مجھے خاموشی ہی میں عافیت نظر آئی۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ کہنے لگی۔ ”چلو نا ناشتا کرتے ہیں قسم سے سخت بھوک لگی ہے۔“
میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”پیسے ہیں جیب میں۔“
وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اگر ہوتے تو تم جیسے کنجوس کی منتیں کر رہی ہوتی۔“
اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اچھا میری جان چھوڑنے کے کتنے پیسے لو گی؟“
اس نے وضاحت چاہی۔ ”تمھارا مطلب ہے قبیل خان کو مارنے کے بعد تمھاری جان بخش دوں۔“
”نہیں ابھی کہیں دفع ہو جاؤ۔“
”ہونہہ!......اس کے لیے رقم کے ساتھ کچھ اور بھی چاہیے ہوگا۔“

''کیا؟''

''ایک لاکھ، گلاک پستول مع سائیلنسر اور مخابرہ (آئی کام سیٹ)''

''مجھے پہلے صرف شک تھا کہ تمھارا دماغ خراب ہے۔''

''تم ساری زندگی شک ہی میں پڑے رہنا۔''

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر آئی کام سیٹ نکال کر ون الفا کو پکارنے لگا۔ یوں تو وہ شام کے وقت آئی کام سیٹ آن کرتا تھا لیکن آج چونکہ اسے ہماری آمد کے بارے معلوم تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہوں گا۔ میرے اندازے کے مطابق جلد ہی اس کا جواب آنے لگا۔ رسمی گفتگو میں پڑنے کے بجائے اس نے فوراً میری جگہ کے بارے پوچھا اور میں نے بس اڈے کے قریب موجود اس ہوٹل کا نام بتا دیا جس کے سامنے ہم اس وقت کھڑے تھے۔

اس نے کہا۔''ٹھیک ہے وہیں رکو میں آرہا ہوں۔''ہمیں بہ مشکل پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا پڑا ہوگا۔ سفید رنگ کی ڈبل ڈور ہمارے ساتھ آکر رکی۔ وہ گاڑی میں اکیلا تھا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''چلیں سر!''پلوشہ نے عقبی دروازے کا ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔

اس نے پوچھا۔''یہ لڑکا تمھارے ساتھ ہے؟''

''اسے چھوڑیں سر!......اور چلیں۔''میں نے جلدی سے کہا۔ نہ جانے کیوں میں پلوشہ سے بھاگنا چاہ رہا تھا۔ اورنگ زیب صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دور آتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا وہ وہیں کھڑی تھی۔

''ویسے کون تھا یہ لڑکا؟''اورنگ زیب صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔

''سر!......گاڑی روکیں۔''میرے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

''کیا ہوگیا؟''بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے اس نے پریشانی سے پوچھا۔

''سر!......اس لڑکے کو ساتھ لے کے چلنا ہے۔''میں نے خفت بھرے لہجے میں کہا۔

”یار!......کیا اوٹ پٹانگ کام کر رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی موڑ لی تھی۔

میں نے میجر صاحب کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔میجر صاحب نے اس کے قریب جا کر گاڑی روک دی۔میں نے ہاتھ بڑھا کر عقبی دروازہ ان لاک کیا۔وہ اطمینان سے اندر گھس آئی۔

”پہلے بھول گئے تھے یا یہ دکھانا چاہتے تھے کہ تم آسانی سے مجھ سے جان چھڑا سکتے ہو۔“ میجر صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں میں نے سوچا اس طرح شاید تم غیرت کا مظاہرہ کر واور میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔لیکن ایسی باتیں وہ خاطر میں نہیں لاتی تھی فوراً بولی۔

”نہیں مجھے ڈر ہے، اگر میں نے تم پر نظر نہ رکھی تو تم کہیں چھپ جاؤ گے۔آخر ایک ضروری کام کے بعد میں نے تمھیں قتل تو کرنا ہے نا۔اس وقت کہاں ڈھونڈتا رہوں گا۔“

پیچھے مڑ کر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ اورنگ زیب صاحب اس کی بکواس سنے۔

”کیا بات کر سکتا ہوں۔“ اورنگ زیب صاحب نے پلوشہ کی وجہ سے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔”ہاں، انگریزی زبان میں کر سکتے ہو۔“

”واہ، تم انگریزی سمجھ بول لیتے ہو۔“ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

اور اس سے پہلے کہ میں جواب دے پاتا عقبی نشست پر بیٹھی پلوشہ کی اطمینان بھری آواز نے میرے سر پر بم پھوڑ ڈالا۔وہ میجر اورنگ زیب کو مخاطب تھی۔”تو انگریزی بولنا اتنا مشکل تو نہیں ہے کہ آپ اس کی اتنی تعریف کر رہے ہیں۔“ اور مزے کی بات کہ اس نے یہ فقرہ انگریزی زبان ہی میں ادا کیا تھا۔

”جی ذیشان!......تمھارا کیا خیال ہے۔“ اورنگ زیب صاحب نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”کہیے سر!......اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”مطلب یہ کہ آپ نے جو پوچھنا یا کہنا ہے جاری رکھیں۔“

”سردار کو اس کی بیوی کی موت کا بتایا تھا؟“

”نہیں سر!......بس بچے کی پیدائش کی خوش خبری سنا کر بھیج دیا ہے۔“

”مشن کہاں تک پہنچا ہے۔“

جواباً میں نے خائستہ گل سے لے کر قبیل خان کی حویلی کی تباہی تک کا احوال مختصراً سنا دیا۔

”ہونہہ!......“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ویسے یہ خبریں مجھ تک پہنچ گئی تھیں۔ اور حویلی تباہ کرنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”جب اس کے ملازموں کو بہ حالت مجبوری قتل کرنا پڑ گیا تو ہم نے دونوں نے یہی سوچا کہ جب ہمارا وہاں آنا ثابت ہو ہی گیا ہے تو اس کا کچھ نقصان ہی کر دیا جائے۔“

”اس لڑکے کو کہاں سے ڈھونڈا ہے۔“ اس نے عقبی سیٹ پر بیٹھی پلوشہ کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ مجاہدین کا ساتھی ہے۔ آپ کو کمانڈر عبدالحق کا بتایا ہے نا، یہ اسی کا شاگرد ہے اور فی الحال تو رہنمائی کے لیے ساتھ رکھا ہوا ہے کہ اس کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔“

”ہونہہ......“ کہتے ہوئے اس نے ایک درمیانی مگر پختہ عمارت کے گیٹ پر گاڑی روک دی۔ ہارن دینے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ گاڑی اندر لیتا گیا۔ گیراج میں گاڑی روک کر ہم نیچے اتر آئے۔ اس عمارت میں چہل پہل دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اورنگ زیب صاحب کا گھر نہیں تھا۔ ہمیں ساتھ لے کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ کافی بڑا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں میز لگی تھی۔ میز کے عقب میں گھومنے والی لکڑی کی کرسی رکھی تھی جبکہ سامنے تین فوم کی کرسیاں پڑی تھیں۔ کمرے کے دوسرے کونے میں لکڑی کا سنگل بیڈ لگا ہوا تھا۔ گویا وہ کمرہ دفتر ہونے کے ساتھ اس کی خواب گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

”شاید آپ لوگ ناشتا کر چکے ہو گے۔“ میز کے عقب میں پڑی کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بالکل بھی نہیں کیا ہے۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے پلوشہ نے منہ کھول دیا۔

میجر اورنگ زیب نے مسکراتے ہوئے گھنٹی بجائی اور دروازہ کھول ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یقیناً میجر صاحب کے وہاں آتے ہی وہ دروازے پر پہنچ تھا۔

"اس لڑکے کو ساتھ لے جا کر اچھا سا ناشتا کرا دو۔ اور ہمارے لیے دو پیالی چائے لے آؤ۔"

"تم نے ناشتا نہیں کرنا۔" پلوشہ مجھے مخاطب ہوئی۔

"مجھے چھوڑو اور اپنی فکر کرو۔"

وہ مزید کچھ کہے نو وارد کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"اب بتاؤ اس لڑکے کا کیا چکر ہے۔" میجر اورنگ زیب نے پلوشہ کے وہاں سے نکلتے ہی پوچھا۔

"تمام کہانی آپ کو سنا دی ہے سر!......بس اتنا اضافہ کر لیجیے کہ قبیل خان نے اس کی بہن کو زیادتی کا نشانہ بنایا، اس کے بھائی اور باپ کو قتل کیا اور اب یہ ان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہے۔"

"مجھے تو یہ قابل بھر سا نہیں لگ رہا۔" اورنگ زیب صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"میں مطمئن ہوں۔" میں نے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف داری کی۔

"ایسا نازک اندام لڑکا آپ لوگوں کی کیا مدد کرے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کسی کے ذرا سا جھڑکنے پر آپ لوگوں کا سارا کچا چٹھا کھول دے گا۔"

میرے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "سر!......اس کا نام پلوشہ ہے اور یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔ اور یقین کرو میں اس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا ہوں، بس تکا ہی لگ گیا تھا کہ میں اسے بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ اس نے میرا کام کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد میں نے اس کی حقیقت اگلوانے کے لیے اس پر اتنا تشدد کیا کہ اتنا تشدد کوئی عادی مجرم بھی برداشت نہ کرتا اور اس کا نام بھی اس کے منہ سے نہیں اگلوا سکا۔"

اورنگ زیب صاحب کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ "یہ لڑکی ہے......" عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "میں بھی کہوں اس لڑکے میں ایسی کیا بات ہے کہ بار بار اسے دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اور شاید اسی لیے اس نے گاڑی میں داخل ہوتے ہی تمھیں قتل کرنے کی دھمکی دی کہ تم نے اسے تشدد کا نشانہ

بنایا تھا۔"

"جی سر!......"میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔اسی وقت ایک آدمی چائے کے برتن لیے اندر داخل ہوا ۔چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھ کر وہ جس خاموشی سے اندر داخل ہوا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔

چائے پیتے ہوئے ہم آگے کا لائحہ عمل طے کرنے لگے۔ہماری باتوں کے درمیان ہی پلوشہ لوٹ آئی تھی ۔میرے دائیں طرف پڑی کرسی پر بیٹھ کر وہ ہماری باتیں سننے لگی۔مزید گھنٹا بھر وہیں گزار کر میں نے میجر صاحب سے اجازت لی اور ہم وہاں سے نکل لائے۔پلوشہ کی حقیقت معلوم ہونے کے باوجود میجر اورنگ زیب نے اسے لڑکے کے طور پر ہی مخاطب کیا تھا۔ویگن اڈے تک ہم میجر صاحب کی گاڑی میں آئے تھے۔ویگن اڈے میں انگور اڈے کی ویگن تیار کھڑی تھی۔ہمارے پہنچنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ویگن اڈے سے نکل آئی ۔پلوشہ خاموش سی تھی۔انگور اڈے پہنچ کر ویگن سے اترتے ہی وہ کہنے لگی۔

"کچھ رقم دے سکتے ہو؟"

"رقم......کس لیے؟"میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

"دے سکتے ہو تو دے دو،نہیں تو سوالات کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"کتنے چاہئیں؟"

"اگر ہو سکے تو دس پندرہ ہزار دے دو۔"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے جیب سے چار بڑے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیے۔"یہ بیس ہزار ہیں۔"

بغیر کسی تکلف کے وہ میرے ہاتھ سے پیسے لیتے ہوئے بولی۔"واپس نہیں ملیں گے۔"

"لیکن میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی،یوں بھی یہ رقم میں نے خائستہ گل کی جیب سے نکالی تھی۔

کمانڈر نصر اللہ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ بولی۔"میں نے کہیں جانا ہے،کل تک لوٹوں گی۔تم یہیں پر میرا انتظار کرنا۔"

”کہاں جانا ہے۔“

”اگر بتانا ہوتا تو میں کہیں کے بجائے اس جگہ کا نام لے لیتی۔“

میں نے تلخی سے کہا۔”اتنا بتانے کی بھی کیا ضرورت تھی، جاؤ جہاں دفع ہونا ہے۔“

وہ برا منائے بغیر بولی۔”اگر گلاک نہیں دے سکتے تو مجھے سردار بھائی والا پستول ہی دے دو۔“

”یہ لو......“اس مرتبہ بھی بغیر کسی حجت کے میں نے گلاک مع سائیلنسر کے ہولسٹر سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے مگر اس کے ہونٹوں سے شکریہ وغیرہ کا کلمہ ادا نہیں ہوا تھا۔

پسٹل نیفے میں اڑستے ہوئے وہ کمانڈر نصراللہ کے دروازے پر دستک دینے لگی جبکہ میں بیٹھک کے دروازے پر لگا تالا کھولنے لگا۔ میرا دماغ اسی کو سوچ رہا تھا۔ پہلے میں شدومد سے اس سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن میجر اورنگ زیب تک اس کا حال پہنچانے کے بعد نہ جانے کیوں ایک دم میں ذہنی طور پر اس کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ پہلے میں اس کی خوب صورتی سے ڈرا ہوا تھا، لیکن پھر بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں یہی بات آئی تھی، کہ اسی طرح اگر میں ہر خوب صورت لڑکی کا سامنا کرنے سے ڈرتا رہا تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ یوں بھی اس جیسی خطرناک لڑکی سے محبت کوئی بے وقوف ہی کر سکتا تھا۔ اور سب بڑھ کر وہاں اس سے بہتر رہنمائی کرنے والا ہمیں نہیں مل سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ موٹر سائیکل ہی پر کہیں روانہ ہوئی ہے۔

اس کی تصدیق کمانڈر نصراللہ کی آمد سے ہوئی۔ وہ میرے لیے دن کا کھانا لایا تھا۔ اس نے خود بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھانا پسند کیا تھا۔ اسی دوران اس نے پلوشہ کے بارے بھی پوچھ لیا کہ۔”پلوخان موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کہاں گیا ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

''اگلے دن دو پہر کو وہ واپس پہنچی۔ کافی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

''ویسے مجھے امید تو نہیں تھی کہ تم مجھے واپسی پر یہیں ملو گے۔'' خالی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بغیر لگی لپٹی کہا۔

میں خاموشی سے لیٹا رہا۔

وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گئی۔ ''پرسوں اپنا کام شروع ہو گا۔''

''کیا مطلب؟'' میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''پرسوں ثقلین خان کے بیٹے کی شادی ہے، اور ثقلین خان، قبیل خان کا حلیف ہے۔''

''تمھارا مطلب ہے وہاں قبیل خان آئے گا۔''

اس نے وثوق سے کہا۔ ''بالکل آئے گا۔''

''پھر تو وہاں جانا پڑے گا۔'' میں فوراً تیار ہو گیا تھا۔

''لیکن یہ یاد رکھنا کہ وہ خبیث ہر وقت محافظوں کے نرغے میں ہوتا ہے۔''

''ویسے یہاں اس کے مخالف بھی تو موجود ہوں گے، میرا مطلب وہ اکیلا ہی سمگلر اور دہشت گرد تو نہیں ہے نا۔''

''بالکل ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ کھل کر اس کا سامنا کر سکے۔ ثقلین خان کافی با رسوخ شخص ہے لیکن اس کے قبیل خان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں۔ البتہ سنگدل خان محسود کے آدمیوں کا اس کے آدمیوں کے ساتھ دو تین بار فائرنگ کا تبادلہ ہو چکا ہے پر بعد میں صلح وغیرہ ہو گئی۔ گو یہ صلح بھی بس خانہ پری ہی کے لیے تھی لیکن وہ کسی اور کے لیے قبیل خان کے خلاف میدان میں نہیں اتر سکتا۔''

''تم وزیر ہو کہ محسود؟''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''تمھیں اس سے کیا لینا کہ میں وزیر ہوں یا محسود۔''

میں جل کر بولا۔ ''بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھاری قوم۔''

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ''ویسے کسی لڑکی کا قوم قبیلہ تب معلوم کیا جاتا ہے جب وہاں رشتہ بھیجنے کا ارادہ ہو اور

ہمارے ہاں تو لڑکی کے والدین بہت زیادہ رقم مانگتے ہیں۔امی جان تو میرا رشتہ دینے کے لیے پچاس لاکھ سے ایک روپیا بھی کم نہیں کریں گی۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم اگر مجھ سے شادی کرلو تب بھی قبیل خان کی موت کے بعد میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔“

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔”تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔“

وہ شوخ لہجے میں بولی۔”خودکشی کی زحمت نہ کرنا۔اپنی موت کا کام مجھ پر چھوڑ دو۔“

”ہم سنگدل خان محسود کے بارے بات کررہے تھے۔“میں نے گفتگو کا رخ اصل موضوع کی جانب موڑا۔

”اس کی بات مکمل ہوچکی ہے اور اب قبیل خان کو ٹھکانے لگانے کا لائحہ عمل سوچو۔“

”اس بارے تم نے کافی کچھ سوچ رکھا ہوگا۔“

”ہاں......اگر وہ سامنے آ گیا تو یقین کرو میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کروں گی۔“

میرے منہ سے بے اختیار پھسلا۔”کوئی بے وقوفی نہ کرنا۔“میرے لہجے میں شامل فکرمندی اس سے زیادہ خود مجھے حیران کرگئی تھی۔

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔”اس بارے مجھے کسی کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

مجھے خود بھی احساس ہوگیا تھا کہ میں نے خوامخواہ فالتو کی بات کردی ہے۔اس کا خشک لہجہ سن کر میری خفت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

مجھے خاموش پاکر وہ بولی۔”شادی پرسوں ہے اس لیے کل ہی نکل چلیں گے۔“

میں اس مرتبہ بھی خاموش لیٹا چھت میں لگے شہتیروں کو گھورتا رہا۔

”تم شاید اس لیے پریشان ہو کہ میری وجہ سے تم پر کوئی مصیبت نہ آجائے ہے نا؟“میری خاموشی بھی اسے چپ پر آمادہ نہیں کرپارہی تھی۔

”اگر تمھیں زبان پر قابو رکھنا آتا تو یقیناً تمھیں ساتھ رکھنے کے فیصلے پر مجھے پچھتانا نہ پڑتا۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔”اسی لیے تو کہتی ہوں، مستقبل کے پچھتاوں سے بچنے کے لیے تمھیں امی جان

سے بات کر لینا چاہیے۔ میرے کہنے پر وہ پچاس لاکھ سے چند ہزار کم کرنے پر راضی ہو جائیں گی۔ اور میرے لیے بھی آسانی رہے گی کہ قبیل خان کی موت کے بعد تمھیں ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ جاؤں گی۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''ویسے تمھیں، کس بے وقوف نے یہ کہا ہے کہ تم خوب صورت ہو۔''

''اتنی جلدی اپنے کہے الفاظ تمھیں بھول گئے ہیں۔''اس نے میری سردار سے کی گئی گفتگو یاد دلائی۔

''سوائے بکواس کرنے کے تمھیں کچھ نہیں آتا۔'' کروٹ بدل کر میں نے سر پر چادر رکھ لی۔

وہ جلدی سے بولی۔''بات سنو۔''

لیکن نے اسے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

وہ دوبارہ بولی۔''راجا ذیشان حیدر صاحب!......اٹھ جاؤ بازار تک جانا ہے۔''

میں نے چہرے سے کپڑا ہٹانے کی زحمت کیے بغیر کہا۔''تو منع کس نے کیا ہے، جاؤ نا۔''

وہ مصر ہوئی۔''نہیں تمھارا ساتھ جانا ضروری ہے۔''

''فضول گوئی سے پرہیز کرو یہ نہ ہو میں سچ مچ تمھیں یہاں سے دفع ہو جانے کا کہہ دوں۔''

''یعنی پہلے تم مذاق میں مجھے چلے جانے کا کہہ رہے تھے۔اس کا مطلب ہوا میرا اندازہ صحیح ہے کہ تم شروع سے مجھ پر بری نظر رکھے ہوئے ہو۔''

''پلوشہ!......فضول گوئی کی کوئی حد ہوتی ہے۔''میں چڑ گیا تھا۔

''تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا نام پلوشہ خان وزیر ہے۔باقی بازار تک تو تمھیں جانا پڑے گا۔''

میں بگڑ کر بولا۔''زبردستی ہے کیا؟''

وہ بے تکلفی سے میری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔''چلو نا۔''

میں اٹھ کر اس سے ذرا سا فاصلہ پیدا کرتے ہوئے بولا۔''تم میں لڑکیوں والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

وہ اطمینان سے بولی۔''تو میں نے کب کہا ہے کہ میں لڑکی ہوں۔''

''کیا تمھارے بال چھوٹے کروانے، زیور نہ پہننے یا مردانہ لباس استعمال کرنے سے تم لڑکا بن جاؤ گی۔''

''راجا صاحب!......یہ اخلاق سدھارنے کا کام میرے بڑوں کے لیے چھوڑ دو اور اٹھو میرے ساتھ بازار

تک چلو۔''

''کل سے تم جانے کہاں کہاں سے گھوم پھر کر آ رہی ہو، بازار تک اکیلے جانے میں کیا قباحت ہے۔''

''تم نے چلنا ہے کہ نہیں۔''میرے سوال کا جواب وہ گول کر گئی تھی۔

''اگر میں نہ کہوں پھر۔''

''تو پھر میں اس وقت تک کہتی رہوں گی جب تک تم میرے ساتھ چل نہیں پڑتے۔''

''سنا تھا عورتیں مصیبت اور پریشانی کا دوسرا نام ہیں۔''میں نے پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ منہ بنا کر بولی۔''یہ بات بیویوں کے متعلق کہی گئی ہے اور میں تمھاری بیوی نہیں ہوں سمجھے۔''

''عورت تو ہو نا۔''

''نہیں، تمھارے لیے عورت بھی نہیں ہوں، مرد ہوں۔ اگر شک ہے تو آ جاؤ میدان میں۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''یقیناً تمھارے جبڑے ٹھیک ہو گئے ہوں گے۔''

''بڑا طنز کر رہے ہو، بندھی ہوئی لڑکی پر تشدد کرنا یقیناً ایک کارنامہ ہی تو ہے۔''

''اچھا اب اپنی ٹیں ٹیں بند کرو اور چلو۔''میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے خاموشی سے میری تقلید میں قدم بڑھا دیے تھے۔ میری تلخ اور طنزیہ باتوں کا اس ڈھیٹ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

میں نے بیٹھک کا دروازہ تالا کرتے ہوئے پوچھا۔''تم نے میرا پستول واپس نہیں کیا۔''

وہ بے پرواہی سے بولی۔''تم دوسرا خرید لینا۔''

میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔''جانتی بھی ہو اس کی قیمت کتنی ہے؟''

''جانتی ہوں تو واپس نہیں کر رہی نا۔''اس کے لہجے میں شامل اطمینان مجھے تپا گیا تھا۔

''پھر تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ اتنا قیمتی پستول میں تمھارے حوالے کر دوں گا۔''

اس نے انکشاف کیا۔''یہ میرا معاوضہ ہے۔''

”کیا“ میں حیرانی سے اچھل پڑا تھا۔”تمھاری منتیں سن کر تمھیں ساتھ رکھا اور اب تمھیں معاوضا چاہیے ،واہ کیا انداز ہے۔“

”تو میرے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، ہر آدمی نوکری کے حصول کے لیے نوکری دینے والے کی منتیں کرتا ہے۔“

میں گہرا سانس لیتے ہوئے خاموش ہوگیا۔بازار میں گھستے ہی اس نے ایک حجام کی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے بال چھوٹے کروانے ہیں۔“

”اب کون سے اتنے بڑے ہیں۔“

”نہیں، اگر میرے بال تھوڑے سے بھی لمبے ہوگئے تو میں بالکل لڑکی لگنے لگوں گی۔“

”تو کیا......؟“

”اس سوال کے جواب کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔“ وہ حجام کی دکان کی طرف بڑھ گئی۔

بوڑھے حجام کو اس نے بال چھوٹے کرنے کا کہا۔میں خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیا۔بال بنواتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

”حجام چاچا کو پیسے دے دو۔“

کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے میں نے پچاس کا نوٹ حجام کی طرف بڑھا دیا۔

دکان سے باہر آتے ہی وہ کہنے لگی۔”مجھے شادی کے لیے نئے کپڑے لے کے دو۔“

میں جانتا تھا کہ اسے مطعون کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہونا تھا اس کے باوجود خاموش نہیں رہ سکا تھا

”تمھیں کل بیس ہزار دیے تھے وہ کہاں گئے؟“

”جانتے ہو تمھاری مثال بالکل اس بکری کی سی ہے جو دودھ تو دیتی ہے مگر مینگنیاں ڈال کر سارا مزہ کرکرا کر دیتی ہے۔“

”تمھاری زبان کچھ زیادہ ہی لمبی ہوتی جارہی ہے۔جاؤ نہیں خرید کر دیتا۔“

ٹھیک ہے واپس چلو۔ وہ بیٹھک کی جانب مڑ گئی، مجھے ہلکی سی ندامت تو ہوئی مگر میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رستے میں ہم خاموشی سے چلتے رہے۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی وہ تو غسل خانے میں گھس کر نہانے لگی اور میں چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔

غسل خانے سے برآمد ہو کر وہ بھی خاموشی سے چارپائی پر آکر لیٹ گئی چند لمحوں کے بعد میرا نام لیے بغیر اس کی دکھ بھری آواز ابھری۔

''امی جان اور میرا چھوٹا بھائی، پچھلے آٹھ نو سال سے رشتے کے ایک ماموں کے گھر پر رہ رہے ہیں ۔ماموں خود بھی غریب آدمی ہیں۔امی جان عید الفطر پر کپڑوں کا ایک جوڑا خریدتی ہیں اور پورا سال اسی میں گزارتی ہیں، چھوٹے بھائی نے شاید ہی کبھی کھلونے کا منہ دیکھا ہو۔تم سے اسی لیے بے غیرت ہو کر پیسے مانگے حالانکہ تم جیسے آدمی سے پیسے مانگنا اپنی انا کے گلے پر چھری چلانے کے مترادف ہے۔اوراب نئے کپڑوں کا بھی اس لیے کہہ رہی تھی کل ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں کم از کم حلیہ تو باراتیوں کا بنا کر جائیں۔''

اس کی بات سن کر مجھے شدید ندامت محسوس ہوئی مگر ندامت ظاہر کیے بغیر میں نے غصے سے کہا۔''تو یہ بکواس پہلے بھی کی جا سکتی تھی۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''تو اب کر دی ہے نا۔''

''اچھا چلو اٹھو۔''میں دوبارہ اٹھ بیٹھا۔گو مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اب میرے ساتھ چلنے پر تیار ہوگی۔مگر وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔وہ ایسی ہی تھی فضول ناراضی میں وقت ضائع نہیں کرتی تھی۔یا شاید اسے اپنی اہمیت ہی کا اندازہ نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں جانے کے لیے کمانڈر عبدالحق کی موٹر سائیکل ہمارے کام آئی تھی۔وہاں تک جانے کے لیے ہمیں علام خیل سے گزر کر جانا پڑا۔اس کے گاؤں کا نام ڈمبریانی تھا۔اس کی بیٹھک کسی وسیع وعریض حویلی سے بھی زیادہ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔بھاری بھر کم

تن وتوش کا مالک ثقلین خان ہمیں بیٹھک ہی میں اپنے آدمیوں کے جھرمٹ میں نظر آیا۔

ہمیں خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتے ہوئے اس نے ایک ملازم کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے اس نے ہم سے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی اور نہ یہ پوچھا تھا کہ ہم آئے کہاں سے ہیں ۔اس علاقے کی خوبیوں میں ایک بڑی خوبی مہمان نوازی ہے۔ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں کچھ اور لوگ بھی کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ کھانا کھا کر ہم باہر آئے اور ثقلین خان کی سجائی ہوئی محفل میں بیٹھ گئے ۔وہاں اس کے محافظوں کے علاوہ اور بھی کافی لوگ موجود تھے۔ اس وقت زوروشور سے یہ بحث ہو رہی تھی کہ کل کس گویے کو بلایا جائے۔ اس میں قریباً تمام آدمی اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ ثقلین خان نے ہم دونوں سے بھی پوچھا، جواباً پلوشہ نے ایک خاتون گلوکارہ کا نام لے دیا تھا۔

رات کا کھانا وغیرہ کھا کر جب مقامی لوگ گھروں کو لوٹنے لگے تبھی ثقلین خان نے سرسری انداز میں ہم سے پوچھ لیا تھا کہ ہم کہاں سے تشریف لائے ہیں۔

”ہم شامون سے آئے ہیں۔ حاجی ارسلان گل میرے چچا جان ہیں۔ ان کی طبیعت ناساز تھی اس لیے اس نے میرے ہاتھ اپنی معذرت بھجوائی ہے۔ اور یہ میرے دوست ہیں ان کا تعلق مردان سے ہے۔“ پلوشہ نے فوراً اپنا اور میرا تعارف کرا دیا۔

”حاجی ارسلان......“ ثقلین خان کے چہرے پر سوچ کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اچھا اچھا شامون والے حاجی ارسلان گل صاحب !......ویسے کیا ہوا انھیں، طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے۔“

”نہیں چچا جان !......اب کافی بہتر ہے، لیکن سفر کرنے قابل نہیں تھے۔“

”چلو واپسی پر میری جانب سے پوچھ لینا، شادی کے ہنگامے نمٹا کر شاید میں شامون کا چکر لگا لوں۔“

”ضرور چچا جان !“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ”آپ کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ لوگ آرام کرو۔“ وہ اٹھ کر بیٹھک کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ محافظوں نے اس کو تین اطراف سے گھر لیا تھا۔

اس کے دور جاتے ہی میں نے پلوشہ سے پوچھا۔ ”یہ حاجی ارسلان گل کون ہے؟“

وہ مسکرائی۔ ”پتا نہیں۔“

”کیا مطلب؟...... پتا نہیں کا۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ میں نے فرضی نام لیا ہے اور ثقلین خان جیسے بڑے سرداروں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں کو ان کے نام سے یاد کرتے پھریں۔“

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”مروا نہ دینا۔“

وہ شوخی سے بولی۔ ”نہیں تمھیں میرے علاوہ کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا اور میں بھی قبیل خان کی ہلاکت کے بعد تم سے نبٹوں گی۔“

میں چڑ کر بولا۔ ”بکواس کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا۔“

”تمھیں یہ بکواس لگ رہی ہے، اس خبیث کو مرنے دو پھر پتا چل جائے گا۔“

”فضول عورت۔“ کہہ کر میں سونے کے کمرے کی طرف چل دیا، وہاں ہر کمرے میں پانچ چھ چھ آدمی سوئے تھے ہم دونوں بھی ایک کمرے میں گھس کر سو گئے۔

☆......☆......☆

اگلے روز سورج ابھرتے ہی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ ثقلین خان کا بیٹا دلدار خان، اونچے لمبے قد کا پر رعب جوان تھا۔ چھوٹی داڑھی اور کندھوں پر بکھری ہوئی گھنی زلفیں اس وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں ۔گویے نے رات کو آنا تھا۔ رات بارہ بجے کے بعد ناچنے گانے والی طوائفیں کا پروگرام تھا۔ لیکن یہ محفل چیدہ چیدہ مخصوص افراد کے لیے تھی۔ ہم دونوں کی کوشش یہی تھی کہ اس محفل میں بیٹھنے کی اجازت حاصل کر سکیں۔ نو دس بجے پشتو کے خوب صورت ساز ساؤنڈ سسٹم پر بجنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے منچلے نوجوان ان خوب صورت دھنوں پر ناچنے لگے۔ پلوشہ میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی اس وقت میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسے ناچتے ہوئے نوجوانوں کا رخ کرتے دیکھا۔ پستول وہ میری گود میں پھینک گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ تھرکتے ہوئے ان میں شامل ہو گئی۔ اس کے بدن کی لچک، ہاتھ پاؤں کی ہم آہنگی خوب صورت انداز میں دائرے میں چکر کاٹنا

ایک عجیب خوش کن منظر تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک نوخیز لڑکا ہی سمجھ رہے تھے یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ وہ لڑکی ہے اور اس وجہ سے مجھ پر اس کا ناچنا کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہو رہا تھا۔ کئی بار میں نے اس کے بدن سے نظریں چرا کر دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام لڑکوں نے پلوشہ کے لیے میدان خالی کر دیا تھا۔ اس کے مسحور کن ڈانس نے جلد ہی تمام کی توجہ اپنی جانب سمیٹ لی تھی۔ وہ کافی دیر ناچتی رہی۔ شوقین حضرات نے بے تحاشا پیسے پھینکنے شروع کر دیے جنھیں سمیٹنے کے لیے مقامی میراثی موجود تھا۔ وقت جیسے تھم گیا تھا۔ دھن بدلتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں اور درمیانی بدن کی حرکت بھی تبدیل ہو جاتی تھی۔ کافی دیر گزر گئی شاید وہ تھکنا جانتی ہی نہیں تھی۔ یہ بات تو مجھے اس سے لڑتے وقت بھی معلوم ہو گئی تھی کہ اس میں بلا کی جان ہے۔ گھنٹا ڈیڑھ مسلسل ناچنا کتنا مشکل ہے اس بارے وہی جانتے ہیں جن کا یہ پیشہ ہے۔ میں تو بس اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ اس کا ڈانس ختم ہوتے ہی ''ہاہو'' کا شور مچ گیا تھا۔ وہ سیدھا میرے پاس پہنچی پسینہ دھاروں کی صورت میں اس کے چہرے اور گردن پر بہہ رہا تھا لیکن اس کا سانس بالکل ہموار تھا۔ دلدار خان بھی اس کا ڈانس بڑے شوق سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے واپس آتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جیب سے کئی بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''شاباش جوان!......دل خوش کر دیا۔''

پلوشہ نے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے تمام نوٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیے تھے۔

''ویسے یہی کاروبار کرو کافی کمائی کر لو گی۔'' چارپائی پر وہ میرے ساتھ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ اس لیے میں نے اسے مطعون کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

''اچھا مشورہ ہے، لیکن پہلے قبیل خان اور تمھیں قتل کر دوں پھر اس بارے بھی کچھ سوچوں گی۔''

''بے حیا۔'' نہ جانے کیوں مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔

''یہ جو فوجی ہوتے ہیں نا، نوکری پر آتے ہوئے عقل گھر چھوڑ آتے ہیں۔ بے وقوف انسان رات کی خصوصی محفل میں شمولیت کے لیے زمین ہموار کر رہی تھی۔ اب دولھے میاں کو میرا ناچنا پسند آ گیا ہے یقیناً وہ مجھے اور میرے دوست کو خصوصی محفل میں شمولیت کا پروانہ عطا کر دے گا۔'' میری ناگواری اور غصہ اسے بھی محسوس ہو گیا

تھا اور عجیب بات یہ کہ اپنے عمل کی توجیہ میں اس نے ایک منٹ کی دیر بھی نہیں لگائی تھی۔

''سچ کہو تم اسی لیے ناچنے گئیں تھیں۔'' مجھے اس کی بات پر یقین تھا لیکن اس کے باوجود میں حجت کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''ہاں، مجھے معلوم تھا کہ تمام میری جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ خوب صورت لڑکے یہاں کسی بھی طرح لڑکیوں سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔''

''بڑی آئی خوب صورت۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا لیکن یہ طنز میرے حلق سے نیچے نہیں اتر سکا تھا۔ اس کا موہنا چہرہ کسی کی تعریف کا محتاج نہیں تھا۔

''وہ کیا کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ''ویسے تم یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے گویا اس سے پہلے کسی لڑکی کو ناچتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''یہ تو سچ ہے کہ میں نے کبھی کسی لڑکی کو ناچتے نہیں دیکھا مگر تم لڑکی کب ہو؟''

''صحیح کہا۔'' اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس نے میری گود میں پڑی چادر اٹھائی اور اپنا پسینہ پونچھنے لگی۔

میں تلخ ہوتا ہوا بولا۔ ''کتنی بار منع کیا ہے کہ میری چیز کو بغیر پوچھے استعمال نہ کیا کرو۔''

''جس دن دل سے کہو گے نہیں کروں گی۔''

اور میں افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتا ہوا دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ یوں بھی وہ انتہائی درجے کی ڈھیٹ تھی۔

''میرا پستول ادھر کرو۔'' پسینہ صاف کر کے اس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ اور میں نے خاموشی سے گلاک اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرے پاس اس وقت پلوشہ کی ایس ایم جی موجود تھی۔ چائنہ کی بنی ہوئی فلوڈنگ بٹ والی گن تھی۔ سردار والا بریٹا میں کمانڈر نصر اللہ کی بیٹھک ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت ڈھول باجے کو خاموشی نصیب ہوئی۔ نماز ظہر کے بعد ایک بار پھر تیاریاں ہونے لگیں۔ یوں بھی دھوپ سے بچنے کے لیے بہت بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا۔

پلوشہ کھانا کھا کر کہیں غائب ہوگئی تھی۔نہ میں نے پوچھا تھا کہ کہاں جارہی ہو نہ اس نے بتانے کی زحمت کی تھی۔میں وہیں کمرے میں تکیے سے ٹیک لگا کر چارپائی پر ڈھیر ہوگیا۔شادی کا اصل ہنگامہ نمازِ عصر کے بعد ہی شروع ہونا تھا۔گھنٹے ڈیڑھ بعد ہی مجھے پلوشہ کی صورت نظر آئی۔اس نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر اندر نگاہ دوڑائی اور مجھے تکیے سے ٹیک لگائے دیکھ کر اندر گھس آئی، یقیناً میری تلاش میں اس نے دوسرے کمروں میں بھی جھانکا ہوگا۔

میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔''ایک بری خبر ہے۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا''تمھارے منہ سے پہلے بھی کبھی اچھی خبر نہیں سنی اور کمرے میں تمام چارپائیاں خالی پڑی ہیں میرے ساتھ بیٹھنا ضروری تھا کیا۔''

''تمھیں خوش کرنے کے لیے بیٹھتی ہوں۔''

''تم جتنی دور رہتی ہو میں اتنا خوش ہوتا ہوں۔''

''جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔''اس نے منہ بنایا۔

''تمھیں تو آتا ہے نا؟اور یہی کافی ہے۔''

''اچھا جو میں خبر لائی ہوں وہ سنو۔''اس نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔میرے پاس سے اٹھنے کی کوشش اس نے نہیں کی تھی۔

''فرماؤ۔''

''وہ خبیث شادی میں شرکت کے لیے نہیں آرہا۔''

''کیا۔''میں نے بدمزگی سے پوچھا۔

''صحیح کہہ رہی ہوں۔میں مکمل چھان بین کر کے آئی ہوں وہ اس وقت افغانستان میں ہے۔''

''پھر تو واپس چلنا چاہیے۔''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''نہیں میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔''

''کیا؟''

”ثقلین خان ایک تگڑی آسامی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ قبیل خان اور ثقلین خان کے درمیان تھوڑی بہت چپقلش پیدا کی جائے جسے بعد میں ہم بڑھاوا دے دیں۔“

”اور اس سے ہمیں کیا ملے گا؟“

”بہت کچھ، اس کا ایک طاقت ور حلیف اگر حریف بن جائے تو کتنا اچھا ہو جائے گا۔“

”تو یہ چپقلش پیدا کیسے ہوگی؟“

”ایک طریقہ ہے تو سہی، اگر تم ہمت کر سکو۔“

”بولتی رہو۔“

اس نے بے باک لہجے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”قبیل خان کے لشکر کا ایک اہم کمانڈر انار گل یہاں آیا ہوا ہے اور یہ انتہائی درجے کا بدکردار شخص ہے۔ کمینہ عورتوں سے زیادہ یہ کم سن لڑکوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اگر میں دوپہر کی طرح ناچتے ہوئے خود کو سستا بنا کر پیش کروں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ مجھے چھیڑنے سے باز رہ سکے۔ وہ لامحالہ مجھے چھیڑنے کی کوشش کرے گا اس وقت میں ہنگامہ کھڑا کر دوں گی اور تم فوراً غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سر میں گولی اتار دینا۔ کیونکہ میں تمھارا دوست ہوں۔ اور اس طرح غیرت کھا کر گولی چلانا بھی کوئی نئی بات نہیں ہے اس لیے ہنگامہ تو ہوگا لیکن اس کا نتیجہ ہمارے حق میں نکلے گا۔ سب سے بڑھ کر ہم ثقلین خان کے مہمان ہیں اور اپنے مہمانوں کو وہ کسی صورت قبیل خان کے آدمیوں کے حوالے نہیں کرے گا۔ انار گل بھی ان معاملات میں شیطان کی طرح بدنام ہے۔“

میں گہرے طنز سے بولا۔ ”گویا اب تم نے قبیل خان کے قتل سے پہلے مجھے مروانے کا منصوبہ سوچ لیا ہے۔“

وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ ”راجا!...... کچھ بھی نہیں ہوگا تم ہمت تو کرو۔“

”اور تم اتنی حور پری کب سے ہو گئی ہو کہ تمھیں دیکھ کر انار گل جیسی گندی ذہنیت کا آدمی آپے سے باہر ہو جائے گا۔“

وہ اعتماد سے بولی۔ ”جس بات میں تمھیں شک نہیں اس پر سوال مت اٹھاؤ۔“

”اچھا اگر میرے گولی چلانے کے بعد اس کے آدمیوں نے بھی فائر کھول دیا تب ثقلین خان کس جادو سے

میری جان بچائے گا۔اور تمھاری آنکھوں میں تو میں یوں بھی کھٹک رہا ہوں۔"

"انار گل، قبیل خان نہیں ہے کہ اس کے دائیں بائیں محافظ موجود ہوتے ہوں۔ باقی قبیل خان کے جو آدمی شادی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی کس وجہ سے انار گل کی اتنی طرف داری کرے گا کہ تم پر گولی چلا دے۔ البتہ قبیل خان ضرور اس بات کو بنیاد بنا کر ثقلین خان سے ہمارا مطالبہ کرے گا۔ اور اس وقت ثقلین چاہ کر بھی ہمیں قبیل خان کے حوالے نہیں کرے گا، کیونکہ ہم اس کے پاس نہیں ہوں گے۔ جبکہ قبیل خان یہی سمجھے گا کہ ثقلین خان نے اس کے مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے یا انھیں کہیں دور بھجوا دیا ہے۔"

میں لگی لپٹی رکھے بغیر بولا۔" ویسے اب تک میں یہی سمجھتا آ رہا تھا کہ خیالی پلاؤ صرف شیخ چلی ہی پکاتا رہا ہے۔ آج یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی ہے۔ بے وقوف!...... قبیل خان جیسے لوگوں کے نزدیک اپنے آدمیوں کی اہمیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ زندہ ہوں۔ ان کے لیے وہ ثقلین خان جیسے سردار سے نہیں جھگڑ سکتا۔ دوسرا یہ فلمی طریقے اپنے پاس رکھو فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

وہ عزم سے بولی۔" میں نے آج انار گل کو ٹھکانے لگانا ہے اور یہ میں طے کر چکی ہوں۔"

"وجہ......؟"

" میرے بھائی نے جب باجی کو بچانے کے لیے گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کی تھی تب یہی کمینہ تھا جس نے بھائی کو لات مار کر گاڑی سے نیچے گرایا تھا۔ اور نیچے گرتے ہی پتھر اس کے سر میں لگنے سے وہ زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔"

"تو کیا یہ کام بعد میں نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں، میں اس غلیظ کو گندہ کر کے ہلاک کروں گی۔ میں چاہتی ہوں جب لوگوں تک اس کی ہلاکت کی وجہ پہنچے تو وہ اس پر تھو تھو کریں۔ اور جب یہ ایک نوخیز لڑکے کو اتنے ہجوم میں چھیڑے گا اور اس لڑکے کا دوست اس کے بھیجے میں گولی اتارے گا۔ یقیناً یہ ایک گندی اور قابل ملامت موت ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، اپنے کسی دوست کو بلا لو...... میں یوں بھی تم سے دوستی کا دعوے دار نہیں ہوں۔"

"دیکھو لوراجا!...... ہم دشمن سہی پر قبیل خان کی موت تک ساتھی ہیں۔ کسی وقت تمھیں بھی مجھ سے کام پڑ سکتا

ہے۔''

''تمھیں کام بتانے سے پہلے میں خودکشی کرنا پسند کروں گا۔''

''خیر تمھارے مرنے کی خواہش کو تو میں جلد پورا کردوں گا۔بہرحال اتنا تو کر سکتے ہو نا کہ یہیں موجود رہو۔''

''موجود ہوں،لیکن مجھ سے کسی مدد کی توقع کرنا فضول ہی ہوگا۔تم جیسی لڑکی کے لیے میں اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔''

''دیکھو،مجھے بہ طور لڑکی مخاطب نہ کیا کرو۔جب تمھیں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ میں تمھارے لیے فقط ایک لڑکا ہوں تو براہ مہربانی مجھے پلوخان ہی کہا کرو۔''

''تم خود مجھ سے باتیں کرتے وقت لڑکی کے انداز میں بات کرتی ہو اس میں میرا کیا قصور۔''

''اب نہیں کروں گا۔''اس نے گویا کونین چباتے ہوئے کہا تھا۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔''تو مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے محترم۔''

ڈھول اور شہنائی کی آواز بلند ہوتے ہی اس نے کہا۔''چلو باہر چل کر بیٹھتے ہیں،شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔''

اور میں اس کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آیا۔بیٹھک کے کھلے صحن میں سیکڑوں لوگ موجود تھے اور مزید لوگوں کی آمد جاری تھی۔ایک بڑی چارپائی پر ثقلین خان تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔اس چارپائی پر خوب صورت چادر بھی بچھی ہوئی تھی۔دو تین اور چارپائیاں بھی اسی انداز میں سجا کر رکھی گئی تھیں اور ان پر صاحب حیثیت لوگ بیٹھے تھے۔ایک چارپائی پر ثقلین کا بیٹا دلدار خان اپنے تین دوستوں کے ساتھ بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔میں اور پلوشہ بیٹھنے کے لیے جگہ دیکھنے لگے۔ایک چارپائی پر تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔میں اسی کی طرف بڑھ گیا۔مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ساتھ نہیں آرہی۔پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک مرد کے ساتھ کھڑی کوئی بات کر رہی تھی۔

میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔دو تین منٹ اس کے ساتھ بات کرنے کے بعد وہ میری طرف بڑھ آئی۔میرے بائیں ہاتھ چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر کا باریش مرد بیٹھا تھا۔ہمارے درمیان بہرحال اتنا خلا موجود تھا جس میں وہ

آسانی سے سما سکتی تھی۔لیکن وہاں بیٹھنے کے بجائے، مجھے اس مرد کی طرف دھکیلتے ہوئے وہ میرے دائیں جانب بیٹھ گئی۔

ایک بات میں نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ وہ بیٹھتے وقت کوشش کرتی کہ میرے علاوہ کسی سے اس کا بدن مس نہ ہو۔شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ مجھے تو معلوم تھا کہ وہ عورت ہے اور کسی دوسرے کو اس کے بدن کے گداز سے معلوم ہو جاتا کہ وہ لڑکا نہیں ہے۔لیکن پھر مجھے اپنی اس بات میں وزن نظر نہ آیا، کیونکہ سردار کی موجودی میں بھی اس کی کوشش یہی ہوتی تھی۔حالانکہ وہ اسے دل سے اپنی بہن سمجھتا تھا۔کبھی کبھی مجھے سردار کی بات پر یقین آنے لگتا تھا کہ پلوشہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔بہر حال کچھ بھی تھا میں اب اس راہِ خارزار پر اپنے قدم نہیں بڑھا سکتا تھا۔یوں بھی پلوشہ لڑکی سے زیادہ لڑکا تھی اور ایسی لڑکیاں مجھے بالکل پسند نہیں ہیں جو لڑکی ہوتے ہوئے لڑکوں کا بھیس بنائے پھریں۔گو پلوشہ اس ضمن میں مجبور تھی، لیکن مجھے پھر بھی اس کی اس عادات سے چڑ تھی۔

”وہ لال ٹوپی والا آدمی نظر آ رہا ہے۔“بیٹھتے ساتھ اس نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے ہمارے بائیں جانب دو چار پائیاں چھوڑ کر بیٹھے ہوئے ایک عام سی شکل کے پختہ عمر مرد کی طرف متوجہ کیا جس کی شکل پر پھٹکار برس رہی تھی۔ہمارا رخ اس وقت جنوب کی طرف تھا جبکہ انار گل جس چار پائی پر بیٹھا تھا اس کا رخ مغرب کی جانب ہو رہا تھا۔

میں پوچھنے لگا۔”یہی انار گل ہے۔“

”ہاں......اور دیکھو کس طرح سفید کپڑوں والے نوعمر لڑکے کو ہوس ناک نظروں سے گھور رہا ہے۔“اس نے ڈھول کی تھاپ پر ناچنے والے ایک لڑکے کی جانب اشارہ کیا۔جو وہاں ناچنے والے باقی لڑکوں اور مردوں میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دے پاتا ایک آدمی ہمارے قریب پہنچا۔اور پلوشہ کو مخاطب کر کے کہا۔

”وڑ کیہ!......سردار زادہ دلدار خان دے غواڑی۔“(چھوٹے،سردار زادہ دلدار خان بلا رہا ہے)

”آتا ہوں۔“ اسے کہہ کر وہ میری جان متوجہ ہوئی۔”لگتا ہے سردارزادے کو میرا ناچ کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا ہے۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”چلے جاؤ، کچھ خرچا پانی ہی بن جائے گا۔“

”میرا خرچا پانی تو خیر تمھارے ذمہ ہے، البتہ اس کام کے لیے میں خود اٹھنے والا تھا۔اب تو بہانہ مل گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ سردارزادے دلدار خان کی جانب بڑھ گیا جو اپنے تین چار دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔

پلوشہ کے قریب جانے پر سردارزادہ دلدار خان نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کچھ کہنے لگا۔پلوشہ کا سر اوپر نیچے ہلا اور جواباً سردارزادے کو کوئی بات کہہ کر میرے جانب پلٹ آئی۔

”سردارزادہ مجھے ناچنے کا کہہ رہا ہے، میں نے کہہ دیا کہ اپنے دوست سے بھی پوچھ لوں اور یہ کہ میں اس مقامی ڈھول پر نہیں ناچوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ کھلی جگہ کی طرف بڑھ گئی۔اسی وقت ڈھول بجانے والے نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ایک لمحے کے لیے ماحول میں سکوت چھا گیا تھا۔صرف لوگوں کے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔اگلے ہی لمحے بہترین ساؤنڈ سسٹم پر پشتو کی بھڑکیلی سی دھن سنائی دینے لگی۔اور اس کے ساتھ ہی پلوشہ کا لچک دار بدن اس دھن سے ہم آہنگ ہو گیا۔چند منچلوں نے پہلے تو اس کا ساتھ دینا چاہا مگر اس کی مہارت دیکھتے ہوئے وہ خود بہ خود پیچھے ہٹ گئے تھے۔وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور درمیانی جسم کا استعمال اس خوب صورتی سے کر رہی تھی گویا اس کی ساری زندگی اسی شغل میں گزری ہو۔اس خوش کن نظارے سے نظریں ہٹانا کافی دشوار تھا لیکن میں نے کوشش کر کے انار گل کی جانب نگاہیں گھمائیں۔اس کے چہرے پر جو تاثرات نظر آ رہے تھے انھیں دیکھ کر مجھے پلوشہ کی بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔اس وقت اس کی آنکھیں کسی گدھ کی طرح پلوشہ کے بدن پر گڑی تھیں۔بدلتی دھنوں کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم کی حرکات بھی تبدیل ہو جاتی تھیں۔جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی حرکات میں سستی کے بجائے تیزی آتی جا رہی تھی۔اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی جیبوں کے منہ بھی کھل گئے تھے۔ڈھول بجانے والے کو پچھلے دو تین دن ڈھول پیٹنے پر اتنی رقم ہاتھ نہیں آئی ہو گی جو ان لمحات میں اکٹھی ہو رہی تھی۔یوں بھی اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ پلوشہ کوئی پیشہ ور ناچنے والا

نہیں تھا جو اس کے ساتھ رقم میں حصہ داری کا دعوا کرتا۔اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ پیسے پھینکنے والوں کے ساتھ ناچتے ہوئے اٹھکیلیاں کرنے لگی۔اس کا انداز بالکل کسی بازاری لڑکے کا سا تھا۔کچھ لوگ جو اسے نہیں جانتے تھے انھوں نے اپنے کسی دوست اور ساتھی وغیرہ کے سر پر بڑا نوٹ رکھ کر پکڑا،ڈھول اور شہنائی بجانے والوں نے جب وہ نوٹ پکڑنا چاہا تو انھوں نے پلوشہ کی جانب اشارہ کیا،کہ وہ خود آکر نوٹ پکڑے۔پلوشہ کو پیشہ ور تو نہیں تھی کہ ادھر جاتی،مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ اس بندے کی طرف بڑھ گئی جس نے ایک بڑا نوٹ نکال کر اپنے ساتھی کے سر پر پکڑا ہوا تھا۔اس کے سامنے چکر کاٹتے ہوئے پلوشہ نے دو تین نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹے۔اس دوران اس نے دو تین بار پلوشہ کی کلائی پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ صفائی سے اپنی کلائی بچا گئی۔اسی وقت ایک آدمی نے میرے سر پر دس روپے کا نوٹ پکڑا۔میں حیرانی سے اس کی جانب دیکھا،وہ وہی جوان تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے پلوشہ کوئی بات کر رہی تھی۔

پلوشہ بھی شاید اسی لمحے کی منتظر تھی۔وہ باقی آدمیوں کے بڑے نوٹوں کو نظر انداز کرتی ہوئی چکر کاٹتے ہوئے وہاں پہنچی اور آتے ساتھ میری گود میں بیٹھتے ہوئے وہ نوٹ اٹھانے لگی۔میں تو بالکل سن ہو گیا تھا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔''میرے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔میں اس سے اتنی زیادہ بے باکی کی امید نہیں کر رہا تھا۔

''خاموش بیٹھے رہو،اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔''اس نے مسکراتے ہوئے مجھے جھڑکا۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ سب وہ ایک منصوبے کے تحت کر رہی تھی۔اس آدمی نے میرے سر پر پانچ چھ نوٹ پکڑے اور پھر آخری نوٹ پلوشہ کے گال کے ساتھ لگا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا یا اور پیچھے ہٹ گیا۔اس کی اس حرکت کا برا منائے بغیر وہ اٹھ کر دوبارہ اٹھ کر ناچتے ہوئے مجھ سے دور جانے لگی۔

اسی وقت میں نے انار گل کو جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اپنے ساتھ بیٹھے آدمی کے سر پر پکڑتے دیکھا۔پلوشہ ناچتے ہوئے اس کے قریب پہنچی اور اس کے ہاتھ سے پیسے پکڑ لیے۔چار نوٹ مسلسل پلوشہ کو پکڑوانے کے بعد انار گل نے اس کی کلائی سے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ چابک دستی سے اپنی کلائی اس کے ہاتھ میں آنے سے بچا گئی تھی۔

انارگل چہرے پرہوس بھرے تاثرات سجائے جیب سے مزید نوٹ نکال کر پاس بیٹھے آدمی کے سر پر رکھنے لگا ۔مزید دو تین نوٹ قربان کرنے کے بعد اس نے ایک دم جھپٹ کر پلوشہ کو پکڑا اور گود میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔اسی وقت پلوشہ نے جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔

انارگل کے چہرے پر طیش بھرے آثار نمودار ہوئے اور اس نے دوبارہ کھڑے ہوکر پلوشہ پر ہاتھ ڈالے ۔اس وقت ایک دم مجھے اتنا غصہ آیا جو خود میری سمجھ سے باہر تھا۔میں نے اضطراری انداز میں گود میں پڑی کلاشن کوف ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔لیکن میرے کچھ کرنے سے پہلے پلوشہ نے اپنا گھٹنا زوردار انداز میں انارگل کی ٹانگوں کے بیچ میں دے مارا۔

اس کے منہ سے کافی بلند کراہ خارج ہوئی تھی اگلے ہی لمحے جیسے بجلی چمکتی ہے، پلوشہ نے نیچے جھک کر اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا اور اس کی گردن پر بھرپور انداز میں چلا دیا۔

لوگ ابھی تک اس معاملے کو مذاق میں لے رہے تھے۔انارگل کے نیچے گر کر تڑپنے کے منظر سے ایک دم چیخ و پکار شروع ہوگئی تھی۔اسی وقت میری نظروں نے انارگل کے ایک ساتھی کو کلاشن کوف کندھے سے اتار کر کاک کرتے دیکھا۔پلوشہ کی نظر بھی اس پر پڑ گئی تھی۔لیکن جونھی اس نے کلاشن کوف اس کی جانب سیدھی کی ۔میں نے ایک لمحے میں کلاشن کوف کندھے سے لگائی اور ٹریگر دباتے ہوئے اس کے گولی چلانے کی خواہش کو حسرت میں تبدیل کر دیا۔ماتھے پر لگنے والی گولی سے وہ منہ کے بل گرا تھا۔میں بھاگ کر پلوشہ کے قریب پہنچا اور بغیر کسی تاخیر کے اسے اپنی آڑ میں کر لیا۔انارگل کا جسم ابھی تک جھٹکے لے رہا تھا لیکن اس کے ساتھی کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ساؤنڈ سسٹم پر گویے کی خوب صورت آواز ۔''شنہ بنگڑی دے مات شہ پہ دا سپنو لیچو باندھے......'' گونج رہی تھی۔

اسی وقت کسی کو خیال آیا اور اس نے ساؤنڈ سسٹم بند کر دیا۔پانچ چھ آدمی میرے اور انارگل کے ساتھیوں کے درمیان میں آ گئے تھے۔وہاں پر اس کے چار ساتھی اور بھی موجود تھے۔

ثقلین خان نزدیک آ کر تشویش بھری نظروں سے لاشوں کو دیکھنے لگا۔

''یہ کیا کر دیا تم لوگوں نے۔''اس کی آواز میں غم وغصہ ابل رہا تھا۔

میں اکھڑ پن سے بولا۔'' بالکل وہی کیا ہے جو کرنا چاہیے تھا۔ میرا دوست پیشہ ور ناچنے والا نہیں ہے۔ وہ تو بس سردار زادہ دلدار کے کہنے پر ناچ رہا تھا۔ اور اس گھٹیا انسان نے سب کے سامنے اسے بے عزت کرنے کی کوشش کی۔''

''انار گل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' میرے دائیں جانب کھڑے جوان نے واضح انداز میں میری تائید کی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ وہی تھا جو میرے سر پر پیسے پکڑ رہا تھا۔

''چلو انار گل کی تو خیر ہے، شمس کو تو نہیں مارنا چاہیے تھا۔'' ایک آدمی نے میری گولی سے مرنے والے کا نام لیا۔

میں نے کہا۔'' پہل اس نے کی تھی، کیا میں چپ چاپ تماشا دیکھتا رہتا۔''

میری بات کے جواب میں تین چار آدمی مسلسل بولنے لگے۔ انار گل کے ساتھی بھی تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

اچانک مجھے اپنے بازو پر کسی کا لمس محسوس ہوا۔ میں اس کی طرف دیکھا، وہ پلوشہ تھی۔ میرے متوجہ ہوتے ہی وہ دبی زبان میں بولی۔

''We need to run away from here''

''اتنا آسان ہے نا؟'' میں نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا تھا۔

''میں جا رہی ہوں مجھے روکنے کے بہانے تم بھی پیچھے آ جانا، اگر موٹر سائیکل تک پہنچ گئے تو پھر نکلنا مشکل نہیں ہوگا۔'' اس کے تیز دماغ نے ایک منٹ میں تجویز سوچ لی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس وقت ثقلین خان لوگوں کو لاشوں سے دور ہٹنے کا کہہ رہا تھا۔ انار گل کے ساتھی شور کر رہے تھے کہ وہ اسی وقت بدلہ لیں گے۔

دلدار خان اور اس کے دو تین دوست انھیں ٹھنڈا کرنے کی تگ و دو میں تھے۔

ثقلین خان پلوشہ کو مخاطب ہوا۔'' لڑکے تمھیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بلاشبہ غلطی انار گل کی بھی تھی

لیکن تمھیں انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔''

''چچا جان آپ بھی اس خبیث کی طرف داری کر رہے ہیں، ٹھہرو میں اپنے حاجی چچا کو بلا کر لاتا ہوں۔'' پلوشہ نے بہانہ گھڑنے میں دیر نہیں کی تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑی۔

''نہیں پلو خان!......حاجی صاحب کو کچھ نہ بتانا......رک جاؤ......ہم خود اس معاملے سے نبٹ لیں گے۔'' میں نے با آواز بلند اسے پکارا۔ مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھتی رہی۔

''پلو خان!......واپس آجاؤ۔'' میں نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ اس وقت وہ دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی ثقلین خان مجھے مخاطب ہوا۔ ''جوان اسے جانے نہ دو۔ جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا یہ کہیں نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے سردار!......میں اسے پکڑ کر لاتا ہوں۔ بچہ ہے نا ڈر گیا ہے اور چاہتا کہ اس کا کوئی سرپرست یہاں موجود ہو۔'' ثقلین خان کو یہ کہہ کر میں نے ساتھ کھڑے آدمی کی طرف اپنی کلاشن کوف بڑھاتے ہوئے کہا ''بھائی جان!......ایک منٹ یہ گن پکڑو میں اس بے وقوف کو پکڑ لاؤں۔''

اس آدمی نے بے اختیار میرے ہاتھ سے گن تھامی اور میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ کہاں جا رہا ہے۔'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے کانوں میں انار گل کے ایک ساتھی کی آواز گونجی، مگر میں دھیان دیے بغیر تیز قدموں سے چلتا رہا۔

''وہ اپنے دوست کو پکڑنے جا رہا ہے۔'' جس آدمی کو میں نے گن پکڑائی تھی غالباً اسی نے جواب دیا تھا دروازے سے نکلتے ہی میں نے دیکھا پلوشہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکی تھی۔

''پلو خان!......رک جاؤ۔'' میں نے چیخ کر زوردار انداز میں کہا اور اس کی جانب اس طرح بھاگنے لگا گویا اسے روکنا چاہتا ہوں۔ قریب پہنچتے ہی میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے پیچھے نشست سنبھال لی۔ وہ میری ہی منتظر تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے کلچ چھوڑتے ہوئے موٹر سائیکل بھگا دی۔

''وہ بھاگ رہے ہیں۔'' میں نے اپنے عقب میں ایک چیختی ہوئی آواز سنی۔ پلوشہ نے گیئر تبدیل کرتے ہوئے رفتار کچھ اور بڑھا دی تھی۔ اس حویلی تک آنے کے لیے سو دو سو گز کا راستہ بنا ہوا تھا اس کے بعد پختہ سڑک

تھی۔ پلوشہ چند سیکنڈز میں سڑک تک پہنچ گئی تھی۔ دائیں جانب موٹر سائیکل موڑتے ہوئے اس نے رفتار کم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا دروازے سے چند آدمی دوڑتے ہوئے نکلے اور دیوار کے قریب کھڑی ڈبل کیبن کی طرف بڑھ گئے۔

اس کے ساتھ ہی کلاشن کوف کے فائر کی تڑتڑ میرے کانوں میں پڑی۔ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر ایک آدمی ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس کا کوئی فائدہ اس لیے بھی نہیں تھا کہ کلاشن کوف سے تین سو میٹر کے فاصلے تک نشانہ لے کر فائر کیا جا سکتا ہے اور ہم اس سے زیادہ فاصلے پر آچکے تھے۔ پلوشہ جس طرح موٹر سائیکل چلا رہی تھی شاید اس مہارت سے میں بھی نہ چلا سکتا۔ ہنڈا ایک سو پچیس گولی کی سی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ گلاک نائنٹین میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ پلوشہ والی کلاشن کوف میں یوں بھی وہیں چھوڑ آیا تھا۔ اس کلاشن کوف کی وجہ ہی سے انھیں میرے لوٹنے کی امید تھی ورنہ وہ مجھے اتنی آسانی سے پلوشہ کے پیچھے نہ جانے دیتے۔ ڈبل کیبن کے روڈ پر چڑھنے تک ہم کافی دور نکل گئے تھے۔ وہ اس رفتار سے موٹر سائیکل دوڑا رہی تھی کہ مجھے اچھا خاصا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی جگہ میں ہوتا تب بھی شاید موٹر سائیکل اسی رفتار ہی سے دوڑاتا۔

اس کے کان کے نزدیک منہ لے جا کر میں نے پوچھا۔ ”کہاں جائیں گے؟“

”پتا نہیں......“

”وہ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں اور ان کے پاس ڈبل کیبن ہے۔ یقیناً وہ جلد ہی ہمیں آلیں گے۔“

”علام خیل تک تو سڑک ہی پر جانا پڑے گا۔ یہاں کوئی ایسا راستہ موجود نہیں ہے جس پر موٹر سائیکل دوڑ سکے ،البتہ کہتے ہو تو موٹر سائیکل چھوڑ کر پیدل بھاگتے ہیں۔“ اس نے قریباً چیختے ہوئے میری بات کا جواب دیا تھا۔

”جو مناسب سمجھو کرو۔“ میں نے ساری ذمہ داری اسی کے سر پھینکتے ہوئے جان چھڑائی۔

وہ جواب دیے بغیر اسی رفتار میں موٹر سائیکل بھگائے چلی گئی۔ سڑک کے بائیں ہاتھ نالہ تھا اور دائیں ہاتھ پہاڑیاں۔ اگر ہم دائیں طرف موٹر سائیکل اتارتے تو سو ڈیڑھ سو گز سے زیادہ آگے نہیں جا سکتے تھے جبکہ دائیں ہاتھ یوں بھی ڈھلان تھی۔

ایک خطرناک موڑ کے قریب آتے ہوئے پلوشہ نے موٹر سائیکل کی رفتار ذرا سی کم کی اسی وقت ہمیں اپنے

عقب میں کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ سنائی دی، لیکن ابھی تک وہ چند سو میٹر دور تھے۔ موڑ کاٹ کر پلوشہ نے دوبارہ رفتار بڑھا دی۔ موٹر سائیکل کی رفتار زیادہ ہونے کے باوجود ڈبل کیبن آہستہ آہستہ ہمارے قریب آتی جا رہی تھی۔ علام خیل عبور کر کے نالے کی کھڑی چڑھائی ڈھلان میں تبدیل ہو جاتی تھی وہاں ہم انھیں جل دے کر نکل سکتے تھے۔ یقیناً یہی بات پلوشہ کے ذہن میں بھی تھی اسی لیے اس نے سڑک ہی پر جانے کا خطرہ مول لیا ہوا تھا۔ علام خیل کی آبادی کے آثار نظر آتے ہی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ڈبل کیبن تین چار سو گز دور ہی تھی۔ مجھے اطمینان سا محسوس ہوا کہ اب ہمارے بچنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ مگر میرا یہ اطمینان اس وقت گہری پریشانی میں ڈھل گیا جب میں نے سامنے سے ایک ڈبل کیبن کو آتے دیکھا۔ وہ ڈبل کیبن علام خیل سے نکل کر آندھی و طوفان کی طرح ہماری طرف بڑھنے لگی۔ یقیناً انھوں نے اپنے ساتھیوں کو وائرلیس سیٹ پر اطلاع دے دی تھی۔ اور ہم دونوں ایسے بے عقل تھے کہ یہ خیال بھی ہمارے ذہنوں میں نہ آیا کہ علام خیل تو قبیل خان کا علاقہ ہے۔

''مارے گئے۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پلوشہ دوسری ڈبل کیبن کو دیکھتے ہی موٹر سائیکل کی رفتار کم کرنے لگی۔ ہم دائیں بائیں پیدل بھاگ کر نکل سکتے تھے لیکن اس وقت یہ کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سامنے والی گاڑی ہمارے قریب پہنچ چکی تھی۔

ہم سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر گاڑی روک کر چار مسلح آدمی باہر نکل آئے، اسی وقت عقبی گاڑی بھی قریب آ کر رک گئی۔ اس میں انار گل کے چاروں ساتھی سوار تھے۔

ہمارے تعاقب میں آنے والوں میں سے ایک نے آتے ہی میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔

''خبیث کا بچہ، تمھارا کیا خیال تھا بھاگ جاؤ گے۔''

اس وقت منہ کھولنے کا مطلب اپنی کم بختی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مجھے ایک اور تھپڑ سے نواز کر وہ پلوشہ کو گندی گالی بکتے ہوئے بولا۔

''تمھارے ساتھ تو میں وہ کروں گا کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکو گے۔'' پلوشہ بھی خاموش رہی تھی۔ علام خیل سے آنے والی گاڑی سے اترنے والے ایک شخص نے مجھے تھپڑ مارنے والے کو کہا۔

''فیروز خان!...... کمانڈر روشن خان نے کہا کہ انھیں وہیں حویلی میں لے آئیں۔''

''اسے حویلی میں لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔''فیروز خان نے میرے جانب اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔''حویلی کے لیے''قرار اراشہ''کافی ہے۔''اس کا گھٹیا اشارہ پلوشہ کی جانب تھا۔

''نہیں روشن خان نے دونوں کو زندہ لانے کا حکم دیا ہے۔''

''چلو چند منٹ اور سانس لے لو۔''مجھے کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''چلو۔''فیروز خان سے بات کرنے والے نے مجھے کلاشن کوف کی نال سے گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا ''عصمت خان!......اس مجنوں کے پاس پستول اور چھوکرے کے پاس تیز دھار خنجر موجود ہے۔''گاڑی کے قریب پہنچتے ہوئے اچانک فیروز خان کو یاد آیا اور اس نے اپنے ساتھی تک یہ بات پہنچانے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگایا تھا۔

''ادھر دو۔''کہتے ہوئے عصمت خان نے فوراً ان ہتھیاروں کا مطالبہ کرتے میری جانب ہاتھ بڑھایا ۔میں نے نیفے میں اڑسا پستول نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا جبکہ پلوشہ نے فرماں برداری سے پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ کر انھوں نے ہمیں گاڑی کی باڈی میں بٹھایا اور آگے بڑھ گئے۔

پچھلی گاڑی کا ایک آدمی ہماری موٹر سائیکل پر بیٹھ دونوں گاڑیوں کے درمیان چلنے لگا۔گاڑی کی باڈی میں ہمارے ساتھ دو آدمی بیٹھ گئے تھے۔پانچ دس منٹ کے اندر ہم قبیل خان کی وسیع و عریض حویلی کے پاس پہنچ گئے تھے۔اس کی حویلی اور بیٹھک کی دیوار ملی ہوئی تھی۔بیٹھک کا رقبہ حویلی سے زیادہ تھا۔بلکہ قبیل خان کی بیٹھک رقبے میں ثقلین خان کی بیٹھک سے بھی بڑی تھی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی بیٹھک کے دروازے پر پہنچیں۔دروازے پر کھڑے ہتھیار بردار چوکیدار نے سرعت سے دروازہ کھول دیا۔گاڑیوں کے اندر گھستے ہی اس نے جس تیزی سے دروازہ کھولا تھا اسی رفتار سے دروازہ بند کر دیا۔

بیٹھک کے صحن میں کمروں کی قطار کے بالکل سامنے ایک جہازی سائز چارپائی پر ٹانگیں پسارے روشن خان لیٹا تھا۔اس کے زخمی پاؤں پر مجھے سفید پٹیاں لپٹی نظر آئیں۔یہ وہی پاؤں تھا جو میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔

ہمیں گاڑی سے اتار کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

”ہونہہ!......تو یہ ہیں وہ سورما۔“ اس نے منہ بگاڑ کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”جی کمانڈر۔“ فیروز خان نے جواب میں سر ہلایا۔

وہ فیروز کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مجھے ذرا تفصیل سے پوری بات بتاؤ۔“

جواباً فیروز خان نے تمام تفصیل دہرا دی۔

”اس چھوکرے نے انار گل کو قتل کیا ہے۔“ روشن کے لہجے میں بلا کی حیرانی تھی۔ جواباً فیروز خان نے منہ سے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اور تم نے شمس خان کو گولی ماری ہے۔“ وہ براہ راست مجھے مخاطب ہوا۔

”پہل اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس نے میرے ساتھی کو گولی مارنے کی کوشش کی اور اپنے بچاؤ کے لیے ہر آدمی گولی چلانے کا حق رکھتا ہے۔“

میں نے جونھی زبان کھولی اس کے چہرے پر حیرت بھرے تاثرات اجاگر ہوئے۔

”تمھارا نام کیا ہے؟“ دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر اس نے اپنا اوپری دھڑ سیدھا کیا۔ اسی وقت وہاں کھڑے ایک آدمی نے جلدی سے دو بڑے تکیے اس کی کمر کے ساتھ لگا دیے۔

”ذیشان۔“ میں محتاط انداز میں بولا۔

”تمھاری آواز سنی سنائی لگتی ہے۔ کیا ہم اسے پہلے مل چکے ہیں۔“

”یقیناً نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”فیروز خان!......تھوڑی دور لے جا کر اس کی میرے ساتھ مخابرے (وائرلیس) پر بات کراؤ۔“

”میں سمجھا نہیں کمانڈر۔“ فیروز خان حیران رہ گیا تھا۔

وہ وضاحت کرتا ہوا بولا۔ ”میں بس اپنا شک دور کرنا چاہتا ہوں۔ اسے دروازے کے قریب لے جا کر اس کی میرے ساتھ مخابرے پر بات کراؤ۔“

مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یقیناً اپنی زندگی کے سب سے بڑے دشمن کی آواز کیسے

اس کی سماعتوں کو بھول سکتی تھی۔

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے روشن خان۔'' میں نے اس ڈرامے سے جان چھڑانے کے لیے اعتراف کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''شمس خان کو گولی کس جگہ پر لگی ہے۔'' وہ فیروز کان کی طرف متوجہ ہو کر مستفسر ہوا۔

''ماتھے پر۔'' فیروز خان اب تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔

''ہونہہ!......'' اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے روشن خان نے گہری نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ''تو تم ایس ایس ہو۔''

''ہاں، مگر انار گل کو ہم نے کسی منصوبے سے قتل نہیں کیا۔ اس نے میرے دوست کے ساتھ غلط حرکت کرنے کی کوشش کی اور نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔''

''اور شمس کا کیا قصور تھا؟''

''پہل اس نے کی تھی۔ اگر میں اسے گولی نہ مارتا تو اس نے میرے دوست کو قتل کر دینا تھا۔''

''بہت پیار ہے اپنے دوست سے۔'' قبیل خان نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''روشن خان!...... جب بات دوستی کی آ جائے تو پھر پیار محبت ثانوی چیز رہ جاتی ہے۔''

روشن خان نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''فلسفے بیان نہ کرو جوان!......اس لڑکے کی شکل دیکھ کر پتا چل رہا ہے کہ تمھاری کتنی کچھ دوستی ہے۔ بہ ہر حال یہ میرا درد سر نہیں ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ تمھارے دوست یا معشوق نے میرے ایک اہم آدمی کو چھوٹی سی بات پر قتل کر دیا ہے اور تم نے بدلہ لینے کی کوشش کرنے والے آدمی کو گولی مار دی۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں بدلہ لینے کا حق ہے یا نہیں ہے؟ اور جواب یہ ہے کہ بالکل ہے۔'' ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم اپنے دل جانی کو گولی مار کر جان بچا سکتے ہو۔''

جواباً میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا تھا۔ پلوشہ سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود میں ایسی بے غیرتی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے خاموش پا کر وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ اور یقیناً جس کے

لیے تم ایسا کر رہے ہو اگر اسے موقع ملا تو وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلوشہ کی جانب متوجہ ہوا۔''لڑکے تمھارا کیا خیال ہے۔کیا اسے گولی مار کر اپنی جان بچانا چاہو گے؟''......!

''ہاں۔''پلوشہ نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔

مجھے سخت قسم کی توہین اور خفت محسوس ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔

''دیکھ لیا۔''اپنے اندازے کی درستی پر وہ مسکرایا۔''خیر گھبراؤ نہیں میں نے تمھارے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ کھڑے فیروز کو مخاطب ہوا۔''اپنی کلاشن کوف مجھے دو اور اپنے سارے آدمیوں کو کہو کہ کہ جناب ایس ایس کو اپنے ہتھیاروں کے نشانے پر رکھ لیں۔''

فیروز خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی کلاشن کوف اس کی جانب بڑھائی اور اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔تمام نے اپنے کلاشن کوفیں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے مجھ پر نشانہ سادھ لیا تھا۔اتنی کلاشن کوف کی گولیاں لگنے کے بعد میں صرف اسی صورت میں زندہ بچ سکتا تھا کہ میں پنجابی فلموں کا ہیرو ہوتا۔میں زیر لب کلمہ شہادت دہرانے لگا کہ یہی ایک مسلمان کا شیوہ ہے۔مگر روشن خان کی اگلی بات نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔وہ فیروز خان کو مخاطب تھا۔

''اخکلی جانان دیوال سرا اودرواودے پہ سریو گلاس کیدا۔''(خوب صورت محبوب کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرو اور اس کے سر پر ایک گلاس رکھ دو)

فیروز خان کے چہرے پر ایک منحوس مسکراہٹ نمودار ہوئی یقیناً اسے پتا چل گیا تھا کہ روشن خان کا مطمع نظر کیا ہے۔اس نے پلوشہ کو دیوار کی طرف چلنے کا کہا اور روشن خان کی چارپائی کے ساتھ لکڑی کی میز پر پڑا گلاس اٹھا لیا۔وہ ایک وسیع بیٹھک تھی۔صحن کے درمیان سے دیوار تک اچھا خاصا فاصلہ بن رہا تھا۔پلوشہ فیروز خان کے کہنے پر خاموشی سے دیوار کی طرف مڑ گئی تھی،دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے فیروز خان نے اس کے سر پر گلاس رکھ دیا روشن خان نے فیروز خان کی کلاشن کوف کاک کر کے میری جانب بڑھا دی۔''یہ لو ایس ایس اب تمھاری اور تمھارے دوست کی زندگی کا دارومدار تمھاری نشانے بازی کی مہارت پر ہے۔اگر تم نے ایک گولی سے اپنے دوست کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنا دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں تمھیں مع موٹر سائیکل اور دوسرے سامان کے

یہاں سے جانے کی اجازت دے دوں گا۔اور تمھارے یہاں سے نکلنے کے ادھ گھنٹا تک کوئی بھی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا۔البتہ اس کے بعد فیروز خان کے آدمیوں نے تمھیں پکڑ لیا تو میری ذمہ داری ختم۔اور اگر تم نشانہ نہ بنا سکے تو میں فیروز خان کے آدمیوں کو نشانہ آزمانے کا موقع دوں گا۔''

روشن خان نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا تھا۔مجھے اپنے نشانے پر بھروسا اور اعتماد تھا لیکن ایسا موقع اس سے پہلے میری زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا کہ کسی کی زندگی کا دارومدار اس بات پر ہوتا کہ میرے گولے نشانے پر لگنے کی صورت میں اس کی زندگی بچ جائے گی۔

''کس سوچ میں ڈوبے ہو ایس ایس!......'' روشن خان استہزائی انداز میں پوچھا۔''یاد ہے تم نے اڑھائی تین سو میٹر کی دوری سے مجھے کہا تھا کہ اگر میں نے آڑ سے ایک ہاتھ بھی باہر نکالا تو وہ ہاتھ میرے جسم کا حصہ نہیں رہے گا۔یہ فاصلہ تو اس کے آدھے سے بھی کم ہے اور گلاس بھی اچھا خاصا حجم رکھتا ہے۔''

''مجھے تین گولیاں چاہئیں تاکہ میں ہتھیار کو جانچ سکوں۔'' ایک لحہ سوچنے کے بعد میرے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''ٹھیک تین لے لو مگر تیسری گولی اس لیے ہوگی کہ دو میں نشانہ نہ بنا سکے تو تیسری گولی اپنے دل میں مارنا جہاں تمھارا محبوب بسا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا تھا۔اور چارپائی پر پڑی میگزین سے دو گولیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔''یہ لو،لیکن ایک گولی فائر کرنے کے بعد ہی تمھیں دوسری گولی لوڈ کرنے کا حق ہو گا۔

میں نے گولیاں اس کے ہاتھ سے لے کر جیب میں ڈالیں اور زمین پر بیٹھ کر پلوشہ کے دائیں جانب مگر اس سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر زمین پر پڑے اینٹ کے ایک ٹکرے پر نشانہ سادھنے لگا۔کلاشن کوف پر میں نے سو میٹر کی رینج لگا لی تھی۔ایک سنائپر کے لیے کسی بھی چیز کو نشانہ بنانے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس ہتھیار کی ہوتی ہے جو اس کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔اسی وجہ سے سنائپرز اپنے ہتھیار کی حفاظت اور دیکھ بھال اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرتے ہیں۔لیکن اس وقت میرے ہاتھوں میں ذاتی ہتھیار نہیں تھا۔اور پھر اتنی باریک بینی سے فائر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی سنائپر رائفل ہوتی۔کلاشن کوف اور وہ بھی کسی دوسرے کی......اس سے کسی

آدمی کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنانا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔سب سے بڑھ کر اگر نشانہ خطا جاتا تو فیروز خان کے آدمی اپنا نشانہ آزماتے گویا پلوشہ کی موت یقینی ہو جاتی اور اس کے بعد لازماً میرا نمبر آجاتا۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے گم ہو چکا تھا لیکن اس کے غروب ہونے میں ابھی بیس پچیس منٹ باقی تھے۔روشنی کی صورت حال ایسی تھی جو ایک فائرر کے لیے پسندیدہ ہوتی ہے۔میں نے زیادہ دیر نشانہ سادھنے پر نہیں لگائی تھی۔ٹریگر دباتے ہی کلاشن کی گولی اس اینٹ کے ٹکڑے کی تھوڑا سا دائیں اور نیچے کی طرف لگی تھی۔اب میرے پاس دو گولیاں باقی تھیں۔استاد عمر دراز کے بہ قول اچھے سنائپر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک گولی چلا کر ہتھیار کا نشانہ جانچ لے۔اسی طرح راؤ تصور صاحب کہا کرتے تھے کہ جو سنائپر کسی ہتھیار سے ایک گولی چلا کر یہ اندازہ نہیں کر پاتا کہ ہتھیار کس جگہ گولی مار رہا ہے اسے سنائپنگ چھوڑ کر گڈریا بن جانا چاہیے۔اپنے دونوں استادوں کے اقوال میرے دماغ میں گونج کر رہ گئے تھے۔

اگر میں دوسری گولی بھی ہتھیار کا نشانہ جانچنے پر استعمال کر لیتا تو پلوشہ کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنانے کے لیے میری پاس ایک گولی بچتی۔یوں بھی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کلاشن کوف کی گولی دائیں اور نیچے کی طرف لگ رہی ہے۔

میں نے کلاشن کوف کی بیرل پلوشہ کے سر کی جانب موڑی۔اور ایک دم میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔اس کے چہرے پر مجھے بے فکری اور بے خوفی کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔اس کے بہادر اور نڈر ہونے کا مجھے پہلے سے معلوم تھا، لیکن اس حالت میں کم از کم تھوڑی بہت پریشانی کے آثار تو اس کے چہرے پر نمودار ہونے چاہیے تھے۔نامعلوم اسے میرے نشانے پر اعتماد تھا یا پھر موت کا کوئی خوف اس کے دل میں موجود نہیں تھا۔میں نے گلاس کے اوپری اور بائیں کنارے کا نشانہ سادھا تھا کیونکہ کلاشن کوف دائیں اور نیچے مار کر رہی تھی۔پسینے سے میری ہتھیلیاں گیلی ہو گئی تھیں۔فائر کرتے ہوئے اتنی زیادہ گھبراہٹ مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔نہ جانے کیوں ایک دم پلوشہ کی اہمیت میرے دل میں بڑھ گئی اور اس کی موت کا سوچ کر میرے ہاتھ پاؤں گویا بے جان سے ہونے لگے تھے۔حالانکہ میری سوچ کے مطابق تو اس کا میری زندگی میں کوئی کردار نہیں تھا۔بہ قول اس کے وہ میری جان کے درپے تھی۔بلکہ چند منٹ پہلے ہی روشن خان کے پوچھنے پر اطمینان بھرے

انداز میں مجھے گولی مارنے پر تیار ہوگئی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ یوں جیسے وہ میرے لیے بہت اہم ہو، یوں جیسے وہ حقیقت میں میرا اقریبی دوست ہو، یوں جیسے اس کے نہ ہونے سے میری زندگی میں کوئی بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا، یوں جیسے ماہین، جینیفر اور رومانہ بھی میرے لیے اتنی اہم نہیں رہی تھیں جتنا وہ تھی۔

میرے ساتھی سنا ئپر مجھے بہت تیز رفتار فائرر سمجھا کرتے تھے۔ اور اس میں شک بھی نہیں تھا کیونکہ میں شست لینے میں چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت میری انگلی ٹریگر کو دبا ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسی وقت میرے کانوں میں روشن خان کی طنز یہ آواز پڑی۔

''ایس ایس!......سو تو نہیں گئے ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی اس گلاس کو نشانہ بنالو ورنہ یقین مانو فیروز خان کے آدمیوں کا نشانہ بہت برا ہے۔ ان کی سر پر چلائی گئی گولی پیٹ میں لگتی ہے۔'' تمام روشن خان کی بات پر زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

میری نظریں گلاس سے پھسل کر پلوشہ کے چہرے پر گردش کرنے لگیں وہ یوں بے فکری سے کھڑی تھی گویا کسی ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی ہو۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور دوبارہ گلاس پر نظریں گاڑ لیں۔ میرے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ زیادہ دیر شست لینے سے گولی کے دائیں بائیں نکل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو میں راؤ تصور صاحب کی نصیحت پر کان دھرنے پر تیار تھا، نہ استاد عمر دراز کی ماننے پر راضی اور نہ کسی اور استاد کی سننے کو تیار۔

''میں دس تک گنوں گا اگر اس دوران تم نے گولی نہ چلائی تو مجبوراً مجھے کسی اور کو موقع دینا پڑے گا۔'' روشن خان نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا اور با آواز بلند گنتی گننے لگا۔

''ایک......دو......تین......چار......پانچ......چھے......سات............''

مجھے لگا کہ میرے ہاتھوں میں ہلکی ہلکی لرزش ہو رہی ہے۔ میں نے آخری بار اپنی شست کے صحیح ہونے کا اندازہ کیا اور اس کے نو کہتے ہی ٹریگر دبا دیا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن میری سماعتوں میں سٹیل کے گلاس سے گولی کے ٹکرانے

کی آواز اور پھر گلاس کے دیوار سے ٹکرا کر نیچے کی گرنے کی آواز پہنچ گئی تھی۔ اس آواز نے میری بے ربط ہوئی دھڑکنوں کو سنبھالا دیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

پلوشہ کے چہرے پر ویسے ہی اطمینان بھرے تاثرات چھائے تھے۔ روشن خان تعریفی لہجے میں بولا۔

''ایس ایس مجھے معلوم تھا کہ تم آسانی سے اپنے معشوق کو بچالو گے، بہ ہر حال تمھارے پاس آدھا گھنٹا ہے اس کے بعد میری ذمہ داری ختم سمجھو۔'' مجھے کہتے ہوئے وہ فیروز خان کی طرف متوجہ ہوا۔''فیروز خان!...... سامان اس کے حوالے کردو۔''

''جی کمانڈر۔'' کہہ کر اس نے گلاک پستول اور موٹر سائیکل کی چابی میرے حوالے کردی۔

''شکریہ روشن خان۔'' پستول نیفے میں اڑستے ہوئے میں نے موٹر سائیکل چابی ہاتھ میں پکڑتے ہوئے پلوشہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کسی بہت بڑی آزمائش سے باہر نکلا ہوں۔

روشن خان نے ایک دم میرے سر پر بم پھوڑا۔''ایس ایس!...... جانے کی اجازت تمھیں دی ہے اس لڑکے کو نہیں۔'' میں اس کی طرف مڑا۔''روشن خان!...... تم اپنے الفاظ سے پھر رہے ہو۔''

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔''تم نے میری جان بخشی کی تھی، میں بھی تمھیں جان کی معافی دے رہا ہوں۔''

''مگر تم نے پہلے کچھ اور کہا تھا۔'' غصے سے میری آواز تبدیل ہوگئی تھی۔

''میں نے کہا تھا کہ تمھیں جانے دوں گا اور تمھیں سے مراد تم دونوں نہیں صرف تم ہو۔''

ہم دونوں بحث میں پڑے تھے مجھ پر کلاشن کوفیں تاننے والے بھی ہم دونوں کی طرف متوجہ تھے۔ پلوشہ اس وقت فیروز خان کے قریب کھڑی تھی۔ اچانک میرے کانوں میں فیروز خان کی زوردار کراہ پڑی۔ میں نے اس طرف دیکھا وہ گھٹنوں کے بل گر گیا تھا اور اس کی کلاشن کوف تھامتے ہوئے پلوشہ اس کے عقب میں ہوگئی تھی۔ دائیں بائیں کھڑے آدمیوں نے اپنی کلاشن کوفیں اس کی طرف سیدھی کیں لیکن اگر وہ گولی چلاتے تو ان کی گولی پہلے فیروز خان کو لگتی۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے فوراً چھلانگ لگائی اور ایک ہاتھ حیران و پریشان روشن خان کے دائیں کندھے سے نیچے گزار کر دوسرا ہاتھ اس کی گردن سے لپیٹ کر اسے پیچھے گھسیٹ لیا

تکلیف بھری آواز اس کے منہ سے خارج ہوئی لیکن میں اسے گھسیٹ کر قریبی دیوار کے قریب ہو گیا ۔گلاک پستول اس کے سر سے لگا کر میں دھاڑا''اگر کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو سراس کے جسم کا حصہ نہیں رہے گا۔''

''تم بچ نہیں سکتے۔''روشن خان خرخرایا۔

میں اطمینان سے بولا۔''مگراس سے پہلے تمھارا نمبر آئے گا۔''

پلوشہ کلاشن کوف کی نال فیروز کان کے سر سے لگا کر خوداس کے عقب میں کھڑی تھی۔

''ٹھیک ہے تم دونوں جا سکتے ہو۔''روشن خان تکلیف سے کراہتا ہوا بولا۔یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ فیروز خان کے ایک ساتھی نے پلوشہ کی طرف کلاشن کوف تان کر دوتین گولیاں فائر کیں۔لیکن یہ ایک اضطراری حرکت تھی گولیاں فیروز خان اور پلوشہ کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔اس کے ساتھ ہی وہ غرایا۔

''ہتھیار پھینک دو ورنہ......''مگر ورنہ سے آگے وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔روشن خان کی گردن سے پستول ہٹا کر میں نے اس کی طرف گولی داغ دی تھی۔وہ ترچھا میرے سامنے کھڑا تھا۔گولی اس کے بائیں کان سے دوانچ اوپر کھوپڑی میں پیوست ہوئی تھی۔اس کے دوسرے ساتھی نے ایک دم کلاشن کوف کا رخ میری جانب موڑ کر فائر کھول دیا۔تین چار گولیاں روشن خان کی چھاتی میں لگی تھیں۔میں فوراًروشن خان کے موٹے جسم کی پناہ میں ہو گیا۔اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کلاشن کوف کی مسلسل تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی۔وہ پلوشہ تھی اس نے مزید انتظار کیے بغیر ہاتھ میں پکڑی کلاشن کوف کو برسٹ پر سیٹ کرتے ہوئے بیرل گھما دی تھی۔تین بندے نیچے گرے اور چار آڑ کی تلاش میں بھاگے۔میں نے ایک دم پستول سیدھا کرتے ہوئے دوتین دفعہ ٹریگر دبایا۔دوآدمی مزید گر گئے تھے۔اسی وقت بھاگتے ہوئے دونوں آدمی ایک کمرے میں گھس گئے،دوسرے کمرے سے ایک آدمی بھاگ کر باہر نکلا اور پلوشہ کی گولی کا شکار ہو کر نیچے گر گیا۔ہمیں وہاں موجود آدمیوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔میں بھاگتا ہوا موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔پلوشہ نے مسلسل فائر کرتے ہوئے میگزین خالی کی اور پھر ہاتھوں میں موجود کلاشن کوف نیچے پھینک کر اس نے ایک مرے ہوئے آدمی کی کلاشن کوف اٹھالی۔میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے داخلی دروازے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھولنے لگا۔پلوشہ مسلسل اس دروازے کی

جانب فائر کر رہی تھی جس میں وہ دونوں غائب ہوئے تھے۔ بغیر کسی شک وشبہ کے وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح میرا ساتھ دے رہی تھی۔ جب تک میں نے دروزاہ کھول کر موٹر سائیکل باہر نہ نکال لی وہ زمین پر لیٹ کر کمرے کی جانب مسلسل فائر کرتی رہی۔ وہ کمرے میں جانے والوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ ہماری جانب فائر کر سکیں۔ موٹر سائیکل باہر نکالتے ہی میں نے ہارن بجایا۔ وہ زمین سے اٹھ کر الٹے قدموں پیچھے آنے لگی۔ قریب آتے ہی میرے پیچھے نشست سنبھالتے ہوئے وہ بولی۔ ''چلو۔'' وہ موٹر سائیکل کے کیریئر کی جانب منہ کر کے بیٹھی تھی۔ میری پیٹھ کے ساتھ اس نے پیٹھ جوڑ دی تھی۔ یقیناً وہ اپنے عقب کو غیر محفوظ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

اس کے کہنے سے پہلے ہی میں نے کلچ چھوڑ کر ریس گھما دی تھی۔ موٹر سائیکل آگے بڑھی اور اس کے ساتھ اس نے فائر کھول دیا۔ میں نے اپنی توجہ موٹر سائیکل چلانے پر مبذول رکھی۔

سڑک پر چڑھتے ہی میں نے پوچھا۔

''کہاں جانا ہے؟''

''انگور اڈے تک تو نہیں پہنچ پائیں گے، بہتر یہی ہے کہ موٹر سائیکل کمانڈر عبدالحق کے حوالے کر کے پیدل ہی کہیں نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ گھوم کر سیدھی بیٹھ گئی کیونکہ قبیل خان کے آدمی ابھی تک باہر نہیں نکل پائے تھے۔

''دماغ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوتا، تو تمھارے ساتھ ہوتی۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بڑا احسان ہے تمھارا۔ یہ جو ابھی بھگت کر آ رہے ہیں اس کی وجہ میں ہی تو ہوں۔''

''اگر وجہ میں ہوں تو تمھارے جیسے اناڑی نشانہ باز کا سامنا بھی تو مجھے ہی کرنا پڑا۔''

''ہا...... ہا...... ہا صحیح کہا۔'' اس مرتبہ میں نے کھلے دل سے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی تائید کی تھی۔

''ہی...... ہی...... ہی۔'' نقل اتارے ہوئے اس نے مجھے چڑایا۔

مجھے معلوم تھا کہ قبیل خان کے آدمی ہماری تلاش میں سڑک ہی پر حرکت کریں گے لیکن اس کے باوجود میں اس وقت تک سڑک نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جب تک کسی محفوظ جگہ پر نہ پہنچ جاتا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ان کے جو آدمی انگور اڈہ میں موجود تھے وہ ہمیں پکڑنے میں اپنے آدمیوں کی مدد کر سکتے تھے۔ جیسے انھوں نے ہمیں علام خیل میں گھیر لیا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں ایک دم رک گیا۔

''اب کیا ہوا؟''

''کہیں ان کے آدمی رستے ہی پر ہمارے منتظر نہ ہوں۔'' میں نے دل میں پلنے والا اندیشہ اس کے سامنے بیان کر دیا۔

وہ فوراً بولی۔ ''اسی لیے تو پہلے سے منع کر دیا تھا، مگر تم نے پہلے بھی کسی کی سنی ہے۔''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے موٹر سائیکل اس جانب موڑ دی جس طرف میں اور سردار قبیل خان کے سالے خائستہ گل کو لے گئے تھے۔

''اب کس طرف چل پڑے؟''

''فی الحال اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں کسی ایسی جگہ چھپنا پڑے گا جہاں قبیل خان کے آدمی ہمیں ڈھونڈ نہ سکیں۔''

''بڑے عقل مند ہو گئے ہو۔'' میرے پیٹ میں انگلی چبھوتے ہوئے وہ مسکرائی۔

میں نے برا مناتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں کتنی بار منع کیا ہے کہ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کیا کرو۔''

''اُفف، قسم سے کتنا دکھاوا کرتے ہو، ورنہ گلاس پر گولی چلاتے وقت تمھارا سانس نکلا جا رہا تھا۔''

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''وہ اس وجہ سے کہ میں نہیں چاہتا تھا کوئی بے گناہ میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو۔''

''بس کرو یار!...... میں جانتا ہوں۔''

میں اس کی فضول بات کا جواب دیے بغیر موٹر سائیکل آگے بڑھاتا گیا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا

تھا۔

”اگر موٹر سائیکل مجھے چلانے دو تو شاید ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں آسانی ہو۔“

”آرام سے بیٹھی رہو۔“ اسے جھڑکتے ہوئے میں نے رفتار بڑھا دی۔ تمام راستہ پتھریلا تھا موٹر سائیکل اچھلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ ہیڈ لائیٹ جلانا میری مجبوری بن گئی تھی۔ ورنہ روشنی کے دور سے نظر آنے کا خطرہ بہت زیادہ تھا۔ اس وقت ہم ایک نالے میں سفر کر رہے تھے۔ آگے جا کر یہ اس نالے کے ساتھ بھی مل رہا تھا جس میں ہم نے خائستہ گل کو قتل کیا تھا۔ لیکن میں نے اس طرف نہیں مڑا تھا کیونکہ اس نالے میں دو تین سو میٹر آگے جا کر چڑھائی اتنی سخت ہو جاتی تھی کہ موٹر سائیکل پر سفر کرنا ممکن نہیں رہنا تھا۔

نالہ پہلے تو سڑک کے ساتھ متوازی چلتا رہا آگے جا کر آہستہ آہستہ سڑک سے دور ہٹنے لگا۔ سڑک ہمارے دائیں ہاتھ رہ گئی تھی۔ اندھیرا مزید گہرا ہونے لگا تھا۔

”کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ نالہ آگے کس جگہ جا کر نکلے گا؟“

وہ بے پرواہی سے بولی۔ ”جب تم نے اپنی مرضی ہی کرنی ہے تو، ضرورت کیا ہے پوچھنے کی۔“

”جتنا پوچھا جائے اتنا جواب دیا کرو، کیونکہ تم میرے ساتھ کام کرنے کا معاوضا وصول کر کے خرچ بھی کر چکی ہو۔“ میرے لہجے میں طنز کے بہ جائے مزاح کا عنصر نمایاں تھا۔ جانے کیوں اس سے بے تکلف ہونے کو دل کرنے لگ گیا تھا۔ یا شاید پہلے ہی سے دل کر رہا تھا مگر جبر کر کے خود پر سنجیدگی اور بے زاری طاری کر رکھی تھی۔

”ہونہہ!......بہت باتیں کرنا آ گیا ہے۔“ اس نے طنزیہ انداز اپنانے کی کوشش کی مگر لہجے میں شامل خوشی نہیں چھپا سکی تھی۔

”محترما!......اس بار دشمن کے ہاتھ چڑھ گئے تو پوچھ گچھ میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں محترما نہیں ہوں اور تم بار بار مجھے اسی طرح مخاطب کر رہے ہو، دوسرا پہلے ہم بے خبری میں مار کھا گئے تھے۔“

”اب کون سی توپ ہے تمھارے پاس۔ ایک کلاشن کوف اور پستول سے کب تک مقابلہ کریں گے۔“

وہ زوردار انداز میں بولی۔ ”ڈرپوک......“

اور پھر میرے جواب دینے سے پہلے موٹر سائیکل جھر جھرا کر خاموش ہو گئی۔

''یک نہ شد دو شد......'' خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے میں نیچے اتر گیا۔ وہ بھی خاموشی سے نیچے اتر گئی تھی۔ قریب موجود درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں موٹر سائیکل چھپا کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ہیولے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی میری ہی جانب متوجہ تھی۔

''اب کیا کریں؟''

''مجھے کیا معلوم؟......'' وہ ہنسی۔ ''میں تو یوں بھی بہ قول تمھارے ملازم ہوں۔''

''اس میں شک ہی کیا ہے۔'' کہہ کر میں نالے ہی میں آگے بڑھ گیا۔

''تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟''

''مالک کا پوچھنا اور ملازم کا جواب دینا فرض بنتا ہے۔''

''چلو وہ تو بعد کا معاملہ ہے پہلے تم پستول میرے حوالے کرو۔''

''کس خوشی میں؟''

''کیونکہ وہ تم میرے حوالے کر چکے تھے۔''

''یاد کرو، عارضی طور پر دیا تھا۔''

''نہیں، کوئی عارضی نہیں تھا اور اس بارے میں پہلے بتا چکا تھا۔'' قریب پہنچ کر اس نے میرے بازو سے پکڑ کر مجھے رکنے پر مجبور کیا۔ ''اور تم یہ کلاشن کوف اپنے پاس رکھو۔''

پستول اس کے حوالے کر کے میں نے کلاشن کوف تھامی اور منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہو یہ پستول تمھاری کلاشن کوف سے چھ گنا زیادہ قیمتی ہے۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''یہ تو یوں بھی میرا معاوضا ہے۔''

میں نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مار کھانے کے لیے کوئی موقع محل بھی دیکھ لیا کرو۔''

''میرا خیال ہے آج دو دو ہاتھ ہو جانے چاہئیں، تا کہ تمھاری یہ غلط فہمی تو دور ہو جائے۔'' اس نے پیچھے سے میری قمیص کو پکڑ کر کھینچا۔

''ہروقت حماقت کے موڈ میں نہ رہا کرو۔'' ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے قمیص چھڑا کر میں آگے بڑھ گیا۔

''ہونہہ بزدل......صرف باتیں کرنا آتی ہیں۔'' چڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے وہ مجھ سے آگے بڑھ گئی۔ چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور چڑھائی چڑھنے میں پوری کوشش کے باوجود میں اس سے مقابلہ نہیں کر پا تا تھا۔اس لیے میں اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس کے عقب میں چلتا رہا۔آکسیجن کی سطح اس علاقے میں بہت کم ہے اس وجہ سے تھوڑی سی مشقت ہی سے بہت زیادہ سانس چڑھ جاتا ہے۔

تھوڑا سا چلتے ہی پلوشہ نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا لیکن میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس نہیں کی کہ وہ مجھ سے کئی گنا زیادہ اس علاقے سے واقف تھی۔

سولہ سترہ کا چاند نکل آیا تھا لیکن ابھی تک وہ مشرقی جانب موجود بلند پہاڑ کی اوٹ میں تھا۔ اس کے باوجود اچھی خاصی روشنی ہوگئی تھی۔

چڑھائی چڑھتے ہی ہمیں سڑک نظر آنے لگی تھی۔تین گاڑیاں انگور اڈے کی طرف جارہی تھیں۔میرے اندازے کے مطابق وہ گاڑیاں قبیل خان کے آدمیوں ہی کی تھیں۔لیکن یہ یقینی بات نہیں تھی۔ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی اور لوگ ہوں۔پلوشہ تیز رفتاری سے اپنے رستے پر بڑھی جارہی تھی میں بڑی مشکل سے اس کا ساتھ دے پا رہا تھا۔وہ پہاڑی کی بلندی ہی پر آگے بڑھتی رہی۔گھنٹا بھر اسی طرح چلنے کے بعد وہ ایک نالے میں اترنے لگی۔چاند کی روشنی میں ہمیں راستہ واضح نظر آرہا تھا۔نالے میں اتر کر وہ اسی نالے میں آگے بڑھنے لگی۔میں بھی خاموشی سے اس کی معیت میں چل رہا تھا۔وہ پہاڑی علاقے میں چلنے کی ماہر تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ پہاڑوں ہی میں پلی بڑھی تھی۔اس کے ساتھ مجاہدین کے ماہر لڑاکوں سے لڑائی بھڑائی کی تربیت بھی حاصل کر چکی تھی۔ایک تربیت یافتہ سنائپر ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ سخت جان ہے۔اس کا تجربہ مجھے تب ہوا تھا جب میں اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنانے کے باوجود اس سے فقط نام ہی نہیں اگلوا سکا تھا۔

''تھک تو نہیں گئے۔'' اس نے کافی دیر سے چھائی خاموشی کو توڑا۔

''چلتے رہو۔''

اس نے رکتے ہوئے پوچھا۔''اگر چاہو تو چند منٹ آرام کر لیتے ہیں۔''

”ضرورت نہیں۔“ کہہ کر میں اس سے آگے بڑھ گیا۔

”اچھا میں تھک گئی ہوں۔ چند منٹ آرام کر لیتے ہیں۔“ اس مرتبہ اس نے اپنا نام لیا لیکن اتنا تو میں جانتا تھا کہ وہ بالکل بھی نہیں تھکی تھی۔

”تھک گئی ہو یا تھک گئے ہو؟“ میں ایک قریبی پتھر پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔

”میری مرضی جو کہوں، البتہ تم مجھے لڑکا ہی سمجھا کرو۔“ وہ میرے ساتھ پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

”کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے۔“

”چار پانچ گھنٹے لگ جائیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے رات چلتے ہوئے بیتے گی۔“

اس نے سنجیدہ لہجے میں مشورہ دیا۔ ”اگر چاہو تو کوئی مناسب جگہ دیکھ کر آرام کر لیتے ہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر چلو۔“ وہ اٹھ کر چل پڑی۔ ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ نالہ در نالہ ہم تیز رفتاری سے چلتے رہے۔ رستے میں دو تین دفعہ پانی پینے کے لیے رکنے کے علاوہ ہم نہ رکے۔ رات کوئی ایک بجے کا عمل ہو گا جب ہم کمانڈر نصر اللہ کی بیٹھک کے سامنے پہنچے۔ چابی میری جیب میں موجود تھی۔

”سخت بھوک لگی ہے۔“ چارپائی پر ڈھیر ہوتے ہوئے وہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

بھوک مجھے بھی لگی تھی لیکن اس وقت کھانے کا بندوبست ہونا ممکن نہیں تھا اس لیے میں خاموشی سے ایک کونے میں لٹکی لالٹین جلانے لگا۔

اس نے کہا۔ ”ہمیں چند دن تک چھپ کر رہنا پڑے گا۔ اور بہتر ہو گا تم اس بیٹھک سے نہ نکلنا۔ جبکہ میں کچھ دن اپنے گھر گزاروں گا۔“

”ہونہہ!“ میں گہرا سانس لیتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”ایسا کرو ایک مخابرہ مجھے دے دو میں روزانہ رات کو آٹھ بجے سے نو بجے کے درمیان مخابرہ آن رکھوں گا اگر کوئی ضروری بات ہو تو مجھے بلا لینا ورنہ ہفتے کے بعد میں آ جاؤں گا اور اکٹھے بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل بنا لیں گے۔“

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔''میرا خیال ہے یہ طے کرنا میرا کام ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔''

اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔''راجے صاحب!......ان حالات میں اس سے بہتر تم کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔چند دن تک قبیل خان کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہماری تلاش میں سرگرداں رہیں گے۔ اوران میں کم ازکم دو آدمی ایسے ضرور ہیں جو ہمیں شکل سے جانتے ہیں۔بلکہ ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں شرکت کرنے والے تمام افراد ہمیں شکل وصورت سے پہچانتے ہیں۔گو وہ قبیل خان کے آدمی تو نہیں ہیں مگران میں کئی ایک ایسے ضرور ہوں گے جن کے قبیل خان کے مختلف آدمیوں سے اچھے تعلقات ہوں۔اس لیے ہمارا چند دن تک منظر عام سے ہٹ جانا بہتر رہے گا۔''

''تو کیا چند دن کے بعد وہ ہماری تلاش ترک کر دیں گے؟''

''نہیں۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔''لیکن تلاش میں ایسی تندی نہیں رہے گی۔''

''میرے سفری تھیلے سے ایک آئی کام اور اس کی فالتو بیٹری نکال لو۔''میں نے میز پر پڑے اپنے تھیلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گویا اس کے ساتھ متفق ہونے کا اعلان کیا تھا۔

میرا تھیلا کھولتے ہوئے اس نے آئی کام سیٹ اور اس کی بیٹری نکال کر کہا۔''یاد رکھنا چینل نمبر گیارہ پر رات آٹھ سے نو بجے کے درمیان میں مخابرہ آن کیا کروں گا۔''

''تو کیا تم ابھی جا رہے ہو۔''اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں......''اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرائی۔''مجھے تم پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔اور پھر میں نے شادی میں ڈانس کر کے کچھ رقم بھی اکٹھی کی ہے۔اس سے پہلے کہ تم یہ رقم چوری کرلو میں یہ بھی امی جان کے حوالے کر آؤں۔''

میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔''فضول گو۔''

''ویسے یاد آیا،تم میری کلاشن کوف کہاں پھینک آئے؟''

''بڑی جلد یاد آ گیا۔''

''نہیں یاد تو کافی دیر سے تھا پوچھنے کا موقع نہ مل سکا۔''

”ثقلین خان کی بیٹھک سے نکلتے وقت میں نے پاس کھڑے آدمی کے حوالے کر دی تھی تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ میں بھی بھاگنے کے چکر میں ہوں۔“

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گہری نگاہ مجھ پر ڈالی چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”اپنا خیال رکھنا اور دروازہ یاد سے کنڈی کر دینا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

دروازہ کنڈی کرنے سے پہلے میں نے باہر جھانکا وہ تیز قدموں سے وہاں سے دور جا رہی تھی دروازہ کنڈی کر کے میں اندر آ گیا۔

میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی صبح کے سات بج رہے تھے۔ دروازہ کھولنے پر سفید ریش کمانڈر نصر اللہ کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔

”اسلام علیکم!“ کہتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا۔

”وعلیکم اسلام۔“ کہہ کر میں نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

”میرا خیال ہے پہلے میں ناشتا لے آؤں؟“ اس نے پر شفقت مسکراہٹ سے پوچھا۔

”بہت اچھا خیال ہے۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا۔

”اکیلے ہو یا پلو خان بھی ساتھ ہے؟“

”اکیلا ہوں، لیکن ناشتا آپ دو بندوں ہی کا لائیں۔ کل رات کا کھانا نہیں کھا سکا تھا۔“

میری بات پر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس نے بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران ہی میں اسے کل کے واقعے کے بارے تفصیل سے بتا دیا۔

تمام تفصیل خاموشی سے سن کر اس نے مجھ سے موٹر سائیکل چھپانے کی جگہ کے بارے پوچھا۔ اور کہنے لگا۔

”موٹر سائیکل کی فکر نہ کرو میں منگوا لیتا ہوں۔“

”کہیں موٹر سائیکل کی وجہ سے آپ لوگوں پر تو کوئی بات نہیں آئے گی۔“

”بالکل بھی نہیں، موٹر سائیکل کے اندر تبدیلیاں کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ یوں بھی یہاں گاڑیوں اور موٹر

سائیکلوں کے کاغذات اور نمبر پلیٹ وغیرہ نہیں ہوتی۔‘‘

اور میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔ناشتے کے بعد وہ برتن سمیٹ کر بیٹھک سے نکل گیا جبکہ میں ایک بار پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔اگلے دو دن میں نے بیٹھک میں آرام کرتے گزارے۔

تیسرے دن کمانڈر نصر اللہ ناشتا لے کر آیا تو بیٹھتے ساتھ قبیل خان کا ذکر چھیڑ دیا۔

’’قبیل خان افغانستان سے واپس پہنچ گیا ہے اور کل اپنی تباہ شدہ حویلی کا جائزہ لینے گیا تھا۔سنا ہے وہ جلد از جلد اپنی حویلی دوبارہ تعمیر کرانا چاہتا ہے۔‘‘

’’لازمی بات ہے اس کی عیاشی کا اڈہ جو تھا۔‘‘ اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔’’ویسے آپ کو کیسے پتا چلا۔یقیناً مجاہدین اس کی نقل وحرکت پر تو نظر نہیں رکھتے۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔’’بس گزشتہ رات اتفاقاً اس کے ایک آدمی سے ملاقات ہوگئی ،میرا پرانا شناسا ہے۔گپ شپ کے دوران ہی یہ سب پتا چلا۔‘‘

’’ہونہہ!......‘‘

’’شاید وہ آج بھی وہاں جائے۔‘‘ کمانڈر نصر اللہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

میں حیرانی سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔’’کیا یہ یقینی بات ہے۔‘‘

’’ایک خبر ملی تھی بھائی، جو آپ کے سامنے دہرادی۔‘‘معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ برتن سمیٹنے لگا۔

’’شکریہ جناب۔‘‘میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔میں جانتا تھا کہ وہ یہ خبر مجھ تک کیوں پہنچا رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر تو شش وپنج میں ڈوبا رہا کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں، آخر میں جانے کا ارادہ غالب آگیا۔دن کے دس ساڑھے دس ہونے کو تھے میں تیار ہو کر بیٹھک سے نکل آیا۔اگر رات کو یہ بات معلوم ہوئی ہوتی تو شاید میں پلوشہ کو بھی بلوا لیتا۔گو وہ نرا سر درد ہی تھی لیکن قبیل خان کے خلاف کام کرتے وقت اس کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔البتہ اس وقت اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس لیے میں اکیلا ہی چل پڑا۔

تباہ شدہ حویلی تک جانے کا جو راستہ پلوشہ نے ہمیں دکھایا تھا وہ آسان ہونے کے ساتھ مختصر بھی تھا۔دو اڑھائی بجے تک میں وہاں پہنچ تھا۔گھنے درختوں اور گنجان جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے میں چکر

کاٹ کر حویلی کے عقب میں موجود پہاڑی کے قریب پہنچا وہاں بلندی سے میں حویلی کی جگہ کا آسانی سے جائزہ لے سکتا تھا۔

میں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک دھما کا ہوا، جھٹکا سا لگا اور مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی گرم انگارہ میرے بائیں کندھے میں گھس گیا ہو۔ میں کولہوں کے بل نیچے گرا اور جلدی سے جھاڑیوں میں رینگ گیا۔ یقیناً اس پہاڑی پر قبیل خان کے آدمی موجود تھے۔ میں کچھ زیادہ ہی بے احتیاطی کا مظاہرہ کر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈریگنو و کو دیکھ کر انھوں نے للکارنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ قبیل خان وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے محافظ چوکس تھے۔

ایک اور برسٹ فائر ہوا گولیاں اسی جھاڑی کی طرف ہی آئی تھیں۔ میں جھک کر وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ پندرہ بیس گز دور آ کر میں بھل بھل کرتے خون کو روکنے کے لیے زخم پر اپنی چادر باندھنے لگا۔ گولی گوشت کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی کی گولی کا شکار بنا تھا۔ شروع میں گولی لگنے کی تکلیف بالکل نہیں ہوئی تھی، مگر اس کے بعد لحہ بہ لحہ درد بڑھتا جا رہا تھا۔ دور مجھے کسی کے چلا کر کچھ کہنے کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً ان کی تعداد کافی زیادہ تھی اور میرے لیے ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ خاص کر اس حالت میں تو میں رائفل چلانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

زخم پر کپڑا لپیٹ کر میں وہاں رکا نہیں تھا، کیونکہ زخم سے ٹپکتے خون کے قطرے میرے چھپنے کی جگہ کو افشا کر سکتے تھے۔ اور اس وقت میرا دماغ کندھے کی تکلیف کو بھلا کر جان بچانے کی تجویز سوچنے میں سرگرداں تھا۔ چادر لپیٹنے کے بعد خون بہنا تقریباً رک گیا تھا۔ جو تھوڑا بہت نکل رہا تھا وہ بھی چادر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ میں تیز قدموں سے وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ عقبی جانب مجھے دو تین برسٹ سنائی دیے۔ یقیناً وہ خواہ مخواہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ درختوں کی بہتات اور جھاڑیوں کے گھنے جھنڈ میرے لیے بہترین پناہ گاہ تھے، وہ اتنی آسانی سے مجھے نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ اور جہاں تک میرا اندازہ تھا قبیل خان کے ذاتی محافظ میری تلاش میں زیادہ دیر سر نہیں کھپا سکتے تھے۔

میرے کندھے کا درد مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔ رائفل سے سلنگ نکال کر میں نے گلے میں ڈالی اور مضروب

بازو کو اس میں لٹکا لیا۔ کیونکہ کسی سہارے کے نہ ہونے کی وجہ سے زخم میں درد مزید بڑھ رہا تھا۔ اس وقت میرا رخ اسی غار کی طرف تھا جہاں میں نے پلوشہ کو زدوکوب کر کے اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ لیکن زیادہ خون بہنے کی وجہ سے میری رفتار میں کمی آ گئی تھی مجھے سخت قسم کی نقاہت محسوس ہونے لگی، لیکن میں آہستہ روی سے چلتا رہا۔ کلاشن کوف کی گولی میرے کندھے میں موجود تھی۔ اگر وہ جلد باہر نہ نکالی جاتی تو یقیناً گولی کا زہر پھیل کر میرے کندھے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس وقت مجھے کسی ساتھی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اگر پلوشہ بھی میرے ساتھ موجود ہوتی، پھر بھی مجھے کافی آسرا ہوتا۔ پتا نہیں وہاں سے پلوشہ کے ساتھ رابطہ ممکن تھا یا نہیں اس بارے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا البتہ کسی بلند جگہ پر جا کر میں اس تک اپنی آواز پہنچانے میں کامیاب ہو سکتا تھا اور اس وقت مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔ اس سے مدد لینے کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں تین چار دن پہلے اپنے کہے ہوئے الفاظ گونجے۔ جب اس نے مجھ سے مدد مانگتے وقت کہا تھا۔

''دیکھو لوراجا!...... ہم دشمن سہی پر قبیل خان کی موت تک ساتھی ہیں۔ کسی وقت تمھیں بھی مجھ سے کام پڑ سکتا ہے۔'' اور جواباً میں نے ''تمھیں کام بتانے سے پہلے میں خودکشی کرنا پسند کروں گا۔'' کہ کر اس کی توہین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''لیکن اس کے باوجود میں نے اس کا مکمل ساتھ دیا تھا۔'' میں خود کو تسلی دینے لگا۔ وقفے وقفے سے کلاشن کوف کے فائر آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

پلوشہ نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ رات کے آٹھ اور نو بجے کے درمیان آئی کام آن کرے گی اور اب مجھے آٹھ بجنے کا انتظار کرنا تھا۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی چار بجنے والے تھے۔ آٹھ بجنے سے چار گھنٹے اب بھی بقایا تھے۔ اس وقت میں اس غار سے جہاں میں نے اور سردار نے بسیرا کیا تھا، ڈیڑھ دو کلو میٹر ہی دور ہوں گا مگر اپنی حالت کے پیش نظر وہ ذرا سا فاصلہ مجھے بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ لحہ بہ لمحہ میری حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر دم لینے کے لیے میں نے نیچے بیٹھ کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی اسی وقت مجھے عقب کی طرف سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

''ہلکا نو واپس زو، ھغہ بہ منڈا کڑے ای۔'' (لڑکو واپس چلو وہ بھاگ گیا ہوگا) وہ میرے کافی قریب پہنچ

گئے تھے۔اپنی نقاہت اور درد کو پس پشت ڈال کر میں فوراً قریبی جھاڑی میں رینگ گیا۔وہ سرسری انداز میں دائیں بائیں دیکھتے آرہے تھے ورنہ وہاں جھاڑیوں کے اتنے جھنڈ تھے کہ انھیں کھنگالنے کی صورت میں وہ ابھی تک دس پندرہ گز بھی آگے نہ بڑھ سکے ہوتے۔

”ویسے اسے گولی تو لگی ہوئی ہے شاید زیادہ دور تک نہ جاسکے۔“ایک اور آدمی نے خیال ظاہر کیا۔

”یار!......شاہ زیب کہہ رہا تھا کہ اسے گولی بازو میں لگی ہے اس کی ٹانگیں تو سلامت ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ یہاں رکنے کی صورت میں اس کی موت یقینی ہے۔“یہ بات پہلے والے آدمی نے کہی تھی۔

”ویسے شاہ زیب خان کو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔اسے کچھ قریب آنے دیتا تو باآسانی زندہ پکڑا جاسکتا تھا۔“یہ چوتھی آواز تھی۔چاروں تھوڑا سا پھیل کر ایک قطار میں آگے بڑھتے آرہے تھے۔میں دم سادھے اسی جگہ دبکا رہا۔چلتے چلتے وہ کسی گھنے جھنڈ میں ایک دو چھوٹے چھوٹے برسٹ فائر کر دیتے۔گویا دائیں بائیں پھیلے درختوں کے گھنے جھنڈوں کی وہ فائر ہی کے ذریعے چھان بین کرتے آرہے تھے۔وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گزرتے چلے گئے۔لیکن وہاں سے وہ زیادہ آگے نہیں گئے اور پچاس ساٹھ گز آگے جاکر پیچھے مڑ آئے۔واپسی پر ان میں سے ایک تو بالکل میرے پاس سے گزرا تھا لیکن ان کا دھیان ایک دوسرے کی باتوں کی طرف تھا۔ان کا تلاشی لینے کا انداز کسی ناپسندیدہ کام کو سرانجام دینے جیسا تھا۔لگتا تھا وہ کسی ناگوار حکم کی بجاآوری کے لیے اس طرف آئے ہوں۔

ان کے گزر جانے کے تھوڑی دیر بعد تک میں لیٹا رہا اور پھر جھاڑی سے باہر نکل آیا۔میرے جسم کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ بڑھتا جارہا تھا اور صحیح طریقے سے چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔اس وقت ضروری تھا کہ میں کسی قریبی آبادی کا رخ کرتا،مگر اس حالت میں وہاں سے انگور اڈے تک چل کر جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔سب سے بہتر پلوشہ ہی سے رابطہ کرنا تھا۔لیکن ایک تو اس سے بات کرنے کے لیے مجھے رات آٹھ بجے کا انتظار کرنا پڑتا دوسرا وہاں جنگل میں مشکل تھا کہ اس سے بات ہو پاتی۔اس سے بات کرنے کے لیے میرا کسی بلندی پر پہنچنا ضروری تھا۔اور اس وقت بدقسمتی سے میں ہموار زمین پر بہ مشکل چل پا رہا تھا تو بلندی پر کیسے چڑھتا مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔میں آہستہ روی سے قریبی پہاڑی کی طرف بڑھتا رہا۔سب سے مناسب غار والی

پہاڑی تھی۔دو اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں مجھے دو تین گھنٹے لگ گئے تھے۔جب میں غار سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر پہنچا اس وقت شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔میرے پاس اس پہاڑ پر چڑھنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت موجود تھا لیکن اس وقت میری جو حالت ہو رہی تھی اس سے میں یا میرا کریم ربّ ہی واقف تھا۔نقاہت، کمزوری، بخار اور درد کی شدت نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ میں زیادہ دیر درد کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گا۔صرف جان بچانے کی جبلت مجھے تحریک دیے ہوئے تھی۔میں رینگنے کی رفتار سے بلندی کا سفر طے کرنے لگا۔پہاڑی کی اونچائی پر چڑھتے وقت صحت مند شخص کا سانس بھی پھول جاتا ہے، میں تو گھائل تھا۔وہاں آکسیجن بھی بہت کم تھی اور اس کے ساتھ بخار بھی مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔گویا ایک ساتھ کئی مصیبتوں مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں۔اس وقت اگر میں اپنا پچھلا قدم اٹھا کر آگے کی طرف رکھ رہا تو اس میں صرف میری قوت ارادی کا عمل دخل تھا۔ورنہ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ خالی سفر ہی کر سکتا کجا چڑھائی چڑھنا۔غار کے دہانے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنی رائفل اور جھولا وہیں پھینکا اور صرف آئی کام سیٹ جھولے سے نکال کر اوپر کی جانب بڑھ گیا۔

زخم سے بہنے والا گاڑھا خون زخم کے منہ پر جم چکا تھا۔زخم پر باندھی گئی چادر بھی اکڑ کر کندھے ہی کا حصہ بن چکی تھی۔میں چیونٹی کی رفتار سے حرکت کرتا رہا۔ہر دس بارہ قدم کے بعد مجھے سانس لینے کے لیے بیٹھنا پڑتا۔سورج پہاڑ کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔تیز ہوا چلنے لگی تھی جو اس موسم میں بھی مجھ پر کپکپی طاری کر رہی تھی۔یہ ایک نئی اذیت تھی۔سردی، درد، بخار، تھکن، دشمنوں کا خوف، ناامیدی اور موت کی آہٹ۔اس وقت جانے میں کس کس کیفیت سے گزر رہا تھا۔پلوشہ جس سے بات کرنے کے لیے میں بلندی کا اذیت ناک سفر طے کر رہا تھا اس کی ذات سے بھی مجھے کوئی خاص امید نہیں تھی۔یہ بھی ممکن تھا کہ بلندی سے رابطہ نہ ہو پاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کوئی بہانہ کر دیتی بلکہ یہ کہہ کر جان چھڑا لیتی کہ......

''اچھا ہے قبیل خان کے بعد میں نے تمھیں یوں بھی قتل کرنا تھا۔''

اگر دیکھا جاتا تو رات کے وقت اس کا اکیلا سفر کرنا بھی تو کافی مشکل کام تھا۔گو وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔مگر اس وقت وہ اکیلی میری تلاش میں تو اپنی پناہ گاہ سے نہیں نکل سکتی تھی۔اور پھر اس کی ماں کیا پڑی تھی کہ کسی غیر

کے لیے اسے اتنی رات گئے کہیں جانے کی اجازت دیتی۔لیکن کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔رات کو نہ سہی وہ صبح سویرے تو مجھے ڈھونڈتے ہوئے آسکتی تھی۔اور اگر میں اذیت بھری رات گزار لیتا تو شاید اگلی صبح مجھے کوئی نہ کوئی مدد مل جاتی۔میرے ذہن پر آہستہ آہستہ اندھیروں کی یلغار ہونے لگی تھی۔زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے میری حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ان ساری تکلیفات کا مقابلہ کرتے آخر میں اونچائی پر پہنچ ہی گیا۔اس علاقے میں ہوا عموماً مغرب سے مشرق کی جانب چلتی ہے۔اس وقت میں پہاڑ کی جنوب مغربی جانب موجود تھا اور اسی وجہ سے میں براہ راست ہوا کی زد میں بھی تھا۔پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں دوسری سمت دو تین گز نیچے ہو کر ایک بڑی چٹان کی آڑ میں ہو گیا۔وہاں ہوا کی براہ راست زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔پانچ دس منٹ مجھے اپنا سانس بحال کرنے میں لگے۔اس کے بعد میں نے گھڑی کی اندرونی لائیٹ جلا کر وقت دیکھا۔سوا آٹھ ہو رہے تھے۔

مجھے ڈر ہوا کہیں پلوشہ نے آٹھ بجے آئی کام سیٹ آن کرنے کے بعد کوئی کال نہ آتی دیکھ کر آئی کام کو بند ہی نہ کر دیا ہو۔یوں بھی جب سے وہ گئی تھی میں نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔میرے دماغ میں آہستہ آہستہ اندھیرا اچھل رہا تھا۔مجھے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔لیکن میں کسی نہ کسی طرح سر جھٹکتے خود کو ہوش میں رکھتے ہوئے آئی کام سیٹ آن کرکے پلوشہ کو پکارنے لگا۔ ’’پلوشہ......پلوشہ......پلوشہ......‘‘میں نے بٹن پریس کرکے چند بار پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔فقط وائرلیس کا اپنا شور سنائی دیتا رہا۔

میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور اسی غنودگی میں میرے دماغ میں۔’’راجا......راجا......راجا‘‘ کی آوازیں گونجیں کوئی بہت دور سے مجھے پکار رہا تھا۔میری پلکیں بہ مشکل وا ہوئیں۔وہ پلوشہ ہی کی آواز تھی۔

’’پلوشہ!‘‘میں نے بٹن پریس کرکے بہ مشکل جواب دیا۔

’’ہاں راجا کیا بات ہے؟......سب ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’مم......مجھے گولی لگ گئی ہے۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو؟‘‘اس کی آواز میں تشویش تھی۔’’اور تم اس وقت کہاں پر ہو؟‘‘

’’میں......میں اس وقت اسی غار کی مغربی سمت میں واقع بلند چوٹی پر موجود ہوں، جہاں تم پہلی بار

مم......مل......ملی تھیں۔'' یہ کہتے ہی میری آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔

''کون سی بلند چوٹی؟''اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''کک......کندھے میں گولی لگی......خ......خون،بب......بہت......بہہ گیا............''میں جیسے خودکلامی کے انداز میں بڑبڑا رہا تھا۔

''اپنی جگہ کے بارے بتاؤ......راجا......راجا......راجا۔''اس کے مسلسل پکارنے پر میں نے دوبارہ کوشش کی۔مجھ سے وائرلیس کا بٹن بھی بڑی مشکل سے دبایا جا رہا تھا۔

''غغ......غا......ر......غار......جج......جہاں ......رے ......رات ......گزاری تھی ...... اکٹھے ...... پہاڑ،مغرب میں سس...... سب ......سب ...... سے اونچی جج جگہ ۔ جج......جا......جس کے دد......دامن......مم......میں پچ......چل......غو......زوں کا......جج......جنگل ...... جنگل......ہوں......'' اور میرے دماغ میں غنودگی چھا گئی۔اس کے بعد اس نے کیا کہا تھا یہ میری سماعتیں نہیں سن پائی تھیں۔

☆......☆......☆

اور پھر نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔کسی نے مجھے جھنجوڑا اس کے ساتھ ہی میرے چہرے پر گیلا ہاتھ پھیرا گیا۔''راجا......راجا۔'' میرے کانوں بہت دور سے پلوشہ کی آواز آرہی تھی شاید ابھی تک وائرلیس سیٹ آن تھا۔

''ہاں پلوشہ!......میں پہاڑ کی چوٹی......''

''راجا!......ہوش میں آؤ۔'' مجھے اپنے گالوں پر پھر گیلے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔اس کے ساتھ ہی اس نے میرے منھ کے ساتھ پانی کی بوتل لگا دی۔ مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔دو تین گھونٹ لیتے ہی مجھے کچھ ہوش آیا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔اپنے چہرے پر مجھے ٹارچ کی روشنی محسوس ہوئی۔

''پلوشہ!......؟''میں نے سوالیہ انداز میں پکارا۔

''ہاں میں پلوشہ ہوں۔اور اٹھو یہاں سے چلنا ہوگا۔''

''مم......میں بہت تھک گیا ہوں۔''میں نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

''ہاں جانتی ہوں۔''اس کی نرم آواز میری سماعتوں میں گونجی۔''مگر یہ جگہ مناسب نہیں ہے نیچے غار میں جانا ہوگا۔اٹھو میں تمھیں سہارا دیتی ہوں۔''

طوعاً وکرہاً میں کراہتے ہوئے اٹھا۔بایاں کندھا بالکل شل ہو چکا تھا۔اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا۔اس کا بدن بہت مضبوط اور توانا تھا۔وہ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔لیکن اس کے باوجود اس حالت میں بھی میں اس کے بدن کا گداز پن محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

مجھے سہارا دے کر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔اپنا بایاں ہاتھ اس نے میری کمر سے لپیٹا ہوا تھا۔آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد ہم کافی نیچے اتر آئے تھے۔ایک چھوٹی ٹارچ جلا کر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی ۔ہوا تو جیسے ہم دونوں کو اڑا رہی تھی۔مزید پندرہ منٹ حرکت کرنے کے بعد وہ جھاڑیوں کے جھنڈ میں رستہ بناتی ہوئی اندر داخل ہوئی اس کے ساتھ ہی مجھے ٹارچ کی روشنی میں غار کا کھلا دہانہ نظر آنے لگا۔نیچے جھک کر ہم اندر داخل ہوئے۔دہانے سے آگے غار اچھی خاصی اونچی تھی۔یہ وہی غار تھی جس میں میں نے بڑی بے دردی سے

اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور آج میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا۔ مجھے بٹھا کر وہ غار کے دہانے پر پڑا اپنا اور میرا سامان سمیٹ کر اندر لے آئی۔ میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میرا تھیلا میرے سر کے جانب رکھتے ہوئے وہ مجھے لیٹنے میں مدد دینے لگی۔

مجھے نیچے لٹا کر۔ ''میں آتی ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خشک لکڑیوں کا گٹھا لے کر اندر گھسی۔ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں ترتیب سے رکھ کر اس نے لکڑیوں کو آگ لگا دی۔ چند لمحوں میں غار کے اندر آگ کی روشنی کے ساتھ خوشگوار حدّت پھیل گئی تھی۔ گو وہ موسم آگ جلانے والا نہیں تھا، لیکن مجھ پر طاری کپکی دیکھ کر اس نے آگ جلانا ضروری سمجھا تھا۔

''گولی بازو کے اندر ہے یا نکل گئی ہے۔'' آگ جلا کر وہ میرے جانب متوجہ ہوئی۔

''اندر ہی ہے۔'' میں بے بسی سے بولا۔

''ہونہہ!...... یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ بہرحال تمھیں تھوڑی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔'' عام سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا جھولا کھول کر باریک دھار کا ایک خنجر نکالا اور ایک درمیانی جسامت کا پتھر آگ کے قریب رکھ کر اس پر وہ خنجر اس طرح رکھا کہ اس کی دھار کو آگ کے شعلے چھونے لگے۔ اس کا ارادہ جانتے ہی میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

''پہلے بھی کبھی یہ کیا ہے؟'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''کیا نہیں ہے، دیکھا تو ہے نا...... اور میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔''

''مم...... مگر دیکھنے اور کرنے میں بہت فرق ہے۔'' میں ہکلایا۔

وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''اگر تمھارے پاس کوئی دوسری تجویز ہے تو میں رہنے دیتی ہوں۔''

''نہیں۔ تجویز تو کوئی نہیں ہے۔''

''اگر تجویز کوئی نہیں ہے تو پھر ہمت کرو..... صرف بندھی ہوئی لڑکیوں کی پٹائی کرنا ہی بہادری نہیں ہوتی۔ درد اور تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ایک مرد میں ہونا چاہیے۔'' اس نے بے رحمی سے میری ماضی کی زیادتی کو یاد کیا تھا۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ’’ویسے تمھارے لیے اچھا موقع ہے۔ تم اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے سکتی ہو۔‘‘

’’میں مرے ہوئے کو نہیں مارا کرتی۔ باقی تمھیں میں نے قبیل خان کی ہلاکت کے بعد قتل کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے اور اپنے ارادے کے خلاف میں کبھی قدم نہیں اٹھاتی۔‘‘ یہ کہتے ہی وہ میرے قریب ہوئی اور میرے کندھے سے بندھی چادر کو کھولنے لگی۔ اس کے چہرے پر چھائے بے پرواہی کے تاثرات اس کے بلند حوصلے کو ظاہر کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک بہادر، دلیر، جرّات منداور باحوصلہ لڑکی تھی۔ حالانکہ اس کی عمر کی لڑکیاں تو بہ مشکل گڑیوں سے کھیلنے سے فارغ ہوتی ہیں۔ اور وہ میرے کندھے سے گولی نکالنے کی تیاری کر رہی تھی۔

چادر کھول کر میرے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے اپنے جھولے سے سٹیل کا بڑا سا مگ نکالا اور اس میں پانی بھر کر آگ پر رکھ دیا۔ میں خالی خالی نظروں سے اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ میرا دل آنے والے جاں گسل لمحات کا سوچ کر دھڑک رہا تھا۔ وہ جو طریقہ اپنا کر میرے کندھے سے گولی نکالنے والی تھی اس درد کو برداشت کرنے کی ہمت میں اپنے اندر مفقود پاتا تھا۔ لیکن اس وقت ایک لڑکی کے سامنے اپنی بزدلی ظاہر کرنے کا حوصلہ بھی مجھ میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی مسئلہ تھا کہ اسے منع کرنے کی صورت میں میرے پاس کوئی متبادل حل بھی موجود نہیں تھا۔ نہ تو وہاں ہسپتال موجود تھا اور نہ کوئی ڈاکٹر۔ گولی زیادہ دیر کندھے میں رہتی تو کندھے کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر کے میں خاموش پڑا پلوشہ کی کارروائی دیکھتا رہا۔ پانی گرم کر کے اس نے میری قمیص کندھے سے پھاڑ کر زخم کو بالکل ننگا کر دیا۔ پھر اپنے جھولے سے ایک صاف چادر نکال کر اس میں سے ایک ٹکڑا پھاڑا اور گرم پانی میں وہ کپڑا بھگو کر زخم کا منھ صاف کرنے لگی۔ گرم پانی کے لگتے ہی زخم سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی درد میں اضافہ ہو گیا۔ میں دانت بھینچے خاموش پڑا رہا۔ رہ رہ کر میرے دماغ میں پلوشہ کا طعنہ گونج رہا تھا۔

’’صرف بندھی ہوئی لڑکیوں کی پٹائی کرنا ہی بہادری نہیں ہوتی۔ درد اور تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ایک مرد میں ہونا چاہیے۔‘‘

میرے اپنے خیال کے مطابق مجھ میں برداشت کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ مگر اس وقت جو مرحلہ درپیش تھا اس بارے سوچ کر ہی میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اگر کوئی تجربہ کار شخص ہوتا تب بھی مجھے اتنا خوف نہ ہوتا، لیکن وہاں تو ایک ناتجربہ کار لڑکی تھی۔

میرے خیالات سے بے خبر وہ اطمینان سے میرے زخم کو گرم پانی سے دھوتی رہی۔ زخم کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اس نے اپنے جھولے سے ایک اور بوتل نکالی۔ اس کا ڈھکن کھلتے ہی میری ناک میں سپرٹ کی ناگوار بو داخل ہوئی، یقیناً وہ اپنی جگہ سے مکمل تیاری کر کے چلی تھی۔ بوتل کا ڈھکن کھول کر وہ میرے زخم پر سپرٹ ڈالنے لگی۔ زخم میں شدید جلن شروع ہو گئی تھی۔ میرے ہونٹوں سے بے اختیار سسکی برآمد ہوئی۔ تھوڑی سی مزید سپرٹ میرے زخم پر انڈیل کر اس نے بوتل بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

''تیار ہو۔'' اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ انکار کر دوں ایک اناڑی کے ہاتھوں اپنے کندھے کا بیڑا غرق کرانا کہاں کی دانش مندی تھی۔ مگر میں چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچانک مجھے اپنے گالوں پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ آگ کے بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ عجیب مگر بہت دلکش لگ رہا تھا۔ چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد وہ نرم لہجے میں بولی۔

''گھبرانا نہیں...... درجن سے زیادہ مرتبہ یہ کام کر چکی ہوں۔ اتنی زیادہ تکلیف نہیں ہونے دوں گی تمھیں ...... بلکہ قبیل خان کی ہلاکت کے بعد جب تمھیں قتل کروں گی اس وقت بھی ڈائریکٹ تمھارے دل میں گولی اتاروں گی تاکہ تمھارا سانس جلدی نکلے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ ابھری۔

اس کی اول الذکر بات نے مجھے بہت حوصلہ دیا تھا۔ اگر واقعی میں وہ درجن بھر سے زیادہ مرتبہ یہ کام کر چکی تھی تو اسے کافی ماہر ہونا چاہیے تھا۔ صاف کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس نے گولا سا بنا کر میرے منھ میں دیا تاکہ میں چیخ روک سکوں۔

اس کے بعد خنجر آگ سے اٹھا کر اس نے ٹارچ جلا کر اپنے منھ میں پکڑ لی۔ بائیں ہاتھ سے میرا کندھا تھام

کر اس نے خنجر کی گرم نوک زخم پر رکھی درد کی شدید لہر سے میں کانپ سا گیا تھا۔ دانت سختی سے بھینچ کر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے ماہرانہ انداز میں خنجر کی نوک زخم میں گھمائی اور کندھے کے گوشت میں گھسے بُلٹ کو محسوس کیا۔ میرا ہاتھ کانپنے لگ گیا تھا۔ اور پھر ایک دم اس نے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ درد کی شدید لہر سے میں اچھل پڑا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ مسلسل کانپ رہا تھا۔ پتا نہیں گولی باہر نکلی تھی کہ نہیں لیکن درد کی شدت سے میرا برا حال تھا۔ میں نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ اور خود کو اس کی دوسری کوشش کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے گالوں پر اس کی ہتھیلیوں کا لمس محسوس ہوا۔

''بس......بس......ہو گیا۔ نکل گئی گولی باہر۔'' میں نے گہرا سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے منھ سے کپڑے کا گولا نکال کر وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''اتنی سی بات تھی، تم یونھی گھبرا رہے تھے۔ یقین مانو یہ کام کسی بے بس لڑکی کی پٹائی کرنے سے بھی زیادہ آسان ہے۔''

واقعی اس نے بہت سرعت اور تیزی سے یہ کام کیا تھا۔ منٹ سے بھی کم وقت میں اس نے گولی نکال لی تھی۔ اس کی موخّرالذکر بات سن کر میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ظاہر ہو گئی تھی۔

میرے بگڑے ہوئے چہرے کو اعتدال پذیر ہوتے دیکھ کر وہ زخم کی طرف متوجہ ہو گئی۔ زخم کو ایک مرتبہ پھر سپرٹ سے دھو کر اس نے نرم کپڑے کی چادر سے دو تین لمبی لمبی پٹیاں پھاڑیں اور اپنے جھولے سے ایک مومی لفافہ نکال لیا جس میں کوئی سفوف بھرا تھا۔ مٹھی بھر سفوف زخم پر ڈال کر اس نے ایک پٹی تہہ کر کے زخم پر رکھی اور پھر اس پر پٹی باندھنے لگی۔ زخم پر پٹی باندھ کر دوسری پٹی میرے گلے میں ڈالی اور میرا ہاتھ احتیاط سے دہرا کر کے پٹی سے گزار کر میرے پیٹ پر رکھ دیا۔

سفوف سے میرے زخم میں ہونے والی جلن کم ہونے لگی۔ وہ دوبارہ اپنے جھولے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے جھولے سے ڈیڑھ لیٹر کی کولڈ ڈرنک والی بوتل نکالی جو دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ سٹیل کے مگ میں موجود پانی گرا کر اس نے تھوڑا سا مزید پانی ڈال کر مگ کو صاف کیا اور اس میں گلاس کے بہ قدر دودھ ڈال کر گرم کرنے لگی۔ اس دوران اس نے دودھ میں کچھ شامل بھی کیا تھا شاید وہ ہلدی وغیرہ تھی۔ دودھ کو ہلکا سا گرم کر کے وہ میرے قریب آئی اور میری پیٹھ پیچھے بیٹھ اس نے آہستگی سے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور میرے دائیں ہاتھ میں

دودھ کا مگ پکڑا کر وہ مجھے پیچھے سے تھام کر بیٹھ گئی۔

میں ہلکے ہلکے گھونٹ لے کر دودھ پینے لگا۔ دودھ پی کر میں نے اپنا سر تھکے تھکے انداز میں پیچھے ٹیکا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنا سر اوپر اٹھا لیا کہ اس جانے پہچانے گداز پن کو محسوس کرتے ہوئے میں اس حالت میں بھی گھبرا گیا تھا۔

اسے بھی شاید میرے احساسات کی خبر ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے میرا سر دوبارہ تھیلے پر منتقل کر دیا۔

"اچھا اب تم آرام کرو مجھے واپس جانا ہے۔"

"تو آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی کا عنصر نمایاں تھا۔

میری بات سن کر وہ ہولے سے مسکرائی۔ "اگر نہ آتی تو تمھیں موت کے منھ سے کون واپس لاتا۔ اور نہ گئی تو تمھارے لیے مناسب خوراک اور دوائیوں وغیرہ کا بندوبست کیسے کروں گی؟"

"معذرت خواہ ہوں۔ میں نے سوچا شاید تم پکی واپس جا رہی ہو۔" میں نے خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

"ویسے تمھارے چہرے پر ظاہر ہونے والا ندامت کا اثر مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تمھاری عادتوں سے بھی برا۔"

"اب تم نے طعنے تو دینے ہیں غلطی سے میرے کام جو آ گئی ہو۔" میں نے اسے مطعون کرنے کی کوشش کی۔

وہ میری کوشش کو ناکام کرتے ہوئے بولی۔ "اس میں شک ہی کیا ہے...... ایک ایسا شخص جسے میں قتل کرنے کا تہیہ کر چکی ہوں اس کی جان بچانے کے لیے رات کے وقت گھر سے نکلنا اور اتنے دشوار گزار رستے پر بغیر آرام کیے اس کے پاس پہنچنا...... مطلب اس کے بعد بھی اگر میں طعنے نہ دوں تو کون دے گا۔" یہ سب کچھ اس نے سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔ لیکن میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ وہ یہ سب بہ طور مذاق کر رہی ہے۔ اسے میری فکر ہے۔ اگر فکر نہ ہوتی تو کیا یوں میری حفاظت کرنے پہنچتی۔

"اگر طعنے ہی دینے ہیں تو براہ مہربانی تشریف لے جائیں، مجھے تمھاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جا تو میں رہی ہوں۔ اور میرا دل بھی نہیں چاہ رہا کہ تم جیسے آدمی کی مدد کروں۔ بس یہ بات مجھے مجبور کر رہی ہے کہ تم میرے دشمن کے دشمن ہو اس لیے تمھیں فی الحال مرنے کے لیے نہ چھوڑوں اور بعد میں ویسے بھی تم نے

میری گولی کا نشانہ بننا ہے۔"

اس مرتبہ میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش رہا تھا۔وہ اپنے تھیلے سے ایک چھوٹا سا سلپنگ بیگ نکال کر مجھے اوڑھانے لگی۔

میں اسے مطلع کرتے ہوئے بولا۔"میرے تھیلے میں بھی ایک سلپنگ بیگ موجود ہے۔"

"چلو پھر یہ نیچے بچھا دیتی ہوں۔"اپنا سلپنگ بیگ نیچے بچھا کر اس نے مجھے اس پر لیٹنے میں مدد دی اور میرا سلپنگ بیگ مجھے اوڑھا دیا۔ڈریگنو رائفل اور بریٹا پستول میرے قریب رکھ وہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

"بہتر ہوگا کہ تم صبح جاؤ۔"

وہ مسکرائی۔"کیوں اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔"

"نہیں......لیکن اتنی رات گئے تمھیں دوائیں وغیرہ تو کہیں سے نہیں ملیں گی۔اور تین چار گھنٹے آرام کے بعد ہم دونوں نکل چلیں گے۔اب یہاں کتنے دن گزارے جا سکتے ہیں۔میرا خیال ہے کمانڈر نصراللہ کی بیٹھک میرے لیے زیادہ آرام دہ رہے گی۔"

"چل پاؤ گے؟"

"امید تو ہے......یوں بھی مجھے تم پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔کیا پتا قبیل خان سے پہلے ہی میرا نمبر لگا دو۔"

"ہاہاہا۔"اس کا سریلا قہقہہ بلند ہوا۔"اب کی ہے عقل مندی کی بات۔"

میں نے منھ بناتے ہوئے کہا۔"تمھیں تو موقع مل گیا ہے نا بدلہ لینے کا۔"

"ہونہہ......"کہہ کر اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا اور پھر جانے کا ارادہ مؤخر کر کے میرے ساتھ ہی بیٹھ کر میرا سر دبانے لگی۔

اس وقت میرے سر میں کافی درد ہو رہا تھا اور ایسی حالت میں آدمی کا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس کا سر دبائے لیکن پلوشہ کا سر دبانا مجھے کافی عجیب لگا تھا۔میں نے سر اس کے ہاتھ سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔"اس کی ضرورت نہیں۔"

"آرام سے لیٹے رہو۔"مجھے جھڑکتے ہوئے اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

میں نے بھی زیادہ اکڑ خانی دکھانے کے بجائے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ جب وہ ڈھیٹ پن سے ہر کام مجھے کہہ سکتی تھی تو مجھے بھی اس سے سر دبوانے میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہیے تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے سر دبانے سے مجھے سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ اور پھر اس کا دوسرا ہاتھ میرے بالوں میں سرسرانے لگا۔ ماہین بھی میرا سر دباتے ہوئے یونہی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرا کرتی۔ اس کی یاد آتے ہی میرے منہ میں تلخی گھل گئی تھی۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے میرے چہرے ہی کو گھور رہی تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت اس کی نرم آواز نے میری سماعتوں پر دستک دی۔

''ویسے تم یہاں کیا کرنے آئے تھے۔''

میں آنکھیں کھولے بغیر بولا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ قبیل خان اپنی تباہ شدہ حویلی کو دوبارہ تعمیر کروا رہا ہے اور اس سلسلے میں وہ یہاں مسلسل پھیرے لگا رہا ہے۔ بس میں اسی بات کی تصدیق کے لیے آیا تھا۔''

''مجھے کیوں نہیں بلایا۔'' اس کے لہجے میں بلا کی خفگی پوشیدہ تھی۔

''کہا تو ہے میں بس تصدیق کرنے لیے آیا تھا۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تو پھر کیا رہا؟''

''کچھ معلوم کرنے سے پہلے ہی میں اس کے ایک محافظ کی نظروں میں آ گیا۔ کم بخت نے دیر لگائے بغیر گولی چلا دی۔ قسمت اچھی تھی جو کندھے میں لگی۔ ورنہ گولی سر میں لگنے کی صورت میں شاید تمھیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ تمھارا دشمن، قبیل خان کے محافظ کے ہاتھوں پورا ہو گیا۔''

''بکواس نہ کیا کرو۔'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ پھسلا۔ میں نے ایک دم آنکھوں کھول کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ نظریں چرا کر آگ کے مدھم پڑتے شعلوں کو دیکھنے لگی۔

''اس میں بکواس کی کیا بات ہے۔'' میں پوچھے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

''کیونکہ تمھیں صرف میں ہی قتل کروں گی۔'' اس نے گڑبڑاتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔

میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تم نے یہ نہیں بتایا کہ شادی میں رقص کر کے کتنی رقم اکٹھی ہوئی۔''

وہ بگڑتے ہوئے بولی۔ ''تمھیں کیا، جتنی رقم بھی اکٹھی ہوئی ہے۔'' نا معلوم اسے کیوں میری بات پر غصہ آ گیا تھا۔ یا شاید وہ لمحہ بھر پہلے مجھ سے چاہت ظاہر کرنے والی بات کا ردعمل ظاہر کر رہی تھی۔

میں دھیمی آواز میں ہنسا۔ ''اچھا ایک بات پوچھوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' اس کا لہجہ اسی طرح بگڑا ہوا تھا۔

میں نے کچھ کہے بنا متبسم ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

''پوچھو......'' دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد وہ گویا بادل نخواستہ بولی تھی۔

''ملک ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں میرے سر پر پیسے پکڑنے والا کون تھا؟'' میں نے کئی دنوں سے ذہن میں مچلنے والا سوال اگل ڈالا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تم کچھ ایسا ہی پوچھو گے۔''

''واہ...... بھلا وہ کیسے؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ مرد ہوتے ہی شکی مزاج ہیں۔ ابھی تک شادی کا پیغام نہیں بھیجا اور پہلے ہی سے مجھ پر شک کرنا شروع کر دیا۔''

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ ''بکواس کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

''ہا...... ہا...... ہا۔'' اس کا سریلا قہقہہ بلند ہوا۔ ''قسم سے بکواس نہیں کر رہی۔ ایمان سے بتاؤ کیا تم اس لیے یہ نہیں پوچھ رہے کہ اس دن میں نے اس سے اکیلے میں بات کی اور بعد میں تمھارے سر پر پیسے رکھتے وقت اس نے آخری نوٹ میرے گال سے لگایا جس پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور یہی بات تمھیں تپائے ہوئے ہے۔''

میں نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ''تم میں لڑکیوں والی کوئی بات ہے ہی نہیں ہے۔ میری گود میں بھی تم بے شرموں کی طرح بیٹھ گئی تھیں تو کسی اور کے تمھارے گال چھونا تو اس سے بہت چھوٹی بات ہے۔''

''تمھاری بات تو خیر اور ہے۔ تم نے تو یوں بھی مجھ سے شادی کرنا ہے چاہے میں تمھیں قتل کرنے کے ارادے سے باز نہ بھی آؤں۔''

”پلوشہ ہر وقت بکواس نہ کیا کرو سمجھیں......کبھی سنجیدہ گفتگو بھی کر لیا کرو۔“

”اچھا تم قسم کھا کر بتاؤ کیا تم نے اس آدمی کے بارے اسی لیے نہیں پوچھا کہ اس کی حرکت پر میں معترض نہیں ہوئی تھی، حالانکہ اس کے علاوہ میں نے کسی کو بھی اس قسم کی حرکت کی اجازت نہیں دی تھی۔“

اس کی بات پر میں نے اپنے دل میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اس کی بات میں کوئی شک محسوس نہ ہوا۔اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا لیکن یہ بات ظاہر کر کے میں اپنا مذاق نہیں بنا سکتا تھا اس لیے کچھ کہنے کے بہ بجائے میں نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔

”اچھا زیادہ پریشانی ہونے کی ضرورت نہیں وہ میرا بھائی ہے۔“

”کیا......؟“میں نے حیرانی اور غصے سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔”جھوٹ بولنے کی کوئی حد ہوتی ہے پلوشہ۔پہلے تم نے کہا کہ تمھارا ایک چھوٹا بھائی اور ماں ہے۔اب یہ نیا بھائی کہاں سے نکال لیا۔“

”یہ میرے رشتے کے ماموں کا بیٹا ہے اور یہ چند ماہ کا تھا جب اس کی ماں فوت ہوگئی تھی۔اسے امی جان نے دودھ پلایا تھا۔اب تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہ کیسے میرا بھائی ہے۔“

”تمھارا ماموں تو مجاہد ہے نا۔“

”ہاں،لیکن یہ سمگلر ہے۔قبیل خان کے لیے بھی کام کرتا ہے اور ملک ثقلین کے لیے بھی۔ان کی دہشت گردانہ کارروائیوں میں تو حصہ نہیں لیتا لیکن اسلحے اور نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ میں ضرور ملوث ہے اور اس سے مجھے قبیل خان کے متعلق بھی کافی مفید معلومات مل جاتی ہیں۔“

”تو کیا قبیل خان اس کے اور تمھارے رشتے سے ناواقف ہے۔“

”کیا احمقوں جیسی بات کر رہے ہو،قبیل خان مجھے کہاں جانتا ہے۔سپوگمائے بھی اسے یاد نہیں ہوگی۔اس کی ہوس کا شکار ہونے والی میری بہن اکیلی تو نہیں تھی نا۔یوں بھی اپنے تئیں قبیل خان ہمارے پورے خاندان کو ختم کر چکا ہے۔اور میرا خیال ہے سردار بھائی تمھیں میری پوری کہانی بتا چکا ہوگا۔“

میں نے اس کی بات کی تصدیق یا تردید کیے بغیر پوچھا۔”سپوگمائے تمھاری بہن کا نام ہے؟“

منھ سے کچھ کہے بنا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا اس دن روشن خان کے پوچھنے پر کیوں کہا تھا کہ تم مجھے گولی مارنے پر تیار ہو۔''

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔''اگر تمھیں قتل کرنے سے میری جان بچ رہی تھی تو اس میں کیا قباحت تھی۔''

''صحیح کہا۔''گو مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی اس کے باوجود میں ہونٹ بھینچتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔''میں نے سنا تھا کہ فوجی دماغ سے نہیں دل سے سوچتے ہیں اور اب دیکھ بھی لیا۔''

''اس میں دل سے سوچنے کی کیا بات ہوئی۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔''فوجی صاحب!......مجھے دل دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں تمھارے ساتھ ماہین ،رومانہ اور وہ کیا نام تھا فرنگن کا......''وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بولی۔''ہاں جینیفر بی بی......ان تمام سے زیادہ برا سلوک کروں گی۔''

میں چڑتے ہوئے بولا۔''پلوشہ!......کتنی بار کہا ہے مجھے تمھاری فضول گوئی سے سخت قسم کی کوفت ہوتی ہے۔''

''مذاق کر رہا تھا یار!......تم تو محسوس ہی کر گئے۔''

''میں تمھارا یار نہیں ہوں۔''میں سچ مچ جھلا گیا تھا۔

وہ کہاں باز آنے والی تھی فوراً بولی۔''ہاں جانتا ہوں......تم تو مجھے بیوی بنانے کے چکروں میں ہونا۔لیکن یادرکھنا کہ امی جان پچاس لاکھ سے ایک روپیا بھی کم نہیں لیں گی اور قبیل خان کی موت کے بعد......''

''بکواس بند کرو پلوشہ!......اور جاؤ میں صبح خود آ جاؤں گا۔''

مگر اس ڈھیٹ پر میرے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔اس نے میرا سر دبانے جاری رکھا۔اس کے ساتھ اس کا ایک ہاتھ برابر میرے بالوں میں سرسرا رہا تھا۔

''چائے پیو گے۔''اس نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد موضوع تبدیل کیا۔

مجھے سچ مچ اس وقت چائے کی اچھی خاصی طلب ہو رہی تھی۔اس کی دعوت ٹھکرانا مجھے مناسب نہ لگا لیکن چونکہ میں نے خود پر غصہ طاری کیا ہوا تھا اس لیے جواباً ہاں نہ کہہ سکا۔

"میرا خیال ہے ہاں کہتے ہوئے جھجک رہے ہو کہ مجھے زحمت نہ ہو۔" یہ کہہ کر وہ اپنے تھیلے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "ویسے زحمت تو مجھے ہوگی، دشمن کی خدمت کرتے ہوئے کسے خوشی ہوتی ہے۔ بہرحال پھر بھی بنالیتی ہوں کہ مجھے خود بھی چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ تمھاری فضول باتوں نے سر میں درد کر دیا ہے۔"

میرا دل کر رہا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ اس ڈھیٹ لڑکی کو باتوں میں ہرانا شاید ممکن ہی نہیں تھا۔ پٹر پٹر باتیں کیے جاتی۔ نہ شرم و حیا نہ جھجک، نہ کوئی لگی لپٹی رکھنا اور نہ اگلے کے احساسات کے بارے ہی کچھ سوچنا۔

میری سوچوں سے بے خبر اپنے تھیلے سے دودھ کی بوتل اور میرے تھیلے سے پتی چینی نکال کر وہ سٹیل کے کٹورے میں چائے بنانے لگی۔ میرے ذہن میں رومانہ در آئی۔ کشمیری چرواہن جس کے چہرے پر سرخ گلابوں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جس کی سیاہ آنکھیں شب دیجور کا منظر پیش کرتیں، باتیں کرتی تو یا قوتی ہونٹوں سے پھول جھڑتے تھے اور گھنی زلفیں دیکھنے والے کو یوں اپنی گرفت میں لیتیں کہ ناظر کا مقدر ہمیشہ ہمیشہ کی اسیری ہی بنتا۔ مگر وہ کسی اور کی امانت تھی۔ شاید وہ میرے دل پر گھاؤ لگانے ہی کے لیے ملی تھی۔ اور اب پلوشہ۔ رومانہ کو یاد کرتے کرتے سامنے بیٹھی پلوشہ نے دل کے کسی کونے سے سر ابھارا۔ ایک انوکھی، بہادر، جرأت مند اور دلیر لڑکی۔ جو رات کے وقت بھی بغیر کسی خوف و ڈر کے میری مدد کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکل پڑی تھی۔ جو کسی دشمن پر گولی چلاتے یا اس کے گلے پر خنجر پھیرتے وقت ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں کرتی تھی۔ جو خالی ہاتھ لڑتے ہوئے کسی بھی اچھے لڑاکے کو ناکوں چنے چبوا سکتی تھی۔ اور پھر شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ رومانہ سے زیادہ خوب صورت نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ گو لڑکوں والے کپڑے اور حلیہ بنانے کی وجہ سے اس کی صورت تھوڑی پس منظر میں چلی گئی تھی لیکن یہ تبدیلی عارضی تھی وہ کسی بھی وقت لڑکیوں کا حلیہ بنا سکتی تھی۔

"پر مجھے کیا وہ حلیہ تبدیل کرتی ہے یا ساری زندگی اسی حال میں گزارتی ہے؟" میں نے خود سے سوال کیا اور میری سوچیں گڑبڑا گئیں۔ بے اختیار میرے منہ سے گہرا سانس خارج ہوا۔ اسی وقت پلوشہ نے چائے کی پیالی میرے قریب رکھی اور مجھے اٹھنے کے لیے سہارا دینے لگی۔ ایک دم میرے ذہن میں چند لمحے پہلے نادانستگی میں حاصل ہونے والا اس کے بدن کے لمس کا ذائقہ جاگا اور میں اس ڈر سے ذرا آگے کو جھک کر بیٹھ گیا کہ کہیں وہ دوبارہ میرے پیچھے نہ بیٹھ جائے۔ مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اپنے لیے وہ گلاس میں چائے ڈال

کر دوبارہ میرے قریب آ بیٹھی۔کہ چائے کی پیالی ایک ہی تھی۔

تازہ دودھ کی بنی ہوئی چائے بہت اچھی بنی تھی۔میرے پیالی خالی کرتے ہی اس نے دوبارہ پیالی بھر دی۔

''اچھا ایک بات پوچھوں؟'' چائے کا گلاس خالی کرتے ہوئے اس نے ایک جانب رکھتے ہوئے پوچھا۔میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس دن تم نے سردار بھائی کو اس کی بیوی کی موت کا کیوں نہیں بتایا تھا۔''

''کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے اور ہوسکتا ہے پردیس میں یہ بری خبر معلوم ہونے کے بعد اسے کچھ ہو جاتا۔یا ذہنی پریشانی کی وجہ سے وہ رستے میں کچھ الٹا سیدھا کر دیتا۔گھر میں تو بہت سے رشتا دار بھی سنبھالنے والے ہوتے ہیں۔اور یہی ہمارے فوجیوں کا طریقہ کار ہے۔''

''اچھا تھوڑی دیر آرام کر لو۔'' آگ پر چند لکڑیاں ڈال کر اس نے اپنا تھیلا سر کے نیچے رکھا اور میرے قریب ہی لیٹ گئی۔

''ویسے تھوڑا سا دور بھی لیٹا جا سکتا ہے۔''اس کے یوں لیٹنے پر میں نے ناک بھوں چڑھائی۔

''میں دور ہی لیٹا ہوں اور مزید بکواس سننے کا میرا بالکل ارادہ نہیں ہے۔اگر اور کچھ کہا تو سلیپنگ بیگ کے اندر بھی گھس سکتا ہوں'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور میں منہ بناتے ہوئے خاموش ہو گیا۔موسم نہایت خوش گوار تھا۔اس لیے اسے رضائی چادر وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔مجھے البتہ سلیپنگ بیگ کی ضرورت تھی کہ پہلے بخار کی وجہ سے مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔غار سے باہر تیز ہوا چل رہی تھی،لیکن غار کے اندر ہوا کا گزر ناممکن تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس کے بھاری ہوتے سانسوں کی آواز میری سماعتوں میں پڑنے لگی۔وہ اتنی بے فکری سے سو گئی تھی گویا گھر میں موجود ہو۔ایک لڑکی کا غیر مرد کے ساتھ اتنی بے پرواہی سے سو جانا اس کی بہادری ،دلیری اور اپنی ذات پر اعتماد کو ظاہر کر رہا تھا۔ہم فوجی تو خیر اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ جہاں رات آئی یا چند لمحے آرام کے ملے وہاں آرام کر لیا۔لیکن وہ لڑکی ہوتے ہوئے تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح کی عادات کی مالک تھی۔میں گردن موڑ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔آگ کے بلند ہوتے شعلوں میں اس کے چہرے پر

چھائی معصومیت مجھے متاثر کرنے لگی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ جتنے زخم کھا چکا تھا اتنے کافی تھے عورت ذات پر اعتبار کرنا اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارنے کے مترادف تھا۔ وہ صرف اس لیے مجھ میں دلچسپی ظاہر کر رہی تھی کہ قبیل خان سے بدلہ لینے کے لیے اسے میری مدد کی ضرورت تھی اور بس۔ بدلہ لیتے ہی شاید اس نے مجھے پہچاننے ہی سے انکار کر دینا تھا۔

''اگر ایسی بات ہوتی تو وہ رات کو اس وقت اکیلے میری مدد کرنے کے لیے نہ آتی۔'' میرے دل کے کسی گوشے سے اس کے حق میں مدہم سی آواز اٹھی۔

''احسان نہیں کیا اس نے، آخر میں نے بھی تو اس کے بھائی کے قاتل کو ٹھکانے لگانے کے لیے اس کی مدد کی تھی۔'' میں نے اس کی حمایت کرنے والی سوچ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی مگر احمق دل کی اس کی طرف داری میں لگا رہا۔

''تمھارے اتنے زیادہ تشدد کے باوجود ابھی وہ تمھاری تیمارداری کسی بہت زیادہ قریبی کی طرح کر رہی ہے اور خلوص کسے کہتے ہیں۔''

''وہ صرف قبیل خان سے بدلہ لینے کے لیے میری تیمارداری کر رہی ہے۔'' دماغ، دل کی حماقتوں پر اس کا ساتھ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔

''بدلہ لینے کے لیے وہ میری محتاج تو نہیں ہے نا۔'' دل ایک نئی دلیل کے ساتھ میدان میں اترا۔

''اگر محتاج نہ ہوتی تو زبردستی میرے ساتھ نہ جڑی ہوتی۔'' دماغ نے دل کو آئینہ دکھایا۔

''یہ میں کس الٹی بحث میں پڑ گیا ہوں۔'' خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں یہ سارے الٹے سیدھے خیالات اس کے چہرے کو دیکھنے کی وجہ سے میرے دل و دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ زخم میں پیدا ہونے والے درد میں بہت زیادہ افاقہ ہو گیا تھا۔ ہلدی ملے گرم دودھ اور پھر چائے نے مجھے کافی تقویت دی تھی۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے بہت دور تھی۔

گولی میرے بائیں کندھے میں لگی تھی اور پلوشہ میرے دائیں طرف سوئی ہوئی تھی۔ وہ نیند میں بڑبڑائی، میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے اس کی جانب دیکھا وہ دائیں کروٹ لے کر مجھ سے تھوڑا دور ہو گئی تھی۔ گو اس

سے پہلے بھی وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر نہیں لیٹی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی قربت مجھے گراں گزر رہی تھی ۔اب اس کا رخ تبدیل ہوتے ہی مجھے زیادہ اطمینان محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔اسی طرح مختلف سوچوں میں ڈوبے جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔یہاں تک کہ کہیں دور سے ہوا کے دوش پر تیرتی صبح کی آواز نے اللہ پاک کی کبریائی کا اعلان کیا۔میں نے پلوشہ کی جانب نگاہ اٹھائی وہ دوبارہ میری جانب کروٹ تبدیل کر کے میرے بہت قریب آ گئی تھی۔لیکن میں اتنی گہری سوچوں میں ڈوبا تھا کہ مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔

اس نے صبح سویرے جانے کی بات کی تھی لیکن اسے جگانے کو میرا جی نہ چاہا۔اور میں اس کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔سورج نکلنے سے پہلے اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں۔تو بہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔

”اچھا خاصا اجالا ہو گیا ہے تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔“ جمائی لیتے ہوئے وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔”تم نے اندھیرے میں ضرور ٹھوکریں کھانا تھیں؟“

”اچھا اب تیار ہو چلنے کے لیے۔“ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

”امید تو ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر اٹھ جاؤ۔“ اس نے میرے بازو کو تھام کر مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔میرے بستر سے اٹھتے ہی اس نے دونوں سلیپنگ بیگ میرے سفری تھیلے میں ٹھونس دیے۔باقی سامان بھی سمیٹ کر سفری تھیلا اپنی پشت پر لادا اور ڈریگنو و رائفل ہاتھ میں پکڑ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

غار سے باہر آ کر وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔”اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر سہارا لیتے ہوئے ڈھلان سے اترو۔“

”شکریہ، مجھے تمھارے سہارے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔“ آہستہ روی سے اترائی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اس کی پر خلوص دعوت کو بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا۔

وہ بگڑتے ہوئے بولی۔”اگر اتنی ہی غیرت تھی تو بلایا کیوں تھا۔“ خود مجھے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں نے

کافی سخت بات کہہ دی ہے۔لیکن اس وقت میں ڈھٹائی سے بولا۔

’’میری مرضی میں جس وقت بلاؤں آخر تنخواہ دیتا ہوں اور تم میرے ملازم ہو۔‘‘

’’بڑا آیا سیٹھ۔‘‘ کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجھ سے آگے نکل گئی تھی۔اس علاقے میں صحت مند ہوتے ہوئے میں اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا تھا،اب تو یوں بھی میری صحت ٹھیک نہیں تھی۔

میں آہستہ قدموں سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ڈھلان اتر کر وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ جونھی میں جھنڈ کے قریب پہنچا وہ وہیں میری منتظر کھڑی تھی۔قریب جاتے ہی وہ دوبارہ چل پڑی۔گھنے درختوں کی وجہ سے اس نے اپنی رفتار بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی تاکہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہو سکے۔پلوشہ کے سفوف سے میرے زخم کی تکلیف میں اسی وقت کافی افاقہ ہو گیا تھا اور اب رات گزرنے کے بعد تکلیف کی شدت میں مزید کمی آ گئی تھی،لیکن اس کے باوجود میں کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔آہستہ چلنے کی وجہ سے ہمیں جنگل سے نکلنے میں گھنٹا بھر لگ گیا تھا۔درختوں کے اختتام پر ہلکی سی ڈھلان تھی۔مجھے اچھی خاصی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔

ڈھلان چڑھنے سے پہلے میں سانس لینے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔مجھے دیکھ کر وہ بھی رک گئی تھی۔لیکن اس نے بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔چند منٹ آرام کرنے کے بعد میں دوبارہ چل پڑا۔ڈھلان پر چڑھ کر ہم پہاڑی کی دائیں جانب آگے بڑھتے چلے گئے۔ڈھلان عبور کر کے ہم ایک نالے میں اترے۔گھنٹا بھر مزید چلنے کے بعد وہ نالہ انگریزی کے حرف ’’وائی‘‘ کی طرح دو شاخوں میں بٹ گیا تھا۔اس رستے پر میں ایک بار پلوشہ اور سردار کے ساتھ اور دوسری مرتبہ اکیلا سفر کر چکا تھا۔ہمیں اس وائی ملاپ سے بائیں جانب مڑنا تھا۔ہم موڑ سے چند قدم دور تھے کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کی کرخت آواز گونجی۔

’’سیدھا چلتے رہو ورنہ سر میں گولی اتار دوں گا۔‘‘ پلوشہ ٹھٹک کر رکی۔وہ مجھ سے چند قدم آگے چل رہی تھی یقیناً اس نے بھی وہ آواز سن لی تھی۔وہ جلدی سے میرے قریب آئی اور میرے ٹھیک بازو سے پکڑ کر مجھے کھینچتے ہوئے ایک پتھر کے عقب میں ہو گئی۔یہ کافی بڑا پتھر تھا۔میں اس پتھر اور پہاڑی کے درمیان میں بننے والی ایک دراڑ میں ہو گیا تھا۔وہ پتھر کی ایک جانب سے نالے موڑ کی طرف جھانکنے لگی۔درمیان میں پتھر حائل ہونے کی

وجہ سے مجھے کوئی منظر تو دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ ان کی آوازیں میرے کانوں میں ضرور پڑ رہی تھیں۔تین چار مختلف آوازیں اور قدموں کی چاپ میرے کانوں میں تواتر سے پڑنے لگی۔وہ ہمارے پتھر کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔پلوشہ نے فوراً میرے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"قبیل خان کے تین آدمی کسی غریب کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں......تو کیا خیال ہے؟"

"اڑا دو......قبیل خان کا کوئی بھی دشمن ہمارا دوست ہی ہو گا۔"

"صحیح کہا، میں یہی کرنے لگی ہوں۔" پشت سے تھیلا اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے اس نے کندھے سے لٹکتی ڈریگنو ہاتھ میں پکڑی اور پتھر کے بائیں کونے کی آڑ لے کر نشانہ سادھنے لگی۔

"بہتر ہو گا، بیٹھنے کے بجائے لیٹ کر فائر کرو۔" اس کے ٹریگر دبانے سے پہلے میں نے دھیمی آواز میں مشورہ دیا۔کیونکہ بیٹھ کر فائر کرنے کی نسبت لیٹ کر فائر کرنا زیادہ آسان بھی ہوتا ہے۔جوابی فائر کرنے پر دشمن کو کم ہدف ملتا ہے اور اس طرح صحیح طرح سے نشانہ بھی سادھا جا سکتا ہے۔

میری بات پر عمل کرتے ہوئے وہ فوراً لیٹ گئی تھی۔وہ تینوں تیس چالیس گز سے زیادہ دوری پر نہیں تھے ۔اس کے باوجود وہ چار بار سے زیادہ ٹریگر دبا چکی تھی۔

"ایک کمینہ بچ گیا ہے۔" وہ پانچواں فائر کرتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی لیکن متوجہ دشمن کی جانب رہی ۔اسی وقت کلاشن کوف گرجنے کی آواز آئی لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ فائر نشانہ سادھے بغیر کیا گیا تھا۔

پلوشہ نے دو تین گولیاں مزید ضائع کیں۔جوابی فائر بھی سنائی دیتا رہا۔

تھوڑا پیچھے کو کھسک کر اس نے پتھر کی آڑ لی اور میگزین اتار کر تھیلے سے ڈریگنو کی فالتو گولیاں نکال کر میگزین دوبارہ بھرنے لگی۔ڈریگنو کی میگزین میں دس گولیاں آتی ہیں اور اس نے دو گولیاں نشانے پر مار کر باقی ضائع کر دی تھیں۔کلاشن کوف کے دو تین برسٹ آئے تمام گولیاں اسی پتھر لگی تھیں جس کے پیچھے ہم نے پناہ لے رکھی تھی۔

"ایک بھاگ کر پتھر کے عقب میں چھپ گیا ہے۔" میگزین رائفل کے ساتھ لگاتے ہوئے اس نے مجھے مطلع کیا۔

میں نے پوچھا۔"اور قیدی کا کیا بنا؟"

”وہ دو تین پتھروں کے درمیان میں لیٹا ہوا ہے۔اب یہ معلوم نہیں کہ وہ زخمی ہے یا بچ گیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر نشانہ سادھ کر دو تین گولیاں اس طرف داغ دیں۔

”اس طرح گولیاں ضائع مت کرو۔تم سے چند گز کے فاصلے پر تین آدمی نہ مارے گئے۔“

”گولی کی آواز سنتے ہی وہ آڑا ترچھا بھاگ کر ایک پتھر کے پیچھے چھپ گیا،اب میں کیا کرتا۔“

”اب گولیوں کی آواز سن کر اگر قبیل خان کے اور آدمی اس طرف آ گئے پھر......؟“

”تو کیا......الحمد اللہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔میں آسانی سے فرار ہو سکتا ہوں اور تمھاری مجھے یوں بھی کوئی پروا نہیں ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے تین چار مزید فائر اس جانب جھونک دیے۔

میں نے جھلا کر کہا۔”یار!......کیوں گولیاں ضائع کر رہے ہو۔“

”تو کیا کروں......اس کا سر تھوڑا سا نظر آتا ہے اور پھر وہ سر کو پیچھے کھینچ لیتا ہے۔“

”سنائپر رائفل کی ایک گولی سے ایک بندہ مارا جاتا ہے اور تم نے ایک بندے کو مارنے کو لیے پندرہ گولیاں فائر کر لی ہیں۔“

”پندرہ نہیں......اٹھارہ۔“ میگزین میں موجود آخری تین گولیاں بھی فائر کر کے وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔ میں جھک کر اس کے نزدیک پہنچا اور پتھر سے تھوڑا سا سر نکال کر دیکھا اسی وقت کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ میرے کانوں میں پڑی اور میں نے اپنا سر پیچھے کھینچ لیا۔وہ قریباً دو سو گز دور ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپا تھا ۔ہماری طرف فائر کرنے کے لیے وہ اپنے سر کو پتھر کے ایک جانب سے ذرا سا باہر نکال کر پھر آڑ میں کر لیتا۔

پلوشہ نے دوبارہ میگزین بھر کر رائفل سے لگائی اور فائر کرنے کے لیے لیٹ گئی۔

”میرا خیال ہے مجھے رائفل سنبھالنا پڑے گی ورنہ ان کو کمک ملنے کی صورت میں بے موت مارے جائیں گے۔“

”رائفل پکڑ نہیں سکتے اور فائر کرو گے۔“ گردن میری جانب موڑتے ہوئے اس نے منھ بنایا اور دوبارہ فائر کرنے لگی۔

”ایک منٹ پلوشہ!“ اس کے دو تین گولیاں چلانے کے بعد مجبوراً مجھے آواز دینا پڑی۔

”اب کیا ہے؟“ پیچھے کی جانب کھسک کر وہ اٹھ بیٹھی۔

”مجھے ایک موقع دو۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس سے رائفل مانگی۔

وہ غصے بھرے لہجے میں بولی۔”دماغ تو ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں ٹھیک ہے دماغ۔اور جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“

”فرماؤ۔“ رائفل میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے منھ بنایا۔”ایک ہاتھ سے تو تم رائفل تھام بھی نہیں پاؤ گے۔“

”اب یہاں آ کر بیٹھو۔“ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا۔”منھ دشمن کی طرف رکھو میں نے تمھارے کاندھے پر رائفل کی نال رکھنی ہے۔“

مجھے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے وہ پتھر کے دائیں کونے کے ساتھ بیٹھ گئی۔اس کے دائیں کندھے پر ڈریگنو و رائفل کی بیرل رکھ کر میں نے اپنے رائفل کا بٹ اپنے دائیں کندھے میں درست کیا۔گو رائفل سے درست فائر کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے دائیں ہاتھ سے پسٹل گرپ کو تھام کر بائیں ہاتھ سے فرنٹ ہینڈ گارڈ کو مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے۔لیکن اس وقت میرا بایاں ہاتھ نا کارہ ہو گیا تھا اور اکیلے دائیں ہاتھ سے رائفل کو سنبھال کر درست فائر کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔

اپنے بائیں ہاتھ کا کام میں پلوشہ کے کندھے اور ہاتھ سے لے رہا تھا۔ٹیلی سکوپ سائیٹ پر رینج دیکھنے پر ایلیویشن ڈرم پانچ سو پر نظر آیا۔ایلیویشن کو دو سو گز کے فاصلے پر لگا کر میں نے پسٹل گرپ کو مضبوطی سے تھاما۔دائیں کندھے میں رائفل کا بٹ پھنسا کر میں نے رائفل کو حتی الوسع پیچھے کی طرف کھینچا۔پلوشہ نے میرے کہے بغیر رائفل کے فرنٹ ہینڈ گارڈ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔اس حالت میں، مجھ سے زیادہ پلوشہ کو خطرہ تھا پر وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی۔زیادہ حرکت دینے سے بائیں کندھے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں لیکن وہ وقت درد محسوس کرنے کا نہیں تھا۔

بایاں گھٹنا نالے میں بکھرے پتھروں پر ٹیک کر میں نے دوسرا پاؤں سمیٹ کر اسی پر نشست بنا کر بیٹھ گیا۔ڈریگنو کی ٹیلی سکوپ سائیٹ سے ہدف کا فاصلہ مزید سمٹ کر قریب آ گیا تھا۔بائیں آنکھ بند کرتے ہوئے میں

نے دائیں آنکھ سائیٹ کے شیشے سے مخصوص فاصلے پر رکھتے ہوئے دایاں گال ڈریگنو ورائفل کے بٹ کے اوپر ٹیک دیا۔دشمن جس پتھر کے عقب سے جھانک کر فائر کر رہا تھا اس پر شست باندھ کر اس کے جھانکنے کا انتظار کرنے لگا۔ہماری طرف سے دو تین منٹ سے فائر نہیں ہو رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی محتاط انداز میں فائر کر رہا تھا۔اس کی احتیاط کی وجہ سے مجھے مزید ایک ڈیڑھ منٹ انتظار کرنا پڑا۔اور پھر اس نے پہلے کی طرح فائر کرنے کے لیے پتھر کی اوٹ سے تھوڑا سا سر باہر نکالا۔مگر اس مرتبہ اسے سر واپس لے جانے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔البتہ اضطراری انداز میں اس سے ٹریگر ضرور دب گیا تھا۔اس کی کلاشن کوف ایک لمبا برسٹ فائر کر کے خاموش ہوئی۔سر میں لگنے والی گولی زیادہ دیر پھڑکنے بھی نہیں دیتی۔اسے گرتے دیکھ کر وہ خوشی سے دمکتے چہرے کا ساتھ میری جانب مڑی۔

''بس تمھاری یہی خصوصیت دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ قبیل خان کے بعد تمھیں مارنے کے ارادے میں تھوڑی سی ترمیم کرلوں۔''

میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ فائر سے ہونے والے ہلکے سے جھٹکے نے میرے زخم میں ہونے والی تکلیف میں اضافہ کر دیا تھا۔میرے چہرے پر ہویدا اذیت بھرے تاثرات دیکھ کر وہ بے چینی سے بولی۔

''کیا ہوا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بے ساختہ میرا زخمی کندھا سہلانے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے نکلتے ہیں۔'' تکلیف ضبط کرتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہونہہ!......چلو۔'' میری تائید کرتے ہوئے وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

ہم لاشوں کی جانب بڑھ گئے دو آدمی اوندھے منہ پڑے تھے جبکہ ایک ادھیڑ عمر کا مرد لاشوں سے ایک جانب ہو کر پتھروں کے درمیان سکڑا سمٹا چھپا ہوا تھا۔اس کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب ایک مضبوط رسی سے بندھے تھے۔پلوشہ ایک تیز دھار خنجر ہر وقت اپنی پنڈلی سے باندھے رکھتی تھی۔اس مرد کے قریب جا کر اس نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر اس کی بندشیں کاٹ ڈالیں۔

''کون ہو تم اور کیا نام ہے تمھارا۔؟'' بندشیں کاٹتے ہی پلوشہ اسے مخاطب ہوئی۔

وہ محتاط لہجے میں بولا۔''قابل خان محسود......اور میں ایک تاجر ہوں۔'' میں ان کے قریب جا کر خاموشی سے

کھڑا ہو گیا تھا۔

”ان کی تمھارے ساتھ کیا دشمنی ہے۔“ پلوشہ نے اگلا سوال پوچھا۔

”ان کی دشمنی میرے ساتھ نہیں، ملک خوشحال خان محسود کے ساتھ ہے، بلکہ ان کے مشر قبیل خان کی دشمنی ہے خوشحال خان کے ساتھ اور میں ملک خوشحال خان کا ماموں زاد بھائی ہوں۔“

اس کی وضاحت سن کر معاملہ سمجھنا آسان ہو گیا تھا لیکن پلوشہ کے سوال جاری رہے۔

”انھوں نے تمھیں کہاں سے پکڑا، میرا خیال ہے دشمنی کے باوجود یوں خواہ مخواہ کسی پر ہاتھ ڈالنا لڑائی کو کھلی دعوت دینا ہے۔“

وہ تفصیل بتلاتا ہوا بولا۔”خوشحال خان محسود کے آدمیوں کے لیے انگور اڈے کے رستے افغان سرحد عبور کرنا منع ہے اس بارے خوشحال خان اور قبیل خان میں باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوا ہے۔اور مجھ سے یہ غلطی ہو گئی ہے۔گو میں کوئی چیز سمگل نہیں کر رہا تھا اور میرا مقصد صرف افغانستان جا کر کسی سے ملاقات کرنا تھا۔اسی وجہ سے میں نے اس رستے پر جانے کی ہمت کی تھی اور صبح سویرے انگور اڈے سے آگے روانہ ہوا۔لیکن میری بدقسمتی کہ اس وقت بھی میرا ٹکراؤ ان آدمیوں سے ہو گیا اور اب یہ مجھے پکڑ کر یہاں اپنے کسی مخصوص اڈے پر لا رہے تھے۔“

”یہاں پر موجود قبیل خان کی حویلی تو غالباً تباہ ہو چکی ہے۔“ پلوشہ نے یقینی بات کو گمان کے انداز میں بیان کیا۔

”ہاں حویلی کی تباہی کی خبر ہم تک بھی پہنچ چکی ہے۔اور اب مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس حویلی کے علاوہ بھی یہاں قبیل خان کے آدمیون کا کوئی ٹھکانہ ہے یا نہیں، البتہ علام خیل یہ اس لیے نہیں لے کر گئے کہ عوامی گاڑی میں جاتے ہوئے ملک خوشحال خان تک میری گرفتاری کی خبر پہنچ جاتی۔اور فی الحال یہ اس خبر کو راز رکھنا چاہتے تھے۔“

”ہونہہ!......“ کہہ کر پلوشہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ کے متعلق کچھ جان سکتا ہوں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”ہمیں تم قبیل خان کے دشمن سمجھو۔“ یہ کہتے ہی وہ لاشوں کی تلاشی لینے لگی۔ان کی جیبوں سے نکلنے والی نقدی اس نے اپنی جیب میں منتقل کی اور غیر ضروری چیزیں ان کے قریب ہی پھینک کر وہ تیسری لاش کی طرف

بڑھ گئی۔ ڈریگنووکی گولی اس کے ماتھے کی بائیں جانب لگی تھی۔اس کی جیب سے بھی نقدی اور ایک موبائل فون نکال کراپنی جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے مرنے والے کی کلاشن کوف اٹھائی اور میری طرف بڑھ آئی۔ان دو لاشوں کے پاس تین کلاشن کوفیں پڑی تھیں۔

''یہ کلاشن کوف میری ہے۔''پلوشہ کو کلاشن کوفیں سمیٹتے دیکھ کر قابل خان نے ایک روسی ساخت کی کلاشن کوف کی جانب اشارہ کیا جس کی بیرل قلم نما ترشی ہوئی تھی۔

''اٹھالو۔''باقی دونوں کلاشن کوفیں اٹھا کر پلوشہ نے قابل خان کو اپنی کلاشن اٹھانے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ۔''کلاشن کوف اٹھا کر وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''اب یہاں سے بھاگنے کی کرو۔ یہ نہ فائرنگ کی آواز سن کر اس خبیث کے مزید آدمی یہاں پہنچ جائیں۔''

''آپ دونوں کے نام جان سکتا ہوں۔''اپنی کلاشن کوف کندھے سے لٹکاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

پلوشہ اسے جواب دینے کے بجائے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''میرا نام ذیشان اور میرے ساتھی کا پلو خان ہے۔''اس کا استفسار سمجھتے ہوئے میں نے براہ راست قابل خان کو جواب دیا۔

''آپ دونوں کا ایک بار پھر شکریہ۔اگر کبھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میرا علاقہ وشلام ہے۔''ہم سے الوداعی مصافحہ کر کے وہ چل پڑا اس کا رخ دائیں جانب نکلنے والے نالے کی طرف تھا۔ہم بھی اپنے رستے پر چل پڑے تھے۔تھوڑا سا چلتے ہی وہ کہنے لگی میرا خیال ہے یہ کلاشن کوفیں یہیں چھپا دیتے ہیں۔''

میں بے پرواہی سے بولا۔''جو مرضی آئے کرو۔''

اور وہ سر ہلاتے ہوئے ایک طرف بڑھ گئی۔میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔میرے زخم سے رہ رہ کر درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔چار پانچ منٹ بعد وہ کلاشن کوفیں چھپا کر لوٹ آئی۔یقیناً تین کلاشن کوفیں ایک ڈریگنو و رائفل، اپنا اور میرا سامان یہ سب کچھ اٹھا کر ان پہاڑوں میں چلنا کافی دشوار تھا۔اس نے بھی اسی وجہ سے کلاشن کوفیں وہیں چھپانے کا مشورہ دیا تھا۔

اس کے قریب آتے ہی میں دوبارہ اٹھ کر چل پڑا۔چار پانچ گھنٹوں کے بعد ہم کمانڈر نصراللہ کی بیٹھک میں

پہنچ گئے تھے۔میرے لیے یہ سفر کافی تکلیف دہ اور مشکل ثابت ہوا تھا۔بیٹھک میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے بستر جھاڑ کر مجھے لیٹنے میں مدد دی۔

''تم آرام کرو میں کسی ڈاکٹر کو یہاں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''وہ جب بھی سنجیدہ ہوتی لڑکے کے انداز میں بات کیا کرتی تھی۔

میں نے اسے جواب دیے بغیر آنکھیں بند کر لیں اور وہ باہر نکل گئی۔اس کی واپسی سے پہلے کمانڈر نصر اللہ آگیا وہ عمر کی اس سطح پر تھا کہ اب وہ ٹریننگ یا عملی طور پر کسی سرگرمی میں حصہ لینے کے قابل نہیں تھا۔بس کبھی کبھار اہم امور کی مشاورت کے اسے بلا لیا جاتا۔باقی وقت وہ گھر ہی میں گزارا کرتا۔اس وقت بھی بیٹھک کا تالا کھلا دیکھ کر وہ اس طرف چلا آیا تھا۔

''اسلام علیکم!......ارے یہ کیا ہوا؟''سلام کہتے ہی اس کی نظر میرے زخمی کندھے پر پڑی اور اس نے پوچھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''وعلیکم اسلام۔''کہہ کر میں اسے زخمی ہونے کی وجہ بتانے لگا۔

''ہونہہ!......اب پلو خان کہاں گیا ہے؟''

''وہ ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے۔''یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ بیٹھک کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''شاید پلو خان ڈاکٹر کو لے آیا ہے۔''کمانڈر نصر اللہ نے کہا۔اس کی بات کی تصدیق اگلے ہی لمحے ہوگئی جب پلوشہ۔''اسلام علیکم۔''کہتے ہوئے ایک باریش شخص کے ہمراہ نمودار ہوئی۔عمومی طور پر ڈاکٹر حضرات کلین شیو ہوتے ہیں۔مگر اس کے چہرے پر بہت خوب صورت گھنی داڑھی تھی۔

سلام کا جواب دے کر کمانڈر نصر اللہ ڈاکٹر اور پلوشہ سے ہاتھ ملانے لگا۔

پلوشہ نے ڈاکٹر کا دوائیوں والا بکس اٹھایا ہوا تھا۔ڈاکٹر کمانڈر نصر اللہ سے ہاتھ ملا کر میرے زخمی بازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔سب سے پہلے اس نے پلوشہ کی باندھی ہوئی پٹیاں تیز دھار قینچی سے کاٹ کر زخم سے علاحدہ کیں اور پھر زخم کو احتیاط سے صاف کرنے لگا۔

زخم صاف کر کے اس نے چند ٹانکے لگائے کیونکہ پلوشہ کے تیز دھار خنجر نے زخم کے منہ کو کھول دیا تھا۔اور

پھر دوبارہ سے تازہ پٹی باندھنے لگا۔ پٹی باندھ کر اس نے درد کش انجیکشن لگایا اور مختلف گولیاں نکال کر پلوشہ کو کھانے کی ترتیب بتانے لگا۔

پلوشہ اسے دروازے تک چھوڑنے گئی اور پھر واپس آ گئی۔

کمانڈر نصر اللہ نے پوچھا۔ ”آپ لوگوں کے لیے کھانا لاؤں؟“

”بھوک تو بہت سخت لگی ہے۔“ پلوشہ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اور کمانڈر نصر اللہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

رات کو میں نے آئی کام پر الفاتو سے رابطہ کیا۔ میں پہلی بار اس سے رابطہ کر رہا تھا۔ اسے کوڈ میں تازہ صورت حال بتا کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میجر اورنگ زیب تک اپنے زخمی ہونے کی خبر پہنچانا لازمی تھا کیونکہ میں کم از کم مہینے بھر کے لیے تو ناکارہ ہو گیا تھا۔

الفاتو سے ہونے والی تمام گفتگو پلوشہ نے بھی سنی تھی لیکن اس نے یہ الفاتو کے بارے جاننے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ گفتگو کے اختتام پر وہ مجھے دوائی کھلانے لگی۔ گولیاں کھلا کر اس نے نیم گرم دودھ کا گلاس مجھے پکڑا دیا۔

”میرا خیال ہے تم چند دن اپنے گھر میں آرام کر لو۔“ دودھ پی کی میں نے خیال ظاہر کیا۔

”شاید تم چھپنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو۔ مگر میں تمھاری یہ ترکیب کامیاب نہیں ہونے دے سکتی۔“

”تمھیں مشورہ دینا ہی فضول ہے۔“

”ہاہاہا۔“ اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

میں نے لیٹنے کے لیے اپنے تکیے کو ہاتھ لگایا اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے لیٹنے میں مدد دینے لگی۔ لیٹتے ساتھ ہی میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں یقیناً میری دوائی میں خواب آور گولی بھی شامل تھی۔ میری آنکھ پیاس لگنے کی وجہ سے کھلی تھی۔ پلوشہ مجھے ساتھ والی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے اونگھتی نظر آئی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور ہلکی سی آواز سن کر وہ جاگ گئی۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' جمائی لیتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔

''پانی پینا تھا۔'' اسے جاگتے دیکھ کر میں نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''تو مجھے آواز دے لی ہوتی۔'' چارپائی سے اٹھ کر وہ کونے میں پڑے گھڑے کی جانب بڑھ گئی۔ پانی کا بھرا گلاس مجھے پکڑا کر اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی پلا کر دوبارہ لٹا دیا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔

اگلے دو ہفتے میں میرے کندھے کا زخم کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس دوران پلوشہ نے میری تیمارداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ میں نے کئی بار اسے گھر جانے کو کہا مگر وہ مزاحیہ انداز اپنا کر ٹال گئی۔ کبھی کبھار جاتی بھی تھی تو شام تک لوٹ آتی تھی۔ میں بازو کو ہلا جلا کر بیٹھک کے اندر ہی ورزش وغیرہ کر لیتا تھا۔ اب میرا بازو ٹھیک ٹھاک کام کرنے لگا تھا ایک رات کو الفاتو سے بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ سردار خان نے ایک ماہ کی اور چھٹی مانگ لی ہے۔

پلوشہ بھی ساری گفتگو سن رہی تھی۔ جونھی میں نے آئی کام آف کیا فوراً بولی۔ ''اس کا مطلب ہے قبیل خان کے خلاف ہم دونوں کو ہمت کرنا پڑے گی، سردار بھائی کا انتظار فضول ہے۔''

''ہونہہ!......'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی تائید کی۔

''تو پھر کیا سوچا۔'' وہ مزید انتظار اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ''وہ خبیث تو کسی جگہ ٹکتا ہی نہیں۔''

''افغانستان جانے کے بارے کیا خیال ہے؟'' میں نے مشورہ مانگنے والے انداز میں پوچھا۔

وہ اعتماد سے بولی۔ ''چلے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ایک چکر اس کی حویلی کا لگا لیں آج کل وہاں زور و شور سے کام شروع ہے۔''

''ہاں اس کی عیاشی کا اڈہ جو تھا۔''

کافی دیر تک ہم منصوبہ بناتے رہے آخر میں طے کیا کہ کل صبح ہم ڈی بلاک پر جا کر وہاں سے بیرٹ ایم 107 لے کر آئیں گے اور اس کے بعد قبیل خان کے خلاف کوئی ایکشن لیں گے۔

صبح سویرے ناشتے کے بعد ہم ویگن میں بیٹھ کر علام خیل پہنچے اور وہاں سے ڈی بلاک کی طرف چل پڑے

۔یہ احتیاط ہم نے ضرور کی تھی کہ علام خیل سے ایک کلومیٹر پہلے اتر کر نالے میں ہو گئے تھے۔ڈی بلاک کے سامنے والے سنتری کو اپنا تعارف کرا کے ہم پوسٹ کمانڈر کو ملے۔پہلے والا کمانڈر وہاں موجود نہیں تھا لیکن وہ اسے ہمارے بارے مکمل طور پر بتا گیا تھا۔دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا اور بیرٹ ایم 107 اٹھا کر وہاں سے نکل آئے۔

''تم مجھے سنائپر رائفل چلانا کیوں نہیں سکھاتے۔''ڈی بلاک کی اترائی پر وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

''یہ بھی تو کلاشنکوف اور دوسرے ہتھیاروں کی طرح چلائی جاتی ہے۔بلکہ تم نے اس دن ڈریگنو سے دو بندے مارے تو تھے اور کیا سیکھنا ہوتا ہے۔''

''جی نہیں وہ تو تیس پینتیس گز دور تھے۔اتنے فاصلے سے تو انھیں پستول سے بھی نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔بعد میں ایک آدمی کے لیے میں نے بیس سے زیادہ گولیاں فائر کیں مگر ناکام رہی اور تم نے زخمی ہوتے ہوئے بھی فقط ایک گولی چلا کر اس کا خاتمہ کر دیا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تو اس میں کمال سنائپر رائفل کا تو نہ ہوا نا،یہ کام تو میں کلاشن کوف یا کسی اور رائفل سے بھی کر سکتا تھا۔بھول گئی ہو جب تمھارے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنایا تھا۔''

''اس دن تو تمھارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔''یہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا اور پھر مسلسل ہنستی چلی گئی۔

''اچھا ہی بند کرو اور قبیل خان کے بارے کچھ سوچو آج سنا تھا پوسٹ کمانڈر کیا کہہ رہا تھا کہ ذخیرہ پوسٹ اور زیارت کیل کے ساتھ موجود چند اور چوٹیوں پر دہشت گردوں نے مورچہ بندی کی ہوئی ہے اور پاک آرمی کے ساتھ آئے روز فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔''

''تو اس میں قبیل خان کہاں سے آن ٹپکا۔اور تم نے پاکستان آرمی کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔''

''بکواس بند کرو......یہ آرمی کا نہیں ملک کا کام ہے۔ملک دشمن اور دین دشمن عناصر کی سرکوبی کرنا ہر پاکستانی کا کام ہے۔''

وہ جلدی سے بولی۔''مذاق کر رہا تھا تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔''

''مجھے اس قسم کا مذاق پسند نہیں ہے،بلکہ تم تو کسی بھی قسم کا مذاق نہ کیا کرو۔''

"واہ جی واہ......وہ کیوں۔اور میں تمھیں اتنی بری کب سے لگنے لگی ہوں؟......جب لیٹی ہوتی ہوں تو چھپ چھپ کر مجھے پہروں گھورتے رہتے ہو اور سامنے یوں بے پرواہی ظاہر کرتے ہو گویا میں تمھیں سچ مچ اچھی نہیں لگتی۔"

"کب گھورا ہے تمھیں۔" میں نے زچ ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ شوخی سے بولی۔"اب بھی گھور رہے ہو۔قسم سے فوجی جوان تو اس طرح نہیں ہوتے۔"

"میرا خیال ہے مجھے یہیں سے اپنا رستہ جدا کر لینا چاہیے۔سردا خان خود تو چھٹیاں کاٹ رہا ہے اور تم جیسا سر درد میرے حوالے کر گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں رک گیا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے اب کچھ نہیں کہتی۔" میرے چہرے پر چھائے سنجیدگی بھرے تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے ہتھیار ڈالنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"آخری بار متنبہ کر رہا ہوں اس کے بعد اگر تم نے ذرا سی بھی بکواس کی تو............"

"اب بس بھی کرو یار!" اس نے بیزاری بھرے لہجے میں قطع کلامی کی۔"تم بڑے یوسف ثانی ہونا کہ ہر وقت تمھارا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔"

"میں جیسا بھی ہوں اپنی ذات کے لیے ہوں، باقی ہم دونوں کسی خاص مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں ورنہ اس کے بعد ہم نے علاحدہ ہو جانا ہے اور یہ بات تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو۔"

"تم ایک بات بھول رہے ہو۔" اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر سنجیدگی بھری ہوئی تھی۔

"وہ کیا؟" اس کے لہجے نے مجھے بات پوچھنے پر مجبور کیا تھا۔

"یہی کہ قبیل خان کے بعد میں تمھیں قتل کر دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جاندار قہقہہ لگایا اور میں افسوس بھرے انداز میں دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔اس کا سدھرنا شاید ناممکن تھا۔

"ویسے سچ کہوں تو اب میرا ارادہ تھوڑا تبدیل ہونے لگا ہے۔جب سے تم نے میرے سر پر رکھے ہوئے گلاس کو نشانہ بنایا ہے، میرا جی چاہ رہا ہے کہ تم سے کچھ سیکھوں لیکن......اس بات کو حتمی نہ سمجھنا ہو سکتا ہے میں اپنے پہلے ارادے ہی پر عمل کرنا پسند کروں۔"

''اور اگر اس سے پہلے میں نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا پھر؟''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''ایسا ہونا بہت مشکل ہے۔

میں نے پوچھا۔''کیوں؟''

وہ شوخی سے بولی۔''کیونکہ میں تمھیں بہت پیاری لگتی ہوں۔''

میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔''

''ہائے رے تمھاری خوش فہمیاں۔''میری طنزیہ ہنسی پر بھی وہ کھل اٹھی تھی۔

''ایک بات تو بتاؤ؟''اسے خوش ہوتے دیکھ کر میں نے کہا۔

ایک لحظہ کے لیے اپنے پاؤں روکتے ہوئے اس نے بیرٹ ایم 107 کے تھیلے کو کندھے پر درست کیا اور پھر قدم میرے ساتھ ملاتے ہوئے بولی۔''پوچھو۔''

''کیا میں تمھیں اتنا گدھا نظر آتا ہوں کہ تم پر مرمٹوں کیا دنیا میں اور عورتیں مر گئی ہیں۔''

وہ کہاں ہار ماننے والی تھی فوراً بولی۔''یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آرہی، کہ آخر تم ایک ایسی لڑکی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو جو تمھیں قتل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ اس طرح میں تمھیں قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دوں گی تو یہ تمھاری غلط فہمی ہے۔''

''یہ بھی خوب رہی، ہر وقت اپنی قیمت بتانے کا شوق تمھیں چرایا ہوا ہے اور پیچھے میں پڑا ہوں۔''

''اس میں شک ہی کیا ہے۔اور قیمت تو اس لیے بتائی ہے تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں اور یہ کہ میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے تمھیں کتنی کچھ رقم اکٹھا کرنا پڑے گی۔''

''تمھارے لیے پچاس روپے خرچ کرنے والا میری نظر میں مہا بے وقوف ہوگا کجا پچاس لاکھ۔''

''یار!......کہا تو ہے تم پچاس لاکھ سے چند ہزار کم کر لینا۔''اس ڈھیٹ پر میری طنزیہ باتوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''اچھا اس فضول بحث کو چھوڑو اور کوئی کام کی بات کرو۔''

''کام کی بات یہی ہے کہ جب تک اس خبیث کو جہنم واصل نہیں کر دیتے آرام نہیں کریں گے۔''

میں نے پوچھا۔''کوئی منصوبہ بھی ہے یا بس ارادے ہی سے سب کام ہو جائے گا۔''

''تو بناؤ نا منصوبہ، منع کس نے کیا ہے۔ میرا تو کوئی بھی مشورہ تمھیں قبول نہیں ہوتا اور یوں بھی تم باس ہو سوچنا تمھارا کام ہے۔''

''اچھا تمھیں مختلف ہتھیاروں کے بارے کمانڈر نصراللہ نے سکھایا ہے، جسمانی داؤ پیچ کی تربیت بھی کسی استاد نے دی ہوگی، مختلف زبانیں پڑھانے والا بھی کوئی استاد ہوگا......''

''ہاں تو پھر؟'' مجھے بات ادھوری چھوڑتا دیکھ کر وہ مستفسر ہوئی۔

''تو یہ کہ کیا بکواس کرنے کی بھی کوئی کلاس لی ہے یا قدرتی طور پر فضول گو ہو۔''

''ہاہاہا......اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے پورے پاکستان کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ جن باتوں کا جواب نہ بن پڑے وہ بکواس ہی تو کہلاتی ہیں۔ عوام کہتی ہے مہنگائی کم کرو حکمران کہتے ہیں بکواس بند کرو۔ لوگ کہتے ہیں لوڈشیڈنگ کا مسئلہ حل کرو واپڈا کا ادارہ کہتا ہے بکواس بند کرو، مزدور کہتا ہے چار پانچ سو کی دیہاڑی سے میرے گھر کا چولھا کیسے جلے گا سیٹھ کہتا ہے بکواس بند کرو...........''

''بکواس بند کرو یار۔'' اس کی لمبی ہوتی تقریر دیکھ کر میں نے قطع کلامی کی۔

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ انھی باتوں کے دوران ہم علام خیل کے نالے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ شام کا ملگجا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

پلوشہ نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''آج شب یہیں قیام کرتے ہیں اور میں قبیل خان کی سن گن لینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''قبیل خان کے آدمیوں میں کم از کم دو تین بندے ایسے موجود ہیں جو تمھیں شکل وصورت سے جانتے ہیں۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔

''ایک تو تمھیں ہر وقت میری فکر لگی رہتی ہے۔'' اس کے لہجے میں شوخی بھری تھی۔

اور میں کچھ کہے بنا وہاں بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنے لگا۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اپنی پشت پر لدا سفری تھیلا اتارا اور اسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی بیٹھنے کے لیے میرے پہلو ہی میں جگہ پسند کی تھی

۔میں نے اعتراض کرنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس نہ کی کہ اس نے جواباً الٹی سیدھی گفتگو شروع کر دینا تھی

''میں نے کہا تھا کہ مجھے سنائپر رائفل سے فائر کرنا سکھادو۔'' گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ پرانی راگنی الاپی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''اچھا قبیل خان کی موت کے بعد سکھادوں گا۔''

''بڑے چالاک ہو۔''معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے وہ مسکرا پڑی۔

اندھیرا گہرا ہوتے ہی ہم وہاں سے چل پڑے کمانڈر عبدالحق تو ہمیں اپنے بیٹھک میں نہ ملا البتہ کمانڈر عبدالرشید بیٹنی وہاں موجود تھا۔وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا، جبکہ پلوشہ توان کے ساتھ رہ چکی تھی۔ہمیں پرتپاک انداز میں خوش آمدید کہا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر پلوشہ مجھے اشارہ کر کے وہاں سے نکل گئی اس کی واپسی دوتین گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔اسے تین دن ہوئے ہیں افغانستان سے لوٹے ہوئے اور پرسوں وہ ڈمبر یانی سے آگے واخدائی جارہا ہے۔

''سچ۔''میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بالکل صحیح اطلاع ہے مگر تم کس بات پر خوش ہونے لگے۔''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ایک منٹ۔''میں اٹھ کر کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔عشاء کی نماز کے بعد وہ گھنٹا ڈیڑھ مشاورت کرتے تھے اور میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک جاگ رہا تھا باقی آدمی دوتین منٹ پہلے ہی اس کے کمرے سے رخصت ہوئے تھے۔

''میں اندر آسکتا ہوں۔''اس وقت کمانڈر عبدالرشید بیٹنی سونے کے لیے اپنا بستر ٹھیک کر رہا تھا جب میں نے اندر جانے کی اجازت مانگی۔

''آجائیں۔''اس نے خوش اخلاقی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں کمانڈر۔''اندر داخل ہوتے ہوئے میں معذرت کا اظہار ضروری سمجھا تھا

''زحمت کی کوئی بات نہیں، آئیں بیٹھیں......اور قہوہ یا چائے پینا پسند فرمائیں گے۔''

''نہیں جناب!......شکریہ۔''میں زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

''حکم کرو۔'' وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس مرتبہ میں نے اپنی ضرورت اس کے سامنے دہرا دی۔

''ہاں یہ سب کچھ مل جائے گا لیکن اس کا مالک میں نہیں ہوں اس لیے معاوضا ادا کرنا پڑے گا۔'' اس نے بے تکلفانہ دل کی بات واضح کر دی۔

''ٹھیک ہے جناب رقم جتنی کہیں مل جائے گی۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔

''یہ سامان کس وقت چاہیے ہوگا۔''

''صبح۔'' یہ کہہ میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا۔ پلوشہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔

''تم کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کے پاس کس لیے گئے تھے۔'' میرے واپس پہنچتے ہی اس نے پوچھا۔

''اگر وہ اطلاع سچ ہے جو تم مجھ تک پہنچا چکی ہو تو پرسوں قبیل خان کے خلاف کارروائی کرنے کا منصوبہ میں نے سوچ لیا ہے۔''

''بھلا وہ کیسے؟'' اس نے اشتیاق آمیز بے تابی ظاہر کی۔

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم قبیل خان کے ساتھ محافظوں کی کتنی گاڑیاں ہوتی ہیں؟''

''چار گاڑیاں محافظوں کی اور پانچویں اس کی اپنی ہوتی ہے۔ پانچوں گاڑیاں ڈبل کیبن ہیں اور ہر گاڑی میں پانچ یا چھے آدمی ہوتے ہیں۔''

''مطلب مجموعی طور پر پچیس تیس بندے ہوتے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''اب تم یہ بتاؤ کہ ہم دو آدمی ان پچیس تیس آدمیوں پر کیسے قابو پائیں گے؟''

اور میں اسے اپنا منصوبہ بتانے لگا۔

''اس میں کافی خطرہ ہے۔'' منصوبہ سنتے ہی اس نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے اس کی تردید کیے بغیر کہا۔ ''قبیل خان جیسے خبیث کو جہنم واصل کرنے کے لیے خطرے تو مول لینا پڑتے ہیں۔''

''ہونہہ!......'' کر کے وہ فقط سر ہلا کر رہ گئی تھی۔اس کے بعد ہم منصوبے کی جزئیات پر گفتگو کرنے لگے۔پلوشہ نے کئی بہترین مشورے دیے تھے۔وہ عملی زندگی میں بھی گھات چھاپے کی کارروائیوں میں حصہ لے چکی تھی۔

صبح رقم ادا کر کے ہم نے مجاہدین کے ٹھکانے سے بارود، ڈیٹونیٹر، راکٹ لانچر اور اس کے چار راکٹ لے کر منصوبے میں طے کی ہوئی جگہ کی طرف چل پڑے۔راکٹ لانچر ہم نے مستعار لیا تھا جو کارروائی کے بعد کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کو واپس کرنا تھا البتہ بارود اور راکٹ ہمیں معاوضا دے کر لینے پڑے تھے۔

دو عدد کلاشن کوفیں، بیرٹ ایم 107 اور دو عدد پسٹل بھی ہمارے پاس موجود تھے۔چار پانچ گھنٹے مسلسل سفر کے بعد ہم مخصوص مقام پر پہنچ گئے تھے۔ملک ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں جاتے ہوئے یہ جگہ میری نظر میں آئی تھی۔اب جب قبیل خان کے جانے کی بابت معلوم ہوا تو میں نے فوراً ایک خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔اگر سردار ہمارے ساتھ ہوتا تو یہ منصوبہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ہم تین مل کر زیادہ بہتر طریقے سے یہ گھات لگا سکتے تھے۔لیکن اس کی غیر موجودی مجھے اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔یوں بھی پلوشہ ایک بہترین ساتھی تھی۔

اس جگہ پر ایک جانب کھڑی چٹانوں کا سلسلہ تھا جسے نقشہ بینی میں اسکارپمنٹ پڑھاتے ہیں، دوسری جانب نالہ تھا اور خوش قسمتی سے نالے کی ڈھلان بھی بالکل سیدھی ہی تھی۔نالہ عبور کر کے جو پہاڑی موجود تھی اس کا فضائی فاصلہ بھی دو اڑھائی سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔میں نے پلوشہ کے ساتھ اسی جگہ پر مورچہ بندی کا منصوبہ بنایا تھا۔دن کی روشنی میں ہم نے پتھروں کی مدد سے اپنے لیے دو تین مورچے بنائے اور شام ہوتے ہی میں سڑک کے اوپر مخصوص جگہوں پر بارود لگانے لگا۔اپنے مورچوں سے اس جگہ کا فاصلہ وغیرہ میں نے لیزر رینج فائینڈر کی مدد سے ناپ لیا تھا۔بارود لگاتے وقت پلوشہ نے بھی مدد کی تھی۔وہ ان کاموں کی اچھی خاصی ماہر تھی۔اس نے کسی بھی قدم پر مجھے سردار کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

پلوشہ سے پتا چلا تھا کہ قبیل خان کی گاڑی کے آگے اور پیچھے محافظوں کی دو دو گاڑیاں ہوتی تھیں اور اس کی گاڑی درمیان میں ہوتی تھی۔چونکہ تمام گاڑیوں کا رنگ کالا تھا اس لیے ہم گاڑیوں کی ترتیب ہی سے اس کی گاڑی کو پہچان سکتے تھے۔خود میں نے قبیل خان کی فقط تصویر ہی دیکھی تھی، براہ راست اس کی منحوس صورت

دیکھنے کا اتفاق اب تک نہیں ہو سکا تھا۔اندھیرا چھانے تک ہم تمام کاموں سے فارغ ہو گئے تھے۔وہ رات ہم نے وہیں گزاری اور صبح دم چائے وغیرہ پی کر ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔قبیل خان کی گاڑیوں سے پہلے پانچ چھے گاڑیاں گزر چکی تھیں۔اور پھر دور سے گرد کا طوفان اٹھا اور پانچ کالے رنگ کی گاڑیاں ایک قطار میں چلتی ہوئی اس جانب آتی دکھائی دیں۔ہم دونوں مکمل طور پر تیار تھے۔پلوشہ دوربین آنکھوں سے لگائے اسی طرف نگران تھی۔

''اسی خبیث کا قافلہ ہے۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔اسے ریموٹ کنٹرول تھما کر میں نے راکٹ لانچر کندھے پر رکھ لیا تھا۔اگر ہمارا لگائی ہوئی IED ریموٹ کنٹرول سے نہ پھٹتی تو میں نے راکٹ لانچر کے ذریعے پہلی گاڑی کو اڑانا تھا۔وہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ گاڑی موڑ نہیں کاٹ سکتی تھی۔اور اگلی گاڑی کے تباہ ہونے کے بعد وہ آگے بھی نہیں جا سکتے تھے۔جس جگہ ہم نے IED (Improvised Explosive Device) لگائی تھی اس کے بعد ایک خطرناک موڑ تھا اس لیے اس جگہ گاڑیوں کی رفتار لامحالہ آہستہ ہونا تھی ۔یوں بھی وہ سڑک کچی تھی اور اس پر بہت زیادہ رفتار سے گاڑی نہیں چلائی جا سکتی تھی۔تمام گاڑیاں ایک قطار میں چل رہی تھیں۔موڑ آنے سے پہلے ہی ڈرائیور نے رفتار کم کرنا شروع کر دی تھی۔دوربین آنکھوں سے لگائے پلوشہ کا ایک ہاتھ آئی ای ڈی کو پھٹانے والے بٹن پر تھا۔جونھی ہی اگلی گاڑی مخصوص جگہ پر پہنچی اس نے بٹن دبا دیا ۔حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے بھی راکٹ لانچر کی ٹیلی سکوپ سائیٹ میں پہلی گاڑی پر نشانہ سادھ لیا تھا۔لیکن مجھے فائر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور اگلی گاڑی چند فٹ ہوا میں اچھل کر الٹی ہو گئی۔پیچھے والی گاڑیاں فوراً رک گئی تھیں۔پلوشہ نے فوراً آخر میں لگائی جانے والی آئی ای ڈی کو پھاڑنے والا بٹن دبا دیا اس مرتبہ زوردار دھماکے کے ساتھ چوتھے نمبر پر موجود گاڑی تباہ ہوئی تھی۔آخری گاڑی چند گز پیچھے تھی۔میں نے فوراً راکٹ لانچر کا رخ اس جانب کرتے ہوئے راکٹ داغ دیا۔اڑھائی سو میٹر سے ایک ساکن ہدف کو نشانہ بنانا اتنا مشکل بھی نہیں تھا کہ میرا نشانہ خطا جاتا۔گاڑی اچھل کر کھڑی چٹانوں سے ٹکرائی اور دوبارہ سڑک پر گر گئی تین گاڑیاں اور ان میں موجود افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔دوسری اور تیسری گاڑی میں موجود قبیل خان کے آدمیوں نے فوراً

گاڑیوں کے عقب میں مورچے سنبھال لیے تھے۔انھیں ہمارے چھپنے کی جگہ معلوم ہوگئی تھی کلاشن کوفوں کی گولیاں ہمارے سامنے پڑے پتھروں سے ٹکرانے لگی تھیں۔

''قبیل خان دوسری گاڑی کے عقب میں چھپا ہے۔'' پلوشہ نے بغیر کسی تاخیر کے مجھے مطلع کرنا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے اپنی شست تیسری گاڑی پر مرکوز کرتے ہوئے اسے کہا۔''راکٹ لوڈ کرو۔''

اس نے فوراً پہلے سے تیار کیا ہوا راکٹ اٹھا کر آگے سے راکٹ لانچر کی مزل میں دھکیل دیا۔اور میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سانس روکتے ہوئے راکٹ داغ دیا۔تیسرے نمبر پر موجود گاڑی کا حشر بھی پہلے والی گاڑی جیسا ہوا تھا اور اس کے عقب میں چھپے آدمی قبیل خان کی مدد کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

اسی وقت دوسری گاڑی کے عقب میں موجود آدمی گاڑی کے عقب سے نکل کر موڑ کی جانب بھاگے۔مجھے اندازہ تھا کہ وہ کچھ ایسا ہی کریں گے اور میں اس کے لیے تیار تھا۔اس کے لیے بیرٹ ایم 107 تیار رکھی تھی۔

''سفید کپڑوں والا قبیل خان ہے۔اسے مرنا نہیں چاہیے۔'' مجھے سناپر رائفل سے شست لیتے دیکھ کر وہ پکار اٹھی تھی۔

ان کی تعداد چھے تھی اور موڑ تک اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ میں تمام کو نشانہ بنا سکتا۔اگر وہ موڑ مڑنے میں کامیاب ہوجاتے تو یقیناً خود بھی بچ جاتے اور ہمارے لیے بھی خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ان تمام میں قبیل خان اہم تھا اسی وجہ سے انھوں بھاگتے ہوئے اسے اپنے سامنے رکھا تھا۔میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا بس چند سیکنڈ ہی تھے۔سب سے پہلے میں نے قبیل خان کی پشت پر دوڑنے والے بندے کی پیٹھ پر گولی ماری۔سر کو نشانہ میں نے جان بوجھ کر نہیں بنایا تھا کہ وہ بھاگ رہے تھے اور اس حالت میں سر پر گولی مارنا مشکل ہوجاتا ہے۔جبکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ گولی کے خطا جانے کا خطرہ مول لے سکتا۔اڑھائی سو گز کے فاصلے پر بیرٹ ایم 107 کے خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔مقتول منھ کے بل گرا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے دوبارہ رائفل کاک کی اور اگلی گولی قبیل خان کے کولہے میں جھونک دی۔دو تین سیکنڈ کی دیر ہونے پر اس نے موڑ مڑ جانا تھا۔وہ نیچے گرا اور اس کے ساتھ بھاگنے والے چاروں اسے سنبھالنے کے لیے نیچے جھک گئے۔اسی وقت میں

نے اگلی گولی فائر کی اور ان کی تعداد میں ایک کی کمی ہوگئی۔ دو آدمیوں نے قبیل خان کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے موڑ کی جانب گھسیٹا اور ایک نے گھٹنا زمین پر ٹیک کر کلاشن کوف کی بیرل کا رخ ہماری جانب کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا تھا۔ کلاشن کوف تڑتڑاتے ہوئے آگ اگلنے لگی مگر یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ اس نے مسلسل ٹریگر دبائے رکھا۔ گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھنے کی وجہ سے وہ ایک آسان ہدف ثابت ہوا تھا۔ بیرٹ ایم 107 کی گولی اسے ماتھے میں لگی۔ پشت کے بل گرتے ہوئے بھی اس کی کلاشن کوف گولیاں اگل رہی تھی۔ میرے دوبارہ رائفل کاک کرنے تک قبیل خان کے آدمی اسے گھسیٹ کر موڑ مڑ گئے تھے۔ موڑ مڑ کر ایک بہت بڑے پتھر کے عقب میں لیٹ کر انھوں نے ہمارے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ شروع کر دیا۔

اس صورت حال میں مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، کہ یہ نہ ہو ایک آدمی ہمارے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ کرتا رہے اور دوسرا قبیل خان کو سہارا دے کر وہاں سے نکل جائے۔

''پلوشے!...... مجھے خطرہ ہے قبیل خان ایک آدمی کے ساتھ فرار نہ ہو جائے اور دوسرا آدمی ہمارے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ کرتا رہے۔'' سردار خان اسے پیار سے پلوشے کہا کرتا تھا۔ نہ جانے اس وقت کیوں میں نے بھی اسے اتنی بے تکلفی سے پکار دیا تھا۔ مگر وہ صورت حال اس طرح کی نہیں تھی کہ وہ میرے ایسا کہنے پر غور کر سکتی۔ اور اگر اس نے غور کیا بھی تھا تو وہ اس پر تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں بہرحال بالکل بھی نہیں تھی۔

''صحیح کہا۔'' اس نے فوراً میری تائید میں سر ہلا دیا تھا۔

''تم یہاں سے سنائپر رائفل کے ذریعے انھیں فائرنگ کا جواب دیتی رہو میں پیچھے سے جا کر انھیں قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''تم سنائپر رائفل پر مجھ سے بہتر فائر کر سکتے ہو اور میں تم سے زیادہ تیز رفتاری سے حرکت کر سکتی ہوں۔''

''مگر......''

''کوئی اگر مگر نہیں، میرا اعتبار کرو۔'' اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بااعتماد نظر آ رہی تھی۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے ایک بار پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔ میرا ضمیر اسے خطرے میں جھونکنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

”پریشان نہ ہوں مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے ایک آئی کام جیب میں ڈالا اور کلاشن کوف ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولی۔ ”آئی کام آن کر لینا، چینل نمبر گیارہ۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مورچے سے نکل کر بھاگتے ہوئے ایک نزدیکی چٹان کے عقب میں چھپ گئی۔ وہاں ایک لمحہ ٹھہر کر وہ بھاگتے ہوئے چند گز دور ایک دوسرے پتھر کے پیچھے لیٹ گئی۔ اس دوران دشمنوں کی طرف سے اکا دکا فائر کی آواز آتی رہی۔ مگر وہ پتھر سے سر نکالے بغیر فائر کر رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اسے پلوشہ کی حرکت کے بارے معلوم ہی نہیں ہوا ہوگا۔ پتھر کی وہ چٹان اتنی بڑی تھی کہ اس پر راکٹ کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ میں نے سنائپر رائفل کی ٹیلی سکوپ سائیٹ میں سے دیکھتے ہوئے اس پتھر پر اپنی شست مرکوز کر دی۔ مگر لگتا یہی تھا کہ قبیل خان وہاں سے فرار ہونے کی کوششوں میں تھا اور ایک آدمی اس نے پتھر کے عقب میں صرف اپنے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اور شاید اس آدمی کو بھی اچھی طرح یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اس کا کوئی عضو نظر آنے کی صورت میں وہ جسم کا حصہ نہیں رہے گا۔ ایسا یقیناً اس وجہ سے ہوا ہوگا کہ ان دنوں میں قبیل خان کے ایک ایسے دشمن کے روپ میں سامنے آ رہا تھا جو مسلسل اس پر حملے کر رہا تھا۔ اور میری نشانہ بازی مبالغہ آمیز واقعات کے ساتھ پیش کی جا رہی تھی۔ یہ سارا اندازہ میں اس بنا پر لگا رہا تھا کہ چٹان کے عقب میں چھپا ہوا دشمن اپنے ہاتھ تک کو پتھر کے عقب سے نہیں نکال رہا تھا۔

پلوشہ بھاگتے ہوئے نالے کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی تھی۔ قبیل خان اور اس کے دونوں آدمی اس جانب چھپے تھے جس طرف ان کی گاڑیوں کا رخ تھا۔ جبکہ پلوشہ کا رخ علام خیل کی جانب تھا۔ کیونکہ اس جانب سے اوپر چڑھا جا سکتا تھا ورنہ تو نالے کے کھڑے کناروں کے اوپر چڑھنا بہت مشکل تھا۔

سڑک کے اوپر پہنچ کر وہ بائیں جانب سے چکر کاٹ کر مزید اوپر چڑھنے لگی۔ یقیناً وہ وہاں سے ہوتے ہوئے قبیل خان کے آدمیوں کے عقب میں پہنچنا چاہ رہی تھی۔

سڑک پر چکر کاٹتے ہی وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں دوبارہ قبیل خان کے آدمیوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ گو وہ مکمل طور پر پتھر کی چٹان کے عقب میں تھے اس کے باوجود میں نے راکٹ لانچر استعمال کرتے ہوئے

،باقی بچے دو راکٹ اس جانب داغ دیے۔تا کہ وہ میرے جانب متوجہ رہیں۔ان کی طرف سے صرف ایک کلاشن کوف وقفے وقفے سے چند گولیاں اگل دیتی۔راکٹوں نے اس بڑی چٹان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔اور چٹان کے عقب میں چھپے ہوئے دشمن لامحالہ محفوظ تھے۔مجھے اپنے اندیشے سچ ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔لیکن اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ پلوشہ وہاں پہنچنے ہی والی تھی۔

اور پھر مجھے ایک نئی کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔دو تین منٹ بعد پلوشہ کی آواز ابھری۔''حالات قابو میں ہیں......اگر قبیل خان کا دیدار کرنا ہے تو نالے میں اتر آؤ میں اسے وہیں لا رہی ہوں۔''

اپنے پاس پستول کے ہونے کا یقین کر کے میں نیچے اترنے لگا۔پلوشہ نے حالات قابو میں ہونے کا مژدہ سنا دیا تھا اس کے باوجود میں بے پرواہی نہیں برت سکتا تھا نیچے اترتے ہوئے مجھے وہ نظر آنے لگی تھی۔قبیل خان لنگڑاتا ہوا اس کے آگے چل رہا تھا۔اس موڑ کے آگے چونکہ نالے کے کنارے اس قابل تھے کہ وہاں سے پیدل آدمی نیچے اتر سکتا تھا اس لیے وہ اسے اسی جانب سے نیچے لا رہی تھی۔

میرے قریب پہنچنے تک اس نے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔

قبیل خان کو پہلی مرتبہ میں اس طرح روبرو دیکھ رہا تھا لیکن اس بری حالت میں کہ اس کا کوئی قریبی عزیز بھی اسے نہ پہچان سکتا۔پلوشہ جنونی کیفیت میں اس پر ٹھوکریں برسا رہی تھی۔قبیل خان کا تمام جسم یوں کانپ رہا تھا گویا وہ رعشہ کا مریض ہو۔وہ بے تحاشا اس کی مضروب ٹانگ اور جسم کے نازک حصوں کو اپنی ضربات کا نشانہ بنا رہی تھی۔

قبیل خان ایک بے رحم ظالم اور غدار شخص تھا لیکن اس وقت مظلومیت کی تصویر بنا نظر آ رہا تھا۔

''لڑکے!......تم بہت زیادتی کر رہے ہو،یاد رکھنا میرے آدمی بدلہ ضرور لیں گے۔''پلوشہ کے ذرا سے دم لینے پر وہ ایک جانب خون تھوکتے ہوئے دھمکی دینے لگا۔

''پہلے میں اپنا بدلہ تو لے لوں۔تیرے آدمیوں کو اگر موقع ملا تو یقیناً میں منع نہیں کروں گا۔''یہ کہہ کر اس نے دو تین ٹھوکریں اس کے پہلو میں جڑ دیں۔

''میرا قصور تو بتا دو۔''اس کے لہجے میں عجیب قسم کی بے بسی اور غصہ ابل رہا تھا۔

”اگر تو مجھے پہچان لیتا تو تجھے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔“اس کے ساتھ اکڑوں بیٹھتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

”تو کرا دو پہچان تاکہ میں معافی مانگنے کے بارے سوچ سکوں۔“ قبیل خان نے جائز بات کہی تھی۔

”سپوگمائے کو جانتے ہو؟“پلوشہ نے اپنی بڑی بہن کا نام لیا۔

قبیل خان کا سر نفی میں ہل گیا تھا۔

”جانو گے بھی کیسے،کوئی ایک سپوگمائے تو تیری ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھی نا۔“پلوشہ نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے اس کا سر زمین سے ٹکریا۔

”آہ......“اس کے منہ سے زوردار کراہ خارج ہوئی۔

وہ دوبارہ اس کے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے بولی۔”قبیل خان!......یاد کرو ایک لڑکی کو تیرے آدمیوں نے لبِ سڑک علام خیل کے مضافات سے اٹھایا تھا،اس کے چھوٹے بھائی کی مداخلت پر تیرے آدمی نے اس معصوم لڑکے کو لات مار کر چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا تھا اور بعد میں اس کا والد بھی تیرے درندے محافظ کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔“

قبیل خان نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔”تت......تم یامین خان کے کیا لگتے ہو؟“

”شکر ہے،ابا جان کا نام تو تجھے یاد ہے۔“

”مم......مگر اس کا تو کوئی بیٹا نہیں تھا۔“قبیل خان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”صحیح کہا۔لیکن بیٹی تو تھی نا۔“ کھڑے ہو کر پلوشہ نے کندھے سے لٹکائی کلاشن کوف ہاتھ میں تھام لی تھی۔

”بیٹی......تو کیا؟“

”ہاں ذلیل انسان میں یامین خان کی بیٹی اور سپوگمائے کی بہن پلوشہ ہوں۔تیرے مردود ساتھی انار گل کو میں نے ہی واصلِ جہنم کیا ہے، تیری حویلی میرے ہی ہاتھوں تباہ ہوئی ہے،روشن خان اور اس کے ساتھیوں کو بھی میں نے انجام تک پہنچایا ہے۔اب تیری باری ہے۔“

”تو وہ تم تھیں۔میں کسی اور کو موردالزام ٹھہراتا رہا۔“

”تو تجھے کس پر شک تھا۔“

”مجھے تو کسی ایس ایس نامی شخص کے بارے خبر ملی تھی۔“اس نے خیال ظاہر کیا۔

”فکر نہ کرو، جسے مورد ِالزام ٹھہراتے رہے وہ بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔“میں نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ویسے بڑے خوش قسمت ہو، مرنے سے پہلے تو نے ایس ایس کا دیدار بھی کر لیا ہے۔“پلوشہ نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”تو میرا اندازہ درست تھا۔“مجھ پر ایک نظر ڈال کر وہ دوبارہ پلوشہ کی جانب متوجہ ہوا۔”پلوشہ......دیکھو تم نے اپنا بدلہ لے لیا، اب ہم صلح کر کے اس دشمنی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔تم جتنا جرمانہ کہو میں بھرنے کو تیار ہوں۔“

”ذلیل خان!......تجھے قتل کرنے کے لیے صرف میری بہن کے اوپر بری نگاہ ڈالنے کی وجہ کافی تھی۔تو نے تو میرا پورا گھرانہ اجاڑ دیا۔اور جہاں تک دشمنی ختم کرنے کا تعلق ہے تو دشمنی ختم کرنے کا آسان طریقہ دشمن کو قتل کرنا ہوتا ہے نا کہ اس سے مذاکرات کرنا۔“

”پلوشہ!......میرا خیال ہے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ اس تماشے کو طول دے سکیں۔“ان کی بات چیت لمبی ہوتے دیکھ کر میں لقمہ دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

مجھے تیکھی نظروں سے گھور کر وہ دوبارہ قبیل خان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”قبیل خان!......افسوس کہ میں تجھے اتنی اذیتیں نہ پہنچا سکی جتنی میں نے جھیلی ہیں۔بہر حال تیرے ساتھی کافی بے چینی سے جہنم میں تیرا انتظار کر رہے ہوں گے اس لیے وہاں پہنچنے کی کرو۔“یہ کہتے ہی اس نے کلاشن کوف کی بیرل کا رخ اس کی ٹانگوں کی طرف کر کے دو تین گولیاں داغ دیں۔وہ کراہتے ہوئے تڑپنے لگا۔اگلی دفعہ اس نے قبیل خان کے دونوں بازووں کو نشانہ بنایا۔اور پھر جھک کر کلاشن کوف کی مزل اس کی ٹھوڑی سے لگاتے ہوئے ٹریگر کو مکمل دبا دیا۔

گولیوں کے برسٹ نے اس کی کھوپڑی کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔فائر رکتے ہی اس نے گھٹنے زمین پر ٹیکے اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔کلاشن کوف اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھی۔وہ یک ٹک قبیل خان کی لاش کو گھور

رہی تھی۔دو تین منٹ انتظار کے بعد میں نے گلا کھنکارتے ہوئے اسے آواز دی۔

''پلوشہ!......میرے خیال میں چلنا چاہیے۔''

''آں ......''وہ گہرے خیالات سے باہر آ کر چونکتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر خوشی سے بھرپور ہنسی نمودار ہوئی اور کھڑے ہو کر وہ مجھ سے بری طرح لپٹ گئی۔

''شکریہ راجے!......یہ سب تمھاری وجہ سے ممکن ہوا۔''

''اچھا......اچھا ٹھیک ہے۔''اس کے گداز جسم کا لمس مجھے بوکھلانے کے لیے کافی تھا۔زبردستی اس کی گرفت سے خود کو آزاد کراتے ہوئے میں نے کہا۔''یہ شکریہ زبانی کلامی بھی ادا کیا جاسکتا تھا۔کم ازکم اتنا خیال تو کرلیا کرو کہ تم لڑکی ہو۔''

میری باتوں کا برا منائے بغیر وہ شوخی بھری مسکراہٹ سے بولی۔''کیا یاد کرو گے آج میں اتنی خوش ہوں کہ قبیل خان کے بعد تمھیں قتل کرنے کے فیصلے کو بھی ترک کرتی ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ۔''طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے پوچھا۔''اب چلیں؟''

''اگر چاہو تو میں ایک بار اور بھی گلے لگ سکتی ہوں۔''

''بے حیا۔''اپنی بے ربط ہوتی دھڑکنوں کو قابو میں کرتے ہوئے میں مورچے کی جانب مڑ گیا۔

''ہا......ہا......ہا۔''اس کا سریلا قہقہہ بلند ہوا۔مگر میں خاموشی سے چلتا رہا۔اس تیز طرار لڑکی کا مقابلہ کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

میرے ساتھ قدم ملاتے اس نے کہا۔''اچھا بات تو سنو۔''

''جی فرماؤ۔''میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھورا۔

''قبیل خان کی جیب سے کافی بڑی رقم میرے ہاتھ آئی ہے۔یہ پستول بھی ہاتھ لگا ہے۔''اس نے ایک قیمتی پستول میری نظروں کے سامنے لہرایا۔''میرا تو خیال ہے باقی تمام کی تلاشی بھی لے لیتے ہیں۔یقیناً کافی رقم ہاتھ لگے گی ان کی کلاشن کوفیں بھی سمیٹ کر کہیں چھپا دیتے ہیں۔''

''نہیں،ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔اگر گھات میں آتے ہی قبیل خان نے اپنے آدمیوں کو آئی کام پر

بتادیا ہوا تو وہ آتے ہی ہوں گے۔“

اس نے منھ بناتے ہوئے کہا۔”اگر ایسا ہوتا تو اب تک اس کے آدمی پہنچ گئے ہوتے۔“

”اگر اس کے آدمی نہیں تو کوئی اور تو پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ پہنچ گیا ہے۔“ سفید رنگ کی کار موڑ مڑ کر تباہ شدہ گاڑیوں کے قریب رک رہی تھی۔

”تو اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔“ وہ مصر ہوئی۔

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دیتا مجھے علام خیل کی طرف سے تین چار ڈبل کیبن اس طرف آتی دکھائی دیں۔

”وہ نظر آ رہی ہیں۔“ میں نے قدموں کی رفتار میں تیزی لاتے ہوئے اسے گرد کا طوفان اڑاتی گاڑیوں کی جانب متوجہ کیا۔

”اگر یہ اس کے آدمی ہوتے تو انھیں کچھ دیر پہلے پہنچنا چاہیے تھا۔“

”ہوسکتا ہے اس نے گولی لگنے کے بعد فرار ہوتے وقت انھیں مدد کو پکارا ہو۔“ میں اپنے مورچے والی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ بیرٹ ایم 107 کو کندھے پر رکھتے ہوئے میں نے خیال ظاہر کیا۔

اس نے سامان کا تھیلا پشت پر لادا راکٹ لانچر کندھے پر رکھا اور دائیں ہاتھ میں کلاشن کوف تھامتے ہوئے چڑھائی چڑھنے لگی۔ میں نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔ ہماری چڑھائی چڑھنے سے پہلے تینوں گاڑیاں وہاں پہنچ گئی تھیں۔ ہر گاڑی میں چار پانچ مسلح آدمی سوار تھے۔ اگلی گاڑی سے اترنے والے دو آدمی سفید کار کی جانب بڑھ گئے۔ ان کی باتوں کے دوران ہم بلندی پر پہنچنے والے تھے۔ میں مسلسل انھی کی جانب متوجہ تھا۔ سفید کار والے نے ہاتھ اٹھا کر ہماری جانب اشارہ کیا تھا شاید اس نے ہمیں نالے سے بلندی کی جانب حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ سفید کار والے سے بات چیت کرنے والے دونوں آدمیوں نے ہاتھ میں پکڑی کلاشن کوفوں کا رخ ہماری جانب کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔

بلندی کے آخری چند قدم ہم نے دوڑ کر طے کیے اور اوپر پہنچتے ہی ایک چٹان کی آڑ لے کر خود کو اس اندھا دھند فائرنگ سے محفوظ کر لیا۔

”یہ یقیناً پیچھا کریں گے۔“پلوشہ نے خیال ظاہر کیا۔اس کے لہجے میں ذرا بھر تشویش شامل نہیں تھی۔میں نے بارہا جانچا تھا کہ وہ بہت دلیر اور بہادر تھی۔

”چلو پھر ان کے تعاقب میں ذرا رکاوٹ پیدا کر دیں۔“بیرٹ ایم 107 کی دو پائی کھول کر میں نے نیچے رکھ دی۔

اس نے اب تک خالی میگزین ہی چڑھائی ہوئی تھی۔پشت پر لدا تھیلا اتار کر وہ اس میں سے بھری ہوئی میگزین نکال کر کلاشن کوف پر چڑھانے لگی۔اس دوران میں ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشوں کی حفاظت کرنے والے کور اتار کر نالے میں اترنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے والے مسلح افراد کا نشانہ لے چکا تھا۔پہلی بار میں نے اس آدمی کو نشانہ بنایا جو جھک کر نالے کے سیدھے کنارے سے نیچے کے لیے پر تول رہا تھا۔اپنے ہتھیار سمیت وہ دس پندرہ گز کی اونچائی سے نیچے گرا تھا۔باقیوں کے چونکنے اور سنبھلنے تک اور ایک آدمی بھی اپنے سردار قبیل خان کے پاس پہنچ چکا تھا۔وہ سرپٹ دائیں بائیں بھاگے اور میرے تیسرے فائر سے پہلے انھوں نے خود کو گاڑیوں اور پتھروں کی آڑ میں کر لیا تھا۔اس کے ساتھ ہی کئی کلاشن کوفیں گولیاں اگلنے لگیں۔سفید کار کے ساتھ موجود آدمی بھی ایک دم زمین پر لیٹ گیا تھا۔

آدمیوں کے غائب ہوتے ہی میں گاڑیوں کے ٹائروں کو نشانہ بنانے لگا۔تینوں گاڑیوں کے اپنی طرف والے چھے ٹائروں کو بے کار کر کے میں نے ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشوں پر دوبارہ کور چڑھائے اور پلوشہ کو کہا۔

”کیا خیال ہے چلیں۔“

”چلو۔“وہ فوراً میرے ساتھ متفق ہو گئی تھی۔

اسی طرح زمین پر لیٹے لیٹے ہم پیچھے کی طرف کھسکے اور جونھی ایسی جگہ پر پہنچے جہاں کھڑے ہو کر بھی ہم ان کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے،اٹھ کر عقبی جانب موجود ڈھلان میں اترنے لگے۔دشمنوں کی طرف سے مسلسل فائر کی آواز متواتر ہمارے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ہم تیز رفتاری سے وہاں سے دور ہٹنے لگے۔گو وہ پندرہ بیس آدمی ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن مقابلہ طول کھینچتا تو ان کی مدد کو مزید آدمی بھی پہنچ سکتے تھے یوں بھی قبیل خان کے پاس بہت بڑا لشکر موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد فائرنگ کی آواز میں وقفہ آنے لگا اور پھر فائرنگ بالکل ہی رک گئی۔ یقیناً انھیں بھی محسوس ہو گیا تھا کہ وہ یک طرفہ فائرنگ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے امید یہی تھی کہ وہ اتنی جلدی آڑ سے باہر نکل کر ہمارا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ شاید قبیل خان آئی کام پر انھیں میرے بارے بھی بتا چکا ہو کیونکہ اس کی آخری گفتگو سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے آدمیوں کو بلاتے ہوئے کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہوگا۔ اسی بات کا ذکر اس نے اپنی آخری گفتگو میں بھی کیا تھا۔ اگر قبیل خان نے نہیں بتایا تھا تب بھی اپنے مرنے والے آدمیوں اور گاڑیوں کے پھٹنے والے ٹائر ان کے سامنے تھے۔

اس پہاڑی کے عقب میں موجود نالے میں اترتے ہی وہ نالے ہی میں آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ وہاں سے تھوڑی دور آتے ہی اس نے ایک مناسب جگہ پر راکٹ لانچر کو چھپا دیا کہ بغیر راکٹوں کے وہ ہمارے لیے فالتو وزن ہی تھا۔

راکٹ لانچر سے جان چھڑا کر ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ دو تین گھنٹوں بعد ہم وہاں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اس دوران ہم نے ایک اور بلندی سر کر کے اس کی دوسری جانب ڈھلوان میں نیچے اتر گئے تھے۔ سورج پہاڑوں کے عقب میں چھپ گیا تھا۔ روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ دور سے نظر آنے والے چند گھروں کو دیکھ کر پلوشہ نے اپنی سمت تبدیل کی اور بائیں ہاتھ موجود پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ اسی وقت جھاڑیوں کے عقب سے گدھے پر لکڑیاں لادے ایک ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ اس کا رخ چند سو گز دور نظر آنے والے گھروں کی جانب تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہمیں اسے نظر انداز کیے ڈھلوان پر چڑھتے رہے۔ پہاڑی پر پہنچتے ہی وہ دوسری جانب اترے بغیر اوپر ہی اوپر چلنے لگی۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے ہمارا پسینہ بہنے لگا تھا۔ مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔

”پانی تو دے دو۔“ میں نے نام لیے بغیر اسے آواز دی۔

سفری تھیلے سے پانی کی بھری بوتل نکال کر اس نے میری جانب بڑھائی اور ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں بھی ایک ہموار پتھر دیکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ شام کا ملگجا اندھیرا تاریکی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

پانی پی کر میں نے بوتل اس کی جانب بڑھا دی۔ بوتل لے کر اس نے منہ سے لگا لی۔

چند منٹ آرام کرنے کے بعد وہ کھڑی ہوگئی۔

میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''ویسے ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ابھی ہم جس طرف نکل آئے ہیں یہ علاقہ میرا بھی دیکھا بھالا نہیں ہے۔ صبح کی روشنی ہی میں اندازہ لگا سکوں گی کہ ہمارا رخ کس جانب ہے۔''

''تو کیا ساری رات ہم یونہی ٹامک ٹائیاں مارتے رہیں گے۔''

کوئی مناسب جگہ دیکھ کر رات گزار لیتے ہیں۔'' وہ بھی میری طرح آرام کرنے کے حق میں تھی۔ ہم اسی طرح بلندی پر سفر کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ پہاڑی دائیں جانب ایک دوسری پہاڑی کی طرف مڑ گئی لیکن دونوں پہاڑیوں کے بیچ گہری جگہ موجود تھی اب اندھیرے میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ دبی ہوئی جگہ کتنی گہری تھی۔ اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے ٹھوکر لگی اور میں نے بہ مشکل خود کو گرنے سے بچایا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''ٹارچ تو جلا لو۔''

تھیلے سے ٹارچ نکال کر اس نے میری جانب بڑھا دی۔ وہ اترائی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس دبی ہوئی جگہ کے بعد ہمارے سامنے ایک پہاڑی کی بلندی شروع ہو رہی تھی جبکہ دائیں بائیں دو نالوں کی اترائی تھی۔ بجائے اوپر جانے کے وہ بائیں نالے میں اترنے لگی۔ نالہ کافی تنگ تھا۔ ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھینک کر میری نظریں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں بھی بھٹک رہی تھیں۔ ساری دن کی بھاگ دوڑ کے بعد میں کافی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''پستول تیار حالت میں رکھو یہاں کسی جنگلی جانور سے بھی مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس کی آواز ابھری تھی۔

''ہونہہ!......'' کرتے ہوئے میں نے ٹارچ بائیں ہاتھ میں تھامتے ہوئے دائیں ہاتھ میں بریٹا تھام لیا تھا۔ بیرٹ ایم 107 یوں بھی میں نے پیٹھ پر لاد دی ہوئی تھی۔

اس نالے کا اختتام ایک چوڑے نالے میں ہوا تھا۔ اگلے دو گھنٹے ہم اسی نالے میں چلتے رہے اس دوران دو تین آبادیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے سفر کا اختتام درختوں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے اکیلے مکان پر ہوا جو

کہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔دروازے پر جھولتے تالے نے ہمیں مکان کے خالی ہونے کا مژدہ سنایا۔

پلوشہ نے کہا۔’’میرا خیال ہے یہی جگہ مناسب ہے۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘میں نے پستول کو نال سے پکڑ کر دستے سے تالے کو ضرب لگائی۔چھوٹا سا تالا فوراً کھل گیا۔اندر داخل ہو کر ہم نے دروازہ اندر سے کنڈی کیا۔ٹارچ کی روشنی پھینک کر میں نے جائزہ لیا۔وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔داخلی دروازے والی جانب چھوڑ کر مکان کے تین اطراف میں دو دو کمرے بنے ہوئے تھے۔مقامی طرز تعمیر کے مطابق چھت پر دو مورچے بھی بنے ہوئے تھے۔کمروں کے سامنے برآمدہ موجود نہیں تھا۔سامنے والے دو کمروں کے دروازوں کو تالے لگے ہوئے تھے،جبکہ باقی کمروں کے دروازے باہر سے کنڈی تھے ان میں تالے لگے ہوئے نہیں تھے۔پلوشہ نے ایک کمرے کا تالا توڑ کر دروازہ کھولا میں نے قریب ہو کر اندر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔کمرے میں بان کی بنی ہوئی تین چارپائیاں دیواروں کے ساتھ ترتیب سے پڑی تھیں۔ایک کونے میں بڑی جستی پیٹی رکھی تھی اور اس پر دو ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔تینوں چارپائیوں پر ایک ایک تکیہ رکھا ہوا تھا۔کھجور کے پتوں سے بنی دو تین چٹائیاں لپیٹی ہوئی لوہے کی پیٹی پر رکھی تھیں۔چند استعمال کے برتن بھی ایک کونے میں دھرے تھے۔کمرے کا جائزہ لے کر ہم نے دوسرے کمرے کا تالا توڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔لوہے کی بڑی پیٹی میں ہمیں بستر رکھے ہوئے بھی مل گئے تھے۔پیٹی کے اوپر رکھے ٹرنکوں میں زنانہ و مردانہ ملبوسات بھرے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے گھر والے عارضی طور پر کہیں گئے ہوں۔اس کمرے کا دروازہ بھی اندر سے کنڈی کر کے ہم نے دو بستر چارپائیوں پر بچھائے اور لیٹ گئے بریٹا پستول میں نے تکیے کے نیچے ہی رکھ دیا تھا۔یوں بھی رات کے وقت کسی کے وہاں آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔قبیل خان کے آدمی بھی اتنی سرعت سے ہمارے پیچھے وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔میں نے سوچ لیا تھا کہ اگلی صبح ڈی بلاک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔پلوشہ کا کام اب ختم ہو چکا تھا یقیناً وہ خدا حافظ کرنے میں تاخیر نہ کرتی۔اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا تھا۔

اوپر لینے کے لیے ہمیں دو ہلکے کمبل جستی پیٹی سے مل گئے تھے۔تھکن کی وجہ سے میں زیادہ دیر تک سوچوں کا کھیل جاری نہیں رکھ سکا تھا۔صبح میری آنکھ پلوشہ کے چارپائی سے اٹھنے پر ہوئی وہ شاید بیت الخلا کی تلاش میں باہر جا رہی تھی۔میں لیٹا رہا۔اس کی واپسی کافی دیر بعد ہوئی تھی۔لیکن اس کے ایک ہاتھ میں پراٹھوں کا چھابہ اور

دوسرے ہاتھ میں پکڑی کیتلی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

"یہاں باورچی خانہ موجود ہے تھوڑا بہت سامان بھی پڑا تھا بس ایک دو تالے توڑنے پڑے۔" میری آنکھوں میں سوالیہ حیرانی دیکھتے ہوئے اس نے فوراً وضاحت کر دی تھی۔

میں نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے تھیلے سے پانی کی بوتل نکالی اور کمرے سے باہر جا کر پانی کے چھینٹے منھ پر مارنے لگا۔ منھ دھو کر میں اندر آ گیا۔ وہ میری ہی منتظر تھی۔ ہم خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ پلوشہ خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی خاموشی میرے لیے حیران کن تھی لیکن میں نے اسے چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ دودھ نہ ہونے وجہ سے اس نے قہوہ بنایا تھا۔

قہوہ پی کر اس نے میری جانب دیکھے بغیر آہستہ سے پوچھا۔ "تو اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا ہونا ہے۔ یہاں سے میں ڈی بلاک کا رخ کرتا ہوں اور تم پہنچو انگور اڈے۔ اب یوں بھی اپنا کام مکمل ہو گیا ہے۔"

"کیا......؟" مجھے اس کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار ابھرتے نظر آئے۔

اس کا غصہ میرے لیے حیران کن تھا۔ "اس میں حیران ہونے یا غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟" میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

"تم ایک بزدل، کم ہمت اور بے وقوف شخص ہو۔ مجھے تمھیں قتل کرنے کا ارادہ تبدیل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یقیناً ماہین نے بالکل ٹھیک کیا تھا تمھارے ساتھ۔ تم ہو ہی اس قابل۔" وہ بھپرتے ہوئے بولی۔

"تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ گو اس کی گفتگو کا سر پیر ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر ایک دم مجھے اس کی بے سروپا باتوں میں چھپا مکمل شکوہ نظر آنے لگا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اور اس کے ساتھ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ میں اسے خود روکوں۔ مگر اب میں کوئی نیا زخم کھانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ جتنی بھی باصلاحیت ہوتی، جتنی بھی خوب صورت، چنچل اور شوخ ہوتی میرے لیے عورت ذات تھی۔ ایک ایسی صنف جس سے مجھے ہمیشہ دکھ، درد اور دھوکا ہی ملا تھا۔

"اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ بزدل، احمق۔ سڑتے رہو اکیلے، بھاڑ میں جاؤ، میں تھوکتی بھی نہیں ہوں تم پر، اتنے

یوسف ثانی نہیں ہو کہ میں تمھارے پیچھے بھاگتی پھروں۔شکل دیکھی ہے اپنی؟......اتنے نخرے کرتے ہو۔'' ایک ایک لفظ چبا کر کہتے ہوئے وہ مڑی چارپائی پر پڑی اپنی کلاشن کوف اٹھائی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی ۔دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک مرتبہ پھر رکی اور میرے جانب مڑتے ہوئے نیفے میں اڑسا گلاک نکال کر زہر خند لہجے میں بولی۔

''اپنا کھلونا بھی پاس رکھو اور یہ پیسے بھی لے لو کہیں بعد میں پچھتاتے نہ رہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے پانچ پانچ ہزار والے چند نوٹ اور گلاک نائینٹین میری جانب اچھال دیے۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔میں جانتا تھا وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی،میرے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی تھی،مجھے سمیٹنا چاہتی تھی،عورت ذات کے بارے میرے دل میں جو بغض اور کینہ بھرا تھا اسے ختم کرنا چاہتی تھی۔لیکن مجھ میں اب اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ دل پر کوئی تازہ گھاؤ برداشت کر سکتا۔حالانکہ وہ کئی بار پہلے بھی اشارے،کنائے میں مجھے اپنی پسندیدگی باور کرا چکی تھی،لیکن آج تو اس نے سب کچھ کھل کر کہہ دیا تھا۔

کمرے سے نکلتے ہی وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی تھی کہ داخلی دروازہ اس کمرے سے نظر نہیں آتا تھا۔اس کے باہر جاتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہو۔صبح کے آٹھ نو بجے مجھے تاریکی محسوس ہونے لگی تھی۔اچانک مجھے اپنی سرگوشی سنائی دی۔

''اب بھی وقت ہے اسے روک لو۔'' مگر میں اس تنبیہہ پر عمل نہ کر سکا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔لمحے گھڑیوں میں بیتے اور میں اسے نہ روکنے کے فیصلے پر پچھتانے لگا۔یہ سوچتے ہوئے کہ پلوشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہے مجھے سانس لینا دشوار لگنے لگا تھا۔

''میں اب بھی اس کے پیچھے جا کر اسے واپس لا سکتا ہوں۔'' میں نے خود کو تسلی دی۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روح فرسا خیال میرے دماغ میں گونجا کہ وہ نہ جانے کس سمت کو گئی تھی اور پھر میرے پاس اس کے گھر کا پتا موجود نہیں تھا۔انگور اڈے میں وہ اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی،لیکن نہ تو مجھے اس کے ماموں کا نام معلوم تھا اور نہ اس کے گھر کا پتا معلوم تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب وہاں سے بھی کہیں چلی جاتی اور پھر وزیرستان میں ایک لڑکی

کوتلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاشنے سے بھی مشکل تھا۔ یوں بھی عورتیں عموماً گھر میں رہتی ہیں ۔پردے کی بھی اچھی خاصی پابندی کی جاتی ہے۔اس نے اپنے دشمن کوٹھکانے لگا دیا تھا اب یقیناً اس کی والدہ اور ماموں وغیرہ اس کے لڑکوں کی طرح گھومنے پر پابندی عائد کردیتے۔وہ خود بھی اپنی صنف سے بھاگ تو نہیں سکتی تھی۔پہلے تو مجبوری کی وجہ سے اس نے لڑکے کا بھیس بھرا تھا اب تو اسے ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔سب سے بڑھ کر وہ عورت کے روپ میں قبیل خان کے آدمیوں سے چھپ سکتی تھی۔پلوخان کو تلاش کرنے والے کب کسی پلوشہ کا برقع الٹنے کا سوچ سکتے تھے۔مجھے لگا میں موقع گنوا چکا ہوں بہ قول شاعر

میں خود تھا اپنی جان کے پیچھے پڑا ہوا
میرا شمار بھی تو میرے دشمنوں میں تھا

''اس کے پاس آئی کام بھی تو تھا۔'' اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں اچھل پڑا۔میں فوراً چارپائی پر پڑے تھیلے کی جانب لپکا اور تھیلے کو چارپائی پر الٹ دیا۔اندر سے برآمد ہونے والے دونوں آئی کام میرا منھ چڑا رہے تھے۔

اسی وقت میری نظر اس کے فالتو لباس پر پڑی جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔اگلے ہی لمحے اس کی کالی قمیص میرے ہاتھوں میں تھی۔اسے چہرے سے لگاتے ہوئے میں نے ایک گہرا سانس لیا پلوشہ کے بدن کی مہک میرے رگ وپے میں اترتی چلی گئی۔قمیص کو بازوؤں میں بھینچتے ہوئے میں اپنی چارپائی کے پاس آیا اور نڈھال انداز میں لیٹتے ہوئے میں نے وہ قمیص ہونٹوں سے لگا کر چہرے پر رکھ لی تھی۔

''تم ایک بزدل، کم ہمت اور بے وقوف شخص ہو۔'' میرے دماغ میں اس کا غیض وغضب سے پر لہجہ گونجا ۔اور مجھے اس کے الفاظ پر یقین آگیا۔واقعی میں ایسا ہی تو تھا۔اگر کم ہمت نہ ہوتا تو اسے کیوں کر جانے دیتا ۔خاص کر جب اس نے اتنے غصے کا اظہار کر ہی دیا تھا اس کے بعد تو اسے روکنا میرا حق بنتا تھا۔لیکن میں خود میں حوصلہ پیدا نہیں کر سکا تھا۔میری یہ سوچ ہی غلط تھی کہ ہر عورت دھوکے باز ہوتی ہے۔مجھے دھوکا تو صرف ماہین نے دیا تھا رومانہ بے چاری نے تو فقط اپنی شادی کی بات مجھ سے چھپائی تھی اور ایسا اس نے میری محبت میں ڈوب کر کیا تھا نہ کہ مجھے دھوکا دینے کی غرض سے۔باقی جینفر تھی تو اس کا مسئلہ ہی علاحدہ تھا۔اپنے ملک کے لیے

اسے اتنا جھوٹ تو بولنا ہی چاہیے تھا۔ جانے میں کتنی دیر خود کو کوستا رہا۔ میرے سارے نظریات اور سوچوں پر پلوشہ کے جانے سے پانی پھیر گیا تھا۔ دل کی ایک ہی رٹ تھی ''وہ مجھے چاہیے اور بس چاہیے۔''

مجھے وہاں سے واپس جانا چاہیے تھا۔ اب وہاں رہنا مناسب نہیں تھا لیکن مجھ میں طاقت ہی ختم ہو گئی تھی ۔یوں لگ رہا تھا جیسے پلوشہ نہ گئی ہو میرے جسم کی طاقت کہیں چلی گئی ہو۔

کافی دیر ہو گئی میں اسی طرح لیٹا رہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں داخل ہوا ہو۔ میں نے ایک دم پلوشہ کی قمیص چہرے سے ہٹائی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

''کیا یہ خواب ہے؟'' میرے ذہن میں پیدا ہونے والا سوال فطرتی تھا۔ جواب جاننے کے لیے میرے چٹکی کاٹنے سے پہلے اس کی شوخ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''میں اپنے کپڑے یہاں بھول گئی تھی وہی لینے آئی ہوں۔'' اس نے میرے ہاتھوں میں پکڑی قمیص کی جانب اشارہ کیا۔ مجھ پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

''وہ......میں......'' مجھ سے کوئی بات نہیں بن پائی تھی۔

''ویسے تنہائی میں کسی نامحرم لڑکی کی قمیص کو گلے لگانے اور چومنے والے شخص کو شریعت کیا سزا سناتی ہے؟ میرا خیال ہے تمھیں قتل کرنے کا ارادہ دوبارہ کر لینا چاہیے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر شوخ مسکراہٹ سے پوچھا ۔اور میں نے نادم انداز میں سر جھکا لیا، نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں سے پھسلا ''قتل کے ارادے کی ضرورت ہی کیا ہے، تم نہ لوٹتیں میں خود بہ خود مر جاتا۔''

''اچھا قمیص والی سامنے کھڑی ہے، اب تو اس بے چاری قمیص کی جان چھوڑ دو۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ ایک دم میں نے قمیص تکیے پر پھینکی اور قمیص والی سے وہی سلوک کرنا شروع کر دیا جو میں اس کی قمیص کے ساتھ کر رہا تھا۔ بہت سی دیر گزر گئی اور پھر اس کی مسرت بھری آواز نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔

''ویسے تم اتنے بزدل بھی نہیں ہو جتنا میں نے سمجھا تھا۔''

''تو تم نے کتنا بزدل سمجھا تھا۔'' اس کا سر گود میں سر رکھ کر میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا ۔سارے اندیشوں اور سارے گمانوں کو میں نے پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جو چند گھنٹے مجھ

پر بیتتے تھے اس کے بعد مجھ میں اتنی ہمت باقی نہیں بچی تھی کہ اس کے سحر انگیز وجود سے نظریں چرا سکتا۔

"بڑا باتیں کرنا آ گیا ہے۔" اس نے لیٹے لیٹے نظریں اوپر اٹھائیں۔

"پہلے گونگا تھا کیا؟...... باتیں کرنا آ گیا ہے۔" میں نے زبان نکال کر اسے چڑایا۔

"تو میرے جانے کے بعد تم سر پکڑ کر کیوں بیٹھ گئے تھے۔ اور اگر یونھی بیٹھنا تھا تو جانے کیوں دیا تھا؟"

"تمھیں کیسے پتا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"تو میں یہیں پر تو تھی، کافی دیر تم پر نظر رکھے رہی۔ جونھی تم قمیص اٹھا کر کچھ زیادہ ہی غمگین ہونے لگے تبھی کھانا بنانے لگی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب تم اپنی محبوبہ کی قمیص کے ساتھ ہی غم غلط کرتے رہو گے۔" اس نے یوں شرارتی انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

زیرِ لب مسکراتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "محبوبہ کون؟"

"وہی، جسے گود میں لٹایا ہوا ہے۔" اس نے ناز بھرے انداز میں جواب دیا۔

"میں نے سوچا تم چلی گئی ہو۔"

"تم سے دور کیسے رہ پاتی۔"

اس نے یاسیت بھرے لہجے میں ایسا اعتراف کیا کہ میری روح تک سرشار ہو گئی تھی۔

"پلوشہ!...... کبھی دھوکا تو نہیں دو گی نا۔" میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ تھوڑا اوپر کیا۔

"اور اسی خوف میں شاید تم پہلے سے میری گردن توڑنے لگے ہو۔" اس نے سر میری گود میں رکھا ہوا تھا۔ ٹھوڑی اوپر کرنے سے اس کی گردن پیچھے کی طرف ٹیڑھی ہو گئی تھی۔

"نہیں، بس تمھیں چھو کر یقین کر رہا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔"

"میرا خیال ہے تمھیں کچھ زیادہ ہی بھوک لگ رہی ہے جو یوں الٹی سیدھی بکواس شروع کر دی۔" میری گود سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے منھ بنایا۔ "میں کھانا لاتی ہوں۔"

"نہیں، یونھی لیٹی رہو۔" میں نے دوبارہ اس کا سر گود میں رکھ دیا۔

"معلوم تو ہے نا کہ میری ماں نے پچاس لاکھ لے کر ہی میرا رشتا دینا ہے۔"

میں اس کے چہرے پر جھکتا ہوا بولا۔ ’’میں پچاس لاکھ پورے کرنے کے لیے اپنی زمین جائیداد گھر بار سب کچھ بیچ دوں گا لیکن تمھاری امی جان کا مطالبہ ضرور پورا کروں گا۔‘‘

’’ہا...... ہا...... ہا۔‘‘ وہ خوب صورت انداز میں مسکرائی۔ ’’امی جان کو اگر میرے پچاس روپے بھی مل گئے تو اس نے نہ نہیں کرنی۔‘‘

’’اب تم نے بکواس شروع کر دی ہے۔‘‘ میں مصنوعی غصے سے بولا۔

’’بکواس نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔ اور آپ پہلے مرد ہیں جس کی آنکھوں میں مجھے اتنی چاہت اور محبت نظر آئی ہے۔ اگر امی جان نہ مانیں تو میں آپ کے ساتھ بھاگنے کو بھی تیار ہوں۔‘‘

’’بھاگنے کی بچی، میں تم سے آپ کب ہو گیا؟‘‘

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ’’پہلے دن سے تھے، بس کہنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ جانتے ہو جس وقت آپ نے غار میں میری پٹائی کی تھی اس وقت مجھے آپ سے اتنی زیادہ نفرت محسوس ہوئی تھی کہ میرا بس چلتا تو آپ کو اسی وقت قتل کر دیتی۔ لیکن بعد میں جب آپ سردار بھائی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ میں آپ کو کتنی معصوم اور پیاری لگی تھی۔ اس وقت میرے دل میں ایک دم آپ کی چاہت بھر گئی۔ اسی وقت میں نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ آپ ہی کو اپناؤں گی چاہے اس کے لیے مجھے کتنی کوشش ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ بعد میں آپ کی آنکھوں سے چھلکنے والی چاہت اور محبت نے مجھے یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ آپ کا بیزاری ظاہر کرنا اور مجھ سے جان چھڑانا بس خود کو دھوکا دینے کے لیے ہے ورنہ آپ بھی مجھے پہلے دن ہی سے چاہنے لگے تھے۔ آپ کی وجہ سے پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں لڑکی ہوں اور اس قابل ہوں کہ مجھے کوئی چاہے، پیار کرے اور مجھے دیکھ کر اسے اپنے وہ محبوب یاد آ جائیں جنھیں پانے کی حسرت وہ دل میں رکھتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے فقط گندی نگاہیں ہی میری قسمت رہی ہیں۔ یا پھر مجاہدین کیمپ کے اساتذہ تھے جو مجھے بیٹا سمجھ کر باپ جیسی شفقت سے نوازتے تھے۔‘‘

’’اچھا اب سہ پہر ہونے کو ہے کیا اگلی شب بھی یہیں قیام کا ارادہ ہے؟‘‘

اس نے چاہت سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔ ’’میرا دل تو چاہتا ہے تمام عمر آپ کے ساتھ یہیں بتا دوں۔‘‘

”تم تو ہو ہی بے وقوف۔“میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی ریشمی زلفوں میں انگلیاں پھیریں۔

”پتا ہے راجو!......وزیرستان میں عورت کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔باپ کسی بھیڑ بکری کی طرح اس کا سودا کرتا ہے۔نہ تو شادی کے وقت عورت کی مرضی دریافت کی جاتی ہے اور نہ اس کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔بلکہ اس معاملے میں کوئی بھی لڑکی زبان کھولنے کی مجاز نہیں ہوتی۔اصولاً تو عورت کی ذمہ داری گھر کے کام سنبھالنا ہوتے ہیں مگر یہاں جنگل سے لکڑیاں لانا، کھیتی باڑی کرنا عورت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔یہاں مرد کا کام صرف جھوٹی غیرت دکھانا، بیٹی کی تعلیم پر پابندی لگانا، جوان ہونے پر اس کا سودا کر کے پیسے کھرے کرنا ہوتا ہے۔خاص کر تعلیم تو عورت کے لیے شجر ممنوعہ ہے۔مجھے بھی کسی وجہ سے پڑھنے کا موقع ملا ورنہ آج میں بھی سپوگمائے باجی کی طرح ان پڑھ ہوتی۔اور سچ کہوں تو اگر آپ مجھے نہ ملتے تب بھی میں نے وزیرستان میں شادی نہیں کرنا تھی۔“

”تو کیا، تم جیسی لڑکی کو پاکستان میں رشتوں کی کوئی کمی ہے؟ایک چھوڑ لاکھوں مرد تمھیں اپنانے پر تیار ہو جاتے۔“

”ہاں، مگر ان میں کوئی بھی راجو تو نہ ہوتا نا۔“

”تو مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔اگر کسی قابل ہوتا تو بار بار یوں نہ دھتکارا جاتا۔“

”دھتکارنے والیاں بے وقوف اور بد قسمت تھیں۔اپنی اہمیت مجھ سے پوچھیں۔“

”پتا نہیں وہ بد قسمت تھیں یا میں۔“

”وہ بد قسمت تھیں......کیونکہ آپ کو تو مجھ جیسی پیاری لڑکی مل گئی ہے نا۔“اس نے شرارتی لہجے میں قہقہہ لگایا۔

”اس میں شک ہی کیا ہے۔“میں نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔یقیناً وہ بہت قیمتی ساتھی تھی۔

”اچھا مجھے اپنی کہانی تفصیل سے سنائیں نا۔“

”پھر کبھی سہی۔فی الحال تم کھانا لے آؤ تاکہ کھا کر نکلیں۔“

وہ میری گود سے سر اٹھاتے ہوئے بولی۔”کھانا تو میں لے آتی ہوں، مگر آج رات یہیں گزاریں گے۔“

"پلوشے یار!......سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ مسکراتے ہوئے شوخی بھرے لہجے میں بولی۔"سچ کہو، کبھی پہلے بھی آپ کی بات مانی ہے۔"

اس کا انداز دیکھتے ہوئے میں بے بسی سے مسکرا دیا تھا۔وہ بھی ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ سجائے باہر نکل گئی۔زندگی ایک عجیب ڈگر پر آگئی تھی۔کہاں تو میں نے ماہین کی بے وفائی اور رومانہ کے جھوٹ کے بعد عورت ذات پر اعتبار نہ کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا اور کہاں پلوشہ کے بغیر ایک لمحہ گزارنا کارِ دار لگ رہا تھا۔وہ پہلی نظر کے ساتھ ہی میرے دل میں اتر گئی تھی مگر میں نے خود کو دھوکے میں مبتلا کیے رکھا۔اور اب ایک دم اس کی چاہت کھل کر سامنے آگئی تھی بلکہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔مجھے یقین تھا کہ ابو جان اور پھوپھو جان نے بھی اس رشتے پر خوشی سے پھولے نہیں سمانے تھے۔میرے لیے ایسی دلھن تو شاید وہ ساری زندگی تلاش نہ کر پاتے۔

میں پلوشہ کو تلہ گنگ بجھوانے کی بابت سوچنے لگا۔اب اسے اپنے ساتھ پھرانا بے وقوفی تھی۔لیکن اس بارے سب سے بڑی رکاوٹ خود پلوشہ کی ذات تھی۔میں جانتا تھا کہ اس نے مشکل ہی سے راضی ہونا تھا۔البتہ فی الفور شادی کا لالچ دے کر میں اسے تلہ گنگ لے جا سکتا تھا۔اس کے بعد شاید وہ ہٹ دھرم مان جاتی۔سب سے بڑھ کر میں خود بھی مزید اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔اسے زندگی میں شامل کرنا مجھے اپنی سب سے بڑی خواہش لگ رہی تھی۔

پلوشہ کی واپسی روٹی کے چھابے اور سالن کے کٹورے کے ساتھ ہوئی تھی۔

"ارے آپ نے ابھی تک پیسے نہیں اٹھائے۔"اس نے زمین پر بکھرے نوٹوں کو دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔اس وقت میری نظر بھی ان نوٹوں پر پڑی جو وہاں سے جاتے ہوئے وہ غصے میں پھینک کر گئی تھی۔

میں نے صاف گوئی سے کہا۔"مجھے نوٹ اٹھانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔"

"واپس آ تو گئی ہوں، ہوش بھی واپس آجانے چاہیے تھے۔"میرے سامنے کھانے کے برتن دھر کر وہ زمین پر بکھرے نوٹ سمیٹنے لگی۔گلاک بھی اٹھا کر اس نے چارپائی پر رکھ دیا تھا۔

"پہلے تمھاری واپسی کی خوشی ہضم تو کر لوں۔"

"اتنی پیاری تھی تو جانے ہی کیوں دیا تھا۔" وہ میرے ہمراہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ ٹماٹر پیاز کے بغیر صرف ابلی ہوئی دال جس میں تھوڑا سا گھی سرخ مرچیں اور نمک شامل تھا، لیکن اس وقت وہ دال بھی بہت لذیز لگ رہی تھی۔

میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ "جانے کہاں دیا، مجھے روکنے کا موقع دیے بغیر تم بھاگ گئی تھیں۔"

"جھوٹا۔" اس نے خفگی بھری نگاہیں میری جانب اٹھائیں اور مجھے مسکراتے دیکھ کر دل آویز تبسم ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کھانا کھانے لگی۔ کھانا کھا کر اس نے پھر وہیں رات گزارنے پر اصرار کیا، مجبوراً مجھے ماننا پڑا۔ رات کو اس نے اپنی چارپائی میری چارپائی سے جوڑ کر لگا دی۔

"یہ کیا؟" میں ہلکا سا معترض ہوا۔

"آج رات آپ سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ پتا نہیں کب سے میرے کان آپ کی زبان سے آپ کی کہانی سننے کو ترس رہے ہیں۔"

"تو کیا چارپائی جہاں پہلے پڑی تھی، وہاں تک میری آواز نہ جاتی۔"

"راجو!......دماغ خراب نہ کریں۔ جب آپ کو معلوم ہے کہ ہونا وہی ہے جو میں کہہ رہی ہوں پھر اپنی توانائی ضائع کرنے کا فائدہ۔"

میں کھسیانا ہو کر خاموش ہو گیا۔

رات گئے تک وہ میری داستانِ حیات سنتی رہی۔ میں نے اپنی زندگی میں آنے والی تینوں لڑکیوں کی کہانی بلا کسی کمی بیشی کے اس کے سامنے دہرا دی تھی۔ وہ خاموشی اور محویت سے سب کچھ سنتی رہی۔ البتہ ماہین کی بے وفائی والے ذکر پر اس نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کی آنکھ نو دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ اٹھتے ساتھ وہ ناشتا بنانے چلی گئی۔ میں نے بھی اٹھ کر بیت الخلا کا رخ کیا۔ اور پھر واپس آ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی قہوے کی کیتلی اور پراٹھوں کے چھابے کے ساتھ ہوئی تھی۔

"راجو جی!......اپنا دانہ پانی یہاں ختم ہو چکا ہے۔ بہ مشکل دو پراٹھے ہی بنے ہیں، آٹا ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کل ہی جانے پر تیار تھا۔“

”کوئی بات نہیں آج چلے جانا۔“ اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے میرے سامنے پراٹھوں کا چھابہ رکھ دیا۔

”ویسے روٹی بنانا کب سیکھا ہے، جبکہ تم نے لڑکا بن کر زندگی گزاری ہے اور لڑکے یہ کام نہیں کرتے۔“ اس کے بنائے ہوئے خوب صورت پراٹھوں کو دیکھتے ہوئے میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجاہدین کے ٹریننگ کیمپ میں کھانا بنانا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ جب چند دن چھٹی پر جاتی، امی جان بھی اس بات پر زور دیتیں کہ میں روٹی بنانا سیکھ جاؤں کیونکہ میں نے ساری زندگی لڑکوں کے بھیس میں تو نہیں رہنا تھا۔“

اچھا ایسا ہے کہ یہاں سے سیدھا انگور اڈے، تمھارے گھر جائیں گے، تمھاری والدہ اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر تلہ گنگ کا رخ کریں گے۔ وہاں پہنچنے کے اگلے دن ابو جان اور پھوپھو جان تمھاری امی جان سے باقاعدہ رشتا مانگیں گے، تمھارے رواج کے مطابق منھ مانگی رقم ادا کریں گے اور اس سے اگلے دو دن میں ہماری شادی ہو جائے گی۔“

”سچ۔“ اس نے ہاتھ میں تھامی قہوے کی پیالی نیچے رکھتے ہوئے وفورِ جذبات سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ قوس قزح کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ اتنی خوش وہ مجھے زندگی میں پہلی بار نظر آئی تھی۔ اگر درمیان میں کھانے کے برتن نہ ہوتے تو یقیناً وہ مجھ سے لپٹ گئی ہوتی۔

”بالکل سچ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ واپسی پر تم میرے ساتھ آنے کی ضد نہیں کرو گی۔“

”تو یہاں آپ کی حفاظت کون کرے گا، کون آپ کا خیال رکھے گا؟“ اس کے لہجے میں حقیقی پریشانی کی جھلک تھی۔

اس کے انداز نے میرے دل میں اس کی چاہت کو مزید بڑھاوا دیا تھا۔ کوئی تو تھا جسے میری پروا اور فکر تھی۔ میں نے جواب دینے کے لیے منھ کھولا تو یہ چاہت میرے لہجے میں شامل تھی۔ ”پگلی! اس سے پہلے بھی تو میری حفاظت میرا اللہ پاک کرتا تھا اب بھی وہی کرے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اسباب بھی تو اسی رب عظیم نے بنائے ہیں۔“

”اللہ پاک نے مرد کو محافظ بنایا ہے نہ کہ عورت کو۔ اور تمھاری یہاں موجودی مجھے کتنا پریشان کرتی ہے یہ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ اگر تم کسی مقام پر حفاظت کے ساتھ موجود ہو گی تو میں تسلی سے اپنا کام کر سکوں گا۔“

وہ شرارت سے بولی۔ ”ہاں جیسے میرے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بناتے وقت آپ کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔“

”بے شک۔“ میں نے کھلے دل سے اعتراف کیا کہ وہ بات شبے سے بالاتر تھی۔

قہوے کی پیالیاں اور چھابہ دوسری چارپائی پر رکھ کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”اچھا میری تعریف کرو نا۔“ اس نے لاڈ بھرے انداز میں کہا۔ اس کے معصومانہ انداز پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

”یہ اچھی زبردستی ہے کہ خود منہ سے کہہ کر اپنی تعریف کرائی جائے۔“

”راجو!...... بتاؤ نا میری آنکھیں کیسی ہیں، گال کیسے ہیں ہونٹ اور بال کیسے ہیں، میں ہنستے ہوئے کیسی لگتی ہوں؟ بتاؤ نا راجو...... کبھی تو میرے سامنے بھی میرے حسن کی تعریف کرو۔“

میں اس کے چہرے پر جھکتا ہوا بولا۔ ”کیا میری آنکھیں تمھیں نہیں بتاتیں کہ تم کیسی ہو؟“

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”زبان بھی تو گونگی نہیں ہے نا۔“

میں جھٹ سے بولا۔ ”تمھارے سامنے آ کر گونگی ہو جاتی ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ میں خوب صورت ہوں یا رومانہ۔“ میں نے چونکہ رومانہ کے حسن کی بہت زیادہ تعریف کی تھی اس لیے عورت کی ازلی سوچ کے مطابق اب تک اس کے دماغ میں وہی سوچ گھسی تھی۔

”رومانہ۔“ میں بہ ظاہر سنجیدگی سے بولا۔

”کیا۔“ اس نے خفگی بھرے انداز میں کہتے ہوئے اپنا سر میری گود سے اٹھا لیا۔

میں نے اس کے چھوٹے چھوٹے بال مٹھی میں بھرتے ہوئے اسے دوبارہ واپس لٹایا۔ ”تم اپنا سوال صحیح طریقے سے کرتیں تو جواب بھی منشا کے مطابق ملتا۔“

”تو کیا کہتی؟“اس کی آواز میں حقیقی خفگی شامل تھی۔
”یہ پوچھتیں کہ ساری دنیا میں مجھے کون پیارا ہے۔یا یہ کہ مجھے رومانہ خوب صورت لگتی ہے یا تم۔“
”بس بس رہنے دیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔“اس نے منہ بسورا۔
”جو بھی قسم کہو میں کھانے کو تیار ہوں۔“میں نے اس کی سرخ ہوتی ستواں ناک کو نرمی سے مروڑا۔
”اسی بارے کہ آپ کی زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں سب سے بدصورت لڑکی میں ہوں، ہیں نا؟“وہ سچ مچ سخت خفا تھی۔
”خدا کی قسم ان میں کوئی بھی تم سے زیادہ تو کیا تمھاری جتنی بھی پیاری نہیں تھی۔“
”کوئی ضرورت نہیں ہے جھوٹی قسمیں کھانے کی سمجھے۔“اس کا غصہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
میں نے خاموش ہوتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا لی۔جب تک اس کا غصہ نہ اترتا اس نے یونھی جلی کٹی سناتے رہنا تھا۔
”اب خاموش کیوں ہو گئے ہیں۔ مجھے منائیں نا......معذرت کریں مجھے۔سوری، بلکہ آئی ایم ویری ویری سوری کہیں۔“میری خاموشی زیادہ دیر اس سے برداشت نہیں ہو سکی تھی۔
میں نے فوراً کہا۔”معافی چاہتا ہوں میری جان، میری گڑیا، میری چندا!......میری توبہ جو آیندہ ایسی بکواس کی۔“
میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے وہ جذباتی لہجے میں بولی۔”خبردار جو آئندہ مجھ سے زیادہ کسی اور کو پیارا کہا، اللہ پاک کی قسم خودکشی کر لوں گی۔“
”پہلے تو تم کچھ اور کہا کرتی تھیں۔“
اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔”ہاں پہلے وہ بڑی دھمکی تھی اور اب یہ بڑی دھمکی ہے۔“
”بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو۔“
”پہلے سے تھی۔اسی لیے تو آپ کو جیون ساتھی چنا ہے۔“اس نے یوں معصومانہ انداز میں کہا کہ میں بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

’’اب چلنے کی تیاری کریں، اپنی لاڈلی کو گود میں لٹا کر آپ کو کچھ زیادہ ہی ہنسی آ رہی ہے۔‘‘

’’میری لاڈلی تو تم ہو اور وعدہ کرتا ہوں ہمیشہ رہو گی۔‘‘

’’اس وعدے سے پھر نہ جانا اور میری غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف کرتے رہنا۔‘‘

میں نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔ ’’بعض اوقات تم اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگ جاتی ہو جیسے تم میں کوئی بوڑھی روح چھپی ہو۔‘‘

’’یہ بڑی بڑی باتیں نہیں ہیں راجو!...... یہ اس خوف کا اظہار ہے جو ہر لڑکی کے دل میں اپنے محبوب کے چھن جانے کے متعلق چھپا ہوتا ہے۔‘‘

’’تو کیا لڑکوں کو اپنے محبوب کے چھننے کا خوف نہیں ہوتا؟‘‘

’’بالکل نہیں ہوتا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے شرارت بھرا قہقہہ لگایا۔ ’’اور اس کی زندہ مثال آپ ہیں کہ تین لڑکیوں کے جانے کے بعد چوتھی کو پھانس لیا ہے۔‘‘

’’مار کھاؤ گی پلوشے۔‘‘ میں نے اس کے دونوں کانوں سے پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔

’’یہ شوق تلہ گنگ جا کر پورا کرنا۔‘‘ میری گود سے اٹھ کر وہ پاؤں میں سپورٹس شوز ڈالنے لگی۔ میں بھی اٹھ گیا کہ گیارہ بجنے والے تھے اور میں چاہتا تھا کہ ہم شام تک میں انگور اڈے پہنچ جائیں۔ فی الحال تو ہمیں یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ ہم انگور اڈے سے کتنا دور تھے۔

ہم سامان سمیٹ ہی نہیں پائے تھے کہ داخلی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

پلوشہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ’’شاید مالک مکان لوٹ آیا ہے۔‘‘

میں نے اطمینان سے کہا۔ ’’کوئی بات نہیں۔ اسے معقول معاوضہ دے دیں گے۔‘‘

’’آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں نے نمک کے ڈبے میں پانچ ہزار روپے رکھ دیے ہیں۔‘‘

’’بہت اچھا کیا۔‘‘ میں تعریفی انداز میں کہا۔ اسی وقت ایک مرتبہ پھر زوردار دستک ہوئی۔ اور پھر دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جانے لگا۔

’’کہیں مالک مکان کے علاوہ یہ کوئی اور نہ ہو۔‘‘ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔'' پلوشہ نے لوہے کی پیٹی پر پڑا ٹرنک کھول کر اس میں سے سرخ رنگ کا زنانہ گھگرا نکالا اور اپنی قمیص کے اوپر پہن لیا۔ اس لمبے گھگرے نے اسے ٹخنوں تک ڈھانپ لیا تھا۔ ایک دم اس کے حسن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں بہ مشکل خود کو اس سے لپٹنے سے باز رکھ سکا تھا۔

میرے احساسات سے بے نیاز اس نے سرخ رنگ کا بڑا سا دوپٹا اوڑھا جس میں اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

''کسی لگ رہی ہوں۔'' وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔ لیکن میری آنکھوں سے ظاہر ہونے والے تاثرات دیکھتے ہی اس نے شرما کر سر جھکا لیا تھا۔

''بے شرم پرائی لڑکیوں کو گھورتا ہے۔'' زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے سائیلنسر لگا گلاک اٹھایا اور بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔ دستک دینے والے اب پشتو میں آوازیں بھی دینے لگے تھے۔

''جی کون؟'' دروازے کے قریب جا کر پلوشہ نے پوچھا۔ دستک کی آواز بند ہوئی اور کسی نے مقامی لہجے میں پوچھا۔ ''گھر میں کوئی مرد نہیں ہے کیا؟''

''نہیں وہ باہر گیا ہوا ہے۔''

''کیا یہاں آج یا کل کوئی اجنبی دیکھا ہے تم لوگوں نے؟''

''نہیں۔'' پلوشہ نے نفی میں جواب دیا۔ اس کا سوال سن کر میرے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد باہر سے آواز آئی۔ ''اچھا دروازہ کھولو ہم نے گھر کی تلاشی لینی ہے۔''

''آپ تھوڑی دیر بعد آ جائیں، اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' پلوشہ نے بناوٹی گھبراہٹ سے کہا۔

''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ہم بس ایک نظر ڈال کر اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں پھر چلے جائیں گے۔''

پلوشہ نے میری جانب دیکھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے دروازہ کھولنے کا کہا اور خود کمرے کا دروازہ بند کر کے کواڑ کی درز سے آنکھ لگا دی۔ بریٹا پستول میں نے ہاتھ میں تھام لیا تھا ذرا سی گڑبڑ پر میں پلوشہ کی مدد کے لیے باہر نکل سکتا تھا۔

پلوشہ دروازے کی کنڈی کھول کر ذرا پیچھے کو ہٹ گئی۔ اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ مکمل طور پر تیار تھی۔

کنڈی کھلتے ہی دو درمیانہ قامت کے مرد اندر گھس آئے۔دونوں نے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامی ہوئی تھیں۔ایک ذرا بھاری تن وتوش کا تھا جبکہ دوسرا چھریرا بدن رکھتا تھا۔موٹے نے پلوشہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمھارا گھر والا کس وقت لوٹے گا۔''

اس نے گھریلو خاتون کے انداز میں کہا۔''بس تھوڑی دیر تک آجائے گا۔''

اس دوران دوسرے آدمی نے ایک سرسری نظر صحن میں دوڑائی۔اور وہ بھی پلوشہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔مجھے محسوس ہوا کہ ان دونوں کی دلچسپی تلاشی لینے کے بہ بجائے پلوشہ کی ذات میں تھی۔

موٹے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ سر ہلاتا ہوا دروازہ کنڈی کرنے لگا۔

''یی......یہ آپ دروازہ کیوں کنڈی کر رہے ہیں؟''پلوشہ نے گھبرائے انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں میری جان،بس تمھارے کپڑوں کی تلاشی لینا ہے کہیں تم نے خطرناک ہتھیار نہ چھپایا ہو۔''موٹے نے شیطانی انداز میں کہا،جبکہ اس کا ساتھی بے شرمی سے ہنسنے لگا تھا۔

موٹے نے کلاشن کوف اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''ذرا یہ پکڑو میں اس بلبل کو کپڑوں کی قید سے نجات دلا دوں۔اور مخابرہ بھی آف کر دو''

اس نے موٹے سے کلاشن کوف لے کر کندھے سے لٹکا لی اور آئی کام سیٹ آف کرتے ہوئے بولا۔''یہاں یہ شور کرے گی اندر لے جا کر اس کی تلاشی لیتے ہیں۔''

اور پھر موٹے کے کچھ کہنے سے پہلے پلوشہ نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''یہ صحیح مشورہ دے رہا ہے موٹے ریچھ۔''ان دونوں نے چونک کر پلوشہ کی طرف دیکھا لیکن ان کے کچھ کرنے سے پہلے پلوشہ نے دوپٹے کی آڑ سے دایاں ہاتھ باہر نکال کر بے دریغ تین گولیاں موٹے کے ساتھی کی چھاتی میں ماردیں کیونکہ اسی کے پاس دونوں ہتھیار تھے۔گولی کھا کر وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔پلوشہ نے پستول کا رخ موٹے کی جانب موڑ دیا۔میں بھی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔موٹے کا رنگ خوف کی شدت سے زرد پڑ گیا تھا۔وہ خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

''تو کیا خیال ہے موٹے!......کمرہ ٹھیک رہے گا یا یہیں پر میری تلاشی لوگے۔''

اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”مم...... میں معافی چاہتا ہوں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”تم کسے تلاش کر رہے تھے؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔

”کک...... کسی کو بھی نہیں۔ ہم تو بس یونہی............“ لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے میرا بازو گھوما ۔ ”چٹاخ۔“ کی آواز سے صحن گونج اٹھا تھا۔

”جھوٹ بول کر تم فقط اپنی اذیت بڑھا گے۔“

”ہم سردار قبیل خان کے قاتلوں کی تلاش میں ہیں اور ہم اکیلے نہیں اس سارے علاقے کو ہمارے آدمیوں نے گھیرا ہوا ہے۔“ اس مرتبہ اس نے جھٹ اصل بات اگل دی تھی۔

”اندر چلو۔“ میں نے اسے کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔

”اگر مجھے چھوڑ دو تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ آپ یہاں چھپے ہیں۔“

”اگر تم نہ رہو تب بھی انھیں یہ بات بتانے والا کوئی نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے بریٹا پستول کی نال سے ٹھوکا دیا اور وہ مرے مرے قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ پلوشہ مرنے والے کی تلاشی لینے لگی۔

اندر لے جا کر میں نے موٹے کی قمیص اتروا کر اسی قمیص سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور اسے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس دوران پلوشہ دونوں کلاشن کوفیں اٹھائے اندر گھس آئی ۔میں اس پر توجہ دیے بغیر اس موٹے جس کا نام انعام خان تھا سے سوال و جواب کرنے لگا۔ تھوڑے بہت تشدد اور چھینٹی سے اس نے کافی مفید باتیں بتائی تھیں ۔تمام باتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ قبیل خان کے جانشین جہانداد نے اس سارے علاقے میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے ۔تمام پارٹیاں دو دو اور تین تین افراد کی تعداد پر مشتمل تھیں ۔ ہر پارٹی کے پاس آئی کام سیٹ موجود تھا۔ پرسوں گولی لگنے کے بعد قبیل خان نے جہانداد خان کو بتا دیا تھا اس پر گھات لگانے والوں میں ایک اچھا نشانہ باز موجود ہے، جس کا مطلب یہی تھا کہ گھات لگانے والوں میں ایس ایس یعنی میں شامل تھا۔ جہانداد خود اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچا مگر میری فائرنگ سے ہونے والے نقصان کے بعد اسے مورچہ بند ہونا پڑا۔ ہمارے چلے جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک گولی کے ڈر سے آڑ میں رہے ۔اور پھر جب انھیں یقین ہو گیا کہ ہم وہاں سے چلے گئے ہیں، تبھی وہ ڈرتے ڈرتے آڑ سے

باہر آ گئے۔ وہاں اپنے ساتھیوں میں انھیں دو آدمی زندہ بھی مل گئے تھے گو وہ شدید زخمی تھے۔ نالے میں پڑی قبیل خان کی لاش دیکھ کر جہانداد غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ وہ قبیل خان کا سوتیلا بھائی تھا۔ اور اس کی موت کے بعد قبیلے کا سردار وہی تھا۔ ان کی تینوں گاڑیوں کے دو دو پہیے میں نے بے کار کر دیے تھے۔ اس نے دو گاڑیوں کے فالتو ٹائر لے کر ایک گاڑی کو سفر کے قابل بنایا اور اس میں قبیل خان کی لاش اور دو زخمیوں کو لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ باقی افراد کو اس نے ہمارا پیچھا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اگلے دن قبیل خان کے جنازے کے بعد وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتر آیا۔ مجھے اور پلوشہ کو اس نے پہاڑی پر چڑھتے دیکھ لیا تھا اور اتنا تو اسے معلوم ہو گیا کہ گھات لگانے والے صرف دو آدمی تھے۔ اس سے پہلے ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں قبیل خان کے جن آدمیوں نے ہمیں دیکھا ہوا تھا انھوں نے پہلے سے اپنے ساتھیوں کے سامنے ہمارا حلیہ بیان کیا ہوا تھا۔ اس طرح دو جمع دو چار کی طرح ان کے سامنے ہم دونوں بہ طور قبیل خان کے قاتل ظاہر ہو گئے تھے۔ رستے میں جن آدمیوں نے ہمیں اس طرف آتے دیکھا تھا ان سے انھیں ہمارے جانے کی سمت معلوم ہو گئی تھی۔ اب یہ ہماری بے وقوفی یا سستی تھی کہ ہم نے دو راتیں وہاں گزار دی تھیں جس کی وجہ سے انھیں ہمارے قریب آنے کا موقع مل گیا تھا۔ ورنہ ہم حرکت میں رہتے تو کسی محفوظ جگہ پر پہنچ گئے ہوتے۔

انعام خان سے تفصیل معلوم کرتے ہی میں پلوشہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اس کا کیا کریں؟''

اس نے گلاک پستول کی نال انعام خان کی طرف کرتے ہوئے دو بار ٹریگر دبایا۔

''ٹھک ٹھک۔'' کی آواز کے ساتھ وہ چہرے پر خوف و دہشت کے اثرات سجائے پیچھے کی طرف گر گیا۔ دونوں گولیاں اس کی چھاتی میں لگی تھیں۔

''اس کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں؟'' اسے گولی مار کر وہ اطمینان بھرے انداز میں پوچھنے لگی۔

''اب یہاں سے نکلنا ایک مسئلہ ہوگا۔ ویسے کچھ اندازہ نہیں ہے کہ ہم کس جگہ پر ہیں۔''

نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے چھت پر چڑھ کر جائزہ لے لیتے ہیں شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے تم اوپر چڑھ کر جائزہ لو پھر نکلتے ہیں۔'' وہ یوں بھی زنانہ لباس میں تھی کسی کی نظر اس پر پڑ بھی

جاتی تب بھی کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔

ایک مرتبہ پھر اپنے چہرے کے گرد دوپٹا لپیٹتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔گھر کے ایک کونے میں لکڑی سیڑھی لگی ہوئی تھی اسی کے ذریعے وہ چھت پر چڑھنے لگی۔میں ان کا آئی کام آن کر کے سن گن لینے لگا۔آئی کام آن کرتے ہی مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ایک دوسرے کو اپنی جگہ کے بارے میں بتانے کے ساتھ ساتھ وہ تازہ صورت حال سے بھی آگاہ کر رہے تھے۔چار پانچ سوافراد اس علاقے میں پھیل کر گھر گھر کی تلاشی لے رہے تھے ۔اس کے ساتھ وہ درختوں کے جھنڈ اور غاروں وغیرہ کی چھان بین بھی باریکی سے کر رہے تھے۔

''برے پھنسے ذیشان میاں۔''میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔پلوشہ ابھی تک چھت پر تھی۔میں نے انعام خان کے ساتھی کی لاش بھی گھسیٹ کر اسی کمرے میں پھینکی اور اپنا سامان باہر نکال کر کمرے کے باہر سے وہی ٹوٹا ہوا تالا لٹکا دیا۔اسی اثناء میں پلوشہ بھی نیچے اتر آئی۔

''کیا کچھ پتا چلا۔''میں بے صبری سے مستفسر ہوا۔

''تھوڑا بہت اندازہ تو ہو گیا ہے۔لیکن ارد گرد کافی آدمی گھومتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور کسی بھی لمحے ان دونوں کی طرح کوئی اور بھی یہاں پہنچ سکتا ہے۔''

''میرا خیال ہے نکل چلتے ہیں۔تم انھی کپڑوں میں ٹھیک ہو میں بیرٹ ایم 107 کو چادر میں لپیٹ کر گٹھڑی کے انداز میں اٹھا لیتا ہوں تم اپنی کلاشن کوف دوپٹے کے نیچے چھپا لینا۔

''ٹھیک ہے۔''اس نے کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر اوپر دوپٹا لیتے ہوئے کہا۔''لیکن سنائپر رائفل کی گٹھڑی مجھے اٹھانا پڑے گی کیونکہ مقامی رواج کے مطابق سامان عورتوں نے سر پر اٹھایا ہوتا ہے۔غیرت مند مرد کے پاس اس کی مردانگی کی نشانی فقط ہتھیار رہوتا ہے۔''آخری فقرہ اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''اچھا یہ لو۔''میں نے چادر میں لپٹی ہوئی بیرٹ ایم 107 اس کی جانب بڑھا دی۔

رائفل اور تھیلے کو اکٹھا باندھ کر اس نے مہارت سے سر پر رکھا اور چل پڑی۔میں نے بھی باریک چادر سر پر پگڑی کے انداز میں لپیٹ کر اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

باہر نکل کر میں نے بیرونی دروازے کی کنڈی میں بھی تالا پھنسایا اور ہم درختوں کی آڑ لے کر چل پڑے

۔نالے میں اترنے کے بجائے ہم ڈھلان پر نالے کے متوازی سفر کرنے لگے۔ہماری کوشش تھی کہ درختوں سے باہر نہ نکلیں۔دشمن سے اچانک سامنا ہونے کے تدارک کے لیے میں نے سائیلنسر لگا گلاک اپنے ہاتھ ہی میں رکھا تھا۔بریٹا بھی میرے پاس موجود تھا لیکن اس پر سائیلنسر لگا ہوا نہیں تھا۔البتہ پلوشہ کے پاس قبیل خان سے چھینا ہوا جو قیمتی پستول موجود تھا اس پر بھی سائیلنسر تو لگا ہوا تھا مگر اس کی گولیاں بہت کم تھیں۔

پلوشہ مجھ سے دو تین قدم آگے چل رہی تھی۔یونھی آگے پیچھے ہم گھنٹا بھر چلتے رہے۔اس دوران میں نے آئی کام مسلسل آن رکھا تھا۔اس کے شور کے تدارک کے لیے میں نے ایئرفون کی لیڈ لگا کر کان میں اڑسی ہوئی تھی ۔پچھلے دو تین منٹ سے مسلسل انعام خان اور ثمین خان کو پکارا جا رہا تھا۔ثمین خان یقیناً اس موٹے انعام کے ساتھی کا نام تھا۔

ایک جگہ وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے باہر نکلی اور ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔میں اس سے کچھ پوچھنے ہی لگا تھا کہ اپنا دوپٹا جھاڑی کے کانٹوں سے چھڑانے کے بہانے وہ پیچھے مڑی اور ہلکی سرگوشی میں بولی۔''دو آدمی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ آگے بڑھ گئی۔میں وہیں جھاڑیوں میں دبک گیا۔آئی کام سیٹ آف کر کے میں نے جیب میں ڈالا اور گلاک نائینٹین کو تیاری حالت میں پکڑ لیا۔اسی وقت میرے کانوں میں ایک کرخت آواز پڑی۔''اوئے لڑکی !......کہاں جا رہی ہو؟''

جواباً پلوشے نے لوچ دار آواز میں کہا۔''ڈیرازل جا رہی ہوں۔''اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈیرازل واقعی قریب میں کوئی آبادی موجود تھی یا اس نے یونھی فرضی نام لیا تھا۔

''رستے میں تم نے دو آدمی تو نہیں دیکھے۔''اسی کرخت آواز والے نے دوبارہ پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' کہہ کر وہ آگے چل پڑی۔میں نے احتیاط سے جھاڑی کی اوٹ سے جھانکا۔وہ اطمینان سے آگے بڑھتی جا رہی تھی جبکہ دو مسلح آدمی اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اسے گھور رہے تھے۔پلوشہ کے جھاڑیوں میں روپوش ہوتے ہی ایک مرتبہ پھر وہ آگے بڑھے اور دائیں بائیں نگاہیں دوڑاتے ہوئے مجھ سے بیس پچیس قدم کے فاصلے پر سے گزرتے چلے گئے۔ان کے تھوڑی دور جاتے ہی میں اٹھ کر احتیاط سے آگے بڑھ گیا۔میری نگاہیں اب بھی جانے والوں کی طرف نگران تھیں۔جھکے جھکے انداز میں میں نے پلوشہ کے جانے

کے رستے قدم بڑھائے۔ اسی وقت اچانک جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک کلاشن کوف بردار آدمی برآمد ہوا۔ ہم دونوں اچانک آمنے سامنے ہو گئے تھے۔ اور پھر میں اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس کے کچھ کہنے یا ہتھیار سیدھا کرنے سے پہلے میرے ہاتھ میں موجود گلاک نے چند گرام سیسہ اگل دیا تھا۔ ماتھے میں پیوست ہونے والی گولی چیخنے کا موقع نہیں دیا کرتی۔ وہ انھی جھاڑیوں میں الٹا ہو کر گر گیا۔ وہ شاید رفع حاجت وغیرہ کے لیے اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی وقت تھوڑے فاصلے سے وہی کرخت آواز سنائی دی۔

''کرم خان!......کہاں مر گئے ہو۔'' مگر کرم خان غریب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں وہ آواز سن بھی لیتا تو جواب نہیں دے سکتا تھا۔

میں چلنے کے بجائے بھاگتا ہوا پلوشہ کے پیچھے روانہ ہوا۔ لیکن دو تین قدم لیتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کرم خان کی لاش ملتے ہی اس کے ساتھیوں نے اس علاقے کو گھیرے میں لے لینا تھا۔ اس کے بجائے اگر میں ان دونوں کو بھی ہلاک کر دیتا تو لازماً فی الفور ہونے والے تعاقب سے جان چھڑا سکتا تھا۔ کیونکہ جب تک ان تینوں کی لاشیں دریافت نہ ہوتیں کسی کو ہمارا خیال نہیں آ سکتا تھا۔

یہ سوچتے ہی میں فوراً ان دونوں کے جانے کی سمت دوڑ پڑا۔ وہ سو دو سو گز سے دور نہیں گئے تھے۔ جھکے جھکے انداز میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا میں اس طرف بڑھا۔

ان میں سے ایک نے پھر مقتول کرم خان کو پکارا اور مجھے ان کی جگہ کے بارے اندازہ لگانے میں آسانی ہو گئی۔ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ مجھے چھپ کر ان کے قریب جانے میں مدد دے رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھی کے انتظار میں دو ہموار پتھروں پر بیٹھ گئے تھے۔ البتہ ان کا رخ پیچھے کی طرف ہی تھا۔ اپنے ہتھیار انھوں نے گود میں رکھ لیے تھے۔

میں دم جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکلا۔ ان میں سے ایک اس وقت بوتل سے منھ لگا کر پانی پی رہا تھا۔ دوسرے کو بھی حیرت کا جھٹکا لگا مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے گلاک کی گولی اپنا کام کر چکی تھی۔

''ٹھک۔'' کی آواز اور اپنے ساتھی کے نیچے گر کر ایڑیاں رگڑنے کی آواز سن کر دوسرے نے بوتل ہونٹوں سے ہٹائی۔ اور اس سے پہلے کہ صورت حال اسے واضح ہوتی گلاک کی گولی اسے تمام دنیاوی پریشانیوں سے دور

لے گئی۔ان کے قریب جا کر میں نے باری باری دونوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر جھاڑیوں میں پھینکا تا کہ انھیں آسانی سے تلاش نہ کیا جا سکے اور واپس مڑ کر دوڑ پڑا۔کرم خان نامی آدمی قدرتی طور پر جھاڑیوں میں گرا تھا۔

پلوشہ کے جانے کی سمت مجھے معلوم تھی ۔میں اسی طرف آگے بڑھتا گیا۔مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا ۔تھوڑی دور ہی مجھے وہ تشویش ناک حالت میں کھڑی نظر آ گئی ۔بڑے بڑے خطروں میں میں نے اس کے چہرے پر پریشانی نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت وہ کافی پریشان نظر آ رہی تھی ۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی پریشانی ،برہمی میں تبدیل ہوگئی تھی۔

''کہاں رہ گئے تھے آپ۔معلوم بھی ہے کتنی پریشانی ہو رہی تھی مجھے۔''

''مجبوری تھی یار!......ان خبیثوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا......''میں اس کے پوچھے بغیر اسے تفصیل بتلانے لگا۔

ساری بات سنتے ہی وہ بولی۔''پھر اس طرف چلو۔''سمت تبدیل کرتے ہوئے وہ اوپر چڑھنے لگی۔اس کے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے میں نے آئی کام آن کر کے اس کی لیڈ کان میں لگا لی تھی۔

ایک آدمی اپنی جگہ کے بارے بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔اس کے چپ ہوتے ہی ایک دوسری آواز آئی جو پہلے والوں کو حکم دے رہی تھی کہ۔''انعام خان اور ثمین خان اسی علاقے میں غائب ہوئے ہیں اور اب مخابرے پر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا۔انھیں ڈھونڈو کہ کہاں مرکھپ گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے کمانڈر۔''پہلی والی آواز میں ادب کا عنصر نمایاں تھا۔

اس کے بعد کمانڈر کسی اسفند خان کو پکارنے لگا مگر اسفند کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔دو تین بار۔''اسفند،اسفند۔''کہہ کر اس نے۔شیر دل اور کرم خان کا نام پکارنا شروع کر دیا تھا۔کرم خان کا نام آتے ہی میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے میرے ہاتھوں انجام کو پہنچنے والی پارٹی کو پکار رہا ہے۔

تھوڑی دیر انھیں پکارنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا تھا۔

پلوشہ کے قدموں کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی ۔وہ کسی لومڑی کی طرح پہاڑ کی بلندی سر کرتی تھی۔بعض اوقات تو مجھے اس پر رشک آنے لگتا۔خود کو بہت زیادہ سخت جان سمجھنے کے باوجود میں ان پہاڑوں میں بہ مشکل اس کے ساتھ قدم ملا پاتا تھا۔

پہاڑ کی بلندی پر پہنچتے ہی وہ دوسری سمت نالے میں اتر گئی۔ دوسری طرف کے نالے میں درخت نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لیے وہ نالے میں چلنے کے بجائے اگلی چڑھائی، چڑھنے لگی۔

مشقت کی وجہ سے ہمارا پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ اگلی چڑھائی کے درمیان میں کافی گھنے درخت موجود تھے۔ ہم انھی درختوں میں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی مجھے نالے تین آدمی اسی سمت حرکت نظر آئے جس طرف ہم روانہ تھے۔ میں نے پلوشے کو اس طرف متوجہ کیا۔

''ہونہہ۔'' کہہ کر وہ رک گئی تھی۔

''اوپر چڑھتے ہیں۔'' وہ چونکہ اس علاقے کو مجھ سے کئی گنا زیادہ بہتر جانتی تھی اس لیے میں نے مشورہ دینے پر اکتفا کیا تھا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے اوپر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اچانک آئی کام میں مجھے ایک آدمی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ انعام خان اور ثمین خان کی لاشیں ملنے کے بارے کمانڈر کو بتاتے ہوئے یہ وضاحت بھی کر رہا تھا کہ دونوں کو مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔

ساری بات سنتے ہی کمانڈر مختلف پارٹیوں کو اس علاقے کو گھیرنے کا حکم دینے لگا۔ نیچے نالے میں سفر کرنے والے دو دونوں آدمی بھی مجھے پیچھے مڑ کر تیزی سے واپس حرکت کرتے نظر آئے۔

میں نے پلوشہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

''فی الحال وہ پیچھے ہی متوجہ رہیں گے۔ ہم جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

بلندی پر پہنچ کر ہم دوسری جانب اتر گئے۔ وزیرستان میں چار سو پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور ہر پہاڑ سے کئی نالے نکل کر مختلف سمتوں میں بہتے ہیں۔ نالے بالکل ہاتھ کی لکیروں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ خشک اور بہتے نالوں کی بہتات کے علاوہ وہاں درخت بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے کسی چھپنے والے کو تلاش کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مسئلہ ہے کہ مقامی آبادی میں کہیں پناہ لینے کی صورت ڈھونڈنے والوں کو آسانی رہتی ہے۔ اور اگر ہم مقامی آبادی میں نہ جاتے تو کھانے پینے کے لیے کہاں سے کوئی چیز پیدا کرتے۔ جس علاقے میں ہم موجود تھے وہاں اس وقت تک پاک آرمی نہیں پہنچ پائی تھی۔ پاک آرمی ان دنوں زیادہ تر وانہ اور اس کے

مضافات میں آپریشن کر رہی تھی۔ کچھ آگے کی پہاڑی بلندیوں پر بھی پاک آرمی نے اپنی پوسٹیں بنالی تھیں مگر وہاں تک آنے جانے کے لیے بغیر QRF(Quick Reaction Force) کے حرکت نہیں کی جاتی تھی۔ وہاں تک جانے والے آرمی کے قافلوں پر بھی دہشت گرد چاروں طرف سے حملے کرتے تھے۔

دوسری جانب اترنے سے پہلے پلوشہ نے یہ کہہ کر زنانہ گھگرا اور دوپٹا پھینک دیا تھا کہ دہرے لباس کی وجہ سے اسے سخت گرمی لگ رہی تھی۔

میں نے بیرٹ ایم 107 کا تھیلا زبردستی اس سے لے کر اپنی پیٹھ پر پہن لیا تھا۔ میرے پاس قبیل خان کے آدمیوں سے چھینی ہوئی ہوئی کلاشن کوف تھی جبکہ اس نے اپنی کلاشن کوف اٹھائی ہوئی تھی۔ سنائپر رائفل سے چلتے پھرتے فائر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کلاشن کوف اسالٹ رائفل ہے۔ اس سے برسٹ اور سنگل راؤنڈ فائر کیے جا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے حرکت میں رہتے ہوئے اس کا استعمال بہترین رہتا ہے۔ گو ہمارے پاس بریٹا اور گلاک جیسے بہترین پستول بھی موجود تھے لیکن پستول ہمیشہ قریب کی لڑائی میں اچھے رہتے ہیں۔ اور کارکردگی میں کلاشن کوف پستول سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ یہ اور بات کہ ایک گلاک پستول کی قیمت سے کئی کلاشن کوفیں خریدی جا سکتی ہیں۔

نیچے اترتے ہوئے ایک دم ہمارے سامنے ایک شخص درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوا۔ پلوشہ نے کلاشن کوف سیدھی کی ہی تھی کہ میں نے چیخ کر کہا۔

''ٹھہرو۔'' وہ ایک دم رک گئی۔ درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہونے والا آدمی بھی ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ مقامی آدمی ہی تھا۔ پلوشہ نے اس سے اس جگہ کے بارے دریافت کیا اور اس کے جواب دینے پر پوچھنے لگی۔ ''وشلام گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟''

وہ دور ایک پہاڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس پہاڑ کے دوسری جانب وشلام ہے۔ یہاں سے دس بارہ کلومیٹر فاصلہ ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہاں کوئی اجنبی افراد آپ نے دیکھے ہیں؟''

''ہاں، کچھ لوگ ہمارے گاؤں میں آئے تھے اور وہ ....'' ایک لمحہ رک کر وہ ہم سے نظریں چراتے

ہوئے بولا۔ ''کسی کو تلاش کر رہے تھے۔''

''ہونہہ!......'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے پلوشہ میری جانب متوجہ ہوئی۔ ''اس کا کیا کریں؟''

میں بے چارگی سے بولا۔ ''ایک بے گناہ آدمی کا ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کہیں باندھ دیتے ہیں۔'' اس مرتبہ اس نے اردو میں کہا تھا۔ اس کے منھ سے انگریزی اور اردو بہت ہی پیاری لگتی تھی۔

میرے ہونٹوں پر کھلتی ہنسی دیکھ کر وہ برا مناتے ہوئے بولی۔ ''کیا غلط بول گئی ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا کر اردو میں کہا۔ ''اتنے پیارے انداز میں نہ بولا کرو میری نظر لگ جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں......

ایک تو لہجہ اس قدر شیریں

اور پھر بولتی بھی اردو ہو

میری بات سنتے ہی اس کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ کھل گئی تھی۔ ''جھوٹ بولنا کب سے سیکھ لیا ہے۔''

''کیا یہ جھوٹ تھا۔'' اب برا منانے کی باری میری تھی۔

''نہیں......'' اس نے شوخی بھرے انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''میں سچ میں ہوں ہی اتنی پیاری۔''

''اچھا ایسا ہے اسے یونھی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ نہ ہوں بندھے بندھے پورا ہی ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ اس اجنبی کی متوجہ ہوئی۔ ''تمھارے لیے بہتر تو یہی ہوگا کہ کسی کو ہمارے بارے نہ بتانا۔ دوسروں کی دشمنی میں ٹانگ اڑانے والے عموماً گھاٹے میں رہتے ہیں۔''

''کسی کو نہیں بتاؤں گا جی۔'' وہ فوراً پلوشہ سے متفق ہو گیا تھا۔

''جاؤ۔'' اسے سر کے اشارے جانے کا کہہ کر وہ میرے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

ہم ایک مرتبہ پھر آگے روانہ ہو گئے تھے۔ اسی دوران مجھے آئی کام میں ایک بندے کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کرم خان کی لاش ملنے کی بابت کمانڈر کو بتا رہا تھا۔ وہ جگہ انھوں نے ہمیں تلاش کرنے کے لیے گھیری

تھی۔ہم تو انھیں نہ مل سکے اپنے ساتھی کی لاش انھیں مل گئی تھی ۔ چند منٹ بعد انھیں دوسری دو لاشیں بھی مل گئی تھیں۔وہ کمانڈر کسی دوسرے کمانڈر کو یہ بات بتا رہا تھا کہ ہم اس کے گھیرے سے نکل کر آگے بڑھ گئے ہیں۔اس کے ساتھ اس نے دو تین گاؤں کے نام لے کر کہا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک جانب جا سکتے تھے۔ان میں وشلام گاؤں کا نام بھی شامل تھا۔دوسرے کمانڈر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہم یا تو وشلام جائیں گے۔یا پھر اب تک وہیں کہیں چھپے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس نے ان تینوں گاؤں کے مضافات میں اپنے لشکری پھیلانے کا عندیہ دے دیا تھا۔

''تم نے وشلام گاؤں کا پتا کس لیے معلوم کیا ہے؟'' اچانک مجھے پلوشہ کا اجنبی سے کیا جانے والا سوال یاد آیا اور میں نے پوچھنے میں دیر نہ لگائی۔

''بھول گئے، وشلام خوشحال خان محسود کا گاؤں ہے۔''

''تو خوشحال خان محسود سے ہمیں کیا لینا دینا؟''

اس نے تفصیل بتلاتے ہوئے۔''خوشحال خان محسود، قبیل خان کا دشمن ہے اور اس وقت ہمیں اسی کے پاس پناہ مل سکتی ہے۔یاد نہیں پچھلے دنوں قابل خان نامی آدمی کو ہم نے قبیل خان کے آدمیوں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔''

''پھر تمھیں اس اجنبی سے وشلام گاؤں کا پتا معلوم نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''صحیح کہا۔بس جلدی میں پوچھ بیٹھی۔''

''ویسے ضروری تو نہیں کہ اس اجنبی سے قبیل خان کے آدمیوں کی ملاقات ہو جائے۔''میں نے خود تسلی دینے کی کوشش کی۔

پلوشہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''وہ وزیر قوم کا آدمی تھا۔اور قبیل خان بھی وزیر ہے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں تک یہ معلومات نہ پہنچائے۔''

''ہاں تمھاری قوم ہے نا اور تم اپنے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہو۔''میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی تھی مگر آپ کچھ زیادہ ہی رحم دل بن گئے تھے۔''

میں بے بسی سے بولا۔ ”کسی بے گناہ کو مارنے پر بھی تو دل راضی نہیں ہوتا۔“

وہ شرارتی انداز میں بولی۔ ”یہ بات اس وقت تو یاد نہیں آئی تھی جب مجھے باندھ کر پٹائی کر رہے تھے۔“

”یہ بھی معلوم ہے نا کہ بعد میں کتنا پچھتایا تھا؟“

”پچھتاتے تو بعد میں آپ کا رویہ ایسا نہ ہوتا۔“

”یہ بتاؤ کیا اس کے بعد تمھاری کسی بات سے انکار کیا تھا؟ کیا تمھیں جانے دیا حالانکہ سردار تمھیں جانے کا کہہ چکا تھا، جو چیز مانگی تمھارے حوالے کی کہ نہیں، ثقلین خان کی شادی میں تمھارا مکمل ساتھ دیا کہ نہیں اور............“

”اچھا بس بس، سب معلوم ہے مجھے۔“ قطع کلامی کرتے ہوئے اس نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا ۔”آپ کی ایک ایک حرکت یاد ہے کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اتنی اہمیت دیتے رہے۔ بہ ظاہر بےزاری ظاہر کرتے تھے اور چھپ چھپ کر مجھے گھورتے رہتے تھے۔“

”پلوشے!...... یاد رکھنا اگر تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تو اس بار میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔“

”بکواس نہ کیا کریں سمجھے۔“ میرا ہاتھ اپنی جانب کھینچ کر وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اپنے راجو کو چھوڑ کر چلی جاؤں۔“

”ممکن تو نہیں ہے لیکن اپنی بدبختی سے ڈرتا ہوں۔“ اس کے ماتھے پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے میں نے آہستہ سے اسے خود سے جدا کیا کہ ہم ابھی تک خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔

میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں بولی۔ ”مقدر میرے اللہ پاک سے بڑا نہیں ہے۔ میں نے اللہ پاک سے آپ کو مانگا ہے اور وہی مقدروں کا بنانے والا ہے۔“

اس کے اعتماد پر میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ یہ تو مجھے پہلے دن سے معلوم تھا کہ میں اسے اچھا لگتا ہوں ۔لیکن اسے اتنا زیادہ پیارا اور عزیز ہوں اس بارے مجھے ابھی اندازہ ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تو تھی کہ وہ ہر وقت مجھے چھیڑتی رہتی، مذاق مذاق میں اپنے رشتے کا ذکر چھیڑ بیٹھتی، بے تکلف ہو کر میری گود تک میں بیٹھ جاتی۔

نالے میں اتر کر ہم نشیب ہی میں چلتے ہوئے اس پہاڑی کی جانب روانہ ہو گئے جس کے دوسری جانب

وشلام گاؤں موجود تھا۔ ساڑھے چار ہونے والے تھے اڑھائی تین گھنٹوں بعد اندھیرا چھا جانا تھا۔ ہم اندھیرے میں زیادہ محفوظ طریقے سے سفر کر سکتے تھے اور یہی بات میں نے فوراً پلوشہ کو کہہ دی تھی۔

''اگر کسی سے رستے میں مڈبھیڑ ہو گئی تب چھپنے کا سوچیں گے۔''

مجھے بھی اس کا مشورہ معقول لگا تھا۔

وشلام گاؤں کی پہاڑی عبور کرتے ہوئے ہم مزید محتاط ہو گئے تھے۔ پہاڑ کی بلندی پر پہنچنے تک سورج مغربی جانب جھکتے ہوئے پیلا ہو چلا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں ایک کھلا میدان تھا گو اس جگہ کو بالکل ہموار تو نہیں کہا جا سکتا تھا پھر بھی گھر بنانے کے لیے بہت موزوں تھی۔ یہی وشلام گاؤں تھا۔ وہاں درخت نہ ہونے کے برابر تھے البتہ گاؤں سے باہر چاروں طرف موجود پہاڑوں پر کافی گھنے جنگلات موجود تھے۔ قبیل خان کے آدمی وشلام گاؤں کے بہت زیادہ قریب نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وشلام گاؤں کے محسود انھیں دیکھ لیتے تو ان کے درمیان جنگ چھڑ جانا تھی۔

میں نے دوربین نکال کر دائیں بائیں کا جائزہ لیا لیکن کوئی حرکت نظر نہ آئی۔ البتہ گاؤں میں لوگوں کی حرکت نظر آ رہی تھی اور لازمی بات ہے وہ محسود ہی تھے۔ اس کے باوجود مجھے اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا مناسب لگا۔ یہی بات میں نے پلوشہ کو کہی۔

''اندھیرا ہونے کے بعد ہی وشلام میں گھسیں گے۔''

''راجو!...... مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ میرا تو خیال ہے چلتے ہیں۔ یہاں اریب قریب کوئی بندہ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''جیسا مناسب سمجھو۔'' میں نے بھی رکنے پر اصرار نہیں کیا تھا کہ پلوشہ کی ادنیٰ سی تکلیف بھی مجھے گوارا نہیں تھی۔

اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''آپ اتنی جلدی میری ہر بات کیوں مان لیتے ہیں...... اس طرح تو میں بالکل لاڈلی ہو جاؤں گی۔ یہ نہ ہو بعد میں اتنی سر پر چڑھ جاؤں کہ آپ تنگ آنے لگیں۔''

''تنگ تو نہیں آؤں گا، البتہ جب غصہ آ گیا اس دن خوب پٹائی کروں گا، اتنی کہ تمھیں غار والی مار بھول جائے گی۔''

''اچھا اتنی ہمت ہے۔'' وہ ناز بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''آہ......کاش ہوتی۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے بے بسی ظاہر کی۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔''اچھا راجو!......سچ بتائیں، جب آپ کو معلوم ہوا تھا کہ میں قبیل خان کی دشمن ہوں اور آپ نے بے گناہ و بے قصور ہی مجھے اذیت کا نشانہ بنا ڈالا ہے تب آپ کو کیسا محسوس ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دیتا دھماکے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔گولی کا نشانہ ہم ہی تھے۔سو ڈیڑھ گز کے فاصلے سے چلائی جانے والی گولی شوں کرتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر کر چار پانچ گز دور موجود درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی تھی۔

''نیچے لیٹو۔'' چیخ کر پلوشہ کو کہتے ہوئے میں خود بھی لیٹ گیا تھا۔وہاں چھدرے چھدرے درخت موجود تھے۔گولی چلانے والے نے اگر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کی ہوتی تو لازماً نظر آجاتا۔اسی وجہ سے اس نے ہمیں دور سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

ہمارے لیٹتے ہی دو تین اور گولیاں چلیں لیکن زمین پر لیٹا ہونے کی وجہ سے اب ہم واضح ہدف نہیں رہے تھے۔میں نے فائر آنے کی جگہ کی طرف نظریں دوڑائیں۔لیکن کچھ نظر نہ آیا۔اسی وقت پلوشہ نے سیفٹی لیور نیچے کرتے ہوئے دو تین گولیاں اس جانب جھونک دیں۔ان کی طرف سے بھی جواب دیا جانے لگا۔لیکن یہ اندھی فائرنگ تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کافی دیر سے آئی کام پر ان میں سے کسی کی آواز نہیں آرہی تھی۔یقیناً جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھی کا آئی کام ہمارے پاس ہے تبھی انھوں نے چینل تبدیل کر دیا ہوگا۔یوں بھی وہ زیادہ سے زیادہ چینل ہی تبدیل کر سکتے تھے کہ آئی کام کے علاوہ ان کے پاس رابطے کو کوئی ذریعہ بھی موجود نہیں تھا۔

میں چینل تبدیل کرنے لگا جلد ہی ان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔''وہ بچ گئے ہیں کمانڈر!......آپ مزید آدمی بھیجیں، ایک بار گھیرے میں آگئے تو پھر نہیں نکل سکیں گے۔''

''آدمی آرہے ہیں تمھاری جانب۔بس تم انھیں وہاں سے غائب نہیں ہونے دینا۔اور خود آڑ ہی میں رہنا یہ نہ ہو اس خبیث کی گولی کا نشانہ بن جاؤ۔'' خبیث اس نے مجھے ہی کہا تھا۔

''پلوشے!...... یہاں سے رینگتے ہوئے آگے بڑھو۔ دشمن ہمیں گھیرنے کی کوشش میں ہیں۔''

کوئی جواب دیے بغیر وہ ناک کی سیدھ میں رینگنے لگی۔ پتھریلی زمین پر کہنیوں کے بل رینگنا نہایت تکلیف دہ مرحلہ ہے لیکن جب جان پر بنی ہو تو اس قسم کی تکالیف کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مخالف مسلسل اس جگہ کو نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ ایک موٹے تنے والے درخت کے قریب پہنچ کر میں تنے کی آڑ لے کر اٹھ بیٹھا۔ شام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا۔ لیکن فی الحال دکھاؤ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ آئی کام میں ہم پر فائر کرنے والے کمانڈر کو پکار رہے تھے کہ ہم بھاگنے کی کوشش میں ہیں۔

کمانڈر نے فوراً کہا۔ ''انھیں جانے نہیں دینا۔''

''جی کمانڈر۔'' کہہ کر ان میں سے ایک نے وہ غلطی کی جو اسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ نتیجہ اسے سر میں لگنے والی گولی کی صورت ملا تھا۔ میرے لیے سو گز کے فاصلے سے ہدف کے سر میں گولی مارنا روٹی کا نوالہ کھانے سے بھی آسان تھا۔ ساتھی کے گرتے ہی دوسرے نے ایک دم فائر کھول دیا تھا۔ لیکن اتنی عقل مندی اس نے ضرور دکھائی تھی کہ اپنا سر اور باقی جسم آڑ کے پیچھے ہی چھپائے رکھا تھا۔ پلوشہ نے زمین پر لیٹ کر ان کی طرف دو تین فائر جھونک دیے تھے میں نے ایسا کرنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس نہ کی بغیر ہدف کے نظر آئے گولی چلانا میری فطرت نہیں تھی۔ اپنے محترم استاد راؤ تصور کے فرمان کے مطابق میں ایک گولی کے بدلے ایک دشمن گرانے کا قائل تھا ورنہ ٹریگر سے انگلی پرے ہی رکھتا تھا۔ پلوشہ البتہ سنائپر نہیں تھی اس لیے اپنی ایک میگزین وہ یونھی ہوا میں جھونک چکی تھی۔ دشمن کا فائر رکتے ہی ہم دونوں اسی درخت کی آڑ لے کر جھکے جھکے وہاں سے دور ہٹنے لگے۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر موجود دوسرے درخت کی آڑ میں بیٹھ کر میں نے مڑ کر دیکھا مگر مخالف وہیں لیٹا ہوا کمانڈر کو اپنے ساتھی کے مرنے کی بابت بتا رہا تھا۔

''کمانڈر!...... سخی جان کو گولی لگ گئی ہے۔''

''بچ تو گیا ہے نا؟'' کمانڈر نے پریشانی سے پوچھا۔

''سر میں گولی لگی ہے۔'' اس مرتبہ اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''تم الو کے پٹھوں کو بتایا بھی ہے کہ اس خبیث کو موقع نہ دو، مگر یہ بات تمھاری سمجھ میں اس وقت آتی ہے

جب تمھارا سر باقی نہیں رہتا۔''

''میں نے اسے منع بھی کیا تھا لیکن ان دونوں کے فرار ہونے کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنی آڑ سے باہر ہو ااور اس سے پہلے کہ میں اسے پیچھے کھینچتا گولی اسے لگ چکی تھی۔''

''اپنے باقی ساتھیوں کے آنے تک وہیں ٹکے رہنا، بس ان کے جانے کی سمت کو نظر میں رکھنا۔''

''دونوں وشلام کی جانب ہی جا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے کمک تمھارے پاس پہنچنے ہی والی ہو گی۔ اور اگر وہ وشلام میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو میرا انتظار کرنا کہیں محسودوں کے ساتھ لڑائی نہ شروع کر دینا۔''

اس نے مودّبانہ انداز میں کہا۔''ٹھیک ہے جی۔''

ان کی باتیں سنتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے۔ جونھی دشمن اور ہمارے درمیان جھاڑیوں کا جھنڈ آیا ہم اٹھ کر بھاگ پڑے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی مدد کس جانب سے آنا تھی۔ اترائی کی وجہ سے ہماری رفتار کافی تیز تھی۔ پندرہ بیس منٹ دوڑنے کے بعد ہم ایک دم درختوں کی حد سے نکل کر کھلی جگہ پر آئے سامنے ہی مکانوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ ابھی ہم پہلے مکان کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دیوار کے عقب سے چار آدمی ہاتھوں میں ہتھیار تھامے باہر نکلے۔

''خبردار!......ہاتھ اوپر کر لو۔'' ان میں سے ایک کرخت آواز میں بولا۔

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے پلوشہ کی جانب دیکھا۔ مدہم پڑتی روشنی میں مجھے اس کے چہرے پر چھائے اطمینان بھرے تاثرات نے چونکا دیا تھا۔ مجھے کوئی جواب دینے کے بہ جائے وہ مسلح افراد کو مخاطب ہوئی۔

''ہم دوست ہیں اور مدد مانگنے آ رہے ہیں۔''

''پہلے اپنا تعارف کراو۔'' اس مرتبہ بھی اسی نے بات کی جس نے ہمیں للکارا تھا۔

''ہمارا تعارف سردار خوشحال خان کا ماموں زاد بھائی، قابل خان محسود کروائے گا۔''

''آ جاؤ۔'' اس مرتبہ اس کے لہجے میں پہلے والی تندی غائب تھی۔

ہم اپنے ہتھیار کندھے سے لٹکا کر ان کے قریب ہو گئے۔ مجھ سے مصافحہ کر کے انھوں نے پلوشہ کی جانب

بھی مصافحے کا ہاتھ بڑھایا۔وہ تکلفی سے تمام سے مصافحہ کرنے لگی۔اس سے پہلے بھی بغیر کسی جھجک کے مردوں سے مصافحہ کیا کرتی تھی۔لیکن نا معلوم اس وقت مجھے اس کا یوں مصافحہ کرنا بہت زیادہ برا لگا تھا۔پلوشہ ان سے مصافحہ کر کے میرے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔''آپ کو چوٹ تو نہیں لگی ہے نا؟''

میں کوئی جواب دیے بغیر خاموش رہا۔مجھے ابھی تک اس کا مصافحہ ہضم نہیں ہو رہا تھا۔حالانکہ اس سے پہلے وہ مردوں میں ناچتی رہی تھی۔اور لڑکے کا بھیس اپنانے کی وجہ سے ہر کسی سے بے تکلف ہو کر مصافحہ بھی کر لیتی تھی ۔لیکن اس سب کے باوجود مجھے بہت برا محسوس ہو رہا تھا۔

پلوشہ کو بھی میری خاموشی ظاہر ہو گئی تھی۔''راجو!......کیا بات ہے۔''میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اس بار بھی میں کوئی جواب دیے بغیر خاموش رہا۔

''اے راجو!......کیا اتنا اعتبار نہیں ہے اپنی پلوشے پر۔''اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔کہتے ہیں محبت کرنے والے بغیر بتائے ایک دوسرے کے احساسات جان لیتے ہیں اور میرے دل کی بات جانتے ہوئے اس نے اس مقولے کو سچا ثابت کر دیا تھا۔

''اچھا آئندہ کسی سے بھی ہاتھ نہیں ملاؤں گی۔''میزبانوں کی پروا کیے بغیر اس نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے روک لیا تھا۔اس لہجے میں شامل تشویش سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

ہمارے میزبانوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ان میں سے ایک دبی زبان میں دوسرے سے ساتھی سے کہنے لگا۔

''ہلک دے خو جینئ پشانتِ خبرے کوی۔''(لڑکا ہو کر لڑکیوں کی طرح بات کر رہا ہے)۔اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔میں اسے نظر انداز کرتا ہوا پلوشے کو مخاطب ہوا۔

''پاگل نہ بنو میں بالکل بھی خفا نہیں ہوں۔''

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔''کہا تھا نہ میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرتے رہنا۔اور خدارا اس طرح نظر انداز نہ کیا کرو میرا سانس رکنے لگتا ہے۔''

”پاگل نہ ہوتو۔“ چاہت بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں اسے بازو سے پکڑ کر ساتھ چلانے لگا۔ ہمارے میزبان پھر رہنمائی کے لیے آگے بڑھ گئے۔

وہ سیدھا ہمیں خوشحال خان کی وسیع بیٹھک میں لے گئے تھے۔قبیل خان کے آدمیوں کے ساتھ ہمارے فائرنگ کے تبادلے کی وجہ سے وہ اس وقت بیٹھک ہی میں موجود تھا۔ چند اور افراد بھی بیٹھک میں بیٹھے تھے جبکہ ہمیں لانے والے انھوں نے صورت حال معلوم کرنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ کیے تھے جنھیں ہم راستے میں مل گئے اور وہ ہمارے ساتھ ہی واپس مڑ آئے تھے۔ بیٹھک کے وسیع صحن میں چاروں اطراف میں چار پائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے جاتے ہی خوشحال خان اور حاضرین محفل سے مصافحہ کیا۔ پلوشہ البتہ ایک جانب خاموشی سے کھڑی رہی۔ اس کی طرف سے پہل نہ ہوتی دیکھ کر کسی نے بھی از خود اس سے ہاتھ ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہمیں لانے والوں میں سے ایک آگے ہو کر خوشحال خان کو بتایا کہ ہم اس کے ماموں زاد بھائی قابل خان کے دوست ہیں اور فائرنگ کرنے والے ہم ہی ہیں۔

”بیٹھیں۔“ خوشحال نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک خالی چار پائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور ہمارے بیٹھتے ہی مستفسر اہوا۔

”آپ لوگ ہمارے علاقے میں کیوں فائرنگ کر رہے تھے؟“ میرے خیال میں چونکہ قبیل خان کے آدمی تلاشی لینے کے لیے وشلام گاؤں میں نہیں آئے تھے اس لیے خوش حال خان کو اصل صورت حال معلوم نہیں تھی ۔بلکہ قبیل خان کے آدمی اگر وہاں آتے بھی، تو کسی نے انھیں گاؤں کی تلاشی لینے کی اجازت نہیں دینا تھی۔

”فائرنگ ہم نہیں قبیل خان کے آدمی کر رہے تھے۔ ہم نے تو اپنے بچاؤ کے لیے جوابی فائرنگ کی ہے۔“

اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”معاملہ کیا ہے؟ دوسرا دن ہے قبیل خان وزیر کے آدمی آس پاس کے علاقوں میں کسی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ بلکہ اب تو انھیں جہانداد خان کے لشکری کہا جائے گا۔“

”وہ قبیل خان کے قاتل کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”تو آپ لوگوں پر انھوں نے غلطی سے گولیاں چلائی ہیں؟“

میں اطمینان سے بولا۔ ”نہیں، خیر غلطی تو خیر نہیں کہہ سکتے کہ ہم دونوں ہی قبیل خان کے قاتل ہیں۔“

”کیا؟“ اس بار اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”جی ہاں۔ اصل بات تو یہی ہے۔“

”تو آپ لوگ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟“

”پناہ۔“

اس نے فوراً انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں قبیل خان کے قاتلوں کو پناہ دے کر ایک نئی جنگ نہیں چھیڑ سکتا ۔اس لیے آپ لوگ کھانا وغیرہ کھا کر تشریف لے جائیں۔“

”قبیل خان آپ کا بھی تو دشمن تھا۔“ پلوشہ نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”بچے آپ ان باتوں کو رہنے دیں، آپ کا بڑا بات کر رہا ہے۔“ پلوشہ کو کم سن لڑکا سمجھتے ہوئے خوشحال خان نے اس کی بات کو درخور اعتناء نہیں جانا تھا۔

”چلو یہی بات میں دہرائے دیتا ہوں، دشمن کے دشمن تو دوست ہوتے ہیں نا؟“

وہ مسکرایا۔ ”تو میں نے کب آپ لوگوں کو دشمن سمجھا ہے۔“

میرے کچھ کہنے سے پہلے بیٹھک کا صحن۔ ”اسلام علیکم!“ کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔ آنے والا قابل خان تھا ۔وہی قابل خان جس کی جان ایک مرتبہ ہم دونوں نے بچائی تھی۔ صحن میں جلتی ٹیوب لائیٹس کی روشنی میں اس نے ہمیں پہچاننے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ فوراً۔ ”پہ خیر...... پہ خیر۔“ کہتے ہوئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ہماری جانب بڑھا۔ میں نے اٹھ کر اس سے معانقہ کرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

”میرا ساتھی لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ اس لیے اس سے ہاتھ وغیرہ ملانے سے گریز کرنا۔“

وہ حیرانی سے بڑبڑایا۔ ”عجیب بات ہے، بہرحال ٹھیک ہے۔“

مجھ سے معانقہ کر کے وہ خوش حال خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ”بھائی جان!...... اس دن انھی دو آدمیوں نے میری جان بچائی تھی۔“ یہ کہتے ہی وہ میرا ہاتھ تھام کر میرے ہمراہ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”ہونہہ!......“ خوش حال خان ایک گہرا سانس لیتے ہوئے حاضرین محفل کو مخاطب ہوا۔ ”آپ لوگ تیاری

کر کے اپنے پہاڑی مورچوں پر پہنچ جائیں۔‘‘ گویا اس نے ہمیں پناہ دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

ہمارے علاوہ وہاں بیٹھے تمام لوگ اثبات میں سر ہلا کر بیٹھک سے نکلنے لگے۔

خوشحال خان، قابل خان کو مخاطب ہوا۔’’آپ مہمانوں کو وقت دیں میں بھی اوپر جا رہا ہوں۔‘‘

’’آپ لوگ یقیناً کھانا کھا کر ہی آرام کرنا پسند کریں گے؟‘‘ قابل خان ہم سے مستفسر ہوا۔

میں نے بلا تکلف کہا۔’’جی ہاں، سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے میں کھانا لاتا ہوں، پھر گپ شپ کرتے ہیں۔ وہ بھی بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

’’یہ گھروں کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھنے کی منطق میری سمجھ سے بالاتر ہے۔‘‘ قابل خان کے جاتے ہی میں پلوشہ کو مخاطب ہوا۔

’’وزیروں اور محسودوں میں جب بھی جنگ ہوتی ہے وہ گاؤں سے باہر نکل کر ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی عورتوں اور بچوں پر کوئی ہتھیار نہیں اٹھاتا۔ اب سارے مرد گاؤں چھوڑ کر پہاڑوں پر پہنچ جائیں گے۔ اور پھر جب تک صلح کی بات چیت نہیں ہوتی فائرنگ ہوتی رہے گی۔

میں نے پوچھا۔’’گویا جہانداد خان ہماری بازیابی کے لیے ضرور لڑائی کرے گا؟‘‘

’’اگر اس نے لڑائی نہ چھیڑی تو یہ لوگ واپس گھروں میں آ جائیں گے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ جب تک ہم یہاں ہیں یہ ہم پر کوئی حرف نہیں آنے دیں گے۔ البتہ تمام قتل ہو گئے تو علیحدہ بات ہے۔‘‘

میں نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔’’ویسے یہ بہت غلط ہو گا اگر ہماری وجہ سے دو قبیلوں میں جنگ چھڑ جائے۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں یہ یہاں معمول کی بات ہے۔ اور پھر وقتی طور پر یہاں پناہ لینا ہماری مجبوری تھی ورنہ جس انداز میں جہانداد نے ہمیں پکڑنے کے لیے اپنے لشکر کو تمام علاقے میں پھیلایا ہوا ہے مجھے ڈر تھا کہ ہم نے پکڑے جانا تھا۔

’’میں اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔

وہ میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں لے کر سہلانے لگی۔ پر مشقت زندگی گزارنے کی وجہ سے

اس کے ہاتھ عام عورتوں کی طرح ملائم تو نہیں تھے، اس کے باجود اس کے ہاتھوں میں ایک کشش اور جادو چھپا تھا۔ ایک لمحہ خاموشی کے بعد اس نے محبوبانہ انداز میں پوچھا۔

''قابل خان کو میرے لڑکی ہونے کے بارے بتلا رہے تھے؟''

''ہاں، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بعد وہ تم سے بھی گلے ملنے لگ جائے۔''

قریب کھسک کر میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے وہ ناز بھرے لہجے میں بولی۔''ایک دم میرے بارے اتنا زیادہ حساس ہوگئے ہیں آپ۔''

''اپنی چیز کے بارے حساس ہونا پڑتا ہے۔''

''میں تو پہلے دن ہی سے آپ کی تھی۔ بس آپ ہی جان چھڑانے کی کوششوں میں تھے۔''

''جان چھڑانا پڑتی ہے میری جان!...... کسی لڑکی سے تعلق اس چیز کا نام نہیں ہے کہ بس اس کے خوب صورت بدن سے لذت کشید کی جائے۔ یہ تو مغربی اور مادر پدر آزاد معاشرے کی سوچ ہوتی ہے۔ اسلام میں تو کسی لڑکی کو اپنانے کا فیصلہ کرنے کے بعد ایک مرد کو اس عورت کی ہر ضرورت کا کفیل بننا پڑتا ہے، اس کے دکھ درد اپنانے پڑتے ہیں، اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے، دنیا کے ہر سرد و گرم سے اسے بچانا پڑتا ہے، اسے تحفظ دینا پڑتا ہے، زندگی گزارنے کی سہولیات دینا پڑتی ہیں، دنیا کی ہر مصیبت کے سامنے سینہ تان کر اسے پناہ پڑتی ہے۔ تب جا کر ''مجھے تم سے محبت ہے۔'' جیسے مختصر سے فقرے کا حق ادا ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ کسی لڑکی کو شریک حیات بنانے کا مطلب ذمہ داریوں کے لیے اپنا دامن کشادہ کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔''

وہ لاڈ بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔''مجھ جیسی لڑکی کے حصول کے لیے بھی یہ ذمہ داریاں نہیں سنبھالی جا سکتیں؟''

''سنبھال تو لی ہیں چندا۔'' ایک ہاتھ اس کے کندھوں کے پیچھے سے لے جا کر میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے مزید اپنے قریب کیا۔

''راجو!...... یونہی ہمیشہ میرے لاڈ اٹھاتے رہو گے نا، میری ناز برداری کرتے رہو گے نا، میرا خیال رکھتے رہو گے نا، کسی کو مجھ سے زیادہ اہمیت تو نہیں دو گے نا، میری غلطیوں کوتاہیوں کو معاف کرتے رہو گے نا؟ بتاؤ نا

راجو!'' اس نے بھی اپنی بانہیں میرے گرد لپیٹ لی تھیں۔

''ہاں، راجے کی جان، جو قسم چاہے لے لو۔''

''مرد کی زبان سے بڑی بھی کوئی قسم ہوتی ہے کیا؟'' خوشی سے سرشار لہجے میں کہتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنا سر میرے کندھے پر ٹیک دیا تھا۔ اس وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور ہم جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ قابل خان تھا کھانے کے برتن اٹھائے اندر آ رہا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں، فی الحال تو جو پکا تھا وہی لے آیا ہوں کل ان شاء اللہ خصوصی طور پر آپ کی مہمان نوازی کریں گے۔''

چکن کری کا بھرا ڈونگہ دیکھتے ہوئے میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اس سے اچھا اور کیا کھلائیں گے بھائی!''

کھانے کے برتن ہمارے سامنے رکھتے ہوئے وہ وضاحت کرتا ہوا بولا۔ ''یہ تو روزمرہ کا کھانا ہے دوست!...... آپ نے بھوکے ہونے کی اطلاع دی ہے تبھی جلدی میں یہی اٹھا لایا ورنہ مہمان کے لیے تو کچھ خصوصی ہی پکایا جاتا ہے۔''

''جزاک اللہ۔'' روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے میں نے خلوص دل سے کہا۔

اس نے پانی کا بھرا جگ ہمارے قریب رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ کھانا کھائیں میں چائے لاتا ہوں۔'' چونکہ میں نے اسے پلوشہ کے لڑکی ہونے کے بارے بتلا دیا تھا اسی وجہ سے وہ وہاں نہیں بیٹھنا چاہ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن چائے دودھ والی لانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے نکل گیا۔ اور ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے کھانے سے فارغ ہونے تک وہ چائے لے آیا تھا۔ ہم بہ مشکل ہی چائے پی سکے تھے کہ سردار خوشحال خان دو دراز قامت محافظوں کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا۔

''قابل خان!......'' اپنے مہمانوں کو اندر کمرے میں لے جاؤ، جہانداد خان چند منٹ تک خود یہاں پہنچنے والا ہے۔''

''جی بھائی!......'' قابل خان سعادت مندی سے بولا۔ جبکہ میں اور پلوشہ اپنا سامان اٹھا کر خود بہ خود کمرے

کی جانب بڑھ گئے تھے۔قابل خان نے زبردستی ہمارے ہاتھوں سے سامان تھاما اور آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

"آپ یہاں بیٹھیں اور خود اپنے کانوں سے دونوں سرداروں کی بات چیت سن لیں۔"

میں نے کہا۔"قابل خان!......کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ہمیں حفاظت سے کہیں اور منتقل کر دیں تا کہ دونوں قبیلوں کے درمیان خواہ مخواہ ہونے والا جھگڑا روکا جاسکے۔"

قابل خان نے خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔"دوبارہ ایسا نہ کہنا بھائی!......اگر دونوں قبیلوں کے درمیان جھگڑا چھڑا بھی تو اس کی وجہ جہانداد خان ہوگا۔اتنا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قبائلی اپنے مہمانوں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔"

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا......"

"آپ ہر قسم کے مطلب کو رہنے دیں بھائی۔"قابل خان نرمی سے مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی جہانداد خان اپنے محافظوں کی معیت میں وہاں پہنچ گیا تھا۔وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔لمبی گھنگریالی زلفیں اور گھنی مونچھوں نے اس کے چہرے کو کافی پر رعب بنا دیا تھا۔اس کے محافظ بھی اسی کی طرح دراز قامت اور مضبوط جثّے والے تھے۔اس کے سر پر رکھی ہوئی سفید قراقلی ٹوپی اور کالی سیاہ واسکٹ اس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھی۔وہ آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔گفتگو کی ابتدا جہانداد خان ہی نے کی تھی۔قدوقامت کی طرح اس کی آواز بھی کافی بھاری اور پر رعب تھی۔

"سردار خوشحال خان!......ہمارے دو مجرم وشلام گاؤں میں چھپے ہوئے ہیں اور ہم انھی کو پکڑنے آئے ہیں۔یقیناً آپ اس ضمن میں ہم سے تعاون کریں گے۔"

"سردار جہانداد خان!......جب ایک قبائلی سردار کسی کو پناہ دیا کرتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ پناہ گزین مجرم ہے یا بے گناہ۔وہ بس اپنے پاس مدد کی درخواست لے کر آنے والے شخص کی مدد کرتا ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے ان افراد کو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں پہنچے ہیں تو وہ پناہ گزین نہیں بلکہ میرے محسن ہیں اور محسنوں کی حفاظت کی جاتی ہے انھیں قتل نہیں کرایا جاتا۔"

”وہ دونوں میرے بھائی قبیل خان کے قاتل ہیں اور دونوں قبائل کے درمیان ہونے والا امن معاہدہ اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ ہمارے مجرموں کو پناہ نہ دیں۔ایسی باتوں سے معاہدے ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ایسی چھوٹی سی بات پر ہمارا معاہدہ بھی باقی نہ رہ پائے۔“ جہانداد خان کے لہجے میں ایک بڑے قبیلے کا سردار ہونے کا زعم ابل رہا تھا۔اس کی باتوں کے پسِ پردہ واضح دھمکی شامل تھی کہ اگر خوشحال خان اس کے دشمنوں کو اس کے حوالے نہیں کرے گا تو وہ وشلام پر حملہ کر دے گا۔

خوشحال خان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔”کیا امن معاہدے میں کوئی ایسی شق شامل تھی کہ کسی بھی آدمی کو پناہ دینے کے لیے ہم دوسرے قبیلے کی مرضی کے محتاج ہوں گے۔یا اس سے پہلے علام خیل کا سردار کسی کو پناہ دینے سے پہلے مجھے مطلع کیا کرتا تھا۔“

”بات کسی کو نہیں لالا قبیل خان کے قاتل کو پناہ دینے کی ہو رہی ہے۔اور یقیناً اگر ہم وشلام کے سردار کے قاتل کو پناہ دیتے تو آپ نے بھی ہم سے یہی مطالبہ کرنا تھا۔“

”تو کیا آپ ہمارے مطالبے پر اپنے پاس پناہ گزین کسی شخص کو ہمارے حوالے کر دیتے۔“ خوشحال خان کے لہجے میں طنز کی بو صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

جہانداد خان نے بے پروائی سے کہا۔”کبھی ایسا موقع آیا تب دیکھا جائے گا۔“

”جہانداد خان !......آپ علام خیل کے نئے سردار بنے ہیں کم از کم قبیل خان کے کیے گئے فیصلوں کو نہ بھولیں۔زیادہ عرصہ نہیں گزرا، سال ڈیڑھ پہلے ہی سردار قبیل خان ہمارے ایک دشمن کو پناہ دے چکا ہے۔بلکہ وہ شخص آج بھی آپ کا لشکری ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں وہ آدمی آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں آپ ہمارے دشمن ہمارے حوالے کر دیں۔“ جہانداد خان ہماری دشمنی میں اپنی قبائلی روایات کو پسِ پشت ڈالنے پر تیار ہو گیا تھا۔

”یقیناً آپ کا فیصلہ ایک قبائلی سردار کی شان کے خلاف ہے۔ہم نے اپنے دشمن کا مطالبہ اسی لیے قبیل خان سے نہیں کیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت ہمارے دشمن کو نہ لوٹاتا۔اور یاد رکھنا جہانداد خان، قبائلی سردار جب کسی کو پناہ دیتا ہے تو ہر سود و زیاں کو پسِ پشت ڈال کر دیتا ہے۔ہم اپنے دشمن کی تاک میں ہیں جب بھی وہ علام خیل کی

حدود سے باہر ہمیں ٹکرا یا بچ نہیں پائے گا۔اور یہی مشورہ میں آپ کو بھی دوں گا کہ آپ کے بھائی کے قاتل جب وشلام کی حدود سے نکل جائیں تب آپ ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں ہم دخل انداز نہیں ہوں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ انکار کر رہے ہیں؟'' جہانداد خان نے تصدیق چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

''سردار جہانداد!...... یقیناً آپ کا یہ سوال ایک قبائلی سردار کی شان سے بعید ہے۔''

جہانداد نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔''خوشحال خان میں یہاں قبائلی سردار کی خصوصیات پر سبق پڑھنے نہیں آیا، مجھے ہاں یا ناں میں جواب دیں۔''

''میں جواب دے چکا ہوں۔'' خوشحال خان نے اس کے غصے کی ذرا بھر پروا نہیں کی تھی۔

جہانداد نے غصے بھری نگاہ خوشحال خان پر ڈالی اور کھڑا ہو گیا۔اس نے اپنے سامنے پڑے قہوے کی پیالی اور خشک میوہ جات کی ٹرے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔چند لمحے اسے گھورنے کے بعد وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

''خوشحال خان!...... یاد رکھنا اس سب کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔''

خوشحال خان نے سلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔''جہانداد خان ہر آدمی اپنے فعل کا جواب دہ خود ہی ہوتا ہے۔میں صرف قبائلی روایات کا پاس رکھ رہا ہوں اور الحمد اللہ میں اس بارے کسی بھی ثالث کا فیصلہ ماننے کو تیار ہوں۔البتہ آپ کی طرف سے کسی بھی قسم کی کارروائی کا ردعمل ظاہر کرنا ہمارا بنیادی حق ہے اور اس کی ذمہ داری یقیناً آپ پر ہو گی نہ کہ ہم پر۔''

جہانداد خان نے مزید کوئی بات کیے بغیر بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔اس نے خوشحال خان سے الوداعی مصافحہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔

''اب یہ یقیناً وشلام پر حملہ کرے گا۔'' میں نے اپنے ساتھ سر جوڑے بیٹھی پلوشہ سے تصدیق چاہی جو اس ساری کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔جہانداد خان کے بیٹھک سے نکلتے ہی ہم دونوں پیچھے ہٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد قابل خان اندر داخل ہوا۔

''آپ لوگوں نے یقیناً علام خیل کے نئے سردار کی گھٹیا باتیں سن لی ہوں گی۔''

''ہونہہ!......'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔پلوشہ البتہ خاموش بیٹھی رہی۔

”آپ لوگ اب آرام کریں۔ ان شاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔“ یہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھے کہ کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ کسی نے ٹریگر کو مکمل دبایا ہوا تھا۔ اور اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ میگزین خالی نہیں ہوگئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے قابل خان کی جانب دیکھا۔ وہ چہرے پر دھیمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”یہ جہانداد خان کی طرف سے اعلان جنگ تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”یعنی اب وہ گاؤں پر حملہ کرے گا؟“

”نہیں...... ہمارے ہاں مقابلہ صرف مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد وہ وشلام گاؤں کے کسی بھی مرد کو گولی کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی جہانداد کے کسی لشکری کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ البتہ نہ تو وہ وشلام گاؤں کی حدود میں داخل ہوں گے اور نہ ہم علام خیل میں داخل ہوں گے۔ اس لڑائی میں عورتیں، بچے اور بوڑھوں مردوں کو کچھ نہیں کہا جاتا۔“

”ویسے یہ اصول قابلِ تعریف ہے۔“

”شاید۔“ کہہ کر وہ جانے کے ارادے سے مڑا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“

”نہیں...... اس وقت آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔ فی الحال تو گاؤں کے زیادہ تر مرد پہاڑوں پر پہنچ کر مورچے بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ پرانے مورچوں کی مرمت کریں گے۔ اصل لڑائی صبح کی روشنی کے بعد ہی شروع ہوگی۔ اندھیرے میں تو بس ایمونیشن ضائع کرنے والی بات ہی ہوتی ہے۔“

”آپ کس وقت جائیں گے؟“

”میں آپ لوگوں کو ناشتا کرا کے ہی ادھر کا رخ کروں گا۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ میں اس کے ساتھ متفق ہوگیا تھا، کیونکہ ایک رات کی نیند لے کر ہم تازہ دم ہو سکتے تھے۔

وہ ”اسلام علیکم۔“ کہتا ہوا رخصت ہوگیا۔ دروازہ اندر سے کنڈی کرتے ہوئے ہم نے دو چارپائیوں قبضہ جما لیا۔

”راجو!...... سوتے ہیں۔“ تو بہ شکن انگڑائی لیتے ہوئے وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔

’’ہاں بہتر یہی رہے گا۔‘‘ میں نے تہہ کیے ہوئے کمبل کو کھول کر ٹانگوں پر پھیلا لیا۔

ایک خوب صورت مسکراہٹ میری جانب اچھال کر وہ بھی کمبل میں گھس گئی۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد جسم آرام کا تقاضا کر رہا تھا۔ ایک اچھی نیند لے کر میں اگلے دن کی لڑائی کے لیے خود کو اچھی طرح تیار کر سکتا تھا۔ میرا ارادہ پلوشہ کو وہیں چھوڑ کر لڑائی میں حصہ لینے کا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی ادنا سی بھی تکلیف پہنچے۔ حالانکہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اندر ہمت و حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے کم صلاحیتیں نہیں رکھتی تھی۔ اس کے باوجود میں اسے لڑائی میں جھونکنے پر خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ البتہ اتنا مجھے معلوم تھا کہ اس نے بہت مشکل سے راضی ہونا تھا اور اسے راضی کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی اچھی سی ترکیب سوچ لیتا۔ سب سے بہتر تو یہی تھا کہ میں اسے اپنے خفگی سے ڈرا کر لڑائی میں حصہ لینے سے روکتا۔

اسی ادھیڑ بن میں میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر میں نیند کی میٹھی وادیوں میں کھو گیا جہاں پلوشہ خوب صورت مسکراہٹوں اور نازنخروں کے ساتھ موجود تھی۔ حیران کن امر یہ تھا کہ اس سحر انگیز دنیا میں پلوشہ کے بال بہت لمبے لمبے تھے۔ مقامی گھگرے میں وہ کوئی جنت سے آئی ہوئی حور یا کوہ قاف کی اپسرا لگ رہی تھی۔ اس لباس میں وہ کسی ہندو ناری کی طرح میرے سامنے خوب صورت رقص کر رہی تھی۔ مدھر اور دل لبھانے والے دھیمے ساز نہ جانے کہاں سے بلند ہو رہے تھے۔ اچانک دور کہیں کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ ابھری اور میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ کمرے میں ابھی تک ٹیوب لائیٹ جل رہی تھی۔ میز پر پانی کا بھرا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ پانی کا گلاس بھرتے ہوئے میں نے پلوشہ کی جانب دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی معصومیت نیند میں اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میرے ذہن میں خواب کے مناظر اجاگر ہوئے اور میں بے ساختہ اسے گھورتا رہ گیا۔ جانے میں کتنی دیر اسے یونہی گھورتا رہتا کہ اچانک کسمساتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور اس کا ملیح چہرہ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں نے کافی دیر ہاتھ میں تھاما گلاس منہ سے لگایا پانی پی کر میں نے گلاس میز پر رکھا اس وقت نہ جانے کیوں میرا دل کر رہا تھا کہ میں پلوشہ کے چہرے کو پھر سے دیکھوں۔ اور پھر دل میں موجود خواہش اتنی بڑھی کہ میں بے اختیار اس کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک مرتبہ تو

میرے دماغ میں آیا کہ یہ نہ ہو کہ وہ میرے قریب آنے کو کوئی اور رنگ دے مگر پھر اپنے دل کو ٹٹولنے پر مجھے کوئی ایسا جذبہ نہ ملا جو مجھے شرمندہ کر دیتا۔ میں نے اعتماد سے اپنی انگلیاں اس کے ریشمی بالوں میں گھسا دیں۔

ایک دم ہڑبڑا کر وہ سیدھی ہوئی اور آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی وحشت، خوف اور ڈر نظر آیا۔ لیکن ایک منٹ مجھے گھورنے کے بعد وہ ڈر اور خوف بتدریج نرمی اور مسکراہٹ میں تبدیل ہوتا گیا۔

''راجو!......کیا بات ہے۔'' چند لمحوں بعد اس کی مدھر آواز نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔

''اس طرف منہ کر کے لیٹو میں تھوڑی دیر تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ ناز سے مسکرائی۔ ''کیوں جی مفت کا مال ہے کیا؟''

''پچاس لاکھ کی حامی تو بھری ہے۔'' میری انگلیاں اسی طرح اس کے بالوں میں سرسراتی رہیں۔

''اتنا سستا سمجھا ہے مجھے۔'' اس نے میرا دوسرا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

میں فوراً بولا۔ ''یہ قیمت تم نے خود لگائی تھی۔ میرے لیے تو تم انمول ہو۔''

''اچھا ایک دم آپ کو ہوا کیا ہے۔ مجھے تو ڈرا ہی دیا تھا۔''

''ڈر کس بات کا؟''

اس نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''اعتبار اور بھروسا ٹوٹنے کا ڈر راجو! ورنہ اپنی حفاظت کرنا میں جانتی ہوں۔''

''کیا تم میرے بارے ایسا سوچ بھی سکتی ہو۔'' میرے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''راجو!......آپ یہاں میرے ساتھ لیٹیں۔'' چارپائی کے دوسرے کنارے کی طرف سمٹتے ہوئے اس نے میرے لیے جگہ بنائی۔

''رہنے دو، کہیں رہا سہا بھروسا ہی نہ جاتا رہے۔'' میں اب بھی خفا سا تھا۔

''راجو!......اگر آپ نہ لیٹے تو بہت برا ہوگا۔'' اس مرتبہ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ میں فوراً اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس نے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھیری۔

''اگر میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو یوں آپ سے نہ لپٹتی۔ خدا قسم میں گہری نیند میں تھی اس لیے

جاگتے ہی مجھے ذرا سا خوف اور ڈر محسوس ہوا تھا اور یہ تو آپ کو پتا ہے نا کہ نیند سے جاگتے ہی چند لمحوں تک آدمی مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں ہوتا۔ اور نیند کی حالت میں شریعت بھی کوئی حکم نہیں لگاتی تو آپ کیسے میرے ڈر کو کسی غلط سمت موڑ سکتے ہیں۔''

''اچھا اب میں نے تمھاری بات مان لی اب میں اپنی چار پائی پر جاتا ہوں۔'' باوجود اس کے کہ اس کے بارے میرے دل میں کوئی غلط خیال موجود نہیں تھا پھر بھی میں اس کے ساتھ نہیں سو سکتا تھا۔ وہ ابھی تک میری شرعی بیوی نہیں بنی تھی۔ ایک چار پائی پر لیٹنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ اور یہ بات وہ مجھ سے بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ بغیر ضد کیے اس نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے اور کیا یاد کریں گے میں اسی کروٹ لیٹی ہوئی ہوں آپ کا جب تک جی چاہے مجھے دیکھتے رہیں۔''

''شکریہ جی۔'' اس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں کا نشانہ بناتے ہوئے میں اپنی چار پائی پر آ گیا۔

وہ دل آویز تبسم ہونٹوں پر سجائے مجھے گھورتی رہی۔ میری نگاہیں بھی اس کے ملیح چہرے پر گڑی رہیں۔ اور اسی طرح اسے گھورتے گھورتے میں ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔ میری دوبارہ آنکھ آذان کی آواز سے کھلی تھی۔ پلوشہ ابھی تک نیند میں تھی۔ میں کمرے سے باہر نکل کر بیٹھک کے ایک کونے میں بنے بیت الخلا کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں پلاسٹک کے تین ڈرم پانی کے بھرے ہوئے پڑے تھے اور ان کے ساتھ پلاسٹک کے چند لوٹے بھی رکھے تھے۔ میں وضو کر کے کمرے میں واپس آیا وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ دیوار سے لٹکا جائے نماز اتار کر میں وہیں نماز پڑھنے لگا۔ میرے نماز پڑھنے تک وہ جاگ گئی تھی۔ جائے نماز دیوار میں گڑی کیل میں لٹکا کر میں اپنی چار پائی پر آن بیٹھا۔ وہ بستر چھوڑ کر منہ ہاتھ دھونے چل پڑی۔

اس کی واپسی پر ہم گپ شپ کرنے لگے۔ طلوع آفتاب کے بعد قابل خان ناشتے کے برتن اٹھائے وہاں پہنچ گیا۔ پر تکلف ناشتے کے بعد میں جانے کے لیے تیار تھا۔

قابل خان ناشتے کے برتن واپس کر کے لوٹا اور کہا۔

''چھوٹی بہن کو میں اپنی بیوی کے پاس چھوڑ دیتا ہوں اور ہم دونوں چلتے ہیں۔''

”کیا......؟“ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ”میں کوئی بہن وہن نہیں ہوں، فی الحال مجھے بھائی ہی سمجھو۔“

”پلوشے تمھارا دماغ ٹھیک ہے۔“ میں نے ذرا سختی سے کہا۔

”نہیں ہے ٹھیک پھر؟“ اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے اسنے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا

”کبھی کسی بے غیرت کی بات مان بھی لیا کرو۔“ مجھے شدید تپ چڑھ گیا تھا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”اگر کوئی بے غیرت ہوتا تو مان بھی لیتی۔“

”تم نے یہاں رہنا ہے کہ نہیں؟“ میں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا۔

”نہیں......نہیں......نہیں۔ میں نے وہیں رہنا ہے جہاں آپ ہوں گے۔“ اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

میں نے بگڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں میں بچہ ہوں جسے تمھاری حفاظت کی ضرورت ہوگی؟“

وہ جھٹ بولی۔ ”میں تو بچی ہوں نا اور مجھے آپ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔“

”اسی لیے تو یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔“

”کتنی بار بتاؤں یہاں نہیں رہنا آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے جو مرضی آئے کرو۔“ میرا پارہ سچ مچ بلند ہو گیا تھا۔

وہ قابل خان کو مخاطب ہوئی۔ ”قابل بھائی!......آپ ایک منٹ کے لیے ہمیں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔“

”کیوں نہیں۔“ وہ باہر جانے لگا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ باہر نکل گیا تھا۔

”راجو!......میں سچ میں روٹھ جاؤں گی۔“ میرا روکھا لہجہ اس سے برداشت نہیں ہو پایا تھا۔

”تو منع کس نے کیا ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا اور سنائپر رائفل کا تھیلا پیٹھ پیچھے ڈالنے لگا۔

”آپ سے نہیں، زندگی سے۔“ عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جیب سے قبیل خان والا پستول نکال کر کنپٹی سے لگا لیا تھا۔

❂......❂......❂

میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر اس کے چہرے پر دو تھپڑ جڑ دیے۔

"بے وقوف، احمق، جاہل، گندی......" میرے منہ میں جو آیا بکتا چلا گیا۔

میرے تھپڑوں اور الفاظ کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اطمینان بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "اپنے ساتھ خوشی خوشی لے کے جائیں گے کہ نہیں۔"

"آ جانا، لیکن وعدہ کرو آج کے بعد ایسی حرکت نہیں کرو گی۔" میں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے خوف بھرے لہجے میں کہا۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ کبھی چھوڑنے کی بات نہیں کریں گے۔" میرے کندھے سے چہرہ رگڑتے ہوئے اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں کسی کے اپنا ہونے کا غرور شامل تھا۔

"کب چھوڑنے کی بات کی ہے چندا!......" میں اسے زور سے اپنے ساتھ بھینچا۔ "میں تو تمھاری حفاظت کے لیے کہہ رہا تھا کہ اگر تم یہاں رہو گی تو وہاں میں تسلی سے لڑائی کا حصہ بن سکوں گا۔"

"راجو!...... میں موم کی گڑیا صرف آپ کے لیے ہوں، ورنہ یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے مراحل میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ اور جہاں تک تعلق ہے مرنے کا تو موت کا وقت تو نہیں ٹلا کرتا۔ تو کیوں نہ جب موت آئے تو میں اپنے راجو کی بانہوں میں ہوں۔ اس سے بڑی خوش قسمتی اور سعادت میرے لیے کیا ہو سکتی ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم اتنی زیادہ ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہو گی، مگر میں غلط تھا۔" اسے خود سے علاحدہ کرتے ہوئے میں بیرٹ ایم 107 کے تھیلے کی ڈوریاں کندھے میں ڈالنے لگا۔

"مجھے آپ کی باتوں سے اب بھی خفگی کی بو آ رہی ہے۔" سامان والا تھیلا اٹھاتے ہوئے اس نے بہ غور میرے چہرے کو دیکھا۔ اس کا معصومیت سے پر لہجہ سنتے ہوئے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا تھا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔" اس نے کلاشن کوف اٹھا کر کندھے سے لٹکا لی۔

میں نے بھی اپنی کلاشن کوف اٹھاتے ہوئے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''پلوشے!...... آئندہ مجھے ایسا موقع کبھی نہ دینا ۔کمینی تم نے میرا سانس ہی نکال دیا تھا۔''

''معافی چاہتی ہوں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

قابل خان بیٹھک کے صحن میں بچھی چار پائیوں پر بیٹھا اپنی کلاشن کوف پر کپڑا مار رہا تھا۔قبائلی حضرات اپنی صفائی سے زیادہ اپنے ہتھیار کی صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔خود کئی کئی دن کے میلے کپڑے زیب تن کیے ہوں گے مگران کا ہتھیار خوب چمک رہا ہوگا۔

''تو کیا فیصلہ ہوا۔'' ہمیں کمرے سے برآمد ہوتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''وہی جو میں چاہوں گی۔'' پلوشہ نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔اور قابل خان بے ساختہ ہنس پڑا۔

''ذیشان بھائی!......اس کا مطلب ہے آپ ہماری بہن سے ڈرتے ہیں۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔''احمقوں سے ڈرنا ہی پڑتا ہے۔''

''بات تو سولہ آنے صحیح کی ہے۔'' کلاشن کوف کو کندھے سے لٹکا کر وہ بھی چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔اس کی معیت میں چلتے ہوئے ہم بیٹھک سے باہر نکل آئے۔اکا دکا فائر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔قابل خان نے ہاتھ میں کینوڈ کا سیٹ پکڑا ہوا تھا۔یہ بھی آئی کام کی طرح کا وائرلیس سیٹ تھا۔بیٹھک سے نکلتے ہی وہ اپنے آدمیوں کو ہمارے آنے کی اطلاع دینے لگا۔

''میں دو آدمیوں کے ساتھ اوپر آرہا ہوں۔'' اس نے اس انداز میں کہا تھا کہ اگر کوئی دشمن سن بھی لیتا تو اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کے ساتھ ہم جا رہے ہیں۔

''آجائیں۔'' ریڈیو سیٹ سے ایک نامانوس آواز ابھری۔یقیناً وہ خوشحال خان کے لشکر کا کوئی کمانڈر تھا۔

''بہتر ہوتا کہ آپ اپنا سامان یہیں چھوڑ دیتے۔صرف ہتھیار ہی کافی تھے۔'' قابل خان نے میری پیٹھ پر لادے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اتنا وزن ساتھ پھرانے کا کیا فائدہ؟''

میں نے ہنس کر کہا۔''یہ ہتھیار ہی ہے بھائی!''

''یہ بھلا کون سا ہتھیار ہے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”یہ سنائپر رائفل ہے۔“
”اچھا......اچھا دور مار رائفل ہے۔“اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔
”بالکل صحیح سمجھے۔“
اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔”اچھا، اگر برا نہ مانو ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“ گاؤں کے آخری مکان کو پیچھے چھوڑ کر ہم تھوڑا سا نشیب میں اترے۔اس سے آگے ہمیں احتیاط سے جانا تھا۔گو دشمن کچھ فاصلے پر تھا،لیکن ان کے پاس اگر کوئی سنائپر رائفل ہوتی تو گولی لگنے کا خطرہ بڑھ جاتا۔

”پچھلے دنوں قبیل خان کے ایک مخالف کا تذکرہ سننے میں آ رہا ہے جو کافی اچھا نشانے باز ہے جسے قبیل خان کے آدمی ایس ایس کہتے ہیں۔ بلکہ سنا ہے اس دن قبیل خان کی گاڑیوں پر گھات لگانے والوں میں وہی ایس ایس شامل تھا۔کیا یہ سچ ہے؟......اگر سچ ہے تو وہ گیا کہاں ہے،آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں۔“

”اس دن تو گھات لگانے والے ہم دو ہی تھے۔اور قبیل خان کی گاڑیوں کو ہم نے سڑک پر بارود لگا کر تباہ کیا تھا۔اس کے علاوہ ہمارے پاس راکٹ لانچر بھی موجود تھا۔جو گاڑی بارود سے بچ گئی اسے راکٹ لانچر سے اڑا دیا۔“میں نے بات کو ایک دم گول مول کر دیا تھا۔

”ہونہہ!......“ کہہ کر قابل خان نے مزید سوال سے گریز کیا تھا۔نشیب سے گزر کر ہم نے ڈھلان پر قدم رکھے اور قریباً دوڑتے ہوئے جھاڑیوں کے قریبی جھنڈ میں گھس گئے۔دوڑنے کی وجہ سے ہمیں جھاڑیوں کے عقب میں دو تین منٹ رک کر اپنا سانس بحال کرنا پڑ گیا تھا۔آکسیجن کی کمی کی وجہ سے اس علاقے میں سانس پھولنا ایک عام مسئلہ ہے۔

دو تین منٹ ٹھہر کر ہم دوبارہ آگے بڑھ گئے۔گاہے گاہے فائر کی آواز اس بات کا پتا دے رہی تھی کہ دونوں قبیلے سرگرم تھے۔قابل خان ہمارے رہنمائی کے لیے آگے تھا۔قابل خان کے پیچھے میں نے جان بوجھ کر پلوشہ کو رکھا تھا کہ عقبی جانب سے دشمن کی چلائی گئی گولیوں سے میں اسے اپنے جسم کی آڑ مہیا کر سکتا تھا۔میری اس حرکت سے وہ بھی ناواقف نہیں تھی۔اسی وجہ سے جب میں نے اسے آگے بڑھنے کو کہا تو وہ مجھے عجیب سی نظروں سے گھور کر رہ گئی تھی۔ایسی نظریں جن میں غصے کے ساتھ فخر و غرور اور اپنی اہمیت کا احساس بھرا تھا۔جب سے ہم دونوں

کے دل کی حالت ایک دوسرے کے سامنے کھل کر آئی تھی میرے دل میں اس کی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔اتنی زیادہ محبت تو میں نے کبھی کسی کے ساتھ بھی نہیں کی تھی۔اس سے پہلے رات کو لیٹتے وقت یا تنہائی میں ماہین کی بے وفائی کا غم مجھے بہت زیادہ بے چین کر دیا کرتا تھا۔کبھی کبھی رومانہ کی یاد بھی حملہ آور ہو جاتی۔جینفر بھی کسی نہ کسی صورت خیالوں میں آدھمکتی۔لیکن جونھی پلوشہ کے ساتھ اقرار کی منازل طے ہوئیں وہ تینوں لڑکیاں میرے خیالوں سے ایسی دور ہوئیں کہ اب ہر جانب فقط پلوشہ ہی کا وجود چھایا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے پلوشہ کو میں صدیوں سے جانتا ہوں اور اس سے پہلے میری زندگی میں آنے والی لڑکیاں صرف سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھیں،میری اصل منزل تو پلوشہ ہی تھی۔

درختوں اور پتھروں کی آڑ لے کر ہم اوپر پہنچے جہانداد خان کے لشکر نے اس علاقے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔سب سے قریب وہ شمال کی جانب والی پہاڑی پر تھے۔جنوبی اور مغربی پہاڑیاں جہاں انھوں نے مورچے سنبھالے ہوئے تھے وہ جگہ بہر حال اتنے فاصلے پر تھی کہ وہاں سے ہمیں گولی کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔شمالی جانب سے وہ کافی قریب تھے اور مشرقی جانب بھی ان کے بندے کسی سنائپر رائفل سے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔جہانداد کی حکمت عملی یہی تھی کہ چاروں طرف خوشحال خان پر دباؤ بڑھا کر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرے یا کم از کم خوشحال خان ہمیں جہانداد خان کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائے۔اس کے ساتھ ہی اس نے گویا ہمارے فرار کی راہیں بھی مسدود کر دی تھیں۔

اوپر جا کر ہمیں پتا چلا کہ وشلام کے ایک آدمی کو بازو پر گولی لگی تھی۔زخمی کو وہ ابھی نیچے لے جا رہے تھے۔میرے دل میں پچھتاوے کی ہلکی سی لہر اٹھی ہمارے حصے کی گولی اس غریب کو لگ گئی تھی۔بلکہ خوشحال خان کے جس آدمی کو بھی گولی لگتی وہ ہمارے حصے ہی کی گولی ہوتی۔

ہم دونوں قابل خان کی معیت میں ایک مورچے کے اندر آ کر بیٹھ گئے۔پشت پر لدے تھیلے اتار کر ہم نے کلاشن کوفیں ہاتھ میں تھام لی تھیں۔زیادہ تر مورچے پتھروں کو ترتیب سے رکھ کر بنائے گئے تھے۔مورچوں کی شمالی اور شرقی جانب پتھروں کی آڑ بنائی گئی تھی کیونکہ انھی اطراف سے دشمن کی گولی وہاں تک پہنچ سکتی تھی۔چند آدمی جنوبی اور غربی جانب نگران تھے کہ اس جانب سے جہانداد خان کے آدمیوں کے آگے بڑھنے کی صورت

میں وہ اپنے ساتھیوں کو بروقت مطلع کر سکتے تھے۔البتہ وہاں تک گولی اتنی آسانی سے نہیں پہنچ سکتی تھی۔کہ دونوں پہاڑیوں کے درمیان فاصلہ زیادہ بن رہا تھا۔

قابل خان ہمیں وہاں بٹھا کر اپنے اور دشمن کی جگہوں کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔چند منٹ تک ہمیں علاقے سے واقفیت دلانے کے بعد وہ ہمیں محتاط رہنے کی تاکید کر کے خوشحال خان کے مورچے کی جانب بڑھ گیا ۔وہ خوشحال خان کا دست راست تھا اور یقیناً خوشحال کو اس کے مشوروں کی ضرورت تھی۔میں نے اس کے ساتھ خوش حال خان کے پاس کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی تھی کہ ایک تو اس نے مجھے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی تھی ، دوسرا مجھے بھی خواہ مخواہ بڑا بننے کا شوق نہیں تھا۔اور سب سے بڑھ کر میں قبائلیوں کے طریقہ جنگ سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا تھا۔

"دیکھو اکیلے بیٹھ کر کوفت زدہ ہوتے رہتے ،اب اتنا حسین ساتھی پاس موجود ہے اس کو دیکھ کر دل بہلاتے رہو۔" قابل خان کے تھوڑا دور جاتے ہی پلوشہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔عجیب لڑکی تھی برملا اپنی تعریفوں پر شروع ہو جاتی۔اپنی خوب صورتی اور حسن پر ہر لڑکی کو فخر و غرور ہوتا ہے لیکن زیادہ تر لڑکیوں ایسی ہوتی ہیں جو چاہتی ہیں ان کا چاہنے والا ان کی تعریف کرے ،بہ ذات خود وہ اپنے کو جھوٹ موٹ عام سی شکل وصورت کی لڑکی کہہ کر چاہتی ہیں کہ ان کا محبوب انھیں جھٹلاتے ہوئے ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جائے۔جبکہ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔پلوشہ بڑے دھونس سے خود کو پیارا اور خوب صورت کہتی ۔اور اس کا ایسا کہنا مجھے بہت زیادہ مسرور کر دیتا تھا۔

"تمھیں خوب صورت کس نے کہا ہے۔" میں نے منھ بناتے ہوئے پوچھا۔

وہ شوخی سے بولی۔"بھول گئے ،رات کو دو بجے نیند سے جگا کر کیا فرما رہے تھے کہ میں اپنا خوب صورت سا چہرہ آپ کی جانب موڑلوں تا کہ آپ اپنی پیاسی نظروں کو سیراب کر سکیں۔"

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔"ہونہہ!......مذاق کو بھی سچ سمجھ لیتی ہو۔"

"جی......جی میں جانتی ہوں وہ کتنا مذاق تھا۔ذرا سی دھمکی کیا دی جناب کی ساری اکڑ ہوا ہو گئی۔اتنے ہی بہادر تھے تو مرجانے دیا ہوتا۔"

”تو کیا خواہ مخواہ تمھارے قتل کا الزام سر پر لے لیتا۔“
میرے جواب دینے سے پہلے ہی شمالی جانب سے کلاشن کوف کے مسلسل گرجنے کی آواز آئی۔خوش حال خان کے آدمی بھی فائر کا جواب دینے لگے۔قابل خان جھکے جھکے ہمارے مورچے کے قریب سے گزرا۔اور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔”ہمارا ایک اور آدمی زخمی ہو گیا ہے۔“
”زیادہ زخمی تو نہیں ہے۔“میں نے بے ساختہ پوچھا۔وہ ہمارے مورچے سے تھوڑا آگے گزر گیا تھا لیکن میری آواز اس تک پہنچ گئی تھی۔رکے بغیر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔
”یہ تو اس کے اس کے پاس جا کر پتا چلے گا۔“
پلوشہ گپیں ہانکنا چھوڑ کر دوربین سے مشرقی جانب دشمن کی حرکت کو دیکھنے لگی۔
”آڑ کے اوپر سے نہیں دائیں جانب سے اس سمت کو جائزہ لو۔اسے سر مورچے کی دیوار سے اوپر نکالتے دیکھ کر میں ٹوکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔
”اب ان میں کوئی راجا تو موجود ہے نہیں کہ مجھے خوف محسوس ہو۔“اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی حالت تبدیل کر لی تھی۔
ایک دم فائرنگ شدت اختیار کر گئی۔پلوشہ نے دوربین رکھ کر کلاشن کوف اٹھا لی اور اکا دکا فائر کرنے لگی۔میں نے البتہ گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔میری ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ میں گولی کو یونھی ضائع نہیں کیا کرتا تھا۔ایک میگزین خالی کرنے کے بعد وہ بھی کلاشن کوف کو گود میں لے کر میرے پاس آن بیٹھی۔اسی وقت ایک آدمی ہمارے جھکے جھکے دوڑتا ہوا ہمارے مورچے کے قریب آیا اور ہاتھ میں پکڑی کپڑے کی ایک تھیلی میرے حوالے کرتا ہوا بولا۔
”اس میں گولیاں ہیں،آپ لوگ اکا دکا فائر کرتے رہیں ورنہ دشمن ہم پر چڑھ دوڑے گا۔“
میں تھیلی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔”زخمی کی حالت کیسی ہے؟“
”شکر ہے بچ گیا ہے۔گولی اس کی گردن سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی ہے۔“
”جہانداد کا کوئی شخص بھی زخمی ہوا ہے کہ نہیں۔“

”معلوم نہیں۔ ویسے اگر ہوا ہوتا تو گولی چلانے والے کو پتا ہوتا اور ابھی تک ہمارے کسی فائرر نے یہ دعوا نہیں کیا۔“ یہ کہہ کر وہ اگلے مورچوں کو ایمونشن دینے کے لیے درختوں کی آڑ لیتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

پلوشہ خالی میگزین اتار کر اس میں ایمونیشن بھرنے لگی۔ میری کلاشن کوف کی میگزین میں بھی چند گولیوں کی گنجائش موجود تھی۔ میں نے وہ میگزین مکمل بھرنے کے لیے پلوشہ کی جانب بڑھا دی۔

دونوں میگزینیں بھر کر اس نے گولیوں کی تھیلی بند کر کے ایک جانب رکھ دی۔

ایک میگزین میری جانب بڑھا کر اس نے دوسری میگزین اپنے ہتھیار پر چڑھائی اور دوبارہ فائر کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

”چندا!......ایک منٹ میرے نزدیک آؤ۔“ فائر کے لیے تیار ہوتا دیکھ کر میں نے اپنے قریب بلایا۔

فائر کا ارادہ موخّر کرتے ہوئے وہ میرے قریب آ بیٹھی۔

”چندا!......پتا ہے، فائر کرنے سے پہلے کچھ باتیں بہت ضروری ہوتی ہیں، گو تمھارے استادوں نے تمھیں اس بارے بتا دیا ہوگا اس کے باوجود دو تین باتیں میری بھی یاد رکھنا۔ میں تمھیں کافی دیر سے فائر کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور تم وہ غلطیاں کر رہی ہو۔ سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ ہر ہتھیار کے ٹریگر کے اندر تھوڑی سی لچک موجود ہوتی ہے جسے ”پل آف سرفس“ کہتے ہیں۔ یعنی ٹریگر کو بالکل آہستگی سے دبایا جائے تو ٹریگر نرمی سے دبتا چلا جاتا ہے اور ایک جگہ پر آکر رک جاتے ہے۔ اس جگہ ہمیں ٹریگر پر تھوڑا زیادہ دباؤ ڈالنا پڑتا ہے تاکہ فائر ہو اور اس وقت ہم ذہنی طور پر فائر کے لیے بالکل تیار ہو جاتے ہیں۔ ذہنی طور پر فائر کے لیے تیار ہونے کا نقصان کیا ہوتا ہے کہ فائر سے ہونے والے جھٹکے کو سہارنے کے لیے اپنے کندھے کو یا تو سخت کر دیتے ہیں یا جھٹکا سہارنے کے لیے کندھے کو آگے کی طرف بڑھاتے ہیں اور رائفل کی شست اس ہلکی سی حرکت سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ سر میں مارے جانے والی گولی یا تو چھاتی یا پیٹ میں لگتی ہے یا سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ اس خامی پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ٹریگر میں انگلی ڈال کر ایک جھٹکے سے مکمل ٹریگر دبایا جائے۔ اور جھٹکے کو برداشت کرنے کے لیے کندھے کو اکڑایا یا آگے کو نہ بڑھایا جائے۔ دوسری بڑی غلطی سانس پر قابو پانا ہے۔ جب بھی شست لے کر گولی چلائی جائے گولی چلانے والے کو چاہیے کہ جیسے ہی ٹریگر دبانے لگے اس وقت سانس لے رہا ہو یا خارج کر

رہا ہو بس اسی جگہ سانس روک لے۔اس کے برعکس کچھ حضرات سانس کھینچ کر روک لیتے ہیں اور سانس اندر کھینچنے کی صورت میں بھی ان کی نشست اپنی جگہ سے ہل جاتی ہے۔اس کے علاوہ رائفل کی سائیٹوں پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے گولی چلانے والے کی نگاہ..........‘‘میں اپنے استادوں سے سیکھے ہوئے سبق اس کے سامنے دہرانے لگا۔استادِ محترم راؤ تصور صاحب بھی ہمیں یونھی ایک ایک بات وضاحت سے سمجھاتے تھے۔رائفل کے جھٹکے کو سہارنے والی غلطی کو سمجھانے کے لیے وہ عموماً میگزین میں مخصوص مقدار میں گولیاں بھرتے اور فائرر کو یہ نہ بتاتے کہ میگزین میں گولیاں کتنی ہیں۔مذکورہ فائرر سے فائر کراتے وقت وہ خود اس کی پشت پر کھڑے ہو جاتے۔فائرر بے چارے کو یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ کب اس کی گولیاں ختم ہوئیں۔آخری بار ٹریگر دباتے ہوئے وہ حسب عادت کندھے کو آگے کی طرف کرتا مگر گولیاں چونکہ ختم ہو گئی ہوتیں اس لیے اسے اپنی غلطی معلوم ہو جایا کرتی تھی۔

میری ساری باتیں وہ غور اور محویت سے سنتی رہی۔اس دوران اس کی پرکشش آنکھیں میرے چہرے ہی پر گڑی رہیں۔جونھی میں نے بات ختم کی وہ دھیرے سے بولی۔

’’راجو!......مجھے سنائپر رائفل کے بارے بھی تو سکھاؤ نا؟‘‘

میں نے تھیلے سے بیرٹ ایم 107 کی ٹیلی سکوپ سائیٹ نکال کر کہا۔’’سنائپر رائفل میں سب سے اہم یہ ٹیلی سکوپ سائیٹ ہوتی ہے جو ایک سنائپر رائفل کو اسالٹ رائفلز سے جدا کرتی ہے۔ہر ٹیلی سکوپ سائیٹ کے اوپر عموماً دو تین ناب لگی ہوتی ہیں۔ایک ایلی ویشن کے لیے۔سادے الفاظ میں رینج لگانے کے لیے اور دوسری ناب ڈیفلیکشن یعنی دائیں بائیں کی غلطی دور کرنے کے لیے...........‘‘میں اسے تفصیل سے ٹیلی سکوپ سائیٹ کے بارے بتاتا گیا۔بیچ میں وہ کوئی نہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتی تھی۔اس کے سوالات کو سن کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ بہت زیادہ ذہین تھی اور اس میں سیکھنے کی صلاحیت عام افراد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ٹیلی سکوپ سائیٹ کے بعد میں نے اسے لیزر رینج فائینڈر پر فاصلہ ناپنے،ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار معلوم کرنے،دوربین اور کمپاس وغیرہ کا استعمال۔سب کچھ اس کے سامنے دہراتا گیا۔خوش قسمتی سے اس وقت یہ تمام چیزیں میرے پاس موجود تھیں۔یہ وہ علم تھا جسے سیکھنے کے لیے مجھے جانے کتنا عرصہ لگا تھا۔بلکہ اب بھی میں خود کو طالب

علم ہی سمجھتا تھا۔استادعمر دراز اور راؤ تصور صاحب ہر ملاقات پر کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سکھا دیتے جو اس سے پہلے مجھے معلوم نہ ہوتی۔وہ بھی ایک دن میں یہ سب کچھ نہیں سیکھ سکتی تھی۔لیکن اتنا ضرور تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا۔

فائرنگ بغیر کسی وقفے کے جاری تھی۔ایک کلاشن کوف خاموش ہوتی تو دوسری گرجنے لگتی۔اس فائرنگ کا اور کوئی فائدہ تھا یا نہیں البتہ مخالفین کی نقل وحرکت میں ضرور رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ہم دونوں اس فائرنگ کی پرواہ کیے بغیر اپنی گفتگو میں مصروف تھے۔

میری باتیں ختم ہوتے ہیں ہی شرارتی لہجے میں بولی۔''اگر آپ پہلے دن ہی سے میری تربیت شروع کر دیتے تو آج میں ایک منجھی ہوئی نشانہ باز ہوتی۔''

''وہ تو اب بھی ہو......دیکھتی نہیں ہو تمھاری نظروں کے چلائے ہوئے تیر سیدھا میرے دل میں پیوست ہوئے ہیں۔''

'ہا......ہا......ہا''اس کے مترنم قہقہے نے میرے کانوں میں رس انڈیلا۔''چلیں میری کسی نہ کسی خوبی کے تو آپ قائل ہو گئے ہیں نا۔''

''تم میں خامی کون سی ہے؟''

''بہ قول آپ کے میں ہٹ دھرم ہوں،ضدی ہوں،واجبی شکل وصورت کی ہوں وغیرہ وغیرہ۔''

''اچھاااا......''میں نے اچھا کی الف کو لمبا کھینچتے ہوئے ہنسا۔

اس نے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا۔''راجو!......سچ میں بتائیں کیا میں ضد کرتی ہوئی آپ کو پیاری نہیں لگتی۔''

''ہاں مگر ضد نہ کرتے ہوئے زیادہ پیاری لگتی ہو۔''

''صاف کہیں نہ کہ پیاری نہیں لگتی۔''اس نے منھ پھلا لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔''ارے پاگل خود تو کہتی ہو کہ تم مجھے ہر وقت اور ہر حال میں پیاری لگتی ہو پھر پوچھنے کا فائدہ۔''

"فائدہ......" اس نے زبان نکال کر مجھے چڑایا۔ اسی وقت قابل خان جھکے جھکے انداز میں دوڑتا ہوا ہمارے پاس آبیٹھا۔

"لگتا ہے جہانداد خان نے اپنی ساری طاقت یہیں لگا دی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے مزید آدمی یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "ہماری تعداد کتنی ہوگی؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "ساڑھے تین سو قریب ہوں۔"

"اور جہانداد خان کے پاس کتنے جنگ جو ہوں گے؟"

"ہزار یا اس سے سو پچاس اوپر نیچے۔"

"ویسے سنا تو یہی تھا کہ قبیل خان کے پاس پندرہ سولہ سو افرادی قوت موجود ہے۔"

"اتنے ہی ہوں گے، لیکن تمام اس کے قبیلے کے افراد تو نہیں ہیں نا۔ اس خبیث کا کاروبار تو افغانستان تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے لشکر میں پنجاب اور دوسرے صوبوں کے افراد بھی شامل ہیں۔ کئی افراد چھٹی پر ہوں گے، کئی اسمگلنگ کی کارروائیوں میں لگے ہوں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر آپ کو یہ کیسے معلوم کہ اس وقت ان کی تعداد ہزار کے قریب ہے؟"

"وہ کیا کہتے ہیں۔ "تمھارے درمیان ان کے سننے والے موجود ہیں" جہاندادداد کے لشکر میں بھی اپنے ایک دو خیر خواہ موجود ہیں جو زیادہ نہیں تو اتنی امداد تو کر سکتے ہیں نا ہماری۔"

دو تین کلاشن کوفیں ایک ساتھ گرجیں، قابل خان بھی اوندھا لیٹ کر اپنی کلاشن کوف کی آواز ہمیں سنانے لگا۔ چند گولیاں فائر کر کے وہ سیدھا ہوا اور کہنے لگا۔

"اگر یہاں تنگ ہو رہے ہو تو میں آپ کو واپس بیٹھک میں بھجوا سکتا ہوں۔ کم از کم ہماری چھوٹی بہن کا تو خیال رکھو گے۔"

قابل خان نے یہ بات مزاحیہ انداز میں کہی تھی لیکن پلوشہ کو بری لگی وہ فوراً بولی۔

"قابل بھائی!...... برا نہ منانا، قبیل خان کے آدمیوں سے آپ کی جان اسی چھوٹی بہن ہی نے بچائی تھی اور

اگر مزید کوئی شک ہو تو اپنے کسی تگڑے جنگ جو کو خالی ہاتھ مجھ سے لڑا کر وہ شک بھی دور کر سکتے ہو۔"

قابل خان نادم انداز میں بولا۔"ارے بہنا!......آپ تو خفا ہونے لگیں۔میں تو اپنی چھوٹی بہن سے مذاق کر رہا تھا۔"

"آپ کا مذاق سر آنکھوں پر،لیکن آپ کی باتوں سے راجو کی طرف داری کی بو آ رہی ہے،پہلے بھی یہ مجھے ضدی،ہٹ دھرم اور جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں،آپ کی وجہ سے تو سر پر چڑھ جائیں گے۔"پلوشہ نے بھی فوراً اپنی باتوں کو مذاق کا رنگ دے دیا تھا۔

"ہا......ہا......ہا۔"قابل خان نے قہقہہ لگایا۔"اگر ایسی بات ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

"شکریہ بھیا!"پلوشہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

اسی وقت کوئی وائرلیس سیٹ پر قابل خان کو آواز دے کر دن کے کھانے کی آمد کا بتانے لگا۔گھڑی پر نگاہ دوڑانے پر مجھے ایک بجتے نظر آئے۔

"انھیں۔"آ رہا ہوں۔"کی خبر دے کر وہ ہم سے پوچھنے لگا۔"کھانا یہیں بھیج دوں یا میرے ساتھ چلو گے؟"

میرے کہنے سے پہلے پلوشہ نے کہا۔"یہیں بھیج دیں۔"

اور قابل خان سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

اس کے بعد شام تک وہی ٹُخ ٹُخ لگی رہی۔شام کو ایک بار پھر قابل خان ہمارے پاس پہنچ گیا۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ رات کو آرام کے لیے بیٹھک میں چلے جائیں،صبح ناشتے کے بعد میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"

"میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ہم یہیں ٹھیک ہیں۔"میں نے پلوشہ کو بھی واپس جانے کا نہیں کہا تھا کیونکہ اس نے پھر بگڑ جانا تھا۔میرے پاس سے دور ہونے کو وہ بالکل بھی تیار نہیں ہوتی تھی۔اس کی حالت مجھے اس دودھ پیتے بچے کی سی لگ رہی تھی جو اپنی ماں کی گود سے ایک منٹ کے لیے نکلنے کے لیے تیار نہیں

ہوتا۔نہ جانے اس نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھی تھی جو یوں دل و جان سے فدا ہوگئی تھی۔جہاں تک اس کی شکل وصورت کی بات تھی تو وہ لاکھوں میں ایک تھی اور اگر اس کے مقابلے میں میں اپنی شخصیت کو دیکھتا تو میں کوئی ایسا پرکشش اور وجیہہ نہیں تھا کہ لڑکیاں مجھ پر فدا ہوتی پھریں۔ڈیل ڈول اور جسامت کے لحاظ سے بھی میں انوکھا یا نمایاں نہیں ہوں۔میرا شمار عام مردوں میں ہوتا ہے۔درمیانہ قد، چھریرا بدن،ہلکی سانولی رنگت جسے زیادہ سے زیادہ گندمی کہا جاسکتا ہے۔ایسی عام شکل وصورت کے مرد پر پلوشہ جیسی لڑکی کا فدا ہونا اچنبھا ہی تھا۔ مجھے اس کی چاہت میں بناوٹ یا دکھاوا ابھی نظر نہیں آتا تھا۔اس کی ہر ادا اور ہر نظر یہ باور کراتی کہ وہ مجھے کس گہرائی سے چاہتی ہے۔بلکہ شروع دنوں میں بھی وہ مجھ سے دور جانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔دو تین بار ایسا موقع آیا تھا کہ میں اسے ساتھ لے جانے پر راضی نہیں تھا۔اس وقت وہ لڑ جھگڑ کر زبردستی ہی ساتھ چل پڑی تھی۔سردار نے پہلے دن ہی مجھ میں اس کی دلچسپی بھانپ لی تھی۔اور یہ بات مجھے بتائی بھی تھی۔لیکن اس وقت میں اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔بعد میں پلوشہ کی حرکتیں دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی تھی،گو میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ سردار کی بات پر یقین کروں مگر پلوشہ کا رویہ مجھے باور کراتا رہا یہاں تک کہ سب کچھ کھل کر سامنے آگیا تھا۔

رات کا کھانا کھا کر میں نے اپنے سفری تھیلے سے دونوں سلیپنگ بیگ نکالے ایک نیچے بچھایا اور دوسرا اوپر اوڑھنے کے لیے پلوشہ کی جانب بڑھا دیا۔

''جب نیند آنے لگے تو مجھے اٹھا دینا۔''سلیپنگ بیگ میں گھستے ہوئے اس نے مجھے تاکید کی۔

''ٹھیک ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تکیے کی جگہ رکھنے کے لیے کوئی ہموار پتھر دے دو۔''وہ بھی میری طرح سر کے نیچے تکیہ رکھنے کی عادی تھی۔اور ہموار زمین پر سر رکھتے ہوئے یقیناً وہ الجھن محسوس کر رہی تھی۔

''تکیے کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔''قریب ہو کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

''راجو!......''جذبات سے بوجھل آواز میں کہتے ہوئے اس نے سسکی لی۔مجھے لگا وہ رو رہی ہے۔میں نے فوراً اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، گرم سیال سے میری انگلیاں بھیگنے لگیں۔

''یہ کیا ہے۔''میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

”کبھی کبھی خوشی کے موقع پر بھی آنسو بہنے لگتے ہیں۔“

”اچھا اپنی فلسفے چھوڑو اور آرام کرو۔“ پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر میں اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

چند لمحے بعد ہی وہ گہرے سانس لینے لگی۔رات گئے مجھے اچھے خاصی سردی کا احساس ہوا لیکن میں اسی طرح پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا، البتہ اپنے پاس موجود ہلکی چادر میں نے اوڑھ لی تھی۔اتنی زیادہ ہنگامہ خیز زندگی گزارنے کے بعد بھی وہ سترہ اٹھارہ سال کی ایک الھڑ دوشیزہ تھی۔اس عمر میں عموماً بہت گہری نیند آتی ہے۔وہ بھی صبح تک بے خبر سوتی رہی اور میرا بالکل بھی جی نہ چاہا کہ اسے جگا دوں۔وہ جتنے حوصلے اور ہمت والی ہوتی جتنی سخت جان اور برداشت والی ہوتی، تھی تو آخر عورت ذات جس کی تخلیق ہی ناز اٹھوانے کے لیے ہوئی ہے۔ایک مرد کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی عورت کو حتی الوسع آرام اور تحفظ مہیا کرے۔میں ایک سخت جان سنائپر تھا۔مسلسل اڑتالیس گھنٹے میں غیر آرام دہ مچان میں بھوکے پیاسے بیٹھ کر گزار چکا تھا۔سخت قسم کی تربیت کے ساتھ عملی زندگی میں بھی میں کافی باران تکلیف دہ مراحل سے گزر چکا تھا۔اس وقت پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا رات گزارنا میرے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔سب سے بڑھ کر میری جان حیات کا سر میری گود میں رکھا ہوا تھا میں بھلا تھکن اور بیزاری کیسے محسوس کر سکتا تھا۔عملی زندگی اور دورانِ تربیت پلوشہ نے بھی کافی سختیاں جھیلی تھیں مگر اس وقت اس کی زندگی میں میں شامل نہیں تھا۔اب اس نے مجھے اپنا سب کچھ مان کر خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا میرا فرض بنتا تھا۔

صبح صادق کے وقت ہلکے سے کسمسا کر وہ اٹھ بیٹھی تھی۔”راجو!......کیا وقت ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

تھیلے سے ٹارچ نکال کر اس نے گھڑی دیکھی۔”راجو!...... یہ کیا حرکت ہے۔“ اس کے لہجے میں گہری خفگی چھپی تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے جگایا کیوں نہیں۔“

"پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے مجھے بھی نیند آ گئی تھی۔"

"جھوٹ بولنا کب سے سیکھ لیا۔"

"جب سے معلوم ہوا کہ تم میرے لیے کتنی ناگزیر ہو۔"

"اچھا اب آپ بھی فلسفے نہ جھاڑیں اور سو جائیں۔"

"نماز پڑھ کر لیٹوں گا۔" میں اس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگا۔

میرے کندھے سے سر ٹیک کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ دور کہیں موذّن کی آواز ابھری اور ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا وہ مقدس اعلان میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وشلام گاؤں سے بھی اللہ پاک کی کبریائی کی صدا بلند ہوئی اور میں پانی کی بوتل اٹھا کر وضو کرنے لگا۔ نماز پڑھ کر میں سلیپنگ بیگ میں گھسا تو وہ میرے قریب کھسک آئی۔

"چندا ابھی روشنی ہو جائے گی خواہ مخواہ کا تماشا نہ بناؤ۔"

"یہ تماشا کیسے ہو گیا؟" وہ مصر ہوئی۔

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے میری ہر بات نہ ماننے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے سوئیں آپ۔ میری گود میں تو کانٹے اگے ہوئے ہیں نا؟" منہ پھلاتے ہوئے وہ پیچھے ہٹ گئی۔ میں رضائی میں سر دے لیٹ گیا۔ اس وقت اسے منانے کا مطلب تھا اس کی بات ماننا اور یوں دن کی روشنی میں سب کے سامنے اس کی گود میں لیٹنا بے شرمی ہی تو تھی۔ دیکھنے والے بے شک اسے ایک نوخیز لڑکا ہی سمجھتے ہوں تب بھی یہ کوئی اچھا فعل نہیں تھا۔ اس علاقے میں تو یہ اور بھی قابل اعتراض ہو جاتا تھا۔

میں زیادہ دیر نہیں سو سکا تھا جلد ہی فائرنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا لیکن اس مرتبہ ہونے والی فائرنگ بے کار نہیں گئی تھی۔ خوشحال خان کا ایک آدمی چھاتی میں گولی لگنے سے جان کی بازی ہار گیا تھا جبکہ تین زخمی ہو گئے تھے اور ان زخمیوں میں ایک کی حالت تشویشناک تھی۔ قابل خان سے پتا چلا کہ جہانداد خان نے تین چار نشانے باز کہیں سے منگوا لیے تھے۔ تمام مورچوں کو خوشحال خان نے حکم جاری کر دیا تھا کہ بغیر آڈر کے کوئی حرکت نہ ہو۔ دن کا کھانا لے جانے والوں کو بھی انھی سنائپروں کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا اور ایک آدمی زخمی کرا کر وہ واپس

لوٹ آئے۔

ایک بجے کے قریب قابل خان پتھروں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا ہمارے مورچے کے قریب آیا۔

”ذیشان بھائی!......اگر آپ اپنے پاس موجود دور مار رائفل عارضی استعمال کے لیے مجھے دے دیں تو ہمارا ایک آدمی کافی اچھا نشانے باز ہے، کم از کم ہم بھی جہانداد خان کو کوئی آدمی زخمی کرلیں۔“

”استعمال تو میں خود بھی کرلیتا، مگر اس کی پچیس تیس گولیاں بچی ہیں اور وہ میں نے کسی برے وقت کے لیے بچا رکھی ہیں۔“

”تو اس سے برا وقت اور کیا آئے گا؟“ قابل کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”چلو پھر میں ہی کچھ کرتا ہوں۔“ میں نے بیرٹ ایم 107 کے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا خیال تھا کہ شاید یہ لڑائی ٹل جائے ورنہ دونوں جانب اموات ہونے کی صورت میں یہ لڑائی زیادہ زور پکڑ سکتی تھی۔ لیکن اب جہانداد کی طرف سے اتنی سخت کارروائی کے بعد ہمارا بھی منہ توڑ جواب دینے کا حق بنتا تھا۔ اگر وہ اچھے نشانہ باز منگوا سکتے تھے تو الحمداللہ خوشحال خان کے پاس بھی میں موجود تھا۔

مجھے بیرٹ کا تھیلا کھولتے دیکھ کر قابل خان نے جلدی سے کہا۔ ”ویسے سردار خوشحال خان کا مورچہ فائر کرنے کے لیے زیادہ مناسب رہے گا کہ وہاں سے چاروں جانب فائر کیا جاسکتا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پلوشہ کو کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔“ اس نے ابھی تک منہ پھلایا ہوا تھا۔ مجھے کوئی دیے بغیر اس نے جلدی جلدی دونوں سلیپنگ بیگ تھیلے میں ڈالے اور تھیلے کو مورچے سے باہر پتھر کی آڑ میں پھینک کر خود بھی سرعت سے مورچے سے باہر پتھر کی اڑ میں ہوگئی۔ اسی وقت ایک گولی سامنے والے پتھر سے ٹکرائی۔ گویا ان کے سنائپر زگھات میں تھے۔

”راجو!......ابھی تک نہ آنا۔“ پتھر سے ٹکراتی ہوئی گولی اسے بھی نظر آ گئی تھی۔ میری جان خطرے میں دیکھتے ہوئے اس نے ناراضی ختم کرتے ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک سنائپر اگر گولی چلانا جانتا ہے تو اسے گولی سے بچنے کے بھی طریقے آتے ہیں۔ میں نے فوراً ہلکی چادر کا گولہ بنا کر کلاشن کوف کی بیرل پر لپیٹا، اس پر اپنی ٹوپی رکھی اور بیرل کو ذرا سا آڑ سے

نکلا۔اگلے ہی لمحے ایک گولی شوں کرتی ہوئی ٹوپی سے چند انچ اوپر سے گزر گئی۔وہ درمیانے درجے کا سنائپر تھا ورنہ گولی کو ٹوپی میں پیوست ہو جانا چاہیے تھا۔گولی کے شوں کر کے گزرتے ہی میں چھلانگ لگا کر مورچے سے باہر نکلا ایک سیکنڈ کے وقفے میں پلوشہ کے پاس آڑ کے پیچھے ہو گیا۔میں جانتا تھا کہ رائفل کو کاک کر کے دوبارہ شست لینے میں سنائپر کو دو تین سیکنڈز لگ جاتے ہیں۔اس وجہ سے میں خوف کھائے بغیر یہ حرکت کر گزرا تھا۔بیرٹ کا تھیلا میں نے پہلے سے پشت پر لادا ہوا تھا۔سفید ٹوپی اپنے سر پر رکھ کر میں نے کلاشن کوف کی بیرل سے لپٹا کپڑا کھولنے لگا۔

قابل خان نے تعریفی لہجے میں کہا۔''ذیشان بھائی!......بہت اچھے انداز میں دھوکا دیا ہے دشمن کو۔''

میں جواباً بولا۔''جنگ میں تو یہ دھوکا بازی چلتی رہتی ہے بھائی۔''

مجھے بہ حفاظت آڑ میں پہنچتا دیکھ کر پلوشہ کے چہرے پر چھائے بے چینی کے آثار گہرے اطمینان میں ڈھل گئے تھے۔اس جگہ سے خوشحال خان کے مورچے تک ہمیں ایک بڑی چٹان کی آڑ میسر تھی۔ہم جھکے جھکے آگے بڑھنے لگے۔خوشحال خان کا مورچہ واقعی ایک بہترین جگہ پر موجود تھا۔وہ کافی پریشان نظر آرہا تھا اور وائرلیس پر مسلسل اپنے آدمیوں کو مورچے میں دبکے رہنے کا حکم جاری کر رہا تھا۔وہاں پہنچتے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ ایک اور آدمی سنائپر کی گولی کا شکار بن چکا تھا۔مقتول کو سر میں گولی لگی تھی۔

میں نے خوش حال کے مورچے میں پہنچتے ہی جلدی سے بیرٹ ایم 107 کا تھیلا کھولا اور دوربین پلوشہ کی جانب بڑھا کر کہا۔

''احتیاط سے جائزہ لو کہ دشمن کس کس جگہ تھوڑ بہت نظر آرہا ہے۔''اور خود رائفل کے پرزے جوڑنے لگا۔رائفل جوڑتے ہی میں نے دس گولیوں والی میگزین لگا کر رائفل کاک کی اور اس کے پیچھے لیٹ کر پہلے شمال کی جانب دیکھا۔مگر اس طرف فاصلہ کم ہونے کی وجہ جہانداد کے آدمی آڑ میں تھے۔شمال کی سمت سے میں نے مشرق کی سمت شست تبدیل کی تو اچھی خاصی حرکت ہوتی نظر آگئی۔تین آدمی دو درختوں کے تنے کے عقب میں بیٹھے غالباً دوپہر کا کھانا کھارہے تھے۔دونوں تنوں کے درمیان میں فٹ بھر کا فاصلہ تھا جس سے دو آدمیوں کے سر اور ایک کے کندھے کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔آگے مورچے میں ایک آدمی پتھروں پر اپنی کہنی ٹیکے ہمارے

جانب فائر کر رہا تھا۔اس کا اوپری جسم بالکل میرے سامنے تھا۔میں نے لیزر رینج فائینڈر سے فاصلہ ناپا وہ قریباً بارہ سو میٹر دور تھے۔میں ٹیلی سکوپ سائیٹ کی ایلی ویشن ناب کے ذریعے مطلوبہ رینج لگانے لگا۔

پلوشہ ابھی تک شمال کی جانب کوئی حرکت ڈھونڈ رہی تھی۔اچانک وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

''لگتا ہے درختوں کے اوپر ایک آدمی چھپا بیٹھا ہے۔اس کا جسم تو نظر نہیں آرہا مگر ٹہنیوں کی حرکت سے پتا چلتا ہے کوئی موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے،اس جگہ کو ذہن میں رکھ کر اور اہداف بھی تلاش کرو۔''اسے کہہ کر میں قابل خان کی طرف متوجہ ہوا۔

''قابل خان !......اگر دوربین پاس ہے تو ذرا اس طرف دیکھنا۔''میں نے انھی دو موٹے تنے والے درختوں کی جاب اشارہ کیا جس کے عقب میں دشمن کھانا تناول فرما رہے تھے۔

قابل خان نے کہا۔''دوربین بھی ہے اور میں ان آدمیوں کو دیکھ بھی چکا ہوں ،لیکن فاصلہ کچھ زیادہ لگتا ہے ۔شاید وہاں تک گولی نہ پہنچے۔''

''بس انھی کی جانب دیکھتے رہو۔''قابل خان کو کہہ کر میں نے دائیں جانب بیٹھے آدمی کے سر پر شست باندھ لی۔جس کے چہرے کی ایک طرف ہی نظر آرہی تھی۔وہ شخص جو بالکل میری جانب رخ کیے بیٹھا تھا وہ ذرا آسان ہدف تھا اور اسے میں نے دوسری گولی کے لیے چنا تھا۔دو تین سیکنڈ شست لے کر میں نے ٹریگر دبایا اور اس کے ساتھ ہی ایک سیکنڈ سے کم وقفے میں رائفل کو دوبارہ کاک کرتے ہوئے دوبارہ گولی داغ دی۔پہلے والے کو گولی لگتے دیکھ کر قابل خان نے نعرہ لگایا۔''وہ مارا......''اس کے پہلے نعرے کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے کی کھوپڑی میں بھی روشن دان کھل گیا تھا۔

''دوسرا بھی گیا۔''قابل خان دوبارہ چہکا۔

میں نے فوراً اپنی شست اس جانب موڑی جہاں ایک آدمی کا اوپری دھڑ مورچے سے باہر نظر آرہا تھا۔میں ان کے سنبھلنے تک چند ایک کو جہنم رسید کر دینا چاہتا تھا۔وہ اسی جانب متوجہ تھا جہاں دو آدمی میری گولی کا نشانہ بنے تھے۔یقیناً ان کے تیسرے ساتھی نے چیخ کر واویلا کیا تھا جو وہ اس طرف متوجہ ہوا تھا۔لیکن احمق کی سمجھ میں یہ

نہیں آیا تھا کہ خود آڑ میں ہو جاتا۔ بیرٹ ایم 107 کی طاقتور گولی نے اسی پیچھے کی جانب اچھال دیا تھا۔

اسی وقت کسی کی زور شور سے چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ تمام کو آڑ میں ہونے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ خوش حال خان نے ایک آئی کام بھی پاس رکھا ہوا تھا جس پر دشمن ایک دوسرے سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

''شاباش ذیشان بھائی! تین تو گئے کام سے۔'' قابل خان میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ کو بہت پہلے یہ رائفل استعمال کرنی چاہیے تھی۔''

''پلو خان!......اب اس جگہ کی نشان دہی کرو۔'' بیرٹ کی بیرل کو شمال کی جانب موڑ کر میں پلوشہ کو مخاطب ہوا۔ چونکہ خوشحال خان کو ابھی تک میں نے پلوشہ کے لڑکی ہونے کی بابت نہیں بتایا تھا اس وجہ سے میں نے اسے بہ طور لڑکا ہی مخاطب کیا تھا۔ قابل خان کو میں پہلے ہی سے منع کر چکا تھا کہ وہ کسی دوسرے کو پلوشہ کی اصلیت سے آگاہ نہ کرے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے۔ گو لڑکے کا روپ دھارنے کے باوجود اس کے نین نقش ایسے تھے کہ ہر آدمی بے اختیار اسے گھورنے لگتا۔ لیکن اس کا لڑکی ہونا معلوم ہونے پر یقیناً لوگوں کی دلچسپی اس میں اور بڑھ جانا تھی۔

وہ مجھے مطلوبہ جگہ دکھانے لگی۔ وہاں تین درختوں کے تنے ایک ساتھ ملے ہوئے تھے اور ان کی ٹہنیوں نے مل کر ایک جال سا بنا دیا تھا۔ کسی بھی سنائپر کے لیے وہاں مچان بنانا بالکل آسان تھا۔ میں نے بیرٹ کی طاقتور ٹیلی سکوپ سائیٹ سے اس درخت کا جائزہ لیا ٹہنیوں کا مصنوعی گھنا پن فوراً ظاہر ہو گیا تھا۔ جب پلوشہ کو وہاں کسی آدمی کے چھپے ہونے کا شک ہو گیا تھا تو میرے جیسے باریک بین سنائپر کے لیے اسے دیکھنا کیا مشکل تھا۔ جلد ہی مجھے اس کی رائفل کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کی چمک دکھائی دے گئی تھی۔ وہ چونکہ شمال کی جانب موجود تھا اور سورج اس وقت تقریباً میری پشت پر چمک رہا تھا اس وجہ سے اس کے ٹیلی سکوپ کے شیشے کی چمک مجھے آسانی سے نظر آ گئی تھی۔ ٹیلی سکوپ کے شیشے کو دیکھنے کے بعد میرے لیے سنائپر کے بقیہ جسم کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ دائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے سنائپر کی داہنی آنکھ ہمیشہ آئی گلاس کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ جبکہ بائیں آنکھ بند ہوتی ہے۔ اس کی کھوپڑی کا آنکھوں سے اوپر والا حصہ شیشے سے قریباً تین چار انچ اوپر ہوتا ہے۔ اس درخت کا

ہوائی فاصلہ بہ مشکل ساڑھے چھے سو گز تھا۔ بیرٹ ایم 107 جیسی سنائپر رائفل کے بعد اس فاصلے کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ رینج لگا کر میں نے چمکتے شیشے سے ایک انچ اوپر شست لی۔ ٹریگر دباتے ہی اس درخت میں جیسے بھونچال آ گیا تھا زور سے تڑپتے ہوئے وہ سنائپر پیچھے کو گرا اور پھر اسی درخت سے الٹا لٹکنے لگا۔ بے چارے کا پاؤں کہیں اوپر اٹک گیا تھا۔ میں نے اپنی شست وہیں باندھے رکھی کیونکہ اسے اتارنے کے لیے کسی نے تو آنا تھا ایک دم دشمن کی جانب سے ہتھیاروں کے دھانے کھل گئے۔ گولیاں جیسے بارش کی طرح برس رہی تھیں ۔میں اس فائر کا مقصد جانتا تھا۔ وہ فائرنگ کے زور میں اپنے سنائپر کی لاش اتارنا چاہتے تھے۔ میں گولیوں کے شور سے بے نیاز اسی لاش کی جانب متوجہ رہا۔ یوں بھی کلاشن کوف سے اتنے فاصلے پر کسی کو بھی شست لے کر نشانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ البتہ اتفاقاً کسی کو گولی لگ جانا ایک دوسری بات ہے۔ اس متعلق شاید میں پہلے بھی قارئین کو بتا چکا ہوں کہ ہر ہتھیار کی کارگر رینج اور وہ فاصلہ جہاں تک اس ہتھیار کی گولی نقصان پہنچا سکتی ہے یہ مختلف ہوتی ہے ۔وہ ہتھیار جن کے ساتھ ٹیلی سکوپ سائیٹ نہیں لگی ہوتی ان پر مکینکل سائیٹ سے فائر کیا جاتا ہے۔ اور ایسی حالت میں چھوٹے ہتھیاروں کی زیادہ سے زیادہ رینج تین سو میٹر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کہ گولی تین سو کے بعد کارگر نہیں رہتی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین سو میٹر تک ایک فائرر اس ہتھیار سے شست لے کر کسی ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ گولی بلاشبہ اس ہتھیار کی دو تین کلو میٹر تک کسی کی جان لے سکتی ہو۔ جیسے پاک آرمی میں استعمال ہونے والی مشہور رائفل جی تھری کی کارگر رینج تو تین سو میٹر ہے لیکن اس کی گولی ساڑھے تین کلو میٹر تک کسی کی بھی جان لے سکتی ہے۔ مکینکل سائیٹ ہر ہتھیار کا حصہ ہوتی ہے جو علاحدہ نہیں کی جا سکتی ۔البتہ جس وقت ٹیلی سکوپ سائیٹ یا نائیٹ ویژن سائیٹ استعمال ہو رہی ہو تب مکینکل سائیٹ استعمال نہیں ہوتی۔ مکینکل سائیٹ پر سنائپر رائفل کا رینج بھی اصل رینج سے کم ہو کر تین سو رہ جاتا ہے۔

ان کے لاش اتارنے کی بابت میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔ ایک آدمی نے درخت کے تنے کی آڑ لے کر اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکتی ہوئی لاش تک رسائی حاصل کرنا چاہی مگر لاش اس سے دور تھی مجبوراً ایک قدم آگے بڑھا کر اس نے لٹکتی لاش کے کندھوں سے تھام کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بھی ٹریگر دبا دیا تھا۔ درخت سے لٹکتی لاش اور اسے نیچے اتارنے والا اکھٹے ہی نیچے گرے تھے۔ البتہ لاش اتارنے والے بے

چارے کی قسمت میں چند لمحے تڑپنا باقی تھا۔

اسی وقت آئی کام پر دشمن کے کسی کمانڈر کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ ”لاشوں کے قریب کوئی نہیں جائے گا۔اور نہ کوئی بے وقوف آڑ سے سر باہر نکالے گا۔جب سب کو معلوم ہے کہ وہ خبیث وہیں چھپا ہے تو بے احتیاطی نہ کرو۔“

”یہ خبیث کس کو کہہ رہا ہے۔“ قابل خان نے میرے قریب بیٹھ کر میری پیٹھ تھپکتے ہوئے پوچھا۔

میں کھسیانی ہنسی سے بولا۔ ”کیا پتا؟“

”یقیناً آپ وہی ایس ایس ہیں جس کی تعریف کافی ہفتوں سے سنتا آرہا ہوں، مگر یقین نہیں آتا تھا۔آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھے خوشحال خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

”سردار کیا اس کی گولیاں مل سکتی ہیں؟“ میں نے تھیلے میں سے بیرٹ ایم 107 کی ایک گولی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

گولی کو گھورتے ہوئے وہ پر خیال لہجے میں بولا۔ ”ملنی تو چاہیں۔“

میں نے دبے دبے جوش سے پوچھا۔ ”مگر کہاں سے؟“

”وانہ میں ہوں گی، نہیں تو افغانستان سے تو لازماً مل جائیں گی۔“

”پھر کیا فائدہ۔“ میرا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”فائدے سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ قابل خان ہماری گفتگو میں مخل ہوا۔

”آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ اس کی گولیاں کم ہیں اور ہمیں مزید گولیوں کی ضرورت پڑے گی ورنہ اس رائفل کو اٹھائے پھرنا ایک بے کار وزن ہی تو ہے۔“

”تو بھائی کہہ تو رہا ہے وانہ یا افغانستان سے مل جائیں گی۔“

میں بے بسی سے ہنسا۔ ”وہاں جائے گا کون؟“

”وانہ تو ابھی ایک آدمی کو روانہ کر دیتے ہیں، اگر یہاں سے نہ ملیں تو کل سویرے کسی کو افغانستان بھیج دیں گے۔“

''اور یہ جو چاروں طرف جہانداد خان کے آدمیوں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے؟''میں نے اسے اصل مسئلے کی طرف متوجہ کیا۔

''دونوں قبیلے عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمارے قبیلے کے عمر رسیدہ مرد موٹر سائیکل پر بیٹھ کر آسانی سے وانہ یا کہیں اور جا سکتے ہیں۔''

''بہت اچھا......''میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔''پھر کسی کو ابھی بھیج دو۔''

''ٹھیک ہے لیکن گولی کا نمونہ بھیجنے کے بجائے آپ اس رائفل کا نام لکھ دیں۔''

میں نے کوئلے سے ماچس کی ڈبی کی اندرونی جانب بیرٹ ایم 107 کا نام لکھ کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

''یہ میں خود کسی کو دے کر آتا ہوں۔''ماچس کی ڈبی کا ٹکڑا جیب میں ڈال کر وہ مورچے سے نکل گیا۔

پر شور فائرنگ ایک مرتبہ پھر اکا دکا فائر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ پلوشہ ہماری باتوں سے بے نیاز دوربین آنکھوں سے لگائے دشمن کی نقل حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ میں نے بھی دوبارہ ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے پر آنکھ ٹکا دی۔

پلوشہ نے مجھے مطلع کرتے ہوئے کہا۔''دو آدمی ایک دم درختوں سے اتر کر نیچے پتھروں میں چھپ گئے ہیں۔''

''اسی وقت بتانا تھا۔''

''آپ سردار سے محو گفتگو تھے۔ جب تک آپ شست لیتے وہ غائب ہو چکے ہوتے۔''

''یقیناً وہ دونوں بھی سنائپر تھے اور اپنے ساتھی کا انجام دیکھنے کے بعد انھوں نے نیچے اترنے میں عافیت سمجھی۔''

''ایس ایس کا نام بڑوں بڑوں کا پتّہ پانی کر دیتا ہے۔''پلوشہ فخریہ انداز میں ہنسی۔

''تمھیں تو کبھی ڈر نہیں لگا۔''میں نے اپنی شست شمالی پہاڑی سے مشرقی پہاڑی پر منتقل کرتے ہوئے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

اس نے پیچھے مڑ کر خوشحال خان کو دیکھا جو اس وقت اپنے آدمیوں کو نئے احکام جاری کر رہا تھا۔ اسے

مصروف دیکھ کر وہ میری جانب متوجہ ہوئی۔
''مجھے اپنے راجو سے کیوں کر ڈر لگنے لگا۔'' میرے پیٹ میں انگلی چبھوتے ہوئے وہ لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔
میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔''جس وقت چھینٹی لگائی تھی اس وقت بھی ڈر نہیں لگا تھا۔''
''ڈر نہیں لگا تھا بس غصہ آیا تھا۔اور اس کے بعد اگر آپ سردار بھائی کے سامنے مجھے پٹائی کرنے کی وجہ بیان نہ کرتے تو شاید میں اسی رات آپ پر حملہ کر دیتی۔''
''اور وجہ سن کر آپ نے مجھے معاف کر دیا ہیں نا۔'' ہم دونوں دبی زبان میں باتیں کر رہے تھے تا کہ خوشحال خان تک ہماری آواز نہ پہنچ جائے۔مگر ہماری احتیاط بے کار تھی کیونکہ وہ مورچے کے دوسرے کونے میں بیٹھا ہر آدمی سے تازہ صورت حال پوچھ رہا تھا۔سردار کا اپنا مورچہ اس پہاڑی کے تقریباً درمیان میں تھا اور وہ کوئی چھوٹی سی پہاڑی نہیں تھی کافی پھیلی ہوئی اور وسیع پہاڑی تھی۔اس سے پہلے بھی دو مرتبہ وہ قبیل خان کے قبیلے سے یہیں پر رہ کر جنگ لڑ چکے تھے۔قبیل خان کے آدمیوں کا جسمانی حملہ روکنے کے لیے پہاڑی کے نچلے حصے میں بھی اس کے آدمی موجود تھے۔مگر وہ ایسے مضبوط مورچوں میں تھے کہ نشیب میں ہونے کے باوجود دشمن کے فائر سے محفوظ تھے۔خوشحال خان کے لشکر کے زخمی اور مرنے والے تمام آدمی بلندی کے مورچوں ہی پر نشانہ بنے تھے۔نیچے والوں کو ایک فائدہ گھنے درختوں کا بھی حاصل تھا۔اور گھنے درختوں ہی وجہ سے خوشحال خان نے آدمی نشیب میں رکھے تھے کہ ان درختوں کا فائدہ اٹھا کر دشمن آسانی سے اوپر تک پہنچ سکتا تھا۔
''نہیں معاف نہیں کیا تھا فدا ہو گئی تھی۔ پلوشہ نے محبت سے لبریز لہجے میں جواب دیا۔''یہ تو خیر میں پہلے سے جانتی تھی کہ میں خوب صورت ہوں، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی خوش قسمت بھی ہوں۔''
''اپنی خوب صورتی کی بہت دعوے دار ہو۔''
''اس میں شک ہی کیا ہے۔'' اس نے حسب سابق فخریہ لہجے میں کہا۔اور دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگا لی۔وہ شمال کی طرف موجود پہاڑی میں دشمنوں کو کھوج رہی تھی اور میں مشرقی پہاڑی پر اپنی شست گاڑے ہوئے تھا۔مشرقی پہاڑی کی بلندی سے ایک آدمی درختوں کی آڑ لے کر مجھے نیچے اترتا نظر آیا۔میں نے اس کا فاصلہ ناپا، وہ

قریباً ڈیڑھ کلومیٹر دور تھا۔ اترائی میں آنے کی وجہ سے اس کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ مگر وہ بڑی احتیاط سے حرکت کر رہا تھا۔ ایلیویشن ناب کو مطلوبہ رینج پر گھما کر میں نے اسی پر شست باندھ لی۔ میں اس کی کسی غلطی کا منتظر تھا۔ جلد ہی اس نے مجھے یہ موقع دے دیا۔ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں ہو کر اس نے اپنا سر پتھر سے اوپر نکالا اور ہماری پہاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ اگر میری پہلے سے اس پر نظر نہ ہوتی تو یقیناً اتنے فاصلے سے پتھر کی آڑ سے نکلا ہوا اس کا سر نہ دیکھ پاتا۔ میں نے سرعت سے اس کا فاصلہ دوبارہ ناپا اور مطلوبہ رینج لگا کر شست لیتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

''ٹھک۔'' کی آواز سنتے ہی خوشحال خان نے کہا۔ ''میرا خیال ایک اور اپنے سردار قبیل خان کے پاس پہنچ گیا ہے۔''

''آپ کے اندازے کو کون غلط کہہ سکتا ہے سردار۔''

''یقین کرو آپ نے میرے دل سے اپنے مرنے والے آدمیوں کے غم کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ جہانداد ہی گھٹنے ٹیکے گا۔ اور ایک دو دن کے اندر جرگہ بلانے کا سوچے گا۔''

''آپ بس اس رائفل کی گولیوں کا بندوبست کریں باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔''

''گولیاں امید ہے کل صبح تک پہنچ جائیں گی۔ نہیں تو اگلی صبح کو تو لازماً پہنچیں گی۔''

پلوشہ نے مجھے پکارا۔ ''راجو!......حرکت نظر آ رہی ہے۔''

''کس طرف۔'' میں فوراً اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے مطلوبہ درخت کی نشاندہی کی۔ وہ بھی مچان بنی ہوئی تھی اور اندر بیٹھے اناڑی سنائپر کے حرکت کرنے کی وجہ سے ٹہنیاں ہلنے لگی تھیں۔ گو اس علاقے میں پہاڑی بلندیوں پر عموماً تیز ہوا چلتی رہتی ہے، لیکن اس دن خوش قسمتی سے ہوا بالکل ساکن تھی۔ سات سو میٹر دور اس درخت پر شست سادھ کر میں چھپے ہوئے آدمی کی جگہ کا تعین کرنے لگا۔

اتنے فاصلے سے گھنی جھاڑیوں کے اندر آدمی پہچان نہیں ہو سکتی۔ اور اگر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تو یقیناً میں اس کی جگہ کا تعین نہ کر سکتا۔ مگر انسان کی فطرت ہے کہ وہ مسلسل ساکن نہیں بیٹھ سکتا۔ البتہ کسی سنائپر کو کڑی تربیت کی بھٹی سے گزار کر اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ بے حس و حرکت کئی کئی گھنٹے گزار دے۔ چیونٹیوں اور

دوسرے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے پر بھی حرکت نہ کرے اور نہ انھیں اپنے جسم سے دور جھٹکے۔استاد راؤ تصور صاحب تو اپنے ایک دوست سنائپر کا واقعہ سنایا کرتے کہ دشمن کے علاقے میں ایک بار انھیں دو مرتبہ بچھو نے ڈسا لیکن وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔اور یہی خصوصیات ایک اچھے اور اناڑی سنائپر میں فرق کرتی ہیں ۔میرے ہدف، سنائپر سے بھی زیادہ دیر ساکن نہ بیٹھا رہا گیا اور اس نے پہلو تبدیل کرتے ہوئے حرکت کی ۔ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑی رائفل کو نیچے رکھا تھا۔اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں اس کی ساری جسمانی ہیئت کا خاکہ بن گیا تھا۔اسی وقت پلوشہ نے مجھے دوبارہ آواز دی۔

"راجو!......وہ پھر حرکت کر رہا ہے۔"

"ہاں چندا!......بس اب اس کی زندگی کا آخر بار حرکت کرنا باقی رہ گیا ہے۔" یہ کہتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا ۔" درخت کی شاخوں میں زوردار حرکت پیدا ہوئی اور منٹ بھر وہ حرکت قائم رہی۔یقیناً گولی اسے سر میں نہیں لگی تھی ورنہ وہ اتنی دیر نہ تڑپتا۔آہستہ آہستہ درخت کی ٹہنیاں پرسکون ہوتی گئیں۔اس کا مچان یقیناً اچھے طریقے سے بنایا گیا تھا کہ وہ نیچے نہیں گرا تھا۔

"راجو!......اگر آپ کی باقی ساری خوبیوں کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی آپ کی نشانہ بازی کی صلاحیت مجھے دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہے۔"

"بچے!......ذیشان بھائی کے تو ہم بھی دیوانے ہو گئے ہیں۔" جانے کس وقت خوشحال خان ہمارے پیچھے آ کر دوربین آنکھوں سے لگائے اسی جانب دیکھ رہا تھا۔شاید جس وقت مجھے پلوشہ نے ہدف کے بارے بتلایا تھا اسی وقت وہ اپنی گفتگو چھوڑ کر ہمارے قریب آ گیا تھا۔

پلوشہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔وہ دوبارہ بولا۔

"میرے حساب میں تو یہ ساتواں تھا۔"

پلوشہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔" آپ کا حساب بالکل درست ہے سردار!"

"ہمارے دو آدمی جان کی بازی ہارے ہیں، دو کے مقابلے میں سات آدمی کوئی برا سودا نہیں ہے۔" اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

اچانک تڑتڑاہٹ کی خوف ناک آواز ابھری، تین چار گولیاں ہمارے مورچے کی عقبی دیوار سے ٹکرائی تھیں ۔میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ 12.7 ایم ایم گن کی تڑتڑاہٹ کو میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے خلاف استعمال کی جانے والی یہ گن جتنی تباہی پھیلا سکتی تھی اس بارے مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز سنتے ہی خوشحال خان بھی فوراً بیٹھ گیا تھا۔

''ایک نئی مصیبت آگئی۔'' وہ بڑبڑایا۔

میں نے پوچھا'' آپ کے پاس 12.7 ایم ایم گن موجود نہیں ہے سردار!''

''فی الحال تو موجود نہیں ہے، البتہ خریدنے کا ارادہ ضرور رکھتا ہوں۔''

''ہونہہ!......'' کہہ کر میں پلوشہ کی جانب متوجہ ہوا۔''پلوخان!......اس گن کا مورچہ تلاش کرو۔''

اس نے فوراً کہا۔''اسی پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔''

اسی وقت گن ایک مرتبہ پھر گرجی۔ اس مرتبہ پہلے سے بھی لمبا برسٹ فائر کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے فوراً اس کا مورچہ تلاش کر لیا تھا۔ 12.7 کی رینج کافی زیادہ تھی لیکن اس کی خامی یہ تھی کہ اس کو فائر کرنے والے کو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر فائر کرنا پڑتا تھا۔ اور اس طرح فائر کرنے والے خود نشانہ بننے کا خطرہ موجود تھا۔ گن کی لمبی ٹانگوں کو اگر مکمل کھول کر بچھا دیا جاتا تو اس کا فائرر عقب میں بیٹھ کر یا لیٹ کر بھی فائر کر سکتا تھا لیکن اس طرح بھی فائرر کے لیے خطرہ بہرحال موجود ہوتا۔ یوں بھی گن سے فائر کرتے ہوئے ضروری تھا کہ فائرر شست باندھ کر فائر کرے اور گن کو مختلف اہداف پر فائر کرنے کے لیے گھمانا پڑتا ایسی صورت میں مورچے کے ہول کو تھوڑا کھلا بنانا پڑتا اور ہول کا کھلا ہونا سنائپرز کو دعوت دینے والی بات تھی۔ میں نے فوراً ہول پر شست باندھ لی تھی۔ گن قریباً تیرہ سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں پتھروں کی ایک دیوار بنا کر اس کے پیچھے گن کو کھڑا کیا گیا تھا۔ بہ غور دیکھنے پر مجھے اس کے پیچھے کوئی بھی کھڑا نظر نہ آیا۔ جو بھی اس گن کے عقب میں موجود تھا یا تو وہ جلدی جلدی ٹریگر دبا کر بیٹھ جاتا۔ یا وہ بیٹھے بیٹھے ہی بغیر شست لیے ٹریگر دبا رہا تھا۔ گن کے دوبارہ گرجنے پر مجھے موخّر الذکر بات صحیح لگی کہ کوئی ہیولہ بھی گن کے پیچھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہی بات پلوشہ نے بھی پوچھی۔''راجو!......کوئی فائر کرنے والا تو نظر نہیں آ رہا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ بیٹھ کر بغیر شست لیے فائر کر رہا ہے۔''

یہ معلوم ہونے کے بعد بھی میں اسی جانب نگران رہا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ مسلسل فائر کے بعد جونھی گن کی ایک میگزین خالی ہوتی فائرر لازماً دوسری میگزین چڑھانے کے لیے تھوڑا سا اوپر ہوتا۔ (12.7 ایم ایم گن پر گولیوں کا بیلٹ چڑھا کر فائر کیا جاتا ہے۔ لیکن خود وہ بیلٹ میگزین میں رکھا ہوتا ہے)

جلد ہی مجھے اپنا اندازہ درست ہوتا نظر آیا۔ فائرنگ میں ذرا سا وقفہ آیا۔ کسی نے بیٹھے بیٹھے نئی میگزین گن کے ساتھ لگائی اور گولیوں کے بیلٹ کی پہلی گولی کو مخصوص جگہ پر رکھنے کے لیے اس نے ذرا سا سر اوپر کیا اور بیلٹ کو گن کے فیڈ ٹرے میں رکھنے کی حسرت دل میں لیے وہ پیچھے کو الٹ گیا۔

میں نے فوراً رائفل کو دوبارہ کاک کر کے اسی جگہ شست قائم کر لی۔ لیکن اس کے بعد کسی کو یہ بے وقوفی کرنے کا خیال نہ آیا۔ اب اسے سنائپرز کی ہٹ دھرمی کہیں یا ثابت قدمی کہ وہ اتنی جلدی کسی جگہ کی شست لینا نہیں چھوڑتے۔ میں بھی اسی جانب نگران رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد پلوشہ نے مجھے ایک اور جانب متوجہ کیا۔ درخت کے عقب میں لیٹے ہوئے آدمی نے سر کا تھوڑا سا حصہ باہر نکال کر شاید کسی سے بات کی تھی۔ میرے شست لینے تک وہ دوبارہ درخت کے عقب میں ہو گیا تھا۔ ایک دو منٹ وہیں شست باندھے رکھنے کے بعد میں اپنی شست دوبارہ مورچے پر لے جا ہی رہا تھا اس نے دوبارہ سر باہر نکالا۔ اس مرتبہ اس کا کندھوں تک جسم درخت کی آڑ سے باہر آیا تھا۔ آگے کو جھک کر وہ کوئی چیز اٹھا رہا تھا جو درخت سے تھوڑے فاصلے پر موجود مورچے سے اس کے ساتھی نے پھینکی تھی۔ مذکورہ چیز سگریٹ نسوار یا اسی قسم کی کوئی اور چیز ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹریگر دبا کر موصوف کی جان اس لت سے چھڑا دی۔ اب اسے نہ سگریٹ کی ضرورت تھی اور نسوار کی حاجت۔ وہ اسی طرح آدھا درخت کی آڑ سے باہر اور آدھا درخت کے پیچھے پڑا رہ گیا تھا۔

اس ساتھ ہی میں فوراً اپنی شست 12.7 ایم ایم کے مورچے پر لے گیا۔ آخری مقتول 12.7 ایم کے مورچے سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے ہی پر ہوا تھا۔ اپنے ساتھی کو گولی لگتے دیکھ کر اس نے سوچا شاید میں کسی اور طرف مصروف ہوں اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ گن کو لوڈ کر سکتا ہے۔ یہ غلطی بے چارے کو لے ڈوبی۔

اسی وقت آئی کام سیٹ دشمن کے کسی کمانڈر کی طرف سے مجھے گندے گندے القابات سے یاد کرتے ہوئے

اپنے تمام آدمیوں کو ہلکی سی حرکت سے بھی سختی سے منع کیا جانے لگا۔

اس کی جھلائی ہوئی، خوف زدہ اور چڑچڑی آواز سن کر خوشحال قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''ویسے اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عددی برتری کے باوجود جہانداد خان کو اس لڑائی میں شکست ہو گی ،کیونکہ ہم پر حملہ کرنے کی جرّات وہ کر نہیں سکتا کہ میرے آدمی مورچوں میں تیار بیٹھے ہیں اور اس کے پاس ایس ایس جیسا کوئی نشانے باز موجود ہی نہیں کہ وہ ہمیں منہ توڑ جواب دے سکے۔''

''ان شاء اللہ فتح ہماری ہی ہوگی خوشحال خان۔''میں نے پتھر سے ٹیک لگاتے ہوئے آرام دہ حالت بناتے ہوئے اعتماد سے کہا۔پلوشہ البتہ اب تک شست لیے ہوئے تھی۔

خوش حال کے آدمی وقتاً فوقتاً اکادکا فائر کر کے اپنے جاگنے کا ثبوت دے رہے تھے۔دشمن کی طرف سے کبھی کبھی ایک دم پر شور فائرنگ شروع ہو جاتی اور کبھی کبھی بالکل خاموشی چھا جاتی۔

گھنٹا بھر شمالی اور مشرقی اطراف میں دشمن کی حرکت دیکھنے کی کوشش کرنے کے بعد پلوشہ مورچے کے مخالف جانب آئی اور جنوب کی سمت دیکھنے لگی۔جنوب کی جانب ان کے مورچے زیادہ فاصلے پر تھے۔جنوب سے وہ مغرب کی سمت نگراں ہوئی اور دو تین منٹ بعد اس نے جوش بھرے انداز میں کہا۔

''راجو!......ادھر آ کر دیکھونا۔''

میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔''ایسی خاص چیز کیا مل گئی ہے۔''

دوربین میری جانب بڑھا کر وہ مغرب کی جانب ایک اونچی ٹیکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ۔''اس بلندی پر کھڑے آدمیوں کی طرف دیکھو؟''

''میں نے مذکورہ سمت میں دیکھا ،طاقتور دوربین مجھے اس جگہ چار دراز قامت آدمی کھڑے نظر آئے ۔بالکل آگے کھڑے ہوئے آدمی کے سر سفید قراقلی ٹوپی اور سفید کپڑوں پر پہنی کالی سیاہ واسکٹ سے مجھے لگا وہ جہانداد خان ہے۔اس کے عقب میں کھڑے تین لمبے تڑنگے محافظ جن کے سر پر پگڑیاں بندھی تھیں وہ بھی خیال کی تصدیق کر رہے تھے۔اور یقیناً پلوشہ نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔خوشحال خان بھی ہمارے کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔دوربین آنکھوں سے لگائے بغیر بولا۔

”آپ لوگ غالباً جہانداد خان کی پہچان کر رہے ہو۔“

”آپ کو کیسے پتا؟“

”پچھلی لڑائی میں سردار قبیل خان نے بھی اسی جگہ اپنا ڈیرہ لگایا تھا۔“

میں جانتا تھا کہ پلوشہ نے مجھے کیوں اس جانب متوجہ کیا تھا۔ میں نے فاصلہ ناپنے والا آلہ نکال کر فاصلہ ناپا وہ پچیس سو میٹر دور تھا۔ بیرٹ ایم 107 کا مکمل رینج ساڑھے اٹھارہ سو تھا اس لحاظ سے وہ ساڑھے سات سو میٹر دور تھا۔ آلہ واپس تھیلے میں ڈالتے ہوئے میں نے پلوشہ کی طرف دیکھ کر مایوسی بھرے انداز میں سر دائیں بائیں ہلا دیا۔

”وہاں تک گولی نہیں جاتی؟“ اس نے زبان سے بھی تصدیق چاہنا ضروری سمجھا تھا۔

”اس رائفل کی رینج ساڑھے اٹھارہ سو میٹر تک ہے اور وہ پچیس میٹر دور کھڑا ہے۔“ میں نے وضاحت کی۔

”اگر آپ مغربی کنارے سے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کریں تو پھر؟“ پلوشہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔

اس کی بات میرے دل کو بھی لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آلہ نکال کر جس پہاڑی پر ہم موجود تھے اس کے انتہائی مغربی کونے پر موجود ایک گھنے درخت کا فاصلہ ناپا۔ وہ فاصلہ تقریباً دو سو چالیس میٹر تھا۔

”اگر ان گھنے درختوں پر مچان بنائی جائے تو شاید کوئی امید نکل آئے۔“ میں نے امکانی لہجے میں کہا۔

”آپ کا مطلب ہے مغربی کونے میں موجود درختوں پر فائر کرنے کی جگہ بنا کر جہانداد خان کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔“ خوشحال خان نے ہماری گفتگو سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے جوش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”سو فیصد یقینی نہیں ہے۔“

”کچھ امید تو موجود ہے نا؟“ وہ خاصا پر جوش تھا۔

اس مرتبہ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اس نے فوراً کہا۔ ”بس ٹھیک ہے آج رات کو میں ان درختوں پر فائر کی جگہ بنوا دوں گا۔“

”آپ کے آدمیوں سے تو وہ جگہ نہیں بنے گی، مجھے خود ہی کوشش کرنا پڑے گی۔“

”آپ کا ہاتھ ہی بٹا لیں گے۔“ خوشحال نے اضطراری انداز میں ہاتھ مروڑے۔ قبائل کی لڑائی میں کسی

قبیلے کے سردار کا مرنا بہت بڑی بدبختی اور شرم کی علامت تھا۔ ایک قبیلے کی کے لیے اپنے سردار کی حفاظت نہ کر سکنا مر جانے کا مقام تھا۔

میں پتھریلی چٹان سے ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ ساری رات نیند نہ کرنے کی وجہ سے سستی جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہوتی دیکھ کر پلوشہ نے فوراً تھیلے سے دونوں سلیپنگ بیگ نکال کر نیچے بچھائے اور مجھے ان پر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ میرے ہونٹوں پر شکر گزار کی مسکراہٹ ابھری اور میں ان سلیپنگ بیگز پر لیٹ گیا۔ ایک ہلکی چادر مجھے اوڑھا کر اس نے آہستہ سے میرا سر سہلایا اور دوبارہ مشرقی و شمالی جانب موجود دشمن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

آنکھیں بند کرتے ہوئے مجھے اس پر بے تحاشا پیار آ رہا تھا۔ وہ میرا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ شادی ہونے سے پہلے ہی اس نے بیوی کی جگہ سنبھال لی تھی۔ میری چھوٹی موٹی ضرورتوں پر اس کی یوں نظر ہوتی کہ میں حیران رہ جاتا۔ چند دنوں کے اندر ہم نے صدیوں کا سفر طے کر لیا تھا۔ وہ میری ایسی مزاج آشنا بن گئی تھی کہ میرے چہرے سے ہویدا تاثرات سے بات کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔ میری سوچوں کی رو تھوڑا سا پیچھے کو چلی اور مجھے اس سے پہلی بار کا ملنا یاد آ گیا۔ کتنی بے دردی سے میں نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس لڑکی کو میں یوں ظالمانہ انداز میں زدوکوب کر رہا ہوں وہ مجھے اتنی پیاری ہو جائے گی کہ اس کی ہلکی سی تکلیف بھی مجھے گوارا نہیں ہوگی۔ نیند آنے تک میں اسی کی سوچوں میں کھویا رہا بلکہ سونے کے بعد بھی اس کی سوچیں میرے خوابوں کی زینت بنی رہیں۔

شام کی آذان کے ساتھ مجھے پلوشہ نے جگایا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''پتا ہے، آپ کی رائفل سے تین گولیاں چلا کر میں نے بھی ایک آدمی مار گرایا ہے۔''

''مطلب دو گولیاں ضائع کر دیں۔''

''تو کیا آپ نے زندگی میں کوئی گولی ضائع نہیں کی۔'' اس نے منہ پھلا لیا تھا۔

''بات تربیت کی نہیں، عملی زندگی کی ہے۔'' سلیپنگ بیگ سے نکل کر میں نے پانی کی بوتل اٹھائی اور مورچے کے ایک کونے میں وضو کرنے لگا۔

”معذرت چاہتا ہوں، آپ کی رائفل کو بغیر پوچھے ہاتھ لگا دیا۔“ خوشحال خان کی وجہ سے اس نے لڑکوں کے انداز میں بات کی تھی۔

وضو کر کے میں نے شام کی نماز ادا کی اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

”دشمن کو گولی کس جگہ لگی تھی؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”آپ سے مطلب۔“ شاباش کی امید میں اس نے مجھے جگاتے ہی یہ خبر سنائی تھی اس لیے میری تنقید اسے ہضم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔ ”اچھا میں اگر تمھاری تعریف کر دیتا تو تمھیں کیا مل جاتا۔“

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”اگر آپ میری تعریف کر دیتے تو آپ کا کیا چلا جاتا۔“

”اچھا ابھی کہہ دیتا ہوں، شاباش پہلی بار تیسری گولی پر بندہ مار گرانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“

”زہر لگ رہی ہے مجھے آپ کی تعریف۔“ جلے کٹے انداز میں کہتے ہوئے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر واپس بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ اتنی بڑی غلطی تو نہیں تھی جس کی اتنی بڑی سزا دی جا رہی ہے۔“

نہ جانے میرے لہجے میں ایسی کون سے بات تھی کہ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”اتنی جلدی پریشان نہ ہوا کریں۔آپ سے خفا ہونا میرے بس ہی میں نہیں ہے۔“

میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”اور یہ جو میرے قریب سے اٹھ کر بھاگی جا رہی تھیں وہ؟“

”لاڈ کر رہی تھی اپنے راجو سے۔“ میرا ہاتھ اپنے پیارے ہاتھوں میں تھام کر وہ سہلانے لگی۔ قابل خان کھانا لے کر واپس پہنچ گیا تھا۔ خوشحال خان اسے دشمن کے گیارہ بندوں کی ہلاکت کی خوش خبری سنا رہا تھا۔

”قبیل خان کے آدمی یونہی تو ایس ایس سے خوف زدہ نہیں تھے، آخر کوئی بات تو تھی نا۔“ قابل خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

کھانا کھانے کے دوران خوشحال خان نے قابل خان کو بتا دیا تھا کہ ہمارا کل کا پروگرام کیا ہے۔ قابل خان خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے آپ لوگ لڑائی کے طول کھینچنے پر راضی نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔''ارادہ تو ایسا ہی ہے، بس دعا کرو کہ وہ رینج میں آجائے۔''

قابل خان نے''سیدھی بات تو یہ ہے ذیشان بھائی، ہمیں آپ پر کچھ ایسا اعتماد اور یقین ہو گیا ہے کہ اگر وہ رینج میں نہ بھی آیا تب بھی آپ اسے مار گرائیں گے۔''

''آپ کا حسن نظر ہے قابل خان ورنہ ناممکن کا وقوع کرامت کے زمرے میں آتا ہے اور کرامت کا ظہور اولیاء کرام کا خاصہ ہے۔''

قابل خان فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''اہل فن اپنے میدان میں مہارت کا ثبوت دیتے رہا کرتے ہیں۔''

''اہل فن ہوں کہ نہیں البتہ اپنا پورا زور لگاؤں گا۔''

اندھیرا گہرا ہوتے ہی ہم پہاڑ کے غربی حصے کی جانب چل پڑے تھے۔آسمان پر بادل جمع ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اندھیرا کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا تھا۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔اس علاقے میں موسم عموماً خراب ہی رہتا ہے۔تیز ہوا، بادل، بارش اور برف باری یہ اس علاقے کی خصوصیات میں سے ہے۔بالکل مغربی کنارے پر دو اونچے درخت مجھے مچان بنانے کے لیے بہتر لگے۔اونچے درختوں کا انتخاب میں نے فاصلے کو کم کرنے کے لیے کیا تھا۔گو چند فٹ کا فاصلہ کوئی معنی نہیں رکھتا، مگر میں کوئی بھی امکان نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ٹارچ کے اوپر کپڑا لپیٹ کر میں نے اس کی تیز روشنی کو مدہم کر دیا تھا تا کہ اس کی روشنی دور تک نہ جا سکے۔

ایک چھوٹی سی کلھاڑی اور چند رسیاں لے کر میں اکیلا ہی اوپر چڑھ گیا کہ یہ کام ان میں سے کوئی بھی مجھ سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔مجھے دو گھنٹے اوپر ہی گزارنے پڑ گئے تھے۔مچان بنا کر میں نیچے اترا قابل خان پلوشہ اور خوشحال خان اسی درخت کے نیچے ہی میرا انتظار کر رہے تھے۔میرے نیچے اترتے ہی پلوشہ فکر مندی سے بولی۔

''راجو!......جس درخت کا انتخاب آپ نے کیا ہے یہاں چھپاؤ کا اتنا زیادہ انتظام نہیں ہے، یہاں آپ دشمن کے سنائپر کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں۔''

''امکان تو ہے۔''میں ہلکے سے مسکرایا۔

اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔''بس پھر آپ یہیں زمین سے فائر کرنا اوپر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''مگر......؟''

''اگر مگر کی ضرورت نہیں اور واپس چلیں۔'' جھگڑالو بیویوں کے سے انداز میں کہتے ہوئے وہ مورچے کی جانب بڑھ گئی۔ میں بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔ غصے میں اس نے ہمارا انتظار کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

''ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہوں گے ذیشان صاحب!'' خوشحال دھیمے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''نہیں سردار!......آپ بے فکر ہو کر بات کریں۔'' میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ بالکل قریب ہونے کے باوجود اندھیرے میں اس کا ہلکا سا ہیولہ ہی نظر آ رہا تھا۔

''آپ کے معاملے میں آپ کے دوست کی عادتیں بالکل لڑکیوں جیسی ہیں۔''

''بھلا وہ کیسے؟'' میں اس کی بات پر حیران رہ گیا تھا۔ جبکہ قابل خان گلا کھنکار کر رہ گیا۔

''کل سہ پہر کو آپ لیٹے تھے تو دو تین بار آپ کے اوپر چادر درست کی اور پھر میں مخابرے پر بات کر رہا تھا تو مجھے بھی کہنے لگا کہ، سردار اگر محسوس نہ کرو تو آہستہ بات کرو کہیں وہ جاگ نہ جائے اور پھر ابھی دیکھو کیسے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا کر چل دیا۔ اسے بتاؤ بھئی، لڑکوں کے یہ چلن نہیں ہوتے۔''

''یہ بھی خوب کہی سردار!......'' میں نے پلوشہ کے لڑکی ہونے کی بات مزید راز میں نہ رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ میری منگیتر ہے۔''

''کیا؟'' خوشحال خان حقیقی طور پر اچھل پڑا تھا۔

''ہاں یہ سچ ہے اور اس بارے صرف قابل خان کو معلوم ہے۔ اب آپ سے بھی یہی درخواست ہے کہ اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔''

''مگر اسے لڑکوں کا روپ دھارنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔''

''یہ لمبی کہانی ہے سردار!......پھر کبھی سہی۔''

''ویسے آپ کو اسے یوں اپنے ساتھ خطروں میں نہیں گھسیٹنا چاہیے تھا۔''

''اس بارے آپ قابل خان سے پتا کر لیں کہ یہاں تک آتے ہوئے ہمارے درمیان کتنی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ لڑنے مرنے پر اتر آئی تھی۔''

''تو اسے اتنا سر پر نہ چڑھاؤنا۔'' خوشحال خان سنجیدہ لہجے میں مشورہ دیا۔

میں نے بے بسی سے کہا۔''یہ بات بھی میرے بس سے باہر ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر بھگتو۔'' خوشحال خان نے قہقہہ لگایا، قابل خان نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہونے کے ساتھ ہوا کی شدت میں بھی تھوڑی سی تیزی آگئی تھی۔

مورچے میں جاتے ہی سردار خوشحال نے قابل خان کو کہا۔''ان دونوں کو بیٹھک میں لے جاؤ، موسم کے تیور ٹھیک دکھائی نہیں دیتے۔''

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''یہ نہیں ہوسکتا سردار۔''

''آپ کو اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لیے بالکل بھی یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کتنے پانی میں ہیں۔ دو اکیلے آدمی اگر قبیل خان جیسے سردار سے ٹکرا کر اسے فنا کر سکتے ہیں تو ان حالات میں ان کے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور میں آپ کو کسی مقصد کی خاطر بھجوا رہا ہوں، کل کا دن بہت اہم ہے اور میں نہیں چاہتا موسم کی وجہ سے آپ کی صحت تھوڑی سی بھی خراب ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ ہلکے سے ہنسا۔''البتہ آپ کا دوست یہیں رات گزارنا چاہے تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں کیوں یہاں رات گزاروں گا۔'' پلوشہ بگڑ کر بولی۔''میں راجو کے ساتھ ہی جاؤں گا یا ہم دونوں یہیں رہیں گے۔''

''ایس ایس کو تو میں اس لیے بھیج رہا ہوں کہ کل اسے اہم کام سرانجام دینا ہے آپ کس خوشی میں جانا چاہتے ہیں۔'' خوشحال خان اسے تنگ کرنے پر تلا تھا۔

''میں اپنے دوست کے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے ذیشان سے آپ کا نکاح ہوگیا ہو۔''

وہ تنک کر بولی۔''نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔''

''یار!......آپ لڑکے ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

"میری مرضی اس میں کسی کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔" مجھ سے دوری کا سن کر اس نے سارے اخلاقیات پس پشت ڈال دیے تھے۔

میں نے ہنستے ہوئے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ "چندا!......سردار تمھیں تنگ کر رہا ہے۔ میں نے اسے تمھارے لڑکی ہونے کی بابت بتا دیا ہے اس لیے تمھیں چھیڑ رہا ہے۔"

میری بات سنتے ہی ایک دم اسے چپ لگ گئی تھی۔

خوشحال خان نے اس کے قریب ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جیتی رہو بیٹی! تم جیسی بہادر اور دلیر لڑکیاں قابل فخر ہوتی ہیں، کاش تم محسود قوم سے ہوتیں۔"

"شکریہ سردار چچا!" پلوشہ کی آواز میں ہلکی سی خفت موجود تھی۔

"ٹھیک ہے آپ دونوں قابل خان کے ساتھ جاؤ، میں کوشش کرتا ہوں کہ آدھے لوگوں کو آرام کرنے کے لیے گھروں میں بھیج دوں، یہاں پر رات کے وقت اتنی نفری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "سردار!...... گستاخی معاف، ایسا بھول کر بھی نہ کرنا۔ موسم دیکھ رہے ہیں آپ۔ ایسے ہی موسم سے فائدہ اٹھا کر دشمن پیش قدمی کر سکتا ہے۔ آج ان کے گیارہ بارہ آدمی ہلاک ہوئے ہیں اور ان کا گھیرا اگر یونھی قائم رہا تو مزید بھی جائیں گے۔ ہمیں ان کے گھیراؤ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہمیں کھانا پینا وقت پر مل رہا ہے۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی عددی برتری کا فائدہ اٹھا کر حملہ کرے۔ اور حملہ کرنے کے لیے اس سے بہتر موسم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر روزانہ تھوڑے بہت آدمی آپ آرام کرنے کے لیے گھروں میں بھیجتے بھی ہیں تو آج ایسا نہ کریں۔"

قابل خان میری تائید کرتا ہوا بولا۔ "ایس ایس ٹھیک کہہ رہا ہے سردار بھائی!" وہ دونوں بھائی کبھی مجھے ایس ایس اور کبھی ذیشان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

خوشحال خان سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ "ویسے مجھے لگتا تو نہیں کہ جہانداد خان اتنی جرّات کا مظاہرہ کرے گا۔"

"سردار!...... اگر حملہ نہ ہوا اور آپ کے آدمیوں نے یہیں رات گزاری تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اور اگر

حملہ ہو گیا اور آپ کے آدھے آدمی یہاں نہ ہوئے تو...........‘‘میں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

’’شاید آپ مجھے ڈرا رہے ہیں، مگر میں ڈرنے والوں میں سے نہیں۔‘‘

’’ڈرا نہیں رہا محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں اور احتیاط کرنا سمجھداری ہوتی ہے نہ کہ بزدلی۔‘‘

’’اگر بالفرض انھوں نے حملے کی بابت سوچا بھی تو جونھی ہی وہ مخابرے پر حملے کا حکم دے گا ان کی آمد سے پہلے میں نے اپنے گھروں میں جانے والے آدمیوں کو واپس بلایا ہوگا۔‘‘

میں نے کہا۔’’ایسے حملوں میں رازداری برتی جاتی ہے سردار!......یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے پاس ان کی باتیں سننے کے لیے آئی کام سیٹ موجود ہے۔بالکل اس طرح جیسے ان کے پاس ہمارا کینوڈ سیٹ موجود ہوگا۔‘‘

’’سردار!......ایسا ہے کہ آپ مہمانوں کے ساتھ گھر تشریف لے جائیں آج میں یہیں پر ہوں اور آپ کی غیر موجودی میں میرا ہی حکم چلے گا۔‘‘قابل خان نے اسے مخمصے میں پڑتے دیکھ کر مشورہ دیا۔

’’نہیں آپ جائیں، میں سب سنبھال لوں گا۔اور فکر نہ کرو میں کسی کو آرام کے لیے نہیں بھیج رہا۔‘‘

’’مجھے آپ پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔اور یوں بھی گزشتہ رات میں نے گھر میں گزاری تھی آج آپ کا نمبر پڑ رہا ہے۔‘‘قابل خان یقیناً اس سے کافی بے تکلف تھا۔

اس مرتبہ خوشحال خان نے مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے قدم ہمارے ساتھ بڑھا دیئے۔اپنے ہتھیار ہم نے اٹھا لیے تھے۔میں نے بیرٹ کو بھی وہاں چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔

خوشحال خان کے ساتھ گپیں کرتے ہوئے ہم نیچے اترنے لگے۔گھنٹا بھر میں ہم بیٹھک میں پہنچ گئے تھے۔بیٹھک کا دروازہ ہمارے لیے کھول کر اس نے پوچھا۔’’اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔‘‘

ہمارے نفی میں سر ہلانے پر وہ واپس مڑ گیا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے بیرٹ کو تھیلے سے باہر نکالا اور اس کی بیرل اور چال والے پرزے صاف کرنے لگا۔اگر فائر کرنے کے بعد ہتھیار کو بروقت صاف نہ کیا جائے تو ہتھیار کی کارکردگی میں فرق آسکتا ہے۔اور اگر مسلسل ہی ہتھیار کی صفائی کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہتھیار فائر کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔اور سنائپر حضرات تو ہتھیار کی صفائی کے بارے سخت قسم

کے وہمی ہوتے ہیں۔اپنا ہتھیار وہ اپنے ہاتھوں ہی سے صاف کرنا پسند کرتے ہیں۔استاد محترم راؤ تصور صاحب تو اگر کسی کے ہتھیار کو دوسرے آدمی کو صاف کرتے دیکھ لیتے تو صاحب ہتھیار کی کم بختی آجاتی۔نصیحتوں اور طنز بھرے وعظ کے ساتھ اسے جسمانی سزا بھی کاٹنا پڑتی۔دو تین سنائپروں کا یہ انجام دیکھنے کے بعد راؤ صاحب کی غیر موجودی میں بھی ہمیں یہ جرّات نہیں ہوتی تھی کہ اپنی رائفل کی صفائی کسی اور کے ذمہ لگائیں۔راؤ تصور صاحب تو رائفل کو ہماری شریک حیات اور عزت کہا کرتے تھے۔اور ان کی نصیحت بھری باتوں کے بعد عملی زندگی میں باقاعدہ قدم رکھنے کے بعد یہ چیز ہماری عادت ثانیہ بن گئی تھی۔

مجھے رائفل کی صفائی کرتے دیکھ کر پلوشہ نے میرا ہاتھ بٹانا چاہا اور میں نے اسے پیار سے منع کر دیا۔اب یہ علاحدہ بات ہے کہ اس قسم کی باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لایا کرتی تھی۔میں نے زیادہ زور اس لیے بھی نہیں دیا کہ استاد محترم کے قول کے مطابق بیرٹ ایم 107 اس کی سوکن ہی تو تھی۔اور اگر وہ اپنی سوکن کی خدمت کر رہی تھی تو میرا منع کرنا بچتا نہیں تھا۔میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دوبارہ استاد محترم راؤ تصور صاحب سے ملاقات ہونے پر ان سے یہ سوال ضرور پوچھوں گا کہ آیا ہماری رائفل کی صفائی ہماری اصل شریک حیات کر سکتی ہے یا نہیں۔

رائفل کی صفائی کے بعد پلوشہ نے مختلف پرزوں کو جوڑنا سیکھا اور پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔چھت پر بارش کی بوندوں کے مسلسل گرنے پر ایک خوب صورت ساز سا بج رہا تھا۔بستر پر لیٹے ہوئے اس نے میرے جانب رخ موڑا اور خواب ناک لہجے میں بولی۔

"شانی!......کتنی پیاری لگتی ہے بارش جب کوئی پیارا اتنے قریب ہو۔"

میں برجستہ بولا۔"قریب کہاں ہوا تنے دور تو لیٹی ہو۔"

اس کے لبوں پر دل آویز تبسم نمودار ہوا۔"تو کیا یہ کم ہے کہ نظر تو آ رہی ہوں۔اگر سردار چچا کے کہنے پر وہیں رک گئی ہوتی تو ساری رات آہیں بھرتے رہتے۔"

میں شرارتی لہجے میں بولا۔"نہیں جی آرام سے سو گیا ہوتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"یہ کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"یہ کیا؟"میں نے فوراً احتجاجی لہجے میں پکارا۔

"جب میری صورت دیکھے بغیر آپ کو آرام آجاتا ہے تو یونھی ہی سہی۔"

"مجھے مجبور نہ کرو کہ میں اٹھ کر تمھاری چارپائی پر آجاؤں۔" میں نے اسے للکارتے ہوئے کہا اور اس نے مسکراتے ہوئے دوبارہ میری جانب رخ موڑ لیا۔اسی طرح کی میٹھی نوک جھوک میں پتا ہی نہ چلا کس وقت اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔دن کو اچھی خاصی نیند لینے کے باوجود میں بھی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

ہم دونوں کی آنکھ فائرنگ کی پرشور آواز سے کھلی تھی۔ایک ساتھ سیکڑوں کلاشن کوفیں گرج رہی تھیں۔چھت پر ہونے والی ٹپ ٹپ ابھی تک موسم کے خراب ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

پلوشہ نیند سے بوجھل آواز میں بولی۔"راجو!......آپ کا اندزہ درست نکلا،لگتا ہے جہانداد خان کے آدمیوں نے موسم کا فائدہ اٹھا کر حملہ کر دیا ہے۔"

"دو جمع دو چار کی طرح اس کا حملہ کرنا بنتا تھا۔"

"کیا خیال ہے چلیں؟"

"اگر اپنے آدمیوں کی گولی سے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو چلے جاتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ خوشحال خان کے آدمیوں کو باہر سے آنے والا ہر آدمی جہانداد خان کا آدمی ہی لگے گا۔"

"کہہ تو صحیح رہے ہیں۔"اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔اور ہم بستروں میں لیٹے مسلسل ہوتی فائرنگ سنتے رہے۔میں دعا کر رہا تھا کہ خوشحال خان کے آدمی سستی اور غفلت کا شکار نہ ہوئے ہوں۔ایسا ہونے کی صورت میں انھیں بہت زیادہ نقصان پہنچتا ورنہ دوسری صورت میں جہانداد خان کی کمر ٹوٹ جاتی۔بوندیں گرنے کی آواز میں تھوڑی تیزی آئی اور فائرنگ کی شدت میں کمی آنے لگی۔پندرہ بیس منٹ بعد مسلسل تڑتڑاہٹ کی جگہ اکا دکا ٹخ ٹخ نے لے لی تھی۔میرے پاس کینوڈ تو موجود نہیں تھا البتہ آئی کام موجود تھا۔وہی آن کر کے میں چینل تبدیل کرنے لگا،مگر دشمن کی کوئی بات سن نہیں پایا تھا۔یقیناً انھوں نے اپنے ریڈیو سیٹ بند کیے ہوئے تھے اور حملے کے لیے جہانداد خان نے زبانی طور ہی پر اپنے احکام جاری کیے تھے۔ایسا کرنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ایک مورچے سے دوسرے مورچے تک یہ بات پہنچانا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔

فائرنگ کی شدت میں کمی آتے دیکھ کر ہم دوبارہ سو گئے تھے۔

صبح سویرے ہمارے پاس آتے ہی خوشحال خان مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

''شاباش جوان !......آپ کے مشورے کی بہ دولت آج ہم سرخ رو ہیں۔ دشمن کو بیس پچیس لاشوں کا تحفہ لے کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ ہمارے دس آدمی معمولی زخمی ہیں۔ دو کی حالت تھوڑی تشویش ناک ہے لیکن امید ہے وہ دونوں بھی جانبر ہو جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا میں آپ کے لیے ناشتا لاتا ہوں۔'' وہ واپس مڑ گیا۔

☆......☆......☆

ناشتا کر کے ہم اپنے سامان کے ساتھ مورچوں کی جانب چل پڑے۔ دشمن اپنے زخم چاٹ رہا تھا اس لیے گاہے گاہے ان کی جانب سے شدید فائرنگ شروع ہو جاتی۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی کہاوت بالکل ان کے حسبِ حال لگ رہی تھی۔ درختوں اور پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے ہم جلد ہی اوپر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہم قابل خان سے ملے۔ میرے گلے لگتے ہوئے اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

''ذیشان بھائی !......آپ کے مشورے نے ہمیں بہت بڑی تباہی سے بچا دیا ہے۔''

''تباہی سے بچانے والی اللہ پاک کی ذات ہے دوست۔''

وہ عقیدت سے بولا۔ ''ہاں مگر سبب تو آپ ہی بنے ہیں نا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا ذرا تفصیل ہی بتا دو۔''

جواباً اس نے جو کچھ کہا اس کا لبِ لباب یہی تھا کہ ہمارے جاتے ہی قابل خان نے ہر مورچے پر بہ ذات خود جا کر اپنے آدمیوں کو حملے کے بارے تیار رہنے کا حکم دیا۔ اور رات کو اڑھائی تین بجے جب جہانداد خان کے آدمی ٹولیوں کی صورت ان کے قریب آئے تو آگے سے خوش حال خان کے تمام آدمی تیار بیٹھے تھے۔ وہ موسم کی وجہ سے انھیں غافل سمجھ کر شکار کرنے آ رہے تھے۔ انھوں نے شکاریوں ہی کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ ان کے ایک دم فائر کھولنے پر پہلے تو وہ گھبرا کر پیچھے بھاگے اور پھر جوابی فائر شروع کر دیا۔ لیکن خوشحال خان کے تمام آدمی

مورچوں میں محفوظ تھے، جبکہ جہانداد کے آدمیوں کو پتھروں اور درختوں کی آڑ لینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ان کے کافی آدمی زخمی ہوئے اور بیس پچیس ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد قابل خان اندازے سے بتا رہا تھا۔ ہلاکتوں کی تعداد اس سے زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ اپنے آدمیوں کی لاشیں بھی وہ پیچھے نہیں لے جا پائے تھے۔

اس تفصیل کے ساتھ اس نے مجھے یہ خوش خبری بھی سنا دی تھی کہ ان کا ایک آدمی وانہ سے بیرٹ ایم 107 کی سو گولیاں خرید کر لے آیا تھا۔ اسلحہ فروش کے پاس بس اتنی ہی گولیاں دستیاب تھیں۔ بیرٹ ایم 107 کی گولیاں کافی مہنگی تھیں لیکن اس بارے قابل خان نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یوں بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اس بات سے ناواقف نہیں ہوں گا۔

ہماری آمد کے تھوڑی دیر بعد جہانداد خان کے کچھ آدمی ڈھلان سے اترتے دکھائی دیے۔ اسی وقت ان کے نزدیکی دو مورچوں سے سفید جھنڈے بلند ہو گئے۔ وہ اپنے آدمیوں کی لاشیں اٹھانے آ رہے تھے۔ قبائلی روایات کے مطابق خوشحال خان کے آدمی انھیں لاشیں اٹھانے سے نہیں روک سکتے تھے۔ گھنٹا ڈیڑھ نیچے گھوم کر انھوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو اکٹھا کیا۔ پھر لاشوں اور ان کے ہتھیاروں کو واپس لے گئے۔ اس دوران دونوں جانب سے فائرنگ رکی رہی۔ ان کی واپسی کے ساتھ سفید جھنڈے نیچے ہوئے اور دشمن کی طرف سے ایک برسٹ فائر کیا گیا جو جنگ کے دوبارہ شروع ہونے کا اعلان تھا۔

سفید جھنڈے کے لہرانے تک ہم مچان والی جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ پلوشہ کسی قیمت پر بھی میرے مچان پر چڑھنے پر راضی نہیں تھی۔ اس کی ضد دیکھتے ہوئے خوشحال خان اور قابل خان نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ میں البتہ اسے کچھ دیر سمجھاتا رہا مگر جب وہ ہتھے ہی سے اکھڑ گئی تو مجھے بھی چپ سادھنا پڑی۔ میں مغربی جانب ایک جگہ دیکھنے لگا۔ وہاں سے جہانداد خان کے مورچے کا فاصلہ ناپنے پر تقریباً 2300 میٹر نظر آیا۔ گویا بیرٹ ایم 107 کی کارگر رینج سے بھی کافی زیادہ تھا۔ (یہاں قارئین کی معلومات کے لیے ایک بات بتاتا جاؤں کہ سنائپر رائفل سے فائر کرنا کسی سائنس سے کم نہیں ہے۔ جب بھی کوئی سنائپر نیچے سے بلندی کی طرف یا بلند مقام سے نیچے کی طرف فائر کرتا ہے تو وہ ہدف کی براہ راست پڑھی جانے والی رینج نہیں لگاتا بلکہ افقی رینج لگاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اسے ہدف چاہے وہ نیچے ہو یا اوپر اس کا زاویہ درکار ہوتا ہے کہ سنائپر سے ہدف کی بلندی یا گہرائی

کا کتنا زاویہ بن رہا ہے۔اور پھر اس زاویے اور فاصلے کو ایک مخصوص تناسب سے جمع تفریق کرنے سے مطلوبہ رینج معلوم ہوتی ہے)

اس وقت ہدف کا فاصلہ 2300 میٹر تھا جب کہ ہدف ہم سے قریباً 35 ڈگری بلندی تھا۔فارمولے کے مطابق وہاں مجھے 1875 میٹر کا رینج لگانا چاہیے تھا۔درخت پر بنی مچان پر یہ فاصلہ ساڑھے اٹھارہ سو میٹر تک ہو جاتا لیکن وہاں مجھے پلوشہ نہیں جانے دے رہی تھی۔مجبوراً وہیں سے فائر کرنا پڑ رہا تھا۔کامیابی کی امید کم ہی تھی لیکن دنیا امید پر قائم تھی۔جہانداد خان ابھی تک وہاں پر دکھائی نہیں دے رہا تھا،لیکن امید تھی کہ جلد ہی وہ میدان جنگ کا جائزہ لینے کے لیے وہاں آموجود ہوتا۔فاصلہ وغیرہ ناپ کر میں نے رائفل کے ساتھ ساری ضروری کارروائیاں کیں اور جہانداد کے انتظار کے لیے وہیں لیٹ گیا۔قابل خان اور خوشحال خان وہیں بیٹھ گئے تھے ۔مچان پر چڑھنے کے لیے میری اور پلوشہ کی اچھی خاصی تکرار ہوئی تھی اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے بات نہیں کررہے تھے۔عجیب بات تھی کہ جب سے ہمارے درمیان قول وقرار ہوئے تھے ہمارے جھگڑے بڑھ گئے تھے ۔لیکن ان جھگڑوں کی وجوہات میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا جنون شامل تھا۔گویا ہم دونوں ایک دوسرے پر ذرا بھر بھی آنچ آتی نہیں دیکھ سکتے تھے۔وہ پلوشہ جو میری نظر میں ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے کسی بھی طرح کم صلاحیتیں نہیں رکھتی تھی مجھے موم اور کانچ کی گڑیا دکھائی دینے لگی تھی جس نے ہلکی سی آنچ سے پگھل جانا تھا۔یا ہلکی سی چوٹ جسے کئی ٹکڑوں میں بکھیر دیتی۔اسی طرح میرے جیسا سنائپر پلوشہ کو ننھا بچہ لگ رہا تھا۔قابل خان اور خوشحال خان جیسے جہاں دیدہ سرداروں سے میرے اور پلوشہ کا رویہ اوجھل نہیں تھا لیکن وہ محبت میں ہونے والے ایسے جھگڑوں سے واقف تھے اس لیے انھوں نہ تو ہمیں سمجھانے کی کوشش کی اور نہ ان جھگڑوں کو خاطر میں لاتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔

جہانداد خان کے انتظار میں ہم نے باقی اطراف کی حرکت کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔خوشحال خان کے آدمی بھی ایمونیشن کی بچت پر مائل نظر آرہے تھے۔موسم صاف ہو گیا تھا اور سورج کی روشنی کچھ زیادہ ہی تیز لگ رہی تھی۔ہوا البتہ کافی تیز چل رہی تھی۔ہوا کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔اسی وقت جہانداد خان بھی اپنے محافظوں کے ہمراہ اپنی مخصوص جگہ پر نمودار ہوا۔

خوشحال نے مجھے اس کی آمد کی اطلاع دی لیکن میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''پل پل سمت تبدیل کرتی ہوئی ہوا کی وجہ سے گولی چلانے کا مطلب گولی کو ضائع کرنا ہی ہوگا اور میں گولی ضائع کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

خوشحال خان اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگیا تھا۔ ہوا نے ایک بار پھر بادلوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا ۔جہانداد خان چند لمحے وہیں کھڑے ہو کر دوربین سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ بارہ بجے کے قریب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ میں نے رائفل کو پلاسٹک کے مخصوص کور سے ڈھانپ دیا۔

تیز چلنے والی ہوا بادلوں کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری پوری کر کے آرام کرنے پر مائل نظر آ رہی تھی۔ اور پھر بادل زور سے گرجے اور ہوا ایک دم ساکن ہوگئی۔ بارش کے قطروں نے گرنے کی رفتار بڑھائی۔ اسی وقت جہانداد خان ایک بار پھر اپنی مخصوص جگہ نمودار ہوا۔ اس کے ایک محافظ نے اس کے سر پر چھتری تانی ہوئی تھی۔

''ذیشان بھائی !......'' آنکھوں سے دوربین لگائے قابل خان نے مجھے آواز دی ،لیکن میں اس کے آواز دینے سے پہلے رائفل کی طرف بڑھ گیا تھا۔ پلوشہ نے فوراً رائفل پر پڑا پلاسٹک کا کور لپیٹا اور میں رائفل کے پیچھے لیٹ گیا۔ رائفل پر ساڑھے اٹھارہ سو کی رینج لگی ہوئی تھی اگر میں روایتی شست لیتا تو گولی نے یقیناً نیچے لگنا تھا کیونکہ ہدف بیس پچیس میٹر دور تھا۔ میں نے اپنے اندازے سے شست کو چند انچ اوپر اٹھا دیا۔ بادلوں کی وجہ سے سورج غائب تھا اور روشنی بالکل فائر کے موافق تھی۔ اسی طرح ہوا نے رضا کارانہ طور پر رک کر مجھے کامیاب ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اب بس جہانداد کی موت کے وقت کا تعین ہونا باقی تھا۔ اگر اس کے سانس پورے تھے تو میری مہارت کا ایک اور ثبوت سامنے آ جاتا۔ اور اللہ پاک کے نزدیک اس کی زندگی کے دن باقی تھے تو میری مہارت، سورج کی روشنی کی موافقت اور ہوا کا رکنا کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔

یوں بھی میں وہاں اپنے ملک کی حفاظت کی غرض سے لیٹا تھا، امن دشمنوں کو نیست و نابود کرنے اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے وہ تکلیفیں اور سختیاں برداشت کر رہا تھا۔ جبکہ جہانداد بدی کا نمائندہ تھا۔ ملک دشمن ہونے کے ساتھ وہ اسلام کا بھی دشمن تھا کہ اسلام کبھی بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ اسلام نشہ آور اشیاء کے پھیلاؤ کا کاروبار کرنے والے کو اچھا جانتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہود و ہنود کے یار کو

اسلام انھی کے انجام کی خوش خبری سناتا ہے۔

رائفل پہلے سے کاک تھی، رینج لگی ہوئی تھی۔ دوپائی اچھی طرح زمین میں گڑی تھی۔ بس شست لے کر ٹریگر دبانے کی دیر تھی۔ اپنے سارے تجربے کو بروے کار لاتے ہوئے میں نے سانس روکا اور ایک دم ٹریگر کو مکمل طور پر دبا دیا۔ ”ٹھک۔“ کی آواز کے ساتھ میرے کندھے نے بیرٹ ایم 107 کے بٹ کا دوستانہ دھکا محسوس کیا ۔یہ دھکا مجھے ایک پیار بھری تھپکی کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر بیرٹ کے بٹ پر ٹیک دیا تھا۔

کامیابی کی نوید مجھے خوشحال خان اور قابل خان کے نعروں سے ملی ۔خوشحال خان نے۔ ”قربان شم جوانا۔“ اور قابل خان نے۔ ”ایس ایس زندہ باد۔“ کی صدا بلند کی تھی۔ جبکہ پلوشہ ان دونوں کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹتے ہوئے میرے چہرے کو گرم ہونٹوں سے داغنے لگی۔

قابل خان نے زور سے گلا کھنکار کر گویا پلوشہ تک اپنا باضابطہ احتجاج پہنچا دیا تھا لیکن وہ پلوشہ ہی کیا جو کسی کو درخور اعتناء سمجھے۔ فور سیزن ہوٹل کی چھت پر یہودی برین ویلز کو کامیابی سے نشانہ بناتے وقت جینیفر نے بھی اسی طرح محبت کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس وقت ہم نے فوری طور پر وہ جگہ چھوڑنا تھی اس لیے وہ جلد ہی پیچھے ہو گئی تھی اس کے برعکس پلوشہ کو کوئی جلدی نہیں تھی۔

”چندا!......بس کرو۔“ پیار بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اس کے ماتھے پر مہر محبت ثبت کی اور اسے آہستہ سے پیچھے کر دیا۔ جس جگہ ہم موجود تھے وہاں ہمارے عقب اور مشرقی جانب کافی گھنی جھاڑیاں موجود تھیں جبکہ سامنے اور مغربی جانب سے دشمن کی گولی وہاں تک آنے کا امکان نہیں تھا۔ اس لیے میں بے دھڑک کھڑا ہو گیا۔ خوشحال خان نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ چوم لیے تھے۔ جبکہ قابل خان مجھے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر میری پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

اچانک آئی کام سے دشمن کے کسی کمانڈر کی چیختی ہوئی آواز برآمد ہوئی وہ تمام لوگوں جہانداد خان کی ہلاکت کی خبر سنانے کے ساتھ حملے کے لیے تیار ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی خوشحال خان فوراً اپنے آدمیوں کو چوکنا کرنے لگا۔

”تمام لوگ سن لیں، جہانداد خان کو ہم نے قتل کر دیا ہے اور اب دشمن حملہ کرنے آ رہا ہے، یاد رکھنا آج موقع ہے۔ دشمن کی تعداد میں خاطر خواہ کمی کر کے اس کی عددی برتری کے غرور کو ختم کر دو۔“

وقفے وقفے سے۔”ہم تیار ہیں......ہم تیار ہیں......“ کی آوازیں سیٹ سے ابھرنے لگی تھیں۔

بارش تیز ہوگئی تھی۔ پلوشہ بیرٹ کو کھول کر اس کے واٹر پروف تھیلے میں منتقل کر چکی تھی۔ ہمارا باقی سامان یوں بھی خوشحال خان کے مورچہ میں پڑا تھا۔ ہم درختوں کی آڑ لیتے اس مورچے کی طرف بڑھ گئے۔ پلوشہ نے رائفل کے تھیلے کو اٹھانا چاہا مگر میں نے زبردستی اس سے لے لیا تھا۔ مرد کی موجودی میں عورت کا سامان اٹھانا وزیرستان کی ثقافت ہوسکتی تھی ہماری نہیں۔ وہ بھی جھگڑا کیے بغیر اپنی کلاشن کوف سنبھال کر میرے آگے چل پڑی۔ خوشحال خان اور قابل خان اس سے بھی آگے تھے۔ اسی وقت بارش میں مزید تیزی آئی موسلا دھار بارش نے ہمیں ایک منٹ میں بھگو دیا تھا۔ اپنی کلاشن کوف میں نے الٹی کر کے اپنے کندھے سے لٹکا لی تھی۔ موسم کی مناسبت سے تمام نے اپنے ہتھیاروں کے لیے مضبوط پلاسٹک کے کور ساتھ رکھے ہوئے تھے۔

کھلے کپڑے بھیگ کر پلوشہ کے بدن سے چپک گئے تھے۔ کپڑوں کے اندر اس کے جسم کے چھپے مخصوص زاویے اور قوسین ایک دم ظاہر ہوگئی تھیں۔ اس کا خیال شاید اس جانب نہیں گیا تھا کہ وہ یوں بے فکری سے چل رہی تھی۔

”پلوشے!“ میں نے اسے آواز دے کر روکا۔

وہ رکتے ہوئے میری جانب مڑی۔ میں نے فوراً اپنے گلے سے لپٹی ہلکی چادر اتار کر اسے اوڑھا دی۔

”کتنا خیال کرتے ہو اپنی چیز کا ہے نا؟“ اس نے شرارتی انداز میں مجھے چھیڑا۔ لیکن شرارت کے ساتھ اس کے لہجے میں بے پناہ محبت بھی ابل رہی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔”قیمتی چیزوں کی حفاظت مالک کو کرنا پڑتی ہے۔“

”راجو!......اگر میں کہوں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟“

میں ہنسا۔”اچھا ابھی تک اقرار کی گنجائش موجود تھی۔“

”اقرار کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ جس آدمی سے محبت ہو جائے اسے فوراً بتا دینا چاہیے۔“

”تو کیا یہ محبت آج ہوئی؟“اس کے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر میں نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔

”نہیں اب تو لگتا ہے ہمیشہ سے تھی۔“وہ جذب کے عالم میں کہنے لگی۔”شاید اس وقت سے جب میں بالغ ہوئی،شاید اس وقت سے جب مجھے پتا چلا کہ میں لڑکی ہوں،شاید اس وقت جب میں نے باتیں کرنا شروع کیا تھا،شاید اس وقت جب میں پیدا ہوئی یا شاید اس وقت جب میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔“

ایک دم مجھے اس کی شدید محبت سے خوف آنے لگا۔میں نے فوراً موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔”پتا ہے میری ساری زندگی مچانوں میں گزری ہے آج تم نے خواہ مخواہ کی ضد کر کے مجھے مچان پر چڑھنے نہیں دیا،اس کی وجہ سے میرا نشانہ خطا بھی ہو سکتا تھا۔“

”خطا ہوا تو نہیں نا۔“اس نے منہ بنایا۔”اور پھر یہ بھی تو دیکھو نیچے فائر کرنے کی وجہ سے تمھیں کتنا فائدہ پہنچا ہے۔“

”فائدہ کون سا؟“اس کی جانب حیرانی سے دیکھتے ہوئے میں دو تین گھنے درختوں کے نیچے رک گیا تھا۔

وہ ناز سے بولی۔”میں نے آپ کو اتنا ڈھیر سارا پیار کیا،کیا یہ کم فائدہ تھا؟“

”تو کیا مچان سے اترتے وقت تم مجھے پیار نہ کرتیں۔“

”آپ کے نیچے اترنے تک وہ وقتی جوش ختم ہو گیا ہوتا اور میرے بوسے اتنے بھی فالتو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ لٹاتی پھروں۔“

”فکر نہ کرو،جلد ہی ان بوسوں کا میں قانونی حق دار ٹھہروں گا اس وقت پوچھوں گا۔“

اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔”پتا نہیں کب وہ دن آئے گا۔راجو!......آپ سردار چاچا کو کہہ کر مجھ سے نکاح کے دو بول پڑھوا کیوں نہیں لیتے۔جب یہ بات یقینی ہے کہ آپ نے مجھے اپنانا ہے اور میں نے بھی اس معاملے میں کسی کی پروا نہیں کرنی پھر انتظار کس بات کا۔“

”کیونکہ میں چاہتا ہوں اپنے خوابوں کی شہزادی کو شہزادیوں کی سی شان سے بیاہ کر گھر میں لاؤں۔“

وہ مجھے تنگ کرتے ہوئے بولی۔”ایک غریب فوجی کے پاس اتنی طاقت کہاں کہ اپنے خوابوں کی شہزادی کو شہزادیوں کی سی شان و شوکت مہیا کر سکے۔مجھے تو لگتا ہے امی جان نے جو مطالبہ رکھا اسے پورا کرنے کے لیے

بھی آپ چند سال کی مہلت نہ مانگ لیں۔"

گو میں اس وقت اسے کہہ سکتا تھا کہ میرے پاس اس کی توقع سے زیادہ رقم موجود تھی۔ پچاس لاکھ کے بہ قدر رقم تو مجھے امریکہ میں سنائپر کورس میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر انعام میں ملی تھی۔ اور اس کے علاوہ میری اپنی تمام تنخواہ بھی میرے اکاؤنٹ میں جاتی تھی۔ گھر کا خرچ تو ہماری آبائی زمین جو ابو جان نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی اسی سے پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں کھانے والے صرف دو افراد ہی تو تھے۔ پہلے ماہین اور ابو جان تھے، اب پھوپھو جان اور ابو جان۔ لیکن یہ تفصیل دہرانے کے بہ جائے میں بولا۔

"اگر ایسی بات تھی تو کسی دولت والے سے محبت کرنا تھی نا، ایک غریب فوجی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔"

"بس کیا کروں یار!...... جب امیر نہ ملے تو غریب پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔"

"پلوشہ!...... تم یہ سب مذاق میں کہہ رہی ہو، مگر مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا، یہ نہ ہو مجھ سے دو تین تھپڑ کھا بیٹھو۔"

مجھ سے تھوڑا سا فاصلہ پیدا کرتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا۔ "مذاق تو خیر نہیں ہے۔"

"اچھا، ٹھہرو بتاتا ہوں۔" میں جارحانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا اور وہ کھل کھلاتے ہوئے بھاگ پڑی۔

اچانک فائرنگ کے تیز شور میں بارش کی ٹپ ٹپ دب گئی۔ مجھے یاد آیا کہ دشمن کے کمانڈر نے حملے کا عندیہ دے دیا تھا۔ اور پلوشہ سے باتیں کرتے ہوئے یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ فائرنگ دور دور ہی سے ہو رہی تھی شاید وہ ابھی تک حملے کے لیے آگے نہیں بڑھے تھے۔ 12.7 ایم ایم گن کا گرجنا سب سے واضح تھا۔

"پلوشہ!...... ادھر آجاؤ۔" میں نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ اس طرح پرشور اور دھڑ دھڑ افائرنگ میں گولی بھولی بھٹکی گولی اس کا مزاج بھی پوچھ سکتی تھی۔

میری گھبراہٹ بھری چیخ سنتے ہی وہ رکی اور بھاگ کر میرے پاس واپس آگئی۔

"اتنے پریشان کیوں ہو جاتے ہیں آپ؟" قریب آتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے نرمی سے ڈانٹا۔

میں فکرمندی سے بولا۔ ''گولیاں چلنے کی آواز پہنچ رہی ہے تمھارے کانوں تک؟''

''ہاں،،لیکن ان میں میرے راجو جیسا کوئی بھی نہیں کہ مجھے ڈرنے کی ضرورت پڑے۔''

''بے وقوف ان موسلا دھار چلنے والی گولیوں میں کوئی گولی بھی غلطی سے لگ سکتی ہے۔'' میں اسے ساتھ لے کر دو درختوں کے موٹے تنوں اور پتھریلی چٹان کے درمیان بیٹھ گیا تھا۔اوپر درخت کی گھنی شاخوں کی وجہ سے وہاں بارش بھی اتنی زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔

''مجھے اگر گولی لگے گی تو ان دعاؤں کا کیا ہوگا جو میرا راجو ہر وقت میرے لیے مانگتا رہتا ہے۔'' میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے اس نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

میں اسے کوئی جواب دیے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے محسوس کرتا رہا۔سخت بارش کے ساتھ شدید فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔میری طرح خوشحال خان کے آدمی بھی جانتے تھے کہ دشمن کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہا ہے۔وہ ان کے آگے بڑھنے کے منتظر بیٹھے تھے۔لیکن دشمنوں میں سے کوئی آگے نہ بڑھا۔دن کا کھانا ہم نے نہیں کھایا تھا۔سہ پہر کو جب بارش ہلکی ہلکی بوندا باندی میں تبدیل ہوگئی تھی اور دشمنوں نے اپنا کافی ایمونیشن ہوا میں پھونکنے کے بعد چپ سادھ لی تھی قابل خان ہمیں ڈھونڈتا ہوا وہاں آنکلا۔گیلے کپڑوں میں مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔پلوشہ کا بدن بھی بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

''ذیشان بھائی!......چلو بیٹھک میں چلتے ہیں۔''

''ہم نے کل رات بھی بیٹھک میں گزاری تھی میرا خیال ہے آج ہمارا نمبر یہیں پڑ رہا ہے۔'' میں نے واجبی سا انکار کیا۔

وہ مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''نہیں، میری چھوٹی بہن یہاں بیمار ہو جائے گی اور چونکہ وہ اکیلی جانے پر تیار نہیں ہوگی اس لیے میں نے سوچا آپ کو ساتھ لیتا جاؤں۔''

''کیا خیال ہے؟'' میں نے اپنے ساتھ جڑی بیٹھی پلوشہ سے پوچھا۔

''جہاں آپ رہیں گے پلوشہ نے بھی وہیں رہنا ہے۔''

''تو چلو پھر۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔قابل خان ہمارا بقیہ سامان ساتھ ہی لے آیا تھا۔ہم قابل خان کی معیت

میں چل پڑے۔ ہمیں بیٹھک میں چھوڑ کر قابل خان گھر سے میرے لیے اپنے کپڑوں کا جوڑا اور پلوشہ کے لیے خوشحال خان کی نوجوان بیٹی کے کپڑوں کا جوڑا اٹھا لایا تھا۔

''میں نے لڑکیوں والے کپڑے نہیں پہننے۔'' پلوشہ نے انکار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''صبح تک آپ کے کپڑے خشک ہو جائیں گے دوبارہ اپنے کپڑے پہن لینا۔ رات گزارنے کے لیے تو یہ پہن لو نا۔''

''آپ کو بڑا شوق ہے مجھے زنانہ لباس میں دیکھنے کا۔'' منھ بناتے ہوئے اس نے قابل خان سے وہ کپڑے لے لیے۔

اس کا انداز دیکھتے ہوئے قابل خان ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ کنڈی کرتے ہوئے وہ بولی۔

''اچھا میں کپڑے تبدیل کر رہی ہوں۔'' اس نے مجھے مطلع کرتے ہوئے گویا رخ پھیرنے کا کہا تھا۔

''کرو نا۔'' اس کی طرف پیٹھ موڑ کر میں بھی کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ شلوار تبدیل کرنے کے لیے میں نے چادر کا سہارا لیا تھا۔

''کر لیے۔'' اس کی شرمیلی سی آواز نے مجھے پیچھے مڑنے کا مژدہ سنایا۔

کالی سیاہ قمیص جس کے سامنے سفید دھاگے سے خوب صورت آبگینے ٹنگے تھے۔ سر پر اسی رنگ کا کڑھائی کیا ہوا دوپٹا اوڑھے وہ مجھے کوئی اور پلوشہ نظر آئی۔ میرا دل یوں دھک دھک کرنے لگا جیسے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔ میں مبہوت ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

اس نے شرماتے ہوئے نظریں جھکائیں اور پھر آہستہ سے بولی۔ ''کہیں نظر ہی نہ لگا دینا۔''

''میں بے خودی میں چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولا۔

''اتنا پیارا نہیں لگا کرتے چندا!''

شوخ اور شرمیلی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔ ''جھوٹا۔''

''کس طرح یقین دلاؤں؟'' میں نے وارفتگی سے پوچھا۔

اس نے پلکوں کی چلمن گراتے ہوئے کہا۔''آپ کی آنکھوں نے یقین دلا دیا ہے۔''

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے اپنی غیر ہوتی حالت کو سنبھالنے کا آسرا دیا اور میں کنڈی کھولنے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔قابل خان کھانے کے برتن لیے کھڑا تھا۔

''شام کی آذان سے پہلے ہی لے آئے۔''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''میں نے سوچا دن کو بھی کھانا نہیں کھا سکے تو یقیناً اس وقت بھوک لگی ہو گی۔''

''بھوک تو لگی ہے۔''میں نے اقرار میں سر ہلایا۔اسی وقت اس کی نظر پلوشہ پر پڑی۔

''ماشاءاللہ ان کپڑوں میں تو میری چھوٹی بہن بہت پیاری لگ رہی ہے۔'' کھانے کے برتن لکڑی کی میز پر رکھ کر قبال خان نے آگے بڑھ کر پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔ ہر وقت لڑکوں والے کپڑے پہننے والی کو یقیناً ان کپڑوں میں خود کو عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ گو وہ جیسا بھی محسوس کر رہی تھی پر میں اپنی نظروں پر اختیار کھو چکا تھا۔کھانے کے دوران بھی میں مسلسل اسی کو گھورتا رہا۔قابل خان کھانا رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔میری وارفتگی دیکھتے ہوئے وہ چاہت بھرے لہجے میں بولی۔''شانی !......آپ کو کہا تو ہے کہ جلدی سے نکاح پڑھوا لو، پھر جیسے کپڑے پہناؤ گے پہن کر آپ کی پیاسی آنکھوں کو سیراب کرتی رہوں گی۔''

''تو نکاح سے پہلے میرا کہا نہیں مانو گی؟''

''ہزار بار مانوں گی۔میری یہ جرّات کہ اپنے راجو کی خواہش کو ٹالوں۔'' کھانے کا نوالہ میرے منہ کی جانب بڑھاتے ہوئے اس نے سرِ تسلیم خم کیا۔

''تو بس ٹھیک ہے کل تم اسی لباس میں رہو گی۔''

''ٹھیک ہے،کوئی اور حکم؟'' وہ فوراً مان گئی تھی۔

ہمارے کھانا کھانے تک قابل خان چائے لے آیا تھا۔

''ویسے آج رات بھی خطرہ تو کافی ہوگا۔'' چائے کی پیالی میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے مشورہ چاہا۔

’’مجھے تو نہیں لگتا۔‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا۔’’ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔گزشتہ رات کی لاشیں وہ ابھی تک نہیں دفنا پائے ہوں گے یقیناً اپنا مزید نقصان کرنا وہ پسند نہیں کریں گے۔‘‘

قابل خان نے کہا۔’’بھول گئے، جہانداد خان کے قتل ہوتے ہی ان کے کمانڈر نے حملہ کا حکم اسی وقت دے دیا تھا۔اب یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے حملہ کیا کیوں نہیں۔شاید اندھیرا ہونے کے منتظر ہوں۔‘‘

’’وہ ایک وقتی اشتعال تھا۔حکم دینے والے کمانڈر کو جب دوسروں نے حقائق سے آگاہ کیا ہوگا تو اسے دوبارہ ایسا کہنے کی جرّات نہیں ہوئی ہوگی۔‘‘

’’کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔‘‘ وہ پرسوچ انداز میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے کہا۔’’لگتا یہی ہے کہ اب وہ دو تین دن سے زیادہ نہیں ٹکیں گے۔‘‘

☆......☆......☆

اگلی صبح ہم ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میدانِ جنگ میں جانے کی تیاری کر رہے تھے جب خوشحال خان بیٹھک میں داخل ہوا۔اس کے عقب میں قابل خان اور چند اور معززین بھی موجود تھے۔

پلوشہ کو کمرے ہی میں چھوڑ کر میں باہر نکلا۔تمام میرے ساتھ مصافحہ کر کے صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ان چہروں پر چھائی سنجیدگی کسی نئے مسئلے کا اعلان کر رہی تھی۔

’’سردار!......خیر تو ہے؟‘‘ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

خوشحال خان کے بجائے قابل خان نے جواب دیا۔’’صنوبر خان نے جرگہ بلوالیا ہے۔‘‘

’’صنوبر خان غالباً......؟‘‘ میں نے اندازہ لگانے کے لب ہلائے اور میری بات مکمل ہونے سے پہلے قابل خان جلدی سے کہا۔

’’صنوبر خان، جہانداد خان کا جانشین اور علام خیل کا نیا سردار ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے یہ خوشی کی بات ہے جبکہ آپ لوگوں کے چہروں پر چھائی سنجیدگی اس سے میل نہیں کھا رہی۔‘‘

’’جرگے کے پیغام بر سے پتا چلا ہے کہ صنوبر خان نے ہم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ہم نے پاک آرمی کے ایک

فوجی کو پناہ دی اور اس لڑائی میں ہم نے آرمی کی مدد سے ان کا نقصان کیا ہے۔‘‘ ایسا کہتے ہوئے قابل خان کے ساتھ تمام معززین کی سوالیہ نگاہیں بھی میرے وجود پر گڑی تھیں

میں نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔’’ میرا خیال ہے پاک آرمی کی کوئی امداد آپ کے پاس نہیں پہنچی۔ یوں بھی آرمی قبائل کے جھگڑوں میں مخل نہیں ہوا کرتی۔ زیادہ سے زیادہ آرمی قبائل کے جھگڑے میں فریق ثالث کا کردار ادا کرسکتی ہے یوں کسی ایک قبیلے کے ساتھ مل کر دوسرے قبیلے سے مقابلہ نہیں کرتی۔‘‘

’’ آپ آرمی کے بارے اتنا وثوق سے یہ بات کیسے کر سکتے ہیں؟‘‘ اخلاص خان نامی شخص نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا۔

’’ بات میرے کہنے کی نہیں حقائق کی ہے، کیا آپ میں سے کسی نے پاک آرمی کو ایسا کرتے دیکھا ہے یا کسی نے سنا ہے کہ آرمی قبائل کی جنگ میں حصہ دار بنی ہو۔‘‘

’’ سیدھی بات یہ ہے ذیشان صاحب کہ صنوبر خان آپ کی شخصیت کو درمیان میں گھسیٹ رہا ہے۔ اگر آپ کا تعلق آرمی سے تو یقیناً وہ اپنے دعوے میں سچا ثابت ہوگا اور ہمیں آپ کو اس کے حوالے کرنے کے ساتھ مرنے والوں کا خون بہا بھی ادا کرنا ہوگا۔‘‘ اس مرتبہ خوش حال نے اصل صورت حال میرے سامنے رکھ دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر واضح ہوا کہ صورت حال کتنی گھمبیر تھی۔

میں نے فوراً اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے مصنوعی قہقہہ لگایا۔’’ میں اور پاک آرمی سے، یہ بھی خوب کہی۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کے پاس پناہ لینے نہ دوڑا آتا، پاک آرمی کی کسی پوسٹ کا رخ کرتا۔‘‘

’’ پوسٹیں یہاں سے کافی فاصلے پر ہیں ذیشان صاحب۔‘‘ خوشحال خان سنجیدہ تھا۔

’’ سردار!......سیدھی بات یہ ہے کہ میرا نام ذیشان نہیں ہے۔ میرا اصل نام سلیم شاہ ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے جیب سے وہ نقلی شناختی کارڈ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا جو اس علاقے میں آتے ہوئے مجھے سرکاری طور پر جاری ہوا تھا۔ اسی طرح سردار کے پاس بھی ایک نقلی شناختی کارڈ موجود تھا۔ اس پر درج پتے کے مطابق ہمارا جو گھر بنتا تھا وہاں اگر جا کر کوئی معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو اسے یہی معلومات دی جاتیں جو میں وہاں بتا رہا تھا۔’’ اور میرا علاقہ مردان ہے۔‘‘

''مگر آپ کا اپنا ساتھی آپ کو راجا ذیشان کہہ کر بلاتا ہے۔''اس حالت میں بھی خوشحال خان نے پلوشہ کے لڑکی ہونے کی بات کو اپنے تک ہی رکھا تھا۔گویا اس کے دل میں ہماری ہمدردی موجود تھی۔

''سردار!......یہ ایک لمبی کہانی ہے۔''

''ہوگی،لیکن جرگہ کل ہونا ہے اور ہمارے پاس آج کا دن موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے دوپہر کا کھانا کھا کر اس بارے تفصیل سے بات ہوگی۔اب جبکہ ساری بات کھل گئی ہے تو میں اور میری منگیتر بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

''منگیتر......''اخلاص خان نے سوالیہ لہجے میں پکارا۔

''پلوخان،کا اصل نام پلوشہ خان وزیر ہے اور اس نے لڑکے کا روپ دھارا ہوا ہے۔''میں نے جو کہانی دماغ میں ترتیب دی تھی اس کے مطابق پلوشہ کی اصلیت سامنے لائے بغیر کام نہیں چل رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ایک بجے دوبارہ اکٹھے ہوں گے۔''وہ تمام کھڑے ہوگئے۔سوائے قابل خان کے باقی مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے رخصت ہوگئے۔اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ ہماری نگرانی ضرور کرائیں گے۔چاہے اس کے لیے قابل خان کو مقرر کیا جائے یا کسی دوسرے تیسرے کو۔

تمام کے رخصت ہوتے ہی قابل خان نے کہا۔''بیٹھیں ذیشان بھائی،بلکہ سلیم بھائی۔''

''میں دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہ اضطراری انداز میں ہاتھ مروڑتے ہوئے بولا۔''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ صنوبر خان کا الزام درست ہے اور آپ صحیح طریقے سے اپنا دفاع نہیں کر سکیں گے تو میں آپ دونوں کو یہاں سے نکال سکتا ہوں۔بعد میں جو ہوگا ہم بھگت لیں گے۔''

''اس کا فیصلہ آپ کھانے کے بعد ہونے والی گفتگو سن کر کرنا۔''اسے تسلی دیتے ہوئے میں چہرے پر اعتماد بھری مسکراہٹ بکھیری۔

''تو پھر میں بھی اجازت چاہوں گا۔''اس نے بھی وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔البتہ ہمیں بچانے کی بات کر کے اس نے ساری ذمہ داری اپنے سر لینے کی جو بات کی تھی اس نے مجھے اتنا اطمینان دلا دیا تھا کہ ہم

دونوں اکیلے نہیں تھے۔

اس کے بیٹھک سے نکلتے ہی میں کمرے کی طرف بڑھا۔ پلوشہ دروازے سے سر جوڑے ساری گفتگو سن رہی تھی۔

”راجو!...... یہ سب کیا ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں مجھے پریشانی جھلکتی نظر آئی۔

”کچھ بھی نہیں ہے راجو کی جان۔“ میں اسے ساتھ لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”کیا آپ کا اصل نام سلیم شاہ ہے؟“ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کی پکی عادت تھی کہ میرے ساتھ بیٹھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر لیتی گویا میرا سہارا لینا چاہتی ہو یا پھر مجھے سہارا دے رہی ہو۔ اس کی باقی بہت سی پیاری عادات کی طرح یہ بھی ایک من موہنی عادت تھی۔

”اگر میں کہوں ہاں تو......؟“

”تو کیا، میں آپ کو پھر بھی راجو اور شانی کہہ کر ہی بلایا کروں گی۔“

”میرا نام وہی ہے جو میری چندا کو معلوم ہے۔ راجا ذیشان حیدر۔“

”سچ۔“ وہ نہ جانے کیوں اتنی زیادہ خوش ہو گئی تھی۔

”ہاں...... اور اب ہم نے ایسی کہانی ترتیب دینی ہے جس میں اگر ہم سے علیحدہ علیحدہ بھی کچھ پوچھا جائے تو ہماری بات ایک ہی ہو۔“

”ٹھیک ہے بتائیں، کیا جھوٹ بلوانا چاہتے ہیں۔“ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے لگاتے ہوئے لگاوٹ کا اظہار کیا۔

اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تمام تفصیل بتلانے لگا۔ بیچ بیچ میں وہ بھی کسی بات سے اختلاف کر کے نئی بات شامل کر دیتی۔ گھنٹا ڈیڑھ لگا کر ہم نے ایک مکمل کہانی تیار کر لی تھی۔ ☆

☆......☆......☆

جرگے کے معزز بزرگوں کے لیے دو سجی ہوئی چارپائیاں رکھی گئی تھیں جن پر منقش چادریں بچھی تھیں۔ عام لوگوں کے بیٹھنے کے لیے زمین پر دری بچھائی گئی تھی۔ دونوں قبیلوں کے سرداروں کی چارپائیاں جرگے کے ارکان

کے سامنے لگائی گئی تھیں۔ وہیں ایک چارپائی پر میں اور پلوشہ بھی بیٹھے تھے۔ پلوشہ اس وقت لڑکوں ہی کے لباس میں تھی۔ جرگے کا آغاز ہوتے ہی جرگے کے سب سے مشر رکن مَلک شامل خان داوڑ نے صنوبر خان کو اپنا مقدمہ پیش کرنے کا حکم دیا۔

صنوبر خان نے کھڑے ہوکر میرے جرائم کی ایک لمبی فہرست گنوائی جس میں روشن خان، انار گل، قبیل خان قبیل خان کے سالے خائستہ گل کے قتل کے ساتھ قبیل خان کی حویلی کی تباہی کا ذکر بھی موجود تھا۔اور اس کے تئیں یہ کام کرتے ہوئے میں اکیلا نہیں تھا بلکہ میرے ساتھ آرمی کے اور جوان بھی شامل تھے۔آرمی کے قافلے کے خلاف لگائی جانے والی گھات کو ناکام بنانا اور پھر روشن خان نے جب ہمیں گھیرا اور آرمی ہماری امداد کو پہنچی یہ ساری باتیں اس نے بڑی تفصیل سے جرگے کے سامنے رکھیں۔آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔''معزز مشر ہمارے لیے ایک اکیلے شخص کو انجام تک پہنچانا کوئی مشکل کام نہیں۔فوج بھی یہاں پر ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرا قبیلہ فوج خلاف کارروائیوں میں شامل ہے۔ ہمارے لیے اصل مسئلہ ہمارے وہ قبائلی سردار ہیں جو فوج کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف ہتھیار اٹھاتے ہیں۔سردار قبیل خان کے قتل کے بعد اگر ہمارے مجرموں کو وشلام کا سردار خوشحال خان محسود پناہ نہ دیتا تو آج ہمارے دونوں مجرم بھی ختم ہو چکے ہوتے اور سردار جہانداد خان جیسا شیر بھی زندہ ہمارے درمیان موجود ہوتا۔بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب علام خیل کا نیا مَلک ہونے کے ناطے میرا مطالبہ یہ ہے کہ سردار خوشحال خان محسود ہمارے مجرموں کو ہمارے حوالے کرے اور حالیہ لڑائی میں ہمارے جتنے آدمی شہید ہوئے ہیں ان کا خون بہا ادا کرے۔''اپنی بات ختم کر کے وہ مشر شامل خان سے اجازت لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مشر شامل خان نے سردار خوشحال خان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔خوشحال خان نے کھڑے ہو کر گفتگو کی ابتدا کی۔

''معزز مشر!......جہاں تک پاک فوج کے ساتھ مل کر جہانداد خان مرحوم یا قبیل خان مرحوم کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی بات ہے تو یہ سراسر الزام ہے اور سردار صنوبر خان اس الزام کو ثابت نہیں کرسکتا۔اگر ہمارے ساتھ فوج کے جوان شامل ہوتے تو یقیناً انھیں اب تک یہیں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ ہمارے گاؤں کو چاروں طرف

سے سردار صنوبر خان کے لشکر نے گھیرا ہوا ہے اور کوئی بھی بندہ ان کے آدمیوں کی اجازت کے بغیر اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا اپنے قبیلے میں کسی اجنبی کو پناہ دینے کی بات تو اس کی اجازت بلکہ حکم مجھے قبائلی روایات دیتی ہیں۔ یہی بات اس دن میں نے سردار جہانداد خان مرحوم سے بھی عرض کی تھی کہ جب تک اس کے مجرم میرے قبیلے میں رہیں گے میں ان کی حفاظت کا پابند ہوں گا، البتہ جب وہ میرے قبیلے کی حدود سے نکل جائیں گے تو پھر ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مگر سردار جہانداد خان نے میری ایک نہ سنی اور اپنے بڑے لشکر کے زعم میں میرے قبیلے کا گھیراؤ کر لیا۔ گولی چلانے کی ابتدا بھی انھوں نے کی، میرے دو آدمی بھی پہلے انھوں نے شہید کیے اس کے بعد جواب دینا میرا حق بنتا تھا۔ اس ضمن میں معزز مشر یہ بات زیر نظر رکھے کہ ڈیڑھ سال پہلے میرے ایک دشمن کو سردار قبیل خان اپنے ہاں پناہ دے چکا ہے جو آج بھی علام خیل میں اس کا لشکری بن کر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ میرے قبیلے کا دشمن ہے اور جس دن ہم میں سے کسی کو علام خیل کی حدود کے باہر نظر آیا ہم اپنا بدلہ لیں گے۔ لیکن ہم نے اس متعلق نہ تو سردار قبیل خان سے گلہ کیا اور نہ اس کی وجہ سے دونوں قبیلوں کے درمیان جو معاہدہ ہو چکا تھا اس پر حرف آنے دیا۔ اب ان کی باری آنے پر بھی میں صنوبر خان سے اسی وسیع القلبی کی خواہش رکھتا ہوں۔“

”سردار جہانداد خان نے آپ کے مجرم کو آپ کے حوالے کرنے کی پیش کش کی تھی۔“ اس مرتبہ صنوبر خان براہ راست خوشحال خان محسود کو مخاطب ہوا تھا۔

”ہاں یہ سچ ہے۔“ خوش حال خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا یہ بات سراسر قبائلی روایات کے خلاف تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ صرف اپنے دشمن کی بازیابی کے لیے اپنے پرکھوں کی شاندار روایات کو پسِ پشت ڈال دوں، یہ بزدلی اور خود غرضی کی علامت ہے۔“

خوشحال خان کی بات کافی سخت تھی۔ صنوبر خان غصے ہوتے ہوئے بولا۔ ”بزدل کون ہے یہ جلد ہی پتا چل جائے گا۔“

”دونوں سردار ایک دوسرے کو دھمکی دینے یا نازیبا الفاظ کہنے سے گریز کریں۔“ مشر شامل خان داوڑ نے فوراً انھیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ دونوں سردار خاموش ہو گئے تھے۔

”سردار خوش حال خان !...... کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ایسا موجود ہے جس سے ثابت ہو کہ آپ کے مہمان ذیشان یا ایس ایس نامی شخص کا تعلق آرمی سے نہیں ہے۔ اس بارے سردار صنوبر خان نے جو بات کی ہے اس کی روشنی میں تو آپ کے دونوں مہمان مشکوک ہیں، کیونکہ دونوں نے بغیر کسی وجہ کے نہ صرف سردار قبیل خان کو قتل کیا ہے بلکہ اور بھی کئی ایسی کارروائیاں کی ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں کیا جا سکتی سوائے اس کے کہ آپ کے دونوں یا کم از کم ایک مہمان فوجی ہے اور دوسرا اس کا مقامی مددگار ہے اور قبائلی روایات کے مطابق آپ سرکاری افراد کو ساتھ ملا کر کسی دشمن قبیلے کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔“

”معزز مشر !...... میں اپنا جواب تفصیل سے دے چکا ہوں۔ باقی جہاں تک میرے مہمان کے فوجی ہونے کا تعلق ہے تو یہ الزام ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے جس کا تفصیلی جواب میرا معزز مہمان ہی دے گا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میرا مہمان اپنے اوپر لگے الزام کا جواب دینے کے لیے تیار ہے۔“

”اجازت ہے۔“ مشر شامل خان نے ہاتھ اٹھا کر مجھے گفتگو کی اجازت دی۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”معزز مشر !...... میری کہانی تھوڑی طویل ہے اور اصل بات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ میری تمام کہانی کو غور سے سنا جائے اس ضمن میں میں جرگے کے معزز افراد کی قیمتی توجہ کا خواہش مند ہوں۔ میری کہانی کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میں مجاہدین کے کیمپ میں جہاد کی غرض سے شامل ہوا۔ لیکن بہ مشکل چند دن ہی تربیت حاصل کر سکا ہوں گا کہ ایک دن طبیعت کی خرابی کی وجہ، وقت سے پہلے تربیت کے میدان سے رہائشی کمرے کی طرف آ گیا۔ مجھے رہائش کے لیے جو کمرہ ملا تھا اس میں میرے علاوہ چار اور لڑکے بھی تھے۔ ان لڑکوں میں ایک نوعمر لڑکا پلوخان بھی تھا جو کافی عرصے سے وہاں تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس دن اتفاق سے پلوخان بھی کسی وجہ سے تربیتی میدان میں نہیں جا سکا تھا۔ میں جب کمرے میں داخل ہونے لگا پلو خان اس وقت کپڑے تبدیل کر رہا تھا اپنے تئیں وہ خود کو اکیلا سمجھ رہا تھا اس لیے اس سے یوں بے احتیاطی ہو گئی اور اندر داخل ہوتے ہی میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پلوخان لڑکا نہیں بلکہ لڑکی تھی۔ یہ بھی مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسی دن پلوخان سے اس کی وجہ پوچھی اور اس کی وجہ جانتے ہی مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی جو بعد میں محبت میں ڈھل گئی۔ میں نے اسے شادی کی پیش کش کی جو اس نے اس شرط پر

مان لی کہ اگر میں اس کے دشمن کے خلاف اس کی مدد کروں۔ پس میں تیار ہوگیا۔اسی دن ہم دونوں مجاہدین کے کیمپ کو خیر باد کہہ کر وہاں سے نکل آئے۔ ہمارے پاس ہتھیار وغیرہ موجود نہیں تھے۔اور اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ ہتھیار خرید تے میں نے رقم کے بندوبست کے لیے مردان کا رخ کیا۔وہاں سے آتے وقت میرا قریبی دوست گل خان بھی میرے ہمراہ تھا۔شکئی سے ہم پیدل شوال وادی کی طرف آ رہے تھے کہ راستے میں وچہ نرائے پہاڑی کے دامن میں ہم پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ ہم ڈرکر وچہ نرائے پر چڑھ گئے۔اوپر جا کر معلوم ہوا کہ ان لوگوں فوج کے دو جوانو کو گھیرا ہوا تھا ہم خواہ مخواہ وہاں پھنس گئے تھے۔اب اگر ہم نیچے جا کر انھیں بتاتے کہ ہمارا تعلق فوج سے نہیں ہے تو یقیناً کوئی نہ مانتا۔سر آئی مصیبت کو دیکھ کر ہم فوجی جوانوں کے ساتھ دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے لگے۔اور حقیقت میں ہمیں اس وقت یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارا مقابلہ قبیل خان کے لشکر سے ہے۔میں لڑکپن ہی سے بہت اچھا نشانہ باز تھا اتفاقاً قبیل خان کا کمانڈر روشن مجھے ایک قریبی پتھر کی آڑ میں لیٹا ہوا نظر آیا جسے میں نے اپنے فائر کے نرغے میں لے لیا۔ بعد میں اس کے معافی مانگنے پر میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔اسی اثناء میں وہاں فوج کی گاڑیاں آگئیں اور یہ بھاگ پڑے۔ بڑے افسروں نے ہمیں شاباش وغیرہ دے کر جانے کی اجازت دے دی۔اب اس بات کو بنیاد بنا کر سردار صنوبر خان مجھے فوجی ثابت کرنے پر تل گیا۔حالانکہ میں قبیل خان کے خلاف صرف اپنی منگیتر پلوشہ خان وزیر کے کہنے پر ہوا تھا۔اور شاید معزز سردار یہ نہیں جانتا کہ پلوشہ خان اس کی ہم قوم ہی نہیں ہم قبیلہ بھی ہے۔پلوشہ کا تعلق علام خیل سے ہے۔اس کے والد کا نام یامین خان ہے اور ......''میں نے پلوشہ کی پوری کہانی بھی جرگے کے ارکان کے سامنے دہرا دی۔''باقی سردار ثقلین خان کے بیٹے کی شادی میں انار گل کو پلوشہ نے اس لیے قتل کیا، کیونکہ انار گل وہی شخص ہے جس نے پلوشہ کے چھوٹے بھائی کو لات مار کر گاڑی سے نیچے گرایا تھا، جس کی وجہ سے اس معصوم کی موت واقع ہوگئی تھی۔ روشن خان خود ان کے اپنے آدمی کی گولی کا نشانہ بنا۔ایک دو اور قتل ہم نے اپنی جان بچانے کے لیے کیے تھے اور دفاع کا حق ہر انسان تو کیا جانور کو بھی حاصل ہے۔قبیل خان کی حویلی کی تباہی اور اس کے سالے خائستہ گل کے قتل کا الزام معزز سردار صنوبر خان بالکل بھی ثابت نہیں کرسکتا یہ بعینہ ایسا ہی الزام ہے جیسا کہ میرا فوجی ہونا الزام ہے۔''

میری تفصیلی بات کو تمام نے بڑے غور سے سنا تھا۔پلوشہ کے لڑکی ہونے کا سن کر حاضرین میں سے اکثریت اسے گھورنے لگی تھی۔وہ سب سے بے نیاز خاموش بیٹھی تھی۔

صنوبر خان کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔''ایک خوب صورت لڑکا لڑکیوں کی طرح لگ سکتا ہے لڑکی ہو نہیں سکتا۔''

میں نے فوراََ جواب دیا۔''معزز مشر!......اس کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہے۔کوئی بھی خاتون پلوشہ کو خلوت میں لے جا کر آسانی سے اس حقیقت سے پردہ اٹھا سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر پلو خان ہے، پلوشہ ہے یا کوئی تیسری مخلوق اس کے لڑکی ثابت ہونے پر اس کا قبیل خان پر لگایا گیا بہتان کہاں سچ ثابت ہوتا ہے۔یوں تو کل کلاں کو مجھ پر بلکہ مجھے چھوڑیں گستاخی معاف معزز مشر پر بھی کوئی یہ الزام لگا کر ان کی قیمتی جان کے درپے ہو سکتا ہے۔''میرا پر اعتماد رویہ دیکھتے ہوئے صنوبر خان نے فوراََ پینترا بدلہ۔

اس کی بات پر خاموش بیٹھی پلوشہ غضب ناک ہو کر کھڑی ہوئی اور جرگہ مشر کی اجازت کے بغیر جذباتی لہجے میں بولی۔''قبیلے کے سردار کی حیثیت قبیلے کے باپ کی سی ہوتی ہے۔اور قبیلے کی لڑکیاں اس کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ایک باپ جب اپنی ہی بیٹیوں پر بری نگاہ رکھنے لگے اور اپنی ہی بیٹی کو جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دے تو اس کے وارث کس سے انصاف کی بھیک مانگنے جائیں۔عزتوں کے رکھوالے جب لٹیرے بن جاتے ہیں تو لٹنے والے بدلہ لینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔قبیل خان نے نہ صرف میری بہن سپوگمائے کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا بلکہ وہ میرے بھائی، باپ اور بہن کا قاتل بھی تھا۔یہ آج سے نو دس سال پہلے کا واقعہ ہے۔اس وقت میں سات آٹھ سال کی بچی تھی میرا پورا خاندان اس ظالم نے برباد کر دیا تھا اور اسی وقت سے میں اور میری ماں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی قبیل خان کی موت کو بنا لیا تھا۔اگر اس متعلق کسی کو کوئی شک ہو تو میں معزز جرگے سے ایک دو دن کی مہلت طلب کرتی ہوں علام خیل میں کئی ایسے افراد موجود ہیں جو میرے حق میں گواہی دینے پر تیار ہو جائیں گے۔''

''علام خیل جانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی!......میں اس بات کا گواہ ہوں کہ قبیل خان نے یہ سب کچھ کیا

جس کے بارے یہ بچی بات کر رہی ہے۔" حاضرین میں بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر شخص نے کھڑے ہو کر فوراً پلوشہ کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

پلوشہ اسے شکر گزاری بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی تھی۔

اس کے بعد بھی صنوبر خان نے کافی آئیں بائیں شائیں کی مگر ہمارا مقدمہ مضبوط تھا۔اس کے ہر سوال کا شافی جواب ہمارے پاس موجود تھا۔ہمارے مقدمے کا سب سے مضبوط پہلو پلوشہ کی مظلومیت اور اس کے واقعے کی سچائی تھی۔پلوشہ کی کہانی میں میرے فوجی ہونے کی بات بھی پس پردہ چلی گئی تھی۔تمام باتوں کے اختتام پر جرگے کے ارکان کمرے میں چلے گئے اور آدھے گھنٹے کی گفت وشنید کے بعد باہر آ کر انھوں نے صنوبر خان کے مقدمے کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے پلوشہ کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔اس کے ساتھ جرگے نے فیصلہ سنا دیا کہ خوش حال خان جب تک چاہے مجھے اور پلوشہ کو اپنا مہمان بنا کر رکھ سکتا ہے۔سب سے آخر میں جرگے کے مشر شامل خان نے سردار صنوبر خان سے درخواست کی تھی کہ وہ وشلام گاؤں سے پرانا معاہدہ بحال کرتے ہوئے علاقے کے امن میں مثبت کردار ادا کرے۔اور بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے قبیل خان مرحوم سے ہونے والی غلطی کو تسلیم کر کے اس کے ظلم کا شکار ہونے والے اپنے قبیلے کے افراد کو انصاف مہیا کرے

☆......☆......☆

جرگے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تھا۔ہم دونوں بہت خوش تھے۔سردار خوشحال خان اور قابل خان بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔دونوں بھائیوں نے خلوص دل سے ہمیں مبارک باد دی تھی۔بیٹھک میں آتے ہی پلوشہ نم آنکھوں کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔"راجو!......آپ کی بہ دولت آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑا کہ پورے علاقے میں قبیل خان کی بدکرداری کھل کر سامنے آ گئی۔وہ اپنے انجام کو پہنچا اس کا بھائی بھی قتل ہوا اور میں سرخ رو ہوں۔اس کے ساتھ مجھے آپ جیسا شریک حیات ملا۔میں اللہ پاک کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔"

"ٹھیک ہے جی اللہ پاک کا شکر تو انسان کو ہر حال میں ادا کرتے رہنا چاہیے،لیکن فی الحال تم وہی کپڑے پہنو نا جو تمھیں قابل خان نے لا کر دیے تھے۔"

"ابھی لو۔" مجھ سے الگ ہوتے ہوئے وہ دیوار پر ٹنگے کپڑوں کی طرف بڑھ گئی۔میں نے بھی اس کی

جانب سے رخ پھیر لیا تھا۔

''اب بتائیں کیسی لگ رہی ہوں۔'' تھوڑی دیر بعد اس کی آواز ابھری۔

میں اس کی جانب مڑا۔اس مرتبہ بھی مجھ پر پہلے والی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ مجھے مبہوت دیکھ کر وہ ایک بار پھر شرمانے لگی۔اس شوخ اور چنچل لڑکی کی شرمیلی ادائیں کچھ زیادہ ہی بااثر تھیں۔ میری محویت میں قابل خان کی آمد سے خلل پڑا تھا۔وہ کھانا لے کر آیا تھا۔کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر خوش حال خان بھی آ گیا۔دوران گپ شپ اس نے بڑے خلوص سے ہمیں اپنے قبیلے میں شامل ہونے کی دعوت دی لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نرمی سے انکار کر دیا کہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔میرے ساتھ صرف پلوشہ کا غم نہیں تھا۔وہ مجھے جتنی پیاری، جتنی عزیز ہوتی پہلا حق میرے وطن کا تھا۔

ان کے جانے کے بعد پلوشہ مصر ہوئی کہ ہمیں سردار خوشحال کی بات وقتی طور پر مان کر وہیں رہائش اختیار کر لینی چاہیے۔اس طرح ہماری شادی بھی ایک دو دن کے اندر ہو سکتی تھی۔

میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔''لڑکیاں اپنی شادی کی بات نہ تو اس بے باکی سے کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں اور نہ بار بار شادی کے لیے بے چینی ظاہر کرتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے نہ مانیں...... پہلے بھی آپ نے کبھی میری مانی ہے جو آج مانیں گے۔'' منھ پھلا کر وہ میرے پاس سے اٹھ کر دوسری چارپائی پر جا لیٹی۔

''پگلی!...... جب کہہ دیا کہ جلد ہی شادی ہو جائے گی پھر خفا ہونے کا مطلب۔میں تم سے زیادہ بے چین ہوں،لیکن چند دن کی مہلت تو دو نا۔'' میں فوراً اسے منانے لگا۔حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کا روٹھنا ڈراما تھا اس کے باوجود مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا خدانخواستہ اگر وہ سچ مچ خفا ہو جاتی تو میرا کیا ہوتا۔

''چند دن کا مطلب ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ دس دن سمجھے آپ۔'' وہ معصومانہ انداز میں چلائی اور میں مسکرا دیا۔

''ہاں تقریباً اتنے ہی۔'' میں بے چارگی سے بولا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''راجو!...... مجھے لگ رہا ہے کہ آپ روز بہ روز اپنی منگیتر کے رعب میں آتے جا رہے ہیں۔''

میں نے رومانوی لہجے میں کہا ”وہ شاعر کہتا ہے نا......

اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جاں نکلتی ہے

یہ سانسیں جاری رکھنے کو ہم اس کی مان لیتے ہیں

”میں کون سا سچ میں خفا ہوتی ہوں۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”مر نہ جاؤں جو آپ سے خفا ہوں۔“

”تمھارا روٹھنا مذاق ہی میں برداشت نہیں ہوتا نا چندا!......سچ میں روٹھ گئی تو شاید زندگی بھی روٹھ جائے۔“

”راجو!......کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہم بہت زیادہ قریب آ گئے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بھلا دور کب تھے؟“

”سچ کہا راجو!......مجھے تو لگتا ہے میں صدیوں سے آپ کو جانتی ہوں، شاید جس وقت اللہ پاک نے تمام روحوں سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تھا نا تو اس وقت میری روح نے اللہ پاک کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہوئے سجدے میں گر کر اپنے لیے راجو کو بھی مانگ لیا تھا۔“

میں چاہت سے مسکرایا۔ ”یونھی دیکھے، جانے بغیر۔“

”دیکھ بھی لیا، جان بھی لیا اور اپنے فیصلے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی۔“

”بات تو عہد الست کی ہو رہی تھی نا؟“

وہ یقین سے بولی۔ ”اس وقت بھی اپنے راجو کے ساتھ ہی تو تھی۔“

”بڑی آئی راجو والی، شادی کے بعد جب پٹائی ہوگی نا اس وقت پوچھوں گا۔“

وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”پتا نہیں کب وہ دن آئے گا جب آپ تھکے ہارے باہر سے آئیں گے اور میں آپ کے سامنے کھانا رکھوں گی۔ جو آپ کو پسند نہیں آئے گا آپ مجھے ڈانٹیں گے اور میں رونے لگ جاؤں گی اور آپ کھانا پینا بھول کر مجھے منانے لگ جائیں گے اور دیر تک مناتے رہیں گے۔ دیر تک...........“ اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں دھیمی آواز میں گنگنانے لگا......

تنخواہ میں جب لے کے آؤں گا۔

ہاتھوں میں تیرے ہی دوں گا

جب خرچ ہوں گے وہ پیسے

میں تم سے جھگڑا کروں گا

پھر ایسا ہوگا تو مجھ سے

کچھ دیر روٹھی رہے گی

سوچے گی جب اپنے دل میں

تو مسکرا کے اٹھے گی

آ کر گلے سے لگے گی......

سونا نہ چاندی نہ کوئی محل میری جاں، تجھ کو میں دے سکوں گا

پھر بھی یہ وعدہ ہے تجھ سے تو جو کرے پیار مجھ سے

چھوٹا سا گھر تجھ کو دوں گا دکھ سکھ کا ساتھ بنوں گا......

میں خاموش ہوا......

وہ آنکھوں میں نمی لیے خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''راجو گنگناتے رہونا؟''

اور میں دھیمی آواز میں گنگنانے لگا۔

چھٹی کا دن جب ہوگا

ہم خوب گھوما کریں گے

دن رات ہونٹوں پہ اپنے......................

اور پھر میری آواز بھرانے لگی، میری آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ یہی گانا تو میں ماہین کو بھی گنگنا کے سنایا کرتا۔ اور وہ مزاحیہ لہجے میں کہا کرتی تھی۔

''اتنا بڑا گھر ہے اور آپ کہہ رہے ہیں چھوٹا سا گھر لے کے دوں گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ سے پیار نہ کروں بس بیوی ہی بنوں رہوں کم از کم گھر تو بڑا مل گیا ہے نا۔''

شاید اسی وجہ سے وہ مجھ سے پیار نہیں کر سکی تھی۔ پتا نہیں اس کو بڑا گھر ملا تھا یا نہیں لیکن اپنا پیار ضرور مل گیا تھا ۔ماہین کی یاد سے میرے اندر تلخی ابھرنے لگی تھی ۔لیکن جونھی میری نظر ہاتھوں کے پیالے میں من موہنا سا چہرہ بھرے میری جانب محبت پاش نظروں سے گھورتی ہوئی پلوشہ پر پڑی میری ساری تلخی، پشیمانی اور پریشانی کہیں بھاپ بن کر اڑ گئی تھی۔ ایک دم مسکراہٹ نے میرے ہونٹوں پر قبضہ جمالیا تھا۔

☆......☆......☆

حفظ ماتقدم کے طور پر ہم دونوں ہفتہ بھر قابل خان ہی کے مہمان بنے رہے۔ گو صنوبر خان جرگے والے دن ہی اپنا سارا لشکر واپس لے گیا تھا۔ اور اس سے ایک دن بعد اس نے خوش حال خان کو علام خیل آنے کی دعوت دی۔ دونوں سرداروں نے اکٹھے کھانا کھایا اور پرانے معاہدے کو پھر سے بحال کر دیا گیا۔ قابل خان بھی ساتھ ہی گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صنوبر خان نے ہم دونوں کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے چند دن وہیں گزارنے ضروری سمجھا تھا۔

اور پھر ایک دن ہم صبح سویرے وہاں سے جانے کو تیار تھے۔ وشلام سے ہم نے ڈی بلاک جانا تھا، وہاں سے پلوشہ کو علام خیل تک چھوڑ کر آتا اور وہ علام خیل سے گاڑی میں بیٹھ کر انگور اڈے پہنچ جاتی ۔اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے قابل خان سے ایک برقع منگوا لیا تھا۔ راستے کے لیے قابل خان نے ہمیں پر تکلف کھانا بنا کر دیا تھا۔

میں نے دونوں سرداروں سے الوداعی معانقہ کیا جبکہ پلوشہ کے سر پر دونوں نے شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر ہمیں رخصت کر دیا۔

سردار خوش حال خان نے ہمیں چند محافظ ساتھ لے جانے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

اسی طرح ندی نالے، گھنے درخت، جھاڑیوں کے جھنڈ، اونچی چوٹیاں، ابھری ہوئی ٹیکریاں، نشیبی علاقہ اور ڈھلوانوں پر سفر کرتے رہے۔ سہ پہر کو موسم نے تیور بدلے اور ہمیں ایک غار میں پناہ لینا پڑی۔ سب سے پہلے تو ہم نے خشک لکڑیوں کا انبار جمع کیا اور پھر آرام کرنے لگے۔

شام کو کھانا وغیرہ کھا کر وہ مجھے آرام کرنے پر اصرار کرنے لگی۔اس کے تئیں اگر وہ سو گئی تو میں نے اسے جگانا ہی نہیں تھا۔اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں لیٹ گیا۔اس دن مورچے میں تو میں نے اس کی گود میں لیٹنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ صبح کی روشنی پھیل گئی تھی اور خواہ مخواہ تماشا بن جاتا۔لیکن اس وقت غار میں وہ اپنی منوا کر رہی۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے مجھے بارہ ایک بجے نہیں جگانا تھا اور وہ ساری رات اسی طرح بیٹھے بیٹھے گزار دینی تھی۔لیکن ہم سنائپرز کی نیند عموماً مرضی کے تابع ہوتی ہے۔نہ تو ہم اتنی گہری نیند سوتے ہیں کہ ماحول سے بے خبر ہو جائیں اور نہ مسلسل ہی نیند میں ڈوبے رہتے ہیں۔بے شک پلوشہ بھی تربیت یافتہ تھی لیکن اس کی تربیت اس نہج پر نہیں ہوئی تھی جس طرح ہم سنائپرز یا کمانڈوز کی ہوتی ہے۔اس کے ساتھ وہ الھڑ دوشیزہ بھی تھی اور اس کی عمر کی نیند تو یوں بھی آدمی کو غافل کر دیتی ہے۔

ساڑھے بارہ بجنے کو تھے جب خود بہ خود میری آنکھ کھل گئی۔اس وقت پلوشہ بھی غار کی پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔وہ گاہے گاہے جلتی ہوئی آگ پر لکڑی کا ٹکڑا رکھ دیتی۔لکڑیوں کا ڈھیر اس کے پاس ہی پڑا تھا۔روشن ہوتی آگ مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھی کہ وہ ہوشیار تھی۔

''سلیپنگ بیگ سے باہر آتے ہوئے میں نے کہا۔''آؤ سو جاؤ۔''

''اتنی جلدی آپ جاگ گئے۔''وہ اب بھی مجھے سلانے پر کمر بستہ تھی۔

''قریباً ایک ہونے والا ہے اس لیے چپ چاپ رضائی میں گھس جاؤ۔''میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔اور وہ میرا منھ چڑاتے ہوئے رضائی میں گھس گئی۔تکیہ اسے وہی ملا تھا جس کی وہ دل میں خواہش رکھتی تھی۔

چائے کا خشک راشن ہمارے پاس موجود تھا۔صبح چائے اور رات کی بچی ہوئی روٹی سے ناشتا کر کے ہم ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔دوپہر بارہ ایک بجے کے قریب ہم ڈی بلاک پہنچ گئے تھے۔سنتری کو اپنی شناخت کروا کر میں نے بیرٹ ایم سیون اور دوسرے سامان کا تھیلا وہیں چھوڑا اور صرف کلاشن کوف اور پستول لے کر پلوشہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔اس کے پاس بھی کلوز بٹ والی کلاشن کوف اور اورقبیل خان سے چھینا ہوا قیمتی پستول موجود تھا۔آگے کا سفر مسلسل اترائی پر مشتمل تھا۔سہ پہر تک ہم اس جگہ پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ہمیں عارضی طور پر الوداع

ہونا تھا۔

''راجو!......'' وہ سسکتے ہوئے مجھے لپٹ گئی تھی۔

''پگلی!......روتی کیوں ہو دو تین دن کی بات ہے۔میں بس اپنی چھٹی کروا کر پرسوں ترسوں تک انگوراڈے پہنچ جاؤں گا۔''

''کہیں دیر نہ کر دینا، یہ نہ ہو مجھے کچھ ہو جائے۔'' وہ بالکل باولی ہو رہی تھی۔

''چندا!......فکر نہ کرو......اور مخابرے پر رابطہ رہے گا، روزانہ رات کے آٹھ بجے چینل نمبر پانچ پر میں اپنی جان کی آواز سننے آؤں گا۔''

''اگر تین دن سے ایک گھنٹا بھی زیادہ لگایا نا، تو بالکل بھی بات نہیں کروں گی۔'' اس نے منہ بسورا۔

''اتنا ظلم؟'' میں گویا کراہتے ہوئے بولا تھا۔

''اور جو میری حالت ہو رہی ہو گی وہ ظلم نہیں ہو گا؟'' وہ سچ مچ رونے لگ گئی تھی۔

ان قیمتی موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے چنتے ہوئے میں زبردستی مسکرایا۔''گڑیا!......ایک فوجی کی بیوی بننے جا رہی ہو، جدائی کی عادت تو ڈالنا پڑے گی۔اور یہ بھی ذہن میں رہے وطن کے محافظ کبھی کبھی عارضی جدائی کو حشر تک موقوف بھی کر دیتے ہیں۔''

''بکواس نہ کریں سمجھے۔''

''اچھا مذاق کر رہا تھا۔میں بس یوں گیا اور یوں آیا۔ہو سکتا ہے تم سے پہلے انگوراڈے پہنچ جاؤں۔''

''آمین......'' اپنی آنکھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتی ہوئی وہ مجھ سے بہ مشکل علاحدہ ہوئی۔کلاشن کوف گلے میں ڈال کر اس نے اوپر سفید برقع پہنا اور سامنے سے برقعے کا پلو اٹھا کر مجھے چاند چہرے کا آخری دیدار کرانے لگی۔چند دن کی جدائی بھی میرا دل چیرے جا رہی تھی۔ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ اسے واپس اپنے ساتھ ڈی بلاک پر لے جاؤں اور وہاں سے چھٹی وغیرہ کروا کر اپنے ساتھ انگوراڈے لے جاؤں۔یا پہلے جس طرح میں نے سیدھا انگوراڈے جانے کا سوچا تھا اس پر عمل کروں، لیکن پھر آرمی کے ڈسپلن کا خیال آتے ہی میں نے اس کمزور سوچ پر قابو پا لیا۔اور سیدھا اگر اس کے ساتھ چلا جاتا تو چھٹی کیسے لے پاتا۔اگر آج میں اس سے چند

دن دور نہیں رہ سکتا تھا تو کل کلاں کو جب وہ میری بیوی بن کر تلہ گنگ میں بیٹھی ہوتی تب میں دن کیسے گزارتا۔

اپنے پیاروں سے جدائی تو یوں بھی ہم فوجیوں کا مقدر ہوتا ہے۔کبھی سیاہ چن اور کارگل کے برف پوش پہاڑوں میں، جہاں رگوں میں خون کی گردش جما دینے والی ٹھنڈ پڑتی ہے وہاں اپنے پیاروں کی یادوں کا آلاؤ جلا کر اس گردش کو رواں رکھتے ہیں۔کبھی وزیرستان کی بارود اگلتی وادیوں میں اپنے لیے دعائیں کرنے والوں کی مناجات سے حوصلہ پا کر دشمن کو منہ توڑ جواب دیتے ہیں۔کبھی سندھ کے خشک صحراؤں میں پیاس اور گرمی کا مقابلہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ کم از کم ہماری وجہ سے وطن عزیز کی کتنی مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بھائی اور بزرگ آرام کی نیند سو رہے ہیں۔کبھی بلوچستان کی بے آب و گیا پہاڑیوں میں پسینہ بہاتے ہوئے دل کو وہ وقت بیت جانے کی تسلی دیتے ہوئے وقت گزار لیتے ہیں۔یہ جدائی، یہ بچھڑنا، یہ دوریاں، یہ فاصلے، یہ تڑپنا، رونا اور آہیں سسکیاں تو ہم فوجیوں کا مقدر ہے۔اور اس کا بدلہ صرف اللہ پاک کی ذات ہی دے سکتی ہے۔تنخواہ کے نام پر موصول ہونے والے چند روپے یقیناً اس کا بدل نہیں ہو سکتے۔

”جاؤ گڑیا!“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔اس وقت میں خود کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔نفی میں سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر تڑپ کر آگے بڑھی اور سسکتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔

”کہہ تو دیا ہے جلدی آؤں گا۔“ میں نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی، مگر میرے منہ سے فقط بے بسی بھری آواز ہی نکل سکی تھی۔وہ بے آواز روتی رہی۔

”پلوشے!...... پتا ہے نا اگر انگور اڈے والی آخری گاڑی نکل گئی تو کتنا مسئلہ بنے گا تمھارے لیے۔اور یہاں سے ڈی بلاک تک میں بھی جانے رات کو کس وقت پہنچوں۔کیا یہی چاہتی ہو کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہوں۔“

اس مرتبہ میری بات کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ایک جھٹکے سے مجھ سے جدا ہو کر اس نے برقع چہرے پر ڈالا اور پیچھے مڑ کر تیز قدموں سے دور جانے لگی۔یوں جیسے اگر ایک سیکنڈ کی دیر ہو گئی تو وہ جا نہیں پائے گی۔میں وہیں رک کر اسے دیکھتا رہا۔پیچھے مڑے بغیر اس نے نالہ عبور کیا اور پھر فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کر کے سڑک پر چڑھ گئی۔میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ علام خیل سے ایک ویگن نکل کر انگور اڈے کی طرف جانے لگی۔اس

کے ہاتھ کا اشارہ پا کر ویگن اس کے قریب رکی۔آخری مرتبہ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔یوں جیسے اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ میں یہاں کھڑا ہوں گا۔اور پھر ویگن میں بیٹھ گئی۔

ویگن کے آگے بڑھتے ہی میں تھکے تھکے انداز میں پیچھے مڑا اور ڈی بلاک کی بلندیاں سر کرنے لگا۔میرے دل و دماغ میں اس وقت پلوشہ کے بچھڑنے کے علاوہ کوئی خیال جاگزیں نہیں تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بچھڑنا ہی ہوتا ہے۔چاہے وہ جدائی عارضی ہو یا ہمیشہ کی۔دوریاں اور فاصلے دل میں وہ گھاؤ پیدا کر دیتے ہیں جنھیں قربت کے مرہم ہی سے شفا مل سکتی ہے۔

”کوئی نہیں چند دنوں کی تو بات ہے۔“میں نے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا کر خود کو تسلی دی۔عجیب بات تھی کہ ماہین،جینیفر اور رومانہ سے ہمیشہ کی جدائی میں میرے دل کا یہ حال نہیں ہوا تھا جو پلوشہ کے عارضی پر دور جانے پر ہو رہا تھا کبھی تو پلوشہ کا ٹکرانا مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بدبختی لگنے لگتا کہ اس ٹکراؤ کی وجہ سے محبت جیسی بیماری نے ایک بار پھر میرے دل میں پنجے گاڑ لیے تھے۔اور کبھی اس کے ملنے پر میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھنے لگتا کہ مجھے اس جیسی البیلی دوشیزہ کی محبت مل گئی تھی۔بلا شک وشبہ اس جیسی لڑکیاں کہیں صدیوں بعد ہی جنم لیتی ہیں۔صنف نازک ہوتے ہوئے یوں ایک ظالم اور جابر سردار سے ٹکرانے کا حوصلہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

پلوشہ کی یادوں میں کھویا میں رات کو دس بجے ڈی بلاک پر واپس پہنچا۔پہچان کا مرحلہ ختم ہوتے ہی مجھے پوسٹ کمانڈر کے بنکر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ایک اور حیرانی میری منتظر تھی۔سردار خان کو وہاں موجود پا کر میں حیرت سے اچھل پڑا تھا۔مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر دکھ بھرے آثار نمودار ہوئے۔لیکن اس سے پہلے پوسٹ کمانڈر نے مجھ سے معانقہ کیا اور پھر ہمیں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

پوسٹ کمانڈر کے باہر جاتے ہی وہ میرے گلے لگ کر رو پڑا تھا۔

”یار راجے!......چنارے مجھے چھوڑ کر چلی گئی،لی زونا کے ساتھ محبت کرنے کی اس نے مجھے اتنی بڑی سزا دے دی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ لیا۔کم از کم ایک بار متنبہ تو کرتی اس کے بعد اگر میں لی زونا کا ذکر کرتا تو اس کا ایسا کرنا بنتا تھا یوں بغیر کچھ کہے سنے روٹھ جانا کوئی انصاف تو نہیں ہے نا یار!“

سردار کا غم دیکھتے ہوئے میرے دل سے عارضی طور پر پلوشہ کی جدائی کا دکھ غائب ہو گیا تھا۔اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے میں گلوگیر لہجے میں بولا۔ ’’جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے دوست!......میری بہن کا وقت مقرر تھا۔اور یہ بھی تو سوچو کہ مرتے ہوئے کم از کم اس کے دل میں کسی سوکن کا اذیت بھرا خیال موجود نہیں تھا۔اور سب سے بڑھ کر وہ اب بھی سلطان خان کی شکل میں تمھارے پاس موجود ہے اور ان شاءاللہ ہمیشہ موجود رہے گی۔‘‘

’’اسی بات نے تو مجھے بھی حوصلہ دیا ہے، ورنہ جانے میرا کیا ہوتا؟‘‘ مجھ سے علاحدہ ہو کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا

’’چھٹی خود بڑھائی تھی یا......‘‘

وہ قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔ ’’کمانڈنگ آفیسر ملک عرفان صاحب نے تعزیتی فون کر کے ساتھ ہی مہینا مزید گھر رہنے کا حکم دے دیا تھا۔‘‘

’’اب سلطان کو کس کے پاس چھوڑ آئے ہو؟‘‘

’’اپنی چھوٹی بہن کے حوالے کر آیا ہوں۔‘‘

’’اس کی دوسری ماں کو بلوا لینا تھا۔‘‘ ماحول میں چھایا بوجھل پن ختم کرنے کے لیے میں نے لی زونا کا ذکر کیا

اس کے پاس جانے کی تو حالت نہیں تھی البتہ اس کا جو ٹوٹا پھوٹا پتا ذہن میں تھا، آتے ہوئے اس پر ایک خط لکھ کر ڈال آیا ہوں۔اب جاپان جا کر اسے کیا ڈھونڈتا پھرتا۔یہ بھی ممکن ہے وہ کسی چھوٹے قد اور چندھی ہوئی آنکھوں والے جوان کی جانب اشارہ کر کے کہتی اس سے ملو یہ ہیں میرے شوہر نامدار۔ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں شادی کو چونکہ آپ کا فون نمبر میرے پاس نہیں تھا اس لیے دعوت نہ دے سکی۔‘‘ اس نے یہ تمام باتیں مزاحیہ انداز میں کہی تھیں مگر اپنے لہجے میں شامل دکھ کو نہیں چھپا سکا تھا۔

’’اگر وہ تمھاری قسمت میں ہوئی تو ضرور ملے گی۔‘‘ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ تم سے محبت کرتی تھی اور محبت کرنے والے اتنی جلد ہار نہیں مانا کرتے۔‘‘

’’ان باتوں میں مجھے قبیل خان کی موت تو بھول ہی گئی ہے۔مبارک ہو یار!......تم نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔مجھے یہاں پہنچ کر ہی پتا چلا ہے کہ اس کا کانٹا نکل گیا ہے۔البتہ تم لاپتا تھے اس لیے کافی پریشانی

تھی۔“

”شکریہ۔“ قبیل خان کا ذکر آتے ہی شوخ و چنچل پلوشہ کی تصویر میں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگی۔ میرا دل ایک دم چاہنے لگا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے اپنے آغوش میں لے کر کہیں ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو۔ بس اس کی شرارتیں ہوں، چنچل ادائیں ہوں، جان دار قہقہے ہوں، اس کا شرمانا اور آنکھیں جھکانا ہو، میرے لیے سجنا سنورنا اور میری گود میں لیٹنا ہو۔ اور میرے ساتھ ہر وقت کا جھگڑنا ہو۔

”کن خیالوں میں کھو گئے ہو۔“ سردار کی آواز مجھے خیالات کی خوب صورت دنیا سے باہر لائی۔

”کچھ نہیں یار!......“ میرے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”راجے!......ایک بات تو بتاؤ۔“

”کیا؟“

”میں اپنی چھوٹی بہن بھی تمھارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟......کیا قبیل خان کی موت کے وقت وہ تمھارے ساتھ ہی تھی۔ یقیناً اس خبیث کی موت پر وہ خوش تو ہوئی ہوگی؟“

”ہاں بہت خوش تھی۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ویسے میں تو ڈر رہا تھا کہ میرے جاتے ہی تم نے اس معصوم کو بھگا دیا ہوگا۔“

پلوشہ کا ذکر آتے ہی میرے منھ میں مٹھاس گھل جاتی تھی۔ میں نے متبسم ہو کر کہا۔ ”وہ اتنی آسانی سے بھاگنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”ہا......ہا......ہا۔“ سردار نے قہقہہ لگایا۔ ”صحیح کہا، ویسے تمھیں تو وہ خوب تنگ کرتی تھی، کیا میرے جانے کے بعد بھی وہ تمھیں اسی طرح دھمکیاں دیتی رہی کہ قبیل خان کے قتل کے بعد تمھیں جان سے مار دے گی۔“

”دھمکیاں تو وہ دیتی تھی لیکن بعد میں اس کی دھمکی تبدیل ہو گئی تھی۔“

”بھلا نئی دھمکی کیا تھی؟“ سردار نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی کہ وہ خود کشی کر لے گی۔“

سردار نے حیرانی سے کہا۔ ''اب یہ کیا کہہ رہا ہے، بھلا یہ کیا دھمکی ہوئی ایسی دھمکی تو کسی چاہنے والے کو دی جاتی ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''تو چاہنے والے ہی کو دیتی تھی نا۔''

''کیا......؟'' سردار نے مجھے یوں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔ ''میرے کان وہی سن رہے ہیں جو تم کہہ رہے ہو یا میرا دماغی فتور ہے۔''

''گو فتور تو ہر پٹھان کے دماغ میں ہر وقت موجود ہوتا ہے، لیکن اس وقت تم نے وہی سنا جو میں نے کہا۔''

''مم......مگر یہ سب کیسے ہوا؟'' خوشی اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

''پتا نہیں یار!......'' میں نے آنکھیں موندتے ہوئے پلوشہ کا تصور کرتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے ناگزیر ہے، اتنی کہ باقی لڑکیوں کے بغیر تو میں آج بھی زندہ ہوں لیکن اس کے اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔''

''راجے!......یوں ایک دم......یہ سب کیسے ہو گیا......مجھے فوراً تفصیل سے ساری کہانی سناؤ۔ یہ نہ ہو میرا سانس رک جائے۔''

''تمھارے جانے کے بعد میں اورنگ زیب صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وہ زبردستی میرے گلے پڑی رہی اور پھر......................'' میں نے تفصیل سے اس کے سامنے سب کچھ دہرا دیا۔ جانے کب سے میں ترس رہا تھا کہ کوئی راز دار میسر ہو جس کے سامنے میں اپنی پلوشہ کا ذکر کروں اور یہ اعتراف کروں کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں، اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں اور وہ میرے لیے کتنی اہم اور ضروری ہے۔

''مطلب تم ابھی اسے رخصت کر کے آ رہے ہو۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو اپنی بہن سے ملاقات ہی کر لیتا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوتی۔''

''راجے!......پلوشہ جیسی شریک حیات تمھیں چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گی۔''

''یار!......اس جیسی اللہ پاک نے اور کوئی بنائی ہی نہیں۔'' میرے لہجے میں پلوشہ کے لیے دنیا جہاں کا پیار ابل رہا تھا۔

سردار کھل کھلا کر ہنسا۔''ہوٹل کے اندر جب میں تمھاری غیر موجودی میں اسے سمجھا رہا تھا کہ میرے آنے تک تمھیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔اسی وقت اس نے مجھے یہی کہا تھا کہ سردار بھائی!......فکر نہ کرو تمھارے راجے کو تو میں ایسا سیدھا کروں گی کہ واپسی پر اسے پہچان نہیں پاؤ گے۔اور یقیناً جیسا کہا تھا ویسا ہی کر دکھایا ہے۔''

''وہ ہے ہی ایسی۔'' مجھے پلوشہ کی تعریف سے خوشی مل رہی تھی۔

اسی وقت وہاں رکھے سرکاری فون کی گھنٹی بجی مگر ہم نے اسے نظر انداز کر دیا۔فون دو تین مرتبہ بج کر خاموش ہو گیا۔

''مجھے عنقریب ہی اپنے دوست کے سر پر سہرا سجتا دکھائی دے رہا ہے۔'' سردار نے خیال ظاہر کیا۔میرے جواب دینے سے پہلے ہی دروازہ ہلکے سے بجا کر ایک آدمی نے اندر جھانکا۔

''سر!......اورنگ زیب صاحب بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔''معذرت یار!......ہم نے سوچا پوسٹ کمانڈر کے لیے کال ہے۔''

فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔میں نے رسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اسلام علیکم سر!......ذیشان بات کر رہا ہوں۔''

''وعلیکم اسلام جناب!......بہت بہت مبارک ہو۔ایک موذی کو تم نے اس خوب صورتی سے ٹھکانے لگا دیا۔''

''شکریہ سر!......بس اب کچھ دنوں کی چھٹی درکار ہے۔''میں نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کیا کہ میں صبح سویرے ہی انگور اڈے جا کر اپنی روح کو تسکین دینا چاہتا تھا۔

''کیا سردار نے تمھیں کچھ نہیں بتایا۔''میجر اورنگ زیب نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں سر!......سردار سے تو بس ان کی بیوی کے بارے تعزیت کی ہے اور پھر میں اسے اپنے واقعات سنانے لگا اس دوران آپ کی گھنٹی آ گئی۔''

''ہونہہ!......ویسے میں نے اتفاقاً پوسٹ کمانڈر سے بات کر لی، اس نے تمھاری واپسی کے بارے بتا دیا

اور میں نے تم سے بات کرنا ضروری سمجھا ورنہ اتنی رات گئے میں فون نہیں کیا کرتا۔“

”آپ جس وقت فون کریں سر! اس سے مجھے کوئی مسئلہ نہیں، میرا مسئلہ تو چھٹی ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ صبح میں روانہ ہو جاؤں۔“

”اگر کوئی زیادہ سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے تو ایک ہفتہ میری خاطر رک جاؤ۔“ میجر اورنگ زیب کے لہجے میں حکم سے زیادہ التجا کا عنصر نمایاں تھا۔

”اللہ پاک ہم سب کو مسائل سے محفوظ رکھے سر!...... بہرحال آپ کی خواہش میرے لیے حکم کا درجہ ہی رکھتی ہے۔ میں ایک ہفتہ صبر کر لیتا ہوں۔“

”شکریہ ذیشان!...... باقی تفصیلات تمھیں سردار سے معلوم ہو جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے سر!...... فی امان اللہ۔“ میں نے اجازت چاہی اور میجر اورنگ زیب نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رسیور نیچے رکھ کر میں سردار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”خان صاحب!...... کیا معاملہ چل رہا ہے، اورنگ زیب صاحب نے تو ایک ہفتے کے لیے میری چھٹی روک دی ہے۔“

وہ ہنسا۔ ”ہاں تمھاری باتوں سے مجھے پتا چل گیا ہے۔ اچھا ہی ہوا اب یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ ادھر ہلکا سا قول وقرار، اور اس کے ساتھ شادی تیار۔ چند دن صبر کرو میرے بھائی!...... رات کے دو ہونے والے ہیں۔ شام سے تمھارے منھ سے پلوشہ پلوشہ کی رٹ سن رہا ہوں۔“

”وہ ہے اس قابل کے اسے یاد کیا جائے۔ تمھاری لی زونا کی طرح نہیں ہے کہ آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی تم ایک دوسرے کو بھول گئے۔“

”بکواس نہ کرو اور سو جاؤ۔“ وہ فوراً رضائی میں گھس گیا۔

”اچھا مجھے تفصیل تو بتا دو آخر ہفتے کے لیے میری چھٹی کیوں رکوا رہے ہیں۔ بتایا تھا نا کہ پلوشے نے تین دن کی مہلت دی ہوئی ہے۔ ایک دن بھی اوپر ہونے کی صورت میں اس نے بات نہیں کرنی۔“

”اتنے ماہ ہو گئے ہیں میں نے لی زونا سے بات نہیں کی...... تو کیا ہوا؟ زندہ ہوں نا۔ تم بھی نہیں مرو گے۔“

خیر تفصیلات جانے بغیر تو میں نے تمھیں نہیں سونے دینا۔‘‘ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

’’گزشتا ایک ماہ سے دہشت گردوں کے حملوں کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ کافی پہاڑی چوٹیاں اب تک دہشت گردوں کے قبضے میں ہیں۔ وچہ نرائے کی بلندی پر آرمی نے دو تین مورچے بنائے ہیں جہاں سے میں نے اور تم نے ذخیرہ ٹاپ پر دہشت گردوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالنی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور ضروری کام یہ ہے کہ پرسوں وانہ سے ایک ٹینک لایا جا رہا ہے جسے حفاظت سے یہاں تک پہنچانے میں ہم نے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ کل ایک QRF کے ساتھ جا کر ہم نے رستے میں آنے والی ایسی جگہوں کا چناؤ کرنا ہے جہاں سے دشمن سنائپرز گھات لگا کر آنے والے قافلے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ کچھ حساس جگہوں پر فوجی جوان پکٹنگ کریں گے، کچھ جگہیں راستے میں آنے والی پوسٹیں سنبھالیں گی اور ہم نے بھی اس کارروائی میں اپنا حصہ ڈالنا ہے۔‘‘

’’ٹینک اور اس علاقے میں؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

’’جی ہاں، اور یہ ذخیرہ ٹاپ کے خلاف منگوایا جا رہا ہے۔ ڈی بلاک کے اوپر جو پوسٹ ہے 3349 اس پر سے ذخیرہ پوسٹ کو نشانہ بنایا جائے گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے اتنی بلندی پر ٹینک کا چڑھنا ایک ریکارڈ ہی ہوگا۔‘‘

’’اورنگ زیب صاحب بھی یہی بتا رہے تھے۔‘‘ سردار نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’مگر ٹینک کو ہماری حفاظت کی کیا ضرورت؟‘‘

’’یہ کوئی الضرّار یا الخالد ٹینک نہیں ہے۔ یہ تو وہی پرانا ٹینک ہے جس میں جدید کمپیوٹر سسٹم موجود نہیں تھا۔‘‘

’’ٹینک نا معلوم نیا ہے یا پرانا مگر اس ظالم نے میری دوریوں کی میعاد میں اضافہ ضرور کر دیا ہے۔‘‘

’’یار!......تم تو بالکل ہی بے صبرے ہوتے جا رہے ہو۔‘‘ سردار کے لہجے شامل تشویش بالکل حقیقی تھی۔ ’’اتنا بے چین میں نے اس سے پہلے تمھیں نہیں دیکھا۔‘‘

’’اس سے پہلے مجھے پلوشے بھی تو نہیں ملی تھی نا۔‘‘ میں نے اس کی بات جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سردار جھلا کر بولا۔ ’’اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایک لڑکی ہی تو ہے۔ نہ جانے دنیا

میں اس سے کتنی حسین اور خوب صورت لڑکیاں موجود ہوں گی۔ بلکہ دور کیوں جاتے ہو لی زونا ہی کو لے لو۔“ آخری فقرہ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

”جہاں تک میری تحقیق ہے تو پلوشے سے خوب صورت نہ تو اس سے پہلے کسی لڑکی کی دنیا میں آمد ہوئی ہے اور نہ اس کے بعد ہی اللہ پاک نے کسی کو اتنے حسن سے نوازنا ہے۔ باقی رہی بات لی زونا بہن کی تو اس بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ، دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔“

سردار نے منھ بنایا۔”مجنوں کو بھی کالی لیلیٰ دنیا کی سب سے حسین لڑکی نظر آتی تھی۔“

”دیکھ لو......یہی بات میں تمھیں لی زونا کے متعلق سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اچھا اب سو جاؤ۔“ میری جانب پیٹھ موڑتے ہوئے سردار نے اپنا سر رضائی کے اندر کر لیا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دن بھر کی تھکن کے باوجود میں جلدی نہیں سو سکا تھا۔ پلوشہ میرے خیالوں میں سرگرداں رہی۔ بڑی مشکل سے اپنے خیالات کو مشن کی جانب موڑ کر میں سونے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کی نماز کے لیے مجھے سردار نے جگایا تھا۔ نماز پڑھ کر میں دوبارہ سو گیا۔ ناشتا ہم نے نو دس بجے کیا تھا۔ ناشتے کے بعد QRF کی پانچ گاڑیوں کے ساتھ ہم راستے کی قراولی (Reconnaissance) کے لیے روانہ ہو گئے۔ چار پانچ گھنٹوں میں ہم شکئی پہنچ گئے تھے۔ وہاں دن کا کھانا کھا کر ہم واپس لوٹے اور گاڑیوں کے ساتھ واپس جانے کے بہ جائے رستے میں اتر گئے۔ وہاں سے ہم نے اپنا مورچہ سنبھالنے کی جگہ پر پہنچنا تھا۔ آنے والی صبح وانہ سے ٹینک نے روانہ ہونا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ وانہ سے بہ مشکل شکئی تک ہی پہنچ پاتا لیکن ہم نے پہلے سے اپنی جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے۔ وزیرستان کی پہاڑیوں میں رات گزارنے کی جگہ تلاش کرنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہاں سردی کی شدت اپنی جگہ برحق ہے لیکن درختوں کی اتنی بہتات ہے کہ پہاڑی بلندیوں پر خشک لکڑی وافر مقدار میں مل جاتی ہے۔ جنھیں جلا کر سردی کی شدت کا مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

کوئی غار تو ہم تلاش نہیں کر پائے تھے البتہ ایک بڑی چٹان کے نیچے ہمیں رات گزارنے کی جگہ مل گئی تھی۔ تیز ہوا سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہم نے خالی جانب پتھروں کی دیوار بنا دی تھی۔ وہاں چھوٹے بڑے اتنے

پتھر بکھرے پڑے تھے کہ چھوٹی سی دیوار تو کیا پورا کمرہ بنایا جاسکتا تھا۔ہم نے تو بس پتھروں کو ترتیب سے رکھ کر دو اڑھائی فٹ دیوار بلند کی تھی ،تا کہ ایک تو ہماری جلائی ہوئی آگ دور تک نظر نہ آسکے،دوسرا تیز چلنے والی ہوا سے بھی آگ کو بچایا جاسکے۔اندھیرا چھانے تک ہم رات گزارنے کے انتظامات سے فارغ ہو گئے تھے۔

سردار آگ جلا کر چائے بنانے لگا۔میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی سات بج رہے تھے۔پلوشہ سے بچھڑے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت بیت گیا تھا۔اسے رخصت کرتے وقت طے یہی ہوا تھا کہ ہم روزانہ رات کے آٹھ بجے چینل نمبر پانچ پر بات کریں گے۔گھنٹا بھر پہلے ہی آئی کام آن کر کے میں نے چینل نمبر پانچ لگا دیا تھا۔لیکن وقت تھا کہ نہایت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔سردار نے چائے بنا کر مخصوص بسکٹوں کا پیکٹ اور چائے کی پیالی میری جانب بڑھا دی۔

میں سرعت سے بسکٹوں کا پیکٹ چبا کر چائے کی پیالی معدے میں انڈیلی اور خالی پیالی سردار کی طرف بڑھا دی۔

’’اور چائے؟‘‘ وہ مستفسر ہوا۔

’’شکریہ کہہ کر میں گھڑی دیکھنے لگا۔

تم پچاسویں بار گھڑی دیکھ رہے ہو، کیا اس طرح بے صبری ظاہر کرنے سے وقت جلدی گزر جائے گا۔‘‘

’’تمھیں کوئی مسئلہ۔‘‘میں نے اسے جھڑکنے میں ایک منٹ نہیں لگایا تھا۔

’’مسئلہ تو کوئی نہیں، بس تمھاری حالت دیکھتے ہوئے ترس آرہا ہے، وہ کیا کہتے ہیں......

عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

’’غالب یا اقبال کا شعر پڑھ کر بھی تم خان ہی رہو گے عقل مند نہیں کہلا سکتے۔‘‘

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔’’پٹھانوں کو بے وقوف سمجھنے والوں کی اپنی عقل میں فتور ہوتا ہے۔‘‘

’’اچھا اگر اتنے ہی عقل مند ہو تو بتاؤ دنیا کی سب سے خوب صورت اور پیاری لڑکی کا نام کیا ہے؟‘‘

’’یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، لی زونا کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا ہے۔‘‘

میں نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔"رہے ناوہی پٹھان کے پٹھان ......میں نے تم سے بے وقوف ترین لڑکی نہیں، خوب صورت لڑکی کا پوچھا ہے جس کا درست جواب تھا پلوشہ خان وزیر۔"

"لی زونا، جاپان انٹیلی جنس کی ذہین آفیسر ہے، بے وقوف کیسے ہوگئی؟"

"بے وقوف آدمی شکل سے نہیں حرکتوں سے پہچانا جاتا ہے اور ایک پٹھان کو دل دے کر اس نے اپنی ذہانت کا پول کھول دیا ہے۔"

"اچھاااا......"اچھا کی آخری الف کو لمبا کھینچتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔"اگر پٹھانوں کو دل دینا بے وقوفی اور بے عقلی کی نشانی ہے تو میرا خیال ہے پلوشہ خان وزیر کوئی سندھی، بلوچی یا پنجابی نہیں ہے۔"

"مجھے تم سے بحث ہی نہیں کرنا۔" گھڑی کی سوئیوں کو آٹھ بجنے کا اعلان کرتے دیکھ کر میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ چٹان کے اوپر چڑھ کر میں نے اسے بار بار پکارنا شروع کر دیا تھا۔"پلوشے...... پلوشے...... پلوشے......" مگر اس کی جوابی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ کافی دیر میں سر کھپاتا رہا مگر اس کی دل لبھانے والی آواز نہیں سن پایا تھا۔ یقیناً وہ زیادہ فاصلے پر موجود تھی جہاں تک آئی کام رابطہ نہیں پا رہا تھا۔

"محترم!......اب تشریف لے آئیں اور آنکھیں بند کر کے اپنی پلوشہ خان سے گفتگو فرما لیں جیسا کہ میرا معمول ہے۔"

"میں خان نہیں ہوں سمجھے، میں اس طرف پہاڑی پر جا رہا ہوں۔" کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر میں انگور اڈے کی جانب موجود بلند پہاڑی پر چڑھنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ آتے ساتھ ہم نے چاروں طرف موجود علاقے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اس پہاڑی اور جس پہاڑی پر ہم موجود تھے، ان دونوں کے درمیان ایک کم بلند پہاڑی اور دو نالے پڑ رہے تھے۔

"اے بے عقل کے ناخن لو، تم تو پٹھان نہیں ہو۔" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر چٹان کے نیچے دھکیلا۔

"یار!......وہ منتظر ہوگی۔" میں سچ مچ متفکر ہو گیا تھا۔

"تمھیں اس پہاڑی پر پہنچنے تک کم از کم ہی دو تین گھنٹے لگ جائیں گے اور اس وقت تک جانان سو چکی ہوگی۔ آٹھ بجنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ گھنٹا آدھ گھنٹا انتظار کرے گی، آخر صبح تک تو اس نے آئی کام آن کر کے تو

نہیں بیٹھے رہنا نا۔اور پھر اندھیرا دیکھو، خواہ مخواہ کا دردسر نہ بڑھاؤ۔''

''اللہ کرے لی زونا کو تمھارا خط ہی نہ ملے۔''میں جھلاتے ہوئے بیٹھ گیا کہ اس کی بات بہ ظاہر مبنی بر حقیقت تھی۔سردار چائے کے برتن صاف کر کے تھیلے میں رکھنے لگا جبکہ مجھے عجیب قسم کی بے چینی ہو رہی تھی۔دو تین منٹ دل گرفتہ رہنے کے بعد میں نے اچانک پوچھا۔

''خان صاحب!......نیند آ رہی ہے کہ نہیں؟''

''فی الحال تو نہیں آ رہی......تم سو جاؤ۔''

''اگر میں کہوں کہ میں نے ساری رات سونا ہے تو تمھارا کیا جواب ہوگا؟''

اس نے دو تین لکڑیاں اٹھا کر آگ پر ڈالتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔''تمھیں میرا جواب معلوم ہے۔''

''تو تمھیں میرے ساری رات سونے پر کوئی اعتراض نہیں۔''

''بے شک۔''اس کا اطمینان برقرار رہا۔

''اٹھو پھر۔''میں نے بیرٹ ایم 107 کا جھولا پیٹھ پر لادنے لگا۔

''اب کیا ہو گیا ہے؟''

''یار!......مجھے چین نہیں آ رہا، وہ بار بار آئی کام آن کر کے مجھے پکارتی رہے گی، میں جانتا ہوں نا اسے......تم بس چلو میرے ساتھ، ہم ابھی سامنے والی پہاڑی پر جا رہے ہیں۔''

''یار راجے، مجھے تم سے اس بچپنے کی امید نہیں تھی۔''وہ بہ ظاہر کوفت کا اظہار کر کے تیار ہونے لگا، مگر میں اسے جانتا تھا وہ خالص پٹھان۔جو دوستی کے نام پر جان قربان کر سکتا تھا یہ تو صرف چند کلو میٹر کا سفر تھا جو اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔اس کے تیار ہوتے ہی ہم چل پڑے۔کلاشن کوف اس نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی جبکہ میرے پاس اپنا گلاک نائینٹین تھا، وہی پستول جسے پلوشہ کے جسم سے اتصال کا شرف حاصل رہا تھا۔چلنے سے پہلے میں نے قطبی ستارے کی مدد سے اپنی سمت کا تعین کر لیا تھا۔مطلوبہ پہاڑی ہم سے غربی جانب موجود تھی قطبی ستارے کو دائیں ہاتھ پر رکھ کر ہم ناک کی سیدھ میں چل پڑے۔سردار کی کوفت دو تین منٹ سے زیادہ

برقرار نہیں رہی تھی۔ ڈھلوان سے اترتے ہوئے اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"یار راجے!......تم کچھ زیادہ ہی باؤلے نہیں ہو رہے۔"

"کیا کروں یار!......خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں نا؟......وہ الو کی پٹھی بری طرح اعصاب پر سوار ہے۔ اسے ذرا بھی اداس یا پریشان نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔"وہ وقت یاد ہے جب اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔"

"آہ......" میں ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

"شاید میں نہ آتا تو تم اسے جان سے مار چکے ہوتے۔"

"ہونہہ!" میں اس کی تردید نہیں کر سکا تھا۔"لیکن جانتے بھی ہو میں نے اسے اس بے دردی سے کیوں پیٹ رہا تھا؟"

"قبیل خان سے نفرت کی وجہ سے۔" سردار نے فوراً اندازہ لگایا۔

"نہیں......بلکہ اس لیے، کہ پہلی بار دیکھتے ہی میں اس پر مرمٹا تھا، لیکن میرا دل اور دماغ اس بات کو تسلم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور مجھے اس کی بے راہ روی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ قبیل خان جیسے دہشت گرد کی رکھیل کیسے بن گئی، حالانکہ وہ تو میرے لیے بنی ہے۔ اب یہ میری بدبختی کہ میں اس معصوم کو وضاحت پر آمادہ نہ کر سکا۔"

سردار نے مجھے چھیڑا۔"اتنی بھی معصوم نہیں ہے۔ پتا نہیں کتنوں کے سر سے گولی گزار چکی ہے۔"

"اس کی گولی کا نشانہ بننے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو مرنے کا حق دار نہ ہو۔ سارے ننگ انسانیت، وطن فروش اور دہشت گرد تھے۔"

سردار نے قہقہہ لگایا۔"ویسے مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم اور پلوشہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہو۔"

"مجھے بھی۔" میں اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا تھا۔

ڈھلان سے اتر ہم نالے اترے اور چوڑا نالہ عبور کر کے اگلی چڑھائی سر کرنے لگے اس درمیانی پہاڑی کے بعد ایک اور نالہ تھا جسے عبور کر کے ہم بلند پہاڑی کی چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ پسینہ دھاروں کی صورت ہمارے چہروں پر بہہ رہا تھا۔ تیز قدم لینے کی وجہ سے ہمارے سانس بھی پھولے ہوئے تھے۔ سردار بار بار مجھے آہستہ چلنے

کا کہتا مگر میرے دل کسی ایسی ان دیکھی ڈور سے بندھا تھا کہ مجھے تھکن محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اگر خیال آ رہا تھا تو یہی کہ وہ منتظر ہوگی۔ بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچتے ہی میں نے ٹارچ کی روشنی میں گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا جو گیارہ بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔

پیٹھ پر لدے جھولے کو اتارنے کا تکلف کیے بغیر میں نے آئی کام آن کیا اور پھولے ہوئے سانسوں سے وہ پیارا نام لیا جس سے میرے منہ میں مٹھاس گھل جاتی تھی۔

''پلوشے!......''

''راجو......!'' ایک سیکنڈ میں اس کی بے تابانہ آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

''چندا!......میں بہت دور تھا جہاں بات نہیں ہو سکتی تھی، ابھی چھ سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ایسی جگہ پہنچا ہوں جہاں تمھاری آواز سن سکوں۔''

میرے خاموش ہوتے ہی وہ بے قراری سے بولی۔''اگر آپ نہ آتے تو میں ساری رات مخابرہ آن کر کے چھت پر بیٹھی رہتی۔''

سردار مجھے باتوں میں مصروف دیکھ کر تھوڑی دور ایک چٹان کے پاس جا کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اس کی ٹارچ کی روشنی سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ پندرہ بیس گز دور چلا گیا ہے۔

''ایسا بھلا ہو سکتا ہے کہ میں تمھیں انتظار کی کوفت میں مبتلا رکھوں۔''

''انتظار ہی تو کر رہی ہوں ......راجو جلدی آؤ نا؟......اب تو لگتا ہے آپ کو دیکھے ہوئے بھی مدت گزر گئی ہے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔''ایک ہفتہ لگ جائے گا۔''

''کیا......؟'' وہ حیرانی اور غصے بھرے لہجے میں چلائی۔''میں اپنی جان لے لوں گی۔''

''چندا!......ایسا تو نہیں کہتے......تم جانتی تو ہو میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

''میں کچھ بھی نہیں جانتی راجو!......میں سچ مچ مر جاؤں گی۔'' اس کی سسکیاں سن کر مجھے کچھ ہونے لگا۔

''اچھا پتا ہے تمھارا سردار بھائی لوٹ آیا ہے۔'' میں نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

”راجو!...... بھائی کو میرا اسلام کہو اور انھیں کہو کہ آپ کو چھٹی دلوا دے نا؟“

”یہ اس کے بس سے باہر ہے چندا......بس تم ایک ہفتہ صبر کر لو......“

”نہیں ہوتا نا صبر۔“ وہ غصے سے چلائی۔ ”اگر اتنی برداشت ہوتی تو منتیں کیوں کرتی۔“

”تو جب تین تین ماہ چھٹی نہیں آؤں گا تب کیا کرو گی؟“ میں نے اسے مستقبل کا حوالہ دے کر سمجھانا چاہا۔

”راجو!...... پتا نہیں مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ آپ بس کسی بھی طرح آ جائیں۔“ اس نے اپنی راگنی الاپی

”میری بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئی ہے نا؟“

”ہاں...... ہاں نہیں آئی......اور نہ میں کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔“

”میری بات نہیں مانو گی۔“

”دیر سے آنے والی بات کے علاوہ، ہر بات مانوں گی۔“ وہ اپنی بات پر مصر رہی۔

”دیکھو چندا!......اگر تم اس طرح روؤ گی تو یقیناً مجھ سے کام نہیں ہو سکے گا۔ اور تمھیں معلوم تو ہے نا میرا کام کتنا خطرناک ہے ذرا سی بے پرواہی سے جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے آپ نے اسی طرح دھونس جمانی ہے۔“ اس ہٹ دھرم کے لہجے میں ہلکی سی نرمی آئی اور میں خوش ہو گیا۔

”میں جانتا تھا میری چندا بہت سمجھ دار ہے۔“

”بس بس زیادہ چاپلوسی نہ کریں۔“ اس کی شوخی بھری آواز نے مجھے قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسی وقت سردار مجھے پکار کر باآواز بلند بولا۔ ”محترم!......اسی بیٹری پر گزارا کرنا، اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ ایک بیٹری ختم ہونے پر میں آئی کام کی فالتو بیٹری تمھارے حوالے کرنے پر تیار ہو جاؤں گا تو یہ ناممکن ہے۔“

میں اس کی بات پر کان دھرے بغیر پلوشہ سے گپ شپ کرتا رہا۔ اس کی شوخی بھری باتیں، لاڈ بھرے گلے شکوے اور جلدی آنے کی تاکید سنتا رہا۔ یہاں تک کہ آئی کام کی بیٹری کمزور پڑنے لگی۔ ہمارے پاس ایک فالتو بیٹری موجود تھی لیکن ہم جس مشن پر نکلے ہوئے تھے اس کے لیے ہمارا اپنوں سے رابطے میں رہنا ضروری تھا۔ میں نے پلوشہ سے اجازت مانگی اور اس کے ساتھ اسے کل کے نہ آنے کی بابت بھی بتا دیا۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد

وہ کل کی غیر حاضری بھی ہضم کر گئی تھی۔ جب اس کی آواز بالکل کٹ کٹ کر سنائی دینے لگی تو میں نے آئی کام آف کر دیا۔

''اب رات یہیں گزارنا ہے یا واپس چلیں؟'' سردار نے میرے بات ختم کرتے ہی پوچھا۔

میں نے فوراً مشورہ دیا''یہاں سے اٹھ کر صبح سویرے واپسی اختیار کرنے سے بہتر ہے ابھی چلتے ہیں۔''

''مروادیا ہے تمھاری پلوشے نے یار!'' تھکے تھکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

''میں تو تازہ دم ہو گیا ہوں۔'' میں خوشی سے چہکا۔

''تم سے تو اللہ سوہنا ہی پوچھے گا.....لڑکے نما لڑکی میں جانے تمھیں نظر کیا آیا ہے،اس کے بال دیکھو ،مردانہ لباس دیکھو، کندھے سے لٹکی کلاشن کوف دیکھو......کوئی ایک بات ایسی ہے جو اسے نازک اندام، معصوم ،بھولی بھالی دوشیزہ سے تشبیہ دی جا سکے۔ قسم سے اپنے بدر منیر اور آپ کے سلطان راہی کی ہم زاد لگتی ہے۔''

''خان صاحب !......میں کہہ سکتا ہوں کہ تمھاری زبان میں کیڑے پڑیں ،مگر یہ کافی نہیں ہو گا،تم نے میرے چاند کی توہین نہیں کی معیارِ حسن کو للکارا ہے۔ یقیناً یہ رطب ویابس تمھارے سیاہ نامہ اعمال کا سب سے بدنما دھبہ ہے۔''

''ہا......ہا......ہا......'' سردار نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا۔''سردار سنو شاعر پلوشے کو کن الفاظ سے یاد کرتا ہے......

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہے اس کی غزال آنکھوں میں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی سیاہ چشم مگیں قیامت ہے
سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت

مکیں ادھر کے بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں
رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
کسے نصیب کہ بے پیرہن اسے دیکھے
کبھی کبھی درودیوار گھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اس کو چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سردار نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے تمھارا قہقہہ اتنا ہی برا لگ رہا ہے جتنا کہ خود تم۔“

”ویسے کمال ہی ہو گیا راجے صاحب!...... مجھے اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آرہا کہ پلوشہ کسی کے لیے اتنی دیوانی ہو سکتی ہے۔ یار، وہ تو بالکل ہی باولی ہوئی جارہی تھی۔ اتنی سمجھ دار لڑکی کو ہو کیا گیا ہے۔ اور تمھارے تھوبڑے میں اسے ایسی کون سی بات نظر آگئی کہ ہفتے کی جدائی پر وہ مری جارہی ہے۔ اور پھر تمھیں اتنی تمیز سے مخاطب کرنا۔ کوئی لکھنوی طرز کی پشتو بول رہی تھی۔ حالانکہ تمھارے جیسا بندہ اتنی عزت کے قابل کہاں ہوتا ہے۔“ سنجیدہ لہجے میں گفتگو کرتے کرتے وہ مذاق پر اتر آیا تھا۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ”مجھ سے زندگی میں ایک ہی گناہ سرزد ہوا ہے اور وہ ہے تم سے تعلق رکھنا۔ اس کے علاوہ میری خامی بتاؤ؟“

”میں تمھارے کرتوتوں پر پی ایچ ڈی کر سکتا ہوں۔ نہ تم امریکہ جا کر سدھرے اور نہ انڈیا جا کر عورت ذات کو معاف کیا۔ اب وزیرستان میں بھی ایک بے وقوف کے پیچھے پڑے ہو جسے یہ تک معلوم نہیں کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔“

''اب اس نے لڑکیوں کے کپڑے پہننے شروع کر دیے ہیں۔اور یہاں سے انگوراڈے جاتے وقت برقع اوڑھ کر گئی ہے۔'' میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

سردار ہنسا۔''ویسے سچ سچ بتاؤ کتنی عجیب لگ رہی تھی۔''

''بالکل اتنی ہی عجیب، جتنا کوئی بھی پٹھان عقل مندی کی بات کرتے ہوئے لگ سکتا ہے۔''

''پٹھانوں پر جگتیں مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر پٹھان بے وقوف ہوتے ہی ہیں تو تمھارے ساتھ پلوشہ کا لگاؤ ایک پٹھانی حماقت ہی ہے۔''

رستے کی طوالت سے ہونے والی کوفت سے بچنے کے لیے ہم ایک دوسرے پر لفظی بمباری کرتے ہوئے ساڑھے تین کے قریب، ہم اپنی کمین گاہ میں پہنچ گئے تھے۔واپسی پر چونکہ اترائی زیادہ تھی اس وجہ سے ہمارا ادھ گھنٹے کے قریب وقت بچ گیا تھا۔پلوشہ سے گفتگو کرنے کے بعد میں تازہ دم تھا۔سردار کو سو جانے کا کہہ کر میں جاگتی آنکھوں سے اپنی پلوشے کو دیکھنے لگا۔میری نگاہوں میں ڈمبریانی کے سردار ثقلین خان کے بیٹے دلدار کی شادی کا منظر کسی فلم کی طرح گھومنے لگا۔پلوشے کے رقص نے اس وقت بھی میرے دل کی دنیا کو زیروزبر کر دیا تھا لیکن اب تو وہ مجھے کسی اور جہاں کا منظر لگ رہا تھا۔جانے اتنا خوب صورت رقص اس نے کہاں سے سیکھا تھا ۔ساز کے ساتھ اس کے لچکیلے بدن کا ہر انگ یوں موزونیت سے حرکت کر رہا تھا گویا ساری زندگی اس نے یہی کام ہی کیا ہو۔اور پھر اس کا بدن یوں سانچے میں ڈھلا تھا خالق کی صناعی پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں رہتا تھا۔پتا نہیں کیسی جادوگرنی تھی کہ چھوٹی چھوٹی زلفوں میں بھی میرے دل کو باندھ لیا تھا۔نہ جانے لمبا ہونے پر ان زلفوں نے اس دل پر کیا قیامت ڈھانی تھی۔اتنا تو طے تھا کہ اب میں نے اسے بال چھوٹے کرنے کی اجازت بالکل بھی نہیں دینا تھی۔میں مشن وغیرہ کی تکمیل کی سوچوں کو پسِ پشت ڈال کر بس اسی کو سوچتا رہا۔یہاں تک کہ نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ہمارے پاس فالتو پانی نہیں تھا کہ میں وضو کی عیاشی کا متحمل ہو سکتا۔مجبوراً تیمّم کر کے میں نے صبح کی نماز ادا کی اور پھر ٹوٹی ہوئی سوچوں کو وہیں سے جوڑا جہاں پر منقطع ہوئی تھیں۔دن خوب چڑھ آیا تھا سردار کو جگانے سے پہلے میں نے چائے بنانا مناسب سمجھا۔چائے بننے تک وہ خود ہی کسمسا کر اٹھ بیٹھا تھا ۔ہم دونوں نے مخصوص بسکٹوں سے پیٹ پوجا کی اور میں بستر میں گھس گیا۔

سردار نے مجھے سہ پہر کے وقت جگایا اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ ٹینک شکئی میں پہنچ کر رک گیا تھا اور آگے وہ کل ہی آئیں گے۔

ہم نے وہ رات بھی وہیں گزاری۔ اگر میرے پاس آئی کام کی فالتو بیٹری ہوتی تو یقیناً میں کل والی جگہ پر جا کر پلوشہ سے بات چیت ضرور کرتا۔ سورج ابھرتے ہی ہم دونوں نے ایک مناسب درخت پر مچان بنائی اور وہاں بیٹھ کر دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگے مگر کوئی ایسی حرکت ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے جس کے خلاف کارروائی کرنا ضروری ٹھہرتا۔ ٹینک سہ پہر کے وقت ہمارے پاس سے گزرا تھا۔ اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ ٹینک کے گزر جانے کے بعد بھی ہم تھوڑی دیر مچان میں بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لیتے رہے۔ لیکن ہماری یہ احتیاط بے کار گئی تھی۔

ہم دونوں اپنے ہتھیار اور سامان سنبھال کر نیچے اتر آئے۔ ہمارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ مجھے رات کے اٹھ بجے تک ڈی بلاک تک پہنچنے کی فکر ستانے لگی۔ مجھے تیز رفتاری پر مائل دیکھ کر سردار کو میری جلدی کی وجہ معلوم کرنے کی تگ ودو نہیں کرنا پڑی تھی کہ وجہ اسے معلوم تھی۔

”راجے یار!...... کیوں مروانے کے چکروں میں ہو......اس دن بھی تو وہ بے وقوف رات گیارہ بجے تک آئی کام پکڑ کر چھت پر بیٹھی تھی آج بھی انتظار کر لے گی۔ تم نے اس پر ایسا تعویز نہیں کیا کہ وہ آرام کر سکے۔ اسے چالیس گھنٹے سے زیادہ ہونے والے ہیں تمھاری آواز سنے ہوئے یقیناً وہ صبح تک آسانی سے انتظار کر لے گی۔“

”تو تمھارا کیا خیال ہے اسے انتظار کروا کر مجھے خوشی ملے گی۔“ میں متفکر ہو کر بولا۔”اور اگر باہر ٹھنڈ میں اس کی طبیعت خراب ہو گئی پھر؟“

”تمھاری کائیں کائیں سنے گی نا تو طبیعت کی خرابی کو ٹھیک ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اب ذرا آرام سے چلو ......تم تو بالکل ہی کام کے نہیں رہے، فوجی بنو یار، مجنوں، رانجھے، پنوں وغیرہ کی تقلید سے تمھیں سوائے بدنامی کے کچھ ہاتھ نہیں آنے والا اور بدنام ماشاءاللہ تم پہلے سے کافی ہو۔“

سردار کی بار بار تاکید کے باوجود میں اپنی رفتار کم نہیں کر پایا تھا۔ دس بجنے میں چند منٹ رہتے تھے جب ہم ڈی بلاک پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے آئی کام آن کر کے پلوشہ سے رابطے کی کوشش کی مگر اس کا

کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ یا تو وہ میرا انتظار کیے بغیر سوگئی تھی یا جگہ کے دور ہونے کی وجہ سے ملاپ نہیں ہو پا رہا تھا ۔اپنا شک دور کرنے کے لیے میں نے ڈی بلاک پر موجود آئی کام کے بیس پر بھی چینل پانچ لگا کر اسے پکارا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ اس طرح یہ بات تو متعین ہوگئی تھی کہ اس نے اپنا آئی کام بند کیا ہوا ہے۔

بے قرار دل کو تسلی دیتا ہوا میں سردار کے پاس آ گیا۔ وہ پوسٹ کمانڈر کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا۔ میرا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر اسے صورت حال کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے پوسٹ کمانڈر کی وجہ سے طنز یا مزاح سے گریز کیا تھا۔

پوسٹ کمانڈر مجھے چند رسمی کلمات کہہ کر ہمارے لیے کھانے لانے کا بتانے لگا۔ وہ چونکہ پہلے سے کھا چکا تھا اس لیے کھانا آتے ہی ہم سے اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ ہم دو دن سے بسکٹوں پر گزارا کر رہے تھے اس کے باوجود مجھ سے صحیح طور پر کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔

سردار نے کہا "گو تمھارے تھوبڑے کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی کہ، اس سے تمھاری بات نہیں ہو سکی ہے اس کے باوجود کھانے کے ساتھ یہ ناراضی کسی طور مناسب معلوم نہیں ہوتی۔"

"میں تمھیں کہہ رہا تھا نا کہ جلدی چلو۔"

"جتنا بھی جلدی کرتے آٹھ بجے تک نہیں پہنچ سکتے تھے حضرت۔"

"اچھا تم کھانا ٹھونسو، مجھے نصیحت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔

سردار مزاحیہ انداز میں پوچھنے لگا۔ "اور ایسا کب تک چلے گا؟"

میں تھرماس سے چائے انڈیلتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "جب تک مجھے چھٹی نہیں مل جاتی۔"

"ان شاء اللہ جلد سنو گے کہ تمھاری چھٹی مزید لیٹ گئی۔"

"ان شاء اللہ تمھیں بھی جلد لی زونا کا جوابی خط موصول ہوگا جس میں اس کی اپنے شوہر کے ساتھ خوب صورت سی تصویر موجود ہوگی۔"

سردار غصے سے بولا۔ "تمھارے منہ میں خاک......"

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ "اور تمھارے منہ میں نسوار...... وہ نسوار جو کسی دوسرے خان نے اپنے منہ سے نکال

کر پھینکی ہو۔"

"جس دن پلوشے بہن سے ملاقات ہوئی، اسے تمھارے کرتوتوں کے متعلق بتانے میں میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں......اسے میں اپنے متعلق تمام تفصیل بتلا چکا ہوں۔"

وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔"تمھارے بتانے اور میرے بتانے میں کافی فرق ہے،اس فرق کا پتا تمھیں تب چلے گا جب میری پلوشہ سے ملاقات ہوگی۔"

"میرا دماغ خراب کرنے کے بجائے تم کوئی ایسا طریقہ سوچو کہ مجھے کل چھٹی مل جائے۔"

"اورنگ زیب صاحب نے تم سے ہفتے کا وعدہ لیا تھا اور ابھی بہ مشکل تین دن گزرے ہیں۔"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔"میری معلومات میں اضافہ کرنے کا شکریہ۔"

"اچھا میں کیا کر سکتا ہوں؟"وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔"اگر کہتے ہو تو اورنگ زیب صاحب سے بات کر کے بتا دیتا ہوں کہ راجا صاحب اس وقت تک کام کے آدمی نہیں بن سکتے جب تک یہ شوہر نہیں بن جاتے۔"

"دوبارہ شکریہ۔"میں نے چارپائی پر لمبا ہوتے ہوئے اوپر کمبل لے لیا تھا۔آنکھیں بند کرتے ہی وہ دھم سے میرے خیالات میں آکودی۔میرے بات نہ کرنے پر سخت ناراضی کا اظہار کر رہی تھی۔اور پھر نیند نہ آنے تک میں اسے مناتے رہا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کوشش کے باوجود اورنگ زیب صاحب سے بات نہیں ہوسکی تھی۔ان کی اجازت کے بغیر ہم وچہ نرائے نہیں جا سکتے تھے۔بلکہ سچ کہوں تو خود میرا دل وچہ نرائے جانے کو نہیں کر رہا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں گھڑی کی سوئیوں پر آنکھیں گاڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ساڑھے سات بجے ہی میں نے آئی کام سیٹ آن کر کے ڈی بلاک کے سب سے اونچے مورچے میں پہنچ گیا تھا۔وہاں موجود سنتری کو میں نے تھوڑی دیر آرام کا مشورہ دے کر اس کے رہائشی بینکر میں بھیج دیا تھا۔

آٹھ بجتے ہی پلوشہ کی آواز ابھری۔"راجو......"

”چندا!......“میں نے جواب دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

”اس وقت کہاں ہو؟“کل کی غیر حاضری کا گلہ کرنے کے بہ بجائے وہ میری خیریت دریافت کرنے لگی۔

”وہیں، جو جگہ تم دیکھ چکی ہو۔“ڈی بلاک کا نام لینے کے بہ جائے میں نے اشارے سے اپنی جگہ کے بارے بتلایا۔

”کل اس جگہ آسکتے ہو جہاں مجھے رخصت کیا تھا۔“اس کے لہجے میں مجھے پہلے والی بے تابی اور چاشنی مفقود نظر آرہی تھی۔

”چندا تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں اور جو پوچھا ہے اس کا جواب دو؟“اس کے انداز نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔حالانکہ اب وہ مجھے بڑی تعظیم اور ادب سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ گو اس کے تمیز یا بدتمیزی سے مخاطب کرنے پر اس کی محبت کے کم یا زیادہ ہونے کا دارومدار نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کا لہجے نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

”تمھارا جواب نہیں آرہا۔“مجھے خاموش پا کر اس نے دوبارہ پوچھا۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں اپنے پرانے گھر میں ہوں،اور تمھارا کل شام تک یہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔“

”مگر میں نے تمھیں بتایا تھا کہ ایک ہفتے کے بعد آؤں گا۔“

”یاد ہے مجھے......لیکن ایک بار آ کر بے شک واپس چلے جانا۔“

”ایسی بھی کیا مصیبت آن پڑی ہے۔“

”کہہ دیا نا......تم صبح سویرے وہاں سے نکلو،ظہر کے وقت وہیں ملیں گے جہاں جدا ہوئے تھے۔ایک گھنٹے کا کام ہے،اس کے بعد تم واپس لوٹ جانا۔“

”ایسا بھلا کون سا کام ہے؟“

”یہاں آ کر جان جاؤ گے،بس اپنے ساتھ بی بی مس 107 کو لازمی لانا۔“اس کا اشارہ واضح طور پر بیرٹ ایم 107 سنائپر رائفل کی طرف تھا۔

''اچھا میں کوشش کروں گا......وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''اگر میں کہوں، تمھارے نہ آنے سے میری جان جانے کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھی۔

میں نے غصے سے کہا۔'' دوبارہ ایسی بکواس تمھارے منہ سے نہ سنوں۔''

''تو آ رہے ہو؟'' میرے غصے کی پروا کیے بغیر اس نے اپنی راگنی الاپی۔

''آ جاؤں گا۔'' اس کی دھمکی ایسی نہیں تھی کہ میں مزید تکرار کر سکتا۔

''میں منتظر رہوں گی۔اور ابھی میں مخابرہ آف کر رہی ہوں باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔صبح چلتے وقت مجھے اطلاع دے دینا۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی۔'' میں نے منہ بسورا۔'' ابھی تک میرا دل نہیں بھرا۔''

''کل ساری کمی پوری کر لینا۔'' عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے۔'' خدا حافظ۔'' کہا اور میرا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔میرے دل میں عجیب سی یاسیت بھر گئی تھی۔اس کا لہجہ اور انداز مجھے کھٹک رہا تھا لیکن اس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔پوری گفتگو میں اس نے مجھے ایک بار بھی پیار سے نہیں پکارا تھا۔مجھے شک ہوا کہ شاید اس وقت وہ جس جگہ سے گفتگو کر رہی تھی وہاں کوئی اور بھی موجود ہو۔اس بات نے مجھے ذرا سی تقویت دی تھی لیکن اس کے باوجود پاگل دل اس کے رویے پر شاکی تھا۔میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ کل اس سے خوب گلے کروں گا۔

میری سوچوں میں سنتری نے آ کر خلل ڈالا تھا۔اس نے بتایا کہ اورنگ زیب صاحب کا فون آیا ہوا تھا۔ سنتری کا شکریہ ادا کر کے میں رہائشی بینکر کی طرف آ گیا۔سردار اورنگ زیب صاحب سے بات کر رہا تھا ۔میرے بینکر میں داخل ہوتے ہی اس نے رسیور میری جانب بڑھا دیا۔رسمی کلمات کی ادائی کے بعد اورنگ زیب صاحب مجھے مشن کی کامیابی کی مبارک باد دینے لگا۔

میں ہنسا۔''ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا سر!

''ہمیں اس مقصد کی تکمیل سے غرض ہے جس کی وجہ سے تمھیں بھیجا گیا تھا۔اگر وہ مقصد بغیر کسی خون خرابہ کے پایہ تکمیل تک پہنچ گیا تو یہ دگنی خوشی کی بات ہے۔''

"کوئی اور نئی تازی سر!"

"ہاں ایک اور خوش خبری ہے، کل تمھارے کمانڈنگ آفیسر سے بات ہوئی تھی تم حوالدار بن گئے ہو۔"

"یوں ایک دم؟" میں حیران رہ گیا تھا۔

"تمھاری اور سردار کی اچھی کارکردگی کی جو رپورٹ میں نے بھجوائی تھی اس کی وجہ سے تم دونوں حوالدار کے رینک پر ترقی پا گئے ہو۔"

"مگر......ایک دم سر!"

"ہاں، اس طرح کی کارکردگی پر، ایک دم ہی رینک ملا کرتے ہیں نا؟"

"شکریہ سر!......" میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "ویسے سردار کو پتا ہے؟"

"تمھی بتا دو۔"

"آگے کا کیا حکم ہے سر!"

"اس بارے سردار کو تفصل سے بتا دیا ہے، کہ کل صبح تم دونوں وچہ نرائے کی چوٹی پر جا رہے ہو۔ اور فکر نہ کرنا ۔وچہ نرائے کے دامن میں پاک آرمی نے چند پوسٹیں بنا لی ہیں۔ اب وہاں کوئی تمھارے کام میں مخل نہیں ہو سکتا۔"

"وہاں ہم نے کتنے دن گزارنے ہیں؟"

""دو تین دن بھی لگ سکتے ہیں، ہفتہ بھی اور ممکن ہے پورا مہینا لگ جائے۔"

میں بے صبری سے بولا۔ "مگر میرے ساتھ تو ایک ہفتے کی بات ہوئی تھی۔"

"بالکل......تین چار دنوں تک آپ کے دو ساتھی آ رہے ہیں......ان کی آمد کے ساتھ میں تمھیں منہ مانگی چھٹی دوں گا۔"

"مطلب......"

"بالکل دو ماہ اور یہ جو ہفتہ گزارا ہے یہ زائد ہوگا۔" اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے مجھے خوش خبری سنائی۔

"بہت بہت شکریہ سر!" میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا تھا۔ پلوشہ کے ساتھ دو مہینے اور ایک ہفتہ گزارنے کی

خوشی کا احساس ہی نرالا تھا۔ اس خوشی میں میں یہ کہنے کا حوصلہ بھی نہ کر سکا، کہ آخر تین دن سردار وہاں اکیلا بھی گزارا کر سکتا تھا۔

اس کے بعد چند منٹ تک اورنگ زیب صاحب نے عام گپ شپ کی اور خدا حافظ کہہ دیا۔ میں چاہنے کے باوجود اسے پلوشہ کے ساتھ شادی کرنے کی بابت کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ چھٹی جاتے ہوئے اسے شادی میں آنے کی دعوت دیتا جاؤں گا۔

''یہ شکریے کس سلسلے میں ادا کیے جارہے تھے محترم!'' رسیور رکھتے ہی سردار خان مستفسر ہوا۔

''دو ماہ اور ایک ہفتے کی چھٹی کی خوشی میں شکریہ ادا کرنا تو بنتا ہے نا۔''

''یہ سراسر ایک شریف، بھولی بھالی اور معصوم لڑکی کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہ اتنا عرصہ تمھیں کیسے برداشت کرے گی۔''

''وہ پگلی اس چھٹی پر کہاں قانع ہوگی۔'' میرے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ کھلنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ چھٹی ختم ہی جانے وہ کتنا واویلا مچائے گی اور پتا نہیں کیسے کیسے جتن کر کے مجھے اس سے رخصت لینا پڑے گی۔

''ہائے رے خوش فہمیاں۔'' سردار افسوس بھرے انداز میں سر ہلانے لگا۔

''ایک افسوس ناک خبر سناؤں۔''

''سنادو، یوں بھی تمھارے منہ سے کبھی اچھی خبر نہیں سنی۔''

''میں حوالدار بن گیا ہوں۔''

''اوہ......واقعی اس سے بری خبر آج تک نہیں سنی ......یعنی اب تمھیں استاد جی کہنا پڑے گا، بہ ہر حال مبارک ہو۔''

''نہیں اس سے بھی بری خبر یہ کہ تم بھی حوالدار بن گئے ہو۔ اور تمھیں بھی مبارک ہو۔''

سردار کے چہرے پر خوشی ظاہر ہوئی۔ ''ہاں یہ کام کی بات کی ہے۔''

''اچھا فضول بکواس چھوڑو اور کام کی بات سنو۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تمھارے نزدیک کام کی بات پلوشہ کا ذکر ہی ہے۔''

میں نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یار!......تمھاری باتیں کبھی کبھی تمھارے پٹھان ہونے پر سے میرا اعتبار اٹھا دیتی ہیں۔ پٹھان سے اتنی سمجھ داری کا ظہور قیامت کی نشانی ہی ہے۔''

''اچھا پھوٹو، تمھاری پلوشہ خان وزیر کو کیا مسئلہ درپیش ہے۔''

''اس سے ملنے کے لیے کل مجھے علام خیل کے نالے تک جانا پڑے گا۔''

''کل صبح سویرے ہم نے وچہ نرائے کا رخ کرنا ہے۔اس لیے یہ فتور دماغ سے نکال کر سونے کی کوشش کرو۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔''

''جانتا ہوں، اسے مذاق نہیں حماقت کہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ رضائی میں گھس گیا تھا۔

میں نے اسے منانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یار!......اتنا وقت نہیں لگے گا۔ گھنٹے بھر کا کام ہے اس کے بعد واپس آ جاؤں گا۔''

''راجے صاحب!......جانے اور واپسی میں کم از کم دس گھنٹے خرچ ہوں گے اور وہاں بے شک آدھے گھنٹے ہی کا کام ہو مگر تم نے کئی گھنٹے لگا دینے ہیں......میرا مطلب ہے تمھارا جی اتنی جلدی تو نہیں بھرے گا کہ تم جاؤ اور کام کر کے واپس لوٹ آؤ۔''

''یار!......تمھاری چھوٹی سی بہن کا حکم ہے اور جانتے ہو اس نے کیا دھمکی دی ہے؟'' میں نے ایک لمحہ کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے سردار کی دلچسپی جاننے کی کوشش کی مگر وہ خاموش لیٹا رہا گویا اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ پلوشہ نے کیا دھمکی دی تھی۔ مجبوراً مجھے خود ہی بتانا پڑا۔ ''کہہ رہی تھی کہ اگر میں نہ گیا تو اسے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''یقیناً یہ دھمکی اس نے پہلی بار نہیں دی ہو گی۔'' سردار سنجیدہ تھا۔

''ہاں......مگر میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ چنارے بہن نے بھی تمھیں کئی بار جانے کی دھمکی دی ہو گی اور ہر بار تم نے اس کی بات ہنسی میں اڑا لی ہو گی۔''

''کیا یہ بکواس کرنا ضروری تھا۔'' چہرے سے رضائی ہٹاتے ہوئے اس نے مجھے غصے سے گھورا۔

”ہاں ...... چنارے بہن، کے جانے کا غم تم نے صرف اس لیے برداشت کرلیا ہے کہ سلطان خان کی شکل میں اس کی نشانی تمھارے پاس موجود ہے۔ اور امید ہے لی زونا بھی اس کا غم غلط کرنے کے لیے آجائے گی۔ مگر میرے پاس پلوشے کا کوئی متبادل موجود نہیں۔ اس کو کچھ ہو گیا تو شاید میں نہ بچ سکوں۔“

”ٹھیک ہے صبح میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔“

”تمھاری موجودی میں میرا کام تو آسان ہو جائے گا، لیکن وچہ نرائے پر اگر ہم دونوں سے کوئی نہ پہنچا تو یہ خبر چھپی نہیں رہے گی۔ میری غیر موجودی کو تم چھپا سکتے ہو ہم دونوں کی غیر حاضری راز نہیں رہ پائے گی۔“

”تم بس فضول کے تخمینے لگا سکتے ہو۔“ سردار جلے کٹے انداز میں کہتے ہوئے دوبارہ رضائی میں ہو گیا۔ اس کا مفاہمتی لہجہ سنتے ہی میں نے متبسم ہو کر کہا۔

”شکریہ خان صاحب! ...... گو کسی پٹھان سے بھلائی کی امید رکھنا .... میرا مطلب ہے یہ ممکن تو ہے لیکن ...... بہ ہر حال شکریہ۔“

وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنی بات منوالی تھی اس لیے میں نے بھی خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے ہی میں نے سردار کو اٹھا دیا تھا۔ میں جلد از جلد علام خیل کا رخ کرنا چاہتا تھا۔ نماز پڑھ کر اس نے تھوڑی دیر آرام کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش میں منت زاری سے ناکام بنادی۔ بادل نخواستہ اسے تیار ہونا پڑا۔ ناشتا کر کے ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ ڈی بلاک سے نکلتے ہی میں نے پلوشہ کو اپنی آمد کا بتا دیا تھا۔ رات کی طرح اس نے۔ ”میں منتظر ہوں گی۔“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس سے ملاقات کی خوشی میں میں نے اس کے رویے کو نظر انداز کر دیا۔ ملنے پر میں اس سے خوب گلے شکوے کر سکتا تھا۔ یوں آئی کام پر اسے شرم سار کرنا مناسب نہیں تھا۔

ڈی بلاک کے نالے میں اتر کر ہم دونوں الوداعی مصافحہ کر کے مخالف اطراف میں مڑ گئے۔ میرا رخ مغرب کی طرف اور اس کا مشرق کی طرف ہو گیا۔

”اللہ کے واسطے...... مطلوبہ کام کرتے ہی واپسی کی راہ لینا...... اور پیار کے اظہار میں جو کمی بیشی رہ گئی ہو وہ

چھٹی جاتے ہوئے پوری کر لینا۔ یوں بھی شادی سے پہلے بہت زیادہ بے غیرتیاں اچھی نہیں ہوتیں۔'' جاتے ہوئے بھی وہ مجھے تاکید کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''نہ وہ لی زونا ہے اور نہ میں کوئی پٹھان، کہ تمھیں ایسی نصیحتوں کی ضرورت پڑے۔'' اسے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے میں تیز رفتاری سے نشیب میں اترنے لگا۔ اردگرد کے مناظر اس وقت اتنے سہانے لگ رہے تھے گویا پر شباب بہار میں چمن نظارے میسر آ گئے ہوں۔ نالے میں بہتا شفاف پانی کا شور جھرنے کی طرح کانوں میں گھنٹیاں بجا رہا تھا۔ تین چار دنوں کی دوری کے بعد کسی کے ملنے کو دل کا یوں بے قراری ظاہر کرنا اس بات کا مظہر تھا کہ وہ میرے دل میں کتنی گہرائی میں پیوست ہو گئی تھی۔ اور جب چاہنے والے کو یہ بھی معلوم ہو کہ محبوب کے دل میں اس کے لیے ایسی ہی تڑپ اور بے قراری موجود ہے تو اس کی محبت کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے نصف وقت میں مطلوبہ فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اس نے آخری ملاقات کی جگہ ہی پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں رک کر پسینہ صاف کرتے ہوئے میری پیاسی نگاہوں تسکین روح کی تلاش میں دائیں بائیں سرگرداں ہوئیں۔ اور اسی وقت وہ نظر آ گئی۔ وہ مردانہ لباس ہی میں تھی۔ گہرے بھرے رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے سبز رنگ کی بغیر بازو والی سوئیٹر پہنی ہوئی تھی۔ اپنے جسمانی خطوط کو چھپانے کے لیے وہ ہمیشہ جرسی، کوٹ وغیرہ کا استعمال کرتی تھی۔ ورنہ وہ عمر کی اس منزل پر تھی کہ چیختا شباب اس کا بھانڈہ پھوڑ دیتا۔

اسے دیکھتے ہی میری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ اس تک بھاگ کر پہنچنے کی غرض سے میں نے کندھوں میں ڈالے بیرٹ ایم 107 کے تھیلے کے تسمے نکال کر تھیلے کو نیچے رکھا، تاکہ اس کے خوشبودار وجود کو اپنی بانہوں کی زینت بناتے ہوئے مجھے کوئی دشواری نہ ہو، لیکن پلوشہ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی میری سماعتوں میں ایک کرخت آواز گونجی۔

''خبردار اگر ذرا سی حرکت بھی کی۔''

یہ آواز مجھے نالے کے دائیں کنارے کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے بے اختیار اس طرف نظریں دوڑائیں

، چار مسلح افراد کو دیکھتے ہی میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ اور یہ دھڑکنا خوف کی وجہ سے نہیں تھا۔ پیٹھ پیچھے گلا کھنکارنے کی آواز پر مجھے یہ شبہ نہیں رہا تھا کہ اس وقت میں دشمن کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے پلوشہ کی جانب دیکھا۔ میری جانب پیٹھ موڑتے ہوئے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' میری سنسناتی سوچوں نے اسے نظر کا دھوکا قرار دینا چاہا۔ دل و دماغ اس کی توجیہ میں مصروف ہو گئے...... آخر پلوشہ ایسا کیسے کر سکتی تھی۔

''ہاتھ اوپر......'' گردن سے لگنے والی کلاشن کوف کی بیرل نے مجھے یقین دلایا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کر کے ہاتھوں کو سر سے بلند کیا۔ ورنہ میرے ہاتھوں پاؤں میں جان نہیں رہی تھی۔

ایک آدمی میری تلاشی لینے لگا۔ میری نظریں تو بس پلوشہ کے وجود پر گڑی تھیں۔ اس کا میری طرف پیٹھ موڑ کر آرام سے پتھر پر نشست سنبھالنا یہ ثابت کر رہا تھا کہ مجھے گرفتار کرانے میں اس کی مرضی شامل تھی۔

ایک لمبے قد کا آدمی پلوشہ کے قریب جا کر رکا اس نے ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹوں والی کئی گڈیاں پکڑی ہوئی تھیں۔

''یہ لو بقایا رقم، اب تم جا سکتی ہو۔'' اس کے الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھے جو سماعتوں کے رستے میرے جسم میں اتر کر میرے بدن کو بے جان کرنے لگے۔ جانے میں کیسے اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے ہاتھ نیچے کر کے پشت پر باندھ رہا ہے۔ شاید اس نے مجھے ہاتھ پیچھے کرنے کو بھی کہا تھا لیکن میری سماعتوں میں تو پلوشہ کے قریب کھڑے لمبی قامت کے آدمی کے الفاظ ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

اس آدمی سے پیسے لے کر اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر میری بے بسی کا نظارہ کیا اور سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ یقیناً اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اپنی محنت کا معاوضہ وصول کر کے وہ جا رہی تھی۔ کسی کے ساتھ چند دن محبت کے اظہار کے بعد لاکھوں کی رقم وصول کرنا گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔

''نہیں وہ ایسی نہیں ہے......ضرور اسے کوئی مجبوری ہے۔'' دل نے احمقانہ واویلا کیا۔اور دل کی بات میں اتنا بھی وزن نہیں تھا کہ دماغ اسے جواب دینے کی زحمت ہی گوارا کرتا۔یا شاید دماغ بھی اسی تگ ودو میں تھا کہ جسم سے نچڑتی ہوئی طاقت کو بحال کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ آجائے۔ڈوبتے کو تنکے کا سہارا چاہیے ہوتا ہے۔اور میری حالت بھی سیلابی ریلے میں آئے ہوئے اس شخص کی سی تھی جو تیرنا ہی نہ جانتا ہو۔نہ تو ایسے ڈوبنے والے کی جان کسی تنکے کا سہارا پا کر بچ سکتی ہے اور نہ اس وقت مجھے کوئی لولی لنگڑی دلیل فائدہ دے رہی تھی۔میری آنکھیں تو بس پلوشہ کو وہاں سے دور جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔سڑک کنارے کسی گاڑی کا انتظار کرنے کے بہ جائے وہ پیدل ہی انگور اڈے کی طرف چل پڑی تھی۔

''اتنی زیادہ رقم کی وجہ سے اس کی جان کو خطرے میں نہ پڑ جائے۔'' اس حالت میں بھی بے ایمان دل کو اس کی فکر ہوئی اور میرا دماغ پیچ وتاب کھاتا رہ گیا۔

کلاشن کوف کی نال سے میری پیٹھ پر ٹھوکا دے کر کسی نے مجھ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔میں مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔میری نظریں اب بھی پلوشہ کو دیکھ رہی تھیں،جبکہ وزیرستان کے پہاڑوں میں چلنے والے کو ایک آنکھ سامنے اور ایک آنکھ زمین پر رکھنا پڑتی ہے۔اس اصول کی منافی کا صلہ مجھے ایک زبردست ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرنے کی صورت میں ملا۔ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے مجھے اچھی خاصی چوٹ آئی تھی لیکن اس وقت میری ساری حسّوں نے عارضی طور پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔نہ تو مجھے کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ پلوشہ کے علاوہ کچھ نظر آرہا تھا۔جسم میں درد و تکلیف محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی۔البتہ میرے دل کو کوئی مٹھی میں لے کر مسلسل بھینچے جا رہا تھا۔

کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔''اوئے،نیچے دیکھ کر چلو کسی مجنوں کی اولاد۔دل کے بعد اپنا تھوبڑا بھی نہ تڑوا لینا۔''

اس کی بات پر میرے دائیں بائیں چلنے والوں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

وہ مجھے دھکے دیتے ہوئے نالے میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کے قریب لائے۔درمیان میں کھڑی ڈبل کیبن

کی عقبی نشست پر مجھے دو آدمیوں کے درمیان بٹھایا گیا۔گاڑی کی باڈی میں بھی چار آدمی بیٹھ گئے ،باقی دو گاڑیوں میں بھی چھے چھے آدمی بیٹھ گئے تھے۔

نالے سے نکل کر وہ سڑک پر آئے۔ہماری گاڑی درمیان میں تھی۔گاڑیاں علام خیل کے بہ جائے انگور اڈے کی طرف چل پڑی تھیں۔میری نظریں سڑک پر جانے والی پلوشہ کی متلاشی تھیں۔وہ سڑک کے دائیں جانب چل رہی تھی۔میں نے گردن موڑ کر اس جانب دیکھا۔

''کمانڈر بہار خان!......لڑکا تو رو رہا ہے۔''میرے بائیں جانب بیٹھے آدمی نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

بہار خان ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا، پیچھے دیکھتے ہوئے بولا۔''بے چارے کو چوٹ گہری آئی ہے نا،فکر نہ کرو جلد ہی بہل جائے گا۔''اسی وقت ہماری گاڑی سست روی سے چلتی پلوشہ کے پاس سے گزرتی چلی گئی ۔کوشش کے باوجود میں اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔

مجھے عقبی شیشے سے پیچھے جھانکتے دیکھ کر میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے اپنے ہاتھ سے میرا چہرہ سامنے موڑتے ہوئے کہا۔''ابے، کیا نکالتے ہو اس چھوکرے سے...... تمھیں بیچ کر رقم کھری کر لی ہے پھر بھی دیوانے ہوتے جا رہے ہو،تمھارے جیسے بے وقوف کم ہی نظر سے گزرے ہیں۔''

''تم بھی خوب ہو کمین خان!......''بہار خان ہنستے ہوئے بولا۔''وہ لڑکا نہیں،لڑکی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو کمانڈر!''میرے بائیں جانب بیٹھا کمین خان حقیقتاً اچھل پڑا تھا۔''اتنا بچہ تو میں نہیں ہوں کہ لڑکے لڑکی میں امتیاز نہ کر سکوں۔''

''کمین خان صحیح کہہ رہا ہے کمانڈر!''اس مرتبہ میرے دائیں جانب بیٹھے آدمی نے کمین خان کی تائید میں زبان کھولی۔

بہار خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''بے وقوفو!......یہی پلوشہ خان وزیر ہے......اور جسے تم پکڑ کر لے جا رہے ہو یہ وہ مشہور ایس ایس ہے جس کے بارے تم لوگ اتنے عرصے سے سنتے آ رہے ہو۔''

''کمانڈر!......آپ مذاق کر رہے ہو نا۔''کمین خان بے یقینی سے بولا تھا۔

بہار خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''بالکل بھی نہیں،بس آپ لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ خوش حال خان

محسود سے ہونے والے جرگے میں آپ لوگ حاضر نہیں تھے ورنہ ان دونوں کو دیکھ لیتے۔"

"کمانڈر!...... میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ پلوشہ خان نے اسے کیوں پکڑوا دیا ہے، حالانکہ یہ دونوں تو سردار قبیل خان کے خلاف اکٹھے کام کرتے رہے ہیں، بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ان دونوں کا کوئی چکر چل رہا ہے۔" کمین خان کو بہار خان کی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"بے وقوف پلوشہ خان وزیر کا کسی ایک ساتھ تو چکر نہیں چلا ہے نا...... بہت چالو اور چکر باز لڑکی ہے۔اس سے پہلے بھی سات آٹھ عاشق بھگتا چکی ہے۔عمر ضرور کم ہے پر تجربہ بہت ہے زیادہ ہے۔اب اسی بات سے اندازہ لگا لو کہ محترم ایس ایس صاحب سے جب تک کام تھا عشق کا ناٹک کھیلتی رہی، جوں ہی کام نکل گیا اسے بیچ کھایا۔اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس نے خود ہی اس کی طرف قدم بڑھائے ہوں گے، اپنی بناوٹی محبت کا یقین دلایا ہوگا۔جونہی یہ محترم اس کے حسن کے جال میں پھنسا اس نے پیسے کھرے کرنے میں دیر نہیں لگائی۔"

"ویسے میرا نہیں خیال کہ سردار صنوبر خان کو اس آدمی کے لیے پندرہ لاکھ خرچ کرنے کی ضرورت تھی ......اور پندرہ لاکھ بھی سردار قبیل خان کی قاتل لے گئی۔"

"سردار قبیل خان اور سردار جہانداد کا قاتل یہ ہے۔" بہار خان نے نفرت بھرے انداز میں میری جانب اشارہ کیا۔"باقی پلوشہ خان وزیر نے گزشتہ دو روز سردار صنوبر خان کو راضی کرنے میں گزارے ہیں۔بے چاری کو اس ضمن میں پوری دو راتیں جاگ کر گزارنا پڑیں۔اور یقین کرو میں تو داد دیتا ہوں اس کی ہمت کی۔صنوبر خان اور اس کے پانچ وحشی دوستوں کو اس عمر میں اکیلے بھگتانا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔"

"اچھا......" کمین خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"تو گویا اسے پلوشہ نے خیر سگالی کے طور پر پکڑوایا ہے۔"

"اتنی بھی سادہ نہیں ہے۔" بہار خان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔"ایک نمبر کی چار سو بیس ہے۔صنوبر خان نے جب ایس ایس کا مطالبہ کیا تو اس نے پندرہ لاکھ کی خطیر رقم مانگ لی۔دوسری صورت میں صنوبر خان کے ساتھ اس کی یوں بھی صلح ہوگئی تھی اسے کیا ضرورت تھی اپنے پرانے عاشق کو پکڑوانے کی۔"

میری دائیں جانب بیٹھے آدمی خیال ظاہر کیا۔"ویسے مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایسی لڑکی صرف صنوبر خان سے

صلح کرنے ہی پہنچی ہوگی، لازمی بات ہے، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ صنوبر خان، سردار قبیل خان اور سردار جہاندادا خان کے قاتل سے بدلہ لینا چاہے گا اور ایسی صورت میں وہ اپنے عاشق کی بلی چڑھا دے گی۔''

''ہونہہ!...... یہ بات بھی دل کو لگتی ہے۔ بہار خان اور کمین خان اثبات میں سر ہلانے لگے۔

''میں بات کرسکتا ہوں کمانڈر!'' خاموش بیٹھے ڈرائیور نے پہلی بار زبان کھولی۔

''کہو دلشاد خان!'' بہار خان کے ساتھ باقی دونوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں پلوشہ خان وزیر کا پرانا چاہنے والا ہوں۔ پرانے سے میری مراد یہی کوئی چھے سات ماہ پہلے کی بات ہے جب یہ مجاہدین کے کیمپ سے باہر نکلی تھی۔ میں اسے لڑکا ہی سمجھتا تھا۔ اس وقت یہ سردار قبیل خان کے بارے معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کے ایک قریبی محافظ سہیل خان کو نواز رہی تھی۔ اس غدار کی پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں تھا۔ اسے جو کچھ پوچھنا ہوتا تنہائی کی ایک ملاقات کے بدلے اگلوا لیتی تھی۔ ابھی سردار قبیل خان کی شہادت کے وقت سہیل خان بھی مارا گیا ہے۔ اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ ملا۔ خیر وہ پرانی بات ہے میں ابھی کچھ اور بتانا چاہ رہا تھا۔ پلوشہ خان کا اصل چکر منور خان نامی ایک جوان سے چل رہا ہے۔ یقین مانو بہت خوب صورت مرد ہے اور یہ حرام زادی اس پر بری طرح سے فریفتہ ہے۔ مگر منور خان کافی سمجھ دار اور ہوشیار ہے۔ اس نے وقتی طور پر پلوشہ سے تعلقات قائم کیے رکھے، مگر وہ ہمیشہ کے لیے نہیں پھنسنا چاہتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسی لڑکیوں کو بس وقت طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اب یہ محترما اس پر شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔ جس ماموں کے ہاں اس نے پرورش پائی ہے اس نے اس کے رشتے کے پندرہ لاکھ مانگے ہوئے ہیں اور منور خان نے صاف طور پر پلوشہ کو بتا دیا ہے کہ اس کے پاس اتنی رقم موجود نہیں ہے۔ تبھی اس فاحشہ کو صنوبر خان سے ملنے کا خیال آیا اور درمیانی واسطہ میں بنا۔'' دلشاد نے مکروہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''میں یوں بھی کافی عرصے سے اس سے ملاقات کا متمنی تھا۔ اس بہانے چند گھنٹوں کی ملاقات میرے حصے میں بھی آ گئی۔ سردار صنوبر خان نے بھی جرگے کے وقت اس کی بھولی بھالی اور معصوم صورت دیکھی تھی۔ میرے ذکر کرنے پر ہی وہ پھڑک اٹھا اور فوراً ملاقات کی خواہش ظاہر کر دی۔ دو راتیں سردار صنوبر خان اور اس کے ساتھیوں کی خدمت کر کے محترما نے اپنے گناہ معاف کرائے اور اپنے عاشق کو پکڑوا کر پندرہ لاکھ کھرے کر لیے ہیں

۔یقیناً اب وہ یہ پیسے منور خان کو دے گی تاکہ وہ اس کی ماں اور ماموں کو دے کر اس کا رشتا مانگ سکے۔لیکن امید یہی ہے کہ منور خان پھر بھی اس سے شادی نہیں کرے گا۔یوں بھی اس کے سامنے پلوشہ کا کردار کھلی کتاب کی طرح ہے۔“

”ابے تم تو چھپے رستم نکلے......ہمیں ہوا ہی نہیں لگنے دی ہاں۔“ بہار خان نے دلشاد خان کی گردن پر ہلکا سا تھپڑ لگایا۔

”مطلب آپ کا بھی دل آیا ہوا ہے۔“ دلشاد خان نے قہقہہ لگایا۔میرے دائیں بائیں بیٹھے دونوں آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

”بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔“ بہار خان نے بے شرمی سے اعتراف کیا۔

”تو کتنا خرچ کر سکتے ہو؟“ دلشاد خان نے بڑے اعتماد سے پوچھا تھا۔

بہار خان نے برا سا منھ بنا کر کہا۔”اب مجھے کیا پتا وہ کتنے پر مانتی ہے۔“

”مجھے بھی کوئی اندازہ نہیں ہے،بہ ہر حال میں اس سے مل کر آپ کو بتا دوں گا۔“ دلشاد نے کمانڈر کو تسلی دی۔

پلوشہ کے بارے ان کی بکواس سن کر میرے بدن سے گویا جان نکلتی جا رہی تھی۔اس کے معصوم اور بھولے چہرے کے پیچھے اتنا مکروہ اور غلیظ چہرہ چھپا ہوگا اس بارے تصور کرنا تو درکنار اگر میری گرفتاری سے پہلے کوئی ایسی بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو میں اس کے سر میں گولی اتارنے میں ایک لمحہ نہ لگاتا۔مگر اب پلوشہ نے میری آنکھوں کے سامنے ان سے رقم وصول کی تھی۔دلشاد کے کہنے کے مطابق پرسوں رات وہ صنوبر خان کا پہلو گرم کر رہی تھی اور یہ بات مجھے اس لیے بھی سچ لگی کہ اس رات کو کافی دیر کوشش کرنے کے بعد بھی اس سے رابطہ نہیں کر سکا تھا،حالانکہ اس سے دو دن پہلے رات کو گیارہ بجے تک وہ میری منتظر تھی۔گزشتہ رات بھی اس نے مجھے ملنے کے پیغام کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔

گاڑی انگور اڈے سے ہوتی ہوئی جنوب کی طرف مڑ گئی۔یہ وہی سڑک تھی جو خڑ کلے سے ہو کر قبیل خان کی حویلی کی طرف جاتی تھی۔قبیل خان کی اس حویلی کی طرف جہاں پلوشہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔اس سڑک پر جاتے ہوئے مجھے اپنا یار سردار یاد آیا اور اس کے ساتھ ہی پلوشہ کے ساتھ ہونے والی لڑائی یاد آ گئی

۔اسے گرفتار کر کے میں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی۔اور آج اس نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔

تباہ شدہ کوٹھی تعمیر ہو چکی تھی بس رنگ وروغن کا تھوڑا بہت کام رہتا تھا۔یقیناً قبیل خان کے جان نشین کے بھی وہی مشاغل تھے جو خوداس کے رہے تھے۔یوں بھی اس کے بارے کافی کچھ مجھے اس کے آدمیوں کی زبانی ہی معلوم ہو گیا تھا۔

حویلی کے ایک کمرے میں لے جا کرانھوں نے مجھے بند کر دیا۔کمرے میں موجود چارپائی اور بستر دیکھ کر مجھے کافی حیرانی ہوئی تھی میرے خیال میں صنوبر خان کے سامنے لے جا کرانھوں نے مجھے قتل کر دینا تھا۔اور پلوشہ سے دھوکا کھانے کے بعد مجھے بھی پناہ لینے کے لیے قبر سے بہتر جگہ کوئی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔وہ جو میرے تیئیں،میرے دماغ سے عورت ذات کے بارے پلنے والی غلط سوچوں کو کھرچنے آئی تھی وہ تو پہلے والیوں سے کئی ہاتھ آگے نکلی تھی۔ماہین کے صرف ایک مرد سے غلط تعلقات تھے اور میری نظر میں معصوم اور غیرت مند پلوشہ کوئی بھی کام نکالنے کے لیے اپنے جسم کا دستر خوان کسی کے سامنے بھی سجا سکتی تھی۔چاہے وہ کوئی عام مرد ہو چاہے سردار وغیرہ۔جینیفر نے وطن کی خاطر مجھ سے محبت جتائی تھی اور پلوشہ نے پیسے کے حصول کے لیے اپنی چاہت کا ڈراما رچایا۔رومانہ نے مجھ سے اپنے شادی چھپائی تھی اور پلوشہ دس بارہ معاشقوں کا ذکر گول کر گئی تھی۔ہر نئی لڑکی نے مجھے نئے طریقے سے دھوکا دیا تھا۔تمام نے اپنے چہرے پر مختلف قسم کے نقاب چڑھا کر اپنے اصل کو چھپائے رکھا۔

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

یقیناً میں احمق اور بے وقوف تھا۔کتنی چالاکی اور کیسی منصوبہ بندی سے اس نے مجھے پھانسا تھا۔اس کے ساتھ بتائے شب وروز یاد کر کے میری آنکھیں بھیگنے لگیں......

اس کے لہجے میں کتنی چاہت اور مٹھاس ابل رہی ہوتی تھی۔کیسی بے ساختگی اور برجستگی سے وہ محبت کا اظہار کیا کرتی تھی۔

''کیا وہ سب جھوٹ اور دکھاوا تھا......؟''میں نے خود سے سوال کیا۔''اگر واقعی وہ مطلب پرستی اور غرض

کا دھندا کر رہی تھی اور ویسے وہ اپنے بدن کی رشوت دے کر ہر کام نکلوانے کی عادی تھی تو یہ دعوت اس نے مجھے کیوں نہیں دی۔ مجھے کبھی اس کی حرکات میں کیوں سستا پن نظر نہ آیا۔ میرے لیے اس نے اپنے خوب صورت جسم کا دستر خوان کیوں نہیں سجایا کہ میرے ساتھ تو اس نے کئی راتیں بتا دی تھیں۔''

''کیونکہ تم سرتا پا اس کی محبت ڈوبے ہوئے تھے احمق آدمی۔'' میرے دماغ نے میرے سوال کا جواب دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔'' بھول گئے کس طرح شادی میں رقص کر رہی تھی۔ کیا شریف لڑکیاں اس طرح مردوں کے درمیان بے فکری اور بے تکلفی سے ناچ سکتی ہیں؟''

میرے دل نے کمزور سا احتجاج کیا۔'' اس وقت وہ لڑکے کے روپ میں تھی، بلکہ وہ بچپن ہی سے ایک لڑکا بن کر زندگی گزار رہی تھی۔ ایسی لڑکی کو رقص کرنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے۔''

''محترم...... تمھاری گود میں کس خوشی میں تشریف فرما ہو گئی تھی...... اور وہ مراد کون تھا جو اس کے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا...... کیا کسی بھی موقع پر اس نے اپنے بدن کو تم سے روشناس کرانے میں کوئی بخل برتا۔ موٹر سائیکل پر کس بے تکلفی سے تمھیں اپنے پیچھے سوار کرا لیا اور جب موٹر سائیکل پر تمھارے پیچھے بیٹھی تو ایسے جڑ کر بیٹھی گویا تم اس کے شوہر ہی تو ہو۔ چارپائی پر اپنے ساتھ سلانے میں ایک لمحے کو بھی نہ جھجکی۔ اس کے علاوہ بھی کئی مواقع پر اس نے تمھیں ایسے اشارے دیے جن کا واضح مطلب یہی بنتا تھا کہ اپنا ہاتھ ذرا سا آگے بڑھا کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو، اب تمھارے اندر ہی ایسے جراثیم مفقود تھے تو اس میں اس کی پارسائی کا کیا عمل دخل۔'' دماغ کے دلائل ہمیشہ بھاری ہوتے ہیں اس وقت بھی میرے دل کے پاس ان دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن پھر بھی کم بخت دل اس کی طرف داری سے باز نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بتایا وقت کسی فلم کی طرح میری بصارتوں کے سامنے سے گزرنے لگا۔

''تھوڑی دیر پہلے بہار خان نے بڑے یقین سے کہا، کہ پلوشہ نے خود ہی میری طرف قدم بڑھا کر اپنی بناوٹی محبت کا یقین دلایا ہو گا۔'' حالانکہ اسے ہمارے تعلقات کی شروعات کے بارے کوئی معلومات نہیں تھی ۔بس پلوشہ کی فطرت کو دیکھتے ہوئے اس نے جو دعوا کیا تھا وہی اصل حقیقت تھی۔ پلوشہ نے شروع دن ہی سے خود کو میرے قریب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی خود کو گھورنے کا کہہ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا۔ کبھی اپنی ماں سے

رشتا مانگنے کی ترغیب دینا۔ گاہے گاہے اپنے دل فریب بدن کے لمس سے روشناس کرا کے میرے جذبات برانگیختہ کرنا۔ اوراس طرح اس نے میرے دل میں اپنی محبت پیدا کر کے ہی چھوڑی۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف خوب صورت سمجھتی تھی، بلکہ اس کا اظہار کرنے میں ذرا بھی نہیں شرماتی تھی۔ میں اس کی ہر حرکت کو شوخی و شرارت کا نام دیتا رہا۔ اس نے بلاشبہ مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کیا تھا۔ اور اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد میری جان چھوڑنے کے بہ جائے میرا سودا کر دیا۔ اپنے محبوب کے حصول کے لیے اسے پندرہ لاکھ چاہیے تھے، اور اس رقم کے حصول کے لیے مجھے اس پلوشہ نے مجھے بیچ دیا جو کہتی تھی میں اگر دور گیا تو وہ اپنی جان لے لی گی۔ اور دور ہونے پر اس نے اپنی جان تو نہیں لی تھی البتہ مجھے موت کے حوالے ضرور کر دیا تھا۔

''یہ سب میری بے وقوفی اور حسن پرستی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' میں خود کو کوسنے لگا۔ ''عورت ذات سے اتنی مرتبہ دھوکا کھا کر بھی مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جسے میں نے تشدد کا نشانہ بنایا، خوب زدوکوب کیا اور وہ بہ جائے نفرت کرنے میری محبت میں مبتلا ہو گئی، محبت بھی ایسی کہ میرے بغیر ایک دن گزارنا اسے کارِدار لگنے لگا۔ واہ...... راجا میاں...... واہ، کچھ تو عقل کی ہوتی، تھوڑا سا تو سوچا ہوتا، ایسی خوب صورت لڑکی بس تیرے ہی انتظار میں تو تھی، کہ تم جیسا گلفام اسے اور کہاں ملنا تھا۔''

اچانک میرے دماغ میں جیسے کسی نے سرگوشی کی کہ اس نے تو اپنا مطمح نظر تم تک پہنچا دیا تھا، جب تم نے کہا کہ تم اسے شہزادیوں کی طرح رکھو گے تو اس نے بہ ظاہر ہنستے ہوئے یہی کہا تھا نا کہ......

''ایک غریب فوجی کے پاس اتنی طاقت کہاں کہ اپنے خوابوں کی شہزادی کو شہزادیوں کی سی شان و شوکت مہیا کر سکے۔ مجھے تو لگتا ہے امی جان نے جو مطالبہ رکھا اسے پورا کرنے کے لیے بھی آپ چند سال کی مہلت نہ مانگ لیں۔''

اور جب میں نے جواب میں کہا تھا...... ''اگر ایسی بات تھی تو کسی دولت والے سے محبت کرنا تھی نا، ایک غریب فوجی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔''

تو کس ڈھٹائی سے اس نے جواب دیا تھا۔ ''بس کیا کروں یار!...... جب امیر نہ ملے تو غریب ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔''

وہ تو ہر مرحلے پر مجھے یہ باور کراتی رہی کہ اسے پیسوں سے کتنا پیار ہے۔ بس میری ہی آنکھوں پر حماقت کی ایسی پٹی بندھی ہوئی تھی کہ اس کی محبت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں اس کی چالیں آ گئی تھیں لیکن اس سمجھ کا بھی کیا فائدہ کہ جو نقصان مجھے پہنچنا تھا وہ پہنچ چکا تھا...... ہار کر اپنی ہار کی وجوہات کو سمجھنے کا دعوا کرنا ایک حماقت ہی تو تھی۔

سمجھ جاتا ہوں چالوں کو مگر کچھ دیر لگتی ہے

وہ بازی جیت جاتا ہے میرے چالاک ہونے تک

میں دل کی تباہی کے ساتھ ساتھ زندگی کی بازی بھی ہار گیا تھا۔ جانے کتنی دیر چارپائی پر لیٹے میں انھی خیالات میں کھویا رہا۔ پلوشہ کے دھوکے نے مجھے جینے سے بھی بیزار کر دیا تھا۔ اس وقت مجھے مرنے کا کوئی ڈر اور خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بس افسوس تھا تو اس بات کا کہ میں اس دھوکے باز اور قابل نفرت لڑکی سے بدلہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے سر میں گولی اتار کر اپنے دل میں جلتے آلاؤ پر پانی نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر باندھ کر اسے ایسے بہیمانہ تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتا تھا کہ جس سے اس کی روح بھی کانپ اٹھتی۔

یہ سوچتے ہوئے ایک دم میرے اندر سے تمسخرانہ قہقہہ بلند ہوا...... ”اگر موت سے بچ گئے تو کیا اتنی جرّات ہے کہ اس پر تشدد کر سکو؟...... خالی بڑھکیں مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر وہ اب بھی تمھارے سامنے آ کر دو آنسو بہا دے تو تم نے اسے گلے لگانے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے......“ میں اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز کو جھٹلانا چاہا، مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ یونھی میری نظروں کے سامنے لہراتا رہا۔

”کاش تم نے میری آنکھوں کے سامنے رقم وصول نہ کی ہوتی...... کم از کم میں آسانی سے مر تو لیتا۔ موت کے ساتھ مجھے تمھاری بے وفائی اور دھوکے کی اذیت تو نہ جھیلنا پڑتی۔ تمھیں تو اپنے فعل پر اتنی بھی ندامت نہیں ہوئی کہ تم میرا سامنے کرنے سے شرما سکو، حالانکہ میں نے کبھی تمھارا برا نہیں چاہا۔ پہلی لڑائی بھی ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھی...... تم پر تشدد کرنا بھی میری غلطی سہی مگر اس کی وجہ سے میں اتنی بڑی سزا کا مستحق تو نہیں ٹھہرتا تھا کہ تم مجھے انھی دشمنوں کے حوالے کر دو جن کے خلاف ہم شانہ بہ شانہ لڑتے رہے ہیں۔ اور تمھارا یہ گمان بھی غلط ہے کہ میں

غریب ہوں...... تمہارا محبوب پندرہ لاکھ دینے کا روادار نہیں جبکہ میں پچاس لاکھ دینے پر تیار تھا۔ آخر تم نے ایسا کیوں کیا پلوشہ...... کیوں آخر کیوں؟'' میری آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے...... بے انتہا درد اور تکلیف برداشت کرنے والے سنائپر کو ایک بے وفا نے دھوکا دے کر رلا دیا تھا۔

استاد محترم راؤ تصور کہا کرتے تھے کہ سنائپر کا دل لوہا اور احساسات پتھر ہوتے ہیں۔ اسے بس اپنے مقصد سے غرض ہوتی ہے۔ نہ اس پر موسم اثر انداز ہوتا ہے اور نہ ماحول کی سختی۔ بھوک اور پیاس اس کے لیے بے معنی ہوتی ہے۔ تھکن وہ نہیں جانتا...... نینداس پر قابو نہیں پا سکتی اور شکست کا لفظ اس نے اپنے لغت سے نکالا ہوتا ہے۔

''کیا میں واقعی سنائپر ہوں...... تھکا، ہارا شکست خوردہ۔ جو ایک دھوکے باز کے لیے رو رہا ہے۔ یقیناً میں سنائپر نہیں ہوں...... یقیناً میں اپنے استادوں کے لیے ندامت اور شرمندگی کا باعث ہوں۔ بزدل، ڈرپوک ایک سہا ہوا شخص...... جسے بس عورتوں سے دھوکا کھانا آتا ہے، جو دو پیار بھرے بولوں پر زندگی بھر ساتھ نبھانے کے سپنوں میں کھو جاتا ہے، جو ایک لڑکی کے لیے اپنے فرض سے غافل ہو جاتا ہے......

دروازے پر ہونے والے کھٹکے کو سن کر میں نے جلدی جلدی آنکھیں کو صاف کیا۔ دروازہ کھول کر ایک شخص کھانے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوا۔ ایک مسلح شخص مجھ پر نظر رکھنے کے لیے اس کے ہمراہ تھا۔ مسلح شخص چوکنا ہو کر دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اور دوسرا کھانے کے برتن لکڑی کی میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس مڑ گیا۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظریں دوڑائیں شام کے سات بج رہے تھے۔ کمرے میں جلنے والی ٹیوب لائیٹ کی روشنی نے مجھے اندھیرا ہونے کا پتا نہیں لگنے دیا تھا۔

میں صبح کا ناشتا کر کے ڈی بلاک سے روانہ ہوا تھا۔ بقیہ دن بغیر کھائے پیے اسی ہنگامے کی نذر ہو گیا تھا اس کے باوجود مجھے ذرا سی بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں کھانے کے برتنوں کو چھوئے بغیر الٹی سیدھی سوچوں سے اپنے غم کو بڑھاوا دیتا رہا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد وہی دو آدمی کھانے کے برتن سمیٹنے آئے۔ کھانے کو جوں کا توں پڑا دیکھ کر برتن لے جانے والے نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم نے کھانا نہیں کھانا؟''

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ایک دو لمحے میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اس نے کندھے اچکاتے ہوئے میز پر دھرے برتن اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ میری زندگی کی بدترین رات تھی۔نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔میں جانتا تھا کہ سردار بھی پریشان ہوگا اور جانے میرے بارے کیا سوچ رہا ہوگا۔وہ زیادہ دیر تک میرے غائب ہونے کو نہیں چھپا سکتا تھا ۔صبح تک تو یقیناً اسے کسی کو بتانا پڑ جاتا، بلکہ اب تو وہ بھی پھنس گیا تھا۔میرے غائب ہونے کی کوئی مدلل وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔میں آج صبح اس کے ساتھ ڈی بلاک سے وچہ نرائے جانے کے ارادے سے نکلا تھا۔اس کے بعد میں علام خیل کی طرف کیوں گیا تھا۔اس کا جواب یقیناً سردار کے پاس موجود نہیں تھا، کہ اس نے کسی متعلقہ ذمہ دار کو میرے جانے کی فوری اطلاع کیوں نہیں دی۔میرے غائب کے بارے وہ کوئی جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا کہ اس میں میرا نقصان تھا۔فوج کی نوکری ایسی نہیں ہے کہ اس میں ذرا سی بے قاعدگی کی بھی گنجائش نکل سکے ۔البتہ اس معاملے کو اورنگ زیب صاحب سنبھال سکتے تھے۔اب نا معلوم سردار اسے بتاتا بھی تھا یا نہیں۔لیکن امید یہی تھی کہ اس کو بتانے کے علاوہ سردار کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔(شاید کچھ قارئین کے دماغ میں یہ سوال اٹھے کہ جب ہم وہاں بغیر کسی روک ٹوک اور مرضی کے اتنا عرصہ گزار سکتے تھے تو یوں میرا غائب ہونا اتنی بڑی بات نہیں ہونی چاہیے، جبکہ اس سے پہلے بھی تو میں اتنا اتنا عرصہ غائب رہ چکا تھا......لیکن ایسا سوال صرف ان قارئین کے دماغ میں اٹھے گا جو فوج کے ماحول سے ناواقف ہیں۔باقی پہلے جو میں غائب رہا تھا تو اس وقت میرا جانا احکامات ہی کے تحت تھا اور اب تو مجھے کسی مخصوص جگہ پر جانے کا حکم مل چکا تھا اور وہاں پر موجود میرے ساتھی کا نہ تو میرے ساتھ رابطہ تھا اور نہ میرے غائب ہونے کا اس کے پاس کوئی جواز تھا)

☆......☆......☆

صبح ،رات ہی طرح ایک آدمی میرے لیے ناشتا لے کر آیا جبکہ ایک مسلح آدمی دروازے پر کھڑا ہو کر مجھ پر نظر رکھے رہا۔ناشتا لانے والا لکڑی کی میز پر ناشتے کے برتن رکھ کر واپس مڑ گیا۔اس کے جانے کے بعد بھی میں نے ناشتے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔بغیر کچھ کھائے پیے مجھے چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔اس وقت میری حالت پھانسی کی سزا پانے والے مجرم کی سی تھی

۔میں جانتا تھا کہ صنوبر خان نے جلد ہی آ کر قبیل خان اور جہانداد خان کی ہلاکت کے بدلے مجھے قتل کر دینا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت بھوک نہ لگنے کی وجہ جان کا خوف نہیں تھا۔ایک پاکستانی فوجی کو بھرتی ہونے کے ساتھ موت سے ڈرنا چھوڑنا پڑتا ہے۔جبکہ ایک سنائپر جس وقت عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو ہر مشن پر جانے سے پہلے وہ خود کو گویا موت کے حوالے کر رہا ہوتا ہے۔مجھے بس پلوشہ کا دکھ اندر سے چیرے جا رہا تھا۔اس کا دھوکا دینا مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اتنی اچھی اداکارہ بھی ہو سکتی ہے ۔آنکھیں بند کرتے ہی اس کے چاہت بھرے جملے،محبت بھری باتیں،میرے لیے پریشانی ظاہر کرنا،شادی کی بات سن کر خوشی کا اظہار کرنا،میری حفاظت کے لیے فکر مند ہونا۔یہ تمام باتیں ایسی تھیں جو گویا میرے دل کو شکنجے میں بھینچ رہی تھیں۔ہمیشہ ساتھ نبھانے کے وعدے کرنے والی نے صرف میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا بلکہ مجھے بیچ دیا تھا۔میرا رقیب اتنا خوش قسمت تھا کہ اس کے حصول کے لیے میری محبوبہ نے میرا سودا کر دیا تھا۔

گھنٹا بھر بعد وہ ناشتے کے برتن لینے آئے۔ناشتے کو ویسے کا ویسا پڑا دیکھ کر مجھے کچھ کہے بغیر وہ برتن واپس لے گئے۔

وہ پورا دن میں نے بغیر کچھ کھائے پیے گزار دیا تھا۔اس دوران مجھے تھوڑی نیند آئی اور پلوشہ دھم سے میرے خوابوں میں آن دھمکی ......وہ منہ بسورتے ہوئے جانے کتنے گلے شکوے کر رہی تھی اور میں اس کا سر گود میں رکھ کر اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتا رہا۔

آنکھیں کھلنے پر وہی قید خانے کی گھٹی گھٹی فضا اور ہجر و فراق کا پر اذیت موسم نظر آیا۔رات کے وقت بھی میرا کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجھے کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔مجبوراً میں نے چند نوالے لے لیے۔

دکھ شروع شروع میں اذیت ناک اور ناقابل برداشت لگتا ہے لیکن آہستہ آہستہ انسان سنبھلنے لگتا ہے۔اللہ پاک نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ اس میں بھولنے کا مادہ وافر مقدار میں ودیعت کر دیا ہے۔انسان بہت جلد ہی اپنے غموں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کر لیتا ہے میں بھی آہستہ آہستہ سنبھلنے لگ گیا تھا۔

گو پلوشہ کے فعل سے مجھے ناقابل بیان اور ناقابل برداشت اذیت پہنچی تھی لیکن اس اذیت کو لے کر میں کب تک خود کو سزا دیتا رہتا۔پلوشہ نے اپنا ظرف دکھا دیا تھا۔وہ ایک خود غرض اور مطلب پرست لڑکی تھی اسے

دل دینا تو میری غلطی تھی ہی اب اس کی اصلیت ظاہر ہونے کے بعد خود کو کوستے رہنا اور اس کے جانے کا ماتم کرتے رہنا کہاں کی عقل مندی تھی۔ سب سے بڑھ میں موت کی دہلیز تک پہنچ گیا تھا۔ دشمنوں کی قید میں پڑے رہ کر اپنی موت کا انتظار کرنا مجھے کسی طور پر زیب نہیں دیتا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا اپنے ساتھ کھلی زیادتی ہی تو تھی میں ایک تربیت یافتہ سنائپر تھا اور ایک سنائپر کو زندگی کی آخری سانسوں تک لڑنے کی ہمت کرتے رہنا چاہیے۔

کھانا کھانے کے بعد میں وہاں سے بھاگنے کے منصوبے بنانے لگا مگر میری سوچیں گھوم پھر کر پلوشہ کی ذات پر آٹھہرتیں، بہ قول شاعر......

ادھیڑ ڈالے ہیں بخیے میرے جُدائی نے
کہ کھا گیا ہے ترا غم کتر کتر کے مجھے

اس کا غم، اس کی سوچیں، اس کے خیال، اس کی یادیں، اس کا ہنسنا ہے، اس کی شوخیاں، شرارتیں، اس کی محبت، اس کی ادائیں اور پھر اس کا دھوکا دینا...... اس کی بے راہ روی، اس کا غلیظ کردار پتا نہیں اس کے بارے کیا کیا سوچتا رہا۔ میرے اندر تو ایسے جھکڑ اور آندھیاں چل رہی تھیں جو ہر چیز کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیتی ہیں

☆......☆......☆

تین دن گزارنے کے بعد میں نے تنگ آ کر کھانا لانے والوں سے صنوبر خان کے بارے پوچھا۔

''صنوبر خان!...... کب آئے گا؟'' وہ رات کے کھانے کے برتن اٹھانے آئے تھے۔

برتن اٹھانے والے نے حیرانی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''سردار تو یہیں موجود ہیں۔'' حیرانی اسے میرے بات کرنے پر ہوئی تھی۔ کیونکہ جب سے میں قید ہوا تھا پہلی بار میں نے زبان کھولی تھی۔

''میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''انھیں اطلاع دے دوں گا۔'' وہ برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔

حیرت انگیز طور پر تھوڑی ہی دیر بعد بہت سارے قدموں کی چاپ کمرے کی طرف آتی سنائی دی۔ جو میرے قید خانے کے سامنے آ کر رک گئی۔ دروازہ کھول کر کرخت شکل صنوبر خان اپنے چار محافظوں کی معیت

میں اندر داخل ہوا۔

ایک محافظ نے فوم کی آرام دہ کرسی اٹھائی ہوئی تھی۔ میری چارپائی کے سامنے کرسی رکھ کر چاروں محافظ میری چارپائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

صنوبر خان نشست سنبھالتے ہوئے بولا۔" کہو محترم سلیم شاہ، ذیشان حیدر، یا راجو صاحب!" اس کے لہجے میں طنز کی بو صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

اس کے راجو کہنے پر میں چونک گیا تھا، کیونکہ راجو تو بس مجھے پلوشہ کہا کرتی تھی۔

"تمھیں، میرا نام راجو کیسے معلوم۔"

"اس دن پلوشہ خان وزیر نے میرے سامنے ہی تم سے بات کی تھی۔" صنوبر خان نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ اور مجھے گرفتاری کے دن کمانڈر بہار خان اور اس کے ساتھیوں کے منھ سے سنی ہوئی باتوں پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ انھوں نے صنوبر خان کی غیر موجودی میں یہی بات کہی تھی۔

"اپنے یوں قید میں رکھنے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں۔"

"اپنا قصور معلوم ہونے کے بعد یہ سوال بے معنی ہی رہ جاتا ہے۔"

"اور اگر قصور معلوم نہ ہو تو؟"

"سردار قبیل خان اور سردار جہانداد کو قتل کرنے والے کے منھ سے معصومیت بھری گفتگو سن کر عجیب لگتا ہے۔"

میں نے کہا۔" سردار قبیل خان کی قاتل پلوشہ خان وزیر ہے۔ جبکہ سردار جہانداد کو میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کیا ہے، یقیناً اصولی طور پر میں بے گناہ ٹھہرتا ہوں۔"

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے پشتو کا ایک محاورہ بولا جس کا مطلب سادہ اردو میں یہی بن رہا تھا کہ۔" اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔"

"اس میں طنز کرنے کی کیا بات ہے، شالوم میں ہونے والے جرگے میں اس بات کی بڑے مفصل انداز میں وضاحت ہو چکی ہے۔ البتہ اگر اس کے بعد میں نے تمھارے کسی آدمی کو قتل کیا ہو تو مجھے مورد الزام ٹھہرا سکتے

ہو۔“

”جرگے میں تو تم نے کافی سارے جھوٹ بولے تھے۔“

”صرف اپنا فوجی ہونا چھپایا تھا۔“

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔”ایک جھوٹ بولنے والے کی باتوں میں جھوٹ، سچ کا امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”آپ میرے سچ جھوٹ کو رہنے دیں، بس اتنا بتا دیں کیا جہانداد خان نے اپنے لشکر کے ذریعے مجھے گھیرے میں نہیں لے لیا تھا، اور کیا اس وقت میرا فائر کرنا اپنے دفاع کے لیے نہیں تھا۔“

”اس حویلی کی تباہی، قبیل خان، اس کے ساتھ موجود بیس کے قریب آدمیوں کا قتل، گاڑیوں کی تباہی، روشن خان، انار گل، شمس خان، خائستہ گل وغیرہ کا قتل۔ان تمام کو میں کس کھاتے میں ڈالوں۔“ وہ کسی وکیل کی طرح مجھ پر جرح کر رہا تھا۔

”سردار صنوبر خان!......ان فضول باتوں میں پڑنے کے بہ جائے مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ تمھارا ارادہ کیا ہے؟......اگر بدلہ لینا چاہتے ہو تو دیر کس بات کی ہے۔“

صنوبر خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔”سمجھو تمھیں عمر قید ہو گئی ہے اور میرا خیال ہے پھانسی سے عمر قید بہتر ہوتی ہے۔“

میں چند لمحے اس کی آنکھوں میں گھورتا رہا جن میں میرے لیے ذرا بھر نفرت موجود نہیں تھی۔اس کا لہجہ اس کے الفاظ کے ساتھ میل نہیں کھا رہا تھا۔

میں بغیر لگی لپٹی رکھے بولا۔”تمھارے لہجے میں نہ تو وہ نفرت موجود ہے جو مجھے دشمن سمجھتے ہوئے اصولی طور پر ہونی چاہیے تھی اور نہ تمھاری قید میں مجھے کوئی جسمانی اذیت پہنچائی گئی ہے،اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ تمھارا مقصد مجھے قتل کرنا نہیں ہے۔“

”ہونہہ!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو......؟“ میرا سوال ہنوز باقی تھا۔

تو یہ کہ چند دن آرام کرو پھر بات چیت ہوگی۔"

"آرام کافی ہو گیا ہے۔" میں اس کا جواب جاننے پر مصر رہا۔

"بے صبری اچھی نہیں ہوتی جوان!......اگر تمھیں یہاں کوئی تکلیف ہے تو بتا سکتے ہو۔"

"قید ہونا بہ ذات خود ایک تکلیف ہی تو ہے۔"

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔"اگر تعاون کیا تو قید و بند کی تکلیف سے جان چھوٹ جائے گی۔"

"پلوشہ کے متعلق ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

میرے لہجے میں نہ جانے کون سی ایسی بات تھی کہ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"نہیں میں خود ہی بتا دیتا ہوں......میرا ایک ڈرائیور ہے دلشاد خان۔ جس دن تم گرفتار ہوئے اس سے دو دن پہلے وہ پلوشہ خان وزیر کا پیغام لے کر آیا کہ اگر میں اسے کچھ نہ کہنے کا وعدہ کروں تو وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ سیدھی سے بات ہے جوان!......میں نے جرگے کے دوران اسے دیکھا ہوا تھا۔ ایک تو وہ بہت زیادہ خوب صورت ہے اوپر سے اس نے حلیہ بھی ایسا بنایا ہوا ہے جو اسے اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ سچ کہوں تو میرا دل اسے دیکھتے ہی بے ایمان ہو گیا تھا۔ دلشاد کی بات پر میں نے فوراً وعدہ کر لیا کہ اسے کچھ نہیں کہوں گا۔بس اس نے آ کر پوری رات مجھے خوش کیا اور اگلی رات میرے خصوصی دوستوں کو نوازا۔ اسی اثناء میں تمھارا ذکر چل نکلا میرے ایک دوست کو تمھاری ضرورت تھی پس پلوشہ خان نے تمھیں پکڑوانے کے لیے پندرہ لاکھ کا مطالبہ کیا اور میرا دوست مان گیا۔ باقی کی کہانی تمھیں معلوم ہوگی۔"

اس نے من و عن وہی بات مختصر لفظوں میں دہرائی تھی جو اس سے پہلے میں دلشاد خان اور بہار خان کی زبانی سن چکا تھا۔

"اتنے پیسوں کا اس نے کیا کرنا تھا۔"

"پتا نہیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی۔"بس اس نے مطالبہ کیا اور میرے دوست نے رضامندی ظاہر کر دی۔"

"تمھارے دوست کا نام جان سکتا ہوں؟"

”دو تین دنوں تک وہ خود تمھیں شرف ملاقات بخشے گا۔“

”ویسے میرا خیال تھا کہ تم نے سردار قبیل خان اور سردار جہانداد خان کا بدلہ لینے کے لیے مجھے پکڑا ہے۔“

”اس موضوع کو رہنے دو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو کھانا لانے والوں سے کہہ دیا کرو۔“ اس کے اٹھنے پر چوکنا محافظوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اس کے باہر جانے کے بعد وہ تمام بھی باہر نکل گئے۔ اور میں اس کے مذکورہ دوست کے بارے سوچنے لگا آخر وہ کون تھا اور مجھے پکڑوانے کے لیے اس نے اتنی خطیر رقم کیوں خرچ کی تھی۔ لیکن کافی دیر سر کھپانے کے باوجود میرا ذہن کوئی اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ اور پھر یہی سوچتے سوچتے میری ذہنی رو دشمن جاں کی جانب پلٹ گئی۔ بے وفا، دھوکے باز اور بدکردار ہونے کے باوجود میں اس سے نفرت کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ دماغ اس پر تھو تھو کر رہا تھا مگر احمق دل نہ جانے کن خوش فہمیوں میں گم تھا۔

☆......☆......☆

شب و روز اسی بے کیفی، الجھن اور پریشانی میں گزر رہے تھے۔ صنوبر خان سے ملاقات کے بعد اتنا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مجھے بدلہ لینے کے لیے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے پکڑا ہے۔ صنوبر خان سے ملاقات کے تیسرے دن قریباً گیارہ بجے چار مسلح افراد میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑے۔ مجھے وہاں آئے ہوئے ہفتہ ہونے کو تھا اور اس دوران پہلی بار میں اس قید خانے سے باہر نکل رہا تھا۔ حویلی کی تعمیر میں پرانے نقشے ہی کو سامنے رکھا گیا تھا۔ اندرونی حویلی میں پہلے کی طرح دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک جانب خصوصی مہمانوں کے لیے انیکسی جیسی بنائی تھی جس کی حد بندی اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیوار سے کی گئی تھی۔ پہلے یہاں بانس کی لکڑی کی باڑ لگائی گئی تھی۔ پلوشہ مجھے پہلی بار اسی انیکسی میں ٹکرائی تھی۔ اس وقت میں نے اسے لڑکا سمجھا تھا۔ سخت مقابلے کے بعد کہیں جا کر میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میری ذہنی رو پھر اسی کی جانب بہنے لگی جس نے مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ شاید کچھ عرصہ بیتنے کے بعد ہی اس کی جان لیوا یادوں سے جان چھوٹ پاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یاد میرے دماغ کا ناسور بن کر مجھے کسی کام کا بھی نہ رہنے دیتی۔ دھوکا دہی اور بے وفائی کے ساتھ ساتھ اس کی بے راہ روی بھی تو میرے

لیے ایک عذاب ہی تھی۔

انیکسی کے دروازے پر جا کر وہ رک گئے تھے۔اسی وقت دروازہ کھول کر صنوبر خان باہر نکلا۔

محافظوں کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ مجھے بولا۔''تم اندر جا سکتے ہو۔''

میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔پہلا کمرہ ڈرائینگ روم کی طرح ہی سجایا گیا تھا۔فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔اور وسط میں آرام دہ اور قیمتی صوفے رکھے ہوئے تھے۔ایک صوفے پر بیٹھے امریکن گورے کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی پڑے دوسرے صوفے پر کالی جینز پر سفید قمیص پہنے ایک نیگرو دوشیزہ بیٹھی تھی۔اس کا رنگ ضرور کالا تھا مگر نقوش عام کالوں کی طرح بہت زیادہ بھدے نہیں تھے۔اس کے کالے گھنے بال بہ مشکل کندھوں کو چھو رہے تھے،جبکہ نیلی آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں۔اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے نا معلوم سی شناسائی کا احساس ہوا جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔

نپے تلے قدم رکھتا ہوا میں ان کے سامنے جا بیٹھا۔مصافحہ کرنے یا ہیلو ہائے کرنے کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی تھی۔صنوبر خان نے بھی باہر ہی رہ گیا تھا۔یقیناً امریکن اس کے مائی باپ اور آقا تھے۔ان کے احکامات کی تعمیل کرنے پر ہی ایسے غدار سرداروں کو ڈالر ملتے ہیں جن کے بل بوتے پر یہ پاک آرمی کو بھی بھونکتے ہیں اور نہتے عوام کے خلاف بھی کارروائیاں کرتے ہیں۔

چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد مرد گلہ کھنکارتے ہوئے گویا ہوا۔

''تو تم ہو،ریچا ذیشن حائیڈر......''اس نے میرے نام کی ٹھیک ٹھاک مٹی پلید کی تھی۔

میں نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر نیگرو دوشیزہ کی طرف دیکھا نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر ایک عجیب سا احساس میرے اندر جاگ رہا تھا۔وہ بھی گہری نظروں سے میری جانب متوجہ تھی۔

وہ اپنا اور اپنی ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔''میرا نام البرٹ بروک ہے۔اور میری ساتھی کا نام ٹریسی والکر ہے۔''

اس مرتبہ بھی میں نے کچھ لب کھولے بغیر اپنے سر کو خفیف سے حرکت دے دی۔

''جانتے ہو تم نے ہمارے ایک سنائپر کو قتل کیا ہے اور ہم اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔''البرٹ

بروک نے گویا مجھ پر فردِ جرم عاید کی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”شاید اس کا ثبوت پیش کرنا آسان نہ ہو۔“

”ہم سب جانتے ہیں محترم!...... بیرٹ ایم 107 اور اس کے ساتھ سنائپنگ کے بقیہ سامان کی تمھارے پاس موجودی واضح کر رہی ہے کہ بیلی واڈ کر کے قاتل تم ہو۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”پھر تو تمھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میری گولی کا نشانہ بننے سے پہلے وہ کیا کر رہا تھا؟“

میری بات کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔ گلا کھنکارتے ہوئے اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر منھ بگاڑتے ہوئے بولا۔ ”اسی وجہ سے تم زندہ بھی نظر آ رہے ہو...... ویسے اس نے ہماری ہدایات کے برعکس سرحد کے اس طرف آ کر ایک ایسی کارروائی میں حصہ لیا جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا اور نتیجے میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔“

”کسرِ نفسی ہے تمھاری...... ورنہ سرحد پار کر کے زیادہ تر حملوں کے احکام تمھاری جانب ہی سے دیے جاتے ہیں۔ اور اس کا واضح ثبوت تم دونوں کی یہاں موجودی ہے۔“ میں اس بار بھی طنز سے باز نہیں آیا تھا۔

وہ برا مناتے ہوئے بولا۔ ”جوان!...... میں تمھارے طنزیہ جملے یا گلے شکوے سننے نہیں، ایک سودا کرنے آیا ہوں۔ اگر جان بچانی ہے تو ہمارے لیے کام کرنا پڑے گا دوسری صورت میں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

میں بے پروائی سے بولا۔ ”تو کس نے کہا ہے کہ میں مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”سوچ لو......“

میں نے اطمینان سے کہا۔ ”فیصلہ کرنے بعد سوچنا وقت کا ضیاع کہلاتا ہے۔“

”دیکھو جوان!...... زندگی بہت قیمتی ہے اور یقیناً اسے یونھی ضائع کر دینا عقل مندی نہیں ہے۔ اگر تم جان کی قربانی دے کر کسی تمغے یا میڈل وغیرہ کے حصول کے چکروں میں ہو تو کیا تمھارے گھر والے اس تمغے کو چاٹیں گے۔ تمھاری محدود پنشن اور چند لاکھ رقم کے بل پر وہ باقی زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ نہ تو تم جیسے گمنام ہیروز کو کوئی یاد کرتا ہے اور نہ تم جیسوں کی قربانیوں کو سراہا جاتا ہے۔ وقت سے فائدہ اٹھانا سیکھو۔ ہمارے ساتھ کام کر کے تمھیں دولت اور پر آسائش زندگی گزارنے کو ملے گی۔ تم آسانی سے اس لڑکی سے انتقام وغیرہ بھی لے

سکو گے جس نے تمھیں گرفتار کرایا ہے، بلکہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ دو تین سال ہمارے لیے کام کرو اس کے بعد تمھیں اور تمھارے کنبے کو گرین کارڈ دلوا دوں گا بقیہ زندگی اطمینان سے امریکہ میں گزارنا۔‘‘

اس کے بکواس کرنے تک میں اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس پر قابو پانا اتنا مشکل نہیں تھا اسے یرغمال بنا کر میں وہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ اس لیے جونھی اس کی زبان رکی میں ایک دم اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ یوں کہ اس کے یا نیگرو دوشیزہ ٹریسی والکر کے ہتھیار نکالنے سے پہلے اسے چھاپ لوں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس کے قریب پہنچتا بجلی چمکنے کی طرح ٹریسی اپنی جگہ پر سے اچھلی اور اس کے پاؤں کی زوردار ٹھوکر میری چھاتی میں لگی۔ چونکہ میرا پورا دھیان البرٹ بروک کی طرف تھا اس لیے میں اپنا دفاع صحیح طریقے پر نہیں کر سکا تھا۔ میں کولھوں کے بل دبیز قالین پر گرا اور کروٹ لیتا ہوا فوراً کھڑا ہو گیا۔ اتنی دیر میں ٹریسی اپنے دائیں پاؤں پر گھوم چکی تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ خطرناک انداز میں میرے چہرے کی طرف بڑھی...... نیچے جھک کر میں نے اس کا وار خطا کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک قدم آگے لیتے ہوئے میرا دایاں ہاتھ دائروی مکے کی صورت اس کے چہرے کی طرف بڑھا۔ اپنے چہرے کو ہلکا سا دائیں کرتے ہوئے اس نے میرا وار خطا کیا اور اس سے پہلے کہ میں دوسرا وار کرتا اس کی دائیں ٹانگ ہتھوڑے کی طرح میری چھاتی پر لگی میں اڑ کر صوفے پر جا پڑا تھا۔ نیچے گرتے ہی میں سپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا لیکن اسی لمحے البرٹ کی سرد آواز میری سماعتوں میں گونجی......

’’تمھاری ذرا سی حرکت شاید تمھیں بے حس و حرکت کر دے۔‘‘ اس کے ہاتھ میں خوف ناک شکل کا گیرا گٹ مارک تھرٹین ایم ایم نظر آ رہا تھا۔

میں ایک دم رک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ٹریسی کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ البتہ مجھ پر مرکوز نیلی آنکھوں میں عجیب سا اسرار پوشیدہ تھا جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔ ایک نیگرو لڑکی کی نیلی آنکھیں بھی کافی عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کا بھرا بھرا سڈول جسم مجھے کسی کی یاد دلا رہا تھا۔ شاید اس کا بدن پلوشہ کی طرح تھا۔ مگر ایک دم میرے دماغ نے اس مشابہت کو جھٹلا دیا کہ ایک تو اس کا قد پلوشہ سے اونچا تھا دوسرا اس کے جسمانی خطوط بھی پلوشہ کے مقابلے کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے۔ یقیناً پلوشہ کی جدائی کی وجہ سے مجھے ہر عورت میں اس کی

شبیہ نظر آنے لگی تھی۔

مجھے رکتے دیکھ کر البرٹ نے شیشے کی خوب صورت میز پر پڑی گھنٹی بجائی اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول کر ایک آدمی اندر آ گیا۔

’’محافظوں کو کہو اسے لے جائیں۔‘‘ البرٹ نے آنے والے کے کچھ پوچھنے سے پہلے حکم دیا۔

’’جی سر!‘‘ آنے والا سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔ صنوبر خان نے ان کی خدمت کے لیے ملازم بھی ایسا ہی مہیا کیا تھا جو انگریزی زبان جانتا تھا۔

ٹریسی اطمینان بھرے انداز میں مڑ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔ البرٹ بروک پستول اپنی گود میں رکھ کر آرام سے بیٹھا رہا۔ ایک منٹ بعد ہی مجھے لانے والے چاروں محافظ اندر داخل ہوئے۔ یقیناً وہ وہیں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

ان کی معیت میں میں واپس کمرے میں آ گیا۔ مجھے کمرے میں چھوڑ کر وہ واپس چلے گئے۔ چارپائی پر بیٹھ کر میں کراہنے لگا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی اتنی تیز اور لڑاکا ہو سکتی ہے۔ یقیناً البرٹ اسی وجہ سے اتنی بے فکری سے بیٹھا تھا۔

میں زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھ سکا تھا۔ دروازہ کھول کر دوبارہ چاروں مسلح افراد اندر داخل ہوئے اور مجھے دوبارہ کمرے سے باہر لے آئے اس مرتبہ وہ مجھے کمرہ در کمرہ گھماتے ہوئے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے جہاں انھوں نے اپنے دشمنوں سے نبٹنے کا خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ کمرے کی صفائی دیکھتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کمرے کا افتتاح وہ مجھ سے کرا رہے تھے۔ چھت میں لگے کنڈوں سے لٹکتی ہوئی زنجیروں میں میرے ہاتھ جکڑ کر وہ باہر نکل گئے۔

البرٹ پر قابو پانے میں تو میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا البتہ اس کے نتیجے میں اپنا آرام قربان کر بیٹھا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد قدموں کی چاپ ابھری، آنے والا صنوبر خان تھا۔

’’اچھے لگ رہے ہو۔‘‘ اندر داخل ہوتے ہی اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’بے وقوف آدمی وہ حبشن دس آدمیوں سے بھی قابو نہیں آتی اور تم اکیلے اس سے ٹکرانے چلے تھے۔ شکر کرو ہڈیاں سلامت رہ گئی ہیں۔‘‘

اس کی طنزیہ بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔اس نے بھی کوئی استفسار نہیں کیا تھا کہ میرے جواب کا انتظار کرتا۔اس کی بات جاری رہی۔

”بہرحال اب تمھارا کھانا پینا اور آرام تو ہفتہ بھر کے لیے ختم ہو گیا اور یہ البرٹ صاحب کا حکم ہے مجھ سے خفا نہ ہونا۔“

”میرا خیال ہے ہم دوست نہیں ہیں۔“میں اس کی بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”ہاں دوست تو نہیں ہیں ،لیکن تم نے میرے سردار بننے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور میری تھوڑی بہت ہمدردی کے حق دار تو تم ٹھہرتے ہونا۔“

میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔”یہ بھی خوب کہی ،گرفتار کروا کر یوں میری ہمدردی سمیٹنا دلچسپی سے خالی نہیں۔“

صنوبر خان نے بگڑتے ہوئے کہا۔”میں نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ تمھیں گرفتار کرایا ہے تمھاری نام نہاد محبوبہ نے۔بلکہ یہاں پر،تمھارا سودا کیا ہے،کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔اب خفا ہونا چاہیے اس فاحشہ سے تم مجھے طعنے دیے جا رہے ہو۔“

میں بغیر کسی لگی لپٹی کے بولا۔”کیا مجھے تمھارے آدمیوں نے گرفتار نہیں کیا ؟اور غیر ملکی دہشت گردوں کا ساتھ دے کر اگر تم اپنے ہم وطن کو پکڑ کر ان کے سامنے پلیٹ میں سجا کر رکھو گے اور ساتھ میں یہ بھی کہو کہ تمھیں قصوروار نہ سمجھا جائے،خاصی واہیات خواہش ہے۔باقی پلوشہ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اس کی قباحت اپنی جگہ مگر اسے بھی ترغیب تو تم نے دی ہے نا۔“

”پہلی بات یہ ہے ذیشان میاں !......میں تمھارا ہم وطن نہیں ہوں کیوں کہ میں پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کرتا ۔دوسرا اس فاحشہ نے خود البرٹ کا پہلو گرم کرتے ہوئے تمھارا سودا کیا تھا۔میں کسی طور بھی اس میں ملوث نہیں تھا اور نہ مجھے تم سے انتقام لینے کی کوئی ضرورت ہی تھی۔اگر تمھیں یاد ہو تو جہانداد خان کے قتل کے بعد میں نے فوری طور پر جرگہ بلا کر اس معاملے کو نبٹایا تھا۔اور جرگہ بلانا بھی میری مجبوری تھی ورنہ میرے قبیلے کے لوگ اعتراض کرنے سے باز نہ آتے کہ میں نے بدلہ لیے بغیر کیوں محاصرہ اٹھا لیا ہے۔اس کے بعد میں نے تم دونوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا لیکن وہ فاحشہ خود معافی تلافی کے چکر میں میرے پاس آ گئی تو اتنا فرشتہ تو میں بھی نہیں تھا کہ

پاس آئی عیاشی کی دعوت ٹھکرا دیتا۔اسے معاف تو میں یوں بھی کر چکا تھا۔اس کی آمد سے قبیلے کے لوگوں کے سامنے بھی سرخ رو ہو گیا کہ میں نے دشمن سے خاطر خواہ انتقام لے لیا ہے۔اور یقیناً یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ پلوشہ خان نے اپنے لیے جس انداز کی معافی تجویز کی تھی یہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔میرا مطلب کسی شریف لڑکی کے لیے۔البتہ اس فاحشہ کے لیے یہ روزمرہ ہی کی بات تھی۔"

صنوبر خان اور اس کے آدمیوں کی قید میں آنے کے بعد پلوشہ کا جو کردار میرے سامنے کھل کر آ رہا تھا پہلے میں ایسا فرض بھی نہیں کر سکتا تھا۔مگر صنوبر خان کے منھ سے اس کے لیے سوائے فاحشہ کے کوئی لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔اور جو کچھ وہ کر چکی تھی اس کے بعد اس لفظ کے علاوہ کوئی لفظ اس کے لیے جچتا بھی نہیں تھا۔

صنوبر خان کی تفصیلی بات سن کر میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں پر میری موجودی میں پلوشہ ہی کا ہاتھ تھا۔صنوبر خان کو اس بارے مطعون کرنا نامناسب ہی تھا۔یوں بھی مجھے گرفتار کرنے کے بعد اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی تھی۔اب بھی میں اپنی بے وقوفی یا کمزوری کے باعث اس سزا کا مستحق ٹھہرا تھا۔

مجھے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا......"میں علام خیل جا رہا ہوں،اب تم جانو اور تمھارے امریکن دشمن،میں تم لوگوں کے بیچ نہیں آؤں گا۔" وہ مڑ کر باہر نکل گیا۔

مسلسل کھڑا رہنا بھی انسان کے لیے ایک عذاب ہی ہے۔اس کے ساتھ سر سے بلند ہونے والے ہاتھ بھی سونے پر سہاگا ثابت ہوتے ہیں۔دوپہر سے شام ہوئی اور پھر رات آہستہ آہستہ بیتنے لگی۔صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ کھا پی نہیں سکا تھا۔اس وقت مجھے اچھی خاصی بھوک پیاس محسوس ہو رہی تھی،لیکن اس سے کئی گنا زیادہ بھوک پیاس برداشت کرنے کی صلاحیت مجھ میں موجود تھی۔اسی طرح مسلسل کھڑے رہنے سے میری ٹانگیں شدید تھکن محسوس کر رہی تھیں،بازو بھی شل ہوئے جا رہے تھے مگر میرا حوصلہ برقرار تھا۔اس درد،تکلیف اور اذیت کا سنائپر کے ساتھ بہت پرانا رشتا ہے۔

لیکن انسان جتنا بھی سخت جان،مضبوط اور حوصلے والا کیوں نہ ہو ذہنی اذیت ہمیشہ انسان کو شکست سے ہم کنار کر دیتی ہے۔جسمانی طور پر مضبوط ہونے کے باوجود پلوشہ کے کردار نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں

کوسلب کرلیا تھا۔اس کا دھوکا دینا اور بے وفائی کرنا میرے لیے سوہان روح سہی مگراس سے بڑھ کراس کی بے راہ روی مجھے اذیت پہنچانے کا باعث بنی تھی ۔اس وقت بھی بھوک ، پیاس اور تھکن سے زیادہ مجھے اس کی یاد ستا رہی تھی ۔محبوب کی یادیں عموماً خوشی ،تسکین اور سکون مہیا کرتی ہیں مگراس کی یاد سوائے اذیت اور ذلت کے اور کوئی احساس نہیں دلا رہی تھی ۔

ساری رات یونھی کھڑے بیت گئی تھی ۔ایک احسان انھوں نے مجھ پر یہ کیا تھا کہ میری ٹانگیں نہیں جکڑی تھیں اس طرح کم ازکم میں اپنے پاؤں کو دو تین فٹ کے دائرے میں حرکت دے سکتا تھا۔اگلا دن بھی اسی حالت میں بیت گیا تھا۔بس دوپہر کو چار مسلح افراد نے مجھے چند منٹ کے لیے کھول کر کمرے کے کونے میں بنے بیت الخلا میں چند منٹ جانے کی اجازت دے تھی ۔بیت الخلا سے باہر نکلنے پرانھوں نے مجھے دوبارہ جکڑ دیا تھا ۔رات تک میری بھوک پیاس شدت اختیار کرگئی تھی لیکن البرٹ بروک یقیناً میری قوت برداشت توڑنا چاہتا تھا

☆......☆......☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب مجھے دروازے پرہلکی سی آہٹ سنائی دی ۔مسلسل کھڑے کھڑے مجھے کبھی کبھی ہلکی سی اونگھ آتی اور جونھی جھٹکا لگنے سے میں گرنے لگتا مضبوط زنجیریں مجھے نیچے گرنے سے روک لیتیں اور میں جاگ جاتا۔کھٹکا سنتے ہی میں نے آنکھیں کھولیں شاید کسی نئی آزمائش کا وقت آ گیا تھا۔اندر داخل ہونے والا اکیلا آدمی تھا۔اس کا قد تو چھوٹا تھا مگر جسم خوب گھٹا ہوا اور مضبوط تھا۔گھنی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔اس کا مشکوک انداز مجھے حیران کر گیا تھا۔اندر داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کرنے سے پہلے ایک بار باہر جھانک کر دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ بند کر کے وہ پیچھے مڑا۔اس نے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پکڑ رکھی تھی ۔ہونٹوں پر انگلی رکھ کراس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے کے کونے کی طرف بڑھ گیا جہاں لوہے کی ایک چرخی اور ہینڈل لگا تھا۔جس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں پڑی زنجیر کو ڈھیلا یا سخت کیا جا سکتا تھا۔اس نے نہایت آہستگی سے چرخی گھما کر میرے ہاتھوں کو نیچے کیا۔ہاتھوں کے نیچے آتے ہی مجھے اچھا خاصا سکون محسوس ہوا تھا۔

قریب آکراس نے مجھے پانی کی بوتل پکڑائی ۔وہ ڈیڑھ لیٹر والی بوتل پانی سے بھری ہوئی تھی ۔بوتل کا

ڈھکن کھول کر میں آدھی سے زیادہ بوتل پی گیا تھا۔میرے پانی پیتے ہی اس نے اخبار میں لپٹا کھانا میری طرف بڑھا دیا۔دو موٹی روٹیوں کے ساتھ چنے کی دال کا سالن، مجھے اتنا لذیز اور ذائقے دار لگا تھا کہ عام حالات میں بھنا ہوا گوشت بھی اتنی مزیدار نہیں لگتا۔میرے کھانا کھانے کے دوران وہ میرے پاس کھڑا مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھتا رہا۔

کھانا کھلا کر اس نے مجھے دوبارہ پانی کی بوتل پکڑائی اور بقیہ پانی معدے میں انڈیل کر میں نے خالی بوتل اس کی جانب بڑھا دی۔

''کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے دوست، میں جان پر کھیل کر تمھیں کھانا دینے آیا ہوں۔'' خالی بوتل بغل میں دباتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ......لیکن اس مہربانی کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔''

اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''اگر میں کہوں تمھیں صرف آم کھانے چاہیں، کیونکہ پیڑ گننا بے وقوفی کہلاتا ہے۔''

''ٹھیک کہا مگر احسان کرنے والے بارے متجسس ہونا غیر فطری نہیں ہے۔''

''وقت آنے پر تمھیں پتا چل جائے گا،بس یہ یاد رکھنا کہ اس بارے اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو میرے مرنے کی باری تم سے پہلے آئے گی۔''

میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔''اپنے خیر خواہ کو مرتے ہوئے کون دیکھ سکتا ہے۔''

''شکریہ۔'' میری پیٹھ تھپتھپا کر وہ کونے کی طرف بڑھ گیا۔چرخی گھما کر وہ میرے ہاتھوں کو پہلے والی حالت میں لایا اور احتیاط کا مظاہرہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیٹھے بٹھائے ایک خیر خواہ مجھے میسر آ گیا تھا۔میں اس کی شناخت کے بارے سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا۔آخر وہاں ایسا کون تھا جسے میری فکر تھی۔کافی دیر کی ذہنی ورزش کے بعد میرے دماغ میں خوش حال خان اور قابل خان محسود کا خیال آیا۔جب ہمیں جہانداد خان کے لشکر نے گھیرے میں لیا ہوا تھا اس وقت قابل خان نے مجھے جہانداد خان کے لشکر کی تعداد کے بارے اطلاع دیتے ہوئے کہا تھا کہ دشمنوں کے لشکر میں ان کے آدمی بھی

موجود ہیں۔ مجھے کافی حد تک اسی بات پر یقین آ گیا کہ وہ خوش حال خان ہی کا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ تو صنوبر خان کے آدمیوں میں میرے کسی خیر خواہ کا ہونا ممکن نہیں تھا۔ ایک بار میرے ذہن میں میجر اورنگ زیب کا بھی خیال آیا لیکن پھر میں نے اس خیال کو سختی سے جھٹلا دیا کیونکہ صنوبر خان کے آدمیوں میں میجر اورنگ زیب کے کسی بندے کی موجودی کا مجھے ضرور معلوم ہوتا۔

اگلی رات وہ دوبارہ میرے لیے کھانا اور پانی لے آیا۔

اس نے مجھے کھانا پکڑواتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام سہراب خان ہے۔''

''میرا خیال ہے آپ کا تعلق خوش حال خان محسود سے ہے۔'' میں نے اپنا اندازہ ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''بڑی جلدی سمجھ گئے ہو...... بہر حال مجھے اس بات کا حکم سردار خوش حال خان نے نہیں دیا ہے۔''

''گویا آپ کے احسان کا وزن میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہے۔''

اس نے انکساری بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو بس موقع ملنے کی بات ہے۔''

اور میں مزید کچھ کہے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

کھانا کھا کر میں نے پانی کی بوتل کو منھ لگایا ہی تھا کہ دروازے کو دھکیلتے ہوئے کمانڈر بہار خان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک کلاشن کوف بردار شخص بھی موجود تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ تیکھے لہجے میں سہراب کو مخاطب ہوا۔

''وہ...... مم...... میں...... میں......'' سہراب خان منمنا کر رہ گیا تھا۔

''بکو......'' اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے وہ غرایا۔ مسلح شخص نے سہراب خان پر کلاشن کوف تان لی تھی۔

''اپنی بہن کے خصم کو کس خوشی میں کھلا پلا رہے تھے۔ تمھارے خیال میں ہم تمام اندھے، بہرے ہیں اور کسی کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔''

اس مرتبہ سہراب خان کوئی بھی جواب دیے بغیر خاموش رہا۔

''گل خان !......اسے دوسرے کمرے میں لے جاکر باندھ دو صبح اس سے تفصیلی بات چیت ہوگی۔'' مسلح آدمی کو حکم دے کر کمانڈر بہار خان باہر نکل گیا۔اس کی حالت بتارہی تھی کہ وہ نیند سے اٹھ کر آیا تھا۔اور اسی لیے اس نے سہراب خان سے پوچھ گچھ کو اگلے دن پر ٹال دیا تھا کہ اس وقت وہ اپنا آرام خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن دوپہر کے وقت وہ سہراب خان کو کمرے میں لے آئے۔اس کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی۔ماتھے اور چہرے پر پڑے خون کے دھبے ظاہر کررہے تھے وہ اسے اچھے خاصے تشدد کا نشانہ بنا چکے تھے۔اس کی مشکیں کس کر انھوں نے کمرے کے ایک کونے میں پھینک دیا۔اس کے ساتھ میرے ساتھ بھی یہ مہربانی کی کہ مجھے زمین میں گڑی لوہے کی کرسی پر بٹھا کر میرے ہاتھ عقب میں باندھ دیے۔ مسلسل کھڑے رہنے سے میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔لوہے کی کرسی پر بیٹھنا میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

ان کے باہر نکلتے ہی میں سہراب خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے خفیف سے لہجے میں بولا۔

''معذرت خواہ ہوں بھائی آپ کو میری وجہ سے اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''کوئی کسی کی وجہ سے تکلف نہیں اٹھاتا،ہر آدمی کو اپنے حصے کی تکلیف بھگتنا پڑتی ہے۔''

''اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو یقیناً انھیں آپ کی اصلیت معلوم نہ ہو پاتی۔''

''چھوڑو اس موضوع کو،مقدر کا لکھا ٹل نہیں سکتا اور گیا وقت واپس لایا نہیں جاسکتا۔''

''صحیح کہا۔''میں نے اس سے متفق ہوتے ہوئے پوچھا۔''ویسے اب ان کا ارادہ کیا ہے؟''

''صنوبر خان علام خیل سے افغانستان چلا گیا ہے۔وہ واپس آکر ہی میری قسمت کا فیصلہ کرے گا۔''

''کیا انھیں بتادیا ہے کہ تمھارا تعلق خوش حال خان محسود سے ہے۔''

''نہیں۔''اس نے نفی میں سر ہلایا۔''فی الحال تو نہیں مانا۔''

''تو کیا کہا ہے؟''

”یہی کہ تم سے کچھ رقم لینے کا وعدہ لے کر مدد کر رہا تھا۔“

”ٹھیک ہے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں بھی یہی بتاؤں گا۔“

”ایک بات پوچھوں؟“اس نے کراہتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگانے کی کوشش کی۔بڑی مشکل سے وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

”ضرور۔“

”تمھیں کیوں قید کیا ہوا ہے، میرے ذہن میں تو تمھیں زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں آرہی۔“

”صنوبر خان کے مائی باپ چاہ رہے ہیں کہ میں ان کے لیے کام کروں۔“

وہ فوراً بولا۔”ایسی غلطی کبھی بھی نہ کرنا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔”بلکہ اسی کی پاداش میں تو سزا کاٹ رہا ہوں۔“

”گویا تم نے انکار کر دیا ہے۔“وہ تحسین آمیز لہجے میں مسکرایا۔

”لازمی بات ہے، پاک آرمی کا جوان وطن کے خلاف کوئی کام کرنے سے جان دینا آسان سمجھتا ہے۔“

”ایک بات تو طے ہے۔مشکل ہے، کہ انکار کے بعد وہ تمھیں زندہ چھوڑ دیں۔“

”جانتا ہوں۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اگر..........“اس نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا اور پھر چپ ہو گیا۔

میں اسے ترغیب دیتے ہوئے بولا۔”یقیناً تم کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔“

”بس اتنا کہ تمھیں مرنا نہیں چاہیے۔“

”ہونہہ!......مرنا کون چاہتا ہے یار!“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔”میرا مطلب، تمھیں بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“

”کیسے؟“

”دیکھیں میں یہ نہیں چاہتا کہ تم امریکیوں کے ساتھ مل جاؤ......لیکن انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلا کر شاید فرار ہونے کا موقع حاصل کر لو۔“

اس کی بات رد کرنے کے قابل نہیں تھی۔ مجھے سوچ میں کھویا دیکھ کر اس نے دوبارہ زبان کھولی۔

''دیکھو، تمھارا مرنا تو یقینی ہے نا، تو کیوں نہ کوشش کر کے مرو۔ اور ایک بار فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔ بس کسی پلوشہ جیسی محبوبہ سے بچ کر رہنا ہوگا۔'' آخری فقرہ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

''تم بھی پلوشہ کو جانتے ہو۔'' پلوشہ کا نام آنے پر نہ جانے کیوں میرے دل میں میٹھا میٹھا درد شروع ہو جاتا تھا۔

''اس سے بھلا کون ناواقف ہے، صنوبر خان کے آدھے سے زیادہ لشکر کو تو وہ نواز چکی ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی میرے منھ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ پلوشہ کا ذکر آتے ہی مجھے یوں لگتا جیسے میری شریک حیات اس گھناؤنی حرکت میں ملوث رہی ہو۔ ماہین کی بے راہ روی پر مجھے اتنی تکلیف اور اذیت نہیں پہنچی تھی کہ جس ذہنی اذیت کا سامنا مجھے پلوشہ کی بے راہ روی کی وجہ سے کرنا پڑ رہا تھا۔ اور پھر ہر بار اس کی گراوٹ کا ذکر سنتے ہی مجھے اپنے دل پر بے پناہ بوجھ کے ساتھ نا قابل برداشت درد کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اس وقت سہراب خان کے منھ سے یہ سب کچھ سن کر پلوشہ کی بے راہ روی کے متعلق رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔

''کاش تم نے مجھے کہا ہوتا کہ تمھیں کتنی رقم چاہیے۔ صرف ایک بار آزمایا ہوتا۔ پندرہ لاکھ تو کوئی رقم ہی نہیں ہے اس سے دگنی تگنی رقم بھی میں ادا کر دیتا۔ تمھیں پسند کی شادی کرنے سے بھی نہ روکتا کم ازکم اس طرح تمھارے کردار پر تو انگلی نہ اٹھائی جاتی۔ پلوشہ تم تو اتنی سمجھ دار تھیں کیا تمھیں نہیں معلوم کہ بے راہ رو عورت اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔''

''کن سوچوں میں کھو گئے ہو۔'' سہراب خان کی آواز مجھے خیالات کی دنیا سے باہر لائی۔

میں چونکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہونہہ...... کچھ نہیں۔''

''برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔''

''کسی بات کا برا لگنا تو ایک احساس کے زیر اثر ہوتا ہے انسان جان بوجھ کر تو غصہ ظاہر نہیں کرتا۔ البتہ برا

لگنے کے بعد جو ردعمل ظاہر کیا جاتا ہے وہ انسان کے اپنے بس میں ہوتا ہے اور میں کوشش کروں گا کہ آپ کی بات پر کوئی ایسا ردعمل ظاہر نہ کروں جس سے آپ کی توہین ہو۔''

''شکریہ کہ تم نے مجھے اتنی اہمیت دی......''سہراب خان ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔''میں بس یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تم پلوشہ کے جھانسے میں کیسے آگئے......اور جب وہ تمھارے ساتھ غلط تعلق استوار کرسکتی تھی تو کسی دوسرے کے ساتھ ایسا کرنے میں اسے کیا قباحت تھی۔''

''یہ تو معلوم نہیں کہ میں اس کے جھانسے میں کیسے آیا، البتہ میرے ساتھ اس کا تعلق ایک اچھے دوست جیسا تھا۔اور پھر ہم نے شادی کا منصوبہ بھی بنالیا۔اس بارے مجھ سے زیادہ وہ پیش پیش تھی۔اور پھر یہ واقعہ پیش آ گیا ۔''اپنے اور پلوشہ کے تعلق کے بارے میں نے اجمالاً ذکر کردیا۔

اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔''اگر یہاں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوگئے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کروگے؟''

''اسے قتل کردوں گا،اسے برہنہ کرکے اس پر کتے چھوڑ دوں گا،اسے زندہ جلا دوں گا،اس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کی من موہنی شکل کو بگاڑ دوں گا......''میرے دماغ نے انتقام کی مختلف شکلیں پیش کیں لیکن دل کسی ایک پر بھی متفق نہیں تھا۔

مجھے لمبی سوچوں میں کھوئے دیکھ کر وہ مسکرایا۔''شاید تم اسے کچھ بھی کہنا نہیں چاہتے۔''

''کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔اور پھر اسے مار کر مجھے کیا ملے گا۔بہتر یہی ہے کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دوں ۔ایسی دھوکا باز اور مطلبی کو زیادہ ڈھیل نہیں ملا کرتی۔''

اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔''گویا، وہ ابھی تک تمھیں پیاری لگتی ہے۔''

''چھوڑو اس موضوع کو......''میں نے آنکھیں بند کرکے کرسی سے ٹیک لگادی۔پتا نہیں کب سے میں نیند نہیں لے سکا تھا۔غیر آرام دہ کرسی پر بھی مجھے نیند کے جھٹکے لگ رہے تھے۔اور پھر میں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

میں دو تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں سو سکا تھا۔آنکھ کھلنے کے بعد مجھے کمرے کے منظر میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔سہراب خان دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔اسے مخاطب کیے بغیر میں اس کے دیے ہوئے مشورے

کے بارے سوچنے لگا۔ان حالات میں اس سے بہتر کوئی مشورہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

’’جاگ گئے ہو۔‘‘سہراب کان کی آواز مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر لائی۔

’’ہونہہ!......‘‘میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’تو کیا سوچا؟‘‘

’’کس بارے......؟‘‘میں نے وضاحت چاہی۔

وہ مسکرایا۔’’گوروں کو دھوکا دینے کے بارے۔‘‘

’’ویسے آپ کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

’’شاباش......بس کوشش کرنا کہ انھیں یقین دلا سکو۔‘‘اس نے میرے فیصلے کو سراہتے ہوئے مجھے مزید مشورے دینا شروع کر دیے۔

سہ پہر ڈھلے بہار خان کی معیت میں دو مسلح آدمی اسے وہاں سے لے گئے۔جاتے ہوئے سہراب خان کی آنکھوں سے ہویدا خوف اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ اسے اپنا انجام واضح آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

سہراب کو وہاں سے لے جانے کے گھنٹا ڈیڑھ بعد مجھے بھی پہلے والے کمرے لے جایا گیا۔شاید میری غلط حرکت کی سزا پوری ہو گئی تھی۔رات کو مجھے کھانا بھی دیا گیا۔اگلی دن دوپہر کے وقت میں ایک بار پھر اسی جگہ پر البرٹ بروک کے سامنے موجود تھا۔نیگرو دوشیزہ ٹریسی والکر بھی چست لباس پہنے وہیں بیٹھی تھی۔اس کی گہری نیلی آنکھوں میں عجیب قسم کے اسرار پوشیدہ تھے۔

’’تو کیا سوچا؟‘‘البرٹ نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی۔

میں ہاں،ناں کیے بغیر خاموش بیٹھا رہا۔

اس نے نرمی سے پوچھا۔’’کیا سوچنے کے لیے مزید وقت چاہیے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘میں نے نفی میں سر ہلایا۔

’’پھر؟‘‘وہ دوبارہ مستفسر ہوا۔

میں نے جچے تلے لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”ہمارے لیے کام کرنا ہوگا۔“ البرٹ نے اس انداز میں جواب دیا گویا میرا سوال ہی غلط ہو۔

میں نے وضاحت مانگتے ہوئے کہا۔ ”تو وہی تو پوچھ رہا ہوں کیا کام کرنا ہوگا؟“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”تمھیں ایک ہی کام آتا ہے اور وہی کروانا ہے۔“

بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟“ میں نے سوچے سمجھے منصوبے کی طرف قدم بڑھائے۔

اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”نئی زندگی، اپنی سابقہ محبوبہ سے بدلہ لینے کا موقع، گرین کارڈ اور امریکن ڈالرز......میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔“ میں نے گویا ہار مان لی تھی۔

”شاباش!......اب کل یا پرسوں تیار رہنا کرنل کولن فیلڈ تم سے خود بات کریں گے، لیکن خیال رہے انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہم نے تمھیں زور زبردستی اپنے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ان کی نظر میں تم خود ہمارے پاس کام کی غرض سے آئے ہو اور میں نے تمھیں کام کرنے کے قابل پاتے ہوئے ان سے سفارش کی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ اس کی بات نے مجھے حیران ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ برا سا منھ بناتے ہوئے بولا۔ ”اس میں سمجھ نہ آنے والی کون سی بات ہے۔“

”میرا خیال ہے میں خود تو تمھارے پاس نہیں آیا۔“

”کہہ تو رہا ہوں کہ تم نہیں آئے لیکن میں نے اپنے سینئر کو یہ بات نہیں بتائی، یوں بھی انھیں یہ معلوم نہیں کہ تم کتنے اچھے سنائپر ہو۔“

”اگر میں نے کرنل کولن فیلڈ کے سامنے اصل بات اگل تو یقیناً میری جان چھوٹ جائے گی۔“

”جی!......البتہ اس کے بعد میرے پاس چناؤ کا اختیار نہیں رہے گا۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”چناؤ کا اختیار؟“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”فی الحال تو تمھیں قتل کرنے اور تم سے کام لینے کا اختیار میرے پاس موجود ہے۔ اس حرکت کے بعد تم سے کام لینے کا اختیار میرے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“میں نے منھ بناتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور ہاں میری طرف سے اجازت ہے کہ تم کرنل صاحب سے جتنی رقم منظور کرالو اتنا معاوضا تمھیں ادا کیا جائے گا۔“

نہ تو مجھے کسی رقم کی ضرورت تھی اور نہ گرین کارڈ کی ...... اپنے وطن کے خلاف کام کرنے پر حاصل ہونے والی دولت اور امریکن شہریت میرے نزدیک لعنت کی مستحق تھی۔ لیکن اس وقت کسی قسم کی جذباتی گفتگو میرے جھوٹ پر پانی پھیر دیتی۔ میں نے البرٹ بروک کو دھوکے میں رکھنے کی خاطر پوچھا۔

”ویسے تم کیا کہتے ہو کتنی رقم کا مطالبہ کرنا مناسب رہے گا؟“

”تم ایک سنائپر ہو اور سنائپر کا کام افراد کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔ بس تم فی آدمی اپنا معاوضا دس، پندرہ یا بیس ہزار ڈالر بتا دینا۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔”کیا ایک آدمی کو قتل کرنے کے بدلے کرنل بیس ہزار ڈالر معاوضا دینے پر تیار ہو جائے گا؟“

”دینا تو چاہیے کہ سنائپر کا کام کلیدی افراد کو نشانہ بنانا ہوتا ہے۔ اور کسی بھی اہم آدمی کو قتل کرنے کا معاوضا اتنا تو بنتا ہے۔“

”کرنل صاحب سے کب ملاقات ہو گی؟“

”کل یا پرسوں۔“

”کچھ اور کہنا ہے یا میں جا سکتا ہوں۔“میں نے جانے کی اجازت مانگی۔

”بس آخری بات...... ہمیں دھوکا دینے کے بارے سوچنا بھی مت، ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

اور میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ٹریسی والکر ہماری گفتگو کے دوران خاموش بیٹھی اپنی اسرار بھری چمک دار نیلی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی۔ صنوبر خان کے کہنے کے مطابق وہ خالی ہاتھ دس افراد کو بھی شکست سے دو چار کر سکتی تھی۔ اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو خیر مجھے بھی ہو گیا تھا۔ بلاشبہ اس کے حملوں میں بہت تیزی اور مہارت شامل تھی۔

وہاں سے باہر نکلتے ہی چاروں محافظ مجھے اپنے منتظر نظر آئے۔ان کے زیر نگرانی چلتا ہوا میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

میرے حامی بھرنے پر البرٹ بروک نے کسی قسم کے شک کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اپنی قومی سوچ کے مطابق ان کے نزدیک ہر پاکستانی بکاؤ تھا۔بدقسمتی سے ان کی اس سوچ کو ہمارے نام نہاد غلیظ سیاستدان تقویت دیتے آ رہے ہیں۔اور یوں چار پانچ فیصد لوگوں کی گندی سوچ کو پوری پاکستان قوم کے کردار پر منطبق کر دیا گیا ہے۔

☆......☆......☆

اگلے ہی روز دن کے کھانے کے بعد میرا بلاوا آ گیا۔کرنل کولن فیلڈ حیران کن طور پر وہاں پہنچ گیا تھا۔البرٹ بروک اور ٹریسی والکراس کے ہمراہ ہی بیٹھے تھے۔

"تو تمھارا نام ذیشان ہے اور تمھارا تعلق پاک آرمی سے ہے۔"مصافحہ کر کے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی۔"میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا وجہ ہے جو تم پاک آرمی کے خلاف ہی کام کرنے پر تیار ہو گئے ہو؟"اس نے ایسا سوال کیا تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب موجود نہیں تھا۔لیکن میری خاموشی کو البرٹ بروک کوئی غلط نام دے سکتا تھا۔ایک دو لمحہ سوچنے کے بعد میں نے زبان کھولی۔

"سر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے......اور میں اس متعلق بات کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"ہونہہ!......"کرتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔"مگر ہمارا اصول ہے کہ ہم اپنے لیے کام کرنے والوں کے بارے ایسی معلومات کا حصول ضروری سمجھتے ہیں۔"

"آپ اسے معاشی پریشانی کا نام دے سکتے ہیں۔"میں نے محمل طور پر بات کرتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"البرٹ صاحب تمھاری نشانہ بازی کی کافی تعریف کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ تم نے امریکہ سے بھی سنائپنگ کی تربیت حاصل کی ہوئی ہے اور وہاں البرٹ صاحب نے تمھیں کام کی پیش کش کی تھی جس کے جواب

میں تم نے کچھ ضروری کام نبٹا کر ہمارے ساتھ کام کرنے کی حامی بھری تھی۔ غالباً اب تم اسی وعدے کو ایفا کرنے آئے ہو۔''

''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' مجھے اس کی غیر ضروری باتوں سے الجھن ہو رہی تھی اور میں اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا اس لیے میں نے تکرار کیے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے......اب آتے ہیں کام کی بات کی طرف۔ دو دن بعد شمالی وزیرستان میں پاک آرمی کے ایک قافلے نے غرلامئے سے وچہ بی بی کی طرف حرکت کرنا ہے۔ تمھیں معلوم ہو گا کہ آج کل پاک آرمی کے لیے وہاں کے حالات کافی گھمبیر ہیں۔ اور یہ قافلہ کافی دنوں بعد حرکت کر رہا ہے۔ قافلے کی قیادت ایک لیفٹیننٹ کرنل کر رہا ہے۔ اور تمھارا اصل ہدف وہی ہے۔ وہ تیسری گاڑی میں ہوگا۔ اس کے بعد قافلے کی سب سے آخری گاڑی میں ایک میجر صاحب ہے جس نے کرنل کی ہلاکت کے بعد قافلے کی قیادت سنبھالنا ہے اور تمھارا دوسرا شکار وہی میجر صاحب ہو گا۔ اور یہاں پر تمھارا کام ختم ہو جائے گا۔''

''اس کی بات ختم ہوتے ہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ اثبات میں سر ہلانے کے بہ جائے اس کی گردن پکڑ کر دبا دوں۔ مگر اس وقت مجھے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھرنا تھی۔ اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں بہ ظاہر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔''

''کیا اس کے ساتھ معاوضے کی بات ہو چکی ہے؟'' کرنل کولن فیلڈ، البرٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''نہیں سر!'' البرٹ نے نفی میں سر ہلایا۔

''جوان!......تمھیں ایک آدمی کا دس ہزار ڈالر معاوضا ملے گا۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ایک آدمی کے پندرہ ہزار ڈالر لوں گا۔'' میں نے ڈرامے میں حقیقت کا روپ بھرنے کی خاطر مول تول ضروری سمجھا۔

کرنل کولن فیلڈ میری آدھی بات کو تسلیم کرتا ہوا بولا۔ ''کرنل کے پندرہ ہزار ڈالر اور میجر کے دس ہزار ڈالر ملیں گے۔''

’’منظور ہے۔‘‘میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

’’تمھارے پاس رائفل کون سی ہے؟‘‘

’’بیرٹ ایم 107۔‘‘میرے منھ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

’’ٹھیک ہے مجھے اجازت ،باقی کی تفصیلات تمھیں البرٹ صاحب سے معلوم ہو جائیں گی۔‘‘اس نے کھڑے ہو کر ہم تینوں سے الوداعی مصافحہ کیا اور باہر نکل گیا۔اس کے جانے کے بعد البرٹ مجھے پوری کارروائی کی تفصیلات بتانے لگا۔میں بے دلی سے اس کی بات سنتا رہا۔البتہ اپنے چہرے پر میں نے بوریت یا بے زاری کے تاثرات پیدا نہیں ہونے دیے تھے۔

البرٹ مجھے تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا۔کارروائی کا علاقہ اس نے گوگل ارتھ پر دکھایا تھا۔جس جگہ پر وہ پاک آرمی کے قافلے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے وہ پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والا تنگ رستا تھا ۔گاڑیوں میں سوار فوج اس جگہ کسی گھات خلاف کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔حملہ آوروں کو بلندی کا فائدہ حاصل تھا ۔میرا دماغ تیزی سے کوئی ایسا منصوبہ سوچنے میں مصروف تھا جس کو بروے کار لا کر میں یہ بات متعلقہ قافلے کے قائد تک پہنچا سکتا۔اگرچہ اورنگ زیب صاحب تک یہ بات پہنچا کر بھی میں اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا لیکن ان سے رابطے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

البرٹ بروک کی بکواس ختم ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں لایا گیا۔معاہدہ ہو جانے کے باوجود میری نگرانی ختم نہیں کی گئی تھی۔یقیناً پرسوں ہونے والی کارروائی کے بعد ہی وہ مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کرتے۔اور جو ارادہ میں نے کر لیا تھا اس کے بعد ان کے اعتماد کی دھجیاں بکھرنے والی تھیں۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں ذہنی طور پر جانے کے لیے تیار تھا۔کیونکہ کارروائی سے ایک دن پہلے گھات کی جگہ پر پہنچنا ضروری تھا۔مگر شام تک بھی مجھے لینے کوئی نہ آیا۔کھانا لانے والوں سے اس بارے استفسار کرنا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ مجھے وہاں تک پہنچانے کی ذمہ داری البرٹ بروک ہی کی تھی۔اگلے دن بھی کوئی سرگرمی نظر نہ آئی ۔میں نے سوچا شاید آرمی کے قافلے کی حرکت کسی التوا کا شکار ہو گئی ہو گی۔

تیسرے دن البرٹ بروک نے مجھے بلا کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔''معذرت خواہ ہوں ذیشن صاحب!......میرا ارادہ تمھیں کل یہاں سے بھیجنے کا تھا لیکن ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا، پرسوں غرلامئی جانے والی ہماری ایک گاڑی آرمی کی چیک پوسٹ پر پکڑی گئی۔اور اس سڑک پر آرمی نے گزرنے والی گاڑیوں کی پڑتال میں سختی شروع کر دی۔بس غلطی یہ ہوئی کہ ہمیں ایک دن پہلے ہی روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔''

''یہ آپ ہی کا کام تھا۔''میں بے نیازی سے بولا۔البتہ میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔یقیناً ان کا منصوبہ ناکام رہا تھا۔

وہ ہنسا۔''خیر ہم نے تو اپنا کام بہ خیر و خوبی سرانجام دے دیا ہے۔بلکہ اپنا کیا تمھارا کام بھی ہو گیا ہے۔''

''میرا کام؟''میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں جی تمھارا کام......''البرٹ معنی خیز لہجے میں بولا۔''قافلہ قائد لیفٹیننٹ کرنل اور اس کا دست راست میجر دونوں ہلاک ہو گئے ہیں۔اور ان کی ہلاکت کا سہرا میں نے تمھارے سر باندھ دیا ہے۔اب کل کرنل کولن فیلڈ سے تم ان کے مارنے کا انعام وصول کر سکتے ہو۔''

کرنل صاحب اور میجر صاحب کی شہادت کا سن کر مجھے دھچکا لگا تھا مگر میں نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔''اس مہربانی کی وجہ......؟''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''یاد رکھنا جوان!......ہم امریکی کبھی کسی پر مہربانی نہیں کرتے، جو کچھ کرتے ہیں اپنے مفاد کے لیے کرتے ہیں۔ان کی ہلاکت تمھارے کھاتے میں ڈالنا اپنی رائے اور فیصلے کی اہمیت تسلیم کرانے کے لیے ہے۔پہلے مشن ہی میں تمھاری کامیابی کا سن کر کرنل کولن فیلڈ کا میرے چناؤ پر بھروسا پختہ ہو جائے گا۔اس کے برعکس اگر میں یہ تسلیم کر لوں کہ تمھیں وہاں تک پہنچا ہی نہیں سکا ہوں تو یقیناً وہ میری اس غفلت کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔باقی تمھاری جیب میں جانے والی انعام کی رقم یوں بھی امریکن سرکار کے خزانے سے ادا ہو گی۔''

''ہونہہ!......تو یہ بات ہے۔''میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلا دیا۔

''جی جناب، اب کل کرنل کولن فیلڈ اسی ضمن میں تم سے بات کریں گے۔کوئی بے وقوفانہ بات کر کے میرا

بھانڈانہ پھوڑ دینا۔ان دونوں کے علاوہ پانچ چھ دوسرے بندوں کی ہلاکت کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لینا۔اچھا اثر پڑے گا۔'' پاک آرمی کے شہید ہونے والے مجاہدوں کے بارے وہ بار بار ہلاک ہو جانے کا لفظ استعمال کر رہا تھا اور میں اتنا بے بس تھا کہ اس پر ناگواری کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔لیکن دل ہی دل میں، میں نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ موقع ملنے پر اس کی گردن مروڑنے سے پہلے اس کی یہ غلط فہمی ضرور دور کروں گا۔

کمرے میں واپس لوٹ آنے کے بعد میرے دماغ میں آرمی کے شہید ہو جانے والے جوانوں کا غم آنسوؤں کی صورت اپنی موجودی کا احساس دلاتا رہا۔میں اپنے بھائیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا۔گو ان کی شہادت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا نہ اس میں میرا کوئی قصور تھا اس کے باوجود پہلے سے اس حملے کی بابت پتا ہونے کے سبب مجھے یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ ان کے بچاؤ کے لیے میں نے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے تھے۔

''تم ہاتھ پاؤں ہلا بھی کیسے سکتے تھے۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنے دکھی دل کو تسلی دینے لگا۔

☆......☆......☆

اگلے روز میں دوبارہ کرنل کولن فیلڈ کے سامنے موجود تھا۔اس نے دل کھول کر میرے کام کی تعریف کی تھی۔یقیناً البرٹ بروک نے میرے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کیے تھے۔سو سو ڈالرز کے نوٹوں کی تین گڈیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔''تمھارا معاوضا تو پچیس ہزار ڈالر طے ہوا تھا۔لیکن اتنا اچھا کام دیکھنے کے بعد پانچ ہزار ڈالر میری طرف سے انعام سمجھو۔''

اپنے بھائیوں کی شہادت کے بدلے ملنے والی رقم پر میں ہزار بار لعنت بھیجتا مگر اس وقت وہ رقم خوش دلی سے وصول کرنا میری مجبوری تھی۔جب تک میں آزادی حاصل نہ کر لیتا مجھے وہ ڈراما جاری رکھنا تھا۔یوں بھی میرے ہاتھوں میرے کسی بھائی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔البتہ اس حملے کے ذمہ داروں کو انجام تک پہنچانے کا تہیہ میں نے ضرور کر لیا تھا۔اب یہ میرے پاک رب کو معلوم تھا کہ میرا یہ ارادہ شرمندہ تعبیر ہونا تھا یا اس سے پہلے میں نے خود ہی ان درندوں کا شکار ہو جانا تھا۔

میرے احساسات سے بے خبر کرنل کولن فیلڈ مجھے اگلے مشن کی تفصیلات بتانے لگا۔

پاکستان آرمی کی ایک چیک پوسٹ درین نرائے نامی پہاڑی کے قریب واقع تھی۔وہاں اٹھارہ جوان

موجود تھے جن میں سے چھے جوان ایک وقت میں ڈیوٹی پر موجود ہوتے تھے۔وہ ان تمام گاڑیوں کی پڑتال کرتے جو اس رستے سے گزر کر انگور اڈے کی طرف جاتی تھیں۔ چیک پوسٹ پر بنے ہوئے ایک بینکر میں دو جوان ایم جی کے پیچھے ہر وقت چوکس کھڑے رہتے۔جبکہ باقی کے چار جوان کلاشن کوف سے مسلح ہوتے اور وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کی پڑتال کرتے رہتے۔ چار دن بعد وہاں سے دو مخصوص گاڑیوں نے گزرنا تھا جن کے پاس کافی اسلحہ اور بارود وغیرہ موجود ہونا تھا۔انگور اڈے سے وانہ جانے والی سڑک پر چونکہ بہت زیادہ چیک پوسٹیں موجود تھیں اس لیے انھوں نے مذکورہ گاڑیاں درین نرائے والے رستے سے گزارنے کا منصوبہ بنایا تھا ۔میرا کام ایم جی مورچے میں کھڑے دو جوانوں کو نشانہ بنانے کا تھا۔جبکہ آرمی کے باقی جوانوں سے گاڑیوں میں موجود دہشت گرد خود نبٹ لیتے۔اگلے مرحلے میں دہشت گردوں نے آگے بڑھ جانا تھا اور پاک آرمی کے رہائشی بینکر جو اس چیک پوسٹ کے ساتھ ایک بلند چوٹی پر موجود تھے وہاں پر موجود بارہ جوانوں کو دہشت گردوں کے تعاقب سے روکنا بھی میری اور میرے ساتھ موجود صنوبر خان کے آدمیوں کی ذمہ داری تھی۔

کرنل کولن فیلڈ نے مجھے مجمل طور پر کارروائی کی ترتیب سے آگاہ کیا اور مکمل تفصیل بتانے کی ذمہ داری البرٹ بروک کے سر پر ڈال کر رخصت ہو گیا۔البرٹ بروک نے باریک بینی سے مجھے سارے منصوبے سے آگاہ کیا۔اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے کہا......

”اس معاملے میں تو مجھے اپنا کوئی کردار نظر نہیں آ رہا، ایم جی مورچے میں موجود دو جوانوں کو نشانہ بنانے کے لیے ایک سنائپر کو اتنا معاوضہ دینا عجیب لگتا ہے۔“

”یہ بات تم اس لیے کر رہے ہو کہ ایک تو تمھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ ہمارے آدمیوں کی گاڑیوں میں موجود گولہ بارود کتنا قیمتی ہے۔دوسرا ایم جی پوسٹ میں موجود دونوں جوان ہماری گاڑیوں کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔اور سب سے بڑھ کر گاڑیوں کے چیک پوسٹ سے گزر کر آگے جانے کے بعد رہائشی بینکروں میں موجود پاک آرمی کے جوان بڑی آسانی سے ہمارے آدمیوں کا تعاقب کر کے انھیں گرفتار یا قتل کر سکتے ہیں۔جبکہ تم جیسا تجربہ کار سنائپر کلو میٹر بھر دور سے بڑی آسانی سے آرمی کے جوانوں کو تعاقب سے روک سکتا ہے ۔اور آخری بات یہ کہ تمھیں اپنے معاوضے سے مطلب ہونا چاہیے، ہم تم سے کیا کام لے رہے ہیں یہ ہمارا درد سر

ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"میں نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیئے۔

"آج منگل ہے اور ہفتے کے دن کارروائی کریں گے۔"اپنی بات ختم کر کے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ ہماری ہر بیٹھک کے وقت نیگرو دوشیزہ ٹریسی والکر موجود رہتی تھی۔ دوران گفتگو وہ اپنی نیلی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہتی۔ میں نے ایک بار بھی اس کے منھ سے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ یقیناً البرٹ اسے اپنے محافظ کے طور پر ساتھ رکھتا تھا۔اس کے مسلسل گھورنے کے ردعمل پر بعض اوقات میں بھی اس کی طرف متوجہ ہوجاتا مگراس نے کبھی نگاہیں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اکثر مجھے اس کی نگاہیں عجیب قسم کی دعوت دیتی یا سوال کرتی نظر آتیں جن کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔ پہلے دن اس سے ہاتھا پائی کرتے وقت بھی مجھے اس کی آنکھوں میں کسی قسم کی برہمی نظر نہیں آئی تھی۔

بستر پر لیٹتے ہوئے میں کافی دیر ٹریسی کے بارے سوچتا رہا۔ البرٹ بروک کا رویہ بھی عجیب سا تھا۔ وہ مجھ سے ایسے کام لے رہا تھا جو کوئی عام آدمی بھی کر سکتا تھا۔

ایک حتمی سوچ میرے دماغ میں یہی آئی کہ۔"شاید وہ کوئی اہم کام کرنے سے پہلے مجھے آزمانہ چاہتا ہے کہ میں پاک آرمی کے خلاف فائر کرتا بھی ہوں یا نہیں۔"

میری طرف سے اس کا ضروری کام بھاڑ میں جاتا، میں تو بس ایک موقع کی تلاش میں تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں۔اور بھاگنے کے کے لیے بھی میں ایسا منصوبہ بنانا چاہتا تھا جس میں غلطی کی گنجائش نہ ہوتی۔ ابھی تک انھوں نے مجھ سے نگرانی نہیں ہٹائی تھی، وہاں سے بھاگنے کی کوشش میں ناکام ہونے کی صورت میں انھیں دھوکا دینے کا پول کھل جاتا۔ بہتر یہی ہوتا کہ دوران مشن ہی میں بھاگنے کے منصوبے پر عمل کرتا۔

☆......☆......☆

ہم نے ہفتے کے دن صبح سویرے کارروائی کی جگہ پر پہنچنا تھا۔ مگر جمعہ کے دن میں ناشتا بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک دم بلاوا آ گیا۔ پتا چلا دہشت گردوں کی گاڑی کسی خاص وجہ سے وقت سے پہلے ہی انگوراڈے سے نکل کر درین نرائے کی طرف چل پڑی تھی۔اور ہفتے کے بہ جائے جمعہ کے دن ہی منصوبے پر عمل درآمد کرنا پڑ گیا تھا۔ ہم

ہنگامی طور پر وہاں سے روانہ ہوئے۔ہم سے پہلے ایک گاڑی فی الفور کارروائی کی جگہ کی طرف بھیج دی گئی تھی ۔میں محافظوں کے نرغے میں گاڑی کے قریب پہنچا ڈبل کیبن کی عقبی نشست پر البرٹ اور ٹریسی براجمان تھے ۔البرٹ نے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم چل پڑے۔آدھا گھنٹا پختہ سڑک پر سفر کرنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی کو کچے رستے پر اتارا اور ہم پہاڑوں کے درمیان سفر کرنے لگے۔البرٹ بار بار ڈرائیور کو تیز رفتاری سے چلنے کا کہہ رہا تھا۔کچے رستے پر ہم بیس منٹ چل پائے ہوں گے کہ گاڑی جھرجھرا کر رک گئی۔

ڈرائیور نے نیچے اتر کر بونٹ کھولا اور خرابی دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔البرٹ بروک پہلو تبدیل کرتے ہوئے بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ٹریسی البتہ بے فکری بیٹھی تھی۔

پانچ دس منٹ کے بعد ڈرائیور نے ناکامی کا اعلان کیا اور البرٹ واہی تباہی بکتا موٹرولہ سیٹ پر دوسری گاڑی منگوانے لگا۔دوسری گاڑی کے آنے تک ہم وہیں ٹھہرے رہے اسی دوران گاڑی کی باڈی میں بیٹھے ہوئے محافظوں کے کمانڈر نے بتایا کہ دہشت گردوں کی گاڑی آرمی چیک پوسٹ پر پہنچ چکی تھی۔ہم سے پہلے جو آدمی کارروائی کی جگہ کی طرف روانہ کیے گئے تھے وہ بھی اپنی جگہ پر پہنچ چکے تھے۔مجبوراً انھیں ہماری غیر موجودی ہی میں منصوبے کی تکمیل کرنا پڑ گئی تھی۔نئی گاڑی کے ہم تک پہنچنے تک ہمیں آرمی چیک پوسٹ سے دہشت گردوں کی گاڑیوں کے کامیابی سے گزر جانے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ہم بجائے آگے بڑھنے کے واپس لوٹ آئے ،کہ میری قید کے دن ابھی تک باقی تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں البرٹ اور ٹریسی کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔کافی کی دعوت البرٹ نے دی تھی۔

”مسٹر ذیشان !......پہلے کی طرح یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے اس مشن میں بھر پور حصہ لیا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ کرنل کولن فیلڈ تک ہماری بدانتظامی اور مشن میں حصہ نہ لینے کی بات پہنچے۔وہ ان چھوٹی موٹی کارروائیوں سے تمھاری کارکردگی جانچ رہا ہے۔اگر وہ تمھیں فائر کرتے دیکھ چکا ہوتا تو کبھی بھی اس طرح سے تمھارا امتحان نہ لیتا ،مگر اب جب تک وہ اپنی تسلی نہیں کرلے گا یونھی تمھارا امتحان لیتا رہے گا۔میں چونکہ تمھاری صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے مجھے اس بات کا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم ان چھوٹی موٹی کارروائیوں میں شامل ہو

پاتے ہو یا نہیں ہو پاتے۔''

میں اس کی بات پر گہرا سانس لے کر رہ گیا تھا۔ زبردستی کے کارنامے میرے نام سے منسوب کر کے وہ کرنل کولن فیلڈ پر اپنی دھاک بٹھانا چاہ رہا تھا۔ اور جس دن میں فرار ہو جاتا یقیناً کرنل کولن فیلڈ کو جواب دینا اس کے لیے مشکل ہو جاتا۔

''میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔'' میں نے جل کر سوچا اور اس سے اجازت لے کر واپس کمرے میں لوٹ آیا۔ چاروں محافظوں نے دم چھلے کی طرح میرے ساتھ چلتے ہوئے مجھے اپنے کمرے میں پہنچا دیا۔ ہر مرتبہ کمرے سے نکلتے اور واپس لوٹتے وقت میں ان کی حرکات و سکنات کو گہری نگاہ سے دیکھا کرتا۔ مگر نا معلوم کیا بات تھی کہ وہ مجھے پہلے دن کی طرح چوکس اور چوکنے ہی نظر آتے تھے۔

اگلے دن کرنل کولن فیلڈ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میری کارکردگی پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مشن کی طے کی ہوئی رقم دس ہزار ڈالر میری جانب بڑھا کر وہ اگلے مشن کی تفصیلات بتانے لگا۔

اس مرتبہ میران شاہ سے دتہ خیل جانے والے ایک قافلے پر گھات کا منصوبہ بنا تھا۔ شمالی وزیرستان کے حالات پاک آرمی کے لیے کافی ناگفتہ بہ تھے اور ہر قافلے کی حرکت سے پہلے رستے میں آنے والی تمام پہاڑیوں پر قافلے کی حفاظت کے لیے آرمی کے دستے ایک دن پہلے بٹھا دیے جاتے۔ تاکہ دہشت گرد قافلے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔ اب جو قافلہ چل رہا تھا اس کی خاص بات یہ تھی کہ دو ٹرکوں میں دتہ خیل اور اس سے ملحقہ ایک دو علاقوں میں تعینات آرمی کے جوانوں کے لیے بڑی مارٹر گنز اور راکٹ لانچرز کا ایمونیشن لایا جا رہا تھا۔ اور مجھے انھی دو گاڑیوں کے فیول ٹینک کو نشانہ بنا کر اس ایمونیشن کو تباہ کرنا تھا۔ چونکہ نزدیکی پہاڑیوں پر پاک آرمی کے چاک و چوبند دستے تعینات تھے اس لیے یہ کام ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے سے کرنا تھا۔ آرمی کے قافلے نے اگلے ہفتے آنا تھا۔ کولن فیلڈ تو اجمالی تفصیل بتا کر رخصت ہو گیا جبکہ ہم تفصیلی منصوبہ بنانے لگے۔

گوگل ارتھ کے ذریعے ہم نے میران شاہ سے دتہ خیل آنے والی پوری سڑک کا جائزہ لیا وہاں انٹرنیٹ کی سہولت بھی تھی اور البرٹ بروک کا لیپ ٹاپ بھی موجود تھا۔ آخر میں اپنی جگہ کا چناؤ کر کے ہم منصوبے کو حتمی شکل دینے لگے۔

مجھے دکھاوے کے لیے مجبوراً بڑھ چڑھ کر گفتگو میں حصہ لینا پڑتا۔ چونکہ اس منصوبے پر عمل کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تھا اس لیے منصوبہ بناتے وقت میں مشورے دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ ایک سنائپر کو ایسے حالات میں کون کون سی مشکلات پیش آسکتی تھیں اور کیسی جگہ کی ضرورت پڑسکتی تھی یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا اور منصوبے بناتے وقت میں یہ معلومات فراخ دلی سے البرٹ بروک کے گوش گزار کرتا رہتا تاکہ اسے یقین ہوجائے کہ میں اس کے ساتھ مخلص ہوں۔ مجھے بس ایک موقع کی تلاش تھی کہ وہاں سے فرار ہوسکوں اس کے بعد میں نے جو کچھ البرٹ اور اس کے چمچے صنوبر خان کے ساتھ کرنا تھا وہ اس سلوک کو اپنی قبر میں بھی نہ بھول پاتے کہ کس سے واسطہ پڑا تھا۔

☆......☆......☆

پہلے کی طرح اس بار بھی منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے ایک دن پہلے پتا چلا کہ پاک آرمی کا قافلہ خلاف توقع میرن شاہ سے نکل کر دتہ خیل کی طرف چل پڑا تھا۔ ہمارا انگور اڈے سے وہاں پہنچ کر قافلے کے خلاف کارروائی کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ البرٹ نے میرے سامنے ہی دیگان کے مقامی کمانڈر سے ٹیلی فون پر بات کر کے اسے اس جگہ کے بارے بتایا جہاں سے وہ قافلے کے خلاف کارروائی کرسکتے تھے۔ اس کے منہ سے انگریزی کے بہ جائے اردو سن کر مجھے خاصی حیرانی ہوئی تھی۔ مگر میں نے اس سے استفسار کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلی بار اس نے میرے سامنے اردو میں بات چیت کی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ ملازموں سے بھی انگریزی زبان ہی میں بات کرتا نظر آتا۔ یہ اور بات کہ صنوبر خان نے اس کے ساتھ جو خدمت گار متعین کیے تھے وہ تمام انگریزی زبان سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔

ٹیلی فون بند کر کے وہ مجھے مخاطب ہوا...... ''ویسے میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ جب بھی ہم نیا منصوبہ بناتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی کمی کیسے رہ جاتی ہے اور ایسا تیسری مرتبہ ہورہا ہے۔''

''کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی۔

ٹریسی کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ بلاشبہ وہ رنگت میں کالی تھی مگر اس کے جسمانی خطوط اور نین نقش بلا کے پرکشش تھے۔

”کیا اب میں اس سے متاثر ہو رہا ہوں؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ جواباً احمق دل نے فوراً پلوشہ کی موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے لہرادی۔ دل کسی صورت اسے بھلانے کو راضی نہیں تھا۔ نہ تو اسے یہ غرض تھی کہ پلوشہ میرے ساتھ کیا کچھ کر چکی تھی اور نہ اسے پلوشہ کے غلیظ کردار پر کوئی غصہ آرہا تھا۔ میرے دماغ کو کسی شاعر کے خیال نے آئینہ دکھایا۔

دل میں ہوتا تو کسی طور نکل بھی جاتا

اب تو وہ شخص بہت دور تلک ہے مجھ میں

واقعی پلوشہ کی محبت میرے دل ہی میں نہیں نس نس میں سما چکی تھی۔ اس کے ساتھ بیتا وقت مجھے گزری ہوئی خوشی کی یاد دلانے لگا۔

”اگر ہمارے آدمی کامیاب ہو گئے تو ہمیں پھر وہی ڈراما رچانا پڑے گا۔“ البرٹ بروک کی آواز مجھے حال کی دنیا میں واپس لائی......

”آں...... ہاں......“ میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آسکی تھی۔

البرٹ مسکرایا۔ ”تم شاید دماغی طور پر حاضر نہیں ہو۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کی تردید کرنے کی فضول کوشش کی۔

”میں کہہ رہا تھا، اگر دیگان کا کمانڈر ہدف کو تباہ کر دیتا ہے تو ہمیں ایک بار پھر پرانی ترکیب آزمانا پڑے گی۔ میں ہر صورت کرنل صاحب کے سامنے اپنے انتخاب کو سرخ رو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”بات اعتراض کی نہیں ہے، بس حیرانی ہے کہ بار بار ایسا اتفاق کیوں ہو رہا ہے۔“

میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”اس کیوں کا جواب میرے پاس بھی موجود نہیں ہے۔“

”خیر آرام کرو، شام کو بات کریں گے۔“ اور میں ٹریسی پر آخری نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کو معلوم ہوا کہ دیگان کا مقامی کمانڈر پاک آرمی کے ایمونیشن والے ٹرکوں میں سے ایک کو تباہ کرنے

میں کامیاب ہوسکا تھا۔ نتیجے میں اس کے دو آدمی بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ البرٹ نے فوراً اس متعلق ایک کہانی ترتیب دی جو میں نے اگلے دن کرنل کولن فیلڈ کے سامنے دہرا دی۔ اس گھڑی ہوئی کہانی میں تباہ ہونے والی گاڑی کی تباہی کا سہرا میرے سر باندھ کر بچ جانے والی گاڑی اور دیگان کے دو آدمیوں کی ہلاکت کا ذمہ دار دیگان کے مقامی کمانڈر کو ٹھہرایا گیا تھا۔

کرنل فیلڈ نے مجھے ہلکی سی سرزنش کی کہ البرٹ بروک کا خصوصی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے وہاں کی قیادت میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے میری تعریف کر کے گویا میری دل جوئی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ میرے ساتھ طے کردہ معاوضے کی آدھی رقم میری طرف بڑھا کر وہ گویا ہوا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے امریکہ جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے چند ضروری کارروائیاں تمھارے ذمہ لگا تا جاؤں گا۔ میری واپسی تک یہ کام مکمل ہو جانے چاہئیں......'' وہ مختلف قسم کی دہشت گردانہ کارروائیوں پر روشنی ڈالنے لگا کہ ہم نے کہاں کہاں وہ کام سر انجام دینا تھے۔ میں اور البرٹ بروک سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ دہشت گردانہ کارروائیوں کی اجمالی تفصیل بتانے کے بعد وہ مجھے مخاطب ہوا۔

''مسٹر ذیشان!......تم سے ایک اور مشورہ بھی کرنا تھا۔''

''جی سر!......'' میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''اگر ہم تمھیں واپس بھیج دیں تو کیا تم پاک آرمی میں رہ کر ہمارے لیے کام کر سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے فوراً جوش ظاہر کیا کیونکہ مجھے تو بس وہاں سے جان چھڑانے کا بہانہ چاہیے تھا۔

''کہیں تم یہ تو نہیں سوچو گے کہ گرین کارڈ کی امید دلا کر ہم تمھیں پھر سے پاک آرمی کے اسی نظم وضبط بھری زندگی کے جہنم میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔''

''نہیں سر!......کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھے وہاں بھی تین سال تک آپ کے لیے کام کرنا پڑے گا۔ اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کام میں یہاں سر انجام دوں یا آرمی میں رہتے ہوئے پورا کروں۔''

''شاباش۔'' اس نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔ ''بس طے ہو گیا امریکہ سے واپسی پر تمھیں واپس بھجوا دوں گا۔''

میرے چہرے پر مایوسی بھرے اثرات پھیل گئے تھے۔ میں نے تو سوچا تھا شاید وہ فی الفور میرے جانے کا حکم جاری کرے گا مگر اس نے اپنے حکم کو اپنی امریکہ واپسی کے ساتھ معلق کر دیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد البرٹ بروک نے باقاعدہ نقشہ نکال کر ان مخصوص جگہوں کی نشان دہی کی تھی جہاں ہم نے پاک آرمی کے رہائشی بینکروں، چیک پوسٹوں، اور حرکتی قافلوں پر چھاپے اور گھات کی کارروائیاں کرنا تھیں۔ کرنل کولن فیلڈ نے تقریباً سات مختلف جگہوں پر کارروائی کا حکم دیا تھا۔ ہم دونوں ترتیب سے ہر جگہ کے لیے علیحدہ علیحدہ منصوبہ بنانے لگے۔ اس ضمن میں ہم تفصیل سے ایک منصوبے کا جائزہ لیتے اور اس کے بارے ساری تفصیلات طے کر کے اگلے منصوبے پر بات چیت کرنے لگتے۔ میں نے دبے لفظوں میں البرٹ کو کہا بھی سہی کہ......

''ہر مشن پر جانے سے ایک دن پہلے اس کا منصوبہ بنا لیا کریں گے۔''

وہ جواباً بولا۔ ''نہیں یار!......ضروری نہیں کہ ہر منصوبے پر میں تمھیں وقت دے پاؤں۔ ایک بار تمام منصوبوں پر بات چیت ہونے کے بعد تم اپنی مرضی سے ہر مشن کی تکمیل کے لیے جا سکتے ہو۔''

اور میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ رات گئے تک میں وہیں مصروف رہا۔ کھانا بھی ہم نے وہیں بیٹھ کر کھایا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر میں آنے والے وقت کے بارے سوچنے لگا۔ عجیب بات تھی کہ مجھے کسی مشن پر جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بغیر کوئی کام کیے میں کرنل کولن فیلڈ سے ڈالرز بھی وصول کر رہا تھا اور شاباش بھی۔ اب بھی امریکہ جانے سے پہلے وہ دہشت گردی کے چھ سات اہداف ہمارے حوالے کر گیا تھا۔ نا معلوم کس مشن پر جانے کا موقع میں حاصل کر پاتا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ میرا پہلا مشن ہی آخری مشن ثابت ہونا تھا، کیونکہ پاک آرمی کے خلاف میں کسی بھی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکتا تھا چاہے اس کے لیے میری جان چلی جاتی یا کسی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ قدرت مجھ پر مہربان ہے اور ہر بار کسی مشن پر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔ گویا قدرت چاہتی ہے کہ میں یہیں سے فرار ہونے کی کوشش کروں لیکن اس کے ساتھ اپنی سخت نگرانی دیکھ کر میں بے بس ہو کر رہ جاتا۔ کمرے کی دیوار میں نقب لگانا ناممکن تھا کہ نہ تو میرے پاس کوئی ایسا تیز دھار آلہ موجود تھا جس سے میں سیمنٹ کے بلاک سے بنی ہوئی دیوار میں سوراخ

بنا پاتا اور نہ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان بنا ہوا تھا کہ جس کے ذریعے میں بھاگنے کی کوشش کرتا۔

''نہ جانے سردار اور میجر اورنگ زیب صاحب میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔'' میری ذہنی رو دوسری جانب بہنے لگی۔ نامعلوم ان کی نظر میں میں زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔ میرے غائب ہونے کے متعلق میرے والد صاحب کو اطلاع پہنچانا ان کا اخلاقی فرض بنتا تھا۔ کیونکہ کسی بھی قسم کا رابطہ نہ ہونے کی صورت میں ان کا یہ گمان کرنا کہ میں دہشت گردوں کا شکار بن چکا ہوں ایک واضح حقیقت تھی۔

''ہوسکتا ہے سردار پلوشہ سے رابطہ کرے۔'' ایک امید افزا سوچ میرے دماغ میں جاگی، لیکن اس کے ساتھ ہی تلخ سوچ نے میرے منہ کڑواہٹ گھول دی کہ۔ ''پلوشہ اسے کیوں حقیقت بتانے لگی۔'' یوں بھی اپنے جرم سے پردہ اٹھانا وہ کب گوارا کرتی۔ پلوشہ کا نام آتے ہی بے ایمان دل ساری سوچوں کو پسِ پشت ڈال کر اسے یاد کرنے لگا.........

تیز بارش کے دوران جب میں نے اسے چادر اوڑھائی تھی تو وہ کتنی بے ساختگی سے بولی تھی...... ''کتنا خیال کرتے ہو اپنی چیز کا ہے نا؟'' اور میں نے کہا تھا...... ''ہاں، قیمتی چیزوں کی حفاظت مالک کو کرنا پڑتی ہے۔'' کتنی بے قدر اور سستی چیز کو میں قیمتی سمجھتا رہا تھا۔

جواباً اس کا یہ کہنا ''راجو!...... اگر میں کہوں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟'' کتنی چاہت، محبت اور خلوص پنہاں تھا ان الفاظ میں۔ اس وقت بھی میں نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا...... ''اچھا اب تک اقرار کی گنجائش موجود تھی۔''

''اقرار کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ جس آدمی سے محبت ہو جائے اسے فوراً بتا دینا چاہیے۔''

''تو کیا یہ محبت آج ہوئی؟''

''نہیں اب تو لگتا ہے ہمیشہ سے تھی، شاید اس وقت سے جب میں بالغ ہوئی، شاید اس وقت سے جب مجھے پتا چلا کہ میں لڑکی ہوں، شاید اس وقت جب میں نے باتیں کرنا شروع کیا تھا، شاید اس وقت جب میں پیدا ہوئی یا شاید اس وقت جب میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔'' کتنی مخلص اور سچی لگی تھی وہ اس وقت......

''کیا کوئی اتنا اچھا اداکار بھی ہوسکتا ہے......؟'' ناں کرنے کی جرأت مجھے اس لیے بھی نہ ہوئی کہ اس متعلق

پلوشہ کی مثال میرے سامنے موجود تھی۔ میرے شادی کا ذکر چھیڑنے پر اس نے کتنی حسرت سے کہا تھا......"پتا نہیں کب وہ دن آئے گا۔ راجو!......آپ چچا خوشحال خان کو کہہ کر مجھ سے نکاح کے دو بول پڑھوا کیوں نہیں لیتے ۔جب یہ بات یقینی ہے کہ آپ نے مجھے اپنانا ہے اور میں نے بھی اس معاملے میں کسی کی پروا نہیں کرنی پھر انتظار کس بات کا۔"

"کیا وہ بے صبری کا اظہار دکھاوا تھا......اگر میں شادی کرنے پر تیار ہو جاتا تو جانے وہ کیا بہانہ کرتی......

"اسے بھلا بہانہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" ایک اور تلخ سوچ میرے دماغ میں ابھری......"کسی مرد کا پہلو گرم کرنا اس کے لیے کوئی نئی بات تو نہیں تھی کہ اسے کوئی پروا ہوتی۔ اس نے تو قبیل خان کی ہلاکت کے بعد میرا سودا کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا ارادہ فقط مجھ سے بدلہ لینے کا ہو......میں نے اسے اتنی بے دردی سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور وہ یہی بات دل میں لیے پھرتی رہی۔ پہلے مجھے قبیل خان کے خلاف بہ طور ہتھیار استعمال کیا اور جب میرا کام پورا ہو گیا تو اسے بدلہ لینے کا خیال آ گیا۔" میرے علاحدہ ہونے کی بات پر اس نے کیسے بپھرتے ہوئے کہا تھا......

"تم ایک بزدل، کم ہمت اور بے وقوف شخص ہو۔ تمھیں قتل کرنے کا ارادہ تبدیل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یقیناً ماہین نے بالکل ٹھیک کیا تھا تمھارے ساتھ تم ہو ہی اس قابل۔ احمق!......سڑتے رہو اکیلے، بھاڑ میں جاؤ، میں تھوکتی بھی نہیں ہوں تم پر، اتنے یوسف ثانی نہیں ہو کہ میں تمھارے پیچھے بھاگتی پھروں۔ شکل دیکھی ہے اپنی ......اتنے نخرے دکھاتے ہو۔" کتنی بے ساختگی سے اس نے ناراضی کا اظہار تھا۔

"وہ صرف ڈراما باز نہیں تھی بے عقل انسان وہ اور کئی کاموں میں بھی ماہر تھی۔ اس کا رقص دیکھا تھا، اس کی برداشت، لڑنے کا انداز، بے خوفی، دلیری اور بہادری......کیا یہ سب باتیں ظاہر نہیں کرتیں کہ وہ انوکھی تھی۔"

ہاں وہ انوکھی تھی......بہت انوکھی......اتنی کہ اتنے غلیظ کردار اور دھوکا باز ہونے کے باوجود بھی دل اس کی طرف داری کرنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ اس دھوکے باز، بے وفا کی یادوں سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ مجھے کسی اور عورت کی محبت مل جاتی۔ کسی ایسی لڑکی کی جو سچ مچ میرے بکھرے وجود کو سمیٹ لیتی۔ "لیکن ایسی لڑکی آئے گی کہاں سے؟" میرے دماغ میں استہزائیہ سوچ ابھری۔ "پہلے والی چار عورتوں کا رویہ بھول گیا

ہے تمھیں؟ اور اگر واقعی کوئی ایسی مل بھی جاتی ہے تو کیا سچ مچ دل اسے بھلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔“

”کبھی بھی نہیں......“ احمق دل نے فوراً نفی میں پکار کر اپنا احتجاج دماغ تک پہنچایا۔

پلوشہ کی یادیں میری نیند اڑا دیتی تھیں۔ کبھی نفرت سے میرا بدن پھنکنے لگتا اور کبھی میرے دماغ میں گلے شکوں کا دریا بہنے لگتا۔ کبھی اس کی شوخی بھری باتیں اور چنچل ادائیں میرے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دیتیں اور کبھی اس کا معصومیت بھری شرمیلی ادائیں مجھے بے چین کرنے لگتیں۔ اس کی یاد میری ساری سوچوں پر غالب آجاتی......نہ تو مجھے یہ یاد رہتا کہ میں دشمن کی قید میں تھا اور نہ یہ کہ میرے پیارے میرے بارے کتنی پریشانی اور مصیبت کا شکار ہوں گے۔

کہیں صبح صادق کے قریب جا کر مجھے نیند آئی تھی۔ نیند میں بھی وہ اپنی پوری وجاہت اور کشش کے ساتھ میرے خوابوں پر حاوی رہی...... ہنستے، مسکراتے اور مجھے چھیڑتے ہوئے وہ اس بات سے بے پروا نظر آئی کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کر چکی تھی۔

میری آنکھ ناشتا لانے والوں کی آمد سے ہوئی۔ شروع دن سے ناشتا اور کھانا دو آدمی لایا کرتے تھے۔ ایک ہتھیار بند آدمی دروازے میں کھڑے ہو کر میری نگرانی کرتا جبکہ دوسرا لکڑی کی میز پر کھانے کے برتن رکھ دیتا۔ اگر میں ناشتا لانے والے پر قابو پا بھی لیتا تب بھی اس کی اہمیت اتنا زیادہ نہیں تھی کہ وہ اس کی جان بچانے کے لیے مجھے جانے دیتے۔ ایک البرٹ بروک کی شخصیت ایسی تھی جس پر قابو پا کر میں وہاں سے نکل سکتا تھا۔ لیکن ٹریسی جیسی خطرناک لڑاکا کی موجودی میں ایسا ہونا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک بار میں ناکام کوشش کر چکا تھا اور اگلی ناکام کوشش میرا پول کھول سکتی تھی۔ فی الحال وہ مجھ پر کافی اعتبار کر رہے تھے۔ دوبارہ کسی ایسے اقدام پر جھلا کر وہ مجھے قتل بھی کر سکتے تھے۔ گو میں مرنے سے نہیں ڈرتا تھا لیکن مجھے زندہ رہنے کی ضرورت تھی......صرف اتنی دیر کے لیے کہ کم از کم ایک بار میں دھوکے باز پلوشہ سے پوچھ سکتا کہ اس نے میرے ساتھ اتنا ظلم کیوں کیا تھا......صرف ایک بار۔

ناشتا رکھ وہ باہر نکل گئے۔ اور میں کمرے سے ملحق غسل خانے میں گھس گیا۔ تازہ دم ہو کر میں نے ناشتا کیا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ دو دنوں بعد پاک آرمی کے خلاف کارروائی کرنا تھی اس سے پہلے مشکل تھا کہ مجھے کمرے

سے باہر نکالا جاتا۔

☆......☆......☆

ہم نے جمعہ کے دن منصوبے پر عمل کرنا تھا...... جمعہ کا دن آیا اور گزر گیا مگر میرا بلاوا نہ آیا۔ میں نے کھانا لانے والوں سے استفسار بھی کیا مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے تھے۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ البرٹ بروک وہاں موجود نہیں تھا۔ یقیناً اس کی غیر موجودی میں مجھے باہر جانے کی اجازت کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ اگلی کارروائی بدھ کے دن ہونا قرار پائی تھی۔ بدھ کا دن بھی یونہی گزر گیا۔ میرے دماغ میں عجیب وغریب اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ میں کسی بڑی سازش کا شکار ہونے والا ہوں لیکن پھر سازش کی توجیہ سے میں قاصر رہتا۔ پاک آرمی کے خلاف میں نے ایک کارروائی بھی نہیں کی تھی کہ ضمیر مجھے مطعون کرتا۔

دو ہفتے بغیر کسی کارروائی کے گزر گئے تھے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر البرٹ بروک نے تمام منصوبوں پر عمل درآمد کیوں روک رکھا تھا۔ مجھے وہاں قید کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن خالی قید بھی بہ ذات خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ ساری دنیا سے کٹ کر ایک کمرے میں محدود ہو جانا نہایت پر آزار اور ذہنی کوفت کا سبب ہوتا ہے۔ تنہائی میں جانے کون کون سی سوچیں، خیالات اور اندیشے مجھے بے چین کیے رکھتے۔ اپنی نہایت محبوب ہستی سے دھوکا کھانا کتنا اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر یہ حادثہ بیت چکا ہو۔

میں کھانا لانے والوں سے مسلسل البرٹ بروک کے بارے پوچھتا رہتا اور وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتے۔ اس دن حسبِ معمول میں نے ناشتا لانے والوں سے البرٹ کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ وہ حویلی میں آ گیا تھا۔ میں نے فوراً اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور ناشتا لانے والا سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

میرے ناشتا کرنے تک وہ البرٹ تک میری بات پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چار مسلح افراد بھی مجھے لینے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ البرٹ انیکسی کے ڈرائینگ روم میں ٹریسی کے ساتھ بیٹھا مجھے اپنا منتظر نظر آیا۔

''جی جناب!...... کیسے ہو، دن کیسے گزر رہے ہیں؟'' میرے بیٹھتے ہی اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا ہماری کارروائیاں منصوبے بنانے کی حد تک ہی تھیں۔''

''ہا......ہا......ہا'' اس نے زبردستی کا قہقہہ لگایا۔ ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ......ہم دو تین دنوں تک اپنے منصوبوں پر عمل درآمد شروع کریں گے، میں تھوڑا مصروف تھا اس لیے تمام منصوبے عدم توجہی کا شکار رہے۔''

''یہ نہ ہو کرنل صاحب واپس لوٹ آئیں اور ہم مصروف ہی رہیں۔'' میرا انداز ایسا تھا گویا کہ میں کرنل کولن فیلڈ کے سامنے سرخ رو رہنا چاہتا ہوں۔

اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بے فکر رہو......اس بات کی تم سے زیادہ فکر مجھے ہے۔''

نہ جانے کیوں مجھے یہ لگ رہا تھا یہ بس طفل تسلی ہی تھی۔ وہ شاید ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی مجھے اچنبھے میں ڈالے ہوئے تھی کہ آخر وہ مجھ سے کب کام لیتے۔ مسلسل قید میں رہتے ہوئے میں تھک گیا تھا۔

''دیکھیں البرٹ صاحب!......صاف بات یہ ہے کہ آپ جب چاہیں مجھ سے کام لیں لیکن، اب میں اس قید سے تنگ آ گیا ہوں اس لیے براہ مہربانی یہ نگرانی ہٹا دیں۔'' میں بغیر لگی لپٹی رکھے مدعے پر آ گیا تھا۔

البرٹ کے چہرے پر مسکراہٹ رینگی......''میرا خیال ہے کافی پی لیتے ہیں۔'' اس نے آواز دے کر ملازم کو کافی لانے کا کہا۔ وہیں انیکسی میں چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور البرٹ کا خدمت گار وہاں موجود تھا۔اس نے میری بات کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''میں نے کوئی اور درخواست بھی کی ہے۔'' اپنی بات کا جواب نہ ملنے پر میں نے یاد دہانی کرائی۔

''فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''البتہ جس دن تم نے کسی مشن میں باقاعدہ حصہ لے لیا اس دن یہ ساری نگرانی ختم کر دی جائے گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ہمیں اپنے منصوبوں پر کام شروع کر دینا چاہیے۔''

وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ ''کہا تو ہے دو تین دن صبر کرو اس کے بعد تمھاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔''

اس کے انداز نے میری سوچوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ میرا یہ سمجھنا غلط تھا کہ وہ مجھ پر اعتماد کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مجھے ٹال رہا تھا۔ دیوار پر لگی بڑی سکرین کی ایل ای ڈی پر انگریزی خبروں

کا کوئی چینل چل رہا تھا۔ مجھے خاموش پا کر البرٹ خبروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ٹریسی ناخن تراش کی کھردری سطح کو اپنی انگلیوں کے ناخنوں پر رگڑ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میرا ذہن تیزی سے کسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ ایک دم میں نے مزید انتظار نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ملازم کافی کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ البرٹ کے سامنے کافی کا مگ رکھ کر اس نے میرے دائیں جانب پڑی تپائی پر بھی کافی کا مگ رکھا اور ٹرے میں رکھا تیسرا مگ لے کر ٹریسی کی طرف بڑھ گیا۔

میرے اعصاب ایک دن تن گئے تھے۔ جونہی وہ ٹریسی اور البرٹ کے درمیان میں آیا میں نے اٹھ کر ایک دم چھلانگ لگا دی۔ البرٹ کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کوئی ایسی حرکت کروں گا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اس کا دایاں بازو پکڑ کر مروڑا اور اگلے ہی لمحے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر میں نے اس کی پیٹھ اپنی چھاتی سے لگا لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں رینگا اور میں نے پستول نکال لیا۔

ملازم نے میری حرکت کی آہٹ سنتے ہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور البرٹ کو میرے قبضے میں دیکھتے ہی اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے چیخ بلند ہوئی۔ ”س...... سس...... سیکورٹی......“

دروازے پر موجود محافظ دندناتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔

”خبردار اگر کسی نے غلط حرکت کی، میں اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔“ پستول کی نال البرٹ کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے میں دھاڑا۔ یہ الفاظ میں نے انگریزی میں ادا کیے تھے۔ میری نظریں ٹریسی واکر پر گڑی تھیں کہ مجھے سب سے زیادہ اسی سے خطرہ تھا۔

مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی کہ ٹریسی ہاتھ کے اشارے سے محافظوں کو باہر نکلنے کا کہہ کر اطمینان سے کافی پینے لگی۔

محافظ گومگو کی کیفیت میں کھڑے تھے۔

”دفع ہو جاؤ......“ وہ انگریزی میں دھاڑی۔ اس کی آواز کافی بھاری تھی۔ یا شاید وہ خود حلق پر زور دے کر بول رہی تھی۔

تمام محافظ الٹے قدموں باہر نکل گئے تھے۔

''تم بھی جاؤ۔'' اس نے ہکابکا کھڑے ملازم کو کہا۔اور وہ چونک کر سر ہلاتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

البرٹ نے کہا۔''میرا خیال ہے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔'' اپنی گردن پر میرے بازو کے دباؤ کی وجہ سے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا تھا۔

''کوئی بات نہیں ہوگی......اگر جان عزیز ہے تو مجھے فی الفور یہاں سے باہر نکالو۔''

''ٹھیک ہے کوئی بات نہیں کرتا......بس تمھیں ایک چیز دکھانی ہے، اگر اس کے بعد بھی تم جانے پر بہ ضد رہے تو تمھیں کوئی نہیں روکے گا۔ بلکہ وعدہ کرتا ہوں جہاں کہو گے تمھیں خود گاڑی میں چھوڑ آؤں گا۔''

اس کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تھوڑی مہلت حاصل کر کے تم بچنے کی کوئی ترکیب سوچ لوگے تو یہ تمھاری خام خیالی ہے۔''

''یار کہہ دیا نا میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہا......'' جھلائے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ ٹریسی کو مخاطب ہوا۔''اسے وڈیو دکھاؤ۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹریسی نے شیشے کی میز پر پڑا لیپ ٹاپ کھول کر اسے ایک کیبل کے ذریعے ایل ای ڈی سے منسلک کر دیا۔ ٹی وی سکرین پر لیپ ٹاپ کا ڈیسک ٹاپ نظر آتے ہی اس نے ایک وڈیو چلا دی ۔اگلے ہی لمحے ایل ای ڈی کی بڑی سکرین پر اسی ڈرائینگ روم کا منظر ابھرا۔وہ میری کرنل کولن فیلڈ کے ساتھ پہلے دن ہونے والی گفتگو کی وڈیو تھی ۔وڈیو نہایت صاف واضح بنی تھی ۔یقیناً اس کمرے میں ایک سے زیادہ طاقتور کیمرے نصب تھے۔منٹ بھر وہ وڈیو چلا کر ٹریسی نے ایک دوسری وڈیو چلا دی جس میں میں کرنل کولن فیلڈ سے اپنی کارکردگی کے انعام میں ڈالر وصول کر رہا تھا۔وہ ایک کے بعد ایک وڈیو چلاتی گئی ۔میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی ۔ایک دم مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ کیوں خالی منصوبہ بنا کر مجھے کسی کارروائی پر ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ہم نے جتنے منصوبے بھی وہاں بنائے تھے ان سب پر عمل درآمد کسی اور نے کیا تھا لیکن اس کا اعتراف انھوں نے مجھ سے کروا لیا تھا۔اب اگر یہ وڈیوز پاک آرمی کے ہاتھ لگتیں تو مجھے غداری کے الزام میں پھانسی لگنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ہر کارروائی کے بعد میں نے ڈالرز وصول کرتے ہوئے باقاعدہ اعتراف کیا

تھا کہ وہ کام میں کر چکا تھا۔اور یہ کوئی ڈرامے کی شوٹنگ نہیں تھی کہ اسے جھٹلایا جاسکتا۔

مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب میرا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے لٹکنے لگا۔میری گرفت ڈھیلی ہوتے ہی البرٹ میرے ہاتھ سے پستول لیے بغیر اطمینان بھرے انداز میں چلتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔میں سن سا ہو کر ٹی وی سکرین کو گھور رہا تھا۔جہاں پر کرنل کولن فیلڈ مجھ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ۔''کیا میں ان کے لیے پاک آرمی کے اندر رہ کر کام کرسکتا تھا۔''اور میں جوشیلے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کام کرنے کی حامی بھر رہا تھا۔ان وڈیوز کو دیکھنے کے بعد کسی احمق اور بے وقوف ہی کو میری غداری میں شبہ ہوسکتا تھا۔

''مسٹر ذیشان بیٹھیں۔''البرٹ کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے واپس کھینچا۔اور میں مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یقیناً اب تک تم یہی سوچتے رہے ہو گے کہ ہم نہایت بے وقوف اور گدھے ہیں جو اتنی آسانی سے تم سے دھوکا کھا رہے ہیں۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

''پتا ہے بچپن میں مجھے اپنی ٹانگ پر اتنی سخت چوٹ لگی تھی کہ بس میری ٹانگ ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی تھی اور یہ سارا کیا دھرا میرے باپ کا تھا۔مجھے درخت پر چڑھا کر اس نے نیچے کھڑے ہو کر کہا تھا کہ، بیٹا چھلانگ لگاؤ میں تمھیں پکڑ لوں گا......ان پر اعتبار کرتے ہوئے میں نیچے کودا اور مجھے پکڑنے کے بہ جائے وہ ایک جانب ہٹ گئے۔میری ٹانگ پر سخت چوٹ لگی تھی۔جب درد سے بے حال ہو کر میں رو رہا تھا اس وقت انھوں نے میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے ایک اہم سبق پڑھایا تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔انھوں نے کہا تھا،''بیٹا!......تمھیں تکلیف تو ضرور ہوئی ہے لیکن اب تمھیں یہ بات نہیں بھولے گی کہ زندگی میں کبھی اپنے باپ پر بھی اعتبار نہ کرنا۔''اس کی بات پر ٹریسی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔اس کے قہقہے سے میرے ذہن میں کسی بھولی بسری یاد نے کروٹ بدلی لیکن مجھے کچھ واضح یاد نہیں آسکا تھا۔بھاری آواز کے برعکس اس کا قہقہہ نہایت سریلا تھا۔البرٹ نے اس کے قہقہے پر توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

''یقیناً تم جان گئے ہو گے کہ میں یہودی ہوں اور پھر امریکن خفیہ ایجنسی کا ایک آفیسر بھی ہوں کیا مجھے نہیں

معلوم کہ تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ تم نے کسی حالت میں پاک آرمی کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا نہ جان کا خوف تمھیں اس بات پر مجبور کر سکتا ہے اور نہ کوئی لالچ ہی اکسا سکتا ہے۔''

''جب جانتے ہو تو پھر اتنی تگ و دو کا فائدہ؟'' میں ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا۔

''میں نے کہا تم پاک آرمی کے خلاف کام نہیں کرو گے......اور بے فکر رہو ہم نے تمھیں پاکستان کے خلاف استعمال ہی نہیں کرنا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''مطلب نہایت واضح ہے......ہم تمھیں افغانستان میں موجود دہشت گردوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''

''اور اگر میں اس کے لیے بھی تیار نہ ہوا تو......؟''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''تو جاؤ رستہ کھلا ہے، روکا کس نے ہے۔ بس خیال رکھنا کہ پاک آرمی کے ہتھے نہ چڑھ جانا۔''

میں نے لرزتی سوچوں کے ساتھ کہا۔ ''یعنی تم یہ وڈیوز پاک آرمی کے حوالے کر چکے ہو؟''

''نہیں ہوئیں تو ہو جائیں گی......دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ''جب تم آرمی کے حوالے یہ وڈیوز کرو گے تو یقیناً انھیں سازش کی بو سونگھنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''ہم نے آرمی کے حوالے نہیں کرنی۔ یہ تو آرمی کے اپنے ذرائع جو دہشت گردوں میں موجود ہیں۔ وہ بڑی جان فشانی سے ان وڈیوز تک رسائی حاصل کریں گے اور فی الفور متعلقہ افراد تک یہ وڈیوز پہنچا دیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اور اگر میں تمھارے لیے کام کروں تو پھر کب تک یہ وڈیوز آرمی کے حوالے نہیں کی جائیں گی؟''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''تین سال ہمارے لیے کام کرو، معاوضا بھی ملے گا اور تین سال بعد اپنی بے گناہی کے ثبوت بھی مل جائیں گے۔ میرا مطلب ہے تین سال بعد ان تمام وڈیوز کو ضائع کر دیا جائے گا۔''

’’مگر میں تم پر کیوں اعتبار کرنے لگا۔‘‘

’’مجبوری ہے تمھاری، اعتبار تو کرنا پڑے گا۔ یوں بھی امید پر دنیا قائم ہے۔ تین سال بعد کم از کم تم اپنے گھر والوں سے تو مل سکو گے۔ اب اگر یہ وڈیوز خفیہ ایجنسیوں کے حوالے ہو گئیں تو پہلے مرحلے میں وہ تمھارے گھر والوں کو اٹھا کر لے جائیں گے۔‘‘

میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔’’تین سال کی غیر حاضری کا کیا بہانہ کروں گا؟‘‘

’’قید...... یا سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے یادداشت چلے جانے کا بہانہ......نہیں تو تمھیں شہادت کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں، تمھارے گھر والوں کو بھی آرمی کی طرف سے اچھی خاصی دولت مل جائے گی۔ یہاں سے فارغ ہوتے ہی تم اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہو سکتے ہو......اگر امریکہ آنا چاہو تو خوش آمدید۔‘‘

میں سوچ میں پڑ گیا۔ انھوں نے مجھے بالکل ہی بے دست و پا کر دیا تھا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

’’تم جاؤ اور اطمینان سے سوچو...... ہمیں تمھارے جواب کا انتظار رہے گا۔ بس یہ یاد رکھنا جس وقت تم نے کام کرنے کی حامی بھری اسی وقت سے تمھارے تین سال کی شروعات ہو جائے گی۔‘‘

میں تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر موجود محافظوں نے مجھے دیکھتے ہی ایک دم میری جانب ہتھیار سیدھے کر لیے تھے۔

’’ہاتھ اوپر۔‘‘ ان کے کمانڈر نے فوراً حکم دیا۔ لیکن میں اس کی بات ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کمانڈر نے فوراً دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اسی وقت میرے کانوں میں البرٹ کی آواز پڑی۔

’’اسے جانے دو۔‘‘

کمانڈر نے دروازہ بند کر کے تمام محافظوں کو ہتھیار نیچے کرنے کا کہا۔ میں بے پروائی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ وہاں سے نکل کر میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں بچی تھی۔ انھوں نے مجھے اس انداز میں گھیرا تھا کہ میں پھڑ پھڑا بھی نہیں سکتا تھا۔

میں بستر پر گرنے کے انداز میں ڈھیر ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہود و نصاریٰ کتنے عیار، دھوکے باز اور

سازشی ہوتے ہیں میں بے وقوفوں کے انداز میں ان کی ہر بات پر عمل کرتا گیا تھا۔ مجھے پھانسنے کے لیے انھوں نے لمبی چال چل تھی۔ سہراب خان کا کردار ایک دم میری نظروں میں واضح ہو گیا تھا۔ اسے بڑے طریقے اور مہارت سے میرے قریب بھیجا گیا تھا۔ اور مجھے مزید اطمینان دلانے کے لیے اسے گرفتار کر کے مصنوعی طور پر تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ ہمدرد بن کر اس نے میرے دل میں جینے کی امنگ پیدا کرنے کے ساتھ مجھے یہ ترغیب دی کہ میں کس طرح گوروں کو دھوکا دے سکتا تھا۔ اور پھر مجھے اس کام پر آمادہ کرتے ہی اسے وہاں سے غائب کر دیا گیا۔ میری سزا پر عمل درآمد بھی روک دیا گیا۔ اور جونھی میں نے کام پر آمادگی ظاہر کی البرٹ بروک بغیر کوئی شک وشبہ ظاہر کیے مجھ پر یقین کرنے لگا۔ اس کا مقصد تو بس میرے منھ سے آرمی پر حملوں کا اعتراف کروانا تھا۔ میرے جرم کو مزید گھناؤنا بنانے کے لیے اس نے کرنل کولن فیلڈ کا کردار بھی ڈرامے میں شامل کیا اور میں احمقوں کی طرح اس کے کہنے پر چلتا گیا۔ وہ میرے ہمراہ بیٹھ کر آرمی پر حملے کا ہر منصوبہ بڑی تفصیل سے بناتا جس کی وڈیو باقاعدگی سے تیار ہوتی، پھر وہ کارروائی کسی اور کے ہاتھوں سرانجام پاتی۔ اور اس کے بعد میں کرنل کولن فیلڈ کے سامنے اس کارروائی کو اپنے ساتھ منسوب کرتے ہوئے انعام بھی وصول کرتا۔ اگر یہ وڈیوز واقعی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں تو انھیں مر کر بھی میری بے گناہی پر یقین نہیں آسکتا تھا۔ آخری ملاقات میں تو کرنل کولن فیلڈ نے مجھے واپس آرمی میں جا کر اپنے لیے کام کرنے کی دعوت بھی دی تھی جس کی میں نے بڑے جوش وخروش سے حامی بھر لی تھی۔

گویا میں واپس جا کر جتنی بھی کوشش کرتا اپنے بڑوں کو یہ یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ میں بے گناہ ہوں۔ انھوں نے کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا تھا۔ اتنے ثبوتوں کی موجودی میں مجھے پھانسی کے پھندے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے خفیہ ایجنسیوں نے پوچھ گچھ کے نام پر میرے ساتھ جو سلوک کرنا تھا اس کے بارے سوچ کر ہی میں کانپ جاتا تھا۔ وطن دشمنوں اور غداروں کے لیے ان ایجنسی والوں کے دل میں رحم کی رمق بھی موجود نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تحقیق کے بعد انھیں میری بے گناہی کا یقین آجاتا مگر یہ یقین کتنے عرصے بعد آنا تھا اور اس دوران مجھے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ غدار نہ ہوتے ہوئے بھی میری ذات پر ایسا دھبہ لگ جاتا جس کے اثرات میری آئندہ آنے والی نسل کو بھی سر اٹھانے

کے قابل نہ چھوڑتے۔

''شادی کروگے تونسل چلے گی نا؟'' میرے دماغ میں ایک ایسی سوچ ابھری جو نہ جانے مجھے تسلی دے رہی تھی یا میرے انجام کومزید بھیانک بنا کر پیش کررہی تھی۔سر جھٹک کر میں نے ان اذیت ناک سوچوں سے جان چھڑانا چاہی مگراس وقت ان سوچوں کے آگے بند باندھنا ناممکن تھا۔میں پیش آنے والے حالات کے بارے سوچنے لگا۔

اب وہ مجھے افغانستان میں موجود مجاہدین کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے کیونکہ افغانستان میں مختلف دھڑے کام کررہے تھے۔امریکن ،افغان ،انڈین آرمی اور دہشت گرد پاکستان آرمی کے خلاف متحرک تھے ۔مجاہدین امریکن اورانڈین آرمی کے خلاف برسرِپیکار تھے۔کچھ مقامی سرداراپنی بقا کی جنگ لڑرہے تھے۔کچھ نے مجاہدین کے ساتھ الحاق کیا ہوا تھا کچھ حکومت کے ساتھ تھےایک لمبی اورالجھی ہوئی جنگ کا حصہ بننا یقیناً دشوار تھالیکن پاک آرمی کے خلاف کام کرنے سے کئی گنا بہتر تھا۔میری بے گناہی کے ثبوت البرٹ بروک کے پاس موجود تھےاوران ثبوتوں کے حصول تک ان کے لیے کام کرنا میری مجبوری تھی۔اگرمیں اس طرح نہ کرتا تو یقیناً اپنی بے گناہی کے ثبوت کبھی حاصل نہ کرپاتا۔

ان الجھن آمیز سوچوں میں میں پوری رات کھویا رہا لیکن کسی واضح نتیجے پرنہیں پہنچ سکا تھا۔دل چاہ رہا تھا کہ کسی ایسی جگہ پر جا کر چھپ جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ ڈھونڈ سکے۔

ناشتا اوردوپہر کا کھانا اکیلا آدمی ہی لے کرآیا تھااس کے ساتھ کوئی مسلح آدمی موجود نہیں تھا۔میں نے اسے البرٹ بروک سے ملاقات کی بات کی تھوڑی دیربعد میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تو کیا فیصلہ کیا؟'' وہ اس وقت اکیلا ہی تھا۔

''کوئی پاکستانی میری گولی کا نشانہ نہیں بنے گا۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

وہ تصحیح کرتا ہوا بولا۔''کوئی پاکستانی فوجی تمھاری گولی کا نشانہ نہیں بنے گا۔''

''میں نے پاکستانی کہا ہے......'' میں مصر ہوا۔

وہ منھ بناتے ہوئے بولا۔''یہ مطالبہ ہی غلط ہے۔''

”وہ کیسے......؟“

”کیونکہ اب تک کئی پاکستانی تمھاری گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔“

”وہ تمام دہشت گرد تھے۔“

”بالکل صحیح۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”دہشت گرد کا نہ تو کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ وطن۔باقی تم یہ اصرار تو کر سکتے ہو کہ پاکستان کے اندر کسی کو قتل نہیں کرو گے لیکن افغانستان کے اندر کام کرتے ہوئے کسی ایسی شرط کے پیش کرنے کا مطلب ہے تم ہمارے لیے کام ہی نہیں کرنا چاہتے۔“

اس کی بات خلافِ حقیقت نہیں تھی۔”پاک آرمی کے کسی فوجی کو افغانستان میں بھی نشانہ نہیں بناؤں گا۔“میں نے حتمی فیصلہ سنایا۔

”منظور۔“اس نے بے جھجکے اثبات میں سر ہلا دیا۔اسی وقت ٹریسی کمرے سے برآمد ہو کر اپنی مخصوص جگہ پر آن بیٹھی۔

میں نے کہا۔”میں تیار ہوں۔“

”شاباش۔“ٹریسی کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری۔اس کی آواز بھاری تھی،لیکن ہنستے وقت اس کی آواز کافی سریلی ہو جاتی تھی۔کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے وہ آواز تبدیل کر کے بول رہی ہے۔

البرٹ نے پوچھا۔”کافی چلے گی؟“

”آپ پئیں۔“میں نفی میں سر ہلا کر وہاں سے باہر نکل آیا۔میں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی حامی تو بھر لی تھی لیکن نہ تو میرا ضمیر مطمئن ہو رہا تھا اور نہ میرا دماغ اس کی تائید کر رہا تھا۔

کمرے میں آ کر لیٹے ہوئے مجھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سردار صنوبر خان پہنچ گیا وہ کافی دنوں بعد لوٹا تھا۔

”مبارک ہو بھئی،سنا ہے ہمارے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“بے تکلفی سے کہتے ہوئے وہ میرے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

”کبھی کبھی ایسے فیصلے کرنا مجبوری بن جاتی ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ البرٹ نے مجھے کس طرح سے پھانسا تھا۔

''چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ اتنے دن کہاں غائب رہے۔'' میں نے وہ دل خراش موضوع تبدیل کیا۔

''اپنا تو کاروبار ہی ایسا ہے کہ کسی جگہ پر ٹک کر نہیں رہ پاتا۔''

میں نے پوچھا۔''اب مجھے تمھارے زیر کمان کام کرنا پڑے گا یا البرٹ خود ہی مجھے حکم دیا کرے گا؟''

وہ ہنسا۔''تم ایک خصوصی آدمی ہو جناب!...... میری کیا مجال کہ تمھیں حکم دے سکوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کبھی کبھی البرٹ صاحب کا حکم تم تک پہنچانے میں واسطہ بننا پڑے۔''

''ہونہہ!'' میں نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا کہ ایک غدار کے زیر کمان کام کرنا مجھے مزید پریشان کر سکتا تھا

''اچھا آج تمھارے لیے ایک خاص پارٹی کا انعقاد کر رہا ہوں۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔''کیسی پارٹی؟''

''تھوڑا ہلا گلا کریں گے، رقص وغیرہ سے لطف اندوز ہوں گے، گانا بجانا ہوگا، کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے گا اور بس اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے۔''

میں نے بے زاری سے کہا۔''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

وہ جلدی سے بولا۔''واہ...... اس کی کیوں ضرورت نہیں، ایس ایس جیسے نشانہ باز کی آمد پر چھوٹا موٹا جشن تو بنتا ہے نا۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے میں چپ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر گپیں ہانکنے کے بعد چلا گیا۔

رات کو حویلی میں واقعی جشن کا سماں تھا۔ پانچ چھے رقاصائیں اور پشتو کے دو تین گائیک بھی بلائے گئے تھے۔ سہ پہر ہی کو آگ کے بڑے بڑے الاؤ حویلی کے وسیع صحن میں جلا کر سالم دنبے اور بکرے بھونے گئے۔ اندھیرا چھاتے ہی گانے بجانے کی محفل شروع ہو گئی تھی۔ البرٹ بروک کے علاوہ بھی مجھے چند امریکن نظر آ رہے تھے۔ خصوصی مہمانوں کے لیے صوفہ سیٹ رکھے گئے تھے جبکہ باقی لوگ تین اطراف میں بچھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ رقص کرنے والیوں کے لیے صوفوں اور چار پائیوں کے درمیان میں جگہ بنائی تھی۔

مختلف پکوانوں سے بھرے ڈونگے اور ٹرے گانے بجانے کے دوران ہی چار پائیوں اور صوفوں کے سامنے

پڑی ہوئی میزوں پر سجا دیے گئے تھے۔گویا ناظرین کو رقاصاؤں کے خوب صورت اجسام کو لٹکتے مٹکتے دیکھتے ہوئے کھانے کی سہولت پہنچائی گئی تھی۔ایسی محافل میں ام الخبائث کی موجودی فرض ہوتی ہے۔ٹریسی بھی لمبوترا گلاس ہاتھ میں تھامے میرے ساتھ آن بیٹھی اور گلاس سے ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے شوخی بھری نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔میں اس سے بے پروا ناچنے والیوں کو دیکھتا رہا۔پیشہ ور ہونے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی پلوشہ کی طرح رقص نہیں کر سکتی تھی۔ان میں سے ایک کے جسمانی خال وخد پلوشہ سے ملتے جلتے تھے۔بس بال ذرا لمبے تھے، نین نقش پلوشہ کی طرح جاذب نظر نہیں تھے اور وہ پلوشہ جتنی ماہر رقاص بھی نہیں تھی۔ دشمن جاں سے تھوڑی بہت مشابہت رکھنے کے وجہ سے وہ میری نظروں کا مرکز بنی رہی۔

''تم مسلسل اس کالے کپڑوں والی رقاصہ کو اس لیے گھورے جا رہے ہو کہ یہ جسمانی طور پر اس جسم فروش لڑکی سے مشابہت رکھتی ہے جس نے تمھارا سودا کیا تھا۔ہے نا؟''ٹریسی کی بھاری آواز نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا۔

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔''تمھیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاہاہا......''اس کا سریلا قہقہہ بلند ہوا۔''ویسے میرے بارے کیا خیال ہے؟''اس نے بے باک لہجے میں پوچھا۔

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔''مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو آئینہ دیکھ لینا تھا۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''یقین کرو میں تمھاری نام نہاد محبوبہ کی طرح جسم فروش نہیں ہوں۔''

''تو اس جسم کو کوئی احمق ہی خرید سکتا ہے۔''نہ جانے کیوں مجھے اس سے چڑ ہونے لگی تھی۔شاید اس نے پلوشہ کے بارے جو بکواس کی تھی وہ مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

میرے طنزیہ لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ بولی۔''ویسے شادی شدہ ہو کر تمھیں کسی فاحشہ میں دلچسپی نہیں لینا چاہیے تھا۔''

اس کی بات سنتے ہی میں حیرت سے اچھل پڑا تھا۔''تمھیں کیسے پتا کہ میں شادی شدہ ہوں۔''

وہ فخریہ لہجے میں بولی۔''تم امریکن انٹیلی جنس کی ایک میجر سے مخاطب ہو۔''

”اچھا......تو امریکن انٹیلی جنس کی میجر کو یہ تو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ ہوں،لیکن یہ پتا نہیں کہ کافی عرصہ پہلے ہی میں اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہوں۔“

اس نے تصدیق چاہنے والے انداز میں کہا۔”اس فاحشہ کے لیے جو تمھیں بیچ کر چلی گئی۔“

”میرا خیال ہے ایک امریکن لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی مرد کے ساتھ جسمانی تعلق کو اتنے اوچھے نام سے ظاہر کرے۔تم خود بھی یقیناً کئی مردوں کو نواز چکی ہوگی۔“

”ہونہہ!......“اس نے طنزیہ ہنکارا ابھرا۔”غلط فہمی ہے جناب کی،ضروری نہیں کہ ہر امریکن لڑکی ایسی ہی ہو۔“

”ایک ادھ کی پارسائی پوری قوم کی بے راہ روی کا دفاع نہیں کر سکتی،بالکل اس طرح جیسے ایک ادھ کی بے راہ روی پوری قوم کو گمراہ ثابت نہیں کرتی۔“

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔”فی الحال موضوعِ بحث وہ فاحشہ اور میں ہیں۔نہ تو تمھاری قوم کی پارسائی اس کی جسم فروشی پر مٹی ڈال سکتی ہے اور نہ میری تہذیب کی آزادی مجھے میلا ثابت کر سکتی ہے۔“

”یوں دعوا کرنے سے کیا حاصل،شاید تمھارے قریبی ساتھی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوں۔“میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

وہ اعتماد سے بولی۔”تمھیں تحقیق کرنے کی اجازت ہے۔“

”کس لیے؟“میں نے اسے حیرانی سے گھورا۔

”دوستی کے لیے۔“اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”محترما!......میں نے صرف اپنی بے گناہی کے ثبوت حاصل کرنے کے لیے تمھارے لیے کام کرنے کی حامی بھری ہے۔یقیناً اس میں تم سے عشق کرنے کی کوئی وجہ شامل نہیں ہے۔“

وہ مسکرائی۔”تو کیا......یہ کام تو اب بھی ہو سکتا ہے۔“

میں نے طنز کا ایک اور تیر چلاتے ہوئے کہا۔”ہاں،اگر تم دنیا کی آخری لڑکی ہوئیں تو......“

اس نے برا منائے بغیر پوچھا۔”اچھا سچ سچ بتاؤ کیا حقیقت میں میں تمھیں بدصورت اور بھدی لگ رہی

ہوں۔“

”مجھے نہیں لگ رہی ہو......تم ہو ہی بدصورت۔“میں نے اسے مطعون کرنا جاری رکھا۔

اسی وقت تین امریکن صوفوں کو چھوڑ کر رقاصاؤں کے ساتھ ناچنے لگے تھے۔

”اچھا میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرو گے۔“میری کسی بھی بات کا برا منائے بغیر وہ زبردستی گلے پڑ رہی تھی۔

میں نے منھ بناتے ہوئے جواب دیا۔”اگر ناچنا آتا تب بھی یہ حماقت نہ کرتا۔“

”چلو نا......“اس نے کھڑے ہو کر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں بھنے ہوئے گوشت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کندھے اچکاتے ہوئے وہ ناچنے والوں کی طرف بڑھ گئی۔پشتو ساز پر رقص کرنا کچھ زیادہ ہی آسان ہوتا ہے۔اپنے امریکن ساتھیوں کے بجائے وہ اسی لڑکی کے ساتھ مل کر تھرکنے لگی جو مجھے پلوشہ کی طرح لگ رہی تھی۔چست لباس میں اس کا سڈول اور پرکشش بدن پیشہ ور رقاصاؤں سے زیادہ جاذب نظر لگ رہا تھا۔

”آج تو بڑی گپ شپ ہو رہی تھی۔“صنوبر خان نے میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔”گپ شپ نہیں کر رہا تھا، جان چھڑا رہا تھا۔“

وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔”قسم سے یار ہم تو ترس رہے ہیں اس کالی کے لیے۔“

میں استہزائی انداز میں ہنسا۔”تو میں کیا کروں۔“

”یہ بھی صحیح کہا۔“اس نے برا نہیں منایا تھا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔”سردار صاحب!......وہ امریکن ہے اور تم اس کے لیے کام کرتے ہو اپنے آقاؤں کی عزت پر نظر رکھنا کوئی مثبت فعل نہیں ہے۔“

”ہا......ہا......ہا۔“اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔”یار یہ حبشن اپنے امریکن ساتھیوں کو بھی گھاس نہیں ڈالتی۔“

”ویسے اس حبشن میں پرکشش لگنے والی چیز کون سی ہے؟“

وہ ندیدے پن سے بولا۔ ”مجھے تو سرتا پا پرکشش دکھتی ہے۔“

میں نے ٹریسی کی طرف دیکھا اس کے رقص کو بے ہنگم اچھل کود ہی کہا جا سکتا تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جوان لڑکی کا سازوں کی لے پر اچھلنا کودنا ہی بہ ذات خود ایک خوش کن نظارہ ہوتا ہے۔ صنوبر خان کی بات میں مجھے بھی کوئی شک نہیں تھا۔ ٹریسی کے اندر ایک عجیب سی پراسرار کشش موجود تھی جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا ۔حالانکہ بہ ظاہر نظر وہ کالی کلوٹی تھی۔

موضوع تبدیل کرتے ہوئے اس نے مجھے بے حیائی سے پوچھا۔ ”اچھا رات گزارنے کے لیے کس رقاصہ کا انتخاب کرو گے۔“

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ان خرافات سے دور ہی رکھو۔“

”نہ کرو یار!“ اس نے حیرانی ظاہر کی، اس کی حیرت مجھے ترغیب دینے کی غرض سے تھی۔

”یہ حقیقت ہے صنوبر خان۔“ میں اپنی بات پر قائم رہا۔

”تم سے شاید پلوشہ خان وزیر کا پرکشش بدن نہیں بھلایا جاتا۔“ اس کا اندازہ حقیقت سے خالی نہیں تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ”نہ تو میں نے اسے اس نظر سے دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کے بارے غلط خیال دل میں لایا تھا۔“

”اتنا عرصہ اس کے قریب رہنے کے باوجود ایسا دعوا کرنا تمھیں زیب نہیں دیتا۔“ ایک مکروہ ہنسی اس کے ہونٹوں پر نمودار ہو گئی تھی۔

میں نے بے زاری سے کہا۔ ”مجھے صفائیاں دینے سے چڑ ہے۔“

”ویسے وہ خود بھی اس معاملے میں بڑی تیز ہے، مردوں کو لبھانا اور الو بنانا تو اس کے لیے بالکل ہی آسان ہے۔“

”بھاڑ میں جائے۔“ میں تپتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے جگر!......مزے کرو۔“ وہ مزید تکرار کیے بغیر اٹھ کر البرٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گھنٹے پون گھنٹے کی اچھل کود کے بعد ٹریسی دوبارہ میرے پاس آن کر بیٹھ گئی تھی۔ ”کیسا لگا میرا رقص۔“ ماتھے

پر نمودار ہوئے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے اس نے داد چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

''جیسی تم، ویسے تمھارا رقص۔'' مجھے سچ مچ ہنسی آ گئی تھی۔

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''تمھاری محبوبہ سے تو اچھا ہی ناچتی ہوں گی۔''

''ٹریسی!......میں اس کے کردار کے بارے کچھ نہیں کہنا چاہتا اور نہ میں اس کے کسی فعل کی صفائی ہی دینا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک بات میں دعوے سے کہتا ہوں، تم تو کیا آج تک میں نے کسی پیشہ ور رقاصہ کو بھی اس جیسا خوب صورت رقص کرتے نہیں دیکھا۔''

''اچھا، اس کا مطلب ہے اس کا تعلق ضرور کسی کوٹھے وغیرہ سے ہوگا۔''

میں نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمھیں کیا معلوم کوٹھا کیا ہوتا ہے؟''

''تم یہ بات کیوں بھول جاتے ہو کہ میں امریکن انٹیلی جنس کی میجر ہوں اور پاکستان آنے سے پہلے یہاں کے لوگوں اور تہذیب و ثقافت کے بارے مکمل جان کاری حاصل کر چکی ہوں۔''

''ویسے سچ کہوں تو مجھے تم البرٹ بروک کی محافظ لگتی ہو۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''وہ میرا ہم رینک ہے۔ گو مجھ سے دو تین سال سینئر ہے لیکن ہے وہ بھی میجر۔''

میں کولڈ ڈرنک کا گلاس بھر کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ وہ پروگرام رات گئے تک جاری رہا۔ اس دوران ٹریسی میرے ناگواری ظاہر کرنے کے باوجود وہیں بیٹھے زبردستی میرے ساتھ گپیں ہانکتی رہی۔ پروگرام کے اختتام پر پسند کی رقاصہ کو پکڑ کر امریکن جیالے اپنے کمروں کا رخ کرنے لگے۔

ٹریسی نے مسکرا کر کہا۔ ''ایک لڑکی تو تمھارے حصے میں بھی آ رہی ہے۔'' اس کا اشارہ بچ جانے والی رقاصہ کی طرف تھا جسے کسی نے بھی ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا تھا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم ہو نا میرے ساتھ۔''

''سچ۔'' وہ جیسے کھل اٹھی تھی۔

''بالکل، لیکن اس کے بعد تم پارسائی کا دعوا نہیں کر سکو گی۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''پروا نہیں۔''

”چلتا ہوں، پھر ملیں گے۔“

”میں جانتی تھی تمھارے بھونڈے مذاق کو۔“ منھ بناتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔اس کی کھلی ڈلی دعوت کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اس کی دعوت بس دکھاوا ہی ہے۔

☆......☆......☆

اگلے دن دوپہر کو میری آنکھ کھلی تھی۔ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ملازم میرے لیے دوپہر کا کھانا لے آیا۔کھانے سے فارغ ہو کر میں چائے پی رہا تھا کہ البرٹ، ٹریسی کے ہمراہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔میں اسے دیکھ کر حیران رگیا تھا۔کیونکہ اسے اپنے کمرے میں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

وہ لکڑی کی کرسی پر نشست سنبھالتے ہوئے بولا۔”مسٹر ذیشان!......ہم ذرا علام خیل تک جا رہے ہیں پرسوں واپسی ہوگی اس کے بعد اکٹھے افغانستان کی جانب کوچ کریں گے۔“

ٹریسی بے تکلفی سے میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

”میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں، حویلی میں پڑے پڑے تنگ آ گیا ہوں۔“

”مناسب نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانی ظاہر کی۔

”دراصل وہاں چند قبائل کے سرداروں کا اکٹھ ہو رہا ہے جس میں پاکستان آرمی کے خلاف حکمت عملی ترتیب دی جائے گی اور یقیناً تم ایسی کسی بھی محفل کا حصہ بننا پسند نہیں کرو گے۔“

”صحیح کہا۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

ٹریسی نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”اگر پسند کرو تو میں تمھارے لیے رک سکتی ہوں۔“

”کوشش کرنا کہ علام خیل ہی سے افغانستان چلی جانا۔میں البرٹ کے ساتھ آ جاؤں گا۔“

میری بات پر البرٹ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ٹریسی کے چہرے پر بھی خوب صورت مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی

البرٹ نے کہا۔”ویسے ٹریسی والکر کی طرف سے دی گئی دعوت ٹھکرانا کفران نعمت ہی تو ہے۔“

ٹریسی نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔”یہ صرف ان جانے میں بے وقوفی کا مرتکب ہو رہا ہے۔“

''میں بے وقوف ہی بھلا۔''

''وقت آنے پر پتا چل جائے گا۔'' اعتماد بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ٹریسی کھڑی ہوئی اور وہ دونوں الوداعی مصافحہ کر کے وہاں سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد صنوبر خان بھی مجھے ملنے کے لیے آ گیا کمانڈر بہار خان بھی اس کے ہمراہ تھا چند منٹ گپ شپ کر کے وہ کمانڈر بہار کو میرے بارے میں بتانے لگا کہ اب وہاں پر میری حیثیت البرٹ صاحب کے خصوصی نمائندے کی سی تھی۔ اس لحاظ ان کے لیے ضروری تھا کہ میری ہر بات کو اہمیت دیتے۔

الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس نے بھی وہی باتیں دہرائی تھیں جو اس سے پہلے البرٹ مجھے بتا چکا تھا ۔پاک آرمی کے خلاف طے کی جانے والی حکمت عملی میں وہ مجھے شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گو یہ بات میرے دل پر ایک بوجھ ہی تھی کہ میں ان لوگوں کے ہمراہ تھا جو فوج کے خلاف متحرک تھے۔ گو میں بے بس تھا مگر یہ دلیل مجھے دہشت گردوں کا ساتھ دینے پر مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔

میری زندگی بھی عجیب گورکھ دھندا بن گئی تھی۔ مجھے اس انداز میں پھانس لیا گیا تھا کہ میرے لیے کوئی چناؤ نہیں بچا تھا۔ البتہ جان کی قربانی دے کر میں اس آزمائش سے بچ سکتا تھا۔

''شاید اورنگ زیب صاحب کو میری بے گناہی کا یقین آ جائے؟'' ایک امید بھری سوچ میرے دماغ میں اجاگر ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روح فرسا خیال میرے دماغ میں جاگا کہ اگر میری وڈیوز خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں چڑھ گئیں تو اورنگ زیب صاحب میری مدد کرنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔

مجھے ہر طرف اندھیرا اور نا امیدی ہی نظر آ رہی تھی۔ اذیت ناک سوچوں سے جان چھڑانے کے لیے میں کمرے سے باہر نکل کر حویلی کے صحن میں آ گیا۔ رات والے جشن کی باقیات کی صفائی کر دی گئی تھی۔ میں حویلی کا جائزہ لینے لگا۔ حویلی کو تقریباً پرانے طرز تعمیر کے مطابق ہی بنایا گیا تھا۔ بس چند چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہی کی گئی تھیں۔ داخلی دروازے پر ایک آدمی گود میں کلاشن رکھ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے کی جانب جہاں جنوبی اور مشرقی دیوار مل رہی تھی وہاں دیوار کی بلندی پر ایک مورچہ بنا تھا اور اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اسی طرح ایک مورچہ شمال مغربی دیوار کے سنگم پر بنا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے وہ بھی خالی نظر آیا۔ یقیناً وہاں رات کے وقت

ہی سنتری موجود ہوتے تھے۔ البتہ صنوبر خان کی موجودی میں مجھے وہاں دن کو بھی سنتری نظر آتے تھے۔ صنوبر خان کے جاتے ہی سنتری ڈھیلے ہو جاتے تھے۔

میں شام کا اندھیرا پھیلنے تک حویلی میں گھومتا رہا۔ اندھرا ہوتے ہی میں واپس کمرے میں آ گیا تھا۔ ایک آدمی میرے لیے کھانا لے کر آیا۔ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور آرام کرنے لیٹ گیا۔ مگر آرام میری قسمت میں نہیں تھا۔ فائر کی آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں فوراً کمرے سے نکلا اسی وقت میرے کانوں میں ایک کرخت آواز گونجی......

''اگر حرکت کی تو جان سے جاؤ گے۔''

ایک لمحے کے لیے لگا کہ یہ مجھے کہا گیا ہے، مگر پھر صحن میں ہونے والی تیز روشنی میں مجھے جنوبی دیوار کے ساتھ ایک آدمی ہاتھ اٹھائے کھڑا نظر آیا۔ اس نے چہرے پر کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ یقیناً اس نے جنوب مغرب کی جانب سے حویلی کے اندر گھسنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بدقسمتی کہ اس پر سنتری کی نظر پڑ گئی تھی۔ اس آدمی کا رخ میری ہی جانب تھا اور اس کے جسمانی خدوخال میری دھڑکنوں کو بے ربط کر رہے تھے۔

فائر کی آواز اور سنتری کے للکارنے پر تمام لوگ ہتھیار سونتے باہر نکل آئے تھے۔ میں بھی اسی طرف بڑھ گیا۔ اندر گھسنے والے نے سنتری کے حکم پر اپنی کلاشن کوف نیچے پھینک دی تھی۔ کمانڈر بہار خان کے اشارے پر ایک آدمی نے آگے بڑھ کر نیچے پڑی کلاشن کوف اٹھائی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر لپٹا کپڑا کھول دیا۔

میرا دل اتنی زور سے دھڑکا، گویا حلق کے رستے باہر آ گرے گا۔ وہ پلوشہ تھی۔ وہی بے خوف چہرہ اور بے نیازانہ انداز۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے ہی گھور رہی تھی۔

''کیا یہ کسی بدکردار لڑکی چہرہ ہو سکتا ہے؟'' احمق دل نے اس کی طرف داری کرنے میں ایک لحظے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

''ڈر اس لڑکی کے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے جس کے پاس کھونے کو کچھ ہو۔ اس فاحشہ کو کس چیز کا خوف اور ڈر ہو گا۔ لڑکیاں عزت جانے کی وجہ سے ڈرتی ہیں اور اس نے اپنی عزت ہتھیلی پر رکھی ہے۔ یقیناً بہار خان کے آدمیوں کو نواز کر یہ اپنی جان آسانی سے چھڑا لے گی۔'' میرے دماغ نے حقیقت کے مطابق تجزیہ کیا تھا۔

''ارے واہ!...... یہ تو اپنی دل جانی ہے...... یقیناً اسے معلوم ہو گیا ہے کہ سردار صنوبر خان اور ایس ایس کی صلح ہو گئی ہے۔اب اس سے پہلے کہ تم اس کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ یہ خود ہی تمھارا خاتمہ کرنے پہنچ گئی ہے۔''بہار خان کا مخاطب میں تھا۔

میرا دماغ اس حالت میں نہیں تھا کہ بہار خان کو جواب دے سکتا۔میں تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے پلوشہ کو گھورے جا رہا تھا۔مدت سے پیاسی آنکھیں شربت دیدار سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔اس کی صورت مجھے اتنی ہی موہنی، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی پرکشش لگ رہی تھی جتنی پہلے لگا کرتی تھی۔

''ارے بے غیرت سنبھلو......''میرے دماغ نے اتنی زور سے ڈانٹا کہ دل چونک کر اس کے ٹرانس سے باہر آ گیا۔

مجھے خاموش پا کر بہار خان اپنے آدمیوں کو بولا......''اسے اندر باندھ دو میں تھوڑی دیر تک تفتیش کا آغاز کرتا ہوں...... میرے بعد تمھارا نمبر پڑے گا۔''اس کا غلاظت بھرا انداز اس کے مکروہ ارادے کو ظاہر کر رہا تھا۔یوں بھی پلوشہ کے بارے اپنے دل میں چھپی غلاظت وہ ایک بار پہلے بھی میرے سامنے ظاہر کر چکا تھا۔لیکن میں اسے یا اس کے آدمیوں کو ایسا کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔پلوشہ جتنی بھی بدکردار اور بے راہ رو ہوتی میرے سامنے اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا چاہے اس بارے اس کی اپنی مرضی اور خواہش ہی کیوں نہ شامل ہوتی۔

''اسے باندھ دو...... میں خود تفتیش کروں گا۔''میں نے اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھانے میں ایک لحظہ بھی نہیں لگایا تھا۔

بہار خان نے روکھے لہجے میں کہا۔''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے محترم!''

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ میری دشمن ہے،اس کے ساتھ میرا کافی حساب کتاب رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے اس بات کا فیصلہ سردار خود ہی آ کر کرے گا۔''بہار خان نے ایک درمیان کا رستا نکالا۔اس کے آدمی پلوشہ کو بازوؤں سے پکڑ کر اسی کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے جہاں چند دن میں نے بھی گزارے تھے۔

''بہار خان!...... تم صنوبر خان کی واپسی کی بات کر رہے ہو،جبکہ میں ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کر سکتا۔تم نہیں

جانتے اس لڑکی کے بارے میرے دل میں نفرت کا کیسا الاؤ دہک رہا ہے۔''

اس نے مکروہ لہجے میں کہا۔''تو پھر ایک ہی حل ہے، چھوڑو پوچھ گچھ کو، اکھٹے ہی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے ہیں۔''

''ایسا جو بھی خیال تمھارے دل میں پرورش پا رہا ہے اسے بھول جاؤ......میں اسے قتل تو کر سکتا ہوں، لیکن کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا۔''

''میرا خیال ہے ہم تمھارے زیر کمان نہیں ہیں۔'' بہار خان بگڑ گیا تھا۔

''شاید تمھیں سردار صنوبر خان کے آخری الفاظ بھول گئے ہیں۔'' تیکھے لہجے میں کہتے ہوئے میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ پلوشہ کو لے گئے تھے۔ بہار خان نے بھی بادل نخواستہ میرے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔

پلوشہ کے ہاتھ انھوں نے چھت سے لٹکتی زنجیروں سے باندھ دیئے تھے۔ باندھنے والے شاید اس سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش کرتے مگر ہمارے قدموں کی چاپ سن کر وہ ایک جانب ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔

پلوشہ سب سے بے نیاز مجھے گھور رہی تھی......وہ میری مجرم تھی، اس نے میرے ارمانوں کا خون کیا تھا، مجھے دھوکا دیا تھا، میرا سودا کر کے پیسے کھرے کیے تھے، اس کی وجہ سے میں پاک آرمی کی نظر میں مجرم بننے والا تھا، اس نے مجھے ایسی اذیت اور ایسی تکلیف پہنچائی تھی جس کا درمان ممکن ہی نہیں تھا۔

نپے تلے قدم رکھتا ہوا میں اس کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب طرح کی یاسیت بھری تھی۔

''تو پندرہ لاکھ ختم ہو گئے ہیں یا سردار صنوبر خان کی آغوش کو بھلانے میں ناکامی ہوئی ہے اور اس کا پہلو گرم کرنے آئی ہو۔'' دانت پیستے ہوئے میں نے منہ سے زہر اگلا۔

وہ میری بات کا جواب دیئے بغیر یاسیت بھری نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے فاحشہ!'' اس کے ریشمی بالوں کو مٹھی میں بھرتے ہوئے میں نے زوردار جھٹکا دیا۔ ایک تیز سسکی اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی میرے دل پر جیسے زوردار گھونسا لگا تھا۔ جب میں نے اسے غار میں تشدد کا نشانہ بنایا تھا اس وقت اس نے ذرا بھر بھی کمزوری نہیں دکھائی تھی اور ابھی اس نے صنف نازک ہونے

کا ثبوت دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

''جواب دو۔'' دل پر جبر کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔

''چٹاخ۔'' کی آواز سے پورا کمرہ گونج اٹھا تھا۔ پھول سے چہرے پر میری انگلیوں کے بنے ہوئے نشان صاف نظر آنے لگے تھے۔ تھپڑ سے اس کے ہونٹ بھی پھٹ گئے تھے۔ ہونٹوں سے رسنے والا خون ایک جانب تھوک کر اس نے دوبارہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ ساحرانہ نگاہیں مجھ پر بے بسی طاری کر رہی تھیں۔ اس کے غلیظانہ افعال کو یاد کر کے میں نے دماغ میں بھری ہوئی نفرت کو دل کی طرف دھکیلا اور اس میں وقتی طور پر کامیاب بھی رہا تھا۔

''بتاؤ کیوں آئی ہو یہاں۔'' میں نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔'' ایک تیز کراہ اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی۔ ''کیا پوچھ رہا ہوں میں۔'' اس کی خاموشی پر میرا غصہ بڑھ گیا تھا۔ اسے گریبان سے پکڑتے ہوئے میں نے نیچے جھکایا اور اس کے ساتھ ہی میرا گھٹنا زوردار انداز میں اس کے پیٹ میں لگا۔

''اُفف......'' وہ کرب ناک انداز میں کراہی۔

''بتاؤ مجھے...... فاحشہ، طوائف بتاؤ...... کیوں آئی ہو یہاں...... بتاؤ...... کیوں کیا تھا میرا سودا...... کیوں مجھے دھوکا دیا تھا...... ہے کوئی جواب۔'' میں نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔ وہ تابڑ توڑ حملے وہ برداشت نہیں کر سکی تھی۔ ہاتھ ڈھیلے چھوڑتے ہوئے وہ زنجیر کے ساتھ جھول گئی۔

''اسے مار دو گے بھائی صاحب۔'' بہار خان نے فوراً مجھے بازوؤں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ میں ایک دم ہوش میں آ گیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے وہ نیچے تو نہیں گری تھی البتہ اس کے گھٹنے فرش سے ٹکرا رہے تھے۔

''پانی لے کر آؤ۔'' میں نے ایک آدمی کو کہا۔ اس آدمی واپس آنے تک میں اپنے چڑھے سانسوں پر قابو پاتا رہا۔ وہ پانی کا جگ لے کر واپس لوٹا۔ اس کے ہاتھ سے پانی کا جگ لے کر میں پلوشہ کے چہرے پر الٹ دیا۔ اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ایک دو لمحہ اسی حالت میں زنجیروں سے لٹکے رہنے کے بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کے بدن میں ہونے والی لرزش واضح نظر آ رہی تھی۔ ایک بار پھر میرا دل بغاوت

پر اتر آیا لیکن دماغ اسے کمزوری ظاہر کرنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔میں اس کے بالکل قریب کھڑا تھا ،اتنے قریب کہ اس کے مہکتے سانس میری قوت شامہ کو تازگی بخش رہے تھے۔میری پیاسی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں ......جانے کتنی بار میرے ہونٹوں نے ان موٹی موٹی ساحرانہ آنکھوں کے نمکین پانی کا ذائقہ چکھا تھا۔جانے کتنی بار میرے ہونٹوں نے ان ملائم گالوں کے لمس سے لذت کشید کی تھی۔جانے کتنی بار میرے ہونٹوں کو لب شیریں کی حلاوت نصیب ہوئی تھی۔اور اب وہ سب کچھ قصہ پارینہ بن چکا تھا۔وہ چہرہ جسے میں تقدیس اور پاکیزگی کی علامت سمجھا کرتا تھا وہ غلاظت کی پوٹ نکلا تھا۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے۔'' دل کی طرف سے تسلسل سے دہرائی جانے والی نرمی کی درخواست کو درخور اعتناء نہ جانتے ہوئے میں نے غضب بھرے لہجے میں پوچھا۔میرے دائیں ہاتھ نے ایک بار پھر ان زلفوں کو گرفت میں لے لیا تھا جو ریشم کے تاروں سے بھی ملائم تھیں۔

اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جوار بھاٹا اٹھا۔دو موتی پلکوں سے پھسل کر گالوں پر لڑھکے اور میرا سارا غصہ ،سارا غضب ہوا بن کر اڑ گیا تھا۔اس کے بالوں پر میری گرفت ڈھیلی ہوئی اور میرا ہاتھ نیچے لٹکنے لگا۔

''چلو۔'' بہار خان کی طرف رخ کر کے میں نے تمام کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

میرے ہمراہ قدم بڑھاتے ہوئے اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔''بس ہو گئی تفتیش۔''

''جب کہہ دیا ہے کہ اس بارے تم میں سے کوئی کچھ نہیں کہے گا تو یقیناً تمھارا بولنا نہیں بنتا۔''

''مجھے تو خاموش کرا لو گے ،مگر سردار صنوبر خان نے جس طرح کی تفتیش کرنی ہے وہ یقیناً تم سے برداشت نہیں ہو گی۔''

''اس معاملے میں سردار کی بھی کوئی بات نہیں سنوں گا۔'' اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں نے دروازہ تالا کیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔دروازے کو کھلا چھوڑ کر میں بہار خان کے آدمیوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ پلوشہ کے ساتھ کوئی گھٹیا حرکت کر سکیں۔پلوشہ کے ہاتھوں میں پڑی زنجیر کے تالے کی چابی بھی ان سے لے کر میں نے جیب میں ڈال لی تھی۔

بہار خان مجھے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ اپنا ایک آدمی اس نے پلوشہ کے قید خانے کے سامنے کھڑا کر دیا تھا

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ مجھے ایک فی صد بھی اندازہ نہیں تھا کہ پلوشہ مجھے یوں ٹکرا جائے گی۔ اس سے ملنے کی کتنی خواہش تھی میرے دل میں اب جبکہ وہ سامنے آ گئی تھی، میرے پاس سوال ہی ختم ہو گئے تھے۔ اس کی وہاں آمد کا مقصد بھی معلوم نہیں تھا۔ اس بارے جب تک وہ خود زبان نہ کھولتی میں اس سے کچھ نہیں اگلوا سکتا تھا۔ خود پر جبر کرتے ہوئے اس پر جتنا تشدد میں کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ اس سے مزید میں اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے پھولوں سے ملائم بدن کی لرزش میری آنکھوں میں لہرائی اور میرا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے میں اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا۔ اپنے افعال کی وہ خود جواب دہ تھی مجھے اسے تشدد کا نشانہ بنانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔

"تمھاری آنکھوں سے آنسو کیوں نکلے ہیں چندا!" آنکھیں بند کرتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا۔ "پلیز مجھے معاف کر دو، کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔" میری آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ میری بے چینی میں ایک دم اضافہ ہوا اور میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

"وہ بھوکی ہو گی، شاید اسے پیاس بھی لگی ہو...... ہو سکتا ہے کپڑوں کے گیلا ہونے کی وجہ سے اسے سردی لگ رہی ہو، وہ اتنی نازک ہے، کیا ساری رات ہاتھ بلند کیے کھڑی رہ سکے گی۔" مختلف قسم کے اذیت ناک سوال میری سوچوں میں سرسرانے لگے۔

"اگر صنوبر خان نے واپس آکر اسے تشدد کا نشانہ بنانا چاہا تو کیا میں اسے روک پاؤں گا۔" اس کا جواب نفی میں تھا۔ میرے لیے ایک ساتھ اتنے زیادہ آدمیوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا۔

کافی دیر سر کھپانے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے فرار کرا دینے میں بھلائی تھی۔ دو دن بعد میں نے یوں بھی افغانستان روانہ ہو جانا تھا پھر نا معلوم کب واپسی ہوتی۔ میں زندہ بھی رہ پاتا یا نہیں۔ بہتر یہی تھا کہ اس کے ساتھ ایک آخری احسان کرتا جاتا۔ میں نے اسے دنیا ہر لڑکی سے زیادہ چاہا تھا اور اپنی چاہت کے لیے اتنا تو میں کر ہی سکتا تھا۔ بعد میں صنوبر خان یا البرٹ پارٹی جو بھی بکواس کرتے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہی میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ اور برآمدے میں چلتا ہوا مطلوبہ کمرے کی طرف

بڑھنے لگا۔ کمرے سے باہر بہار کا مقرر کیا ہوا سنتری پستول سے کھیل رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے وہ اس پستول کو پہچان لیا تھا۔ وہ وہی پستول تھا جو پلوشہ نے قبیل خان سے چھینا تھا۔ اور اب پلوشہ سے اس کے ہاتھ چڑھ گیا تھا ۔کلاشن کوف اس نے کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔

مجھے قید خانے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ چوکنا ہو گیا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ محتاط انداز میں بولا۔ ”کمانڈر بہار نے حکم دیا ہے کہ کوئی آدمی پلوشہ سے نہ ملے۔“

”کیا اس نے میرا نام بھی لیا تھا۔“

”جی جناب۔“ اس نے زور و شور سے کہا۔

”ہونہہ!......“ میں نے پر خیال انداز میں سر ہلایا اور پھر ایک دم جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی۔

اس نے تڑپ کر میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر میں نے سرعت سے اس کی گردن اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لیتے ہوئے مخصوص انداز میں دبا دی۔ اس کا بے ہوش جسم میرے ہاتھوں میں جھول گیا تھا۔ اسے احتیاط سے زمین پر لٹا کر میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں سے پستول لینا مجھے نہیں بھولا تھا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ کسی بھی وقت بہار خان کا کوئی آدمی اس طرف کا رخ کر کے میرے کام میں رخنہ ڈال سکتا تھا۔ دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ اسی حالت میں کھڑی تھی جیسا میں اسے چھوڑ گیا تھا ۔دروازے کھلنے کی آہٹ پر وہ اس طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ میرے اندر داخل ہونے پر اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہوئے اور اس کی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میرے پاس سوال وجواب کا وقت نہیں تھا۔ اس کی ریشمی کلائیوں کو زنجیر سے آزاد کرا کر میں نے پستول اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بے گانے لہجے میں کہا۔

”باہر موجود سنتری کو میں نے بے ہوش کر دیا ہے، برآمدے سے نکلتے ہی دائیں جانب مڑ جانا اور کوشش کرنا کسی آدمی کا سامنا نہ ہو۔“

پستول میرے ہاتھ سے لے کر وہ دکھی نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ شاید تھوڑی دیر پہلے ہونے والے تشدد کا گلہ کر رہی تھی۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر میں نیچے دیکھنے لگا۔ ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ ایک دم مڑی

اور باہر نکل گئی۔ میں بس اس کی پشت کو گھورتا رہ گیا تھا۔ میری زندگی کا ایک اور باب بند ہو گیا تھا۔ میں تھکے انداز میں وہیں کھڑا رہا۔ دل بار بار احتجاج کرتے ہوئے اسے روکنے کی ضد کر رہا تھا۔ لیکن دماغ ایسی کسی بھی بے قوفی کے لیے تیار نہیں تھا۔

اچانک میرے کانوں میں تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی۔ میں خیالوں کی دنیا سے نکلتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ سنتری کی کلاشن کوف مجھے غائب نظر آئی یقیناً وہ پلوشہ کے ہاتھ چڑھ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سنتری کی گردن غیر معمولی طور پر پیچھے کی طرف مڑی ہوئی نظر آئی۔ جاتے جاتے وہ میرے لیے جواب دہی مشکل بنا گئی تھی۔ فائرنگ کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ میں جھکے جھکے انداز میں باہر نکلا۔ پلوشہ مجھے جنوبی دیوار کے ساتھ بنے ایک کمرے کی آڑ میں داخلی دروازے کے اوپر بنے مورچے والے سنتری سے فائر کا تبادلہ کرتی نظر آئی۔ اسی وقت ایک اندرونی کمرے سے کمانڈر بہار بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے ہاتھوں میں کلاشن کوف تھامی ہوئی تھی۔ اس کی جگہ سے پلوشہ کو نشانہ بنانا نہایت آسان تھا۔ اسے کلاشن کوف سیدھی کرتے دیکھ کر میں تڑپ کر آگے بڑھا۔

''گولی نہ چلانا۔'' میں اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''ہٹ جاؤ جوان!'' وہ دھاڑا۔

''میں نے قریب ہوتے ہوئے ایک دم اس کی کلاشن کوف کی بیرل پر ہاتھ ڈالا اگلے ہی لمحے کلاشن کوف میرے ہاتھوں میں تھی۔

بہار خان کو میری یہ جسارت پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے گالیاں بکتے ہوئے مجھ پر ہلہ بول دیا۔ ایک جانب ہٹتے ہوئے میں نے اس کے کولہوں پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ چند قدم بھاگتے ہوئے منہ کے بل نیچے گرا پڑا۔ لین ایک لمحہ بھی زمین پر لیٹے بغیر وہ دوبارہ کھڑا ہوا اور گالیاں بکتے ہوئے میری جانب بڑھنے لگا۔

اچانک میرے کانوں میں پلوشہ کی تیز چیخ آئی۔ میرا دل خوف سے بھر گیا تھا۔ میں نے اس کی جانب نظریں دوڑائیں وہ نیچے گر گئی تھی، یقیناً اسے گولی لگ گئی تھی۔

میرے دماغ میں ایک دم سرخ چادر تن گئی تھی، بغیر ایک سیکنڈ ضایع کیے میں نے کلاشن کوف کی بیرل کا رخ بہار خان کے سر کی طرف موڑا اور ٹریگر دبا دیا۔ ورنہ میرا اسے قتل کرنے کا ایک فیصد بھی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پلوشہ کی چیخ سننے کے بعد اگر میری کوئی ترجیح تھی تو وہ پلوشہ کی زندگی تھی۔

مورچے کی طرف سے اب تک فائر کی آواز آ رہی تھی۔ گھٹنا نیچے ٹیکتے ہوئے میں نے مورچے کے ہول پر شست باندھی جہاں سے کلاشن کوف کی بیرل جھانک رہی تھی۔ اس بے وقوف نے مورچے کے اندر جلنے والی روشنی کو بھی بجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مسلسل دو بار ٹریگر دبا کر میں نے مورچے والے سورما کو اپنے انجام تک پہنچایا۔ اور پلوشہ کی طرف بھاگ پڑا۔ وہ ہوش میں تھی اس کی دائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا گولی اس کی ران کی جڑ میں لگی تھی۔ میں نے فوراً دائیں بائیں دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر پڑی لاش کے سر سے بندھی پگڑی کھل کر نیچے گری ہوئی تھی۔ وہ پلوشہ کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر پگڑی اٹھائی اور اس سے ایک لمبی پٹی پھاڑ کر پلوشہ کی ٹانگ پر لپیٹنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے بھل بھل بہتا خون دیکھ کر مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہتی رہی۔ حالانکہ وہ بہت حوصلے اور برداشت والی تھی لیکن اس وقت برداشت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ بلکہ تھوڑی دیر پہلے میرے تشدد کرنے پر بھی اس نے خاصی کمزوری دکھائی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ ایسی نہیں تھی۔

اس کی حالت دیکھ کر میرا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں کوئی لائحہ عمل نہیں آ رہا تھا۔ میں نے حویلی کے صحن میں نظریں دوڑائیں، ایک لاش داخلی دروازے کے ساتھ اور دوسری صحن کے وسط میں پڑی تھی۔ تیسری لاش بہار خان کی تھی جو برآمدے کے سامنے تھی۔ اسی طرح ایک لاش اس سنتری کی تھی جسے میں نے بے ہوش کیا تھا اور بعد میں پلوشہ نے اس کی گردن مروڑ دی تھی۔ پانچویں لاش مورچے کے اندر موجود اس آدمی کی تھی جسے ختم کرنے کے لیے میں نے عادت کے برعکس اکٹھی دو گولیاں چلائی تھیں، کیونکہ اس وقت پلوشہ کی چیخ سن کر مجھ سے ذرا سی بھی تاخیر برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔

صنوبر خان، بہار خان کے زیر کمان چار آدمی حویلی میں چھوڑ گیا تھا۔ پانچواں خود بہار خان تھا۔ اور پلوشہ

خان کی وجہ سے وہ پانچوں لاشوں کی صورت بکھرے پڑے تھے۔اب وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔صنوبر خان تک پلوشہ کی گرفتاری کی بات پہنچ گئی تھی،اس لیے میں ان اموات کو کسی نامعلوم حملہ آور کے کھاتے میں بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔گو مجھے یقین تھا کہ ان مرنے والوں کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان کی وجہ سے البرٹ بروک مجھے صنوبر خان کے ہاتھوں کوئی نقصان پہنچنے دیتا۔لیکن اس وقت میرے لیے پلوشہ مصیبت بن گئی تھی۔نہ تو وہ اکیلی کہیں جاسکتی تھی اور نہ میں اسے وہیں رہنے دے سکتا تھا۔اس کے تمام افعال کے باوجود وہ اب بھی میرے لیے اہم تھی، مجھے اس کا مرنا کسی طور بھی قبول نہیں تھا۔بلکہ اس کی ٹانگ میں گولی لگنے کی جتنی تکلیف مجھے ہورہی تھی شاید خود اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔میں تشویش بھرے انداز میں اسے تڑپتے دیکھ رہا تھا۔میں جانتا تھا کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا زخم نے پھوڑے کی شکل اختیار کرتے جانا تھا۔ہمیشہ گولی لگتے وقت ذرا سی جلن اور درد ہوتا ہے اور جوں جوں زخم ٹھنڈا ہوتا جاتا ہے تکلیف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ گولی اب تک اس کے جسم کے اندر تھی۔

اچانک میرے ذہن میں وہاں پڑے ابتدائی طبی امداد کے بکس کا خیال آیا۔اور میں نے بھاگ کر انیکسی کا رخ کیا۔ابتدائی طبی امداد کا بکس تلاش کرتے ہوئے مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔بکس کھول کر میں نے اندر نگاہ دوڑائی اور اپنے کام کی دوائی ڈھونڈنے لگا۔ایک سنائپر کو ابتدائی طبی امداد کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔مطلوبہ دوائیوں کو دیکھ کر میری آنکھوں میں اطمینان جھلکنے لگا تھا۔میں بکس اٹھا کر باہر نکلنے لگا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ پلوشہ کی ران میں لگنے والی گولی نکالنے کے لیے لازمی طور پر کسی آرام دہ جگہ کی ضرورت تھی اور ایسی آرام دہ جگہ اس انیکسی سے بڑھ کر کوئی نہیں تھی۔ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں آیا کہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں یقیناً انگوراڈے میں ایسا ڈاکٹر مل جاتا۔مگر اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ اسے تقریباً ران کی جڑ میں گولی لگی تھی اور وہاں سے گولی نکالنے کے لیے اس کا بے پردہ ہونا لازمی تھا، جبکہ میں کسی مرد ڈاکٹر کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اسے بے پردہ دیکھے۔

''چاہے وہ اپنے مفاد کے لیے ہر کسی کو اس کی اجازت دیتی رہے۔'' میرے دماغ میں ایک تلخ سوچ گونجی

''ہاں......'' میرا دل، دماغ کے خلاف ڈٹ گیا تھا۔''یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔اس کی بے

راہ روی کا یقین ہوتے ہوئے بھی میں اس کی عزت کو اتنا ہی قیمتی سمجھوں گا جتنا کسی بھی چاہنے والے کے دل میں اپنے محبوب کی عزت و حرمت کا خیال چھپا ہوتا ہے۔"

میں بھاگ کر باہر نکلا اور اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے ایک ہاتھ اس کے گھٹنوں کے نیچے اور دوسرا ہاتھ اس کے کندھوں کے پیچھے سے گزار کر اسے اوپر اٹھا لیا۔ اس کا کومل وجود مجھے پھول کی طرح ہلکا لگا تھا۔

جیسے ہی اسے لے کر میں سیدھا ہوا اس کے منہ سے ایک تیز کراہ خارج ہوئی تھی۔ یقیناً ٹانگ کو ذرا سا ہلانے پر بھی درد کی شدید لہر نے اٹھنا تھا۔ بے ساختہ اس نے اپنی بانہوں کا ہار میرے گلے میں ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ میرے کندھے پر ٹیک دیا تھا۔ اس وقت مجھے اس پر بہت پیار آیا تھا۔

اسے اٹھا کر میں انیکسی کے اندر لایا اور اندرونی کمرے میں آرام دہ بیڈ پر لٹا دیا۔ دو تکیے اس کے سر کے نیچے رکھ کر میں باہر نکل آیا۔ اس کی ران سے گولی نکالنے کے لیے مجھے کسی باریک دھار والے چاقو، چھری کی تلاش تھی۔ چھری کے بہ جائے مجھے جسم سے گولی نکالنے مخصوص آلہ فورسپ، کمانڈر بہار خان کے کمرے میں پڑے ابتدائی طبی امداد کے بکس میں پڑا نظر آ گیا یوں بھی ان کا روزمرہ ہی ایسا تھا جس میں گولی لگنا معمول کی بات تھی۔

میں واپس انیکسی میں آ گیا۔ گو یہ کام مجھے پہلی بار کرنا پڑ رہا تھا لیکن اس بارے میں نے تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ خصوصی سنائپر کورس اور کمانڈوز کے ساتھ کرنے والے کورس میں مجھے جسم میں پیوست گولی کو نکالنے کے بارے بہت باریک بینی سے سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

پلوشہ کا کراہنا جاری تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے قدموں کی چاپ سن کر ہی اس نے کراہنا شروع کیا ہے۔

"کیا یہ میری ہمدردی حاصل کرنے کا کوئی بہانہ ہے۔" ایک امید افزا سوچ میرے دماغ میں ابھری، لیکن پھر میں نے سختی سے اس خیال کو جھٹلا دیا۔ اسے میری ہمدردی حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جو کچھ وہ میرے ساتھ کر چکی تھی اس کے بعد مجھ سے تعلقات بحال کرنے کی کوئی صورت نکالنا اس کی بے وقوفی ہی تھی۔

بیڈ پر بیٹھتے ہوئے میں نے سب سے پہلے اس کی ران کے ساتھ بندھی ہوئی پٹی کھولنے لگا۔

''اُف......'' اس کے چہرے پر اذیت جیسے ثبت ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھوں میں لرزش شروع ہو گئی، اسے تکلیف میں مبتلا دیکھنا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

پٹی کھلتے ہی اس کی کراہیں مزید بلند ہو گئی تھیں۔

''اگر تمھارا رونا پیٹنا تھوڑا مدہم ہو جائے تو شاید میں آرام سے اپنا کام کر سکوں۔'' بہ ظاہر میں نے سخت لہجے میں ڈانٹا تھا لیکن در پردہ میرا دل کر رہا تھا کہ اسے اپنی آغوش میں بھر کر کہوں۔

''بس کرو میری جان!...... تمھارے کراہنے سے میرے ہاتھ کانپنے لگ گئے ہیں۔ تمھیں جتنی تکلیف اپنی ٹانگ میں محسوس ہو رہی ہے اس سے کئی گنا بڑھ کر میرے دل کو درد ہو رہا ہے۔'' مگر میں ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہمارے درمیان اب ایسے کسی بھی تعلق کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

میرے ڈانٹنے کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، البتہ ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔

پٹی کھولنے کے بعد کے مراحل بہت دشوار تھے۔ سب سے پہلے تو اس کے زخم کو کھول کر دھونا ناقابلِ عمل لگ رہا تھا۔ اگر پہلے کبھی ایسی صورت حال پیش آئی ہوتی تو مجھے اتنی مشکل پیش نہ آتی کیونکہ اس وقت میں اسے شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اب وہ میرے لیے اجنبی لڑکی تھی۔ اور کسی اجنبی لڑکی کو بے پردہ کرنا ایک شریف انسان کے لیے دشوار ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ بغیر کسی گاڑی کے انگور اڈے تک جانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور تھا۔ اور بالفرض میں وہاں تک پہنچ بھی جاتا تب بھی عجیب بات یہ تھی کہ میرا دل اسے کسی مرد ڈاکٹر کے سامنے بے پردہ ہونے کی اجازت دینے پر بھی تیار نہیں تھا۔ اس کے بعد خون کو روکنا بھی بہت ضروری تھا۔ ابتدائی طبی امداد کا تو پہلا اصول ہی خون کے بہاؤ کو روکنا ہوتا ہے۔

ایک صاف چادر لے کر میں نے اس کے پیٹ سے لے کر رانوں تک بچھائی اور اس کا زیریں لباس اتار دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑی رہی۔ اسے جھجکتے گھبراتے نہ دیکھ کر ایک بار پھر میرے دماغ میں صنوبر خان اور اس کے آدمیوں کی سنی ہوئی باتیں گونجنے لگی تھیں۔ سر جھٹک کر میں نے ان واہیات خیالوں کو دور کیا اور سپرٹ سے اس کا زخم کا صاف کرنے لگا۔

اس کے منھ سے ایک بار پھر پر اذیت کراہیں نکلنا شروع ہو گئی تھیں۔ سپرٹ زخم میں بہت زیادہ جلن پیدا کر

دیتی ہے۔ سپرٹ اور اس کے زخم سے نکلنے والے خون سے بیڈ پر بچھے قیمتی گدے کا بیڑا غرق ہو رہا تھا۔ مگر پلوشہ کی تکلیف کے مقابل مجھے اپنی جان کی پروانہ ہوتی وہ تو ایک گھٹیا سا گدا تھا۔

زخم صاف کر کے میں نے گولی کو پکڑ کر باہر کھینچنے والا چمٹا نما آلہ فورسپ بھی سپرٹ سے دھو لیا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر اجاگر ہو گیا جب غار کے اندر میرے کندھے سے گولی نکالتے وقت اس نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ تھامتے ہوئے تسلی دی تھی۔ گولی نکالتے وقت اس نے چند سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ اس کا وہ احسان آج تک میرے دل پر نقش تھا۔ رات کے وقت کسی نوجوان لڑکی اکیلا گھر سے نکل کر ایسی جگہ پر پہنچنا بہ ذات خود بہت بڑا کارنامہ تھا۔ شاید ابھی مجھے اس کے اسی احسان کا بدلہ چکانے کا موقع مل رہا تھا۔

اس کی ران کے نیچے تکیہ رکھ کر میں نے دل ہی دل اللہ پاک کو یاد کیا۔ زخم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے پر کیسی تکلیف محسوس ہوتی ہے یہ بات الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ مجھ پر یہ اذیت ناک وقت بیت چکا تھا اور میں اس تکلیف کی شدت سے خوب واقف تھا۔ اب ایسی ہی تکلیف سے پلوشہ دوچار ہونے والی تھی۔

میرے دل کو تو اس کے کانٹا چبھنا بھی گوارا نہیں تھا لیکن بدقسمتی کہ مجھے اسے اس حال میں دیکھنا پڑ رہا تھا۔

گہرا سانس لے کر میں نے ہمت باندھی اور چمٹے نما اوزار کی نوک زخم کے منہ کی طرف بڑھا دی۔ اگر اس کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو مجھے ذرا بھر بھی پروانہ ہوتی۔ میرے اعصاب بہت مضبوط تھے، لیکن بدقسمتی سے جو شخصیت میرے سامنے زخمی حالت میں پڑی تھی اس کا تعلق براہ راست میرے دل سے جڑا تھا اپنی عزیز ہستی کا آپریشن کرنا خود اپنے جسم کے کسی حصے پر طبع آزمائی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

اچانک میرے دماغ میں خیال آیا کہ اگر وہ تکلیف کی شدت کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے اچھلنا شروع کر دیا تو یقیناً وہ زیادہ زخمی ہو سکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں رسی کی تلاش میں انیکسی سے باہر نکل آیا۔ رسی ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ ایک لمبی رسی مجھے ملازموں کے کمرے میں مل گئی تھی۔

میں جونھی واپس لوٹا اسے حیرانی بھری نظروں سے اپنا منتظر پایا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں میرا یوں چلے جانا نہیں آرہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں رسی کا بنڈل دیکھ کر اس کی حیرانی دوچند ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے کچھ بھی کہنے سے

گریز کیا تھا۔
میں بھی وضاحت کیے بغیر بیڈ کے نیچے سے رسی گزار کر اسے مضبوطی سے جکڑنے لگا۔اس کی چھاتی اور پیٹ سے رسی لپیٹتے ہوئے میں اس کے گھٹنوں تک رسی کو بل دیتے ہوئے لایا۔بس رانوں کی تھوڑی سی جگہ میں نے خالی چھوڑ دی تھی اب وہ چاہ کر بھی معمولی سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔وہ خاموشی سے مجھے یہ سب کرتا دیکھتی رہی۔شاید اسے بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔
میرے کندھے سے گولی نکالتے وقت اس نے میری مردانگی کو یوں للکارا تھا کہ مجھے اس اذیت ناک مرحلے سے گزرنا آسان ہو گیا تھا۔لیکن وہ تو صنف نازک تھی،ایک جوان سال لڑکی کو میں کیا کہہ کر جوش دلاتا۔اس کی عمر کی لڑکیاں تو شاید ایسا منظر دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جائیں۔لیکن وہ ان روایتی دوشیزاؤں سے یکسر مختلف تھی۔
فورسپ دوبارہ ہاتھوں میں تھام کر میں نے زخم میں گھسیڑا،گو میرا دل کانپ رہا تھا مگر میں نے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پا لیا تھا وہ کمزوری دکھانے کا وقت نہیں تھا۔میں جتنی نرمی دکھاتا پلوشہ کو اتنی زیادہ تکلیف پہنچتی۔گولی لگنے کا زخم سامنے سے ہمیشہ تنگ ہوتا ہے لیکن گولی جسم کو پھاڑ کر نکل جائے تو جس جگہ سے گولی نکلتی ہے وہاں سے کافی سارا گوشت لے اڑتی ہے۔
پلوشہ نے سختی سے دانت پر دانت جما کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔اس کا سارا جسم تشنج کے مریض کی طرح اکڑ کر لرزنے لگا تھا۔اگر میں نے اسے باندھا نہ ہوتا تو یقیناً وہ خود کو زیادہ زخمی کرا بیٹھتی۔اس کی تیز کراہوں سے بے پروا بنتے ہوئے میں نے گولی ٹٹول کر آلے کے منہ میں تھامنے لگا۔یہ بہ ظاہر بہت عام اور آسان سا لگتا ہے پڑھنے والوں کو کبھی بھی اس تکلیف اور اذیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو زخمی پر گزر رہی ہوتی ہے۔البتہ زخمی کوئی ایسی شخصیت ہو جس سے دل کے تار جڑے ہوں تب انسان اس درد کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔
گولی کو آلے کے منہ میں پھنسا کر میں نے احتیاط سے باہر کھینچا۔پلوشہ مٹھیاں بھینچ کر اس درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔گولی زخم سے باہر نکلتے ہی اس نے سختی سے روکا ہوا سانس ایک آہ کے ساتھ خارج کیا اور بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔زخم سے خون بہت تیزی سے نکلنے لگا تھا۔میں نے دوبارہ زخم کو سپرٹ سے دھویا اور پائیوڈین سے روئی تر کر کے زخم کے منہ پر رکھ دی۔خون کے بہاؤ کو روکنے کے لیے میں نے کافی زیادہ

پٹی تہہ کر کے زخم کے منہ پر دبا دی تھی۔ پٹی باندھنے سے پہلے اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کرانا ضروری تھا۔

اس کا جسم رسیوں سے آزاد کر کے میں نے چوڑی پٹی زخم پر لپیٹی اور ایک درد کش ٹیکہ تیار کرنے لگا۔ درد کش ٹیکہ بھی جسم کے پر گوشت حصے میں لگایا جاتا ہے۔ لیکن اب اس کا میرا معاملہ ڈاکٹر اور مریض کا سا تھا۔ دل میں کافی ساری جھجک محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے کولہے پر انجیکشن لگا دیا۔ دوائیوں کے بکس میں اینٹی بائیوٹک انجیکشن بھی موجود تھے۔ ایک اینٹی بائیوٹک انجیکشن میں نے اس کے دائیں بازو کی رگ میں بھی لگا دیا۔

وہ ابھی تک گہرے گہرے سانس لے کر گزری تکلیف کو زائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ جاؤں، لیکن شکر کا مقام تھا کہ میرے دماغ نے برے بھلے کی تمیز نہیں کھوئی تھی ورنہ مجھے دل کی مانتے ہی بنتی۔

پٹی باندھ کر میں نے اس کی ران سے نکلنے والی گولی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ کیونکہ وہ پستول کی گولی تھی جبکہ میرے خیال کے مطابق تو اسے کلاشن کوف کی گولی لگی تھی۔ مورچے سے پلوشہ کی آڑ تک کے لمبے فاصلے سے پستول کی گولی کا پلوشہ کی ران میں اتنی گہرائی میں اترنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ پستول کی گولی بیس پچیس گز کے بعد اپنی طاقت کھونے لگتی ہے اور سو گز کے فاصلے سے تو کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جب کہ جس مورچے سے وہ گولی چلائی گئی تھی اس کا فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔

ایک دو لمحہ سوچنے کے بعد میں نے سر جھٹک کر اس فالتو کی سوچ کو دور بھگایا۔ خون اور سپرٹ کی وجہ سے بیڈ پر بچھے گدے کا کافی سارا حصہ خراب ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر احتیاط سے پلوشہ کو اپنے بازوؤں میں بھرا اور دوسرے کمرے میں جا کر صاف ستھرے بیڈ پر لٹا دیا۔ کمرے کی الماری کھولنے پر مجھے زنانہ لباس لٹکے نظر آئے وہ لازماً میجر ٹریسی والکر کا کمرہ تھا۔ جینز کی چست پتلونیں بنیان اور اسی طرح کے دوسرے واہیات لباس۔ البتہ دو زنانہ شلوار قمیص سوٹ دیکھ کر میں خوش ہو گیا تھا۔ چونکہ پلوشہ کی قمیص پر بھی کافی خون لگا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وہ صاف لباس پہن لے۔ ایک سوٹ الماری سے باہر نکال کر میں پلوشہ کو مخاطب ہوا۔

''میں باہر جا رہا ہوں تم کپڑے تبدیل کر لو۔'' یہ کہتے ہوئے میرے دماغ میں خوش حال خان کی بیٹھک میں گزرنے والا منظر در آیا۔ جب اس کے کپڑے گیلے ہونے پر میں نے اسے زنانہ لباس پہننے کا کہا تھا۔ اس

وقت اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا......

''آپ کو بڑا شوق ہے مجھے زنانہ لباس میں دیکھنے کا۔''

آج بھی میں اس کی طرف زنانہ لباس ہی بڑھا رہا تھا۔لیکن وہ کوئی شوخی بھرا جملہ یا لاڈ بھرا انداز اپنائے بغیر خاموشی سے مجھ گھور کر رہ گئی تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا وہاں مجھے دودھ کے پیکٹ پڑے نظر آئے تھے۔دو پیکٹ کھول کر میں نے ایک صاف برتن میں ڈالے اور چولھے پر رکھ دیے۔چولھے کے ساتھ ایک بڑا گیس سلنڈر لگا تھا اس لیے مجھے آگ جلانے میں کوئی تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔وہیں ایک الماری میں مجھے اوولٹین بھی نظر آ گئی تھی۔تین چار چمچ اوولٹین کے دودھ میں ڈال کر میں نے اچھی طرح چمچ ہلایا اور گرم دودھ شیشے کے جگ میں ڈال کر پلوشہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹانا ضروری سمجھا تھا۔

وہ لباس تبدیل کر چکی تھی۔زنانہ لباس میں وہ ہمیشہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آیا کرتی۔اس وقت بھی ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑے اپنی خوشی قسمتی پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔میں اپنی نظروں پر اختیار کھونے لگا تھا۔وہ آنکھیں کھول کر لیٹی تھی۔میری آمد کے ساتھ ہی اس نے پلکوں کی چلمن گرا لی تھی۔نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے آنکھیں اس لیے بند کر لی تھیں تاکہ میں اسے سہولت سے دیکھ سکوں۔اس کے بال پہلے سے بڑے ہو گئے تھے۔مجھے یقین تھا کہ جونھی اس کے بال عورتوں کی طرح لمبے ہوتے اس کے حسن نے مزید نکھر آنا تھا۔

''مگر اس وقت تم اسے دیکھ نہیں پاؤ گے۔''میرے دل نے مجھے محرومی کا طعنہ دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

خیر وہ بعد کا مسئلہ تھا۔فی الحال تو میں اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکتا تھا۔اوولٹین ملے دودھ کا جگ شیشے کی میز پر رکھتے ہوئے بھی میری نظریں اس کے ملیح چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون بھرے تاثرات پھیلے تھے۔میری نظریں سیراب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں،مگر میں زیادہ دیر اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔خود پر جبر کرتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائیں اور اس کی خون آلود قمیص اٹھا کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔اس کی قمیص بھی بقیہ لباس کے ساتھ پھینک کر میں وہاں پڑے دو

صاف تکیے اٹھا کر واپس لوٹ آیا۔تین چار تکیے اکٹھے رکھ کر میں نے اسے بازووں سے تھام کر تکیوں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔حالانکہ وہ خود بھی اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی لیکن میرے ہاتھ بار بار اس کے پھول سے بدن کے لمس سے حظ اٹھانا چاہ رہے تھے اس لیے میں نے اسے خود پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔اس نے بھی بغیر کسی جھجک کے اپنا جسم میرے حوالے کیا ہوا تھا۔کندھوں کے پیچھے تکیے درست کر کے میں نے اوولٹین ملے دودھ کا گلاس بھر کرا سے تھما دیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر اوولٹین ملا دودھ پینے لگی۔میز کو کھینچ کر میں نے بیڈ کے ساتھ لگا دیا تاکہ ایک گلاس خالی کر کے وہ اپنے لیے دوسرا گلاس بھی بھر سکے اور خود اس کمرے سے نکل آیا۔گھڑی پر نگاہ دوڑانے پر صبح کے تین بجتے نظر آئے۔رات قریباً بیتنے والی تھی اور میں وہاں مزید نہیں ٹھہر سکتا تھا۔صنوبر خان اور اس کے آدمیوں نے دن چڑھے پہنچ جانا تھا۔اور ان کی آمد سے پہلے پلوشہ کو وہاں سے کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا۔اور یقینی طور پر وہ خود حرکت کرنے کے قابل نہیں تھی اس لیے اسے میں نے ہی کسی محفوظ مقام تک پہنچانا تھا۔اس کی طرف سے اطمینان حاصل ہونے کے بعد ہی میں صنوبر خان اور البرٹ پارٹی کا سامنا کر سکتا تھا۔اتنا یقین تو مجھے بھی تھا کہ ان پانچ غیر اہم افراد کے قتل کی وجہ سے وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔خاص کر میں صنوبر خان کے آقاؤں کی ضرورت تھا۔اور اس کے آقاؤں کے نزدیک صنوبر خان کے آدمیوں کی حیثیت چند ٹکوں میں بکنے والے غلاموں سے بڑھ کر نہیں تھی۔

انیکسی سے باہر نکل کر ایک امید کے سہارے میں نے دوبارہ نظریں دوڑائیں مگر پارکنگ میں کوئی گاڑی تو کیا سائیکل کھڑی بھی نظر نہ آئی۔اب یہ بدقسمتی ہی تھی ورنہ وہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی گاڑی موجود رہتی تھی۔

گویا اب مجھے پلوشہ کو اٹھا کر ہی لے جانا پڑتا۔ایک دم میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا۔بے ایمان دل اس کی قربت کے مواقع ہی تو تلاش رہا تھا۔

اب اسے انگور اڈے پہنچانا ممکن نہیں تھا۔کافی دیر سوچنے کے بعد مجھے وہی غار سب سے محفوظ لگا جہاں اس نے میرے کندھے سے گولی نکالی تھی۔وہ غار حویلی سے اڑھائی تین کلومیٹر دور تھا۔وہاں پلوشہ کے پاس کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی اشیاء چھوڑ کر میں آرام سے واپس آ سکتا تھا۔اس کے بعد میری ذمہ داری پوری ہو جاتی۔

پلوشہ اور سامان کو اکٹھا وہاں تک پہنچانا آسان نہیں تھا۔اسے غار تک پہنچانے سے پہلے وہاں استعمال کا سامان پہنچانا ضروری تھا۔

نیچے بچانے کے لیے فوم کا گدا ،تکیہ ،سلیپنگ بیگ ،پینے کے لیے دودھ کا کاٹن ،کھانے کے لیے بسکٹ،پیسٹریاں ،زخم کے لیے صاف پٹیاں، دوائیاں اور انجیکشن ،کلاشن کوف اور فالتو میگزینیں وغیرہ۔ یہ تمام سامان اٹھا کر تین کلومیٹر چلنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔مگر جس کے لیے میں یہ کر رہا تھا اس کے لیے اس سے زیادہ مشقت کرنا بھی میرے لیے نہایت آسان تھا۔

ضرورت کا تمام سمیٹ کر میں نے ایک بیگ میں ڈالا اور بیگ کندھوں میں ڈال کر میں نے فوم کا گدا لپیٹ کر اٹھایا اور حویلی سے باہر آ گیا۔سورج طلوع ہونے تک مجھے تمام سامان اور پلوشہ کو غار تک پہنچانا تھا۔ٹارچ کی روشنی میں اطمینان سے آگے بڑھتا گیا۔میرے دل میں بس جنگلی جانوروں کے بارے تھوڑی سی فکر مندی تھی ،کیونکہ اس علاقے میں بھیڑیے ،ریچھ اور سوّر وغیرہ پائے جاتے ہیں۔بندر بھی موجود ہیں مگر ان کا شمار نقصان پہنچانے والے جانوروں کی فہرست میں نہیں آتا۔چیتے اور تیندوے کی افواہیں بھی سننے میں آتی رہتی ہیں مگر کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میں بغیر کسی قابل ذکر واقعے کے آدھے گھنٹے تک غار کے نیچے پہنچ گیا تھا۔چونکہ وہاں میں پہلے بھی دو تین بار آ چکا تھا اس لیے مجھے رستا پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

چڑھائی پر چڑھ کر میں نے سامان غار سے باہر چھوڑا اور کلاشن کوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں تھامتے ہوئے محتاط انداز میں غار کے اندر گھس گیا۔غار بالکل خالی پڑا تھا۔اچھی طرح دیکھ بھال کر کے میں باہر نکل آیا ۔باہر رکھا سامان اٹھا کر میں نے غار کے اندر رکھا اور واپسی کی راہ لی۔واپسی میں خالی ہاتھ تھا اس لیے مجھے بھاگنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔میں پندرہ منٹ میں حویلی میں پہنچ گیا تھا۔پلوشہ کو غار میں پہنچا کر مجھے ایک بار پھر حویلی ہی میں لوٹنا تھا۔مجھے فکر اس لیے بھی نہیں تھی کہ میرے پاس کافی وقت موجود تھا۔صنوبر خان اتنا سویرے کبھی نہ لوٹتا۔اور نہ اتنا سویرے اسے بہار خان سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

پلوشہ مجھے جاگتی ہی ملی تھی۔میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اور آنکھیں موند

لیں۔ یہ اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ اس فیاضی سے مجھے اپنے دیدار کا موقع فراہم کر رہی تھی۔

"وہ تم سے آنکھیں نہیں ملا پا رہی ہے محترم۔" میرے دماغ نے حسب عادت اس کے خلاف زہر اگلا۔

"مجھے آم کھانے سے غرض ہے۔" اس کی دید کے پیاسے دل نے دماغ کی بات کو درخورِ اعتناء نہیں جانا تھا

"ہمیں یہاں سے جانا پڑے گا...... کیا تم پیدل چل سکو گی؟" یہ سوال منہ سے نکالتے ہی مجھے اپنے سوال کے احمقانہ پن کا اندازہ ہو گیا تھا۔

اس نے آنکھوں کی چلمن اٹھاتے ہوئے میری جانب گہری نظروں سے دیکھا مگر جواب دیے بغیر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

خون بہنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر پیلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ کافی نقاہت بھی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کومل وجود کو بازوؤں میں بھرا اور اوپر اٹھا لیا۔ وہ مضبوط اور چھریرے بدن کی مالک تھی۔ مجاہدین کے کیمپ میں تربیت کے بعد عملی زندگی میں بھی کافی عرصے سے سرگرم تھی اور اس جفاکشی اور محنت کی وجہ سے اس کا بدن سانچے میں ڈھلا محسوس ہوتا تھا۔

انیکسی سے نکل کر میں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا کیوں کہ اسے مسلسل بازوؤں میں بھر کر غار تک پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ آرمی میں زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔ میں نے بھی اسے اسی انداز ہی میں اٹھایا ہوا تھا جیسا کہ ہمیں تربیت ملی تھی۔ لیکن ایسا کرنے کی وجہ سے اس کے جسم کے بہت سے گداز حصے میرے بدن سے مس ہو کر میری قوت برداشت کا امتحان لینے لگے تھے۔ اور میں ٹارچ کی روشنی میں دائیں بائیں کا جائزہ لیتے ہوئے خود کو اس کے لمس کی سحر آفرینی سے بچانے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا۔ پلوشہ سے دوبارہ ملنے کے بعد میں عجیب قسم کی کش مکش میں پھنس گیا تھا۔ دماغ اس سے نفرت کی ترغیب دینے کے ساتھ اس سے دور جانے کے مشورے دے رہا تھا، جبکہ دل اسے اپنی آغوش میں بھر کر ماضی کی ساری باتیں بھلانے کے چکر میں تھا۔ بلاشک وشبہ اس نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ دکھ مجھے اس کی بے راہ روی اور بدکرداری کا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود دل کی ایک ہی رٹ تھی۔

"جو ہوا اسے بھول جاؤ۔"

جبکہ دماغ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔اس کی بے راہ روی اور غیر مردوں سے غلط تعلقات کسی صورت بھلائے جانے کے قابل نہیں تھے۔سب سے بڑھ کر وہ کسی دوسرے مرد کو پسند کرتی تھی ،جس سے شادی کے لیے اس نے اتنے زیادہ پاپڑ بیلے تھے۔اب میرے معاف کرنے یا اس کے لیے اپنی آغوش دوبارہ وا کرنے سے اس نے کون سا بھاگ کر میرے پاس آجانا تھا۔اس کے نزدیک اگر میری تھوڑی سی بھی اہمیت ہوتی تو وہ کبھی بھی ایسا نہ کرتی۔

دماغ کے بھاری دلائل نے دل کو خاموش کرادیا تھا۔قریباً سوا گھنٹے میں میں غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ہر طرف صبح کا اجالا پھیل گیا تھا۔اسے کندھے سے اتار کر میں نے بازوؤں میں بھرا اور غار میں داخل ہو گیا۔زمین پر بچھے گدے کے پاس جا کر ،اسے احتیاط سے گدے پر لٹا دیا اور سر کے نیچے تکیہ درست کر کے غار سے باہر نکل آیا۔میرا ارادہ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنے کا تھا۔لکڑیوں کی وہاں کوئی کمی نہیں تھی۔پندرہ بیس منٹ لگا کر میں نے غار کے اندر کافی ساری خشک لکڑیاں ڈھیر کرلیں۔

اب مجھے اس سے رخصت لینا تھی۔وہ آنکھیں بند کیے چت لیٹی ہوئی تھی۔اس کی بند آنکھوں کا فائدہ اٹھا کر میں نے چند لمحے اپنی نظروں کو عیاشی کی اجازت دی۔لیکن پیاسی نظریں سیر ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔نہ جانے وہ اتنی پرکشش ،جاذب نظر اور من موہنی تھی یا مجھے ہی ایسی لگتی تھی۔میں شاید اس شغل کو اتنی جلدی ترک نہ کرسکتا مگر اس کی پلکوں کی جنبش نے مجھے نظریں پھیرنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس کی آنکھیں وا ہوتے ہی گلا کھنکار کر گویا ہوا۔

’’میں نے ضرورت کا تمام سامان یہاں رکھ دیا ہے ،امید ہے تین چار دنوں میں تم چلنے کے قابل ہو جاؤ گی۔یہاں سے انگور اڈہ اتنی دور نہیں ہے تم آسانی سے وہاں پہنچ کر چھپ سکتی ہو۔باقی تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا میں اس بارے بات نہیں کرنا چاہتا بس ایک مشورہ دینے کی جسارت کروں گا کہ آج کے بعد وہ سارے پرانے کام چھوڑ دو۔عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہوتا ہے۔تم نے قبیل خان سے بدلہ لینا تھا سو لے لیا،اب کسی اچھی جگہ شادی کر کے اپنا گھر بساؤ۔‘‘ایک لمحہ رک کر میں نے گفتگو کو طول دینے کے لیے الفاظ کی تلاش میں اپنے دماغ پر زور دیا لیکن اس سے بچھڑنے کے غم نے ایک دم میری سوچوں پر حملہ آور ہو کر میری گویائی سلب کر لی تھی۔بڑی مشکل سے میں۔’’خدا حافظ۔‘‘کہہ کر ایک دم مڑا اور غار سے باہر نکل آیا۔میرے دل کو ایک انجانی ڈور

پیچھے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرا ضمیر بھی اسے اس حالت میں بے یارومددگار چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مگر اب وہاں رک کر میں اپنی نظروں سے نہیں گر سکتا تھا۔ بہ قول شاعر......

تعارف بوجھ بن جائے تو اس کا بھولنا بہتر

تعلق روگ بن جائے تو اس کا توڑنا اچھا

وہ افسانہ جسے تکمیل دے دینا ہو ناممکن

اسے اک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

غار سے نکل کر میں دوڑ پڑا۔ آہستہ چلنے کی صورت میں مجھے خدشہ تھا کہ میں پھر واپس لوٹ جاؤں گا۔ حویلی کے قریب پہنچا تو دھوپ پھیل گئی تھی۔

سب سے پہلے میں مورچے پر چڑھ کر وہاں موجود لاش کے پاس وہ پستول ڈھونڈنے لگا جس کے ذریعے اس نے پلوشہ کو اتنی دور سے گولی ماری تھی۔ مگر اس کے پاس کلاشن کوف پڑی دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی۔ گویا پلوشہ اس کی گولی سے زخمی نہیں ہوئی تھی۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے میں نے ایک بار پھر انیکسی میں جا کر دیکھا۔ وہ پستول ہی کا بلٹ تھا۔ کلاشن کوف اور پستول کے بُلٹ میں کافی فرق ہوتا ہے۔ اسے تو کوئی عام آدمی بھی پہچان سکتا ہے سناپر کی نظر تو اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔

''کہیں کوئی اور بھی یہاں موجود تو نہیں۔'' ایک روح فرسا خیال میرے دماغ میں جا گرا۔ مگر پھر میں نے یہ خیال سختی سے جھٹلا دیا، کیونکہ کسی بھی تیسرے کی موجودی میں شاید اب تک ہم اس کا نشانہ بن چکے ہوتے۔ میں زیادہ دیر اس مسئلے پر نہیں سوچ سکا تھا۔ میرے دل میں عجیب قسم کے وسوسے سر ابھارنے لگے تھے۔ پلوشہ کی مرہم پٹی تو میں نے کر دی تھی کیا وہ دوبارہ اپنی پٹی تبدیل کر پاتی۔ فطری تقاضے کے لیے وہ غار سے باہر کیسے نکل پاتی۔ وہ صبح شام خود کو دردکش اور اینٹی بائیوٹک انجیکشن کیسے لگا پاتی۔ میں نے اس کے پاس پانی کی تین بوتلیں بھر کر رکھی تھیں۔ کیا وہ پانی اس کی ضروریات کو پورا کر سکتا تھا۔ اور اگر کوئی جنگلی جانور خون کی بو پا کر غار میں گھستا تو وہ کیسے اس سے مقابلہ کرتی۔ اور اگر وہ جانور پر فائر کرتی تو کیا فائر کی آواز سن کر صنوبر خان کے آدمی چوکنا نہ ہو جاتے۔ میں تو اپنی جان چھڑانے کے شوق میں اسے موت کے منہ میں چھوڑ آیا تھا۔

بغیر تاخیر کے میں نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ بیرونی دروازے کے قریب پہنچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ بیڈ پر پلوشہ کا خون بکھرا دیکھ کر صنوبر خان یا البرٹ وغیرہ کو اندازہ لگانے میں دیر نہ لگتی کہ ہم دونوں میں کوئی ایک زخمی ہے پھر ایک گدا اور رضائی وغیرہ کو غائب دیکھ کر وہ یقیناً یہی سوچتے کہ ہم کہیں قریب ہی چھپے ہیں۔ ورنہ رضائی اور گدے کا ہم نے کیا کرنا تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہوئے میں نے ضرورت کی چند چیزیں حویلی سے باہر نکال کر رکھیں اور پھر اس چھوٹے کمرے کا رخ کیا جہاں وہ ڈیزل اور پٹرول وغیرہ ذخیرہ رکھتے تھے۔ تین چار بھرے ہوئے کین اس وقت بھی وہاں موجود تھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں میں نے وہ پٹرول انیکسی اور دوسرے کمروں میں چھڑک دیا تھا۔ وہاں موجود تین چار گیس سلنڈر بھی میں نے کھول دیے۔ اور پھر پٹرول کو ایک لکیر کی طرح زمین پر گراتا ہوا میں داخلی دروازے تک آیا اسے تیلی دکھا دی۔ آگ سرعت سے زمین پر پڑے تیل کو چاٹتی ہوئی کمروں کے دروازے تک پہنچی۔ میں نے حویلی سے باہر نکل کر ضروری سامان اٹھایا اور اپنی جانِ حیات کے مسکن کی طرف چل پڑا۔ گیس سلنڈروں کے پھٹنے کے دھماکے میرے کانوں میں پڑے اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک بار پھر صنوبر خان سے دشمنی کا آغاز ہو گیا تھا۔

غار تک پہنچتے ہوئے سورج کافی تیز ہو گیا تھا۔ ساری رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی تھی۔ مجھے اس وقت بھوک کے ساتھ چائے کی بھی سخت حاجت محسوس ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں وہ میری واپسی کو کیا نام دے گی۔“ غار کے اندر داخل ہوتے ہوئے میرے دماغ میں بس یہی سوال گردش کر رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے تھے۔

سامان نیچے رکھ کر میں نے سب سے پہلے آگ جلائی اور دودھ کا پیکٹ کھول کر اس کے لیے دودھ گرم کرنے لگا۔ اوولٹین ملا کر میں نے دودھ گلاس میں ڈالا اور ایک پیسٹری کا ریپر اتار کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”مجھے چائے پینا ہے۔“ میں نے اتنے عرصے بعد پہلی مرتبہ وہ مدھر اور پیاری آواز سنی تھی۔ ورنہ کل رات سے وہ مسلسل خاموش ہی تھی۔

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''دودھ پی لو پھر چائے بھی بناتا ہوں۔''

مزید کچھ کہے بنا اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں جلدی سے دودھ کا گلاس نیچے رکھ کر اسے اٹھنے میں مدد دینے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی میں نے دودھ کا گلاس اور پیسٹری اسے تھما دی۔ اس کے بازوؤں سے پکڑتے وقت مجھے اس کا جسم کافی گرم لگا تھا۔ یقیناً اسے بخار ہو رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے اکیلا چھوڑ کر جانے کے فیصلے پر پچھتانے لگا۔ مجھے ایسا کرنا کسی طور بھی زیب نہیں دیتا تھا۔

پیسٹری ایک بار دانتوں سے کاٹ کر اس نے واپس رکھ دی تھی البتہ دودھ وہ ہلکے ہلکے گھونٹ لے کر پیتی رہی ۔میں چائے بنانے لگا۔ میرے چائے بنانے تک وہ گلاس خالی کر چکی تھی۔ ایک پیالی میں چائے ڈال کر میں نے اس کی طرف بڑھا دی۔ پیالی تھماتے ہوئے اس کی پرکشش آنکھیں میری طرف اٹھیں میں اس کی طرف ہی متوجہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں مجھے اضطراب کی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''یہ بھی کھا لو نا۔'' میں پیسٹری کی طرف اشارہ کیا۔

''دل نہیں کر رہا۔'' کہہ کر وہ چائے پینے لگی۔

میں خود وہ پیسٹری اٹھا کر کھانے لگا۔ اس کے دانتوں نے اس پیسٹری کو کاٹا تھا۔ محبوب کے منہ سے لگی ہوئی کوئی بھی چیز چاہنے والے کے لیے ایک نعمت ہی تو ہوتی ہے۔ پیسٹری کھا کر میں نے بسکٹ کا ایک پیکٹ کھول کر معدے کو تقویت دینے لگا۔ وہاں مجھے اعلا کوالٹی کے بسکٹ اور پیسٹریاں وغیرہ پڑی ہوئی ملی تھیں جو یقیناً امریکی آقاؤں کی خاطر رکھی گئی تھیں۔ میں تمام ہی سمیٹ لایا تھا۔

میں جونھی چائے پی کر فارغ ہوا وہ آہستہ سے بولی۔

''مجھے تازہ دم ہونا ہے۔''

''چلو۔'' اسے بازوؤں میں بھر کر میں باہر لایا اور ایک مناسب جگہ اتار کر پانی کی بوتل اس کے ساتھ رکھ کر آڑ میں ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آواز آئی۔ ''آ جائیں۔''

میں نے دوبارہ اسے بازوؤں میں بھرا اور بستر تک لے آیا۔ اسے لٹاتے ہوئے میں نے اس کے ماتھے پر

ہاتھ رکھا اس کے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا تھا۔ مجبوراً اسے لٹانے سے پہلے میں نے بخار اور سکون کی گولی کھلانا مناسب سمجھا۔

گولی کھلا کر میں نے اسے احتیاط سے پیچھے لٹایا اور اس کے جسم پر رضائی درست کرنے لگا۔ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کر کے میں نے کلاشن کوف کندھے سے لٹکائی اور ہاتھوں میں دوربین پکڑ کر باہر نکل آیا۔ وہ غار اس پہاڑی کے قریباً درمیان میں بنی ہوئی تھی۔ میں درختوں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ بیس پچیس منٹ بعد میں چوٹی تک پہنچ گیا تھا۔ ایک بڑے پتھر کے عقب میں لیٹ کر میں حویلی کا جائزہ لینے لگا۔ حویلی سے اٹھتا ہوا دھواں اس بات کا مظہر تھا کہ اسے ابھی تک آگ لگی ہوئی تھی۔ گو اس آگ سے ان کے سامان اور لکڑی کے دروازوں ہی کو نقصان پہنچنا تھا لیکن یہ نقصان بھی کافی زیادہ تھا۔ چھت میں چونکہ لکڑی وغیرہ کا استعمال نہیں ہوا تھا اس لیے چھتیں اور دیواریں محفوظ تھیں۔ ابھی تک صنوبر خان وغیرہ میں سے کوئی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ کیونکہ حویلی کے قریب مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

چند لمحے اچھی طرح اطراف کا جائزہ لے کر میں نیچے اتر آیا۔ غار میں داخل ہوتے ہی پلوشہ کی بھاری سانسوں نے مجھے اس کے سو جانے کا مژدہ سنایا تھا۔

اس کا چہرہ رضائی سے باہر تھا۔ نزدیک ہو کر میں اسے محبت بھری نظروں سے گھورنے لگا۔ نزدیک آتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ میں چاہ کر بھی اس سے نفرت نہیں کر پا رہا تھا۔ بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگنے لگی ہے۔ شاید اب وہ ناممکن الحصول ہو چکی تھی اور ایسی شخصیت جو رسائی سے دور ہو ہمیشہ انسان کو زیادہ پرکشش لگنے لگتی ہے۔

میں بھی ساری رات کا تھکا ہوا تھا۔ مجھے بھی نیند آنا چاہیے تھی مگر پلوشہ کی قربت نے میری نیند اڑا دی تھی ۔ میں بس اس کے سرہانے بیٹھا اسے محبت پاش نظروں سے گھورتا رہا۔ کافی دیر میں اسی شغل میں مصروف رہا ۔ اچانک اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی اور کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے رخ موڑ کر اپنا بستر ٹھیک کرنے لگا۔ حویلی کو آگ دکھانے سے پہلے میں نے دو کمبل اور تکیہ وغیرہ اپنے لیے سنبھال لیے تھے۔

بستر بچھا کر میں اس کی طرف مڑا۔اس کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو چکی تھیں۔میں بھی بستر میں گھس کر اس کی طرف رخ کر کے لیٹ گیا۔جلد ہی نیند نے مجھے غافل کر دیا تھا۔گو ہم دونوں کا اس طرح سو جانا مناسب نہیں تھا۔لیکن اس غار کی جگہ ایسی تھی کہ وہ آسانی سے کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔سب سے بڑھ کر غار کے دہانے پر موجود درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے یہ غار لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کہیں سہ پہر کے قریب جا کر کھلی تھی۔پلوشہ جاگ رہی تھی اور چت لیٹی غار کی چھت میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔بستر سے نکل کر میں نے پانی کی خالی بوتلیں اٹھائیں اور غار سے باہر نکل آیا۔نالے میں صاف وشفاف پانی بہہ رہا تھا۔وزیرستان کی پہاڑیوں میں کافی چشمے مل جاتے ہیں۔نالے میں اتر کر پہلے تو میں نے وضو کر کے وہیں پر عصر کی نماز ادا کی اور پھر پانی کی بوتلیں بھر کر واپس لوٹ آیا۔

پلوشہ کی پٹی تازہ کرنی تھی۔پائیوڈین اور صاف پٹی دوائیوں کے بکس سے نکال کر میں اسے مخاطب ہوا۔

”کیا پٹی تبدیل کر لو گی؟“

میری طرف متوجہ ہو کر اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔بے ایمان دل کو تو بس اسے چھونے کا بہانہ چاہیے تھا۔

”اچھا میں کر دیتا ہوں۔“میں نے پہلے کی طرح اس کے جسم پر چادر بچھا کر زیریں لباس اتارا اور پرانے والی پٹی کھول کر نئی پٹی باندھنے لگا۔پرانی پٹی خون سے تر تھی لیکن خون کا رسنا رک گیا تھا۔نئی پٹی باندھ کے میں نے درد کش انجکشن کولہے میں لگایا۔اور پھر اس کا لباس درست کر کے اسے بازو میں انٹی بائیوٹک انجکشن لگانے لگا۔اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ وہ مسلسل مجھے گھورے جا رہی ہے۔

خالی انجکشن ایک طرف پھینک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا،مگر اس نے نظریں چرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اسی طرح مجھے گھورتی رہی۔میں بھی بے اختیار اسے دیکھتا چلا گیا۔اچانک اس کی آنکھوں میں جوار بھاٹا اٹھتا محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی سیلابی ریلا پلکوں کے پشتے کو خاطر میں نہ لاتا ہوا بہہ نکلا۔میں سارے شکوں،گلوں اور نفرتوں کو پس پشت ڈالتا ہوا تڑپ کر آگے بڑھا اگلے ہی لمحے اس کا کومل وجود

میری آغوش میں تھا۔

''کیا ہوا......میری جان!'' میرے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔ اتنا سنتے ہی اس کے منہ بلند چیخ نکلی اور وہ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر مجھ سے یوں لپٹی جیسے لوہا مقناطیس کو چمٹتا ہے۔ اور پھر زوردار سسکیوں کے ساتھ اس کے منہ سے بے ربط الفاظ نکلنے لگے......

''کہا تھا نا جلدی آنا مجھے ڈر لگ رہا ہے......میں نے کہا تھا مجھے کچھ ہو جائے گا، مگر تمھیں تو اپنی نوکری کی پڑی تھی نا...... بھاڑ میں جائے تمھاری نوکری...... مجھے اذیتوں، مصیبتوں اور دکھوں کے حوالے کر کے سکھ کما لیا ہے نا......مل گیا ہے سکون، آ گیا ہے آرام......ذلیل کمینے میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی......کبھی نہیں...... کبھی نہیں..........'' گلہ کرنا میرا بنتا تھا، ناراض ہونا مجھے جچتا تھا......شکوے شکایتیں میں نے کرنا تھیں۔ مگر وہ کچھ سوچے بغیر سارا الزام میرے سر پر پھینکے جا رہی تھی۔ اس کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ میں اسے روکتا ٹوکتا۔ یوں بھی میں نے اس کی ساری غلطیاں معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے دور رہنا ممکن ہی نہیں تھا تو دوری کیسے اختیار کرتا۔ اس کا واویلا حد سے بڑھتا دیکھ کر مجھے اس کا منہ بند کرنا پڑا اور خوش قسمتی سے ایسا کرنے کے لیے میرے ہاتھ فارغ نہیں تھے۔

وہ مدہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ جانے کتنی دیر میں اسے اپنی آغوش میں لیے ماحول سے بے خبر بیٹھا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ پر سکون ہوتی گئی۔ اس کے آنسو تھمے، سسکیاں بند ہوئیں اور وہ اپنی مسحور کن آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر مجھے وہی دھیمی دھیمی شوخ مسکراہٹ نظر آ رہی تھی جس نے مجھے اس کا دیوانہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

''اب بتاؤ، گلہ کرنا میرا بنتا ہے یا تمھارا۔'' اسے متبسم دیکھ کر میں نے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ پر زور لہجے میں بولی۔ ''میرا......میرا......میرا۔''

''وہ کیوں؟'' اس کی ناک کی پھننگ سے پکڑ کر میں نے آہستہ سے مروڑا۔

''کیونکہ آپ کی لاڈلی جو ہوں۔'' اس کا ناز بھرا انداز مجھے نہال کر گیا تھا۔

''جانتی بھی ہو مجھ پر کیا بیتی۔''

اس کے چہرے سے تبسم غائب ہوا اور اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”نہیں اور نہ جاننا چاہتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے کو تیار ہوگئی تھیں۔

”اگر ایک آنسو بھی گرا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس کی پلکوں کے آشنا لمس کو لبوں سے محسوس کرتے ہوئے میں نے تنبیہ کی۔

”راجو!...... مجھے معاف کردو۔“ مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے چاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ”راجو کی جان!...... کردیا معاف۔ ایک بار نہیں ہزار بار معاف کردیا۔ پھر ایسا کرو گی پھر معاف کروں...... جتنی بار کرو گی اتنی بار معاف کروں گا۔“

”وجہ نہیں پوچھو گے؟“

”کبھی نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”البتہ بتانا چاہو تو سنوں گا ضرور۔“

”نہیں بتاؤں گی...... آپ پوچھیں گے تب بھی نہیں بتاؤں گی۔“

میں نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”باقی باتوں کو چھوڑیں، بس آپ مجھ سے ابھی ابھی شادی کریں۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چند شرائط ماننا پڑیں گی۔“

”فرماؤ؟“ اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”بال نہیں کٹواؤ گی، مردانہ لباس نہیں پہنو گی، کانوں میں بالیاں اور ناک میں کوکا پہنو گی، مردوں میں نہیں ناچو گی اور خودکشی کرنے کی دھمکی نہیں دو گی۔“

وہ دلبری سے مسکرائی۔ ”آخری شرط کے علاوہ باقی سب منظور ہیں۔“

”نہیں جی، سب سے اہم تو آخری شرط ہی ہے۔“

”راجو!...... اب مذاق کو چھوڑیں۔“

”چندا کوئی مولوی تو مل جائے نا؟“

''نکاح مولوی کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر گواہ کہاں سے لائیں گے۔''

''آپ بس جان چھڑانا چاہ رہے ہیں۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔

میں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔''اللہ پاک کی قسم جان نہیں چھڑا رہا۔ انگور اڈے پہنچتے ہی پہلا کام یہی کروں گا۔''

''اگر ایسا نہ کیا تو خدا قسم میں اپنی جان......'' اتنا کہہ کر وہ ایک لمحہ کو رکی اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔''پتا تو چل گیا ہوگا۔''

''جی ہاں چل گیا ہے پتا......تمھاری بکواس کرنے کی عادت اتنی جلدی تو ختم نہیں ہو سکتی۔''

''نہیں ہوگی......نہیں ہوگی......نہیں ہوگی۔'' لاڈ بھری ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اس نے میری گود میں سر رکھا اور اپنے بازو میری کمر کے گرد لپیٹ لیے۔

ایک دم وہ پرانی پلوشہ کے روپ میں میرے سامنے آ گئی تھی۔ وہی شوخی، ویسے لاڈ اور وہی محبوبانہ انداز۔ میرے دماغ میں صنوبر خان کے آدمیوں کی سنی ہوئی باتیں گونجیں مگر میں نے خود میں اتنی جرأت مفقود پائی تھی کہ اس سے دریافت کر سکتا۔ وہ اس کا رشتا کسی منور خان نامی آدمی سے جوڑ رہے تھے جو ان کے بہ قول پلوشہ کا محبوب تھا۔ اور اس کے لیے پلوشہ نے میرا سودا کیا تھا۔ مگر پلوشہ کا انداز دیکھتے ہوئے ذرا بھر بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اسے مجھ سے زیادہ کوئی دنیا میں عزیز بھی ہے۔ اس کی چاہت میں نہ تو کوئی کھوٹ نظر آ رہا تھا اور نہ وہ ویسی لگ رہی تھی جیسی ان تمام نے بکواس کی تھی۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پوچھنے لگی۔''کہاں گم ہو گئے ہو؟''

''یہیں ہوں۔'' میں ہولے سے مسکرایا۔''اپنی چندا کو گود میں لیے بیٹھا ہوں۔''

''ہاں بس ایسے ہی بیٹھے رہو......میں تو سونے لگی ہوں۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

مجھے سوالیہ نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمھیں گولی کیسی لگی تھی؟“

اس کے ہونٹوں پر دل آویز تبسم ابھرا۔سچ سچ بتا دوں۔“

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔”بالکل سچ……کیوں کہ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔“

”اگر وعدہ کرو کہ نہ تو کچھ کہو گے اور نہ ناراضی کا اظہار کرو گے تو شاید سچ اگل دوں۔“

”کوشش کروں گا۔“ مجھے اپنے اندیشے صحیح ہوتے نظر آرہے تھے۔

وہ مصر ہوئی۔”نہیں جی وعدہ۔“

”اچھا وعدہ رہا۔“ بادل نخواستہ مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔

”میں نے خود ہی ماری تھی۔“ میرے دل میں چھپے شبہات کو اس نے حقیقت کا جامہ پہنایا۔

”مگر کیوں……؟“ میں چیخ ہی تو پڑا تھا۔

”کیا آپ نہیں جانتے۔“ وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

”نہیں……میں نہیں جانتا کہ تم نے یہ بے وقوفی کیوں کی۔“

”کیوں کہ میں راجو کے بغیر مر جاتی……کیسے آپ کو وہاں چھوڑ کر آجاتی……میں جانتی ہوں آپ مجھے قصور وار سمجھ رہے ہیں، نامعلوم انھوں آپ کو کیا کیا کہانیاں سنائی ہوں گی اور پھر میں نے آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کو پکڑوانے کا معاوضا بھی تو وصول کیا تھا۔وہاں میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنی صفائیاں دیتی رہتی ۔یہ بھی ممکن تھا کہ آپ میری کسی بات پر یقین نہ کرتے۔اس لیے جب آپ نے مجھے آزاد کر کے بھاگنے کو کہا اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آپ کو ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گی……اور آپ کو ساتھ لے جانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اس طرح زخمی ہوتی کہ خود حرکت کے قابل نہ رہتی تبھی آپ مجھے وہاں سے خود نکال کر لاتے ۔اس کے ساتھ میں نے خود کو گولی بھی ایسی جگہ پر ماری کہ آپ کسی اور سے میرا علاج بھی نہ کرا سکیں۔اور دیکھ لو وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔“

”چندا!……ایسا کرتے ہیں بھلا۔“ اس کی چاہت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

”تو اور کیا کرتی……کیسے آپ کو ساتھ لانے پر مجبور کرتی۔“

”میں تم سے پوچھ تو رہا تھا کہ بتاؤ کیوں آئی ہو......تم نے کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی بس چپ چاپ مار کھاتی رہیں۔“

”اور صنوبر خان کا پالتو جو کچھ کہہ رہا تھا وہ بھول گئے ہیں آپ...... بلکہ آپ کو تو بہانہ چاہیے تھا میری پٹائی کرنے کا۔“اس کے لہجے سے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اسے میری وہ حرکت ناگوار گزری تھی۔

”ویسے تم اتنی نازک کب سے ہوگئی ہو کہ ذرا سا تھپڑ کھا کر کراہنا شروع کر دیتی تھیں۔“

”آپ کی نظر میں تو نازک ہوں نا۔“اس نے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں چندا!......میری نظر میں تو تم پھولوں اور کلیوں سے بھی نازک ہو۔“

”تو بس آپ کے تھپڑ کھا کر ہی تو کراہ رہی تھی۔کوئی اور کتنی بھی کوشش کر لیتا میرے منہ سے اف نہیں سن سکتا تھا۔البتہ آپ کی بات اور تھی۔آپ کو تو اپنی کراہیں سنا کر جانچ رہی تھی کہ آیا اب بھی مجھے پیار کرتے ہو یا دل سے نکال بیٹھے ہو۔“

میں نے چاہت سے کہا۔”تمھیں دل سے نکالنے کے لیے، دل ہی کو سینے سے نکالنا پڑے گا۔“

”جھوٹا۔“اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈالتے ہوئے مجھے نیچے کی طرف کھینچا اور میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔

اس کا مطمح نظر پورا کر کے میں نے پوچھا۔”اچھا یہ بتاؤ تم روئی کیوں تھیں۔“

”آپ کی محبت دیکھ کر رونا آ گیا تھا۔“

”محبت......؟“میں حیران ہی تو رہ گیا تھا۔

”ہاں محبت......آپ اگر اس وقت آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیتے تو آپ کو پتا چلتا کہ رونی صورت کیا ہوتی ہے۔اپنے تئیں آپ غصہ اور نفرت دکھا رہے تھے جبکہ آپ کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ ساری چوٹیں جو بہ ظاہر مجھے لگ رہی تھیں ان کا نشانہ آپ کا اپنا دل ہے۔“

”میری دلی کیفیت جاننے کے باوجود تم نے کسی قسم کی صفائی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”محبت کرنے والے صفائیوں کے محتاج نہیں ہوتے......اور یقین مانو اس وقت میرا صفائی دینا کسی کام کا

نہیں تھا۔ بلکہ سچ کہوں تو اگر اس وقت میں آپ کو ساری بات بتا دیتی اور آپ میری بات کو ایک بار بھی غلطی سے جھٹلا دیتے تو مجھے مرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔''

''ساری کہانی تو تم نے مجھے اب بھی نہیں بتائی۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔''ہاں نہیں بتاؤں گی، جب تک شادی نہیں کر لیتے نہیں بتاؤں گی۔''

''جانتی ہو انھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے بعد کیا کیا باتیں سنائیں؟''

''راجو!...... کہہ دیا نا، میں نے کچھ نہیں سننا...... کیوں مجھے اذیت دینا چاہتے ہیں۔''

''سننا تو پڑیں گی راجو کی جان۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ہم شادی کر سکیں گے۔''میں مصر ہوا اور اس نے آنکھیں بند کر کے خاموشی اختیار کر لی۔

وہ تمام بکواس کر رہے تھے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی ہو اور اس سے شادی کرنے کے لیے تمھیں پندرہ لاکھ روپے درکار تھے............''میں نے دھیمے لہجے میں صنوبر خان کے آدمیوں سے سنی ہوئی ساری بکواس دہرا دی۔

''آپ نے ان کی باتوں کا یقین کر لیا......''اس نے جیسے کراہتی ہوئی آواز میں پوچھا۔''اور اسی لیے آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں صنوبر خان سے ملاقات کرنے کو لوٹی ہوں۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔''پتا نہیں یقین کیا یا نہیں۔''

''تو گویا اب ہماری شادی میں میری پارسائی رکاوٹ بن گئی ہے۔''اس مرتبہ اس کے لہجے میں عجیب قسم کی بے گانگی در آئی تھی۔

''اللہ پاک کی قسم بالکل بھی نہیں......اگر ایسی بات ہوتی تو کیا تم میری گود میں لیٹی ہوتیں۔''

''پھر شادی کا طعنہ کیوں دیا؟''اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اس کی وجہ تم نہیں میں خود ہوں...... یہ ضمنی بات تھی اصل بات اور ہے......''اتنا کہہ کر میں اسے البرٹ بروک کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کی کہانی سنانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا......''اب میں نہ صرف امریکنوں اور صنوبر خان کا دشمن نمبر ایک ہوں بلکہ ان کے ساتھ پاک آرمی بھی مجھے کسی صورت معاف نہیں کرے گی۔ تو کیا تم کسی ایسے آدمی کو اپنا شریک حیات بنانا چاہو گی۔ جو ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہو۔''

میری بات ختم ہوتے ہی اس کے منہ سے گہرا سانس خارج ہوا۔میں نے اس کے موہنے چہرے کی طرف دیکھا جو خوشی سے کھل رہا تھا......"راجو!......یہ تو انھوں نے دھوکے سے آپ کو پاک آرمی کا دشمن بنا دیا ہے اور امید ہے جلد ہی پاک آرمی کے سامنے سچائی آجائے گی،اگر آپ سچ مچ بھی ایسے ہوتے تب بھی میرا انتخاب آپ ہی ہوتے ......بلکہ ساری دنیا بھی آپ کے خلاف ہو جائے تب بھی پلوشہ آپ ہی کا چناؤ کرے گی۔اور جہاں تک صنوبر خان کے آدمیوں کی بکواس کا تعلق ہے اللہ پاک کی قسم آپ کی پلوشہ کو آج تک نہ تو کسی نے اس طرح چھوا ہے جیسے آپ چھوتے ہیں اور نہ اس حال میں دیکھا ہے جیسا آپ دیکھ چکے ہیں......سپوگمائے باجی کی عزت کی خاطر میں نے اپنا بچپن کھیلنے کودنے کے بہ جائے سخت قسم کی تربیتی مشقوں میں گزار دیا تھا،اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میں خود اتنی بے راہ رو اور سستی ہو جاؤں......اور نہ جانے وہ کس منحوس منور خان کو میرا محبوب بنا کر پیش کر رہے ہیں۔میں نے زندگی میں ایک مرد سے محبت کی ہے اور وہ وہی ہے جس کی گود میں اب بھی سر رکھ کر لیٹی ہوں ،بہ خدا اگر میری اس بات میں ذرا بھر جھوٹ ہو تو مجھے مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہ ہو۔میں مانتی ہوں میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔میرا چھوٹا بھائی اور میری ماں ،میرے لیے آپ سے بڑھ کر نہیں ہیں......مگر میں کمزور پڑ گئی ......شاید اس لیے کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو جان سے نہیں ماریں گے......شاید اس لیے کہ میں کچھ مہلت حاصل کرنا چاہتی تھی اور شاید اس لیے کہ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر آپ کو کچھ بھی ہو گیا تو آپ کے قاتلوں کو فنا کر کے میں آپ کے پاس پہنچنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤں گی۔لیکن اب اس کی میں جو توجیہ دینا چاہوں وہ خود مجھے قابل قبول نہیں ہے کجا کسی دوسرے کو۔میں ہمیشہ آپ کی مجرم رہوں گی۔بے شک آپ مجھے کبھی معاف نہ کرنا بس خود سے دور نہ کرنا اس کے علاوہ مجھے ہر سزا منظور ہے۔"

"تو میری موت کے بعد تم تمام کو مار کر خودکشی کر لیتیں۔"میں نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے ڈانٹا۔

"آپ کے مرنے کے بعد کیا میں زندہ رہ پاتی۔راجو!......یاد رکھنا عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور اس کے بعد وہ کسی مرد سے سمجھوتہ تو کر سکتی ہے محبت نہیں کر سکتی اور میں سمجھوتہ کرنے کی عادی نہیں ہوں۔"

”جانتی ہو جب تم پندرہ لاکھ کی خطیر رقم لے کر اکیلی انگوراڈے کی طرف جارہی تھیں اس وقت مجھے یہ سوچ پریشانی میں ڈالے ہوئے تھی کہ اتنی بڑی رقم کی وجہ سے کوئی تمھیں جانی نقصان نہ پہنچادے۔“

”راجو!......“ میرا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ رو پڑی۔

”روتی کیوں ہو پگلی......وہ وقت تو بیت گیا ہے، اب تو بس میری چندا ہوگی اور میں۔“

”آپ شادی کرنے میں دیر کیوں کر رہے ہیں۔اگر پہلے میری بات مان لی ہوتی تو ہمیں ان آزمائشوں کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا۔“

”تو میں کب دیر کرنا چاہتا ہوں......پہلے بھی اس لیے موخر کیا تھا کہ دونوں خاندان مل بیٹھ کر اس خوشی کے موقع سے لطف اندوز ہوں، اب تو وہ خیال بھی دور جھٹک دیا ہے، بس کوئی گواہ مل جائیں میں چاند کو اپنی منکوحہ بنانے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کروں گا۔“

”کمانڈر نصراللہ کی بیٹھک میں جاتے ہیں وہاں ہم چھپ کر بھی وقت گزار لیں گے اور وہیں نکاح بھی پڑھا لیں گے۔“ اس کے دماغ کی سوئی بس ایک ہی خیال پر اٹک گئی تھی۔گو اب تو میں خود بھی اس کام کو موخر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تو جیسے باولی ہوتی جارہی تھی۔

”یہاں سے انگوراڈے تک جائیں گے کیسے؟“ میں نے مزاحیہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا میرا وزن بہت زیادہ ہے؟“ اس نے منہ بسورتے ہوئے شکوہ کیا۔اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”پھول کا بھی وزن ہوتا ہے کیا؟“ اس کا کومل چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے میں نے چاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تو پھر انگوراڈے تک جانے میں کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی بھی مسئلہ نہیں ہے......بس پیٹ پوجا کر کے نکلتے ہیں۔“

”سچ......“ وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

”بالکل سچ۔اب مجھ سے بھی یہ دوریاں برداشت نہیں ہوتیں......اتنی پیاری لڑکی کے پاس رہ کر خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

”جی جی......آرام سے رہیں......میں نے نکاح کی بات کی ہے......رخصتی کی نہیں۔“اس نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔

اور میں کھسیانے انداز میں اس کا سر تکیے پر منتقل کرتا ہوا۔ چولھے کی طرف بڑھ گیا۔اندھیرا چھانے لگا تھا۔آگ جلا کر میں نے شام کی نماز ادا کی اور پھر چائے بنا کر بسکٹ اور پیسٹریوں وغیرہ سے ہم پیٹ پوجا کرنے لگے۔کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ایک کلاشن کوف تو غار سے باہر پتھروں میں چھپادی تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگے اور دوسری کلاشن کوف گلے سے لٹکا کر میں نے چند ضروری دوائیاں بھی بکس سے نکال کر جیبوں میں بھر لی تھیں۔پلوشہ کو بازوؤں میں بھر کر میں غار سے باہر نکلا اور اسے کندھوں پر لاد کر انگور اڈے کی طرف روانہ ہو گیا ......سفر کرنے کے لیے پوری رات پڑی تھی اور مجھے امید تھی کہ آہستہ روی سے سفر کرتے ہوئے بھی ہم صبح صادق سے پہلے انگور اڈے تک پہنچ جاتے۔

اترائی اترتے ہی پلوشہ نے دھیمے لہجے میں کہا......”راجو!......یاد ہے جس دن آپ مجھ سے بات کرنے کے لیے کئی کلومیٹر چل کر آئے تھے۔اور بچھڑنے کے بعد پہلی بار ہماری بات ہو رہی تھی۔“

میں نے چاہت بھرے لہجے میں اعتراف کرتے ہوئے کہا۔”تم سے جڑی کوئی بات بھول سکتی ہے بھلا۔“

”ہماری وہ باتیں......خبیث صنوبر خان نے سن لی تھیں......جرگے میں چونکہ میری اصلیت کھل گئی تھی اور اس نے ماموں جان کے گھر کو پہلے سے تلاش کیا ہوا تھا اس لیے اسی رات صبح صادق کے قریب اس خبیث کے آدمی مجھے،امی جان اور میرے چھوٹے بھائی کو گرفتار کر کے لے گئے۔میں ہر تکلیف جھیل لیتی، ہر تشدد برداشت کر لیتی اپنی عزت اور عصمت کو بھی داؤ پر لگا لیتی مگر انھوں نے تو میرے معصوم بھائی اور بوڑھی ماں کو بے عزت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اگر وہ انھیں قتل کرنے کی دھمکی دیتے تب بھی میں ان کی دھونس میں نہ آتی۔مگر وہ ننگ انسانیت تو میرے معصوم بھائی جو بہ مشکل نو دس سال کا ہے اور بوڑھی عورت کے بارے ایسی ایسی شرمناک اور واہیات گفتگو کر رہے تھے کہ مجھے مجبور ہونا پڑا۔میرے حامی بھرتے ہی ایک کالی لڑکی اور ایک انگریز بھی وہاں آ گئے۔انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ میرے راجو کو کچھ نہیں ہوگا۔وہ پندرہ لاکھ کی رقم لینے کا ڈراما بھی اس کالی لڑکی کا تھا۔وہ یہ باتیں اپنے ساتھی کے ساتھ کر رہی تھی اسے معلوم نہیں تھا کہ میں انگریزی جانتی ہوں ورنہ

میرے سامنے ایسی گفتگو نہ کرتی۔ اگلے دن ہمیں علام خیل لایا گیا۔ رات کو میری آپ سے گفتگو ہوئی۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا رویہ رکھا کہ آپ کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے مگر آپ تو اپنی لاڈلی کی محبت میں ایسے اندھے ہوئے تھے کہ بغیر کسی غور و فکر کے بھاگتے چلے آئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ناز بھرے انداز میں ہنس دی تھی۔ جبکہ میں خود کو ملامت کرنے میں لگا ہوا تھا میری عزیز ہستی کے ساتھ کیا کچھ بیت گیا تھا اور میں اس کی محبت میں شک کرتا پھر رہا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس کی بات جاری رہی......

''آپ کو گرفتار کر کے انھوں نے وعدے کے مطابق میری امی جان اور بھائی کو رہا کر دیا۔ ایک مہربانی انھوں نے یہ کی تھی کہ وہ رقم مجھ سے واپس نہ لی۔ میں امی جان اور بھائی کو لے کر ڈیرہ اسماعیل خان پہنچی ......وہاں وزیرستان کے کافی مہاجرین پناہ گزین ہیں۔ ایک محلے میں کرایے کا گھر تلاش کر کے میں نے چند ماہ کا پیشگی کرایہ ادا کیا۔ اور بقیہ رقم امی جان کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد وہاں چند دن ان کے ساتھ ہی رہی تا کہ وہ اچھی طرح سے علاقے کو جان جائیں اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ میرے بغیر بھی رہ لیں گے تو اپنے راجو کے لیے واپس لوٹ آئی۔ چار پانچ دن پہلے ان کا ایک آدمی جو رخصت پر جا رہا تھا میرے ہاتھ چڑھ گیا۔ اس سے مجھے آپ کے بارے تمام تفصیل معلوم ہوئی۔ اور کل جب میں نے بہت ساری گاڑیوں کو وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تب میں نے اندر گھسنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب یہ میری بدقسمتی تھی کہ اندر داخل ہوتے ہی میں ان کی نظروں میں آ گئی۔ بعد کی کہانی آپ کو معلوم ہے۔''

ساری تفصیل اطمینان سے سننے کے بعد میں نے کہا۔''تم نے تو کہا تھا کہ شادی سے پہلے مجھے کچھ بھی نہیں بتاؤ گی۔''

''کہا تو تھا......لیکن آپ کی محبت دیکھ کر رہا نہیں گیا...... مجھے فخر ہے کہ میں نے آپ کو چاہا ہے، جو مرد اپنی عورت کا غیر مرد سے غلط تعلق دیکھ کر بھی اس کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا ایسے مرد کا ملنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اور میری خوش قسمتی کہ مجھے ایک ایسا ہی ہیرا مل گیا ہے۔''

''تم غلط کب سے ہو گئیں چندا!''

وہ ہنسی۔''آپ تک جو خبریں پہنچیں اس کے مطابق تو مجھ جیسی غلط لڑکی شاید ہی دنیا میں پائی جاتی ہو۔''

''اچھا دفع کرو پرانی باتوں کو...... یہ بتاؤ شادی کرنے کا کتنا معاوضا لوگی۔''

اس نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔''معاوضا......''

''ہاں ......تمھاری طرف رواج ہے نا کہ لڑکی والے، لڑکے والوں سے منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں ،اب چونکہ ہمارا کوئی سرپرست موجود نہیں ہے تو یہ سب ہمیں ہی طے کرنا پڑے گا نا۔''

''ہا......ہا......ہا۔''اس کے سریلے قہقہے نے میرے کانوں میں جلترنگ بجائے۔

میں مصر ہوا۔''ہنسو مت سچ سچ بتاؤ۔''

وہ شوخ لہجے میں بولی۔''میں نے پہلے ہی دن سے اپنی قیمت بتائی ہوئی ہے۔''

''یعنی پچاس لاکھ۔''میں نے تصدیق چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں، بس آپ پچاس لاکھ کی تمام صفریں ختم کر کے بقیہ رقم ادا کر دینا۔''

''پچاس لاکھ سے پانچ روپے پر اتر آئی ہو؟''میں نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی۔

وہ مسرور کن لہجے میں بولی۔''ڈرتی ہوں نا......کہیں انکار ہی نہ کر دیں۔''

''پگلی!......اپنی جان کی قیمت دے کر بھی تمھیں حاصل کرنا گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

وہ چاہت سے لبریز لہجے میں پوچھنے لگی۔''راجو!......میں آپ کو اتنی پیاری کیوں لگتی ہوں۔''

میں جھٹ بولا۔''کیونکہ تم ہو ہی اتنی پیاری۔''

''جھوٹا......یہ بات اس وقت بھول گئی تھی جب میری پٹائی کر رہے تھے۔''

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''وہ تو شادی کے بعد بھی کروں گا۔''

''اور جب میں روؤں گی تب؟''

''ہونہہ، ویسے یہ سوچنے کی بات ہے۔''میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔''بہرحال اس بارے بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔''اسی طرح کی پیار بھری نوک جھوک میں رستا کٹنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا ۔ایک دو مرتبہ میں پلوشہ کے کہنے پر ستانے کے لیے رکا تھا مگر مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پلوشہ کے پھول سے بدن کو اٹھا کر چلنا میرے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے جب میں کمانڈر نصر اللہ کی بیٹھک کے سامنے پہنچا۔ نیفے میں اڑسا پلوشہ والا پستول نکال کر میں بیٹھک کے بیرونی دروازے کا تالہ توڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی کمرے کو فقط کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کنڈی کھول کر میں پلوشہ کو بازوؤں میں بھرے اندر داخل ہوا اور اسے ایک چارپائی پر بٹھا کر اس کے لیے بستر بچھانے لگا۔ بستر بچھا کر میں نے اسے سلایا اور دوسری چارپائی اس کے قریب لگا کر خود بھی لیٹ گیا ۔وہ چت لیٹی تھی مگر اپنی گردن موڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔ میں بھی اس کی طرف کروٹ بدلے اسے دیکھے بغیر بیتے ہوئے دنوں کی کمی پوری کر رہا تھا۔ مگر ہم زیادہ دیر یہ وظیفہ جاری نہ رکھ سکے کہ بجلی چلی گئی۔

"راجو ٹارچ جلا لو نا؟" پلوشہ کی منت بھری آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی اس لوڈ شیڈنگ کو غنیمت سمجھ کر سوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر اس نے غیر متوقع طور پر میری بات مان لی تھی۔

☆......☆......☆

میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی تھی کوئی بیرونی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ باہر نکل کر میں نے دروازے کی درز سے جھانک کر کمانڈر نصر اللہ کو پہچانا اور دروازہ کھول دیا۔

"ارے آپ۔" وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"آئیں کمانڈر!" میں نے ایک طرف ہو کر اسے رستا دیا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ کنڈی کر دیا۔

"بڑے عرصے بعد نظر آئے ہو؟" مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔

"حالات نے اجازت ہی نہ دی۔" میں اسے ساتھ لیے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے کہا۔ "ویسے آپ کے متعلق کافی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔"

"کیسی باتیں۔" استفسار کے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

"ایک بات کی تصدیق تو آپ کے بتائے بغیر ہو گئی ہے۔" اس نے زنانہ کپڑے پہنے لیٹی ہوئی پلوشہ کی طرف اشارہ کیا۔ جو اسے دیکھتے ہی اٹھنے لگی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

کمانڈر نصر اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''بیٹی کیا ہوا ہے؟''

''اسے گولی لگی ہے۔'' پلوشہ سے پہلے میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ویسے میں تو یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ پلو خان، دراصل پلوشہ خان وزیر ہے۔''

''بات ہی حیرانی کی ہے۔'' میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''اچھا یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی......سب سے پہلے میرا خیال ہے ناشتا ہو جائے۔''

میں بے تکلفی سے بولا۔ ''بھوک تو لگی ہے۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پر تکلف ناشتے کو جڑے ہوئے تھے۔ ناشتے کے دوران ہی قبیل خان اور جہاں داد کے قتل اور اس کے بعد ہونے والے جرگے کی باتیں اس نے میرے سامنے دہرا دی تھیں۔ کوئی بھی واقعہ مختلف زبانوں سے گزرنے کے بعد حقیقت سے کافی دور ہو جاتا ہے۔ ہمارے واقعے میں بھی کچھ نئی باتیں شامل ہونے کے علاوہ کچھ باتیں حذف بھی ہو گئی تھیں۔ ناشتا کر کے میں نے ان باتوں کی اجمالاً وضاحت کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈر کو میں نے اپنی گرفتاری سے رہائی تک کے واقعات سنانے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھا تھا۔ ان حالات میں وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکتے تھے۔

میری بات ختم ہوتے ہی وہ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

''ذیشان صاحب!......آپ دونوں میرے بچوں کی جگہ پر ہیں اگر برا نہ منائیں تو سب سے پہلے میں آپ دونوں کے اکٹھا رہنے پر اعتراض کروں گا۔ ایک جوان لڑکے اور لڑکی کو بغیر کسی رشتے کے یوں ایک ساتھ رہنا بالکل ہی مناسب نہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ علیحدہ ہو جائیں......قبیل خان کے موت کے بعد میرا نہیں خیال کہ پلوشہ کو کسی اور جنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ اور اگر تم دونوں اکٹھا رہنے پر مصر ہو تو پھر شادی کر لو۔'' اس کی بات نے پلوشہ کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''محترم کمانڈر ہم اسی غرض سے آپ کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ ہم آج ہی نکاح کرنا چاہیں گے۔''

کمانڈر نصر اللہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''جزاک اللہ......آج تو پھر بہت مبارک دن ہے نماز ظہر کے بعد آپ دونوں کا نکاح کر دیا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ”شکریہ کمانڈر اس کے ساتھ ہی اگر آپ میرے لیے کچھ خریداری کر لیں۔“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔

”چلیں آپ کو بتاتا ہوں۔“ میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پلوشہ کے سامنے مطلوبہ سامان کی تفصیل بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

باہر آ کر میں نے دو ہزار ڈالر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے مطلوبہ سامان کی تفصیل بھی دہرادی۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ میں بیرونی دروازہ کنڈی کر کے پلوشہ کے پاس آ گیا۔

”کیوں جی، مجھ سے چوری چوری کیا منگوا رہے ہو؟“

”پلوشے، چپ کرو یار!...... دلہنیں ایسی بات چیت میں حصہ نہیں لیا کرتیں۔“

اس نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسی دلہن بننا بالکل گوارا نہیں ہے۔“

”اچھا شور کرنے کی ضرورت نہیں...... تمھاری پٹی تبدیل کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

وہ لجاتے ہوئے بولی۔ ”آپ باہر بیٹھیں میں خود تبدیل کر لوں گی۔“

”ہائیں۔“ میں حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ ”پہلے بھی میں ہی تو کرتا رہا ہوں۔“

وہ کھل کھلاتے ہوئے بولی۔ ”پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت تو میں آپ کو پھانس رہی تھی۔“

”بے حیا۔“ میں نے نئی پٹی اور پائیوڈین لے کر اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”راجو!...... میں سچ کہہ رہی ہوں میں پٹی تبدیل کر لوں گی۔“

”اچھا یہ لو، کرو تبدیل۔“ میں مطلوبہ سامان اس کے قریب رکھ کر صحن میں آ گیا۔ اس کا شرمانا میری سمجھ سے بالاتر تھا مگر شرماتے ہوئے وہ اور بھی پیاری لگنے لگتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آواز دے کر مجھے اندر بلا لیا۔ پرانی پٹی اٹھا کر میں نے باہر صحن کے ایک کونے میں پھینکی اور انجکشن تیار کرنے لگا۔

اینٹی بائیوٹک اور درد کش انجکشن لگا کر میں اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ بار بار وہ بے پایاں خوشی سے کہہ اٹھتی ...... ”راجو!...... مجھے یقین نہیں آ رہا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے بننے جا رہے ہیں۔“

میں خود بھی اس خوشی کو اتنا ہی محسوس کر رہا تھا جتنا کہ وہ۔ دو تین دن پہلے تک میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا نظر آ رہا تھا۔ غم اور دکھ مجھے اس طرح سے گھیرے ہوئے تھے کہ میرا سانس لینا محال ہو گیا تھا اور آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سارے غم اور دکھ درد بھولی بسری داستان نظر آنے لگے تھے۔ وہ میرے لیے کتنی ضروری اور اہم تھی اس بارے مجھے تب پتا چلا تھا جب میرے تئیں وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی تھی۔ اور اب ایک دم اس کا واپس ملنا مجھے اپنے رب کی بارگاہ میں شکر گزاری کے گہرے احساس سے سر ٹیکنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ہم کمانڈر نصر اللہ کی واپسی تک گپ شپ کرتے رہے۔ وہ مجھے تلخ ایام میں اپنی دگرگوں حالت کا بتا رہی تھی کہ میری جدائی میں اس کی کیا حالت بنی رہی۔ اس کی باتیں سن کر تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ذرا بھر بھی تکلیف نہیں کاٹی اور ساری اذیتیں میری جانِ حیات ہی کو چمٹی رہی ہیں۔

کمانڈر نصر اللہ میرا مطلوبہ سامان لے آیا تھا۔ سامان رکھ کر وہ نماز کے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میں نے سرخ لباس پلوشہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کپڑے پہنو...... میں بھی لباس تبدیل کرتا ہوں۔'' اپنے سفید کپڑے اٹھا کر میں بیٹھک کے صحن میں بنے غسل خانے میں گھس گیا۔ واپس پہنچنے پر وہ مجھے سرخ لباس پہنے نظر آئی۔ سرخ رنگ کے کڑھائی کیے ہوئے دوپٹے میں اس کا سفید چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ یاقوتی ہونٹوں پر چھائی شرمیلی مسکان مجھے بے خود کر گئی تھی۔

''بیٹھو نا۔'' مجھے مسلسل کھڑا دیکھ کر وہ لجاتے ہوئے بولی۔ اور میں چونک کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''اب نظر ہی نہ لگا دینا۔'' میری آنکھوں سے پھوٹتی چاہت دیکھ کر وہ شرمیلی مسکان سے بولی۔

میں نے وارفتگی کے عالم میں پوچھا۔ ''چندا! سچ سچ بتاؤ تم ہو اتنی پیاری یا مجھے لگ رہی ہو؟''

''مجھے اپنی شکل وصورت سے کچھ نہیں لینا دینا بس آپ کو پیارا لگنے کا احساس ہی میرے لیے کافی ہے۔''

''دو دن پہلے تک میں خود کو دنیا کا بدقسمت اور ناکام ترین انسان سمجھ رہا تھا اور آج مجھے خود سے خوش قسمت کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا۔''

وہ شرارت سے مسکرائی۔ ''یہ تو جب شادی کے بعد میں اپنی فرمائشیں پوری کرواؤں گی تب معلوم پڑے گا۔''

''بھول ہے تمھاری۔'' اس کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے میں سہلانے لگا۔

''سچ کہوں راجو!......تو مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔''

''بس تھوڑی ہی دیر کی تو بات ہے، کمانڈر نصراللہ، گواہوں کو لے کر آتے ہی ہوں گے۔''

''اب تو لمحے بھی صدیاں بن گئے ہیں۔'' اس نے بے چینی ظاہر کی۔ خود میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ میری بن جائے گی۔ ہزار ہا اندیشے اور وسوسے میرے دامن سے لپٹے تھے۔ مگر ہمارے اندیشوں کے برعکس کمانڈر نصراللہ ظہر کی نماز کے بعد اپنے دو جوان بیٹوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ راز داری کے تقاضے پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹوں کے علاوہ کسی کو دعوت نہیں دی تھی۔

رسمی کلمات کی ادائی کے بعد وہ نکاح کا خطبہ پڑھنے لگا۔ خطبہ پڑھ کر اس نے پہلے پلوشہ کی رضا مندی معلوم کی اور پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ...... ''پلوشہ خان وزیر بنتِ یامین خان وزیر تمھیں اپنے حبالہ نکاح میں قبول ہے۔''

میرا دل کر رہا تھا کہ سو بار کہوں۔ ''قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے......'' مگر شرم مانع ہوئی اور میں نے ایک دفعہ پر اکتفا کیا۔

''مبارک ہو۔'' مجھ سے معانقہ کر کے کمانڈر نصراللہ نے پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دونوں بیٹوں نے بھی مجھے مبارک باد دی۔ کمانڈر نصراللہ نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر سب کا منھ میٹھا کرایا۔

اس کے دونوں بیٹے تو مٹھائی کھا کر والد سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ جبکہ کمانڈر وہیں بیٹھ گیا۔

''اب کیا ارادہ ہے۔'' بیٹوں کے رخصت ہوتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

''چچا جان!......ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا جو حل ہو گیا ہے۔ فی الحال پلوشہ کے ٹھیک ہونے تک ہم یہیں رہیں گے اس کے بعد ہی کچھ سوچیں گے۔'' میں نے پہلی مرتبہ اسے اس رشتے سے پکارا تھا۔

''بیٹا!......آپ دونوں نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اگر مجھے پلوشہ کے بارے پہلے سے پتا ہوتا تو یقیناً بہت پہلے میں آپ پر زور دے چکا ہوتا۔ بہ ہر حال دیر آید درست آید۔'' انھوں نے میرے چچا کہنے پر خوشی کا اظہار

کرتے ہوئے مجھے بیٹا کہنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''ہم بہت پہلے یہ فیصلہ کر چکے تھے چچا جان!...... ہمارا خیال تھا کہ بزرگوں کی موجودی میں یہ بابرکت فعل سرانجام دیں گے۔مگر حالات ہمیں ایسا موقع دینے پر تیار نہیں تھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔''

''بلاشبہ بزرگوں کی شمولیت باعث برکت ہوتی ہے ،مگر جب حالات ایسے ہو جائیں تو دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

میں نے کہا۔''آپ ہمارے بزرگ ہی تو ہیں۔''

''بے شک۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہم دونوں ہی گفتگو کر رہے تھے۔پلوشہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔اس شوخ ،شرارتی اور نٹ کھٹ کی ساری تیزی طراری کہیں گم ہوگئی تھی۔

''چچا جان!......ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بزرگوں کے سامنے ایک بار پھر شادی کریں گے تاکہ وہ ہمارے فعل کا برانہ منائیں۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''وہ میرے فیصلے کو سراہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔''اب میں چلوں گا۔کسی چیز کی ضرورت ہوتو مجھے بلوالینا۔''

''ٹھیک ہے چچا جان!''میں انھیں رخصت کرنے دروازے تک چلا گیا۔بیرونی دروازہ کنڈی کر کے میں واپس کمرے میں آیا۔میری دلھن سرخ کپڑوں میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔اللہ پاک نے انسان کو نکاح کا طریقہ بھی بہ طور نعمت عطا کیا ہے۔دو گواہوں کے سامنے مرد اور عورت ہمیشہ ایک ساتھ رہنے کا اقرار کر کے ایک ایسے رشتے میں بندھ جاتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں رہتا۔وہ عورت جسے نکاح کے دو بولوں سے پہلے چھونا منع اور گناہ تھا نکاح ہوتے ہی اسے چھونا عبادت بن جاتا ہے۔وہ عورت جسے دیکھنا جائز نہیں تھا،نکاح کے بعد اس کا دیکھنا باعث ثواب ہوجاتا ہے۔میاں بیوی کا ایک دوسرے سے ہنسی مذاق اور دل لگی کرنا پسندیدہ ترین فعل گردانا گیا ہے۔جھوٹ ایک ایسا ناپسندیدہ فعل ہے جسے موجب لعنت قرار دیا گیا ہے۔لیکن بیوی کو خوش کرنے کے لیے اس کی جھوٹی تعریف کی اسلام اجازت دیتا ہے۔اور اب پلوشہ میری بیوی تھی۔میرا لباس،میرے زندگی

کی گاڑی کا دوسرا پہیہ، میری شریک حیات، میرے دکھ سکھ کا ساتھی، میرے ہونے والے بچوں کی ماں، میری محبتوں اور چاہتوں کا مرکز اور میری سب کچھ تھی۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے قریب بیٹھ گیا۔وہ مزید سمٹ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ شوخ و چنچل حسینہ شرما رہی تھی۔مگر میں اس وقت اسے تنگ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے میں نے گفتگو کی ابتداء کی۔

''چندا!......آخر میں نے تمھیں پا لیا ہے۔اس لمحے کے خواب جانے میں کب سے دیکھ رہا تھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ یوں ایک دم تم مجھے حاصل ہو جاؤ گی۔یقیناً یہ میرے پاک رب کا کرم اور رحمت ہے کہ تم میری شریک حیات بن گئی ہو۔میں اللہ پاک کا جتنا شکرادا کروں کم ہے۔میں جانتا ہوں میں تمھارے قابل نہیں ہوں۔تمھاری شخصیت،شکل وصورت، دلیری و بہادری اور غیرت مندی اس کی متقاضی ہے کہ تم کسی بادشاہ کی ملکہ بنتیں لیکن تم نے خود ایک بے بضاعت، غریب اور عام سی شکل وصورت کے فوجی کو پسند کیا۔اور تمھارا یہ احسان یہ فوجی کبھی نہیں اتار سکے گا۔البتہ نئی زندگی کی شروعات میں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دنیا کی ہر خوشی تمھارے قدموں میں ڈھیر کرنے کی کوشش کروں گا۔تمھیں رانی، ملکہ اور شہزادی بنا کر رکھوں گا۔تمھاری ہر خواہش میرے لیے حکم کا درجہ رکھے گی۔''میرے ہاتھ کو اس نے ایک دم سختی سے جکڑا، ایک تیز سسکی میرے کانوں میں گونجی اور وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا چندا!......''اپنا بازو اس کے گرد لپیٹتے ہوئے میں نے چاہت سے لبریز لہجے میں پوچھا۔مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر سسکیاں بھرتے ہوئے روتی رہی۔

میں نے اس کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا، آنسو بھری آنکھوں سے محبت کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔

ان سحر انگیں آنکھوں کو لبوں سے چھوتے ہوئے میں نے کہا۔''میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے چندا!......تم میرے لیے اللہ پاک کا ایک عظم تحفہ ہو......تم نے میرے دل کی اجڑی ہوئی دنیا کو جس محبت سے بسایا ہے وہ کوئی چھوٹا احسان نہیں ہے۔ایک ٹھکرائے ہوئے مرد کو گلے سے لگا کر تم نے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔ان پھول

سے رخساروں پر طمانچے مار کر یقیناً میں نے تمھیں بہت دکھ پہنچایا ہے، میں آج خلوص دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ان گھٹیا لوگوں کی جھوٹی باتوں میں آ کر میں نے تم پر شک کیا۔اس سے بہتر تھا کہ میں مر جاتا..........‘‘

ایک دم تڑپ کر اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے دائیں بائیں سر ہلا کر گویا مجھے سرزنش کی تھی۔

’’یہ حقیقت ہے چندا!......‘‘

’’راجو!......اگر مزید کچھ کہا تو میرا دل پھٹ جائے گا۔اللہ پاک کی قسم آپ مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں، میری غلطیوں کو اپنے کھاتے میں نہ ڈالیں۔قصوروار میں ہوں، مجرم میں ہوں۔عظیم تو آپ ہیں جو اتنے الزامات کے باوجود بغیر صفائی مانگے مجھے گلے سے لگا لیا۔‘‘ وہ پھر رونے پر تیار ہو گئی تھی۔

’’ویسے منہ دکھائی کے بغیر چاند کا دیدار کرا دیا ہے۔‘‘ میں نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا تا کہ وہ جذباتی کیفیت سے نکل آئے۔

اس نے لجا کر پلکوں کی چلمن گرا لی۔

’’اچھا پتا ہے میں نے چچا نصر اللہ کو سونے کے کنگن لانے کو کہا تھا۔کنگن تو نہ ملے سونے کی چوڑیاں مل گئیں۔یقیناً ان ریشمی کلائیوں میں پہلی بار چوڑیاں ڈالنے کا شرف مجھے ہی مل رہا ہے۔ہے نا؟‘‘

’’آنکھیں کھولے بغیر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔میں نے پیکنگ کھول کر سنہری چوڑیاں نکالیں اور اس کی دونوں کلائیوں میں چار چار چوڑیاں پہنا دیں۔چوڑیوں کے ساتھ چچا نصر اللہ گلابی رنگ کے نگینے والی خوب صورت انگوٹھی بھی بنوا لایا تھا۔انگوٹھی اسے پہنا کر میں نے اس کا ہاتھ لبوں سے لگاتے ہوئے کہا اب تو میں اس روشن چہرے کے دیدار کا حق دار ہو گیا ہوں نا......اب تو آنکھیں کھول دو۔‘‘

میرے درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے اس نے سحر انگیں آنکھیں کھول دیں۔

میں نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے ڈالرز کی پانچ گڈیاں نکال کر اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔’’تم نے پچاس لاکھ کا کہا تھا......یہ پچاس ہزار ڈالرز ہیں پاکستانی رقم میں یہ پچاس لاکھ سے زیادہ مالیت بن رہی ہے۔اب یہ نہ کہنا میں تمھاری امی جان کی منہ مانگی قیمت ادا نہیں کر سکا ہوں۔‘‘

''راجو!...... مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے، نہ سونا چاندی، نہ زیور، نہ زمین جائیداد اور نہ روپیا پیسا بس کبھی خود سے دور نہ کرنا۔ایک بار پہلے بھی کہا تھا میری غلطیوں کو بنیاد بنا کر مجھے خود سے جدائی کی سزا نہ دینا۔اور مجھے کچھ نہیں چاہیے کچھ بھی تو نہیں چاہیے۔''اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''وعدہ کرتا ہوں چندا!...... تمھیں خود سے کبھی جدا نہیں کروں گا، کبھی بھی نہیں۔تم چاہو گی تب بھی نہیں۔''

اس نے آنکھیں موند کر میری گود میں سر رکھ دیا اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ہم نہ جانے کتنی دیر یونھی ایک دوسرے کو محسوس کرتے رہے۔یہاں تک کہ کمانڈر نصراللہ رات کا کھانا لے آیا۔ہمیں رات ہونے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔کھانا کھا کر میں نے پوچھا......

''پٹی تو خود کر لو گی نا؟''

''جی نہیں۔''وہ لاڈ سے بولی۔''میرا سرتاج موجود ہے نا۔''

''بڑی آئی سرتاج والی۔''اس کے ناک کی پھننگ مروڑ کر میں اس کی پٹی کرنے لگا۔پٹی کر کے میں نے اسے ضروری دوائیاں کھلائیں، انجکشن لگائے اور ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔لیکن رات بھر اس نے مجھے سونے نہیں دیا تھا۔نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔خود میری آنکھوں سے بھی نیند غائب تھی۔اسے پانے کی خوشی ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔صبح صادق کے قریب کہیں جا کر میں نے اسے زبردستی سلایا۔میرے بازو پر سر رکھ کر وہ بے خبر سو گئی۔مجھے بھی نیند نے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا تھا۔نیند میں بھی اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور اسی طرح شوخی بھری مسکراہٹ اور چنچل اداؤں سے وہ میری نیند میں اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی رہی۔☆

☆......☆......☆

مہینے بھر میں اس کا زخم ٹھیک ہو گیا تھا۔اس دوران میں نے اس کی توانائی بحال کرنے کے لیے اسے خوب اچھی غذائیں کھلائی تھیں۔دودھ، شہد، مختلف قسم کے پھل، خشک میوہ جات، دنیا جہان کی اچھی غذائیں میں چچا نصراللہ کو کہہ کر منگواتا رہتا۔خرچ کے لیے البرٹ بروک کے دیے ہوئے کافی ڈالرز موجود تھے۔یوں بھی انگور اڈے میں دکاندار ڈالرز بڑی خوشی سے وصول کرتے تھے۔اس کے ساتھ وہاں ڈالرز کے بدلے پاکستانی رقم بھی

مل جاتی تھی ۔امریکنوں کی افغان آمد کے بعد افغانستان میں تو ڈالرز کا عام رواج تھا۔پلوشہ نے پچاس ہزار ڈالر یہ کہہ کر زبردستی واپس کر دیے تھے۔کہ اسے بس میری ہی ضرورت تھی۔

اس ایک ماہ کے دوران میں نے اس کے اتنے لاڈ اٹھائے تھے اتنی ناز برداری کی تھی کہ جتنے کی وہ حق دار تھی ۔کئی بار میری چاہت کو دیکھ کر وہ رونے لگ جاتی ۔اس کے مکمل صحت یاب ہونے کے بعد بھی ہمارا دل کہیں جانے کو نہیں کر رہا تھا۔ہم دونوں مستقبل کے اندیشوں سے بے نیاز بس ایک دوسرے کی ذات میں کھوئے ہوئے تھے۔محبوب کی معیت میں گزرے دن پر لگا کر گزر جاتے ہیں۔ہمیں معلوم بھی نہیں ہوا تھا اور ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔

نہ جانے ہم وہاں کتنا عرصہ مزید گزارتے کہ وصل کے شب و روز نے ہمیں ہر غم سے بے نیاز کر دیا تھا،لیکن ہم یہ بھول گئے تھے کہ دشمن ہماری تاک میں ہیں۔کمانڈر نصراللہ کو روزانہ بیٹھک میں کھانے پینے کا سامان پہنچاتے دیکھ کر یقیناً کسی کو شک ہو گیا تھا۔اور یہ شک کرنا اس لیے بھی بنتا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بیٹھک سے باہر نہیں نکلتا تھا۔اور پھر ایک دن ہم پر چھاپہ پڑ گیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی کہ میرے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی، یوں لگا جیسے کوئی دیوار سے نیچے اترا ہو۔آنے والا یقیناً اپنے تئیں ایسے وقت میں آیا تھا جب کہ عمومی طور پر لوگ سو جاتے ہیں لیکن میرے اور پلوشہ کے سونے میں ابھی تک کچھ وقت باقی تھا۔ہم تو کبھی کبھی باتوں باتوں میں صبح کر دیتے تھے۔ایک دوسرے کی باتیں سن کر ہمارا جی ہی نہیں بھرتا تھا۔اس وقت بھی ہم سرگوشیوں میں محو گفتگو تھے کہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے کا الگ ہی مزہ ہے۔وہ آواز پلوشہ نے بھی سن لی تھی۔

”کوئی ہے۔“ کہہ کر وہ ایک دم چوکنا ہوتے ہوئے میرے بازوؤں کے گھیرے سے نکلی میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

میں دوسری چارپائی پر پڑی کلاشن کوف کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک دروازہ دھکیلتے ہوئے دو آدمی اندر داخل ہوئے۔اگر میں کلاشن کوف اٹھانے کی کوشش کرتا تو یقیناً مارا جاتا۔کلاشن کوف کا خیال دل سے نکالتے ہوئے میں نے چھلانگ لگائی اور آگے والے آدمی سے توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح ٹکرایا۔اس نے ہاتھ

میں سائیلنسر لگا پستول تھامانا تھا۔میری ٹکر کھا کر وہ دیوار سے ٹکرایا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔لیکن اس سے پہلے کہ میں دوسرے سے نمٹنے کی کوشش کرتا اس کی سرد آواز میرے کانوں سے ٹکرائی......

''اگر ذراسی بھی حرکت کی تو کھوپڑی میں روشندان کھول دوں گا۔'' یہ فقرہ اس نے انگریزی میں ادا کیا تھا۔وہ دونوں غیر ملکی ہی تھے۔میں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے پیچھے مڑا۔اس دوران پلوشہ چارپائی سے اتر کر اس کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ کھلے دروازے سے ٹریسی والکر کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہوئی اس کی لات چھاتی میں کھا کر پلوشہ دیوار سے جاٹکرائی تھی۔اگر وہ دیوار سے ہاتھ نہ ٹیک لیتی تو یقیناً زیادہ زخمی ہوگئی ہوتی۔

پلوشہ کو لات کھاتے دیکھ کر میں نے بے چینی سے پہلو بدلا،مگر اسی وقت نیچے گرے ہوئے آدمی نے اپنا پستول اٹھا کر میری گردن سے لگا دیا۔اور مجھے ایک دم رکنا پڑا۔مجھ پر پہلے جس آدمی نے پستول تانا ہوا تھا اس نے بھی میرے قریب آ کر میرے بازو کو مروڑ کر پیٹھ پیچھے جکڑ لیا۔

دیوار سے ٹکرا کر پلوشہ پیچھے مڑی مجھے اس کے چہرے پر چھائی وحشت دیکھ کر ڈر لگ گیا تھا۔

''نہیں پلوشہ کوئی حرکت نہ کرنا۔''میں نے اسے روکنا چاہا۔میری گردن سے پستول لگائے ہوئے امریکن نے بھی اسے متنبہ کرنے کے لیے اس کی جانب پستول سیدھا کیا،لیکن ٹریسی والکر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرتے ہوئے کہا......

''چھوڑو اسے میں دیکھ لیتی ہوں۔''اس کے لہجے میں شامل اطمینان یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے خود پر کتنا اعتماد تھا۔لیکن وہ پلوشہ کی صلاحیتوں سے بھی ناواقف تھی۔پلوشہ نہ تو میری منت کو خاطر میں لائی تھی اور نہ اس نے اپنی جانب اٹھے ہوئے پستول کی دھونس کو کسی قابل سمجھا تھا۔وہ جارحانہ انداز میں ٹریسی والکر کی طرف بڑھی جو اسے آڑے ہاتھوں لینے کے لیے تیار تھی۔

☆......☆......☆

میں جانتا تھا کہ پلوشہ لڑائی بھڑائی میں کسی سے کم نہیں تھی،لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ ٹریسی والکر ایک خطرناک لڑاکا تھی۔اور پھر پلوشہ کو زخمی ہونے کے بعد عملی میدان میں قدم رکھتے ہی اتنے سخت حریف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

”میجر!......پلیز اسے کچھ نہ کہنا۔“ میں پلوشہ کے بجائے ٹریسی کی منت کرنے لگا۔

اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بھاری لہجے میں بولی۔ ”نہیں اس کی گرمی تو نکالنا پڑے گی نا۔“ یہ الفاظ اس کے منہ میں تھے کہ پلوشہ نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

اپنی جگہ کھڑے وہ نیچے جھکی اور اس کی ٹانگ پیچھے سے خم کھا کر پلوشہ کی چھاتی میں لگی، وہ کولہوں کے بل نیچے گر گئی تھی۔ غصے میں میری مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ ٹریسی نے ایک دم سیدھے ہو کر چھلانگ لگائی اور اس کا گھٹنا خطرناک انداز میں پلوشہ کے پیٹ کی طرف بڑھا۔ اگر وہ گھٹنا پلوشہ کے پیٹ میں لگ جاتا تو یقیناً اسے بے ہوش ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن پلوشہ کو میں نے کچھ زیادہ ہی نازک اندام سمجھ لیا تھا وہ اتنی کمزور نہیں تھی جتنی مجھے لگ رہی تھی۔ ٹریسی کا گھٹنا پیٹ تک پہنچنے سے پہلے وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ایک طرف کو ہوئی اور اگلے ہی لمحے اس کے ننگے پاؤں کے زوردار ٹھوکر ٹریسی کے چہرے پر لگی ٹریسی کولہوں کے بل گر کر پیچھے کو الٹ گئی تھی۔ لیکن ٹریسی نے ایک لمحہ بھی زمین پر نہیں گزارا تھا فوراً الٹی قلابازی لیتے ہوئے وہ پیچھے کی جانب کھڑی ہو گئی۔ مگر اس وقت تک پلوشہ زمین سے اٹھ کر اس پر چھلانگ لگا چکی تھی۔ پلوشہ کا دایاں گھٹنا خطرناک انداز میں اس کی چھاتی کی طرف بڑھا۔ اپنی کلائیوں کا کراس بنا کر ٹریسی نے بہ مشکل وہ وار سہا لیکن اس کے ساتھ ہی دو تین قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی تھی۔ اس کے عقب میں دیوار تھی مجبوراً اسے دیوار سے ٹکرا کر رکنا پڑ گیا تھا۔

پلوشہ کی حرکت نہیں رکی تھی۔ نیچے گرتے ہی وہ دائیں پاؤں پر گھومی اور اس کے بائیں پاؤں کی جچی تلی ضرب ایک بار پھر ٹریسی کی چھاتی میں لگی۔ ٹریسی کا سر زوردار انداز میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے چہرے پر چھائی استہزائیہ مسکراہٹ، غیض و غضب میں تبدیل ہو گئی تھی۔ یقیناً اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے مقابل کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔

زوردار ٹھوکر اس کی چھاتی میں لگاتے ہی پلوشہ کا دایاں ہاتھ دائرے میں گھوما، اگر اس مرتبہ وہ اپنے داؤ میں کامیاب ہو گئی ہوتی تو ٹریسی کا بے ہوش ہونا لازمی تھا۔ لیکن اس کے دائروی مکے کو اپنی ہتھیلی پر روکتے ہوئے ٹریسی نے سر کی زوردار ٹکر پلوشہ کی چھاتی میں رسید کی اور پلوشہ پیچھے کو الٹ گئی۔

ٹریسی نے اسے چھاپنے کے لیے اس پر چھلانگ لگائی مگر ایک دم اپنی ٹانگیں گھٹنوں سے موڑتے ہوئے

پلوشہ نے اپنے پاؤں ٹریسی کی چھاتی پر ٹیکے اور اسے سر سے پیچھے اچھال دیا۔اس کے ساتھ ہی وہ سپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔ٹریسی بھی الٹی قلابازی کھا کر اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ آمنے سامنے کھڑی تھیں۔پلوشہ کی گرمی نکالنے والی خود غصے میں تپ رہی تھی۔آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو تولتے ہوئے دونوں نے اکٹھی چھلانگ لگائی اور ایک دوسرے سے گھتم گھتا ہوگئیں ۔میں اپنی پلوشہ کو جتنا قابل سمجھتا تھا وہ اس سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ٹریسی کے ہر وار کو اگر اینٹ سمجھا جاتا تو وہ اس کا جواب پتھر سے دے رہی تھی۔دونوں نہ تو ہار ماننے کو تیار تھیں اور نہ تھکنے کو۔وہ ایسی دلچسپ اور خطرناک جنگ تھی کہ مجھے قابو کرنے والے پوری طرح اس میں کھو چکے تھے۔ٹریسی والکر کے بارے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک خطرناک لڑاکا تھی اور یہ بات اس کے ساتھی مجھ سے بہتر جانتے تھے۔اب گھریلو لباس پہنے ہوئے ایک عام سے لڑکی کو ٹریسی کا مقابلہ کرتے دیکھنا ان کے لیے یقیناً حیرت کا باعث تھا۔اور پھر وہ دونوں لڑتے ہوئے اپنے لباس وغیرہ سے غافل ہی ہوگئیں تھیں۔پلوشہ جیسی پر کشش دوشیزہ اور ٹریسی جیسی جاذب نظر فگر کی مالک لڑکی کے جسمانی زاویوں کو یوں چندفٹ کے فاصلے سے اس انداز میں دیکھنا ایک خوش کن نظارہ ہی تو تھا۔اور اس نظارے نے انھیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا وہ مجھ سے پوری طرح غافل ہو چکے تھے۔اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے۔میں نے ایک دم اپنا بازو مروڑے ہوئے شخص کے چہرے پر اپنے سر کے عقبی حصے کی زوردار ٹھوکر لگائی۔اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔دوسرے آدمی نے میری گردن سے پستول لگایا ہوا تھا۔میرے پیچھے ہٹتے ہی اس کا پستول میری آنکھوں کے سامنے تھا۔چوٹ کھا کر میرے عقبی جانب موجود آدمی کے منہ سے۔’’اف......‘‘ کی زوردار آواز نکلی اور میرا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔میں نے دوسرے آدمی کے ہاتھ سے پستول لینے کے بہ جائے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے پستول کی نال اس کی کھوپڑی کی طرف گھمائی اور ٹریگر دبا دیا۔

’’ٹھک۔‘‘ کی آواز کے ساتھ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ڈھیلی کر کے میں فوراً پیچھے مڑا اور عقبی جانب موجود آدمی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان گھٹنے کی زوردار ضرب لگائی۔وہ ابھی تک ناک والی ٹکر سے مدہوش تھا ٹانگوں کے درمیان لگنے والی ضرب سے وہ منہ کے بل گرا۔اس کے ہاتھ سے سائیلنسر لگا

پستول لے کر میں نے اس کی کھوپڑی میں بھی روشن دان کھول دیا تھا۔ یہ تمام کارروائی میں نے چند سیکنڈ کے اندر ہی کر ڈالی تھی۔

ان دونوں سے فارغ ہوتے ہی میں ٹریسی اور پلوشہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی وقت پلوشہ نے ٹریسی کی چھاتی میں لات مار کر اسے پیچھے کی طرف گرایا تھا۔

''ایک منٹ پلوشے!'' میں نے زوردار آواز دے کر پلوشہ کو آگے بڑھنے سے روکا۔ میرا پستول والا بازو ٹریسی کی طرف سیدھا ہوا۔ اس نے بھی اپنی جانب اٹھتی ہوئی گلاک کی بے رحم نال دیکھ لی تھی۔ اس کی آنکھوں سے کسی لبریز پیالے کی طرح خوف چھلکا اور وہ چلائی......

''ذی......گولی نہ چلانا۔'' وہ لوچ دار اور سریلی آواز ٹریسی والکر کی تو نہیں تھی۔ اور مجھے ذی صرف ایک ہستی ہی کہتی تھی جس کا نام کیپٹن جینیفر ہنڈ سلے تھا۔

وہ زمین سے اٹھ کر اپنی شناخت کراتے ہوئے بولی۔ ''میں جینی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے گریبان کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک باریک جھلی اس کے چہرے سے اترتی چلی گئی۔ کالے سیاہ چہرے کے نیچے جینیفر کا سرخ وسفید چہرہ نکل آیا تھا۔ اس کے سر کے بال سنہری تھے۔ لیکن اب یقیناً اس نے کسی لوشن سے بالوں کا رنگ بھی کالا کیا ہوا تھا۔

میرا پستول والا ہاتھ ابھی تک اس کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ لیکن اپنی پہچان کرانے کے بعد وہ بے جھجک میرے جانب بڑھی، اگلے ہی لمحے میرے پستول کو ایک جانب کرتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ثقافت کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے جینی!'' اسے ڈانٹتے ہوئے میں نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔ پلوشہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہمیں گھور رہی تھی۔ مجھے لگا وہ گر جائے گی۔

''اتنے عرصے بعد ملے ہو کیا میرا اتنا بھی حق نہیں بنتا۔'' اس نے شرمندگی ظاہر کیے بغیر منہ بنایا۔

''شاید تم بھول گئی ہو کہ تم میری دشمن ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''بھول ہے تمھاری......اگر دشمن ہوتی تو آج تم زندہ نظر نہ آرہے ہوتے۔''

”یہ مہربانیاں اپنے پاس رہنے دو سمجھیں......اور میں نے تمھیں منع کیا تھا کہ پلوشہ پر ہاتھ نہ اٹھانا۔“

”تمھاری پیلاوشہ بھی کوئی ہے۔“اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے عجیب سے تلفظ سے پلوشہ کا نام ادا کیا۔

”دانت مت نکالو...... تمھیں پتا بھی ہے یہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے۔“

”تو اس نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی...... تمھیں میرا احساس نہیں اور اس کے لیے مرے جا رہے ہو۔ بھول گئے ہو اس سے پہلے میں تمھاری زندگی میں آئی ہوں۔“

”جینی!......سمجھنے کی کوشش کرو پلوشہ میری بیوی ہے۔“

”بیوی......“جینیفر حیران ہی تو رہ گئی تھی۔”مگر شادی کب ہوئی؟“

”مہینا ہو گیا ہے اور یقین مانو ابھی ہم ہنی مون منا رہے تھے کہ تم مصیبت بن کر نازل ہو گئی ہو۔“

”تو ایسی لڑکیاں تو شادی کے بغیر بھی نہ نہیں کرتیں، تمھیں شادی کی ضرورت کس لیے پیش آ گئی۔“

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔”شاید تمھارا زندہ واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے۔“

وہ اعتماد بھرے لہجے میں بولی۔”تم جتنی بڑھکیں مار لو ایک بات تو یقینی ہے کہ تم مجھے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔“

”ہاں......مگر پلوشہ کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”اب ڈراؤ تو نہیں نا یار!“ بے تکلفی سے کہتے ہوئے وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پلوشہ ابھی تک کینہ توز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

”ویسے اپنی پیاری بیوی کو بھی بتا دو کہ میں دشمن نہیں ہوں۔“پلوشہ کو مسلسل گھورتے دیکھ کر وہ کہے بنا نہیں رہ پائی تھی۔

”پلوشہ، انگریزی اچھی طرح جانتی ہے محترمہ۔“میں نے دوسرے امریکی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاک اٹھا کر نیفے میں اڑسنے لگا۔

”اوہ...... یہ بات ہے۔“وہ پلوشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔”بے بی غصہ تھوک دو، میں میجر جینیفر ہنڈ سلے ہوں ،ذی کی پرانی دوست۔“

پلوشہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔اس کے چہرے پر چھائے غصے بھرے

تاثرات معدوم نہیں ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جنیفر کے مجھ سے لپٹنے اور بوس و کنار کی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

میں اسے پشتو میں مخاطب ہوا۔"چندا!...... یوں غصہ نہیں کرتے۔ اور تم جانتی تو ہو کہ یہ ان لوگوں کی ثقافت ہے۔"

"میں کسی گھٹیا ثقافت کو نہیں جانتی اور آپ سے تو میں بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ جیسے غصے سے ابل رہی تھی ایک دم پھٹ پڑی۔

"بھئی یہ تو بہت غصے میں ہے۔" جینیفر مزاحیہ انداز میں بولی۔ اسے پلوشہ کی حالت دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کیسے تشریف آوری ہوئی؟" میں اس کے سامنے چارپائی پر جگہ سنبھالتے ہوئے مستفسر ہوا۔ یوں بھی میں جانتا تھا کہ پلوشہ کا غصہ اتنی آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔

جواباً اس نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہی بنتا تھا کہ صنوبر خان کے ایک آدمی نے تین چار بار کمانڈر نصراللہ کو بیٹھک میں کھانا لاتے دیکھا۔ ایک دن اس نے یونہی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر بیٹھک میں جھانکا۔ اس وقت میں کسی کام سے بیٹھک کے صحن میں نکلا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے یہ بات صنوبر خان تک پہنچانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اور اگلے ہی دن جینیفر نے مجھے پکڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ چونکہ وہ جانتی تھی کہ میں نے صنوبر خان کے آدمیوں کے ہاتھ نہیں آنا تھا اس لیے خود ہی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ مجھے پکڑنے آ گئی تھی۔ انھیں اب تک یہ خوش فہمی تھی کہ میں ان سے کیے ہوئے وعدے سے انحراف نہیں کروں گا۔

"ٹھیک ہے تو جواب سن لو، میں تم لوگوں کے لیے کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ پاکستان آرمی کے خلاف البرٹ نے جو کارروائیاں کرائی ہیں ان کا جواب اسے دینا پڑے گا۔"

"پاگل مت بنو ذی!" جینیفر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے، کیا مجھے جچتا ہے کہ میں اپنے ملک کے خلاف کام کرنے والوں سے معاہدے کرتا پھروں۔"

"ذی!...... جانتے ہو میں امریکہ سے افغانستان صرف تمھاری خاطر آئی ہوں۔" اس نے مجھے جذباتی طور

پر بلیک میل کرنا چاہا۔

پلوشہ سے ہماری گفتگو برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ رضائی میں گھس گئی۔ مگر جینیفر اسے خاطر میں لائے بغیر مجھے قائل کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ’’جتنے دن میں امریکہ میں رہا تم مجھے اسی طرح اپنی جھوٹی محبت کا دھوکا دے کر ورغلاتی رہیں اب تک تمھاری وہ عادت ختم نہیں ہوئی۔‘‘

’’ذی میں قسم کھاتی ہوں میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا ......اور اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ لی زونا نے تمھیں پہلے سے میرے بارے بتا دیا تھا تو یقین کرو ہر مرتبہ وہ گفتگو میں نے خود لی زونا کے کانوں تک پہنچائی تھی کیونکہ میں تمھیں بلیک میل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔‘‘

میں شکوہ کناں ہوا۔ ’’بعد میں تم نے ان کا آلہ کار بن کر مجھے بلیک میل تو کروا دیا تھا۔‘‘

’’ہاں ...... کیونکہ کرنل سکاٹ ڈیوڈ اور کرنل جولی روز ویلٹ کسی بھی قیمت پر تم سے برین ویلز کے قتل کا کام لینا چاہتے تھے۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بغیر وہ کوئی ایسا منصوبہ ترتیب دے لیں جس سے تمھاری ذات کو نقصان پہنچے۔‘‘

’’آخری دن بھی تم نے محبت کا ڈراما کھیلا تھا۔‘‘

وہ ہنسی۔ ’’یقیناً لی زونا نے تمھیں کہا ہوگا کہ میں کسی کو فون پر یہ کہہ رہی تھی کہ میں تمھیں راضی کرنے میں ناکام رہی ہوں۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’وہ میں نے اپنی انا کو تسکین پہنچانے کے لیے کہا تھا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ مجھے کسی نے تمھیں وہاں رہنے پر مجبور کرنے کو نہیں کہا تھا۔‘‘

’’میری سمجھ میں یقیناً تمھاری بات نہیں آئی۔‘‘

’’ذی! ......میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ سمجھو کہ تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس لیے جونھی تم نے میری آفر ٹھکرائی میں نے بھی لی زونا کے ذریعے تم تک یہ بات پہنچا دی کہ میں کسی کے کہنے پر تمھیں وہاں رکنے پر راضی کر

رہی تھی۔"

میں نے پوچھا۔"لی زونا کو تمھارے ڈرامے کی بابت معلوم تھا؟"

"نہیں۔"اس نے نفی میں سر ہلایا۔"میں اس کے آنے کی منتظر تھی۔ جونھی اسے آتے دیکھا میں نے فرضی طور پر موبائل فون پر بات چیت شروع کر دی۔ اور اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ تمھیں یا سیر در (سردار) کو لازماً بتائے گی۔ اور جب تم چلے گئے تو یقین مانو میں بہت بے چین رہی۔ تمھاری ٹریننگ میں بنی ہوئی وڈیوز دیکھ کر دل کو بہلایا کرتی تھی۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ تم افغانستان محاذ کے پر پہنچے ہوئے ہو۔ اور تمھاری محبت مجھے بھی اس مشکل جگہ پر کھینچ لائی۔"

"اچھا مان لیا، جو تم کہہ رہی ہو وہ صحیح ہے، لیکن میرا انکار تو اب بھی برقرار ہے۔"

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔"ذی!......تم بے شک امریکن سی آئی اے کے لیے کام نہ کرو، بلکہ تم امریکہ میں بھی کوئی کام نہ کرنا سب کچھ میں کروں گی، تمھیں گرین کارڈ لے کر دوں گی اور تمھیں زندگی کی وہ سہولتیں ملیں گی جو تم نے خواب میں بھی نہیں سوچی ہوں گی۔ تم بے شک ہمارے بچوں کو مسلمان بنانا میں اس پر بھی اعتراض نہیں کروں گی بس میرے ساتھ چلو۔"

"اور اس کا کیا کروں؟"میں نے رضائی میں لپٹی پلوشہ کی جانب اشارہ کیا۔

"اسے میں اتنی رقم دے دوں گی کہ یہ باقی کی زندگی عیاشی میں گزارے گی۔"

میں ہنسا۔"مطلب تم، مجھے اس سے خرید لوگی؟"

"پہلے بھی تو اس نے پندرہ ہزار ڈالر میں تمھارا سودا کر لیا تھا......اب اس سے چار پانچ گنا زیادہ رقم لے کر کیوں کر انکار کرے گی۔"

"بکواس نہ کرو جینی!......مجھے معلوم ہے اس معصوم کے ساتھ تم لوگوں نے کیا ظلم کیا تھا۔"

"چلو مان لیا، لیکن یہ بھی تو سوچو اس نے اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کو تم پر ترجیح دی، جبکہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر تم کہو گے تو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو تمھارے لیے چھوڑ دوں گی۔"

"یہ ممکن نہیں ہے جینی!"میں نے بے بسی سے سر ہلایا۔

”کیا میں خوب صورت نہیں ہوں، کیا میں تمھیں پیاری نہیں لگتی، کیا میری محبت تمھارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔“اس کی آواز سچ مچ گلوگیر ہونے لگی۔بغیر شک وشبہ کے مجھے یقین تھا کہ وہ ڈراما نہیں کر رہی تھی۔

”جینی معلوم ہے ہمارے درمیان سب سے بڑا تہذیبوں کا فرق ہے۔ہم وقتی طور پر یقیناً ایک ہو جائیں گے،شادی بھی کر لیں گے اور چند سال محبت سے بھی گزار لیں گے۔لیکن تم جس ماحول میں پل کر جوان ہوئی ہو وہ اس ماحول سے یکسر مختلف ہے جو مجھے میسر رہا ہے۔میں کبھی بھی یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بیوی کو چھونا تو درکنار کوئی دیکھ بھی سکے۔جبکہ اپنی تہذیب کے مطابق تم میرے سامنے کسی بھی مرد کے گلے لگنے کو بھی معیوب نہیں سمجھوگی۔اور یہ میں نے ایک مثال دی ہے اس کے علاوہ بھی ہماری شادی میں کئی ایک قباحتیں ہیں جو اس وقت تمھیں اس لیے نظر نہیں آ رہیں کہ تمھاری آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہے۔جونھی یہ پٹی کھلے گی تمھیں یہ شادی ایک مذاق سے بڑھ کر معلوم نہیں ہوگی۔“

وہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔”نہیں بلکہ تمھاری آنکھوں پر پیلا وشہ کی محبت کی پٹی بندھی ہے۔اس چھوٹی سی چھوکری نے تمھیں مجھ سے چھین لیا ہے۔“

میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔”یقیناً تم نے میری بات نہ سمجھنے کی قسم کھائی ہے۔“

”اچھا سچ سچ بتاؤ...... تمھیں ہم دونوں میں سے کون زیادہ پیارا ہے۔اور کیا تمھاری پیلا وشہ مجھ سے خوب صورت ہے؟“

”چلو تمھیں دروازے تک چھوڑ آؤں ......اور صبح ہونے والی ہے تھوڑی دیر تک ہم دونوں بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”میں اپنے ساتھیوں کی لاشیں یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”تو میں نے ان لاشوں کا کیا کرنا ہے۔اٹھاؤ اور لے جاؤ۔“

”میری مدد کرو۔“وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کی طرف بڑھ گئی۔دونوں لاشوں کو بیٹھک کے بیرونی دروازے کے پاس رکھ کر وہ باہر نکل گئی۔اپنی گاڑی انھوں نے بیٹھک سے تھوڑے فاصلے پر پارک کی تھی۔ڈبل کیبن اس نے بیٹھک کے دروازے کے سامنے لا کر کھڑی کی اور میری مدد سے لاشوں کو گاڑی کی باڈی میں رکھ

لیا۔لاشیں کوٹھکانے لگا کر وہ میرے جانب متوجہ ہوئی۔''میں نے کوئی سوال پوچھا تھا۔''

''تم حد سے زیادہ خوب صورت ہو اور مجھے بہت زیادہ پیاری ہو جبکہ پلوشہ کے بغیر شاید میں زندہ نہ رہ پاؤں۔''

''مطلب وہ مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔''

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''تو پھر اس بات کا کیا مطلب بنتا ہے؟''

''یہی کہ ہمارے ملاپ میں بہت ساری رکاوٹیں ہیں جو ہم چاہ کر بھی دور نہیں کر سکتے۔''

''ذی!......'' وہ جذباتی انداز میں مجھے لپٹ گئی۔میرے ہاتھوں نے بھی اس کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔وہ میرے لیے امریکہ سے افغانستان تک آ گئی تھی۔اس کی اتنی پذیرائی تو میرا حق بنتا تھا۔وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہی اور میں اسے روکے ٹوکے بغیر اس کا ساتھ دیتا رہا۔میں جانتا تھا کہ وہ ہماری آخری ملاقات تھی اور آخری ملاقات میں اس کا دل توڑنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔گو میں جانتا تھا کہ اسے میری پلوشہ کے ساتھ محبت بہت کھل رہی تھی لیکن پلوشہ میری مجبوری تھی۔اگر میں جینی کا محبوب تھا تو پلوشہ میری محبت تھی۔لیکن کچھ سچ ایسے ہوتے ہیں جن کا کھلم کھلا اقرار کسی دل کو چکنا چور کر دیتا ہے۔میں نے بھی پلوشہ کی محبت کے بہ جائے اور مسائل کا رونا رو کر جینیفر کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔جینی اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا مگر اس کے ساتھ وہ سب باتیں بھی کھلی حقیقت تھیں جو میں اس کے گوش گزار کر چکا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ مجھ سے علیحدہ ہوئی۔اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میں نے اس کے ماتھے پر بوسا دیا اور کہا......''جی!......پلیز یہاں سے واپس چلی جاؤ......میں ہمیشہ ایک اچھے اور مخلص دوست کی طرح تمھیں یاد رکھوں گا۔جب کبھی دل کرے مجھے ملنے آ جانا......مگر خدارا مجھے اس بات پر مجبور نہ کرنا کہ اپنے وطن اور تم میں، مجھے ایک کا چناؤ کرنا پڑے......شاید ایسے موقع پر میں تمھاری توقعات پر پورا نہ اتر سکوں......اور ہاں میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔''

چودھویں کے چاند کی روشنی میں مجھے اس کے پرکشش چہرے پر دل آویز تبسم نمودار ہوتا ہوا محسوس ہوا اور

چاہت بھرے لہجے میں بولی ......"شکریہ ذی! ......اب شاید میں اطمینان سے واپس لوٹ سکوں ......اور ہاں پیلاوشہ کو میری طرف سے بہت پیار کرنا۔" اتنا کہتے ہی وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا۔"کیا میری وڈیوز پاک آرمی تک پہنچ گئی ہیں؟"

"فی الحال تو نہیں لیکن جلد ہی پہنچادی جائیں گی ......اور معذرت چاہوں گی کہ میں البرٹ کو ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔وہ مجھ سے سینئر ہے۔"

"جی! ......اپنا خیال رکھنا اور یادرکھنا جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے واپس چلی جاؤ۔تم پر گولی چلانے کے بعد شاید میں خود کو کبھی معاف نہ کرسکوں۔"

وہ ہنسی۔"مطلب مجھ پر گولی ضرور چلانی ہے۔"

"خداحافظ۔"اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہو گیا۔

ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہوگئی۔گاڑی کے موڑ مڑنے تک میں وہیں کھڑا رہا۔جونھی گاڑی کی عقبی بتیاں نظروں سے غائب ہوئیں میں بیٹھک میں داخل ہو گیا۔گواس وقت بیٹھک میں موجود رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن مجھے جینیفر پر پورا بھروسا تھا۔وہ کبھی بھی میری پیٹھ میں خنجر نہیں گھونپ سکتی تھی۔اس کے باوجود میں نے صبح ہوتے ہی وہاں سے چلے جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر پلوشہ پر پڑی جواسی طرح رضائی میں لپٹی پڑی تھی۔اب اسے منانے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔یقیناً وہ غصے میں تھی اور خفا بھی تھی۔

میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور پھر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے رضائی ہٹا کر میں نے اس کا چہرہ سامنے کیا اس کی آنکھیں رورو کر سوجنے والی ہوگئی تھیں۔جونھی میں نے اس کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے بے ساختہ میری چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا......

"دفع ہو جائیں......کچھ نہیں لگتی میں آپ کی......جائیں اپنی جینی کے پاس......وہ مجھ سے خوب صورت بھی ہے اور امیر بھی ہے......میرے پاس کیا لینے آئے ہیں......اگر وہ کم پڑے تو ماہین بھی منتظر ہو گی تمھاری ......اور وہ کشمیرن بھی ہے......جاؤ مجھے نہیں رہنا آپ ساتھ۔" روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔مگر

میں کوئی بات کیے بغیر اس کے آنسو چننے لگا۔

''آپ نے اسے گلے سے کیوں لگایا...... اسے چوما کیوں...... آپ نے اس کے منہ پر تھپڑ کیوں نہ مارا...... بتائیں ناں؟'' وہ میرے پیار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مچلتی رہی۔

''کیا میری چاہت میں شک ہے؟'' اس کے کان سے لب لگاتے ہوئے میں نے سرگوشی کی۔

''ہاں...... شک ہے...... نفرت ہے مجھے آپ سے...... آپ اس قابل ہی نہیں کہ آپ سے محبت کی جائے...... آپ چلے جائیں...... کہیں دور چلے جائیں............''

اس کے ہونٹوں پر مہر لگاتے ہوئے میں نے اس کے مسلسل شکوؤں کو روکنے کی کوشش کی مگر میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے مجھے دور دھکیل دیا۔

''میں کہہ رہی ہوں دور ہو جائیں مجھ سے...... مجھے آپ کے جھوٹے پیار کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے...... وہ...... وہ...... میرے سامنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ وہ خوب صورت ہے یا میں اور یہ کہ وہ آپ کو پیاری ہے یا میں...... اور آپ اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے رہے تھے...... باہر جا کر آپ نے یہی کہا ہوگا نہ کہ وہ آپ کو پیاری ہے...... مجھے پتا ہے آپ نے یہی کہا ہے...... آپ صرف اس لیے اس سے شادی نہیں کر سکتے کہ اس کی اور آپ کی ثقافت میں فرق ہے ورنہ تو آپ مجھے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے......''

''پلوشے!...... مجھ سے تھپڑ کھاؤ گی۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔''ہاں ماریں گے تو آپ سہی...... آپ کی لاڈلی کے خلاف بات جو کرلی مجھے تو آپ یوں بھی پیٹنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں...... آپ کی لاڈلی نے بھی میری پٹائی کی اور آپ نے اسے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ اس نے میرے پیٹ میں لاتیں ماریں، مجھے چہرے پر مکے برسائے، میری چھاتی ٹھوکریں رسید کیں اور آپ اسے سینے سے لپٹا کر پیار کرنے لگے۔''

میں ہنسا۔''اور تم نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔''

''اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ تمھاری اتنی زیادہ لاڈلی اور پیاری ہے تو یقیناً میں اس پر ہاتھ نہ اٹھاتی۔''

''ہونہہ!......'' کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔''تو گویا تم چاہ رہی ہو میں اس کے پاس چلا جاؤں۔''

”ہاں……ہاں……ہاں، میں یہی چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے……میں کھڑا ہوتا ہوا بولا۔میں بھی تم سے اجازت ہی لینے آیا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کروں، شکریہ کہ تم نے خود ہی اجازت دے دی…… پچاس لاکھ کے قریب رقم میں یہیں چھوڑے جا رہا ہوں اور اتنی ہی رقم کل تک جینی بھی تمھیں بھجوا دے گی……کوئی غلطی ہو تو معاف کرنا۔“

”کک……کیا مطلب؟“ وہ جیسے تڑپ کر بستر سے اٹھی۔”کک……کیا……آپ سچ مچ……“ حیرت کی شدت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور زرد پڑتا رنگ دیکھ کر مجھے لگا اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔

”خود ہی تو کہہ رہی ہو چلا جاؤں۔“

”میں اپنی جان لے لوں گی سمجھے آپ۔“ غصے سے چلاتے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔شدت جذبات سے اس کا بدن رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔

اپنے بازوؤں میں بھر کر میں نے اس کا کومل بدن اٹھایا اور چارپائی پر لٹا کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”میں نے دور جا کر مرنا ہے کیا۔“

میرے ہاتھوں کو پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے اس نے کراہتے ہوئے کہا۔”راجو!……آئندہ ایسا مذاق میں بھی نہ کہنا……“

”میں نے کب کہا، خود ہی تو مجھے بار بار دفع ہو جانے کا کہہ رہی تھیں۔“

”میں غصے میں تھی……آپ منا بھی تو سکتے تھے۔“

”منا تو رہا تھا تم نزدیک ہی نہیں آنے دے رہی تھیں۔“

”آپ نے اسے اتنی اہمیت کیوں دی؟“ اس نے پرانا شکوہ نئے الفاظ میں دہرایا۔

”کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے چندا!……اور یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ میں اسے سزا دوں۔باقی میرے لیے جو اہم ہے میں اسی کے پاس ہوں۔نہ تو مجھے ماہین کی ضرورت ہے نہ مجھے رومانہ چاہیے اور نہ کوئی دوسری تیسری۔میرے لیے میرا چاند، میری پلوشے، میری گڑیا کافی ہے۔“

وہ سسکی۔”کبھی دور تو نہیں جاؤ گے۔“

میں عزم سے بولا۔ ''اپنی زندگی میں تو نہیں جاؤں گا۔''

''اللہ پاک نہ کرے کہ میرے راجو کو کچھ ہو۔'' سارے گلے شکوے پس پشت ڈال کر اس نے مجھے ریشمی بانہوں کا ہار پہنایا اور میرے پیاسے ہونٹوں کو سیراب کرنے لگی۔

☆......☆......☆

صبح کی آذان ہوتے ہی میں نے پلوشہ کو تیار ہونے کا کہا۔

''کہاں جانا ہے۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ جگہ صنوبر خان کے آدمیوں کی نظر میں آ گئی ہے۔ چچا نصر اللہ کو کہہ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس لفنگی میجر کو قتل کر دیتے تو یقیناً کسی کو اس جگہ کے بارے معلوم نہ ہوتا۔''

''اس جگہ کے بارے جینی کو صنوبر خان سے پتا چلا ہے، پھر تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ اس کی موت کے بعد ہم محفوظ ہو جاتے۔''

وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کو بتا رہی ہوں اس کے بعد وہ جب بھی میرے سامنے آئی بچے گی نہیں۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''یہی بات جاتے ہوئے وہ بھی کہہ کر گئی ہے۔''

''چلیں، اس طرح آپ کی جان تو چھوٹ جائے گی نا۔''

''مذاق کر رہا ہوں، سچ تو یہ ہے کہ اس نے کہا ہے میری طرف سے پلوشہ کو بہت سارا پیار کرنا۔''

وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ''یہ نہ ہو میں سمجھنے لگوں کہ آپ اس کے کہنے پر مجھے اتنی توجہ دے رہے ہیں اور آپ کو قریب ہی نہ آنے دوں۔''

''تمھاری تو کوئی کل ہی سیدھی نہیں ہے......اب اٹھ جاؤ دیر ہو رہی ہے۔'' میں پاؤں میں بوٹ ڈالنے لگا۔ شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے وہ بھی تیار ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کمانڈر نصر اللہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ وضو کر کے مسجد جا رہا تھا۔

''ارے آپ، اتنی صبح۔'' وہ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''ہاں چچا جان!......ایک مسئلہ ہو گیا ہے............'' میں اجمالاً اسے رات کو ہونے والے واقعے کے بارے بتانے لگا۔

''اوہ......یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر چلو میں تمھیں اپنے دوست کی بیٹھک میں چھوڑ آتا ہوں۔''

''دوست کے بہ جائے اگر کسی ایسے آدمی کے پاس ٹھکانہ مل جائے جس سے آپ کا تعلق لوگوں کو معلوم نہ ہو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔''

کمانڈر چچا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''اس کی اور میری دوستی ایسی ہی ہے فکر نہ کرو۔''

اور ہم سر ہلاتے ہوئے ان کی معیت میں چل پڑے۔ ان کا دوست امام مسجد تھا۔ اس کا گھر مغرب کی طرف سے مسجد کے کے ساتھ متصل تھا۔ اور گھر کے ساتھ ہی چھوٹی سی بیٹھک تھی جس کا صحن نہایت ہی مختصر سا تھا۔ اور ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں دو چار پائیوں کی گنجائش تھی۔ لیکن ایک فائدہ یہ تھا کہ بیٹھک میں ایک کھڑکی گھر کی طرف بھی کھلتی تھی جس کی وجہ سے پہلے کی طرح کسی کو وہاں ہمارے چھپنے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ہمیں اسی کھڑکی سے کھانے پینے کا سامان وصول ہو جانا تھا۔

امام مسجد اور کمانڈر چچا ہمیں بیٹھک میں چھوڑ کر نماز کو چلے گئے۔ ہم دونوں بھی وضو کر کے بیٹھک ہی میں نماز پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد امام مسجد ہمارے لیے ناشتا لے آیا۔ اس کا نام مولانا عبد القدوس تھا۔ چچا نصر اللہ ہی کے ہم عمر تھے۔ اور جوانی میں مجاہدین کے ساتھ جہاد میں حصہ لے چکے تھے۔ نہ جانے کمانڈر نصر اللہ نے اسے ہمارے بارے کچھ بتایا تھا یا نہیں لیکن از خود اس نے ہم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

ناشتا کر کے ہم نے بیٹھک کا دروازہ کنڈی کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئے ساری رات جاگتے ہوئے گزر گئی تھی۔

☆......☆......☆

اسی رات میں اور پلوشہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہے تھے۔ اپنے واپس جانے کی بات پر تو وہ ہتھے ہی سے اکھڑ گئی تھی۔

”میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی راجو!......اس بات پر خفا ہونا ہے تو ہزار بار ہو جائیں، مناؤں گی بھی نہیں۔“

”چندا!......معلوم ہے تمھاری موجودی میں میرا دل ہر وقت لرزتا رہتا ہے۔“

”معلوم ہے، مجھے واپس بھیج کر آپ نے اپنی جینی کے ساتھ گل چھرے اڑانے ہوں گے۔“

میں نے خفگی سے پوچھا۔”اب شک کرنا بھی شروع کر دیا۔“

وہ بے پروائی سے بولی۔”پہلے دن سے کرتی تھی۔“

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر بھی خوب صورت تبسم کھلنے لگا۔

”پلوشے!......مار کھاؤ گی۔“

اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔”مار کھالوں گی......چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”اچھا تمھارا ارادہ کیا ہے؟“

”آپ کی حفاظت کرنا۔“

”مرد میں ہوں کہ تم۔“

”میں......اور آپ ہیں پنجابن کڑی۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا اور پھر کھل کھلا کر ہنستی چلی گئی۔اس کی خوب صورت ہنسی ایسی نہیں تھی کہ میرے دماغ میں لڑائی بھڑائی کے منصوبے پل سکتے۔اس پر کشش اور دل کے تاروں کو چھیڑنے والی ہنسی کو سن کر ایک ہی کام سوجھ سکتا تھا اور وہی میں کرنے لگا۔

بادل زور سے گرجا اور چھت پر ٹپ ٹپ پڑنے والے قطروں نے کمرے کی رومانوی فضا کو چار چاند لگا دیے۔وزیرستان میں گرمی کے موسم میں بھی رات کو اچھی خاصی سردی ہوتی ہے۔خاص کر پہاڑیوں کے اوپر تو تیز چلنے والی ہوا موسم کو گرم ہونے ہی نہیں دیتی اور ستمبر اکتوبر میں ایک بار پھر سردی ڈیرے ڈالنے لگتی ہے۔اب اکتوبر کی شروعات تھی، سردی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔اور ایسی سردیوں میں محبوب کی کمی کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگتی ہے۔جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا، کہ میری زندگی کا پیارا ساتھی میرے ساتھ ہی تھا۔اسے دور بھیج کر یقیناً میں خوش نہ رہ پاتا۔

بہت ساری دیر گزر گئی اور پھر اس کی مدھر آواز نے میرے کانوں میں سر بکھیرے۔ ”راجو! اگر میں چلی گئی تو خوش رہ پائیں گے۔“

”نہیں......“ میرے منہ سے سچ ہی نکلا تھا۔

”اسی لیے نہیں جاتی جانو!......کیا معلوم زندگی کب ساتھ چھوڑ جائے، میں چاہتی ہوں مرتے وقت آپ کی بانہوں کا سہارا میسر ہو۔ یقین مانو میں کبھی کسی بات سے نہیں ڈری......مگر آپ سے دور رہ کر جو کچھ مجھ پر بیتی ہے اب میں آپ سے دوری کا تصور کر کے ہی لرزنے لگتی ہوں۔“

میں صاف گوئی سے بولا۔ ”یہ حالت تو میری بھی ہوتی ہے چندا!“

”پھر دور بھیجنے کی بات کیوں کرتے ہیں......اور فکر نہ کیا کریں میں نرم و نازک اور موم کی بنی ہوئی گڑیا صرف آپ کے لیے ہوں۔ ورنہ دیکھ لینا دشمن کے لیے میں لوہے کا چنا ثابت ہوں گی۔“

اور یہ بات تو میں بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی تربیت یافتہ کمانڈو سے کم نہیں تھی۔ امریکن سی آئی اے کی تربیت یافتہ میجر جینیفر ہنڈسلے جیسی خطرناک لڑاکا کو برابر کی ٹکر دینے والی کوئی عام لڑکی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اسے اپنے ساتھ پھرا کر غیر مطمئن تھا۔ وہ میری عزت تھی کسی بھی مشکل جگہ پر اس کی وجہ سے میری پریشانی کئی گنا بڑھ جاتی۔ وہ دشمن کا تشدد تو برداشت کر لیتی مگر ایک عورت پر قابو پانے کے بعد وہ ننگ انسانیت اس کے ساتھ کیا کیا سلوک کر سکتے تھے اس کو سمجھنے کے لیے کسی عقل بینا کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر پلوشہ کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آ جاتا تو شاید میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔ ان سب سوچوں کے باوجود میں نے اسے خوش کرنے کی خاطر کہا۔

”اچھا پھر ایسا کچھ نہیں کہوں گا......اب خوش۔“

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”کہہ دیں......میں نے کون سا ماننا ہے کہ آپ کے کہنے کی فکر کروں۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اچھا سوتے ہیں......“ اور میرے مشورے کی تائید میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆......☆

دو ہفتے ہم نے وہیں گزار دیے تھے۔اس دوران امام مسجد کی وساطت سے کمانڈر نصر اللہ کو کہہ کر ہم نے گلاک کی سو گولیاں بھی وانہ سے منگوا لی تھیں۔جینی کے ہلاک ہونے والے ساتھیوں سے دو سائیلنسر لگے گلاک میرے ہتھے چڑھے تھے، جاتے ہوئے جینی نے جان بوجھ کر ان کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا تھا یا شاید اسے بھول گیا تھا۔بہ ہر حال اگر وہ مانگتی بھی تو میں نے واپس نہیں کرنے تھے، کہ گلاک نائینٹین ایک کار آمد پستول ہے اور اس پر لگا سائیلنسر سونے پر سہاگے کی مصداق تھا۔

ایک صبح ہم علام خیل جانے کے لیے تیار تھے۔ایک روز پہلے ہی رات کے وقت پلوشہ برقع اوڑھ کر اپنے ماموں کے گھر سے ہو آئی تھی۔اور ماموں کے گھر جانے کی وجہ اس کا دودھ شریک بھائی مراد تھا۔وہ چند دن کے لیے گھر آیا ہوا تھا۔اسے مسجد میں دیکھتے ہی امام مسجد مولانا عبدالقدوس نے پلوشہ تک یہ بات پہنچانے میں دیر نہیں کی تھی کہ پلوشہ نے وہاں آنے کے اگلے ہی دن مولانا صاحب کو یہ درخواست کی تھی۔اس کے ماموں کا گھر بھی اسی محلے میں تھا اور وہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔

مراد سے اسے کافی کام کی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔دو دن بعد اس کی انگور اڈے والی حویلی میں ایک بڑا پروگرام تھا۔میں نے حویلی کے ساز و سامان اور دروازوں وغیرہ ہی کو جلا سکا تھا یقیناً عمارت کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔اور وہاں پر جشن مناتے وقت اس کے زیادہ تر لشکریوں نے وہیں اکٹھے ہونا تھا اس صورت میں علام خیل کی حویلی میں اس کے آدمیوں کی کوئی خاص تعداد موجود نہ ہوتی۔علام خیل میں اس کی دو حویلیاں تھیں ایک میں اس کے خاندان والے رہائش پذیر تھے اور دوسری اس سے ملحق بیٹھک تھی جو رہائش کی حویلی سے بھی کافی بڑی تھی۔یہ وہی حویلی تھی جو اس سے پہلے قبیل خان کا مسکن تھی۔قبیل خان اور جہانداد خان سگے بھائی تھے جبکہ صنوبر خان ان کا سوتیلا بھائی تھا۔اور وہ شروع دن ہی سے ایک ہی حویلی میں سکونت پذیر تھے۔

پلوشہ مجھے یہ بھی بتا چکی تھی کہ صنوبر خان نے اس پر تشدد کرتے وقت اس کی قمیص بھی پھاڑی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کے ساتھ بھی بدتمیزی کی تھی۔اس لیے صنوبر خان کو سبق سکھانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے بھی ویسی ہی اذیت سے دوچار کیا جاتا۔گو میں نے کبھی عورتوں کو مردوں کی دشمنی میں گھسیٹنے کا نہیں سوچا تھا نہ وزیرستان میں ایسا کوئی رواج تھا مگر صنوبر خان نے پلوشہ کی ماں اور کم سن بھائی کو درمیان میں لا کر اس گھٹیا

رسم کو شروع کر دہی دیا تھا تو اسے اتنا احساس دلانا ضروری تھا کہ گھر والا وہ بھی تھا۔

انگور اڈے سے علام خیل تک ہمیں ویگن مل گئی تھی۔ پلوشہ برقعے میں روپوش تھی جبکہ میں نے پگڑی باندھ کر اس کا پلو چہرے سے لپیٹا ہوا تھا۔ علام خیل میں ہمارے علاوہ دو مرد اور بھی اترے تھے۔ ویگن ہمیں اتار کر آگے بڑھ گئی، جبکہ میں پلوشہ کے ساتھ دھیرے قدموں گاؤں میں داخل ہو گیا۔ ہمارے ساتھ اترنے والے دونوں مرد ہم سے پہلے ایک جانب بڑھ گئے تھے۔ کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک تک ہم بغیر بات چیت کیے پہنچے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا بیٹھک دروازہ کھلا تھا۔ دروازے پر موجود آدمی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔

''کمانڈر عبدالرشید بیٹنی سے ملنا ہے۔'' اپنا تعارف کرائے بغیر میں نے مدعا بیان کیا۔

اس نے برقع میں روپوش پلوشہ پر حیرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔''وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔''

''کمانڈر عبدالحق مل جائیں گے۔'' کمانڈر عبدالحق وہی مرد مجاہد تھا جس کی وجہ سے میرے لیے مجاہدین کے ٹھکانوں کے دروازے کھلے تھے۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔''وہ بھی موجود نہیں ہیں۔''

''یہاں پر کوئی کمانڈر موجود نہیں جس سے میں بات کر سکوں۔''

''قاری غلام محمد صاحب موجود ہیں۔''

''رغزئی والے۔'' میں نے تصدیق چاہنے کے انداز میں پوچھا۔ کیونکہ اس کے متعلق کمانڈر عبدالحق مجھے پہلے سے بتا چکے تھے۔ کہ اگر میں رغزئی میں کبھی چلا جاؤں تو ان کے ہاں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے انھیں بتا دیں انگور اڈے سے کمانڈر نصراللہ خان خوجل خیل کے خصوصی مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''آپ اندر تشریف لے جائیں وہ حجرے میں تشریف فرما ہیں۔'' اتنے زیادہ کمانڈرز سے واقفیت نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ میں کوئی غیر نہیں تھا۔

اور میں۔''شکریہ۔'' کہتے ہوئے پلوشہ کے ساتھ حجرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے شاید اندازہ تھا کہ میں

پہلے بھی وہاں آچکا ہوں اس لیے اس نے حجرے کی جگہ کے بارے میری رہنمائی کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ کام اس نے اندر موجود آدمیوں کے لیے رہنے دیا ہو۔

بیٹھک کے اندر کافی جوان دائیں بائیں پھر رہے تھے۔اور خالص مردانہ ماحول میں ایک برقع پوش خاتون کی آمد ان کے لیے حیرانی کا باعث تھی۔لیکن اس حیرانی کا اظہار کرنے کے لیے انھوں نے پلوشہ کو گھورنے سے پرہیز کیا تھا۔

حجرے میں قاری غلام محمد صاحب چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔چونکہ میں انھیں شکل وصورت سے نہیں جانتا تھا اس لیے میں نے اندر داخل ہوتے ہی۔''اسلام علیکم۔'' کہہ کران کے متعلق استفسار کیا۔

تکیے سے ٹیک لگائے گھنی کالی داڑھی والے ایک صحت مند آدمی نے خوش اخلاقی سے''جی؟'' کہتے ہوئے گویا اپنا تعارف کرا دیا تھا۔اور پھر برقع پوش پلوشہ پر نظر پڑتے ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے آدمیوں کو جانے کا اشارہ کیا۔

تمام خاموشی سے اٹھ کر حجرے سے باہر نکل گئے تھے۔

''تشریف رکھیں۔'' قاری غلام محمد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اور میں پلوشہ کے ساتھ زمین پر بچھی چٹائیوں پر بیٹھ گیا۔

''کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' ہمارے بیٹھتے ہی اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہم نصر اللہ خان خوجل خیل کے جاننے والے ہیں، کسی کام سے آئے ہیں۔دو تین دن یہاں گزاریں گے۔''

''مگر، کوئی خاتون یہاں نہیں رہ سکتی۔'' قاری غلام محمد ہچکچاتے ہوئے انکار کیا۔

''ایسی بھی کیا بے رخی ہے استاد جی۔'' پلوشہ نے اپنا برقع سامنے سے اٹھاتے ہوئے معصومانہ لہجے میں کہا۔

قاری غلام محمد کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں۔''اوہ پلو خان!......تمھارے بارے معلوم ہوا تھا کہ تم پلوشہ خان وزیر ہو......مطلب وہ حقیقت تھی۔''

''جی استاد جی۔'' پلوشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس کا مطلب ہے آپ ایس ایس ہیں۔'' وہ میری طرف متوجہ ہوا اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔یوں

بھی مجاہدین اور صنوبر خان کے آدمیوں کی اکثریت مجھے ایس ایس کہہ کر ہی پکارتے تھے۔

''اگر آپ لوگ برانہ منائیں تو ایک بات کہوں۔''

''یہ میرے شوہر ہیں استاد جی!''اس کے نصیحت کرنے سے پہلے پلوشہ نے حقیقت اگل دی۔

وہ اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے بولا۔''ماشاء اللہ......مبارک ہو۔شادی کب کی ہے؟''

پلوشہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔''ڈیڑھ ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے...... چچا نصر اللہ خوجل خیل نے خود نکاح پڑھایا تھا۔''

''بہت خوشی ہوئی ......اور یہ آپ کا اپنا گھر ہے بیٹی !...... یہاں رکنے کے لیے کم از کم میری اجازت کی ضرورت آپ کو نہیں تھی۔''

''آپ تمام اساتذہ کی اجازت تو مجھے زندگی کے ہر مرحلے پر درکار ہو گی استاد جی !...... میں نے یہ شادی بھی چچا نصر اللہ خان کے کہنے پر کی ہے۔''پلوشہ عقیدت سے بولی۔

''خوش رہو بیٹی!'' قاری غلام محمد نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔''یقیناً کھانا آپ اپنے کمرے میں کھانا پسند کریں گے۔''

''جی استاد جی!''پلوشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''چلیں میں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔''وہ ہمیں ساتھ لے کر بیٹھک کے شمالی کونے میں بنے ہوئے ایک بڑے سے کمرے کے پاس لایا جس کے ساتھ ملحق بیت الخلاء اور غسل خانہ بھی موجود تھا۔وہ کمرہ یقیناً پلوشہ کی وجہ سے ہمارے حوالے ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے میں اور سردار یہاں رہ چکے تھے،اس وقت بھی ہمارے حوالے انھوں نے علیحدہ کمرہ ہی کیا تھا لیکن اس کمرے ساتھ یہ سہولت موجود نہیں تھی۔

گو پلوشہ لڑکا نما لڑکی تھی اور ابھی تک اس کے سر کے بال اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے جن میں پونی ڈالی جا سکتی یا جوڑا باندھا جا سکتا۔اسی طرح نہ تو اس کی ستواں ناک میں عورتوں کی طرح سوراخ ہوا تھا اور نہ کانوں میں۔اب بھی مردانہ لباس پہن کر وہ لڑکے کا کردار آسانی سے ادا کر سکتی تھی۔لیکن مجھے اس کا بے پردہ پھرنا بالکل بھی گوارا نہیں تھا۔وہ میری عزت تھی اور اپنی عزت کی حفاظت ہر مسلم کرنا جانتا ہے۔میرا پکا ارادہ تھا کہ صنوبر خان

کوانجام تک پہنچاتے ہی اسے کسی بہانے تلہ گنگ جا کر چھوڑ آؤں گا۔لیکن اسے اپنے ارادے سے مطلع کرنا گویا نیا محاذ کھولنے کے مترادف تھا اس لیے یہ ارادہ میرے دل ہی میں نہاں رہا۔

شادی کے بعد سے وہ کھانا مجھے اپنے ہاتھوں ہی سے کھلاتی تھی۔اس کی ہر ادا اور ہر انداز سے میرے لیے یوں محبت ٹپکتی تھی جیسے سوراخ زدہ چھتے سے شہد ٹپکتا ہے۔میری پسند سے وہ مجھ سے زیادہ واقف تھی،میری ناراضی اور خفگی کو وہ ایک لمحے میں بھانپ جایا کرتی۔اور میرے آرام وسکون کو اتنا خیال کرتی جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہی تو تھا۔یقیناً مشرقی بیویاں اپنے خاوند کا ہر کام نہایت عقیدت سے سرانجام دیتی ہیں،لیکن پلوشہ اس معاملے میں گھریلو خواتین سے بھی ایک ہاتھ آگے تھی۔گو مجھ سے جھگڑا کرتے وقت وہ کافی ساری بکواس کر جایا کرتی تھی،لیکن اس کی یہ باتیں بس زبان تک ہی محدود ہوتی تھیں۔اور کچھ بھی ایسا ویسا کہتے ہوئے وہ مجھے آپ ہی کہا کرتی تھی۔بلاشک وشبہ وہ میرے لیے قدرت کا ایک تحفہ ہی تو تھی۔

کھانا کھا کر ہم آرام کے لیے لیٹ گئے۔ظہر کی نماز میں نے باقیوں کے ساتھ ادا کی تھی البتہ پلوشہ کمرے سے باہر نہ نکلی۔مسجد میں مجھے کچھ اور جاننے والے بھی مل گئے تھے۔جن پہلی مرتبہ یہاں رہتے ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔کچھ دیر ان سے گپ شپ کر کے میں پلوشہ کے پاس پہنچ گیا۔رات کا کھانا کھا کر ہم دونوں تیار ہو کر باہر نکل آئے۔پلوشہ ایک بار پھر لڑکے کے روپ میں تھی،لیکن چہرہ چھپانے کے لیے اس نے اپنی پگڑی کا پلو چہرے پر اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔گو اس کی آنکھیں بھی کسی کے دل کی دنیا کو زیرو زبر کرنے کے لیے کافی تھیں مگر رات وقت کوئی کہاں ان پر غور کر پاتا۔قاری غلام محمد کو میں بتا دیا تھا کہ کچھ دیر کے لیے ہم باہر جا رہے ہیں،تا کہ وہ اپنے سنتریوں کو اس کی اطلاع کر دے۔کلاشن کوف ہم نے کمرے ہی میں چھوڑ دی تھی اور دونوں کے پاس سائیلنسر لگے گلاک نائینٹین پستول موجود تھے۔علام خیل اس کا اپنا گاؤں تھا اور وہ اس کے چپے چپے سے واقف تھی۔میں اور سردار خان بھی اس گاؤں کو اچھی طرح کھنگال چکے تھے اس لیے میرا بھی وہ خوب دیکھا بھالا تھا۔یوں بھی علام خیل کو پلوشہ کی پیدائش کا گاؤں ہونے کی سعادت حاصل تھی اس لحاظ سے فطری طور پر میرے دل میں علام خیل کی محبت بسیرا کیے ہوئے تھی۔

”چندا!......جانتی ہو قبیل خان کی وجہ سے مجھے علام خیل سے نفرت جیسی تھی،مگر آج کل علام خیل مجھے اپنے

گاؤں کی طرح پیارا لگتا ہے۔“

”راجو!......ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“صنوبر خان کی حویلی کی طرف مٹر گشت کے انداز میں جاتے ہوئے وہ سرگوشی میں بولی۔

”کون سی بات؟“میں حیرانی سے مستفسر ہوا۔

وہ جذباتی لہجے میں بولی۔”یہی کہ آخر آپ کو مجھ میں ایسی کون سی چیز نظر آئی جو آپ نے مجھے اتنے اونچے مقام پر بٹھا دیا۔“

میں استہزائی انداز میں ہنسا۔”تو مجھ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔“

”اگر آپ میں سرخاب کے پر نہ لگے ہوتے تو وہ کمینی جینیفر آپ کے پیچھے امریکہ سے یہاں نہ آئی ہوتی۔اور وہ رومانہ آپ کی خاطر اپنے شوہر سے طلاق لینے پر آمادہ نہ ہو گئی ہوتی۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”تو تمھیں ماہین بھول گئی ہے کیا؟“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔”آپ کو بھی تو پلوشے خان وزیر بھول گئی ہے، جسے آپ کے بغیر سانس بھی نہیں لیا جاتا۔“

”اچھا فضول باتوں کو چھوڑو یہ بحث واپس آکر کریں گے۔“

”آپ نے خود ہی یہ بحث شروع کی ہے۔“وہ منھ بنا کر خاموش ہو گئی۔

میں نے بھی مزید کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔صنوبر خان کی حویلی اور بیٹھک متصل تھیں۔حویلی شمال کی جانب اور بیٹھک جنوب کی طرف بنی ہوئی تھی۔دونوں کے داخلی دروازے شرقی جانب تھے۔حویلی کی شمالی دیوار پر شرقاً غرباً دو مورچے بنے تھے جبکہ بیٹھک کی جنوبی دیوار پر شرقاً غرباً دو مورچے بنے تھے۔گویا حویلی اور بیٹھک کو ملا کر دیکھا جاتا تو ان کے چاروں کونوں پر مورچے موجود تھے۔حویلی اور بیٹھک کے داخلی دروازوں کے بیچ بس درمیانی دیوار ہی کی آڑ تھی۔اس طرح دونوں دروازوں کے سامنے ایک آدمی کھڑا ہو کر دونوں دروازوں کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔

ہم دونوں حویلی اور بیٹھک کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔دونوں دروازے بند تھے اور ان کے سامنے

کوئی آدمی کھڑا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیٹھک کی جنوبی دیوار سے تھوڑا آگے بڑھ کر ہم مغرب کی جانب مڑ گئے ۔وہاں سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر چڑھائی شروع ہو رہی تھی ۔اس ڈھلوان پر بھی اکا دکا گھر موجود تھے۔گھروں سے بچتے ہوئے ہم تھوڑا سا بلندی پر آئے اور ایک تباہ شدہ گھر میں گھس گئے ۔دو تین آوارہ کتوں نے ناراضی بھرے انداز میں بھونک کر ہماری آمد پر ناپسندیدگی کا اعلان کیا اور احتجاج کرتے ہوئے وہاں سے نکل گئے۔وہ گھر کافی عرصے سے تباہ شدہ پڑا تھا۔میں اور سردار اس کا اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے۔ایک کمرے کی چھت جو تھوڑی سلامت تھی اس کے اوپر لیٹ کر ہم حویلی کی جانب دیکھنے لگے۔صنوبر خان کی حویلی وہاں سے بالکل نیچے تھی۔چاند کی پہلی دوسری تاریخ تھی اس لیے اندھیرا کافی گہرا تھا۔لیکن حویلی کے صحن میں ہونے والی روشنی ہماری کافی مدد کر سکتی تھی ۔میں نے دوربین آنکھوں سے لگا کر اس طرف دیکھا مگر اونچی دیواروں نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔میں نے مایوس ہوتے ہوئے دوربین پلوشہ کی جانب بڑھا دی۔

''کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔بس اتنا محسوس ہو رہا ہے کہ چاروں مورچوں میں سنتری موجود ہیں۔''

میں نے کہا۔''حویلی کی دیواریں کچھ زیادہ ہی اونچی ہیں۔''

اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔''میرا خیال ہے کل دن کو مزید بلندی سے جا کر جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔''

''ہونہہ!......''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''کل یہاں سے مزید آدمی بھی انگور اڈے والی حویلی کی جانب کوچ کریں گے۔''

''اس بارے بھی کل پتا چل جائے گا۔''

''چلو چلتے ہیں۔''وہاں مزید ٹھہرنا فضول تھا اس لیے میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔واپس بھی ہم اسی رستے سے آئے تھے ۔بیٹھک اور حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم اپنے مسکن تک پہنچے اور دروازے پر موجود آدمی کو اپنی پہچان کراتے ہوئے اندر گھس گئے ۔ایک اور امنگوں بھری وصل کی رات ہماری منتظر تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ناشتا کر کے سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی ہم باہر نکل آئے تھے۔ پلوشہ اسی طرح ایک لڑکے کے روپ میں تھی۔ البتہ اپنا چہرہ اس نے پگڑی کے پلو سے ڈھانپا ہوا تھا۔ ہم دونوں صنوبر خان کی حویلی کے سامنے گزرنے کے بہ جائے ایک دوسرے رستے سے پہاڑ کی بلندی سر کرنے لگے۔ سورج کے اچھی طرح نکلنے تک ہم صنوبر خان کی حویلی کے عقب میں موجود ایک بلندی پر موجود تھے۔ اس جگہ سے خالی آنکھوں سے کوئی خاص نگرانی نہیں ہو سکتی تھی، مگر ہمارے پاس ایک طاقت ور دوربین موجود تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر ہم بیٹھک اور حویلی کے صحن کا جائزہ لینے لگے۔ چونکہ یہ بلندی عین اس حویلی اور بیٹھک کے عقب میں موجود تھی اور اس کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا اس لیے یہاں سے دونوں عمارتوں کے صحن کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ نا معلوم حویلی بناتے وقت قبیل خان یا بنانے والے نے اس متعلق کیوں سوچا تھا۔ شاید اتنی بلندی سے صرف دوربین کی مدد ہی سے محدود سا دکھاؤ ممکن تھا اس لیے انھوں نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ یوں بھی اتنی دور سے دوربین کی مدد سے بھی کسی کے چہرے کی شناخت ممکن نہیں تھی۔

بیٹھک کے صحن میں کافی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ تین گاڑیاں ہمیں بیٹھک کے دروازے سے نکل کر انگوراڈے کا رخ کرتی نظر آئیں یقیناً وہ رات کو ہونے والے جشن میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔

مورچوں کا جائزہ لینے پر ہمیں ان میں کوئی حرکت نظر نہ آئی۔

”راجو!...... میرے ذہن میں ایک منصوبہ آ رہا ہے۔“ تھوڑی دوربین سے حویلی اور بیٹھک کا جائزہ لینے کے بعد وہ مجھے مخاطب ہوئی۔

”بولو۔“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سر پر پگڑی لپیٹے مردانہ لباس میں کچھ عجیب ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر میں نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ زنانہ لباس کے بہ جائے وہ مردانہ لباس میں زیادہ آرام دہ محسوس کیا کرتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ بچپن ہی سے لڑکوں والے کپڑے پہننے کی عادی تھی۔ بلکہ گزشتا شب وہ یہ کہہ رہی تھی کہ اسے مسلسل بڑھتے ہوئے بالوں سے الجھن محسوس ہونے لگی ہے۔ جواباً مجھ سے ٹھیک ٹھاک جھاڑ کھا کر اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا...... ”جس دن بھی اسے موقع ملا وہ سر پر استرا پھروا دے گی۔“

”اگر ایسا کیا تو سچ مچ خفا ہو جاؤں گا۔“ اس دھمکی کے بغیر میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ شوخی سے بولی۔ ''منانا مجھے آتا ہے۔'' اور میں زچ ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔
وہ مشورہ دیتے ہوئے بولی۔ ''اگر ہم ابھی حویلی میں گھسنے کی کوشش کریں تو شاید کامیاب ہو جائیں۔چاروں مورچے خالی ہیں اور بیٹھک میں آدمیوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہو گی۔''
چند لمحے سوچ میں کھوئے رہنے کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلو۔''
''سچ۔'' وہ خوش ہو گئی تھی۔
''اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے، رات کو کم از کم مورچوں میں موجود لوگ تو چوکنے ہوتے ہیں۔اس وقت یقیناً وہ بے فکر ہوں گے۔اور مورچے یوں بھی خالی پڑے ہیں۔صرف داخلی دروازے ہی پر کوئی محافظ موجود ہوگا۔''
ہم احتیاط سے نیچے اترنے لگے۔دونوں کے پاس سائیلنسر لگے گلاک موجود تھے۔کلاشن کوف ہم کمرے ہی میں چھوڑ آئے تھے۔رات جس ویران عمارت کی چھت سے ہم نے حویلی کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کی تھی وہاں چند لمحے رک کر ہم نے ایک بار پھر دوربین سے مورچوں کے خالی ہونے اطمینان کیا۔وہیں پر ایک گرے ہوئے کمرے کی چھت کی کڑیوں میں سے پلوشہ نے ساڑھے سات آٹھ فٹ لمبی ایک کڑی اٹھالی جو میرے بازو کے بہ قدر موٹی ہو گی۔
''اس کا کیا کرو گی؟'' میں پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔
اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔ ''جو بھی میرے قریب آیا، سر میں مار کر اس کا سر پھاڑ دوں گی۔''
''میرے بھی؟'' میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔
وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''ہاں آپ کے بھی اگر دور جانے کی کوشش کی تو۔''
میں مسکرا کر رہ گیا تھا۔مزید کچھ کہے بغیر اس نے اترائی کی جانب قدم بڑھا دیے۔
بیٹھک اور حویلی کے عقب میں چھوٹا سا خالی میدان تھا۔حویلی کے دائیں بائیں جڑا کوئی عمارت یا مکان موجود نہیں تھا۔جنوب کی طرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر دو تین گھر بنے تھے اور قریباً اتنے ہی فاصلے پر شمال کی جانب گھروں کا سلسلہ تھا۔ان دونوں عمارتوں کے سامنے پختہ سڑک بنی تھی جو وہاں سے علام خیل اور انگور اڈے

کو ملانے والی مستقل سڑک سے ملاپ کرتی تھی۔ سامنے کی جانب ہی سڑک عبور کر کے ڈھلان تھی جس کے اختتام پر کچے پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وزیرستان کے چند بڑے شہروں، جیسے میران شاہ، وانہ، رزمک، مکین وغیرہ میں تو گلیاں اور کوچے مل جاتے ہیں لیکن عام آبادی سلسلے گلیوں وغیرہ کے تکلف سے آزاد ہیں۔ نظریہ ضرورت کے تحت جس کو جہاں جگہ ملتی ہے وہ اپنا مکان بنا لیتا ہے۔ دو دو تین تین مکانات اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر درمیان میں ڈھلان، میدان، درختوں کے جھنڈ یا کھیت وغیرہ آجاتے ہیں اور پھر چند گھر بنے ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں کے مضافات میں موجود آبادی کی بھی یہی صورت حال ہے۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بڑے شہروں کی آبادی بھی پنجاب یا کے پی کے کے کسی متوسط گاؤں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ جب بڑے شہروں کا یہ حال ہے تو چھوٹے دیہاتوں کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

ڈھلان سے اتر کر ہم دونوں ایک چٹان کے ساتھ یوں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے جیسے تھک کر ستا رہے ہوں۔ دائیں بائیں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے ساتھ ہم نے عقب میں موجود دونوں مورچوں کو بھی بہ غور دیکھ لیا تھا۔ دور کھیتوں میں چند عورتیں کام کرتی نظر آرہی تھیں۔ ڈھلان اترتے وقت ایک بوڑھا شخص ہم سے تھوڑا آگے گدھے پر لکڑیاں لادے ہوئے جا رہا تھا۔ جو ہمارے چٹان کے ساتھ بیٹھنے کے بعد حویلی سے شرقی جانب ہوتا ہوا آگے بڑھ کر مزید اترائی اترتے ہوئے مکانات کے سلسلے میں غائب ہو گیا تھا۔ انھی مکانوں کے مغربی جانب کچھ بچے اور بچیاں کھیل رہے تھے۔ لیکن جب ہم بیٹھک کی دیوار کے قریب پہنچ جاتے تو انھیں نظر نہ آتے۔ مغربی جانب کچھ فاصلے پر دو نازنینیں بکریاں، بھیڑیں چرا رہی تھیں اور وہی دو ایسی جگہ پر تھیں، جہاں سے ہمیں آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن امید یہی تھی کہ اگر وہ ہمیں دیکھ بھی لیتیں تب بھی حویلی یا بیٹھک کے پاس آکر کسی کو بتانے کی جرأت نہ کرتیں۔ اور اس کی وجہ بیٹھک میں اوباش مردوں کی موجودی اور بیٹھک سے منسوب جھوٹی سچی کہانیاں تھیں، جن میں صنفِ نازک کے ساتھ زیادتی کے واقعات کثیر تعداد میں تھے۔

''کہاں سے گھسا جائے؟'' اطراف کا جائزہ لینے کے بعد ہم دونوں ہدف کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

وہ جلدی سے بولی۔ ''دونوں عمارتوں کو ملانے والی دیوار مناسب رہے گی۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سے گھسنے پر ہم دونوں عمارتوں میں موجود لوگوں کو دکھائی دے

سکتے ہیں۔اس کے بہ جائے جنوبی دیوار میں بنے ہوئے مورچے کی جگہ سے اندر داخل ہونے پر ایک تو دیکھے جانے کا خطرہ کم ہوگا دوسرا وہاں سے آسانی سے نیچے بھی اتر سکیں گے۔‘‘

’’آپ کی محبت نے مجھے کچھ بہتر سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔‘‘ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں اس نے ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔اس کی ایسی باتیں مجھے خوشی سے نہال کر دیا کرتیں۔محبت جتانے کا کوئی لمحہ بھی وہ ضائع نہیں جانے دیتی تھی۔دل کی بات دل میں چھپانے کی وہ عادی نہیں تھی۔

ہم دونوں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے جنوبی مورچے کے عین نیچے آ کر کر کھڑے ہو گئے۔وہ دیوار کافی بلند تھی اور بالکل ہی سیدھی بنی ہوئی تھی۔وزیرستان کے لوگ گھر کی بیرونی دیواریں بہت اونچی بناتے ہیں۔ہر گھر کا نقشہ کسی قلعے کے جیسا ہوتا ہے۔چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ان کے بیچوں بیچ چھوٹے چھوٹے کمرے جن کی چھتیں چار دیواری سے نیچی بنی ہوتی ہیں۔دیوار کے اوپر وہ لوگ پلاسٹک، کھجور کی چٹائیاں یا پتے وغیرہ کی اس طرح ڈالتے ہیں کہ بارش ہونے کی صورت میں پانی دیواروں کے اوپر نہ بہہ سکے۔ان دیواروں کی اونچائی چودہ فٹ سے تو کم نہیں ہوگی۔میرا قد پانچ فٹ نو انچ ہے جبکہ پلوشہ کا قد بہ مشکل پانچ فٹ دو انچ ہوگا اگر اس کے پاؤں میرے اٹھے ہوئے ہاتھوں پر ہوتے تب بھی وہ دیوار کی بلندی کو نہیں چھو سکتے تھے۔

’’گڑ بڑ ہوگئی ہے۔‘‘ دیوار کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے ہوئے میں نے پریشانی ظاہر کی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ اس نے پوچھنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔

اوپر کیسے چڑھیں گے؟‘‘ میں پریشانی کی وجہ بتلائی۔

’’آپ بس اپنی نئی نویلی دلھن کے ناز نخرے اٹھاتے رہنا، کام کی بات پر توجہ نہ دینا۔‘‘ اس کے ہونٹوں پر محبوبانہ تبسم کھل گیا تھا۔

’’طنز کر رہی ہو؟‘‘ میں نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

وہ بے پروائی سے بولی۔’’حقیقت بتا رہی ہوں۔بہ ہر حال پوچھنا یہ تھا کہ کیا مجھے ہاتھوں پر اٹھا لوگے؟‘‘

میں نے اسے مطعون کرتے ہوئے کہا۔’’بھول گئیں، کتنے دیران بازوؤں میں اٹھا کر چلتا رہا۔‘‘

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔’’اس وقت تو میں پرائی لڑکی تھی اور غیر لڑکیوں کا وزن بھلا مردوں کو کہاں محسوس ہوتا

ہے۔“

”پلوشے!...... مار کھاؤ گی۔“ میں نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

”آپ اس ڈنڈے کا پوچھ رہے تھے نا، تو یہ اسی لیے ساتھ لایا ہے راجو جی!“ اس نے وہ موٹی کڑی میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اور جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگی۔ بوٹ اتار کر اس نے جرابیں بھی اتاریں اور جرابیں بوٹوں کے اندر ٹھونس کر، دونوں بوٹوں کے تسموں کو ایک دوسرے سے باندھ کر گلے میں ڈال لیا۔

تیار ہو کر وہ مجھے طریقہ بتانے لگی۔ تفصیل سن کر میں سر ہلاتے ہوئے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ننگے پاؤں میرے کندھوں پر رکھے اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اپنی پیٹھ دیوار سے لگائی ہوئی تھی۔ جونھی اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا میں اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ یوں بھی وہ مجھے پھول کی طرح ہلکی لگا کرتی۔ سیدھا ہوتے ہی میں نے وہ مضبوط کڑی اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑی اور اس کا ہموار سرا اوپر کی طرف کر کے نچلا سرا زمین پر ٹکا دیا۔ ساڑھے سات آٹھ فٹ لمبی کڑی مجھ سے کافی اونچی تھی۔ اس نے ایک پاؤں میرے سر پر رکھا اور دوسرا پاؤں بہ مشکل کڑی کے دوسرے کونے پر ٹکا کر وہ کڑی کے اوپر منتقل ہو گئی۔ پلوشہ کا سارا بوجھ کڑی پر منتقل ہو گیا تھا۔

”تھوڑا اوپر اٹھاؤ۔“ اپنا توازن برقرار کرتے ہی اس نے ہولے سے کہا۔ اور میں کڑی کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ کڑی کو متوازن پکڑنے کے لیے میں اسے اپنے سر اور گردن کے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ میں بہت مشکل سے کڑی کو بلند کر پا رہا تھا۔ میرے بازو بالکل اکڑ گئے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں زیادہ دیر کڑی کو اسی انداز میں تھامے نہیں رہ پاؤں گا۔

کم از کم پلوشہ کا وزن پچاس کلوگرام کے بہ قدر تو ہو گا۔ حقائق کو خالی محبت کی آنچ سے نہیں ناپا جاتا۔ میرے دل میں بھری اس کی محبت کی وجہ سے اس کے وزن میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ البتہ محبت انسان کو برداشت اور حوصلہ ضرور عطا کرتی ہے۔ اور میں جانتا تھا کہ اگر کڑی میرے ہاتھوں میں ہلی جلی یا لرزی تو پلوشہ نیچے بھی گر سکتی تھی۔ اور اسے چوٹ لگنے کے اندیشے پر میرے بازوؤں میں پورے جسم کی قوت سمٹ آئی تھی۔

میں نے بہ مشکل فٹ بھر کڑی کو بلند کیا ہوگا کہ اچانک میرے ہاتھ بالکل ہلکے ہو گئے۔ میں نے گہرا سانس لے کر اوپر کی جانب نظریں اٹھائیں وہ دیوار کے کنارے میں انگلیاں پھنسا کر اوپر چڑھ رہی تھی۔

کڑی کو ایک طرف پھینک کر میں وہیں نیچے کھڑا ہو گیا کہ اگر خدانخواستہ اس کے ہاتھ چھوٹ گئے تو اسے نیچے گرنے سے پہلے بازوؤں میں سنبھال سکوں۔ اتنی سخت جان ہونے کے باوجود مجھے تو وہ کانچ کی گڑیا ہی لگتی تھی۔

مگر میری احتیاط بے کار گئی تھی۔ وہ دیوار کے اوپر پہنچ کر بیٹھک کے صحن کا جائزہ لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ مطمئن ہو کر دیوار پر اس طرح لیٹی گئی کہ اس کا پیٹ تو دیوار کے اوپر تھا نچلا دھڑ دوسری جانب اور سینہ اور ہاتھ میری طرف جھکے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ اس نے سر سے لپٹی پگڑی اتار کر اس کا ایک سرا اپنے ہاتھوں میں لپیٹ کر دوسرا سرا میرے لیے نیچے لٹکا دیا۔ اس نے پتلی دھوتی نما چادر ہی پگڑی کے انداز میں سر سے لپیٹی ہوئی تھی۔ چادر سر سے اتارتے ہی اس کے ریشمی بال بکھر کر ماتھے پر لہرانے لگے تھے۔

میں نے ایک پتھر سے کڑی کا نچلا سرا جوڑ کر اسے دیوار کے ساتھ سیدھا کھڑا کیا اور پلوشہ کی چادر کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ میری نظر اس کے سرخ پڑتے چہرے پر تھی، صاف لگ رہا تھا کہ اسے بہت زیادہ قوت صرف کرنا پڑ رہی ہے۔ اسے زیادہ زحمت سے بچانے کے لیے ہی میں نے کڑی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا تھا۔ وہ ساڑھے سات آٹھ فٹ لمبی کڑی کافی مدد دے سکتی تھی۔ تھوڑا سا اوپر ہوتے ہی میں کڑی کے ہموار سرے پر پاؤں رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک دم پلوشہ کے ہاتھوں پر سے میرا وزن ہٹ گیا اور میں دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھوں اور دیوار کی کگر میں چند انچ کا فرق تھا۔ اس نے دوبارہ میرے ہاتھ تھامنے چاہے، مگر میں اسے مزید مشقت میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا۔

"میں چڑھ جاؤں گا، تم مورچے میں پہنچو۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیوار پر چڑھ کر اس نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا اور پھر سیدھا کھڑے ہو کر مورچے کی ایک جانب سے نکلے ہوئے لکڑی کے سروں پر پاؤں رکھتی ہوئی مورچے میں گھس گئی۔ اس اثناء میں میں نے اچھل کر دیوار کی کگر میں انگلیاں پھنسائیں اور اپنے ہاتھوں کے بل پر اوپر اٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں

دیوار پر تھا۔اسی دیوار سے چند فٹ نیچے کمروں کی چھت تھی۔لیکن چھت پر پاؤں رکھنے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر اس کمرے میں کوئی آدمی بھی موجود ہوتا تو اسے ایک منٹ میں معلوم ہو جاتا کہ چھت پر کوئی موجود ہے۔میں نے ایک سرسری نظر صحن میں دوڑائی ،مگر نہ تو داخلی دروازے پر کوئی نظر آیا اور نہ صحن کوئی حرکت نظر آئی۔غور کرنے پر مجھے حویلی کے داخلی دروازے کی اندر سے کنڈی لگی نظر آئی۔

کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کرتے ہی میں سرعت سے اٹھا اور پلوشہ کی طرح بڑھی ہوئی لکڑیوں پر پاؤں رکھ کر مورچے میں گھس گیا۔مورچہ چھے سات فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا تھا۔دیوار کے ساتھ ایک کلاشن کوف کھڑی تھی ۔تپائی نما لکڑی کی میز پر گولیوں سے بھری تین چار میگزنیں بھی رکھی ہوئی تھیں ۔جدید ساخت کی ایک دوربین دیوار سے لٹکی ہوئی تھی ۔ایک لوہے کی کرسی جس کی ٹانگیں اتنی اونچی تھیں کہ اس پر بیٹھنے والا آسانی سے مورچے کی تین اطراف کی دیواروں میں بنے ہوئے سوراخوں میں سے جھانک کر نگرانی کرسکتا تھا۔چوتھی سمت میں یوں بھی مورچے کا دروازہ تھا۔

پلوشہ جرابیں اور بوٹ پہن کر تیار تھی۔سر پر باندھی ہوئی چادر کو اس نے مفلر کے انداز میں چہرے پر لپیٹ لیا تھا جبکہ نیفے میں اڑسا ہوا گلاک نائنٹین اس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔وہ ہلہ بولنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھی ۔

’’کلاشن کوف لے لیں؟‘‘اس نے مشورہ چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

’’نہیں ۔‘‘میں نے نفی میں سر ہلایا۔’’فی الحال اس کی کوئی ضرورت نظر نہیں آ رہی ،گلاک کافی ہے ۔‘‘میں نے اپنا گلاک بھی ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔مورچے کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی بنی ہوئی تھی ،مگر وہ سیڑھی اتنی چوڑی ضرور تھی کہ ہاتھوں کا سہارا لیے بغیر سیڑھی سے اترا جاسکتا تھا۔سیڑھی کا اختتام ایک کمرے ہی میں ہو رہا تھا۔

نیچے اترتے ہی پلوشہ نے اپنی پیٹھ میری پشت سے جوڑتے ہوئے عقب کی دیکھ بھال کرنے لگی۔میں نے بارہا پرکھا تھا کہ اس کا انداز کسی تربیت یافتہ کمانڈو کا سا ہوتا تھا۔اس کی دلربائی اور محبوبیت سے ہٹ کر بھی اس کی موجودی میں مجھے سردار خان جیسے تربیت یافتہ اور دلیر ساتھی کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اس کمرے کے دو دروازے تھے۔ایک باہر صحن کی جانب کھلتا تھا،جبکہ دوسرا برآمدے کی طرف۔ہمارا رخ

اندر کی طرف تھا۔گلاک کو فائر کے لیے تیار حالت میں تھامے میں دبے قدموں آگے بڑھتا گیا۔ایک کمرے سے بے ہنگم موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔اس کمرے کے دروازے سے ہم ایک لمبے چوڑے برآمدے میں داخل ہوئے، جس کی مغربی جانب کمروں کے دروازے اور مشرقی جانب بیٹھک کا کھلا اور وسیع صحن تھا۔کمروں کی یہ قطار دیوار کے اختتام کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ شمالی دیوار کی طرف مڑ جاتی تھی۔اگر مغرب کی جانب سے دیکھا جاتا تو وہ کمرے اور برآمدہ انگریزی کے حرف ایل کی طرح نظر آتا تھا۔شمالی جانب ان کمروں اور برآمدے کے اختتام پر ایک علاحدہ کمرہ بنا ہوا تھا۔شاید وہ سنتریوں کے لیے بنا تھا۔جنوب مشرقی دیوار کے ملاپ پر بھی جنوب مغربی دیوار کے کونے کی طرح ایک طویل کمرہ بنا ہوا تھا جس اوپر ایک مورچہ موجود تھا جس سے مشرق اور جنوب کی جانب کی دیکھ بھال کی جاسکتی تھی۔مورچے والے مشرقی اور مغربی دونوں کمروں کے درمیان تھوڑی سی جگہ خالی تھی اور پھر دو تین کمرے بنے نظر آ رہے تھے جن کے سامنے اپنا برآمدہ موجود تھا۔مشرقی دیوار کے ساتھ دو تین غسل خانے اور بیت الخلاء بنے تھے اور ان کے بعد گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے ایک گیراج بنا ہوا تھا،جس میں پہلو بہ پہلو پانچ چھے گاڑیاں بآسانی کھڑی کی جاسکتی تھیں۔اس وقت بھی وہاں ایک سنگل کیبن کھڑی تھی۔مورچے والے کمرے شرقاً غرباً طول لیے ہوئے تھے۔مغربی جانب بنا مورچے والا کمرہ دوسرے کمروں کی چوڑائی اور برآمدے کی چوڑائی کے برابر لمبا تھا۔

مغربی جانب کمروں کی قطار میں آٹھ دروازے میں نے گنے۔جن میں سے صرف دو کے دروازے کھلے تھے۔ایک ہماری طرف سے دوسرا کمرہ اور دوسرا آخری کمرہ جس سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔بند کمروں کو نظر انداز کر کے میں نے پہلے آنے والے کھلے کمرے میں جھانکا۔مگر کمرہ بالکل خالی پڑا تھا۔اس دوران پلوشہ صحن اور جنوبی دیوار کے ساتھ بنے ہوئے کمروں کی جانب متوجہ رہی تھی۔ہم محتاط مگر ذرا تیز قدموں سے آخری کمرے کے قریب پہنچے۔دروازے سے ذرا پہلے رکتے ہوئے میں نے پلوشہ کے کان سے منہ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم باہر ہی رہنا۔''

''ٹھیک ہے۔''اس کی آواز بھی سرگوشی میں ڈھلی ہوئی تھی۔

میں کھسکتا ہوا کھلے دروازے کے قریب ہوا۔اب موسیقی کی آواز کے ساتھ ایسی حیوانی اور قبیح آوازیں بھی

میرے کانوں میں پڑنے لگیں تھیں جو دیکھے بغیر کمرے کا اندرونی منظر آشکارا کر رہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ میں پلوشہ کو باہر رکنے کا کہہ چکا تھا۔

کمرے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اس لیے مجھے دروازے کو ٹھوکر مار کر یا دھکیل کر اندر داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں گلاک دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے زقند بھر کر اندر گھسا، کیوں کہ پستول کو اگر ایک کے بہ جائے دونوں ہاتھوں میں تھاما جائے تو درست نشانہ لینے میں آسانی رہتی ہے۔

''خبردار اگر کسی نے حرکت کی۔'' میری آواز اتنی ہی بلند تھی کہ کمرے میں موجود آدمی ہی سن سکتے تھے۔

http://sohnidigest.com

وہ تعداد میں چار تھے۔ایک آدمی، کم عمر بے ریش لڑکے کے ساتھ شرم ناک حالت میں ملوث تھا جبکہ باقی تین سی ڈی پلیئر پر پشتو کا مجرا دیکھنے میں محو تھے۔میری آواز سے سوائے لڑکے کے ساتھ گھناؤنی حالت میں موجود آدمی کے باقی تمام سن ہو گئے تھے۔وہ ابھی تک اپنی حرکت پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔اس کی مشکل گلاک کی مزل سے نکلنے والی بے رحم اور صورت حال نا آشنا گولی نے آسان کر دی تھی۔ماتھے میں پیوست ہونے والی گولی نے اس کے اندر پلنے والے حیوانی جوش کو پر اذیت تھرتھراہٹ میں تبدیل کر دیا تھا۔

اپنے ساتھی کا انجام دیکھتے ہی ان میں سے دو نے اٹھ کر دوسری چارپائی پر پڑی کلاشن کوفوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔یقیناً حرکت میں برکت ہوتی ہے مگر ان کی حرکت کسی بھاری گاڑی کے پہیے کے نیچے سر دینے کے مشابہ تھی اور لازماً ایسی حرکت برکت کے بہ جائے حسرت کا باعث بنتی ہے دونوں کی کوشش میں گلاک کی گولیاں یوں رخنہ انداز ہوئی تھیں جیسے بارش کی راہ میں چھتری، دونوں اپنے ساتھی کی نقل اتارنے لگے۔چوتھے آدمی نے فوراً اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے، جبکہ نوعمر لڑکا زور زور سے رونے لگ گیا تھا۔

''چپ۔''میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر اسے ڈانٹا۔''جلدی سے کپڑے پہنو۔''

وہ لرزتا ہوا اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''حالات قابو ہیں باہر ہی رہو۔''پلوشہ تک اپنی خیریت پہنچا کر میں آگے بڑھ کر ماہرانہ انداز میں چوتھے آدمی کی تلاشی لینے لگا۔مگر اس کی جیبوں میں کوئی قابل ذکر چیز موجود نہیں تھی۔اس کی قمیص اتار کر میں اسی سے اس کے ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھ دیئے۔

ایل ای ڈی کی سکرین پر پشتو کے بھڑکیلے گیت پر چست شلوار قمیص میں ملبوس ایک رقاصہ جسم کو یوں توڑ موڑ رہی تھی جیسے اسے تشنج کے دورے پڑ رہے ہوں۔جتنے واہیات اس گانے کے بول تھے، اس سے کئی گنا واہیات اس لڑکی کا رقص تھا۔

''پہ لار رازی پکار نہ رازی سہ ورسرا او کو...... یو کال کیگی کہ یار نہ رازی سہ ورسرا او کو۔''

(راستے پر تو ملتا ہے مگر کسی کام نہیں آتا اب اس کے ساتھ کیا کریں۔اور ایک سال ہو گیا ہے کہ یار میرے

پاس نہیں آرہا اس کے ساتھ کیا کریں)

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ سی ڈی پلیئر یا ایل ای ڈی کو آف کرتا پھرتا۔ میرے قیمتی وقت کو بچانے کے لیے گلاک کی گولی کام آئی تھی۔ ایل ای ڈی سکرین اور سی ڈی پلیئر پر ایک ایک گولی ضائع کر کے میں لڑکے کی طرف متوجہ ہوا جو باقاعدہ لرز رہا تھا۔

اسے بازو سے پکڑ کر میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دھکیلا۔ ”پلوخان!......اسے ساتھ والے کمرے میں بند کر دو۔“

”پلوشہ نے فوراً اندر جھانک کر دیکھا مگر اس انداز میں بھی اس کا سر کسی پنڈولم کی طرح ہلتے ہوئے باہر کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکے کو بازو سے پکڑ کر بغیر کوئی سوال کیے اس نے باہر کھینچ لیا۔

”کمرے میں ہتھیار وغیرہ کی غیر موجودی کو یقینی بنا لینا۔“ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پلوشہ کوئی بے احتیاطی نہیں کر سکتی تھی میں نے مشورہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ایس ایس!“ وہ یقیناً مجھے جانتا تھا، رہی سہی کسر پلوشہ کے نام نے پوری کر دی تھی ۔صنوبر خان کے آدمیوں کے لیے پلوخان، نام اجنبی نہیں تھا۔ یوں بھی پلوشہ خان وزیر اور ایس ایس کی داستان محبت کافی لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس میں زیادہ کردار قبیل خان اور جہانداد خان کی ہلاکت کا تھا۔ علاقے کے دو سرکردہ سرداروں کا ایک عام سی لڑکی اور لڑکے کے ہاتھوں قتل ہونا بہت بڑی بات تھی۔

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، تمھارے جیسے ننگ انسانیت سے زمین کا صفایا کرنا یقیناً اچھا نہیں بہت اچھا کام ہے۔“

”تمھارے ساتھ ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”مگر میری تو ہے۔“

”وجہ؟“

”تم میرے وطن کے دشمن ہو اور میرے لیے یہ وجہ کافی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔“

”سردار صنوبر خان اس بار تمھیں معاف نہیں کرے گا۔“ اس نے دبے لفظوں میں دھمکیاں دینا جاری رکھا

۔اس مرتبہ میرا ہاتھ گھوما، وہ الٹ کر پیچھے کو گر گیا تھا۔

میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر سیدھا بٹھایا۔"میں تمھاری دھمکیاں سننے نہیں آیا، اس لیے جو پوچھتا ہوں آرام سے اس کا جواب دیتے رہو۔"

وہ کوئی لفظ منھ سے نکالے بغیر کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

"تمھارا نام؟"

وہ آہستہ سے بولا۔"شاہجہان۔"

"باقی لوگ کہاں دفع ہو گئے ہیں۔"میں نے جانتے بوجھتے ایسا سوال پوچھا تھا جس کی بابت مجھے معلوم تھا

"تھوڑی دیر ہوئی نکلے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔"اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

اور میں اس کے جھوٹ بولنے ہی کا تو منتظر تھا۔اگلے سوال سے پہلے میں نے چارپائی پر پڑی کلاشن کوف کی سلنگ نکال کر اس کی ننگی پیٹھ پر چابک کی طرح تواتر سے برسانے لگا۔

"اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے، مگر زیادہ دیر وہ ان ضربات کو برداشت نہ کر سکا اور جلد ہی کراہنے پر مجبور ہو گیا۔اس کی پیٹھ پر سرخ لکیریں پڑ گئی تھیں، کسی کسی جگہ سے خون بھی رسنے لگا تھا۔

"یقیناً، اب جھوٹ نہیں بولو گے،اس کی کراہیں جب چیخنے میں تبدیل ہونے لگیں تو ہاتھ روک کر میں دوبارہ اسے مخاطب ہوا۔

"تم زیادتی کر رہے۔"اس نے کراہتے ہو زبان کھولی۔

میں مسکرایا۔"جھوٹے جواب پر اتنی زیادتی تو روا ہوتی ہے نا میری جان ۔باقی جواب دیتے ہوئے یہ دھیان میں رہے کہ، کچھ سوالات کے جواب مجھے معلوم ہیں اور ایسے سوالات کا مقصد تمھاری سچائی کو جانچنا ہے ۔یہ آخری وارننگ تھی، اس کے بعد تمھارا جھوٹ زندگی کا آخری جھوٹ ثابت ہو گا۔"

اس نے بے بسی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر جھکا لیا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔"تو باقی لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"انگور اڈے والی حویلی میں آج سردار صنوبر خان ایک بہت بڑی پارٹی دے رہے ہیں، جہاں ان کے

حلیف سردار بھی آئیں گے۔ چند غیر ملکی مہمان بھی ہیں۔‘‘اس مرتبہ اس نے سچ بتاتے ہوئے تفصیلی جواب دیا۔

’’شاباش......اب ذرا یہ بتاؤ، ساتھ والی حویلی میں کتنے محافظ موجود ہیں؟‘‘

’’ایک بھی موجود نہیں ہے۔‘‘

’’گھر میں کتنے مرد ہوں گے۔‘‘

’’کوئی مرد موجود نہیں ہے، عورتیں اور بچے ہیں۔‘‘

’’ہونہہ!......‘‘ایک گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔اس دوران پلوشہ بھی اندر آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا......

وہ جلدی سے بولی۔’’تمام بیٹھک چھان لی ہے، کوئی بھی موجود نہیں ہے۔‘‘

میں دوبارہ شاہجہان سے سوالات کرنے لگا۔سوالات کے اختتام پر میں نے پلوشہ کی جانب دیکھا۔گویا اس کا کوئی سوال تھا تو وہ کر سکتی تھی۔

وہ زہر خند لہجے میں مستفسر ہوئی۔’’شاہ جہان! یاد ہے میرے معصوم بھائی کے بارے غلاظت اگلتے وقت صنوبر خان نے تمھاری طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ اس کے پاس ایسے آدمی موجود ہیں جو کم سن لڑکوں کا شوق رکھتے ہیں۔‘‘

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔’’وہ......وہ......تو سردار نے تمھیں ڈرانے کی غرض سے کہا تھا۔‘‘

’’اور تم نے کہا تھا کہ میرے بھائی کے بعد میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرو گے۔‘‘پلوشہ کے اطمینان بھرے لہجے میں کوئی ایسی دھمکی پوشیدہ تھی کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

’’مم......میں......میں......‘‘اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پلوشہ نے گلاک سیدھا کرتے ہوئے اس کی چھاتی میں گولی اتارتے ہوئے کہا۔’’بکواس بند کرو کنجر۔‘‘یقیناً وہ مزید وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

’’چلیں۔‘‘شاہجہان کا پھڑ کنا رکتے ہی میں نے اسے متوجہ کیا۔

’’ہوں چلنا ہی پڑے گا، ایل ای ڈی آپ نے یوں بھی توڑ دی ہے، ورنہ جو گانا لگا تھا اس پر میں بہت اچھا رقص پیش کر سکتی تھی۔‘‘

”اور میں نے منع جو کیا تھا۔“میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔”آپ نے مردوں میں ناچنے سے منع کیا تھا......آپ اکیلے کے سامنے تو کوئی قباحت نہیں ہے نا۔“

”بے شرم۔“میرے ہونٹوں پر بھی ہنسی نمودار ہوگئی تھی۔

”اچھا ایک خوشی کی بات بتاؤں۔“اس نے مسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں فلسفیانہ لہجے میں بولا۔”خوشی کی بات چھپانی تو نہیں چاہیے۔“

”میری سوکن بھی یہیں موجود ہے۔“

”سوکن......؟“میں نے حیرانی بھری نظروں سے اسے گھورا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے مسکرائی۔”بیرٹ ایم 107۔“اسے بھی میں نے استاد محترم راؤ تصور کا مقولہ میں نے سنایا تھا اور وہ اسے بھولا نہیں تھا۔

”کہاں ہے؟“میں بے صبری سے مستفسر ہوا۔

”آئیں۔“وہ مجھے ساتھ لے کر جنوبی طرف بنے خواص کے کمروں کی طرف بڑھ گئی۔وہیں ایک کمرے میں بیریٹ ایم 107 مکمل سامان کے ساتھ موجود تھی۔اس کے ساتھ ساٹھ کے قریب فالتو گولیاں بھی موجود تھیں۔

وہ قیمتی رائفل دیکھتے ہی خوشی سے میری باچھیں کھل گئی تھیں۔میں محبت بھرے انداز میں رائفل کی باڈی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

”راجو!......مجھے جلن محسوس ہو رہی ہے۔“میری محویت میں پلوشہ کی آواز نے خلل ڈالا تھا۔

میں فوراً اس کی طرف مڑا۔”چندا!......جانتی ہو سانس لینے کے بعد میرے لیے سب سے اہم کام تمھیں چاہنا ہے۔“

”تو پھر رائفل کے ساتھ یوں چاہت سے تو پیش نہ آؤ نا۔“وہ شکوہ کناں ہوئی۔”مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ میرے علاوہ آپ کسی سے اس چاہت سے پیش آئیں چاہے وہ بے جان رائفل ہی کیوں نہ ہو۔“

”پاگل۔“ مجھے سچ مچ ہنسی آگئی تھی۔

”اچھا ایک اور بات، یہاں تہہ خانہ بھی موجود ہے جس میں کافی ہتھیار اور گولہ بارود موجود ہیں۔“

”اوہ......“ جوش بھرے انداز میں میں اسکی معیت میں تہہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ تہہ خانے کا دروازہ ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ تہہ خانہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ دونوں کمروں کی لمبائی چوڑائی پندرہ سولہ فٹ کے قریب ہوگی۔ وہ دونوں کمرے عین ان خاص کمروں کے نیچے بنے تھے۔ ایک کمرے میں لکڑی کے بکسوں میں نئی کلاشن کوفیں، روگر ایم پی نائن سیمی آٹو میٹک (Ruger mp 9) پسٹل، راکٹ لانچر اور سنائپر رائفل ڈریگنو وبھری ہوئی تھیں۔ کلاشن کوفوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ان ہتھیاروں کے ایمونیشن کی بھری ہوئی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں، جبکہ دوسرے کمرے میں بارود کی تھیلیاں، مختلف قسم کے سوئچ، سیفٹی فیوز اور ڈیٹونیٹر وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ مختلف قسم کے بارودی پھندے، ٹائم بم اور ٹینک شکن بارودی سرنگیں بھی پڑی دکھائی دیں۔

(قارئین کی تفریح طبع کے لیے بارود کے بارے چند ضروری باتیں لکھتا جاؤں، کہ عمومی طور پر لکھاری حضرات بارود وغیرہ کے بارے بہت سطحی معلومات رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھاریوں کی اکثریت وہ ہے جنھیں میں ڈرائینگ روم کے لکھاری کہا کرتا ہوں۔ عملی زندگی میں ان بے چاروں نے اصلی پستول تک کی شکل نہیں دیکھی ہوتی۔ اس ضمن میں بتاتا چلوں کہ پچھلے دنوں ایک محترم مصنف کی تحریر نظر سے گزری جس میں موصوف کا ہیرو ایک عمارت میں کچھ خطرناک دشمنوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، وہاں دشمنوں کے پاس کچھ فالتو ہتھیار اور ایمونیشن کا ذخیرہ بھی موجود ہوتا ہے، ایمونیشن کے ذخیرے میں غلطی سے گولی لگتی ہے اور اتنا بڑا دھماکا ہوتا ہے کہ ساری عمارت بھک سے اڑ جاتی ہے جبکہ ہیرو صاحب اس دھماکے کی شدت سے اڑتے ہوئے عمارت سے باہر جانے والی کسی ٹرالی میں جا گرتے ہیں اور اسے خراش تک نہیں آتی، جبکہ باقی کی عمارت اور اس میں موجود لوگوں کا نام ونشان بھی نہیں بچتا۔ کسی کرم فرما کی فرمائش پر میں نے وہ چند صفحات پڑھے یقین مانیں وہ سطور پڑھ کر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہنسوں یا روؤں...... سب کے مرنے کے باوجود ہیرو میاں کیسے بچے یہ تو ایک علیحدہ موضوع ہے، میرا مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا ایمونیشن کے ذخیرے میں گولی لگنے سے اس طرح دھماکا ہوسکتا

ہے۔ یہ بات اتنی ہی بعید از قیاس ہے کہ جتنی پانی کو آگ لگنا۔ کیوں کہ بارود کا ذخیرہ بھی اس طرح گولی لگنے سے ایک دم دھماکے سے نہیں پھٹتا، جبکہ فاضل مصنف نے ہتھیاروں کے ایمونیشن کو یوں دھماکے سے پھٹا یا جیسے کوئی تیار شدہ ڈیمولیشن سیٹ یا آئی ای ڈی ہو۔ یقیناً محترم نے کسی انگلش فلم کا سین دیکھ کر یہ منظر تراشی کی ہوگی۔ بہر حال حقیقت سے اس کا دور دور تک کا واسطہ نہیں۔ حالانکہ کسی بھی جگہ اگر کوئی ایسا ایمونیشن پڑا ہو جیسے کہ راکٹ لانچر یا مارٹر وغیرہ کا ایمونشن اور اسے آگ وغیرہ لگ جائے یا فاضل مصنف کے بہ قول گولی وغیرہ لگنے ہی سے وہ پھٹنا شروع ہو جائے تو یقینی طور پر ہر راکٹ یا گولہ علیحدہ علیحدہ اور وقفے وقفے سے پھٹے گا۔ باقی عام رائفل کی گولیاں دھماکا وغیرہ نہیں کریں گی۔ بس خود پھٹ کر ناکارہ ہو جائیں گی۔ ان کے پھٹنے کی آواز تو پھلجڑیاں چلنے کی طرح آئے گی لیکن رائفل، کلاشن کوف وغیرہ کی گولیاں اس طرح پھٹ کر کسی کمرے وغیرہ کو نہیں اڑا سکتیں۔ بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی میں بارود کے بارے چند باتیں عرض کرنا چاہتا تھا، اگر بارود کی اقسام کی بات کی جائے تو بارود کی دو بڑی اقسام ہیں، ایک لو ایکسپلوزیو اور دوسرا ہائی ایکسپلوزیو۔ لو ایکسپلوزیو رائفل وغیرہ کی گولیوں میں استعمال ہوتا ہے اور ہائی ایکسپلوزیو کسی بھی چیز یا جگہ کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر خود ہائی ایکسپلوزیو کی مختلف اقسام ہیں، کوئی مائع کی شکل میں ہوتا ہے، کوئی ٹھوس اور کوئی پاؤڈر وغیرہ کی شکل میں تھیلیوں میں بند ملتا ہے۔ اس کو پھٹانے کے لیے بھی ایک مخصوص قسم کی کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ جس میں، ڈیٹونیٹر، پرائمر، سیفٹی فیوز وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ہائی ایکسپلوزیو بارود کو شیطانی پھندوں میں بھی لگا کر استعمال کیا جاتا ہے جن میں کچھ پھندے ایسے ہوتے ہیں جو کھینچنے پر چال کرتے ہیں جنھیں دروازوں اور کھڑکیوں وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے، کچھ پھندے وزن پڑنے پر چال کرتے ہیں جیسے بارودی سرنگیں، کچھ وزن ہٹنے پر چال کرتے ہیں، ایسے پھندے عام استعمال کی ایسی چیزوں کے نیچے رکھ کر استعمال کیے جاتے ہیں جنھیں عام روزمرہ میں لوگ دائیں بائیں کرتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو مخصوص وقت پر چال کرتے ہیں جنھیں ٹائم بم کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں میں اجمالاً بارود کے بارے چند باتیں ذکر کی ہیں ورنہ یہ ایک بہت بڑا موضوع اور مستقل علم ہے جس پر سینکڑوں ہزاروں صفحات بھی کم پڑ جائیں گے)

''میرا خیال ہے دونوں عمارتوں کو تباہ کرنے کے لیے یہ بارود کافی ہے۔'' بارود کے ذخیرے کو اچھی طرح

دیکھتے ہی میں نے اعلان کیا۔

”اس سے بہتر کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“ پلوشہ نے خوشی کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”ٹھیک ہے میں دھماکے کے لیے بارود تیار کرتا ہوں تم گیراج میں کھڑی گاڑی کی چابیاں ڈھونڈ کر گاڑی کو ان کمروں کے سامنے لے آؤ۔“

وہ سر ہلاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چل پڑی جبکہ میں ڈیمولیشن سیٹ تیار کرنے لگا۔

وہ کافی وقت لگا کر لوٹی تھی۔ اس کی واپسی تک تمام ضروری کارروائیاں کر کے میں نے سارے بارود کو ٹائم بم کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ ٹائم بم پر میں نے وقت سیٹ نہیں کیا تھا۔

”کافی دیر لگا دی۔“ اس کے واپس آتے ہی میں نے پوچھا۔

”چابی نہیں مل رہی تھی۔“

”چلو ایمونیشن اور ہتھیار گاڑی میں رکھتے ہیں۔ تاکہ اتنا قیمتی اسلحہ انھی کے خلاف استعمال ہو۔“

وہ کہنے لگی۔ ”جانتی ہوں، آپ نے اسی لیے تو گاڑی کو ان کمروں کے سامنے منگوایا ہے۔“

ہم دونوں ہتھیار اور ایمونیشن کی پیٹیاں سنگل کیبن کی باڈی رکھنے لگے۔ ہمارا مزید آدھا گھنٹا اسی میں لگ گیا تھا۔ اسی اثناء میں وہ لڑکا دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے آوازیں دینے لگا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم وہاں سے رخصت ہو گئے ہیں۔

میں نے قریب جا کر اسے سختی سے ڈانٹا اور چپ رہنے کو کہا۔ وہ سہم کر دوبارہ خاموش ہو گیا تھا۔

”اب کیا کریں؟“ بیٹھک کے دوسرے کمروں میں موجود ہتھیار بھی گاڑی کی باڈی میں منتقل کر کے پلوشہ مستفسر ہوئی۔

”تم قبیل خان کی عورتوں سے انتقام وغیرہ کا سوچ ہوئے تھیں۔“ میں نے اسے وہاں آتے وقت کی بات یاد دلائی۔

”دفع کرو...... اس خبیث اور بے غیرت کے افعال میں ان بے چاریوں کا کیا قصور۔“

”مگر ان سے گھر تو خالی کرانا پڑے گا۔ یہاں ہونے والے دھماکے سے یقیناً اس عمارت کو بھی کافی نقصان

پہنچے گا...... بلکہ میرا خیال ہے وہ بھی ملبے کا ڈھیر بنے گی۔“
”راجو!...... کہیں اس دھماکے سے دائیں بائیں موجود عمارتوں کو نقصان نہ پہنچے، یا دھماکے کی وجہ سے جو پتھر وغیرہ اڑیں گے ان کی زد میں کوئی بے گناہ نہ آجائے۔“
”تم اتنی سمجھ دار پہلے تو نہیں تھیں۔“ اس کے ساتھ متفق ہوتے ہوئے بھی میں اس پر طنز کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔
وہ ترکی بہ ترکی بولی۔”اگر سمجھ دار ہوتی تو آپ سے شادی کرتی۔“
میں دوبارہ تہہ خانے کا رخ کرتے ہوئے بولا۔”پگلی، یہی ایک کام تو تم نے سمجھ داری والا کیا ہے۔“
”صحیح کہا۔“ کھل کھلا کر ہنستے ہوئے اس نے میرے ساتھ قدم بڑھا دیے۔ سیڑھیاں اتر کر میں نے آپس میں باندھی ہوئی بارود کی تھیلیوں کو کھول کر وہ پاؤڈر تہہ خانے میں بکھیرنے لگا۔ وہاں موجود ڈیٹونیٹر، پرائمر اور دوسرا ہلکا پھلکا سامان میں نے پلوشہ کو گاڑی میں رکھنے کا کہا۔ سیفٹی فیوز جو کیبل کی طرح ہوتا ہے اسے کھول کر میں نے ایک سرا تہہ خانے میں موجود لکڑی کی پیٹی سے باندھا اور باقی کو کھول کر اوپر تک لے گیا۔ وہاں سے جاتے وقت میں اسے آگ لگانا چاہتا تھا تاکہ وہ تہہ خانے میں بکھرے تمام بارود کو ضائع کر دے۔ ڈیٹونیٹر کے بغیر وہ بارود دھماکا نہیں کر سکتا تھا۔ بس جل کر ضائع ہو جاتا۔
باہر جا کر سب سے پہلے تو اس لڑکے کو کمرے سے نکال کر دو تین تھپڑ لگائے اور وہاں سے بھاگ جانے کا کہا۔ اس کے بھاگ جاتے ہی میں نے پلوشہ کو داخلی دروازہ کھولنے کا کہا اور خود سیفٹی فیوز کو آگ لگا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سیفٹی فیوز کی لمبائی پینتیس چالیس فٹ تھی۔ سیفٹی فیوز ایک منٹ میں دو فٹ کے قریب جلتا ہے۔ اس طرح بیس منٹ کے بعد ہی آگ تہہ خانے تک پہنچ پاتی۔
گاڑی کے دروازے سے باہر جاتے ہی، پلوشہ نے دروازہ باہر ہی سے کنڈی کر کے میرے ساتھ آبیٹھی۔ اگر گاڑی کو میں وہاں سے اپنے ٹھکانے پر لے جاتا تو خطرہ تھا کہ صنوبر خان کے کسی ہمدرد وغیرہ کی نظر پڑ سکتی تھی یا یونھی برسبیل تذکرہ ہی کوئی اس کا ذکر صنوبر خان یا اس کے کسی آدمی سے کر سکتا تھا، اس لیے میں انگور اڈے والی سڑک پر آگے نکلتا گیا۔ گاؤں سے باہر آتے ہی میں دائیں بائیں احتیاط سے جائزہ لیتے ہوئے گاڑی نالے میں

اتاردی۔

اسی بڑے نالے میں چلتے ہوئے تھوڑا سا آگے جا کر میں نے گاڑی ایک ذیلی نالے میں موڑی۔ یہ وہی نالہ تھا جس جگہ سردار خان اور میں نے قبیل خان کے سالے خائستہ گل کو اپنے انجام تک پہنچایا تھا۔

گاڑی گھنی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپا کر ہم باہر نکل آئے۔ پلوشہ نے وہاں سے روگر ایم پی نائن سیمی آٹو میٹک (Ruger mp 9) پسٹل اوران کی سوڈیڑھ سو کے قریب گولیاں اٹھا کر اپنے پاس رکھ لی تھیں ۔میں نے بس بیرٹ ایم 107 کوساتھ لینا پسند کیا تھا۔اسی نالے نالے میں چلتے ہوئے ہم علام خیل کے شمالی جانب جا کر گاؤں میں داخل ہوئے سہ پہر ڈھلے ہی ہم کمانڈر عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک میں پہنچ سکے تھے۔ جاتے ساتھ میں نے قاری غلام محمد کو حویلی پر حملے کی اجمالی تفصیل بتا کر اسے اسلحہ چھپانے والی جگہ کے بارے بتا دیا ۔خوشی سے اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

”جزاک اللہ بیٹا!......باقی ہم سنبھال لیں گے۔“اور میں سر ہلاتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔

پلوشہ تکیے کے ساتھ کمر ٹیکے پشتو کا کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ میں اس کی گود میں سر کر لیٹ گیا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے آہستہ آواز میں گنگناتی رہی۔اس کی آواز کسی خوب صورت لوری سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔میری آنکھیں بند ہونے لگیں میں گیت کے بولوں میں کھویا ہوا نیند کی خوب صورت وادیوں میں اترتا چلا گیا جہاں پلوشہ اسی طرح گنگناتے ہوئے میرے ساتھ تھی۔

”تل مے خیالونو کی اوسیگی یما گران دے......دا پور کلے مے دا جانان دے۔“(وہ ہمیشہ میرے خیالوں میں بسا رہتا ہے اور مجھے بہت پیارا ہے......اور میرا محبوب دوسرے گاؤں میں رہتا ہے)

☆......☆......☆

اگلے دن علام خیل میں کافی ہل چل مچی ہوئی تھی۔صنوبر خان بالکل پاگل ہوا تھا۔اپنے چار آدمیوں کی موت اسلحے اور بارود کا نقصان اسے اتنی جلدی ہضم نہیں ہوسکتا تھا۔قاری غلام محمد نے ان کی گاڑی سے اسلحہ لینے کے لیے بہت اعتماد والے بندے روانہ کیے تھے۔کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ مجاہدین میں بھی صنوبر خان کا کوئی آدمی چھپا ہوا ہوسکتا ہے۔گوایسا آدمی ہماری مخبری بھی کر سکتا تھا۔مگر ہماری وہاں موجودی سے مجاہدین کے صنوبر خان

سے ہونے والے معاہدے پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔وہ اسلحہ اٹھا کر قاری غلام محمد کے آدمی سیدھا انگور اڈے میں موجود اپنے کیمپ میں لے گئے تھے۔ان ہتھیاروں اور ایمونشن کو عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک میں رکھنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔یہاں پر شاید کوئی یہ سوچے کہ مجاہدین معاہدے کے خلاف یہ کام رہے تھے تو ایسا سوچنا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ یہ سب کارروائی میں نے اور پلوشہ نے کی تھی اوران کا اسلحہ لوٹ لینے کے بعد ہم اپنی طرف سے مجاہدین کے حوالے کر رہے تھے۔البتہ اگر اس کام میں مجاہدین ہماری مدد کرتے تب وہ معاہدہ توڑنے والے بنتے۔

ہم نے پورا دن کمرے میں بند رہ کر ہی گزارا تھا۔میں نے خود بھی تمام نمازیں کمرے میں ادا کی تھیں۔میری وہاں موجودی کے بارے اب صرف قاری غلام محمد یا اس کا وہ بھروسے والا آدمی جانتا تھا جو ہمارے لیے کھانا لاتا تھا۔دن کا کھانا وہ عین اس وقت لایا تھا جب لوگ ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں چلے گئے تھے اور رات کا کھانا وہ ٹھیک عشاء کی نماز کے وقت لایا تھا۔پورا دن بے کار کمرے میں پڑے ہم مستقبل کے منصوبے بناتے رہے اور جب تھک گئے تو پلوشہ مجھے گود میں سلا کر اپنی سریلی آواز میں پشتو کے گیت سناتی رہی۔اس کی آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ کمرے سے باہر جاسکتی۔

اگلے تین چار دن ہم نے وہیں گزارنے تھے۔کہ اس تازہ واقعے کے بعد صنوبر خان اور اس کے آدمی یقیناً چوکنا ہوتے۔اتنا اندازہ تو مجھے بھی تھا کہ صنوبر خان تک یہ بات پہنچ گئی ہوگی کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔اور کوئی نہیں تو وہاں موجود جس لڑکے کو ہم نے زندہ جانے دیا تھا اس نے ضرور اس تک یہ خبر پہنچا دی ہوگی۔کیوں کہ ایسے لڑکوں کی صنوبر خان کی بیٹھک میں آمدورفت رہتی تھی۔

میرا ارادہ اب صنوبر خان کے کانٹے کو نکالنے کا تھا اس کے جانشینوں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی جگہ سنبھال سکتا۔گو اس کے کمانڈروں میں چند ایسے آدمی موجود تھے جو دہشت گردانہ کاروائیوں کو جاری رکھ سکتے مگر ان میں کوئی بھی صنوبر خان یا اس کے ہلاک ہونے والے سوتیلے بھائی، قبیل خان جیسا نہیں تھا۔البتہ یہ ممکن تھا کہ کسی دوسرے گاؤں کا سرداران کارروائیوں کی سرپرستی کرنے لگتا۔یوں بھی کئی سردار اس کے حلیف تھے۔اسی طرح دہشت گردانہ کارروائیوں میں بھی چند اس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔البتہ کچھ اس کے دوست تو تھے

مگروہ پاک آرمی یا وطن دشمنی میں ملوث نہیں تھے وہ بس اسلحے اور نشہ آور اشیاء کی سمگلنگ کرتے تھے۔

صنوبر خان کو ٹھکانے لگانے کے بعد میرا ارادہ پلوشہ کو گاؤں چھوڑ کر آنے کا تھا کیوں کہ میں اسے مزید ان خطرناک کارروائیوں میں ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ پاک آرمی کا سپاہی ہونے کے ناتے میری ذمہ داری تو یہ بنتی تھی کہ میں دہشت گردوں کے خلاف لڑتا، میرے گھر والی کسی بھی حساب سے ان کارروائیوں کا حصہ بننے کی مجاز نہیں تھی۔ اس کا میرے ساتھ موجود ہونا مجھے جتنا بھی خوش کرنے والا ہوتا، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی وجہ سے میرا دل ہر وقت مختلف قسم کے اندیشوں سے لرزتا رہتا۔ وہ تربیت یافتہ، حوصلہ مند، بہادر اور دلیر لڑکی جو دشمنوں کو ناکوں چنے چبانے کی صلاحیت رکھتی تھی وہ مجھے کانچ کی گڑیا لگتی جس نے ہلکی سی ٹھوکر سے بکھر جانا ہو ۔میرا دل چاہتا بس وہ، ہار سنگھار کیے، زنانہ لباس پہن کر میری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتی رہے۔اس کے پاؤں میں زمین پر بھی نہ لگنے دوں اسے جہاں جانا ہو اپنے بازوؤں میں بھر کر لے جاؤں۔زمانے کے ہر سرد و گرم سے اسے محفوظ رکھوں، اسے بس میری ہی آنکھیں دیکھ سکیں اور ہر وہ آسائش جس کے بارے بس گمان کی جا سکتا ہو اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں، ہر وہ آرام جو انسانی طاقت کے بس میں اسے پہنچاؤں، ہر وہ عیش جس کے لیے دنیا میں ترسا جاتا ہے اس کا نصیب کر دوں۔ مجھے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ بھی میرے بارے ایسے ہی خیالات رکھتی تھی۔ایک سخت جان سنائپر اس کی نظر میں موم کا راجا تھا جس نے حالات کی تیز آنچ سے پگھل جانا تھا۔اسی وجہ سے وہ مجھ سے دور جانے پر خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات کافی گزر گئی تھی۔ باتیں کرتے کرتے پلوشہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں تھیں۔اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

”میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور دروازہ کھولنے کو بڑھا۔ پلوشہ فوراً رضائی میں گھس گئی تھی۔اسے معلوم تھا کہ میں اس کے مردوں کے سامنے آنے کا بہت برا مناتا ہوں اور وہ میرے جذبات کا احترام کرنا جانتی تھی۔ مجھے ناراض کرنے کے بارے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دروازہ کھولنے پر مجھے قاری غلام محمد کی شکل نظر آئی۔میں نے حیران ہوتے ہوئے انھیں اندر آنے کا رستہ دیا

۔اندر آکر دروازہ بھیڑتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

''اس وقت زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں۔''

میں احترام سے بولا۔''حکم کریں قاری صاحب!''

''محترم بات یہ ہے کہ صنوبر خان اپنے آدمیوں کی ہلاکت اور اسلحے کے نقصان پر بالکل باولا ہوا ہے۔اس تک یہ خبر بھی پہنچ گئی ہے کہ ایسا کرنے والے آپ دونوں ہیں۔آپ دونوں کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح بھاگتا پھر رہا ہے۔اور اتنا تو آپ جانتے ہوں گے کہ غدار ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔کوئی پیسے پر بک جاتے ہیں تو کوئی کسی اور لالچ میں اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں......اسی وجہ سے میں نے اسلحہ اٹھانے کے لیے نہایت اعتماد والے آدمی روانہ کیے تھے۔اسی طرح میری یہ کوشش بھی تھی کہ آپ دونوں کی دوبارہ آمد کی خبر کسی تک نہ پہنچے۔ہو سکتا میں اس کام میں کامیاب نہ ہوسکا ہوں تو یقیناً صنوبر خان تک آپ دونوں کی یہاں موجودی خبر پہنچ جائے گی ۔وہ فوراً ہم سے مطالبہ کرے گا کہ آپ دونوں کو اس کے حوالے کیا جائے۔یا یہ کہ آپ لوگوں یہاں سے نکال دیا جائے۔اور اس صورت میں اس کے آدمی اس جگہ کو بھی گھیر لیں گے۔''

میں نے فوراً اس کا مطمح نظر سمجھتے ہوئے کہا۔''گویا آپ چاہتے ہیں ہم یہاں سے چلے جائیں۔''

''نہیں......''اس نے نفی میں سر ہلایا۔''میں اس وقت آپ لوگوں کو یہاں سے بھاگنے کا رستہ دکھانے آیا ہوں کہ بالفرض ایسا ہو جائے تو آپ لوگ کیسے بچ کر نکل سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ہمیں علام خیل سے نکلنے کے تمام رستوں کا علم ہے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔''یقیناً ہوگا۔مگر میں آپ کو علام خیل نہیں، یہاں سے نکلنے کا رستہ بتانے آیا ہوں۔''

''یہاں سے۔''میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

وہ مسکرایا۔''جی محترم یہاں سے۔آپ لوگ جس کمرے میں رہ رہے ہو یہ عام کمرہ نہیں ہے۔یہ مجاہدین کے چند بڑے کمانڈروں کے لیے مخصوص ہے۔اور آپ یہاں پلوشہ بیٹی کی وجہ سے ٹھہرایا ہے کہ لڑکی ذات کی بے پردگی نہ ہو اور اسے غسل خانہ یا بیت الخلاء وغیرہ کے استعمال کے لیے غیر مردوں کے سامنے نہ آنا پڑے۔''

''ممنون و شکر گزار ہوں۔''

”میں بھی۔“ پلوشہ نے رضائی سے منہ نکالے بغیر کہا۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی تھی۔

”اب اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا کہ ایس ایس کی مجاہدین کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ آپ کو بہت چاہتے ہیں، جس طرح آپ نے ان دہشت گرد سرداروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے یقین مانو دل خوش ہو جاتا ہے آپ کے کارنامے دیکھ کر۔“

”قاری صاحب!......اصل تعریف کے حق دار تو آپ لوگ ہیں کہ بغیر کسی صلے اور تنخواہ وغیرہ کے کفر سے برسرِپیکار ہیں، میں تو پاک آرمی کا نوکر ہوں ٹھیک ٹھاک تنخواہ لیتا ہوں۔“

”کسرنفسی ہے آپ کی ورنہ پاک آرمی کا ہر سپاہی بھی اپنی جگہ جہاد ہی کر رہا ہے، ملک کی حفاظت کے لیے سرحدوں پر پہرہ دینا، دہشت گردوں کے خاتمے کے لیے اندرون ملک ہر مصیبت کو گلے لگانا اتنا آسان نہیں ہے، باقی جہاں تک تنخواہ کا تعلق ہے تو وہ لینا مجبوری ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے اوقات اور صلاحیتیں ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے تو بیوی بچے اور بوڑھے والدین بھی اس کی ذمہ داری ہوتے ہیں۔ ملک کی خدمت کرتے ہوئے ان کا بوجھ کس پر لادے گا۔“

میں نے کہا۔”میرا خیال ہے ہم بے فائدہ تکرار میں مشغول ہیں۔“

”چلیں پھر فائدے کی بات کر لیتے ہیں۔“ کہہ کر وہ مغربی دیوار کے ساتھ لگے کپڑے لٹکانے والے ہینگر کی طرف بڑھا۔ جس کی چوڑائی کے برابر دیوار پر خوبصورت پلاسٹک شیٹ لگی ہوئی تھی۔ اور اس پلاسٹک شیٹ کا مقصد ہینگر سے لٹکانے والے کپڑوں کو دیوار کے ساتھ لگ کر گندا ہونے سے بچانے کا تھا۔ ہینگر زمین سے قریباً سات فٹ بلندی پر لگا تھا۔ جو کہ چوڑائی میں پانچ فٹ کے بہ قدر ہوگا۔ اور اس جگہ پر لگی ہوئی پلاسٹک شیٹ پانچ فٹ چوڑی اور چھ فٹ لمبی تھی۔ یوں پلاسٹک شیٹ زمین سے ایک فٹ اوپر ہی ختم ہو جاتی تھی اس کے نیچے کچی دیوار نظر آتی تھی۔

قاری غلام محمد نے پلاسٹک شیٹ کی ایک جانب گڑے ہوئے کیل نکالے جو نہایت آسانی سے باہر آ گئے تھے۔ پلاسٹک شیٹ ہٹاتے دوسری جانب کھڑکی دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ مجھے پیچھے آنے کا کہہ کر وہ اس چوکور سوراخ کے اندر داخل ہو گیا جو زمین سے دو فٹ اونچائی سے شروع ہو کر چھ فٹ بلندی تک چلا گیا تھا۔ میں نے

اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ دوسری جانب جاتے ہی تین فٹ چوڑا راستہ نظر آیا جو جنوب کی طرف جا رہا تھا ۔گویا وہ گیلری نما رستہ تمام کمروں کے عقب سے گزرتا تھا۔ وہ راستہ اس بیٹھک کی جنوبی دیوار کے پاس جا کر ختم ہوا۔ دیوار کے پاس زمین دوز رستہ تھا، سیڑھیاں اتر کر ہم پندرہ بیس فٹ سیدھے چلے اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر پہلے کی طرح تین فٹ چوڑے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ یقیناً نیچے اتر ہم نے گلی کو عبور کیا تھا اور اس کے بعد اگلے مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ وہ راستہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک اور ساتھ والے مکان کے درمیان تو گلی موجود تھی لیکن اس کے بعد چند مکانوں کی دیواریں بالکل جڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے اس کے بعد ہمیں نیچے نہیں اترنا پڑا تھا۔ قاری صاحب خاموشی سے آگے بڑھتا گیا۔ میں بھی اس سے ایک قدم پیچھے چلتا رہا۔ ہم نے مسلسل پانچ چھ مکان عبور کیے ہوں گے۔ یہ تمام مکان ایک ہی قطار میں موجود تھے اور یقیناً تمام کے مالکان کا ایک دوسرے سے خاص تعلق تھا تبھی تو وہ راستہ وجود میں آیا تھا۔ ایک جگہ پر جا کر وہ راستہ بند ہو گیا تھا ۔آگے ٹھوس دیوار نظر آ رہی تھی۔ دیوار کے قریب جاتے ہی قاری غلام محمد نیچے جھکا، ٹارچ کی روشنی میں مجھے لکڑی کا تختہ نظر آیا جسے قاری صاحب نے شمال کی جانب سے اٹھا کر جنوبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ تین ضرب تین فٹ کا ایک چوکور خلا تھا جہاں سے مٹی کی سیڑھیاں نیچے اترتی نظر آ رہی تھیں۔

قاری صاحب کے پیچھے میں بھی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سات آٹھ فٹ کی اترائی کے بعد ہم نیچے پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک دراڑ نما جگہ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس خلا کی دیواریں دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا وہ دراڑ قدرتی طور پر وجود میں آئی تھی، اس کی بناوٹ میں انسانی ہاتھوں کا بس اتنا ہی عمل دخل تھا کہ اس پر ڈالی گئی چھت قدرتی نہیں تھی۔ وہ دراڑ مغرب کی جانب آگے بڑھتی گئی تھی اور راستہ بتدریج نشیب میں اترتا گیا۔ ڈیڑھ دو سو میٹر کے بعد ہم جو دروازہ کھول کر باہر نکلے وہ اندرونی جانب سے تو لوہے کا تھا مگر بیرونی جانب یوں پتھر کی چٹان تراش کر اس میں نصب کی گئی تھی کہ دیکھنے والے کو وہ قدرتی اور ٹھوس چٹان ہی کی طرح لگتا تھا۔ اس کے ساتھ وہاں جھاڑیوں کا بھی کافی گھنا جھنڈ موجود تھا۔ اس راستے کا اختتام ایک نالے میں ہو رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے نکلے بغیر قاری غلام محمد نے اس نالے کے حدود اربع پر روشنی ڈالی اور ہم واپس مڑ آئے۔

کمرے میں آ کر قاری غلام محمد مجھ سے اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے وہ ٹارچ اور ایک مخابرہ

میرے حوالے کرنا نہیں بھولا تھا۔مخابرہ کے بارے اس نے ہدایت دی تھی کہ اسے میں نے چینل نمبر پندرہ پر ہر وقت آن رکھنا تھا۔کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال میں قاری صاحب نے ہمیں ہوشیار کرنا تھا،اور اس کے بعد ضروری تھا کہ ہم کمرے کا دروازہ اندر سے کھول کر اس مخصوص راستے پر فرار ہو جاتے۔

میں نے پلوشہ کو بھی تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔سونے سے پہلے ہم نے اپنا سامان تیاری حالت میں سنبھال کر رکھ دیا تھا تاکہ ناگہانی صورت حال میں ہم اپنی چیزیں نہ سمیٹتے رہ جائیں۔

صنوبر خان نے وہاں آنے کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا جب مجبوری سے جاگنے والوں کے علاوہ کسی کی آنکھ کھلی نہیں رہ پاتی ،مگر قاری غلام محمد کی احتیاط کام آ گئی تھی۔رات،اڑھائی تین بجے کا وقت ہو گا جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ایک سنائپر یوں بھی ایک آنکھ کھلی رکھ کر سونے کا عادی ہوتا ہے۔میں فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔دروازہ کھولنے پر مجھے عبدالرحیم نامی آدمی دکھائی دیا جو ہمارے لیے کھانا وغیرہ لایا کرتا تھا۔دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اندر گھسا اور دروازہ اندر سے کنڈی کر دیا۔

”بھائی جان!......صنوبر خان کے آدمیوں نے بیٹھک کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے اور وہ قاری صاحب سے تعاون کی اپیل کر رہا ہے۔اس کے بہ قول اسے پکی اطلاع ملی ہے کہ آپ دونوں یہاں چھپے ہو۔“

”مگر قاری صاحب نے تو کہا تھا کہ وہ مجھے مخابرے پر اطلاع دے گا۔“

”قاری صاحب نے آپ کو مخابرے پر پکارا تھا لیکن آپ کی طرف کوئی جواب نہ پا کر انھوں نے فی الفور مجھے بھیج دیا،اب آپ باتوں میں وقت ضائع نہ کریں اور نکلیں۔“

پلوشہ بھی جاگ گئی تھی اور عبدالرحیم کی باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھیں۔وہ جلدی سے چہرے پر چادر لپیٹ کر پاؤں میں بوٹ ڈالنے لگی۔میں نے بھی ایک منٹ میں اپنے بوٹ ڈالے اور بیرٹ کا تھیلا اٹھا کر خفیہ راستے کی طرف بڑھ گیا۔پلوشہ میرے پیچھے ہی تھی۔ٹارچ کی روشنی میں میں آگے بڑھتا گیا۔یقیناً عبدالرحیم وہیں لیٹ کر صنوبر خان کے آدمیوں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہاں وہ لیٹا تھا۔ورنہ کمرے کی حالت یہ ظاہر کر دیتی کہ تھوڑی دیر پہلے تک وہاں کوئی موجود تھا۔البتہ عبدالرحیم کی موجودی میں کوئی شک کا اظہار نہیں کر

سکتا تھا۔

ہم قریباً چوتھے مکان کو عبور کرنے والے تھے جب مخابرے سے قاری غلام محمد کی آواز ابھری۔

”جوان!...... مجھے سن رہے ہو۔“

”جی، کہیں۔“ میں نے بھی اس کی طرح نام لیے بغیر ہی اسے جواب دیا تھا۔

”بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، ایک غدار دشمن تک، اس راستے کی خبر پہنچا چکا ہے۔ یقیناً وہاں اس کے آدمی تمھاری تاک میں موجود ہوں گے۔“

”تو...... کیا کروں؟“ مجھے ایک دم رکنا پڑا۔ ”واپس آنا مناسب رہے گا یا یہیں کچھ دیر چھپا رہوں۔“

”اس کے بجائے کسی دوسرے گھر سے نکلنے کی کوشش کرو اور خیال رہے اس کے آدمی ہر طرف پھیل گئے ہیں اور...........“ قاری صاحب کی آواز ایک دم غائب ہو گئی۔ مجھے شک ہوا کہ کسی کی آمد پر اسے خاموش ہونا پڑ گیا تھا۔

پلوشہ بھی اس کی تمام باتیں سن رہی تھی۔ ”اب کیا کریں؟“ ایسی صورت حال میں بھی اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ایسی ہی بہادر اور دلیر تھی۔ اس کی بے خوفی دیکھ کر مجھے بہت حوصلہ ملا تھا۔ ایک لمحہ سوچ کر میں مشرقی دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ ایسے حالات میں قاری صاحب کا مشورہ سب سے بہتر تھا۔ جلد ہی مجھے ایک دروازہ نظر آ گیا۔ دو فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا ایک ہی کواڑ تھا۔ جو ہماری جانب ہی کھل رہا تھا۔ پٹ کے کھولتے ہی سامنے سے ایک پلاسٹک کی شیٹ لگی نظر آئی۔ پلاسٹک کی وہ شیٹ ہٹاتے ہوئے میں نے اس چوکور سوراخ سے اندر جھانکا۔

کمرے میں ساتھ ساتھ ملی ہوئی دو چار پائیوں پر دو آدمی موجود تھے۔ یقیناً وہ میاں بیوی ہی ہوں گے۔ پلاسٹک ہٹانے پر ہینگر سے لٹکے کپڑے نیچے گر گئے تھے۔ گو اس سے اتنی زیادہ آواز نہیں ابھری تھی لیکن اس کے باوجود وہاں سوئے میاں بیوی جاگ گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اتنے حیران ہوئے تھے کہ عورت کو چہرہ چھپانا بھی بھول گیا تھا۔ کمرے میں جلتی ہوئی ایمر جنسی لائیٹ کی روشنی نے ہماری دیکھ بھال کو آسان کر دیا تھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دبے لہجے میں کہا۔ ”ہم دشمن نہیں

ہیں۔‘‘

’’مم......مگر آپ............‘‘ اس مرد نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کچھ کہنا چاہا۔

’’بات چیت نہیں...... خاموشی سے لیٹ جاؤ۔ دشمن ہمارے پیچھے ہیں۔ اور تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔‘‘ قطع کلامی کرتے ہوئے اسے میں نے خاموشی کی تاکید کی اور پلوشہ کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر کا رخ کیا۔ صحن میں اچھا خاصا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

کمرے کا دروازہ باہر سے کنڈی کر کے ہم دونوں داخلی دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی میرے کانوں میں آئی کام کی دھیمی آواز پہنچی...... کسی کو چوکنا رہنے کی ہدایت کی جا رہی تھی۔ یقیناً ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے تھے۔ صنوبر خان نے ہماری تاک میں نہ صرف اس نالے میں اپنے آدمی بٹھائے ہوئے تھے بلکہ ایک قطار میں موجود ان گھروں کے چاروں جانب بھی اس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

☆......☆......☆

’’اب کیا کریں؟‘‘ پلوشہ کے قریب ہو کر میں نے مشورہ چاہنے کے انداز میں پوچھا۔ یقیناً ہمارے پاس وقت کی بہت زیادہ کمی تھی۔

’’میرا خیال ہے عقبی جانب سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے، کیونکہ اس جانب ڈھلوان چڑھتے ہی ہم ان کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔‘‘ اس بہادر لڑکی کے لہجے میں حالات کی گھمبرتا کا ذرا سا بھی اثر موجود نہیں تھا

’’وہاں رک کر اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرنا کہ جب کمک ملنے کی بھی کوئی امید نہ ہو، ایک حماقت ہی ہے۔ باقی فرار کے لیے نشیب کا راستہ اس لیے بھی بہتر رہتا ہے کہ بھاگنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔‘‘

وہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ ’’مطلب، آپ سامنے سے بھاگنے کا سوچے ہوئے ہیں۔‘‘

’’کیا خیال ہے؟‘‘

’’چلو۔‘‘ اس نے بے خوف انداز میں کہتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

میں نے اپنی پشت پر لدا بیرٹ کا تھیلا اتار کر نیچے رکھا اور زنجیر کھول کر NVG (نائیٹ وژن گاگل

ڈھونڈنے لگا۔ وہ شب دید عینک، امریکن سنائپر سے میرے ہاتھ لگی تھی، جو بعد میں بیرٹ ایم 107 کے تھیلے کے ساتھ صنوبر خان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اور گزشتہ دن بیرٹ ایم 107 کے ساتھ موجود تمام سامان کے ساتھ واپس میرے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

شب دید عینک ڈھونڈ کر میں نے آن کر کے تسموں کے ذریعے آنکھوں پر باندھ لی۔ کچھ قارئین کے لیے یقیناً شب دید عینک ایک نئی اور عجیب چیز ہو گی۔ لیکن سنائپر کی پہلی اقساط میں میں اجمالاً ان کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے اندر ہر چیز سبز نظر آتی ہے۔ اور چاند کی چودھویں شب سے واضح نظارا دکھتا ہے۔ اس میں چھوٹی بیٹریاں پڑتی ہیں۔ آن کرتے ہی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ بیٹریاں ابھی تک استعمال نہیں ہوئی تھیں۔

NVG آنکھوں پر باندھتے ہی میں نے پلوشہ کو کہا۔ ''میں دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھتا ہوں کہ کتنے آدمی باہر موجود ہیں، اور کوشش کرتا ہوں کہ انھیں اوپر ہی سے جہنم واصل کر دوں۔ تم دروازے پر تیاری حالت میں رہنا اور میرا اشارہ پا کر باہر نکلنے کے لیے تیار رہنا۔ اور گلاک کے ساتھ فائر کرنا تاکہ سائیلنسر کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز ظاہر نہ ہو۔'' یہ کہتے ہی میں نے اپنا گلاک نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

وہ آہستہ سے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے کلاشن کوف کندھے سے لٹکا کر گلاک پکڑ لیا۔ سامنے کی دیوار میں بنے ہوئے مورچے پر چڑھنے کے لیے لکڑی کی سیڑھی موجود تھی۔ میں اسی سیڑھی کی مدد سے اوپر چڑھا اور چودہ، پندرہ فٹ دیوار سے نیچے جھانکنے لگا۔ دونوں مکانوں کے دروازے کے درمیان میں وہ ایک ڈبل کیبن لیے موجود تھے۔ ڈبل کیبن کی باڈی میں دو آدمی بیٹھے تھے، جبکہ ایک ایک آدمی دونوں مکانوں کے سامنے اس انداز میں کھڑا تھا کہ کسی بھی شخص کے اندر سے نکلنے پر اس کی نظر میں آ جاتا۔ چاروں کلاشن کوف سے مسلح تھے۔ ان چار کے علاوہ گاڑی کے کیبن میں بھی ایک سے زیادہ آدمی موجود تھے۔ دروازوں پر نگراں کھڑے دونوں آدمی چونکہ گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے اس لیے میں نے پہلے انھی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی کی بتیاں آف تھیں جبکہ گلی میں بھی روشنی کا ایسا انتظام موجود نہیں تھا کہ وہ خالی آنکھ سے واضح نظر آتے۔

گلاک سیدھا کر کے میں اس آدمی کے سر کا نشانہ سادھا جو اس مکان کے سامنے کھڑا تھا جس میں میں اور

پلوشہ چھپے تھے۔ یہاں بتاتا چلوں کہ پستول اور رائفل کے فائر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پستول سے نشانہ سادھتے وقت رائفل کی طرح اس کی ریئر سائیٹ سے آنکھ نہیں لگانی پڑتی، بلکہ ایک یا دونوں ہاتھوں میں پستول کو سیدھا کر کے اندازے سے نشانہ لینا پڑتا ہے۔ اگر پستول کی جگہ کوئی رائفل ہوتی تو یقیناً میں آنکھوں پر بندھی NVG کی وجہ سے درست نشانہ نہ لے سکتا۔

''ٹھک۔'' کی ہلکی سی آواز اگران کے کانوں میں پڑی بھی تھی تو وہ توجہ نہیں دے پائے تھے۔ لیکن ان کے ساتھی کے گولی کھا کر گرنے کے دھماکے کی آواز گاڑی کی باڈی میں بیٹھنے والے اس کے ساتھیوں تک ضرور پہنچ گئی تھی۔

''اوے بہرام خانا!...... کھڑے کھڑے، نیند تو نہیں آ گئی۔'' ڈبل کیبن کی باڈی میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان کے مذاق سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتا۔ میں نے فوراً گلاک کی بیرل دوسرے مکان کے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی جانب موڑی اور اگلے ٹھک کے ساتھ وہ بھی نیچے گر کر خرخرانے لگا۔

''کوئی گڑبڑ ہے۔'' باڈی میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمی۔ ہڑبڑا کر اٹھے۔ مگر ان کے اترنے سے پہلے میں دو مرتبہ ٹریگر دبا چکا تھا۔ بیس پچیس گز سے میرے نشانہ چوکنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ ایک آدمی جو اترنے کے قریب تھا وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا۔ ان کے گرنے پر بھی گاڑی میں سے کوئی نہیں نکلا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ یا تو گاڑی کے اندر کوئی بھی موجود نہیں تھا یا وہ گاڑی کے شیشے وغیرہ بند کر کے موسیقی وغیرہ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ یوں بھی اچھی خاصی سردی تھی۔ اور پھر رات کے اس وقت تو یوں بھی سردی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار میرا جی چاہا کہ پلوشہ کو آواز دے کر باہر نکلنے کا کہوں، مگر پھر اسے خطرے میں جھونکنے پر میرا دل آمادہ نہ ہوا۔ خود میں نیچے اتر کر دروازے سے باہر جاتا تو زیادہ وقت ضائع ہو جاتا۔ سرعت سے ایک فیصلہ کرتے ہوئے میں فوراً باہر کی جانب دیوار سے نیچے لٹک کر کود گیا۔ نیچے لٹکنے کے باوجود میرے پاؤں زمین سے چھ سات فٹ بلند تھے۔ اس لیے اچھی خاصی آواز آئی تھی، لیکن کسی قسم کی حرکت نہ ہوتی دیکھ کر میں نے قریب ہو

کر دیکھا، اسٹیئرنگ ویل پر ایک آدمی سر ٹیکے سویا ہوا نظر آیا۔اس کے علاوہ گاڑی کا کیبن خالی تھا۔دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اسے گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

''کک......کیا......کون......'' وہ ہڑبڑاتے ہوئے ہکلایا،مگر اس وقت تک میں گلاک کی ایک اور گولی ضائع کر چکا تھا۔اس کے تڑپنے کا نظارا کیے بغیر میں بھاگ کر اس دروازے کے قریب پہنچا جہاں پلوشہ میری منتظر کھڑی تھی۔

''آجاؤ۔''اسے آواز دے کر میں گاڑی کی طرف پلٹ آیا۔گاڑی کی باڈی میں پڑی لاش نیچے پھینک کر میں نے نیچے گرا آئی کام اٹھالیا۔اس وقت تک پلوشہ بیرٹ کے تھیلے کو پشت پر لادے وہاں پہنچ چکی تھی۔

''کیا رہا؟''اس نے قریب آتے ہی بے صبری سے پوچھا۔اور اس سے پہلے کہ میں اسے جواب دیتا آئی کام سے ایک کھردری آواز ابھرنے لگی۔کوئی تمام پارٹیوں کو چوکنا رہنے کی تاکید کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ شکار پھندے کی طرف بڑھ رہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ نالے کی طرف جانے کے بہ جائے کسی گھر سے نکلنے کی کوشش کرے۔بتانے والے تک شاید ہمارے عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک سے نکلنے کی خبر ابھی پہنچی تھی۔گو اس نے اپنے ساتھیوں کو نہایت مفید مشورہ دیتے ہوئے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی،مگر بے چارہ ذرا لیٹ ہو گیا تھا۔اور اس کا خیر خواہی بھرا مشورہ اس کے ساتھیوں کے کام نہیں آسکا تھا۔

''گاڑی میں بیٹھو۔''میں نے پلوشہ کی بات کا جواب دیئے بغیر اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لی۔

''گاڑی مجھے چلانے دو۔''بیرٹ کا تھیلا عقبی نشست پر پھینکتے ہوئے اس نے مجھے دوسری نشست کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔''آپ کا نشانہ مجھ سے کئی گنا بہتر ہے اور میں آپ سے زیادہ راستوں سے واقف ہوں۔''

میں بحث کیے بغیر دوسری نشست پر منتقل ہو گیا۔پلوشہ نے کندھے سے لٹکی ہوئی کلاشن کوف میری گود میں پھینکی اور ساتھ ہی گاڑی کے قریب گری ہوئی لاشوں کی گنیں اور ان کے بنڈوریل سے فالتو میگزینیں بھی نکال کر بیرٹ کے پاس پھینک دی تھیں۔ایسے حالات میں اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔یقیناً ہتھیاروں اور ایمونیشن کی ہمیں سخت ضرورت پیش آسکتی تھی۔

وہ اندر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگی۔ جبکہ میں NVG آنکھوں سے ہٹانے لگا کہ اب اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ گاڑی سٹارٹ کرتے ہی اس نے مشرقی جانب موجود ایک مکان کے دائیں طرف بنے راستے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''دلبر خان کہاں چل دیئے؟'' آئی کام سیٹ سے کسی کی آواز آئی۔ یقیناً یہ آخری مکان کے سامنے کھڑی ہوئی پارٹی کا کمانڈر پوچھ رہا تھا۔

میں نے اسے جواب دینے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔

''دلبر خان! جواب کیوں نہیں دے رہے، دلبر خان......دلبر خان......'' وہ مسلسل اس ساتھی کو پکارنے لگا جو ہر قسم کے سوال و جواب سے بہت دور جا چکا تھا۔

ایک نئی آواز نے پوچھا۔ ''دلبر خان!......جواب کیوں نہیں دے رہے ہے؟'' اور اس مرتبہ بھی دلبر کی کوئی آواز نہ ابھرتے دیکھ کر اسی آواز کی طرف سے پوچھا گیا۔

''طورخم جان!......اس کا رخ کس طرف ہے؟''

''کمانڈر!......اس کی گاڑی مشرقی جانب نشیب میں اتر رہی ہے۔''

''اس کا پیچھا کرو طورخم جان......'' کمانڈر کی چیختی ہوئی آواز ابھری اور پھر وہ کسی دوسرے کو پکارنے لگا۔

''وزیر خان!......دلبر خان کی گاڑی آپ کی طرف آرہی ہے، تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑک پر ہو کر اسے روکو۔''

وزیر جان کا اثباتی جواب ابھرا۔ ''جی کمانڈر۔''

''کمانڈر!......اس گاڑی میں دلبر خان نہیں ہے، اس کی اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں یہاں بکھری پڑی ہیں۔'' یقیناً طورخم کو ہمارا پیچھا کرنے کے لیے اس مکان کے قریب سے گزرنا پڑا تھا جہاں دلبر خان کے ساتھی موجود تھے اور گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں سڑک پر پڑی لاشوں کا نظر آجانا حیرانی کا باعث نہیں تھا۔

''جانے نہ پائے۔'' کمانڈر کی آواز میں غیض و غضب بھرا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے، تھوڑا سا نیچے آکر پلوشہ نے گاڑی کا رخ انگور اڈے کے بجائے مخالف سمت میں موڑ دیا۔

''وہ ڈمبریانی کی طرف مڑ گئے ہیں۔'' یہ طورخم کی آواز تھی۔

کمانڈر نے کہا۔''تم تعاقب میں رہو، ہم بھی آرہے ہیں۔'' مجھے بائیں جانب دو گاڑیوں کی روشنی نظر آرہی تھی جو نشیب میں اتر رہی تھیں۔

''پلوشے رفتار بڑھاؤ۔'' بائیں جانب آنے والی روشنی کو دیکھتے ہی میں نے پلوشے کو ہدایت کی اور اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس پر نشانہ سادھ کر گولی چلا دی۔

مگر چلتی گاڑی سے متحرک ہدف کو نشانہ بنانا لگ بھگ ناممکن ہی تھا۔ کیونکہ چلتی گاڑی میں انسان کے جسم کو مسلسل حرکت ملتی رہتی ہے۔ گو تربیت کے دوران ہم نے چلتی گاڑی سے بھی ہدف کو نشانہ بنانے کی مشق کی تھی لیکن پھر بھی میں ناکام رہا تھا۔

اگلی مرتبہ میں نے ایک گولی فائر کرنے کے بجائے تین چار گولیوں کا برسٹ چلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اگلی گاڑی کی دائیں والی لائیٹ بجھ گئی تھی۔

اچانک دو تین کلاشن کوفیں اکٹھی گرجنے لگیں۔ بلاشک وشبہ نشانہ ہماری گاڑی ہی تھی۔

پلوشہ نے ایکسی لیٹر کو مکمل دبا دیا تھا۔ سیدھی سڑک پر گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اڑی جارہی تھی۔ پلوشہ کا بااعتماد انداز میں اسٹیئرنگ ویل پکڑنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور تھی۔

بائیں جانب آنے والی گاڑیوں کے سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہم آگے نکل گئے تھے۔ ہمارے عقب میں بھی ایک گاڑی نظر آرہی تھی جو یقیناً طورخم جان کی تھی۔ طورخم کی گاڑی سے پہلے ہی بائیں جانب سے آنے والی دونوں گاڑیاں سڑک پر پہنچ چکی تھیں۔

میں نے سیٹ کو لیور کے ذریعے پیچھے کیا اور عقبی نشست پر منتقل ہو گیا۔ آئی کام سے ان کی اٹھنے والی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں، شاید انھوں نے متبادل چینل لگا لیا تھا۔ میرے پاس فی الحال چینل تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ کلاشن کوف کے بٹ سے سیٹ کے عقب میں لگا ہوا شیشہ توڑ کر میں نے کلاشن کوف کی بیرل باہر نکال لی۔ مخالفین کی اگلی گاڑی سے اکادکا فائر کی آواز آرہی تھی۔ اس گاڑی کی ایک ہیڈ لائیٹ میں ناکارہ کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کی دوسری ہیڈ لائیٹ پر شست باندھی اور دو ہلکے برسٹ چلا دیئے۔ میری دوسری کوشش کامیاب

رہی تھی۔

”ایک تو گئی۔“ پلوشہ نے شیشے میں سے گاڑی کی ہیڈ لائیٹ ضائع ہوتے دیکھ لی تھی۔

”باقی بھی جائیں گی۔“ میں اعتماد سے بولا۔ اور دوسری گاڑی کے آگے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پلوشہ نے ایک خطرناک موڑ کاٹنے کے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور موڑ کاٹتے ہی رفتار بڑھا دی۔ میں آئی کام کے چینل تبدیل کرنے لگا۔ جلد ہی مطلوبہ چینل مجھے مل گیا۔ ان کی باتیں سن کر پتا چلا کہ کمانڈر کی گاڑی کی ہیڈ لائیٹس ٹوٹی تھیں اور میرا تعاقب کرنے کے لیے وہ دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ صنوبر خان سے مزید گاڑیاں اور آدمی بھی منگوا رہا تھا۔

ہم نے مسلسل دو تین موڑ کاٹے، اچانک میرے دماغ میں ایک منصوبہ پیدا ہوا اور اس پر عمل کرنے کے لیے میں نے فوراً پلوشہ کو کہا...... ”اگلا موڑ کاٹ کر گاڑی روک دو۔“

”کیوں......؟“ حسب توقع اس نے سوال پوچھنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔

”میرا خیال ہے رک کر ہم دونوں گاڑیوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔“

”اس کے لیے دو تین کلومیٹر بعد ایک مناسب جگہ آئے گی۔“ میرے ساتھ متفق ہوتے ہوئے اس نے منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم بھی کر لی تھی۔ مجھے اس کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے اگلے ہی موڑ پر رکنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ جلد ہی ہم مطلوبہ موڑ کے پاس پہنچ گئے تھے۔

وہ موڑ اتنا خطرناک تو نہیں تھا لیکن اس کے دائیں طرف موجود کھڑی ڈھلان کافی خطرناک تھی۔ جہاں سے گرنے کی صورت میں گاڑی پچاس ساٹھ فٹ نیچے نالے میں جا گرتی۔ سڑک کے بائیں جانب بھی ایسی ڈھلان موجود تھی جس پر گاڑی کا چڑھنا ناممکن تھا۔

گاڑی موڑ کر اس نے ایک چٹان کے عقب میں کھڑی کی اور سرعت سے نیچے اتری، میں نے بھی نیچے اترنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ایک کلاشن کوف پلوشہ کی جانب بڑھاتے ہوئے میں نے اپنی کلاشن کوف پر بھی بھری ہوئی میگزین چڑھا لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے NVG بھی اٹھا کر آنکھوں پر باندھنے لگا۔ کیونکہ اگر وہ گاڑی روک کر مقابلے پر اتر آتے تو اس اندھیرے میں ان نقل و حرکت دیکھنے میں NVG میرے بہترین مدد

گار ہو سکتی تھی۔

آٹھ نو فٹ اوپر چڑھ کر ہم دونوں نے ایک پتھر کے عقب میں مورچہ سنبھال لیا تھا۔

''اگلی گاڑی تمھاری ہے۔''میں نے NVG آن کرتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے باس۔''وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ذرا سا بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خطرناک صورت حال کو کوئی اہمیت دے رہی ہے۔

اس وقت موڑ کی جانب سے روشنی نمودار ہوئی، پلوشہ نے اپنی کلاشنی کوف پہلے سے کاک کر کے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا ہوا تھا۔(ناول پڑھنے والے زیادہ تر افراد تو سیفٹی لیور اور اس کی مختلف پوزیشنز کے متعلق جانتے ہیں مگر کچھ قارئین ایسے ہوتے ہیں جن کا ساری زندگی کسی ہتھیار سے پالا نہیں پڑا ہوتا۔خصوصاً خواتین کہ ہتھیار سے کوسوں دور ہوتی ہیں،ان کی معلومات کے لیے بتاتا جاؤں کہ آٹومیٹک ہتھیار میں سیفٹی لیور کے ایک تین کام ہوتے ہیں۔جس وقت سیفٹی لیور محفوظ پوزیشن پر لگا ہو تب ٹریگر دبانے سے بھی ہتھیار فائر نہیں کرتا ۔جب سیٹی لیور سیمی آٹومیٹک پوزیشن میں لگا تب ہر بار گولی چلانے کے ٹریگر کو دبانا پڑتا ہے۔اور جب سیفٹی لیور برسٹ پر لگا ہو تب ایک بار ہی ٹریگر دبانے سے ہتھیار سے مسلسل گولیاں برسنا شروع ہو جاتی ہیں)

دونوں گاڑیوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔موڑ سے ہمارے مورچے تک پچاس ساٹھ گز سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔وہ نسبتاً پھیلا ہوا موڑ تھا یوں کہ جب تک ان کی گاڑی قریب نہ آجاتی ہماری گاڑی پر ان کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

پچاس ساٹھ گز اتنا فاصلہ نہیں تھا کہ ہمیں دونوں گاڑیوں کے موڑ کاٹنے کے بعد انتظار کرنا پڑتا۔جونہی دونوں گاڑیاں موڑ کاٹ کر سیدھا ہوئیں پلوشہ نے ٹریگر پر انگلی رکھ کر فائر کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی میری کلاشن کوف بھی آگ اگلنے لگی۔زوردار دھماکے کے ساتھ اگلی گاڑی کا دایاں پہیہ پھٹا اور گاڑی بے قابو ہو کر نالے میں جا گری۔پچھلے ڈرائیور نے گاڑی بائیں جانب ڈھلان کی طرف موڑنی چاہی،تھوڑی سی چڑھائی چڑھتے ہی گاڑی پہلو کے بل گر پڑی تھی۔میں نے اس پر گولیاں برسانا جاری رکھا تھا۔پلوشہ نے بھی نئی میگزین چڑھا کر کلاشن کوف کاک کی اور دوبارہ فائرنگ شروع کر دی۔

اچانک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا، اور گاڑی نے آگ پکڑلی، یقیناً فیول ٹینک میں گولی لگ گئی تھی۔اس کے ساتھ ہی چند انسانی چیخیں بلند ہوئیں، مگر کوئی گاڑی سے دور نہیں جاسکا تھا۔

''چلو۔'' NVG میں کسی کو حرکت نہ کرتے دیکھ کر میں اپنے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پلوشہ نے ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی اس نے نسبتاً آسان ڈھلان دیکھ کر گاڑی نالے میں اتار لی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بولی۔

''راجو!......بہتر ہوگا کہ ہم نالے نالے میں واپس علام خیل کی طرف جائیں، ورنہ اب وہ پوری قوت سے اس سڑک پر آگے بڑھیں گے، ہوسکتا ہے انھوں ڈمبریانی کے سردار ثقلین سے بھی مدد مانگ لی ہو اور وہ سڑک پر ہمارا منتظر ہو۔

''ٹھیک ہے۔'' مجھے اس کے ساتھ متفق ہوتے ہی بنی تھی۔

''شب دید عینک مجھے دے دو۔'' اس نے ہیڈ لائیٹس آف کر کے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

NVG اس کے حوالے کرنے کے بہ جائے میں نزدیک ہو کر خود ہی اس کے سر پر NVG کے تسمے باندھنے لگا۔

اس نے کیبن کی اندرونی لائیٹ بجھاتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔''بڑا صاف نظر آرہا ہے۔''

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔''خاک صاف نظر آرہا ہے۔ آنکھیں ترس ہی گئی ہیں۔''

اور اس کے نقرئی قہقہے سے گاڑی کا کیبن گونج اٹھا تھا۔

اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے منہ بنایا۔

''ہنسنے کی بات تو ہے نا، جب نظر آتی ہوں اس وقت دیکھتے نہیں اور اب چند لمحوں کے لیے میرا چہرہ اوجھل کیا ہوا کہ جناب کو غم نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں ہے چندا، کہ جونہی تمھارا چہرہ نظر سے ذرا سا اوجھل ہوتا ہے میں پریشان ہوجاتا ہوں۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔''یہ وہی چہرہ ہے نا جس پر اتنے تھپڑ مار چکے ہو جتنا کسی پرانے میراثی نے ڈھول بھی

نہیں پتا ہوگا۔''

میں نے وارفتگی سے کہا۔''وہ سارے تھپڑ جو بہ ظاہر تمھارے پھول سے گالوں پر لگے تھے، ان کی تکلیف میرے دل کو جھیلنا پڑی تھی۔''

''جھوٹا۔''اس کے لہجے سے اُمڈتی چاہت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔

ہم صنوبر خان کی تباہ شدہ گاڑیوں کی جگہ سے آگے بڑھے تب مجھے کچھ اطمینان محسوس ہوا تھا، کیونکہ اگر ان کی کچھ اور گاڑیاں وہاں تک پہنچ گئی ہوتیں تو ایک جگہ پر رکے ہونے کی وجہ سے وہ نالے میں جاتی ہوئی ہماری گاڑی کو دیکھ لیتے۔البتہ سفر کی حالت میں انھیں اندھیرے نالے کے بیچوں بیچ چلتی ہوئی ایسی گاڑی نظر نہیں آسکتی تھی جس کی ہیڈ لائیٹس بجھی ہوں۔

NVG سے اتنا زیادہ بھی واضح نظر نہیں آتا کہ پلوشہ گاڑی کو زیادہ تیز چلا سکتی، یوں بھی نالے میں بکھرے چھوٹے بڑے پتھر اچھی خاصی رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد ہمیں علام خیل کی طرف سے تین گاڑیاں تیزی سے حرکت کرتی نظر آئیں۔انھیں دیکھتے ہی پلوشہ نے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا تھا، گو اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی مگر وہ ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

گاڑیوں کے گزر جانے کے بعد وہ دوبارہ چل پڑی۔جلد ہی ہم علام خیل کے مضافات میں پہنچ گئے تھے۔علام خیل سے آگے بڑھنے کے بعد بھی پلوشہ نے گاڑی کو سڑک پر چڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں انھوں نے انگور اڈے سے کوئی نفری وغیرہ نہ منگوائی ہو۔

''اب جانا کہاں ہے؟''علام خیل سے تھوڑا آگے آتے ہی اس نے مشورہ چاہنے کے انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا''انگور اڈہ یا رغزئی چلتے ہیں۔''

وہ کہنے لگی۔''اس کے لیے گاڑی سڑک پر چڑھانا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی مناسب ڈھلوان دیکھ کر گاڑی کو سڑک کی طرف موڑتی، ہمیں دور سے دوڑتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں۔وہ قریباً چار گاڑیاں تھیں اور انگور اڈے سے علام خیل کی طرف آرہی تھیں۔پلوشہ نے گاڑی

روک کر ایک مرتبہ پھر انجن بند کر دیا۔ جبکہ میں آئی کام سیٹ کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے لگا۔ جلد ہی میں نے دشمنوں کی فریکونسی ڈھونڈ لی تھی۔

''ہم علام خیل پہنچنے والے ہیں سردار!''

''یہاں رکنے کی ضرورت نہیں سیدھا آگے نکلتے جاؤ، کمانڈر رودا خان تین گاڑیاں لے کر ان کے پیچھے گیا ہوا ہے۔ اپنی دو گاڑیاں اور ان میں موجود آدمی دھوکے سے تباہ ہو گئے ہیں۔ احتیاط سے جانا اور اس بار ان خبیثوں کو بچنا نہیں چاہیے۔'' صنوبر خان کی آواز پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔

باعتماد لہجے میں جواب ملا۔ ''بے فکر رہیں سردار!...... اگر آپ کو یہاں کچھ آدمیوں کی ضرورت ہے تو میں ایک گاڑی یہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً انھیں گاڑیوں میں موجود تھا جو ابھی انگور اڈے سے علام خیل پہنچی تھیں۔

''نہیں، میرے ساتھ سدھیر خان اور بادشاہ گل موجود ہیں، زیادہ بندوں کی اسے گھیرنے کے لیے ضرورت پڑے گی، اس لیے تمام گاڑیاں ساتھ لے جاؤ۔ اور ہاں...... زندہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

خباثت بھرے لہجے میں پوچھا گیا۔ ''ویسے لڑکی کو چند دن زندہ رکھنے میں کیا حرج ہے سردار۔''

''تم نہیں سدھرو گے شالم خان۔'' صنوبر خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس خبیث کو گولی مارتے ہی پلوشہ خان کو سیدھا یہاں لے کر آنا، میرا خیال ہے اس پر خبیث ایس ایس سے زیادہ ہمارا حق ہے۔''

''شکریہ سردار!......'' شالم نے مکروہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت ہمیں ان کی گاڑیوں کی عقبی روشنی علام خیل سے آگے کی طرف حرکت کرتی نظر آئی۔

''راجو!...... کیا خیال ہے؟'' پلوشہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''تم بے وقوف تو نہیں ہو۔'' اس کے انداز سے مجھے اس کی بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

''صرف دو محافظ اس کے ساتھ ہیں...... اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔''

میں نیم دلی سے کہا۔ ''پلوشے!...... بغیر کسی منصوبے کے صنوبر خان پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔''

”راجو یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔“ وہ مصر رہی۔

چلو......“ میں زیادہ دیر اس کی بات نہیں ٹال سکا تھا۔

”شکریہ راجو!“ خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے گاڑی سڑک پر چڑھا دی۔ آنکھوں سے NVG اتارتے ہوئے اس نے گاڑی کی روشنیاں جلا دی تھیں۔

”ویسے لائحہ عمل کیا ہوگا؟“ صنوبر خان کی حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

”ان کی گاڑیاں آ جا رہی ہیں۔ بس سیدھا حویلی کے داخلی دروازے کی طرف چلتی جاؤ۔ یوں بھی یہ انھی کی گاڑی ہے۔“

”میرا ارادہ بھی یہی ہے۔“ اس نے میری تائید میں سر ہلا دیا۔

بیٹھک کے دروازے پر پہنچتے ہی اس نے کیبن کی اندرونی روشنی بجھا دی۔ ذیلی کھڑکی کھول کر چوکیدار نے باہر جھانکتے ہوئے اس نے پوچھنے کی کوشش کی۔

”کیا اندر جانا......؟“ سائیلنسر لگے گلاک نے اسے فقرہ پورا نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ کھڑکی سے باہر آ گرا تھا۔

”چلو اترو۔“ میں سرعت سے کھڑکی کھول کر باہر نکلا۔ پلوشہ میرے کہنے سے پہلے حرکت میں آ چکی تھی۔ اسے اپنے عقب میں رکھتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ صحن کے جنوب مغربی اور شمال مشرقی کونے میں دو بڑے انرجی سیور لگے اندھیرے سے برسرِ پیکار تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے چوکیدار کی لاش گھسیٹ کر دروازے سے اندر کی، پلوشہ نے اندر گھستے ہی ذیلی کھڑکی بند کر دی تھی۔

بیٹھک کے اندر ملازموں کا ایک کمرہ روشن تھا اور اس کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں پلوشہ نے لڑکے کو قید کیا تھا۔ اس کے ساتھ وی آئی پی کمرے سے بھی روشنی جھلک رہی تھی۔ ☆

”اس کمرے میں صنوبر خان ہوگا، میرے آنے سے پہلے اندر نہ جانا۔“ میں نے پلوشہ کو وی آئی پی کمرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے دبے قدموں اس جانب بڑھ گئی، جبکہ میرا رخ صنوبر خان

کے محافظوں کے کمرے کی طرف ہو گیا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی میرے کانوں میں آئی کام سیٹ کی کھڑکھڑاتی آواز گونجنے لگی۔ وہ ہماری تلاش میں نکلی ہوئی پارٹیوں کی باتیں سن رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی حالات حاضرہ پر گفتگو بھی جاری تھی۔

''ویسے مجھے تو شک ہے کہ وہ ملک ثقلین کے سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈمبریانی سے آگے گزر گئے ہوں گے۔''

''ناممکن اتنی جلدی وہ ڈمبریانی سے آگے نہیں جا سکتے۔'' دوسری آواز نے پہلے والے کو جھٹلایا۔ میرے پاس ان کی فضول گفتگو سننے کا وقت نہیں تھا۔ ایک دم پستول تانتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں اپنی کلاشن کوفیں چارپائی کے ساتھ کھڑی کر کے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ کمرے میں پھیلی سفیدے کی لکڑی کے جلنے کی بو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ چرس سے بھرے ہوئے سگریٹ کو جڑے تھے۔ ان دونوں کو میں پہلے سے جانتا تھا کہ وہ ہر وقت صنوبر خان کے ساتھ سائے کی طرح جڑے رہتے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''تت......تم......تم......؟'' دونوں کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

''ہاں......میں نے سوچا کہاں کہاں میری تلاش میں خوار ہوتے رہو گے، چلو میں خود ہی تمھارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔''

''چلو سردار کے پاس چلتے ہیں۔'' سدھیر خان نے چارپائی کے ساتھ کھڑی کلاشن کوف کی طرف محتاط انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس انداز میں کہا گویا میں ان کی دعوت ہی پر تو وہاں پہنچا تھا۔

میں اس کی بات کا جواب دینے کے بہ جائے اس کے کلاشن کوف کی طرف بڑھنے والے ہاتھ کی طرف پستول کی نال کر کے ٹریگر دبا دیا۔

''ٹھک۔'' کی آواز کے ساتھ ہی ایک تیز کراہ اس کے منہ سے نکلی اور وہ مضروب ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے دہرا ہو گیا۔ بادشاہ گل نے ایک دم جھپٹ کر ہتھیار اٹھانا چاہا مگر گلاک کی بے آواز گولی اس سے تیز ثابت ہوئی تھی۔ جھٹکنے کے بعد وہ سیدھا نہیں ہو سکا تھا۔ اور اسی طرح اوندھے منہ گر گیا تھا۔

"تت......تم......" سدھیر خان نے ہکلا کر کچھ کہنا چاہا مگر اس کی بکواس سننے کا میرے پاس وقت نہیں تھا ۔تیسری بار ٹریگر دبا کر میں نے ایک گولی اس کی کھوپڑی میں اتاری اور مڑ گیا۔ برآمدے سے نکلتے ہی مجھے پلوشہ وی آئی پی کمروں کے سامنے چوکنے کے انداز میں کھڑی نظر آئی۔

مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔اس اثناء میں میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔دروازے پر رک کر اس نے تصدیق چاہنے والے انداز میں میری جانب دیکھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر دروازے کو زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔

صنوبر خان صوفے پر پھیل کر بیٹھا تھا۔اس کے سامنے بدیسی شراب کی بوتل کھلی پڑی تھی۔ایک ادھ بھرا گلاس اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔ ہمارے ایک دم اندر داخل ہونے پر وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔اس کے چہرے پر چھائی حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے پلوشہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"سردار صنوبر خان وزیر!......سنا ہے آپ مجھے یہاں بلوا رہے تھے،حکم کریں کیا کام تھا۔"

حیرت کے پہلے جھٹکے سے سنبھلتے ہی اس کے چہرے پر حیرت کی جگہ خوف ظاہر ہوا،مگر اس نے ہمت کر کے خود کو بے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔یوں بھی اتنے بڑے سردار کو اپنے احساسات چھپانا آتے تھے۔

"ایس ایس!......تم نے ہمیں دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔" اس کا انداز دھمکی سے زیادہ شکوے کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

"گو سوال جواب کا وقت گزر گیا ہے،اس کے باوجود میں ایمان سے بتاؤ دھوکا کس نے دیا ہے،کیا جرگے کے بعد میں نے تمھارے کسی آدمی کو نشانہ بنایا تھا...... یقیناً تمھارا جواب نفی میں ہوگا۔لیکن تم نے میری منگیتر کے ساتھ کیا کیا؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "جھوٹ بکتی ہے،وزیر قوم کے نام پر بدنما دھبہ ہے یہ۔ورنہ سچ وہی ہے جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔اس نے تمھارا سودا کیا اور بدلے میں پندرہ لاکھ کی خطیر رقم وصول کی۔"

میں مسکرایا۔ "ویسے داد دینا پڑے گی تمھاری ڈھٹائی کی۔شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ ٹریسی والکر مجھے سب کچھ

سچ سچ بتا چکی ہے۔‘‘

’’چلو ایسا ہی ہے...... پھر بھی اس کے بعد ہماری صلح ہو چکی ہے اور میرا خیال ہے یہ وقت گڑے مردے اکھیڑنے کا نہیں ہے۔‘‘ وہ اپنے جھوٹ پر قائم نہیں رہ پایا تھا۔

’’تھوڑی دیر پہلے تم اپنے آدمیوں کو میرے قتل کا حکم صادر کر چکے ہو اور اس کے ساتھ میری بیوی کے بارے نہایت گھٹیا حکم دے چکے ہو۔‘‘

’’ہم سب کچھ بھلا کر نئے سرے سے دوستی کا آغاز کر سکتے ہیں۔‘‘ اس مرتبہ وہ اپنا اعتماد برقرار نہیں رکھ پایا تھا ۔میرا سرد لہجہ اور پلوشہ کے غضب بھرے تیورا سے گھگھیانے پر مجبور کر گئے تھے۔

’’اچھا مشورہ ہے۔‘‘ میں نے اطمینان بھرا انداز میں سر ہلایا۔ ’’لیکن پلوشہ کو یقیناً یہ مشورہ پسند نہیں آئے گا۔‘‘

وہ سرعت سے بولا۔ ’’پلوشہ میری بیٹی کی طرح ہے...... میں اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ لوں گا۔‘‘

’’چلو مانگو......‘‘ میں نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر ذرا ایک طرف ہوا۔

’’پلوشہ میں تمھارے قبیلے کا سردار ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے زیادتی ہوئی ہے۔لیکن یقین مانو تمھارے بھائی اور ماں کو میں نے کچھ بھی نہیں کہنا تھا صرف تمھیں ڈرا رہے تھے اور دیکھ لو وعدے کے مطابق انھیں بھی رہا کر دیا تھا اور تمھارا منگیتر بھی زندہ سلامت تمھارے پاس موجود ہے۔‘‘

’’صنوبر خان، یہ ہر فرعون کی فطرت میں شامل ہے کہ جب موت کو سامنے پاتا ہے تو سدھرنے کے دعوے شروع کر دیتا ہے۔قوم کا سردار قوم کی ہر لڑکی کے باپ کی جگہ پر ہوتا ہے،لیکن باپ اپنی بیٹیوں کے کپڑے تو نہیں پھاڑا کرتے۔تُف ہے تم جیسے گندے باپ پر۔‘‘ یہ کہتے ہی پلوشہ نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا،صنوبر خان نے دہشت زدہ ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے گویا گولیوں کو روک رہا ہو،مگر گولیاں ایسی ڈھال سے نہیں رکا کرتیں ۔پلوشہ ترس کھائے بغیر مسلسل ٹریگر دباتی گئی یہاں تک کہ پستول ہی خالی کر دیا۔اس کی میگزین میں چھ گولیاں بچی ہوئی تھیں دو صنوبر خان کے سر اور باقی چھاتی میں لگی تھیں۔اسے زیادہ دیر پھڑکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔اس کے ساکت ہوتے ہی میں نے کہا......

’’پلوشے چلو۔‘‘

وہ جیسے گہرے خیال سے چونکتے ہوئے بولی۔ ’’آں......ہاں......چلیں۔‘‘

ہم باہر نکل آئے،اور گاڑی میں بیٹھ کر انگوراڈے کی جانب چل دیئے ایک بہت بڑا مرحلہ بہ خیر وخوبی گزر گیا تھا۔ پلوشہ نے اپنے چھوٹے بھائی، ماں اور اپنی ہتک کا بدلہ لے لیا تھا۔ جبکہ میں نے ایک اور دہشت گرد کو کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔اب مجھے آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ گو اب تک میں خود میں اتنی جرّات مفقود پاتا تھا کہ پاک آرمی کے کسی ذمہ دار سے رابطہ کروں۔ البرٹ روک نے میری جس قسم کی وڈیوز تیار کی ہوئی تھیں ان کے مطابق میرے آرمی سے رابطہ کرنے کو بھی ایک سازش سمجھا جاتا۔ اب میرے آرمی سے رابطہ کرنے پر لازمی بات ہے سب سے پہلے مجھ سے یہی مطالبہ کیا جاتا کہ میں گرفتاری پیش کروں۔اور جب تک میں اپنی بے گناہی کے ثبوت نہ ڈھونڈ لیتا میرا گرفتاری پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔اور لازمی بات ہے گرفتاری پیش نہ کرنے کی صورت میں مجھے سچ مچ غدار قرار دیا جاتا۔اور غدار کے لیے احکام تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اب تک البرٹ بروک، پاک آرمی تک میری وڈیوز پہنچا چکا ہوتا۔ میں عجیب قسم کے حالات میں پھنس گیا تھا۔ ’’نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔‘‘ کی کہاوت میری حالت پر سو فیصد منطبق ہو رہی تھی ۔کوئی مناسب لائحہ عمل مجھے سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر میں میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پلوشہ کو گھر چھوڑ کر واپس اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے لوٹوں گا۔اور ثبوت ملنے کے بعد کسی ذمہ دار سے ملاقات کروں گا۔ایک صورت یہ بھی تھی کہ میں اپنی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے پاس جا کر ساری کہانی من وعن بیان کر دیتا لیکن اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ میرا وڈیو بیان تھا جس میں میں نے کرنل کولن فیلڈ کے پوچھنے پر بڑے جوش و خروش سے پاکستان آرمی کے اندر رہتے ہوئے ان کے لیے کام کرنے کی حامی بھری تھی۔اس بیان کے بعد میری ذات حد درجہ مشکوک ٹھہرتی تھی۔

’’چپ کیوں ہو؟‘‘ مجھے مسلسل خاموش پا کر وہ پوچھے بنا نہیں رہ پائی تھی۔

’’میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں، تمھاری امی جان اور بھائی کو بھی تلہ گنگ چھوڑ آتے ہیں،شادی کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیں گے بلکہ دوبارہ شادی ہی کر لیتے ہیں۔‘‘

وہ شرارت سے بولی۔’’میں اپنی شادی میں ناچوں گی تو ضرور۔‘‘

”شرم نہیں آئے گی۔“

”شرم کیسی......خوشی کے موقع پر عورتوں کا عورتوں کے مجمع میں ناچنا عام ہے۔“

”ہاں مگر دلھن تو نہیں ناچا کرتی۔“

وہ ڈھٹائی سے بولی۔”جسے زیادہ خوشی ہو وہ ناچتی ہیں۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔”تم بس میرے سامنے ناچ لیا کرنا......“

وہ زبان نکال کر مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔”آپ کے سامنے تو بالکل بھی نہیں ناچوں گی۔“

”پھر عورتوں میں بھی نہیں ناچنے دوں گا۔“میں نے اسے چھیڑا۔

”آپ کون سا وہاں موجود ہوں گے۔“

”پھوپھو جان کو بتا دوں گا کہ تم پر نظر رکھے۔“

”انھیں تو میں ایسے ہاتھ میں کروں گی کہ دیکھ لینا، ہر وقت آپ کے کان کھینچیں گی۔“

”اور میں جو تمھاری پٹائی کروں گا وہ......“

وہ چاہت سے بولی۔”کوئی بات نہیں......بس دور نہ جانا، پٹائی برداشت کر لوں گی۔“

”کوئی پاگل ہی ہوگا جو اتنی پیاری بیوی کی پٹائی کرے گا، میں تو پھول کی طرح رکھوں گا۔“

وہ شوخ لہجے میں بولی۔”بس بس جانتی ہوں، آپ نے اپنی پیاری محبوبہ کو نہیں بخشا، بیوی کو کہاں معاف کرو گے۔“

اس کے انداز پر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”زہر لگ رہی ہے آپ کی ہنسی۔“اس نے مجھے بازو پر مکا رسید کیا۔

”مکے تم مار رہی ہو اور گلے مجھ سے کیے جا رہے ہیں۔“

وہ دھمکی دیتے ہوئے بولی۔”ابھی تو جو چھترول پھوپھو جان اور ابو جان سے کرواؤں گی تب آپ کو پتا چلے گا۔“

”میں شادی ہی نہیں کرتا۔“

”وہ تو ہو چکی ہے جناب۔“

”کوئی ثبوت ہے؟“

”ہاں۔“ قریب کھسک کر اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔”یہ ثبوت کافی ہے یا کوئی اور دلیل پیش کروں۔“

ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے میں نے دوسرا ہاتھ اس کی زلفوں میں پھیرا۔”کافی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔“

اور وہ ناز بھرے انداز سے مسکرا دی۔ انگور اڈے پہنچ کر میں نے گاڑی نصراللہ خان خوجل خیل کے گھر کے سامنے روک دی۔ رات کے اس پہر انھیں بے آرام کرنا مناسب تو نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ انھیں گھر سے بلا کر میں نے گلی ہی میں کھڑے کھڑے مختصر صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور بیرٹ ایم 107 ان کے پاس چھوڑ کر ہم اجازت لے کر چل پڑے۔ صبح دم ہم وانہ پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر نصراللہ خوخل خیل سے ہم نے وانہ میں مجاہدین کے ایک ٹھکانے کا پتا معلوم کیا تھا۔ وہاں گاڑی چھوڑ کر ہم نے پر تکلف ناشتا کیا، فجر کی نماز پڑھی اور ویگن اڈے جا کر ڈیرہ اسماعیل خان جانے والی ویگن میں بیٹھ گئے۔

”راجو!......ایک بات کہوں۔“ ہم وانہ سے نکل کر تھوڑا دور آئے تھے کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”منع کس نے کیا ہے۔“

اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔”ایک کار لے دو گے، مجھے بہت شوق ہے اپنی کار چلانے کا۔“

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔”جہیز میں لڑکیاں کار لایا کرتی ہیں سمجھی نا۔“

”راجو!......آپ کو پتا تو ہے میں کتنی غریب ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”مذاق کر رہا تھا چندا!......ایک چھوڑ دو کاریں لے لینا۔“

”نہیں بس ایک ہی کافی ہے۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

میں مسکرایا۔”پچاس لاکھ میں تو تین کاریں آجائیں گی۔“

”بس ہروقت پچاس لاکھ کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔“اس نے منہ بسورا اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”تو کیا تمھاری امی جان پچاس لاکھ نہیں لیں گی۔“

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔”اب تو ضرور لیں گی اور میں کار بھی لوں گی......اور کچھ۔“

”اور یہ کہ کیا منہ دکھائی بھی دوبارہ دینا پڑے گی یا پہلے والی سے گزارا چل جائے گا۔“

”سونے کے کنگن لوں گی۔“

”میں تو پراندہ دوں گا۔“

وہ دھمکی دیتے ہوئے بولی۔”سر پر تو میں جاتے ہی استرا پھیروں گی۔“

”تم ابھی بالوں کو ہاتھ لگا کر دکھانا۔“

”بڑا آیا رعب جھاڑنے والا۔“مجھے چڑا کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ویگن پہاڑی رستوں پر چکر کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔میں نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ڈرائیور نے ایم پی تھری پر کوئی پشتو کا گیت لگایا ہوا تھا۔پلوشہ اپنی مدھر آواز میں وہی گیت گنگنانے لگی تھی۔اوراس کی مدھر آواز مجھے سپنوں کی دنیا میں کھینچ کر لے گئی۔

پلوشہ کا......”قرار اراشہ،قرار اراشہ..........“مجھے سوتے میں بھی سنائی دیتا رہا۔

میری آنکھ ویگن کے ناہموار زمین پر چلنے سے کھلی تھی۔اس جگہ پر سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی۔آنکھ کھول کر میں نے پلوشہ کو دیکھا......وہ بھی میرے کندھے سے سر ٹیکے اونگھ رہی تھی۔اس کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان تک ہم ایسے ہی اونگھتے اور نیم خوابیدہ حالت میں پہنچے تھے۔

ٹانک اڈے پر اتر کر ہم نے رکشا پکڑا اور پلوشہ کے گھر کی جانب چل پڑے۔دن کے دس بج رہے تھے۔بس اڈے سے اس کے گھر تک آدھا گھنٹا لگا تھا۔رکشے والے کو فارغ کر کے ہم چھوٹے سے پختہ مکان کی طرف بڑھے۔اور پلوشہ نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

چند لمحوں بعد اندر سے ایک زنانہ آواز ابھری۔”کون؟“

”امی جان،میں ہوں پلوشہ۔“اس نے اپنا تعارف کرایا اور دروازہ کھل گیا۔

پاکیزہ چہرے والی ادھیڑ عمر خاتون کے چہرے کے نقوش بالکل پلوشہ ہی طرح تھے۔ پلوشہ فوراً ماں سے لپٹ گئی۔

''کیسا ہے میرا بیٹا۔'' ماں نے اس کا ماتھا چوما۔

''بیٹا تو آپ کا یہ ماں جی!'' پلوشہ نے انھیں میری طرف متوجہ کیا۔

وہ چونک کر میری جانب متوجہ ہوئیں......اس کے ساتھ ہی ان کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ ابھری

''یقیناً میں اپنے بیٹے ذیشان کو دیکھ رہی ہوں۔''

مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ پلوشہ انھیں میرے بارے سب کچھ بتا چکی تھی۔

''جی ماں جی!'' میں نے اپنا سر ان کے نزدیک جھکا دیا۔

''جیتے رہو بیٹا!'' انھوں نے ممتا بھری شفقت سے میری پیشانی چوم کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔

اس کا چھوٹا بھائی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ وہ پلوشہ سے لپٹ کر پیار لینے لگا۔ پلوشہ کے بعد میں نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر اس کا نام پوچھا۔

اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔''عدیل خان۔''

میں نے پوچھا۔''کس کلاس میں پڑھتے ہو؟''

''میں اسکول نہیں جاتا۔'' اس کے جواب پر میں نے پلوشہ کی جانب دیکھا اور اس نے دکھی انداز میں سر جھکا دیا۔ واقعی غربت انسان سے بہت سے حقوق چھین لیا کرتی ہے۔

''اچھا، مگر اب تو جانا پڑے گا۔'' میں نے اسے نیچے اتار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دوبارہ پلوشہ کی گود میں چلا گیا تھا۔

''راجو!......اصل میں......'' پلوشہ نے وضاحت کرنا چاہی، لیکن اس کے بات پوری ہونے سے پہلے میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

''میں سب جانتا ہوں چندا!......اب یہ بھی پڑھے گا اور تمھاری بھی کوئی خواہش تشنی نہیں چھوڑوں گا۔''

''ہاں جانتی ہوں اب میں بھی کسی کی ملکیت میں آ گئی ہوں، کوئی ایسا جو میرے کہنے سے پہلے میری

محرومیوں کا ازالہ کر دیتا ہے۔" خوشی سے بھرپور تبسم اس کے ملیح چہرے پر نمودار ہوا اور وہ چاہت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اس کی ماں شربت کا جگ بنا کر لے آئی۔ وزیرستان میں اچھی خاصی سردی تھی مگر ڈیرہ اسماعیل خان کے گرم موسم میں ہمیں شربت ہی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

پانی پلا کر وہ میرے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ اس وقت جانے پلوشہ کو ماں نے کوئی اشارہ کیا یا وہ اپنی مرضی ہی سے اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لگا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی جب میری ساس نے بات چیت شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ پلوشہ کو انھوں ہی نے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

"بیٹا!...... پلوشہ مجھے آپ کے بارے سب کچھ بتا چکی ہے، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ پلوشہ کو پسند کرتے ہیں ...... ہمارے حالات جاننے کے باوجود آپ نے نہ صرف پلوشہ کا ساتھ دیا بلکہ آپ کی وجہ سے وہ قبیل خان جیسے موذی کو بھی کیفر کردار تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکی۔ یقین مانو پلوشہ نے میری بیٹی کے بہ جائے بیٹے کا کردار ادا کیا ہے۔ اب جبکہ وہ ہر ذمہ داری سے سبک دوش ہو چکی ہے تو میں چاہوں گی کہ وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ اس بارے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"بس ابھی تھوڑی دیر بعد یہاں سے نکلیں گے، شام تک میرے گھر پہنچ جائیں گے۔ کل یا پرسوں سادگی سے نکاح پڑھا لیں گے۔"

میری بات پر اس سادہ خاتون کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ "اللہ پاک آپ کو خوش رکھے، آپ کی جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے۔"

میں نے ان کی دعا پر پرزور انداز میں کہا۔ "آمین۔"

"ثمہ آمین۔" کہہ کر انھوں نے بھی اللہ پاک کی رحمت کو پکارا تھا۔

"آپ اپنا ضروری سامان وغیرہ سمیٹیں، میں پلوشہ کو کہہ دیتا ہوں کہ وہ مالک مکان کو فون کر کے یہیں بلوا لے تاکہ اسے چابیاں واپس کریں، پھر میں میں گاڑی لے آؤں گا دن کا کھانا ان شاء اللہ راستے ہی میں کھائیں گے۔"

"مکان کی چابیاں مالک مکان کو دینے کی کیا ضرورت ہے، پرسوں ترسوں تک تو میں اور عدیل واپس لوٹ آئیں گے۔"

میں حتمی لہجے میں بولا۔ "نہیں ماں جی! اب آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔"

"مگر بیٹا! ...... یہ مناسب نہیں لگتا۔" اس نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔

"ماں جی! ...... میں نہیں چاہتا کہ پلوشہ آپ دونوں کی وجہ سے پریشان یا دکھی رہے۔ اللہ پاک کا دیا سب کچھ ہے یقیناً اکھٹے رہنا ہماری خوشیوں کو چار چاند لگا دے گا۔"

"اللہ پاک آپ کو سکھی رکھے بیٹا ......۔" وہ جذباتی انداز میں دعائیں دینے لگی۔

"چلیں اٹھیں پھر تیاری کریں۔" میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پلوشہ مجھے باورچی خانے میں مصروف نظر آئی۔ عدیل بھی وہیں ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "پلوشے مالک مکان کا موبائل فون نمبر ہے؟"

"ہاں، گھر کے موبائل میں Save تو کیا تھا۔"

"تو اسے کال کر کے بلوا لو تا کہ مکان کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ عدیل اور ماں جی تو پکے پکے ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔"

شکر گزاری سے بھرپور نگاہ میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ سر ہلاتی ہوئی موبائل فون اٹھانے چل پڑی ۔تھوڑی دیر تک مالک مکان وہاں پہنچ گیا تھا۔ چونکہ پلوشہ پہلے ہی سے چند ماہ کا کرایہ اس کے حوالے کر چکی تھی اس لیے ہم نے بس مکان کی چابی اس کے حوالے کی اور بتا دیا کہ جاتے وقت ہم تالا لگاتے جائیں گے۔

میرے منع کرنے کے باوجود دوپہر کا کھانا پلوشہ نے تیار کر دیا تھا۔ کھانا کھا کر میں انھیں سامان تیار کرنے کا کہہ کر بنوں اڈے پہنچ گیا۔ وہاں سے تلہ گنگ کے لیے میں نے ٹوڈی کار ہائر کی اور ڈرائیور کے ساتھ واپس پہنچ گیا۔ پلوشہ ماں کے ساتھ مل کر ضروری سامان سمیٹ چکی تھی جو دو پرانے بیگوں میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

کار کی ڈگی میں سامان کے بیگ رکھ کر ہم تلہ گنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے تلہ گنگ تک ساڑھے چار پانچ گھنٹوں کا سفر تھا۔ ہم سہ پہر پانچ بجے گھر کے

دروازے پر اتر رہے تھے۔ڈرائیور کو فارغ کر کے میں سامان کے دونوں بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہوا۔کئی ماہ بعد میں گھر لوٹ رہا تھا۔اس دوران نہ تو ابو جان سے فون پر بات ہوئی تھی اور نہ میں کوئی چھٹی خط وغیرہ بھیج سکا تھا۔ابو جان صحن میں بچھی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگائے لیٹے تھے۔مجھے دیکھتے ہی وہ حقیقتاً اچھل پڑے تھے۔چارپائی سے اٹھ کر وہ ہاتھ پھیلائے ہوئے میری طرف بڑھے۔باورچی خانے میں بیٹھی پھوپھو جان نے بھی انھیں یوں بھاگتے دیکھ لیا تھا وہ بھی باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

''شانی پتر!'' مجھے دیکھتے ہی پھوپھو جان نے آواز لگائی۔اس وقت تک ابو جان مجھے بانہوں میں سیمٹ چکے تھے۔ابو جان کے بعد پھوپھو جان بھی مجھے وارفتگی سے ملی۔اس دوران پلوشہ اور اس کی ماں ہمیں دلچسپی سے دیکھتے رہے۔

''یہ مہمان......'' جذبات کا طوفان تھمتے ہی پھوپھو جان نے سوالیہ لہجے میں کہتے ہوئے پلوشہ کی ماں کی جانب مصافحے کا ہاتھ بڑھایا۔

''پھوپھو جان!...... یہ لڑکی کی ماں ہے،آپ ذرا لڑکی کو دیکھ کر بتائیں،شادی کے لیے کسی رہے گی۔'' میں نے پلوشہ کی طرف اشارہ کر کے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''ہائیں......'' پھوپھو جان نے ششدر ہو کر مجھے گھورا اور پھر پلوشہ کو دیکھا جو نفاست سے دوپٹا اوڑھے کسی شہزادی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے نقاب اتار دیا تھا۔

''کک......کیا یہ سچ ہے۔'' پھوپھو جان نے ہکلاتے ہوئے ہاتھ پھیلائے اور اگلے ہی لمحے پلوشہ اس کی مہربان آغوش میں تھی۔وہ بے ساختہ اس کا معصوم چہرہ چومنے لگی۔پھوپھو جان کی وارفتگی دیکھتے ہوئے پلوشہ اور زیادہ شرما گئی تھی۔

''کیا بہت ہی بری شکل ہے لڑکی کی جو آپ پریشان ہو گئیں۔'' میں نے پھوپھو جان کو چھیڑا۔

''آئے ہائے،اتنی پیاری لڑکی تو میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔'' پھوپھو جان نے پلوشہ کو اپنے ساتھ لپٹائے رکھا تھا۔

''آئیں بیٹھیں بہن جی!'' ابو جان نے پلوشہ کی ماں کو چارپائیوں کی طرف بلایا اور خود عدیل خان کو

بازوؤں میں اٹھالیا۔
تھوڑی دیر بعد ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھا کر ہم چاے پی رہے تھے۔ پھوپھو جان تو پلوشہ پر صدقے واری جارہی تھی۔ انھیں ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اپنے لیے ایسی لڑکی ڈھونڈ کر لا سکتا ہوں۔
رات کو کھانے کے بعد میں نے ابوجان کو اجمالاً پلوشہ کی کہانی سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ اس کی امی جان اور چھوٹا بھائی بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ ابوجان میرے فیصلے سے بہت خوش ہوئے تھے۔ اسی رات پھوپھو جان نے جھٹ منگنی پٹ ویاہ کا حکم صادر فرمادیا تھا۔ اب انھیں یہ تو معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں پہلے ہی سے میاں بیوی تھے۔ یوں بھی یہ بتا کر میں انھیں خفا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مسئلہ یہ پیدا ہورہا تھا کہ پلوشہ کی ماں اردو صحیح طریقے سے سمجھ بول نہیں سکتی تھی۔ جبکہ پھوپھو جان اور ابوجان کو پشتو نہیں آتی تھی۔ پھوپھو جان اور پلوشہ کی ماں گلناز کے درمیان پلوشہ ہی ترجمان بنی ہوئی تھی۔
میرے ساتھ یہ دکھ چمٹا ہوا تھا کہ پلوشہ میری ہو کر بھی مجھ سے دور تھی۔ دو تین بار وہ مجھے دور دور سے زبان نکال کر چڑا چکی تھی۔ اس شوخ و چنچل کے ہاتھ مجھے تنگ کرنے کا بہانہ آگیا تھا۔ وہ رات میں نے بڑی بے قراری میں گزاری تھی۔ اگلی صبح میں اپنے دوست اویس کے گھر کی طرف چل پڑا تاکہ اسے شادی کے بارے بتا سکوں۔ گھر سے نکلتے ہی میری نظر ریڑھی والے پر پڑی جو تازہ سبزی سجائے میرے گھر کے دروازے سے بیس پچیس گز دور کھڑا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے سرسری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی لیکن اسے پہچان نہ سکا۔ یوں بھی فوجی حضرات اپنے گاؤں کے باسیوں کو کم ہی جانتے ہیں۔ اس سے سبزی خریدنے والے ایک آدمی کو تو میں جانتا تھا کہ وہ ہمارا پڑوسی سرفراز صاحب تھا۔ البتہ دوسرا خریدار بھی میرے لیے اجنبی تھا۔
میں آگے بڑھتا گیا۔ میرے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر اویس کا گھر آتا تھا۔ دوسری گلی کا موڑ مڑتے ہوئے میں نے بے خیالی میں پیچھے مڑ کر دیکھا اور ریڑھی سے سبزی خریدنے والے کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر مجھے ذرا عجیب سا لگا تھا کیونکہ میرا مشاہدہ تھا کہ ریڑھی سے سبزی خریدنے والے عموماً اسی محلے کے ہوتے ہیں جہاں ریڑھی والا موجود ہوتا ہے۔ کوئی اتنی دور سے سبزی خریدنے کسی مستقل دکان پر تو جا سکتا ہے ریڑھی پر نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ شاید وہ اتفاقاً وہاں سے گزر رہا ہوں اس لیے اس نے اپنے لیے سبزی خرید لی ہو

۔موڑ مڑ کر اویس کی بیٹھک کے قریب پہنچتے ہوئے میں نے ایک مرتبہ پھر پیچھے دیکھا لیکن وہ سبزی والا غائب تھا ،البتہ ایک آدمی ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی کتابوں کا بنڈل اٹھائے نظر آیا۔

میں نے سر جھٹک کر اویس کے دروازے پر دستک دی۔اویس کے آنے تک کتابیں بیچنے والا میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اس وقت اویس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے ......''ابے تو زندہ ہے۔'' وہ بازو پھیلاتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

معانقہ کر کے وہ مجھے بیٹھک کے اندر لے گیا۔اندر داخل ہوتے ہی اس نے بیٹھک کی گھر کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے اپنی بیوی کو آواز دے کر چائے وغیرہ کا بتانے لگا۔اس کی بیوی ارم مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔

''اب سناؤ جانی!......بہت عرصے بعد چھٹی آئے ہو؟'' تکیہ اٹھا کر میری گود میں رکھتے ہوئے وہ میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

میں ہنسا۔''بس یار!......تمھارے لیے بھابی ڈھونڈ رہا تھا۔''

''کیا......؟ میں سمجھا نہیں۔'' وہ حیرانی سے چیخ پڑا تھا۔اسی وقت گلی میں ایک فقیر کی صدا سنائی دینے لگی ،نامعلوم کیوں وہ آواز سن کر میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔میری چھٹی حس کسی بہت بڑے خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

''ابے کس سوچ میں غرق ہو گئے ہو۔'' مجھے خاموش پا کر اس نے دوبارہ آواز دی۔

''آں......ہاں......کچھ نہیں یار!......بس کل میری شادی ہے اس بارے اطلاع دینے آیا تھا۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں......یہ ایک دم کیسے؟''

''ارم بہن کی طرح مجھے بھی ایک پٹھان لڑکی ٹکرا گئی اور میں نے فیصلہ کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔''

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔''فلسفہ نہیں محترم ،مکمل تفصیل......''

اور میں اسے پلوشہ کے بارے ضروری باتیں بتانے لگا۔اسی دوران ارم بہن چائے لے آئی۔

”ذیشان بھیا!...... کیسے ہیں آپ۔“ چائے اور لوازمات کی ٹرے لکڑی کی میز پر رکھ کر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا۔

اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ ”بالکل ٹھیک بہنا۔“

وہ ہم دونوں کو چائے کا ایک ایک کپ پکڑا کر باہر نکل گئی۔ میری بات جاری رہی۔ اویس پلوشہ کے تذکرے کو بڑے غور سے سنتا رہا۔ میں نے اسے پلوشہ سے شادی ہو جانے کی بابت بھی سچ سچ بتا دیا تھا۔

میری بات ختم ہوتے ہی اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تو اب دوبارہ شادی کرنے کا مطلب؟“

”یار!...... پلوشہ کی ماں اور میرے گھر والے تو اس شادی سے لاعلم ہیں تو کیوں نا دوبارہ شادی کر کے انھیں خوش ہونے کا موقع دیا جائے۔“

”ہونہہ!...... چلو جیسے آپ کی مرضی۔“

میں اس کے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ بیٹھ کر گپ شپ کرتا رہا۔ اس دوران میرے دماغ میں عجیب قسم کے اندیشے پرورش پاتے رہے۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ بہ ظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر درپردہ کسی طوفان کی آمد کے آثار نہایت واضح تھے۔

اویس نے جلد ہی میری بے توجہی کو جان لیا تھا۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

”شاید کافی دیر سے آپ پلوشہ بہن کو نہیں دیکھ پائے ہیں اس لیے ہر بات کا جواب ہاں، ہوں سے زیادہ نہیں مل رہا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ تشریف لے جائیں۔“

”ٹھیک ہے چلتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا اور سہ پہر کو ملنے کا کہہ کر الوداعی مصافحہ کرنے لگا۔ گلی میں نکلتے ہی میں نے محتاط انداز میں دائیں بائیں دیکھا۔ سفید کاٹن کا سوٹ پہنے ایک آدمی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسی طرف جانا تھا۔ میں اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اگلی گلی میں ایک سبزی ریڑھی والا آہستہ روی سے جاتا دکھائی دیا۔ میں تیز رفتاری سے چلتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ چند قدم آگے جا کر میں نے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا اس کے باوجود مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی نظر آ

رہی تھیں۔میں نے کبھی کسی ایجنسی کے لیے کام نہیں کیا تھا مگر ان کے طریقہ کار سے اچھی طرح واقف تھا۔نہ جانے کیوں مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔یا شاید وہ میرے اندر کا خوف تھا جو ہر راہ گیر مجھے آئی ایس آئی کا رکن نظر آ رہا تھا۔میں نے سر جھٹک کر اس خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

گھر پہنچنے پر مجھے محلے کی کافی خواتین صحن میں بیٹھی نظر آئیں،مجبوراً میں بیٹھک میں گھس گیا۔ابو جان پہلے سے وہاں موجود تھے۔پلوشہ کا چھوٹا بھائی عدیل خان ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔عدیل خان کو بھی پشتو کے علاوہ کوئی زبان بولنا نہیں آتی تھی۔ابو جان اس کے لیے نمکو وغیرہ لے آیا تھا اور وہ ان کے پاس بیٹھا نمکو کھانے کو جڑا ہوا تھا۔

میں۔”اسلام علیکم۔“کہتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

”صبح سے کہاں غائب ہو یار!......“سلام کا جواب دیتے ہوئے ابو جان کہنے لگے۔”نہ تو عدیل خان کی سمجھ میں میری بات آتی ہے اور نہ اس کی باتیں میرے پلے پڑ رہی ہیں۔جبکہ پلوشہ بیٹی تو بہت اچھی اردو بولتی ہے۔بلکہ آج صبح تو اس نے مجھ سے پنجابی میں بھی بات چیت کی ہے۔“

”بتائیں پھر کیسی بہو ڈھونڈ کر دی ہے۔“

ابو جان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔”بس زندگی میں یہی ایک اچھا کام کیا ہے۔“اور میں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

اسی وقت پھوپھو جان نے اندر آ کر کھانے کا پوچھا۔

”پھوپھو جان بھجوا دیں کھانا اور خود زحمت نہ کرنا،گھر میں کوئی اور بھی تو موجود ہوگا۔“

”اور کون ہے گھر میں،اب دلھن بیٹی تو تمھیں کھانا دینے آ نہیں سکتی۔“

”دھت تیرے کی۔“میں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔”ٹھیک ہے آپ ہی لے آئیں۔“

پھوپھو جان دوٹوک لہجے میں بولی۔”مہینا بھر تو میں دلھن کو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔“

”ٹھیک ہے پھوپھو جان!......اسے چڑھا لو سر پر،مگر بعد میں مجھے گلہ نہ کرنا۔“

”شانی!......میں پلوشہ بیٹی کے خلاف دوبارہ ایک لفظ بھی نہ سنوں تمھارے منہ سے۔“

”چلیں جی اپنی تو قسمت ہی پھوٹی تھی جو اس لڑکی کو شادی کے لیے لے آیا۔“ پھوپھو جان ہنستی ہوئی بیٹھک سے باہر نکل گئی۔ ابو جان بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”ابو جان دیکھ لی اپنی بہو کی حرکت۔ ایک ہی دن میں پھوپھو جان کو مجھ سے چھین لیا۔ پتا نہیں آگے کیا گل کھلائے گی۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں تمھاری پھوپھو۔“ ابو جان نے بھی پھوپھو کی طرف داری میں دیر نہیں لگائی تھی۔

میں نے منھ بنایا۔ ”یعنی یک نہ شد دو شد۔“

”ہم تو بھئی ترسے ہوئے تھے بہو کے لیے، اب اتنی پیاری بہو اللہ پاک نے جھولی میں ڈال دی ہے تو یقیناً اسی کی طرف داری کریں گے۔“

”عدیل خان!......تم سناؤ، کب اسکول جانا ہے؟“ میں پلوشہ کے چھوٹے بھائی کو مخاطب ہوا۔

وہ معصومیت سے بولا۔ ”جب آپ کہیں لالا۔“

میں ابو جان کو اس کے اسکول میں داخلے کا بتانے لگا۔ اسی اثناء میں پھوپھو جان کھانا گرم کر کے لے آئیں اور ہم کھانے کو جڑ گئے۔ کھانے کے بعد پھوپھو جان میرے سر ہو گئیں کہ انھیں شاپنگ کے لیے شہر لے جاؤں۔ اور میں ٹیکسی کروا کر انھیں شہر لے آیا۔ عدیل خان کو بھی میں نے ساتھ لے لیا تھا۔ اس دوران ہر لمحہ یہی احساس میرے ساتھ رہا کہ میں ان دیکھی نگاہوں کے حصار میں ہوں۔ اگر میرا گمان صحیح تھا تو میرے بھاگنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے وقتی طور پر ان تکلیف دہ احساسات کو دور جھٹکا۔

پھوپھو جان نے زیادہ تر خریداری پلوشہ کے لیے کی تھی۔ درجن بھر سوٹ، جیولری، جوتے، میک اپ کا سامان اور بھی جانے کیا کیا۔ پلوشہ ایک ہی دن میں پھوپھو جان کے دل پر قابض ہو گئی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی شوخ چنچل اور دل موہ لینے والی۔

شام کی آذان تک ہم واپس لوٹ آئے تھے۔ پلوشہ کی فرمائش کے مطابق میں نے سونے کے کنگن بھی خرید لیے تھے۔

☆......☆......☆

اگلے دن بعد از نماز ظہر ہمارا نکاح تھا اور شام کو رخصتی تھی۔ رخصتی کیا، بس پھوپھو کے کمرے سے پلوشہ کو میرے کمرے تک آنا تھا۔ مجھے سچ مچ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے پہلی بار میری زندگی میں آنا ہو۔ شادی کی رسموں نے میرے دماغ سے اس خطرے کو وقتی طور پر محو کر دیا تھا جس کی تلوار پچھلے دو دن سے میرے سر پر لٹک رہی تھی۔

شادی میں میری سابقہ بیوی ماہین کے والد چچا حشمت اور اس کے دونوں بیٹوں نے شرکت کی تھی۔ نکاح کے بعد انھوں نے بڑے خلوص سے مجھے مبارک باد دی تھی۔ ماہین کے متعلق مجھے پتا چلا تھا کہ اس کی شادی چند ماہ سے زیادہ نہیں چل سکی تھی، مہینا بھر پہلے ہی اس نے اپنے دوسرے شوہر طاہر سے طلاق لے لی تھی۔ ان کے درمیان جھگڑے کی وجہ تو مجھے معلوم نہیں ہو پائی تھی، مگر اتنا میں پہلے سے جانتا تھا کہ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوا کرتیں۔ نہ ماہین جیسی لڑکیاں اچھی بیوی ثابت ہوتی ہیں اور نہ طاہر جیسے بدکردار کسی عورت کو اس کا صحیح مقام دے سکتے ہیں۔

جن مردوں کے نزدیک عورت کی حیثیت جنسی کھلونے سے بڑھ کر نہیں ہوتی وہ عورت کا مقام کیا جانیں۔ حالانکہ شکل وصورت اور جسمانی خدوخال سے ہٹ کر بھی عورت کی ایک شناخت ہے۔ شریک حیات کا مطلب زندگی کے ہر دکھ سکھ کو برابر بانٹنا، ہر اذیت کو دو حصوں میں تقسیم کرنا، ہر خوشی پر یکساں حق جتانا ہوتا ہے۔

کسی کو پسند کرنا یا چاہنا طبی میلان کے زیر اثر ہوتا ہے، لیکن انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ شادی کے وقت ہر مرد و عورت کو اپنی پسند کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ اگر گھر والوں اور خاندان کے دباؤ میں آ کر کوئی دوسری جگہ شادی کر بھی لیتے ہیں تو پھر اس رشتے کو نبھانا چاہیے۔ کسی مرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی شریک حیات کو اس کا اصل مقام نہ دے اسی طرح کسی عورت کو بھی یہ روا نہیں کہ وہ شوہر کی امانت میں خیانت کی مرتکب ہو۔ شادی ہو جانے کے بعد بغاوت کرنا بے غیرتی اور بے حیائی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے شادی سے پہلے ہی لڑکی یا لڑکے کو اپنے بزرگوں کو اعتماد میں لے لینا چاہیے۔ اسی طرح بزرگوں کا بھی کام بنتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی ترجیحات کو مدنظر رکھیں۔ ان کی پسند کو اہمیت دیں۔ ان کے جذبات کی قدر کریں۔ خالی بزرگی کی دھونس اور بڑے پن کا ناجائز استعمال نہ کریں۔

بہر حال کچھ بھی تھا مجھے ماہین کی ناکام شادی کے بارے جان کر خوشی نہیں ہوئی تھی۔البتہ یہ بات میرے لیے شکر کا باعث ضرور تھی کہ مجھے جلد ہی اس کی اصلیت معلوم ہوگئی تھی ۔ورنہ تو ایسی عورتیں ساری زندگی اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہتی ہیں اور شوہر اپنی آنکھوں پر بیوی کی خدمت اور محبت کی پٹی باندھے قبر میں جااترتا ہے۔

☆......☆......☆

نکاح کی سنت مسجد ہی میں ادا کی گئی تھی ۔اس کے بعد تکمیل سنت میں ابوجان نے چھوارے بھی پھینکے کہ ایسے موقع پر حاضرین کی طرف چھوارے اچھالنا سنت ہے۔

واپسی پر ہم بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے ۔مجھے رات تک کا وقت گزارنا مشکل ہورہا تھا،یوں لگ رہا تھا جیسے پلوشہ کئی سالوں سے مجھ سے دور ہو۔اس کے ساتھ ہی میری چھٹی حس بھی رہ رہ کر کسی انہونی کا اعلان کرنے لگتی۔

عصر کی نماز بھی ہم نے مسجد ہی میں ادا کی تھی۔نماز ادا کرکے ہم دوبارہ بیٹھک میں آگئے تھے۔گھر کے اندر سے عورتوں،لڑکیوں اور بچوں کا شور ایک تسلسل سے سنائی دے رہا تھا۔نعروں کی گونج سے پتا چل رہا تھا کہ ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں بالیاں رقص وغیرہ بھی کر رہی تھیں۔

مہمان آہستہ آہستہ رخصت لے کر واپس جارہے تھے۔اچانک بیٹھک کے اندر دو اجنبی داخل ہوئے ۔میں اس وقت اتفاق سے دروازے ہی کی طرف متوجہ تھا۔ان کی عقابی آنکھیں،پراعتماد انداز اور ہونٹوں پر کھلتی دھیمی مسکراہٹ مجھے لرزا گئی تھی۔میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دو دن سے میرے اندر پلنے والے اندیشے سچ ثابت ہونے جارہے تھے۔

وہ دائیں بائیں سے بے نیاز سیدھا میرے قریب پہنچے۔

''اسلام علیکم !......ذیشان بھائی کیا حال ہے۔'' قریب آتے ہی ان میں سے ایک کسی پرانے شناسا کی طرح مجھے مخاطب ہوا۔

میں ۔''وعلیکم اسلام ۔'' کہہ کر کھڑا ہوا اور دونوں سے مصافحہ کرکے انھیں بیٹھنے کی دعوت دی ۔اس وقت میرے ساتھ چارپائی پر اویس اور ایک دوسرا دوست بیٹھا تھا۔انھوں نے ایک طرف ہوکر ان دونوں کو بیٹھنے کی

جگہ دی۔

”شادی مبارک ہو ذیشان بھائی۔“اس مرتبہ دوسرا آدمی مجھے مخاطب ہوا۔

”خیر مبارک، شکریہ۔“میں تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”میرا نام خرم ہے اور یہ ارسلان ہے۔“اس نے اپنا اور ساتھی کا تعارف کرایا۔لیکن اتنا تو مجھے بھی یقین تھا کہ وہ دونوں فرضی نام تھے۔

”حکم کریں خرم بھائی۔“گو میں ان کا مطمح نظر جانتا تھا لیکن پھر بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔

خرم گلا کھنکارتا ہوا بولا۔”اس خوشی کے موقع پر ہم کوئی اچھی خبر نہیں لائے۔ایک ایمرجنسی کی وجہ سے آپ کو اسی وقت یونٹ میں حاضر ہونا ہے۔“

میں اس ایمرجنسی سے واقف تھا۔وہ میری عزت رکھنے کے لیے مجھے باقاعدہ گرفتار نہیں کر رہے تھے۔اگر میں ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا تو یقیناً وہ مجھے زبردستی لے جاتے۔لیکن میں اتنا احمق نہیں تھا کہ ایسی بے وقوفی کرتا۔البتہ نرمی سے اجازت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔میں نپے تلے الفاظ میں بولا۔

”اگر صبح تک رکنے کی اجازت مل جائے تو شکر گزار ہوں گا۔“

”یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، مگر جو احکامات ملے ہیں اس کے مطابق آپ کے پاس آدھے گھنٹے کا وقت ہے۔شام کی اذان سے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“اس مرتبہ بھی خرم ہی نے جواب دیا تھا۔شاید سینئر وہی تھا۔

میں نے اجازت طلب کرنے کے انداز میں پوچھا۔”ٹھیک ہے، میں گھر والوں سے اجازت لے کر آتا ہوں۔“

خرم نے اعتماد بھرے انداز میں اجازت دیتے ہوئے کہا۔”جی بھائی، بتا دیا نا آپ کے پاس آدھا گھنٹا ہے۔“

میرے جانے کی بات ابو جان کے پاس بھی پہنچ گئی تھی وہ فوراً قریب ہوئے اور وجہ دریافت کرنے لگے۔میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ابو جان!......کوئی ضروری کام آن پڑا ہے اس لیے بڑے افسر نے مجھے فوری طور پر بلوایا ہے، اسی وجہ سے اس نے سرکاری گاڑی بھی بھیجی ہے۔آپ فکر نہ کریں۔امید ہے چند دنوں تک میں لوٹ آؤں گا۔"

"مگر ایک دو دن کے بعد بھی تو جایا جا سکتا ہے بیٹا۔" ابو جان معترض ہوئے۔

"ابو جان!......اسی کا نام فوج ہے، اگر مجھے فی الفور حاضر ہونے کا حکم دیا ہے تو کوئی وجہ ہوگی، خالی تنگ کرنا تو مقصد نہیں ہے نا کسی افسر کا۔"

میرے لہجے کے اتار چڑھاؤ اور چہرے کے اثرات میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ ابو جان نے اصرار نہیں کیا تھا۔میں نے ایک چھوٹے لڑکے کو بھیج کر پھوپھو جان کو دروازے پر بلایا اور کہا کہ پردہ دار خواتین کو پردہ کرنے کا بتا دے میں گھر کے اندر آ رہا ہوں۔

انھوں نے حیرانی سے پوچھا۔"کوئی ضروری کام تھا بیٹا۔"

"ہاں پھوپھو!......پلوشہ سے ملنا ہے، مجھے ایمرجنسی میں واپس جانا پڑ رہا ہے۔"

"کیا مطلب، واپس جانا پڑ رہا ہے۔" وہ ششدر رہ گئی تھیں۔

"پھوپھو جان!......کہہ تو دیا کہ ایمرجنسی ہے، زیادہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔میں نے فوراً جانا ہے۔"

پھوپھو جان بادل نخواستہ سر جھٹکتی ہوئی اندر گھس گئی۔ایک دو منٹ انتظار کے بعد مجھے بھی اندر جانے کی اجازت مل گئی۔میں سیدھا دلھن کے کمرے کی طرف بڑھا۔پھوپھو جان نے وہاں موجود خواتین کو باہر نکال دیا تھا۔اس وقت دولھے کا دلھن کے کمرے میں جانا سب کے لیے اچنبھے کا باعث تھا مگر میرے پاس ان کی حیرانی دور کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میرے اندر داخل ہونے کی آہٹ سنتے ہی پلوشہ گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی تھی۔اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے تو میں ساری پریشانیاں بھول کر اسے مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔روایتی دلھن کا روپ دھارے وہ تختِ حسن پر براجمان ایسی ملکہ کی طرح لگ رہی تھی کہ جس کے سامنے جنت کی حوریں، کوہ قاف کی اپسرائیں اور دنیا کی تمام حسینائیں ہاتھ باندھے کھڑی ہوں۔اس کے جسم پر سجے زیورات ضرور

اپنی خوش قسمتی پر رشک کر رہے تھے۔

"راجو!......کیا ہوا؟......خالہ جان کہہ رہی ہیں آپ نے ابھی واپس جانا ہے۔" وہ جسے میں نے زندگی کے کسی مرحلے میں خوف زدہ نہیں دیکھا تھا اس وقت مجھے سہمی ہوئی چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا راجو کی جان!" میں نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر تسلی دینے کی کوشش کی۔ مگر اپنے لہجے میں اعتماد کا فقدان خود مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔ وہ تو پھر پلوشہ تھی جو میرے دل میں چھپے خیالات کو بغیر بتائے جان جایا کرتی تھی۔

"راجو!......مجھے ڈر لگا رہا ہے۔" میری چھاتی پر سر رکھتے ہوئے وہ کراہی۔

"غلط فہمیاں زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ پائیں گی چندا......میں ان شاء اللہ جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ میرا خیال ہے البرٹ روک نے میری وڈیوز ایجنسیوں تک پہنچا دی ہیں۔ ابھی ایجنسی کے آدمی ہی مجھے لینے آئے ہوئے ہیں۔ لیکن فکر کی ضرورت نہیں۔ نہ تو میں مجرم ہوں اور نہ ہماری ایجنسیاں اتنی احمق ہیں کہ دشمنوں کی چال کو سمجھ نہ پائیں۔"

اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"پاگل نہ بنو چندا!......گھر والوں کو کون تسلی دے گا۔ اور تم اپنے سردار بھائی کو فون کر کے میری خیریت معلوم کر لینا میں اس کا موبائل فون نمبر تمھیں لکھ دیتا ہوں۔"

وہ مصر ہوئی۔ "راجو!......آپ مجھے ساتھ لے جائیں نا......میں متعلقہ آفیسرز سے بات کر کے ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"چھوڑو اس بحث کو تم کہیں بھی نہیں جا رہی ہو......بس میرے بعد میرے ابو جان اور پھوپھو جان کا خیال کرنا......اور دیکھو میں اپنی چندا کے لیے کتنے پیارے کنگن لایا ہوں۔" میں نے جیب سے خوب صورت قیمتی کنگن نکال کر اس کی ریشمی کلائیوں میں پہنانے لگا۔

وہ بے آواز آنسو بہانے لگی۔

"یقیناً تمھارے آنسو مجھے اتنی تکلیف دے رہے ہیں جتنی کسی کو عالم نزع میں ہو سکتی ہے۔"

''راجو!......اگر آپ کو کچھ ہوا تو آپ کی پلوشے زندہ نہیں رہ پائے گی۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا پگلی۔''

''اگر ہم دونوں بھاگ جائیں......؟''اس نے امید بھرے لہجے میں تجویز پیش کی۔

''بے وقوفوں والی بات نہ کرو ایسا کر کے میں خود پر لگے الزاموں کو سچا ثابت نہیں کرنا چاہتا۔''میں نے پلوشہ کو سمجھانے کی کوشش کی، حالانکہ خود میرا دل یہی کر رہا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگوں......لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ میں اس وقت آئی ایس آئی کے گھیرے میں تھا اور ان سے کوئی بعید نہیں تھا کہ اس وقت آئی ایس آئی کے چند ارکان عورتوں کے روپ میں برقع اوڑھے اس کمرے کے گرد میرے منتظر ہوتے۔ بھاگ کر اپنی لیے سختیاں بڑھانے سے بہتر تھا کہ میں آرام سے گرفتاری دے دیتا۔اور میں نے یہی کیا۔

بڑی مشکل سے میں نے پلوشہ کو راضی کیا۔وہ بار بار رونے لگتی۔وہ ایک ہی رٹ لگا رہی تھی کہ اسے ڈر لگ رہا ہے۔گو ڈرا ہوا تو میں بھی تھا۔اگر کوئی حوصلے کی بات تھی تو وہ یہ تھی کہ میرا دامن کسی بھی قسم کی غداری اور جرم سے پاک تھا۔البتہ یہ معلوم نہیں تھا کہ میری بے گناہی کتنے عرصے میں ثابت ہوتی۔میں نے تو یہ منصوبہ بنایا ہوا تھا کہ پلوشہ کو گھر میں پہنچا کر اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے جاتا مگر اس سے پہلے ہی یہ مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔

پلوشہ سے الوداعی ملاقات کر کے میں نے اسے سردار کا موبائل فون نمبر لکھ کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔پھوپھو جان میری منتظر تھی انھیں جلد لوٹ آنے کا کہہ کر میں گھر سے نکل آیا۔بیٹھک میں ابوجان اور چند دوسرے احباب سے ہشاش بشاش انداز میں ملتے ہوئے میں خرم اور ارسلان کے پاس آ گیا۔

''چلیں بھائی۔''سخت پریشان ہونے کے باوجود میں نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز اپنایا ہوا تھا تا کہ کسی کو میری پریشانی کے بارے معلوم نہ ہو جائے۔

وہ دونوں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑے۔ہمارے دروازے پر ہی ایک کالے شیشوں والی ڈبل کیبن کھڑی تھی۔جس کی باڈی میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔میں خرم اور ارسلان کے درمیان عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔اگلی سیٹ پر پہلے ہی سے دو آدمی موجود تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی موڑی اور ہم گاؤں سے باہر کی طرف چل پڑے۔ بڑی سڑک پر آتے ہی ارسلان نامی آدمی نے جیب سے ایک کالے رنگ کا کپڑا نکالا اور میرے سر پر چڑھا دیا۔ اب ارد گرد کے سارے منظر اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔

☆......☆......☆

گاڑی کافی دیر چلتی رہی۔ اس دوران کسی نے بھی بات چیت نہیں کی تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا آنے والے پر اذیت لمحات کا سوچ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایجنسی والے ملک دشمنوں کے لیے کیسے جلاد کا روپ دھارتے ہیں۔ گو میں ملک دشمن نہیں تھا لیکن میرے خلاف جو ثبوت موجود تھے وہ مجھے ملک دشمن ثابت کرتے تھے۔ اور میرا بے گناہ ہونا میرے کہنے سے تو ثابت نہیں ہوسکتا تھا۔ ایجنسی کا اپنا طریقہ کار تھا اب نہ جانے انھوں نے کس طریقے سے میری بے گناہی کا یقین کرنا تھا۔ ہمارا سفر چند گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران گاڑی نے کئی موڑ کاٹے تھے۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ ہم راولپنڈی شہر میں داخل ہوئے تھے، لیکن یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ ٹریفک اور لوگوں کے ملے جلے شور سے کسی شہر کے بارے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

گاڑی کے رکنے پر بھی انھوں نے میرے سر سے کپڑا نہیں اتارا تھا۔ میرے دائیں جانب ارسلان بیٹھا تھا اسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر گاڑی سے نیچے اتارا اور ایک جانب آگے بڑھ گیا۔ اس کی معیت میں چلتے ہوئے میں نے تین چار موڑ کاٹے دوبار سیڑھیاں اتریں اور اور پھر میرے سفر کا اختتام ہو گیا۔ میرے سر سے کپڑا اتارا گیا۔ وہ ہر قسم کے سامان سے عاری کمرہ تھا۔ بس ایک کونے میں لکڑی کا تختہ نصب تھا جو زمین سے فٹ بھر اونچا تھا۔ اس پر ایک کمبل بچھا تھا اور سفید رنگ کا تکیہ پڑا تھا۔

میں نے سرسری نظر دوڑا کا کمرے کا جائزہ لیا۔ میرے ساتھ وہاں تک اکیلا ارسلان ہی آیا تھا۔ میری جامہ تلاشی لے کر اس نے میری جیبوں سے تمام چیزیں نکال کر ایک مومی لفافے میں ڈالیں اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے وہ لوہے کا مضبوط دروازہ باہر سے بند کر گیا تھا۔ یقیناً ان کی ذمہ داری مجھے وہاں تک لانے کی تھی، پوچھ گچھ کے لیے کسی اور نے وہاں آنا تھا۔ میں لکڑی کے پھٹے پر لیٹ گیا۔ میری قسمت میں انتظار ہی کی زحمت لکھی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی میرے لیے رات کا کھانا لے آیا۔وہ اکیلا تھا اور بغیر کسی ہتھیار کے تھا۔کمرے میں کوئی میز وغیرہ تو موجود نہیں تھی۔اس نے کھانے کی ٹرے میرے سامنے بستر پر رکھی اور کچھ کہے بنا باہر نکل گیا۔

بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے چند نوالے زہر مار کیے۔اور غسل خانہ میں گھس کر وضو کرنے لگا۔شام کی نماز سفر کی نذر ہو گئی تھی۔شام کی قضا نماز پڑھ کر میں نے عشاء کی نماز ادا کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

کافی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد ہی میں سونے میں کامیاب ہو سکا تھا۔دیر سے سونے کے باوجود صبح جلدی میری آنکھ کھل گئی تھی۔گھڑی وغیرہ کی غیر موجودی میں، میں وقت کا اندازہ تو نہیں کر سکتا تھا بس اندازے ہی سے نماز ادا کی اور دوبارہ لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میرے لیے ناشتا آ گیا۔اور پھر میں ناشتے سے بہ مشکل فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازہ کھول کر ایک آدمی پلاسٹک کی کرسی اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔کرسی اس نے میری چارپائی کے سامنے رکھی اور ناشتے کے خالی برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔اس کے باہر جانے کے چند لمحے بعد قدموں کی آہٹ ہوئی۔آنے والی شخصیت کو دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا تھا۔وہ میجر اورنگ زیب تھا۔میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو۔'' کرسی پر نشست سنبھالتے ہوئے وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔اس کے چہرے پر شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہیں تھی۔

میں آہستگی سے بیٹھ گیا۔چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد وہ بغیر کسی تمہیدی جملے کے براہ راست مطلب کی بات پر آ گیا۔

''تو ایسا کرنے کی وجہ کیا تھی؟......اپنی محبوبہ کی جان بچانا، ڈالرز یا گرین کارڈ کا حصول۔''

میں نپے تلے الفاظ میں بولا۔''ایسا کچھ بھی نہیں ہے سر!......اصل کہانی کوئی اور ہے۔''

اس نے کہا۔''تو شروع ہو جاؤ۔''

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سردار نے میرے جانے کے بارے انھیں کیا بتایا تھا۔لیکن میں اس وقت سچ کے علاوہ کچھ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ میرے بیان کا ہلکا سا تضاد میری مشکلات میں اضافے کا باعث بنتا۔لمحہ بھر سوچ کر میں نے اپنے دماغ میں واقعات کو ترتیب دی اور پھر اس وقت سے بات شروع کی جب سردار خان اور میں نے

وجہ نرائے جانا تھا۔ پلوشہ کا اپنی ماں اور بھائی کی وجہ سے مجھے پکڑوانا، میرا البرٹ بروک کے ہاتھوں دھوکا کھانا ،وڈیو کلپس کی حقیقت، پلوشہ کا مجھے بچانے کے لیے لوٹنا، صنوبر خان کی موت اور میری گھر واپسی تک میں نے تمام ضروری باتیں اورنگ زیب صاحب کے گوش گزار کر دیں۔ اس دوران اس نے مجھے ٹوکنے یا کسی قسم کے سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ کہنے لگا۔

''تم نے رہا ہوتے ہی ڈی بلاک میں رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ یا میں نے تمھیں الفاٹو یعنی سبیل خان سے رابطہ کرنے کا کہا تھا، اسے بھی تم نے اپنی رہائی کی بابت نہیں بتایا۔''

''کیونکہ میں اپنی رہائی کے ثبوت حاصل کر کے ہی آپ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔''

''جانتے ہو، ہمارے ذرائع نے یہ بتایا ہے کہ تم نے صنوبر خان کو اپنے امریکی آقاؤں کے کہنے پر قتل کیا ہے ۔صنوبر خان کی امریکیوں سے کوئی ان بن ہو گئی تھی اور انھوں نے تمھارے ذریعے اس کا کانٹا نکال دیا۔''

البرٹ بروک واقعی بہت خبیث شخص تھا۔ صنوبر خان کا قتل جس کی بہ دولت مجھ پر غداری کا الزام ہلکا ہو سکتا تھا وہ اسے بھی میری مخالفت میں استعمال کر چکا تھا۔

''سر!......امریکن میری نشانہ بازی کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر انھوں نے میرے ہاتھوں سے صنوبر خان کو مروانا ہوتا تو میں نے سنائپر رائفل سے اسے ختم کیا ہوتا جبکہ آپ جانتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے ۔اسے پلوشہ اور میں نے اس وجہ سے قتل کیا کہ اس نے پلوشہ کو بلیک میل کرنے کے لیے اس کی ماں اور بھائی کو حبس بے جا میں رکھا۔ پلوشہ کو تشدد کا نشانہ بنایا اور سب سے بڑھ کر وہ دہشت گرد تھا اور اسے ختم کرنے کا حکم مجھے پہلے سے مل چکا تھا۔''

''اسے ختم کرنے کا باقاعدہ حکم تمھیں کس سے ملا تھا۔''

''آپ سے۔''

''میں نے کب کہا کہ صنوبر خان کو قتل کرو۔''

''جب قبیل خان کو قتل کرنے کا حکم آپ دے سکتے ہیں، اس کے جانشین جہاں داد کے قتل پر مجھے شاباش دے سکتے ہیں تو صنوبر خان بھی تو اسی کردار کا مالک تھا۔''

”ہو گا......لیکن باقاعدہ حکم نہیں دیا گیا تھا۔تمھیں آخری حکم وچہ نرائے پہنچنے کا ملا تھا جس پر تم نے عمل نہیں کیا اور ایک لڑکی کی خاطر اپنے فرض سے غافل ہو گئے۔تمھارا کورٹ مارشل ہونے کے لیے اتنی وجہ کافی ہے،لیکن تم نے صرف اپنے فرض سے غفلت نہیں برتی بلکہ تم پر غداری کا الزام لگا ہوا ہے جس کے ٹھوس ثبوت اور شواہد موجود ہیں۔تم نے پاک آرمی کے کئی جوانوں اور آفیسرز کو شہید کرنے کا اعتراف کیا ہے اس کے لیے رقم وصول کی ہے ،اب تمھارا یہ کہنا کہ وہ فقط ایک ڈراما تھا تو یہ بات کوئی بھی نہیں مانے گا۔“

”سر!......یہ میرے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے،امریکہ میں کورس کے دوران بھی انھوں نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی تھی اور پھر مجھے اپنے دوست سردار کی خاطر ان کا کام کرنا پڑا......“میں اسے امریکہ میں ہونے والا واقعہ سنانے لگا۔

”یہ ساری بات سردار مجھے بتا چکا ہے اور یہ بات تمھارے کردار کو اور مشکوک کر رہی ہے۔کرنل کولن فیلڈ نے تم سے پہلی ملاقات میں اسی بات کا حوالہ دیا ہے کہ البرٹ بروک امریکہ ہی سے تمھیں اپنے لیے کام کرنے پر مائل کر چکا تھا اور تم نے نامعلوم وجوہات کی وجہ سے کچھ مہلت طلب کی تھی۔اسی طرح سردار خان کے بہ قول وہاں امریکہ میں بھی تم اکیلے اکیلے ہی ان سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے ہو اور ان کے لیے کام بھی کرتے رہے ہو سردار کو وہی معلوم ہے جو اس نے تمھاری زبان سے سنا،باقی واپسی پر تمھارے اکاؤنٹ میں کافی بھاری رقم بھی جمع کی گئی۔ایک سپاہی کے لیے پچاس ہزار ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔“

”وہ رقم مجھے سنائپر کورس میں پہلی پوزیشن لینے پر بہ طور انعام ملی تھی۔“

اس نے منہ بنایا۔”کسی کورس میں اول پوزیشن لینے پر اتنی رقم نہیں ملا کرتی۔“

”یونھی سہی......مگر آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں نے وہاں ایک یہودی کو بھی قتل کیا تھا شاید وہ رقم اس کا انعام ہو بہرحال میرے حوالے وہ سنائپر کورس میں اول پوزیشن حاصل کرنے کا انعام بتا کر کی گئی تھی۔“

”تم نے واپسی پر اپنی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کو امریکہ میں ہونے والے حادثے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔“

”کیوں کہ میرے تئیں وہ ایک حادثہ تھا جس سے ہم دونوں بہ خیریت گزر چکے تھے۔اس کے ساتھ مجھے یہ

بھی ڈر تھا کہ شاید میرا امریکنوں کے لیے کام کرنے والا فیصلہ غلط ہو اور کمانڈنگ آفیسر اس پر کوئی سزا سنا دیں۔“

”سردار اور تم نے ایک اور غلط کام یہ کیا کہ پاکستان آرمی سے تعلق رکھنے کے باوجود دہشت گردوں سے چھینے ہوئے ہتھیار مجاہدین کے حوالے کرتے رہے ہو جو پاکستان آرمی کی پالیسی کے سخت خلاف ہے اس معاملے میں آرمی کا موقف بالکل واضح ہے۔ پاک آرمی کسی دوسرے ملک کے خلاف کام کرنے والے کسی فرد کی مدد کرنے کے حق میں نہیں۔ نہ کشمیر میں کام کرنے والے مجاہدوں کو آرمی کوئی مدد دیتی ہے اور نہ افغانستان کے محاذ پر امریکہ یا شمالی اتحاد کے خلاف مجاہدین کی مدد کرتی ہے۔ اور تم نے آرمی سے تعلق رکھنے کے باوجود ایسی حرکت کیوں کی؟“

”سر!......ایک تو ہم سر چھپانے کے لیے مجاہدین کے ٹھکانے استعمال کر رہے تھے اور دوسرا یہ ہمارا ذاتی فعل تھا، اس ضمن میں ہم نے نہ تو پاک آرمی کا حوالہ دیا اور نہ مجاہدین نے ہمیں پاک آرمی کا سمجھتے ہو ہم سے یہ ہتھیار وصول کیے۔ البتہ ہمارے اس فعل سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہم امریکہ کے مفاد نہیں بلکہ اس کے خلاف کام کر رہے تھے۔“

”دیکھو ذیشان!......یہ بات تمھارے حق میں بالکل ہی نہیں جاتی، کیونکہ جو آدمی وطن سے غداری کر سکتا ہے وہ کسی کے لیے بھی مخلص نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص دوغلا ہوتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے کسی کام میں عار محسوس نہیں کرتا۔ تمھارے اس فعل سے تمھاری غداری اور بھی واضح ہوتی ہے۔ البتہ سردار خان کو اس معاملے میں بے قصور مانا جا سکتا ہے کہ سینئر ہونے کے باوجود وہ تمھارے احکامات ہی کے تابع فرمان رہا ہے۔“

اس مرتبہ میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی کہ اتنے ثبوتوں کے جواب میں میرے پاس لے دے کے اپنا ناقص حوالہ تھا اور اپنے بارے اپنی ہی گواہی دنیا کی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرتی۔

مجھے خاموش پا کر اس نے ایک مرتبہ پھر زبان کھولی۔ ”تمھارے پاس سوچنے کے لیے ایک ہفتہ ہے ......کیونکہ تم سے پوچھ گچھ کے لیے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی گئی ہے۔ اگر اس دوران تم اپنے جرائم کا اعتراف کر لیتے ہو تو ٹھیک ورنہ اس کے بعد تمھیں اسپیشل برانچ کے حوالے کر دیا جائے گا اور بات میرے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔“

میں خوف کھائے بغیر دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''جو حقیقت تھی وہ میں نے بتادی ہے سر!''

''صرف تمھارا کہہ دینا کافی نہیں ہے، کوئی ثبوت ہے تو پیش کرو۔''

''ثبوت کے لیے میری گزشتہ کارکردگی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔''

''ایک آخری سوال ...... تم نے شروع دنوں میں دعویٰ کیا تھا کہ ایک امریکن سنائپر تمھاری گولی کا نشانہ بنا ہے جس سے تمھارے ہاتھ بیرٹ ایم 107، گلاک پسٹل ، ایک قیمتی گھڑی اور بھی کافی چیزیں ہاتھ لگی تھیں ......'' اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ سامان واقعی میں کسی سنائپر کو ہلاک کرنے کے بعد تمھارے ہاتھ لگا تھا یا...... امریکنوں نے اپنے ایجنٹ کے حوالے ضرورت کا سامان کیا تھا۔''

میرے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ ''اس کا گواہ تو سردار خان کی صورت میں موجود ہے۔''

''نہیں ......'' میجر اورنگ زیب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سردار خان کے کہنے کے مطابق جب تم نے مخالف پہاڑی پر موجود سنائپر کو ہلاک کر دیا تھا تو باصرار اس پہاڑی کی طرف گئے تھے اور وہاں سے لوٹتے وقت تمھارے پاس وہ تمام سامان موجود تھا۔''

عجیب اتفاق تھا کہ میرے مخلص دوست کی بتائی ہوئی صحیح باتیں بھی میرے خلاف غداری کے الزام کو تقویت دے رہی تھیں۔

''میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔'' میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

''دوبارہ بتادوں کہ میرے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے، آخری دن آؤں گا اگر کچھ کہنا ہو تو ٹھیک ورنہ میں تمھیں متعلقہ لوگوں کے حوالے کردوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو طلب کر لینا۔''

میں بھی اس کے احترام میں بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''سردار خان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''اس تک تمھارا پیغام پہنچا دیا جائے گا......'' کہہ کر اورنگ زیب صاحب وہاں سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

اگلا ہفتہ میں نے قید تنہائی میں گزارا تھا۔کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔اس دوران کسی نے بھی مجھ سے بات چیت کی کوشش نہیں کی تھی۔بس اورنگ زیب صاحب کا ایک ہی پیغام مجھ تک پہنچا تھا کہ سردار چھٹی پر تھا اور اس کا موبائل فون نمبر بند مل رہا تھا۔ایک ہفتے بعد اورنگ زیب صاحب دوبارہ میرے سامنے موجود تھے۔مگر میرے پاس اسے بتانے کے لیے کوئی نئی بات موجود نہیں تھی۔

چند لمحے مجھے سوالیہ نظروں سے گھورنے کے بعد اس نے لب کھولے۔

''چلنے کے لیے تیار ہو؟''

میں نے منھ کھولے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''عرفان......''اس نے پیچھے مڑ کر کسی کو آواز دی۔

''جی سر۔'' کہتے ہوئے ایک جوان اندر داخل ہوا۔اس نے میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر ہتھکڑی لگائی اور میرے سر پر کالے رنگ کا کپڑا اچڑھا کر مجھے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔اپنے ساتھ چلاتے ہوئے وہ مجھے تہہ خانے سے باہر لایا۔(تہہ خانہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے سیڑھیاں چڑھنا پڑی تھیں)چند موڑ مڑنے کے بعد گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس نے مجھے گاڑی کی سیٹ پر بٹھا دیا۔

گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ٹریفک کا شور ایک تسلسل سے میرے کانوں میں پہنچ رہا تھا۔گھنٹا ڈیڑھ چلنے کے بعد آہستہ آہستہ ٹریفک کا شور ختم ہوا۔گاڑی کا بار بار رکنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔اور اس کی چال میں ردھم آگئی تھی۔اچانک گاڑی رکی اور کسی نے میرے سر پر سے وہ کالا کپڑا کھینچا۔وہ میجر اورنگ زیب ہی تھا۔میرے سر سے کپڑا اتار کر اس نے میری ہتھکڑی کھولی اور پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔گاڑی اس وقت موٹروے پر چل رہی تھی۔ہم راولپنڈی سے لاہور کی طرف جا رہے تھے۔

میجر اورنگ زیب نے دکھی لہجے میں کہا۔''ذیشان!......معذرت خواہ ہوں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔''

''جانتا ہوں سر۔''میجر صاحب کو ذمہ دار ٹھہرانا کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔

''ویسے تم نے گھر آنے کی غلطی کیسے کر لی؟''

''میں پلوشہ کو گھر چھوڑ کر افغانستان جانا چاہتا تھا۔''

”تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ، سردار خان اور تمھاری نئی نویلی دلھن پرسوں وزیرستان کے لیے نکل گئے ہیں ......سردار خان مہینا چھٹی پر ہے۔اور اپنی چھٹی وہ تمھاری بے گناہی کے ثبوت اکٹھے کرنے گزارے گا۔“

”مم......مگر پلوشہ............“میں گڑبڑا گیا تھا۔

”جی یہ سارا منصوبہ اسی کا ہے......وہ تو اکیلی ہی روانہ ہورہی تھی مگر سردار خان نے اسے اکیلے جانے کی اجازت نہ دی اور خود بھی اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”سردار خان کی پرسوں مجھ سے بات ہوئی تھی۔میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کہنے لگا کہ وہ اپنی بہن کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔اور پلوشہ کسی صورت رکنے کو تیار نہیں تھی۔“

میں نے پریشانی کے عالم میں خود کلامی کی۔”پتا نہیں ابوجان نے اسے کیسے جانے کی اجازت دے دی۔“ یہ الفاظ میرے ہونٹوں پر تھے کہ اورنگ زیب صاحب کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ لہرایا اور کار سڑک سے اتر کر تیزی سے ڈھلان میں اتری، آگے ایک کیکر کا بڑا درخت کھڑا تھا۔اس کے مضبوط تنے سے ٹکرا کر کار ایک جانب مڑ گئی۔اورنگ زیب صاحب کا سر زور دار انداز میں اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تھا۔میں نے بھی ڈیش بورڈ پر ہاتھ ٹیک کر بہ مشکل اپنا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرانے سے روکا۔

”سر آپ ٹھیک ہیں؟“میں نے اورنگ زیب صاحب کو سنبھالنا چاہا۔

”میں ٹھیک ہوں جوان!“اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری جانب دیکھا۔”ایسی صورت حال کا فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہوتی ہے۔“

”کک......کیا مطلب سر!“

”کیا تم پلوشہ اور سردار خان کے پیچھے جا کر اپنی بے گناہی کے ثبوت نہیں ڈھونڈنا چاہتے۔“

”مم......مگر......آپ......؟“

”کیا تمھیں لگتا ہے کہ میں اتنا برا ڈرائیور ہوں کہ بریک ہی نہیں لگا سکتا۔“

اسکی بات سن کرایک دم میرے دماغ میں جھما کا ہوا۔ یہ سب اس نے سوچ سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔

''شکریہ سر!''اس کا مطمح نظر جانتے ہی میں نے اس کا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا اور کار سے باہر نکل گیا۔

''یہ کچھ رقم بھی لیتے جاؤ اور گھر کا رخ نہ کرنا۔''اس نے جیب سے بٹوہ نکال کر چند بڑی مالیت کے نوٹ میری جانب بڑھائے۔اوراس کے ساتھ ہی کمر سے بندھا پستول بھرا ہوا پستول مع خالی میگزین کے میری جانب بڑھا دیا۔

اس کا احسان شکریے سے بہت بڑا تھا میں نے رقم اور پستول پکڑ کر وہاں سے بھاگتے ہوئے دور جانے لگا۔

مجھے جلد از جلد وزیرستان پہنچنا تھا۔جس پلوشہ کی حفاظت کے لیے میں نے گھر آنے کا خطرہ مول لیا تھا وہ محترما میرے لیے دوبارہ خطروں میں کود پڑی تھی۔

☆☆☆

تھوڑی دور آتے ہی اچانک مجھے لگا کہ سڑک سے دور ہٹنا بے وقوفی ہوگی۔سڑک ہی پر مجھے کوئی گاڑی مل سکتی تھی۔میں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور دوبارہ سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔اورنگ زیب صاحب کی کار مجھ سے فرلانگ بھر پیچھے رہ گئی تھی اور وہ ابھی تک کار سے باہر نہیں نکلا تھا۔میرے پاس اس وقت اورنگ زیب صاحب کا دیا ہوا پستول اور چند ہزار کی رقم تھی۔میرا سروس کارڈ اور قومی شناختی کارڈ تلاشی کے دوران نکال لیے گئے تھے۔البتہ گھر میں میرا نقل شناختی کارڈ موجود تھا جو سلیم شاہ کے نام سے بنا ہوا تھا۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ اورنگ زیب صاحب نے مجھے گھر جانے سے منع کر دیا تھا۔یقیناً تھوڑی دیر تک وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی اطلاع ہیڈکوارٹر تک پہنچا دیتا اور دنیا کی تیز رفتار ایجنسی میری تلاش میں نکل پڑتی۔اب میرا مقابلہ دہشت گردوں اور امریکیوں کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی کے ساتھ بھی تھا۔اور میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ آئی ایس آئی ہی تھی کیونکہ میں اپنے وطن کے کسی محافظ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا،اس کے برعکس ان کی نظر میں میں مجرم تھا،پاکستان آرمی کے کئی جوانوں اور آفیسرز کا قاتل۔ایسے غدار کے لیے یقیناً ان کے دل میں ذرا بھر بھی رحم موجود نہیں ہونا تھا۔

مجھے زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا تھا سڑک کے کنارے بنے ہوئے ہوٹل کو دیکھ کر میں اسی جانب مڑ گیا

۔یوں بھی موٹروے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسافروں کے لیے ہوٹل بنے ہوئے ہیں۔ جہاں وہ کھانے پینے کے ساتھ تازہ دم بھی ہو سکتے ہیں۔اور نماز کا وقت ہو تو مسجد وغیرہ کی سہولت بھی موجود ہے۔اس وقت ہوٹل پر صرف ایک گاڑی ہی رکی ہوئی تھی جو لاہور سے راولپنڈی جا رہی تھی۔مسافر نیچے اتر کر کھانے پینے میں مشغول تھے۔دوپہر بارہ ایک بجے کا وقت تھا۔میں نے بھی موقع غنیمت جانتے ہوئے جلدی جلدی کھانا کھایا اور بل چکا کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔مسافر گاڑی میں بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

کنڈیکٹر کو بتا کر میں بھی اندر گھس گیا۔گھنٹے ڈیڑھ بعد گاڑی راولپنڈی پہنچ گئی تھی۔میں پشاور موڑ پر اتر گیا ۔سردیوں کی آمد آمد تھی۔نومبر لگ چکا تھا۔پٹھان بھائیوں کی ریڑھیاں گرم چادروں،ٹوپیوں، جرابوں، مفلروں اور کوٹوں وغیرہ سے سج گئی تھیں۔اپنی شناخت چھپانے کے لیے مجھے اس وقت مفلر اور چادر وغیرہ کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ایک چادر اور سردیوں کا دوسرا ضروری سامان خرید کر میں ویگن کا انتظار کرنے لگا، کیونکہ یہ سامان مجھے وزیرستان میں بہت کام دیتا وہاں تو سردی بھی بہت زیادہ پڑتی ہے۔جلد ہی مجھے تلہ گنگ جانے والی ویگن مل گئی تھی۔

تلہ گنگ اتر کر میں نے ایک دکان سے سستا سا موبائل فون اور سم کارڈ خریدا اور اویس کو کال کرنے لگا اس کا موبائل فون نمبر مجھے یاد تھا۔یوں بھی الحمد اللہ میری یادداشت قابل ذکر ہے۔ایک اچھے سنائپر کے لیے جہاں اور بھی کئی خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہیں اچھی یادداشت کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔اس بارے میں کہانی کی شروعات میں مفصل بحث کر چکا ہوں اور یقیناً قارئین ان باتوں کو دہرایا جانا پسند نہیں کریں گے۔

''اسلام علیکم!'' دوسری گھنٹی ہی پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''وعلیکم اسلام،اویس!......میں ذیشان بات کر رہا ہوں۔''

''کیا حال ہے جگر، اتنے دن بعد فون کرنے کا خیال کیسے آ گیا۔''اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''یار نہ تو گلوں شکوں کا وقت ہے اور نہ میرے پاس تمھیں سمجھانے کا وقت ہے۔جو کہہ رہا ہوں اس پر فوراً عمل کرو۔''

”فرماؤ۔“ سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی اس کے لہجے سے طنز دور نہیں ہوا تھا۔

”فوراً میرے گھر جاؤ، میرے کپڑوں کی الماری کے اوپر والے خانے میں ایک پرانا سا پرس پڑا ہوگا جس میں میرا شناختی کارڈ ہے جو سلیم شاہ کے نام سے بنا ہوا ہے۔تم وہ پرس اٹھا کر اسی وقت اپنی موٹر سائیکل پر تلہ گنگ کا رخ کرو، ابو جان کو میرے بارے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔جونہی گاؤں سے باہر نکلو مجھے دوبارہ کال کر لینا میں تمھیں مزید بتا دوں گا کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔“

”یار!...... یہ کون سی جاسوسی کرانا شروع کر دی ہے۔“

”میں بہت بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں یار!...... تفصیل بتانے کا وقت بھی نہیں ہے اور یہ سب جاننا فی الحال تمھارے لیے ضروری بھی نہیں ہے۔بس جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔“

”ٹھیک ہے باس۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا اور میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ اویس کے لیے یہ سب کرنا بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا۔یوں بھی میرے گھر میں وہ بغیر روک ٹوک کے آ جا سکتا تھا۔ابو جان ہمارے دوستی سے اچھی طرح واقف تھے یقیناً وہ اویس کو میری الماری سے کچھ نکالنے سے کبھی بھی منع نہ کرتے۔اس کے باوجود میں نے اویس کے بعد ابو جان کا نمبر بھی ملا دیا۔

”اسلام علیکم!“ دو تین گھنٹیوں کے بعد ابو جان کی مشفقانہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”وعلیکم اسلام!......ابو جان میں ذیشان بات کر رہا ہوں۔“

”کیسے ہو بیٹا!......میں نے تو سوچا شاید تم ایسی جگہ پر ہو جہاں سگنل ہی نہیں آتے۔“

”نہیں ابو جان پہلے تو مصروفیت کی وجہ سے فون نہ کر سکا البتہ اب ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں واقعی سگنل نہیں آتے۔“

انھوں نے کہا۔”چلو جب موقع ملے کال کر دیا کرنا۔“

”ٹھیک ہے ابو جی!...... پلوشہ کہاں ہے؟“

”وہ وزیرستان گئی ہے۔کوئی اراضی کا مسئلہ تھا، اس کا دودھ شریک بھائی اسے لینے آیا تھا۔کہہ رہی تھی چند دنوں تک لوٹ آئے گی۔میں تو خود اس کے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا مگر اس نے منع کر دیا۔“

یقیناً پلوشہ نے سردار کا تعارف اپنے دودھ شریک بھائی کے طور پر کرایا تھا اور ابوجان کو اصل بات سے آگاہ کیے بغیر وہ بہانہ کر کے نکل گئی تھی۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ اس نے اپنی ماں کو حقیقت سے آگاہ کر دیا ہو۔ اس کی ماں یوں بھی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

''اچھا ابوجان !...... اجازت چاہوں گا۔ پھوپھو جان اور پلوشہ کی امی جان کو میرے سلام عرض کرنا اور اویس ابھی گھر آئے گا میری الماری سے اس نے کچھ کاغذات نکالنے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!...... اللہ حافظ۔''ابوجان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے بس اڈے کے مضافات میں موجود ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی اویس کی کال آگئی۔ وہ میرا بٹوہ لے کر گاؤں سے نکل پڑا تھا۔

میں نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔''احتیاط سے آنا اور یہ دیکھ لینا کہ کوئی موٹر سائیکل یا کار تمھارے تعاقب میں تو نہیں ہے۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔''اچھی طرح دیکھ لیا ہے یار، موٹر سائیکل تو چھوڑو کوئی پرندہ بھی میرے تعاقب میں نہیں ہے۔''

گو میں جانتا تھا کہ اویس کے لیے آئی ایس آئی کے کسی آدمی کو تاڑ لینا ناممکنات میں سے تھا، کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس کے تعاقب ہی میں آتے۔ ان کے پاس کسی آدمی کا پیچھا کرنے کے ہزاروں طریقے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میں خطرہ مول لینے پر مجبور تھا۔ میں، اویس کو بس اڈے پہنچنے کا کہہ کر ہوٹل سے نکل آیا۔ سڑک پر ایک ریڑھی والے پاس کھڑے ہو کر میں تھوڑی سے مونگ پھلی خرید کر ٹونگنے لگا۔ اویس جلد ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اسے رکنے کا اشارہ کر کے میں اس کے قریب ہو گیا۔

میرے چہرے گرد لپٹا مفلر دیکھ کر وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔''تم تو پکے ہی جاسوس بنے ہوئے ہو۔''

''مذاق کا وقت نہیں ہے یار!...... بٹوہ میرے حوالے کرو اور یہاں سے غائب ہو جاؤ۔''

''یہ لو۔''بٹوہ میری جانب بڑھا کر اس نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور آگے بڑھ گیا۔ میں دوبارہ بس اڈے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک ویگن میں بیٹھا میانوالی کی طرف رواں دواں تھا۔ رات کا کھانا

میں نے میانوالی بس اڈے میں کھایا اور وہاں سے ڈیرہ اسماعیل خان روانہ ہو گیا۔ میانوالی سے ڈیرہ اسماعیل خان کا سفر دو اڑھائی گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ رات کے بارہ بجے میں ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا تھا۔

اس وقت وانہ کے لیے کوئی گاڑی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ رات میں نے ایک ہوٹل میں گزاری۔ صبح سویرے میں ویگن میں بیٹھا وانہ کی طرف روانہ تھا۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ یوں بھی میرے جانے کی سمت کا صرف اورنگ زیب صاحب کو معلوم تھا۔ اور اس نے یقیناً کسی کو بھی یہ بات نہیں بتانی تھی۔ مجھے ڈھونڈنے والوں کے لیے میرے جانے کی سمت کا تعین اتنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ میں ان کی نظر میں مجرم تھا اور ایک مجرم کے لیے وزیرستان کا رخ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

وانہ میں اترتے ہی میں انگور اڈے جانے والی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا کہ میں جلد از جلد پلوشہ کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ یقیناً اس نے سب سے پہلے کمانڈر نصراللہ خوجل خیل کے گھر کا رخ کرنا تھا کہ ہم نے اپنے ہتھیار اور ضروری سامان وہیں رکھوایا تھا۔ میں بس یہ دعا کر رہا تھا کہ وہ ابھی تک وہیں موجود ہوں۔

انگور اڈے پہنچتے ہی میں کمانڈر نصراللہ کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ بیٹھک کو باہر سے تالا لگے دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ اگر وہ وہیں ہوتے تو یقیناً سردار کو بیٹھک میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی ایک موہوم امید کے سہارے میں نے کمانڈر نصراللہ کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی دروازے پر نمودار ہوئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر حیرانی بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔

”ارے ذیشان میاں!......آپ کے متعلق تو مجھ تک کوئی اور خبر پہنچی تھی۔“

میں نے ان سے معانقہ کرتے ہوئے جواب دیا۔”آپ نے ٹھیک ہی سنا تھا چچا جان!......میں کسی دوست کی مدد سے فرار ہوا ہوں۔“

”وہ مجھے بیٹھک کی طرف لے جاتے ہوئے بولے۔”ویسے یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اب تو آپ کے محکمے کا شک یقین میں بدل جائے گا۔“

”مجبوری تھی چچا جان!......بہ جائے قید میں پراذیت دن گزارنے کے میں نے سوچا اپنی بے گناہی کے ثبوت تلاش کیے جائیں۔“

”پلوشہ اور سردار خان بھی اسی غرض سے یہاں آئے تھے۔“ بیٹھک کا دروازہ کھولتے ہوئے انھوں نے میرے دماغ میں موجود سوال کا جواب دیا۔

”وہ کہاں ہیں؟“ میں بے صبری سے مستفسر ہوا۔

”وہ تو کل ہی یہاں سے چلے گئے ہیں۔“ کمانڈر نصر اللہ نے میرے اندیشوں کو حقیقت کا روپ دیا۔

”کس طرف گئے ہیں؟“ میرے لہجے میں شامل حیرانی ان کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔

”افغانستان ...... کیونکہ صنوبر خان کی موت کے بعد یہاں کوئی امریکن تو باقی بچا نہیں۔ علام خیل کا نیا ملک ایک شریف آدمی ہے۔ صنوبر خان کا لشکر قریباً بکھر گیا ہے۔ کچھ لوگ ڈمبریانی کے ملک ثقلین سے جا ملے ہیں جو صنوبر خان کا حلیف ضرور تھا مگر دہشت گردانہ کارروائیوں میں ملوث نہیں تھا وہ صرف اسلحے اور نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ کرتا ہے۔ اب امریکیوں کی نظریں تورے خار کے ملک فیروز خان پر لگی ہیں۔ وہ اسمگلنگ کے ساتھ دہشت گردانہ کاروائیوں میں بھی حصہ لیتا رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ صنوبر خان سے احکامات لیتا تھا اب شاید اسے براہ راست احکام ملنا شروع ہو جائیں۔“

”میرے سامنے تو البرٹ بروک نے دیگان کے مقامی کمانڈر سے خود بات چیت کی تھی اور اس ضمن میں صنوبر خان کو بالکل لاتعلق رکھا تھا۔“

”شمالی وزیرستان میں دیگان کا مقامی کمانڈر ہی ایجنسیوں کا خاص بندہ ہے۔ وہ قبیل خان کی طرح بڑے اثر رسوخ کا مالک ہے۔ دتہ خیل، میرن شاہ، غرلامئے، بکا خیل اور میر علی وغیرہ کے علاقوں میں گلبدین خان ہی دہشت گردانہ کارروائیاں کرواتا ہے۔“

”کیا سارے علاقوں کا وہ اکیلا سردار ہے؟“

”نہیں، ہر علاقے کا اپنا ملک ہے۔ ان میں کچھ محبِّ وطن ہیں اور کچھ دہشت گرد ہیں جبکہ کچھ صرف اسمگلر ہیں۔ لیکن گلبدین کو ہر علاقے میں ایسے کرائے کے آدمی مل جاتے ہیں جو پیسے لے کر وطن مخالف کارروائیوں میں اس کا ساتھ دیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”یقیناً پلوشہ اور سردار ہمارا رکھوایا ہوا سامان ساتھ لے گئے ہوں گے؟“

انھوں نے منھ سے کچھ کہے بنا اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب میں نے بھی افغانستان ہی کا رخ کرنا ہے۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پلوشہ اور سردار کس راستے سے گئے ہیں اور وہاں انھوں نے کس جگہ جا کر ٹھہرنا ہے۔''

''وہ انگور اڈے ہی کی طرف سے افغانستان میں داخل ہوئے ہیں،انھیں میں نے راستہ بتا دیا تھا۔مجاہدین کے کچھ اڈوں کی طرف بھی رہنمائی کر دی تھی،اب یہ معلوم نہیں کہ وہ کس جگہ ٹھہریں گے یا اپنے کام کا آغاز کیسے کریں گے؟''

''ہونہہ!......''ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے میں گہری سوچ میں کھو گیا۔اتنے بڑے ملک میں دو آدمیوں کو ڈھونڈنا سمندر میں گری سوئی تلاشنے کے مترادف تھا۔پلوشہ نے میری پریشانیوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔گو وہ سب کچھ میری محبت کے زیر اثر کر رہی تھی لیکن اس کی وجہ سے میں اپنے کام پر صحیح توجہ دینے کے قابل نہیں رہا تھا ۔سردار خان،میرا مخلص دوست تھا لیکن کیا وہ پلوشہ کی حفاظت کر پاتا اس بارے میرا دل مطمئن نہیں تھا۔

''کن سوچوں میں کھو گئے ہو؟''میری خاموشی کو طویل ہوتا دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہیں رہ پائے تھے۔

''چچا جان!......پچھلے دنوں ہم نے کافی سارے ہتھیار قاری غلام محمد صاحب کے حوالے کیے تھے جن میں درجن بھر ڈریگنو رائفلز اور ان کا ایمونیشن بھی تھا۔''

''ہاں مجھے پتا چلا تھا۔''

''کیا ان میں سے ایک ڈریگنو رائفل مجھے مل سکتی ہے؟''

''مشکل ہے۔''انھوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''کیونکہ وہ تمام ہتھیار افغانستان بھیجے جا چکے ہیں۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔''تو کیا یہاں کیمپ میں کوئی ڈریگنو رائفل موجود نہیں ہو گی؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔''اگر کوئی بھی ڈریگنو رائفل چاہیے تو ضرور ملے گی،میں نے سوچا شاید آپ کو نئی والی ڈریگنو چاہیے۔''

''نئی پرانی کو چھوڑیں چچا جان،مجھے کوئی سی بھی سنائپر مل جائے کام چل جائے گا۔''

”ایک مشورہ دوں۔“

میں انکساری سے بولا۔”آپ حکم بھی دے سکتے ہیں۔“

وہ پوچھنے لگا۔”آپ نے بھی افغانستان کا رخ کرنا ہوگا۔“

”اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“

”تو کلاشن کوف ساتھ لے جاؤ، کیونکہ آپ کسی ایسے مشن پر نہیں جارہے جس میں خصوصی طور پر کسی کو دور سے نشانہ بنانا ہو۔آپ نے اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے ہیں اور اپنی بیوی کو تلاش کرنا ہے۔اور عام حالات میں کلاشن کوف، سنائپر رائفل سے کئی گنا زیادہ مفید ہے،اس لیے بہتر ہوگا کہ سنائپر رائفل کا وزن ساتھ پھرانے کے بہ جائے کلاشن کوف کو ساتھ رکھو۔“

”صحیح کہہ رہے ہیں۔“میں نے ان کے ساتھ متفق ہونے میں ایک لحظہ بھی نہیں لگایا تھا۔

وہ خوش ہوتے ہوئے بولے۔”تو بس، میرے پاس ایک بہترین کلاشن کوف موجود ہے وہی آپ لیتے جائیں۔“

”ٹھیک ہے چچا جان!......آپ کلاشن کوف لے آئیں کیونکہ میں تھوڑی دیر تک افغانستان کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔“

”پاگل تو نہیں ہوئے۔“انھوں نے شفقت بھرے لہجے میں ڈانٹا۔”ابھی تو آئے ہو۔اب تک تو میں نے چائے پانی کا نہیں پوچھ سکا ہوں۔“

”چچا جان! یہ میرا اپنا گھر ہے۔باقی میں چاہتا ہوں کہ جتنا جلدی ہو سکے پلوشہ اور سردار کو ڈھونڈ لوں۔“

”دیکھو بیٹا!......حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں رہا۔وہ اب قسمت ہی سے ملیں گے،ان کو ڈھونڈنے کی دھن میں خود کو بہت زیادہ جوکھم میں نہ ڈالو۔“

یقیناً کمانڈر نصراللہ کو معلوم نہیں تھا کہ پلوشہ کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے ورنہ وہ کبھی بھی ایسا مشورہ نہ دیتے۔

میں شاکی ہوا۔”تو کیا انھیں،ان کے حال پر چھوڑ دوں۔“

''ایسا میں نے کب کہا'' وہ میری غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولے۔'' آپ ضرور ان کی تلاش میں نکلیں۔لیکن ضروری تو نہیں کہ بغیر ایک دن آرام کیے آپ آگے بھاگ پڑیں۔آج کی رات مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں کل چلے جانا۔آرام بھی کرلو گے۔راستے کے بارے معلومات بھی لے لو گے اور آگے کے لیے کوئی لائحہ عمل بھی سوچ لو گے۔''

ایک لمحہ سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد مجھے ان کا مشورہ قابل عمل لگا تھا۔میری رضامندی پا کر وہ خوش ہو گئے تھے۔

میرے رکنے کی بابت طے ہوتے ہی انھوں نے پوچھا۔'' کھانا لے آؤں؟''

''فی الحال تو اچھی سی چائے پلوا دیں۔کھانا رات کو کھاؤں گا ،اگر ابھی کھا لیا تو رات کو نہیں کھایا جائے گا۔''اور کمانڈر نصراللہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بیٹھک سے نکل گئے۔

میں آگے کا لائحہ عمل کے بارے سوچنے لگا۔اپنی بے گناہی کے ثبوت حاصل کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔کام شروع کرنے کا کوئی واضح طریقہ کار بھی میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔افغانستان کا علاقہ میرے لیے بالکل انجان اور نیا تھا۔وہاں کے حالات کے بارے بھی کوئی واضح تصویر میرے ذہن میں موجود نہیں تھی۔پھر وہاں پر امریکن قریباً قلعہ بند ہی تھے۔میں انھیں جانی نقصان پہنچانے کے منصوبے تو سوچ سکتا تھا،انھیں بلیک میل کر کے اپنی بے گناہی کے ثبوت حاصل کرنے کا کوئی منصوبہ مجھے نہیں سوجھ رہا تھا۔لے دے کے یہی ایک طریقہ تھا کہ میں افغانستان جا کر ہی کوئی مناسب منصوبہ سوچ کر اپنے کام کی شروعات کرتا۔اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ افغانستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور وہاں پر البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ کو تلاش کرنا اگر نا ممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔البرٹ بروک وغیرہ کا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے خلاف وہی کام کر رہا تھا۔اب یہ کہنا تو مذاق ہی ہوتا کہ پورے افغانستان میں موجود امریکن مجھ سے واقف ہوتے یا میرے خلاف سرگرم عمل ہوتے۔گو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افغانستان میں امریکنز کی موجودی دہشت گردوں کی وجہ سے نہیں ہے۔نہ امریکہ پاکستان یا دنیا کا اتنا بڑا خیر خواہ ہے کہ اس نے اپنی اتنی بڑی فوج ،ہتھیار اور روپیا افغان جنگ میں جھونک دیا ہے۔جہاں تک ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا معاملہ ہے تو امریکہ کے تئیں اس کے مجرم اسامہ بن لادن کو امریکہ

نے اپنے انجام تک پہنچا دیا ہے پھر اب وہ یہاں کیا ڈھونڈ رہا ہے؟۔اگر ہم اس ساری جنگ کا جائزہ لیں تو امریکہ کے مقصد کو کھوجنا اور دہشت گردی کی لہر کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں ہے۔جیسا کہ سب جانتے ہی ہوں کہ اس جنگ کا آغاز نو نومبر دو ہزار ایک میں ہوا۔کہا گیا دو ہوائی جہاز ہائی جیک ہوئے اور دونوں جہاز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کے ساتھ چند سیکنڈ کے وقفے سے آکر ٹکرائے جس سے وہ تمام عمارت مٹی کا ڈھیر بن گئی۔اب یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی عمارت جس کے سامنے جہاز ایک کھلونے کی طرح نظر آرہا تھا کیا جہاز کے ٹکرانے سے وہ ملبے کا ڈھیر بن سکتی ہے۔یقیناً نہیں۔اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ عمارت کی تباہی میں جہازوں کا ٹکرانا ہاتھی کے دانت کی طرح تھا۔اصل معاملہ کوئی اور تھا۔امریکہ کو افغانستان میں مداخلت کا بہانہ چاہیے تھا۔اور اس طرح اس نے دنیا کی ہمدردیاں سمیٹ کر وہ بہانہ پیدا کیا۔اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کو یہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تو یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ہزاروں صفحات لکھنا بھی کم پڑ جائیں گے۔مختصراً اگر کہا جائے تو دنیا کے ہر اس خطے میں امریکہ نے اپنی افواج بھیجیں جہاں سے وہ کوئی فائدہ حاصل کرسکتا تھا۔عراق پر حملہ ہوا تیل کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے۔صومالیہ، کانگو وغیرہ میں یونائیٹڈ نیشن کی افواج گئیں کہ وہاں ہیرے کی کانیں ہیں۔افغانستان پر قبضہ ہوا کہ دنیا بھر میں یہاں پوست کی کاشت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور امریکہ کی ایجنسیاں نشہ آور ادویات کی سب سے بڑی سپلائیر ہیں۔دوسری بات جنگ کے جاری رہنے ہی میں امریکہ کے اسلحے کی فیکٹریاں چل سکتی ہیں اور تیسری بات یہ کہ اصل طالبان جو دینِ اسلام کی صحیح شکل سامنے لے کر آئے تھے جنھوں نے افغانستان میں امن قائم کر دیا تھا انھیں غلط ثابت کرنا۔اور آج دیکھ لیں سنہ دو ہزار تک طالبان کا نام کس عزت سے لیا جاتا تھا اور پاکستانی عوام ان سے کتنی محبت کرتے تھے اور آج وہ کس مقام پر ہیں۔اس مقصد کے لیے دہشت گرد تنظیمیں کھڑی کی گئیں جنھوں نے اسلام کا لیبل لگا کر ہر وہ کام کیا جو شاید شیطان بھی نہ کر سکے۔را، موساد، فری میسن اور باقی اسلام مخالف ایجنسیوں کی ہر کارروائی کی ذمہ داری ان مجاہدین کا لبادہ اوڑھنے والے ملعونوں نے قبول کی۔مساجد، امام بارگاہوں، بزرگوں کے مزارات، اسکولوں اور ہسپتالوں میں دہشت گردی کرنے کے بارے سوچا بھی نہیں جا سکتا، مگر مقصد چونکہ اسلام کو بدنام کرنا تھا، جہاد کی غلط تعبیر پیش کرنی تھی اس لیے بہت بڑے پیمانے پر یہ

کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔اور عجیب بات یہ کہ اسلام کے نام لیواؤں نے نہ تو کبھی سینما گھروں میں بم دھماکے کیے،نہ فحاشی کے اڈوں کو نشانہ بنایا،نہ فلم ڈراما انڈسٹری میں ایسی کارروائی کی گئی۔اور ہمارا لعنتی میڈیا بھی اس ضمن میں اسلام مخالف پروگرام چلا چلا کر یہود و ہنود و نصاریٰ کے ایجنڈے پر کام کرتا رہا۔ہماری عوام ایسی بھولی بھالی ہے کہ جو ٹی وی پر دیکھا اسے قران وحدیث سے بھی زیادہ اہمیت دی۔اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھیں کہ امریکہ کے مقاصد ابھی تک پورے نہیں ہوئے۔ملک خداداد کو ختم کرنے کے لیے اس کی نظر اسلام کو بدنام کرنے کے بعد پاک آرمی پر لگی ہے۔جس کی شروعات وہ کر چکا ہے۔دہشت گردی کے پیچھے وردی کے نعرے،منظور پشتین نامی غدار کی ہرزہ سرائی اور ہمارے دیسی لبرلز کی زبان سے فوج مخالف باتیں اس کا بین ثبوت ہیں۔میں برسبیل تذکرہ چند باتیں عرض کر دی ہیں ورنہ یہ موضوع ایسا نہیں کہ چند سطور میں بیان کیا جا سکے۔

اب اصل کہانی کی طرف آتے ہیں میں بات کر رہا تھا اپنے بے گناہی کے ثبوتوں کو ڈھونڈنے کی۔اور ایسا کرنے کے لیے میرے پاس کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں تھا۔اس کے ساتھ پلوشہ کی تلاش ایک علیحدہ سر درد تھی۔اس جذباتی لڑکی سے کوئی بعید نہیں تھا کہ میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کو کسی مشکل میں پھنسا دیتی۔میری وجہ سے اب وہ بھی البرٹ بروک وغیرہ کی نظر میں ایک دشمن ہی تھی۔اس پر قابو پانے کے بعد جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ایک خوب صورت لڑکی کا ایسے درندوں کے چنگل میں پھنس جانا ایک مرد کی نسبت زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔عورت کو جان کے ساتھ عزت کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے اور اپنی عصمت کی حفاظت اس کے لیے اپنی جان سے بھی زیادہ معنی رکھتی ہے۔مجھے اگر ذرا بھی شک ہوتا کہ وہ کوئی ایسا کام کر دے گی تو میں جاتے ہوئے اسے سختی سے منع کر گیا ہوتا۔مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔میری شریک حیات جسے میں پھولوں کی سیج پر سلانا چاہتا تھا وہ آگ و خون کے دریا میں چھلانگ لگا چکی تھی۔

میری سوچوں میں کمانڈر نصر اللہ کی آمد سے خلل پڑا۔انھوں نے چائے کے برتن ٹرے میں اٹھائے ہوئے تھے اور کندھے سے رشین ساخت کی کلاشن کوف لٹکائی ہوئی تھی جس کی بیرل قلم نما ترشی ہوئی تھی۔کمانڈر نصر اللہ روس کے خلاف جہاد میں حصہ لے چکے تھے اور یقیناً یہ خوب صورت ہتھیار اسی دور کی یادگار تھا۔(کلاشن کوف روس کے ایک سائنس دان میخائل کلاشن کوف کی ایجاد ہے۔روس کے بعد اس ہتھیار کو بہت سارے ملکوں نے

بنایا، ہر ملک نے اس میں مناسب تبدیلی بھی کی مگر اس کا بنیادی فنکشن وہی رہا۔ چائنہ، انڈیا اور پاکستان خود بھی یہ ہتھیار بنا رہا ہے۔ یہ ایک ہردل عزیز ہتھیار ہے۔ موسم اس کی کارکردگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ورنہ کافی ہتھیار ایسے ہیں جو منفی درجہ حرارت میں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ مجاہدین، دہشت گردوں، پاک آرمی، انڈین آرمی میں باقاعدگی سے استعمال ہو رہا ہے۔ دنیا میں اگر نئے ہتھیاروں کی ایجاد کا جائزہ لیں تو سینکڑوں، ہزاروں قسم کے نئے ہتھیار متعارف ہو چکے ہیں مگر اس کے استعمال میں کمی کے بہ جائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ پہلے اس کا بٹ لکڑی کا ہوتا تھا اور بیرل کے ساتھ ایک فولڈ ہونے والی سنگین لگی ہوتی تھی۔ آج کل یہ کلوز بٹ میں بھی دستیاب ہے اور اس کی بیرل کے ساتھ لگی ہوئی سنگین بھی ختم کر دی ہے۔ اس کے ساتھ استعمال ہونے والی میگزینیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ جن میں تیس، چالیس اور ستر گولیوں والی پڑتی ہیں)

چائے کے ساتھ وہ بسکٹ بھی لے آئے تھے۔ چند بسکٹ چبا کر میں نے چائے کی پیالی معدے میں انڈیلی اور کلاشن کوف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے ساتھ چالیس گولیوں والی میگزین لگی ہوئی تھی۔

”قریباً چالیس سال سے یہ میرے پاس ہے۔“ مجھے کلاشن کوف کا جائزہ لیتے دیکھ کر کمانڈر اس ہتھیار کے ساتھ اپنی رفاقت کی داستان سنانے لگا۔ ”یہ مجھے ابو جان نے تحفے میں دی تھی۔ اور اس کے بعد اسے میں کبھی خود سے جدا نہیں کیا۔ نہ جانے کتنے اسلام کے دشمن اس کی بیرل سے نکلی گولی کا نشانہ بنے، جانے کتنے ایسے مواقع آئے جب اس نے میری جان بچانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور جانے کتنی مرتبہ اس کی مدد سے میں نے اپنے مشکل میں پھنسے ساتھیوں کی مدد کی یہ سب شمار سے باہر ہے۔ جب سے میں گوشہ نشین ہوا ہوں اس وقت سے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کس کے حوالے کروں کیونکہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں یہ ابھی تک پہلے کی طرح تازہ دم ہے اور اسے گوشہ نشین کرانا ناانصافی ہوگی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آ رہا تھا جسے یہ قیمتی اور نایاب ہتھیار تحفے میں پیش کر سکوں۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے اپنے بڑے بیٹے کے حوالے کرنے کا سوچا، مگر بعد میں وہ مجھے اس کا صحیح حق دار نظر نہ آیا۔ وہ اسے اس طرح استعمال نہیں کر سکتا جس طرح میرا دل چاہتا ہے۔ اب آپ کو دیکھ کر لگا کہ میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔“

میں ہنسا۔ ”چچا جان!...... میری تعریف میں آپ نے کچھ مبالغہ نہیں کر لیا۔“

وہ صاف گوئی سے بولے۔ ”جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں اگر وہ سچ ہیں پھر تو مبالغہ نہیں ہے۔“

”بہرحال میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

”بیٹا! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ ایک انسان سے توقعات اس کی صلاحیتوں اور ماضی کے کارناموں کو مدنظر کر کی جاتی ہیں، مگر مستقبل کا حال اللہ پاک بہتر جانتا ہے۔ ضروری نہیں ماضی کا ہیرو مستقبل میں بھی اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑتا جائے۔ ہوسکتا ہے آپ کو اس ہتھیار سے ایک گولی بھی چلانے کا موقع نہ ملے اور خدانخواستہ اس سے پہلے ہی آپ کسی کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔ میرے لیے بس یہ اطمینان کافی ہے کہ آپ اس ہتھیار کو مجھ سے بھی بہتر طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور یہی میرا مطمح نظر ہے۔“

”بجا فرمایا۔“ ان کی بات تردید کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اسی اثناء میں عصر کی آذان ہونے لگی تھی۔ وہ مسجد تشریف لے گئے اور میں وہیں نماز ادا کرنے لگا۔

ان کی واپسی پر میں نے انھیں کہہ کر بازار سے ابتدائی طبی امداد کا کچھ سامان منگوا لیا تھا، جس میں درد کش و انٹی بائیوٹک گولیاں، انجیکشن اور ابتدائی طبی امداد کی کوئی اور ضروری چیزیں شامل تھیں۔ میں جس علاقے میں جا رہا تھا وہاں کچھ بھی ہوسکتا تھا اور یہ سامان میرے لیے بہت زیادہ ضروری تھا۔ گولی لگنے کے حادثے سے میں دو بار گزر چکا تھا۔ ایک بار خود مجھے گولی لگی تھی اور دوسری بار میری جانِ حیات پلوشہ نے حماقت کا ارتکاب کرتے ہوئے خود کو گولی ماری تھی۔ گو یہ بات تو ہمیں تربیت ہی میں بتا دی جاتی ہے کہ ابتدائی طبی امداد سے متعلق سامان کتنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ان دو حادثوں کے بعد تو مجھے حق الیقین ہو گیا تھا۔ کمانڈر نصراللہ نے ایک مخصوص سفوف کی چھوٹی سی تھیلی بھی میرے حوالے کی تھی۔ یہ سفوف زخم وغیرہ میں بھرنے سے درد، جلن اور سوزش کو بھی ختم کرتا تھا اور خون کے بہاؤ میں بھی رکاوٹ ڈالتا تھا۔ یہ وہی سفوف تھا جو پلوشہ نے میرے کندھے سے گولی نکال کر زخم میں ڈالا تھا۔

رات کا کھانا وہ نماز مغرب کے بعد لے آئے تھے۔ عشاء پڑھ کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا کہ صبح سویرے ہی مجھے سرحد عبور کرنا تھی۔ نہ جانے افغانستان میں کون سے ہنگامے میرے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

موسم رات ہی سے ابر آلود تھا۔سورج طلوع ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر بادلوں کی وجہ سے سورج اب تک پردے ہی میں تھا۔ہمارے ہاں نومبر کا موسم کافی خوش گوار ہوتا ہے۔کیونکہ گرمی کا زور ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور سردی کی آمد میں تھوڑی تاخیر ہوتی ہے۔مگر وزیرستان میں نومبر ہی سے سردی اپنے پنجے گاڑنے لگتی ہے۔اس وقت گرم کوٹ اور اونی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔میں اس وقت ایک ایسی جگہ موجود تھا جہاں سے افغانستان کی سرحد چند فرلانگ ہی کے فاصلے پر تھی۔وہاں تک مجھے کمانڈر نصراللہ کا بڑا بیٹا موٹر سائیکل پر بٹھا کر لایا تھا۔وہ مجھے سیدھی سڑک کے بہ جائے پہلے خڑ کلے لایا اور وہاں سے مزید جنوب کی طرف لا کر اس جگہ اتار دیا۔

وہ تو الوداعی مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا اور اور میں اس درہ نما راستے کو دیکھنے لگا جہاں سے مجھے وہ پہاڑی عبور کرنا تھی۔کمانڈر نصراللہ کے بیٹے کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔تھوڑی دیر چلنے کے بعد سردی کا احساس زائل ہو گیا تھا۔پیدل چلتے ہوئے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ سردی نہیں لگتی۔بارش کے خطرے کے پیش نظر میں نے کلاشن کوف کی بیرل زمین کی طرف کر کے کندھے سے لٹکائی ہوئی تھی۔ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔وہ درہ نما راستہ عبور کرتے ہی مجھے اپنے سامنے پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا نظر آیا۔تھوڑی سی ڈھلان اتر کر میں ایک کھلے نالے میں سفر کرنے لگا۔نالے میں پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کے ساتھ جھاڑیوں کے جھنڈ بھی موجود تھے۔ہوا کی شدت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ایسی تیز ہوا میں چادر اوڑھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔میں نے چادر کو بھی مفلر کی طرح چہرے سے لپیٹ لیا تھا۔

(یہاں قارئین کی معلومات کے لیے عرض کرتا جاؤں کہ اس وقت افغانستان کی سرحد عبور کرنا چنداں دشوار نہیں تھا۔پہاڑیوں میں بڑے بڑے ایسے خلا موجود تھے جہاں سے گزر کر دونوں طرف آیا جایا جا سکتا تھا۔لیکن اب پاکستان آرمی نے تمام سرحد پر کانٹا دار تار کی ایک اونچی باڑ لگا کر ایک بہت بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔اس باڑ کی نگرانی کے لیے نگرانی ٹاور بھی قائم کیے گئے ہیں)

پہاڑی علاقوں میں سفر کرتے ہوئے سب سے بڑا مسئلہ سمت کا تعین ہوتا ہے۔نالوں کے موڑوں، پہاڑیوں کے بے ترتیب پھیلاؤ، درختوں کی بہتات اور ایک جیسے مناظر سے مشرق مغرب کی پہچان ہی ختم ہو

جاتی ہے۔سمتوں کی پہچان کے لیے رات کے وقت تو ستارے مدد دیتے ہیں اور دن کے وقت یہ سہولت سورج مہیا کرتا ہے۔موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے کمپاس کو استعمال کر کے سورج اور ستاروں سے بے نیاز ہوا جا سکتا ہے۔مگر بد قسمتی سے اس وقت میرے پاس کمپاس موجود نہیں تھا۔البتہ ایک سنائپر ہونے کے ناتے اتنا تجربہ ضرور تھا کہ میں کمپاس کے بغیر بھی سفر کی سمت کو درست رکھ سکتا تھا۔

(سول اور آرمی کے مابین سمتوں کی پہچان میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ سول لوگ مغرب کی سمت کو اہمیت دیتے ہیں کیونکہ اس جانب کعبہ شریف بنتا ہے مگر آرمی میں ساری اہمیت شمال کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شمال کی سمت کو پہچاننا آسان ہے۔شمال کی سمت کی پہچان کے لیے دو چیزیں بہت اہم ہیں۔پہلی چیز کمپاس ہے۔ قطب شمالی کے قریب کینیڈا کے شمال کی طرف بوتھیا نامی ایک جزیرہ نما ہے جس میں مقناطیس کا بہت بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔مقناطیسی سوئی کو اگر عمودی محور پر اس طرح لٹکایا جائے کہ وہ افقی وضع میں آزاد گھوم سکے تو وہ اس مقناطیسی ذخیرے کی سمت میں رہے گی۔کمپاس مقناطیس کی اسی خاصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایجاد کیا گیا ہے۔کمپاس کی سوئی کا رخ ہمیشہ سمت شمال کی جانب رہتا ہے۔دوسری چیز قطبی ستارا ہے جو قطب شمالی کے اوپر چمکتا رہتا ہے اور کبھی بھی اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتا۔خوش قسمتی سے اس ستارے کی پہچان بہت آسان ہے کیونکہ کچھ مخصوص جھمکے اس کے گرد گھڑی کی سوئیوں کے مخالف رخ حرکت کرتے رہتے ہیں۔یہاں یہ بات مدنظر رہے کہ زمین کی محوری اور مداری حرکت کی وجہ سے آسمان بھر کے تمام ستارے حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔تمام ستارے مشرق سے طلوع ہوتے ہیں اور مغرب میں جا کر غروب ہو جاتے ہیں۔یہ ستارے چوبیس گھنٹوں میں اپنا چکر مکمل کرتے ہیں اور مکمل چکر سے کچھ زائد فاصلہ بھی طے کرتے ہیں جو پورے چکر کے (365) حصے کے برابر ہوتا ہے۔اس طرح جو ستارہ آج رات کے نو بجے آسمان پر جس مقام پر دکھائی دے گا۔ کل اس مقام پر مقررہ وقت سے چار منٹ پہلے پہنچ جائے گا۔اس طرح ہفتہ میں آدھا گھنٹا اور تین ماہ کے بعد چھ گھنٹے کا فرق پڑے گا۔شمال کی پہچان کے لیے اور بھی کئی طریقے ہیں مگر میرا مقصد قارئین کی سکھلائی نہیں ہے۔یہ تو بر سبیل تذکرہ تھوڑی بہت معلومات اس لیے آپ لوگوں کے گوش گزار کر دیتا ہوں تا کہ آپ کے دماغ میں فوجیوں کے کام کرنے کے طریقہ کار کی وضاحت ہوتی رہے)

بادل آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ میرے قدموں کی رفتار میں تیزی آ گئی اس کے ساتھ ہی میری نظریں دائیں بائیں کسی مناسب آڑ کی تلاش میں سرگرداں ہوگئیں کیونکہ بارش ہونے کی صورت میں مجھے کسی پناہ کی ضرورت پڑتی۔

ہلکی ہلکی بارش شروع ہوئی لیکن ہوا کی وجہ سے یہ ہلکی بارش بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ چند بوندیں گرنے کے بعد ان بوندوں نے یوریا کھاد کی طرح سفید دانوں کی شکل اختیار کرلی۔ یہ اس بات کا مظہر تھا کہ موسم زیادہ سرد ہوگیا ہے اور کسی بھی وقت باقاعدہ برف باری ہوسکتی ہے۔ جن علاقوں میں برف پڑتی ہے وہاں برف باری کی ابتداء یوریا کھاد کی طرح سفید دانوں سے ہوتی ہے، بلکہ جب اپریل مئی میں برف باری ختم ہونے لگتی ہے تب بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ یہ سفید دانے زمین پر گرتے ہی پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ البتہ اصل برف باری جو روئی کے گالوں کی صورت پڑتی ہے وہ اگر کم مقدار میں پڑے تو جلد ہی پگھل جاتی ہے اور زیادہ دیر جاری رہنے کی صورت میں زمین پر اپنی اصل شکل میں موجود رہتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ تہہ بہ تہہ یہ پہاڑوں کو سفید لباس پہنا دیتی ہے۔ درجہ حرارت منفی میں ہونے کی وجہ سے اس کا پگھلنا رک جاتا ہے اور یہ کئی فٹ تک بلند ہو جاتی ہے۔ وزیرستان میں تو یہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ فٹ تک ہی پڑتی ہے البتہ شمالی علاقہ جات میں یہ کئی جگہوں پر چالیس پچاس فٹ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔

کسی مناسب پناہ کی تلاش سے پہلے ہی ہوا کی شدت میں کمی آنے لگی اور اس کے ساتھ ہی بارش بھی ایک دم ختم ہوگئی تھی۔ کشمیر کی طرح اس علاقے کے موسم کا بھی کوئی پتا نہیں چلتا۔ ایک دم بادلوں کا چھا جانا اور پھر اچانک ہی دھوپ نکل آنا روز مرہ کا معمول ہے۔ ایسی صورت حال قریباً ہر پہاڑی علاقے میں نظر آتی ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ گہرے بادل دائیں بائیں ہوئے اور سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی بادل مکمل طور پر غائب نہیں ہوئے تھے یقیناً سورج کے ساتھ ان کی آنکھ مچولی جاری رہتی۔

میں جس نالے میں چل رہا تھا فرلانگ بھر کے فاصلے پر وہ نالا دو حصوں میں تقسیم ہوکر ایک سرا شمال کی جانب مڑ گیا تھا جب کہ دوسرا جنوب کی طرف۔ خود میرا رخ مغرب کی جانب تھا۔ سامنے ایک سیدھی پہاڑی تھی جس کی

چڑھائی اتنی مشکل تھی کہ میں اسے اوپر سے عبور کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ جنوب کی سمت اس پہاڑی کی بلندی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں بھی جنوب کی طرف مڑ کر ترچھا ہی بلندی کی طرف گام زن ہو گیا۔ تھوڑا تھوڑا بلند ہو کر آخر میں پہاڑی کے اوپر پہنچ ہی گیا۔ وہاں سے اگلی طرف اترنا آسان تھا۔ شدید سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ گیا تھا۔

دوسری جانب تھوڑا سا اترتے ہی مجھے پہاڑی چشمہ نظر آ گیا جو پانی پتلی دھار کی صورت نیچے گر رہا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں ان چشموں میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ سردیوں میں زیادہ تر چشمے تو منجمد ہو جاتے ہیں اور جو جاری رہتے ہیں ان میں بھی پانی کی مقدار نہایت کم ہو جاتی ہے۔

پانی کی بوتل کو خالی کر کے میں نے تازہ پانی بھرا اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ دیسی گھی سے چپڑی ہوئی روٹیاں جن پر چنے کی دال کا سالن پڑا تھا۔ سردی کی وجہ سے روٹیاں اکڑ کر سخت ہو گئی تھیں۔ دائیں بائیں سے خشک ٹہنیاں جمع کر کے میں نے آگ جلائی اور روٹیاں آگ پر پکڑ کر سینکنے لگا۔ میرے سفری تھیلے میں ضرورت کا قریباً تمام سامان موجود تھا۔ پہاڑی علاقے اور جنگلات میں سفر کرتے ہوئے مقامی لوگوں کے ملنے کا بہت زیادہ اتفاق ہوتا ہے۔ ایسی جگہ پر عموماً لوگ اچھے مہمان نواز بھی ہوتے ہیں، مگر ہم سنائپرز پہلے ہی سے سفر ی ضروریات کا بندوبست کر کے چلتے ہیں اور ایسے اتفاقات کو کم ہی نظر میں رکھتے ہیں۔

کھانا کھا کر میں نے ملک پاؤڈر سے چائے تیار کی۔ پیالی کو منہ سے لگاتے ہوئے ایک دم پلوشہ میرے خیالوں میں آ دھمکی۔ شادی کے بعد سے ہمیشہ میری پیالی سے پہلا گھونٹ وہی بھرا کرتی۔ اور اس کے ساتھ ہی شوخ لہجے میں پوچھا کرتی۔

"راجو!......میری جھوٹی چائے زیادہ میٹھی ہوتی ہے نا؟"

اس کا خیال آتے ہی جانے کیوں وہ چائے مجھے بہت زیادہ پھیکی لگنے لگی تھی۔

چائے پی کر میں ایک بار پھر آگے جانے کے لیے تیار تھا۔ اگر راستہ نہ بنا ہو تو عموماً اترائی چڑھائی سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔ اس جانب ڈھلان کافی دشوار تھی اور ایسی ڈھلان میں پاؤں کے ذرا سا غلط جگہ پڑنے پر انسان گھنٹوں کا سفر سیکنڈز میں طے کر لیتا ہے مگر جہاں اس کا سفر رکتا ہے وہاں سے آگے جانے کے لیے اسے لا

محالہ کندھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اور جسے کندھے میسر نہ ہوں اسے بھیڑیوں وغیرہ ہی کی خوراک بنا پڑتا ہے ۔مجھے نہ تو بھیڑیوں کی خوراک بننے کا شوق تھا اور نہ پرائے کندھوں پر سفر کرنے کی خواہش اس لیے سنبھل سنبھل کے اترنا پڑا۔

نالے میں اتر کر میرے قدموں میں تھوڑی تیزی آ گئی کہ گرنے وغیرہ کا خطرہ ختم ہو گیا تھا۔گو پہاڑی نالے بھی بتدریج نیچے اترتے جاتے ہیں مگر یہ اترائی بہت ہلکی اور خفیف ہوتی ہے۔سورج کے نظر آنے کی وجہ سے میرے لیے سمت کا تعین مشکل نہیں رہا تھا۔ سہ پہر تک میں بغیر کسی خاص واقعے کے آگے بڑھتا رہا۔اس دوران بادلوں اور سورج کی آنکھ مچولی جاری مگر بارش نہیں ہوئی تھی۔میری نظریں ایک بار پھر کسی مناسب جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئیں جہاں میں رات گزار سکتا۔اگر موسم صاف ہوتا تو میں درختوں میں مچان بنانے کو ترجیح دیتا مگر بادلوں کی وجہ سے میں کھلے آسمان تلے لیٹنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ایک تو یوں بھی سردی کافی زیادہ تھی جبکہ میرے پاس ہلکا سا سلیپنگ بیگ موجود تھا جو کسی بیرونی امداد کے بغیر سردی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔بیرونی امداد سے میری مراد آگ کا آلاؤ اور سر پر چھت کی موجودی تھی۔

جلد ہی مجھے تنگ دھانے کا ایک چھوٹا سا غار نظر آ گیا تھا۔دھانے کے سامنے اگی ہوئی گھنی جھاڑی کی وجہ سے غار کا دھانہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔میری نظر بھی بس اتفاقاً ہی اس پر پڑی تھی۔سورج ڈوبنے میں ابھی تک تھوڑی دیر تھی، میں گھنٹا پون گھنٹا اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا مگر آگے سر چھپانے کے لیے کسی کوئی مناسب ٹھکانے کا ملنا متعین نہیں تھا۔اس لیے میں نے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سب سے پہلے میں نے جھاڑیوں سے ٹہنیاں توڑ کر جھاڑو بنایا اور غار کا فرش صاف کر دیا۔اور پھر رات کو جلانے کے لیے خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے لگا۔لکڑیاں اکٹھی کر کے میں نے دائیں بائیں فرلانگ دو فرلانگ کے علاقے میں گھوم کر پانی کا چشمہ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر مجھے ناکامی ہوئی تھی۔زیادہ تگ ودو میں نے اس لیے بھی نہیں کی تھی کہ مجھے بس وہاں رات ہی گزارنا تھی۔

واپس غار کی جانب آتے ہوئے میری نظر تین افراد پر پڑی۔وہ اچانک ہی جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکلے تھے۔ایک کے کندھے پر کلوز بٹ کی کلاشن کوف لٹکی تھی، جبکہ دو خالی ہاتھ تھے۔البتہ ان کے پاس پستول وغیرہ کی

موجودی ممکن ہوسکتی تھی۔

انھوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔قریب پہنچنے پر میں نے انھیں سلام کہا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے کلاشن کوف والے نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔''کہاں سے آرہے ہو بھائی۔''

میں نے کہا۔''انگوراڈے سے۔'' یہ بتانے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آئی تھی۔

''ہونہہ!......اس علاقے کے تو نہیں لگتے، کہاں کا ارادہ ہے؟''اس مرتبہ بھی ہتھیار بردار ہی نے پوچھا تھا۔باقی دو خاموش کھڑے عجیب سی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔یقیناً اس نے میرے لہجے کے فرق سے مجھے پہچانا تھا۔وزیرستان کی پشتو، پشاور میں بولی جانے والی پشتو سے بالکل مختلف ہے۔بلکہ پنجابی زبان کی طرح ہر علاقے کی پشتو کے لہجے اور الفاظ کی ادائی میں اچھا خاصا فرق ہے۔مجھے پشتو پر تو عبور تھا مگر میں پشاوری لہجے میں پشتو بولتا تھا۔وزیرستان کے لوگوں کا لہجہ بالکل عجیب سا ہے۔اتنا کہ شروع شروع میں تو ان کی بات میری سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی۔البتہ چند ماہ کے بعد میری سمجھنے کی الجھن تو دور ہوگئی تھی لیکن ابھی تک میں ان کا سا لہجہ نہیں اپنا سکا تھا۔اس معاملے میں پلوشہ بہت تیز تھی وہ وزیرستان، پشاور، کرک، لکی مروت ہر لہجے کی پشتو بول سکتی تھی۔میرے ساتھ رہتے ہوئے وہ اچھی خاصی پنجابی بھی بولنے لگی تھی۔مختلف زبانیں سیکھنے کے معاملے میں اس میں خداداد صلاحیت موجود تھی۔

میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔''یقیناً اس علاقے میں بسنے والے تمام پیدائشی یہاں کے نہیں ہیں۔''

''صحیح کہا۔''اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ویسے بہت اچھی رائفل رکھی ہوئی ہے۔کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رائفل لینے کے لیے میری جانب ہاتھ بھی بڑھا دیا تھا۔ان کی شکلوں سے واضح نظر آرہا تھا کہ وہ آوارہ گرد قسم کے اچکے تھے۔اس علاقے میں مجاہدین بھی دو، دو، تین، تین کی ٹولیوں میں نظر آجاتے ہیں مگر ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی نرمی اور پاکیزگی ہوتی ہے۔یہ تینوں تو شاید پانچ چھ ماہ سے نہائے بھی نہیں تھے۔

ایسے لٹیروں کے بارے مجھے کمانڈر نصر اللہ پہلے سے مفصل طور پر آگاہ کرچکے تھے کہ یہ اچکے ہتھیار دیکھنے کے بہانے لیتے ہیں اور اسی ہتھیار سے صاحب ہتھیار کا کام تمام کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔لیکن مجھے ایسے

لوگوں سے نمٹنے کا طریقہ آتا تھا۔میں خوش دلی سے بولا۔

’’ہاں ......ہاں یہ لو۔‘‘ کندھے سے کلاشن کوف اتارتے ہوئے میں میگزین اتار کر جیب میں ڈالی اور اس کے ساتھ ہی نیفے میں اڑسا گلاک بھی ہاتھ میں پکڑ کر بہ ظاہر پستول کا جائزہ لینے لگا۔اب وہ خالی کلاشن کوف سے تو مجھے نشانہ بنا نہیں سکتا تھا اور اپنے کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتارنے کی کوشش میں وہ پستول کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔میری حکمت عملی دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک مانند پڑ گئی تھی۔ایک دفعہ خالی کلاشن کوف کاک کر کے اس نے ٹریگر دبایا اور پھیکی مسکراہٹ سے کلاشن کوف واپس میری جانب بڑھا دی۔

’’واقعی بہت اچھی رائفل ہے۔‘‘

میں نے کچھ کہے بنا اس کے ہاتھ سے کلاشن کوف لے کر میگزین چڑھائی اور کلاشن کوف کو کاک کر کے پستول نیفے میں اڑس لیا۔میں ان کے سامنے نہ تو کوئی ڈر،خوف اور کمزوری ظاہر کرنا چاہتا تھا اور نہ انھیں کوئی ایسا موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر وار کر سکیں۔

اتنا تو وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ میں انھیں پہچان چکا ہوں۔اور یہاں ان کی دال نہیں گلنے والی۔مزید وقت برباد کیے بغیر ہتھیار بردار بولا۔

’’شکریہ بھائی چلتے ہیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تمام آگے بڑھ گئے۔میں وہیں کھڑا انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے مڑتے ہی وہ وار کر گزریں۔

ان کے جھاڑیوں کے جھنڈ میں اوجھل ہوتے ہی میں غار کی طرف بڑھ گیا۔وہ غار تھوڑا بلندی پر تھا۔سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو چکا تھا مگر غروب نہیں ہوا تھا۔غار تک پہنچنے کے لیے بھی میں نے احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔غار کے دہانے کے سامنے موجود جھاڑی کے عقب میں بیٹھ کر میں نالے کی طرف دیکھنے لگا۔وہاں سے پورا نالہ نظر آ رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے مجھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ تینوں محتاط انداز میں واپس جاتے نظر آئے۔کلاشن کے علاوہ انھوں نے میرے پاس گلاک نائینٹین بھی دیکھ لیا تھا اتنے قیمتی ہتھیاروں کے حصول کے لیے وہ موذی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ایسے آوارہ گرد ظالم اور بزدل ہوتے ہیں۔سامنے سے کبھی وار نہیں کرتے۔ہمیشہ پیٹھ پیچھے

اور چھپ کر وار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ضمیر، احساس اور اخلاق نام کے کسی جذبے سے واقف نہیں ہوتے۔

وہ احتیاط اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یقیناً وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی ہنسی نمودار ہوئی۔ میرا غار تک محتاط انداز میں پہنچنا کام آ گیا تھا۔ ان کے آگے بڑھتے ہی میں غار میں گھس گیا اب یقیناً وہ کافی دور تک مجھے ڈھونڈتے ہوئے جاتے۔ یوں بھی وہاں کوئی متعین راستہ تو موجود نہیں تھا کہ میری تلاش میں انھیں آسانی ہوتی۔ وہ نالہ موڑ مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے شام کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ وضو کے لیے پانی تو موجود نہیں تھا مجبوراً مجھے تیمّم کرنا پڑا۔ تیمّم بھی اللہ پاک کی عجیب نعمت ہے کہ پانی کی غیر موجودی میں بھی بندے کو اللہ پاک کے دربار میں حاضری کی اجازت مل جاتی ہے۔

نماز پڑھ کر میں نے اپنی گرم چادر غار کے دھانے پر لٹکا دی تا کہ آگ جلانے پر اس کی روشنی دور تک نظر نہ آئے۔ گو دھانے کے سامنے اچھی خاصی گھنی جھاڑیاں موجود تھیں لیکن پھر بھی میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ روشنی کو چھپانے کے ساتھ وہ چادر ہوا وغیرہ کے لیے اچھی خاصی رکاوٹ بنتی۔

پانی بس اتنا ہی بچا تھا کہ میں بہ مشکل ایک پیالی چائے کی بنا سکتا تھا۔ دن کے بچے ہوئے کھانے سے بھوک مٹا کر میں نے ایک پیالی چائے بنا کر پی اور آرام کرنے لیٹ گیا۔ آگ کی وجہ سے غار کا ماحول کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ رات گئے سردی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ آگ کب کی بجھ چکی تھی۔ کوئی چنگاری تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ دوبارہ لکڑیوں کو ترتیب دے کر میں آگ روشن کر لی۔ چند لمحوں بعد دوبارہ خوشگوار حدت پھیل گئی تھی۔ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔

صبح سویرے ہی میں سامان سمیٹ کر آگے بڑھ گیا۔ نومبر کی طویل رات نے میری نیند اور تھکن کا سدباب کر دیا تھا۔ کلومیٹر بھر بعد ہی مجھے شفاف پانی کا چشمہ نظر آ گیا تھا۔ خوب سیر ہو کر پانی پی کر میں نے اپنے پاس موجود دونوں بوتلیں بھی بھر لی تھیں۔ آسمان پر گزشتہ روز کی طرح ہی بادلوں کے آوارہ جھنڈ مٹر گشت کر رہے تھے۔ تیز ہوا بادلوں کو بکھیرنے سے زیادہ اکٹھا کرنے پر مائل تھی۔ ہوا کی کوششیں جلد ہی رنگ لائیں اور پانی کے قطرے تیز سوئیوں کی طرح میرے گالوں پر پڑنے لگے۔ میری نظریں کسی پناہ کی تلاش میں گھومنے لگیں، مگر کوئی

جائے پناہ دکھائی نہ دی۔اس لیے رک کر بھیگنے کے بجائے میں نے چلتے ہوئے بھیگنے کو ترجیح دی تھی۔رفتہ رفتہ بارش تیز ہونے لگی۔اور پھر بارش کے قطروں نے یوریا کھاد کے دانوں کی سی شکل اختیار کرلی،زمین پر چاروں طرف سفیدی نظر آنے لگی تھی۔میری چادر،کوٹ، کپڑے، جوتے،ٹوپی وغیرہ ہر چیز مکمل طور پر گیلی ہو چکی تھی۔تیز ہوا نے سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔میری متلاشی نظریں مسلسل کسی جائے پناہ کی تگ ودو میں تھیں مگر مجھے ناکامی ہورہی تھی۔اگر میں جلد ہی کوئی پناہ تلاش نہ کرپاتا تو وہ سردی مجھے کوئی جانی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔

جس طرح گرمیوں میں ہیٹ سٹروک جانی نقصان کا باعث بن سکتا ہے اسی طرح سردی کا حملہ بھی جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔سردیوں میں سب سے بڑا خطرہ فراسٹ بائیٹ کا ہوتا جس میں ہاتھ یا پاؤں سردی کی شدت سے کالے پڑ جاتے ہیں اوران کا علاج کاٹنے کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔گو فراسٹ بائیٹ کا خطرہ زیادہ تر گلیشئر سیاچن اور کارگل وغیرہ کی جانب ہوتا ہے،مگر بے احتیاطی اور مسلسل سردی کی شدت میں گھرے رہنے کے باعث وزیرستان میں بھی اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ڈی بلاک پر موجود اپنے فوجی بھائیوں سے مجھے یہ خبر پتا چلی تھی کہ برف میں سفر کرتے ہوئے برفانی بوٹوں کی غیر موجودی میں اس یونٹ کے ایک آدمی کو فراسٹ بائیٹ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اس غریب کے پاؤں کا پنجہ کٹ گیا تھا۔اس وقت میرے ساتھ بھی ویسی ہی صورت حال پیش آرہی تھی۔میرے پاؤں میں پہنے سپورٹس شوز مع جرابوں کے بالکل گیلے ہوگئے تھے۔

سفر شروع کرتے وقت بارش کے امکان کو نظر انداز نہ کرنے کے باوجود میں انگور اڈے سے چلتے وقت پانی پلہ یا کوئی واٹر پروف کوٹ وغیرہ ساتھ نہیں رکھ سکا تھا، نتیجے میں مجھے اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑ گیا تھا۔یوریا کھاد کی شکل کے سفید دانے ایک ہی تسلسل سے گر رہے تھے۔اور پھر ان دانوں نے روئی کے گالوں کی شکل اختیار کرلی۔ہوا کی تیزی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔صورت حال پہلے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔اگر ہوا رک جاتی تب بھی سردی کی شدت میں کمی آجاتی۔کیونکہ برف باری ہوتے وقت اگر ہوا نہ چل رہی ہو تو سردی اتنی زیادہ نہیں محسوس ہوتی۔البتہ تیز ہوا سردی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔بلیزرڈ(برفانی طوفان) سے دکھاوٴ کے حالات بھی ابتر ہوگئے تھے۔بہ مشکل چند گز کے فاصلے تک ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ایسی صورت حال میں کسی

غار وغیرہ کا ملنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔

اچانک میری نظر پتھر کی ایک بڑی چٹان پر پڑی جس کے ساتھ گھنی جھاڑیاں بھی موجود تھیں۔ میں اس کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا، گو اس وقت ہوا کے چلنے کی سمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کبھی ہوا مشرق کی جانب سے آتی محسوس ہوتی، کبھی مغرب اور کبھی شمال وجنوب کی طرف سے۔ مگر اس وقت میرے ایک جانب وہ بڑی چٹان تھی، دوسری جانب گھنی جھاڑی، عقب میں پہاڑی کی ڈھلان اور سامنے اٹھی ہوئی زمین۔ سر پر بھی چٹان نے سایہ کیا ہوا تھا۔

ہوا سے جان چھوٹتے ہی چند لمحوں کے لیے تو مجھے بہت اچھا محسوس ہوا تھا، لیکن رفتہ رفتہ گیلے کپڑے مجھ پر کپکپی طاری کرنے لگے۔ اس سردی سے مجھے آگ کی تپش ہی نجات دے سکتی تھی مگر ایسی حالت میں آگ کسی کرامت سے ہی جلائی جا سکتی تھی اور کرامت کا ظہور اللہ پاک کی طرف سے کسی ولی اللہ کے ہاتھ پر ہوتا ہے مجھ جیسے گناہ گار کو دنیاوی اسباب ہی بروئے کار لانا پڑتے ہیں۔

میرے پاؤں سن ہونے لگے تھے، ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور باقی جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ہاتھ البتہ کچھ بہتر حالت میں تھے کہ میں نے چمڑے کے دستانے ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار میں کمی آنے لگی ہو۔ وہ اذیت مجھ جیسے سخت جان سنائپر کی برداشت سے بھی باہر ہونے لگی تھی۔ اچانک میرے دماغ میں پلوشہ کا خیال آیا کہ کہیں وہ بھی اس طوفان میں نہ پھنس گئی ہو۔ وہ پھول سا بدن رکھنے والی نہ جانے اس سردی کو کیسے برداشت کرتی۔ میں دل ہی دل میں اللہ پاک سے اس کی بہتری کی دعا مانگنے لگا۔

کچھ دیر مزید وہاں گزار کر مجھے لگنے لگا کہ شاید میں وہیں اکڑ کر مر جاؤں گا۔ مجبوراً ایک بار پھر آڑ سے باہر آنا پڑا۔ چلتے ہوئے کم از کم مرنے کا خطرہ تو نہ رہتا۔ زمین پر چھ سات انچ سے زیادہ برف پڑ چکی تھی اور ابھی تک برف کے رکنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بعض اوقات تو برف باری تین چار دن بلکہ ہفتہ ہفتہ مسلسل جاری رہتی ہے اور ایسا عموماً برف باری کی شروعات میں ہوتا ہے کہ موسم کی پہلی برف باری پہاڑوں کو سفید کفن پہنا کر ہی رکتی ہے۔ اور اس برف باری میں اگر کسی شخص کو سر چھپانے کا ٹھکانہ نہ مل سکے تو اسے بھی زندگی سے

ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔آگ میں جلنے کی طرح، سردی میں جمنا بھی انتہائی اذیت ناک اور دردناک ہوتا ہے۔اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جہنم کے عذابوں میں سردی کے عذاب کا بھی ذکر ہوا ہے۔

پیدل چلتے ہوئے میں دوبارہ ہوا کے عذاب کا شکار تو ہوگیا تھا، مگر بیٹھے رہنے کی حالت میں جو پاؤں سن ہورہے تھے اور جسم کا خون جمتے ہوئے محسوس ہونے لگا تھا وہ کیفیت جاتی رہی۔

میں صبح بغیر ناشتے کے چلا تھا کہ پانی کے نہ ہونے کی وجہ میں چائے نہیں بنا سکا تھا۔پانی ملنے کے بعد بھی میں نے چائے کا ارادہ دوپہر کے کھانے تک موخّر کردیا تھا اور اب چائے کی طلب کے ساتھ مجھے سخت بھوک لگ گئی تھی۔چائے بنانے کا تو کوئی موقع نہیں تھا البتہ بھوک کا سدباب ہوسکتا تھا۔جھاڑوں کی آڑ لے کر میں نے پشت پر لٹکے تھیلے سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر کھانے لگا۔بسکٹ کے دو پیکٹ چبا کر مجھے پانی کی حاجت محسوس ہوئی، میرے پاس موجود بوتل میں پانی اتنا ٹھنڈا ہوچکا تھا کہ میں دو تین گھونٹ زیادہ نہیں پی سکا تھا۔

سفری تھیلے کو دوبارہ پشت پر لاد کر میں چل پڑا۔بسکٹ کھانے کے بعد بدن میں تھوڑی طاقت آگئی تھی جس سے میری رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔اب مجھے اس وقت تک چلتے رہنا تھا جب تک سر چھپانے کی کوئی مناسب جگہ نہ مل جاتی۔

وزیرستان ایسا علاقہ ہے جہاں دور دراز کی پہاڑیوں میں لوگوں نے گھر بنائے ہوتے ہیں۔یہ لوگ اکتوبر کے آخر اور نومبر کے اوائل ہی میں سردی سے بچاؤ کی غرض سے میدانی علاقوں کا رخ کرتے ہیں جہاں فروری مارچ تک وقت گزار کر یہ گرمیوں کے آنے سے پہلے واپسی کا رخ کرتے ہیں۔البتہ وزیرستان کے بڑے شہروں اور ایسے دیہاتوں کے لوگ جن کے گھر نسبتاً ہموار جگہوں پر بنے ہوتے ہیں وہ سردیاں بھی یہیں گزارنا پسند کرتے ہیں۔وزیرستان سے ملحقہ افغانستانی علاقے کے لوگوں کی بودوباش کا طریقہ کار بھی بالکل یہی ہے اور اسی وجہ سے اس وقت میں میرا زیادہ دھیان کسی ایسے ہی ویران مکان کی تلاش تھا جو مجھے اس اذیت ناک سردی سے چھٹکارا دلا دیتا۔

ہوا کی شدت میں ہلکی سی کمی ہوئی مگر روئی کے گالوں کا حجم ذرا بڑا ہوا ساتھ ہی برف گرنے کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔دھند بھی پہلے سے گہری ہوگئی تھی۔میں نالے کی تہہ میں چل رہا تھا۔اچانک مجھے خیال آیا کہ

دھند کی وجہ سے بلندی پر بنے ہوئے مکان نظر نہیں آسکتے تھے اور اس علاقے کے لوگ نالے کی تہہ کے بہ بجائے ڈھلان پر مکان بناتے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میں ہمت کر کے نالے کے داہنی جانب ترچھا ہو کر ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ برفانی بوٹ وزن میں بھاری ہوتے ہیں اتنے کہ عام زمین پر انھیں پہن کر چلنا ایک عذاب ہی ہوتا ہے۔ دونوں بوٹوں کا وزن پانچ کلوگرام کے بہ قدر ہوتا ہے، مگر وہ پہن کر برف میں چلنا نہایت آسان ہوتا۔ ان کے ساتھ پھسلنے کا خطرہ بھی نہایت کم ہوتا ہے اور پاؤں سردی کی وجہ سے خراب بھی نہیں ہو پاتے۔ اس وقت میں نے بہترین کوالٹی کے سپورٹس بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بوٹ مسلسل ہونے والی بارش اور برف باری کی وجہ سے گیلے ہو گئے تھے ۔ اور چڑھائی چڑھتے ہوئے میں بار بار پھسل بھی رہا تھا۔ تازہ پڑی ہوئی برف پاؤں کے نیچے سے سرک رہی تھی، مجبوراً مجھے ایک خشک لکڑی ہاتھ میں پکڑ کر چلتے ہوئے اس کا سہارا لینا پڑا۔ پھسلن کی وجہ سے میری رفتار کافی سست ہو گئی تھی، البتہ بلندی میں چڑھنے کی وجہ سے میری مشقت میں اضافہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سردی کا احساس تھوڑا کم ہو گیا تھا۔ سنبھل سنبھل کر چلنے کے باوجود میرا پاؤں ایک ہموار پتھر پر پھسلا اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، منھ کے بل گرتے وقت میں نے بہ مشکل اپنا چہرہ پتھر سے ٹکرانے سے بچا پایا تھا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی، میں لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا پندرہ بیس فٹ نیچے ایک جھاڑی اگر نہ روکتی تو میں دوبارہ نالے کی تہہ میں پہنچ گیا ہوتا۔ میری جسمانی حالت بھی کافی ناگفتہ بہ تھی، لڑھکتے ہوئے مجھے اچھی خاصی چوٹیں لگی تھیں، سب سے خطرناک چوٹ جھاڑی میں اٹکنے سے پہلے ایک بڑے پتھر کے میری کنپٹی پر ٹکرانے سے ہوئی تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی کی موجودی کے باوجود میرا سر اس زور سے ٹکرایا تھا کہ میری آنکھوں میں نیلے پیلے تارے چمکے اور میری آنکھیں بند ہو گئیں......

میں عبدالرشید بیٹنی کی بیٹھک میں پلوشہ کے ساتھ موجود تھا۔ کمرے سے باہر ہونے والی بارش کی وجہ سے سردی کافی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ پلوشہ نے گرم کمبل میرے جسم سے کھینچ کر اپنے اوپر لپیٹ لیا تھا۔

”پلوشے!...... مجھے بھی تو سردی لگتی ہے نا یار۔“ آنکھیں کھولتے ہوئے میں نے اسے نیند سے جگاتے ہوئے باقاعدہ احتجاج کیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑتی، سوتے میں وہ اکثر

سارا کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا کرتی......

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مگر مجھے زیادہ سردی لگتی ہے۔اور خود ہی تو کہتے ہو میں نازک سی گڑیا ہوں پھر واویلا کیسا۔''

میں نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔''تو اتنی سی جان کے لیے پورے کمبل کی کیا ضرورت۔''

''اچھا یہ لو سارا کمبل ہی لے لو۔''منہ بسورتے ہوئے اس نے کمبل اپنے جسم سے اتار پھینکا اور ناراضی بھرے انداز میں رخ موڑ لیا۔

''اچھا سوری نا یار!......ایسا کر کے مجھے تکلیف تو نہ دو۔''میں جلدی سے بیٹھ کر اسے کمبل اوڑھانے لگا۔

''کہہ دیا نا میں بغیر کمبل کے لیٹوں گی۔''اس نے دوبارہ خود سے کمبل ہٹانے کی کوشش کی،مگر میں نے جلدی سے کمبل سمیت اسے آغوش میں بھرتے ہوئے کہا۔''چندا معاف کر دو نا غلطی ہوگئی۔''

اس کا ناز بھرا قہقہہ گونجا۔''اگر آئندہ مجھے جگایا تو بالکل بھی معاف نہیں کروں گی......اور اب آپ کی سزا یہی ہے کہ کمبل سے باہر ہی لیٹے رہو۔''

''ٹھیک ہے جی۔''میں کپکپاتے ہوئے لیٹ گیا تھا۔سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔وہ کمبل سے اپنا ملیح چہرہ باہر نکالے مجھے کپکپاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''ارے آپ کو تو بہت سردی لگ رہی ہے۔اندر آجاؤ۔''اس نے فوراً مجھے کمبل کے اندر گھسیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا،مگر سردی کا احساس ختم ہونے ہی میں نہیں آرہا تھا۔

''پلوشہ!......مم......مجھے بہت سردی لگ رہی ہے......''میں منمنایا۔

''تو قریب ہو جاؤ نا اور کمبل اپنے اوپر صحیح طریقے سے لپیٹ لو......''اس نے مزید میرے قریب ہونے کی کوشش کی مگر وہ پہلے ہی اتنے نزدیک تھی کہ مزید نزدیکی ممکن ہی نہیں تھی۔اس کے ساتھ ہی وہ ہاتھ بڑھا کر میری پشت پر کمبل صحیح کرنے لگی۔اچانک دروازہ کھلا اور تیز ہوا اندر داخل ہونے لگی۔جس کی وجہ سے کمبل لپیٹنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''ٹھہرو میں دروازہ بند کردوں۔''بستر سے اٹھتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھی مگر ہوا اتنی تیز ہو گئی تھی کہ وہ دروازے تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

''راجو!......ہوا بہت تیز ہے میری مدد کرو۔''اس نے گھبرا کر مجھے آواز دی۔

''ہاں......مم......مگر مجھے بہت زیادہ سردی لگ رہی ہے۔''میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میرا جسم جیسے سن ہو گیا تھا اور میں چاہ کر بھی حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔''پلوشے!......میں اٹھ نہیں سکتا۔''

''کیا ہوا راجو!''وہ میری جانب پلٹی۔ تیز ہوا سے اس قدم اکھڑ رہے تھے۔ وہ میرے قریب پہنچی، مگر ہوا نے اسے پیچھے کی جانب دھکیل دیا تھا۔ اسے دور جانے سے روکنے کے لیے میں نے پوری کوشش کر کے جسم کو حرکت دی تا کہ اس کا اپنی جانب بڑھا ہاتھ تھام سکوں اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔

میں اوندھے منھ جھاڑی میں الجھا ہوا تھا۔ ہوا اسی شدت سے جاری تھی۔ برف باری کے رکنے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دستانے والا گیلا ہاتھ کنپٹی پر پھیرا جہاں چوٹ لگنے کی وجہ سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ زمین میں گڑے پتھر سے میری کنپٹی بہت زور سے ٹکرائی تھی۔ تھوڑی دیر کنپٹی سہلا کر میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا۔ میرے پورے جسم میں درد ہلکورے لے رہا تھا۔ ایسی صورت حال سے میرا پہلی بار پالا پڑا تھا کہ میری ساری تربیت، ساری برداشت اور ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ مجھے اپنا زندہ بچ جانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ کہتے ہیں مرنے سے پہلے انسان کو وہی خیال آتے ہیں جیسا کہ وہ روزمرہ کی زندگی گزار چکا ہوتا ہے۔ ہر وقت اللہ کا ذکر کرنے والوں کے لب پر ذکر جاری ہوتا ہے، تلاوت کے شوقین حضرات کلام مجید دہرا رہے ہوتے ہیں، حدیث سے محبت کرنے والوں کی زبان نبی پاک ﷺ کے فرمان سے تر ہوتی ہے اور مجھ جیسے دنیادار کو وہی پلوشہ نظر آ رہی تھی جسے شاید میں نے سب سے زیادہ سوچا تھا۔

سر جھٹک کر میں نے ناامیدی بھری سوچوں کو دور پھینکا اور کوشش کر کے کھڑا ہو گیا۔ میری کلاشن کوف دو تین گز اوپر پڑی تھی۔ کلاشن کوف کے بارے کمانڈر نصر اللہ کے آخری الفاظ میرے دماغ میں گونج کر رہ گئے تھے۔ ہوسکتا ہے آپ کو اس ہتھیار سے ایک گولی بھی چلانے کا موقع نہ ملے اور خدانخواستہ اس سے پہلے ہی آپ

کسی کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔'' گو میں کسی کی گولی کا نشانہ تو نہیں بنا تھا مگر لگ یہی رہا تھا کہ شاید اس کلاشن کوف سے فائر کرنا میری قسمت میں نہیں تھا۔لیکن اس کے باوجود میں وہ کلاشن کوف وہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا ۔کلاشن کوف اٹھا کر میں نے گلے سے لٹکائی اور دوبارہ اپنا سفر جاری کر دیا۔مجھے موسم کا مقابلہ کرنا تھا۔مجھ جیسا سنائپر اتنی جلدی ہار ماننے اور شکست کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔میں رینگنے کی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔میری نظروں میں ابھی تک کسی پناہ کو پانے کی امید زندہ تھی۔اور امید ہی پر دنیا قائم ہے۔جس نے امید کھو دی سمجھو اس نے جینے کا آسرا کھو دیا۔ابھی تک میرے بہت سے کام ادھورے پڑے تھے...... مجھے اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈ کر خود پر لگے الزامات کو جھٹلانا تھا، البرٹ بروک سے اپنے بھائیوں کی شہادت کا بدلہ لینا تھا۔اپنی پلوشہ کو تلاش کر کے واپس تلہ گنگ پہنچانا تھا، اس کے لیے کار خریدنا تھی، اس کی کئی ایسی تشنہ خواہشوں کو پورا کرنا تھا جن کے وہ ہمیشہ سپنے دیکھا کرتی تھی۔اس کے معصوم بھائی عادل کو اعلا تعلیم دلانا تھی۔ابوجان اور پھوپھو جان کو ایسے پھول سے بچوں کا تحفہ دینا تھا جس سے ان کے سارے گلے شکوے دور ہو جاتے......اس کے علاوہ بھی جانے کیا کیا کرنا باقی تھا۔

''ذیشان میاں! موت اپنے وقت سے ٹلا نہیں کرتی۔حضرت عزرائیلؑ کسی کے ادھورے کاموں کا نہیں اللہ پاک کے حکم کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔وقت آنے پر تو ماؤں کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنے بچے کو ایک بار دودھ ہی پلا سکیں۔کبھی مائیں جگر کے ٹکڑوں کو بلکتا چھوڑ جاتی ہیں اور کبھی بچے ماؤں کو ہمیشہ رونے کا سامان مہیا کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ......سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں۔''

امید اور نا امیدی کی کشمکش میں مبتلا میں گرتا پڑتا آگے بڑھتا رہا۔ہمت کر کے میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر سے کوٹ کی اکڑی ہوا آستین کو بہ مشکل ہٹا کر وقت دیکھا ...... گھنٹے والی سوئی پانچ کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔سورج غروب ہونے میں بس آدھا گھنٹا ہی رہ گیا تھا۔اگر میری رات بھی اسی حالت میں گزرتی تو یقیناً مجھے مرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔برف باری شروع ہوتے وقت میرے ذہن میں ایک بار واپس غار کی جانب لوٹنے کا خیال آیا تھا جہاں کہ میں نے گزشتہ رات گزاری تھی، مگر پھر چند کلو میٹر طے کیا ہوا فاصلہ میرے پاؤں کی بیڑی بن گیا اور آگے کسی مناسب جگہ کے ملنے کی امید نے مجھے واپس پلٹنے نہ دیا۔اب تو میں اس

غار تک بھی نہیں جا سکتا تھا کہ نہ جانے وہ کتنا پیچھے رہ گیا تھا اور پھر رات کے اندھیرے، دھند اور برف باری میں اس تنگ دھانے کے غار کو تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ ملگجا اندھیرا تاریکی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ میں رینگنے کی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ میرے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ سردی کے ساتھ تھکن سے بھی ابرا حال تھا۔ میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ عام حالات میں میں چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ مسلسل چل چکا تھا مگر اس دن چند گھنٹوں نے میرا برا حال کر دیا تھا۔ اس تھکاوٹ میں زیادہ عمل دخل موسم کی شدت اور میرے گیلے لباس کا تھا۔ برفانی طوفان انسان کا سانس لینا بھی مشکل بنا دیتا ہے۔ درختوں کی بہتات کے باوجود اس علاقے میں آکسیجن لیول بہت کم ہے۔ سردی کے ساتھ مجھے سخت بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی، مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پشت پر لدے تھیلے کو کھول کر بسکٹ نکال لیتا۔ تھیلا بالکل اکڑ گیا تھا۔ بلکہ میرے پورے لباس کی یہی حالت تھی۔ تھیلے میں ٹارچ بھی موجود تھی۔ لیکن اندھیرا ہونے کے باوجود میں نے ٹارچ نہیں نکالی تھی۔ چڑھائی چڑھ کر میں نسبتاً ہموار جگہ پر پہنچا۔ چند لمحے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر میں جھک کر کھڑا رہا تا کہ چڑھے ہوئے سانس تھوڑا ہموار چلنے لگیں۔ لیکن جونہی سیدھا ہو کر میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی ٹانگوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ قدم اٹھانے کی کوشش میں میں منہ کے بل دھڑام سے نیچے گرا اور لمحہ بھر یونہی پڑا رہا۔ شاید میری زندگی کا خاتمہ قریب آ گیا تھا۔

''الوداع پلوشے!...... میں ساتھ جینے کا وعدہ نہیں نبھا سکا، مجھے معاف کر دینا چندا۔ اور بس کر و واپس لوٹ جاؤ، اب میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے میں خوار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمھارا راجو ہی باقی نہیں رہا۔ بس رونا مت اور مجھے یاد بھی نہ کرنا۔'' زندگی کو الوداع کہنا اور پلوشہ کو الوداع کہنا ایک ہی برابر تھا۔ اس وقت زندگی میرے ہاتھوں سے بند مٹھی میں دبی ریت کی مانند سرک رہی تھی۔ نیچے جھکا سر میں نے ذرا سا اوپر اٹھایا اور یہ دیکھتے ہی میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا کہ چند گز کے فاصلے ہی پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر ہونٹ جیسے اکڑ گئے تھے۔ میرے منہ سے نکلنے والی مدہم آواز مشکل سے میری سماعتوں تک ہی پہنچ رہی تھی۔ برف کے اس طوفان میں یہ مدہم آواز مکان میں بند کسی آدمی کے کانوں تک کیسے پہنچتی۔ اٹھنے کی کوشش میں میں بس ہل کر رہ گیا تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں کسی شاعر کے خوب صورت الفاظ گونجے......

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

جب اٹھنے کی ساری کوششیں بے کار گئیں تو میں نے رینگ کر ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔اگر کوئی بات میرے حق میں جاتی تھی تو وہ اس جگہ کا ہموار ہونا تھا۔میری ٹانگیں بالکل شل ہوگئی تھیں البتہ بازو تھوڑی بہت حرکت کر سکتے تھے۔دستانوں کی وجہ سے ہاتھوں میں بھی ذرا سی جان باقی تھی۔سب سے پہلے تو میں نے کوشش کر کے اپنی پشت پر لدے تھیلے سے بازو نکال کر اس سے جان چھڑائی۔اس کے ساتھ ہی کلاشن کوف بھی میرے کندھے سے نکل گئی تھی۔اس بوجھ کو اتار کر مجھے ذرا سہولت ہوگئی تھی۔اب میں آگے بڑھنے کو تیار تھا۔

بازو آگے بڑھا کر میں نے کہنیوں پر زور دیا اور چند انچ آگے کو کھسکا۔اور پھر میں مسلسل یہ حرکت دہرانے لگا۔چند گز کا فاصلہ نا قابل عبور کھائی کی طرح میری راہ میں حائل تھا۔میری مثال اس دودھ پیتے بچے سے بھی بد تر تھی جو دودھ کی بوتل کو خود ہاتھ سے پکڑ کر پی نہیں سکتا بس حلق پھاڑ کر چیختا رہتا ہے کہ ماں اپنے ہاتھ سے بوتل اس کے منہ سے لگا دے۔اور مجھ میں تو چیخنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔

ہمت ہارے بغیر میں انچوں کے حساب سے آگے کھسکتا رہا۔وہ فاصلہ جسے عام حالات میں طے کرنے میں مجھے ایک سیکنڈ بھی نہ لگتا اب وہ فاصلہ زمین و آسمان کے درمیانی خلا کے مصداق بن گیا تھا۔لیکن کہتے ہیں مسلسل ہمت اور کوشش انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔میں بھی آخر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔اپنی بے پناہ خوشی پر قابو پاتے ہوئے میں نے اپنا نحیف ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دی،اور اس کے ساتھ ہی میرا دل ڈوبنے لگا کہ میری دستک کی آواز سے زیادہ تو دروازہ ہوا سے ہل کر شور پیدا کر رہا تھا۔میری دستک سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی اسے خود میرے کان نہیں سن پا رہے تھے کمرے میں آرام کرتے لوگ خاک سن پاتے۔

چند بار کوشش کرنے کے بعد میں نے سر نیچے پھینک دیا۔میری ساری کوشش اور محنت بے کار گئی تھی۔یقیناً گھر والوں کو صبح کے وقت ہی بن بلائے مہمان کا پتا چل پاتا۔اور اس وقت وہ اس مہمان کی ایک ہی خدمت کے قابل رہتے کہ اسے کفن پہنا کر کسی مناسب جگہ دفن کر دیتے۔برف پر مسلسل لیٹنے کی وجہ سے ایک بار پھر میں بے ہوشی کا شکار ہونے لگا،آنکھیں بند ہوتے ہی پلوشہ دھم سے میرے خیالوں میں آ کودی تھی...... مجھے سردی سے

کانپتے دیکھ کر بھی وہ مسلسل قہقہے لگاتے ہوئے چڑا رہی تھی۔ ''کمبل تو میرا اپنا ہے۔ یہ تو نہیں دوں گی۔''

''پلوشے!...... مجھے سردی لگ رہی یار!''

''تو کیا، لگتی رہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اُفف......'' میں نے سرد ہوتے ہاتھ رگڑ کر بغلوں میں دبائے۔

''ارے راجو!...... آپ کو تو سچ میں سردی لگی ہے۔'' مجھے سنجیدہ ہوتے دیکھ کر وہ فوراً میرے نزدیک آ گئی تھی میں کپکپاتے ہوئے بولا۔ ''پلوشے مجھے اپنی آغوش میں چھپا لو نا۔''

''یہ آغوش ہے ہی میرے راجو کی۔'' چاہت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے مجھے کمبل کے اندر کھینچا اور کمبل میرے گرد لپیٹتے ہوئے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ مگر یہ کیا اس کا پورا لباس گیلا تھا۔

میں چلایا۔ ''پلوشے تمھارے کپڑے بھی گیلے ہیں۔''

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''ہاں راجو!...... مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔''

''میرا خیال ہے میں دروازہ بند کر کے آگ جلاتا ہوں۔'' میں نے کھلے دروازے سے تیز ہوا اندر آتے دیکھ کر مشورہ دیا۔ ''جلدی کرو راجو، ورنہ آپ کی پلوشہ مر جائے گی۔'' اس نے رونی صورت بنا کر کہا اور میں نے سرعت سے اٹھنے کی کوشش کی، نتیجے میں، میں منہ کے بل گرنے لگا۔ اپنا منہ زمین پر لگنے سے بچانے کے لیے میں نے ہاتھ آگے بڑھائے اور اسی وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں کسی انجان شخص کے دروازے پر معذور بھکاری سے بھی بری حالت میں پڑا تھا۔ بھکاری پھر بھی آواز تو دے لیتا ہے مجھ میں تو آواز دینے کی سکت بھی باقی نہیں تھی۔ میرا دماغ آہستہ آہستہ اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ آنکھیں بند ہونے پر میں اپنی جانِ حیات پلوشہ کی آغوش میں پہنچ جاتا اور جب سردی کی شدت جسم میں تکلیف کی لہر اٹھنے سے ہوش آتا تو میں اس بے رحم ماحول میں پھنسا دکھائی دیتا۔ موت کو یقینی جان کر میں زیرِ لب کلمہ شہادت پڑھنے لگا۔ مرتے وقت بس ایک ہی خوشی تھی کہ میری موت ایمان کی حالت میں ہو رہی تھی۔

(بقیہ واقعات اسنائپر پارٹ ۲ میں ملاحظہ کیجیے)

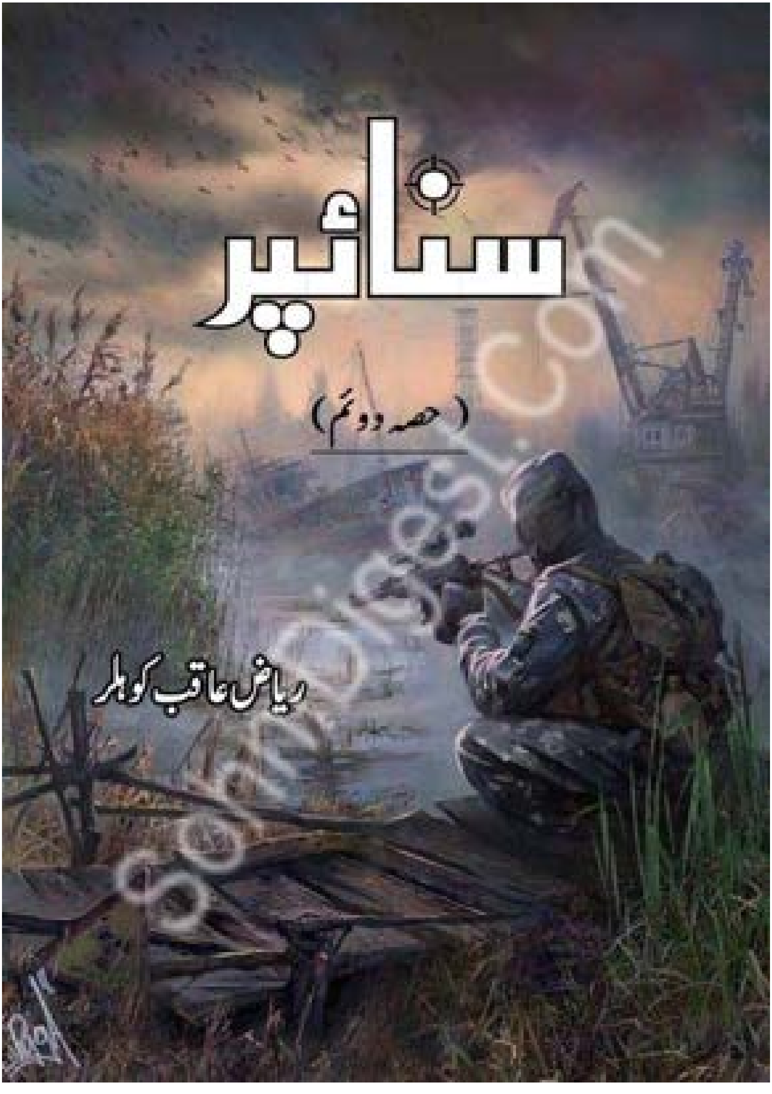
سنائپر
(حصہ دوئم)
ریاض عاقب کوہلر

ناول | ریاض عاقب کوہلر

سنائپر

(حصہ دوئم)

http://sohnidigest.com سوہنی ڈائجسٹ

اس وقت بے ہوشی کے عالم میں مجھے بہت گہری کھائی دکھائی دے رہی تھی۔ تیز بارش ہو رہی تھی اور میں لمحہ بہ لمحہ کھائی کی طرف پھسلتا جا رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں کے ناخن چکنی زمین میں گھسیڑنے کے باوجود میں خود کو پھسلنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ اور پھر میں ایک دم کھائی میں لڑھک گیا خوش قسمتی سے آخری کوشش میں پتھر کا ایک ابھرا ہوا کنارہ میری انگلیوں کی گرفت میں آ گیا تھا۔ اسے پکڑ کر میں ہوا میں لٹکنے لگا۔ نیچے دیکھنے پر حد نگاہ تک کھائی کی تہہ نظر نہ آئی۔ میرے ہاتھ سے پتھر کا کنارہ چھوٹنے کی دیر تھی اس کے بعد یقیناً کھائی کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے رب کو پیارا ہو جانا تھا۔ میں نے اوپر اٹھنے کی کوشش کی مگر میرے بازوں میں جان ہی ختم ہو گئی تھی۔ موت لمحہ بہ لمحہ مجھے نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ پتھر کا کنارہ میرے ہاتھ سے چھوٹنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک جانب سے پلوشہ بھاگتی ہوئی نمودار ہوئی، اگلے ہی لمحے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے میرے دائیں ہاتھ کو اپنے ملائم ہاتھ میں جکڑ لیا۔ دونوں ایڑیاں چکنی زمین میں گاڑ کر اس نے پورا زور لگایا اور میں آہستہ آہستہ اوپر آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں ہانپتا ہوا اس کے پہلو میں لیٹا تھا۔

”راجو!...... مجھے آواز نہیں دے سکتے تھے۔“ وہ شکوہ کناں ہوئی۔ ”اگر مجھے آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی ہوتی تو آپ تو گئے تھے نیچے۔“

”چندا میرا حلق ہی خشک ہو گیا تھا۔ منھ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔“

”ضروری تو نہیں کہ آپ منھ ہی سے پکارتے، مجھے کسی اور طرح سے بھی تو متوجہ کر سکتے تھے نا۔“ اس کا گلہ جاری رہا۔ ”اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو پلوشہ کیسے زندہ رہ پاتی۔“

میں مسکرایا۔ ”گویا مجھ سے زیادہ اپنی موت کی فکر ہے۔“

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ”ہاں...... ہاں...... ہاں اپنی موت کی فکر ہے، کیونکہ میرے راجو کے لیے میری زندگی بہت اہمیت کی حامل ہے۔“

”چندا!...... خفا تو نہیں ہوتے، اب بتاؤ نہ ایسی حالت میں تمھیں کیسے متوجہ کرتا۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے پاس پستول بھی موجود تھا، اس سے ہوائی فائر کر لیتے۔“

”اوہ......اس کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ میں نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

”خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ وہ مجھے چڑاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ اسے یہ بھول گیا تھا کہ زمین کتنی چکنی اور پھسلن زدہ ہے۔ کھڑے ہوتے ہی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کھائی میں گرتی چلی گئی۔ میں نے ایک دم اسے گرفت میں لینا چاہا مگر کھائی کے اندھیرے اسے نگل گئے تھے۔ میری سماعتوں میں بس اس کی آخری چیخ ہی گونجتی رہ گئی تھی جو وہ میرا نام پکارتے ہوئے چیخی تھی۔

”راجو......................“ اس کے ساتھ ہی مجھے ہوش آ گیا۔ اس حالت میں بھی اس بھیانک سپنے سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں اور زبان پر فوراً برے خواب کے شر سے بچنے کی دعا مچل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں پلوشہ کی تجویز گونجی۔

”آپ کے پاس پستول بھی تو موجود تھا۔ آپ ہوائی فائر بھی تو کر سکتے تھے۔“ گویا وہ میرے خواب میں مجھے اس صورت حال سے نمٹنے کی تجویز ہی تو بتانے آئی تھی۔ میں کوشش کر کے اپنا بازو کمر کی طرف لے گیا جہاں میں نے نیفے میں گلاک نائنٹین اڑسا ہوا تھا۔ پستول کو پکڑنے کے لیے مجھے دستانہ اتارنا پڑا تھا۔ میری انگلیاں بس تھوڑی تھوڑی حرکت ہی کر پا رہی تھیں، بہ مشکل پستول کا دستہ پکڑ کر میں نے پستول کو باہر کھینچا۔ اب پستول کو کاک کرنے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے دستانے والے ہاتھ کو پستول کے اوپر ٹیک کر اس کی سلائیڈ کو پیچھے کی جانب کھینچنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دو تین منٹ کی کوشش کے بعد اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے کلاشن کوف کاک کر کے کندھے سے لٹکائی تھی۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ کلاشن کوف تو میں چند گز پیچھے پھینک آیا تھا اور وہاں تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں دوبارہ پستول کے ساتھ مغز ماری کرنے لگا۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد سلائیڈ ہلکا سا پیچھے کو کھسکی میں نے ہاتھ پر مکمل زور دے دیا تھا اور پھر وہ مشکل مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ سلائیڈ مکمل پیچھے دھکیل کر میں نے اس پر سے ہاتھ ہٹایا۔ سلائیڈ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور پستول کاک ہو گیا۔

میں نے ٹریگر گارڈ میں شہادت کی انگلی ڈال کر پستول کی بیرل کا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر کھینچ لیا۔ دھماکے کے ساتھ میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ گولی فائر ہونے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ میں نے ایک گولی

پر اکتفا نہیں کیا تھا۔دوسری، تیسری اور چوتھی بار بھی میں ٹریگر دباتا گیا۔ ہر بار مجھے اتنا ہی زور لگانا پڑا جتنا کہ ایک گہرے کنویں سے پانی کا بڑا ڈول کھینچنے والے شخص کو لگانا پڑتا ہے۔ چوتھی بار ٹریگر دبا کر میں نے بے دم ہو کر اپنی کہنیوں پر سر ٹیک دیا۔اس کے بعد میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ کئی لمحے بیت گئے یا شاید مجھے ہی لگ رہا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ دروازے پر آہٹ ہوئی کسی نے کچھ پکارا تھا مگر شاید میری سماعتوں نے بھی کام چھوڑ دیا تھا پھر میری آنکھوں نے روشنی کی جھلک دیکھی۔ اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

دو ہاتھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا ......اور میرے کانوں کے قریب ہی ایک نسوانی آواز آئی ......''ہوش میں......آؤ اٹھو......'' شاید وہ اکیلی عورت مجھے اٹھا نہیں پا رہی تھی۔

''مم......میں حرکت نہیں کر سکتا۔''میں زیر لب بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ مجھے مدد بھی ملی تھی تو ایک کمزور عورت کی جو مجھے اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے چلائی۔''رنڑا......رنڑا، بھائی کو ساتھ لے کر یہاں آؤ۔''

چند لمحوں بعد مجھے قریب سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔''جی باجی!......'' شاید وہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔

''تم دونوں اس کی ٹانگوں سے پکڑو، میں بازو تھامتی ہوں، یہ بے ہوش ہے، اگر کچھ دیر ایسے پڑا رہا تو زندہ نہیں بچے گا۔''

''ٹھیک ہے باجی۔''اس مرتبہ ایک لڑکے کی آواز آئی تھی۔اور پھر میرا جسم ذرا سا زمین سے بلند ہوا اور وہ مجھے اندر لے جانے لگے۔طویل صحن عبور کر کے وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں انگیٹھی روشن تھی ۔ایک دم مجھے لگا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔

''رنڑا جلدی سے خالی چارپائی پر بستر بچھاؤ۔اور پیٹی سے موٹے والا لحاف بھی نکال لاؤ۔''

''جی باجی!'' رنڑا سعادت مندی سے بڑی بہن کے حکم پر عمل کرنے لگی۔

وہ چھوٹے بھائی کو مخاطب ہوئی۔''ثمر خان!......بھاگ کر باورچی خانے سے چھری اٹھا لاؤ اس کا گیلا اور اکڑا ہوا لباس کاٹ ہی کر جسم سے اتارنا پڑے گا۔''

''کون ہے گلگارے بیٹی!''کسی مرد کی تکلیف میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''بابا جان!......کوئی اجنبی ہے۔ فائر کی آواز سن کر میں باہر نکلی تو یہ دروازے پر بے سدھ پڑا تھا۔ شاید ہمیں متوجہ کرنے کے لیے ہی اس نے فائر کیے تھے۔'' باپ کو تفصیلی جواب دیتے ہوئے بھی وہ مسلسل میرا کوٹ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر کوٹ بالکل اکڑ گیا تھا۔ اسی وقت اس کا بھائی ثمر خان بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔

''یہ لیں باجی!'' اس نے یقیناً بہن کی طرف چھری بڑھائی تھی۔ چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے چھری لے کر اس نے جلدی سے میرا کوٹ کاٹنا شروع کر دیا، کوٹ کے بعد اس نے قمیص اور بنیان بھی کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کر دی اور پھر اپنا دوپٹا میرے درمیانی جسم پر ڈال کر اس نے میرا زیریں لباس بھی کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔ میں نیم وا آنکھوں سے اس دوشیزہ کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مگر میرا جسم حرکت سے معذور تھا۔ میری جان بچانے کے لیے وہ جس حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی اتنی جرّات کم ہی لڑکیوں کا خاصا ہوتی ہے۔ جب تک وہ لباس کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کرتی اتنی دیر میں اس کی چھوٹی بہن رنڑا ایک موٹا لحاف چارپائی پر بچھا کر دوسرا لحاف میرے اوپر ڈالنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔

''اسے اٹھانے میں میری مدد کرو۔'' اس نے چھوٹی بہن کو آواز دی۔ ایک مرتبہ پھر تینوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور نرم بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی گلگارے بی بی نے مجھے وہ موٹا لحاف اوڑھا دیا۔ خوش گوار حدت میری رگوں میں اترنے لگی تھی۔

''ثمر خان انگیٹھی میں اور لکڑیاں ڈالو۔'' چھوٹے بھائی کو کہہ کر وہ بہن کو مخاطب ہوئی۔ ''رنڑا!...... دودھ میں ہلدی ڈال کر گرم کر کے لے آؤ۔''

وہ دونوں۔ ''جی باجی۔'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تھے۔ وہ خود لحاف کے کونوں کو موڑ کر میرے جسم کے نیچے دینے لگی تاکہ لحاف مکمل بند ہو جائے۔ اور ہوا کا گزر بالکل ممکن نہ رہے۔

میرے جسم میں اٹھنے والا درد تا حال پہلے کی طرح ہی باقی تھا۔ گو گلگارے بی بی نے بہت اچھے طریقے سے مجھے سنبھالا تھا۔ میرا گیلا لباس اتار کر مجھے لحاف اوڑھانے کے بہ جائے اگر وہ براہ راست مجھے انگھیٹی کے قریب ڈال دیتی تو بلاشبہ میرے جسم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ ٹھنڈ لگنے والے شخص کو یوں ایک دم آگ کے قریب لے جانا بالکل ہی غلط ہے۔ البتہ مجھے لحاف اوڑھا کر انگھیٹی کی آگ کو زیادہ سے زیادہ دہکانا بہت

مناسب تھا۔ یقیناً ٹھنڈے علاقے سے تعلق رکھنے کے باعث اسے معلوم تھا کہ ٹھنڈ کا شکار ہونے والے شخص کو کیسے سنبھالا جاتا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینے شروع کر دی تھی۔ میرے پاؤں ابھی تک سن تھے۔ البتہ نچلے دھڑ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اور ایسا ہونا میرے لیے تسلی کا باعث تھا۔ درد کا احساس ہونے کا مطلب یہی تھا کہ میرا جسم ٹھیک تھا۔ میں پاؤں کی انگلیوں کو حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ میرے پاؤں میں بھی درد کا احساس جاگنے لگا تھا۔ میرے کانوں میں اس مرد کے کراہنے کی آواز پہنچی غالباً وہ بھی کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا تھا۔

اسی وقت رنڑا ہلدی ملا دودھ لے کر پہنچ گئی۔ میرے چہرے سے تھوڑی سی رضائی کھسکا کر گلگارے بی بی نے میرا منھ باہر نکالا اور میرے سر کے نیچے تکیہ رکھ کر ایک بڑے چمچ سے ہلدی ملا دودھ مجھے پلانے لگی۔ اس نے مجھے رضائی سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہلکا گرم دودھ میرے جسم میں جس جس جگہ تک جا رہا تھا مجھے اس کا بہاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ میں دودھ کا پورا کٹورا خالی کر گیا تھا۔ دودھ نے مجھے بہت تقویت پہنچائی تھی۔

دودھ پلا کر اس نے میرا چہرہ دوبارہ ڈھانپ دیا۔

''رنڑا!......ثمر خان کو ساتھ لے جا کر ڈربے سے وہ بڑا چوزہ پکڑ لاؤ۔'' وہ چھوٹی بہن کو مخاطب تھی۔

''کیوں باجی!'' یقیناً اس کی بات سن کر رنڑا حیران ہوئی تھی۔

''اسے ذبح کر کے یخنی بنانا ہے۔ جب تک اسے اندر سے گرمی نہیں پہنچے گی اس کی سردی دور نہیں ہوگی۔''

''اچھا باجی!'' کہہ کر وہ ثمر خان کو ساتھ چلنے کا کہنے لگی۔

میرا دل اس کے لیے شکر گزاری کے احساسات سے بھر گیا تھا۔ وزیرستان کے لوگ غریب ہونے کے باوجود بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ ایک اجنبی کی اتنی زیادہ خدمت اور دیکھ بھال یقیناً مہمان نوازی کا منھ بولتا ثبوت تھی۔

چوزہ اس نے خود ہی ذبح کیا تھا۔ میں بس سماعتوں ہی سے ان کی حرکات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس دوران ان کے باپ کی کراہتی ہوئی آواز بھی میرے کانوں میں پڑ جاتی۔ وہ مسلسل نہیں کراہ رہا تھا۔ بلکہ مجھے یوں محسوس

ہورہا تھا جیسے کروٹ تبدیل کرنے یا ہلتے جلتے وقت اسے تکلیف پہنچتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ میرے لیے یخنی بھی بنا کر لے آئی تھی۔کالی مرچ اور نمک کے علاوہ اس نے اس میں کچھ نہیں ڈالا تھا۔ایک مرتبہ پھر اس نے میرے چہرے سے لحاف ہٹا کر مجھے اپنے ہاتھوں سے یخنی پلائی۔دیسی چوزے کی یخنی پیتے ہی آہستہ آہستہ میرے پاؤں کی انگلیوں میں بھی درد کا احساس ہونے لگا۔جو اس بات کا مظہر تھا کہ میرے پاؤں پہلے سے بہتر ہو رہے تھے۔

ہاتھوں کا درد تو ختم ہو چکا تھا۔میں بار بار مٹھیاں بھینچ کر ہاتھوں کی ورزش کرنے لگا۔ٹانگوں کا درد بھی آہستہ آہستہ زائل ہو رہا تھا۔

میری سماعتوں میں لکڑیوں کی کھٹ پٹ آنے لگی۔یقیناً وہ انگیٹھی میں مزید لکڑیاں ڈال رہی تھی۔

''تم دونوں اب اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔''انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر وہ چھوٹے بہن بھائی کو مخاطب ہوئی تھی۔

''جی باجی!''انھوں بیک زبان ہی کہا تھا۔لگتا تھا دونوں بہن بھائی کے نزدیک باجی کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔

''باباجان!......قہوہ پئیں گے۔''اس مرتبہ وہ باپ کو مخاطب ہوئی تھی۔

''نہیں بیٹی!......اب بس آرام کرو۔''

اس نے جلدی سے کہا۔''تھوڑا سا پی لینا باباجان!......یوں بھی مہمان کے لیے بنانے لگی ہوں۔''

پہلے ہلدی ملا دودھ، پھر یخنی اور اب گرم قہوہ وہ مسلسل گرم مشروبات میرے معدے میں انڈیل کر سردی کے خلاف میری قوت مدافعت کو بڑھا رہی تھی۔ہمیں بھی سردی سے نمٹنے کے لیے جو طریقے پڑھائے گئے تھے ان میں متاثرہ شخص کے جسم کو گرم کرنے کے لیے گرم ماحول اور لباس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گرم مشروبات پلانے کے بارے بھی ہدایات کی گئی تھیں۔

اس کے باپ نے کہا۔''ٹھیک ہے بیٹی!''اور اس کے قدموں کی آواز کمرے سے باہر جانے لگی۔

اب میرے بازوؤں میں جان پڑ گئی تھی۔ٹانگوں کا درد بھی مدھم ہونے لگا تھا اور پاؤں بھی حرکت کرنے

لگے تھے۔البتہ دونوں پاؤں اور پنڈلیوں میں ہلکا ہلکا درد ضرور محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ لیں بابا جان!'' وہ شاید قہوے کی پیالی اپنے باپ کے حوالے کر رہی تھی۔کراہتی ہوئی آواز میں میں نے شکریہ کے الفاظ سنے اور پھر اس کے قدموں کی آواز میری چار پائی کی طرف بڑھ گئی۔

پہلے کی طرح ہی اس نے مجھے قہوہ بھی پلایا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نرم آواز میری سماعتوں میں گونجی......

''اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''پہلے سے بہت بہتر لگ رہا ہے۔اللہ پاک آپ کو اور آپ کے گھرانے کو دنیا اور آخرت کی عزت اور کامیابی دے۔'' میرے دل سے خلوص بھری دعا نکلی تھی۔

''آمین۔'' کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا شاید اسے میرے دعائیہ انداز پر ہنسی آئی تھی۔وہ تیکھے نقوش اور گہری نیلی آنکھوں والی خوب صورت دوشیزہ تھی۔اس قدر نیلی آنکھیں میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر وہ میرے اتنے قریب ہوئی تھی ورنہ شاید میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔اس کا اور میرا حساب بالکل ڈاکٹر اور مریض کا سا تھا۔

میرے چہرے کو ایک بار پھر ڈھانپ کر وہ کمرے باہر سے نکل گئی۔واپسی پر اس نے میرے چہرے پر سے لحاف اتارے بغیر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سرھانے کے ساتھ کپڑوں کا جوڑا رکھ دیا ہے۔جونہی خود کو اس قابل سمجھو کہ کپڑے پہن سکو یہ پہن لینا۔اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا میں ساتھ والے کمرے میں ہوں اور جاگ رہی ہوں۔''

میں نے لحاف منہ سے اتارے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔''ٹھیک ہے بہن، شکریہ۔''

اس کے جانے کے بھی میں اسی طرح لیٹا رہا۔قریباً گھنٹے بھر بعد ایک بار پھر میری سماعتوں میں قدموں کی چاپ گونجی، جو انگیٹھی کے ساتھ جا کر رک گئی تھی۔لازماً وہ انگیٹھی میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی۔لکڑیاں ڈال کر وہ واپس لوٹ گئی۔میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔لحاف کا کونہ الٹا کر میں نے باہر جھانکا۔وہ کافی بڑا کمرہ تھا۔کمرے کے ایک کونے میں درمیانی سی انگیٹھی لگی ہوئی تھی۔جس میں جلنے والی آگ کی تپش سے کمرے میں خوشگوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔انگیٹھی کے مخالف کونے میں لالٹین لٹکی تھی جس کی زرد روشنی کمرے میں پھیلے

اندھیرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھی۔لالٹین کے نیچے ایک چوڑی چارپائی پڑی تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر شخص لیٹا نظر آیا۔سر کے علاوہ اس کا باقی جسم موٹے لحاف میں پوشیدہ تھا۔اس کے چہرے پر گھنی داڑھی نظر آرہی تھی۔وہ آنکھیں کھولے جانے چھت کی کڑیوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔اس کی چارپائی کے علاوہ بھی کمرے میں تین چارپائیاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پر تو میں لیٹا تھا اور دو چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ان پر بستر بھی نہیں بچھے تھے۔

ایک سرسری نظر کمرے میں دوڑا کر میں نے سرہانے کے ساتھ رکھے کپڑے اٹھائے اور لحاف کے اندر ہی زیریں لباس ڈالنے لگا۔شلوار پہن کر میں اٹھ بیٹھا اور قمیص ڈال کر دوبارہ لحاف میں غائب ہو گیا۔دودھ اور یخنی سے میری بھوک کافی حد تک مٹ گئی تھی مگر اب آہستہ آہستہ دوبارہ بھوک محسوس ہونے لگی تھی،سردی میں یوں بھی بھوک زیادہ لگتی ہے اور مجھے تو کھانا کھائے چوبیس گھنٹے ہونے کو تھے۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں گلگارے بی بی کو نیند سے اٹھا کر کیسے کہتا کہ مجھے بھوک لگی ہے کھانے کو کچھ لاؤ۔پہلے بھی اس نے اتنا کچھ کیا تھا اب وہ غریب سو رہی تھی تو مجھے بھوک لگ گئی تھی۔میں نے اسے آواز نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر میرے اس فیصلے پر اس نے خود ہی پانی پھیر دیا۔وہ دوبارہ انگیٹھی میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی مجھے جاگتے پا کر وہ سر پر دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔میں نے بھی اس کے دلکش سراپے سے نگاہیں پھیر کر مخالف جانب دیکھنے لگا۔وہ میری محسن تھی۔اسے سبب بنا کر اللہ پاک نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے کا موقع عطا فرمایا تھا۔میں اس کی جتنی عزت اور احترام کرتا کم تھا۔یوں بھی مجھے نظروں کی حفاظت کرنا آتا تھا۔آج اگر میں پرائی عزت پر ایسی ویسی نظریں گاڑتا تو یقیناً میری پلوشہ بھی کسی بدنیت کی گندی نظروں کا شکار بنتی۔

انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر وہ لوٹی اور میرے قریب رکتے ہوئے پوچھنے لگی ”کسی چیز کی ضرورت ہے۔“

”نہیں شکریہ۔“

”بھوک تو نہیں لگی؟“ پتا نہیں اس نے میرے بھوکا ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا یا روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”کوئی خاص نہیں،آپ کو زحمت ہو گی۔“ یہ کہتے ہوئے بھی میں اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

”ارے، زحمت کیسی ......ابھی لائی۔“ مجھے محسوس ہوا کہ ایسا کہتے ہوئے وہ متبسم ہوئی تھی۔اپنے انکار پر ثابت قدم رہ کر میں صبح تک پیٹ کا واویلا نہیں سن سکتا تھا۔اس لیے خاموش رہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی ۔ہمارے مکالمے سے اس کے والد کی آنکھ کھل گئی تھی۔یا شاید وہ پہلے ہی سے جاگ رہا تھا اور مجھے سوتا سمجھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔☆

”جوان اب طبیعت کیسی ہے؟......اور کیا ہوا تھا؟“

”الحمد اللہ، ٹھیک ہوں چچا جان!......اور ہونا کیا تھا کل صبح برف باری میں پھنس گیا، بڑی تلاش کے بعد بھی کوئی جائے پناہ نہ ڈھونڈ سکا، یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے، بس اتفاق ہی تھا کہ آپ کے دروازے تک آ پہنچا اور کچھ سانس باقی تھے جو گلگارے بہن کی مدد مل گئی۔اللہ پاک اسے اجر دے، عزت اور سلامتی دے۔“

”آپ کا نام کیا ہے، آپ اس علاقے کے تو نہیں لگتے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔”ذیشان نام ہے اور میں واقعی اس علاقے کا نہیں ہوں۔یہاں مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش کی جستجو لے آئی ہے۔“

”میرا نام شمریز خان ہے اور اگر آپ کے ساتھی گم ہو گئے ہیں تو شاید انھیں ڈھونڈنا اتنا آسان نہ ہو۔“اس نے بلا جھجک حقیقت کا اظہار کر دیا تھا۔

”مگر کوشش تو کرنا چاہیے نا......ناکامی کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بزدلی کہلاتا ہے۔“

اس نے متبسم ہوتے ہوئے پشتو کہاوت بولی۔”کہ غر سومرہ ہم لوڑ وی پہ سر پہ لاروی۔“(پہاڑ جتنا بھی اونچا ہو اس پر چڑھنے کا راستہ ضرور ہوتا ہے) مگر اس کی ہنسی میں بھی تکلیف کا عنصر واضح چھلک رہا تھا۔

”صحیح کہا۔“میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔”ویسے برا نہ منائیں تو پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو ہوا کیا ہے؟“

”بابا جان کو ٹانگ میں گولی لگی ہے۔“چھابے میں گرم روٹیاں اور سالن کا کٹورا رکھے گلگارے بی بی نے اندر داخل ہوتے ہی والد سے پہلے میری بات کا جواب دیا۔

”کب، کیسے؟“میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

’’پرسوں......‘‘ لکڑی کی چھوٹی سی میز پر چھابہ رکھ کر اس نے وہ میز اٹھا کر میری چار پائی کے ساتھ رکھ دی۔’’رنڑا اور ثمر خان گھر سے باہر خشک لکڑیاں چن رہے تھے اسی وقت دو آوارہ گرد وہاں سے گزرے۔ان بدبختوں نے رنڑا کو اکیلا سمجھ کر پکڑنا چاہا، رنڑا چیختی ہوئی گھر کی جانب بھاگی، رنڑا کی چیخیں سن کر بابا جان ہتھیار لے کر باہر نکلے، وہ تینوں میری چھوٹی بہن کا پیچھا کر رہے تھے۔ ابو جان نے فوراً ہوائی فائر کیا، جسے سنتے ہی وہ جوابی فائر کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔ بابا جان بھی ان کے فائر کا جواب دیتے رہے، ان بزدل اچکوں کو تو معلوم نہ ہو سکا مگر اس دوران ابو جان کی ٹانگ میں ایک گولی لگ گئی تھی۔ میں اس وقت باورچی خانے میں تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر میں بابا جان کی مدد کو پہنچی مگر وہ وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ ہم بابا جان کو اٹھا کر اندر لے آئے۔ سہ پہر ڈھلنے کو تھی۔ ہم نے سوچا اگلی صبح بابا جان کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے کہ ایک تو تھوڑی دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا دوسرا خان کلے یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ مگر آج صبح جب ہم آگے جانے کے لیے تیار ہوئے تو موسم خراب ہو گیا اور ہمارا ارادہ پھر دھرے کا دھرا رہ گیا۔‘‘

’’کیا گولی ٹانگ کے اندر ہی ہے؟‘‘ میں نے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

’’جی......‘‘ گلگارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’ہونہہ!‘‘ کہہ کر میں روٹی کا گرم نوالہ توڑ کر منھ کی جانب لے جانے لگا۔ سالن میں اس نے اسی یخنی کو تڑکا لگا کر میرے سامنے رکھ چھوڑا تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے میں نے پوچھا۔’’اب موسم کی کیا صورت حال ہے؟‘‘

’’ہوا تو قریباً رک گئی ہے مگر برف باری جاری ہے۔‘‘ اس نے والد کی چار پائی کے قریب پڑی ہوئی خالی چار پائی پر نشست سنبھال لی تھی۔

’’میرا کچھ سامان باہر رہ گیا تھا۔ کہیں وہ برف ہی میں نہ دب جائے۔‘‘

’’آپ کا پستول تو میں لے آئی تھی، اس کے علاوہ کیا ہے۔‘‘

چند گز پیچھے ڈھلان کی جانب میرا سفری تھیلا اور کلاشن کوف پڑی تھی۔‘‘

’’ابھی لائی۔‘‘ وہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

’’صبح لے آنا......‘‘ میں نے رسمی انداز میں اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گئی

۔میرے روٹی کھانے سے پہلے ہی وہ ہاتھوں میں میرا تھیلا اور کلاشن کوف پکڑے واپس لوٹ آئی تھی۔تھیلے کے اوپر پڑی نرم برف کو اس نے باہر ہی جھاڑ دیا تھا،لیکن خود تھیلے کا مضبوط کپڑا گیلا ہو کر اکڑ گیا تھا۔تھیلے کو انگھیٹی کے سامنے رکھ کر اس نے کلاشن کوف کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔اور خود انگھیٹی کے سامنے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔اس نے موٹا اونی کوٹ پہنا ہوا تھا مگر گرم کمرے سے نکل کر باہر کا رخ کرنے والے سے سردی صحیح حال پوچھتی تھی۔

میں نے ممنونیت سے کہا۔''بہت شکریہ۔''

''ویسے آپ اس طوفان میں کیسے پھنسے؟''اس نے بھی وہی سوال پوچھا جو پہلے اس کا والد پوچھ چکا تھا ۔جواباً میں نے وہی باتیں دہرا دیں جو اس کے باپ کو بتائی تھیں۔اپنی بات کے اختتام تک میں کھانے سے فارغ ہو گیا تھا۔

برتن سمیٹتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔''کچھ اور چاہیے؟''

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔''اگر دودھ والی چائے مل جاتی......''

''کیوں نہیں......''خوش دلی سے کہتے ہوئے وہ باپ کی جانب متوجہ ہوئی۔''بابا جان!......آپ چائے لیں گے۔''

اس نے کراہتے ہوئے کہا۔''بنا رہی ہو تو پی لوں گا۔''

''شمریز چچا!ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہوں گے۔''

''کھل کر کہو ذیشان میاں۔''وہ بس مسکرانے کی کوشش ہی کر پایا تھا۔

''جب تک ٹانگ سے گولی نہیں نکلے گی آپ یونہی تکلیف محسوس کرتے رہیں گے۔بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم مزید بگڑتا جائے گا۔زیادہ وقت گزرنے پر آپ کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

وہ افسردہ لہجے میں بولا۔''جانتا ہوں،مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔جب تک موسم ٹھیک نہیں ہو جاتا ہم خان کلے تک نہیں پہنچ سکتے۔اور گولی بھی نہیں نکل سکتی۔''

میں نے کہا۔''اگر تھوڑی تکلیف برداشت کر لو تو شاید میں بھی یہ گولی نکال لوں۔''

”تکلیف تو اب بھی برداشت کر رہا ہوں۔“

”اس سے تو کچھ زیادہ ہو گی ......لیکن ان شاء اللہ اس کے بعد آرام ضرور آ جائے گا اور آپ کو خان کلے جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“

”مگر آپ یوں بغیر کسی اوزار کے..........میرا مطلب ہے گولی ہے کوئی کانٹا تو نہیں ہے کہ سوئی کے ساتھ نکل آئے۔“اس کے لیے میری آفر حیرانی کا باعث بنی تھی۔

”یہ میرا دردِ سر ہے، آپ برداشت کرنے والے بنیں۔“

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔”سر پر پڑی مصیبت کو جھیلنا پڑتا ہے۔“

”ٹھیک ہے صبح روشن ہونے پر ان شاء اللہ آپ کی ٹانگ سے گولی نکالوں گا۔“یہ کہہ کر میں چارپائی سے اٹھ کر اپنے سفری تھیلے کی جانب بڑھ گیا۔ دیوار سے لٹکی جائے نماز اتار کر میں نے انگھیٹی کے سامنے بچھائی اور اپنا تھیلا کھول کر سارا سامان باہر نکال کر جائے نماز پر رکھنے لگا۔ وہ سفری تھیلا پیراشوٹ کے مضبوط کپڑے کا بنا ہوا تھا اس کے باوجود نمی کا اچھا خاصا اثر اندر پہنچا تھا۔ البتہ تھیلے کے اندر رکھی ہوئی ضروری اشیا چونکہ پلاسٹک کے لفافوں میں بند تھیں اس لیے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ورنہ ابتدائی طبی امداد کے تو سارے سامان نے برباد ہو جانا تھا۔ سامان کو انگھیٹی کے سامنے پھیلا کر رکھنے کے بعد میں نے کلاشن کوف کو بھی مکمل کھول کر اس کے پرزے خشک ہونے کے لیے انگھیٹی کے سامنے رکھ دیے تھے۔ اسی اثناء میں گلگارے چائے کی پیالیوں کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ چائے کی کیتلی کے ساتھ وہ تین خالی پیالیاں لے آئی تھی۔ ہمیں ایک ایک پیالی پکڑا کر اس نے تیسری پیالی میں اپنے لیے چائے انڈیل لی۔

چائے بہت اچھی بنی تھی، بس میٹھا ذرا زیادہ ہو گیا تھا۔ چائے پی کر میں نے گلگارے سے کوئی پرانا خشک کپڑا اور اپنا پستول مانگا۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آمد ایک پرانی زنانہ قمیص اور گلاک نائینٹین کے ساتھ ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ سے پرانا کپڑا لے کر میں نے کلاشن کوف اور پستول کے پرزوں کو اچھی طرح خشک کیا ۔دونوں ہتھیاروں کی میگزینوں سے گولیاں نکال کر انھیں بھی خشک کیا اور تمام سامان کو انگھیٹی کے سامنے مزید

خشک ہونے کے لیے رکھ کر رضائی میں گھس گیا۔گلگارے کافی دیر کی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔شمریز خان بھی اونگھ رہا تھا۔میری بھی آنکھیں بند ہونے لگیں۔رات کے دو بج رہے تھے۔میرے پاس آرام کرنے کے لیے چار ساڑھے چار گھنٹے موجود تھے۔طلوع آفتاب کہیں پونے سات بجے ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن موسم کی صورت حال برقرار رہی۔نماز پڑھ کر میں دوبارہ لیٹ گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد میرے لیے رنڑا ناشتا لے آئی۔وہ چودہ سال کی تھی مگر اچھی صحت کی وجہ سے دیکھنے میں کچھ بڑی ہی لگ رہی تھی۔اس کے معصوم چہرے پر کئی سوال مچل رہے تھے۔ناشتا میرے سامنے رکھ کر اس نے خالی چارپائی پر نشست سنبھال لی ۔اسی وقت اس سے چھوٹا بھائی ثمر خان بھی وہاں پہنچ گیا۔شرماتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بہن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''تو آپ کا نام ثمر خان ہے؟''انھیں مانوس کرنے کے لیے میں نے خود ہی گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

''جی لالا۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اسکول پڑھتے ہو؟''

وہ معصومانہ انداز میں بولا۔''یہاں پر اسکول ہے ہی نہیں ،البتہ مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے جاتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔''کہاں جاتے ہو؟''

''یہیں اپنے گاؤں میں۔''

''کیا یہاں اور گھر بھی ہیں؟''

ثمر خان کے بجائے اس کا باپ شمریز جواب دیتے ہوئے بولا۔''ہاں ذیشان صاحب!...... پہاڑی کے عقب میں ہمارا چھوٹا سا گاؤں ہے خواگا او بو۔قریباً بیس پچیس گھر ہوں گے۔ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جہاں مولوی صاحب بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے ہیں۔''

''اور میری چھوٹی سی بہن رنڑا بھی وہاں جاتی ہے۔''

'میں باجی سے پڑھتی ہوں۔'' میرے مخاطب کرنے پر وہ کھل اٹھی تھی۔ میں تھوڑی دیر دونوں بچوں سے عام سے سوالات پوچھتا رہا، اس دوران ان کی بڑی بہن گلگارے بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ طلوعِ آفتاب کے باعث اچھی خاصی روشنی بھی ہو گئی تھی۔ میں گلگارے کو مخاطب ہوا......

''گلگارے بہن!...... ایسا کرو ایک برتن میں پانی گرم کر کے لے آؤ، صاف نرم کپڑا، قینچی اور ایک لمبی رسی بھی لے آؤ۔''

''خیر تو ہے۔'' میری فرمائش سن کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔

میں مسکرایا۔ ''آپ کے بابا جان کی خیر نہیں ہے۔''

اسے ہنوز حیرانی میں مبتلا پا کر میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شمریز چچا کی ٹانگ سے گولی نکالنا بہت ضروری ہے ورنہ دیر ہونے کے ساتھ زخم کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔''

''کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھو۔''

ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ رنڑا اور ثمر خان کو رسی لانے کا بتا کر واپس مڑ گئی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مطلوبہ سامان پہنچ گیا تھا۔ ان تمام کے ساتھ مل کر میں نے شمریز خان کی چارپائی کو اٹھا کر انگھیٹی کے نزدیک کیا اور ثمر خان کو کمرے کا دروازہ مکمل کھولنے کو کہا تا کہ روشنی ہو جائے۔ سارے انتظامات مکمل ہونے کے بعد میں نے کہا......

''گلگارے بہن!...... آپ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلی جائیں۔''

''شش...... شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے آفر کی۔ یقیناً وہ والد کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ والد اور بیٹی کا بھی عجیب رشتہ ہے، کمزور اور نازک اندام بیٹی کے بس میں ہو تو والد کی تمام تکالیف اپنے ذمہ لے لے۔ حالانکہ بعض باپ اپنی بیٹی کے بہت سارے حقوق کی ادائی میں غفلت برت جاتے ہیں اس کے باوجود بیٹی کے دل سے اپنے باپ کی محبت کم نہیں ہوتی۔

''اچھا بچوں کو باہر بھیج دو۔'' میں اصرار کیے بغیر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یوں بھی آپریشن کے دوران مجھے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شمریز خان کے بدن سے لحاف اٹھا کر میں نے خالی چارپائی پر پھینک دیا۔ اسے گھٹنے سے ذرا اوپر گولی لگی تھی۔ گلگارے یا اس نے خود شلوار کے اوپر ہی سے ایک بڑی چادر زخم پر لپیٹ دی تھی۔ جس کے لپیٹنے کا بس اتنا فائدہ ہوا تھا کہ خون کا بہاؤ رک گیا تھا۔ ان کا جانے انجانے میں کیا ہوا یہ کام شمریز خان کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔ میں نے زخم پر بندھی پٹی کھول کر قینچی سے اس کے زخم پر موجود شلوار کا بڑا سا ٹکڑا کاٹ دیا تا کہ زخم کے علاج میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ابتدائی طبی امداد کے سامان میں میں نے فورسپ بھی رکھا تھا۔ اس باریک منھ والا آلے سے جسم میں موجود گولی کو پکڑ کر نکالا جا سکتا ہے۔ آپریشن کرنے والے سرجن کے پاس تو کئی قسم کے فورسپ ہوتے ہیں لیکن ہم جیسوں کو تو بعض اوقات کسی باریک دھار کے خنجر سے بھی یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ البتہ خنجر اور فورسپ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ خنجر سے زخم کا منھ بھی چر جاتا ہے اور خنجر سے کام لینے والے کو اس کام میں زیادہ ماہر بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ خنجر کی نوک سے ٹٹول کر گولی کو محسوس کرنا اور پھر نوک ہی کی مدد سے گولی کو زخم سے باہر نکالنا نہایت دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد تکلیف میں مبتلا شخص کی کراہنا اور سسکنا ہوتا ہے۔ گو طبی لحاظ سے خنجر سے گولی نکالنا شاید سراسر غلط ہو، اس طرح متاثر شخص کو اس طریقہ کار سے بھی بہت زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ وقتی تکلیف بعد میں ہونے والی معذوری یا زخم کے ناسور میں تبدیل ہونے کی اذیت سے بہت بہتر ہوتی ہے۔

زخم کو دھونے سے پہلے میں نے شمریز خان کو مخصوص طریقے سے باندھ دیا تا کہ وہ تکلیف کی وجہ سے ہل جل کر خود کو مزید زخمی نہ کرا بیٹھے۔ اسے باندھنے کے بعد میں نے گرم پانی سے اس کا زخم دھویا اور زخم پر تھوڑی سپرٹ بھی ڈال دی۔ دھونے اور سپرٹ سے خون کا بہاؤ پھر جاری ہو گیا تھا۔ کپڑے کا ایک گولا بنا کر میں نے شمریز خان کے حوالے کیا تا کہ وہ دانتوں میں دبا کر اپنی چیخ روکنے کی کوشش کر سکے۔ اس کے بعد فورسپ کو اسپرٹ سے تر کر کے میں آپریشن کے لیے تیار تھا۔

پہلی مرتبہ مجھے پلوشہ کے بدن سے گولی نکالنا پڑی تھی اور اسے تکلیف میں مبتلا دیکھ کر میرے ہاتھوں میں لرزش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن آج مجھے کسی قسم کی جھجک یا پریشانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اطمینان سے اپنا کام

کرنے لگا۔

فورسپ کو زخم کے اندر ڈالتے ہی شمریز خان کی مٹھیاں اذیت کی زیادتی سے بھینچ گئی تھیں۔ سختی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے منھ سے درد بھری سسکیاں نکل رہی تھیں۔ گلگارے نے بے ساختہ اس کا سر سہلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ باپ کے زخم کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔ کافی ہمت اور حوصلے والی ہونے کے باوجود اس میں اتنی ہمت مفقود تھی کہ براہ راست آپریشن ہوتا دیکھ سکتی۔ ایسا منظر کم لوگ ہی دیکھ پاتے ہیں۔ وہ پلوشہ ہی تھی جو گلگارے سے بھی عمر میں سال دو سال چھوٹی ہوگی اور دیکھنا تو چھوڑ وہ خود اپنے ہاتھوں یہ کام کر گزرتی تھی۔

فورسپ کی نوک کا گولی سے ٹکرانا مجھے محسوس ہو گیا تھا۔ گولی کو احتیاط سے فورسپ کے منھ میں پکڑ کر میں نے آہستگی سے آلے کو باہر کھینچ لیا۔ گولی کے باہر آتے ہی شمریز خان نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے دانتوں میں پکڑا کپڑا زبان کی مدد سے باہر دھکیلا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منھ سے گہرا سانس خارج ہوا۔

میں نے صاف کپڑا زخم کے منھ پر دبا کر بھل بھل بہتے خون کو روکا اور گلگارے کو کہا۔

”والد کے جسم سے رسی کھول لو۔“

میرے اچانک پکارنے پر وہ ہڑبڑا سی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھیمے لہجے میں۔ ”جی۔“ کہا اور رسی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے رسی کھولنے تک میں نے زخم کے منہ پر پٹی کو دبائے رکھا۔ جونہی وہ رسی کھول کر فارغ ہوئی میں نے کہا......

”اس پٹی کو یہاں دبا کر رکھو۔“

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ میرے قریب ہوئی۔ میں نے پیچھے ہو کر اسے زخم پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دی اور خود دوائیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے صاف کپڑے سے مناسب لمبائی میں دو تین پٹیاں پھاڑیں۔ پھر پائیوڈین کی بوتل کھول کر میں نے گلگارے کو پیچھے ہٹنے کو کہا۔

زخم پر تھوڑی سی پائیوڈین ڈال کر ساتھ ہی درد کش اور خون کے بہاؤ کو روکنے والا سفوف زخم میں بھر دیا۔ اس کے اوپر ایک پٹی تہہ کر کے رکھتے ہوئے میں نے دوسری پٹی زخم پر لپیٹ دی۔ پٹی سے فارغ ہو کر میں نے درد کش ٹیکہ تیار کر کے شمریز خان کو پہلو کے بل لٹایا اور جسم کے پر گوشت حصے میں وہ ٹیکہ لگا دیا۔ اس کے بعد اینٹی

بائیوٹک ٹیکہ بھی اس کی رگ میں لگا کر میں اس سے حال پوچھنے لگا۔

''کافی بہتر محسوس ہورہا ہے، درد بھی ختم ہونا شروع ہوگیا ہے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' گلگارے نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ تو شاید ہماری مدد کرنے آئے تھے، میں سمجھ رہی تھی ہم آپ کی مدد کررہے ہیں۔''

''گلگارے بہن!......آپ نے تو مجھے نئی زندگی دی ہے۔میں نے جو کام کیا ہے یہ آج نہیں تو کل پرسوں تک ڈاکٹر صاحب نے کردینا تھا۔اور یقیناً وہ مجھ سے بہت بہتر انداز میں یہ کام سرانجام دیتا۔''

''پتا نہیں موسم نے کب ٹھیک ہونا ہے۔اور ڈاکٹر صاحب کوئی کلومیٹر بھر کے فاصلے پر تو نہیں بیٹھا کہ ہم آسانی سے وہاں پہنچ جائیں۔اس علاقے میں ڈاکٹر صاحب تک مریض کو لے جاتے ہوئے مریض کی جو حالت ہوتی ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔اور باباجان کی طرح زخمی آدمی کا تو ستیاناس ہوجاتا ہے۔گولی نکالنے کے لیے بھی ڈاکٹر صاحب کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے طلب کرتا ہے۔دوائیوں کا خرچ ایک علیحدہ مسئلہ ہوتا ہے۔آپ نہیں جانتے آپ نے ہمیں کتنی پریشانیوں سے چھٹکارا دلایا ہے۔''

میں نے مزید تکرار سے بچتے ہوئے کہا۔''مجھے خوشی ہوئی کہ میں اپنی چھوٹی بہن کے کسی کام آیا۔'' یہ کہہ کر میں گرم پانی سے اپنے ہاتھ اور فورسپ کو دھونے لگا۔وہ اپنے والد کے سرہانے کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی تھی۔تمام سامان سنبھال کر میں نے شمریز خان کو کھلانے کے لیے دردکش اور اینٹی بائیوٹک گولیاں گلگارے کی طرف بڑھادیں۔اور ساتھ ہی اسے گولیاں کھلانے کی ترتیب بھی بتادی۔

رنڑا اور ثمر خان ساتھ والے کمرے کے دروازے سے بار بار متجسس ہوکر جھانک رہے تھے۔

''آپ دونوں بھی آجاؤ۔'' میں نے انھیں آواز دی اور وہ بھاگ کر اندر آگئے۔رنڑا تو آتے ساتھ باپ سے لپٹ گئی تھی۔

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹی!'' وہ اس کا سر تھپتھپانے لگا۔اللہ پاک کی قدرت بھی عجیب ہے۔یقیناً ان معصوم لڑکیوں نے اپنے باپ کی تکلیف دور ہونے کے لیے خلوص دل سے دعا کی ہوگی اور وہ عظیم رب مجھ جیسے گناہ گار کو ان کی مدد کے لیے اس انداز میں گھسیٹ کر وہاں تک لے آیا تھا۔ورنہ اس سے پہلے میں کبھی بھی کسی

غار وغیرہ کی تلاش میں اتنا سرگرداں نہیں رہا تھا۔ان پہاڑوں میں گھنٹے ادھ گھنٹے کی تلاش کے بعد ہی کوئی نہ کوئی پناہ گاہ مل جایا کرتی تھی۔گزشتہ دن میں شام تک پاگلوں کی طرح پھرنے کے بعد بھی کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔انھیں باتیں کرتا چھوڑ کر میں اپنی کلاشن کوف اور پستول کے ساتھ مصروف ہو گیا۔شاید گلگارے میری ہی جانب متوجہ تھی کہ جونہی میں نے کلاشن کوف کے پرزوں کو ہاتھ لگایا وہ فوراً بولی۔

''اگر چاہیے ہو تو گھر میں رائفل کا تیل پڑا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔''میں خوش ہو گیا۔

''ابھی لائی۔''وہ سر ہلاتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔اس کی واپسی ایک درمیانے حجم کی پلاسٹک کی بوتل کے ساتھ ہوئی جس میں ہتھیاروں پر لگانے والا تیل بھرا تھا۔یہ تیل ہتھیار کے پرزوں کو زنگ وغیرہ لگنے سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور چال والے پرزوں کی حرکت میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔

''شکریہ۔''کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ سے تیل کی بوتل پکڑ لی۔

☆......☆......☆

سہ پہر تک برف باری رک گئی تھی۔لیکن بادل اب تک ویسے ہی موجود تھے۔میں اس وقت انگیٹھی کے سامنے نمک ملے گرم پانی کی ادھ بھری بالٹی میں پاؤں ڈبوئے بیٹھا تھا۔گزشتہ کل میرے پیروں کو جس سردی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا اثر اب تک ہلکے ہلکے درد کی صورت میں موجود تھا۔اور اس درد کا بہترین حل نمک ملا گرم پانی ہی تھا۔

گلگارے اپنے والد کا سر دبا رہی تھی۔اسے اچھا خاصا بخار ہو گیا تھا۔میں نے سر درد اور بخار والی گولی بھی اسے کھلا دی تھی۔رنڑا اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے گھر سے باہر نکل گئی تھی۔اچانک وہ بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔

''بب......باجی،اس دن والے آدمی اس طرف آرہے ہیں۔ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی ہیں۔''یہ بتاتے ہوئے اس کے معصوم چہرے پر خوف کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

لڑکیوں کی جنس ایسی ہے کہ انھیں مردوں کے گندے ارادے کے بارے فوراً ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ دو روز پہلے ان ظالموں نے اس معصوم کو غلط نیت ہی سے پکڑنا چاہا تھا اور آج ان کی آمد پر وہ ایک دم سہم گئی تھی۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اسی کے لیے لوٹے ہوں گے۔ حالانکہ اس سے بڑی بہن بھی موجود تھی، مگر ان موذیوں کی نظر ابھی تک گلگارے پر نہیں پڑی تھی۔

"دروازہ بند کر دیا ہے نا، ثمر خان کہاں ہے؟" گلگارے نے اطمینان بھرے انداز میں پوچھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ذرا بھر بھی خوف نظر نہیں آیا تھا۔

"میں یہیں ہوں باجی۔" دروازے کی طرف سے ثمر خان کی آواز آئی۔

میں نے اپنے پاؤں بالٹی سے نکالے اور تولیے سے صاف کر کے جرابیں ڈالنے لگا۔ جونہی میں نے بوٹوں میں پاؤں ڈالے وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔ "آپ کیوں تیار ہونے لگے۔"

"شاید آنے والے مہمانوں سے کوئی بات چیت کرنا پڑ جائے۔"

"آپ ان کی فکر نہ کریں، برساتی مینڈکوں کی طرح یہ اچکے بھی برف باری کے دنوں میں نمودار ہو جاتے ہیں...... اس سے پہلے بھی دو تین بار ان جیسوں سے واسطہ پڑ چکا ہے، حد درجہ کے بزدل ہوتے ہیں۔ ہوائی فائر سن کر بھی بھاگنے میں دیر نہیں لگاتے۔"

"تو اب کیا کریں، یونھی دروازہ بند کر کے بیٹھے رہیں۔"

"نہیں، دو تین گولیاں تو ضائع کرنا پڑیں گی۔ میں مورچے پر چڑھتی ہوں۔" والد کا سر دبانا چھوڑ کر وہ دیوار میں کیل کے سہارے ٹنگی کلاشن کوف اتارنے لگی۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے اپنی طرف دیکھتی گلگارے کو آنکھوں سے استفہامیہ اشارہ کیا۔

وہ فوراً بولی۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے دروازہ کھولنے کی، میں مورچے پر چڑھ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ مورچے پر پہنچیں، میں دروازے پر جا کر ان سے وجہ پوچھتا ہوں، ہو سکتا ہے مسئلہ بات چیت سے حل ہو جائے۔"

”یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔“

”پھر بھی پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔اپنی گولیاں اور توانائی خواہ مخواہ ضائع نہ کرو۔“ گلگارے کو کہہ کر میں نے گلاک نائینٹین کاک کر کے ہاتھ میں تھاما اور گرم چادر اوڑھتے ہوئے رنڑا کو کہنے لگا۔”تم کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردو۔“

”جی لالا۔“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔گلگارے بھی مزید تکرار کیے دوسرے کمرے میں لگی سیڑھی کی جانب بڑھ گئی جس کے ذریعے وہ چھت پر بنے مورچے میں پہنچ سکتی تھی۔

وقفے وقفے سے ان کا دستک دینا جاری تھا۔دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے رسمی انداز میں پوچھا ۔”کون؟“

”دروازہ کھولو۔“ میری نرم آواز نے اسے لہجہ سخت کرنے کی شہہ دی تھی۔

دروازے میں بنی ذیلی کھڑکی کی کنڈی کھول کر میں باہر نکلا،ان میں سے دو دروازے کے قریب جبکہ تین چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے تھے۔دستک دینے والوں میں ایک کے ہاتھ میں ایٹ ایم ایم اور دوسرے کے ہاتھ میں کلوز بٹ کلاشن کوف تھی،جبکہ تھوڑی دور کھڑے افراد میں دو کے ہاتھ میں تیس بور پستول اور ایک نے سنگل بیرل بارہ بور اٹھائی ہوئی تھی۔

”جی۔“ سلام ودعا اور مصافحے کے بغیر میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”میں طالبان کمانڈر ہوں اور پرسوں اس گھر سے میرے آدمیوں پر فائر کیا گیا ہے۔“ گھنے گھنگریالے بال ،لمبی مونچھوں اور ہلکی داڑھی والے ایک آدمی نے دھمکی آمیز لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

”تو جن پر گولیاں چلائی گئیں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت وہ کس عبادت کی بجا آوری کی کوشش میں تھے۔“ میں نے بہ ظاہر عام سے انداز میں کہا۔میرے لہجے سے غصے یا خوف کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

”ایسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔وہ اپنے راستے پر جا رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے انھیں دیکھا اور ڈر کر گھر کی طرف بھاگ پڑی۔حالانکہ انھوں نے لڑکی کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔“

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔”جانتے ہو جھوٹ بولنے کے لیے بھی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔“

اس کے ساتھ کھڑا دوسرا آدمی بپھر کر بولا۔ ’’جھوٹ نہیں بول رہے، تم ذرا اس لڑکی کو باہر بلاؤ‘‘

’’وہ میری چھوٹی بہن ہے اور اس نے ان بزدلوں کا جو حلیہ بتایا ہے وہ بالکل تم دونوں جیسا ہے۔ تمھاری خوش قسمتی کہ اس دن تم بچ نکلے، مگر یقین مانو خوش قسمتی ہمیشہ ساتھ نہیں دیا کرتی۔‘‘

’’دھمکی دے رہے ہو؟‘‘ خود کو کمانڈر بتانے والے کا غصہ دیدنی تھا۔

’’نہیں۔‘‘ میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ’’جان بچانے کا موقع دے رہا ہوں۔‘‘

’’یقیناً تم ہم سے واقف نہیں ہو ورنہ بڑھکیں مارنے کے بجائے اپنی جان بچانے کا سوچتے۔‘‘

میں متبسم ہوا۔ ’’جانتا نہ ہوتا تو شاید کچھ اہمیت دے بھی دیتا۔‘‘

’’چلو تعارف کرا دیتے ہیں۔‘‘ اس نے کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتاری۔ اس کے ساتھی نے بھی ایٹ ایم ایم رائفل ہاتھ میں تھام لی تھی۔ اچانک ہی ماحول دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ مسلسل تین گولیاں چلائی گئی تھیں اور ساری گولیاں خود کو کمانڈر کہنے والے کلاشن کوف بردار کے سامنے زمین میں لگی تھیں۔

دھماکے کی آواز سنتے ہی وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نظریں مکان کے سامنے والی دیوار کے دائیں کونے میں بنے مورچے کی طرف اٹھیں جہاں سے کلاشن کوف کی بیرل جھانک رہی تھی۔ گلگارے نے اپنا کالا دوپٹا پگڑی کے انداز میں سر پر باندھ کر اس کا ایک پلو چہرے سے بھی لپیٹ لیا تھا ۔مورچے کے ہول سے کلاشن کوف کی بیرل کے ساتھ اس کے چہرے کی بھی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں سے وہ ایک مرد ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے با اعتماد فائر نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کلاشن کوف کا استعمال جانتی تھی۔ میں نے بھی چادر کے نیچے چھپایا پستول باہر نکال لیا تھا۔

ایک دو لمحے مورچے کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھنے کے بعد نام نہاد کمانڈا اپنے ساتھیوں کو بولا۔

’’چلو پھر کبھی سہی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے مڑا۔

’’بات سنو۔‘‘ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’اگر دوبارہ اس گھر کی طرف آنا ہو تو اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتا کر آنا، کیونکہ واپسی کے لیے تمھیں ان کے کندھوں کی ضرورت پڑے گی۔‘‘

’’دیکھ لوں گا تمھیں۔‘‘ گیدڑ بھبکی دیتے ہوئے وہ دوبارہ چل پڑا تھا۔

”اگر میرے پانچ گننے تک یہ غائب نہ ہو جائیں تو سب سے آخر والے کو گولی مار دینا۔“ گلگارے کی جانب رخ کر کے میں نے اس کا نام لیے بغیر کہا۔اس کے ساتھ ہی میں نے زور سے۔”ایک“ پکارا تھا۔

ان سورماؤں کی ٹانگوں میں ایک دم جان پڑ گئی تھی۔میرے تین کہنے تک وہ ڈھلان سے اتر کر میری نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔

میں مسکراتے ہوئے واپس مڑ گیا۔میرے کمرے میں داخل ہونے تک گلگارے بھی نیچے آ گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھل رہی تھی۔کلاشن کوف کو دیوار کے سہارے کھڑا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”دیکھ لی ان کی بہادری۔“

”یقیناً آپ کی نشانہ بازی سے ڈر کر بھاگنے پر مجبور ہوئے ہیں۔“

رنڑا نے فوراً کہا۔”ہاں لالا جی!......باجی کا نشانہ بہت اچھا ہے۔بابا جان سے بھی اچھا ہے۔“

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”خاک اچھا ہے،اتنے قریب سے بھی تین گولیاں چلا کر ان لٹیروں کو نشانہ نہیں بنا پائی۔“

”مرد کبھی بھی یہ بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا کہ کوئی عورت اس سے بہتر انداز میں ہتھیار کو استعمال کر سکتی ہے۔“میرے مذاق کو جانے کیوں اس نے سنجیدگی سے لے لیا تھا۔

”گلگارے بہن!......میں مذاق کر رہا تھا۔“میں نے فوراً ندامت ظاہر کی۔

”میں نے بھی آپ کی بات نہیں کی،ایک تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔“وہ میری ندامت کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔

”ضروری تو نہیں کہ اپنے والد سے اچھی نشانہ باز لڑکی،ہر مرد سے بہتر ہو......یقیناً آپ سے بہتر کئی مرد نشانہ باز دنیا میں موجود ہوں گے۔“نہ جانے کیوں مجھے اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

”آ جائیں،آپ بھی تو مرد ہی ہیں نا۔“اس نے مجھے للکارنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا۔

”میں نے اپنے بارے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔“میں نے پسپا ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”جس دن خود سے بہتر نشانے باز نظر آ گیا مجھے ضد پر جری نہیں پاؤ گے۔“

اسی وقت خاموش لیٹے شمریز خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ”گلگارے تو میرا بیٹا ہے بیٹا ہے۔“

”نہیں بابا جان!......میں آپ کی بیٹی ہوں اور مجھے عورت ذات ہونے پر فخر ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا اور باپ کے سرہانے کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

”شمریز چچا!......آپ کو یقین ہے کہ یہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔“

”ذیشان صاحب، ہمارے علاقے میں مختلف پارٹیاں سرگرداں رہتی ہیں، ان میں مجاہدین، اسمگلر، شکاری، چور اچکے، دہشت گرد، ناقابل معافی جرم کر کے چھپنے کی غرض سے یہاں آنے والے وغیرہ۔ ان سب کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی مصیبت ازبک اور تاجک دہشت گرد ہوتے ہیں جو پورے پورے گاؤں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہمارا گاؤں کچھ زیادہ اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے اس لیے کوئی ایسا گروپ اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ البتہ چھوٹے موٹے چور اچکے جو تین تین چار چار کی تعداد میں پھر رہے ہوتے ہیں آئے روز تنگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی عموماً اس جگہ ہاتھ ڈالتے ہیں جہاں انھیں مزاحمت نہ ہونے کا یقین ہو۔ البتہ کسی خاص چیز کے لالچ میں یہ دو تین بار کوشش ضرور کرتے ہیں اور ایسی حالت میں کبھی جان سے جاتے ہیں کبھی وہ چیز حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے پاس ایسی کون سی خاص چیز ہے جس کے پیچھے انھیں بار بار آنے کی زحمت کرنا پڑے۔“

میرے دماغ میں فوراً رنڑا کا نام گونجا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی ایسی کھلتی ہوئی کلی تھی جس کے پیچھے ہوس کے پجاری، بھیڑیوں کی طرح دانت نکوسے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ مجھے ان کی گفتگو بھولی نہیں تھی۔ گفتگو کی ابتداء ہی میں انھوں نے رنڑا کو بلانے کی بات کی تھی۔ اور کسی بھی جنسی مریض کے لیے سب سے اہمیت کی حامل ایسی لڑکی ہوتی ہے جس پر اس کا دل آ جائے۔ مجھے بھی ان درندوں سے یہی خدشہ تھا کہ ان میں کسی کا ایک دل رنڑا پر آ گیا تھا اور اب وہ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے۔ گندگی بھرے ذہن کی سوچوں کو کلاشن کوف کی گولی ہی صاف کر سکتی ہے۔ میں انھیں واپس جانے دینے کے فیصلے پر پچھتانے لگا۔ اپنے خیالات میں میں شمریز خان یا گلگارے کو حصہ دار نہیں بنا سکتا تھا۔ نہ یہ ایسے اندیشے تھے جن پر کسی لڑکی کے باپ سے تبادلہ خیال کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے ان کی خوش فہمی برقرار رکھتے ہوئے چپ سادھ لی تھی۔

مجھے خاموش پا کر شمریز خان پوچھنے لگا۔ ’’کن خیالوں میں کھو گئے ہو۔‘‘

’’بس یہ سوچ رہا تھا کہ وہ خبیث دوبارہ کس لیے لوٹے تھے۔‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ نہ کچھ اندیشے ان کے دماغ میں ابھارنے چاہے۔

خاموش بیٹھی گلگارے بولی۔ ’’کیونکہ پہلے انھیں خاطر خواہ طریقے سے خوش آمدید نہیں کہا گیا تھا۔‘‘

’’بہر حال کچھ بھی ہو میرے جانے کے بعد آپ لوگ محتاط رہنا۔‘‘

’’میرا خیال ہے ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ باقی دو دنوں میں ہمیں آپ کی عادت نہیں پڑ گئی کہ آپ کے جانے کا دکھ یا کمی محسوس ہو۔‘‘

گلگارے نے کافی تلخ مگر مبنی بر حقیقت بات کہی تھی۔ اور ایسی سچی بات کو ہضم کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ مگر وہ میری محسن تھی اور میں اسے سخت جواب دے کر اس کا دل نہیں دکھا سکتا تھا۔

میں نے۔ ’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔‘‘ کہہ کر چپ سادھ لی تھی۔

☆......☆......☆

رات کو کھانے کے خالی برتن میرے سامنے سے اٹھاتے ہوئے گلگارے دھیمے لہجے میں بولی۔ ’’میں اپنی سہ پہر کی گفتگو پر معذرت خواہ ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بہنوں کا بھائیوں سے معذرت کرنا عجیب سا لگتا ہے۔‘‘

’’صحیح کہا۔ میرا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔‘‘ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ’’بہر حال میں نادم ہوں۔‘‘ نجانے کیوں مجھے اس کا انداز معنی خیز لگا تھا۔

برتن سمیٹ کر وہ باہر نکل گئی جبکہ میں شمریز خان سے طبیعت کا پوچھنے لگا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا اس لیے سردی تھوڑی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ گلگارے باورچی خانے میں برتن رکھ کر واپس لوٹ آئی۔ باپ کو گولیاں کھلا کر وہ اس کا سر دبانے لگی۔ میں لحاف میں چھپ گیا۔ ایک لڑکی کی موجودی میں مجھے تھوڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا رواج مہمان کو بیٹھک میں سلانے کا تھا، لیکن وہاں

میں جس حال میں پہنچا تھا اس کی وجہ سے مجھے گھر کے اندر جگہ مل گئی تھی اور پھر گھر کے سربراہ کا علاج کرنے کی وجہ سے انھوں نے مجھے بیٹھک کی راہ نہیں دکھلائی تو میرا بھی کچھ حق بنتا تھا۔ سیانے کہتے ہیں کسی کے گھر مہمان بنو تو اپنی نظروں کی حفاظت کرو۔ گو میں گلگارے کو بہن ہی کہتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے تھوڑا سا خود میں سمٹنے کی ضرورت تھی۔ یوں بھی موسم کو صاف دیکھ کر میں نے صبح آگے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں کوئی سیر سپاٹے کے لیے نہیں آیا تھا کہ وہاں کچھ دن گزارنے کی کوشش کرتا۔ مجھے بہت اہم کام درپیش سے تھے۔ سب سے بڑھ کر اپنی پلوشہ کو تلاش کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری شریک حیات آگ وخون کی جنگ کا مزید حصہ بنے۔

پلوشہ کا نام ذہن میں آتے ہی میری سوچیں اسی کی ذات پر مرتکز ہو گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بچھڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اس کے ساتھ گزرے پل کسی سہانے سپنے کا حصہ لگ رہے تھے۔ اس کا روٹھنا، منانا، اس شوخیاں، شرارتیں اور چنچل پن، اس کی محبت بھری گفتگو۔ میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنے کا جنون۔ اس کی ہر ادا، ناز نخرا اور دلربانہ انداز میرے دماغ کے پردہ سکرین پر فلم کی طرح چلنے لگا۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے میں نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب گیا۔ جہاں ہر رات کی طرح اپنی آغوشِ محبت وا کیے وہ مجھے بے صبری سے اپنی منتظر نظر آئی۔

''راجو!......بھول تو نہیں گئے ہو اپنی لاڈلی کو۔'' اس نے شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

میں نے چاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ''چندا، سانس لینا بھی کوئی بھول سکتا ہے۔''

''چل جھوٹے۔'' وہ ناز بھرے انداز میں مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح بستر سے نکلنے سے پہلے ہی ہوا کی سائیں سائیں مجھے وہاں مزید رکنے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ بے وقت کی برف باری میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ وزیرستان میں برف باری عموماً دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع ہوتی ہے۔ اور اب نومبر کے وسط میں ہونے والی برف باری نے اچھا خاصا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے شمریز خان کی پٹی تبدیل کی۔ اب اس کے زخم میں پہلے جتنا درد نہیں تھا۔ گولیاں وغیرہ گلگارے نے اسے کھلا دی تھیں۔

ظہر کے بعد برف باری تو جاری رہی البتہ ہوا رک گئی تھی۔ میں رنڑا اور ثمر خان کو لے کر خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا۔ گلگارے نے مجھے منع کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کی بات کو درخورِ اعتناء نہ جانا۔ یونھی بے کار بیٹھا رہنا مجھے پسند نہیں تھا۔

برف ڈیڑھ دو فٹ کے قریب پڑ چکی تھی۔ سپورٹس شوز پہن کر اس برف میں چلنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے شمریز خان کے بوٹ ڈال لیے تھے۔ لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ واپسی پر ہم تینوں کے سر پر لکڑیوں کے گٹھے تھے۔ آتے جاتے ہوئے راستے میں اور لکڑیاں اکٹھی کرنے کے دوران رنڑا کی زبان مسلسل چلتی رہی تھی۔ اپنے گھر، گاؤں، والد بہن، سہیلیوں وغیرہ کے بارے اس نے کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا تھا۔ اپنی گلگارے باجی سے وہ بہت متاثر تھی اور اسی کی طرح بننا چاہتی تھی۔

خشک لکڑیاں رکھنے کے لیے انھوں نے ایک بڑا کمرہ مختص رکھ چھوڑا تھا۔ وہ کمرہ آدھے سے زیادہ لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لکڑیاں وہاں رکھ کر رنڑا اور ثمر خان تو چھت پر چڑھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کے بنے ہوئے مخصوص پھاوڑے تھے جن کی مدد سے وہ چھت پر پڑی برف اتارنے لگے۔ کہ چھت پر پڑی برف چھتوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ گلگارے باورچی خانے میں مصروف نظر آئی۔ دروازے پر رک کر میں نے پوچھا......

"چائے مل جائے گی۔"

اس نے خوش دلی سے کہا۔ "ضرور ملے گی۔ آئیں، یہیں بیٹھ کر پی لیں۔"

مجھے وہاں بیٹھنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا مگر اس نے دعوت اس خلوص سے دی تھی کہ میں ٹھکرا نہ سکا۔ لکڑی کی چوکی پر میں چولھے کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ غالباً شام کے لیے سالن تیار کر رہی تھی۔ ہانڈی چولھے سے اتار کر اس نے چھوٹی سی دیگچی چڑھا دی۔ ایک دوسرے پتیلے میں گائے کا تازہ دودھ رکھا تھا۔ ان کی اپنی دو گائیں اور دس پندرہ بکریاں تھیں۔

میں نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ "ویسے آپ لوگ اگر گاؤں ہی میں رہتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا۔ ان لچے لفنگے آوارہ گردوں سے بھی جان چھوٹ جاتی اور لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے میں اور کئی مسائل بھی حل ہو

جاتے۔“

”ہم پہلے گاؤں ہی میں رہتے تھے۔ابھی دوسال ہوئے ہیں یہاں گھر بنائے ہوئے۔گاؤں والا گھر بھی اب تک موجود ہے۔اور گاؤں اتنی دور بھی نہیں ہے کلومیٹر ڈیڑھ کا تو فاصلہ ہے،صبح موسم میں تو دن میں دوتین بار چکر لگ جاتا ہے۔“

”پھر بھی یہاں گھر بنانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”ایک تو یہاں پانی کا چشمہ بالکل ہی ساتھ ہے،دوسرا یہ ہماری اپنی زمین ہے یہاں اخروٹ کے پندرہ بیس درخت ہیں جن کی نگرانی ہم یہاں رہتے ہوئے آسانی سے کر سکتے ہیں،خشک لکڑی بھی وافر موجود ہے ،گاؤں میں رہتے ہوئے تو ہمیں لکڑی لینے کے لیے یہیں آنا پڑتا تھا۔اب ہماری دیکھا دیکھی ماموں جان بھی یہیں گھر بنانے کی سوچ رہے ہیں۔شاید آنے والی گرمیوں میں وہ کام کی ابتدا کر دیں۔“اس نے وہاں گھر بنانے کی وجوہات پر مفصل روشنی ڈالی۔

”ہونہہ!......مطلب میرا مشورہ ٹھیک نہیں تھا۔“

چائے کی پیالی میری جانب بڑھاتے ہوئے وہ مسکرائی ۔”خیر اتنا بھی برا نہیں تھا کہ آپ پریشان ہو جائیں۔“

”اور کوئی نئی تازی۔“میں نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی تھام لی۔

ہانڈی دوبارہ چولھے پر چڑھا کر اس نے اپنی پیالی اٹھائی اور دھیمے لہجے میں کہنے لگی۔”ہمارے گاؤں کے ایک آدمی نصیر خان نے مجھ سے اپنے بیٹے کا رشتہ کرنے کے لیے بابا جان کو دس لاکھ کی آفر کی ہے،جبکہ بابا جان پندرہ لاکھ مانگ رہے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔وہ کوئی ایسی معلومات نہیں تھی جو ایک جوان لڑکی کسی اجنبی لڑکے کو بتا پاتی۔مجھے اس کی بات کا کوئی مناسب جواب بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

”شاید میری بات آپ کو بری لگی ہے۔“مجھے خاموش پا کر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے؟''میں نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکائی۔''اور یوں بھی بہنوں کی کوئی بات بھائیوں کو بری نہیں لگا کرتی۔''

''اوہ......چائے میں چینی ڈالنا تو بھول ہی گئی تھی۔''صفائی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے وہ چینی کا ڈبہ کھولنے لگی۔''آپ نے بھی ذکر نہیں کیا۔''

''میں کم چینی پیتا ہوں محسوس ہی نہ ہوا کہ چینی بالکل نہیں ہے۔''

''کیا آپ مجاہدین کے ساتھی ہیں۔''چمچ سے چینی حل کرتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر یہاں آپ کی آمد کا مقصد؟''

''بتایا تو تھا کہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔''

''ہاں بتایا تو تھا، مگر اس روکھے پھیکے اور جان چھڑانے کے انداز میں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا۔''

''کیسا اندازہ؟''میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہی کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے کیوں، پھر وہ آپ سے بچھڑے کیسے اور اب افغانستان جیسے دشوار گزار ملک میں انھیں ڈھونڈیں گے کیسے، آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

''شاید یہ سب جاننا آپ کے لیے ضروری نہ ہو۔''میں نے جان چھڑانا چاہی۔

اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''کسی بھی آدمی کی ضروریات اور ترجیحات کو وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے۔''ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت نپی تلی اور بامعنی گفتگو کرتی تھی۔

''میری کہانی بہت لمبی ہے۔''

''جب دادی جان زندہ تھیں، میں روزانہ سونے سے پہلے ان سے کہانی سنا کرتی تھی۔اور ہمیشہ اس بات پر شاکی رہتی کہ ان کی کہانی اتنی جلدی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔آپ بھی اپنی کہانی مختصر کر کے سنانے کی کوشش نہ کرنا۔''

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھلنے لگا۔

”اچھا رات کو سب کچھ بتا دوں گا فی الحال میں رنڑا اور ثمر خان کا ہاتھ بٹا دوں۔“ وہ چھتیں صاف کر کے صحن میں اتر آئے تھے۔

”وہ صفائی کر لیں گے۔“ گلگارے نے مجھے منع کیا۔

”اگر میں بھی ان کی تھوڑی سی مدد کر لوں تو یقیناً میری شان میں فرق نہیں پڑے گا۔“

”اچھا وعدہ کریں رات کو اپنے متعلق سب کچھ بتائیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔“ کہہ کر میں باورچی خانے سے باہر آ گیا۔

بہن بھائی بڑے زور و شور سے صفائی میں مشغول تھے، میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا شمریز خان اور میں نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا تھا۔ رنڑا نے خالی برتن سمیٹے اور ثمر خان کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں سونے چلی گئی۔ جبکہ گلگارے، والد کو گولیاں کھلانے لگی۔ گولیاں کھلا کر وہ اس کا سر دبانے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی ٹانگیں لحاف میں کر لیں تھیں۔ اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ گلگارے مجھے مسلسل گھور رہی ہے۔ میں نے بادل نخواستہ اس کی طرف دیکھا، وہ فوراً آنکھوں سے اشارہ کر کے مجھے وعدہ یاد دلانے لگی۔ باپ کی موجودی میں وہ کھل کر نہیں کہہ پا رہی تھی کہ میں اپنی کہانی سناؤں۔

اب میں بغیر کسی وجہ کے اپنی کہانی کیسے شروع کرتا۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد میں اس کے والد کو مخاطب ہوا۔

”شمریز چچا!...... کیا آپ میری کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو کیسے تلاش کروں۔“

”میں اس بارے کیا کہہ سکتا ہوں، یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس مقصد سے افغانستان کی سرحد پار کی اور انھیں افغانستان کے کس شہر یا علاقے میں جانا تھا۔“

”شہر یا علاقے کے بارے تو مجھے بھی واضح نہیں البتہ ان کا مطمح نظر امریکن ایجنسی کے خلاف کام کرنا تھا۔“

”تو صاف کہو نا کہ مجاہد ہیں...... اور مجاہدین کی تلاش بہت آسان ہے۔ ان کے کسی بھی کمانڈر کو مل کر آپ اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔“

گلگارے نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے خفگی بھرے انداز میں مجھے گھورا۔ اس نے باورچی خانے میں، مجھ

سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں مجاہدین کا ساتھی ہوں اس وقت میں نے صاف انکار کر دیا اور اب امریکنوں کے خلاف کام کرنے کی بات پر وہ بھی والد کی طرح مجھے مجاہد سمجھ بیٹھی تھی۔

''مجاہد نہیں ہیں شمریز چچا۔''میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ذیشان میاں!......آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آرہیں۔نہ آپ نے اپنے بارے کوئی تفصیل بتائی ہے۔اب میں کیا اندازے لگاتا پھروں اور کیسے مشورہ دوں۔''

میں کافی دیر سے ایسے ہی کسی سوال کا منتظر تھا تاکہ گلگارے سے کیے گئے وعدے کے مطابق اپنی کہانی سنا سکوں۔اس کے لہجے میں اپنے بارے جاننے کا اشتیاق محسوس کرنے کے باوجود میں نے کہا۔

''شمریز چچا، میری کہانی کافی طویل ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ کا وقت ضائع ہو یا آپ بیزاری محسوس کریں۔''

''چارپائی پر پڑے معذور آدمی کے پاس وقت کی کمی نہیں ہوتی۔''

میں نے جلدی سے کہا۔''اللہ نہ کرے آپ معذور ہوں۔''

''میں عارضی معذوری کی بات کر رہا تھا۔بہرحال آپ اپنی کہانی شروع کریں، اگر میں نے بیزاری محسوس کی بھی تو آپ پر اپنی بیزاری ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کی بات پر میرے ساتھ گلگارے بھی ہنس پڑی تھی۔

''میرا خیال ہے تم آرام کرو۔''شمریز نے اسے جانے کی اجازت دی۔

''بابا جان! آپ جانتے تو ہیں میں کہانیاں سننے کی کتنی شوقین ہوں۔''اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

''جیسے تمھاری مرضی۔''بیٹی کو کہہ کر اس نے استفہامیہ نظروں سے مجھے گھورا۔گویا بہ زبان خاموشی کہہ رہے ہوں کہ میں نے اب تک کہانی شروع کیوں نہیں کی۔

''میرا تعلق پاک آرمی سے ہے۔''گلا کھنکارتے ہوئے میں نے بات شروع کی۔میری بات سنتے ہی گلگارے کا چہرہ ٹیوب لائیٹ کی طرح چمکنے لگا تھا۔میری بات جاری رہی۔

''وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف کام کرتے ہوئے میرا ٹکراؤ ایک بہت بڑے دہشت گرد قبیل

خان سے ہوا۔اسی اثناء میں میری ملاقات ایک لڑکی پلوشہ خان وزیر سے ہوئی، جو اپنی بہن کی بے حرمتی اور قتل کا بدلہ لینے کے لیے قبیل خان کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ہمارا دشمن ایک ہی تھا اور اسی بات نے ہمیں قریب کر دیا ....‘‘ میں ترتیب سے تمام ضروری باتیں ان کے گوشِ گزار کرتا گیا۔قبیل خان اور جہانداد خان کی موت کس طرح پلوشہ کی وجہ سے میں امریکنوں کے ہاتھ چڑھا، کس طرح انھوں نے میری وڈیوز بنائیں، پلوشہ کا دوبارہ ملنا، شادی، صنوبر خان کی موت، اپنی گرفتاری، فرار اور پلوشہ کا سردار کے ساتھ میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈ نے نکلنے تک میں نے تمام اہم باتیں ان کے گوش گزار کر دیں۔پلوشہ کے ذکر پر گلگارے کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔یا شاید مجھے ہی کچھ ایسا لگ رہا تھا۔میری بات ختم ہوتے ہی شمریز خان تحسین آمیز لہجے میں بولا......

’’تو آپ ہیں وہ ایس ایس جو اڑتی مکھی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔‘‘میں نے اسے اپنی نشانہ بازی اور ایس ایس نام کے بارے کچھ نہیں بتایا۔اب اس کا یوں کہنا مجھے ششدر کر گیا تھا۔

’’آپ کو میرے نام کا کیسے پتا؟‘‘

وہ مسکرایا۔’’دیکھ لیں اتنی جادوگری تو ہمیں بھی آتی ہے۔‘‘

’’پھر بھی۔‘‘میں جاننے پر مصر ہوا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔’’ہمارے گھر میں صرف اچکے اور آوارہ گرد ہی نہیں آتے، یہاں مجاہدین کا گزر بھی رہتا ہے۔‘‘

’’یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔‘‘

’’بھائی، قبیل خان جیسے بڑے سردار کا قتل جس کی جڑیں افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں، اتنی چھوٹی بات نہیں ہے کہ علاقے میں اس کی شہرت نہ ہوتی۔اور پھر اس کے قتل میں اس کی اپنی قوم و قبیلے کی لڑکی شامل تھی......اس کے ساتھ دو قبیلوں کی لڑائی میں ایک سردار کا قتل اور وہ بھی اس انوکھے انداز سے، آج تک اڑھائی تین کلومیٹر کے فاصلے سے ہم نے کسی کو نشانہ بنتے نہیں دیکھا۔اور اسے نشانہ بنایا پلوشہ خان وزیر کے محبوب ایس ایس نے۔اسی طرح قبیل خان کے روشن خان نامی کمانڈر کو ایس ایس نے کلومیٹر بھر کی دوری سے ایک آڑ میں پھنسا لیا، یہاں تک کہ اسے معافی مانگ کر اپنی جان بچانا پڑی...... یہ اور اس جیسی اور بہت سی باتیں ہمیں مجاہدین اور یہاں سے

گزرنے والے دوسرے لوگوں سے پتا چلتی رہیں۔آپ کی باتوں میں بس صنوبر خان کی موت اور آپ کی پلوشہ سے شادی میرے لیئے نئی بات ہے۔باقی آپ نے جونہی اپنی کہانی شروع کی میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا تھا۔''

''میں نے بھی۔'' گلگارے بھی پیچھے نہیں رہی تھی۔'' کیونکہ جو لوگ بابا جان کے ساتھ بیٹھک میں مصروفِ گفتگو ہوتے ہیں میں ان کی ساری باتیں سنا کرتی ہوں۔''

میں انکساری سے بولا۔''خیر میری نشانہ بازی کے متعلق تو لوگوں نے کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے ورنہ اتنا اچھا نشانے باز ہوتا تو اس دن گلگارے بہن کا چیلنج قبول نہ کر لیتا۔''

وہ سرعت سے بولی۔''مجھے کیا پتا تھا کہ آپ ایس ایس ہیں۔''

میں نے کہا۔''اچھا آپ نے ساری کہانی سن لی ہے نا،اب جائیں اور آرام کریں۔''

''جب نیند آئے گی تو چلی جاؤں گی۔'' وہ بے پروائی سے والد کا سر دباتی رہی۔

ایک لمحہ اسے گھورنے کے بعد میں شمریز خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔اس دوران اس نے بھی نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''شمریز چچا!......اب تو آپ مشورہ دے سکتے ہیں نا۔''

''ویسے آپ کی بیوی نے کی تو بے وقوفی ہے لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں،لیکن اس کی اس بے وقوفی سے مجھے کتنی تکلیف ہو گی اس کا وہ اندازہ نہ کر سکی۔''

''اس کے لیے سب سے اہم آپ کی جان بچانا تھا۔اور جن حالات میں اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ایسے حالات میں اس سے بہتر کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔'' گلگارے ہماری گفتگو میں مخل ہوئی۔

میں نے فوراً کہا۔''ہاں،آپ بھی عورت ہو۔اپنی ہم ذات ہی کی طرف داری کرو گی۔''

''تو کیا کرتی......آپ کو بے گناہ تشدد کا نشانہ بنتے دیکھتے رہتی،جبکہ نہ تو وہ ایک گھریلو خاتون ہے۔اور نہ لڑائی جھگڑا اس کے لیے کوئی نئی چیز ہے۔'' گلگارے اپنے موقف پر ڈٹ گئی تھی۔

''اگر اسے کچھ ہو گیا پھر؟'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی اور آپ کو کچھ ہو جاتا پھر؟''

”اسے کچھ تو انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے یوں جھلاتے ہوئے کہا گویا پلوشہ کو گلگارے ہی نے افغانستان بھیجا ہو۔

”انتظار کرنے والے عموماً گھاٹے میں رہتے ہیں۔اور معاف کرنا آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے گویا چاہت کے اظہار کا حق صرف آپ ہی کو حاصل ہے۔اگر آپ اس کے افغانستان جانے پر اتنے پریشان ہیں تو خود سوچیں آپ کے ایجنسیوں کے ہاتھوں گرفتاری پر اس پر کیا بیتی ہوگی۔جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ایک منظّم سازش کا شکار ہو چکے ہیں اور آپ کے خلاف بہت سارے ثبوت ایجنسیوں تک پہنچا دیے گئے ہیں۔“

”آپ،اس کی بڑی طرف داری کر رہی ہیں۔“

”ہاں،کیونکہ میں اسے حق پر سمجھتی ہوں۔آپ بے جا ہی اس سے خفا ہو رہے ہیں۔“

”میں خفا نہیں،پریشان ہوں۔اور اس کی وجہ سے مجھے اپنی صلاحیتیں دو محاذوں پر لگانا پڑ رہی ہیں۔“

”آپ پلوشہ کی تلاش کو چھوڑیں اور اصل کام پر توجہ دیں۔“ وہ باقاعدہ بحث پر اتر آئی تھی۔شمریز خان متبسم ہو کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔میرے لیے ہر کام سے اہم پلوشہ کی خیریت ہے۔“

گلگارے کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔”آپ کی باتوں سے ذرا بھی نہیں لگ رہا کہ آپ وہی ایس ایس ہیں،جس کے واقعات سن کر ہم باپ بیٹی اتنے زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔“

”کہا تو ہے اس بارے لوگ کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے ہیں۔“

”اچھا مجھے یہ بتائیں،پلوشہ خان نے افغانستان میں جا کر کس کو تلاش کرنا ہے؟“

”البرٹ بروک کو۔“

”اور پلوشہ کی تلاش کے علاوہ آپ کا مطمحِ نظر کیا ہے؟“ اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

میں نے فوراً کہا۔”البرٹ بروک کی تلاش۔“

”تو جب آپ دونوں کی منزل ایک ہی ہے تو دائیں بائیں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بجائے سیدھا اپنے

کام پر توجہ دیں۔امید ہے پلوشہ خان بھی آپ کو البرٹ بروک کے دائیں بائیں مل ہی جائے گی۔“

اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا تھا۔اس کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں تھا۔میں نے تحسین آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔”ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چھوٹی بہن اتنی سمجھ دار ہو سکتی ہے۔“

”صحیح کہا۔“اس نے منہ بناتے ہوئے اوپر نیچے سر ہلایا۔”مردوں کے نزدیک عورت ہمیشہ فاتر العقل ہی رہی ہے۔اسی وجہ سے تو بابا جان بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں۔گویا بیٹی سے تو بہادری اور عقل مندی کی توقع عبث ہے۔“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔”خیر یہ تو آپ زیادتی کر رہی ہیں۔میں نے حیرانی آپ کے عورت ہونے پر نہیں کم عمر ہونے پر ظاہر کی ہے۔اسی طرح شمریز چچا اس وجہ سے آپ کو بیٹا نہیں کہتے کہ ان کی نظر میں بیٹی بہادر نہیں ہو سکتی۔بلکہ وہ اس لیے ایسا کہتے ہیں کہ کسی کی تعریف کرنے کے لیے عموماً تشبیہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔جیسے کہا جاتا ہے فلاں تو شیر ہے شیر۔اگر میں پوچھوں،کیا ایک جانور انسان سے بہتر ہو سکتا ہے۔تو آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔لیکن کبھی کسی نے خود کو شیر کہنے کا برا نہیں منایا ہوگا۔یونھی آپ کا اعتراض کرنا بھی نہیں جچتا۔“

”باتیں بنانا تو مردوں کا خاصا ہے۔“میری بات سے اختلاف نہ کرنے کے باوجود وہ میری وضاحت قبول کرنے پر راضی نہیں تھی۔

”اسے چھوڑیں چچا،آپ کوئی مشورہ دیں نا۔“میں اس سے بحث کرنا ترک کرتے ہوئے شمریز خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ مستفسر ہوا۔”ایک بات تو طے ہو گئی نا کہ آپ پلوشہ کے بجائے البرٹ بروک کی تلاش میں نکلیں گے۔“

”ہاں۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔”اس سے بہتر مشورہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”اب رہ گئی البرٹ بروک کی بات تو اس کے متعلق آپ کو مجاہدین سے کوئی رہنمائی نہیں مل سکتی۔اس ضمن میں یا تو صنوبر خان کے قائم مقام سے مدد مل سکتی ہے کہ اب اسی سے امریکنوں نے کام لینا ہے یا آپ کسی امریکی کو اغواء کر کے البرٹ بروک کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔“

''ہونہہ۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔''اس کا مطلب ہے مجھے ملک گلبدین، یا ملک فیروز خان پر ہاتھ ڈالنا چاہیے تھا۔''

''غالباً آپ تورے خار کے ملک فیروز خان کی بات کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور یہ گلبدین کون ہے؟''

میں نے جواب دیا۔''یہ دیگان کا سردار ہے اور شمالی وزیرستان میں دہشت گردانہ کارروائیوں کا کرتا دھرتا ہے۔''

''بہرحال بہتر یہی ہے کہ اب پیچھے جانے کے بجائے آگے ہی کا رخ کرو۔ یوں بھی آپ کی پلوشہ بھی آگے جا چکی ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔''آپ نے تو ہر پچھتاوے کا خاتمہ کر دیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اچانک چھت پر ہلکا سا دھماکا ہوا، یوں جیسے کوئی دیوار سے نیچے اترا ہو۔ کمروں کی چھت سے چاردیواری قریباً ساڑھے چار پانچ فٹ اونچی تھی۔ میں سوالیہ انداز میں شمریز خان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ویسی ہی آواز دوبارہ ابھری اور میرے دل میں تھوڑا سا شک تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔ یقیناً وہ موذی رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھانے پہنچ گئے تھے۔ گلگارے کے چہرے پر بھی گہری تشویش اور اندیشے ظاہر ہو گئے تھے۔ حالانکہ چھوٹی موٹی باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لایا کرتی تھی۔

میں فوراً لحاف سے باہر نکلا۔ بوٹ ڈالنے کا وقت نہیں تھا۔ پاؤں ہوائی چپل میں ڈال کر میں نے سر پر گرم ٹوپی رکھی اور اپنی کلاشن کوف کاک کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑ لی۔

''شمریز چچا کی چارپائی کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دو۔ ثمر خان اور رنڑا کو بھی دروازے کے سامنے نہ آنے دینا۔'' گلگارے کو ضروری ہدایات دیتے ہی میں چھت پر چڑھنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

گلگارے نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے مگر اس کی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ دوسرے

کمرے کے شمال مغربی کونے میں لوہے کی سیڑھی لگی تھی جس کا اختتام چھت پر بنے ہوئے مورچے میں ہوتا تھا ۔ان کے گھر دو، مورچے بنے ہوئے تھے۔ایک گھر کی سامنے کی طرف شمال کی جانب اور دوسرا گھر کی عقبی جانب جنوب مغربی دیوار پر۔دونوں مورچوں پر جانے کے لیے علیحدہ علیحدہ سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔مورچوں پر لوہے کے مضبوط دروازے لگے تھے جو اندر کی جانب بند ہوتے تھے۔

میں سرعت سے سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا چھت کے سوراخ سے مورچے میں داخل ہوا۔مورچے کے دروازے پر مجھے کھسر پھسر سنائی دے رہی تھی ۔مجھے لگا کوئی دروازے کو کھولنے کی کوشش میں ہے۔میں دروازے کے قریب ہوا اور ان کی سرگوشیوں کی آواز میرے کانوں میں پڑنے لگی۔

''سنگین خانا،دروازہ اندر سے بند ہے۔اور ہول اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے اندر نہیں گھسا جائے گا۔''

''تو پھر دوسرے مورچے کا جائزہ لیں۔''شاید اس مرتبہ بولنے والا سنگین خان تھا۔

''یقیناً وہ بھی اندر سے بند ہوگا۔''ایک تیسری آواز ابھری تھی۔''ہمیں صحن ہی میں اترنا پڑے گا۔''

''لازماً انھوں کمروں کے دروازے بھی اندر سے بند کیے ہوں گے۔''یہ وہ پہلا آدمی تھا جس نے سنگین خان کو پکارا تھا۔

''پھر کیا کریں؟''سنگین خان کی آواز میں بے چینی تھی۔

''دیکھ لو......تمھی اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہوئے جا رہے ہو۔اور اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ گھر میں کم از کم دو ہتھیار بردار مرد موجود ہیں۔''تیسرے مرد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''الفت جان!......کیا میں نے تمھارے لیے کبھی خطرہ مول نہیں لیا۔''سنگین خان کی آواز میں گہری خفگی پنہاں تھی۔

''میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔''الفت جان جھلاتے ہوئے بولا۔''فقط مشورہ ہی دیا ہے نا۔''

''لڑنے کی ضرورت نہیں اور کوئی ترکیب سوچو کہ ہمیں ناکام نہ لوٹنا پڑے۔''یہ وہی تھا جس نے سنگین خان کو دروازہ بند ہونے کی اطلاع دی تھی۔

سنگین خان بولا۔''میرا خیال ہے نیچے اتر کر دیکھتے ہیں۔اگر دروازے بند ملیں گے تو صبح کا انتظار کرلیں

گے۔جیسے ہی وہ اٹھیں گے ہم انھیں چھاپ لیں گے۔''

الفت جان طنزیہ لہجے میں بولا۔''مطلب تم اس لڑکی کو حاصل کیے بغیر نہیں جانے والے۔''

''بالکل بھی نہیں۔''سنگین خان حتمی لہجے میں بولا۔''جب سے اسے دیکھا ہے میری راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔اسے پائے بغیر مجھے سکون نہیں آئے گا۔''

الفت جان نے کہا۔''اسفند یار!......وزیر بادشاہ اور سلیم جان کو بھی اوپر ہی بلالو۔وہ ساری رات باہر تو نہیں کھڑے رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''اسفند یار اس سے متفق ہوتا ہوا بولا۔وہ یقیناً ان آدمیوں کو اوپر لانے کے لیے چل پڑا تھا ،مگر اس کے قدموں کی آواز مجھے سنائی نہ دی کہ وہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔میں نے مورچے کے ہول سے احتیاط سے باہر جھانکا۔مورچے کے اندر اندھیرا تھا اور میرا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔برف باری کب کی رک چکی تھی ،آسمان بھی صاف تھا۔اٹھارہ انیس کے چاند کی روشنی سفید برف پر منعکس ہو کر ماحول کو خوب روشن کیے ہوئے تھی۔مورچے کے دروازے پر کھڑے آدمی تو مجھے نظر نہ آسکے البتہ اسفند یار دیوار کی جڑ میں قدم رکھتا ہوا دروازے سے دور جاتا نظر آیا گیا۔

مجھے ان کی بے وقوفی پر حیرانی ہو رہی تھی کیونکہ کچی چھتوں پر جتنی بھی احتیاط سے قدم رکھا جائے نیچے موجود آدمیوں کو لازماً پتا چل جاتا ہے کہ کوئی چھت پر چل رہا ہے۔البتہ کوئی گہری نیند میں ہو تو علیحدہ بات ہے۔اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔شاید انھیں یہ لگا ہو کہ تمام سو رہے ہیں اور یہی بات ان کی اس حماقت کی وجہ بنی ہو۔واقعی جب انسان کے دماغ پر کسی عورت کے حصول کا بھوت سوار ہو تو اسے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا ۔سنگین خان کے غلاظت بھرے بھیجے میں بھی معصوم رنڑا کا نوخیز اور پرکشش جسم سمایا ہوا تھا،جس کی وجہ سے وہ بار بار شمریز خان کے گھر کے چکر کاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔اور اس کا ایک ہی علاج تھا کہ، گندے خیالات سے بھری کھوپڑی ہی اس کے سر پر باقی نہ رہنے دی جاتی۔اس کے علاوہ تو رنڑا کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتا تھا

اچانک ہلکی آہٹ کے ساتھ کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا، یقیناً وہ گلگارے تھی جو محتاط انداز میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی تھی۔مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کچھ بول نہ دے۔میں نے فوراً مڑ کر اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر

جمادیا، وہ ایک دم ساکت ہوگئی تھی۔

اسی وقت سنگین خان نے بے صبری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔’’نیچے اتریں۔‘‘اور اس کے بولنے کے بعد مجھے گلگارے کو کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ اسے ساری صورت حال واضح ہو جانی چاہیے تھی۔اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا کر میں دوبارہ دروازے کی جانب متوجہ ہوگیا۔

’’ٹھہرو انھیں اوپر تو آنے دو۔‘‘الفت خان نے میری دل لگتی بات کہی تھی۔میں بھی ان کے اوپر ہی آنے کا منتظر تھا۔

’’تو وہ آجائیں گے نا؟‘‘سنگین خان نیچے جا کر جلد از جلد دروازوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔شاید اس کے دل کے کسی کونے میں دروازہ کھلا ہونے کی امید روشن تھی۔اور نفسانی خواہشات اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھیں۔

’’رسی کے بغیر چھت سے کودو گے تو کتنا دھماکا ہوگا یہ بھی سوچا ہے۔‘‘الفت جان نے اس کی بے صبری پر ڈانٹا۔’’اور ہوش سے کام لو، وہ کہیں سج سنور کر اپنے دولھے سنگین خان کی منتظر نہیں کہ تم مرے جا رہے ہو۔‘‘

’’ہائے الفت جان!......تم نے اسے دیکھا نہیں ورنہ یہ بکواس نہ کرتے۔یقین کرو دودھ کی طرح سفید مکھن کے پیڑے کی طرح ملائم اور چاند کی طرح روشن چہرہ ہے اس کا۔اگر چہرے کی یہ حالت ہے تو باقی بدن کیسا ہوگا۔اف......ایک تو یہ بھی چیونٹی کی رفتار سے اوپر چڑھ رہے ہیں۔‘‘سنگین خان رنڑا کی تعریف کرتے کرتے اپنے ساتھیوں کی سستی پر شکوہ کناں ہوگیا۔اسے بالکل ہی قرار نہیں آ رہا تھا۔نہ جانے گزشتہ رات اس نے کیسے صبر لیا تھا۔

’’شاید موسم کی خرابی آڑے آ گئی تھی۔‘‘میں نے سوچا مگر اس کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ خراب موسم تو ایسے کاموں کے لیے مفید رہتا ہے۔

اس کی گھٹیا گفتگو گلگارے نے بھی سن لی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ گئی ہو۔اپنی چھوٹی بہن کے متعلق ایسی باتیں سن کر یقیناً وہ غصے کے ساتھ خفت بھی محسوس کر رہی ہوگی۔

میں مورچے کے ہول سے باہر جھانکنے لگا۔چھت کی اس جانب کوئی دوسرا ہول موجود نہیں تھا اس وجہ سے

گلگارے بھی میرے قریب آکر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ایسا کرتے ہوئے وہ بالکل میرے ساتھ جڑ گئی تھی۔وہ خوش نما، بھرپور اور گداز جسم کی مالک ایک نوخیز دوشیزہ تھی۔جبکہ میں عام خواہشات سے مغلوب ہونے والا ایک گناہ گار جوان اس کی قربت مجھے مہنگی پڑسکتی تھی۔اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک قابل احترام اور پاکیزہ خیالات کی حامل لڑکی کے بارے میرے ذہن میں کوئی گندہ خیال پرورش پاکر ہمیشہ کی شرمندگی میرا نصیب کر دے۔یوں بھی شیطان خون کی طرح انسان کی رگوں میں دوڑتا ہے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے فوراً اسے بازو سے تھام کرنرمی سے دور دھکیل دیا۔گوایسی حرکت نرمی سے کی جائے یا سختی سے۔مخالف کو نہایت ناگوار گزرتی ہے، بلکہ صنف نازک کو تو شرمسار کر دیتی ہے۔لیکن ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔

وہ کچھ کہے بنا دور ہو گئی۔البتہ اندھیرے کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ میں اس کے غصے یا شرمندگی کا اندازہ کر پاتا۔

میں دوبارہ ہول سے باہر جھانکنے لگا۔چھت کا دوسرا کنارہ اتنی دور نہیں تھا کہ مجھے ان کے واضح ہیولے دکھائی نہ دیتے۔یوں بھی برف پڑ جانے کے بعد چاندنی رات میں ماحول کچھ زیادہ ہی روشن ہو جاتا ہے۔پہلے وہاں صرف اسفندیار موجود تھا، اس کے بعد ایک ہیولے کا اضافہ ہو گیا۔اور دیوار سے ایک تیسرا ہیولہ بھی چھت پر اتر رہا تھا۔ان کے نیچے موجود دونوں ساتھی، اوپر پہنچ گئے تھے۔

میں ان کے ارادوں کو بھی جان گیا تھا اور ان میں سے کسی کی زندگی بھی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔نہ میں نے کسی سے کوئی پوچھ گچھ ہی کرنا تھی۔کلاشن کوف کو نیچے ہی سے کاک کر کے آیا تھا کہ، کلاشن کوف کاک کرنے سے اچھی خاصی آواز ابھرتی ہے۔ہاتھ سے ٹٹول کر میں نے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

دروازے کے بولٹ کو اگر میں احتیاط سے کھولتا تو ذرا سی بھی آواز نکلنے پر سنگین خان اور الفت جان چوکنا ہو کر سنبھل سکتے تھے۔اس کے برعکس بولٹ کو ایک جھٹکے سے کھولنے پر آواز تو ضرور اٹھتی مگر ان کے سنبھلنے سے پہلے میں دروازہ کھول چکا ہوتا۔میں نے دوسری تجویز پر عمل کا سوچا اور دوازے کے بولٹ پر مضبوطی سے ہاتھ جما کر

ایک دم بولٹ کھول کر دروازے کے اکیلے پٹ کو اندر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ دونوں اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کھڑے تھے جو انھی کی طرف چل پڑے تھے۔ بولٹ کھلنے کی آواز پر وہ اچھل کر سنبھلے...... سنگین خان کے منھ سے بے ساختہ......"کک...... کیا...... ہے۔" نکلا تھا۔ لیکن یہ وہ آخری الفاظ تھے جو اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

انسان بھی کتنا انجان اور لاعلم ہے۔ نفسانی خواہشات سے مغلوب، رنڑا کے نوخیز بدن کو روندنے کا منصوبہ بنانے والے سنگین خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ موت اس کے کتنا قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے، رنڑا کی چیخیں اور آہیں سننے کے متمنی کانوں میں کلاشن کوف کی بھیانک تڑتڑاہٹ موت کا نغمہ بن کر گونجی۔ اس نے لذت کے عروج کے حصول کا منصوبہ بنایا ہوا تھا اور ربّ نے اذیت کی انتہا اس کے مقدر میں لکھ دی تھی۔

کلاشن کوف کے فائر کی آواز اور اپنے دونوں ساتھیوں کے نیچے گرنے پر ایک لمحے کے لیے وہ بدحواس ہو کر ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے ٹریگر سے انگلی ہٹائے بغیر بیرل کا رخ ان کی جانب موڑا۔ ان میں سے ایک آدمی نے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی اور فوراً دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب کودنے کی کوشش کی۔ مگر چھت کے ساتھ متصل دیوار پر چڑھنے تک اس کی اپنی کوشش کا عمل دخل تھا، جبکہ اسے دوسری جانب گرانے میں سراسر کلاشن کوف کی گولیوں کا کمال تھا۔

سنگین اور الفت جان کے تڑپنے کی رفتار میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ جبکہ دوسرے دو ابھی تک اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک رہے تھے۔ وہ ایک معصوم کلی کو تڑپانے آئے تھے، انھیں خود تڑپنا پڑ گیا تھا، اسی کو مقدر کہتے ہیں، یہی موت کی گھات ہوتی ہے، یہی فرق انسان اور اللہ پاک کے بنائے ہوئے منصوبے میں ہوتا ہے۔ ایک طرف انسان تجویز بنا رہا ہوتا ہے اور دوسری جانب اللہ پاک ایک فیصلہ فرما چکا ہوتا ہے۔ اور ہوتا وہی ہے جو اللہ پاک نے مقرر کر دیا ہو۔ وہ ظالم تھے اور ظالموں پر اللہ پاک لعنت فرما چکا ہے، جبکہ لعنت کا مطلب اللہ پاک کی رحمت سے دور ہونا ہے۔ وہ بھی اپنے گندے منصوبوں اور غلیظ خیالات کے ساتھ توبہ کی توفیق پائے بغیر مردار ہو گئے تھے۔

گو مجھے یقین تھا کہ دیوار سے کودنے والا میری گولی کھا کر ہی دوسری جانب گرا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ایک بار نیچے جھانک کر دیکھنا ضروری سمجھا۔ اس کی مڑی تڑی لاش دیوار کے ساتھ ہی پڑی تھی۔

اسی وقت گلگارے بھی مورچے سے نکل آئی۔ مجھے مخاطب کیے بغیر وہ ہاتھ میں موجود ٹارچ جلا کر ان کے چہرے دیکھنے لگی۔ ان کے چہروں پر اذیت ثبت ہونے کے باوجود مجھے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ وہ وہی پانچوں تھے جو اس دن دھمکانے آئے تھے۔ مورچے کے دروازے کے ساتھ گرنے والے الفت جان اور سنگین خان میں ایک کے پاس تیس بور پستول اور دوسرے کے پاس کلاشن کوف تھی۔ جبکہ دوسرے کونے پر پڑی لاشوں کے پاس بارہ بور بندوق، ایٹ ایم ایم اور ایک پستول پڑا نظر آ رہا تھا۔ دیوار سے کودنے والا اپنی رائفل وہیں پھینک گیا تھا۔

''ان کی لاشوں کا کیا کریں؟'' میں جانتا تھا کہ وہ خفا ہے اس کے باوجود میں اسے مخاطب ہوا۔

میری بات کا جواب دیے بغیر وہ وہاں پڑے ہتھیار سمیٹنے لگی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے۔'' میں اسے دوبارہ مخاطب ہوا۔ مگر بے پروائی سے تمام ہتھیار اٹھا کر وہ واپس مورچے کی جانب چل دی۔ مجھے اچھی خاصی سبکی کا احساس ہوا تھا۔ گو میں نے بھی اس کی توہین کی تھی، مگر میرا مقصد ہرگز ہرگز اس کی توہین یا سبکی کا نہ تھا۔ میں نے فقط حفاظتی تدبیر پر عمل کیا تھا، مگر وہ جان بوجھ کر میری ہتک کرنے پر تل گئی تھی۔

سر جھٹک کر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے میں رنڑا اپنے باپ کی بغل میں گھسی تھی۔ وہ گلگارے کی طرح بننا چاہتی تھی مگر اس کی طبیعت مجھے گلگارے سے یکسر مختلف نظر آئی تھی۔ گلگارے بہادر، دلیر اور حوصلے والی تھی۔ جبکہ رنڑا روایتی لڑکیوں کی طرح ڈرپوک، سہمی ہوئی اور جلدی گھبرا جانے والی تھی۔ ثمر خان البتہ مجھے کافی حوصلے والا لگا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا اس وقت گلگارے باپ کو تمام موذیوں کے مرنے کی اطلاع دے چکی تھی۔

میں نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ ''چچا شمریز!......ان لاشوں کا کیا کریں۔''

''لازمی بات ہے زمین میں دبانا پڑیں گی۔''

''اتنا بڑا گڑھا کھودنے میں تو صبح ہو جائے گی۔''

''گڑھا کھودنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے گھر کے شمالی جانب جو اخروٹ کے دو بڑے درخت ہیں ان

کی غربی جانب تھوڑی سی ڈھلان اتر کر ایک کافی بڑا گڑھا موجود ہے۔گلگارے بیٹی آپ کو وہ جگہ دکھا دے گی ۔وہاں پھینک کر اوپر پتھر پھینک دو۔ایسوں کے لیے ایسی ہی قبر دستیاب ہوا کرتی ہے۔''

''ثمر خان چلا جائے گا، مجھے سخت نیند آرہی ہے۔''وہ اتنی خفا تھی کہ میرے ساتھ جانے پر بھی راضی نہیں تھی۔

میں نے فوراً کہا''ثمر خان، میں چھت پر پڑی لاشوں کو شمالی جانب پھینک کر آتا ہوں،تم کوئی ٹارچ اور بیلچہ وغیرہ ڈھونڈلو۔''

''جی لالا۔'' کہہ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔میں دوبارہ مورچے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ایک ایک کر کے میں نے چاروں لاشوں کو شمالی جانب سے دیوار سے باہر پھینک دیا۔میرے کپڑے تو ان کے گندے خون سے ناپاک ہو گئے تھے۔لیکن یہ کپڑے شمریز خان کے تھے۔اس لیے مجھے زیادہ پروا نہیں تھی۔مورچے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں نیچے اتر آیا۔گلگارے اپنے لحاف میں گم ہو چکی تھی۔رنڑا بھی بہن کی موجودی سے حوصلہ پا کر اپنی چارپائی پر پہنچ چکی تھی۔میں سرسری نظر ان پر ڈالتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا جہاں ثمر خان چوڑے منہ والے بیلچے اور ٹارچ کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

''ذیشان صاحب!......یقیناً آپ کو زحمت ہو رہی ہو گی،مگر میں مجبور ہوں اور..........''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں شمریز چچا۔''میں قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔''اس میں زحمت کیسی۔اب عورتیں تو یہ کام نہیں کر سکتی نا۔اور گھر میں موجود صحت مند مرد اس کام کے لیے جا رہے ہیں۔کیوں ثمر خان۔''میں آخری فقرہ مسکرا کر کہا تھا۔

ثمر خان فوراً چھاتی چوڑی کرتے ہوئے بولا۔''جی لالا۔''اس کے انداز پر شمریز خان بھی مسکرا پڑا تھا۔

میں ثمر خان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔سب سے پہلے میں نے غربی جانب اکیلی پڑی لاش اٹھائی اور ثمر خان کی معیت میں چل پڑا۔اخروٹ کے دونوں درخت پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہیں تھے۔اور مذکورہ گڑھا ان درختوں سے مزید پچیس تیس گز ڈھلان میں بنا تھا۔وہ گڑھا اتنا بڑا تھا کہ پانچوں لاشیں آسانی سے اس میں سما جاتیں۔

میں نے ایک ایک کر کے تمام کی لاشیں گڑھے میں پھینک دیں۔ ہر لاش کو اٹھانے سے پہلے میں اس کی تلاشی ضرور لے لیتا تھا۔ ان کی جیبوں سے نکلنے والی تھوڑی بہت نقدی میں اپنے پاس سنبھالتا رہا، کیونکہ اب وہ ان کے کسی کام کی نہیں تھی۔ صرف ایک آدمی کی جیب سے توقع سے زیادہ رقم برآمد ہوئی تھی جس پر میں حیرانی کا اظہار ہی کر سکتا تھا۔ گڑھے کو پتھروں سے پاٹنے کے لیے ثمر خان نے بھی میرا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہاں جا بجا اتنے پتھر بکھرے تھے کہ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد ان کی لاشیں مکمل۔ طور پر پتھروں سے ڈھک گئی تھیں۔ پتھر پھینکنے کے بعد میں نے بیلچے کی مدد سے گڑھے کی دیواریں بھی گرا کر کنکر بھری مٹی، گڑھا پاٹنے والے پتھروں پر بکھیر دی تھی۔ اب ان پتھروں کو کوئی مردار خور جانور بھی ہٹا کر لاشوں تک رسائی نہیں پا سکتا تھا۔ البتہ مردہ خور کیڑوں کی چند روزہ ضیافت کا انتظام ہو گیا تھا۔

لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ ثمر خان کو اس کی چارپائی پر بھیج کر میں خود غسل خانے میں گھس گیا۔ خون آلود کپڑے اتار کر میں نے کپڑا گیلا کر کے جسم پر لگے خون کے اثرات کو صاف کیا اور پھر صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ شمریز خان میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

ایک بار پھر تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہی اس نے لحاف اپنے اوپر لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو دیر تک سونے کی وجہ سے صبح کی نماز پر میں بہ مشکل ہی جاگ پایا تھا۔ نماز پڑھ کر دوبارہ سویا تو دیر سے جاگا۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ وہ دن خوب روشن اور صاف تھا۔ سفر کرنے کے لیے ایک بہترین دن، اگر میں کھانا کھا کر نکل جاتا تو اچھا خاصا سفر طے کر لیتا امید تھی کہ خان کلے تک پہنچ جاتا۔ لیکن میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ میری نگاہوں میں گلگارے کا خفگی بھرا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں نے واقعی اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ جہاں میں چار پانچ دن گزار چکا تھا وہاں ایک دن مزید رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

چارپائی چھوڑ کر میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا۔ اور ہاتھ منہ دھو کر غسل خانے سے باہر آ گیا۔ رنڑا نے مجھے بستر چھوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے غسل خانے سے باہر آنے تک وہ ناشتا لے آئی تھی۔ وہاں دودھ والی چائے کا صرف میں ہی شوقین تھا، باقی قہوے کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ چائے پی کر میں شمریز خان سے گپ شپ

کرنے لگا۔راستے کے بارے ضروری معلومات لینے کے علاوہ میں نے اس سے گرم کوٹ، پانی پلہ (رین کوٹ) اورلانگ بوٹ بھی مانگ لیے تھے۔ یہ تمام سامان اس کے پاس موجود تھا۔اور مجھے آگے سفر کے لیے ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔

اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

میں نے ممنونیت سے کہا۔''شکریہ شمریز چچا!''

اس نے پوچھا۔''رات کو جو ہتھیار ہاتھ آئے ہیں ان کا کیا کرو گے؟''

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔''بارہ بور، رنڑا کے لیے بہتر رہے گی، کلاشن کوف ثمر خان کی ہو جائے گی، ایٹ ایم ایم آپ رکھ لینا کہ آپ کی کلاشن کوف پر گلگارے قابض ہے۔باقی بچے دو پستول تو ان کے بدلے میں میں نے گرم کوٹ، پانی پلہ اور بوٹ لے لیے ہیں نا۔''

اس نے نفی میں سرہلایا۔''یہ تو خیر زیادتی ہے، اتنے قیمتی ہتھیار آپ کو یونھی نہیں چھوڑ دینے چاہئیں۔''

''پہلی بات کہ میں یونھی نہیں چھوڑ رہا اور دوسرا، کیا یہ سارا وزن ساتھ پھراتا رہوں گا۔''

''نہیں۔''اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے مشورہ دیا۔''ساتھ پھرانے کی کیا ضرورت ہے بیچ دو۔خواگا او بو میں ان کے کئی خریدار مل جائیں گے۔''

''شمریز چچا!......چند ٹکے، رنڑا اور ثمر خان کی خوشی سے اہم نہیں ہیں۔باقی یہاں رہتے ہوئے آپ کو ان ہتھیاروں کی بہت ضرورت پڑے گی۔''

''شکریہ ذیشان صاحب۔''

''اچھا میں ذرا دیکھ لوں یہ بچے کیا کر رہے ہیں۔''میں باہر آ گیا۔گلگارے دن کا کھانا بنانے باورچی خانے میں گھسی تھی۔میں اس سے معذرت کرنے کے لیے ہی رکا تھا اور اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔دروازے پر کھڑے ہو کر میں پوچھنے لگا۔

''چائے مل سکتی ہے۔''

آٹے کے پیڑے بنا کر اس نے سامنے رکھے ہوئے تھے اور اب روٹیاں ڈالنے والی تھی۔میری آواز سنتے

ہی وہ کوئی جواب دیے بغیر کھڑی ہوئی اور باورچی خانے سے باہر نکل کر رنڑا کو آوازیں دینے لگی۔ وہ بھائی کے ساتھ مل کر مویشیوں کے باڑے کی صفائی میں لگی تھی۔ بہن کی آواز سنتے ہی باہر نکل کر پوچھنے لگی۔

”جی باجی!“

”مہمان کے لیے چائے بنا دو۔“ اس کے لہجے سے ٹپکتی اجنبیت مجھے شرمسار کر گئی تھی۔

”ٹھیک ہے باجی۔“ سعادت مندی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ دھوئے اور باورچی خانے میں آ گئی۔

”لالا!......دودھ والی چائے یا قہوہ۔“

”تمھیں نہیں پتا، بڑا بھائی کون سی چائے پیتا ہے۔“

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”پتا تو ہے۔“

”تو پھر بناؤ۔“

”ٹھیک ہے لالا جان!“ اس نے چائے کا پتیلا چولھے پر چڑھا دیا۔

”ویسے باجی آپ سے خفا تو نہیں ہیں۔“

”کیا پتا۔“ میں نے منھ بنایا۔ ”اور مجھے اس کی خفگی کی پروا بھی کب ہے۔ جب میری ننھی سی رنڑا بہن موجود ہے تو کسی دوسرے کے نخرے کیوں اٹھاؤں۔“

”دیکھ لیں لالا جی!......آپ نے چلے جانا ہے اور باجی نے میری درگت بنا دینی ہے۔“

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”درگت کیوں، کل میں نے آوارہ گردوں سے جو بارہ بور بندوق چھینی ہے وہ تمھاری ہوئی۔ گلگارے جونہی رعب جمانے کی کوشش کرے بندوق نکال لینا۔“

وہ معصومیت سے بولی۔ ”مجھے بندوق چلانا ہی نہیں آتا۔“

”چائے پی کر میں تمھیں سکھا دیتا ہوں۔“

”پتا ہے رات کو جس وقت آپ دشمنوں سے لڑ رہے تھے اس وقت بابا جان نے مجھے آپ کے بارے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”کیا سب کچھ؟“ میں نے حیرانی ظاہر کی۔

”یہی کہ آپ فوجی ہیں، بہت اچھے نشانہ باز ہیں، دلیر اور بہادر ہیں اور ان تمام بدمعاشوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سچ میں میں اس وقت اتنی ڈری ہوئی تھی، بابا جان کی باتیں سن کر مجھے بہت تسلی ہوئی۔ بعد بابا جان کا کہنا سچ ثابت ہوا اور میرے بہادر لالا نے سب کو قتل کر دیا۔“

یقیناً رات کو اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہی شمریز خان نے میری بہادری کے بارے کچھ مبالغہ آرائی کی تھی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔”ان بدمعاشوں کو تمھاری باجی گلگارے نے مارا ہے۔“

”لالا جی، بابا جان کہتے ہیں جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔ایسا ہی ہے نا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی اور اپنے لیے چائے ڈالنے لگی۔

”تم اپنے لالا کو جھوٹا کہہ رہی ہو۔“میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

وہ شوخی سے مسکرائی۔”نہیں لالا جی!......میں نے تو بس تصدیق چاہی ہے۔“

میں اس کی ہنسی میں شامل ہوتا ہوا بولا۔”ویسے تمھارے بابا جان نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔“

چائے پینے کے دوران وہ مجھ سے رات والی ساری بات اگلوا چکی تھی۔چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”اچھا چھت پر چڑھتے ہیں،آپ مجھے بارہ بور رائفل چلانا بھی سکھا دینا اور وہاں آپ کو ایک خاص بات بھی بتاؤں گی۔“

میں نے اس کی تجویز میں ہلکی سی ترمیم کرتے ہوئے کہا”تو گھر سے باہر جاتے ہیں نا۔“

وہ مصر ہوئی۔”نہیں چھت پر جانا ضروری ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے،میں اوپر جا رہا ہوں،تم رائفل لے آؤ۔“

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ گلگارے کو آوازیں دینے لگی۔”باجی!......ہم نے چائے پی لی ہے آجائیں۔“

رنڑا کی آواز سن کر وہ مویشیوں کے باڑے سے باہر نکل آئی۔رنڑا کو چائے بنانے بھیج کر وہ خود صفائی میں

مشغول ہوگئی تھی۔وہ نہ صرف ناراض تھی بلکہ اپنی ناراضی کا واضح اظہار بھی کررہی تھی۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا مگر وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے باورچی خانے میں گھس گئی۔ایک لمحے کے لیے میرا ارادہ ہوا کہ میں بھی باورچی خانے میں گھس کراس سے ناراضی کی وجہ دریافت کروں،مگر پھر مجھے ہمت نہ ہوسکی۔نہ جانے میرے زبردستی پوچھنے پروہ کیا ردعمل ظاہر کرتی۔آخر وہ ایک جوان لڑکی تھی اوراس کا کوئی سخت ردعمل،شمریز خان کے دل میں غلط فہمی کا بیج بھی بوسکتا تھا۔مجھے اپنا دن ضائع کرنے پرافسوس ہوا ۔مجھے آج صبح ہی آگے چلے جانا چاہیے تھا۔یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں چھت پر جانے کے لیے سیڑھی والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چھت بالکل صاف پڑی تھی۔ان موذیوں کے خون کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔اوراس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا گندہ خون برف پر گرا تھا۔جو صبح ہی صبح رنڑااور شمر خان نے اٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دی تھی۔

اسی وقت رنڑا نے چھت پر چڑھ کر مجھے آواز دی۔”لالا جی!......اس طرف۔“اس نے مکان کے سامنے شمال کی جانب موجود مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ہم چھت پر چلتے ہوئے اس مورچے کے قریب پہنچے۔مکان کی بناوٹ ایسی تھی کہ اس کے تین اطراف میں کمرے تعمیر کیے گئے تھے جبکہ سامنے والی دیوار کے ساتھ کوئی کمرہ نہیں بنا تھا۔شمال مشرقی دیوار کے ساتھ جو آخری کمرہ تھا اس کی چھت پر سامنے کے رخ کی دیکھ بھال کے لیے مورچہ بنایا گیا تھا۔تمام کمروں کو ملانے کے لیے دروازے لگائے گئے تھے۔یوں کہ آدمی صحن میں نکلے بغیر پورے کمروں میں گھوم سکتا تھا۔سامنے والا مورچہ جس کمرے پر بنا تھا اس کی چھت باقی کمروں سے بلند تھی۔اتنی کہ چھت اور سامنے والی مشرقی دیوار کی بلندی برابر ہوجاتی تھی۔یوں کہ اس جانب سے آدمی چھت پر لیٹ کر بھی فائر کرسکتا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ رنڑا نے میری کلاشن کوف بھی کندھے سے لٹکائی ہوئی ہے۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔”ارے بھئی میری کلاشن کوف کیوں لے آئی ہو،کیا کلاشن کوف سے بھی فائر کرنا ہے؟“

”نہیں لالا جی!......کلاشن کوف سے تو آپ نے فائر کرنا ہے۔“

”میں نے کیوں؟“

”بتاتی ہوں۔“معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک جانب انگلی اٹھائی۔”وہ درخت کا تنا نظر آرہا ہے۔“

میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا قریباً اڑھائی تین سو میٹر کے فاصلے پر درخت کا ایک ٹنڈ منڈ تنا نظر آرہا تھا، جو زمین سے سات، آٹھ فٹ بلند تھا۔”ہاں مگر اس میں کیا خاص بات ہے۔“

”تنے کے درمیان میں کوئی چیز نظر آرہی ہے۔“میری بات کا جواب دیے بغیر اس نے اگلا سوال داغا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔”ہاں، لگتا ہے کوئی شیشہ چمک رہا ہے۔“

وہ میری کلاشن کوف لانے کا مقصد پھوٹتے ہوئے بولی۔”بس لالا جی!......اسی شیشے کو آپ نے دس گولیوں سے نشانہ بنانا ہے۔“

میں ہنسا۔”تو یہ کام اپنی باجی سے کروانا تھا نا۔“

”باجی ہی کا تو یہ ہدف ہے۔اور یقین مانو درجنوں گولیاں ضائع کر چکی ہے ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی۔“یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی یوں جیسے گلگارے ہم سے دو قدم دور ہی تو کھڑی ہو۔

”اگر میں بھی اسے نشانہ نہ بنا سکا پھر؟“

”پھر مجھے معلوم ہو جائے گا کہ گلگارے باجی سچ کہتی ہیں۔“

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔”کیا کہتی ہے وہ؟“

”کک......کچھ نہیں۔“وہ ہکلا گئی تھی۔

”جانتی ہو شمریز چچا کہتے ہیں جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔“میں نے اس کی باورچی خانے میں کہی گئی بات لٹائی۔وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی......

”لالا جی!......آپ نے ادھار لوٹانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگائی۔“

”آئیں بائیں نہیں، اصل بات بتاؤ۔تمھاری باجی کیا کہتی ہے۔“

”وہ......“کہہ کر وہ ایک دو لمحے کو خاموش ہوئی اور پھر اٹکتے ہوئے بات مکمل کرنے لگی۔”کہتی ہیں کہ

.........آپ ......بس ایسے ......مشہور ہو گئے ہیں ....اور......آپ ......اتنے اچھے نشانہ باز بھی نہیں ہیں۔“

”اور تم اسی لیے مجھے آزمانے لے آئیں۔“

”نہیں لالا جی!.......یہ بات نہیں ہے۔“

”اچھا چھوڑو اس موضوع کو، تمھاری باجی صحیح کہتی ہے۔مجھ سے یہ نشانہ نہیں لگے گا۔اب چلو میں تمھیں بندوق چلانا سکھادوں۔“

اس نے منھ پھلاتے ہوئے کہا۔”یونھی فائر کیے بغیر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔“

وہ میرے سر ہو گئی۔”نہیں بس آپ اس شیشے کو نشانہ بنائیں گے،مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی میرے لالا جی کے خلاف بات کرے،چاہے وہ باجی ہی کیوں نہ ہوں۔“

”رنڑا،بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”آپ نے نہیں نا کرنا فائر......؟“اس کے لہجے میں ناراضی شامل ہونے لگی تھی۔گلگارے پہلے سے خفا تھی اب رنڑا کو خفا کرنا مجھے مناسب نہ لگا۔یوں بھی وہ اتنی عقیدت اور خلوص سے مجھے لالا جی کہتی تھی۔اور ہر لڑکی کی نظر میں اس کا بڑا بھائی ہیرو ہوتا ہے دنیا کے تمام مردوں سے انوکھا۔ایک چھوٹی بہن کے سامنے میں اس کے بھائی کو زیرو نہیں کر سکتا تھا۔

”اچھا ناراض نہ ہو،کرتا ہوں فائر۔لیکن صرف ایک گولی فائر کروں گا۔اگر شیشے کو نشانہ نہ بنا سکا تو سمجھ لینا تمھاری باجی ٹھیک کہتی ہے۔“یہ کہہ کر میں نیچے بیٹھ گیا۔کلاشن کوف کی سائیٹ پر تین سو رینج لگا کر میں نے دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹیک دیں۔یہ سنائپر کی وہ خاص پوزیشن ہوتی ہے جب وہ درخت پر بنی مچان سے کسی ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔پوزیشن درست کر کے میں نے پچھلی سائیٹ کے وی نما کٹاؤ کو اگلی سائیٹ کی نوک سے ملایا اور شیشے پر نظر سادھ لی۔اس کلاشن کوف کو میں پہلے سے آزما چکا تھا وہ میری نظر کے مطابق ہی صفر تھی اس لیے مجھے اس وقت کلاشن کوف کو جانچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شیشے کا دو انچ کا ٹکڑا صرف اپنی چمک کی وجہ سے

دکھائی دے رہا تھا۔اور سورج کی روشنی پڑنے کی وجہ سے وہ اپنے حجم سے کچھ بڑا دکھائی دیتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ گلگارے اسے نشانہ نہیں بنا پا رہی تھی۔یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی کلاشن کوف صحیح طریقے سے صفر ہی نہ ہوئی ہو۔اور اتنا باریک نشانہ لگانے کے لیے ہتھیار کا مکمل صفر ہونا ضروری ہوتا ہے،جبکہ ہتھیار کی ایسی صفر کاری کوئی منجھا ہوا سنائپر ہی کر سکتا ہے۔عام نشانہ بازی میں چونکہ اتنے فاصلے پر لگے ہدف کی لمبائی چوڑائی ایک انسان کے بالائی جسم کے بہ قدر ضرور ہوتی ہے اس لیے عموماً ہتھیاروں کو اس باریک بینی سے نہیں جانچا جاتا۔البتہ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا تو میں نے جس ہتھیار کو چند دن بھی پاس رکھنا ہوتا،اسے اپنے طریقے سے صفر ضرور کرتا تھا۔اور اس وقت میرے ہاتھوں میری ذاتی کلاشن کوف ہی تھی۔وہ کلاشن کوف جو کمانڈر نصر اللہ نے مجھے بہ طور تحفہ عنایت کی تھی۔

شیشے کی چمک کی وجہ سے اس کا مرکز معلوم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔میں نے اپنی آنکھوں کو ساٹھ ستر فیصد میچ کر شیشے کی چمک کو دھندلایا اور مجھے شیشے کا مرکز معلوم ہو گیا۔اس کام میں مجھے دو تین سیکنڈ ہی لگے تھے۔شیشے کا مرکز معلوم ہوتے ہی میں نے بغیر کسی جھجک کے ٹریگر دبا دیا۔دھماکے کی گونج ختم ہونے سے پہلے شیشے کی چمک ختم ہو گئی تھی۔لازمی بات ہے ایک نازک شیشے کو کلاشن کوف کی طاقت ور گولی نے درجنوں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

''اوہ......نشانہ بن گیا لالا جی!زندہ باد۔''رنڑا وارفتگی سے چلائی اور اس کے ساتھ ہی منڈیر سے جھک کر گلگارے کو آوازیں دینے لگی۔''باجی......باجی......باجی......''

''ہاں کیا ہے۔''وہ باورچی خانے سے نکل کر سامنے ہوئی۔اس نے شاید یہ سوچا تھا کہ رنڑا نے پہلی مرتبہ گولی چلائی ہے اور یہی خوش خبری اسے دینا چاہتی ہے۔

''لالا جی......نے ایک ہی گولی سے شیشے کو نشانہ بنا دیا ہے۔میں کہتی تھی نا لوگ جھوٹ نہیں کہتے،لالا جی بہت بہادر،دلیر اور اچھے نشانہ باز ہیں۔''وہ جوش بھرے انداز میں کہتی چلی گئی تھی۔

''تمھارا دماغ خراب ہوا ہے۔''سر جھٹکتے ہوئے وہ واپس مڑ گئی یقیناً اسے میری تعریف پسند نہیں آئی تھی۔

''کیا سچ مچ لالا نے اس شیشے کو نشانہ بنا لیا ہے۔''ثمر خان جو اس کے گلگارے کو مسلسل پکارنے پر صحن میں

آیا تھا حیران کن انداز میں پوچھنے لگا۔

رنڑا جلدی سے بولی۔ ''قسم سے سچ کہہ رہی ہوں، بے شک اوپر آ کر دیکھ لو۔''

''ابھی آیا۔'' وہ خوش ہوتا ہوا سیڑھی کی طرف بھاگ پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ مورچے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ آتے ساتھ اس کی نظروں مطلوبہ تنے کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ رنڑا پر جوش انداز میں اسے تفصیل بتانے لگی۔ میں بس مسکراتے ہوئے ان دو معصوم بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری نظر میں وہ معمولی سا کام ان کی نظر میں ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ دو کلو میٹر دور سے ہدف کو نشانہ بنانے والے سنائپر کے لیے دو اڑھائی سو میٹر دور سے کسی ہدف پر گولی مارنا ایک مذاق ہی تو تھا۔

☆......☆......☆

رات کو سوتے وقت تک ثمر خان اور رنڑا اسی موضوع کو چھیڑے رہے۔ گلگارے نے اس بحث میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شمریز خان خود اس شیشے کو نشانہ بنانے کے لیے چند گولیاں ضائع کر چکا تھا۔ رنڑا کی زبانی شیشہ ٹوٹنے کی بات سنتے ہی اس نے بس اتنا کہا تھا۔

''وہ ایس ایس ہے بیٹی، یہ نشانہ تو اس کے لیے نہایت معمولی بات تھی۔''

''باجی تو کہتی تھیں ان سے اچھا نشانہ باز کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور یاد ہے انھوں نے لالاجی کو للکارا بھی تھا۔''

شمریز خان محبت سے بولا۔ ''وہ بھی تو تمھاری طرح بچی ہے۔''

رنڑا نے منھ بناتے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ ''بچی کہاں ہیں ...... اتنی بڑی ہوگئی ہیں۔ اور دیکھ لیں ذرا بھی ان کی حکم عدولی کریں پٹائی کرنے سے بھی باز نہیں آتیں۔''

''تمھیں لالاجی کیا ملے، بڑی بہن ہی کے خلاف ہوگئی ہو۔''

رنڑا جلدی سے بولی۔ ''خلاف تو خیر نہیں ہوئی، وہ مجھے بہت پیاری ہیں۔ البتہ لالاجی سے ذرا کم۔''

شمریز خان نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے لالاجی کل واپس جا رہے ہیں۔''

''کیوں ...... کس لیے۔'' وہ فوراً میری جانب متوجہ ہوگئی تھی۔

میں ہنسا۔ ''تو کیا ساری زندگی یہیں پر گزاروں گا۔''

”کیا فرق پڑتا ہے، ہمارا اتنا بڑا گھر ہے۔“

میں اسے ڈراتے ہوئے بولا۔”میری بیوی پلوشہ نے یہ سنا، نا تو تمھیں جان سے ماردے گی۔“

رنڑا فخر سے بولی۔”میرے لالاجی کے ہوتے وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔“

”بھول ہے تمھاری، وہ تمھارے لالاجی کے بھی کان کھینچتی ہے۔“

”لالاجی!...... باباجان کہتے ہیں کہ جھوٹ......“ رنڑا کے منہ میں یہ الفاظ تھے کہ گلگارے اندر داخل ہوئی۔

”رنڑا، بڑوں سے تمیز سے بات کیا کرو۔اور جاؤ سو جاؤ۔“

”جی باجی۔“ وہ دھیمے لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی۔

میں نے کہا۔”چچا شمریز!...... ایک بات پوچھنا تھی۔“

”پوچھو جناب۔“ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔جبکہ گلگارے میری طرف پیٹھ کر کے باپ کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی تھی۔

”بڑوں سے تمیز سے بات کرنا، صرف چھوٹی بہنوں کے لیے ضروری ہوتا ہے یا یہی کلیہ بڑی بہن پر بھی لاگو ہوتا ہے۔“

شمریز خان نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔”گویا آپ میری گلگارے بیٹی پر الزام لگا رہے ہیں کہ وہ بڑوں کی عزت نہیں کرتی...... اگر ایسا ہے تو بہت زیادتی کر رہے ہیں آپ۔“

”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔“

”آپ کی بات سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا ہے۔“

”اچھا اس موضوع کو چھوڑیں چچا شمریز!...... آپ مجھے راستے کے بارے مزید تفصیل بتائیں۔“

”بہتر تو یہی ہے کہ چند دن اور یہیں قیام کرلو، جلد ہی مجاہدین کی کوئی پارٹی یہاں سے گزرے گی ان کے ساتھ آگے چلے جانا۔“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ کسی کا انتظار کر سکوں۔“

اس نے پوچھا۔”اچھا صبح کس وقت نکلو گے؟“

”ناشتا کرتے ہی،قریباً سات آٹھ بجے تک۔“

”ہونہہ!......کہہ کر وہ چند لمحے سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر راستے کے بارے ضروری باتیں بتانے لگا۔گھنٹا ڈیڑھ بات چیت کرنے کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے کہ صبح مجھے سفر بھی کرنا تھا۔ہماری گفتگو کے دوران گلگارے مسلسل خاموش بیٹھی رہی تھی۔اور جونہی ہم سونے لگے وہ اپنے باپ کے جسم پر لحاف ٹھیک کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

صبح نماز کے بعد میں لحاف میں گھس کر ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔ناشتا رنڑا لے کر آئی تھی۔شمریز خان اور میں نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کیا۔میں دو تین پراٹھے کھا گیا تھا تا کہ دوپہر کے کھانے کی حاجت نہ رہے۔ناشتے کے بعد میں اپنا سفری تھیلا تیار کرنے لگا۔تھوڑی دیر میں میں جانے کے لیے تیار تھا۔شمریز سے الوداعی معانقہ کر کے میں نے رنڑا اور ثمر خان کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔وہ دونوں میرے جانے سے پریشان ہو گئے تھے۔

رنڑا نے پوچھا۔”لالا جی!......آپ واپس کب لوٹیں گے۔“

”اس بارے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

اس نے منھ بسورا۔”اچھا یہ وعدہ تو کر سکتے ہیں نا کہ اسی راستے سے لوٹیں گے۔“

”نہیں۔“میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔”مجھے نہیں معلوم کہ میری واپسی کن حالات میں ہو گی، بلکہ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں واپس لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں۔“

”لالا جی،ایسے تو نہیں کہتے۔“رنڑا کی آنکھیں نم ہونے لگیں تھیں۔

”اچھا تمھاری باجی کہاں ہے؟ کیا اس نے مجھے رخصت نہیں کرنا۔“میں نے جلدی سے موضوع تبدیل کیا

”وہ تو ناشتا بنا کر گھر سے نکل گئی تھیں۔“وہ انکشاف کرتے ہوئے بولی۔”شاید گاؤں کی طرف گئی ہوں۔میں نے انھیں کہا بھی تھا کہ لالا جی نے ناشتے کے بعد الوداع ہونا ہے،مگر مجھے انھوں نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ یہ معلومات میں اپنے پاس ہی رکھوں۔“

”شاید کوئی ضروری کام ہو۔“میں نے کھسیانا ہو کر بات بنائی۔

''بچی ہے ذیشان صاحب، میں اس کی طرف سے معذرت خواہ ہوں۔'' شمریز خان نے جلدی سے صفائی دی۔

جیب سے چار پانچ ہزار کے بقدر رقم نکال کر میں نے ثمر خان اور رنڑا کے ہاتھ پر آدھے آدھے نوٹ رکھے اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ انکار میں سر ہلاتے رہ گئے تھے۔

گلگارے واقعی مجھ سے سخت ناراض تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی حساس ہو گی۔ اور آخری وقت تک مجھے معاف کرنے پر تیار نہیں ہو گی۔ اسے منانے کے لیے میں نے اپنا ایک دن ضائع کر دیا تھا۔ گو اس کے ساتھ میرا کوئی ایسا جذباتی لگاؤ تو نہیں تھا کہ میں وہ واقعہ بھول نہ پاتا، البتہ اس نے میری جان بچا کر جو احسان کیا تھا اس قرض کے بوجھ نے میرے کندھے ضرور جھکا دیے تھے۔

گھر سے نکل کر میں جنوب کی طرف موجود ڈھلان پر چلنے لگا۔ ڈھلان پر ترچھا چلتے ہوئے میں نالے میں اتر سکتا تھا مگر نالے میں برف کچھ زیادہ ہی اکٹھی ہوتی ہے۔ جبکہ تازہ پڑی برف میں چلنا کافی دشوار ہوتا ہے ڈیڑھ دو فٹ پڑی ہوئی تازہ برف میں آدمی کا پاؤں گھٹنے تک دھنس جاتا ہے۔ پاؤں کو اوپر کھینچتے ہوئے ٹھیک ٹھاک طاقت استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یوں منٹوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ اس پر مشقت چلنے سے اتنی تھکن ہوتی ہے کہ چند کلومیٹر چلنا بھی کارِ دار بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے نالے میں اترنے کے بجائے ڈھلان پر ترچھا چلنا پسند کیا تھا کہ ڈھلان پر زیادہ برف جمع نہیں ہو پاتی۔

کلومیٹر بھر چل کر مجھے نالے کی تہہ نظر آنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں خوش ہو گیا تھا کہ تہہ میں بہتے پانی کی وجہ سے نالے کے درمیان میں برف مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ڈھلوان پر چلنے کا ارادہ ختم کر کے نالے میں اترنے لگا۔ اسی وقت میری نظر پندرہ بیس گز دور گزرنے والے قدموں کے نشانات پر پڑی۔ کوئی آدمی وہاں سے پہلے بھی گزرا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں خیال گزرا کہ شاید وہ گلگارے کے پاؤں کے نشان ہوں، مگر پھر میں نے اپنے خیال کو جھٹلا دیا کہ ان کا گاؤں خواگا ابو مخالف جانب میں پڑتا تھا اسے اس طرف آنے کی کیا ضرورت تھی۔

نالے میں اتر کر میں پانی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔قدموں کے بنے ہوئے دوسرے نشان بھی نالے کی تہہ میں بہتے ہوئے پانی کے پاس آکر ختم ہو گئے تھے۔میں چلتے ہوئے چوکنے انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ بھی لیتا گیا کہ قدموں کے نشان کسی ایسے اچکے کے بھی ہو سکتے تھے جو مجھے دھوکے سے نشانہ بنا لیتا۔نالے کا رخ مشرق سے مغرب کی جانب تھا، پانی کا بہاؤ بھی اسی جانب تھا۔مجھے گویا غیر محسوس اترائی میں اترنا پڑ رہا تھا اس وجہ سے مجھے چلنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آرہی تھی۔

فرلانگ بھر کے فاصلے پر نالا جنوب کی طرف مڑا مزید پچاس میٹر چلتے ہی مجھے پاؤں کے نشان اوپر کی جانب بڑھتے نظر آئے۔اس طرف نظریں دوڑاتے ہی مجھے قریبی ٹیکری پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔اسے پہچانتے ہی میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔وہ کوئی اور نہیں گلگارے تھی۔گود میں کلاشن کوف رکھے ایک پتھر پر تشریف ٹیکے وہ سامنے کی جانب دیکھ رہی تھی۔وہ مجھے دیکھ چکی تھی مگر اس نے نہ تو مجھے مخاطب کیا تھا اور نہ میری جانب متوجہ ہوئی تھی۔وہ چھوٹی سے ٹیکری نالے کی تہہ سے بیس پچیس گز ہی بلند تھی۔ایک لمحہ رک کر میں نے اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھا اور پھر آگے گزرتا چلا گیا۔میرا خیال تھا کہ وہ مجھے آگے جاتا دیکھ کر ضرور آواز دے گی، مگر دس پندرہ قدم چلنے کے باوجود وہ اسی طرح بے پروائی سے بیٹھی ناک کی سیدھ میں دیکھتی رہی۔

اپنے قدم روک کر میں نے دوبارہ اس کی جانب دیکھا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس کے قدموں کے بنے ہوئے نشانات کی طرف بڑھ گیا۔نہ جانے وہ وہاں کیوں آئی تھی، مجھے معذرت کا موقع دینے، مجھ سے مزید شکوے کرنے یا کسی اور مقصد سے۔بہر حال اس کی سوچ جو بھی تھی اس کی وہاں آمد کی وجہ میں ہی تھا۔اور وہی وجہ جاننے کے لیے میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔

تھوڑی سی چڑھائی طے کر کے میں اس کے قریب پہنچا۔مگر میری جانب توجہ دیے بغیر وہ سامنے دیکھتی رہی ۔اس کا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا یوں جیسے کوئی آدمی تنہائی میں خالی الذہن ہو کر خلا میں گھور رہا ہو۔

قریب پہنچ کر میں نے گلا کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا، مگر اس کے انہماک میں کوئی فرق نہ پڑا، اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔اس کے دائیں جانب پڑے پتھر پر سے برف ہٹا کر میں نے بھی نشست سنبھال لی۔سفری تھیلا اپنے کندھوں سے نکال کر میں نے نیچے رکھ دیا تھا۔

ایک دولمحہ سوچنے کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔میں شرمندہ ہوں اور معافی کا طلب گار ہوں۔''

اس کے انہماک میں دراڑ پڑی، میری جانب سر گھماتے ہوئے اس نے گہری نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں جن کی تہہ میں جوار بھاٹا اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔''اور آپ کے معذرت کرنے سے مجھے پہنچنے والی اذیت کا ازالہ ہو جائے گا۔''

''میں نے تو بس اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے اور یقیناً اعتراف جرم سے مجرم معافی کا حق دار تو ہو جاتا ہے۔''

''حق دار نہیں،طلب گار کہیں۔یہ طے کرنا زیادتی کا شکار ہونے والے کا کام ہے کہ معاف کیا جائے یا بدلہ لیا جائے۔''

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔''شاید اتنا بڑا قصور تو نہیں تھا میرا۔''

''یہ چھوٹی بات نظر آ رہی ہے آپ کو، جانتے بھی ہیں مجھ پر کیا بیتی؟......میں اپنی نظروں سے گر گئی، آپ کو آنکھ ملانے کے قابل نہ رہی، میرے کردار، پارسائی اور شخصیت کا بت پاتال میں جا گرا۔میرے احساسات کے اتنے ٹکڑے ہوئے جنہیں سمیٹنے کے لیے شاید ساری زندگی بھی کم پڑ جائے۔''اس کی نیلی آنکھیں جھیل کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔''میں ایسی لڑکی تو نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ بیٹھے،اپنے رشتے کی اطلاع ہی دی تھی نا،یہی باور کرایا تھا کہ میں آپ کو بھائی نہیں سمجھتی وہ بھی اس وقت جب تک مجھے پلوشہ کے بارے معلوم نہیں ہوا تھا۔اور میں کچھ بھی سمجھتی رہتی آپ نے تو مجھے چھوٹی بہن کہا تھا نا،اگر مجھ سے آپ کے ساتھ ٹکرانے کی غلطی ہو گئی تھی تو اسے اس انداز میں اجاگر کرنے کیا ضرورت تھی کہ میرے کردار پر انگلی اٹھنے کی نوبت آ جاتی۔اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں میں کسی ایسی نیت یا ارادے سے آپ کے قریب نہیں ہوئی تھی جیسا آپ سمجھ بیٹھے۔اتنے اوچھے، سستے اور بے قیمت کردار کی مالک نہیں ہوں میں۔وہ تو بس حالات ایسے تھے کہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی اور آپ نے مجھے بے توقیر کرنے،میری عزت خاک میں ملانے اور مجھے اپنی نظروں سے گرانے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہ کی۔''

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی حساس ہو سکتی ہے۔میں تو پلوشہ کا عادی تھا جسے شروع شروع

میں میں کتنی بار ایسی باتوں پر نہ صرف زبان سے متنبہ کرتا رہا تھا بلکہ ہاتھوں سے پکڑ کر بھی دور دھکیل دیا کرتا تھا اوراس نے میری کسی بات کو مچھر کے پر جتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ الٹا وہ مجھے مطعون کر دیا کرتی۔ حالانکہ وہ اس وقت میرے لیے مکمل غیر تھی اور میں جو کچھ کہتا تھا وہ بناوٹی نہیں حقیقت ہوا کرتا تھا۔لیکن وہ الٹا مجھے ہی دھمکانے لگتی۔ یہاں میری ذرا سی غلطی پر گلگارے نے جانے کتنی گہرائی میں اسے محسوس کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی جگہ اگر پلوشہ ہوتی اور اسے میں نے یونھی دور دھکیلا ہوتا تو وہ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر دوبارہ مجھ سے آلپٹی ہوتی۔ میرے اندر کہیں دور سے آواز اٹھی......

''ہاں، کیونکہ وہ تمھیں شروع دن سے چاہتی تھی اور اس کے قریب ہونے کا مقصد نزدیکیاں ختم کرنا ہی تھا ،گلگارے تو بے خیالی میں قریب ہوئی تھی۔''

''اچھا روؤ تو مت۔''میں نے اس کا سر دہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ لیا اور خفت سے بولا۔''بہ خدا میرا نہ تو یہ ارادہ تھا اور نہ یہ خیال ہی جیسا آپ سمجھے بیٹھی ہیں۔ جو کچھ ہوا نا دانستگی اور عجلت میں ہوا۔ یقیناً میں نے غلط بلکہ بہت ہی غلط کیا تھا اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں دور دور تک بھی یہ گمان نہیں کہ میں آپ کے کردار پر رائی برابر بھی شک کر سکوں...... حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ سے حفظ ماتقدم کے طور پر وہ فعل سرزد ہوا تھا۔ بے شک میں نے آپ کو بہن کہہ کر پکارا،لیکن اتنا تو آپ بھی جانتی ہیں کہ کسی لڑکی کو بہن کہنے یا سمجھنے سے وہ آپ کی محرم نہیں بن جاتی۔ اس کی حیثیت تب بھی غیر عورت جیسی ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ جانتی ہوں گی کہ شیطان مردود انسان کے جسم میں خون کی طرح متحرک رہتا ہے۔ وہ کسی کے دماغ میں گندے اور غلیظ خیالات پیدا کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا۔ آپ جیسی خوب صورت اور پیاری شکل اللہ پاک نے بہت کم لڑکیوں کو عنایت کی ہوگی، جبکہ میں ایک گناہ گار اور سستے خیالات کا مالک عام سا جوان ہوں۔ آپ کے بارے میرے دل میں نہایت پاکیزہ، مقدس اور عقیدت مندانہ خیالات بھرے ہیں۔ اتنے زیادہ قریب ہونے پر خدا نخواستہ میرے دل میں کوئی ایسا خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا جس پر میں ساری زندگی پشیمان رہتا۔ بس یہی سوچ کر میں عجلت میں کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ بجائے اس کے کہ میں خود پیچھے ہو جاتا اور آپ یہ سمجھتیں کہ میں آپ کو ہول میں جھانکنے کا موقع دے رہا ہوں، میں نے آپ کو بازو سے پکڑ دور دھکیل دیا۔ میرا طریقہ اور انداز غلط نہیں بے

ہودہ تھا، لیکن معاف کرنا اور نظر انداز کر دینا آپ کے بس میں ہے۔ مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا۔ اب تک شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ میری محسن ہیں۔ مجھے نئی زندگی عطا کرنے میں اللہ پاک نے آپ کو سبب بنا کر بھیجا ہے...... براہ مہربانی درگزر کرو، مجھے معاف کر دو۔"

اپنے بائیں ہاتھ کی پشت کو اس نے آنکھوں پر پھیرا اور نیچے دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "پلوشہ کو یہ بات بتاؤ گے؟"

"نہیں۔ مگر آپ کے بارے ضرور بتاؤں گا۔"

"چھوٹی بہنوں کو تو آپ کہہ کر نہیں پکارا جاتا۔" بہ ظاہر تو نہیں، مگر اس کے لہجے کی گہرائیوں میں ہلکے سے دکھ کی آمیزش شامل تھی۔

میں مسکرایا۔ "یہ تم نے بالکل صحیح کہا۔"

"میں بھی معذرت خواہ ہوں، کل آپ مجھے منانے کے لیے پورا دن رکے رہے مگر میں نے آپ کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔"

"تو تمھیں معلوم تھا کہ میں کیوں رکا ہوں۔"

"بچی تو نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"اتنی بڑی بھی نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"آپ کی پلوشہ سے تو بڑی ہوں نا۔"

"ہونہہ!...... عمر میں کہہ سکتے ہیں، ورنہ جو کام وہ کرتی ہے اس کے مقابل آپ بالکل چھوٹی بچی نظر آئیں گی۔"

"ہاں، وہ میری آئیڈیل ہے۔ میں نے اس کی بہت ساری کہانیاں سنی ہیں اور اسے ملنے کا مجھے بہت شوق ہے۔"

"دعا کرو وہ مجھے جلدی مل جائے تاکہ میں اسے تمھارے گھر بھیج دوں، پھر خوب گپ شپ کرنا۔"

"اچھا دکھنے میں کیسی ہے؟" گلگارے کی آنکھوں میں گہرا تجسس تھا۔

میں نے پرس میں رکھی اس کی تصویر نکال کر گلگارے کی طرف بڑھا دی۔ ''لو خود دیکھ لو۔'' یہ تصویر میں نے اس کی ماں سے لی تھی۔ تصویر میں ہونٹوں پر ملکوتی تبسم سجائے وہ کیمرے کی طرف متوجہ تھی۔

گلگارے اس کی تصویر کو انہماک سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''واقعی اس کے بال تو بالکل چھوٹے ہیں اور بالکل لڑکا ہی لگ رہی ہے۔''

''شکل کیسی ہے۔''

''جتنی پیاری ہے اتنی ہی خوش قسمت بھی ہے کہ، جسے پیار کرتی ہے اسے بھی اس قدر محبوب ہے۔''

''جانتی ہو اس کے ملنے سے پہلے میری زندگی کتنی پھیکی بے رونق اور بے مزہ تھی۔ خاص کر عورت ذات تو میرے نزدیک بالکل اعتبار کے قابل نہیں تھی۔ اور اس دن میں نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ پلوشہ شروع میں مجھ سے کیسے ٹکرائی تھی......'' میں اس کے سامنے پلوشہ ایسی بہت سی باتیں دہراتا گیا جو میں پہلے نہیں بتا سکا تھا۔

وہ انہماک، دلچسپی اور مسکراتے ہوئے پلوشہ کی شوخیوں، شرارتوں بھرے واقعات سنتی رہی۔ اس دوران وہ گاہے گاہے اس کی تصویر پر بھی نظریں دوڑا لیتی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''اللہ پاک کا شکر ہے کہ آپ دونوں ایک ہوگئے ہو۔''

''صحیح کہا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتا ہے میں نے دل میں ایک اور گلہ بھی چھپایا ہوا ہے۔'' پلوشہ کی تصویر میری جانب بڑھاتے ہوئے وہ شکوہ کناں ہوئی۔

میں دلچسپی سے مستفسر ہوا۔ ''بھلا وہ کون سا؟''

''ثمر خان کو آپ نے کلاشن کوف تحفے میں دی، رنڑا کو بارہ بور، ابوجان کو ایٹ ایم ایم، میرے لیے کچھ بھی نہیں......کم از کم اتنا ہی کہہ دیتے کہ یہ پستول گلگارے کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔''

''تمھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟''

''میں دوسرے کمرے میں باباجان اور آپ کی تمام باتیں سن رہی تھی، جونہی آپ نے باہر جانے کا ارادہ کیا میں بھاگ کر باورچی خانے میں گھس گئی۔''

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''چھپ کر باتیں سننا کوئی اچھی عادت تو نہیں ہے نا۔''

''آپ میرے شکوے کو باتوں میں نہ اڑائیں ...... بہرحال آپ کے بتائے بغیر میں نے ایک پستول آپ کی نشانی کے طور پر رکھ لیا ہے۔'' اس نے کندھے سے لٹکے ہوئے کپڑے کے تھیلے سے تیس بور پستول نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ پشاور سے ملحق شہر درہ آدم خیل کا بنا ہوا مقامی ساخت کا پستول تھا۔ درے میں اچھا اسلحہ بھی بنتا ہے اور ناقص بھی۔ وہ دونوں پستول میں نے دیکھے تھے، بس گزارے لائق ہی تھے۔

''پاگل، یہ ہتھیار میرے نہیں ہیں ...... یہ تو ان اچکوں کی نشانی ہیں۔ تمھارے لیے میرے پاس کچھ اور موجود ہے...... لیکن تم نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نیفے میں اڑسا ہوا گلاک نائینٹین نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، یہ میں نہیں لے سکتی...... آپ کو آگے ضرورت پڑے گا۔''

''میرے لیے یہ کافی ہے۔'' میں نے گود میں رکھی کلاشن کوف کا بٹ تھپتھپایا۔

پستول میرے ہاتھ سے لے کر الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''ویسے اتنا مہنگا تو نہیں لگ رہا، اگر کبھی رقم کی ضرورت پڑے تو کیا اسے دس پندرہ ہزار میں بیچ سکتی ہوں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دو سو سے کم ایک روپیا بھی نہ لینا۔''

''مذاق تو نہ کریں......'' مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس کے لہجے میں حقیقی حیرانی ابھر آئی تھی۔ ''دو سو میں تو آج کل اچھا چاقو بھی نہیں ملتا۔''

''سچ کہہ رہا ہوں...... دو سو ہزار سے ایک روپیا بھی کم نہ لینا۔''

''دو سو ہزار......'' وہ اب تک میری بات نہیں سمجھی تھی۔

''میرا مطلب ہے دو لاکھ۔''

''کیا......؟ اتنا مہنگا، میں نے نہیں رکھنا۔'' اس نے ایک دم پستول میری جانب واپس بڑھایا۔

''پاگل۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی پیاری بہن کے لیے تو اس سے کئی گنا قیمتی چیز بھی حقیر کہلائے گی۔''

''آپ جب واپس آئیں گے تو پھر لوں گی۔فی الحال یہ آپ کو وہاں کام آئے گا۔''پستول میرے حوالے کرنے کے بہانے اس نے میری واپسی کے راستے کا بھی تعین کر دیا تھا۔

''میرے لیے یہ بہتر رہے گا۔''میں نے اس کے ہاتھ سے تیس بور پستول لے کر نیفے میں اڑس لیا۔

''مگر......''

''خاموش۔''میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بات کرنے سے روکا اور سفری تھیلے سے گلاک کی گولیاں نکالنے لگا۔سو کے قریب فالتو گولیاں میرے پاس موجود تھیں وہ تمام میں نے گلگارے کی جانب بڑھا دیں۔

گولیاں میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔''ویسے لالا جی کی لاڈلی بہن رنڑا بی بی نے آپ کو بتایا تو ضرور ہوگا کہ میں نے اس کے سامنے آپ کی کتنی برائیاں کی تھیں۔''

میں کھل کھلا کر ہنسا۔''ہاں کچھ ایسا کہہ تو رہی تھی۔''

''کل کا سارا دن اور گزشتہ رات، آپ کی تعریفیں کر کر اس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔کم از کم پانچ چھ دفعہ تو بے عزت ہوئی ہوگی مگر باز پھر بھی نہ آئی۔آپ نے غلطی سے شیشے کو کیا نشانہ بنا لیا اسے آپ سے بہتر نشانے باز پوری دنیا میں دکھائی نہیں دے رہا۔کل رات جب آپ کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں گئی وہ جاگ رہی تھی اور اس کے پاس ایک ہی موضوع تھا،اس کا لالا جی۔''

''حاسد کہیں کی،میرے سامنے بھی اس نے اپنی باجی کی کافی تعریفیں کی تھیں،مگر میں نے تو اسے نہیں ڈانٹا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔میں بھی مسکرا دیا تھا۔

''اچھا وہ بڑی چٹان پر پڑا چھوٹا گول پتھر نظر آرہا ہے۔''اس نے نالے میں پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کیا جس پر چھوٹا سا گول پتھر رکھا تھا۔فاصلہ اڑھائی سو میٹر سے زیادہ ہی ہوگا۔لگ یہی رہا تھا کہ اس نے آتے وقت اس چٹان پر خود ہی وہ پتھر رکھا تھا۔

میں نے جواب دیے بغیر کلاشن کوف کو کندھے سے لگایا اور لبلبی دبا دی۔چھوٹا پتھر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔میں نے ہنستے ہوئے۔''اب نظر نہیں آرہا۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ”یہ بات میں رنڑا بی بی کو تو بالکل بھی نہیں بتاؤں گی۔“

میں نے مزاحیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”سب جانتے ہیں کہ گلگارے بی بی کتنی حاسد ہے۔“

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”اگر حاسد ہوتی تو کسی اور سے حسد کرتی۔“

”اور کس سے؟“ میں نے بے خیالی میں پوچھ بیٹھا۔

”کسی سے بھی، ثمر خان، بابا جان یا پلوشہ وغیرہ سے۔“ بات کو گول مول کر کے بھی اس نے واضح کر دیا تھا۔

”یقیناً اب مجھے چلنا چاہیے۔“ میں اس لا یخل بحث کو مزید جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر اداسی نمودار ہوئی مگر اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بغل میں لٹکائے جھولے سے کپڑے کی پوٹلی نکال کر اس نے میری جانب بڑھائی۔

”آپ کے لیے دال کے پراٹھے بنائے ہیں۔“

”ہاں اس کی تو بہت ضرورت تھی۔“ میں نے پوٹلی لے کر سفری تھیلے میں ڈال لی۔ ان کے گھر سے چلتے وقت بھی میرے دماغ میں یہ بات موجود تھی کہ رنڑا کو کہہ کر راستے کے لیے کوئی پراٹھے وغیرہ پکوا لوں، مگر گلگارے کے جانے کی خبر سن کر میں رنڑا کو نہیں کہہ پایا تھا۔

میں جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔ وہ بھی اداس چہرہ لیے اٹھی، ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ قدم بڑھا کر میرے نزدیک ہوئی اور میری چھاتی پر سر رکھ دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے اداس لہجے میں کہا۔ ”بہنا دعاؤں میں یاد رکھنا۔“

”بھائیوں کو تب ایسا کہنا پڑتا ہے جب انھیں بہن کی محبت میں شبہ ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے آہستگی سے علیحدہ ہو گئی۔

”نہیں صرف یاد دہانی کرا رہا تھا۔“

”پھر بھی مجھے برا لگا۔“

”اچھا غلطی ہو گئی اور اب تم جاؤ۔“

”میں یا آپ؟“ پھیکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہو گئی تھی۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم......''

''اللہ پاک آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے لالاجی!'' یہ کہتے ہی وہ جھٹکے سے مڑی اور ٹیکری سے اترتی چلی گئی۔ نالے میں اتر کر اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر واپسی کے راستے پر گامزن ہوگئی۔ پلوشہ کی طرح اس کے قدموں میں بھی بہت تیزی تھی۔ پہاڑی علاقے کے رہائشیوں کے لیے پہاڑوں پر چڑھنا اترنا معمول کی بات ہوتی ہے۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نالے کے موڑ پر پہنچ گئی۔ وہاں ایک بار پھر رک کر وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر الوداعی انداز میں ہاتھ لہرانے لگی۔

میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر زیرلب ''خداحافظ۔'' کہا۔ یقیناً اس کی طرح میری آواز بھی اس تک نہیں پہنچی تھی مگر میری طرح اسے بھی یقین ہوگا کہ میں نے خداحافظ کہا ہے۔

لمحہ بھر ہاتھ لہرانے کے بعد وہ موڑ مڑتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک اور قابلِ احترام اور معزز ہستی مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔ نہ جانے وہ زندگی میں دوبارہ مل بھی پاتی یا ہمیشہ انھی مختصر گھڑیوں کی یاد کی صورت میں میری یادداشت میں زندہ رہتی۔

میں نے سفری تھیلا اپنی پیٹھ پر لادا، کلاشن کوف کو دائیں کندھے سے لٹکایا اور بوجھل قدموں سے اپنے راستے ہولیا۔ میں نے کافی وقت گلگارے کے ساتھ گزار لیا تھا۔ سورج کے سامنے چھوٹی چھوٹی بدلیاں آنے لگی تھیں۔ ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے میں نے کوٹ کی جیب میں ڈالے، میرا داہنا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور میں ایک دم حیرانی بھرے انداز میں رک گیا کہ شمریز خان کے مکان سے رخصت ہوتے وقت میں نے جیب میں کوئی چیز بھی نہیں ڈالی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ باہر نکالا، وہ ہزار ہزار کے نوٹ تھے جنہیں گول لپیٹ کر ان پر دھاگا پھیرا گیا تھا۔ دھاگا کھولنے پر مجھے نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹا سا رقعہ بھی نظر آ گیا تھا جو پشتو میں تحریر کیا گیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹے شکستہ الفاظ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والا واجبی تعلیم رکھتا ہے۔ بلاشبہ وہ رقعہ اور پیسے میری جیب میں گلگارے نے ڈالے تھے۔ میری نظریں اس شکستہ تحریر پر پھسلنے لگیں۔

سلام کے بعد لکھا تھا۔ بے ہوشی کے وقت آپ کے جسم سے میں نے ہی لباس علیحدہ کیا تھا۔ لباس کی تلاشی لینے پر تین ہزار روپے کے بہ قدر رقم نظر آئی تھی۔ اور جہاں آپ جارہے ہیں وہاں آپ کو کافی رقم کی ضرورت

پڑے گی۔ یہ میرے اپنے پیسے ہیں، میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے براہ راست آپ کے حوالے کیے تو بڑا ہونے کا فائدہ اٹھا کر آپ مجھے ڈانٹ کر یہ پیسے واپس دے دیں گے۔ اسی لیے مجھے چوری آپ کی جیب میں ڈالنے پڑ رہے ہیں۔ گو یہ تھوڑی سی رقم ہے، مگر یقین مانو میری ساری پونجی یہی ہے۔ اگر بہت زیادہ پیسے بھی میرے پاس ہوتے تو آپ کو دے دیے ہوتے۔ اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ میرے گزشتہ دو روز کے رویے پر لازماً آپ کا دل دکھا ہوگا۔ بہ خدا میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ بس اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ معذرت خواہ ہوں ۔اللہ پاک آپ کو اور میری بہن پلوشہ کو ہمیشہ خوش رکھے......اللہ حافظ۔" یہ ساری تحریر اس نے پہلے سے لکھ کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صرف اپنا گلہ مجھ تک پہنچانے آئی تھی ورنہ ناراضی وہ پہلے سے ختم کر چکی تھی۔

اس کا خلوص دیکھتے ہوئے میری آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ میں نے رقم شمار کی ہزار ہزار کے پندرہ نوٹ تھے لیکن ان کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ شاید قارون کا خزانہ اٹھانے والے اونٹ بھی ان کے بوجھ تلے بیٹھنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے عہد کر لیا کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ایک بار گلگارے کو ملنے ضرور لوٹوں گا ۔یقیناً اس نے میری جیب میں نوٹ ڈالنے کے لیے ہی میری چھاتی پر سر رکھا تھا۔ میں پہلے ہی اس کا بہت زیادہ مقروض تھا اس نے مزید زیر بار کر دیا تھا۔ اس نیلی آنکھوں والی پاکیزہ خیالات لڑکی نے ہمیشہ میری یاد میں زندہ رہنا تھا۔

"اللہ پاک تمھارا نصیب اچھا کرے اور تمھیں ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں میری پیاری بہنا!......" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے میں نے آنکھوں میں پیدا ہونے والی نمی خشک کی اور آگے بڑھ گیا۔

ان اچکوں میں سے ایک کی جیب میں مجھے بیس پچیس ہزار کے قریب پاکستانی کرنسی ملی تھی مگر اس بارے میں اسے نہیں بتا سکا تھا۔ اسی وجہ سے اس مخلص لڑکی کو اپنی ساری پونجی میرے حوالے کرنا پڑ گئی تھی۔ میں مسلسل اترائی میں جا رہا تھا، لیکن زیادہ دیر اترائی کا یہ سفر جاری نہ رہا۔ وہ نالہ شمال کی جانب مڑا اور فرلانگ بھر کے بعد اس کا رخ مشرق کی طرف ہوگیا۔ وہ علاقہ یوں بھی پہاڑ در پہاڑ ہے۔ نہ نالوں کا رخ متعین ہے اور نہ پہاڑی سلسلے کسی ایک سیدھائی میں ہیں۔ انجان آدمی کے لیے تو وہ پہاڑ بھول بھلیوں کی طرح ہیں۔ جو ایک بار ان بھول

بھلیوں میں گھس جائے نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتا۔

میں نے مغرب کی سمت اپنا سفر جاری رکھا اور ایسا کرنے کے لیے مجھے اب اوپر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ بلندی کے سفر میں آدمی کی رفتار خود بہ خود دھیمی پڑ جاتی ہے۔ زیادہ تیزی کی کوشش میں تھکن کے ساتھ انسان کا سانس بھی پھولنے لگتا ہے۔ اور میدانی علاقے سے آئے ہوئے آدمیوں کا سانس، رہائشی لوگوں کی نسبت زیادہ پھولتا ہے۔ سورج کے گرد پھرنے والی آوارہ بدلیاں دھوپ کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ گو لگتا تو نہیں تھا کہ برف باری یا بارش ہوگی، مگر اس بارے وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہاں کا موسم تو ایسا ہے کہ تیز دھوپ کی حکمرانی کو بادل چند لمحوں میں زیر کر کے جل تھل کر دیتے ہیں اور زمین پر بارش کا پانی ابھی تک بہہ رہا ہوتا ہے کہ سورج ایک بار پھر پوری آب و تاب سے چمکنا شروع ہو جاتا ہے۔

چڑھائی شروع شروع میں تو نارمل تھی مگر آہستہ آہستہ سخت ہونا شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ میرے لیے سیدھا اوپر چڑھنا مشکل ہو گیا اور میں ترچھا آگے کا سفر طے کرنے لگا یوں کہ دس پندرہ قدموں کے بعد میں تین چار قدم بلند ہو پاتا۔

سورج اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ میرے پاس موجود پانی کی دونوں بوتلیں خالی ہو گئی تھیں اور جس بلندی پر میں موجود تھا اتنی اونچائی پر عموماً چشمے نہیں ہوتے۔ چشمے زیادہ تر نالوں کی تہہ سے بیس پچیس گز اوپر ہی پھوٹتے ہیں۔ اس پہاڑی کی ڈھلان تو اتنی سیدھی تھی کہ وہاں برف بھی نہیں ٹھہر پائی تھی۔ اب دوسری جانب اتر کر ہی مجھے کوئی چشمہ مل سکتا تھا۔

اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر پانی کی غیر موجودی میں مجھے کھانا کھانا مناسب نہ لگا۔ یوں بھی بھوک پیاس برداشت کرنا ہم سنائپرز کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ کئی کئی دن بھوکا پیاسا رہنے والوں کو چند گھنٹے کی بھوک کبھی نہیں ستاتی۔ گھنٹے بھر کی تگ و دو کے بعد میں بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود اس سخت چڑھائی پر مجھے اچھا خاصا پسینہ آ گیا تھا۔ چوٹی پر بیٹھ کر میں سستانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظریں سامنے کی جانب اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ پیچھے راستے میں مجھے چند ویران گھر ملے تھے۔ ایک چھوٹی سی آبادی سے بھی میں گزرا تھا۔ اب سامنے کافی دور ایک وادی جیسی نظر آ رہی تھی جہاں کافی مکان دکھائی دے رہے

تھے۔شمریز خان کی معلومات کے مطابق جہاں تک میرا اندازہ تھا یہ خان کلے کی آبادی تھی۔اس اونچی پہاڑی اور خان کلے کی آبادی کے درمیان کوئی خاص بڑی پہاڑی تو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ وہاں تک پہنچتے ہوئے شام کا اندھیرا چھا جانا تھا۔

چند لمحے سستا کر میں آگے بڑھ گیا۔دوسری جانب اترائی کافی آسان تھی۔نیچے اترتے ہوئے خود بہ خود میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔اس بلند پہاڑی پر چڑھتے ہوئے مجھے دو اڑھائی گھنٹے لگے تھے اور نیچے میں آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا تھا۔نالے کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک چشمہ نظر آ گیا تھا۔وہیں پتھر کی ایک بڑی چٹان پر اپنا سفری تھیلا رکھ کر میں نے چشمے کے پانی سے وضو کیا،خوب سیر ہو کر پانی پیا اور دو رکعت عصر کے (سفر کی وجہ سے) پڑھ کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ظہر کی نماز میں تیمّم کر کے پیچھے ہی ادا کر چکا تھا۔

گلگارے نے دال کے پراٹھوں کے درمیان تازہ مکھن ڈال دیا تھا۔ٹھنڈے ہونے کے باوجود ان پراٹھوں سے اٹھنے والی دیسی مکھن اور خلوص کی مہک میرے رگ و پے میں اتر گئی تھی۔گلگارے نے چار پراٹھے باندھے تھے،مگر میں بہ مشکل دو ہی کھا سکا تھا۔باقی دو میں نے رات کے لیے رکھ چھوڑے۔کھانے کے بعد مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی،برف پڑنے کی وجہ سے زمین پر بکھری ہوئی لکڑیاں تو گیلی ہو گئی تھیں،مگر خشک درختوں کے ساتھ لگی ہوئی ٹہنیاں وغیرہ جلانے کے قابل تھیں۔

ضرورت کے بہ قدر لکڑیاں توڑ کر میں نے آگ جلائی اور چائے بنانے لگا۔ایک پیالی چائے بنانے میں اتنی دیر نہیں لگی تھی۔پہلا گھونٹ بھرتے ہی میرے منھ میں بدمزگی سی پھیل گئی تھی۔پچھلے چار پانچ دنوں سے میں مسلسل تازہ دودھ کی بنی ہوئی بہترین دودھ پتی پیتا رہا تھا اب ایک دم ملک پاؤڈر کی بنی چائے نے اس اعلا چائے کا ذائقہ یاد دلا دیا تھا۔ایک مخلص بہن کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کا مقابلا بھلا وہ روکھی پھیکی اور بدمزہ چائے کہاں کر سکتی تھی۔

چائے پی کر میں نے بوتلیں چشمے کے تازہ پانی سے بھریں اور تیار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ایک بار پھر نالے کا ہموار سفر شروع ہو گیا تھا۔تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ میرے کانوں میں گونجی۔کسی نے ٹریگر مکمل دبا کر ایک لمبا برسٹ فائر کیا تھا۔فائر کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہوائی فائر کیا گیا ہے۔اور ایسے

ہوا میں کلاشن کوف کا برسٹ فائر کرنا یا تو کسی خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے جیسے، عید وغیرہ کا چاند دیکھ کر فائر کرنا یا شادی وغیرہ میں شغل کرنا اور دوسری صورت میں کسی کو للکارنے کے لیے یوں ایک لمبا برسٹ ہوا میں پھونک دیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی احمق نے یونھی بہ طور شغل یہ حرکت کی ہوتی، مگر ایسا ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔

میں نے رفتار کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اپنا دوسرا اندازہ ٹھیک ہوتا دکھائی دیا کہ وہ برسٹ بہ طور اعلان جنگ تھا۔ پرانے زمانے میں جنگ کا اعلان نقارہ بجا کر یا سینگ پھونک کر کیا جاتا تھا، فی زمانہ کلاشن کوف کے برسٹ ہی نے اعلان جنگ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ اچانک ہی ایک سے زیادہ ہتھیاروں کے دھانے کھل گئے تھے۔ وہ فائر دو تین کلومیٹر دور ہی ہو رہا تھا۔ اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسی طرح چلتا رہا تو ان مقابلہ کرنے والوں میں جا پھنسوں گا۔ اس سوچ نے مجھے قدم روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے زیادہ دیر سوچ میں مبتلا نہیں رہنا پڑا تھا کہ دو آدمی مجھے نالے موڑ سے نمودار ہو کر اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ دونوں خالی ہاتھ ہی لگ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے کلاشن کوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا جواں سال لڑکا ہی تھا۔ شکلوں کی شباہت سے دونوں مجھے باپ بیٹا ہی لگ رہے تھے۔ باپ نظر آنے والے نے۔ ''اسلام علیکم!......'' کہتے ہوئے پوچھا۔ ''ہلکا چرتہ زئے، دلے مہ زہ۔'' (او لڑکے کہاں جا رہے ہو، اس طرف مت جاؤ۔'')

میں فوراً پوچھا۔ ''ولے سہ چل دے؟'' (کیوں کیا ہوا۔)

وہ میرے قریب رک کر اپنے چڑھے سانس درست کرتا ہوا بولا۔ ''غزنی خیل اور شلوبر قبیلہ برسر پیکار ہیں۔ جوانب کے آدمی تمھیں مخالف قبیلے کا سمجھ کر قتل ہی نہ کر دیں۔'' وہ شاید بھاگ کر نالہ موڑ تک پہنچے تھے اور اب وہاں سے تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجھ تک پہنچے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ سامنے کون سا گاؤں ہے؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اگر آپ کو اتنا نہیں معلوم تو ادھر کیوں جا رہے ہو۔''

''میں نے تو خان کلے جانا تھا۔''

”خان کلے تو اس جگہ سے آٹھ دس کلومیٹر دور شمال کی جانب پڑتا ہے۔“اس نے شمال کی جانب ہاتھ کا بھی اشارہ کیا تھا۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔”ویسے یہ گاؤں ہے کون سا۔“

”شلوبر......جن پر غزنی خیلوں نے چڑھائی کر دی ہے۔“

”کیوں؟“میں مستفسر ہوا۔

”کسی لڑکی کا چکر ہے، شلوبر قبیلے کا جوان، غزنی خیل قبیلے کی ایک ایسی لڑکی کو بھگا لایا ہے۔ جس کے باپ نے اپنی بیٹی کا رشتہ پشاور میں کسی دوست کے بیٹے سے طے کیا ہوا تھا۔ غزنی خیل والوں کو معلوم ہو گیا کہ لڑکی کس کے ساتھ بھاگی ہے۔ اب شلوبر والے اس لڑکی کے بدلے منھ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں مگر وہ اپنی لڑکی اور اسے بھگانے والے جوان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“

”مطلب دونوں کو قتل کرنے کے لیے؟“میں نے اندازہ لگایا۔

”جی جناب۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”اب آپ بھی اس راستے کو نظر انداز کر دیں، یہ نہ ہو خواہ مخواہ کسی اندھی گولی کا شکار بننا پڑ جائے۔“

میں نے حیرانی ظاہر کی۔”ویسے کیا یہاں سے پاکستان میں بھی لڑکیوں کے رشتے کیے جاتے ہیں۔“

اس نے منھ بناتے ہوئے کہا۔”اللہ کے بندے، آدھا افغانستان تو پاکستان میں موجود ہے۔ باقی اپنے ہاں تو لڑکی کا سودا کیا جاتا ہے جس نے زیادہ رقم پھینکی وہ لے گیا۔“

”تو شلوبر والے بھی تو رقم دے رہے ہیں۔“

”پہلی بات یہ کہ دشمن قبیلے سے رشتے نہیں کیے جاتے اور دوسرا شلوبر کے جوان نے لڑکی کو بھگا کر پورے غزنی خیل کی عزت اچھالی ہے اور اس کا حل تو ایک ہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”یہاں سے قریباً چار کلومیٹر جنوب کی جانب ہمارا گاؤں ہے شنہ وُنہ۔ ہمارے ساتھ چلنا ہے تو آجاؤ۔“

میں نے پہاڑوں کے پیچھے چھپتے ہوئے سورج کو دیکھا، غروب آفتاب میں بیس پچیس منٹ ہی باقی تھے

رات گزارنے کے لیے وہی جگہ مناسب تھی، شنہ ونہ جا کر یونھی سفر کی طوالت میں اضافہ ہی ہونا تھا۔ رات کے کھانے کے لیے میرے پاس پراٹھے موجود تھے، سونے کا بستر میں نے پیٹھ پر لادا ہوا تھا، تو خواہ مخواہ آنے جانے کا آٹھ دس کلومیٹر فاصلہ کیوں طے کرتا۔ یوں بھی پہاڑی علاقوں میں ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرتے ہوئے دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔

''آپ کا بہت شکریہ۔'' میں نے انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اور وہ کندھے اچکا کر بیٹے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں وہیں کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔ وہ اسی اونچی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جہاں سے میں اترا تھا۔

فائرنگ کی آواز میں دم بہ دم اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک ساتھ کئی کلاشن کوفیں گرج رہی تھیں۔ اور پھر ان تمام آوازوں پر 12.7 ایم ایم کی آواز بھاری پڑ گئی۔ جانے وہ تباہی پھیلانے والا ہتھیار کس کے پاس تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو 12.7 ایم ایم گرجنے لگیں۔ معلوم یہی پڑتا تھا کہ دونوں جانب وہ ہیوی گن موجود تھی۔ یا کسی ایک قبیلے کے پاس دو گنیں موجود تھیں۔ اسی گن گرج میں راکٹ لانچر کے دھماکے بھی سنائی دینے لگے۔ لگتا تھا دو قبیلوں کے بجائے دو ممالک کی فوجیں سرحد پر برسر پیکار ہوں۔ میں وہیں دائیں بائیں گھوم کر شب بسری کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ جلد ہی ایک جھکی ہوئی چٹان کے نیچے مجھے مناسب جگہ نظر آگئی تھی۔ اندھیرا چھانے سے پہلے میں جگہ صاف کر کے رات کو جلانے کے لیے ایندھن اکٹھا کر چکا تھا۔

کھانا میں نے عشاء کی نماز پڑھ کر ہی گرم کرنا شروع کیا۔ دن کا کھانا دیر سے کھانے کی وجہ سے مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پراٹھوں کو گرم کرنے پر وہ مجھے اتنے لذیز لگے کہ میں دونوں ٹھونس گیا۔ اس طرف برف باری نہ ہونے کے برابر ہوئی تھی۔ پیچھے جو بڑی پہاڑی میں عبور کر کے آیا تھا برف باری کا زور وہاں تک ہی رہا تھا۔ یقیناً اس طرف بلندی کم تھی اس وجہ سے برف نہیں ہوئی تھی۔ سردی البتہ کافی زیادہ تھی۔ دسمبر لگنے والا تھا اور سردی نے مزید بڑھنا تھا۔ میدانی علاقوں میں لوگ سردی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہاں سردی نہ صرف تکلیف و اذیت کا باعث بنتی ہے بلکہ کاروبار زندگی بھی معطل کر دیتی ہے۔ یوں بھی جب یہاں کی گرمی میدانی علاقے کی سردی کے برابر ہوتی ہے تو سردی کا اندازہ خود کر لیں۔

آگ پر اچھی طرح لکڑیاں ڈال کر میں سلپنگ بیگ میں گھس گیا۔ وہ سلپنگ اچھا خاصا گرم تھا مگر اس

سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے بیرونی امداد کی بھی ضرورت تھی، اس لیے سلیپنگ بیگ میں گھستے وقت میں نے گرم کوٹ پہنے رکھا تھا۔ اس کے ساتھ آگ نے بھی اس چھوٹی سی پناہ گاہ کو اچھا خاصا گرم کر دیا تھا۔ مجھے نیند آتے دیر نہ لگی۔ حالانکہ کسی نئی جگہ پر نیند بہت مشکل سے آتی ہے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں بھرتی ہو کر ٹریننگ سنٹر پہنچا تھا تو ساری رات جاگتا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایسا عادی ہوا کہ اب جنگل، بیابان، صحرا، پہاڑ، پرائے دیس اور بیگانے علاقوں میں مجھے سونے میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا تھا۔ اس وقت بھی اس چٹان کے نیچے میں یوں سو گیا جیسے عام لوگ اپنی خواب گاہ میں بے فکر ہو کر سوتے ہیں۔ حالانکہ جن حالات اور جیسے علاقے میں میں محوِ سفر تھا وہاں کچھ ہوتے دیر نہیں لگتی اور ہوا بھی وہی۔

میں صبح تک کا ارادہ لے کر سویا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد ہی چھاپہ پڑ گیا۔

ان کی تعداد پانچ تھی۔ تمام مسلح تھے۔ آنکھیں کھلتے ہی مجھے پانچ کلاشن کوفیں اپنی جانب تنی نظر آئی تھیں۔

”جی، آپ لوگ کون ہو اور کیا چاہیے؟“ گو میں گہری نیند سے جاگا تھا، مگر میری تربیت اس نہج پر کی گئی تھی کہ آنکھ کھلتے ہی مجھے ماحول کا ادراک ہو جاتا تھا۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ میں کہاں ہوں اور مجھ سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر موجود دو قبائل برسرِ پیکار ہیں۔

ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ہم وہی ہیں جن کا شکار کرنے تم آئے تھے اور اب خود ہمارے شکنجے میں آگئے ہو۔“

”میں مسافر ہوں جناب اور کسی کا شکار کرنے نہیں آیا ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ اس مرتبہ بھی وہی آدمی بولا تھا۔

”محترم مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، میں خان کلے جا رہا تھا راستہ بھول کر اس طرف آنکلا، سہ پہر ڈھلے یہاں پہنچا تو تیز فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہاں سے گزرنے والے ایک شریف آدمی نے بتا دیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی ہے اور یہ کہ خان کلے اس جانب واقع نہیں ہے، پس مجھے آگے جانا مناسب نہ لگا یوں بھی میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا سو چا رات کو آرام کر لوں صبح خان کلے کی راہ ناپوں گا۔“

”کہانی اچھی ہے، مگر تمھارا فیصلہ مشر کرے گا۔“

”بھائی جان، براہ مہربانی مجھے بے آرام نہ کرو، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کس قبیلے کے ہیں۔“

”بھولے بادشاہ، ہم اسی قبیلے کے ہیں جس کی تاک میں تم یہاں گھات لگا کر رات گہری ہونے کا انتظار کر رہے ہو......شلوبر قبیلے کے کسی حلیف کو یوں باتیں نہیں بنانا چاہئیں۔ پچھلی لڑائی میں تمھارے دو تین آدمیوں نے چھاپہ مار کر ہمارا کافی نقصان کیا تھا، اس مرتبہ ہم ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ہم سارے رستوں کی نگرانی کررہے ہیں۔“ اس کی بات سنتے ہی مجھے ساری کہانی پتا چل گئی تھی۔ وہ غزنی خیل قبیلے کے لوگ تھے اور رات کے وقت پہاڑی نالوں اور ایسے رستوں پر گشت کررہے تھے جہاں سے شلوبر قبیلے کے لوگ چھپ کر ان کے پڑاؤ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اور ایسا غالباً ان کی پچھلی لڑائی میں بھی ہوا تھا ،جس کا حوالہ مجھ سے بات کرنے والا آدمی دے چکا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے، ہمارے مشر کو مل لو پھر اس کی مرضی جو فیصلہ وہ کرے گا۔“

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”وہ بھی تو آپ کا مشر ہے۔“

”زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں، تم ہمارے پڑاؤ سے کلو میٹر بھر کے فاصلے پر مسلح حالت میں موجود ہو میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”میرا لہجہ، زبان اور شکل یہ واضح نہیں کر رہے ہیں کہ میں یہاں پر بالکل اجنبی ہوں۔“

”تو......؟“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

”تو یہ کہ مجھے بے آرام نہ کرو جناب۔“

”کہہ دیا نا کہ اس کا فیصلہ مشر کرے گا اور بے آرمی کیسی تھوڑا سا تو فاصلہ ہے تم وہاں ہمارے پڑاؤ میں بقیہ رات گزار لینا صبح ناشتا کروا کر ہم خان کلے کی جانب تمھاری رہنمائی کر دیں گے۔“

میں جھلاتے ہوئے سلیپنگ بیگ سے باہر نکلا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ ان سے متھا مارنا، وقت کا ضیاع ہی تھا۔ یقیناً وہ سردار کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے مجھے اس کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرے سامان سمیٹنے کے

دوران وہ ٹارچ روشن کر کے میری کارروائی کا جائزہ لیتے رہے۔ میری کلاشن کوف البتہ انھوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ سفری تھیلا تیار کر کے میں نے پیٹھ پر لادا اوران کی معیت میں چل پڑا۔ایک آدمی میرے آگے اور باقی پیچھے چلنے لگے۔گو میرے پاس تیس بور پستول موجود تھا اور جس بے پروائی سے وہ چل رہے تھے میں چاہتا تو ان پانچوں کو لاشوں میں تبدیل کر سکتا تھا،مگر کسی بے گناہ کو قتل کرنا مجھے گوارا نہیں تھا۔وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اور مجھے قوی امید تھی کہ ان کا سردار مجھ سے بات کرنے والے کی طرح احمق نہیں ہوگا۔

کچھ دیر نالے میں چلنے کے بعد وہ ترچھا ہو کر نالے کے دائیں جانب موجود ڈھلان پر چڑھنے لگے ۔پانچوں بے فکر ہو کر گپ شپ کرتے جا رہے تھے۔ان کے انداز سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ دل ہی دل میں وہ بھی مجھے غیر متعلق شخص سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا سفر بتدریج اوپر کی جانب جاری رہا۔ادھ پون گھنٹے میں ہم بلندی پر پہنچ کر نسبتاً ہموار راستے پر چلنے لگے۔اس دوران ان کے مورچے شروع ہو گئے تھے۔لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ چوکنا تھے۔سردی سے مقابلے کے لیے انھوں نے جا بہ جا چھوٹے چھوٹے آلاؤ روشن کیے ہوئے تھے۔ایک دو آدمی نے قریب آ کر ان سے حال بھی پوچھا تھا۔اوران کی آپس کی بات چیت سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے وہاں لانے پر اصرار کرنے والے کا نام روشن خان ہے۔اس سے پہلے بھی ایک روشن خان مجھے ٹکرا چکا تھا جو قبیل خان کا کمانڈر تھا۔

جلد ہی ہم غزنی خیل کے مشر کے سامنے موجود تھے۔وہ جس جگہ بیٹھا تھا اس کے تین اطراف میں پتھروں کی دواڑھائی فٹ دیواریں اٹھائی گئی تھیں،صرف شمال کی جانب آنے جانے کا راستہ رکھا گیا تھا۔شلو بر قبیلہ اس جگہ سے جنوب مغرب کی طرف موجود تھا۔

غزنی خیل کے سردار کا نام سیلاب خان تھا۔اس کی عمر چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان دکھائی دے رہی تھی۔اس کے مورچے میں بھی آگ کا بڑا سا الاؤ روشن تھا اوراس کے ہمراہ پانچ چھ اور آدمی بھی موجود تھے ۔روشن خان کی بات سننے سے پہلے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک آدمی کو قہوہ لانے کا کہا۔

میں نے الاؤ کے گرد پڑے ہوئے ایک پتھر پر نشست سنبھالتے ہوئے۔ ”شکریہ۔“ کہا اور خود ہی تفصیل بتلانا شروع کر دی۔میری کہانی میں کوئی ایسا جھول نہیں تھا کہ مجھ پر شک کیا جا سکتا۔سردار سیلاب خان نے میری

بات غور سے سنی اور اختتام پر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''اپنے آدمیوں کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں کہ غلط فہمی کی وجہ سے آپ کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ گئی ۔بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ،اب آپ یہیں آرام کریں ،صبح ہم خان کلے کی جانب آپ کی رہنمائی کر دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ روشن خان کی طرف متوجہ ہوا۔

''روشن خان !......تم اتنے بچے تو نہیں ہو کہ دشمن کو نہ پہچان سکو۔ہم پر حملہ کرنے والا نہ تو اکیلا ہوگا اور نہ اپنے ساتھ بستر اور ضرورت کا سامان پھرا رہا ہوگا۔تمھاری اس حرکت سے ایک شریف آدمی کو اتنی زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی۔اب جاؤ اور دوبارہ کسی ایسے آدمی پر ہاتھ نہ ڈالنا۔''

''جی سردار۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہتا ہوا مورچے سے باہر نکل گیا۔میرے بات کرنے کے دوران ہی ایک آدمی میرے لیے قہوہ لے آیا تھا اور انھی باتوں کے درمیان ہی قہوے کی پیالی خالی کر کے میں نے نیچے رکھ دی تھی۔روشن خان کے جانے کے بعد سردار نے مجھ سے کھانے کی بابت دریافت کیا اور میرے انکار کرنے پر مجھے اسی مورچے میں آرام کرنے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''باقی گپ شپ صبح کریں گے۔''

میں نے ممنونیت بھرے انداز میں سر ہلایا اور اپنے سفری تھیلے سے سلپنگ بیگ نکالنے لگا۔آگ کی وجہ سے وہاں خوشگوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔ایک آدمی ہر چند منٹ بعد آلاؤ پر اور لکڑیاں ڈال کر آگ کو بجھنے نہیں دے رہا تھا۔بستر میں گھس کر میں سونے کی کوشش کرنے لگا،مگر شاید سونا میری قسمت میں نہیں تھا۔مجھے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی مورچے میں داخل ہوا۔اس کے پھولے سانسوں سے مجھے سلپنگ بیگ کے اندر پڑے ہوئے اندازہ ہو گیا کہ وہ وہاں تک دوڑتا ہوا پہنچا تھا۔

''خیر تو ہے ضمیر خان۔''اس کے سانسوں پر قابو پانے تک سردار سیلاب خان اس سے استفسار کر چکا تھا۔

''سردار!......ہمیں گھیر لیا گیا ہے۔میں نے ابھی مخابرے پر ان کی بات چیت سنی ہے۔''

''گھیر لیا گیا ہے۔''سیلاب خان نے حیرانی سے کہا۔''اکبر خان دماغ جگہ پر ہے،شلوبر گاؤں کی افرادی قوت اتنی تو نہیں ہے کہ وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر سکیں۔''

اکبر خان وثوق سے بولا۔ ”میام خیل قبیلے کے چنگیزی ان کے ساتھ ہیں سردار!......چنگیزیوں نے شمالی اور مشرقی جانب سے گھیرا ڈالا ہے، جنوب اور مغرب میں شلوبر قبیلہ ہے۔ان کے علاوہ چنگیزی سردار نے کچھ ازبک اور تاجک دوستوں کو بھی ساتھ ملا لیا ہے۔“

”جھوٹ بول رہے ہوں گے۔“ سردار سیلاب کے لہجے میں شامل اندیشے اس کے اعتماد کی عمارت کے زمین بوس ہونے کا مژدہ سنا رہے تھے۔

اسی وقت سیلاب خان کو کسی نے ریڈیو سیٹ پر آواز دی۔ ”سردار ہمیں شمال کی طرف کچھ حرکت نظر آ رہی ہے، کیا اپنے آدھے آدمیوں کو اس طرف بٹھا دیں۔“

”ہاں بٹھا دو۔“ سیلاب خان نے مزید استفسار کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”سردار، مشرقی جانب بھی حرکت دیکھی جا رہی ہے۔“ یہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔

سیلاب خان کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک دم تیز فائر کھل گیا تھا۔گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز چاروں طرف سے آ رہی تھی، گویا اکبر خان کی بات مبنی بر حقیقت تھی۔ مجھے غزنی خیل قبیلے سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر میں مفت میں گھیرے میں آ گیا تھا۔اب شلوبر یا چنگیزیوں کو یہ باور کرانا کہ میں ان کا ساتھی نہیں ہوں ناممکنات میں سے تھا۔کیونکہ میں ان کے ساتھ ایسی جگہ موجود تھا جہاں وہ شلوبر قبیلے سے مقابلہ کرنے اکٹھے ہوئے تھے۔اور یوں بھی بات چیت کی نوبت آنے سے پہلے ہی کوئی گولی میرا اپتا پوچھ سکتی تھی۔ جنگ کے دوران استفسار نہیں کیا جاتا اور نہ صفائیاں سنی جاتی ہیں۔روشن خان میرے لیے نہایت منحوس ثابت ہوا تھا۔اس کی بے وقوفی مجھے اس حال تک لے آئی تھی کہ جان کے لالے پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا کہ اب لیٹے رہنے کی کوئی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔اپنا سامان دوبارہ سفری تھیلے میں ٹھونس کر میں اس خطرناک صورت حال سے جان چھڑانے کی تجویز سوچنے لگا۔افغانستان کی زمین میرے لیے کچھ زیادہ ہی بھاری ثابت ہو رہی تھی۔

......

سردار سیلاب خان ریڈیو سیٹ پر اپنے آدمیوں سے رابطے کر رہا تھا۔ وہاں بیٹھے باقی آدمی فائرنگ کے شروع ہوتے ہی اپنے اپنے مورچے میں چلے گئے تھے۔

”سردار!......فائرنگ ہو رہی ہے بیٹھ کر بات کر لو۔“ وہ بات کرتے ہوئے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی، اس نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ مختلف اطراف سے اسے مسلسل خبریں مل رہی تھیں۔

”سردار! وہ قریب نہیں آ رہے، بس دور دور سے فائر کر رہے ہیں۔“

سیلاب خان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، جب تک قریب نہیں آتے، اپنی گولیاں ضائع نہ کرو بس اکا دکا گولی چلا کر ان کے قریب آنے کا انتظار کرو۔“

فائرنگ کا یہ سلسلہ گھنٹا بھر جاری رہا تھا، اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے شلو برادران کے حلیفوں نے بس غزنی خیل قبیلے کو یہ یقین دلانے کے لیے فائرنگ شروع کی تھی کہ وہ گھیرے میں آ گئے ہیں۔

فائرنگ کے رکتے ہی ماحول میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی، ایک ایسی خاموشی جس کی تہہ میں کئی قسم کے طوفان پوشیدہ تھے۔ رات کی تاریکی میں بغیر نشانہ لیے فائر کرنے والے دن کو انھیں چن چن کر نشانہ بنا سکتے تھے کہ وہ چاروں طرف سے گھیرے میں تھے۔ اور اس گھیرے سے ان کا کوئی بندہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ البتہ اس پہاڑی کی دفاعی صورت حال کا اندازہ میں روشنی ہونے پر ہی کر سکتا تھا۔

”جوان، میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں آپ کو روشن خان کی وجہ سے اتنی زحمت اٹھانا پڑی، بلکہ اب تو آپ بھی ہمارے ساتھ پھنس ہی گئے ہیں۔“ مجھے سوچوں میں گم پا کر سیلاب خان معذرت کرنے لگا۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”کسی کو کوسنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو سکتا نا۔“

”یہی تو دکھ ہے کہ اس کا ازالہ اب نہیں ہو سکتا، ہمارے دو دشمن قبیلے یکجا ہو گئے ہیں ان کے ساتھ کچھ ازبک اور تاجک دہشت گرد بھی مل گئے ہیں، یقیناً ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔“

”سردار!......اگر میں ابھی یہاں سے نکل جاؤں۔“ میں نے مشورہ مانگا۔

''یقیناً ہمارے ساتھ رہنے میں آپ کی جان کو خطرہ ہے اور اس وقت یہاں سے جانے کا مطلب خودکشی کرنا ہی ہوگا۔''

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''خودکشی ہو یا لڑائی، انجام دونوں کا موت ہی ہوتا ہے۔''

''جنگ میں تمام ہارنے والے مر نہیں جایا کرتے۔''

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک کر جسم کو مردہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے روح کو نہیں۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ ''مہلت کے حصول کے لیے گھٹنے ٹیکنا مصلحت کہلاتا ہے روحانی موت نہیں۔''

''اگر میں پکڑا گیا تو یقیناً انھیں مطمئن کر لوں گا۔'' فلسفیانہ گفتگو کو چھوڑ کر میں اصل موضوع کی جانب پلٹا۔

''ہمارے ساتھ کچھ پشاور کے مہمان بھی موجود ہیں، جن کی بابت ہمارے دشمن اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس کا واضح جواب سن کر بھی میں جلدی میں پوچھ بیٹھا تھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''مطلب یہ کہ وہ آپ کو بھی ہمارا دوست سمجھیں گے، جبکہ آپ کا لہجہ اور زبان اس بات کی تصدیق کرے گا۔''

میں بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

''اچھا اپنی جان بچانے کے لیے کوئی فائر وغیرہ کر لو گے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''کسی بے گناہ کی جان لینا مجھے گوارا نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا دشمن نہیں ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو ان سے زیادہ میرے دشمن غزنی خیل کے وہ افراد ہیں جن کی وجہ سے مجھے اس جان لیوا صورت حال میں پھنسنا پڑا۔''

سیلاب نے مدافعانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔ ''آپ کچھ زیادہ ہی غلط سوچنے لگے ہیں۔''

''آپ کا میری سوچ کو غلط قرار دینا ظاہر کر رہا ہے کہ آپ نہایت ہی سیدھے سادھے آدمی ہیں اور اتنے سیدھے آدمی کو سرداری نہیں جچتی۔''

وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ ''طنز اچھا کر لیتے ہو۔''

''ایسی صورت حال میں طنز کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''میرا خیال میں ہم نے آپ کو جان بوجھ کر نہیں پھانسا۔ یہ صورت حال تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔''

اس کے مسلسل معذرتی رویے نے میرے دل سے کدورت دور کر دی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جانتا ہوں، یہ خورای مقدر میں لکھی تھی، روشن خان غریب تو بہانہ ہی بن گیا۔''

''یہ روشن خان کی پارٹی اب تک واپس کیوں نہیں لوٹی......'' میرے منھ سے روشن خان کا نام سنتے ہی اسے اپنی گشت کرنے والی پارٹی کا خیال آیا۔ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ ریڈیو سیٹ پر انھیں پکارنے لگا۔ مگر کافی دیر پکارنے کے بعد بھی اسے جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے دیر کر دی سردار!......دشمنوں کے گھیراؤ کی خبر ملتے ہی انھیں بلا لینا چاہیے تھا۔''

وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''میرے دھیان ہی میں نہیں رہا تھا۔''

''میدان جنگ میں سرداروں کو ایسی بے دھیانیاں راس نہیں آیا کرتیں۔''

''جوان آپ اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں طنز یا غصے کے بجائے حیرانی تھی

''حکمت عمر نہیں تجربے سے آتی ہے سردار۔''

''ہونہہ۔'' اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کافی تجربے کار دکھتے ہو۔''

اچانک ریڈیو سیٹ بول اٹھا کسی نے ہیجان خیز لہجے میں سردار کو پکارتے ہوئے انکشاف کیا۔ ''سردار!......روشن خان اور صغیر واپس لوٹ آئے ہیں......دونوں شدید زخمی ہیں۔ اور روشن خان نے بتایا ہے کہ ان کے تین ساتھی باقی نہیں رہے۔''

''دونوں کی مرہم پٹی کرو میں وہیں آرہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا مورچے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ میں نے پاؤں پسارتے ہوئے اپنی کلاشن کوف گود میں لی اور سفری تھیلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

غزنی خیل والے کافی گھمبیر صورت حال کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کے مقابلے میں دو حلیف قبیلے اور خاصی تعداد میں ازبک تاجک دہشت گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اور ان تمام کے ساتھ تنہا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔

یقیناً اس گندم کے ساتھ میں نے بھی گھن کی شکل میں پس جانا تھا اور ان سوکھی لکڑیوں کے ساتھ میں نے گیلا ہو کر بھی جل جانا تھا۔ سیلاب خان کے لوٹنے تک میں ان حالات سے جان چھڑانے کی کوئی معقول تجویز سوچتا رہا۔ کوئی ایسا طریقہ جس سے سانپ مار کر بھی میں لاٹھی بچالیتا، کوئی ایسی ترکیب کہ آسمان سے چھلانگ لگاتے وقت میں کھجور میں نہ اٹکتا، کوئی ایسا حل کہ وہ زبردستی کی بلا میرے سر سے ٹل جاتی، کوئی ایسا ٹوٹکا کہ طویلے کی بلا، بندر کے سر نہ پڑتی۔

میری سوچوں میں سیلاب خان مخل ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ چار آدمی اور بھی تھے۔ مورچے میں جلتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا بس تھوڑے بہت انگارے دمک رہے تھے۔ فائرنگ ہونے کے بعد کوئی اس پر مزید لکڑیاں نہیں ڈال سکا تھا۔ سردار کے ساتھ آنے والے آدمیوں میں سے ایک نے سردار کے کہے بغیر کافی ساری خشک لکڑیاں اٹھا کر بجھتے ہوئے انگاروں پر پھینکیں۔ اور آگ بھڑکانے لگا۔

سردار باقیوں کے ساتھ محو گفتگو ہو گیا۔ وہ تمام قبیلے کے مشر تھے۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ روشن خان کے ساتھ گشت پر جانے والوں میں تین آدمی مارے گئے تھے۔ روشن خان اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مشکل سے جان بچا کر وہاں تک پہنچا تھا اور اب اس کی اپنی حالت کافی تشویش ناک تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور آدمی بھی معمولی سا زخمی ہوا تھا۔ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اب ان کی رسد کی راہیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ تو وہ مزید ایمونیشن منگوا سکتے تھے اور نہ کھانے پینے کا سامان ان تک پہنچ سکتا تھا۔ صلح کی گنجائش بھی ختم ہو گئی تھی ایسے حالات میں شلوبر قبیلے کے افراد ایسی کڑی اور شرمندہ کر دینے والی شرائط پیش کرتے جو، ان کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہ ہوتیں۔

وہ اس صورت حال سے نمٹنے کے منصوبے بناتے رہے۔ میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سنتا رہا۔ نہ انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور نہ میں نے بیچ میں مخل ہونے کی کوشش کی۔

مشرقی جانب قدرے فاصلے پر چند گولیاں فائر ہوئیں جن سے متصل مغربی جانب سے ایک لمبا برسٹ فائر ہوا، شمال و جنوب کی طرف سے بھی چند مرتبہ "ٹخ ٹخ۔ " ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ وقفے وقفے سے پہلے بھی گولیاں چلتی رہی تھیں۔ غزنی خیل والوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے گھیراؤ کرنے والے انھیں چاروں

طرف اپنی موجودی کا احساس دلا رہے تھے۔

ایک آدمی قہوے کی بھری کیتلی کے ساتھ مورچے میں وارد ہوا اور تمام کو گرما گرم قہوے کی پیالی پکڑا دی۔ رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔قہوہ پی کر میں ایک بار پھر اپنا سلیپنگ بیگ تھیلے سے باہر نکالنے لگا۔ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے پاس ان حالات سے نمٹنے کی بس یہی تجویز بچی تھی کہ فی الحال مورچوں میں بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، بلکہ اسے مقابلے کے بجائے دفاع کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔اس طرح ایک دو دن گزار کر اندازہ ہو پائے گا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ان بے وقوفوں کو کافی دیر سے بیٹھا ہوا اونٹ ابھی تک کھڑا نظر آ رہا تھا۔

ایک سنائپر کی نیند پر ماحول اثر انداز نہیں ہو سکتا۔میں بھی گاہے گاہے اٹھنے والی فائرنگ کی ''ٹخ ٹخ۔'' سے بے نیاز سو گیا تھا۔صبح کے ناشتے کا انتظام ان لوگوں کے پاس نہیں تھا۔میرے پاس البتہ کچھ چنے اور بسکٹ پڑے تھے جو ظاہر ہے غزنی خیل کے پورے لشکر کی داڑھ بھی گیلی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اکیلے کھانا مجھے بھی گوارا نہ تھا کہ میرے ہمراہ موجود لوگ بھوکے ہوتے اور میں کھانے کو جڑا ہوتا۔قہوہ بنانے کا سامان البتہ ان کے پاس موجود تھا اور میں نے بھی اسی قہوے ہی پر گزارا کیا تھا۔ دن کی روشنی میں فائرنگ کے سلسلے میں تیزی آ گئی تھی۔ جوانب میں ایک دوسرے کے آدمی نظر آنے پر ہتھیار کی لبلبی دبانا مجبوری بن جاتی ہے۔

انھیں گھیرنے والے اگر چاروں جانب سے حملہ کر دیتے تو شاید کامیاب بھی ہو جاتے مگر ایسی صورت میں انھیں بھی کافی جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔کیونکہ غزنی خیل والے جس بلندی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے وہاں تک پہنچنے کے لیے مخالفین کو چڑھائی چڑھنا پڑتی۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ جگہ ارد گرد کی پہاڑیوں سے زیادہ بلند تھی، بلکہ اس کی وجہ اس پہاڑی کے چاروں اطراف میں موجود نالہ تھا جو اسے تمام پہاڑیوں سے جدا کر رہا تھا۔

اطراف میں فائرنگ کا شور وغل زیادہ ہوا مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔''سردار!......اپنے آدمیوں کو کہو حتی الوسع گولی چلانے سے پرہیز کریں،آپ لوگوں کے پاس ایک گولی بھی ضائع کرنے کی گنجائش نہیں۔ یوں ہوا میں ایمونیشن پھونک دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''صحیح کہہ رہے ہو۔''اثبات میں سر ہلا کر وہ ریڈیو سیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔میں نے فوراً اسے ٹوکتے ہوئے

کہا۔

”دشمن بھی سن رہے ہیں، ایسی باتیں مخابرے پر نہیں کیا کرتے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔”تو سنتے رہیں۔کیا فرق پڑے گا۔“

”بہت فرق پڑے گا۔آپ کی کمزوری دشمن کے ہاتھ آ جائے گی وہ آپ کا ایمونیشن ختم کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی پیش قدمی کر سکتا ہے۔اور یقیناً ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آپ کے آدمیوں کو بے دریغ فائر کرنا پڑے گا۔“

”یہ بات انھیں یوں بھی معلوم ہے کہ ہم ان کے گھیرے میں ہیں۔“

”انھیں کیا پتا کہ آپ کے پاس ایمونیشن کا کتنا ذخیرہ ہے۔اور یاد رکھنا کسی کی کمزوری معلوم ہو جانے کے بعد ہی حکمت عملی کام میں لائی جاتی ہے۔“

”ہمارے مسلسل فائر نہ کرنے پر بھی تو وہ یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔“

”آپ پر جو شمال کی جانب سے فائر ہوگا، وہ جنوب والوں کو آپ کا فائر بھی لگ سکتا ہے۔باقی یہ کس نے کہا کہ آپ کے آدمی بالکل بھی فائر نہ کریں۔جب کسی کو نشانہ بنانا ممکن ہو تو بے شک وہ فائر کر سکتے ہیں۔“

وہ مسکرایا۔”ویسے میں اتنی جلدی قائل نہیں ہوا کرتا۔“

”تو جلدی کہاں ہوئے ہیں، اتنی دیر سے تو تکرار کیے جا رہے ہیں۔“

”پھر بھی ہو تو گیا۔“اس کا انداز شکست کا احساس لیے ہوئے تھا۔

”کم رتبہ سے اتفاق کرنا شکست نہیں عقل مندی کی دلیل ہوتی ہے۔باقی مسلمانوں کو ہر کام مشورے سے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔اور اس بارے سرداروں اور عوام میں کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی۔“

”آپ کی باتیں، آپ کے بارے جاننے کے تجسس کو ہوا دے رہی ہیں۔“

”کسی کو جاننے کا تجسس تعلق رکھنے کے فیصلے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔اور ہمارے درمیان ایسی کوئی گنجائش نہیں۔میں جس رستے کا مسافر ہوں وہ آپ کے پڑاؤ سے بہت دور گزرتا ہے۔“

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔”گزرتا تھا جناب!......اب تو آپ کو مقدر کی آندھی نے میرے پڑاؤ کے قریب نہیں

اندر لا پھینکا ہے۔'' اس کی بات پر مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی۔

وہ کسی ضامن خان کو آواز دینے لگا۔ قریب کے مورچے سے ایک جوان وہاں آ گیا اور سیلاب خان اسے فائرنگ کے بارے ضروری ہدایات دینے لگا جو اسے چاروں اطراف میں موجود غزنی خیل لشکر کمانڈروں تک پہنچانا تھیں۔

سورج کے سامنے کافی دیر سے بدلیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ دھوپ کے غائب ہونے نے خوشگوار حدت کا خاتمہ کر دیا جبکہ دھیمی دھیمی ہوا بھی سردی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ مسلسل بیٹھنے کی وجہ سے گرم کوٹ نے سردی کے مقابلے میں ناکامی کا اعتراف کیا اور مجھے گرم چادر نکال کر لپیٹنا پڑی۔ سردار سیلاب خان نے بجھی ہوئی راکھ کو کرید کر چند انگارے ڈھونڈے اور ان پر چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ دہکانے لگا۔ اپنی پھونکوں سے راکھ اڑانے کے ساتھ ساتھ اس نے انگاروں کی آنچ کو خشک لکڑیوں میں منتقل کر دیا تھا۔ ہلکا سا دھواں اٹھا اور آگ نمودار ہو گئی۔ سیلاب خان ان لکڑیوں کو مزید لکڑیوں سے ڈھانپنے لگا۔ جلد ہی آگ بھڑک اٹھی میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ سیلاب خان کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا میں نے بھی اس کے خیالات میں مخل ہونے کی کوشش نہ کی اور اسی شغل میں لگ گیا۔ ایسی لڑائی سے ایک بار پہلے بھی میرا پالا پڑ چکا تھا، لیکن اس وقت پلوشہ میرے ساتھ تھی اور ہم اتنے برے حالات کا شکار بھی نہیں ہوئے تھے۔

اچانک فائرنگ کی رفتار تیز ہوئی۔ اور یہ فائرنگ سیلاب خان کے آدمی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے ریڈیو سیٹ پر سیلاب خان کو اطلاع دی کہ ضامن خان دشمن کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔

سیلاب خان کے آدمیوں کی تیز فائرنگ کے جواب میں دشمن کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آنے لگی۔ جنوب مغربی کونے سے 12.7 ایم ایم کی گرج سنائی دے رہی تھی۔

''آپ کے پاس 12.7 ایم ایم موجود نہیں ہے۔'' میں نے خاموش بیٹھے سیلاب خان کو متوجہ کیا۔

''اس کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔''

اسی وقت ریڈیو سیٹ پر ایک اور بری اطلاع ملنے لگی۔ مغربی کونے میں دو آدمیوں کو چھاتی میں 12.7 ایم ایم کی گولی لگی تھی۔ اور 12.7 ایم ایم کی چھاتی میں لگنے والی گولی سامنے سے گھس کر پشت سے نکلتے ہوئے

سانس کو ساتھ لیتی جاتی ہے۔
وہ تمام کو مورچوں کی آڑ میں رہنے کا حکم دینے لگا۔ مشرقی جانب سے بھی ایک دم تیز فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ ریڈیو سیٹ پر پاس ہوا کہ اس جانب سے کچھ لوگ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فائرنگ کی پرشور آواز گھنٹا بھر بعد ہی دھیمی ہو پائی تھی اور اس دوران تین چار آدمی اور زخمی ہو گئے تھے۔ دشمن کے بھی چار آدمی انھوں نے مار گرائے تھے۔ سیلاب خان کے حکم کے بعد تمام لوگ گولی چلانے میں احتیاط سے کام لے رہے تھے اور اس احتیاط کے نتیجے میں دشمن کے حوصلوں کو بڑھاوا مل رہا تھا۔ لیکن زیادہ گولیاں چلا کر غزنی خیل والوں نے جلد ہی بے دست و پا ہو جانا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ سنبھال کر رکھتے۔ اور ساتھ ساتھ دشمن کا نقصان بھی کرتے رہتے۔ ورنہ زمینی حقائق کے مطابق تو وہ جنگ ہار چکے تھے کہ چند دن کے گھیراؤ کے بعد انھوں نے بھوک سے گھبرا کر ہی ہتھیار ڈال دینے تھے۔
خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ پائی تھی اور اس دفعہ ہونے والی فائرنگ ایک نئی افتاد لے کے آئی تھی۔ پانی کا چشمہ جنوب کی سمت میں اس پہاڑی کے تقریباً نصف بلندی سے بھی تھوڑا نیچے نالے کی طرف تھا۔ وہاں پر غزنی خیل والوں نے اپنا ایک مورچہ بنایا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لیے چار افراد بھی موجود تھے۔ شلوبر والوں کو کسی طرح چشمے کی اس جگہ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے 12.7 ایم ایم کو جنوب مغربی کونے سے اٹھا کر جنوب کی سمت میں پانی کے چشمے پر لے کر دیا، اس طاقتور گن کے اتنی قریب سے مسلسل فائر نے مورچے کے عارضی رکھے ہوئے پتھروں کو بکھیر دیا تھا۔ دو آدمی ہی جان بچا کر واپس لوٹ پائے تھے۔ کھانے کے ساتھ پانی کی سہولت بھی چھن گئی تھی۔ اکادکا آدمیوں کے پاس پلاسٹک کی بھری ہوئی بوتلیں موجود تھیں مگر وہ چند گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں دے سکتی تھیں۔ خود میرے پاس ڈیڑھ بوتل پانی موجود تھا، مگر یہ ڈیڑھ بوتل بھی جانے کب تک ساتھ دے پاتی۔
شام تک فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے شروع رہا۔ غزنی خیل کے آٹھ آدمی زندگی کی جنگ ہار گئے تھے جبکہ چھے زخمی تھے۔ اور ان زخمیوں میں دو کی حالت تشویش ناک تھی۔ سیلاب خان کو لگا رات کو دشمن کی طرف سے حملے کا خطرہ زیادہ ہے اس لیے سرشام ہی اس نے اپنے کمانڈروں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ گزشتہ رات اپنی حوصلوں سے

دشمن کو ناکوں چنے چبوانے والے کمانڈرز اس وقت کافی پریشان اور بجھے بجھے سے تھے۔ چوبیس گھنٹے سے انھیں کھانا بھی نہیں ملا تھا۔ کمانڈروں کی شکلیں دیکھ کر باقی جوانوں کی حالت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔

ساری صورت حال ان کے سامنے تھی سیلاب خان نے حالات پر روشنی ڈالے بغیر بس اتنا پوچھا تھا کہ ......''آج حملے کا خطرہ زیادہ ہے ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟''اور اس کا جواب اسے ایک طویل خاموشی کی صورت میں ملا تھا۔

چند لمحے انتظار کے بعد اس نے گہرا سانس لیا اور میری جانب رخ کرتا ہوا بولا۔

''سلیم شاہ!......آپ اس معاملے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں''میرے پاس جو شناختی کارڈ موجود تھا اس پر میرا نام سلیم شاہ درج تھا اور عموماً مجھے یہی نام بتانا پڑتا۔ گلگارے وغیرہ کو البتہ میں نے اپنا اصل نام بتایا تھا۔

ایک لمحہ سوچ کر میں نے مناسب الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور پھر گلا کھنکار کر گفتگو کی ابتداء کی۔''محترم سرادر!......آپ، بلکہ ہم لوگ جس صورت حال میں پھنسے ہیں بہ ظاہر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا لیکن اگر صحیح حکمت عملی اپنائی جائے تو ناممکن کو ممکن میں ڈھالنا مشکل نہیں ہوتا۔''میں نے ایک لحظہ خاموش ہو کر ان کے چہروں پر سرسری نظر دوڑائی جو آگ کی لپٹوں میں عجیب قسم کی تشویش، پریشانی اور بیزاری سے بھرے نظر آ رہے تھے۔ انھیں میری بات کسی فضول فلسفے سے بڑھ کر اہم نہیں لگی تھی۔ لیکن اپنی بات پوری کیے بغیر میں چپ نہیں ہو سکتا تھا۔ آلاؤ پر اپنی نظریں گاڑ کر میں نے بات آگے بڑھائی۔''سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ دشمن آج کسی بھی صورت حملہ نہیں کرے گا، بلکہ اس وقت تک حملہ نہیں کرے گا جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ آپ لوگ مزاحمت کے قابل نہیں رہے۔ ان کی جگہ اگر آپ ہوتے تو یقیناً یہی کرتے، کیونکہ خواہ مخواہ اپنے آدمیوں کی قیمتی جانیں گنوانے کے بہ جائے وہ ایک دو دن صبر کرنا پسند کریں گے۔ اب یہ طے کرنے کے بعد کہ دشمن فی الحال حملہ نہیں کرے گا ہم اپنی کمزوریوں پر نظر دوڑاتے ہیں......ہمارے پاس کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی موجود نہیں ہے۔ جلانے کے لیے لکڑیاں بھی شاید کل تک ختم ہو جائیں تب بھوک پیاس کے ساتھ سردی کا عذاب جھیلنا بھی ہمارا نصیب ہو جائے گا۔ مسلسل استعمال کے بعد ایمونیشن نے بھی ختم ہو جانا ہے، تب ہماری حالت تر نوالے کی سی ہو جائے گی جسے نگلنے کے لیے دشمن کو ذرا سی بھی تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی.........''

”ہمیں صورت حال کا ادراک ہے سلیم شاہ۔“ سیلاب خان نے نرم لہجے میں کہا۔”آپ یہ مشورہ دیں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔“

”میں اسی طرف آ رہا ہوں ......کل کا دن ہمیں دشمن کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہمارے پاس کھانا بھی موجود ہے اور ہم مقابلے سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں۔ کھانے کا جھانسا تو ہم مخابرے پر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے دے سکتے ہیں اور مقابلے کی دھونس جمانے کے لیے ہمیں ایسے اچھے نشانہ بازوں کی ضرورت پڑے گی جو ان کی آزادانہ حرکت میں رکاوٹ بن سکیں۔“

”اچھے نشانہ باز تو پہلے بھی اپنی کوشش کر رہے تھے، کیا تیر مار لیا۔“ اس مرتبہ کمانڈر مشر خان بولا تھا۔

”اس کی وجہ ہے دشمن کا دور ہونا۔ کلاشن کوف کی کارگر رینج تین سو میٹر ہے اور دشمن زیادہ فاصلے پر موجود ہے۔ فاصلہ کم کرنے کے لیے ہمارے نشانہ بازوں کو دشمن سے اڑھائی تین سو میٹر دور درختوں پر مچان بنانا پڑے گی۔ اور دن کی روشنی میں وہاں سے فائر کرنا پڑے گا۔“

”پہلی گولی فائر کرتے ہی، دشمن انھیں بھون ڈالیں گے، فاصلہ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ بھی تو رینج میں ہوں گے۔“ کمانڈر رشید جان نے رائے دی۔ تمام کا بات چیت میں حصہ لینا یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ میری باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔

”اچھا سوال ہے۔ اور جواب ہے کہ وہ چھپ کر بیٹھے ہوں گے اور اس وقت فائر کریں گے جب دونوں طرف سے مسلسل فائر ہو رہا ہوگا۔ اس پرشور آواز میں کون اندازہ کر سکے گا کہ ان کے قریب کے درختوں سے بھی فائر ہو رہا ہے۔“

”ہم دور مار رائفل سے بھی تو انھیں نشانہ بنا سکتے ہیں۔ کل نوشاد گل نے اپنی رائفل سے ان کے چار آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔“ کمانڈر الفت بادشاہ نے زبان کھولی۔

”نوشاد گل کے پاس کون سی رائفل ہے؟“ میرے لہجے میں اشتیاق بھرا تھا۔

”نام کا تو پتا نہیں ہے۔“ الفت خان نے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا وہ بعد میں دیکھ لیتے ہیں پہلے یہ بتائیں میری تجویز سے متفق ہو کہ نہیں۔“

مشر خان بولا۔ ’’ہم اتفاق کر لیتے ہیں اور اس طریقے کو بروے کار لا کر ہم دشمن کے چند بندے زخمی یا ہلاک بھی کر دیتے ہیں تب کیا ہوگا۔ پندرہ بیس آدمیوں کے ہلاک ہونے سے پانچ چھے سو کے لشکر کا کیا نقصان ہوگا‘‘

’’شاید میں بتا چکا ہوں کہ ہمارا مقصد انھیں یہ یقین دلانا ہے کہ ہم لڑائی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔‘‘

’’چلو یقین دلا دیا کہ ہم لڑائی سے بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے اور ہمارے پاس خوراک بھی موجود ہے، اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہمیں کتنا عرصہ بھوکا پیاسا رہ کر انھیں اپنے پیٹ کے بھرے ہونے کا یقین دلانا پڑے گا۔‘‘ مشر خان اس انداز سے بولا تھا گویا قبیلے کا سردار میں ہی ہوں۔ لیکن میں اس کی باتوں کا برا منائے بغیر بولا۔

’’بس کل کا دن، آنے والی رات کو ہم ان پر حملہ کریں گے۔‘‘

کافی دیر سے خاموش بیٹھے کمانڈر امید علی خان نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ’’پہلے جو مشورے آپ نے دیے ایسی صورت حال میں اس سے اچھا سوچا بھی نہیں جا سکتا، مگر اب آخر میں آ کر آپ نے جو پھلجڑی چھوڑی ہے اس سے پہلے والی باتوں کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا ہے۔‘‘

میں متبسم ہوا۔ ’’میری بات مکمل نہیں ہوئی۔‘‘

امید علی نے بیزاری سے کہا۔ ’’اگر حملے کی بات کرنا ہے تو نامکمل ہی رہنے دیں۔‘‘

’’امید علی خان!...... اگر خود کچھ نہیں سوچ سکتے تو دوسرے کی سن لو، سلیم شاہ حکم نہیں دے رہا مشورہ دے رہا ہے۔‘‘ یقیناً سیلاب خان کو امید علی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

امید علی سرعت سے بولا۔ ’’معذرت خواہ ہوں سردار، میرا مقصد سلیم شاہ کی دل آزاری کرنا نہیں تھا۔‘‘

میں مخل ہوتے ہوئے بولا۔ ’’نہیں اپنی سمجھ کے مطابق کمانڈر امید علی نے صحیح کہا ہے۔ البتہ میری بات مکمل ہونے کے بعد انھیں رائے دینا چاہیے تھی۔‘‘

’’آپ جاری رکھیں۔‘‘ سیلاب خان نے مجھے بات مکمل کرنے کو کہا۔

میں سر ہلا کر مستفسر ہوا۔ ’’ہماری تعداد کتنی ہوگی؟‘‘

سیلاب نے جواب دیا۔ ’’قریباً اڑھائی سو۔‘‘

’’ٹھیک ہے ان اڑھائی سو میں سے ستر آدمی کل رات بارہ بجے جنوب مغرب کی جانب زوردار حملہ کریں

گے اور...............''میں اپنا منصوبہ ان کے سامنے دہرانے لگا۔ابتداء میں میری باتوں پر ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئےلیکن جوں جوں میری بات مکمل ہوتی گئی ان کے چہروں پر دبا دبا جوش ابھر آیا تھا۔ میری بات کے اختتام پر تمام میرے ساتھ متفق ہو گئے تھے۔

''ویسے مجھ لگ رہا ہے آپ مجاہدین کے کوئی بڑے کمانڈر رہو۔''سیلاب خان تحسین آمیز لہجے میں بولا۔''اتنا شاندار منصوبہ کوئی منجھا ہوا کمانڈر ہی بنا سکتا ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''میری داڑھی آپ کو مجاہدین جیسی لگ رہی ہے۔''

''شاید حلیہ تبدیل کیا ہوا ہو۔''وہ اپنا اندازہ منوانے پر مصر تھا۔

''نہیں ، میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''اس کے ساتھ ہی میں موضوع تبدیل کرتا ہوا بولا۔

''آپ کسی نوشاد گل کے پاس دور مار رائفل کی موجودی کا ذکر کر رہے تھے۔''

سیلاب نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔''ہاں......لیکن آپ نے رائفل کا کیا کرنا ہے۔''

میں مصر ہوا۔''آپ نوشاد گل کو تو بلوائیں۔''

سیلاب خان نے ریڈیو سیٹ پر نوشاد گل کو مع ہتھیار وہاں آنے کا حکم دیا۔اس کے آنے تک وہ میرے منصوبے پر بات کرتے رہے اور اس میں جو بہتری لائی جا سکتی تھی اس پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ نوشاد پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہاں پہنچ پایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشن کوف دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی تھی۔

''تمھاری اپنی رائفل کہاں ہے۔''اس کے سلام کا جواب دیتے ہی سیلاب خان مستفسر ہوا۔

''مورچے میں ہے۔''وہ سیلاب خان کے سوال پر پریشان نظر آنے لگا تھا۔

سیلاب خان نے کہا۔''جاؤ لے آؤ۔''

''جی سردار!''کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔باقی کمانڈر مشاورت میں مگن تھے۔

اس کے مورچے سے نکلتے ہی سیلاب خان نے کہا۔''ہمارے ایک آدمی گل ریز کے پاس جی تھری رائفل بھی موجود ہے۔''

http://sohnidigest.com

''جی تھری......؟'' اب حیران ہونے کی میری باری تھی۔

''ہاں۔'' سیلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اصل میں نوشاد گل اور گل ریز اس سے پہلے انگور اڈے میں ایک بڑے اسمگلر کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اسمگلنگ کے ساتھ وہ سردار دہشت گردانہ کارروائیوں میں بھی ملوث تھا ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ وہ سردار کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا لشکر قریباً بکھر گیا ہے۔ میرے قبیلے کے بھی چار پانچ آدمی اس کے پاس کام کرتے تھے۔ تین آدمی تو کسی دوسرے سردار کے پاس چلے گئے یہ دونوں گھر واپس آ گئے، شاید کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتے تھے۔''

''کس سردار کے پاس کام کرتے تھے؟'' میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

''صنوبر خان۔'' سیلاب خان سے پہلے مشر خان نے جواب دیا۔ وہ تمام اپنی گفتگو ختم کر کے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

صنوبر خان کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیلاب خان کے دو آدمی مجھے پہچانتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ نوشاد گل نے ابھی مجھے دیکھ کر بھی کسی قسم کی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میں آلاؤ کے بالکل قریب بیٹھا تھا اور بھڑکتی آگ کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر وہ آپس میں مصروفِ گفتگو ہو گئے تھے۔

نوشاد کی واپسی تک میں خیالات میں کھویا رہا۔ اس بار اس نے ہاتھ میں سٹائر سنائپر رائفل پکڑی ہوئی تھی۔ سٹائر ایک عمدہ اور بہترین رائفل ہے۔ آسٹریا کی بنی ہوئی یہ رائفل پاک آرمی کے سنائپرز میں سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی تربیت اسی رائفل سے مکمل کی تھی۔ اور اگر قارئین کو یاد ہو تو اپنے پہلے مشن کی تکمیل کے وقت بھی یہی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ اور ناول کے ابتدائی صفحات میں میں نے اس رائفل کے متعلق ضروری معلومات لکھی تھیں۔

میں نے نوشاد گل کے ہاتھ سے رائفل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس دوران میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر چھائے اجنبیت کے گہرے تاثرات مجھے مطمئن کر گئے تھے۔ اس نے بغیر کچھ کہے میری جانب رائفل بڑھا دی۔

’’اس کی کتنی گولیاں ہیں آپ کے پاس؟‘‘

’’سوتھیں، تقریباً آدھی فائر کر بیٹھا ہوں۔‘‘ بہ ظاہر اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا تھا مگر کہیں گہرائی میں ناگواری کی بو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ شاید میرا استفسار کرنا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اس کی کیفیات کو نظر انداز کیے میرے سوالات جاری رہے۔ ’’کمانڈر مشر خان بتا رہے تھے کہ اس کی مدد سے آپ نے دشمن کے چار آدمیوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔‘‘

’’بے شک۔‘‘ اس نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔

’’پچاس گولیوں کے بدلے چار آدمی......‘‘ میں نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

’’برا سودا نہیں ہے۔‘‘ کمانڈر رشید نے لقمہ دیا۔ میرا طنز تمام کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ اگر استادِ محترم راؤ تصور صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ ایک شخص نے سٹائر کی پچاس گولیاں چلا کر فقط چار آدمیوں کو نشانہ بنا پایا ہے تو انھیں اپنے ہوش و حواس کھو کر کومے میں چلے جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اور اگر وہ کومے میں جانے سے بچ جاتے تو مذکورہ فائرر کا بچنا ناممکن تھا، یقیناً اسی سٹائر رائفل سے مذکورہ شخص پر ایک گولی ضائع کر کے وہ اکیاون گولیوں پر مرنے والوں کی تعداد پانچ کر دیتے۔

انھیں اپنے احساسات سے بے خبر رکھتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ ان تک پہنچایا۔ ’’ایسا ہے کل میں اس رائفل سے فائر کروں گا......لیکن ابھی سے بتا دوں، کسی آدمی کو ہلاک نہیں کروں گا، بس زخمی کروں گا۔‘‘

نوشاد گل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’ہاں آپ ایس ایس ہو نا کہ پچاس گولیوں پر پچاس آدمی مار گراؤ گے۔‘‘

’’نوشاد گل......‘‘ سیلاب خان نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

وہ منھ بنا کر کہنے لگا۔ ’’سردار!......میں نے صرف مذاق کیا ہے۔‘‘

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔ ’’ویسے یہ ایس ایس کس بلا کا نام ہے۔‘‘

الفت بادشاہ نے قہقہہ لگا کر انکشاف کیا۔ ’’ایس ایس، نوشاد گل کے سردار کو مارنے والی بلا کا نام ہے ......اسی کی وجہ سے نوشاد گل غریب کی نوکری چھوٹی۔‘‘

’’ہونہہ!......‘‘ میں نے اثبات میں ہلاتے کہا۔ ’’بہ ہر حال اس کی ساری گولیاں مجھے دے دو امید ہے چار

سے زیادہ آدمیوں کو نشانہ بنالوں گا۔''

اس نے بغل سے لٹکی گولیوں والی تھیلی میرے سامنے پھینکی۔''اگر چار سے زیادہ آدمیوں کو نشانہ بنالیا تو یہ رائفل واپس نہیں مانگوں گا۔''

میں متبسم ہوا۔''یہ نہ ہو بعد میں مکر جاؤ۔''

''اور نہ بنا پائے پھر؟''یقیناً یک طرفہ شرط میں سراسر اسی کا نقصان تھا۔اور یہ بات اسے فوراً یاد آ گئی تھی۔

''تو میرا خیال ہے اس سے بہتر کلاشن کوف، غزنی خیل میں کسی کے پاس نہیں ہو گی۔''میں نے گود میں رکھی کلاشن کوف کو تھپتھپایا۔

''نوشاد گل، یہ شرطیں وغیرہ رہنے دو، سلیم بھائی ہمارے مہمان ہیں۔''

''نہیں سردار!......منھ سے نکلی بات اور بندوق سے نکلی گولی واپس نہیں آسکتی۔ جو طے ہو گیا سو ہو گیا ......بس اس میں اتنی ترمیم کر لیں کہ اگر ہر دو گولیوں پر میں نے ایک آدمی کو نشانہ نہ بنایا تب بھی نوشاد گل جیتا ہوا تصور کیا جائے گا۔''گو میں ہر چلنے والی گولی پر بھی یہ دعوا کر سکتا تھا لیکن اس طرح انھیں مجھ پر شک بھی ہو سکتا تھا۔

''یار سلیم!......کس بچپنے میں پڑ گئے ہو، چھوڑو ان شرطوں کو۔''سیلاب خان میری بات پر خوش نہیں تھا۔

''کبھی کبھی شغل میلہ بھی ہونا چاہیے سردار!۔''میں اس کی درخواست ہنسی میں اڑا گیا تھا۔

نوشاد گل کی آنکھیں البتہ چمکنے لگی تھیں۔اس بے وقوف کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ سٹائر رائفل کیا چیز تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سٹائر کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کو کیسے صفر کیا جاتا ہے۔ اور کسی سنائپر رائفل کو صفر کیے بغیر اس سے درست نشانہ لگا لینا، اندھے کے پاؤں تلے بٹیرا آنے کے مترادف ہے۔

''اچھا اب تمام اپنی اپنی جگہ لوٹ جاؤ اور احتیاط سے رات گزارنا ہے۔ ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی آرام کرنے لیٹے، اس کے ساتھ اپنے سامنے کے علاقے میں ہر کمانڈر درختوں پر ایسی جگہ بنوالے جہاں سے کل صبح فائر کیا جائے گا۔''سیلاب خان نے مزید تکرار سے گریز کرتے ہوئے تمام کمانڈروں کو حتمی احکام بتا کر جانے کی اجازت دے دی۔اور نوشاد گل کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔''نوشاد گل تم وقتی طور ضامن خان کی کلاشن کوف استعمال کر لینا۔''ضامن خان کل دوپہر ہی کو دشمن کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ابھی تک اس جوان کی صورت میری

نگاہوں میں پھر رہی تھی۔اسے میرے سامنے ہی سیلاب خان نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔موت بھی عجیب بے حس اور بے نیاز ہوتی ہے کہ، نہ تو کسی کے بچپنے پر ترس کھاتی ہے اور نہ کسی کی جوانی پر رحم کرنے کو تیار ہوتی ہے۔

''جی سردار۔'' کہہ کر نوشاد گل نے اثبات میں سر ہلایا اور مورچے سے باہر نکل گیا۔باقی لوگ اس سے پہلے روانہ ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

وہ رات بھی میں نے آرام کرتے گزاری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق دشمن نے حملہ کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ جو فتح وہ بغیر کوئی نقصان اٹھائے حاصل کر سکتے تھے،اس کے لیے جانوں کی قربانی دینا بے وقوفی ہی تو تھی۔البتہ دو تین مرتبہ پر شور فائرنگ سے انھوں نے غزنی خیل قبیلے کے سونے والوں کی نیند کو ضرور حرام کیا تھا۔اور ان سونے والوں میں بد قسمتی سے میں بھی شامل تھا۔

صبح منھ اندھیرے اٹھتے ہی میں نے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے چبائے۔اور دو تین گھونٹ پانی پی کر سارے دن کے لیے تیار ہو گیا۔سردار سیلاب خان اونگھ رہا تھا۔تیمّم کر کے میں نے نماز ادا کی اور آگ کو تازہ کرنے لگا۔اتنی دیر میں سردار سیلاب خان بھی اٹھا بیٹھا تھا۔

روشنی ہوتے ہی اکا دکا فائر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سٹائر کی میگزین میں گولیاں بھریں اور اندازے سے سو گز دور پڑے ہوئے چھوٹے سے پتھر پر نشانہ سادھنے لگا۔وہ پتھر ایک چوڑے تنے کے درخت کی جڑ میں پڑا تھا۔گولی پتھر تو کیا درخت کے تنے میں بھی نہیں لگی تھی۔ مجھے بس ذرا سا اندازہ ہوا تھا کہ گولی تنے کے دائیں جانب نکلی ہے۔

کسی بھی ہتھیار یا ٹیلی سکوپ سائیٹ کو صفر کرنے کے لیے دو ہی غلطیاں دور کرنا پڑتی ہیں۔ اوپر نیچے کی یا دائیں بائیں کی۔اب پہلی گولی چلا کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رائفل کافی دائیں مار رہی تھی۔ ٹیلی سکوپ سائیٹ میں مناسب تبدیلی کر کے میں نے اگلی گولی چلائی۔گولی پتھر کے بائیں کنارے کے ساتھ ہی لگی تھی۔ میں دوبارہ سائیٹ میں تبدیلی کرنے لگا۔اور اسی طرح پانچ گولیاں چلا کر میں نے سائیٹ کو اپنی مرضی کے

مطابق صفر کر لیا تھا۔

میری ساری کارروائی سیلاب خان بھی دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا۔لیکن اس دوران اس نے مجھے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

رائفل کی صفرنگ سے مطمئن ہو کر میں نے کہا۔''سردار! میں کسی دوسرے مورچے کا رخ کرتا ہوں آپ کا مورچہ فائر کرنے کے مناسب نہیں ہے۔''

''میں بھی چلتا ہوں۔'' اپنی کلاشن کوف تھامتے ہوئے وہ بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے۔''میں نے اسے روکنے کی رسمی کوشش کی۔

''یہاں بھی کیا کروں گا......بس مخابرے پر بات چیت ہی کرنا ہے تو وہ وہاں سے بھی ہو جائے گی۔''

''چلیں۔'' اپنا تھیلا اور کلاشن کوف میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔

باقی اطراف کی نسبت دشمن کے شمالی مورچے ہم سے زیادہ قریب تھے اور اس جانب چنگیزی قبیلے کے افراد ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔

''اس طرف۔'' مورچے سے باہر نکل کر اسے اپنی جانب سوالیہ نظروں سے گھورتے دیکھ کر میں نے شمال کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑا۔ وہ پہاڑی شمالاً جنوباً لمبائی میں پھیلی ہوئی تھی۔ شرقاً غرباً اس کی چوڑائی تھی۔ اس کے آدمیوں نے پتھر کی بڑی چٹانوں کے عقب میں مورچے بنائے ہوئے تھے کہیں پر گڑھا وغیرہ تھا تو اسے چھپنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اگر کچھ بھی نہیں تھا تو انھوں نے پتھر کی دیواریں کھڑی کر کے مورچے کی شکل دے دی تھی۔ رستے میں سیلاب خان نے جوش بھرے انداز میں مجھے یہ بتایا تھا کہ چاروں اطراف میں اس کا ایک ایک اچھا نشانے باز درختوں میں چھپا ہوا تیز فائرنگ کا منتظر تھا۔ چاروں آدمی انھوں نے رات ہی کو مطلوبہ جگہ پہنچا دیے تھے۔

''ویسے لوگوں کو بھوک تو کافی لگی ہو گی۔''

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔''بھوک تو واقعی میں لگی ہوئی ہے،لیکن یہ بھی سنا ہے بھوکا بٹیرا زیادہ اچھا لڑتا ہے۔''

میں فراخ دلی سے آفر کرتے ہوئے کہا۔’’ویسے میرے تھیلے میں کچھ چنے اور تھوڑے بہت بسکٹ موجود ہیں جو چند آدمیوں کی بھوک مٹا سکتے ہیں۔‘‘

’’باقی کیا کریں گے۔‘‘اس نے ایک سردار کی طرح سوچا تھا۔جس کے جواب میں میں کندھے اچکانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پہاڑی کے انتہائی شمالی کونے میں جا کر میں نے اپنے لیے ایک مورچہ پسند کیا اور اس میں موجود افراد کو دوسرے مورچوں میں بھیج دیا۔ابھی ہم پوری طرح مورچے میں بیٹھ نہیں پائے تھے کہ نوشاد گل وہاں پہنچ گیا۔ آتے ساتھ اس نے رات والی بات چیت پر معذرت چاہی۔ مجھے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

’’کوئی بات نہیں نوشاد گل ہو جاتا ہے ایسا۔‘‘مجھے لگ رہا تھا شاید کسی کمانڈر یا سیلاب خان نے اسے معذرت کرنے کا کہا ہے اسی لیے اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔’’سلیم بھائی!......میں نے شرط وغیرہ کی بھی بکواس کی تھی......‘‘

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔’’چھوڑو شرط کو یار!......میں نے بھی یونھی شیخی بگھاری تھی۔‘‘

اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے سیلاب خان کو کہا۔’’سردار!...... یقیناً آپ کو یہاں میری مدد کی ضرورت پڑے گی۔‘‘

’’شاید سلیم بھائی کو پڑے۔‘‘سیلاب خان نے اس کے وہاں بیٹھنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔’’خالی بیٹھنے کے بجائے، دوربین لے لو اور دشمن کے وہ آدمی تلاش کرو جو مورچوں سے باہر ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے باس۔‘‘مزاحیہ انداز میں کہہ کر وہ سردار سیلاب خان کے ہاتھ سے دوربین لے کر جائزہ لینے لگا۔یہی کام میں سنائپر کی ٹیلی سکوپ سے کر رہا تھا۔اچانک مجھے چھ سو میٹر کے فاصلے پر دشمن کے ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔مورچے کی دیوار سے اس کا بالائی دھڑ جھلک رہا تھا۔اس کے فاصلے کے بارے میں نے اندازہ لگایا تھا اور یہ ایک سنائپر کا اندازہ تھا۔

ایلی ویشن ناب پر چھے سو میٹر رینج لگا کر میں نے مذکورہ شخص کے دائیں کندھے کا نشانہ لیا، کیونکہ میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ گو کسی کو زخمی کرنا بھی اسے نقصان پہنچانے کے زمرے میں آتا تھا مگر یہ جان جان جانے سے بہت کم تھا۔ اور پھر مجھے اپنی جان بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت تو کرنا تھی۔ یونھی پادری بنے بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلنے والا تھا۔

میرے لبلبی دباتے ہی وہ اچھل کر نیچے گرا۔

''وہ مارا......'' نوشاد گل کے منھ سے نعرہ بلند ہوا۔

میں رائفل کو دوبارہ کاک کر کے اسی طرف متوجہ رہا تھا۔ میری گولی کا نشانہ بننے والا نیچے گر کر تڑپنے لگا تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے ساتھ والے مورچے سے دو جوان بھاگتے ہوئے نکلے اور جونھی اگلے والا اپنے ساتھی پاس رکتے ہوئے نیچے جھکا اور میں نے دوبارہ لبلبی دبا دی۔ زخمی کو سنبھالنے والا خود تڑپنا شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ تیسرا ہکا بکا کھڑا تھا اور اس کے کچھ سمجھنے سے پہلے میں رائفل کو تیسری مرتبہ کاک کر کے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنا چکا تھا۔

''دوسرا بھی گیا۔'' یہ نعرہ نوشاد کے ہونٹوں پر تھا کہ تیسرا گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آس پاس موجود مورچوں سے تیز فائرنگ شروع ہو گئی۔

ان کی دیکھا دیکھی چاروں طرف سے بارش کی طرف گولیاں برسنا شروع ہو گئی تھیں۔ اور وہی موقع تھا جب غزنی خیل قبیلے کے چار چھپے ہوئے نشانہ بازوں نے درختوں کے اوپر سے دشمن کو تاک تاک کر نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گو وہ تربیت یافتہ سنائپر تو نہیں تھے اور نہ ان کے پاس سنائپر رائفل ہی موجود تھی کہ دشمن کا زیادہ نقصان کر پاتے۔ لیکن اس کے باوجود ہر نشانہ باز نے دشمن کے ایک ادھ آدمی کو نشانہ بنا ہی لیا تھا۔ یوں زخمی ہونے والے آدمیوں نے انھیں مورچوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دوران دشمن کے دو مزید آدمی میرا نشانہ بن کر زخمی ہو چکے تھے۔

کہتے ہیں جنگ کے دوران مرنے والوں سے زیادہ زخمی ہونے والے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زخمیوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ اس طرح اپنے ساتھ وہ صحت مند آدمیوں کو بھی پابند کر دیتے ہیں، دوسرا زخم میں ہونے والی تکلیف کی وجہ سے زخمی افراد جو آہ و بکا کرتے ہیں وہ بھی اپنے آدمیوں کا مورال کم

کرتی ہے۔

''سلیم بھائی!......شکر ہے میں نے اپنی شرط واپس لے لی تھی۔'' پانچویں آدمی کو شکار بنتے دیکھ کر نوشاد گل نے مجھے یہ یاد دلانے میں دیر نہیں کی تھی کہ ہمارے درمیان اب کوئی شرط وغیرہ باقی نہیں رہی ہے۔

سردار سیلاب خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''شرط کس وقت ختم ہوئی تھی جناب، ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا۔''

نوشاد نے رونی صورت بنا کر کہا۔''سردار یہ ظلم نہ کریں۔'' اس کی رونی صورت دیکھ کر سیلاب خان اور میں ہنس پڑے تھے۔

شمالی جانب سے تو دشمن بالکل ہی مورچوں میں دبک گئے تھے۔ سردار سیلاب خان دشمن کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پہلے جس چینل پر بات چیت کر رہے تھے وہ تبدیل کر دیا تھا۔ جلد ہی اس نے نیا چینل ڈھونڈ لیا تھا۔ دشمن کی باتوں سے یہی پتا چلا کہ زخمی ہونے والوں کے علاوہ ان کے سات آدمی ہلاک ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تمام کو آڑ میں رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

''کیا خیال ہے، کسی دوسری جانب کا رخ کریں۔'' ان کی نقل و حرکت کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر میں نے مشورہ چاہا۔

سیلاب خان نے کہا۔''جو مناسب سمجھو۔''

وہاں سے ہم جنوب کی طرف آ گئے تھے۔ دشمن کے اس نقصان پر غزنی خیل والوں میں خوشی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔

جنوب کی جانب دشمن شمال سے زیادہ فاصلے پر تھا، لیکن ان کے کچھ مورچے ایسے تھے جو سٹائر کی مار میں آ رہے تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ کی نگرانی کے بعد مجھے دوبارہ موقع مل گیا تھا۔ دو آدمی کافی محتاط انداز میں اپنے مورچے سے نکلے تھے۔ لیکن ان کی احتیاط کسی کام نہیں آ سکی تھی۔ پہلے کو ٹانگ میں گولی لگنے کے بعد دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس دوران میں دوبارہ رائفل کو کاک کر چکا تھا اور اس کے مورچے میں گھسنے سے پہلے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''کیا آپ کی کوئی گولی ضائع نہیں جائے گی؟'' نوشاد گل نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز میں کہا تھا مگر اس کے لہجے

میں تحسین بھری تھی۔

”دورانِ جنگ گولیاں ضائع کرنے والوں کو ہارنا پڑتا ہے دوست۔“

”ویسے یہ گولیاں تو آپ ان کے سر میں بھی اتار سکتے ہیں نا۔“ دلشاد گل نے معنی خیز لہجے میں پوچھا تھا۔

”پتا نہیں یار!......لیکن اس وقت میں کسی کے سر میں گولی اتارنا جائز نہیں سمجھتا۔“

سیلاب خان جلدی سے بولا۔”آپ جتنا کر رہے ہیں، اتنا ہی بہت ہے جناب۔“

سہ پہر ڈھلنے تک میں اطراف میں جا کر مختلف جگہوں سے غزنی خیل کے دشمنوں کو زخمی کرتا رہا۔ چونکہ میری اپنی زندگی کا انحصار بھی اسی منصوبے کے کامیاب ہونے میں تھا اس لیے میں نے فائر کرتے وقت کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

دشمنوں کا کافی نقصان ہو چکا تھا۔ اس دوران جب بھی تیز فائرنگ شروع ہوتی دشمن کے قریب مورچہ سنبھالے غزنی خیل کے چھپے ہوئے نشانہ باز اپنا کام کر جاتے۔ یہ بات دشمن کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ آخر تیز فائرنگ کے بعد ان کے تین چار آدمی کیسے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے مرنے والے آدمی مسلسل مخصوص مورچوں ہی میں جان سے جا رہے تھے اس لیے انھوں نے وہ مخصوص مورچے خالی کرا لیے تھے۔ میں چونکہ مسلسل گھوم کر مختلف اطراف سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا اس لیے میرے خلاف ان کی یہی حکمت عملی کام آئی تھی کہ وہ کم سے کم آڑ سے باہر نکلتے یا ان کے جسم کا کوئی حصہ آڑ سے باہر جھلکتا۔ بہ ہر حال کچھ بھی تھا مجموعی طور پر انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ غزنی خیل والے اتنی جلدی ان کے قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔

شام کا اندھیرا چھاتے ہی تمام کمانڈروں اور خاص خاص افراد کو سردار سیلاب خان کے مورچے میں بلا کر رات کے لیے حکمت عملی کا جائزہ لیا جانے لگا۔ وہاں قریباً پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو گئے تھے۔ اپنے سفری تھیلے کو ہلکا کرنے کے لیے میں نے کھانے پینے کی تمام اشیاء ان کے سامنے رکھ دیں تھیں۔ چند لمحوں میں وہ بسکٹ اور خشک چنے وغیرہ ہڑپ کر گئے تھے۔ سیلاب خان نے رسمی سا انکار کیا، لیکن باقیوں نے ذرا سا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔

منصوبے کو آخری شکل دے کر تمام اپنے مورچوں میں لوٹ گئے تھے۔ سیلاب خان اور اس کے کمانڈ مجھ

سے خاصا مرعوب نظر آرہے تھے۔ سیلاب خان تو دو تین دفعہ برملا کہہ چکا تھا کہ میں ان کے لیے غیبی مددگار بن کر آیا ہوں۔ روشن خان غریب جو زخموں کی تاب نہ لاکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، اس کے ختم ہو جانے کے بعد سیلاب خان اس کے، مجھے وہاں لانے کے فیصلے کو سراہ رہا تھا۔

دس بجتے ہی کمانڈر الفت بادشاہ اور کمانڈر امید علی ستر کے قریب افراد کو ساتھ لے کر جنوب مغرب کی جانب بڑھ گئے تھے۔ باقی تمام افراد کے ساتھ سیلاب خان شمالی نالے کے کنارے پہنچ گیا تھا۔

گیارہ بجتے ہی پرشور فائرنگ کے ساتھ الفت بادشاہ اور امید علی کے آدمیوں نے جنوب مغربی جانب ہلہ بول دیا۔ دشمن اس اچانک اور پرشور حملے سے پہلے تو گھبرا گئے تھے اس کے بعد انھوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ منصوبے کے مطابق الفت بادشاہ اور امید علی نے ریڈیو سیٹ پر ایسی گفتگو کی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دشمن کے اگلے مورچوں تک پہنچ گئے ہیں اور چند گھنٹوں میں شلوبر گاؤں تک پہنچ جائیں گے۔

اس حملے کو روکنے کے لیے دشمن نے دائیں بائیں کے مورچوں سے مزید نفری اس جانب منگوالی تھی۔ تمام کی توجہ کا مرکز جنوب مغرب کی طرف ہی تھی۔ اگلا گھنٹا سخت فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ الفت جان اور امید علی نے اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انھوں نے ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھنا ہے۔ حملے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انھوں نے اپنے پاس موجود چند راکٹ بھی فائر کر دیے تھے۔ اسی اثناء میں دشمن نے نزدیک کے مورچوں سے کافی نفری وہاں طلب کر لی تھی۔ توقع کے مطابق انھوں نے شمال مغربی اور جنوبی مورچوں سے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا تھا کہ یہی مورچے زیادہ قریب تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد الفت بادشاہ اور امید علی نے دس پندرہ تیز رفتار جوانوں کو چھوڑ کر باقی نفری شمال کی جانب بھیج دی۔ ان آدمیوں کے پہنچتے ہی ہم تمام شمال مغربی جانب کی طرف بڑھنے لگے۔ اس جانب دشمن کی برائے نام نفری ہی موجود تھی۔ تمام کو یہی ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک دشمن کی طرف سے فائر نہیں کیا جاتا کوئی فائر نہیں کرے گا۔ دشمن کی ساری توجہ جنوبی محاذ کی طرف تھی۔ ان کے خیال کے مطابق غزنی خیل والے شلوبر گاؤں تک پہنچنا چاہتے تھے، کہ ریڈیو سیٹ پر بات چیت کے ساتھ ساتھ غزنی خیل والوں نے اس جانب بھرپور حملہ بھی کر دیا تھا۔ اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی ریڈیو سیٹ پر ہونے والی بات چیت سنتی رہتی تھیں۔

پیچھے رہنے والے پندرہ جوانوں نے بیس منٹ بعد اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ کر اپنے آدمیوں سے آملنا تھا۔ شمالی جانب سے غزنی خیل کا پہلا آدمی دشمنوں کو اس وقت نظر آیا جب وہ ان سے سوڈیڑھ سو میٹر قریب پہنچ گیا تھا ۔نالے میں دشمن کے دو مورچے موجود تھے ۔اپنے تمام آدمیوں کے سامنے سیلاب خان نے دس چاق وچوبند آدمیوں کی ٹولی رکھی ہوئی تھی ۔دشمن کی طرف سے فائر آتے ہی وہ تمام لیٹ گئے تھے پیچھے آنے والے اس ٹولی سے پچاس ساٹھ قدم دور تھے ۔اس ٹولی کے پاس راکٹ لانچر موجود تھا۔ دشمن کا فائر سنتے ہی انھوں نے دو راکٹ مورچے پر فائر کر دیے ۔یوں بھی وہ مستقل مورچے نہیں تھے ،بس عارضی طور پر پتھروں کی آڑ بنائی گئی تھی ۔ ایسے مورچے رائفل ،کلاشن کوف وغیرہ کی گولیوں کے لیے تو اچھی آڑ ثابت ہو سکتے تھے راکٹ لانچر اور 12.7mm وغیرہ کے لیے کوئی خاص رکاوٹ نہیں تھے۔

راکٹ نے مورچے کی دیوار گرا کر وہاں موجود بندوں کو زخمی کر دیا تھا۔سیلاب خان کے دو آدمی جھکے جھکے تباہ شدہ مورچے کے قریب پہنچے اور زخموں سے کراہنے والوں کو ہر تکلیف سے نجات دلا دی ۔نالے میں دو مورچے اور بھی موجود تھے وہاں سے تیز فائرنگ کی آواز آنے لگی ۔اس کے ساتھ ہی کوئی اپنے آدمی کو ریڈیو سیٹ پر بلانے لگا۔''سردار!......غزنی خیلوں نے شمال کی جانب حملہ کر دیا ہے اور ہمارے پاس نفری کم ہے ۔مزید آدمی بھیجو۔''

اسی وقت دوسرے کی چیختی ہوئی آواز ابھری......''یہاں پر کوئی بھی موجود نہیں ہے اور نہ فائر کا جواب آرہا ہے۔'' غالباً وہ جنوب کی طرف اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں الفت بادشاہ اور امید علی نے اپنے پندرہ آدمی بٹھائے تھے ۔اس وقت تک وہ پندرہ اپنے باقی لشکر کے ساتھ آن ملے تھے۔

''تمام لوگ شمال کی جانب پہنچو،دشمن وہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' وہ بھاری سی آواز شلوبر کے سردار کی تھی ۔چونکہ میں سعدار سیلاب خان کے ساتھ کافی دیر سے ان کی ٹرانسمشن سن رہا تھا اس لیے مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

دشمن کو غزنی خیل کی چال سمجھ میں آ گئی تھی ،لیکن وہ دیر کر بیٹھے تھے ۔ان کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے غزنی خیلوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے دونوں مورچوں کو وہ راکٹ لانچر سے تباہ کر کے آگے بڑھ گئے تھے ۔میں سردار سیلاب خان کے ساتھ موجود تھا۔وہ لڑائی میں وطن کی خاطر نہیں لڑ رہا تھا کہ اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔وہ

دو قبیلوں کی لڑائی تھی جس میں میں خواہ مخواہ پھنس گیا تھا۔ میری تھوڑی بہت ہمدردی غزنی خیل کے ساتھ اس لیے تھی کہ میں خود ان کے ساتھ موجود تھا۔ ان سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ لڑائی کس انجا کو پہنچتی اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسی وقت مغرب اور شمال کی جانب سے فائر آنے لگا تھا۔ یقیناً انھوں نے دور ہی سے فائر کرنا شروع کر دیا تھا۔

''یہاں سے جلدی نکلو......'' سیلاب خان نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے کا کہا۔

وہ نالہ کافی چوڑا تھا، تمام تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

شمال کی جانب دشمن کی کافی نفری موجود تھی۔ اور اپنے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے سیلاب خان نے دو پارٹیاں مقرر کر دی تھیں، جنھوں نے وہیں رک کر دشمن کے تعاقب کو روکنا تھا۔ یہ سارا منصوبہ ہم نے گزشتہ رات بیٹھ کر ترتیب دیا تھا۔

دشمن نے تعاقب کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر غزنی خیل والے اس جانب گھیرے سے نکل گئے تھے۔ رات کے وقت تعاقب کرنے میں خطرہ زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ تعاقب سے باز نہیں آئے تھے۔

''مشر خان اور رشید جان کو کہو اپنے آدمی نالہ موڑ کے ساتھ روک دیں۔'' سیلاب خان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے اسے یاد دلایا۔

سیلاب خان نے کہا۔ ''انھیں معلوم ہے۔''

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''معلوم ہے مگر یاد دہانی ضروری ہے۔ ایسے حالات میں سارے منصوبے ذہن سے محو ہو جایا کرتے ہیں۔''

سیلاب خان بغیر کسی حجت کے رک کر رشید جان اور مشر خان کو آواز دینے لگا۔ وہ سردار تھا لیکن میرے مشوروں پر یوں عمل کر رہا تھا جیسے اصل سردار میں ہوں۔

''مشر خانا، رشید جانا............''

''جی سردار!'' تھوڑے فاصلے پر رشید جان کی آواز ابھری۔

''مشر خان کے ساتھ اپنی ذمہ داری سنبھالو۔''

”ٹھیک ہے سردار!......ہم تیار ہیں۔“ یہ کہتے ہی وہ اپنے آدمیوں کو آواز دے کر روکنے لگا۔ نالہ موڑ تک رشید جان نے اپنی پارٹی کے افراد کو روک لیا تھا۔ مشر جان نے اپنے آدمی شمالی جانب اور رشید جان نے غربی جانب ڈھلان پر چڑھا دیے تھے۔

اپنے تمام آدمیوں کے آگے بڑھتے ہی انھوں نے بے تحاشا فائر کھول کر تعاقب کرنے والوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔

دشمن بھرپور انداز میں جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ رات کے اندھیرے میں نالے کے اندر تو تیز حرکت کی جا سکتی تھی ڈھلان پر چڑھ کر بغیر روشنی کے تیز حرکت ممکن نہیں تھی۔ سیلاب خان کے آدمی نالے میں حرکت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جبکہ دشمن کے لیے سامنے کی جانب سے کلاشن کوفوں کی برستی ہوئی گولیاں ایک ایسی رکاوٹ تھیں جس کی وجہ سے وہ قدم آگے نہیں بڑھا پا رہے تھے۔ منصوبے کے مطابق فرلانگ بھر آگے جا کر سیلاب خان نے دو پارٹیاں نالے میں اوپر ڈھلان تک ترتیب سے بٹھائیں اور ریڈیو سیٹ پر مشر خان اور رشید جان کی پارٹیوں کو پس قدمی کا حکم دے دیا۔ دونوں کمانڈر سب سے پیچھے تھے۔ الفت بادشاہ اور امید علی کی پارٹیوں کی لگی ہوئی جگہ سے گزرتے ہی انھوں نے اپنے بہ حفاظت گزرنے کی اطلاع دے دی تھی۔

شلوبر اور میام خیل کے آدمیوں کو جب فائرنگ کا جواب نہ ملا تو وہ ایک مرتبہ پھر احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ سیلاب خان کے آدمیوں کی طرح بے فکری سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی انھیں یقین ہو گیا کہ سیلاب خان کے آدمی وہاں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ لیکن جونھی وہ اس جگہ پر پہنچے جہاں الفت بادشاہ اور امید علی کی پارٹیاں تعینات تھیں، ایک دم ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سب سے آگے موجود دس بارہ آدمی پہلے ہی ہلے میں نیچے گر گئے تھے۔ باقی جوابی فائر کرتے ہوئے وہ رک گئے اور آڑ کی تلاش میں پیچھے ہٹنے لگے۔

دس پندرہ منٹ مسلسل اور تیز رفتار فائرنگ کے بعد الفت بادشاہ اور امید علی خان اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے، پہلے والی دو پارٹیوں نے اسی رستے پر اپنی جگہیں سنبھال لی تھی۔ پسپائی کا یہ طریقہ کار انھیں میں نے گزشتہ رات بڑی تفصیل اور وضاحت سے سمجھایا تھا۔

اس مرتبہ شلوبر اور میام خیل والے پھونک پھونک قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے، لیکن انھیں گزرنا تو اسی رستے سے تھا جہاں غزنی خیل والے گھات لگائے موجود تھے۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی انھیں دوبارہ فائرنگ کا سامنا کرنا پڑ گیا اور پہلے کی طرح دس پندرہ منٹ کی تیز فائرنگ کے بعد وہ پارٹیاں اپنے رستے پر آگے بڑھ گئی تھیں۔ دشمن کو کافی نقصان پہنچ گیا تھا۔ مزید تعاقب کی ہمت ان میں باقی نہیں رہی تھی۔

ڈیڑھ دو کلومیٹر دور آ کر سیلاب خان نے اپنے تمام آدمیوں کو روک کر اکٹھا کیا اور چالیس چاق و چوبند آدمی عقب میں رکھ کر باقیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ان چالیس آدمیوں نے پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ رکھ کر ان کے عقب میں رہتے ہوئے حرکت کرنا تھی۔ یقیناً دشمن بھی کوئی حکمت عملی تیار کر رہا تھا مگر اب وہ پہلے کی طرح بے احتیاطی سے ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے سیلاب خان نے پکا اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ گو تمام منصوبہ ہم نے پہلے ہی سے طے شدہ تھا، اس کے باوجود وہ تازہ حکمت علمی کے لیے مجھ سے مشورے کرتا رہا۔ جلد ہی ہمیں سفر کرنے کے لیے متبادل نالے بھی مل گئے تھے۔ وہ اس علاقے کو پہچانتے تھے اور انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کن رستوں پر چل کر وہ جلد از جلد غزنی خیل پہنچ سکتے تھے۔

ہمیں ساری رات چلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ پانی وغیرہ تو لوگوں نے رستے میں آنے والے چشموں اور نالوں سے پی لیا تھا مگر بھوک کی وجہ سے قریباً تمام نڈھال سے تھے۔ جان بچانے کی جبلت ہی تھی جو وہ اتنا سخت مقابلہ کر کے دشمن کے گھیرے سے باہر نکل پائے تھے۔ جب ہم غزنی خیل کے قریب پہنچے تو صبح کا ملگجا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔

''دشمن کی تعداد زیادہ ہے وہ غزنی خیل کو گھیرنے کے لیے نہ پہنچ جائیں۔'' ڈھلان سے اترتے ہوئے میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سیلاب خان نے جھکتے ہوئے کہا ''اب ہمیں ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ کھانے پینے کا سامان اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود ہے۔ باقی ہمارے بھی حلیف قبیلے موجود ہیں بس ان کے پاس پیغام بر بھیجنے کی ضرورت ہے''

''مطلب وہ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے؟'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''شاید، لیکن ہم نے تو اعلان جنگ کر دیا ہے اور جب تک شلو بر والے ہمارے مطالبات پورے نہیں کرتے ہم بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ اس مرتبہ ہم بہت زیادہ تیاری کے ساتھ حملہ کریں گے۔''

گاؤں میں داخل ہوتے ہی سردار نے تمام کو جلد از جلد کھانا کھا کر تیار ہونے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ جنوبی اور مغربی جانب کی پہاڑی پر اپنے آدمی تعینات کرنے کا تھا۔ یہ دونوں پہاڑیاں گاؤں کے قریب واقع تھیں اور وہاں انھوں نے پہلے سے مورچے وغیرہ بھی بنا رکھے تھے۔

مجھے سردار سیلاب خان اپنی بیٹھک میں چھوڑ کر گھر میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی چائے اور پراٹھے لے آیا۔ یقیناً اس وقت گھر میں جو کچھ تیار تھا سیلاب خان نے میری طرف بھجوا دیا تھا۔

گندم کی روٹی ایسی چیز ہے جس کا نعم البدل دنیا کی کوئی خوراک بھی نہیں ہو سکتی۔ اور میں دو تین دن سے کھانا نہیں کھا سکا تھا۔ دو تین پراٹھے کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا کہ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ یوں بھی غزنی خیل والے اب خطرے کی حدود سے نکل آئے تھے اور اپنی لڑائی وہ خود لڑ سکتے تھے۔ نہ تو مجھے ان سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ واسطہ کہ میں مزید چچا خواہ مخواہ بننے کی کوشش کرتا۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کہیں ظہر کی آذان سن کر کھلی تھی۔ وہی بوڑھا شخص جس نے ناشتا لایا تھا بیٹھک کے صحن میں بیٹھا نظر آیا۔ مجھے جاگتے دیکھ کر وہ کھانے کا پوچھنے لگا۔

''شکریہ چاچا بھوک نہیں ہے، بس چائے پلوا دیں۔'' کہہ کر میں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے نماز پڑھنے تک سیلاب خان وہاں پہنچ گیا تھا۔

''کیا حال جناب!'' خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے چارپائی پر نشست سنبھال لی۔

میں نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک آپ سنائیں۔'' اس دوران بوڑھا چاچا چائے کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔

سیلاب خان کہنے لگا۔ ''فی الحال تو امن ہے، آدھے آدمی مورچوں پر پہنچ چکے ہیں اور باقی آرام کر رہے ہیں۔''

میں نے بوڑھے ملازم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''آگے کا کیا ارادہ ہے؟''

وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ ”جب تک لڑکی اور اسے لے جانا والا جوان نہیں مل جاتا یہ جنگ جاری رہے گی۔ دو تین دن تک جرگہ بلانے کا ارادہ ہے، اس کے بعد اگلی حکمت عملی طے کریں گے۔“

”اگر خفا نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔“ تازہ دودھ سے بنی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔

سوالیہ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ ایک لڑکی کے لیے آپ نے پہلے بھی اتنے آدمیوں کی قربانی دے دی مخالفین کے بھی کافی آدمی قتل ہو گئے۔ حالانکہ وہ لڑکی بالغ ہے اسے اپنی زندگی جینے کا حق ہے...... گو اس کا طریقہ کار غلط ہے مگر اس وجہ سے وہ موت کی سزاوار تو نہیں ٹھہرتی نا۔“

”ہونہہ!......“ گہرا سانس لیتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کے خیال میں ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی دشمن قبیلے کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور ہمیں اس بات پر شکر ادا کرتے ہوئے کہ اس لڑکی نے اپنا شوہر خود ڈھونڈ لیا ہے خوشی کے شادیانے بجانے چاہیں۔“

اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔ ”تو اس لڑکی کے حصول کے لیے اتنے گھرانوں کے چراغ بجھا دیے ہیں مزید کتنی جانیں ضائع کراؤ گے؟“

وہ اطمینان سے بولا۔ ”اگر آپ کا تعلق قبائلی علاقے سے ہوتا تو یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں نہ اٹھتا۔“

”تو کیا قبائلیوں کے لیے جان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”ضرور ہے، مگر ہماری خودداری اور انا پہلے ہے، جان کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ باقی دشمن قبیلے کے افراد بھی تو مر رہے ہیں، وہ اپنی غلطی کیوں نہیں تسلیم کرتے۔“

”وہ رقم ادا کرنے پر تو تیار ہیں اور کیا کریں۔“ میں نے دلیل پیش کی۔

وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ”ہمیں رقم کی نہیں، اس لڑکی کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہماری بے عزتی ہوئی ہے اور اس لڑکے کی ضرورت ہے جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔“

”تو انھیں مار کر آپ کو کیا ملے گا؟“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہمارے سینوں میں ٹھنڈ پڑ جائے گی اور علاقے بھر میں کوئی غزنی خیل کے پیچھے بات نہیں کر سکے گا۔''

میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''معذرت خواہ ہوں، مجھے ایسا کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''جلد ہی سمجھ گئے ہو۔'' سیلاب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بہر حال آپ جانیں اور آپ کا کام، میں نے صبح آگے بڑھ جانا ہے۔''

''کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''منزل کا تعین تو مجھے خود بھی نہیں ہے۔''

''اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہو گی۔''

''شکریہ سردار۔'' میرے لہجے میں ممنونیت بھری تھی۔

سیلاب خان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اچھا آج رات کو ہم نے آپ کے لیے خصوصی دعوت کا اہتمام کیا ہے، غزنی خیل کے کافی جوان آپ کو ملنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا غائبانہ تعارف سن سن کر تمام کے دل میں آپ سے ملاقات کا شوق جاگا ہوا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس کا معنی خیز انداز مجھے حیران کر گیا تھا۔

وہ میرے سر پر بم پھوڑتے ہوئے بولا۔ ''اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے جناب ایس ایس!......وہ ایسے نشانہ باز کو دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔''

''ایس......ایس۔'' میں گڑبڑا گیا تھا۔

''جی محترم!'' سیلاب خان آنکھیں میچتے ہوئے بولا۔ ''نوشاد گل آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اور آپ کو جوش دلانے کے لیے ہی اس نے شرط لگائی تھی۔ اسی رات آپ کے سو جانے کے بعد مجھے مورچے سے باہر بلا کر اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ چونکہ اسے آپ کی صلاحیتوں کا اچھی طرح اندازہ تھا اس لیے صبح سویرے ہی اس نے اپنی رائفل بچانے کے لیے شرط واپس لے لی تھی۔''

”اسے پہچاننے میں غلطی بھی تو ہوسکتی ہے۔“

”اس کی بات سن کر میں نے بھی یہی سوچا تھا۔لیکن آپ کی نشانے بازی نے یقین دلا دیا۔“

اس مرتبہ میں نے کسی لولی لنگڑی دلیل کا سہارا لیے بغیر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ مجھے تسلی دیتا ہوا بولا۔”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں،نوشاد گل اب کسی خان کا ملازم نہیں ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو وہ آپ سے بہت زیادہ متاثر ہے،ہم سب پر بھی آپ کا احسان ہے کہ آپ کی وجہ سے ہم اس گھیرے سے باہر نکل سکے ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں سردار!......نہ تو مجھے پریشانی ہے اور نہ کوئی خوف۔ بس یہ سوچ کر خفت ہو رہی ہے کہ لوگوں نے میرے بارے کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی کی ہوئی ہے۔“

”نوشاد گل کہہ رہا تھا کہ آپ نے اس کی آنکھوں کے سامنے پلوشہ خان وزیر کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنایا تھا۔کیا یہ جھوٹ ہے؟“

میں جلدی سے بولا۔”اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔“

وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔”ان کے سردار جہان داد کے سر میں دو کلومیٹر دور سے گولی مارنا، یہ بھی اتفاقاً ہوا ہوگا، بلکہ سردار جہانداد کے سارے مرنے والے ساتھیوں کے سر میں اتفاقی طور پر گولی لگتی رہی ہوگی اور کل شلوبر اور میام خیل کے سارے آدمی بھی اتفاقی طور پر ہی زخمی ہوتے رہے ہیں۔“

میں خفیف ہوتا ہوا بولا۔”اچھا چھوڑیں اس موضوع کو آپ کی سمجھ میں میرا نکتہ نظر نہیں آئے گا۔“

”اچھا اب تو بتا دیں کہ افغانستان کس سلسلے میں آنا ہوا۔“اس نے موضوع تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں نکلا ہوں۔“میں نے مجمل سا جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال کیے اٹھتے ہوئے بولا۔”آپ آرام کریں شام کو ملاقات ہوگی۔“اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

شام کے بجائے سہ پہر ہی کو شام کے کھانے کا بندوبست ہونے لگا تھا۔وسیع بیٹھک کے صحن میں آلاؤ جلا کر وہ سالم دنبے روسٹ کر رہے تھے۔اس کے علاوہ بھی مقامی طور کئی مقامی پکوان تیار کیے جا رہے تھے جن میں کابلی پلاؤ اور افغانی کباب وغیرہ شامل تھے۔

اسی دوران نوشاد گل اور گل ریز بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔یہ دونوں قبیل خان کے لشکر کا حصہ رہ چکے تھے،قبیل خان اور جہانداد خان کے قتل کے بعد انھوں نے صنوبر خان کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔البتہ صنوبر خان کی موت بعد علام خیل کا کوئی ایسا سردار نہیں بچا تھا جس کے پاس یہ کام کر سکتے پس کسی اور سردار کے لشکر میں شمولیت اختیار کرنے کے بجائے یہ گاؤں واپس لوٹ آئے تھے۔دونوں میرے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھے۔خوش حال خان کے گاؤں میں ہونے والے جرگے میں گل ریز مجھے دیکھ چکا تھا،جبکہ نوشاد گل اس وقت قبیل خان کی بیٹھک میں موجود تھا جب میں نے پلوشہ کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنایا تھا۔اس وقت نوشاد گل بڑی مشکل سے پلوشہ کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکا تھا۔

دونوں مجھ سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے،ان کے ہمراہ چند اور جوان بھی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ان کے انداز میں مجھے ایک عقیدت اور مرعوبیت نظر آ رہی تھی۔یوں بھی قبائلی علاقے میں اچھے نشانے باز کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ ان کی لڑائی کا دارومدار ہی ہتھیار کے استعمال پر ہے۔تھوڑی دیر میں تمام بے جھجک ہو کر مجھ سے گپ شپ کر رہے تھے۔

سیلاب خان کی آمد کے بعد چند منچلوں نے میرا نشانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی،جس کی تائید تمام حاضرین محفل کرنے لگے تھے۔ میں نے بھی خواہ مخواہ کی بہانے بازی سے گریز کرتے ہوئے نوشاد گل کے ہاتھ سے سٹائر سنائپر لے لی کہ سٹائر،کلاشنکوف سے کئی گنا زیادہ بہتر تھی۔نوشاد گل کو میں نے بیٹھک کی ایک دیوار کے ساتھ ایک سفید چادر لٹکانے کا کہا۔

اثبات میں سر ہلا کر اس نے ایک آدمی سے چادر لے کر دیوار سے لٹکا دی۔دوسری دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے بیس گولیاں تیز رفتاری سے فائر کیں۔جونھی میں ایک میگزین خالی کرتا نوشاد گل مجھے بھری میگزین پکڑا دیتا۔زیادہ تر لوگ اس بات پر حیران تھے کہ اتنی چوڑی چادر پر نشانہ بازی کر کے میں کون سی مہارت کا

ثبوت دے رہا ہوں۔لیکن کسی نے زبان سے یہ نہیں کہا تھا۔

فائر ختم کرتے ہی میں نے تمام کو کہا کہ وہ قریب جا کر چادر کو دیکھ لیں۔چادر کے قریب جا کر وہ حیرانی سے چیخ پڑے تھے، کیونکہ چادر پر میں گولیوں کے ذریعے انگریزی زبان میں ایس ایس لکھا تھا۔ اور ایسا کرنا کسی عام شخص کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ مظاہرہ دیکھ کر سیلاب خان نے بے ساختہ کہا......''اب تو لگتا ہے نوشاد گل آپ کے متعلق کچھ بتا ہی نہیں پایا تھا۔''

باقی لوگ بھی پہلے سے زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔جبکہ میں خود کو خاصا خفیف محسوس کر رہا تھا۔بار بار تعریفی کلمات سن کر مجھے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔کوئی میری پیٹھ تھپتھپا رہا تھا تو کوئی تعریف میں رطب اللسان تھا ،اور کوئی میرا شاگرد بننے پر تلا ہوا تھا۔

شام کی نماز کے بعد کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد محفل موسیقی تھی۔رباب اور گھڑے کے ملاپ نے عجیب سماں باندھ دیا تھا۔مقامی گلوکار کی آواز خاصی دلکش تھی۔پشتو ٹپے سنتے ہی پلوشہ دھم سے میرے خیالوں میں آکودی تھی۔پشتو ساز پر تو وہ یوں بھی اتنا خوب صورت اور دلکش رقص کرتی تھی کہ دیکھنے والے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔میرے دماغ میں وہ وقت فلم کی طرح چلنے لگا جب ملک ثقلین کے بیٹے کی شادی میں اس نے جادو بھرا خوب صورت رقص پیش کیا تھا۔

رات گئے تک پروگرام جاری رہا۔اور پھر میرے آرام کرنے کی درخواست پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

گھروں کو لوٹتے وقت کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس نے مجھ سے مصافحہ نہ کیا ہو۔نوشاد گل جب جانے لگا تو اسے میں نے روک لیا۔تمام کے رخصت ہونے بعد میرے پاس سیلاب خان اور نوشاد گل ہی رہ گئے تھے۔

میں سردار سیلاب خان کو بولا......

''سردار!......اگر اجازت ہو تو میں نے نوشاد گل سے چند ضروری باتیں پوچھنا ہیں۔''

''ہاں......ہاں کیوں نہیں۔''جہاں دیدہ سردار فوراً میرے مطمح نظر تک پہنچ گیا تھا۔الوداعی مصافحہ کر کے وہ بھی چلا گیا۔

”نوشاد گل!......کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ جو پوچھوں گا آپ اس کا صحیح جواب دیں گے۔“

”ذیشان بھائی!......سردار قبیل خان اور اس کے بعد بننے والے سرداروں میں سے کوئی بھی نہ تو میرا رشتا دار تھا اور نہ کسی سے میری جذباتی وابستگی ہی تھی۔ میرا ان سے تعلق فقط مالک اور ملازم کا تھا۔ اس لیے آپ نے جو پوچھنا ہے بے جھجک ہو کر پوچھیں، اگر مجھے معلوم ہوا تو کبھی نہیں چھپاؤں گا۔“ وہ میرے اصل نام سے واقف تھا

”البرٹ بروک، ٹریسی والکر اور کرنل کولن فیلڈ میں سے کسی کو جانتے ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”تینوں کو جانتا ہوں۔“

میں نے پر جوش لہجے میں پوچھا۔”یہ تینوں یا ان میں سے کوئی ایک مجھے کہاں مل سکتا ہے۔“

”میں نے ایک بار صنوبر خان کے ساتھ البرٹ بروک اور کالی لڑکی کو غزنی میں پہنچایا تھا۔اب یہ معلوم نہیں کہ وہ مستقل وہیں ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں۔“

”میں غزنی تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔“

”یہاں سے آپ کو مرناہ گر جانا ہوگا، وہاں سے پکتیکا نزدیک ہی ہے۔اس کے بعد زرغون شہر آئے گا۔ اس کے بعد پناہ اور اس سے آگے قرہ باغ ہے وہاں سے غزنی کی گاڑی مل جائے گی۔اسی طرح اگر زرغون سے آپ سیدھا اب بند کا رخ کریں تو وہاں سے بھی غزنی جا سکتے ہیں۔ یہ میں سڑک کا راستہ بتا رہا ہوں، اگر آپ پکتیکا سے سیدھا غزنی کا رخ کریں تو یہ راستہ مختصر ہے مگر بڑی سڑک میسر نہیں ہے۔اس طرف آپ کو کچے پکے رستوں اور پہاڑی علاقے کو عبور کرنا پڑے گا۔“

میں نے مزید ضروری معلومات دریافت کیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ تمام رات میں نے آگے کی حکمت عملی بناتے گزاری، غزنی ایک بڑا شہر تھا۔اور وہاں امریکن فوج نے اپنی چھاؤنی بنائی ہوئی تھی۔اس حساس علاقے میں گھسنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔اس کے لیے مجھے کسی ایسے منصوبے کی ضرورت تھی جس میں غلطی کی گنجائش نہ ہوتی۔مگر ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا عملی طور پر اگر یہ ناممکن نہیں تو بہت زیادہ دشوار ضرور تھا۔سب سے بڑھ کر میں نے کسی کو جان سے نہیں مارنا تھا کہ دور سے گولی چلا کر اپنا کام کر لیتا۔

مجھے تو ان کے کیمپ میں گھس کر اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنا تھے۔ یہ سراسر جاسوسوں والا کام تھا۔ گو ایک سنائپر کو وقت پڑنے پر ہر کام کرنا پڑتا ہے، لیکن پھر بھی نشانہ بازی اور مار دھاڑ سے جاسوسی ایک الگ کام تھا۔

صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے سیلاب خان کو کہہ کر کاغذ پین منگوایا اور نوشاد گل سے سنی ہوئی معلومات کو ایک نقشے کی صورت میں کاغذ پر اتار لیا۔ راستے کے لیے کھانے پینے کی چیزیں سفری تھیلے میں ڈال کر میں جانے کے لیے تیار تھا۔ اس وقت تک نوشاد گل اور چند اور جوان بھی پہنچ گئے تھے۔ میں تمام کی معیت میں چلتا ہوا غزنی خیل سے باہر نکلا اور ان سے الوداعی معانقہ کر کے غزنی خیل سے غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

خان کلے کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب مرناہ گر سے ہوتے ہوئے میں نے پکتیکا پہنچنا تھا۔ مرناہ گر سے پکتیکا کے لیے گاڑی بھی مل جاتی تھی لیکن گاڑی میں سفر کرنے میں یہ قباحت تھی کہ میں کلاشن کوف ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔

غزنی خیل سے شمال کی جانب ایک چوڑے نالے میں کلومیٹر ڈیڑھ چلنے کے بعد مجھے مغرب کی طرف مڑنا تھا۔ موسم تقریباً صاف تھا۔ شمالی جانب ہلکے ہلکے بادل نظر آ رہے تھے اور بہ ظاہر بارش یا برف باری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں اس بات سے بھی واقف تھا کہ بادلوں کو اکٹھا ہونے میں اتنی دیر نہیں لگنی تھی۔ اس موسم کے ہاتھوں میں ایک بار پہلے بھی مرتے مرتے بچا تھا اب میں اس موسم پر بالکل بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ موسم کے ذرا سا بھی خراب ہونے پر میں بغیر سفر جاری رکھے کسی پناہ گاہ میں گھسوں گا۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی، دسمبر شروع ہونے والا تھا اور دسمبر کی شروعات کے ساتھ ہی پہاڑی علاقے میں مزید برف باری ہونے کا امکان تھا۔

نالہ موڑ مڑتے ہی ہلکی ہلکی اترائی شروع ہو گئی تھی۔ موڑ مڑ کر میں چند قدم ہی لے پایا تھا کہ اچانک کسی نے زوردار آواز میں للکار کر مجھے رکنے کو کہا۔

ایک دم میرے قدم رک گئے تھے، آواز کی سمت دیکھنے پر چار آدمی جھاڑیوں کے جھنڈ سے برآمد ہوتے دکھائی دیے۔ چاروں مسلح تھے۔ یقیناً وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے روک رہے تھے۔

''ہتھیار نیچے پھینک دو۔'' ایک کرخت شکل کے لمبے آدمی نے دور ہی سے حکم جاری کیا۔

''شاید آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں............''

''بکواس بند کرو اور ہتھیار نیچے پھینکو۔''اس مرتبہ اس نے کلاشن کوف میری جانب تان کر درشت لہجے میں کہا۔

افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے کلاشن کوف نیچے رکھی۔

''پیچھے ہو جاؤ۔''اس نے ہتھیار سے دور ہونے کا اشارہ کیا۔

میں چند قدم لے کر ہتھیار سے دور ہو گیا۔ ان چاروں کے چہروں پر چھائے خشونت بھرے تاثرات مجھے حیران کیے ہوئے تھے۔ لمبے آدمی نے قریب پہنچ کر بغیر شناخت پوچھے، گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے مجھے دور پھینکا۔

''تمھارے ساتھ کافی حساب کتاب باقی ہے بے غیرت شخص۔''اس کے لہجے میں شامل غیظ و غضب مجھے حیران کیے دے رہا تھا۔ اس کے انداز پر مجھے بھی انتہائی غصہ آ گیا تھا لیکن اپنے جانب اٹھی تین کلاشن کوفوں کی موجودی میں میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ غصے کا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے حتی الوسع نرم لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھائی صاحب!...... یقیناً تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسافر ہوں اور اس سے پہلے میں نے آپ لوگوں کو نہیں دیکھا۔''

''تم مسافر تھے، لیکن غزنی خیل قبیلے کے ساتھ مل کر تم نے ہمارے کتنے بندوں کو ناکارہ کیا اس بات سے تم واقف ہو گے۔ تمھارا کیا خیال ہے غزنی خیل میں ہمارا کوئی ہمدرد موجود نہیں ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ شاید وہ شلوبر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ غزنی خیل قبیلے کے کسی غدار نے میرا مکمل راز فاش کر دیا تھا، یہاں تک کہ اس نے شلوبر قبیلے والوں کو میرے جانے کے رستے کے بارے بھی بتا دیا تھا۔ اور یقیناً شلوبر قبیلے کے یہ آدمی کافی دیر سے میری گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غزنی خیل قبیلے کے ساتھ کرنے والی ہمدردی مجھے راس نہیں آئی تھی۔ ایسی حالت میں تو سیلاب خان کے آدمی بھی میری مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے کہ انھیں اس بابت کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں بہت بری طرح

پھنس گیا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’اب تو بولتی ہی بند ہو گئی ہے۔‘‘

زمین سے اٹھتے ہوئے میں نے اپنے کندھوں سے سفری تھیلے کی ڈوریاں نکالیں اور تھیلے کو زمین پر چھوڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ان کے ارادے مجھے چھوڑنے والے نہیں لگ رہے تھے۔

میں نے صلح کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کو ساری بات معلوم نہیں ہے بھائی صاحب!...... میں واقعی مسافر ہوں اور غزنی خیل والے مجھے آپ کا آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ میں ان کی غلط فہمی دور کر کے اپنا سفر جاری رکھ پاتا، آپ لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور میں بے گناہ پھنس گیا۔ اس کے بعد گزشتہ رات وہ گھیرا توڑ کر نکل بھاگے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔‘‘

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ’’تمھارا قصور یہ ہے کہ بھاگنے کا سارا منصوبہ تمھارا تھا اور کل دن بھر تم ہمارے آدمیوں کو زخمی کرتے رہے ہو۔ تمھاری ہی ترکیب سے ہمارے کئی آدمی جان سے گئے ہیں۔‘‘

انھیں خبر دینے والا محاذ پر نہیں گیا تھا ورنہ ہمارا کل کا منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔ یقیناً اسے کل لڑائی سے لوٹنے والوں ہی سے میرے بارے معلوم ہو پایا تھا اور اپنے کرم فرماؤں تک اس نے فوراً ساری بات پہنچا دی تھی۔ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

’’میں نے آپ کے کسی بھی آدمی کو جان سے نہیں مارا۔‘‘

’’انھیں ٹانگوں اور بازوؤں میں گولی مار کر ناکارہ تو کیا ہے نا...... میں بھی تمھیں جان سے نہیں ماروں گا ،بس دونوں ٹانگوں اور بازوؤں میں گولی ماروں گا۔‘‘ یہ کہتے ہی اس نے کلاشن کوف میرے جانب سیدھی کی۔

اس کے کلاشن کوف سیدھی کرتے ہی میں نے حرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر واضح لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا تھا ویسا ہی کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے کہا۔ ’’اچھا میری آخری بات سن لو اس کے بعد جو مرضی آئے کرنا۔‘‘

’’سناؤ۔‘‘ میری بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے کلاشن کوف کی بیرل زمین کی طرف جھکائی۔

اس وقت تک میں ایک سرسری نظر تینوں پر ڈال چکا تھا۔ وہ تمام اس کے عقب میں کھڑے تھے اور وہ سب

سے آگے کھڑا تمسخرانہ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ ہمارے درمیان بس دو تین قدموں کا فاصلہ تھا۔ باقی تینوں اس سے چند قدم دور تھے ان تمام کے انداز میں بے پروائی تھی۔

اس کی کلاشن کوف کا رخ نیچے کی طرف ہوتے ہی میں زقند بھرتے ہوئے اس کے قریب ہوا اور اس سے پہلے کہ میرا ارادہ اس پر ظاہر ہوتا میں نے کلاشن کوف کی بیرل کو پکڑ کر اس کے دھانے کا رخ خود سے موڑتے ہوئے اپنے گھٹنے کو زوردار انداز میں اس کی ٹانگوں کے درمیان اٹھا دیا۔

''اوغ۔'' کی آواز کے ساتھ وہ نیچے جھکا اور میں نے ایک جھٹکے سے کلاشن کوف اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا تھا کہ وہ تینوں ہکا بکا کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ اس علاقے میں اکثریت ایسے لڑاکوں کی تھی جو صرف ہتھیار کا استعمال ہی جانتے تھے۔ جسمانی داؤ پیچ سے وہ لوگ نابلد تھے۔ البتہ مجاہدین کے کیمپوں میں خالی ہاتھ لڑنے کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ دہشت گردوں میں بھی اکا دکا ایسے آدمی مل جاتے ہیں جو ہاتھ پیر کا استعمال جانتے ہوں، مگر ایسے لوگ بہت کم تعداد ہی میں مجھے ٹکرائے تھے۔

کلاشن کوف ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کا بٹ زوردار انداز میں گھٹنوں کے بل جھکے آدمی کے سر میں مارا، وہ منھ کے بل نیچے گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بیرل کا رخ ان تینوں کی طرف موڑ دیا۔ وہ تینوں بھی ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر حواسوں میں آئے، لیکن انھوں نے ذرا سی دیر کر دی تھی وہ جب تک کلاشن کوف کا رخ میری طرف کرتے میں ٹریگر دبا چکا تھا۔

دو بندے ٹانگوں میں گولی کھا کر چیختے ہوئے نیچے گر گئے، تیسرے آدمی نے ٹریگر دبانے کے ساتھ ہی پیچھے کی جانب چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے کلاشن کوف برسٹ پر سیٹ کی ہوئی تھی۔ اگر وہ تیزی میں درستی نہ بھول جاتا تو یقیناً آج میں کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ ٹریگر دباتے ہی چونکہ اس نے پتھر کی جانب چھلانگ لگائی تھی اس لیے بیرل کا رخ مجھ سے بائیں طرف ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے بائیں بازو میں شدید جلن کا احساس ہوا، اس کے جلد بازی میں فائر کیے گئے برسٹ میں سے ایک بھولی بھٹکی گولی میرے بازو کا مزاج پوچھ چکی تھی۔

اچانک ڈھلان کی طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔گولیاں میرے دائیں بائیں لگی تھیں۔ اگر میرے سامنے ان کا ایک آدمی بے ہوش نہ پڑا ہوتا تو ان گولیوں کا نشانہ میرے جسم نے بننا تھا۔میں نے فوراً خود کو زمین پر گرایا اور قریبی پتھر کے پیچھے رینگ گیا۔میرے بائیں بازو میں جلن تو ہو رہی تھی مگر بازو ٹھیک ٹھاک کام کر رہا تھا ،اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ گولی میرے بازو کو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔

اب اسی پتھر کو نشانہ بنایا جا رہا تھا جس کے پیچھے میں چھپا تھا۔اوپر والوں سے زیادہ مجھے اس آدمی سے خطرہ تھا جو نالے ہی میں چھپا تھا۔آڑ کے دائیں جانب سے اس طرف نظر دوڑانے پر مجھے ایک کلاشن کوف کی بیرل اپنی جانب اٹھی نظر آئی،اس کا باقی جسم پتھر کے پیچھے غائب تھا۔ایک دو چھوٹے چھوٹے برسٹ چلا کر وہ مجھے اپنے ساتھ الجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کا جسم تو نظر نہیں آرہا تھا فقط کلاشن کوف پتھر کے پیچھے سے جھلک رہی تھی۔کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر میں نے کلاشن کوف کے اوپر نشانہ سادھتے ہوئے ٹریگر دبایا۔اس فاصلے سے نشانہ چوکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔گولی کلاشن کوف کے فرنٹ ہینڈ گارڈ پر لگی تھی۔کلاشن کوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔

میں نے فوراً کلاشن کوف کا رخ ڈھلان کی طرف کرتے ہوئے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا اور ٹریگر دبا دیا ۔دو تین گولیوں کے بعد۔''ٹرنچ۔'' کی آواز نے مجھے کلاشن کوف کے خالی ہونے کی بری خبر سنائی۔یقیناً کلاشن کوف کی میگزین بھری ہوئی نہیں تھی،کیونکہ میں تو چند گولیاں ہی فائر کر سکا تھا۔میری اپنی کلاشن ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔وہاں تک جانے کے لیے مجھے دشمن کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا جس کا نتیجہ موت کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا تھا۔

ٹانگوں پر گولیاں کھانے والے کراہتے ہوئے اپنی جگہ پر تڑپ رہے تھے۔یقیناً انھیں طبی امداد کی ضرورت تھی ورنہ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے انھیں جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔

اسی وقت نالے موڑ سے ہونے والی فائرنگ کی آواز نے مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف کیا کہ وہاں پر دشمن کی کافی پارٹیاں موجود تھیں۔وہاں مزید لیٹنا بھی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لینا تھا۔اور ایک بار اگر میں ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو میری زندگی کی ضمانت ضبط ہوتے

دیر نہ لگتی۔

اس پتھر سے بیس پچیس گز دور جھاڑیوں کا جھنڈ تھا، وہاں تک پہنچ کر میں اپنے فرار میں آسانی پیدا کر سکتا تھا۔ جھاڑیوں تک پہنچنے کے لیے مجھے جلدی کرنا تھی ورنہ دشمن کے نزدیک پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہتا۔ دشمن اس لیے بھی دور دور تھے کہ ان کے خیال کے مطابق میں مسلح تھا۔ جبکہ میں بغیر ایمونیشن کے بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔

میں ابھی اس صورت حال سے نکلنے کی ذہنی ورزش ہی کر رہا تھا کہ بے ہوش پڑے آدمی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ بیٹھا، میری کلاشن کوف اس سے دو تین قدم ہی دور پڑی تھی۔ میں نے نیفے میں اڑساتیس بور نکال کر کاک کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

ہوش میں آتے ہی وہ چند لمحے کنپٹی مسلنے کے بعد زمین پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے اٹھنے لگا۔ اسی وقت خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں زقند بھر کر پتھر کے پیچھے سے نکلا اور اس سے پہلے کہ وہ مکمل کھڑا ہو پاتا، اس کا دایاں بازو مروڑتے ہوئے میں نے اس کی پیٹھ اپنی چھاتی سے لگا لی تھی۔

پتھر کے عقب میں چھپا وہ آدمی جس کی کلاشن کوف کو میں نے نشانہ بنایا تھا۔ مجھے اپنے ساتھی کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس نے پتھر کے پیچھے سے نکل کر اپنی کلاشن کوف اٹھانا چاہی۔

بائیں ہاتھ سے اپنے اسیر کی کلائی تھامتے ہوئے میں نے دائیں ہاتھ میں پکڑا تیس بور کلاشن کوف کی طرف بڑھنے والے شخص کی طرف سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا، مگر گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح کے مقامی اسلحے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ بغیر کسی وجہ کے رک جاتا ہے۔ اس وقت مجھے گلگارے کو تحفہ دیے ہوئے گلاک کی سخت کمی محسوس ہوئی تھی۔ اس بے چاری نے تو اصرار بھی کیا تھا کہ میں پستول اپنے ساتھ لے جاؤں۔ مگر اس وقت مجھے کسی ایسی صورت حال میں پھنسنے کا گمان نہیں تھا۔

پستول کو نیچے پھینک کر میں نے اسی لمبے آدمی کو ڈھال کی طرح اپنے سامنے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھیوں نے چند ہوائی فائر کیے مجھے نشانہ بنانے کی صورت ان کے اپنے آدمی کو پہلے گولی لگتی۔ پتھر کے چھپے آدمی نے بھی کلاشن کوف اٹھا کر میری جانب تان لی تھی لیکن میرے سامنے ان کا ساتھی ڈھال کی صورت میں موجود تھا۔

ایک ہاتھ سے اس کا مروڑا ہوا بازو پکڑ کر دوسرا بازو میں نے اس کی گردن میں ڈالا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کلاشن کوف کے قریب پہنچ گیا۔ نیچے جھک کلاشن کوف اٹھانے کی صورت میں وہ میری گرفت سے نکل جاتا۔ میں نے ایک پاؤں سلنگ میں ڈال کر کلاشن کوف کو دھیرے سے زمین سے اٹھایا۔ اس دوران اس نے مچل کر میری گرفت سے نکلنا چاہا۔

اس کے گلے میں ڈالے ہوئے بازو کے پھندے کو مزید کستے ہوئے میں نے اسے خاموش دھمکی دی۔ کسی اکھڑ سے اکھڑ آدمی کو بھی سمجھانے کے لیے زبان سے زیادہ عملی دھمکی کام آتی ہے۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حرکت کرنا اس کی گردن کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اس نے تعاون کا اعلان کرتے دیر نہیں کی تھی۔

کلاشن کوف ہاتھ میں آتے ہی میں نے بیرل اس کی پیٹھ سے لگائی اور اس کے گلے سے بازو نکال لیا۔ کلاشن کوف کی سرد بیرل گردن میں پڑے ہوئے بازو سے بھی زیادہ ڈرانے والی تھی۔ وہ میرے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کا دوسرا ساتھی مجھے دھمکیاں دینے لگا۔

''اگر ایک منٹ کے اندر اندر تم غائب نہ ہوئے تو ان دونوں کے ساتھ لیٹے نظر آؤ گے۔'' میں نے زمین پر پڑے زخمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی۔ اس نے فوراً ایک بڑے پتھر کے عقب میں آڑ لے لی تھی۔

میرے پاس وقت کم تھا، دیر ہونے کی صورت ان کے مزید ساتھی پہنچ جاتے اور میرا پکڑا جانا یقینی ہو جاتا۔ اس لمبے آدمی کو اپنے سامنے ڈھال کی طرح رکھ کر میں الٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے ساتھیوں کو میری حکمت علی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انھوں نے مجھے دھمکانے کے لیے تیز فائرنگ شروع کر دی، لیکن ان کی کوئی بھی گولی ان کے ساتھی سے اتصال کیے بغیر مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

درختوں کے جھنڈ میں گھستے ہی میں دشمن کی تمام پارٹیوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اپنے قیدی کو میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہا۔

بغیر کسی لیت و لعل کے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً کلاشن کوف کے بٹ سے اس کے سر کی

مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔وہ ایک بار پھر منھ کے بل نیچے گر گیا تھا۔میں مڑ کر بھاگ پڑا۔ان کے تعاقب سے پہلے میں وہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔وہ گھنی جھاڑیاں میری کافی مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد ہی میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔یقیناً انھوں نے اپنے بے ہوش ساتھی کو تلاش کر لیا تھا۔

غزنی خیل والی لڑائی کے بعد اس جھڑپ کے دوران بھی میں نے پوری کوشش کی تھی کہ شلوبر کے کسی آدمی کو جان سے نہ ماروں۔کیونکہ میں حتی الوسع کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ اور اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔گزشتہ روز سے لے کر اب تک شلوبر کا کوئی آدمی میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا۔ البتہ زخمی ہونے والوں کی تعداد دو درجن کے قریب پہنچ گئی تھی۔

نالے کے درمیان میں درخت موجود نہیں تھے۔جھاڑیوں کے جھنڈ چونکہ ڈھلان پر تھے اس لیے مجھے ڈھلان پر ترچھا بھاگنا پڑ رہا تھا۔فرلانگ بھر دور مجھے ان کے چیخنے، چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں نہ جانے وہ کیا حکمت علی تیار کر رہے تھے۔ان آوازوں پر کان دھرے بغیر میں جھاڑیوں کے درمیان آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آکسیجن لیول کم ہونے کی وجہ سے میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

دوڑتے دوڑتے میری نظر نالے کے درمیان میں پڑی۔ان کے نو دس آدمی نالے کے بیچوں بیچ دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ان کا ارادہ مجھ سے آگے بڑھ کر ان جھاڑیوں کے جنگل کو گھیرنے کا تھا۔اگر ایسا ہو جاتا تو میں نے چوہے دان میں پھنس جانا تھا۔

ایک دم رک کر میں نے ایسی جگہ پر پوزیشن سنبھالی جہاں سے پورا نالہ میری نظروں کے سامنے تھا،اس کے ساتھ ہی کلاشن کوف کو سنگل راؤنڈ پر سیٹ کرتے ہوئے میں نے سب سے آگے والوں کی ٹانگوں پر شست لے کر مسلسل تین بار ٹریگر دبا دیا۔

دو آدمی منھ کے بل گر کر تڑپنے لگے۔باقی ایک دم بکھر کے دائیں بائیں پڑے پتھروں کی آڑ میں ہو گئے تھے ۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے اندازے سے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔دو تین مزید گولیاں ضائع کر کے میں کروٹ تبدیل کرتا ہوا ایک جھاڑی کی آڑ میں پہنچا اور جھکے جھکے وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔انھیں ابھی تک

پتھروں کی آڑ سے نکلنے کی جرّات نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی میں کھڑے ہو کر دوڑ پڑا۔ کلومیٹر بھر آگے نالہ دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا اور ان کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے مجھے اگلے نالے میں پہنچنا تھا۔ کیونکہ جلد ہی انھیں یقین ہو جانا تھا کہ میں آگے بڑھ گیا ہوں اور اس کے بعد وہ تیز رفتاری سے نالہ موڑ تک پہنچ سکتے تھے۔

میرے بائیں بازو میں ہلکی ہلکی جلن اور اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔ یقیناً گولی نے کافی گہری خراش ڈالی تھی۔ اپنے بازو کی جلد پر مجھے خون کی نمی بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ رک کر بازو پر پٹی وغیرہ لپیٹ سکتا۔ بس اطمینان تھا تو اتنا کہ گولی بازو کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی تھی اور رگڑ کھاتے ہوئے نکل گئی تھی۔

نالے موڑ کے قریب پہنچنے تک میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کلومیٹر بھر کا فاصلہ جو میدانی علاقے میں دس بارہ منٹ میں آسانی سے طے ہو جاتا ہے اور تھکن بھی محسوس نہیں ہوتی، پہاڑی علاقے میں اس سے دگنا وقت لگا کر بھی اتنا فاصلہ بہ مشکل طے ہو پایا تھا۔ اور اس کے ساتھ میرا سانس یوں پھولا ہوا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آرہا ہوں۔

اس جگہ پر تین نالے آکر اس چوڑے نالے میں مل رہے تھے۔ ایک نالہ دائیں طرف سے، دوسرا بائیں اور ایک نالہ سیدھا آکر اس چوڑے نالے میں مل رہا تھا۔ مرناہ گر نامی گاؤں کو دایاں نالہ جاتا تھا، لیکن دائیں نالے میں جانے کے لیے مجھے وہ چوڑا نالہ عبور کرنا پڑتا جبکہ دشمن نالے میں موجود تھا اور تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سیدھا جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، کہ ایک تو اس نالے میں جھاڑیاں کم نظر آرہی تھیں دوسرا اس نالے میں جاتے ہوئے میں دشمن کو دور سے نظر آسکتا تھا۔ سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں بائیں طرف کے نالے میں گھس گیا کہ اس وقت میری پہلی ترجیح اپنی جان کو بچانا تھا۔ مرناہ گر گاؤں کو بعد میں بھی ڈھونڈا جا سکتا تھا۔

بائیں نالے میں مڑتے ہی میں نالے کے دائیں کنارے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ایک خاص فرق یہ پڑا تھا کہ اس جگہ سے چڑھائی شروع ہو رہی تھی حالانکہ پہلے میں اترائی میں بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ چڑھائی میں دوڑنا ناممکن تھا، میں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ جھاڑیوں کے جھنڈ بتدریج اونچائی کی طرف چلے گئے تھے۔ میں

بھی نالے میں سیدھا چلنے کے بجائے ترچھا ہو کر اوپر کی طرف چلنے لگا۔ فرلانگ بھر چلنے کے بعد ہی مجھے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔لیکن فائرنگ کا رخ متعین نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ میرے جانے کی سمت سے آگاہ نہیں تھے اور اندازے ہی سے فائر کر رہے تھے۔اس نالے کے دونوں کناروں پر گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ موجود تھے، جبکہ سیدھے نالے میں بھی جھاڑیاں موجود تھیں۔اور وہی جھاڑیاں مجھے چھپنے میں مدد دے رہی تھیں۔

میں نے قدم روکتے ہوئے ایک جھاڑی کی اوٹ سے نالہ موڑ کی جانب نگاہ دوڑائی، وہاں پندرہ بیس کے قریب مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔یقیناً وہ میرے جانے کی سمت کا تعین کر رہے تھے۔ گو وہاں سے مجھے ان کے تیور تو نظر نہیں آ رہے تھے البتہ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سخت غصے میں تھے۔ وہ مجھے ناکارہ کرنے آئے تھے، اس کے بجائے اپنے تین چار آدمی زخمی کرا بیٹھے تھے۔اور اتنے آدمیوں کے گھیرے سے ایک بندے کا یوں آرام سے نکل جانا انھیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔وہ لمبا آدمی جسے میں نے دو مرتبہ کلاشن کوف کا بٹ مار کر بے ہوش کیا تھا وہ مجھے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اب ان کے قابو میں آ جاتا تو اس لمبے نے تو مجھے بغیر وضاحت سنے ہی گولی مار دینا تھی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوئے آدھے سیدھے جانے والے نالے میں گھس گئے جبکہ بقایا اس نالے میں آ گئے جس میں میں موجود تھا۔البتہ دائیں مڑنے والے نالے کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ نیچے ہی نیچے چلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو مجھے وہیں چھپے ہوئے ان کے آگے نکل جانے کا انتظار کرنا چاہیے،اس کے بعد میں واپس جا کر مر ناہ گر جانے والے نالے میں گھس کر خود کو محفوظ کر سکتا تھا۔اس طرح ان کے تعاقب سے بھی میری جان چھوٹ جاتی اور میری منزل بھی کھوٹی نہ ہوتی۔

لیکن جب میں نے اس پارٹی کو مزید تین حصوں میں منقسم ہوتے دیکھا تو مجھے اپنے منصوبے میں ترمیم کرنا پڑی۔ان میں سے چار آدمی نالے کے بائیں کنارے کی طرف بڑھے اور پھیل کر ڈھلان پر چڑھنے لگے۔چار

آدمی دائیں ڈھلان پر چڑھنے لگے کہ جس جانب میں چھپا ہوا تھا۔ جبکہ باقی نالے کی تہہ میں آگے بڑھنے لگے۔

اس کے ساتھ دوسری پارٹی کے آدمی جو سیدھے نالے میں گھسے تھے انھوں نے اپنے تین آدمی نالہ موڑ ہی پر چھوڑ دیے تھے۔ گویا میں کسی طرح اپنی تلاش میں آنے والوں کی نظر میں آنے سے بچ بھی جاتا تب بھی واپس نہیں جا سکتا تھا۔

اپنے منصوبے پر مٹی ڈالتے ہوئے میں جھاڑیوں کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ ان کی نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ اب آگے بڑھنے کے بجائے میں اوپر چڑھنے پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ پچاس ساٹھ گز چلنے کے بعد ایک دم چلغوزے کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان درختوں کی وجہ سے میں زیادہ تیزی سے سفر کر سکتا تھا، کیونکہ اب کھڑا ہونے کے باوجود میں دور سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس پہاڑی کی بلندی اتنی زیادہ نہیں تھی جلد ہی میں چوٹی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ چوٹی سے پچاس ساٹھ گز نیچے ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے خطرے سے بچنے کا سوچا اور انھی درختوں کے اندر رہتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ دشمن کے بلندی پر پہنچنے کی صورت میں میں دونوں جانب سے گھیرے میں آ جاتا اور اس وقت کسی کی بھی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو میرا وہاں سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے محتاط انداز میں بلندی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ چھدری چھدری جھاڑیوں اور اکا دکا پتھریلی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا میں حتی الوسع کوشش کر رہا تھا کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ صبح سویرے ہی مجھے دشمن کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا اس وجہ سے دن گزرنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر اندھیرا چھا جاتا تو مجھے مزید سہولت مل جانا تھی۔ پھر میں دور سے کسی کو نظر نہ آتا اور اس اندھیرے میں پہاڑی علاقے میں ایک آدمی کو تلاش کرنا کسی بڑے اتفاق ہی کے مرہون منت ہو سکتا تھا۔ اور عموماً ایسے اتفاقات ظہور پذیر نہیں ہوا کرتے۔

لیکن اندھیرا چھانے میں ابھی آدھے دن سے زیادہ وقت پڑا تھا۔ اور اتنی دیر ان موذیوں کی نظروں سے بچ کر حرکت کرنا نہایت دشوار تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ یہاں کے مقامی تھے سارا علاقہ ان کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ تیزی سے ان پہاڑوں میں سفر کر سکتے تھے اور انھیں سانس کا مسئلہ بھی میدانی علاقوں کے لوگوں کی نسبت کم پیش آتا تھا۔

میں اپنا سفری تھیلا بھی پیچھے ہی پھینک آیا تھا۔اب میرے پاس جیبوں میں موجود نقدی، پنڈلی سے بندھے خنجر اور کلاشن کوف کے علاوہ ضرورت کا کوئی سامان باقی نہیں بچا تھا۔کلاشن کا ایمونیشن بھی تھیلے ہی میں رہ گیا تھا۔شلو بر قبیلے سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے کی صورت میں میں چند گولیوں سے کب تک ان کی پیش قدمی روک پاتا۔وہ کافی طویل پہاڑی تھی ۔اور اوپر پہنچ کر میں کافی تیزی سے حرکت کر کے کسی مناسب نالے یا دوسری پہاڑی کا رخ کر سکتا تھا۔اور جتنا زیادہ میں دور ہوتا جاتا میری تلاش میں آنے والوں کا ایک دوسرے سے فاصلہ بڑھتا جاتا۔اس فائدہ یہ ہوتا کہ اگر اتفاقاً کوئی پارٹی مجھ سے ٹکرا بھی جاتی تو دوسرے اس کی مدد کو بروقت نہیں پہنچ سکتے تھے۔اور اتنا موم کا پتلا میں بھی نہیں تھا کہ تین چار آدمیوں کے قابو میں آجاتا۔

میں محتاط انداز میں حرکت کرتا ہوا دھیرے دھیرے سے چوٹی کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ایک گھنی جھاڑی کے قریب پہنچ کر میں لمحہ بھر سانس لینے کو رکا، وہاں سے چوٹی تک پندرہ بیس قدم کا فاصلہ باقی تھا لیکن رستے میں کوئی نظری آڑ میسر نہیں تھی جس کا سہارا لے کر میں اوپر پہنچ سکتا۔لیکن بلندی پر پہنچنا بھی ضروری تھا اس لیے خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔نالے کی طرف نظر دوڑانے پر مجھے کوئی نظر نہ آیا کہ وہاں سے نہ تو نالے کی تہہ نظر آتی تھی اور نہ نالے میں موجود کوئی شخص اس جگہ کو دیکھ سکتا تھا۔البتہ میرے پیچھے ڈھلان چڑھنے والے افراد مجھے دیکھ سکتے تھے، اسی طرف نالے کے دوسرے کنارے پر ڈھلان چڑھنے والوں کی نظر بھی اس جانب اٹھ جاتی تو انھیں میں نظر آسکتا تھا، کیونکہ نالے کی چوڑائی اتنی زیادہ نہیں تھی۔دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتے ہوئے میں نے اوپر کی طرف قدم بڑھا دیے۔وہ تھوڑا سا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کرنے کی کوشش کی تھی۔گو بلندی پر دوڑنا قریباً ناممکن ہوتا ہے کہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس پھولنے تو کیا اکھڑنے لگتا ہے، لیکن چند قدم لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔اور پھر میں اوپر پہنچ کر ایک پتھر کی آڑ لینے ہی والا تھا کہ مخالف پہاڑی کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری اور بلاشک وشبہ اس فائرنگ کا نشانہ میری ذات تھی۔بالکل آخری لمحات میں میں دیکھ لیا گیا تھا بہ قول شاعر......

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

گولی چلانے والا کا نشانہ خطا جانے کے باوجود میرا مقصد پورا نہیں پایا تھا۔نظر آ کر میں نے ایک بار پھر انھیں ہدف مہیا کر کے اپنے گرد گھیرا ڈالنے کا موقع دے دیا تھا۔ بہ ہر حال میرے پاس سوگ منانے یا سر پیٹنے کا وقت نہیں تھا۔ دوسری جانب اترنے کے بجائے میں نے بلندی پر ہی آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ پہاڑی پانچ چھے سو گز طویل تھی۔ اس کا رخ قریباً جنوب مغرب بن رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز تواتر سے آنا شروع ہو گئی تھی۔ گو اب میں ان کی نظروں سے اوجھل تھا لیکن ان کی فائرنگ کے باعث دائیں بائیں پھرنے والی تمام پارٹیاں اس جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔ اس کے ساتھ لازمی بات ہے انھوں نے یہ بات مخابرے پر بھی دوسری پارٹیوں کو بتا دی ہو گی۔ تھکن محسوس کرنے کے باوجود میری ٹانگوں میں بجلی بھر گئی تھی اور میں جلد از جلد وہاں سے دور ہو کر کسی ایسی جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں میری تلاش کے لیے انھیں دوبارہ منتشر ہونا پڑ جاتا۔ بائیں جانب موجود نالا اس پہاڑی کے ساتھ ساتھ جنوب مغرب کی جانب مڑ رہا تھا، یقیناً نالے کی تہہ میں موجود آدمیوں نے سامنے کی طرف آ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرنا تھی۔ البتہ اس پہاڑی کے دائیں جانب جو دو تین نالے لگ رہے تھے میں ان میں سے کسی نالے میں اتر سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک نالا چھوڑ کر دوسرے کے نظر آتے ہی میں ڈھلان اترنے لگا۔ اب میرے قدموں میں پہلے سے زیادہ تیزی آ گئی تھی۔ میں بہ مشکل ایک تہائی ڈھلان اتر پایا تھا کہ مجھے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ چاروں آدمی جو میرے پیچھے پیچھے اس ڈھلان پر چڑھ رہے تھے یہ معلوم ہوتے ہی کہ میں بلندی پر ہوں انھیں نے اوپر پہنچتے ہوئے دیر نہیں لگائی تھی۔ بہ ہر حال ابھی تک وہ مجھ سے دور تھے اور اتنے فاصلے سے وہ مجھے نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اپنے قدموں میں مزید تیزی لاتے ہوئے میں حتی الوسع کسی آڑ کو اپنے عقب میں رکھ کر آگے بڑھتا گیا۔ نالے میں اترنے کے بعد ہی میں اگلی چڑھائی چڑھ سکتا تھا جونھی میں نالے میں اترا ایک مرتبہ پھر عقب میں فائر کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ سامنے کی پہاڑی پر زیادہ درخت نہیں تھے لیکن اس پر چڑھنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ نیچے اترتے وقت ایک اور پریشان کن بات میرے مشاہدے میں آئی تھی، کہ جس نالے میں میں اترا تھا وہ اس سیدھے نالے سے ٹکرا رہا تھا جہاں شلوبر قبیلے والوں کی دوسری پارٹی میری تلاش میں گئی تھی۔ اس لیے بجائے نالے میں آگے بڑھنے کے میرا بلندی پر پہنچنا ضروری تھا۔

دوڑتے دوڑتے میں یہ سب کچھ طے کر چکا تھا،اس لیے نالے میں رکنے کے بہ جائے میں نے بلندی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ایک بار پھر میرا سانس پھولنے لگا تھا لیکن وہ وقت سانس بحال کرنے کا نہیں تھا۔غزنی خیل قبیلے کے ساتھ ہمدردی کرنا مجھے کچھ زیادہ ہی مہنگا پڑ رہا تھا۔شلوبر قبیلے والے غزنی خیلوں پر آیا ہوا غصہ مجھ پر نکال رہے تھے۔یا شاید ان کی نگاہ میں میرا قصور نا قابل معافی تھا۔حالانکہ اپنے تئیں میں نے ان کے کسی آدمی کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا، ورنہ بازو یا ٹانگ پر لگنے والی گولی کو سر میں مارنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

میری کوشش یہ تھی کہ کسی چٹان، جھاڑی یا درخت وغیرہ کی آڑ لے کر چلوں۔ان کے نالے میں اترنے تک میں کلاشن کوف کی کارگر رینج سے دور نکل جانا چاہتا تھا ورنہ نالے میں کھڑے ہو کر وہ مجھے آسانی سے نشانہ بنا لیتے۔(ویسے ایک بات میں قارئین کی معلومات کے لیے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اونچائی اور نشیب میں فائر کرتے وقت کسی بھی ہتھیار کی کارگر رینج بڑھ جایا کرتی ہے،لیکن یہ سنائپروں کا طریقہ کار ہے اور یہ حساب ایک کلیے کے تحت کیا جاتا ہے،عام آدمی اس بات سے واقف نہیں ہوتا ہے)

پوری کوشش کے باوجود میں مطلوبہ بلندی تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔میں بہ مشکل دو سو میٹر اوپر پہنچا ہوں گا کہ انھوں نے نالے میں پہنچ کر فائرنگ شروع کر دی۔

فائر کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں فوراً نیچے لیٹا اور ایک قریب پتھر کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کے لیے تیار ہو گیا۔وہ چاروں بغیر کسی آڑ کا سہارا لیے نالے درمیان میں کھڑے تھے۔میری کلاشن کوف کا سیفٹی لیور سنگل راؤنڈ پر سیٹ تھا۔مطلوبہ رینج لگا کر میں نے شست لے کر درمیانی آدمی کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے لگا۔یوں بھی ان کے رکے ہونے کی وجہ سے وہ آسان ہدف کی صورت اختیار کر گئے تھے۔لبلبی دباتے ہی مذکورہ آدمی نیچے گر گیا تھا ۔اس کے ساتھ ہی باقی آڑ کی تلاش میں پہاڑی کی جڑ کی طرف بھاگے۔ان کے چھپنے کا تماشا دیکھنے کے بجائے میں بلندی پر چڑھنے لگا۔پہاڑی کی جڑ میں چھپنے کی وجہ سے میں بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔اور جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہو جانا تھا۔ اور میرے گمان کے مطابق تھوڑی دیر بعد ہی ان کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔وہ نالے کے دوسرے کنارے پر جا کر کسی پتھر وغیرہ کی آڑ لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔اتنی دیر میں میں مزید دور ہو گیا تھا۔دائیں بائیں پڑے پتھروں سے ٹکرانے والی گولیوں نے مجھے فوراً ہی یہ باور کرا دیا تھا کہ

میں اب تک ان کی رینج ہی میں تھا۔

ایک مرتبہ پھر مناسب آڑ کے پیچھے لیٹ کر میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زخمی آدمی اب تک اسی جگہ پر موجود تھا۔ زمین پر بیٹھ کر وہ اپنی ٹانگ پر کپڑا لپیٹ رہا تھا کیونکہ خون کے بہاؤ کو روکنے کے لیے یہ کام نہایت ضروری تھا۔ میں اگر چاہتا تو آسانی سے اس کا عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا سکتا تھا، لیکن اب تک میں انھیں جان سے مارنے سے گریز کر رہا تھا۔

میں نے فائر کرنے والوں کی پوزیشنوں کا جائزہ لیا دو آدمی آڑ کے اوپر سے فائر کر رہے تھے اور ان کے سر میں گولی مارنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ تیسرا آدمی پتھر کی آڑ کی دائیں جانب سے فائر پر شروع تھا۔ میں نے اسی کے کندھے پر نشانہ سادھ کر فائر کر دیا۔ اس کی چیخ سنتے ہی باقی دونوں مکمل طور پر پتھر کے پیچھے چھپ گئے تھے۔

میں وقت ضائع کیے بغیر دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔ اس مرتبہ مجھے نشانہ بنانے کے بجائے وہ اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے لگے۔ اس دوران میں ان کی رینج سے نکل گیا تھا۔ بلندی پر پہنچتے ہی میں نے دو تین منٹ رک کر سانس سیدھا کیا اور پھر ایک طرف کو بڑھ گیا۔

دشمن نے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چار میں سے دو زخمی ہو گئے تھے اور زخمی ساتھیوں کو اکیلا چھوڑ کر انھوں نے میرا تعاقب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انھوں نے ریڈیو سیٹ کے ذریعے اپنے دوسرے ساتھیوں کو وہاں بلا لیا ہو۔ میری بلا سے کوئی وجہ بھی تھی مجھے جلد از جلد وہاں سے دور نکلنا تھا۔ بیٹھے بٹھائے مفت کی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ نہ روشن خان مجھے اس دن سیلاب خان کے پاس لے جاتا اور نہ میرا سفر کھوٹا ہوتا۔ اس ہنگامے میں پھنسنے پر اگر میرا کوئی فائدہ ہوا تھا تو بس اتنا کہ نوشاد گل کے ذریعے مجھے تھوڑی بہت معلومات مل گئی تھی۔ وہ بھی ادھوری سی کہ وہ ٹریسی اور البرٹ بروک کے ساتھ ایک بار غزنی خیل گیا تھا۔ اب نامعلوم وہ مستقل وہیں رہتے تھے یا ایک بار ہی کسی وجہ سے وہاں گئے تھے۔ خیر کچھ بھی تھا اب مجھے ایک بار تو غزنی تک جانا تھا۔ اگر البرٹ مجھے وہاں نہ بھی ملتا تب بھی شاید اس کے بارے کوئی ہلکا سا سراغ مل جاتا۔ البرٹ سے بھی بڑھ کر مجھے میجر جینیفر ہنڈسلے کو تلاش کرنا تھا۔ قوی امید تھی کہ اس معاملے میں وہ میری مدد ضرور کرتی۔ گو اس بارے وہ گزشتہ ملاقات میں سرسری سی معذرت کر چکی تھی، مگر اس وقت میں نے اس پر اتنا زور بھی نہیں دیا تھا

۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واپس لوٹ چکی ہوتی۔ بہ ہر حال یہ بعد کی باتیں تھیں اس وقت تو مجھے جان بچانے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ شلو بر قبیلے کے لوگ پیر تسمہ پا کی طرح میرے پیچھے پڑے تھے۔ میرے تعاقب میں آنے والے گو اس پہاڑی کے نیچے ہی رک گئے تھے مگر ابھی تک میں خطرے کی حدود سے نہیں نکلا تھا۔

پہاڑی آگے جا کر ایک دوسرے بلند پہاڑ سے مل رہی تھی، درمیان میں کوئی نالہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ دوسری پہاڑی کی انتہائی بلندی پر مجھے برف کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ میرے پاؤں میں اس وقت سپورٹس شوز تھے، گلگارے کے والد شمریز خان کے بوٹ میرے سفری تھیلے ہی میں رہ گئے تھے۔ ایک بار تو میں نے اوپر نہ چڑھنے کا سوچا، کیونکہ برف کی وجہ سے اپنے ساتھ پیش آنے والا حادثہ مجھے بھولا نہیں تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ۔

”میں نے کون سا وہاں رہنا ہے، اس بلندی کو عبور کر کے آگے گزر جاؤں گا۔“

یہ سوچتے ہی میرے قدم ایک بار پھر بلندی کی جانب بڑھ گئے۔ کافی مشکل چڑھائی تھی۔ مجھے صبح سے مسلسل کبھی دوڑنا پڑ رہا تھا اور کبھی چڑھائیاں چڑھنا پڑ رہا تھا۔ ایسی صورت میں تھکن ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ البتہ میں ایسے حالات میں جینا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ابھی تک مجھ میں کافی جان موجود تھی اور میں اتنا نہیں تھکا تھا کہ گر پڑتا۔

وہاں نصف بلندی تک درخت موجود تھے۔ جوں جوں میں بلند ہوتا گیا تیز ہوا کے ساتھ سردی بھی بڑھتی گئی۔ گو چڑھائی چڑھتے ہوئے زیادہ مشقت کی وجہ سے پسینہ آ جاتا ہے اور سردی کم ہی لگتی ہے، مگر انسان کو سردی کے بڑھ جانے کا احساس ضرور ہو جاتا ہے۔

گھڑی دیکھنے پر سوئیاں ایک کا ہندسہ عبور کرتی نظر آئیں۔ مجھے دوڑتے، بھاگتے، نشیب و فراز عبور کرتے قریباً ساڑھے پانچ گھنٹے ہو رہے تھے۔ کیونکہ غزنی خیل سے میں صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوا تھا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد میں اوپر پہنچ گیا تھا۔ چند لمحے میں سستانے بیٹھا لیکن ٹھنڈی ہوا میرا مزاج پوچھنے لگی تھی۔ آرام کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسری جانب نیچے اترنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر نگاہ دوڑائی، حد نگاہ تک پہاڑی سلسلے نظر آ رہے تھے۔ میرے پاس دوربین موجود نہیں تھی ورنہ میں اپنے دوستوں کی حرکت دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔

نیچے اترتے وقت میری رفتار کافی تیز تھی۔ بیس پچیس منٹ میں میں دوسری جانب موجود نالے میں پہنچ گیا تھا۔ نالے میں بہتا پانی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ صبح سے میں پانی نہیں پی سکا تھا۔ ہاتھوں کا اوک بنا کر میں چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان جاری شفاف پانی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ خوب سیر ہو کر ٹھنڈا پانی پینے کے بعد میں نالے ہی نالے میں آگے بڑھ گیا۔ بلندی پر چلنے والی تیز ہوا وہاں بالکل ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نالے کا رخ جنوب مغرب کی طرف تھا۔ نالے کے بائیں کنارے پر جھاڑیوں کا گھنا جھنڈ تھا جو بلندی کی طرف بتدریج چھدرا چھدرا ہوتا گیا تھا۔ البتہ دائیں جانب اکا دکا جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے میں مناسب رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن سکون شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔ میں نالے موڑ سے سو ڈیڑھ سو گز ہی دور تھا کہ مجھے چھ سات آدمی موڑ مڑ کر اس جانب آتے دکھائی دیے۔ ٹھٹک کر رکتے ہوئے میں نے فوراً قریبی جھاڑی کی آڑ لی، مگر میری تیزی کسی کام نہیں آئی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور بغیر سیکنڈ ضائع کیے انھوں نے کلاشن کوفوں کا رخ میری جانب کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔

ایک بار پھر میری دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ چڑھائیاں سر کرنا اس دن میرے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ کندھے سے لٹکی ہوئی کلاشن کوف میں نے ہاتھوں میں پکڑ لی تھی۔ اگر وہ اسی طرح دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے تو مجھے جلد ہی آ لیتے۔ یہ سوچتے ہی میں نے رکتے ہوئے ان کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر تین چار گولیاں فائر کر دیں۔ اپنے زخمی ساتھی انھیں بھولے نہیں تھے۔ وہ فوراً پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ میرے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر تھا، میں ان کے ہر فائر کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے مزید گولیوں کی بچت کرتے ہوئے میں نے فائر بند کیا اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔

جیسے ہی ان کی طرف سے فائرنگ رکی میں جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر ایک پتھر پیچھے لیٹا اور نالے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ انھیں چند قدم لینے دینے کے بعد میں نے ایک گولی فائر کی لیکن جس جگہ سے میں فائر کر رہا تھا وہاں سے لیٹ کر انھیں نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ البتہ گولی چلنے کی آواز نے انھیں بدحواس ہو کر لیٹنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا۔ امید تھی کہ وہ اتنی جلدی اٹھنے کی ہمت نہ کرتے۔ البتہ لیٹے لیٹے

انھوں نے فائر ضرور کھول دیا تھا۔

میں نے رینگتے ہوئے قریبی جھاڑی کی آڑ لی اور اور ایک بار پھر اوپر چڑھنے لگا۔ یہ ایک طویل اور لمبی ڈھلان تھی جو بتدریج اوپر کو اٹھتی گئی تھی۔ نقشہ بینی کی اصطلاحات میں ایسی ڈھلان کو پہاڑ کا بازو کہتے ہیں یعنی پہاڑ کی وہ شاخ جس کی بلندی بتدریج کم ہو کر زمین سے مل جائے۔

بیس پچیس قدم اوپر جاتے ہی مڑ کر دیکھنے پر وہ مجھے حرکت کرتے نظر آئے، مگر اب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور میرے گولی فائر کرنے پر وہ زمین پر لیٹ کر آڑ لینے کے بجائے جھاڑیوں کی آڑ لینے کی کوشش کرتے۔ میں نے گولی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور قدموں میں تیزی پیدا کر دی۔ یقیناً جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہی انھوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دینا تھی۔ مقامی ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے زیادہ تیز رفتاری سے پہاڑی چڑھ سکتے تھے۔ مگر میری مثال اس وقت ایسے ہرن کی سی ہو گئی تھی جو جان بچانے کے خوف میں وہ چوڑی کھائی بھی پھلانگ جاتا ہے جسے اس کا تعاقب کرنے والا طاقتور شیر عبور نہیں کر سکتا۔

اکا دکا فائر کی میرے کانوں میں تسلسل سے آ رہی تھی۔ یقیناً وہ گھنی جھاڑیوں کو فائر کے ذریعے چھان رہے تھے۔ کسی جھاڑی میں چھپنے کی تجویز بھی میرے زیرِ غور تھی لیکن ان کے گھنی جھاڑیوں پر فائر کرنے نے مجھے اس تجویز پر عمل کرنے سے باز رکھا تھا۔

مختلف مقامات سے اٹھنے والی فائروں کی آواز سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جھاڑیوں کا جھنڈ زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں نبھا سکتا تھا۔ میں اسی صورت میں بچ سکتا تھا کہ ان کے جھاڑیوں کے جنگل سے نکلنے سے پہلے بلندی پر پہنچ جاتا۔

جلد ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے آگے اکا دکا جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے رفتار مزید تیز کر دی، مگر میں زیادہ دیر اپنی رفتار برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ میرا دل جیسے حلق کے رستے باہر آنے کو تیار ہو گیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھاگنا ترک کرنا پڑا۔ لمحہ بھر رک کر میں نے اپنے سانس بحال کیے اور پھر تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں بہ مشکل سو ایک سو بیس گز ہی اوپر پہنچا ہوں گا کہ ایک مرتبہ پھر تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک بڑا پتھر پڑا تھا۔ اس کی آڑ لینے کے لیے میں نے رفتار بڑھائی مگر اس سے پہلے ہی مجھے یوں لگا جیسے

میری دائیں ران میں کوئی گرم انگارہ گھس گیا ہو۔ میں منہ کے بل نیچے گرا۔ اپنے ہاتھ سامنے ٹیکتے ہوئے میں نے خود کو زیادہ زخمی ہونے سے بچالیا تھا۔ وہاں سے رینگتے ہوئے پتھر تک جانا ناممکن تھا۔ کوشش کر کے میں سیدھا ہوا اور جھک کر پتھر کی جانب بڑھا۔ میری دائیں ٹانگ سے بڑی تیزی سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ پتھر کے قریب پہنچنے تک مجھے ایک اور جھٹکا لگا، اس مرتبہ گولی میری دائیں پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بائیں پاؤں پر زور دیتے ہوئے میں نے ایک جھٹکا لیا اور پتھر کے پیچھے پہنچ گیا۔

آڑ میں جاتے ہی میں نے بغیر وقت ضائع کیے گلے سے لپٹا مفلر کھول کر اپنی ران پر لپیٹنے لگا۔ گولی ران کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ مگر اس وقت گولی نکالنے سے زیادہ خون کے بہاؤ کو روکنا ضروری تھا۔ ران پر کس کر مفلر لپیٹنے کے بعد میں نے خنجر نکال کر اپنی قمیص کا دامن پھاڑا اور اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ کر پٹی کی شکل دیتے ہوئے پنڈلی پر لپیٹنے لگا۔

پہلے پہل گولی کا زخم اتنی تکلیف نہیں دیتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم میں درد اور جلن بڑھتی جاتی ہے۔ خاص کر جس زخم میں گولی اندر ہی رہ جائے وہ زیادہ تکلیف دیتا ہے۔

دونوں زخموں پر پٹی باندھنے کے بعد میں نیچے کی طرف متوجہ ہوا۔ یقیناً دشمن کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گولی لگ چکی ہے۔ تین آدمی بڑی تیز رفتاری سے اوپر کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ سب سے آگے والے کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے میں نے سانس روکا اور ٹریگر دبا دیا......بس بہت رعایت ہو گئی تھی۔ میری جان چھوڑنے پر وہ یوں بھی آمادہ نہیں ہو رہے تھے، یہاں تک کہ اب تو سچ مچ مجھے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ اچھل کر پیچھے کو الٹا اور نیچے لڑھکنے لگا۔ اس ساتھ آنے والے فوراً نیچے لیٹ گئے اس کے ساتھ انھوں نے موسلا دھار فائر کھول دیا۔ میں اس پتھر کے پیچھے محفوظ تھا۔ البتہ ان کی گولیوں سے بچنے کے لیے مجھے اپنا سر بھی آڑ کے پیچھے کرنا پڑ گیا تھا۔ دونوں نے پوری پوری میگزین ہی خالی کر دی تھی۔ جوں ہی ان کا فائر رکا میں نے اس پتھر کے دائیں جانب سے کلاشن کوف کا دہانہ نکال کر شست سادھ لی۔ ایک آدمی کو تو پتھر کی آڑ مل گئی تھی دوسرا یوں ہی لیٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بے وقوفی بھی کی تھی کہ کہنیاں ٹیک کر درست فائر کرنے کے لیے اپنا سر زمین سے بلند کیا ہوا تھا۔ ان کی دو میگزینوں کے جواب میں میں نے ایک اور گولی فائر کر دی۔ ہدف نے اٹھا ہوا سر اپنی کلاشن کوف پر ٹیک

دیا۔ ماتھے میں پیوست ہونے والی گولی نے اسے زیادہ تڑپنے کا موقع نہیں دیا تھا۔
اتنی دیر میں پتھر کے پیچھے آڑ لیے ہوئے آدمی نے میگزین تبدیل کر لی تھی۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھتے ہی بدحواسی میں اس نے ایک بار پھر ٹریگر یوں دبایا کہ انگلی اٹھانا اسے بھول گیا تھا۔ میگزین زیادہ دیر تک گولیاں فراہم نہیں کر سکی تھی۔ برسٹ کی صورت فائر ہونے والی تیس گولیاں ختم ہونے میں وقت ہی کتنا صرف ہوتا ہے۔ زیادہ تر گولیاں اس پتھر سے ٹکرائی تھیں جو مجھے آڑ مہیا کیے ہوئے تھا۔ کچھ دائیں بائیں زمین میں لگ کر گرد اڑانے کا سبب بنی تھیں۔
میں اس کے فائر کے رکنے کا منتظر رہا۔ جونھی اس کا فائر رکا میں ایک بار پھر پتھر کی آڑ کے دائیں جانب سے اس طرف جھانکنے لگا۔ (قارئین یہ بات یاد رکھیں کہ دائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے فائرر کے لیے کسی بھی آڑ کی دائیں طرف کا استعمال ہی مناسب رہتا ہے، کیونکہ آڑ کی بائیں جانب کا استعمال کرنے کی صورت میں اس کا زیادہ جسم دشمن کو نظر آ سکتا ہے)
وہ پتھر کے عقب میں بے حس لیٹا تھا۔ میرے خیال میں وہ میگزین تبدیل کر رہا تھا۔ مگر منٹ بھر بعد بھی جب اس کی جانب سے فائر نہ ہوا تو مجھے شک ہونے لگا کہ اس کے پاس گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔
اسی وقت مجھے درختوں کے جھنڈ سے ان کے باقی چار ساتھی آگے بڑھتے نظر آئے۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر تھے تبھی تو یوں بے فکری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی چونکہ میری طرف متوجہ تھا اس لیے اسے بھی اپنے ساتھی نظر نہیں آئے تھے ورنہ وہ انھیں ضرور متنبہ کرتا۔ میں نے فوراً کلاشن کوف کی بیرل کا رخ آنے والوں کی طرف موڑا، میرا ارادہ کم از کم دو آدمیوں کو نشانہ بنانے کا تھا۔ درمیان والے آدمی کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے میں نے لبلبی دبائی، اپنے پہلے ساتھی کی طرح وہ اچھل کر پیچھے گرا تھا۔ باقی تینوں نے فوراً آڑ لینے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں میں ایک اور بار ٹریگر دبا چکا تھا۔ ان کا چوتھا آدمی بھی مجھے مارنے کی حسرت لیے پہلے والے تین کے پاس پہنچ چکا تھا۔ کلاشن کوف کے آٹو میٹک ہونے نے میرے کام کو آسان بنا دیا تھا۔
بچنے والے دونوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے اضطراری فائر سے گھبرا کر ان کے آگے لیٹے ہوا ساتھی گھبرا کر با آواز بلند انھیں فائر سے منع کرنے لگا۔ کیونکہ وہ ان کے اور میرے درمیان میں لیٹا ہوا تھا۔ انھیں

منع کرتے کرتے وہ اس پتھر کی اونچائی کا حساب نہیں رکھ پایا تھا جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ اس کی کھوپڑی کا عقبی حصہ پتھر کے اوپر سے جھلکا اور مجھے بس اتنا ہی ہدف درکار تھا۔ سو گز سے چلائی ہوئی کلاشن کوف کی طاقتور گولی نے کھوپڑی کے عقب سے گھس کر اسے دنیا کی ہر فکر اور اندیشے سے دور کر دیا تھا۔

مرنے سے پہلے اس نے بچنے والوں دونوں ساتھیوں کو مرنے والوں کے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔ بلکہ ان دونوں نے بھی دیکھ لیا تھا ٹانگوں اور بازوؤں میں لگنے والی گولیاں اب سر اور ماتھے میں پیوست ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

اچانک ان میں سے ایک آدمی نے اٹھ کر نیچے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ یقیناً وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ لیکن اب چاہے وہ خوفزدہ ہو کر، چاہے کسی مقصد سے بھاگتے میں انھیں رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بہ مشکل تین قدم ہی لے پایا تھا۔ اس سے آگے گولی نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس کے تڑپتے ہوئے جسم کو ایک بڑے پتھر نے نیچے لڑھکنے سے روکا تھا۔

اب ہم دو بچ گئے تھے۔ ممکن تھا کہ اسے مزید ساتھیوں کی کمک مل جاتی، مگر فی الحال وہ بھی اکیلا تھا۔ اپنے آخری ساتھی کے ہلاک ہوتے ہی اس نے بھی اپنی کلاشن کوف کو برسٹ پر سیٹ کرتے ہوئے چھوٹے برسٹ میری جانب فائر کرنے لگا۔ مجبوراً مجھے پتھر کے پیچھے سر چھپانا پڑا۔

اچانک اس کے فائر سے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کھڑا ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کا فائر آہستہ آہستہ دور ہٹنے لگا۔ یقیناً وہ بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ اور اس مقصد کے لیے وہ مجھے سر اٹھانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ ہر برسٹ تین چار گولیوں کا فائر کر رہا تھا۔ میں اس کے فائر ہونے والے برسٹ گننے لگا۔ ساتویں اٹھویں برسٹ پر میں نے رسک لیتے ہوئے پتھر سے جھانکا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیکے نئی میگزین لگا رہا تھا۔ اگر مجھے پتھر سے جھانکنے میں دو سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ دوبارہ فائر شروع کر چکا ہوتا۔ جب میں نے جھانکا اس وقت وہ کلاشن کوف کو کاک کر رہا تھا۔ جبکہ میری کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی اور یقیناً وہ مجھ سے تیز رفتار فائر نہیں تھا۔ نئی میگزین سے گولی چلانے کی حسرت دل میں لیے وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا تھا۔

آخری دشمن کے مرتے ہی میں نے اپنا سر پتھر پر ٹیک دیا تھا۔ ایک دم مجھے اپنے زخموں میں ہونے والی

تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ مجھے نہایت ناگفتہ بہ صورت حال کا سامنا تھا۔ میری دائیں ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں ۔ پٹی باندھنے کے باوجود خون رس رہا تھا۔ اور پوری ٹانگ جیسے پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں پہاڑی پر چڑھنا تو مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ البتہ بہت زیادہ ہمت کر کے نیچے اترنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

کلاشن کوف کی میگزین اتار کر دیکھنے پر مجھے فقط دو گولیاں نظر آئیں ۔ یہ چالیس راؤنڈ والی میگزین تھی گویا اڑتیس گولیاں میں فائر کر چکا تھا۔ میگزین لگا کر میں نے سیفٹی لگائی اور کلاشن کوف کا بٹ ڈنڈے کی طرح نیچے ٹیک کر اس کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میری ٹانگ میں اتنا شدید درد اٹھا تھا کہ کراہیں روکنے کے لیے مجھے سختی سے ہونٹ بھینچنے پڑ گئے تھے۔

لمحہ بھر درد کو سہارنے کے بعد میں نے اترائی میں قدم بڑھا دیے۔ چند قدم لینے کے بعد ہی میں بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ درد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ دائیں ٹانگ جیسے مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ میں دائیں ٹانگ کو نیچے لگانے کے بجائے بائیں ٹانگ پر کودتا ہوا نیچے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے عقب میں آہٹ سنائی دی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، چار مسلح افراد ڈھلان سے نیچے آتے دکھائی دیے۔

میری کلاشن کوف میں فقط دو گولیاں باقی تھیں ۔ میرے اندازے کے مطابق جو آدمی سب سے پہلے میری گولی کا نشانہ بنا تھا، اس کی میگزین میں گولیاں موجود ہونی چاہیے تھیں۔ وہ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر پڑا تھا ۔میں اس قابل نہیں تھا کہ تیزی سے حرکت کرتا۔ لیکن اب زندگی، موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کرنے کی کوشش کی اور دو تین قدم لیتے ہی میرا بایاں پاؤں ایک چھوٹے سے پتھر کے اوپر آ کر پھسلا، میں منھ کے بل گرا اور اس کے ساتھ ہی لڑھکتے ہوئے نیچے جانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری دائیں ٹانگ پر کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ کوشش کے باوجود میں خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ شاید میری مشکل ایک پتھر کی چٹان نے حل کی تھی۔

شاید میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت تک میں اپنے حواس کھو چکا تھا۔ اور ایسے وقت میں جب دشمن سر پر پہنچ چکا ہو بے ہوش جانے کا مطلب زندگی سے ہاتھ دھو لینا تھا۔ میری ساری کوششیں اور تگ و دو رایگاں گئی تھیں۔ بہ قول شاعر......

زندگی تم نے کب وفا کی ہے
اپنی خوش فہمی ہی بلا کی ہے

☆......☆......☆

آنکھ کھلتے ہی میں چند لمحے بے دھیانی میں پڑا رہا۔ گو ایک سنائپر کا دماغ ہر وقت چوکنا ہی رہتا ہے اور نیند سے اٹھتے ہی اسے ماحول اور صورت حال کا اچھی طرح ادراک ہوتا ہے۔ مگر اس وقت میں نیند سے نہیں جاگا تھا بلکہ طویل بے ہوشی سے اٹھا تھا۔

آہستہ آہستہ میرا شعور بیدار ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ ابھی تک میں زندہ کیسے ہوں۔ شلوبر قبیلے کے آدمیوں کو تو مجھے بغیر کسی تاخیر کے ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔ مگر میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ ٹانگ، پنڈلی اور بازو پر بندھی ہوئی سفید پٹیاں بھی مجھے یہ باور کرا رہی تھیں کہ بے ہوشی کے دوران ہی میرا آپریشن وغیرہ ہو چکا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظریں گھمائیں وہ جگہ مجھے کسی غار کی طرح لگی، کیونکہ کمرے کی دیواریں اتنی کھردری اور بے ترتیب نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں فرش پر بچھے ایک نرم گدے پر لیٹا تھا۔ سرہانے کی طرف دیوار میں گڑی کیل کے ساتھ ایک ڈرپ لٹکی تھی جس کا ایک سرا سوئی کے ساتھ میری کلائی سے جڑا تھا۔ میرے پاؤں کی طرف ایک بیٹری پڑی تھی جس سے منسلک تار چھت میں لگے ایک ڈی سی بلب کو روشن کیے ہوئے تھی۔ دروازے کی جگہ ایک کالے رنگ کا کمبل لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے عقب میں دروازہ موجود بھی تھا یا نہیں۔ اندر جلنے والے بلب کی وجہ سے رات دن کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

نہ جانے بے ہوشی کے دوران کتنا وقت گزر گیا تھا۔ میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی غائب تھی۔ اسی طرح میرا لباس بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جس طرح میری دیکھ بھال کی گئی تھی، میرے ساتھ ایسا برتاؤ شلوبر قبیلے والے تو کسی صورت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ذہنی ورزش میں مشغول ہو گیا، لیکن کافی دیر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اور پھر میں انھی سوچوں میں غرق تھا کہ پردہ ہٹا کر کوئی اندر داخل ہوا۔

آنے والے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کمانڈر عبدالحق تھا۔ اسی کی وجہ سے میرا تعارف پہلی بار مجاہدین سے ہوا تھا اور اس کے بعد مجاہدین میرے کافی کام آئے تھے۔

"آپ کو ہوش آگیا ہے۔" محبت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ قریب آکر بیٹھ گیا۔

میں مسکرایا۔ "ہوش تو آگیا ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"جن مسلح آدمیوں کو دیکھ کر آپ بھاگنے کی ناکام کوشش میں بے ہوش ہوئے تھے وہ آپ کے دشمن نہیں مجاہدین تھے۔"

میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے میرا بے ہوش ہو جانا فائدہ مند رہا، ورنہ میں نے مقابلے سے باز نہیں آنا تھا۔"

کمانڈر عبدالحق نے قہقہہ لگایا۔ "یقیناً ہمارے مجاہدین کے چند سانس بقایا تھے۔"

میں خفیف ہوتا ہوا بولا۔ "خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"

"کسر نفسی ہے آپ کی، ورنہ وہاں کافی لاشیں بکھری ہوئی نظر آئی ہیں اور تمام کے سر میں گولی لگی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "ویسے آپ کسی افغانی قبیلے سے کیسے ٹکرا گئے۔ یہ لوگ تو پاک آرمی کے دشمن نہیں ہیں۔"

"لمبی کہانی ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "ایسی حالت میں کہانیاں سنانے کے علاوہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں بچا۔"

"پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ مجاہدین وہاں کیسے آگئے اور انھوں نے مجھے پہچانا کیسے۔"

"پہچانا کہاں ہے، وہاں آپ اکیلے ہی زندہ بچے تھے اس لیے آپ کو لے آئے۔ یہاں خوش قسمتی سے میں خود موجود تھا۔ بس سب سے پہلے تو آپ کو طبی امداد دی، ٹانگ میں پھنسی گولی نکالی، مرہم پٹی کی اور پھر کمزوری کی وجہ سے ڈرپ لگا دی۔ یہ پانچویں ڈرپ ختم ہوئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری کلائی سے سوئی نکال کر وہاں روئی رکھ کر دبا دی۔

"گویا مجھے بے ہوش ہوئے دوسرا دن ہے۔"

”کل شام کو آپ کو یہاں لایا گیا تھا۔اور ابھی رات کے بارہ بجنے کو ہیں۔“

”آپ سوئے نہیں۔“

”ڈرپ ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔“

میں نے پوچھا۔”یہ جگہ غار کی طرح لگ رہی ہے۔“

”یہ غار ہی ہے۔جس جگہ آپ کا دشمنوں سے مقابلہ ہوا ہے اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمارا یہ ٹھکانہ موجود ہے۔“

”یعنی میں نے بے دھیانی میں صحیح سمت اختیار کیے رکھی۔“

”ہاں۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”اور اب آپ تفصیل بھی بتا دیں کہ یہ لوگ کیوں آپ کے پیچھے پڑے تھے۔“

جواباً میں نے غزنی خیل اور شلوبر کی آپس کی لڑائی میں اپنے غلطی سے پھنس جانے کے متعلق بتانے لگا۔ ساری تفصیل سنتے ہی اس نے پوچھا۔

”آپ نے افغانستان آنے کی وجہ نہیں بتائی۔“

اس مرتبہ میں نے البرٹ بروک کے ہاتھوں بلیک میل ہونے اور اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے کے متعلق ضروری تفصیل دہرا دی۔پلوشہ کے ساتھ میری شادی کی خبر سن کر وہ خوش ہو گیا تھا۔

”سب سے پہلے تو شادی کی مبارک ہو۔“

”خیر مبارک بھائی!......مگر اب نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔“میں افسردہ ہو گیا تھا۔

”پلوخان کسی سے مار کھانے والا نہیں۔وہ میرا بہت لاڈلا شاگرد تھا۔تمام استادوں سے میں نے اس کی تعریف ہی سنی ہے۔ایک مشن میں تو وہ میرے ساتھ بھی کام کر چکا ہے،یقین مانو دل خوش ہو جاتا ہے اس کی کارکردگی دیکھ کر۔“

”ہاں،مگر اس وقت وہ پلوخان تھی اور ابھی پلوشہ ہے۔“

وہ بے تکلفی سے بولا۔”نام کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہوتا یار!“

”بات نام کی نہیں جنس کی تبدیلی کی ہے بھائی!......ایک جوان لڑکی کو دشمنوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد کیا مشکلات درپیش آسکتی ہیں اس بارے یقیناً آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔“

”یہ تو صحیح کہا۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”مگر آپ خواہ مخواہ برے گمان نہ پالیں اللہ پاک بہتر کرے گا۔“

”ایک اسی ذات کا سہارا ہے۔“میں نے امید ظاہر کی۔

”تو اب آپ غزنی جائیں گے۔“

میں نے کہا۔”ارادہ تو یہی ہے۔“

”آپ کے زخم ٹھیک ہوتے کچھ وقت تو لگے گا اور میرا نہیں خیال کہ اس وقت تک البرٹ بروک وغیرہ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔“

”مجھے اپنا ہتھیار نظر نہیں آرہا۔“دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔

”ساتھی وہاں پڑے سارے ہتھیار ہی سمیٹ لائے تھے اور ان میں موجود کمانڈر نصراللہ خوجل خیل کی خاص کلاشن کوف پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔“

میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔”بڑی تیز نظر ہے آپ کی۔“

”وہ میرے استاد ہیں اور میں نے ان کے ہمراہ ان گنت معرکوں میں حصہ لیا ہے۔ان کی کلاشن کوف اس لیے بھی خصوصی ہے کہ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ یہ کلاشن کوف وہ ایسے شخص کو تحفہ میں دیں گے جو ان کی نظر میں اس کا صحیح حق دار ہوگا۔اور میرا خیال ہے انھوں نے ایسا آدمی تلاش کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔“

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔”یقیناً آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔“

”اچھا آپ سچ سچ بتائیں کہ استاد محترم نے یہ کلاشن کوف آپ کے حوالے کرتے ہوئے کیا فرمایا تھا؟“

مجھے نصراللہ خوجل خیل کی باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔انھوں نے بھی کمانڈر عبدالحق اے ملتی جلتی ہی باتیں کی تھیں۔یوں بھی مجاہدین کے درمیان میری نشانہ بازی کا کافی چرچا تھا۔اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کچھ تو مجھ میں قدرتی طور پر نشانے بازی کی صلاحیت موجود تھی اور کچھ یار لوگوں کی مبالغہ آرائی نے مجھے شہرت دے دی تھی۔

میں جواب سے پہلوتہی کرتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ''یہ بعد کا مسئلہ ہے فی الحال تو مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اوہ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔'' خفت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ غار سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

افغانستان کے مختلف پہاڑوں میں مجاہدین نے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ وہ بھی مجاہدین کا ایک محفوظ ٹھکانہ تھا۔ اور میری خوش نصیبی کہ جس جگہ میرا شلوبر قبیلے سے آخری ٹاکرا ہوا یہ ٹھکانہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ اس کی حیثیت رستے میں آنے والی ایک چوکی کی سی تھی کہ پاکستانی سرحد عبور کرنے والے مجاہدین وہاں ایک دن گزار کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہاں مجاہدین کی محدود تعداد ہی رہتی تھی، اس کے باوجود اس ٹھکانے کے دائیں بائیں ہونے والی کسی بھی کارروائی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن بھی جب میرا شلوبروں سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا انھیں بھی وہ فائرنگ سنائی دے گئی تھی۔ وہاں کمانڈر عبدالحق ہی امیر تھے۔ انھوں نے چار آدمی صورت حال کا جائزہ لینے بھیجے۔ اور ان چاروں کو زندہ حالت میں صرف میں ہی ملا تھا، اس لیے وہ مجھے اٹھا لائے۔ کمانڈر عبدالحق نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ میری ٹانگ کا آپریشن انھوں نے خود ہی کیا تھا۔ کچھ بے ہوشی کے ٹیکے اور کچھ کمزوری کی وجہ سے مجھے انتیس، تیس گھنٹوں بعد ہی ہوش آسکا تھا۔

میرے ہوش میں آنے کے اگلے دن شلوبر قبیلے کا ایک وفد وہاں پہنچ گیا تھا۔ اپنی لاشیں وہ ایک دن پہلے ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن اب ان کی آمد کا مقصد اپنے ہتھیاروں کی واپسی اور مجھے تحویل میں لینا تھا۔ کمانڈر عبدالحق کو ساری تفصیل معلوم تھی۔ ان کے ہتھیار واپس کرتے ہوئے کمانڈر عبدالحق نے الٹا انھیں مطعون کیا کہ ان کی وجہ سے ایک مجاہد زخمی ہوا ہے۔ چونکہ اس ساری کارروائی میں شلوبر قبیلے کی غلطی زیادہ تھی اس لیے جلد ہی انھیں مجھے تحویل میں لینے کے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑا۔ میرا غزنی خیل قبیلے کا ساتھ دینا اپنی جان بچانے کی وجہ سے تھا۔ اور جب تک شلوبروں نے مجھے مجبور نہیں کیا، تب تک میں نے ان کے کسی آدمی کو جان سے بھی نہیں مارا تھا۔ البتہ آخری معرکے میں مجبور ہو کر مجھے انتہائی اقدام اٹھانا پڑا تھا۔ اسی بات کو کمانڈر عبدالحق

نے نہایت وضاحت سے انھیں سمجھا دیا، کہ اگر میں چاہتا تو جتنے آدمی زخمی کیے تھے ان تمام کو جان سے بھی مار سکتا تھا۔اور یہ بات تو انھیں بھی تسلیم تھی کہ میری فائر کی ہوئی گولیوں سے ان کا کوئی بھی آدمی جان سے نہیں گیا تھا سوائے ان سات آدمیوں کے جنھیں مارنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔شلو بروں کو اس لیے بھی خاموش ہونا پڑا کہ کسی قبیلے سے تو وہ دشمنی پال سکتے تھے، مجاہدین کے لشکر ساتھ ٹکر لینا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔اس کے ساتھ غزنی خیل قبیلے سے بھی ان کی لڑائی عروج پر تھی اس لیے یہ محاذ انھیں بند کرنا ہی مناسب لگا اور ہتھیاروں کی واپسی ہی کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ واپس چلے گئے تھے۔ان کے جانے کے بعد کمانڈر عبدالحق نے مجھے ساری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ایک خواہ مخواہ کی مصیبت سے جان چھوٹنے کا سن کر میں نے سکھ بھرا سانس لیا تھا۔ان سے کوئی بعید نہ تھا کہ کبھی دوبارہ میرے سامنے آنے پر میری جان کے درپے ہو جاتے۔اب کمانڈر عبدالحق کے سمجھانے کی وجہ سے یقیناً میرے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے وہ سو بار سوچتے۔

کمانڈر عبدالحق کی بات ختم ہوتے ہی میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔''ویسے آپ نے جھوٹ کیوں بولا کہ میں آپ کا ساتھی ہوں اور مجاہد ہوں۔''

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔''آپ کے مجاہد ہونے میں مجھے تو کوئی شبہ نہیں پھر یہ جھوٹ کیسے ہو گیا۔اسی طرح ساتھی صرف اس کو نہیں کہتے جو آپ کے شانہ بہ شانہ لڑے، بلکہ وہ آدمی بھی ہمارا ساتھی ہی کہلاتا ہے جو لڑ تو کسی دوسرے محاذ پر رہا ہو لیکن اس کا اور ہمارا مقصد مشترک ہو۔''

''گویا آپ کے نزدیک میرا اور آپ کا مقصد مشترک ہے۔''

''بالکل مشترک ہے، آپ بھی کفر سے برسرِ پیکار ہیں ہم بھی یہی مقصد لیے میدان میں اترے ہوئے ہیں ،بس طریقہ کار تھوڑا مختلف ہے۔بلکہ آپ نے تو کئی بار اسلحے کی صورت میں مجاہدین کی کھلم کھلا مدد بھی کی ہے۔اور ایسا کوئی ساتھی ہی کیا کرتا ہے غیر نہیں۔''

میں مسکرایا۔''ٹھیک ہے جی میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

کمانڈر عبدالحق میری ہنسی میں شامل ہوتا ہوا بولا۔''غلط الفاظ واپس لینے ہی میں بھلائی ہوتی ہے۔''

☆......☆......☆

زندگی میں ایک دم ٹھہراؤ آ گیا تھا۔اس سے پہلے بھی میں ایک بار زخمی ہو کر کمانڈر نصراللہ خوجل خیل کی بیٹھک میں صاحب فراش رہ چکا تھا۔جب میری تیماردار، میری جانِ حیات پلوشہ تھی۔گو اس وقت تک اس سے اقرار الفت تو نہیں ہو پایا تھا اس کے باوجود وہ وقت ایک خوشگوار یاد کی صورت میرے دل میں مقید تھا۔پلوشہ نے جس طرح میری خدمت کی تھی اور جیسے میرا خیال رکھا تھا ایسا کوئی نہایت ہی محبت کرنے والا ہی رکھ سکتا ہے۔اور اب وہ پلوشہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔لگتا تھا شاید اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔اپنے آرام و سکون کو ٹھوکر مار کر وہ میری بے گناہی کے ثبوت حاصل کرنے گئی تھی۔اس کے ساتھ میرا یار سردار خان بھی تھا۔نہ جانے وہ بہن بھائی کہاں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

میرے دن رات نہایت بے کیف گزر رہے تھے۔عضو معطل بن کر میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ بس آنے جانے والے مجاہدین کی باتیں سن کر میں جی کو بہلاتا رہتا۔اکیلا بیٹھنے کی صورت میں تو پلوشہ فوراً آ دھمکتی تھی۔بہ قول مومن......

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کھانے پینے کا سامان اور روزمرہ ضروریات کا دوسرا سامان وہ پکتیکا سے لے کر آتے تھے۔

مجھے وہاں ہفتے سے زیادہ ہونے کو تھا۔اس دن بھی چار مجاہد آئے ہوئے تھے۔وہ چھٹی جا رہے تھے۔ میں بھی کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔وہ چاروں گردیز سے آئے تھے۔

کمانڈر عبدالحق اسلام نامی مجاہد کو مخاطب ہوا۔”اسلام بھائی!......اس مرتبہ کچھ دیر سے چھٹی جا رہے ہو۔“

اسلام نے جواب دیا۔”یوں تو میرا ارادہ پچھلے ماہ ہی چھٹی جانے کا تھا مگر کام کچھ بڑھ گیا تھا مجبوراً مہینا بھر مزید گزارنا پڑا۔“

”تو ان کی چھٹی بھی موخر کرنا تھی نا۔“ کمانڈر عبدالحق نے مزاحیہ انداز میں باقی تینوں کی طرف اشارہ کیا۔

اسلام ہنسا۔”کیوں مجھے مروانے کے چکروں میں ہو یار!......ایک تو دشمن نے ہماری حرکت کو محدود کیا ہوا ہے اور تم چاہتے ہو اندرونِ خانہ بھی دشمن کھڑے ہو جائیں۔“

’’یہ تو خیر کمانڈر زیادتی کر رہا ہے۔‘‘شفیق نامی مجاہد صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔’’انھوں نے خود ہی ہمیں چھٹی کے لیے زور دیا ہے۔‘‘

عبدالحق پوچھنے لگا۔’’ویسے دشمن کی بات میرے سر پر سے گزر گئی ہے۔‘‘

اسلام نے حیرانی سے پوچھا۔’’کیا آپ تک یہ خبر نہیں پہنچی؟‘‘

’’کون سی۔‘‘ کمانڈر عبدالحق ہمہ تن گوش ہو گیا۔میرے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

اسلام تفصیل بتلاتے ہوئے بولا۔’’ایک برطانوی نشانے باز نے حقیقت میں اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے ۔قریباً بیس بائیس مجاہد اس کی گولی کا شکار ہو چکے ہیں۔ڈیڑھ دو کلو میٹر کے فاصلے سے بھی کم بخت کی گولی سر ہی میں لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری حرکت کافی محدود ہو گئی ہے۔اندھیرے کے تیر کی طرح نہ جانے کس کونے سے نکلتا ہے اور ہمارے دو تین ساتھیوں کو شہید کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ اپنے مخبروں سے ہمیں یہی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام نک سٹیورٹ ہے برطانوی آرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی مددگار بھی کوئی برطانوی لڑکی ہی ہے وہ بھی اچھی خاصی ماہر نشانہ باز ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہیں۔‘‘

عبدالحق گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔’’عجیب بات سنا رہے ہو۔‘‘

اسلام نے کہا۔’’ہونہہ، عجیب سہی مگر حقیقت ہے۔‘‘

میں ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔’’آپ لوگوں کے پاس دور مار ہتھیار نہیں ہے کیا؟‘‘

اسلام میری طرف متوجہ ہوا۔’’کیوں نہیں ہے۔چند ماہ پہلے ہی ہمارے ہاتھ تین ہیوی رائفلیں لگی ہیں۔ کمانڈر صدیق بتا رہا تھا کہ وہ رینج ماسٹر ہیں۔اور دو کلو میٹر تک کسی بھی آدمی کو ان سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ان کا ایمونیشن بھی موجود ہے لیکن دو کلو میٹر تو کیا ہم میں سے کوئی دو تین سو میٹر کے فاصلے پر بھی اس رائفل سے نشانہ نہیں بنا سکتا۔ہمیں تو بے کار وزن ہی محسوس ہو رہی ہیں۔‘‘

وہ رینج ماسٹر کو بے کار وزن کہہ رہا تھا۔یقیناً ان میں سے کوئی رینج ماسٹر کی افادیت سے واقف نہیں تھا۔ورنہ وہ کبھی بھی ایسا نہ کہتے۔میں نے پوچھا۔’’کمانڈر صدیق بھی اس سے فائر نہیں کر سکتا۔‘‘

’’کمانڈر صدیق نے ان رائفلوں کے اندر موجود کتابچے سے ان کا نام ہمیں بتایا ہے۔باقی اس رائفل کے

بارے وہ بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔“

”صحیح ہے۔“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں خاموش ہو گیا۔

کمانڈر عبدالحق بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر انجان بنا بیٹھا رہا۔

اسلام، عبدالحق کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ویسے آپ نے ذیشان بھائی کا مکمل تعارف نہیں کرایا۔“

”ذیشان بھائی کا تعلق پاک آرمی سے ہے اور انھوں نے کافی بار ہماری مدد کی ہے۔ اب کسی کام کے سلسلے میں افغانستان آنا ہوا، رستے میں غلط فہمی میں ایک قبیلے سے ٹاکرا ہو گیا، انھی سے لڑتے ہوئے زخمی ہو گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے ٹھکانے کے نزدیک ہی یہ لڑائی ہوئی تھی، بس ہم بھائی کو یہاں لے آئے۔ ہفتہ ڈیڑھ ہی ہوا ہے تب سے یہیں پر ہیں۔ اور جب تک مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے میں انھیں کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔“

اسلام فوراً شاکی ہوا۔ ”کس قبیلے سے لڑائی ہوئی تھی، کم از کم آپ کو ان سے گلہ تو کرنا چاہیے تھا۔ جو شخص ہمارا مددگار رہ چکا ہو وہ ہمارا ساتھی ہی ہے اور ہمارے ساتھیوں کو کوئی یوں زخمی کرے اس کی اجازت ہم نہیں دے سکتے۔“

کمانڈر عبدالحق ہنسا۔ ”صحیح کہہ رہے ہیں آپ، گلہ کرنا تو ہمارا بنتا تھا لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا اس لیے مجھے خاموش ہونا پڑا۔“

”کیسا مسئلہ؟“ اسلام نے حیرانی سے پوچھا۔

کمانڈر عبدالحق اطمینان سے بولا۔ ”یہی کہ اس قبیلے کے دو درجن افراد زخمی ہوئے اس کے علاوہ انھیں سات لاشیں بھی اٹھانا پڑیں۔“

”کک......کیا مطلب؟“ اسلام ششدر ہی تو رہ گیا تھا۔ اس کے باقی تین ساتھی بھی حیرانی سے مجھے گھورنے لگے تھے۔

کمانڈر عبدالحق نے منھ بنایا۔ ”میں نے عبرانی تو نہیں بولی، سادہ پشتو ہی میں بات کی ہے۔“

”مگر اکیلا آدمی......؟“

کمانڈر عبدالحق تحسین امیز لہجے میں بولا۔ ”جی اکیلا آدمی اگر ایس ایس ہو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔“

”ایس ایس ......“ اسلام نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”گویا آپ کا مطلب ہے ذیشان بھائی ہی ایس ایس ہے۔ وہی پلوخان، میرا مطلب پلوشہ کا ساتھی۔“

”ساتھی نہیں شوہر کہو...... اب محترم نے پلوشہ بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔“

”مبارک ہو ذیشان بھائی۔“ اسلام نے فوراً ہی پر خلوص لہجے میں کہا۔

”شکریہ دوست۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

اس کے بعد ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے، موضوع گفتگو میری ذات ہی بنا رہا۔ اسلام اور اس کے ساتھیوں نے ساری گپ شپ کو پسِ پشت ڈال کر میری کہانی میری زبانی سننے پر اصرار کیا تھا۔ گو میری زیادہ تر باتیں تو ان تک پہنچی ہوئی تھیں مگر کسی اور زبانی پہنچی ہوئی باتوں میں جھوٹ اور مبالغے کی ملاوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں ان کے اصرار کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک پایا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر اسلام اور اس کے تینوں ساتھی جانے سے پہلے الوداعی ملاقات کے لیے آ گئے تھے۔ میں نے ان سے جانے کے رستے کی بابت دریافت کیا۔

اسلام نے جو راستہ بتلایا وہ خواگا او بو سے گزر کر ہی جاتا تھا۔ خواگا او بو گلگارے کا گاؤں تھا۔

”خواگا او بو تو آپ لوگوں نے دیکھا ہے اس کے جنوبی جانب ایک اکیلی حویلی ہے شمریز خان کی، کبھی ان سے واسطہ پڑا ہے۔“

اسلام اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل دیکھی ہوئی ہے، البتہ کبھی ان سے ملنے کی نوبت نہیں آ سکی۔“

اسلام کا ساتھی عبدالصمد بولا۔ ”میں نے ان کی بیٹھک میں ایک رات گزاری تھی۔“

”بس جاتے ہوئے چچا شمریز اور ان کے گھر والوں کو میرے بہت سے سلام و دعا پہنچا دینا اور انھیں کہہ دینا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔“

اسلام نے پوچھا۔ ''اور کچھ۔''

''بس اللہ پاک آپ کو خیر سے لے جائے۔'' میں نے معانقے کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔

انھیں رخصت کرنے میں غار سے باہر تک گیا تھا۔ اب بیساکھی کے سہارے میں اچھا بھلا چل لیتا تھا۔ میرا زخم پہلے سے کافی بہتر ہو گیا تھا۔ بازو کے زخم کا تو کھرنڈ بن کر بھی اتر چکا تھا۔ لیکن پنڈلی اور ران کا زخم اتنی جلدی مکمل ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن دوپہر کو کھانا کھاتے ہوئے کمانڈر عبدالحق مستفسر ہوا۔ ''ذیشان بھائی!...... ایک بات پوچھوں؟''

میں خفیف ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر اس نے پوچھا۔ ''کل آپ اسلام بھائی سے دور مار رائفل کے استعمال کے بارے کیوں پوچھ رہے تھے، کیا آپ اس رائفل کو استعمال کرنا جانتے ہیں؟''

ایک لمحہ سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جانتا ہوں۔''

''اگر میں کہوں کہ آپ ہمارے کسی ساتھی کو اس رائفل کا استعمال سکھا دیں تو کیا یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔''

میں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''درخواست اور منظوری، عبدالحق بھائی!...... کچھ زیادہ ہی میٹھا نہیں ڈال دیا۔''

عبدالحق نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کسی سے بھی کام لینے کے دو طریقے ہیں حکم دینا یا درخواست کرنا اور ہم آپ سے درخواست ہی کر سکتے ہیں۔''

''اپنوں کو نہ تو حکم دیا جاتا ہے اور نہ درخواست کی جاتی ہے۔ بس ان تک اپنی خواہش پہنچا دی جاتی ہے۔''

وہ فوراً اپنی سابقہ بات سے رجوع کرتا ہوا بولا۔ ''تو بس سمجھ لیں کہ میں نے اپنی خواہش آپ تک پہنچا دی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''عبدالحق بھائی!...... آپ کی خواہش کو پورا کرنا، میرے لیے نہایت ہی دشوار اور مشکل ہوتا۔ لیکن اس حالت میں میں کوئی بھی کام کرنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے آپ رائفل اور سیکھنے والے دو تین آدمی یہیں پر بلوا لیں میں انھیں تربیت دے دوں گا۔''

عبدالحق نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”کہنا تو نہیں چاہیے مگر آپ کا زخمی ہونا ہمارے لیے فائدہ مند ہی رہا ہے۔“اس کی بات نے مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد چار آدمی رینج ماسٹر کے دو بکس لے کر پہنچ گئے تھے۔اس کے ساتھ وہ رینج ماسٹر کی دو سو گولیاں بھی لائے تھے۔کمانڈر عبدالحق نے گزشتہ دن میرا عندیہ لیتے ہی وائرلیس بیس پر اپنے گردیز کیمپ میں موجود کمانڈر سے بات کر لی تھی۔اور کوڈ ورڈ میں انھیں رائفلیں ،ایمونیشن اور آدمی بھیجنے کا بتا دیا تھا۔اس دعوت کو غنیمت جانتے ہوئے انھوں نے بغیر کسی تاخیر کے چار آدمی اس جانب روانہ کر دیے تھے۔

ان دنوں میں مجھے وقت گزارنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔حالانکہ جب پلوشہ زخمی تھی اس وقت ہم نے دو ماہ کے قریب عرصہ یونھی کوئی کام کیے بغیر گزار دیا تھا۔مگر وہ دو ماہ میری زندگی کے سب سے زیادہ تیز گزرنے والے دن تھے۔رات، دن لمحوں میں بیت جایا کرتے تھے۔ اور اب وہی شب روز مہینوں پر محیط ہو گئے تھے۔

گردیز کیمپ سے آنے والے چاروں جواں سال مجاہد تھے۔ان میں سے دو تو میرے ہم عمر تھے جن کا نام صغیر اور احسان تھا۔ اسلم مجھ سے سال دو سال بڑا ہو گا جبکہ مبین بہ مشکل اٹھارہ انیس سال کا لڑکا تھا۔

رات ہی کو میں نے رینج ماسٹر کے دونوں بکس کھول کر سامان کا جائزہ لے لیا تھا۔سارا سامان مکمل دیکھ کر میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ سردار اور میں نے امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران اس رائفل کے متعلق بہت تفصیل سے پڑھا تھا۔اور یہ وہ رائفل جس سے میں سب سے زیادہ فائر کیا ہے۔ (اس رائفل بارے کہانی کی شروعات میں میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں اس لیے اگر کسی کو رینج ماسٹر کے بارے جاننے کا شوق ہو تو انھی صفحات کو دوبارہ پڑھ لے)

”صبح نماز کے بعد تیار رہنا۔“میں نے چاروں سیکھنے والوں کو تربیت کا وقت بتایا اور وہ سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

کمانڈر عبدالحق کچھ دیر مزید میرے ساتھ بیٹھا رہا۔اس کے جانے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ گیا کہ صبح آرام کا موقع نہ ملتا۔

صبح کی نماز کے بعد ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر چاروں جوان پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر عبدالحق نے بھی ان کے ہمراہ بیٹھ کر سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

میں نے تمہیدی بات چیت میں رینج ماسٹر کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور انھیں باور کرایا کہ ایک تربیت یافتہ آدمی اس رائفل سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں انھیں رائفل کے پرزوں وغیرہ کے بارے تفصیل سے بتلانے لگا کہ کس طرح وہ اس رائفل کو ٹکڑوں میں کھول سکتے تھے۔ وہ سارا دن میں انھیں رائفل کے متعلق ہی پڑھاتا رہا اس کے ساتھ انھیں بھی موقع دیا کہ وہ بار بار رائفل کو کھولیں جوڑیں۔ اس کے ساتھ میں انھیں اس رائفل سے مختلف پوزیشنوں سے فائر کرنے کے طریقے بھی بتلاتا رہا۔ وہ سارا کام چونکہ ہم بند کمرے میں بھی کر سکتے تھے اس لیے غار کے اندر بیٹھ کر ہی سکھلائی کرتے رہے۔

اگلے دن میں میں انھیں غار سے باہر لے گیا تھا۔ سنائپر رائفل میں سب سے زیادہ کام چونکہ ٹیلی سکوپ سائیٹ کا ہوتا ہے اس لیے اس کے بارے جاننا ایک سنائپر کے لیے بہت زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ سنائپر بننے نہیں آئے تھے لیکن انھیں اچھا نشانے باز تو بننا تھا۔ لیوپولڈ سائیٹ کے بارے ہم سنائپر ہونے کے باوجود پورا ہفتہ پڑھتے رہے تھے۔ میں انھیں وہ سب کچھ تو اس لیے بھی نہیں پڑھا سکتا تھا کہ اس کام میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ میں بس انھیں ضروری اور کام کی باتیں بتاتا رہا۔ لیوپولڈ سائیٹ پر تو عام آدمی صحیح طریقے سے رینج بھی نہیں لگا سکتا۔ ہر فاصلے کے لیے ایلیویشن ڈرم پر مخصوص کلک لگانے پڑتے ہیں۔ تمام کلکس کی ترتیب میں نے انھیں لکھ کر دے دی تا کہ وہ اسے زبانی طور پر یاد رکھیں۔ وہ پورا دن میں انھیں لیوپولڈ سائیٹ ہی متعلق پڑھاتا رہا۔ کمانڈر عبدالحق بھی سیکھنے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ رات کو وہ اپنے غار میں کافی دیر تک دن کی سکھلائی کو دہراتے رہے تھے۔ مجاہدین کا وہ ٹھکانہ غار در غار بنا ہوا تھا۔ یوں جیسے کسی مکان میں کئی کمرے بنے ہوتے ہیں۔

تیسرے دن میں انھیں فائر کروانے لگا۔ رائفل کے صفر ہونے کے بعد وہ چھ سات سو میٹر کے فاصلے پر آسانی سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ عملی طور پر رینج ماسٹر کی کارکردگی دیکھ کر انھیں بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ کمانڈر عبدالحق نے بھی درجن بھر گولیاں چلا کر اپنا نشانہ آزمایا تھا۔ اگلے دو ہفتوں میں میں

انھیں مختلف فاصلوں سے فائر کرواتا رہا۔ ان میں سب سے اچھا فائر مبین تھا جو عمر میں تمام سے چھوٹا تھا۔ وہ پندرہ سو میٹر دور کے ہدف کو نشانہ بنالیتا تھا۔ چونکہ ان کے پاس گولیوں کی محدود تعداد تھی اس لیے ہر آدمی روزانہ تین چار گولیاں ہی فائر کر پاتا۔ اس سارے تربیتی عرصے کے دوران انھوں نے چند بار میرا فائر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر زخمی ہونے کا بہانہ کر کے میں نے معذرت کر لی تھی۔ البتہ آخری دن جب ان کے پاس فقط دو گولیاں باقی بچی تھیں، کمانڈر عبدالحق نے اصرار کیا کہ وہ دونوں گولیاں میں فائر کروں۔

اس کی حکم نما التجا پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے میں نے دونوں گولیوں سے انیس سو میٹر دور دو چھوٹے پتھروں کو نشانہ بنا کر رینج ماسٹر پر ان کا اعتماد مزید پختہ کر دیا تھا۔

اگلے دن ان چاروں نے واپس جانا تھا۔ کیونکہ گردیز کیمپ میں بڑی بے چینی سے ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ رات کو انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر میں نے سنائپنگ کے متعلق اہم باتیں دہرائیں، کچھ نئے نکتے ان کے گوش گزار کیے تاکہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

صبح سویرے واپس جاتے ہوئے چاروں بڑی عقیدت سے مجھے ملے تھے۔ میرے دن پھر بے زاری سے گزرنے لگے۔ پنڈلی کا زخم تو قریباً ٹھیک ہی ہو گیا تھا لیکن ران کا زخم ابھی تک اتنا ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ میں آگے بڑھ سکتا۔ سردی کی وجہ سے زخم یوں بھی ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لیتا ہے۔ اب میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ اپنے ٹھکانے سے پانچ چھے سو میٹر دور چلا جاتا تھا۔

ایک دن ہم سہ پہر کو لوٹے تو یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ صغیر برطانوی سنائپر نک سٹیورٹ کی گولی کا شکار ہو کر جام شہادت نوش کر گیا تھا۔ جبکہ اسلم شدید زخمی تھا۔ گولی اس کے سر سے رگڑ کھاتے ہوئے گہرا زخم چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کیمپ تک واپس پہنچا تھا۔ بعد میں صغیر کی لاش اٹھانے کے لیے جانے والے پانچ آدمیوں میں سے دو آدمی بھی نک سٹیورٹ یا اس کی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ یوں لاش اٹھانے کے لیے انھیں رات کا انتظار کرنا پڑ گیا تھا۔ اس بات کو دو دن گزر گئے تھے۔ اب شہداء کے گھروں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے جو دو آدمی جا رہے تھے ان کی زبانی ہم تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی۔

اسلم اور صغیر دونوں میرے شاگرد تھے۔ تین ہفتے تک ہم دن رات مسلسل ساتھ رہے تھے۔ اب ایک دم

ان کی موت کا سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے ہی وہ ایک امید لے کر یہاں سے واپس لوٹے تھے۔ برطانوی سنائپرز کو انجام تک پہنچانے کے لیے وہ پرعزم تھے۔ گوان سنائپرز کی جو کہانیاں مجھ تک پہنچ چکی تھیں اس کے بعد ان چاروں سے مجھے اتنی زیادہ امید تو نہیں تھی کہ وہ، انھیں ختم کر سکیں گے۔ لیکن یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ خود ان کا نشانہ بن جائیں گے۔ حالانکہ میں نے انھیں سنائپرز کے حربوں اور چالاکیوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ یقیناً وہ میری ہدایات پر صحیح طریقے سے عمل نہیں کر سکے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنے ساتھی کی لاش اٹھانے کے لیے وہ یوں منہ اٹھا کر بھاگتے چلے گئے تھے۔ حالانکہ میں انھیں اچھی طرح بتلا چکا تھا کہ ایک سنائپرز مخالف کی نفسیات سے کھیلتا ہے۔ اور اپنے ہدف کا انتظار کرنے کے لیے وہ گھنٹوں نہیں دنوں انتظار کر سکتا ہے۔ گو تمام آدمی یہ بات نہیں جانتے تھے مگر میرے دو اور شاگرد، مبین اور احسان تو وہاں موجود تھے وہ انھیں اس خطرے سے آگاہ کر سکتے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ احسان وغیرہ نے انھیں خبردار نہیں کیا تھا یا انھوں نے خود ہی بے پروائی برتی تھی۔

صغیر ایک ہنس مکھ اور بہادر جوان تھا۔ اس کا تعلق مانسہرہ جیسے خوب صورت علاقے سے تھا۔ اس کے دل میں اسلام اور پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ رینج ماسٹر سے فائر کرتے ہوئے وہ اکثر کہتا تھا......

''استاد ذیشان!......امید کرتا ہوں ان دونوں کی موت میری ہی گولی سے لکھی ہو۔''

جب میں نے انیس سو میٹر سے پتھر کو نشانہ بنایا تھا، تب اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ ''اگر ان کافروں کو پتا چل گیا کہ ہمارے استاد ایس ایس کا نشانہ کیسا ہے، یقیناً وہ بھاگنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔''

کمانڈر عبدالحق نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔ ''بیٹا!......استاد کو چھوڑو، اپنی سناؤ۔''

وہ عزم سے بولا۔ ''میں تو انھیں بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔''

آنے والے وقت سے کوئی بھی واقف نہیں ہوتا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے انھی سنائپرز کا نشانہ بننا ہے تو شاید ایسے دعوے نہ کرتا۔ اس کی شادی کو ایک ہی سال ہوا تھا۔ محاذ پر آنے سے پہلے اس کی بیوی امید سے تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ وہ نو ماہ گزارنے کے بعد ہی گھر جائے گا تاکہ اپنی بیوی اور بچے سے ملنے کی دہری خوشی سے لطف اندوز ہو سکے۔ اسے چھٹی سے آئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور اب ایک مہینا گزار کر اس نے گھر جانا

تھا۔لیکن اجل نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔اپنے محبوب کی آمد کے لیے چشم براہ بیوی کو اس کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

کمانڈر عبدالحق میری غار میں داخل ہوا۔''ذیشان بھائی!......آپ تو رو رہے ہیں۔''اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

مجھے معلوم ہی نہیں ہوا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔''پتا نہیں یار۔''آنکھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اگر موت کے بعد فنا ہو جانا ہوتا تو کافی گھاٹے کا سودا تھا۔''اس نے مجھے سمجھایا تھا یا شاید تسلی دی تھی۔

''جانتا ہوں۔''میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔''لیکن دکھ اور غم کا احساس قدرتی ہوتا ہے۔''

''اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے۔''کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ ہی بستر پر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن مخابرے پر اسلم کی حالت کے بارے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ بچ نہیں سکا تھا۔ یقیناً علاج کی بہتر سہولت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جانبر نہیں ہو سکا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے تین چار ہفتے بھی میں کمانڈر عبدالحق کا مہمان بنا رہا۔مجھے وہاں رکے ہوئے دو ماہ سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔لیکن بغیر تندرست ہوئے میں اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے جب تک میں مکمل صحت یاب نہ ہو گیا میں نے وہاں سے ہلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اسی اثناء میں کمانڈر اسلام اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چھٹی کاٹ کر لوٹ آیا تھا۔اس کے ہمراہ گئے ہوئے باقی دو ساتھی کسی وجہ سے واپس نہیں لوٹ سکے تھے۔مجھے ابھی تک وہیں موجود پا کر کمانڈر اسلام خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''شکر ہے ذیشان بھائی آپ یہیں مل گئے،ورنہ آپ کی تلاش میں کہاں کہاں پھرنا پڑتا۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''میرا خیال ہے میں نے آپ سے قرض وغیرہ تو نہیں لیا تھا۔''

''آپ کی ایک امانت ساتھ پھر رہا ہوں یار!''اسلام نے سفری تھیلے سے ایک شاپر نکال کر میری طرف

بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟''میں سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔

''بھول گئے،آپ نے جاتے وقت مجھے کوئی پیغام دیا تھا۔''

''چچا شمریز نے بھیجا ہے یہ۔''میرے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔''میرے حوالے تو اسی نے کیا ہے،اب بھیجنے والا کون ہے یہ معلوم نہیں۔''

''بہت اچھا گھرانا ہے۔اللہ پاک انھیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔''

''آمین۔''اسلام کے ساتھ کمانڈر عبدالحق کے منھ سے بھی دعائیہ کلمہ ادا ہوا۔اسلام کی بات جاری رہی۔''ویسے آپ کا نام لیتے ہی ہماری جو پذیرائی ہوئی اس کا تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ہمیں تو لگ رہا تھا کہ شمریز آپ کا سگا چچا ہے۔اور پھر اس کے دونوں چھوٹے بچوں نے ہم سے اتنے سوال کیے کہ بیان سے باہر ہے۔اپنے لالا جان کے زخمی ہونے کا سن کر تو وہ رونے لگے تھے۔ جب انھیں ساری کہانی سنائی تب انھیں افاقہ ہوا،کہ ان کے لالا جان نے زخمی ہونے سے پہلے کتنوں کو زندگی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔کوئی پردے کے پیچھے سے بھی ہماری گفتگو سنتا رہا ہے۔اور میرا خیال ہے یہ سامان اسی نے بجھوایا ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔''ہاں وہ بھی میری منھ بولی بہن ہے۔لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ کوئی پردے کے پیچھے بھی موجود ہے۔''

''جب میں آپ کے بارے تفصیل سنا رہا تھا تو اس نے وہیں سے بے ساختہ دو تین سوال پوچھے تھے۔اور جب اگلی صبح ہم جانے لگے تو شمریز چچا نے باصرار ہمیں اسی رستے سے واپس لوٹنے کی درخواست کی تھی۔کل صبح جب وہاں سے نکلے تو یہ سامان تو چچا شمریز نے ہمارے حوالے کیا لیکن یہ سامان آپ تک پہنچانے کی ہدایات پردے کے پیچھے سے موصول ہوئی تھیں۔''

میں نے کہا۔''میں شاید دو دن پہلے رخصت ہو گیا ہوتا،مگر عبدالحق بھائی نے ایک دن اور ایک دن اور کی رٹ لگا کے مجھے زبردستی روکا ہوا تھا۔''

عبدالحق نے فوراً کہا۔''دیکھ لیں،بڑوں کی بات ماننے میں کتنے فائدے ہوتے ہیں۔''

''آپ کی وجہ سے بس اسلام بھائی کی مشقت میں کمی ہوئی ہے کہ انھیں امانت سے جان چھڑانے کا موقع مل گیا۔ ورنہ میں جہاں بھی جاتا اسلام بھائی یہ مجھ تک ضرور پہنچا دیتے۔ کیوں اسلام بھائی۔''میں نے تصدیق چاہنے کے انداز میں اسلام کی طرف دیکھا۔

''بلاشک وشبہ۔''اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات کافی ہوگئی تھی، کچھ دیر مزید بیٹھ کر وہ رخصت ہوگئے۔ میں نے اگلی صبح آگے جانے کا بتا دیا تھا۔ اس ضمن میں کمانڈر عبدالحق سے رہنمائی مانگی تو اس نے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ مجھے رستے کے لیے ایک رہنما مل جائے گا۔ مجھے اس کے علاوہ کیا چاہیے تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں کالے رنگ کے شاپر کو کھولنے لگا۔ اس میں ایک خوب صورت سوئیٹر، ایک گرم ٹوپی اور ہلکے بھورے رنگ کا کپڑوں کا سلا ہوا سوٹ بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ بھی موجود تھا۔ گلگارے کی لکھائی پہچانتے ہوئے مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ سلام ودعا کے بعد لکھا تھا۔

''امید کرتی ہوں کہ یہ سامان جلد ہی آپ تک پہنچ جائے گا۔ آپ نے اسلام چچا کے ذریعے اپنی خیریت کا احوال بھیجا سن کر دل تشکر سے بھر گیا کہ آپ نے ابھی تک ہمیں یاد رکھا ہے۔ اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہم اس قابل ہیں کہ اب تک آپ کو نہیں بھولے۔ آپ کے زخمی ہونے کا سنا بہت افسوس ہوا۔ اگر ابوجان اجازت دیتے تو یقیناً میں آپ کو ملنے وہیں پہنچ جاتی لیکن انھوں نے منع کر دیا۔ آپ کی گڑیا بہن رنڑا بھی بہت پریشان ہوئی، مگر جب اسے معلوم ہوا کہ آپ کتنوں کو مار کر زخمی ہوئے تب اسے افاقہ ہوا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت تو غالباً نہیں ہوگی کہ اسلام چچا کی آمد کے بعد سے اب تک روزانہ آپ کا تازہ کارنامہ سننا پڑتا ہے۔ آپ کے معاملے میں نہ تو وہ میرے ڈانٹنے کی پروا کرتی ہے اور نہ مجھ سے ڈرتی ہے۔ آپ کا دیا ہوا پستول اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے مجھ پر الزام دھرا کہ میں نے آپ سے چرایا ہے۔ بعد میں بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا کہ آپ ہی نے میرے حوالے کیا ہے۔ ثمر خان آپ جیسا نشانہ باز بننے کے لیے روزانہ مشق کرتا ہے۔ دونوں اب پہلے کی طرح مجھ سے نہیں ڈرتے۔ ہر وقت آپ کی واپسی کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ انھیں تنگ کرنے کے لیے مجھے آپ کی کافی ساری برائیاں کرنا پڑتی ہیں جواباً وہ لڑنے سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ

کپڑے میں نے ماموں جان کے ساتھ خان کلے جا کر خریدے ہیں اور سلائی بھی خود کیے ہیں۔ اگر سلائی اچھی نہ لگے تب بھی آپ نے پہننے ضرور ہیں۔ آپ کی گڑیا بہن کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ میں آپ کے لیے کپڑوں کا جوڑا اور سوئیٹر بھیج رہی ہوں، چونکہ صبح چچا اسلام نے آگے جانا ہے اس لیے بے چاری کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کچھ خرید سکتی۔ لگی منتیں کرنے کہ میں یہ سوئیٹر اس کا نام لے کر آپ کے پاس بھجوادوں۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہے کہ آپ دونوں بہن بھائیوں کی چاہت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی اس لیے میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ بس ساری رات اسی تگ و دو میں رہی کہ آپ کو کیا تحفہ بھیجے۔ ثمر خان کے لیے ماموں جان شہر سے گرم ٹوپی اور رنڑا کے لیے گرم شال لے کر آئے تھے۔ گرم شال تو صرف لڑکیاں ہی اوڑھ سکتی تھیں۔ بے چاری نے ثمر خان کی منتیں کر کے اس سے گرم ٹوپی اس شرط پر مستعار لی کہ ماموں جان سے ٹوپی کی قیمت معلوم کر کے وہ اسے اتنی ہی رقم دے گی۔ اور وہی ٹوپی آپ کو بھجوادی۔ باقی ابو جان بھی خیریت سے ہیں۔ ان کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ تمام آپ کو ڈھیروں سلام و دعا کہہ رہے ہیں۔ پلوشہ بہن سے جونھی ملاقات ہوتی ہے اسے فوراً ہمارے بارے تفصیل سے بتلانا اور اسی رستے سے واپس بھیجنا۔ ان سے ملنے کو میرا بہت دل کرتا ہے۔ اور ہاں میں آپ کو بتایا تھا نا کہ نصیر خان نے اپنے بیٹے سے میرا رشتا کرنے کے لیے دس لاکھ کی آفر کی تھی اور ابو جان نے پندرہ لاکھ مانگے تھے۔ اب وہ پندرہ لاکھ دینے کو تیار ہو گیا ہے۔ لیکن ابو جان نے سال ڈیڑھ کی مہلت مانگ لی ہے وہ فی الحال میری شادی نہیں کرنا چاہتے، شاید میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اجازت چاہوں گی اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ میری پیاری بہن پلوشہ کو جلد از جلد ڈھونڈنا۔ اللہ پاک آپ کا حامی و ناصر ہو...... از طرف گلگارے ثمریز خان۔"

خط کے ہر لفظ سے محبت خلوص اور اپنائیت ٹپک رہی تھی۔ رنڑا گڑیا کی بھیجی ہوئی ٹوپی تو میں نے اسی وقت سر پر اوڑھ لی۔ خلوص اور اپنائیت کی چاشنی نے ان تحائف کو بہت قیمتی بنا دیا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد، گلگارے کے بھیجے ہوئے کپڑے اور سوئیٹر پہن کر میں آگے جانے کے تیار تھا۔ کپڑے بالکل میرے ناپ کے مطابق تھے۔ کمانڈر عبدالحق کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ کی یہاں زیادہ ضرورت ہے۔“

”صحیح کہا، مگر میرے علاوہ غزنی تک جانے کا مختصر رستہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے اور یوں بھی کمانڈر اسلام میری واپسی تک یہیں رہے گا۔“

”چلیں پھر بسم اللہ پڑھیں۔“ میں نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے آگے ہو گیا۔

غزنی تک ہم نے پیدل ہی جانا تھا۔ میں نے رستے میں کافی وقت ضائع کر دیا تھا، نا معلوم البرٹ بروک وغیرہ اب تک غزنی میں تھے یا کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن میرے پاس ان کے بارے یہی آخری معلومات تھی اس لیے مجھے ایک بار تو وہاں ضرور جانا پڑتا۔ وہاں جانے کے بعد ہی میں اگلی منزل کا تعین کر سکتا تھا۔

تھوڑا سا آگے آتے ہی میں نے پوچھا۔ ”یہاں سے ہم مرناہ گر جائیں گے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم مرناہ گر، پکتیکا اور زرغون شہر وغیرہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پہاڑیوں کے بیچوں بیچ مختصر رستوں سے آگے بڑھیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”گردیز کیمپ بھی تو رستے ہی میں آتا ہے نا۔“

”نہیں وہ دوسری جانب ہے، اس سے کم وقت تو غزنی پہنچنے میں لگے گا۔“

”وہاں سے صغیر شہید پارٹی تو دو دنوں میں ہم تک پہنچ گئے تھے۔“

وہ گردیز سے ارگون اور ساروبی تک گاڑیوں میں آئے تھے۔ وہاں سے مختصر رستے پر مرناہ گر پہنچ گئے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب گردیز سے میران شاہ والا راستہ انھیں قریب پڑتا ہوگا۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بہت قریب پڑتا ہے اور گاڑی کا راستہ ہے، مگر وہ راستہ ہمارے لیے محفوظ نہیں اس لیے چکر کاٹ کر اس طرف سے آنا پڑتا ہے۔“

”ہونہہ!“ کر کے میں خاموش ہو گیا۔

اس نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے پکتیکا کے مضافات میں موبائل فون کے سگنل بھی شروع ہو جاتے ہیں۔“

”اس کا مطلب آگے شہروں میں موبائل فون کے سگنل آتے ہیں۔“

”بالکل آتے ہیں۔ AWCC یعنی افغانستان وائرلیس کمیونیکیشن، روشن، ADIA وغیرہ۔“

”پھر تو رابطوں میں سہولت رہتی ہوگی۔“

”بہت زیادہ۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور اب کام شروع ہے ان شاء اللہ جلد ہی سرحدی پہاڑوں پر بھی سگنل آنے شروع ہو جائیں گے۔“

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”گویا اس بہانے چچا شمریز اور ان کے گھر والوں سے بات چیت ہو جایا کرے گی۔“

کمانڈر عبدالحق ہنسا۔ ”لگتا ہے بات کافی بڑھ گئی ہے۔“

”ہاں بھائی، بہت مخلص گھرانا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے میری زندگی بھی بچائی ہے۔“ میں اسے اپنے برف باری میں پھنسنے کی تفصیلات بتانے لگا۔

عبدالحق نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”یہ تو اللہ پاک کا نظام ہے، انسان کو وہاں سے دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔“

”بے شک۔“ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق ان رستوں کا شناور تھا۔ اور پھر کافی عرصے سے اس کا واسطہ پہاڑوں سے پڑ رہا تھا تبھی وہ ڈھلان پر کافی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ دوپہر ڈھلے ہم ایک چشمے کے کنارے دن کا کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد گرم قہوے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”ویسے بہتر ہوتا کہ آپ مجھے نقشہ بنا کر دے دیتے۔“

”دراصل میں غزنی کے علاقے میں مصروف عمل مجاہدوں سے آپ کا رابطہ بھی کرانا چاہتا تھا۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا مطلب وہ کوئی اور مجاہد ہیں؟“

وہ مجھے سمجھاتا ہوا بولا۔ ”بالکل، افغانستان میں مختلف گروپ کفر سے برسرِ پیکار ہیں اور ہر گروپ کا علیحدہ کمانڈر ہے۔ آپ کو تو بس ہمارے گروپ کے کچھ لوگ جانتے ہیں، باقی گروپس کے لیے آپ بالکل ہی انجان اور لاتعلق شخص ہوں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ''تو کیا افغانستان میں کام کرنے والے تمام گروپس آپ کو جانتے ہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں انھیں اپنی پہچان کرا سکتا ہوں، تمام چھوٹے کمانڈروں کے پاس بھی مختلف پاس ورڈز اور خفیہ معلومات ہوتی ہیں جن میں میں آپ کو حصہ دار نہیں بنا سکتا اسی وجہ سے مجھے خود آپ کے ساتھ سفر طے کرنا پڑا۔''

''ویسے افغانستان میں کتنے گروپ کام کر رہے ہیں۔'' قہوہ پی کر ہم آگے چل پڑے تھے۔

''کافی زیادہ گروپ ہیں.........'' وہ ان گروپوں کی تفصیل بتانے لگا۔ شام تک ہم ایک چھوٹی سی آبادی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دونوں نے مشورے سے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بھلے آدمی کے گھر سے ہمیں کھانا اور ٹھکانہ مل گیا تھا۔ صبح سویرے نماز پڑھ کر ہم نے ناشتا کیا اور اللہ پاک کا نام لے کر چل پڑے۔ اگلے دو دن ہم نے آرام سے سفر کرتے ہوئے رستے ہی میں گزارے تھے۔ اس دوران ہمیں دریائے غزنی بھی عبور کرنا پڑا۔ ہم دن کو سفر کرتے اور رات کو کسی کے مہمان بن جاتے۔ تیسرے دن سہ پہر ڈھلے ہم مجاہدین کے ایک خفیہ ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر عبدالحق نے اپنی پہچان کروائی، فوراً ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔

رات کے کھانے پر کمانڈر بسم اللہ جان ہماری آمد کی غایت پوچھ رہا تھا۔

''ایک ذاتی کام ہی سمجھ لو۔'' عبدالحق نے تفصیل بتانے سے گریز کیا تھا۔ شاید میری مرضی معلوم کیے بغیر وہ کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

بسم اللہ جان نے تفصیل جاننے میں دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔ ''بس یہ بتا دیں کہ ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔''

عبدالحق نے کہا۔ ''فی الحال تو کوئی نہیں البتہ جب بھی کسی مدد کی ضرورت ہوئی آپ کو ضرور تکلیف دیں گے۔''

بسم اللہ جان خوش دلی سے بولا۔ ''خوش آمدید۔''

رات کو جب ہم بستر پر لیٹے تو میں کمانڈر عبدالحق کو مخاطب ہوا۔ ''میرا خیال ہے اب آپ کی ذمہ داری بھی ختم ہو گئی ہے۔''

''نہیں یار!...... آپ جس دشمن کے خلاف کام کر رہے ہیں وہ میرا بھی اتنا ہی دشمن ہے۔''

”ویسے یہاں تک میں پہنچ تو گیا ہوں مگر کوئی لائحہ عمل ذہن میں نہیں آ رہا۔“ میں نے اس موضوع پر مزید بات نہ کر کے گویا اس کی بات مان لی تھی۔

عبدالحق اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ”پہلے ان کے کیمپ کا جائزہ لے لیں پھر منصوبہ بھی بنا لیں گے۔“

☆......☆......☆

اگلے دن ہم نے اپنے ہتھیار مجاہدین کے ٹھکانے پر چھوڑے اور ایک رہنما کو ساتھ لے کر غزنی شہر کی طرف چل پڑے۔ امریکن آرمی کا کیمپ شہر کے مضافات میں تھا۔ کیمپ کیا پورا قلعہ تھا۔ سیکیورٹی کے اتنے سخت انتظامات کہ حقیقتاً وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ امریکنز کی رہائش تک چار پانچ حفاظتی حصار بنے ہوئے تھے۔ اتنی فول پروف سیکیورٹی دیکھ کر میرے دماغ میں کیمپ کے اندر گھسنے کا خیال بھک سے اڑ گیا تھا۔

”میرا خیال میں اندر گھسنے کی کوشش کرنا نری خودکشی ہی ہوگی۔“ میں نے آنکھوں سے لگی دوربین کمانڈر عبدالحق کی طرف بڑھائی۔

میرے ہاتھوں سے دوربین لے کر اس نے آنکھوں سے لگانے کی زحمت کیے بغیر کہا۔ ”مجھے پہلے سے معلوم تھا، مگر میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ آپ خود جائزہ لے لیں۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ پہلے یہ کیمپ دیکھ چکے ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر دیکھ چکا ہوتا تو اپنے ساتھ کسی رہنما کو کیوں لاتا، مگر ان کے تمام کیمپ اسی طرح سے فول پروف بنائے گئے ہیں اور یہ بھی باقی کیمپوں کی طرح ہی ہے۔ امریکن بس اپنی فلموں ہی میں دلیری دکھا سکتے ہیں، حقیقتاً اتنے بزدل ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔“

”کیا یہ کیمپ سے باہر نہیں نکلتے۔“

”نکلتے ہیں، مگر بہت کم اور خاطر خواہ انتظام کے بعد ایک قافلے کی صورت باہر آتے ہیں۔ سب سے آگے ایک خصوصی گاڑی چلتی ہے جس میں جیمر نصب ہوتا ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی ٹائم بم یا آئی ڈی وغیرہ چال نہیں کر سکتی۔ اور اگر اتفاق سے آئی ای ڈی پھٹ بھی جائے تب بھی آگے والی گاڑی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ عقب میں چلنے والی گاڑیوں میں بھی کئی افغان اور امریکن ہتھیار بردار تیاری حالت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہیلی

کاپٹر بھی عموماً قافلے کے ساتھ ہی چلتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔''پاکستان میں تو البرٹ بروک وغیرہ اتنا اہتمام نہیں کرتے تھے۔''

''کیونکہ وہاں وہ امریکنوں کی حیثیت سے سفر نہیں کرتے۔وہاں وہ دہشت گردوں کی گاڑیوں میں چھپ کر حرکت کرتے ہیں اور کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان گاڑیوں میں کوئی امریکی جا رہا ہے۔''

اس دن ہم امریکن کیمپ کا چاروں اطراف سے جائزہ لے کر واپس آ گئے۔واپس پہنچتے ہوئے شام ہو گئی تھی۔صبح ناشتے کے بعد سے ہم کچھ نہیں کھا سکے تھے،کیمپ پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلے کھانا کھانا پسند کیا۔رات کو سونے سے پہلے ہم ایک مناسب لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔

میں نے کہا۔''بھائی مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آ رہا ہے کہ ان کا کوئی اہم آدمی اپنے قبضے میں کریں اور پھر مذاکرات کے ذریعے اپنی شرائط منوا لیں۔''

''صحیح کہا۔''عبدالحق نے میری تائید میں سر ہلایا۔''مگر اصل مسئلہ ہی کسی اہم آدمی کو پکڑنے کا ہے۔ان بزدلوں کے ہوٹل اور تفریح کے دوسرے انتظامات حفاظتی حصار کے اندر ہی کیے گئے ہیں۔اس طرح نہ انھیں باہر نکلنا پڑتا ہے اور نہ انھیں کوئی خطرہ ہوتا ہے۔''

''ان کے کیمپ پر تو حملہ کیا جا سکتا ہے نا۔''

''شاید،مگر اس طرح ہم انھیں جانی نقصان تو پہنچا سکتے ہیں کسی کو پکڑ نہیں سکتے۔کیونکہ یہ حملہ دور سے راکٹ وغیرہ پھینک کر ہی کیا جا سکے گا۔ورنہ کیمپ کے حفاظتی انتظامات تو آپ نے خود دیکھ ہی لیے ہیں۔''

''شہر میں خریداری وغیرہ کے لیے تو جاتے ہوں گے۔''

''ضرورت کا سامان انھیں کیمپ کے اندر ہی پہنچا دیا جاتا ہے۔اور سامان لانے والے مخصوص افراد ہوتے ہیں جنھیں شناخت کے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''اب یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ ان کے کسی قافلے پر گھات لگائی جائے۔''

''ہاں،لیکن وہ تب ہی ممکن ہے کہ ہمیں پہلے سے ان کے قافلے کے جانے کے وقت اور سمت کے بارے معلوم ہو جائے۔اس صورت میں بھی ہمیں کمانڈر بسم اللہ جان کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔''

میں نے پوچھا۔''تو کیا کمانڈر ہماری مدد نہیں کرے گا؟''

''کیوں نہیں۔''

''بہتر تو یہی ہو گا کہ انھیں ساری بات بتا کر مشورہ مانگا جائے،شاید وہ کسی دوسری تجویز کی طرف رہنمائی کر دیں۔''

''ٹھیک ہے کل ان سے بات کریں گے۔'' کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ متفق ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر بسم اللہ جان صبح سویرے ہی کہیں نکل گیا تھا۔ان کی واپسی کہیں رات گئے ہوئے تھی۔یوں ایک دن بعد ہی ان سے بات ہو سکی۔ساری بات سن کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔چند لمحوں بعد اس نے زبان کھولی۔

''ان کے قافلے تو پندرہ بیس دن بعد حرکت کر ہی لیتے ہیں،لیکن ایک تو ضروری نہیں کہ ہر قافلے میں کوئی اہم شخصیت موجود ہو۔اور دوسرا قافلے کی حفاظت کے لیے عموماً ہیلی کاپٹر بھی ساتھ چلتا ہے۔ایسی صورت میں قافلے پر حملہ تو کیا جا سکتا ہے کسی کو گرفتار کرنا مشکل ہوتا ہے۔''

میں پھیکے انداز میں بولا۔''گویا ہمارا منصوبہ کسی کام کا نہیں۔''

کمانڈر بسم اللہ جان نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''ایک طریقہ تو ہے،لیکن اس میں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔''

ہم نے بیک زبان پوچھا۔''وہ کیا؟''

''غیر ملکی میڈیا کے کافی نمائندے افغانستان کے بڑے شہروں میں موجود ہیں،اسی طرح ان شہروں میں کچھ دوسرے مقاصد سے آئے ہوئے امریکی شہری بھی موجود ہوتے ہیں.........''

''مگر ہمیں میڈیا کے نمائندوں یا عام امریکنز سے کیا مطلب۔''میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

کمانڈر بسم اللہ نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔''میرا خیال ہے میری بات درمیان ہی میں ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔"معذرت خواہ ہوں۔"

"تو میں کہہ رہا تھا کہ ان میں امریکن سی آئی اے کے کچھ ایجنٹ بھی چھپے ہوتے ہیں۔اب ان سیکرٹ ایجنٹس کو کیسے پہچانا جاسکتا ہے اس بارے میں بس اتنی ہی رہنمائی کرسکتا ہوں کہ اس کے لیے ایسے افراد کی نگرانی کرنا پڑے گی اور یہ کافی تھکا دینے والا کام ہے۔"

"گویا اب مجھے جاسوس بننا پڑے گا۔"

"جی۔" کمانڈر بسم اللہ جان نے اثبات میں سر ہلایا۔"اور شہر میں رہنے کے لیے آپ کے پاس اپنی شناخت موجود ہونا چاہیے یہ نہ ہو دوسروں کو پکڑتے ہوئے اپنی جان پھنسا بیٹھیں۔"

میں نے کہا۔"اب کام تھوڑا مشکل ہو گیا ہے۔"

"نہیں اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرلیں گے۔" عبدالحق نے مجھے تسلی دی۔

میں نے پوچھا۔"وہ کیسے؟" بسم اللہ جان بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

عبدالحق نے کہا۔"افغانستان میں کافی کنسٹریکشن کمپنیاں کام کررہی ہیں جن میں پاکستانی مزدور اور انجینئر وغیرہ کام کررہے ہیں۔"

"تو۔" میں نے مزید وضاحت چاہی۔

"آپ کسی بھی کمپنی میں بہ طور مزدور وغیرہ شامل ہو کر اپنے پاکستانی شناختی کارڈ پر آسانی سے گھوم سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔"ویزا وغیرہ بھی تو بنانا ہوگا نا؟"

"ویسے سردیوں میں تو کنسٹریکشن کمپنیوں کا کام ٹھپ ہو جاتا ہے۔" اس سے پہلے کہ عبدالحق میرے سوال کا جواب دیتا بسم اللہ جان نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

"یہ امریکہ نہیں ہے کہ یہاں ویزوں کی اتنی جانچ پڑتال ہو اور نقلی ویزہ بنانا اتنا مشکل نہیں ہے۔باقی کنسٹریکشن کمپنیاں سائیٹوں کا کام سردی کی وجہ سے روک دیتی ہیں لیکن تھوڑا بہت دفتری سٹاف موجود رہتا ہے۔" عبدالحق نے ایک ہی سانس میں ہم دونوں کا اعتراض ختم کر دیا تھا۔

اس کے بعد ہم باقی تفصیلات طے کرنے لگے۔اگلے دن عبدالحق نے وہاں سے کابل جانا تھا کیونکہ اس کی واقفیت جس کنسٹریکشن کمپنی میں تھی وہ کابل کے مضافات میں کام کر رہی تھی۔وہیں پر اس نے میرے لیے ویزہ وغیرہ بھی بنوانا تھا۔میں نے بھی اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا لیکن اس نے منع کر دیا کیونکہ میرا اسٹرک کے ذریعے کابل جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔خود عبدالحق کے پاس افغانستان کی شناخت موجود تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر عبدالحق مجھ سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔جاتے ہوئے اس نے ایک کیمرے والے موبائل فون میں میری چند تصاویر کھینچ لی تھیں۔ایک مجاہد کو میں نے اپنے ذاتی کام میں گھسیٹ لیا تھا۔گو ان مجاہدین کی زندگی کا مقصد ہی کفر کے خلاف برسرِ پیکار رہنا ہے، لیکن ان کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر میں فارغ تھا۔فروری کے وسط میں سردی کا زور ٹوٹنے لگتا ہے مگر یہاں ابھی تک سخت سردی پڑ رہی تھی۔کمانڈر عبدالحق نے یہی کہا تھا کہ اسے میرے کام میں ہفتے سے زیادہ وقت لگ جائے گا۔اب اسے ڈیڑھ ہفتہ بھی لگ سکتا تھا اور دو سے تین ہفتے بھی۔اس کی واپسی تک مجھے کوئی کام نہیں تھا۔خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں فارغ اوقات میں مختلف ورزشیں کر کے وقت گزارتا رہتا۔اس طرح پلوشہ کی یادوں سے بھی کچھ افاقہ ہو جاتا اور کسرت بھی ہو جاتی۔

کمانڈر عبدالحق کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا جب ایک رات کمانڈر بسم اللہ جان میرے پاس آ گیا۔میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

''آپ غالباً سو رہے ہیں۔'' مجھے رضائی میں گھسا دیکھ کر وہ واپس مڑنے لگا۔

میں نے جلدی سے کہا۔''ارے نہیں بھائی آئیں بیٹھیں، فارغ آدمی کو اتنی جلدی کہاں نیند آتی ہے۔''

''اچھا۔'' کر کے وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کام میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے آپ کے پاس نہیں بیٹھتا ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ رات گئے تک آپ کے ساتھ گپ شپ کروں۔''

''گویا فراغت آپ کو راس نہیں آ رہی۔'' اس نے بہ ظاہر ہنستے ہوئے پوچھا۔نا معلوم کیوں مجھے اس کا لہجہ

معنی خیز لگا تھا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں، مجھے مسلسل فارغ رہنا پڑ رہا ہے اور یہ بے کاری نرا سر درد ہی تو ہے۔''

''ویسے ایک کام تو ہے اس بہانے ہماری بھی مدد ہو جائے گی اور آپ کو بھی ملنے جلنے کا موقع مل جائے گا۔''اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ صرف اسی خاطر ہی میرے پاس آیا تھا۔اور گفتگو کا رخ اتفاقاً ایسے موضوع کی جانب مڑ گیا کہ اسے اپنی بات کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔

میں خوش دلی سے بولا۔''کمانڈر آپ بے جھجک کام بتائیں، اگر میرے بس میں ہوا تو انکار نہیں سنو گے۔''

''عبدالحق بھائی کہہ رہے تھے کہ آپ کا نشانہ بہت اچھا ہے۔''کام بتانے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے انکساری سے کہا۔''لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔''

اس نے متبسم ہو کر کہا۔''تو لوگوں کے سمجھنے کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا نا وہ کیا کہتے ہیں......

برا کہے جسے دنیا اسے برا کہیے

زبان خلق کو نقارہ خدا کہیے

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''گویا آپ کے نزدیک اچھا نشانہ باز ہونا برائی کی علامت ہے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔''بالکل، مخالفین کو ایسا آدمی بہت برا لگتا ہے۔''

''غالباً آپ یہی چاہتے ہیں کہ وہ مجھے برا ہی سمجھتے رہیں۔''میں نے جوابی وار کیا۔

''پرسوں ایک خصوصی تقریب منائی جا رہی ہے، محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کے مطابق اگلے تین چار دن موسم صاف رہے گا۔دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ محفل ایک کھلی جگہ منعقد ہو گی۔ایک بڑا سا کیک کاٹا جائے گا اور اس دوران آپ ہمیں یقین دلا سکتے ہیں کہ دشمن آپ کو یونہی برا نہیں سمجھتے۔''آخری فقرہ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''یہ پکی اطلاع ہے۔''میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ہاں۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن اس دن میں نے کمانڈر عبدالحق کے ساتھ کیمپ کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے ہم کیمپ کے اندر موجود کسی شخص کو نشانہ بنا سکیں، کیونکہ کیمپ کے نزدیک جو دو ٹیکریاں ہیں وہاں افغان آرمی تعینات ہے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''جنوبی ٹیکری پر کل رات ہمارا قبضہ ہو جائے گا، سارا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ جنوبی ٹیکری سے کیمپ کے اندر مناسب طریقے سے فائر کیا جا سکے گا۔''

''شاید اس ٹیکری پر بغیر شور شرابہ کیے قبضہ نہ کیا جا سکے۔'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ''ایک بھی گولی چل گئی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اور ہم نے وہاں کافی وقت گزارنا ہے۔''

وہ تیقّن سے بولا۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس ٹیکری پر جو لوگ تعینات ہیں ان میں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔ کل رات کو تمام کے کھانے میں زود اثر بے ہوشی کی دوا شامل ہو جائے گی اور اس کے بعد یقیناً کوئی مزاحمت کے قابل نہیں رہے گا۔''

''یہ سارا منصوبہ آپ نے میری نشانہ بازی کی وجہ سے بنایا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔''

''ایسے منصوبے ہم وقتاً فوقتاً بناتے رہتے ہیں، کیونکہ ہم دشمن کو آرام سے رہنے نہیں دے سکتے۔ ویسے یہ منصوبہ پچیس دسمبر کے لیے ترتیب دیا گیا تھا، لیکن موسم خراب ہونے کی وجہ سے جو تقریب کھلے میدان میں ہونا تھی وہ بند سٹیڈیم میں منائی گئی۔ بس ہم نے اپنا جو آدمی وہاں تک پہنچایا تھا اسے کہہ دیا کہ وہ کسی مناسب موقع کی آمد تک وہیں ٹکا رہے۔ اور اب وہ مناسب موقع آ گیا ہے۔ ہم نے جو منصوبہ پہلے بنایا تھا اس کے مطابق ہم وہاں راکٹ فائر کرتے ہیں گو وہ تمام راکٹ اندازے سے فائر کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھار ہی کوئی راکٹ نشانے پر لگتا ہے لیکن ہمارا اصل مقصد افراتفری پھیلانا اور انھیں یہ باور کراتے رہنا ہے کہ ہم موجود ہیں۔''

''تو یہ کام آپ کسی بھی وقت کر سکتے ہیں یوں کسی تقریب کا انتظار کرنے کا کیا مطلب؟''

''کیونکہ تقریب کے وقت تمام اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک بھی راکٹ نشانے پر لگ جائے تو کافی تباہی پھیلا سکتا ہے، دوسرا ان کے جشن کے موقع پر ایسی کارروائی ان میں زیادہ مایوسی پھیلاتی ہے۔''

''میرے گولی چلانے سے تو ایک دم افراتفری پھیل جائے گی اور اس صورت میں میں تین چار سے زیادہ

افراد کو نشانہ نہیں بنا پاؤں گا۔شاید آپ کے راکٹوں کو بھی ضائع کرنے کا باعث بن جاؤں۔‘‘

’’ہمارے پاس ایسے موقعوں کے لیے ون او سیون راکٹ ہیں جن کا لانچر نہیں ہوتا بس راکٹ ہی کو سیدھائی دے کر ہم مطلوبہ سمت میں ان کا رخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔یوں کبھی کبھار تو ایک آدمی کا بھی نقصان نہیں ہوتا اور کبھی چند افراد ہلاک ہو جاتے ہیں، جبکہ آپ کے فائر سے دو تین تو مردار ہو ہی جائیں گے۔خاص کر بڑے آدمیوں کی موت سے ان کے مورال پر کافی اثر پڑے گا۔‘‘

’’جب تک میں تقریب کی جگہ کا فاصلہ ناپ نہیں لیتا تب تک یہ کہنا قبل از وقت ہوگا، کہ میں کتنوں کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔اس ضمن میں مجھے کچھ سامان بھی درکار ہوگا۔‘‘اس کا سارا منصوبہ سمجھ میں آتے ہی میں نے اسے اپنی ضروریات سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

’’آپ اپنی ضروریات کے بارے بتائیں۔‘‘

’’سب سے پہلے تو ایک دور مار رائفل چاہیے ہوگی، اس کے ساتھ دوربین، ونڈ میٹر، لیزر رینج فائینڈر............‘‘میں اسے مطلوبہ سامان کے بارے تفصیل سے بتلانے لگا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔’’چلیں میں آپ کو اپنے پاس موجود سامان دکھا دیتا ہوں جو چیز کم ہوگی اس کا بندوبست ان شاءاللہ کل ہو جائے گا۔‘‘

میں سر ہلاتا ہوا بستر سے نکل کر اس کے ہمراہ ہو لیا۔تھوڑی دیر بعد ہم ایک تہہ خانے میں موجود تھے۔وہاں ہتھیاروں کے درمیان ڈریگنو اور گلیل سنائپر رائفل کے علاوہ رینج ماسٹر بھی موجود تھی۔اور رینج ماسٹر کی موجودی میں دوسری رائفلوں سے مجھے کیا مطلب ہو سکتا تھا۔یہ تمام امریکن اور افغان فوجیوں سے چھینا گیا سامان تھا۔سوائے ونڈ میٹر کے مجھے اپنے مطلب کی ہر چیز مل گئی تھی۔یہاں تک کہ ایک اچھی کوالٹی کا سائیلنسر بھی موجود تھا

’’سامان تو قریباً مکمل ہی ہے۔‘‘میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

کمانڈر بسم اللہ جان خوش ہوتے ہوئے بولا۔’’ویسے ان میں سے کافی چیزیں ایسی ہیں جن کے استعمال کے بارے ہم نہیں جانتے تھے۔ہمارے نزدیک وہ بالکل فالتو تھیں پھر بھی میں نے یہ سوچ کر رکھ چھوڑی تھیں کہ شاید کبھی کام آ جائیں۔آج لگتا ہے میرا یہ فیصلہ مفید ثابت ہوا۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب سب سے اہم کام یعنی فاصلہ ناپنا رہ گیا ہے کہ اس ٹیکری سے تقریب کی جگہ کا فاصلہ کتنا ہوگا۔“

”ویسے آپ کتنے فاصلے سے کسی آدمی کو نشانہ بنالیں گے۔“

”دو کلومیٹر۔“ میں نے رینج ماسٹر کی رینج کے مطابق کہا۔

”مطلب کمانڈر عبدالحق کی آپ کے بارے بتلائی گئی بات حقیقت ہے۔“

”اب میں کمانڈر عبدالحق کو جھوٹا تو نہیں کہہ سکتا نا۔“ میں نے لطیف انداز میں چوٹ کی اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

مجھے بستر تک پہنچا کر اس نے اجازت لی اور رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر رائفل کو صفر کر لیا تھا۔ سائیلنسر کی موجودی میں مجھے فائر کرتے ہوئے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ رینج ماسٹر رائفل کی تو بور سائیٹنگ بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب فائر کرنے کی سہولت موجود ہو تو بور سائیٹنگ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (بور سائیٹنگ بغیر گولی چلائے رائفل کو صفر کرنے کا طریقہ ہے)

رات کو کمانڈر بسم اللہ جان اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ مذکورہ ٹیکری پر پہنچ گیا تھا۔ انھیں سارے افغان فوجی بے ہوش ہی ملے تھے۔ پوری پوسٹ قبضے میں لیتے ہی اس نے موبائل فون پر کال کر کے اپنے ساتھیوں کو مطلع کر دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھ تک بھی یہ اطلاع پہنچا دی تھی۔

میں نے صبح سویرے وہاں پہنچنا تھا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی میں ایک ڈبل کیبن میں بیٹھا اس ٹیکری کی طرف روانہ تھا جہاں مجاہدین کا قبضہ ہو چکا تھا۔

ہم نے بہ مشکل آدھا راستہ طے کیا تھا کہ کمانڈر بسم اللہ جان کی کال آگئی۔ اس نے میرے ساتھ بات کرنا چاہی۔ اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے موبائل فون میری جانب بڑھا دیا۔

وہ سلام وغیرہ کے بعد بولا۔ ”ذیشان بھائی!...... میرا خیال ہے یہاں آپ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔“

''کیوں؟'' میں نے حیرانی کے اظہار میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔''میں نے اس جگہ کا فاصلہ ناپا ہے دو کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ بن رہا ہے۔''

''یہ طے کرنا میرا کام ہے۔'' ٹیکری کی بلندی ذہن میں لاتے ہوئے میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے میری آمد کو میری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔

ڈرائیور بے خوف و خطر، گاڑی کو اس ٹیکری کے عقب میں لے گیا تھا۔ پہلے والی تین گاڑیاں بھی وہیں چھپا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ہماری رہنمائی کے لیے دو آدمی ٹیکری سے نیچے آئے ہوئے تھے۔ ان کی ہدایات پر ڈرائیور نے گاڑی پہلے والی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی کی اور ہم ان کی رہنمائی میں اوپر چڑھنے لگے۔ ٹیکری کے اوپر پہنچتے ہی کمانڈر بسم اللہ جان ہمیں اپنا منتظر نظر آیا۔ اس کے چہرے پر چھائے تاثرات یقیناً میرے منھ سے کوئی امید بھری خبر سننے کے خواہاں تھے۔ میں نے بھی اس سے مصافحہ کرتے ہی فاصلہ ناپنے والے آلے (لیزر رینج فائینڈر) کے متعلق دریافت کیا۔

''آئیں میرے ساتھ۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر پوسٹ کی شمالی جانب لے گیا۔ امریکن کیمپ بالکل ہی میرے سامنے تھا۔ ایک وسیع میدان کے بیچوں بیچ تقریب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ دھوپ سے لطف اندوز ہونے کی خاطر شامیانے وغیرہ نہیں لگائے گئے تھے۔ یو کی شکل میں صوفہ سیٹ اور کرسیاں ترتیب سے لگائی گئی تھیں۔ ایک جانب چند چوڑی میزیں جوڑ کر کھانا وغیرہ رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ میں نے فاصلہ ناپنے والا آلہ تھامتے ہی ترتیب سے رکھے صوفوں کا فاصلہ ناپا۔ وہ بائیس سو میٹر تھا۔ جبکہ رینج ماسٹر کی کارگر رینج دو ہزار میٹر ہے۔

''کتنا فاصلہ ہے۔'' فاصلہ ناپتے ہی میں نے کمانڈر بسم اللہ جان سے تصدیق چاہی۔

اس نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔''بائیس سو۔''

اطمینان بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اپ ہل، ڈاؤن ہل پروٹیکٹر کے ذریعے ہدف کا زاویہ معلوم کیا۔ وہ جگہ ہماری ٹیکری سے تیس ڈگری نشیب میں تھی۔ کوسائن فیکٹر کو استعمال کرتے ہوئے میں نے رائفل پر لگانے والی رینج معلوم کی جو کہ انیس سو پانچ میٹر بن رہی تھی۔

(اس سے پہلے غالباً میں بتا چکا ہوں کہ جب بھی کوئی سنائپر نیچے سے بلندی کی طرف یا بلند مقام سے نیچے کی

http://sohnidigest.com

طرف فائر کرتا ہے تو وہ ہدف کی براہ راست پڑھی جانے والی رینج نہیں لگاتا بلکہ افقی رینج لگاتا ہے۔اس مقصد کے لیے اسے ہدف چاہے وہ نیچے ہو یا اوپر اس کا زاویہ درکار ہوتا ہے کہ سنائپر سے ہدف کی بلندی یا گہرائی کا کتنا زاویہ بن رہا ہے۔اور پھر اس زاویے اور فاصلے کو ایک مخصوص تناسب سے جمع تفریق کرنے سے مطلوبہ رینج معلوم ہو جاتی ہے۔قبیل خان کے جانشین سردار جہانداد خان کو میں نے اسی فارمولے کو بروئے کار لاتے ہوئے بلندی کی طرف فائر کر کے کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔)

''میرا خیال ہے فائر کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب رہے گی۔''ایک ہموار سطح دیکھ کر میں نے کمانڈر بسم اللہ جان کو کہا۔''یہاں ایک کمبل وغیرہ بچھوا دیں تاکہ میں آرام دہ حالت میں لیٹ کر فائر کر سکوں۔''

اس نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔''کیا فاصلہ ناپنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے؟''

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''فاصلہ بائیس سو میٹر ہی بن رہا ہے۔لیکن نشیب میں ہونے کی وجہ سے رائفل پر رینج انیس سو میٹر لگے گی۔''

''وہ کیوں؟''اس کی حیرانی برقرار تھی۔

''اس کیوں کو کھوجنے کے لیے آپ کو میری شاگردی اختیار کرنا پڑے گی۔''ہنستے ہوئے میں رائفل کی میگزین بھرنے لگا۔

''اس کا فیصلہ آپ کے فائر کے بعد ہی کر سکوں گا۔''میرے پر اعتماد لہجے نے اسے خوش کر دیا تھا۔

میں نے برجستہ کہا۔''فائر کے بعد شاید میری پیش کش برقرار نہ رہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''یہ بھی ممکن ہے فائر کے بعد مجھے ہی اپنے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑے۔''

میں نے منھ بناتے ہوئے کہا۔''اب اتنے بھی برے دن نہیں آئے۔''

''چلو دیکھ لیں گے۔''

دو میگزینیں بھر کر میں نے رائفل کے ساتھ رکھیں۔اتنی دیر میں میری بتائی ہوئی جگہ پر ایک آدمی نے نرم کورین کمبل بچھا دیا تھا۔رائفل پر ٹیلی سکوپ سائیٹ لگا کر میں نے صوفوں کی جانب سیدھائی دی۔ایلی ویشن ڈرم پر مطلوبہ رینج لگائی اور رائفل کو کاک کر کے سیفٹی لگا دی۔اب بس ان کے آنے کی دیر تھی۔دھوپ خوب روشن

تھی تقریب کی جگہ پر ہلکی پھلکی چہل پہل نظر آنے لگی تھی ۔ملازم کھانے کی میز پر برتن وغیرہ لگا رہے تھے۔کچھ صوفوں اوران کے سامنے پڑی شیشوں کی میزوں کو صاف کر رہے تھے۔

رائفل کو وہیں چھوڑ کر میں کھڑا ہو گیا۔''سادہ کپڑے کی چھوٹی سی جھنڈی درکار ہو گی۔''

''جھنڈی......؟''بسم اللہ جان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں۔''میں وضاحت کرتا ہوا بولا۔''ونڈ میٹر نہیں ہے نا تو ہوا کی رفتار ناپنے کے لیے ایک جھنڈی سامنے لگوادو۔''

''اب جھنڈے سے کیسے ہوا ناپی جائے گی؟''کمانڈر بسم اللہ جان کی سمجھ میں میری بات نہیں آرہی تھی۔اور آ بھی کیسے سکتی تھی ،یہ تو سنائپرز کے اپنے تجربات ہوتے ہیں اور وہ کوئی سنائپر تو نہیں تھا۔

میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔''ہوا کی وجہ سے جھنڈے کا کپڑا اس کے ڈنڈے کے ساتھ ایک مخصوص زاویہ بناتا ہوا لہراتا ہے۔ہوا جتنی تیز ہوتی ہے کپڑا اتنا ہی سیدھا اڑتا ہے۔اس زاویے کو ناپ کر ہم سنائپرز اندازہ لگالیتے ہیں کہ ہوا کی رفتار کیا ہے اور پھر رفتار معلوم کر کے ہم دائیں بائیں فرق ڈالنے والی ناب کے ذریعے ٹیلی سکوپ سائیٹ پر مناسب رینج لگا سکتے ہیں ،اس طرح کہ ہوا گولی پر اثر انداز نہ ہو سکے۔''

''اتنے بکھیڑے ،مجھ سے تو نہیں پالے جائیں گے۔''

میں نے کہا۔''کامیاب فائر کرنے کے لیے ایسے بکھیڑے پالنا پڑتے ہیں کمانڈر جی۔''کہتے ہوئے میں رہائشی بینکر کی طرف بڑھ گیا۔وہ جلدی سے بولا۔''اپنے چہرے پر کپڑا لپیٹ لو،ہم نے افغان فوجیوں کو قتل نہیں کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر چہرے پر مفلر لپیٹ لیا۔اندر موجود مجاہدوں نے بھی اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔اس پوسٹ پر بیس کے قریب افغان فوجی موجود تھے۔تمام کو انھوں نے باندھ دیا تھا۔بسم اللہ جان کے دو مسلح ساتھی ان کی نگرانی کر رہے تھے اور باقی افغان فوجیوں کا اسلحہ،ایمونیشن اور دوسری کام کی چیزیں نیچے لے جا کر اپنی گاڑی میں لوڈ کر رہے تھے۔

اندر کا جائزہ لے کر ہم باہر نکل آئے۔ایک طرف پلاسٹک کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ان پر بیٹھ ہم وقت

http://sohnidigest.com

گزارنے لگے۔تھوڑی دیر تک مجاہدین ایمونیشن اور ہتھیاروں وغیرہ کو دو گاڑیوں میں لوڈ کر چکے تھے۔آدھے افراد کو کمانڈر بسم اللہ جان نے واپس جانے کا حکم دیا کیونکہ فائر ہونے کے بعد ہم نے وہاں سے فرار ہونا تھا اور مناسب یہی تھا کہ اس سے پہلے سامان والی گاڑیاں اپنے ٹھکانے کی طرف بھیج دی جاتیں۔

تقریب والی جگہ پر لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔رائفل کے پیچھے لیٹ کر میں لیوپولڈ سائیٹ کے سے تقریب والی جگہ کا جائزہ لینے لگا۔رینج ماسٹر کی ٹیلی سکوپ سائیٹ عام انسانی آنکھ سے پچیس گنا زیادہ طاقتور ہے۔اس میں پورا منظر بالکل صاف نظر آرہا تھا۔آنے والے گورے سائیٹ کے اندر صاف نظر آرہے تھے۔زیادہ تر تو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے البتہ اکا دکا دائیں بائیں جوڑیوں میں کھڑے ہو کر بات چیت کر رہے تھے۔باوردی بیرے انھیں مشروبات پیش کر رہے تھے۔غالباً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ وہ کون سا مشروب تھا۔افغان فوج کے چند آفیسر بھی مجھے صوفوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئے تھے۔ان کی پہچان مجھے فوجی وردی کی وجہ سے ہو پائی تھی۔اکا دکا خواتین بھی نظر آرہی تھیں۔

میری نظریں پھسلتی ہوئی ایک لڑکی پر مرکوز ہوئیں اور میں چونک گیا۔الگ تھلگ بیٹھی ہاتھ میں پکڑے جام سے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔وہ میجر جینیفر ہنڈ سلے تھی۔لیکن اس وقت بھی وہ ٹریسی والکر کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

تمام کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ انھیں کسی کا انتظار ہے۔درمیان میں پڑا ٹو سیٹر صوفہ سیٹ خالی پڑا تھا اس کے ساتھ پڑے ہوئے سنگل سیٹ صوفوں پر دو آدمی بیٹھے تھے۔باقی تمام کرسیاں اور صوفے بھی تقریباً بھر چکے تھے۔

پھر ایک لمبے تڑنگے سفید سوٹ والے آدمی کی آمد پر تمام نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی تھی۔درمیان والے صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے تمام کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سب نے اپنی جگہ پر نشست سنبھال لی۔میں نے نظر بھر کر سامنے لگے جھنڈے کو دیکھا جو بالکل ہلکے انداز میں ہل کر واضح کر رہا تھا کہ ہوا کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی کہ گولی کو ہدف سے دائیں بائیں کر سکتی۔مطمئن ہو کر میں دوبارہ سائیٹ میں دیکھنے لگا۔جبکہ میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے سیفٹی ہٹا دی تھی۔

''ذیشان بھائی!......میرا خیال ہے مزید انتظار فضول ہوگا۔'' میرے ساتھ لیٹے بسم اللہ جان نے بھی فائر کرنے کا عندیہ دیا۔

میں نے درمیانی صوفے پر پھیل کر بیٹھے آدمی کے چہرے پر نشانہ سادھتے ہوئے کہا۔''میرا بھی یہی خیال ہے۔بس مہمان خصوصی کا انتظار تھا۔'' یہ کہتے ہی میں نے سانس روکا اور ایک جھٹکے سے ٹریگر دبا دیا۔اس وقت وہ گلاس کو منہ کی طرف لے جا رہا تھا لیکن اس کے مقدر کا رزق یقیناً پورا ہو چکا تھا تبھی گلاس کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے رینج ماسٹر کی گولی اس کے ماتھے تک کا سفر طے کر چکی تھی۔طاقت ور گولی نے اس کی کھوپڑی کا دایاں حصہ ہی اڑا دیا تھا۔

''وہ مارا۔'' بسم اللہ جان نے پرجوش انداز میں نعرہ لگایا۔مگر میں نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر رائفل کو دوبارہ کاک کر کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بیرل کا رخ موڑا تمام لوگ ایک لمحے کے لیے سن ہو گئے تھے۔میرے فائر کرنے سے پہلے دائیں اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے دونوں آدمی صوفے پر تڑپنے والے کو مدد دینے کے لیے اس کے قریب ہوئے،مگر وہ ہر قسم کی مدد سے دور جا چکا تھا۔دائیں جانب والے آدمی کے ساکت ہوتے ہی میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا اور وہ آدمی بھی اپنی کھوپڑی کے چوتھائی حصے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔رینج ماسٹر کی گولی اس کی کھوپڑی سے گزر کر بائیں طرف موجود آدمی کے کندھے کو بھی زخمی کر گئی تھی۔ایک نے جان سے ہاتھ دھوئے جبکہ دوسرا زخمی ہو کر تڑپنے لگا تھا۔صوفے سے نیچے گرنے کی وجہ سے مجھے اس کا صحیح نشانہ نہیں مل رہا تھا۔اس پر وقت ضائع کیے بغیر میں دوسروں کو نشانہ بنانے لگا۔سرعت سے میں نے میگزین میں موجود باقی تین گولیاں فائر کیں۔میرا نشانہ زیادہ تر وہ بنے جو شاک کی سی کیفیت میں اپنی جگہ پر ہکا بکا بیٹھے یا کھڑے رہ گئے تھے۔

میگزین خالی ہوتے ہی میں نے نئی میگزین لگائی اور رائفل کاک کر کے اپنا اگلا شکار ڈھونڈنے لگا۔وہاں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔کچھ لوگ صوفوں کے عقب میں پناہ لے رہے تھے۔کچھ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔اور کچھ ہمدردی دکھاتے ہوئے تڑپنے والوں کی مدد کی کوشش کر رہے تھے۔میری انگلی نے دو مرتبہ ٹریگر دبا کر مزید دو کو ان کے انجام تک پہنچایا۔اسی دوران مجھے وہ زخمی ہمت کر کے اٹھتا ہوا نظر آیا۔اس کے کندھے میں تو اتفاق سے گولی

لگی تھی البتہ اس کے سر میں میں جان بوجھ کر گولی اتارنا چاہتا تھا۔اس کے سیدھا ہوتے ہی میری بیرل کا رخ اس کی جانب گھوما اسی وقت کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا کہ وہ جینیفر تھی۔ زخمی کو اپنے جسم کے پیچھے چھپاتے ہوئے اس کی نظریں اسی جانب اٹھی تھیں جہاں ہم موجود تھے۔ وہ زبردست سنائپر تھی اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کس جگہ سے فائر کیا جا رہا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا یوں بے وقوفوں کے انداز میں کسی کو بچانے کے لیے اپنے جسم کی آڑ مہیا کرنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں لہرایا اور میں چونک گیا۔''کیا اس نے پہچان لیا تھا کہ فائر کرنے والا میں ہوں اور اسی وجہ سے یوں دلیرانہ انداز میں میرے کھڑی ہو گئی تھی۔''

اسی وقت ایک دوسرا آدمی ان کے قریب پہنچا۔ یقیناً وہ جینیفر کی وجہ سے ہمت کر کے قریب آیا تھا۔ اور یہ بہادری اسے مہنگی پڑی۔ جونھی جینیفر کی نظر اس پر پڑی اس نے چیخ کر اسے واپس جانے کو کہا۔ گو اس کے الفاظ تو میرے کانوں تک نہیں پہنچے تھے مگر اس کے ہاتھوں کے اشارے اور انداز سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی یہ نصیحت یا مشورہ بے سود رہا تھا۔ جب تک دوسرے کی سمجھ میں جینیفر کی بات آتی، رینج ماسٹر کی گولی اسے سمجھا چکی تھی۔ اس کے بائیں کان کے ساتھ لگنے والی گولی نے اسے دائیں جانب اچھال دیا تھا۔ اس کا آدھا جسم صوفے پر اور آدھا نیچے تھا اس حالت میں تڑپتے ہوئے وہ کافی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا

میں نے دوبارہ رائفل کاک کی لیکن جینیفر وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے ہمراہ لیٹے ہوئے کمانڈر بسم اللہ جان نے کہا۔''ذیشان بھائی!......دوران جنگ، لڑائی میں شامل عورتوں مردوں کی تخصیص ختم ہو جایا کرتی ہے۔'' یقیناً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں جینیفر کے عورت ہونے کی وجہ سے اس پر گولی نہیں چلا پا رہا۔ اس کی بات سن کر مجھے لگا کہ میں جینیفر پر گولی نہ چلا کر کچھ غلط کر رہا ہوں۔ اس وقت میں اس سے ہونے والی آخری ملاقات کو سوچ رہا تھا جب میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے سامنے آنے کی صورت میں میں اس پر گولی چلانے سے خود کو نہیں روک پاؤں گا۔ اور اب اپنے الفاظ پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ''الوداع جینی!'' کہا اور میری انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے لگا۔

......

کوشش کے باوجود میں ٹریگر نہیں دبا سکا تھا۔میں نے رائفل کے بٹ پر ماتھا ٹیک دیا۔
مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کمانڈر بسم اللہ جان ایک مرتبہ پھر بولا۔ ”کیا سوچ رہے ہو اتنا وقت نہیں ہے۔“
اسے جواب دیے بغیر میں نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن میرے دل میں نہاں اس کی محبت مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔مجھ سے ملنے کی خاطر اس نے وہاں تک آنا گوارا کیا تھا اور اب میں کیسے اس کی جان لے لیتا
”ذیشان بھائی اٹھو چلیں۔“بسم اللہ جان زیادہ انتظار نہیں کر سکا تھا۔مجھے کہتے ہی وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوا......”راکٹ فائر کر دو۔“
جینیفر کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں نے ایک سرسری نظر صوفوں کی قطار پر گھمائی۔ایک کونے میں چھپے شخص کی کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔
کاک شدہ گولی سے اسے چھپنے کی ضرورت سے بے نیاز کرتے ہوئے میں اٹھ گیا۔کمانڈر بسم اللہ جان مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا۔
”ذیشان بھائی!......ان کا کافی نقصان ہو چکا ہے،تھوڑی دیر تک وہ پوری قوت سے یہاں حملہ کر دیں گے۔اور یقیناً ہیلی کاپٹر کی وجہ سے ہمیں نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“
میری سمجھ میں اس کا تیزی کرنا آ گیا تھا۔میں نے رائفل کو کھولے بغیر کندھے پر رکھا اور نیچے کی طرف دوڑ لگا دی۔اس وقت تک بسم اللہ جان کے ساتھی راکٹ فائر کر چکے تھے۔
دس منٹ میں میں نیچے پہنچ گیا تھا۔بسم اللہ جان اور اس کے ساتھی بھی میرے قریب پہنچ چکے تھے۔رائفل کو میں نے ڈبل کیبن کی عقبی نشست پر رکھا۔بسم اللہ جان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے تیزی سے درختوں کے جھنڈ سے نکالی اور ایک مخصوص جانب بڑھتا گیا۔اس کے باقی ساتھی دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ہمارے پیچھے ہی چل پڑے تھے۔دو گاڑیاں اسلحے وغیرہ کی بھر کر وہ پہلے ہی وہاں سے بھیج چکے تھے۔

کمانڈر بسم اللہ جان سیدھا چلتا رہا۔ وہ کچا رستہ آگے جا کر ایک سڑک سے مل گیا تھا۔ وہاں پر اس کے ساتھی ہم سے مخالف سمت مڑ گئے۔

''باقیوں نے اپنی سمت تبدیل کر لی ہے۔'' میں نے بسم اللہ جان کو مطلع کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''انھوں نے ہمارے ساتھ نہیں جانا۔'' مجھے مطلع کرتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے مختصراً کہا۔''ہم آرہے ہیں۔'' اور جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کرتے ہوئے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چار پانچ کلومیٹر کے بعد اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر پہاڑی کے دامن میں نظر آنے والے دو گھروں کی طرف موڑ دی وہ سڑک سے چھ سات سو گز دور تھے۔ ان گھروں کے قریب گاڑی روکتے ہوئے وہ بولا۔''رائفل اٹھا لو۔'' کلاشن کوف اس نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے عقبی نشست پر پڑی رینج ماسٹر اٹھا لی۔ گاڑی کو رکتے دیکھ کر ایک گھر سے درمیانی عمر کا ایک مرد بھاگتے ہوئے باہر نکلا۔ ہم سے رسمی مصافحہ کر کے اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی واپس سڑک کی جانب موڑ لی۔

''چلو۔'' بسم اللہ جان نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ دروازے پر ایک بوڑھا بابا ہمیں منتظر نظر آیا۔ دونوں سے معانقہ کر کے اس نے خوش آمدید کہا۔ اسی وقت بسم اللہ جان نے مجھے اس ٹیکری کی طرف متوجہ کیا جہاں دو ہیلی کاپٹر اترتے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری نظر دو تین کم عمر بچوں پر پڑی جو صحن میں کھیل رہے تھے۔ ایک کمرے کے دروازے سے ایک جواں سال عورت کا چہرہ جھلک رہا تھا، مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ ہم بوڑھے کی معیت میں چلتے ہوئے ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئے جو خوب سجا ہوا تھا۔ اندر داخل ہو کر وہ رکا نہیں بلکہ آگے بڑھتا گیا۔ کمرے سے ملحق غسل خانے میں گھس کر اس نے ہمارے اندر داخل ہونے کا انتظار کیا۔ جونھی ہم بھی اندر گھسے اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ غسل خانے کی چاروں دیواروں پر پلاسٹک کی زرد رنگ کی شیٹ لگی ہوئی تھی۔ دروازہ بند کر کے اس نے دروازے کے عقب میں آنے والی شیٹ کو ہٹایا اور دیوار کو دھکیلا تو

وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی دیوار ہٹتے ہی تنگ سا دروازہ نظر آیا۔ وہ بوڑھا اندر داخل ہو گیا اس کے پیچھے بسم اللہ جان اور سب سے آخر میں میں تھا۔ اس تنگ سی گیلری کا اختتام سیڑھیوں پر ہوا جو نیچے جا رہی تھیں۔ بارہ سیڑھیاں اتر کر ہم زیرزمین کمرے میں پہنچے کافی کھلا تہہ خانہ تھا۔ شمالی اور جنوبی دیواروں پر ٹنگے دو بلب تہہ خانے کو خوب روشن کیے ہوئے تھے۔ چاروں دیواروں کے ساتھ ایک ایک چارپائی لگی ہوئی تھی جن پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ دو چارپائیوں پر موٹی رضائیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ شاید انھیں ہماری تعداد کے بارے بسم اللہ جان پہلے سے آگاہ کر چکا تھا۔ درمیان میں لکڑی کی ایک میز بھی نظر آ رہی تھی جس پر ہاتھ سے کڑھائی کی ہوئی ایک سفید چادر بچھی تھی۔

بوڑھے نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے رینج ماسٹر کو ایک چارپائی پر رکھا اور خود دوسری چارپائی پر نشست سنبھال لی۔

ہمارے بیٹھتے ہی بوڑھے نے پوچھا۔ ’’چائے یا قہوہ۔‘‘

’’بہرام چچا! ہم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔‘‘ کمانڈر بسم اللہ جان نے کسی قسم کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

بہرام سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

’’ذیشان بھائی بہت عمدہ۔‘‘ بوڑھے بہرام کے باہر جاتے ہی بسم اللہ جان نے تحسین آمیز لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ’’بتایا تھا نا شاگرد بنانے کی پیش کش محدود مدت کے لیے ہے۔‘‘

بسم اللہ جان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’اب تو میں زبردستی شاگرد بنوں گا۔‘‘

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’ویسے سچ تو یہ ہے کہ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ کسی کو سکھا سکوں۔‘‘

’’یہ قدرتی صلاحیت ہوتی ہے ذیشان بھائی، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے سکھانے پر بھی ہم آپ کی طرح نشانہ باز نہیں بن سکتے۔‘‘

’’ہم گاڑی پر یہاں سے دور بھی نکل سکتے تھے۔‘‘ میں نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔

”بہت مشکل تھا۔ دیکھا نہیں تھا اس پوسٹ پر دو ہیلی کاپٹر پہنچ گئے تھے۔ اور اب تک کافی ساری گاڑیاں بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ سڑکوں کی ناکا بندی بھی ہو گئی ہو گی۔ وہ سارے علاقے کا گھیراؤ کر لیں گے۔ اس لیے جب تک ہماری تلاش کی سرگرمی ماند نہیں پڑتی، ہمیں چند دن یہیں گزارنے پڑیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”جو آدمی ہماری گاڑی لے گیا ہے اسے کوئی کچھ نہیں کہے گا؟“

اس نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ”نہیں اس کے کاغذات وغیرہ مکمل ہیں، یہ گاڑی بھی اسی کے نام پر ہے۔ اس وقت اس نے ایک آدمی کو گھر سے اٹھا کر ائیر پورٹ پہنچانا ہے۔ اس پر کسی صورت کوئی بات نہیں آ سکتی۔“

”یہ سب کچھ آپ نے پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔“

”پہلے ہی سے طے کرنا پڑتا ہے یار!“

”بہ قول آپ کے ہم یہاں چند دن رہیں گے، اس دوران کمانڈر عبدالحق واپس آ گیا پھر؟“

”اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہم نکل چلیں گے۔ ورنہ خواہ مخواہ خطرہ مول لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔

”برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“ میں اسے حیرانی سے گھورنے لگا۔

”آپ نے اس لڑکی کو کیوں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ وہ آپ کے لیے نہایت آسان ہدف تھی۔“ وہ میجر جینیفر ہنڈسلے کے بارے مستفسر تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے اس وقت مجھے اس پر گولی چلانے کی ترغیب بھی دی تھی۔ ویسے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اس پر نشانہ سادھا ہوا ہے۔“

”آپ اتنی تیز رفتاری سے فائر کر رہے تھے اچانک ہی آپ رک گئے۔ اور دوربین میں مجھے بھی وہ لڑکی واضح نظر آ رہی تھی، کہ باقی لوگ چھپنے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں اور وہ سینہ تانے کھڑی ہے۔ کوئی وجہ تو تھی نا۔ اس وقت مجھے یہی لگا کہ آپ عورت سمجھ کر اس پر گولی نہیں چلا رہے۔ لیکن بعد میں سوچا تو معاملہ کچھ اور لگا

۔کیوں کہ کوئی امریکن عورت اتنی دلیر نہیں ہوسکتی جو یوں اکڑ کر ایک سنائپر کے سامنے کھڑی رہے جبکہ دائیں بائیں اس کے کئی ساتھیوں کی لاشیں بھی بکھری پڑی ہوں۔سب سے بڑھ کر ہماری جانب یوں دیکھ رہی تھی جیسے ہم اسے نظر آرہے ہوں۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔''وہ میجر جینیفر ہنڈ سلے ہے۔میرے ساتھ اس نے سنائپر کورس کیا ہے اور افغانستان کے محاذ پر وہ مجھے ملنے کی خاطر ہی پہنچی ہے۔''

''اسے کیا معلوم کہ آپ افغانستان میں ہیں اور یہ کہ ابھی فائر کرنے والے آپ ہی ہیں۔اور آپ کو کیسے معلوم کہ وہ آپ کی خاطر یہاں پہنچی ہے۔'' وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا تھا۔

''گزشتہ کئی ماہ سے میں وزیرستان میں مصروف تھا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ دہشت گردوں کا اصلی سرپرست امریکہ ہی ہے وہاں وزیرستان میں جس دہشت گرد سے میرا ٹکراؤ ہوا وہ امریکنز کا خاص پرزہ تھا ۔اس کی اور اس کے جانشین کی موت کے بعد مجھے ایک جرگے میں سامنے آنا پڑا، وہیں سے میری تصویر امریکنز تک پہنچ گئی۔چونکہ میں سال بھر پہلے ہی امریکہ سے سنائپر کورس کر کے آیا تھا اس لیے مجھے پہچاننے میں انھیں کوئی دقت نہ ہوئی۔میجر جینیفر امریکہ کی خفیہ ایجنسی کی میجر ہے اور مجھ سے محبت کی دعوے دار بھی۔بس مجھے امریکہ کے لیے کام کرنے پر راضی کرنے کے لیے وہ افغانستان آنے پر تیار ہوگئی............''میں نے جینفر کے متعلق تمام ضروری باتیں کمانڈر بسم اللہ جان کے سامنے دہرا دیں۔

میری بات کے اختتام پر اس نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔''تو وہ آپ کو ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔''

''ہوں۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے یہ بات اب تک بھی واضح نہیں ہوئی کہ اس میجر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ فائر کرنے والے آپ ہیں۔''

''جتنی دور سے انھیں نشانہ بنایا جا رہا تھا،شاید جینی کے نزدیک اتنے فاصلے سے میں ہی کسی کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔''

''اب کی ہے کام کی بات۔'' وہ چہکا۔''ویسے ایک حبشن سے عشق لڑانے کا خیال آپ کو کیسے آیا۔اتنی دور

سے بھی اس کی بدصورتی مجھ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکی۔‘‘

یقیناً طاقت ور دوربین سے جینیفر کے ٹریسی والکر کے روپ کی کالک اسے واضح ہوگئی تھی۔

میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔’’کمانڈر!......اگر آپ نے اس کی اصل شکل دیکھ لی تو جو پہلا خیال آپ دماغ میں آئے گا وہ یہی ہوگا کہ اسے مسلمان کر کے نکاح پڑھاؤں یا اہل کتاب سے نکاح پڑھوانے کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جائے۔‘‘

’’مذاق کر رہا تھا یار!‘‘میری سنجیدگی کو اس نے غصے پر محمول کیا تھا۔

’’مگر میں مذاق نہیں کر رہا، بلا شک وشبہ وہ ایسی ہی ہے۔‘‘اسی وقت بوڑھا بہرام خان کھانے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوا۔اور ہم چپ ہوگئے۔

ہمارے کھانا کھانے کے دوران بہرام چاچا قہوہ بنا کر لے آیا تھا۔قہوہ پی کر میں نے بہرام چاچا سے رائفل صاف کرنے کے لیے کپڑا مانگا اور رینج ماسٹر کو کھول کر صاف کرنے لگا۔بسم اللہ جان آرام کرنے لیٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

چند دن ہمیں وہیں گزارنے پڑ گئے تھے۔اس دوران کمانڈر بسم اللہ جان موبائل فون پر بھی محتاط انداز میں گفتگو کیا کرتا تھا۔شہر بھر میں مجاہدین کی تلاش میں کافی چھاپے مارے گئے مگر دشمنوں کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ان کا کافی نقصان ہوا تھا۔نو آدمی بشمول ایک کرنل اور لیفٹیننٹ کرنل کے ہلاک ہوئے تھے اور ایک لیفٹیننٹ کرنل زخمی ہوا تھا۔زخمی ہونے والا وہی تھا جسے میجر جینیفر ہنڈ سلے کی بدولت رعایت ملی تھی۔مرنے والے قریباً سارے آفیسر ہی تھے۔بس ایک افغانی فوجی غلطی سے مارا گیا تھا۔وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کا باقی جسم صوفے کے عقب میں چھپا تھا اور صرف اس کا سر آڑ سے باہر نظر آرہا تھا۔مرنے والے سینئر کا نام جان مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔وہ کرنل کولن فیلڈ تھا۔یقیناً وہ وزیرستان میں حلیہ تبدیل کر کے آیا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں پر اس کے بہروپ میں کوئی اور آیا ہو اور اس کا صرف نام استعمال کیا گیا ہو۔البرٹ بروک بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔شاید وہ بھی حلیہ تبدیل کر کے مجھے ملتا رہا تھا یا پھر وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا۔جینیفر تو ٹریسی والکر کے حلیے میں مجھے نظر آگئی تھی۔اتنے فاصلے سے شکلیں بالکل واضح تو نظر نہیں آتیں لیکن جس کے ساتھ کچھ وقت بتایا

جا چکا ہو اس کی پہچان مشکل نہیں ہوتی۔شکل وصورت ،جسمانی خال و خد اور حرکات و سکنات بھی کسی آدمی کی پہچان میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

جینیفر کے معاملے میں میرے دل میں ایک اور دھڑکا بھی موجود تھا۔اگر اس نے مجھے پہچان لیا تھا تو وہ یہ بات اپنے سینئرز کو بتا سکتی تھی۔اور اتنے اہم آدمیوں کی اموات کے ذمہ دار کو یقیناً وہ پہلی فرصت میں مروانا پسند کرتے۔لیکن پھر اپنی جینی سے مجھے یہ بات بعید نظر آئی کہ وہ مجھے مروا دے گی۔اگر وہ سینہ تان کر میرے سامنے کھڑی ہوسکتی تھی تو مجھے بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ میرے خلاف کسی کارروائی کی ذمہ دار نہ بنتی۔

اس کارروائی کے بعد کمانڈر بسم اللہ جان نے اپنے تمام ساتھیوں کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا حکم دے دیا تھا۔خود میں اور وہ بھی ہفتہ بھر اسی تہہ خانے میں چھپے رہے۔اس دوران بہرام چاچا اور اس کا بیٹا دلگیر خان ہماری ضروریات کا خیال رکھتے رہے۔کمانڈر عبدالحق ابھی تک نہیں لوٹا تھا اس وجہ سے مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔

حالات کے تھوڑا سا ساز گار ہوتے ہی ہم دلگیر خان کی گاڑی میں بیٹھے اپنے ٹھکانے کا رخ کر رہے تھے۔رینج ماسٹر اور بسم اللہ جان کی کلاشن کوف دلگیر خان ایک دن پہلے بسم اللہ جان کے خفیہ اڈے تک پہنچا چکا تھا۔اس وقت ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے ایک ایک پستول موجود تھا۔ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر پہاڑوں میں چھپے خفیہ اڈے تک پہنچ گئے تھے۔ہمیں پہاڑ کے دامن میں اتار کر دلگیر خان وہیں سے رخصت ہو گیا۔ہم جب غار در غار ٹھکانے کے پاس پہنچے تو ہمیں پر جوش طریقے سے خوش آمدید کہا گیا۔انھوں نے منصوبہ اتنا بڑا نہیں بنایا تھا جتنا کہ دشمن کا نقصان کر چکے تھے۔اور اس کارروائی کا روحِ رواں میں تھا۔اس سے پہلے کمانڈر عبدالحق انھیں میری نشانہ بازی کے کافی واقعات سنا چکا تھا مگر حالیہ واقعہ کے تو وہ خود شاہد تھے۔ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی دور سے یوں کامیاب نشانہ بازی ممکن ہو پائے گی۔

☆......☆......☆

عبدالحق کو گئے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے۔اس نے کچھ زیادہ ہی وقت لے لیا تھا۔

تیسرے ہفتے کے اختتام پر وہ لوٹ آیا۔اس تک بھی میرے حالیہ کارنامے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ملتے ساتھ اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے شاباش کہا تھا۔وہ بھی کامیاب لوٹا تھا۔رات کو آرام کے لیے لیٹتے وقت وہ تفصیل

بتانے لگا۔ ہماری کارروائی کی تفصیلات وہ پہلے ہی باریک بینی سے کرید چکا تھا۔ مجھے ان تفصیلات کو جاننے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کہ اس نے کس طرح میرے ویزے وغیرہ کا بندوبست کیا اور کیسے ایک کنسٹریکشن کمپنی میں جگہ پیدا کی۔ اس کا خیریت اور کامیابی سے لوٹ آنا ہی میرے لیے کافی تھا۔ ویزے کی ضمن میں خرچ ہونے والی رقم میں نے اس کے حوالے کر دی تھی۔ اب میرے پاس لے دے کے گلگارے بہن کی دی ہوئی رقم ہی باقی بچی تھی۔ اور غزنی جانے کے لیے مجھے پیسوں کی اچھی خاصی ضرورت پڑ سکتی تھی بہرحال وہ بعد کا مسئلہ تھا اس بارے میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا، فی الحال مجھے آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

جینیفر سے رابطے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی ورنہ مجھے اتنے پاپڑ بیلنے نہ پڑتے۔ مجھے اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا، اگر آخری ملاقات میں، میں نے اس سے رابطہ نمبر لے لیا ہوتا تو اتنا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

اس کے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں بھی اندر گھس گیا۔ اس سے دو میزیں چھوڑ کر مجھے خالی نشست مل گئی تھی۔ بیرے کو قہوہ لانے کا بتا کر میں بہ ظاہر سرسری نظر ہوٹل کے ہال میں دوڑانے لگا۔

میں پچھلے ایک ہفتے سے غزنی میں موجود تھا۔ میری شناخت کے کاغذات پورے تھے۔ آتے وقت کمانڈر بسم اللہ جان نے چند ساتھیوں کے پتے دیے تھے، جن سے میں ضرورت کی کوئی چیز بھی مانگ سکتا تھا۔ کسی کے گھر میں پناہ لینے کے بجائے میں نے ایک سستے سے ہوٹل میں رہنا پسند کیا تھا۔ کیونکہ بغیر اشد ضرورت کے میں کسی کو تنگ کرنا یا خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ دوسرا امریکن تھا جس کا میں تعاقب کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں ایک امریکن صحافی کے پیچھے تین دن تک پڑا رہا تھا مگر وہ بندہ صاف نکلا، اب یہ دوسرا تھا اور اس کی بھی کوئی مشکوک حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ سارا دن غزنی کے مضافات میں گھومتا، مختلف مقامات کی تصاویر لیتا، مقامی لوگوں سے ملاقات کرتا۔ یوں جیسے وہ کوئی خاص رپورٹ تیار کر رہا ہو۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس ایک نائن ایم ایم پستول موجود تھا جو مجھے کمانڈر بسم اللہ جان سے ملا تھا۔ اس پستول سے فائر کر کے میں نے اس کے ٹھیک ہونے کی اچھی طرح تسلی کر لی تھی۔

شام تک میں اسی صحافی کے تعاقب میں لگا رہا۔ اندھیرا چھانے پر میں اپنے ہوٹل میں لوٹ آیا تھا۔ چونکہ

مسلسل ایک ہوٹل میں رہنا مجھے مشکوک کر سکتا تھا اس وجہ سے میں دو تین دن سے زیادہ کسی ہوٹل کو اپنا مسکن نہیں بناتا تھا۔صبح میرا ارادہ کابل جانے کا بن رہا تھا کیونکہ غزنی میں مجھے اپنے مقصد کا حصول مشکل نظر آنے لگا تھا۔

رات کا کھانا میں ہوٹل کے ہال ہی میں بیٹھ کر کھاتا اور اس بہانے وہاں موجود لوگوں پر نظر بھی ڈال لیا کرتا ۔کھانا کھانے کے دوران ایک مقامی آدمی پر میری نظر پڑی،اس نے چہرے پر مفلر کی طرح کالے رنگ کی چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہال میں دوڑائی۔اس کی نظر ایک لمحے کے لیے مجھ پر رکی اور پھر دائیں بائیں کا جائزہ لے کر وہ مجھ سے دو ٹیبل چھوڑ کر بیٹھ گیا۔چال ڈھال سے وہ کچھ دیکھا بھالا لگ رہا تھا،مگر میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔گو اس معاملے میں میری یادداشت بہت تیز ہے اور کوئی ایسا آدمی جس سے میرا ہلکا سا بھی واسطہ رہ چکا ہو مجھے بھولتا نہیں ہے،لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آسکا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔شاید چہرے سے لپٹی ہوئی چادر کی وجہ سے میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔کھانا کھا کر میں نے قہوہ پیا،اس دوران اس نے بھی اپنے لیے قہوہ منگوا لیا تھا۔قہوہ پی کر بھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کن اکھیوں سے مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔

جونھی میں نشست چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا میں نے اسے بھی استقبالیہ کا رخ کرتے دیکھا۔کمرے میں پہنچ کر میں نے چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا دی۔اندازے کے مطابق تھوڑی دیر بعد ہی مجھے گیلری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی جو میرے کمرے کے سامنے آکر رک گئی۔چابی کے سوراخ سے بھی مجھے اسی کے کپڑوں کا رنگ نظر آرہا تھا۔میں فوراً دروازے سے ایک طرف ہوا کیونکہ مجھے شک تھا کہ وہ چابی کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کرے گا۔مگر میرے اندازے کے برعکس دروازے پر ہلکی سی۔’’ٹھک ٹھک۔‘‘ ہوئی۔

پستول ہاتھ میں تھام کر میں نے اسے چھپانے کے لیے جسم پر چادر لپیٹی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

’’اسلام علیکم ذیشان بھائی!‘‘اس نے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا تھا۔اب اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔اس کا نام تو میں نہیں جانتا تھا البتہ امریکی کیمپ پر حملے کے وقت وہ میرے ساتھ ہی تھا۔

’’آپ۔‘‘میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا موقع دیا۔اس کے اندر گھستے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

''بیٹھو۔'' لکڑی کی پرانی سی کرسی کی طرف اشارہ کر کے میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔

''آپ کا نام مجھے نہیں آتا۔''

''احمد۔''

''تو احمد بھائی وہیں ہال ہی میں مل لیتے۔ مجھے ایسے ہی ڈرا دیا۔''

''میں نے سوچا آپ مجھے نہیں پہچان پائیں گے۔ اور اپنا تعارف کرانے کے لیے علیحدگی کی ضرورت تھی۔''

''ہوٹل میں گھستے ہی میں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ بس چہرہ چھپا ہونے کی وجہ سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔''

''آپ کا پتا مجھے کمانڈر سے معلوم ہوا ہے اور انھی نے مجھے آپ سے ملنے کا کہا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''خیریت۔''

''ہاں خیریت ہے، ایک مشکوک شخص کے بارے اطلاع دینا تھی۔''

''تو موبائل فون پر بتا دیتے۔'' کمانڈر بسم اللہ جان نے ایک موبائل فون بھی میرے حوالے کیا تھا۔

''مناسب یہی ہے کہ میں دور سے اس کی شکل آپ کو دکھا دوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''ابھی جانا پڑے گا۔''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ ہوٹل سے تھوڑی دور آتے ہی ہم اکٹھے ہو گئے تھے۔ مجھے ساتھ لیے وہ پیدل ہی ایک جانب روانہ ہو گیا۔ امریکی کیمپ پر حملے کے بعد وہ چھپنے کے لیے شہر میں آ گیا تھا۔ یہاں اس کا اپنا گھر موجود تھا۔ مجھے کمانڈر بسم اللہ جان نے جن آدمیوں کے پتے دیے تھے ان میں ایک احمد بھی تھا لیکن یہاں آ کر میں کسی سے بھی نہیں ملا تھا۔ اس کی گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ کمانڈر بسم اللہ جان کے دو مخبروں کی لاشیں ایک دن کے فرق کے ساتھ غزنی کے مضافات سے ملیں۔ مخبر عموماً دونوں جانب سے ملے ہوتے ہیں اس لیے انھیں اپنا راز نہیں بتایا جاتا۔ دونوں کو مارنے سے پہلے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا

۔ان میں سے ایک کا تعلق افغان آرمی سے تھا۔اوراس نے مرنے سے ایک دن پہلے کمانڈر بسم اللہ کے ساتھی بلال سے بات کر کے اپنے تعاقب کی بابت مطلع کیا تھا۔ہر مخبر کے سامنے ایک ہی آدمی کو سامنے لایا جاتا ہے جو اس مخبر سے رابطے میں رہتا ہے۔اوراس فوجی کے ساتھ بلال کا رابطہ تھا۔وہ چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔بلال نے اسے چھٹی ختم کر کے واپس حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا،لیکن اگلے ہی دن شہر کے مضافات سے اس کی لاش ملی تھی۔بلال فوراً زیرزمین ہوگیا،البتہ جانے سے پہلے اس نے فوجی کا تعاقب کرنے والے کی پہچان احمد کو کرادی تھی۔گزشتہ روز ایک دوسرے مخبر کی لاش ملی۔دوسرے نے بھی کئی بار مجاہدین کو کام کی خبریں پہنچائی تھیں۔دوسرا ایک صحافی تھا۔ کمانڈر بسم اللہ جان کو شک تھا کہ دونوں قتل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔اس نے احمد کو مجھ سے رابطہ کر کے مخبر کا تعاقب کرنے والے کی بابت بتانے کا کہا۔اوراب احمد مجھے اسی مقصد سے وہاں لے جارہا تھا۔مشکوک شخص کے ٹھکانے تک احمد تمام تفصیل دہرا چکا تھا۔وہ غزنی کے بہترین ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔رات اتنی نہیں بیتی تھی۔ہوٹل کا ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ہم بھی ایک کونے میں خالی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

''دوسری منزل کمرہ نمبر بتیس اے میں رہتا ہے۔کرس کارٹر نام ہے۔شاید کھانے کے لیے نیچے ہال میں آ جائے۔''دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔''اگر میں نہ ہوتا تو آپ اس کے ساتھ کیا کرتے۔''

''ایسے جاسوسوں کو ہم بھی معاف نہیں کرتے۔''اسی وقت بیرہ ہمارے قریب آیا۔

''دو کافی۔''احمد نے اس کے دریافت کرنے سے پہلے بتادیا اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔احمد مجھے ہوٹل کے بارے ضروری باتیں بتانے لگا۔کافی پی کر بھی ہم کافی دیر بیٹھے رہے۔اور پھر ہم مایوس ہو کر اٹھنے ہی لگے تھے کہ احمد ایک دم میری طرف جھکا۔

''وہ سفید سوٹ والا سیڑھیوں سے اتر کر آرہا ہے۔''میں غیر محسوس انداز میں اس طرف متوجہ ہوا۔گھٹے ہوئے مضبوط جسم اور لمبے قد والا ایک آدمی مجھے سیڑھیوں سے اترتا دکھائی دیا۔ہال میں طائرانہ نظر دوڑا کر وہ ایک خالی میز کی طرف بڑھ گیا۔اس کے نشست سنبھالنے تک چاق و چوبند بیرہ اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔اس کے آرڈر دینے تک بدیسی لباس میں ملبوس ایک مقامی حسینہ سیڑھیاں اترتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور بے تکلفی

سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔لڑکی کی پیٹھ ہماری جانب تھی۔اس کے انداز سے واضح نظر آرہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہے۔

''یہ کون ہے۔'' کن اکھیوں سے اسے گھورتے ہوئے میں احمد سے مستفسر ہوا۔

''اس طرح کی کئی لڑکیاں یہاں مل جاتی ہیں بس جیب کا منھ کھولنا پڑتا ہے۔''

''میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔'' وہاں مزید بیٹھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔

اثبات میں سرہلاتے ہوئے احمد نے بیرے کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔اور بل ادا کر کے ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔کرس کارٹر لڑکی سے محو گفتگو تھا لیکن اس کی آنکھیں کسی سرچ لائیٹ کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

ہوٹل سے نکلتے ہی میں نے کہا۔''مجھے کچھ رقم چاہیے۔''

''چلو۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر ایک پلازے کی طرف بڑھ گیا۔وہاں لگی اے ٹی ایم مشین سے مطلوبہ رقم نکال کر اس نے میرے حوالے کی اور ہم واپس مڑ آئے۔

میرے ہوٹل کا رخ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔''اب کیا ارادہ ہے؟''

''صبح اس ہوٹل میں کمرہ لوں گا باقی لائحہ عمل بعد کا مسئلہ ہے۔''

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔''اس نے پرخلوص لہجے میں آفر کی۔

''موٹر سائیکل مل جاتی تو اس کے تعاقب میں آسانی رہتی۔لازماً اس کے پاس ذاتی یا کرائے کی گاڑی ہو گی۔''

''ضرور ملے گی۔مگر اتنی سردی میں موٹر سائیکل کی سواری کچھ مشکل ہو جاتی ہے۔میں خود ٹیکسی میں آتا جاتا ہوں۔''

''مجبوری ہے،شاید بروقت ٹیکسی نہ مل پائے۔''میں نے خیال ظاہر کیا۔

''صحیح کہا۔''اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ہم ہوٹل کے قریب پہنچ چکے تھے۔اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارہ کر کے روکا۔اندر بیٹھتے ہی وہ اپنے گھر کا پتا بتانے لگا۔وہ پتا پہلے سے میری یادداشت

میں محفوظ تھا کہ بسم اللہ جان اس کا پتا میرے حوالے کر چکا تھا۔البتہ میں نے وہاں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گھر کے سامنے اتر کر اس نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

میں نے پوچھا۔"ساتھ کون رہتا ہے۔"

وہ مسکرایا۔"تمھاری بھابی۔"

اسی وقت اندر سے قدموں کی چاپ ابھری اور ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔"کون؟"

اس نے جواب دیا۔"احمد، میرے ساتھ مہمان بھی ہے۔"

دروازہ کھلتے ہی میری نظر ایک جواں سال خاتون پر پڑی جس نے مہمان کا سن کر چہرہ ڈھانپ لیا تھا صرف اس کی آنکھیں چادر کے عقب سے جھلک رہی تھیں۔اس پر نظر پڑتے ہی میں نے سر جھکا لیا تھا۔وہ بھی دروازہ کھول کر پیچھے مڑ گئی۔

"احمد بھائی!......چائے پانی کا تکلف نہ کرنا۔"میں نے فوراً اسے منع کیا۔"بلکہ موٹر سائیکل باہر ہی لے آؤ۔"

"ایک پیالی قہوہ، سردی کے ساتھ مقابلہ کرنے میں مدد دے گا۔"

"پھر کسی وقت سہی۔"

"ٹھیک ہے۔"مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے وہ اندر گھسا اور لمحہ بھر بعد موٹر سائیکل لیے باہر نکل آیا۔اس کے ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے اور موٹر سائیکل کے سیفٹی گارڈ کے ساتھ لٹکا ہیلمٹ دیکھ کر میں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ سردی کے موسم میں بغیر دستانوں اور ہیلمٹ کے موٹر سائیکل چلانا ایک عذاب ہی ہوتا ہے۔

اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں واپس ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔

وہ رات میں نے اسی ہوٹل میں گزاری۔کابل جانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا تھا۔نو دس بجے کے قریب ناشتا کر کے میں اپنا مختصر سامان اٹھا کر نکل آیا۔دوسرا ہوٹل اتنی دور نہیں تھا کہ مجھے ٹیکسی وغیرہ کا تکلف کرنا پڑتا۔پندرہ بیس منٹ میں میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ہوٹل کے ہال مجھے اکا دکا گاہک ہی نظر آئے۔ایسے ہوٹلوں کی رونق

رات کے وقت دیکھنے والی ہوتی ہے۔

استقبالیے پر جا کر میں نے کمرے کا پوچھا۔ نچلی منزل میں ایک کمرہ خالی تھا مگر میں نے دوسری منزل پر کمرہ لینا پسند کیا تھا۔

کمرے کی چابی میرے جانب بڑھاتے ہوئے استقبالین معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''سر اگر کوئی خاص خدمت درکار ہو تو بلا تکلف حکم کرنا۔''

''ضرور۔'' چابی پکڑتے ہوئے میں نے منھ بنایا۔ اس کی خاص خدمت سے میں ناواقف نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کی غلیظ خدمتوں سے میں یونھی بہتر تھا۔

تین دنوں کا ایڈوانس کرایہ جمع کرا کے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کمرے میں گزار کر میں ہوٹل کے ہال میں آن بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری بے خبری میں وہ باہر نہ نکل جائے۔ ایک سنائپر کو جاسوس بننا پڑ گیا تھا۔

گو انتظار دنیا کا پر اذیت کام ہے، مگر سنائپر بے چارے کا تو انتظار کے ساتھ بہت مضبوط رشتہ ہے۔ اپنے شکار کے انتظار میں سنائپر کو کئی گھنٹے بلکہ دن گزارنے پڑ جاتے ہیں۔

آہستہ آہستہ ہال میں بیٹھے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں دو مرتبہ چائے منگوا کر پی چکا تھا۔ اسی اثناء میں دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ میں نے بھی کھانا منگوا لیا اور پھر بہ مشکل کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ میں نے کرس کارٹر کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ رات والی تتلی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ اب بھی سکن ٹائیٹ پاجامے اور بہ مشکل ناف تک آتی شرٹ میں ملبوس تھی۔ البتہ سردی کی وجہ سے گھٹنوں تک آتے فر کے کوٹ نے چھپنے کے کافی تقاضے پورے کر دیے تھے۔ کوٹ سامنے سے کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے دور ہی سے اس کے پیٹ کی سفیدی نظر آ گئی تھی۔ ہال میں رکنے کے بہ جائے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اسے دیکھتے ہی میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ان کے دروازے کے قریب پہنچنے تک میں نے بل دستخط کر کے واپس بیرے کی طرف بڑھایا اور ان کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

میرے دروازے سے نکلنے تک وہ پارکنگ میں پہنچ کر سفید رنگ کی کار میں بیٹھ رہے تھے۔ میں ان پر توجہ

دیے بغیر موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ میرے موٹر سائیکل ان لاک اور اسٹارٹ کرنے تک وہ پارکنگ سے نکل کر سیمنٹ کی روش پر چڑھ چکے تھے۔ میں نے ان کے سڑک تک جانے کا انتظار کیا اور پھر موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

شہر میں کسی کا تعاقب کرنے کے لیے موٹر سائیکل ایک بہترین سواری ہے۔ میں محتاط انداز میں کار کا تعاقب کرتا رہا۔ مگر وہ شاید شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلے تھے۔ دو تین پلازوں میں گھوم پھر کر انھوں نے تھوڑی بہت خریداری کی اور واپس چل پڑے۔ اس دوران میں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہا تھا، مگر کرس کارٹر کی کوئی مشکوک حرکت میری نظر میں نہ آسکی۔

اسے ہوٹل کی پارکنگ میں مڑتے دیکھ کر میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر میں واپس ہوٹل کی جانب مڑ آیا۔

ہال میں مجھے وہ نظر نہیں آئے تھے۔ میں استقبالین کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی تک صبح والا آدمی بیٹھا تھا۔

''جی سر!'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

''ایک چھوٹا سا کام پڑ گیا تھا۔''

''حکم کریں۔'' ایک آنکھ میچتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''ابھی دو منٹ پہلے ایک گورے کے ساتھ براؤن کوٹ میں ملبوس ایک تتلی یہاں سے گزری ہے، مجھے تو مقامی لگ رہی تھی۔ حقیقت میں ایسا ہی ہے یا میری نظر کا قصور ہے۔''

''بڑی تیز نظر ہے آپ کی۔'' اس کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بہر حال حکم کریں۔''

''میرا دل ساتھ لے گئی ہے، وہی واپس لینا تھا۔''

''ہاہاہا۔'' اس نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا۔ ''ویسے اس سے بڑھیا مال بھی موجود ہے۔''

میں نے منھ بنایا۔ ''بڑھیا مال خاک پسند آئے گا جب دل کسی اور کے قبضے میں ہو۔''

''پھر تو معذرت خواہ ہوں، کیونکہ وہ ہمارے ہوٹل سے تعلق نہیں رکھتی۔''

''دھت۔'' میں نے بیزاری بھرے انداز میں استقبالیہ کاؤنٹر پر مکا رسید کیا۔

”اگر وہ ہمارے ہوٹل کی ہوتی تب بھی گورے کی مرضی کے بغیر کسی گاہک کو وقت نہ دے پاتی۔“

”کہیں اکیلی بھی جاتی ہے یا وہ خبیث ہر وقت ساتھ ہی چپکا رہتا ہے۔“

”کبھی دیکھا نہیں ہے، البتہ آپ کا رقیب کافی دفعہ اکیلے بھی نکل جاتا ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ جب بھی وہ یا لڑکی اکیلے کہیں جائیں تو مجھے فوراً معلوم ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سو ڈالر کا نوٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

سو ڈالر کے نوٹ کو حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولا۔”صبح دس سے شام چھ بجے تک آپ کو یہ اطلاع بغیر کسی رکاوٹ کے مل سکتی ہے۔“

”آپ کا نام؟“ میں نے نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”شان علی۔“ نوٹ جھپٹتے ہوئے اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔

”میں اپنے کمرے میں منتظر رہوں گا۔“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سارا دن ہوٹل کے ہال میں بیٹھنے سے بہتر تھا کہ نگرانی کا کام میں کسی اور سے لیتا۔ یوں بھی میں نے گورے کے بجائے اس لڑکی میں دلچسپی ظاہر کی تھی تا کہ شان کو کوئی شک نہ ہو۔

شام چھ بجے کے قریب مجھے انٹرکام پر شان علی کی کال موصول ہوئی۔”سر!......میں چھٹی کر رہا ہوں آپ کا رقیب اور تتلی کمرے ہی میں ہیں۔“

”شکریہ۔“ کہہ کر میں نے ریسیور رکھا اور تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ یوں بھی کافی آرام کر لیا تھا۔ آٹھ بجے تک میرا کوفت زدہ انتظار جاری رہا۔ آٹھ بجے وہ اس لڑکی کے ہمراہ نیچے ہال میں آ کر بیٹھ گیا۔ کھانا کھا کر دونوں تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ ان کے دوبارہ کمرے کا رخ کرنے پر بھی میں وہیں بیٹھا رہا کہ کہیں وہ اکیلا نہ لوٹ آئے مگر مزید آدھا گھنٹا انتظار کے بعد بھی اسے واپس نہ آتے دیکھ کر میں کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اتنی رات گئے وہ باہر نہ جاتا۔

دروازہ کنڈی کر کے میں بہ مشکل بوٹ اتار پایا تھا کہ موبائل فون بجنے لگا۔ سکرین پر کمانڈر بسم اللہ جان کا نام چمک رہا تھا۔

''اسلام علیکم۔'' میں نے کال وصول کی۔

''وعلیکم اسلام! آپ کہاں ہیں؟'' اس کی آواز میں شامل گھبراہٹ مجھے حیران کر گئی تھی۔

''اسی ہوٹل میں جہاں ہمارا دوست مقیم ہے۔''

وہ سرعت سے بولا۔ ''فوراً وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، احمد صبح سے غائب ہے، شاید آپ بھی ان کی نظروں میں آ گئے ہوں۔''

''مگر......''

''تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے ذیشان بھائی!'' اس نے قطع کلامی کی۔

''ٹھیک ہے۔'' رابطہ منقطع کرتے ہوئے میں وہاں سے نکلنے کا سوچنے لگا۔ شاید میں نے دیر کر دی تھی احمد کے ان کے ہتھے چڑھنے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ میں کل سے ان کی نظروں میں ہوں۔ اور یقیناً اسی وجہ سے کرس کارٹر نے بھی اپنے کسی آدمی سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ ان کی نظروں میں آئے بغیر میں ہوٹل سے نکل نہیں سکتا تھا۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ وہ صرف میری نگرانی کر رہے ہوتے اور میں باہر نکل کر انھیں جل دے کر بھاگ جاتا لیکن اس کے بعد کرس کارٹر میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ یقیناً میرے غائب ہونے کے بعد وہ بھی منظر عام سے ہٹ جاتا بہتر یہی تھا کہ میں اسے یرغمال بنا کر ہوٹل سے اڑن چھو ہونے کی کوشش کرتا۔ ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے پستول کی نال پر سائیلنسر چڑھایا اور جسم پر چادر لپیٹ کر باہر نکل آیا۔ گیلری سنسان پڑی تھی۔ کمرہ نمبر بتیس اے تک میں دبے قدموں چلتا ہوا پہنچا۔ دائیں بائیں دیکھ کر میں نے گیلری کے خالی ہونے کا یقین کیا اور سائیلنسر کو لاک کے ساتھ لگا کر ٹریگر دبا دیا۔

''ٹھک۔'' کی آواز ابھرتے ہی میں دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں ایسی حالت میں نہیں تھے کہ کمرے سے باہر ہونے والی۔ ''ٹھک۔'' انھیں متوجہ کر سکتی۔ یقیناً کرس کارٹر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسی جرات کا مظاہرہ کروں گا۔ میرے آندھی و طوفان کی طرح اندر گھسنے پر وہ ہڑبڑا گئے تھے۔ لڑکی کے

منھ سے سریلی چیخ برآمد ہوئی مگراس وقت تک میں دروازہ بھیڑ چکا تھا۔

''تولیہ لپیٹ لو۔'' میں نے ہکابکا بیٹھی لڑکی کواس کی بے لباسی کی طرف متوجہ کیا۔

اس نے ہڑبڑاتے ہوئے تولیہ اٹھا کر لپیٹ لیا تھا۔

''تم اسی طرح کھڑے ہوجاؤ۔'' کرس کارٹر کو میں انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔

''یقیناً تمھیں اپنی جان عزیز نہیں ہے۔'' کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں ہنسا۔''یہ کسی صحافی کا لہجہ تو نہیں ہے۔''

میری بات پر وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔

اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔''گھوم جاؤ۔'' وہ آہستہ سے گھوم گیا۔

''اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔'' میں نے اگلا حکم دیا۔یہ کہتے ہوئے میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

ہاتھ پیچھے لاتے ہوئے وہ ایک دم میری طرف مڑ کر پستول پر جھپٹا۔مجھے اس سے اسی قسم کی کارروائی کی توقع تھی۔پستول والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے میں نے پستول کو اس کی دست برد سے بچایا اس کے ساتھ ہی میرا بایاں مکا نیم دائرہ بناتا ہوا اس کی ٹھوڑی کی طرف بڑھا۔اس کی سمجھ میں کچھ آنے سے پہلے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔وہ لہراتا ہوا منھ کے بل نیچے گر گیا۔اگر فرش پر دبیز قالین موجود نہ ہوتا تو یقیناً اس کا تھوبڑا ٹیڑھا ہو گیا ہوتا۔

''کھڑی ہو جاؤ۔'' میں نے پستول کی نال سے لڑکی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔اسے میں پشتو میں مخاطب کر رہا تھا۔وہ لرزتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ایسی لڑکیوں کی بزدلی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔

''اس طرف۔'' میں نے پستول کی نال سے اسے غسل خانے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

''مم...... مجھے جانے دو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' وہ باقاعدہ کانپنے لگ گئی تھی۔

''تعاون کروگی تو یقیناً جان بچ جائے گی۔''

وہ پرجوش لہجے میں بولی۔''میں ہر قسم کے تعاون پر تیار ہوں۔'' میری بات کا اس نے الٹا مطلب لیا تھا۔

''ہر قسم کا تعاون چھوڑو،بس تھوڑی دیر غسل خانے میں گزار لو۔'' اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور مطمئن ہوتے ہوئے اسے اندر دھکیل دیا۔

کرس کارٹر کسی بھی وقت ہوش میں آسکتا تھا۔لڑکی سے بے فکر ہوتے ہی میں نے کرس کارٹر کی ٹائی اٹھا کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھے تاکہ ہوش میں آنے پر وہ کوئی غلط حرکت نہ کر سکے اور لباس کی تلاشی لینے لگا۔اس کا پرس اور موبائل فون میں نے اپنی جیب میں منتقل کر دیا۔تکیے کے نیچے پڑے بریٹا نے مجھے خوش کر دیا تھا۔گلاک کی طرح یہ بھی اعلا کوالٹی کا پستول تھا۔جلدی جلدی باقی کمرے کی تلاشی لے کر میں کمانڈر بسم اللہ جان کو کال کرنے لگا۔

''ہاں ذیشان!''کال وصول کرتے ہی اس نے بے صبری سے پوچھا۔''کیا آپ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں؟''

''میں اسی کے کمرے میں ہوں اور اب اسے کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب۔''وہ حیرانی سے چیخ پڑا تھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''مطلب یہ کہ میں نے اسے بے ہوش کر دیا ہے اور اسی سے احمد کے بارے بھی معلوم ہو جائے گا۔''

''ہوٹل سے باہر کیسے نکالیں گے؟''

''آپ دو تین ساتھیوں کو گاڑی دے کر ہوٹل کی جانب بھیجیں میں اسے باہر نکالنے کی سعی کرتا ہوں۔''

''مطلب ٹاکرا ہو کر رہے گا۔''اس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

''اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے،میری کال کا انتظار کرنا۔''

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔اسی اثناء میں کرس کارٹر کسمسا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

میں نے لڑکی کو غسل خانے سے باہر نکال کر کپڑے پہننے کو کہا۔وہ ابھی تک سخت خوفزدہ تھی۔لرزتے کانپتے ہوئے اس نے کپڑے پہن لیے۔

''اب اسے بھی پتلون پہنا دو۔''میں کرس کارٹر کی طرف اشارہ کیا۔

سر ہلاتے ہوئے وہ کرس کا انڈرویئر اور پتلون اٹھا کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

کرس نے بے چوں وچراں پتلون پہن لی تھی۔ وہ بار بار منھ کھول کر اپنے جبڑے کو ہلا رہا تھا۔ یقیناً میرے دائروی مکے نے اس کے جبڑے کو ہلا دیا تھا۔

''یہ کوٹ بھی اسے اوڑھا دو۔'' میں نے گرم اوورکوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کوٹ کافی کھلا تھا۔ لڑکی نے اس کے کندھوں پر کوٹ ڈال کر سامنے سے بٹن بند کر دیے۔ اب محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔

کرس کارٹر کے نزدیک جا کر میں نے پستول جیب میں ڈالا اور کہا۔

''اپنا منھ بند کرو۔'' اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اس نے منھ بند کر لیا۔ میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اس کے جبڑوں کے دائیں بائیں رکھ کر اندر کی طرف ٹھوکر لگائی۔ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں اپنے جوڑوں میں بیٹھ گئی تھیں۔

''چلو۔'' انھیں آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے میں اپنے کمرے میں لے آیا۔ خوش قسمتی سے گیلری اس وقت بھی خالی پڑی تھی۔ اگر کوئی موجود بھی ہوتا تب بھی اسے کچھ معلوم نہ ہو پاتا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اپنے کمرے داخل ہوتے ہی میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے خود بیڈ پر نشست سنبھال لی تھی تھوڑی دیر بعد ہی کمانڈر بسم اللہ جان کی کال آنے لگی تھی۔

''اسلام علیکم!'' میں کال وصول کی۔

''پانچ منٹ میں دو گاڑیاں ہوٹل کے سامنے پہنچ جائیں گی۔ ہر گاڑی میں تین آدمی سوار ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم بھی باہر آ رہے ہیں۔'' مختصراً کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''انگلش سمجھتی ہو؟'' میں نے لڑکی سے پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں سے تم دونوں اکھٹے باہر نکلو گے۔ لڑکی!...... تم کرس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کے ساتھ چپک کر چلو گی۔ میں تم سے ایک قدم پیچھے چلوں گا۔ اگر ذرا بھی گڑبڑ کی کوشش کی تو مسٹر کرس!...... یاد رکھنا وہ تمھاری زندگی کی آخری بے وقوفی ہو گی۔ استقبالیہ پر جا کر بتاؤ گے کہ تم ایک دن کے لیے کہیں جا رہے ہو۔ میں اپنے کمرے کی چابی استقبالین کو واپس کر کے اپنا حساب بے باق کروں گا۔ اس دوران تم وہیں ٹھہر کر میرے منتظر رہو

گے۔میں جانتا ہوں کہ نیچے ہال میں تمھارا ایک یا اس سے زیادہ ساتھی موجود ہیں، مگر وہ عمر گھٹانے کے علاوہ تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

وہ ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا۔

"اب اٹھو اور چل پڑو، چہرے پر بھی ذرا خوش گواری لاؤ۔ بالکل ویسا ہی موڈ جیسا میری آمد سے پہلے بنایا ہوا تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں اپنے جسم پر چادر لپیٹ لی تھی تا کہ پستول نظر نہ آئے۔

سیڑھیاں اتر کر ہم ہال میں پہنچے۔اتنی رات گزرنے کے بعد بھی ہال مکمل خالی نہیں ہوا تھا۔اکا دکا میز پر اب بھی گاہک بیٹھے نظر آ رہے تھے۔میرے حکم کے مطابق وہ دونوں استقبالیہ کی طرف بڑھنے لگے میں ان کے قریب ہی چل رہا تھا۔

"ہم کہیں جا رہے ہیں کل تک لوٹ آئیں گے اگر کوئی میرا پوچھنے آئے تو بتا دینا کہ کل شام تک واپس پہنچ جاؤں گا۔" کرس کارٹر نے رٹا رٹایا فقرہ دہراتے ہوئے کمرے کی چابی استقبالین کی طرف بڑھا دی۔

"ٹھیک ہے سر۔" استقبالین نے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر بکھیری۔

"میں کمرہ چھوڑ رہا ہوں، بل بنا دیں۔" استقبالین سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی میرا رخ ان دونوں کی جانب تھا۔وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لے رہے تھے۔

استقبالین نے پوچھا۔"سر کمرہ نمبر پلیز۔"

کمرہ نمبر بتا کر میں نے کمرے کی چابی بھی اس کی جانب بڑھا دی۔

حساب کتاب کر کے اس نے بل اور میرا پاسپورٹ میری جانب بڑھا دیا۔بل ادا کر کے میں نے کہا۔

"ایک منٹ ذرا رجسٹر دکھانا۔"

"یہ لیں سر۔" اس نے رجسٹر میری جانب گھمایا۔ایک نظر صفحے پر گھماتے ہوئے میں نے تیزی سے وہ صفحہ پھاڑ کر اپنے ساتھ رکھ لیا۔

"کک......کیا......" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پستول کی جھلک دیکھتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔

اسی دوران ایک لمحے کے لیے میں کرس کارٹر سے غافل ہوا۔اس نے کندھے سے لڑکی کو میری جانب دھکا

دیا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

لڑکی کو واپس دھکیل کر میں اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔اسی وقت مختلف کونوں سے تین افراد کھڑے ہوئے۔میں نے فوراً گھٹنا نیچے ٹیک کر کرس کی پنڈلی پر فائر کر دیا۔وہ بھاگ رہا تھا لیکن اس کا مجھ سے فاصلہ چند قدموں سے زیادہ نہیں تھا۔گولی ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اوندھے منہ نیچے گرا۔تین آدمی پستول نکال کر ہماری طرف بڑھے تینوں مقامی ہی تھے۔دائیں بائیں میزوں پر بیٹھے گاہکوں کو بھی گڑبڑ کا پتا چل گیا تھا۔چند نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔کوئی پولیس کو بلانے کا مشورہ دینے لگا۔تین چار آدمی دروازوں کی طرف بھاگے کچھ کونوں میں سمٹ گئے تھے۔

میں بھاگ کر کرس کے قریب پہنچا۔وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر میں نے زبردستی کھڑا کر دیا۔

اس کے ساتھی بھی قریب پہنچ گئے تھے۔تینوں کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

''اگر کسی نے ہوشیاری کی کوشش کی تو یہ جان سے جائے گا۔'' کرس کی کنپٹی سے پستول لگاتے ہوئے میں نے انھیں دھمکایا۔

''بچے گا تو بھی نہیں۔'' ایک نے جوابی دھمکی دی۔

صورت حال کافی بگڑ چکی تھی۔اگر مزید وقت گزرتا تو پولیس بھی وہاں آجاتی۔انھوں ایک خاص بے وقوفی کی تھی کہ وہ ایک جانب اکٹھے ہو گئے تھے۔اگر وہ میرے چاروں جانب کھڑے ہو گئے ہوتے تو میں زیادہ خطرے میں ہوتا۔سرعت سے سوچتے ہوئے میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔اور کرس کو اپنے سامنے ڈھال کی طرح پکڑتے ہوئے کہا۔

''میرے تین گننے تک اگر تم لوگوں نے پستول نیچے نہ پھینکے تو یہ جان سے جائے گا۔ایک......''

انھوں نے میرے گنتی شروع کرتے ہی ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اسی لمحے میں کام کر گزرا۔بغیر لمحہ ضائع کیے میں نے پستول سیدھا کیا اور ٹریگر کو مسلسل دباتا گیا۔تینوں کے ماتھے میں گولیاں لگی تھیں۔اتنی تیزی سے پستول سے فائر کر کے کسی کے سر میں گولی مارنا ایک فن ہی تھا۔مگر وہاں مجھے سراہنے کے بجائے تیز نسوانی

چیخیں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔

''چلو۔'' میں نے کرس کو دھکیلا۔

وہ کراہتے، لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ہوٹل کے داخلی دروازے کے باہر کھڑے دو ہتھیار بردار دربان یقیناً میرے لیے مسئلہ پیدا کر دیتے، مگر اسی وقت دروازے سے چار کلاشن کوفوں والے اندر گھسے۔ ان میں سے دو کو میں پہچانتا تھا۔ وہ کمانڈر بسم اللہ جان کے ساتھی تھے۔ ایک نے دربانوں پر کلاشن کوف پکڑ کر انھیں ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ باقی تینوں میرے قریب آ گئے۔

''کیا حکم ہے۔''

''وقت نہیں ہے اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کلاشن کوف ساتھی کے حوالے کی اور کرس کو کندھے پر اٹھا کر واپس مڑ گیا۔ دروازے کے سامنے ہی دو ڈبل کیبن کھڑی تھیں۔ بیٹھتے ہوئے میں نے ایک آدمی کو احمد کی موٹر سائیکل کی چابی پکڑائی اور پارکنگ میں کھڑی موٹر سائیکل کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''آپ احمد بھائی کی موٹر سائیکل لے آئیں۔''

وہ سر ہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔ دونوں ڈبل کیبن آگے پیچھے حرکت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ میں چادر سے پٹی پھاڑ کر کرس کی پنڈلی سے باندھ دی تھی ورنہ زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہم ہوٹل سے دور ہوتے گئے۔ میں کرس کے ہمراہ آگے والی گاڑی میں تھا۔ تھوڑی دور آتے ہی دوسری گاڑی ہم سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک درمیانے مکان کے سامنے رک گئے۔ ہارن سن کر ایک شخص نے باہر جھانکا اور گاڑی کو پہچانتے ہی دروازہ کھول دیا۔

وہ ایک درمیانہ سا مکان تھا۔ گاڑی صحن میں کھڑی کر کے ہم نیچے اترے اور مکان میں موجود آدمی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک خفیہ کمرے میں پہنچے۔ گو وہ کمرہ دوسرے کمروں کے درمیان ہی میں تھا مگر اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کمرہ موجود ہے۔

اندر گھستے ہی ہم نے فی الفور کرس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

’’احمد کہاں ہے؟‘‘میں نے پہلا سوال ہی اپنے گمشدہ ساتھی کے متعلق پوچھا تھا۔

’’کون احمد۔‘‘اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے خود کو نڈر ظاہر کرنا چاہا۔

’’دیکھو مسٹر کرس !......احمد کے بارے تمھیں زبان تو کھولنا پڑے گی ۔آرام سے یا تکلیف برداشت کر کے۔‘‘

وہ اطمینان سے بولا۔’’اگر خواہ مخواہ تشدد کرنے کا شوق ہے تو آگے بڑھو۔‘‘

’’آری مل جائے گی۔‘‘میں نے میزبان سے پوچھا۔

’’جی۔‘‘اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

اس کی واپسی تک میں نے اس کی پتلون کا پائنچہ موڑ کر زخمی پنڈلی کو ننگا کر دیا تھا۔وہ ہونٹ بھینچے میری کارروائی دیکھتا رہا۔دو تین منٹ بعد میزبان آری لیے نمودار ہوا۔

’’اس کی ٹانگ یہاں گھٹنے سے پکڑو۔‘‘میں نے میزبان ہی کو کہا۔اور اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے گھٹنے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

’’تت......تم کیا کر رہے ہو۔‘‘میرا اطمینان بھرا انداز اسے خوفزدہ کر گیا تھا۔

’’زخمی پنڈلی کو کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہوں، یہ تو اب یوں بھی بے کار ہے۔‘‘یہ کہتے ہوئے میں نے زخم سے انچ بھر اوپر آری رکھی۔

’’ایک منٹ......‘‘وہ لرزتے ہوئے ایک پتا دہرانے لگا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور انھوں نے اوپر نیچے سر ہلا کر سمجھ جانے کا اشارہ کر دیا۔

’’تیار ہو جاؤ۔‘‘کرس کارٹر کو میزبان کے حوالے کر کے میں باقیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

انھوں نے کال کر کے دوسری گاڑی کو بھی بلا لیا تھا۔رستے ہی میں ہمیں دوسری گاڑی نے مل جانا تھا۔

’’کیا ابھی جانا ضروری ہے۔‘‘بسم اللہ جان کے ایک ساتھی نے پوچھا جس کا نام مجھے بعد میں حیدر معلوم ہوا تھا۔

میں نے کہا۔''ہاں دیر کرنے سے وہ اسے کسی دوسری جگہ بھی منتقل کر سکتے ہیں۔''

''ہونہہ۔'' حیدر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حیدر کے علاوہ میرے ساتھ شمال خان اور میر قلم خان بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی افراد دوسری گاڑی میں تھے۔ ایک چوک پر دوسری گاڑی ہماری منتظر کھڑی تھی۔ ہمارے آگے بڑھتے ہی وہ پیچھے پیچھے چل پڑے۔

مطلوبہ مکان گنجان آبادی میں تھا۔ وہاں تک ہمیں آدھا گھنٹا لگا تھا۔ ایک چوک پر گاڑی روکتے ہوئے حیدر نے کہا۔''سامنے پہلی گلی میں دوسرا مکان وہی ہے۔''

''آپ لوگ یہیں رکو میں جائزہ لیتا ہوں۔'' میں نے نیچے اترنے کے لیے دروازہ کھولا۔

''میں جاتا ہوں۔'' میر قلم نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''آپ بس تیاری حالت میں رہنا۔'' میں نے مفلر چہرے کے گرد لپیٹا اور نیچے اتر گیا۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' میر قلم بھی میرے ساتھ ہولیا تھا۔

رات ختم ہونے کو تھی۔ سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ دونوں گاڑیاں چوک سے تھوڑا آگے لا کر انھوں نے سڑک کے ایک جانب کھڑی کر دیں۔ میں اور میر قلم چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ گو نہ تو صبح کی نماز کا وقت ہوا تھا اور نہ مٹرگشت کا وقت تھا۔ ہماری حرکت شکوک کے دائرے میں آ رہی تھی۔ لیکن ہم احتیاط کو نظر انداز کیے آگے بڑھتے گئے۔ گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے مطلوبہ گھر کے دروازے سے روشنی چھلکتی ہوئی نظر آئی۔ واضح نظر آ رہا تھا کہ گھر دروازہ کھلا ہوا ہے۔

''مجھے لگتا ہے وہ نکل گئے ہیں۔'' آگے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں گلی میں مڑ گیا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔ کھلے دروازے کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دشمن افراتفری میں بھاگ گئے ہیں۔'' میر قلم نے میری تائید میں سر ہلا دیا۔

مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچتے ہی مجھے اپنا اندازہ صحیح ہوتا نظر آیا۔ نہ صرف داخلی دروازہ کھلا تھا بلکہ اندر کمروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ روشنی کو جلتا اور دروازوں کو کھلا چھوڑ کر بھاگے تھے۔

''میرا خیال ہے اندر چل کر جائزہ لے لیتے ہیں۔'' میر قلم نے مشورہ دیتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے

میں سر ہلاتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

مختصر صحن کے بعد برآمدہ نظر آرہا تھا جس کے بعد کمروں کے دروازے تھے۔ میر قلم مجھ سے دو قدم آگے تھا جونھی وہ برآمدے کے قریب پہنچا اچانک ہی مجھے اس کی گردن کے نیچے ایک سرخ نقطہ نظر آیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ یقیناً وہ لیزر پوائنٹ کا نشان تھا۔ کسی نے ہم پر نشانہ سادھا ہوا تھا۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔'' خود کو زمین پر گراتے ہوئے میں چیخا۔ لیکن میر قلم کو دیر ہوگئی تھی۔ میرے الفاظ جب تک اس کی سمجھ میں آتے اس کی گردن میں گولی پیوست ہوگئی تھی۔ میری طرح وہ بھی اوندھے منھ ہی گرا تھا لیکن اس کے گرنے میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔

نیچے گرنے کے ساتھ میں ساکت نہیں ہوا تھا بلکہ زقند بھر کر میں نے برآمدے کے ستون کے ساتھ آڑ ڈھونڈ لی۔ انھوں نے مکان کے دروازے کھلے چھوڑ کر ہمارے لیے چارہ ڈالا تھا اور ہم بغیر سوچے سمجھے ان کی چال میں آگے تھے۔ گو اس مکان میں گھستے وقت میرے دماغ میں ہلکی سی کھٹک موجود تھی لیکن میں احتیاط نہیں برت سکا تھا۔ ستون کی آڑ میں آکر میں نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا، مگر فائر کرنے والے مخالف مکان کی چھت پر تھے اور پستول کی رینج سے دور تھے۔

میرے سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ ستون کی آڑ میں بہر حال تھوڑا بہت خطرہ موجود تھا۔ چھت پر لیٹے فائرر نے مجھے نشانہ بنانے کے لیے چند اور فائر کیے تمام گولیاں ستون میں لگی تھیں۔ اسی وقت کلاشن کوف کے فائر کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ اندازے کے مطابق وہ میرے ساتھیوں کا جوابی فائر تھا۔ میرے لیے واپس دروازے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہونا مناسب سمجھا۔ اور کلاشن کوف کا دوسرا برسٹ فائر ہوتے ہی میں چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوا، مگر میری بدقسمتی کہ کمرہ خالی نہیں تھا۔

''ہاتھ اوپر۔'' انگریزی میں پکارا گیا تھا۔ وہ دو نقاب پوش تھے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے منھ سے الفاظ کی ادائی ہونے تک میں فائر کر چکا تھا۔ مجھے ہینڈز اپ کرانے کی حسرت دل میں لیے وہ سر میں گولی کھا کر مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گرا، اس کا ساتھی زیادہ چست ثابت ہوا تھا۔ میرے دوبارہ ٹریگر دبانے سے پہلے اس نے بائیں پاؤں پر گھومتے ہوئے اپنے دائیں پاؤں سے میرے پستول والے ہاتھ کو نشانہ بنا لیا تھا۔ اس کی ٹھوکر

سے پستول میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔اس کے بعد بھی اس کی حرکت رکی نہیں تھی۔دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے وہ دوبارہ گھوما اور اس کی دوسری ٹانگ میری چھاتی میں لگی۔میں دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔اس کے حملوں میں بڑی تیزی تھی۔میرے جوابی حملے سے پہلے سیدھے ہو کر اس نے اپنا گھٹنا میری ناف میں مارنے کے لیے اوپر اٹھایا،لیکن اس وقت تک میں سنبھل چکا تھا۔اس کا وار میں نے اپنے ہاتھوں پر سہا اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی چھاتی میں رسید کی اور فوراً ہی مجھے پتا چلا کہ وہ مرد نہیں کوئی عورت تھی۔میری ٹکر کھا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک دم اپنے بائیں پاؤں پر گھومی۔اس کا دایاں پاؤں میرے چہرے کی طرف بڑھا۔

سر کو ذرا سا نیچے جھکاتے ہوئے میں نے اس کا وار خطا کیا۔دایاں پاؤں نیچے لگاتے ہوئے اس نے دوسرا پاؤں اٹھا کر حملہ کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی میری زبردست ٹھوکر اس کی پیٹھ پر پڑ چکی تھی۔

وہ منھ کے بل نیچے گری لیکن اپنے ہاتھوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے چہرے کو زمین پر لگنے سے بچا لیا تھا۔اور پھر اسی طرح پڑے رہنے کے بجائے وہ کروٹ تبدیل کرتی ہوئی میری اگلی ٹھوکر کی زد سے دور ہو گئی۔دو تین کروٹیں لے کر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔اس کے تیز حملے اور قدو قامت مجھے کسی شک میں مبتلا کر رہا تھا۔شک دور کرنے کے لیے میں نے اگلے حملے سے پہلے چہرے پر لپٹا مفلر کھولا۔وہ حملے کے لیے پر تول رہی تھی،میرا چہرہ دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

”ذی تم؟“میرے کانوں میں جینیفر کی سریلی آواز گونجی۔میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا وہ جینی ہی تھی۔میرے جواب دینے سے پہلے تین ہتھیار بردار اندر گھستے چلے آئے تھے۔چاروں نے نقاب اوڑھے ہوئے تھے۔

”ہاتھ اوپر۔“ان میں سے ایک پشتو میں بولا تھا۔

میں نے فوراً ہاتھ اٹھا لیے۔باہر اب تک فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

”ٹریسی جانا ہوگا۔“ایک دوسرا آدمی جینیفر کو انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جینیفر سے سینئر یا اس کا ہم رینک تھا۔

”باہر والوں کو بھی اندر بلا لو اور دو آدمی چند منٹ تک یہیں کمرے کے اندر سے فائر کا جواب دیتے رہو

اس کے ساتھ وہ بولا۔ ''ایک آدمی اس کے ہاتھ باندھ دو۔''

''جی سر!'' ایک آدمی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ دوسرے نے اس کے اشارے پر میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور میری تلاشی لے کر جیبوں میں موجود سامان نکال لیا۔

مجھے حراست میں لے کر وہ کمرے میں موجود اندرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ دوسرے کمرے کے کونے میں سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی شمالی دیوار میں تنگ سی سرنگ نظر آ رہی تھی۔ جینیفر آگے ہو گئی اس کے پیچھے میں تھا۔ میرے عقب میں باقی آ رہے تھے۔ کافی طویل سرنگ تھی۔ اس کے اختتام پر سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ ہم پہلے والے مکان سے قریباً پانچ چھ مکان دور آ گئے تھے۔

اس دوران میرا دماغ اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ نہ جانے جینی میری کچھ مدد کر پاتی یا نہیں۔ آخر وہ خود امریکن سرکار کی ملازم ہی تو تھی اور جب اس سے ایک سینئر آدمی موجود تھا تو اس کا کیا بس چلتا۔ اگر وہ دھوکے سے مجھے فرار کر دیتی تب بھی اس پر بات تو آ سکتی تھی۔ پہلی دفعہ میرا نام لینے کے بعد اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ میرے ساتھ شناسائی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوسرے مکان کے صحن میں آتے ہی میرے کانوں میں ایک بار پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی تھی۔ صحن میں دو گاڑیاں تیاری حالت میں کھڑی تھیں۔ میرے چہرے پر کالا کپڑا چڑھا کر انھوں نے ایک گاڑی کی عقبی نشست پر دھکیلا اور اس مکان سے باہر نکل آئے۔ ان کی بات چیت سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جینی اور دوسرا امریکن اسی گاڑی میں تھے۔ اس کا نام الیگزینڈر تھا اور وہ جینی سے سینئر لگ رہا تھا۔ موضوعِ گفتگو مجاہدین کا خفیہ ٹھکانہ تلاش کرنے کی جستجو تھی۔ یقیناً احمد سے انھیں کچھ معلوم نہیں ہو پایا تھا۔

گاڑی آدھا پون گھنٹا چلتی رہی۔ رکنے پر ایک آدمی نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک کرسی پر بندھا ہوا بیٹھا تھا۔ میرے سر پر چڑھا کپڑا انھوں نے اتار دیا تھا۔ الیگزینڈر نے مجھے باندھنے والوں کو کہا۔

''مجھے غزنی میں موجود دہشت گردوں کے تمام ٹھکانوں کی تفصیل چاہیے۔ اور تفتیش کرتے ہوئے بس اتنا

خیال کرنا کہ اسے مرنا نہیں چاہیے باقی ہاتھ پاؤں کاٹتے ہو یا ناک کان اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔''

''فکر نہ کریں سر!'' دونوں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔ جینی ٹریسی والکر کے روپ میں وہاں کھڑی مجھے گہری نظروں سے گھور رہی تھی۔

''چلیں۔'' الیگزینڈر جینی سے مستفسر ہوا۔

جینی نے پر خیال لہجے میں کہا۔''سر!...... میرا خیال ہے اس آدمی کو مجھے خود سنبھالنا ہوگا۔''

''ہاں، اپنے دونوں آدمیوں کی نگرانی کر لینا۔ اگر صحیح سوال جواب نہیں کرتے تو آپ پوچھ گچھ کر لینا۔''

''آپ سمجھے نہیں سر!...... میرا مطلب ہے پہلے ہمیں کرس کارٹر صاحب کی بازیابی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

الیگزینڈر بے پروائی سے بولا۔''جب دہشت گردوں کے تمام ٹھکانوں کی بابت معلوم ہو جائے گا تو کرس کارٹر بھی بازیاب ہو جائے گا۔''

جینیفر نے منھ بنایا۔''پہلے پکڑے جانے والے دہشت گرد سے ہم نے کیا اگلوا لیا ہے جو اس سے تمام ٹھکانوں کی بابت معلوم ہو جائے گا۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟'' الیگزینڈر نے مفاہمتی انداز میں پوچھا۔

وہ جلدی سے بولی۔''سر، کرس کارٹر کو آزاد کرانا ضروری ہے۔''

''ہاں مگر اس کے لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، یہ نہ ہو اسے آزاد کراتے ہوئے کوئی اور نقصان کرا بیٹھو۔''

جینیفر اعتماد سے بولی۔''میں سنبھال لوں گی سر۔''

''ویسے پہلے کوشش کر لو اگر کچھ معلوم ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کرس کارٹر کی واپسی کا کچھ کریں گے۔'' الیگزینڈر نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ ان دونوں کی بات چیت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ الیگزینڈر کی نظر میں میں انگلش سے نابلد تھا۔ اسی وجہ سے وہ یوں آزادی سے بات چیت کر رہا تھا۔ البتہ جینیفر کی بات اور تھی۔

''ٹھیک ہے سر!'' جینیفر نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ رخصت ہو گیا۔

”تم دونوں بھی جاؤ۔“جینیفر نے دونوں مقامی افراد کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

ان کے جاتے ہی اس نے سب سے پہلے میری بندشیں کھولیں اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

”تو میرا اندازہ ٹھیک تھا، اس دن تم ہی تھے۔“بغیر کسی تمہید کے وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔”تم نے کیسے اندازہ لگایا۔“

”اتنے فاصلے سے سر میں گولی مارنا کسی عام آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔“

”پھر بھی میں افغانستان میں موجود نہیں تھا، اگر کوئی اور ہوتا تو یقیناً تم ماری جاتیں۔“

”صحیح کہہ رہے ہو، مگر کیا کروں کہ اتنے فاصلے سے یوں صفائی سے فائر کرنے والا تمھارے علاوہ ایک نک سٹیورٹ ہی دیکھا ہے اور نک تو ہمارا اتحادی ہے۔“

”یہ کون ذات شریف ہے؟“میں نے انجان بن کر پوچھا۔ حالاں کہ اس کے بارے مجھے کمانڈر اسلام سے معلوم ہوا تھا۔

”برطانوی فوج کا ایک سپاہی ہے، اس کی ساتھی لورا براؤن بھی اچھی نشانہ باز ہے۔“

”اچھا اب میرے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔”تمھارے ساتھ کیا کر سکتی ہوں سوائے محبت کرنے کے؟“

”بکواس نہ کرو۔ اور میں نے کہا تھا کہ واپس امریکہ چلی جاؤ، اس دن بڑی مشکل سے تمھیں بچایا تھا۔“

”بس دو تین ماہ میں واپس چلی جاؤں گی، ملنے آؤ گے نا؟“

”ملنے آنا تو شاید مشکل ہو البتہ اپنا فون نمبر بتا دو کال کر لیا کروں گا وہ بھی پلوشہ سے پوچھ کر۔“آخری فقرہ میں نے مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔

”کہاں ہے وہ آفت کی پرکالہ۔“جینیفر بھی مسکرا دی تھی۔

”وہ بھی افغانستان آئی ہوئی ہے۔“

”سچ، کہاں ہے؟“اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

جواباً میں نے اپنی گرفتاری اور ثبوتوں کی تلاش وغیرہ کی ساری کہانی اجمالاً دہرادی۔

وہ کہنے لگی۔ ''تمھیں مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔''

''کیسے رابطہ کرتا۔ اور معاف کرنا تم سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تو اس حالت میں پہنچا ہوں۔''

''یہ کون سی رابطہ کرنے کی کوشش تھی۔'' اس نے منھ بنایا۔ ''ہمارے آدمیوں کو قتل کرنا اور انھیں اغواء کرانا مجھے تلاش کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔''

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو تم لوگوں نے پاکستان میں کوئی کسر چھوڑی ہے۔''

''جانتے ہو، البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ دونوں اس دن تمھاری گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔''

''وہ دونوں میرے مجرم بھی تو تھے۔''

''بہرحال اس دن حملہ کرنے والوں کو بہت کوشش سے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ گو پہلے تو مجھے اندازہ تھا کہ گولی چلانے والے تم ہو، جو بعد میں یقین میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن میں نے کسی کو ہلکا سا اشارہ بھی نہ دیا۔ باقی جیسن سمتھ کی جان بچاتے ہوئے میں نے حماقت کا ثبوت دیا تھا، لیکن اس حماقت کی بدولت بعد میں میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ فائر کرنے والے واقعی تمھی ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''جیسن کے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے؟''

''استاد ہے میرا۔ اور اتنی ہمت میں اس لیے کر پائی تھی کہ کولن فیلڈ کے سر میں لگنے والی گولی نے میری سوچوں کو تمھاری جانب موڑ دیا تھا۔ اس کے بعد جب دوسرے افراد کو بھی سر ہی میں گولی لگنا شروع ہوئی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ ہو نہ ہو فائر کرنے والا ذی ہے۔''

''اچھا اب میرے بارے کیا سوچا ہے۔''

''سوچنا کیا ہے، ابھی جاؤ اور کرس کارٹر کو رہا کر دو۔''

میں ہنسا۔ ''تو تم مجھے یونھی جانے دو گی۔''

”شک ہے کیا؟“

”نہیں، مگر اس طرح تم سے باز پرس ہو سکتی ہے۔“

”نہیں تمھارے بدلے ہمیں کرس کارٹر مل جائے گا نا۔اور بالفرض وہ تمھارے قبضے میں نہ ہوتا میں تب بھی تمھیں چھوڑ دیتی۔“

”واپس امریکہ کب جا رہی ہو؟“

”کہا تو ہے دو تین ماہ میں چلی جاؤں گی۔“

میں نے پوچھا۔”البرٹ بروک تو رہا نہیں، کیا میری بے گناہی کے ثبوت بھی اس کے ساتھ ضائع ہو گئے ہیں۔“

اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔”اگر تمھیں وہ ثبوت میں لا دوں تو کیا انعام ملے گا۔“

”کیا انعام چاہیے۔“

”مجھ سے شادی کر لو۔“

”پاکستانی ایجنسیوں کے ہاتھوں شاید بچ جاؤں لیکن پلوشہ مجھے قتل کرنے امریکہ تک بھی پہنچ جائے گی۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔”اتنا ڈرتے ہو اس سے۔“

”کیا نہیں ڈرنا چاہیے؟“

”پیلا وشہ کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔“

میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔”جینی!......تنگ نہ کیا کرو۔“

”اچھا میں کوشش کروں گی، وعدہ نہیں کر سکتی میرا نمبر یاد کر لو۔“اس نے ایک نمبر دہراتے ہوئے کہا۔”اس پر رابطہ کر کے معلوم کر لینا امریکہ واپسی سے پہلے تمھارا کام کر جاؤں گی۔“

اس کا نمبر ذہن نشین کرتے ہوئے میں نے اپنا نمبر دہراتے ہوئے کہا۔”اپنا امریکہ کا رابطہ نمبر بھی بتا دو۔“

میرا نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر کے وہ اپنا نمبر بتاتے ہوئے مسکرائی۔”ابھی تک تمھاری یاداشت ویسی ہی ہے۔“

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں مطلب کی بات پر آیا۔ ''میں احمد کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''کون احمد؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہمارا جو آدمی تمھارے پاس قید ہے۔''

اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ضروری ہے کیا؟''

''ہاں، کیونکہ یہاں میری حیثیت مہمان کی سی ہے، میں بس اپنی بے گناہی کے ثبوت ہی حاصل کرنے آیا ہوں پھر واپس چلا جاؤں گا۔ اور اب اگر میں وہاں جا کر کرس کارٹر کی رہائی کی بات کروں گا تو یقیناً اچھا نہیں لگے گا۔''

''اس کا مطلب ہے جلد سے جلد وہ ثبوت تمھارے حوالے کر کے جان چھڑانا بہتر رہے گا۔''

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سچ کہوں تو اپنے لیے شوہر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''

''کس وقت جانا ہوگا۔''

اس نے کہا۔ ''بھوک لگی ہو تو ناشتا منگوا دیتی ہوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

چلو، مگر آنکھیں باندھنا پڑیں گی۔''

میں ہنسا۔ ''مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے صاف گوئی سے اقرار کیا۔ ''اس بارے اعتبار نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں تمھارے سب سے بڑے دشمن امریکی ہیں۔''

''تم بھی تو امریکی ہو۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''میں تو تمھیں پیاری ہوں نا۔ اور جب بھی پیلاوشہ سے ملاقات ہوئی اسے ضرور بتاؤں گی کہ تم نے کس طرح میری جان بخشی کی۔''

''اچھا بتا دینا یار، فی الحال تو چلیں ناں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے ہم ایک مخصوص سمت میں روانہ تھے۔ احمد بھی ساتھ تھا۔ احمد اور میرے سر پر جینفر کے کہنے پر کالا کپڑا چڑھا دیا تھا اور ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ایک غیر معروف ہوٹل کے سامنے گاڑی روک کر اس نے میرے سر سے کپڑا اتارا اور کہا۔'' اپنے آدمیوں کو کہو کرس کارٹر کو یہاں لے آئیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں، میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں یہیں بیٹھ کر تمھارا انتظار کروں گی۔'' بغیر کسی تکرار کے وہ اپنے ساتھ موجود تین مسلح مقامی محافظوں کو نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر گئی۔

احمد کو کافی زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ عقبی نشست پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کیے بغیر میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور موبائل فون نکال کر کمانڈر بسم اللہ کو کال کرنے لگا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کال وصول کرلی گئی تھی۔

''جی۔'' اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''ذیشان بات کر رہا ہوں۔'' میں نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔

اس نے بے صبری سے پوچھا۔''آپ کہاں ہیں؟''

''میں احمد کے گھر کی طرف جا رہا ہوں، احمد بھی میرے ساتھ ہے۔ آپ یوں کریں کہ کرس کارٹر کو ایک گاڑی میں بٹھا کر وہیں لے آئیں باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھانے کا وقت بھی نہیں ہے، فی الحال جو کہا ہے وہ کریں۔''

''کہیں یہ سب......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''نہیں میں کسی دباؤ یا مجبوری کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہے۔ مختصراً اتنا جان لیں کہ احمد کے بدلے کرس کارٹر کو واپس کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

احمد کا مکان میں نے دیکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں چند منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ مکان کو تالا لگا ہوا تھا ہم گاڑی ہی میں بیٹھے رہے۔

''شمسہ کہاں ہے؟'' گاڑی میں چھائی خاموشی کو احمد کی نحیف آواز نے توڑا۔

''کون شمسہ؟''میں نے حیرانی سے پوچھا اور پھر ایک خیال کے تحت کہا۔''شاید ہماری بھابی کا نام شمسہ ہے۔''

کچھ کہے بغیر اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''وہ محفوظ ہے۔''میں نے اسے تسلی دی۔

بسم اللہ جان کے آدمیوں کے پہنچتے ہی میں نے احمد ان کے حوالے کیا وہ کرس کارٹر کی آنکھیں بند کر کے لائے تھے۔ اسے اپنی گاڑی میں منتقل کر کے میں نے انھیں جانے کا کہا اور خود مطلوبہ ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہوٹل کے قریب پہنچتے ہی میں نے سے کال کر کے باہر بلا لیا تھا وہ بڑی شدت سے میری منتظر تھی۔ کرس کارٹر کو دیکھتے ہی اس نے میرا شکریہ ادا کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔''کیا تمھیں واپس چھوڑ کے آنا پڑے گا۔''

''شکریہ، تم جاؤ۔''

''موقع ملتے ہی میں خود رابطہ کروں گی، تمھیں کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاتے ہوئے وہ مجھے سمجھانا نہیں بھولی تھی۔

اس کے جاتے ہی میں نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے خفیہ ٹھکانے کے قریب ایک مناسب مقام پر اترا اور احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ تمام بے صبری سے میرے منتظر تھے۔ احمد کے لیے انھوں نے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا تھا جو اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ میری آمد کے ساتھ حیدر نے بسم اللہ جان کو کال کر کے موبائل فون میری جانب بڑھا دیا۔

سلام ودعا کے بعد وہ تفصیل پوچھنے لگا۔

''وہی لڑکی مل گئی تھی یار! مجھے رہا کرنے کا اسے یہی بہانہ مناسب لگا کے میرے بدلے کرس کارٹر کو طلب کر

لے۔میں نے اپنی رہائی کے ساتھ احمد کا بھی مطالبہ کر دیا۔"

"آپ کا کام تو درمیان ہی میں رہ گیا۔"

"کوئی بات نہیں، اللہ پاک کوئی اور سبب بنا دے گا۔"

اس نے پوچھا۔"مطلب دوبارہ سے پوری محنت کرو گے۔"

"فی الحال تو آرام کروں گا چند دن بعد ہی کچھ سوچوں گا۔" میں نے جینی کی آفر کا ذکر مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"تو پھر یہاں آجاؤ۔"

میں نے گول مول انداز میں کہا۔"جب آنا ہو گا بتا دوں گا۔" اور اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔میں وہیں ٹھہر کر جینی کے جواب کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔مجھے قوی امید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گی۔

احمد اور میں اسی خفیہ کمرے میں رہنے لگے۔تیسرے دن احمد کی بیوی بھی وہیں آگئی تھی اور اس کی آمد کے ساتھ احمد اور اس کی بیوی کے حوالے ایک علیحدہ کمرہ کر دیا گیا تھا۔اپنی آمد کے دوسرے دن وہ احمد کو ساتھ لے کر میرا شکریہ ادا کرنے بھی آئی تھی۔اسے معلوم ہو گیا تھا کہ احمد کی جان میری ہی وجہ سے بچی تھی۔شب و روز کافی بے کیفی سے گزر رہے تھے۔مجھے پاکستان سے آئے ہوئے بھی کئی ماہ گزر گئے تھے اور ابھی تک میں کسی واضح کامیابی کے نزدیک نہیں پہنچا تھا۔اب تو لے دے کے جینی ہی کی امید باقی تھی۔کئی بار میرا گھر کال کرنے کو جی چاہا مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ انھوں نے پلوشہ کے بارے پریشانی ظاہر کرنا تھی جس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔مگر یہ سوچ مجھے زیادہ دیر نہ روک سکی۔اگلے دن میں نے ابو جان کے نمبر پر کال کر دی۔

"یار! خود تو پہلے بھی نظر نہیں آتے تھے اس بار تو ہماری بیٹی کو بھی غائب کر دیا ہے۔" سلام و دعا کے بعد ابو جان کے شکوے شروع ہو گئے۔

"تو کہاں ہے وہ آپ کے پاس ہی تو چھوڑ گیا تھا۔" میں الٹا ان سے استفسار کرنے لگا۔

"اپنے بھائی کے ساتھ وزیرستان گئی تھی بیٹا، اس کے بعد پتا نہیں چلا۔"

میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔"اچھا میں وزیرستان جانے کی کوشش کرتا ہوں شاید مل جائے۔"

"اتنی دیر تو نہیں ہونا چاہیے تھی بیٹا، گلناز بہن بھی بہت پریشان ہے اور تمھاری پھوپھو نے تو رو رو کر برا حال

کرلیا ہے۔''

''اسے کچھ نہیں ہوتا ابو جان وہ لڑکی کم اور لڑاکا زیادہ ہے۔''

ابوجان نے امید بھرے لہجے میں کہا۔''وزیرستان جانے سے پہلے گھر کا ایک چکر لگا لیتے۔''

''کوشش کروں گا ابو جان، مگر مشکل نظر آرہا ہے۔''میں نے گول مول جواب دیا۔

''اچھا اپنی پھوپھو جان سے بات کرو۔''ابو جان نے موبائل فون پھوپھو جان کو پکڑا دیا۔وہ پلوشہ کے متعلق بہت پریشان تھیں،انھیں تسلی دے کر میں نے پلوشہ کی ماں گل ناز سے بھی بات کی،چونکہ ابو جان اور پھوپھو پشتو نہیں جانتے تھے اس لیے وہ بے فکری سے پلوشہ کے بارے محو گفتگو ہو گئی۔

''بیٹا!......میں نے اسے منع کیا تھا،مگر وہ میری کوئی بات ہی نہیں مان رہی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ تمھیں اس کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔تمھاری وجہ سے مجھے بھی زور دینا مناسب نہ لگا،آخر تمھارے بھی تو ہم پر اتنے احسان ہیں۔''

''ماں جی اپنوں کا حق ہوتا ہے احسان نہیں ہوا کرتا۔باقی فکر نہ کریں میں افغانستان ہی میں ہوں اور ایک چھوٹا سا کام کر کے اسے ڈھونڈنا شروع کر دوں گا۔''انھیں تسلی دے کر میں نے چند منٹ مزید گپ شپ کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

گھر والوں کی خیریت جان کر مجھے کافی تسلی ملی تھی لیکن اس کے ساتھ پلوشہ کے بارے میں زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔اس کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔کمانڈر عبدالحق کو میں نے پہلے سے پلوشہ کے بارے بتایا ہوا تھا کہ مجاہدین سے اس کے بارے معلوم کرتا رہے اور وہ گاہے گاہے معلوم کرتا بھی رہا تھا،مگر اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔گلگارے نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ جہاں میں البرٹ بروک وغیرہ کو ڈھونڈوں گا وہیں پلوشہ بھی مجھے مل جائے گی کہ وہ بھی انھی کو تلاش کر رہی ہوگی،مگر وہ یہاں کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔اگر اس نے امریکنوں کے خلاف کوئی کام کیا ہوتا تو جینی کو کچھ نہ کچھ سن گن ضرور ہوتی مگر اس نے بھی پلوشہ کے بارے استفسار کر کے گویا لاعلمی ظاہر کر دی تھی۔

اتنا عرصہ اس سے جدا رہنے کے بعد کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا کہ وہ میری زندگی میں آئی ہی نہیں اور

میں ایک لمبا سپنا دیکھ کر بیدار ہو گیا ہوں۔ پلوشہ کی ہنستی مسکراتی صورت ہر وقت نظروں میں رہنے کے باوجود لگتا تھا کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایسی کوئی لڑکی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے متعلق مختلف قسم کے اندیشے بھی میرے دل میں سرسراتے رہتے۔ اس کی صلاحیتوں پر بھروسا ہونے کے باوجود میرا دل لرزتا رہتا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسی مشکل میں نہ پھنس جائے جس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہ ہو اور اس وقت تو میں بھی اس کی مدد کے لیے موجود نہ ہوتا۔ گو سردار خان ایک مخلص اور غیرت مند دوست تھا۔ پلوشہ کا وہ ہر ممکن خیال کرتا مگر مجھے یہ سوچ بھی تسلی نہیں دیتی تھی۔

☆......☆......☆

دن بھر میں اس مختصر مکان ہی میں گھومتا رہتا۔ کبھی احمد کے ساتھ گپ شپ کرتا اور کبھی یونھی صحن میں چکراتا رہتا۔ وہاں سے باہر جانے کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں احمد کے ساتھ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا جب کمانڈر عبدالحق کی کال موصول ہوئی۔

سلام ودعا کے بعد عبدالحق کہنے لگا۔ ”ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔“

میں نے جوش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا پلوشہ کا پتا چل گیا؟“

”ان شاء اللہ وہ بھی لگ جائے گا، لیکن فی الحال ایک اہم امریکن ہاتھ لگا ہے، اب ہم آپ کی بے گناہی کے ثبوتوں کا سودا کر سکتے ہیں۔“

میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”بھلا وہ کیسے؟“

”کل ایک قافلے پر گھات لگائی ہے اسی میں یہ ہاتھ لگا ہے۔“

”مگر یوں ایک دم، اچانک......“

”یہاں آجاؤ نا پھر گپ شپ کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ احمد بھی ہماری گفتگو کی طرف متوجہ تھا پوچھنے لگا......

”کیا پلوشہ مل گئی ہے؟“

”نہیں کوئی امریکن ہاتھ لگا ہے اور اب مجھے وہیں جانا ہوگا۔“

http://sohnidigest.com سوہنی ڈائجسٹ

اس نے پوچھا۔ ''اس وقت؟''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

احمد نے حیدر کو کال کر کے گاڑی منگوا لی۔ میں احمد سے الوداعی ملاقات کر کے وہاں سے نکل آیا۔ حیدر اور اس کے ساتھ دو افراد میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔

گھنٹے ڈیڑھ کے بعد ہم بغیر کسی رکاوٹ کے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر بسم اللہ جان اور عبدالحق بڑے تپاک سے مجھے ملے۔ ان سے جو تفصیل معلوم ہوئی اس کے مطابق گزشتہ کل انھیں امریکن قافلے کی آمد کے بارے معلوم ہوا اور وہ ایمرجنسی میں کارروائی کر گزرے۔ امریکنز نے گاڑیاں بھگانا شروع کر دیں افراتفری میں ایک گاڑی سڑک سے لڑھک کر الٹی ہو گئی۔ باقی گاڑیوں والے اس کے لیے رکے نہیں تھے۔ امریکیوں کی بدقسمتی کہ قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ ہیلی کاپٹر بھی موجود نہیں تھا پس جب تک انھیں کچھ سمجھ آتا مجاہدین نے الٹی ہوئی گاڑی سے چار آدمیوں کو نکال لیا تھا۔ ان میں دو محافظ، ایک ڈرائیور اور ایک آفیسر تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ کابل سے امریکنز کے غزنی کیمپ کے لیے ایک کمانڈنگ آفیسر آ رہا تھا جو کیمپ تک پہنچنے سے پہلے مجاہدین کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یہ دوپہر کا واقعہ تھا اور اب تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے مذکورہ آدمی سے ملنے کا کام صبح پر ٹالا اور آرام کے لیے لیٹ گیا۔ کمانڈر بسم اللہ جان کے جانے کے بعد بھی عبدالحق اور میں کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ میں پلوشہ اور سردار کے غائب ہو جانے کے بارے تشویش کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے اپنے طور پر تو مجھے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میں بچہ نہیں تھا جو ان تسلیوں سے بہل جاتا۔ میری چھٹی حس بار بار کسی بڑی مصیبت کا اعلان کرنے لگتی۔ کوئی دلیل اور تسلی اس ضمن میں فائدہ نہیں دے رہی تھی۔ عبدالحق سے میں نے جینیفر کی بات اور اس کے مدد کرنے کا ذکر بھی کیا تھا۔

''آپ کے لیے تو کافی مددگار ثابت ہوئی ہے۔'' عبدالحق نے دبے لفظوں میں اس کی تعریف کی تھی۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے بعد میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ قیدی کو دیکھنے چل پڑا۔ اپنے چہروں پر ہم نے مفلر لپیٹ لیے تھے، کیونکہ اس آفیسر کو ہم نے سودے میں استعمال کر کے واپس بھیجنا تھا اور ایسے کسی آدمی کے سامنے اصل

شکل میں جانا مناسب نہیں تھا۔ وہاں ایک بہت بڑی حیرت میری منتظر تھی۔ قیدی کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا تھا ۔وہ میجر جیمس میتھونی تھا۔ وہ میرا استاد تھا۔ ایک قابل اور ذہین شخص کو یوں کرسی پر بندھا دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ اس سے میں نے کافی کچھ سیکھا تھا۔ ہمیں اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اسے پہچانتے ہی میں تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے میں اس کی بندشیں کھول رہا تھا۔ کمانڈر عبدالحق کو میرا جوش دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی، لیکن اس نے مجھے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ میں وہ کام کسی خاص مقصد ہی سے کر رہا تھا۔ خود میجر جیمس میتھونی بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی بندشیں کھول کر میں اس کے سامنے آیا اور اپنے چہرے سے مفلر اتار دیا۔

''ذیشان!......'' اس کی حیرت دگنی ہو گئی تھی۔

''جی سر!'' میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بے ساختہ اٹھتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس سے معانقہ کر کے میں کمانڈر عبدالحق کو مخاطب ہوا۔ ''یہ میرا استاد ہے، اسے کسی بہتر کمرے میں منتقل کرنا پڑے گا۔''

''اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔'' کمانڈر عبدالحق نے فوراً مشورہ دیا۔ اور میں اپنے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ عبدالحق چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے نکل گیا تھا۔

''آپ بھی دہشت گردوں کے ساتھ مل گئے ہو۔'' جیمس میتھونی نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

''میرا خیال ہے دہشت گرد کون ہے اس بارے بحث رہنے دیتے ہیں سر!''

وہ خفیف ہوتا ہوا بولا۔ ''معذرت خواہ ہوں۔''

''ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، آپ میرے استاد ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''اب تو آپ کی قید میں ہوں۔''

''آپ قیدی نہیں ہیں، جب چاہیں آپ کو چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اتنی مہربانی کس لیے؟''

”یہ مہربانی نہیں ہے۔“

”آپ تو پاکستان آرمی میں تھے اور جہاں تک میری معلومات ہے پاکستان آرمی افغانستان میں کسی قسم کی کارروائی میں ملوث نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا سر، میں یہاں اپنے کسی کام سے آیا ہوں۔“

”اپنا کام، مطلب وہی جہاد وغیرہ کا شوق؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

”جہاد کا شوق تو ہے سر، مگر پاکستان آرمی کا کوئی سپاہی صرف اسی جہاد میں شامل ہو سکتا ہے جس کی اجازت آرمی کی طرف سے ملی ہو۔“

”پھر......“ اس نے حیرانی ظاہر کی۔

اب طنز کی باری میری تھی۔ ”اس کے پیچھے بھی آپ لوگوں کی مہربانی شامل ہے۔“

”بھلا وہ کیسے؟“ اس نے کچھ جاننے کی کوشش کی۔

جواباً میں نے اس کے سامنے البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ کی ساری کارروائیاں دہرا دیں جو کہ انھوں نے مجھے بلیک میل کرنے کی خاطر کی تھیں۔

میری بات کے اختتام پر وہ پوچھنے لگا۔ ”اور ان کے قتل میں یہی وجہ کارفرما تھی۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں پر میں اکیلا آیا تھا اور مجھے کچھ مددگاروں کی ضرورت تھی۔ یقیناً دنیا میں لے دے کے اصول پر کام چلتا ہے پس مجھے مجاہدین کی مدد کرنا پڑی۔“

”یقیناً اتنی دور سے آپ ہی انھیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ جب مجھ تک کرنل کولن فیلڈ اور دوسرے آفیسرز کے قتل کی بات پہنچی میرا پہلا خیال تمھاری طرف گیا تھا، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ پاکستان آرمی کا کوئی سپاہی افغانستان میں کیسے آسکتا ہے۔“

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ کی کارروائی سے آپ بے خبر تھے۔“

”مجھے کرنل کولن فیلڈ کے قتل کے بعد ہی امریکہ سے بلایا گیا ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیوں اتنا

غلط کام کیا، کسی کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔“

”میرے دماغ میں تو یہی خیال تھا کہ شاید آپ ہی نے البرٹ بروک کو میرے بارے مطلع کیا ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔”اسے کرنل سکاٹ ڈیوڈیا کرنل جولی روز ویلٹ سے پتا چلا ہوگا۔“

”ہونہہ!......تو آپ اب کرنل ہیں۔“

اس نے تصحیح کی۔”لیفٹیننٹ کرنل۔“

”جانتے ہیں سر، آپ کو پکڑنے کی وجہ، میری بے گناہی کے ثبوتوں کا حصول ہے۔“

وہ ہنسا۔”تو گویا اب میرا سودا کیا جائے گا۔“

”سودا کیا جانا تھا، لیکن اب تو بغیر کسی معاہدے کے آپ کو رہا کروں گا۔“

”کیا باقی آپ کی بات مان لیں گے۔“

”ماننا پڑے گی، جب ان کا مقصد میری بے گناہی کے ثبوتوں کا حصول تھا تو پھر آپ کے بارے فیصلہ کرنا میرا حق ہے۔

اس نے ممنونیت سے کہا۔”شکریہ ذیشان!“

اسی وقت کمانڈر عبدالحق چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لوازمات لے آیا۔

جیمس نے کہا۔”ویسے میں ناشتا کر چکا تھا۔“

میں نے کہا۔”ہم بھی۔“

کمانڈر عبدالحق چائے کے برتن چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ یقیناً وہ ہمیں تنہائی میں گپ شپ کا موقع دینا چاہتا تھا۔ یوں بھی وہ انگریزی نہیں جانتا تھا کہ ہماری بات چیت اس کے پلے پڑتی۔

جیمس کو اپنے بستر پر لٹا کر میں عبدالحق کے بستر پر لیٹ گیا اور دائیں بائیں کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اسے سونے کے لیے چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ رات کو اسے واپس چھوڑ آؤں گا۔

کمانڈر بسم اللہ جان کو کمانڈر عبدالحق ساری بات بتا چکا تھا، اس نے کسی قسم کے استفسار کی ضرورت محسوس

نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا کھا کر ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ جانے سے پہلے میں نے جینی کو رابطہ کرنے کا میسج کر دیا تھا۔ خفیہ ٹھکانے سے نکلنے سے پہلے ہم نے کرنل جیمس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ رستے ہی میں جینی کی کال آ گئی تھی۔ میرے ہیلو کرتے ہی وہ بولی۔

''ذی!...... تمھیں بتایا تھا کہ خود سے رابطہ نہ کرنا۔''

میں ہنسا۔''مجبوری تھی یار!''

''ذی ہم پر بہت کڑا وقت آیا ہوا ہے، ایک آفیسر کل سے دہشت گردوں کے قبضے میں ہے، اسے ڈھونڈنے کے لیے کوئی لائحہ عمل سوچا جا رہا ہے۔''

میں ہنسا۔''ویسے امریکہ سے بڑا دہشت گرد کون ہو سکتا ہے۔''

''مذاق کا وقت نہیں ہے ذی۔'' یہ کہتے ہوئے اسے کوئی بات یاد آئی اور وہ پوچھنے لگی۔''جانتے ہو وہ ہے کون؟''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔ اور مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے اس کے بارے۔''

''ذی تمھیں اپنا استاد جیمس میتھونی تو یاد ہو گا۔''

''استاد بھی کبھی بھولتے ہیں، ہمارا مذہب تو استادوں کی تکریم کی اتنی ہدایت کرتا ہے جو تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے''

اس نے ایک دم اشتیاق سے پوچھا۔''کیا تم اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو؟''

''اگر میرا جواب ہاں میں ہو اور میں انھیں باحفاظت لے بھی آؤں تو کیا انعام دو گی۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''کیا انعام لو گے، میں تو کب کی سراپا انعام بنی پھر رہی ہوں تم خود ہی انکار پر مائل ہو۔''

''بکواس کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔''

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔''اچھا سچ بتاؤ، کچھ کر سکتے ہو۔''

''جس ہوٹل کے سامنے آخری ملاقات ہوئی تھی وہاں کتنی دیر میں پہنچ سکتی ہو۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”موجودہ حالات میں تو بالکل نہیں آسکتی۔“

”اگر میں کہوں میں جیمس صاحب کو گھنٹے تک وہیں لا رہا ہوں پھر؟“

”ذی!......میں رابطہ منقطع کر رہی ہوں۔“ اس نے میری بات کو مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

”اچھا یہ لو بات کرو۔“ میں نے ساتھ بیٹھے جیمس کو موبائل پکڑا دیا۔ ”سر!......جینی سے بات کریں۔“

جیمس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو گڈ گرل۔“

”سر!......“ اس نے اتنے زور سے کہا تھا کہ میرے کانوں تک اس کی آواز پہنچی تھی۔

”میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور میں اس وقت مسٹر ذیشان کے ساتھ ہوں۔ وہ مجھے کہیں چھوڑنے جا رہے ہیں۔“

جانے اس نے جواب میں کیا کہا تھا کہ جیمس نے موبائل میری جانب بڑھا دیا۔

موبائل کان سے لگاتے ہی میں نے پوچھا۔ ”یقین آیا۔“

وہ وارفتگی سے بولی۔ ”ذی!......آئی لو یو، میں بس آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔“

”کوشش کرنا کہ اکیلی آنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

غزنی شہر کے مضافات میں پہنچتے ہی میں نے کرنل جیمس کی آنکھوں پر سے پٹی کھول دی۔ میں اپنے ساتھ بس ڈرائیور کو ہی لایا تھا۔

ہوٹل کے سامنے ہی ہمیں جینیفر بڑی بے صبری سے منتظر ملی گاڑی کے رکتے ہی وہ آگے بڑھی اور میرے اترتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔

”ذی!......بہت بہت شکریہ۔“

میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ نیویارک نہیں ہے محترمہ۔“

وہ برا منائے بغیر کرنل جیمس میتھونی کی طرف بڑھ گئی۔

”کیسی ہو آفیسر۔“ جیمس نے اس سے پرتپاک مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ”عمدہ سر۔“

”اچھا میں چلوں گا۔“ میں ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔

”ٹھیک ہے۔“ جیمس نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔ جینی دوبارہ زبردستی گلے ملی اور وہ دونوں اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دور آتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوا۔

”رات یہیں شہید خان کے گھر گزار لیتے ہیں، صبح نکل چلیں گے۔“

شہید خان کا گھر وہی خفیہ ٹھکانہ تھا جہاں احمد بھی ٹھہرا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے وہیں چلو“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کمانڈر بسم اللہ جان کو کال کر کے وہاں رکنے کا بتانے لگا صبح بھی احمد کے اصرار پر ہم نے واپس لوٹنے کا پروگرام اگلے دن کے لیے مؤخر کر دیا تھا۔ رات گئے مجھے جینی کی کال ملی۔ میری ہیلو کے جواب میں وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

”ذی، تمھاری بے گناہی کے سارے ثبوت میں نے حاصل کر لیے ہیں۔“

”کیا......؟“ میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔“ جینی کھل کھلائی۔ ”کیا یقین نہیں آ رہا۔“

”ہاں۔“ میں نے صاف گوئی سے اقرار کیا۔

”ذی، حقیقت تو یہ ہے کہ میں اتنی جلدی ان ثبوتوں تک رسائی نہیں پا سکتی تھی، یہ کرنل جیمس میتھونی کی مہربانی ہے کہ کل جاتے ہی انھوں نے کرنل کولن فیلڈ کی جگہ کیمپ کی قیادت سنبھالی اور سب سے پہلا کام یہی کیا کہ تمھاری بے گناہی کے ثبوت میرے حوالے کر دیے۔“

”جینی!......اگر یہ سچ ہے تو میں بغیر کسی تاخیر کے انھیں حاصل کرنا چاہوں گا۔“

وہ اعتماد سے بولی۔ ”کہاں پہنچاؤں۔“

”وہی پرانا ہوٹل بہتر رہے گا۔“

”نہیں، اس مرتبہ کسی اچھے ہوٹل میں ملیں گے، اکھٹے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے تھوڑی دیر گپ شپ کریں گے اس کے بعد تم یوں بھی ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤ گے۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“میں نے فوراً حامی بھری۔

اس نے ایک مشہور اور اچھے ہوٹل کا نام لیتے ہوئے کہا۔”کل دوپہر میں کمرہ نمبر پندرہ میں تمھاری منتظر رہوں گی۔“

میں نے دوبارہ۔”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن دوپہر کو میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہٹ دھرمی کا اظہار کر کے اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور وہ تمام وڈیو دکھانے لگی جن کے شروع اور آخر میں ان کی اپنی باتیں اور منصوبے تھے جو وہ مجھے قابو میں کرنے کے لیے بنا رہے تھے۔ دو تین وڈیو دیکھ کر میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے جینی، یہ لیپ ٹاپ میں لے جاؤں گا۔“

”اس یو ایس بی میں تمام ڈاٹا ڈال دیا ہے۔“اس نے ایک یو ایس بی میرے جانب بڑھائی۔

یو ایس بی پکڑتے ہوئے میں نے کہا۔”لیپ ٹاپ بھی لے جاؤں گا۔“

وہ ہنسی۔”بے شک مجھے بھی لے جاؤ۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”ویسے شرم کی بات ہے کہ تمھارے سامنے وہ میرے خلاف منصوبے ترتیب دیتے رہے اور تم نہ صرف آرام سے وہ سب کچھ سنتی رہیں بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی انھیں نوازتی رہیں اور مجھے اشارہ تک نہ دیا۔“

وہ ہنسی۔”صحیح کہا اور میں اپنے فعل پر بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں۔“

”گویا مجھ سے پہلے تمھاری ذمہ داریاں ہیں۔“

”نہیں تم سے پہلے اور تم سے بعد بھی تم ہی ہو۔“

”جھوٹ بولنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“میں سچ مچ خفا تھا۔

”ڈی، ایسا میں نے ملک وقوم کے لیے نہیں اپنے لیے کیا تھا، میرا خیال تھا کہ شاید اس طرح تم امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ اور سچ کہوں تو تمھیں بلیک میل کرنے کے منصوبے میں میں پیش پیش تھی۔“اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

”تو وزیرستان میں آخری ملاقات کے موقع پر جب میں نے کسی بھی صورت امریکہ کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا، تب بھی تم نے یہ مواد میرے حوالے کیوں نہیں کیا۔“

”اس وقت تمام مواد البرٹ بروک کے پاس تھا، مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اسے میں نے اپنے اور تمھارے بارے سب کچھ سچ بتا دیا تھا اور اس کے بعد تمھارے معاملے وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔“

”اچھا جانے دو اس بحث کو، اب ارادہ کیا ہے۔“

اس نے انکشاف کیا۔ ”مہینے ڈیڑھ تک واپس جا رہی ہوں اور جاتے ساتھ شادی کا ارادہ ہے۔“

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”مجھے کیوں سنا رہی ہو۔“

”سنا نہیں رہی آخری موقع دے رہی ہوں، اب بھی وقت ہے مجھے روک سکتے ہو۔“

”کیا فائدہ، مجھ سے شادی کرنے کے ایک ماہ کے اندر تم اپنے فیصلے پر پچھتانا شروع کر دو گی۔ ہم مشرقی لوگ اپنی بیوی کو اتنی آزادی نہیں دے سکتے جو تمھارے ہاں میسر ہے۔“

وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ”میں پابندی برداشت کر لوں گی۔ بلکہ ایسا ہے کچھ عرصہ میرے ساتھ رہ کر دیکھ لو اگر تمھارے معیار پر پوری نہ اتری تو بے شک شادی نہ کرنا۔“

”بغیر شادی کے لڑکی، لڑکے کا اکٹھے رہنا بھی تمھاری ثقافت ہے، ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”تم اور پیلا وشہ بھی تو شادی سے پہلے اکٹھے رہتے رہے ہو، تمھارا کیا خیال ہے میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں جلدی سے بولا۔ ”تمھارے پاس نہایت غلط معلومات ہیں، پلوشہ اور میرے اکٹھا رہنے کا مقصد قبیل خان کا خاتمہ تھا۔“

وہ وثوق سے بولی۔ ”ممکن ہے ایک وجہ یہ بھی ہو، لیکن بھول گئے کیسے پیلا وشہ کے ایک بار پکارنے پر بھاگے چلے آئے تھے۔ مانو یا نہ مانو تمھارے دل میں پہلے سے اس کے بارے میں ایسے خیالات موجود تھے۔“

میں اسے جھڑکتے ہوئے بولا۔ ”جب بات کا پتا نہ ہو تو خواہ مخواہ بکواس نہیں کی جاتی۔“

وہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولی۔ ”اچھا دفع کرو، یہ بتاؤ ملنے آؤ گے کہ نہیں۔“

''کال پر بات کرلوں گا اور میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔ یوں بھی وہاں آ کر تمھارے شوہر سے مار کھانے سے بہتر ہے میں آؤں ہی نا۔''

''بڑے آئے مظلوم۔'' اس نے میرا منھ چڑایا۔ اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ویسے کوئی دولھا ڈھونڈا ابھی ہے یا واپسی ہی پر کچھ سوچو گی۔''

''کئی مرد عندیہ دے چکے ہیں، بس ابھی جا کر کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔''

میں نے کہا ''تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ کیونکہ ہماری شادی میں پلوشہ کے علاوہ بھی کئی رکاوٹیں ہیں۔''

''بالکل اور سب سے بڑی رکاوٹ ہے تمھاری ناپسندیدگی۔'' اس نے منھ بنایا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ''لڑکیاں چاہے کتنے بڑے عہدے پر کیوں نہ ہوں سوچنا انھوں نے دل ہی سے ہوتا ہے۔ ہماری شادی میں جو قباحتیں ہیں ان کے بارے میں تمھیں تفصیل سے آگاہ کر چکا ہوں اس کے باوجود تم یہی سمجھتی ہو تو بھاڑ میں جاؤ۔''

''پیلاوشہ میں ایسی کون سے بات ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔'' وہ میری ناگواری خاطر میں نہیں لائی تھی۔

''مجھ میں ایسی کون سے بات ہے جو تمھیں اپنے ملک کے پرکشش، خوب صورت اور اپنے ہم مذہب جوان پسند نہیں آرہے۔''

''یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور تمھارے اس سوال سے مجھے علم بھی ہو گیا ہے جو تم باور کرانا چاہتے ہو۔''

''کیا؟''

''یہی کہ، وہ مجھ سے خوب صورت ہے اور تمھیں زیادہ پیاری ہے۔''

''جینی، تم خواہ مخواہ بات کو بگاڑ رہی ہو پلوشہ کے ہوتے ہوئے بھی مجھے مذہب دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن یقین کرو تم بچپن سے جس ماحول میں پلی بڑھی ہو اسے چھوڑنا تمھارے لیے ممکن نہیں ہوگا، یہ محبت کا بھوت اترنے میں مہینے سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''اچھا یار چھوڑو، خواہ مخواہ صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''صفائیاں نہیں دے رہا حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

”کیا میں واقعی تمھیں پیاری لگتی ہوں؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور اس بات پر تمھیں بھی یقین ہے۔“

اس نے کہا۔ ”اور پیلا وشہ۔“

”وہ بھی۔“

”سچ کہوں تو پیلا وشہ مجھے بہت پیاری لگی ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”وہ بہت مظلوم ہے اور اس سے بھی زیادہ ہمت والی ہے۔“

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”ویسے میرے بارے کیا کہہ رہی تھی۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔ ”کچھ ایسا نہیں کہا جو بتایا جائے۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں اس خونخوار بلی کو۔“ نہ جانے کیوں مجھے اس کے لہجے کی گہرائی میں شفقت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

”اچھا مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے، تھوڑی خریداری کرنا ہے۔“

”اس وقت تو دو تین ہزار ڈالر ہی ہوں جیب میں، اگر زیادہ چاہئیں تو منگوا لیتی ہوں۔“

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”دو ہزار کافی ہیں۔“

وہ ممنونیت سے بولی۔ ”تمھارا رقم مانگنا مجھے اچھا لگا۔“

ہم کافی دیر گپ شپ کرتے رہے پھر اس سے اجازت لے کر میں وہاں سے نکل آیا۔ الوداع ہوتے وقت وہ کافی اداس ہو گئی تھی۔ لیکن بچھڑنا تو آخر تھا۔ اپنی عادت پر عمل کرتے ہوئے اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں نے حاصل کر لیے تھے۔ واپسی کا ارادہ کرنے کے ساتھ میرے دل میں کچھ خریداری کا خیال آیا، کیونکہ میں گلگارے، رنڑا اور ثمر خان وغیرہ کے لیے کچھ تحائف لینا چاہتا تھا۔ گھنٹا ڈیڑھ خریداری میں لگا کر میں واپس شہید خان کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہاں احمد، اس کی بیوی اور میزان سے آخری ملاقات کر کے میں ڈرائیور کے ساتھ واپس چل پڑا۔ عبدالحق اور بسم اللہ جان کو میں کامیابی کی خبر سنا چکا تھا۔ انھوں نے کال ہی پر مجھے بہت بہت مبارک باد دی تھی۔

"گویا اب واپس جاؤ گے۔" رات کو لیٹتے وقت عبدالحق مجھے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور پلوشہ بیٹی کے بارے کیا سوچا ہے۔"

ایک دم مجھے خیال آیا کہ ثبوت ملنے کی خوشی میں میں نے اپنی جان حیات کو بھلا دیا تھا جو میرے لیے جانے کہاں خوار ہوتی پھر رہی تھی۔

میں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ "میرے ذہن ہی سے یہ اہم کام نکل گیا تھا۔"

"چلو اب بتا دو کیا پروگرام ہے۔"

میں فوراً بولا۔ "پلوشے کو ڈھونڈ کر واپس جاؤں گا۔"

"ایک سودا کرو گے۔"

"کیسا سودا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈنے کا کام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں، میرا مطلب یہ کام میں چند مجاہدین کے ذمہ لگاتا ہوں آپ میرا ایک کام کر دیں۔"

"کون سا کام؟"

"نک سٹیورٹ نامی نشانہ باز ہمارا کافی نقصان کر چکا ہے۔"

"میرا خیال ہے پہلے بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔ پلوشہ جب تک مل نہیں جاتی مجھے یکسوئی حاصل نہیں ہو گی۔"

"ایسا کرتے ہیں آپ میرے ساتھ گردیز چلیں میں وزیرستان میں رابطہ کر کے کسی کمانڈر کے ذمہ پلوشہ کی تلاش کا کام لگاتا ہوں۔ آپ کے مطابق آخری بار وہ کمانڈر نصر اللہ خوجل خیل سے ملے تھے اس کے بعد کہاں گئے یہ کسی کو بھی پتا نہیں ہے۔ اب میرے خیال میں ان کی تلاش کا کام وہیں شروع کرنا پڑے گا اور اس ضمن میں کافی آدمی استعمال ہوں گے، تو بہتر یہی ہے کہ آپ میری بات مان لیں۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "گویا، میرے انکار کرنے پر آپ پلوشہ کی تلاش میں میری مدد نہیں کریں گے۔"

وہ فوراً بولا۔ "ایسا میں نے کب کہا ہے۔"

”آپ پلوشہ کی تلاش کا کام پہلے بھی تو شروع کرا سکتے تھے۔“میں شاکی ہوا۔

”ہاں، آپ کی طرح مجھے بھی امید تھی کہ وہ جلد یا بدیر مل جائے گی، مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ آپ کا کام ختم ہونے کے بعد بھی اس کی کوئی سن گن نہیں ملے گی۔ اور سب سے بڑھ کر آپ نے بھی تو کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔“

اس کی بات صحیح تھی پلوشہ کے ضمن میں مجھ سے تھوڑی سے بے پروائی ہو گئی تھی۔ مجھے کسی نہ کسی کو اس کی تلاش میں شروع دن سے لگا دینا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں خیال آیا۔

”کس کو لگاتا۔“ مجاہدین میرے زرخرید یا ملازم نہیں تھے کہ جہاد چھوڑ کر میری بیوی کو تلاش کرتے پھرتے۔ پاکستان آرمی سے میں یوں بھی بھاگتا پھر رہا تھا، جو دوست کسی قابل تھا وہ پہلے سے میرے کام کے سلسلے میں مصروف تھا اس کے علاوہ میں کر کیا سکتا تھا۔

”مجھے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔“ اگر اس کے علاوہ کوئی حل سوجھتا تو ہم آپ کو بالکل تکلیف نہ دیتے۔ یقین مانو اس خبیث کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب تو لگتا ہے ہمیں گردیز کیمپ کو خیر باد کہنا پڑے گا اور گردیز کیمپ کے بعد وہ کسی اور جگہ کو تاڑ لے گا۔ آپ کے شاگرد بھی اسے روکنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ صغیر اور اسلم پہلے شہید ہو گئے تھے، ایک ہفتہ پہلے مبین اور احسان بھی باقی نہیں رہے۔“

وہ چاروں میرے شاگرد تھے، گو انھوں نے صرف نشانہ بازی کے متعلق ہی تھوڑا بہت سیکھا تھا لیکن میرے ساتھ انھوں نے جو دو تین ہفتے گزارے تھے وہ وقت ایک یاد کی صورت میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ وہ نک سٹیورٹ کو ہلاک کرنے کی کوششوں میں خود شہید ہو چکے تھے۔ ایک منجھے ہوئے سنائپر کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ نک سٹیورٹ کی جینیفر بھی کافی تعریف کر چکی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ ایک خطرناک سنائپر تھا اور ایسے شخص کے مقابل آنے کا مطلب خود کو شدید خطرے میں ڈالنا تھا کیوں کہ وہ اس علاقے میں کافی عرصے سے سرگرم تھا۔ گویا گردیز کا علاقہ اس کے لیے ہوم گراؤنڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنی مرضی کے میدان کا انتخاب کر کے مجھے کسی مشکل سے دوچار کرنا اس کے لیے دشوار نہ ہوتا۔ اس سب کے باوجود بھی مجھے جان سے زیادہ پلوشہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”کس سوچ میں گم ہو۔“ مجھے خاموش پا کر وہ مستفسر ہوا۔

''عبدالحق بھائی آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ضروری نہیں کہ ایک سنائپر کے مقابلے میں آپ سنائپر ہی کو لائیں،اس کے خلاف کوئی اور منصوبہ بھی تو بنایا جاسکتا ہے۔

''ایسا بہت پہلے سوچ کر اس پر عمل کرنے کے باوجود ہم ناکامی کا سامنا کر چکے ہیں۔''

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔''پلوشہ کی تلاش کے لیے رابطہ کرلو۔اس کے علاوہ میری بے گناہی کے ثبوت بھی ایک خاص آدمی تک پہنچانے ہوں۔''

''ایس ایس زندہ باد۔''عبدالحق نے خوش دلی سے نعرہ بلند کیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ہم بسم اللہ جان اور اس کے ساتھیوں سے الوداع ہو رہے تھے۔کمانڈر بسم اللہ نے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔''ذیشان بھائی!......آپ کی یاد آئے گی۔''

''آپ کی محبت ہے کمانڈر، یقیناً آپ کی مدد کے بغیر میں یہ سب کچھ نہ کرسکتا۔''

''ہم نے آپ کے لیے اتنا نہیں کیا جتنا آپ نے ہمارے لیے کیا ہے۔''

میں ہنسا۔''چلو حساب برابر ہو گیا۔''

وہاں سے کچھ رستہ گاڑی میں بیٹھ کر گئے اور پھر پیدل روانہ ہوئے ہماری منزل پکتیکا کا ٹھکانہ تھی۔گو ہم گردیز تک گاڑی میں جاسکتے تھے،مگر میرے پاس جو ثبوت موجود تھے ان کی حفاظت کے لیے گاڑی کے بجائے ہم نے پیدل رستے کو ترجیح دی تھی۔

راستے میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا اور ہم خیریت سے اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر اسلام ہمیں پرتپاک انداز میں ملا۔

''یقیناً آپ کامیاب لوٹے ہیں۔''اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

میں نے کہا۔''الحمدللہ۔''

باقی افراد سے مصافحہ کرکے ہم بیٹھ گئے۔کمانڈر عبدالحق مختصر لفظوں میں کارگزاری سنانے لگا۔اس کی بات کے اختتام پر کمانڈر اسلام تصدیقی انداز میں مجھے مخاطب ہوا۔''گویا اب واپسی کا ارادہ ہے۔''

''نہیں۔'' میرے بجائے کمانڈر عبدالحق نے جواب دیا۔''ابھی تک ذیشان بھائی کا ایک کام رہتا ہے۔''
اسلام نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔''یقیناً ذیشان بھائی نے اپنی بیگم صاحبہ کو ڈھونڈنا ہوگا۔''
''نہیں۔'' عبدالحق نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔''پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈنے کے لیے آپ جا رہے ہیں۔اور اس کی شروعات آپ کریں گے استاد محترم نصراللہ خان خوجل خیل سے مل کر۔''
''میں سمجھا نہیں۔'' اسلام سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔
''ذیشان بھائی سے ایک معاہدہ ہو گیا ہے، یہ ہمارے لیے نک سٹیورٹ کا شکار کرے گا اور ہم پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈیں گے۔''
''یہ ہوئی نا بات۔'' اسلام خوشی سے اچھل پڑا تھا۔اسی دوران رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔کھانا کھا کر ہم نے عشاء کی نماز پڑھی، تھکے ہونے کے باوجود ہم کافی دیر بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔کمانڈر عبدالحق نے اسلام کو تفصیل سے پلوشہ کے ڈھونڈنے کی ترتیب بتا دی تھی۔لیکن اس سے پہلے اسے اورنگ زیب صاحب کو مل کر میری بے گناہی کے ثبوت ان کے حوالے کرنا تھے۔اورنگ زیب صاحب کا موبائل فون نمبر میں نے اسے دے دیا تھا۔کمانڈر اسلام کو میں نے ایک یو ایس بی بھی دی تھی جو اسے اورنگ زیب صاحب کے حوالے کرنا تھی۔ایک یو ایس بی میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی جبکہ لیپ ٹاپ میں نے اسی ٹھکانے پر رکھوا دیا تھا۔ثبوتوں کو گم کرنے کا میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔
اگلی صبح کمانڈر اسلام ایک ساتھی ہمراہ روانہ ہو گیا۔شمریز چچا اور ان کے گھر والوں کے لیے میں نے کافی تحائف خریدے تھے وہ تمام سامان میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔
کمانڈر اسلام نے معنی خیز لہجے میں کہا۔''مطلب چچا شمریز خان آپ کو بھولا نہیں ہے۔''
میں نے فلسفیانہ لہجے میں جواب دیا۔''ایسے لوگ بھلائے جانے کے قابل نہیں ہوتے۔''
''صحیح کہا۔''اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور الوداعی معانقہ کر کے۔''فی امان اللہ۔'' کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔
کمانڈر عبدالحق نے رات ہی کو ایک نزدیکی ٹھکانے سے دو تین آدمی منگوا لیے تھے، جو دوپہر تک ہمارے

پاس پہنچ گئے تھے۔ہم نے وہ دن بھی وہیں گزارا تھا۔دوسرے دن ہم دونوں گردیز روانہ ہو گئے۔کمانڈر عبدالحق بہت جوش میں تھا۔نک سٹیورٹ نے کافی مجاہدوں کو شہید کیا تھا اور اب وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔

مجھے جاننے والے میری نشانے بازی پر اندھا اعتماد کرتے تھے،ان کے نزدیک میں ایک ہیرو کی طرح تھا۔جبکہ بذات خود میرے دل میں یہ خوف جاگزیں رہتا کہ آیا میں لوگوں کی توقعات پر پورا بھی اتر پاؤں گا یا نہیں۔عمومی طور پر لوگ جس آدمی کے لیے خوش اعتقاد ہوتے ہیں اس کے بارے،بہت سی باتیں خود سے طے کر لیتے ہیں۔اور اس کے خلاف بات سننا تو درکنار سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔میری نشانہ بازی بھی کچھ لوگوں کے لیے یہی صورت اختیار کر گئی تھی۔کچھ صلاحیت اور کچھ مبالغہ آئی نے مجھے اس بلندی پر اٹھا دیا تھا جس کا میں خود کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔

ہم دونوں وہاں سے مرناہ گر روانہ ہوئے۔وہاں سے ہوتے ہوئے ہم ساروبی اور ارگون کے رستے گردیز پہنچ گئے۔یہ افغانستان کے صوبے پکتیا کا دارلحکومت ہے۔مجاہدین کا ٹھکانہ شہر سے کافی ہٹ کر پہاڑوں کے بیچ میں تھا۔رستے میں ہمارے دو دن مزید ضائع ہو گئے تھے۔وہاں ہم رات کو پہنچے تھے۔دن کے وقت ان پہاڑی سلسلوں میں حرکت کرنا کافی دشوار گزار ہو گیا تھا۔نک سٹیورٹ نے مجاہدین کی دن کی نقل وحرکت کو محدود کر دیا تھا۔نہ جانے کس جگہ پر چھپے ہوئے وہ اپنی دور مار رائفل کے ذریعے ان پہاڑوں میں گھومنے والے افراد کو نشانہ بناتا رہتا۔اس ضمن میں اس نے کافی ایسے افراد کو بھی نشانہ بنا دیا تھا جن کا اس جنگ سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا۔مرد تو کجا وہ عورتوں کو بھی معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔یوں بھی امریکیوں کے لیے تیسری دنیا کی عوام انسانیت کیا جانوروں کا درجہ بھی نہیں رکھتی۔اب اسی نک سٹیورٹ اور اس کی ساتھی لورا براؤن کے ساتھ میرا ٹاکرا ہونے والا تھا۔نہ جانے یہ مقابلہ کیا رنگ لاتا۔

⊛......⊛......⊛

گردیز کیمپ بھی دوسرے ٹھکانوں کی طرح غاروں کے مجموعے پر مشتمل تھا۔اور وہ غار جن پہاڑی سلسلوں میں موجود تھے وہ پہاڑی سلسلے کافی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔وہاں ایک بلند پہاڑی پر نک سٹیورٹ اور اس کی ساتھی لورا براؤن نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔اس پہاڑی کی تین اطراف میں بالکل سیدھی ڈھلانیں تھیں جنھیں نقشہ بینی میں ہم''اسکارپمنٹ''پڑھتے ہیں۔اوپر چڑھنے کے لیے صرف ایک ہی جانب راستہ موجود تھا جہاں پر سخت پہرہ تھا۔نک سٹیورٹ اس پہاڑی کی بلندی سے کافی دور دور تک نشانہ بنالیتا تھا۔ویسے وہ مستقل وہاں نہیں رہتا تھا،کبھی کبھار وہ نیچے اتر کر بھی اپنا شکار ڈھونڈنا شروع کر دیتا۔مجاہدین نے اسے مارنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا لیکن کامیابی سے ہنوز دور تھے۔اور اب میری شکل میں وہ ایک نئی کوشش کر رہے تھے ۔اس بار وہ کافی مطمئن تھے۔البتہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس ٹاکرے کا کیا انجام ہونے والا ہے۔اس مرتبہ میرے مخالف ایک ایسا سنائپر موجود تھا جس کی نشانہ بازی کی اس کے دشمن بھی تعریف کر رہے تھے۔میری طرح وہ بھی سر ہی میں گولی مارتا تھا۔جس پہاڑی پر وہ موجود تھا وہاں مستقل ٹھکانہ بنا کر رہنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہاں غار وغیرہ موجود نہیں تھے۔البتہ امریکن آرمی کے لیے ایسی پہاڑی پر رہائش کی سہولت مہیا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔مجاہدین بھی وہاں مورچے وغیرہ بنا کر رہ سکتے تھے لیکن وہ مورچے بالکل کھلے میں ہوتے اور امریکنز انھیں آسانی سے ہیلی کاپٹر سے نشانہ بنا سکتے تھے۔اس وجہ سے انھوں نے کبھی اس پہاڑی پر رہائش اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ ساری تفصیل مجھے گردیز کیمپ کے کمانڈر ضلع خان سے ملی تھی۔اگلی صبح میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ ان کے پاس موجود سنائپر رائفلوں کا جائزہ لیا،تاکہ اپنے لیے ہتھیار کا چناؤ کر سکوں۔کسی بھی لڑائی کا حصہ بنتے وقت سب سے زیادہ اہمیت ہتھیار کی ہوتی ہے۔اور سنائپرز کی جنگ میں تو ہتھیار کا درجہ عام لڑائی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

ان کے پاس تین ہیوی سنائپر یعنی رینج ماسٹر دو ڈریگنو،ایک سٹائر سنائپر اور ایک گلیل موجود تھیں۔ان میں سب سے بہتر رینج ماسٹر تھی کیوں کہ اس کی کارگر رینج باقی سنائپر رائفلوں سے زیادہ تھی۔اس کے علاوہ میں نے اس پر بہت زیادہ مشق بھی کی ہوئی تھی۔میں نے تینوں رینج ماسٹر کا معائنہ کیا اور ان میں سے ایک رائفل اپنے لیے

منتخب کر لی۔ گھنٹا ڈیڑھ میں نے رائفل کی صفرنگ کی اور پھر رائفل کی صفائی کرنے لگا۔ یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کر دوں۔ ایک اچھا سنائپر ایک ہی گولی سے رائفل کو جانچ لیتا ہے کہ وہ نشانہ سادھنے کے مقام سے کتنا دائیں بائیں یا اوپر نیچے مار رہی ہے۔ اور اپنے اندازے سے وہ اسی رائفل سے دوسری گولی چلا کر ہدف کو نشانہ بھی بنا سکتا ہے لیکن ایسا کرنا عارضی طور پر تو قابل قبول ہے مستقل بنیادوں پر نہیں۔ جب سنائپر نے ایک رائفل کو مسلسل زیرِ استعمال رکھنا ہو تب وہ اس کو صفر ضرور کرتا ہے اور اس کے لیے سنائپر کو کم از کم رائفل سے پانچ گولیاں فائر کرنا پڑتی ہیں۔ اور صفر کرنے کے بعد ہی ایک سنائپر اپنے ہتھیار پر اعتماد کر سکتا ہے۔

دن کا بقیہ حصہ میں نے علاقے سے واقفیت حاصل کرنے اور مختلف لوگوں کو پیش آنے والے حادثات کی تفصیل سننے میں گزارا۔ نک سٹیورٹ نے اپنے ٹھکانے سے دو کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر بھی چند آدمیوں کو کامیابی سے نشانہ بنایا تھا۔ یقیناً اس نے بلندی کا فائدہ اٹھا کر اپ ہل، ڈاؤن ہل تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اہداف کو نشانہ بنایا تھا۔ اور یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک منجھا ہوا سنائپر تھا۔ میرے بارے بھی جاننے والے یہی کہتے تھے۔ نامعلوم اب ہم دونوں میں سے کس کو کامیابی ملنے والی تھی۔ یہ ایسی جنگ تھی جس میں غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل تھی کہ اس کا کوئی مخصوص ہدف نہیں تھا۔ مار کے علاقے میں وہ جو حرکت دیکھتا اپنا کام کر گزرتا۔ اس کے برعکس مجھے صرف اسی کو نشانہ بنانا تھا۔

اگلی صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی میں ضلع خان کے ایک آدمی کے ساتھ مخصوص ٹھکانے سے باہر نکل آیا تھا۔ میرا ارادہ کسی ایسی پہاڑی پر ڈیرا ڈالنے کا تھا جہاں سے میں نک سٹیورٹ کی روزمرہ پر نظر رکھ سکتا۔ سب سے بڑا مسئلہ اس کی پہچان کا تھا کہ اس کے بعد ہی میں اسے نشانہ بنا پاتا۔

گزشتہ دن ہی میں نے ضلع خان کے آدمی اکرم کو تفصیل سے چلنے کے طریقہ کار کے متعلق بتا دیا تھا۔ چلتے ہوئے آڑ کا استعمال کیسے کرنا ہے، درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں سے کس طرح فائدہ اٹھانا ہے، پس منظر سے کیسے بچنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ایک تربیت یافتہ مجاہد تھا اس لیے اس کے دماغ میں میری باتیں اچھی طرح آ گئی تھیں۔

میں نک سٹیورٹ کے ٹھکانے کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اپنی جگہ سے چلنے سے

پہلے میں نے اس کے ٹھکانے کے دائیں بائیں موجود پہاڑیوں کا دوربین کی مدد سے گہری نظر سے جائزہ لیا تھا ۔اور پھر ایک مخصوص پہاڑی کا چناؤ کر کے میں نے اکرم کو اپنی منزل سے آگاہ کر دیا تھا۔

ہم نالے میں اتر کر مطلوبہ سمت کو چل پڑے۔نالے میں اتر کر ہم دور کے دکھاؤ سے محفوظ ہو گئے تھے۔اس لیے ہماری رفتار بھی تیز رہی اور ہمیں درختوں یا پتھریلی چٹانوں کی آڑ وغیرہ لینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی تھی۔نالے کے اندر جہاں تک محفوظ جا سکتے تھے ہم اطمینان سے گپ شپ کرتے ہوئے چلتے رہے۔اکرم کا تعلق بنوں سے تھا اور وہ پچھلے کئی سال سے افغانستان جہاد میں شامل تھا۔میں اسے سنائپرز سے بچنے کے لیے ضروری احتیاطوں کے بارے بتاتا رہا۔اس دوران اس نے کافی سوال بھی پوچھے تھے۔وہ مجھ سے کافی متاثر دکھائی دیتا تھا۔باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

”سچ کہوں تو ذیشان بھائی،آپ کی آمد سے پہلے آپ کے بارے بہت کچھ سن رکھا تھا اور میری خواہش تھی کہ کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو فائر کرتے ہوئے دیکھوں۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔”کل رائفل کو صفر کرتے وقت میں کافی گولیاں فائر کی تھیں امید ہے آپ کی تمنا پوری ہو گئی ہو گی۔“

وہ جلدی سے بولا۔”نہیں وہ تو آپ پتھروں کو نشانہ بنا رہے تھے۔اور میری خواہش ہے کہ دشمن کے سر میں آپ کی گولی کو لگتا دیکھوں۔اور اسی وجہ سے میں بڑی کوشش سے آپ کے ساتھ آیا ہوں۔“

اس کی بات پر میں نے ہلکی سی ہنسی اچھالی۔لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بننا ایک خوش کن بات ہوتی ہے،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی توقعات پر پورا اترنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔کیونکہ کوئی بھی کارنامہ سرانجام دینے کے لیے قسمت کا شامل حال ہونا ضروری ہوتا ہے۔اور مقدر کس وقت دغا کر جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔

ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے چڑھائی تھی اور اس جگہ پر ہم نک سٹیورٹ کے ٹھکانے سے دیکھے جا سکتے تھے۔گو ضروری نہیں تھا کہ اس وقت وہ اپنے ٹھکانے ہی پر ہوتا۔اس کا کسی دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہونا بھی ممکن تھا۔یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس وقت وہ نیند کے مزے لے رہا ہوتا۔اس کے علاوہ بھی کئی احتمال ممکن

تھے۔اور ایک سنائپر کو میدان جنگ میں سارے امکانات کو مدنظر رکھ کر حرکت کرنا پڑتی ہے۔

اوپر کی جانب حرکت کرتے ہوئے میں نے درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں کی آڑ کا استعمال خود بھی کیا اور اکرم کو بھی بار بار محتاط رہنے کا مشورہ دیتا رہا۔اوپر پہنچ کر ہمیں مطلوبہ پہاڑی بالکل قریب نظر آنے لگی جہاں پہنچ کر میں نے نک سٹیورٹ کے ٹھکانے کی نگرانی کرنا تھی۔لیکن اتنے قریب نظر آنے کے باوجود ابھی تک ایک نالا درمیان میں حائل تھا۔اس لیے وہ تھوڑی سی دوری ختم کرنا بھی ہمیں کافی دشوار لگا تھا۔دوسری طرف کے نالے میں اتر کر ہم اوپر پہنچ گئے۔وہ نالہ ہمارا، دو گھنٹے سے زیادہ وقت ضائع کر گیا تھا۔اور اتنا وقت احتیاط سے حرکت کرنے کی وجہ سے لگا تھا۔

بلندی پر پہنچ کر بھی ہم نک سٹیورٹ والی پہاڑی سے کافی نیچے تھے۔وہاں اس وقت مورچہ وغیرہ بنانا تو ممکن نہیں تھا البتہ آڑ میں رہ کر میں نے اپنے جسم، رائفل اور اکرم کو جھاڑیوں کی سبز ٹہنیوں سے چھپا ضرور لیا تھا۔ایک درمیانی پتھر کے پیچھے لیٹ کر میں نے رائفل کو دوپائی پر لگا دیا۔اس کے بعد فاصلہ ناپنے والے آلے سے مطلوبہ پہاڑی کا درمیان ناپا اور ٹیلی سکوپ سائیٹ پر رینج لگا دی۔اکرم خاموشی سے میری کارروائی دیکھتا رہا۔

”اکرم یاد رکھنا، کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال میں آڑ چھوڑنے کی غلطی نہ کرنا۔اب ہم خطرے کی حدود میں موجود ہیں اور آڑ سے باہر رہنے والا عضو تمھارے جسم کا حصہ نہیں رہے گا۔“

وہ خوش دلی سے بولا۔”بے فکر رہیں ذیشان بھائی، میں محتاط ہوں۔“

رینج ماسٹر پر لگنے والی لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کارکردگی کے لحاظ سے ایک عمدہ سائیٹ ہے۔عام آنکھ کی نسبت پچیس گنا زیادہ دکھانے کی خاصیت رکھتی ہے۔میں نے سائیٹ کے سامنے والا اور عقبی کور ہٹائے اور سامنے والے علاقے کا جائزہ لینے لگا ابھی تک میں نے رائفل کو کاک نہیں کیا تھا۔

جس پتھر کے پیچھے ہم لیٹے تھے وہاں سے ہم لیٹ کر ہی دشمن کی نظر اور فائر سے بچ سکتے تھے۔

اکرم نے پوچھا۔”میرا کیا کام ہوگا؟“

”تمھارا کام دائیں بائیں کا جائزہ لے کر کسی بھی ہلکی سی حرکت کے بارے مجھے مطلع کرنا ہے۔میگزین کو لوڈ کرنا وغیرہ وغیرہ۔“

اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ”وغیرہ کا مطلب ہے اس کے علاوہ بھی کوئی کام ہے۔“

”سنائپر کے ساتھ جو دوسرا آدمی ہوتا ہے اس کے بہت سارے کام ہوتے ہیں، مگر وہ تم نہیں کر سکو گے۔“

”مثلاً۔“ یقیناً اسے سنائپنگ کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کا شوق تھا۔

”ہوا کی رفتار ناپنا اور تیز یا درمیانی ہوا کی صورت میں حساب لگا کر ڈیفلیکشن معلوم کر کے لگانا، فاصلہ ناپنا، رینج لگانا، فائر ہونے والی گولی کو جانچنا بھی تمھاری ذمہ داریوں میں آتا ہے، مگر فی الحال تمھیں ان کاموں کے بارے معلوم نہیں ہے۔ اس لیے کوئی بے احتیاطی کیے بغیر پڑے رہو۔“ اجمالاً اس کی ذمہ داریاں دہراتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اسے محتاط رہنے کی تاکید کر دی۔

اور اس کی ”ٹھیک ہے۔“ سنتے ہی میں نے سائیٹ سے علاقے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے ہلکی سی چمک دکھائی دی۔ یہ چمک نک سٹیورٹ کے ٹھکانے والی پہاڑی کے بائیں جانب موجود نسبتاً ہموار اور ہماری طرف موجود ڈھلان سے آئی تھی۔ میں نے فوکسنگ ناب کو گھما کر منظر کو مزید واضح کیا۔ اس جگہ کا فاصلہ ہم سے ڈیڑھ کلو میٹر ہوگا۔ سبزے کے ڈھیر نے مجھے مزید چونکا دیا تھا۔ میں نے فوراً رائفل کاک کر کے مطلوبہ رینج لگائی اور اس کے بعد میں شیشے کی چمک پر شست لینے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے شعلہ دکھائی دیا۔ یقیناً فائر کیا گیا تھا۔ سیکنڈ کے چوتھائی حصے میں میں نے خود کو نیچے گرایا اور اسی وقت گولی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے اگلے عدسے کو توڑتی ہوئی آئی گلاس سے گزر گئی۔ اور ساتھ ہی گولی چلنے کا ہلکا سا دھماکا سنائی دیا۔ گولی کی رفتار آواز سے تیز ہوتی ہے۔ اگر مجھے آئی گلاس سے آنکھ ہٹانے میں آدھے سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو سنائپر رائفل کی طاقت ور گولی میری آدھی کھوپڑی اڑا کر لے جاتی۔

”ذیشان بھائی، آپ ٹھیک تو ہیں۔“ اکرم گھبراتے ہوئے اٹھ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ اسے لگا تھا کہ شاید گولی مجھے لگ گئی ہے۔

”لیٹ جاؤ بے وقوف۔“ میں اسی طرح اوندھے منھ لیٹے لیٹے چلایا۔ مگر میرا چیخنا بے کار گیا تھا، وہ گولی سے تیز حرکت نہیں کر پایا تھا۔ ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ نیچے گرا اور ہاتھ جھٹکنے لگا۔ سر میں لگنے والی گولی جلد ہی اسے خواہشات کی دنیا سے بہت دور لے گئی تھی۔ میرے بار بار محتاط رہنے کی نصیحت بے اثر گئی تھی۔

میں نے وہیں لیٹے لیٹے گردن کو موڑ کر اس کا جائزہ لیا لیکن وہ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں خود بھی پھنس گیا تھا۔ایک سنائپر اپنے کام کے معاملے میں بہت ثابت قدم ہوتا ہے وہ اتنی جلدی اپنے ہدف کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔اگر وہ اپنے شکار کو مردہ بھی سمجھ لے تب بھی وہ منتظر رہتا ہے کہ شاید لاش کے اٹھانے کے لیے کوئی وہاں آجائے اور اسے ایک نیا ہدف مل جائے۔

اگر میں لیٹے لیٹے بھی پیچھے کی طرف سرکتا پھر بھی پتھر سے ذرا دور ہٹتے ہی میرا جسم نظر آنا شروع ہو جاتا اور پھر ایک ماہر نشانہ باز کے لیے مجھے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ایک دفعہ میں نے بھی قبیل خان کے کمانڈر روشن خان کو اسی طرف پتھر کے عقب میں گھیرا تھا۔اور آج میں خود گھیرے میں آیا ہوا تھا۔

دوپہر بارہ ایک بجے کا وقت تھا اور مجھے پکا یقین تھا کہ روشنی ختم ہونے تک تو نک سٹیورٹ نے وہاں سے شست نہیں ہٹانا تھی۔کیوں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔مگر یوں اپنے دشمن سے دبک کر مسلسل وہاں پڑے رہنا میرے لیے نہایت ذلت آمیز تھا۔ایک سنائپر ہونے کے ناطے مجھے مخالف سنائپر کے حربوں کا توڑ آنا چاہیے تھا۔اس کے سامنے چار پانچ گھنٹے مسلسل دبکے رہنے سے بہتر تھا میں گولی کھا لیتا۔

اپنے غصے کو پس پشت ڈال کر میں نے ٹھنڈے دماغ سے اس حالت سے نکلنے کی ترکیب سوچی اور اس پر عمل کرنے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھا کر اکرم کی کلاشن کوف سے میگزین اتاری اور اس کے سر پر بندھی چادر کھول کر میگزین پر لپیٹنے لگا۔چادر کو میں نے اس طرح لپیٹا تھا جیسے انسان کی کھوپری ہوتی ہے۔چادر لپٹی میگزین کو میں نے بالکل دھیرے سے یوں بلند کیا جیسے کوئی آدمی سر اٹھا کر آگے کا جائزہ لینا چاہتا ہو۔میگزین کے چادر لپٹے ہوئے گول حصے کے آڑ سے باہر آنے کی دیر تھی کہ ایک دم میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور میگزین اڑ کر دور جا گری تھی۔اس کے ساتھ ہی میں نے عقب کی طرف موجود ڈھلان کی طرف زقند بھری اور دوسری چھلانگ کے ساتھ میں ڈھلان کی پناہ حاصل کر چکا تھا۔ایک سنائپر ہونے کی وجہ سے میں جانتا تھا کہ نک کو فائر کرنے کے بعد رائفل دوبارہ کاک کرنا ہوگی۔اس کے بعد دوبارہ شست قائم کرتے ہوئے دو اڑھائی سیکنڈ لگ جانا تھے۔اور اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔

(یہاں قارئین کے دماغ میں یہ سوال آسکتا ہے کہ کچھ سنائپر رائفلز آٹومیٹک بھی ہوتی ہیں۔اور ممکن تھا کہ

اس وقت نک سٹیورٹ کے پاس کوئی ایسی ہی رائفل ہوتی۔ایسی صورت میں میرا مارا جانا یقینی تھا۔تو مجھے کم از کم اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔جن قارئین کے دماغ میں یہ سوال اٹھا یقیناً وہ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو نظر انداز نہ کرنے والے قاری ہوں گے۔بہ ہرحال ان کے سوال کا میں پوچھے بغیر ہی جواب دے دیتا ہوں۔سنائپنگ میں استعمال ہونے والی تمام اٹو میٹک رائفلوں کا زیادہ سے زیادہ رینج ہزار میٹر یعنی ایک کلو میٹر تک ہوتا ہے۔اس سے زیادہ علاقے تک مار کرنے والی یعنی ہیوی سنائپر رائفلز آٹو میٹک نہیں ہوتیں۔کیونکہ اتنی بڑی رائفل کو اگر آٹو میٹک بنایا جایا تو یقیناً وہ فائر کرنے والے آدمی کے کندھے کو توڑ دے گی۔اور اس وقت نک سٹیورٹ ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے سے پر موجود تھا۔یقیناً وہ ہیوی سنائپر رائفل ہی استعمال کررہا تھا)

ڈھلان کی آڑ میں لیٹ کر میں اندھیرا چھانے کا انتظار کرنے لگا۔کیوں کہ اپنے ساتھی کی لاش اور اپنے ہتھیاروں کو پھینک کر بھاگ جانا مجھے کسی صورت زیب نہیں دیتا تھا۔اکرم کی کلاشن کوف اور میری رینج ماسٹر پتھر کے پیچھے ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ان تک رسائی اندھیرا ہونے کے بعد ہی ممکن تھی۔

یونھی لیٹے لیٹے میرا دل دکھ اور نا امیدی سے بھر گیا تھا۔نک سٹیورٹ مجھ سے کئی گنا بہتر ثابت ہوا تھا۔وہ اس وقت جنوب مغرب کی جانب اور میں اس سے شمال مشرق کی جانب موجود تھا۔سورج اس کے دائیں ہاتھ اور میرے بائیں جانب چمک رہا تھا۔اس طرح کہ ہماری ٹیلی سکوپ سائیٹوں کے سامنے والا عدسے (آبجیکٹ لینز) پر سورج کی روشنی یکساں پڑ رہی تھی۔جس طرح مجھے اس کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے کی چمک نظر آ گئی تھی،اسی طرح اس نے بھی میرے عدسے ہی کی چمک سے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔اور اسے میری خوش نصیبی ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ٹریگر دباتے وقت میں اسی کی جانب متوجہ تھا۔اور فائر سے ہونے والے شعلے کو دیکھ کر حفاظتی اقدام کر گزرا۔

اس مایوسی کے عالم میں مجھے اپنے پیاروں کی یاد بہت شدت سے آنے لگی۔پگلی پلوشہ جس کے نزدیک دنیا میں مجھ سے بہتر نشانے باز پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔اگر اسے میں کہہ دیتا کہ ایک نشانے باز کے ہاتھوں میں مرتے مرتے بچا ہوں۔تو یقیناً وہ میری جان کو آ جاتی۔مجھے جھوٹا،فراڈی اور جانے کیا کیا کہتی۔میرا یار سردار خان جس کے ہونے سے میری ہمت کئی گنا بڑھ جایا کرتی تھی۔میری پیٹھ پر تھپکی دے کر لازماً یہی کہتا۔

”راجے صاحب، اس فرنگی بے چارے کو کیا پتا کہ اس نے کس کے ساتھ پنگا لیا ہے۔ چل اب بوتھے پر ہنسی لا اور اٹھ جا۔“

محترم استاد راؤ تصور صاحب جن کی گالیاں بھی دعائیں محسوس ہوا کرتیں۔ فائر کراتے ہوئے وہ غلط فائر کرنے والے کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ڈانٹا کرتے۔ ”اوئے بے غیرتا، اوے بے شرما، بہت مہنگی گولی ہے جو تم نے ہوا میں اڑا دی۔ اگر تم میں تھوڑی عقل بھی ہوتی تو ٹریگر کو یوں نہ دباتے جیسے کسی کا گلا دبایا جاتا ہے۔“ یقیناً اس موقع پر انھوں نے مجھے یہی کہنا تھا کہ ”لڑکے جب تمھیں معلوم ہے کہ مخالف ایک اچھا سنائپر ہے اور ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے کی چمک دور سے نظر آجایا کرتی ہے تو تم نے پاپ اپ کور (ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے پر چڑھانے والا پلاسٹک کا کور) کو ذرا سا جھکا کر کیوں نہ رکھا تاکہ اس کے سائے سے شیشے کی چمک چھپ جاتی۔ خبردار دوبارہ ایسی غلطی کی تو۔ جاؤ دوبارہ کوشش کرو اور گولی ضائع نہ کرنا۔“

یا پھر استاد عمر دراز جنھوں نے یہی کہنا تھا۔ ”بیٹا اپنے سے کم تر سے مقابلہ کرنا کون سا مشکل ہے، مزہ تو تب ہے کہ خود سے بہتر کا سامنا کرو۔ اور کبھی بھی خود کو کمتر خیال نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے تمھاری حکمت عملی میں کوئی غلطی ہو۔“

اپنے تمام بہی خواہ اور ہمدرد آج مجھ سے کوسوں میل دور تھے۔ بس ان کی یادیں اور محبتیں ہی میرا سہارا تھیں۔ کمانڈر عبدالحق بھی ایک اچھا دوست تھا، مگر سردار جیسے جگری کا متبادل تو وہ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں کافی دیر یونھی لیٹا رہا۔ اچانک میرے کانوں میں وائرلیس پر ہونے والی بات چیت کی آواز آئی۔ جس کے پاس بھی وائرلیس سیٹ موجود تھا اس نے آواز کو مکمل کھولا ہوا تھا، تبھی تو کافی دور سے وہ آواز میرے کانوں پر میں پڑ گئی تھی۔

ایک دم چوکنا ہوتے ہوئے میں قریبی جھاڑی میں گھس گیا۔ ساتھ ہی میں نے کمر سے بندھے ہولسٹر سے بریٹا نکال لیا۔ یہ قیمتی پستول بھی مجھے ضلع خان ہی سے ملا تھا۔ وہ آدمی ڈھلان کے اوپر چلتے ہوئے آرہے تھے۔ لمحہ بھر بعد ہی مجھے دو آدمی دکھائی دے گئے تھے۔ ان کی حتمی تعداد کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وائرلیس سے اٹھتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی مگر بات چیت میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ میری نظروں کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھے، ان کے عقب میں ایک اور مسلح آدمی بھی موجود تھا

۔تینوں بریٹا پستول کی رینج میں تھے۔مگر جب تک ان کی تعداد کا اندازہ نہ ہو جاتا میں کوئی کارروائی نہیں کرسکتا تھا ۔میں بے حس وحرکت جھاڑی میں دبکا رہا۔

''یہاں پر ایک لاش اور دو ہتھیار پڑے ہیں۔اوور......''اس دفعہ میرے کانوں میں بولنے والے کی واضح آواز آئی تھی۔

''نک تو دو لاشوں کا بتا رہا تھا۔اور تم جانتے ہو اس بارے اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔اوور......''وائرلیس سیٹ سے ابھرنے والی آواز تک بھی میری سماعتوں کی رسائی ہوگئی تھی۔

''شاید دوسری لاش ان کا کوئی ساتھی اٹھا کر لے گیا ہو۔اوور......''اس نے اندازہ ظاہر کیا۔

''نہیں یہ جگہ نک کی نگرانی میں تھی ،ایک شخص یہاں سے فرار ضرور ہوا ہے مگر وہ اپنے کسی ساتھی کو اٹھا کر ساتھ نہیں لے گیا۔اوور......''

''یہاں پر ایک میگزین کے ساتھ گول چادر لپٹی ہوئی ہے اور اس میں گولی پیوست ہے۔یہاں سے بھاگنے والے نے یقیناً نک کو بے وقوف بنایا ہے۔اوور......''اس نے کافی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

''خیال کرو،کہیں آس پاس ہی نہ چھپا ہو۔اوور......''فوراً ہی اسے احتیاط کا مشورہ دیا گیا۔

''اگر اسے مرنے کا شوق ہوا تبھی مرجان سے پنگا لے گا۔اوور......''اس کا متکبرانہ انداز ظاہر کررہا تھا کہ وہ خود کو کوئی توپ چیز سمجھتا تھا۔اس کا ڈیل ڈول اور جسامت بھی اس کے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق ہی تھی۔موٹا تازہ لمبا تڑنگا دیونما انسان تھا۔

''لاش کو وہیں چھوڑ دو اور ہتھیار لے کے آجاؤ۔اوور اینڈ آل۔''انھیں آخری پیغام موصول ہوا۔

''چلو ہتھیار اٹھاؤ۔''اس نے اپنے ساتھیوں کو ہتھیار اٹھانے کا اشارہ کیا۔اس کی نظریں گھومتے ہوئے چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ایک دفعہ اس کی اچٹتی ہوئی نظر اس جھاڑی پر بھی پڑی تھی جس میں، میں چھپا ہوا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی کلاشن کوفوں کو کندھے سے لٹکا کر وہاں بکھرا سامان سمیٹنے لگے۔دوربین، کمپاس، لیزر رینج فائینڈر، ونڈ میٹر، فالتو ایمونیشن وغیرہ۔میرے لیے وہ سنہری موقع تھا کہ ہتھیار صرف ایک آدمی کے ہاتھوں

میں تھا۔اسے سر میں گولی مار کر میں بڑی آسانی سے باقی دونوں کو ہاتھ اوپر کروا سکتا تھا۔لیکن کمانڈر ہونے کے ناتے اس سے مجھے زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں ۔اس لیے اس کے سر کا نشانہ سادھنے کے بجائے میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو نشانہ بنایا۔جس میں اس نے کلاشن کوف پکڑی ہوئی تھی ۔ بریٹا کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا اس لیے گولی چلنے کی آواز کے بجائے، وہ مرجان کی چیخ سن کر ہڑبڑائے تھے۔کلاشن پر مرجان کی گرفت ختم ہوئی اور کلاشن کوف نیچے گر گئی۔اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے مضروب ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے ہاتھوں میں پکڑا سامان پھینکتے ہوئے کندھوں سے لٹکی ہوئی کلاشن کوفیں اتارنے کی کوشش کی ۔لیکن ان کی کوشش اتنی ہی ناکام ہوئی تھی جتنی ہوائی جہاز سے بغیر پیرا شوٹ کے چھلانگ لگانے والے کی اڑنے کی کوشش ناکام ہوتی ہے۔ان کے سر میں لگنے والی بریٹا کی ایک ایک گولی کافی رہی تھی۔ان کے تڑپنے کے نظارے سے بے نیاز ہو کر میں مرجان کی طرف متوجہ رہا۔وہ اپنے بائیں ہاتھ سے نیچے گری کلاشن کوف اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں جھاڑی سے باہر آتا ہوا بولا۔''اگر بائیں ہاتھ کو ضائع کرانے کا شوق ہے تو بے شک کلاشن کوف اٹھا سکتے ہو۔''

مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی کلاشن کوف نیچے گرا دی۔''ہمارے ساتھی آتے ہی ہوں گے،تم بچ نہیں پاؤ گے۔''وہ مجھے دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

''تم اپنے بائیں ہاتھ سے ایک ایک کر کے تمام ہتھیار اور بکھرا ہوا سامان نشیب کی طرف لے آؤ۔''ایک پتھریلی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر میں نے اس پر پستول تان لیا۔گو ان کے وہاں پہنچنے کا مطلب یہی تھا کہ نک سٹیورٹ نے وہاں اپنی نگرانی ختم کر دی تھی۔لیکن اس کے باوجود میں خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''بہتر ہو گا کہ مجھے جانے دو۔''وہ میرے حکم پر عمل کرنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔''مرجان خان،بہتر تو یہی ہو گا کہ تم دونوں ٹانگوں اور بائیں ہاتھ کو سلامت رکھتے ہوئے یہ کام سرانجام دو۔اگر ایک ٹانگ زخمی کرا کے تم زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو تو یقیناً مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔''

اس مرتبہ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چار کلاشن کوفیں، رینج ماسٹر اور سنائپنگ کا دوسرا سامان وہ میرے قریب لا کر ڈھیر کر چکا تھا۔

آڑ میں کر کے میں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور پھر اسی کی چادر سے پٹی پھاڑ کر اس کے ہاتھ پر باندھ دی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم کی لاش کو اس کے کندھوں پر لاد کر میں اسے اپنے آگے چلا کر مخصوص ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اپنی پیٹھ پر میں نے رینج ماسٹر کا تھیلا اٹھایا ہوا تھا جبکہ کلاشن میں نے ہاتھوں میں تیاری حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔ باقی کلاشن کوفیں میں نے وہیں ایک جھاڑی میں چھپا دی تھیں۔

سہ پہر ڈھلنے والی تھی اور سورج ڈوبنے سے پہلے میں کسی محفوظ جگہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

مرجان خان زخمی ہاتھ کے باوجود بڑی آسانی سے اکرم کی لاش اٹھا کر چل رہا تھا۔ یقیناً وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا جب وہ مجھ پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا۔ لیکن اس بے وقوف کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس وقت وہ پاک آرمی کے ایک تربیت یافتہ سنائپر کے قبضے میں تھا۔ میں اس بارے ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہا تھا، یوں کہ نہ تو بھاگ کر مجھ سے دور جا سکتا تھا اور نہ اکرم کی لاش کو مجھ پر پھینک کر کوئی فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ کلاشن کوف کی ایک سلنگ اکرم کی کمر سے باندھ کر دوسری سلنگ کا پھندا بنا کر میں نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ اور دونوں سلنگوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ اس طرح اکرم کی لاش کو پھینک کر وہ بھاگنے کی قطعاً نہیں سوچ سکتا تھا۔

میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے وائرلیس سیٹ پر اسے پکارا جانے لگا۔

”مرجان خان، تم کہاں پہنچے ہو؟ اوور......“

”اسے بتا دو تم رستے میں ہو۔“ مرجان کے قریب پہنچ کر میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وائرلیس اس کے منھ کے قریب پکڑ لیا۔

”ہمیں قریباً آدھا گھنٹا مزید لگے گا۔ اوور......“ اس نے بڑی شرافت سے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔

”ٹھیک ہے احتیاط سے آنا۔ اوور اینڈ آل۔“ اس کا ساتھی مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔

واپسی کے سفر میں ہمیں چڑھائیوں سے زیادہ اترائیوں کا سامنا رہا اس لیے مطلوبہ فاصلہ ہم نے بہت جلد

طے کر لیا تھا۔شام کا اندھیر گہرا ہونے سے پہلے میں مرجان خان کے ساتھ اس پہاڑی کی بنیاد میں موجود جس کے قریباً درمیان میں مجاہدوں کا ٹھکانہ تھا۔ ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔میں نے مرجان کو غلط حرکت سے روکنے کے لیے اس کے مزید نزدیک ہو گیا تھا۔

''رکو۔''اسے رکنے کا کہہ کر میں نے سامنے جا کر دیکھا۔وہ پھندے کی گرہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا ۔کلاشن کوف کی نال اس کی ٹھوڑی سے لگا کر میں نے دوسرے ہاتھ سے گرہ کو ٹھیک کر کے باندھ دیا۔اتنی سردی کے باوجود اس کے چہرے اور گردن پر پسینہ بہہ رہا تھا۔رستے میں میں نے اسے دو تین منٹ سے زیادہ ستانے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''چلو۔''اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے میں نے ٹارچ نکالی اور مخصوص انداز میں جلانے بجھانے لگا ۔فوراً ہی روشنی کا اشارہ موصول ہو گیا تھا۔اور پھر توقع کے مطابق دس منٹ بعد تین چار مجاہد نیچے اترتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔

اپنی شناخت بتا کر میں نے انھیں مزید قریب بلا لیا۔ایک نے میری پیٹھ سے رینج ماسٹر کا تھیلا اتار کر خود پہن لیا۔اسی نے تشویش بھرے انداز میں اکرم کی بابت پوچھا۔

میں دکھی دل سے بولا۔''اکرم ہم میں نہیں رہا۔''

''یہ کون ہے؟''اس نے آہستہ روی سے آگے بڑھتے مرجان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دشمن ہے اور اس کے کندھوں پر اکرم کی لاش ہے۔''

مزید کوئی بات کیے وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ٹھکانے پر پہنچتے ہی وائرلیس سیٹ سے مرجان پارٹی کو پکارنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔میں نے سیٹ کو آف کر دیا۔اکرم کی لاش کو اس کے کندھوں سے اتار ضلع خان کے آدمیوں نے مرجان کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک غار میں بند کر دیا تھا۔

کھانا کھا کر میں انھیں کارگزاری سنا رہا تھا۔

''اکرم کو جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔''میری بات کے اختتام پر کمانڈ عبدالحق نے زبان کھولی۔

''جب وقت پورا ہو جائے تو پھر کوئی احتیاط کام نہیں آتی۔''ضلع خان نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

عبدالحق نے پوچھا۔ ’’تو اب کیا ارادہ ہے؟‘‘

گہرا سانس لے کر میں خاموش ہو گیا تھا۔ عبدالحق نے ایک دو منٹ میرے جواب کا انتظار کیا۔ مستقل خاموش پا کر وہ مجھے تسلی دینے لگا۔

’’اس میں آپ کی غلطی نہیں ہے ذیشان بھائی، بلکہ آپ نے تو ایک کے بدلے دو کو موت کے گھاٹ اتارا اور ایک کو قیدی بنا کر بھی لے آئے ہیں۔‘‘

’’میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس مرتبہ بھی عبدالحق کی بات کا جواب دیے بغیر میں قہوے کی خالی پیالی دستر خوان پر رکھ کر اٹھ گیا۔

بستر میں گھستے ہی مجھے مایوسی اور اداسی نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سیر کو سوا سیر ٹکرا جائے تو یہی ہوا کرتا ہے۔ میں اپنی خامیوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت مجھے کسی اپنے کی ضرورت بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اگر پلوشہ میرے ساتھ ہوتی تو اب تک میں اپنی شکست کا غم بھول کر نئے عزم کی جوت جگا چکا ہوتا۔ مگر جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔ میری ہمراز، میری محافظ، میری ساتھی، میری بیوی، میرے کندھے سے کندھا ملا کر ہر مشکل میں کود پڑنے والی، میری روکھی پھیکی زندگی میں خوشیاں اور سکون بھرنے والی جانے کہاں غائب تھی۔ اب تو یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کے ساتھ بیتا وقت ایک سہانا سپنا ہی تو تھا۔ اس کی مدُھر آواز سننے کو میرے کان ترس گئے تھے، اس کی موہنی صورت کے دیدار کے لیے آنکھوں کی پیاس بڑھ گئی تھی۔ ہاتھوں کو اس کے لمس کی چاہ تھی تو ناک اس کی خوشبو سونگھنے کو بے تاب۔ اپنی شکست کو بھلا کر میں اسی کو سوچتا گیا اور اسی سوچوں نے مجھے نیند کی وادیوں میں دھکیل دیا جہاں اب تک وہ مجھ سے بچھڑی نہیں تھی۔ اس کے جاندار قہقہے میری سماعتوں کو رونق بخش رہے تھے، اس کی شرارتیں میرے ہونٹوں کو ہنسنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اور اس کی موہنی صورت میری آنکھوں کی پیاس بجھا رہی تھی۔ مجھ سے اٹھکیلیاں کرتے کرتے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اور میری گود میں سر رکھے ہوئے اس نے اپنی روشن آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

’’راجو، کیا کبھی آپ نے خود سے بہتر نشانے باز دیکھا ہے؟‘‘

’’نک سٹیورٹ مجھ سے بہتر ہے نا گڑیا۔‘‘ اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے میں نے صاف گوئی سے اقرار کیا

”آپ کیسے پتا چلا، کیا کبھی آمنا سامنا ہوا ہے۔“

”ہاں......“ میں اسے گزشتہ روز ہونے والے جھڑپ کی تفصیل سنانے لگا۔

وہ بحث کرتے ہوئے بولی۔ ”تو اس کے پہلے گولی چلانے کی وجہ سے وہ بہتر ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس نے آپ کو پہلے دیکھ لیا ہو اور آپ کی نظر اس پر بعد میں پڑی ہو۔“

”اس نے میری ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے میں گولی مار کر مجھے مار ہی دیا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی جو میں نے بروقت سر ہٹا لیا تھا۔“

وہ وثوق سے بولی۔ ”قسمت کے بارے تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتی، لیکن یہ آپ کی مہارت ہی تھی جس کی وجہ سے آپ اس کی گولی کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ اور اگر اسے ایک لمحے کی دیر ہو گئی ہوتی تو یقیناً وہ اپنا سر پیچھے نہ ہٹا پاتا۔“

میں نے منھ بنایا۔ ”تم بس مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہی ہو۔“

”راجو، میری آنکھوں میں دیکھو۔“ اس کی ہلکی نیلی آنکھیں جھیل سیف الملوک سے بھی گہری تھیں۔ میں ان کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ ”راجو، میں جھوٹ نہیں کہتی......اور کبھی مجھے مایوس نہ کرنا۔ مجھے آپ پر بہت مان، بہت بھروسا اور بہت یقین ہے۔ کبھی کسی ہار نہ ماننا۔ ورنہ آپ کی پلوشے نہیں رہے گی، غم سے مر جائے گی۔“

اس کا مایوس لہجہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ میں فوراً بولا۔ ”پگلی، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نک سٹیورٹ تو میرے بائیں ہاتھ کی مار ہے، میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔“

”جانتی ہوں۔“ اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا تھا۔ ”اب بس جلدی سے اس کانٹنا ختم کرو اور میرے پاس پہنچو۔ میرا ایک ایک پل سال بن کر گزر رہا ہے۔“ اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ اور پھر میں کوشش کے باوجود سو نہیں سکا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر میں نے ناشتا کیا اور طلوع آفتاب کے ساتھ نئی لیوپولڈ سائیٹ نکال کر اسے صفر کرنے کے لیے غار سے باہر نکل آیا۔ رینج ماسٹر کا پورا تھیلا ہی میں اٹھا کر لے آیا تھا کہ صفر رنگ میں فاصلہ ناپنے والے آلے اور ونڈ میٹر وغیرہ کی بھی ضرورت تھی۔ کمانڈر عبدالحق نے مجھے رائفل کے ساتھ غار سے باہر

جاتے دیکھ لیا تھا۔وہ بھی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔اس کی آمد سے پہلے میں چند فائر کر چکا تھا۔

''ذیشان بھائی،لگتا ہے تیاری شروع کر دی ہے۔''

''ہاں۔''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''کل صبح سویرے دوبارہ جا رہا ہوں۔میرے لیے کسی سمجھ دار ساتھی کا انتخاب کر لو۔''

وہ مسکرایا۔''یہاں پر مجھ سے سمجھ دار کوئی بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر خود ہی تیار ہو جانا۔''میں نے ایلی ویشن اور ڈیفلیکشن ناب میں مناسب تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے منھ بنایا۔''میں تو پچھلی بار بھی تیار تھا۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔''آپ کی زندگی کے کچھ دن بقایا تھے نا تبھی آپ ساتھ نہ جا سکے۔''

اس کا قہقہہ مجھ سے بھی بلند تھا۔

''اچھا قیدی سے کس وقت پوچھ گچھ کرو گے؟''

''آخری گولی فائر کر لوں پھر چلتے ہیں۔''میں رائفل کے پیچھے لیٹ کر صفرنگ کو پرکھنے کے لیے تیار تھا۔کوئی مناسب پتھر ڈھونڈنے کے لیے میں نے سائیٹ میں دیکھتے ہوئے بیرل کو گھمایا۔میں نزدیکی پہاڑی پر کوئی ہدف تلاش کر رہا تھا۔اچانک مجھے دور ایک پہاڑی پر حرکت نظر آئی۔یہ وہی پہاڑی تھی جس پر کل اکرم شہید ہوا تھا۔مذکورہ پہاڑی کا زمینی فاصلہ تو زیادہ تھا مگر ہوائی فاصلہ دو کلو میٹر ہی کے بہ قدر ہو گا۔وہ پہاڑی ہمارے ٹھکانے سے زیادہ بلندی پر واقع تھی۔میں نے فوراً لیزر رینج فائیڈر سے فاصلہ ناپا اکیس سو میٹر بن رہا تھا۔بلندی کا زاویہ ناپ کر میں نے حساب لگایا۔ساڑھے انیس سو میٹر کی رینج نکلی۔میں نے فوراً مطلوبہ رینج لگائی اور آئی گلاس سے مخصوص فاصلہ رکھ کر اپنا گال بٹ پر ٹیک دیا۔

میری تیزی دیکھتے ہوئے کمانڈر عبدالحق کو بھی شک گزرا تھا۔''خیر تو ہے بڑی تیزی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔''خوش گوار حیرت کے اظہار کے ساتھ اس نے تھیلے سے دوربین اٹھا کر آنکھوں سے لگا لی۔

''کل ہم جس پہاڑی پر گئے تھے وہاں حرکت نظر آ رہی ہے۔''یہ کہتے ہوئے میں نے سائیٹ میں جھانکتے ہوئے کہا۔''چھ......نہیں سات آدمی ہیں۔''

”آٹھ، نو، دس......تین ڈھلان پر ہیں۔“ کمانڈر نے پر جوش لہجے میں تصحیح کی۔”مگر فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے ایک ساکن آدمی پر شست باندھی جو شاید وائرلیس پر بات کر رہا تھا۔لبلبی دباتے ہی۔ہلکی سی ”ٹھک۔“ ہوئی اور مذکورہ شخص اچھل کر نیچے گر گیا تھا۔اسے تڑپتے دیکھ کر دائیں بائیں موجود افراد اسے سنبھالنے کے لیے اس کی طرف بڑھے مزید دو کے گرتے ہی باقیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ تڑپنے والوں کو سنبھالنے سے زیادہ اپنے جسم کو آڑ میں رکھنا اہم ہوگا۔تین آدمی مخالف جانب کی ڈھلان میں اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے،جبکہ ایک میری طرف موجود ڈھلان میں اترنے کی حماقت کر بیٹھا۔اس کے تین ساتھی اور بھی اس طرف موجود تھے اور اپنے ساتھیوں کی چیخ وپکار سن کر وہ بھی اوپر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ڈھلان پر موجود آدمیوں کا اپنے مرنے والے ساتھیوں سے اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا کہ مجھے رینج میں کوئی تبدیلی کرنا پڑتی۔میں نے جلدی سے میگزین تبدیل کی کہ پہلے والی میگزین میں صرف تین ہی گولیاں موجود تھیں۔نئی میزین لگاتے ہی میں نے رائفل کاک کی اور اگلی گولی پناہ کے لیے غلط سمت کا چناؤ کرنے والے کو لے ڈوبی۔ڈھلان پر پہلے سے موجود تینوں آدمی آڑ کی تلاش میں اوپر کی طرف بھاگے کیونکہ انھیں گولیاں چلنے کی سمت معلوم ہوگئی تھی۔چند گز چڑھائی چڑھنا اتنا مشکل نہیں تھا،لیکن ایسی چڑھائی پر بھاگ کر نہیں چڑھا جاسکتا تھا۔اگلی دو گولیوں نے مزید دو کو جدوجہد سے بے نیاز کر دیا تھا۔تیسرا ایک جھاڑی میں دبک گیا۔لیکن اس کی بدقسمتی کہ جھاڑی صرف نظری آڑ دے سکتی ہے گولی کے لیے کوئی حفاظت مہیا نہیں کرتی۔اس کے ساتھ ہی مجھے دور سے فائر کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔یقیناً وہ اندھا دھند فائر کر کے ایمونیشن کو ضائع کر رہے تھے۔دو تین لمحے جھاڑی پر شست باندھنے کے بعد مجھے اس کا ہیولا نظر آنے لگا تھا۔اس کے سر وغیرہ کا تو کوئی خاص اندازہ نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نے اندازے ہی سے گولی فائر کر دی۔جھاڑی میں ہونے والی ہلچل نے مجھے کامیاب فائر کی نوید سنا دی تھی۔

”یار سنائپر واقعی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔“ میرے ساتھ لیٹا عبدالحق پتا نہیں میری تعریف کر رہا تھا یا مذمت۔

میں نے اپنی شست بلندی پر پڑی لاشوں کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔" فوراً کمانڈر ضلع خان کو کہو کہ ایک پارٹی تیار کرے۔ میں یہیں لیٹے ہوئے دشمن کو لاشیں اٹھانے سے روکوں گا وہ روشنی ختم ہونے سے پہلے کسی لاش کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ کمانڈر کے آدمی چھپتے ہوئے مناسب جگہوں پر مورچے سنبھال لیں وہ اندھیرا چھاتے ہی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے آئیں گے۔ اور اس وقت کسی کو واپس نہیں جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" کہتے ہوئے وہ غار کے اندر کی طرف بھاگ پڑا۔ میں سنائپرز کی ازلی ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی طرف متوجہ رہا۔ ہمیں تربیت کے دنوں میں کئی کئی گھنٹوں تک ایک ہی جانب شست باندھ کر لیٹنا پڑتا تھا۔ پورے دن میں ہدف نے صرف تیس سیکنڈ کے لیے نمودار ہونا ہوتا تھا۔ فائر کرنے کے لیے ایک ہی گولی ہوتی تھی اور ناکامی کی صورت میں استاد راؤ تصور صاحب کا سامنا کرنے کے خیال ہی سے ہماری روح فنا ہونے لگتی۔ سردار خان تو کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی ہدف پر گولی نہ مار سکے تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس گولی کو اپنے سر میں مار کر عزت کی موت قبول کر لے۔ ورنہ راؤ تصور صاحب کی جلی کٹی باتیں سن کر اس نے بعد میں ویسے ہی خودکشی کر لینا ہے۔ ہم سب تصور صاحب سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا کواغلیل، چوہا بلی اور ہرن شیر سے ڈرتا ہے۔ لیکن تربیت کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ بہ ظاہر نہایت سخت دل اور بے رحم نظر آنے والے راؤ تصور صاحب دل کے کتنے نرم اور ہمدرد انسان ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جذباتی ہو کر آنکھیں نم کرنے والے ہمارے شفیق استاد نے بس تربیت کے دنوں میں جلاد کا روپ اختیار کیے رکھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی استاد تھے اگر ان کی مار اور پھٹکار نہ ہوتی تو ہم کبھی بھی اتنی سخت مشقوں سے نہ گزر سکتے۔ بعد میں سردار خان اکثر راؤ صاحب کے بے عزتی بھرے وعظ کو سننے کے لیے کافی الٹی سیدھی حرکتیں کر جایا کرتا تھا، مگر تربیت کے دنوں والی بات پھر کبھی میسر نہ ہوئی۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ اصل مزہ آتا ہی اس بے عزتی کا ہے جو حقیقتاً بے عزتی محسوس ہو۔ اور جب بے عزتی پندو نصیحت محسوس ہونے لگے تب اس میں وہ مزہ نہیں رہتا۔

دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ضلع خان اپنے دس آدمیوں کے ہمراہ تیار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ خود اپنے آدمیوں کے ہمراہ جا رہا تھا۔ ہدف سے شست ہٹائے بغیر میں نے انھیں مخالف سنائپر کی گولی سے بچنے کے لیے ضروری ہدایات کیں۔ کمانڈر عبدالحق نے انھیں مطلوبہ پہاڑی کی نشان دہی کرائی اور اس کے ساتھ ہی انھیں

مخصوص جگہیں بتائیں جہاں وہ چھپ کر دشمن کا انتظار کر سکتے تھے۔

''اگر انھیں ذراسی حرکت بھی نظر آ گئی تو دشمن کبھی بھی وہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پوری پہاڑی کو گھیر کر شکاریوں ہی کو شکار کر ڈالے۔اس لیے بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانا ہے اور فکر نہ کروا ندھیرا چھانے تک وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔اور یاد رکھنا مخالف سنائپر کی طرف سے کسی کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے تو وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔اس کا صاف مطلب یہی ہوگا کہ وہ تمھاری موجودی سے واقف ہو گئے ہیں۔ایسی صورت میں لوٹنے کی کرنا۔''میں نے انھیں آخری ہدایت کی۔

ضلع خان خوشگوار لہجے میں۔''ٹھیک ہے کمانڈر۔'' کہتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نشیب میں اترنے لگا۔

کمانڈر عبدالحق نے خواہش ظاہر کی۔''مجھے بھی جانا چاہیے۔''

''آپ کی یہاں زیادہ ضرورت ہے۔فی الحال خالی میگزین میں گولیاں بھر دو۔اور پھر دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا ہوگی۔''

وہ میرے ساتھ بیٹھ کر میگزین میں گولیاں بھرنے لگا۔میں مسلسل ہدف کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا،لیکن لگتا یہی تھا کہ انھیں سختی سے حرکت نہ کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

ایک دم خیال آنے پر میں نے عبدالحق کو کہا۔''کمانڈر،اندر سے ان کا وائرلیس سیٹ تو اٹھا لاؤ۔''

وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔واپسی پر اس کے ہاتھ میں دشمن سے چھینا ہوا وائرلیس تھا۔میرے ساتھ بیٹھ کر اس نے وائرلیس آن کیا اور چینل تبدیل کرنے لگا۔جلد ہی اس نے مطلوبہ چینل ڈھونڈ لیا تھا۔

ایک بھاری سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔''کوئی حرکت بھی نظر نہیں آ رہی کمانڈر۔اوور......''

''ایک آدمی کو اوپر بھیجو مگر احتیاط سے۔اور تمام لاشیں کو اپنی جانب کی ڈھلان پر اکٹھا کر لو،یہاں سے بیس آدمیوں کی ایک پارٹی بھیج دی ہے۔اوور......'' دوسری آواز تھوڑی مدہم آ رہی تھی،یقیناً فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس آواز مدہم اور کٹ کٹ کر آ رہی تھی۔

پہلی سنائی دینے والی آواز نے کہا۔''پرلی ڈھلان پر بھی ہمارے چار ساتھی موجود تھے،ان کی آواز سنائی

نہیں دے رہی۔اوور......"

"پہلے اوپر والی لاشیں اکٹھی کرلو، اگر گولی وغیرہ نہیں چلتی تو وہ بھی اٹھالانا۔اوور......"

"ٹھیک ہے کمانڈر۔اوور......"

اور کمانڈر کے۔"اوور اینڈ آل۔" کہنے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

چند لمحوں بعد ہی قربانی کا ایک بکرا محتاط انداز میں عقبی ڈھلان سے نمودار ہوا۔چونکہ میں انھیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ جونھی وہ سامنے آئیں گے مارے جائے گے تبھی اس کے سامنے آتے ہی میں نے ٹریگر دبا کر اس کے ناتواں کندھوں سے ساتھیوں کی لاشیں اکٹھی کرنے کا بار ہٹا دیا۔اب اس کی لاش کی فکر بھی دوسروں نے کرنا تھی ۔اس کا تڑپنا نہیں رکا تھا کہ وائرلیس جاگ اٹھا۔وہی پہلے والا شخص گھبرائی ہوئی آواز میں پکار رہا تھا۔

"احتشام فار مبین اوور......"

"سنیڈ یور میسج اوور......" مبین کی مدھم آواز ابھری۔

احتشام نے کہا۔"کمانڈر، شامل خان کو بھیجا تھا وہ بھی باقی نہیں رہا۔اوور......"

کمانڈر مبین نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔"ٹھیک ہے اب حرکت نہیں کرنا اور آنے والوں کو بھی اندھیرا چھانے کا انتظار کرنے کو کہنا ہے۔اوور اینڈ آل۔" اس کے لہجے میں شامل جھلاہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ کسی نامعلوم سنائپر پر اسے کتنا غصہ آیا ہوا تھا۔

اچانک وائرلیس سے ایک نسوانی آواز ابھری وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی ۔"موبن، جب منع کیا گیا ہے تو پھر اپنے آدمی کو کیوں سامنے آنے دیا ہے۔اوور......" اس نے مبین نام کی مٹی پلید کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

مبین نے نادم لہجے میں کہا۔"سوری میڈیم، میں نے سوچا شاید وہ خبیث دفع ہو گیا ہو۔اوور......"

"نکی، نے کل بتا دیا تھا نا کہ کوئی پیشہ ور سنائپر ہے۔اوور......" اندازے کے مطابق میں لورا براؤن کی آواز سننے کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔

مبین نے کہا۔"اب احتیاط کریں گے میڈم۔اوور......"

میں اور نکی اس کی تلاش میں جا رہے ہیں، تم اندھیرا ہونے سے پہلے لاشیں نہ اٹھوانا۔شاہ اور کاریم ہمارے ساتھ ہیں۔اوور اینڈ آل۔'' کاریم یقیناً وہ کریم کو کہہ رہی تھی۔

میں نے فوراً اٹھ بیٹھا۔کمانڈر عبدالحق انگلش نہیں جانتا تھا، پوچھنے لگا۔

''یہ شاید لورا براؤن تھی، کیا کہہ رہی تھی؟''

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔''میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''وہ میری تلاش میں نکل رہے ہیں۔اور میرے اندازے کے مطابق انھیں اس رستے سے آنا چاہیے۔''میں نے شمال مغرب کی پہاڑیوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔''کیوں کہ جنوب کی جانب سے انھیں ایک تو طویل چکر کاٹنا پڑے گا اور دوسرا اس طرف سے آتے وقت وہ میری نظر میں آسکتے ہیں۔اورنک جیسا سنائپر کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔''

''تو......؟''اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

''اگر ہم ان سے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بلندی پر پہنچ گئے تو شاید کوئی کامیابی ہاتھ لگ جائے۔''میں نے شمال کی جانب موجود ایک اونچی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

عبدالحق بولا۔''اگر ہم چلے گئے تو وہ لاشیں اٹھانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور ابھی تک ضلع خان اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا''اب وہ حرکت نہیں کریں گے۔لورا براؤن اسی متعلق بات کرتے ہوئے اسے ڈانٹ رہی تھی۔''

''چلو پھر۔''اس نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی تھی۔اپنا سامان سمیٹتے ہوئے ہم چل پڑے۔وہاں موجود آدمیوں کو ہم نے اپنے جانے کی سمت کا بتاتے ہوئے ضلع خان تک بھی فوراً یہ اطلاع پہنچانے کا کہا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے انھیں تاکید کی تھی کہ وہ غار سے باہر نہ نکلیں۔کیوں کہ نک سٹیورٹ کا نشانہ وہی پہاڑی اور اس کے دائیں بائیں موجود دو پہاڑیوں نے بننا تھا۔جہاں پر اس کے ساتھی میرا نشانہ بنے تھے، وہاں انھیں نشانہ بنانے کے لیے انھی تین بلندیوں سے فائر کیا جا سکتا تھا۔اورنک جیسے تجربہ کار سنائپر سے بعید تھا کہ وہ یہ اندازہ نہ لگا پاتا۔اب مجھے اس پر صرف اتنی فوقیت حاصل تھی کہ اس کے ارادے کا پتا چل گیا تھا۔

رینج ماسٹر کا جھولا میری پیٹھ پر لدا تھا۔کمانڈر عبدالحق نے ہاتھوں میں کلاشن کوف تھامی ہوئی تھی۔ہم تیز رفتاری سے چلتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی مشرقی جانب اترے اور پھر نالے میں بے فکری سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔وہ نالہ فرلانگ بھر مشرق کی طرف جا کر شمال کی جانب مڑ رہا تھا۔میرے پاس چونکہ وزن زیادہ تھا اس لیے کمانڈر عبدالحق مجھ سے دو تین قدم آگے چل رہا تھا۔رینج ماسٹر کا وزن تقریباً سترہ کلو گرام ہے۔گویا یہ ایک رائفل چار پانچ کلاشن کوفوں کے بہ قدر وزنی ہو گی۔سنائپنگ کا بقیہ سامان البتہ کمانڈر عبدالحق نے اپنے جھولے میں ڈالا ہوا تھا۔

میری کوشش تھی کہ جلد از جلد ہم اس بلندی پر پہنچ جائیں۔نالے میں ہونے کی وجہ سے دشمن کی وائرلیس سیٹ پر کی گئی گفتگو ہمیں سنائی نہیں دی رہی تھی۔

تیز رفتاری سے چلنے کی وجہ ہمارے سانس پھول گئے تھے۔اب نالہ بتدریج بلند ہو رہا تھا۔چڑھائی چڑھتے ہوئے مجھے پلوشہ کی یاد آ گئی وہ بہت تیز رفتاری سے پہاڑوں پر چڑھتی تھی۔سر ہلا کر میں نے اس کی یادوں کو دور جھٹکا کیوں کہ اس وقت مجھے ایک شاطر سنائپر سے لڑنے کی حکمت عملی سوچنا تھی۔اور پلوشہ کی یاد مجھے ہر چیز سے غافل کر دیا کرتی۔

ایک چھوٹی پہاڑی عبور کر کے ہم دوسری جانب اترے۔نشیب میں جاتے ہوئے ہمارے قدموں کی رفتار تیز تھی۔نالے میں پہنچتے ہی اونچائی کا سفر شروع ہو گیا۔کمانڈر عبدالحق نے با اصرار مجھ سے رینج ماسٹر کا تھیلا لے لیا تھا۔اب ہم مطلوبہ پہاڑی کی بلندی طے کر رہے تھے۔اوپر چڑھتے ہوئے ہم نے مشرقی جانب کا انتخاب کیا تھا اور یوں ہم نک سٹیورٹ کی نظروں میں آئے بغیر اوپر پہنچ سکتے تھے۔ہمارا ٹھکانہ اس پہاڑی کے جنوبی سمت میں پڑ رہا تھا۔اس ٹھکانے سے نک سٹیورٹ کی جگہ شمال مغرب میں بن رہی تھی جبکہ یہاں سے اس کا مقام جنوب مغرب کی جانب بن رہا تھا۔ہمیں اس بلندی پر پہنچتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔اوپر پہنچتے ہی ہم نے دو منٹ ستا کر اپنے سانس بحال کیے اور پھر میں فوراً رائفل کو جوڑنے لگا۔سب سے آخر میں ٹیلی سکوپ سائیٹ جوڑ رہا تھا۔اس دوران کمانڈر عبدالحق دوربین نکال کر علاقے کا جائزہ لینے لگا۔

رائفل جوڑ کر میں نے سب سے پہلے فائر کرنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کی اور پھر اس پہاڑی کا ٹیلی

سکوپ کی مدد سے جائزہ لینے لگا جس پر میرے خیال میں نک سٹیورٹ نے پہنچنا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ کسی دوسری پہاڑی کا انتخاب کرتا لیکن ایک سنائپر ہونے کے ناتے اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اسی پہاڑی کا انتخاب کرتا۔ اور پھر وہ مجھے نظر آ گئے۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ اس پہاڑی کے شمال مغربی کونے سے اوپر چڑھے تھے ۔ان کی تعداد چار تھی ۔لیکن سب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے نک سٹیورٹ کی پہچان نہیں تھی ۔ بلکہ نک تو کیا اس فاصلے سے لورا براؤن کا امتیاز بھی نہیں ہو رہا تھا۔ تمام نے سروں پر گرم ٹوپیاں اوڑھی ہوئی تھیں ۔ فاصلہ ناپنے پر مجھے انیس سو میٹر معلوم ہوا تھا۔ ان کا رخ پتھر کی ایک بڑی چٹان کی طرف تھا اور مجھے شک تھا کہ اس چٹان کے جنوبی جانب مورچہ سنبھال کر وہ میری نظر سے اوجھل ہو جاتے ۔اس سے پہلے مجھے اندازے سے نک سٹیورٹ کو پہچان کر کے نشانہ بنانا تھا۔

ایک آدمی پیٹھ پر جھولا اٹھایا ہوا تھا، لامحالہ اس جھولے میں سنائپر رائفل نے ہونا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ رائفل کو اٹھانے والا نک سٹیورٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی تینوں میں سے اندازے سے درمیان میں چلنے والے پر نشانہ سادھتے ہوئے میں نے گولی داغ دی۔ دیر کرنے کی صورت میں انھوں نے بڑی چٹان کی آڑ میں پہنچ کر میری نظر سے غائب ہو جانا تھا۔ گولی کھا کر وہ اچھل کر مخالف سمت میں گرا تھا، اس کے دائیں بائیں چلنے والے دونوں افراد نے اتنی تیزی سے زمین پر گر کر لڑھکتے ہوئے پتھروں کے عقب میں پناہ لی تھی کہ میں انھیں نشانہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کر سکا تھا۔ البتہ سامان اٹھانے والا پہلے تو شاک کی کیفیت میں کھڑا رہ گیا تھا اور پھر شاید کسی کے کہنے پر اس نے حرکت میں آنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے دیر ہو گئی تھی ۔ یقیناً اس کا زمین پر لیٹنے کا سو فیصد ارادہ تھا، مگر اس کے ارادے کو عملی جامہ میری گولی نے پہنایا تھا۔ غریب اپنی پیٹھ پر لدا تھیلا بھی نہ اتار سکا۔ وزنی تھیلے نے اسے سکون سے تڑپنے بھی نہیں دیا تھا۔

رائفل کو دوبارہ کاک کرتے ہوئے میں نے ان دو پتھروں کو اپنی نظر میں رکھ لیا تھا جس کے پیچھے بقیہ دو آدمی چھپے تھے۔ ان کی تیزی دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دونوں ہی میرا اصلی ہدف تھے۔

’’میرا خیال ہے اصلی آدمی بچ گیا ہے۔‘‘ کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ ہی لیٹ کر دوربین سے جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ بھی آدمی ہی تھے یار۔“میں ہنسا۔”کیا آپ کو روبوٹ دکھائی دے رہے تھے۔“

”میرا مطلب تھا کہ نک سٹیورٹ بچ گیا۔“اس نے خوش دلی سے وضاحت کی۔

اسی وقت وائرلیس سیٹ پرنسوانی آواز ابھری۔یہ وہی آواز تھی جو ہم پہلے بھی سن کر اسے لورا براؤن سمجھ چکے تھے۔

”ون ون فارٹو ون اوور......“

”یس میڈیم......“مبین نامی کمانڈر کی آواز ابھری یقیناً اسی کا کوڈ نام ٹو ون تھا۔

”موبن، ہم پرحملہ ہوا ہے،شاہ اور کاریم مارے جا چکے ہیں۔یہاں کچھ آدمی بھیجو۔اوور......“اس کی بات سن کر ہمیں نک کے بچنے کی تصدیق ہوگئی تھی۔

”میڈم،بیس آدمی لاشیں اٹھانے کے لیے بھیجے ہیں،یہاں پر دس بارہ آدمی ہی بچے ہیں۔اور کیمپ سے شام تک مزید نفری نہیں پہنچ سکتی۔اوور......“

”کیا وہ اب تک وہاں نہیں پہنچے۔اوور......“لورا براؤن کی آواز میں شامل جھلاہٹ اس کے غصے کو ظاہر کر رہی تھی۔

”پہنچ تو گئے ہیں،لیکن اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔اوور......“

لورا براؤن نے کہا۔”انھیں کہو لاشیں اٹھائیں اور واپس آجائیں۔اوور......“

”مگر سنائپر کا خطرہ تو اب تک موجود ہے نا۔اوور......“مبین نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”نہیں،وہ خبیث شاید ہماری ٹرانسمشن سن رہا تھا اس لیے وہ ہمارے خلاف گھات لگانے پہنچ گیا۔اوور......“یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سب دانت پیستے ہوئے کہہ رہی ہو۔پچھلے چند ماہ سے وہ مسلسل کامیابیاں سمیٹ رہے تھے۔اب انھیں خاطر خواہ جواب ملا تھا تو غصہ تو انھیں آنا تھا۔

”مگر اسے کیسے معلوم کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔“مبین نے حیرانی ظاہر کی۔”یہ نہ ہو آپ پر حملہ کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہو۔اوور......“

”موبن،یہ بحث کا وقت نہیں ہے،دیے گئے حکم پر عمل کرو......جب کہہ دیا کہ وہ وہاں نہیں ہے تو بس نہیں

ہے۔اوور اینڈ آل۔“لورا براؤن نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

میں ساتھ ساتھ کمانڈر عبدالحق کو بھی لورا براؤن اور مبین کی بات چیت سے آگاہ کرتا گیا۔اسی وقت مبین اپنے انتظار کرنے والے ساتھیوں کو لاشیں اٹھانے کا حکم بھی دہرانے لگ گیا تھا۔اس بار وہ پشتو میں بولا تھا اس لیے کمانڈر عبدالحق کو اس کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔اس کے آدمیوں کا فاصلہ ہم سے زیادہ تھا اس کے باوجود ان کا جواب سنائی دے گیا تھا۔

عبدالحق دعائیہ لہجے میں بولا۔”اللہ کرے ضلع خان تک ہمارا پیغام پہنچ گیا ہو۔“

میں نے مشورہ چاہنے والے انداز میں کہا۔”میرا خیال ہے لورا براؤن کے ساتھ تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔“

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔”اس طرح تو انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم ان کی ٹرانسمشن سن رہے ہیں۔“

”انھیں پہلے ہی سے پتا ہے،لورا براؤن اس بارے مبین کو اشارہ دے چکی ہے۔“

”بات چیت کا فائدہ؟“عبدالحق بات چیت کے حق میں نہیں تھا۔”اور پہلے اگر شک تھا تو آپ اسے یقین میں بدل دیں گے۔“

”دشمن کو نفسیاتی طور پر اس کی شکست کا احساس دلانے سے وہ بدحواس ہو کر غلطیاں کرتا ہے،غصے میں آکر مواقع فراہم کرتا ہے۔باقی جہاں تک اس سیٹ کا تعلق ہے تو چند گھنٹوں تک اس کی بیٹری جواب دے جائے گی اور ہمارے پاس نہ تو اس کی فالتو بیٹری ہے اور نہ اس بیٹری کو چارج کرنے کے لیے اس کے مخصوص برانڈ کا چارجر۔بہتر ہوگا کہ انھیں اپنے پاس وائرلیس کی موجودی کا یقین دلا کر ان پر نفسیاتی دباؤ بڑھا دیں،اس طرح وہ کھل کر بات چیت نہیں کر سکیں گے۔“

”بڑا دور تک سوچتے ہو یار۔“اس کا تحسین آمیز لہجہ مجھے بات چیت کی اجازت دینے کے لیے تھا۔

میرے بات کرنے سے پہلے ہی دور کہیں مسلسل فائر کی آوازیں آنے لگیں۔

عبدالحق نے خیال ظاہر کیا۔”لگتا ہے کمانڈر ضلع خان نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“

اسی وقت لورا براؤن مبین کو پکار کر فائرنگ کی وجہ پوچھنے لگی۔

''میڈم، لگتا ہے دشمنوں سے ٹاکرا ہو گیا ہے، میں پوچھ کر بتاتا ہوں۔ ویٹ......''لورا کو انتظار کرنے کا کہہ کر وہ بار بار اپنے آدمی کو پکارنے لگا۔''احتشام فار مبین اوور......''

تین چار بار پکارنے کے بعد احتشام کی سہمی ہوئی آواز آئی۔''کمانڈر، ہم دشمن کے گھیرے میں ہیں۔ جتنے آدمی بھی لاشیں اٹھانے اوپر پہنچے تھے ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ میں اور ضیاء ایک چٹان کے پیچھے چھپے ہیں ہمیں کمک بھیجو اوور......''

''تمھارے پاس بیس آدمی بھیجے تھے۔ اوور......''مبین چیخ ہی تو پڑا تھا۔

''میرے خیال میں تو ہم دو بچے ہیں۔ اوور......''احتشام کی سہمی ہوئی آواز اس کے خوفزدہ ہونے کو ظاہر کر رہی تھی۔ یقیناً ضلع خان نے ایک دم ہلہ بول کر ان کا صفایا کیا تھا۔

مبین اسے جواب دیے بغیر لورا براؤن کو صورت حال بتانے لگا۔ نک سٹیورٹ کی آواز اب تک میں نہیں سن پایا تھا۔ شاید وائرلیس سیٹ لورا کے ہاتھ تھا اس لیے وہی بات چیت کرتی تھی۔

''فوراً کیمپ میں بات کر کے ہیلی منگواؤ۔ اوور اینڈ آل۔''صورت حال دیکھتے ہی لورا نے چیختے ہوئے حکم پاس کیا تھا۔ پیچھے کیمپ سے مبین نے لانگ رینج وائرلیس ہی پر بات کرنا تھی اور وہ ٹرانسمشن ہم نہیں سن سکتے تھے۔ گردیز شہر میں موبائل فون سروس کام کرتی تھی۔ مگر ان پہاڑوں میں سگنل نہیں آتے تھے۔ یا اگر آتے بھی تھے تو انھیں جام کر دیا گیا تھا تاکہ مجاہدین کے رابطے میں رکاوٹ ڈالی جا سکے۔

''لورا بے بی، بہت پریشان لگ رہی ہو۔ اوور......''وائرلیس سیٹ پر خاموشی چھاتے ہی میں بول پڑا تھا۔

''Who is here''اس نے چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''شاید دوست نہ کہہ سکو اور دشمن کے نام سے کیا لینا کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ اوور......''

''تمھارا انجام بہت برا ہو گا۔''اس نے نفرت بھرے لہجے میں دھمکی دی۔

''اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا لورا بے بی، اور تمھیں اس احمق نک نے بھی نہیں بتایا کہ سنائپر تب ہی اپنے شکار کا پیچھا چھوڑتا ہے جب اس کا متبادل بندوبست کر لے۔ خواہ مخواہ اتنے آدمیوں کو مروا دیا۔ اوور......''

”وعدہ کرتی ہوں تم زیادہ عرصہ زمین پر چلتے نظر نہیں آؤ گے۔اوور......“غصے کی زیادتی کی وجہ سے اسے دھمکی دینے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

میں نے اسے چڑایا۔”اگر تم آڑ سے اپنا ہاتھ بھی باہر نکال کر دکھا دو تو میں سمجھوں گا تم واقعی کچھ کر سکتی ہو۔اوور......“

”اگر اتنے ہی سورما ہو تو مجھے سنائپر رائفل اٹھانے دو، پھر میں دیکھ لیتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔اوور......“اس مرتبہ اس کے لہجے میں غصے کے بجائے دلچسپی چھپی تھی۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔”کیا دشمن کو بھی ہتھیار دیے جاتے ہیں لورا بے بی۔اوور......“

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”نہتے آدمیوں پر ہتھیار تان کر بڑھکیں مارنے والا کوئی نامرد ہی ہو سکتا ہے۔اوور......“

میں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔”تو تم کون سا مرد ہو۔اوور......“

”تمھارا نام کیا ہے۔اوور......“

میں عاشقانہ انداز میں بولا۔”حسن والے جس نام سے پکاریں مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔اوور......“

اس نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔”کیا تم نے مجھے دیکھا ہے؟اوور......“

”تعریف تو کافی سنی ہے۔اوور......“میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔

اس نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا۔”اگر اتنی ہی خوب صورت لگتی ہوں تو مجھے جانے دو۔اوور......“

میں نے پوچھا۔”کیا اپنے ساتھی کو یہیں چھوڑ جاؤ گی؟اوور......“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔”پہلے اپنی جان کی فکر کرنا چاہیے۔اوور......“

”اگر جانے دوں تو بدلے میں مجھے کیا ملے گا۔اوور......“

”کیا چاہیے۔اوور......“

میں نے کہا۔”ڈیٹ پر چلو گی۔اوور......“

”اگر میرا جواب اثبات میں ہوا تو۔اوور......“اس کا شوخی بھرا لہجہ اس کی تہذیب و ثقافت کو ظاہر کر رہا تھا

۔وہ کوئی مشرقی لڑکی نہیں تھی کہ ایسی باتوں پر شرماتی ۔جس تہذیب میں شوہر کی آنکھوں کے سامنے اس کے دوست سے لپٹ کر بوسا دیا جا سکتا ہو ان کے لیے شرم و حیا کوئی معنی نہیں رکھتے۔

''ٹھیک ہے، تم اپنے سر سے ٹوپی اتار کر اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دو تاکہ میں پہچان کی تصدیق کر سکوں۔ایسا نہ ہو دھوکے میں تمھارا نامراد عاشق نک بھاگ جائے۔اوور......''

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم مجھے جانے دو گے۔اوور......''یقیناً وہ مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔بس تھوڑی مہلت لے کر ہیلی کاپٹرز کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

''جب اعتبار نہیں ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔اوور......''

''ایک پاکستانی سنائپر کا نام سنا تھا، جسے ہمارے کچھ دوست ایس ایس کہہ کر پکارتے تھے۔کیا تم وہی ہو۔اوور......''اس مرتبہ وہ مطلب کی بات پر آ گئی تھی۔یقیناً میری نشانہ بازی سے ساتھ جو مبالغہ آمیز کہانیاں مشہور تھیں ان تک بھی یہ شہرت پہنچی ہو گی۔یوں بھی ہم پیشہ ہونے کی حیثیت سے میرا نام اس تک پہنچنا کوئی حیرت نہیں رکھتا تھا۔مجھ تک بھی تو کافی عرصہ پہلے اس کا نام پہنچ گیا تھا۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''پتا نہیں یہ ایس ایس کیا بلا ہے۔اس کی تعریفیں میرے کانوں تک بھی پہنچی ہیں۔اوور......''

وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔''اگر تم وہ نہیں ہو تو پھر ہم یونہی تم سے ڈر رہے ہیں۔یقیناً تم ہمیں روک نہیں پاؤ گے۔اوور......''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔بہ ہر حال تم آڑ سے سر باہر نکال کر میرا امتحان لے سکتی ہو۔اوور''

اسی وقت ایک پتھر کے پیچھے سے کوئی چیز بلند ہوئی۔یقیناً وہ انسانی سر نہیں تھا۔غور کرنے وہ مجھے کلاشن کوف کے بٹ جیسی نظر آئی تھی۔یقیناً اس نے کلاشن کوف کو الٹا کر کے اس کا بٹ پتھر کی آڑ سے اوپر اٹھایا تھا۔وہاں گولی کو ضائع کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔مگر دشمن کے دل میں ہیبت بٹھانے کا اچھا موقع تھا۔یا شاید میں نک سٹیورٹ کو اپنی مہارت دکھانا چاہتا تھا۔بہ ہر حال کچھ بھی تھا، میں نے کلاشن کوف کے بٹ کے پتھر کی آڑ سے بلند ہونے کے ایک سیکنڈ بعد ہی ٹریگر دبا دیا تھا۔رینج ماسٹر کی گولی نشانہ ڈھونڈنے میں ناکام نہیں ہوئی تھی۔

رائفل کاک کر کے میں نے فوراً وائرلیس سیٹ کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”سوری بے بی، یقیناً تمھارے نازک ہاتھوں کو جھٹکا لگنے کی تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی۔اوور......“

”تمھیں مارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا۔اوور......“ اس مرتبہ رسیور سے مردانہ آواز ابھری تھی۔

”چچ...... چچ......ویسے ایک سنائپر کے لیے شرم کا مقام ہے کہ اتنی دیر سے اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہیں کر سکا۔اوور......“ میں نے اسے غیرت دلائی، مگر وہاں غیرت کرنا اپنی گردن کٹوانے کے مساوی تھا۔اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو بھی وہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرتا۔گزشتہ روز میرے عقب میں موجود ڈھلان قریب تھی اس لیے میں انھیں دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔آج انھیں کم از کم دس بارہ قدم لینے کے بعد آڑ مل سکتی تھی اور اس اتنے قدم لینے کی اجازت انھیں رینج ماسٹر کی گولی نہیں دے سکتی تھی۔وہ اکٹھے بھاگتے تو یقینی تو نہیں البتہ شاید ایک آدمی کی جان بچ جاتی۔اور اتنا بڑا خطرہ وہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

وعدہ رہا، جلد ہی تمھارا ادھار سود سمیت واپس کروں گا۔اوور......“ نک سٹیورٹ کے لہجے میں شامل اعتماد ظاہر کر رہا تھا کہ اسے اپنی نشانہ بازی پر کتنا بھروسا تھا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اگر بچ گئے تو۔یوں بھی تھوڑی دیر تک تمھارے گرد میرے آدمیوں کا گھیرا تنگ ہو جائے گا۔اوور......“

اس مرتبہ اس کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

عبدالحق نے لمحہ بھر کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زبان کھولی۔ ”بڑی طویل گپ شپ ہو رہی ہے بھئی ،ہمیں بھی کچھ پتا چلے۔“

میں نے کہا۔ ”بڑی غلطی ہوگئی ہے یار!......آئی کام سیٹ نہیں لایا، اگر ضلع خان کے آدمیوں سے رابطہ ہوتا تو انھیں اس پہاڑی کو گھیرنے کے لیے بلا سکتے تھے۔“

کمانڈر عبدالحق نے کہا۔ ”جلدی کے منصوبے میں اس طرح کی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔“

میں مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ”بس یہ غلطی ہمارے جدوجہد کو بڑھا دے گی۔“

وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے واپس جانے میں مجھے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا۔تقریباً سارا راستہ

اترائی ہے۔ٹھکانے سے تین چار آدمی ساتھ لے کر میں خود ہی اس پہاڑی کا رخ کروں گا۔‘‘

’’بھاگو۔‘‘میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

’’ہوسکتا ہے ضلع خان پارٹی کے ہاتھوں دشمنوں کا کوئی اور وائرلیس لگ گیا ہو،ایسا ہوا تو اسی پر رابطہ کریں گے۔میں آپ کو کہوں گا عبداللہ کیا حال ہے اور آپ نے فوراً چینل نمبر پندرہ لگا لینا ہے۔‘‘اس نے سرعت سے منصوبہ سوچتے ہوئے بیان کیا اور میرا جواب سنے بغیر دوڑ لگا دی۔اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی نک پارٹی کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

’’ون ون فار ٹو ون اوور......‘‘نک مبین کو پکار رہا تھا۔

’’ٹو ون سینڈ یور میسج اوور......‘‘مبین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

’’شاباش۔‘‘نک نا معلوم اسے کس بات پر شاباش دے رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی تھی۔اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ’’شاباش‘‘فریکونسی تبدیل کرنے کا کوڈ بھی تو ہوسکتا تھا۔تبھی تو ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔میں فوراً ناب گھمانے لگا۔ایک دومنٹ میں مجھے مطلوبہ فریکونسی مل گئی تھی۔واقعی میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔شاباش کا مطلب متبادل فریکونسی لگانا ہی تھا۔مبین اپنی بات ختم کر چکا تھا۔اس وقت نک بول رہا تھا۔

’’آٹھ آدمیوں کی پارٹی کو فوراً ہماری طرف روانہ کردو،اگر ہیلی کاپٹر کی آمد سے پہلے دشمن یہاں پہنچ گیا تو ہم بے دست وپا مارے جائیں گے۔اوور......‘‘

مبین خوشامدانہ لہجے میں بولا۔’’سر!آپ کے کہنے سے پہلے میں دس آدمی آپ کی طرف روانہ کر چکا ہوں۔اوور......‘‘

’’اپنے ذرائع کو بھی حرکت دو،معلوم کرو یہ سنائپر کون ہے؟اوور......‘‘نک میرے بارے جاننے کے لیے بے چین تھا۔

’’جی سر،کل تک معلوم کرلوں گا۔اوور......‘‘

’’اوور اینڈ آل۔‘‘نک نے جونھی بات ختم کی میں نے فوراً پہلے والا چینل لگا لیا۔کیوں کہ ایک تو اسی پر کمانڈر عبدالحق نے مجھ سے بات کرنا تھی۔دوسرا اگر نک یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ آیا میں اس کی بات سن سکا

ہوں یا نہیں تو لازماً وہ اسی چینل پر مجھے پکارتا۔

میں بہ مشکل مطلوبہ چینل لگا پایا تھا کہ لورا براؤن کی لوچ دار آواز ابھری۔

”شہزادے، کہاں غائب ہو؟“

میں نے لہجے میں خوشی سموتے ہوئے کہا۔”مجھے شہزادہ کہنے کا مطلب ہے ڈیٹ پکی ہوئی۔اوور......“

وہ شوخی سے بولی۔”بالکل، قسم بھی کھا سکتی ہوں۔مگر تم آؤ گے نہیں۔اوور......“

میں اسی کے انداز میں بولا۔”تو تم آجاؤ۔ابھی کھڑے ہو کر میری طرف چلنا شروع کر دو۔میری جگہ کے بارے تو تمھیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔وعدہ کرتا ہوں گولی نہیں چلاؤں گا۔اوور......“

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔”میں نے ڈیٹ پر جانے کی حامی بھری ہے، قیدی بننے کی نہیں۔اگر میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کا شوق ہے تو کسی شہر میں ملنے کی کوشش کرو۔اوور......“

میں نے قہقہہ لگایا۔”چلو یہ دعوت ادھار رہی۔اوور......“

”اپنا نام نہیں بتاؤ گے۔اوور......“اس نے ایک بار پھر مجھے کریدا۔

”تم مجھے عبداللہ خان کہہ سکتی ہو۔اوور......“میں نے ایسا نام بتایا جو ہر مسلمان خود کو سمجھتا ہے۔

”ایبڈ الّا کھان......“اس کے انگریزی لب و لہجے نے اتنے پیارے نام کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

میں جلدی سے بولا۔”خالی خان کہنا کافی ہوگا۔اوور......“

وہ بولی۔”کھان تو یہاں سارے پٹھان ہیں۔اوور......“

”مگر تمھارے ساتھ ڈیٹ کا حق دار تو صرف میں ہوں نا......تو بس تم اسی نسبت سے یاد رکھ لینا کہ وہ خان جس کے ساتھ تم نے ڈیٹ پر جانا ہے۔اوور......“

”ہاہاہا۔“اس نے قہقہہ لگا کر گویا میری حوصلہ افزائی کی تھی۔مگر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ خاصا بدلا ہوا تھا۔”تو کھان صاحب، الوداع۔شاید تم زندہ نہ بچ پاؤ۔اوور اینڈ آل۔“

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھے چونکا دیا تھا۔لیکن میری حیرانی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ پائی تھی۔ہیلی کاپٹر کے پروں کی پرشور آواز مجھ تک پہنچ گئی تھی۔میں نے فوراً ان کی متبادل فریکونسی لگائی۔وہ مبین کو اس پہاڑی

کی نشاندہی کر رہی تھی جس پر میں موجود تھا۔ ”ایک ہیلی کاپٹر اس پہاڑی پر بھیجنا۔ وہاں کم از کم دو آدمی موجود ہوں گے۔ انھیں زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ پائلٹس سے رابطے میں تو ہو نا؟ اوور......“

”یس میڈم! اور جو آدمی آپ کے پاس آ رہے تھے، انھیں بھی اس پہاڑی کی طرف روانہ کر دیتا ہوں۔ اگر کوبرا کی گن سے بچ بھی گیا تو ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں نہیں بچے گا۔ اوور......“

لورا نے پوچھا۔ ”تینوں کوبرا آ رہے ہیں۔ اوور......“

”نہیں، دو کوبرا اور ایک ایم آئی سیونٹین ہے۔ اوور......“

”گڈ، ایک کوبرا اور ایم آئی سیونٹین لاشیں اٹھانے بھیج دو۔ اوور......“

مبین نے پوچھا۔ ”آپ کے پاس نہیں بھیجنا۔ اوور......“

”نہیں، اس خبیث کے پاس جیسے ہی ہیلی پہنچے گا ہم دونوں واپسی کی راہ لیں گے۔ اوور اینڈ آل۔“ لورا براؤن نے گفتگو ختم ہونے کا اعلان کیا۔ خبیث کا لقب اس نے مجھے عطا کیا تھا۔ ہیلی کاپٹروں کی آواز سنتے ہی میں نے رائفل کا بٹ اور دو پائی کلوز کر کے تھیلے میں ڈالی۔ کیوں اتنا وقت میرے پاس نہیں تھا کہ رائفل کو مکمل کھولتا۔ مجھے ہیلی کاپٹروں کی اتنی جلدی آمد کی امید نہیں تھی۔ یقیناً گردیز کیمپ میں ان کے پاس ہیلی کاپٹر موجود تھے تبھی تو اس سرعت سے تین ہیلی یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ ویسے بھی امریکیوں کو ہیلی کاپٹروں کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ ان کی بات کے اختتام تک میں جھولا اپنی پیٹھ پر لاد کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑا تھا۔ دس آدمی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن کوبرا (گن شپ ہیلی کاپٹر) میرے پرخچے بھی اڑا دیتا۔ یہ خاص جنگ کے لیے تیار کیا گیا ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر ہے۔ مچھلی جس طرح پانی میں حرکت کرتی ہے یہ ہوا میں ایسے ہر طرف سے گھوم کر حملہ کرتا ہے۔ عام ہیلی کاپٹرز میں گن کو چلانے والا گن مین بیٹھا ہوتا ہے، جو کسی بھی ہدف پر فائر کرتا ہے لیکن کوبرا کا پائلٹ آٹو میٹک گن سے ہدف پر تباہی پھیرتا ہے۔ اس میں آٹو میٹک 12.7 ایم ایم کی گنیں فٹ ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہیوی سنائپر رینج ماسٹر کی گولی بھی 12.7 ایم ایم ہی ہوتی ہے۔ اگر ایک گولی انسان کی کھوپڑی کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتی ہے تو اسی کیلی بر کی درجنوں گولیوں نے کیا تباہی مچانا تھی یہ اندازہ کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

میرے پاس چل کر یا بھاگ کر فائر کرنے کے لیے لے دے کے بریٹا پستول ہی موجود تھا۔ دس کلاشن کوفوں اور ایک کوبرا ہیلی سے فقط بریٹا کے ساتھ مقابلہ کرنا یقیناً خودکشی کی آسان کوشش کہی جا سکتی ہے۔ دشمن کے دس آدمیوں نے مغربی جانب سے آنا تھا، میرے لیے مشرقی طرف فرار ہونا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس جانب کوئی ایسی آڑ موجود نہیں تھی جس سے میں کوبرے کے پائلٹ کی نظروں سے بچ پاتا۔ البتہ شمال کی جانب موجود درخت اور جھاڑیاں مجھے نظری آڑ مہیا کر سکتی تھیں۔ سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں اسی جانب چل پڑا تھا۔ ہیلی کی آواز لحظہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کی آمد سے پہلے میں جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں گھس کر بے حس وحرکت لیٹ گیا تھا۔ کوبرا بہت نیچی پرواز کرتا ہوا ان جھاڑیوں کے قریب سے گزرا جہاں میں پہلے لیٹا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں۔ ''تڑتڑتڑ'' کی بھیانک آواز گونجی۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا آگے گزر گیا۔

میرا دل ہولنے لگا تھا۔ اگر وہ اسی طرح ہر جھنڈ پر گولیوں کے دو تین برسٹ فائر کرتا رہتا تو مجھے نشانہ بنانا اس کے لیے مشکل نہ ہوتا کیوں کہ اس پہاڑی پر جھاڑیوں کے اتنے زیادہ جھنڈ موجود نہیں تھے۔

چکر کاٹ کر کوبرا واپس مڑا اور اس مرتبہ گولیوں کا برسٹ ساتھ والی جھاڑی پر پڑا تھا۔ جو سوچ میرے دماغ میں آئی تھی، پائلٹ بھی اس پر عمل پیرا ہو گیا تھا۔ اور جلد ہی میرا نمبر آ جانا تھا۔ کوبرا میرے ساتھ والی جھاڑی پر گولیوں کا برسٹ فائر کرتا ہوا آگے گزر رہا تھا۔ اس وقت میری بچت مغربی سمت کا رخ کرنے میں تھی۔ گو اس طرف سے دشمن اوپر کو آ رہے تھے لیکن کوبرے کی گولیوں سے اسی جانب اتر کر بچا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر میں نے ایک اور رسک لیا اور کوبرے کے مڑنے سے پہلے، جھاڑی سے نکل کر چند قدم دور موجود اس جھاڑی میں گھس گیا جہاں کوبرا ابھی فائر کر کے آگے گیا تھا۔ اگر پائلٹ مجھے دیکھ لیتا یا وہ غلطی سے دوبارہ اسی جھاڑی پر فائر کر دیتا تو لورا براؤن کا مجھے الوداع کہنا حق سچ ہو جاتا۔

مگر پائلٹ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا اور نہ اس نے فائر کرنے میں غلطی کی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس کا غلطی کرنا اسے کامیاب کر سکتا تھا۔ اس نے واپسی پر تھوڑی دیر پہلے میرا ٹھکانہ بننے والی جھاڑی پر گولیوں کا چھڑکاؤ کیا اور آگے گزرتا چلا گیا۔ اس سیدھ میں جتنی جھاڑیاں آئی تھیں ان تمام پر کوبرے کی گولیاں لگی تھیں۔ کوبرے کے سر

پر سے گزرتے ہی میں مزید جنوب کی طرف بڑھا۔ اگلی جھاڑی پندرہ بیس قدم دور تھی لیکن کوبرے کے مڑنے سے پہلے میں جھاڑی میں داخل ہو چکا تھا۔ پائلٹ گولیاں برساتے ہوئے ترتیب سے تمام جھاڑیوں کی چھان بین کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک دفعہ فائر کر چکنے کے بعد پائلٹ دوبارہ ایک ایک برسٹ تمام جھاڑیوں پر برسانا شروع کر دیتا۔

میں جس جھاڑی میں گھسا ہوا تھا اسی سے کوبرے نے فائرنگ کی ابتدا کی تھی۔ اس کے بعد جنوب کی طرف جھاڑیوں کے جھنڈ موجود نہیں تھے۔ اکا دکا درخت بلاشبہ موجود تھے لیکن درختوں کے نیچے میں پائلٹ کی نگاہوں سے نہیں چھپ سکتا تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے ایک اور تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنوب کی جانب میرے چھپنے کی جگہ سے پچاس ساٹھ گز دور ایک پتھریلی چٹان پڑی تھی۔ اس کی آڑ لے کر میں پائلٹ کی نظر میں آنے سے بچ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میں پائلٹ کے ساتھ ساتھ اس چٹان کے دائیں بائیں حرکت کرتا رہتا۔ کوبرے کے اگلی جھاڑی پر آگ برسا کر آگے بڑھتے ہی میں آخری جھاڑی سے نکل کر پوری قوت سے دوڑا۔ میری پیٹھ پر لدا رینج ماسٹر کا جھولا مجھے زیادہ رفتار سے بھاگنے نہیں دے رہا تھا لیکن اس وقت زندگی اور موت کی بازی شروع تھی اور یہ بازی کوئی بھی نہیں ہارنا چاہتا۔ یوں بھی پائلٹ کی توجہ ان جھاڑیوں کی طرف مبذول تھی جہاں وہ گولیاں برسا رہا تھا۔

چٹان کے جنوبی جانب آڑ لیتے ہی میں چڑھے ہوئے سانسوں کو اعتدال پر لانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے اس حالت سے نکلنے کی تجویز سوچ رہا تھا۔ اگر پیدل دشمن اوپر پہنچ جاتا تو یقیناً وہ مجھے چوہے کی طرح گھیر کر ہلاک کر دیتے۔ کوبرے کی وجہ سے میں کسی آڑ میں رہ کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا کہ کوبرا سر پر پہنچ کر مجھے بڑی آسانی سے ہلاک کر دیتا۔ بچاؤ کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوبرا وہاں سے چلا جاتا۔ جبکہ پائلٹ کا فی الحال ایسا ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور پھر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق میں نے ایسا فیصلہ کیا جسے عام حالات میں خود کشی ہی کا نام دیا جا سکتا تھا۔

رینج ماسٹر کا جھولا پیٹھ سے اتار کر میں نے رائفل باہر نکالی۔ اور اس پر سائیٹ لگانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد میں

دو سو میٹر رینج لگا کر رائفل کے پیچھے لیٹ چکا تھا۔اس وقت اگر پائلٹ اس طرف دیکھ لیتا تو میرا بچنا محال تھا ۔بھری ہوئی میگزین رائفل سے جوڑتے ہوئے میں نے رائفل کاک کی اور پیچھے لیٹ کر پائلٹ پر نشانہ سادھ لیا ۔کوبرے کی تیز رفتاری میرے لیے نہایت مشکل پیدا کر رہی تھی ،اگر میں سیدھی گولی فائر کرتا تو پائلٹ کو کبھی بھی نشانہ نہ بنا سکتا۔مناسب لیڈ لے کر ہی میں کامیاب فائر کر سکتا تھا۔گو کسی بھی متحرک ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے لیڈ کا فارمولا موجود ہے،مگر مسئلہ یہ تھا ایسا تبھی ممکن ہے جب متحرک چیز کی رفتار معلوم ہو۔اور کوبرے کی رفتار مجھے معلوم نہیں تھی ۔اس لیے مذکورہ فارمولا میرے کسی کام کا نہیں تھا۔البتہ پیشہ ور سنائپرز کے دماغ میں ایک اپنا اندازے کا میٹر لگا ہوتا ہے۔اوراس وقت میرا ذاتی اندازہ ہی کام آ سکتا تھا۔ہیلی کی بائیں کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا اس لیے میں اس کے مغرب کی طرف مڑنے کا انتظار کرنے لگا۔میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کیوں کہ کوبرا جھاڑیوں کے آخری جھنڈوں کو نمٹانے والا تھا۔پائلٹ کے چکر کاٹ کر مغرب کی طرف مڑتے ہی میں نے پائلٹ کے سر پر شست لی اوراس کے اپنی رائفل کے متوازی آنے سے پہلے میں نے بیرل کو اندازے سے مناسب لیڈ دے کر دل دل ہی میں اپنے پاک پروردگار کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک فائر تھا۔ٹریگر دباتے ہی میں نے جلدی سے رائفل کو دوبارہ کاک کیا مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی ۔اللہ پاک نے میری مناجات کو قبول فرما لیا تھا۔ایک دم ہیلی کاپٹر گھوما اور پھر درختوں سے ٹکراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ڈھلان میں گرنے کی وجہ سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔لیکن اس کے گرنے سے پیدا ہونے والا دھما کا کافی زوردار تھا۔ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔اس سے پہلے میں مجھے ایسا موقع نہیں ملا تھا کہ میں ہیلی کا نشانہ بنانے کی کوشش ہی کر سکتا۔

میں نے سرعت سے رائفل کے بٹ اور دو پائی کو کلوز کر کے جھولے میں ڈالا اور جھولے کو پیٹھ پر لاد کر مشرقی ڈھلان اترنے لگا۔میری رفتار اتنی ہی تیز تھی جتنی کسی نشیب میں اترنے والے ایسے شخص کی ہو سکتی ہے جس کے پیچھے موت لگی ہو۔اترائی میں دوڑتے وقت سب سے زیادہ مشکل اپنے جسم کو سنبھالنا ہوتا ہے کیونکہ ذرا سا توازن بگڑنے سے انسان کا تو بڑا بگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ آدمی کو سیدھے کے بجائے ترچھا ہو کر دوڑنا پڑتا ہے۔یوں کہ پاؤں کا ٹخنے والا حصہ آگے رکھا جاتا ہے اور عام دوڑ کے برعکس ایک ہی پاؤں

مسلسل آگے رہتا ہے۔ میرے دماغ میں دوسرے کوبرے کی آمد کا خطرہ بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے والے کو تو میں نے اس کی بے خبری میں مار گرایا تھا اور اس کے عبرت ناک انجام کے بعد دوسرا پائلٹ کبھی بھی ایسی غلطی نہ کرتا۔

اچانک میرے ذہن میں ان کی ٹرانسمشن سننے کا داعیہ پیدا ہوا۔ وائرلیس سیٹ کافی دیر سے بند کر کے میں نے جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب سے وائرلیس نکال کر میں نے آن کیا۔ لورا براؤن بڑے غصے میں کسی کو لتاڑ رہی تھی۔

"تمھارے سورما اب تک نہیں پہنچے۔ انھیں کہو جلدی وہاں پہنچ کر معلوم کریں پائلٹ کو کیسے حادثہ پیش آیا ہے ۔اوور......"

"جی میڈم! وہ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ اصل میں مغربی جانب سے چڑھائی بالکل سیدھی ہے اس لیے انھیں دیر ہو رہی ہے۔اوور......" کمانڈر مبین کی صفائی دیتی آواز ابھری۔

"تمام ہیلی کے گرد نہ اکٹھے ہو جائیں، کچھ کو کہو اوپر پہنچ کر دیکھیں ہوسکتا ہے گرنے سے پہلے پائلٹ اس خبیث کو نشانہ بنا چکا ہو۔اوور......"

"ٹھیک ہے میڈم۔اوور......"

"اوور اینڈ آل۔" کہہ کر لورا براؤن نے بات ختم کی۔

میں نے پرانی فریکونسی لگائی۔ دو تین منٹ بعد ہی میرے کانوں میں کمانڈر عبدالحق کی آواز آئی۔

"عبداللہ کیا حال ہے۔" وہ شاید وقفے وقفے سے مجھے پکار رہا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں دوست میں ذرا مصروف ہوں بعد میں بات ہوتی ہے۔ فی الحال خدا حافظ۔" میں پھولے سانسوں کے ساتھ کہا اور اس کے ساتھ ہی پندرہ نمبر چینل لگا دیا۔ اس دوران میری رفتار ذرا سی دھیمی ہوئی تھی لیکن میں نے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آدھے سے زیادہ اترائی میں طے کر چکا تھا۔ اور اب تو چھدری چھدری جھاڑیاں شروع ہو گئی تھیں جو مجھے اچھی خاصی آڑ مہیا کر رہی تھیں۔ اگر دشمن نشیب میں جھانک بھی لیتا تو مجھے اتنی آسانی سے نہ ڈھونڈ سکتا۔ نیچے نالے میں کوبرے کے فائر سے بچنے کے لیے بھی کافی جگہیں مل جاتیں۔

"شکر ہے عبداللہ بھائی آپ کی آواز سنی۔" کمانڈر عبدالحق کی اطمینان بھری آواز ابھری تھی۔

(یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کردوں کہ وائرلیس سیٹ (ریڈیو سیٹ) پر جب ایک آدمی بات کر رہا ہو تو دوسرا صرف سن سکتا ہے اگر دوسرا بھی بٹن دبا کر بات کرنے کی کوشش کرے گا تو دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سن سکیں گے۔اس لیے تربیت یافتہ افواج میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب ایک آدمی اپنی بات مکمل کر لیتا ہے تو ''اوور'' کہہ کر بات کی تکمیل کا بتاتا بھی ہے تاکہ دوسرا اپنی بات کر سکے۔عام لوگ ''اوور'' وغیرہ کا کھٹ راگ نہیں پھیلاتے وہ بس اندازے ہی سے جان لیتے ہیں کہ مخالف کی بات مکمل ہوگئی ہے۔دہشت گردوں کی گفتگو ایسے ہی بغیر ''اوور'' کہے چلتی رہتی ہے۔اسی طرح مجاہدین کو بھی میں نے اسی طرح گفتگو کرتے سنا ہے۔یہاں یہ وضاحت اس لیے کرنا پڑی کہ جن لوگوں کا کبھی ریڈیو سیٹ پر بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا کہیں یہ بات انھیں الجھن میں نہ ڈال دے کہ اسی وائرلیس سیٹ پر بات کرتے ہوئے امریکن وغیرہ ہر بات کے اختتام پر اوور کررہے تھے اور میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بغیر ''اوور'' کہے کیسے گفتگو کرتا رہا)

''باقی گپ بعد میں ہوگی یہ بتاؤ اس وقت کہاں پر ہو؟''میں نے پوچھا۔

''ہم طے شدہ جگہ پر جانے کے لیے نکل چکے تھے،مگر ہیلی کی آمد کی وجہ سے رستے میں رک گئے ہیں۔''

''واپس ٹھکانے پر پہنچو۔وہیں آکر بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''اس کی اطمینان بھری آواز ابھری۔وائرلیس سیٹ جیب میں ڈال کر میں نے دوبارہ اپنی رفتار بڑھادی۔نالے میں اترتے ہی میرے کانوں میں کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ گونجی۔چار پانچ کلاشن کوفیں اکھٹی ہی گرج رہی تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا دشمن بلندی پر پہنچ چکا تھا اور وہیں سے وہ نالے میں فائر کر رہے تھے۔کلاشن کوف کی کارگر رینج اتنی نہیں تھی کہ وہ مجھے وہاں سے نشانہ بنا سکتے۔البتہ تعاقب کر کے مجھے نقصان پہنچانا مشکل نہیں تھا۔ایک بڑے پتھر کی آڑ میں رک کر میں ان کا جائزہ لینے لگا۔وہ میرے تعاقب کے لیے نشیب میں اترنے لگ گئے تھے۔نزدیک پہنچنے پر میں ان کا مقابلہ نہ کر پاتا کیوں کہ سنائپر رائفل دور کی لڑائی کے لیے زیادہ موثر ہے نزدیکی اور دوبدو لڑائی میں تو آٹومیٹک اور ہلکی رائفل ہی زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ان پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنا ضروری تھا۔رینج ماسٹر کو جھولے سے نکال کر میں نے پتھر پر لگایا فاصلہ ناپ کر ان کی بلندی کا زاویہ ناپا،کیوں کہ

درست فائر کرنے کے لیے مجھے ان تمام معلومات کی ضرورت تھی۔ البتہ اب میرا اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ ایک منٹ کے قلیل وقت میں میں رینج لگا چکا تھا۔

پہلا فائر میں نے اس پر کیا جو سب سے آگے تھا۔ اس کی تیز رفتاری گولی لگنے کے بعد بھی برقرار رہی تھی۔ چونکہ میں نے بیرل پر سائیلنسر چڑھایا ہوا تھا اس لیے باقیوں نے اپنے ساتھی کے گرنے کو ٹھوکر لگنے پر محمول کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد گرنے والے دو آدمیوں نے ایک دم ان کے قدموں میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آڑ لینے کا کہنے لگے۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تمام کو فوراً ہی مضبوط آڑ مل جاتی۔ ان کے چھپنے تک دو اور آدمی باقی نہیں رہے تھے۔ باقی تین پتھروں کے پیچھے لیٹ کر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ ان کی تعداد دس تھی جبکہ میرے تعاقب میں آٹھ آ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ دو ہیلی کاپٹر کے ساتھ رک گئے تھے۔ میں وائرلیس سیٹ نکال کر ان کا مخصوص چینل لگا لیا۔ کیوں کہ انھوں نے اس حادثے کی اطلاع تو کسی کو دینا تھی۔

”وہیں لیٹے رہو آڑ سے باہر نہ نکلنا، میں تم لوگوں سے بات کرتا ہوں۔“ میرے کانوں میں مبین کی آواز پڑی۔ یقیناً وہ مبین کو اطلاع دے چکے تھے اور اب مبین انھیں حکمت عملی بتا رہا تھا۔

انھیں انتظار کا کہہ کر وہ لورا براؤن کو پکارنے لگا۔ ”ٹو ون فار ون ون اوور......“

”سینڈ یور میسج اوور......“ لورا کی آواز ابھری۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نک سے زیادہ وہ احکام پاس کرتی تھی۔ شاید وہ نک سے سینئر تھی یا پھر اسے کمانڈ کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

مبین اسے پانچ آدمیوں کی ہلاکت کا بتانے لگا۔

”یہ الو کے پٹھے اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، ایک حرامی ان کے قابو میں نہیں آ رہا۔ اوور......“ غصے میں مبتلا ہو کر وہ گالیاں بکنے پر اتر آئی تھی۔

مبین نے کہا۔ ”میڈم، میرا خیال ہے وہاں کوبرا بھیج دیتے ہیں۔ اب بڑے ہیلی کی حفاظت کے لیے کوبرے کی ضرورت نہیں رہی۔ تمام لاشیں ایک جال میں باندھ کر ایم آئی سیونٹین روانہ ہو چکا ہے۔ اوور......“

”ٹھیک ہے اس کے پائلٹ کو بھی پہلے والے حرامی کا انجام بتا دو۔ خالی بھونکنے والے سورا کھٹے ہو گئے ہیں

۔اوور اینڈ آل۔‘‘لورا براؤن کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

’’ہائے بے بی ،اتنے پیارے ہونٹوں سے اتنی گندی گندی گالیاں بکنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ اوور......‘‘میں اسے مزید سلگانے سے باز نہیں آیا تھا۔

’’تم..................‘‘اس نے تم کے بعد ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جو یہاں لکھنے کی کم از کم مجھے ہمت نہیں ہے۔شاید انگریزی زبان کی ساری معروف اور غیر معروف گالیاں اسے ازبر تھیں۔ہمارے ہاں جو انگلش گالیاں زبان زدِ عام ہیں انھیں ہم اردو گالیوں کے مقابلے میں کم برا سمجھتے ہیں۔یہ حکمران زبان کا اعجاز ہی ہے کہ گالیاں سننے والا بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا بھلی
قربان ترے پھر سے مجھے کہہ دے اس طرح

مگر اس نے جو الفاظ منہ سے نکالے تھے ،مرد ہونے کے باوجود مجھے پہلی بار وہ سب سننے کا اتفاق ہوا تھا ۔کسی گالیاں بکنے والے کے جواب میں ویسے ہی الفاظ منہ سے نکالنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کی سطح پر آگئے ہیں۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گالیاں بکنا اپنی کمزوری اور بے بسی کا اظہار کرنا ہے۔لورا براؤن بھی کچھ نہ کر سکنے پر یوں بے ہودگی پر اتر آئی تھی۔

میں نے قہقہہ لگا کر اسے مزید سلگایا۔وہ مزید مغلظات بکنے لگی۔اس کی زبان رکنے پر میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

’’یہ گالیاں بکنا کہیں اپنے ڈیٹ کے وعدے سے انحراف کی چال تو نہیں ہے۔اوور......‘‘

’’مسٹر، میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ تمھاری موت بہت بری ہوگی۔‘‘اس کا غصہ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اگر میں اس کے سامنے ہوتا تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالتی۔

’’مطلب میرا اندازہ ٹھیک ہے ،تمھارے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی خواہش خواب ہی بنی رہے گی ۔اوور......‘‘میں نے یوں دکھ کا اظہار کیا گویا سچ میں وہ میری محبوبہ ہی ہو۔

’’اگر میرے سامنے ہوتے تو تمھیں بتا دیتی کہ تم کتنے کچھ دلیر ہو۔‘‘

اس سے باتیں کرتے ہوئے میں پتھروں کی آڑ میں لیٹے ہوئے دشمنوں سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ان کی موسلا دھار فائرنگ اب گاہے گاہے کی ٹخ ٹخ میں تبدیل ہو چکی تھی۔میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ میں فضول ٹریگر دبانے سے پرہیز ہی کرتا ہوں۔استادوں نے ہمیشہ بلا مقصد کی فائرنگ سے روکا تھا اور میں اس اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہوں۔اسی وجہ سے تو دوران تربیت کبھی غلط گولی چلانے کی پاداش میں استاد محترم راؤ تصور صاحب کے تادیبی وعظ سے بہرہ مند نہیں ہو سکا تھا۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں ہمیشہ ہی بے عزتی کرانے سے محفوظ رہا۔نشانہ بازی سے ہٹ کر خیر سے مجھے بھی درجنوں بار بے عزت ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔لیکن یہ موقع تفصیل بتانے کا نہیں ہے۔

لورا براؤن سیدھے منھ بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور مجھے بھی خواہ مخواہ بے ہودہ الفاظ سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔اس لیے میں مزید کچھ کہے بغیر دائیں بائیں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا جہاں میں ہیلی کی فائرنگ سے اپنا بچاؤ کر سکتا۔یوں بھی نالے میں جا بہ جا ایسی چٹانیں بکھری پڑی تھیں جن کے نیچے گھس کر میں اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔اس لیے مجھے ہیلی کا اب پہلے جتنا خوف نہیں رہا تھا۔بلکہ ایک ہیلی کو گرا لینے کے بعد میرا حوصلہ بلند تھا۔میں چھپ کر ہیلی پر نشانہ سادھ سکتا تھا۔یوں بھی سائیلنسر کی وجہ سے میری رائفل سے نکلنے والی گولی کی آواز ہی نہیں آتی تھی۔

پچاس ساٹھ قدم دور مجھے ایک مناسب چٹان نظر آئی جس کے ساتھ کھوہ جیسی بنی تھی۔میں رائفل کو اسی طرح کندھے پر رکھ کر اس جانب بڑھ گیا۔دشمن مجھ سے چھ سات سو گز دور تھا اور اتنے فاصلے پر سے کلاشن کوف کی گولی سے مجھے نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔مطلوبہ چٹان کے پاس جا کر میں نے رائفل کندھے سے اتار کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔تین آدمی بڑی تیزی سے اوپر چڑھ رہے تھے۔جس وقت ان پر نظر پڑی وہ ایسی جگہ پر پہنچ چکے تھے کہ میرے نشانہ سادھنے سے پہلے ہی وہ نظر سے اوجھل ہو جاتے۔اس لیے کسی ایسی کوشش سے گریز کرتے ہوئے میں ان کی طرف متوجہ رہا۔مجھے لورا براؤن کے ساتھ مصروف گفتگو پا کر کمانڈر مبین نے کسی اور چینل پر انھیں واپس لوٹنے کا حکم دے دیا تھا۔ہیلی کی آواز بھی اب تک میرے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔اور اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ ان کا منصوبہ تبدیل ہو چکا تھا۔ویسے ہیلی کاپٹر کے نہ آنے کی ایک ٹیکنکل وجہ تو یہ

بھی ہوسکتی تھی کہ ہیلی کا فیول کم رہ گیا ہو۔ یوں بھی ہیلی کا پٹر ایک ایسی سواری ہے جسے بار بار ایندھن ڈلوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے ہیلی پر مسلسل لمبا سفر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تین چار گھنٹوں کے بعد ہیلی کو فیول ٹینک بھروانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

دشمن کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے رینج ماسٹر کو جھولے میں ڈالا اور اپنے رستے ہو لیا۔ چلتے ہوئے میں وائرلیس سیٹ کے چینل بھی تبدیل کرتا گیا تاکہ کسی جگہ دشمن کی گفتگو سننے کو ملے، مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سارے چینلز کھنگا لنے کے بعد میں نے پندرہ نمبر چینل لگا کر عبدالحق کو پکارنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی اس کا جواب موصول ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ٹھکانے والی پہاڑی کی بلندی پر چڑھا تھا۔ صورت حال پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ دونوں ہیلی کاپٹرز کو واپس جاتے ہوئے اس نے خود دیکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کوئی خاص حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھکانے والی پہاڑی کے نالے میں پہنچتے ہی مجھے تین مسلح آدمی اپنا انتظار کرتے ملے۔ میرے منع کرنے کے باوجود عبدالحق نے ان آدمیوں کو نیچے بھیج دیا تھا۔ انھوں فوراً ہی رینج ماسٹر کا جھولا مجھ سے لے لیا تھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ اور جان بچانے کی کوشش میں میرے کپڑے نہایت گندے ہو چکے تھے۔ پسینہ، جھاڑیوں کے پتے اور مٹی وغیرہ لگنے کی وجہ سے میں پورا بھوت بنا ہوا تھا۔ گو ایک سنائپر کو دشمن کی نظر سے چھپنے کے لیے اپنی شکل اور لباس کو خود ہی خراب کرنا پڑتا ہے، لیکن میری اس وقت کی حالت کے ذمہ دار حالات تھے۔

ٹھکانے پر پہنچتے ہی سب سے پہلے تو میں نے گرم پانی سے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے۔ اس کے بعد کھانے کے لیے بیٹھ گیا کہ بھوک سے برا حال تھا۔ شام کی نماز پڑھ کر تمام میری کارگزاری سن رہے تھے۔ کمانڈر ضلع خان بہت خوش تھا۔ دشمن کو کافی عرصے بعد اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ویسے اس پہاڑی پر ہیلی کاپٹر کے اترنے جگہ تو نہیں تھی پھر انھوں نے لاشیں کس طرح اکٹھی کیں۔“

ضلع خان بتانے لگا۔ ”انھوں نے ایک جال نیچے پھینکا اور اس کے ہمراہ چار پانچ آدمی رسی کی سیڑھی سے نیچے اتر گئے۔ تمام لاشوں اکٹھی کر کے انھوں نے جال میں ڈالیں اور پھر جال کے چاروں کونوں میں لگے کنڈوں

میں رسی گزار کر ہیلی کاپٹر کے نیچے باندھ دیا۔ ان کے لاشیں اکھٹا کرنے تک دونوں ہیلی ہوا میں چکراتے رہے تھے۔"

میں نے پوچھا۔" آپ کہاں سے دیکھ رہے تھے۔"

ضلع خان نے جواب دیا۔" ہم بالکل قریب تھے۔ لیکن اس وقت فائر کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔چھوٹے والا ہیلی کاپٹر بہت خطرناک ہے۔ ایک گولی فائر ہونے کے بعد شاید ہم میں سے کوئی نہ بچ پاتا۔"

میں نے کہا۔" اچھا اب عشاء کے بعد اگلے مرحلے کے لیے تیار رہنا۔"

" کیا مطلب؟" کمانڈر عبدالحق اور ضلع خان نے بیک وقت پوچھا تھا۔ باقی بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ضلع خان سے پوچھا۔" آپ کے پاس 12.7 گنیں کتنی تعداد میں موجود ہیں۔"

اس نے کہا۔" صرف دو ہیں۔"

میں نے پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر غار کے فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔ دائیں بائیں کی پہاڑیوں کی نشاندہی کر کے میں انھیں تفصیل سے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ میرے منصوبے کا لب لباب یہ تھا کہ میں ایک اونچی پہاڑی پر مورچہ پکڑ کر دشمن کے آدمیوں کو چن چن کر نشانہ بناتا۔ اس دوران ضلع خان کے آدمی اس پہاڑی کو گھیرے میں لے کر مجھے حفاظت مہیا کرتے رہتے تاکہ دشمن وہاں اپنے آدمی بھیج کر مجھے نقصان نہ پہنچا سکتا۔ اسی طرح ہیلی کاپٹرز کے خلاف وہ ساتھ والی پہاڑی پر 12.7 گنیں لگا کر ان کی مدد سے ہیلی کے خلاف کارروائی کر سکتے تھے

ضلع خان بولا۔" منصوبہ تو بہت اچھا ہے مگر اس طرح ہم میں سے ایک بھی نہیں بچے گا۔ اگر دشمن کو ہماری پوزیشن واضح ہوگئی تو بمباری کر کے تمام پہاڑی کو سرمہ بنا ڈالے گا۔ اور پھر تین چار کو برا ہیلی کاپٹرز کو دو گنوں سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہاں ڈرون بھی مار سکتے ہیں، جنگی جہاز بھی بھیج سکتے ہیں، اس لیے یہ منصوبہ قابل عمل نہیں ہے۔ ہم بس چھاپہ مار کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ ایک جگہ پوزیشن سنبھال کر مقابلہ کرنے میں ہمارا سراسر نقصان ہے کیونکہ دشمن کے پاس بہت زیادہ وسائل موجود ہیں۔"

وہ کافی عرصے سے وہاں برسرپیکار تھے اور انھیں مجھ سے کئی گنا زیادہ تجربہ تھا۔اس لیے میں بحث میں پڑے بغیر بولا۔"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

ضلع خان بولا۔"آپ اس سناپئر کا بندوبست کر دیں اس سے جان چھوٹنے کے بعد ہم اپنے طریقے سے کارروائیاں کرتے رہیں گے۔"

"تو نک سٹیورٹ کوئی اکیلا سناپئر تو نہیں ہے۔"

ضلع خان اطمینان سے بولا۔"صحیح کہا،مگر اس جیسا اچھا نشانے باز اتنی آسانی سے انھیں دوسرا نہیں ملے گا۔باقی تربیتی کیمپ میں ہم نے اپنے مخصوص آدمیوں کو نشانہ بازی کی تربیت دینا شروع کر دی ہے جلد ہی ہمیں اچھے سناپئر مل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"میں فوراً اس سے متفق ہو گیا تھا۔یوں بھی میں خواہ مخواہ ہی اس بکھیڑے میں پھنس گیا تھا۔مجھے واپس جا کر بہت سارے کام نبٹانا تھے اور میں افغانستان میں کسی اور کے مسائل میں الجھا تھا۔یہاں جتنے کام میں کر چکا تھا سارے غیر قانونی تھے۔پاک آرمی کا قانون مجھے کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔اب بھی میں جو کچھ کر رہا تھا چوری چھپے ہی کر رہا تھا۔اگر کسی سینئر کو معلوم ہو جاتا تو مجھے سزا ملتے دیر نہ لگتی۔

رات کو بستر پر لیٹتے وقت میں عبدالحق سے اگلے دن کے لائحہ عمل کے بارے بات چیت کرتا رہا۔تھکے ہونے کی وجہ سے ہم زیادہ دیر گپ شپ نہیں لگا سکے تھے۔صبح ناشتے کے بعد میں اس کے ہمراہ اس مخصوص پہاڑی کی جانب روانہ تھا جسے میں نے کل چنا تھا۔ضلع خان کے ہاتھوں دشمنوں کے دو ریڈیو سیٹ لگے تھے ایک کی بیٹری نکال کر ہم نے اضافی بیٹری کے طور پر ساتھ لے لی تھی۔ضلع خان کے آدمیوں سے رابطے کے لیے ہمارے پاس آئی کام بھی موجود تھا۔کل جس پہاڑی پر میں نے نک سٹیورٹ اور لورا براؤن کو پھنسایا تھا وہ ہمارے رستے ہی میں پڑ رہی تھی۔اپنے ساتھیوں کی لاشیں تو وہ اٹھا کر لے گئے تھے،البتہ گاڑھا خون اب تک بکھرا تھا۔میں نے عبدالحق کو وہ دو پتھر بھی دکھائے تھے جس کے عقب میں لورا براؤن اور نک سٹیورٹ نے آڑ لیے رکھی تھی۔

اس پہاڑی کو عبور کرنے کے بعد میں نے کمانڈر عبدالحق کو محتاط رہنے کا مشورہ دے دیا تھا۔دشمنوں کے ٹھکانے اور ہمارے درمیان ایک اور اونچی پہاڑی حائل تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہت ضروری تھی،کیوں کہ وہ جگہ

دشمن کے ٹھکانے سے دیکھی جا سکتی تھی اور پھر نک سٹیورٹ جیسا نشانے باز بھی دشمن کی صفوں میں موجود تھا۔ چھپتے چھپاتے درختوں کے تنوں، جھاڑیوں اور پتھریلی چٹانوں کی آڑ لیتے ہم آخر کار پہاڑ کی بلندی پر پہنچ ہی گئے تھے۔ وہاں سے دشمن کے ٹھکانے کا ہوائی فاصلہ بارہ تیرہ سو میٹر تھا۔ جس جگہ گزشتہ کل میں نے نک سٹیورٹ کو پھنسایا تھا اس جگہ کا دشمنوں کے ٹھکانے سے فاصلہ انیس سو میٹر کے بہ قدر تھا۔

سب سے پہلے جھاڑیوں کے درمیان ہم نے اپنے لیٹنے کی جگہ بنائی۔ یوں کہ وہاں ہم نہ صرف دشمن کی نظروں سے چھپ سکتے تھے بلکہ سامنے سے ہونے والی فائرنگ سے بھی بچ سکتے تھے۔ رائفل کو تیار کر کے ہم بھی وہاں لیٹ گئے۔ دشمن کے ٹھکانے کا جائزہ لینے پر ہمیں کوئی چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی۔ لازمی طور پر نک سٹیورٹ اور لورا براؤن نے انھیں آڑ میں رہنے کی سختی سے احکامات دیے ہوں گے۔ ریڈیو سیٹ پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

عبدالحق نے پوچھا۔ ”ہم کب تک یہاں چھپے رہیں گے۔“

میں مسکرایا۔ ”اب وقت کی گنتی بھول جاؤ، یہاں سے مر کر یا مار کر ہی واپسی ہوگی۔“

کمانڈر عبدالحق فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے لگتا ہے ایک سنائپر کا ساتھ چن کر میں نے اپنے لیے خواری دیکھ لی ہے۔“

میرے کھل کھلانے پر وہ دوبارہ بولا۔ ”جانتے ہو سب سے مشکل کام انتظار کرنا ہوتا ہے۔ اور ایسا انتظار جس کا پھل ملنے کی امید کم ہی ہو وہ طبیعت پر اور بھی گراں گزرتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہی سنائپر کی زندگی ہے۔ اور ایسی زندگی ہر کوئی نہیں گزار سکتا۔“

گپ شپ کرتے ہوئے بھی ہماری نظریں ہدف کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ اس دوران ہمیں تھوڑی بہت حرکت بھی نظر آئی لیکن اب میں اپنے ہدف کے علاوہ کسی کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ کسی ایک آدمی کے مرتے ہی نک سٹیورٹ مزید چوکنا ہو جاتا۔

عبدالحق نے پوچھا۔ ”ویسے اپنے ہدف کو پہچانیں گے کیسے؟“

”وہ زیادہ دیر یہاں چھپ کر نہیں لیٹے گا مجھے یقین ہے شکار کی تلاش میں وہ ضرور اپنے ٹھکانے سے نکلے گا

اوراس وقت اس کی پہچان ہو جائے گی۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں نا، جب اس کے ہمراہ اور آدمی بھی موجود ہوں گے تو کیسے اس کی پہچان ہو پائے گی ؟"

"جس جگہ بھی وہ فائر کرنے کے لیے لیٹے گا ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔"

کمانڈر عبدالحق کی سمجھ میں میرا فلسفہ آیا تھا یا نہیں لیکن اس نے دوبارہ اس متعلق سوال نہ پوچھا۔ دوپہر کو ہم نے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا اور پانی پی کر دوبارہ نگرانی کے لیے لیٹ گئے۔ کھانے کے بعد عبدالحق کو نیند آنے لگی تھی۔ اسے سو جانے کا مشورہ دے کر میں جاگتا رہا۔ یوں بھی ایسے مواقع پر سنائپر نیند کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ میں گاہے گاہے ریڈیو سیٹ آن کر کے مختلف چینلز تبدیل کرتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد ان کی ذرا سی ٹرانسمشن میں سن پایا تھا، مگر وہ ان کے روزمرہ کے کاموں کے متعلق تھی۔ ان کی پانی لانے والی پارٹی کسی نزدیکی چشمے پر جا رہی تھی۔ اس پہاڑی پر صرف ایک ہی جانب اترنے کا راستہ موجود تھا اور وہ راستہ ہماری نظر میں تھا۔ پانی لانے والی پارٹی میری نظروں کے سامنے ہی نیچے گئی تھی اور انھیں میں آسانی سے نشانہ بھی بنا سکتا تھا، لیکن اب میں کسی غیر اہم آدمی کی لاش گرا کر نک سٹیورٹ کو مزید چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سہ پہر کو عبدالحق کی آنکھ کھلی اور اسے میں نے مشرقی جانب کی ڈھلان پر رات گزارنے کی جگہ ڈھونڈنے کے لیے بھیج دیا۔

اندھیرا چھانے سے پہلے ہی اس نے ایک غار ڈھونڈ لیا تھا۔ اور کافی ساری خشک لکڑیاں اس نے غار کے اندر اکٹھی کر دی تھیں۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں اس کے ہمراہ غار میں پہنچ گیا۔ چونکہ دشمن ہم سے مغربی جانب کی پہاڑی پر موجود تھا اس لیے ہم نے بے فکری سے آگ جلائے رکھی۔ عبدالحق دن کو اچھی خاصی نیند لے چکا تھا اس لیے اس نے مجھے سو جانے کا مشورہ دیا۔ رات کے دو اڑھائی بجے تک وہ جاگتا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے جگا کر سو گیا۔

میں اچھی خاصی نیند لے چکا تھا۔ عبدالحق نے قہوہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ گرم قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے میرے دماغ میں اسی کی یاد تھی جو کبھی بھولی نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کہاں تھی۔ کبھی کبھی میرے دماغ میں بہت زیادہ ہولناک خیالات جنم لیتے جنھیں جھٹکنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس وقت بھی میرے دماغ میں اس کی گلا کرتی ہوئی

آواز گونج رہی تھی۔

”راجو، کہاں غائب ہو گئے ہو۔ کب آؤ گے میرے پاس۔ میں سختی سے منتظر ہوں راجو جلدی لوٹ آؤ۔“

میں اس کے پاس نک سٹیورٹ والا معاملہ نبٹا کر ہی جا سکتا تھا۔ پلوشے کی حسین یادوں کو زبردستی دور جھٹک کر میں موجودہ صورت حال سے نبٹنے کا طریقہ سوچنے لگا۔ صبح تک میں ایک قابل عمل منصوبہ سوچ چکا تھا۔ پانی کا چشمہ غار سے ذرا ہی نیچے تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے میں نے ہموار جگہ پر چادر بچھا کر نماز پڑھی۔ میرے سلام پھیرنے تک عبدالحق بھی وضو کر کے پہنچ گیا تھا۔ میں غار کی طرف بڑھ گیا۔ سورج طلوع ہونے میں تھوڑی دیر تھی لیکن ارد گرد کے مناظر صاف ہو گئے تھے۔ میں جھولے سے لیزر رینج فائینڈر نکال کر بلندی پر پہنچ گیا۔ اور جو منصوبہ بنایا تھا اس کے مطابق پہاڑیوں کا فاصلہ ناپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں کمانڈر عبدالحق کو تمام منصوبہ سمجھا رہا تھا۔

”آپ نے اس سرخ پہاڑی پر پہنچنا ہے۔“ اس پہاڑی کی مٹی کا رنگ سرخی مائل تھا اس لیے وہ دور سے سرخ ہی نظر آتی تھی اور تمام اسے سرخ پہاڑی ہی کہتے تھے۔ ”سرخ پہاڑی سے دشمن کا ٹھکانہ تو دو کلو میٹر سے زیادہ دور ہے لیکن جہاں سے وہ پینے کا پانی بھرتے ہیں وہ جگہ پانچ چھے سو میٹر سرخ پہاڑی کی طرف واقع ہے اور نشیب میں بھی ہے۔ اس لیے سرخ پہاڑی سے آپ ان کے پانی بھرنے والوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اگر چشمے کا فاصلہ سرخ پہاڑی سے دو کلو میٹر سے زیادہ بھی ہوا تب بھی اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے تحت آپ آسانی سے وہاں سے فائر کر سکیں گے۔ اب آپ کی سرکوبی کے لیے نک کو لازماً اس اونٹ کی کوہان نما پہاڑی پر جانا پڑے گا کہ اس سے ایک تو سرخ پہاڑی اس کی رینج میں ہو گی دوسرا کوہان شکل کی پہاڑی پر جانے کے لیے اسے رستے میں کوئی خاص خطرہ بھی درپیش نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑھ کر دونوں پہاڑیوں کی بلندی برابر ہے جو نک کو مزید مذکورہ پہاڑی کی طرف مائل کرے گی۔“

عبدالحق صاف گوئی سے بولا۔ ”میرے دماغ میں کافی سوال اٹھ رہے ہیں۔“

میں اطمینان سے بولا۔ ”باری باری پوچھنا شروع کر دو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے میں سنائپر رائفل سے اتنا کامیاب فائر کر لوں گا۔“

''کامیاب فائر کی ضرورت ہی نہیں ہے،بس وہاں پر اپنی موجودی کو ظاہر کرنا ہے۔پانی بھرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی گولی لگ گئی یا انھیں اتنا ہی معلوم ہو گیا کہ ان پر گولیاں چلائی جا رہی ہیں تو سمجھو کام بن گیا ۔باقی آپ نے سنائپر رائفل کے متعلق پچھلے دنوں مجھ سے کافی کچھ سیکھا ہے،سات آٹھ سو میٹر تک ہدف کو بھی نشانہ بنایا ہے اب آپ کو بلندی سے نشیب میں فائر کرنے کا فارمولا سمجھا دوں گا یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔''جن دنوں مجھے گولی لگی تھی تب گردیز کیمپ سے چار آدمی صغیر،احسان،اسلم اور مبین سنائپر رائفل کے متعلق سیکھنے آئے تھے۔وہ چاروں بعد میں نک کا شکار بن کر شہید ہو گئے تھے۔انھی کے ساتھ کمانڈر عبدالحق بھی رینج ماسٹر کے متعلق سیکھتا رہا تھا۔

اس نے اگلا سوال پوچھا۔''نک اِس پہاڑی پر بھی تو آسکتا ہے۔''

''اس طرح تو میرا کام اور آسان ہو جائے گا،مگر وہ یہاں آئے گا نہیں کیوں کہ یہاں سے سرخ پہاڑی کا فاصلہ زیادہ بنتا ہے۔اسی طرح نک،چشمے والی جگہ سے بھی فائر کر سکتا ہے۔اور کوئی بے وقوف سنائپر ہی ہو گا جو بلندی پر موجود سنائپر کے ساتھ نشیب میں مورچہ بنا کر لڑائی کرے،جبکہ میرے خیال کے مطابق وہ بے وقوف نہیں ہے۔اور بالفرض وہ چشمے والی جگہ ہی سے فائر کرتا ہے تب بھی میرے لیے زیادہ فائدہ ہے۔''

''اس ساری تگ و دو کا مطلب؟''اس کے سوال جاری تھے۔

''اسے بل سے نکالنا۔یونھی لیٹے لیٹے ہم کب تک اس کا انتظار کریں گے۔اور دشمن کو منصوبہ بنانے کا موقع دینے کے بجائے اسے اپنی مرضی کے میدان میں لانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔''

''یہاں سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کا فاصلہ کتنا ہے؟''

میں نے کہا۔''پچیس سو میٹر۔''

''تو وہاں پر انھیں کیسے نشانہ بناؤ گے؟''اس نے حیرانی ظاہر کی۔

''وہاں پہنچنے سے پہلے وہ اس نالے میں میرا نشانہ بنیں گے جہاں وہ بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔میرا مطلب میں انھیں آڑ پکڑنے سے پہلے قتل کر دوں گا۔''

''اس نالے سے تو وہ پہاڑی زیادہ نزدیک ہے۔''اس نے نک سٹیورٹ کے گزشتہ روز والے ٹھکانے کا

ذکر کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔"ہاں مگر اس بحث کو رہنے دو۔"

"واپس ٹھکانے پر پہنچنا اور وہاں سے دوسری سنائپر رائفل اٹھا کر سرخ پہاڑی پر دشمن کے پانی لانے والی پارٹی سے پہلے پہنچنا ذرا مشکل دکھائی دیتا ہے۔"

"وہ ضلع خان کے آدمی اپنے ٹھکانے سے اٹھا کر سرخ پہاڑی پر پہنچیں گے۔آپ یہیں سے سرخ پہاڑی کا رخ کریں گے۔آپ کو وہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ تین، ساڑھے تین گھنٹے لگیں گے۔یعنی دن کے دس بجے سے پہلے آپ وہاں ہوں گے۔اور دشمن کی پانی پارٹی قریباً گیارہ بارہ بجے چشمے کا رخ کرتی ہے۔"

"میں تیار ہوں۔"اس نے انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کیا۔

رینج ماسٹر کے متعلق اسے یوں بھی کافی کچھ پتا تھا۔اپ ہل، ڈاؤن ہل فائر کے متعلق ضروری باتیں بتا کر میں نے اسے رائفل کی بیرل کے ساتھ زاویہ پیا لٹکا کر بلندی سے نشیب کا زاویہ ناپنے کا طریقہ سمجھا دیا۔اس کے بعد میں اسے ضروری احتیاطوں کے بارے ایک بار پھر ہدایات دیں اور جانے کا اشارہ کر دیا۔آئی کام سیٹ ہمارے پاس ایک ہی تھا اس لیے وہ میں نے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔کمانڈر عبدالحق کے لیے ضلع خان کے آدمیوں نے دوسرا آئی کام سیٹ لانا تھا۔

اسے روانہ کر کے میں نے ضلع خان سے رابطہ کر کے پوچھا۔

"کمانڈر، آپ کے پاس ڈریگنو رائفل موجود ہے نا۔"

"موجود ہے۔"اس کا اثباتی جواب سن کر میں نے کہا۔"ایک ڈریگنو رائفل اور ایک رینج ماسٹر.........."میں اسے مختصر الفاظ میں ضروری ہدایات دینے لگا۔اس سب سے فارغ ہو کر میں بہتر فائر کرنے کے لیے اپنے مورچے میں مناسب تبدیلیاں کرنے لگا۔گھنٹے ڈیڑھ بعد میں رینج ماسٹر کے پیچھے لیٹ کر علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔نا معلوم میرا منصوبہ کامیاب ہوتا بھی تھا یا نہیں۔لیکن یونھی ہاتھ پیر ہلائے بغیر لیٹا رہنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔

پونے دس بجے کمانڈر عبدالحق نے مجھے اپنی جگہ پر پہنچ جانے کا مژدہ سنا دیا تھا۔اس کے ساتھ ہی ضلع خان

کے بہروز نامی آدمی نے بھی اپنے جگہ پر پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔اب ہمیں دشمن کی پانی والی پارٹی کا انتظار کرنا تھا۔

میں ٹیلی سکوپ سائیٹ میں دشمن کے ٹھکانے کا جائزہ لیتا رہا۔ساڑھے دس بجے کے قریب مجھے پانچ آدمی نیچے اترتے دکھائی دیے۔یہ پانی والی پارٹی تو اس لیے نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ایک جیپ میں نیچے جاتے تھے اور یہ پانچوں پیدل جارہے تھے۔دو آدمیوں نے اپنی پیٹھ پر جھولے بھی لادے ہوئے تھے۔مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ نک سٹیورٹ اس پارٹی کا حصہ ہے۔ان کے ریڈیو سیٹ پر کوئی ٹرانسمشن نہیں ہورہی تھی۔میں مختلف چینل تبدیل کر کے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔

ان کے ٹھکانے تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا۔لیکن پہاڑی کی نصف بلندی پر ایک ہموار پہاڑی تھی جہاں سے مختلف اطراف میں جایا جاسکتا تھا۔اسے ان کے ٹھکانے کا بیس کہا جاسکتا ہے۔بیس سے پانی کا چشمہ شمال کی جانب نشیب میں موجود تھا۔ان کا رخ جنوب کی طرف ہوگیا تھا۔نشیب میں اتر کر وہ ایک نالے میں پہنچ جاتے ۔وہ نالہ کافی چوڑا اور کھلا تھا۔اگر مجھے مکمل یقین ہوتا کہ وہ نک سٹیورٹ ہی کی پارٹی ہے تو انھیں نالے میں گھیرا جا سکتا تھا۔اور یقیناً اس دن میری قسمت عروج پر تھی کہ اچانک ایک فریکونسی پر مجھے لورا براؤن کی آواز سنائی دے گئی۔وہ کمانڈر مبین کو مخاطب تھی لیکن آج وہ صاف گفتگو کے بجائے کوڈ ورڈز میں بات کر رہی تھی۔اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ ہمیں اپنی بات نہیں سمجھنے دینا چاہتے تھے۔

وہ مبین سے پوچھ رہی تھی۔”ٹو ون بات ہوگئی ہے۔اوور......“

مبین نے جواب دیا۔”یس میڈم، تین تھرماس بھیج دیں گے۔اوور......“ اب پتا نہیں وہ تھرماس کیا بلا تھی۔ کیونکہ وہ چائے والے تھرماس تو ہو نہیں سکتے تھے۔

”کافی ہیں، میں اپنی جگہ پہنچتے ہی تمھیں مطلع کر دوں گی۔اوور......“

”میڈم، انڈے دو درجن ہی ملیں گے۔اوور......“

”گزارا ہو جائے گا، اتنے ہی پرانے انڈے بھی تو موجود ہوں گے۔اوور......“ شاید وہ ہینڈ گرنیڈ کو انڈے کہہ رہے تھے۔یہ بھی ممکن تھا انڈوں سے مراد کوئی مخصوص ہتھیار ہو۔وہ آدمی بھی ہو سکتے تھے۔میرا ذہن مختلف

اندازے لگاتا رہا۔نالے میں اتر کر وہ پانچوں بڑے آرام سے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔لورا براؤن، مبین کو بتا رہی تھی کہ وہ نالے میں پہنچ گئے ہیں۔ان کے جانے کا انداز دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔یقیناً وہ نک سٹیورٹ کی پارٹی نہیں تھی۔وہ اصل میں میرے لیے پھینکا گیا چارہ تھا۔کیونکہ لورا براؤن مختلف انداز میں بار بار ریڈیو سیٹ پر یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ نالے میں آگے بڑھ رہے ہیں اور انھیں کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی۔

میں خاموشی سے ان کی بات چیت سنتا رہا۔آدھا پون گھنٹا نالے میں پھرنے کے بعد وہ پارٹی واپس لوٹ آئی تھی۔وہ لوگ بیس سے اوپر کا رخ کر رہے تھے۔اوپر سے پانی والی جیپ اترتی دکھائی دی۔دس منٹ بعد جیپ چشمے پر پہنچ گئی تھی۔اور پھر جیپ کے وہاں پہنچنے کے دو منٹ بعد سرخ پہاڑی کی جانب سے فائر کرنے کی ہلکی سی آواز آئی۔میں اگر پوری طرح اس طرف متوجہ نہ ہوتا تو شاید وہ آواز نہ سن پاتا۔عبدالحق کے پاس موجود رینج ماسٹر پر سائیلنسر نہیں لگایا تھا کیوں کہ ہمارا مطمحِ نظر ہی دشمن کو اپنی جگہ سے آگاہ کرنے کا تھا۔فائر کے ساتھ ہی چشمے والی جگہ پر ہل چل مچ گئی تھی۔میں مسلسل مختلف چینل تبدیل کر کے ان کی بات چیت سننے کی کوشش میں تھا۔میری کوشش جلد ہی کامیاب ہو گئی تھی۔چشمے پر موجود دشمن کے آدمی اپنے زخمی ہونے والے آدمی کی رپورٹ دے رہے تھے۔

”فوراً پتھروں کی آڑ لے کر اندازہ لگاؤ کہ فائر کس طرف سے آیا ہے۔اوور......“ کمانڈر مبین نے انھیں ایسا حکم دیا جس پر وہ پہلے سے عمل پیرا ہو چکے تھے۔

”ہم آڑ میں ہیں کمانڈر اور فائر سامنے سرخ پہاڑی پر سے آ رہا ہے۔اوور......“

”ٹھیک ہے وہیں آڑ میں پڑے رہو۔اگلے حکم تک کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔اوور اینڈ آل۔“ ریڈیو سیٹ پر خاموشی چھا گئی تھی۔

اسی وقت فائر کے دو ہلکے ہلکے دھماکے ہوئے۔یقیناً عبدالحق ابھی تک فائر کرنے میں لگا ہوا تھا۔میں دشمن کے ٹھکانے کی طرف متوجہ رہا۔ایک تیز رفتار جیپ اوپر سے اترتی نظر آئی۔بیس پر آ کر جیپ رک گئی تھی۔چار آدمی جیپ سے باہر نکلے وہ جگہ ایسی تھی کہ میں صرف ایک آدمی کو کامیابی سے نشانہ بنا پاتا اور باقیوں کو چھپنے کا

موقع مل جاتا۔

دو آدمیوں نے اپنی پیٹھ پر جھولے لادے اور چاروں بیس کے غربی اور ان کے اپنے ٹھکانے کے شرقی جانب موجود ڈھلان میں اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میرے اندازے کے مطابق انھوں نے اس نالے میں چلتے ہوئے چشمے والی جگہ کو پیچھے چھوڑ کر اگلے نالے میں نمودار ہونا تھا۔ وہ بھی کافی وسیع نالہ تھا لیکن وہ جگہ سرخ پہاڑی سے نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے اس جگہ کا فاصلہ اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے مطاق انیس سو میٹر بنتا تھا اور گزشتہ روز جس جگہ نک سٹیورٹ نے ٹھکانہ بنایا تھا اس پہاڑی سے وہ مقام چودہ پندرہ سو میٹر سے زیادہ نہیں بن رہا تھا۔ اگر میں اس جگہ ہوتا تو زیادہ آسانی انھیں نشانہ بنا سکتا تھا، مگر میں نے جان بوجھ کر اس پہاڑی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور کیوں نظر انداز کیا تھا اس متعلق آپ لوگوں کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہ اس نالے کو عبور کر کے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے دامن میں پہنچ جاتے تب بھی میری رینج سے باہر نکل جاتے۔

جلد ہی مجھے اپنا اندازہ درست ہوتا نظر آیا، وہ چاروں بغلی نالے سے نکل کر اس وسیع نالے میں نمودار ہوئے۔ چاروں ایک سیدھی قطار میں چلنے کے بجائے پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور اس طرح میرا کام اور زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ اتنی دور سے بھی ایک آدمی کے کندھوں سے نیچے تک پھیلے ہوئے بال ظاہر کر رہے تھے کہ وہ لورا براؤن ہے۔ دو آدمیوں کی پیٹھ پر جھولے لدے تھے یقیناً وہ معمولی آدمی تھے۔ اب پیچھے صرف ایک آدمی بچ رہا تھا۔ اور کوئی شک نہیں کہ وہی نک سٹیورٹ تھا۔ یوں بھی اس وقت میں چاروں کو باری باری نشانہ بنا سکتا تھا۔ سر میں گولی مارنے کے بہ جائے میں نے اس کی ٹانگ پر نشانہ سادھا اور ٹریگر دبا دیا۔ وہ فوراً منھ کے بل گرا تھا۔ لمبے بالوں والی یقیناً لورا تھی وہ اسے سنبھالنے کے لیے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ میں مجھے ریڈ سیٹ نظر آیا اور اگلے ہی لمحے اس کی گھبرائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ ”موبن، نک کو ٹانگ میں گولی لگ گئی ہے۔ اوور......“

”ہائے بے بی۔“ مبین سے پہلے میں نے بٹن دبا کر اسے پکارا۔ ”ذرا نک سے تو بات کراؤ، کہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی۔“

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تت......تم کہاں پر ہو۔“

”کم ازکم سرخ پہاڑی پرنہیں ہوں......اور اگر مجھے ملنا چاہتی ہوتو ٹھیک جس جگہ بیٹھی ہو وہاں سے ناک کی سیدھ میں چلتی آؤ مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔اوور......“

وہ گڑگڑائی۔”پپ......پلیز نک کو چھوڑ دو۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔”رقیب کو کون زندہ چھوڑتا ہے بے بی۔باقی اس احمق نک کو کہو کہ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں جو چشمے پر موجود شخص کے سر میں گولی نہ مار سکتا۔اس وقت بھی میں نے جان بوجھ کر اسے ٹانگ میں گولی ماری ہے تاکہ اسے تڑپا سکوں۔اوور......“

اس کی شکست خوردہ آواز ابھری۔”کھان،میں ہار تسلیم کرتی ہوں واقعی میں تم نے بہت خوب صورتی سے ہمیں گھیرا۔اوور......“

”کوشش تو تم لوگوں نے بھی کی تھی،مگر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے۔اوور......“

اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔”کیا مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔“

میں بے نیازی سے بولا۔”کیا کہہ سکتا ہوں،ویسے پہلے نک کا تو بندوبست کردوں نا۔اوور......“

”تت......تم مجھے نظر نہیں آرہے۔میں مرنے سے پہلے تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔اوور......“

میں ہنسا۔”اتنی دور سے کیسے دیکھو گی؟اوور......“

”تم بس اپنی جگہ پر ایک بار اٹھ کر دکھا دو،مرنے سے پہلے میں اپنی آخری حسرت پوری کرنا چاہتی ہوں۔اوور......“

اس کی حسرت بھری آواز سن کر میں نے کہا۔”اچھا،اپنی آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھو،میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو رہا۔اوور......“یہ کہتے ہوئے میں نے آئی کام سیٹ اپنے قریب کرلیا تھا۔

ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔”دیکھ لیا۔“

”ہاں دیکھ لیا۔“اس مرتبہ لورا کے بجائے نک سٹیورٹ کی آواز ابھری تھی۔”اور جانتے ہو اب تم میرے نشانے پر ہو۔میں واقعی اتنا بےوقوف نہیں تھا کہ اپنے آدمی کی ٹانگ میں لگنے والی گولی کو تم سے منسوب کرتا۔اور اب تم اپنی جگہ سے ہل کر دکھاؤ تاکہ میں تمھیں اپنا نشانہ دکھا سکوں۔اوور......“

http://sohnidigest.com

میں نے کہا۔ ”تم دونوں اب بھی میرے نشانے پر ہو۔ اوور......“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”بے وقوف نہ وہ لورا ہے اور نہ مجھے گولی لگی ہے......اب یہیں لیٹ کر تھرماس، میرا مطلب کوبروں کا انتظار کرو۔ اتنا تو تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ کتنے تھرماس آرہے ہیں۔ اوور......“

”تت......تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں ہکلا گیا تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ”اس بات کی تصدیق تم اپنا سر آڑ سے نکال کر کر سکتے ہو۔ اوور......“

میں ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ نالے میں موجود زخمی کو لمبے بالوں والا سہارا دے کر آڑ کی طرف لے جارہا تھا۔ میں نے انھیں یونھی جانے دیا تھا۔

مجھے چپ دیکھ کر وہ دوبارہ بولا۔ ”تم ایشیائی لوگ بس لڑکی کے ذرا سا توجہ دینے پر احمقوں کی طرح ردعمل ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہو۔ بہ ہر حال تمھیں مرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمھاری نشانہ بازی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اور تم پہلے نشانہ باز ہو جس سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ بہ ہر حال اب چناؤ تمھارے ہاتھ میں ہے ،کوبروں کی گنوں سے مرنا چاہتے ہو یا مجھے یہ موقع دو گے۔ اوور......“

میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ”لورا کہاں ہے؟“

”نک کے ساتھ ہی ہوں بے بی۔“ وہ ہنسی۔ ”سوری کہ اب تم میری ڈیٹ والی آفر سے فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔ اوور......“

”اگر میں کہوں کہ اب میں تمھیں مرنے سے پہلے دیکھنا چاہتا ہوں تو۔ اوور......“ میرے لہجے میں شامل حسرت یقیناً اس کے لیے انوکھی نہیں تھی۔

”اس نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاں تا کہ تم فوراً مجھے گولی مار سکو، میں جانتی ہوں کہ میں تمھاری رینج میں ہوں ۔اوور......“

میں نے فوراً کہا۔ ”وعدہ کرتا ہوں تمھیں گولی نہیں ماروں گا۔ اوور......“

وہ بے یقینی سے بولی۔ ”میں تم پر کیوں اعتبار کروں۔ اوور......“

”تم جانتی ہو ہم مسلمان اللہ پاک کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولتے۔ تم اپنے سر سے ٹوپی اتار کر کھڑے ہو کر

اپنے زلفوں کی جھلک دکھادو۔اللہ پاک کی قسم تمھیں گولی نہیں ماروں گا۔اوور......''

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔''میری زلفیں دیکھ کر کیا کروگے۔اوور......''

''ایک حسرت تھی دل میں اگر پوری کردو،باقی دوبارہ قسم کھاتا ہوں تمھیں گولی نہیں ماروں گا،میرا مقابلہ تو نک کے ساتھ ہے نا۔تھوڑی دیر پہلے جو نقلی لورا مجھے نظر آئی تھی اس پر بھی میں نے گولی نہیں چلائی تھی۔اوور......''

''میں جانتی ہوں کہ میرا کھڑا ہونا حماقت ہے،لیکن میں تم پر اعتبار کر کے کھڑی ہو رہی ہوں۔''اس کے ساتھ ہی اپنے سر سے ٹوپی اتار کر وہ زلفیں بکھرائے کھڑی ہوگئی۔

''بس اسی طرح کھڑی رہو میں تھوڑی دیر تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔اگر گولی چلانا ہوتی تو اب تک چلا چکا ہوتا،تم جانتی تو ہونا میں کتنا تیز فائرر ہوں۔اس کے ساتھ میں نک سٹیورٹ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں بھی تم متاثر ہوں دوست۔اور مرنے سے پہلے جان لو کہ تم نے ایس ایس سے پنگا لینے کی کوشش کی تھی۔گڈبائی......''اتنا کہتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا۔رینج ماسٹر کی گولی کا تیرہ سو میٹر کے فاصلے پر ضائع ہونے کا مطلب سنائپر کی نالائقی ہی ہوسکتی ہے اور میرے استادوں کے خیال میں میں نالائق نہیں ہوں۔نک سٹیورٹ کی کھوپڑی کا دایاں حصہ اڑ گیا تھا۔

شاید قارئین کی سمجھ میں یہ کہانی نہ آئی ہو۔میں وضاحت کردیتا ہوں۔کمانڈر عبدالحق کو بھیجتے وقت مجھے یقین تھا کہ اس کا فائر اتنا پختہ نہیں ہے کہ وہ لمبے فاصلے پر کسی کے سر میں گولی مار سکے۔اور یقیناً اگر اس کی گولی خطا جاتی یا مضروب کو جسم کے کسی اور حصے میں لگتی تو اس بات پر نک سٹیورٹ چونک سکتا تھا۔کیوں کہ اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے مقابل کوئی ٹٹ پونجیا سنائپر نہیں تھا۔اب یہاں دو احتمال تھے یا تو وہ اس بات کو خاطر میں نہ لاتا اور کوہان کی شکل کی والی پہاڑی کی طرف دوڑ پڑتا۔کیوں وہیں سے وہ سرخ پہاڑی پر موجود سنائپر کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ایسی صورت میں میں اسے نالے ہی میں گھیر لیتا بالکل اس طرح جیسے نقلی نک اور لورا کو گھیرا تھا۔دوسرا احتمال یہ تھا کہ شک پڑ جانے پر وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ اس نے کی۔اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس کی نگاہ اسی پہاڑی پر پڑنا تھی جہاں وہ گزشتہ روز پہنچا تھا۔کیوں اسی جگہ سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے نالے کو بہت اچھی طرح سے رینج میں لایا جاسکتا تھا۔اور ایک بار اسے میرے مورچے کی جگہ معلوم ہوجاتی اس کے

http://sohnidigest.com

بعد وہ بڑی آسانی سے مجھے گھیر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس کو برا ہیلی کا پٹر منگوانے کی سہولت بھی موجود تھی۔ اب میں جس پہاڑی پر موجود تھا اس جگہ سے اپ ہل، ڈاؤن ہل کے فارمولے کے تحت تو نالے میں کارگر فائر گرایا جا سکتا تھا ویسے نہیں۔ اور یقیناً جس نے سو فیصد درست فائر کرنا ہوتا وہ اس کے بجائے اول الذکر پہاڑی کا انتخاب کرتا۔ مگر میں نے ایسا جان بوجھ کر نہ کیا اور ضلع خان کو کہہ کر دوسری پہاڑی پر دو آدمی ڈریگنو و رائفل کے ساتھ بھجوا دیے۔ اور ضلع خان کو بتا دیا کہ ان کے پاس آئی کام سیٹ بھی ہونا چاہیے۔ انھیں جس جگہ مورچہ بنانا تھا یہ انھیں میں نے یہیں سے بتا دیا تھا۔ نقلی نک کو گولی لگتے ہی جب لورا نے میری جگہ کے بارے استفسار شروع کیا تبھی میں جان گیا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کے استفسار نے میرا کام اور زیادہ آسان کر دیا تھا۔ میں نے آئی کام پر ضلع خان کے آدمی بہروز کو بتایا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ہاتھ لہرائے اور پھر لیٹ جائے۔ اس نے یونہی کیا اور نک سٹیورٹ کھل کر سامنے آ گیا۔ اب جس جگہ بہروز موجود تھا وہ پہاڑی میرے شمالی جانب واقع تھی۔ جبکہ نک کو وہ پہاڑی جنوب مشرق میں پڑتی تھی۔ نک سٹیورٹ نے اس کے خلاف جب مورچہ سنبھالا تو وہ میرے مغربی جانب موجود تھا۔ اس نے بہروز والی پہاڑی کی جانب سے اپنے سامنے آڑ پکڑی تھی میرے جانب اس کا دایاں بازو آ رہا تھا۔ اور جس جگہ میں موجود تھا وہاں سے وہ آسانی سے دکھائی بھی دے گیا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ آ رہا تھا کہ لورا براؤن اس کے دائیں جانب بہ طور مددگار بیٹھی تھی۔ اور اس کی وجہ سے میں نک کو براہ راست نشانہ نہیں بنا پا رہا تھا۔ تبھی میں نے لورا براؤن کو کھڑا ہونے پر اکسایا اور جونھی وہ کھڑی ہوئی نک سٹیورٹ کی کھوپڑی میرے نشانے پر آ گئی تھی۔

''ہیلو بے بی۔'' میں نے دو تین دفعہ لورا براؤن کو پکارا جو، نک کی کھوپڑی اڑتے ہی ایک دم بیٹھ گئی تھی۔ مگر نک اس کی ہر قسم کی مدد سے دور جا چکا تھا۔

''تم جیت گئے ایس ایس۔'' خلاف توقع اس نے گالیاں نہیں بکیں تھیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آج گالیوں کا برسٹ نہیں چلایا بے بی۔ اوور......''

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''ایس ایس تم مجھے بھی مار سکتے تھے۔ اوور......''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''ہاں مگر پھر ڈیٹ پر کس کے ساتھ جاتا۔ اوور......'' اب میں کیا بتاتا، کہ اسے مارنے کی

صورت میں نک سٹیورٹ نے کبھی ہاتھ نہیں آنا تھا۔اور میرا اصل شکار نک سٹیورٹ تھا وہ نہیں۔اسی وجہ سے تو مجھے قسم کھا کر اسے اٹھنے پر مجبور کرنا پڑا تھا۔البتہ نک کو قتل کرنے کے بعد میں اسے بھی گولی مار سکتا تھا،مگر مسلمان ہونے کے ناطے مجھے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ میں اللہ پاک کی قسم کھا کر اس کے خلاف کرتا۔ایسا کم از کم مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ پھیکے سے لہجے میں بولی۔''سمجھ نہیں آتا شکریہ کہوں یا اپنے ساتھی کی موت کے غم تمھیں کوسوں۔''

''اگر میرا مشورہ مانتی ہو تو کل تک یہاں سے غائب ہو جانا۔شاید اس کے بعد سامنا ہونے پر مجھے ڈیٹ کا لالچ بھی نہ روک سکے۔باقی میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو رہا ہوں،تم مجھے دیکھ سکتی ہو۔پہلے میرا آدمی کھڑا ہوا تھا۔اور ہاں میں دوربین سے تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔اور جانتا ہوں کہ تم بھی سنائپر ہو اس لیے بدلہ لینے کو کسی اور وقت کے لیے مؤخر کر دو۔اور......'' یہ کہہ کر میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔وہ بھی کھڑی ہو کر میرے جانب ہی دیکھ رہی تھی۔اب اتنی دور سے مجھے اس کے چہرے پر چھائے تاثرات تو نظر نہیں آ رہے تھے کہ وہ غصے میں ہے یا خوش دکھائی دے رہی ہے۔نیچے جھک کر میں نے رینج ماسٹر کو اٹھا کر کندھے پر رکھا اور عقبی ڈھلان کی طرف بڑھ گیا۔اس کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ فاصلہ ناپ کر رینج لگاتی اور مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتی۔یوں بھی وہ مجھ سے خوف زدہ تھی۔اس لیے اپنی جگہ پر کھڑی میری جانب گھورتی رہی۔

ڈھلان میں اترتے ہی میں نے جلدی جلدی رینج ماسٹر کو جھولے میں ڈالا اور بہروز اور عبدالحق کو کال کر کے انھیں فوراً ٹھکانے پر پہنچنے کا کہنے لگا۔کیونکہ کوبرے کسی وقت بھی پہنچ کر ہماری فتح کو شکست سے دوچار کر سکتے تھے۔چلتے ہوئے میں ان کے ریڈیو سیٹ کے چینل بھی تبدیل کرتا گیا۔ایک فریکونسی پر مبین پانی والی پارٹی کو واپس بلا رہا تھا۔اس کی تھکی تھکی آواز سن کر معلوم ہو رہا تھا کہ اسے نک سٹیورٹ کی موت کا کافی دکھ ہوا تھا۔لورا براؤن کی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

ساری کہانی کی ضلع خان اور عبدالحق کو سمجھ تو آ گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہت حیران بھی ہو رہے تھے۔عبدالحق نے کہا۔

”یار، میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آپ کو پہلے سے کیسے پتا چل گیا کہ وہ آپ کو سرخ پہاڑی کے بجائے کسی اور جگہ خیال کرے گا۔“

”کیوں کہ وہ سنائپر تھا۔اور اسے معلوم تھا کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔تیسری بات یہ کہ وہ خود مجھے گھیرنے کی کوشش کر چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایسی کوشش کروں گا۔بس ایک جگہ پر وہ مار کھا گیا کہ اس نے یقینی طور پر مجھے اسی پہاڑی پر موجود سمجھ لیا تھا جہاں بہروز موجود تھا۔اور وہی پہاڑی ایسی تھی جہاں سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے نالے میں موجود کسی بھی آدمی کو بہت آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ورنہ جہاں میں موجود تھا اس کا فاصلہ بہ ظاہر اس نالے سے دو کلومیٹر سے زیادہ تھا۔میں تو بس اپ ہل ڈاؤن ہل کے فارمولے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام کر گزرا۔باقی دشمن کا ٹھکانہ مسلسل میری نظر میں تھا اور میں منتظر تھا کہ کوئی مورچے میں بیٹھ کر اپنا سنائپر ہونا ظاہر کرے۔“

وہ تعریفی لہجے میں بولا۔”یار اتنی گہری چال، یقین کرو میرا تو سر چکرا گیا ہے۔“

میں نے کہا۔”بہ ہر حال، میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے اور اب میں واپس چلوں گا۔“

ضلع خان نے کہا۔”دوست آپ جب کہیں روانگی کا بندوبست ہو جائے گا۔البتہ چند دن خدمت کا موقع دیتے تو ہمیں خوشی ہوتی۔“

”کمانڈر، میں نے اب تک غیر قانونی طور پر آپ لوگوں کی مدد کی ہے، جبکہ پاک آرمی کا قانون مجھے قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔میری افغانستان آمد کا مقصد اپنی بے گناہی کے ثبوتوں کی تلاش تھی نہ کہ امریکن آرمی یا افغانستان آرمی کے خلاف کوئی کارروائی کرنا۔باقی آپ لوگوں ہی کی وجہ سے مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ملی ہے اور اتنی سہولتیں ملی ہیں کہ میں باآسانی کامیاب ہو پایا ہوں۔اس لیے آپ تمام کا بہت بہت شکریہ۔البتہ معذرت چاہوں گا، کہ یہاں مزید کچھ وقت گزارنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔“

ضلع خان مسکرایا۔”آج کی رات گزارو گے یا ابھی رخصت لو گے۔“

میں نے جواب دیا۔”ان شاءاللہ صبح سویرے نکلوں گا۔“

رات کو انھوں نے میرے لیے خصوصی دعوت کا بندوبست کیا تھا۔غار کے اندر ہی انھوں نے سالم دنبہ

لکڑیوں کے انبار پر بھونا تھا۔دنبے کے پیٹ سے آلائشیں نکال کر انھوں نے چاول بھر دیے تھے۔بہت ہی اعلا کھانا تیار ہوا تھا۔میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا۔صبح سویرے نماز کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر میں اور کمانڈر عبدالحق جانے کے لیے تیار تھے۔

سڑک تک جانے میں ہمیں دو تین گھنٹے لگے تھے وہاں سے ہمیں ارگون اور ساروبی تک گاڑی مل گئی تھی۔وہ گاڑی مجاہدین ہی کی تھی۔آگے کا راستہ پیدل طے کرتے ہوئے ہم پکتیکا پہنچے،کیونکہ میرا ارادہ کچھ خریداری کرنے کا تھا۔قریباً دو ہفتے پہلے میں چچا شمریز کے گھر تحائف بھجوا چکا تھا۔لیکن خود اسی رستے سے جانے کا ارادہ تھا تو خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔رات ہم نے شہر میں گزارنے کے بجائے آگے جانے کو ترجیح دی تھی۔صبح کے قریب ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ناشتا وغیرہ کر کے ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ظہر کی نماز پڑھ کر میں جانے کے لیے تیار تھا۔کمانڈر عبدالحق نے بھی چھٹی جانا تھا اس لیے وہ بھی میرے ساتھ چل پڑا۔جن رستوں کو میں نے پچھلی بار جان بچا کر بھاگتے ہوئے طے کیا تھا ان رستوں کو پیدل عبور کرتے ہوئے اچھا لگا تھا۔عشاء کے قریب ہم غزنی خیل گاؤں کے مضافات سے گزر رہے تھے۔رات گزارنے کے لیے سردار سیلاب خان کی بیٹھک ایک بہترین چناؤ تھا۔میں کمانڈر عبدالحق کو ساتھ لے کر اسی جانب بڑھ گیا۔

سیلاب خان مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔اس نے فوراً ہی ہمارے لیے خصوصی کھانا تیار کرنے کا حکم دے دیا۔کمانڈر رشید جان،الفت بادشاہ،مشر خان،نوشاد گل،گل ریز وغیرہ وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ان سے رخصت ہونے کے بعد میرا شلوبر قبیلے سے جو ٹاکرا ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں شلوبروں کے زخمی اور قتل ہونے والے افراد کی خبر ان تک بھی پہنچ گئی تھی۔میرے ساتھ ان کے رویے میں پہلے سے زیادہ عقیدت جھلک رہی تھی۔میں نے سردار سیلاب کو بتایا کہ ان کے قبیلے میں کوئی غدار موجود ہے کہ جس نے میرے بارے شلوبروں کو اطلاع فراہم کی تھی۔

سردار سیلاب خان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔"ایک نہیں دو تھے۔دونوں کے سر کاٹ کر شلوبر قبیلے کو بھجوا دیے تھے۔البتہ ان کے دھڑ یہیں دفن کرنے پڑے۔اور سر کے بغیر جنازہ ہو سکتا ہے یا نہیں اس مسئلے کے بارے چونکہ ہمیں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں اس لیے ہم جنازہ نہیں پڑھ سکے تھے۔"

میں نے کہا۔ ''دھڑ کے بغیر جنازہ ہوتا ہے یا نہیں یقیناً یہ مسئلہ شلوبروں کو بھی معلوم نہیں ہوگا اور انھوں نے بھی یہی حل سوچا ہوگا جو آپ لوگوں کو سوجھا۔''

کمانڈر عبدالحق نے لقمہ دیا۔ ''غداروں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے کہ انھیں نہ تو اپنے، اپنا تسلیم کرتے ہیں اور نہ غیر ہی اپنانے کو تیار ہوتے ہیں، وہ کیا بھلی سی کہاوت ہے۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔''

اسی گپ شپ کے دوران کھانا تیار ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی سیلاب خان اور باقیوں نے ہمیں اتنی جلدی سونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان کی شلوبروں کے ساتھ ابھی تک صلح نہیں ہوئی تھی۔ اس ضمن میں دو تین جرگے ہو چکے تھے۔ اب آخری اور حتمی جرگہ ایک ہفتے بعد ہونا تھا۔ میرے اپنے اتنے مسائل تھے کہ میں دوسروں کے معاملات کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی لڑکی کو پھانسی دیتے، اس کا سر قلم کرتے یا اس کے علاوہ ان کا کوئی اور منصوبہ تھا مجھے اس بارے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ان کی لڑائی کے بارے اجمالاً پوچھ کر میں نے گفتگو کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود ہم صبح کی نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر جانے کے لیے تیار تھے۔ سردار سیلاب خان نے اپنے قبیلے کے درجن بھر آدمی میری حفاظت کے پیش نظر میرے ساتھ روانہ کر دینا چاہے مگر میں نے منع کر دیا۔ یوں بھی کمانڈر عبدالحق، شلوبر قبیلے کے ساتھ میری صلح کی بات کر چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ میری واپسی سے بھی ناواقف تھے تو مجھے نقصان پہنچانے کا کیا سوچتے۔ اور اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا مطلب بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔ مجاہدین اتنے بھی کمزور نہیں تھے کہ ایک گاؤں پر قابو نہ پا سکتے۔

آتے وقت رستے پر برف پڑی تھی جبکہ اب اپریل کا اختتام تھا برف بالکل ختم ہو گئی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی پہلے جتنا زور باقی نہیں رہا تھا۔ سہ پہر ڈھلے میں اس جگہ سے گزر رہا تھا جہاں میری گلگارے سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتیں اس وقت بھی میری یادداشت میں تازہ تھیں۔ اس کا گلہ کرنا، میری جیب میں چوری پیسے ڈالنا، مجھے واپس اسی رستے سے آنے کی تلقین کرنا، پلوشہ سے ملنے کی خواہش کرنا وغیرہ۔ کوئی بھی بات مجھے بھولی نہیں تھی۔ صبح سیلاب خان کی بیٹھک سے نکلنے سے پہلے میں نے اسی کے بھیجے ہوئے کپڑے اور سوئیٹر

پہن لی تھی۔رنڑا گڑیا کی بھیجی ہوئی ٹوپی میرے سر پر تھی۔جس وقت میں وہاں سے گزر کر آگے گیا تھا تب وہاں خوب برف پڑی تھی اب نالہ میں پانی کی مقدار پہلے سے تھوڑی زیادہ ہوگئی تھی۔سورج غروب ہونے سے پہلے ہم چچا شمریز کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے۔دور ہی سے انگھیٹی کا دھواں دیکھ کر میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا،یقیناً وہ گھر میں موجود تھے۔مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں واپس جارہا ہوں ۔کبھی کبھی سرِ راہ ملنے والے مسافر ایسے ہی دل ودماغ کے قریب ہوجاتے ہیں کہ ان میں اور خون کے رشتوں میں تمیز کرنا محال ہوجاتا ہے۔پلوشہ بھی تو مجھے یونھی ملی تھی کہ آج اس سے زیادہ میرے دل کے کوئی بھی قریب نہیں تھا۔یہی حال شمریز چچا اور اس کے بچوں کا تھا۔اگر میں برف باری میں نہ پھنستا تو شاید میں اس کے گھر کے باہر ہی سے یہ جانے بغیر آگے بڑھ گیا ہوتا کہ اس کے مکین کتنے مخلص،محبت کرنے والے اور مہمان نواز ہیں۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے میرے احساسات عجیب سے ہورہے تھے۔نہ جانے انھوں نے مجھے دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کرنا تھا۔دستک دینے کے چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازے میں لگی ذیلی کھڑکی کھول کر شمریز چچا کا شفقت بھرا چہرہ نمودار ہوا۔مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے تو وہ گنگ رہ گئے تھے اور اس کے بعد۔''ذیشان بیٹا!'' کہتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے مجھے لپٹ گئے تھے۔مجھے زوردار انداز میں بازوؤں میں بھینچ کر اس نے میرے ماتھے پر بوسا دیا اور پھر علیحدہ ہوکر کمانڈر عبدالحق سے ہاتھ ملانے لگے۔

''اچھا میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔'' گھر میں دوبارہ گھس کر اس نے گھر کے کونے میں بنی ہوئی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔مجھے ہلکی سی سبکی کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے چہرے پر مسکراہٹ ہی طاری رکھی تھی ۔لیکن بیٹھک میں داخل ہوتے چچا شمریز نے میری حیرانی دور کردی تھی۔

''اچھا بیٹا،میں مہمان کے ساتھ بیٹھا ہوں تم باقیوں کو مل لو،ثمر خان کو کہو کہ مہمان کے لیے گرم پانی کا لوٹا لے آئے۔''

''جی چچا جان۔''میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا بیگ سمیت بیٹھک میں لگے بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

جونھی میں اندر داخل ہوا رنڑا گڑیا مجھے صحن ہی نظر آگئی تھی اور اسی طرف متوجہ تھی۔ملگجی روشنی میں بھی اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''لالا جان!'' وہ چیختے ہوئے میرے طرف بھاگی۔اس کی چیخ سن کر باورچی خانے میں بیٹھی گلگارے بھی سرعت سے باہر نکلی تھی۔ثمر خان اندرونی کمرے سے بھاگ کر نکلا۔رنڑا چھوٹی بہنوں ہی کی طرح قریب آ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

''کیسی ہے میری چھوٹی سی بہادر بہن۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''لالا جان، میں آپ کو روز یاد کرتی تھی۔اور آپ کی سلامتی سے لوٹ آنے کی دعائیں بھی مانگا کرتی تھی۔''

میں مسکرایا۔''دیکھ لو اللہ پاک نے میری گڑیا کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے۔''

ثمر خان بھی قریب آ کر مجھ سے چمٹ گیا تھا۔میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا کر اپنے برابر کیا۔

''تم تو میرے جتنے لمبے ہو گئے ہو یار۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

وہ فوراً بولا۔''رنڑا سے تو لمبا ہوں نا۔''

اسے نیچے اتارتے ہوئے میں نے کہا۔''شرم کرو یار، بہنوں سے مقابلہ کرتے ہیں کیا۔''

اسی وقت گلگارے کی دھیمی آواز میرے کانوں میں پڑی۔''اکیلے آئے ہیں آپ۔''

''نہیں ایک دوسرا مہمان بھی ہے۔'' میں نے اس کے روشن چہرے پر نگاہ ڈالی۔اس کی شوخ نیلی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

اس نے فوراً وضاحت کی۔''میرا مطلب پلوشہ بہن سے ہے۔''

میں گہرا سانس لے کر خاموش رہا تھا۔ایک دم میرے چہرے پر اداس نے ڈیرا جما لیا تھا۔

میری اداسی اس حساس لڑکی سے اوجھل نہیں رہ پائی تھی، میرا ذہن بٹاتے ہوئے وہ فوراً بولی۔''اچھا پتا ہے ابھی دستک سن کر میں نے دعا کی تھی کہ یا اللہ یہ آپ ہوں۔اب اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ قبولیت کا وقت ہے تو ساتھ کچھ اور بھی مانگ لیتی۔''

میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔''بالکل، اگر میرے ساتھ تم نے پلوشہ کے آنے کی دعا کر لی ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔''

"اچھا آپ کیسے ہیں؟" اس نے موضوع تبدیل کیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اندر چلیں نا۔" اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے ہمراہ قدم بڑھاتے ہوئے میں ثمر خان کو بولا۔ "جوان، مہمان کے لیے گرم پانی کا لوٹا لے جاؤ۔"

"جی لالا جی!" کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ رنڑا اور گلگارے میرے ساتھ انگھیٹی کے سامنے آ بیٹھی تھیں۔

"آپ کا بھیجا ہوا سامان مل گیا تھا، شکریہ اور یہ کپڑے پہننے پر بھی بہت بہت مہربانی۔ البتہ یہ فضول ٹوپی سر پر رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" وہ ٹوپی مجھے رنڑا نے بھیجی تھی اس لیے وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"فضول کیوں ہے لالا جی میری ٹوپی تو ہر وقت پہن کر رکھیں گے۔ ہیں نا لالا جی!"

میں فوراً بولا۔ "بالکل، اپنی بہادر بہن کا اتنا قیمتی تحفہ میں سر سے اتار سکتا ہوں۔"

رنڑا نے منھ بسورا۔ "باجی کہتی ہیں کہ آپ نے جو میرے لیے چیزیں بھیجی تھیں وہ نقلی ہیں اور باجی کے لیے جو سامان بھیجا تھا وہ ان سے اچھا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس کی اپنی چیزیں نقلی تھیں اس لیے تمھیں تنگ کرتی ہے پگلی۔ اور پتا ہے میں تمھارے لیے اور تحفے بھی لایا ہوں۔"

اس نے سرعت سے پوچھا۔ "باجی کے لیے تو نہیں لائے نا۔"

"مجھے یاد نہیں آ رہا، شاید کوئی چھوٹی موٹی چیز لے لی ہو، آخر میری چھوٹی سی بہن کی باجی تو ہے نا۔"

گلگارے متبسم ہو کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "اگر میرے لیے کچھ نہیں لائے تو آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے آپ کو گھر میں نہیں رہنے دینا۔"

"یہ میرا بھی گھر ہے اور لالا جی یہیں رہیں گے۔" رنڑا نے میری طرف داری کرنے میں ذرا بھی تساہل نہیں برتا تھا۔

"تمھارا گھر ہے تو تمھیں رہنے دے رہی ہوں نا۔" گلگارے نے سنجیدہ منھ بنا کر کہا۔

”میں بابا جان سے بات کرتی ہوں۔“ رنڑا غصے میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

”ایسے چھیڑ رہی تمھیں، یہ کون ہوتی ہے مجھے نکالنے والی جاؤ وضو کے لیے گرم پانی لے آؤ۔“ میں نے جلدی سے اسے روکا ورنہ وہ بیٹھک کا رخ کرنے والی تھی۔

”ابھی لائی لالا جان۔“ وہ باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے کہا۔”کیوں اسے تنگ کرتی ہو۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔”تو کیا کروں، پندرہ سال کی ہوگئی ہے، میرے برابر قد ہو گیا ہے اور اب تک بچپنا نہیں گیا اس کا۔“

میں ہنسا۔”وہ تو تمھارا ابھی نہیں گیا۔“

”اچھا آپ نے میری بہن پلوشہ کے بارے کچھ نہیں بتایا۔“

”وہ اب تک نہیں ملی۔“ میں دوبارہ اداس ہو گیا تھا۔

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔”ساری تفصیل بتاؤ نا؟“

میں نے رنڑا کو گرم پانی کی بالٹی غسل خانے میں لے جاتے دیکھ کر کہا۔”رات کو گپ شپ کریں گے فی الحال نماز پڑھ لوں۔“

”نماز تو میں نے بھی پڑھنا ہے۔“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

کھانا میں نے عبدالحق کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا اور قہوہ پیتے ہی ثمر خان مجھے بلانے آ گیا تھا۔

”لالا جان، باجی آپ کو بلا رہی ہے۔“

عبدالحق نے کہا۔”ذیشان بھائی، میری فکر نہ کرو میں عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹ رہا ہوں، آپ بچوں کو وقت دیں، صبح تو یوں بھی چلے جانا ہے۔“

”شکریہ کمانڈر۔“ میں گھر کے اندر گھس گیا۔ ثمر خان مجھ سے پہلے بھاگ کر بہنوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اور جاتے ہی یہ راز بھی فاش کر دیا کہ لالا جان صبح چلے جائیں گے۔

''آپ صبح نہیں جا رہے۔'' میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی گلگارے حتمی لہجے میں بولی تھی۔

میں نے اسے ناراض نظروں سے گھورا۔ ''گویا میں نے اس رستے سے آ کر غلطی کی ہے۔'' اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گہری نیلی آنکھیں میں برہمی بھرتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''بالکل غلطی تو کی ہے نا، آخر یہاں کون آپ کا منتظر تھا۔ کون سا کسی نے آپ کے سلامتی سے لوٹ آنے کی دعائیں مانگیں، کون سا کسی کے لیے آپ بہت اہم ہیں۔ آپ کی ضرورت ہی یہاں کس کو ہے۔''

''اس بکواس کا مطلب۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

''کچھ نہیں۔'' بے رخی سے کہہ کر اٹھتے ہوئے وہ چھوٹی بہن کو مخاطب ہوئی۔ ''رنڑا بابا جان میرا پوچھیں ہیں تو کہہ دینا نیند آ رہی تھی سو گئی ہے۔''

اس نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو اور مذاق رنڑا کا اڑاتی ہو۔''

وہ بے رخی سے بولی۔ ''ہاتھ چھوڑیں، میں نے سونے جانا ہے۔''

میں اسے خوش کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا صبح نہیں جاؤں گا، بس۔''

اس نے میری طرف رخ پھیرا، گہری نیلی آنکھوں کی تہہ میں پانی جمع ہو چکا تھا۔ لمحہ بھر مجھے گھورنے کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔ ''کم از کم ایک ہفتہ۔''

میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''پاگلوں والی بات نہ کرو۔''

''ایک ہفتہ، یا ابھی سے خدا حافظ۔'' وہ ڈٹ گئی۔

میں بے بسی سے بولا۔ ''تمھیں میرے حالات کا پتا نہیں ہے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''ہاں، مگر اپنی حالت کا تو پتا ہے نا۔''

''اچھا اس بارے بعد میں بات کریں گے، تم فی الحال بیٹھ تو جاؤ۔'' میں نے اسے چارپائی کی جانب کھینچا۔ رنڑا اور ثمر خان خاموشی سے ہماری بحث سن رہے تھے۔

گہرا سانس لے کر وہ رنڑا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اب بھی ناراضی نظر آ رہی تھی۔

رنڑا معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔"لالاجی، آپ باجی کی بات مان جائیں نا۔"

"تم کچھ نہیں جانتیں، تم چھوٹی سی بچی ہو گڑیا۔"میں نے اسے ہلکے جھڑکا۔

گلگارے نے منھ بنایا۔"ہاں بڑے تو صرف آپ ہیں باقی سب بچے ہیں۔"

"مطلب تم نے مار کھانے کا پورا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔"میں نے اسے دھمکایا۔

اسی وقت شمریز چچا اندر داخل ہوئے۔"کس کی پٹائی کی بات ہو رہی ہے بھئی۔"

"کسی کی نہیں چچا جان، آپ سنائیں مہمان سو گیا ہے۔"وہ شام سے مسلسل کمانڈر عبدالحق کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

"ہاں سو گیا ہے اور سنا ہے ایس ایس افغانستان میں بڑی دھوم مچا کر آ رہا ہے۔"

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔"پتا نہیں کمانڈر نے کون کون سے کارنامے مجھ سے منسوب کر کے آپ کو سنا دیے ہیں۔"

"چلو آپ سے سچ سن لیتے ہیں۔"وہ اپنی رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔میرے منع کرنے کے باوجود گلگارے نے میرا بستر بھی وہیں پر لگا دیا تھا۔میں نے بھی نچلے دھڑ پر رضائی لیتے ہوئے ثمر خان اور رنڑا کو اپنے کمرے میں جا کر سونے کا کہا مگر دونوں نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

رنڑا بولی۔"ہم بھی آپ کی باتیں سنیں گے، کیا پتا آپ کل چلے جائیں۔"

چچا شمریز نے منت بھرے لہجے میں کہا۔"ویسے یہ تو زیادتی ہے ذیشان میاں، ایک دن تو قیام کر لیتے۔"

"آپ فکر نہ کریں ابا جان یہ ایک ہفتہ کہیں نہیں جانے والے۔"پر اعتماد لہجے میں کہتے ہوئے وہ مجھے مخاطب ہوئی۔"آپ ہمیں یہاں سے جانے کے بعد کے حالات بتائیں۔آپ زخمی کیسے ہوئے تھے اور باقی سب کچھ بھی۔"

میں اس کی ہفتے والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں غزنی خیل اور شلوبر گاؤں کی لڑائی کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔جس کا اختتام نک سٹیورٹ کی موت پر ہوا۔

گلگارے نے پوچھا۔"پلوشہ بہن کی تلاش میں مجاہدین نے کیا پیش رفت دکھائی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فی الحال تو کچھ پتا نہیں چلا۔''

''اچھا اب آرام کرلیں۔'' اس نے رنڑا اور ثمر خان کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

صبح نماز پڑھ کر میں نے کمانڈر عبدالحق کو مزید ایک دو دن رکنے کا عندیہ دیا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''میں زیادہ سے زیادہ آج کا دن رک سکتا ہوں۔''

میں بے بسی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے یار میں کوشش کرتا ہوں، مگر بچے ضد کررہے ہیں۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''بچوں کی تو خیر ہے کوئی بڑا ضد نہ کررہا ہو۔ اور اگر ایسا ہے تو آپ کو ضرور رکنا چاہیے۔''

''اچھا میں ناشتا لے کر آتا ہوں۔'' اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں گھر کی طرف بڑھ گیا۔

گلگارے نماز پڑھ کر باورچی خانے میں گھسی تھی۔ میں بھی لکڑی کی چوکی لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ جھلملانے لگے تھے۔

وہ پوچھنے لگی۔ ''ناشتا مہمان کے ساتھ کریں گے۔''

''ہاں، وہ بس جانے کے لیے تیار ہے۔ میرے کہنے پر ایک دن کے لیے رک گیا ہے۔''

وہ بے نیازی سے بولی۔ ''آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے رکا ہے تو اسے ہفتہ رکنا پڑے گا۔''

''گل، پتا ہے میں پلوشے کے لیے کتنا پریشان ہوں، پہلے بھی اتنی دیر ہوگئی ہے۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

انڈہ فرائی کردوں یا آملیٹ بنادوں۔'' اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''میری بات نہیں مانوگی۔''

وہ نیازی سے بولی۔ ''تو آپ کی مرضی ہی پوچھ رہی ہوں نا، آملیٹ، ابلا ہوا یا انڈہ فرائی کھائیں گے۔''

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''جو مرضی ہے بنادو۔''

''یہ دودھ پی لیں۔'' اس نے جست کا کٹورا میرے سامنے رکھا جو گائے کے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا تھا ''یہ شہد بھی ڈال لیں۔ میں نے خود اتارا تھا۔'' اس نے ایک کھلے منہ والی خالص شہد کی بوتل بھی میری طرف

بڑھادی تھی۔

''شکریہ۔'' دودھ میں شہد ملا کر میں نیم گرم دودھ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

''اب گھر جائیں گے یا، وزیرستان سے پلوشہ کی تلاش شروع کر دیں گے۔''

''ایک بار گھر تو جاؤں گا، کیونکہ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں نے بھجوا دیے تھے اور اس کے بعد میرے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

''ہونہہ!'' ہنکارا ابھرتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔''ویسے پلوشہ کس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئی تھی؟''

''نصراللہ خوجل خیل نے انھیں بھی اسی رستے کے متعلق ہدایات دی تھیں۔لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئے یا کسی اور رستے سے۔''

''اگر اس رستے سے گئے ہوتے تو یقیناً کہیں نہ کہیں سے ان کی سن گن مل جاتی۔انگور اڈے سے آنے والے لوگ عموماً خواگا ابو میں ضرور قیام کرتے ہیں۔اور ہمارا گھر ایسی جگہ پر ہے کہ یہاں اکثر مہمانوں کی آمدورفت رہتی ہے۔اس کے علاوہ بھی آپ اس پورے رستے پر سفر کر چکے ہیں اگر وہ اس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئے ہوتے تو ان کی کہیں نہ کہیں سے سن گن آپ کو ضرور ملتی۔سب سے بڑھ کر افغانستان میں سرگرم تنظیموں میں سے انھیں کسی نہ کسی کے ساتھ رابطہ ضرور کرنا چاہیے تھا کیونکہ امریکنز کے خلاف کام کرنے کے لیے ان تنظیموں کا سہارا لینا انسان کی مجبوری بن جاتی ہے۔اور اگر وہاں کام کرنے والے دو تین گروپوں کے افراد سے پوچھنے کے باوجود ان کا پتا نہیں چل سکا، بلکہ آپ کی ایک امریکن دوست نے بھی ان کے بارے لاعلمی کا اظہار کیا ہے حالانکہ وہ کافی بڑی عہدہ دار ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں جینیفر کا ذکر کر کے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرے جینی سے تعلق کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔''تمھاری اس ساری کہانی سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

''یہی کہ انھیں افغانستان داخل ہونے سے پہلے ہی کوئی حادثہ پیش آگیا ہو یا وہ اپنا ارادہ مؤخر کر کے واپس لوٹ گئے ہوں۔اور اللہ کرے میرا آخری اندازہ ہی صحیح ہو۔''

بات چیت کے دوران اس کے ہاتھ نہیں رکے تھے دیسی گھی میں پراٹھے بنا کر اس نے چار انڈے فرائی کیے اور گائے کے تازہ دودھ کی گاڑھی چائے بنا کر اس نے خالص دیہاتی اور گھر کا ناشتا تیار کر دیا تھا۔

''بعد میں بات کرتے ہیں۔'' میں ناشتے کے برتن اٹھا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ چچا شمریز خان، کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ناشتا کر کے میں نے برتن اٹھائے اور گھر میں گھس گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرا اپنا ہی گھر ہو۔ رنڑا اور ثمر خان جاگ گئے تھے۔ میں ان کے لائے ہوئے تحائف ان کے حوالے کرنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ تحائف کو محبت بڑھانے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ تحفہ پانے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ تحفہ لانے والے کے لیے کتنا اہم اور خاص ہے۔ اور یہ کہ تحفہ لانے والے نے اسے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی یاد رکھا ہے۔ گلگارے اور شمریز چچا کے لیے بھی میں نے تحائف خریدے تھے۔ گلگارے کے بدن پر مجھے وہی لباس نظر آ رہا تھا جو دو ہفتے پہلے میں نے کسی اور کے ہاتھ بجھوایا تھا۔

دن کا زیادہ وقت میں نے گلگارے، رنڑا اور ثمر خان کے ساتھ ہی گزارا تھا۔ گلگارے نے مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ شاید مہینے ڈیڑھ تک ان کے گاؤں میں بھی موبائل فون کے سگنل آنے لگ جائیں۔ اس نے میرا موبائل فون نمبر بھی اپنے پاس لکھ لیا تھا۔ البتہ اس کی ناراضی کے خوف سے اس کے بعد میں نے جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ رات کو رنڑا اور ثمر خان کے سونے کے بعد بھی میں چچا شمریز اور گلگارے کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ گلگارے چائے بنا کر لے آئی۔ دوران گفتگو چچا شمریز پوچھنے لگا۔

''صبح جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔''

میں نے گہرا سانس لے کر گلگارے کی طرف دیکھا جو بہ ظاہر بے نیازی سے چمڑے کے بوٹوں کو گھور رہی تھی جو میں اس کے لیے لے آیا تھا۔ میں دھیمے لہجے میں بولا۔

''فی الحال تو اجازت نہیں ملی۔''

''اجازت۔'' چچا شمریز حیران رہ گیا تھا۔

میں مسکرایا۔ ''گل سے پوچھ لیں۔''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''ابا جان یہ چند دن تو یہیں رکیں گے نا۔''

”مگر بیٹی، اسے کافی کام کرنے ہیں۔“ چچا شمریز اسے سمجھانے لگا۔

”تو......“اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”اسے چھوڑو ذیشان بیٹا، صبح جانے کی تیاری کرو۔ آپ کا یہاں رہنا مجھے بھی پسند ہے لیکن پہلے آپ کے اپنے کام ہیں۔ البتہ پلوشہ بیٹی کے ملنے کے بعد میں درخواست کروں گا کہ چند دن کے لیے ہمیں خدمت کا موقع ضرور دینا۔“

وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ”یہ نہیں جائیں گے۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”چچا شمریز آپ ہمیں تنگ نہ کریں، جب ایک بار طے ہوگیا کہ میں نہیں جاؤں گا تو بس بات ختم۔“

میرا انداز دیکھتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”سن لیا ابو جان۔“

”جو مرضی آئے کرو۔“ چچا شمریز نے ناراض لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر رضائی میں کرلیا۔

”آپ بھی آرام کریں۔“ ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈال کر وہ چائے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے باہر نکل گئی۔

صبح نماز پڑھ کر میں نے باورچی خانے میں جا کر شہد ملا نیم گرم دودھ پیا اور ناشتا تیار کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”رستے کے لیے دال کے پراٹھے بنادوں یا سالن تیار کردوں۔“

میں مسکرایا۔ ”خوشی سے کہہ رہی ہو۔“

”اگر پلوشہ بہن کی فکر نہ ہوتی تو ہرگز اجازت نہ دیتی۔ اور شکریہ آپ نے میرا مان رکھا۔“

”اگر پلوشہ کی فکر نہ ہوتی تو کم از کم یہ شہد کی بوتل ختم ہونے تک میں ضرور ٹھہرتا۔“

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”دیکھ لیں، کہیں یہ نہ ہو آپ کی اگلی بار کی آمد سے پہلے میں اتنا شہد اکٹھا کرلوں کہ آپ سے وہ شہد ختم ہی نہ ہو پائے۔“

”ان شاء اللہ، اگلی بار تمھاری بہن پلوشے میرے ساتھ ہوگی اور یقیناً وہ شہد ختم کرانے میں میری مدد کرے گی۔“

''ان شاء اللہ۔''اس نے خلوص بھرے لہجے میں کہا اور میں ناشتے کے برتنوں کے ساتھ بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ارادہ ہے؟''ناشتا شروع کرنے سے پہلے ہی عبدالحق مستفسر ہوا۔

میں نے کہا۔''بس راستے کے لیے کھانا تیار ہو رہا ہے۔''

''اور وہ رات والی گفتگو کا کیا ہوا۔''چچا شمریز مستفسر ہوئے۔

''منا لیا ہے، پلوشہ کی گمشدگی پر وہ بھی پریشان ہے۔بس یونھی اپنی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔''

ناشتے کے بعد ہم جانے کے لیے تیار تھے۔گلگارے نے دال کے پراٹھے بنا کر کپڑے میں باندھ دیے تھے۔تمام نے دکھی دل سے مجھے الوداع کہا تھا۔سب سے آخر میں گلگارے میرے قریب آئی۔

''پلوشہ بہن کے ملتے ہی یہاں آنا ہوگا۔''

''ان شاء اللہ کوشش کروں گا۔''

''اکیلے نہیں،ان کے ساتھ۔''اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے مجھے تنبیہ کی۔

''ہاں اس کے ساتھ گل!......وہ ضرور اس لڑکی کو دیکھنا چاہے گی جس کی وجہ سے اس کے راجو کی جان بچی ہے اور جو اس کے راجو کی مسیحا ہے۔''

''اپنا خیال رکھنا۔اللہ پاک آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔''دھیرے سے کہہ کر اس نے مجھے الوداع کہہ دیا۔

☆......☆......☆

میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ اس رستے پر دوبارہ گامزن ہو گیا کہ جس رستے پر میں نے برف کا عذاب جھیلا تھا۔اسے میں نے وہ سارا واقعہ بتایا اور ساتھ ہی یہ کہ گلگارے نے کس طرح میری جان بچائی تھی۔وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔

''واقعی ایسی لڑکی عزت اور احترام کے قابل ہے۔اگر اس کے کہنے پر آپ کو مہینا بھی رکنا پڑ جاتا تو آپ کا احسان نہ ہوتا۔''

''کمانڈر، میں اسے بہن کی طرح پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا ہوں، مگر وہ مجھے بھائی نہیں کہتی، مجبوراً میں بھی اسے نام سے پکارنے لگ گیا۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''کچھ رشتوں کو بے نام اور الجھا ہوا چھوڑ دینے پر دل چاہتا ہے اور ایسی حالت میں دل کی بات مان لینا چاہیے۔ باقی زندگی موت کا کیا بھروسا، ہوسکتا ہے اسے بھی آپ کی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔''

''میرے پاس اسے امید دلانے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کمانڈر۔ میری زندگی میں کئی ایسی لڑکیاں آئی ہیں جنھیں میں پسند کرتا تھا بلکہ اب بھی کرتا ہوں، گل بھی ان میں سے ایک ہے۔ خوب صورت، شریف مخلص، سلجھی ہوئی۔ لیکن بہ خدا پلوشہ وہ واحد لڑکی ہے جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ محبت کی ہے اور جو مجھے اتنی ہی ضروری لگتی ہے جتنا کہ سانس لینا ضروری ہوتا ہے۔ دو تین بار مجھ پر ایسا وقت بھی بیتا کہ میں اپنے آخری سانس گن رہا تھا، ان لمحات میں بھی وہ مجھے نہ بھولی۔''

وہ مسکرایا۔ ''پلوخان کی تو کیا ہی بات تھی۔ بہت ہی ہونہار اور لائق شاگرد تھا۔ ہر چیز کو اتنا جلدی سمجھ جاتا تھا کہ بعض اوقات ہم اساتذہ حیران رہ جاتے۔ خالی ہاتھ لڑائی کرنا، ہتھیار چلانا، پڑھائی لکھائی، مختلف زبانیں سیکھنا، چھاپہ مار کارروائی کے منصوبے بنانا، گاڑی چلانا، یہاں تک کہ جسم میں لگی ہوئی گولی کو خنجر کی نوک سے یوں صفائی سے نکال لیتا تھا کہ یقین مانو اس طرح ہم سے یہ کام نہیں ہوتا تھا۔ سب استادوں کا چہیتا شاگرد تھا۔ اللہ پاک اس پر اپنی رحمت برسائے اور اس کی تمام منازل کو آسان فرمائے۔''

میں معترض ہوا ''وہ فوت تو نہیں ہوئی یار کہ اس کی مغفرت کی دعا شروع کر دی۔''

عبدالحق کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

دوپہر کو ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانے کی پوٹلی کھولی۔ اس میں ایک تہ شدہ کاغذ دیکھ کر کمانڈر عبدالحق نے میری طرف بڑھا دیا۔ ''یقیناً یہ آپ کے لیے ہوگا۔''

وہ گلگارے کا خط تھا۔ سلام ودعا کے بعد اس نے لکھا تھا۔

''پتا نہیں زندگی دوبارہ ملنے کا موقع دیتی ہے یا نہیں، لیکن ایک بات جو میں اب مزید چھپا نہیں سکتی اور آپ

کو بتا دینا چاہتی ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ آپ کا دوبارہ سامنا ہونے پر ضرور معذرت کروں گی، آپ آئے اور چلے بھی گئے لیکن مجھے ہمت نہ ہو سکی۔ البتہ کاغذ قلم نے مجھے یہ ہمت عطا کر دی ہے۔ اس دن رات کو مورچے میں میں انجانے میں یا غلطی سے آپ کے قریب نہیں ہوئی تھی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ امید ہے اگلی ملاقات تک آپ یہ بات بھلا چکے ہوں گے اور میری بہن پلوشہ سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کریں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ پلوشہ بہن کے دل میں میرے بارے کوئی غلط فہمی جڑ پکڑ لے۔ پلوشہ مجھے رنڑا کی طرح ہی پیاری ہے۔ اس کے علاوہ نصیر خان بار بار ابو جان کے پاس اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگنے آ رہے ہیں۔ اس کا بیٹا فخر الاسلام خان ایک اچھا اور سلجھا ہوا جوان ہے۔ ابو جان بھی یہ اچھا رشتہ گنوانا نہیں چاہتے۔ میرا خیال ہے ہاں کر دیتی ہوں۔ کیوں کہ خواہ مخواہ کی امیدیں باندھنا کوئی صحت مندانہ روش نہیں ہے۔ ہر لڑکی پلوشہ بہن کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتی۔ اسی طرح کوئی بھی اچھے خاندان کی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کا گھر اجاڑ کر یقیناً اپنا گھر نہیں بسانا چاہے گی اور میں بھی اپنے آپ کو اچھے خاندان ہی کا سمجھتی ہوں۔ باقی مجھے یقین ہے کہ میرے ہاں کرتے ہی وہ ایک ماہ کے اندر اندر شادی پر زور دیں گے۔ فخر الاسلام خان مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ ایک محبت بھرے دل کو توڑنا بالکل ہی غلط ہوگا۔ آپ کو پہلے سے بتا رہی ہوں۔ چند دنوں تک میں کسی اور کے نام منسوب ہو جاؤں گی۔ اگر میری شادی میں پلوشہ بہن کے ساتھ شرکت کی تو میرے دل میں کوئی گلہ نہیں بچے گا۔ خدا حافظ

......آپ کی چھوٹی بہن رنڑا کی باجی گل۔''

میرے گل کہنے پر وہ خود کو گل ہی کہنے لگ گئی تھی۔ مجھے خط پڑھتے دیکھ کر کمانڈر عبدالحق آگ جلانے لگ گیا تھا۔ خط پڑھ کر میں نے آگ میں پھینک دیا۔ گلگارے کا وہ راز میں نے سینے میں دفن کر دیا تھا۔ اپنی محسن کی یہ بات کسی کو بیان کر کے میں اس کے کردار کو ہلکا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی اخلاقی جرأت تھی کہ اس نے اعتراف کر لیا تھا۔ باقی اس کی ذو معنی گفتگو آنکھیں میں چھپی التجا اور اس کے انداز دیکھ کر مجھے پہلے سے اس کے دل میں چھپے جذبات معلوم ہو گئے تھے۔ اور اب تو اس نے خط میں کھل کر اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن اس کے اس نے ساتھ اپنے ہوش مندانہ فیصلے سے مجھے خوش بھی کر دیا تھا۔

کھانے اور گرم قہوے سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے ظہر کی نماز پڑھی اور دوبارہ کمر باندھ لی۔ اور

پھر رات کو بھی رکے بغیر چلتے رہے۔ صبح کی اذان کے وقت ہم انگور اڈے پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر نصراللہ خوجل خیل نے ہمیں بڑے خلوص سے خوش آمدید کہا تھا۔ ساری رات چلنے کی وجہ سے ہم تھکن محسوس کر رہے تھے لیکن ہمارا ارادہ آرام کرنے کا بالکل نہیں تھا۔ چچا نصراللہ خوجل خیل کے پاس ناشتا کر کے ہم گپ شپ کرنے لگے۔ ان کے پاس ہمارے لیے کوئی خوش خبری موجود نہیں تھی۔ کمانڈر اسلام کے بارے معلوم ہوا تھا کہ وہ پلوشہ اور سردار کے بارے پوچھ گچھ کرنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ البتہ کمانڈر عبدالحق نے مجھے زبردستی ساتھ چلنے کا کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ایک بار اپنے سینئرز سے ملاقات کرلوں۔ مجھ پر لگے الزامات کے ثبوت ملنے کے بعد میرے لیے کیا طے کیا جانا تھا اس کا سامنا کرلوں اس کے بعد میں آرام سے پلوشہ کو تلاش کر سکتا تھا۔ مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ اور ہم چچا نصراللہ سے اجازت لے کر ویگن اڈے کی طرف بڑھ گئے۔ ان سے لی ہوئی کلاشن کوف میں نے ان کے پاس ہی چھوڑ دی تھی کیوں کہ وہ میں اپنے ساتھ آگے تو نہیں لے جا سکتا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ کر کمانڈر عبدالحق مجھ سے الوداع ہوتے وقت عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ذیشان بھائی، مجھے معاف کر دینا یار۔''

''کیا مطلب؟'' میری چہرے پر حیرانی بھری مسکراہٹ ابھری۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''ویسے ہی بس، دانستہ یا نادانستگی میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے نا یار۔''

میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو ہر کسی سے ہو جاتی ہے، شاید مجھ سے بھی ہوئی ہو۔''

ویگن اڈے سے اس نے پشاور کی گاڑی پکڑی اور میں راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گھر جا کر میں نے پھنس جانا ہے اور گھر والوں نے پلوشہ کے بارے پوچھ پوچھ کر میرے دماغ کی لسی بنا دینا ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں پہلے اورنگ زیب صاحب سے ملاقات کر لیتا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے راولپنڈی تک میں اپنی نیند پوری کرتا رہا۔ صبح کی اذان کے وقت میں پیرودھائی موڑ پر اتر رہا تھا۔ میرا موبائل فون وغیرہ چونکہ اورنگ زیب صاحب ہی کے پاس رہ گیا تھا۔ اس لیے مجھے ایک دکان دار سے فون مانگ کر اورنگ زیب صاحب کو کال کرنا پڑی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی۔ ''ہیلو'' میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے فوراً کہا۔ ’’اسلام علیکم سر میں ذیشان بات کر رہا ہوں اور اس وقت پیرودھائی موڑ پر کھڑا ہوں۔‘‘

’’وعلیکم اسلام، مجھے بیس منٹ لگیں گے۔‘‘ ان کی آواز سے غنودگی غائب ہو گئی تھی۔

میں وہیں پر ان کا انتظار کرنے لگا وہ بتائے گئے وقت سے دو منٹ پہلے پہنچ گئے تھے۔ پرتپاک انداز میں مجھ سے چھاتی ملاتے ہوئے انھوں نے میری پیٹھ تھپکی۔ اور میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

’’ویسے، وہ ثبوت تمھیں خود لانے چاہیے تھے۔‘‘ کار آگے بڑھاتے ہی انھوں نے سوال کیا۔

’’بس سر، ایک چھوٹے سے کام کے لیے وہیں رہ گیا تھا اس لیے کسی اور کے ہاتھ بھجوانے پڑے۔‘‘

وہ مسکرائے۔ ’’تمھارا چھوٹا کام کسی کے سر میں گولی اتارنا ہی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’کچھ ایسا ہی سمجھیں سر۔‘‘ میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

’’تمھاری کہانی تو تفصیل سے سنوں گا فی الحال یہ سن لو کہ تم پر لگے الزامات تو صاف ہو گئے ہیں لیکن مجھے بے ہوش کر کے تم نے بھاگنے کی جو غلطی کی ہے اس کا مقدمہ ابھی تک باقی ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ’’ایک فیلڈ ایجنٹ سے ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں سر۔‘‘

’’ہاں، مگر سزا کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے نا۔‘‘ انھوں نے کار اپنے گھر کی طرف موڑ دی تھی۔ ناشتا کرا کر انھوں نے مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ آرام دہ بستر پاتے ہی میں سو گیا تھا۔ مسلسل دو راتوں سے مجھے بستر نصیب نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے گیارہ بجے جگا کر انھوں نے مجھے تیار ہونے کا حکم دیا۔ میرے ناپ کی وردی اور بوٹوں وغیرہ کا بندوبست انھوں کر دیا تھا۔ بارہ بجے مجھے کرنل احمد کے سامنے پیش کیا گیا۔ کرنل صاحب کو ساری بات اورنگ زیب صاحب تفصیل سے بتا چکے تھے۔ میرے سابقہ کارناموں کو دیکھتے ہوئے اور میری مجبوری کو مدنظر رکھ کر انھوں نے مجھے خالی وارننگ دینے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مجھے واپس اپنی یونٹ میں بھیجنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر میں نے اللہ پاک کا شکر ادا کیا تھا۔ البتہ میری اپنی یونٹ کے کرنل صاحب تک بھی یہ تمام باتیں تحریری صورت میں بھجوا دی گئی تھیں۔ نامعلوم ان کا کیا فیصلہ ہوتا۔ اور مجھے لگ بھی یہی رہا تھا کہ کرنل احمد نے میری سزا وغیرہ کا تعین میری یونٹ کے کرنل صاحب کی صواب دید پر چھوڑ دیا

تھا۔(یہاں پر آرمی کے قانون وغیرہ کے متعلق اس لیے کچھ لکھنے سے گریز کر رہا ہوں کہ اس کے نہ جاننے سے نہ تو کہانی پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ قارئین کے لیے ایسی معلومات جاننا فائدہ مند ہے۔اس لیے یہ سطور میں نے بالکل ہی اجمالاً تحریر کی ہیں۔حالانکہ اپنے مقدمے پر میں کئی صفحات کالے کر سکتا تھا لیکن یہ ایک بوریت بھری کارروائی کا تذکرہ ہوتے)

آرمی میں ایک یونٹ سے دوسری یونٹ میں تبدیلی پر چند دن کی چھٹی ضرور ملتی ہے۔جسے ''Joining time'' کہتے ہیں۔

''سر، موو آرڈر پر جتنی زیادہ چھٹی دے سکتے ہیں دے دینا۔'' کرنل صاحب کے دفتر سے باہر آتے ہی میں اورنگ زیب صاحب کو مخاطب ہوا۔

''دے دوں گا، مگر کیا کرنا ہے لمبی چھٹی کا؟'' وہ مستفسر ہوئے۔

میں صاف گوئی سے بولا۔''سر، میری بیوی پلوشہ کا اب تک پتا نہیں چلا اس کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں ۔''یوں بھی اورنگ زیب صاحب کا ساتھ میرا تعلق سینئر، جونیئر کے علاوہ بھی کچھ بن چکا تھا۔اس لیے میں ان سے کوئی بات خفیہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''کیا؟'' ان کے چہرے پر حیرانی ابھری۔

''جی سر، سردار خان اور پلوشہ بھی میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے گئے تھے۔شاید سردار خان کو تو بھگوڑا ظاہر کر دیا گیا ہو۔اس کی چھٹی تو کب کی ختم ہو چکی ہو گی۔''

اورنگ زیب صاحب میری بات کا جواب دیے بغیر مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے انھوں نے انٹر کام اٹھا کر کلرک کو میرا یونٹ واپسی کا Move Order تیار کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ Joining Tim انتیس دن بھر دے۔وہ زیادہ سے زیادہ اتنی چھٹی ہی دے سکتے تھے۔

رسیور رکھ کر اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا جس میں میرا سروس کارڈ، شناختی کارڈ اور موبائل فون وغیرہ موجود تھا۔یہ وہ سامان تھا جو میری گرفتاری کے وقت یہاں جمع کیا گیا تھا۔

”شکریہ۔“میں سامان وردی کی جیبوں میں منتقل کرنے لگا۔

وہ گھمبیر لہجے میں بولے۔”سردار اپنے گھر میں ہے حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔اس حادثے کی وجہ سے اسے بھی واپس یونٹ بھیج دیا گیا ہے۔“

”پپ......پلوشہ......؟“مجھے اپنی آواز جیسے کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”اس بارے تمھیں سردار ہی تفصیل بتائے گا۔“وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھے۔ان کا دکھ بھرا لہجہ میرا دل ہولائے دے رہا تھا۔

”سر کچھ تو بتائیں۔وہ ٹھیک تو ہے نا۔کیا وہ بھی حادثے کے وقت سردار کے ساتھ تھی۔“میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔کیا سردار کی طرح وہ بھی زخمی تھی۔اگر ایسا تھا تو مجھے گھر والوں نے کیوں نہیں بتایا تھا۔انھیں تو لازماً یہ خبر ہو جانا چاہیے تھی۔یا ممکن تھا کہ جس وقت میں نے گھر فون کیا تھا اس وقت تک سردار وغیرہ کا حادثہ نہ ہوا ہو۔

وہ نپے تلے الفاظ میں بولا۔”ذیشان ، بہت سارے حادثوں کو ، اپنے پیاروں کے بچھڑنے کو اور ان کی معذوری وغیرہ کو ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔اب میں نہیں جانتا کہ پلوشہ کے ساتھ کیا ہوا ہے یا کچھ بھی نہیں ہوا۔یہ سردار کو معلوم ہے وہی تمھیں تفصیل سے بتا سکتا ہے۔سچ کہوں تو میں بس ایک بار ہی سرسری انداز میں سردار سے مل پایا ہوں اور تمھاری بیوی چونکہ کوئی سرکاری آدمی نہیں ہے اس لیے نہ میں نے سردار سے اس کے متعلق کچھ پوچھا اور نہ اس نے کچھ بتانے کی زحمت کی۔“

”سر ، جھوٹ بول کر مجھے بہلانے کی کوشش نہ کریں۔“میرے لہجے بدتمیزی کا عنصر نمایاں تھا۔

”مووآرڈر بننے تک اپنی وردی وغیرہ اتار لو۔“اس نے جیب سے کار کی چابی نکال کر میری طرف پھینک دی۔

میں زچ ہو کر بولا۔”آخر آپ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ اصل بات کیا ہے۔“

”اگر معلوم ہوتا تو ضرور بتاتا۔“اس نے کرسی گھما کر اپنا رخ دیوار کی جانب موڑ لیا تھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں ان کے دفتر سے نکل آیا۔ان کے گھر پہنچ کر میں نے جلدی جلدی وردی اتار کر کپڑے پہنے اور پھر اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے نکل آیا۔واپسی پر میرا مووآرڈر تیار ہو چکا تھا۔

موو آرڈر مجھے پکڑاتے ہوئے اورنگ زیب صاحب کہنے لگے۔ ''کار کی چابی اپنے پاس رکھو بعد میں واپس کر دینا۔ میں فی الحال سرکاری گاڑی پر گزارا کر لوں گا۔''

شکریہ وغیرہ ادا کرنے کا تکلّف کیے بغیر میں ان سے مصافحہ کر کے کار کی جانب بڑھ گیا۔

میرے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ جھک کر نصیحت کرتا ہوا بولا۔ ''احتیاط سے جانا۔ تیز رفتاری سے ماضی میں ہوا کام تو تبدیل نہیں ہو سکے گا البتہ تم خود ماضی بن جاؤ گے۔''

''جی سر۔'' کہتے ہوئے میں کار موڑ لی۔ موبائل فون کی بیٹری بند پڑے پڑے ختم ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اے ٹی ایم سے ضرورت کے مطابق رقم نکالی اور پھر ایک نیا موبائل فون خرید کر اپنا سم کارڈ اس میں منتقل کر دیا۔ ایک ایزی لوڈ کی دکان سے سم کارڈ ریچارج کر کے میں فوراً سردار کو کال کر رہا تھا۔ سپیکر سے۔ ''آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔'' کی بے ہودہ خبر سن کر میں ابو جان کا نمبر ملانے لگا۔ چونکہ اس بار میں ذاتی نمبر سے کال کر رہا تھا تبھی انھوں نے میرا نام پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''اسلام علیکم ذیشان بیٹا!'' گھنٹی وصول کرتے ہی ابو جان کی مشفق آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''وعلیکم اسلام ابو جان! کیسے ہیں آپ؟''

''بالکل ٹھیک ہوں بیٹا۔ باقی تمام بھی خیریت سے ہیں بس تم دونوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔''

ان کی بات سن کر میرا سانس رکنے لگا تھا۔ آخری کوئی تو بات تھی کہ سردار نے گھر میں پلوشہ کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اسی طرح اورنگ زیب صاحب بھی کچھ بتانے پر راضی نہیں تھے۔ یا شاید سچ مچ انھیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

''چپ کیوں ہو گئے بیٹا؟'' مجھے خاموش پا کر ابو جان مستفسر ہوئے۔

''بس میں یہ اطلاع دے رہا تھا کہ کل تک ان شاء اللہ میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ باقی گپ شپ ملنے پر ہو گی۔''

''پلوشہ بیٹی تمھارے ساتھ ہے۔'' انھوں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''گھر آ کر بات کرتے ہیں ابو جان۔ اس وقت میں ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔'' اس وقت میں ہاں ناں کی حالت میں نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا، اپنا خیال رکھنا۔'' انھوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

موبائل فون بند کر کے میں نے ساتھ والی سیٹ پر پھینکا اور خود کو تسلی دینے کے لیے کچھ بہتر سوچنے کی کوشش کرنے لگا، جو اس وقت ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ہر سوچ میرے دل کو بٹھائے جا رہی تھی۔ ''کیا مجھے معذور پلوشہ منظور تھی۔'' میں نے دل سے پوچھا جس کا جواب نہایت واضح ملا۔ ''دل و جان سے منظور ہے بس وہ زندہ ہونی چاہیے میں ساری زندگی اس کی خدمت کروں گا۔''

اچانک ہی میرے دماغ میں کمانڈر عبدالحق کی ذو معنی گفتگو گونجنے لگی۔ اس نے سرسری انداز میں پلوشہ کے لیے مغفرت کی دعا بھی کر دی تھی۔ پھر گلگارے کے ذکر پر یہ کہنا کہ۔ ''زندگی موت کا کیا بھروسا، ہو سکتا ہے اسے بھی آپ کی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔'' ڈیرہ اسماعیل خان میں مجھ سے الوداع ہوتے وقت اس نے معافی بھی مانگی تھی۔ رسمی معذرت اور کسی غلطی پر معذرت چاہنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اس وقت اس کا انداز رسمی معذرت والا نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسے پلوشہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے معلوم تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر مجھے لاعلم رکھا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے میری واپسی پر زور دیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے اس بارے نک سٹیورٹ کی موت سے پہلے ہی پتا چل گیا ہو۔ اور مجھے ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے اس نے یہ خبر اپنے تک محدود رکھی ہو۔ اور بعد میں شرمندگی کی وجہ سے اظہار نہ کر سکا ہو۔

ان تمام الجھنوں سے مجھے سردار خان ہی نکال سکتا تھا۔ میں ایک بار سردار کے گھر جا چکا تھا۔ اور اس وقت جو میری دماغی حالت تھی اس کے بعد اورنگ زیب صاحب کی نصیحت پر عمل کرنا ایک مذاق ہی تھا۔ راولپنڈی سے سردار کے گاؤں تک میں اڑھائی تین گھنٹوں میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے کار روک کر میں نیچے اترا سہ پہر کے چھے بج رہے تھے۔ دروازے پر دستک دیتے ہی ایک چھوٹا سا لڑکا دروازے پر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ''سردار خان گھر پر ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں ماموں جان گھر پر ہی ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اندر کی طرف رخ موڑ کر ہانک لگائی۔ ''ماموں جان آپ کا مہمان ہے۔''

دروازے کی طرف کھٹ پٹ کی آواز آئی جیسے کوئی بیساکھیوں پر چل رہا ہو۔میرا دل جیسے ڈوبنے لگ گیا تھا ۔چھوٹے بچے نے دروازے کا ایک کواڑ کھول لیا تھا اور پھر سردار خان میرے سامنے ہوا۔مجھے دیکھتے ہی وہ سن ہو گیا تھا۔کوئی لفظ منھ سے نکالے بغیر ہم ایک دوسرے کو گھورتے لگے۔وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے نیچے پلستر چڑھا ہوا تھا۔بائیں ٹانگ البتہ محفوظ تھی۔اس کے چہرے پر اچھی خاصی داڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔

''محسن بیٹا، بیٹھک کا دروازہ کھولو۔'' اپنے بھانجے کو کہہ کر وہ میرے قریب ہوا اور پھر وہ میری بانہوں میں تھا ۔چند لمحوں بعد ہم بیٹھک میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔میں اس سے کوئی سوال پوچھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا ۔وہ بھی خاموش بیٹھا تھا۔تھوڑی دیر اسی خاموشی میں گزر گئی گفتگو کی ابتداء سردار نے کی تھی۔

''لی زونا کی کال آئی تھی، وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہے۔شاید مہینے ڈیڑھ تک یہاں پہنچ جائے۔'' یہ خوشی کی خبر سناتے ہوئے بھی مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ رو رہا ہو۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔وہ دوبارہ بولا۔

''اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اب پاکستان آنے کے لیے کاغذی کارروائی کر رہی ہے ۔''اس کی یہ باتیں ایک ایسی ہی کوشش لگ رہی تھیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر کے جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی وقت اس کا کم سن بھانجا ٹرے میں شربت کا جگ اور دو خالی گلاس رکھے اندر داخل ہوا بڑی مشکل سے اس نے ٹرے اٹھائی ہوئی تھی۔ٹرے میز پر رکھ وہ باہر نکل گیا تھا۔مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے جگ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

''کیا ہوا تھا؟'' میرے منھ سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔ابھی تک مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ پلوشہ کہاں اور کس حال میں ہے۔میں کچھ دیر مزید خود کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

میری بات سن کر سردار کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔میری نظریں زمین پر گڑی تھیں۔اور دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ سردار کے منھ سے کوئی تسلی آمیز بات نکل جائے۔وہ کہہ دے کہ بس یار بڑی مشکل سے ہم دونوں

کی جان بچی ہے۔یا ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔اس طرح کی کوئی بات سننے کے لیے میرا پورا وجود ہمہ تن گوش ہو چکا تھا۔

سردار کی خاموشی طول پکڑنے لگی۔میں نے بھی اسے بولنے پر نہیں اکسایا تھا بس انتظار کی اذیت کو برداشت کرتا رہا۔

"وہ بہت پرعزم تھی۔اس مکمل یقین تھا کہ وہ اپنے راجو کی بے گناہی کے ثبوت ضرور حاصل کرلے گی۔کہتی تھی۔"سردار بھائی، جان دے دوں گی مگر ثبوت حاصل کیے بغیر نہیں لوٹوں گی۔"

نصراللہ خان خوجل خیل کے گھر سے ہمیں تمھارے رکھوائے ہوئے ہتھیار مل گئے تھے۔کمانڈر نصراللہ نے افغانستان کے رستے کی طرف ہماری رہنمائی کردی تھی انگور اڈے سے ہم سرحد تک پہنچے مگر پھر اس کا ارادہ تبدیل ہوگیا۔کہنے لگی کہ افغانستان جاکر ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے کسی دہشت گرد کے گروپ میں شامل ہوکر وہاں پہنچیں۔اس طرح البرٹ بروک وغیرہ کو ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔اسے سب سے زیادہ امید جینیفر کے ملنے کی تھی۔اسے یقین تھا کہ جینی اس کی ضرور مدد کرتی۔سرحد کے قریب جاکر ہم واپس پلٹ آئے تھے۔اپنی شکل چھپانے کے لیے اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں اور داڑھی چہرے پر چپکا کر سر پر پگڑی لپیٹ لی تھی۔میں نے بال کٹوانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگی۔

"بھائی، کیوں اپنے دوست سے پٹوانا چاہتے ہیں۔راجو نے منع کر دیا ہوا ہے اور آپ جانتے ہیں نا کہ ان کی کسی بات کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

میرا چہرہ چونکہ دہشت گردوں کے لیے نیا تھا اس لیے میں نے حلیہ تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اس کا منصوبہ شمالی وزیرستان میں دیگان کے ملک گل بدین کے پاس جاکر کام حاصل کرنے کا تھا۔کیوں کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ملک گل بدین بھی امریکنز کا خاص بندہ تھا۔اس نے ماموں کے گھر جاکر اپنے دودھ شریک بھائی کے بارے معلومات حاصل کیں کیونکہ اسی کے ذریعے ہم دہشت گردوں میں جگہ بنا سکتے تھے۔معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی دن پہلے تورے خار روانہ ہوا ہے۔سنائپر رائفل اس کے ماموں کے گھر چھوڑ کر، ہم نے بھی ویگن میں بیٹھ کر تورے خار کا رخ کیا۔وہ رائفل ہم دہشت گردوں میں جگہ بنانے کے بعد وہاں سے بآسانی لے جاسکتے تھے۔

تورے خار کا ملک فیروزاب صنوبر خان کے بعد دہشت گردوں کا کرتا دھرتا ہے،لیکن جنوبی وزیرستان میں پلوشہ اور آپ نے بہت کام کیا تھا اس لیے حلیہ تبدیل کرنے کے باوجود وہ ملک فیروز کے پاس کام حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی۔البتہ اس کی بیٹھک میں ایک بار جا کر اپنے بھائی کا پتا معلوم کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ہم دونوں دوپہر کے وقت تورے خار پہنچے تھے۔لیکن اس کی بیٹھک میں گھستے ہی عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔اسے ایک انوکھا اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ تورے خار کے سردار فیروز خان کے ہمراہ راج پال بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا۔وہی ہندو راج پال جس نے اپنے ساتھ امریکہ میں سنائپر کورس کیا تھا۔جب تک میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔پہچانتے ساتھ ہی اس نے فیروز خان سے پوچھا کہ پاکستان آرمی کا جوان اس کی بیٹھک میں کیا کرنے آیا ہے۔

اس کی بات سنتے ہی فیروز خان چونک کر میری طرف متوجہ ہوا اور تب تک میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔وہاں گرفتاری دینے کا مطلب خود کو ذبح کرانا ہوتا۔پلوشہ کو بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔میں نے فوراً کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتار کر سیفٹی لیور برسٹ پر لگاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔میرا نشانہ راج پال ہی تھا مرنے سے پہلے کم از کم ایک دشمن سے تو جان چھوٹ جاتی۔راج پال چھاتی میں گولی کھا کر تڑپنے لگ گیا تھا۔فیروز خان کے آدمی ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گئے تھے۔اس وقت پلوشہ نے مجھے باہر کی طرف کھینچا اور ہم بھاگ کر بیٹھک سے باہر نکل آئے پیدل بھاگ کر جان بچانا ناممکن تھا اور خوش قسمتی سے وہاں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔پلوشہ نے فوراً ایک ڈبل کیبن کا شیشہ توڑا اور اندر گھس کر اگنیشن کے تار توڑ کر گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔اس دوران میں نے بیٹھک کے دروازے سے برآمد ہونے والے دو تین دہشت گردوں کا اپنا شکار بنا چکا تھا۔باقی دروازے کی آڑ ہی سے فائرنگ کا جواب دینے لگے۔پلوشہ نے ڈبل کیبن سٹارٹ کرتے ہی میرے لیے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور میرے بیٹھتے ہی گاڑی بھگا دی۔اس ڈبل کیبن کے ساتھ کھڑی ہوئی دو گاڑیوں کے ٹائر پھاڑ کر میں نے وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔مگران کے پاس بیٹھک میں اور گاڑیاں موجود تھیں۔دشمن کی تین گاڑیاں ہمارے تعاقب میں تھیں۔پلوشہ بڑی مہارت سے گاڑی بھگائے جا رہی تھی۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ ہم کسی قابل خان محسود کے پاس وشلام جا رہے ہیں۔تینوں گاڑیاں

پوری کوشش کے باوجود ہمارے قریب نہیں پہنچ پائی تھیں۔ وہ بلاشک وشبہ ایک بہترین ڈرائیور تھی۔ لیکن پھر ہماری بدقسمتی کا ظہور ہوا۔ اس وقت ہم وشلام کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے اور بالکل ٹھیک جارہے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک چھوٹا بچہ اچانک ہی ہماری گاڑی کے سامنے آیا، پلوشہ نے اسٹیرنگ کو بائیں جانب کاٹا، گاڑی کچی سڑک کے کنارے ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی اور لڑھکیاں کھاتے ہوئے نشیب میں گرنے لگی۔ میرے دماغ میں جو آخری احساس زندہ ہے وہ یہی ہے کہ میں نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے بعد میری آنکھ ہسپتال میں کھلی تھی۔ میرے سر پر گہری چوٹ لگی تھی اور مجھے قریباً مہینے بعد ہوش آیا تھا۔ میں پشاور کے ایک اچھے ہسپتال میں داخل تھا۔ مجھے وہاں لے کر آنے والا قابل خان محسود تھا۔ وہ پلوشہ کا منہ بولا بھائی تھا۔ اسی کی زبانی مجھے باقی کے واقعات معلوم ہوئے۔ حادثہ ہوتے ہی وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ دشمن شاید ہماری موت کی تسلی کر کے ہی وہاں سے ہٹتے مگر میری خوش قسمتی کہہ لو کہ وشلام کے لوگوں نے پلوشہ کو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔ وہ حادثے کے بعد بھی ہوش میں تھی۔ وہ سب سے پہلے ہمیں وانہ لے گئے مگر وہاں کوئی خاص ہسپتال تو موجود نہیں ہے اس لیے ایمبولینس کروا کر بنوں اور پھر وہاں سے صاف جواب ملنے پر پشاور لے آئے تھے۔ وہ حادثے کے ہفتہ بعد تک زندہ رہی اور پھر.........'' سردار نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی اور گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''اس نے قابل خان کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بہن سپوگمائے کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہے۔ ہوش میں آتے ہی مجھے قابل خان نے ساری بات تفصیل سے بتلائی۔ اس نے شناختی کارڈ کے ذریعے میرے گھر والوں کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی مگر میری جیب میں تو نقلی شناختی کارڈ تھا اس لیے اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ پلوشہ بھی حادثے کے بعد تھوڑی دیر تو ہوش میں تھی لیکن اس کے بعد وہ مسلسل بے ہوش رہی تھی۔ بس ہمیں چھوڑنے کے فیصلے پر عمل کرتے وقت اسے چند لمحوں کے لیے ہوش آیا اور قابل خان کے سامنے اپنے دفن کی وصیت کر کے وہ چلی گئی۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی اورنگ زیب صاحب سے بات کی وہ میرے واپس نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھے۔ اس کے حکم پر مجھے فوراً ہی سی ایم ایچ پشاور میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے قابل خان کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کیا۔ میری ٹانگ وغیرہ پر تو سول ہسپتال والوں نے پلستر چڑھا دیا تھا۔ سی ایم ایچ والوں نے مجھے چند دن رکھ کر سک لیو (فوج میں کسی بڑی بیماری یا حادثے وغیرہ کا شکار

ہونے والے شخص کو ملنے والی چھٹی) پر گھر بھیج دیا۔ اور تب سے میں یہیں ہوں۔"

سردار کی بات ختم ہو چکی تھی۔ میں کہیں دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔ نہ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ دماغ کسی سوچ پر مرتکز، جانے میں کیا سوچ رہا تھا۔

"راجے!" سردار نے مجھے آواز دی۔

میں نے غائب دماغی سے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"راجے وہ چلی گئی ہے یار، میری چنارے کی طرح تمھاری پلوشہ بھی چلی گئی ہے۔ پتا نہیں یہ عورتیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔ جب انھیں پتا چل جاتا ہے کہ ان کے بغیر شوہر کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا تو اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔"

میں کچھ نہیں بولا تھا۔ سردار بتانے لگا......"اس نے اپنی موت کی خبر ماں اور آپ کے گھر والوں تک پہنچانے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ سب سے پہلے اس کی موت کی بابت تمھیں اطلاع دی جائے اور پھر باقی تمام کو آپ خود ہی بتا دیں گے۔ جب قابل خان محسود نے تمھارا پتا کرایا تو اسے معلوم ہوا کہ تم دو تین دن پہلے ہی افغانستان چلے گئے ہو۔ وہ تمھارے گھر جا کر پلوشہ کی ماں کو ملا تھا۔ بہانہ اس نے یہ بنایا تھا کہ پلوشہ اس کے پاس تھوڑا سامان چھوڑ کر آگے افغانستان چلی گئی ہے۔ تبھی پلوشہ کی ماں نے اسے تمھارے افغانستان جانے کے بارے بتا دیا۔ اس کے بعد اسے تو ہمت نہ ہوئی تمھارے گھر والوں کو اطلاع دینے کی اور نہ مجھے ہمت ہوئی۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو وہ کب کی دفن ہو چکی تھی۔"

میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا تھا۔ میرے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ ایک دفعہ پہلے بھی وہ مجھے چھوڑ چکی تھی اور اب دوبارہ اس نے وہی کیا تھا۔ پہلے بھی وہ اپنی ماں اور بھائی کی وجہ سے مجبور تھی اور اب اس کے پاس مہلت ختم ہو چکی تھی۔

مجھے مسلسل چپ دیکھ کر سردار خان نے کہا۔ "یار کچھ تو بولو خاموش کیوں ہو؟"

لیکن میرے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار کو کیا کہوں، گلہ کروں یا تسلی دوں۔ کوسوں یا نظر انداز کر دوں۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن انسان کو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کوئی ہدف تو

چاہیے ہوتا ہے۔اپنے نقصان کا ذمہ دار کسی کو تو ٹھہرانا ہوتا ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے،لیکن دل و دماغ تو موت سے بچنے کے کئی بہانے تراشتے ہیں،اگر یوں نہ کیا ہوتا تو یوں ہو جاتا اور وہاں نہ گیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔یہ کر لیا ہوتا تو جان بچ سکتی تھی وغیرہ۔حالانکہ یہ سب بس پچھتاوے کو بڑھانے والی باتیں ہیں۔

''میں بے قصور ہوں راجا۔میں بے بس ہو گیا تھا،میں اسے کبھی مرنے نہ دیتا دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا جاتا مگر افسوس عزرائیلؑ سے تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

میں چپ چاپ اٹھ کر بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔سردار نے مجھے پکار کر روکنے کی کوشش کی مگر میں دروازے سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔اس کے بیٹھک کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے میں کار آگے بڑھا چکا تھا۔اور پھر مجھے معلوم نہ ہوا کہ کیسے میں بغیر کسی حادثے کے گھر تک پہنچا تھا۔منتشر سوچیں،بکھرے خیال ،اذیت بھرے احساسات،آنکھوں سے بہتا پانی اور درد و غم سے بوجھل دل کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔گھر کا دروازہ بند تھا دستک کے جواب میں ابو جان نے دروازہ کھولا تھا اور ان کی شفقت بھری آغوش میں سر چھپاتے ہی میرے بند ہونٹوں سے درد بھری سسکیاں برآمد ہوئیں۔ابو جان گھبرا گئے تھے۔

''کیا ہوا بیٹا۔''ابو جان کی آواز میں چھپے اندیشے غیر متوقع نہیں تھے۔

''وہ چلی گئی ہے ابو جان،وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔اس کے ساتھ نبھانے کے سارے وعدے اور قسمیں جھوٹی تھیں۔تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔''

ابو جان نے مجھے زور سے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے پوچھا۔''کہاں چلی گئی ہے،بیٹا کس کے ساتھ گئی ہے؟''

میں نے اذیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔''اکیلی ہی گئی ہے ابو جان،ایسی جگہ جہاں سے کوئی لوٹا نہیں کرتا۔''

ہم دروازے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔موسم ایسا تھا کہ گھر والوں نے چار پائیاں صحن میں بچھائی ہوئی تھیں۔ابو جان مجھے ساتھ لپٹائے ہوئے چار پائیوں کی طرف بڑھ گئے۔اگلے دو تین لمحوں میں پلوشہ کی ماں اور پھوپھو جان کو پلوشہ کی موت کے بارے معلوم ہو چکا تھا۔پھوپھو جان دھاڑیں مارتی ہوئی مجھ سے آن لپٹی تھی ۔آن کی آن میں تمام ماحول ماتم زدہ ہو گیا تھا۔صرف پلوشہ کا معصوم بھائی عدیل بے خبر پڑا سو رہا تھا۔اس کے

علاوہ رات بھر کوئی بھی نہیں سویا تھا۔میں گھٹنوں پر سر ٹیکے بند آنکھوں سے اس کے ساتھ گزرے لمحات کو فلم کی طرح دیکھتا رہا۔کوئی پل بھی تو مجھے نہیں بھولا تھا۔جس وقت وہ پہلی بار میرے سامنے آئی اور جب میں نے آخری بار اسے گلے سے لگاتے ہوئے اس کی کشادہ جبیں پر آخری بار مہر محبت ثبت کی۔ان لمحات کے درمیان میں موجود ہر لمحہ، ہر پل اور ہر گھڑی میری یاداشت میں محفوظ تھی۔اس کے پیارے ہاتھوں نے میرے جسم کو جس جس جگہ پر چھوا تھا اس لمس کی گرمی اب تک تازہ تھی۔اس کے سانسوں کی مہکتی خوشبو اس وقت بھی میری قوت شامہ محسوس کر سکتی تھی۔اس کی مدھر آواز میری سماعتوں میں زندہ تھی۔اس کا چاند سا روشن مکھڑا میری بصارتوں کے سامنے تھا۔اس کی شوخیاں، شرارتیں، محبت بھرے گلے شکوے، ناز وادا کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔اور بھول بھی کیسے سکتا تھا ،کوئی سانس لینا بھی بھول سکتا ہے کیا......

میں ایک پل بھی جو بھولوں تجھے تو مر جاؤں
تمھاری یاد کا پہرہ ہے میرے سانسوں پر

صبح کی اذان سن کر ابوجان نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’نماز پڑھ لو بیٹا۔‘‘اور میں خاموشی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔وضو کر کے ہم مسجد کی طرف بڑھ گئے تھے۔واپسی پر عدیل جاگ گیا تھا۔مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے چہکتا ہوا میرے ساتھ لپٹ گیا تھا۔وہ پلوشہ کو بہت پیارا تھا۔اس کے سرخ وسفید ملائم گالوں کو پلوشہ کے حیات آفریں لبوں سے اتصال کی سعادت ہزاروں بار حاصل ہو چکی تھی۔میں بے ساختہ اسے چومنے لگا۔اس معصوم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر پر کیا قیامت بیت چکی تھی ۔اس نے چھوٹتے ہی اپنی باجی کا پوچھا تھا۔میں اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

’’میرا بیٹا اسکول جاتا ہے یا نہیں۔‘‘

’’ہاں لالاجان ،اسکول تو جاتا ہوں اور اب مجھے پنجابی میں بات کرنا بھی آ گیا ہے۔‘‘اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

’’تو کس کلاس میں ہو۔‘‘میں اس کا ذہن بٹانے کے لیے مسلسل سوال کرنے لگا تا کہ اسے سوال کا موقع نہ ملے۔اسی دوران پھوپھو جان اس کے لیے ناشتا لے آئی تھی۔پلوشہ کی ماں گھٹنوں میں سر دیے گم سم بیٹھی تھی

۔پلوشہ اس کی بیٹی نہیں بیٹا تھی۔وہ بہت، ہمت، جرات اور حوصلے والی تھی۔اس نے ہمیشہ ماں اور چھوٹے بھائی کی حفاظت کی تھی۔اور اب وہ نہیں رہی تھی یقیناً مستقبل کے اندیشے بھی اس کے ذہن میں موجود ہونا تھے کہ پلوشہ کے جانے کے بعد اس کا ہمارے گھر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔یہ اور بات کہ میں انھیں کسی صورت گھر سے دور جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔پلوشہ اپنے چھوٹے بھائی کو اعلا تعلیم دلانے کی خواہش مند تھی اور اس کی یہ خواہش میں ہر صورت میں پوری کرنا چاہتا تھا۔

پھوپھو جان سے ناشتا لے کر میں عدیل کو ناشتا کرانے لگا۔اس نے ایک بار پھر اپنی باجی کے بارے میں پوچھا، جسے میں آئیں بائیں میں ٹال گیا۔اسے تیار کرا کے میں نے اسکول بھیج دیا۔دوپہر تک پلوشہ کی موت کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی تھی۔مرد بیٹھک میں آ کر تعزیت کرنے لگے جبکہ عورتوں کی آمد سے ہمارا صحن بھر گیا تھا ۔میں کمرے میں گھسا رہا۔یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں نے اسے آخری بار گلے لگایا تھا۔اس وقت وہ دلھن کے روپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔اس کی ریشمی کلائیوں میں کنگن پہنا کر میں نے اسے تسلی دی تھی۔وہ میرے ساتھ چلنے پر بہ ضد تھی۔

میں نے حسرت بھرے لہجے میں سوچا۔”میں اسے ساتھ لے گیا ہوتا تو شاید وہ بچ جاتی۔“

حجلہ عروسی کو پھوپھو جان نے خوب سجایا تھا۔اور اب تک وہ سجاوٹ اسی طرح موجود تھی۔میرے جانے کے بعد پلوشہ نے گھر میں چند دن سے زیادہ نہیں گزارے تھے۔اس کے باوجود وہ بیڈ اس کے بدن کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔سہ پہر کو اویس اپنی بیوی ارم کے ساتھ میرے کمرے میں آ گیا۔میاں بیوی نے دکھی دل کے ساتھ تعزیت کی، مجھے حوصلہ دیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر ہمدردی بھرے کلمات سے مجھے تسلی دے کر رخصت ہو گئے۔

☆......☆......☆

غم جتنا بھی بڑا ہو، سدا نہیں رہتا، دکھ کتنا ہی زیادہ ہو وقت کی گرد اسے اپنی لپیٹ میں لے کر بھولا بسرا کر دیتی ہے۔اذیت کی انتہا اگر وقت بیتنے کے ساتھ راحت میں نہیں بھی ڈھلتی تب بھی اذیت میں پہلے جتنا دم خم باقی نہیں رہتا۔بچھڑنے والا جتنا بھی پیارا ہو اس کے دور جانے کی حقیقت کو تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو بھی پلوشہ کی جدائی کا دکھ جھیلنے کی عادت ہو گئی تھی۔میری چھٹی پوری ہو گئی تھی مگر میں واپس جانے پر تیار

نہیں تھا۔راؤ تصور صاحب نے کمانڈنگ آفیسر سے بات کر کے مجھے یونٹ کی طرف سے دو ماہ کی مزید چھٹی دلوا دی تھی ۔دوست احباب مجھے ملنے اور تسلی دینے آئے تھے۔اورنگ زیب صاحب نے بھی آ کر تعزیت کی تھی ۔واپس جاتے ہوئے میں نے کار کی چابی شکریے کے ساتھ ان کے حوالے کر دی تھی۔

ایک دن پلوشہ کی ماں گل ناز مجھ سے واپس جانے کی اجازت مانگ رہی تھی۔

''بیٹا، میں چاہتی ہوں اپنے بھائی کے پاس انگور اڈے پر چلی جاؤں۔''

میں نے پوچھا۔''یہاں کوئی تکلیف ہے ماں جی؟''

وہ دکھی لہجے میں بولی۔''تکلیف تو کوئی نہیں ہے بیٹا، مگر اب ہم کس رشتے سے یہاں رہیں گے۔''

میں زخمی لہجے میں بولا۔''تو آپ کا کیا خیال ہے اس بے وفا کے جانے سے ہمارے سارے رشتے ٹوٹ گئے ماں جی۔''

''پھر بھی بیٹا......؟''انھوں نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولنا چاہا میں فوراً قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔

''ماں جی، آج کے بعد اگر کچھ ایسا کہا تو سچ میں خفا ہو جاؤں گا۔اور آپ یقیناً نہیں جانتیں کہ ہم دونوں بہت پہلے شادی کر چکے تھے۔بعد والی شادی تو بس آپ، ابوجان اور پھوپھو جان کی خاطر کر رہے تھے۔اور پتا ہے اس نے اپنے علاقے کے رواج کے مطابق کتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔''پلوشہ کی بات ذہن میں آتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔''پورے پچاس لاکھ۔اور وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔اس کی ساری رقم آپ کی اور عدیل ہی کی تو ہے۔اور یہ رقم آپ کی ضروریات کے لیے کافی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔وہ عدیل کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی۔کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں عدیل کو واپس انگور اڈے بھیج کر اس کی روح کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں۔''

''بیٹا میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''ان کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔

ان کا ہاتھ پکڑ کر میں لبوں سے لگاتا ہوا بولا۔''آپ پلوشے کی ماں ہیں اور اس کی ہر چیز سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی اس سے تھی۔آپ میری بھی ماں ہیں۔کبھی دل میں ایسی ویسی بات کو جگہ نہ دینا۔اس گھر پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا یا ابوجان کا ہے۔یہ پلوشہ کا گھر ہے۔وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے میں نے اسے نہیں

چھوڑا۔‘‘

’’جیتے رہو بیٹا۔‘‘اس نے دستِ شفقت میرے سر پر رکھ دیا تھا۔

یہ مقدس ہاتھ جانے کتنی بار انھوں نے میری پلوشے کے سر پر بھی رکھا ہوگا۔سکون اوراطمینان میرے رگ و پے میں اتر گیا تھا۔میں ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔’’یہ شفقت بھرا ہاتھ کبھی بھی میرے سر سے نہ ہٹانا ماں جی۔‘‘

☆......☆......☆

فوجی کی عام دنوں کی چھٹی پر لگا کر گزرتی ہے۔مگراب پلوشہ کی جدائی میں میرا ہر دن صدیوں کی مسافت پر مشتمل ہوگیا تھااس کے باوجود چھٹی کے تین ماہ بیت چکے تھے۔میں واپس یونٹ پہنچا۔دوست احباب ایک بار پھرتسلی دینے اور حوصلہ بڑھانے میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔سردار بھی یونٹ واپس پہنچ گیا تھا۔ایک بار وہ میرے گھر بھی آچکا تھالیکن نا معلوم کیوں میں نے اس سے بات چیت کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔وہ کئی بار اپنے ناکردہ جرم کی معافی مانگ چکا تھا،مگر میں خاموش رہ کراس کی ہر کوشش کونظرانداز کردیتا تھا۔اس کی ٹانگ کا پلستر اتر چکا تھالیکن ابھی تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوسکا تھا۔یونٹ واپسی کے دوتین دنوں تک مجھے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ایک رات مجھے حکم ملا کہ اگلے دن میری کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیشگی ہے۔

صبح نو بجے میں کمانڈنگ آفیسر کے دفتر میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے سب سے پہلے پلوشہ کی موت کی تعزیت کی اوراس کے بعد بتایا کہ چونکہ انھیں ہائی کمانڈ کی طرف سے سختی سے مجھے سزا سنانے کا حکم ملا تھااس وجہ سے انھوں نے میرا حوالداری کا رینک توڑ کر مجھے دوبارہ سپاہی بنا دیا تھا۔مجھے نہ تو رینک کا شوق تھااور نہ میں مزید نوکری کرنا چاہتا تھا۔اس لیے میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

’’سر،میں ڈسچارج ہونا چاہتا ہوں۔کیوں کہ اب میں خود کو مزید پاک آرمی کی خدمت کے قابل نہیں سمجھتا۔‘‘

’’شاید تم رینک ٹوٹنے کی وجہ سے دل گرفتہ ہو۔‘‘انھوں نے خیال ظاہر کیا۔’’اگرایسا ہے تو فکر نہ کرو ایک سال کے اندر میں تمھیں دوبارہ حوالدار بنادوں گا۔لیکن فی الحال تمھارا رینک توڑنا ضروری تھا کیوں کہ نادانستگی

ہی میں سہی تم آرمی کا قانون توڑنے کے مجرم ہو۔"

"نہ تو مجھے اپنے جرم سے انکار ہے اور نہ میں مجھے رینک ہی کا شوق ہے۔ بس اب میں خود کو نوکری کرنے کے قابل نہیں سمجھتا اس لیے بہتر ہوگا کہ مجھے باعزت ڈسچارج کر دیا جائے۔" میں نوکری چھوڑنے پر مصر تھا۔

"جاؤ، فی الحال آرام کرو اور جتنی چھٹی کی ضرورت ہو لے لو۔ اس بارے بعد میں بات کریں گے۔" انھوں نے میری خواہش پر ذرا بھر دلچسپی کا اظہار کیے بغیر مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں سیلوٹ کر کے ان کے دفتر سے نکل آیا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ہی استاد راؤ تصور صاحب، استاد فیاض، استاد بدرالدین اعوان، استاد اشفاق تنولی اور میرے دوسرے استادوں نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ تمام نے کھل کر میرے فیصلے کو رد کیا۔ اور بجائے منت کے یہ حکم دیا کہ اگر میں نے ڈسچارج ہونے کی باقاعدہ درخواست دی تو وہ درخواست فوج سے ڈسچارج ہونے کی نہیں ان سے تعلق توڑنے کی درخواست ہوگی۔ اپنے ان استادوں سے میرا تعلق ایسا نہیں تھا کہ میں ان کا حکم ٹال سکتا۔ انھیں مجھ پر کوئی مان تھا تو انھوں نے منت کے بجائے دھونس دھمکی سے کام لیا تھا۔ میں نے ان کے حکم کے آگے خاموشی سے سر جھکا دیا تھا۔

شام کو حوالدار میجر نے مہینا چھٹی کی راہداری میرے حوالے کی۔ جو میں نے شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دی تھی۔ گھر جا کر میں پلوشہ کی یادوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جبکہ وہاں تمام دن اور رات کا بیشتر حصہ دوست احباب کی معیت میں گزرتا تھا اس لیے دشمن جاں کی یادوں سے کچھ افاقہ رہتا۔ ورنہ تو وہ ہر لحہ میرے پاس ہی موجود رہتی۔ اسے ہمیشہ مجھ سے بچھڑنے کا خوف ستاتا رہتا تھا۔ مجھ سے دور جانے کے خیال سے وہ اکثر رات کو اٹھ کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ اور اس وقت ساتھ نبھانے کی ساری قسمیں اور وعدے مجھے دہرانا پڑتے۔ یوں گویا اسے میں نے ہی چھوڑ کر جانا ہے وہ کبھی ایسا کام نہیں کرے گی۔ اور جب وقت آیا تو خود ہی سارے وعدے اور قسموں کو پاؤں کی ٹھوکر میں اڑا کر اتنی دور چلی گئی جہاں تک میری سوچ کی رسائی بھی ممکن نہیں تھی۔ ایک بار اس نے میری گود میں سر رکھ کر ایک نظم گنگنائی تھی۔ اس کی مدھر آواز میں سنائی ہوئی نظم مجھے آج بھی ایسے ہی یاد تھی جیسے گھڑی بھر پہلے کی بات ہو......

اگر کبھی میری یاد آئے

تو چاند راتوں کی نرم رنگین روشنی میں،

کسی ستارے کو دیکھ لینا

اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر تمہارے قدموں میں آ گرے تو

یہ جان لینا وہ میرا دل تھا

اگر نہ آئے؟

مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے

کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو اور اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے

وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے

گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا

میں جنبشوں میں تمھیں ملوں گی

تم اوس قطرے کے آنسوؤں میں تلاش کرنا

میں وسعتوں میں تمھیں ملوں گی

اگر اوس قطرے کے آنسوؤں میں نہ پاؤ مجھ کو

تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا

کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا

ہر اک پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکی ہوں

تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی راکھ دریا میں ڈال دینا

میں، سمندروں میں سفر کروں گی

کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رک کے تم کو صدائیں دوں گی

سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اترنا۔

نہ جانے وہ کس جزیرے پر رک کر مجھے صدائیں دے رہی تھی کہ اس کی صدائیں میری سماعتوں تک ہی نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

تربیتی مشقیں فوج کی روزمرہ ہے۔ ذہن بٹانے کے لیے میں بھی تربیتی مشقوں میں حصہ لینے لگا تھا۔ نئے سنائپرز کو تربیت دے کر میں گویا استاد کے درجے پر ترقی پا گیا تھا۔ میرے عملی تجربات ایسے تھے کہ استاد تصور بھی مجھ سے مشورہ لے کر میری عزت افزائی کرتے رہتے۔ دن بھر کی سخت تربیتی مشقوں کے بعد رات کو اچھی خاصی نیند آتی۔ البتہ کبھی کبھار پلوشہ میرے خوابوں کو رونق بخشنے آجاتی۔ ایک رات وہ میرے خواب میں آئی تو خفا خفا سی تھی۔

کیا ہوا چندا؟" اس کی ناراضی بھری نگاہوں کی تاب لانا میرے لیے کہاں ممکن تھا۔

"آپ میرے سردار بھائی سے خفا کیوں ہیں؟"

"تمھیں نہیں معلوم۔"

"اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"اگر اس نے تمھیں گھر واپس بھیج دیا ہوتا اور اکیلا میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے جاتا تو کبھی بھی یہ حادثہ پیش نہ آتا۔"

اس نے منھ بنایا۔ "آپ کے خیال میں میں نے ان کی بات فوراً مان جانی تھی ہے نا......اور یہ آپ کو کس نے کہا انھوں نے مجھے واپس بھیجنے کی کوشش نہیں کی۔"

"مگر......"

"چھوڑیں اگر مگر کو اور ابھی اٹھ کر ان سے خفگی دور کریں۔" اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی تھی ۔کمرے میں چلنے والے پنکھے اور ائیر کولر اگست کی گرمی سے لڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ میں نے اٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی سردار کی چارپائی مجھ سے تین چار پائیوں کے فاصلے پر پڑی تھی۔ کروٹوں کا تسلسل اس کے جاگنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ ہاتھ والا پنکھا تکیے کے نیچے سے نکال کر میں اس کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا

۔دیوار سے ٹنگی گھڑی رات کے دو بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔اس کی چار پائی کے سامنے رکتے ہوئے میں دھیمے لہجے میں بولا۔"اگر نیند نہیں آ رہی تو باہر چلتے ہیں۔"

میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ ہی رہا تھا۔فوراً اٹھ بیٹھا۔پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔"اچھا مشورہ ہے۔"

ہم دونوں لان میں لگے سنگی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔سردار میرے ماضی کے رویے کا ذکر کیے بغیر یوں گپ شپ کرنے لگا جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"تمھارا بھتیجا سلطان بہت شرارتی ہو گیا ہے یار!......اور اب اسے نئی ماں کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اس دن تم لی زونا بہن کے بارے کچھ کہہ رہے تھے۔"

اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔"پرسوں آ رہی ہے،میں بھی کل چھٹی لے کر جا رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔"شادی کے بارے کیا سوچا ہے؟"

وہ ہنسا۔"دس دنوں کی چھٹی جا رہا ہوں،کوشش یہی ہو گی کہ کوئی دن ضائع نہ جائے۔"

"کیوں ائیر پورٹ پر نکاح خواں کو بھی ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"نہیں وہ گھر میں بیٹھ کر ہمارے آنے کا انتظار کریں گے۔"

میں نے کہا۔"اس کا مطلب مجھے بھی اپنی چھٹی کا بتا دینا چاہیے۔"

وہ اطمینان سے بولا۔"میں بتا چکا ہوں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔"کب؟"

"آج ہی حوالدار میجر کو بتایا ہے۔کیوں کہ میں جانتا تھا کہ لی زونا کی آمد کا سن کر تم ضرور میرے ساتھ چلو گے۔"

"صحیح کہا۔"میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ہم گھنٹا ڈیڑھ وہیں بیٹھے گپیں ہانکتے رہے۔اور پھر مچھروں کی مسلسل یلغار سے تنگ آ کر وہ بارک میں گھس گیا۔جبکہ میں وہیں بیٹھا رہا۔سردار خان ایک مخلص دوست تھا

۔اس نے میرے پچھلے دنوں کے رویے کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک میرے دماغ میں جینی کا خیال ابھرا۔ میں نے کلائی سے بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی صبح کے چار بج رہے تھے۔ گویا ان کے پاس شام کے چھے سات بجے کا وقت ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ نیویارک کا وقت ہم سے قریباً نو گھنٹے پیچھے ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی یادداشت کھنگالی ذرا سی کوشش سے اس کا نمبر مجھے یاد ہو گیا تھا۔ موبائل فون نکال کر میں اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد کال وصول کر لی گئی تھی۔ میں نے اس کی حیرانی بھری۔ ''ہیلو۔'' کے جواب میں پوچھا۔

''جینی کیسی ہو؟''

''زی......'' اس نے مجھے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ ''شکر ہے تمھیں میری یاد بھی آ گئی۔ جانے کب سے تمھاری کال کا انتظار کر رہی ہوں۔ تمھیں اپنی شادی پر بلانا تھا مگر تمھاری کال ہی نہ آئی مجبوراً مجھے تمھارے بغیر ہی شادی کرنا پڑی۔ مہینا ہو گیا ہے میری شادی کو۔'' وہ پر جوش لہجے میں بولتی گئی۔

میں نے اس کے نام کو مزید مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو جی!''

''شکریہ زی!......''

''اچھا کیسا ہے؟''

''بہت محبت کرتا ہے۔ اتنا خیال رکھتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ اس وقت بھی باورچی خانے میں گھسا رات کا کھانا بنا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو کہتا تھا کہ کسی ہم مذہب اور ہم تہذیب سے شادی کر لو مزے کرو گی۔''

''زی! میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ اور اتنا تو تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی تھی۔ اور سچ کہوں تو میری دلی تمنا اب بھی وہی ہے۔''

''اگر باورچی خانے میں کھانا بنانے والے شوہر صاحب نے تمھاری بے ہودہ بات سن لی تو دیگچہ تمھارے سر میں دے مارے گا۔''

''اسے میں تمھارے بارے سب کچھ بتا چکی ہوں وہ تمھاری اس آفت کی پرکالہ کی طرح نہیں ہے۔'' اس

نے پلوشہ کا ذکر کرتے ہوئے گویا میرے دل کے زخم کریدے۔ ”ویسے کیسی ہے اور کیا اسے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بات کر رہے ہو؟“

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”زی، کیا ہوا خیریت تو ہے نا؟“ نہ جانے کیسے اسے میری خاموشی سے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

”جینی!......وہ نہیں رہی۔“ یہ مشکل مختصر سا فقرہ میرے حلق سے برآمد ہوا۔

”کیا مطلب نہیں رہی۔“ وہ حیرانی سے چیخ پڑی تھی۔

”تمھیں بتایا تھا نا کہ وہ میری بے گناہی کے ثبوتوں کے حصول کے لیے مجھ سے پہلے نکلی تھی۔ بس اسی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اور جانتی ہو مرنے سے دو تین دن پہلے وہ تمھیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ تم اس کی مدد ضرور کرو گی۔“

”میں اس کی مدد ضرور کرتی زی، وہ بہت پیاری تھی۔ سچ کہوں تو مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا۔“ جینی کی آواز میں شامل دکھ مصنوعی نہیں تھا۔

”اچھا چھوڑو اس کے ذکر کو۔ کوئی اور بات کرو۔“

وہ خلوص بھرے لہجے میں بولی۔ ”زی اگر کہو تو میں تمھارے پاس آجاتی ہوں یا تمھیں امریکہ بلوا لیتی ہوں۔ اور یقیناً میں اب بھی اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہوں۔“

”جینی میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہو اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مجھے بھی تم اتنی ہی پیاری ہو۔ لیکن اپنے تعلق کے بارے میں تمھیں پہلے بھی تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔ تم ہمیشہ میری بہت اچھی دوست رہو گی ایسی دوست جسے میں بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔“

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ”زی، تم اس کے لیے بہت زیادہ روتے ہو نا؟“

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”نہیں، بس کبھی کبھی۔“

”اچھا یاد آیا تم نے بے چارے نک سٹیورٹ کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔“ اس نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا۔

''تم تک یہ بات پہنچ گئی تھی۔''

''جب اسے گولی لگنے کی بات مجھ تک پہنچی میں سمجھ گئی تھی کہ یہ زی کا کام ہے۔بعد میں لورا براؤن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اوراس نے تصدیق کر دی کہ نک سٹیورٹ، ایس ایس کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔وہ تم سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔جب اسے میرے اور تمھارے تعلق کے بارے معلوم ہوا تو کافی دیر تمھارے بارے گپ شپ کرتی رہی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔''ویسے اسے کس خوشی میں زندہ چھوڑ دیا تھا؟''

میں نے اجمالاً اسے زندہ چھوڑنے کی وجہ بیان کر دی۔

بہرحال وہ کسی اور خوش فہمی میں تھی۔''

میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔''ویسے دکھنے میں کیسی ہے؟''

وہ فوراً بولی۔''مجھ سے خوب صورت ہے۔''

میں اعتماد سے بولا۔''یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔''

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔''کیوں، مجھ سے کوئی لڑکی خوب صورت نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں۔''

''کیا پیلاوشہ بھی نہیں۔''

''اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔''میں نے ناراض لہجے میں اسے جھڑکا۔

وہ فوراً بولی۔''معافی چاہتی ہوں۔اور لورا کا فون نمبر میرے پاس موجود ہے اگر بات آگے بڑھانا ہو۔''یقیناً مزاحیہ انداز اپنا کر وہ پلوشہ کے دل فگار تذکرے کا کفارہ کرنا چاہ رہی تھی۔

میں اطمینان سے بولا۔''تمھارا فون نمبر میرے پاس موجود ہے۔اور میرا خیال ہے اس کے علاوہ مجھے کسی کے فون نمبر کی ضرورت نہیں۔''

''آئی لو یو زی!''

''می ٹو اور اب نماز کا وقت ہو گیا ہے، میرا یہ نمبر محفوظ کر لینا اس پر جب چاہو کال کر سکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے زی، گڈ بائی اپنا بہت بہت خیال کرنا اور ہو سکے تو تم بھی شادی کر لو یقیناً تمھیں سنبھلنے کے لیے

ایک عورت کی ضرورت ہے۔“

”اتنے قیمتی مشورے پر شکر گزار ہوں۔“ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اذان کافی دیر کی ہو چکی تھی۔ میں اٹھ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

لی زونا کے سر سے لپٹے ہوئے دوپٹے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سردار کی طرف سے پاکستان آنے کی دعوت ملتے ہی اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان دونوں کا ملاپ دیکھ کر جانے کیوں میرا دل غم سے بھر گیا تھا۔ سردار خان کو تو چنارے بیگم کا متبادل مل گیا تھا، کیا مجھے بھی پلوشہ جیسا کوئی مل پاتا۔ یہ سوچ آتے ہی میرے دماغ میں نیلی آنکھوں والی گلگارے کا خوب صورت چہرہ لہرایا۔ سر جھٹکتے ہوئے میں نے اس واہیات سوچ کو دماغ سے نکال دیا تھا۔ کہ پلوشہ کی جگہ کوئی لڑکی نہیں لے سکتی تھی۔ اور پھر گلگارے یقیناً کب کی کسی کی دلھن بن چکی ہو گی۔ اس نے اپنے آخری خط میں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہ مہینے کے اندر اندر شادی کر لے گی کیوں کہ وہ پلوشہ کو چھوٹی بہن سمجھتی تھی اور چھوٹی بہن کا گھر اجاڑنا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔

لی زونا کے سر پر ہاتھ رکھ کر میں نے اسے خوش آمدید کہا۔ ائرپورٹ سے ہم ٹیکسی کرا کر مردان روانہ ہو گئے۔ وہ رات میں اور سردار بیٹھک میں رہے تھے جبکہ لی زونا اس کی بڑی بہن کے ساتھ گھر میں تھی۔ اگلے دن دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ سہ پہر کو مجھے دلھن سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ سردار کی بہن نے اسے روایتی دلھن کی طرح اسے سجایا تھا۔ لی زونا کا معصوم چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک قیمتی ہار کا تحفہ اسے دیا۔

وہ پوچھنے لگی۔ ”ایک بات کہوں ذیشان بھائی۔“

”کہو۔“

”آپ پریشان ہیں یا مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔“

”میں واقعی پریشان ہوں میری بہن۔“ میں دکھی لہجے میں بولا۔ ”تھوڑے دن پہلے ہی میری بیوی کا حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔“ پلوشہ کو مرے ہوئے ساتھ آٹھ ماہ ہو گئے تھے لیکن یہ کل ہی کی بات لگتی تھی۔

''بہت افسوس ہوا بھائی۔'' وہ بھی دکھی ہوگئی تھی۔

''چھوڑو اس دل دکھانے والے موضوع کو۔'' میں ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ''اگر سردار کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو پریشان نہ ہونا تمھارا بھائی یہاں موجود ہے، فوراً ہی مجھے کال کرنا۔''

''جانتی ہوں بھائی! اور مجھے اپنے بھائی پر فخر ہے۔ البتہ سردار پر مجھے بھروسا ہے تو سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئی ہوں، ورنہ اتنا بڑا اقدم کوئی یونھی تو نہیں اٹھالیتا۔''

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ سردار ایک مخلص اور اچھا انسان تھا۔ اس کے ساتھ وہ لی زونا کو دل سے چاہتا تھا یقیناً ان کی شادی شدہ زندگی نہایت کامیاب ہوتی۔

''ویسے مریم بہت پیارا نام ہے۔ اور تمھارے ساتھ بہت جچتا ہے۔'' میں نے اس کے اسلامی نام کو سراہا۔

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ نام مجھے کلمہ پڑھانے والے مولوی صاحب نے رکھا ہے۔''

''اچھا چلتا ہوں، اللہ پاک آپ کے رشتے کو خوشیوں بھری طوالت دے۔ باقی گپ شپ بعد میں ہوتی رہے گی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں سردار سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ گو سردار نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میری موجودی میں وہ اپنی نئی نویلی دلھن کو پورا وقت نہ دے پاتا۔ وہاں مزید ٹھہر کر میں رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہاں سے میں نے صوابی کا رخ کیا تھا۔ رات کا کھانا میں استاد عمر دراز کے ساتھ کھا رہا تھا۔ باقی کی رات میں انھیں پلوشہ کی کہانی سناتا رہا۔ ان کے سامنے روتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''بیٹا!......تم پہلے آدمی تو نہیں ہو جس سے محبوب چھن گیا ہو۔ دنیا بھری پڑی ہے ایسوں سے البتہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ماضی میں جھانکنے کے بجائے مستقبل پر نظر رکھو۔ اور بہتر یہی ہوگا کہ شادی کرلو اگر کوئی عورت تمھیں پلوشہ کے دکھ سے نجات نہ بھی دے پائی تو اس سے ہونے والے بچے یقیناً یہ کام کرلیں گے۔ اور اس کی زندہ مثال خود میں ہوں۔ ایک موذی مرض نے مجھ سے بھی جینے کا سہارا چھین لیا تھا، مگر پھر امی جان کی کوشش سے وشمہ میری زندگی میں آئی، مجھے دو خوب صورت بچیوں کا تحفہ دیا اور سمیرا کے بچھڑنے کا دردناک غم نہ

ہونے کے برابر رہ گیا۔‘‘

میں صاف گوئی سے بولا۔’’فی الحال تو ہمت نہیں ہے استاد جی،البتہ کچھ عرصہ بعد کوشش کروں گا کہ آپ کے حکم پر عمل کر پاؤں۔‘‘ وہ ہنس کر خاموش ہو گئے تھے۔رات کافی بیت چکی تھی انھوں نے مجھے سونے کا مشورہ دیا اور چپ سادھ لی۔

پلوشہ کا متبادل کوئی لڑکی بھی نہیں ہو سکتی تھی البتہ گلگارے ایک ایسی لڑکی تھی جس سے شادی کرنے کا سوچا جا سکتا تھا،مگر وہ بہت پہلے اپنی شادی کا بتا چکی تھی۔جینیفر بھی ایک بہترین انتخاب تھا لیکن وہ بھی کسی اور کی بن چکی تھی اور جس سے اس نے شادی کی تھی وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔یوں کسی سے اس کی محبت چھیننا یقیناً خود غرضی اور بے حسی کی انتہا ہوتی۔بلکہ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ گلگارے نے بھی اپنے ہونے والے شوہر کے بارے یہی بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ان دونوں کے علاوہ بھی ایک لڑکی میری زندگی کا حصہ بن چکی تھی کشمیری چرواہن رومانہ جو میری زندگی میں آنے والی تمام لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت تھی۔گو پلوشہ مجھے بہت عزیز تھی اور بہت زیادہ پیاری بھی تھی لیکن یہ حقیقت جھٹلائے جانے کے قابل نہیں تھی کہ رومانہ،پلوشہ سے بھی زیادہ پرکشش اور خوب صورت تھی۔اور وہ میری زندگی میں پلوشہ سے پہلے آئی تھی۔یہ اور بات کہ جب وہ مجھے ملی تو اس سے چند ماہ پہلے ہی وہ کسی اور کی بن چکی تھی۔یہ الٹی سیدھی سوچیں نیند آنے تک میرے دماغ میں چکراتی رہیں۔اگلے دو دن میں نے استاد عمر دراز کے پاس ہی گزارے تھے۔وہاں سے میں گھر آ گیا اور بقیہ چھٹی عدیل کے ساتھ گزاری اسے بھی اپنی باجی کی موت کا علم ہو گیا تھا۔اس کے نین نقش پلوشہ سے بہت زیادہ ملتے تھے اس لیے وہ میرے دل کے بہت زیادہ قریب تھا۔میں اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ابو جان کو بھی وہ بہت زیادہ عزیز تھا۔ایک دن پھوپھو جان رات کے وقت میرے کمرے آئیں۔وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھیں۔چند منٹ دائیں بائیں کی گفتگو کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گئیں۔

’’بیٹا،ایک ضروری بات کرنا تھی۔‘‘

’’جی مجھے بھی کوئی ایسا ہی شک ہو رہا ہے پھوپھو جان!...... بہر حال حکم کریں۔‘‘میں ذہنی طور پر کسی انجان لڑکی کے رشتے کو ٹھکرانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"دیکھو بیٹا برا نہ منانا مگر سچ تو یہ ہے کہ محلے میں دبی زبان میں گلناز بہن کی یہاں موجودی پر باتیں ہو رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران رہ گیا تھا۔

"بیٹا، تم جانتے تو ہو کہ ہمارے معاشرے کی کیا ذہنیت ہے۔ گلنار بہن چھوٹی لڑکی نہیں ہے نا بھائی جان پر جوانی ٹوٹی پڑ رہی ہے لیکن باتیں کرنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا، کوئی اتنی گھٹیا بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن پھوپھو جان بھی تو جھوٹ نہیں کہہ سکتی تھیں۔ "پھوپھو جان کوئی کتنی ہی بکواس کیوں نہ کر لے، میں پلوشہ کی ماں کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بلکہ میں انھیں اپنی سگی ماں ہی کی طرح سمجھتا ہوں۔"

پھوپھو جان جھجکتے ہوئے بولیں۔ "جب سگی ماں جیسا سمجھتے ہو تو پھر سچ میں ماں بنا کیوں نہیں لیتے۔"

"مم...... مگر پھوپھو جان......" میں ہکلا کر خاموش ہو گیا تھا۔

"بیٹا، میں مولوی صاحب سے پوچھ چکی ہوں، کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ گلناز بہن کو بھی میں راضی کر چکی ہوں، صرف آپ کی مرضی باقی ہے۔"

"اور ابو جان۔"

"انھوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھیں کوئی اعتراض ہے۔"

میں ہنسا۔ "مطلب تمام کام مکمل ہے صرف میرا انتظار تھا۔"

"بیٹا، اس طرح گلناز بہن کے دل میں یہاں رہنے کے بارے جو جھجک ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی، معترضین کو بھی اپنی بکواس کا خاطر خواہ جواب مل جائے گا۔"

"پھوپھو جان، آپ نے نہایت خوشی کی خبر سنائی ہے، کل محلے کے چند بزرگوں کی موجودی میں یہ بابرکت کام کر لیتے ہیں۔"

پھوپھو جان میرا ماتھا چوم کر رخصت ہو گئیں۔ صبح نماز کے لیے جاتے ہوئے میں نے ابو جان کو شرارتی لہجے میں کہا۔

”ویسے آپ نے انھیں، میرا اماں جی کہنے کا بہت الٹ مطلب لیا ہے، بہر حال کوئی بات نہیں۔“

وہ باپ تھے کہاں ہار ماننے والے تھے، ترکی بہ ترکی بولے۔”تو کیا کروں، گھر میں ایک دلھن کی موجودی تو ضروری ہے نا، تم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا اب میں بھی نامرد بن جاؤں۔“

میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔”ویسے بہت بہت شکریہ ابو جان، امی جان کی کمی بہت سختی سے محسوس ہو رہی تھی۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔”صحیح کہا، لیکن اس سے زیادہ کمی بہو کی محسوس ہو رہی ہے۔“

”مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا سخت گناہ ہے۔“میں نے مسجد میں داخل ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”جب نکاح کی سنت مسجد میں ادا ہو سکتی ہے تو شادی کی بات میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔“

اس مرتبہ ان کی بات کا جواب دیے بغیر میں نے سنتوں کی نیت باندھ لی کہ جان چھڑانے کا اس سے آسان طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی دن عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب اور محلے کے چند معززین کی موجودی میں یہ بابرکت کام سر انجام پا گیا تھا۔ پلوشہ کی ماں کو میں پہلے بھی ماں کہتا تھا کہ ساس بھی ماں ہی کا درجہ رکھتی ہے لیکن اب تو وہ سچ میں میری ماں بن گئی تھیں۔ چھٹی کے بقیہ دنوں میں مجھے ابو جان اور امی جان کے چہروں پر چھائی آسودگی، اطمینان اور خوشی دیکھ کر دلی سکون ملا تھا۔ پلوشہ کی ماں اور بھائی کو میں نے صرف ماں اور بھائی سمجھا نہیں بلکہ بنا بھی لیا تھا۔ پلوشہ کی ماں پہلے بھی میری ضروریات کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی لیکن اس کے بعد تو ان کا رویہ سچ مچ امی جان کا سا ہو گیا تھا۔ نہ جانے میری پلوشے زندہ ہوتی تو اس شادی پر کتنا خوشی کا اظہار کرتی۔ یقیناً وہ ہلا گلا کیے بغیر نہ رہتی۔

سردار اور میری چھٹی اکٹھی ہی ختم ہوئی تھی۔ واپسی پر اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی جو کبھی میری ہوا کرتی تھی۔ ہر وقت لی زونا یعنی مریم کی باتیں ہیڈ فون اس کے کانوں سے کم ہی اترا کرتا تھا۔ مریم کے ساتھ مسلسل انگریزی بول کر اس کی انگریزی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ مریم بھی پشتو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں اس

شادی سے خوش اور مطمئن تھے۔

ایک دن انجان نمبر سے کال وصول کر کے مجھے گلگارے کی آواز سننے کو ملی۔

''شکر ہے تمھیں یاد تو ہوں۔'' پہچان ہوتے ہی میں نے شکوہ کیا تھا۔

وہ دکھی آواز میں بولی۔ ''آپ بھولے کب تھے۔''

''پھر اتنے عرصے بعد گھنٹی کرنے کی توجیہ کیا کرو گی؟''

اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔ ''آپ کو راجو کہہ سکتی ہوں؟''

میرے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ایک کہنے والی تو رہی نہیں تم بھی شوق پورا کرلو۔''

وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔ ''شادی کے دوسرے ہی دن مجھے پلوشہ بہن کے مرنے کی خبر پہنچی۔ آپ کا دوست کمانڈر عبدالحق چھٹی سے واپسی پر ابو جان کو پلوشہ بہن کے مرنے کی دل فگار خبر بتا کر آگے چلا گیا تھا۔ میں گھر آئی تو رنڑا کی زبانی پتا چلا۔ اس کے بعد ہمت ہی نہ ہوئی کہ خان کلے جا کر آپ سے بات کرسکوں۔ البتہ اب ہمارے گاؤں میں بھی موبائل فون کے سگنل آگئے ہیں تو ہمت کر ڈالی ہے۔''

''شوہر کیسا ہے؟'' میں نے تکلیف دہ موضوع سے جان چھڑانا چاہی۔

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''بہت اچھا، اتنا کہ شادی کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا۔''

''میری گڑیا کیسی ہے؟'' میں نے رنڑا کی بابت پوچھا۔

گل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ لیں خود ہی بات کرلیں، موبائل فون لینے کے لیے مسلسل ہی بھیک مانگنے کے انداز میں ہاتھ پکڑا ہوا۔''

''اگلے ہی لمحے میں رنڑا کی پرجوش آواز سن رہا تھا۔ اس کے بعد ثمر خان اور چچا شمریز سے بھی گپ شپ ہوئی۔ آخر میں گل نے چند باتیں کہہ کر مجھے تسلی دی اور ملنے کی درخواست بھی کر دی۔

''کوشش کروں گا کہ جلد ہی آپ کی طرف چکر لگے۔'' اسے اطمینان دلا کر میں نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

جینی بھی ہر دوسرے دن کال ضرور کرتی تھی۔ سردار اور مریم کی شادی کا سن کر وہ مجھ سے کافی خفا بھی ہوئی

تھی۔لیکن رابطہ کرنا نہ چھوڑا۔میں زیادہ وقت تربیتی مشقوں میں گزارتا رہتا۔بھاگ دوڑ، جمنازیم، فائرنگ وغیرہ کے شغل میں دن آسانی سے گزر جاتا۔میری نشانہ بازی پہلے سے بھی نکھر گئی تھی۔وزیرستان جاتے وقت ایس ایس میرا اور سردار دونوں کا کوڈ نام تھا،لیکن اب یونٹ میں مجھے زیادہ تر لوگ ایس ایس ہی کہہ کر بلاتے تھے۔تعلق رکھنے والے افراد مجھے مختلف ناموں سے پکارتے تھے لیکن راجو صرف پلوشے کہتی تھی۔

زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔اور پھر اس ٹھہراؤ میں کنکر کمانڈنگ آفیسر کے اردلی نے پھینکا۔اس وقت میں کنٹین میں بیٹھا سردار کو چھیڑ رہا تھا جب وہ مجھے بلانے وہیں آ گیا۔

''ذیشان بھائی، کمانڈنگ آفیسر یاد کر رہے ہیں۔''

''آ رہا ہوں۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سردار نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔میں لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد میں کمانڈنگ آفیسر عرفان ملک صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھو۔''میرے سیلوٹ کا جواب سر کے اشارے سے دیتے ہوئے انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی جلدی سامنے کھلی فائل پر دستخط کرتے ہوئے کام نبٹانے لگے۔فائل میں موجود آخری کاغذ پر دستخط ثبت کر کے انھوں نے فائل میز پر رکھی کام ختم ہونے کی مخصوص ٹرے میں پھینکی اور میری جانب متوجہ ہو کر مسکرائے۔

''جوان، میرا خیال ہے تم نے کافی آرام کر لیا ہے اب اگر کام کی بات ہو جائے۔''

میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔''سر، یقیناً یہ آپ کا احسان ہوگا۔''

''شاباش۔''وہ دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے۔''تیاری کرو تمھارے پاس زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے ہیں، چار بجے کی فلائیٹ سے تم رینج ماسٹر اپنے ساتھ لے کر گلگت جا رہے ہو۔ باقی کی تفصیل تمھیں وہیں معلوم ہو جائے گی۔''

☆......☆......☆

گلگت ائیر پورٹ پر ہمیں لینے کے لیے ایک یونٹ کی دو گاڑیاں آئی ہوئی تھیں۔ایک فوجی جیپ اور دوسری سنگل کیبن۔گلگت میں رکے بغیر ہم نے آگے جانا تھا۔ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے آنے والوں کو ہمارے کام

کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا،اس لیے ہم نے ان سے سر کھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔میرے ساتھ دوسرا اسنائپر الیاس آیا تھا۔وہ جہلم سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان سنائپر تھا اور پہلی بار کسی مشن پر یونٹ سے باہر آیا تھا۔وہ خاصا پر جوش تھا۔

راولپنڈی کی گرمی یہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔گلگت سے ہم نے جگلوٹ کا رخ کیا اور وہاں سے استور روانہ ہوئے۔نو بجے کے قریب ہم استور پہنچ گئے تھے۔رات وہیں آرمی کے مہمان خانے میں گزاری اور اگلے دن آٹھ بجے استور سے روانہ ہو گئے۔

استور میں اچھی خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔اور میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جاتے سردی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔سردار کے مشورے پر میں نے گرم کپڑے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔الیاس بھی کوٹ وغیرہ ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ائرپورٹ ہی سے میں نے ابو جان کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ چند دنوں کے لیے ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں شاید بات نہ ہو سکے۔امی جان سے بھی بات کر کے میں دعائیں لینے میں سستی نہیں دکھائی دی تھی۔اس بار یونٹ سے نکلتے وقت راؤ تصور صاحب نے مجھے خصوصی طور پر چند ہدایات کی تھیں۔

استور سے چلم اور وہاں سے برزل ٹاپ کی بلندی کا سفر طے کرتے ہوئے ہمیں دوپہر ہو گئی تھی۔برزل ٹاپ کے بعد مسلسل اترائی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔اس علاقے میں میں پہلی بار آیا تھا اس لیے دلچسپی سے دائیں بائیں کا جائزہ لے رہا تھا۔یوں بھی دائیں بائیں کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔پہاڑوں سے میرا تعلق بہت پرانا ہے لیکن یہاں کے پہاڑ کچھ زیادہ ہی بلند تھے۔نہ جانے کیوں ان بلند پہاڑوں کو دیکھ کر پلوشے کی یادیں زیادہ ہی حملہ آور ہو گئی تھیں۔یقیناً ہم دونوں نے جتنا وقت اکٹھے گزارا تھا وہ پہاڑی علاقے ہی میں گزارا تھا۔اسی وجہ سے پہاڑوں کو دیکھتے ہی وہ دھم سے آنکھوں کے سامنے آ کودتی تھی۔

دمبہ باؤ کا طویل میدان طے کر کے ہم شام ڈھلے مطلوبہ یونٹ کے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے تھے۔سنا یہی ہے دمبہ باؤ بلندی پر موجود دنیا کا سب سے بڑا میدان ہے۔رات کا کھانا کھاتے ہی ہمارا بلاوا آ گیا تھا۔یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر نے ہم دونوں کو اپنے کمرے ہی میں بلوا لیا تھا۔اردلی کو چائے کا بتا کر اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ کہہ کر ہم نے نشست سنبھال لی۔

”تو ذیشان حیدر آپ ہیں۔“ اس نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

”جی سر!...... یہ الیاس ہے۔“ میں نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

”ملک صاحب کی مہربانی کہ اس نے بہت جلد ہی آپ کو یہاں بھیج دیا ہے۔کیا کام کا بتایا ہے؟“

”نہیں سر۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”کام کوئی اتنا مشکل نہیں ہے جوان، خاص کر جو تمھاری تعریف سنی ہے ذیشان! تو یقیناً تمھارے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہی ثابت ہوگا۔“ لازماً میرے بارے انھیں ملک عرفان صاحب ہی نے ایسا کچھ بتایا تھا کہ وہ بار بار تعریفی نظروں سے مجھے گھورنے لگتے۔

میں انکساری سے بولا۔”کام کے بارے سن کر ہی کچھ اندازہ لگا پائیں گے سر۔“

وہ تفصیل بتلاتے ہوئے بولے۔”سردیاں شروع ہونے ہی والی ہیں۔یہاں پر جولائی، اگست اور ستمبر کے پہلے ہفتے تک ہم اپنی دور دراز پوسٹوں پر سال بھر کا راشن ذخیرہ کروا دیتے ہیں۔یہ کام ویسے تو ہم سوّل مزدوروں سے لیتے ہیں جو خچروں کے ذریعہ تمام پوسٹوں پر راشن پہنچاتے ہیں۔لیکن دو پوسٹیں ایسی ہیں جہاں سوّل لوگ راشن پہنچانے سے گھبراتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو دونوں پوسٹیں کافی بلندی پر واقع ہیں۔یعنی انیس ہزار فٹ کی بلندی کافی معنی رکھتی ہے۔اور دوسرا یہ وہ پوسٹیں ہیں جو کارگل جنگ میں ہم نے انڈیا سے چھینی تھیں اور معاہدے کے بعد باقی علاقہ تو واپس کر دیا تھا لیکن ان دونوں پوسٹوں کو معاہدے میں شامل نہیں کیا تھا۔یہ دونوں پوسٹیں چونکہ ہم سے زیادہ انڈیا کی پوسٹوں کے قریب ہیں اس لیے وہ آئے دن ان پوسٹوں کو نشانے پر رکھتے ہیں۔عام دنوں میں تو ہمیں فائرنگ کے تبادلے میں کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا، البتہ راشن کی ترسیل کے دنوں میں ہماری مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ان دونوں پوسٹوں پر فوجی جوانوں ہی کو راشن چڑھانا پڑتا ہے۔اور ایک جوان جب کندھوں پر آٹے یا چینی کی بوری اٹھا کر مشکل چڑھائی طے کر رہا ہو تب وہ فائر کا جواب نہیں دے سکتا۔بلکہ اس کے لیے تو اپنی جان بچانا بھی کافی دشوار ہو جاتا ہے۔ان دونوں پوسٹوں میں فہیم پوسٹ پر ہم راشن سٹور کر چکے ہیں البتہ خرم پوسٹ پر آدھے سے بھی کم راشن پہنچا پائے ہیں۔“ یہ تفصیل بتاتے ہوئے کمانڈنگ

آفیسر شہزاد اکبر اٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے نقشے کے پاس پہنچے۔ ''یہ فہیم او پی ہے اور یہ خرم او پی۔'' انھوں نے دو بلندیوں کی نشان دہی کی۔ ''اور یہ انڈیا کی وہ دو پوسٹیں ہیں جہاں سے مسلسل فائر آتا ہے۔ پہلے وہ یہاں آرٹلری کا فائر کرواتے تھے۔ اور سچ کہوں تو آرٹلری کے فائر سے پھر بھی بچت ہو جاتی تھی آج کل انھوں نے اپنی ان دونوں پوسٹوں پر سنائپر بٹھا رکھے ہیں اور جو ہمارے جوانوں کے لیے مسائل کھڑے کیے رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم خرم او پی پر چوتھائی سے بھی کم راشن ذخیرہ کر پائے ہیں۔ اور ہمارے پاس بس دس پندرہ دن ہی بچے ہیں اس کے بعد برف باری نے شروع ہو جانا ہے اور تب راشن کی ترسیل ناممکن ہو جائے گی۔''

میں بھی نشست چھوڑ کر ان کے قریب پہنچا اور نقشے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس ضمن میں ہم دونوں کیا کر سکتے ہیں؟''

''پرسوں آپ کے کمانڈنگ آفیسر، سر عرفان سے بات ہوئی وہ میرے کورس میٹ ہیں۔ ہم دونوں اکٹھے ہی PMA سے پاسنگ آؤٹ ہوئے تھے۔ دوران گپ شپ میں نے انھیں اپنا مسئلہ بتایا۔ تب انھوں نے کہا کہ وہ اپنا ایک بہترین سنائپر میرے پاس بھیج رہے ہیں جو کسی بھی آدمی کو انیس سو میٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر نشانہ بنا سکتا ہے۔''

''گویا آپ ہمیں انڈین سنائپرز کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔'' انھیں کہہ کر میں ان دونوں پوسٹوں کا انڈیا کی پوسٹوں سے فاصلہ ناپنے لگا۔

شہزاد اکبر صاحب بتا رہے تھے۔ ''انڈیا کی ایک پوسٹ فارورڈ ون اور دوسری کو ٹرپل سیون کہتے ہیں (اس کی بلندی 17777 فٹ تھی۔ اور ون ٹرپل سیون سیون کو مختصر کر کے ٹرپل سیون کہتے تھے) آپ دونوں میں سے ایک کو خرم او پی اور دوسرے کو فہیم او پی پر جا کر دشمن کے سنائپرز کو منہ توڑ جواب دینا پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے یہ کام ہم فہیم او پی پر جا کر بہتر طریقے سے سر انجام دے سکیں گے۔ یوں بھی ہم سنائپرز جوڑی میں کام کرتے ہیں اور میرا ساتھی پہلی مرتبہ عملی میدان میں آیا ہے اسے میں اکیلا نہیں بھیج سکتا۔''

کرنل صاحب معترض ہوئے۔ ''مگر فہیم او پی سے ٹرپل سیون کا فاصلہ دو ہزار سے زیادہ ہے۔''

میں اطمینان سے بولا۔ ''یہ میرا دردسر ہے، آپ ہمیں کل کا دن دیں اور پرسوں ان شاء اللہ آپ اپنی راشن

ذخیرہ کرنے والی پارٹی چلانا شروع کر دیں۔''

انھوں نے پوچھا۔''اور کل......؟''

میں نے کہا۔''کل چند جوان خالی جھولے لے کر اوپر چڑھیں گے تاکہ فائر شروع ہونے کے بعد خود کو آڑ میں رکھ کر محفوظ کر سکیں۔ یہ جوان بس دشمن کے سنائپرز کے لیے بہ طور چارہ پیش کیے جائیں گے۔''

''تم دونوں کس وقت نکلو گے؟''

میں نے پوچھا۔''یہاں سے فہیم او پی کا فاصلہ کتنا ہے؟''

''فاصلہ تو کافی ہے، مگر اس کی بنیاد تک آپ کو گاڑی چھوڑ کر آئے گی اور اس سے آگے بھی تین چار گھنٹے لگ ہی جاتے ہیں۔''

''تو ہم ابھی نکلیں گے۔''

''کیا۔'' انھوں نے حیرانی ظاہر کی۔''میرا خیال ہے آج رات آرام کر لیں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''سر، آرام ضرور کرتے، مگر ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جتنا جلدی اپنے کام پر لگیں گے اتنا ہی بہتر ہے۔ یوں بھی مزدور پیشہ لوگ کام ملنے کے بعد آرام کے بجائے کام ختم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔''

''یہ سن کر اچھا لگا۔'' انھوں نے تعریفی انداز میں گردن ہلائی۔

چائے پی کر ہم شہزاد صاحب کے کمرے سے نکل آئے تھے۔ انھوں نے بٹالین کے صوبیدار میجر صاحب کو بلا کر ہمارے آگے جانے کے احکامات دے دیے تھے۔

ایک گھنٹے بعد ہم اپنے سامان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ گو ہمارے لیے آرام کرنا مناسب تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ الیاس کی تھوڑی تربیت ہو جائے۔ ایک سنائپر کو سخت جان اور پر مشقت زندگی کا عادی ہونا چاہیے۔ طویل پہاڑی سفر کے بعد انسانی جسم آرام کا طلب گار ہوتا۔ مسلسل جاگنے سے انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے اور صحیح کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن سنائپرز کی تربیت میں انھیں مسلسل بے آرام رکھ کر ان کے چڑچڑے پن کو دور کرنا ہوتا ہے۔ ایک زیر تربیت سنائپر کو گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں کے حساب سے جگا کر مقصد پورا کرنے کے قابل

بنایا جاتا ہے۔نیند کے بارے کہاوت مشہور ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ سنائپر کو جب تک وہ خود ہی نہ سونا چاہے اپنی مچان میں نیند نہیں آنا چاہیے۔

ہمارا یہ مشن کافی آسان تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آسان مشن کی چھاپ الیاس پر ایسی پڑے کہ وہ ہر مشن کو یونھی آسان اور آرام دہ سمجھتا رہے۔گو وقت آنے پر اسے معلوم ہو جاتا، مگر اس وقت شاید وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوتا۔اور ایسا ہونے کی صورت میں یقیناً اپنا نقصان کرا بیٹھتا۔جبکہ اپنے شاگرد کو میں یونھی نقصان اٹھانے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔اپنے پہلے مشن میں میں نے اپنے محترم استاد صادق کو شہید ہوتے دیکھا تھا۔اس نے اپنی جان دے کر میری جان بچائی تھی۔اور اسی مشن کا اثر تھا کہ بعد میں مجھے ہر قسم کے حالات کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔گو حالیہ مشن میں جان جانے جیسا تو کوئی معاملہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں الیاس کو بے آرام تو رکھ سکتا تھا تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ عملی زندگی تربیت سے مشکل ہوتی ہے۔

ہم دو گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد فہیم او پی کے بیس میں پہنچ گئے تھے۔اس کا بیس بھی سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ بلند تھا۔جبکہ اس کی بلندی انیس ہزار فٹ تھی۔گویا پانچ ہزار فٹ کی بلندی ہم نے پیدل طے کرنا تھی۔رات کا ایک بج رہا تھا جب ہم نے فہیم او پی کے بیس سے اپنا سفر شروع کیا۔سردی ٹھیک ٹھاک طریقے سے حال پوچھ رہی تھی۔تیز ہوا گویا اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ہمارے ساتھ آنے والے جوانوں نے الیاس سے رینج ماسٹر کا جھولا لینے کی کوشش کی مگر میں نے انھیں۔"یہ وزن اٹھانا ہماری ذمہ داری ہے دوست۔" کہہ کر منع کر دیا تھا۔

بلندی پر پہنچتے ہوئے ہمیں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔میں نے چند منٹ سے زیادہ الیاس کو سستانے نہیں دیا تھا اور فوراً اسے ساتھ لے کر دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لینے باہر نکل آیا اگلا ایک گھنٹا میں نے اس کے ہمراہ ایسی مناسب جگہ ڈھونڈنے میں گزارا جہاں ہم رینج ماسٹر کو لگا کر فائر کر سکتے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ہندو بنئے نے اتنی سویرے نہیں اٹھنا تھا اس لیے میں زیادہ دیر الیاس کے ساتھ باہر نہ رہا اور رہائشی بینکر میں گھس گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنوعی طور پر خود کو کتنی ہی مصیبت اور جوکھم میں مبتلا رکھو وہ حقیقت سے میل نہیں کھاتی۔اب الیاس کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی لیکن اسے پہلا مشن نہایت ہی آسان مل گیا تھا

رہائشی بینکر میں لکڑی کے تختے زمین سے تھوڑا بلندی پر لگا کر سونے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ہم دونوں قریب قریب پڑے بستروں میں گھس گئے۔

''ایک خاص بات بتاؤں الیاس۔''

میرے طرف کروٹ تبدیل کرتے ہوئے وہ بولا۔''جی استاد جی۔''

''جانتے ہوئے جب میں اپنے پہلے مشن میں گیا تھا،اس وقت استاد صادق میرے ہمراہ تھے۔جاتے ہوئے رستے ہی میں ان کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔مشن کی تکمیل کے بعد ہم دونوں ایک درخت پر چھپے بیٹھے تھے تبھی استاد صادق نے مجھے اپنے پہلے مشن کی کہانی سنائی جس میں ان کے استاد ہاشم نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے شاگرد کو جان بچانے کا موقع دیا تھا۔یہ کہانی سنانے کے اگلے دن استاد صادق نے مجھے پانی لانے کے بہانے بھیجا اور جب میں چھپ کر دشمن کے گھیرے سے نکل گیا تب انھوں نے دشمن پر فائر کھول دیا۔میں چاہ کر بھی ان کی مدد سے قاصر تھا کیوں کہ انھوں نے سنائپر رائفل کی تمام گولیاں میرے جھولے سے نکال لی تھیں۔واپسی پر جب استاد راؤ تصور صاحب کو میں نے یہ واقعہ سنایا،تب انھوں نے بڑی عجیب بات بتائی کہ استاد صادق کے استاد ہاشم کو بھی ان کے استاد نے اپنے پہلے ہی مشن میں اسی طرح دشمن کے نرغے میں آنے سے بچایا تھا۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''اس بات کا کیا مطلب ہوا استاد جی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اس بات کا مطلب یہ ہے کہ روایت کے مطابق میرا اس مشن میں شہید ہو جانا لازمی ہے۔کیوں یہ سلسلہ کافی دور سے چلا آرہا ہے۔لیکن اس مشن کی صورت حال دیکھتے ہوئے تو مجھے نہیں لگتا کہ کچھ ایسا پیش آئے۔''

وہ گھبرا کے بولا۔''اللہ پاک نہ کرے ایسا ہو سر!''

''کیوں یار،شہادت کی موت تو اعلیٰ موت ہے۔''

الیاس نے پوچھا۔''کیا ہر سنائپر کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے پہلے مشن پر جاتا ہے تو اس کا استاد اس کے لیے جان قربان کر دیتا ہے۔''

''ایسا میں نے کب کہا۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو آپ کی بات کا کیا مطلب ہوا۔“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”یار، میری بات کا مطلب تھا کہ خاص سنائپرز کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔ ایک مخصوص زنجیر ہے، یعنی میرے استاد صادق، ان کے استاد ہاشم، ان کے استاد گل خان ان کے استاد بشیر...... اور اب تمھیں میرے ہمراہ بھیج دیا گیا ہے۔ دورانِ تربیت بھی تم میرے خصوصی شاگرد رہے ہو اور جانتے ہو استاد تصور نے آتے وقت میرے کان میں یہی کہا تھا کہ وہ میرے لیے خصوصی دعا کریں گے۔“

”ان شاء اللہ، اس بار یہ زنجیر ٹوٹ جائے گی۔“ وہ اعتماد سے بولا۔ ”اور یوں بھی آپ کی جان مجھ سے بہت قیمتی ہے۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں استاد جی۔“

”اچھا تھوڑا آرام کرلو۔“ اسے آرام کا مشورہ دیتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ یوں بھی مجھے موت کا خوف پہلے بھی کبھی نہیں تھا اب تو مرنا ایک مذاق ہی لگتا تھا۔ پلوشہ کی جدائی بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ تھی۔ ایک دم جب اس کی سوچیں دماغ پر حملہ آور ہوتیں ہر طرف اندھیر اور ظلمت ہی نظر آتی۔

ہم نے تین چار گھنٹوں سے زیادہ آرام نہیں کیا تھا۔ نو بجے اٹھ کر ہم نے ناشتا کیا اور دن کی روشنی میں دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لینے لگے۔ فائر کرنے کے لیے ہم نے ایسی جگہ کا چناؤ کرلیا تھا جہاں سے ہم دشمن کی دونوں پوسٹوں پر فائر گرا سکتے تھے۔ دشمن کی ٹرپل سیون نامی پوسٹ کا ہوائی فاصلہ بہ ظاہر دو کلومیٹر سے زیادہ تھا۔ لیکن اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے مطابق انیس سو میٹر بنتا تھا۔ جبکہ فارورڈ ون پوسٹ کا فاصلہ سترہ سو میٹر بن رہا تھا۔

ہماری طرف سے تیاری کا اشارہ ملتے ہیں، اس یونٹ کے چند جوان خرم او پی کی بلندی طے کرنے لگے۔ تمام نے بلٹ پروف جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ لوہے کی یہ جیکٹیں گردن سے نیچے ناف تک کے جسم کو گولی اور دھماکے وغیرہ سے اڑنے والے شیل سے محفوظ رکھتی ہیں۔ چونکہ ان میں موجود پلیٹوں کا اچھا خاص وزن ہوتا ہے اس لیے اسے پہن کر چلنے والا خاصی تھکن محسوس کرتا ہے۔ خاص کر جب یہ جیکٹ پہن کر خرم پوسٹ کی دشوار ترین بلندی پر چڑھنا ہو۔ اور سونے پہ سہاگا کہ کندھوں پر سامان بھی اٹھایا ہو۔

اسی مشکل کی وجہ سے عام دنوں میں فوجی جوان پوسٹ پر سامان چڑھاتے وقت بلٹ پروف جیکٹیں نہیں

پہنتے تھے۔لیکن آج چونکہ دشمن کو دھوکا دینے کے لیے ان کی پیٹھ پر خالی پٹھو لدے تھے اس لیے انھوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن لی تھیں۔

"سب سے پہلے ہم ٹرپل سیون پر موجود دشمن کے سنائپرز کو نشانہ بنائیں گے، کیوں کہ ایک تو وہ تھوڑا مشکل ہدف ہیں اور دوسرا خرم او پی پر وہیں سے زیادہ فائر آتا ہے۔"

"جی استاد جی۔" الیاس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔رینج ماسٹر کے پیچھے میں خود لیٹ گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے الیاس کو فائر کرتے وقت کچھ ضروری احتیاطوں کے بارے سمجھانا شروع کر دیا۔گو تمام چیزیں اسے دورانِ تربیت بھی بتائی جا چکی تھیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ علم کے تکرار ہی سے وہ دل و دماغ میں جڑ پکڑتا ہے۔

الیاس نے ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار ناپ کر ڈیفلیکشن ناب کو مطلوبہ جگہ پر سیٹ کیا۔دشمن کا درست فاصلہ ناپ کر بلندی سے پستی کی جانب فائر کرنے کے فارمولے کے مطابق مخصوص رینج لگائی اور...... "تیار۔" کہہ کر سپارٹر سائیٹ کو آنکھوں سے لگا لیا۔

سائیٹ میں جھانکتے ہی مجھے دشمن کی پوسٹ واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ہمارے آدمی ابھی تک اس خاص بلندی پر نہیں پہنچے تھے جہاں سے وہ دشمن کی نظروں میں آسکتے۔

ہم دونوں اس وقت فہیم او پی پر موجود تھے۔وہاں سے خرم او پی مغرب کی جانب واقع تھی۔یہ دونوں پوسٹیں ان مجاہدوں کے نام سے منسوب ہیں جنھوں نے یہاں لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔دشمن کی پوسٹ ٹرپل سیون شمال مغرب کی جانب اور فارورڈ ون شمال کی جانب موجود تھی۔اگست کے گرم مہینے میں بھی فہیم اور خرم او پی کے شمال کی جانب ڈھلان پر برف کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔اور یہ تازہ برف نہیں تھی۔یہ کئی سال پرانی برف تھی جو پگھل نہیں پائی تھی اور چھوٹے سے گلیشیر کی صورت میں شمال کی جانب موجود ڈھلان پر کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔شمالی ڈھلان پوسٹ کے قریب تو بالکل سیدھی تھی۔یعنی اسی ڈگری کا زاویہ ناتی ڈھلان پر برف نہیں ٹھہر سکتی تھی۔لیکن سو ڈیڑھ سو گز کے بعد یہ ڈھلان بتدریج کم ہوتے ہوئے نیچے نالے تک چلی جاتی تھی۔

"ہلچل نظر آ رہی ہے۔" الیاس نے اعلان کیا۔دو بندے مجھے بھی دوڑتے ہوئے نظر آئے تھے۔دونوں دو

مختلف مورچوں میں گھس گئے تھے۔ان مورچوں کے ہول کافی چوڑے تھے۔اور ایک سنائپر کو فائر کرنے کے لیے لازمی بات ہے ہول کی دو اڑھائی فٹ کی چوڑائی کی ضرورت پڑتی ہے تبھی تو وہ سامنے والے علاقے میں اپنی مرضی کے مطابق شست لے سکتا ہے۔اب یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہاں میں پہنچ گیا تھا اور میرے لیے دو فٹ کے ہول میں شست لے کر فائر کرنا ایسا ہی تھا جیسا مچھلی کے بچے کے لیے تیرنا یا لنگور کے بچے کا درخت پر چڑھنا۔

”پہلے دائیں والا مورچہ۔“ الیاس کو بتا کر میں نے دائیں والے مورچے پر شست سادھ لی۔اس وقت تک دشمن کے سنائپر تین چار فائر کر چکے تھے۔ان کی تیزی کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ بس نام ہی کے سنائپرز تھے۔ورنہ سنائپرز ہوا میں گولیاں نہیں اڑایا کرتے۔ان کی نالائقی ہی تھی کہ وہ اتنے دنوں تک مسلسل فائر کر کے دشمن کے چار پانچ آدمیوں ہی کو قتل کر پائے تھے۔ایک اور غلطی میں نے یہ جانچی تھی کہ وہ سنائپرز ہوتے ہوئے بھی کھڑے ہو کر فائر کر رہے تھے۔گو ایک سنائپر ہر حالت میں فائر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔لیکن جب اسے چناؤ کا اختیار دیا جائے تو وہ لیٹنے کو ترجیح دیتا ہے کیوں کہ اس طرح وہ زیادہ اطمینان سے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔اب جیسے میں نے وہاں پہنچتے ہی بجائے مورچے کے اندر کھڑے ہو کر فائر کرنے ایک مورچے کی چھت پر فائر کرنے کے لیے جگہ منتخب کی تھی۔اپنے سامنے ایک فٹ بلند پتھر کی آڑ رکھ کر میں نے سامنے سے آنے والے فائر کا سد باب بھی کر لیا تھا۔یوں بھی دشمن کی دونوں پوسٹیں فہیم او پی سے نیچی تھیں۔

مورچے کے اندر چھاؤں تھی اور رائفل کے پیچھے کھڑا ہوا آدمی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔لیکن ہول سے باہر نکلی ہوئی بیرل کو دیکھ کر مجھے فائر کی جگہ کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔اتنے سال کے تجربے کے بعد یہ اندازہ لگانا میرے لیے نہایت ہی آسان تھا۔مخصوص جگہ پر شست سادھ کر میں نے ٹریگر دبایا اور فوراً ہی شست دوسرے مورچے پر لے جا کر دوسری مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔اس کے بعد بھی میرا کام رکا نہیں تھا۔دونوں سنائپروں کے گرتے ہی رہائشی بینکر سے دو تین آدمی بھاگ کر باہر نکلے تھے۔یقیناً انھیں مورچے میں موجود دوسرے آدمی نے اپنے مرنے والے سنائپرز کے بارے بتا دیا تھا۔پوسٹ کی چار دیواری صرف اتنی تھی کہ آدمی جھک کر ہی فہیم پوسٹ پر موجود سنتری کی نظروں سے اوجھل رہ سکتا تھا۔وہ تینوں تیزی کی کوشش میں جھکے بغیر اس

جانب دوڑتے ہوئے پہنچے تھے اور الحمد اللہ مورچے تک صرف ایک ہی سلامت پہنچ پایا تھا۔دو کے نصیب میں مزید سانس نہیں لکھے تھے۔فہیم پوسٹ پر موجود جوانوں نے زوردار نعرہ لگا کر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔وہ دو دوربینوں کی کی مدد سے باری باری یہ نظارہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ ٹرپل سیون والے یہ خبر فارووڈون تک پہنچاتے میں اپنی شست تبدیل کر کے فارووڈون کی جانب موڑ چکا تھا۔اس مرتبہ کام پہلے کی نسبت بھی آسان تھا۔الیاس نے جلدی جلدی نئی میگزین بھر کے رائفل کے ساتھ لگائی اور ایلی ویشن سائیٹ پر رینج کم کر دی۔اس جانب دو سنائپروں کے نشانہ بنتے ہی باقی آڑ میں ہو گئے تھے۔اور پھر ایک دم تیز فائرنگ شروع ہو گئی۔دشمن بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر بے فائدہ ہی ایمونیشن پھونک رہا تھا۔البتہ اتنی عقل انھیں آ گئی تھی کہ وہ آڑ سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔رائفل کے پیچھے سے اٹھ کر میں نے الیاس کو جگہ لینے کا اشارہ کیا اور خود چھت سے نیچے اتر گیا۔گو ٹرپل سیون پر تو وہ کامیاب فائر نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا فاصلہ زیادہ تھا،البتہ فارووڈون پر موجود آدمیوں کو ضرور نشانہ بنا سکتا تھا۔

فہیم او پی کے پوسٹ کمانڈر نے صوبیدار اکرم نے بے ساختہ مجھے گلے سے لگا کر میرا ماتھا چوم لیا تھا۔

”شاباش جوان،جو تعریف سنی تھی اس سے کچھ زیادہ ہی پایا ہے۔“

”شکریہ سر،اب آپ اپنے جوانوں کو بتا دیں کہ وہ راشن چڑھانا شروع کر دیں۔ان شاء اللہ اب انھیں نشانہ سادھ کر گولی نہیں ماری جا سکے گی۔“

صوبیدار اکرم نے خوش دلی سے کہا۔”یہ بات میں آپ کے کہنے سے پہلے بٹالین میں بتا چکا ہوں۔کمانڈنگ آفیسر بہت خوش ہیں اور خرم او پی بیس تک راشن پہنچانے کے لیے راشن گاڑیوں میں رکھا جا رہا ہے۔“

میں چائے پی کر دوبارہ مورچے کے اوپر چڑھ گیا تھا۔

”استاد جی تین گولیاں چلا ایک آدمی کو جہنم رسید کرنے والے شاگرد کی آپ بے عزتی کریں گے کہ داد دیں گے۔یہ بھی خیال رہے پہلا مشن ہے۔“

”دو گولیوں کے ضیاع پر تھپڑ مارنا تو بنتا ہے۔“

وہ ہنسا۔”تین چار اکٹھے ہی لگا دیں،مجھے تھپڑ مارنے کے لیے کیا بار بار چھت پر چڑھتے رہیں گے۔“

میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔"الیاس، یاد رکھنا ہمارا حالیہ مشن بالکل پکنک منانے کی مانند ہے۔ کیوں کہ ہمیں جان کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔ جبکہ سنائپر نے عملی زندگی میں فائر کرتے وقت جان ہتھیلی پر رکھی ہوتی ہے۔ گولی کے خطا جانے کا سیدھا سادھا مطلب جان سے جانا ہوتا ہے۔ چلو میں یہاں تو دو گولیوں کے ضیاع کو برداشت کرلوں گا۔ لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ مشکل حالات میں پھنسنے پر تمھارا کیا ہوگا۔ اس وقت میرے غصہ کرنے کا یا افسوس کرنے سے بات گزر جائے گی۔"

"معافی چاہتا ہوں سر۔" اس کا لہجہ ندامت سے پر تھا۔

"ہمارا کام دشمن کو فائر کی آواز سنانا نہیں، جسم میں گولی گھسنے کی اذیت محسوس کرانا ہے۔ خالی ٹخ ٹخ تو اس پوسٹ پر موجود تمھارے بھائی تم سے کئی گنا بہتر کر سکتے تھے۔ ایک عام فوجی درجن بھر گولیاں چلا کر بھی دشمن کا ایک آدمی مار لے تو اسے گھاٹے کا سودا نہیں کہا جاتا، لیکن سنائپر کی گولی کبھی بھی خطا نہیں جاتی۔ یا تو دشمن کی چھاتی میں گھستی ہے یا لوٹ کر خود سنائپر کو آلگتی ہے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ گولی لوٹتی کیسے ہے۔ یقین مانو ایک گولی درجنوں گولیوں کی شکل اختیار کر کے لوٹتی ہے۔"

اس مرتبہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سپارٹر سائیٹ آنکھوں سے لگا کر میں نے دشمن کی ٹرپل سیون پوسٹ کی طرف دیکھا۔ ایک مورچے کے ہول سے مجھے دوبارہ رائفل کی بیرل جھلکتی نظر آرہی تھی۔

الیاس کو ہٹا کر میں فوراً رائفل کے پیچھے لیٹ گیا۔ دشمن کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ وہ ان مورچوں کے ہولوں کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اور اسی سے وہ ذہنی طور پر شکست تسلیم کر کے اپنے دفاعی اقدامات پر توجہ دیتے۔ دو تین منٹ شست سادھ کر میں نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ ایک دم ہول سے جھلکتی رائفل کی بیرل کا غائب ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ رائفل کے پیچھے کھڑا دشمن تھوڑی دیر پہلے مرنے والے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا ہے۔

"کیا کبھی آپ کی گولی خطا بھی گئی ہے۔" میرے ساتھ لیٹے الیاس نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس سوال کا جواب اثبات میں دینا سچ نہیں ہوگا۔" میں نے شست دشمن کی دوسری پوسٹ کی طرف موڑ دی تھی۔ اس طرف سے بھی بس فائرنگ کی آواز آرہی تھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ دشمن کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آڑ سے سر کی قربانی دے کر ہی سر نکال سکتے تھے۔

دو تین لمحے ٹھہر کر میری ہدایات جاری رہیں۔ ’’ایک اور بات ذہن میں رکھنا، جب بھی دشمن پر شست سادھو تو وقت کا دھیان بالکل چھوڑ دو۔ یہ نہ ہو گھنٹا ڈیڑھ چابک دستی سے نشانہ سادھنے کے بعد تم سست ہو کر چند لمحے ستانے کا سوچو اور انھی چند لمحوں کا دشمن فائدہ اٹھا جائے۔‘‘

’’جی سر۔‘‘ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’چلو پھر جگہ سنبھالو۔‘‘ میں دوبارہ نیچے اتر گیا تھا۔

اس دن کامیابی سے راشن کی ترسیل جاری رہی۔ شام کو کمانڈنگ آفیسر شہزاد اکبر صاحب نے ٹیلی فون پر بہ ذات خود مجھ سے بات کی تھی۔

’’بہت عمدہ ذیشان میاں، تم لوگوں نے تو چند گھنٹوں ہی میں ہمارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔‘‘

میں انکساری سے بولا۔ ’’شکریہ سر!‘‘

’’اب تمھیں ہفتہ بھر ہمارا مہمان بننا پڑے گا۔ کیوں کہ تمھارے جاتے ہی انھیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ہم خرم او پی پر راشن ذخیرہ ہونے تک کہیں نہیں جا رہے سر۔‘‘

وہ مسکرائے۔ ’’بہت مہربانی جوان۔‘‘

’’اس میں مہربانی کی کوئی بات نہیں سر!...... یہ میری ذمہ داری اور فرض ہے کہ اپنے ساتھیوں کے لیے مجھ سے کچھ ہو سکتا ہے تو یقیناً میں قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔‘‘

’’صحیح کہہ رہے ہو برخوردار!...... پاک آرمی کا ہر جوان چاہے وہ کسی بھی عہدے رینک کا حامل ہو، کسی بھی بیج سے تعلق رکھتا ہو وہ یقیناً ملک کی سلامتی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔‘‘

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے۔ ’’جی سر۔‘‘ کہنے پر اکتفا کیا تھا۔

کہنے لگے۔ ’’بہر حال میں کوشش کروں گا کہ جتنا جلدی ہو سکے راشن ذخیرہ کر لیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے عارضی طور پر بٹالین کی چھٹی بھی بند کر دی ہے اور پڑوسی یونٹ سے بھی پچاس جوان تین دنوں کے لیے مانگ لیے ہیں۔‘‘

”آپ اطمینان سے راشن ذخیرہ کریں سر، ان شاءاللہ دشمن کے سنائپرز کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔“

اورانھوں نے مجھے شاباش دیتے ہوئے رسیور رکھ دیا۔

الیاس کو سارا دن میں نے رینج ماسٹر کے ساتھ مصروف رکھا تھا۔خود البتہ دن کو چند گھنٹے کی نیند لے لی تھی ۔اس کے بعد دشمن کے سنائپرز کا فائر نہیں آیا تھا۔یقیناً وہاں پوسٹ پر موجود سنائپرز کا صفایا ہم نے کر دیا تھا۔البتہ جو عام فوجی موجود تھے،انھوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق دن بھر ”ٹخ ٹخ“ جاری رکھی تھی۔

اگلے دن بھی راشن کی ذخیرہ اندوزی کا کام اطمینان سے جاری رہا۔دن کے ابتدائی تین چار گھنٹے تو میں رائفل کے پیچھے لیٹا رہا مگر اب دشمن چوکنا تھا۔کوئی موقع بھی نہ پا کر میں نے الیاس کو رائفل کے ساتھ یہ اجازت دے کر چھوڑ دیا کہ وہ دس پندرہ گولیاں ضائع کر سکتا ہے۔اس طرح ایک تو دشمن پر فائر کا خوف طاری رہتا اور دوسرا اس کی بھی مشق ہوتی رہتی۔خود میں پوسٹ کمانڈر کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے بیٹھ گیا۔

پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اس پوسٹ پر مسلسل وقت گزارنا واقعی جان جوکھم کا کام تھا۔سردی کی شدت، تیز ہوا، پانی کی کمی، گھر سے دوری، تازہ خوراک کی عدم دستیابی، رہائش کا ناقص انتظام، گھر رابطے میں مشکلات اور ان جیسے درجنوں مسائل کے ہوتے ہوئے پاک آرمی کے جوانوں کا وہاں وقت گزارنا ہمت وجرات کا ایک نمونہ ہی ہے۔رہائش کے لیے پتھروں سے بنے ہوئے بینکر جنھیں سیمنٹ اور مٹی وغیرہ کے بغیر ہی ایک دوسرے پر رکھ کر دیوار کی شکل دے دی گئی تھی۔ان کے سوراخوں سے ہوا کی آمد ایسے ہی جاری رہتی تھی جیسے سوراخ زدہ بوری سے غلہ گرتا رہتا ہے۔وہ لوگ جو سردیوں میں ہیٹر اور گرمیوں میں اے سی کے سامنے سے ہل جائیں تو انھیں ہسپتال جانا پڑ جائے۔وہ بھی پاک آرمی پر منھ اٹھا کر یوں بکواس کرتے ہیں جیسے بے نیاز درویش پر آوارہ کتے بھونکتے ہیں۔فوج نے پاکستان کے لیے کیا قربانیاں دی ہیں اور کیا کیا دے رہی ہے یہ بات وہ ایک دم فراموش کر دیتے ہیں۔میں یقین سے کہتا ہوں کہ ایسے کسی آدمی کو اگر گھنٹا بھر بھی فہیم او پی جیسی جگہ پر گزارنا پڑ جائے تو وہ اس کی زندگی کا آخری گھنٹا ثابت ہوگا۔وہ یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کی آرام دہ نیندوں کی عمارت کچھ جیالوں کی بے آرامی اور بے سکونی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ان کے سیر سپاٹے، بے فکری سے گھومنے پھرنے اور آزادی کی زندگی کے پیچھے ان جوانوں کی ہمت کارفرما ہے جو آزاد ہوتے ہوئے قیدی کی سی زندگی گزار رہے

ہیں، جو بیوی کے ہوتے ہوئے مجرد بنے ہوئے ہیں، جو کبھی اپنے بچوں کی شرارتوں سے دل بھر کے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ جنھوں نے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا موقع سال میں چند دن ہی ملتا ہے۔ جو ہمیشہ اپنے گاؤں میں مہمان اور اجنبی بنے رہتے ہیں۔ جو کسی خوشی کے موقع پر وقت پر نہیں پہنچ پاتے، جن کے پیاروں کے جنازے ان کے بغیر پڑھ دیے جاتے ہیں۔ جو کبھی کبھار ایسی حالت میں بھی گھر واپس آتے ہیں کہ ان کا پورا یا ادھورا جسم لکڑی کے صندوق میں بند ہوتا ہے۔ بیٹے کے انتظار میں راتوں کو جاگنے والی ماں کو بتا دیا جاتا ہے کہ اب تمھارا انتظار اختتام پذیر ہوا۔ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ شوہر کی آمد کے لیے نئے کپڑے سلوا کر رکھنے والی بیوی کو بتایا جاتا ہے کہ تمھارے نئے جوڑے کو سراہنے والی آنکھیں باقی نہیں رہیں۔ باپ کی آمد پر نئے کھلونے پانے کے منتظر بچوں کے کانوں میں بس ماں اور دادی کی سسکیاں اور کراہیں ہی گونجتی رہتی ہیں۔ اور ایک گھٹیا بے غیرت کہتا ہے پاک فوج نے آج تک کیا کیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اگر پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جس پر پاکستان کے عوام آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں تو وہ پاک آرمی ہے۔ البتہ انسان ہونے کے ناطے پاک آرمی کے جوانوں سے غلطی کا ارتکاب ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ دہشت گردی کے خلاف مسلسل آپریشن کرنے والوں سے نادانستگی میں خطا ہو جانے کو ان کا گناہ نہیں گردانا جا سکتا۔ آپ تصور کریں کہ ایک جوان پاک آرمی کی وردی زیب تن کر کے دہشت گردوں کا کھلا ہدف بن کر جب کسی جگہ کا آپریشن کرتا ہے تو وہاں سول کپڑوں میں دکھائی دینے والا ہر آدمی بہ ظاہر نظر اس کا دشمن اور دہشت گرد ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت میں اخلاقیات اور نرم خوئی دکھانا ایک سپاہی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کم فہم لوگوں نے ہمیشہ اپنے ہیروز کی ناقدری کی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کو اپنے مطلب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ چور کو کبھی بھی جاگنے والا چوکیدار اچھا نہیں لگتا۔ ایسے لوگ جو پاکستانی ہوتے ہوئے یہود و ہنود کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہوں انھیں پاک آرمی سے کیسے لگاؤ ہو سکتا ہے۔ بہ ہر حال یہ ایک لمبی بحث ہے میں واپس کہانی کی جانب آتا ہوں۔

باقی کا دن خیریت سے گزرا تھا۔ بس الیاس دشمن کے ایک آدمی کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ اور دشمن کو اپنی حدود میں سمٹے رہنے کے لیے اتنا کچھ بھی کافی تھا۔ اگلے دو دن بھی سکون سے گزر گئے تھے۔ سوائے

اس کے کہ دشمن کی ٹرپل سیون پوسٹ پر ایک آدمی نے آڑ سے سر نکال کر دوربین کے ذریعے خرم او پی کا جائزہ لینا چاہا تھا۔ اور اس کی بدبختی کہ اس وقت رینج ماسٹر کے پیچھے میں لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کی مزید بدبختی کہ اسی جانب متوجہ تھا۔ بے چارہ اپنے سر کے ساتھ دوربین کا بھی بیڑا غرق کروا گیا تھا۔

ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے آنے جانے کا راستہ عقب میں تھا۔ جہاں سے ان کی آمدورفت بغیر کسی مسئلہ کے جاری رہتی۔ پانچویں دن انڈین آرمی کی آرٹلری گنوں کے دہانے کھل گئے تھے۔ لیکن آرٹلری کو درست فائر کرانے کے لیے ایک ایسے دیدبان کی ضرورت ہوتی ہے جو آگے کسی پوسٹ پر بیٹھ کر ہدف پر درست فائر گرا سکے۔ ورنہ تو آرٹلری گنوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسا اندھے کے ہاتھ میں غلیل دے دی جائے۔ پہلے دن فارورڈ ون پر ایک دیدبان نے اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش ضرور کی تھی اور اس کوشش کا جواب اسے چھاتی میں لگنے والی گولی کی صورت میں ملا تھا۔ یہ الیاس کا پہلا شکار تھا جس کا مشاہدہ میں نے بہ ذات خود سپاٹر سکوپ میں کیا تھا۔ اس کے بعد گولہ باری تو جاری رہی مگر گولوں کو ہدف پر گرانے والا کوئی دیدبان سامنے نہ آیا۔ گولہ باری کا ہدف چونکہ خرم او پی تھی اس لیے الیاس اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔

سہ پہر ڈھلے میں مورچے کی چھت پر چڑھا تاکہ دن کی آخری روشنی میں دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لے سکوں، دشمن کی گولہ باری وقفے وقفے سے جاری تھی۔ تین چار گولے فہیم او پی کے اطراف میں بھی گرے تھے۔ لیکن فوجی جوان اس گولی باری کے اس لیے بھی عادی ہو جاتے ہیں کہ یہ ان کے لیے کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہوتی۔ اور یہی چیز ایک تربیت یافتہ فوجی اور ایک عام انسان کے درمیاں فرق کو اجاگر کرتی ہے۔ فوجی کے اعصاب عام لوگوں کی نسبت قوی ہوتے ہیں۔ گولہ بارود کے دھماکے، گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور توپوں کی گھن گرج مسلسل سن کر اس کے کانوں کو یہ آواز نامانوس نہیں لگتی۔ اور اسی وجہ سے اکثر بے ضابطگیاں بھی ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

یقیناً اس وقت میری بدبختی کا سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا جب میں دشمن پر آخری نظر ڈالنے مورچے پر چڑھا۔ الیاس مجھے آتے دیکھ کر رینج ماسٹر کے پیچھے سے ہٹ کر دائیں جانب ہو گیا تھا۔ میں نے لیٹ کر ٹیلی سکوپ سائیٹ سے ٹرپل ون سیون سیون پوسٹ کا جائزہ لیا کیوں کہ الیاس وہاں کامیاب فائر نہیں کر سکتا تھا۔

کسی قسم کی حرکت نہ ہوتی دیکھ کر میں نے رائفل کے عقب سے اٹھ کر الیاس کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔اس وقت میں مورچے کی چھت پر غربی جانب کھڑا تھا جبکہ الیاس میرے دائیں اور مشرقی جانب کھڑا تھا۔اچانک ہی اس مورچے کے پچیس تیس گز نیچے ڈھلان پر آرٹلری گن کا ایک گولہ آ کر زوردار دھماکے سے بلاسٹ ہوا۔پورا مورچہ ہی لرز کر رہ گیا تھا۔ہم دونوں جلدی سے نیچے بیٹھے تا کہ گولے کے پھٹنے سے چاروں جانب اڑنے والے لوہے کے ٹکڑوں بچ سکیں۔

گولے کی دھمک ختم ہوتے ہی میں جلدی سے اٹھ کر چلایا۔"رائفل کو چھوڑ دو الیاس اور نیچے چلو۔"

یہ کہتے ہی میں اٹھا،الیاس میرے جتنی تیزی نہیں دکھا سکا تھا ایک دم مورچے کی شمالی اور شرقی دیوار لڑھک گئی تھی۔وہ مورچہ بالکل فہیم اوپی کے شمال مشرقی کونے پر بنا تھا۔الیاس شمالی جانب پھسلا اور اگر وہ اس جانب گر جاتا اور پتھروں کی لپیٹ میں آنے سے بھی بچ جاتا تب بھی خود کو پہاڑی کی بنیاد تک پہنچنے سے پہلے روک نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس جانب کھڑی ڈھلان تھی۔اسّی ڈگری پر اٹھی ہوئی ڈھلوان لڑھکنے والے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا کرتی۔اس وقت میں نے تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بایاں بازو تھام کر اسے اپنی جانب کھینچا۔ایسا کرتے ہوئے وہ میرے بازوؤں میں آ گیا تھا۔چھت مشرقی اور شمالی جانب بالکل جھک گئی تھی اسے سنبھال کر میں اپنا توازن بھی کھو بیٹھا تھا۔جب مجھے لگا کہ ہم دونوں کسی صورت گرنے سے بچ نہیں سکتے ہیں تبھی میں نے اپنے استاد صادق،اس کے استاد ہاشم اور اس کے استاد گل کی پیروی کرنے میں سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگایا تھا۔الیاس کو جنوب کی جانب زوردار دھکا دیتے ہوئے میں خود شمال کی جانب گر گیا تھا۔نیچے گرتے ہوئے خود کو پتھروں کی لپیٹ میں آنے سے بچانے کے لیے میں نے لاشعوری طور پر مغرب کی طرف کھسکنے کی کوشش کی مگر سیدھی ڈھلان مجھے رکنے کا موقع دینے پر تیار نہیں تھی۔میں جس روایت کی زنجیر میں جکڑا تھا یقیناً اس روایت نے اپنی بھینٹ وصول کر لی تھی۔میری جگہ سنبھالنے کے لیے الیاس پہنچ گیا تھا اور اب میری ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا مشن میری زندگی کو نگلنے کے لیے تیار تھا۔دور گہرائی میں مجھے پلوشہ دونوں بانہیں کھولے اپنی منتظر نظر آ رہی تھی۔

میرے کانوں میں جو آخری آواز گونجی وہ الیاس کی زوردار چیخ تھی۔اس نے پوری قوت سے مجھے پکارا تھا۔
''استاد ذیشان ن ن ن...........''اس جانب ڈھلان ایسی تھی کہ ایک بار لڑھکنے والا کسی صورت میں سنبھل نہیں سکتا تھا۔ایک بات جو میرے حق میں جاتی تھی کہ اس طرف پتھریلی چٹانوں کے بجائے بھربھری مٹی اور کنکروں وغیرہ کی بہتات تھی۔پتھریلی چٹانیں ہونے کی صورت میں میرے سر کو ٹوٹنے سے بچانا شاید ممکن نہ رہتا۔میں نے اپنے حواس بحال رکھنے کی پوری کوشش کی ہوئی تھی لیکن میرا دماغ کسی پھرکی کی طرح گھوم رہا تھا۔پوسٹ پر شاید چیخ وپکار شروع ہوگئی تھی لیکن مجھے الیاس کی پہلی چیخ کے بعد کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔

ایک تسلسل سے لڑھکنے کی وجہ سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی مستند باکسر میرے جسم پر مسلسل گھونسے برسا رہے ہوں۔اچانک نیچے سے زمین ختم ہوئی اور میرا جسم ہوا میں بلند ہوگیا۔مجھے یقین ہوگیا کہ اب میرا بچنا محال ہے۔لڑھکتے ہوئے جسم کو چوٹیں ضرور لگ رہی تھیں لیکن وہ چوٹیں برداشت کی جا سکتی تھیں۔یوں ہوا میں بلند ہوکر پتھریلی زمین پر گرنے سے موت نہ بھی آتی کئی ہڈیوں نے ضرور ٹوٹ جانا تھا۔☆

اور پھر میرے جسم کا زمین سے اتصال ہوا،میں گلیشئر پر گرا تھا۔اگست کے مہینے کی آخر تھی۔برف اوپر سے یوریا کھاد کے دانوں کی طرح بھربھری ہوئی پڑی تھی،البتہ اس کی نچلی سطح سخت تھی۔میری ہڈیاں ٹوٹنے سے تو بچ گئی تھیں،لیکن برف پر تھوڑا سے لڑھکتے ہی ایک دم برف کی اوپری سطح ٹوٹی اور میں ایک کریوس میں لڑھکنے لگا۔
(کریوس،سخت برف کے اندر بنے ہوئے غار نما گہرے گڑھوں کو کہتے ہیں۔جو کافی گہرے ہوتے ہیں۔سیاہ چن گلیشئر میں تو کئی کریوسز ایسے ہیں جو ہزاروں سینکڑوں آدمیوں کو نگل چکے ہیں اور اب تک ان کا پیٹ نہیں بھرا۔وہ گلیشئر چھوٹا سا تھا مگر اس کریوس کی گہرائی اچھی خاصی تھی۔میں خود کو مزید لڑھکنے سے روکنے کی کافی کوشش کی مگر کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے پکڑ کر میں خود کو لڑھکنے سے روک سکتا۔تہہ میں پہنچ کر میں نے اوپر دیکھا کریوس کا منہ نظر نہیں آ رہا تھا۔یوں بھی شام کا ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔

مسلسل حرکت کی وجہ سے میرا جسم کافی گرم تھا۔میں نے جسم کی تمام دکھتی ہڈیوں کو ہاتھ لگا کر اچھی طرح جانچا،الحمداللہ کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔البتہ تمام جسم میں اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔لیکن اس وقت مجھے درد سے زیادہ

کریوس سے نکلنے کی فکر کرنا تھی۔ گو میں نے سردی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے گرم لباس پہنا ہوا تھا۔ کیونکہ فہیم او پی پر چلنے والی تیز ہوا اور سردی وغیرہ سے بچنے کے لیے رہائشی بینکر سے باہر نکلتے ہی گرم لباس کی ضرورت سختی سے محسوس ہوتی تھی۔ ٹریک سوٹ کے نیچے گرم پاجامہ، موٹا اوورکوٹ، سر پر اونی ٹوپی، پاؤں میں سپورٹس شوز وغیرہ۔ مگر اس گرم لباس کی کریوس کی سردی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک بھیانک موت میری منتظر تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب سے دستانے نکال کر ہاتھوں میں پہن لیے اور باہر نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گھپ اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ٹٹول کر کریوس کی دیواروں کا جائزہ لیا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر ٹھوس برف میں بلند ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہاں میری مدد کو کوئی بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں انڈیا کی جانب گرا تھا اور انڈین پوسٹ سے اس گلیشئر کا فاصلہ فہیم او پی سے کم تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی انڈین فوجی شب دید آلات کی مدد سے اس طرف کی دیکھ بھال شروع کر دیتے تھے۔ اگر فہیم او پی سے کوئی اتر کر اس جانب کا رخ کرتا تو لازماً وہ فائر کھول دیتے۔ ایک مجھے بچانے کے لیے دس مزید آدمیوں کی قربانی دینے کی ہمت کون کر سکتا تھا۔

انڈین اور پاک فوج کے جوانوں کے ساتھ گاہے گاہے اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ اور جوانب کے فوجی ایسے گرے ہوئے آدمی کو اٹھانے کے لیے آنے والی پارٹی سے تعرض بھی نہیں کرتے۔ مگر اب معاملہ اور تھا۔ پچھلے چند دنوں میں ہم اپنے سامنے والی پوسٹوں پر موجود دشمن کو کافی جانی نقصان پہنچا چکے تھے اور ایسی صورت حال میں غصے میں مبتلا دشمن کی پوری کوشش یہی ہونا تھی کہ کسی ایک آدمی کو مار کر وہ دل میں بھڑکنے والی آگ کو تھوڑا سا ٹھنڈا کر لیں۔ اور بالفرض انھیں معلوم ہو جاتا کہ گرنے والا آدمی وہی ہے جو براہ راست ان کے آدمیوں کو قتل کرنے کا ذمہ دار ہے تو وہ ہر قیمت پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرتے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس وقت میرے دماغ میں انڈین فوجیوں کا کوئی خوف نہیں تھا۔ مجھے مرنے سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ خاص کر ان دنوں تو جو میری حالت تھی اس میں موت ایک نعمت ہی لگتی ہے۔ پھر شہادت کی موت کا تو اپنا مزہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود برفانی قبر میں سسک سسک کر ایڑیاں رگڑتے ہوئے جان دینا مجھے گوارا نہیں تھا۔ ایسا شخص ان لمحات میں کس اذیت اور تکلف سے گزرتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی ذہنی ورزش کی

ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ کریوس کا منہ اوپر سے کھلا تھا اس لیے مجھے سانس رکنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔سردی البتہ میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو جمانے لگی تھی۔اس مختصر جگہ میں میں مسلسل حرکت میں تھا۔لیکن وہ حرکت جسم کو گرم کرنے میں کوئی مدد نہیں دے رہی تھی۔اگر کوئی کھلا میدان ہوتا اور میں مسلسل دوڑ لگا سکتا تو شاید کوئی فرق پڑ جاتا ۔اب اس محدود و مختصر جگہ پر حرکت کرنا بھلا مجھے کیا فائدہ دیتا۔

آہستہ آہستہ میرے ہاتھ پاؤں سن ہونا شروع ہو گئے تھے۔ناک اس طرح ہو گئی تھی جیسے میں اس جگہ برف کا گولا باندھ رکھا ہو۔اس سردی کا مقابلہ کرنا نہ تو کسی سناپر کے بس میں ہے اور نہ کسی کمانڈو وغیرہ کے۔وہ تو اللہ پاک کے عذابوں میں سے ایک عذاب ہے اور جو اس کی لپیٹ میں آجائے دردناک موت اس کا مقدر ہی بنتی ہے۔اس وقت میرے پاس دوا کی کوئی صورت باقی نہیں بچی تھی۔ایک دعا تھی جو میرے لبوں پر جاری تھی ۔مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے کم از کم یہ اطمینان تو میسر تھا کہ میری موت حالت اسلام میں ہو رہی تھی ۔اگر موت کی آمد کا یقین ہو جائے تو انسان کو اپنے گناہ بڑے واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔میری آنکھوں میں بھی اپنے گناہ اجاگر ہو گئے تھے۔میں زیر لب اپنے رحیم و کریم رب سے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔پھر میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی صورتیں گھومنے لگیں، مجھے ابو جان کا نورانی چہرہ نظر آیا۔ان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ رقصاں تھی، پھر امی جان نظر آئیں جو باہیں کھولے میری منتظر تھیں۔اسی وقت میری دوسری امی جان ،یعنی پلوشہ کی ماں نے میرے بازو کو پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔شاید وہ مجھے خود سے دور نہیں کرنا چاہتی تھیں ۔پھر مجھے جانِ حیات نظر آئی۔وہ میری دونوں ماؤں سے الگ بازو پھیلائے کھڑی تھی۔”راجو، میرے پاس آجاؤ نا..........“میں آہستہ سے کریوس میں بیٹھ گیا ہاتھ پاؤں کی حرکت سست پڑنا شروع ہو گئی تھی۔میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ایک سخت قسم کی تکلیف اور اینٹھن میرے بدن میں شروع ہو گئی تھی۔

سیدنا فاروقِ اعظم حضرت عمرؓ نے ایک بار حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا تھا کہ وقت نزع کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔تو انھوں نے جو جواب دیا اس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے۔”یا امیر المومنین ایک کانٹے دار جھاڑی کو جسم میں داخل کیا جائے اور اس کے کانٹوں سے جسم کے تمام اندرونی اعضاء کو لپیٹ کر منہ کے رستے ایک جھٹکے

سے باہر کھینچا جائے تو کیسا محسوس ہوگا، نزع کے عالم میں ایسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔“

وہ تکلیف میرا مقدر تھی۔ کہتے ہیں موت جس جگہ لکھی ہو، وہیں آتی ہے۔ نہ ایک سیکنڈ پہلے نہ بعد میں۔ سیدنا عزرائیلؑ مقررہ وقت پر تشریف لے کے آجاتے ہیں۔ اور اس وقت میں انھی کے انتظار میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اب نامعلوم میرے لیے کتنی گھڑیاں بقایا تھیں۔ اس وقت جو اذیت میرے جسم کو پہنچ رہی تھی اس کے بعد میں یہی دعا کر سکتا تھا کہ وہ جلد از جلد تشریف لے آئیں۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ موت نعمت اور نجات لگنے لگتی ہے۔ ایسی سردی سے ایک بار پہلے بھی میرا پالا پڑ چکا تھا جب میں گہری نیلی آنکھوں والی گلگارے کے دروازے پر زندگی کی بھیک مانگنے پہنچا تھا۔ اس وقت میرے دل میں زندہ رہنے کی خواہش موت سے برسرِ پیکار تھی، کیوں کہ اس وقت میری پلوشے زندہ تھی، اس وقت مجھے اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنا تھے، اس وقت مجھے مجاہدین کی مدد کرنا تھی لیکن اب میرے لیے کوئی ایسا کام باقی نہیں تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنے زندہ بچ جانے کی امید ہوتی۔ اپنا آخری مشن میں کامیابی سے پورا کر چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو دنوں میں ذخیرہ اندوزی کا کام پایہ تکمیل تک پہنچ جانا تھا۔ میری رائفل میرے پسندیدہ شاگرد تک پہنچ گئی تھی۔ اپنی زندگی کی قربانی دے کر میں نے اس روایتی زنجیر میں شہید ہونے والے اپنے سابقہ استادوں کی روحوں کو مایوس نہیں کیا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ انڈین آرمی کی ورکرس گن کی تڑتڑاہٹ میں خوب پہچانتا تھا۔ اس حالت میں بھی مجھے ہتھیاروں کے فائر سے ان کی قسم کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ جس کا ساری زندگی ہی مختلف قسم کے ہتھیاروں سے پالا پڑ چکا ہو مرتے وقت بھی اس کا لاشعور ان آوازوں کو اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں اس فائرنگ کے ہونے کی وجہ گونجی۔ یقیناً فہیم پوسٹ پر موجود میرے ساتھیوں نے میری تلاش کے لیے نیچے اترنے کی کوشش کی تھی اور اس کا جواب انھیں ورکرس کے فائر نے دیا تھا۔ ورکرس کا فائر دشمن کی فارورڈ ون سے فہیم او پی تک تو کارگر نہیں تھا البتہ گلیشئر ورکرس کی حدود میں آرہا تھا۔

ورکرس کے دو تین اور برسٹ میری سماعتوں میں گونجے اور اس کے ساتھ ہی جیسے مجھے الہام ہوا کہ وہ آواز میری سماعتوں اس شدت سے کیسے گونج رہی ہے۔ میں کریوس کی گہرائیوں میں تھا اور وہاں ورکرس کے فائر کی اتنی

تیز آواز کا پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ایسا صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ کریوس کی تہہ میں ایسا سوراخ ہوتا جس سے وہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہوتی۔

میری مردہ رگوں میں جیسے نئی زندگی پڑ گئی تھی۔میں نے آنکھیں کھول کر فائرنگ کی آواز کو غور سے سنا۔ایک جانب مجھے ہلکی سی روشنی کی جھلک نظر آئی۔یوں جیسے بتی جل رہی ہو۔

روشنی کی جگہ پر میں نے دستانے والے ہاتھ کا مکا رسید کیا اور میرا ہاتھ کلائی تک برف سے باہر نکل گیا۔میرا دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ہاتھ واپس کھینچتے ہی مجھے انڈین پوسٹ پر جلنے والی روشنی نظر آ گئی تھی۔میں دونوں ہاتھوں سے برف کو دھکیل کر سوراخ کو چوڑا کرنے لگا۔تین چار منٹ میں میں اتنا سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس سے رینگ کر میں اس برفانی قبر سے باہر نکل سکتا۔دونوں ہاتھ مضبوطی سے سوراخ کے کناروں پر جما کر میں باہر رینگ گیا۔میں گلیشئر کی بالکل تہہ میں پہنچا ہوا تھا۔دو تین کروٹیں لے کر میں برف کی سفیدی سے دور ہوا۔اس کے بعد پتھریلی زمین تھی۔سردی کی شدت میں ایک دم کمی ہوگئی تھی۔گو شام کے اندھیرے میں وہاں سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا،لیکن کریوس کے اندر کی سردی اور باہر کے موسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔کریوس کے اندر منفی بیس پچیس درجے سنٹی گریڈ تو ضرور ہوگا۔جبکہ باہر کا درجہ حرارت منفی دو تین ڈگری سے زیادہ نہیں تھا۔البتہ دسمبر جنوری میں باہر کا درجہ حرارت بھی منفی تیس، پینتیس ڈگری سنٹی گریڈ پر پہنچ جاتا تھا اور اس وقت کریوس کا اندرونی درجہ حرارت اس سے دگنا،تگنا ہو جاتا تھا۔

چند لمحے زمین پر لیٹے لیٹے میں نے جائزہ لیا۔جہاں سے میں گرا تھا وہاں اسی رستے سے پہنچنا ناممکن تھا۔کیوں کہ ایک تو بلندی بالکل ہی سیدھی تھی دوسرا وہ علاقہ انڈین فوج کے سنتری شِب دید آلات سے چھانتے رہتے تھے۔عام حالات میں وہ چڑھائی ایک نعمت ہی محسوس ہوتی کیوں کہ سیدھی ڈھلان کی وجہ سے دشمن کے جسمانی حملے کا خطرہ صفر فیصد بھی نہیں ہوتا تھا۔لیکن اس وقت وہ چڑھائی میری واپسی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔مجھے اپنے علاقے میں پہنچنے کے لیے ایک لمبا چکر کاٹنا تھا تب جا کر میں پاکستان کی حدود میں داخل ہوسکتا تھا۔اس جگہ سے حرکت کر کے کہیں دائیں بائیں جانا بھی خاصا مشکل تھا کیوں کہ دشمن کی پوسٹ بالکل سامنے تھی اگر ان کی نظر اس طرف اٹھ جاتی تو انھوں نے مجھے گولیوں سے بھون دینا تھا۔اس وقت میری

حالت منیر نیازی کے اس شعر کے مصداق تھی......

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار پہنچا تو میں نے دیکھا

مگر میں ایک بڑی مصیبت سے جان چھڑا چکا تھا۔کریوس میں ایڑیاں رگڑنے سے گولی کی موت کہیں آسان تھی۔یوں بھی میں ساری زندگی گولیوں سے کھیلتا آ رہا تھا اور اب گولی ہی سے مرنا میرا حق بنتا تھا۔

میں کھڑا ہونے کے بجائے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے نیچے اور بائیں کی جانب ہٹنے لگا۔وہاں میں دشمن کی پوسٹ کے بالکل سامنے تھا۔تھوڑا سا ایک جانب ہوتے ہی میں کھڑا ہو کر دائیں جانب موجود نالے میں حرکت کر سکتا تھا۔کریوس اور کلاشن کوف کا فائر وقفے وقفے سے جاری تھا۔اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔لیکن شبِ دید آلات کی موجودی اس اندھیرے کو بے کار کر دیتی ہے۔اور انڈین آرمی کے پاس ایسے آلات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔شب دید آلات میں سب سے خطرناک صوفی تھرمل سائیٹ ہے کیوں کہ یہ گھپ اندھیرے میں ہونے والی معمولی حرکت کو ظاہر کر دیتی ہے۔بلکہ حرکت نہ کرنے پر بھی یہ جانداروں کی نشان دہی بہت آسانی سے کر دیتی ہے۔اس کے بلیک اینڈ وائیٹ نظارے میں زندہ اشیاء سفید دھبوں کی طرح نظر آتی ہیں اور بے جان اشیاء کالے دھبوں کی صورت میں اس لیے جہاں بھی سفید دھبہ نظر پڑے سائیٹ میں جھانکنے والے کو فوراً کسی زندہ جسم کی موجودی کا ادراک ہو جاتا ہے۔

حرکت کرنے سے میرا جسم بھی آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔کریوس کی جان لیوا سردی دھیرے دھیرے میرے رگ و پے سے دور ہونے لگی۔میرے دل میں دیکھ لیے جانے اندیشہ موجود تھا۔اور اس اندیشے نے جلد ہی حقیقت کا روپ دھار لیا۔تیز فائرنگ کی آواز کے ساتھ گولیوں کا رخ مجھے اپنی جانب ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔میں نے فوراً ہی ایک پتھریلی چٹان کی آڑ لے لی۔دائیں بائیں لگنے والی گولیوں نے میری نس نس میں بجلی بھر دی تھی۔میں زیادہ دیر وہیں پڑا دشمن کی کسی تلاشی پارٹی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔فہیم اوپی سے پاکستان کی مایہ ناز گن، ایل ایم جی کی تڑتڑاہٹ ایک تسلسل سے سنائی دینے لگی۔یہ تڑتڑاہٹ بھی میرے لیے خطرے کا نشان تھی کیوں اس کی کوئی اچٹتی ہوئی گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔لیکن اس وقت میں اپنے ساتھیوں تک یہ

پریشانی پہنچانے کا کوئی ذریعہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔اور نہ دشمن کی کسی پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ہتھیار موجود تھا۔

وکرس کے فائر میں ذرا سا ٹھہراؤ آتے ہی میں بھاگ کر نیچے جانے لگا۔نالے میں جا کر میں دشمن کی چلائی ہوئی گولیوں سے محفوظ ہو سکتا تھا۔فی الحال اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا۔میری آنکھوں کو دائیں بائیں بکھری بڑی چٹانوں کا ادراک اچھی طرح ہو رہا تھا۔البتہ چھوٹے موٹے پتھر میری نظروں سے اوجھل تھے۔تیزی کے ساتھ میں نے درستی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔نیچے گرنے کی صورت مجھے کوئی شدید چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔

ایک بار پھر فائر کی آواز سنتے ہی میں نے قریب موجود ایک پتھری آڑ لے لی۔میرے لیے سب سے مفید بات یہ تھی کہ وہ شست لے کر فائر نہیں کر سکتے تھے۔صوفی سائیٹ سے وہ میری حرکت تو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ سائیٹ وکرس پر نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ میرا نشانہ سادھ سکتے۔یقیناً ایک آدمی صوفی نائیٹ سائیٹ میں دیکھ کر فائر کرنے والے کو سیدھائی دے رہا ہوگا۔اور اس طرح کسی کو نشانہ بنانا ممکن نہیں ہوتا۔جبکہ وکرس پر لگائی جانے والی شب دید سائیٹ کی رینج اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس سے پانچ چھے سو میٹر پر کارگر فائر کیا سکتا۔(شبِ دید آلات میں صوفی تھرمل نائیٹ سائیٹ تھرڈ جنریشن ہے اور اس کے متعلق میں کہانی کے ابتداء میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں نئے پڑھنے والے وہیں دیکھ لیں)

میں اس پتھر کے پیچھے زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔چند گز دور نظر آنے والے دوسرے پتھر کے ہیولے کو نگاہ میں رکھ کر میں سرعت سے وہاں منتقل ہو گیا۔

فہیم اوپی اور دشمن کی فارورڈ ون کے علاوہ بھی دور دور سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔پورا سیکٹر ہی فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔سرحدی علاقے میں اس طرح ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔تمام پوسٹیں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی فائرنگ شروع کر دیتی ہیں۔نالے میں اترتے ہی میں کسی مخصوص سمت کو اختیار کرنے کے بارے متذبذب ہو گیا۔

وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا نہیں تھا۔میں نے نقشے کے ذریعے اس علاقے کا سرسری جائزہ تو لیا تھا،لیکن چونکہ اس علاقے میں کسی مشن کے لیے نہیں جانا تھا اس لیے میں نے زیادہ باریک بینی سے نقشہ پڑھنے کی ضرورت

محسوس نہیں کی تھی۔ میرا کام تو بس دشمن کی دو پوسٹوں پر فائر کرنا تھا۔ اور میں نے اپنی پوسٹ سے کہیں بھی نہیں جانا تھا۔ اب جبکہ میں اتفاقی طور پر نیچے آ گیا تھا تو مجھے اس علاقے سے واقفیت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پہاڑی علاقے میں سمت کو برقرار رکھنا یوں بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔ تمام رستے بھول بھلیوں کی طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہوتے ہیں۔ سونے پر سہاگا یہ کہ اس علاقے میں پاکستان، انڈیا کی سرحد بھی کسی ترتیب سے نہیں بنی ہوئی۔ بالکل ٹیڑھی میڑھی سرحد ہے۔ کہیں انڈین آرمی، پاکستانی سرحد میں آگے تک چلی آئی ہے اور کہیں پاک آرمی کئی کلومیٹر تک انڈیا میں گھسی ہے۔ ان تمام مسائل کو مدنظر رکھ آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کسی مخصوص سمت کو اختیار کرنے کے لیے کتنا متذبذب ہو سکتا تھا۔ مغربی نالے میں اگر سیدھا چلتا جاتا تو آگے بائیں ہاتھ خرم اوپی آتی، مگر اس جگہ اس کی بلندی عبور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اور پھر اس کے سامنے دشمن کی پوسٹ ٹرپل سیون بھی موجود تھی۔ میں جس نالے میں اس وقت موجود تھا گو وہ دونوں ممالک کی افواج نگرانی میں تھا، مگر نالے کے اندر پاکستان سے زیادہ انڈین آرمی کا قبضہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی اس جانب پاک آرمی کے جوان نالے میں اتر نہیں سکتے تھے۔ جبکہ انڈین آرمی کے فوجیوں کی وہاں تک رسائی نہایت آسان تھی۔ اسی طرح انڈین فوجی نہایت آسانی سے نالے میں موجود افراد کو فائر کا نشانہ بنا سکتے تھے جبکہ پاک آرمی کا کوئی مستند سنائپر تو نالے میں کامیاب فائر کر سکتا تھا عام فائرر کی رینج سے وہ نالہ دور تھا۔

میں نے سرسری طور پر سوچ کر مغرب کی جانب جانے کا فیصلہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی جانب رخ کرنے کے لیے مجھے فارو ڈون کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہی میں دوڑ پڑا، مگر یہ دوڑنا میدانی علاقے کی طرح سرپٹ نہیں تھا۔ اس کی وجہ ایک تو آکسیجن کی کمی تھی، دوسرا دکھاؤ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ فارو ڈون اور ٹرپل سیون کے درمیان ایک نالہ گزر رہا تھا۔ جبکہ خرم اوپی اور فہیم اوپی کے درمیان کوئی نالہ نہیں پڑتا تھا۔ دونوں پوسٹوں کے درمیان ایک دشوار گزار پہاڑی سلسلہ تھا۔ جو خرم اوپی کے بیس کے پاس جا کر نیچے دب جاتا تھا۔ اور وہی جگہ خرم اوپی کا بیس تھی۔ لیکن اس بیس کی چڑھائی نالے کی طرف سے بالکل سیدھی تھی۔ البتہ ون ٹرپل سیون سے گزر کر یقیناً راستہ موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ فہیم اوپی کے پوسٹ کمانڈر کے بہ قول دشمن کے قبضے میں جب یہ اوپی تھی تب وہ اسی طرف سے

اپنے آدمی اوپر چڑھایا کرتا تھا۔اب مجھے اس جگہ تک پہنچنا تھا۔ٹرپل سیون پوسٹ کی روشنی نظر آتے ہی میں نے اپنی رفتار آہستہ کرلی تھی۔اس جگہ سے مجھے احتیاط سے گزرنا تھا۔اس وقت پوسٹ کے متوازی ہونے میں سوگز کا فاصلہ رہتا ہوگا کہ اچانک ماحول دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔گولی میرے قریب سے ”شوں“ کرکے گزری تھی ۔میں فوراً منھ کے بل لیٹ گیا۔اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کسی کی جھلاتی ہوئی آواز آئی۔

”بے وقوف انسان،تمھیں کس الو کے پٹھے نے فائر کرنے کا کہا ہے؟“انھوں نے میرے لیے ناکا بندی کی ہوئی تھی اور میں نے بغیر کسی شک وشبے کے ان کے قابو میں آجانا تھا۔لیکن ایک آدمی کی بے صبری یا اضطراب نے مجھے چوکنا کردیا تھا۔اسی بات پر سینئر اسے ڈانٹ رہا تھا۔

نیچے لیٹتے ہی میں پیچھے ہٹنے لگا۔ہتھیار کی غیر موجودی مجھے بے دست وپا بنا رہی تھی۔

”اب وہ بھاگ رہا ہے فائر کرو۔“اس مرتبہ سینئر نے تمام کو اجازت دے دی تھی۔ایک دم گولیوں کی تڑتڑاہٹ شروع ہوگئی تھی۔میرے لیٹ جانے کی وجہ سے ہدف انھیں نظر نہیں آرہا تھا وہ بس اندازے سے فائرنگ کررہے تھے۔

وہ اپنی جگہ پر موجود رہ کر فائر کررہے تھے۔اس کے بجائے اگر وہ آگے بڑھ کر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہوگئے ہوتے۔محسوس یہی ہورہا تھا کہ انھیں میرے پاس ہتھیار کی موجودی کا خطرہ تھا۔اور یہی بات انھیں آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھی۔ایک پتھر کی آڑ میں رہتے ہوئے میں پیچھے کھسکتا رہا۔چند گز پیچھے ایک بڑی چٹان تک پہنچ کر میں نے چٹان کی آڑ لی اور ترچھا ہوکے بھاگ پڑا۔جس طرح دشمن نے ٹرپل سیون پوسٹ سے نالے میں اتر کر میرے لیے گھات لگائی تھی،میرے اندازے کے مطابق انھیں فارورڈ ون سے بھی اترنا چاہیے تھا۔اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نالے کے دونوں جانب یعنی مغرب اور مشرق میں دشمن کے مسلح افراد موجود تھے۔جنوب کی طرف کھڑی ڈھلانیں اور شمال کی جانب دشمن کی پوسٹیں تھیں۔اس چوہے دان میں صرف ایک راستہ باقی تھا جہاں سے میرے بھاگ نکلنے کی تھوڑی سی امید بقایا تھی اور وہ فارورڈ ون اور ٹرپل سیون پوسٹ کے درمیان موجود نالہ تھا۔یہ نالہ شمال کی جانب نکل رہا تھا۔اس نالے میں بھی آگے جاکر تو لازماً دشمن کی پوسٹوں نے موجود ہونا تھا۔لیکن اس وقت مرحلہ تھا اس گھیرے سے نکلنے کا۔اگر تو دشمن کے سپاہیوں نے

اس نالے پر بھی اپنے آدمی کھڑے کیے ہوتے تب تو میرا مارا یا پکڑا جانا یقینی تھا۔عقب میں مجھے دشمن کی للکاریں اور چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔دشمن کے ان آدمیوں نے لازماً فارورڈ ون پوسٹ والوں کو میرے بھاگ نکلنے اوران کی جانب رخ کرنے کا بتادیا ہوگا۔

جلد ہی میں دونوں پوسٹوں کے درمیان موجود نالہ موڑ پر پہنچ گیا تھا۔مشرقی اور مغربی دونوں نالوں کا پانی شمالی نالے ہی میں گر رہا تھا۔گویا شمال کی جانب اترائی تھی۔شمالی نالے میں مڑتے ہی میرے قدموں رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر میں تیسری مرتبہ گرا اور اٹھ کر پھر بھاگ پڑا۔بھاگتے ہوئے میری نظر دائیں جانب ڈھلان پر پڑی پانچ چھے سو گز دور ٹارچوں کی روشنیاں شمالی نالے کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔وہ شمالی نالے پر بھی ناکا لگانے آرہے تھے۔لیکن شاید انھیں تھوڑی سی دیر ہوگئی تھی۔اور دیر کی وجہ ان کی غفلت کے بجائے وقت کی کمی تھی۔کیوں کہ میرے فہیم اوپی سے نالے میں گرنے اور دشمن کو اس بارے معلوم ہونے کے بعد اتنا وقت نہیں گزرا تھا۔دشمن نے پہلے ان دو رستوں کی ناکا بندی کی تھی جہاں سے میرا بھاگ نکلنا یقینی تھا۔اوراب جبکہ میں ٹرپل ون پوسٹ کے آدمیوں کی گھات سے بچ نکلا تھا تو انھیں بھی شمالی نالے کا خیال آگیا تھا۔

ٹارچوں کی روشنی کو دیکھتے ہی میرے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔مسلسل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھوں کی کارکردگی کافی بڑھ گئی تھی۔گو میں کافی دفعہ ٹھوکر کھا کر گر چکا تھا،لیکن اس وقت احتیاط سے چلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔آکسیجن کی کمی تیز رفتاری کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔اور چونکہ یہی مسئلہ دشمن کو بھی درپیش تھا اس لیے وہ مجھ سے زیادہ تیز رفتاری نہیں دکھا سکتے تھے۔یوں بھی میری مثال اس ہرن کی سی تھی جو جان بچا کر بھاگ رہا ہو۔اور ایسی حالت میں ہرن دنیا کے تیز رفتار جانور چیتے کو بھی مات دے جاتا ہے۔

میں شمالی نالے میں آگے گزرتا چلا گیا۔نالہ بتدریج شمال کی جانب بڑھتا جارہا تھا۔لیکن اس نالے میں میرا مسلسل بڑھتے رہنا مناسب نہیں تھا۔میری وہاں موجودی کی خبر یقیناً دشمن کی ہر پوسٹ تک پہنچ گئی تھی۔اور ابھی تک میں ایک محدود علاقے ہی میں بھاگ رہا تھا۔اس محدود جگہ کو گھیرنا دشمن کے لیے مشکل نہیں تھا۔مجھے بچنے

کے لیے اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرنا ضروری تھا۔اور اسی بات میں میری نجات تھی۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میں ایسے رستے پر حرکت نہ کرتا جو دشمن کو میرے بھاگنے کی سمت سے آگاہ رکھتا۔ یہی سوچ کر نالے میں پانچ چھے سو گز آگے جاتے ہی میں نے بھاگنا موقوف کرتے ہوئے بائیں جانب موجود ڈھلان پر چڑھنا شروع کر دیا۔یوں کہ بلند ہونے ساتھ میرا آگے کا سفر بھی جاری رہا۔

پہاڑ کی بلندی پر تو اگر آدمی تیز قدموں سے چلتا ہوا جائے تب بھی سانس بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے۔اس وقت بھی میرا سینہ جیسے پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔دو منٹ رک کر میں نے سانس بحال کیا اور اس دوران دائیں بائیں کا جائزہ لیتا رہا۔نالہ ملاپ پر ٹارچوں کی روشنی نظر آنا بند ہو گئی تھی۔نامعلوم دشمن وہیں رک گیا تھا یا نالے میں آگے بڑھ رہا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ ایک پارٹی وہیں رک گئی ہو اور دوسری نالے میں آگے بڑھتی آ رہی ہو۔

اچانک ہی نالہ ملاپ کی جانب زبردست قسم کی فائرنگ کی آواز ابھری۔نامعلوم وہ تلاشی فائر کر رہے تھے یا کوئی بد قسمت جانور ان کے آگے چڑھ گیا تھا۔سانس بحال ہوتے ہی میں پھر بلند ہونے لگا۔پہاڑی ڈھلان پر راستہ بنا نہ ہونے کی صورت میں سفر کرنا کتنا مشکل اور دشوار ہے اس کے بارے صرف وہی شخص اندازہ کر سکتا ہے جس کا واسطہ پہاڑوں سے پڑ چکا ہو۔ٹیلی ویژن سکرین کے سامنے بیٹھ کر سر سبز پہاڑوں کے نظارے کرنا اور بات ہے لیکن جب خود انسان کا ان پہاڑوں سے واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سہانوں نظاروں کے پیچھے کیا مصیبت چھپی ہے۔

گرتا سنبھلتا میں آگے بڑھتا رہا۔چند سو گز کے بعد اچانک ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں راستہ بنا ہوا تھا۔اور یہ راستہ خطرے کا بہت بڑا نشان تھا۔اس علاقے میں راستہ صرف انڈین فوج کی آمد و رفت ہی سے بن سکتا تھا۔وہ خالصتاً سرحدی علاقہ تھا وہاں سول آبادی کافی پیچھے تھی۔

میں رستے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا۔اب میرے قدموں میں تیزی سے زیادہ احتیاط در آئی تھی۔دشمن کہیں بھی گھات لگا کر بیٹھا ہو سکتا تھا۔اور تیز قدموں سے جہاں میرا سانس پھول رہا تھا اور گہرے سانسوں کی آواز دور تک سنائی دے سکتی تھی وہیں پاؤں کے نیچے آ کر لڑھکنے والے روڑے اور کنکر بھی میرا راز فاش کر سکتے تھے۔

مزید سو ڈیڑھ سو گز چلنے کے بعد مجھے اس احتیاط کا پھل مل گیا۔ ایک دم ہی میرے کانوں میں ریڈیو سیٹ کی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز پڑی اور میرے قدم رک گئے۔ پچاس ساٹھ قدموں کے فاصلے پر بیٹھا کوئی ریڈیو سیٹ پر بات کر رہا تھا۔

''یس سر، ہم اپنی جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔ اوور......''

پوچھا گیا۔ ''نالے میں اترے ہو یا اوپر بیٹھے ہو؟ اوور......''

''قریباً ڈیڑھ سو گز بلندی پر بیٹھے ہیں۔ اوور......''

''تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں اور شب دید عینک موجود ہے اوور......''

''ٹوٹل پانچ آدمی ہیں اور شب دید عینک نہیں ہے۔ اوور......''

''کیوں نہیں ہے اوور......'' پوچھنے والے کے لہجے میں جھلاہٹ شامل تھی۔

جواباً تفصیل بتاتے ہوئے کہا گیا۔ ''سر، پوسٹ پر تین شبِ دید عینکیں تھیں۔ پوسٹ کمانڈر نے دو تو پوسٹ پر موجود سنتریوں کے حوالے کر دیں اور تیسری ہم سے پہلے نکلنے والی پارٹی لے گئی ہے۔ اوور......''

''اندھیرا ہے، احتیاط سے کام لینا۔ دشمن غائب ہو چکا ہے اور اندازہ ہے کہ وہ اسی نالے میں موجود ہے اوور اینڈ آل۔'' کہہ کر سینئر نے بات چیت ختم کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کسی دوسری پارٹی کو پکارنے لگا تھا۔ وہاں پر موجود آدمی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ موضوع میں ہی تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے وہ آگے نکل گیا ہوگا۔''

''دیپ راج، تمھارا دماغ خراب لگتا ہے۔'' یہ اسی آدمی آواز تھی جو ریڈیو سیٹ پر بات کر رہا تھا یقیناً وہ ان کا سینئر تھا۔

دیپ راج کی آواز ابھری۔ ''سر جی، نالہ موڑ سے یہاں تک آدھا کلو میٹر فاصلہ بن رہا ہے، اگر وہ نالے ہی نالے میں بھاگ رہا ہے تو یقیناً وہ آگے نکل گیا ہوگا۔ ہمیں یہاں پہنچے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ ہوئے ہیں۔''

''اطلاع ملتے ہی ہم پوسٹ سے اتر آئے تھے اور پوسٹ سے یہاں تک کا فاصلہ کلو میٹر سے کم ہے۔'' سینئر نے دیپ راج کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ایک اور آواز ابھری۔ ''سر پرتاپ، چھوڑیں اس بے وقوف آدمی کو، اس کی ہر سے نرالی منطق ہوتی ہے۔''

ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے میں وہاں سے گزرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ جس پوسٹ سے اترے تھے وہ قریب ہی تھی۔ کلومیٹر بھر کا فاصلہ پہاڑی علاقے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر میرے پاس ہتھیار ہوتا تو ان پانچوں کا صفایا کرنا نہایت آسان تھا۔ لیکن اب خالی ہاتھ پانچ مسلح افراد پر حملہ بولنا ممکن نہیں تھا۔ لازماً پیچھے میں جو راستہ چھوڑ کر آیا تھا وہ ان کی پوسٹ تک ہی جاتا تھا۔ میں بندر چال چلتا ہوا وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ (بندر چال ایک فوجی اصطلاح ہے یعنی ایک فوجی کا دشمن کے علاقے میں زمین پر بیٹھ کر اپنے سامنے کے علاقے کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے ہوئے بغیر آواز نکالے حرکت کرنا)

چونکہ وہ نیچے نالے کی طرف متوجہ تھے اس لیے میں مزید بلندی پر چڑھنے لگا۔ مزید سو گز اوپر آ کر میں کھڑے ہو کر وہاں آگے بڑھ گیا۔ اب ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مگر میرا وہاں سے گزرنا زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے آ کر ایک درمیانی جسامت کا پتھر اپنی جگہ سے کھسکا اور لڑھکتے ہوئے نشیب میں گرنے لگا۔ رات کی خاموشی میں مجھے وہ آواز صورِ اسرافیل سے کم درجہ نہیں لگی تھی۔

پتھر کے لڑھکنے کا جواب چند سیکنڈ کے اندر کلاشن کے کوف کے برسٹ کی صورت میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ اس پارٹی کے پاس شب دید آلہ موجود نہیں تھا۔ کلاشن کوف چلانے والے نے بیرل کا رخ لڑھکنے والے پتھر کی طرف رکھا تھا اس لیے گولیاں میری جانب نہیں آئی تھیں۔ لیکن کسی بھی وقت بیرل کا رخ میری جانب ہو سکتا تھا۔ میں وہاں رک کر کسی پتھر کی آڑ بھی لے سکتا تھا۔ لیکن دشمن پارٹی تلاشی لیتے ہوئے اس جانب کا رخ کرتی تو میں پکڑا جاتا۔ اور وہاں سے آگے بڑھنے کی صورت میں کسی اندھی گولی کا شکار بننے کا خطرہ تھا۔

میں موخّر الذکر خطرہ مول لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اب میں نے اوپر چڑھنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے ڈھلان پر ترچھے ہی آگے قدم بڑھا دیے تھے۔ اس طرح میں اوپر چڑھنے کی نسبت ذرا تیز قدموں سے نالے کے متوازی سفر کر سکتا تھا۔ پینتالیس ڈگری زاویے پر جھکی ہوئی ڈھلان میرے نیچے لڑھکنے کے خطرے کو کم کر رہی تھی۔ گولیاں وقفے وقفے سے چل رہی تھیں۔ چونکہ وہ علاقہ سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند تھا

اس لیے وہاں جھاڑیاں، درخت وغیرہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ دن کے وقت تو میں دور ہی سے نظر آ جاتا۔ اچانک فائرنگ کی آواز تیز ہوئی۔ میں چند قدم پیچھے ایک پتھریلی چٹان چھوڑ آیا تھا۔ فوراً ہی رکتے ہوئے میں نے اس چٹان کی آڑ لے لی۔ نجانے میں دشمن کو نظر آ گیا تھا یا یونھی انھیں ایمونیشن کو ضائع کرنے کا شوق چرایا تھا۔ عقب میں مجھے دو اڑھائی سو قدم دور دو ٹارچیں روشن نظر آ رہی تھیں۔ آنے والوں کا رخ اسی جانب تھا۔ دو ٹارچوں کو روشن دیکھ کر مجھے خیال آیا شاید ان کے دو آدمی ہی اس طرف آ رہے ہیں اور باقی وہیں بیٹھے ہیں۔ اگر آنے والے واقعی دو تھے تو میں ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ہتھیار کے علاوہ میں بالکل ہی بے دست و پا تھا۔ اس خیال نے مجھے وہیں لیٹنے پر مجبور کیے رکھا۔ اگر وہ پانچوں ہی اس سمت کو آ رہے تھے تب تو میرا بچنا محال ہو جانا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیوں وہ چھوٹے چھوٹے برسٹ چلا کر مسلسل فائر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یونھی دو، دو، تین، تین گولیاں چلا کر انھوں نے پوری میگزین ختم کر دی تھی۔

وہ رک کر ٹارچ کی روشنی میں نئی میگزین لگانے لگے۔ کلاشن کوفیں دوبارہ کاک کر کے وہ چل پڑے نئی میگزین سے انھوں نے فائر نہیں کیا تھا۔ پچاس ساٹھ قدم دور ہی سے ان کی باتوں کی آواز آنے لگی تھی۔ علاقے کو مدنظر رکھ کر وہ آگے پیچھے ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس علاقے میں پھیل کر آگے بڑھنا کافی مشکل ہے۔ بلکہ زیادہ تر جگہوں پر تو ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اب مجھے واضح طور پر نظر آ گیا تھا کہ وہ دو ہی تھے۔ میں ذہنی طور پر ان کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

”کوئی لومڑ وغیرہ ہی تھا۔“ پہلی واضح بات میری سماعتوں میں پہنچی۔

”صحیح کہہ رہے ہو یار۔“ دوسرے کی آواز سنائی دی۔

میں جس پتھر کے عقب میں چھپا تھا انھوں نے وہاں چند گز نیچے سے گزرنا تھا۔ اور پھر میری بدقسمتی کہ بیس پچیس گز دور رک کر انھوں نے چاروں طرف ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ایک آدمی نے پیچھے مڑ کر زوردار آواز میں پکارا۔

”سر، یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔“

"اچھی طرح تسلی کرلی ہے۔" ان کے سینئر کی آواز ابھری۔

"جی سر۔" پہلی بار آواز دینے والے نے جواب دیا۔اس دوران ٹارچ کی روشنی اسی پتھر پر آ کر ٹھہر گئی تھی جس کے عقب میں میں چھپا تھا۔میں اپنے آپ میں مزید سمٹ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے واپس آ جاؤ۔" سینئر کی اطمینان بھری آواز گونجی۔

"اس پتھر کے پیچھے دیکھ لیں۔" ایک نے مشورہ چاہنے والے انداز میں پوچھا تھا۔میرے اعصاب ایک بار پھر تن گئے تھے۔

"ضرورت نہیں ہے۔" دوسرا یہ کہہ کر واپس مڑ گیا۔

"راجیش!......ٹھہرو، دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔" پہلے والا مصر ہوا۔

راجیش رکتے ہوئے بولا۔"اچھا دیکھ لو میں یہیں پر تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اگر وہ اس پتھر کو نظر میں رکھ کر ہتھیار تانے ہوئے اس جانب کا رخ کرتا تو میں آسانی سے اس پر قابو نہ پا سکتا خاص کر اس صورت میں جب بیس پچیس قدم دور اس کا مسلح ساتھی بھی موجود ہوتا۔

"رہنے دو۔" راجیش کی بے دلی دیکھتے ہوئے اس نے بھی ارادہ منسوخ کر دیا تھا۔میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔میں وہیں پڑا ان کے دور جانے کا انتظار کرتا رہا۔آہستہ آہستہ ان کی بات چیت کی آواز معدوم ہونے لگی اور میں اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

دو تین سو قدم چلنے کے بعد میں ایک بار پھر بلند ہونے لگا۔کیونکہ اس نالے میں میرے لیے زیادہ خطرہ تھا۔پہاڑی عبور کر کے میں دوسرے نالے میں اتر کر زیادہ محفوظ ہو جاتا۔اب میں آگے جانے کے بجائے مسلسل بلند ہو رہا تھا۔

جو لوگ پہاڑی علاقے میں رہ چکے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ بلندی کا سفر سیدھی لائن میں طے نہیں کیا جا سکتا۔آدمی کو زگ زیگ میں چل کر اوپر چڑھنا پڑتا ہے۔اس طرح گرنے کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے اور انسان کو چلنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

آدھے پون گھنٹے بعد میں پہاڑ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔دن کا وقت ہوتا تو میں علاقے کا جائزہ لے سکتا تھا

رات کا اندھیرا مجھے ایسی کسی کارروائی کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھا۔اب اگلے نالے میں اتر کر میں واپس جنوب کا رخ بھی کرسکتا تھا،لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس نالے کے اختتام پر مجھے دشمن ضرور ملتا۔کیوں کہ دشمن کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ میں واپس پاکستان کی سرحد عبور نہ کرسکوں۔اور وہاں پر میرا سرحد عبور کرنا یقیناً ناممکن ہی تھا۔البتہ اس علاقے سے دور جا کر مجھے سرحد عبور کرنے میں اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔اور ایک دو دن گزرنے کی وجہ سے میری تلاش میں بھی پہلی جتنی تندی نہ رہتی۔اس سوچ نے مجھے واپس مڑنے سے باز رکھا تھا۔

نالے میں اترنے کے بجائے میں نے بلندی ہی پر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ابھی تک میرا رخ شمال کی جانب تھا۔آسمان پر چمکتا قطبی ستارہ سمت کے تعین کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔دو تین سو گز چلنے کے بعد ڈھلان نیچے کی جانب اترنے لگی۔اسی لائن میں ایک پہاڑی کا ہیولہ سامنے بھی نظر آ رہا تھا لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے پہلے مجھے مکمل نالے میں اترنا پڑتا۔مجھے وہ نالہ کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔وہ ایسی جگہ تھی جہاں دشمن ناکا لگا سکتا تھا،کیوں کہ وہ دونالوں کو ملانے والا ایک مختصر سے نالہ تھا۔اور دشمن کی نظر میں میں اپنے دائیں ہاتھ موجود نالے سے بائیں یعنی مغربی جانب موجود نالے میں منتقل ہوسکتا تھا۔

ایک لمحہ رک کر میں نے خود کو دشمن کی جگہ رکھ کر سوچا کہ وہاں وہ کس جگہ پر اپنے آدمی بٹھا سکتا تھا۔آیا وہ اس ملاپ والے نالے کو عبور کر کے مغربی نالے میں ناکا لگاتا۔یا میرے دائیں ہاتھ موجود مشرقی نالے میں پارٹی لگاتا۔مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ دشمن کے لیے مشرقی نالے کے سرے پر آدمی بٹھانا زیادہ مناسب تھا کیوں کہ اس طرح ایک تو وہ میرے مغربی نالے میں مڑنے کی نگرانی کر سکتے تھے۔دوسرا بالفرض میں مشرقی نالے ہی میں سفر کرنا مناسب سمجھتا تو مشرقی نالہ بھی ان کی نظر میں ہوتا۔اس کے برعکس مغربی نالے میں میں صرف اس وقت ان کا نشانہ بنتا جب میں مشرقی نالہ چھوڑ کر مغربی نالے میں انتقال کا سوچتا۔اور ایک بات تو یقینی تھی کہ دشمن کی نظر میں میں ابھی تک مشرقی نالے ہی میں چھپا تھا یا سفر کر رہا تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہی میں پچاس قدم پیچھے چل کر مغربی جانب اترنے لگا۔بلندی کے بجائے نیچے اترتے وقت گرنے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔اس طرح پاؤں کے نیچے سے کنکر اور پتھر وغیرہ بھی زیادہ لڑھکتے ہیں۔اس لیے میں حتی الوسع آرام اور احتیاط سے اتر رہا تھا کہ کنکر اور پتھر وغیرہ میرے پیروں سے ٹکرا کر نیچے لڑھک کر میرا

رازنہ فاش کرتے رہیں۔دشمن نے مجھے پکڑنے یا مارنے کے لیے چاروں طرف اپنی پارٹیاں پھیلا دی تھیں۔اور کسی بھی جگہ پر ان کی پارٹی موجود ہوسکتی تھی۔

نالے کی تہہ میں پہنچنے تک مجھے اتنا ہی وقت لگا تھا جتنا اس پہاڑی کی بلندی پر چڑھتے ہوئے لگا تھا۔ایک بات ذہن میں رہے کہ وزیرستان کے پہاڑ ہیں یا کوئی اور پہاڑی سلسلہ ہے ان میں تمام نالوں کا بہاؤ کسی مخصوص سمت میں نہیں ہے۔بھول بھلیوں کی طرح ہر نالے کا اپنا ہی رخ ہے۔آخر میں آ کر البتہ تمام نالے دریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اور پانی مختلف اطراف میں بہنا شروع کر دیتا ہے۔کچھ نالوں کا پانی کشمیر کا رخ کرتا ہے اور کچھ نالوں کا رخ پاکستان کی طرف ہو جاتا ہے۔

مشرقی نالے میں چلتے ہوئے میں مسلسل نشیب میں جا رہا تھا جبکہ مغربی نالے میں جاتے ہوئے مجھے ہلکی چڑھائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اچانک ریڈیو سیٹ کی کھڑ کھڑاتی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا، میرے اندازے کے برعکس دشمن اس جانب موجود تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ دشمن نے دونوں جانب اپنے آدمی بٹھائے ہوتے۔ریڈیو سیٹ پر کسی اور پارٹی کو پکار کر ان سے فائرنگ کرنے کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔سر شام جس وقت سے میں بھاگا تھا فائرنگ کی آواز وقفے وقفے سے گونج رہی تھی۔یوں بھی ہندو اس لحاظ سے کافی بہادر ہیں کہ پتے کے کھڑکنے پر بھی میگزین خالی کر دیتے ہیں اور آج تو یقینی طور پر ایک مسلمان فوجی ان کی صفوں میں موجود تھا جس پارٹی کو ذرا شبہ ہو جاتا وہ فائر کھولنے میں ایک سیکنڈ ضائع نہ کرتی۔

قدم دھیمے کر کے میں رک گیا اور پھر زمین پر لیٹ کر انھیں جانچنے لگا کہ آیا وہ کتنے آدمی ہیں۔اور ان کے پاس شب دید آلات موجود ہیں یا نہیں۔میرا وہاں سے گزر کر آگے بڑھنا ناگزیر تھا۔کیوں کہ واپس لوٹنے میں خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا۔مجھے وہاں لیٹے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے جب وہ کنٹرول کو سب اچھا رپورٹ دینے لگے۔یقیناً وہ ہر گھنٹے بعد سب اچھا رپورٹ دے رہے تھے۔

”تھری ٹو فار کنٹرول اوور......“ایک آدمی نے اپنے کال سائن کے ساتھ کنٹرول کو پکارا تھا۔

”تھری ٹو، سینڈ یور میسج اوور......“

”آل اوکے اوور۔“اس نے سب اچھا پیش کیا۔

''تھری ٹو محتاط رہنا......دشمن ابھی تک اسی حدود میں ہے۔کیپ لسننگ آؤٹ......'' کنٹرول نے اسے رابطے میں رہنے کا کہہ کر خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

کنٹرول کو دوسری پارٹیوں کی طرف سے بھی پکارے جانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔مختلف پارٹیوں کے، بیس کال سائن میں نے گنے۔گویا میری تلاش میں بیس پارٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔مجھے ٹکرانے والی یہ چوتھی پارٹی تھی۔اس سے پہلے ٹکرانے والی پارٹی میں پانچ افراد تھے۔نا معلوم یہ پارٹی کتنے افراد پر مشتمل تھی۔جہاں تک غالب گمان تھا ان کی تعداد بھی پانچ ہی ہونا چاہیے تھی۔ایک پتھر کی آڑ میں لیٹ کر میں ان کا جائزہ لیتا رہا۔مجھے دو ہیولے ٹہلتے نظر آرہے تھے۔مجھے مسلسل چلتے ہوئے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔اور اس وقت اندازے کے مطابق ساڑھے دس، گیارہ بجے کا عمل تھا۔انیس بیس کا چاند دس گیارہ بجے نکل آتا ہے اور اس وقت پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگ گئی تھی۔میری کلائی سے گھڑی بندھی ہوئی تھی۔لیکن گھڑی کی اندرونی لائیٹ جلا کر وقت دیکھنا بے وقوفی تھی اس اندھیرے میں ہلکی سی روشنی بھی دور سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا۔گھپ اندھیرے میں نظر پہلے سے زیادہ کام کرنے لگی تھی اور اس کی وجہ چاند کا طلوع ہونا تھا۔

''سر راجیو!......کیا اس نرگ واسی کے پکڑے نہ جانے تک ہم تمام یونھی جاگتے رہیں گے؟'' جھلائے ہوئے سنتری نے مجھے جہنمی کہتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔

''ایک آدمی جاگتا رہے، باقی دو آرام کرنے لیٹ جاؤ۔'' راجیو نامی سینئر نے فوراً ہی اس کی بات مان لی تھی۔اور اس کی بات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان تعداد چار تھی۔

ایک اور آواز ابھری۔''یہ بھی خوب کہی، اس سردی میں نیند خاک آئے گی، لکڑیاں بھی موجود نہیں ہیں کہ آگ جلائی جائے۔''

''سر راجیو، ایک مشورہ ہے۔'' یہ اسی کی آواز تھی جس نے مجھے کوسا تھا۔

''بولیے مہاراج۔'' راجیو نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔''سر، میں اور رنجیت واپس پوسٹ پر چلے جاتے ہیں دو تین کمبل بھی لے آئیں گے اور حلوہ چائے کا بندوبست بھی کر لیں گے۔یوں بھی اب پوری رات یہیں گزارنا پڑے گی۔''

”یار، کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“ ان کا سینئر راجیو نیم رضامند تھا۔

”کیا گڑبڑ ہو گی سر، نالہ عبور کر کے یہاں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اور پارٹی لگی ہوئی ہے۔ اور اس بے غیرت کے پاس بھی کوئی ہتھیار وغیرہ موجود نہیں ہے۔“ میری وجہ سے وہ خوار ہو رہے تھے اس لیے مجھے کوسنا تو بنتا تھا۔

”پھر ایسا ہے، رنجیت اور پریم چند چلے جائیں گے تم یہیں میرے ساتھ رہو۔“ راجیو نے رضامند ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ یقیناً اس سردی میں گرم کمبل اور چائے حلوے کا ملنا ایک نعمت ہی تو تھی۔

”ٹھیک ہے سر۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بولا۔ ”رنجیت اور پریم چند تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔“

”چلیں رنجیت بھائی۔“ وہ پریم چند کی آواز تھی وہ لہجے سے نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔

رنجیت نے کہا۔ ”چلو۔“ اور دو ہیولے مغرب کی جانب بڑھ گئے۔ چاند کے بلند ہونے کے ساتھ منظر پہلے سے صاف نظر آنے لگ گیا تھا۔ میں پریم چند اور رنجیت کے دور جانے کا انتظار کرنے لگا۔ ان کے ہیولے مغربی جانب جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اور اسی طرف ان کی پوسٹ نے موجود ہونا تھا۔ میں نے اندازاً آدھا گھنٹا مزید انتظار کیا اور پھر حملے کے لیے تیار ہو کر پتھر کی آڑ سے باہر آ کر بندر چال چلتا ہوا ان کے قریب ہونے لگا۔

ان کا سینئر راجیو ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا جبکہ سنتری کھڑے ہو کر نالہ موڑ کی جانب متوجہ تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کے جانے کے بعد وہ چند منٹ تو گپ شپ کرتے رہے، مگر اب خاموش تھے۔ میرا رخ راجیو کی طرف تھا کیوں کہ بے فکری سے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا۔

اس تک پہنچنے سے پہلے اگر کوئی آواز وغیرہ پیدا ہو جاتی تو میں نے سخت مشکل میں پھنس جانا تھا۔ سنتری نے ٹارچ جلا کر نالے موڑ کی جانب روشنی پھینکی اور سامنے کے علاقے کی نظری تلاشی لینے لگا۔ اس کا سینئر پتھر سے ٹیک لگا کر سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سردی بغیر گرم بستر کے سونے کے لیے کہاں چھوڑتی ہے۔ البتہ اس نے گرم لباس پہنا ہوا تھا اس وجہ سے کم از کم وہ آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ ورنہ تو بغیر حرکت کیے کام نہ بنتا۔

ایک ہاتھ سے پاؤں کے نیچے آنے والے روڑوں، کنکروں کو جانچ کر میں وہاں آہستگی سے پاؤں رکھتا اور

پھر اگلا پاؤں رکھنے کے لیے زمین ٹٹولنا شروع کر دیتا۔ چند قدم کا فاصلہ دو سیکنڈ میں طے کیا جا سکتا تھا مگر مجھے وہ فاصلہ طے کرنے میں کئی منٹ لگ گئے تھے۔

میں راجیو سے دو قدم دور تھا جب سنتری فطری تقاضے سے مغلوب ہو کر چند قدم مزید دور ہوا اور کھڑے کھڑے ٹینکی خالی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ اس نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم اٹھ کر راجیو نامی سینئر پر ہلہ بول دیا۔ شاید اس کی چیخ کی آواز اپنی پوسٹ تک چلی جاتی مگر میں نے سب سے پہلے ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں اور ناک پر رکھ اس کی چیخ کا سدباب کر لیا تھا۔ ہونٹوں پر سختی سے جمائے ہوئے دائیں ہاتھ کو میں نے دائیں جانب کھینچا اور بایاں ہاتھ اس کے سر پر جما کر میں نے بائیں اور نیچے کی جانب زوردار جھٹکا دیا۔ یہ مخصوص جھٹکا گردن توڑنے کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پاؤں جھٹکنا شروع کر دیے تھے۔

میں نے اس کی گردن سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے ساتھ پڑی کلاشن کوف اٹھائی اور سنتری کی طرف بڑھ گیا۔ وہ فارغ ہو کر پتلون کے بٹن بند کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بھدی آواز میں......

''سندیسے آتے ہیں، ہمیں تڑپاتے ہیں ......'' گنگنا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے تمام احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی۔ اس نے بھی میرے قدموں کی آواز کو اپنے سینئر کے قدموں کی آواز سمجھا تھا۔ گولی چلانے سے آواز دور تک جا سکتی تھی، میں نے کلاشن کوف کو بیرل کی جانب سے پکڑ کر اس کے بٹ سے گنگنانے والے سنتری کے سر کی سختی کا اندازہ کیا۔ ''اوغ۔'' کی آواز نکال کر وہ لہراتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔ ایک بار اور اس کے سر کو بٹ سے بجاتے ہوئے میں نے اسے اپنے سینئر کے پاس بھیج دیا تاکہ اکٹھے مل کر اپنی غفلت کا سوگ منا سکیں۔ سر کی چوٹ زیادہ دیر تڑپنے کے لیے نہیں چھوڑتی۔ وہ بھی چند بار ہاتھ پاؤں جھٹک کر ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی حرکت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

میں جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لینے لگا۔ وہاں دو جھولے بھی پڑے ہوئے تھے جن میں پانی کی بوتلیں اور کلاشن کوف کی اضافی میگزینیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک جھولے میں پانچ فالتو میگزین ڈال کر میں نے اپنی پشت پر لٹکا لیا۔ راجیو کی جیب سے سگریٹ اور لائیٹر بھی برآمد ہوا تھا۔ سگریٹ کی ڈبی کو پھینک کر لائیٹر میں نے جیب

میں ڈال لیا تھا۔ چونکہ ابھی تک وہاں برف باری شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے ان دونوں کے پاؤں میں عام فوجی بوٹ تھے۔ میرے اپنے پاؤں میں موجود سپورٹس شوز ان کے جوتوں سے بہتر تھے اس لیے میں نے ان کے جوتے اتارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ راجیو کے ہاتھوں پر چڑھے چمڑے کے دستانے مجھے اپنے کپڑے کے دستانوں سے بہتر لگے تھے۔ اپنے دستانے جیب میں ڈال کر میں نے اس کے ہاتھوں سے دستانے نکال کر پہن لیے تھے۔ سنتری کی جیب سے مجھے ایک چاقو بھی مل گیا تھا۔ ایسی چیزیں چونکہ بہت کارآمد ہوتی ہیں اس لیے میں نے چاقو اپنے پاس سنبھال لیا تھا۔

اس ساری کارروائی میں مجھے دس منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔ سب سے آخر میں میں نے ریڈیو سیٹ جیب میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا۔ ریڈیو سیٹ کی آواز میں نے بالکل ہی مدھم کر دی تھی۔ وہ سیٹ دشمن کی Transmission سننے کے لیے میرا مددگار ہوتا۔ ہتھیار ہاتھ میں آنے کے بعد میرا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ اب میں اس قابل تھا کہ دشمن کو منہ توڑ جواب دے سکتا۔ کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی۔ لیکن میں نے دوبارہ کاک کر کے اپنی تسلی ضرور کر لی تھی۔

ایک تربیت یافتہ فوجی کے پاس جب بھی ہتھیار آتا ہے وہ سب سے پہلے ہتھیار کے لوڈ ان لوڈ ہونے کا جائزہ لیتا ہے۔ ایک بار ہتھیار کی میگزین اتار کر ہتھیار کو خالی کاک کر کے ٹریگر دباتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہتھیار فائر کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ یہ ساری کارروائی ہر تربیت یافتہ فوجی کا روزمرہ ہوتی ہے۔ اور میں تو اس لحاظ سے خاص پرزہ تھا کہ سنائپر تھا۔ اور سنائپر حضرات کا نہ صرف ہتھیاروں سے لگاؤ زیادہ ہوتا ہے بلکہ ان کا تجربہ بھی عام فوجیوں سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

میں کلاشن کوف کو کندھے سے لٹکا کر آگے بڑھ گیا۔ مشرقی اور مغربی نالوں کو ملانے والے نالے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر مشرقی نالے میں ڈالی مگر اندھیرے کی وجہ سے دوسرے کنارے پر کوئی حرکت نظر نہیں آسکی تھی۔ شمال کی جانب وہ نالہ بتدریج بلند ہو رہا تھا۔ تھوڑا سا آگے جاتے ہی ایک راستہ بھی نظر آ گیا جو اوپر کو جا رہا تھا۔ رستے کی موجودی کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس طرف بلندی پر انڈیا کی کوئی پوسٹ موجود تھی۔ میں نے نالے ہی نالے میں آگے بڑھنا مناسب سمجھا تھا کہ رستے پر چلنا زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔

پہاڑی نالوں میں ویسے تو چڑھائی یا اترائی بہت ہموار اور دھیمی ہوتی ہے۔لیکن پہاڑی کے قریب پہنچنے پر یہ ایک دم کھڑی ڈھلان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اوپر جانے والا راستہ نالے کے بائیں جانب پڑ رہا تھا جبکہ میں نے نالے کے دائیں کنارے کو سفر کے لیے اختیار کیا ہوا تھا۔نالہ غیر محسوس انداز میں مشرق کی جانب مڑ رہا تھا۔ اب قطبی ستارہ مجھے بائیں جانب چمکتا دکھائی دینے لگا تھا۔

نالے کی ہموار ڈھلان، مشکل ڈھلان میں تبدیل ہونے لگی تھی۔بائیں جانب چونکہ کسی پوسٹ کا ہونا یقینی تھا اس وجہ سے میں دوبارہ مشرقی جانب بلند ہونے لگا۔تھوڑا سا اوپر جاتے ہی مجھے تھوڑے فاصلے پر ایک پوسٹ کی روشنیاں نظر آنے لگ گئی تھیں۔گو اس پوسٹ سے میرا ہوائی فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا، مگر مجھ تک پہنچنے کے لیے انھیں درمیانی نالہ عبور کرنا پڑتا۔

ترچھا بلند ہوتے ہوئے میں آہستہ آہستہ نالے سے دور ہو گیا تھا۔اونچائی پر پہنچتے ہی میں دوسری جانب اترنے لگا۔اس طرف اترائی کافی آسان تھی۔چاند کی روشنی میرے سفر کو مزید آسان کر رہی تھی۔اچانک میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی جو میرے عقب میں ہو رہی تھی۔میرا رخ شمال مشرق کی جانب تھا۔ریڈیو سیٹ کی آواز بلند کرنے پر مجھے کنٹرول کی سخت آواز سنائی دے رہی تھی۔یقیناً انھیں مرنے والوں کی خبر پہنچ چکی تھی۔

”تم کہاں دفع ہو گئے تھے اوور......“

کنٹرول کے سوال پر ایک سہمی ہوئی آواز ابھری جو لازماً رنجیت کی تھی۔”سر، مجھے اور پریم چند کو حوالدار راجیو نے چائے لینے بھیجا تھا۔اوور......“ یقیناً انھوں نے واپسی پر اپنے دونوں ساتھیوں کو مردہ پا کر کنٹرول تک یہ بات پہنچائی تھی۔اور اس مقصد کے لیے انھیں نالہ عبور کر کے اپنی دوسری پارٹی کے پاس جانا پڑا ہو گا کیوں کہ ان کا ریڈیو سیٹ میں اٹھا لایا تھا۔

کنٹرول نے پوچھا۔”اندازہ ہے دشمن کا رخ کس سمت کو ہو گا؟ اوور......“

رنجیت نے کہا۔”کوئی خاص اندازہ نہیں ہے سر، البتہ وہ اپنے ساتھ کلاشن کوف اور اضافی میگزینیں اٹھا کر لے گیا ہے اوور......“

”احمق انسان، تم لوگوں کی غلطی کی وجہ سے اب وہ مسلح ہو گیا ہے۔ بہر حال انکوائری تو بعد میں ہوتی رہے گی ۔وائرلیس سیٹ حوالدار سدھو کو دو۔اوور......“

”جی سر۔“ اگلے ہی لمحے ایک نئی آواز آئی جو لامحالہ حوالدار سدھو کی تھی۔

”سدھو، تم اپنی پارٹی اور ان دونوں کے ساتھ مل کر راجیو اور مہیش کی لاش کو ان کی پوسٹ تک پہنچا دو۔دشمن آگے نکل گیا ہے اب یہاں پہرہ دینا بے فائدہ ہی ہو گا۔اوور......“

”راجر۔“ سدھو نے سمجھ جانے کا عندیہ دیا۔

”ٹھیک ہے، تم لوگ بتایا گیا کام کرو اور اب یہ ذہن میں رہے کہ دشمن کے پاس ہتھیار موجود ہے۔کیپ لسننگ آؤٹ۔“ اسے بتا کر کنٹرول نے دوسری دو پارٹیوں کو یہ کہہ کر خبردار رہنے کا حکم دیا کہ میرا رخ اسی جانب ہے۔اس کے علاوہ اس نے تین مختلف پارٹیوں کو کسی روبن پوسٹ والے نالے میں پہنچنے کا حکم دیا۔اب روبن پوسٹ کا علاقہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

مجھے اس نالے میں آگے بڑھنا بھی مناسب نہ لگا اور میں بائیں طرف کی بلندی سر کرنے لگا۔اس کے ساتھ ہی میں نے پہاڑی کی چوٹی کا بہ غور جائزہ لے لیا تھا کہ کہیں اس پر کوئی پوسٹ نہ بنی ہو۔مگر مجھے کوئی روشنی وغیرہ نظر نہیں آئی تھی۔اس کے باوجود جب میں بلندی کے قریب پہنچا تو اپنی رفتار آہستہ کر لی۔لیکن اندازے کے مطابق وہاں کوئی پوسٹ موجود نہیں تھی۔اگلا نالہ بھی عبور کر کے میں اس سے اگلی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔اور اس دوران ملگجا اجالا پھیلنے لگا تھا۔مجھے دن گزارنے کے لیے فوراً ہی کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔پہاڑی کی بلندی پر میں دور سے نظر آ سکتا تھا اس لیے میں اگلی ڈھلان پر ہو گیا۔اس جانب مجھے کسی پوسٹ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔البتہ میرے بائیں یعنی مغرب کی جانب دور بلندی پر روشنی جھلک رہی تھی۔

نالے کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک مناسب دراڑ نظر آ گئی تھی وہ ایسی جگہ تھی کہ دشمن میرے سر پر پہنچ کر ہی مجھے ڈھونڈ پاتا۔گو میرے لیے بہتر تو یہی تھا کہ میں جنوبی ڈھلان پر کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتا کیوں کہ اس جانب سورج کی روشنی مجھے خاطر خواہ گرمی پہنچا سکتی تھی۔اس کے برعکس شمال کی جانب پہاڑی کے سایے نے مجھے ٹھنڈک ہی میں مبتلا رکھنا تھا۔لیکن ایک سنائپر کے لیے جسمانی آرام و تسکین سے زیادہ چھپنے اور دشمن سے محفوظ

رہنے کی ضرورت اہم ہوتی ہے۔

دشمن سے حاصل کی ہوئی ٹارچ کی روشنی میں میں نے اس دراڑ کا جائزہ لیا اور پھر اندر گھس کر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ کلاشن کوف میں نے گود میں رکھ لی تھی۔ ریڈیو سیٹ کی آواز ذرا بلند کر کے میں دشمن کی بات چیت سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے والی فریکونسی پر خاموشی چھائی تھی۔ ناب گھما کر میں نے جلد ہی نیا چینل ڈھونڈ لیا تھا۔ کنٹرول پارٹیوں کو مختلف مقامات پر تعینات کر رہا تھا۔ وہ زیادہ تر جن مقامات کے نام لے رہا تھا وہ میرے لیے نئے اور انجان تھے۔ میں صرف فارورڈ ون اور ٹرپل سیون پوسٹ کے نام سے واقف تھا۔ اس کے علاوہ وہ مکمل علاقہ میرے لیے بالکل ہی نیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ روبن پوسٹ کون سی ہے، ڈبلیو نالہ کس جگہ واقع ہے یا بر ہما ٹاپ کس چوٹی کا نام ہے۔ میرے لیے تو ان مقامات کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔

عام طور پر جب کوئی سنائپر، کمانڈو یا جاسوس وغیرہ کسی مشن کے لیے سرحد عبور کرتا ہے تو جس علاقے میں وہ جا رہا ہوتا ہے اس کے متعلق نقشوں کے ذریعے اسے مکمل طور پر واقفیت دلائی جاتی ہے۔ لیکن اس دفعہ میرا آنا کسی منصوبے کے تحت تو تھا نہیں اسی لیے میری مشکلات اتنی بڑھ گئی تھیں۔

میں نے زیادہ دیر وائرلیس سے سر کھپانے کے بجائے آرام کو ترجیح دی اور وائرلیس بند کر کے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سخت تھکن، سردی اور بھوک کی وجہ سے نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی سونا میرے لیے نقصان دہ تھا۔ جھولے میں پڑی پانی کی بوتل سے پیاس بجھا کر میں جسم کو آرام دینے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں تو کمی آنے لگی مگر بھوک میں اضافہ ہوتا گیا۔ سرد موسم میں یوں بھی بھوک کچھ زیادہ ہی لگا کرتی ہے۔ کل صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

دوپہر ڈھلے میرے کانوں میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز پڑی وہ نیچے نالے میں جا رہے تھے۔ پہلے تو میں نے انھیں تلاشی پارٹی سمجھا مگر ان کی بات چیت سے پتا چلا کہ وہ ٹیلی فون کی تار ٹھیک کرنے والی پارٹی تھی۔ اس علاقے میں اکثر ہوا کی شدت یا کسی جانور وغیرہ کے پاؤں سے اٹکنے کی وجہ سے ٹیلی فون کی تار کٹ جاتی ہے۔ اور رابطے کی بحالی کے لیے پارٹی چلانا پڑتی ہے۔ آوازوں کے آگے بڑھ جانے پر میں نے احتیاط سے جھانک کر دیکھا، ان کی تعداد آٹھ تھی۔ حالات کے پیش نظر تمام کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ وہ راستے

میں بچھی ہوئی فون کی تار کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دو تین گھنٹوں بعد وہ اسی رستے سے واپس لوٹے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر محتاط انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اگر میں وہیں پر مزید دو دن گزار لیتا تو میری تلاش میں وہ تیزی نہ رہتی مگر اس طرح بھوک مجھے اتنا کمزور کر دیتی کہ میں صحیح طرح سے چلنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ وہاں جھاڑیاں وغیرہ بھی موجود نہیں تھیں کہ ان کے پتے چبا کر میں پیٹ میں لگی آگ پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا۔ گو بھوک پیاس برداشت کرنا ایک سنائپر کا خاصا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلسل بھوکا رہنے سے جسم بھی کمزوری کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایسی کمزوری جسمانی کارکردگی پر اثر انداز ہونے کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

گو عام حالات میں نالے کے اندر سفر کرنا مناسب رہتا ہے لیکن دشمن کے ناکا لگانے والوں کی نظر بھی عموماً نالے کی گزرگاہ ہی پر ہوتی ہے اس لیے میں نالے میں آگے بڑھنے کے بجائے مخالف سمت کی ڈھلان پر چڑھ کر آگے بڑھنے لگا۔ وہ نالہ آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ چونکہ میرا مطمح نظر وہاں سے دور ہٹنا تھا اس لیے میں نے بائیں طرف مڑنے والے نالے کو اختیار کیا۔ اب میرا سفر بتدریج اترائی میں جاری تھا۔ گویا میں مسلسل نشیب میں جا رہا تھا۔ وہ نالا آگے جا کر شمال کی جانب مڑا، میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ نالہ موڑ اور نالہ ملاپ وغیرہ کی جگہ کو میں دائیں بائیں کی ڈھلان پر چڑھ کر عبور کروں۔ کیونکہ دشمن نے ایسی ہی جگہوں پر ناکے لگائے ہوتے ہیں۔ لیکن میری یہ احتیاط کام نہ آئی۔ نالہ موڑ سے سو میٹر پہلے ہی میں نے بلند ہونا شروع کر دیا تھا تاکہ اوپر ہی اوپر سے وہ جگہ عبور کروں بلندی پر پہنچنے سے پہلے ہی اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیوں کا رخ میری ہی جانب تھا۔ فائر کرنے والے مشرقی جانب نشیب میں تھے۔ جبکہ میں ان سے شمال کی جانب نالے سے دو اڑھائی سو فٹ بلندی پر تھا۔ انھوں نے مجھے شبِ دید آلے سے دیکھا تھا۔

(یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کر دوں کہ شب دید آلات کی مختلف اقسام ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دوربین کی طرح فقط دکھاؤ مہیا کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو مخصوص ہتھیاروں پر لگا کر ان کی مدد سے رات کو بھی فائر کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر انڈین آرمی اور پاک آرمی کے پاس دونوں قسم کے شب دید آلات

موجود ہیں۔لیکن رائفل پر لگا کر فائر کرنے والے آلات زیادہ تر سپیشل گروپس یعنی کمانڈوز وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں۔یہ آلات ہر بٹالین کو مہیا نہیں کیے جاتے۔عام فوج کے پاس شب دید عینکیں ہوتی ہیں جس سے وہ رات کے وقت علاقے کی دیکھ بھال تو کر سکتے ہیں انھیں رائفل پر لگا کر فائر نہیں کر سکتے۔اور جو شب دید آلات رائفل اوپر لگائے جاتے ہیں ان سے بھی زیادہ سے زیادہ سوڈیڑھ سو میٹر تک کارگر فائر گرایا جاسکتا ہے)

پہلی گولی چلتے ہی میں اپنی جگہ پر دبک گیا تھا۔چند قدم نیچے ایک ابھری ہوئی چٹان تھی میں نے فوراً لڑھکتے ہوئے اس کے پیچھے پناہ لے لی۔

''وہ مارا۔''میرا لڑھکنا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا کر گیا تھا۔اس نے سوچا شاید میں گولی لگنے کی وجہ سے لڑھکا ہوں۔اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ختم ہوئی۔اور پھر تین ٹارچوں کی روشنی اس طرف بڑھنے لگی۔ٹارچ جلا کر دشمن کی طرف حرکت کرنا یقیناً انتہائی درجے کی حماقت تھی۔اس کا نتیجہ انھیں فوراً ہی بھگتنا پڑ گیا تھا۔اس جانب کلاشن کوف سیدھی کرتے ہوئے میں نے مسلسل پانچ چھے دفعہ ٹریگر دبایا تھا۔پہلی گولی فائر ہوتے ہی میرے کانوں میں مضروب کی چیخ پہنچی تھی باقی دو نے ٹارچیں بجھانے کی کوشش کی مگر میں انھیں یہ موقع کب دینا چاہتا تھا۔کلاشن کوف جیسے آٹومیٹک ہتھیار سے تیزی سے فائر کرنا ایک سنائپر کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔میری چلائی ہوئی تیسری گولی کی گونج ختم ہونے سے پہلے چار پانچ کلاشن کوفیں اکٹھی آگ اگلنے لگیں۔میں نے اپنا سر آڑ میں کر لیا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے ریڈیو سیٹ کی آواز تھوڑی سی بڑھائی۔کنٹرول ان سے فائرنگ کی وجہ پوچھ رہا تھا۔وہاں موجود آنند گپتا نامی سینئر اسے ٹاکرا ہونے کی بابت اطلاع دینے لگا۔

کنٹرول نے پوچھا۔''تمھاری پارٹی ڈبلیو نالے کے جنوبی سرے پر لگی ہے نا۔اوور......''

''جی سر۔اوور......''آنند نے فوراً اثباتی جواب دیا۔

''روبن پوسٹ اور چشمہ والی پارٹیاں میں تمھاری طرف بھجوا رہا ہوں،اسے وہیں گھیرے میں لیے رہو،بچ کر نہیں جانا چاہیے۔آؤٹ......''اسے خاموش رہنے کا کہہ کر وہ دوسری پارٹیوں کو پکارنے لگا۔''روبن پوسٹ اوور......''

''روبن پوسٹ فار کنٹرول پیغام نقل کر لیا ہے۔اوور......''روبن پوسٹ سے فوراً ہی جواب آ گیا تھا۔

’’حوالدار روہیت فار کنٹرول، پیغام نقل کر لیا ہے۔ اوور......‘‘ اس مرتبہ غالباً چشمہ پارٹی نے جواب دیا تھا۔

’’کیپ لسننگ آؤٹ۔‘‘ کہہ کر کنٹرول مزید پارٹی کمانڈروں سے رابطہ کر کے انھیں وہاں پہنچنے کے احکامات جاری کرنے لگا۔

میرا وہاں پڑا رہنا سراسر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور پتھر کی آڑ سے نکلنا بھی نہایت خطرناک تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ سامنے گرجنے والی چار پانچ کلاشن کوف میں صرف ایک فائر کر رہی تھی باقی خاموش ہو گئی تھیں۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ میں نے آڑ سے سر نکال کر فائر کرنے والے کی سمت نگاہ دوڑائی۔ اس کے مسلسل فائر کرنے سے اس کی گن کی بیرل سے بار بار چمک پیدا ہو رہی تھی۔ کیوں گولی چلنے سے بیرل سے شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ فی الوقت میرے دوڑنے کی راہ میں وہی کلاشن کوف حائل تھی۔ شست سادھنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کے نظر نہ آنے کی وجہ سے درست فائر کرنا ممکن نہیں رہتا۔ پہلے والے تین آدمیوں پر بھی میں نے اندازے سے فائر کیا تھا۔ یہ علیحدہ بات کہ ایک سنائپر کے اور عام فوجی کے اندازے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ سلیکٹو لیور کو برسٹ پر لگاتے ہوئے میں نے ٹریگر دبا دیا۔ سامنے والا فائر فوراً ہی رک گیا تھا۔ میں فوراً اٹھ کر بلند ہونے لگا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میرے بائیں جانب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز آئی، فائر کرنے والے نے بیرل کو آدھے چاند کی شکل میں گھمایا تھا، جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسے میری جگہ کے بارے معلوم نہیں تھا۔ گولیوں کی آواز پر میں ایک لمحہ کے لیے قدم روک کر زمین سے چمٹ گیا تھا۔ اور جیسے ہی فائر، رکا اٹھ کر دوبارہ چڑھنا شروع کر دیا۔ گو اس ڈھلان پر بھاگ کر چڑھنا تو ممکن نہیں تھا البتہ تیز چل کر اوپر پہنچا جا سکتا تھا ۔اور میں یہی کر رہا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چلنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ سے بھی گولیاں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ دشمن میرے تین اطراف میں موجود تھا اور اب صرف سامنے کی سمت بقایا تھی۔ اور اس سمت میں یوں بھی پہاڑ کی بلندی حائل تھی۔

اوپر پہنچتے ہی ایک لمحے کے لیے میں نے جانے کی سمت کے بارے سوچا اور پھر مخالف سمت میں اترنا شروع کر دیا۔ گو میں جانتا تھا کہ ایک دشمن نالہ موڑ مڑ کر سامنے موجود ہے، لیکن کسی اور سمت جانے پر میرے پھنسنے کے

خطرات زیادہ تھے۔ جبکہ اس ایک دشمن کو دھوکا دے کر میں ان کے گھیرے سے نکل کر آگے بڑھ سکتا تھا۔

آدھی اترائی میں نے بھاگ کر طے کی تھی اس کے بعد محتاط انداز میں چلنا شروع کر دیا۔ سامنے چھپا دشمن خاموش تھا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اسے مشرقی جانب ہونا چاہیے تھا۔ وہاں مغرب اور شمال سے آنے والے دونالے مل رہے تھے۔ میں پہلے بھی مغرب سے چل کر مشرق کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بلندی عبور کر کے میں پھر ایک ایسے نالے میں پہنچنے والا تھا جس کا بہاؤ مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ پہلا نالہ اس ناکے کی جگہ سے شمال کی طرف مڑ کر آگے نکلتا چلا گیا تھا دوسرا نالہ بھی اس جگہ پر پہلے والے نالے سے مل کر شمال کی طرف مڑ کر ایک بڑے نالے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ان دونوں نالوں میں پانی بھی بہہ رہا تھا۔ اور جیسا کہ دشمن اس نالے کو ڈبلیو نالہ کہہ رہے تھے اس نسبت سے شمال کی جانب آگے چل کر ایک اور نالے کو اس میں شامل ضرور ہونا چاہیے تھا، اسی طرح ہی اس کی شکل انگریزی کے حرف ڈبلیو کی طرح بنتی۔

دشمن کا خاموش رہ کر گھات میں بیٹھنا میرے لیے نقصان دہ تھا۔ تھوڑا سا مزید نیچے آتے ہی مجھے دو بڑے پتھر پڑے نظر آئے جن کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ موجود پتھر کے اوپر ٹارچ رکھ کر میں اس کا رخ شمال مشرق کی جانب موڑا اور ٹارچ جلا کر سرعت سے بائیں ہاتھ موجود پتھر کے پیچھے سے گھوم کر مغرب کی جانب نیچے اترنے لگا۔ چار پانچ سیکنڈ بعد ہی کلاشن کی تڑتڑاہٹ گونجی، فائر کرنے والا سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے ٹارچ پر گولیاں برسا رہا تھا۔ دو تین برسٹ کے ساتھ ہی ٹارچ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ لیکن ٹوٹنے سے پہلے مجھے دشمن کی جگہ کے بارے مطلع کر گئی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو یقیناً میں نے صرف ایک گولی ہی فائر کرنا تھی۔ لیکن اس وقت اندھیرے کی وجہ سے میرے لیے شست لینا ممکن نہیں تھا۔ سلیکٹیو لیور کو برسٹ پر لگا کر میں نے بیرل کا رخ مطلوبہ سمت میں کرتے ہوئے ایک دم ٹریگر دبا دیا۔ ایک سنائپر کو یوں بے دردی سے گولیاں اڑانا بالکل بھی زیب نہیں دیتا تھا، استاد محترم راؤ تصور نے اس موقع پر لازماً یہی کہنا تھا۔ ”اوے بے وقوف، گولیاں بے شک دشمن سے چھینی ہوئی ہیں، مگر ان پر قبضہ تو اپنا ہے نا۔“

مگر وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں استاد کے مشوروں پر عمل کر سکتا۔ ٹریگر سے انگلی ہٹانے سے پہلے ہی مجھے دشمن کی چیخ سنائی دے گئی تھی۔

”ٹرنچ۔“ کی آواز نے میگزین خالی ہونے کا اعلان کیا۔خالی میگزین اتار کر زمین پر پھینک کر میں نے بھاگتے ہوئے پشت پر لدے جھولے سے بھری ہوئی میگزین نکالی اور کلاشن کوف پر چڑھاتے ہوئے گن کاک کر لی۔نالے میں پہنچتے ہی میں نے وائرلیس سیٹ کی آواز بڑھا دی تھی۔البتہ قدموں کی رفتار میں بھی میں نے کمی نہیں آنے دی تھی۔دشمن کی بات چیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چشمہ اور روبن پوسٹ کی پارٹیاں ٹاکرے والی جگہ کے بالکل قریب پہنچ گئی تھیں۔کنٹرول چیخ چیخ کر صورت حال کے بارے پوچھ رہا تھا۔اسے وہاں پہلے سے موجود پارٹی کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔وہاں موجود سینئر آنند گپتا شاید میری گولی کا شکار ہو چکا تھا۔میرے اندازے کے مطابق وہاں صرف ایک ہی آدمی بچا تھا جو مجھے گھیرے میں لینے کے لیے مغربی نالے کی طرف گیا تھا۔

اسی وقت حوالدار روہیت کنٹرول کو پکار کر بتانے لگا۔”سر،یہاں صرف ایک آدمی زندہ بچا ہوا ہے باقی تمام سورگ باشی ہوگئے ہیں۔اوور......“

”یہ تمام الو کے پٹھے سوئے رہتے ہیں اور وہ انھیں آرام سے مار کر آگے بڑھ جاتا ہے۔اوور......“ کنٹرول کا غصہ دیدنی تھا۔

”سر ہم ڈبلیو نالے میں آگے بڑھ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔اوور......“ روہیت نے اجازت مانگنے کے انداز میں پوچھا۔

”روہیت،ابھی تک تم لوگوں کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ نالے میں سفر نہیں کرتا،وہ نرگ واسی مسلسل ڈھلان پر سفر کر رہا ہے۔اوور......“

”تو پھر کیا کریں سر؟اوور......“

کنٹرول نے کہا۔”روبن پوسٹ سے آنے والی پارٹی کو بھی اپنے ساتھ ملا کر ڈبلیو نالے میں آگے بڑھو۔اپنے کچھ آدمی دائیں بائیں بلندی پر چڑھا کر آگے کا رخ کرنا نالے ہی میں نہ بھاگتے جانا۔اوور......“

”راجر سر......“

”روہیت،بہت احتیاط سے۔مجھے شک ہے اس آدمی کا فہیم اوپی سے گرنا حادثہ نہیں ہے۔یہ کسی منصوبے

کے تحت ہی نیچے اترا ہے۔کوئی عام فوجی اتنا چالاک اور تیز نہیں ہوسکتا۔یہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو لگ رہا ہے۔ اوور......''

''آپ چنتا نہ کریں سر میں محتاط رہوں گا۔اوور......''

''میں مزید نفری بھی بھجوار رہا ہوں، کیپ لسننگ آؤٹ۔'' کنٹرول آخری حکم بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔

نالہ مسلسل نشیب میں اتر رہا تھا۔اب تو مجھے کہیں کہیں جھاڑیوں وغیرہ کے ہیولے بھی نظر آنے لگ گئے تھے ۔اندازے کے مطابق جلد ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں مغرب سے آنے والا ایک اور نالہ وہاں شامل ہو رہا تھا۔میں شمالی نالے ہی میں آگے بڑھتا گیا۔ پچاس ساٹھ قدم آگے آکر ایک تنگ سا راستہ مشرق کی طرف نکل رہا تھا۔مشرق کی جانب موجود پہاڑی وہاں دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔میں نے شمالی نالہ چھوڑ کر تھوڑی سی بلندی طے کی اور مشرقی نالے میں گھس گیا۔وہ نالہ کافی تنگ تھا اور عام نالوں کے برعکس اس کی اترائی کسی ڈھلان کی طرح تھی۔پانچ چھے سو گز آگے جا کر نالہ وسیع ہونے لگا۔مشکل اترائی بھی بتدریج آسان اور ہموار ہوگئی تھی۔ وائرلیس سیٹ کی بیٹری ختم ہوگئی تھی۔اب وہ سیٹ میرے کسی کام کا نہیں تھا۔اس فالتو بوجھ کو بھی میں نے ایک طرف اچھال دیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ میں دشمن کے گھیرے سے نکل آیا ہوں۔ڈبلیو نالے سے مختلف راستے دائیں بائیں نکل رہے تھے۔دشمن اتنی آسانی میرے جانے کی سمت کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔یوں بھی میں کسی قائدے قانون کے تحت سفر نہیں کر رہا تھا کہ کسی متعین سمت کا رخ کرتا۔میرا مطمح نظر تو دشمن کے گھیرے سے نکل کر واپس پاکستان کی سرحد کو عبور کرنا تھا۔فی الحال تو میں دشمن کے گھیرے سے نکل آیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ عقب میں دشمن کی پوسٹیں موجود نہیں تھیں۔ممکن تھا کہ انھوں نے عقبی پوسٹوں کو بھی مختلف رستوں پر تعینات کر دیا ہو۔اور اب تک میں دشمن کو کافی نقصان بھی پہنچا چکا تھا۔ایسی صورت میں میری تلاش اور زیادہ ضروری ہوگئی تھی۔وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی غرض سے میں ہلکے قدموں سے دوڑ کر جا رہا تھا ۔وہاں سے جتنا زیادہ فاصلہ ہوتا اتنا ہی بچت کے امکان بڑھ جاتے۔بیس کا چاند طلوع ہو کر گھپ اندھیرے سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔

عقب میں چند کلومیٹر دور تیز فائرنگ کی آواز گونجنے لگی۔شاید کسی بے زبان جانور کی شامت آ گئی تھی۔دشمن کی بات چیت سننا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

مسلسل پر مشقت بھاگ دوڑ اور بھوک کی وجہ سے میں نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔سخت سے سخت جان آدمی کو بھی بھوک توڑ کر رکھ دیتی ہے۔بغیر کچھ کھائے مجھے چالیس گھنٹے سے بھی زیادہ وقت ہو گیا تھا۔اگر کسی جگہ بغیر حرکت کیے بیٹھنا ہوتا تو بھوک برداشت کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا لیکن ایسی حالت میں پہاڑی علاقے کا دشوار گزار سفر نہایت ہی مشکل تھا۔

آگے جا کر اس نالے میں اور نالے بھی شامل ہوئے، دو تین جگہ سے وہ نالہ تقسیم ہو کر دائیں بائیں بھی مڑا مگر میں سیدھا چلتا رہا۔خوش قسمتی سے مجھے ابھی تک دشمن کی کوئی پارٹی نہیں ٹکرائی تھی۔یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عقب میں آنے والا دشمن کون سی سمت اختیار کیے ہوئے تھا۔خود مجھ سے بھی کسی مخصوص سمت کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔میرے ذہن میں بس ہلکا سا جو منصوبہ تھا وہ اس سرحد سے دور جا کر بارڈر پار کرنے کا تھا۔یقیناً وہاں نزدیک کے علاقے میں دشمن بارڈر سیل کر چکا ہوگا۔اور جب تک میری تلاش کی سرگرمی مانند نہ پڑتی دشمن نے رستوں کی ناکا بندی سے احتراز نہیں برتنا تھا۔دوسرا نمبر سردی کا تھا۔کارگل کی ان پہاڑیوں میں سردی شدید نوعیت کی تھی۔اور ناکافی لباس میں میں نے موسم ہی سے ہار جانا تھا۔اس لیے میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں کم اونچے علاقے کا رخ کرتا۔اس طرح ایک تو حادثے کی جگہ سے زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میری حفاظت کا امکان زیادہ ہوتا۔دوسرا موسم اتنا سرد نہ ہوتا کہ مجھے بھاری برفانی لباس کی ضرورت پڑتی۔

وہ نالہ ایک چھوٹی سی وادی میں نکلا۔اس کے ساتھ ہی مجھے تھوڑے فاصلے پر روشنیوں کی جھلک نظر آئی۔وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ایسی آبادیوں میں چھپ کر وقت گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے کیوں کہ ایسی آبادیوں پر ایک تو فوج بہت گہری نگاہ رکھتی ہے دوسرا وہاں ایسے سول بھی موجود ہوتے ہیں جو فوج کے لیے جاسوسی کا کام کرتے ہیں اور کسی بھی اجنبی کی آمد کی اطلاع متعلقہ فوج تک پہنچانے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔البتہ کسی قابل بھروسا آدمی کے گھر کے کسی اندرونی کمرے میں چھپ کر پڑا رہنے کی صورت میں بچنے کی امید پیدا ہو جاتی ہے میں نے بغیر کسی شک وشبے کے اس آبادی کو نظر انداز کر کے آگے نکل جانا تھا، اگر بھوک سے میرا برا حال نہ

ہوتا۔اب تو کسی گھر سے مانگ کر کھانا کھانا میری مجبوری تھی۔انسان کے جسم کی بنیادی ضروریات میں بھوک اور پیاس ایسی ضرورتیں ہیں جن سے زیادہ دیر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔اور اس وقت میرا ابھی بھوک سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

آبادی میں گھسنے سے پہلے ہی چند آوارہ کتے قریب آ کر مجھے خوش آمدید کہنے لگے۔ان کے استقبال کے لیے میں نے پہلے ہی سے ایک چھڑی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔چونکہ ان کتوں کا کام ہی کسی اجنبی آدمی اور گیدڑ ،لومڑ وغیرہ کو دیکھ کر بھونکنا ہوتا ہے اور رات کے بیش تر حصے میں ان کا بھونکنا جاری رہتا ہے اس لیے ان کی آواز پر کم ہی کان دھرا جاتا ہے۔کتوں کو لاٹھی سے ڈرا کر میں ایک قریبی مکان کی چاردیواری میں داخل ہو گیا۔پہاڑی علاقے میں موجود چھوٹی آبادیوں میں عموماً گلیوں وغیرہ کا تصور ناپید ہوتا ہے۔اسی طرح مکانات کی چاردیواری بھی خال خال بنی ہوتی ہے۔یہ ثقافت میں نے کشمیر والے علاقے کی بیان کی ہے،وزیرستان میں تو مکانات کی چاردیواری کمروں سے بھی اونچی بنی ہوتی ہے۔

جس مکان میں میں گھسا اس کی چاردیواری چار پانچ فٹ ہی بلند تھی۔میرے مکان میں گھستے ہی کتوں کا بھونکنا ذرا کم ہو گیا تھا۔چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں دروازے کے قریب پہنچا۔متوقع طور پر دروازہ اندر سے بند تھا۔میں نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر بعد ہی نامانوس لہجے میں کچھ پوچھا گیا۔

"دروازہ کھولو۔"میں نے یوں درشت لہجہ اپنایا جیسے انڈین فوج اس کے دروازے پر آئی ہو۔یوں بھی اتنا تو میں جانتا تھا کہ انڈین آرمی گاہے گاہے ان آبادیوں کو تنگ کرتی رہتی ہو گی۔

فوراً ہی چٹخنی اترنے کی آواز آئی دروازے کا پٹ وا ہوا،ایک درمیانی عمر کا مرد دروازے پر کھڑا تھا۔اس نے ہاتھ میں لالٹین تھامی ہوئی تھی۔کلاشن کوف کی نال اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے میں نے اندر دھکیلا اور دروازہ کنڈی کر دیا۔

"جج......جی آپ کون؟"اس نے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔اس مرتبہ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کی تھی۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔"دشمن نہیں ہوں، میں نے بس کھانا کھانا ہے اور آگے نکل جاؤں گا۔"

"مم......مگر آپ ہیں کون؟" وہ سخت خوف زدہ تھا۔

"بتایا تو ہے مہمان ہوں۔اور اب آگے چلو۔" میں نے اسے کلاشن کوف سے ٹھوکا دیا۔

وہ مرے مرے قدموں سے واپس مڑ گیا۔لالٹین اندرونی کمرے کی دیوار سے لٹکا کر وہ مجھے گھورنے لگا۔

میں نے پوچھا۔"گھر میں اور کون کون موجود ہے؟"

اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔"اکیلا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔"کھانے کو کچھ موجود ہے؟ دو تین دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

وہ خفیف لہجے میں بولا۔"روٹی اور سالن تو نہیں ہے، البتہ آٹا گوندا ہوا رکھا ہے۔"

"باورچی خانہ کہاں ہے؟"

"اسی کمرے میں کھانا پکاتا ہوں۔" اس نے کونے میں موجود چولھے کی جانب اشارہ کیا۔

"تو شروع ہو جاؤ۔" میں نے اسے آگ جلانے کا اشارہ کیا۔

ایک جانب پڑی لکڑیاں چولھے میں ترتیب سے جما کر اس نے کپڑے کے ایک ٹکڑے کو جلا کر لکڑیوں کے بیچ میں رکھ دیا۔آگ کے تیز ہونے تک وہ توا چولھے پر رکھ کر گوندے ہوئے آٹے کا پیڑا بنانے لگا۔

"دوست میں آپ کو کبھی بھی تکلیف نہ دیتا مگر میں دو روز سے بھوکا ہوں، انڈین فوج کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے۔اور سچ کہوں تو میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں پاکستان آرمی کی ایک پوسٹ سے غلطی سے پھسل کر اس طرف آ گرا۔" اس کی ہمدردی سمیٹنے کے لیے میں نے اپنے متعلق تمام تفصیل اس کے سامنے بیان کر دی۔وہ کوئی جواب دیے بغیر گرم توے پر روٹی ڈالنے لگا۔گوندے ہوئے آٹے سے بہ مشکل دو روٹیاں ہی بن پائی تھیں۔اس نے جیسے ہی پہلی روٹی توے سے اتاری میں گرم گرم روٹی کو جڑ گیا۔سالن یوں بھی موجود نہیں تھا۔اور نہ مجھ میں اتنا صبر رہ گیا تھا کہ سالن وغیرہ کے بننے کا انتظار کرتا۔دوسری روٹی کے بننے تک میں پہلی روٹی معدے میں اتار چکا تھا۔گرم گرم گندم کی روٹی نے اس وقت جو لطف دیا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔

"یار! سیدھی بات ہے کہ آپ کو مزید آٹا گوندنا پڑے گا، کیوں کہ ان دو روٹیوں سے میری آنت بھی گیلی

نہیں ہوئی۔البتہ آٹا گوندنے سے پہلے چائے بنانا ضروری ہے۔‘‘

وہ بغیر کسی تکرار کے ایک برتن میں رکھے تازہ دودھ سے چائے بنانے لگا۔صبح کی چائے کے لیے رکھا گیا دودھ اس ضمن میں کام آیا تھا۔

’’آپ کا نام کیا ہے؟‘‘

’’مشتاق۔‘‘اس کے لہجے سے مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ بیزار ہے، غصے میں ہے یا بالکل نارمل ہے۔اس نے پتیلی میں دودھ، پانی، پتی اور چینی اکٹھے ہی ڈال کر چولھے پر چڑھا دی۔

’’مشتاق بھائی، کیا مجھے آپ کے کپڑوں کا کوئی پرانا جوڑا مل سکتا ہے۔‘‘ وہاں سے آگے مجھے دن کو بھی سفر کرنا پڑ سکتا تھا اور ایسی صورت میں ٹریک سوٹ کے بجائے کپڑوں کا ہونا ضروری تھا۔ٹریک سوٹ میں میں نمایاں لگتا، کیوں کہ وہ کوئی شہر نہیں تھا۔وہاں کے مقامی لوگ عموماً شلوار قمیص میں ملبوس نظر آتے اور میرے لیے بھی انھی کا حلیہ بنانا ضروری تھا۔

مشتاق نے حسب سابق خاموشی سے اٹھ کر ایک پرانے سے ٹرنک کا ڈھکن اٹھایا اور مٹیالے رنگ کے کپڑوں کا ایک جوڑا میرے جانب بڑھا دیا۔

ٹریک سوٹ اتار کر میں نے کمرے کے ایک کونے میں لگے ہوئے لکڑی کے پھٹوں پر پھینکا البتہ ٹریک سوٹ کے نیچے پہنا ہوا گرم پاجامہ اور بنیان اتارنے کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی تھی۔فوجی جھولا بھی مجھے پھنسا سکتا تھا اس لیے میں نے اس میں رکھی کلاشن کوف کی تین اضافی میگزینیں نکال کر کوٹ کی جیبوں میں منتقل کر دیں۔اس اثناء میں چائے تیار ہو گئی تھی۔

میں گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا جبکہ وہ آٹا گوندنے لگا تھا۔دو روٹیاں کھانے کے بعد بھوک کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تھی لیکن ابھی تک کھانے کی طلب اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔اس کے آٹا گوندنے تک میں چائے کی دو پیالیاں معدے میں انڈیل چکا تھا۔

اچانک ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔یوں جیسے کوئی اجنبی آبادی میں داخل ہوا ہو۔یہ بھی ممکن تھا کہ کتے کسی جانور وغیرہ پر بھونک رہے ہوں۔لیکن جلد ہی دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے میرے

موٴخرالذکراندازے کو جھٹلا دیا تھا۔

''پہنچ گئے ہیں کتے۔'' مشتاق کی نفرت بھری آواز بلند ہوئی۔اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے بہلانے کے لیے انڈین فوجیوں کو کوس رہا تھا یا سچ ہی میں وہ ان سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا۔البتہ زوردار دستک یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ انڈین فوجی ہی تھے۔

مجھے لگا میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔وہاں سے بھاگ نکلنا خاصا دشوار تھا۔کیوں کہ وہاں کوئی اکیلا فوجی تو ہونا نہیں تھا۔پھر میں مشتاق پر بھی اعتماد کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

میری سوچوں سے انجان اس نے فوراً ہی دیوار سے ٹنگی لالٹین اتاری اور کہنے لگا۔''ادھر۔'' اس نے کونے میں لگے لکڑی کے پھٹوں کے سامنے سے لٹکی چادر اٹھائی اور مجھے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا۔

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ انڈین فوجی ان پھٹوں کے نیچے نہ جھانکتے۔مجھے متذبذب دیکھ کر وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔

''اعتبار کرو۔''

ایک دم خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں جھک کر ان پھٹوں کے نیچے گھس گیا۔وہاں کافی کاٹھ کباڑ پڑا نظر آ رہا تھا۔

وہ تیز تیز بولا۔''کونے میں جو لکڑیاں پڑی ہیں انھیں ہٹانے پر ایک تختہ نظر آئے گا۔اس کے نیچے گھس کر تختہ اپنے اوپر برابر کرلو۔''

دروازے پر ہونے والی دستک اور زیادہ تیز ہوگئی تھی۔میرے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی موجود نہیں تھا۔میں زمین پر ہاتھ ٹیک کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سرعت سے کونے میں پڑی لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا لکڑیوں کے ڈھیر کو ذرا سا ہٹاتے ہی مجھے تختہ نظر آ گیا۔تختے کو اوپر اٹھا کر میں فوراً ہی نیچے گھس گیا تھا۔وہ گڑھا قریباً چار پانچ فٹ گہرا ہوگا۔میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے تختہ بند کیا اور اس کے اوپر دوبارہ لکڑیاں بکھیر کر باہر نکل گیا۔اب میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا۔میں لکڑی کے تختے سے کان لگا کر اپنی سماعتوں سے کچھ جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

منٹ بھر کے وقفے کے ساتھ ہی بھاری بوٹوں کی آواز اندر داخل ہوتی ہوئی سنائی دی۔

''سچ سچ بتاؤ کوئی یہاں آیا تھا؟'' ایک کرخت آواز میری سماعتوں میں داخل ہوئی۔

''نن......نہیں صاحب، کوئی بھی نہیں آیا۔'' مشتاق نے گھگیائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''یہ کیا ہے، رات کے تین بجے تم آٹا کیوں گوندر ہے تھے اور یہ چائے کس کے لیے بنائی تھی؟'' یقیناً اسے چولھے میں دہکتے انگارے، تازہ گوندا ہوا آٹا اور چائے کی پتیلی نے چوکنا کر دیا تھا۔

''صص......صاحب روزہ رکھنے کے لیے آٹا گوندا ہے اور چائے بھی بنائی ہے۔'' اسے فوراً ہی ایک مناسب بہانہ سوجھ گیا تھا۔

''یہ روزوں کا مہینا تو نہیں ہے۔'' پوچھنے والے کے لہجے میں شکوک کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

''نفلی روزے رکھ رہا ہوں صاحب۔'' اس مرتبہ مشتاق کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد موجود تھا۔

''استاد روہیت!......یہ دیکھیں۔'' ایک نئی آواز ابھری تھی۔ نجانے اس نے روہیت کو کیا دکھایا تھا۔

اس آدمی بات ختم ہوتے ''چٹاخ۔'' کی زوردار آواز ابھری۔ یقیناً حوالدار روہیت نے مشتاق کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرخت لہجے میں گالی بکی...... ''کتے کے بچے یہ جھولا تمھارے پاس کہاں سے آیا۔ اور یہ ٹریک سوٹ کس کا ہے؟''

میرا دل ایک دم ڈوب گیا تھا۔ تیزی میں ہم سے درستی بھول گئی تھی۔ اگر وہ جھولا اور ٹریک سوٹ ان کے ہاتھ نہ لگے ہوتے تو ہمارے بچنے کی گنجائش موجود تھی، مگر اب وہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ مشتاق کی بھی بولتی بند ہوگئی تھی۔

''بولتے کیوں نہیں ہو ماں..........'' روہیت کے منھ سے گندی گندی گالیوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ ''کہاں چھپایا ہے بہن کے خصم کو جلدی بولو۔'' گالیاں بکنے کے ساتھ اس نے ہاتھ، پاؤں سے بھی مشتاق کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔

''وہ کافی دیر ہوئی یہاں سے نکل گیا ہے۔'' مار کھاتے ہی مشتاق نے میرے وہاں آنے کی بات تو اگل دی لیکن اب بھی وہ مجھے حفاظت مہیا کر رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے خلوص نے رقت بھر دی تھی۔ میں مجبوری سے

وہاں چھپ تو گیا تھا، مگر میرے دل میں یہ اندیشہ ضرور موجود تھا کہ وہ دھوکا دے گا۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس نے مجھے بچانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی۔

''یہاں تلاشی لو، ہوسکتا ہے اس کی بہن کا..........اب تک یہیں چھپا ہو۔'' روہیت اپنے آدمیوں کو بولا۔ انھوں نے فوراً ہی لکڑیوں کے بستر کے نیچے جھانکا کہ میرے چھپنے کے لیے سب سے مناسب جگہ وہی تھی۔ مگر مشتاق نے اس ضمن میں بہت اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔ انھیں تمام کاٹھ کباڑ ہٹائے بغیر لکڑی کا تختہ نظر نہیں آسکتا تھا، مگر انھوں نے صرف نیچے جھانکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اور پھر وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ گئے، دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولنے کی آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

''کچھ نہیں ہے سر۔'' ان مختصر سے کمروں کی تلاشی لیتے ہوئے انھیں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

''سچ بتاؤ اس پاپی کا رخ کس جانب تھا۔'' روہیت ایک بار پھر مشتاق سے پوچھنے لگا۔

''اس بارے اس نے کوئی بات بھی نہیں کی صاحب، بس دروازہ کھٹکھٹا کر اس نے مجھے جگایا اور رائفل دکھا کر کھانا بنانے کو کہا۔ اور زبردستی کپڑوں کا جوڑا پہن کر یہاں سے نکل گیا۔ میں نے جو صبح کے لیے آٹا گیلا کیا تھا اس کی روٹیاں بنا کر اسے دی تھیں۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد اب صبح ناشتے کے لیے آٹا گوندھ رہا تھا۔'' مشتاق نے جھوٹ سچ ملا کر ایک کہانی بیان کر دی۔

روہیت نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''ہونہہ! تو پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی۔''

''میں ڈر گیا تھا صاحب!'' مشتاق گھگیایا۔

''ڈرنا تو تمھیں چاہیے۔'' روہت نے قہقہہ لگایا۔ ''بہر حال اب تم چھٹی کرو، ایک گھس بیٹھے کے سہولت کار کو میں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مم......ماف......'' اس سے زیادہ مشتاق نہیں بول پایا تھا۔ کلاشن کوف دو مرتبہ گرجی اور مشتاق کی پر اذیت چیخ نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا۔ میرے حصے کی گولی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ میرا دل ایک دم غم سے بھر گیا تھا۔

''اس کی لاش، یہ جھولا اور ٹریک سوٹ باہر لے جاؤ، کنٹرول کو بتا دیں گے کہ چونکہ اس خبیث کے ساتھ

رہنمائی کرنے والا ایک مقامی شخص موجود تھا اس وجہ سے وہ ہمیں پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔باقی یہاں بسنے والے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی لاش دیکھ کر عبرت حاصل ہوگی اور آئندہ کوئی کسی گھس بیٹھے کو پناہ دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔اور شرما تم گھر کو آگ لگا دو۔“

اس کی موخّر الذکر بات سن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگ گئی تھیں۔وہ گڑھا میرے لیے جہنم کا گڑھا بننے والا تھا۔

☆......☆......☆

وہ تمام گھروں کی تلاشی لینے میں لگے ہوئے تھے۔آبادی کے دوسرے ہی گھر سے میرے بارے اطلاع ملتے ہی روہیت نے اپنے باقی آدمیوں کو کال کرکے مشتاق کے گھر کے سامنے اکٹھا ہونے کا حکم دے دیا تھا۔اس کا ارادہ غالباً میرا تعاقب کرنے کا تھا۔اس کے ریڈیو سیٹ پر بات کرنے سے ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ اس کے ہمرا کافی افراد موجود تھے۔

شرما نامی آدمی کے آگ لگانے تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ان پہاڑی علاقوں میں بنے ہوئے گھروں میں لکڑی کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اور اب وہ لکڑی کا گھر میرے لیے چتا بننے والا تھا۔آگ میں جلنے سے بہتر تھا کہ میں گولی کھا کر جان دے دیتا۔یہ سوچ آتے ہی میں باہر نکلنے کے تیار ہو گیا۔میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی وہ آگ لگا کر باہر نکلیں گے میں بھی اس چوہے دان سے باہر نکل جاؤں گا۔

جیب سے لائیٹر نکال کر میں نے اس گڑھے کا جائزہ لینے لگا۔وہ پانچ ضرب پانچ فٹ کی چوکور جگہ تھی۔غربی جانب لکڑی کا دروازہ بنا دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ایک دم میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا لائیٹر کی روشنی میں ایک تنگ راستہ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔یقیناً وہ چور راستہ تھا۔اور وہ راستہ یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ مشتاق کا تعلق آزادی کی خاطر لڑنے والے مجاہدین کے کسی گروہ سے تھا۔چونکہ میری ایک دم آمد پر وہ شش پنج میں پڑ گیا تھا کہ آیا مجھ پر اعتبار کرے یا نہیں اسی وجہ سے اس نے میرے سامنے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی تھی۔البتہ انڈین فوجیوں کے پہنچ جانے کے بعد اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتا۔میں اس رستے پر آگے بڑھنے لگا۔چونکہ وہ راستہ نہایت تنگ تھا اس وجہ سے مجھے جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔وہ سرنگ پچاس ساٹھ گز سے

زیادہ طویل نہیں تھی۔اس کا اختتام ایک اور گڑھے پر ہوا۔اب وہاں سے باہر نکلنے کی صورت میں جانے کیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔میں وہیں بیٹھ کر انڈین فوجیوں کے دفع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ان کے جانے کے بعد میں اطمینان سے باہر نکل سکتا تھا۔باقی مشتاق کے گھر کو آگ لگ جانے کے بعد وہ سرنگ یوں بھی ظاہر نہیں ہو سکتی تھی۔چھت کے ملبے نے گر کر یقیناً مشتاق کے گھر موجود گڑھے کو بھر دینا تھا۔

میں پاؤں پسارے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔خوراک کے پیٹ میں جاتے ہی مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔وہاں پر مجھے کوئی خاص خطرہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔زمین دوز گڑھا کافی گرم بھی تھا۔مجھے جلد ہی نیند آ گئی تھی۔

آنکھ کھلنے پر میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی دن کے نو بج رہے تھے۔میں کافی دیر آرام کر چکا تھا۔میں نے اٹھ کر کلاشن کوف کندھے سے لٹکائی اور دونوں ہاتھوں کو گڑھے کی چھت پر پڑے لکڑی کے تختے پر ٹیک کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔میری کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ نکلے۔وہ گڑھا اور اس پر پڑا لکڑی کا تختہ بالکل مشتاق کے گھر جیسا ہی تھا۔بہت زیادہ احتیاط کے باوجود تھوڑی بہت آواز پیدا ہوئی تھی کیوں کہ اس تختے پر بھی کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔آہستہ آہستہ میں نے تختہ بالکل ہی اوپر اٹھا دیا اور پھر اچک کر باہر نکل آیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے تختہ واپس بند کر دیا۔

میں اس وقت لکڑی کے پھٹوں سے بنے ہوئے کسی بستر کے نیچے ہی تھا۔اور کمرے میں چھائی خاموشی ظاہر کر رہی تھی کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

میں بے آواز رینگتا ہوا بستر کے نیچے سے نکلا۔کمرہ واقعی خالی تھا۔مجھے صحن میں کافی لوگوں کی موجودی کا احساس ہوا۔عورتوں کا رونا،بچوں کا شور اور کچھ باتوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر میں نے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اس کے سامنے ایک اور کمرہ موجود تھا جس کی وجہ سے میں صحن میں نظر نہیں دوڑا سکا تھا۔البتہ لگ یہی رہا تھا کہ جیسے کوئی میت والا گھر ہو اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ گھر کے مکینوں کا مشتاق سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔اس وقت وہاں سے باہر نکلنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔اور یہ مصیبت میرے ساتھ مشتاق کے احباب کی زندگیوں کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔میں باہر نکلنے

کا ارادہ ترک کر کے وہیں کھڑا رہا۔ اچانک ہی رونے دھونے کی آوازیں تیز ہوئیں۔ یوں لگا جیسے جنازہ اٹھا کر باہر لے جایا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک عورتوں کے اونچی آواز میں رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر آہستہ آہستہ وہ شور تھم گیا۔

مجھے دو تین گھنٹے انتظار کرنا پڑ گیا اور کسی نے بھی کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ کر کسی کے وہاں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کسی نے باہر والے کمرے کا دروازہ کھولا، میں ایک دم چوکنا ہو کر اٹھا اور کمرے کے دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والا اسی طرف آ رہا تھا۔ دروازے کے بھڑے ہوئے دونوں پٹ وا ہوئے اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس کی نظر ایک دم مجھ پر پڑی تو اس کے منہ سے چیخ بھی نکل سکتی تھی اس لیے جیسے ہی وہ دو قدم آگے بڑھی میں نے فوراً دروازے کے عقب سے نکل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حیرت سے تڑپی، اس کے منہ سے ''اوں......اوں۔'' کی آواز برآمد ہوئی مگر میری گرفت کافی سخت تھی۔ ایک غیر عورت کو یوں اپنے ساتھ لپٹانے پر مجھے خفت تو محسوس ہو رہی تھی مگر میری مجبوری تھی۔ اسے دروازے کے سامنے سے ایک طرف کر کے میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں دوست ہوں، شور نہ کرنا۔ تمھیں چھوڑ رہا ہوں۔'' پتا نہیں میرے الفاظ اس کی سمجھ میں آئے تھے یا نہیں مگر اس نے مچلنا بند کر دیا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا وہ آنکھوں میں حیرانی بھرے میری طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ایک جوان سال لڑکی تھی۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک مرد جب کسی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ لڑکی اس کی بیٹی یا بہن جیسی ہے ۔ یہ ایک بین الاقوامی اشارہ ہے۔ اور الفاظ سے کئی گنا زیادہ موثّر ہے۔ اس کے چہرے پر ایک دم اطمینان پھیل گیا تھا۔

''میں مشتاق کا دوست ہوں۔'' میں نے رک رک فقرہ پورا کیا۔ نا معلوم وہ کون سی زبان بولتے تھے اور آیا اسے اردو اس کی سمجھ میں آتی بھی تھی کہ نہیں۔

اس نے سمجھ جانے والے انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی انگلی سے بستر کی طرف اشارہ کیا

گویا پوچھ رہی تھی کہ میں وہیں سے برآمد ہوں۔

میں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔اپنے پیچھے دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔گو میرے دل میں تھوڑا بہت خدشہ موجود تھا کہ کہیں باہر جا کر وہ شور نہ مچا دے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں اس پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری میں حفظ ما تقدم کے طور پر دوبارہ کواڑ کے پیچھے ہو گیا تھا۔اس مرتبہ وہ لڑکی ایک جواں سال آدمی ہمراہ نمودار ہوئی۔میں دروازے کے عقب سے نکل آیا۔آنے والے مجھ سے تر تپاک مصافحہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہی تھا کہ وہ مشتاق کا بہنوئی ہے اور اس کے ساتھ موجود لڑکی مشتاق کی بہن تھی۔مشتاق کافی عرصے سے آزادی کے متوالوں کا ساتھی تھا۔اس نے شادی نہیں کی تھی۔گزشتہ رات ہندوؤں نے اس کے گھر کو آگ لگانے کے بعد گاؤں کے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کیا تھا کہ اس کے بعد بھی اگر کسی نے مجاہدین کو پناہ دینے یا ان کی مدد کرنے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔حالانکہ یہی کچھ وہ پچھلی چھ سات دہائیوں سے کرتے آرہے ہیں مگر آزادی کے متوالوں کے دل میں جلتی جوت کو بجھانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ان ظالموں نے جاتے ہوئے اتنی مہربانی کی تھی کہ مشتاق کی لاش وہیں چھوڑ گئے تھے۔تھوڑی دیر پہلے ہی مشتاق کی تدفین ہوئی تھی۔

آج آزاد وطن کی پر بہار فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے ہماری نوجوان نسل کو آزادی کی قدر نہیں ہے۔وہ یہ نہیں جانتے کہ آزادی کون سی نعمت ہے اور غلامی کس چڑیا کا نام ہے۔انھیں بالکل بھی معلوم نہیں کہ غلامی ایسا طوق ہے جو جس قوم کے گلے میں پڑا اسے ذلت کی گہرائیوں میں گرا دیا۔قوموں کا عروج اور ترقی آزادی کی مرہونِ منت ہوتا ہے۔وہی قومیں دنیا میں سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہیں جو کسی کی غلام نہ ہوں۔غلام قومیں اپنے آقا کی دست نگر ہو جایا کرتیں ہیں، نہ ان کا مذہب محفوظ رہتا ہے، نہ تہذیب و ثقافت۔آزادی ہی ایک قوم کی پہچان ہے اور آزادی ہی ایک قوم کا فخر۔آزادی رب کریم کی عطا کی ہوئی ایسی نعمت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔آج اگر ہم آزاد و خود مختار ہیں تو یہ ہمارے ان اسلاف کا کارنامہ ہے، جنھوں نے اپنا حال ہمارے مستقبل

پر قربان کر دیا، اپنی خواہشات کو ہماری چاہتوں پر نچھاور کر دیا، اپنی خوشیوں کے بدلے دکھ درد سمیٹ کر ہمارا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ جنہوں نے سکون کے بدلے بے سکونی اور راحت کے بدلے تکلیف مول لے لی لیکن ہمارے لیے ایک آزاد وطن کا تحفہ، ایک علاحدہ ملک کی نعمت، اور خود مختاری کی سوغات چھوڑ گئے۔ اگر آج ہم سر اٹھا کر چل رہے ہیں تو یہ سر بلندی ان سروں کی مرہون منت ہے جو اپنے شانوں پر باقی نہ رہے اور ان عزائم کی عطا کردہ ہے جو وقت کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے۔ ان حوصلوں کی دین ہے جو پہاڑوں سے غم برداشت کر کے بھی اپنے مقصد سے نہ ہٹے۔

لیکن پاکستانی قوم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس ملک خداداد کے معرض وجود میں آتے ہی یہ قوم مخلص حکمران سے محروم ہو گئی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے بعد کوئی ایسا لیڈر ہمارے حصے میں نہ آ پایا جو ذاتی مفاد کو بیچ میں لائے بغیر ملک وقوم کے لیے کچھ بہتر کرتا۔ حکمرانوں کے نام پر ہمیں تسلسل سے ایک مفاد پرست ٹولے سے واسطہ رہا جن کی نظریں حریص گِدھوں کی طرح ہمیشہ غریب عوام کی جیب پر رہیں۔ جن کے دماغوں کے گٹر میں ہمیشہ حرص وہوس کی گندگی ابلتی رہی۔ ان کے پاپی پیٹوں کی طوالت سوئٹزر لینڈ کے بینکوں تک جا پہنچی۔ جو خون پینے والی جونکوں کی طرح عوام کے نحیف ولاغر جسموں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ایسی جونکیں جو خون پینے کے بعد گوشت کو بھی چاٹ جاتی ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں کہ مستقبل قریب و بعید میں ہماری ترجیحات اور منصوبے کیا ہونے چاہئیں۔ ان کے بعد ہم عوام کا نمبر ہے کہ آج ہم زبانی کلامی نعرے بازیوں اور بلند بانگ دعوؤں سے دشمن کا مقابلہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ میدان عمل میں گفتار کے غازیوں کی نہیں کردار کے غازیوں کی ضرورت ہے۔ آزادی کی نعمت اور قدر ان کشمیری ماؤں بہنوں سے پوچھو جو آئے روز اپنے کسی پیارے پر بین کر رہی ہوتی ہیں۔ جن کی نہ عزتیں محفوظ ہیں اور نہ جان و مال۔ آج کشمیری جو آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اللہ پاک کے فضل سے اگر یہ کامیاب ہو گئے تو شاید ان کی آنے والی نسلیں بھی ہماری طرح ہی اپنے آباواجداد کی کوششوں کو بھلا کر کشمیر کا وہی حال کر دیں جو ہم نے پاکستان کا کیا ہوا ہے۔ بہ ہر حال یہ لمبی داستان ہے۔ درد مند رو رو کر لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک یہ فقط لفاظی ہوتی ہے۔

مشتاق کے بہنوئی کا نام ایوب تھا۔اس کی بات ختم ہوتے ہی میں اسے اپنے بارے بتانے لگا۔اسی دوران مشتاق کی بہن طاہرہ کھانا لے آئی تھی۔ایوب سے پتا چلا کہ وہ کھانا کسی قریبی رشتہ دار کے گھر سے آیا تھا۔مشتاق کی موت کا دکھ ہونے کے باوجود مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔میں بے تکلف کھانے کو جڑ گیا۔کھانے کے بعد ایوب نے مجھے اسی کمرے میں آرام کا مشورہ دے کر کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔رات کو جب تعزیت والے چلے گئے تھے۔تبھی طاہرہ بہن میرے لیے کھانا لے آئی۔ایوب کی وساطت سے میں نے اپنی ندامت اور افسوس اس لڑکی تک پہنچا دیا تھا جس کے سگے بھائی نے میرے لیے جان قربان کر دی تھی۔مگر کشمیر کی بیٹی کا عزم اور حوصلہ بہت بلند تھا۔اس کے مقدس چہرے سے ہویدا مسکراہٹ نے مجھے بہت سکون دیا تھا۔اس نے ایوب کی وساطت سے کہا۔

”آپ بھی تو میرے بھائی ہیں اور کس نے کہا کہ مشتاق مر گیا ہے۔قرآن کہتا ہے انھیں مردہ نہ کہو تو میں کیسے اسے مردہ سمجھ لوں۔“

میں نے بے اختیار ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔”ہاں میری بہادر بہن، میں تمھارا بھائی ہوں۔ اور مجھے اپنی بہن پر فخر ہے۔“

ایوب نے رستے کے بارے میری تھوڑی بہت رہنمائی کر دی تھی۔لیکن پہاڑی راستوں کی پہچان اتنی آسان نہیں ہوتی۔ایک جیسے پہاڑ، ان سے نکلنے والے نالے، درختوں، جھاڑیوں کے جھنڈ، بہنے والے چشمے اور آبشاریں یہ تمام یکساں مناظر بغیر کسی نقشے کی موجودی کے راستوں کی پہچان کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ان سے اجازت لے کر میں محتاط انداز سے ان کے گھر سے نکلا۔میری ذرا سی غفلت ان پر بھی کوئی مصیبت لا سکتی تھی۔اس گھر سے تھوڑا دور ہوتے ہی میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔وہ وادی شرقاً غرباً پھیلی ہوئی تھی۔جب شمال سے جنوب کی طرف اس کی چوڑائی تھی جو چار پانچ سو میٹر سے زیادہ نہیں تھی۔میں نے آبادی کے بیچوں بیچ آگے بڑھنے کے بجائے چوڑائی میں وادی کو عبور کیا اور جنوب کی طرف موجود بلندی پر چڑھنے لگا۔

جہاں تک میں ایوب کے بتائے رستے پر چل سکتا تھا اسی رستے پر گام زن رہا۔جونھی اس کی بتائی ہوئی نشانیاں گڈمڈ ہوئیں میں نے زیادہ سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر اندازے سے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔

گھپ اندھیرا جہاں میرے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا وہیں مجھے چھپاؤ بھی مہیا کر رہا تھا۔ دشمن کی پوسٹوں پر چمکنے والی روشنی مجھے دور ہی سے نظر آجاتی اور میں اپنا راستہ ذرا تبدیل کر دیتا۔ وہ رات میں بغیر کسی حادثے کے چلتا رہا۔ صبح کا ملگجا اجالہ پھیل گیا جب میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں جھاڑیوں اور درختوں کا وسیع جنگل موجود تھا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں گھس کر میں مچان بنانے لگا۔ طلوع آفتاب تک میں اس کام سے فارغ ہو گیا تھا۔ ایوب کے گھر سے چلتے وقت میں نے دو تین روٹیاں مرغی کے شوربے میں چپیڑ کر ساتھ رکھ لی تھیں۔ انھیں معدے میں اتار کر میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ جھاڑیوں اور درختوں کا وہ جنگل کافی دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں مجھے تلاش کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا کہ مجھے کوئی خاص خطرہ ہوتا۔ میں بے فکر ہو کر لیٹ گیا۔

لیکن دشمن کو میرا زیادہ دیر آرام کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ باتوں کی تیز آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے فوراً ہی کلاشن کوف ہاتھ میں تھام کر سیفٹی لیور نیچے کر دیا۔ آنے والوں کی تعداد تین تھی۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اس جنگل کو گھیر کر تلاشی لے رہے ہیں۔ یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کیوں میرے تئیں انھیں میری تلاش یہاں سے کافی آگے کرنا چاہیے تھی۔

ان کے پاس موجود ریڈیو سیٹ سے مختلف پارٹیوں کی بات چیت کی آواز آرہی تھی۔ میں ان سے بالکل ہی تعرض نہ کرتا اور انھیں آگے بڑھ جانے دیتا اگر وہ اس باریکی سے تلاشی نہ لے رہے ہوتے۔ کیوں فائر کرنے کا مطلب اپنی موجودی کا راز فاش کرنا تھا۔ مگر انھیں جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں نے ایک دم درمیان والے آدمی پر شست سادھ لی تھی۔ وہ اس وقت اپنے باقی دو ساتھیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش میں تھا ان کا اس جنگل کو چھاننا بالکل ہی بے فائدہ اور فضول ہے۔ میں ٹریگر دبانے ہی لگا تھا کہ اچانک ہی کچھ فاصلے پر تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ وہ تینوں ٹھٹک کر رکے اور پھر اس جانب بھاگ پڑے جدھر سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ ان کے وائرلیس سیٹ سے بھی کنٹرول کا استفسار سنائی دے رہا تھا جو وہ فائرنگ کرنے والوں سے کر رہا تھا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ مگر میرا یہ اطمینان زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ جلد ہی وہ مجھے واپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز دور ہی سے میرے کانوں میں گونجنے لگی تھی

میں ایک بار پھر ان کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ ان کے قریب پہنچنے سے پہلے جنوب کی طرف سے

پانچ آدمی نمودار ہوئے۔ان کا رخ بھی میری جانب تھا۔درمیان میں موجود آدمی کے کندھوں پر مجھے دور ہی سے کراؤن چمکتے نظر آرہے تھے۔وہ کوئی آفیسر تھا۔ان تینوں نے بھی اپنے آفیسر کو دیکھ لیا تھا۔قریب پہنچ کر انھوں نے اکٹھے سیلوٹ کیا تھا۔

سیلوٹ کا جواب دیے بغیر آفیسر ان سے صورت حال کے بارے پوچھنے لگا وہ اتنی دور نہیں تھے کہ ان کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچتی۔آفیسر کے کندھوں پر سجے تین کراؤن اس کے کیپٹن ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

''اس تمام علاقے کی ایک ایک جھاڑی کو چھان مارا ہے سر مگر یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔''تینوں میں سے ایک آدمی نے نظر آنے والی تمام جھاڑیوں کی طرف ہاتھ گھما کر اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

''شاباش۔'' کیپٹن نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''اب یوں کرو کہ جنوب کی طرف جا کر وہاں حوالدار مانس کو مل جاؤ،مزید گھومنے کی ضرورت نہیں ہے۔جنگل کافی گھنا ہے اور تیس پینتیس آدمیوں سے ہم تمام جنگل نہیں کھنگال سکتے۔امید یہی ہے کہ رات کو وہ اپنے ٹھکانے سے نکلنے کی کوشش ضرور کرے گا،اس وقت ہم اسے چھاپ لیں گے۔اس وقت چاروں طرف کے رستوں پر موجود رہ کر اس کے یہاں سے بھاگنے کو روکو۔''

''جی سر۔''تینوں نے اثبات میں سر ہلا کر سیلوٹ کیا اور جنوب کی طرف بڑھ گئے۔اسی وقت مشرقی جانب سے ایک برسٹ فائر ہوا۔

کیپٹن نے ساتھ کھڑے جوان کو کہا۔''پوچھو کیا ہوا ہے؟''

''ون الفا فار آل سٹیشن یہ فائر کس نے کیا ہے؟اوور......''

''حوالدار روہیت فار ون الفا،یہ فائر میری پارٹی کے جوان سے ہوا ہے۔ایک لومڑ تھا جھاڑیوں کے ہلنے پر شک کی بنا پر فائر کیا تھا۔اوور......''

کیپٹن نے ہاتھ بڑھا کر جوان سے ریڈیو سیٹ لیتے ہوئے پوچھا۔''روہیت تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟اوور......''

''چار آدمی ہیں سر۔اوور......''

''ٹھیک ہے تم جنوب مشرقی جانب دھیان رکھو،کوئی جنگل سے باہر نہ نکلنے پائے۔اگلی پوسٹوں اور بٹالین

ہیڈکوارٹر سے مزید نفری آرہی ہے اس وقت تک ہم نے جنگل کو گھیرے میں لیے رکھنا ہے۔کیپ لسننگ آؤٹ۔‘‘وائرلیس واپس جوان کی طرف بڑھا کر وہ مغرب کی جانب بڑھ گیا۔اس کے ہمراہ موجود چار آدمیوں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس جنگل پر اتنی توجہ کیوں دے رہے تھے۔اور میرے وہاں چھپنے کا انھیں اتنا یقین کیوں تھا۔شاید کسی نے مجھے وہاں گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔اس کے علاوہ تو اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی تھی۔اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔اگران کی مزید نفری پہنچ جاتی تو میرا وہاں سے بچ کر نکلنا ممکن نہ رہتا۔کیوں آج کی رات وہ جنگل کو گھیرے رکھتے اور آنے والے دن ایک ایک جھاڑی کو چھان کر مجھے ڈھونڈ نکالتے۔چند لمحے سر کھپا کر میں نے اسی وقت حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔دائیں بائیں کا جائزہ لے کر میں نیچے اترا،حوالدار روہیت کی پارٹی مشرقی جانب تعینات تھی اور اس سے تھوڑا حساب کتاب بھی رہتا تھا اس لیے میں نے مشرق ہی کا رخ کیا وہ جنگل مغرب کی جانب زیادہ پھیلا تھا اس لیے زیادہ تر پارٹیوں کا رخ اس جانب تھا۔

رائفل کو تیاری حالت میں پکڑ کر میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مشرق کی جانب بڑھنے لگا۔مغرب کی جانب سے آتا ہوا چوڑا نالہ جنوب کی طرف مڑ گیا تھا۔جھاڑیوں کے جھنڈ مغربی اور جنوبی نالے میں نہایت کثرت سے پھیلے تھے۔مشرقی جانب ایک پہاڑی موجود تھی جو جنوب کی طرف آگے بڑھتی گئی تھی۔شمال کی طرف بھی ایک نالہ موجود تھا جو جنوبی نالے میں شامل ہو رہا تھا۔اس وقت جنوبی نالے میں سفر کرنا مشرق کی نسبت زیادہ آسان تھا لیکن مجھے مشتاق کی موت کا بدلہ لینے کی خواہش نے مشرق کی جانب گامزن رکھا۔

اصولاً تو روہیت پارٹی کو ذرا بلندی پر بیٹھنا چاہیے تھا کہ اسی صورت میں وہ اس جانب کی نگرانی کر سکتے تھے۔میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کبھی بندر چال،کبھی چیتا چال اور کبھی زمین پر لیٹ کر رینگتا ہوا جنگل کے جنوب مشرقی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔اسی اثناء میں میرے کانوں میں وائرلیس سیٹ کی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ کر میں نے اس طرف نظر دوڑائی قریب کی ایک ڈھلان پر وہ پانچوں بیٹھے ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ان میں سے ایک آدمی کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ بقیہ

اطمینان سے ہتھیاروں کو گود میں رکھ کر پتھروں سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔انھیں اس لیے بھی کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ شکاری تھے اور ایک اکیلے آدمیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد تیس پینتیس افراد پر مشتمل تھی۔یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اکیلا آدمی ان پر ہلا بول سکتا۔ریڈیو سیٹ سے ابھرنے والی Transmission سے مجھے معلوم ہوا کہ مغربی جانب ان کی مدد کے لیے اگلی پوسٹوں سے کچھ مزید نفری پہنچ گئی تھی۔

''استاد روہیت، مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ وردھی اب تک یہیں چھپا ہوگا۔'' ایک آدمی نے خیال ظاہر کیا۔اس نے میرے مطلب کی بات پوچھی تھی میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''سچ کہوں تو میرا ابھی یہی خیال ہے،اسی لیے میں تم لوگوں کے ساتھ کافی آگے نکل گیا تھا لیکن پھر حکم کی تعمیل میں واپس آنا پڑا۔اب میں کیپٹن اندراجیت کو تو یقین دلانے سے رہا۔''

''کیپٹن صاحب کو بھی جانے کیا سوجھی ہے۔'' پہرہ دینے والا ان کی گفتگو میں شامل ہوا۔

حوالدار روہیت بولا۔''یہ نائیک راہول سنگھ کی کرپا ہے۔اس نے کیپٹن صاحب کو بتایا ہے کہ اس نے صبح دم دشمن کو جنگل میں گھستے ہوئے بذات خود دیکھا ہے۔''

سنتری نے منھ بناتے ہوئے پوچھا۔''تو گولی کیوں نہیں ماری؟''

روہیت نے جواب دیا۔''کیوں کہ اس وقت دشمن کلاشن کوف کی رینج سے دور تھا اور وہ اس پر گولی چلا کر اسے چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا پس اس نے کیپٹن صاحب کو اطلاع دے دی۔''

''راہول نے لازماً کسی سور وغیرہ کو دیکھا ہوگا۔'' ایک اور آدمی نے خیال ظاہر کیا۔

روہیت نے منھ بگاڑ کر کہا۔''یہ مسلے بھی سور سے کم تو نہیں ہوتے۔'' ان کی گفتگو کا رخ میری جانب مڑ گیا تھا۔وہ بس مجھے ہی کوستے رہے۔

ان کا فاصلہ بیس پچیس قدموں سے زیادہ نہیں تھا لیکن وہ ذرا ڈھلان پر تھے اس لیے میں بھاگ کر ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔میں ان سے نبٹنے کا ایسا طریقہ سوچنے لگا جس سے باقی لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوتے۔ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں پیچھے مڑ کر جھنڈ کے درمیان میں پہنچا اور جس کپڑے میں ایوب نے مجھے روٹی باندھ کر دی تھی، چاقو کے ذریعے اس کی باریک باریک پٹیاں بنانے لگا۔تمام پٹیوں کو باندھ کر میں نے ایک لمبی رسی بنائی

اور پھر کلاشن کوف سے سلنگ نکال کر اس رسی کے ساتھ باندھ دی۔ اب تک بھی رسی اتنی لمبی نہیں تھی کہ میرا کام ہو سکتا۔ میں مفلر کی بھی پٹیاں بنانے لگا۔ پندرہ بیس میٹر لمبی رسی بنا کر میں رینگتا ہوا شمال کی طرف بڑھنے لگا۔ رسی کی لمبائی کے بقدر دور جا کر میں نے رسی کا ایک سرا چھوٹی سے جھاڑی کے تنے سے باندھا اور واپس لوٹ آیا ۔ایسی جگہ پر لیٹ کر جہاں میں سنتری کو اپنی نگاہ میں رکھ سکتا تھا میں سنتری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی تکرار کا حصہ بنا ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد جا کر اسے اپنی ذمہ داری پورا کرنے کا خیال آیا اور اس نے چاروں طرف ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ جوں ہی اس کی نظریں مطلوبہ جھاڑی کی طرف اٹھیں میں نے ایک دم رسی کھینچ لی۔ اس نے فوراً ہی کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتار کر ہاتھ میں پکڑی ۔''جھاڑیوں میں حرکت ہو رہی ہے۔'' اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔

اگلے ہی لمحے اس نے فائر کھول دیا۔ دو تین برسٹ فائر کر کے وہ بہ غور جھاڑی کو دیکھنے لگا۔ ون الفا کی طرف سے فائرنگ کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔ روہیت نے پہلے کی طرح جانور کا بتا کر انھیں ٹالا۔ اور پھر جیسے ہی اس نے ریڈیو سیٹ ہاتھ سے رکھا میں نے فوراً ہی شست لے کر سنتری کے سر کا نشانہ سادھا اگلے چند سیکنڈ میں چار کے سر میں سوراخ کھل گئے تھے۔ انھیں حرکت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ حوالدار روہیت کو میں نے جان بوجھ کر زندہ چھوڑا تھا۔ جونھی اس نے کلاشن کوف سیدھی کرنا چاہی میں نے پانچویں گولی فائر کی جو اس کے دائیں کندھے میں لگی تھی۔

''اوغ۔'' کی آواز نکالتے ہوئے وہ پیچھے گرا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے گری ہوئی کلاشن کوف اٹھانے کی کوشش کی۔ میری چلائی ہوئی اگلی گولی اس کے بائیں ہاتھ میں گھس گئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر نیچے گرا۔ میں جھاڑی کی آڑ سے نکل کر اس کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ ریڈیو سیٹ پر ایک بار پھر فائرنگ کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔ میں نے فوراً ریڈیو سیٹ اٹھا کر اپنا ایک پاؤں حوالدار روہیت کے منھ پر رکھا اور کہا۔

''سر!...... یہاں جھاڑیوں میں کافی سؤر موجود ہیں جو بار بار جھاڑیاں ہلا کر مشکوک کر دیتے ہیں۔ اور ور......'' میں نے کوشش کی تھی کہ میری آواز سنتری کی آواز جیسی ہو۔ یوں بھی وائرلیس سیٹ پر آواز کافی تبدیل ہو جاتی ہے۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اسے مجھ پر شک ہوا تو روہیت کی کنپٹی پر گن رکھ کر اس سے بات کرا کر

ان کا شک دور کروں گا۔ مگر پوچھنے والے کو شک نہیں ہوا تھا۔ وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے تمام کو کیپٹن صاحب کا حکم پاس کرنے لگا۔

”آل سٹیشن، کیپٹن صاحب نے حکم دیا ہے کہ اس کے بعد کسی نے فضول فائر کیا تو سزا کا حق دار ٹھہرے گا۔ کیپ لسننگ آوٹ۔“

گہرا سانس لے کر میں نے ریڈیو سیٹ جیب میں ڈالا اور حوالدار روہیت کے سر کی طرف اکڑوں بیٹھ گیا۔

”تو حوالدار روہیت، تم نے پرسوں رات ایک کمزور، نہتے شخص کو تشدد کا نشانہ بنا کر گولی مار دی تھی کیوں......؟“

وہ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا کراہتا رہا۔

”تمھیں نرگ میں بھیجنے سے پہلے یہ بتاتا جاؤں کہ تم اور تمھارے ساتھی صرف اسی شخص کی وجہ سے ہلاک کیے گئے ہو۔ بہ ہر حال میرے پاس مزید وقت نہیں ہے کہ تم سے گپ شپ کر سکوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی اور دوسرا سر پر رکھ کر اپنے ہاتھوں کو مخالف سمت میں جھٹکا دیا۔ اس کا بگڑا ہوا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ تڑپنے کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے فوراً ایک موٹے آدمی کے جسم سے وردی اتاری اور اپنے کپڑوں کے اوپر ہی وہ وردی ڈال کر میں نے جلدی جلدی چند فالتو میگزینیں اٹھا لیں۔ اپنی کلاشن کوف وہیں پھینک کر میں نے حوالدار روہیت کی کلاشن اٹھائی اور ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ انڈین آرمی کی وردی کی وجہ سے کسی بھی دیکھنے والے کو مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پہاڑی اتنی اونچی نہیں تھی۔ بلندی پر پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مگر کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری جانب ڈھلان سے اترتے ہی میں نے وردی اتار دی کہ وہ میرے تیزی سے چلنے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ البتہ وردی کو لپیٹ کر میں نے پاس رکھ لیا تھا کہ پھر کسی موقع پر کام دے جاتی۔ مشرقی ڈھلان سے میں دوڑتے ہوئے نیچے اترا اور پھر نالہ عبور کر کے اگلی ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ اس سے اگلے نالے میں اتر کر میں مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں کافی دیر آرام کر چکا تھا اور میرا پیٹ بھی بھرا ہوا تھا اس لیے تازہ دم تھا۔ سب سے بڑھ کر مشتاق کے

قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے پر ایک علیحدہ ہی سکون واطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔دن کی روشنی کی وجہ سے میری حرکت دور ہی سے دیکھی جا سکتی تھی اس لیے میں نالوں کی گہرائی، جھاڑیوں اور چٹانوں وغیرہ کی آڑ کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ساتھ ساتھ میں دشمن کی بات چیت پر بھی کان دھرے ہوئے تھا۔تمام پارٹیاں کنٹرول کو ہر گھنٹے بعد سب اچھا رپورٹ دے رہی تھیں۔ایک بار روہیت پارٹی کی طرف سے رپورٹ نہ دیے جانے کو کنٹرول نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی کیوں کہ ایک ادھ بار کسی پارٹی سے رپورٹ رہ بھی جاتی ہے۔مگر دوسرے گھنٹے کے اختتام پر بھی جب روہیت پارٹی کی آواز سنائی نہ دی تو کنٹرول بار بار انھیں پکارنے لگا۔اس کے باوجود بھی جب ان کی طرف سے خاموشی چھائی رہی تو کنٹرول نے جنوب کی جانب موجود ایک پارٹی کو روہیت پارٹی کی طرف روانہ کیا تاکہ جا کر ان کی خیر خبر لے۔

بیس پچیس منٹ بعد ہی ریڈیو سیٹ سے ایک گھبرائی ہوئی آواز روہیت پارٹی کی ہلاکت کے بارے کنٹرول کو بتا رہی تھی۔ایک دم ہی ہلچل مچ گئی تھی۔کنٹرول فوراً ہی تمام پارٹیوں کو ہوشیار کرنے لگا۔حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کہ تمام اس فریکونسی پر موجود تھے اور انھیں یہ بات اچھی طرح سنائی دے رہی تھی۔

انھیں میرے جانے کی سمت کا خاص تعین نہیں ہو رہا تھا۔وہ صرف اتنا ہی اندازہ کر سکتے تھے کہ میں نے مشرقی جانب کی پہاڑی عبور کی ہے اس کے بعد میرا رخ کس جانب ہو گیا ہے اس متعلق وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔سہ پہر ڈھلنے لگی تھی میرا سفر جاری رہا۔میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

رات کا اندھیرا چھانے تک دشمن کی Transmission کی آواز کٹ کٹا کر غائب ہو گئی تھی۔یقیناً میں ان سے زیادہ فاصلے پر آچکا تھا۔اور پھر نالوں کی گہرائیاں بھی ریڈیو سیٹ کے مواصلات (Communication) میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

میرا سفر تمام رات جاری رہا۔دو چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی میں نے نظر انداز کی تھیں کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو میری وجہ سے مشتاق کی طرح جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔صبح ہوتے ہی میں ایک کھوہ میں چھپ کر لیٹ گیا تھا۔میرا ارادہ شام کے وقت جنوب کا رخ کرنے کا تھا کیونکہ اب وقت آگیا تھا کہ میں سرحد عبور کر لیتا۔یقیناً میں کارگل کے پہاڑوں سے کافی دور نکل آیا تھا۔اب میں جس علاقے میں تھا وہاں ایک تو سردی کی شدت پہلے

جیسی نہیں تھی دوسرا درخت اور جھاڑیاں وغیرہ بھی کثرت سے تھے۔

شام کا اندھیرا چھاتے ہی میں کھوہ سے باہر نکلا اور ستاروں کی مدد سے جنوب کی سمت کا تعین کر کے چل پڑا۔ ایک نالہ جنوب مشرق کی سمت جا رہا تھا۔ میں اسی میں چل پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہیں دائیں بائیں موجود دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ آگے جا کر وہ نالہ مکمل طور پر مشرق کی جانب مڑ گیا تھا۔ جنوب کی سمت جانے کے لیے مجھے دائیں جانب کی بلندی عبور کرنا پڑتی۔ پہاڑ کی اونچائی دیکھ کر میں نے ہمت ہار دی تھی۔ خواہ مخواہ توانائی ضائع کرنے کے بجائے میں اسی نالے میں چلتا رہا۔ یوں بھی میں کون سا نقشے کے مطابق چل رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہوتا۔

مختلف نالے اور چھوٹی بڑی ڈھلانوں کا سفر طے کرتے ہوئے میں ایک تنگ نالے سے برآمد ہوا، میرا رخ جنوب کی طرف تھا۔ سامنے ایک کھلا نالہ تھا۔ وہ وسیع نالہ چھوٹی سی وادی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ وہاں اچھی خاصی آبادی نظر آ رہی تھی۔ جس کا اندازہ مجھے گھروں میں جلنے والی لالٹین اور اسی قسم کی دوسری بتیوں سے ہوا۔ میں ایک کچی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ آبادی شرقی جانب پھیلی تھی۔ آبادی کے تین چار سو میٹر جنوب مغرب کی طرف پھیلا ہوا جنگل نظر آ رہا تھا۔ صبح صادق ہونے میں گھنٹا، پون گھنٹا باقی تھا۔ میں نے آگے بڑھنے کے بجائے اسی جنگل میں دن گزارنا مناسب سمجھا۔ گو مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر اپنے سابقہ تجربے کو یاد کر کے میں نے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہ سمجھا۔

سڑک عبور کر کے میں جنگل میں گھس گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد مجھے ایک چٹان کی آڑ میں جھاڑیوں کا ایسا جھنڈ مل گیا تھا جہاں میں دن گزارنے کے لیے مچان بنا سکتا۔ طلوع آفتاب سے پہلے میں مچان بنا کر لیٹ چکا تھا بھوک کی وجہ سے مجھے کوئی خاص نیند تو نہ آ سکی مگر جسم کو آرام مل گیا تھا۔ دوپہر تک تو میں لیٹا رہا لیکن اس کے بعد کسی چرواہے کو ملنے کے ارادے سے مچان سے باہر آ گیا تاکہ اس سے کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر پیٹ پوجا کر سکوں۔ آبادی قریب ہی تھی یقیناً چرواہوں کی آمد وہاں یقینی تھی۔ مچان سے نکل کر میں قریبی ٹیکری پر چڑھا اور اچانک ہی میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ جنگل، وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہ وہی جنگل تھا جہاں میں ایک بار پہلے بھی مچان بنا کر چھپ چکا تھا۔ بالکل وہی جنگل جس میں میری ملاقات کشمیری چرواہن رومانہ سے ہوئی

تھی۔ وہی رومانہ جو میری زندگی میں آنے والی تمام لڑکیوں سے خوب صورت تھی۔ جو میری خاطر اپنے شوہر سے طلاق لینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ میری یادداشت میں اس سے ہونے والی آخری ملاقات کا منظر ابھرا......

''اجنبی!......اجنبی......میں مر جاؤں گی۔ یوں خفا ہو کر نہ جاؤ......لوٹ آنے کا وعدہ کر کے جاؤ۔ میں اس سے طلاق لے لوں گی۔'' اس نے مجھ سے لپٹنے کی کوشش کرتے ہوئے یہی کہا تھا اور میں اسے تھپڑ مار کر بھاگ پڑا تھا۔

''پتا نہیں وہ اب بھی وہاں آتی ہو گی یا نہیں۔ اسے اب بھی اپنے اجنبی سے پیار ہو گا یا ایک دو بچوں کی ماں بن گئی ہو گی۔'' میرے دماغ میں کئی سوال ابھرے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ نے مجھے اس جانب کا رخ کرنے سے منع کیا لیکن پھر میں قدموں کو روک نہیں پایا تھا۔ علاقے کی پہچان ہوتے ہی سارے رستے مجھے ازبر ہو گئے تھے۔ میں اسی جانب روانہ ہو گیا۔ کم از کم مجھے اس پر بھروسا تو تھا۔ اور وہ میرے لیے کھانا بھی لا سکتی تھی۔ یوں بھی پلوشہ کے بعد میری زندگی میں کسی کی گنجائش نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں اس طرف بڑھتا گیا۔

میں مچان سے میں تھوڑا دور ہی تھا کہ بکریاں اور بھیڑیں اس علاقے میں گھومتی نظر آنے لگیں۔ جلد ہی میں گھنی جھاڑیوں کے درمیان پڑی اس خالی جگہ پر پہنچ گیا تھا جہاں میں نے دو انڈین سپاہیوں کو رومانہ کی خاطر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہیں اس کے ہاتھ کی بنی لذیز چائے سے لطف اندوز ہوا تھا اور اسی جگہ جانے کتنی دیر مجھ سے لپٹ کر وہ اپنے ریشمی وجود کا احساس دلاتی رہی تھی۔

وہاں کوئی چادر لپیٹے سویا ہوا نظر آیا اس سے پہلے کہ میں سوئے ہوئے شخص کی جانب بڑھتا ایک جھاڑی کے پیچھے سے قریباً میرا ہم عمر جوان سامنے آیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی مجھے حیرانی سے گھور رہا تھا۔ لباس، حلیہ اور کندھوں سے لٹکی کلاشن کوف میری شخصیت کا تعین کر رہے تھے۔

سلام ڈالنے کے لیے میرے لب ہلنے ہی لگے تھے کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز دیکھ مجھے کافی حیرانی ہوئی تھی۔ قریب آ کر وہ سرگوشی میں بولا۔

''اسلام علیکم!''

''وعلیکم اسلام!'' میں نے بھی اسی کی طرح دبے لہجے میں کہا تھا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اسی جھاڑی کی طرف بڑھ گیا جس کے پیچھے سے وہ برآمد ہوا تھا۔ دو پتھروں کے نیچے جلتی ہوئی آگ اور اس پر رکھا چائے کا کٹورا دیکھ کر میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا تھا۔ وہ کٹورا بھی مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہی رومانہ والا کٹورا تھا یا شاید اسی کی طرح لگ رہا تھا۔

مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے وہ نادم لہجے میں بولا۔

''معذرت خواہ ہوں آپ کو اس لیے بولنے سے منع کیا تھا کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔'' سوئے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔

''کون ہے وہ؟'' میرے سرگوشی بھرے لہجے میں گہرا اشتیاق شامل تھا۔

''ہے ایک بدنصیب۔'' اس کے لہجے میں گہرا دکھ در آیا تھا۔

''شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔'' نہ جانے کیوں مجھے اس کے بارے کرید لگی تھی۔

''چھوٹی بہن ہے میری۔'' اس مرتبہ اس نے سچ اگل دیا تھا۔ ''اور غالباً آپ کا تعلق کسی جہادی گروپ سے ہے۔''

''کچھ ایسا ہی سمجھو۔'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' اس نے میری دل لگتی بات پوچھی۔

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔''

جھولے سے کھانے کی پوٹلی نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔

میں نے بغیر کسی تکلف کے پوٹلی کھولی اور کھانے کو جڑ گیا۔ وہ دال کے بنے ہوئے پراٹھے تھے۔ میں نے رسمی لہجے میں پوچھا۔

''میرا، تمام پراٹھے چٹ کر جانا آپ کو برا تو نہیں لگے گا۔''

وہ مسکرایا۔ ''اچھا لگے گا۔''

''آپ نے اپنی بہن کو بدنصیب کیوں کہا ہے؟'' میں جھجکتے ہوئے مستفسر ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ سویا ہوا وجود رومانہ کا تھا۔ اور اس کی بدنصیبی میں کسی نہ کسی طرح میری ذات بھی ملوث ہو رہی تھی۔

"میرا نام سکندر ہے کیا آپ کا نام جان سکتا ہوں؟" چائے کا کٹورا آگ سے اتار کر وہ سٹیل کے مگ میں چائے انڈیلنے لگا۔

"ابنِ حیدر۔" میں نے اپنے نام کا آخری حصہ بتایا تھا۔

"تو حیدر بھائی بات یہ ہے کہ فضول اور بے فائدہ کہانی سن کر یقیناً آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ چھوڑیں اسے اپنی سنائیں، کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"اب تو میرا شوق اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اس لیے پہلے میں آپ کی کہانی سنوں گا اور اس کے بعد اپنے بارے بتاؤں گا۔ یوں بھی میں نے شام ہی کو آگے جانا ہے اور اس میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔"

چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ تفصیل بتانے لگا۔ "سچ کہوں تو حیدر بھائی، ہمیں خود معلوم نہیں اس بے چاری کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ قریباً دو سال ہونے کو ہیں۔ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مزدوری کرنے شہر گیا ہوا تھا، انھی دنوں اس بدنصیب کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ اس دن گھر پہنچی تو بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس ایک سفری تھیلا بھی موجود تھا جس میں زنانہ لباس، شال اور سوئیٹر وغیرہ کے ساتھ پستول اور مردانہ لباس بھی موجود تھا۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے کچھ بھی نہ بتایا بس یہی کہتی رہی کہ۔" وہ چلا گیا ہے اجنبی چلا گیا ہے۔......" وہ تھیلا اس نے آج تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی حالت نہ سنبھل سکی۔ اس کا شوہر بھی ہمارے ساتھ محنت مزدوری کرنے شہر گیا ہوا تھا۔ ساس نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے میکے بجھوا دیا۔ اس پہلے بھی وہ اپنی اور ساس کے گھر کی بکریاں اکٹھے ہی چرانے کے لیے لایا کرتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ابو جان نے اسے گھر سے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ مجبوراً ابو جان کو اس کے ساتھ ہی آنا پڑا۔ وہ جھاڑی دیکھ رہے ہو۔" اس نے مچان والی جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہاں ایسی جگہ بنی ہوئی جیسے کسی نے وہاں رات گزاری ہو۔ یہ آتے ہی بے تابی سے اسی جھاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ ہماری واپسی تک یہ ابو جان کے ساتھ آتی رہی اور اس کی یہی روزمرہ ہوتی کہ صبح سویرے آتے ہی اس جھاڑی میں بنی ہوئی جگہ کو دیکھتی اور اسے خالی پا کر اسی جگہ بیٹھ جاتی جہاں اب

سوئی ہوئی ہے۔اس کے شوہر نے واپس آکر اسے گھر لے جانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔اور صاف لفظوں میں اس سے طلاق مانگ لی۔اسفندیار ہمارا چچازاد بھائی ہے،لیکن کب تک انتظار کرتا۔پانچ چھے ماہ بعد اس نے مجبور ہو کر اسے طلاق دے دی۔اس سے پہلے ہم نے اسے شہر جا کر ڈاکٹر کو بھی دکھایا،حکیموں سے بھی دوائی لی،پیروں اور عاملوں سے بھی رابطہ کیا تعویز وغیرہ لیے دم کروایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔بس خاموش رہتی ہے،کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔اور بلاناغہ یہاں ہمارے ساتھ آتی ہے۔نماز روزے کی بہت زیادہ پابندی کرتی ہے،تہجد بھی پڑھتی ہے۔اور لمبی لمبی دعائیں مانگتی ہے۔اب تو گاؤں کی کئی عورتیں اپنے بیمار بچوں کو اس کے پاس لا کر دم وغیرہ کروانے لگی ہیں۔یہ بے چاری ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتی ہے۔البتہ یہاں آکر اسے بہت سکون ملتا ہے۔صبح دم ایک بار آکر جھاڑی میں بنی مچان کو دیکھ کر یہ یہیں بیٹھی رہتی ہے۔یا چادر تان کر سو جاتی ہے اور جونہی آنکھ کھلتی ہے سب سے پہلے جا کر مچان کو دیکھتی۔پیر بابا کہہ رہے تھے کہ اس پر بہت طاقت ور جن کا سایا ہے اور انھوں نے جن کو دور کرنے کے ایک دو چلے کاٹے بھی ہیں مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔چونکہ اس میں یہی بات غیر صحت مندانہ ہے کہ یہاں بلاناغہ آتی ہے،رات رات بھر سوتی نہیں اور کسی سے بات چیت نہیں کرتی۔اس کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں کہ ہمیں زیادہ پریشانی ہوتی۔پیر صاحب نے بھی ہمیں منع کر دیا ہے کہ اسے یہاں آنے سے نہ روکا جائے۔ایک دو سیانے یہ کہتے ہیں کہ اسے کسی مجاہد وغیرہ سے محبت ہوگئی ہے۔مگر اس نے خود کبھی ایسی بات نہیں کی۔بس کبھی کبھی۔''اجنبی کب آؤ گے۔''کے چند الفاظ اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں۔اس وجہ سے ہمیں بھی یہی لگتا ہے کہ وہ سیانے سچ کہتے ہیں اسے کسی انجان شخص سے محبت ہوگئی ہے اور یہ اسی کا انتظار کر رہی ہے۔نجانے اس کا انتظار کتنا طویل ہے۔''سکندر کی آواز بھرا گئی تھی۔

میرے دل کی بھی عجیب حالت ہوگئی تھی۔رومانہ کی کہانی عجیب موڑ پر آگئی تھی۔کیا میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے پسِ پردہ رومانہ کی دعائیں تھیں۔کیا میری جان حیات پلوشہ کی موت اسی وجہ سے ہوئی کہ میری زندگی میں رومانہ واپس آسکے،میرا جینیفر جیسی لڑکی ہر آفر کو ٹھکرا دینا،گلگارے جیسی ثابت قدم لڑکی کا کسی دوسرے سے شادی کر لینا،حالانکہ وہ مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔پھر میرا پوسٹ سے پھسل کر انڈیا کی جانب نیچے گرنا اور اتنی جدوجہد کے بعد ایک دم وہاں پہنچ جانا۔یوں جیسے کوئی ان دیکھی طاقت مجھے وہاں کھینچ کر لے آئی ہو۔کیا یہ

سب رومانہ کی محبت کے دم قدم سے ہوا تھا۔

''پریشان ہو گئے نا؟'' مجھے خاموش پا کر سکندر پوچھنے لگا۔

''ویسے آپ لوگوں نے کسی جوان کو اس مچان والی جگہ پر بٹھا کر اس کا جائزہ لینا تھا کہ یہ کیا کرتی ہے۔''

''صحیح کہہ رہے ہو، مگر ایسا کوئی خیال ہمارے ذہن میں نہیں آسکا تھا۔''

''اچھا یہ کس وقت جاگتی ہے۔'' کھانا کھانے کے بعد میں نے چائے بھی پی لی تھی۔

''کبھی کبھی شام تک سوئی رہتی ہے اور کبھی گھنٹے ادھ گھنٹے بعد ہی جاگ جاتی ہے۔''

''اچھا یوں کرو، میں مچان میں داخل ہوتا ہوں آپ ذرا اسے جگائیں، دیکھیں تو کیا کرتی ہے۔'' بہ ظاہر میں نے عام لہجے میں ایک تجویز بتائی مگر درحقیقت میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی حالت کا ذمہ دار میں تھا۔ اور اسے اس کے محبوب سے مزید جدا رکھنا بالکل بھی جائز نہیں تھا۔ کسی پیارے کے بچھڑنے پر دل کی کیا حالت ہوتی ہے یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ پلوشہ کی جدائی نے مجھ پر جو ظلم ڈھایا تھا یقیناً ویسی ہی حالت رومانہ کی بھی تھی۔ بلکہ میں تو چند ماہ میں سنبھل گیا تھا اور زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا رومانہ کی محبت مجھ سے بھی کئی گنا بڑھی ہوئی تھی کہ وہ آج بھی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس کا محبوب بچھڑا تھا۔

سکندر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''شاید ایسا کرنا مناسب نہ ہو۔ نجانے کیا ردعمل ظاہر کرے۔''

''یہ ضروری ہے۔'' اس سے مزید بحث کیے بغیر میں مچان کی طرف بڑھ گیا۔ سکندر چند لمحے تو وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر متذبذب حالت میں اٹھ کر سوئی ہوئی بہن کی طرف بڑھ گیا۔ سر کے قریب بیٹھ کر اس نے روما کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ ایک نظر بھائی پر ڈال کر اس نے مچان کی طرف دیکھا اور اسی طرف آنے لگی۔ اس کا بالکل وہی حلیہ تھا جو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ گہرے سبز اور سرخ رنگ کی ٹخنوں تک آتی کھلی قمیص، سر کے بالوں پر مخصوص انداز میں باندھی ہوئی چادر جو نیند کی حالت میں بھی اس کے سر سے علاحدہ نہیں ہو سکی تھی۔ نجانے مجھے دیکھ کر وہ کیا ردعمل ظاہر کرتی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ چار پانچ قدم دور تھی جب میں نے مچان سے باہر نکلنے کے لیے پر تولے۔ ٹہنیوں میں حرکت ہوتی دیکھ کر وہ ایک دم رک گئی تھی۔ جونھی میں سیدھا ہوا اس نے ایک لمحہ اپنی آنکھوں کو مل کر دیکھا اگلے ہی لمحے......"میرے اجنبی۔" کہتے ہوئے وہ مقناطیس کی طرح مجھ سے آچمٹی تھی۔"میں جانتی تھی آپ لوٹیں گے، مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا تھا کہ میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی، میں اپنے اجنبی کا انتظار کر رہی تھی، کرتی رہتی......کرتی رہتی یہاں تک کہ موت آجاتی..........." اس کے منھ سے بے ربط باتیں نکل رہی تھیں۔ میرے کندھے پر سر ٹیکے وہ اپنی مدھر آواز میں بولتی رہی۔ میری نظریں اس کے بھائی سکندر کی طرف اٹھیں۔ اس نے رومانہ کو میرے ساتھ لپٹتے دیکھ کر اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

میں نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔"روما!......تمھارا بھائی بھی یہیں موجود ہے۔"

ایک دم اس کی گفتگو میں ٹھہراؤ آیا اور وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ کافی کمزور ہوگئی تھی۔ سرخ و سفید چہرے پر ہلکی سی پیلاہٹ بھی نظر آرہی تھی۔

"ابو جان کو ملیں گے نا۔" ایک قدم پیچھے ہٹ کر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ملتجی ہوئی۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔"ہاں، اسے لیے تو اتنی دور سے گھسیٹ کر یہاں لایا گیا ہوں۔"

اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا۔"آئیں آپ کو بھیا سے ملاتی ہوں۔" وہ سکندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ ایک بار پھر آگ کے قریب جا بیٹھا تھا۔

میرے قریب پہنچتے ہی وہ دھیمے لہجے میں مستفسر ہوا۔"تو وہ آپ تھے۔"

"ہاں میں تھا۔" میں نے اس کے ساتھ ہی زمین پر نشست سنبھال لی تھی۔ رومانہ بھی بھائی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی لیکن اس کی ساحرانہ آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کتنی چاہتیں، کتنا خلوص، کتنی عقیدتیں اور کتنی وارفتگی چھپی تھی۔

"آپ نے گویا مرد کی بے وفائی کی داستانوں کو حقیقت کر دکھایا۔" اس کے لہجے میں طنز کے بجائے دکھ کی آمیزش تھی۔

میں نے کہا۔”میری کہانی سنے بغیر آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔“

”سنائیں، سورج کے غروب ہونے میں تو اب بھی کافی دیر ہے۔“

”ایک شادی شدہ لڑکی کے ساتھ میں کیا تعلق رکھتا۔“

”یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“

”میں لاعلم تھا، اسی جگہ روما سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے دو انڈین فوجیوں کے چنگل سے رہائی دلائی اور انجانے میں محبت کر بیٹھا۔“ رومانہ کے بجائے میں نے جرم محبت اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ اصل بات بتانے میں اس کی سبکی تھی۔”اس وقت میں کسی مشن پر جا رہا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے دل کی بات نہ بتائی ۔واپسی پر میں اس کے لیے کپڑوں وغیرہ کا تحفہ لایا تھا۔ جونھی میں نے اس کے والد سے ملنے کی بات کی اس نے اپنے شادی شدہ ہونے کی بات بتا دی۔ بس حواس باختہ ہو کر میں بھاگ پڑا۔ آج پھر ایک مشن سے واپسی ہو رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر کررخ کر لیا۔ میں اس بات سے بالکل انجان تھا کہ ایک بھولی بھالی لڑکی نے میرے بھاگ جانے کو دل پر لے لیا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو بہت پہلے لوٹ آیا ہوتا۔“

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔”اب کیا ارادہ ہے؟“

میں نے کہا۔”آپ کے والد صاحب کو مل کر جھولی پھیلاؤں گا۔“

رومانہ کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ سکندر نے ایک نظر بہن کے چہرے پر ڈالی اور پھر پوچھنے لگا۔

”کیا آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“

میں نے صاف گوئی سے کہا۔”کی تھی، مگر وہ ساتھ نہ نبھا سکی۔ اس کے مرنے کے بعد ہی تو اس طرف کا رخ کر پایا ہوں۔“

”آپ کا تعلق مجاہدین کے کس گروپ سے ہے۔“ اس کی پوچھ گچھ جاری رہی۔

میں نے کہا۔”میرا تعلق پاک آرمی سے ہے۔“

پہلی بار مجھے سکندر کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آئی تھی۔”یہ سچ ہے؟“ اس نے تصدیق چاہنے والے انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھا میں بکریوں کو اکٹھا کرلوں۔“اس نے کھڑے ہوکر لاٹھی سنبھالی۔اب نا معلوم وہ سچ مچ بکریاں اکٹھا کرنا چاہتا تھا یا ہمیں تنہائی میں بات چیت کا موقع دینا چاہتا تھا۔

اس کے جھاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہوتے ہی رومانہ کے مسکراتے لبوں سے شکوہ پھسلا۔”اتنی دیر لگا دی، میں تو اب مایوس ہوچکی تھی۔“

”اب بھی آیا تو نہیں ہوں بھیجا گیا ہوں۔“

”کیا مطلب۔“وہ حیران رہ گئی تھی۔

”تم کہہ رہی تھیں نا کہ تمھیں اپنے ربّ پر پورا بھروسا ہے۔بس سمجھ لو کہ یہ اسی یقین کا کرشمہ ہے جو میں یہاں موجود ہوں۔“

”صاف صاف بتائیں نا جھوٹے اجنبی۔“اس کے ہونٹوں پر ملکوتی تبسم پھیل گیا تھا۔میری واپسی کے ساتھ ہی اس کی شوخی،شرارت اور ہنسی لوٹ آئی تھی۔

میں نے تفصیل بتلاتے ہوئے کہا۔”میں ہفتہ ایک پہلے کارگل کے محاذ پر دشمن سے برسر پیکار تھا۔ہماری پوسٹ پر دشمن کی گن کا گولہ لگا جس کی وجہ سے میں پھسل کر اس جانب آگرا۔اور اس کے بعد مسلسل دشمن سے جان بچا کر بھاگتا رہا۔مجھے معلوم نہیں تھا میرا رخ کس طرف۔آج صبح سویرے یہاں پہنچا۔اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں مچان بنا کر سو گیا۔دوپہر کو آنکھ کھلی۔دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔بھوک سے بے تاب ہوکر مچان سے باہر نکلا تو علاقے کو پہچان لیا۔بس فوراً ہی اس طرف دوڑا چلا آیا کہ شاید تم سے ملاقات ہوجائے اور ایک بار پھر تم مجھے کھانا کھلا دو۔یہاں تمھارے بھائی سے ملاقات ہوئی۔اس نے تمھارے بارے تفصیل بتلائی اور باقی کی کہانی تمھیں معلوم ہے۔“

اس نے قریب کھسکتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں میں تھاما۔”ابو جان سے ملیں گے نا؟“اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی جس کا جواب میں اسے اور اس کے بھائی کو علیحدہ علیحدہ دے چکا تھا۔

میں ہنسا۔”اعتبار نہیں ہے۔“

”جھوٹے پر کون اعتبار کرے۔“ اس کی گنگناتی ہنسی ابھری۔

”جھوٹا میں ہوں یا تم۔“

وہ ناز سے بولی۔ ”آپ ہیں جھوٹے اجنبی۔“

”پتا ہے مجھے تمھارا نام بھی یاد ہے۔“

”بتاؤ ذرا۔“

”روما......“

اس نے ناز بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ صرف روما کے ہیں نا۔“

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ”ہاں، اب صرف تمھارا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا۔“ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک ایسی لڑکی ملی تھی جس جیسی اللہ پاک نے دوسری نہیں بنائی۔ اس نے مجھے محبت دی، میرا خیال رکھا اور پھر نہایت مختصر وقت کے لیے میری زندگی میں اجالے بکھیر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہت دور چلی گئی۔“

”اگر آپ کی بیوی زندہ ہوتی تب بھی میں نے آپ ہی سے شادی کرنا تھی۔“

”مجھ سے شادی کرنے بعد گھر والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔“ میں نے اس کی توجہ اصل حقیقت کی طرف مبذول کی۔

”جانتی ہوں۔“ میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ پرعزم لہجے میں بولی۔ ”یوں بھی لڑکی شادی کے بعد گھر والوں کے لیے پرائی ہو جاتی ہے۔“

ہم غروب آفتاب تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران اس نے ایک بکری کا دودھ نکال کر میرے لیے چائے بھی بنائی تھی۔ اس کا بکری کو دوہنا ایک خوش کن نظارا ہی تھا اور اب وہ میری بیوی بننے والی تھی۔ میں نے اس دلفریب نظارے سے آنکھیں نہیں چرائی تھیں۔

”یہ ایک دم پرانے والی رومی بن گئی ہے۔“ اسے بکری کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس کا بھائی کہے بنا نہیں رہ

پایا تھا۔ ملگجا اندھیرا چھاتے ہی ہم وہاں سے چل پڑے تھے۔ آبادی میں داخل ہوتے ہوتے اچھا خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔

گھر میں روما کا باپ شفیق، ماں ریحانہ اور بڑا بھائی انوار موجود تھے۔ تینوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔ مجھ سے بھی زیادہ حیرانی انھیں رومانہ پر ہو رہی تھی جو خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی۔

سکندر نے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ رومانہ بھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

سکندر جونہی باہر نکلا میں نے رومانہ کو کہا۔ ”بے وقوف، میرے ساتھ اکیلے بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“

اس کے چہرے پر نامعلوم خوف کی جھلک نظر آئی اور اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ پھر کہیں چلے جائیں گے۔“

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر کہیں جانا ہوتا تو آتا کیوں۔“

وہ بھول پن سے بولی۔ ”ٹھیک ہے میں دروازے پر بیٹھ جاتی ہوں، وہیں سے آپ پر نظر رکھوں گی۔“

میں بے بسی سے بولا۔ ”میں قیدی بنا کر تو نہیں لایا گیا یار۔“

”اجنبی، مجھے تنگ نہ کریں۔ میں بہت ڈری ہوئی ہوں سمجھے آپ۔“ اس نے کھل کر اپنے ڈر کا اظہار کر دیا تھا۔

میں نے اسے جذباتی طور پر ورغلانا چاہا۔ ”مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“

اس نے ذو معنی جواب دیا۔ ”آپ پر اعتبار تو پہلے بھی تھا۔“

”مطلب تم نے میرا اڈراما ضرور بنانا ہے۔“

اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ چاہتے ہیں کہ میں بے چین اور خوفزدہ رہوں۔“

میں نے بے بسی سے سر تھام لیا تھا۔

اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے گھر والوں سے شرمانے کی ضرورت نہیں، وہ میرے کسی کام میں دخیل نہیں ہوتے۔“

”تم بغیر نکاح کے ایک غیر مرد کے ساتھ اکیلے کمرے میں بیٹھی ہو اور تمھارے گھر والوں کو اعتراض نہیں ہوگا

۔‘‘میں نے ذرا سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔’’آپ مجھ سے شادی کرنے والے ہیں، غیر مرد کیسے ہو گئے۔‘‘

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ سکندر میرے لیے کھانا لے آیا تھا۔

’’رومی، جاؤ کھانا کھا لو، تم نے دن کو بھی نہیں کھایا تھا۔‘‘ سکندر میرے سامنے کھانے کے برتن رکھتے ہوئے بہن کو مخاطب ہوا۔

’’مجھے بھوک نہیں ہے۔‘‘ وہ وہاں سے ہلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

’’اچھی امی جان بلا رہی ہیں ان کی بات سن لو۔‘‘ یقیناً سکندر اسے وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔

’’جو کچھ کہنا ہے یہیں آکر کہہ دیں۔‘‘ اس نے صاف الفاظ میں اپنے ارادے کا بتا دیا۔

’’رومی، اب بدتمیزی بھی شروع کر دی۔‘‘ سکندر نے اسے ڈانٹا۔

ایک دم اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی ابھری اور اس نے سر جھکا لیا۔ مگر اٹھنے کی کوشش اس نے پھر بھی نہیں کی تھی۔

’’اس میں رونے کی کیا بات ہے۔‘‘ اس کے آنسو دیکھ کر سکندر پریشان ہو گیا تھا۔

’’کہیں نہیں جاؤں گی، میں یہیں اجنبی کے ساتھ ہی بیٹھوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ انھیں بھگا دیں گے۔‘‘ اس نے کھل کر اپنے ڈر کا اظہار کیا۔

اسی وقت اس کا باپ اور بڑا بھائی انوار بھی وہیں آکر بیٹھ گئے تھے۔

’’رومی بیٹا، جاؤ کھانا کھا لو۔‘‘ اس کا والد یقیناً وہاں ہونے والی بات چیت سے بے خبر تھا۔

’’اسے چھوڑیں ابو جان، آپ ذرا میری بات سنیں۔‘‘ سکندر نے باپ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کے والد سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیے۔ میں خود کو خاصا ہونّق محسوس کر رہا تھا۔ رومانہ کی بے وقوفی نے مجھے خجالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ صورت حال سے بے خبر انوار مجھ سے حال احوال پوچھنے لگا۔ میرے کھانا کھاتے ہی اس نے برتن اٹھائے اور باہر نکل گیا۔ سکندر اور شفیق اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہروں سے مترشح پریشانی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ وہ لڑکی والے تھے، لڑکی بھی ایسی جس کا ذہنی توازن ان کی نگاہوں میں ٹھیک نہیں تھا

۔میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا اس لیے بغیر وقت ضائع کیے میں شفیق صاحب کو مخاطب ہوا۔

''شفیق چچا ایک عرض کرنا تھی۔''

''کہو بیٹا۔'' وہ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''اصولاً یہ بات میرے والدین کو کرنا چاہیے تھی، مگر معذرت خواہ ہوں کہ وہ پاکستان میں ہیں اور اگر راستے میں انڈین فوج کا کڑا پہرہ نہ ہوتا یقیناً میں انھیں ہی زحمت دیتا۔ مگر اب بہ حالت مجبوری مجھے خود ہی یہ بات کرنا پڑ رہی ہے اس لیے میری جسارت کو نظر انداز کر دینا آپ کا بڑا پن ہوگا۔ میرا تعلق پاکستان آرمی سے ہے اور میرا نام ذیشان حیدر ہے۔ میں آپ کی بیٹی رومانہ سے شادی کا خواہش مند ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اسے خوش و خرم رکھوں گا۔''

شفیق صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''آپ کے ہمراہ رومی کو وداع کرنے مطلب یہی ہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ اگر میں اپنی بیٹی کے احساسات سے ناواقف ہوتا تو یقیناً میرا جواب ناں میں ہوتا۔ اس سے یہ مراد بھی نہ لینا کہ میں پاک آرمی کے کسی جوان کو رشتہ دینے پر انکاری ہوں اصل مسئلہ رومی کی جدائی کا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی خوشی کے سامنے اس کی جدائی کے دکھ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے میری طرف سے ہاں سمجھو بیٹا۔''

رومانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ باپ کے نزدیک جا کر ان سے لپٹ گئی۔ شفیق اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''جانتا ہوں بیٹی!''

امام مسجد رومانہ کا سگا ماموں تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد سکندر انھیں بلا لایا تھا۔

نکاح کا خطبہ پڑھ کر انھوں نے شفیق صاحب سے حق مہر کے بارے دریافت کیا۔

وہ سادگی سے بولے۔ ''حق مہر شرعی ہوگا۔''

میں مخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''چچا جان، شریعت تو کوئی حق مہر مقرر نہیں کرتی۔''

مولوی صاحب بولے۔ ''بچہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو ایسا ہے پچاس ہزار ٹھیک رہے گا۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔شفیق صاحب اور اس کے دونوں بیٹوں کے چہروں پر خفت ظاہر ہوئی، مگر میری اگلا فقرہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ ''کم از کم پانچ لاکھ اور اگر چچا جان یا روما چاہے تو اس سے زیادہ بھی بتا سکتے ہیں۔''

''بیٹا یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔'' شفیق چچا نے بہ ظاہر ہلکا سا اعتراض کیا۔

''مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔ چچا جان مروت میں ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ روما جیسی لڑکی کا یہ حق مہر بہت کم ہے۔''

مولوی صاحب سر ہلاتے ہوئے ایجاب وقبول کرانے لگے۔رومانہ بہ ذات خود اس محفل میں موجود تھی۔ میری منت کے باوجود وہ وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔مولوی صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد میں اسے مخاطب ہوا۔

''اب تو کوئی خطرہ نہیں رہا یقیناً تمھیں دوسرے کمرے میں جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

رومانہ کے کچھ کہنے سے پہلے شفیق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔''اب اسے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہم باری باری ہم دونوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور کمرے سے نکل گئے۔وہ رات رومانہ کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئی تھی۔اپنے اجنبی کے ساتھ جانے وہ کیا کیا باتیں کرتی رہی۔گزشتہ دو سال کی جدائی کی کسر وہ ایک رات ہی سے پورا کرنا چاہتی تھی۔میں بھی اس کی ہر خواہش کو تسلیم کرتا گیا۔نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔میری لائی ہوئی چوڑیاں، کپڑے اور سوئیٹر وغیرہ اس کے پاس ویسے ہی محفوظ پڑے تھے۔گلاک نائینٹین پستول بھی ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔میری خواہش پر اس نے میرے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے تھے۔ان کپڑوں کو دو سال بعد وہ مقام نصیب ہوا تھا جس کے وہ حق دار تھے۔

شفیق صاحب نے درخواست کی تھی کہ میں اور رومانہ ایک ہفتہ ان کے ساتھ گزاریں۔ہفتے کے بجائے میں نے پورا مہینا وہاں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔کیوں میں چاہتا تھا کہ انڈین فوجی میری تلاش سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں تب رومانہ کے ساتھ سرحد عبور کروں۔وہ مہینا میں نے قریباً ایک ہی کمرے میں بند رہ کر گزارا تھا۔اور اس دوران روما بھی خال ہی باہر نکلتی تھی۔وہ اپنی خلوص بھری محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ مجھ پر یوں ٹوٹ

کر بسی کہ میری کئی حسرتوں کو تعبیر کی شکل دے دی تھی۔اس کی محبت میں ایک قسم کی عقیدت شامل تھی۔شوہر اور بیوی کا رشتہ دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔قران پاک میں اللہ پاک نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔جس طرح انسان پہنے ہوئے کپڑوں سے کچھ پوشیدہ نہیں رکھ سکتا اسی طرح میاں بیوی کا ایک دوسرے سے نہ تو کچھ راز میں ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔وہ مجھے اب بھی میرے اجنبی کہہ کر بلاتی ۔یہ میرے ساتھ عجیب معاملہ تھا کہ چاہنے والے مجھے مختلف ناموں سے مخاطب کرتے۔ماہین اور پھوپھو جان مجھے شانی کہتی تھیں،جینیفر ذی کہہ کر بلاتی،روما اجنبی کہتی تھی،سردار راجا کہہ کر مخاطب کرتا اور میری جانِ حیات پلوشے مجھے راجو کہتی تھی۔

مہینے گزرتے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ایک شام کو میں اور روما جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔اس کے بھائیوں نے سرحد تک ہمارے ساتھ جانا چاہا مگر میں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔اس رستے پر میں دو بار سفر کر چکا تھا اور ایک سنائپر جس رستے پر ایک بار بھی سفر کر لے وہ راستے کے تمام خوبیوں خامیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ایک جذباتی مکالمے کے بعد روما باری باری تمام گھر والوں سے گلے مل کر وداع ہوئی میں نے انھیں اپنا فون نمبر دے دیا تھا تاکہ جب بھی ان کا دل چاہے وہ شہر جا کر روما سے بات کر کے اس کی خیریت وغیرہ معلوم کر سکیں۔اس کے ساتھ میں نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جب بھی ممکن ہوا قانونی طریقے سے سرحد پار آ کر روما کی گھر والوں سے ملاقات ضرور کراؤں گا۔

واپسی کے سفر میں میں نے بہت زیادہ احتیاط برتی تھی کیوں کہ میرے ساتھ بیوی بھی تھی۔اس کی موجودی میں یقیناً میں دشمن کا مقابلہ نہ کر پاتا۔لیکن کشمیر اور کارگل کی سرحد ایسی ہے جس سے دونوں اطراف کی افواج مکمل طور پر بند نہیں کر سکتی۔سارے نالوں اور پہاڑیوں پر آرمی کی تعیناتی ناممکن ہے۔البتہ کسی جاسوس وغیرہ کی آمد کی پیشگی اطلاع پر مختلف نالوں میں ناکے وغیرہ لگا کر آنے والے کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔میری وہاں آمد پرانی ہو گئی تھی اس لیے حالات ایک بار پھر معمول پر تھے۔پوری رات ہم آرام سے سفر کرتے رہے۔روما ایک کشمیری چرواہن تھی جس کی ساری زندگی انھی پہاڑوں پر گزری تھی۔پہاڑی رستوں پر چلنے کے معاملے میں وہ مجھ سے کچھ بہتر ہی تھی۔پلوشے بھی پہاڑیوں پر لومڑ کی سی تیزی سے حرکت کیا کرتی تھی۔روما کی بے تحاشا محبت پا کر بھی

وہ دشمن جان بھولنے میں نہیں آ رہی تھی۔ کیوں حقیقت یہی تھی کہ انسان زندگی میں سچی محبت ایک بار ہی کرتا ہے اور وہ میں نے پلوشے سے کی تھی۔ روما مجھے پیاری تھی، میں اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی باتوں کو مانتا تھا اسے کسی قسم کی تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ پلوشے کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ پلوشہ کی مکمل کہانی میں روما کو سنا چکا تھا۔ اور اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فقط اتنا کہا تھا۔

''میرے اجنبی کاش وہ زندہ ہوتی، یقیناً میں اسے اپنی چھوٹی بہن جیسی محبت دیتی۔'' حالانکہ وہ پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ پلوشے کی زندگی کی صورت میں وہ کبھی بھی میری زندگی میں شامل نہ ہو سکتی۔ لیکن ایسا کہہ کر میں اسے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ میری محبت میں اپنے سارے رشتوں کو چھوڑ کر اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر میرے ساتھ جا رہی تھی، میں اس کی جتنی قدر، جتنی عزت اور جتنا احترام کرتا کم تھا۔

پوری رات سفر کرنے کے بعد ہم نے طلوع آفتاب سے کچھ پہلے چھپنے کی ایک جگہ تلاش کر لی تھی۔ گھر سے چلتے وقت روما نے راستے کے لیے پراٹھے بنا کر ساتھ رکھ لیے تھے۔ کھانا کھا کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے سونے کا کہہ کر خود بیٹھا رہا۔ اپنی بیوی کو آرام پہنچانا ایک مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے اور میں اپنی ذمہ داری سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کو اٹھ کر اس نے زبردستی مجھے سلا دیا تھا۔ شام کو ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا اور رات کے دو اڑھائی بجے کے قریب ہم پاکستان اور انڈیا کی سرحد کے درمیان موجود چند گھروں کی آبادی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ دیکھا جاتا تو وہ گھر بہت غلط جگہ پر بنے تھے کہ دونوں افواج کے فائرنگ کے تبادلے سے انھیں بھی نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن وہ لوگ اپنے گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

اکتوبر کا مہینا شروع ہو گیا تھا۔ سردی کی شدت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب برف باری کسی بھی وقت متوقع تھی۔ کارگل کی پہاڑیوں پر تو یقیناً اس مہینے میں اچھی خاصی برف پڑ چکی ہوتی ہے۔ البتہ اس جانب برف باری اکتوبر نومبر میں جا کر شروع ہوتی ہے۔ نالے میں پانی پہلے کی نسبت تھوڑا زیادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے جوتے اتار کر نالہ عبور کرنا مناسب سمجھا کیوں گیلے جوتوں کے ساتھ آگے سفر کرنا پاؤں کو خراب کر دیتا۔ البتہ روما کو میں نے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔

”جھوٹے اجنبی،آپ میرا اتنا زیادہ خیال کیوں کرتے ہیں۔“میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔”کیوں کہ تم ہو ہی اس قابل کہ تمھارا بہت زیادہ خیال رکھا جائے۔“

”جھوٹا۔“وہ ناز سے مسکرادی تھی۔چاند طلوع ہو چکا تھا اور اس کی مدہم روشنی میں ہم آگے بڑھنے لگے۔ بارودی سرنگی قطعے کے قریب جا کر میں نے ٹارچ کی روشنی پاک آرمی کے جوان کی طرف پھینکی کہ وہاں سے آگے ہم اس کی نظروں میں آئے بغیر نہیں جاسکتے تھے۔حالانکہ مجھے وہاں سے گزرنے کا راستہ معلوم تھا۔

”کون؟“ٹارچ کی روشنی پر سنتری چوکنا ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً جواب دیا۔”دوست ہوں۔“

اس نے فوراً ہی مجھے خبردار کیا۔”آگے نہ بڑھنا،تم بارودی سرنگوں کے قریب کھڑے ہو۔“

”تو آکر ہمیں لے جاؤ۔“رستہ معلوم ہونے کے باوجود میں نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا کہ دو سال میں وہاں تبدیلی ہونا بھی ممکن تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں سنتری اور اس کے ساتھ موجود گارڈ کمانڈر وہاں پہنچ گئے تھے۔میرے ساتھ ایک خاتون دیکھ کر ان کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔اپنا نام نمبر اور یونٹ وغیرہ بتا کر میں شناخت کرائی اور سنتری کی رہنمائی میں ہم نے بارودی سرنگی قطعہ عبور کر لیا۔تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پوسٹ کمانڈر کے سامنے بیٹھے تھے۔پچھلی بار جب میں نے سرحد عبور کی تھی اس وقت وہاں ایک اور یونٹ تعینات تھی جو اپنا عرصہ پورا کر کے کہیں اور جا چکی تھی۔البتہ میری یونٹ سے رابطہ کر کے انھوں نے میری شناخت کو یقینی بنا لیا تھا۔میرے کمانڈنگ آفیسر نے فوراً ہی مجھ سے بات کرنے کی خواہش کی تھی کیوں کہ ان کے تئیں تو میں مر چکا تھا۔مجھ سے بات کر کے اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

پوسٹ کمانڈر نے فوراً ہی اپنا رہائشی بینکر ہمارے حوالے کیا اور خود باہر نکل گیا۔میں روما کے ساتھ آرام کرنے لیٹ گیا۔دن چڑھے اٹھ کر ہم نے ناشتا کیا اور اس یونٹ کے بٹالین ہیڈکوارٹر کی جانب بڑھ گئے جو وہاں سے چھ کلومیٹر دور تھا۔وہاں سے ہمیں چھتر دو تک گاڑی مل گئی تھی۔کلاشن کوف میں نے اسی یونٹ میں جمع کرادی

تھی البتہ اور یونٹ کمانڈر نے فوراً ہی مجھے ایک لیٹر بنا کر دے دیا تھا کہ میں ایک نے ایک عدد کلاشن کوف مع پانچ فالتو میگزینوں کے وہاں جمع کرائی ہے۔ پاک آرمی میں ہتھیاروں کے بارے اتنی احتیاط برتی جاتی ہے کہ ہتھیار کو غلط استعمال کرنا تو چھوڑیں اس بارے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چھتر دو سے ہم سول ویگن میں باغ پہنچے اور وہاں راولپنڈی کی بس میں بیٹھ گئے۔ شام آٹھ بجے کے قریب ہم پیرودھائی پہنچ گئے تھے۔ میں نے فوراً ہی صوبیدار راؤ تصور صاحب کا نمبر ملا کر انھیں راولپنڈی آمد کا بتا کر ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ میرے ساتھ میری بیوی موجود ہے اور میں گھر جا رہا ہوں۔

میرے زندہ رہنے کی خبر تمام یونٹ میں پھیل چکی تھی۔ بلکہ اس بارے وہ میرے گھر والوں کو بھی مطلع کر چکے تھے جہاں میرا غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا ہو چکا تھا۔

تصور صاحب نے مجھے خیریت سے لوٹنے کی مبارک باد دی، اپنے صوبیدار میجر بننے کی خوش خبری سنائی اور یقیناً دلایا کہ وہ میری زیادہ سے زیادہ چھٹی کرانے کی کوشش کریں گے۔

اے ٹی ایم مشین سے پیسے نکلوا کر میں نے تلہ گنگ تک ٹیکسی کروائی اور ابوجان کو کال کر کے اپنی آمد کا بتانے لگا۔ ابوجان میری آواز سن کر خوشی سے بات نہیں کر پا رہے تھے۔ یقیناً جو بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کا جنازہ پڑھ چکا ہو اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کی خبر جھوٹی تھی تو اس نے خوشی سے بے قابو تو ہونا ہے۔ گھر کے سامنے ٹیکسی کے رکتے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ ابوجان نے فوراً ہی مجھے اپنی پرشفقت آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت ہماری بیٹھک مرد رشتہ داروں سے اور گھر زنانہ رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ ابوجان کے بعد پھوپھو جان اور امی جان نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ چونکہ وہاں کافی مرد موجود تھے اس لیے میں نے امی جان کو کہا۔

''اپنی بہو کو اندر لے جائیں میں باقیوں سے مل لوں۔''

میری بات پر اس نے حیرانی بھری نگاہ میرے ساتھ کھڑی رومانہ پر ڈالی اور فوراً ہی انھیں اپنے ساتھ لپٹا کر اندر لے گئیں۔ میں بیٹھک میں گھس گیا تھا۔ چند لمحوں میں میری شادی کی خبر بھی تمام تک پہنچ گئی تھی۔ تمام سے مل کر شادی اور نئی زندگی کی مبارک باد سمیٹ کر میں ابوجان کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو تمام عورتوں نے رومانہ کو

گھیرا ہوا تھا۔ پھوپھو جان اور امی جان کی خوشی دیدنی تھی۔ عدیل بھی ابھی تک جاگ رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور پھر مجھے عورتوں کے جھرمٹ میں ماہین بھی نظر آئی۔ وہ مجھے ہی گھور رہی تھی۔ میری نظر پڑتے ہی اس نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔ یہ اس کی ہی ہمت تھی کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے بعد بھی اس نے میرے گھر آنے کی جرّات کر لی تھی۔ چونکہ میں نے اسے پہلے ہی دن سے معاف کر دیا تھا اس لیے اسے نظر انداز کر کے رشتہ دار خواتین کے مبارک باد کا جواب دیتا رہا۔ تمام عورتیں رومانہ کے حسن سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ رات گئے جا کر وہ بھیڑ ختم ہوئی۔ میں نے پلوشہ والے کمرے کے بجائے اس کے ساتھ والے کمرے میں رومانہ کو رکھا تھا۔ کیوں کہ اس کمرے میں میری پلوشہ کی خوشبو رچی بسی تھی۔ وہ سیج ابھی تک ویسے ہی قائم تھی اس کے کپڑے اور زیور ویسے ہی پڑے تھے جیسے وہ چھوڑ گئی تھی اور میں انھیں ہمیشہ اسی حالت میں رکھنا چاہتا تھا۔

اگلے دن ابو جان نے بہت بڑی ضیافت کا بندوبست کیا تھا اور پورے گاؤں کھانے پر مدعو تھا۔ میری یونٹ کے کافی جوان بھی مجھے ملنے پہنچ گئے تھے۔ تصور صاحب نے آتے ہی مجھے دو ماہ کی چھٹی کی خوش خبری سنا دی تھی۔ الیاس بھی خصوصی طور پر مجھے ملنے آیا۔ میرے گلے لگتے ہی وہ رو پڑا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ پوسٹ پر خیریت سے ذخیرہ اندوزی ہو گئی تھی۔ البتہ پوسٹ پر موجود جوان اور یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر میرے لیے بہت پریشان تھے۔

رومانہ نے گھر والوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں بالکل ہی دیر نہیں لگائی تھی۔ ہمارے پہنچ جانے کے اگلے ہی روز اس کے بھائی سکندر کی کال آئی تھی۔ ہمارے خیریت سے پہنچ جانے کا سن کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔ رومانہ کافی دیر بھائی کے ساتھ مصروف گفتگو رہی تھی۔

مبارک باد کا یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ حالات معمول کے مطابق ہو گئے تھے۔ میری چھٹی کا مہینہ گزر گیا تھا۔ اس وقت میں اپنے دوست اویس کی بیٹھک میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا جب ابو جان نے کال کر کے کسی مہمان کی آمد کی بابت بتایا۔ اویس سے اجازت لے کر میں گھر کی جانب بڑھ گیا۔ بیٹھک میں قابل خان محسود کو دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا احساس ہوا تھا۔ اسے پرتپاک انداز میں معانقہ کر کے میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گفتگو کی ابتداء میں ہی اس نے گلے شکوے سے کی تھی۔ اس کے تئیں اور تو چھوڑو میں

نے پلوشہ کی قبر پر جانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

میں پر اذیت لہجے میں بولا۔ ”سردار قابل خان، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن جس کے ریشمی بدن پر مٹی کا ذرہ لگنا مجھے گوارا نہیں تھا اسے منوں مٹی تلے دبا کیسے دیکھتا۔ اور پھر اس نے خود بھی تو ہمارے پاس دفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنے بہن کے پہلو کو اپنے لیے پسند کیا۔“

اس نے منھ بنایا۔ ”یہ بہانے بازی ہی ہے۔“

اس مرتبہ میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر وہ کہنے لگا۔ ”اچھا میں ایک خاص سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔“

”حکم کرو بھائی۔“

”خوشحال بھائی کی بیٹی اور میرے بیٹے کی شادی ہے اور آپ کا آنا نہایت ہی ضروری ہے۔“ خوش حال اس کا ماموں زاد بھائی تھا۔ لیکن دونوں میں بلا کی محبت تھی۔

میں خوش دلی سے بولا۔ ”بڑی خوشی کی بات ہے یار، میری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول کرلو۔“

وہ فوراً بولا۔ ”خیر مبارک، لیکن میں نے کوئی اور درخواست بھی کی ہے۔“

”قابل بھائی، آپ تو جانتے ہیں ہم فوجیوں کی چھٹی نہایت ہی مختصر ہوتی ہے اور خوشی کی ایسی محافل میں شرکت کرنا عموماً ممکن نہیں رہتا۔ فی الحال تو نہیں البتہ میں جلد ہی آپ کی طرف آنے کی کوشش کروں گا۔“

”ہونہہ!...... جان چھڑا رہے ہو۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں قابل بھائی، لیکن سچ کہوں تو کچھ ایسی مصروفیات درپیش ہیں کہ حقیقت میں میرا آنا مشکل ہوگا۔“ میں سچ ہی میں جان چھڑا رہا تھا۔ کیوں اس علاقے میں جا کر دشمن جاں کی یادوں نے مجھے اور زیادہ اذیت پہنچانی تھی۔ قابل خان کی بیٹھک میں میں نے پلوشے کے ساتھ بہت قیمتی لمحات بسر کیے تھے۔ میں ان لمحات کو یاد کرنے سے کتراتا تھا۔ یقیناً وہاں جا کر اس کی یادوں نے اودھم مچا دینا تھا۔

”تو کیا میں اتنی دور سے یہاں جھک مارنے آیا ہوں، یا میرا آپ پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔“ قابل خان نے اپنے جذبات کے اظہار میں ذرا بھر نرمی نہیں برتی تھی۔

''میں نے ایسا کب کہا ہے یار۔'' اسے غصے میں دیکھ کر میں نے مفاہمتی لہجہ اپنا لیا تھا۔

''محترم، وشلام گاؤں کے لوگوں نے آپ کے لیے جان کی قربانی بھی دی ہوئی ہے۔ کیا اتنی جلدی بھول گیا ہے کہ آپ کے لیے ہمارے پورے گاؤں نے علام خیل جیسے بڑے قبیلے سے ٹکر لی تھی۔'' وہ اتنا غصے میں تھا کہ اس نے احسان جتلانے میں بھی شرم محسوس نہیں کیا تھا۔

''یار آپ تو ناراض ہی ہو گئے ہیں۔'' میں پریشان ہو گیا تھا۔

''ہاں میں ناراض ہوں۔ اور معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنا سمجھ کر یہاں آ گیا تھا۔ یقیناً آپ کا اور ہمارا تعلق بس پلوشہ کی زندگی تک تھا، خدا حافظ۔'' وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی جذباتی دھونس کے سامنے میں نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کا بازو تھامتے ہوئے میں لجاجت سے بولا۔

''قابل بھائی، ایسا تو خیر نہیں چلے گا۔ یہاں سے خفا ہو کر تو میں آپ کو نہیں جانے دے سکتا۔ اور جہاں تک شادی کا تعلق ہے تو میں کیا میرا باپ بھی اس شادی میں شرکت کرے گا۔''

''باپ کو زحمت نہ دیں صرف آپ کی ضرورت ہے۔ خوشحال بھائی کی بھی یہی تمنا تھی، نشانہ بازی کا بھی مقابلہ رکھا ہے شاید آپ حصہ لینا چاہیں بس دو دن ہمیں دے دینا تیسرے دن واپس آ جانا۔'' میرا مفاہمتی لہجہ سنتے ہی اس نے ناراضی ختم کر دی تھی۔

''کب آنا ہوگا۔''

''اسی جمعہ اور ہفتے کو اتوار کو آپ واپس آ جانا۔''

وہ سوموار کا دن تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں جمعرات کی صبح یہاں سے نکلوں گا۔''

قابل خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ تو خیر نہیں بولوں گا کہ کوئی احسان نہیں کر رہے ہو ہمارا آپ پر پورا پورا حق ہے۔''

''صحیح کہا۔'' میں بھی مسکرا دیا تھا۔ وہ رات میرے پاس گزار کر قابل خان اگلی صبح واپس لوٹ گیا تھا۔

جانے سے ایک دن پہلے میں نے رومانہ کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا تھا، مگر ابو جان، پھوپھو اور امی جان نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ رومانہ کو کسی صورت وزیرستان جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ میں نے ھی

انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بدھ کے دن میں سہ پہر کو گھر سے نکلا راولپنڈی جا کر میں نے دلھا دلھن کے لیے تھوڑی سی خریداری کی اور وہاں سے رات کو ڈیرہ اسماعیل خان کی گاڑی پکڑ کر صبح دم ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں میں صرف ناشتا کرنے رکا اور پھر وانہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وانہ سے وشلام کی ویگن بھی آسانی سے مل گئی تھی۔ میں جمعرات کی شام کو وشلام پہنچ گیا تھا۔ خوشحال خان اور قابل خان مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اسی بیٹھک میں قیام کرنا پڑ گیا تھا جہاں کبھی میں پلوشے کے ساتھ اپنی زندگی کے خوب صورت ترین دن گزارے تھے۔ اب تک بیٹھک کے اس کمرے سے پلوشے کے وجود کی خوشبو آ رہی تھی۔ جمعے کے دن نشانہ بازی کے بہت بڑا مقابلے کا انقاد ہوا تھا۔ قابل خان کے بہت زیادہ زور دینے کے باوجود میں نے اس مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ جیتنے والے نے پانچ گولیاں فائر کر کے تین سو میٹر کے فاصلے پر موجود ایک چھوٹے سے شیشے کا نشانہ بنایا تھا۔ وہاں موجود وشلام گاؤں کے قریباً تمام لوگ مجھ سے واقف تھے۔ مقابلہ ختم ہونے کے بعد کافی لوگوں کے اصرار پر میں نے کلاشن کوف تھام لی تھی۔ صرف ایک گولی چلا کر میں نے اسی فاصلے پر موجود شیشے کو نشانہ بنا لیا تھا۔ لوگوں نے زوردار نعرے سے مجھے سراہا تھا۔ ہفتے کی رات کو خصوصی پروگرام تھا۔ قابل خان نے پشتو کے دو مشہور گلوکاروں کو بلایا ہوا تھا۔

عشاء کے بعد رباب کے تار اور طبلے کی دھمک سے وشلام گاؤں کے در و دیوار جھوم اٹھے تھے۔ گاؤں سے باہر انھوں نے پہاڑی کے دامن میں سٹیج بنایا تھا جہاں یہ محفل سجی تھی۔ نجانے کیوں پشتو ساز اور دھن سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے پلوشہ کا خوب صورت وجود تھرکتا ہوا نظر آنے لگتا۔

”راجو، میں اپنی شادی میں ناچوں گی۔“ اس کی مدھر آواز میرے کانوں میں گونجی اور میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس نے کتنی حسرت سے کہا تھا......

”راجو، پتا نہیں کب وہ دن آئے گا جب آپ تھکے ہارے باہر سے آئیں گے اور میں آپ کے سامنے کھانا رکھوں گی۔ جو آپ کو پسند نہیں آئے گا آپ مجھے ڈانٹیں گے اور میں رونے لگ جاؤں گی اور آپ کھانا پینا بھول کر مجھے منانے لگ جائیں گے اور دیر تک مناتے رہیں گے۔ دیر تک..........“

''ہاں دیر تک مناتا رہوں گا دیر تک......بس ایک بار واپس لوٹ آؤ......'' میرے دل میں ایسی حسرت اٹھی جس کا پورا ہونا یقیناً ناممکن تھا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ پاک کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔

''معجزے صرف انبیاء پاک کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں راجے میاں۔'' میں نے خود کو جھڑکا اور اپنی توجہ گانے والے کی طرف متوجہ کرلی جو اپنی خوب صورت آواز میں ......

''مانا جانان غوغنتو تو روسنڑوں تا گلونہ پہ سرلیا

(محبوب نے اپنے کالے بالوں کے لیے مجھ سے پھول مانگے ہیں ہیں اے بہار)

چرتہ خوز مونگ کلی تہ ہمراپے خاوکا۔

(کبھی تو ہمارے گاؤں میں بھی چکر لگا لو)''

گا رہا تھا۔ میری پلوشہ کے بال بھی تو اب بڑے ہو گئے ہوتے، کیا وہ بھی بالوں میں لگانے کے لیے پھول مانگنے کی ضد کرتی تو کیا میں بھی یونہی موسم بہار کی منتیں کر رہا ہوتا۔ ایک دم میرے لیے وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے قابل خان کو کہا۔

''یار میرے سر میں درد ہے اگر اجازت ہو تو تھوڑا آرام کرنا چاہوں گا۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی۔'' وہ خفا ہونے لگا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''معذرت خواہ ہوں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔''

وہ مصر ہوا۔ ''تھوڑی دیر تو بیٹھو، ایک خاص آئیٹم سن کر چلے جانا۔''

''نہیں میں شکریہ، میرے سر میں بہت درد ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''اچھا وہ خاص آئیٹم میں ابھی چلوا دیتا ہوں آپ بس دو منٹ انتظار کریں۔'' وہ اٹھ کر سٹیج کی طرف بڑھا مگر میں اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتا ہوا قناتوں کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور آتے ہی میرے کانوں میں قابل خان محسود کی آواز آنے لگی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔ اعلا کوالٹی کا ساؤنڈ سسٹم ہوتے ہوئے بھی میری سمجھ میں اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً وہ کسی مہمان گانے بجانے والی کے بارے کوئی اعلان کر رہا تھا۔ اور پھر اس وقت میں بیٹھک میں داخل ہو رہا تھا جب میری سماعتوں میں ایک

عورت کی درد بھری آواز گونجی۔

داہجران تورے تیارے دی خدایا خیر

(ہجر کے کالے اندھیرے چھا گئے ہیں اللہ خیر)

ٹول غمونہ راپسے دی خدایا خیر

(تمام غم میرے ہی پیچھے پڑے ہیں اللہ خیر)

میرا دل اتنے زور سے دھڑکا گویا اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ کیا سماعتیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔ یا قدرت میرے ساتھ کوئی مذاق کرنے پر تلی تھی۔ میری ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے گویا معذوری ظاہر کر دی تھی۔ میں نے بیٹھک کے دروازے کا پٹ تھام لیا۔ میرا پورا جسم ہی گوش بن گیا تھا۔

چرتہ لاڑشمہ فریاداو کما چاتہ

(کہاں جاؤں اور کس کو فریاد کروں)

بالکل اسی کی آواز تھی......

داامید ڈیوے مہ مڑے دی خدایا خیر

(کہ میری امید کے دیے ہی بجھ چکے ہیں اللہ خیر)

اس آواز کو میں کیسے بھلا سکتا تھا۔ جی ہاں وہ پلوشہ ہی کی آواز تھی۔ اپنی غیر ہوتی حالت کو سنبھال کر میں پیچھے مڑ کر بھاگ پڑا۔

☆......☆......☆

دو تین قدم لیتے ہی ٹھوکر لگی اور میں منھ کے بل گر گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ سازندے ساز بجا رہے ہیں یا نہیں، رباب کے تاروں کو چھیڑا جا رہا ہے یا نہیں، طبلچی اور گھڑا بجانے والوں کے ہاتھ رکے ہوئے ہیں یا مصروف ہیں میرے کانوں میں تو بس اس کی درد سے لبریز آواز گونج رہی تھی۔

داشپہ نہ صبا کیگی خدایا لا پس اوگدے گی غمونہ دی اوزہ یم

(اس رات کی صبح نہیں ہو رہی یا اللہ یہ اور بھی لمبی ہوتی جا رہی ہے اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپو اوخکے مہِ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

اس کے الفاظ صرف معنوی طور پر دردانگیز نہیں تھے اس کی آواز سے ظاہر ہونے والی اذیت بھی دل کو محسوس ہو رہی تھی۔ میں زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھا اور پھر دوڑ پڑا۔ پہلے والی چوٹ مجھے بھول چکی تھی۔ بلکہ اس وقت میرے دماغ میں کچھ تھا تو وہ پلوشہ کی آواز کے متعلق تھا۔ کیا کسی کی آواز اس قدر مماثل ہو سکتی تھی......؟

غمونہ دی غمونہ، دا ہجران تورے تیارے دی، عجبہَ زندگی دا

(غم ہی غم اور ہجر کے کالے اندھیرے ہیں، عجیب زندگی ہے)

زہ تل خاورے پہ سریم در پہ دریم اندیخنے دی، عجبہَ زندگی دا

(ہمیشہ سر میں خاک سجائے در بہ در پریشانیاں سمیٹتی ہوں عجیب زندگی ہے)

پہ خپو کے مہِ بیڑی دی، منزلونہ لرے کیگی غمونہ دی اوزہ یم

(پاؤں میں بیڑیاں ہیں، منزلیں دور ہوتی جا رہی ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپو اوخکے مہِ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دی اوزہ یم

(چہرے پر لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

”وہ زندہ تھی تو کیسے؟......اسے چھپنے کی کیا ضرورت آن پڑی، اور جب خود مرضی سے چھپی تو اتنے درد بھرے انداز سے گانے کا کیا جواز......؟“ اس کے الفاظ کو سنتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔

زندی یما داوخت او دا حالاتو پہ زندانِ کے یوازے پہ جڑا

(وقت اور حالات کے ہاتھوں قیدی بنا تنہا آہ وبکا میں مصروف ہوں)

خبرونہ یم پاتے دا اللہ پہ دے جہان کے یوازے پہ جڑا

(دنیا میں بات کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تنہا آہ وبکا میں مصروف ہوں)

ہڈوکی مہ اچیگی بدن غوخے ویلے کیگی، غمونہ دے اوزہ یم

(ہڈیاں خشک ہو رہی ہیں، بدن کا گوشت گل سڑ رہا ہے اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

دا لپو لپو او خلکے مہ پہ مخ باندے بہ ہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگا تار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

کیا اسی وجہ سے قابل خان مجھ پر شادی میں شرکت پر زور دے رہا تھا، یہاں تک کہ وہ احسان جتلانے کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکت سے بھی باز نہیں آیا تھا۔ اور ابھی میرے محفل سے اٹھنے پر بھی اس نے میرے خصوصی آئیٹم کو سننے پر کتنا زور دیا تھا۔ یقیناً وہ چاہتا تھا کہ مجھ تک پلوشہ کا درد پہنچ جائے ......اس کا درد وغم آواز کی صورت میں فضاؤں کا سینہ چیر کر مجھے بے حال کرتا جا رہا تھا......میں پنڈال میں داخل ہوا۔ ارد گرد کے علاقے سے بھی کافی لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔

دا کورا مسافر یم دا ہر چہ یم دا خبرو، زمہ پہ حال خندیگی

(موت کے سفر پر رواں مسافر اور ہر بندے کی باتوں کا نشانہ ہوں تمام مجھ پر ہنستے ہیں)

قیمت مہ کلہ شتا دا ترڑ مو اخکو مسافرو، زمہ پہ حال خندیگی

(میرے بہتے اشک جو بے قیمت ہیں اور فقط ہنسی کا باعث بنتے ہیں)

پہ او چو شونڈو گورامہ یاران رانہ بے لیگی غمونہ دے اوزہ یم

(خشک لبوں سے یاروں کو جدا ہوتے دیکھ رہا ہوں، اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپو او خلکے مہ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگا تار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

اس کی آواز بند ہو گئی تھی، لوگوں نے تالیاں بجا کر اور نعرے بلند کر کے اس کے درد کو سراہنے لگے۔ اس کی نوحہ خوانی اور بین سے لطف اندوز ہونے والے اس آواز کے پیچھے چھپی اذیت کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔ یا اگر کی بھی تھی تو اسے کسی گلوکار کے کمال سے تشبیہ دے دی تھی۔

لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا میں آگے نکلا۔ گلوکاروں کے بیٹھنے کے لیے زمین سے چار پانچ فٹ بلند سٹیج بنایا گیا تھا۔ سٹیج کے سامنے دائیں بائیں چار پائیاں پڑی تھیں جن پر مختلف قبیلوں کے سردار، ملک وغیرہ براجمان تھے۔

سامنے کی طرف بھی چارپائیوں کی دو قطاریں بچھی تھیں اور اس کے بعد عام لوگ، جس کو جدھر جگہ ملی تھی کی بنیاد پر چاروں طرف موجود تھے۔ میں چونکہ خصوصی مہمان تھا اس لیے پہلے سامنے کی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ البتہ ایک بار اٹھ کر جانے کے بعد مجھے آگے جانے کے لیے کافی زور لگانا پڑا تھا۔

وہ مجھے سٹیج پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک پردہ لگا ہوا نظر آیا وہ اسی کے پیچھے موجود تھی۔ لوگ اس سے ایک اور گانے کی فرمائش کر رہے تھے اور میں تمام سے بے نیاز سٹیج کی طرف بڑھتا گیا چارپائیوں کی قطار سے گزر کر خالی جگہ پر پہنچتے ہی میں بھاگ کر سٹیج تک جا پہنچا۔ سٹیج پر موجود گلوکار اور سازندوں نے شاید مجھے گیت سنگیت کا ایسا شیدائی سمجھا تھا جو دو تین بول سن کر گلوکاروں کی طرف بھاگ پڑتے ہیں۔ شاید لوگ بھی کچھ ایسا ہی سمجھ رہے ہوں، مگر اس وقت مجھے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں کہ کوئی سدھ بدھ ہوتی۔

جونہی میں سٹیج پر چڑھا دائیں بائیں کھڑے انتظامیہ کے آدمیوں نے میرے قریب آنا چاہا۔ سب سے پہلے قریب پہنچنے والے کی چھاتی پر میری زوردار لات پڑی اور اس کے ساتھ ہی میں نے کوٹ کی جیب سے گلاک نکال کر لہراتے ہوئے دھاڑا......

''اگر کوئی قریب آیا تو جان سے جائے گا......'' یہ کہتے ہی میں پردے کے پیچھے گھستا چلا گیا۔ باہر شور مچ گیا تھا۔ پتا نہیں لوگ کیا کہہ رہے تھے۔ کوئی چیخ چیخ کر لوگوں کو سب اچھا ہے کی تسلی دے رہا تھا۔ میں تو پردے کے پیچھے موجود وجود کی طرف متوجہ تھا۔ سو فیصد وہی تھی۔ میری پلوشہ، میری جانِ حیات مگر پہلے سے بہت بدلی ہوئی۔ وہ پہلے والی پلوشہ لگ ہی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک چیز جو اس کے جسم پر پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی وہ اس کے بال تھے جو اب کندھوں سے نیچے تک جھول رہے تھے، مگر ان ریشمی بالوں کی بھی بری حالت تھی، الجھے ہوئے، روکھے اور بے رونق شاید ان میں کئی ہفتوں سے کنگھی نہیں کی گئی تھی۔ اس کے سرخ و سفید قندھاری اناروں کے مشابہ گال پچک کر اندر کو دھنس گئے تھے۔ موٹی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا گداز جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس نے ایسا حلیہ بنایا ہوا تھا جیسا بھیک مانگنے والی عورتوں کا ہوتا ہے۔ یقیناً اسے نہائے ہوئے بھی کئی ہفتے گزر گئے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے جلدی سے اپنی اوڑھنی چہرے پر لپیٹ لی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ کر اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ ویران آنکھوں میں نمودار ہونے والے پانی کو وہ روک تو نہیں سکی تھی، البتہ چھپانے کے لیے اس نے چہرہ نیچے جھکا لیا تھا۔

"بھائی صاحب!...... آپ............" کسی مرد نے مجھے واپس لے جانے کے لیے بازو سے پکڑنا چاہا تھا۔ میں ایک دم گھوما، اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میرا بھرپور مکہ اس کی کنپٹی پر لگا، وہ اچھل کر نیچے گرا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کے ساتھ ہی میں دھاڑا......

"کہا نا اگر کوئی قریب آیا تو جان سے جائے گا۔"

"ذیشان بھائی!...... بات تو سنیں۔" قابل خان اندر داخل ہوا۔

"بکواس بند کرو قابل خان!...... اور دور ہو جاؤ میری نظروں سے، میں تمھارا منحوس چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔" پلوشہ کی موت کی جھوٹی خبر اسی نے تو ہم تک پہنچائی تھی...... ہمیں حقیقت سے بے خبر رکھنے والا وہی تو تھا......

"میری بات تو سن لو......" اس نے مجھے منانے کی کوشش کی۔

"نہیں سننا تمھاری کوئی گھٹیا بات۔" یہ کہتے ہی میں نے گھٹنوں کے بل پلوشہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پستول جیب میں ڈالا اور اس کے بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"میری طرف دیکھو۔" نہ جانے اس وقت میری آواز، کن کیفیات کا مجموعہ بن گئی تھی، غصہ، درد، پریشانی، پشیمانی، اذیت، حیرانی...... پتا نہیں اور بھی کون کون سے احساس میرے لہجے میں شامل تھے۔

"م...... مم...... میں آپ کو نہیں جانتی۔" کوئل سی آواز میں وہ منمنا کر رہ گئی تھی۔

"صحیح کہا۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "اگر جانتی ہوتیں تو یقیناً یوں نہ کرتیں۔"

"مم...... میں............" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، میں نے دھاڑتے ہوئے قطع کلامی کر کے کہا۔

"خاموش، تمھاری بکواس نہیں سننا چاہتا، چلو میرے ساتھ۔"

وہ جھرجھری لیتے ہوئے کانپی اور اس کے ساتھ ہی اس نے دائیں بائیں پڑی دو بیساکھیاں پکڑ لیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ "کیا وہ معذور ہو گئی تھی؟" یقیناً یہی بات تھی ورنہ اسے چھپنے کی ضرورت ہی کیوں پیش

آتی۔اس سے پہلے کہ وہ بیساکھیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتی، میں نے دونوں بیساکھیاں اس کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیں۔اگلے ہی لمحے وہ میرے مضبوط بازوؤں میں تھی۔وہ پہلے بھی مجھے پھول کی طرح لگا کرتی تھی، اس وقت تو اس کے جسم پر گوشت کا نام ونشان ہی نہیں تھا۔نرا ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی ناگوار بو بھی مجھے مشک وعنبر سے زیادہ بھینی بھینی لگ رہی تھی۔اس کی ہڈیوں کی سختی ریشم و کم خواب سے بھی ملائم محسوس ہو رہی تھی۔رومانہ جیسی پرکشش لڑکی کی بے تحاشا محبت بھی میرے دل سے اس کی چاہت دور نہیں کر سکی تھی۔وہ آج بھی پہلے دن کی طرح میرے دل کے سنگھاسن پر براجمان تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی محبوب ہوگئی تھی۔

اسے سینے سے لپٹائے میں نے پنڈال کے عقبی رستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔قابل خان وہیں کھڑا پشیمان نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔باقی لوگوں کو اس نے آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے دیا تھا۔میں پنڈال سے باہر نکلا میرا رخ بیٹھک کی جانب تھا۔اپنے نحیف بازو میرے گلے میں ڈال کر وہ میرے کندھے پر سر ٹیکے آنسو بہا رہی تھی۔میں خاموشی سے چلتا رہا۔

ساؤنڈ سسٹم پر خوشحال خان کی آواز ابھری وہ لوگوں کو آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے کر محفل جاری رہنے کا پیغام سنا رہا تھا۔میں بس پلوشہ کے وجود کو محسوس کرتا ہوا بیٹھک کی طرف بڑھتا رہا۔وہاں بیٹھک میں چند اور مہمانوں کا بھی بسیرا تھا۔لیکن اندر داخل ہوتے ہی میں نے بیرونی دروازہ کنڈی کر دیا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہماری تنہائی میں مخل ہو۔ان مہمانوں کو قابل خان اور خوشحال خان خود ہی سنبھال لیتے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بڑے آرام سے پلوشہ کو ایک چارپائی پر لٹایا۔اس کا جسم اب تک ہولے ہولے لرز رہا تھا۔میری چھاتی اس کے آنسوؤں سے گیلی ہوگئی تھی۔جانے وہ خوشی کے آنسو تھے یا اپنے معذوری پر دکھ کے اظہار کے لیے بہائے گئے تھے۔

اس کے سر کی جانب بیٹھتے ہوئے میں نے اس کا سر اپنے زانو پر منتقل کیا اور صدیوں کی پیاسی نگاہوں کو اس کی دید سے سیراب کرنے لگا۔اس کی آنکھیں بند تھیں۔اور وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں تھی، بس اسے محسوس کرتا رہا۔میں اس وقت کی کیفیات کو بیان

کرنے سے یقیناً قاصر ہوں۔ اس وقت خوش تھا، اس سے سخت خفا تھا، پریشان تھا، اس کی معذوری کو دیکھ کر دکھی تھا یا شاید میرے دماغ میں ان سب سے ہٹ کر کچھ چل رہا تھا۔

بہت سی دیر گزر گئی پھر اس کی کراہتی ہوئی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”راجو! مجھے معاف کر دو، میں مجبور تھی۔“

”کبھی نہیں، زندگی بھر معاف نہیں کروں گا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ معافی طلب بھی کر سکو۔“ پتا نہیں میرے لہجے سے غصہ جھلک رہا تھا یا سخت ناراضی......

وہ کراہی۔ ”راجو، اب میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتی تھی، نرا بوجھ ہی تو تھی ایسا بوجھ بہت جلد تھکا دیا کرتا ہے۔“

”بکواس بند کرو۔ میں نے تمھیں جسمانی تسکین کے لیے نہیں اپنایا تھا۔ نہ شوہر بیوی کا رشتہ فقط جسمانی تعلقات تک محدود ہوتا ہے۔ کیا میرے ساتھ حادثہ پیش آجاتا تو میں تمھارے لیے بوجھ کی حیثیت اختیار کر لیتا۔ کیا تمھارا بوجھ قابل خان کو نہ تھکاتا؟...... یا وہ مجھ سے زیادہ تمھیں چاہتا ہے۔ اتنا بے گانہ پن، اتنی بے حسی...... جانتی ہو مجھ پر کیا بیتی، کس طرح میں اپنی موت کا خواہاں رہا۔ امی جان اور عدیل کی کیا حالت ہے۔ ساری زندگی تم نے ان کا خیال رکھا تو کیا اب وہ بھی تمھارا خیال نہ رکھتے۔ چلو میں تو بے حس، بے غیرت اور بے وفا ٹھہرا۔ مجھ پر تمھیں اعتبار نہیں تھا اپنی ماں پر بھی اعتبار نہ کیا۔“

اس مرتبہ کوئی جواب دیے بغیر وہ آنسو بہانے لگی۔ مجھ سے اس کے آنسو برداشت نہ ہوئے اگلے ہی لمحے میں اس کی پلکوں پر جھک گیا تھا۔

”تم اپنے راجو کے پاس ہو گڑیا، رونا کس بات کا...... دیکھو اس شب تاریک کی سحر ہو گئی ہے۔ میں آ گیا ہوں نا اب تمھیں آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پگلی میں ساری زندگی تمھارا خیال رکھ سکتا ہوں۔ تمھارا بوجھ ہے ہی کتنا کہ مجھے اٹھانے میں تکلیف ہوگی۔ پھول کا وزن تو نہیں ہوتا، خوشبو کب کسی پر گراں گزرتی ہے موسم بہار سے بھی بھلا آدمی تنگ پڑ سکتا ہے، آنکھیں بھی کبھی سرمے کے بوجھ سے تھکی ہیں، خوشیوں نے کبھی کسی کی زندگی اجیرن کی ہے، شبِ وصل کی طوالت بھی کسی کو محسوس ہو سکتی ہے، بتاؤ میری جان بتاؤ۔ کیا تمھیں میری

محبت میں شبہ تھا یا میرے خلوص میں کوئی کمی نظر آئی تھی۔"

کوئی جواب دیے بغیر اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کیں اور جھجکتے ہوئے اپنے لرزتے لب میری پیشانی پر ٹیک دیے۔ان لبوں کی حلاوت میری روح تک میں سرائیت کر گئی تھی۔کوئی بات کیے بغیر وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہی۔

نہ جانے کس وقت گانے بجانے کی محفل اختتام پذیر ہوئی پھر دروازے پر دستک ہونے لگی اور ہوتی رہی مگر میں وہیں بیٹھا رہا۔دستک دینے والے تھک کر لوٹ گئے تھے۔صبح تک اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر میں بیٹھا رہا اور اذان کی آواز سن کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔نماز کے بعد ایک بار پھر دستک کی آواز سنائی دی میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا وہ قابل خان تھا۔

"قابل خان، میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

دروازے پر کھڑے اس نے لجاجت سے کہا" ذیشان بھائی، میری صرف ایک بات سن لیں۔"

اسے کوئی جواب دیے بغیر میں خاموشی سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔میری خاموشی سے شہ پا کر وہ گویا ہوا۔

"یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا، اس نے مجھ سے قسم لی تھی کہ اگر میں نے اس کے بارے کسی سے بات کی تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔میں نے اسے اپنی بہن کہا تھا اور چھوٹی بہن کی بات کو میں کیسے رد کرتا۔البتہ آپ تک تو میں نے بات پہنچا دی ہے نا۔الفاظ میں نہ سہی مگر جو طریقہ بھی اپنایا ہے آپ تک اس کی خبر پہنچ گئی ہے نا۔اب بھی ناراض ہو گے تو زیادتی کا ارتکاب کرو گے۔"

"زنانہ کپڑوں کا ایک صاف جوڑا لے آؤ۔ناشتا ہم تھوڑی دیر بعد کریں گے۔"اس مرتبہ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔اس کی بات غلط نہیں تھی۔سارا قصور پلوشہ ہی کا تھا وہ تو بس اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا تھا۔

میرا نارمل لہجہ سنتے ہی وہ خوشی سے بولا۔"شکریہ ذیشان بھائی۔میں بس ابھی کپڑے لاتا ہوں۔"میں اس کے انتظار میں وہیں دروازے پر ٹھہر گیا۔اس کے گھر کی دیوار بیٹھک سے ملی ہوئی تھی۔دو تین منٹ بعد وہ کپڑوں کا ایک نیا جوڑا لے کر آ گیا۔اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر میں نے دروازہ کنڈی کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ خاموش لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر چار پائی سے اٹھالیا۔اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں اسے کہاں لے جارہا ہوں۔وہ پہلے والی پلوشہ لگ ہی نہیں رہی تھی۔

غسل خانے میں جا کر میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہلایا۔گرم پانی کا ڈرم رکھا ہوا تھا۔میں نے صابن کی پوری ٹکیہ ہی اس کے جسم پر رگڑ کر ختم کر دی تھی۔وہ محجوب اور شرمائی شرمائی سی خاموشی سے مفعول بنی رہی ۔نہلا کر میں اسے بڑے تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا نئے کپڑے پہنا کر میں نے اسے دو تین تکیوں سے ٹیک لگا کر بٹھایا اوراس کے بالوں میں خوب تیل چپیڑ کر کنگھی کرنے لگا۔اس کے چہرے پر مجھے بے پایاں سکون پھیلا نظر آرہا تھا۔کنگھی کرتے ہوئے میں ہولے ہولے گنگنانے لگا......

لٹ الجھی سلجھا جارے بالم،میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے......

وہ بے ساختہ متبسم ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

''ہنس کیوں رہی ہو؟''اس کی ناک کی پھننگ کو میں نے ہولے سے مروڑا۔

''یہ لٹ تو جلد ہی کٹنے والی ہے۔''

''تم ہاتھ لگا کر تو دیکھو......''کنگھی کر کے میں نے کوشش کی کہ اس کے بالوں کا جوڑا باندھ سکوں مگر مجھے طریقہ نہیں آتا تھا۔وہ کھلکھلا دی تھی۔اس کی ہنسی دیکھ کر مجھے لگا جیسے ہر جانب بہار نے ڈیرے ڈال لیے ہوں۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ نہ بال ہوں گے اور نہ آپ کو اتنی تگ ودو کرنا پڑے گی۔''

میں اطمینان سے بولا۔''تمھاری زلفیں سنوارنے کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لوں گا۔''

''ایک بات مانیں گے۔''وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔

میں شرارتی لہجے میں بولا۔''اس قابل تو نہیں ہو کہ تمھاری کوئی بات مانی جائے لیکن سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔''آپ دوسری شادی کرلیں۔''

''ٹھیک ہے۔''میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی۔''

میں نے ایک دم دھماکا کیا۔ ”میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔“

”کیا......“اس کے چہرے پر حیرانی ابھری۔ ”کب، کس سے؟“

”اسی سے جو تمھیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔“

”اس کے لیے دوبارہ کشمیر کی سرحد عبور کر لی۔“ وہ ایک لمحے میں رومانہ تک پہنچ گئی تھی۔ مجھے اس کے لہجے میں دکھ کی جھلک نظر آئی تھی۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے لگتا ہے مجھے زبردستی ہی وہاں بھیجا گیا اور اس کا میری زندگی میں آنا قدرت نے طے کر دیا تھا۔“

اس مرتبہ وہ خاموش رہی تھی۔ دو تین لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد میں اپنے آخری مشن کی تفصیلات اس کے سامنے بیان کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی ......آخر میں میں کہہ رہا تھا۔ ”پلوشے کیا تمھیں نہیں لگتا کہ مجھے اس تک زبردستی بھیجا گیا تھا۔ تمھاری موت کا ڈراما، جینیفر کے بار بار شادی کی آفر کرنے پر بھی میرا انکار کر دینا، یوں انڈیا کی جانب میرا اچھل کر گرنا اور پھر بغیر کسی ارادے کے وہاں پہنچنا۔ اور اب دیکھو جیسے ہی اس سے شادی ہوئی تم بھی مجھے واپس مل گئی ہو۔ کیا یہ تمام باتیں ظاہر نہیں کرتیں کہ اس شادی میں میری مرضی سے زیادہ قدرت کی منشا شامل تھی۔“

”راجو، صفائیاں کیوں رہے ہیں میری جان۔ مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا۔“ اس نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دورازے پر دستک ہوئی اور میں اس کے ہاتھ کو لبوں سے لگا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا ۔قابل خان ناشتا لیے کھڑا تھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ خاموشی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے کے برتن میز پر رکھ کر اس نے پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھا جو قابل خان کو دیکھتے ہی سر پر دوپٹا ٹھیک کرنے لگ گئی تھی۔

”میری بہن کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“ قابل خان شفقت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔ ”بھیا آپ نے میری ساتھ گہری چال چلی ہے۔“

”نہیں کوئی چال بھی نہیں چلی۔“ قابل خان صاف مکر گیا تھا۔ ”تم نے خود کہا تھا کہ ذیشان کا ذکر تمھارے

سامنے نہ کروں اور نہ تمھارے بارے ذیشان کو کچھ بتاؤں۔ پوچھ لو کیا اسے تمھارے بارے اطلاع دی ہے۔"

"مجھ پر بار بار زور کیوں دے رہے تھے کہ ان گلوکاروں کی موجودی میں میں گانا سناؤں۔ یہاں تک کہ سکینہ کو بھی آپ نے مجھ پر دھونس جمانے کا کہا۔" سکینہ قابل خان کی بیٹی کا نام تھا جو قریباً پلوشے کی ہم عمر ہی تھی۔

قابل خان نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔"وہ تو تمھاری زبان سے یہ گیت سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا، میں نے کہا دوسرے لوگ بھی سن لیں کہ میری بہن کتنا اچھا گاتی ہے۔اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ذیشان بھائی آپ کی آواز کو پہچان لے گا۔"

"اچھا مذاق ہے۔" پلوشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔لیکن اس کی آواز سے خفگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"تم پاگل ہو، یقین کرو اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید تم چند ماہ ہی مزید گزار پاتیں اس کے بعد سچ مچ سپو گمائے کے پہلو میں قبر کھودنا پڑ جاتی۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔کہ......"ذیشان بھائی، کھانے پینے کی طرف یہ بالکل ہی توجہ نہیں دیتی ہے۔"

"فکر نہ کرو دوست۔" اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں نے برتن اٹھا کر چارپائی پر رکھے اور خود اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔وہ خاموشی سے میرے ہاتھ سے ناشتہ کرنے لگی۔

"امی جان کیسی ہیں؟" وہ ناشتے کے بعد پوچھنے لگی۔

"بڑے افسوس کی بات کہ اب وہ تمھاری امی نہیں رہیں۔"

"کک......کیا ہوا؟" میری بات کا اس نے کوئی دوسرا مطلب لیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔"مطلب یہ کہ اب وہ میری امی بن گئی ہیں۔"

اس نے منھ بنایا۔"تو ساس ماں کی جگہ ہی ہوتیں ہیں۔"

"نہیں جی سچ والی امی جان بن گئی ہیں۔انھوں نے ابو جان سے شادی کر لی ہے۔" میں نے دھماکا کیا۔

"م......مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے۔" اس کی حیرانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"بالکل ہو سکتا ہے، مولوی صاحب سے مشورے کے بعد ہی یہ بابرکت کام سرانجام پایا ہے۔"

پلوشہ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔"کتنی بڑی خوش خبری سنائی ہے راجو۔"

میں نے حماقت کا ارتکاب کرتے ہوئے کہا۔ ’’اگر تم ہوتیں تو ضرور اس شادی میں رقص کرتیں ہیں نا......‘‘

اس کے ہونٹوں سے تیز سسکی برآمد ہوئی اور اس نے سر جھکا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والوں آنسوؤں نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا اگلے ہی لمحے وہ میری آغوش میں تھی۔

’’تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بھروسا رکھو میری جان میں تمھارا علاج کراؤں گا۔ تم ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ویسی ہی بن جاؤ گی۔‘‘

’’یہ ممکن نہیں ہے راجو......ڈاکٹروں کی طرف سے صاف جواب سن کر ہی میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب مجھے ساری زندگی وہیل چیئر یا بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارنا پڑے گی تبھی میں نے قابل بھائی کو کہا تھا کہ میری موت کی خبر آپ تک پہنچا دے۔‘‘

’’پشاور کے ڈاکٹروں کی بات حرف آخر نہیں ہو سکتی چندا، طب کی دنیا میں آئے روز کئی معجزات رونما ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے کہ میری گڑیا بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘ میں اسے آغوش میں بھر کر تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اس کا ذہن بٹانے کے لیے میں اس کی کہانی سننے لگا۔ اس نے بھی کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے مجھے سردار بتا چکا تھا۔ بس اتنا اضافہ کیا کہ جب اسے ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے اس کے باقی زخموں کا تو علاج کر دیا تھا لیکن ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ کے بارے وہ تشویش میں مبتلا تھے۔ اور جب تمام ٹیسٹ وغیرہ کر لیے تو انھوں نے صاف جواب دے دیا تھا کہ پلوشہ کا ٹھیک ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ آپریشن کر کے اس کی ٹانگوں میں ہونے والی ہلکی سی حرکت کو بالکل ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ دوائیوں کے استعمال سے اس کی کمر کی تکلیف آہستہ آہستہ کم ہو جائے گی مگر وہ چل نہیں سکے گی۔ اس کے کمر سے نیچے کا حصہ بے کار ہو گیا تھا۔ ٹانگوں میں بس ذرا سا احساس بیدار تھا کہ جس کی وجہ سے وہ بہ مشکل زمین پر ٹانگیں لگا کر دو بیساکھیوں کی مدد سے تھوڑی بہت حرکت کر لیتی تھی۔ قابل خان نے اس کی فطرتی ضروریات کی بجا آوری میں مدد دینے کے لیے ایک عورت ملازمہ رکھ چھوڑی تھی۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ کبھی میرے سامنے نہیں جائے گی۔ اور عدیل کے بڑا ہونے کا انتظار کرے گی جونہی وہ کسی قابل ہوا اسے وزیرستان میں بلا کر اسی کے پاس منتقل ہو جائے گی۔

وہ بہ مشکل اپنی کہانی سنا کر فارغ ہوئی تھی کہ خوشحال خان وہاں پہنچ گیا۔اس نے بھی قابل خان سے ملتی جلتی بات کر کے معذرت طلب کی تھی۔

مزید کسی گلے شکوے کے بجائے میں نے اپنا مطمح نظر بیان کیا۔''اچھا مجھے گھر تک جانے کے لیے کوئی کار وغیرہ کرائے پر مل جائے گی؟''

خوش حال خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ٹانک تک قابل خان آپ کو اپنی کار میں چھوڑ آئے گا آگے جانے کے لیے وہاں سے کرایہ کی کار کا بندوبست کرنا پڑے گا کیوں کہ ہماری گاڑیوں کے کاغذات وغیرہ نہیں ہوتے۔''

''میں ابھی جانا چاہوں گا۔''مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو پا رہا تھا۔

خوش حال خان سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد ہم قابل خان کی کار میں وانہ کا رخ کر رہے تھے۔وانہ تک ہمیں شام ہو گئی تھی وہاں سے ٹانک تک پہنچتے ہوئے رات کے بارہ بج چکے تھے۔میں عقبی نشست پر پلوشہ کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھا تھا۔اسے آرام پہنچانے کی غرض سے اس کی کمر کے نیچے میں نے نرم و ملائم کورین کمبل بچھا دیا تھا۔

ٹانک سے تلہ گنگ کے لیے میں نے خصوصی کار کرائے پر لی اور قابل خان کو الوداع کہہ کر ہم چل پڑے۔دوپہر دس بجے کے قریب ہم گھر کے سامنے اتر رہے تھے۔ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے میں نے کمبل میں لپیٹ کر اس کے ہلکے پھلکے وجود کو اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گیا۔دسمبر کی آمد ہو چکی تھی ابو جان صحن میں چارپائی ڈال کر دھوپ سینک رہے تھے۔امی جان اور پھوپھو دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔امی جان اب اچھی خاصی پنجابی بول لیتی تھیں۔روما بغیر چھت کے کھلے باورچی خانے میں گھسی چائے وغیرہ بنا رہی تھی۔مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر تمام میری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔انھوں نے میرے بازوؤں میں موجود پلوشہ کے وجود کو حیرانی سے دیکھا تھا۔پلوشہ نے میری چھاتی میں سر چھپایا ہوا تھا۔

قریب پہنچتے ہی میں نے کہا۔''امی جان جگہ دیں۔''

پھوپھو جان اور امی جان نے فوراً ہی چارپائی خالی کر دی تھی۔میں نے جھک کر آہستگی سے پلوشہ کو چارپائی

پر لٹایا اس کا چہرہ نظر آتے ہی امی جان کے منہ سے زوردار چیخ نکلی۔

''میری پلوشے۔'' وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ روما بھی حیران ہو کر باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ وہ جذباتی ملاپ کافی دیر جاری رہا۔ پلوشہ کو دیکھ کر بھی مجھے روما کے چہرے پر پریشانی کے بجائے خوشی ہی نظر آئی تھی۔ بلاشک وشبہ وہ نہایت ہی مخلص لڑکی تھی۔ اسی اثناء میں عدیل بھی آدھی چھٹی پر گھر پہنچ گیا تھا۔ اپنی باجی کو دیکھ کر وہ خوشی سے باؤلہ ہو گیا تھا۔ ہمارے گھرانے کو ایک بار پھر بہت بڑی خوشی ملی تھی۔

ظہر کی اذان سن کر ہمیں وقت کا گزرنے احساس ہوا۔ میں اور ابو جان مسجد کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

سہ پہر کو صحن میں سایہ اترتے ہی میں نے پلوشہ کو گود میں اٹھایا اور اسی کمرے لے جا کر سلا دیا جو جانے کب سے اپنے مکین کے لیے چشم بہ راہ تھا۔

سیج کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

''پاگل نہیں بنتے گڑیا۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

روما نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔ اور پر خلوص لہجے میں بولی۔ ''میری چھوٹی سی بہن بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

رات کو وہ مصر ہوئی کہ میں روما کے ساتھ جا کر سو جاؤں۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''ایک دن تمھارے ساتھ اور ایک دن اس کے ساتھ۔''

وہ کراہی۔ ''میں آپ کے کس کام کی۔''

''گڑیا، بکواس کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔'' اسے ڈانٹ کر میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ رات بھر میں اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ صبح سویرے میں یونٹ جانے کے ارادے سے گھر سے نکل آیا تھا۔ سردار اور باقی دوستوں کو مل کر میں نے پلوشہ کی زندگی کی خبر دی تمام حیران رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر ان سے گپ شپ کر کے میں نے پلوشہ کی سک رپورٹ (فوجی کی فیملی وغیرہ کے علاج کے لیے بننے والا سرکاری فارم) بنوائی اور واپسی کی راہ لی۔

رات کو میں روما کے ساتھ تھا۔ مگر گھنٹا بھر میرے ساتھ گزار کر وہ پلوشہ کے کمرے میں گھس گئی اور بقیہ رات

اس کے ساتھ گزاری۔ایک دن میں وہ پلوشہ کے بہت قریب آ گئی تھی۔ پلوشہ ذرا چڑ چڑی اور خفا خفا لگتی تھی۔مگر روما بغیر ناک بھوں چڑھائے زبردستی اس کی خدمت میں لگی رہی۔اب پلوشہ کو سنبھالنے والے کئی موجود تھے۔ قابل خان اس کے ساتھ جتنا بھی مخلص ہوتا اس کی ایسی خدمت نہیں کروا سکتا تھا۔اس کی سگی ماں جو اس پر جان چھڑکتی تھی، پھوپھو جان جسے اس نے پہلے ہی دن سے اپنی ساحرانہ شخصیت کے زیر اثر کر لیا تھا، مخلص رومانہ جو اس کی زندگی کی خبر پا کر اتنا ہی خوش نظر آ رہی تھی جیسے پلوشہ اس کی سگی بہن ہی تو ہو اور پھر میں خود کہ میرے لیے وہ سانس جتنا ہی اہم تھی۔

اگلے دن میں نے اویس سے اس کی کار مانگی کیوں کہ اب مجھے پلوشہ کے ساتھ بار بار ہسپتال جانا پڑتا۔ پلوشہ کے ساتھ امی جان اور پھوپھو بھی چل پڑی تھیں۔روما نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی مگر میں نے اسے منع کر دیا کہ گھر میں بھی کسی کی موجودی تو ضروری تھی۔ایم ایچ راولپنڈی علاج کی جدید سہولیات سے مزین ہسپتال ہے۔اگلے ایک دو ہفتے پلوشے کے مختلف ٹیسٹ ہوئے۔ مجھے کافی امید تھی لیکن جب ڈاکٹروں نے تمام رپوٹیں دیکھیں تو نفی میں سر ہلا کر ناکامی کا اظہار کر دیا۔میرے دل میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔کیا اب میں اپنی پلوشے کو کبھی چلتے ہوئے نہ دیکھ پاتا، کیا اب وہ ہمیشہ محتاجی کی زندگی گزارتی رہتی، کیا چارپائی اس کا نصیب بن گئی تھی۔

میرے چہرے پر چھائی مایوسی دیکھ کر اس نے سر جھکایا اور اس کی پیاری آنکھوں سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔میرا دل جیسے غم سے بھر گیا تھا۔گھر جا کر میں نے اسے کمرے میں لٹایا، لیکن میرے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔روما ساتھ بیٹھ کر اس کی دل جوئی میں لگ گئی تھی۔

میں دل گرفتہ سا گھر سے نکل آیا۔اویس کے پاس جا کر میں اسے اپنا دکھ سنانے لگا۔میں اپنی پلوشے کی حالت پر رو رہا تھا۔باتوں باتوں میں وہ کہنے لگا۔

”یار، ویسے ضروری تو نہیں کہ پاکستان میں علاج نہ ہو سکے تو باہر کے ڈاکٹر بھی ناکام ہو جائیں۔“

اس کی بات سن کر ایک دم میرے دماغ میں جینیفر کی صورت ابھری اگلے ہی لمحے میں موبائل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے گویا امریکہ میں صبح سات بجے کا وقت ہونا تھا۔

دوسری تیسری گھنٹی پر جینی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔”ذی، اتنا سویرے کیوں کال کی۔“

میں نے سب سے پہلے اس کے کانوں میں خوش خبری انڈیلی۔ ’’جینی، جانتی ہو پلوشہ زندہ ہے۔‘‘

’’کیا، کیسے، سچ، مبارک ہو۔‘‘ اس کی آواز سے غنودگی غائب ہوگئی تھی۔

’’ہاں جینی، مگر اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں گہری چوٹ لگی ہے اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔ یہاں پاکستان میں ڈاکٹروں نے اس کے علاج سے جواب دے دیا ہے۔‘‘

اس نے مخلصانہ مشورہ دینے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ ’’ذی، اسے امریکہ لے آؤ، مجھے امید ہے وہ ٹھیک ہو جائے گی، بلکہ ایسا کرو تم فوراً ہی اس کی رپورٹس کی تصاویر بنا کر مجھے ’’وٹس اپ‘‘ کر دو میں یہاں ماہرین سے مشورہ کرتی ہوں۔‘‘

میں بس دس منٹ میں تمام رپورٹوں کی تصاویر بھیج دیتا ہوں۔‘‘ پرجوش انداز میں کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کیا اور گھر کی طرف بھاگ پڑا۔ اویس مجھ سے پوچھتا رہ گیا تھا کہ میں نے انگریزی میں کیا ’’گٹ مٹ‘‘ کی ہے مگر میرے پاس اس کے سوال کا جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ گھر جاتے ہی میں نے موبائل فون کے کیمرے سے تمام رپورٹس کی تصاویر بنائیں اور جینی کو بھیج دیں۔ اب مجھے اس کے جواب کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

دو دنوں بعد ہی جینی نے کال کر کے بتا دیا کہ ڈاکٹر سو فیصد تو نہیں البتہ کافی پرامید ہیں۔ باقی حتمی فیصلہ وہ ایکسرے رپوٹس اور مریض سے مل کر کریں گے۔ میں نے فوراً ہی امریکہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے مرحلے میں تو میں نے یونٹ جا کر کمانڈنگ آفیسر سے مل کر ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی۔ پہلے والے کمانڈنگ آفیسر ملک عرفان صاحب چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ سیکنڈ ان کمانڈ وسیم صاحب نئے کمانڈنگ آفیسر بنے تھے۔ میرا مسئلہ سنتے ہی انھوں نے میری دو ماہ اور چھٹی کر دی تھی اور اس کے ساتھ ہی انھوں کہہ دیا کہ اگر مزید بھی ضرورت ہوئی تو وہ مجھے چھٹی ضرور دیں گے۔ پاک آرمی میں ویسے تو زیادہ سے زیادہ اکٹھی چھٹی دو ماہ کی مل سکتی ہے، البتہ کسی خصوصی معاملے میں چھ مہینے اور سال تک بھی کمانڈنگ آفیسر اپنے جوان کو چھٹی پر رکھ سکتا ہے۔ پلوشہ کا پاسپورٹ بنانے سے پہلے شناختی کارڈ بنانے کا مرحلہ تھا۔ وہ مشکل سے ابھی اٹھارہ سال کی

ہوئی تھی۔اس ضمن میں میجر اورنگ زیب صاحب اور وسیم صاحب نے میری بڑی مدد کی تھی۔میں نے دونوں بیویوں کے شناختی کارڈ بنوالیے تھے۔میجر اورنگ زیب نے ہنستے ہوئے کہا تھا......

''یار، تمھیں شادی کرنے کے لیے پاکستان میں کوئی لڑکی نہ ملی۔''

اس کی بات واقعی حقیقت تھی کیوں کہ روما کا تعلق مقبوضہ کشمیر سے تھا، پلوشے وزیرستان کی تھی، گلگارے کا تعلق افغانستان سے تھا تو جینیفر امریکن تھی۔

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''سر!......ایک شادی گاؤں سے بھی کی تھی جس کی وجہ سے اب تک سر جھکا ہوا ہے۔''

انھوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''غلطی اس کی تھی، تمھارا سر کیوں جھکا ہوا ہے۔''

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''سر!...... ہمارے ہاں عورت کی بے راہ روی مرد کے کھاتے میں جاتی ہے۔''

''جانے دو یار گزری باتوں کو، اس کے بدلے اللہ پاک نے تمھیں دو بیویاں دے دی ہیں۔یقین مانو ہم تو ترستے ہی رہے ہیں دوسری شادی کے لیے۔''

میں نے موبائل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔''میرا خیال ہے تہمینہ باجی کو کال کرنا پڑے گی۔''

''یہ دیکھ رہے ہو۔''انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔''آفیسر میں آپ کے لیے ہوں یار۔''اور میں مسکراتا ہوا ان کے آفس سے باہر آ گیا۔

میری ان ساری کارروائیوں سے پلوشے ناواقف نہیں تھی۔غیر متوقع طور پر وہ پرسکون ہوگئی تھی۔روما اور اس کی خوب بن رہی تھی۔روما کے خلوص کے سامنے اس ہٹ دھرم نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ایک دن میں پلوشہ کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے روما سے کشمیری زبان میں بات کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔مختلف زبانوں کو سیکھنے کی اس میں خاص صلاحیت موجود تھی۔

''جب روما اردو میں بات کرسکتی ہے تو کشمیری سیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔''میں پلوشہ کو چھیڑے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ”تاکہ آپ کی موجودی میں ہم خفیہ باتیں کرسکیں۔“

”اچھا مجھ سے بھی کچھ چھپاتی ہو۔“ اس کی ناک کی پھننگ کو پکڑ کر میں نے آہستہ سے مروڑا۔

وہ جھٹ بولی۔ ”جی ہاں، بہت ساری باتیں۔“

”گندی بچی۔“ میں اس کے ماتھے پر جھک گیا۔ یوں بھی تمام گھر والے بشمول اس کے چھوٹے بھائی عدیل کے ہر وقت اس کی دل جوئی میں لگے رہتے تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اس ضمن میں روما تو حد ہی عبور کر جاتی تھی۔ شاید سگی بہن بھی پلوشے کے اتنے نخرے برداشت نہ کرتی جو روما کرتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سوکنیں ہیں۔ اور ایسا روما کے خلوص کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا۔ ورنہ پہلے دنوں میں پلوشہ اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ میں ایک دن پلوشہ کے ساتھ ہوتا اور دوسرے دن روما کے ساتھ۔ اور اپنی باری پر روما میرے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ بتا کر پلوشہ کے کمرے میں گھس جاتی۔ اس کے بعد رات بھر وہ گپیں ہانکتیں یا سگی بہنوں کی طرح اکٹھے سو جاتی تھیں۔

ایک رات میں نے روما کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جانتی ہو اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمھارا دل تمھارے چہرے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے تو پہلی ہی بار تمھیں شوہر سے طلاق دلوا کر ساتھ لے آیا ہوتا۔“

وہ ناز سے بولی۔ ”جھوٹے اجنبی، جھوٹ بولنا کب چھوڑیں گے۔“

میں مسکرایا۔ ”اچھا اب بھی اجنبی ہوں۔“

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ”ہمیشہ رہیں گے۔“

میں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر چھیڑا۔ ”جب یہ آجائے گا تب بھی۔“

وہ مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں...... بھول گیا ہے جب میں نے پہلی بار نام پوچھا تھا تو جناب نے کیا فرمایا تھا کہ آپ مجھے اجنبی کہہ سکتی ہو۔ اب وہی اجنبی کہوں گی۔“

”اگر میں معذرت کروں تو......؟“

”یہ معذرت وغیرہ اپنے پاس رہنے دیں۔ اور میں خفگی سے نہیں کہتی ایسا کہنا مجھے اچھا لگتا ہے ہمیشہ اجنبی کے نام ہی سے آپ کو سوچا ہے۔“ قریب ہو کر اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور میں آہستہ آہستہ اس کی

ریشمی زلفوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔

☆......☆......☆

شناختی کارڈ کے بعد میں نے پلوشے کا پاسپورٹ بنوایا اور امریکن ایمبسی میں ویزے کی درخواست دے دی۔ جینی نے اپنے تعلقات بروے کار لاتے ہوئے دو تین دن کے اندر ہم دونوں کا ویزا لگوا دیا تھا۔ یوں بھی ہم علاج کے سلسلے میں امریکہ جا رہے تھے جس کی وجہ سے کوئی خاص رکاوٹ سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک دن ہم دونوں ہوائی جہاز میں بیٹھ رہے تھے۔ طویل پرواز کے بعد ہم نیویارک ائرپورٹ پر اترے جینی اپنے شوہر کے ہمراہ ہماری منتظر تھی۔ شوہر کی موجودی کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے گلے سے لگ کر بے باکی سے میرے دونوں گالوں کو چوما اور پھر پلوشہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میری بے بی کیسی ہے۔'' اس نے وہیل چیئر پر بیٹھی پلوشہ کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر ماتھے پر بوسا دیا۔

پلوشہ معصومیت سے بولی۔ ''ساری رپوٹیں تو راجو نے بھیج دی تھیں۔ اب تک ویسی ہی ہوں۔'' اور جینی کھل کھلا کر ہنس دی۔

اس کے شوہر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اس نے ایک سیاہ فام سے شادی کی تھی۔ اس کا نام پال کلفٹن تھا۔ میرے ساتھ معانقہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

''ذیشان برادر، شکریہ کہ تم نے جینی جیسی حسینہ کو میرے لیے چھوڑ دیا۔'' وہ امریکی تھا اور ان کی تہذیب میں ایسی کوئی بھی رقیبانہ جلن موجود نہیں ہے۔ اپنی بیوی کا مجھ سے لپٹنا اور میرے بوسے لینا اس کے لیے عام روزمرہ تھی۔ اسے یہ شرم نہیں تھی کہ میں اس کی بیوی کا پرانا محبوب تھا بلکہ وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں نے اتنی خوب صورت لڑکی کو اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اس کی بے تکلفی کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی ویسا ہی انداز اپنایا تھا۔ ''ویسے اتنے وسیع ملک میں جینی کو تم ہی ملے ہو۔''

''ہا......ہا......ہا۔'' اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ''جینی کہتی ہے کہ میری شکل تم سے ملتی جلتی ہے۔''

''جینی۔'' میں جینیفر کی طرف مڑا۔ ''اگر اس کی موخّر الذکر بات درست ہے تو یہ بات ہماری دوستی کو ہمیشہ

کے لیے ختم کرسکتی ہے۔''

پال نے ایک اور قہقہہ لگایا۔جینی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''نہیں شکل کی بات تو میں نے نہیں کی تھی، میں نے کہا تھا کہ پال تمھاری طرح جھوٹ بولتا ہے۔اور اس کا ثبوت یہ ابھی جھوٹ بول کر دے چکا ہے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔''جھوٹا ہونا برداشت کرلوں گا۔مگر یہ شکل کی مماثلت والی بات بالکل بھی قابل قبول نہیں ہے۔''

وہاں سے ہم ان کی رہائش گاہ میں پہنچے۔ہماری آمد کا سنتے ہی جینی نے اپنے فرج وغیرہ میں چکن، گائے اور بکرے وغیرہ کا گوشت بھروالیا تھا۔

پال واقعی ہی اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔اگلی صبح سے ہماری ڈاکٹروں کے پاس آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔میرے استاد کرنل جیمس میتھونی بھی افغان کے محاذ سے انھی دنوں لوٹے تھے۔جیمس صاحب اور جینیفر نے ہر ہر قدم پر میری مدد کی تھی۔ان کے تعلقات میرے بہت کام آئے تھے۔ اس معاملے میں پال بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔نیویارک میں رہائش کا مسئلہ یوں بھی جینی کی وجہ سے حل ہوگیا تھا۔جہاں میرے دس روپے خرچ ہوتے وہاں ان لوگوں کی وجہ سے پانچ ہی سے کام نبٹ گیا تھا۔پیسوں کی میرے پاس کمی نہیں تھی۔ایک لاکھ ڈالر تو امریکنوں کے دیے ہوئے میرے اکاؤنٹ میں موجود تھے۔پلوشہ کے علاج کے لیے تو میں اپنی تمام جائیداد بھی بیچ سکتا تھا۔اپنی جان گروی رکھ کر بھی اس کا علاج کرواسکتا تھا۔

ابتدائی رپوٹس دیکھتے ہی ڈاکٹروں نے مجھے امید دلادی تھی۔اور امریکہ پہنچتے ہوئے ہمیں مہینہ ہونے والا تھا جب پلوشے کی کمر کا آپریشن ہوا۔وہ آپریشن ڈاکٹروں کے ایک پینل نے کیا تھا۔اس میں آرتھوپیڈک، نیرو سرجن، ایل ایس سپائن وغیرہ کے ماہر موجود تھے۔طب کے متعلق میں نہ تو اتنی ٹیکنیکل باتیں میں جانتا ہوں اور نہ ان کے درج نہ کرنے سے کہانی پر کوئی اثر پڑے گا۔بلکہ الٹا یہ باتیں قارئین کی اکثریت کو بور کردیں گی۔اس لیے میں علاج کی تفصیل سے پہلوتہی کروں گا۔

آپریشن کے متعلق میں نے گھر بات کر کے بھی بتادیا تھا۔تمام مصروفِ دعا ہوگئے تھے۔نہ جانے کیوں مجھے روما کی دعاؤں پر سب سے زیادہ بھروسا تھا۔اسے میں نے خصوصی طور پر دعا مانگنے کی تاکید کی تھی۔

آپریشن کافی دیر جاری رہا تھا۔ اس دوران میں مسلسل ہی آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلتا رہا۔ جینی اور پال بھی میرے ساتھ ہی موجود تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ جینی نے واپس نہیں جانا تھا۔ اس وجہ سے اس کے بجائے میں نے پال کو کہا۔

"میرا خیال ہے آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پاگل تو نہیں ہوں جو تمھیں جینی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں۔" وہ ماحول وغیرہ دیکھے بغیر ہر وقت ایسے ہی مذاق کرتا رہتا تھا۔

"کیا مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "ہے، مگر جینی پر نہیں ہے۔"

جینی تپتے ہوئے بولی۔ "اگر تم اگلے ایک منٹ میں غائب نہ ہوئے تو میں سچ میں ذی کے ساتھ کسی کمرے میں بند ہو جاؤں گی۔"

پال فوراً ہی کان دباتے ہوئے وہاں سے بھاگ پڑا۔ جینی مسکراتے ہوئے زیر لب بولی۔ "گدھا۔" مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی۔

اور پھر اللہ کے فضل و کرم اور تمام کی دعاؤں سے پلوشے کا کامیاب آپریشن ہو گیا۔ ڈاکٹر نے پلوشہ کو پندرہ دن تو مکمل طور پر بیڈ پر لیٹنے کا حکم دیا تھا۔ اس دوران اس کی دواؤں اور دوسری ضروریات کا میں نے ہر لمحہ خیال رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ میرا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا کر اس پر اپنے یاقوتی لب رکھ کر رو پڑتی۔ اور میں اسے بہلانے لگ جاتا۔

پندرہ دن بعد ڈاکٹر کی ہدایات پر پلوشے نے ڈرتے ڈرتے بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر میرا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے اس کے چہرے پر مجھے ویسی ہی خوشی نظر آئی تھی جب مجھ سے نکاح کرتے وقت اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دو تین قدم لے کر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر رونا شروع کر دیا۔

اس کا سر سہلاتے ہوئے میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "کہا تھا نا میری گڑیا اللہ پاک کے حکم سے ٹھیک

ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر نے مجھ سے مصافحہ کر کے مبارک باد دی۔ میرے بعد جینی نے پلوشہ کو گلے سے لگا کر بہت سا پیار کیا تھا۔

پلوشہ نے فوراً ہی گھر کا نمبر ملا کر تمام کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔ مجھ سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی تھی کہ اس کی کال امی جان نے وصول کی تھی اور انھیں یہ خبر بتانے کے بجائے اس نے سب سے پہلے رومانہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور سب سے پہلے روماہی کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔

رات کو میرے بازو پر سر رکھ کر وہ ہولے سے بولی۔''راجو جانتے ہوئے آپریشن سے پہلے میں نے کیا دعا مانگی تھی۔''

''بتاؤ ذرا۔'' میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

''میں نے کہا یا اللہ پاک، اگر میں ٹھیک ہو گئی تو رومی باجی کو ہمیشہ سپوگمائے جتنا پیار کروں گی۔ اور دیکھ لو اللہ پاک نے میری دعا قبول کر لی۔'' رومانہ کو صرف میں روما کہتا تھا۔ باقی تمام اسے رومی کہہ کر بلاتے تھے۔

''تو اسی لیے سب سے پہلے اسی کو یہ خوش خبری سنائی۔''

''ہونہہ!......'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو اب کیا ارادہ ہے۔''

وہ پر عزم لہجے میں بولی۔''ان کی ہر بات مانوں گی، جو کہیں گی عمل کروں گی۔''

☆......☆......☆

اگلے تین ماہ بھی ہم امریکہ ہی میں رہے تھے۔ کیوں کہ آپریشن کے بعد بھی کئی مراحل بقایا تھے۔ اور پھر ایک دن ڈاکٹروں نے ہمیں واپسی کی اجازت دے دی تھی۔ پلوشے اب بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک تھی۔ اب اسے کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے سال بھر کے لیے اسے وزن اٹھانے، بھاگنے دوڑنے اور مشقت والے کاموں سے منع کیا تھا۔ ان کے مطابق اگلے چند ماہ میں پلوشہ نے بالکل تندرست ہو جانا تھا۔ اور اس کے بعد اسے کسی پرہیز کی ضرورت نہیں تھی۔

رات کے کھانے پر جینی مجھے اداس نظر آئی۔

''میں نے خلوص دل سے میاں بیوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا وہ احسان بھلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔''

پال سنجیدگی سے بولا۔''اگر میرا ذرا سا بھی احسان سمجھتے ہو تو اس کا بدلہ چکاتے ہوئے جانا۔''

''کیسے؟'' ہر وقت مذاق کرنے والے پال کا سنجیدہ لہجہ مجھے کافی عجیب لگا تھا۔

''ایک تو جینی کو کہہ دو کہ اپنے موبائل فون کی سکرین پر تمھاری تصویر ہٹا کر میری تصویر لگا دے۔ دوسرا مجھے ایک بے بی چاہیے جبکہ محترمہ نے پانچ سال بعد کی تاریخ دے رکھی ہے، تیسرا یہ دوستوں کی محفل میں تمھاری تعریف نہیں کرے گی، چوتھا نوکری چھوڑ کر میری کمپنی جوائن کرے گی اور آخری اس کے بعد مجھے طلاق دینے کی دھمکی بالکل نہیں دے گی۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں پھلجڑیاں چھوڑیں۔ پلوشے کے منہ سے قہقہے ابل پڑے تھے ۔جبکہ جینی پال کو غصے سے گھورنے لگی۔

''یہ دیکھو۔'' جینی نے اپنا موبائل فون میری جانب بڑھایا۔ جس پر پال کی مسکراتی ہوئی تصویر نظر آ رہی تھی۔

میں نے موبائل فون کی سکرین پال کی جانب سیدھی کی۔''یہ کیا ہے برادر۔''

وہ فوراً بولا۔''یقیناً اس نے ابھی لگائی ہے۔''

میں نے کہا۔''چلیں ایک بات تو پوری ہوگئی ہے نا۔''

''ہاں مگر یہ نہ ہو، کہ ادھر تم لوگ جہاز میں بیٹھو اور ادھر میری تصویر بھاپ کی طرف اس سکرین سے اڑ جائے۔''

میں جینی کو مخاطب ہوا۔''جی!......نوکری والی بات تو تم ضرور مانو گی۔''

جینی نے منہ بنایا۔''میں کرنل بننے والی ہوں۔''

پال فوراً بولا۔''جتنی تنخواہ آرمی سے لیتی ہو اس سے دگنی دوں گا۔'' پال خود بہت بڑے بزنس کا مالک تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے گھر میں اکثر خود کام کرتا نظر آتا۔

''ٹھیک ہے۔'' غیر متوقع طور پر جینی نے حامی بھر لی تھی۔

''ہرّا......'' پال نے نعرہ بلند کیا۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کافی ہو گیا۔''

پال جلدی سے بولا۔ ''بے بی والی بات۔''

اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جینی مجھے مخاطب ہوئی۔ ''ویسے تمھارے مذہب میں ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے اور تم نے صرف دو کی ہیں۔'' یہ کہتے ہی وہ پلوشے کو بولی۔ ''کیا خیال ہے پیلا وشہ، مجھے برداشت کر لو گی۔''

پلوشہ مسکرائی۔ ''اب تو مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔''

پال فوراً ہی پلوشہ کو مخاطب ہوا۔ ''دیکھو چھوٹی لڑکی، کالا ہو یا گورا بھائی، بھائی ہوتا ہے۔''

جینی اچانک ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ساری شرطیں منظور ہیں، اگر ذی اور پیلا وشہ ہمارے ساتھ ایک ہفتہ اور گزار لیں۔''

ایک دم مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ تمام منصوبہ انھوں نے ہمیں چند روز روکنے کے لیے بنایا تھا اور پال یہ جانتے ہوئے بھی کہ جینی مجھ سے محبت کرتی ہے اس منصوبے میں بیوی کا حامی بن گیا تھا۔

میں نے پلوشہ کی جانب دیکھا اسے گھر جانے کی بہت جلدی تھی۔ مگر جینی کی خواہش کو نہیں ٹھکرا سکی تھی۔ منھ بسورتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھے امریکہ تو گھمایا ہی نہیں ہے۔''

''پیلا وشہ زندہ باد۔'' جینی نے اسے بے ساختہ بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اگلا ہفتہ بھی ہم نے ان مخلص میاں بیوی کے ساتھ گزارا۔ ہمارے واپسی کے ٹکٹ بھی انھوں نے کرائے تھے۔ اور پھر ایک دن ہم تحائف سے لدے پھدے گھر وپس لوٹے۔ پلوشہ کو اپنے پاؤں پر چلتے دیکھ کر تمام کے چہرے خوشی سے گلنار ہو گئے تھے۔

واپس آکر میں نے چند دن گھر گزارنا ضروری سمجھے تھے کیونکہ روما مجھے خوش خبری سنانے والی تھی۔ انھی دنوں گلگارے کی کال بھی مجھے موصول ہوئی۔ پلوشہ کے بارے جان کر وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اسے اللہ پاک نے اپنی رحمت سے نوازا تھا جس کا نام اس نے پلوشہ رکھا تھا۔ میں پلوشہ کو اس کی کہانی سنا چکا تھا۔ پلوشہ سے کال پر بات کر کے گلگارے نے فوراً ہی اسے گھر آنے کی دعوت دے دی تھی۔ مجبوراً مجھے اگلی چھٹی پر گلگارے کے گھر جانے کا وعدہ کرنا پڑا۔ امریکہ سے واپسی کے ایک ہفتے بعد مجھے اللہ پاک نے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ جس کا نام

پلوشہ نے عبداللہ رکھا تھا۔اس کی ماں سے زیادہ پلوشہ خوش تھی۔وہ صرف دودھ پینے کے لیے ہی ماں کے پاس جاتا ورنہ ہر وقت پلوشہ نے اسے اٹھایا ہوتا۔پلوشہ کے رخساروں کی سرخی لوٹ آئی تھی۔اس کا شاداب جسم پہلے سے بھی صحت مند ہو گیا تھا۔اور لمبے بال تو گویا......

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

کے مصداق سب پر اپنا جادو چلاتے رہتے تھے۔اسے اب تک بالوں کی مینڈھیاں بنانا نہیں آتی تھیں۔یہ کام روما ہی کو کرنا پڑتا۔وہ اس کے بالوں میں کنگھی کر کے پراندہ باندھ دیتی۔ایک دن میں نے پلوشہ کے سامنے ہی روما کو کہا کہ......

"تم نوکر تو نہیں ہو کہ ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی ہو۔اب یہ بچی نہیں رہی اسے خود ہی اپنے بال بنانے چاہئیں۔"

پلوشے بے پروائی سے بولی۔"تو کیا، میں سر پر استرا پھروا لوں گی۔"

روما اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولی۔"میری گڑیا کو ضرورت ہی کیا ہے اپنے کام کرنے کی۔اس کی روما باجی موجود ہے نا۔" رومانہ کو تمام رومی کہتے تھے صرف میں اسے روما کہتا تھا اور وہ بھی میری نقل میں خود کو روما ہی کہا کرتی۔

"سن لیا۔" پلوشے نے زبان نکال کر مجھے چڑایا اور میں کان دبا کر خاموش ہو گیا۔

سردار اور مریم بھابی (لی زونا) بھی عبداللہ کی پیدائش پر میرے گھر آئے تھے۔مریم ابھی اچھی خاصی اردو اور پشتو سیکھ گئی تھی۔میرے پوچھنے پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ذیشن بھائی، پشتو اور اردو اس لیے سیکھنا پڑی کہ سردار کی انگریزی اب بھی ویسی ہی ہے۔"

سردار کے بیٹا سلطان خان نے اماں، ابا کہنا سیکھ لیا تھا۔وہ مریم سے بہت زیادہ مانوس تھا۔بلکہ ایسے جیسے وہ اس کی سگی ماں ہی تو ہو۔

اسی رات روما میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔"ایک بات مانیں گے۔"

''پہلے کبھی ناں کی ہے۔''

وہ لجاجت سے بولی۔''ایک کار خرید لونا۔''

''سچ سچ بتاؤ یہ تمھیں کس نے کہا ہے۔''میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

وہ صاف گوئی سے بولی۔''پلوشے کہہ رہی تھی۔''

''تو وہ خود کہے نا۔''

''اسے شرم آ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ پہلے ہی اس کے علاج پر اتنا خرچہ آیا ہے، کار کا سن کر آپ خفا نہ ہو جائیں۔''

''اور اس کی روما باجی نے کہا ہوگا، کہ وہ فکر نہ کرے روما اسے کار خرید کر ضرور دے گی۔''

''ہاں کہا ہے تو......''وہ ایک دم بگڑ گئی تھی۔

میں فوراً ہار مانتا ہوا بولا۔''ٹھیک ہے یار، لڑتی کیوں ہو۔''

''اگر آپ نہیں لے کر دیں گے تو میں ابو جان سے بات کرلوں گی۔''وہ دونوں میرے والد کو ابو جان ہی کہتی تھیں۔

میں نے کہا۔''کہا تو ہے کہ لے دوں گا۔''

''جھوٹا اجنبی۔''منھ بناتے ہوئے اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔

دوسرے دن میں نے اکیلے میں پلوشے کے کان سے پکڑا۔''روما کی کچھ ہوتی سوتی، مجھے کیوں نہیں کہا کار کے بارے۔''

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔''آپ کو کہا تو تھا، بھول گیا ہے شاید۔''

''بھولا تو نہیں تھا بس موقع ہی نہیں مل سکا۔''

''بس بس رہنے دیں۔''اس نے منہ بنایا۔

''کیا مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔''

''اپنی جان سے بھی بڑھ کر اعتبار ہے۔''وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

جانتی ہوں اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر آپ کو کوئی عزیز نہیں ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں رومی باجی کو اس گھر میں مجھ سے زیادہ اہمیت ملے۔ وہ جتنی اچھی ہیں، جتنی مخلص ہیں اگر کبھی ان کے دل ذرا سا بھی ملول آ گیا تو میں خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔ اسی لیے انھیں کہا کہ آپ سے بات کریں۔ ورنہ راجو اور میری کوئی بات ٹال جائے یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔''

میں نے اسے چڑایا۔''بڑا پیار کرتی ہو اپنی رومی باجی سے۔''

''وہ ہیں ہی اس قابل کہ اسے چاہا جائے۔ دیکھتے نہیں وہ امی جان سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے سپوگمائے باجی اب تک زندہ ہیں۔''

''اچھا کل میں واپس جا رہا ہوں۔'' سب سے پہلے میں اسے ہی یہ خبر دے رہا تھا۔

وہ لجاجت سے بولی۔''آپ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ یہیں پر کوئی کاروبار وغیرہ شروع کر دیں۔''

''جانتی ہو میری تربیت پر پاک آرمی نے کتنا خرچا کیا ہے۔ اور پھر اگر سارے مرد ہی وطن کی حفاظت کو چھوڑ کر اپنی پیاری پیاری بیویوں کی آغوش میں لیٹ جائیں تو ایک دن ان کی بیویاں ہندوؤں کے بچے پیدا کر رہی ہوں گی۔''

وہ نادم لہجے میں بولی۔''میرا یہ مطلب نہیں تھا راجو، میں تو بس آپ سے دور رہنے کا سوچ کر گھبرا رہی ہوں۔''

میں فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''یہ گھبراہٹ، وطن کے ہر رکھوالے کی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی قسمت میں شامل ہے۔''

''اچھا ایک دن اور ٹھہر جائیں۔'' اس ہٹ دھرم نے آسان سی شرط پیش کی جو میں نے مان لی تھی۔

اگلے دن میں روما اور پلوشے کو ساتھ لے کر ایک شو روم میں پہنچا اور ان کی پسند کی کار خرید لی۔ شہر سے واپس آتے ہوئے میں اولیس کی کار میں تھا جب کہ وہ دونوں نئی کار میں لوٹی تھیں۔ جسے پلوشے ڈرائیو کر رہی تھی۔ ایک بار پلوشے نے کہا تھا کہ وہ اپنی کار چلانا چاہتی ہے اور آج اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

عبداللہ کی پیدائش کے ایک ہفتے بعد میں کئی خوش خبریوں کے ساتھ یونٹ واپس لوٹا تھا۔ تصور صاحب،

استاد فیاض، الیاس، شہزادو غیرہ نے مجھے محبت سے خوش آمدید کہا تھا۔ سردار ابھی تک چھٹی پر تھا۔

☆......☆......☆

یونٹ میں ہفتہ بھر گزارنے کے بعد ایک دن کمانڈنگ آفیسر نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔

''ذیشان، کیسے ہو؟'' مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ میرا حال پوچھنے لگے۔

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''بالکل ٹھیک ہوں سر۔''

اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''کچھ عہدہ داران کہہ رہے ہیں طویل چھٹی نے تمھاری صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا ہے۔''

میں اعتماد سے بولا۔ ''آپ کل ٹیسٹ لے کر جانچ لیں سر۔''

''آج سردار خان کی بھی چھٹی سے واپسی ہے۔'' مجھے لگا وہ موضوع تبدیل کر رہے ہیں۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی سر۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔ ''یقیناً، تم اپنے ساتھ اسی کو لے جانا چاہو گے۔''

''میں سمجھا نہیں سر۔'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

انھوں نے اطمینان بھرے انداز میں وضاحت کی۔ ''سنا ہے افغان بارڈر پر باڑ لگانے والی یونٹوں کو دہشت گردوں کے سنائپرز کا بہت خطرہ ہے۔ خاص کر انڈین سنائپرز دہشت گردوں کا ہراول بنے ہوئے ہیں۔''

میرے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میرے دائیں کندھے میں کھجلی ہونے لگی۔ یقیناً رینج ماسٹر کے بٹ کا جانا پہچانا لمس میرے کندھے کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ''کب جانا ہو گا سر؟''

وسیم صاحب بولے۔ ''پرسوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کل کا دن ہم رستے میں گزارنا پسند کریں گے۔''

وسیم صاحب نے قہقہہ لگایا۔ ''اس کا مطلب ہے عہدادران کے اندیشے غلط ہیں۔''

ان کی مسکراہٹ کو اجازت پر محمول جانتے ہوئے میں نے کہا۔ ''شکریہ سر۔''

ہم نے کافی آرام کر لیا تھا اور مادرِ وطن ہمیں دوبارہ اپنی خدمت کے لیے بلا رہی تھی۔ یقیناً اس مٹی کا ہم پر

بہت زیادہ قرض ہے اور جب تک میری جان میں خون کا ایک قطرہ باقی ہے میں اس فرض سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ بہ قول شاعر......

خون دل دے کے نکھاریں گے رخ برگ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

اور......

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے ترے جانباز چلے آتے ہیں

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ شاید پھر کبھی آپ لوگوں کے سامنے اس کے بعد کے واقعات سنانے کا موقع ملے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی موقع نہ دے۔ لیکن میرے آپ کے ختم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ موت تو اٹل حقیقت ہے۔ البتہ اس ارض وطن کو قیامت کی صبح تک یونھی قائم و دائم رہنا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہو گا جب ہم میں مادر وطن پر قربان ہونے کا جذبہ اور حوصلہ موجود رہے گا۔

......ختم شد......